بیان القرآن

یعنی

اردو ترجمہ مع مختصر تفسیر

تالیف

حضرت مولانا محمد علی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ

بیان القرآن

یعنے

اردو ترجمۃ القرآن معہ حل لغات و حواشی تفسیریہ

تالیف

حضرت مولینا محمد علی

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام

لاہور (مغربی پاکستان)

۱۳۸۸ ہجری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

بیان القرآن

یعنی

اردو ترجمۃ القرآن معہ حل لغات و حواشی تفسیریہ

تالیف

حضرت مولینا محمد علی مفسر انگریزی ترجمہ تفسیر قرآن

جلد اوّل

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام

لاہور (مغربی پاکستان)

سنہ ۱۳۸۸ ہجری

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No.
★ MAILSI ★
TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY
Masood Faisal Jhandir Library

عرضِ ناشر

بیانُ القرآن کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا۔ گذشتہ پینتالیس سالوں میں اِس تفسیر نے اپنوں اور غیروں سے یکساں طور پر دادِ تحسین حاصل کی ہے۔ اِس کی شہرت کی وجہ یہ ہے کہ یہ تفسیر گذشتہ چودہ سو سال کے علمِ تفسیر کا نچوڑ ہے، جو حضرت مولانا نے اِس میں نہایت عام فہم اور سلیس انداز میں پیش کیا ہے۔ اِس کے علاوہ جدید علوم کی روشنی میں مستشرقین کے اسلام اور قرآن مجید پر اعتراضات کے نہایت مدلل جوابات پیش کئے ہیں۔ قرآن مجید کے مشکل مقامات کی جو تشریحات بیان کی گئی ہیں اُن کو حضرت مولانا نے محض اپنی رائے تک محدود نہیں کیا بلکہ ان کی صحت میں مستند لغات اور تفاسیر کے حوالے درج کئے ہیں۔ ان خوبیوں نے حضرت مولانا کو جدید دَور کے مفسّرین میں ایک منفرد حیثیت عطا کی ہے۔ عام قارئین کے علاوہ اہلِ تحقیق اور درس و تدریس کرنے والے علما بھی اکثر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس تفسیر کی مقبولیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ محسوس کیا گیا کہ نہ صرف نیا ایڈیشن عکسی ہو بلکہ اس کے حجم میں مواد کو کم کئے بغیر کمی کی جائے۔ چنانچہ بیانُ القرآن کے عکسی ایڈیشن کی طباعت کا اہتمام کیا گیا۔ اس کی تقطیع کو ۲۲×۲۹ سے کم کر کے ۲۰×۲۶ کر دیا گیا اور مکمل تفسیر جو پہلے ۲۲۰۰ صفحات پر مشتمل تین جلدوں میں تھی اب اِسکو دو جلدوں میں ۱۵۰۰ صفحات میں سمیٹ لیا گیا ہے۔

بیان القرآن کے اِس ایڈیشن کے بارے میں دو امور کی وضاحت ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ اس حمائل شریف سے لیا گیا ہے جو بیان القرآن کے ۷ سال بعد ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھی اور جو بیان القرآن کی تلخیص تھی۔ اِس میں ترجمہ درج کرتے وقت حضرت مولانا نے خاصی حد تک اس پر نظرِ ثانی فرمائی تھی۔ اس لئے ہم نے بیانِ القرآن کے اِس ایڈیشن کے لئے حمائل شریف کے ترجمہ کو ترجیح دی ہے؛ دُوسرے صفحات کے سائز اور حجم کو کم کرنے کی غرض سے ہم نے تفسیری حواشی کی ذیلی سرخیوں کو حاشیہ میں درج کرنے کی بجائے متعلقہ مضمون کے شروع میں درج کر دیا ہے یا متعلقہ مضمون کے کسی خاص فقرہ کو خط کشیدہ کر کے اشارہ کر دیا ہے۔ پوری سُرخی کو ملاحظہ کرنے کیلئے فہرست مضامین سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

بیان القرآن کے موجودہ ایڈیشن کی کتابت اور طباعت میں عمدگی پیدا کرنے کا سہرا مولینا عبد المنّان صاحب ایم اے (علیگ) کے سر ہے جنھوں نے شروع سے آخر تک تمام مراحل میں نہ صرف اپنا قیمتی مشورہ دیا بلکہ ان پر اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اسکی نگرانی کی۔ ہم اسکے لئے انکے بیحد مشکور ہیں ——— اسکے علاوہ ہم محترم الحاج شیخ میاں فضل الرحمٰن صاحب کے بیحد ممنون ہیں جنھوں نے ایک گرانقدر عطیہ اسکی طباعت کیلئے مرحمت فرمایا۔ ہماری جماعت کے ایک نہایت مخلص اور نیک نوجوان میجر چوہدری عبد اللطیف بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے سب سے پہلے ۵۰۰ روپے کی رقم بطور پیشگی قیمت ارسال کی اور دیگر اصحاب کو اس طریق پر بیان القرآن کی طباعت کے بوجھ کو کم کرنے کی تحریک کی۔

آخر میں ہم ناصر احمد صاحب بی اے ایل ایل بی کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے نہایت محبت اور محنت سے اس ایڈیشن کی طباعت کے کام کو سر انجام دیا۔ ہماری دُعا ہے کہ اسکے ذریعہ فرقانی تعلیمات کی ترویج کے کام کو وسعت ہو اور لوگ اسکی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ایک مثالی معاشرے کی بُنیادوں کو مضبوط کریں!

خاکسار: **ممتاز احمد فارُوقی**

۲۰ر جنوری ۱۹۶۹ء

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 692846
★ MAILSI ★

○ بار اوّل ـــــ لیتھو ایڈیشن ـــــ ۱۹۲۲ء

○ بار دوم ـــــ عکسی ایڈیشن ـــــ ۱۹۶۹ء

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

Masood Faisal Jhandir Library

○ کاتب : منشی محمد شریف و منشی غلام جیلانی

○ طابع : نوائے وقت پرنٹرز لمیٹڈ - لاہور

○ ناشر : احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام - لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

اللہ تعالیٰ نے قوموں کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں میں اپنے رسول بھیجے اور ان کی تعلیم نے مُردہ دلوں پر وہی کام کیا جو آسمانی بارش مُردہ زمین پر کرکے دکھاتی ہے وہ روشن چراغ تھے جنہوں نے ایک تاریک رات میں انسانوں کی مختلف بستیوں کو منوّر کیا اور ان سب کے آخر اللہ تعالیٰ کے ظاہری قانون قدرت کے مطابق وہ آفتاب عالمتاب نمودار ہوا جس نے کُل عالم کو منوّر کیا اور جس کے سامنے سب روشنیاں ماند پڑ گئیں، وہ سراج منیر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ نور ہدایت جو آپ لائے قرآن کریم ہے۔ آپ کے بعد کسی پیغامبر کی ضرورت نہ رہی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا آخری اور کامل پیغام لوگوں تک پہنچ گیا اور نہ کسی نبی کی ضرورت رہی اس لیے کہ تمام صفات الٰہی کا کامل مظہر آچکا۔ دنیا میں ایک ہی پیغام ہوگا اور ایک ہی پیغامبر یہ دونوں تاقیامت زندہ رہیں گے، ہاں اس پیغام کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے واقف ہونا اور اس پیغامبر کے حالات سے آگاہی حاصل کرنا ہر ایک مسلم کہلانے والے کا پہلا فرض ہے۔ وہ مقدس پیغام ان لوگوں کی زبان میں نازل ہوا جنہوں نے دنیا میں اس کے حامل بننا تھا۔ مگر آج اس عالم کے مختلف اطراف و اکناف میں رہنے والے مسلمان اس زبان سے ناآشنا ہیں اور بہت ہیں کہ اس پیغام کو پڑھتے ہیں مگر انہیں علم نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس پیغام کی غرض یہ تھی کہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں اور غلط راہوں کو چھوڑ کر اپنی دینی اور دنیوی فلاح کا صحیح راستہ اختیار کریں تو اس کا مطلب سمجھے بغیر وہ غرض حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں نے جب تبلیغ اسلام کی ضرورت کو مدّنظر رکھتے ہوئے انگریزی میں اس پاک کلام کے ترجمہ اور مطالب کو بیان کیا تو بہت سے احباب نے یہ اصرار کیا کہ اُردو زبان میں بھی اپنے اہل ملک کے فائدہ کے لیے اسے شائع کیا جائے مگر یہاں کی ضروریات کو مدّنظر رکھتے ہوئے از سرِ نو یہ کام کرنا پڑا۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان قرآن کریم کو پڑھے اور اس کے مطالب پر آگاہ ہو کر اپنی روزمرہ زندگی میں اور مشکلات پیش آمدہ میں اسے اپنا ہادی اور رہنما بنائے اس راہ کو اختیار کیے بغیر مسلمان کبھی موجودہ مشکلات سے باہر نہیں نکل سکتے۔

انگریزی ترجمہ کی طرح اُردو ترجمہ قرآن شریف مکمل ایک جلد میں شائع نہیں ہو سکا جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس ترجمہ و تفسیر میں انگریزی کی نسبت بہت زیادہ تشریح ہے۔ الفاظ کی لغت کی تشریح کے علاوہ حواشی تفسیریہ بھی زیادہ ہیں اور ان میں بسط بھی زیادہ ہے اور اس لیے اس کا حجم بھی قریب قریب انگریزی ترجمہ کے حجم سے (دیباچہ کو الگ کرکے) دوچند ہو جائیگا اور علاوہ بریں یہ دقت ہے کہ انگریزی کے لیے جو باریک کاغذ استعمال ہوا ہے ہندوستان میں وہ مشینیں نہیں کہ جو اسے چھاپ سکیں اس لیے موٹا کاغذ لگانا پڑا اور قرآن کریم کو تین جلدوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ اسوقت پہلی جلد شائع ہوتی ہے جو قریباً ساڑھے سات سو صفحوں کی ہے اور گو اسمیں فقط ساڑھے سات پارے ہیں مگر آئندہ جلدوں کا حجم جو قریباً گیارہ گیارہ پاروں کو لئے ہوئے ہونگی اسی کے قریب قریب ہوگا کیونکہ بیشتر مضامین پہلے پاروں میں تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں اس لیے آئندہ حواشی میں ان مضامین کے دہرانے کی ضرورت نہ رہے گی اس جلد کے ساتھ صرف ان مضامین کی فہرست لگائی گئی ہے جو تفسیری حواشی میں آگئے ہیں اور ان الفاظ کی فہرست جن کی لغت بیان ہوتی ہے نہیں لگائی گئی اس لیے کہ ایسی فہرست اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جب وہ ترتیب وار لغت کی طرز پر تیار ہوتی اور یہ کام سوائے تکمیل کے ہو نہیں سکتا۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ مکمل فہرست آخری جلد کے ساتھ لگائی جائیگی اس وقت تک لغت کی تشریح کی تلاش میں بلاشبہ قارئین کرام کو دقت پیش آئے گی مگر یہ مجبوری ہے علاوہ ازیں آخری جلد کے ساتھ مضامین کی انڈکس بھی ہوگی جس سے یہ تلاش کرنا آسان ہو جائے گا کہ کس مضمون پر کس مقام پر بحث ہے۔

ترجمہ کے متعلق میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میری یہ کوشش رہی ہے کہ اصل الفاظ کو محاورۂ زبان پر کسی طرح قربان نہ کیا جائے باایں محاورہ کو مدّنظر رکھا ہے اور لفظی ترجمہ کرتے ہوئے اسے اُردو کے محاورہ کے مطابق ادا کیا ہے۔ ترجمہ کو عموماً الفاظ کی حد سے نہیں نکلنے دیا گو محاورہ اُردو نے اسبات کے لیے مجبور کر دیا ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ اس لفظ کے نیچے نہیں آسکا۔ ترجمہ میں اپنی طرف سے لفظ بڑھانے کے اصول کو قریباً بکلی ترک کیا گیا ہے۔ ہاں جہاں اُردو زبان میں اگر مطلب خبط ہوتا تھا زاید الفاظ کو خطوط وحدانی میں کھڑا کیا گیا ہے جو کہ بہت ہی کم دیکھنے میں آئے گا۔

حل لغت میں امام راغب کی نادر کتاب مفردات فی غریب القرآن کو مقدم کیا ہے جو لغت قرآن میں بہترین کتاب ہے اور اس کا بیشتر حصہ نوٹوں میں آجائیگا۔ مگر اس کے ساتھ ہی تاج العروس اور لسان العرب جیسی ضخیم کتابوں کی طرف بھی بکثرت رجوع کیا ہے اور جہاں مفردات میں کسی لفظ کی تشریح میں کمی تھی اسے دوسری معتبر لغاتوں سے پورا کر دیا ہے۔ عام قارئین کو لغت کے حصہ سے زیادہ دلچسپی نہ ہوگی اور مفردات کی فلسفیانہ بحث لغت الفاظ شاید ثقیل بھی معلوم ہوں مگر اس کے بغیر تفسیری حواشی نامکمل ہوتے اور چونکہ میرا منشاء یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں قرآن کریم کے درس تدریس کا سلسلہ عام طور پر جاری ہو اور یہ غرض بغیر حل لغت حاصل نہ ہو سکتی تھی اس لیے میں نے اس اضافہ کو ضروری سمجھا۔ ہاں عام قارئین حصہ لغت کو ترک کر سکتے ہیں ہر لفظ جس کی تشریح کی ہے اس تشریح کے سامنے حاشیہ پر وہ لفظ حروف عربی میں دیدیا ہے اور مضامین جن پر بحث ہے ان کی سُرخیاں اُردو حروف میں ہیں۔ پس جن قارئین کو لغت کے حصہ کی ضرورت نہیں وہ اسے آسانی سے چھوڑ سکتے ہیں۔ حل لغت میں بہترین صورت یہ ہوتی کہ ایک لفظ کی مکمل تشریح اور قرآن شریف کے مختلف موقعوں پر اس کا استعمال ایک جگہ آجاتا مگر اس طرح پر حجم بھی بہت بڑھ جاتا اور حل لغت کے حصہ میں ثقالت بھی بڑھ جاتی۔ اس لیے عموماً ملتے جلتے استعمال کا ایک جگہ ذکر کر دیا ہے اور جہاں کسی دوسرے معنی میں لفظ کا استعمال ہوا ہے اسے اپنے موقعہ پر بحث کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس جگہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں الفاظ کے استعمال میں وسعت لغوی موجود ہے اور ایک جگہ ایک لفظ ایک معنی میں استعمال ہوا ہے تو دوسری جگہ کسی اور معنی میں استعمال ہو گیا ہے اور یہ صرف سیاق سے ہی فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کونسے معنی کس جگہ مراد ہیں۔ مثلاً کفار کا لفظ عموماً حق کا انکار کرنے والوں پر بولا گیا ہے مگر ایک جگہ اپنے لغوی معنی میں کسانوں پر بھی بولا گیا ہے اصحاب الجنۃ سے عموماً بہشتی ہی مراد ہیں مگر ایک جگہ اس دنیا کے ایک باغ کے مالک بھی مراد لیے گئے ہیں اصحاب النار دوزخی ہیں مگر ایک جگہ دوزخ کے داروغے بھی ہیں۔

اصول تفسیر پر مفصل بحث کی جگہ نہیں۔ میں نے جن اصول کو مدنظر رکھا ہے وہ یہ ہیں۔ اول یہ کہ قرآن کریم کے ایک موقعہ کا حل دوسرے موقعہ سے کیا جائے اور یہ اصول خود اس پاک کتاب نے بتایا ہے جہاں تک متشابہات کے ذکر میں کل من عند ربنا فرما کر بتا دیا کہ ایک مقام کی تفسیر قرآن کریم کے دوسرے مقام کے خلاف نہیں ہونی چاہیئے جہانتک میں نے اس پاک کتاب پر غور کیا ہے یہی معلوم ہوا ہے کہ کوئی مضمون اس میں ایک جگہ بطور اشارہ یا برنگ اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی وضاحت اور اس کی تفصیل موجود ہے اور اس بات نے مجھے بہت سے مشکل مقامات کے حل کرنے میں مدد دی ہے اور جہاں معنی میں اشتباہ واقع ہو وہاں سب سے بڑھکر خود قرآن پاک اس اشتباہ کو دور کرتا ہے دوسری بات یہ مدنظر رکھی ہے کہ احادیث صحیحہ کو تفسیر میں اور باتوں پر مقدم کیا جائے اس غرض کے لیئے میں نے امام بخاری کی کتاب التفسیر تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن کثیر کو سامنے رکھا ہے لیکن یہاں چند باتوں میں احتیاط ضروری ہے یعنی اول کوئی حدیث خواہ وہ صحاح کی ہو قابل قبول نہیں اگر قرآن کریم کی صراحت کے خلاف ہو یا اصول دینی کے خلاف ہو۔ دوم تفاسیر میں بہت سی اسرائیلی روایات راہ پا گئی ہیں اور ان پر اس قدر اصرار ہو گیا ہے، کہ ان کے خلاف اگر کہا جائے تو بعض لوگ ناواقفی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ حدیث کو رد کر دیا گیا سوم قصص کی احادیث پر خود محدثین نے وہ تنقید نہیں کی جو اوامر و نواہی کی احادیث پر کی ہے اس لیے حدیث قصص بہت احتیاط سے قبول کرنے کے قابل ہیں چہارم جو باتیں احادیث میں واقعات یا مشاہدہ یا مسلمہ تاریخ کے خلاف ہوں وہ قابل قبول نہیں اور ان سب امور کے علاوہ یہ بات مدنظر رکھنے کے قابل ہے کہ احادیث اور بالخصوص احادیث قصص میں روایت بالمعنی ہے تیسری بات جس کا میں بالخصوص ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں نے استعمال الفاظ کے متعلق لغت کو سب سے مقدم کیا ہے۔ جن معنوں کی اجازت لغات عربی نہیں دیتی ان معنوں کو قبول نہیں کیا صحابہ کے اقوال کی میں بہت عزت کرتا ہوں لیکن کسی صحابی سے اختلاف کرنا جرم نہیں۔ صحابہ میں خود آپس میں بھی اختلاف تھے مفسرین نے بھی ان سے اختلاف کیا ہے اور سب سے آخر اقوال مفسرین کے متعلق اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ان بزرگوں کی محنت کی ان کے علم وفضل کی ان کے عشق قرآن کی میرے دل میں بیحد عظمت ہے اور ان کی خدمت قرآن کے سامنے میں اپنی اس ناچیز خدمت کو ہیچ سمجھتا ہوں لیکن حالات زمانہ کے اثر سے کوئی شخص خالی نہیں ہو سکتا۔ آج اس زمانہ میں نئے علوم نے قرآن کریم کی عظمت کو اور بھی بڑھا دیا ہے میرے خیالات حالات زمانہ سے متاثر ہو کر غلط ہو سکتے ہیں مگر خدا کے کلام کے ایک حرف کو بھی کوئی علم باطل نہیں کر سکتا۔ ہاں اپنے زمانہ کے مطابق جو علوم ہوں ان کی روشنی میں ہی ہم جو کچھ خدمت کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔

اس ترجمہ اور ان حواشی میں ایک بات کی طرف بالخصوص توجہ دلانا چاہتا ہوں قرآن کریم سے اجنبیت نے جن دلوں میں یہ خیال پیدا کیا ہے کہ اس پاک کتاب کے مضامین میں کوئی ترتیب نہیں انہوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہے اور یہ ایک ابلغ اور محکم ترتیب ہے۔ مخالفین میں غور و خوض کی کمی نے بے ترتیبی کا خیال پیدا کیا یہانتک کہ اس زمانہ میں ایک مسلمان نے بھی ان خیالات سے متاثر ہو کر ایک ترتیب نزول اپنے پاس سے بنا کر قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے ترتیب اور نظم دکھانے میں پچھلے مفسرین نے قابل قدر خدمات کی ہیں مگر میں نے اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اس حصہ کو خاص توجہ دی ہے اور تین قسم کی ترتیب کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے یعنی اول آیات میں باہمی تعلق جو جگہ جگہ جہاں ضرورت تھی حواشی میں ظاہر کیا ہے دوم ہر سورت کے رکوعوں میں باہمی تعلق، سوم سورتوں میں باہمی تعلق۔ ان دونوں اغراض کے لیے ہر رکوع کا خلاصہ اس رکوع کے نیچے دیدیا ہے اور ہر سورت کے شروع میں ان تمام خلاصوں کی ترتیب اور نظم کو ظاہر کیا ہے جس کا عنوان خلاصہ مضمون ہے اور سورتوں کے باہمی تعلق کو عنوان تعلق کے ماتحت ظاہر کیا ہے اس کے علاوہ سورتوں کے اسماء میں بھی حکمت ہے اور نبی کریم صلعم نے یہ اسماء رکھے ہیں کسی نام کے رکھنے میں جو حکمت میری سمجھ میں آئی ہے اسے ابتدائے سورت میں ظاہر کیا ہے۔

بعض خاص باتوں سے قارئین کرام کو آگاہ کر دینا ضروری ہے ہر سورت کی آیات کا شمار مسلسل چلتا ہے مگر آیت اور رکوع کا شمار اس آیت یا رکوع کے آخر پر نہیں دیا جیسا کہ عموماً مروج ہے بلکہ اس کے شروع میں دیا ہے مثلاً ۱۰ ع ۱۴ سے مراد ہے کہ یہاں سے دسواں رکوع سورت کا اور چودھواں رکوع پارے کا شروع ہوتا ہے اور اس رکوع میں گیارہ آیتیں ہیں آیات کے شمار کے لیے حاشیہ میں علیحدہ جگہ خالی چھوڑی ہے جہاں کسی سطر کے سامنے کوئی نمبر ہے اس سے مراد ہے کہ اس سطر کے کسی موقعہ پر اس نمبر کی آیت شروع ہوتی ہے اور جہاں اس سطر میں دو یا زیادہ آیتیں شروع ہوتی ہیں تو وہ نمبر اسی ترتیب سے اوپر نیچے کر دیئے ہیں اس سے حوالہ کی تلاش میں سہولت رہیگی۔ نوٹوں کا شمار سارے قرآن شریف میں مسلسل ایک ہی چلتا ہے تاکہ کسی نوٹ میں جب دوسرے نوٹ کا حوالہ آجائے تو اسکی تلاش میں سہولت رہے۔ نوٹوں کے اندر جہاں قرآن کریم کی کسی آیت کا حوالہ دیا ہے سورت کے نام کے اوپر سورت کا نمبر۔ اور آگے آیت کا نمبر دیا ہے۔ جہاں اسی سورت کی دوسری آیت کا حوالہ ہو تو صرف خطوط وحدانی میں آیت کا نمبر دیدیا ہے جہاں ع حوالہ ہے اس سے مراد اس نمبر کا نوٹ ہے حوالجات لغت وتفاسیر وغیرہ میں بجائے پورے نام کے اختصاراً حروف دیدیئے ہیں۔ ت تاج العروس۔ ث ابن کثیر۔ ج تفسیر ابن جریر۔ ح تفسیر بحر المحیط۔ ر روح المعانی۔ ز تفسیر کبیر امام رازی۔ ض تفسیر بیضاوی۔ غ مفردات راغب۔ غق تفسیر غرائب القرآن۔ ف تفسیر فتح البیان۔ ک تفسیر کشاف۔ ل لسان العرب۔ ن نہایہ ابن اثیر کی جگہ ہے۔

بالآخر اس بات کا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ گو قرآن شریف کی اس ناچیز خدمت میں میں نے سلف صالحین کی محنت سے بہت فائدہ اٹھایا ہے مگر میری زندگی میں جس شخص نے قرآن کریم کی محبت اور خدمت قرآن کا شوق پیدا کیا وہ اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور ان کے بعد فہم قرآن میں جس شخص نے مجھے اس راہ پر ڈالا وہ استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب مرحوم ہیں اگر کسی شخص کو میری اس ناچیز خدمت سے کچھ فائدہ پہنچے تو وہ جہاں میرے لیے دعا کرے ان بزرگوں کے لیے بھی دعا کرے میں محض مٹی ہوں اگر اس میں کچھ خوشبو کسی کو معلوم ہو تو وہ کسی اور کی پھونکی ہوئی روح ہے ؎

جمال ہمنشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

پھر میں اکیلا کچھ نہ کر سکتا تھا اگر میرے وہ احباب جو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے ممبر ہیں میرے معاون نہ ہوتے مجھ سے بڑھ کر ان احباب کی کوششوں کا نتیجہ یہ ترجمہ ہے جزاہم اللہ خیرا۔ معمولی لغزشوں اور غلطیوں پر اگر کوئی صاحب چشم پوشی سے کام لیں تو اللہ تعالیٰ کی صفت ستاری ہے۔ قابل اصلاح غلطی نظر آئے تو مجھے اطلاع دیں اپنی سمجھ کے مطابق اصلاح کی کوشش کروں گا۔ اختلاف رائے پر صبر کریں تو آج اتحاد اسلامی کے لیے سب سے بڑھ کر اسی کی ضرورت ہے و آخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین۔

اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی صحت اور توفیق عطا فرمائی تو دوسری جلد ترجمہ کی انشاء اللہ تعالیٰ نومبر ۱۹۲۲ء میں اور تیسری جلد اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع ہو جائے گی۔ مقدمہ علیحدہ کتاب کی صورت میں ہو گا جو کسی وقت بعد میں شائع ہو گا۔

خاکسار

محمد علی

احمدیہ بلڈنگس، لاہور

۸۔ مارچ ۱۹۲۲ء

فہرست مضامین بیان القرآن جلد اوّل

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
۱	**سورۃ الفاتحہ - ۱ تا ۶**	
	سورتوں کے نام توقیفی ہیں	۱
	فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی	
	فاتحہ کے اور نام	
	اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی چار صفات	
	فاتحہ کے دو حصے اور ان کا باہم تعلق	
	فاتحہ کی عظمت	
	خلاصہ تعلیم قرآنی	
	فاتحہ میں عقاید باطلہ کی تردید	۲
	فاتحہ میں میانہ روی کی تعلیم	
	بہترین دعا	
	عیسائی دعا سے مقابلہ	
	بہترین وظیفہ	
	ابتدائی وحی	
	نماز باجماعت کی ابتدا	
	نزول میں سب سے پہلی مکمل سورت	
	بسم اللہ کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں	
	ہر سورت میں مستقل آیت ہے	
	بسم اللہ ہر سورت کا خلاصہ ہے	
	سورۃ فاتحہ کا خلاصہ	
	نظام عالم رحمانیت و رحیمیت پر ہے	
	نظام روحانی بھی رحمانیت و رحیمیت پر ہے	
	اسم اعظم	۳
	بسم اللہ میں عملی توحید	
	بسم اللہ کی ابتدا	
	بسم اللہ سے کام میں برکت ہوتی ہے	
	فعلان اور فعیل کے مبالغہ میں فرق	
	رحمان دنیا - رحیم آخرت	
	رحمان غیر اللہ پر نہیں بولا جاتا	
	حمد - مدح - شکر میں فرق	
	الحمد میں رضا بالقضا کا سبق	۴
	قلب نبوی کی وسعت	
	احمد - محمد	
	وحدت نسل انسانی	
	ضرورت وحی	

	خلاصہ مضامین	صفحہ
	مخلوق کی خدمت کا سبق	
	رب اور رب	
	دعاؤں میں ربنا کا استعمال	
	جزا و سزا اس عالم میں بھی ہے	
	مالکیت میں گناہوں کی معافی کا اشارہ	
	عبادت مقصد زندگی ہے	۵
	عبادت استعانت پر مقدم ہے	
	ہدایت چار طرح پر ہے	
	دعائے فاتحہ کا مقصد	
	مقام عصمت سے اوپر کمال انسانی کا حصول ہے	
	منعم علیہم کون ہیں	
	اسلام کس مقام پر پہنچاتا ہے	
	انعمت علیہم میں مقام نبوت کی دعا نہیں	
	نبوت موہبت ہے	
	النبی - الرسول	۶
	کن کمالات کی دعا ہے	
	دعائے حصول نبوت اور اُمت کی محرومی	
	غضب الٰہی	
	مغضوب علیہم اور ضالین کون ہیں	
	حقوق میں تفریط و افراط	
	عملی اور علمی غلطیوں سے بچنے کی دعا	
	آمین	
۲	**سورۃ البقرۃ - ۱ تا ۱۷۸**	
	نام خلاصہ مضمون	۷
	ابتدا میں رکھے جانے کی وجوہات	
	زمانۂ نزول	۸
	مدنی سورتوں میں مکی آیات	
	مقطعات	
	نفی ریب کا دعویٰ اور اس کی دلیل	
	متقی بروئے حدیث	
	تقویٰ اللہ نگہداشت حقوق ہے	۹
	قرآن ہدی للمتقین کس معنی سے ہے	
	ہدی للناس کس معنی سے	
	متقی کے لیے غیر متناہی ترقی	
	تقویٰ کمال کے حصول کی پہلی سیڑھی ہے	

خلاصہ مضامین	صفحہ
ایمان کا دوسرا مفہوم	
ایمان کے معنی پر حدیث سے روشنی	
ایمان کا مفہوم خاص اسلام میں	
ایمان بالغیب کی حقیقت	۱۰
صلوٰۃ کی اقامت کا مفہوم	
اقامت کے حقوق	
نماز کی تفصیلات	
ارکان و واقعات میں اتحاد اسلامی	
آنحضرت کی نماز	
ایمان بالغیب اور صلوٰۃ کا تعلق	
انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم	۱۱
صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے اکٹھے ذکر میں حکمت	
حسن و احسان	
وحی اور رسول کا نزول	
وحی الٰہی پر ایمان	
پہلی وحی پر ایمان میں حکمت	
پہلی وحی پر عمل کی ضرورت نہیں	
ایمان بالآخرۃ کا مفہوم	۱۲
مذہب کی اصلی غرض	
جزا و سزا پر یقین گناہ سے بچاتا ہے	
مفلح کون ہیں	
ہر فعل مذموم کفر میں داخل ہے	
اصل اور فرع کا کفر	
اضداد کا ذکر	۱۳
انذار کی پروا نہ کرنے والے	
دلوں پر مہر سے مراد	
خدا کی مہر نتیجۂ اعمال ہے	
بدی کا اثر ساتھ ساتھ پیدا ہوتا ہے	
عقل سے کام نہ لینا دل پر مہر ہے	
برے کام کو اچھا سمجھنا دل پر مہر ہے	۱۴
مہر لگانے کی نسبت اللہ کی طرف	
زردشتی عقیدہ کی تردید	
عذاب کا استعمال قرآن میں	
عذاب عظیم اور عذاب الیم	
اللہ اور آخرت پر ایمان سے مراد	

خلاصہ مضامین	صفحہ
عبداللہ بن اُبی	
اسلام کے اندرونی دشمن	
منافقین زمانہ حال	
عملی نفاق	
منافقوں کی دھوکہ بازی	۱۵
امراض روحانی	
منافقوں کی بیماری	
خدا کس طرح بیماری بڑھاتا ہے	
جھوٹ منافق کا نشان ہے	
صحابی کی روایت پر جھوٹ کا احتمال نہیں	
زمین کا چکر کھانا	
منافقوں کا فساد اور انکا دعوٰی اصلاح	
منافقوں کا مسلمانوں کو بیوقوف کہنا	۱۶
انسانوں میں سے شیطان	
بُرے اخلاق پر شیطان کا اطلاق	
شیطان کا انسان میں خون کی طرح پھرنا	
بدی کا محرک شیطان ہے	
شیطان صفت انسان	
ایک ہی الفاظ کے اللہ تعالٰے اور انسانوں پر بولنے کے مفہوم میں فرق	
اللہ کا استہزا	۱۷
کسی فعل پر سزا کا ذکر انہی الفاظ میں	
سزا کا فلسفہ	
عمہ اور عمی میں فرق	
منافقوں کا انجام	
آگ جلانے کی مثال	
بارش کی مثال	۱۸
کمزور دل منافق	
صفات الٰہی اور صفات مخلوق میں کامل و ناقص کا تا الامتیاز	۱۹
خدا کی مشیت انسان کی مشیت پر غالب ہے	
قادر مطلق پر اعتراض اور اس کا جواب	
خدا نیستی سے ہستی کرتا ہے	
عبادت اور اطاعت میں فرق	
خلق سے توحید الٰہی پر دلیل	
عبادت سے حصول کمال	
نظارہ قدرت اور فطرت انسانی کا مقابلہ	۲۰
شرک فی العبادۃ شرک فی الذات ہے	
شہید کون کون ہیں	
رازِ توحید وحی نے کھولا ہے	

خلاصہ مضامین	صفحہ
قران کی مثل کا مطالبہ	۲۱
مثل میں یہ باتیں چاہیئے فصاحت و بلاغت، جامعیت مضامین، ہدایت دینا	
پتھر کس معنی میں دوزخ کا ایندھن ہیں	
دوزخ پر فنا	
بہشت کے باغ اور نہریں	۲۲
جنت کے پھل	
بہشت میں ازواج	
مچھر کی مثال	۲۳
میثاق عہد	۲۴
قطع ما یوصل	
فساد فی الارض	
نیستی سے ہستی دلیل الوہیت ہے	
اللہ کی طرف رجوع	
زمینی مخلوق انسان کے فائدہ کیلئے ہے	
آسمان کیا ہے	۲۵
سات آسمان	
صفت علم و قدرت	
اللہ تعالیٰ کا قول	
فرشتوں کا وجود	
وحی الٰہی خارجی شے ہے	
فرشتے قویٰ کا نام نہیں	
ذریت آدم خلیفہ ہے	۲۶
ضرورتِ نبوت	
انسان کے خلیفہ ہونے سے مراد	
فرشتوں کا ذکر فساد	
ملائکہ کو انسان کی خونریزی کا علم کس طرح ہوا	
تسبیح و تقدیس میں فرق	
آدم	۲۷
الاسماء سے مراد	
بنی آدم اور علم اسماء	
خدا کا انسان کو علم دینا	
خواص اشیاء کا علم	
ملائکہ پر اشیاء کا پیش کرنا	
انبئونی میں اشارہ	
صادق ہونے سے مراد	
ملائکہ اور علم خواص اشیاء	۲۸
آدم کا ملائکہ کو اسماء بتانا	
ملائکہ کے کتمان سے مراد	

خلاصہ مضامین	صفحہ
قوائے عالم پر انسان کے تصرف کی غرض	
سجدۂ اختیار و تسخیر	
لغوی معنی میں سجدہ	
ملائکہ کے سجدہ سے مراد	
ابلیس اور شیطان	۲۹
ابلیس اور قوت وہمیہ	
شیاطین محرک بدی ہیں	
شیطان کو کیوں پیدا کیا	
نوری ناری مخلوق	
شیطان کو حکم فرمانبرداری	
ابلیس کا انکار سجدہ	۳۰
شیطان کی فرمانبرداری	
خلق آدم میں تیسرا مرتبہ	
بہشت میں بیبیاں	
آدم کی پہلی جنت	
سکون روحانی کی جنت	
ہٰذہ الشجرۃ	۳۱
لا تقربا کا حکم فطری ہے	
بائبل کی غلطی کی اصلاح	
شیطان کی وسوسہ اندازی	
آدم کی لغزش	۳۲
ہبوط آدم سے مراد	
نفس انسانی اور شیطان	
فطری کمزوری کا علاج	
وحی الٰہی خارجی شے ہے	
اولاد آدم کا ہبوط اور اس کا علاج	۳۳
نسل انسانی میں نزول وحی کا قانون	
فطری بیگناہی اور کامل عصمت	
وحی کی ضرورت	
اس دنیا کا دوزخ	
بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل	۳۴
عرب میں یہودی	
بنی اسرائیل کے ذکر سے اصل مقصود	
بنی اسرائیل کا خدا سے عہد	
مسلمانوں کا عہد	
قرآن کے مصدق کتب ہونے سے مراد	۳۵
مثیل موسیٰ کی پیشگوئی	
حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک تین نبیوں کا انتظار	

خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ
یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت	
ثمن قلیل	
حق و باطل کی ملاوٹ	
نماز اور زکوٰۃ	۳۶
واعظ کیلئے ضرورت عمل	
مذہب میں عقل کے استعمال کی ضرورت	
عقل اور وحی	
طریق استعانت	۳۷
مصائب میں توجہ الی اللہ کی ضرورت	
لقاء اللہ	
رجوع الی اللہ	
بنی اسرائیل کی فضیلت	
مسئلہ شفاعت	۳۸
آل محمد اور اُمت محمد	
فرعون رعمیس	
بنی اسرائیل سے ذلیل کام کروانا	۳۹
بنی اسرائیلی لڑکوں کا مارنا	
بنی اسرائیل کا عبور دریا	
رعمیس ثانی کا زمانہ	۴۰
نزول شریعت موسوی	
بنی اسرائیل اور گائے کی پرستش	
خلق۔ برأ میں فرق	۴۱
قتل نفس سے مراد کیا ہے	
بنی اسرائیل کا اللہ کو دیکھنے کا سوال	
حضرت موسیٰ کا سوال رب ارنی کرنا	
صاعقہ اور رجز ایک ہی ہیں	۴۲
موت کے مختلف معنی	
بنی اسرائیل کی موت کے بعد زندگی	
بادل کا سایہ	
من و سلویٰ کا اُترنا	۴۳
بنی اسرائیل کا جنگ سے انکار	
رجز کا عذاب	۴۴
ابتدائی مذاہب کی دعائیں	
بارہ چشموں کا معجزہ	
بلا محنت مانگنے کی عادت بنی اسرائیل اور مسلمان	۴۵
زراعت اور فتوحات ملکی کا مقابلہ	
قتل بمعنی اشراف علی القتل	۴۶
نبی کے لغوی معنی اور اصطلاح شریعت	

خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ
نبی کیلئے کتاب ضروری ہے	
آنحضرت کے بعد نبی نہیں	
بنی اسرائیل کی ذلت و مسکنت	
قتل انبیاء سے مراد	
ایمان باللہ والیوم الآخر	۴۷
وسعت دائرہ اسلام	
کامل نجات صرف اسلام میں ہے	
اخذ میثاق	
پہاڑ اٹھانے سے مراد	
بنی اسرائیل کا بندر بننا	۴۸
گائے ذبح کرنے کا حکم	۴۹
گائے کے ذبح کے مقابل پر ایک اور واقعہ	۵۰
مسیح کے قتل کی کوشش	
قرآن کریم آپ اپنی تفسیر کرتا ہے	۵۱
حضرت مسیح اور واقعات صلیب	
بنی اسرائیل کی قساوت قلبی	
مسلمانوں کی حالت	
کلام اللہ کا مفہوم بلا لفظ نہیں	۵۲
تحریف لفظی	
بائبل میں تحریف لفظی	
تحریف شدہ کتاب کا نام توریت و انجیل ہونا	
قرآن کریم کن معنوں میں مصدق ہے	
ایک مفسر بائبل کا اقرار تحریف لفظی	
کتب خمسہ میں تحریف لفظی کی مثالیں	
اناجیل اور مسیح کی زبان کا اختلاف	
اناجیل کے متعلق پہلے بزرگوں کا خیال	
اناجیل میں تحریف لفظی کا اقرار	
اناجیل میں تحریف کی مثالیں	۵۳
منافق یہودی	
آنحضرت کے ظہور کی پیشگوئیوں کی عام شہرت	
یہود کے ذکر میں اشارہ کہ سب مسلمان علم حاصل کریں	
یہودیوں اور عیسائیوں کا دعویٰ متعلق عذاب	۵۴
بدی کا مقابلہ	
نیکی کی قوت بدی سے زبردست ہے	
توریت کے احکام	۵۵
اپنی قوم کے خلاف جنگ نہ کرنے کا حکم	
تین قیامتیں۔ کبریٰ۔ وسطیٰ۔ صغریٰ	۵۶
اوس و خزرج کی جنگوں میں یہود کی شرکت	

خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ
مسلمان ایک دوسرے کے خلاف جنگ کریں	
مسلم کی تعریف	
فتاویٰ کفر سے قوم کی تباہی	
لفظ رسول کا اطلاق مجاز کے طور پر	۵۷
سلسلہ رسل بنی اسرائیل	
رسول کے لیے ہدایت لانا ضروری ہے	
روح القدس	
ابن مریم نام کی وجہ	
روح القدس کا تعلق حضرت عیسیٰ سے	
یہودیوں کا شیوہ تکذیب و قتل انبیاء	
دلوں کے پردے	۵۸
بنی اسرائیل اور نبی موعود	
موعود نبی کی شناخت	
یہودیوں کا حسد آنحضرت سے	۵۹
غیر بنی اسرائیل سے نبی آنا کیوں ضروری تھا	
منہ سے دعویٰ ایمان اور عملی نافرمانی	
توریت کی غلطی کی اصلاح	۶۰
یہودیوں سے مباہلہ	
آرزوئے موت	
ہزار سال کی زندگی	
عیسائیت کی مخالفت اسلام	۶۱
جبرائیل۔ میکائیل۔ اسرافیل	
جبرائیل اور یہودی۔ جبرائیل کا وحی لانا	
قلب پر نزول قرآن سے مراد	
جبرائیل کا آنحضرت پر وحی لانا	
میکائیل	۶۲
اللہ کی عداوت کا مفہوم	
سلیمان پر یہودیوں کا افترا	
سلیمان کی طرف کفر و شرک کی نسبت	۶۳
بائبل میں تحریف کی اصلاح	
ہاروت و ماروت کا قصہ یہودیوں نے ایرانیوں سے لیا	
اس پر محققین اہل اسلام کے خیالات	
تعلیم سحر	
فریمیسنری	۶۴
اسلام کے خلاف خفیہ منصوبے	
فریمیسنری کی اصلیت	
مومنوں کو تکالیف پہنچنے کی وجہ	
منصوبہ کرنے والوں کا انجام	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
یہودیوں کی شرارتیں	۶۵
یہودیوں کی مخالفت نیک نیتی سے نہ تھی	
یہود کا اعتراض کہ شریعت موسوی کیوں منسوخ ہوئی	۶۶
یہ شریعت کس معنی میں موسوی شریعت کی مثل ہے	
وجوہات کہ یہاں نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے نہ نسخ آیات قرآنی کا	
آنحضرت قرآن کو بھولتے نہ تھے	
نسخ کی کوئی روایت آنحضرت تک نہیں پہنچتی	
صحابی کا قول نسخ پر حجت نہیں	
روایات نسخ پر ایک دوسرے کی تردید	
روایات نسخ ضعیف ہیں۔	
تعداد آیات منسوخ میں بھاری اختلاف	۶۷
اختلاف قبول کر کے منسوخ کہنا	
یہودیوں کے گستاخانہ سوالات	
یہود کا بت پرستی کو توحید سے اچھا قرار دینا	
جنگوں میں مسلمانوں کا عفو پر عمل	
نماز بطور علاج	۶۸
قرآن دعوی کی دلیل دیتا ہے	
اسلام شریعت میں دو طرح پر ہے	
نجات عمل سے ہے نہ الفاظ سے	
طریق عمل جو جنت میں پہنچاتا ہے	
خوف و حزن سے نجات	۶۹
ہر مذہب میں سچائی ہونے کی تعلیم	
غلط عقاید پر اس دنیا میں گرفت نہیں	
خدا کی عبادت سے روکنے کی سزا	
مساجد سے مراد مسجد حرام	
مسلمانوں کا مسلمانوں کو مسجدوں سے روکنا	۷۰
دنیا کی سزا آخرت کی سزا پر بطور دلیل	
خانہ کعبہ سے روکا جانے پر مسلمانوں کو تسلی	
بشارت فتوحات	
لفظ ولد کا استعمال مجازی	
عیسائی عقیدہ کی بنیاد	
ابنیت مسیح کا عقیدہ	
خدا کا بیٹا بطور مجاز	
انجیل کی شہادت کہ مسیح مجازاً خدا کا بیٹا کہلایا	
ابنیت کے عقیدہ سے خدا میں نقص ماننا پڑتا ہے	۷۱
ابنیت کے تعلق سے بڑھ کر مخلوق ہونے کا تعلق ہے	
بغیر مادہ کے پیدا کرنے والا بیٹے کا محتاج نہیں	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
قضا و قدر میں فرق	
حکم کُن	
خدا کے عام لوگوں سے کلام نہ کرنے کا اعتراض	۷۲
مطالبہ نشان ہلاکت	
خدا کس سے کلام کرتا ہے	
نشان ہلاکت کا آنا	
ملت اور دین میں فرق	
مذہب علم ہے	۷۳
اسلام ایک علم اور کامل ہدایت نامہ ہے	
کامل علم کے بعد عمل کی ضرورت	
صحابہ کا بے نظیر عمل قرآن پر	
مسلمانوں کی موجودہ حالت	
بنی اسرائیل کو تین مرتبہ خطاب	
عرب سے تعلق	۷۴
کلمات سے حضرت ابراہیم کی تکمیل نفس	
وعدہ ابراہیمی	
قرآن بائبل سے نہیں لیا گیا	
وعدہ ابراہیمی میں اسمٰعیل کی شمولیت پر تاریخی شہادت	۷۵
بیت المقدس کا دو دو مرتبہ اصل حقداروں کے ہاتھ سے نکلنا	
دنیا کی پہلی عبادت گاہ	
تفرقہ کے بعد اجتماع مذاہب	
خانہ کعبہ کی قدامت پر میور کی شہادت	
بائبل میں بیت ایل اور اس سے مراد	
کعبہ کے متعلق دو پیشگوئیاں	۷۶
خانہ کعبہ پر کبھی اسکے دشمن قابض نہ ہوں گے	
مقام ابراہیم	
خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم	
اسمٰعیل اور ہاجرہ	
فاران	
عرب کا اسماعیل کی اولاد سے ہونا	
تطہیر کعبہ	۷۷
مکہ کیلئے دعائے ابراہیم	
عرب سے کفر مٹ جانے کی پیشگوئی	
ابراہیم کا خانہ کعبہ کو تعمیر کرنا	۷۸
خانہ کعبہ پانچ مرتبہ بنایا گیا	
خانہ کعبہ بنانے والے مزدور	
اعمال حج ابراہیم کے قائم کردہ ہیں	
اعلام اور تعلیم میں فرق	۷۹

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
تعلیم کتاب تلاوت سے الگ رسول کا کام ہے	
دعائے ابراہیم	
دعا کا اثر	
اُمت مسلمہ اور تزکیہ کا ذکر بطور پیشگوئی	
رسول کے چار کام	
علمائے ربانی	
فیصلہ کیلئے ملت ابراہیمی کا اصل	۸۰
عملی اصول	
مسلم کا مقام بلند	
یعقوب	
وصیت انبیاء بھی دین کیلئے ہوتی ہے	
جوارح کی عبادت	۸۱
انبیاء سب ایک اُمت ہیں	
ملت ابراہیمی کا اعتقادی اصل	
جامعیت مذہب اسلام	
دنیا کے کل نبی ایک ہی مذہب پر تھے	
ما انزل من قبلك کی تفسیر	
اسلام کسی بزرگ کو جھوٹا نہیں کہتا	۸۲
دین اسلام کا مقابلہ عیسائی بپتسمہ سے	
خالص اور صافی میں فرق	
خدا کی ربوبیت کی وسعت	
مسلمانوں کو تعلیم کہ اپنی دشمن سے ہمدردی کریں	۸۳
کفارہ مسیح اور انبیائے سابق	
تحویل قبلہ	۸۴
تحویل قبلہ پر احادیث	
تحویل قبلہ دو دفعہ نہیں ہوئی	
وحی الٰہی قلب نبوی سے نہ پھوٹتی تھی	
قبلہ کے مضمون میں ختم نبوت کی طرف اشارہ	۸۵
کمالات اُمت محمدیہ	
تحویل قبلہ کے ذریعہ سے تمحیص	
علم بمعنی تمیز۔ علم الٰہی دو طرح پر ہے	
ضرورت تمحیص	
قبلہ پرستش کی چیز نہیں	
قبلہ اصل مقصود نہیں	
منہ کا آسمان کی طرف پھیرنا	۸۶
خانہ کعبہ کی تولیت	
اہل کتاب اور آنحضرت صلعم	
قبلہ سے مراد دین	۸۷

خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ
یہودیوں۔ سامریوں۔ عیسائیوں کے قبلے	
اہل کتاب کا آنحضرت کو شناخت کرنا	
وجوہات تقرر قبلہ	۸۸
مسلمان کعبہ کی پرستش نہیں کرتے	
حجر اسود کا بوسہ	
انگورستان کی تمثیل	
کعبہ کی طرف منہ اتحاد پیدا کرتا ہے	
قبلہ کے حکم کو تین دفعہ دہرانے میں حکمت	۸۹
اہل کتاب کا اعتراض	
عبادت الٰہی کا پہلا اور آخری گھر	
دعائے ابراہیمی کا رسول اور قبلہ ابراہیمی	۹۰
اعلائے کلمۃ اللہ سے ہی مسلمان بڑے بن سکتے ہیں	
مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اور اس کی مشکلات	
صبر اور صلوٰۃ	
استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا دو دفعہ ذکر	
اللہ کی راہ میں قتل ہونیوالے مردہ نہیں	۹۱
ان کی زندگی کا مفہوم	
کافر کی بعد موت زندگی حیات نہیں	
شہداء کی زندگی	
شہداء کی موت اور ان سے استمداد کا ناجائز ہونا	
مصائب میں حکمت	
صحابہ کا کمال صبر	۹۲
انا للہ کا مفہوم	
اللہ کی صلوٰۃ بندوں پر	
صفاء اور مروہ کے ذکر میں اشارہ	
حج اور عمرہ میں فرق	
سعی بین الصفا والمروۃ	۹۳
کتمان ہدایت اور اس کے نتائج	
توحید ہدایت کا اصل الاصول ہے	۹۴
توحید کیا ہے	
مناظر قدرت سے توحید باری کی شہادت	۹۵
فطرت انسانی کی شہادت توحید باری پر	
عقل اور محبت کا مقام	
جھوٹے پیشواؤں اور پیروں کی ایک دوسرے سے بیزاری	۹۶
بدی پر حسرت عذاب بن جاتی ہے	
نیکی پر ندامت نہیں ہوتی	
غذاؤں کا اثر اخلاق پر	۹۷
ظاہری اور باطنی طہارت کا تعلق	

خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ
سوء اور فحشاء میں فرق	
بدی اور بےحیائی کا تعلق غذاؤں سے	
عقل سے کام لینے کی ہدایت	۹۸
مردار وغیرہ کی حرمت شریعت یہود میں	
مسیح کا سؤر سے اظہار نفرت	
حرمت کی وجہ	
حرمت غذا اور تقویٰ کا تعلق	۹۹
خدا کا دوزخیوں سے کلام نہ کرنا	
تفصیلات شریعت اور اصل الاصول	۱۰۱
کعبہ کی طرف منہ کرنے کی اہمیت	
تکالیف میں صبر قوم کی کامیابی کا اصل گر ہے	
ایمان کا مفہوم	
ایثار	
دشمنوں سے پیار کا عملی رنگ	
نماز اور زکوٰۃ	
ایفائے عہد	
صبر سب سے بڑا اصل کامیابی کا ہے	
حکم قصاص کی مناسبت	۱۰۲
زخموں میں قصاص	
قصاص میں امتیاز حیثیت نہیں	
خوں بہا	
قصاص قوم کی زندگی کی بنیاد ہے	۱۰۳
حکم وصیت منسوخ نہیں	
قرآن و حدیث کی شہادت	
ایک تہائی مال کی وصیت	
خیراتی کاموں کیلئے وصیت	
ورثا کے لیے وصیت نہیں	
وصیت کے وقت اصلاح	۱۰۴
روزہ سب قوموں میں پایا جاتا ہے	
حضرت عیسیٰ کا روزہ رکھنا اور روزہ کی تعلیم	
روزہ کی غرض	
خواہشات پر حکومت کی تعلیم	
عاشورہ کا روزہ	۱۰۵
روزہ چھوڑنے کیلئے بیماری کی حد	
سفر کی حد	
رخصت یا وجوب	
آیت فدیہ صیام کی منسوخی میں اختلاف	۱۰۶
روزے کا فدیہ کون لوگ دے سکتے ہیں	

خلاصہ مضمون	نمبر صفحہ
صدقۂ فطر	
روزہ سے نیکی کی قوت ترقی پکڑتی ہے	
قرآن نام کی وجہ	۱۰۷
ابتدائے نزول قرآن رمضان میں	
قرآن کے تین کمالات	
قرب اللہ کا بندہ سے اور بندہ کا اللہ سے	
رمضان میں قرب الٰہی کی راہیں	
قرب الٰہی کے حصول کی دعا	۱۰۸
معمولی دعائیں اور ان کی قبولیت	
رمضان میں عورت سے رغبت	
میاں بی بی کا تعلق	
نزول حکم قرآنی سے پہلے روزہ میں تشدد	
روزہ کی حدود	۱۰۹
جہاں دن لمبے ہوں وہاں روزے کا حکم	
روزہ اور حرام خوری سے اجتناب	۱۱۰
سوالات کی غرض	
حج کے مہینے	
حرمت کے مہینے	
ابواب جنت و ابواب جہنم	
فرشتوں کا کتے والے گھر میں داخل نہ ہونا	
عرب کی توہم پرستی	
ذی الحج کی دس راتیں	
حج اور جنگ کے اکٹھے ذکر میں حکمت	
فی سبیل اللہ جنگ سے مراد	۱۱۱
اس کی غرض مذہبی آزادی کا قیام تھی	
اسلامی جنگ کی شرائط	
ہر کافر کے قتل کا حکم نہیں	
جنگ کی حد	
فتنہ سے مراد کفار کی ایذا رسانی ہے	
مسجد حرام میں جنگ کی ممانعت	۱۱۲
کفار کے جنگ سے رک جانے کی صورت میں حکم	
یکون الدین للہ سے مراد	
مذہبی آزادی کا قیام	
حرمت کے مہینوں میں جنگ سے رکنے کا حکم	۱۱۳
فی سبیل اللہ اموال کا خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے	
حج میں روکا جانے کی صورت	
سر منڈوانا	۱۱۴
حج تین طرح پر	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
حج کے مہینے	
حج کی غرض	۱۱۵
حج میں زاد راہ کی ضرورت ہے	
آخرت کا زاد راہ	
حج میں تجارت	
دینی اور دنیوی ترقی پہلو بہ پہلو	
میدان عرفات	۱۱۶
اسلام نے کیا انقلاب پیدا کیا	
عفو عفو د پر ترقی ہے	۱۱۷
استغفار کا بلند مرتبہ	
جنت میں استغفار کی ضرورت	
امتیاز قومی کو دور کیا	
رمی جمار یعنی کنکریوں کا پھینکنا	
حج میں دوڑنا اور تیز چلنا	
طواف	
باپ دادوں کی بڑائی کرنے سے روکا ہے	
دعائے جامع دین و دنیا	
دنیا کی حسنات کی طلب	
خدا کا محاسبہ دنیا اور قیامت میں	۱۱۸
ایام تشریق	
مہذب مفسد	
حکومت کی اصل غرض	۱۱۹
مہذب اقوام کا نقشہ	
مسلمانوں کا حکومت کی اصل غرض کو بھلا دینا	
جھوٹی شیخی حصول کمال پر مانع ہے	
صحابہ کا بلند مقام	
اسلام میں کامل طور پر داخل ہونے کی ضرورت	۱۲۰
بادلوں کے سائے	
اللہ کا آنا	۱۲۱
ملائکہ کا آنا	
جنگوں میں نزول ملائکہ	
فتح مکہ	
غلبۂ اسلام کی پیشگوئی	
آنحضرتؐ کی صداقت کے کھلے نشان	
تبدیل نعمت اللہ	
تباہی چاہنے والوں کو جواب	
بری چیزوں کا اچھا دکھانا شیطان کا کام ہے	۱۲۲
کافروں کا مومنوں پر ہنسنا	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
فوقیت اخلاق سے ہے	
قرآن شریف کس دنیا کی زندگی کی مذمت کرتا ہے	
انبیاء کی بعثت کا عام قانون	
سب اختلافوں کے فیصلہ کیلئے محمد صلعم کی بعثت	۱۲۳
ہر نبی کے ساتھ کتاب اتری	
حق کے قیام میں مشکلات	
نصرت الٰہی کیا ہے۔ انفاق مال کی ترغیب	۱۲۴
مسلمان جنگ کو ناپسند کرتے تھے	
موجودہ حالت اور جنگ	
حرمت کے مہینوں میں جنگ۔	۱۲۵
کفار کی مسلمانوں پر زیادتی	
ابن حضرمی کا قتل	
کفار کی مسلمانوں سے جنگ میں غرض	
ہر مرتد کا حکم قتل نہیں	
ہر مرتد کا نکاح فسخ نہیں ہوتا	۱۲۶
حصول طلاق کے لیے عیسائیت	
حبط عمل دو طرح پر ہے	
حبط عمل کی دو اور صورتیں	
ہجرت	
جہاد کی تین قسمیں	۱۲۷
جہاد اصغر جہاد اکبر	
منافقوں سے جہاد	
مقدم کونسی ہجرت اور جہاد ہیں	
خمر و میسر کا تعلق	
خمر و میسر کا جنگ سے تعلق	۱۲۸
عیسائی اقوام کی خاص بیماریاں اور انکا علاج	
یہودیوں میں حرمت شراب قطعی نہ تھی	
ہندوؤں میں شراب	
عیسائیت اور شراب	
شراب اور آنحضرتؐ کی قوت قدسی	
حرمت شراب کی تدریج میں حکمت	
شراب تھوڑی اور بہت یکساں حرام ہے	
شراب کا استعمال بطور دوا	
نفس اور اولاد پر خرچ	۱۲۹
یتیموں سے میل جول	
انجنیں اور یتامیٰ	
مشرکین سے تعلقات نکاح کی ممانعت	۱۳۰
شرک سے بیزاری عملی رنگ میں	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مشرکین اہل کتاب سے نکاح	
مسلمان اور مشرکانہ رسوم	
مسائل طلاق کا تعلق جنگ سے	۱۳۱
ایام حیض میں مقاربت	
قرآن کریم میں مرد و عورت کے تعلقات	
بائبل میں فحش قصے	
ستیارتھ پرکاش میں مرد و عورت کے تعلقات کا ذکر	
عورت کے بمنزلہ کھیتی ہونے سے مراد	
انی شئتم سے مراد	۱۳۲
نیکی سے روکنے کی قسم یا عہد	
لغو قسمیں	
عورت کے پاس جانے کی قسم	۱۳۳
عربوں میں طلاق	
یہودیوں اور ہندوؤں میں طلاق	
عیسائیت اور طلاق	
اسلام نے طلاق میں اعتدال قائم کیا	
وجوہ طلاق کو کیوں معین نہیں کیا	
طلاق حالت طہر میں ہو سکتی ہے	
طلاق پر پہلی حد بندی	۱۳۴
طلاق پر دوسری حد بندی عدت ہے	
عدت کی دوسری غرض	
طلاق پر تیسری حد بندی	
مساوات حقوق زوجین اور مردوں کی فوقیت	
معاشرت اور تمدن	
طلاق پر چوتھی حد بندی	۱۳۵
طلاق پر پانچویں حد بندی	
طلاق صرف دو دفعہ دی جا سکتی ہے	
تین دفعہ طلاق کہنے کا کوئی حکم نہیں	
طلاق رجعی اور طلاق بائن	۱۳۶
طلاق بدعی	
تین طلاق کتاب اللہ سے ہنسی ہے	
تین طلاق ایام جاہلیت کا بقیہ ہے	
تین طلاق اور حضرت عمرؓ کا فیصلہ	
طلاق کے تین اقسام	
حالت حیض کی طلاق طلاق نہیں	
طلاق میں حسن سلوک کا حکم + مہر کی ادائیگی ضروری ہے	
طلاق پر چھٹی حد بندی ادائیگی مہر ہے	
عورت بذریعہ قاضی طلاق حاصل کر سکتی ہے۔	۱۳۷

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
جمیلہ کی طلاق کا واقعہ	
عورت کن وجوہات پر طلاق لے سکتی ہے	
بلاوجہ طلاق پر زجر	
ناموافقت طبع کو کیوں وجہ طلاق قرار دیا گیا ہے	
ہندوستان میں عورت کی حق طلاق سے محرومی	
طلاق پر ساتویں حدبندی طلاق بائن ہے	
حلالہ رسم جاہلیت ہے۔	۱۳۸
حدیث اور عمل صحابہ میں اس سے اظہار نفرت	
نکاح عارضی نہیں ہو سکتا	
عورت کو خاوند کیطرف سے دکھ ہو تو قاضی طلاق دلوا سکتا ہے	
عدت گزرنے پر پہلے خاوند اور بی بی کا نکاح	۱۳۹
تین طلاقوں کا عدم جواز	
دودھ پلانے کی مدت	
بیوہ کی عدت	۱۴۰
بیوہ کا نکاح	
عدت میں بیوہ کو پیغام	۱۴۱
طلاق قبل از تقرر مہر	
نکاح بغیر تقرر مہر	
آنحضرت کا طلاق سے بکثرت روکنا	۱۴۲
طلاق قبل از خلوت جب مہر مقرر ہو چکا ہو	
مسائل طلاق کا ربط ذکر نماز سے	
صلوٰۃ وسطیٰ نماز عصر ہے	
نمازوں کی تعداد پانچ ہے	
حالت خوف میں نماز	
خوف میں نماز با جماعت	
نماز ذکر اللہ کی بہترین صورت ہے	۱۴۳
اہل قرآن کی غلطی	
وحی خفی سے نماز کا سکھایا جانا	
نماز کی تفصیلات قرآن میں برنگ اشارہ	
بیوہ کے ایک سال متاع کا حکم	۱۴۴
نسخ اور عدم نسخ کے اقوال	
حدیث لا وصیۃ لوارث	
بنی اسرائیل کا مصر سے خروج	۱۴۵
بنی اسرائیل کی موت اور زندگی	
تاریخ اسرائیل سے مسلمانوں کیلئے سبق	
انفاق فی سبیل اللہ	۱۴۶
سموئیل کا ذکر اور مسلمانوں کو نصیحت	۱۴۷
طالوت یا ساؤل	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
بادشاہ کے انتخاب کے اصول	
بادشاہت وراثت سے نہیں	
بادشاہت کی غرض	
بادشاہت کی ضرورت	
موسیٰ و ہارون دونوں صاحب اُمت و صاحب کتاب ہیں	۱۴۸
بائبل کا تابوت	
توریت و انجیل کا باہم اختلاف	
قرآن میں کس تابوت کا ذکر ہے	
عیسائیوں کا اعتراض	
سموئیل کی کتابیں	
تابوت کی تاریخ	
قرآن کریم میں تابوت بمعنی قلب ہے	
سکینت کا تعلق قلب سے ہے	۱۴۹
نہر سے آزمائش	
جدعون کے ذریعہ سے پہلی آزمائش	
تھوڑوں کا بہتوں پر غالب آنا	۱۵۰
بائبل میں طالوت کے متعلق متضاد بیان	۱۵۱
داؤد میں بادشاہت اور نبوت کا اجتماع	
عیسائیوں کے اعتراض اور قرآن کی حقانیت	۳پ
آنحضرت میں اجتماع نبوت و بادشاہت	۱۵۲
فضیلت سے دوسرے میں نقص لازم نہیں	
آنحضرت کا جامع کمالات انبیائے بنی اسرائیل ہونا	
حضرت داؤد اور مسیح کی پیشگوئیوں میں آنحضرت	
کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا ہے	
احادیث کہ مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو	
اللہ کا کلام بندہ کے ساتھ صرف تین طرح پر ہے	
خدا کا کلام کل رسولوں سے ہوا	
حضرت عیسیٰ کے ذکر کی وجہ	۱۵۳
سب قوموں کیطرف ایک رسول کے آنے کی ضرورت	
قیامت میں بیع۔ خلت شفاعت کا نہ ہونا	
قیامت کی خلت و شفاعت	
کفار سے مشابہت نہ ہو	۱۵۴
سنۃ کو نوم پر مقدم کرنے کی وجہ	
شفاعت کیلئے ضرورت اذن	
شفاعت اور دعا	
علم سے احاطہ	۱۵۵
آیۃ الکرسی	
اسم اعظم	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
آیۃ الکرسی میں مذاہب باطلہ کا رد	
مسئلہ شفاعت کو افراط و تفریط سے پاک کیا	
انصار میں بطور نذر یہودی بنانے کا دستور	۱۵۶
آیت لا اکراہ منسوخ نہیں	
حکم لا اکراہ اہل کتاب سے مقید نہیں	
قرآن کریم مسلمانوں سے بھی بجبر کچھ نہیں منواتا	
کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے مراد	
اللہ کی ولایت مومنوں سے کیا ہے	۱۵۷
نور واحد اور ظلمات جمع لانے کی وجہ	
ظالموں کو ہدایت نہ دینے سے مراد	
حضرت ابراہیم کا بادشاہ سے جھگڑا	۱۵۸
احیائے موتیٰ کی دوسری مثال حزقیل کی رؤیا	۱۵۹
حزقیل کے مکاشفہ کا ذکر قرآن کریم میں	
یروشلم کیلئے پیشگوئی	
رؤیا میں سو سال کی موت کیوں دکھائی گئی	
کیفیت احیائے موتیٰ کا سوال	۱۶۰
مردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں	
حدیث کی شہادت کہ سوال کیفیت سے تھا	۱۶۱
انفاق فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے	
قوم کی زندگی کے اسباب کیا ہے	
بیج کی مثال اور انجیل سے مقابلہ	
اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے ہوگی	۱۶۲
انفاق کی پہلی غرض ترقی دین ہے	
بھلی بات بتانا بھی صدقہ ہے	
صدقہ کے ابطال سے مراد	۱۶۳
ریا کے خرچ کی مثال	
ریا کا خرچ مسلمانوں کا کام نہیں	
رسم و رواج کے اخراجات ریا میں داخل ہیں	
مال خرچ کرنے سے محبت الٰہی کا بڑھنا	۱۶۴
من واذی کا اثر صدقہ پر	
کیسا مال خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے	۱۶۵
صدقہ سے انسان مفلس نہیں ہوتا	
لمّہ شیطانی و لمّہ ملکی	
حکمت خیر کثیر ہے	
صحابہ کا نمونہ	
نذر میں شرط	۱۶۶
علانیہ صدقات	
انجیل کی ناقص تعلیم	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
انجیل کی ناقص تعلیم	
قومی چندے	
مخفی صدقات	
غیر مسلموں پر مال خرچ کرنا	۱۶۷
صدقہ سے فائدہ	
غیر حقدار کے ہاتھ صدقہ کا چلا جانا	
کون محتاج خصوصیت سے مستحق امداد ہیں	
سوال کرنا مذموم ہے	۱۶۸
بھیک مانگنے سے روکنے کا انتظام	
قرآن نے صدقات کی تعلیم کو کامل کیا	
صدقات اور سود کا تقابل	
ربائے جاہلیت	۱۶۹
حرمت ربا کا حکم آخری حکم نہیں	
اس قول کے معنی کہ آنحضرتؐ نے ربا کی تفسیر نہیں کی	
سود کی ممانعت عام ہے	
بنکوں کا سود	
زمیندارہ بنک	
بغیر تقرر کے زیادہ رقم لینا	
احادیث میں حرمت ربا	
ممانعت سود کی دو وجوہ	۱۷۰
مال کی بیجا محبت	
شراب اور سود کے بدنتائج بہت باریک ہیں	
آنحضرتؐ کی کامل تعلیم اور کامل قوت قدسی	
کسی کی پچھلی کمزوریوں کا ذکر	
سود اور تجارت میں فرق	
سود سے محنت کی بیوقری	
شراکت کی افضلیت	
سود خواری کا دوسرا بدنتیجہ	۱۷۱
سوشلزم اور بولشوزم	
اصول محنت و مساوات دولت میں توازن	
شراب کی تجارت	
سود سے بے برکتی اور صدقات سے برکت کا پیدا ہونا	
قوم کا مال کس طرح بڑھتا ہے	
بقایا سود کا ترک کرنا	۱۷۲
حجۃ الوداع کا خطبہ	
سود لینے والے کا قتل کرنا جائز نہیں	
سود کا روپیہ اشاعت اسلام پر خرچ کرنا	
ملازمین کا بونس	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
ناجائز کمائی کا روپیہ	
قرضہ کا معاف کرنا	
آخری آیت جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی	۱۷۳
آیات کی ترتیب آنحضرتؐ کے حکم سے	
حفاظت مال کی تعلیم	
لین دین کے معاملات چار طرح پر	
تحریر معاملات کے حکم میں آئندہ کی خبر	
وثیقہ نویس	۱۷۴
مدیون کا حق	
باہم معاملات میں اصول قوانین	
دو گواہ	۱۷۵
عورت کی گواہی	
رہن باقبضہ کا جواز عام ہے	
آنحضرتؐ کا زرہ کو یہودی کے پاس رہن رکھنا	
نبی کریم کا گزارہ	
رہن بلاقبضہ جائز نہیں	
مکان اور زمین کا رہن	
معاملہ دنیوی میں راستی کی اہمیت	
کتمان شہادت اور جھوٹی شہادت	
آیت ان تبدوا کی منسوخی پر بحث	۱۷۶
نسخ کا استعمال صحابہ میں	
چھپی اور کھلی باتوں پر خدا کا محاسبہ	
سب انبیاء پر ایمان	۱۷۷
من قبلک کی تحدید	
مشقت سے راحت پیدا ہوتی ہے	
ظل اللہ	
عفو اور غفر کا اکٹھا ذکر	۱۷۸
خواتیم سورت بقرہ کی فضیلت	
نسیان اور خطا	
عہد شکنی	
قضاء و قدر کے مصائب	
دعائے عفو و غفر و رحم	
سورت کی غرض و غایت	
۳ سورۃ آل عمران - ۱۷۹ تا ۳۰۳	
نام - خلاصہ مضمون	۱۷۹
بقرہ اور آل عمران کا تعلق الزہراوان	
زمانہ نزول	۱۸۰
صفات الٰہی جن سے عیسائیت کا ابطال ہوتا ہے	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
آنحضرتؐ کی وفد نجران سے گفتگو	
حضرت عیسیٰ پر فنا کا ذکر	
پہلی وحی کے ہوتے ہوئے نزول قرآن کی ضرورت	
توریت میں کونسی کتابیں ہیں	۱۸۱
صحابہ کے سینے اناجیل ہیں	
انجیل کونسی کتاب ہے	
چار انجیلیں	
بائبل	
پرانا اور نیا عہد نامہ	
اناجیل کے مصنف	
زمانہ تصنیف اناجیل	
محرف کتابوں کا نام بھی توریت و انجیل ہی ہے	۱۸۲
توریت و انجیل میں ہدایت	
فرقان قرآن کا نام ہے	
حضرت مسیح کا اعتراف لاعلمی	
آدم کو اللہ کی صورت پر پیدا کرنے سے مراد	
روح میں ضمیر	۱۸۳
مسیح کا معمولی بچوں کی طرح حمل میں آنا اور پیدا ہونا	
محکم اور متشابہ پر راغب کی بحث	
اپنی خواہش کے مطابق تاویل	۱۸۴
راسخ فی العلم اور متشابہات کی تاویل	
عیسائی مذہب کی بنیاد متشابہات پر ہے	۱۸۵
پیشگوئی متشابہات سے ہے	
بائبل کی پیشگوئیاں جن میں خدا کے آنے کا ذکر ہے	
آنحضرت صلعم کیلئے ہیں	
لفظ خدا کا استعمال نیکوں کے حق میں	
اقرار مسیح کہ وہ بطور مجاز خدا کا بیٹا کہلائے	
مرزا صاحب کی طرف دعوی نبوت کی نسبت	
محکمات اصول دین ہیں	
فروع کو اصول کے ماتحت کیا جائے	۱۸۶
متشابہات میں پڑنے والا گروہ	
زیغ سے بچنے کی دعا	
کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی	۱۸۷
النساء لایحتشمن سے مراد	
عیسائیوں سے خطاب	۱۸۸
جنگ بدر کی پیشگوئیاں	
آنحضرتؐ کی دعا بدر کے دن	
بائبل میں جنگ بدر اور ہجرت کی پیشگوئیاں	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
بدر میں مسلمانوں کا کفار کو دو چند دیکھنا	۱۸۹
دنیا کے مرغوبات مقصدِ زندگی نہیں	۱۹۰
جنت اور رضائے الٰہی کا حصول دنیا میں	
انہماک مرغوبات دنیا کا انجام	
استغفار ترقی کا آخری مرتبہ ہے	۱۹۱
مسیح کے وقت استغفار اور دعا	
اللہ تعالیٰ کا نزول سماء دنیا پر	
توحید پر تین قسم کی شہادت	
عیسائیت پر اتمام حجت	
کیوں اسلام ہی قابل قبول دین ہے	۱۹۲
آنحضرتؐ کی بعثت اسود و احمر کی طرف	
نبیوں کا قتل	۱۹۳
حبط عمل	
تحریف بائبل	
قرآن تمام اختلافات مذہبی کا فیصلہ کرتا ہے	
دوزخ سے بریت کا دعویٰ	
فعل اور اس کی جزا میں اتصال	۱۹۴
خدا کی بادشاہت	
لفظ عزت میں حکومت کی خوشخبری	
مردہ اور زندہ سے مراد	۱۹۵
سوالات کفار	
مسئلہ تقیہ اور اہلِ تشیع	۱۹۶
کفار سے سوالات کی ایک صورت	
دشمنانِ اسلام کی مخفی تدابیر	۱۹۷
کفار کے ذکر میں مسلمانوں کو ہدایات	
دوسرا شفیع	
محبوبِ الٰہی کس طرح بنتا ہے	۱۹۸
کفارہ گناہ سے نہیں چھڑا سکتا	
حضرت عیسیٰ کے ذکر کی ابتدا	
آدم اول اور آدم آخر	
برگزیدگی بالخصوص اپنے زمانہ میں ہے	
مریم کو اخت ہارون اور بنت عمران کہنے سے منشاء	۱۹۹
اولاد کو خدمت دین کے لیے وقف کرنا	
عورتیں بھی خدمت دین کر سکتی ہیں	۲۰۰
مریم کا بیٹا جانا اور صاحب اولاد ہونا	
حدیث مس شیطان	
مس شیطان کے دو مفہوم	
بچہ اور وساوس شیطانی	۲۰۱

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے	
احادیث میں یحییٰ کا گنہگار ہونے سے استثنا	
یحییٰ، مریم، ابن مریم کا ذکر بطور مثال	
حدیث میں مس شیطان کا اصل مفہوم	
حدیث میں پیدائش روحانی مراد ہے	
زکریا اور زکریاہ	۲۰۲
مریم کے متعلق بعض مفسرین کے خیالات	
بے موسم پھل	۲۰۳
رزق سے مراد	
مریم کے پاس رزق کا پہنچنا	
معمولی امور کے ذکر میں سبق	
نیک اولاد کی خواہش	۲۰۴
ملائکہ کا کلام	
یوحنا، بپتسمہ دینے والا	
سلسلہ موسویہ کے اول و آخر دو دو نبیوں کا ظہور	
یحییٰ کے ظہور کی پیشگوئی	
الیاس کا آسمان پر جانا	
الیاس کی دوبارہ آمد کی پیشگوئی	۲۰۵
کلمہ کی تصدیق سے مراد	
یحییٰ اور عیسیٰ	
زکریا کی خاموشی اضطراری تھی یا اختیاری	۲۰۶
لوقا کا قصہ	
مریم نبیہ تھیں یا نہیں	۲۰۷
محض مکالمہ نبوت نہیں	
غیر انبیاء سے مکالمہ اور ان کو وحی	
نبی بلحاظ معنی لغوی	
نبی اصطلاح شریعت میں	
طہارت جسمانی و طہارت نفس	
عالمین پر فضیلت سے مراد	
عورتوں میں فضیلت	
مریم کی فضیلت سے عیسیٰ کی فضیلت پر استدلال	
مریم کا ذکر اناجیل میں	۲۰۸
حضرت مسیح کا اپنی والدہ سے خطاب	
آنحضرتؐ کا اپنی بیٹی کی عزت کرنا	
حکم دینے سے خلاف ورزی پر حکم استدلال	
واقعات گزشتہ اور غیب	
مسیح اور مریم کے صحیح حالات انباء الغیب ہیں	
مریم کی عصمت پر شہادت انباء الغیب ہے	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مریم کی دوسری کفالت مریم کی بلوغت پر	۲۰۹
مریم صدیقہ کا نکاح	
قرعہ اندازی	
مریم کی بریت کی شہادت	
اصطفائے روحانی میں ذکر خصوصیت	
کلمۃ اللہ سے مراد	۲۱۰
اصول اور خصوصیت کی بحث	
بروئے قرآن کلمات اللہ بہت ہیں	
کلمہ یا قول کے آنے سے مراد	
آنحضرتؐ کا اپنے آپکو دعائے ابراہیم قرار دینا	
کلمہ کی دوسری توجیہہ	
نام کی وجہ تسمیہ	
مسیح کا کشمیر وغیرہ میں آنا	
مسیح کی بائیں اور دجال کی دائیں آنکھ نہ ہونے سے مراد	۲۱۱
مسیح کو وجیہہ کہنے کی وجہ	
حضرت عیسیٰ کا دوسری اقوام اسرائیل میں جانا	
مسیح کا مقرب ہونا	
مسیح کو مقرب کہنے کی ضرورت	
مسیح کا جھولے میں اور بڑھاپے میں باتیں کرنا	
جھولے کے کلام پر بحث	۲۱۲
لکڑی کی آواز معجزات نبوی میں سے ہے	
صالح ہونے سے مراد	
مہد اور کہولت کی باتوں سے مراد	
بشارت کے ذکر میں نفی الوہیت مسیح	
کھانا کھانے کے ذکر میں نفی الوہیت	۲۱۳
حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش اسلامی عقاید میں	
داخل نہیں عیسائیت کا اصول ہے	
بن باپ پیدا ہونے میں فضیلت نہیں	
مسلمان مریم کا روح القدس سے حاملہ ہونا نہیں مانتے	
نسل انسان کی پیدائش کے متعلق قانون الٰہی	
مس بشر	
توریت و انجیل کی تاریخی بشارت	
یوسف کا مریم سے تعلق زوجیت اور اولاد کا ہونا	
حدیث کی شہادت کہ حضرت مسیح معمولی حالات	
میں حمل میں آئے اور پیدا ہوئے	۲۱۴
حضرت عیسیٰ کی تعلیم کس طرح پر ہوئی	
حضرت عیسیٰ کا صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونا	۲۱۵
دوسری اقوام کو کتوں کی حیثیت دینا	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
یہود سے مایوسی پر دوسری اقوام کیطرف توجہ	
حضرت مسیح امت محمدیہ میں نہیں آ سکتے	
خلق کے معنی جب انسان کیلئے بولا جاتا ہے	
خلق پیدا کرنے کے معنی میں فقط اللہ تعالیٰ کیلئے ہے	۲۱۶
پانی میں پھونکنے کی ممانعت	
بدی اور نیکی کا نفخ	
حضرت عیسیٰ کا پرندیا چمگادڑ بنانا	
خلق اشیاء خاصہ صفات باری ہے	۲۱۷
طیر کی توجیہ کہ وہ جلد مٹی ہو جاتے تھے	
مسیح کے کلام میں کثرت مجاز	۲۱۸
روحانیت کا ذکر جسمانیات میں	
طیر کے مجازی معنی	
طیر کا استعمال بطور مجاز قرآن و حدیث میں	
انجیل میں بیماریوں سے مراد روحانی بیماریاں ہیں	۲۱۹
قرآن کریم میں بیماریوں اور شفا سے مراد	
عیسائیوں کی لفظ پرستی	
دنیا کا سب سے بڑا طبیب	
مردوں کا اس دنیا میں واپس آنا	
قرآن کریم میں روحانی مردوں کے احیاء کا ذکر	۲۲۰
مسیح کے احیائے موتے سے مراد	۲۲۱
نبی کی قوت قدسی کا اظہار دو رنگوں میں	
مسیح کے متعلق غلط قصے	
حضرت مسیح کے احکام کھانے اور ذخیرہ کے متعلق	
مسیح کا توریت کا مصدق ہونے سے منشا	
توریت اور انبیائے بنی اسرائیل	۲۲۲
حضرت عیسیٰ کا بعض احکام توریت کو منسوخ کرنا	
توریت کی تکمیل ترمیم نسخ کی مثالیں	
حضرت عیسیٰ کا اپنی اطاعت کیطرف بلانا	
نبی کی اطاعت جزو دین ہے	
اناجیل میں توحید کی تعلیم	
حواری نام کی وجہ	۲۲۳
بارہ حواریوں کے نام	
وعظ کے لیے ہدایات	
حواریوں کا کام	
حواریوں کی ایمانی حالت بروئے اناجیل	
حواریوں کے ساتھ وعدے	
قرآن شریف کا عیسائیوں پر احسان	
صلیب پر کھچوانے کی تدبیر	۲۲۴

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مسیح کو آسمان پر اٹھانا مخفی تدبیر نہیں	
متوفیک پر مفسرین کے خیالات	۲۲۵
وفات مسیح	
امام مالک کا مذہب کہ مسیح فوت ہو گئے	
حیات مسیح کا عقیدہ اور عیسائی مذہب	
وفات مسیح پر حدیث کی شہادت	۲۲۶
رفع کے معنی حدیث میں	
حضرت عیسیٰ کی تطہیر	۲۲۷
حضرت عیسیٰ کی تطہیر اور آنحضرتؐ کا غفر	
حضرت عیسیٰ کے متبع عیسائی ہیں مسلمان نہیں	
کافران مسیح	
حضرت مسیح کے چار وعدے	
یہود کی تدبیر صلیب کا جواب	
چاروں وعدوں میں ترتیب	
مسیح کے منکر قیامت رہیں گے	
اختلاف عقیدہ تا قیامت رہے گا	
مسیح کے منکروں کیلئے عذاب دنیا	۲۲۸
عیسائیوں کے دو گروہ	
قرآن کو کیوں ذکر کہا جاتا ہے	
مسیح کے حالات سے الوہیت کے خلاف دلیل	
آدم اور عیسیٰ کی مشابہت	
ہر بشر مٹی سے پیدا ہوتا ہے	۲۲۹
دعوت مباہلہ عیسائیوں پر اتمام حجت کیلئے	۲۳۰
واقعہ مباہلہ وفد نجران سے	
مسجد میں عیسائیوں کو نماز پڑھنے کی اجازت	
عیسیٰ پرستی کی تردید	
مباہلہ میں حضرت علیؓ کا نکلنا اور اہل تشیع	
مباہلہ کب جائز ہے	
شرک فی الصفات	۲۳۱
پیر پرستی	
تین قسم کا شرک عبادت صفات اطاعت میں	
اصول مقابلہ مذاہب اور صداقت اسلام	
مقوقس کے نام آنحضرت صلعم کا خط	۲۳۲
مذہب ابراہیمی بطور امر مشترک	
یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت	
ابراہیم سے نفی یہودیت و نصرانیت	
آنحضرتؐ ابراہیم کے متبع ہیں	۲۳۳
عیسائیوں کی مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
یہودیوں کی منافقانہ چال	۲۳۴
احکام اسلام میں تفریق کی چالبازی	
موجودہ زمانہ میں عیسائیوں کی چالبازیاں	
مثیل موسیٰ کی پیشگوئی اور یہودیوں کے اس	
سے گریز کے حیلے	۲۳۵
پیشگوئی ناقابل تردید ثبوت صداقت اسلام کا ہے	
نبوت ایک قوم سے مخصوص نہیں	۲۳۶
اہل کتاب کے معاملہ میں اسلام کا منصفانہ رویہ	
معاملات دنیا میں دیانت معیار امتیازی ہے	
اُمّی سے مراد	
عیسائیوں کا دوسروں کے حقوق اپنے برابر نہ سمجھنا	
عہد کے معاملہ میں تعلیم اسلامی	۲۳۷
اہل ذمہ کے حقوق	
عہد اور امانت	
دنیا پرستی	
عیسائی اور معاہدات	
اہل کتاب کی کتاب کے پڑھنے میں تحریف	
عیسائیت کی تحریف	۲۳۸
علمائے ربانی مثیل اور وارث انبیاء ہیں	۲۳۹
ہر نبی کو کتاب و حکم دیا جاتا ہے	
وفد نجران کا آنحضرتؐ کے متعلق غلط خیال	
میثاق النبیین	
آنحضرت صلعم جملہ انبیائے عالم کے موعود ہیں	۲۴۰
اول النبیین اور آخری نبی	
کل دنیا کیطرف صرف ایک رسول کا آنا اور اسمیں حکمت	
آخری رسول کی سب سے بڑی علامت تصدیق رسل عالم ہے	۲۴۱
حواریان مسیح کی شہادت آنحضرتؐ کیلئے	
ابراہیم اور عیسیٰ کی پیشگوئیوں کا ذکر	
اسلام عالمگیر ہے	
طوعاً وکرہاً فرمانبرداری سے مراد	۲۴۲
اسلام کو چھوڑنا فطرت بگاڑنا ہے	
نجات اور دوسرے مذہب	
اہل کتاب کا باوجود مشاہدہ صداقت نبوی سے انکار	۲۴۳
توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے	
ازدیاد کفر	پ ۴
مال دنیا آخرت میں کام نہ دے گا	۲۴۴
خیر و برکت حاصل کرنے کی راہ	
مما تحبون کیا ہے۔	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
اونٹ کے گوشت کے متعلق اعتراض	
بنی اسرائیل پر بعض چیزیں حرام ہوئیں	۲۴۵
یہود و نصاریٰ کو ملت ابراہیم کے اتباع کی دعوت	
بکہ کو مبارک کہنے سے مراد	
خانہ کعبہ سب سے پہلا دنیا کا معبد ہے	۲۴۶
آدم کا کعبہ کو بنانا	
بیت اللہ اور بیت المقدس میں چالیس سال کا فرق	
مکہ کے نام۔ خانہ کعبہ کے نام۔ آخری عبادتگاہ	
استطاعت راہ سے مراد	
مقام ابراہیم سے شہادت	۲۴۷
کعبہ مقام امن ہے	
خانہ کعبہ کا حج کبھی نہ رکے گا	
خانہ کعبہ دشمن کے قبضہ میں نہ جائے گا۔	
کفار کی اطاعت	۲۴۸
کامیابی کا پہلا گُر فرداً فرداً ذمہ داری کا احساس ہے	۲۴۹
کامیابی کا دوسرا گُر اتحاد قومی ہے	
قرآن پر مسلمانوں کا اتحاد	
قرآن کی بنیاد اتحاد ہونے سے منشاء	
قرآن میں اتحاد پیدا کرنے کی طاقت	۲۵۰
کامیابی کا تیسرا گُر دعوت الی الاسلام ہے	
موجودہ گدیاں	
دعوت الی الاسلام کی اہمیت	
مجدد صدی چہاردہم اور دعوت الی الاسلام	۲۵۱
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر	
پہلے مذاہب کا اصولی اختلاف	
مونہوں کی سفیدی اور سیاہی سے مراد	۲۵۲
اُمت محمدیہ کا کام دوسروں کی تکمیل ہے	۲۵۳
اُمت کی فضیلت اور اس کی وجوہات	
فضیلت کا ثبوت	
یہود کی شکست کی پیشگوئی	۲۵۴
یہود کا انجام	
اہل کتاب کے مومن	۲۵۵
عصمت انبیاء	۲۵۶
دشمن کو دوست بنانے کی ممانعت	۲۵۷
یہود کی منافقت اور بدزبانی	
حضرت عائشہؓ کا جنگ اُحد میں شریک ہونا	۲۵۸
جنگ میں عورتوں کی شمولیت	
جنگ اُحد کے متعلق مشورہ	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
آنحضرتؐ کی تین رویا	
مشورہ کی عزت	
واقعات جنگ اُحد	۲۵۹
آنحضرت صلعم کے مختلف کام	
بنوحارثہ اور بنوسلمہ	
قرآن سے توکل کے معنی پر روشنی	۲۶۰
احادیث سے توکل کے معنی پر روشنی	
تین ہزار ملائکہ کی نصرت کا وعدہ	۲۶۱
احزاب میں پانچ ہزار ملائکہ کا وعدہ	
بدر۔ اُحد۔ احزاب میں نزول ملائکہ کی حکمت	
امر رب کا آنا	
نزول ملائکہ فرضی بات نہ تھی	
ملائکہ نے قتال نہیں کیا	۲۶۲
اُحد میں کفار کی ناکامی	۲۶۳
آنحضرتؐ کا بددعا کرنا	
واقعہ بئر معونہ	
آنحضرتؐ کو بددعا سے روکنے میں سبق	۲۶۴
رحمت کا غضب پر سبقت لے جانا	
حرمت سود جنگوں کے روکنے میں معاون ہے	
کامیابی اللہ اور رسول کی اطاعت میں ہے	۲۶۵
رسول کی اطاعت شرک نہیں	
و تفسیر کے لئے نہیں آتی	
رسول۔ اللہ کی تفسیر نہیں	
مغفرت الٰہی	۲۶۶
وسعت جنت	
مکان جنت کی کیفیت اس عالم کی طرح نہیں	
خوشحالی اور تنگی میں انفاق	۲۶۷
غضب کا دبانا	
محسن	۲۶۸
بیان اور نطق میں فرق	
اُحد میں آنحضرتؐ کی دعا	
علم وقوع فعل	۲۶۹
تکالیف کی غرض	۲۷۰
تکلیف سے فائدہ اُٹھانا مومن کا کام ہے	
خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو	
موت اور قتل	۲۷۱
اُحد میں آنحضرتؐ کے قتل کی خبر مشہور ہو جانا	
آنحضرتؐ سے پہلے تمام رسول فوت ہو چکے	۲۷۲

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
فلسفہ عمل	
دنیوی اور اُخروی بھلائی کے متعلق قانون الٰہی	۲۷۳
اپنی کمزوری کا علاج دشمن پر فتح سے مقدم ہے	۲۷۴
محسن کون ہے	
اطاعت کفار	۲۷۵
آنحضرتؐ کی غیرت توحید باری	
مسلمانوں کا کافروں پر رعب	۲۷۶
آنحضرتؐ کا رعب آپ کی خصوصیات میں سے ہے	
ابتدائے جنگ میں کفار کا شکست کھانا	
قوم کے بعض افراد کا اثر کُل قوم پر	۲۷۷
تیراندازوں کی غلطی	
حصول مال غنیمت جنگوں کی غرض نہ تھی	
صحابہ کی جانفشانی اور شجاعت کا اظہار	۲۷۸
آنحضرت صلعم کی شجاعت	
صحابہ کی محبت آنحضرت صلعم سے	۲۷۹
نبی کریم صلعم کا جنگ میں تنہا رہ جانا	۲۸۰
منافقوں کی چہ میگوئیاں	۲۸۱
صحابہ کی جاں نثاری پر قرآن کی شہادت	
جنگ اُحد میں بھاگنے والے	
بھاگنے والوں کی تعداد اور وہ کون تھے	۲۸۲
حضرت عثمان پر طعن	
مسلمانوں کو موت سے خائف نہ ہونا چاہیئے	۲۸۳
آنحضرتؐ کی لینت	۲۸۴
آپ کے اخلاق اور خلق لینت کا کمال	
آنحضرتؐ کی رحمت	
استغفار کے معنی	۲۸۵
شوریٰ کا حکم	
آنحضرتؐ کا شوریٰ پر عمل	
کثرت رائے پر عمل	
عزم شوریٰ کا نتیجہ ہے	
مجدد کا کثرت رائے کے اصول کو زندہ کرنا	
خیانت کی سزا کا ذکر بطور مثال	۲۸۶
عصمت انبیاء پر شہادت	
تفاوت درجات	۲۸۷
نبی کا کام دوسروں کو پاک کرنا ہے	
آنحضرتؐ کی تعلیم اور تزکیہ کی چار دفعہ میں حکمت	
مصیبت کی وجہ اور غرض	۲۸۸
قوم کو ہلاکت یا ذلت سے بچانے کا فرض	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
ادائیگی فرض میں موت کی پروا نہ ہو	۲۸۹
شہداء کی زندگی	
خوف وحزن سے مراد	۲۹۰
دینی اور دنیوی منافع کی بشارت	
غزوۂ حمراء الاسد	
حکم رسول کی فرمانبرداری	۲۹۱
بدر صغریٰ	
جیش السویق	
مصائب کی غرض	۲۹۲
کیوں ہر شخص کو وحی نہیں ہوتی	۲۹۳
یہودیوں کا اسلامی چندہ پر استہزا	۲۹۴
مبالغہ کی نفی	
سوختنی قربانی	۲۹۵
شریعت موسوی کا ایک امتیازی نشان	
آگ کا آسمان سے اترنا	
زبور اور کتاب	
دنیا کی زندگی دھوکہ ہونے سے مراد	۲۹۶
موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مالی	
اور جانی نقصانوں اور ایذا کی پیشگوئی	
ان مصائب کا علاج	۲۹۷
اہل کتاب کا اپنی کتاب کو چھپانا	
مسلمانوں کی بیماری قرآن کو بیان نہ	
کرنا ہے	
قرآن کریم کے پیش کرنے سے اصلاح	
اور اشاعت کے دو کام ہوتے ہیں	
مخلوق اور اختلافات زمانہ میں نشان	۲۹۸
ذکر وفکر	
عبادت اور حصول علم کا اکٹھا بیان	۲۹۹
اشیاء میں فکر سے خدا کی طرف توجہ دلائی	
دنیا اور آخرت کی آگ	
منادی سے مراد	
دین ودنیا میں کامیابی کی دعا	۳۰۰
وعدہ کے ساتھ دعا کی ضرورت	
دعا کے ساتھ عمل کی ضرورت	
جو عمل جن پر کامیابی ملتی ہے	
مومنوں سے وعدہ	۳۰۱
گناہوں سے پاک کرنے والی چیزیں	
عیسائیوں کے زمین میں تصرف کی پیشگوئی	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
عیسائیوں کے اسلام لانے کی پیشگوئی	۳۰۲
بدی اور دشمن دونوں کے مقابلہ کی	
ضرورت	
تقوی اللہ	۳۰۳
۴ سورۃ النساء ۳۰۴ تا ۴۰۱	
نام ۔ خلاصہ مضمون	۳۰۴
تعلق	۳۰۵
تاریخ نزول	
نفس واحدہ سے مراد	
نسل انسانی کا متحد الاصل ہونا	۳۰۶
آدم سے پہلی نسل انسانی کا وجود	
حوا کا آدم سے پیدا ہونا	
عورت کا پسلی سے پیدا ہونا	
انسان اول کی پیدائش	۳۰۷
عورت میں اعوجاج کا مطلب	
حقوق العباد وصلہ رحمی میں داخل ہیں	
صلہ رحمی کی تاکید	
یتامیٰ کی خبر گیری کی تاکید	۳۰۸
صاحب جائداد یتیم	
یتامیٰ کی بحث میں تعداد ازدواج کا ذکر	
نکاح میں پسندیدگی اور ایک دوسرے	۳۰۹
کو دیکھ لینا	
چھوٹی عمر میں نکاح	
چار سے زیادہ نکاح منع نہیں	
تعدد ازدواج کے متعلق چار سوال	
یہ اجازت ہے نہ حکم	
اجازت صرف ضرورت کیلئے ہے	
تعدد ازدواج کی ضرورتوں کی تصریح	
کیوں نہیں کی	۳۱۰
تعدد ازدواج کی ضرورت	
سب راستباز تعدد ازدواج کے مجوز ہیں	
چار کی حد بندی	۳۱۱
نبی کریم کی ازواج کی تعداد	
نکاح میں اصول ایک شوہر کے لیے ایک	
بی بی ہے	
عدل کی شرط	
حجر اسود یمین اللہ ہے	
ملک یمین سے مراد	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
لونڈیاں	۳۱۲
مہر عطیہ بلا بدل ہے	
مہر دینے کی تاکید	
مہر پر لڑکی کے والد کا کوئی حق نہیں	۳۱۳
مال کو ترقی دینے والے سفہاء ہیں	
یتامیٰ وغیرہ کی تربیت	
حفاظت مال کی تاکید	
صغرسنی کی شادی	۳۱۴
سن بلوغ	
تربیت اولاد	
مال یتیم سے حق الخدمت	
جاہلیت میں یتامیٰ کی وراثت سے محرومیت	۳۱۵
آنحضرت کی قوت قدسی کا کمال	
آپ کی یتیموں اور بیواؤں کی بے نظیر حمایت	
تقسیم ترکہ کے وقت غرباء کو کچھ دینا	۳۱۶
اسلام کا قانون وراثت	
تقسیم وراثت میں اصول جمہوریت	
تقسیم دولت کا صحیح اصول	۳۱۷
بولشوزم	
تقسیم دولت میں مساوات قایم رکھنے	
کے لیے چار علاج	
حقوق وراثت کن باتوں سے پیدا ہوتے	
ہیں	
اولاد کا حق وراثت	۳۱۸
پوتے کا حق	
ماں باپ کے حصے	
ماں باپ کے ساتھ بھائیوں کی موجودگی	
وصیت اور قرضہ	۳۱۹
وصیت کا حق کہاں تک ہے	
غرض وصیت	۳۲۰
خاوند اور بیوی کے حصے	
عول کا مسئلہ	۳۲۱
کلالہ کی وراثت	
دو قسم کے کلالہ	
وراثت کی پانچ صورتیں	
ضرر والا قرضہ	۳۲۲
رواج اور قرآن	
عورت کی عصمت کو محفوظ کرنے کے اسباب	۳۲۳

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مبادئی زنا کا علاج	
تعلیم اسلام میں زنا سے بچانے کے	
سامان	
مبادئی زنا میں مرد کیلئے سزا	
توبہ اور اس کی قبولیت	۳۲۴
عدم قبولیت توبہ	۳۲۵
عورتوں کا ورثہ میں لیا جانا	
طلاق کے وقت عورت سے مال لینا	
عورت سے سلوک	۳۲۶
حدیث میں حسن معاشرت کی تاکید	
طلاق کب دینی جائز ہے	
مہر کی مقدار	۳۲۷
حضرت عمرؓ کا خطبہ تعین مہر پر	
میثاق غلیظ	
عورت سے مہر کس صورت میں لیا جا سکتا ہے	۳۲۸
چودہ وجوہ حرمت نکاح	۳۲۹
رضاعت کے رشتے	پ
ملک یمین کا حکم	۳۳۰
استمتاع اور متعہ میں فرق	۳۳۱
نکاح اور مسافحت	
متعہ مسافحت ہے نہ نکاح	
احادیث میں متعہ کی حرمت	
متعہ کب حرام ہوا	۳۳۲
متعہ کے بارہ میں ابن عباس کا مذہب	
مہر کی کمی بیشی تقرر مہر کے بعد	
لونڈیوں سے نکاح	۳۳۳
لونڈیوں سے نکاح سے روکنے کی وجہ	
ماریہ قبطیہ	
لڑکیوں کی تعلیم	۳۳۴
لونڈیوں سے نکاح کی شرائط	
مالک اور مملوک۔ لونڈی	
شرائع کا نزول	
نزول شریعت کی غرض اور ضرورت	۳۳۵
شرائع پر چلنے کی قابلیت اور عیسائی	
عقیدہ	
کفارہ	
تجارت	۳۳۶
خودکشی	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
کبیرہ گناہ کون کون سے ہیں	
بدی سے پاک ہونے کا طریق	۳۳۷
بدی کا کفارہ اسلام اور دیگر مذاہب میں	۳۳۸
تمنی سے روکنے کا مطلب	
مال کے حصول کا ذریعہ اکتساب ہے	
رضا بالقضا	۳۳۹
مال کے حصول کے دو بحر جائز ذرائع	
معاہدہ کے ذریعہ سے ورثہ کی منسوخی	
مردوں کے عورتوں پر قوام ہونے سے	
مراد	۳۴۰
ہر گھر ایک بادشاہت ہے	
حدیث ولوا امرھم امرأۃ سے مراد	
نیک عورتوں کی دو بڑی صفات	
خوف میں مفہوم علم	
نشوز کرنے والی عورتیں	۳۴۱
عورت کے نشوز کا علاج	
عورت کو مارنا کب اور کس حد تک	
جائز ہے	
نبی کریم صلعم کا نمونہ	۳۴۲
میاں بیوی میں فساد میں دو حکم مقرر	
کرنا	
کل مخلوق سے حسن سلوک	۳۴۳
پڑوسی کے حقوق	
غلاموں سے حسن سلوک	
مختال اور فخور میں فرق	
تکبر کیا ہے	۳۴۴
رسول اللہ صلعم کی گواہی اُمت محمدیہ پر	۳۴۵
نماز کے ساتھ حالت سکر و جنابت کیوں	
جمع نہیں ہو سکتی	۳۴۶
شراب کی قطعی حرمت سے پہلے حالت	
سکر سے روکا	
نماز کیلئے حضور قلب کی ضرورت	۳۴۷
تیمم کا طریق	
دو قسم کی تحریف	۳۴۸
یہودیوں کا نبی کریم صلعم سے طرز عمل	
طمس وجوہ سے مراد	۳۴۹
یہود کی سزا	
بندر بننے سے مراد	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
شرک کی اقسام	
شرک کے نہ بخشنے کی وجہ	۳۵۰
شرک کی سزا اور اس سے توبہ	
مسلمانوں میں پیر پرستی کی بیماری	۳۵۱
ایک دوسرے کی مدح کرنے کی ممانعت	
یہودیت پر عرب کی بت پرستی کا اثر	
بادشاہت اور نبوت کے لیے وسعت	
قلب کی ضرورت	
مسلمانوں کے لیے بادشاہت اور نبوت	
کا وعدہ	
مسلمانوں پر ہندوؤں کی بت پرستی کا اثر	۳۵۲
چمڑوں کے پکنے اور بدلنے سے مراد	۳۵۳
ادائے امانت سے مراد	۳۵۴
حاکم و محکوم کے تعلقات	
عثمان بن ابی طلحہ اور خانہ کعبہ کی چابی	
اولی الامر سے مراد	
اولی الامر کا حکم کس حد تک مانا جا سکتا ہے	
مخلوق کی اطاعت باقی نہیں رہتی جب خالق	
کی معصیت لازم آئے	۳۵۵
اولی الامر کی اطاعت	
اہل قرآن اور رسول اللہ کی اطاعت	
اہل تشیع اور قادیانی احمدی	۳۵۶
منافقوں کا ذکر	
ہر رسول مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں ہوتا	۳۵۷
ختم نبوت پر فیصلہ کن دلیل	
حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد	۳۵۸
انبیاء بنی اسرائیل	
آنحضرت صلعم کا استغفار	
رب کی قسم سے منشا	
شریعت کی ظاہری پابندی	۳۵۹
اجتہاد نبوی میں وحی خفی	
اپنے آپ کو قتل کر دینے کے حکم سے مراد	
اطاعت رسول سے منعم علیہم کی رفاقت	۳۶۰
دنیا میں منعم علیہم کی رفاقت	
اکتساب کا کمال صدیقیت ہے	۳۶۱
صرف مبشرات باقی ہیں	
ولایت یا محدثیت	۳۶۲
صحابہ کی کمال اطاعت	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
دشمن کے مقابلہ کے لیے تیاری کی ضرورت	
مسلمان جنگ کرنیوالے کیسے ہوں	۳۶۳
مال غنیمت کا حاصل کرنا غرض جنگ نہ ہو	
جنگ کی ضرورت	۳۶۴
ولی اور ناصر	
مسلمانوں اور کفار کی اغراض جنگ کا مقابلہ	
کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی	
اصلاح نفس جہاد پر مقدم ہے	
فرائض کی ادائیگی میں موت سے خائف نہ ہو	۳۶۵
بھلائی اور دکھ اللہ کی طرف سے ہونے سے مراد	
من اللہ اور من عند اللہ	
رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے	۳۶۷
رسول اللہ صلعم کے حالات میں اختلاف کثیر کے باوجود قرآن میں اختلاف نہ ہونا اس کے منجانب اللہ ہونے پر دلیل ہے	
آنحضرت کا امی ہونا اور قرآن کریم میں اختلاف نہ ہونا اس کے اعجاز پر شاہد ہے	۳۶۸
قرآن میں اختلاف کا نہ ہونا ناسخ منسوخ کو غلط ٹھہراتا ہے	
استنباط مسائل	۳۶۹
جنگ کیلئے آنحضرت اکیلے مکلف تھے	
السلام علیکم کی سنت	۳۷۰
منافقوں کے مختلف مدارج	
منافقوں کے اور گروہ	۳۷۱
مرتد کب قتل ہو سکتا ہے	
مسلمان کا مسلمان کو غلطی سے مار دینا	۳۷۲
مومن کا قتل عمد	۳۷۳
مومن کو کافر کہنا	
قتل بربنائے کفر نہیں بربنائے جنگ ہے	
دشمن قوم میں سے السلام علیکم کہنے والے کا حکم	۳۷۴
مال غنیمت کا خیال	
السلام علیکم اسلام کا نشان ہے	
جہاد کی فضیلت	
جہاد نہ کرنے والوں کا حکم	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
اولوالضرر سے مراد اور ان کا حکم	
ہجرت کی استطاعت نہ رکھنے والے	۳۷۵
ہجرت	
حالات موجودہ میں ہجرت	۳۷۶
قصر صلوٰۃ سے مراد	
سفر میں قصر ضروری ہے	
کیا قصر صرف حالت خوف میں ہے	
قصر دو طرح پر ہے قصر سفر اور قصر خوف	۳۷۷
حالت جنگ اور میدان جنگ کی نماز	
غزوۂ ذات الرقاع	
طعمہ بن ابیرق کا واقعہ	۳۷۸
آنحضرت کی فوق العادت امانت اور دیانت	
خطیئۃ اور اثم میں فرق	۳۸۰
نیک بات کا مشورہ	
اصلاح بین الناس۔	۳۸۱
اللہ تعالیٰ کا انسان سے معاملہ	
اجماع اُمت	
شیطان کی عبادت سے مراد	۳۸۲
کان چیرنے کی رسم	
خلق اللہ سے مراد دین اللہ	
واشمات	
شیطان کے وعدے	۳۸۳
ایمان بلا عمل محض امانی کی پیروی ہے	
مرد اور عورت میں نتائج اعمال کے لحاظ سے مساوات	
اللہ کی بندہ سے محبت	
اتباع ملت ابراہیم	۳۸۴
مسئلہ تعدد ازدواج پر مزید روشنی	
خاوند کا نشوز عورت پر	۳۸۵
عورتوں میں عدل سے مراد	۳۸۶
عدل وانصاف پر قیام کی نصیحت	۳۸۷
ہنسی اور ٹھٹھے کی مجالس	۳۸۸
منافقوں کی دورخی چال	۳۸۹
خدع کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف	
الحرب خدعۃ سے مراد	
نماز میں کسل اور راحت	۳۹۰
	پ ۶

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	عذاب کی غرض اصلاح ہے	۳۹۱
	ازالہ حیثیت عرفی کا قانون	
	لکھی لکھائی کتاب کے اتارنے کا سوال	۳۹۲
	حضرت مریم پر بہتان	
	یہودیوں میں طرز صلیب	۳۹۳
	مسیح کی نفی قتل وصلیب	
	انجیل کی شہادت کہ مسیح صلیب پر چڑھائے گئے مگر زندہ رہے	
	واقعات تاریخی اور اتمام حجت	
	مسیح کے ہمشکل کا قصہ	۳۹۴
	مسیح کے آسمان پر جانے کا ذکر قرآن میں نہیں	
	حضرت مسیح کے مقتول ہونے میں شک	
	شک آسمان پر جانے کو غلط ٹھہراتا ہے	
	رفع اور عدم مصلوبیت کا تعلق	۳۹۵
	قول ابوہریرہ متعلق نزول مسیح	
	حضرت عیسٰی اگر دوبارہ آئیں تو لوگ ان پر ایمان نہیں لائیں گے بلکہ آنحضرت صلعم پر لائیں گے	
	ان من اہل الکتاب میں مراد عیسائی ہیں	۳۹۶
	طیبات جو یہود پر حرام کی گئیں	
	وحی کی اقسام	۳۹۷
	آنحضرت صلعم کی وحی دیگر انبیاء کی طرح تھی	
	آنحضرت سب انبیاء کے کمالات کے جامع ہیں	
	دوسری قوموں میں نبی	
	حضرت موسیٰ پر نزول جبرائیل	
	صداقت قرآن پر اللہ تعالیٰ کی گواہی	۳۹۸
	عیسائی عقیدہ کہ مسیح ملعون ہوا	
	حضرت عیسےٰؑ کے روح منہ ہونے سے مراد	۳۹۹
	تثلیث	
	مسیح کا اقرار عبودیت	۴۰۰
	کلالہ کی وراثت	۴۰۱
	ایک لطیف اشارہ	
۵	سورۃ المائدہ ۴۰۲ تا ۴۵۳	
	نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق	۴۰۲

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
زمانہ نزول	
وفاداری کی تعلیم	۴۰۲
عہد اور عیسائیت	
دشمن کے حقوق	۴۰۵
قومیت کی بنیاد ایک دوسرے کی اعانت ہے	
ذبح کی غرض	۴۰۶
جاہلیت میں فال نکالنے کا دستور	
غیر اللہ کے نام پر جانور کا ذبح کرنا	
قبروں کے چڑھاوے	
فال نکالنے کا حکم	
استخارہ	
قرعہ اندازی	
اسلام کے کمال غلبہ کی پیشگوئیاں	۴۰۷
خشیت اللہ	
اسلام میں تکمیل دین	
تکمیل دین میں کیا امور داخل ہیں	۴۰۸
اتمام نعمت و کمال اطاعت	
شکار کا جواز	۴۰۹
اہل کتاب کا کھانا کھانا اور دعوت کرنا	
اہل کتاب کا ذبیحہ	
اہل کتاب سے مناکحت	
یہودیوں اور عیسائیوں میں غیروں سے نکاح	
ایمان کا انکار	۴۱۰
صفات بہیمی اور صفات ملکوتی	
تفصیل وضو کے ذکر میں حکمت	
موزوں پر مسح	۴۱۱
فطری عہد	
حقوق العباد کی تاکید	۴۱۲
آنحضرتؐ کا دشمنوں سے بچانا	
یہود کا عہد	
زمین کنعان اور بارہ اسرائیلی سردار	۴۱۳
عیسائیوں کو شریعت پر چلنے کا حکم	
عیسائیوں میں باہم بغض	
مسیح کی موت ماننے کے سوائے الوہیت	۴۱۴
مسیح کا ابطال نہیں ہو سکتا	
گزشتہ کے متعلق مضارع کا استعمال	۴۱۵
یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ابنیت	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
زمانہ فترت	۴۱۶
حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت صلعم کے درمیان نبی	
خالد بن سنان	
یہود کی عہد شکنی کی ایک مثال	
نبی اور بادشاہ بنانے سے مراد	
اصحاب موسیٰ اور اصحاب محمد صلعم	۴۱۷
ہابیل اور قابیل کے قصے کی غرض	۴۱۸
آدم کے دو بیٹے	
دو مسلمانوں کا جنگ کرنا	۴۱۹
اثمی سے مراد میرے خلاف گناہ ہے	
ذنبك سے مراد	
کسی کے ارادہ قتل پر اس کا قتل جائز نہیں	
جانوروں سے سبق	۴۲۰
فساد یا ڈاکہ کی سزا	۴۲۱
عرنیہ کی سخت سزا کی وجوہات	
ڈاکہ کی چار قسم کی سزا	
توبہ پر معافیٔ سزا	۴۲۲
حصول قرب الٰہی	
دوسروں کو وسیلہ بنانا	
دوزخ سے نکلنا	۴۲۳
قطع ید سے مراد	
ہاتھ کاٹنا چور کی انتہائی سزا۔ عادی چور کی سزا۔	
سزا بلحاظ حالات	۴۲۴
منافق یہودی	
یہودیوں کے فیصلے توریت کے مطابق	
یایها الرسول سے خطاب	۴۲۵
یہودیوں کا توریت کے فیصلوں کو قبول نہ کرنا	
توریت میں ہدایت و نور	
حفاظت توریت	۴۲۶
انبیائے بنی اسرائیل کا مطابق توریت فیصلہ کرنا نہیں الگ کتب ملنے کے منافی نہیں	
ما انزل اللہ پر ایمان	۴۲۷
زخموں میں قصاص	
مسیح کا پہلے انبیاء کے نقش قدم پر آنا	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
انجیل میں ہدایت و نور سے اشارہ	
کفر دون کفر	۴۲۸
قرآن کتب سابقہ کا محافظ ہے	
اختلافات مذہبی کا فیصلہ	
ہر نبی صاحب شریعت ہے	۴۲۹
شرائع مختلفہ۔ حکمت اختلافات مذہبی	
اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی	۴۳۰
اہل کتاب سے موالات	
غلبہ کفر سے مرعوب نہ ہونا چاہیے	۴۳۱
ابتدائی تاریخ اسلام میں واقعات ارتداد	۴۳۲
ابوبکرؓ کے صدق پر شہادت قرآنی	
موجودہ فتنہ ارتداد اور مجدد صد چہاردہم	
مومنوں کی موالات کس سے ہے	
حضرت علی اور انگوٹھی دینے کا واقعہ	
کن اہل کتاب سے موالات جائز ہے	۴۳۳
اذان	
اہل کتاب کا مسلمانوں سے سلوک	
مسیح موعود اور قتل خنزیر	۴۳۴
یہود و نصاریٰ میں عداوت	۴۳۵
عصمت انبیاء سے مراد	۴۳۶
تبلیغ حق اور عصمت کا تعلق	
اہل تشیع کا خیال	
علم دین سب کا سب امت کو پہنچا دیا گیا	۴۳۷
وعدہ حفاظت کی ضرورت کیوں ہوئی	
عیسائیوں کو ان کی اپنی کتب مقدسہ کی شہادت پر الزام	
مسیح کی خدائی اور تثلیث	۴۳۸
مسیح کے کھانا کھانے کا ذکر	۴۳۹
الوہیت مسیح میں پہلے بت پرستوں کی نقل	
بنی اسرائیل پر داؤدؑ اور عیسیٰ کے بعد عذاب آنا	
ترک امر بالمعروف	۴۴۰
النبی سے مراد	
عیسائیوں کے اسلام کے زیادہ قریب ہونے کی وجہ	۴۴۱
موجودہ عیسائی اور اسلام	

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	نجاشی اور مسلمان مہاجر	پ ۷
	اسلام اور رہبانیت	۴۴۲
	مسکین کے کھانے کا اندازہ	
	قسم کا کفارہ	۴۴۳
	شراب اور بت پرستی	
	عیسائیوں کا حرام کو حلال بنا لینا	
	تقویٰ کے تین مراتب	۴۴۴
	عیسائیت کے ذکر میں حرمت کعبہ کا ذکر	
	حالت احرام میں شکار	۴۴۵
	خانہ کعبہ کا دنیا کیلئے قیام ہونا	
	حج بیت اللہ کا ہمیشہ قایم رہنا	۴۴۶
	کعبہ کے متعلق پیشگوئی	
	چھوٹے چھوٹے سوالات کی ممانعت	
	مشرکانہ رسوم سے بچنے کی ضرورت	۴۴۷
	ضال قوم کی کثرت کے وقت علاج	
	غیر مسلم کی گواہی	۴۴۸
	رسولوں سے ان کی قبولیت کا سوال اور اس سے مراد	۴۴۹
	حضرت مسیح سے دشمنوں کو روکنے کے معنی	۴۵۰
	انبیاء کو ساحر کہنے کی وجہ	
	غیر نبی کی طرف وحی	
	حواریوں کی درخواست مائدہ	۴۵۱
	حواریوں کی حالت ظاہری	
	حواریوں کی حالت روحانی	
	حضرت عیسیٰ کی دعائے مائدہ	
	آنحضرتؐ کو امت کی روحانیت کا فکر	
	وقتی تعلیم اور معجزات مسیح	
	حضرت عیسیٰ سے عالم برزخ میں سوال	۴۵۲
	مریم کی الوہیت	
	حضرت عیسیٰ کا اقرار توحید اور تعلیم	
	وفات مسیح پر دلیل	۴۵۳
	حضرت عیسےٰ کی دعائے مغفرت	
	امت سے مراد	
	صادقوں سے صدق کے سوال کا مطلب	
۶	سورۃ الانعام ۴۵۴ تا ۵۰۰	
	نام	۴۵۴

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
مشرکانہ رسوم کی بیخکنی اسلام کا اصل کام تھا	
گائے کی مشرکانہ عظمت	
خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ تاریخ نزول	۴۵۵
ثنویہ کا شرک	
بدی کیا ہے	
خالق شر الگ نہیں ہو سکتا	
لکھی ہوئی کتاب کیوں نہیں اتری	۴۵۷
فرشتہ کیوں رسول بن کر نہیں آیا	
اللہ کی رحمت کی وسعت	۴۵۸
فعلی شہادت	۴۵۹
فطری روشنی اور اس پر مواخذہ	
شرک افترا علی اللہ ہے	
شرک نہ کرنے کا عذر	۴۶۰
دلوں پر پردوں کا ڈالنا	۴۶۱
افعال بد کے بد نتائج اور ان کا اخفاء	
ظہور آخرت پر یقین کا فائدہ	
لقاء اللہ کا رتبہ	۴۶۲
لہو و لعب میں فرق	
حیوٰۃ الدنیا سے مراد	
آنحضرتؐ کی صداقت کا اعتراف	
لا مبدل لکلمات اللہ کا مفہوم	۴۶۳
بعث سے مراد بعث روحانی ہے	
آیۃ سے مراد عذاب استیصال ہے	۴۶۴
دابہ اور طیر کے انسانوں جیسی امت ہونے سے مراد	
حیوانات کا حشر	
عذاب اور ساعۃ کا مقابلہ	۴۶۵
دعائے اضطرار	
عذاب دینے کی غرض	
بدعملی کو اچھا کر کے دکھانا شیطان کا کام ہے	
دابر قوم کے کاٹ دینے سے مراد	
قوم کب ہلاک ہوتی ہے	
نیکی کی خاطر نیکی	۴۶۶
آنحضرتؐ کی عصمت	
کمال عمل	۴۶۷
مسلمان غربا کے متعلق کفار قریش کا مطالبہ	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
چھوٹے کس طرح بڑے بن جاتے ہیں	
آنحضرتؐ کا بت پرستی سے بچا رہنا	۴۶۸
وسعت رحمت الٰہی	
حکم خدا کے ماتحت حکم	
دلیل قرآنی کا دوہرا کام	۴۶۹
قوموں کا عروج و زوال	
توفی بمعنی نیند	
کونسی روح قبض ہوتی ہے	
حفاظت اعمال کا قانون	۴۷۰
توفیٰ میں جسم نہیں لیا جا سکتا	
فوق اور تحت کے عذاب سے مراد	۴۷۱
اعدائے اسلام میں باہم جنگ کا عذاب	
امت محمدیہ کی ہلاکت باہمی فساد سے	
آنحضرتؐ کے لیے سرخ و سفید خزانوں کا وعدہ	
مجلس استہزا میں شمولیت سے روکنے کی وجہ غیرت دینی ہے	
صحبت کا بد اثر	۴۷۲
ہمصحبتوں کو نصیحت کی ضرورت	
غیر اللہ کے اتباع کا نتیجہ	۴۷۳
کن فیکون سے مراد	
نفخ فی الصور	
آزر کون تھا	۴۷۴
انبیاء کیلئے نور عقل کی ہدایت	
ستاروں وغیرہ کا قانون میں جکڑے ہوئے ہونا اور معبود نہ ہونا	
قوم ابراہیم کا بڑا دیوتا سورج تھا	
بعض انبیاء کے ناموں کو اکٹھا کرنے کی وجہ اور غیر تاریخی ترتیب کی حکمت	۴۷۶
کسی نبی کی فضیلت کا ذکر الزام دور کرنے کے لیے	
منصب نبوت کی ضروری شرائط	
آنحضرت صلعم کو تمام انبیاء کے کمالات کا وارث بنایا گیا	۴۷۷
یہود کا انکار نبوت	۴۷۸
مکی سورتوں میں اہل کتاب سے خطاب	
قرآن کی فضیلت دیگر کتب پر	

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	مخالفین کے مختلف اقسام	
	عبداللہ بن سعد بن ابی سرح	
	حق کی ابتدائی حالت اور تدریجی کامیابی	۴۷۹
	دو قسم کا شرک	۴۸۱
	اہرمن	
	خدا کا بیٹا ہونے کے عقیدہ کی تردید	
	اللہ تعالیٰ کی رویت	۴۸۲
	مشیت الٰہی متعلق شرک	۴۸۳
	دوسرے معبودوں کو گالیاں نہ دینے کی تعلیم	
	تزیین اعمال	پٹ
	قرآن شریف معجزات کا انکار نہیں کرتا	
	اللہ کا دلوں کو پھیرنا	۴۸۴
	دلائل اور معجزات	
	معجزات کے باوجود ایمان نہ لانے والے	
	کلام موتیٰ سے مراد	
	مذہبی اختلافات میں کوئی شخص حکم نہیں بنایا جاسکتا	۴۸۵
	کتاب مفصل سے مراد	
	دعاوی اور دلائل کا قرآن میں ہونا	۴۸۶
	دنیا کی آخری مذہبی کتاب	
	مشرکانہ رسوم	
	ظاہری اور باطنی گناہ	
	آنحضرتؐ کا مردوں کو زندہ کرنا	۴۸۷
	رسالت موہبت ہے	
	ضیق صدر	۴۸۸
	کفر سے سینہ تنگ ہوتا ہے	
	جن کا استعمال انسان پر	۴۸۹
	جن سے مراد خاص انسان ہونے پر دلائل	
	خلود جہنم	
	کیا جنوں میں رسول آئے ؟	
	ہلاکت سے پہلے تنبیہ ہوتی ہے	۴۹۰
	آنحضرتؐ نے مشرکانہ رسوم کا استیصال کیا	۴۹۱
	قتل اولاد کی رسم۔	
	اولاد کو جاہل رکھنا بھی قتل کرنا ہے	
	قتل اولاد سے مراد	۴۹۲
	لوشاء اللہ ما اشرکنا کی تفسیر	۴۹۴
	توحید کا عملی رنگ	۴۹۵
	حفاظت جان و مال کی ضرورت	۴۹۶
	توریت کن معنوں میں اتمام نعمت ہے	
	محمد رسول اللہ توحید کی عملی تعلیم ہیں	۴۹۷

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	نیکی اور بدی کے بدلہ کا قانون	۴۹۸
	آنحضرتؐ کے اول المسلمین ہونے کی دلیل	۴۹۹
	ہر مسلم کا نصب العین	
	ہر انسان کی اپنی ذمہ داری	
	کفارہ	۵۰۰
۷	سورۃ الاعراف۔ ۵۰۱ تا ۵۵۱	
	نام۔ خلاصہ مضمون تعلق	۵۰۱
	زمانہ نزول	
	قرآن کا نا ذکر رکھنے کی وجہ	۵۰۲
	نزول کتاب سے مصلح کو شرح صدر کا ملنا	
	نزول کتاب کی غرض	
	وزن اعمال سے مراد	۵۰۳
	آدم اور ابن آدم کا معاملہ ایک ہے	
	شیطان کو سجدہ کا حکم	۵۰۴
	جنوں کا آگ سے اور انسان کا مٹی سے پیدا ہونا	
	شیطان کے ہبوط سے مراد	
	یوم یبعثون سے مراد	
	شیطان کے مہلت مانگنے سے مراد	
	ذکر آدم میں بنی آدم کا ذکر	
	شیطان کو مہلت کا ملنا	۵۰۵
	شیطان کے ہر طرف سے آنے سے مراد	
	شیطان کا مردود ہونا	۵۰۶
	شیطان کا آدم اور حوا کو اُن کی سوآت دکھانے سے مراد	
	شیطان کا بدی کو سجانا	
	پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے سے مراد	۵۰۷
	جسمانی افعال میں روحانی امور کی طرف اشارہ	
	زمینی زندگی کا اختتام صرف موت سے ہے	
	لباس اور اسکے اتار دینے سے مراد	۵۰۸
	آدم اور ابن آدم	
	جنوں یا شیاطین کا دیکھنا	
	لفظ شیطان کا استعمال بطور اسم جنس	
	گمراہی کا فتویٰ	۵۰۹
	عرب کا عبادت کے وقت کپڑے اُتار دینا	
	نماز کے وقت زینت سے مراد	
	کھانے پینے میں اعتدال کی تعلیم	
	اچھی چیزوں کا استعمال خلاف شریعت نہیں	۵۱۰

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	فاحشہ ۔ اثم ۔ بغی	
	رسولوں کے بھیجنے کا عام قانون اور ختم نبوت	۵۱۱
	رسول کیساتھ پیغام کا آنا ضروری ہے	
	دو چند عذاب سے مراد	۵۱۲
	آسمان کے دروازے نہ کھولنے سے مراد	
	دوسری زندگی کے حواس اور کیفیات	۵۱۳
	اصحاب اعراف سے مراد	۵۱۴
	اہل نار کی رزق سے محرومی کی وجہ	۵۱۵
	آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کرنے سے مراد	
	استویٰ علی العرش سے مراد	۵۱۶
	کرسی اور عرش کے متعلق غلط فہمی	
	مصائب میں دعا	۵۱۷
	تضرع کی دعا	
	روحانی بارش کا اثر	
	قبولیت حق میں اختلاف استعداد	۵۱۸
	انبیاء کے ذکر کی غرض	
	حضرت نوح	
	عصمت انبیاء	
	طوفان نوح	۵۱۹
	قوم عاد	۵۲۰
	رسولوں کا امین ہونا اور عصمت انبیاء	
	قوم ثمود	۵۲۱
	ناقۃ اللہ	
	صالح کی اونٹنی	
	حضرت لوط	۵۲۲
	حضرت لوط اور بائبل میں تحریف	
	حضرت شعیب	۵۲۳
	تلوار سے مسلمان کرنے کے خلاف دلیل	۵۲۴ ت ۹
	مسلمانوں میں ارتداد نہ تھا	
	انبیاء میں غمخواری	۵۲۵
	عذاب بطور سزا نہیں علاج کے طور پر ہے	
	مہر لگانے سے مراد ۰	۵۲۶
	عہد فطرت	
	حضرت موسیٰ اور اُن کی بعثت کی اصل غرض	۵۲۷
	حضرت موسیٰ کے دو معجزے	
	حضرت موسیٰ کے معجزات کا پہلا ظہور کن حالات میں ہوا	
	الٰہ معجزات میں کیا سمجھایا	۵۲۸
	انبیاء کو ساحر کہنے کی وجہ	

نمبر صفحہ	خلاصہ مضامین
	حضرت موسیٰ کا ساحروں سے مقابلہ اور ان کی رسیاں اور سونٹیاں
۵۲۹	ساحروں کی سونٹیاں اور عصائے موسیٰ
	ساحروں کا ایمان لانا اور بائبل
۵۳۰	بنی اسرائیل کے ذکر میں مسلمانوں کی مشکلات کا علاج
۵۳۱	بادشاہت کے حصول کا طریق
	مسلمانوں کے مصائب اور مجدد صد چہارم
۵۳۲	حضرت موسیٰ کے نو نشان
	الارض سے مراد
۵۳۳	اس امت کی کامیابی تلوار سے نہیں
	بنی اسرائیل پر مصریوں کا اثر
	مسلمانوں پر ہندؤں کا اثر
	بت پرستی کے نابود ہونے کی پیشگوئی
	شرک کے خلاف دلیل
۵۳۴	عبادت کی چالیس خاص راتیں
	ہارون کی خلافت سے مراد
	موسیٰ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا سوال
	الٰہی تجلیات
	اللہ تعالیٰ کی کامل تجلی
۵۳۵	اللہ تعالیٰ کو دیکھنا
	کلام الٰہی اور رسالت
	اللہ تعالیٰ کے توریت کے لکھنے سے مراد
	توریت میں ہر چیز کی تفصیل سے مراد
۵۳۶	اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا منقطع نہیں ہو سکتا
	قرآن کا ہارون کے بچھڑا بنانے سے انکار
۵۳۷	اور بائبل کی اصلاح
	حضرت موسیٰ کے تختیاں توڑنے کے معاملہ میں بائبل کی اصلاح
	حضرت موسیٰ کی میقات طور پر ایک ہی تھی
۵۳۸	حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کو طور پر غشی کا آنا
	وسعت رحمت الٰہی
۵۳۹	توریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی
	انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی
	رسول موعود کی صفات
	ساری نسل انسان کا نبی
	سبت کے دن مچھلی کا شکار
۵۴۱	یہودیوں کا نقشہ مکی اور مدنی سورتوں میں ایک سے
	یہود کے بندر بننے سے مراد

نمبر صفحہ	خلاصہ مضامین
	یہودیوں کے متعلق پیشگوئی
۵۴۲	گناہ کی مغفرت کا اصول
	میثاق فطرت
۵۴۳	میثاق فطرت کب اور کس طرح لیا گیا
	میثاق فطرت سے مراد
	اس اعتراض کا جواب کہ تقلید آبدیاں کرنیوالے قابل الزام نہیں
۵۴۴	بلعم
	کتے کی مثال
	اطمینان قلب کس طرح ملتا ہے
۵۴۵	جہنم کیلئے انسانوں کا پیدا کرنا
	اسماء الٰہی سے حصول کمال
	ہلاکت میں تدریج
۵۴۶	رسول کو جنون نہیں ہوتا
۵۴۷	قریش کی ساعت وسطیٰ
	اصول اسلام کی سادگی
	آدم کی طرف شرک کی نسبت غلط ہے
۵۴۸	بتوں کا عبد ہونا
	بے نظیر تحدی
	اسلام کی کامیابی پر ایمان کی ضرورت
۵۴۹	بت پرستی کا انجام اور آخر مغلوب ہونا
	دشمنوں کو معافی
	انسان شیطان
۵۵۰	غضب کا علاج
	شیاطین کے بھائی
	فاتحہ خلف امام کا مسئلہ
۵۵۱	دل میں ذکر
	دون الجہر سے مراد
	سجدۂ تلاوت
	دعائے سجدۂ تلاوت
۸	سورۃ الانفال - ۵۵۲ تا ۵۷۴
۵۵۲	نام - خلاصہ مضمون
	تعلق - زمانہ نزول
	مال غنیمت اور انفال میں فرق
۵۵۳	فیٔ اور نفل میں فرق
	ایمان کا بڑھنا اور گھٹنا
	ایمان کی شاخیں
	مسلمانوں کو عاجزی سکھا کر جنگ کیلئے تیار کرنا

نمبر صفحہ	خلاصہ مضامین
	جنگ بدر کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کن حالات میں نکلے
۵۵۴	ارباب سیر کی غلطی
	اسباب کی وجوہات کہ آنحضرتؐ قافلہ پر حملہ کیلئے نہیں بلکہ لشکر کے مقابلہ کیلئے نکلے تھے۔
	مزید دلائل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دفاع کیلئے نکلے
	دو گروہوں کا ذکر اور خدائی ارادہ
۵۵۵	فرشتوں کا لشکر اسلامی لشکر کے آگے چلنا
	ایک ہزار ملائکہ
	ملائکہ سے نصرت کیوں کر ہوئی
۵۵۶	ملائکہ نے بدر میں جنگ نہیں کی
	میدان جنگ میں نیند کا آنا
۵۵۷	جنگ بدر میں بارش کا اترنا
	عذاب دنیا عذاب آخرت کیلئے بطور پیش خیمہ ہے
۵۵۸	جنگ میں پیٹھ دکھانے کی ممانعت
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رمی اور لشکر کفار کی ہزیمت
	جنگوں کے متعلق پیشگوئی
	کفار کی دعائے مباہلہ بدر سے پہلے
	کفار کی جنگوں میں ناکامی کی پیشگوئی
۵۵۹	مسلمانوں کی حقیقی فلاح کی راہ
	عقل اور مذہب
	حالت عناد
	مسلمانوں کی زندگی
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مردے زندہ کرنا
۵۶۰	اللہ کے انسان اور اسکے قلب میں حائل ہونے مراد
	مسلمانوں پر عظیم الشان فتنے
	ایک خوشخبری
	اللہ اور رسول کی خیانت سے مراد اور قومی ترقی کا راز
	اغراض قومی اور دینی کی اہمیت کو نہ سمجھنے
۵۶۱	کی سزا
	اندرونی فرقان
	دار الندوہ میں آنحضرتؐ کے خلاف مشورہ
	خیر الماکرین
۵۶۲	کفار کا عذاب مانگنا
	کفار پر تاخیر عذاب کی وجہ

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	مسلمانوں کے خانہ کعبہ کے متولی ہونیکی پیشگوئی	
	مشرکین عرب کی عبادت کا رنگ	
	ابن حضرمی کا قتل	۵۶۳
	جنگ بدر کے بعد اور لڑائیوں اور ان میں کفار	
	کی مغلوبیت کی پیشگوئی	
	یکون الدین کلہ للہ سے مراد	۵۶۴
	تقسیم مال غنیمت	
	آنحضرتؐ کا گذارہ	
	ذوالقربیٰ سے مراد	
	جنگ بدر کیوں فرقان کہلائی	۵۶۵
	رئیس بنی کنانہ شیطان کی صورت میں	۵۶۶
	کفار کی عہد شکنی	
	قوم سے نعمت کب چھنتی ہے	۵۶۷
	کفر اسلام پر غالب نہیں آسکتا	۵۶۸ تا
	اسلام کے جن دشمن	۵۶۹
	دشمن کے ملکی اور مذہبی مقابلہ کے لئے تیاری	
	کا حکم	
	قلمی جہاد میں مسلمانوں کی غفلت	
	یورپ میں تبلیغ کا خاص فائدہ	
	اسلام صلح کو مقدم کرتا ہے	
	مسلمانوں کی باہمی محبت	
	اسلام کے دشمنوں میں محبت پیدا کرنیکی طاقت	۵۷۰
	سامانوں کے ساتھ توکل	
	مسلمانوں کو جنگ پر تحریض	
	مسلمانوں کا دو چند پر غالب آنا اور اسکی وجہ	
	فقاہت کا قرار دینا	
	مسلمانوں کا دو چند تعداد پر غالب آنا اور دونوں	
	حالتوں میں فرق	۵۷۱
	قیدیان بدر کے بارہ میں مشورہ	
	بدر کے قیدیوں کا فدیہ مطابق حکم قرانی تھا	
	قیدیوں کے فدیہ کی مقدار	۵۷۲
	ایسے مسلمانوں سے تعلقات ولایت جو کفر	
	قوموں میں ملے ہوئے ہیں	۵۷۳
	مسلمانوں پر مسلمانوں کی دینی مدد فرض ہے	
	تعلقات رشتہ داری	۵۷۴
	ابتدائی مسلمانوں کے تعلقات اخوت	
9	سورۃ التوبۃ ۵۷۵ تا ۶۱۶	
	البراءۃ یا التوبۃ نام کی وجہ خلاصہ مضمون	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
تعلق۔ زمانہ نزول	
مشرکوں سے علیحدگی کے اعلان کی وجہ	۵۷۶
وہ امور جن کا اعلان کیا گیا	
عہدوں کے واپس کرنے کی وجہ	
یوم الحج الاکبر سے مراد	
عہد جو مستثنیٰ کئے گئے	۵۷۷
تمام مشرکین عالم سے علیحدگی کا اعلان نہیں ہوا	
سزا جو بار بار کی عہد شکنی پر تجویز کی گئی	
اس سزا کی معافی کی صورتیں	۵۷۸
پناہ مانگنے والوں کو امن دینا اور بصورت انکار	
اسلام اپنی قوم میں واپس کر دینا	
اسلام میں عہد کی عزت	۵۷۹
کفار کا مسلمانوں سے سلوک	
مسیلمہ وغیرہ اور انکار زکوۃ والوں سے	
جنگ کی وجہ	۵۸۰
اسلام کس قسم کی قربانیاں مسلمانوں سے چاہتا ہے	
مسلمانوں کی زندگی کا اصل الاصول	۵۸۲
دین کو دنیا پر مقدم کرنا	
جنگ حنین	
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت	
ملائکہ ان آنکھوں سے نہیں دیکھے جا سکتے	۵۸۳
مسجد حرام میں غیر مسلم کو داخل ہونے کی ممانعت	
مکہ کیلئے فقر کی بجوئی کی بشارت	
جزیہ کیا ہے	
اہل کتاب کے ساتھ جنگ کے احکام	۵۸۴
نبی کریمؐ کا عمل اہل کتاب سے جنگ کے بارہ میں	
حضرت عزیرؑ	
عقیدہ ابنیت مسیح پہلی کافر قوموں کی نقل ہے	۵۸۵
ارباباً من دون اللہ اور آجکل کی گدیاں	
نور اللہ سے مراد	
دین اسلام کی کل ادیان پر غلبہ کی پیشگوئی	
عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ	۵۸۶
اظہار دین اسلام اور مسیح موعود	
علماء اور مشائخ کی حالت	
مال جمع کرنا اور ابوذرؓ	
پیشانی وغیرہ کا داغا جانا	۵۸۷
سال کے بارہ ماہ اور چار حرمت کے مہینے	
مسلمانوں کو دشمن کے مقابلہ میں ایک ہونیکی نصیحت	

خلاصہ مضامین	
نسئی کی غرض	
جنگ تبوک	۵۸۸
ہجرت کے واقعات اور حضرت ابوبکرؓ کی	
رفاقت	
فضیلت ابوبکرؓ	
عفا اللہ عنک	۵۹۰
مسلمانوں کے لیے دو بھلائیاں	۵۹۲
نماز میں سستی	
منافقوں پر مال و اولاد کا عذاب	
خرچ زکوۃ کی مدات	۵۹۳
فقیر اور مسکین میں فرق	۵۹۴
عاملین۔ مولفۃ القلوب	
غلاموں کا آزاد کرنا۔ قرضدار	
جہاد قلمی یا سیفی کرنے والے۔ مسافر	
فریضہ زکوۃ سے مسلمانوں کی غفلت	
تقسیم دولت کا مسئلہ	
بیت المال کی ضرورت	
اشاعت اسلام اور تعلیم پر زکوۃ کا خرچ	
یتامیٰ اور زکوۃ	۵۹۵
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن ظن اور حیا	
منافقوں کی آخری علیحدگی	۵۹۶
بہشت کی سب سے بڑی نعمت	۵۹۷
جہاد تین طرح پر ہے	۵۹۸
جہاد لسانی یا قلمی	
منافقوں سے جہاد	
نبی کریمؐ کی منافقوں سے سختی سے مراد	
منافقت کا نتیجہ ناکامی اور شقیوں پر اتمام حجت	۵۹۹
ثعلبہ بن حاطب اور منافقوں سے زکوۃ کا نہ لیا جانا	
مہر بطور سزا ہے	
منافقوں کیلئے استغفار اور عبداللہ بن ابی کا جنازہ	۶۰۰
منافقوں سے انقطاع تعلق جسمانی	۶۰۱
انقطاع تعلقات روحانی	
قبر پر دعا	
وحی کا رائے کے خلاف ہونا	
بادیہ نشین عرب	۶۰۲
الدین النصیحۃ کا مفہوم	
معذور لوگوں کا گروہ	
سواری کا نہ ہونا بھی عذر ہے	۶۰۳

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
صحابہ کا جذبہ محبت اور مسلمانوں کے لیے سبق	
منافقوں سے اعراض	پ۱۱
قرآن نے کن لوگوں کی اصلاح کی۔	۶۰۴
انفاق کو چٹی سمجھنے والے	
اعدائے اسلام آخر تک اسلام کی تباہی کے منتظر تھے	
قرب الٰہی کیا ہے	
قرآن کریم کا پیدا کردہ انقلاب	
حصول قرب الٰہی کیلئے انفاق مال	
آنحضرتؐ کی دعا اور قوت قدسی	۶۰۵
پیر اوران کی نذریں	
رضائے الٰہی	
کامل مومنین کا گروہ	
سابقون اولون سے مراد	
حصول رضائے الٰہی کا مقام	۶۰۶
اهل الجنة مُرْد کی تشریح	
منافقین کی سزا	
دو دفعہ عذاب سے مراد	
اقرار گناہ	
منافقوں کی توبہ	
تطہیر اور تزکیہ میں فرق	۶۰۷
توبہ کرنیوالے منافقوں سے زکوۃ کا لینا اور مسلمانوں کیلئے سبق	
ثبوت اخلاق	
منافقین سے تشابہ	
مسجد ضرار	۶۰۸
ابو عامر	
مسجد ضرار بنانے کی غرض	
مسجد قبا	
تطہیر سے مراد	
قطع قلوب	۶۰۹
مسلمانوں کا عہد	
صحابہؓ نے اس عہد کو کس طرح پورا کیا ہی	
عہد سب انبیاء لیتے تھے	۶۱۰
حضرت مسیحؑ کی تعلیم مال و جان دینے کی	
مومنوں کی صفات	
مشرکوں کے لیے ممانعت استغفار	
ابو طالب	

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ	
	ممانعت استغفار میں شرائط	۶۱۱
	غیر مسلم کا جنازہ	
	ابراہیم اور آزر	
	ساعة العسرة	
	مسلمانوں کی جان نثاری کا کمال	۶۱۲
	کعب بن مالک۔ مرارة۔ ہلال کعب اور	
	ملک غسان	۶۱۳
	صحابہ کی سچائی سے محبت	
	صحابہ کی جان نثاری اور اطاعت کا کمال	
	معیت صادقین کا حکم	
	صادقین سے مراد رتبا زخادمان دین ہیں جیسے مجدد	
	اعدائے دین کا مقابلہ عبادت میں داخل ہے	۶۱۴
	سب سے بڑا مجاہدہ دینی	
	مجاہدہ علمی	
	قطع الطريق سے مراد	
	ہر ایک نفقہ اور کام پر اجر	
	جنگوں کا خاتمہ	۶۱۵
	صداقت اسلام کا ایک نشان	
	سب اقوام میں علم پھیلانے کی تجویز	
	نشر و توسیع علم کی تجویز	
	قریب کے کفار سے جنگ کا منشاء	
	منافقوں کو نصیحت کہ خدا تعالیٰ کیطرف رجوع کریں	
	قلب رسول کی اصلی حقیقت	۶۱۶
	گناہ اور ہلاکت سے دنیا کو بچانے کی تڑپ	
	رب العرش	
	رسول اللہ کو تسلی کہ ایک خدا پر بھروسہ کرو	
۱۰	سورۃ یونس ۶۱۷ تا ۶۳۴	
	نام۔ خلاصہ مضمون	۶۱۷
	تعلق اور ترتیب	
	الٓر سورتوں کا زمانہ نزول	
	قرآن میں حکمت	
	انبیاء کو ساحر کہنے کی وجہ	۶۱۸
	دوسری پیدائش	
	ضوء اور نور میں فرق	۶۱۹
	حدیث نار اهل الشرك	
	کھانا پینا مقصد زندگی نہیں	
	نجات کیلئے ایمان صحیح کی ضرورت	

خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
بہشت کا نقشہ	۶۲۰
برائی مانگنے کی ممانعت	
مصیبت کیوں آتی ہے	
کفار کا مطالبہ تعلیم قرآن انکے منشا کے مطابق ہو	۶۲۱
آنحضرتؐ کا اتباع وحی الٰہی کرنا	
آنحضرتؐ کی صداقت و امانت کا اعتراف	
پیشگوئی کہ مفتری اور مکذب فلاح نہیں پا سکتے	۶۲۲
بتوں کی شفاعت کا عقیدہ اور بت پرستی	
مخالفت کا قانون مستمرہ	
عذاب کب آئے گا	۶۲۳
دکھوں میں سبق	
آرام میں انسان خدا کو بھول جاتا ہے	۶۲۴
سیاہی چھانے کا مفہوم	۶۲۵
تین قسم کے معبود	
سمع و بصر کا مالک	۶۲۶
مشرکین کا اقرار توحید	
عہد فطرت اور عہد شریعت	
بدء خلق اور عود	۶۲۷
معبودان غیر اللہ کا عجز	
قرآن میں ظنی باتیں نہیں	
دو دلیلیں کہ قرآن افترا نہیں ہو سکتا	
علوم قرآنی اور تکذیب کرنے والوں کا غور نہ کرنا	۶۲۸
اعمال کی ذمہ داری	
بصیرت سے کام نہ لینے والے	۶۲۹
آرام اور مصیبت کا مقابلہ	
آنحضرتؐ کے مخالفین پر قیامت تک سزا کا اترنا	
ہر قوم کے لیے رسول	
حق کی قبولیت دنیوی نفع نقصان کے خیال سے پاک ہو	۶۳۰
قوموں کی زندگی و موت	
تعیش اور غفلت سے عذاب آتا ہے	
عذاب پر مذمت	
صدر اور قلب میں فرق	۶۳۱
قرآن سے کیا ملتا ہے	
اخلاق اور رمل	
کوئی اچھا عمل ضائع نہیں ہوتا	۶۳۲
قرآن کس مقام بلند پر پہنچاتا ہے	
اولیاء اللہ کو مبشرات دی جاتی ہیں	۶۳۳

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	حدیث لم یبق من النبوۃ الا المبشرات	
	مبشرات چالیسواں حصہ جزو نبوت ہے	
	انقطاع نبوت سے انقطاع مقامات عالیہ نہیں ہوا	
	شرک، اتخاذ ولد	۶۳۴
	اعدائے رسول کو چیلنج	۶۳۵
	موسیٰ ؑ کا غلبہ بذریعہ کلمات	۶۳۶
	موسیٰ ؑ پر پہلے ایمان لانے والے	۶۳۷
	بنی اسرائیل کے بڑے لوگ اور قوم کی ہچکچاہٹ	
	بنی اسرائیل کی نجات کا سامان	
	حکومت اصل نصب العین نہیں	
	ہارون کو وحی	
	حضرت موسیٰ کی دعا فرعون کے تباہی کیلئے	۶۳۸
	فرعون کا رجوع موت کے وقت	
	فرعون کی لاش اور قرآن کریم کا معجزہ	
	بنی اسرائیل پر نعمت اور ان کی مخالفت رسول	۶۳۹
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کے متعلق کبھی	
	شک نہ تھا نہ ہو سکتا تھا	
	عبداللہ بن سلام	
	یونس	۶۴۰
	اہل نینوی اور عذاب	
	انذاری پیشگوئیوں کا ٹل جانا	۶۴۱
	اعدائے دین کے ظلم سے نجات	
۱۱	سورۃ ھود - ۶۴۳ تا ۶۶۱	
	نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول	۶۴۳
	قرآن میں اصول و فروع کا ضروری عمل	
	اللہ تعالیٰ کا رزق پہنچانا کس طرح پر ہے	۱۲/۶۴۴
	کان عرشہ علی الماء سے مراد	۶۴۵
	جسمانی دکھ اور سکھ	
	ضیق صدر	۶۴۶
	دنیا داروں کے مطالبات	
	قرآن افترائے انسان نہیں	
	اس کے مضامین علمی	
	دنیا طلبی کے اعمال	۶۴۷
	حبط اعمال	
	بینۃ قرآن کریم ہے شاھد نبی ہے	
	رسول کا اسوۃ	
	موسیٰ کی کتاب	
	ہر نبی کی وحی بینۃ ہے	

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	دنیا طلب اور حق طلب کا مقابلہ	۶۴۸
	نبی کے بشر ہونے پر اعتراض	۶۴۹
	انبیاء کے پیرووں کی قربت	
	محنت شرف انسانیت ہے	
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور محنت	
	فضیلت کا معیار	
	اللہ تعالیٰ کا علماء میں ہونا	
	دنیا پرست اور دلائل حقہ	
	انبیا کی بے نفسی	۶۵۰
	دعوت انبیاء کا دنیوی مال و جاہ کے لالچ	
	سے برتر ہونا	
	مومنوں کی کفار پر ہنسی سے مراد	۶۵۲
	طوفان نوح	
	فار التنور سے مراد	
	حضرت نوح نے کشتی میں کیا لیا	
	طوفان نوح کل روئے زمین پر نہ تھا	۶۵۳
	عمل غیر صالح سے مراد	۶۵۴
	نوح کے بیٹے کا اہل میں سے نہ ہونا	
	کیسی دعا نہ کرنی چاہیے	
	نوح کا ذکر انباء الغیب کس معنی میں ہے	۶۵۵
	مخلوق خدا کی خدمت فطرت انبیاء ہے	۶۵۷
	ابراہیم کو بشارت اور قوم لوط کے عذاب کا تعلق	
	یہ رسول فرشتے تھے یا انسان	
	خلق مہمان نوازی	
	صلحاء کا سلام	۶۵۹
	حضرت لوط کی بیٹیاں	۶۶۱
	بائبل کا گندہ قصہ لوط کی بیٹیوں کے متعلق	
	لوط کی بستیاں کس طرح تباہ ہوئیں	۶۶۲
	رزق حسن	۶۶۳
	طوفان نوح کل دنیا پر نہ تھا	۶۶۴
	شعیب کی نابینائی کی روایت	
	جنت اور دوزخ کے خلود میں استثناء	۶۶۶
	اس کی چار توجیہیں	
	عصاۃ مومنین اور کفار کے خلود عذاب میں	
	قرآن کریم نے کوئی فرق نہیں رکھا	۶۶۷
	جہنم پر فنا آنے کی شہادت	
	فنائے جہنم کے متعلق اقوال صحابہ	
	حدیث شفاعت سے استدلال کہ کفار بھی	

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	جہنم سے نکالے جائیں گے	۶۶۸
	صحابہ کی استقامت	۶۶۹
	صحابہ کی معیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے	
	ماسوی اللہ کا سہارا	
	اوقات نماز	۶۷۰
	نماز مصائب سے نجات کا ذریعہ ہے	
	بدی کا کفارہ نیکی ہے	
	عذاب فساد پر آتا ہے	
	پیدا کرنے کی غرض رحم کرنا ہے	۶۷۱
	محدود عذاب پر بھی رحم ہے	
	ذکر انبیاء میں آنحضرتؐ کا ذکر عمل اور زندگی	
۱۲	سورۃ یوسف - ۶۷۲ تا ۷۰۲	
	نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول	۶۷۲
	عربی ام الالسنہ ہے	
	قرآن عربی سے مراد	۶۷۳
	احسن القصص سے مراد	
	سچے خواب	
	سورج چاند کا سجدہ	۶۷۴
	بائبل اور قرآن میں فرق	
	ستاروں سورج چاند کے سجدہ سے مراد	
	حضرت یعقوب علیہ السلام کی تعبیر	
	سائلین سے مراد	۶۷۵
	بن یامین	
	بائبل اور قرآن کے بیان میں فرق	۶۷۶
	وحی قبل از نبوت	
	بائبل اور قرآن کے بیان میں فرق	۶۷۷
	مصائب میں صبر کا سبق	
	قمیص کا ذکر تین مرتبہ	
	قمیص کی تعبیر علم ہے	
	بلوغ سے مراد	۶۷۸
	ارادہ الٰہی	۶۷۹
	عصمت یوسف علیہ السلام	
	عصمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	
	یوسف کے دل میں بدی کا خیال بھی نہیں گزرا	
	برہان ربہ سے مراد	۶۸۰
	شاہد کون تھا	
	قرائن کی شہادت	
	قرآن کریم اور بائبل میں فرق	

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	بائیبل اخلاق فاضلہ نہیں سکھا سکتی	
	عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کا واقعہ	۶۸۱
	عورتوں کی چالبازی	۶۸۲
	عورتوں کا یوسف پر دباؤ ڈالنا	
	معصیت پر قید کو ترجیح	۶۸۳
	بائیبل اور قرآن	
	مشرک کی حالت	۶۸۴
	اسماء سے مراد	
	حلم اور رویا میں فرق	۶۸۵
	مکہ میں سات سال کا قحط	۶۸۶
	آنحضرتؐ کی دعا سے قحط کا دور ہونا	
	بائیبل حضرت یوسفؑ کو الزام سے کیا نہیں کرتی	
	آنحضرت صلعم کا ارشاد لاجبت الداعی	۶۸۷
	تہمت کے موقعہ سے بچے	
	ہاتھوں کا کاٹنا یوسفؑ کے خلاف سازش تھی	
	راستبازوں کا طریق	پ۱۳ ۶۸۸
	نفس امارہ	
	نفس لوامہ	
	نفس مطمئنہ	
	حضرت یوسف علیہ السلام کا مصر پر مالی تصرف	
	الگ الگ دروازوں سے داخل ہونیکی نصیحت کی غرض	۶۹۰
	حضرت یعقوبؑ کو آنیوالی مصیبت کا علم تھا	
	اسباب اور توکل	۶۹۱
	نظر کا لگنا	
	بن یامین کی بوری میں پیالہ رکھنے والے حضرت	
	یوسف علیہ السلام نہ تھے	
	بائیبل میں تحریف	۶۹۲
	بن یامین کا حضرت یوسفؑ کے پاس جانا	۶۹۳
	دوسرے دین کے بادشاہ کے قانون پر عمل	
	بن یامین پر چوری کا الزام بھائیوں کا	
	منصوبہ تھا	۶۹۴
	حضرت یعقوبؑ کا غم میں رو رو کر اندھا ہو	
	جانا خلاف قرآن ہے	۶۹۵
	مصیبت کے چھپانے کا حکم	۶۹۶
	قرآن کا بائیبل سے اختلاف اور اسباب مایوسی	
	کو انتہا تک پہنچا ناپھر رحمت سے مایوس نہ کرنا	
	مسلمانوں کے مایوس دلوں کیلئے مرہم	
	بن یامین سے بھائیوں کی شرارت	۶۹۷

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	دُکھ سے سُکھ آتا ہے	
	عفو یوسفؑ اور عفو خاتم النبیینؐ	
	قمیص سے حکومت کی طرف اشارہ	۶۹۸
	لفظ خرّ میں تسبیح پر دلیل	۶۹۹
	سجدہ یوسفؑ کو نہ تھا۔ سجدہ شکر تھا	۷۰۰
	راستبازوں کی خواہش	
	مسلمانوں کو عرب اور اس سے باہر بادشاہت	
	ملنے کی خبر	
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور اُسکا انجام	
	آنکھوں سے کام لینے کی ضرورت	۷۰۱
	توحید کے ساتھ شرک	
	توحید پر فطرت کی شہادت	
	مسلمانوں میں شرک	
	دعوت اسلام توحید خالص ہے	
	آنحضرتؐ کی پیروی سے بصیرت حاصل ہوتی ہے	
	رسولوں کی مشکلات	۷۰۲
	نصرت الٰہی	
	قرآن تفصیل کل شئی سے مراد	
۱۳	سورۃ الرعد ۔ ۷۰۳ تا ۷۱۷	
	نام خلاصہ مضمون۔ تعلق ۔ زمانہ نزول	۷۰۳
	حقانیت قرآن	
	آسمانوں کے غیر مرئی ستون	۷۰۴
	نظام سماوی میں تعلقات اور اثرات	
	انسان کا تعلق خالق سے	
	ہر چیز کے ازواج	۷۰۵
	اختلاف مراتب انسانی	
	تردید تناسخ	
	اغلال سے مراد	
	بعث بعد الموت اور اس کا انکار	۷۰۶
	قوائے روحانی کا نشوونما	
	مطالبۂ نشان ہلاکت اور اس کا جواب	
	تمام اقوام کیلئے انذار اور ہدایت اور ختم نبوت	
	نتائج اعمال کی تشبیہ حمل سے	۷۰۷
	معقبات سے مراد کراماً کاتبین ہے	۷۰۸
	اعمال کی ذمہ داری کا احساس کامل اسلام نے پیدا کیا	
	قوم کی حالت کیونکر بدل سکتی ہے	
	وحی کی مثال بارش سے	
	تعلق باللہ سے ہی فائدہ حاصل ہوتا ہے	

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	من دون اللہ سے نہیں	
	کافر کی دعا	
	طوعاً وکرھاً سجدہ	
	ظلال کا سجدہ	
	ظل کے معنی ہیں وسعت	
	ظل اللہ سے مُراد	
	ظلال کے سجدہ میں لطیف اشارہ	
	ظلی نبوت	
	غیر اللہ سے تعلق بے سود ہے	۷۱۰
	خلق دلیل عبادت اور الوہیت ہے	
	بدی کو نیکی سے دور کرنیکی تعلیم	۷۱۱
	عزیزوں کا جنت میں انسان کے ساتھ ہونا	
	ہدایت اور گمراہی کا قانون	۷۱۲
	ذکر اللہ سے اطمینان قلب	
	وحی رحمانیت سے ہے	
	قرآن کے کمالات	۷۱۴
	قارعہ سے مراد	
	کفار کے استہزاء کی وجہ	
	شرک کا ابطال	۷۱۵
	معبودان باطل	
	جنت کی نعماء کا ذکر بطور مثال ہے	
	ایک قوم کا جانا اور دوسری کا آنا	۷۱۶
	قضاء و قدر ٹل سکتی ہے	
	حق کے آخری غلبہ کا کھلا نشان اسکی قبولیت ہے	۷۱۷
	مخالفانہ منصوبے	
	اہل عرب نے کیوں بالآخر اسلام قبول کیا	
۱۴	سورۃ ابراھیم ۔ ۷۱۸ تا ۷۳۰	
	نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول	۷۱۸
	ظلمت اور نور	
	نزول قرآن کی غرض	
	مسلمانوں میں ایثار کی کمی	۷۱۹
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ پر ایک	
	اعتراض اور اس کا جواب	
	شکر نعمت سے مراد	۷۲۰
	اخراج رسل اور ان کی آخری کامیابی	۷۲۱
	شیطان کا انکار شرک	۷۲۳
	چھوٹوں کی غلطی سے بڑے گمراہ ہو جاتے ہیں	۷۲۴
	وعدہ شیطانی	

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	نیکی اور بدی پر وعدے	
	شیطانوں کا تسلط نہ نیکوں پر ہے نہ بدوں پر	
	کلمۂ حق کی مضبوطی	
	حق کے اصول و فروع	
	اشجار بہشت اعمال انسانی سے پیدا ہوتے ہیں	
	باطل کی بے بنیادی	۷۲۵
	سورج چاند وغیرہ کی تسخیر	۷۲۶
	سلسلہ نبوت کا نظم	
	عصمت انبیاء کا راز اور ہمارے لیے اسمیں فوائد	
	انبیاء میں رحمت کا جوش	۷۲۷
	اسمٰعیل علیہ السلام کا کعبہ کے پاس چھوڑا جانا	
	کس غرض سے تھا۔ خانہ کعبہ میں کشش۔	
	ابراہیم علیہ السلام کے اَبْ آپکے والد تھے کوئی	
	اور بزرگ تھے	۷۲۸
	عذاب کے وقت کا نقشہ	
	قریش کی تدابیر	۷۲۹
	وعدۂ عذاب دنیا کیلئے بھی ہیں۔	
	نتیجہ تبلیغ	۷۳۰
۱۵	سورۃ الحجر۔ ۷۳۱ تا ۷۴۶	
	نام۔ خلاصہ مضمون۔ تعلق۔ زمانہ نزول	۷۳۱
	قرآن پہلی کتابوں کے اجمال کو کھولتا ہے	
	کافروں کے مسلمان ہونے کی آرزو	پ۱۴
	فرشتوں کے آنے سے مراد	۷۳۲
	قرآن کی حفاظت ابدی	
	شیطان کاہن یا منجم کو کہا ہے	۷۳۴
	شیاطین کا ملائکہ کی باتوں کو سننا	
	آسمان کے شیاطین سے محفوظ ہونیسے کیا مراد ہے۔	
	استراق سمع سے کیا مراد ہے	۷۳۵
	کہانت اور نجوم کو قرآن کریم نے دور کیا	۷۳۶
	الٰہی خزانے۔ ابتدائے پیدائش	۷۳۷
	زمین کی سب سے پہلی حالت ناری مخلوق	۷۳۸
	اللہ کی روح کا انسان میں نفخ	
	شیطان کا آخر دنیا تک رہنا۔	۷۳۹
	دنیوی زندگی کو مقصد ٹھہرانا اصل حصول	
	مقصد میں ناکامی ہے	
	شیطان کو کسی انسان پر تسلط نہیں	
	علی رض باب علم ہیں	
	دوزخ کے سات باب	۷۴۰

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	جنت کی کمال راحت کا نقشہ	
	ایمان خوف و رجاء کے درمیان ہے	
	ابراہیمؑ کے مہمان انسان تھے	۷۴۱
	حضرت لوطؑ نے بھی ان مرسلوں کو انسان ہی سمجھا	
	اللہ تعالیٰ کی قسم سے مراد	۷۴۲
	اصحاب الایکۃ کون تھے	۷۴۳
	قوم لوطؑ۔ قوم شعیبؑ اور ثمود کا یکجائی ذکر	
	ان اللہ جمیل سے مراد	
	قرآن کریم کو مثانی کس معنی سے کہا گیا ہے	۷۴۴
	سبع من المثانی سے مراد	
	آئندہ زمانہ کی پیشگوئی	۷۴۵
	بار بار انذار کی ضرورت	۷۴۶
	عبادت کب تک ہے	
۱۶	سورۃ النحل۔ ۷۴۷ تا ۷۷۵	
	نام۔ خلاصہ مضمون	۷۴۷
	تعلق۔ زمانہ نزول	
	امر اللہ سے مراد	۷۴۸
	جسمانی سامانوں کے مقابلہ پر روحانی سامان	۷۴۹
	حد بندیاں محدد پر دلالت کرتی ہے	۷۵۰
	پہاڑوں نے اضطراب ارضی کا رک جانا	
	ناشکر گذاری	۷۵۱
	حضرت عیسٰےؑ کی وفات پر ایک قطعی دلیل	
	آخرت سے انکار توحید سے بھی انکار ہے	۷۵۲
	خلاف حق تدابیر کا انجام	
	اللہ کی مشیت	۷۵۴
	دکھوں کے وقت کامیابی کی بشارت	۷۵۵
	اھل الذکر سے مراد	
	عورت کی نبوت	
	آنحضرتؐ کے مخالفین کا عذاب	۷۵۶
	تین قسم کا عذاب	
	فرشتے کیسی مخلوق ہیں	۷۵۷
	من فوقھم سے مراد	
	دو خداؤں کا عقیدہ	
	لڑکیوں کے مارنے کے رواج کا استیصال	۷۵۸
	آنحضرتؐ کی بدی کو دور کرنیکی طاقت	
	دابۃ سے مراد ظالم انسان ہیں	۷۵۹
	زمانہ جاہلیت کا نقشہ	
	اعتقادات جاہلیت	

	خلاصہ مضامین	نمبر صفحہ
	قرآن کی ضرورت مذاہب کے اختلافات	
	کے فیصلہ کے لیے بھی تھی	
	چارپایوں میں انسان کیلئے عبرت	۷۶۰
	دوسری مخلوق میں عبرت	
	شہد کی مکھی سے سبق	۷۶۱
	انسانوں کے مراتب میں اختلاف اور نزول	
	وحی	
	کافر اور مومن کی مثال	۷۶۲
	عذاب دنیا اور الساعۃ	۷۶۳
	پرندوں کا تعلق ذکر عذاب سے	۷۶۴
	نعمائے ظاہری سے ضرورت وحی پر دلیل	۷۶۵
	نبی کس معنی میں گواہ ہے	
	خیر و شر کی جامع تعلیم	۷۶۶
	تفرقہ پر ایک مثال	۷۶۷
	اہل جاہلیت اور معاہدات اور یورپ کی حالت	
	مرد و عورت کیلئے اعمال حسنہ کی جزا یکساں ہے	۷۶۸
	حیات طیبہ سے مراد	
	تلاوت قرآن اور استعاذہ	
	شیطان کا تسلط کس پر ہے	۷۶۹
	قرآن میں نسخ نہیں	
	مخالفین کا اعتراض کہ آپکو کوئی انسان سکھاتا ہے	۷۷۰
	حالت مجبوری میں کلمہ کفر	۷۷۱
	مسلمانوں کا ایمان اور اخلاص	
	دل پر مہر	
	ہجرت حبش اور ہجرت مدینہ	
	جہاد اعلائے کلمۃ اللہ	
	اہل مکہ کی سزا	۷۷۲
	حضرت ابراہیمؑ اپنی نیکی کی وجہ سے دنیا	۷۷۳
	کے پیشرو بنے	
	ملت ابراہیمی پر چلنے کا ارشاد	
	یہودیوں اور عیسائیوں کا سبت	۷۷۴
	سبت میں اختلاف سے مراد	
	دعوت الی الحق کی طرز	
	دعوت الی الحق میں صبر کی ضرورت اور	
	غلبہ کی پیشگوئی	۷۷۵

اٰیاتها ۷ (۱) سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ① — اللہ بے انتہا رحم والے، بار بار رحم کرنے والے کے نام سے[1]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ② — سب تعریف اللہ کے لیے ہے (تمام) جہانوں کے رب[2]

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ③ — بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ④ — جزا کے وقت کے مالک (کے لیے)[3]

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ⑤ — ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں[4]

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑥ — تو ہم کو سیدھے رستے پر چلا

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ — اُن لوگوں کے رستے (پر) جن پر تُو نے انعام کیا[5]

الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦ ع — نہ اُن کے جن پر غضب ہُوا اور نہ گمراہوں کے[6]

نام اس سورۃ شریفہ کا سب سے مشہور نام الفاتحۃ یا فاتحۃ الکتاب ہے۔ سورتوں کے اسماء جن سے وہ مشہور ہیں بہت سے صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مروی ہیں۔ سورتوں کے نام توقیفی ہیں: اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کے اسماء توقیفی ہیں، یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہونے کی وجہ سے منجانب اللہ ہیں۔ چنانچہ اس سورت کا نام الفاتحہ یا فاتحۃ الکتاب بھی حدیث میں مروی ہے۔ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی: جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی کی اس حدیث سے ثابت ہے، جس میں فرمایا: لاصلوٰۃ الا بقراۃ فاتحۃ الکتاب یعنی فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اور بھی کئی حدیثوں میں یہ نام آتا ہے مثلاً صحیحین میں ابوہریرہؓ کی روایت سے ہے قال رسول اللہ صلعم لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب جو شخص فاتحۃ الکتاب نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ فاتحہ کے اور نام: خود قرآن شریف میں سورۃ الحجر میں اس کا نام سبعاً من المثانی آیا ہے یعنی سات آیات جو بار بار دہرائی جاتی ہیں اور حدیث صحیح میں اس کا نام اُمّ القراٰن یا اُمّ الکتاب بھی آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہے اور نام بھی وارد ہیں۔ جیسے الدعاء۔ الصلوٰۃ۔ الشفاء۔ الکنز۔ الحمد۔ امام سیوطیؒ نے پچیس[25] نام اتقان میں لکھے ہیں۔

خلاصۂ مضمون اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی چار صفات: اس سورت میں کل سات آیات ہیں جن میں سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی ان چار صفات کاملہ کا ذکر ہے، جن پر اس دنیا کا کل نظام قائم ہے۔ ربوبیت: یعنی پہلی آیت میں ربوبیت یا وہ صفت جو ہر ایک مخلوق کو اپنے دائرہ کے اندر کمال تک پہنچاتی ہے۔ رحمانیت: دوسری آیت میں رحمانیت یا وہ صفت جو ہر شے کے اپنے کمال تک پہنچنے کے لیے ضروری اسباب اس کے وجود میں آنے سے بھی پہلے مہیا فرماتی ہے۔ رحیمیت: اور رحیمیت یعنی وہ صفت جو ان سامانوں سے فائدہ اٹھانے پر اعلیٰ درجہ کے ثمرات مرتب فرماتی ہے۔ مالکیت: اور تیسری آیت میں مالکیت یا وہ صفت جو ان سامانوں سے فائدہ نہ اٹھانے پر یا قوانین کی خلاف ورزی پر سزا دیتی ہے تاکہ نظامِ عالم قائم رہے اور چیزیں اپنے کمال کو پہنچتی رہیں۔ چوتھی آیت میں بندہ کا یہ اقرار ہے کہ صرف وہی ذات پاک جس کی محامد پہلی تین آیات میں مذکور ہیں لائق عبادت ہے اور صرف اسی سے ہر قسم کی مدد طلب کی جاتی ہے۔ **فاتحہ کے دو حصے اور ان کا باہم تعلق:** آخری تین آیات میں راہِ راست پر چلنے اور تفریط و افراط سے بچنے کی دُعا ہے۔ پس پہلی تین آیات صرف محامد الٰہی کے لیے ہیں۔ آخری تین بندہ کے لیے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات کا وارث ہو اور درمیانی آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد کا تعلق ہے یعنی دونوں میں مشترک ہے اور اس سے پہلے حصہ یعنی اِيَّاكَ نَعْبُدُ کا تعلق درحقیقت پہلی تین آیتوں سے ہے کیونکہ وہ کامل محامد جن کا ذکر ان آیات میں ہے اسے مستحق عبادت ٹھہراتی ہیں اور جب وہ مستحق عبادت ہُوا تو اعانت کا طلب کرنا بھی اُسی سے ضروری ہُوا۔ اب اس پچھلے حصہ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا تعلق پہلے حصہ سے قائم ہو گیا اور پھر اس استعانت کی تشریح آخری تین آیات میں فرمائی اور یوں اس کا تعلق آخری تین آیات سے ہو گیا۔ یہی معنی ہیں اس حدیث کے جس کو ترمذی نے حسن قرار دیا ہے کہ صلوٰۃ یعنی فاتحہ مجھ میں اور میرے بندہ میں نصف نصف ہے۔ قال اللہ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین ولعبدی ماسأل۔

فاتحہ کے ابتدا میں رکھا جانے کی وجہ اس کی عظمت ہے صحیح احادیث میں اس کو اعظم السور فی القراٰن کہا گیا ہے یعنی قرآن کریم کی سب سے زیادہ عظمت والی سورت، اس کی عظمت اوّل تو خود اس سے ظاہر ہے کہ نماز میں جسے مومن کا معراج قرار دیا گیا ہے ہر رکعت میں اس سورت کا پڑھنا ضروری ہے اس کے ساتھ اور جہاں سے چاہے پڑھ لے۔

خلاصہ تعلیم قرآنی: پھر اس کا نام اُمّ الکتاب بتاتا ہے کہ یہ سورت گویا قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ قرآن کریم کی اصل غرض محامد الٰہی کا بیان کرنا اور انسان کو اپنے حقیقی کمال تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ اس سورت کے پہلے حصہ میں وہ محامد مذکور ہیں اور پچھلے حصہ میں انسانی کمال کے حصول کا ذکر ہے۔ پھر اس سورت کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے شروع کر کے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا ہی ذکر کر دیا، بلکہ نسل انسانی کی بھی وحدت کی بنیاد رکھ دی اور عٰلمین کا لفظ استعمال فرما کر ساری تفریقات قومی کو دُور کر دیا

اور یہی مذہب کا خلاصہ ہے کہ وہ خدا کی ربوبیت اور انسانوں کی اخوت کو قائم کرے اور ان الفاظ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے بہتر الفاظ میں یہ خلاصہ نہیں ہو سکتا۔

فاتحہ میں عقائد باطلہ کی تردید: پھر اس سورت کے اندر جن صفاتِ الٰہی کا ذکر ہے وہ گویا کُل صفاتِ الٰہی کے لیے بطور اُمّ یا جڑ کے ہیں، یعنی ربوبیّت، رحمانیت، رحیمیت مالکیّت۔ انہی سے باقی صفاتِ الٰہی بھی پیدا ہوتی ہیں اور ان چار صفات میں دوسرا کمال یہ ہے کہ مذاہبِ عالم کے کُل اصولِ باطلہ کی اُن میں تردید ہے۔ صفت ربوبیّت میں اس بات کا ردّ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات میں کوئی شریک ہو سکتا ہے۔ وہ رُوح اور مادہ کا بھی ربّ ہے اس لیے رُوح اور مادّہ اس کی کسی صفت میں جیسے غیر مخلوق ہونا شریک نہیں ہو سکتے۔ ایسا ہی بُت پرستی اور ہر قسم کے شرک کی تردید ہے۔ کیونکہ مستحقِ حمد وعبادت وہی ذات ہو سکتی ہے جو دوسروں کی ربوبیّت کرے اور ربوبیّت کرنے والی ذات صرف ایک ہی ہے۔ صفتِ رحمانیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ بلا بدل رحم کرتا ہے۔ کفّارہ کے عقیدہ کی تردید ہے کیونکہ کفّارہ کے عقیدہ کی بُنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم بلا بدل نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کا بیٹا انسانوں کے گناہوں کا معاوضہ بنایا جاتا ہے۔ مگر رحمانیت چاہتی ہے کہ خدا کا رحم انسانوں پر بلا بدل بھی ہو، جیسا کہ اُس کی مخلوق میں ہم کو نظر آتا ہے کہ انسانوں کے پیدا ہونے سے بھی پہلے وہ ان کے لیے سامان مہیّا فرماتا ہے۔ صفت رحیمیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اعمال پر جو اس کے قوانین کی فرمانبرداری میں ہوں اللہ تعالیٰ بڑے بڑے اجر دیتا ہے۔ ایسے عقائد کی تردید ہے جو انسان کے اعمال کے محدود ہونے کی وجہ سے ان کے اجر کو بھی محدود قرار دیتے ہیں اور اس لیے نجات کو عارضی قرار دیتے ہیں۔ صفتِ مالکیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گو قوانین کی نافرمانی پر سزا دیتا ہے مگر اس کا معاملہ اپنی خلق کے ساتھ مالک کا معاملہ اپنے مِلک کے ساتھ ہے تناسخ وغیرہ عقاید کی تردید ہے جن کی رُو سے اللہ تعالیٰ کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا اور اس لیے ہر گناہ کی پاداش میں انسان کو بے شمار جُونوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

میانہ روی کی تعلیم: اور جس طرح عقایدِ باطلہ کی تردید اس حصّہ میں ہے پچھلے حصّہ میں ہر ایک قوم کی افراط و تفریط کی تردید ہے۔ سوائے اسلام کے جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں وہ اپنی موجودہ حالت میں صرف ایک خاص شاخ اخلاقِ انسانی پر ہی سارا زور دیتے ہیں اور اس لیے ان میں تفریط و افراط کی غلطیاں پیدا ہو گئی ہیں، یعنی ایک شاخ پر حد سے زیادہ زور دیا اور دوسری کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہاں اعتدال یا میانہ روی قرار دیا گیا ہے جو ایک طرف تفریط سے بچاتا ہے اور دوسری طرف افراط سے محفوظ رکھتا ہے۔ پس یوں سورہ فاتحہ میں ہر ایک باطل کی تردید بھی موجود ہے اور اس کے بالمقابل عقاید اور اعمال میں ان اصولِ حقّہ کی تعلیم ہے جو بطور بنیاد کے ہیں۔

بہترین دعا: پھر جو دُعا اس سورت میں سکھائی گئی ہے وہ دعا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ دعا ہے، جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ عیسائی دعا سے مقابلہ: عیسائیوں کو اپنے خداوند کی دعا کے متعلق بہت کچھ دعوٰی ہے، مگر فاتحہ کے بالمقابل یہ دعا کچھ بھی نہیں، وہاں روز کی روٹی کی التجا ہے یہاں صراطِ مستقیم کی یعنی کمالِ انسانی کے حصول کی۔ اس سے دونوں دعاؤں کے مقاصد میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ پھر وہاں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔ یہاں اس مقام پر پہنچنے کی آرزو ہے جہاں گناہ ہی انسان سے سرزد نہ ہو اور نہ کسی قسم کے حقوق میں تفریط واقع ہو نہ افراط۔ گویا یہ بیگناہ یا معصوم بن جانے کی دعا ہے۔ پس کامل اصولِ حقّہ کے سکھانے میں اصولِ باطلہ کی تردید میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا سکھانے میں اور کمالِ انسانی تک پہنچانے میں اس کی نظیر نہ تورات میں ملتی ہے نہ انجیل میں، ایسا ہی جو تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے مختصر فقرہ میں قائم کیا گیا ہے وہ بھی بے نظیر ہے۔ بہترین وظیفہ: جو لوگ وظائف کے پیچھے بھٹکتے پھرتے ہیں وہ اگر افضل الدعا سے کام لیں تو بہت جلد اپنے مقاصد کو پا سکتے ہیں۔ سورہ فاتحہ سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں اور یہ وہ وظیفہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کو سکھایا ہے۔

زمانۂ نزول | نہ صرف اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سورۃ مکّہ میں نازل ہوئی، ابتدائی وحی: بلکہ اس پر بھی کہ مکّی وحی میں بھی نہایت ابتدائی زمانہ کی ہے۔ نماز باجماعت کی ابتدا: یہ سورت ابتدا سے نماز میں پڑھی جاتی تھی اور نماز مکّہ میں برابر پڑھی جاتی تھی۔ بلکہ بعثتِ نبوی کے چوتھے سال کا یہ واقعہ کہ سعدؓ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مکّہ کے پاس ایک میدان میں نماز پڑھ رہے تھے جس پر کفار کے ساتھ جھگڑا ہو گیا اور اس کے بعد ارقم کا گھر نماز پڑھنے کے لیے منتخب کیا گیا بتاتا ہے کہ چوتھے سال سے پیشتر نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی اور اس لیے سورہ فاتحہ بھی پڑھی جاتی تھی۔ اس کے ابتدائی نزول کے متعلق صرف قیاس اور قرائن ہی نہیں، نزول میں سب سے پہلی مکمّل سورت: بلکہ ایک روایت میں یوں بھی آیا ہے کہ فاتحہ اوّل شئی انزل من القراٰن ہے یعنی سب سے پہلے جو چیز قرآن سے نازل ہوئی۔ اس حدیث کو بیہقی نے دلائل النبوّۃ میں بیان کیا ہے (ش) اس پر جرح یہ ہوئی ہے کہ بالاتفاق اقرأ باسم ربّك سب سے پہلے نازل ہوا ہے۔ مگر غالب مراد اوّل شئ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ پوری سورت جس کا نزول سب سے پہلے ہوا فاتحہ ہے کیونکہ سورۂ علق کی صرف پانچ آیتیں صدر کی پہلے نازل ہوئیں اور بقیہ حصّہ بعد میں نازل ہوا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قرآن کریم میں سوائے سورۂ براۃ کے سب سورتوں کی ابتدا میں لکھی جاتی ہے۔ بسم اللہ کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں: اور اس کا نزول ہر سورت کی ابتدا میں صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ایک سورۃ کی علیحدگی کو نہیں پہچانتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ پر بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نازل ہوتی۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ ہر سورۃ کے شروع میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ البتہ یہ آیت قرآن کریم کی کسی سورۃ کی آیات کے اندر شمار نہیں ہوتی اور نہ ہی فاتحہ کے۔ ہر سورت میں مستقل آیت ہے: ابن کثیر میں ہے کہ داؤد نے کہا کہ ہر ایک سورۃ کی ابتدا میں یہ ایک مستقل آیت ہے۔ اس سورۃ میں سے نہیں اور یہی امام احمد بن حنبل سے روایت ہے اور یہی امام ابو حنیفہ کا صحیح مذہب ہے۔

بسم اللہ ہر سورۃ کا خلاصہ ہے | بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم کیوں ایک مستقل آیت ہے، اس لیے کہ جس طرح سورۃ فاتحہ خلاصہ ہے کل قرآن کریم کا بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم خلاصہ ہے سورۂ فاتحہ کا اس لیے کل قرآن کریم کا بھی یہ خلاصہ ہے اور چونکہ قرآن کریم کی ہر ایک سورۃ بجائے خود بھی ایک کتاب ہے کہ اس کے اندر ایک مستقل مضمون ہے اس لیے ہر سورۃ کی ابتدا میں بھی اسے ایک مستقل آیت رکھا گیا ہے۔ سورۃ فاتحہ کا خلاصہ: اور سورۃ فاتحہ کا اس کا خلاصہ ہونا اس بات سے ظاہر ہے کہ فاتحہ میں جن چار صفاتِ الٰہی کا ذکر ہے ان میں سے یہاں دو کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یعنی وہاں ربوبیّت، رحمانیّت، رحیمیت، مالکیّت کی صفات ہیں، جو کل صفاتِ الٰہی کے لیے بطور اُمّ کے ہیں۔ یہاں ان میں سے دو صفات رحمانیت اور رحیمیت کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ نظامِ عالم رحمانیت و رحیمیت پر ہے: اور اگر غور کیا جائے تو سامانوں کا مہیا ہونا اور جب ان سامانوں کو کام میں لایا جائے تو اس پر اجر کا مرتب ہونا یہی سلسلہ نظامِ عالم ہے جس پر کل کاروبار کا دارومدار ہے جس قدر سامانِ زندگی اللہ تعالیٰ نے ہم کو دیئے ہیں جیسے ہَوا، پانی، آگ، سورج وغیرہ ایسا ہی اس کے قوانین پر سب

کچھ صفتِ رحمانیت کا ظہور ہے اور جب ان چیزوں کو ہم اپنے کام میں لاتے ہیں تو ان سے نتائج کا پیدا ہونا صفتِ رحیمیت کا ظہور ہے۔ نظامِ روحانی بھی رحمانیت و رحیمیت پر ہے یہی ہماری جسمانی زندگی کے سلسلہ میں یہی دو صفات اصلی کام کرنے والی ہیں۔ یہی حالت ہماری روحانی بقا کی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ صفتِ رحمانیت کے تقاضا سے ہمیں اپنی طرف سے قانون اور شرائع انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے عطا فرماتا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ اور جب ان شرائع اور قوانین کو ہم اپنے عمل میں لاتے ہیں تو ان پر نتائج مترتب فرماتا ہے پس نظامِ جسمانی اور نظامِ روحانی دونوں کا قیام انہی دو صفات سے ہے۔ اسم اعظم: اس لیے بعض نے اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم اللّٰہ، الرَّحْمٰن، الرَّحِیْم قرار دیا ہے (زرقانی) اور نہ صرف صفاتِ الٰہی کا ہی بسم اللہ میں خلاصہ آگیا ہے بلکہ وہ نصف حصہ جو سورہ فاتحہ میں بندہ کے لیے ہے اس کو یہاں ایک جا سے ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ وہ حصہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سے شروع ہوتا ہے اور یہاں بھی با استعانت کے لیے ہے۔ بسم اللہ میں عملی توحید: یوں بسم اللہ ہر مسلمان کی زندگی میں عملی توحید کا سبق ہے۔

بسم اللہ امرِ الٰہی کی تعمیل بھی ہے | یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم درحقیقت اس امرِ الٰہی کی بھی تعمیل ہے جو رسول اللہ صلعم کو سب سے پہلے ہوا بخاری میں ہے کہ جب آپ غارِ حرا میں حسبِ معمول عبادتِ الٰہی میں مصروف تھے تو فرشتہ آیا اور کہا اِقْرَاْ یعنی پڑھ۔ آپ نے کہا ما انا بقارئٍ میں تو پڑھنا نہیں جانتا فرشتہ نے پھر وہی لفظ دوہرائے اور آپ نے بھی جواب کا اعادہ کیا اور اسی طرح تین مرتبہ ہوا۔ چوتھی مرتبہ فرشتہ نے کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ الخ۔ تو اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو سکھایا کہ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ کس طرح پڑھا جاتا ہے۔ بسم اللہ کی ابتدا: چنانچہ بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد دوسری وحی جو نازل ہوئی وہ یہی تھی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سورت کے آخر تک۔ گویا اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو تعلیم دی کہ وہ خدا کی مدد کس طرح طلب کیا کرے۔ بسم اللہ سے کام میں برکت ہوتی ہے: اور ایک حدیث میں ارشادِ نبوی یوں ہے کل اَمرٍ لا یُبْدَءُ فیہ ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم فھو اَجذم یعنی ہر ایک کام جسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے اور یقیناً جو شخص اپنے کاموں میں اللہ تعالیٰ سے استعانت کا طالب ہوگا اسے برکت ملے گی۔

ع ۱ بِاسْمِ اللّٰہِ میں با استعانت کے لیے ہے یعنی اللہ کے نام کی مدد چاہتا ہوا پڑھتا ہوں اور یہ اِقْرَاْ کی تعمیل ہے (العلق ۹۶-۱)

اسم: اسم۔ سمو سے ہے جس کے معنی بلندی ہیں پس اسم وہ ہے جس سے مسمّٰی کا ذکر بلند ہو اور وہ اس سے پہچانا جائے (غ) جوہر اور عرض یا ذات و صفات دونوں پر اس کا استعمال ہے۔ اللہ اسم ذات ہے اور الرحمٰن الرحیم صفاتی نام ہیں گویا پڑھنے والا اللہ کی صفاتِ رحمانیت و رحیمیت کی مدد چاہتا ہے۔

اللہ اسم اعظم: اللّٰہ باری تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور یہی اسم اعظم ہے اور کل اسمائے الٰہی کے لیے یہ اسم جامع ہے۔ یہ اَلَہَ سے مشتق نہیں نہ اس کا اصل اِلٰہ ہے کیونکہ اِلٰہ غیر اللہ معبود پر بولا جاتا ہے۔ حالانکہ اللّٰہ کا لفظ نہ اسلام میں اور نہ اسلام سے پہلے کبھی دوسرے معبود پر بولا گیا ہے۔ نہ یہ اَلْاِلٰہ کا مخفف ہے کیونکہ یَا اللّٰہُ کہا جاتا ہے یا الالٰہ یا یَا الرَّحْمٰن نہیں کہا جاتا پس اَلْ اس میں زائد نہیں۔ عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں اللہ کا اسم ذات موجود نہیں۔

الرحمٰن الرحیم فعلان اور فعیل کے مبالغہ میں فرق: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ دونوں رَحِمَ سے مشتق مبالغہ کے صیغے ہیں۔ ایک فَعْلان کے وزن پر دوسرا فعیل کے۔ فَعْلان کا مبالغہ امتلا اور غلبہ کے لیے ہوتا ہے یعنی صفت کی زیادتی کے لیے فعیل کا مبالغہ تکرار کے لحاظ سے ہوتا ہے یعنی صفت کے بار بار تکرار سے (ح) اور بعض نے یوں فرق کیا ہے کہ رحمٰن کا لفظ اس صفت پر دلالت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں قائم ہے اور رحیم اس صفت پر جو اس شخص کے تعلق سے پیدا ہوتی ہے جس پر رحم کیا گیا پس رحمان وہ ذات ہے جس کا رحم بہت ہی بڑا ہے یہاں تک کہ انسان کی پیدائش سے پہلے وہ انسان کے لیے سامان مہیا کرتا ہے اور یہ صفت مومن اور کافر دونوں پر جاری ہے اور رحیم وہ ذات ہے جس کا رحم بار بار عود کرتا ہے اور یہ صفت اس شخص کے فعل پر ظہور پذیر ہوتی ہے (اور ہر فعل پر بار بار ظہور پذیر ہوتی ہے) جس پر رحم کیا گیا۔

رحمان دنیا، رحیم آخرت: اسی لیے حدیث میں آتا ہے دنیا کا رحمان، اور آخرت کا رحیم۔ کیونکہ رحمٰن نے انسان کی پیدائش سے پہلے محض اپنے رحم سے اس کے لیے سارے سامان پیدا کیے اور رحیم انسان کے صالح اعمال پر جزا دینے والا ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے گویا ابتدا میں جو سامان انسان کے لیے مہیا کرتا ہے وہ رحمٰن ہے اور ان سامانوں سے فائدہ اٹھانے پر جب انسان کوشش صرف کرتا ہے تو اس کا نتیجہ دینے والا رحیم ہے۔ زمین، پانی، آگ وغیرہ کا پیدا کرنا صفتِ رحمانیت کا تقاضا ہوا زمین میں ہل چلا کر پانی دے کر انسان ایک دانہ کا سو بنا لیتا ہے یہ تقاضائے رحیمیت ہے اسی طرح شرائع کا دینا نبوت کا عطا کرنا صفتِ رحمانیت کا تقاضا ہے ان شرائع پر عمل کرکے فلاح حاصل کرنا صفتِ رحیمیت کے ماتحت ہے۔ اسی لیے قرآن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھانا بھی اَلرَّحْمٰن کا کام ہے۔ الرحمٰن علّم القراٰن

رحمان غیر اللہ پر نہیں بولا جاتا: رحمان اللہ سے مخصوص ہے غیر پر نہیں بولا جاتا اور رحیم پر بولا جاتا ہے۔ بالمؤمنین رؤف رحیم (التوبہ ۹-۱۲۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا ہے۔

ع ۲ ال۔ حمد: اَلْحَمْدُ میں اَلْ استغراقی ہے یعنی سب محامد یا ہر جنس کی حمد مراد ہے۔ حَمْد وہ تعریف ہے جو فضیلت کی وجہ سے کی جاتی ہے یعنی ان خوبیوں کی وجہ سے جو دوسرے کو مسخر کر لیتی ہیں۔ حمد مدح شکر میں فرق: مدح وسیع ہے کیونکہ مدح اختیار سے بھی کی جاتی ہے اور تسخیر سے بھی اور شکر کسی خاص نعمت کے مقابل پر ہونے سے اور بھی محدود ہے (غ)

رَبّ۔ اصل مصدر ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشوونما دینا یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے (غ) اور اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے پس ربّ وہ ذات ہے جو تدریجاً ایک چیز کو اپنے کمال تک پہنچاتی ہے۔ یہاں سے مسئلہ ارتقا کی بھی اصلیت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کی رو سے بھی ہر چیز تدریجاً اپنے کمال کو پہنچتی ہے مطلق لفظ ربّ صرف ذاتِ باری پر بولا جاتا ہے دوسرے کی طرف منسوب کرکے اوروں پر بھی بول سکتے ہیں۔ جیسے رَبّ الدار گھر کا مالک حضرت یوسفؑ کا قول منقول ہے اذکرنی عند ربک (یوسف ۱۲-۴۲) اس کی جمع ارباب آتی ہے ءَاربابٌ متفرقون خیر (یوسف ۱۲-۳۹)

عالم: عَالَمِیْنَ۔ عَالَم کی جمع ہے جو علم سے مشتق ہے۔ کل مخلوق یا موجودات کو عَالَم اس لیے کہا جاتا ہے وہ آلہ ہے جو صانع کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔

مخلوق کی ہر قسم کو بھی عَالَم کہا جاتا ہے ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار سے بھی زیادہ عالم ہیں (ت) کل انسان بھی ایک عَالَم ہیں اور ہر ایک قوم بھی ایک عَالَم ہے۔ بلکہ ہر زمانہ کے لوگوں کو بھی ایک عَالَم کہا جاتا ہے (ج)۔ اس لیے جہاں بعض انسانوں یا قوموں کو عالمین پر فضیلت دینے کا ذکر ہے وہاں مراد اس زمانہ کے لوگ ہیں۔ یہاں مراد جمع لانے سے موجودات کی سب اقسام کو شامل کرنا ہے۔

الحمد میں رضا بالقضا کا سبق: اسلام کی تعلیم کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے ہوتی ہے۔ جس میں انسان کو رضا بالقضا کا اعلیٰ سے اعلیٰ سبق سکھایا گیا ہے کیونکہ یہ وہ سورت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ نمازوں میں کئی کئی بار پڑھتا ہے اور راحت میں ہو یا تکلیف میں اس کے مُنہ سے حمد اور شکر کے کلمات ہی نکلتے ہیں۔ قلب نبوی کی وسعت: اس سے نبی کریم صلعم کے قلب مبارک کی بھی کیفیت معلوم ہوتی ہے جس پر اس وحی کا نزول ہُوا۔ آپ کے دل میں اس قدر حمدِ الٰہی بھری ہوئی تھی کہ کسی حال میں خدا کی شکایت کا وہم بھی آپ کے دل میں نہ آسکتا تھا۔ صبح اُٹھتے ہیں تو حمد۔ دوپہر کو حمد۔ سہ پہر کو حمد۔ غروب آفتاب پر حمد۔ رات کو سوتے وقت حمد۔ رات کو اُٹھ کر حمد۔ آپ کا سینہ حمدِ الٰہی سے لبریز تھا۔

احمد: اسی حمد کی وجہ سے جو آپ نے سب انبیاء سے بڑھکر کی۔ آپ کا نام احمد ہُوا جو آپ سے پہلے کسی انسان کا نام نہیں ہُوا۔ محمد: اور جب آپ نے سب سے بڑھ کر خالق کی حمد کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی مخلوق سے سب سے بڑھ کر آپ کی حمد کرائی اور اس لیے آپ کا نام محمد ہوا صلی اللہ علیہ وبارک وسلم۔

اسلام کی تعلیم کی وسعت پر یہ دلالت ہے کہ اس کی ابتدا ہی تمام جہانوں کی ربوبیت سے ہوتی ہے نہ ایک قوم کی۔ وحدت نسل انسانی: اس ایک فقرہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں جہاں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی نسل انسانی کی وحدت بھی بیان کردی۔ رب العالمین کا لفظ اختیار کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر پہلے متفرق طور پر نسل انسانی کی روحانی ربوبیت ہوتی رہی تو اب ان سب کی ربوبیت ایک ہی نبی کے ذریعہ سے ہوگی۔ کیونکہ یہاں ربکم یا رب المسلمین یا اور کوئی ایسا لفظ اختیار نہیں کیا۔ جس سے تفرقہ پیدا ہوتا ہو۔ ضرورت وحی: پھر رب العالمین میں وحی الٰہی کی ضرورت کی طرف بھی صاف اشارہ ہے کیونکہ اسم رب کا تقاضا ہے کہ ہر مخلوق کو اپنے کمال کو پہنچائے مگر انسان کا حقیقی کمال صرف جسم کی پرورش تک محدود نہیں بلکہ وہ اخلاق سے ہے۔ پس جس طرح جسم کے کمال کے لیے عالمِ جسمانی میں خارجی سامان ربّ نے پیدا کیے ہیں ضروری ہے کہ روحانی کمال کو حاصل کرنے کے لیے خارجی سامان عالمِ روحانی میں موجود ہوں یہی وحی الٰہی ہے۔ اسی چھوٹے سے فقرہ میں یہ عظیم الشان سبق بھی ہے کہ استحقاق حمد ربوبیت سے پیدا ہوتا ہے۔ مخلوق کی خدمت کا سبق: پس وہی انسان قابلِ حمد ہوگا جو دوسرے انسانوں کی خدمت گزاری کرے اور وہ بھی صرف اپنے عیال یا خاندان یا قوم کی نہیں بلکہ سب قوموں کی بلکہ انسانوں کو چھوڑ کر دوسری مخلوق کی بھی۔

ربّ اور اَب: یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ جہاں دوسرے مذاہب نے خدا تعالیٰ کو اَب یا باپ کر کے پکارا ہے۔ قرآن کریم نے دعاؤں میں لفظ ربّ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ ربّ کا تعلق اپنی مخلوق سے اس سے بہت بڑھ کر ہے جو باپ کا تعلق بیٹے سے ہے۔ دعاؤں میں ربنا کا استعمال: قرآنی دعائیں عموماً رَبَّنَا سے شروع ہوتی ہیں، گویا ہر دعا کا مقصد انسانوں کا کمالِ حقیقی تک پہنچنا ہے کیونکہ ربّ وہ ہے جو ہر شے کو اس کے کمال تک پہنچاتا ہے مگر اَب انسان کو اس کے کمال تک نہیں پہنچاتا پس خدا کو اَب کر کے پکارنا بہت ادنیٰ مرتبہ ہے۔

ع۳ مالک اور مَلِک یعنی بادشاہ میں فرق یہ ہے کہ مَلِک صرف بعض امور میں متصرف ہوتا ہے مالک اپنی مِلک پر پُورا تصرف رکھتا ہے۔ کیونکہ حرف کے بڑھنے سے معنی میں قوت بڑھ جاتی ہے۔ دوسرا مَلِک کا لفظ صرف انسانوں کی سیاست سے مخصوص ہے یعنی وہ جو جمہور میں امر ونہی کا تصرف رکھتا ہو جو ایک محدود تصرف ہے مَلِکِ النّاس کہا جاتا ہے اشیاء کا یا یوم الدّین کا مَلِک نہیں ہوگا مالک ہوگا۔

یَوْم۔ سے عموماً مراد وہ وقت ہے جو طلوع آفتاب سے غروب تک ہے لیکن اکثر اس سے مراد زمانہ کی کوئی مدت ہوتی ہے خواہ وہ بہت ہی کم ہو یا بہت ہی زیادہ (غ) چنانچہ کل یوم ھو فی شان (الرحمٰن ۵۵: ۲۹) میں یوم سے مراد ایک آن ہے اور فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ (المعارج ۔ ۴) میں ایک یوم پچاس ہزار سال کا فرمایا۔

دین کے اصل معنی جزا ہیں (غ) بخاری میں ہے الدین الجزاء فی الخیر والشر یعنی یہاں دین سے مراد نیکی بدی کا بدلہ ہے۔ بطور استعارہ دِین کا استعمال شریعت پر ہوتا ہے۔ گویا شریعت کی تابعداری کا نام دِین ہے۔

پس مالک یوم الدین کے معنی ہوئے جزا و سزا کے وقت میں مالک۔ جزا و سزا کا ایک عظیم الشان وقت وہ ہے جو قیامت یا محشر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جزا و سزا اس عالم میں بھی ہے: مگر ایک رنگ جزا و سزا کا اس عالم میں بھی جاری ہے اور قرآن کریم کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کی جزا و سزا ایک کُھلا کُھلا رنگ ان نتائج کا ہے جو فی الحقیقت ہر فعل کے ساتھ ساتھ ہر آن یہاں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر وہ نظر انسانی سے بسا اوقات مخفی رہتے ہیں۔ بعض وقت بطور نمونہ ظاہر بھی ہو جاتے ہیں۔

مالکیت میں گناہوں کی معافی کی طرف اشارہ: مالک کا لفظ بجائے مَلِک کے اس لیے اختیار فرمایا کہ مَلِک محض ایک محدود اختیارات کا حاکم ہے جو فریقین میں انصاف کے لیے مامور ہے وہ کسی مجرم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ لیکن مالک کو اختیار ہے جسے چاہے معاف بھی کر دے اس میں کفارہ اور تناسخ کا ابطال ہے کیونکہ ان دونوں کی رُو سے خدا گناہ کو معاف نہیں کر سکتا بلکہ سزا دینے کے لیے مجبور ہے یہ عقیدہ کس قدر خلاف واقعات ہے ایک نوکر کا آقا یا مالک جو حقیقت میں مالک نہیں اس کا گناہ معاف کر سکتا ہے مگر خدا جو مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ ہے وہ معاف نہیں کر سکتا۔ اور اگر معافی کی خواہش انسان میں ہے تو خالق میں کیوں نہیں۔ جو صفت خالق میں نہ ہو وہ مخلوق میں نہیں ہو سکتی۔

ع۴ نَعْبُدُ۔ عُبُوْدِیَّۃ اظہار تذلّل کا نام ہے اور عبادۃ اس سے بلیغ تر ہے یعنی انتہا درجہ کے تذلّل اور انکساری کا نام ہے اور اس کا حقدار صرف وہی ہو سکتا ہے جس کی فضیلت انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے سوائے دوسرے کی عبادت جائز نہیں (غ) یا عبادت وہ طاعت ہے جس کے ساتھ

خضوع یعنی عاجزی ہو (رت) پس عبادت اصل میں یہ ہے کہ اپنے آپ کو پوری عاجزی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں لگا دے۔ **عبادت مقصدِ زندگی ہے:** عبادت کو انسان کی زندگی کی غرض فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات ۵۱-۵۶) کیونکہ انسان اپنے کمال کو نہیں پا سکتا جب تک کہ اپنے قویٰ کو اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں نہ لگا دے۔ عبادت انسان کی اپنی بہتری کے لیے ہے اللہ تعالیٰ کی ذات غنی ہے اس کو نہ کسی کی عبادت سے فائدہ پہنچتا ہے نہ عدمِ عبادت سے نقصان۔

نَسْتَعِيْنُ۔ استعانۃ کے معنی ہیں طلب عون یعنی مدد چاہنا۔

عبادت استعانت پر مقدم ہے: جب اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا ذکر ہوا تو انسان بے اختیار بول اُٹھتا ہے کہ ہم اپنی طاقتوں کو ایسی ذات کی کامل فرمانبرداری میں لگاتے ہیں اور اس کے سوائے کسی دوسرے کی عاجزانہ فرمانبرداری اختیار نہیں کر سکتے اور اس کے ساتھ ہی انسانی رُوح اپنے عجز کا اعتراف کرتی ہوئی پکارتی ہے کہ اے خدا منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے تیری ہی مدد بکار ہے تو ہماری کمزوریوں کی اصلاح فرما اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہم کو منزلِ مقصود تک پہنچا۔ فطرتِ انسانی میں عبادت کی استعداد موجود ہونے پر ہم اِیَّاكَ نَعْبُدُ کہتے ہیں اور عملاً محتاجِ اعانت ہونے پر اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی خواہش موجزن ہوتی ہے جب تک انسان عبادت نہیں کرتا اپنے قوائے فطری کو کام میں نہیں لگاتا اس وقت تک وہ مدد کا مستحق بھی نہیں ہوتا۔

ع۵ اِهْدِنَا۔ ھدایۃ کے معنی ہیں الرشاد والدلالۃ بلطف الی ما یوصل الی المطلوب (ت) یعنی لُطف کے ساتھ لے جانا اور رہنمائی کرنا اس کی طرف جو مطلوب یعنی منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ **ہدایت چار طرح پر ہے:** امام راغب نے ہدایت کو چار طرح پر بیان کیا ہے۔ اوّل فطری ہدایت ہے جو عام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو خلق کے ساتھ ہی دے دی ہے اعطیٰ کل شیٔ خلقہ ثم ھدیٰ (طٰہٰ ۲۰-۵۰) یا فرمایا والذی قدر فھدیٰ (الاعلیٰ ۸۷-۳) یہ ہر چیز کی فطرت میں موجود ہے دوسری وہ ہدایت ہے جو انسانوں کو نبیوں کے ذریعہ سے ملتی ہے یعنی انبیاء کی دعوت الی الحق۔ جعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا (السجدۃ ۳۲-۲۴) انبیاء ایک راستہ دکھا دیتے ہیں۔ انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا (الدھر ۷۶-۳) تیسری ہدایت وہ توفیق ہے جو اس شخص سے خاص ہے جو ہدایت پا گیا۔ یہ سب انسانوں کے لیے عام ہے جس کے لحاظ سے قرآن شریف کو ھدی للناس فرمایا (البقرۃ ۲-۱۸۵) والذین اھتدوا زادھم ھدی (محمد ۴۷-۱۷) ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ (التغابن ۶۴-۱۱) چوتھی ہدایت جنت ہے یعنی منزلِ مقصود تک پہنچا دینا جیسے سیھدیھم ویصلح بالھم (محمد ۴۷-۵) یا جیسے یہاں یا ھدی للمتقین میں جیسا کہ تاج العروس سے شروع میں حوالہ دیا گیا ہے۔

المستقیم۔ وہ راہ ہے جو ایک سیدھے اور ہموار خط پر ہو اور اس سے طریقِ حق کو تشبیہ دی گئی ہے (غ)

دعائے فاتحہ کا مقصد: معترض کہتا ہے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا کرنے والے کو تا حال گمراہ ثابت کرتی ہے اس نے پہلے الفاظ پر غور نہ کیا۔ یہ دعا کرنے والا تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کو پہچان چکا۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ کہہ کر اپنے قویٰ کو خدا کی کامل فرمانبرداری میں لگا چکا اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے ذریعہ اپنی کمزوری کو دور کرنے کی مدد اللہ سے طلب کر چکا؛ وان اعبدونی ھذا صراط مستقیم (یٰس ۳۶-۶۱) میری عبادت کرو یہ صراطِ مستقیم ہے۔ پس اِیَّاكَ نَعْبُدُ کہنے والا صراطِ مستقیم پر تو ہے اس لیے ان الفاظ میں اس راہ پر قائم رہنے کی دعا مانگتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ اسی راہ پر چلتا رکھے اور راہ کو پا لینے کے بعد اس کا قدم نہ ڈگمگائے اور نہ سُست ہو۔ یہاں تک کہ وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے جیسا کہ ھدایت کے معنی سے ظاہر ہے۔ اصل مقصد اس دعا کا اس اعلیٰ منزل پر پہنچنا ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے اور جس کی طرف ایک طرف رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور دوسری طرف اِهْدِنَا میں اشارہ ہے یعنی کمالِ انسانی کا معراج پس اصل مطلب یہ ہے کہ اے خدا ہمیں سیدھی راہ پر چلاتے رہیو یہاں تک کہ ہم اس کمال کو حاصل کر لیں جو انسان کی ترقی کی اصل منزلِ مقصود ہے۔ **مقامِ عصمت سے اوپر کمالِ انسانی کا حصول ہے** —— اس دعا میں انسان کے سامنے وہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر وہ پہنچ سکتا ہے اور مذہب تو صرف گناہوں کی معافی کی دعا سکھانے تک رہ گئے۔ اسلام نہ صرف گناہوں سے بچنے، لغزشوں سے محفوظ رہنے اور یوں مقامِ عصمت یا محفوظیت پر پہنچنے کی دعا سکھاتا ہے بلکہ اس سے بھی بہت آگے کمالِ انسانی پر پہنچنے کی یہ دعا ہے جس کے برابر کوئی دُعا کسی آسمانی کتاب میں نہیں۔ بلکہ خود قرآن شریف کی دعاؤں میں بھی یہ دعا سب سے افضل ہے۔

ع۶ اِنعام کے معنی ہیں انسان کو احسان پہنچانا غیر ناطق پر یہ لفظ نہیں بولا جاتا مثلاً یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں نے اپنے گھوڑے پر انعام کیا (غ)

منعم علیہم کون ہیں: اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے کون مراد ہیں۔ قرآنِ کریم خود تشریح فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (النسآء ۴-۶۹) یعنی وہ انبیاء اور صدیق اور شہید اور صالح ہیں۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے لے کر تمام مفسرین نے قبول کی ہے۔ پس ثابت ہُوا کہ اھدنا کی دعا کرنے والا اعلیٰ سے اعلیٰ منازل پر پہنچنے کی دعا کرتا ہے جہاں نبی صدیق شہید صالح پہنچے وہیں ہر مسلم پہنچنے کی تڑپ اپنے اندر رکھتا ہے۔ عیسائیوں کی مشہور خداوند کی دعا میں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔ **اسلام کس مقام پر پہنچاتا ہے:** یہاں نہ صرف اس مقام کی دعا ہے کہ انسان سے گناہ ہی سرزد نہ ہو، بلکہ اس مقام پر پہنچنے کی دعا ہے جہاں بڑے بڑے برگزیدگانِ الٰہی پہنچے۔ یعنی بڑی بڑی خدمات کے بجالانے اور بڑے بڑے کمالات کے حاصل کرنے کا اعلیٰ مقام یا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام جس پر کوئی انسان پہنچا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دعا روپیہ، مال، مرتبہ کے ملنے کے لیے نہیں۔ کمالات، معرفت، محبّت کے حصول کے لیے ہے۔

انعمت علیہم میں مقامِ نبوت کی دعا نہیں: یہاں نبی کا لفظ آ جانے سے بعض لوگوں کو یہ ٹھوکر لگی ہے کہ خود مقامِ نبوت بھی اس دعا کے ذریعہ سے مل سکتا ہے اور گویا ہر مسلمان ہر روز بار بار مقامِ نبوت کو ہی اس دعا کے ذریعہ سے طلب کرتا ہے۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے۔ **نبوّت موہبت ہے:** اس لیے کہ نبوت محض موہبت ہے اور نبوت میں انسان کی جدوجہد اور اس کی سعی کو کوئی دخل نہیں۔ ایک وہ چیزیں ہیں جو موہبت سے ملتی ہیں اور ایک وہ جو انسان کی جدوجہد سے ملتی ہیں۔ نبوت اوّل میں سے ہے جیسا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ سے بھی ظاہر ہے۔ دنیا میں کوئی شخص کوشش کرے اور دعائیں مانگ مانگ کر اور خدا سے التجائیں کر کے نہ پہلے نبی بنا نہ آئندہ بنے گا۔ بلکہ خود اللہ تعالیٰ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ کے ماتحت جب چاہتا کسی کو نبوت و رسالت کے منصب پر کھڑا کر دیتا تھا یہاں تک کہ اپنی کامل ہدایت کی راہیں آنحضرت صلعم پر کھول کر تمام آنے والی نسلوں کے لیے مقامِ نبوت و رسالت کو ایک برگزیدہ انسان کے نام کے ساتھ مخصوص کر دیا اور اس کو النبی اور الرسول کے نام سے

پکار کر بتا دیا کہ اب دُوسرا نبی اور رسول نہیں ہوگا کیونکہ اگر دوسرا نبی بھی آجائے تو یہ الفاظ مشتبہ ہوجائیں پس مقامِ نبوت کے لیے دعا کرنا ایک بے معنی فقرہ ہے اور اسی شخص کے منہ سے نکل سکتا ہے جو اصول دین سے ناواقف ہے۔

کن کمالات کی دعا ہے: ایسے بھی لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ اس دعا میں حصولِ بادشاہت کی دعا ہے کیونکہ بادشاہت کو بھی اللہ تعالٰے نے اپنا انعام قرار دیا ہے (المائدۃ ۵۔ ۲۰) اور بعض نے اسے اور بھی وسیع کرکے دنیا کے تمام امور میں صراطِ مستقیم کی دعا قرار دیا ہے۔ ادنیٰ تدبّر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب باتیں دعا کے اصل مقصد سے دور ہیں۔ بیشک بادشاہت ایک انعام ہے۔ مال و دولت بھی ایک انعام ہے، مگر یہ وہ انعامات ہیں جن میں نیک و بد شریک ہیں۔ بادشاہت ایک انعام ہے مگر ہر ایک بادشاہ منعم علیہ نہیں، دولت ایک انعام ہے مگر ہر دولتمند منعم علیہ نہیں۔ اور یہاں منعم علیہم کی راہوں کا ذکر ہے نہ خاص خاص انعامات کا مطالبہ۔ پھر منعم علیہم کے مقابلہ پر مغضوب علیہم اور ضالین ہیں جو دولت اور بادشاہت سے محروم نہیں اور نہ دنیا کے کاموں کو سرانجام دینے سے محروم ہیں بلکہ نیکی سے محروم ہیں، اخلاق فاضلہ سے محروم ہیں۔ دعا صرف اس قدر ہے کہ جن راہوں پر نیک بندے چلتے رہے انہی راہوں پر چلنے کی ہمیں بھی توفیق دے بالفاظ دیگر یہ کہ ہمیں انبیاء، شہدا، صلحاء کے نقش قدم پر چلا۔ اس دعا کے مقابل پر امور دنیا کی خواہشات ایک نہایت پست مقام ہے۔

اگر دعا حصول نبوت ہے تو امت کی محرومی لازم آتی ہے: اگر یہ دعا نبوت کے حاصل کرنے کے لیے ہوتی تو کم از کم آنحضرت صلعم کو ہی مقامِ نبوّت پر کھڑا ہونے سے پہلے سکھائی جاتی۔ مگر قرآن کریم میں اس کا موجود ہونا بتاتا ہے کہ مقام نبوت ملنے کے بعد سکھائی گئی۔ نبوت عطا فرما کر اس دُعا کا سکھانا صاف بتاتا ہے کہ حصول نبوت کے لیے یہ دعا نہیں۔ اور اگر حصول نبوت کی دعا مانا جائے تو ماننا پڑے گا کہ تیرہ سو سال میں کسی مسلمان کی دعا قبول نہ ہوئی حالانکہ مقربین اور محبوبین الٰہی تو ہزاروں کی تعداد میں ہو گذرے۔ خدا خود دعا سکھائے اس کی غرض یہ ہو کہ دعا مانگنے والے کو نبوت ملے، دعا کرنے والی اُمّت کو خیر اُمّة کہا جائے اور پھر تیرہ سو سال سب کے سب محروم رہیں حتّٰی کہ وہ بھی جن کے متعلق صریح سند ہے رضی اللّٰہ عنہم و رضوا عنہ اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔

ع ۶ المغضوب علیہم۔ غضب کے اصل معنی ہیں سزا کے ارادہ سے خون کا جوش مارنا (غ) اور حدیث میں غضب سے بچنے کی تاکید ہے اور اس کو قلب ابن آدم میں ایک انگارا قرار دیا گیا ہے۔ غضب الٰہی: مگر چونکہ اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے اس لیے جب اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ لفظ بولا جائے تو جو حصّہ جسم سے تعلق رکھتا ہے یعنی ثوران دم یا خون کا جوش مارنا۔ وہ مراد نہیں ہوتا بلکہ صرف اصل غرض باقی رہ جاتی ہے جو ارادہ سزا ہے اور یہی حالت تمام الفاظ کی ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں کہ ان میں وہ حصّہ جو جسم سے تعلق رکھتا ہے باقی نہیں رہتا تفصیل کے لیے دیکھو ۲۷ پس مغضوب علیھم وہ لوگ ہوئے جن کے متعلق ارادۂ الٰہی سزا کا ہوا۔

ع ۷ الضالّین۔ ضالّ۔ ضلال سے اسم فاعل ہے اور اس کے عام معنی ہیں سیدھی راہ سے ہٹ جانا عمداً ہو یا سہواً (غ) اور یہ ھدی کے مقابل پر ہے اس لیے اس کے معنی یوں بھی کیے گئے ہیں سلوك طريق لا يوصل الى المطلوب (ت) ایسی راہ پر چلنا جو مطلوب تک نہیں پہنچاتی پس ضالّین وہ لوگ ہوئے جو سیدھی راہ سے ہٹ گئے۔ یا ایسی راہ پر چل پڑے جو مطلوب تک نہیں پہنچاتی۔ ضلال اور اضلال کے اور معانی اپنے اپنے موقعہ پر آئیں گے۔

مغضوب علیہم اور ضالین کون ہیں: اس آیت میں کن لوگوں کا ذکر ہے؟ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ مغضوب علیھم یہود ہیں اور ضالّین عیسائی۔ اور ایک حدیث میں جس کو ترمذی نے حسن غریب کہا ہے یہی معنی آنحضرت صلعم سے مروی ہیں۔ یہود کی صفات غالب جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے یہ ہیں کہ انہوں نے انبیاء کے بارہ میں تفریط کی راہ اختیار کی یعنی عموماً انبیاء کی تکذیب کرتے رہے اور ان کے قتل کے در پے رہے اور شریعت کے احکام کی نافرمانی کی یعنی ان پر عمل نہ کیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے ذکر کے شروع میں ہی آتا ہے۔ وباؤ بغضب من الله ذٰلك بانهم كانوا يكفرون بٰايات الله ويقتلون النبيّين بغير الحق ذٰلك بما عصوا وكانوا يعتدون۔ وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اس لیے کہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھتے تھے (البقرۃ ۲۔ ۶۱) پس انبیاء کا انکار و تکذیب اور احکام الٰہی کی نافرمانی یہ وہ تفریط کی راہیں ہیں جن کی وجہ سے یہود پر غضب الٰہی آیا۔ باوجودیکہ وہ پہلے ایک ایسی قوم تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا۔ اور مسلمان کو جب یہ دعا سکھائی گئی کہ اس کا قدم مغضوب علیہم کی راہ پر نہ پڑے تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ ان تفریط کی راہوں سے بچے اور عیسائیوں کی صفاتِ غالب جن کی وجہ سے وہ طریق مستقیم سے پھر گئے قرآن کریم میں غلو اور افراط بیان کی گئی ہیں یعنی ایک نبی کو خدا بنا لینا جیسا کہ فرمایا یاَ اھل الكتاب لا تغلوا فی دینکم غير الحق ولا تتبعوا اهوآء قوم قد ضلّوا من قبل واضلّوا كثيرا وضلّوا عن سوآء السبيل (المائدۃ ۵۔ ۷۷) اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہوگئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھے رستہ سے بھٹک گئے۔ گویا اب مسلم کی دعا یوں ہوئی اے اللہ ہم کو سیدھا رستہ دکھا ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام کیا اور ان لوگوں کے رستہ پر چلنے سے بچا جو بوجہ تفریط غضب الٰہی کے نیچے آئے اور ان کے بھی جو بوجہ افراط و غلو گمراہ ہوگئے۔ بالفاظ دیگر اس صراطِ مستقیم پر چلا جو تفریط و افراط سے، تکذیب و غلو سے پاک ہے۔ یہ معنی بر بنائے قرآن و حدیث ہیں۔ حقوق میں تفریط و افراط: مگر یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تفریط و افراط تمام حقوق میں ہوسکتی ہے۔ اگر ایک نبی کا انکار تفریط اور اس کا خدا بنانا افراط ہے تو ہر ایک حق کا انکار یا اس کا ادا نہ کرنا تفریط ہے اور ہر ایک حق کو اپنے مرتبہ سے بڑھانا اور اس قدر اس پر زور دینا کہ دوسرے حقوق کی فروگزاشت کا موجب ہوجائے افراط ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ یہود عملی رنگ میں نافرمان ہوئے یعنی شریعت کے مانتے ہوئے پھر اس پر عمل نہ کیا اور عیسائی علمی رنگ میں بھٹک گئے کہ ایک انسان کو خدا بنا لیا۔

عملی اور علمی غلطیوں سے بچنے کی دعا: پس یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ اے خدا ہم کو یہود کی سی عملی اور نصاریٰ کی سی علمی غلطیوں سے بچا۔ کیونکہ انسان اپنے کمال حقیقی کو نہیں پہنچتا جب تک دونوں پہلو عمل اور علم کے صحیح نہ ہوں۔

آمین: سورہ فاتحہ کے آخر پر آمین کا پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا جب امام غير المغضوب عليهم ولا الضالّين کہے تو تم آمین کہو (بخاری) اٰمین اسم فعل ہے اور اس کے معنی ہیں اِستَجِب یعنی اے اللہ ہماری دعا کو قبول فرما۔

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ (۲)

ایاتھا ۲۸۶ رکوعاتھا ۴۰

۱ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے، باربار رحم کرنے والے کے نام سے

نام اس سورت کا نام البقرہ اس تذکرہ سے لیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیئے جانے کے متعلق اس سورت کے آٹھویں رکوع میں کیا گیا ہے۔ چونکہ اس سورت میں خاص طور پر یہودیوں کا ذکر ہے اور یہود میں جن کو اللہ تعالیٰ ایک موحد قوم بنانا چاہتا تھا۔ گائے کی پرستش کا مرض مصر میں رہ کر پیدا ہو چکا تھا۔ اس لیے گائے کے ذبح کا تذکرہ اس سورت کے اہم ترین مضامین میں سے ایک مضمون ہے۔

خلاصہ مضمون اس سورت کا خلاصۂ مضمون یہ بتایا ہے کہ مسلمان کس طرح ایک کامیاب اور زندہ قوم بن سکتے ہیں۔ چنانچہ رکوع (۱) سب سے پہلے ان اصول کا ذکر کیا جو اسلام کی بنیاد ہیں اور بتایا کہ جو ان پر عمل پیرا ہونگے وہ کامیاب ہوں گے اور جو ان کی پروانہ کریں گے دُکھ اُٹھائیں گے (۲) پھر ایک اور گروہ (منافقین) کا ذکر کیا جو منہ سے تسلیم کرتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے (۳) پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر کیا اور اس سے اس کی توحید کے دلائل دیئے اور اس کی عبادت کو ضروری ٹھہرایا (۴) پھر انسان کے کمال کا ذکر فرمایا اور اس کمال تک پہنچنے کی راہ بتائی کہ بغیر نبوّت کے وہ کمال حقیقی کو حاصل نہیں کر سکتا (۵) کمال کے بعد گر جانے کے خطرہ سے ڈرایا۔ یہود کا ذکر کیا جو ایک منعم علیہ قوم تھی مگر بوجہ اپنی نافرمانیوں کے رد کی گئی اور ان کو بتایا کہ اب بھی اگر اس نبی کو مان لو جو تمہاری اپنی پیشگوئیوں کے مطابق آیا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں شوکت وعظمت دے گا (۶ تا ۹) پھر ان پر جو انعامات کیے اور جو جو نافرمانیاں انہوں نے کیں ان کا ذکر فرمایا اور ضمناً مسلمانوں کو سمجھایا (۱۰) پھر بنی اسرائیل کے میثاق اور ان کی خلاف ورزی کا ذکر کر کے مسلمانوں کو سمجھایا کہ وہ ایسی غلطی نہ کریں (۱۱) پھر بنی اسرائیل کے ان اعتراضوں کا ذکر کیا جو انہیں اسلام پر تھے اور ان کا جواب دیا کہ کیوں بنی اسرائیل میں سے یہ نبی نہیں آیا (۱۲) پھر ان کے عداوت میں اور ترقی کر جانے اور آنحضرت صلعم کے خلاف فریبیوں والے منصوبوں کا ذکر کیا (۱۳) پھر بتایا کہ اگر پہلی شرائع کو ہم نے منسوخ کیا ہے تو ان سے بہتر شریعت تم کو دے دی ہے۔ اور بتایا کہ نجات تو صرف اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور مخلوق کے ساتھ احسان کرنے سے ملتی ہے نہ برائے نام کسی مذہب کا پیرو ہو جانے سے (۱۴) پھر بتایا کہ تھوڑی بہت سچائی ہر مذہب میں ہے مگر اسلام کامل صداقتوں کا مجموعہ ہے (۱۵) پھر فرمایا کہ موسیٰ کی پیشگوئی سے اوپر چلو تو ابراہیمؑ کے ساتھ بھی تو یہی وعدہ تھا کہ اس کی اولاد کو برکت دی جائیگی اور وہ اپنی اولاد کے ایک حصّہ کو مکہ معظمہ چھوڑ کر اور وہاں دعائیں کر کے اس بیج بتایا گیا تھا کہ آخر رحمت الٰہی اس چشمہ سے پھوٹ کر تمام دنیا کو سیراب کرے گی اور کعبہ کو قبلہ قرار دیا۔ (۱۶) پھر بتایا کہ اسی ابراہیمی مذہب پر یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط سے بگڑ کر یہ نبی کھڑا ہوا ہے (۱۷ و ۱۸) پھر بتایا کہ جب ابراہیمؑ کی دعاؤں کی صداقت یوں ظاہر ہوئی تو یہ بھی ضروری تھا کہ اس نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قبلہ کعبہ قرار دیا جاتا اور مسلمانوں کو بھی سمجھایا کہ یہ ایک قبلہ تمہارے اتحاد کا مرکز ہے (۱۹) پھر بتایا کہ کامیابی کے لیے مسلمانوں کو مال وجان کی بہت سی قربانیاں کرنی پڑینگی۔ ان اصولی باتوں کو طے کر کے اور (۲۰) پھر خدا تعالیٰ کی توحید کے مضمون کو دوہرا کر (۲۱ تا ۳۱) شریعت کی تفصیلات کی طرف رجوع کیا یہ دکھانے کے لیے کہ یہ شریعت تفصیلات میں بھی ویسی ہی باتیں یا ان سے بہتر باتیں بتاتی ہے جو یہود کی شریعت میں تھیں۔ چنانچہ غذاؤں کے حرام وحلال۔ قصاص۔ وصایا۔ روزوں۔ جنگ، حج، شراب، جُوا، یتامیٰ۔ زناشوئی کے تعلقات، طلاق، بیواؤں کا ذکر کے (۳۲ و ۳۳) پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا کہ جس طرح بنی اسرائیل ایک مردہ قوم تھی جہاد اور کوشش سے خدا نے اسے زندہ کر دیا اسی طرح مسلمانوں کو بھی اب جہاد اور کوشش کرنا ضروری ہے (۳۴) پھر خدا تعالیٰ کے حیّ وقیوم ہونے کا ذکر کر کے یہ اشارہ کیا کہ اب وہ اپنے نام لیواؤں کو زندگی بخشے گا اور انہیں بڑی قوم بنائے گا مگر ان کو اکراہ فی الدّین سے روکا۔ (۳۵) پھر بتایا کہ کیونکر وہ مردہ قوموں کو زندہ کیا کرتا ہے حضرت ابراہیمؑ اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے دو واقعات کا ذکر کیا (۳۶ و ۳۷) پھر کھول کر بتایا کہ اصل جڑ ساری کامیابیوں کی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اگر اس وقت ایک ایک دانہ ڈالو گے تو کل کو سینکڑوں نہیں ہزاروں اور لاکھوں دانے تمہیں ملیں گے۔ (۳۸) پھر بتایا کہ قربانیاں کر کے جب دولتمند ہو جاؤ تو سود نہ کھانا کیونکہ سودخور قوم آخر تباہ ہو جاتی ہے اور اخلاق فاضلہ سے عاری رہتی ہے (۳۹) ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنے حقوق کی خوب نگہداشت کیا کرو اور لین دین کے معاملات کو لکھ لیا کرو (۴۰) اور سب سے آخر سب رسولوں پر ایمان لانے کا تذکرہ کر کے بتایا کہ کامیابی اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ کامل اطاعت نہ کرو اور اس کے ساتھ خدا سے دعائیں نہ مانگو اپنا زور بھی پورا لگاؤ۔ پھر خدا کے حضور بھی گرے رہو تو ہم کافروں کے مقابلہ میں تمہاری نصرت کریں گے۔

سورہ بقرہ کا تعلق سورہ فاتحہ سے اس سورت کا تعلق ایک تو بلحاظ ترتیب سورۂ فاتحہ سے ہے چونکہ سورۂ فاتحہ میں یہ دعا سکھائی گئی تھی کہ اھدنا الصراط المستقیم تو اس کا ابتدا یوں فرمایا ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین گویا یہ اسی دعا کا جواب ہے اور بتایا کہ قرآن کریم وہ صراط مستقیم بتاتا ہے۔ اس سورت میں بتایا کہ انعمت علیہم کا گروہ وہ ہے جو ان اصولوں پر عمل پیرا ہوتا ہے جن کا ذکر صدر سورت میں ہے ساتھ ہی مغضوب علیھم یعنی یہود کا تذکرہ بالتفصیل اور ضالین یعنی نصاریٰ کا مجملاً کیا۔

سورہ بقرہ کے ابتدا میں رکھے جانے کی وجوہات: لیکن چونکہ سورۂ فاتحہ ساری قرآنی تعلیم کا نچوڑ ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن شریف کی ابتدا اسی سورۂ بقرہ سے ہوتی ہے اور یہی سچ ہے چنانچہ یہاں شروع میں ہی اس پاک کتاب کی اغراض کو بیان فرما دیا ہے اور اکمل واتم طور پر وہ باتیں بتا دی ہیں جو ایک قوانین کا واضع بطور تمہید بیان کر دیا کرتا ہے۔ کہ اوّل یہ اس خدائے علیم کی طرف سے ہے جو نہ صرف فطرت انسانی اور ضروریات بشری کو جاننے والا ہے بلکہ گزشتہ اور آئندہ کی تمام باتوں کو بھی جانتا ہے۔ پھر یہ ایک کتاب ہے، پراگندہ الفاظ یا منتشر اوراق کا مجموعہ نہیں۔ پھر اس کی غرض ہدایت یا دنیا کو راہ راست پر لانا ہے۔ اصول اسلام کی قبولیت اور انکار کے نتائج: پھر وہ اصول بیان فرما دیئے ہیں جن پر چل کر انسان ہدایت کو پا سکتا ہے اور وہ کل پانچ اصول ہیں۔ تین عقائد کے رنگ میں یعنی ایمان بالغیب (اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ پر ایمان) اللہ تعالیٰ کی وحی پر ایمان۔ اس پر جو نبی کریم صلعم

الٓمّٓ ۚ ① — میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں ؀۸

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۖۛ فِيْهِ ۚۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ② — یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں ؀۹ متقیوں کے لیے ہدایت ہے ؀۱۰

پر نازل ہوئی اور اس وحی پر جو آپ سے پہلے انبیاء پر دنیا میں نازل ہو چکی اور آخرت یعنی اعمال کی جزا و سزا پر یقین۔ اور دو عمل کے رنگ میں۔ صلوٰۃ یعنی نماز اور دعا جو حقوق اللہ کا خلاصہ ہے اور انفاق یعنی اپنی قوتوں اور مال کو مخلوق خدا کی بھلائی کے لیے خرچ کرنا جو حقوق العباد کا خلاصہ ہے۔ پھر اس کا آخری نتیجہ بتایا کہ وہ کامیاب اور بامراد ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ پہلے رکوع میں بیان فرما دیا اور یہ سورت ابتدا کے لیے ایسی موزون ہے کہ اگر اس کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو دوسری کوئی سورت اس کی جگہ نہیں رکھی جا سکتی۔ کیونکہ اور کسی سورت کی ابتدا میں اس طرح اصول اسلامی کو مکمل طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ اس سے قرآن کریم کی موجودہ ترتیب کا منجانب اللہ ہونا صاف ظاہر ہے۔

زمانہ نزول| اس سورت کا نزول مدینہ میں ہجرت کے بعد ہوا اور اس کا اکثر حصہ جنگ بدر سے پیشتر کا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ سب سے پہلی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ بعض آیات کا نزول آنحضرت صلعم کی زندگی کے آخری حصہ کا ہے۔ اس کی خاص خاص آیات کو مکی قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ صرف بعض لوگوں کا خیال ہے۔

مدنی سورتوں میں مکی آیات: گو اس میں شک نہیں کہ بعض سورتوں کا نزول ایک لمبے زمانہ پر ممتد رہا ہے مگر جب تک کوئی صریح اور بیّن شہادت نہ ہو مدنی سورتوں کی بعض آیات کو مکی اور پہلے کا نازل شدہ قرار دینا غلط طریق ہے۔ ہاں یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ مکی سورتوں میں بعض آیات ایسی ہوں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہوں۔ مگر یہ بھی محض قیاس کی بنا پر قبول نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ کوئی صاف اور واضح شہادت نہ ہو۔ پس جس طرح یہ غلط ہے کہ جو آیت یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ سے شروع ہوتی ہے وہ مکی ہے خواہ مدنی سورت میں ہو اور جو یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے شروع ہوتی ہے وہ مدنی ہے خواہ مکی سورت میں ہو۔ اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ جن آیات میں یہود و نصاریٰ کا ذکر یا توریت و انجیل کا نام ہو وہ ضرور مدنی ہیں خواہ مکی سورت میں ہوں۔

؀۸ الٓمّٓ۔ یہ حروف جو بعض سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں مقطعات کہلاتے ہیں اور قرآن کریم کی ۲۹ سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں عام طور پر ترجموں میں ان کے معنی نہیں کیے جاتے۔ حالانکہ صحابہؓ سے ثابت ہیں۔ یہ حروف الفاظ کے قائم مقام ہیں اور حروف سے الفاظ کی طرف اشارہ کرنا تمام زبانوں میں مروج ہے آج کل انگریزی میں تو یہ رواج بہت ہی بڑھا ہوا ہے۔ عرب میں بھی یہ دستور تھا چنانچہ اس مصرعہ میں قلت لھا قفی قالت قاف ق کے معنی قد وقفت ہیں یعنی میں ٹھہر گئی۔ اور بھی کئی مثالیں اس کی ہیں مگر عربی میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا کہ فلاں حرف سے فلاں لفظ کی طرف اشارہ ہوگا بلکہ سباق و سیاق سے معلوم کیا جاتا تھا۔ اس لیے قرآن کریم میں بھی یہ ضروری نہیں کہ ایک جگہ جو معنی ایک حروف کے لیے گئے ہیں دوسری جگہ بھی وہی ہوں۔ ہاں جو مجموعہ ایک ہی طرح پر آیا ہے اس کا مفہوم ایک ہی ہے جیسے الٓمّٓ کہ اس سورت کے علاوہ پانچ اور سورتوں کی ابتدا میں ہے۔ یعنی آل عمران جو البقرہ کے بعد آتی ہے اور العنکبوت[۲۹]۔ الروم[۳۰]۔ لقمان[۳۱]۔ السجدہ[۳۲] جو چاروں مکی ہیں اور ترتیب قرآنی میں ایک جگہ ہیں گویا کل چھ سورتوں کے شروع میں الٓمّٓ ہے۔

الٓمّٓ کے معنی حضرت ابن عباس سے انا اللہ اعلم مروی ہیں یعنی میں اللہ بہت جاننے والا ہوں۔

؀۹ ذٰلک: یہ لفظ عموماً اشارہ بعید کے لیے آتا ہے مگر عظمت کے ظاہر کرنے کے لیے بھی لایا جاتا ہے۔ یہاں بلحاظ عظمت کتاب ہی بولا گیا ہے دوسری جگہ ھذا کے لفظ سے بھی اشارہ فرمایا ہے۔ جیسے ھذا کتاب انزلناہ مبارک (الانعام۔ ۱۵۵) یا ذٰلک سے اشارہ بعید کتاب موعود کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی وہ کتاب جس کا وعدہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا تھا (ر)

الکتاب۔ کتاب مصدر ہے جو کتب سے مشتق ہے جس کے اصل معنی ایک دوسرے کے ساتھ ملانا یا جمع کرنا ہیں اور لکھنے کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ لکھنے میں حرف ایک دوسرے کے ساتھ ملائے جاتے ہیں اور کتاب اصل میں صحیفہ کا نام ہے مع اس کے جو اس میں لکھا گیا (غ) اور کلام اللہ کو کتاب کہا جاتا ہے۔ گو وہ لکھی ہوئی ہو یا نہ (غ) یہ لفظ قرآن شریف پر بھی بولا گیا ہے جیسے یہاں۔ کسی ایک سورت پر بھی پہلی شرائع پر بھی۔ ہر ایک نبی کی وحی پر بھی۔ جملہ انبیاء کی وحی پر بحیثیت مجموعی بھی۔

ریب۔ وہ شک جس کے ساتھ تہمت ہو (ت)

نفی ریب کا دعوے اور اس کی دلیل: یہاں اس کتاب میں ریب کی نفی کی ہے یہ ایک دعویٰ ہے جس کی صداقت کے لیے آگے چل کر فرمایا و ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ اس سے کوئی مخالف آج تک عہدہ برا نہیں ہو سکا۔ اس لیے یہ دعویٰ سچا اور ثابت شدہ قرار پایا۔

؀۱۰ ھدی یہاں بمعنی ہادی ہے یعنی ایسی راہ پر چلانے والی جو منزل مقصود تک پہنچا دے۔ دیکھو ؀۴

متقین۔ متقی۔ اِتّقیٰ سے اسم فاعل ہے اور اتقی اصل میں اِوْتقیٰ ہے جو وقی یقی سے باب افتعال ہے۔ اور مصدر وِقَایَۃ کے معنی ہیں حفظ الشئ مما یؤذیہ و یضرہ (غ) ایک چیز کی حفاظت کرنا اس سے جو اس کو ایذا دے اور نقصان پہنچائے اور تقویٰ کے اصل معنی ہیں جَعْلُ النَّفْسِ فِیْ وِقَایَۃٍ مِّمَّا یُخَافُ (غ) یعنی اپنے آپ کو اس چیز سے بچانا جس کا خوف کیا جاتا ہے اسی وجہ سے اس کے معنی بعض وقت خوف بھی کر لیے جاتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں تقویٰ اپنے آپ کو گناہ میں پڑنے سے بچانا ہے حِفْظُ النَّفْسِ عَمَّا یُؤْثِمُ (غ) متقی بروئے حدیث: اور نبی کریم صلعم نے فرمایا لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع ما لا باس بہ حذرا مما بہ باس یعنی متقی ہونے کو انسان نہیں پہنچتا جب تک کہ ان چیزوں سے بچنے کے لیے جن میں برائی ہے ان چیزوں کو بھی چھوڑ نہ دے جن میں برائی نہیں۔ اور ایک حدیث میں توقہ نفس کے متعلق آتا ہے جس کے معنی ابن اثیر نے یوں کیے ہیں کہ اپنے نفس کو ہلاکت کے لیے پیش مت کرو اور آفات سے اس کی نگہداشت کرو۔ تاج العروس میں ہے کہ توقی اور اتقی کے ایک ہی معنی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ تقوی اللہ کیا چیز ہے یا اتقوا اللہ سے کیا مراد ہے کیونکہ متقی وہی ہے جو تقوی اللہ اختیار کرتا ہے۔ ظاہر ہے

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

جو غیب پر ایمان لاتے ہیں [ع۱۱]

کہ اللہ کوئی ایسی چیز تو نہیں کہ انسان اس سے خائف ہو کر بچے یا اس سے اپنے آپ کو بچائے یا اس سے دُور ہو بلکہ اللہ کی طرف آنا اور اس کا قرب حاصل کرنا تو عین انسانی زندگی کی غرض ہے۔ قرآن شریف میں سورۃ النساء کے شروع میں آتا ہے واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام اور اللہ کا تقویٰ کرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ اور رحموں کا تقویٰ کرو۔ ان دو لفظوں کو اکٹھا کر کے قرآن شریف نے تقوی اللہ کے معنی پر روشنی ڈالی ہے۔ ظاہر ہے کہ رحموں کے تقویٰ سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ رحموں کے حقوق کی حفاظت کرو۔ تقوی اللہ حقوق کی نگہداشت اور متقی حقوق کی نگہداشت کرنے والا ہے: پس اتقوا اللہ کے معنی بھی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حقوق اللہ کی حفاظت کرو اور متقی وہی ہے جو حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو جو معنی امام راغب نے دیئے ہیں وہ یہی ہیں کیونکہ گناہ میں پڑنے سے انسان اپنے آپ کو اسی طرح بچا سکتا ہے کہ حفاظت حقوق کرے اور کوئی حق تلف نہ ہونے دے اور یہی معنی حدیث میں ہیں۔ کیونکہ نبی کریم صلعم نے متقی اسی کو قرار دیا ہے جو اپنے آپ کو ہر قسم کی برائیوں سے بچاتا ہے (اور بدی کا مفہوم حق تلفی ہے) یہاں تک کہ اگر برائی سے بچنے کے لیے کسی ایسے کام کو بھی چھوڑنا پڑے جس میں کوئی برائی نہیں تو وہ اسے بھی چھوڑ دیتا ہے۔ پس متقی اپنے آپ کو گناہ یا حق تلفی سے بچانے والا ہے اور اتقوا اللہ کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حقوق اللہ کی حفاظت کرو اور چونکہ ہر قسم کے حقوق اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کے ذمے رکھے ہیں اس لیے تقوی اللہ میں تمام حقوق کی نگہداشت آجاتی ہے اور اگر ڈرنا بھی اس کے معنی کیے جائیں تو خدا سے ڈرنا یا خوف کرنا اس کے عذاب سے ڈرنا یا اس سزا سے ڈرنا ہے جو گناہ پر ملتی ہے۔ پس اصل غرض پھر بھی گناہ سے بچنا ہوئی اور گناہ حقوق اللہ یا حقوق العباد کے ضائع کرنے کا نام ہے۔

قرآن ہدی للمتقین کس معنی سے ہے: یہاں قرآن شریف کو ھدی للمتقین فرمایا یعنی متقیوں کے لیے ہدایت۔ اور دوسری جگہ ھدی للناس فرمایا (۲: ۱۸۵) یعنی سب لوگوں کے لیے ہدایت۔ ہدی للناس کس معنی سے: ہدایت کے مختلف معنوں کے لحاظ سے یہ دونوں باتیں درست ہیں دیکھو ۵۔ اس معنی سے سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے کہ رستہ سب کو دکھا دیا اور کسی کے لیے کوئی روک نہیں جو چاہے اسے اختیار کرے جو نہ چاہے نہ کرے۔ اور متقیوں کے لیے اس معنی سے ہدایت ہے کہ ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

متقی کو ضرورت ہدایت: یہ کہنا کہ جو متقی ہے اسے ہدایت کی ضرورت نہیں لغو بات ہے۔ متقی وہی ہے جو اپنے آپ کو حق تلفیوں سے، ضرر دینے والی چیزوں سے گناہ سے بچاتا ہے۔ اس کو ضرورت ہے کہ اسے بتایا جائے کہ یہ حقوق تمہارے ذمہ ہیں۔ یہ چیزیں ضرر دینے والی ہیں حصول کمال کی یہ راہ ہے۔ ہدایت منجانب اللہ کے بغیر اور محض اپنی جد و جہد سے کوئی انسان کمال کو حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس جد و جہد کے ساتھ منجانب اللہ ہدایت بھی چاہیئے تاکہ وہ اسے روشنی کا کام دے ھدی للمتقین میں دونوں پہلوؤں کو روشن کر دیا۔ انسانی جد و جہد کی بھی ضرورت ہے اور وہ تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی طرف سے روشنی کی بھی ضرورت ہے اسی سے منزل مقصود حاصل ہوتی ہے جس طرح الحمد للہ رب العالمین کہنے والا ایاک نعبد کا اقرار کرنے والا اھدنا کی دعا کا محتاج ہے اسی طرح متقی جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا اور دُکھ دینے والی چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کتاب، اس نُور کا محتاج ہے تاکہ منزل مقصود پر پہنچ سکے۔ متقی کے لیے غیر متناہی ترقی: علاوہ ازیں یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ انسان جس قدر بھی چاہے تقویٰ میں ترقی کرتا چلا جائے ہمیشہ اپنے لیے اس کتاب میں نئی سے نئی روشنی آئندہ ترقیات کے لیے پائے گا۔ کسی مقام پر پہنچ کر یہ کتاب عاجز نہیں ہو جاتی کہ اس سے بڑھ کر کسی درجہ پر پہنچانے کے لیے میرے پاس کوئی سامان نہیں۔ جس طرح ترقی انسانی غیر متناہی ہے۔ اسی طرح اس کتاب کا نور بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

تقویٰ کمال کے حصول کی پہلی سیڑھی ہے: اور گو یہ سچ ہے کہ خود تقویٰ کے بھی مدارج ہیں اور جو شخص تقویٰ کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتا ہوا اس کتاب سے ہدایت کا طالب ہوتا ہے وہ اس کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ تاہم اس آخری منزل کا نام یہاں فلاح اور کہیں صدیقیت اور کہیں شہید کا مرتبہ رکھا ہے۔ تقویٰ یا دکھوں سے اپنے آپ کو بچانا ہی کمال انسانی نہیں بلکہ کمال انسانی کے حصول کی یہ پہلی سیڑھی ہے۔ اس کے مقابل پر وہ لوگ ہیں جو دکھوں اور تکلیفوں سے بچنے کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا ذکر آیت ۶ میں ہے۔

ع۱۱ یومنون۔ ایمان امن سے ہے اور اٰمن کا استعمال دو طرح پر ہے۔ متعدی جیسے اٰمنتہ جس کے معنی ہیں میں نے اس کے لیے امن کر دیا۔ اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا نام المؤمن ہے یعنی امن عطا کرنے والا (اپنے بندوں کو) ایمان کا دوہرا مفہوم: اور اس کا دوسرا استعمال غیر متعدی ہے جب آمن کے معنی ہونگے وہ امن والا ہو گیا۔ اصطلاح میں اس کا استعمال بعض وقت صرف اقرار لسانی پر ہوتا ہے یعنی زبان سے یہ اقرار کرنا کہ محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لایا۔ جیسے ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا (۶۲) یا جیسے یاَیھا الذین اٰمنوا اٰمنوا باللہ ورسولہ (النساء۔ ۱۳۶) اور بعض وقت اس سے مراد ہوتی ہے اپنے آپ کو تصدیق کے طور پر حق کا بکلی فرمانبردار کر دینا اور اس کے لیے تین باتوں کا جمع ہونا ضروری ہے زبان سے اقرار کرنا، دل سے حق جاننا اور اس کے مطابق اعضا سے کام کرنا جیسے والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اولئک ھم الصدیقون والشھداء (الحدید۔ ۱۹) اور پھر اس کا اطلاق اعتقاد اور سچے قول اور عمل صالح ہر ایک پر بھی ہو جاتا ہے (غ)

ایمان کے معنی پر حدیث سے روشنی: احادیث نبوی سے بھی ایمان کے اس معنی پر شہادت ملتی ہے بعض جگہ ایمان میں صرف اعتقاد کا ذکر کیا ہے اور بعض جگہ صرف اعمال صالح کا اور بعض جگہ دونوں کو ملا کر۔ اوّل تو ظاہر ہے۔ دوسرے کی مثال ہے۔ کہیں فرمایا کہ حیا ایمان سے ہے، کہیں فرمایا ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں اسی طرح دوسرے اعمال کو ایمان میں داخل کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ زبان سے اقرار ایمان کا بیج ہے لیکن اس کی نشوونما اس کی تکمیل بغیر اعمال صالحہ کے نہیں ہوتی۔

ایمان کا مفہوم خاص اسلام میں: ایمان کا وہ مفہوم اسلام میں نہیں جو دوسرے مذاہب میں ہے جیسے مثلاً عیسائی مذہب میں کفارہ پر ایمان کو محض ایک بات کے اقرار کر لینے کا نام ہے۔ اسلام میں ایمان ایک معنی رکھتا ہے اور اس کے مطابق ایک عمل ہے اللہ پر ایمان یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اخلاق اللہ کے رنگ میں رنگین کرے۔ اس کی محبت اور معرفت کے حاصل کرنے کو زندگی کی اصل غرض سمجھے۔ فرشتوں پر ایمان ان کی نیک تحریکوں کو قبول کرنا ہے۔ رسولوں پر ایمان ان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ کتابوں

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ — اور نماز قائم کرتے ہیں۱۲ اور اس سے جو ہم نے اُن کو دیا

پر ایمان ان کی باتوں پر عمل پیرا ہونا ہے۔ آخرت پر ایمان یہ ہے کہ ہر ایک فعل کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ کسی اپنے کام کو انسان لغو نہ سمجھے۔ علی ھذا القیاس۔

الغیب مصدر ہے، جو چیز انسان کی آنکھ سے چھپ جائے اس پر غاب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ایسا ہی جو چیزیں حواس ظاہری سے مخفی ہوں اور غیب اور غائب کسی چیز کو محض لوگوں کے لحاظ سے کہیں گے اور اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشھادۃ یعنی ان چیزوں کو جاننے والا جن کو انسان نہیں دیکھتا اور ان کو بھی جنہیں وہ دیکھتا ہے۔ اور یہاں الغیب سے مراد وہ امور ہیں جو حواس کے ماتحت نہیں آتے اور بداہت عقل ان کی مقتضی نہیں اور ان کا علم انبیاء علیہم السلام کے خبر دینے سے ہوتا ہے (غ) مفسرین میں سے کسی نے الغیب سے مراد یہاں قرآن کو لیا ہے (ج) حالانکہ اس کا ذکر علیحدہ ما انزل الیک میں موجود ہے اور بعض نے اللہ اور فرشتوں اور رسولوں پر ایمان (ف) اور بعض نے اللہ تعالیٰ (ر۔ ف) اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غیب در غیب اور نہاں در نہاں اور وراء الوریٰ ہے یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ ہاں ملائکہ بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

ایمان بالغیب کی حقیقت: ابتدا میں بجائے اللہ پر ایمان کے الغیب کا لفظ کیوں اختیار فرمایا، ایک یہ بتانے کو کہ اس کی صفات پر آگہی انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے ہی ہوتی ہے۔ دوسرے تمام ترقیات کا مدار ایمان بالغیب پر ہے۔ ہر ایک علم میں کچھ باتیں مان کر انسان چلتا ہے نتائج ان کی صحت کی تصدیق کر دیتے ہیں۔ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت پہلے دن حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ذات نہاں در نہاں ہے۔ ہاں اسی الغیب پر ایمان لا کر جب انسان قدم آگے بڑھاتا ہے تو آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کامل بھی حاصل کر لیتا ہے بلکہ اس سے ہمکلام بھی ہو جاتا ہے گویا یوں کہنا چاہیئے کہ غیب سے شروع کر کے قرآن شاہدہ تک پہنچا دیتا ہے۔

فلاح یا دینی اور دنیوی کامیابی کے لیے جو پانچ اصول اسلام نے یہاں ابتدائے سورت میں قرار دیئے ہیں ان میں سے پہلا یہ ایمان بالغیب یا ایمان باللہ ہے۔

ع۱۲ یقیمون۔ اقام کا مادہ قوم ہے اور اقام الامر کے معنی ہیں کام کو درست حالت میں رکھا۔ صلوٰۃ کی اقامت کا مفہوم: قرآن کریم میں جہاں مدح یا تحریص کے مقام پر صلوٰۃ کا ذکر آیا ہے وہاں اقام یا اس کے مشتقات کو استعمال کیا ہے جیسے اقیموا الصلوٰۃ۔ یقیمون الصلوٰۃ۔ المقیمین الصلوٰۃ اور صلوٰۃ کے ساتھ اقامت کو خاص کیا ہے۔ متنبہ کرنے کو کہ مقصود اس کے حقوق اور شرائط کا پورا کرنا ہے نہ صرف ظاہری صورت کا ادا کرنا اور اسی لیے یہ روایت ہے کہ مصلّی یعنی نماز پڑھنے والے بہت ہیں اور اس کے قائم کرنے والے تھوڑے (غ) اور یہی وجہ ہے کہ ذم کے مقام پر لفظ مصلّی اختیار کیا ہے نہ مقیم الصلوٰۃ۔ فویل للمصلّین (الماعون ۱۰۷-۴) اقامت کے حقوق و شرائط کا ذکر خود قرآن شریف میں موجود ہے (۱) طہارت جسمانی جیسے وضو غسل وغیرہ۔ (المائدۃ ۵-۶) (۲) اوقات مقررہ پر ادا کرنا ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتٰبًا موقوتا (النساء ۴-۱۰۳) (۳) نماز پر دوام یعنی سب نمازوں کا ادا کرنا یہ نہیں کہ کوئی پڑھ لی، کوئی چھوڑ دی علی صلاتہم دائمون (المعارج ۷۰-۲۳) (۴) نماز کی محافظت سفر ہو یا بیماری ہو جنگ ہو کوئی سی مشکلات ہوں نماز نہ چھوڑے ھم علی صلاتہم یحافظون (المعارج ۷۰-۳۴) (۵) نماز کی اصل حقیقت سے غافل نہ ہو عن صلاتہم ساھون (الماعون ۱۰۷-۵) (۶) ریا سے پاک ہو الذین ھم یراءُون (الماعون ۱۰۷-۶) (۷) نماز کی ادائیگی میں طبیعت میں کسل نہ ہو منافقوں کے ذکر میں ہے لا یاتون الصلوٰۃ الا وھم کسالیٰ (التوبۃ ۹-۵۴) رسول اللہ صلعم کی نسبت احادیث میں ہے کہ آپ نماز میں راحت محسوس کرتے تھے (۸) باجماعت ہو وارکعوا مع الراکعین (۲-۴۳) (۹) نماز میں خضوع و خشوع ہو الذین ھم فی صلاتہم خاشعون (المؤمنون ۲۳-۲) (۱۰) بدیوں اور ناشائستہ امور سے رک جائے ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر (العنکبوت ۲۹-۴۵)

الصلوٰۃ۔ صَلِیَ آگ کے جلانے پر بولا جاتا ہے اور آگ میں داخل ہونے پر یصلی النار الکبریٰ۔ یصلون سعیرا۔ اور صلوٰۃ کے اصل معنی دعا اور برکت دینا ہیں۔ چنانچہ صلیت علیہ کے معنی دعوت لہ آتے ہیں یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی اور شاعر کہتا ہے وصلّٰی علٰی دَنِّهَا وَارْتَسَمْ۔ اس کے مشکیزہ پر دعا اور التجا کرتا رہا۔ قرآن شریف میں ہے وصل علیھم ان صلوٰتک سکن لھم (التوبۃ ۹-۱۰۳) اِنَّ اللہ وملٰئکتہٗ یصلّون علی النبی (الاحزاب ۳۳-۵۶) اولٰئک علیھم صلوات من ربھم (۲-۱۵۷) اور عبادت کی جگہ کو بھی صلوٰۃ کہا جاتا ہے لھدّمت صوامع وبیع وصلوٰت (الحج ۲۲-۴۰) اور وہ نماز مخصوص بھی اس سے مراد ہے جو نبی صلعم نے مسلمانوں کو سکھائی اور وہ اقامت کے ساتھ صرف اسی ہیئت خاص سے ہی مخصوص ہے (غ) یعنی اقامت صلوٰۃ سے مراد نماز پڑھنا ہی ہے۔

نماز کی تفصیلات: نماز کے متعلق قرآن شریف میں یہ تو فرمایا کہ نماز کتٰبا موقوتا ہے یعنی اس کا اوقات مقررہ پر ادا ہونا ضروری ہے، لیکن اس کی تفصیلات کتنی دفعہ دن میں نماز ہو، کون کون سے وقت پر ہو، رکعات کی تعداد، ان کے ارکان اور ارکان کی ترتیب، اذکار کا ذکر قرآن شریف میں کسی ایک جگہ نہیں دیا۔ اشارۃ النص کے طور پر کوئی شخص کوئی نتیجہ نکال لے تو اور بات ہے۔ ارکان و اوقات میں اتحاد اسلامی: دوسری طرف ان تمام تفصیلات میں عالم اسلامی میں حیرت انگیز اتحاد پایا جاتا ہے۔ سُنّی، شیعہ، خوارج، مقلد، غیر مقلد۔ پھر وہ فرقے جو ایک دوسرے کے ہمیشہ دشمن رہے مشرق سے لیکر مغرب تک اور ابتدا سے لیکر آج تک ایک ہی نماز پڑھتے چلے آئے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ چین ہو یا افریقہ کا جنگل، جزائر بحر ہند ہوں یا روس کے دور دراز مقامات جہاں چلے جاؤ، ایک ہی اوقات ایک ہی تعداد رکعات، ایک ہی ترتیب پاؤ گے جس طرح اللہ ایک، رسول ایک، قرآن ایک، قبلہ ایک ہے اسی طرح نماز بھی ایک ہے۔ آنحضرت ؐ کی نماز: یہ اتفاق کبھی پیدا نہ ہو سکتا اگر یقیمون الصلوٰۃ کے سب سے پہلے عامل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی نماز نہ پڑھی ہوتی۔ اور پھر آپ کو دیکھ کر صحابہ اور ان کو دیکھکر تابعین نے علیٰ ہذا یہی نماز پڑھی۔ پس یہی وہ صلوٰۃ ہے جس کی اقامت کا یہاں حکم ہے۔

ایمان بالغیب اور صلوٰۃ کا تعلق: یہ نماز اللہ کا قرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس لیے ایمان بالغیب کے بعد فوراً اس کا ذکر کیا اور ایمان کے ساتھ عمل کا ذکر اصول میں داخل کر کے اس کی اہمیت بتا دی۔ خدا پر ایمان ایک منہ کی بات رہتی اگر اس کے ساتھ وہ ذریعہ نہ بتا دیا ہوتا جس سے اس نہاں در نہاں ہستی سے انسان کا تعلق پیدا ہو سکتا۔ یعنی انسان اپنے کمال حقیقی کو پہنچ سکتا ہے۔ صلوٰۃ چونکہ خدا کے آگے گرنے اور عاجزی کا نام ہے اس لیے جس قدر زیادہ انسان خدا کے حضور گریگا اسی قدر زیادہ اخلاق الٰہی میں رنگین ہو گا اور ایمان کی اصل غرض پوری ہو گی۔ پس نماز دوسرا رکن ان پانچ ارکان میں سے ہے جو اسلام کی بنیاد قرار دیئے گئے اور عملی ارکان میں سے یہ پہلا ہے۔

يُنْفِقُوْنَ ۝۳ — خرچ کرتے ہیں ع۱۳

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ — اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اُتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اُتارا گیا ع۱۴ اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں ع۱۵

ع۱۳ رزقنٰھم۔ رزق کا لفظ کبھی عطائے جاریہ پر استعمال ہوتا ہے دنیوی ہو یا آخرت کے متعلق کبھی حصہ یا نصیب پر کبھی غذا پر (غ) اس لیے یہاں مما رزقنٰھم میں نہ صرف مال داخل ہے بلکہ جاہ اور علم بھی (غ) بلکہ جو کچھ قواء انسان کو دیئے گئے ہیں سب اس میں شامل ہیں۔

ینفقون۔ انفاق نَفَقَ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز گزر گئی اور نَفَق سرنگ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کے اندر چلی جاتی ہے اور اسی سے نفاق ہے جس کے معنی ہیں ایک رستہ سے دین میں داخل ہونا اور دوسرے سے نکل جانا (غ) اور اَنْفَقَ جب لازمی ہو تو اس کے معنی مال جاتا رہنے کے ہوتے ہیں جیسے اذا لامسکتم خشیۃ الانفاق (بنی اسرائیل۱۷-۱۰۰) جہاں انفاق کے معنی فناء ہیں۔ اور متعدی ہو تو خرچ کرنا معنی ہوتے ہیں (ت)

انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم: یہ تیسرا اصول ہے اور عملی رنگ میں دوسرا جس کو اختیار کئے بغیر فلاح حاصل نہیں ہو سکتی اور ماحصل اس کا یہ ہے کہ اپنی تمام طاقتوں کو اور مال کو اور علم کو خدا کی راہ میں یعنی مخلوق کی بھلائی کے لیے لگا دے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی محض اس کا ایک حصہ ہے۔ نماز کے بعد اس کا ذکر ترتیب طبعی کے مطابق ہے اس لیے کہ مخلوق کی خیرخواہی صحیح رنگ میں وہی انسان کر سکتا ہے جس کا تعلق خالق سے پیدا ہو۔ اور خالق سے تعلق پیدا ہونے کا ذریعہ نماز ہے۔ پس جب نماز سے یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ انسان خدا سے تعلق پیدا کر کے اخلاق الٰہی کے رنگ میں رنگین ہوا اور صفات الٰہی میں سب سے پہلی صفت ربوبیت ہے تو انسان کے لیے مخلوق کی خدمت ضروری ٹھہری کیونکہ اگر بذریعہ نماز خدا سے تعلق پیدا کر کے مخلوق کی خدمت کا شوق پیدا نہیں ہوا، تو نماز کی اصل غرض ہی مفقود ہو گئی۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے اکٹھے ذکر میں حکمت: یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں ہمیشہ اقامت صلوٰۃ کے بعد زکوٰۃ کا یا خدمت مخلوق کا ذکر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز کی حقیقت سے بے خبری کا ذکر کیا۔ وہاں بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز صرف دکھاوے کی پڑھتے ہیں۔ کیونکہ مخلوق خدا کی خدمت کے چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں کرتے الذین ھم یراؤن ویمنعون الماعون (الماعون۱۰۷-۶و۷) حسن و احسان: عملی طور پر تکمیل نفس انسانی کے یہ دو ہی پہلو ہیں۔ خدا کے حضور جھکنا اور مخلوق خدا کی خدمت۔ ایک کو حسن کہہ لو، دوسرے کو احسان۔ جب نماز کے ذریعے حسن پیدا ہو تو مما رزقنٰھم میں احسان کی تعلیم دی۔

ع۱۴ انزل۔ نزول کے اصل معنی گو اوپر سے نیچے آنے کے ہوں مگر استعمال میں اوپر سے نیچے آنا اس کے معنی میں ضروری جزو نہیں اور انزال مطلق ایصال و ابلاغ ہے یعنی ایک چیز کا پہنچا دینا (غ) قرآن کریم میں ہے انزلنا علیکم لباسا یواری سوأتکم (الاعراف۷-۲۶) وانزل لکم من الانعام ثمٰنیۃ ازواج (الزمر۳۹-۶) انزلنا الحدید (الحدید۵۷-۲۵) حالانکہ لوہا، چارپائے، لباس اوپر سے نہیں اُترتے۔ وحی اور رسول کا نزول: تنزیل یا انزال کا لفظ نہ صرف انبیاء علیہم السلام کی وحی پر استعمال ہوا ہے بلکہ خود رسول اللہ صلعم کے مبعوث ہونے کو بھی انزل کے لفظ سے ہی تعبیر کیا ہے۔ قد انزل اللہ الیکم ذکرا رسولا (الطلاق۶۵-۱۰) جس کی تفسیر کرتے ہوئے امام راغب فرماتے ہیں کہ یہاں رسول اللہ صلعم کا نام ذکر رکھا جیسا حضرت عیسیٰ کا نام کلمۃ رکھا اور لکھتے ہیں کہ انزالِ ذکر سے مراد بعثت آنحضرت صلعم ہے۔

وحی الٰہی پر ایمان: اب چوتھا اصول بیان فرماتا ہے جس پر ایک متقی انسان کو عمل پیرا ہونا چاہیئے اور وہ ہے ایمان اس پر جو محمد رسول اللہ صلعم کی طرف اتارا گیا اور اُس پر جو آپ سے پہلے اتارا گیا۔ اور اعتقادی اصول میں سے یہ دوسرا ہے گویا پہلا ایمان باللہ اور دوسرا وحی الٰہی پر ایمان۔ کیونکہ اللہ پر ایمان پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وحی پر ایمان نہ ہو۔ وحی الٰہی خالق اور مخلوق کے درمیان سچا تعلق پیدا کرتی ہے پس ایمان کامل اللہ تعالیٰ پر صرف وحی سے پیدا ہوتا ہے اور خالی نظارۂ قدرت سے کبھی ایمان پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں انسان اقرار کر سکتا ہے کہ اس کا کوئی صانع ہے مگر ایمان جس سے عمل کی طاقت پیدا ہوتی ہے وہ اس تعلق کے قیام سے پیدا ہوتا ہے جو فی الواقع خالق اور مخلوق میں ہے اور اس کا واحد ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ اسی کی طرف خود لفظ الغیب میں بھی اشارہ ہے۔

پہلی وحی پر ایمان میں حکمت: مگر یہاں وحی پر ایمان کی ضرورت میں صرف قرآن پر ایمان ہی ضروری قرار نہیں دیا بلکہ پہلے بھی وحی الٰہی انبیاء پر آتے رہنے کو جزو ایمان قرار دیا۔ تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ محمد رسول اللہ صلعم سے کوئی الگ معاملہ نہیں بلکہ خالق اور مخلوق کا یہ تعلق ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور اس لیے بھی ما انزل من قبلك کی ضرورت پیش آئی کہ قرآن کی وحی کل عالم کی طرف تھی اور کل قوموں کو اس پر اکٹھا کرنا تھا۔ اس لیے پہلی وحیوں کا ذکر کرنا اس کے لیے ضروری ہوا۔ غرض ما انزل من قبلك کہہ کر ایک عظیم الشان اتحاد کی بنیاد رکھی، کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت جسمانی سارے انسانوں کے لیے ہے اس کی ربوبیت روحانی بھی سب قوموں کے لیے ہے۔ ایک عرب کے اُمی نے یہ اصول دنیا کو سکھلایا جس کو بڑے سے بڑے فلاسفر دریافت نہ کر سکے۔ جہاں ما انزل الیك یعنی قرآن کریم پر عمل ضروری ہے پہلی وحی پر عمل کی ضرورت نہیں۔ وہاں پہلی کتابوں کے متعلق چونکہ دوسری جگہ قرآن شریف نے خود بیان فرما دیا کہ ان میں تحریف ہو چکی ہے اس لیے ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں ان کی تعلیم وقتی ضرورت زمانہ اور ضرورت مکان کے لحاظ سے تھی جس کا بہت سا حصہ قابل عملدرآمد نہ رہا اور جو تعلیم ہمیشہ رہنے کے قابل تھی اسے قرآن شریف نے اپنے اندر کامل طور پر جمع کر لیا جیسا کہ فرمایا فیھا کتب قیمۃ (البینۃ۹۸-۳) پس عمل کی ضرورت صرف قرآن پر ہے۔

ع۱۵ اخرۃ۔ آخِر اوّل کے مقابلہ پر ہے اور آخَر واحد کے مقابلہ پر اور الدار الاخرۃ سے مراد النشأۃ الثانیۃ ہے یعنی دوسری زندگی اور کبھی دار کا لفظ محذوف کر کے الاخرۃ سے مراد دار الاخرۃ لیا جاتا ہے (غ) یہ تو لغت کی شہادت ہے قرآن شریف کو دیکھا جائے تو اس میں الاخرۃ کا لفظ جہاں ایمان بالآخرۃ یا کفر بالآخرۃ کا ذکر ہے اس موقعہ کے سوائے اٹھارہ موقعہ پر آتا ہے اور کسی ایک جگہ بھی سوائے النشأۃ الثانیۃ کے کوئی دوسرے معنی مراد نہیں پس یہ قطعی شہادت ہے۔ دیکھو الانعام۶-۹۲و۱۱۳و۱۵۰، الاعراف۷-۴۵، یونس۱۰-۱۹، یوسف۱۲-۳۷، النحل۱۶-۲۲و۶۰، بنی اسرائیل۱۷-۴۵، المومنون۲۳-۷۴، النمل۲۷-۳و۴، لقمان۳۱-۴

أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾

یہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں ؏۱۶

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾

جنھوں نے انکار کیا (یہاں تک) کہ ان کے لیے برابر ہے کہ تو اُن کو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ نہیں مانتے ؏۱۷

السبا ۳۴ - ۸ و ۲۱، الزمر ۳۹ - ۴۵، حم السجدہ ۴۱ - ۷، النجم ۵۳ - ۲۷ پس الاٰخرۃ سے مراد الوحی الاٰخرۃ لینا اور پھر یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن کریم کے بعد کوئی اور وحی بھی نازل ہونیوالی ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہوگا خلاف قرآن کریم ہے۔

یوقنون یقین۔ علم کی وہ صفت ہے جو معرفت و درایت وغیرہ سے بڑھ کر ہے (غ)

ایمان بالآخرۃ کا مفہوم: ایمان بالآخرۃ پانچواں اصول مذہب کا قرار دیا۔ الاٰخرۃ یا النشاۃ الثانیۃ وہ زندگی ہے جو انسان کے ان اعمال کا نتیجہ ہے جو وہ اس دنیوی زندگی میں کرتا ہے۔ اس زندگی پر یقین رکھنا یہی ہے کہ انسان اعمال کی جزا و سزا پر یقین کامل رکھے جب ایک انسان ایک فعل کے نتیجہ کو بُرا جانتا ہے تو وہ عموماً اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب اچھا جانتا ہے تو اُسے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اگر فوری نتیجہ ایک کام کا اچھا بھی ہو مگر آخر کار اس کا اثر بُرا ہو تو عقلمند انسان اس سے بھی بچتا ہے کھیل کود کو ایک نادان بچہ پسند کرے گا مگر ایک عقلمند انسان آج سے دس بیس بعض وقت سو سو سال آئندہ کے نتائج پر نگاہ رکھتا ہے۔ یورپ کے مدبرین کی چالیں اسی اچھی صفت کا استعمال بد ہیں جتنی وسیع نگاہ ہوگی اسی قدر زیادہ ایک شخص ضرر سے بچ سکے گا۔ مذہب کی اصل غرض: مذہب انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اعمال کے نتائج صرف اسی انسانی زندگی تک محدود نہیں بس اور سو سال تک محدود نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں سالوں تک چلتے ہیں اور اس دنیا کی زندگی کے بعد بھی انسان پر اپنا اچھا یا بُرا اثر ڈالتے ہیں بلکہ جس طرح یہاں بعض وقت فوری نتیجہ ایک فعل کا اچھا نظر آتا ہے مگر اس کا انجام بُرا ہوتا ہے اسی طرح اس دنیا میں ایک فعل کا نتیجہ اچھا نظر آیا ہے مگر دوسری زندگی میں اس کا نتیجہ بد ہوتا ہے پس جو عمل فی نفسہٖ بُرا ہے اسکا نتیجہ یہاں اچھا بھی نظر آتا ہو تو بھی وہ ترک کرنیکے قابل ہے جو عمل فی نفسہٖ اچھا ہو اسکا نتیجہ یہاں بُرا بھی نظر آتا ہو تو بھی وہ کرنیکے قابل ہے یوں ہر ایک عمل کی ذمہ داری اس عمل کے اچھا یا بُرا ہونے کے لحاظ سے انسان کو سمجھنی چاہیئے نہ ان نتائج سے جو ممکن طور پر اس دنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں ایک شخص جھوٹ بول کر دوسرے کا مال لے سکتا ہے اور سزا سے بھی بچ سکتا ہے ایک قوم بوجہ اپنی طاقت جسمانی کے دوسری پر ظلم کر سکتی ہے اور اس کا کچھ بگڑتا بھی نظر نہیں آتا۔ مگر ایک متقی انسان جو کچھ کرے محض اس بات کو مدنظر رکھ کر کرے کہ یہ کام اچھا ہے یا بُرا۔

جزا و سزا پر یقین گناہ سے بچاتا ہے: اٰخرۃ کے ساتھ یقین کا لفظ بتاتا ہے کہ اعمال کی جزا و سزا پر جب تک یقین کامل نہ ہو اس وقت تک انسان گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ بہت لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر چونکہ دل میں یقین نہیں اس لیے گناہ کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہیں جس شخص کو یقین ہو کہ فلاں سوراخ میں سانپ ہے وہ اس میں ہاتھ نہیں ڈالتا پس کس طرح وہ اعمال کی جزا و سزا پر یقین رکھتا ہوا اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر سکتا ہے؟

؏۱۶ علیٰ ھدًی یعنی ہدایت پر متمکن ہو گئے اور اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہونگے اور ان کو ایک نور اور روشنی مل جاتی ہے یہ معنی ہدایت کے یہاں حضرت ابن عباسؓ نے کیے ہیں (ج)

المفلحون ۔ فلح کے اصل معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں۔ زمین میں ہل چلانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس لیے کسان کو فلّاح کہتے ہیں اور فلاح کے معنی ظفر و ادراک بُغیۃ ہیں (غ) یعنی کامیابی اور مطلوب کا پالینا۔ کیونکہ جس طرح ہل چلانے سے زمین کی مخفی طاقتیں اور اصلی جوہر باہر نکل آتے ہیں اسی طرح قوائے انسانی کا بھی حال ہے۔ ان کے مخفی جوہروں کا باہر نکل آنا ہی حقیقت میں کامیابی ہے پس فلاح سے مراد صرف دنیوی کامیابی نہیں بلکہ انسان کے مخفی قوٰی کا ظہور پذیر ہونا ہے محض دنیا کا مال کما لینا یا بادشاہت کا حاصل کر لینا فلاح نہیں اور نہ ایسا شخص مفلح کہلا سکتا ہے بلکہ فلاح کے معنی الفوز والخیر یعنی دنیوی اور دینی دونوں کامیابیوں کو شامل کرتے ہیں۔ چنانچہ تاج العروس میں ہے کہ ائمہ لسان کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی زبان میں فلاح کے لفظ سے بڑھ کر دینی اور دنیوی دونوں بھلائیوں کو شامل رکھنے والا اور کوئی لفظ نہیں۔

مفلح کون ہیں: یہاں یہ فرمایا کہ ان پانچ اصولوں کو قبول کر کے قرآن کریم کو اپنا دستور العمل بنا لینے والے لوگ ہدایت پر ہیں۔ اور ان کے ہدایت پر ہونے کی یہ دلیل ہے کہ وہ فلاح حاصل کرلیں گے یعنی دینی و اُخروی کامیابی حاصل کرلیں گے اور ان کے جسمانی اور روحانی قوٰی اعلیٰ درجہ کا نشوونما پالیں گے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا ثبوت دنیا کو دے دیا۔ گویا علیٰ ھدًی دعوےٰ تھا۔ ھم المفلحون اس کی دلیل ہے۔

؏۱۷ کفروا۔ کافر: کفروا۔ کُفر لغت میں سَتْرُ الشَّیءِ یعنی ایک چیز کو ڈھانکنے کا نام ہے۔ چنانچہ رات کو کافر کہہ دیا جاتا ہے اور کسان کو بھی کافر کہہ دیا جاتا ہے اس لیے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے اور کفر نعمت کی ناشکرگزاری ہے اس لیے کہ اس کا شکر ادا نہ کرنا گویا اس کو چھپانا ہے اور سب سے بڑا کفر انکار توحید یا شریعت یا نبوت ہے (غ)۔ ہر فعل مذموم کفر میں داخل ہے اصل اور فرع کا کفر: اور جس طرح ہر ایک فعل محمود یعنی قابل تعریف فعل ایمان سے ہے اسی طرح ہر ایک فعل مذموم کفر ہے (غ) اور ابن اثیر نے لکھا ہے کہ کفر دو قسم کا ہے ایک اصل ایمان کا کفر اور اس کی ضد اور دوسرا فروع اسلام میں سے کسی فرع کا کفر اس سے انسان اصل ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ چنانچہ ازہری کا قول نقل کیا ہے۔ قد یقول المسلم کفرا پس اصطلاح شریعت میں کفر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار ہے اور اس کے نیچے جو بعض افعال کا نام کفر رکھ دیا ہے جیسے سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر یا من رغب عن ابیہ فقد کفر وغیرہ تو یہ محض فرع کا کفر ہے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا اور اصل معنی میں وسعت ہے۔

انذرت ۔ نذر ہے جس کے معنی ہیں اپنے نفس پر کسی چیز کو واجب کر لینا (غ) اور اَنْذَرَ یا اِنْذَار کے اصل معنی قاموس میں صرف اَعْلَمَ ہیں یعنی ایک بات کا

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۚ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫

اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر مُہر لگا دی اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے ؏۱۸

اس کو علم دے دیا رت) اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ انذار یہ ہے کہ ایک بات کے پہنچانے میں انسان کو محتاط کیا جائے اور ڈرایا جائے اور اصل معنی اِنْذار کے اعلام ہی ہیں یعنی ایک بات سے آگاہ کر دینا رت) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مُنذِر ایسا علم دینے والا ہے جو قوم کو خطرات سے آگاہ کرے جیسے دشمن وغیرہ سے پس انذار کے اصل معنی دھمکانا نہیں بلکہ ایک علم دینا ہیں اور بالخصوص وہ علم جو کسی آنے والے خطرہ سے آگاہ کرتا ہے۔

اضداد کا ذکر: قرآن کریم کا قاعدہ ہے کہ اضداد کا ذکر بالمقابل کر کے اصل مقصود کو ظاہر کرتا ہے جب متقیوں کا ذکر کیا اور ان کے فلاح پانے یعنی اپنے کمال حقیقی کو پہنچ جانے کا، تو اب اُن لوگوں کا ذکر کرتا ہے کہ جب ان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ تمھارے یہ افعال بُرے ہیں اور ان کا نتیجہ اچھا نہیں تو وہ پروا بھی نہیں کرتے۔ متقی تو وہ ہے جو ہر ایک دُکھ کی بات سے بچتا ہے اور اس کے مقابل پر وہ شخص ہے جس کو جب بتایا جاتا ہے کہ دُکھ دینے والی چیز ہے تو پروا بھی نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں ھدی للمتقین کہنے سے جو شبہ وارد ہوتا تھا کہ جب یہ کتاب تمام دنیا کے لیے ہے تو کیا بعض قسم کے لوگ اس سے محروم بھی رہ جائیں گے اس کا جواب دیا ہے کہ محروم وہی رہیں گے جن کو پروا نہیں۔

انذار کی پروا نہ کرنے والے: جملہ سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم جملہ معترضہ ہے جو اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کی حالت کو بیان کرتا ہے بحر المحیط اور روح المعانی میں اس ترکیب کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ اور اس کو جملہ معترضہ نہ ماننے کی صورت میں کوئی معنی صحیح نہیں بنتے۔ کیونکہ اگر اسے ان الذین کفروا کی خبر قرار دیا جائے تو معنی یوں ہونگے کہ جو کافر ہوئے ان پر تیرا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعات ہے اور خلاف واقعات معنی قرآن کریم کے قبول نہیں ہو سکتے۔ آنحضرت صلعم کفار کو ہی ڈراتے تھے اور قرآن کریم میں بھی بار بار کفار کو ڈرانے کا حکم ہے۔ اور ان میں سے لوگ مسلمان بھی ہوتے گئے۔ پس اصل معنی یوں ہیں کہ جنھوں نے کفر کیا اور ایسا کفر کہ ان پر تیرا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے وہ ایمان نہیں لاتے۔ اور یہ سچ بھی ہے جو شخص ڈرانے کی پروا نہیں کرتا وہ کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہاں جب دل کی اس حالت کو تبدیل کر لیتا ہے تو پھر وہ بھی فائدہ اُٹھا لیتا ہے۔ یہ حکم ایک خاص حالت پر ہے کسی خاص انسان پر نہیں۔

؏۱۸ ختم۔ ختم و طبع کے لغت میں ایک ہی معنی ہیں یعنی ایک چیز کو ڈھانک دینا اور ایسا مضبوط باندھ دینا کہ دوسری چیز اس میں داخل نہ ہو سکے (ت)

دلوں پر مہر سے مراد: امام راغب نے مفردات میں دلوں پر ختم یا مہر کرنے کی تشریح یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ جب ایک شخص اعتقاد باطل میں یا ارتکاب گناہ میں حد سے بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ کسی طرح پر حق کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا تو یہ اس میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو اس کو گناہ کے اچھا سمجھنے کا عادی کر دیتی ہے گویا اس کے ساتھ اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ ایسا ہی استعارہ ہے جیسے جعلنا علیٰ قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ (الانعام۔ ۲۵) میں یا جعلنا قلوبھم قاسیۃ (مائدہ۔ ۱۳) میں استعارہ ہے۔

غشاوۃ۔ غشی مادہ ہے جس کے معنی ڈھانکنا ہیں۔ اور غشاوۃ وہ ہے جس کے ساتھ کوئی چیز ڈھانکی جائے۔ غَشِیَ۔ یَغْشٰی۔ تَغَشّٰی۔ غاشیۃ۔ مغشی۔ اِسْتَغْشَوْا وغیرہ بہت سے مشتقات اس سے قرآن شریف میں آئے ہیں۔

خدا کا مہر لگانا انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے: اس آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کا پہلی آیت میں ہے علی قلوبھم میں جو ضمیر ھم ہے وہ عام کافروں کی طرف نہیں جاتی، بلکہ صرف انہی کفار کی طرف جن کے لیے ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے جو کفر کے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ پس یہ مہر لگانا ابتدا کے طور پر نہیں کہ بعض انسانوں کو خدا نے پیدا ہی ایسا کیا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے بلکہ یہ مہر لگانا بطور نتیجہ کے ہے۔ جب ایک شخص اپنے دل سے غور و فکر کا کام نہیں لیتا تو وہ قوت سلب ہو جاتی ہے جس طرح اگر ہاتھ سے کچھ مدت تک بالکل کام نہ لے تو وہ ہاتھ بیکار ہو جاتا ہے۔ ہاں جس طرح یہ جسمانی قوتیں بھی خاص علاج سے لوٹ آتی ہیں اسی طرح دلوں کی مُہر بھی جو اللہ تعالیٰ بطور سزا لگاتا ہے ٹوٹ جاتی ہے۔ قرآن کریم اس کا بھی علاج کرتا ہے کیونکہ شفاء لما فی الصدور ہے مگر علاج اسی کے لیے ہے جو علاج کرانا چاہے۔

قرآن و حدیث کی شہادت کہ بدی کا اثر ساتھ ساتھ پیدا ہوتا رہتا ہے: اس معنی کی تائید خود قرآن شریف سے ہوتی ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ فرماتا ہے بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون (التطفیف۸۳۔ ۱۴) ان کے دلوں پر اسی نے زنگ لگا دیا ہے جو وہ کام کرتے تھے۔ پس انسان کے اپنے عمل جس طرح دل پر زنگ لگاتے ہیں مہر بھی کر دیتے ہیں۔ زنگ لگنا پہلا مرتبہ ہے مہر لگ جانا آخری مرتبہ۔ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ داغ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کرے، تو اس کا قلب صاف ہو جاتا ہے (قلب سے مراد قلب روحانی ہے) اور اگر اور گناہ کرتا جائے تو وہ سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ران علیٰ قلوبھم کا مصداق ہو جاتا ہے گویا وہ روشنی جو خدا نے انسان کے اندر رکھی تھی وہ بالکل دب جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زنگ یا مہر کافر کے ساتھ خاص نہیں مسلمان بھی بدیوں کے ارتکاب کی عادت کرلے تو اس کے دل پر بھی مہر لگ جاتی ہے پس اس آیت نے ایک پُر حکمت فلسفہ بدی کا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ بدی کا اثر ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔

عقل سے کام نہ لینا دل پر مہر ہے: مہر لگانے سے کیا مراد ہے۔ حضرت ابن مسعود اور کئی صحابہ سے ختم اللہ علی قلوبھم و علی سمعھم کی تفسیر میں مروی ہے لایعقلون ولا یسمعون وہ نہ عقل سے کام لیتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ خود قرآن کریم نے یہی تشریح فرمائی ہے۔ ومنھم من یستمع الیک حتی اذا خرجوا من عندک قالوا للذین اوتوا العلم ماذا قال اٰنفا اولئک الذین طبع اللہ علیٰ قلوبھم (محمد۴۷۔ ۱۶) اور ان میں ایسے لوگ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں کو جن کو علم دیا گیا کہتے ہیں ابھی اس نے کیا کہا تھا، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے گویا مہر لگنا اس حالت کا نام ہے کہ انسان بات کو سنتا ہے سمجھتا نہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اٰذان لا یسمعون بھا (الاعراف۷۔ ۱۷۹) ان کے دل ہیں جن سے

ع ۱ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٧﴾ — اور اُن کے لیے بڑا عذاب ہے ع۱۹

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ — اور لوگوں میں بعض ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے

الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾ — دن پر ایمان لائے اور وہ مومن نہیں ع۲۰

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ — وہ اللہ کو اور اُن کو جو ایمان لائے ہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں ع۲۱

وہ سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سُننے کا کام نہیں لیتے۔

بُرے کام کو اچھا سمجھنا دل پر مہر ہے: جب انسان ایک بُرے کام کے ارتکاب پر قائم ہو جاتا ہے تو اس کی حالت آہستہ آہستہ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ اس بُرے کام کو اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ اس کے دل پر مہر ہے کیونکہ پھر اس کا خیال بھی اس طرف نہیں جاتا کہ یہ جو میں کر رہا ہوں کوئی بُرا کام ہے۔

مہر لگانے کی نسبت اللہ کی طرف: مہر کا لگانا اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے منسوب کیا کہ انسان کے ہر فعل پر جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے جس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب ایک شخص اپنے گھر کے دروازے بند کر لے تو اللہ تعالیٰ اس پر اندھیرا کر دیتا ہے یا ہاتھ سے کام لینا چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ ہاتھ کو بیکار کر دیتا ہے اسی طرح جب ایک انسان کو بدی کے انجام سے ڈرایا جائے اور وہ پروا بھی نہ کرے بلکہ بدی میں ترقی کرتا چلا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مُہر لگا دیتا ہے۔

زردشتی عقیدہ کی تردید: اس میں زردشتیوں کے اس غلط عقیدہ کی تردید بھی ہے کہ نور خدا کی طرف سے ہے اور ظلمت شیطان کی طرف سے۔ اسلام تمام اسباب کا مسبّب اللہ تعالیٰ کو قرار دیتا ہے۔

ع۱۹ عذاب اس کا مادہ عذب ہے اور مَاءٌ عَذْبٌ شیریں اور عمدہ پانی کو کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں ہے ھٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ (الفرقان ۲۵-۵۳) اور عذاب سخت دُکھ کو کہتے ہیں جس کی وجہیں بیان کی جاتی ہے کہ عَذَبَ الرَّجُلُ کے معنے آتے ہیں اس نے کھانا پینا ترک کر دیا گویا تعذیب اصل میں یہ ہے کہ اس کو کھانے پینے نیند سے محروم کیا جائے اور بعض کے نزدیک تعذیب میں ازالۂ عذب ہے یعنی زندگی کی اچھی چیزوں کو دور کر دینا۔ جیسے تمریض مرض کے دور کر دینے کو کہتے ہیں۔ گویا اچھی چیزوں سے محروم ہو جانے کا نام عذاب ہے۔ عذاب کا استعمال قرآن میں: قرآن کریم نے ہر ایک سزا یا تکلیف کے پہنچنے پر اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ جہاں ایک باغ والوں کو اپنی محنت کا پھل نہیں ملا، اس کو بھی عذاب کہا۔ کَذٰلِكَ الْعَذَابُ (ن ۶۸-۳۳) دنیا میں جو قوموں پر تباہیاں اور دُکھ آتے ہیں ان کو بھی عذاب کہا ہے۔ کسی جرم پر جو سزا دی جاتی ہے اس کو بھی عذاب کہا ہے۔ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا (النور ۲۴-۲) آخرت کی سزا کو بھی عذاب کہا ہے۔ انسان کا دل جو بدی کے بعد دُکھ محسوس کرتا ہے وہ بھی عذاب ہے۔

عذاب عظیم اور عذاب الیم: قرآن کریم میں کبھی عذاب کو بلحاظ اس کی ظاہری کیفیت کے عظیم کہا ہے یعنی بڑا عذاب اور کبھی بلحاظ اس دُکھ کے جو انسان اندر ہی اندر اُٹھاتا ہے الیم کہا ہے یعنی دردناک عذاب۔ اسی مناسبت سے یہاں کفار کے عذاب کو جو ظاہر میں واقع ہونے والا تھا عذاب عظیم کہا ہے اور آیت ۱۰ میں منافقوں کے عذاب کو عذاب الیم کہا ہے۔

ع۲۰ اللہ اور آخرت پر ایمان مسلمان ہونے کے قائم مقام ہے: یہاں اللہ اور آخرت پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے قائم مقام رکھا ہے۔ کیونکہ اللہ کی صفات اور آخرت کے مسئلہ کو کھول کر قرآن کریم نے ہی بیان کیا ہے اور دوسرے شروع میں جو اصول بیان کیے اُن میں سے پہلا اصول اللہ پر ایمان اور آخری آخرت پر یقین ہے پس اوّل و آخر کو سب کا قائم مقام بنا لیا۔ یہاں منافقوں کے ذکر میں جو منہ سے اسلام کا اقرار کرتے تھے ایمان باللہ والیوم الاٰخر کو لا کر اس کے معنی کی وضاحت کر دی ہے یعنی اس سے مراد مسلمان ہونا ہے۔

پہلے رکوع میں دو گروہوں کا ذکر کیا اوّل کامل طور پر ماننے والے دوسرے کلی طور پر انکار کرنے والے، یہاں ایک تیسرے گروہ کا ذکر کیا ہے جو مُنہ سے کہتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ مدینہ میں عبد اللہ بن ابیّ قوم خزرج میں سے ایک بڑا سردار تھا جس کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانے والے تھے۔ نبی کریم صلعم کی مدینہ میں آمد سے صورت معاملہ بدل گئی اور سب قوموں نے یہودیوں سمیت آنحضرت صلعم کو سب جھگڑوں کا آخری فیصلہ کرنے والا تسلیم کیا۔ عبد اللہ بن اُبیّ کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اسلام کے اندرونی دشمن: جہاں اور کھلے دشمن اسلام کے پیدا ہوئے اس نے اپنے ارد گرد ایک چھپا ہُوا دشمنِ اسلام گروہ پیدا کر لیا۔ ان لوگوں کو اسلام سے فی الواقع کوئی تعلق نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ ظاہرداری کے طور پر مسلمان ہونے کا اقرار کرتے تھے، مگر اندرونی طور پر پورا زور اسلام کے استیصال کے لیے لگاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ان سب حالات میں بچا کر دکھا دیا کہ اسلام کو نہ اس کے کھلے دشمن کچھ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ چھپے ہوئے۔ کیونکہ خدا کا ہاتھ اس کی تائید میں ہے۔

منافقین زمانہ حال: اس زمانہ میں بھی مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ ہے جو دشمنانِ اسلام کے ساتھ مل کر اسلام کو نقصان پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے گو بظاہر مسلمان کہلاتے ہیں ان کے حالات ان منافقین سے جو آنحضرت ؐ کے وقت میں تھے بہت ملتے ہیں۔ عملی نفاق: لیکن ان کے علاوہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو منہ سے قرآن کریم پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہیں مگر عمل کے وقت اپنے رسوم اور خواہشات کی پیروی کرتے اور قرآن کو پسِ پشت ڈالتے ہیں۔ یہ عملی نفاق ہے اور اسی کا نتیجہ وہ ذلت و ادبار ہے جو آج مسلمانوں کے شاملِ حال ہے۔

اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝٩
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝١٠
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا
اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝١١
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝١٢

سوائے اپنے آپ کے (کسی کو) دھوکا نہیں دیتے اور وہ سمجھتے نہیں ع۲۱
اُن کے دلوں میں بیماری ہے سو اللہ نے اُن کی بیماری کو بڑھایا ع۲۲ اور
اُن کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ جھوٹ بولتے تھے ع۲۳
اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، کہتے
ہیں ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔
یقیناً یہ خود ہی فساد کرنے والے ہیں، پر سمجھتے نہیں ع۲۴

ع۲۱ یخدعون۔ خدع اس کا مادہ ہے جس کے معنی دھوکہ دینا ہیں یعنی ظاہر کچھ کرنا اور دل میں دوسری بات چھپا رکھنا اس ارادہ سے کہ دوسرے کو نقصان پہنچائے اور خادع کسی کو دھوکا دینے کے قصد پر بھی بولا جاتا ہے (ت) یہی معنی یہاں مراد ہیں مفاعلۃ کا باب بعض وقت صرف ایک کے لیے بھی آتا ہے۔ جیسے عاقبت اللص میں پس یخدعون اللہ کے معنی ہیں اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یشعرون۔ شعر بال کو کہتے ہیں اور اس کی جمع اشعار آتی ہے۔ واشعارھا (النحل ۱۶-۸۰) اور شَعَرْتُ کے معنی ہیں ایک چیز کا ایسا دقیق علم حاصل کیا گویا کہ اس کے بالوں تک پہنچ گیا۔ اور شِعر بھی اصل میں دقیق کلام کو کہتے ہیں (غ) پس شعور علم سے زیادہ باریک بینی کو چاہتا ہے۔

منافقوں کی دھوکہ بازی: منافقانہ چال سے ان کا مطلب تو یہ تھا کہ مسلمانوں کو دھوکہ دیں جو گویا خدا کو ہی دھوکا دینا تھا یعنی مسلمان ان کو اپنے مددگار اور حامی سمجھیں۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود نقصان اٹھایا، مسلمانوں کا ان کی شرارتوں سے کچھ نہ بگڑا۔ یہی اپنے آپ کو دھوکہ دینا تھا۔

ع۲۲ مرض۔ مرض اس حالت اعتدال سے خروج کا نام ہے جو انسان سے خاص ہے اور یہ دو طرح پر ہے ایک جسمانی جیسے لا علی المریض حرج (النور ۲۴-۶۱)

امراض روحانی: اور دوسرے اس سے مراد رذائل لیے جاتے ہیں جیسے جہالت، جبن، بخل، نفاق وغیرہ۔ یعنی اخلاقی بیماریاں (غ) یہی معنی یہاں مراد ہیں اور قرآن شریف میں کثرت سے مرض کا ذکر اسی معنی میں آتا ہے اور اخلاقی رذائل کو مرض اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ فضائل کے حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ جیسے بیماریاں ہ

منافقوں کی بیماری: وہ بیماری نفاق ہے جس کا یہاں ذکر کر دیا یعنی منہ سے جو کچھ کہتے ہیں اس پر یقین نہیں رکھتے۔ اسی لیے عذاب الیم کو جھوٹ کا نتیجہ بتایا۔ یا یہ بیماری اسلام کی عداوت ہے جو اپنے دلوں میں مخفی رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا اس بیماری کو بڑھانا یوں تھا کہ جوں جوں اللہ تعالیٰ اسلام کو قوت اور شوکت عطا کرتا گیا اُن کا نفاق اور ان کی اسلام سے عداوت اور ترقی کرتی گئی۔ خدا کس طرح بیماری بڑھاتا ہے: اللہ تعالیٰ کی طرف بیماری کا بڑھانا منسوب کیا کیونکہ یہ بطور سزا تھا۔ یا اس لیے کہ وہ اسباب جن سے بیماری بڑھی اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیے تھے۔ گو وہ چاہتے تو انہی اسباب سے ہدایت حاصل کر سکتے حضرت نوحؑ کہتے ہیں فلم یزدھم دعاءی الا فرارا۔ (نوح ۷۱-۶) میرے بلانے نے ان کو صرف بھاگنے میں زیادہ کیا۔ حالانکہ دعوت کی غرض تو اُن کا بلانا تھا۔ نہ بھگانا۔ مگر چونکہ جس قدر وہ بلاتے تھے اسی قدر وہ زیادہ دُور ہوتے تھے۔ اس لیے بڑھانے کو دعا کی طرف منسوب کیا۔ گو وہ دعا کا مقصد نہ تھا۔

ع۲۳ یکذبون۔ کذب۔ صدق کی ضد ہے اور صدق کی طرح قول اور فعل دونوں پر بولا جاتا ہے (غ) جھوٹ بول کر انسان کو کبھی راحت نہیں ملتی۔

جھوٹ منافق کا نشان ہے: منافق کی چار علامتیں حدیث میں لکھی ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑی یہی ہے کہ اذا حدث کذب جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔ مسلمانوں میں اس زمانہ میں یہ بیماری بہت بڑھی ہوئی ہے۔ باتوں میں جھوٹ بولتے، جھوٹی شہادتیں دیتے اور جھوٹے اقرار کرتے ہیں۔ حکام کو خوش کرنے کے لیے بھی جھوٹ بول دیتے ہیں کسی قوم میں ایسے لوگوں کی زیادتی سے قوم کی عزت باقی نہیں رہ سکتی۔ صحابی کی روایت پر جھوٹ کا احتمال نہیں: ان کے بالمقابل صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالت دیکھو تو وہاں عمداً جھوٹ کا وجود بھی نہیں پایا جاتا یہاں تک کہ جو روایت صحابی تک پہنچ جائے اس پر جھوٹ کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔

ع۲۴ تفسدوا۔ فساد کسی چیز کا اعتدال سے نکل جانا ہے تھوڑا ہو یا بہت۔ اور اس کی ضد صلاح ہے اور اس کا استعمال نفس میں اور بدن میں اور اشیاء میں جو حدِ اعتدال سے نکل گئی ہوں ہوتا ہے (غ)

الارض۔ ارض کے مصدری معنی الرِعدۃ یعنی کانپنا یا الدّوار یعنی چکّر کھانا آتے ہیں (ت) زمین کا چکّر کھانا: اور اَرْض زمین کو کہتے ہیں گویا اس کے معنی میں ہی چکّر کھانے کی طرف اشارہ ہے۔ اور زمین کے خاص حصّہ یا خاص ملک کو بھی کہتے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ ہر ایک چیز کے نیچے کے حصّے کو اس کی ارض کہہ دیا جاتا ہے جس طرح ہر چیز کے اوپر کے حصّہ کو اس کا سما کہہ دیا جاتا ہے۔ چٹائی کو، گھوڑے وغیرہ کی ٹانگوں کے نیچے کے حصّہ کو، جوتی کے تلوے کے نچلے حصّہ کو جو زمین سے لگتا ہے اس کی ارض کہہ دیا جاتا ہے اور مجازاً قلب انسانی پر بھی یہ لفظ بول دیا گیا ہے (غ)

منافقوں کے فساد اور ان کے دعویٰ اصلاح سے مراد کیا ہے: یہاں زمین میں فساد کرنے سے مراد اُن کے خفیہ تعلقات اور سازشیں ہیں جو وہ اسلام کو تباہ کرنے کے لیے کرتے تھے یا اُن کا اندر سے کفر پر قائم رہنا فساد ہے۔ ان کا اپنے آپ کو مصلح کہنا اس لحاظ سے تھا کہ ہم دونوں فریقوں سے صلح رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی شرارتوں سے متنبہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ فی الواقع مفسد ہیں لیکن اپنے آپ کو مفسد نہیں سمجھتے۔ یہ عموماً مفسدوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کوئی من سمجھوتہ کر کے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ⑬
وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ⑭
اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ

اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے، کہتے ہیں کیا ہم مان لیں جس طرح بے وقوفوں نے مان لیا[۲۵]، یقیناً یہ خود ہی بیوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے۔
اور جب انھیں ملتے ہیں جو ایمان لائے، کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں کہتے ہیں ہم تمھارے ساتھ ہیں (ان سے) ہم صرف ہنسی کرتے ہیں[۲۶]
اللہ اُن کو ذلیل کرے گا[۲۷] اور وہ اُن کو مہلت دیتا ہے، وہ

اپنے فعل کا جواز کر لیتے ہیں۔ بہتیرے دوسروں کی جڑوں کو کاٹنا اصلاح خیال کرتے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ اُن کے مفسد ہونے پر کسی کو اطلاع مل جائے گی اور یا یہ کہ ان میں جو عامۃ الناس ہیں ان کو یہی بتایا جاتا ہے کہ یہ کام اصلاح کا ہے۔ اس لیے وہ فساد کا کام کرتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ یہ فساد کا کام ہے۔

ع۲۵ السفہاء سفیہ کی جمع ہے سفہ کے اصل معنی ہلکا پن ہیں کمی عقل نفس انسانی کا ہلکا پن ہے اس لیے کم عقل یا بیوقوف آدمی کو سفیہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے اموال کو ٹھیک طور پر خرچ کرنا نہیں جانتے ان کو بھی قرآن کریم نے سفیہ قرار دیا ہے۔ (النساء ۴-۵)

منافقوں کے مسلمانوں کو بیوقوف کہنے کی وجہ: منافق مسلمانوں کو بیوقوف اس لیے کہتے تھے کہ انھوں نے اپنے مال و دولت گھروں رشتہ داروں کو ایک شخص کے پیچھے لگ کر چھوڑ دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کفار جلدی اُن کو کچل ڈالیں گے۔

ع۲۶ خلو اخلا مکان اور زمانہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بلحاظ زمانہ اس کے معنی ہیں مضی و ذھب یعنی گزر گیا، چلا گیا۔ تلک امۃ قد خلت (۱۳۴) قد خلت من قبلہ الرسل (آل عمران ۳-۱۴۴) وغیرہ میں یہی مراد ہے اور خلا الیہ یا خلا فلان بفلان کے معنے آتے ہیں اس کے ساتھ خلوت میں ہوا۔ یہی صورت اور معنی یہاں ہیں۔

شیطان۔ شطن سے ہے جس کے معنی ہیں دُور ہُوا پس شیطان وہ ہستی ہے جو رحمت الٰہی سے دُور ہوئی۔ بعض نے شاط (یشیط) سے مشتق کہا ہے جس کے معنی ہیں غضب میں جل گیا۔ قرآن شریف میں شیطان کی خلقت نار یعنی آگ سے بیان فرمائی ہے۔ انسانوں میں سے شیطان: قوت غضبیہ میں بڑھے ہوئے انسان بھی شیطان کہلاتے ہیں۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ شیطان ہر ایک سرکش کا نام ہے جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے یا حیوانوں میں سے۔ قرآن شریف میں بھی شیاطین الانس والجن آتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انسانوں میں سے بھی شیطان ہوتے ہیں (ت) بُرے اخلاق پر شیطان کا اطلاق: امام راغب کہتے ہیں کہ ہر ایک بُرے خُلق کو بھی شیطان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حسد بھی ایک شیطان ہے اور غضب بھی ایک شیطان ہے۔ شیطان کا انسان میں خون کی طرح پھرنا: ایک حدیث میں آتا ہے کہ شیطان انسان میں اس طرح پھرتا ہے جیسے خون پھرتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ میں۔ فرمایا ہاں الا ان اللہ اعاننی علیہ فاسلم صرف یہ فرق ہے کہ اللہ نے اس کے خلاف مجھے مدد دی پس وہ فرمانبردار ہو گیا۔ جس سے معلوم ہُوا کہ شیطان کو انسان پر نہیں بلکہ انسان کو شیطان پر تصرّف دیا گیا ہے بدی کا محرک شیطان ہے: نہایت باریک راہوں سے بُری تحریک کرنے والی ہستی شیطان ہے اسی طرح بُری تحریک کرنے والے انسان بھی شیطان ہیں۔ قیامت کے دن یہی عذر گنہگاروں کا مذکور ہے کہ ہمارے سرداروں نے ہم کو بُری راہ پر ڈالا اور حدیث میں جو آتا ہے الواکب شیطان تو وہاں مراد صرف یہ ہے کہ جب آدمی اکیلا نکلتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

شیطان صفت انسان: اس جگہ شیاطین سے مراد قریباً تمام مفسرین کے نزدیک انسان شیطان ہی ہیں۔ بخاری میں امام مجاہد سے مروی ہے کہ شیاطین سے مراد ان کے منافق اور مشرک دوست ہیں۔ ابن عباس سے ہے رؤساءھم فی الکفر ان کے کافر سردار۔ اسی سورت کی آیت ۷۶ میں بجائے خلوا الی شیاطینھم کے ہے خلا بعضھم الی بعض۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہاں شیطان صفت انسان ہی مراد ہیں۔

ع۲۷ استھزاء کے معنی کشاف نے لکھے ہیں انزال الھوان والحقارۃ یعنی ذلت اور حقارت کا نازل کرنا۔ کیونکہ استہزا کرنے والے کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر کرنا ہوتا ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ مجازاً استہزا سے مراد تحقیر اور ذلّت کا وارد کرنا ہے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ استہزا ایسے طریق پر تحقیر کرنے کو کہتے ہیں جس پر ہنسی آ جائے۔ بیضاوی میں ہے کہ استھزاء کی اصل ھزا ہے جس کے معنی خفت ہیں اور یہ معنی سرعت سے ماخوذ ہیں جس معنی میں یہ لفظ آتا ہے گویا استھزاء کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر ہے اور ہنسنا ایک ذریعہ ہے جس سے وہ تحقیر کی جاتی ہے۔ محض ہنسنا جس کی غرض دوسرے کی تحقیر نہ ہو استھزاء نہیں کہلاتا۔

ایک ہی الفاظ کے اللہ تعالیٰ اور انسان پر بولنے کے مفہوم میں فرق: اب یہ ایک اصول کے طور پر یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کسی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے تو وہی لفظ بولا جاتا ہے جو انسان کے لیے۔ مگر یہ فرق ہمیشہ ہوتا ہے کہ انسان چونکہ ہر فعل میں آلوں اور ذریعوں کا محتاج ہے اور خدا نہیں اس لیے اس لفظ میں جو آلہ

يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۵﴾	اپنی سرکشی میں حیران پھر رہے ہیں ع۲۸
اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰى فَمَا	یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کو دے کر گمراہی خریدلی۔
رَبِحَتۡ تِّجَارَتُهُمۡ وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۶﴾	سو اُن کی تجارت فائدہ مند نہ ہوئی اور نہ ہی وہ ہدایت پانیوالے ہوئے ع۲۹
مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ	اُن کی مثال اس شخص کی مثال کی طرح ہے جس نے آگ جلائی،
اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ وَ	پھر جب اس (آگ) نے جو کچھ اُس کے گرد تھا روشن کر دیا اللہ
تَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷﴾	اُن کے نور کو لے گیا اور انکو اندھیرے میں چھوڑ دیا وہ کچھ نہیں دیکھتے ع۳۰

یا ذریعہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتا، صرف فعل کی آخری غرض مقصود ہوتی ہے مثلاً انسان دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی کا محتاج ہوتا ہے مگر جب کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی جو ذریعہ انسان کے دیکھنے کا ہیں وہ مراد نہیں ہونگے صرف جو غرض دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ ایسا ہی انسان سننے میں کان اور ہوا کا محتاج ہے مگر اللہ تعالیٰ کے سننے میں یہ ذریعہ مفقود ہوگا اور اصل غرض جو سننے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ ایسا ہی انسان کا رحم یا غضب اس کے قلب پر خاص حالت کے وارد ہونے کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے مگر خدا کا رحم اور غضب صرف نتیجہ کا نام ہے۔ اللہ کا استہزا: یہی صورت استہزاء کے متعلق ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا تو ہنسنا جو ذریعہ تھا وہ مفقود ہوگیا۔ اور ذلیل کرنا جو اصل غرض تھی وہ باقی رہ گئی پس اللہ تعالیٰ کا استہزا صرف ذلیل کرنے کا نام ہے نہ ہنسنے کا۔

کسی فعل پر سزا کا ذکر انہی الفاظ میں: عربی زبان میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ کسی کے ایک فعل پر جو سزا دی جائے اس کو اسی فعل کے الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ جب ایک فقرہ جواب کے طور پر ہو تو اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے کسی فعل کی سزا ہوتی ہے۔ خود قرآن شریف میں اس کی مثالیں ہیں جزاؤ سیئۃ سیئۃ مثلھا (الشوریٰ ۴۲-۴۰) حالانکہ سزا فی الواقع بدی نہیں۔ فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ (۲-۱۹۴) حالانکہ دوسرے اعتداء سے مراد صرف سزا ہے نہ فی الواقع زیادتی۔ امام راغب نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے اور ایسا ہی لسان العرب میں ہے۔ سزا کا فلسفہ: اسی لفظ کو سزا کے لیے استعمال کرنے میں سزا کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہے کہ اس کو ضرورت جائز کرتی ہے۔ پس یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ ان کو اُن کے استہزا کی سزا دے گا۔

ع۲۸ یمد۔ مدّ کے اصل معنی جرّ (غ) یعنی کھینچنا یا بسط یعنی پھیلانا (ت) ہیں جیسے لاتمدن عینیك (الحجر ۱۵-۸۸) کیف مد الظل (الفرقان ۲۵-۴۵) پھر اس کے معنی امہال یعنی مہلت دینا بھی آتے ہیں (ت) اور مدد کرنا بھی۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ جب ایک انسان سرکشی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو اسی حالت میں چھوڑ دیتا ہے جیسا جو شخص گمراہی اختیار کرے اسے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے وہ کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ ابن مسعود اور صحابہ سے یہی معنی مروی ہیں واقعات بھی اسی معنی کے موئید ہیں کیونکہ منافقوں کو سزا آنحضرت صلعم کے آخری ایام میں غزوہ تبوک کے بعد دی گئی۔

طغیان۔ طغی سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں نافرمانی میں حد سے گزر جانا (غ)

یعمھون۔ عمہ کے معنی ہیں حیرانی کی وجہ سے کسی امر میں متردد ہونا۔ عمہ اور عمی میں فرق: یہ لفظ صرف رائے کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور عمی یعنی اندھا پن ظاہری نابینائی اور رائے کی نابینائی دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔

ع۲۹ اشتراء۔ اشتروا۔ شری سے ہے۔ عموماً شراء کے معنی خریدنا اور بیع کے معنی بیچنا آتے ہیں یعنی اول میں قیمت دینا اور چیز لینا اور دوئم میں چیز دینا اور قیمت لینا ہے لیکن جب چیز کے عوض چیز لی جائے تو دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں اس لیے اشتراء ہر معاملہ پر بولا جاتا ہے جس سے کچھ حاصل ہو (غ)

منافقوں کا انجام: ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لینا یہ ہے کہ ہدایت جو ان کے پاس آئی تھی اس کو ردّ کر دیا اور اس کی جگہ گمراہی اختیار کر لی۔ پھر اس کو ایک تجارت قرار دیکر فرمایا فما ربحت تجارتھم۔ ربح اس فائدہ کو کہا جاتا ہے جو تجارت سے ملے جس فائدہ کو انہوں نے مدنظر رکھا تھا وہ دنیوی منفعت تھی مگر وہ بھی ان کو نہ ملی۔ وما کانوا مھتدین اور ہدایت بھی نہ ملی یعنی دنیا بھی ہاتھ سے گئی اور دین بھی برباد ہوا۔ یہ ایک پیشگوئی کے رنگ میں کہا گیا تھا کہ جس دنیا کی خاطر دین کو چھوڑتے ہیں وہ بھی نہیں ملیگی اور ایسا ہی حال منافقوں کا ہُوا۔

ع۳۰ مَثَل۔ مَثَل سے مراد کسی چیز کے متعلق کوئی بیان ہے جو کسی دوسری ملتی جلتی چیز کے بیان سے مشابہت رکھتا ہو تاکہ ان میں سے ایک دوسرے کو واضح کرے (غ)

ظلمات۔ ظلمۃ کی جمع ہے جو روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے۔ یہ لفظ عموماً جمع میں لایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ تاریکیاں بہت قسم کی ہیں۔ جیسے جہالت۔ توہم وغیرہ، یا شدّت ظلمت مراد ہے۔

آگ جلانے کی مثال: دو مثالیں بیان کی ہیں ایک اس آیت میں دوسری آیت (۱۹) میں۔ دونوں مثالیں بحیثیت کل ہیں یعنی پہلی مثال میں آگ جلانے والا منافق نہیں بلکہ رسول ہے جیسا دوسری مثال میں بارش کی تشبیہ منافقت سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہے اور بخاری میں ہے مثلی کمثل رجل استوقد نارا۔ یعنی نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ میری مثال اس شخص کی مثال ہے کہ اس نے آگ جلائی۔ پس اس مثال کا ماحصل یہ ہے کہ رسول نے ایک آگ روشن کی جس کے ساتھ نُور پیدا ہوا اور چیزیں نظر آنے

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾
اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ
وَّ بَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ
الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ اللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾
یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا
فِیْهِ ۙۗ وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ
ع ۲ ۱۲ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۰﴾ ع

بہرے ، گونگے ، اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹتے ۳۰ع
یا جیسے مینہ (جو) بادل سے (برسا) اس میں اندھیرا اور کڑک اور
بجلی ہے ہولناک آوازوں سے اپنی انگلیاں موت کے ڈر سے اپنے
کانوں میں دیتے ہیں اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے ۳۱ع
قریب ہے کہ بجلی اُن کی نظر کو اچک لیجائے، جب کبھی وہ انکو روشنی دیتی ہے
اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب اُن پر اندھیرا کرتی ہے ٹھہر جاتے ہیں اور اگر اللہ
چاہتا تو ضرور اُنکی شنوائی اور انکی بینائی کو لیجاتا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۲ع

لگیں۔ مگر منافقوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے وہ طاقت جس کے ساتھ انسان دیکھتا ہے، گنوادی۔ کیونکہ دیکھنے کے لیے دو نُوروں کی ضرورت ہے، ایک انسان کے اندر کی روشنی، اور دوسری بیرُونی روشنی۔ سو جب اندر کا نُور جاتا رہا تو ان کے لیے بیرونی روشنی بھی جو رسول نے روشن کی تھی کچھ فائدہ مند نہ ہوئی۔ روشنی اسی کو فائدہ دے سکتی ہے جس کے اندر بھی نُور ہو۔

ع۳۰ صُمٌّ۔ اَصَمّ کی جمع ہے۔ بہرا۔ بُکْمٌ اَبْکَم کی جمع ہے۔ گونگا۔ عُمْیٌ اَعْمٰی کی جمع ہے۔ اندھا۔ مجازی معنی مراد ہیں یعنی کلمہ حق سنتے نہیں نہ کہتے ہیں۔ نشانات صداقت دیکھتے نہیں۔ یہ شدید نفاق والے ہیں جو حق کی شنوائی اور بینائی سے ہی محروم ہو چکے ہیں۔ یا منافقوں کے سردار ہیں اور دوسری مثال والے ان کے پیرو ہیں یا وہ جن کا نفاق محض بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ہے۔

ع۳۱ صَیِّب۔ صوب سے مشتق ہے صَواب وہ امر ہے جو فی ذاتہ پسندیدہ ہو اور صَوْب یا صَیِّب بارش کو کہتے ہیں جب وہ ایسے اندازے پر برسے جو موجب نفع ہو اور صَیِّب ایسے بادل کو بھی کہتے ہیں (غ)

السماء۔ سماء ہر چیز کا اس کا اوپر کا حصہ ہے (غ) اس لیے محض بلندی پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سماء مینہ کو بھی کہتے ہیں جب تک زمین پر نہ آجائے اور سماء کے معنی سحاب یعنی بادل بھی ہیں السماء السحاب (ل)

الصواعق۔ صاعقۃ کی جمع ہے جو صعق سے ہے اور صاعقۃ اس ہولناک آواز کو کہتے ہیں جو گرج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے مراد بعض وقت موت یا عذاب بھی ہوتا ہے مگر امام راغب کہتے ہیں کہ یہ چیزیں اس کی تاثیرات میں سے ہیں۔ پس اصل معنی اس کے ہولناک آواز کے ہی ہیں اور زلزلہ کے ساتھ یا رعد میں جو ہولناک آواز آتی ہے اس پر بھی قرآن شریف میں اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

بارش کی مثال: اس تمثیل میں صیّب یا رحمت کی بارش سے مراد وحی الٰہی ہے۔ اندھیرے سے مراد وہ مشکلات ہیں جو وحی الٰہی کے قبول کرنے میں پیش آتی ہیں۔ کڑک سے مراد بعض خوفناک امور ہیں جیسے مثلاً دشمنوں کے حملے جن سے کمزور دل خائف ہو جاتے ہیں۔ چمک سے مراد وہ کامیابیاں ہیں جو مطلع کو روشن کر دیتی ہیں۔ یہ دوسری قسم کے منافق ہیں جو بالکل اپنی روشنی نہیں کھو چکے مگر ان کے اندر کچھ کمزوری ہے۔ کوئی مشکلات سامنے آجاتی ہیں تو فوراً گھبرا جاتے ہیں۔ دشمن کی طرف سے کچھ تیاری دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ بس اب مارے گئے۔ دوسری جگہ آتا ہے یحسبون کل صیحۃ علیھم (المنافقون ۶۳:۴) اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ مسلمانوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

ع۳۲ لَو۔ بعض وقت محض حرف شرط کا کام دیتا ہے۔ یہاں بھی محض اگر کے معنی میں ہے۔

شاء۔ مشیئۃ اور ارادہ بعض کے نزدیک یکساں ہیں مگر بعض کے نزدیک مشیت کسی چیز کو وجود میں لانے کا نام ہے اور اللہ کی مشیت ایجاد شے ہی ہے اور انسان کی مشیت اصابۃ الشی ہے یعنی ارادہ کے ہم معنی۔ اسی معنی کی رُو سے درست ہے جو کہا گیا ما شاء اللہ کان جو اللہ چاہتا ہے ہوتا ہے۔ پس اللہ کی مشیت وجود شے کی مقتضی ہے (غ)
شئ۔ بعض کے نزدیک شئ وہ چیز ہے جو جانی جائے اور جس کی خبر دی جائے (ر) اور شئ اصل میں شاء کا مصدر ہے جو بمعنی مفعول ہے یعنی چاہی گئی چیز۔

قدیر قدرۃ سے ہے اور جب یہ انسان کی صفت ہو، تو مراد اس سے ایسی حالت ہے جس میں انسان کسی چیز کے کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو مراد اس سے ہر قسم کے عجز یا کمزوری کی نفی ہوتی ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے قدرت مطلقہ کا لفظ دوسرے پر بولا نہیں جا سکتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلاں امر پر قادر ہے اور قدیر کے معنی ہیں الفاعل لما یشاء علی قدر ما تقتضی الحکمۃ لا زائدا علیہ ولا ناقصا عنہ یعنی کرنے والا اس کا ہے جسے وہ چاہے اس اندازے پر جو حکمت کا اقتضا ہے نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم (غ)

پچھلی آیت میں جب یہ بیان کیا کہ کافر اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اسلام کامیاب ہوگا تو اب بتایا کہ اسلام کی کامیابیاں تو ایسی ہونگی کہ آنکھوں کو چندھیا دینگی۔
کمزور دل منافق: مگر منافقوں کی حالت یہ ہے کہ جب کوئی کامیابی دیکھتے ہیں تو کچھ قدم آگے اُٹھانا چاہتے ہیں لیکن پھر مشکلات نظر آتی ہیں پھر ٹھہر جاتے ہیں یہی حالت منافقوں کی تاریخی واقعات سے نظر آتی ہے۔ کامیابی دیکھتے تو مسلمانوں کے ساتھ ملاپ زیادہ ظاہر کرتے تکلیف دیکھتے تو طرح طرح کی باتیں اسلام کے خلاف بنانے لگتے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور انھیں جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی ہو جاؤ ۳۳

ان کی روشنی پہلی مثال کے منافقوں کی طرح بکلی نہیں جاتی رہی، اس لیے یہ آخر کار راہِ راست پر آجائیں گے۔

صفاتِ الٰہی اور صفاتِ مخلوق میں کامل و ناقص کا مابہ الامتیاز: یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تمام صفات جو اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ اس کی مخلوق کی بھی صفات ہیں۔ مگر مخلوق کبھی کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں شریک نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اشتراکِ کامل سے شرک پیدا ہوتا ہے۔ مخلوق میں وہ صفات ناقص طور پر موجود ہیں اور خالق میں کامل طور پر۔ مثلاً انسان میں بھی سننے کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ میں بھی اور انسان میں بھی دیکھنے کی صفت ہے اللہ تعالیٰ میں بھی مگر انسان کے سننے اور دیکھنے کو اللہ تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے سے کوئی نسبت نہیں۔ خدا کی مشیت انسان کی مشیت پر غالب ہے: اسی طرح انسان میں بھی قدرت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے وہ ہیچ ہے۔ انسان میں بھی مشیت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اس پر غالب ہے۔ انسان کی صفات ایک تنگ اور محدود دائرہ میں کام کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات تمام حدبندیوں اور تمام قیود سے پاک ہیں۔ یہ ایک اصول ہے جو صفاتِ الٰہی کے سمجھنے میں بڑا کام دیتا ہے۔ ہم جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت کے ماتحت ہیں اسی طرح اس کی مشیت کے بھی ماتحت ہیں۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت نہ ہوں تو ہماری مشیت بھی اس کی مشیت کی طرح کامل ہوگی اور یہ شرک ہے۔

توحید پر دلائل: قادرِ مطلق پر اعتراض اور اس کا جواب: اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس پر یہ اعتراض آریہ سماج کی طرف سے ہوا ہے کہ پھر وہ اپنے جیسا قادرِ مطلق خدا بنا سکتا ہے یا نہیں؟ اپنی مملکت سے کسی کو خارج کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ امور اس کی صفاتِ کاملہ کے خلاف ہیں۔ اس لیے وہ ایسا نہیں کرتا۔ قدرت کا سوال ہی اس بات پر آتا ہے جو اس کی صفات کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ فلاں شخص اتنا امیر ہے کہ وہ جو چاہے کھائے اور جو چاہے پہنے تو یہ ایک احمقانہ سوال ہوگا کہ کیا وہ غلاظت کھا سکتا ہے یا گندے چیتھڑے پہن سکتا ہے علاوہ ازیں لفظ شیءٌ کو اختیار کرکے قرآن شریف نے خود بتا دیا کہ اس کی قدرت ان چیزوں پر ہے جو وہ چاہتا ہے۔ یعنی جو اس کی صفات کے تقاضا کے خلاف نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دوسرے قادرِ مطلق خدا کا ہونا یا اس کی مملکت سے باہر کسی اور مملکت کا ہونا اس کی صفات کے تقاضا کے خلاف ہے اور اس لیے شیءٌ کا اطلاق ہی اس پر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ آج سے سینکڑوں سال پیشتر جب ان اعتراضات کا نام و نشان نہ تھا اس وقت بھی قدیر کے معنی ائمہ لغت نے یہی کیے کہ اس چیز کا کرنے والا جیسے وہ چاہے اور اس اندازے پر جو اقتضائے حکمت کے مطابق ہو نہ اس سے زیادہ ہو اور نہ کم، پس خود لغت ہی ان اعتراضات کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

ع۳۳ خلق۔ خَلق کے اصل معنی التقدیر المستقیم ہیں یعنی صحیح اندازہ اور اس کا استعمال دو طرح پر ہے۔ اول فی ابداع الشیٔ من غیر اصل ولا احتذاءٍ یعنی ایک چیز کا بالکل نیا وجود میں لانا جس کی نہ کوئی اصل ہے اور نہ کوئی نمونہ ہے جیسے فرمایا خلق السمٰوٰت والارض کیونکہ دوسری جگہ فرمایا ہے بدیع السمٰوٰت والارض (جس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ خلق ہے جو بغیر مادہ اور آلہ کے ہے) خدا نیستی سے ہستی کرتا ہے: اور دوسرا۔ ایک چیز سے دوسری چیز کے وجود میں لانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے خلق الانسان من نطفۃ اور وہ خلق جو بمعنی اِبداع ہے یعنی نیستی سے ہستی کرنا وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے (رغ) پس معلوم ہوا کہ لفظ خلق کا استعمال زبانِ عرب میں دونوں طرح پر ہے نیستی سے ہستی کرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ایک چیز سے دوسری چیز کے بنانے پر بھی چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو خالق کل شیءٍ بھی کہا ہے اس لیے جہاں تک بھی یہ سلسلہ چلایا جائے کہ فلاں چیز فلاں سے بنی اور فلاں فلاں سے آخر جہاں تک علم انسانی پہنچ سکتا ہے اس کا خالق بھی وہی ہے پس وہ نیستی سے ہستی کرنے والا ہوا۔

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عظمت کا ذکر ہے اور انسان کو اس عظمت کے سامنے سر جھکانے کا حکم ہے اور اس سے اگلے رکوع میں انسان کے مقامِ بلند کا ذکر ہے کہ اس کو کس قدر تسلط کائنات پر حاصل ہے بتایا کہ خدا کے آگے عاجزی اختیار کرکے وہ سب کائنات پر حکمران ہوتا ہے۔

عبادت اور اطاعت میں فرق: سب سے پہلا حکم جو قرآن کریم میں دیا جاتا ہے وہ اللہ کی عبادت کرنا ہے یعنی اپنے قویٰ کو اس کی فرمانبرداری میں لگا دینا اس طرح پر کہ انسان کی حالت خضوع کی ہو۔ اطاعت کے لیے خضوع ضروری نہیں عبادت کے لیے ہے اس لیے اطاعت دوسروں کی بھی ہو سکتی ہے مگر عبادت سوائے اللہ کے اور کسی کی جائز نہیں۔ پھر انسان کے وہ تمام کام جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہوں عبادت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ حفاظتِ دین کے لیے صحابہ کا جنگیں کرنا بھی عبادت میں داخل تھا۔

خلق سے توحیدِ الٰہی پر دلیل: جو پیدا کرنے والا ہے عبادت اسی کی ہونی چاہیئے نہ اس کے غیر کی اور سب مذاہب کا اتفاق ہے کہ پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ پس اس میں توحیدِ الٰہی پر بھی دلیل ہے۔

عبادت سے حصولِ کمال: ربّ کی عبادت کرو۔ اور ربّ وہ ہے جو انسان کو اس کے کمالِ حقیقی تک اور اس کی پیدائش کی علتِ غائی کے حصول تک پہنچاتا ہے۔ اس کی عبادت کے حکم میں اشارہ یہ ہے کہ بدون عبادتِ الٰہی تم اس کمال کو حاصل نہیں کر سکتے اور یہ کہ ایک اللہ کی عبادت ہی کمالات کے حصول تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اس لیے اس کا نتیجہ تتقون فرمایا اور اتقاء ضرر رساں اشیاء سے بچنا یا حقوق کی نگہداشت کرنا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے وہ کمالِ انسانی کو پہنچنا تو ایک طرف رہا حقوقِ انسانی کی بھی پوری نگہداشت نہیں کر سکتے۔ آج یورپ کی اقوام کیوں آدھی نسلِ انسانی کے حقوق کو پامال کر رہی ہیں۔ اس لیے کہ خدا کی عبادت نہیں کرتیں، بلکہ سونے کی اور حکومت کی پرستش کرتی ہیں۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ
بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ
مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا
لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾
وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا
فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

وہ جس نے زمین کو تمھارے لیے فرش بنایا اور آسمان کو عمارت [۳۴]
اور اوپر سے پانی اتارا۔ پھر اس کے ساتھ تمھارے لیے
پھلوں سے رزق نکالا [۳۵] پس تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ اور
تم جانتے ہو [۳۶]
اور اگر تمھیں اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر
اتارا ہے تو ایک سورت اس جیسی لے آؤ ۔ اور اللہ کو
چھوڑ کر اپنے مددگاروں کو بلا لو اگر تم سچے ہو [۳۷]

ع۳۴ فِراش کے معنی مفروش یا پھیلائی ہوئی چیز ہیں کیونکہ فرش کے معنی بسط یا پھیلانا ہیں ۔ راغب کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ ایسا بنایا جس پر انسان قرار پکڑ سکتا ہے۔ بناء بمعنی مَبْنی یا بنائی گئی چیز کے ہے (غ) یعنی عمارت ۔ تنکیر عظمت کے لیے ہے۔

خلق سے دلیل: اگر خلقِ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت پر دال ہے تو زمین و آسمان کی بناوٹ اس عظمت کا اور بھی بلند احساس پیدا کرتی ہے۔ بعض نے بناء کے معنی ڈیرہ یا خیمہ کیے ہیں ۔ اس صورت میں ظاہری تشبیہ مراد ہے اور آسمان کو عمارت کہنے سے یہ مراد ہے کہ سب کچھ ایک نظم کے ماتحت ہے جیسے عمارت میں ایک ترتیب ہوتی ہے اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اس کے بنانے والی ایک مدبّر بالارادہ ہستی ہے ۔ زمین کے فراش یا بچھایا ہوا ہونے یا انسان کی قرارگاہ ہونے میں اس کی کرویت کے خلاف کوئی دلیل نہیں۔

ع۳۵ نظارۂ قدرت اور فطرت انسانی کا مقابلہ: آسمان سے پانی کا برسنا اور اس کے ساتھ زمین سے پھلوں کا نکلنا ۔ اس میں بتایا کہ زمین جو پستی کا مظہر ہے آسمان سے جو بلندی کا مظہر ہے کس طرح فائدہ اُٹھاتی ہے اسی طرح جب انسان اپنے آپ کو عبادت میں لگا کر پستی کا مظہر بناتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے اور فطرت انسانی کی مخفی قوتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں گویا جو کچھ نظارہ قدرت میں نظر آتا ہے ۔ وہی فطرت انسانی میں موجود ہے ۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جب تک وحی الٰہی سے بندوں کو ہدایت نہ ملے جو اوپر کے پانی سے مشابہت رکھتی ہے اندرونی استعدادیں دبی کی دبی رہ جاتی ہیں ۔ اسی تعلق کے لحاظ سے اگلی آیت میں کھول کر وحی الٰہی کا ذکر کیا ہے۔

ع۳۶ انداد ۔ نِدّ کی جمع ہے اور نِدّ کسی چیز کا وہ ہے جو اس کے جوہر یعنی اصل میں شریک ہو (غ) یا اس کی مثل اور اس کی ضد ہو (ت)

شرک فی العبادت شرک فی الذات ہے: عبادت یا دیگر امور میں دوسروں کو شریک کرنا ان کو اللہ کی ذات میں ہی شریک کرنا ہے۔ کسی شخص نے آنحضرت صلعم کے سامنے کہہ دیا تھا ماشاء اللہ وشئت جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں ۔ آپ نے فرمایا اجعلتنی للہ ندا کیا تم مجھے اللہ کا شریک کرتے ہو صرف ماشاء اللہ کہو کیونکہ اسی کی مشیت سب مشیتوں پر غالب ہے ۔ اور یہ جو فرمایا کہ تم جانتے ہو تو مراد یہ ہے کہ اس بات کو جانتے ہو کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے یہ بُت وغیرہ نہیں ہیں ۔ پھر بتوں کو پرستش میں شریک کرتے ہو اور ایک اصول کو مان کر خود اس کے خلاف چلتے ہو۔

ع۳۷ سورۃ ۔ سورۃ اصل میں بلند منزل یا بلند مقام کو کہتے ہیں (غ) اور سُور شہر کی فصیل کو کہتے ہیں ۔ قرآن کریم کی سورت کو سورت یا تو اس لیے کہا کہ اس کا مقام بلند ہے اور یا اس لیے کہ جس طرح فصیل شہر کا احاطہ کرتی ہے اسی طرح سورت مضامین کا احاطہ کرتی ہے (غ) اور ہر سورت بجائے خود ایک کامل کتاب ہے اور عرف میں قرآن کریم کا ایک حصّہ ہے جو دوسرے حصّوں سے بسم اللہ کے ذریعہ ممیز ہے قرآن کریم میں کل ۱۱۴ سورتیں ہیں ۔ اسی مادہ سے قرآن کریم میں اساور کڑوں کے معنی میں اور تسوّروا انھوں نے دیوار پھاندی کے معنی میں آئے ہیں۔

شھداء ۔ شہید کی جمع ہے اور شہود اور شہادت حاضر ہونا ہے دیکھنے کے ساتھ ۔ آنکھ سے ہو یا بصیرت سے اور کبھی محض حاضر ہونے کو بھی کہتے ہیں۔

شہید صفات باری میں: لفظ شہید مختلف معنی میں آیا ہے اللہ کی صفات میں بھی شہید ہے اور یہ بلحاظ اپنے کمال کے ہے یعنی وہ جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں (ت) یا العلیم محض علم کے لحاظ سے ہے اور الخبیر امور باطنی کے لحاظ سے اور الشہید امور ظاہری کے لحاظ سے۔

شہید کون کون ہیں: انبیاء کو اپنی اپنی اُمتوں پر شہید کہا گیا ہے ۔ کیونکہ جس قدر زیادہ کوئی شخص نضیلت رکھتا ہے اسی قدر زیادہ شہادت دینے کا اہل ہے جو اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں ان کو بھی شہید کہا گیا ہے اور بالآخر اسے بھی جو اللہ کی راہ میں مارا جائے بلکہ حدیث میں جلے ہوئے مبطون، غرق وغیرہ کو بھی شہید کہا گیا ہے ۔ یہاں شہداء کے معنی میں مختلف روایات ہیں بعض کے نزدیک مددگار مراد ہیں ۔ بعض نے معبودان باطل ۔ بعض نے حکام الفصحاء مراد لیے ہیں اور بعض کے نزدیک ائمہ یعنی پیشرو مراد ہیں۔

رازِ توحید وحی نے کھولا ہے: توحید الٰہی کا اصل راز وحی الٰہی نے ہی کھولا ہے ۔ اس لیے پچھلی آیت میں وحی الٰہی کی طرف اشارہ کر کے اب اس کامل وحی کا ذکر کرتا ہے جس نے محمد رسول اللہ صلعم پر نازل ہو کر حقیقی توحید کی راہ دنیا کو دکھائی ۔ اس آیت میں قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر یہ دلیل دی ہے کہ یہ ایک بےنظیر کتاب ہے جس کی مثل کوئی

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ
وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أَنَّ لَهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوْا
مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ
رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَأُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ

پھر اگر تم نے (ایسا) نہ کیا اور ہرگز نہ کر سکو گے، تو اس آگ سے
بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں یہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے [۳۸]
اور اُنھیں خوش خبری دے دو جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے
ہیں کہ اُن کے لیے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں [۳۹]، جب
کبھی اُن کو ان میں سے کوئی پھل رزق دیا جائے گا کہیں گے
یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا، اور انھیں ملتا جلتا (رزق)

نہیں بنا سکتا قرآن کی مثل کا مطالبہ: یہ دعویٰ قرآن مجید میں کئی جگہ ہے کہیں اس رنگ میں کہ اس قرآن کی مثل لاؤ، کہیں یوں کہ دس سورتیں اس کی مثل بنا کر دکھاؤ اور آخری اور اقل مطالبہ یہ ہے کہ ایک ہی سورت اس کی مثل بنا کر لے آؤ۔ یہ تصریح نہیں کہ کس بارہ میں مثل ہو مثل تین باتوں میں چاہیئے: ایک کتاب یا کلام کا بے مثل ہونا تین باتوں میں ہو سکتا ہے، الفاظ کی ظاہری بندش کے لحاظ سے کمال اور جامعیت مضامین میں اور اس اثر کے لحاظ سے جو اس کلام سے پیدا ہو۔ فصاحت وبلاغت و حسنِ بیان: فصاحت وبلاغت میں قرآن کریم کا بے مثل ہونا خود اس سے ظاہر ہے کہ یہ زبان عربی میں فصاحت وبلاغت کا معیار مانا جاتا ہے۔ حالانکہ اس وقت نازل ہوا جب عربی زبان میں نثر کا رواج نہ تھا۔ بلحاظ کمال مضامین یہ حالت ہے کہ نہ صرف تمام مذاہب کے اصول باطلہ کی تردید کرتا اور اصولِ حقہ کو کھول کر بیان کرتا ہے بلکہ تمدن اور معاشرت اور سیاست کے اصول کو بھی بیان کرتا ہے پھر جس بات کا دعویٰ کرتا ہے اس کے دلائل بھی ساتھ دیتا ہے۔ جامعیت مضامین قرآن: بلحاظ جامعیت مضامین چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی اپنے اندر یہ کمال رکھتی ہے کہ ایک خاص مضمون کو کمال تک پہنچاتی ہے، اور ایک کتاب کا حکم رکھتی ہے۔ مگر سب سے واضح معیار مثل ہونے یا نہ ہونے کا یہ ہے کہ جو کام اس کتاب نے کر کے دکھایا ہے وہ دوسری کسی کتاب نے کر کے نہیں دکھایا اور چونکہ اس سورت کی ابتدا اس دعویٰ سے کی تھی کہ یہ کتاب ہدایت ہے۔ ہدایت دینے میں بے نظیری: پس اسی میں بے مثل ہونے کا بھی دعویٰ کیا ہے یعنی کوئی ایسی کتاب یا سورت لاؤ جو دنیا کے لیے اسی طرح موجب ہدایت بنی ہو۔ قرآن کریم نے جو انقلاب دنیا میں پیدا کیا اور جس طرح نہایت پستی کی حالت سے ایک قوم کو اُٹھا کر اوج کمال تک پہنچایا اس کے متعلق دنیا کو اعتراف ہے کہ ایسا کام کسی اور کتاب نے کر کے نہیں دکھایا۔

ع ۳۸ یہاں پیشگوئی کی ہے کہ اس کتاب کی مثل کبھی کوئی نہ بنا سکے گا اور اس کی صداقت آج آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے۔ باوجود ایسی کھلی دلیل کے جو شخص توحید کو چھوڑتا اور بت پرستی اختیار کرتا ہے۔ اس کا انجام آگ ہے۔ یہاں دوزخ کی آگ کے متعلق فرمایا کہ اس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ گویا شرک یا بت پرستی سے ہی یہ پیدا ہوتی ہے اور سارے گناہ شرک کی ہی فرع ہیں۔ جس طرح ساری نیکیوں کی جڑ توحید ہے۔ پتھر کن معنوں میں دوزخ کا ایندھن ہیں: پتھروں سے مراد یہاں معبودانِ باطل ہیں یا جیسا کہ امام راغب نے ایک قول نقل کیا ہے مراد ایسے لوگ ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سخت دل ہیں جیسے پتھر، اسی کی طرف فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ (۲: ۷۴) میں اشارہ ہے اور عربی میں بڑے ہیبت ناک آدمی کو بھی حجر کہا جاتا ہے جس پر دوسرے کی بات کا اثر نہ ہو۔ پس ہو سکتا ہے کہ یہاں الحجارۃ سے مراد وہ قسی القلب لوگ ہوں جو ختم اللہ علی قلوبھم کے مصداق ہیں اور الناس سے مراد عام لوگ۔ لوگوں کا دوزخ کا ایندھن ہونا بتاتا ہے کہ دوزخ انسان کے ہی اعمال کا نتیجہ ہے حتیٰ کہ اس کا ایندھن یعنی جس سے یہ آگ جلتی ہے خود انسان ہیں کچھ اور نہیں۔

اعدت للکافرین میں بتایا کہ وہ کفر سے ہی تیار ہوتی ہے مسلمان میں جس قدر حصہ کفر کا ہے اسی قدر اس کے لیے دوزخ ہے۔ دوزخ پر فنا: یہی وجہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اس بات کے قائل ہیں کہ دوزخ پر آخر فنا آ جائے گی۔ جیسا کہ ابن تیمیہ نے یہ قول ایک جماعت سے نقل کیا ہے۔ کیونکہ روایات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب اس میں کوئی نہ رہے گا پس جب کوئی انسان اس میں نہ رہا اور اس کا ایندھن ختم ہو گیا تو وہ آگ بھی فنا ہو جائے گی۔ اس پر مفصل بحث سورہ ہود میں آئے گی۔

ع ۳۹ جنات۔ جنۃ کی جمع ہے جو جَنّ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا حواس ظاہری سے مخفی رکھنا (غ) اور جنۃ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے درختوں نے اس کی زمین کو ڈھانک لیا ہو (غ) لفظ جنّت صرف باغ کے معنی میں بھی قرآن شریف میں آیا ہے اور بہشت کو بھی جنّۃ کہا ہے یا تو اس لیے کہ اس کو دنیا کے باغوں سے تشبیہ دی ہے (غ) اور بہشت کا نقشہ جو قرآن کریم نے کھینچا ہے وہ گویا بطور مثال ہے جیسا کہ خود الفاظ قرآنی مثل الجنۃ التی وعد المتقون (الرعد ۱۳: ۳۵ - محمد ۴۷: ۱۵) سے بھی ظاہر ہے اور یا اس لیے کہ جنت کی نعمتیں انسان کے حواس ظاہری سے مخفی رکھی گئی ہیں (غ) جیسا کہ لفظ جنّ کے اصل معنی بتاتے ہیں اور قرآن کریم نے اس اخفا کو دوسری جگہ خود بیان فرمایا ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین (السجدہ ۳۲: ۱۷)

الانھار: نہر کی جمع ہے یعنی وہ مقام جہاں سے پانی بافراط بہتا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مثال کے طور پر بیان کیا ہے اس کے لیے جو جنت میں لوگوں کو اس کے فیض اور فضل سے بافراط ملے گا اور تجری من تحتھا الانھار میں اور ان المتقین فی جنات ونھر میں ان کے نزدیک یہی مراد ہے۔

فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾	دیا جائیگا اور انکے لیے اُن میں پاک ساتھی ہونگے اور وہ انہی میں رہیں گے[۱۳۹ف]
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً	اللہ اس بات سے شرم نہیں کرتا کہ کوئی سی مثال بیان کرے مچھر کی اور
فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ	اس سے بڑھ کر[۱۴۰ع] سو جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہ اُن کے رب کی

ربط: جب آگ کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ یہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے تو اس کے مقابل پر مومنوں کا اور ان کی آیندہ حالت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے، اس کے احکام کی فرمانبرداری سے بجائے آگ کے باغ اور نہریں بنتی ہیں۔

بہشت کے باغ اور نہریں: قرآن کریم نے بہشتی زندگی کا نقشہ بسا اوقات ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وہ جنّات یعنی باغوں میں ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یا کہیں فرمایا کہ وہ باغوں میں اور نہریں میں ہوں گے۔ اس سے کیا مراد ہے۔ پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ آیندہ زندگی کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے وہ محض بطور مثال بیان ہوا ہے اور مثل الجنۃ التی وعد المتقون (محمّد[۴۷]-۱۵، الرعد[۱۳]-۳۵) میں یہ صراحت موجود ہے اور ابن عباس سے ابن کثیر میں روایت موجود ہے لا یشبہ شیٔ مما فی الجنۃ ما فی الدنیا الا فی الاسماء یعنی جو چیزیں جنت میں ہیں وہ دنیا کی کسی چیز سے سوائے نام کے مشابہت نہیں رکھتیں اور دوسری بات یہ ہے کہ جنت کی نعماء انسان کی اس آنکھ سے اور اس کے ظاہری حواس سے مخفی رکھی گئی ہیں۔ اس پر اول تو خود لفظ جنّت کے معنی سے شہادت ملتی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ پھر قرآن شریف میں صراحت سے ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین (السجدۃ[۳۲]-۱۷) یعنی کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے لیے کیا آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی نعمت مخفی رکھی گئی ہے اور حدیث صحیح میں اس سے بھی زیادہ صراحت ہے جہاں اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلعم نے فرمایا قال اللہ اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر (بخاری) اللہ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی بشر کے دل پر وہ گزرا۔ جنت کی نعماء کا جہاں ذکر ہو اس میں ان دونوں باتوں کا یاد رکھنا ضروری ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ فی الواقع جنّات سے مراد ایسے باغ تو نہیں جیسے یہاں ہیں اور نہ نہروں سے مراد ایسی ہی پانی کی نہریں ہیں۔ وہ کیا ہیں۔ اس حقیقت کا علم وہیں ہوگا۔

۱۳۹ف متشابہ۔ شبہ سے ہے اور اس کے معنی ہیں ایک دوسرے سے ملتے جُلتے۔

ازواج۔ زوج کی جمع ہے۔ حیوانات میں جن کے جوڑے ہوتے ہیں جوڑے کے ہر فرد کو دوسرے کا زوج کہا جاتا ہے اور غیر حیوانات میں اور حیوانات میں بھی ہر ایک کو جو دوسرے کا قرین یعنی ساتھی ہو اس کا زوج کہا جاتا ہے (غ) چنانچہ احشروا الذین ظلموا وازواجھم (الصّٰفّٰت[۳۷]-۲۲) میں اور ھم وازواجھم فی ظلل (یٰسٓ[۳۶]-۵۶) میں امام راغب نے ازواج کے معنی کیے ہیں ان کے ساتھی جنھوں نے ان کے افعال میں ان کا اقتدا کیا۔

مطھرۃ۔ طہارۃ بمعنی پاکیزگی سے ہے اور طہارت دو طرح پر ہے جسم کی اور نفس کی (غ) چنانچہ یہاں ازواج مطہرۃ کے معنی انہوں نے یوں کیے ہیں کہ دنیا کی آلائشوں اور اس کی نجاستوں سے پاک یا بُرے اخلاق سے پاک کیے گئے۔ قتادہ سے ہے گناہ اور اذی سے پاک کیے گئے (ج)

خالدون۔ خلد سے ہے اور خلود کے معنی ہیں کسی چیز کا فساد کے واقع ہونے سے بری رہنا اور اس کا بقا اس حالت پر جس پر وہ ہو (غ) اور خلود فی الجنۃ کے معنی امام راغب کے نزدیک یہی ہیں یعنی اشیاء کا بقا اس حالت پر جس پر وہ ہیں بغیر اس کے کہ ان میں فساد واقع ہو۔ بالفاظ دیگر وہاں تنزّل نہیں جس طرح اس دنیا میں ہے اور ہمیشگی کے معنی اس میں بطور استعارہ ہیں (غ) اور روح المعانی میں ہے کہ خلود معتزلہ کے نزدیک بقائے دوام یا ہمیشہ رہنا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ اور اہل سنت کے نزدیک بقائے طویل یعنی زمانہ دراز تک رہنا ہے خواہ منقطع ہو جائے خواہ نہ ہو۔

جنت کے پھلوں کے متعلق یہ کہنا کہ یہ وہ ہے جو ہمیں پہلے یعنی دنیا میں دیا گیا۔ مراد جسمانی پھل تو ہو نہیں سکتے کیونکہ وہ پھل تو سب مومنوں کو دنیا میں ملتے نہیں۔ پس مراد اعمال حسنہ کے ثمرات ہیں جن کو روحانی طور پر مومن یہاں بھی پا لیتا ہے اور متشابہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ گو وہ آخرت کے پھل الگ ہوں گے مگر اعمال حسنہ کے مشابہ ہوں گے جس طرح بدی کی سزا اس کی مثل ہے اسی طرح نیکی کا پھل بھی اس عمل نیک سے ملتا جلتا ہے۔

بہشت میں ازواج: جنت میں ازواج بھی ہوں گے۔ ازواج کے صاف معنی تو ساتھی ہیں جیسے احشروا الذین ظلموا وازواجھم۔ (الصّٰفّٰت[۳۷]-۲۲) میں مومن مرد اور مومن عورتیں دونوں الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت میں شامل ہیں دونوں کے لیے بہشت کی نعماء ہوں گی دونوں کے لیے باغ اور نہریں ہوں گی دونوں کے لیے ازواج مطہرہ یعنی پاک ساتھی ہونے چاہئیں۔ اگر بیبیاں بھی مراد لی جائیں تو بہشت میں ان کا ہونا کوئی امر قابل اعتراض نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں جیسا کہ فرمایا ومن کل شیٔ خلقنا زوجین (الذّٰریٰت[۵۱]-۴۹) اور گو جوڑے پیدا کرنے کی ایک غرض اس دنیوی زندگی میں سلسلہ توالد و تناسل بھی ہے۔ مگر مرد و عورت کے جوڑے کی اور اغراض بھی ہیں وہ ایک دوسرے کے لیے تسکین و راحت کا موجب ہیں وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ ان پاک تعلقات کے جنت میں ہونے پر کسی عقلمند کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور بہرحال اس بات کو تو سب نے مانا ہے کہ جنت کی نعماء کی حقیقت وہ نہیں جو اس دنیا کی ہے گو ناموں میں اشتراک ہو اور ازواج کے ساتھ مطہرۃ کا لفظ بڑھا کر بتایا کہ یہ رفاقت تمام آلائشوں سے پاک ہے اس پاک رفاقت پر اعتراض کرنا ناپاکوں کا کام ہے۔

۱۴۰ع یستحی۔ اس کا مادہ حیی ہے جس سے حیاۃ بمعنی زندگی بھی ہے اور حیاء کے اصل معنی ہیں بُری باتوں سے رُکنا اور ان کا ترک کرنا اور یہی معنی استحیاء کے ہیں (غ) اسی لیے حیا کو ایمان سے کہا ہے کیونکہ وہ بُری باتوں یعنی معاصی سے روکتا ہے۔ اچھے کام سے رکنے کا نام حیا نہیں۔

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ
مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ
يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾
الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠
وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ
فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

طرف سے سچ ہے اور جنھوں نے انکار کیا وہ کہتے ہیں اللہ نے اس مثال سے
کیا چاہا ہے وہ بہتیروں کو اس سے گمراہ ٹھیراتا ہے اور بہتیروں کو اس سے
ہدایت دیتا ہے اور وہ اس سے سوائے فاسقوں کے کسی کو گمراہ نہیں ٹھیراتا ع۴۱
جو اللہ کے عہد کو اس کے پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اُسے
کاٹتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ ملایا جائے اور زمین میں
فساد پھیلاتے ہیں یہی نقصان اُٹھانے والے ہیں ع۴۲

بعوضۃ ۔ بعض سے مشتق ہے دوسرے حیوانات کے مقابل میں اس کے جسم کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بعوضۃ کہا جاتا ہے (غ) عربی زبان میں غایت درجہ کی کمزور چیز کی مثال مچھر سے دی جاتی ہے ان کی امثال میں ہے اضعف من بعوضۃ یعنی مچھر سے بھی زیادہ کمزور۔

مچھر کی مثال: اصل مضمون رکوع کا اللہ تعالیٰ کی توحید اور عظمت ہے اسی کی تائید میں قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا اثبات کیا گیا ہے۔ رکوع کے اول آخر میں بھی یہی مضمون ہے، اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو معبودان باطل کی مثالیں کہیں مکڑی سے اور کہیں مکھی سے دی ہیں تو یہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ حق کے بیان کرنے سے نہیں رُکتا۔ مکڑی کی مثال سورہ عنکبوت میں دی ہے جہاں فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے سوائے اولیاء بناتے ہیں تو ان کی مثال مکڑی کے گھر کی ہے جو سب گھروں میں کمزور ہے یعنی ادھر بنتا ہے اُدھر بگڑتا ہے (العنکبوت ۲۹-۴۱) اور مکھی کی مثال یوں دی ہے کہ سارے معبودان باطل ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ مکھی ان سے کچھ لے جائے تو اسے بھی واپس نہیں لے سکتے (الحج ۲۲-۷۳) معبودان باطل کی ان مثالوں کو کفار بُرا مناتے تھے تو فرمایا کہ کمزور سے کمزور شے کی مثال بھی باطل معبودوں کی عاجزی کے اظہار کے لیے غیر محل نہیں حتیٰ کہ مچھر کی مثال بھی جس کو سب سے زیادہ کمزور سمجھا جاتا ہے اور یا چونکہ اوپر جنت کا ذکر تھا اور وہ بھی ایک مثال ہے اس لیے فرمایا کہ ان نعماء کو سمجھانے کے لیے اس دنیا کی چیزوں سے ان کی مثال دینے میں ہرج نہیں۔

ع۴۱ یضل ۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ اضلال دو طرح پر ہے ایک یہ کہ اضلال نتیجہ ہو گمراہ ہو جانے کا مثلاً اگر کسی کا اُونٹ گم ہو جائے تو وہ کہے گا اضللت البعیر۔ اب اس کے یہ معنی نہیں کہ میں نے اونٹ کو گمراہ کر دیا۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ میرا اونٹ گمراہ ہو گیا یعنی گم ہو گیا۔ اسی طرح کسی پر گمراہ ہونے کا حکم لگایا جائے یعنی اس کے متعلق کہا جائے کہ وہ گمراہ ہو گیا تو بھی اضللتہ کہ دینگے۔ جیسے اس شعر میں۔ فما زال شربی الراح حتی ٭ اضلنی صدیقی وساءنی بعض ذٰلک یعنی میں شراب پیتا رہا یہاں تک کہ میرے دوست نے مجھے گمراہ قرار دیا۔ حالانکہ لفظ اضلّ استعمال کیا ہے مگر مراد یہ نہیں کہ گمراہ کر دیا بلکہ گمراہ کہا۔ اور دوسرا یہ کہ اضلال کا نتیجہ گمراہی ہو یعنی ایک شخص دوسرے کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگا رہے یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو جائے مثلاً باطل کو اچھے اچھے پیرایوں میں بیان کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ لفظ اضلال پہلے معنی میں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے یا دوسرے معنی میں۔ دوسرے معنی میں منسوب کرنے سے یہ مراد ہوگی کہ خدا تعالیٰ انسانوں کے سامنے باطل باتوں کو اچھے پیرایوں میں بیان کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو جاتے ہیں یہ بالبداہت باطل ہے اللہ تعالیٰ اعمال حسنہ کو اچھے پیرایوں میں بیان کرتا ہے اور اُن کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے پس لازماً پہلے معنی میں لفظ لیا جائے گا اور مراد صرف اس قدر ہوگی کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو گمراہ پاکر گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے یا ان پر گمراہ ہونے کا فتویٰ لگاتا ہے یعنی ان کی گمراہی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بطور سزا گمراہ ہونے کا فتویٰ لگ جاتا ہے لغتِ حدیث میں بھی ہے کہ اضللتہ کے معنی اس طرح پر بھی آتے ہیں جیسے احمدتہ کے معنی ہیں میں نے اس کو محمود پایا اور ابخلتہ کے معنی ہیں میں نے اس کو بخیل پایا۔ اسی طرح اضللتہ کے معنی ہیں میں نے اُسے گمراہ پایا۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے ان النبی صلعم اتیٰ قوماً فاضلھم جس کے معنی ہیں کہ نبی صلعم ایک قوم کے پاس آئے اور ان کو گمراہ پایا۔ یہ معنی نہیں کہ ان کو گمراہ کر دیا (ت)

الفاسقین ۔ فاسق فسق سے ہے جس کے معنی شریعت کی روک سے نکل گیا گویا ایک عہد کر کے اس سے پھر گیا کیونکہ قبولیت شریعت ایک عہد ہے اور فسق تھوڑے اور بہت ذنوب دونوں پر بولا جاتا ہے مگر عرف شریعت میں کثرت پر بولا جاتا ہے۔ یعنی جب ایک شخص بہت زیادہ خروج عن الشریعت کرے تو اسے فاسق کہا جاتا ہے اور کفار کو جو فاسق کہا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے کہ وہ زیادہ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس عہد کو توڑتے ہیں جو انسان کی فطرت میں مرکوز ہے (غ) اور یہ شرعی اصطلاح ہے۔ فاسق کا لفظ کلام عرب میں انسان کی وصف میں نہ بولا جاتا تھا (غ) یہاں مایضلّ بہ الا الفاسقین کہہ کر یہ بتا دیا کہ اضلال کے معنی گمراہ پانا یا گمراہی میں چھوڑنا ہیں کیونکہ فاسق تو خود ہی پہلے گمراہ ہے اسے اور گمراہ کیا کرنا ہے کیونکہ فاسق اس کو کہتے ہیں جو شریعت یعنی قانون کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے تو وہ خود گمراہ ہو چکا ہوا ہے یہ دوسرا قرینہ ہے کہ اضلال کے معنی یہاں گمراہ ٹھہرانا یا گمراہی میں چھوڑ دینا ہیں۔

ع۴۲ عھد اللہ ۔ عہد وہ اقرار موثق ہے جس کی حفاظت کرنی ضروری ہو۔ راغب لکھتے ہیں کہ عھد اللہ یعنی اللہ کا عہد کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس نے ایک بات ہماری عقل میں ودیعت کر رکھی ہے اور کبھی یہ کہ اس کے رسول کتاب و سنت سے ایک بات کا حکم دیتے ہیں (تیسری صورت یہ بھی لکھی ہے کہ انسان خود اپنے اوپر ایک امر کو واجب کر لے جسے نذر کہا جاتا ہے) پہلے کی مثال الست بربکم قالوا بلیٰ (الاعراف ۷-۱۷۲) ہے جس کو قرآن کریم نے خود عہد فرمایا ہے۔ اللہ کا سب سے بڑا عہد یہی ہے جس کو ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیا کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ
ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا
ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ
سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو اور تم مُردہ تھے، پھر اُس نے تمھیں
زندگی دی، پھر تم کو مار یگا، پھر تمکو زندہ کریگا، پھر اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے[۴۳]
وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمھارے لیے پیدا
کیا، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہُوا تو انھیں ٹھیک سات آسمان
بنایا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے[۴۴]

میثاق عھد: من بعد میثاقہ۔ میثاقہ میں ضمیر عہد کی طرف بھی جا سکتی ہے اور اللہ کی طرف بھی۔ اور اللہ کا عہد کو مضبوط کرنا یا تو یہ ہے کہ وہ عہد خود مضبوط ہوتا ہے جیسے عقل و فطرت کی شہادت کہ وہ ایک نہایت مضبوط شہادت ہے اور یا جب رسولوں کے ذریعہ سے کوئی حکم دیا جاتا ہے تو اس کو بذریعہ نشانات و دلائل کے مضبوط کیا جاتا ہے اور میثاق عہد سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک شخص اس عہد کو قبول کرکے پھر اسے توڑتا ہے جیسے منافق ہو گیا۔

قطع ما یوصل: یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ان باتوں کو قطع کرنا جن کے ملانے کا حکم اللہ نے دیا ہے یعنی جن حقوق کے ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ان کا ادا نہ کرنا۔ اس میں قطع رحمی بھی آجاتی ہے اور مخلوق کے تمام حقوق بھی آجاتے ہیں گویا حقوق مخلوق کا ادا نہ کرنا بھی فسق ہے۔ خواہ وہ اپنے عزیزوں، دوستوں کے حقوق ہوں خواہ اپنے ہمقوموں اور ہموطنوں کے، خواہ دوسری اقوام کے۔

فساد فی الارض: یفسدون فی الارض۔ وہ نہ صرف اللہ کے عہد کو توڑتے اور اللہ کی عبادت سے انحراف کرتے ہیں نہ صرف مخلوق کے حقوق کو ادا نہیں کرتے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زمین میں فساد پھیلاتے اور ظلم کرتے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ادا نہ کرنے کا نتیجہ فساد فی الارض ہے اور آخر کار وہ ایک کھلی صورت اختیار کر لیتا ہے ایسی قوم کی آخری حالت کی تصویر اولٰئک ھم الخاسرون ہے یعنی وہ سخت نقصان اس دنیا میں بھی اُٹھاتے ہیں۔

خاسرون۔ خسر اور خسران راس المال کے گھاٹے کا نام ہے اور اس کا اکثر استعمال مال وجاہ کے نقصان پر ہوتا ہے مگر قرآن شریف میں عموماً عقل ایمان اور ثواب کے نقصان پر بولا گیا ہے (غ)

ع[۴۳] اس آیت میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر ہے۔ پہلی موت سے مراد عدم ہے یعنی نیستی کی حالت سے عالم وجود میں آنا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے ھل اتٰی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئا مذکورا (الدھر ۷۶-۱) یہی معنی ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے ثابت ہیں۔

نیستی سے ہستی دلیل الوہیت ہے: پس یہاں اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل دی ہے کہ نیستی سے تم کو ہستی کی حالت میں لایا۔ اگر آریوں کی طرح محض یہ مانا جائے کہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال ہوتا ہے اور نیستی سے ہستی کوئی نہیں تو الوہیت پر دلیل پیدا نہیں ہوتی۔

ثم یمیتکم ثم یحییکم بطور دلیل نہیں بلکہ اس میں آئندہ کی ایک خبر بتائی کہ موت کے بعد وہ تمہیں پھر ایک زندگی عطا فرمائے گا۔ اللہ کی طرف رجوع: اور ثم الیہ ترجعون میں اس دوسری زندگی کی غرض بتائی کہ تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے بالآخر سب کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہو گا۔

ع[۴۴] ثم کے معنی میں ترتیب شرط نہیں (مغنی) بعض وقت صرف فا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہاں یہی معنی ہیں کیونکہ دوسری جگہ صاف فرما دیا والارض بعد ذٰلک دحٰھا (النزعٰت ۷۹-۳۰) یعنی زمین بعد میں بنی۔

استوٰی الیٰ۔ استوٰی۔ جب دو فاعل رکھتا ہو تو مساوی ہونے کے معنی میں ہوتا ہے جیسے لا یستوون اور جب ایک ہی فاعل ہو تو ایک چیز کے اپنی ذات میں اعتدال کی حالت میں ہونے پر دلالت کرتا ہے جیسے ذو مرۃ فاستوٰی (النجم ۵۳-۶) اور جب اس کا صلہ الیٰ ہو جیسے یہاں تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی طرف پہنچنا اپنی ذات سے ہو یا تدبیر سے (غ)

السماء۔ لغت میں ہے سماء کل شی اعلاہ ہر ایک چیز کے اوپر جو ہو وہ اس کا سماء ہے۔ یہاں تک کہ وہی چیز اپنے سے اوپر والی چیز کے لحاظ سے ارض ہے اور اپنے سے نیچے والی چیز کے لحاظ سے سماء ہے (غ)

سبع یا سات کو اعداد تامہ میں سے سمجھا گیا ہے اور لسان العرب میں ہے کہ عرب لوگ سات اور ستر اور سات سو کے اعداد کو کثرت کے موقعہ پر استعمال کرتے ہیں۔ ابن اثیر نے بھی ایسا ہی لکھا ہے اور مثال دی ہے کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل (۲-۲۶۱) گویا سات خوشوں سے مراد بہت سے خوشے ہیں ان تستغفر لھم سبعین مرۃ (التوبہ ۹-۸۰) گویا ستر مرتبہ سے مراد کئی دفعہ ہے۔

سوّی، سوّٰھن۔ تسویۃ کے معنی ہیں کسی چیز کا ٹھیک ٹھیک بنانا یا حالت اعتدال پر یا حکمت کے بموجب بنانا (غ) خلقک فسوّٰک (الانفطار ۸۲-۷) میں یہی معنی مراد ہیں اور یہاں بھی

علیم۔ علم سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اس کی حقیقت کے ساتھ پا لینا (غ) اور عالم اور علیم اور علّام اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں یعنی جاننے والا اس کا جو ہے اور جو اس کے ہونے سے پہلے ہے اور جو ہو گا اور جو اس کے بعد ہو گا اور اس کا علم تمام اشیاء پر محیط ہے ان کے ظاہر پر اور ان کے باطن پر اور چھوٹی پر اور بڑی پر (ت)

زمینی مخلوق انسان کے فائدے کے لیے ہے: زمین میں جو کچھ ہے اس کو انسان کے فائدے کے لیے بنایا۔ اس آخری آیت میں اس اور اگلے دونوں رکوعوں کے مضمون کی طرف اشارہ ہے بنانے والے کی عظمت کی طرف بھی اور اس کے مقام بلند کی طرف بھی جس کے فائدے کے لیے یہ چیزیں بنائیں، رکوع کو اس بات سے

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں ع۴۵ انھوں نے کہا کہ کیا تو اس میں (اسے) بناتا

شروع کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا اور اس پر ختم کیا کہ زمین میں سب کچھ انسانوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا۔ اس میں یہ بھی سکھایا کہ تم ان چیزوں کو اپنے فائدے کے لیے اپنے کام میں لگانا سیکھو۔

آسمان: سماء کیا ہے اور سبع سمٰوات سے کیا مراد ہے لغت میں محض بلندی کا نام سماء ہے پس مراد ہے کہ اس کی طرف متوجہ ہوا جو زمین سے اوپر ہم کو نظر آتا ہے وہ کیا چیز ہے۔ آسمان دخان ہے: قرآن کریم میں فرمایا ثم استوٰی الی السماء وھی دخان (حٰم السجدۃ ۴۱-۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دخان ہے یعنی دھواں ہے۔ پس سماء کوئی ٹھوس چیز نہیں۔ بلکہ محض ایک دخان ہے۔ سائنس کہتا ہے ایتھر ہے ہاں اس میں ستارے اور سیارے ہیں۔

سات آسمان: سبع سماوات میں ممکن ہے محض تکثیر مراد ہو یعنی کئی آسمان۔ یوں جو اوپر کوئی عالم ہم کو نظر آتا ہے۔ ایک تو خود ہمارا نظام شمسی ہے جس میں زمین کے علاوہ سات بڑے سیارے ہیں۔ وہ سب چونکہ ہم کو زمین کے اوپر نظر آتے ہیں اس لیے بلحاظ ہماری زمین کے وہ سماء ہیں اور ایک جگہ ان کو سبع طرائق (المومنون ۲۳-۱۷) یعنی سات رستے بھی کہا ہے۔ اور کل فی فلک یسبحون (یٰسٓ ۳۶-۴۰) میں یہ بھی بتا دیا کہ سیارے اپنے اپنے فلک میں گردش بھی کرتے ہیں پس ایک تفسیر سبع سماوات کی ہمارا نظام شمسی بھی ہو سکتا ہے اور دوسری تفسیر کل ستارے جو ہم کو نظر آتے ہیں۔ اب تک سائنسدانوں نے ان ستاروں کے جو کھلی آنکھ سے نظر آتے ہیں سات طبقے کیے ہیں اس لحاظ سے کہ کوئی ان میں سے بڑا اور کوئی چھوٹا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے آئندہ جب افلاک کا علم اور بڑھ جائے تو کوئی اور سات تقسیمیں معلوم ہو جائیں۔ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ صدیوں بعد سچ ثابت ہوا ہے مثلاً فرمایا وجعلنا من الماء کل شئ حی (الانبیاء ۲۱-۳۰) یعنی زندگی پانی سے پیدا ہوتی ہے۔ یا فرمایا کہ ہم نے حیوانات نباتات ہر ایک قسم کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔ ان دونوں باتوں کا علم سائنسدانوں کو پہلے نہ تھا۔

صفات علم و قدرت: اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ذکر کیا اور خاتمہ کمال علم الٰہی پر کیا اس لیے کہ قدرت کاملہ اور علم کامل ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ہیں اور انہی دو صفات پر ایمان لانے سے انسان گناہ سے بچ سکتا ہے جب اس کا علم کامل ہے تو انسان دوسروں سے کتنا بھی چھپ کر کچھ کرے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہوگا۔ پھر ہر ایک فعل کی جزا و سزا پر اس کو قدرت بھی ہے۔

ع۴۵ قول: قال۔ مفردات میں ہے کہ قول سے مراد نطق بھی ہوتا ہے یعنی زبان سے الفاظ کا ادا کرنا اور جو دل میں تصور کر لیا جائے قبل اس کے کہ لفظوں میں اس کا اظہار ہوا سے بھی قول کہہ دیتے ہیں۔ ویقولون فی انفسھم لولا یعذبنا اللہ (المجادلۃ ۵۸-۸) اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ اور اعتقاد پر بھی قول کا لفظ بول دیتے ہیں۔ کسی چیز کی حالت کسی بات پر دلالت کرے تو اسے بھی قول کہہ دیتے ہیں امتلاء الحوض وقال قطنی یعنی حوض بھر گیا اور اس نے کہا مجھے بس ہے۔ قرآن کریم میں ہے قالتا اتینا طائعین (حٰم السجدۃ ۴۱-۱۱) راغب کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی تسخیر سے تھا نہ ظاہر خطاب سے قلنا یا نار کونی بردا میں یہی توجیہ کی ہے ابن اثیر کہتے ہیں کہ عرب لوگ قول سے تمام افعال مراد لیتے ہیں اور جہاں زبان سے کلام نہ ہو اس پر بھی اس کا اطلاق کرتے ہیں۔ قال بیدہ یعنی پکڑ لیا۔ قال برجلہ چلا گیا۔ قالت لہ العینان یعنی آنکھوں نے اشارہ کیا۔ قال بالماء علی یدہ پانی ہاتھ پر ڈالا۔ قال بثوبہ کپڑا اٹھا لیا۔ احادیث میں قال بمعنی آرام کیا۔ آگے ہوا۔ مائل ہوا۔ مارا۔ غالب آیا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا قول یا کچھ فرمانا بندوں سے ایک رنگ رکھتا ہے۔ اور فرشتوں سے دوسرا۔ حیوانات سے تیسرا، زمین و آسمان سے چوتھا۔ پھر خود انسانوں میں الگ الگ رنگ ہیں۔ ایک بات فطرت میں رکھ دیتا ہے وہ بھی اس کا ارشاد ہے ایک طرف عقل کے ذریعہ ہدایت فرماتا ہے وہ بھی اس کا قول ہے۔ انبیاء کی وحی اور ہی رنگ رکھتی ہے۔ بذریعہ الہام اور خواب بھی کچھ فرماتا ہے۔ باقی مخلوق کو وہ کس طرح فرماتا ہے اس کو انسان نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ وہ اس کے تجربے سے باہر چیز ہے ایسا ہی ان کا خدا کے حضور کچھ عرض کرنا یہ بھی نہیں سمجھ سکتا ہے۔

ملٰئکۃ۔ ملاک کی جمع ہے جس کی دوسری صورت ملک ہے اور اس کا مادہ الک ہے اور الوکۃ بمعنی رسالت ہے گویا ملک بمعنی رسول ہے اور یا یہ ملک سے مشتق ہے۔

فرشتوں کا وجود: ملائکہ نورانی ہستیاں ہیں جن کو یہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول یعنی وسائط ہیں۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ ملائکہ صرف قوتوں اور طاقتوں کا نام ہے۔ حتیٰ کہ نبوت کو بھی ایک ملکہ یا طاقت قرار دیکر اس کا نام جبرئیل قرار دیا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے بھی یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ وحی الٰہی انسان کے اندر سے ہی ایک آواز کے پیدا ہونے کا نام ہے اور وہ کوئی خارجی شے نہیں۔ وحی الٰہی خارجی شے ہے: حالانکہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان سے کلام کرنے کا ذکر ہے وہاں اگر کلام کی ایک صورت یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ دل میں ایک بات ڈال دیتا ہے تو دوسری صورت من وراء حجاب فرمائی اور تیسری یہ کہ وہ رسول بھیجکر اپنا کلام پہنچاتا ہے جہاں رسول سے مراد جبرئیل ہی ہے۔ پس اگر یہ محض اندر کی شے ہوتی تو یہ تیسری صورت قطعاً ناممکن تھی اور اگر وحی اندر کی آواز نہیں بلکہ خارجی شے ہے تو ملک یا فرشتہ بھی قوائے عالم یا قوائے انسانی کا نام نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ ملائکہ وہ وسائط ہیں جو ان قوائے عالم یا قوائے انسانی کے عمل میں آنے کا ذریعہ بنتے ہیں وہ ان قویٰ پر ایک گونہ حاکم ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ جب انسان کے قوائے ظاہری کے لیے ظاہری وسائط موجود ہیں اور انکے بغیر وہ قوتیں کام نہیں دیتیں مثلاً دیکھنے کے لیے نہ صرف انسان کے اندر ایک قوت ہے بلکہ باہر ایک واسطہ روشنی ہے جس کے بغیر وہ قوت کام نہیں دیتی اور سننے کے لیے نہ صرف انسان کے اندر ایک سننے کی قوت ہے بلکہ باہر ایک واسطہ ہوا ہے جسکے بغیر وہ قوت کام نہیں دیتی اسی طرح اس

وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ

ہے جو اس میں فساد کرتا اور خون گراتا ہے[۴۶] اور ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں[۴۷]۔

کے قوائے باطنی کے لیے باطنی وسائط کی ضرورت ہے اور یہ وسائط یا نیکی کی قوتوں کو تحریک میں لاتے ہیں اور ملک کہلاتے ہیں اور یا بدی کی قوتوں کو تحریک میں لاتے ہیں اور جن یا شیاطین کہلاتے ہیں۔ اسی لیے ملک کی پیدائش نور سے اور جن کی پیدائش نار سے مانی گئی ہے۔ علاوہ ازیں دنیا کے بڑے بڑے راستبازوں کی شہادت اس بات پر ہے کہ ملائکہ علیحدہ ہستیاں ہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو جن لوگوں کا اس بات پر اعتقاد ہے کہ نیکی کے کوئی محرک ہیں جن کو ہم ملک کہتے ہیں انہی میں اعلیٰ درجہ کی نیکیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور فلسفی جو اس بات پر ایمان نہیں رکھتے وہ عملاً بھی ان نیکی کے محرکات سے فائدہ نہیں اٹھاتے جس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ کا علیحدہ ہستیاں ہونا ہی صحیح خیال ہے کیونکہ اس پر عملی شہادت ملتی ہے۔

خلیفۃ۔ خلف سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پیچھے آنا۔ اور خِلافۃ کے معنی دوسرے کی نیابت کرنا ہے یا اس کے قائمقام ہونا بوجہ اس کی غیر حاضری کے یا اس کے مرجانے کے یا کام کی نااہلیت کے مگر بعض وقت جس کو خلیفہ بنایا جائے اس کی عزت افزائی کے لیے ہوتا ہے اور اسی آخری وجہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین پر اپنا خلیفہ فرمایا ہے (غ) ذریت آدم خلیفہ ہے: یہاں خلیفہ کے معنی میں مفسرین نے عموماً اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد خود حضرت آدم علیہ السلام نہیں بلکہ حضرت آدم کی ذریت ہے ایک اس لیے کہ آگے فساد اور خونریزی کا ذکر ہے اور وہ نسل انسانی کی طرف ہی اشارہ ہے نہ خود آدم کی طرف اور دوسرے اس لیے کہ قرآن کریم میں نسل انسانی کو خلیفہ فرمایا ہے ھو الذی جعلکم خلائف الارض (الانعام ۶-۱۶۵) ویجعلکم خلفاء الارض (النمل ۲۷-۶۲) اللہ تعالیٰ کی نیابت یہ ہے کہ اس کے علم سے اور اس کی قدرت سے کچھ حصہ انسان کو ملا ہے۔

ضرورت نبوت: اس رکوع میں انسان کے مقام بلند کا ذکر کیا اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ جسمانی رنگ میں وہ اس مقام بلند کو حاصل کر سکتا ہے مگر اخلاقی اور روحانی رنگ میں بغیر اللہ تعالیٰ کی وحی کے کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس طرح شرف انسانی کے ساتھ ضرورت نبوت کو وابستہ کر دیا۔

انسان کے خلیفہ ہونے سے مراد: سب سے پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ ملائکہ کو کچھ فرماتا ہے۔ ملائکہ چونکہ وسائط ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کا ان کو فرمانا یہ معنی رکھتا ہے کہ ارادہ الٰہی ظہور میں آئے۔ وہ ارادہ الٰہی یہ ہے کہ کوئی اس کی مخلوق زمین میں خلیفہ کا حکم رکھے۔ یہ مخلوق انسان ہے جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے یا جیسا کہ دوسری جگہ فرماتا ہے انی خالق بشرا (الحجر ۱۵-۲۸) میں ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہوں۔ اور انسان کے خلیفہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت سے حصہ ملیگا۔ چنانچہ آگے انہیں دو باتوں کا ذکر ہے ایک علّم اٰدم الاسماء میں انسان کو علم دینے کا اور دوسرا ملائکہ کو فرمانبرداری کا حکم دیکر اپنی قدرت سے اس کو حصہ دینے کا۔ اور دوسری جگہ قرآن شریف میں آتا ہے سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا منہ (الجاثیہ ۴۵-۱۳) قدرت کی بہت سی طاقتیں ہیں وہ ایک دوسری پر حکمران نہیں ہو سکتیں مگر انسان ان سب پر حکمران ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کو ملک سے بھی بڑھ کر شرف حاصل ہے۔

ع۴۶ یسفک۔ سفک سیال چیز کے گرانے پر بولا جاتا ہے (غ) اور عموماً اس کا استعمال خون گرانے پر یا آنسو بہانے پر ہوتا ہے (ر)

الدماء۔ دَمٌ کی جمع ہے جس کے معنی خون ہیں۔

فرشتوں کا ذکر فساد: فرشتوں کا یہ کہنا نہ بطور مشورہ ہے اس لیے کہ مشورہ دینا ان کا کام نہیں یخلق ما یشاء اور نہ بطور اعتراض ہے اس لیے کہ وہ یفعلون ما یؤمرون کا مصداق ہیں۔ نہ وہ مشورہ دے سکتے ہیں نہ اعتراض کر سکتے ہیں نہ انکار کر سکتے ہیں۔ وہ وسائط ہیں جب ارادۂ الٰہی ایک امر کا ہو تو وہ اس کو عمل میں لے آتے ہیں پھر ان کا کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ ملائکہ کا کہنا فی الحقیقت اس رنگ کا نہیں جس رنگ کا انسان کا کہنا ہے بلکہ یہ محض ایک حالت کا اظہار ہے کہ انسان سے فساد اور خونریزی وقوع میں آئے گی اور یہ بالکل سچ ہے، یا مطلب یہ ہے کہ کیا ایک حاکم کی ضرورت اس لیے ہے کہ زمین میں فساد کرنیوالے لوگ ہونگے۔

ملائکہ کو انسان کی خونریزی کا علم کس طرح ہوا: دوسرا سوال ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا؟ اس لیے کہ انسان کے کمالات تو تدریجاً ظہور پذیر ہونے والے تھے لیکن فساد خونریزی پہلے ہی ظہور پذیر ہو جاتے ہیں مگر ابھی انسان پیدا ہی نہیں ہوا تو ملائکہ کو یہ علم کس طرح ہو گیا کہ فساد اور خونریزی ہو گی؟ دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ پہلے معنی کے لحاظ سے دو جواب ہیں۔ اوّل اللہ تعالیٰ ہمیشہ خلق کرتا رہا ہے پہلے کوئی ایسی مخلوق گزر چکی تھی۔ دوم خلیفہ کے لیے ضروری تھا کہ متضاد طاقتوں پر حکومت کرے اور یہ نہ ہو سکتا تھا جب تک خود اس کے اندر متضاد طاقتیں جمع نہ ہوں اور متضاد طاقتوں کے ایک ہی مخلوق میں جمع ہونے کا نتیجہ فساد اور خونریزی کو چاہتا ہے۔ بہرحال ملائکہ کی زبان سے انسان کو سمجھایا ہے کہ کس بلند مقصد کے لیے اسے پیدا کیا گیا تھا اور کس طرح وہ فساد اور خونریزی سے اس مقصد کو ترک کر رہا ہے۔

ع۴۷ نسبح۔ تسبیح۔ سبح سے ہے جس کے معنے ہیں پانی میں اور ہوا میں تیزی سے گزرنا۔ کل فی فلک یسبحون (یٰس ۳۶-۴۰) اور عمل میں تیزی سے گزرنے پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے ان لک فی النھار سبحا طویلا (المزمل ۷۳-۷) اور تسبیح کے معنی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں تیزی سے گزرنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی تنزیہ (غ) یا عیب سے پاک ہونا بیان کرنا۔ سُبْحَانَ اسی سے مصدر ہے اور سبحانک کے معنی ہیں تیری تنزیہ ہو اور بحمدک ساتھ بڑھایا کہ تیری ذات صرف عیوب سے پاک نہیں بلکہ انعامات کی وجہ سے حمد کی مستحق بھی ہے۔

نقدس لک۔ قُدْس کے معنی طہارت اور تقدیس کے معنی تطہیر ہیں (ل) نقدس لک کے معنی بعض نے یوں بھی کیے ہیں کہ ہم تیرے لیے اپنے آپ کو اور ان کو جو تیری اطاعت کرتے ہیں پاک رکھتے ہیں (ل) مگر القدوس اسمائے الٰہی میں سے ہے۔ تسبیح و تقدیس میں فرق: تسبیح اور تقدیس

قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰
فرمایا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۴۸

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۳۱
اور آدم کو سب کے نام سکھائے ۴۹ پھر اُن (چیزوں) کو فرشتوں کے سامنے کیا اور کہا مجھے اُن کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو ۵۰

دونوں صلہ ل کے ساتھ اور اس کے بغیر بھی آتے ہیں پس مراد یہ ہے کہ ہم تیری نسبت طہارت کی طرف کرتے ہیں اور تسبیح اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بلحاظ اس کی ذات کے ہے جسم، ندّ وغیرہ سے پاک ہونا اور تقدیس اس کی تنزیہ بلحاظ صفات یا افعال ہے اور تسبیح و تقدیس کے ذکر سے مراد ہے کہ یہ کہنا بطور اعتراض نہیں کیونکہ تیری ذات اور صفات سب نقائص و عیوب سے مبرا ہیں۔

ع ۴۸ اعلم ما لا تعلمون یعنی اس کے اندر کمالات ہیں جن کا علم ملائکہ کو ابھی نہیں دیا گیا اور وہ کمالات ابھی ظاہر ہونے والے تھے۔

ع ۴۹ ادم۔ ابوالبشر کے لیے اسم معرفہ ہے مگر بعض وقت مورث اعلیٰ کا نام لیا جاتا ہے مراد اس کی نسل بھی ہوتی ہے۔ یہاں نسل انسانی شامل ہے کیونکہ علم صرف آدم کو نہیں دیا گیا بلکہ نسل انسانی کو بھی۔ امام راغب کہتے ہیں آدم کو آدم اس لیے کہا گیا کہ اس کو عقل و فہم دے کر جسے دوسری جگہ روح سے تعبیر کیا گیا ہے تمام مخلوقات پر فضیلت دی گئی کیونکہ اُدم کے معنی میں فضیلت ہے۔ یا اُدم نام اس لیے رکھا کہ اس میں مختلف عناصر اور متفرق قویٰ رکھے گئے جیسے فرماتا ہے امشاج نبتلیہ (الدھر ۲) کیونکہ اُدْمَہ کے معنی تخلیط یعنی ملانا جلانا آتے ہیں اور حدیث میں جہاں منسوبہ کو دیکھ لینے کی ہدایت فرمائی ہے تو اس کی وجہ بتائی ہے یؤدم بینکما جس کی تشریح ابن اثیر نے کی ہے تاکہ تمہارے درمیان محبت اور اتفاق ہو۔

الاسماء۔ اسم کی جمع ہے دیکھو ۱۔ بخاری میں اس کی تفسیر میں حدیث شفاعت نقل کی ہے جس میں حضرت آدم کے ذکر میں آتا ہے وعلمک اسماء کل شئ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب چیزوں کے اسماء سکھائے پس الاسماء کلھا سے مراد سب چیزوں کے اسماء ہیں یعنی سب چیزوں کے نام یا سب چیزوں کی صفات یعنی ان کے خواص اور امام راغب کہتے ہیں کہ الاسماء سے یہاں الفاظ اور معانی مفردات اور مرکبات سب مراد ہیں اور پھر وہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا محض نام کسی زبان میں جاننا مفید نہیں ہوتا جب تک کہ اس نام کے ساتھ اس چیز کی صورت کی طرف ذہن منتقل نہ ہو پس محض نام کا جاننا ایک صوت یعنی آواز ہے اور کسی چیز کے نام کی معرفت تب ہی حاصل ہوتی ہے جب اس چیز کی معرفت حاصل ہو اور بعض نے الاسماء کلھا سے مراد اسمائے ملائکہ لیے ہیں اور بعض نے اسمائے ذریت آدم (ج)

بنی آدم اور علم اسماء: اب جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے حضرت آدم کے ذکر میں بنی آدم بھی شامل ہیں یعنی نسل انسانی کا بھی ذکر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خلق الانسان علمہ البیان میں ہر ایک انسان کا ذکر ہے نہ صرف حضرت آدم کا۔ کیونکہ بیان سب کو سکھایا۔ تو پس چیزوں کے اسماء یعنی ان کے صفات یعنی خواص بھی سب کو ہی سکھائے اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ انسان ان باتوں کو خود تدریجاً سیکھتے ہیں۔ خدا کا انسان کو علم دینا: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کے سیکھنے کی استعداد انسان کے اندر رکھ دی ہے وہ گویا اس نے انسان کو سکھا ہی دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایک طرف چیزوں کے اندر خواص رکھ دینا دوسری طرف انسان کے اندر یہ استعداد رکھ دینا کہ وہ ان کو معلوم کرے یہ انسان کو علم دے دینا ہے گو انسانی جدوجہد کی اس میں ضرورت باقی رہے۔ بعینہٖ جس طرح اللہ تعالیٰ کا انسانوں کو رزق دے دینا یہ ہے کہ ایک طرف اس رزق کے سامان عالم میں پیدا کر دیئے ہیں اور دوسری طرف انسان کے اندر استعداد رکھ دی ہے کہ ان کو حاصل کرے اور قرآن کریم نے خود تعلیم یا علم دینے کا استعمال ایسے موقعوں پر کیا ہے جیسے علم بالقلم (العلق ۹۶: ۴) میں جو علوم قلم کے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ تدریجاً ہی انسان کی جدوجہد سے حاصل ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف ہی منسوب کیا ہے۔ اسی طرح کاتب کے متعلق فرمایا کہ وہ لکھ دیا کرے۔ کما علمہ اللہ (۲: ۲۸۲) جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا۔ حالانکہ کاتب خود اپنی محنت سے سیکھتا ہے۔ اسی طرح شکاری کتوں کو جو انسان سکھاتا ہے تو اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تعلمونھن مما علمکم اللہ (المائدۃ ۵: ۴) گویا یہ علم بھی اسی علم میں سے ہے جو خدا نے تم کو تعلیم کیا ہے پس ان تمام موقعوں سے صاف ظاہر ہے کہ نسل انسانی بھی علم ادم الاسماء کلھا میں شامل ہے کیونکہ ان کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی ذات اور ان کے خواص کو جاننے کی استعداد رکھ دی ہے۔ خواص اشیاء کا علم: اور بیضاوی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اجزائے مختلف اور قوائے متفرق سے پیدا کیا اور اس میں یہ استعداد رکھی کہ وہ قسم قسم کے مدرکات کو معقولات ہوں یا محسوسات یا متخیلات یا موہومات ادراک میں لا سکے اور اشیاء کی ذات کی معرفت اور ان کے خواص اور ان کے اسماء اور علم کے اصول اور صنعتوں کے قوانین اور آلات کی کیفیت اس کے دل میں ڈالی۔

ع ۵۰ عرضھم میں ضمیر مسمیات یعنی اشیاء کی طرف جاتی ہے جیسا کہ اگلے الفاظ باسماء ھؤلاء سے ظاہر ہے اور ضمیر مذکر بوجہ تغظیم ہے یا اس لیے کہ عقلاء کو ان میں غلبہ حاصل ہے (ر) ملائکہ پر اشیاء کا پیش کرنا: چیزوں کے پیش کرنے سے مراد قلوب ملائکہ میں ان کی صورت کا آنا یا ان پر اُن کا اظہار عالم مثال میں ہے (ر)

انبؤنی۔ انباء۔ نبا سے ہے اس خبر کو کہتے ہیں جس میں عظیم الشان فائدہ ہو جس سے علم یا غلبۂ ظن حاصل ہو (غ) اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ ان اسماء پر اطلاع پانے میں کوئی فائدہ عظیم حاصل ہوتا ہے۔ انبئونی میں اشارہ: اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ مجھے خبر دو اس سے مراد صرف اظہار عجز ملائکہ ہے اور یہ بتانا ہے کہ وہ صفات یا خواص اشیاء کا علم نہیں رکھتے۔ گویا اصل مراد ایک حالت کا اظہار ہے اور قول کا اس معنی میں آنا اوپر دکھایا جا چکا ہے۔

ان کنتم صادقین۔ صدق ضد کذب ہے۔ صادق ہونے سے مراد: اور مراد صادق ہونے سے اس خبر کے دینے میں صادق ہونا ہے جس کی طرف

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

انھوں نے کہا تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں مگر وہی جو تو نے ہمیں سکھایا، بیشک تو علم والا، حکمت والا ہے ۵۰ لا

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

کہا اے آدم ان کے نام انھیں بتا دو، پس جب اُس نے اُن کے نام اُنھیں بتا دیئے، فرمایا کیا میں نے تمھیں نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں! اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے تھے ۵۱

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انھوں نے فرمانبرداری ۵۲

انبئونی میں اشارہ تھا مطلب یہ ہُوا کہ ملائکہ اٹکل پچّو ایک بات کے کہنے پر تو جرأت نہیں کرتے پس کیا تم ان اشیاء کے خواص سے واقف ہو یا اِنْ بمعنی اِذْ لے کر یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ جب تم حق وصدق کہنے والے ہی ہو تو بتاؤ کہ تم ان اشیاء کے خواص پر آگہی رکھتے ہو۔ اور ایک تفسیر ان الفاظ کی حضرت ابن عباس سے یوں مروی ہے کہ ملائکہ نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے اعلم اور افضل مخلوق پیدا نہیں کریگا۔ تو ان کو اس خیال کی غلطی پر آگاہ کیا اور صدق بمعنی صواب بھی آسکتا ہے جس طرح کذب بمعنی خطا آجاتا ہے۔ اور مراد یہ ہو سکتی ہے کہ اگر تم اس خیال میں صواب پر ہو کہ وہ فساد اور خونریزی کریگا اور مراد اس سے نفی فساد و خونریزی نہیں بلکہ اس کے کمالات کی طرف توجہ دلانا ہے۔

ع ۵۰ لا الحکیم۔ حَکَمَ کے معنی ہیں اصلاح کے لیے روکا۔ اور حِکْمَۃُ اللّٰہ تعالیٰ ہیں اشیاء کی معرفت اور ان کا غایت درجہ کی مضبوطی پر وجود میں لانا ہے اور انسان میں حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کا کرنا ہے (غ) اور اسمائے الٰہی میں الحکیم سے مراد وہ ہے جس میں حکمت علیٰ وجہ الکمال پائی جاتی ہو۔

ملائکہ اور علم خواص اشیاء: ملائکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں صفات اشیاء کا علم نہیں۔ اور اس سے پہلے سبحانک کو پھر دوہرایا ہے یعنی ایسا علم نہ دینے میں اللہ تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں اور آخر پر العلیم الحکیم کہہ کر بتایا کہ کامل علم تو اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور وہ اپنی حکمت سے جس قدر اس میں سے چاہتا ہے کسی کو دیتا ہے ملائکہ کو جو وسائط ہیں خواص اشیاء کا علم نہ دینا اس کی حکمت پر مبنی ہے کیونکہ وسائط کو ایسے علم کی ضرورت نہیں۔

ع ۵۱ آدم کا ملائکہ کو اسماء بتانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ آدم نے ان کو وہ علم دے دیا جو اللہ تعالیٰ نے نہ دیا تھا۔ بلکہ یہ خبر دینا عمل سے ہے انسان کے اشیاء پر تصرف سے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کو ان کی صفات پر اطلاع ہے کیونکہ بغیر صفات پر اطلاع کے تصرف نہیں ہو سکتا۔

ماتبدون وما کنتم تکتمون۔ کتم کے معنی چھپانا ہیں مگر ایک چیز جب کسی کے عمل سے ظاہر نہ ہو تو اس پر بھی کَتْم کا لفظ بول دیا جاتا ہے جیسے بخل کرنے والوں کے بارہ میں ہے ویکتمون ما اٰتٰھم اللہ من فضلہ (النساء ۴-۳۷) جس کی تفسیر امام راغب نے کفران نعمت سے کی ہے۔ ایسا ہی لایکتمون اللہ حدیثا (النساء ۴-۴۲) نہ چھپا رکھنے سے مراد عملاً اس کا اظہار ہو جانا ہے۔ پس ماتبدون وہ باتیں ہیں جو ملائکہ نے ظاہر کیں یعنی انسان کا فساد اور خونریزی کرنا۔

ملائکہ کے کتمان سے مراد: اور ما کنتم تکتمون وہ جو اُن سے مخفی رہا یعنی انسان کا علم خواص اشیاء اور اس کا کمال اور اسی کا جاننا ان کی غرض تھی جب اتجعل فیھا کہا تھا کہ انسان کے خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے۔

قوائے عالم پر انسان کے تصرف کی غرض: اس مضمون پر اتنا زور اس لیے دیا کہ معلوم ہو جائے کہ قوائے عالم پر جو حکمران ہستیاں یعنی ملائک ہیں ان سے بڑھ کر علم اور کمال انسان کو دیا گیا ہے پس انسان کو قوائے عالم کے سامنے جھکنا نہیں چاہیئے بلکہ ان پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ع ۵۲ سجدۂ اختیار و تسخیر: سَجَدَ اسجدوا۔ سُجُود کے اصل معنی جُھک جانا اور فرمانبرداری اختیار کرنا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی اور اس کی عبادت کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے اور وہ دو طرح پر ہے ایک سجدہ اختیار ہے جو انسان کے لیے خاص ہے اور دوسرا تسخیر ہے جو انسان، حیوان، نباتات غرض ہر مخلوق اپنے خالق کو کرتی ہے (غ) اسجدوا لاٰدم کے معنی امام راغب نے دو طرح پر کیے ہیں ایک یہ کہ آدم کو بمنزلہ قبلہ رکھ کر اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کا حکم تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ان کو اس کی فرمانبرداری کا حکم دیا گیا اور اس بات کا کہ وہ اس کے اور اس کی اولاد کے مصالح کو قائم کریں۔ لغوی معنی میں سجدہ: اصطلاح شریعت میں سجدہ عبادت کے اس خاص رُکن کا نام ہے جب پیشانی زمین پر رکھ دی جاتی ہے اور یہ سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کے لیے جائز نہیں لیکن یہاں سجدہ کا لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہُوا ہے یعنی محض فرمانبرداری کے معنی میں جیسا کہ شاعر کے اس قول میں فقلنا لہ اسجد للیلی فاسجدا جہاں اونٹ کے سر جھکانے پر اسجد کا لفظ بولا گیا ہے۔

ملائکہ کے سجدہ سے مراد: آدم (انسان) کے کمال کا پہلا مرتبہ تعلیم اسماء ہے یعنی اس میں استعداد علمی کا رکھنا۔ اب یہ اس کے کمال کا دوسرا مرتبہ آتا ہے جس میں ملائکہ کو آدم کی فرمانبرداری کا حکم دیا جاتا ہے۔ ملائکہ چونکہ قوائے عالم پر حکمران ہستیاں ہیں اس لیے ملائکہ کی فرمانبرداری سے مراد سارے عالم پر حکمرانی ہے۔ دوسری جگہ اسی کے مطابق فرمایا سخر لکم ما فی السمٰوات وما فی الارض جمیعا منہ (الجاثیۃ ۴۵-۱۳) یعنی جو کچھ آسمانوں اور زمین کے اندر ہے سب کا سب تمھارے لیے

اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی وَ اسْتَکْبَرَ٭ وَ کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۳۴﴾ کی مگر ابلیس (نے نہ کی) اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔۵۳

مسخر کر دیا۔ اس سے بھی مراد ایسی استعداد کا انسان کے اندر رکھنا ہے جس سے وہ کل عالم کو اپنے کام میں لگا سکتا ہے۔ یہی معنی بیضاوی نے لکھے ہیں او التذلیل والانقیاد بالسعی فی تحصیل ماینوط بہ معاشہم ویتم بہ کمالہم یعنی یا مراد اس سے فرشتوں کا جھک جانا اور فرمانبردار ہونا ہے۔ بذریعہ کوشش کے ان چیزوں کے حاصل کرنے میں جن سے ان کی معاش کا تعلق ہے اور جن سے ان کا کمال پورا ہوتا ہے۔ جمع کے صیغہ میں اشارہ ہے کہ آدم میں نسل آدم بھی شامل ہے جیسا کہ فرمایا ولقد خلقنٰکم ثم صورنٰکم ثم قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لاٰدم (الاعراف ۷-۱۱) ہم نے تم کو پیدا کیا پھر ہم نے ہی تمہاری تصویریں بنائیں پھر ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔ گویا ہر بشر کے لیے وہی ہوتا ہے جو ابوالبشر کے لیے ہوا۔

۵۲ؔ اِلّا بعض وقت استثنائے منقطع کے طور پر آتا ہے یعنی جس چیز کا استثنا کیا جاتا ہے وہ ان میں شامل نہیں ہوتی جن سے اس کا استثنا کیا جاتا ہے کیونکہ لفظ کا اصل مفہوم صرف مابعد کی ماقبل سے مخالفت ظاہر کرنا ہے۔

ابلیس۔ بلس سے ہے اور ابلاس اس حزن یعنی غم کو کہتے ہیں جو شدت ناامیدی سے پیدا ہو (غ) یبلس المجرمون (الروم ۳۰-۱۱) پس ابلیس کو ابلیس اس کی شدت ناامیدی کی وجہ سے کہا ہے جو وہ رحمت الٰہی سے رکھتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے الم تر الجن و ابلاسھا۔ ابلیس جیسا کہ قرآن شریف میں صاف لکھا ہے ملائکہ یا اعلیٰ نورانی ہستیوں میں سے نہیں بلکہ وہ جن یا ناری ہستیوں میں سے ہے کان من الجن (الکھف ۱۸-۵۰) یہ باتیں کہ ابلیس ملائکہ سے تھا اور وہ سب سے بڑھ کر علم رکھتا تھا اور آدم کی صورت سے یوں کیا کرتا تھا۔ یہودیوں سے سنے سنائے ہوئے قصے ہیں جو تفاسیر میں درج ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ابن کثیر ایک اس قسم کی روایت کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس میں بہت سے اسرائیلی قصے درج کر دیئے گئے ہیں جو کلام صحابہ سے نہیں۔

ابلیس اور شیطان: ابلیس کو ہی شیطان بھی کہا گیا ہے۔ جب تک وہ خود انکار کرتا ہے ابلیس ہے جب دوسروں کو ورغلاتا ہے شیطان ہے اور یہی ظرافت بھی یہی درست ہے کیونکہ ابلیس وہ ہے جو خود رحمت الٰہی سے مایوس ہے اور شیطان جو شطن بمعنی بُعد یعنی دُوری سے ہے۔ وہ ہے جو دوسروں کو رحمت الٰہی سے دور کرتا ہے۔

ابلیس اور قوت وہمیہ: ابلیس سے مراد بعض لوگوں نے قوت وہمیہ کو لیا ہے چنانچہ سر سید احمد خاں کا یہی خیال تھا اور اس کی تائید میں انہوں نے شرح فصوص سے بعض حکما کا ایک قول نقل کیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ابلیس اس وقت وہمیہ کلیہ کا نام ہے جو عالم کبیر میں پائی جاتی ہے اور اشخاص انسانی میں جو قوت وہمیہ پائی جاتی ہے یہ اسی کے افراد ہیں مگر ہمارے نزدیک جس طرح ملائکہ کو محض قوائے عالم یا قوائے انسانی قرار دینا غلطی ہے اسی طرح ابلیس اور اس کی ذریت کو محض قوائے انسانی قرار دینا غلطی ہے بلکہ درحقیقت جس طرح ملائکہ ایک وجود رکھتے ہیں ابلیس اور اس کی ذریت بھی ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے اور ان کو جنّ اسی لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ آنکھوں سے مستور ہیں۔ پس ہر انسان سے تعلق رکھنے والی ایک تو وہ ہستیاں ہیں جن کو ہم ملائکہ کہتے ہیں جو اس کے اعلیٰ قویٰ کو یا نیکی کے میلان کو تحریک میں لاتی ہیں۔

شیاطین محرک بدی ہیں: اور دوسرے وہ جن کو ہم جنّ یا شیاطین کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو اس کے قوائے بہیمیہ یا نفس امّارہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اس کے بدی کے میلان کو تحریک میں لانے کا موجب ہوتی ہیں۔ انسان میں ایک قسم کی خواہشات وہ ہیں جو سفلی کہلاتی ہیں کیونکہ اس سفلی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک وہ جن کا تعلق اس کے اخلاق اور روحانیت سے ہے جو اس کو ایک بلند مقام کی طرف لے جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ انسان کی ترقی کے لیے دونوں قسم کی خواہشات کا اس میں ہونا ضروری تھا۔ سفلی خواہشات کا اس لیے کہ اس زندگی کے بغیر وہ ترقی حاصل نہیں ہو سکتی اور مُلکی خواہشات کا اس لیے کہ ان کے بغیر ترقی کی طرف قدم نہیں اُٹھ سکتا۔

شیطان کو کیوں پیدا کیا: یہ کہنا کہ شیطان کو خدا نے پیدا ہی کیوں کیا گویا اس کا مرادف ہے کہ انسان کو یہ زندگی ہی کیوں عطا فرمائی حیوانی زندگی میں سے ہو کر ہی روحانی زندگی مل سکتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے الشیطان یجری من بنی اٰدم مجری الدم شیطان بنی آدم کے ساتھ ایسا ہی لگا ہوا ہے جیسے خون کا بہنا۔ یعنی جیسے اس کی حیوانی زندگی۔

نوری ناری مخلوق: اور ملائکہ کو جو نور سے مخلوق اور جنوں کو نار سے مخلوق قرار دیا گیا ہے تو وہ بھی اسی پُر حکمت فلسفہ کی طرف اشارہ ہے۔ ملائکہ کی تحریک سے انسان کے اندر نور پیدا ہوتا ہے اللّٰہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیاؤھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات (۲:۲۵۷) کیونکہ وہ نار جس کے اندر نور نہ ہو وہ نرا دھواں ہونے کی وجہ سے ظلمت کے قائم مقام ہے۔

۵۳ؔ اَبٰی۔ اِباء شدت امتناع کو کہتے ہیں یعنی نہایت سختی سے ایک بات سے رکنا۔ یا سختی سے انکار کرنا (غ)

استکبر۔ کِبْر سے ہے اور یہ انسان کی وہ حالت ہے کہ وہ اپنے نفس پر فخر کرے اور اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھے اور سب سے بڑا تکبّر قبول حق سے رکنا ہے۔ اِسْتِکْبار دو طرح پر ہے ایک یہ کہ انسان یہ قصد کرے اور چاہے کہ بڑا ہو جائے اور یہ اگر ایسی حالت اور ایسے مکان اور ایسے وقت میں ہو جو واجب ہے تو محمود ہے یعنی اچھی چیز ہے اور دوسرا یہ کہ اپنی بڑائی کے خیال سے بھر کر اپنے نفس کے لیے وہ کچھ ظاہر کرے جو اس کے لیے نہیں ہے اور یہ مذموم ہے اور اسی معنی میں قرآن شریف میں یہ لفظ آیا ہے (غ) اور تَکَبُّر کا استعمال بھی دو طرح پر ہے ایک یہ کہ کسی کی خوبیاں غیروں پر بہت بڑھی ہوئی ہوں اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں المتکبّر ہے دُوسرا یہ کہ تکلف سے اور اپنی بڑائی کے خیال سے بھر کر اپنے آپ کو بڑا بنائے اور یہ مذموم ہے (غ)

حکم تو ملائکہ کو تھا کہ سجدہ کریں، ابلیس کا ذکر درمیان میں کیونکر آ گیا؟ انسان میں امتیاز کا رکھنا اور ایک حد تک اسے اختیار نیک بد دینا انسان میں دو قسم کے قویٰ ضروری ٹھہراتا ہے ایک اعلیٰ یا مَلکی قویٰ اور دوسرے ادنیٰ یا بہیمی قویٰ۔ شیطان کو حکم فرمانبرداری: جس طرح ان اعلیٰ یا ملکوتی قویٰ کو تحریک میں لانے

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور ہم نے کہا اے آدم تو اور تیرا جوڑا باغ میں رہو اور اس میں سے بافراغت کھاؤ جہاں سے چاہو[۵۴] اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے[۵۵]

والے ملائکہ ہیں۔ اسی طرح ادنیٰ یا بہیمی قویٰ کے محرک شیاطین ہیں تو جب اعلیٰ ہستیوں کو انسان کی فرمانبرداری کا حکم ہوا تو ادنیٰ ہستیاں خود اس حکم میں شامل ہو گئیں یہی وجہ ہے کہ حالانکہ سارے قرآن شریف میں شیطان کو یہ حکم نہیں کہ تو سجدہ کر لیکن ایک جگہ اس کے متعلق لفظ اذ امرتك (الاعراف۷-۱۲) آ گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ بسبب ایک ادنےٰ ہستی ہونے کے وہ بھی اس حکم میں شامل تھا جو اعلیٰ ہستیوں کو دیا گیا۔

ابلیس کا انکار سجدہ: جس طرح ملائکہ کے سجدہ کرنے سے مراد ان کا انسان کی تکمیل نفس میں معاون ہونا ہے جیسا کہ مفسرین نے بھی مانا ہے اسی طرح ابلیس کا انکار یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انسان کی ترقی کی راہ میں حارج ہوگا اور یہ وہ قوت بہیمیہ کو اکسا کر یا نفس امارہ کو تحریک میں لا کر کرتا ہے یہاں تک کہ انسان اس کو اپنا فرمانبردار بنا لیتا ہے یعنی اس کے قوائے بہیمیہ حالتِ اعتدال پر آ جاتے ہیں اور وہ کبھی ان کو غیر محل پر استعمال نہیں کرتا۔ شیطان کی فرمانبرداری: چنانچہ جب نبی صلعم نے شیطان کا مجری الدم ہونا بیان فرمایا تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ سے بھی۔ فرمایا ہاں مگر اللہ تعالےٰ نے مجھے اس پر مدد دی سو وہ فرمانبردار ہو گیا ہے۔ اور کمال انسانی کا پہلا مرتبہ یہی ہے کہ وہ شیطان کو اپنا فرمانبردار بنا لے اور اس کے قوائے بہیمی اور اس کا نفس امارہ اس کی ترقی کی راہ میں روک نہ ہوں اور شیطان کو جو من الکافرین کہا ہے تو اس لحاظ سے کہ وہ ان نعماء کو ان اعلیٰ ملکوتی صفات کو جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں دبانا چاہتا ہے اور کفر کے معنی دبانا ہیں۔

ع۵۴ اسکن۔ سُکُوْن کے اصل معنی حرکت کا جاتے رہنا یا ٹھہر جانا اور استقرار ہے (ت) اس لیے اضطراب نہ ہونے سے جو حالت اطمینان پیدا ہوتی ہے اس پر بھی لفظ سکون بولا جاتا ہے۔

خلق آدم میں یہ تیسرا مرتبہ ہے۔ پہلے مرتبہ پر اسے علم دیا جاتا ہے دوسرے مرتبہ پر اسے مسجودِ ملائک بنا کر طاقت دی جاتی ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اسے جنت ملے یعنی راحت و آرام کی زندگی۔ اور یہاں آدم کے ساتھ اس کی بی بی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ راحت اور آرام کی زندگی اکیلا انسان حاصل نہیں کر سکتا علم اور طاقت حاصل کر سکتا ہے۔ بہشت میں بیبیاں: چنانچہ دوسری جگہ فرمایا خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا (الروم۳۰-۲۱) تمھارے نفسوں سے تمھارے لیے بیبیاں پیدا کر دیں تاکہ تم ان سے راحت پاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ جنت دار الخلد میں بھی بیبیوں کے موجود ہونے کا ذکر ہے اس پر اعتراض کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہاں سکون نہ ہو۔

آدم کی پہلی جنت: کیا اس جنت سے مراد وہ بہشت ہے جس کا وعدہ اعمال صالحہ پر ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ نہیں۔ کیونکہ وہ جنت جو بعد موت حاصل ہوتی ہے اس سے انسان کبھی نکالا نہیں جاتا۔ وما ھم منھا بمخرجین (الحجر۱۵-۴۸) اور اس سے آدم کو نکلنا پڑا۔ پس یہ جنت اس دنیا کی زندگی کی جنت ہے اور مفسرین نے اسے مانا ہے اور یہاں اس جنت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ تم اس سے جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ۔ اور سورہ طٰہٰ۲۰-۱۱۸ و ۱۱۹ میں اس جنت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ تمھارے لیے اس میں یہ حاصل ہے کہ نہ تم اس میں بھوکے رہو نہ ننگے رہو اور نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ میں رہو پس جسمانی لحاظ سے تو انسان کو جنت یوں حاصل ہے کہ زمین میں اللہ تعالےٰ نے وہ سب سامان پیدا کر رکھے ہیں جن سے انسان کی بھوک دور ہوتی ہے اور پیاس دُور ہوتی ہے اور جن سے لباس ملتا ہے اور مکان ملتا ہے۔ اور یہی انسان کی ضرورت کی چار چیزیں ہیں جو کوشش سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے معنی ظاہر ہیں ایک طرف عالم میں سامان موجود ہیں دوسری طرف انسان میں وہ طاقت ودیعت کی گئی ہے جس سے وہ ان کو اپنے کام میں لاتا ہے یا مسجودِ ملائکہ بنتا ہے۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا ہے توں توں اس کی طاقت بڑھتی ہے اور اسی طرح ہی تدریجاً اس کی راحت کے سامان بڑھتے ہیں۔ سکون روحانی کی جنت: مگر ظاہر ہے کہ انسان کے لیے آرام اور راحت یا حالت سکون صرف خورد و نوش اور لباس و رہائش سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے ایک روحانی سکون کی بھی ضرورت ہے اور وہی اس کی حقیقی جنت ہے۔ کھانے پینے کے سب سامان ہوں مگر سکون قلب نہ ہو تو ان سے کوئی راحت نہیں پہنچ سکتی۔ اطمینان قلب میسّر ہو تو بھوک پیاس اور ہر قسم کی تکلیف انسان خوشی سے برداشت کر لیتا ہے پس اصل وہ جنت جہاں سکون ملتا ہے گو سامان خورد و نوش کی بھی اس کے لیے ضرورت ہے اور اس کے دینے کا ذکر بھی موجود ہے اس دنیا کی زندگی میں ایک روحانی جنت یا اطمینان قلب ہے۔ اب ظاہر ہے کہ روحانی سکون یا اطمینان قلب اس وقت تک رہتا ہے، جب تک انسان بدی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ بدی کے ارتکاب کے ساتھ سکون روحانی دور ہو جاتا ہے۔ پس وہ جنت روحانی یہ ہے کہ انسان معصومیت کے مقام پر ہو۔ سو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک انسان کو فطرتاً بیگناہ پیدا کر کے وہ مقام دے دیا ہے۔ اس لیے حکم ہوتا ہے کہ فطرتاً ہم نے تم کو جنت دے دی ہے اب تم خود اس کو ضائع نہ کر دینا و من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا (طٰہٰ۲۰-۱۲۴) جو شخص میرے ذکر سے مُنہ پھیرتا ہے اس کے لیے تنگی کی روزی ہے جس سے مراد اسی سکون روحانی کا جاتے رہنا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قصہ عیسائیت سے لیا گیا ہے جب اس کی بنیاد ہی انسان کے فطری طور پر معصوم ہونے پر ہے حالانکہ عیسائی مذہب نے اسی کو انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے کی دلیل ٹھہرایا ہے۔

ع۵۵ الشجرۃ۔ شَجَر یا شَجَرَۃ اس نبات کو کہتے ہیں جس کا تنہ ہو (غ) یعنی درخت۔ اور شِجَار (ماضی شَجَرَ) اور مُشَاجَرَۃ اور تَشَاجُر کے معنی تنازع اور اختلاف کرنے کے آتے ہیں بعض لوگوں نے جو شجرۃ کے معنی جھگڑا کیے ہیں وہ لغت سے ثابت نہیں۔

الظالمین۔ ظُلْم کے اصل معنی اہل لغت کے نزدیک وضع الشیٔ فی غیر موضعہ المختص بہ (غ) ہیں یعنی ایک چیز کا اس مقام سے جو اس کے لیے

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيۡطٰنُ عَنۡهَا فَاَخۡرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيۡهِ ۖ وَقُلۡنَا اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۳۶﴾

پس شیطان نے اُن کو اس سے پھسلا دیا سو ان کو اس سے نکال دیا جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا اُتر پڑو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھیرنا اور فائدہ اُٹھانا ہے ۵۶

خاص ہے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا کمی سے ہو یا زیادتی سے یا اس کے وقت سے ہٹ کر یا مکان سے ہٹا کر اس لیے ظَلَمْتُ الْاَرْضَ کے معنی ہیں ایسے مقام سے اُسے کھودا جو کھودنے کی جگہ نہ تھی اور حق سے مجاوزت کا نام بھی ظُلْم ہے خواہ وہ نہایت ہی قلیل ہو اور خواہ بہت زیادہ ہو (غ) اور ظُلْم کو تین قسم پر تقسیم کیا ہے، اوّل بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اور اس میں کفر و شرک سب سے بڑھ کر ہے۔ اور دوسرا لوگوں پر ظلم اور تیسرا اپنے نفس سے ظلم۔ اور یہاں یہی اپنے نفس سے ظلم مراد ہے (غ) یعنی اپنے آپ کو کوئی نقصان پہنچانا۔

ھذہ الشجرۃ سے کونسا درخت مراد ہے۔ مفسرین نے گیہوں، کھجور، کافور، انجیر، حنظل وغیرہ نام گنے ہیں۔ مگر ان کا یہاں کیا مطلب؟ ھذہ میں اشارہ قریب موجود ہے پس اس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور ابھی آچکا ہے اور قریب ترین جو ذکر ہے وہ ابا اور استکبار کا ذکر ہے اور وہ سب سے بڑی بدی ہے جس کی وجہ سے شیطان خود گمراہ ہوتا ہے بلکہ اس کی تفسیر دوسری جگہ موجود ہے دیکھو سورہ اعراف[۲] آیت ۱۱ سے ۱۹ تک جہاں پہلے شیطان سجدہ سے انکار کرتا ہے تو اس کو حکم ہوتا ہے کہ اس حالت سے نکل جا۔ تب وہ کہتا ہے میں نسل انسانی کو سیدھی راہ سے پھیر دونگا اور اُن کے آگے پیچھے سے آؤں گا اور وہ شکرگذار نہیں رہیں گے یعنی بدیوں میں مبتلا ہوں گے۔ اس کے بعد آدم کو حکم ہوتا ہے اسکن انت وزوجك الجنّة اور ولاتقربا ھذہ الشجرۃ (الاعراف[۲] - ۱۹) تو یہاں سے صاف معلوم ہوا کہ ھذہ میں اشارہ اسی شیطان کے ورغلانے کی طرف ہے جو انسان کی ترقی کی راہ میں روک بننا چاہتا ہے۔ اور ھذہ الشجرۃ سے مراد سوائے بدی کے اور کچھ نہیں۔ اور یہی ذکر نسل انسانی کو گمراہ کرنے کا انکار سجدہ کے بعد الحجر[۵] - ۳۹ و ۴۰ اور بنی اسرائیل[۷] - ۶۲ - اور ص[۳] - ۸۲ و ۸۳ میں موجود ہے اور بدی کو خود قرآن شریف نے ایک درخت سے تشبیہ دی ہے مثل کلمة خبيثة كشجرة خبيثة (ابراھیم[۴] - ۲۶) اور ظاہر ہے کہ جس درخت سے آدم کو روکا اسی درخت سے بنی آدم کو بھی روکا ہوگا اور بنی آدم کو فرمایا لاتقربوا الفواحش (الانعام[۶] - ۱۵۱) بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ۔

لاتقربا کا حکم فطری ہے: اس آیت کا سارا نقشہ حالت اور فطرت کا نقشہ ہے اور لاتقربا کا حکم بھی فطرت کے رنگ کا حکم ہے۔ یہ الہام نہیں وحی نہیں۔ کیونکہ الہام اور وحی اس فطری حکم کی خلاف ورزی کا علاج ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ پھر یہ میاں بی بی دونوں کو حکم ہے جہاں وحی کا ذکر آتا ہے وہاں فتلقّی اٰدم ہے یعنی آدم کو وہ کلمات سکھائے گئے پس یہ فطری حکم ہے اور اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ فطری حکم بھی اللہ تعالیٰ کے عہد میں داخل ہے دیکھو ع۴۲ مگر انسان کمزور ہے اس لیے اس فطری حکم کی تقویت کے لیے وہ ذکر کا محتاج ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اسے عطا فرماتا ہے۔

بائبل کی غلطی کی اصلاح: بائبل نے ھذہ الشجرۃ کو نیکی اور بدی کی تمیز کا شجر کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ آدم کو اس سے روکنے کے یہ معنی ہوئے کہ اس کو تمیز کا جوہر خدا نے عطا نہ کیا تھا پھر حیوانوں پر اس کی فضیلت کیا؟ اور یہ کس قدر بیہودہ بات ہے کہ وہ عجیب جوہر جس سے انسان حیوان پر ممتاز ہوتا ہے خدا کے حکم کی نافرمانی کر کے انسان نے زبردستی حاصل کر لیا۔ قرآن کریم اس خیال کی تردید کرتا ہے۔

اس فطری حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہو گے یعنی اس اطمینان قلب اور راحت روحانی کو کھو دو گے جو فطرت نے تمہیں دی ہے۔ کس طرح اس کو کھو دیا اس کا نقشہ سورۂ اعراف میں کھینچا ہے۔

ع۵۶ ازل۔ زلّ سے ہے اور زَلَّةٌ کے معنی اِسْتِرْسَالُ الرِّجْلِ مِنْ غَيْرِ قَصْدٍ (غ) ہیں یعنی بلا ارادہ پاؤں کا ڈگمگا جانا۔ اور اس لیے زَلَّةٌ اس قصور کو کہا جاتا ہے جو بلا ارادہ سرزد ہو (غ) پس ازلّھما کے معنی ہوئے ان سے زَلّۃ کا ارتکاب کرایا یعنی شیطان کے پھسلانے کی وجہ سے مگر بغیر عمد اور ارادہ کے آدم اور اس کی زوجہ سے کوئی قصور ہو گیا۔

عنہا میں ضمیر شجرۃ کی طرف بھی جا سکتی ہے یعنی اس درخت کی وجہ سے ان سے لغزش کرا دی اور جنت کی طرف بھی۔ یعنی ایسی لغزش کرا دی کہ جنت سے نکلوا دیا۔

اھبطو۔ ھَبَطَ کے وہی معنی ہیں جو نَزَلَ کے ہیں (ف) اوپر سے گرنے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے یھبط من خشیة الله (۲ - ۷۴) اور کسی مقام پر اُترنے کے معنی میں بھی اھبطوا مصراً (۲ - ۶۱) امام راغب ھبط اور نزل میں یہ فرق کرتے ہیں کہ ھبوط استخفاف کے رنگ میں ہوتا ہے اور نزول اکرام کے رنگ میں؛ اور حدیث میں آتا ہے اللّٰھم غبطاً لَا ھَبَطاً جس کے معنی ابن اثیر یوں کرتے ہیں کہ ہم تجھ سے اچھی حالت کی التجا کرتے ہیں اور ذلّت اور انحطاط سے تیری پناہ چاہتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ نقل مکانی کے علاوہ اس کے معنی ایک حالت سے دوسری کی طرف نکل جانا بھی ہیں اور ھبط کے معنی نقصان بھی ہیں۔ چنانچہ ھبط القوم کے معنی لکھے ہیں پستی کی حالت میں ہو گئے اور نقصان اُٹھایا (ت) روح المعانی میں بھی ہے کہ ھبط مرتبہ میں گر جانے پر بولا جاتا ہے۔

شیطان کی وسوسہ اندازی: یہاں پر مفسرین نے بہت سے قصے اسرائیلیات سے داخل کر دیئے ہیں کہیں شیطان کو سانپ بنا کر اور کہیں چارپایہ بنا کر جنت میں داخل کیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے خود فرما دیا ہے کہ یہ بذریعہ وسوسہ اندازی کے تھا۔ فوسوس لھما الشیطان (الاعراف[۲] - ۲۰) اور ہر ایک انسان کے

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۳۷

پھر آدم نے اپنے رب سے (کچھ) باتیں سیکھ لیں پس اس نے اس پر (رحمت سے) توجہ کی بیشک وہ (رحمت سے) توجہ کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۵۷

دل میں شیطان وسوسہ اندازی سے ہی کام کرتا ہے یوسوس فی صدور الناس (الناس ۱۱۴-۵) چونکہ آدم جس جنّت میں تھے وہ اطمینان قلب کی جنت ہے اور وہ دار الخلد نہیں جو انسان کو موت کے بعد بطور جزائے اعمال عطا کی جاتی ہے جہاں شیطان کا گزر نہیں اس لیے شیطان کے وسوسہ ڈالنے پر کوئی اعتراض نہیں فطری بیگناہی گو ایک اطمینان قلب کی حالت ہے مگر وہ کامل اطمینان کی حالت نہیں جہاں شیطان وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا۔ اسی دوسری حالت پر انسان کو صرف وحی الٰہی پہنچاتی ہے جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔

آدم کی لغزش: یہاں لفظ ازلّ یا ازلّہٗ اختیار کر کے بتا دیا کہ آدم سے جو کچھ ہوا بلا قصد ہوا اسی کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے فنسی ادم ولم نجد لہ عزما (طٰہٰ ۲۰-۱۱۵) مطلب یہ ہے کہ گو فطری بیگناہی حاصل ہے مگر فطری کمزوری بھی ساتھ ہی لگی ہوئی ہے جب تک اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق خاص حاصل نہ ہو جو وحی الٰہی سے پیدا ہوتا ہے اس وقت تک انسان کو ٹھوکریں لگتی رہتی ہیں۔

مما کانا فیہ سے مراد وہ حالت جنّت یا حالت اطمینان قلبی ہے جس میں وہ تھے اس نے نکلوا دیا کیونکہ جب گناہ آیا تو اطمینان قلب گیا۔

ھبوط آدم سے مراد: قلنا اھبطوا۔ یہ کہنا بلحاظ اس حالت کے ہے جو پیدا ہو گئی۔ گویا پہلے فعل کا نتیجہ یہ ہوا نتیجہ بھی چونکہ حکم الٰہی سے وارد ہوتا ہے اس لیے اس پر قلنا کا لفظ فرمایا۔ دیکھو قول کے معنی میں ۴۵ اھبطوا میں ضمیر جمع ہے اس لیے خطاب آدم اور اس کی ذریّت سب سے ہے یعنی سب انسانوں سے جیسا کہ فراء نے کہا ہے (ر) اور آدم اور حوّاء اور ہر ایک انسان کو یہ وحی تو ہوئی نہیں اس لیے قلنا اظہار حالت کے لیے ہی ہے۔ چونکہ یہ حالت نقصان کی تھی اس لیے ھبط کا لفظ استعمال کیا ہے۔

بعضکم لبعض عدو۔ اس میں شیطان کی عداوت کا ذکر نہیں۔ کیونکہ اس کی عداوت کو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے پہلے ہی جتلا دیا تھا ان ھذا عدو لک و لزوجک (طٰہٰ ۲۰-۱۱۷) پس یا تو انسانوں کی باہمی عداوت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تم فطرت کی حالت کو چھوڑتے ہو تو پھر ایک دوسرے کے دشمن بھی بن جاتے ہو اور یسفک الدماء کے مصداق بن جاتے ہو۔ نفس انسانی اور شیطان: اور یا یہ مراد ہے کہ ہر انسان کے اندر دونوں قسم کی تحریکات ہیں وہ جو اس کو بلند مقام کی طرف لیجاتی ہیں اور وہ جو اس کو پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ یوں گویا انسان کا اپنا ہی ایک حصّہ دوسرے کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس معنی سے وجود شیطان کی نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ جس طرح انسان کا نفس بھی وسوسہ اندازی کرتا ہے ونعلم ما توسوس بہ نفسہ (ق ۵۰-۱۶) اور شیطان بھی وسوسہ اندازی کرتا ہے الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنّۃ والناس (الناس ۱۱۴-۵، ۶) اور نفس بھی بدی کا حکم دیتا ہے ان النفس لامارۃ بالسوء (یوسف ۱۲-۵۳) اور شیطان بھی بدی کا حکم دیتا ہے ولاٰمرنھم فلیغیرن خلق اللہ (النساء ۴-۱۱۹) اسی طرح شیطان بھی دشمن انسان ہے جیسا کہ بار بار قرآن میں فرمایا اور انسان کا نفس بھی جس پر حدیث بھی شاہد ہے اعدا عدوک نفسک التی بین جنبیک سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے شیطان کا تعلق نفس امارہ سے ہے اور اسی کا وہ محرک ہے۔

ع۵۷ تلقی۔ لقی سے ہے اور لقاء کے معنی کسی چیز کا سامنے آجانا اور اسے پا لینا ہیں (غ)، اور تَلَقَّى الشَّیْءَ کے معنی لَقِیَہٗ یعنی اس کو ملا، گویا کلمات کو لے لینے اور قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے سے ان کا استقبال کیا۔

کلمات - کلمۃ کی جمع ہے۔ اور کلمہ وہ تاثیر ہے جو دو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ پائی جائے یعنی شنوائی کے حاسہ سے کلام یا بات اور بینائی کے حاسہ میں کَلْم یا زخم (غ) اور کلمۃ سے مراد صرف لفظ مفرد نہیں بلکہ کلام بھی ہوتا ہے کبرت کلمۃ (الکھف ۱۸-۵)

تاب - توب سے ہے جس کے معنی رجوع ہیں اور جب بندہ کے لیے استعمال ہو تو مراد اللہ کی طرف لوٹ آنا اور جھک جانا اور رجوع کرنا ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ پہلی حالت بُری ہو بلکہ ایک اچھی حالت سے اس سے بہتر حالت کی طرف رجوع کرنا بھی توبہ ہے۔ ایک خدا پرست بھی جب خدا کی طرف اور زیادہ فرمانبرداری سے جُھکتا ہے تو وہ اس کی توبہ ہے اور جب اللہ کے لیے ہو تو مراد اس سے بندہ کی طرف مغفرت کے ساتھ عود کرنا ہوتا ہے (ت) اسی سے تواب مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے الٰہی میں سے ہے۔

فطری کمزوری کا علاج: جب آدم نے اپنے رب سے کلمات سیکھے تو اللہ نے اس پر رجوع برحمت فرمایا، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو نقص اس میں تھا وہ دور کر دیا گویا فطری کمزوری کے نقص کا علاج وحی الٰہی سے کیا گیا پس بندہ کی روحانی ربوبیت کا سامان خدا کے کلام میں ہے۔

وحی الٰہی خارجی شئے ہے: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کلام الٰہی انسان کے اندر کی آواز نہیں جیسا کہ سر سید نے غلطی سے خیال کر لیا۔ کیونکہ اگر یہ بات پہلے فطرت میں ہی موجود تھی تو فطرت کی کمزوری کا علاج خود فطرت کی آواز کس طرح کر سکتی ہے۔ علاج صرف خارجی ہو سکتا ہے۔ اور خدا کے کلام سے یہ علاج ہوا۔ اس آیت میں ذکر صرف ابو البشر حضرت آدم کا ہے کیونکہ کلمات صرف اس نے سیکھے دوسرے انسان سیکھ سکتے ہیں یا نہیں اور کس طرح؟ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

ہم نے کہا سب اس سے اُتر جاؤ[۵۸]، پھر اگر میری طرف سے تمھارے پاس ہدایت آئے تو جو میری ہدایت پر چلا، نہ اُن کو ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے[۵۹]

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے[۶۰]

ع۵۸ اولادِ آدم کا ہبوط اور اس کا علاج: اھبطوا کا حکم تو پہلے بھی ہو چکا تھا دوبارہ کیوں فرمایا؟ پہلے آدم اور اس کی اولاد کا ذکر مشترک تھا۔ اس کے بعد فتلقی آدم من ربہ کلمات میں آدم کے ذکر کو الگ کر دیا۔ آدم ابو البشر کو وحی عطا فرمائی، مگر اس کے بعد ہر ایک انسان کو وحی نہ دی جاتی تھی۔ اس لیے ان کے متعلق یہاں قانون بیان فرمایا کہ اس حالتِ ہبوط کا علاج یہ ہے کہ نسل انسانی میں وقتاً فوقتاً منجانب اللہ ہدایت آتی رہے گی۔ اس کی پیروی سے پھر انسان اس کھوئی ہوئی جنت کو اس اعلیٰ مقام روحانیت کو اُس راحت و سکون کو حاصل کر سکتا ہے جس سے پھر وہ نکلے گا نہیں۔ پہلے آدم میں ابن آدم بھی شامل تھا۔ یہاں آ کر آدم نبی اللہ کو ابن آدم سے الگ کر کے دکھا دیا۔

ع۵۹ اِمّا مرکب ہے اِن حرفِ شرط سے اور ما سے جو تاکید کے لیے ہے اور اس کے بعد اکثر فعل تاکید آتا ہے۔

ھدی کے معنی پر دیکھو ع۵ یہاں وہ ہدایت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ انبیاء کے ذریعہ سے دنیا میں بھیجتا ہے۔

تبع کے معنی نقش قدم پر چلنا ہیں اور یہ کبھی حکم پر عمل کرنے سے ہوتا ہے جیسے یہاں (غ)

خوف کے معنی کسی مکروہ امر کی توقع جس کے مقابل پر رجاء ہے جو کسی محبوب امر کی توقع ہوتی ہے۔ خوف امن کی ضد ہے (غ)

یحزنون۔ حُزن اور حَزَن اصل میں زمین میں خشونت یعنی سختی کا ہونا ہے۔ پھر غم سے جو نفس میں خشونت پیدا ہوتی ہے اس پر بولا گیا ہے (غ)

نسل انسانی میں نزول وحی کا قانون: جب آدم پر وحی کے نزول کا ذکر فرمایا تو اب نسل آدم کے لیے بھی قانون بتایا کہ ہر ایک پر وحی نہیں آئے گی، بلکہ انسانوں میں کبھی کبھی کوئی ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ جایا کرے گی۔ دوسری جگہ فرمایا امّا یاتینّکم رسل منکم (الاعراف ۷-۳۵) تمھارے پاس کبھی رسول آ جایا کریں گے۔ یہ نسل انسانی کے ہادی ہوں گے اس طرح پر کہ جو شخص اس ہدایت کی جو وہ لائیں پیروی کرے گا (لفظ تبع یہاں قابل توجہ ہے ایمان نہیں بلکہ اس ہدایت کی پیروی کی ضرورت ہے) وہ اس اصل حالت پر قائم ہو جائے گا جہاں نہ شیطان کے حملے کا خوف ہے کہ وہ وسوسہ اندازی سے پھسلا دے اور نہ یہ غم ہو گا کہ یہ راہ اختیار کی یا نہ کی کیونکہ انہوں نے صحیح راہ پر قدم مارا۔ فطری بیگناہی اور کامل عصمت: اس میں آخری کامیابی کی طرف اشارہ ہے گویا پہلی فطری حالت اس مقام امن تک نہ پہنچا سکتی تھی جہاں شیطان حملہ ہی نہ کر سکے مگر وحی الٰہی کی اتباع سے انسان اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق پیدا کرتا ہے کہ پھر وہ کبھی پھسلتا نہیں جیسا کہ فرمایا ان عبادی لیس لک علیہم سلطان (الحجر ۱۵-۴۲) فطری حالت بھی ایک بیگناہی کی حالت ہے مگر چونکہ اس میں اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق پیدا نہیں ہوا جس کی طاقت اس کمزوری کا علاج ہو جائے اس لیے وہ ابھی خوف کی حالت ہے کہ شیطان حملہ آور ہو کر اس جنت سے نہ نکال دے۔

وحی کی ضرورت: لیکن جس حالتِ امن و اطمینان پر وحی الٰہی کا اتباع پہنچاتا ہے وہ شیطان کے حملہ سے محفوظ ہے اور یوں بتایا کہ وحی الٰہی کی ضرورت دنیا میں کیا ہے۔ فطرت انسانی کی کمزوری کا علاج صرف اللہ تعالیٰ کے طاقتور ہاتھ سے ہو سکتا ہے اور وہی انسان گرنے سے بچ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں اپنے آپ کو دیدیتا ہے۔ لاخوف علیہم ولاھم یحزنون نجاتِ کامل ہے جس کے متعلق دوسری جگہ فرمایا یایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی (الفجر ۸۹-۲۷ تا ۳۰)

ع۶۰ کذبوا۔ کذب سے ہے کذّبتہ کے معنی ہیں میں نے اس کی طرف جھوٹ منسوب کیا یعنی یہ کہا کہ تو جھوٹ کہتا ہے (غ)

آیات۔ آیۃ کی جمع ہے اور یہ تاتی سے ہے جس کے معنی ہیں کسی بات پر ثابت قدم ہونا اور آیۃ کے معنی ظاہر نشان ہیں اس لیے بلند عمارت کو بھی آیۃ کہتے ہیں۔ اتبنون بکل ریع آیۃ (الشعراء ۲۶-۱۲۸) اور آیۃ رسالت یعنی پیغام الٰہی کو بھی کہتے ہیں اور دلیل اور معجزہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (ت) اور یہی معنی آیۃ کے عموماً زیادہ تر موزون ہیں اس لیے آیات سے یہاں بعض مفسرین نے کتبِ منزلہ مراد لی ہیں (ر) اور قرآن کریم کے ہر ایک جملہ کو جو کسی حکم پر دلالت کرتا ہے آیت کہا جاتا ہے خواہ وہ ایک سورت ہو یا اس کی کئی فصلیں یا ایک فصل ہو (غ) اور بعض کے نزدیک آیت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے معنی جماعت ہیں۔ اور ہر آیت میں الفاظ و حروف کی ایک جماعت ہوتی ہے اور یا یہ وجہ ہے کہ آیت کے معنی نشان ہیں اور کلام الٰہی کی آیات بطور اعجاز کے نشان ہیں۔

اصحاب۔ صَاحِب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مُلازِم یعنی کسی شے کے ساتھ لگ جانے والا۔ خواہ مصاحبت جسم سے ہو خواہ عنایت و ہمت سے (غ)

اصحاب النار وہ لوگ ہوئے جنھوں نے نار سے تعلق پیدا کر رکھا ہے۔ گویا آگ کے ساتھ ان کا ہر وقت تعلق ہے۔ یہی تعلق آخرت میں کھلا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

اس دنیا کا دوزخ: اصل غرض تو انسان کو اس کے کمال کی راہ بتانا تھا مگر جب وہ بتا دی تو جو لوگ ان کے مقابل پر ہیں ان کا بھی ذکر کر دیا کہ وہ جب الٰہی پیغام

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی [۶۱] اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو [۶۲]

آتا ہے تو نہ صرف اس کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس کو جھوٹا بھی کہتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اقوال و افعال میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں اور اس امن و اطمینان کی بجائے جو اتباع آیات کرنے والوں کو حاصل ہے (لاخوف علیہم) ان کا تعلق نار کے ساتھ ہو جاتا ہے گویا ایک جلن اور قلق اور اضطراب ان کے اندر رہتا ہے یہ تو اس دنیا کی حالت ہے اور آخرت میں وہی جنت و نار ایک ظاہری صورت اختیار کر لیں گے۔

ع ۶۱ بنی۔ بنو۔ اَبناء اِبن کی جمع ہے اور یہ لفظ بناء سے مشتق ہے جس کے معنی بنائی ہوئی چیز ہیں یا مصدر بنانا کے معنی ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے، والسماء بنینھا (الذاریات ۵۱-۴۷) لایزال بنیانھم الذی بنوا ریبۃ (التوبۃ ۹-۱۱۰) قالوا ابنوا لہ بنیانا (والصّٰفّٰت ۳۷-۹۷) کانھم بنیان مرصوص (الصف ۶۱-۴) اور بیٹے کو اِبن اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا وجود باپ سے ہُوا۔ پھر ہر چیز کو جو کسی شئے کی جہت سے یا اس کی تربیت سے یا اس کے تعاہد سے یا کثرت خدمت سے یا اس کے قیام امر سے حاصل ہو اس کا اِبن کہا جاتا ہے۔ ابن حرب ابن العلم وغیرہ ابن السبیل مسافر ہے (غ)۔

اسرائیل عبرانی ہے اَسْر بمعنی عَبْد ہے عربی میں اَسَر کے معنی قید کرنا ہیں جس سے اَسیر اور جمع اُساریٰ اور اَسْریٰ ہے اور ایل اللہ تعالیٰ کا نام ہے، اسی نام سے اللہ تعالیٰ کو حضرت مسیحؑ نے صلیب پر پکارا۔ پس اسرائیل کے لفظی معنی عبداللہ یا اللہ کا بندہ ہوئے اور یہ حضرت یعقوب کا دوسرا نام ہے۔

بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل: توحید الٰہی اور ضرورت نبوت کا ذکر کر کے اب ایک قوم کا ذکر نمونہ کے طور پر کیا ہے۔ بنی اسرائیل سے مراد وہ قوم ہے جو حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کی اولاد ہے۔ حضرت ابراہیم کی اولاد کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل ہیں یعنی حضرت اسماعیل کی اولاد پس بنی اسرائیل قوم جس کو یہاں خطاب کیا ہے اور بنی اسمٰعیل جن میں سے حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کا ظہور ہُوا دو بھائی بھائی قومیں ہیں۔ بنی اسمٰعیل پہلے سے ملک عرب میں آباد ہوئے اور بنی اسرائیل کوئی ڈیڑھ سو سال کنعان میں رہ کر حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر میں چلے گئے۔ کوئی چار سو برس وہاں رہ کر حضرت موسٰی کے ساتھ ارض مقدس میں واپس آئے اور حضرت موسٰی کے بعد حضرت یوشع کے ماتحت ارض مقدس کو فتح کیا۔ عرب میں یہودی: آنحضرت صلعم کے ظہور سے کئی سو سال پیشتر بہت سے یہودی عرب میں آکر آباد ہوئے اغلب یہ ہے کہ نبی آخر الزمان کی پیشگوئیوں کی بنا پر انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی۔ ان میں سے تین قومیں خاص مدینہ میں آباد تھیں، بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع۔ خیبر میں بھی یہودی آباد تھے اور ان کی وہاں حکومت تھی۔

بنی اسرائیل کے ذکر سے اصل مقصود: قرآن شریف میں کسی انسان کا ذکر ہو یا کسی قوم کا سب مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ہے قصّہ کے طور پر نہیں۔ بنی اسرائیل کا ذکر سب سے پہلے کیا ایک اس لیے کہ اس کا خاص تعلق بنی اسمٰعیل سے ہے پھر اس لیے کہ یہ قوم تمام نعمتوں کی وارث بھی ہوئی، انبیاء ان کو کمال روحانی پر پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے، ظاہری کمال ان کو فتوحات کی صورت میں عطا فرمایا چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ اس نعمت کا ذکر کیا ہے اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا (المائدۃ ۵-۲۰) یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی نعمتوں سے اور اعلیٰ سے اعلیٰ جسمانی نعمتوں سے متمتع فرمایا۔ پھر تمام نعمتوں کے بعد اپنی بدعملیوں سے غضب کے نیچے بھی آئے۔ یہ سب کچھ مسلمانوں سے بھی ہوا۔ گویا انہی کی تاریخ بنی اسرائیل کے قصّہ میں بطور ایک پیشگوئی کے لکھی گئی ہے اور یہ تفسیر زبان نبوی سے ہی سمجھنی چاہیئے۔ اس لیے کہ متفق علیہ حدیث میں ہے آپ نے فرمایا لتتبعن سنن من قبلکم تم بھی پہلوں کے طریق پر قدم بقدم چلو گے اور جب دریافت کیا گیا الیھود والنصاریٰ یا رسول اللہ تو فرمایا ہاں اور کون۔ تو گویا اس آیت میں مسلمانوں کو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی اور جسمانی نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں جو ان کو دی گئی تھیں اور جن دونوں سے وہ آج محروم ہیں ہاں اوّل اپنے آپ کو اپنے عمل سے نعمت روحانی سے محروم کیا تو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو ان پر مسلط کر کے نعمت جسمانی سے ان کو محروم کر دیا۔ اے کاش ہم قرآن سے کچھ سبق لیتے۔

ع ۶۲ ارھبون۔ رَھَب کے معنی ایسا خوف ہے جس میں احتیاط ملی ہوئی ہو اور اضطراب (غ) لانتم اشد رھبۃ (الحشر ۵۹-۱۳) ترھبون بہ عدو اللہ (الانفال ۸-۶۰) وغیرہ۔ اسی سے تَرَھُّبْ بمعنی عبادت ہے اور رَھبانِیّۃ عبادت میں غلو کا نام ہے۔ فارھبون اصل میں فارھبونی ہے یعنی مجھ سے ہی خوف کرو ایّای حصر کے لیے بڑھا دیا یعنی اور کسی کا ایسا خوف نہ ہو۔

بنی اسرائیل کا خدا سے عہد: دونوں عہدوں کا ذکر کتاب استثناء ۲۶: ۱۷ و ۱۸ و ۱۹ میں ہے "تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے اور میں اُس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کی شرعوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا جیسا کہ اس نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو اس کی خاص گروہ ہووے اور تو اس کے سب احکام کی محافظت کرے اور تجھے سارے گروہوں سے جنہیں اس نے پیدا کیا صفت اور عزت اور نام میں بالا کرے"۔ خداوند کی آواز کا شنوا ہونے کا یہ مطلب تھا کہ نبی آخر الزمان کو تسلیم کریں۔ مسلمانوں کا عہد: ایسا عہد مسلمانوں سے بھی لیا گیا تھا ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ (التوبۃ ۹-۱۱۱) اللہ نے مومنوں سے ان کے مالوں اور ان کی جانوں کو خرید لیا ہے اور اس کا معاوضہ جنت ہے اب مسلمان اس عہد پر قائم نہیں رہے۔ اور یہی ان کی مصیبتوں کی اصل وجہ ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

اور اُس پر ایمان لاؤ جو میں نے اُتارا، اُسے سچا ٹھیراتا ہُوا جو تمھارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر نہ ہو[۶۳] اور میری باتوں کے بدلے تھوڑا مول نہ لو اور میرا ہی تقویٰ اختیار کرو[۶۴]

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ اور (نہ) سچ کو چھپاؤ اور تم جانتے ہو[۶۵]

ع۶۳ مصدقا۔ صدق سے ہے اور صدّقت فلانًا کے معنی ہیں میں نے اسے صدق کی طرف منسوب کیا (غ)،
مصدقا لما معکم۔ اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے۔ تصدیق کے معنی ہیں کسی کو سچا قرار دینا اور مصدق کے بعد صلہ ل لانے سے یہ غرض ہے کہ یہ تصدیق اس کے فائدہ کے لیے ہے جس کی تصدیق کی گئی ہے۔ قرآن کا سب کتابوں کا مصدق ہونا اور اس سے مراد: قرآن کریم کو صرف بنی اسرائیل کی کتب کا مصدق ہی نہیں کہا گیا بلکہ دوسری جگہ کل کتب منزلہ کا مصدق بھی کہا گیا ہے مصدقا لما بین یدیہ من الکتٰب (المائدۃ ۵ - ۴۸) قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے جس نے نہ صرف انبیائے بنی اسرائیل کو سچا قرار دیا بلکہ تمام دنیا کے انبیاء پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ مصدقا لما معکم کے ایک اور معنی بھی ابن جریر میں مروی ہیں کہ آنحضرت صلعم کی پیشگوئیاں ان کے پاس تھیں پس آپ کے ظہور سے ان پیشگوئیوں کی تصدیق ہوئی ورنہ ان کے غلط ہونے میں کوئی شبہ ہی نہ تھا۔
مثیل موسیٰ کی پیشگوئی: مثال کے طور پر خود حضرت موسیٰؑ کی پیشگوئی کو لو "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" (استثناء ۱۸: ۱۸) اب موسیٰ جیسا ایک نبی آنا اس پیشگوئی کی رو سے ضروری ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ بنی اسرائیل کے کسی نبی نے موسیٰؑ کی مثل نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی بنی اسرائیل کا کوئی نبی موسیٰ جیسا ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا، کیونکہ وہ سب ایک رنگ میں حضرت موسیٰؑ کے خلفاء تھے حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ تک تین نبیوں کا انتظار: یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک برابر یہودیوں کو اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا انتظار چلا آتا ہے۔ چنانچہ حضرت یحییٰؑ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تو مسیح ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر دریافت کیا کیا تو ایلیاس ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر دریافت کیا کہ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ یہاں وہ نبی پر تمام بائیبلوں میں استثناء ۱۸: ۱۸ کا حوالہ موجود ہے یعنی مثیل موسیٰ نبی (یوحنا ۱: ۲۱) اب ظاہر ہے کہ اس وقت تک یہود کو تین نبیوں کی انتظار تھی۔ ان میں سے حضرت یحییٰ کو الیاس کی آمد کا مصداق خود حضرت عیسیٰؑ نے قرار دیا اور مسیح ہونے کا خود دعویٰ کیا مگر وہ مثیل موسیٰ نبی ابھی باقی رہ گیا اور حضرت عیسیٰ کے بعد کوئی نبی ہوا نہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت: پس اگر آنحضرت صلعم ظاہر ہو کر مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہ کرتے تو اس پیشگوئی کو ہی غلط ماننا پڑتا پس آنحضرتؐ کے ظہور سے اس پیشگوئی کی سچائی ظاہر ہوئی اور دوسری طرف یہ عجیب بات ہے کہ آنحضرت صلعم کی بہت ہی ابتدائی وحی میں یہ لفظ آتے ہیں کہ یہی وہ موسیٰ جیسا نبی ہے جیسا کہ سورہ مزمّل سے ظاہر ہے کما ارسلنا الی فرعون رسولا اور یہ یہودیوں اور عیسائیوں پر آنحضرت صلعم کی صداقت کی ایسی اتمام حجت ہے جس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ایسا ہی اور کئی پیشگوئیاں ہیں جن کا مصداق ان میں کوئی نبی نہیں ہوا اور نبی صلعم کے ظہور سے ہی ان پیشگوئیوں کی سچائی ثابت ہوئی۔ یہی بالخصوص یہاں مراد ہے یعنی تم کو اس نبی کے ماننے میں کیا عذر ہے جو ان پیشگوئیوں کو پورا کرتا ہے جو تمھاری اپنی کتابوں میں ہیں۔

ع۶۴ ثمن قلیل۔ تھوڑے مول سے مراد دنیوی زندگی کے فوائد ہیں۔ ان کی خاطر ہی اکثر انسان حق کو قبول کرنے سے رُک جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے قل متاع الدنیا قلیل (النساء ۴ - ۷۷) دنیا کا سارا سامان ہی ایک قلیل شے ہے۔

ع۶۵ تلبسوا۔ لَبس کپڑا پہننا ہے یا کپڑے سے اپنے آپ کو چھپا لینا۔ اسی سے لباس ہے دیکھو ع۲۳۳ پھر ظاہر سے باطن کی طرف معنی چلے گئے ہیں۔ اور لَبَسْتُ عَلَیْہِ اَمْرَہٗ کے معنی ہیں میں نے اس کا امر اس پر مخفی کر دیا (غ)
الحق۔ راغب کہتے ہیں کہ حقّ کے اصل معنی مطابقت اور موافقت ہیں۔ اور کئی وجہ پر اس کا استعمال ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی الحق کہا گیا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ چیزوں کا اس کے مطابق جو اقتضائے حکمت ہے وجود میں لانے والا ہے ثم ردوا الی اللہ مولٰھم الحق (الانعام ۶ - ۶۲) اور خدا کی پیدا کی ہوئی اشیاء کو اس لحاظ سے حق کہا جاتا ہے کہ وہ اقتضائے حکمت کے مطابق وجود میں آئی ہیں اور ہر فعل و قول کو حق کہا جاتا ہے، جو اس کے مطابق جو واجب ہے اور اس اندازہ سے جو واجب ہے اور اس وقت پر جو واجب ہے ہو (غ) اور حق کے بہت سے معنی ہیں سے صدق بھی ایک معنی ہیں (ت)، اور حق نقیض باطل ہے۔
باطل۔ نقیض حق ہے وہ چیز جس کے لیے جب تحقیق کیا جائے تو کوئی ثبات نہ ہو۔

حق و باطل کی ملاوٹ: یہاں حق سے مراد وہ پیشگوئیاں ہیں جو اب تک ان کی کتابوں میں چلی آتی تھیں۔ اور باطل ان کی اپنی خواہشات جن کے ساتھ پیشگوئیوں کو خلط کرتے تھے۔ پیشگوئیوں کو چھپانے کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے قالوا اتحدثونھم بما فتح اللہ علیکم (۷۶) اپنے پیروؤں کو کہتے ہیں تم اُن سے وہ باتیں کرتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جھک جانے والوں کے ساتھ جھکے رہو ۶۶

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ پس کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۶۷

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ

اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگتے رہو اور یقیناً یہ بڑی مشکل ہے

ع۶۶ الزکوٰۃ۔ زکا سے مشتق ہے اور کھیتی میں نمو آنے یا اس کے بڑھنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اسی سے زکوٰۃ ہے اور یہ وہ مال ہے جو فقرا کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ اس لیے کہا گیا کہ حقیقتاً اس سے برکت ہوتی ہے یعنی مال بڑھتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ اس سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے (رغ)

ارکعوا۔ رکوع کے اصل معنی جھک جانا ہیں اور ایسی فرمانبرداری پر بولا جاتا ہے جب انسان دوسرے کے آگے جھک جائے۔ اور اصطلاح شریعت میں ارکان نماز میں سے ایک رکن ہے جب انسان دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر اس قدر جھکتا ہے کہ پیٹھ اور گردن بالکل سیدھی ہو جائے۔ یہاں اصل معنی ہی مراد ہیں۔

نماز اور زکوٰۃ: پہلے ایمان کی طرف بلایا تھا اب بتایا کہ صرف منہ سے مان لینا ہی کافی نہیں، بلکہ ان دو باتوں کو بطور اصول قبول کرنا ضروری ہے جن کو اسلام نے پاکیزگی نفس یا کمال نفس کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ یعنی نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔ اوّل کمال حسن کے لیے ہے دوئم کمال احسان کے لیے کیونکہ نماز سے زیادہ تر غرض ان کمالات انسانی کا حصول ہے جو اپنے نفس سے تعلق رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہے۔

وارکعوا میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے انسان کی گردن جھکی رہنی چاہیئے۔

ع۶۷ البرّ۔ برّ نیکی میں وسعت یا بڑی نیکی کو کہتے ہیں (رغ) کیونکہ برّ خشکی کے وسیع قطعہ کو کہتے ہیں۔

تنسون۔ نسیان انسان کا اس چیز کے ضبط کو چھوڑ دینا ہے جس کی اُسے ودیعت کی گئی ہو۔ خواہ ضعف قلب سے یا لاپرواہی سے یا ارادۃً یہاں تک کہ اس کی یاد دل سے جاتی رہے (رغ)، وہ نسیان قابل مواخذہ ہے جو عمداً ہو۔ جیسے فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھذا (السجدۃ ۳۲-۱۴) یہاں بھی وہی نسیان مراد ہے جو عمداً ہو کیونکہ دوسروں کو نصیحت کرنے والا عمداً ہی ترک کرتا ہے۔

تتلون۔ تلی کے اصل معنی ہیں اس کی پوری پوری پیروی کی خواہ جسم سے ہو یا اقتدائے حکم سے (رغ)، اور تلاوت کتب منزل من اللہ سے مخصوص ہے خواہ قرأت سے ہو اور خواہ ان پر عمل کرنے سے (رغ)، اس لفظ کو اللہ کی کتابوں سے مخصوص کر کے یہ بتا دیا کہ ان کی تلاوت کی اصل غرض ان کی پیروی ہے۔

تعقلون۔ عقل کے اصل معنی روکنا اور پکڑ لینا ہیں جیسے عقال (اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی رسی) سے اونٹ کا روک لینا (رغ)، حدیث میں ہے اعقل وتوکل جہاں اعقل کے معنی گھٹنا باندھ دو ہیں۔ امام راغب کہتے ہیں عقل کا استعمال دو طرح پر ہے ایک اس قوت کو عقل کہا جاتا ہے جو قبول علم کے لیے انسان کو تیار کرتی ہے اور دوسرے اس علم کو بھی عقل کہا جاتا ہے جو اس قوت کے ذریعہ سے انسان حاصل کرتا ہے اور لکھتے ہیں کہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے عدم عقل کے لیے کفار کی مذمت کی ہے وہاں یہ دوسرے معنی ہی مراد ہیں اور یہ بات صاف بھی ہے قوت تو اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کے اندر رکھی ہے قابل الزام وہی ہیں جو اس قوت سے کام نہیں لیتے۔

واعظ کے لیے ضرورت عمل: یہاں بالخصوص خطاب علما سے ہے جو دوسروں کو لمبے چوڑے وعظ کرتے ہیں اور اپنی اصلاح نہیں کرتے۔ اگر خطاب بنی اسرائیل کے علما سے لیا جائے تو رسول صلعم کی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلاتی ہے مگر میرے نزدیک خطاب مسلمانوں سے ہے اس طرح دونوں خطابوں کو ملانے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کہا گیا ہے۔ جب تک واعظ خود عامل نہ ہو اس کا وعظ دوسروں پر بھی اثر نہیں کرتا۔

مذہب میں عقل کے استعمال کی ضرورت: افلا تعقلون اس قسم کے فقرات قرآن شریف میں بکثرت آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ نے انسان کو بڑا جوہر دیا ہے اور اس سے کام لیے بغیر انسان صداقت کو کبھی نہیں پا سکتا اور نہ سچے مذہب کی اور سچے ترقی کی اسے شناخت حاصل ہو سکتی ہے مفردات میں حدیث نقل کی ہے ماخلق اللہ خلقا اکرم علیہ من العقل اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کی نگاہ میں عقل سے زیادہ عزت والی ہو۔ اسی سے انسان کی فضیلت حیوان پر ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب میں عقل کا دخل نہیں صریح قرآن شریف کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ملزم کرتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ عقل اور وحی: ہاں یہ سچ ہے کہ وحی سے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کو عقل خود دریافت نہیں کر سکتی۔ لیکن عقل کا عجز ان باتوں کے معلوم کرنے سے اور چیز ہے اور ان باتوں کا عقل کے مطابق ہونا اور ان کی صداقت کو عقل سے معلوم کر لینا بالکل الگ ہے۔

وحی فطرت کی روشنی یعنی عقل کو جلا دینے والی اور تیز کرنے والی چیز ہے۔ ایک کو دوسرے کا مخالف بنانا دونوں کی حقیقت سے بے خبر ہونے کا نتیجہ ہے۔

إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ﴿۴۵﴾

مگر نہ ان پر جن کے دل پگھلتے ہیں ۶۸ء

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلٰقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ ﴿۴۶﴾

جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور کہ وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ۶۹ء

الربع

يٰبَنِيٓ إِسْرٰٓءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِينَ ﴿۴۷﴾

اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو، جو میں نے تمھیں عطا کی اور یہ کہ میں نے تمھیں قوموں پر فضیلت دی ۷۰ء

ء۶۸ الصبر۔ صبر اصل میں تنگی کے اندر روک رکھنے کا نام ہے اور پھر اپنے آپ کو روک رکھنے کا نام ہے اس چیز پر جس کو عقل اور شریعت چاہتی ہوں (غ)، بالفاظ دیگر طاعت پر قائم رہنے اور معصیت سے رُکے رہنے کا نام صبر ہے پس صبر ایک عام لفظ ہے اور مصیبت میں استقلال، جنگ میں ثبات اور روزہ کو صبر کہا ہے۔

کبیرۃ۔ کبیر کے اصل معنی بڑا ہیں مگر کبیرۃ کا استعمال اس چیز پر بھی ہے جو سخت اور دشوار ہو۔ کبر بھی اس معنی میں آیا ہے وان کان کبر علیك اعراضهم (الانعام-۳۵)

خاشعین۔ خشوع عاجزی، فروتنی (غ) سکون اور فرمانبرداری (ت) ہے۔ آواز کی پستی کے لیے اور نگاہ کے نیچا ہونے کے لیے یہ لفظ بالخصوص بولا جاتا ہے۔ قرآن شریف میں ہے خشعت الاصوات (طٰهٰ ۲۰-۱۰۸) خاشعة ابصارهم (القلم ۶۸-۴۳)

طریق استعانت: قرآن کریم نے مومن کو مشکلات کے وقت جو طریق استعانت بتایا ہے۔ وہ صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ ہے۔ صبر اصول حقہ پر مضبوط رہنے کا نام ہے۔ اور صلوٰۃ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا۔ صبر تو یہ چاہتا ہے کہ انسان ایک بات پر ایسا اڑا رہے کہ کسی مخالفت کی اور کسی روک کی اُسے کچھ پروا نہ ہو تمام دنیا بھی اس کے خلاف ہو تو ایک مضبوط پہاڑ کی طرح اس کے قدم میں جنبش نہ آئے اور صلوٰۃ یہ چاہتی ہے کہ وہ اس قدر عاجز ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گرا رہے اور اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھے۔ جب انسانوں کے سامنے حد درجہ کی مضبوطی اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حد درجہ کی عاجزی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ تب کامیابی کی راہیں سہل ہو جاتی ہیں اور مشکلات کے پہاڑ بھی ہوں تو اُڑ جاتے ہیں۔

مصائب میں توجہ الی اللہ کی ضرورت: انها میں ضمیر بعض مفسرین نے استعانت کی طرف لی ہے یعنی صبر و صلوٰۃ سے مدد چاہنا عام لوگوں کو دشوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر بعض نے اسے صرف صلوٰۃ کی طرف لیا ہے اور میرے نزدیک یہی درست ہے جیسا کہ سیاق عبارت بتاتا ہے۔ کیونکہ خدا کے حضور عاجزی اختیار کرنا، مصائب میں اللہ کی طرف متوجہ ہونا یہ انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایسا یقین کامل رکھتے ہیں کہ اس سے ملاقی ہونے کا بھی انہیں یقین حاصل ہوتا ہے۔ یہاں استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا حکم دے کر صلوٰۃ کے ذکر کو جاری رکھا ہے کیونکہ یہاں نبی کی شناخت یا اس پر ایمان کا ذکر ہے اور یہ مقصد دعا سے ہی زیادہ حاصل ہوتا ہے اور دوسری دفعہ بعینہٖ یہی حکم دیکر (دیکھو آیت ۱۵۳) صبر کے ذکر کو جاری رکھا ہے کیونکہ وہاں جنگ کا ذکر ہے اور دشمن کے مقابلہ کا۔ جہاں گو دعا کی بھی ضرورت ہے مگر مقدم استقلال ہے۔

ء۶۹ یظنون۔ ظن اس چیز کا نام ہے جو نشانات سے حاصل ہو اور جب یہ مضبوط ہو تو علم کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور جب بہت ہی کمزور ہو تو توہم کی حد سے آگے نہیں بڑھتا (غ) ظن شک اور یقین دونوں پر بولا جاتا ہے جب یقین مراد ہو تو ایسا یقین ہوتا ہے جو تدبر سے حاصل ہو نہ وہ جو دیکھنے سے حاصل ہو کیونکہ جو یقین دیکھنے سے حاصل ہو اس پر صرف لفظ علم بولا جاتا ہے (ت) یہاں ظن سے مراد یقین ہی ہے اور اس پر مفسرین کا قریباً اتفاق ہے۔

ملاقوا۔ لقاء کسی چیز کے سامنے آجانے اور اسے پالینے دونوں کو کہا جاتا ہے لیکن الگ الگ دونوں مضمونوں کے ادا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔

راجعون۔ رُجوع لوٹ کر جانے کا نام ہے اس کی طرف جس سے ابتدا ہو یا تقدیرا ابتدا خواہ بلحاظ مکان کے ہو یا فعل کے یا قول کے (غ) رب کی ملاقات سے کیا مراد ہے۔ یہ ذکر قرآن شریف میں بار بار آتا ہے اور کافروں کو ملزم کیا ہے کہ وہ لقاء اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔ ان الذین لایرجون لقاءنا ورضوا بالحیوۃ الدنیا (یونس ۱۰-۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ محض دنیا کی زندگی کو غرض و غایت سمجھ لینا انکار لقاء اللہ ہے۔ سورۃ کہف کے آخر میں ان لوگوں کا ذکر کر کے جو سارا زور دنیا کی زندگی پر ہی صرف کر دیتے ہیں فرمایا اولئك الذین کفروا بایات ربهم ولقائه اور ایک جگہ فرمایا انك کادح الی ربك کدحا فملقیه (الانشقاق ۸۴-۶) پس لقاء اللہ سے مراد اعلیٰ زندگی ہے جو مومنوں کو میسر آتی ہے اور گو کامل رنگ لقاء اللہ کا بعد موت یا قیامت میں ہی میسر آئے گا لیکن جو لوگ اسی زندگی میں جنت کو پالیتے ہیں یعنی نفوس مطمئنہ وہ یہاں بھی خدا کے حضور ہی زندگی بسر کرتے ہیں پس لقاء اللہ یا اللہ کو پالینا اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد انسانی زندگی کا ہے۔

رجوع الی اللہ: الیه راجعون۔ موت کے بعد سب انسانوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جانا آیت ۲۸ میں بیان ہو چکا ہے۔ پس اس سے مراد حساب کتاب کے لیے اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے۔

ء۷۰ جیسا کہ ء۲ میں دکھایا جا چکا ہے۔ ہر زمانہ کے لوگ ایک عالم کہلاتے ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اپنے زمانہ کی قوموں پر فضیلت دی گئی۔ اس کے مقابل پر مسلمانوں کے متعلق فرمایا کنتم خیر امة اخرجت للناس تم تمام قوموں میں سے جن کو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا بہترین قوم ہو۔ بنی اسرائیل کو یہاں دوسری مرتبہ خطاب کیا ہے پہلی مرتبہ خطاب کر کے ان کو وہ پیشگوئیاں یاد دلائی تھیں جو ان کی کتابوں میں رسول اللہ صلعم کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ اب دوسری مرتبہ خطاب کر کے ان کو وہ نعمتیں یاد دلائی ہیں۔ جو خدا تعالیٰ نے ان کو دی تھیں۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور اُس دن سے بچاؤ کرو جب کوئی جی کسی جی کے کچھ کام نہیں آئے گا اور نہ اس سے سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے بدل لیا جائے گا اور نہ اُنھیں مدد دی جائے گی [۷۱]

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

اور جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے چھڑا لیا جو تمھیں بُرا دُکھ دیتے تھے، تمھارے بیٹوں کو مار ڈالتے اور تمھاری عورتیں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے ایک بڑی آزمائش تھی [۷۲]

ع۷۱ تجزی ۔ جزا کے اصل معنی کام آنا کافی ہونا (غ) یا ادا کرنا اور عوض دینا ہیں (ج) یہاں مراد یہ ہے کہ جو حق ایک کے ذمہ ہے اُسے دوسرا کوئی ادا نہ کر سکے گا۔

شفاعۃ ۔ شفع (جفت) سے مشتق ہے شفع کے اصل معنی ہیں ایک شے کو اس جیسی دوسری شے سے ملا دینا (غ) اور شفاعت کے معنی ہیں کسی دوسرے سے مل جانا اس کی مدد کرتے ہوئے اور اس کا حال دریافت کرتے ہوئے اور اکثر استعمال اس کا اس طرح پر ہے کہ ایک اعلیٰ عزت اور مرتبہ والا اس کے ساتھ ہو جائے جو ادنیٰ ہے اور اسی سے قیامت کی شفاعت ہے (غ)

مسئلہ شفاعت: شفاعت کا مسئلہ شریعت اسلامی میں مسلم ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ بعض گناہ ایک انسان کے پاک لوگوں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے معاف کر دیئے جائیں۔ اسلام کی اصل تعلیم یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے افعال کا ذمہ وار نہیں ہو سکتا۔ نہ ایک کی ذمہ واری کو دوسرا ادا کر سکتا ہے۔ شفاعت کا مسئلہ اس اصول کو باطل نہیں کرتا اور اس کے یہ معنی نہیں کہ جس کی سفارش چل گئی وہ بچ گیا۔ بلکہ جس طرح ہم اس دنیا میں شفاعت کو کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں کہ مثلاً نبی کریم صلعم کے ساتھ تعلق رکھنے والے کس طرح گناہوں سے پاک ہو گئے اور یہ محض آپ کی شفاعت یا آپ سے تعلق کا نتیجہ تھا اور آپ کی دعاؤں نے جو اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے حق میں آپ کرتے تھے یہ انقلاب پیدا کر دکھایا۔ اسی سے قیامت کی شفاعت کا قیاس ہو سکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ انسان کی نجات اللہ کے رحم اور فضل پر موقوف ہے۔ پھر یہ فضل و رحم اوّلاً انسان کے اعمال پر ظہور پذیر ہوتا ہے پھر بعض نیکوں کے ساتھ سچے تعلق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جب انسان نیک نیتی سے بعض غلطیاں کر بیٹھتا ہے، یا اپنی غفلت کی وجہ سے معذور ہوتا ہے۔ گو دل میں نیکی کی تڑپ رکھتا ہے تو صلحا کی دعا سے اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا رحم خالق و مالک ہونے کی حیثیت سے خود بھی جوش مار کر اپنی مخلوق کی دستگیری فرماتا ہے۔ چنانچہ شفاعت کی حدیث ذیل جو بخاری اور مسلم میں آئی ہے اس کی تصدیق کرتی ہے اور وہ حدیث یہ ہے شفعت الملٰئکۃ وشفع النبیون وشفع المومنون ولم یبق الا ارحم الراحمین فیقبض قبضۃ من النار فیخرج منھا قوما لم یعملوا خیرا قط یعنی اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ فرشتوں نے بھی شفاعت کی نبیوں نے بھی شفاعت کی مومنوں نے بھی شفاعت کی اور سوائے ارحم الراحمین کے کوئی باقی نہیں رہا پس وہ آگ میں سے ایک مٹھی بھر لیگا اور ایسے لوگوں کو باہر نکالیگا جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔ یہاں تین شفاعتوں کا ذکر ہے ایک ملائکہ کی، ایک انبیاء کی، ایک مومنوں کی۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ کا تعلق بہت وسیع ہے یعنی کل نیکی کرنے والوں سے۔ انبیاء کا تعلق صرف اپنی اپنی امتوں سے اور مومنوں کا تعلق بہت ہی محدود ہے پس ملائکہ ہر ایک نیکی کرنے والے کی شفاعت کرینگے، انبیاء اپنی اپنی اُمتوں اور مومن اپنے ساتھ خاص تعلق رکھنے والوں کی اور جنھوں نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی یعنی نہ ان کا تعلق کسی مومن سے ہوا نہ کسی نبی سے نہ ملائکہ سے جو نیکیوں کے محرک تھے ان پر خود اللہ تعالیٰ کا رحم جوش ماریگا۔ اس میں مفہوم شفاعت بتایا ہے کہ اصل غرض گنہگاروں پر رحم ہے جس کے لیے ایک یا دوسرا سامان خدا تعالیٰ نے پیدا کر دیا ہے۔ یہاں عیسٰی مسیح والی شفاعت نہیں کہ صلیب اور کفارہ پر ایمان لانیوالے تو سب بچ جائیں خواہ کچھ ہی کرتے رہے ہوں اور دوسرے لوگوں نے خواہ کتنی ہی نیکی کی ہو ان پر رحم قطعاً نہ ہوگا اور نہ یہ شفاعت سفارش ہے جو ایک انسان پیش کر سکے بلکہ یہ محض کامل مومنوں اور انبیاء کے اور خود خالق عالم کے رحم کے جوش میں آنے کا نتیجہ ہے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو توجہ دلائی ہے کہ ان کی نافرمانی کی حالت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ خدا کے رحم سے وہ بالکل دُور جا پڑے ہیں۔ انسان کے بچاؤ کے سامان یہی ہوتے ہیں کہ کوئی دوسرا کام آ جائے۔ کوئی سفارشی ہو۔ کوئی معاوضہ لے لیا جائے کوئی رحم کر کے مددگار بن جائے مگر ان کو بتایا کہ انہوں نے اپنے آپ کو ان سب سامانوں سے محروم کر لیا ہے آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے اور سبق لینے کا مقام ہے۔

ع۷۲ نجینا ۔ نجات کا مادہ نجو ہے اور نجوۃ بلند زمین کو کہتے ہیں۔ پس نجات کے معنی الارتفاع من الھلاک ہیں یعنی ہلاکت سے بلند ہو جانا (ت)، یا جس چیز میں خوف ہو اس سے مخلصی پا لینا۔ راغب کہتے ہیں کہ نجاء کے اصل معنی کسی چیز سے الگ ہو جانا ہیں۔ پس نجات کے معنی اسلام میں گناہ سے جو ہلاکت پیدا کرتا ہے بلند ہو جانا یا اس سے بالکل الگ ہو جانا اور مخلصی پا لینا ہے۔

اٰل ۔ اھل کی بدلی ہوئی صورت ہے اٰل اور اھل میں فرق یہ ہے کہ اٰل صرف معرفہ کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اھل عام ہے نکرہ کی طرف یا مکان یا زمانہ کی طرف بھی منسوب ہو سکتا ہے اور دوسرے اٰل کا لفظ اشرف اور افضل لوگوں کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اھل ہر ایک کی طرف منسوب ہو سکتا ہے اور بعض کے نزدیک اس کا استعمال سوائے خصوصیت ذاتی کے نہیں ہوتا۔ خواہ وہ قریبی قرابت کے لحاظ سے ہو یا دوستی اور تعلق کے لحاظ سے ہو۔

آل محمد اور اُمت محمد: اس لیے آل محمد صلعم اور اُمت محمد صلعم میں یہ فرق ہے کہ اُمت محمد صلعم میں سب نام لیوا داخل ہیں۔ مگر آپ کی آل میں وہی لوگ کہلائینگے

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۞

اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا پس ہم نے تمہیں بچا لیا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ ۷۳

جو علم یقینی اور عمل مضبوط کی خصوصیت رکھتے ہوں۔ (غ)

فرعون رعمیس: فرعون مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا وہ خاص فرعون جس کا یہاں ذکر ہے رعمیس ثانی تھا۔

یسومون۔ سوم کے اصل معنی کسی چیز کی طلب میں نکلنا ہیں۔ پھر خالص جانے پر اور صرف طلب پر بھی اس کا استعمال ہو جاتا ہے اور یہاں طلب کے معنی میں ہی ہے (غ)، اور سامہ کے معنی یہ بھی آتے ہیں کہ ایک سخت کام اس پر ڈال دیا (ر)

یذبحون۔ ذبح کے اصل معنی جاندار چیز کا حلق کاٹنا ہے۔ مگر محض کاٹنے یا محض ہلاکت پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

بلاء۔ بلی سے ہے جو کپڑے کے پرانا ہونے پر بولا جاتا ہے اور بلی کے معنی آزمانا اس لیے آتے ہیں کہ گویا کثرت آزمائش سے اُسے بڈھا کر دیا غم اور تکلیف کو بھی اسی لیے بلاء کہتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش بعض وقت بذریعہ مصائب کے ہوتی ہے اور بعض وقت خوشی اور راحت پہنچانے سے، اس لیے انعام کو بھی بلاء کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے بُلِیْنَا بِالضَّرَّاءِ فَصَبَرْنَا وَبُلِیْنَا بِالسَّرَّاءِ فَلَمْ نَصْبِرْ اور قرآن شریف میں بھی ہے وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (الانبیاء ۲۱۔ ۳۵) اور یہاں بلاء میں اس تکلیف و مشقت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جس کا ذکر یذبحون میں ہے اور اس انعام کی طرف بھی جس کا ذکر نجات دینے میں ہے۔

بنی اسرائیل سے ذلیل کام کروانا: سوء العذاب یا بڑا دُکھ جس کا یہاں ذکر ہے۔ بائبل میں اس کے متعلق ہے" اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی" (خروج ۱: ۱۳ و ۱۴)

بنی اسرائیلی لڑکوں کا مارنا: لڑکوں کے مارنے کا حکم بھی فرعون نے دیا تھا "تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائی جنائیوں کو ...... یوں کہا کہ ...... اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو اور بیٹی ہو تو جینے دو" (خروج ۱: ۱۵ و ۱۶) فرعون اور اس کی قوم نہ چاہتی تھی کہ ایک دوسری قوم ان کے ملک میں قوت پکڑے اس لیے ذلت اور بیگار کے سب کام ان سے لینے شروع کیے۔ لڑکوں کو مارنے اور لڑکیوں کو جیتا رکھنے سے بھی یہ منشاء تھا کہ قوم نابود ہو جائے، کیونکہ لڑکیاں مجبور ہو کر مصریوں کے نکاح میں آئیں۔ حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان تمام مصیبتوں سے چھڑایا۔

ع ۷۳ فرقنا۔ فرق اور فلق کے ایک ہی معنی ہیں لیکن فرق علیحدہ ہونے کے لحاظ سے اور فلق پھٹ جانے کے لحاظ سے کہا جاتا ہے (غ)، مگر پانی کے پھٹ جانے سے مراد بھی اس کا ہٹ جانا ہی ہے دوسری جگہ فرمایا فانفلق۔ دریا پھٹ گیا (الشعراء ۲۶۔ ۶۳)۔

البحر۔ بحر۔ اصل میں اس وسیع جگہ کا نام ہے جس میں بہت سا پانی جمع ہو (غ) اس لیے دریا، سمندر سب پر بولا جاتا ہے۔ پھر بلحاظ معنی وسعت پر بولا جاتا ہے جیسے تَبَحَّرَ فی العلم یعنی علم میں وسعت اور گھوڑے کو جو بہت چلنے والا ہو بحر کہہ دیتے ہیں۔ جیسے آنحضرت صلعم ابو طلحہ کے ایک گھوڑے پر سوار ہوئے تو فرمایا انا وجدنہ لبحرًا۔ اور اسی لیے بَحَرَ کے معنی زیادہ پھاڑ دیا بھی ہیں جس سے بَحِیْرَۃ آتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا اور شہروں اور بستیوں کو بھی بحاد کہا جاتا ہے (ت)

بنی اسرائیل کا عبور دریا: قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے دریا پار ہونے کا ذکر کئی جگہ ہے۔ مگر کہیں یہ ذکر نہیں کہ دریا میں بارہ رستے بن گئے تھے اور پانی کی دیواریں کھڑی رہ گئی تھیں اور ان میں دریچے بن گئے تھے۔ نہ کسی صحیح حدیث میں یہ مضمون ہے۔ یہاں فرقنا بکم البحر فرمایا یعنی دریا کو تم سے الگ کر دیا۔ دو جگہ فرمایا وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر (الاعراف ۷۔ ۱۳۸؛ یونس ۱۰۔ ۹۰) یعنی بنی اسرائیل کو ہم نے دریا پار کر دیا۔ ایک جگہ فرمایا فانفلق (الشعراء ۲۶۔ ۶۳) یعنی دریا پھٹ گیا۔ دریا پھٹنے سے مراد یہی ہوتی ہے کہ خشک راستہ ہو گیا اور ایک جگہ فرمایا فاضرب لهم طريقا فی البحر يبسا (طٰہٰ ۲۰۔ ۷۷) دریا میں ان کو خشک راستہ پر لے جاؤ۔ اور ایک جگہ فرمایا واترك البحر رهوا (الدخان ۴۴۔ ۲۴) دریا کو ٹھہرا ہوا یا درمیان میں چھوڑ کر پار ہو جاؤ۔ نہ کہیں بارہ رستوں کا ذکر ہے نہ پانی کی دیواروں کا۔ ہاں خشک راستہ کس طرح ہو گیا یا دریا کس طرح پھٹ گیا۔ یہ قرآن شریف نے بیان نہیں فرمایا۔ بائبل میں صرف اس قدر ہے کہ "خداوند نے بسبب پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا اور دریا کو سکھا دیا۔" (خروج ۱۴: ۲۱)

اس قدر صاف ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر دشت سینا میں لائے دریا درمیان میں کہاں حائل ہوا۔ بائبل اور مفسرین بائبل نے اسے بحیرہ قلزم کا شمالی حصہ موجودہ شہر سویز سے کچھ اوپر قرار دیا ہے ممکن ہے وہاں کوئی تنگ حصہ سمندر کا اس زمانہ میں ہو جہاں سے پانی کے آندھی سے جیسا کہ بائبل کہتی ہے یا جوار بھاٹے سے ہٹ جانے سے خشک راستہ نکل آیا ہو۔ مگر زیادہ تر قرین قیاس یہ ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو اتنی دُور آنے کی مہلت نہیں دی اور شاید یہ واقعہ دریائے نیل سے تعلق رکھتا ہو یا کسی اور دریا سے جو درمیان میں حائل ہوا ہو۔ دریاؤں میں یہ بسا اوقات ہو جاتا ہے کہ ایک وقت دریا پایاب ہو جاتا ہے اور آناً فاناً ایک ایسی خطرناک رَو آتی ہے کہ سیلاب آ جاتا ہے۔ جو دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں ان میں یہ واقعات اکثر پیش آ جاتے ہیں۔ خود دریائے نیل کے متعلق یہ امکان ہے کہ پرانے زمانے میں یہ اس قدر بڑا نہ ہو۔ اور کوئی حصہ اس کا پایاب ہو اور فرعون نے جوش تعاقب میں کہ بنی اسرائیل کو پکڑ لے یہ خیال نہ کیا ہو کہ رَو کا پتہ لے لے۔ بہر حال وہ اسباب جو اس طرح پر گزارنے اور فرعونیوں کو غرق کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیئے معمولی ہوں یا غیر معمولی۔ اس سے احسان میں فرق نہیں

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس رات کا وعدہ کیا[۷۴] پھر تم نے اس کے پیچھے بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے[۷۵]

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر ہم نے تم کو اس کے بعد معاف کر دیا، تاکہ تم شکر کرو[۷۵ا]

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور فرقان دیا، تاکہ تم ہدایت پاؤ[۷۶]

آتا۔ اگر نبی کریم صلعم کو دشمنوں سے غار میں چھپا کر بچا لینا، اگر مدینے کے گرد محاصرہ کی ہوئی فوج کو ایک آندھی سے ہٹا دینا انعامات الٰہی ہیں تو معمولی اسباب سے ایک نتیجہ کا پیدا ہو جانا کسی طرح احسان کی نوعیت کو نہیں بدل سکتا۔

ع۷۴ واعدنا۔ وعد سے باب مفاعلہ ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا اور حضرت موسیٰ کی طرف سے اس کا قبول کرنا۔

موسیٰ۔ عبرانی نام ہے۔ ہمارے مفسّر اس کو مو بمعنی ماء یعنی پانی اور شیٔ بمعنی شجر سے مرکب بتاتے ہیں اور بعض اس کو ماس یمیس سے فعلی کا وزن بتاتے ہیں مفسرین بائبل اس کو ماشہ (نکلنا) سے مشتق بناتے ہیں اور تازہ تحقیقات یہ ہے کہ یہ مصری لفظ ہے جس کے معنی بچّہ یا بیٹا ہیں۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل میں سے نہایت اولوالعزم نبی ہیں۔ آپ کے والد کا نام عمران تھا اور مصر میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کی بہن مریم آپ سے بہت بڑی تھیں اور ہارون آپ سے تین سال بڑے تھے۔ آپ کا زمانہ عموماً پندرہ سو قبل مسیح سمجھا گیا ہے مگر تازہ تحقیقات یہ ہیں کہ آپ کا زمانہ تیرہ سو قبل مسیح کے قریب ہے۔ رعمیس ثانی کا زمانہ: کیونکہ رعمیس ثانی کا زمانہ جس کے ساتھ آپ کو معاملہ پیش آیا ساڑھے تیرہ سو سال قبل مسیح ہے۔ آپ کا عظیم الشان کام بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے آزاد کرنا اور ایک شریعت اپنی قوم کو دینا ہے۔ قرآن کریم میں آپ کا ذکر بہت آتا ہے جس کی وجہ سے آپ آنحضرت صلعم کی مماثلت ہے۔

لیلۃ عموماً غروب آفتاب سے صبح صادق تک کے وقت کو کہا جاتا ہے یوں تو چالیس راتوں میں چالیس دن بھی شامل ہیں، مگر عبادت کے لیے چونکہ رات زیادہ موزون ہے شاید اس مناسبت سے لیلۃ کا لفظ اختیار کیا۔ الاعراف ۷-۱۴۲ میں چالیس کی جگہ تیس اور دس کہا و واعدنا موسیٰ ثلٰثین لیلۃ و اتممنٰھا بعشر۔

نزول شریعت موسوی: بائبل میں حضرت موسیٰ کا چالیس دن پہاڑ پر رہنا مذکور ہے "اور موسیٰ بدلی کے درمیان چلا گیا اور پہاڑ پر چڑھ گیا اور موسیٰ پہاڑ پر چالیس دن رات رہا" (خروج ۲۴: ۱۸) یہ وہ خلوت کا زمانہ تھا جب حضرت موسیٰ پر توریت کے احکام نازل ہوئے اور یہ واقعہ مصر سے آنے کے بعد کا ہے پہلا کام حضرت موسیٰ کے سپرد صرف یہی کیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے نکال لائیں۔ جب وہ نکال لائے تب شریعت نازل ہوئی۔

ع۷۵ اتخذتم۔ اتخاذ کا جب ایک مفعول ہو تو بنانے کے معنی میں آتا ہے (ذ) پس مراد یہ ہے کہ انھوں نے ایک بچھڑے کی مورت بنائی۔

بنی اسرائیل اور گائے کی پرستش: مصر میں جہاں بنی اسرائیل چار سو سال رہے تھے گائے کی پرستش ہوتی تھی۔ اس کا اثر بنی اسرائیل پر ہوا جیسے ہندوستان میں ہندوؤں کی بہت سی باتوں کا اثر مسلمانوں پر ہوا ہے۔ پیر پرستی قبر پرستی کی ترویج عام کا یہ بھی ایک موجب ہے اور بہت سے رسوم و رواج ہندوؤں کے مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں حضرت موسیٰ چالیس دن کے لیے پہاڑ پر گئے تو بنی اسرائیل نے ایک بچھڑے کا بت بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی اس کی تفصیل قرآن شریف میں سورہ طٰہٰ میں اور بائبل میں کتاب خروج کے ۳۲ باب میں ہے۔

ع۷۵ا عفونا۔ عفو کے اصل معنی کسی چیز کے لے لینے کا قصد کرنا ہیں (غ) اس لیے دو متخالف معنوں پر بولا جاتا ہے یعنی مٹانا اور بڑھانا اسی دوسرے معنی کی رُو سے حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے اعفاء اللحی کا حکم دیا جس کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں ھو ان یوفر شعرہ ولا یقص کالشوارب (ن) یعنی یہ کہ ڈاڑھی کے بالوں کو زیادہ کیا جائے مونچھوں کی طرح چھوٹا نہ کیا جائے اور عفوت عنہ کے معنی ہیں میں نے اسکے گناہ کے دور کرنے کا قصد کیا (غ) گویا اسے مٹا دیا۔

تشکرون۔ شکر کے معنی ہیں نعمت کا تصوّر اور اس کا ظاہر کرنا (غ) پس ایک شکر قلب یعنی دل کا شکر ہے جو محض تصور نعمت ہے اور ایک شکر لسان یعنی زبان کا شکر ہے جو دینے والے کی ثنا ہے اور ایک شکر بالجوارح یعنی اعضا سے شکر ہے جس سے مراد نعمت کی مکافات اس کے استحقاق کے مطابق دینا ہے (غ) اور شکر نعمت کفر نعمت کے مقابل پر ہے یعنی نعمت کو چھپانے کے (غ) اس لیے شُکر احسان یعنی نعمت کا پہچاننا اور اس کا پھیلانا ہے (ت) اور اللہ تعالیٰ شکور ہے یعنی تھوڑے عمل پر بہت بڑی جزا دینے والا (ت) یہی معنی شاکر کے ہیں جب اللہ تعالیٰ کی صفت ہو۔

ع۷۶ فرقان۔ حق و باطل میں فرق کو کہتے ہیں (غ) فرق عام ہے قرآن شریف میں جنگ بدر کو بھی فرقان کہا ہے یوم الفرقان یوم التقی الجمعن (الانفال ۸-۴۱) اور خود قرآن شریف کو بھی فرقان کہا ہے۔ تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ (الفرقان ۲۵-۱) مومن کو جو نور حق و باطل میں فرق کرنے کا دیا جاتا ہے اسے بھی فرقان کہا ہے۔ ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا (الانفال ۸-۲۹) پس موسیٰ کو فرقان دینے سے مراد وہ معجزہ بھی ہو سکتا ہے جس سے بنی اسرائیل کے دشمن تباہ ہوگئے اور فرقان توریت کا نام بھی ہو سکتا ہے اس لحاظ سے کہ وہ حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز ہے اور وہ نور بھی مراد ہو سکتا ہے جس سے انبیا حق و باطل میں فرق کرتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَٰقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ
أَنفُسَكُم بِٱتِّخَاذِكُمُ ٱلْعِجْلَ فَتُوبُوٓا۟ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ
فَٱقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ
فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾
وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ
جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ ٱلصَّٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿٥٥﴾

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم بچھڑا بنا کر تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے پس اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پھر آؤ اور اپنے نفسوں کو مار ڈالو[۷۷] یہ تمہارے لیے تمہارے پیدا کرنے والے کے حضور بہتر ہے پس وہ تم پر رحمت سے متوجہ ہوا بیشک وہ رحمت سے متوجہ ہونیوالا رحم کرنے والا ہے۔

اور جب تم نے کہا اے موسیٰؑ ہم تیری بات کبھی نہ مانیں گے جب تک کہ کھلا کھلا اللہ کو (نہ) دیکھ لیں پس تم کو ہولناک آواز نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے[۷۸]

ع۷۷ قوم۔ قام یقوم سے ہے جس کے معنی کھڑا ہونا ہیں۔ اور یہ اسم جمع ہے۔ زبان عربی میں قوم کا لفظ صرف مردوں کی جماعت پر بولا جاتا تھا جس میں عورتیں شامل نہ ہوں کیونکہ وہی متکفل امور سمجھے جاتے تھے مگر قرآن شریف نے عموماً مردوں اور عورتوں دونوں کو اس لفظ قوم میں شامل کیا ہے۔ (غ) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی حیثیت کو قرآن شریف نے کس طرح بڑھایا ہے۔

باری۔ الباری اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے بَرَأَ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ایسے طور پر پیدا کیا جس کی پہلے مثال یا نمونہ نہ ہو (ت) خلق اور برأ میں (ق): خلق اور برأ میں یہ فرق ہے کہ خلق عام ہے اور برأ حیوانات سے مخصوص ہے (ل) گویا الباری روح کا پیدا کرنے والا ہے ہاں بعض وقت جواہر اور اعراض کے پیدا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے (ل)۔ قرآن کریم میں مصیبت کے متعلق آتا ہے من قبل ان نبرأها (الحدید ۵۷-۲۲)

اقتلوا۔ قتل کے اصل معنی روح کا جسم سے دور کرنا ہیں (غ) یا موت کا وارد کرنا مارنے سے یا پتھر سے یا زہر سے یا اور کسی طرح پر (ت) مگر بعض وقت یہ معنی مراد نہیں ہوتے مثلاً حدیث سقیفہ میں قتل اللہ سعدا کے معنی ابن اثیر نے لکھے ہیں ای دفع اللہ شرہ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے شر کو دور کرے اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا اقتلوا سعدا قتلہ اللہ یعنی سعد کو قتل کر دو مطلب یہ نہ تھا کہ فی الواقع قتل کر دو بلکہ ایسا کر دو گویا کہ وہ قتل ہو گیا ہے اور مر گیا ہے۔ ایسا ہی دوسری حدیث میں جہاں دو خلیفوں کی بیعت کا ذکر ہے وہاں لفظ آتے ہیں فاقتلوا الاٰخر دوسرے کو قتل کر دو جس کے معنی ابن اثیر لکھتے ہیں ابطلوا دعوتہ واجعلوہ کمن مات (ن) یعنی اس کی دعوت کو باطل کر دو اور اسے اس کی طرح کر دو جو مر گیا ہے اور قتلت فلاناً کے معنی ذَلَّلْتُہٗ آتے ہیں (غ) یعنی میں نے اس کو فرمانبردار بنا لیا۔ قتل نفس سے مراد: اسی لیے فاقتلوا انفسکم میں امام راغب نے یہ معنی بھی قبول کیے ہیں قیل عنی بقتل النفس اماطۃ الشھوات یعنی قتل نفس سے مراد شہوات کا دور کرنا یا مارنا ہے۔

انفس۔ نفس کی جمع ہے اور نفس کے معنی روح بھی ہیں اور ایک چیز کے کل کے یا اس کی حقیقت پر بھی بولا جاتا ہے (ت) جیسے ظلمتم انفسکم یعنی اپنے آپ پر ظلم کیا اور اخ یا بھائی بند کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے فسلموا علیٰ انفسکم (النور ۲۴-۶۱) ہیں ایسا ہی ظن المومنون والمومنات بانفسہم خیرا (النور ۲۴-۱۲) میں انفس سے مراد اہل ایمان اور اہل شریعت لیے گئے ہیں۔ فاقتلوا انفسکم میں مراد بھائی بند بھی ہو سکتے ہیں اور اپنے نفس بھی جیسا ظلمتم انفسکم میں مراد ہے۔

قتل نفس کی مزید تشریح: توریت میں ہے کہ بنی لاوی کو حضرت موسیٰ نے حکم دیا تھا کہ "تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریب تین ہزار مرد مارے پڑے۔" (خروج ۳۲: ۲۷ و ۲۸) پس ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ درست ہو اور قرآن کریم نے فاقتلوا انفسکم میں اسی طرف اشارہ کیا ہو یعنی اپنے لوگوں کو جو اس شرک کے بانی مبانی اور قوم کو گمراہ کرنے والے ہیں قتل کر دو۔ مگر دوسرے معنی جو امام راغب نے بھی نقل کیے ہیں کہ قتل نفس سے مراد اماطۃ الشھوات ہے۔ بلحاظ سیاق و سباق بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اول تو ظلمتم انفسکم میں نفسوں پر جس ظلم کا ذکر ہے اس سے مراد بھی ذلیل خواہشات میں مبتلا ہونا ہے۔ اور پھر توبہ کا یہاں صاف طور پر ذکر بھی ہے اور اس کے بعد گویا بتایا کہ توبہ ایسی ہو کہ دوبارہ اس قسم کی ذلیل حرکت تم سے سرزد نہ ہو۔ اس لیے اپنے نفسوں کو بہت فرمانبردار بناؤ۔ اور اگلے الفاظ فتاب علیکم بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں اور سورہ اعراف میں جہاں اس واقعہ کا زیادہ تفصیل سے بیان ہے صرف توبہ ہی کا ذکر ہے دیکھو (الاعراف ۷-۱۵۳) پس یہ دوسرے موقعہ کی تفصیل بھی دوسرے معنی کو ترجیح دیتی ہے۔

ع۷۸ بنی اسرائیل کا اللہ کو دیکھنے کا سوال: لن نؤمن لک سے مراد یہ ہے کہ محض آپ کے کہہ دینے سے ہم یہ نہ مانیں گے کہ خدا آپ سے کلام کرتا ہے جب تک خود بھی خدا کو نہ دیکھ لیں۔ یہ کہنے والے سارے بنی اسرائیل نہیں بلکہ وہ ستر آدمی ہیں جن کو حضرت موسیٰ قوم میں سے منتخب کر کے ساتھ لے گئے تھے۔ جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے واختار موسیٰ قومہ سبعین رجلا لمیقاتنا (الاعراف ۷-۱۵۵) اور موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمی ہمارے میقات کے لیے چن لیے۔ یہ میقات اور واعدنا والا مواعدہ ایک ہی ہیں۔ یہ ستر آدمی حضرت موسیٰ کے ساتھ طور پر گئے اور انہوں نے یہ لفظ کہے کہ جب تک ہم خدا کو اس طرح نہ دیکھ لیں جس طرح ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اس وقت تک محض تمہارے کہنے سے نہیں مان سکتے۔ حضرت موسیٰ کا ان کی درخواست پر سوال رب ارنی کرنا: حضرت موسیٰ نے ان کی ضد

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾
وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ
وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا

پھر ہم نے تمکو تمہاری موت (کی سی حالت) کے بعد اُٹھایا، تاکہ تم شکر کرو ع۷۹
اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا ع۸۰ اور من اور سلوٰی تم پر اتارا ع۸۱ ان
ستھری چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں اور انھوں نے

دیکھ کر آخریوں سوال کیا ربّ ارنی انظر الیك (الاعراف۷ - ۱۴۳) جیسے حضرت مسیح نے حواریوں کی درخواست پر نزولِ مائدہ کے لیے التجا کی حالانکہ اس کو ناپسند بھی فرماتے تھے جیساکہ ان کے قول اتقوا اللّٰہ ان کنتم مومنین (المائدہ ۵ - ۱۱۲) سے ظاہر ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی ایک تجلی دکھائی جس سے پہاڑ میں زلزلہ آگیا، جعلہ دکّا میں یہی اشارہ ہے اور یوں سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے کاموں اور عجیب قدرتوں سے پہچانا جاتا ہے ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

صاعقہ اور رجفہ ایک ہی ہیں: اسی کو یہاں صاعقۃ کہا ہے۔ سورہ اعراف میں اسی کو الرجفۃ یعنی زلزلہ بھی کہا ہے فلمّا اخذتہم الرجفۃ (الاعراف۷ - ۱۵۵) جب ان کو زلزلہ نے آلیا۔ اسی طرح قرآن شریف میں ثمود کے عذاب کو ایک جگہ رجفۃ یعنی زلزلہ کہا ہے فاخذتہم الرجفۃ (الاعراف۷ - ۷۸) اور دوسری جگہ اسی کو صاعقۃ کہا ہے۔ فاخذتہم الصاعقۃ (الذٰریٰت۵۱ - ۴۴) پس صاعقۃ کے صحیح معنی ہولناک آواز ہیں اور شدید زلزلہ سے پہلے بھی ایک ہولناک آواز آتی ہے اس لیے زلزلہ کو صاعقہ کہا گیا ہے اور بائبل میں بھی زلزلہ کا ذکر ہے "اور پہاڑ سراسر ہل گیا" (خروج ۱۹: ۱۸)

ع۷۹ بعثنا۔ بعث کا لفظ موت سے اُٹھانے اور نیند سے اُٹھانے دونوں پر بولا جاتا ہے (ت) ایسا ہی بیہوشی سے ہوش میں لانے پر بولا جاتا ہے (ض)

موت کے مختلف معنی: موت۔ امام راغب نے موت کے کئی معنی بیان کیے ہیں۔ اوّل قوت نامیہ کا نہ ہونا، جیسے یحی الارض بعد موتہا (الحدید۵۷ - ۱۷) دوم قوت حسّی کا زائل ہونا یعنی بیہوش ہوجانا یہی معنی یٰلیتنی مت قبل ھذا (مریم۱۹ - ۲۳) میں لیے گئے ہیں۔ سوم قوت عقلی کا زائل ہونا یعنی جہالت جیسے اومن کان میتا فاحییناہ (الانعام۶ - ۱۲۲) میں چہارم وہ غم جو زندگی کو مکدّر کردیتا ہے جیسے ویاتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت (ابراھیم۱۴ - ۱۷) پنجم اس کے معنی نیند ہیں۔ چنانچہ نیند کو موت خفیف اور موت کو نوم ثقیل یعنی بھاری نیند کہا جاتا ہے اور حدیث میں ہے الحمد للّٰہ الذی احیانا بعد ما اماتنا جو سو کر اُٹھنے کی دعا ہے یعنی سب تعریف اس کے لیے ہے جس نے ہم کو زندہ کیا بعد اس کے کہ ہم کو مار دیا تھا۔ احیا اور امانت دونوں کا ذکر ہے مگر مراد صرف بیداری اور نیند ہیں ششم معمولی معنی یعنی روح کی جسم سے مفارقت۔ اور لسان العرب میں ہے کہ موت کا لفظ کبھی استعارۃً احوال شاقہ پر بولا جاتا ہے جیسے فقر اور ذلّت اور سوال اور بڑھاپا اور معصیت وغیرہ۔ اور موت کے معنی غشی بھی ہیں۔

بنی اسرائیل کی موت کے بعد زندگی: یہاں کون سے معنی مراد ہیں۔ اوپر ذکر تھا کہ ان کو صاعقہ نے آلیا۔ صاعقہ سے موت کا نہ واقع ہونا ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ فرمایا وانتم تنظرون۔ جب صاعقہ نے آپکڑا تو تم دیکھ رہے تھے۔ اور دیکھنا حالتِ زندگی پر دلالت کرتا ہے۔ مفسرین نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کہہ دیا ہے کہ نصف پہلے مرگئے اور دوسرے نصف ان کو دیکھتے رہے پھر وہ پہلے مرے ہوئے زندہ ہوگئے اور دوسرے نصف مرگئے۔ یہ بیفائدۃ تکلّف ہے۔ موت کے معنی یہاں قوتِ حسّی کا جاتے رہنا ہے۔ زلزلہ کی شدت سے ان کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ پھر اللہ نے ان کو ہوش و حواس دیدیئے۔ یا قوت عقلی کا جاتے رہنا ہے۔ یعنی یہ سوال تمہارا جہالت کا سوال تھا اور تم ایک جہالت کی موت میں تھے خدا نے تمہیں اس سے باہر نکالا اور تم کو نورِ ایمان عطا فرمایا جیسے اومن کان میتا فاحییناہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس (الانعام۶ - ۱۲۲) میں جہاں ایک مُردہ کو زندہ کرنے کا ذکر کرکے فرمایا کہ ہم نے اس کو ایک نور دیا ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے گویا یہی نورِ ایمان کا ملنا ہی حیات ہے۔ یہ معنی روح المعانی میں بھی دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ نظم و نثر میں یہ معنی مروج ہیں جیساکہ شاعر کا اس قول میں
اخو العلم حی خالد بعد موتہ - واوصالہ تحت التراب رمیم ؞ وذو الجہل میت وھو ماش علی الثریٰ - یظن من الاحیاء وھو عدیم۔
اور ابن جریر میں ایک قول ثم بعثنکم کی تفسیر میں مروی ہے۔ ثم بعثنکم انبیاء یعنی تم میں سے نبی اُٹھائے کیونکہ لفظ بعث نبیوں کے بھیجنے پر بھی بولا جاتا ہے۔

ع۸۰ ظلّلنا۔ ظِلّ سے ہے جس کے معنی سایہ ہیں فَیْءٌ بھی سایہ کو کہتے ہیں مگر فَیْءٌ صرف اس سایہ کو کہتے ہیں جو دھوپ سے رکاوٹ ہو اور ظل عام ہے جہاں سورج نہ پہنچے اس لیے ظل اللیل اور ظل الجنۃ کہا جاتا ہے (غ)

غمام: غمامۃ کی جمع ہے یعنی بادل۔ غمّ سے ہے جس کے اصل معنی ڈھانکنا ہیں بادل سورج کی روشنی کو ڈھانکتا ہے (غ) اَمْرٌ غُمَّۃٌ مشتبہ یا تاریک امر ثم لایکن امرکم علیکم غمّۃ (یونس۱۰ - ۷۱)

بادل کا سایہ: مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو دشتِ سینا میں سے گزرنا پڑا۔ جہاں شدت کی گرمی پڑتی ہے اور خیموں میں رہائش ناقابل برداشت ہوتی ہے شدت گرمی کے وقت ایسے بیابان میں بادل بڑی نعمت الٰہی ہے۔ قرآن شریف نے بائبل کے عجیب و غریب بادل کا ذکر نہیں کیا جو دن کے وقت سایہ کا کام دیتا ہو اور رات کے وقت روشنی کا۔

ع۸۱ مَنّ اصل میں مَنّ ایک مشہور وزن ہے۔ اور اس لیے بھاری نعمت کے دینے پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے گویا نعمت کے بوجھ کے نیچے دبا دیا۔ اور مَنّ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو شبنم کی طرح ایک درخت پر اُترتی ہے اور اس میں مٹھاس ہوتی ہے (غ) جیسے ترنجبین بخاری میں ہے الکمأۃ من المن یعنی کھمبی بھی مَنّ سے ہے۔

ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾
وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾
فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ
لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ
ع ۱۳/۶ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾

ہمارا کچھ نقصان نہ کیا، بلکہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتے تھے ۸۳

اور جب ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس سے جہاں چاہو بافراغت کھاؤ ۸۳ اور دروازے میں فرمانبردار بنکر داخل ہو ۸۴ اور کہو ہماری خطائیں معاف ہوں ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے ۸۵ اور احسان کرنے والوں کو اور زیادہ بھی دیں گے۔

پھر اُن لوگوں نے جو ظالم تھے بات کو بدل کر اسکے خلاف بنا دیا جو انھیں کہا گیا تھا ۸۶ پس ہم نے اُن پر جو ظالم تھے اوپر سے ایک عذاب اُتارا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ۸۷

سَلْوٰی ۔اس کا مادہ سلا ہے اور سَلْوٰی کے اصل معنی وہ چیز ہیں جو انسان کو تسلی دے (غ) اور سَلْوٰی ایک پرند ہے جو بٹیر سے مشابہ ہے۔

من وسلوٰی کا اُترنا: راغب نے ایک قول نقل کیا ہے کہ مَن اور سَلْوٰی ایک ہی چیز ہے مَنّ اس کو اس لیے کہا کہ اس کے ساتھ ان پر احسان کیا اور سَلْوٰی اس لیے کہ اس کے ساتھ ان کو تسلی دی اور ابن عباس کا قول سلا کے ماتحت نقل کر کے کہ مَنّ وہ ہے جو اوپر سے اُترتا ہے اور سلوی پرند ہے بعض محققین کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے ابن عباس نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو اللہ تعالٰی نے اپنے بندوں کو گوشت اور نبات یعنی سبزیوں سے رزق دیا ہے اور یہ صرف لطور ایک مثال کے ہے۔

ع ۸۲ طیبٰت ۔طیب وہ چیز ہے جس سے حواس کو لذت حاصل ہو اور جس سے نفس کو لذّت حاصل ہو اور شریعت میں طعام طیب وہ ہے جو اس طرز سے لیا جائے جو جائز ہے اور اس اندازہ سے لیا جائے جو جائز ہے اور اس مکان سے لیا جائے جو جائز ہے (غ) سڑی بُسی چیزوں پر لفظ طیب نہیں بولا جا سکتا۔

طیبات کا حکم: بائبل میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل نے لالچ کر کے ان چیزوں کا ذخیرہ کرنا شروع کیا تو وہ چیزیں سڑ کر خراب ہو جاتیں۔ ستھری چیزوں کے کھانے کے حکم میں یہی اشارہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ طیب وہ چیز ہے جو سڑی گلی یا مضر صحت نہ ہو۔ یہاں ایک عام اصول سمجھایا ہے کہ خلاف ورزی احکام الٰہی سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا وہ غنی ہے بلکہ انسان خود ہی نقصان اُٹھاتا ہے ایسا ہی فرمانبرداری سے انسان خود ہی فائدہ اٹھاتا ہے۔

ع ۸۳ القریۃ ۔قری سے ہے جس کے معنی جمع کرنا ہیں اور قریۃ اس مقام کو جس میں لوگ جمع ہوں مع ان لوگوں کے جو جمع ہوں کہتے ہیں مگر ان دونوں معنوں پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے کبھی مراد صرف موضع ہوتا ہے اور کبھی صرف لوگ (غ)

ھذہ القریۃ ۔کسی مشہور بستی کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے اور وہ مشہور بستی بیت المقدس ہی ہے جس میں داخل ہونے کا دوسری جگہ صاف حکم ہے یٰقوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم (المائدہ ۵-۲۱) ان کو کہا گیا تھا کہ بیت المقدس کو فتح کر کے اس میں داخل ہوں۔ جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ میں بھی یہی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت فاتح داخل ہوں۔ اگلی آیت بتاتی ہے کہ انھوں نے اس حکم کو نہ مانا جیسا کہ مائدہ میں بھی ان کا انکار موجود ہے۔ اور یا سطیم مراد ہے (گنتی ۲۵-۱)

ع ۸۴ امام راغب نے سجدا کے معنی کیے ہیں متذ للین منقادین یعنی فرمانبرداری اور اطاعت اختیار کرتے ہوئے یا تعمیل حکم کرتے ہوئے یہی معنی یہاں درست ہیں اسی کے مطابق سورہ مائدہ میں ہے ادخلوا علیھم الباب (المائدہ ۵-۲۳) یہ مراد نہیں کہ سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔

ع ۸۵ حِطَّۃ ۔حطّ کے معنی اوپر سے نیچے اُتارنا ہیں (غ) اور حِطّۃ کے معنی ہیں حُطّ عنا ذنوبنا (غ) یعنی ہمارے گناہ دُور کیے جائیں۔ اسی کے قریب قریب معنی حسن قتادہ وغیرہم سے مروی ہیں۔ ابن عباس سے مغفرت مانگنا معنی مروی ہیں۔ نغفر لکم خطایٰکم جو حطۃ کی دعا کا جواب ہے اس سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے

ع ۸۶ بنی اسرائیل کا جنگ میں جانے سے انکار: بات کے بدل دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسے قبول نہ کیا۔ فاتح بن کر داخل ہونے سے انکار کیا۔ اس کی تفصیل مائدہ میں ہے اور اس کی بجائے زراعت وغیرہ کو چاہا کہ کھانے کی چیزیں ملیں (۶۱) بخاری کی حدیث میں جو آتا ہے کہ حطۃ کی جگہ انہوں نے حبۃ فی شعرۃ کہا یعنی بال میں دانا جو زراعت کی طرف اشارہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو تبدیلی انہوں نے چاہی وہ یہی تھی کہ بجائے جنگ میں جانے کے ہم زراعت کریں گے اور یوں جنگ کو ناپسند کیا دیکھو ع ۹۰ اور اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون (المائدہ ۵-۲۴) یعنی ہم جنگ نہیں کریں گے تم اور تمہارا رب جنگ کرو۔

ع ۸۷ رِجز کے اصل معنی اضطراب ہیں اور اس عذاب کو رجز کہا جاتا ہے جو اپنی شدّت کی وجہ سے قلق پیدا کرے (ت) اور ایسے عمل کو بھی جو ایسا عذاب پیدا کرے۔ رجز کہا جاتا ہے اور نسائی کی حدیث میں طاعون کو بھی رجز کہا ہے۔

من السماء ۔یا اوپر سے آنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ قضاء وقدر ازل ہو گی۔ روح المعانی میں ہے اشارۃ الی الجھۃ التی یکون منھا القضاء

وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا، تو ہم نے کہا اپنا عصا چٹان پر مار۔ پس اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے سب قبیلوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا۔ اللہ کے دیئے سے کھاؤ اور پیو اور ملک میں فساد نہ پھیلاتے پھرو [۸۸]

او مبالغة فی علوہ بالقھر والاستیلاء یعنی من السماء میں اشارہ ہے اس جہت کی طرف جہاں سے قضا آتی ہے یا مبالغہ ہے اس کے علو میں قہر اور غلبہ کے ساتھ رجز کا عذاب: دوسری جگہ ہے کہ وہ چالیس سال جنگل میں بھٹکتے پھرتے رہیں گے۔ یہی وہ قلق پیدا کرنے والا عذاب ہے اور اگر ھذہ القریۃ سے سطیم مراد لیا جائے تو عذاب طاعون ہوگا جس سے اسرائیلی وہاں ہلاک ہوئے (گنتی ۲۵-۹)۔

[۸۸] اضرب۔ ضرب ایک چیز کے دوسری پر مارنے کو کہتے ہیں اور ضرب فی الارض کے معنی زمین میں چلنا ہیں (غ) بلکہ تاج العروس میں ضرب بمعنی ذھب لکھا ہے یعنی چلا گیا۔ اسی لیے ضرب الغائط کے معنی ہیں قضائے حاجت کے لیے گیا اور ضرب کے معنی مارنا بھی آتے ہیں۔

عصا۔ آئمہ لغت نے عصا کے اصل معنی اجتماع اور ائتلاف لکھے ہیں (ل) یعنی اکٹھا ہونا۔ بلکہ اصمعی کہتے ہیں کہ عصا کے معنی سونٹا اس لیے آتے ہیں کہ اس پر انگلیوں کا اجتماع ہوتا ہے (ل)، اس لیے عصا کے معنی جماعت اور عصوت کے معنی میں نے جمع کیا لغت میں آتے ہیں۔ خوارج کے متعلق آتا ہے سقوا عصا المسلمین یعنی انہوں نے مسلمانوں کی جماعت میں اختلاف ڈال دیا۔ ایسا ہی ایاك وقتیل العصا کے معنی ہیں کہ جماعت اسلام میں تفرقہ ڈالنے والوں سے بچو۔ پس عصا کے معنی سونٹا اور جماعت دونوں ہو سکتے ہیں۔

اس لیے اضرب بعصاك الحجر کے معنی تین طرح ہو سکتے ہیں۔ اپنا سونٹا چٹان پر مارو۔ اپنے سونٹے سے چٹان پر چلے جاؤ۔ اپنی جماعت کے ساتھ چٹان پر چلے جاؤ۔

انفجرت۔ فجر سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا فراخ پھٹ جانا اور فَجر صبح کو کہتے ہیں کہ وہ رات کو پھاڑ دیتی ہے (غ) تَفجیر اور انفجار میں وسعت پائی جاتی ہے۔ سورہ اعراف میں اسی موقع پر انبجست ہے اس کے معنی بھی پھوٹ نکلنا ہیں۔ مگر یہ اول خروج پر بولا جاتا ہے (جو تھوڑا ہوتا ہے) اور تفجر یا انفجار اس پر بھی بولا جاتا ہے جو منبع سے نکل کر باہر آجاتا اور وسعت اختیار کر لیتا ہے اور فجور جس سے فاجر ہے دیانت کے پردے کو پھاڑنا ہے (غ)

عین۔ اصل معنی آنکھ ہیں۔ پانی نکلنے کی جگہ کو اسی لحاظ سے عین کہا جاتا ہے کیونکہ آنکھ سے بھی پانی نکلتا ہے۔ جاسوس کو عین کہتے ہیں اس لیے کہ وہ خصوصیت سے ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ سونے کو عین کہتے ہیں اس لیے کہ افضل الجواہر ہے جس طرح آنکھ افضل الاعضا ہے کسی چیز کی ذات کو بھی اس کا عین کہتے ہیں (غ)

اناس۔ الناس کی دوسری صورت ہے اناس یا الناس بعض وقت بمعنی قبیلہ اور طائفہ بھی آجاتا ہے (ت) یہاں یہی معنی لیے گئے ہیں بنی اسرائیل کے بارہ ہی قبیلے تھے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بارہ قبیلے علیحدہ علیحدہ چشموں پر خیمہ زن ہوئے تھے۔ اس لیے وہ بارہ چشمے الگ الگ مقامات پر اور ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہوں گے۔

تعثوا۔ عثیٰ سے ہے عثیٰ اور عیث دونوں کے معنی فساد ہیں (غ) یا اس کے معنی حد سے گزر جانا ہیں اور پھر فساد میں حد سے گزر جانے پر بولا گیا ہے۔

ابتدائی مذاہب میں دعائیں: اس آیت میں بنی اسرائیل کے پانی مانگنے کا ذکر ہے اگلی آیت میں کھانا مانگنے کا۔ تمام ابتدائی مذاہب میں کھانے پینے کی دعائیں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ کی سب سے بڑی دعا بھی روزانہ روٹی کے لیے ہے۔ بارہ چشموں کا معجزہ: بیابان میں پانی کی ضرورت ایک اہم ضرورت تھی قوم کا ٹھکانا سوائے پانی کے نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو کسی خاص پہاڑ پر جانے کی ہدایت فرمائی، جہاں ان کو بارہ چشمے مل گئے۔ ایلیم ایک مقام ہے جہاں بارہ چشمے تھے (خروج ۱۵: ۲۵-۲۷) اور آج تک یہ عیونِ موسیٰ کے نام سے مشہور ہے (بائبل ڈکشنری مطبوعہ اکسفورڈ پریس) ممکن ہے یہ یا اس کے قریب کوئی مقام ہو یا کسی خاص چٹان پر سونٹا مارنے کی ہدایت کی جہاں سے پانی کا چشمہ بہ نکلا اور پھر اس کے بارہ چشمے بن گئے۔ کسی پتھر کے شق ہو جانے سے پانی کے چشمے کا نکل آنا بھی ایک معمولی واقعہ ہے لیکن بارہ قبیلوں کے ان چشموں پر آباد ہونے کے لیے یہی معنی زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں کہ اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چلے جاؤ۔ مفسرین کے اس قصے کی بنیاد کہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تین گز مربع کا ایک پتھر رہتا تھا جہاں اسے جنگل میں رکھ کر سونٹا مارتے اس سے بارہ چشمے نکل پڑتے۔ قرآن و حدیث پر نہیں ہے۔ جو معنی ہم نے کیے ہیں وہ اس لحاظ سے بھی زیادہ موزوں ہیں کہ اگلی آیت میں جب کھانا مانگنے کا ذکر آتا ہے تو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ شہر میں اُتر پڑو۔ اور کھیتی باڑی کرو۔ اور دونوں واقعوں کا یکجا بیان بتاتا ہے کہ دونوں کی ایک ہی نوعیت ہے۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، پس اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کر کہ وہ ہمارے لیے ان چیزوں سے نکالے جو زمین اگاتی ہے اسکی ترکاریوں سے اور اسکی ککڑیوں سے اور اسکے لہسن سے اور اس کے مسور سے اور اسکے پیاز سے ۸۹ع، اس نے کہا کیا تم وہ چیز جو ادنیٰ ہے اسکے بدلہ میں لینا چاہتے ہو جو بہتر ہے (کسی) شہر میں اُتر پڑو جو تم مانگتے ہو تمھیں مل جائیگا ۹۰ع اور اُن پر ذلت اور محتاجی ڈالی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں آگئے یہ اس لیے (ہوا) کہ وہ اللہ کی باتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس لیے (ہوا) کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ جاتے تھے ۹۱ع

۸۹ع بقل۔ بَقَل کے معنی ہیں ظاہر ہُوا۔ ہر ایک چیز جس سے زمین سرسبز ہو بقل ہے مگر یہاں مراد وہ اعلیٰ درجہ کی ترکاریاں ہیں جو انسان کھاتا ہے۔

فوم کے معنی لہسن بھی آتے ہیں اور گیہوں بھی، یہاں مراد لہسن ہی معلوم ہوتی ہے ابن مسعود کی قرأت ثوم ہے اور قرینہ بھی اسی معنی کو چاہتا ہے۔

بلا محنت مانگنے کی عادت بنی اسرائیل اور مسلمان: بنی اسرائیل کے سارے واقعات میں یہ بات خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ ہر چیز بلا محنت مانگتے ہیں۔ اسی لیے جنگ کا حکم ہوا، تو وہاں بھی کام سے دل چرایا فاذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون۔ تُو اور تیرا رب جاؤ اور جنگ کرو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ چاہتے تھے کہ فتح ہُوا ہوا یا ملک مُفت مل جائے۔ یہی حالت آج مسلمانوں کی ہے۔ محنت سے دل چراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بادشاہت کے مالک ہوں یا امام مہدی علیہ السلام آئیں اور وہی سب کچھ کر کے دے جائیں اور مسلمانوں کو خزانوں کے مالک بنا دیں۔ اس کا جواب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہود کو دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قوانین پر عمل کرو تو یہ چیزیں ملیں گی اور اهبطوا مصرًا میں یہی ہدایت ہے دیکھو اگلا نوٹ۔

۹۰ع ادنیٰ۔ دنو سے ہے جس کے اصل معنی قرب ہیں۔ ادنیٰ سے مراد بعض وقت اصغر یعنی چھوٹی چیز بمقابلہ بڑی کے اور بعض وقت ارذل یعنی زیادہ حقیر بمقابلہ بہتر کے اور بعض وقت اقرب یعنی زیادہ قریب بمقابلہ دور کے ہوتی ہے (غ) یہاں خیر کا مقابلہ ہے اس لیے ارذل مراد ہے۔

مصرا۔ مصر کے اصل معنی حد ہیں اس لیے ہر ایک ممصور یعنی محدود شہر کو مصر کہتے ہیں اور مصر مشہور ملک کا نام بھی ہے۔ مگر یہاں نکرہ ہے اور مراد شہر ہے۔

زراعت اور فتوحات ملکی کا مقابلہ: ادنیٰ اور خیر سے مراد یہاں ادنیٰ اور بہتر حالت معلوم ہوتی ہے۔ وہ سبزیاں ترکاریاں چاہتے ہیں اور وہ بغیر کاشتکاری اختیار کرنے کے پیدا نہیں ہو سکتیں جو قوم زراعت میں لگ جائے گی وہ فاتح نہیں بن سکتی۔ اس لیے ان کو سمجھایا کہ گو تم کو کھانے کی مشکلات ہیں، مگر یہ حالت انجام کار تمھارے لیے زیادہ مفید ہے زراعت میں لگ جاؤ گے تو فتوحات تمھیں میسّر نہیں آسکتیں۔ پھر اس کی طرز بھی بتادی کہ شہری زندگی اختیار کر لو اور کھیتی باڑی کرو۔ یہ چیزیں مل جائیں گی۔ ان کی خواہشات کا میلان اس قسم کے کاموں کی طرف اس لیے بھی زیادہ تھا کہ مصر میں وہ ایسے ہی کام زیادہ تر کرتے تھے۔ مِصر کے معنی شہر ہیں اور یہاں ملک مصر ہرگز مراد نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک شہر کی صورت میں رہائش اختیار کر لو۔

۹۱ع ضربت علیهم۔ یہ محاورہ ضَرَبَ الْخَیْمَةَ سے لیا گیا ہے۔ یعنی اس نے خیمہ لگایا۔ مراد یہ ہے کہ ذلت نے ان کو اس طرح اپنے اندر لپیٹ لیا جیسے خیمہ اس شخص کو جس پر وہ لگایا جاتا ہے۔

الذلة۔ ذُل اور ذِلّة کے ایک ہی معنی ہیں یعنی مقہور یا محکوم ہونے کی حالت اور ذِلّ وہ ہے جو صعوبت کے بعد ہو (غ) مگر ذلّة ایسی محکومی کی حالت ہے جس کے ساتھ قتل و غارت بھی لگی ہو جیسا کہ آل عمران ۱۱۱ میں مفسرین نے لکھا ہے کیونکہ یہ محکومیت کی ذلیل ترین حالت ہے۔

المسكنة۔ سکن سے ہے جو حرکت کے بعد ٹھہر جانے کا نام ہے (غ) اور سَکَنٌ کے معنی زوال رعب بھی ہیں (غ) اور اس کے معنی میں جھکنا اور ذلت اور حالِ بد داخل ہیں اور کبھی مسکنة سے مراد ضعف یعنی کمزوری ہوتی ہے (ل) گویا مسکنت کی حالت وہ ہے کہ پھر حکمران ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مار سکیں۔ پس یہ محکومیت کا دوام ہے۔

باؤا۔ بواء اصل میں مکان کے اجزا میں مساوات یعنی ہمواری کو کہتے ہیں اور باء بغضب من اللہ کے معنی ہیں ایسے مکان میں اترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب تھا (ع) اسی لیے یتبوأ جگہ بنانے کے معنی میں ہے یا باء کے معنی اِحْتَمَلَ ہیں گویا وہ اس گناہ یا غضب کی جگہ بن گیا (ت)، اور باء کے معنی رَجَعَ بھی آتے ہیں یعنی لوٹ آیا۔

یقتلون۔ قتل کے معنی ۷۷ع میں بیان ہو چکے ہیں۔ روح المعانی میں آیت ۸۷ میں فریقا تقتلون (انبیاء کے ایک گروہ کو تم قتل کرتے ہو) کی تفسیر میں

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾ وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّ اذۡکُرُوۡا

جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابی، جو کوئی بھی اللہ اور پیچھے آنے والے دن پر ایمان لاتا ہے اور اچھے کام کرتا ہے تو ان کے لیے ان کا بدلہ اپنے رب کے ہاں ہے اور ان کو کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ع۹۲

اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تمھارے اوپر پہاڑ بلند کیا، جو ہم نے تمھیں دیا ہے اسے زور سے پکڑ رکھو اور جو اس میں ہے

قتل کے معنی یوں کیے ہیں (المراد من القتل مباشرۃ الاسباب الموجبۃ لزوال الحیٰوۃ سواء ترتب علیہ اولا یعنی قتل سے مراد ان اسباب کا حصول ہے جن سے حیات زائل ہو سکتی ہے خواہ اس پر زوالِ حیات مرتب ہو یا نہ۔ قتل بمعنی اشراف علی القتل: اور یہ فی الواقع سچ ہے کہ ایک فعل کے اشراف پر عام طور پر وہ لفظ بول دیا جاتا ہے جو اصل فعل پر دلالت کرتا ہو خود قرآن شریف میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ جیسے فبلغن اجلھن آیت ۲۳۱ میں بلغ سے مراد واقعی پہنچ جانا نہیں بلکہ پہنچنے کے قریب ہو جانا ہے۔ پس یقتلون النبیین میں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ نبیوں کے قتل کے درپے ہوتے تھے اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ نبیوں کو قتل کر دیتے تھے۔

النبیین۔ نبی کی جمع ہے جو نبأ سے مشتق ہے جس کے معنی خبر ہیں یا وہ خبر جو اپنے اندر عظیم الشان فائدہ رکھتی ہو اور نبی فعیل بمعنی فاعل ہے مگر ہمزہ ترک کر دیا گیا اس لیے نبئ اللہ صحیح نہیں نبی اللہ ہے جیسا حدیث میں مذکور ہے اور بعض کے نزدیک نبی نُبُوَّۃ سے مشتق ہے جس کے معنی رفعت یعنی بلندی ہیں اور نبی کو اس کے مقام بلند کے لحاظ سے نبی کہا گیا (غ) اور نُبُوَّت سفارت ہے (یعنی پیغام رسانی) اللہ اور اس کی مخلوق میں سے ذوی العقول کے درمیان (غ) اور قاموس میں ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ کے متعلق خبر دینے والے کو کہتے ہیں جس کی مزید تشریح تاج العروس میں یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی توحید کی خبر دیتا ہے اور اس کو غیب کی باتیں بتاتا ہے اور اسے علم دیتا ہے کہ وہ اس کا نبی ہے۔ نبی کے لغوی معنی اور اصطلاح شریعت: پس لفظ نبی کے لغوی معنی صرف خبر دینے والے کے ہیں۔ مگر اصطلاح شرعی میں یہ لفظ صرف ان رفیع القدر انسانوں پر بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان سفارت کا کام انجام دیتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں کو انسانوں تک پہنچاتے اور ان کو ان پر چلنے کی راہ بتاتے ہیں۔ لغوی معنی کی رو سے ہر ایک خواب بین یا الہام پانے والے پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔

نبی کے لیے کتاب ضروری ہے: مگر چونکہ شریعت نے خاص اصطلاح قرار دی ہے پس جو شخص سفارت کے کام پر مبعوث نہ ہو گو وہ کتنے بھی الہام پائے یا رؤیا دیکھے وہ نبی نہیں کہلا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حالانکہ نبی کریم صلعم کثرت سے سچے خواب دیکھتے تھے مگر جب تک اقرأ کا حکم نہیں پہنچا اس وقت تک اپنے آپ کو نبی نہیں سمجھا اور وہ احکام الٰہی جو نبی پہنچانے کے لیے مامور ہوتا ہے وہی اس کی کتاب ہے اس لیے آیت ۲۱۳ میں فرمایا کہ نبی کو جو خدا مبعوث کرتا ہے تو وہ بشارت بھی دیتا ہے اور ڈراتا بھی ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کتاب بھی نازل کرتا ہے وانزل معھم الکتاب تاکہ اس کتاب کے ساتھ وہ ان کے اختلافوں کا فیصلہ کرے پس نبی بغیر کتاب نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت کے بعد نبی نہیں: اور چونکہ قرآن کے بعد کسی کتاب کی ضرورت نہیں اس لیے آنحضرت ؐ کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں۔

بنی اسرائیل کی ذلت و مسکنت: یہاں جو نقشہ ذلت اور مسکنت کے بنی اسرائیل کے لازم حال ہونے کا کھینچا ہے اس کا تعلق پہلے مضمون سے صرف اسی قدر ہے کہ ان کی کجروی کا آخری نتیجہ یہ ہوا ورنہ یہ مراد نہیں کہ حضرت موسیٰ ؑ کے وقت میں ہی ایسا ہو گیا تھا۔ بلکہ یہ ایک زمانہ دراز کے بعد کا آخری نقشہ ہے اور اس کی وجہ بھی پیچھے نہیں بلکہ اگلے الفاظ میں بیان کی ہے اس لیے کہ انہوں نے آیات اللہ کا انکار کیا اور نبیوں کو ناحق مارتے تھے۔ خدا کی نافرمانی ہی نہیں کی بلکہ نافرمانی میں حد سے بڑھ گئے۔

قتل انبیاء سے مراد قتل کی کوشش یا ابطال دعوت بھی ہو سکتی ہے: نبیوں کے قتل سے کیا مراد ہے، بائبل کے بعض حوالجات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فی الواقع بھی بعض نبیوں کو قتل کیا۔ مگر قتل کے معنی ابطال دعوت بھی آتے ہیں یعنی اس کی دعوت کو باطل کر دینا۔ چنانچہ اس روایت کے اذا ابویع خلیفتین فاقتلوا الاٰخر منھما کی تشریح میں ابن اثیر لکھتے ہیں ای ابطلوا دعوتہ واجعلوہ کمن مات یعنی اس کی دعوت کو باطل کر دو اور اسے ایسا سمجھ لو جیسے کہ وہ شخص جو مر چکا۔ ایسا ہی قتل کا لفظ زبان عربی میں ان اسباب کے جمع ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے جن سے موت واقع ہو سکتی ہے خواہ واقع ہو یا نہ ہو۔ پس ان دونوں معنی کے لحاظ سے بھی الفاظ قرآنی کی تفسیر ہو سکتی ہے یعنی انبیاء کی دعوت کو باطل کرنا یا ان کو قتل کرنے کی کوشش کرنا۔ روح المعانی میں ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کی حالت ایسی ہے کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو قتل ہی کر دیں زیادہ وضاحت کے لیے دیکھو ع۲۴۳ و ع۹۱۔

ع۹۲ هادوا۔ هَوْد کے اصل معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنا ہیں (غ) اور انا ھدنا الیک (الاعراف: ۱۵۶) میں ھدنا کے معنی تبنا ہیں یعنی ہم نے توبہ کی۔ اور ھاد فلان کے معنی ہیں فلاں شخص نے دین میں یہود کا طریقہ اختیار کیا۔

النصاریٰ۔ نصرانی کی جمع ہے اور یہ نام حضرت عیسیٰ ؑ کے گاؤں ناصرہ سے مشتق ہے۔ بعض نے اس کو عربی مادہ نصر سے ملانے کی کوشش کی ہے مگر یہ تاویل بعید ہے۔

مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ — اس کو یاد رکھو تاکہ تم متقی بنو ۹۳

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ — پھر اس کے بعد تم پھر گئے سو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت

عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ — نہ ہوتی تو تم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔

الصابئین۔ صابی کی جمع ہے جو صباء سے ہے جس کے معنی ہیں ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں چلا گیا (ت) اور اس کے اصل معنی ہیں ظاہر ہوا (غ) اسی وجہ سے کفار آنحضرت ؐ کو صابی کہتے تھے۔ صابی کون لوگ ہیں اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں بعض کے نزدیک وہ ملائکہ کی عبادت کرتے تھے، بعض کے نزدیک ستاروں کی، بعض کہتے ہیں وہ دین نوحؑ پر تھے بعض کہتے ہیں یہود و نصاریٰ کے بین بین ایک فرقہ تھا۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا میں ہے کہ یہ ایک نیم عیسائی فرقہ تھا جو یوحنا بپتسمہ دینے والے کے مریدوں سے بہت ملتا جلتا تھا۔ یہ رائے آخری خیال کے ساتھ ملتی ہے اور یہود و نصاریٰ کے ذکر کے ساتھ قرین قیاس ہے۔

ایمان باللہ والیوم الآخر: ایمان باللہ والیوم الآخر کو قرآن کریم نے مسلمان ہونے کے مرادف رکھا ہے دیکھو نوٹ ۲۰ سورہ مجادلہ کے آخر میں یہ ذکر کرتے ہوئے کہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والی قوم اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت نہیں رکھ سکتی فرمایا اولٰئک کتب فی قلوبہم الایمان وایدھم بروح منہ یعنی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح کے ساتھ ان کی تائید کرتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ کامل مومنین کی جماعت ہے۔ پھر ان کے متعلق فرمایا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ یہ بھی کامل مومنین کے لیے ہی ہے۔

وسعت دائرہ اسلام: پچھلے رکوع کے خاتمہ پر یہ بتایا تھا کہ نافرمانیوں کی وجہ سے ذلت اور مسکینی یہود کے اوپر لازم کردی گئی۔ اور وہ اللہ تعالےٰ کے غضب کے نیچے آگئے۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ رحمت الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کسی قوم پر بند نہیں ہوتا۔ اعمال کی سزا ہوتی ہے اور یہود اب بھی نجات حاصل کر سکتے ہیں اور قوموں میں ممتاز ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اسلام لائیں۔ اصل غرض تو یہودیوں کو رحمت کی راہ بتانے کی ہے مگر اس کو عام اصول کے رنگ میں بیان کیا۔ اس لیے کہ یہود سمجھتے تھے کہ قوم یہود ہی کو نجات مل سکتی ہے اور دنیا کی دوسری قومیں سب کی سب محروم کی گئی ہیں پس یہاں یہ اصول بیان کردیا کہ کوئی قوم بحیثیت قوم نہ نجات کی ٹھیکیدار ہے نہ نجات سے محروم ہے۔ اسلام کا دائرہ وسیع ہے ہر ایک قوم اس میں داخل ہو سکتی ہے ایمان اور اعمال صالحہ شرط ہیں الذین اٰمنوا سے مراد منہ سے دعوئ ایمان کرنے والے ہیں اور ان کو یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ رکھ کر یہ بتا دیا کہ نرے دعوئ ایمان سے چنداں فائدہ نہیں۔

کامل نجات صرف اسلام میں ہے: اسلام اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ دوسرے مذاہب میں بھی صداقت ہے۔ ہاں اس صداقت میں باطل کی آمیزش ہو گئی ہے مگر وہ صداقت اپنے کمال میں صرف اسلام میں پائی جاتی ہے اس لیے لاخوف علیہم ولاھم یحزنون کی حالت جو اس دنیا میں ہی انسان کو بہشتی بنا دیتی ہے اور اللہ تعالےٰ کا کامل قرب عطا فرماتی ہے صرف اسلام سے ہی مخصوص ہے۔ ان الفاظ سے یہ مطلب نکالنا کہ عیسائی رہ کر اور تثلیث اور کفارہ پر ایمان رکھ کر بھی انسان نجات پا سکتا ہے قرآن کریم کی تمام تعلیم کے خلاف ہے ان الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران ۳-۱۹) ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ (آل عمران ۳-۸۵) اور بیسیوں آیات نجات کامل کے لیے آنحضرت صلعم پر ایمان کو ضروری ٹھہراتی ہیں۔ بدوں وساطت خاتم النبیین اب کوئی شخص خدا کے قرب کو حاصل نہیں کر سکتا۔ گو ایک حد تک گناہ سے پاک ہو جاتا ہو اور اگر یہ کہا جائے کہ ایمان باللہ سے مراد توحید الٰہی پر ایمان لانا ہے تو اول تو یہ یہاں لکھا نہیں کسی دوسری جگہ سے یہ قید نکالی جائے گی۔ دوسری جگہ سے ہی قید لگانا ہے تو پھر وہی قید کیوں نہ لگائیں جو خود قرآن شریف نے لگائی ہے۔ کہ ایمان باللہ والیوم الآخر سے مراد مسلمان ہونا ہے اور دوسرے پھر بھی نرے اعمال صالحہ تو کافی نہ ہوئے۔ کروڑہا کی تعداد میں وہ لوگ ہیں جو یا تین خدا مانتے ہیں یا بت پرستی کے ساتھ خدا مانتے ہیں یا بدھ مذہب کے پیروؤں کی طرح خدا کے منکر ہیں یا دہریہ ہیں پس ایمان باللہ سے مراد صرف توحید الٰہی لینے سے حاصل بھی کچھ نہ ہوا اور قرآن کریم کے دوسرے مقامات کی بھی مخالفت لازم آئی جہاں سچا دین اور خدا تعالیٰ تک پہنچنے کی حقیقی راہ صرف اسلام کو قرار دیا ہے۔

ع۹۳ اخذنا میثاقکم۔ اخذ میثاق یا عہد لینے سے مراد بذریعہ نبی کے بعض احکام کا دیا جانا ہے۔ نبی پر ایمان لانا یہ اقرار کرنا ہے کہ ہم اس کے احکام کی تعمیل کریں گے۔

رفعنا۔ رفع کا استعمال امام راغب نے چار طرح پر بیان کیا ہے (۱) اجسام کے متعلق جب ان کو اپنی جگہ سے اوپر اٹھایا جائے (۲) عمارت کے متعلق جب اسے اونچا کیا جائے جیسے واذ یرفع ابراھیم القواعد (۱۲۷) (۳) ذکر کے متعلق جب اسے شہرت دی جائے (۴) مرتبہ کے متعلق جب اسے شرف دیا جائے رفعنا فوقکم الطور کے معنی یہ نہیں کہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے اٹھا کر اونچا کیا۔ بلکہ یہ کہ تم نیچے تھے اور پہاڑ تمہارے اوپر اٹھا ہوا تھا۔ بخاری کتاب المناقب میں آتا ہے فرفعت لنا صخرۃ جس کے معنی بحار الانوار میں کیے گئے ہیں ظہرت الابصارنا یعنی ہماری آنکھوں کے سامنے چٹان ظاہر ہوئی حالانکہ عام معنی کی رو سے یوں کہنا چاہیئے تھا کہ ہمارے لیے صخرہ اونچا کیا گیا۔ مگر فی الحقیقت صخرہ اونچا نہیں ہوا بلکہ اس کی اونچائی آنکھوں کے سامنے آگئی۔

طور۔ پہاڑ کو کہتے ہیں (ت) ایک خاص پہاڑ کا نام بھی ہے۔

طور پہاڑ اٹھانے سے مراد: اس آیت کے یہ معنی کرنا کہ بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ کو لا کر معلق کردیا گیا تھا کہ اگر تم ان احکام کو نہ مانو گے تو ابھی پہاڑ تمہارے سروں پر آپڑے گا۔ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے لا اکراہ فی الدین جب انسان کو حکم ہے کہ دین میں جبر نہ کرے تو خود خدا کا جبر کرنا کیا معنی، علاوہ ازیں اس جبر کا تو یہی جواب بنی اسرائیل کی طرف سے کافی ہے کہ ہم نے اقرار کوئی نہیں کیا۔ ڈرا کر اقرار لیا گیا۔ ایسا اقرار تو کسی عدالت میں بھی تسلیم نہیں ہو سکتا بلکہ صرف ان کو یاد دلایا ہے کہ

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ
فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۚ ﴿٦٥﴾
فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا
وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾
وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ
تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾

اور بیشک تم ان کو جانتے ہو جو تم میں سے سبت کے معاملہ میں حد
سے نکل گئے، پس ہم نے ان سے کہا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ[ع۹۴]
پس ہم نے اُسے عبرت بنایا اُن کے لیے جو اُن کے سامنے تھے اور
جو اُن کے بعد میں آنے والے ہیں اور متقیوں کے لیے نصیحت[ع۹۵]
اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ
گائے ذبح کرو، انھوں نے کہا کیا آپ ہم سے ہنسی کرتے ہیں،
(موسیٰؑ نے) کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں[ع۹۶]

جب حضرت موسیٰ پر احکام نازل ہوئے تو اس وقت بنی اسرائیل کے بزرگ پہاڑ کے نیچے موجود تھے اس لیے حکم ہوتا ہے کہ اس کو مضبوطی سے پکڑ رکھو یعنی اس پر عمل کرو۔ توریت میں یہ الفاظ ہیں "اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملادے اور وَے پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے" (خروج ۱۹: ۱۷) اور ان کو حکم تھا کہ نیچے ہی رہیں اور حضرت موسیٰ کے ساتھ اوپر نہ آئیں (خروج ۱۹: ۲۴)

ع۹۴ اعتدوا۔ عدا سے ہے اور عَدْو کے معنی تجاوز یعنی حد سے نکل جانا ہیں۔ اور اعتداء حق سے تجاوز کا نام ہے۔

سبت کے اصل معنی کاٹنا ہیں (غ) اور اصطلاح میں ایک خاص دن تھا۔ یہودیوں کو ہفتہ میں ایک دن یعنی شنبہ کو کاروبار بند رکھنے کا حکم تھا اس لیے وہ دن کاروبار کے قطع ہونے کی وجہ سے سبت کہلایا۔ اعتداء فی السبت سے مراد سبت کے حکم کو توڑنا ہے۔ ہفتہ میں ایک دن ان کی عبادت کے لیے مقرر تھا۔ جب اس دن بھی خدا کی طرف دھیان نہ لگایا اور اپنی دنیا میں ہی مبتلا رہے تو اخلاق فاضلہ سے آہستہ آہستہ عاری ہوتے چلے گئے۔

قردة ۔ قِرْد کی جمع ہے بندر۔

خاسئین۔ خساء سے ہے جس کے معنی ذلیل ہو کر پیچھے ہٹ جانا ہیں (غ)، دوزخیوں کے متعلق آتا ہے قال اخسئوا فیھا (المومنون ۲۳-۱۰۸) اور سورہ ملک میں ہے ینقلب الیک البصر خاسئا (الملک ۶۷-۴) جہاں متحیراً معنی لیے گئے ہیں۔

بنی اسرائیل کا بندر بننا: کونوا قردة خاسئین۔ امام مجاہد سے اس کی تفسیر یوں مروی ہے قال مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردة یعنی ان کے دل مسخ ہو گئے تھے اور صورتیں مسخ ہو کر بندر نہیں بنیں۔ مفردات میں بھی منقول ہے قیل بل جعل اخلاقھم کاخلاقھا یعنی ان کے اخلاق بندروں کے سے ہو گئے۔ اس تفسیر کی تائید قرآن کریم کے دیگر مقامات سے ہوتی ہے۔ النساء ۴-۴۷ میں ہے او نلعنھم کما لعنا اصحاب السبت یعنی ہم ان پر لعنت کریں جیسا سبت والوں پر لعنت کی۔ اب رسول اللہ صلعم کے دشمنوں پر جو لعنت واقع ہوئی وہی لعنت اصحاب سبت پر ہوئی۔ لیکن اوّل الذکر بندر نہیں بنائے گئے بلکہ ذلیل کیے گئے۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا جعل منھم القردة والخنازیر وعبد الطاغوت اولئك شر مکانا واضل عن سواء السبیل (المائدہ ۵-۶۰) یعنی ان میں سے بندر اور سؤر بنائے اور وہ جس نے شیطان کی پرستش کی یہ لوگ بہت بُری حالت میں ہیں اور سیدھے رستہ سے بہت دُور بھٹکے ہوئے۔ اب جو لوگ بندر اور سؤر بنے انہی کے متعلق فرمایا کہ ان کی حالت بہت خراب ہے اور وہ سیدھی راہ سے دُور چلے گئے۔ یہ انسان کو ملزم کرنے کا طریق ہے نہ حیوان کو۔ اور قرآن کریم ایسے محاورات سے بھرا پڑا ہے کسی کو گدھے سے مثال دی ہے کمثل الحمار، کسی کو کتّے سے کمثل الکلب۔ بندر ایک نقّال جانور ہے یعنی انسان کے فعل کی نقل کرتا ہے مگر اس کے نیچے حقیقت نہیں ہوتی پس ان کو بندر کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ محض نقالی کے طور پر رسوم ادا کرتے ہیں اور ان کے افعال حقیقت سے خالی ہیں۔ یا ذلّت کے لحاظ سے اُن کو بندر کہا ہے اور اس کی طرف خاسئین میں اشارہ ہے۔ عربی زبان میں بندر کی مثال زنا کی کثرت کے لیے دی جاتی ہے ازنی من قرد۔ اور یہودیوں میں اس بدی کی کثرت پر بائبل گواہ ہے "تیرے بیچ وے ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں تیرے بیچ باپ کو بھی انہوں نے بے ستر کیا... کسی نے دوسرے کی جورو سے بُرا کام کیا ہے اور دوسرے نے اپنی بہو سے بد ذاتی کی ہے اور کسی نے اپنی بہن اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے درمیان خراب کیا ہے" (حزقیل ۲۲: ۹-۱۱) ان تمام باتوں کے لحاظ سے یہ لوگ بندر بن گئے۔

ع۹۵ نکال عبرتناک سزا کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ نکل کے معنی قید کرنے کے ہیں (غ) اور نکال سے مراد وہ سزا ہے جو دوسرے کو ایسا کام کرنے سے روک دے (غ) ما بین یدیھا سے مراد اس زمانہ کے لوگ اور ما خلفھا سے پیچھے آنے والی نسلیں ہیں۔

موعظة ۔ وعظ ایسا روکنا ہے جس کے ساتھ تخویف ہو یعنی بُرے کام سے اس کا بد انجام بتا کر روکنا یا وہ اچھی باتوں کا یاد دلانا ہے جس سے قلب میں رقت پیدا ہو (غ) موعظة اسی سے اسم ہے۔

ع۹۶ بقرة ۔ اس کی جمع بقر ہے اور بقرة گائے کو اور ثور بیل کو کہتے ہیں اور بقر کے معنی شَقّ یعنی پھاڑنا آتے ہیں۔ اس لیے باقر خطاب ہے اس معنی کے لحاظ سے کہ وہ علوم کے دقائق کے پھاڑنے میں وسعت رکھتا ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ
إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ
عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ
إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا
تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ
تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾
قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ
الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ
فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا
ع وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

انھوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ وہ کیسی ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جو نہ بوڑھی ہے نہ بچہ، جوان ہے انکے بین بین، پس کرو جو کچھ تمھیں حکم دیا جاتا ہے ۹۶ الف
انھوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ اس کا رنگ کیا ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک زرد گائے ہے اس کا رنگ گہرا زرد ہے دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے ۹۶ ب
انھوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں کھولکر بتائے کہ وہ کیسی ہے کیونکہ ہمارے لیے گائیں ایک سی ہیں اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور پتہ لگا لیں گے۔
کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جو کام میں نہیں لگائی گئی کہ زمین کو پھاڑتی ہو اور نہ کھیت کو پانی دیتی ہے صحیح وسالم ہے اس میں کوئی داغ نہیں، انھوں نے کہا اب آپ نے ٹھیک (پتہ) بتایا ہے، سو انھوں نے اُسے ذبح کیا اور وہ کرنا نہ چاہتے تھے ۹۷

ھزؤا - ایسی مزاح کو کہتے ہیں جو خفیہ طور پر کی جائے۔

جاھلین - امام راغب نے جہل کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ اوّل نفس کا علم سے خالی ہونا یعنی ایک چیز کا علم نہ ہونا یحسبھم الجاھل اغنیاء (۲۷۳) میں جاھل سے مراد وہ شخص ہے جو حالات سے ناواقف ہے۔ دوسرے ایک چیز پر خلاف اس کے اعتقاد رکھنا جس حالت میں وہ ہو۔ تیسرے ایک کام کرنا خلاف اس کے جو اس کا حق ہے کہ اس طرح کیا جائے۔ یہاں یہی تیسرے معنی مراد ہیں۔

گائے ذبح کرنے کا حکم: گائے کی پرستش ایک خاص قسم کا شرک تھا جو بنی اسرائیل میں سرایت کر گیا تھا۔ اس کا علاج ضروری تھا۔ موسوی شریعت میں اس قسم کی گائیوں کی قربانی کرنے کا حکم خاص خاص موقعوں پر تھا جو ہل میں نہ لگائی جاتی تھیں۔ دیکھو استثناء ۲۱: ۱-۹ "ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو اور جوئے تلے نہ آئی ہو" اس قسم کی گائے کو قتل کا پتہ لگانے کے لیے ذبح کرنے کا حکم ہے۔ اور گنتی ۱۹: ۱-۱۹ میں ایک لال گائے کے ذبح کرنے کا حکم ہے "جو بے داغ اور بے عیب ہو اور جس پر کبھی جُوا نہ رکھا گیا ہو" یہ عام احکام بتاتے ہیں کہ گائے کی پرستش کے شرک کو دور کرنا بھی ان کا مقصود تھا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں آیا انہی عام احکام کی طرف اشارہ ہے یا یہ کسی خاص واقعہ کا ذکر ہے؟ میں دوسری توجیہہ کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ آیت کے آخری الفاظ بتاتے ہیں کہ ایک خاص گائے کے ذبح کرنے کا حکم تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں کسی خاص خوبصورت گائے کی عظمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بچھڑے کی پرستش کی طرح اس کی پرستش کا خطرہ ہو گیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا۔

۹۶ الف ماھی - سوال اس کی حالت اور صفت سے ہے یعنی وہ کیسی ہے۔

فارض - فرض سے ہے جس کے معنی سخت چیز کا کاٹنا ہیں اور احکام میں وہ حکم فرض ہے جس کے متعلق حکم قطع ہو چکا اور فارض اس بوڑھی گائے کو کہتے ہیں جس کی ولادت بوجہ بڑھاپے کے منقطع ہو چکی ہو (غ)

بکر - بُکرۃ - اول النھار یعنی دن کے پہلے حصّہ کو کہتے ہیں اور پہلے بچہ کو بکر کہتے ہیں اور یہاں بکر سے مراد وہ ہے جس نے ابھی بچہ نہیں جنا (غ)

عوان - عون کے معنی مدد ہیں اور عوان حیوانات میں اس کو کہتے ہیں جو اپنی عمر کے نصف حصّہ کو پہنچ چکا ہو۔ نہ بہت چھوٹا نہ بہت بڑا (ت)

۹۶ ب فاقع - گہرے زرد رنگ کو اصفر فاقع یا صفراء فاقع کہتے ہیں۔ گویا زردی کی گہرائی پر یہ لفظ دلالت کرتا ہے۔ ایسا ہی گہرے سیاہ کو اسود حالک کہتے ہیں۔ گہرے سُرخ کو احمر قان گہرے سفید رنگ کو ابیض ناصع گہرے سبز کو اخضر ناضر۔

۹۷ ذلول - ذُل یعنی مقہور ہونے سے ہے اور اس جانور کو کہتے ہیں جو کام میں لگایا گیا ہو اور اس کی سختی توڑ دی گئی ہو۔ یعنی اسے ماتحت کر لیا گیا ہو۔

تثیر - ثار غبار یا بادل کے پھیل جانے پر بولا جاتا ہے اور اثار کے معنی ہیں اس میں ہیجان پیدا کیا واثاروا الارض (الروم ۔۹) اور اثارۃ زراعت کے لیے زمین کے اوپر نیچے کرنے کو کہتے ہیں (غ)

وَ اِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِیۡهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخۡرِجٌ مَّا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۷۲﴾

اور جب تم نے ایک شخص کو (اپنی طرف سے) قتل کر دیا، پھر آپس میں اختلاف کیا اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا، جو تم چھپاتے تھے۔

فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحۡىِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى ۙ وَ يُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۳﴾

پس ہم نے کہا کہ اس کو اسکے بعض سے مارو، اس طرح اللہ مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمھیں اپنے نشان دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۹۵

شیة - اس کا اصل وِشیة ہے اور وشی کے معنی ہیں ایک چیز پر ایسا داغ کرنا جو اس کے کھلے رنگ کا مخالف ہو۔

کادوا - کاد - افعال مقاربہ سے ہے۔ ایک قول کے رو سے اس کی نفی اثبات ہوتی ہے اور اس کا اثبات نفی گویا کاد یفعل کے معنی ہیں گو کرنے کے قریب تھا مگر کیا نہیں اور ما کاد یفعل کے معنی ہیں گو قریب تھا کہ نہ کیا ہوتا مگر کر لیا (غ) مگر کاد کے معنی بعض وقت اراد بھی آتے ہیں یعنی اس نے ارادہ کیا۔ اور اس کی مثال دی ہے کذالك کدنا لیوسف (یوسف ۱۲-۷۶) اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے ارادہ کیا۔ یا فرمایا اکاد اخفیھا (طٰہٰ ۲۰-۱۵) جس کے معنی ہیں میں ارادہ کرتا ہوں کہ اسے ظاہر کر دوں اور اشعار عرب میں ہے کادت وکدت وتلك خیر ارادۃ۔ جہاں کادت کے معنی ہیں اس نے ارادہ کیا اور کدت کے معنی ہیں میں نے ارادہ کیا (ت)۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص گائے تھی اور چونکہ قوم کے دل میں اس کی محبت اور عظمت تھی، اس لیے ذبح نہ کرنا چاہتے تھے بار بار کی ہیرا پھیری کا مطلب بھی یہی تھا کہ کسی طرح یہ حکم ٹل جائے۔ بعض مفسرین نے لکھ دیا ہے کہ یہ کوئی معمولی گائے نہ تھی بلکہ آسمان سے اُتری تھی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وانزل لکم من الانعام ثمنیة ازواج (الزمر ۳۹-۶) سب چار پائے خدا نے ہی اتارے ہیں سو جس طرح دوسرے چار پائے اُترے اسی طرح یہ گائے اُتری یعنی اسی زمین پر پیدا ہوئی۔

ع ۹۸ قتلتم - جیسا کہ یقتلون النبیین کی تفسیر میں مانا گیا ہے۔ قتلتم کے معنی یا تو یہاں یہ ہیں کہ تم نے ان تمام اسباب کو جمع کر دیا جو زندگی کے منقطع کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں اور یا یہ کہ تم نے اپنی طرف سے قتل کر دیا گو کوئی اور مانع ہو گیا ہو دیکھو ع ۹۱

ادّٰرءتم - درء سے ہے تفاعلتم کے وزن پر۔ پس اس کا اصل تدارأتم ہے (ج)، اور درء کے معنی نشوز یعنی جھگڑا کرنا اور اختلاف ہیں (ت) خلع کی حدیث میں ہے اذا کان الدرء من قبلھا جہاں درء کے معنی خلاف اور نشوز ہیں اس لیے ادّٰرأتم کے معنی اختلفتم وتنازعتم کیے گئے ہیں یعنی تم نے اختلاف کیا اور جھگڑا کیا (ج - د) اور درء کے معنی دفع بھی آتے ہیں جس کی مثال دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے ویدرؤا عنھا العذاب (النور ۲۴-۸) فادرءوا عن انفسکم الموت (آل عمران ۳-۱۶۷) (غ)

گائے کے ذبح کے مقابل پر ایک اور واقعہ: استثناء ۲۱ : ۱-۹ میں جو عام حکم ہے کہ جب مقتول کا پتہ نہ لگے تو ایک ایسی بچھیا لیکر جو جوئے تلے نہ آئی ہو، اسے ذبح کیا جائے اور اس پر ہاتھ دھوئے جائیں ممکن ہے کہ ان آیات میں اس کی طرف اشارہ ہو۔ مگر بظاہر جس طرح سارے واقعات جن کا ذکر پچھلے رکوعوں میں واذ کے ساتھ شروع ہوتا ہے الگ الگ واقعات ہیں۔ اسی طرح یہ بھی الگ واقعہ ہے۔ اس کا تعلق گائے کے ذبح کے واقعہ سے کچھ نہیں، بلکہ اس کے مقابلہ پر ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے اور قرآن کریم میں اضراد کا ذکر بہت آتا ہے اس لیے جب پہلے رکوع کو اس آیت پر ختم کیا کہ ایک گائے کے ذبح کرنے میں تم نے کس قدر پس وپیش سے کام لیا تو اب یہ بتاتا ہے کہ اس کے مقابل پر تم اس حالت پر غور کرو جب تم نے ایک عظیم الشان انسان کو قتل کر دیا۔

قتلتم نفسا میں کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے: مفسرین کہتے ہیں ایک بھتیجے نے چچا کو قتل کر دیا تھا تاکہ اس کی بیٹی سے شادی کر کے اس کی جائداد کا وارث ہو۔ مگر اس قسم کے قتل کے واقعات تو قوموں میں ہر روز ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا ہو تو قرآن کریم کو اس کے ذکر کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ قرائن سے یہ شہادت ملتی ہے کہ ان الفاظ میں کسی نبی کے قتل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اوّل تو جو دو جرم ان کے بیان کیے تھے ایک کفر آیات اللہ اور دوسرا قتل انبیاء ان میں سے اوّل کی مثالیں کئی ایک بیان کر دیں، مگر دوسرے کی مثال کوئی بیان نہ کی تھی۔ دوسرے نفسا میں تنکیر عظمت کے لیے ہے۔ کسی عظیم الشان انسان کا ذکر ہو سکتا ہے۔ تیسرے تمام قوم ایک معمولی انسان کے قتل پر ملزم نہیں ہو سکتی۔ ہاں انبیاء کے قتل پر کل قوم کو ملزم کیا جاتا ہے اگر بھتیجے نے چچا کو قتل کر دیا تھا تو قوم پر الزام بے معنی ہے لیکن اگر کوئی نبی قتل ہو تو قوم پر الزام درست ہے کیونکہ خود قرآن کریم نے قوموں کو انبیاء کے قتل کے لیے ملزم کیا ہے۔ پس یہ قرائن بتاتے ہیں کہ کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے۔

یہ نبی حضرت مسیح ہیں: اب اس کے متعلق چند اور باتیں قابل توجہ ہیں۔ اوّل یہ کہ اپنی طرف سے قتل کر دینے کے بعد پھر ان لوگوں میں اختلاف ہوا ہے جیسا فادّٰرءتم فیھا سے ظاہر ہے۔ دوسرے وہ قتل میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ فرمایا کہ جو کچھ تم چھپانا چاہتے تھے اللہ نے اسے ظاہر کرنا تھا۔ اب ایسا قتل یا قتل کی کوشش جس میں اختلاف ہوا ہو اور بظاہر قتل بھی کسی نبی کا ہو حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھانے کا واقعہ ہے اور کوئی واقعہ اس قسم کا تاریخ بنی اسرائیل میں نہیں پایا جاتا۔

مسیح کے قتل کی کوشش: قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف فرمایا وقولھم انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم یعنی وہ تو یہی کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا۔ مگر فرمایا وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبه لھم انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر مارا بلکہ ان کے لیے وہ مشابہ بالمقتول کر دیا گیا اور پھر فرمایا وان الذین اختلفوا فیه لفی شك منه (النساء ۴-۱۵۷) جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا وہ اس کے متعلق شک میں ہیں۔ پس ایک طرف قرائن صفائی سے بتاتے ہیں کہ ان الفاظ میں کسی نبی کے قتل کا ذکر ہے تو دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسا نبی جس کے قتل میں اختلاف ہوا ہو اور کامیابی نہ ہوئی ہو وہ مسیح علیہ السلام ہیں۔ گویا قوم یہود کی بے اعتدالیوں کا نقشہ کھینچا ہے کہ ایک طرف تو گائے تک کو ذبح کرنے میں اس قدر لیت ولعل کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک عظیم الشان نبی

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ
كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ
لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ
فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ
خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۷۴
اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ
مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

پھر تمہارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے، سو وہ پتھروں کی طرح ہیں
بلکہ سختی میں اس سے بھی بڑھ کر اور یقیناً پتھروں میں ایسے بھی ہیں جن سے
نہریں بہتی ہیں اور بیشک اُن میں ایسے بھی ہیں جو پھٹتے ہیں تو اُن میں
سے پانی نکلتا ہے اور بیشک اُن میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے خوف
سے گر جاتے ہیں اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔ ۹۹
پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور اُن میں
ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے کلام کو سنتے، پھر اس میں تحریف
کرتے بعد اس کے کہ اُسے سمجھ لیا اور وہ جانتے ہیں ۱۰۰

کو قتل کرنے میں اس قدر دلیری ہے۔ حضرت مسیح کی طرف اشارہ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فوراً بعد فرمایا ثم قست قلوبکم من بعد ذٰلک پھر تمہارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے اور قرآن شریف سے ہی ثابت ہے فطال علیہم الامد فقست قلوبہم (الحدید ۵۷-۱۶) یعنی ایک لمبا زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے تھے۔ پس یہ کوئی ایسا قتل ہے جو حضرت موسیٰ سے لمبا زمانہ گزرنے کے بعد وقوع میں آیا۔

قرآن کریم آپ اپنی تفسیر کرتا ہے: قرآن کریم بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے۔ ان واقعات کا جو ذکر یہاں ہے وہی ذکر سورۃ النساء میں بھی ہے دیکھو آیت ۱۵۳۔ جہاں خدا کو دیکھنے کی درخواست ہے۔ پھر بچھڑا بنانے کا ذکر ہے۔ اور آیت ۱۵۴ جہاں میثاق کا ذکر ہے اور شہر میں فرمانبرداری سے داخل ہونے کا حکم ہے اور سبت کے معاملہ میں زیادتی سے روکا ہے۔ اور آیت ۱۵۵ جہاں نقض میثاق اور قتل انبیا کا ذکر ہے۔ یہ سب کچھ اس کے مطابق ہے جو یہاں سورۃ البقرہ میں بیان ہوا۔ اس قدر فرق ہے کہ یہاں تفصیل ہے سورۃ النساء میں انہی واقعات کا ذکر اختصار سے ہے اور پھر آیت ۱۵۷ میں حضرت مسیح کے قتل کی کوشش اور اس میں ناکامی اور اختلاف کا ذکر ہے گویا جو کچھ یہاں سورہ بقرہ میں اشارۃً بیان فرمایا اس کو سورۃ النساء میں کھول کر بیان کر دیا۔ یہ کمال قرآن پاک کا ہے کہ یہ دو سورتیں کئی سال کے فرق پر نازل ہوتی ہیں لیکن ایک میں جو اختصار ہے اس کی دوسری میں تشریح کر دی ہے اور جس کو پہلے تفصیل سے بیان کر دیا تھا اس کا دوسرے موقعہ پر اختصاراً ذکر کر دیا۔ یہ مقابلہ بھی اس بات کا موید ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی کوشش کی طرف ہی اشارہ ہے۔

فقلنا اضربوہ ببعضہا سے کیا مراد ہے اضربوہ میں ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے۔ کیونکہ بعض وقت نفس کی ضمیر بلحاظ معنی مذکر آجاتی ہے اور ببعضہا کی ضمیر فعل قتل کی طرف جاتی ہے۔ یعنی بعض قتل سے اس کو مار دو یا فعل قتل اس پر پورا وارد نہ ہونے دو۔ چنانچہ ضمیر کا قتل کی طرف جانا جو مصدر فعل سے مفہوم ہے بحر المحیط میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ حضرت مسیح اور واقعات صلیب: اور یہی سچ ہے کہ حضرت مسیح پر پورا فعل قتل وارد نہیں ہوا صلیب پر آپ صرف تین گھنٹے رہے اور اتنی تھوڑی دیر میں کوئی شخص صلیب کی موت سے مر نہیں سکتا۔ آپ کے ساتھ جو چور صلیب دئے گئے تھے ان کی ہڈیاں توڑی گئیں آپ کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں یہی فاضربوہ ببعضہا ہے اور کذٰلک یحی اللہ الموتٰی کہہ کر بتا دیا کہ جس کو تم مُردہ خیال کر بیٹھے تھے اُسے خدا نے یوں زندہ رکھا یا زندہ کر دیا۔ اور یہ جو فرمایا ہے یریکم اٰیاتہ لعلکم تعقلون تو بتایا کہ مسیح جو تم کو مُردہ معلوم ہوتا تھا جس طرح اسے خدا نے زندہ کر دیا۔ کیونکہ اللہ کے نام کو بلند کرنا اس کی زندگی کا مقصد تھا اسی طرح اگر تم بھی اعلائے کلمۃ اللہ کا کام اختیار کرو تو گو تم ایک مُردہ قوم ہو اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی عطا فرمائے گا۔

۹۹ قست۔ حجر قاس سخت پتھر کو کہتے ہیں اس لیے قسوۃ کے معنی دل کی سختی ہیں۔ اَوْ یہاں بمعنی بَلْ ہے۔

بنی اسرائیل کی قساوت قلبی: ان کی سخت دلی کو پہلے پتھروں سے مثال دی ہے لیکن با ایں اُمید دلائی ہے، مایوس نہیں ہونے دیتا۔ جب پتھروں میں سے بھی نہریں نکل آتی ہیں تو پتھر جیسے سخت دلوں میں سے علوم کی نہریں کیوں نہ نکلیں جو ایک عالم کو سیراب کر دیں اس سے نچلے درجہ پر وہ ہیں جن سے پھوٹ کر تھوڑا ہی پانی نکل آتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا نفع بہت وسیع نہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کا نفع اگر دوسروں تک نہ پہنچے تو اپنی ذات میں ہی فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے جلال کے سامنے جھک جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی حالت: بنی اسرائیل کی تاریخ تو سب اسلامی تاریخ کا نقشہ ہے۔ پس بنی اسرائیل سے بڑھ کر مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ باوجود قساوت قلبی کے بھی انہیں نا امید نہیں ہونا چاہئے۔ جیسا کہ فرمایا الم یان للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبہم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیہم الامد فقست قلوبہم (الحدید ۵۷-۱۶) کیا ان لوگوں کے لیے جو مومن ہیں وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے اور جو حق اُترا اس کے لیے جھک جائیں اور وہ ان لوگوں کی مثل نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی پھر ان پر لمبا زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ قساوت قلبی کے بعد علوم سے قوم ترقی کر سکتی ہے۔

۱۰۰ تطمعون۔ طمع نفس کا اشتیاق ہے کسی چیز کے لیے اس کو چاہتے ہوئے (رغ)، اور اس کا اکثر استعمال ذلیل خواہشات پر ہوتا ہے مگر اس کے معنی صرف رجا بھی ہیں یعنی کسی چیز کی امید رکھنا (ت)۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

اور جب اُن سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب ایک دوسرے کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں کہتے ہیں کیا تم اُن سے وہ کہدیتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولا ہے تاکہ وہ اسکے ساتھ

کلام اللہ ۔ کلام کلم سے ہے جس کے لیے دیکھو ع۵۷ اور کلام ان الفاظ کو کہتے ہیں جو ایک نظم میں ہوں مع اس معنی کے جو اُن کے نیچے ہوں (رغ) یعنی صرف لفظ بغیر معنی یا معنی بغیر لفظ پر کلام نہیں بولا جاتا پس کلامِ اللہ الفاظ مع معانی ہیں اور یہ عقیدہ کہ وہ صرف مفہوم ہے جو صاحب وحی کے قلب میں ڈالا جاتا ہے لفظ کلام کے معنی سے غلط ٹھہرتا ہے۔

یحرفون ۔ تحریف حرف سے ہے جس کے معنی کنارہ یا حد ہیں اور تحریف کے معنی التغیر والتبدیل ہیں (ت) یعنی تغیر و تبدل کرنا۔ تغیر و تبدل لفظی بھی ہو سکتا ہے اور معنوی بھی۔ مگر اوّل مراد لفظی ہی لی جائے گی اور یہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی کی تائید قرآن شریف کی اس آیت سے ہوتی ہے جو آگے آتی ہے یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ اپنے ہاتھوں سے کچھ لکھ کر کہہ دیتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تحریف لفظی ہے۔ پس یہاں تحریف لفظی ہی مراد ہے۔ بائبل میں تحریف لفظی: قرآن کریم کے اعجازوں میں سے ایک یہ اعجاز ہے کہ بائبل میں تحریف ہونے کا دعویٰ اس وقت کیا جب دنیا اس سے بے خبر تھی۔ اور آج تیرہ سو سال بعد خود عیسائی محققین کو یہ اعتراف ہے کہ بائبل میں تحریف ہوئی ہے۔ ایک اُمّی کو یہ علم تیرہ سو سال پیشتر کس نے دیا جب تحریف کا نام کوئی نہ جانتا تھا؟

اس بات کا جواب کہ تحریف شدہ کتاب کا نام توریت و انجیل کیوں رکھا: عیسائیوں کو قرآن کریم کے اس بیان پر کچھ اعتراض ہیں۔ اگر یہ کتابیں تحریف شدہ تھیں اصلی نہ تھیں، تو ان کا نام وہی کیوں رکھا۔ توریت اور انجیل ان کو کیوں کہا؟ یہ نہایت ہی لغو اعتراض ہے تحریف ہو جانے سے کتاب کا نام بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی دوسرا اعتراض ہے کہ ان پر عمل کے لیے کیوں بلاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ سے اوّل مطالبہ ہے کہ جو کچھ یہ تمھارے ہاتھ میں ہے جس کو تم خدا کا کلام سمجھتے ہو اسی پر عمل کرو ورنہ تمھارے سارے دعوے نرے لاف و گزاف ہیں جیسا کہ فرمایا قل یٰاھل الکتاب لستم علیٰ شیٔ حتیٰ تقیموا التوراۃ والانجیل (المائدہ ۵-۶۸) قرآن کریم کن معنوں میں مصدق ہے: تیسرا اعتراض ہے کہ قرآن کریم ان کا مصدق ہے تصدیق کے معنی اوپر بیان ہو چکے ہیں کہ ان کی پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کی سچائی کی شہادت دیتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اصول کا مصدق ہے۔ اگر ان کے سارے رطب و یابس کا مصدق ہوتا تو خود ان کے غلط خیالات کی تردید کیوں کرتا؟ پھر اعتراض ہے کہ ان کو ہدایت و نور کیوں کہا؟ اس لیے کہ باوجود تحریف کے ان میں ہدایت و نور ہے۔ خود پیشگوئیاں ہدایت و نور ہیں۔ اب جبکہ بائبل میں تحریف ایک مسلّم امر ہے۔ یہ اعتراض حضرت عیسٰیؑ پر آتا ہے کہ انہوں نے کیوں اس تحریف کو نہ سمجھا۔ وہ بات جو حضرت عیسٰیؑ کو خدا نے نہیں بتائی وہ رسول اللہ صلعم کو بتا دی ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ ایک مفسر بائبل کا اقرار تحریف لفظی: اب ہم خود ایک مفسر بائبل کا اقرار دکھاتے ہیں کہ بائبل میں تحریف لفظی ہوئی ہے۔ یہ مفسر پادری ڈملو صاحب ہیں جنہوں نے ایک جلد میں بائبل کی مکمل تفسیر انگریزی میں لکھی ہے وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ موسٰیؑ کی کتابیں حضرت موسٰیؑ کی اپنی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اصل تحریروں میں کمی بیشی کر کے یہ بنائی گئیں، لکھتے ہیں:۔

کتب خمسہ میں تحریف لفظی کی مثالیں: "مگر غور سے تحقیق کرنے پر ماننا پڑتا ہے کہ کتب خمسہ میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اس پرانے خیال سے کہ موجودہ صورت میں یہ موسٰیؑ کی کتابیں ہیں مطابقت نہیں کھاتیں۔ مثلاً یہ اطمینان سے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ استثناء باب ۳۴ میں موسٰیؑ نے اپنی موت کا حال خود نہیں لکھا۔ استثناء باب ۱-۱ میں یہ بیان کہ یہ وہ باتیں ہیں جو موسٰیؑ نے یردن کے اس پار بیابان کے میدان میں ...... اسرائیل کو کہیں کسی ایسے شخص کے نقطۂ خیال سے لکھا گیا ہے جو کنعان میں رہتا تھا مگر موسٰیؑ کنعان میں کبھی نہیں گئے۔"

اس قسم کی بہت سی مثالیں دیکر پادری صاحب کئی وجوہات اس بیان کی تائید میں دیتے ہیں کہ "موسٰیؑ کی پانچ کتابیں اصل میں ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ پہلی تحریروں کی بنا پر تالیف کی گئی ہیں۔"

اناجیل اور مسیح کی زبان کا اختلاف: نئے عہد نامہ یا اناجیل کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ وہی مفسر لکھتا ہے:

"اناجیل کے لکھنے والے یسوع مسیح کے اقوال کو یونانی میں لکھتے ہیں حالانکہ وہ اغلباً اکثر ارمی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ نہ ہی یہ اغلب ہے کہ ان کاتبوں کا کبھی یہ خیال تھا کہ ان کی تحریریں ابتدائی کلیساؤں سے آگے جائیں گی جن سے وہ خود آشنا تھے۔ یہی حال پولوس کی تحریروں کا ہے۔ اس کے خطوط جن کی اب بس قدر عزت کی جاتی ہے وہ اصل میں صرف انہی کلیساؤں کے لیے لکھے گئے تھے جن کے نام وہ تھے۔ جنہوں نے ان کو پہلے نقل کیا وہ ہرگز ان کو ان معنوں میں پاک نوشتے نہ سمجھتے تھے جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں۔"

اناجیل میں تحریف لفظی کا اقرار: پھر اس سے بھی واضح الفاظ میں وہی مفسر لکھتا ہے:۔

"پچھلی صدیوں میں ہم مقدس الفاظ کی حفاظت میں وہ احتیاط کا خیال نہیں پاتے جو عہد نامہ قدیم کے پہنچانے میں پایا جاتا ہے۔ ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض وقت وہ الفاظ درج نہ کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہوتے تھے بلکہ وہ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہونے چاہیئے تھے۔ وہ ایک ناقابل اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرتا یا بعض وقت اصل عبارت کو بدل کر اس فرقہ کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس میں وہ خود ہوتا۔ ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارات اور حوالجات کے علاوہ قریباً چار ہزار نئے عہد نامہ کے یونانی نسخے موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اختلاف عبارات بہت زیادہ ہے۔"

لِيُحَآجُّوكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۷۶
اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝۷۷
وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ
وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝۷۸
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ
يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا

تمہارے رب کے حضور تم سے جھگڑ سکیں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۱۰۱
بھلا کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں -
اور کچھ اُن میں سے اَن پڑھ ہیں جو کتاب تو جانتے نہیں مگر جھوٹے خیالات
کے پیچھے چلتے ہیں اور صرف اٹکل پچو خیال دوڑاتے ہیں ۱۰۲
سو اُن کے لیے حسرت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے
ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی قیمت لے لیں

اناجیل میں تحریف کی مثالیں: بہت سی مثالیں موجودہ اناجیل سے دی جاسکتی ہیں جہاں صاف طور پر تحریف تسلیم کی گئی ہے اور نئے ترجموں میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے مگر یہ مقام تفصیل نہیں۔ متی باب ۱۷ کی اکیسویں آیت "مگر اس طرح کے دیو بغیر دعا و روزہ کے نہیں نکالے جاتے" ترمیم شدہ ترجموں میں سے نکال دی گئی ہے۔ اسی انجیل کے انیسویں باب میں جہاں کوئی شخص مسیح کو نیک استاد کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور مسیح جواب میں کہتا ہے "تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے" ترمیم شدہ ترجموں میں یہ لفظ ہیں "تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے" (متی ۱۹: ۱۷) اس پر پادری ڈملو مفسر مذکور مرقس ۱۰: ۱۷ کی تفسیر میں لکھتا ہے "متی کے مصنف نے یا کسی پہلے کاتب نے عبارت میں تھوڑی سی تحریف کر دی تاکہ قاری یہ خیال نہ کرے کہ مسیح اپنے نیک ہونے سے انکار کر رہا ہے"۔ مرقس کے آخری باب کی آیت ۹-۲۰ تک کے متعلق اسی مفسر کو یہ اعتراف ہے کہ یہ بعد میں بڑھائی گئیں۔ مرقس کا نسخہ ایک زمانہ کے بعد جب تلاش کیا گیا، تو نامکمل ملا۔ اس لیے ضرورت پورا کرنے کے لیے اس قدر آیات بعد میں بڑھا دی گئیں۔ غرض تحریف بائبل اب ایک اظہر من الشمس صداقت ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کا یہ اعجاز بھی کہ تیرہ سو سال پیشتر اس وقت تحریف بائبل کی خبر دی جب دنیا میں کسی کو خبر تک نہ تھی کہ بائبل میں تحریف ہوئی ہے نہ کسی یہودی کو یہ علم تھا نہ عیسائی کو، مگر آج سب مانتے ہیں۔ یہ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کا نہایت بدیہی ثبوت ہے۔

ع۱۰۱ فتح۔ فَتْح کے معنی زنجیر اور بیڑی کا دور کرنا ہے۔ جیسے دروازہ کا کھولنا۔ پھر برکات یا علوم کے کھولنے پر بھی بولا جاتا ہے اور فتح علیہ کے معنی ہیں ایک چیز کا اسے علم دیا (غ)

یحاجوکم۔ حج زیارت کے قصد کو کہتے ہیں (اور عرف شریعت میں بیت اللہ کی زیارت کے قصد کے لیے مخصوص ہے) اور حُجَّة دلیل کو کہتے ہیں جو مقصد مستقیم کو واضح کر دیتی ہے اور مُحاجّة یہ ہے کہ دو شخصوں میں سے ہر ایک دوسرے کی دلیل کو رد کرنا چاہے (غ)

منافق یہودی اور آنحضرت صلعم کے ظہور کی پیشگوئیوں کی عام شہرت: منافق طبع یہودی جب مسلمانوں سے ملتے تو کہہ دیتے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں اور ہماری کتابوں میں ان کی پیشگوئیاں ہیں لیکن جب اپنے علما کے پاس آتے (یہاں اُن کو بعضھم کہا ہے شروع سورت میں شیاطینھم کہا ہے) تو وہ علماء ان کو کہتے کہ تم مسلمانوں سے پیشگوئیوں کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ اس سے اُن کے ہاتھ میں ایک دلیل آجاتی ہے جس کی بنا پر وہ یہودیوں کو ملزم کر سکتے ہیں۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے کہ خدا تو سب کچھ جانتا ہے تمہارے چھپانے سے کیا بنے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشگوئیاں اس وقت یہودیوں میں عام طور پر مشہور تھیں۔

ع۱۰۲ اُمیون۔ اُمی کی جمع ہے اُمّی اس کو بھی کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ یعنی اُمّ کی طرف منسوب شخص گویا جیسا کہ ماں کے پیٹ سے نکلا تھا ایسا ہی ہے اور اکتساب سے علم حاصل نہیں کیا (ر) یا اس لیے کہ عورتیں ابتدا میں لکھنے پڑھنے سے محروم رہتی تھیں اور عرب کے لوگوں کو بھی اُمّی کہتے ہیں یعنی منسوب بہ اُمّ القریٰ (غ) کیونکہ اُمّ القریٰ مکہ کا نام ہے۔ یہاں اَن پڑھ یہودی بھی مراد ہو سکتے ہیں اور جو اہل عرب یہودی ہو گئے تھے وہ بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

امانی۔ اُمْنِيَة کی جمع ہے اور یہ منی سے ہے جس کے معنی تقدیر یا اندازہ کرنا ہیں اور منی جس سے حیوانات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی مادہ سے ہے گویا حیوانات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے (غ) اور اسی سے تمنّی ہے جس کے معنی خواہش کرنا ہیں۔ کیونکہ یہ بھی دراصل کسی چیز کا دل میں اندازہ کرنا ہے اور تمنّی کا لفظ اکثر ان چیزوں پر بولا جاتا ہے جن کی حقیقت کوئی نہ ہو (غ) اور اُمْنِيَة وہ صورت حاصلہ ہے جو نفس میں کسی چیز کی تمنّی سے پیدا ہوتی ہے اور چونکہ جھوٹ بھی ایک ایسا تصوّر ہے جس کی حقیقت کوئی نہیں اس لیے تمنی جھوٹ کے لیے مثل مبداء کے ہو گیا ہے یعنی تمنی سے جھوٹ پیدا ہوتا ہے (غ) مجاہد نے یہاں تمنی کے معنی اسی بنا پر جھوٹ مراد لیے ہیں۔ بعض نے بغیر معنی جاننے کے لفظوں کو پڑھ لینا بھی مراد لیا ہے۔

یہود کے ذکر میں اشارہ کہ سب مسلمان علم حاصل کریں: آج مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے کہ بغیر معنی جاننے کے قرآن کریم کو پڑھ لینا کافی سمجھتے ہیں۔ یہودیوں پر ایک وقت وہ آگیا کہ عوام الناس علم دین سے بالکل بے خبر ہو گئے اور جو کچھ ان کے علماء یا سجادہ نشین کہتے اُسے مانتے چلے جاتے۔ معلوم ہوا کہ قرآن کریم اس کو پسند نہیں کرتا کہ علم دین صرف خاص لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ بلکہ چاہتا ہے کہ ہر ایک شخص بجائے خود علم حاصل کرے تاکہ اندھا ہو کر دوسروں کے پیچھے نہ لگے بلکہ خود بھی کچھ بصیرت سے کام لے سکے رسول اللہ صلعم کا ایک کام یعلمھم الکتاب والحکمة بھی ہے اور آپ نے تمام ہی صحابہ کو کتاب و حکمت سکھائی۔ کسی خاص گروہ کو نہیں۔ اسی لیے ایک اُمی قوم دنیا میں علوم کی مشعل بردار ہو گئی۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت ان آیات کی روشنی میں قابل عبرت ہے وہ نہ صرف علوم سے بے بہرہ اور توہمات میں مبتلا ہیں بلکہ

قَلِيۡلًا ؕ فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ
وَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۷۹﴾
وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً ؕ قُلۡ
اَتَّخَذۡتُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ عَهۡدًا فَلَنۡ يُّخۡلِفَ اللّٰهُ
عَهۡدَهٗۤ اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۰﴾
بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓـئَتُهٗ
فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾
وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ
ع ۹ الۡجَـنَّةِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۲﴾
وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ
اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِى الۡقُرۡبٰى وَ
الۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّ

پس ان کے لیے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے
لکھا اور اُن کے لیے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں ۱۰۳ء
اور کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئیگی - کہہ
کیا تم نے اللہ سے کوئی اقرار لیا ہے تو اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں
کرتا، بلکہ اللہ پر وہ بات بناتے ہو جو تم نہیں جانتے ۱۰۴ء
ہاں جو بدی کماتا ہے اور اس کی بُرائیاں اُسے گھیر لیتی ہیں، وہی
آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے -
اور جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں وہی جنت والے
ہیں، وہ اسی میں رہیں گے ۱۰۵ء
اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ سوائے اللہ کے تم
کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اور رشتہ داروں
اور یتیموں اور مسکینوں (کے ساتھ) اور لوگوں کو اچھی بات کہو اور نماز

ان کے دنیوی اور دینی لیڈر بھی ان کا علوم سے مستفیض ہونا پسند نہیں کرتے. اس لیے کہ اس سے اُن کی جھوٹی سرداری میں فرق آتا ہے۔

۱۰۳ء پچھلی آیت میں عوام الناس کا ذکر تھا، اس میں علمأ کا ذکر ہے جب عوام میں علم کتاب کا نہ رہا تو تحریف کا موقع خوب مل گیا۔ یہ آیت بائبل کی تحریف لفظی پر قطعی شہادت ہے۔ آخری الفاظ میں علماء کی بدعملوں کی طرف اشارہ ہے۔

۱۰۴ء یہودیوں اور عیسائیوں کا دعویٰ کہ عذاب چند روز ہوگا: یہود کہتے تھے ہم کو صرف چالیس دن عذاب ہوگا اور بعض کہتے تھے سات دن۔ سیل کہتا ہے یہودیوں میں مسلّم ہے کہ کوئی یہودی خواہ کیسا ہی بدکار ہو گیارہ ماہ یا ایک سال سے زیادہ دوزخ میں نہ رہے گا عیسائیوں نے اس پر یہ ترقی کی ہے کہ مسیح کا تین دن دوزخ میں رہنا تمام بدکاریوں کے لیے کفارہ ہوگیا۔ خدا کا کوئی حکم ایسا نہیں بلکہ انجیل میں بھی اعمال کو نجات کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ متی ۷: ۲۲-۲۳ میں معجزات دکھانے والوں کو مسیح کہتا ہے: "اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ"۔ پس نجات بدکار کے لیے نہیں۔

۱۰۵ء سیئۃ۔ سوء سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو انسان کے لیے غم لاتی ہے خواہ امور دنیوی سے ہو یا امور اُخروی سے اور خواہ وہ حالت نفس کے متعلق ہو یا بدن کے یا خارجی امر ہو جیسے مال وجاہ کا جاتے رہنا (غ) اور سیئۃ اس فعل قبیح کو کہا جاتا ہے جو حسنۃ یعنی بھلائی کی ضد ہے پھر ہر سیئۃ اور حسنۃ دو قسم کی ہے اوّل جو حسب اقتضائے عقل و شریعت ہو اور وہی یہاں مراد ہے اور دوسری وہ جو باعتبار موافقت طبیعت ہو یعنی جو چیز طبیعت کو اچھی معلوم ہو اور طبیعت اس کو ہلکا سمجھے اس پر حسنۃ کا لفظ بول دیا جاتا ہے اور جو طبیعت پر گراں ہو اس کو سیئۃ کہہ دیا جاتا ہے (غ) اس معنی میں بہت جگہ قرآن شریف میں یہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔

خطیئۃ۔ خطاء سے ہے جس کے اصل معنی العدول عن الجھۃ یعنی ٹھیک سمت سے ایک طرف ہو جانا۔ اور یہ کئی قسم کی ہے اوّل یہ کہ ارادہ کرے اسکے غیر کا جس کا ارادہ مستحسن ہے پھر اس کو کرے یہ خطاء تام ہے۔ اور اس پر انسان ماخوذ ہوتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے دوسرے یہ کہ ارادہ ایسی چیز کا کرے جس کا ارادہ مستحسن ہے لیکن جو کچھ ارادہ کیا ہے اس کے خلاف اس سے واقع ہو جائے یہ وہ خطاء ہے جس کے متعلق آتا ہے دفع عن امتی الخطاء والنسیان یا من اجتھد فاخطاء فلہ اجر یعنی جو شخص اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد غلط ہو جائے اُسے ایک اجر ملتا ہے (غ) یہی خطاء ان نسینا او اخطانا میں مراد ہے اور سیئۃ اور خطیئۃ میں امام راغب نے یہ فرق کیا ہے کہ خطیئۃ کا لفظ اکثر اس امر پر بولا جاتا ہے جو فی نفسہٖ مقصود الیہ نہیں ہوتا۔

بدی کا مقابلہ: بدی کے لیئے کسب کا لفظ اختیار کر کے بتا دیا کہ انسان جب ہمہ تن ہی بدی کے پیچھے لگ جاتا ہے تو چاروں طرف سے بدیاں اس کو گھیر لیتی ہیں پھر اس کے لیے نکلنے کا رستہ نہیں رہتا۔

نیکی کی قوت بدی سے زبردست ہے: جو شخص بدی کے مقابلہ کی کوشش کرتا ہے وہ بدیوں میں گھرتا نہیں بلکہ آخرکار غالب آتا ہے۔ بدی کی کشش گو بہت سخت معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں وہ ایک کمزور چیز ہے اور نیکی کی قوت زبردست ہے کیونکہ فطرت نیکی کی معاون ہے اس لیے نیکی اور بدی میں جب مقابلہ ہوگا نیکی غالب آئے گی۔

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

قائم کرو اور زکوٰۃ دو، پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم منہ موڑنے والے ہو[۱۰۶]

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا کہ تم اپنے (لوگوں کے) خون نہ گراؤ گے اور نہ اپنے لوگوں کو اپنے گھروں سے نکالو گے، پھر تم نے اقرار کیا اور تم گواہ ہو[۱۰۷]

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى

پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنے لوگوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو اُن کے گھروں سے نکالتے ہو، ان کے خلاف گناہ اور زیادتی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو اور اگر قید ہو کر تمہارے پاس آئیں فدیہ دیکر انھیں چھڑاتے ہو حالانکہ اُن کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا ۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو، تو اس کی سزا جو تم میں سے ایسا کرتا ہے سوائے اس کے کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن زیادہ

---

۱۰۶ احسان یعنی وہ شے ہے جو خوش کرتی ہے یا جس میں رغبت کی جاتی ہے ۔ بروئے عقل یا بروئے خواہشات یا بروئے حس اور اس کا اکثر استعمال قرآن شریف میں اس پر ہے جو عقل کی رو سے اچھا لگے (رغ) یہاں حسن سے مراد کلمہ حسنہ ہے یعنی اچھی بات اور احسان ایک اپنے فعل میں ہوتا ہے جیسا اچھا علم یا اچھا عمل ۔ جیسے حدیث میں آیا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو ۔ یا کم از کم یہ کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے اور اکثر استعمال اس کا دوسرے پر انعام پر ہے ۔ گویا انسان کا حسن متعدی ہو جاتا ہے ۔

ذی القربیٰ ۔ قرب کئی لحاظ سے ہوتا ہے ۔ نسبت کے لحاظ سے جیسے یہاں پھر نسبت بھی یا باپ کے لحاظ سے ہو گی یا ماں کے ۔ پھر قرب مکان و زمانہ کے لحاظ سے ہوتا ہے یا مرتبہ کے لحاظ سے جیسے من المقربین ہیں ۔ رعایت یعنی نگہداشت کے لحاظ سے جیسے ان رحمت اللہ قریب من المحسنین ہیں ۔ قدرت کے لحاظ سے جیسے نحن اقرب الیہ من حبل الورید (رغ) مگر یہ علم کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے ۔

الیتامیٰ ۔ یتیم کی جمع ہے ۔ اور یُتم کے معنی انقطاع یعنی کٹ جانا ہیں ۔ اور یتیم انسانوں میں سے وہ ہے جو بلوغ سے پہلے باپ سے منقطع ہو گیا ہو ۔ یعنی اس کا باپ مر گیا ہو (رغ) اور ہر ایک منفرد کو یتیم کہتے ہیں جیسے دُرّۃ یتیمۃ ۔

تولیتم ۔ تولّی کا اصل ولی سے ہے جس کے معنی قرب ہیں اور جب اس کا صلہ عن ہو خواہ لفظاً یا تقدیراً جیسے یہاں تو اس کے معنی اعراض اور ترک قرب کے ہوتے ہیں (رغ)

معرضون ۔ اعرض ۔ عرض سے ہے جو طول کے خلاف ہے اور غیر اجسام میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے فذو دعاء عریض (حٰمٓ ۔ ۵۱) اور اعرض عنہ کے معنی ہیں اس سے پھر گیا ۔ تولّی اور اعراض میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ تولی یہ ہے کہ جدھر سے آیا تھا اُدھر واپس چلا گیا یعنی محض پیٹھ پھیر دی اور اعراض یہ کہ اس رستہ کو چھوڑ کر اس کی چوڑائی میں چلا گیا ۔ گویا نہ صرف حق پر پیٹھ پھیر دی بلکہ باطل کو اختیار کر لیا ۔

توریت کے احکام: پہلے جب اخذ میثاق کا ذکر کیا تو تفصیل نہ فرمائی تھی اب اسی میثاق کی تھوڑی سی تفصیل کر دی ہے کہ کیا کیا حکم تھے ۔ یہ احکام گویا اصل الاصول کے رنگ میں ہیں ۔ ایک خدا کی عبادت، دوسرے مخلوق خدا سے نیکی ۔ توریت میں خدا تعالیٰ کی توحید پر بڑا زور تھا اس تاکید کو ظاہر کرنے کے لیے اخباری صورت اختیار کی ہے ۔ دوسرے حصہ میں سب سے پہلے والدین پھر رشتہ دار پھر یتیم پھر مسکین پھر عام لوگ ۔ پھر اس کی دو نمایاں صورتیں بیان کیں ۔ نماز اور زکوٰۃ توریت میں یہ سب احکام موجود ہیں ۔ ایک خدا کی عبادت کے لیے دیکھو خروج ۲۰ ۔ ۳ ۔ ماں باپ کی عزت خروج ۔ ۲۰ ۔ ۱۲ ۔ قریبی استثناء ۱۵ : ۱۱ ۔ یتامیٰ استثنا ۔ ۱۲ : ۲۹ مسکین استثناء ۱۵ : ۱۱ عام لوگ خروج ۲۳ باب کا شروع نماز استثناء ۱۴ : ۴ زکوٰۃ خروج ۲۲ : ۱۰ و ۱۱ ۔ احبار ۲۵ : ۱

۱۰۷ اپنی قوم کے خلاف جنگ نہ کرنے کا حکم: یہاں خطاب براہ راست کیا ہے اس لیے کہ یہ بات یہود عرب سے خاص تعلق رکھتی تھی ۔ اور ان کی ایک نمایاں عہد شکنی کا ذکر اس میں ہے اور اس لیے بھی کہ اس کی طرف خصوصیت سے مسلمانوں کو متوجہ کرنا مقصود ہے ۔ اپنے خون نہ گرانے سے مراد ہے کہ اپنی قوم کے خلاف

اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾	سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں اور اللہ اس سے بےخبر نہیں جو تم کرتے ہو ۱۰۸
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ	یہی وہ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلے اس دنیا کی زندگی کو خرید لیا،
فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع ۱۰	پس نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائیگا اور نہ وہ مدد دیئے جائیں گے ۱۰۹

جنگ نہ کرو گے یہ حکم خروج ۲۰: ۱۳ میں ہے۔ اپنے بھائیوں کو گھروں سے نکالنے سے مراد یا تو یہ ہے کہ ان کے گھروں پر قابض ہونے کا لالچ کرنا۔ دیکھو خروج ۲۰: ۱۷ اور یا مراد فساد ہے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بعض لوگوں کو گھروں سے نکلنا پڑے۔

۱۰۸ تظٰہرون۔ تظاہُر ایک دوسرے کی اعانت کرنا ہے اور ظَہر بمعنی پیٹھ سے مشتق ہے گویا ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی پیٹھ کی ٹیک اپنے ساتھی سے لگاتا ہے۔

اثم۔ اِثم اور اٰثام ان کاموں کو کہتے ہیں جو ثواب سے پیچھے رکھیں گویا اس کے اصل معنی میں تاخیر ہے (غ) اور حدیث میں اثم کی تعریف کی ہے ما حاك فی نفسك یعنی جو چیز تیرے اندر اثر کر جائے اور راسخ ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی ہے وکرھت ان یطلع الناس علیہ اور تو ناپسند کرے کہ لوگ اس کی اطلاع پائیں۔

عدوان۔ عدو بمعنی تجاوز سے ہے۔ اور یہ تجاوز کبھی دل سے ہوتا ہے تو اس کو عداوت یا معاودت کہا جاتا ہے اور کبھی چلنے میں ہوتا ہے تو اس کو عَدْد یعنی تیز رفتاری کہتے ہیں اور کبھی معاملہ میں میانہ روی مدنظر نہ رکھنے سے ہوتا ہے تو اس کو عُدوان کہا جاتا ہے۔ اور اثم اور عدوان میں فرق یہ ہے کہ اثم اپنی ذات میں ایک فعل ہے اور عدوان دوسرے پر ظلم ہے پس ان کا فعل حکم الٰہی کے مخالف ہونے کی وجہ سے اثم ہے اور اپنے بھائیوں پر ظلم کی وجہ سے عدوان ہے۔

اساریٰ۔ اسیر کی جمع ہے یا اَسریٰ کی جمع جو اسیر کی جمع ہے۔ اور اَسر کے معنی زنجیر سے باندھنا ہیں اور ہر شخص جو پکڑا جائے خواہ زنجیر سے باندھا جائے یا نہ اسیر ہے۔

تفادوا۔ فداء اور فدیٰ کے معنی ہیں انسان کو کسی مصیبت سے اس کی طرف سے کچھ خرچ کر کے محفوظ کرنا (غ)

الدنیا۔ دنوّ سے ہے جس کے معنی قرب ہیں اور دنیا قریب کی زندگی یا قریب کی منفعت ہے بمقابلہ آخرت کے۔

القیامۃ۔ قیام۔ قام یقوم سے مصدر ہے اور پھر ھا کے اضافہ سے قیامۃ بن گیا ہے اور اس کے معنی ہیں انسان کا ایک ہی مرتبہ کھڑا ہو جانا اور اس کے اچانک واقع ہونے کے لیے ہائے تنبیہ داخل کی گئی ہے (غ)، اور قیامت یوم بعث ہے جس میں مخلوق حی و قیوم کے سامنے کھڑی ہو جائے گی (ت)

تین قیامتیں۔ کبریٰ، وسطیٰ، صغریٰ: مفردات میں لفظ ساعۃ کے نیچے ہے کہ وہ ساعات جو قیامت ہیں تین ہیں کبریٰ یا حساب کتاب کے لیے لوگوں کا بعث۔ وُسطیٰ ایک نسل کا گزر جانا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے عبداللہ بن انیس کو دیکھ کر فرمایا ان یَطُلْ عُمُرُ ھذا الغلام لم یَمُتْ حتی تقوم الساعۃ اگر اس لڑکے کی عمر لمبی ہو تو یہ نہیں مریگا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔ چنانچہ روایت ہے کہ وہ صحابہ میں سے آخری بزرگ ہیں جو فوت ہوئے اور صغریٰ جو ہر انسان کی موت کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔

اوس اور خزرج کی جنگوں میں یہودیوں کی شرکت: مدینہ میں خزرج اور اوس دو بڑی قومیں تھیں جن کی باہم جنگ رہتی تھی۔ اور یہودیوں کی دو بڑی قوموں میں سے ایک بنو نضیر خزرج کے حلیف بن گئے تھے اور دوسرے یعنی بنو قریظہ اوس کے۔ یوں یہ اپنے اپنے حلیف سے مل کر اپنے ہی بھائی بندوں کو قتل کرتے اور گھروں سے نکلواتے۔ مگر جب ایک فریق غالب آ کر دوسرے کے قیدی لے لیتا تو پھر دونوں قومیں مل کر چندہ کر کے انہیں چھڑاتیں۔ اس پر انہیں ملزم کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اپنی قوم سے جنگ کرنے کا آپس میں فساد ڈالنے اپنے بھائی بندوں کو وطن سے بےوطن کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں بھی ذلیل ہو جاؤ گے اور آخرت میں بھی جنت کی امید نہ رکھو بلکہ دنیا سے بدتر عذاب وہاں ملیگا۔ یہودیوں کی نظیر دیکر مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنے سے روکا ہے: یہود کا قصہ بیان کر کے توجہ مسلمانوں کو دلائی تھی مگر وہ بھی انہیں کے نقش قدم پر چلے اور جو نقشہ یہاں کھینچا ہے وہ پیشگوئی کے رنگ میں مسلمانوں کا نقشہ ہے۔ ایک طرف تو ہمدردی کا اظہار اس قدر ہے کہ جنگوں میں دنیا کے ایک حصہ میں مسلمان زخمی ہو جائیں تو دوسرے حصہ دنیا میں چندہ ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف ایک ملک دوسرے اسلامی ملک کو تباہ کرنے کی فکر میں ہے کبھی دوسروں سے مل کر کبھی خود بخود۔ ایک طرف خود مسلمان عیسائیوں کے ساتھ مل کر خلافت اسلامی کو تباہ کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کے قیام کے لیے اپیلیں اور مظاہرے کرتے ہیں۔

مسلم کی تعریف: یہود کا قصہ بیان کر کے سمجھایا ہے کہ کچھ بھی حالات ہوں مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کر کے ان کا خون گرانا اور ان کا ملک چھیننا جائز نہیں۔ حدیث میں ہے المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان دکھ نہ اٹھائیں۔ ہاتھ سے دکھ دینا یہ ہے کہ ان کو قتل کریں، ان کا مال لوٹیں اُن کے ملک چھینیں۔ زبان سے یہ کہ ان کی عزت پر حملہ کریں، گالی دیں، کافر کہیں، باہم جنگ کر کے باہم فساد کر کے دنیا کی زندگی میں پوری رسوائی حاصل کر چکے ہیں لیکن اس رسوائی میں بھی زندہ رہنا نہیں چاہتے۔ فتاویٰ کفر سے قوم کی تباہی: اور جب حکومت گئی تو اب ویسے ایک دوسرے کو کافر بنا کر اپنی قوم کی تباہی کے درپے ہیں علما اور مشائخ کو یہ فکر نہیں کہ کافروں کو مسلمان بنائیں یا اسلام پر جو حملے ہو رہے ہیں ان کا جواب دیں بلکہ مسلمانوں کو کافر بنانا ان کا شیوہ ہے۔

۱۰۹ اب کلام کا رُخ اس طرف پھیرا ہے کہ یہ لوگ جنھوں نے عہد شکنیاں کیں۔ اب جب ان کی ہدایت کا سامان پھر آیا تو انہوں نے دنیا کی خاطر پھر دین کو ترک کر دیا۔ اگر وہ ہدایت کو اختیار کر لیتے تو اُن کا عذاب دُور کر دیا جاتا۔ ان کی نصرت ہوتی مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ
بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ
اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ
بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا
كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور یقیناً ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اس کے بعد ہم نے پے بہ پے
رسول بھیجے ع۱۱۰ اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو کھلے دلائل دیے اور روح القدس
کے ساتھ اس کی تائید کی ع۱۱۱ پس کیا جب کبھی کوئی رسول تمہارے
پاس وہ چیز لایا جسے تمہارا جی نہیں چاہتا تھا، تو تم نے تکبر (ہی) کیا،
پس ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرنے لگے ع۱۱۲

ع۱۱۰ تقّینا۔ تقفا کے معنی پیٹھ ہیں اور تقفیتہ کے معنی اس کو اس کے پیچھے رکھا۔

الرسل۔ رسول کی جمع ہے اور رسول اصل میں وہ ہے جو کسی قول اور رسالت کا متحمل ہو (غ) پس بغیر کسی رسالت کے رسول کا لفظ حقیقی معنی میں اطلاق نہیں پا سکتا۔

لفظ رسول کا اطلاق مجاز کے طور پر: اللہ کے رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغام اس کی مخلوق کے لیے لاتے ہیں مگر مجازاً اس کا اطلاق دوسروں پر جائز ہے جیسے یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات (المومنون ۲۳-۵۱) میں رسول اللہ صلعم اور آپ کے برگزیدہ صحابہ شامل ہیں دیکھو مفردات راغب اور ایسا ہی لفظ مُرسل مجازاً حضرت عیسیٰ کے حواریوں پر بولا گیا ہے واضرب لھم مثلاً اصحاب القریۃ اذ جاءھا المرسلون (یٰس ۳۶-۱۳) پس مجازاً اس کا اطلاق اس اُمت کے مجددین پر جو مامور بھی ہوتے ہیں جائز ہے نہ حقیقتاً۔ ملائکہ پر جو اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان وسائط ہیں اور انبیاء پر جو خدا کی طرف سے مخلوق کے لیے کوئی خبر لاتے ہیں۔ یہ لفظ بالخصوص بولا گیا ہے اور ایک فرستادہ یا قاصد پر بھی بولا جاتا ہے جیسے جاعل الملئکۃ رسلا (الفاطر ۳۵-۱) فلما جاءہ الرسول (یوسف ۱۲-۵۰)

سلسلہ رسل بنی اسرائیل: سلسلۂ بنی اسرائیل میں انبیاء کے آنے کو اب بطور نعمت بیان کیا ہے اور اول سلسلہ حضرت موسیٰؑ اور آخر سلسلہ حضرت عیسیٰؑ کا نام لیکر باقی ناموں کو چھوڑ دیا۔ کتاب سے مراد یہاں شریعت کی کتاب ہے۔ جو حضرت موسیٰؑ کو دی گئی۔ یہ شریعت سب انبیاء کے لیے ایک ہی رہی۔ ہاں اپنے اپنے وقت اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں انبیاء کچھ کمی بیشی کرتے رہے جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے ولاُحلّ لکم بعض الذی حرم علیکم (آل عمران ۳-۵۰)۔

رسول کے لیے ہدایت لانا ضروری ہے: چنانچہ خود قرآن شریف میں حضرت عیسیٰؑ کو انجیل اور حضرت داؤدؑ کو زبور دیا جانے کا ذکر ہے۔ اسی لیے آیت کے آخر پر فرمایا کہ جو کچھ کوئی رسول تمہارے پاس لاتا تھا تم اس کو قبول نہ کرتے تھے معلوم ہوا کہ ہر ایک رسول کچھ نہ کچھ ہدایت بھی لاتا تھا جسے لوگ قبول نہ کرتے تھے۔ جس کو بینات یعنی معجزات یا پیشگوئیوں سے الگ کر کے بیان کیا ہے۔ اور معجزات یا پیشگوئیاں محض تائید کے لیے ہوتی ہیں۔

ع۱۱۱ عیسیٰ۔ اس کا اصل عیس اور وزن فعلی ہے (ل) اور عرب کے لوگ اس اونٹ کو اَعْیس کہتے ہیں جس کی سفیدی پر کچھ تاریکی ہو اور عَیس ماء الفحل کو کہتے ہیں اور ممکن ہے کہ اسی سے لفظ عیسیٰ کا اشتقاق ہو (غ) مگر بعض اہل لغت کے نزدیک یہ عجمی ہے حالانکہ سریانی میں یہ لفظ عیسیٰ نہیں بلکہ الیسوع ہے اور انجیل میں یسوع آیا ہے۔ جس کے معنی سید یا مبارک ہیں (ل)

مریم کے معنی عبرانی میں خادمہ یا عابدہ ہیں مگر قاموس میں ہے کہ مریم عربی لفظ ہے اور اس عورت کو کہتے ہیں التی تحب محادثۃ الرجال ولا تفجر۔

بینات۔ بینۃ کی جمع ہے جو بان (ظاہر ہوا) سے ہے اور اس کے معنی ہیں کھلی دلیل خواہ عقلی ہو یا محسوس (غ) اس میں معجزات پیشگوئیاں دلائل سب شامل ہیں۔

روح القدس مفردات میں ہے کہ روح نفس کے معنی میں بھی آتا ہے اور اشراف الملائکہ کو بھی کہا ہے جبرئیل کو بھی جسے روح القدس اور روح الامین کے نام سے یاد کیا ہے خود قرآن یعنی کلام الٰہی کو بھی روح کہا گیا ہے۔ جیسے وکذٰلک اوحینا الیک روحا من امرنا (الشوریٰ ۴۲-۵۲) کیونکہ اسی سے زندگی ملتی ہے۔ یہاں روح القدس سے مراد بعض کے نزدیک جبرئیل ہیں اور بعض کے نزدیک انجیل (ج)

ابن مریم نام کی وجہ: حضرت عیسیٰؑ کے نام کے ساتھ قرآن کریم نے لفظ ابن مریم بڑھایا ہے۔ یہ عیسائیوں پر اتمام حجت کے لیے ہے کہ وہ جسے تم خدا اور بے گناہ بناتے ہو وہ ایک عورت کا بیٹا تھا۔ اور انہی کی کتابوں میں لکھا ہے "اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیونکر پاک ٹھہرے" (ایوب ۲۵: ۴) پھر عیسائیوں کے خیال کے مطابق گناہ مرد دنیا میں نہیں لایا، بلکہ عورت لائی۔ کیونکہ عورت نے ہی آدم کو ممنوع پھل کھلایا بس یہ بتایا ہے کہ جب اس کی ماں موجود ہے تو تم اُسے دوسرے انسانوں سے بیگناہی کا امتیاز اس بنا پر کیونکر دے سکتے ہو۔ کیونکہ جب اصلی گنہگار حوّا ہوئی اور اس کے ورثہ میں گناہ کا چلنا ضروری ہے جیسا کہ عیسائیوں کا اعتقاد ہے، تو مریم اس سے کیوں کر پاک ٹھہری۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کو جو شہرت دنیا میں حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی ان کے خاوند کو حاصل نہیں۔ اس لیے بھی مریم کی طرف منسوب کرنا اولیٰ تھا۔ جیسے حضرت فاطمہ کی فضیلت کی وجہ سے بنی فاطمہ۔

روح القدس کا تعلق حضرت عیسیٰؑ سے: حضرت عیسیٰؑ سے روح القدس کا تعلق وہی ہے جو ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ مومنوں کو بھی روح القدس کی تائید ملتی ہے فرمایا ایدھم بروح منہ (المجادلۃ ۵۸-۲۲) جہاں صحابہ کا ذکر ہے یعنی اپنی روح سے ان کی تائید کی اور حدیث میں ہے اللّٰھم اید حسان بروح القدس لے اللہ تو حسان کی تائید روح القدس سے فرما۔ حضرت مسیح کی بینات اور تائید روح القدس کا خصوصیت سے ذکر اس لیے کیا کہ یہودی ان کا انکار کرتے اور ان کو ناپاک قرار دیتے تھے۔

ع۱۱۲ یہودیوں کا شیوۂ تکذیب و قتل انبیاء: اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ نبی کریم صلعم سے تمہاری عداوت اس وجہ سے نہیں کہ تم کو دلائل نہیں ملتے بلکہ تم ایسے قسی القلب ہو گئے ہو

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸

اور کہتے ہیں ہمارے دل پردوں میں ہیں بلکہ اللہ نے اُن کے کفر کی وجہ سے اُن پر لعنت کی پس وہ بہت ہی کم مانتے ہیں ع۱۱۳

وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَي الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ښ فَلَمَّا جَاۗءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝۸۹

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آئی اُس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اُن کے پاس ہے اور پہلے وہ ان پر جو کافر تھے فتح مانگا کرتے تھے مگر جب اُن کے پاس وہ آیا جسے انھوں نے پہچانا اس کا انکار کر دیا پس انکار کرنیوالوں پر اللہ کی لعنت ہے ع۱۱۴

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰي غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰

کیا ہی بُرا ہے جس کے عوض انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا کہ اس کا انکار کرتے ہیں جو اللہ نے اتارا، اس حسد سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اتارے پس وہ غضب پر غضب میں آ گئے اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ع۱۱۵

کہ ہمیشہ ہی خدا کے رسولوں کی تکذیب کرتے رہے، بلکہ ایک گروہ کے قتل کے بھی درپے ہوئے چنانچہ کذبتم کو ماضی رکھ کر اور تقتلون کو مضارع رکھ کر یہ بتایا ہے کہ تم اس وقت بھی ایک رسول کے قتل کے درپے ہو اور اپنی طرف سے تو تم نے اسے قتل کر ہی دیا تھا اگر اللہ تعالیٰ اس کا بچانے والا نہ ہوتا۔ چنانچہ روح المعانی میں ہے انکم الاٰن فیه فانکم حول قتل محمد صلی الله علیه وسلم ولولا انی اعصمه القتلتموه۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کے قتل کے درپے ہونے پر یا اس کے اسباب قتل کے جمع کر دینے پر بھی قتل کا لفظ بول دیا جاتا ہے گو وہ شخص فی الواقع مقتول نہ ہو۔

ع۱۱۳ غُلْف۔ یا اَغلف کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو غلاف میں ہو اور اس سے اُن کی مراد علوم توریت کے غلاف ہیں اور یا غلاف کی جمع ہے یعنی ہمارے دل خود علم کے غلاف یا علم کے دعاء ہیں (غ) یعنی علم ان کے اندر بھرا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تم سے کچھ سیکھنے کے محتاج نہیں۔

لعن۔ لعن کے اصل معنی ہیں ناراضگی کی وجہ سے نکال دینا اور دُور کر دینا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں لعنت کے ہونے سے مراد سزا کا دینا ہے اور دنیا میں لعنت یہ ہے کہ ایک شخص اس کی رحمت اور اس کی توفیق سے کٹ جائے (غ) اور شماخ بن ضرار کے شعر میں آتا ہے مقام الذئب کالرجل اللعین جہاں الرجل اللعین سے مراد دور پھینکا گیا انسان ہے (ج)

قلیلا ما۔ ما قلیل کے لیے بطور تاکید بڑھایا گیا ہے۔ یعنی بہت ہی کم۔

دلوں کے پردے: یہودیوں کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دل ایسے پردوں کے اندر ہیں کہ آپ کی بات ان میں داخل نہیں ہو سکتی۔ جیسے دوسری جگہ ہے قلوبنا فی اکنة مما تدعونا الیه (حٰمٓ السجدۃ ۴۱-۵) گویا یہ خلقی پردے ہیں اور یا یہ کہ ہمارے دلوں میں پہلے ہی علم بھرا ہوا ہے ہم تم سے کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اصل وجہ یہ ہے کہ تم رحمت اور توفیق الٰہی سے دور جا پڑے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تم بہت کم ہی مانتے رہے ہو۔

ع۱۱۴ یستفتحون۔ استفتاح فتح سے ہے اور اس کے ایک معنی ہیں کہ آنحضرت صلعم کی بعثت کے ذریعہ سے خدا کی مدد مانگا کرتے تھے۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اس کی خبر چاہتے تھے کبھی لوگوں سے پوچھتے کبھی کتابوں سے استنباط کرتے تھے یا یہ کہ دوسری قوموں پر اس ذریعہ سے غلبہ مانگتے تھے (غ) اور یستفتحون بمعنی یفتحون بھی ہو سکتا ہے (ض) یعنی نبی آخرالزمان کے آنے کی خبریں بُت پرستوں کو سنایا کرتے تھے۔

بنی اسرائیل اور نبی موعود: چونکہ ان کے ساتھ وعدہ تھا کہ نبی موعود پر ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں انہیں ممتاز قوم بنائے گا۔ استثناء ۲۸: ۱۲ و ۱۸: ۵ '۱۸۔ اس لیے جب دنیا میں بوجہ انبیاء کے انکار کے ذلیل ہو گئے تو پھر خدا سے یہ دعائیں مانگنے لگے کہ وہ موعود نبی آئے تو ہمیں کافروں پر غلبہ ملے۔ لیکن جب وہ کتاب آ گئی جو ان کی وحی کی تصدیق کرتی تھی اور یہی موعود نبی کی سب سے بڑی علامت تھی کہ وہ دنیا کے کل انبیاء کی تصدیق کرے گا تو اسے رد کر دیا۔

موعود نبی کی شناخت: یہاں یہ بھی دعویٰ کیا۔ ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی صداقت کو خوب پہچانتے ہیں اس لیے کہ نہایت بیّن اور موٹے نشان آپ کی صداقت کے اُن پر کھل چکے تھے مثیل موسٰی ہونے کا دعویٰ اب تک کسی نبی نے نہ کیا تھا۔ صرف آنحضرتؐ نے کیا۔ دوسرے انبیاء کی تصدیق کسی نبی نے نہ کی تھی۔ صرف آپؐ نے کی۔

اس موعود نبی کا انکار اللہ کی جناب سے دوری ہے صرف اس کی ہدایت پر عمل کر کے وہ خدا تک رسائی حاصل کر سکتے تھے جب اس کو رد کر دیا تو خود ہی دوری یا لعنت کو خرید لیا۔

ع۱۱۵ بئس۔ بؤس سے ہے جس کے معنی شدت اور مکروہ ہیں اور بئس ہر ایک مذمت کے مقام پر بولا جاتا ہے جیسے نعم ہر ایک مدح کے مقام پر (غ)، بائس، بأساء اسی مادہ سے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا
نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ
وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ
اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾
وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ
الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾
وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ
خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا
وَعَصَيْنَا ٭ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ
بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتارا ہے، کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اتارا گیا اور اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے سوا ہے حالانکہ وہ حق ہے اسکی تصدیق کرنیوالا جو اُنکے پاس ہے کہہ تو پہلے تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے تھے اگر تم مومن تھے ۱۱۶

اور بیشک موسٰی تمھارے پاس کھلی دلیلیں لایا پھر اُس کے پیچھے تم نے بچھڑا (معبود) بنالیا اور تم ظالم تھے ۱۱۷

اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تمھارے اوپر پہاڑ بلند کیا، جو ہم نے تم کو دیا ہے اسے زور سے پکڑ لو اور سُن لو اُنھوں نے کہا ہمنے سُن لیا اور نہیں مانتے ۱۱۸ اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑا رچ گیا ۱۱۹ کہہ وہ بُرا ہے جس کے لیے تمھارا ایمان تمھیں حکم دیتا ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

بغیا۔ بغی کے معنی ہیں میانہ روی سے تجاوز کرنے کی خواہش کرنا (غ) اور بغی مذموم بھی ہے اور محمود بھی مگر اکثر استعمال اس کا محل ذم میں ہے۔ یہاں بغی سے مراد حسد ہے (غ)

مھین۔ اَھان سے اسم فاعل ہے اور ھوان دو طرح پر ہے ایک انسان کا اپنے آپ میں تذلّل اختیار کرنا اس سے پستی اس کے لاحق حال نہیں ہوتی اور مدح کے مقام پر بولا جاتا ہے جیسے یمشون علی الارض ھونا (الفرقان ۲۵-۶۳) یا حدیث میں ہے المومن ھین لین مومن انکسار اختیار کرنے والا نرم ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ دوسرا انسان اس پر متسلط ہو کر اس کی خفت کرنا چاہتا ہے (غ) اور یہ ذلت ہے گویا دوسرے کا محکوم ہونے کی حالت خود ایک ذلت یا عذاب مہین ہے۔

یہودیوں کا حسد آنحضرت سے: جس انکار کا ذکر پچھلی آیت میں ہے اس کی وجہ بتائی کہ وہ صرف حسد ہے کہ اللہ نے اپنے فضل کا حصّہ سوائے بنی اسرائیل کے کسی اور قوم پر کیوں اتارا۔ چنانچہ اگلی آیت میں اس کی اور بھی تشریح فرمائی ہے۔ جہاں ان کا قول نقل کیا ہے کہ ہم صرف اسی پر ایمان لائیں گے جو بنی اسرائیل پر اُترے۔ غضب پر غضب اس لیے فرمایا کہ ایک غضب کے نیچے تو وہ پہلے ہی آئے ہوئے تھے اب آنحضرت صلعم کے انکار سے اور غضب کے نیچے آگئے۔ عذاب مہین یا رسوا کرنے والا عذاب یہ ہے کہ دوسرے کے ماتحت رہیں۔

ع ۱۱۶ اس کا جواب کہ غیر بنی اسرائیل سے نبی آنا کیوں ضروری تھا: ان کے اس قول کا کہ سوائے بنی اسرائیل کے کسی دوسری قوم کے آدمی پر اگر وحی نازل ہو تو اس کو ہم نہیں مانیں گے ایک جواب تو یہ دیا ہے کہ یہ وحی تمہاری وحی کی مصدق ہے اور یہی اس موعود نبی کا نشان تھا۔ دوسرا یہ کہ تمھارا یہ دعوٰی بھی غلط ہے کہ بنی اسرائیل میں سے یہ نبی ہوتا تو تم ایمان لے آتے پہلے تم اسرائیلی نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے۔ پہلے جواب میں یہ بھی بتایا کہ اگر بنی اسرائیل کے باہر سے یہ نبی نہ آتا تو تمہاری پیشگوئیاں غلط ٹھہریں کیونکہ پیشگوئیوں میں بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے آنے کا وعدہ ہے اور پھر عرب کا نام بھی موجود ہے۔ پھر موسٰی کی مثل نبی موسٰیؑ کے خلفاء میں سے تو ہو نہ سکتا تھا اس لیے اس کا دوسری قوم سے آنا ضروری ہُوا۔

ع ۱۱۷ ان کے انکار کے سارے قصّہ کو پھر دوہرایا ہے اور ملزم کیا ہے کہ اور انبیاء تو ایک طرف رہے خود موسٰیؑ کے زمانہ میں تم نے شرک کا ارتکاب کیا جب بچھڑا بنا کر اس کی عبادت کرنے لگے۔

ع ۱۱۸ اسمعوا۔ سمع کے اصل معنی سننا ہیں مگر علاوہ شنوائی کے قرآن شریف میں کبھی اس سے مراد فہم اور کبھی طاعت لی گئی ہے (غ) یہاں سُن لینے سے مراد سمجھ لینا یا فرمانبرداری ہی ہے کیونکہ یہی سننے کی اصل غرض ہوتی ہے۔

منہ سے دعوٰی ایمان اور عملی نافرمانی: باوجود سخت عہد کے تم نے اس کی ایسی نافرمانی کی کہ گویا تم نے منہ سے ہی کہہ دیا کہ ہم نافرمانی کرتے ہیں۔ فی الحقیقت سمعنا یعنی ہم نے سن لیا منہ سے کہا اور عصینا یعنی ہم نے نافرمانی کی دل سے کہا۔ یا زبان قال سے کہا سمعنا اور زبان حال سے کہا عصینا۔ آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ منہ سے قرآن پر ایمان کا دعوٰی ہے مگر عملی حالت میں نافرمانی۔

ع ۱۱۹ اشربوا۔ شرب پانی یا دوسری سیال چیزوں کے پینے پر بولا جاتا ہے (غ) جب کسی چیز کا اندر سرایت کر جانا بتانا ہو تو اس کو پینے کی چیز سے مشابہت دیتے ہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ
خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ
إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾
وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيْهِمْ ط
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾
وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَ
مِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ
أَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ
أَنْ يُّعَمَّرَ ط وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع ۱۱

کہہ اگر آخرت کا گھر اللہ کے ہاں اور لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے لیے ہے، تو موت کی آرزو کرو، اگر تم سچے ہو[120]

اور کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے بسبب اس کے جو اُن کے ہاتھ پہلے بھیج چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے۔

اور یقیناً تو اُن کو سب لوگوں سے بڑھ کر لمبی زندگی پر حریص پائے گا اور اُن سے بھی جنھوں نے شرک کیا ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اُسے ہزار برس کی عمر دیجائے اور یہ بات اُسے عذاب سے بچا نہیں سکتی کہ اُسے لمبی عمر دیجائے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں[121]

کیونکہ پانی فوراً روم روم میں پہنچ جاتا ہے اور بچھڑا رچ جانے سے مراد بچھڑے کی محبت کا رچ جانا ہے (غ) مراد یہ ہے کہ وہ شرک کی بیماری جو بچھڑے کی پرستش میں تم سے ظاہر ہوئی وہی تمہارے اندر چلی آتی ہے۔

توریت کی غلطی کی اصلاح: توریت میں یہ ذکر ہے کہ بچھڑے کو جلا کر خاکستر کو پانی میں ملا کر بنی اسرائیل کو پلا دیا تھا، خروج ۳۲ : ۲۰۔ مگر یہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ قرآن کریم نے فی قلوبھم بڑھا کر بتا دیا کہ یہ بھی یہود کو کوئی ظاہر الفاظ سے غلطی لگی ہے اور تحریف ہوگئی ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرماتا ہے کہ خاکستر کو دریا میں ڈال دیا۔ لنحرقنه ثم لننسفنه فی الیم نسفا (طٰهٰ ۲۰ - ۹۷)

ع ۱۲۰ یہودیوں سے مباہلہ: موت کی آرزو کرنے سے مراد جھوٹے کی موت کی دعا کرنا ہے۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران میں عیسائیوں کو مباہلہ کیلیے بلایا یہاں یہودیوں کو ایک قسم کے مباہلہ کے لیے بلایا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے ادعوا بالموت علٰی ای الفریقین اکذب دعا کرو کہ جو فریق جھوٹ پر ہے اس کو موت آجائے۔ اگر تم مقبولان بارگاہ الٰہی ہو جیسا کہ تمہارا دعوٰی ہے تو خدا تعالٰی تمہاری دعا قبول کرلے گا۔ اگلی آیت میں بتا دیا کہ اپنی بدعملیوں کی وجہ سے وہ ایسی دعا کی کبھی جرأت نہ کریں گے۔ آرزوئے موت: بعض نے موت کی آرزو کرنے سے اپنی ہی موت کی آرزو مراد لی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مومن موت سے خائف نہیں ہوتا، مگر تم موت سے خائف ہو۔ مگر یہ معنی کچھ موزوں نہیں اور دوسرے معنی کی تائید خود قرآن شریف سے ہوتی ہے اور حضرت ابن عباس جیسا مفسر بھی وہی معنی کرتا ہے۔

ع ۱۲۱ احرص۔ حریص سے افعل ہے۔ اور حرص کے معنی ہیں بہت زیادہ ایک چیز کو چاہنا (غ)

اشرکوا۔ شرکة یہ ہے کہ ایک چیز دو یا دو سے زیادہ کے لیے پائی جائے اور دین میں شرک دو قسم کا ہے اوّل شرک عظیم یعنی اللہ تعالٰی کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ دوم شرک صغیر یعنی کسی امر میں غیر اللہ کی رعایت ملحوظ رکھنا (غ) حدیث میں ہے الشرک فی ھذہ الامة اخفی من دبیب النمل علی الصفا یعنی اس امت میں شرک چیونٹی کے صاف جگہ پر چلنے سے بھی زیادہ خفی ہے۔

بصیر۔ بَصَر آنکھ کو کہتے ہیں اور دیکھنے کی قوت کو بھی اور دل میں جو قوت مدرکہ ہے اس کو بَصِیرة بھی کہتے ہیں اور بَصَر بھی (غ) اور اَلْبَصِیر اللہ تعالٰی کے اسماء میں سے ہے اور اس سے مراد ہے کہ وہ تمام اشیاء کو دیکھتا ہے ظاہر کو بھی اور مخفی کو بھی بغیر کسی آلہ کے اور بَصَر اس کے حق میں وہ صفت ہے جس سے تمام اشیاء کے کمال اوصاف کا انکشاف ہوتا ہے (ت)

مزحزح۔ زَحْزَحَ۔ زَحّ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔

یُعَمَّر۔ عِمَارَة آباد کرنا ہے یعنی ویرانی کا نقیض۔ اسی لیے عَمْر اور عُمُر وہ مدت ہے جس میں جسم زندگی کے ساتھ آباد رہتا ہے اور قسم میں عَمْر کا لفظ آتا جیسے لعمرك انھم لفی سکرتھم (الحجر ۱۵ - ۷۲) اور تعمیر جس سے یُعَمَّر مضارع ہے عمر کا عطا کرنا ہے (غ)

ہزار سال کی زندگی: یہاں یہ بیان کیا ہے کہ ان یہودیوں کو تم دنیا کی زندگی کے لیے سب لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بڑھ کر حریص پاؤ گے اور مشرکوں سے مراد بعض لوگوں نے محض مشرک لیے ہیں اس لیے کہ وہ بعث بعد موت کے قائل نہیں اس لیے اس دنیا کی زندگی کو ہی وہ سب کچھ سمجھتے ہیں اور بعض نے مجوس کو مراد لیا ہے جو جیسا کہ ابن جریر میں ہے چھینک پر "ہزار سال بزی" کی دعا دیتے تھے یعنی ہزار سال زندہ رہو۔ اور ابن عباس سے روایت ہے کہ اس سے مراد عجمی لوگ ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ومن الذین اشرکوا سے نیا بیان شروع ہوتا ہے اور ان مشرکوں سے مراد اہل کتاب کے مشرک یعنی عیسائی لوگ ہیں بمقابلہ یہود کے گویا فرمایا کہ یہودی تو دنیا میں مبتلا ہو کر اس دنیا کی زندگی پر حریص ہیں ہی مگر ان کے مشرک بھائی یعنی عیسائی تو ایک ہزار سال کی زندگی چاہتے ہیں

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ
عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾
مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ

کہہ جو کوئی جبریل کا دشمن (ہو) ع۱۲۲ اس نے تو اللہ کے حکم سے اس
کو تیرے دل پر اتارا، اُس کی تصدیق کرتا ہُوا جو اس سے پہلے ہے
اور مومنوں کے لیے ہدایت اور خوش خبری (ہے) ع۱۲۳
جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرائیل

عیسائیت کی مخالفتِ اسلام: اس صورت میں ہزار سال کی زندگی سے مراد ایک قوم کی مخالفتِ اسلام کی ہزار سال کی زندگی ہوگی، جیسا کہ دوسری جگہ ہے ان لبثتم الا یوما (طٰہٰ ۲۰-۱۰۴) اور یوم بھی خدا کے ہاں ہزار سال کا ہے تو مراد ہوگی کہ عیسائی اگر ایک ہزار سال بھی اسلام کی مخالفت کر لیں اور غالب ہیں تو بھی سزا سے نہ بچ سکیں گے۔

ع۱۲۲ جبریل۔ بخاری میں عکرمہ کا قول ہے کہ جبرَ، میکا، اسرافِ سب بمعنی عبد اللہ ہیں جبر یا میك یا سراف کے معنی عبد اور ایل بمعنی اللہ۔ مگر جبریل جبر اور اِئل سے مرکب ہو سکتا ہے۔ جَبر کے معنی کسی قسم کے غلبہ سے کسی چیز کی اصلاح کرنا ہے اور اس لیے جبر سلطان یعنی بادشاہ کو بھی کہتے ہیں (غ) اور اِئل اَوْل سے ہے یعنی رجوع کرنے والا پس جبرئیل وہ ہے جو اصلاح کرنے والے بادشاہ کی طرف بار بار رجوع کرتا ہے۔

جبرائیل اور یہودی: کئی ایک صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے وقت میں یہودی جبریل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ چنانچہ بخاری میں آنحضرت صلعم کے سامنے عبد اللہ بن سلام کا قول ہے ذالك عدو الیهود من الملئكة اور بعض روایات میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ وہ جبریل کو ملك التشدید والعذاب یعنی سختی اور عذاب کا فرشتہ سمجھتے تھے۔ جبرائیل کا وحی لانا: حالانکہ بائبل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ فرشتہ ہے جو وحی لاتا تھا۔ چنانچہ دانیال ۸: ۱۶ میں جبرئیل کو حکم ہوتا ہے کہ دانیال کو اس کی رویا کے معنی سمجھا دے۔ اور لوقا ۱: ۱۹ و ۲۶ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور قرآن کریم میں بھی یہی فرمایا ہے کہ جبرئیل اللہ تو کی وحی آنحضرت صلعم پر لاتے تھے۔ جیسا کہ یہاں بھی صاف فرمایا۔ اور احادیث سے حضرت جبرئیل کا آنحضرت صلعم کے ساتھ رمضان میں قرآن کریم کا دَور کرنا ثابت ہے اور بخاری سے ہی یہ بھی ثابت ہے کہ وہی فرشتہ جو آنحضرت صلعم پر وحی لایا حضرت موسیٰ پر بھی وہی وحی لاتا تھا۔ دیکھو ورقہ کا قول کتاب کیف کان بدء الوحی میں۔ هذا الناموس الذی نزل الله علی موسیٰ۔ معلوم ہوتا ہے یہودیوں کا یہ عقیدہ اس لیے ہو گیا کہ جب جبرئیل کسی نبی پر وحی لاتا تو وہ اپنی قساوت قلبی کی وجہ سے انکار کرتے اور ان پر عذاب آتا اس لیے وہ عذاب کو جبرائیل کی طرف منسوب کرنے لگ گئے۔

پچھلے رکوع میں یہود اور عیسائیوں کی اسلام کے ساتھ عداوت کا اشارۃً ذکر کیا تھا۔ اس رکوع میں ان کی عداوت کا کھول کر ذکر کیا ہے کہ یہاں تک اُن کی عداوت ترقی کر گئی ہے کہ خود جبرئیل سے بھی دشمنی کرتے ہیں۔

ع۱۲۳ نزّل۔ تنزیل اور انزال میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ تنزیل اس موقعہ کے ساتھ خاص ہے جہاں اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنے کی طرف یا سورتوں اور آیات کے یکے بعد دیگرے نزول کی طرف اشارہ ہو اور انزال عام ہے (غ)

قلب کے اصل معنی ہیں ایک چیز کا ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف پھیرنا (غ) قلب دل کو کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ خون کو پھیرتا ہے یا اس لیے کہ خیالات کو پھیرتا ہے اور قلب کے معنی کسی چیز کا اصل یا اس کا لُبّ بھی ہیں (ت) حدیث میں ہے الا لكل شئ قلب وقلب القرآن یٰس۔ ہر چیز کا ایک قلب ہے اور قرآن کا قلب یٰس ہے۔ یہاں ابن اثیر نے قلب کے معنی لُبّ اور اصل ہی کیے ہیں۔ قلب پر نزول قرآن سے مراد: پس انسان کے جسمانی قلب کے مقابل پر ایک قلب اس کی روحانیت کا مرکز ہے اور اسی کا یہاں ذکر ہے۔ نزول وحی اسی قلب پر ہوتا ہے۔ بعض نے نزله علیٰ قلبك سے یہاں مراد لی ہے جعل قلبك متصفا باخلاق القرآن (د) تیرے دل کو اخلاق قرآنی سے متصف کیا۔

اذن۔ اُذُن کان کو کہتے ہیں اور اِذن یا اذان وہ چیز ہے جو سنی جائے اور علم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ سماع کے ذریعہ سے اسے حاصل کرتے ہیں۔ اور کسی چیز میں اذن اس کی اجازت کا علم دینا ہے اس لیے اذن اللہ سے مراد یہاں اس کا ارادہ اور اس کا امر ہے اور جہاں اِذن بمعنی علم آتا ہے تو وہ ایسا علم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی ہو۔ اس لیے یہ خاص ہے اور علم عام ہے۔

بشریٰ۔ بَشَرَۃ چمڑے کے ظاہر کو یعنی اوپر کے حصّہ کو کہتے ہیں جیسے اَدَمَۃ اس کے اندر کی طرف کو کہتے ہیں اور اسی لحاظ سے انسان کو بَشَر کہا جاتا ہے اور بشریٰ اور بشارۃ خوش کرنے والی خبر کو کہتے ہیں (غ) اس لیے کہ اس سے انسان کے چہرہ کے بشرہ میں بسط پیدا ہوتا ہے۔

جبرائیل کا آنحضرتؐ پر وحی لانا: جیسا کہ پچھلے نوٹ سے ظاہر ہے۔ بائبل سے بھی یہی ثابت ہے کہ حضرت جبرئیل انبیاء پر وحی لاتے تھے۔ گو یہودیوں نے غلطی سے جبرئیل کو عذاب کا فرشتہ سمجھ رکھا تھا۔ اس لیے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے جب جبرائیل کا ذکر آیا، تو فرمایا کہ جس طرح وہ پہلے انبیاء پر وحی لاتا تھا اسی طرح تیرے قلب پر بھی وحی الٰہی کا لانے والا ہے۔ اور یہ وحی پہلی وحی کی مصدق بھی ہے اور مان لینے والوں کے لیے اس میں بشارت بھی ہے پس وہ ملک عذاب نہیں۔ بلکہ ہدایت اور بشارت لانے والا ہے۔

جِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

اور میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ (اُن) کافروں کا دشمن ہے ع۱۲۴

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ
بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾

اور یقیناً ہم نے تیری طرف کھلی باتیں اتاری ہیں اور سوائے فاسقوں کے کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا ع۱۲۵

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ
بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾

اور کیا جب کبھی وہ کوئی عہد باندھتے ہیں انہی کا ایک فریق اُسے پھینک دیتا ہے بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ
لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ
كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾

اور جب اللہ کی طرف سے اُن کے پاس ایک رسول آیا اسکی تصدیق کرنے والا جو اُن کے پاس ہے تو اُن میں سے جنھیں کتاب دی گئی تھی ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ جانتے ہی نہیں ع۱۲۶

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ

اور ان باتوں کی پیروی کی جو شیطان سلیمانؑ کی نبوت پر افترا کرتے تھے ع۱۲۷

ع۱۲۴ عدوّ۔ عَدْو کے معنی تجاوز یعنی حد سے گزرنا اور موافقت کا نہ ہونا ہیں، بلحاظ دل ہو تو عداوۃ اور معاودۃ یعنی دشمنی ہے، چلنے کے لحاظ سے ہو تو عَدْو ہے۔ معاملہ میں یا عدالت میں خلل کے لحاظ سے ہو تو عُدْوان اور عَدْو یعنی زیادتی ہے، اور عَدُوّ یعنی دشمن دو طرح پر ہوتا ہے ایک ارادہ اور قصد سے جیسے من قوم عدولکم (النساء۴-۹۲) اور ایک وہ جو ارادہ اور قصد سے نہیں بلکہ دوسرے کے لیے ایسی حالت پیش کرے جس سے اسکو تکلیف پہنچے جس طرح دشمن سے پہنچتی ہے، جیسے بتوں کے متعلق حضرت ابراہیمؑ کا فرمانا فانھم عدولی الارب العالمین (الشعراء۲۶-۷۷) یا جیسے فرمایا ان من ازواجکم واولادکم عدوالکم (التغابن۶۴-۱۴) (غ)۔ اللہ تعالیٰ کا کافروں کا دشمن ہونا اسی لحاظ سے ہے یعنی ان کے ساتھ اس کا معاملہ ایسا ہوگا یا اس کی طرف سے ان کو سزا پہنچے گی۔

یہاں بتایا کہ جبریلؑ کے ساتھ دشمنی اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ سب سے دشمنی ہے (میکائیل کا نام اس لیے بڑھایا کہ یہودی میکائیل کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ چنانچہ دانیال ۱۲: ۱ میں میکائیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "وہ بڑا سردار جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کے لیے کھڑا ہے") اور جو شخص اللہ اور ملائکہ سے دشمنی کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ایسے شخص کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ اللہ کی عداوت کا مفہوم: عداوت سے اللہ تعالیٰ پاک ہے اور اس لفظ کا استعمال محض ان کی عداوت کی سزا کے اظہار کے لیے ہے اس استعمال کے لیے دیکھو ع۲۷۔

ع۱۲۵ فاسق یہاں ان کو اس لیے کہا کہ ان سے نبی آخر الزمان کے متعلق عہد بھی لیا گیا تھا۔ اس عہد کو زیادہ واضح الفاظ میں اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔ فاسق کے معنی کے لیے دیکھو ع۴۱۔

ع۱۲۶ نبذ۔ نبذ کسی چیز کا پھینک دینا ہے جب اس کی کچھ قدر و قیمت نہ سمجھی جائے (غ)

اور بھی زیادہ تصریح فرمائی کہ ان لوگوں نے خدا کی کتاب توریت کی بھی پروا نہ کی کیونکہ اس میں نبی صلعم کے متعلق عہد مذکور تھا۔

ع۱۲۷ تتلوا الشیاطین علیٰ۔ تلی یا تلاوت کا لفظ کتب منزل من اللہ کے لیے خاص ہے دیکھو ع۶۷ تلی علیہ کے ایک معنی تو یوں ہونگے کہ اس کو پڑھ کر سنایا۔ جیسے یتلوا علیھم اٰیاتہ مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی یہاں نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ شیاطین ملک سلیمان کو تو کچھ پڑھ کر نہ سناتے تھے۔ اس لیے یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یتلوا علیٰ فلان کے معنی ہیں یَکْذِبُ عَلَیہ یعنی اس پر جھوٹ بولا یا اس پر افترا کیا۔ گویا ملک سلیمان کی طرف جھوٹ باتیں منسوب کرکے ان کا کلام الٰہی ہونا ظاہر کرتے تھے۔

ملک۔ ملک اور جتنے مادے ان حروف کو مقلوب کرکے بنتے ہیں ان سب میں قوت اور شدّت کے معنی پائے جاتے ہیں (ت) اور مُلک اصل میں حکم کے ساتھ کسی چیز کا ضبط ہے جس میں تصرّف حاصل ہو اور عام معنی اس کے بادشاہت ہیں۔ یہاں مراد نبوّت ہے جیسا کہ اللّٰھم مالک الملک کی تفسیر میں مجاہد سے ملک کے معنی نبوّت مروی ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کا اصل ملک یہی نبوت ہی تھی۔

سلیمان ابن داؤد۔ ان کا زمانہ حضرت مسیح سے ۹۷۰ سال پیشتر ہے اور بنی اسرائیل میں شان و شوکت کے لحاظ سے اور وسعت مملکت کے لحاظ سے ان کے برابر کوئی نہیں ہوا۔ آپ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔

سلیمان پر یہودیوں کا افترا: یہ بتا کر کہ محمد صلعم کے ظہور پر یہودیوں نے کس طرح کتاب اللہ کو پس پشت پھینک دیا اب بتاتا ہے کہ بجائے کتاب اللہ کی پیروی کے یہ لوگ ان جھوٹی باتوں کے پیچھے لگ گئے ہیں جو شریر اور مفسد لوگ حضرت سلیمانؑ پر افترا کرکے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور ان باتوں کے ذریعہ سے حق کو مٹانا چاہتے ہیں۔ بہت سی جھوٹی باتیں یہودی سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے جن میں سے کچھ حصہ مسلمانوں نے بھی لیکر سحر سلیمانی اور نقش سلیمانی بنا لیے ہیں۔ شیاطین سے مراد وہی لوگ ہیں جو اس قسم کی باتیں حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ

اور سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا [۱۲۸] مگر شیطان کفر کرتے ہیں (جو) لوگوں کو سحر سکھاتے ہیں [۱۲۹] اور وہ بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نہیں اُتارا گیا [۱۳۰] اور نہ وہ دونوں کسی کو سکھاتے تھے یہاں تک کہ کہتے ہم صرف فتنہ ہیں، پس کافر نہ بن [۱۳۱] سو وہ ان دونوں (ذریعوں) سے وہ باتیں سیکھتے ہیں [۱۳۲] جن سے مرد اور اسکی جورو کے درمیان

ع [۱۲۸] سلیمان کی طرف کفر و شرک کی نسبت بائبل میں: یہ اس لیے فرمایا کہ یہودیوں کی بعض اقوام کو حضرت سلیمانؑ سے اس قدر بغض ہو گیا تھا کہ انہوں نے سلیمان کی طرف کفر و شرک کو منسوب کر دیا یہاں تک کہ یہ باتیں بائبل میں بھی داخل ہو گئیں۔ چنانچہ اسلاطین ۱۱: ۴ میں ہے "جب سلیمان بوڑھا ہُوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کی طرف مائل نہ تھا" پھر آگے آتا ہے کہ سلیمان کا دل خداوند سے برگشتہ ہو گیا اور خداوند اس پر غضبناک ہُوا۔

بائبل میں تحریف اور قرآن کریم کا اس کی اصلاح کرنا: یہ اگر ایک طرف بائبل میں تحریف کا قطعی ثبوت ہے کہ ایک نبی کی طرف ایسی بیہودہ باتوں کو منسوب کیا ہے تو دوسری طرف قرآن کریم کے ان کتابوں پر محافظ ہونے کا ثبوت ہے کہ ان کی غلطی کو ظاہر کر دیا۔ آج عیسائی محققین بھی اسی بات کے معترف ہیں کہ بائبل کا یہ بیان غلط ہے۔ چنانچہ انسکلوپیڈیا ببلیکا میں ہے "غالباً یہ تو صحیح ہے کہ سلیمان کی بہت سی بیبیاں تھیں جن میں سے کچھ اسرائیلی قوم کی اور کچھ غیر اسرائیلی تھیں مگر اس نے ان سب کے لیے قربانگاہ نہیں بنائے تھے۔ نہ ہی اس نے ان بیبیوں کے دیوتاؤں کی پرستش کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ملانے کا کبھی ارتکاب کیا" قرآن کریم کی صداقت کی کیسی عظمت نظر آتی ہے کہ جو بات تیرہ سو سال پیشتر بغیر بائبل کو پڑھنے کے ایک اُمی کے منہ سے نکلی، آج تحقیق کے بعد وہی درست ثابت ہوتی ہے اور بائبل کا اپنا بیان غلط ثابت ہوتا ہے پس قرآن بائبل سے نقل نہیں کرتا۔ بلکہ بائبل کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔

ع [۱۲۹] السحر۔ اَلسِّحْرُ الْخِدَاعُ وَتَخْيِيْلَاتٌ لَا حَقِيْقَةَ لَهَا (غ) سحر ان دھوکے کی باتوں اور تخیلات کو کہتے ہیں جن کی حقیقت کچھ نہ ہو۔ اور جوہری کا قول ہے کل ما لطف ودق ماخذہ فھو سحر (ت) وہ امر جس کی اصل دقیق اور لطیف ہو وہ سحر ہے اور حدیث میں ہے ان من البیان لسحرا۔ یعنی بعض بیان سحر کا حکم رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پس شیطانوں کے لوگوں کو سحر سکھانے سے دھوکے کی باتیں اور تخیلات سکھانا مراد ہے جن کی اصلیت کچھ نہ تھی۔ جیسا کہ اب بھی بہتیرے شیطان ایسی باتیں لوگوں کو بتاتے رہتے ہیں۔ سحر کے معنی جو قلب ماہیت عام لوگوں نے بنا رکھے ہیں اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

یہاں بتایا کہ شیاطین یعنی شریر لوگ ایک تو حضرت سلیمانؑ پر کچھ افترا کر کے لوگوں کو سناتے ہیں اور یہودی اس کی پیروی کرتے ہیں اور دوسرے یہ لوگ اس سحر کی پیروی کرتے ہیں جس کی تعلیم دینے والے بھی شریر لوگ ہیں۔ اس سحر کو وہ کس کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

ع [۱۳۰] بابل۔ ایک نہایت قدیم اور بہت بڑا شہر تھا، جو مدت تک عراق عرب کا دارالخلافہ رہا۔ دریائے فرات پر واقع تھا جس کے دونوں طرف اب اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔ مسیح سے ۲۳۰۰ سال پیشتر بھی یہ دارالخلافہ تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس کے گرداگرد کی فصیل ۵۵ میل تھی۔ بخت النصر کے زمانہ میں بھی یہ عروج پر تھا بعد میں تباہ ہو گیا

ما انزل میں ما نافیہ ہے ابن جریر نے اس معنی کی روایت کی ہے۔ کیونکہ فرشتوں کو کبھی رسول بنا کر دنیا میں نہیں بھیجا جاتا چہ جائیکہ ان پر سحر نازل ہو۔

ہاروت ماروت کا قصہ یہودیوں نے ایرانیوں سے لیا: یہودیوں کے تعلقات ایرانیوں سے بھی تھے جن کو وہ اب اسلام کے خلاف اُکسا بھی رہے تھے۔ اور ایرانیوں سے ہی انہوں نے ہاروت ماروت کا قصہ لیا تھا جن میں یہ مشہور تھا جیسا کہ سیل نے لکھا ہے کہ بابل میں ہاروت ماروت نام دو فرشتوں پر کچھ نازل ہُوا تھا اور کہ وہ لوگوں کو کچھ سحر کی باتیں سکھاتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہاں دو قسم کی باتوں کی نفی کی ہے، ایک اُن کی جو سلیمانؑ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں دوسرے ہاروت ماروت کے قصہ کی اور ان پر سحر نازل ہونے کی اور جس طرح پہلے سلیمانؑ کی طرف منسوب شدہ باتوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا۔ یہاں سحر کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ یہودی یہ کہہ کر اس کا اتباع کرتے ہیں کہ یہ دو فرشتوں ہاروت ماروت پر اُترا تھا۔ اس کی نفی کی ہے کہ دو فرشتوں ہاروت ماروت پر سحر اتارا گیا ہو۔

ہاروت ماروت کے قصے پر محققین اسلام کے خیالات: ہاروت ماروت کے جسقدر بے سروپا قصے بعض مفسرین نے لکھ دیئے ہیں انکی اصل یا مجوسیوں میں کچھ ملتی ہے یا یہودیوں میں۔ قرآن و حدیث ان خرافات سے پاک ہیں۔ امام رازی نے ان قصوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ یہ روایت فاسد اور مردود ہے۔ شہاب عراقی نے کہا ہے کہ جو شخص ان باتوں کو مانتا ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتے ہیں جن کو زہرہ کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے وہ اللہ کا کافر ہے کیونکہ ملائکہ معصوم ہیں وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ رُوح المعانی میں ہے کہ ان قصوں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی ثابت نہیں۔ اے کاش اسلام کی کتابوں میں ان خرافات میں سے کچھ نہ ہوتا جنکو کوئی عاقل قبول نہیں کر سکتا۔ غرض یہ قصے اہل علم کے نزدیک مردود ہیں

ع [۱۳۱] ہاروت ماروت کا قصہ بنانے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ فرشتے جو اوندھے منہ بابل کے کنوئیں میں لٹکے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں۔ مگر پہلے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایک آزمائش ہیں۔ پس ہم سے جادو نہ سیکھو۔ اس سارے بے سروپا قصہ کا انکار کیا ہے اور فرمایا کہ وہ کچھ سکھاتے ہی نہیں جو یہ کہنے کی نوبت آئے کہ ہم فتنہ ہیں تم ہم سے جادو سیکھ کر کافر نہ ہو۔ قرآن شریف نے سحر کا سیکھنا سکھانا شیاطین کا کام بیان فرمایا ہے۔ مسلمانوں کو ان خرافات سے بچنا چاہیئے۔

ع [۱۳۲] منھما میں ضمیر ان دونوں ذریعوں کی طرف جاتی ہے جنکا ذکر اوپر ہے یعنی ایک وہ کفر کی باتیں جو سلیمان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں حالانکہ سلیمان کا ان سے کوئی تعلق نہیں اور دوسرے وہ سحر جس کا بابل میں ہاروت و ماروت پر نازل ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ
بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ یَتَعَلَّمُوْنَ مَا
یَضُرُّهُمْ وَ لَا یَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ
اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۟ؕ وَ
لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾
وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ
اللّٰهِ خَیْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۲

تفریق کرتے ہیں[۱۳۳] اور اس سے وہ کسی کو ضرر پہنچانے والے نہیں ہوں گے
سوائے اسکے جو اللہ کے حکم سے ہو[۱۳۴] اور وہ باتیں سیکھتے ہیں جو انھیں ضرر دیتی ہیں
اور انھیں نفع نہیں دیتیں اور یقیناً وہ جانتے ہیں کہ جس نے اسکو مول
لیا اُس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں[۱۳۵] اور کیا ہی بُرا ہے جس کے عوض
انھوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا، کاش وہ جانتے ۔
اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقوےٰ کرتے اللہ کی طرف سے بدلہ بہتر
تھا کاش وہ جانتے[۱۳۶]

ع۱۳۳ فریمیسنری: اس ایک فقرہ میں اس کل منصوبہ کی اصلیت کو بیان کر دیا ہے جو آنحضرت صلعم کے خلاف کیا جاتا تھا۔ دنیا میں صرف ایک ہی سوسائٹی بزنگ مذہب ایسی ہے جس نے مرد اور عورت میں تفرقہ کیا ہے یعنی مردوں کو اس کا ممبر بنایا جاتا ہے مگر عورتوں کو نہیں اور یہ فریمیسنوں کا طریق ہے پس یہاں بتا دیا کہ فریمیسن یعنی خفیہ سوسائٹیوں کے ذریعہ سے اسلام کو تباہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی طرف اگلے الفاظ میں اشارہ ہے۔ اور یہودی فریمیسنوں سے مل کر خفیہ منصوبے آنحضرت صلعم کے خلاف کر رہے ہیں۔

ع۱۳۴ اسلام کے خلاف خفیہ منصوبے: یہاں یہ بتایا کہ ان کی غرض اسلام کو اور آنحضرت صلعم کو نقصان پہنچانا ہے مگر وہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے کہ اہل کتاب خفیہ منصوبے مومنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کرتے ہیں انّما النجوٰی من الشیطان لیحزن الذین اٰمنوا ولیس بضارھم شیئًا الا باذن اللہ (المجادلۃ ۵۸: ۱۰) خفیہ مشورے شیطانی کام ہیں جن کی غرض یہ ہے کہ وہ یعنی شیطان مومنوں کو غم میں ڈالے اور وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہاں اللہ کے اذن سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ پہنچے گا۔ سو دونوں جگہ لفظ قریبًا ایک ہی ہیں۔ پس درحقیقت ان الفاظ میں بھی انہی خفیہ منصوبوں کی طرف اشارہ ہے جو فریمیسنوں کے ساتھ مل کر یہود آنحضرت صلعم کو ہلاک کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ فریمیسنری کی اصلیت: فریمیسن ایک سوسائٹی ہے جو بہت قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ کی طرف اس کو منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے حالات کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے نہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کی تعلیم کیا ہے۔ اس زمانہ میں اس سوسائٹی کی باگ ان قوموں کے ہاتھ میں ہے جن کو دنیا میں سیاسی غلبہ حاصل ہے اور اس کی آخری منزل عیسائیت ہے۔ بعض بھولے بھالے مسلمان بھی اس جال میں پھنس کر اپنے دین و ایمان کو تباہ کر لیتے ہیں۔

یہاں چار باتیں بتا دی ہیں۔ اوّل یہ کہ کچھ خفیہ منصوبے ہیں جو شیطان صفت لوگ کر رہے ہیں۔ دُوسرا یہ کہ وہ ان باتوں کا جواز اس طرح کرتے ہیں کہ انبیاء (سلیمانؑ) اور ملائکہ (ہاروت ماروت) کی طرف ان کو منسوب کرتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ یہ منصوبے ان لوگوں کے ہیں جو مرد اور عورت میں تفرقہ کرتے ہیں یعنی فریمیسن۔ چہارم یہ کہ ان کی غرض اسلام کو تباہ کرنا ہے مگر وہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

مومنوں کو تکلیف پہنچنے کی وجہ: اِلّا باذن اللہ۔ اِلّا یہاں استثنائے منقطع کے طور پر ہے یعنی اس سے ایک نیا کلام شروع ہوتا ہے یعنی وہ تو تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے ہاں اللہ کے اذن سے کچھ تکلیف مومنوں کو پہنچ بھی جائے گی۔ اور یہاں اس قسم کے استثناء کی ضرورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ مومنوں کو بھی کچھ نہ کچھ تکلیفیں کچھ خوف کچھ بھوک کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی ضرور ہے کہ پہنچیں۔ کیونکہ بغیر تکالیف کے مومن کمال کو حاصل نہیں کر سکتے (۱۵) پس مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ جو تکلیف یہ دشمن پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور وہ منصوبۂ ہلاکت ہے وہ تو یہ نہیں پہنچا سکیں گے۔ ہاں مومنوں کو ان کے کمال تک پہنچانے کے لیے جو علم الٰہی میں بعض تکالیف کا پہنچنا ضروری ہے وہ پہنچیں گی۔

ع۱۳۵ اخلاق۔ خلق پیدا کرنا ہے یعنی ظاہری بناوٹ اور خُلق خصائل سے تعلق رکھتا ہے گویا وہ اندرونی بناوٹ ہے اور خلاق وہ فضیلت ہے جو انسان اپنے خُلق سے حاصل کرتا ہے۔ اس لیے اس کے معنی حظ یا حِصّہ ہو گئے ہیں (غ)

منصوبہ کرنے والوں کا انجام: یہاں یہ بتا دیا کہ نہ صرف وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ بلکہ یہ باتیں خود ان کے نقصان کا موجب ہوں گی وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے بلکہ نقصان ہی اُٹھائیں گے۔ چنانچہ ایسا واقعہ ہی ہُوا کہ یہ اسلام کے خلاف منصوبے آخر اُن کی تباہی اور جلاوطنی کا موجب ہوئے۔

ع۱۳۶ مثوبۃ اور ثواب دونوں ثوب سے ہیں جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اس اصل حالت کی طرف رجوع کرنا جس پر وہ تھی اور مثوبۃ یا ثواب کسی عمل کی جزا کو اس خیال سے کہا جاتا ہے کہ گویا وہی عمل ہی واپس آ گیا (غ)

اس آیت میں قرآن شریف پر ایمان کو پیش کیا اور اس طرح سے اخر رکوع کا تعلق اگلے رکوع سے کیا جس میں قرآن شریف کی عظمت کا ذکر ہے اور یہ ذکر ہے کہ پہلی شرائع اس سے منسوخ ہوئیں اس لیے اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو راعنا نہ کہو اور انظرنا کہو اور سنو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے ۱۳۷ع

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿١٠٥﴾

اہل کتاب میں سے جو کافر ہیں پسند نہیں کرتے اور نہ ہی مشرک کہ تمھارے رب سے تم پر کوئی بھلائی اتاری جائے اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے ۱۳۷ع ۱

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٦﴾

جو پیغام ہم منسوخ کرتے ہیں یا اُسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسا لے آتے ہیں ۱۳۸ع کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے

۱۳۷ع راعنا۔ راعَ۔ رعْی سے مشتق ہے جس کے معنی حفاظت کرنا ہیں چنانچہ حدیث میں ہے کُلُّکُم راعٍ پس راعنا کے معنی ہیں ہماری بات سنیئے۔

انظرنا۔ نَظَر آنکھ کے پھیرنے کا نام ہے کسی چیز کے دیکھنے کے لیے۔ کبھی اس سے غور اور تحقیق مراد ہوتی ہے اور نظر کے معنی انتظار کرنا بھی آتے ہیں (غ)

یہاں انظرنا کے معنی ہیں ہمارا انتظار کیجیے یا ہمیں مہلت دیجیے تاکہ ہم آپ کی بات سمجھ لیں۔

یہودیوں کی شرارتیں: راعنا کہنے کی ممانعت کی وجہ دوسری جگہ یُوں دی ہے کہ یہودی کہتے ہیں راعنا لیا بالسنتہم (النساء ۴- ۴۶) راعنا کا لفظ اپنی زبانیں مروڑ کر بولتے ہیں یعنی راعنا کی بجائے رعن کہہ دیتے ہیں اور یہ لفظ رعونت سے ہے جس کے معنی جہالت و حماقت ہیں۔ یہودیوں کی شرارتوں میں یہ ادنیٰ قسم کی ایک شرارت تھی کہ بات بات میں استہزا کرتے تھے اور پھر فخر کرتے تھے کہ دیکھو ہم انہیں کیسا بناتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس لفظ سے اس لیے روکا کہ گو اُن کا منشاء بُرا نہ ہو مگر یہودی اس قسم کی باتوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اور یوں بتایا کہ ان باتوں سے بھی اجتناب ضروری ہے جن کا گو منشاء بُرا نہ ہو مگر نتیجہ بُرا ہو۔

یہودیوں کی مخالفت نیک نیتی سے نہ تھی: مضمون کا تعلق پہلے مضمون سے ظاہر ہے وہاں بھی یہودیوں کی کچھ شرارتوں کا ذکر تھا مگر وہ ایسی شرارتیں تھیں جو خفیہ طور پر منصوبوں کے رنگ میں اسلام کو تباہ کرنے کے لیے وہ کرتے تھے۔ یہاں ان کی اس قسم کی شرارتوں کا ذکر ہے جو معمولی بول چال میں وہ استہزا کے رنگ میں کرتے تھے۔ ان کا اس طرح استہزا کرنا صاف بتاتا ہے کہ ان کے اندر نیک نیتی کوئی نہ تھی۔ مخالفت بعض وقت انسان نیک نیتی سے بھی کر بیٹھتا ہے مگر یہودیوں کی مخالفت بربنائے شرارت تھی اور یہی ان کے منصوبوں اور استہزا کا ذکر کرنے سے مقصود ہے۔

۱۳۷ع ۱ یود۔ وَدّ کسی چیز کی محبت رکھنا اور اس کے ہونے کی خواہش کرنا ہے اور دونوں معنوں میں سے ہر ایک پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

اھل الکتاب۔ اھل کسی شخص کے وہ ہیں جن میں اور اس میں ایک اتحاد یا جمعیت کا رنگ ہو بوجہ نسب کے یا دین کے یا اور کسی چیز کے جو اُن دونوں کے قائمقام ہو جیسے صنعت یا گھر یا شہر (غ) پس اھل الکتاب سے مراد وہ لوگ ہوئے جو ایک کتاب پر مجتمع ہیں اس لیے چونکہ کتاب کا لفظ بعض وقت صرف حضرت موسیٰؑ کی وحی پر بولا گیا ہے اور بعض وقت حضرت عیسیٰؑ کی وحی پر اور بعض وقت کل انبیاء کی وحی پر تو اہل کتاب سے مراد کبھی صرف یہود کبھی صرف نصاریٰ کبھی یہود و نصاریٰ دونو ہوتے ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر جس طرح کتاب میں بعض وقت عمومیت ہوتی ہے اسی طرح اہل کتاب میں بھی عمومیت مراد ہو سکتی ہے۔

خیر۔ خَیر اصل میں وہ چیز ہے جس میں سب لوگ رغبت کریں (غ) یہاں مراد وحی الٰہی ہے (ر)

رحمته۔ رَحْمَة رقت ہے جس کا اقتضا مرحوم پر احسان ہو اور کبھی اس کا استعمال صرف رقت پر ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان پر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت صرف انعام و افضال کا نام ہے (غ)

الفضل۔ فضل۔ اقتصاد یعنی درمیانہ حالت سے زیادہ کا نام ہے مگر جہاں محل ذم ہو وہاں فُضول کہا جاتا ہے اور فضل کا اکثر استعمال محل مدح میں ہے اور ہر ایک عطیہ جس کا دینا دینے والے پر لازم نہیں، فضل کہلاتا ہے (غ) اور یہاں مراد ایسا ہی فضل ہے گو بعض وقت ان چیزوں پر اس کا استعمال ہو جاتا ہے جو بذریعہ اکتساب حاصل ہوتی ہیں جیسے مال و جاہ و قوت (غ)

یہاں الفاظ خیر اور رحمت اور فضل سب میں اس وحی کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم صلعم پر نازل کی گئی۔

۱۳۸ع ننسخ۔ نسخ کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز سے ازالہ کرنا۔ اس لیے یہ لفظ لکھنے یا اثبات کے معنی میں بھی آتا ہے اور صرف ازالہ کے معنی میں بھی اور ایک چیز کا ازالہ کر کے دوسرے کا اثبات کرنے کے معنی میں بھی۔ یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔ یعنی ایک حکم کا دوسرے حکم سے ازالہ کرنا جو اس کے پیچھے آتا ہے (غ) اور نسخ کتاب صرف کتاب لکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے قرآن شریف میں اس معنی میں استنساخ بجائے نسخ کے آیا ہے جیسے انا کنا نستنسخ ما کنتم تعملون (الجاثیة ۴۵- ۲۹) اور نسخة بمعنی تحریر ہے و فی نسختھا ھدی (الاعراف ۷- ۱۵۴)

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ کی ہی ہے

اٰیۃ ۔ کے مشہور معنی العلامۃ الظاھرۃ یعنی ظاہر نشان ہیں ۔ مگر تاج العروس میں ہے الاٰیۃ الرسالۃ وتستعمل بمعنی الدلیل والمعجزۃ ۔ یعنی اٰیۃ کے معنی رسالت یا پیغام الٰہی ہیں اور دلیل اور معجزہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ حضرت آدم کے ذکر کے بعد آتا ہے فاما یاتینکم منی ھدی (۳۸) میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آتی رہے گی پس جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو اُن پر کوئی خوف نہیں اور نہ حزن ہوگا ۔ اور اس کے مقابل پر ہے والذین کفروا وکذبوا باٰیاتنا اور جو لوگ ہماری آیات کا انکار کریں اور انہیں جھٹلائیں ۔ یہاں صاف طور پر آیات کے معنی الٰہی پیغام ہیں ۔ ایسا ہی یٰس ۳۶ ـ ۴۶ میں ہے وما تاتیھم من اٰیۃ من اٰیات ربھم الا کانوا عنھا معرضین ۔ کوئی آیت ان کے رب کی آیات میں سے ان کے پاس نہیں آتی مگر اس سے اعراض کرتے ہیں ۔ جہاں اٰیات کے معنی روح المعانی میں ہیں الکتب المنزلۃ یعنی وہ کتابیں جو خدا کی طرف سے نازل ہوئیں ۔ یہی وسیع معنی یہاں مراد ہیں ۔

یہود کا اعتراض کہ شریعت موسوی کیوں منسوخ ہوئی : یہاں نسخ آیات یا ان کے فراموش کرا دینے سے کیا مراد ہے ؟ سیاق مضمون یوں ہے کہ یہودی قرآن پر ایمان اس لیے نہیں لاتے کہ یہ بنی اسرائیل پر نازل نہیں ہوا ۔ اگر موعود نبی بنی اسرائیل میں سے ہوتا ۔ تو شریعت موسوی کلیۃً منسوخ نہ ہوتی ۔ اسی بات کا جواب قرآن کریم نے یہاں دیا ہے ۔ چنانچہ پہلی آیت میں اصل مضمون کی طرف پھر توجہ دلائی ہے کہ یہ اہل کتاب تم پر (یعنی مسلمانوں یا بنی اسمٰعیل پر) وحی الٰہی کا آنا پسند نہیں کرتے ۔

یہ شریعت کس معنی میں موسوی شریعت کی مثل ہے : اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم نے شریعت موسوی کو منسوخ کر دیا یا فراموش کرا دیا تو اس سے بہتر یا اس کی مثل شریعت ہم نے تم کو دیدی ہے ۔ بہتر یا مثل اس لیے کہا کہ بعض احکام تو وہی رہتے ہیں لیکن اس کی تعلیم کا اکثر حصّہ شریعت موسوی سے بہتر ہے وہ ایک قوم کے لیے تھی یہ کل قوموں کے لیے ہے وہ ایک زمانہ کے لیے تھی ۔ یہ کل زمانوں کے لیے ہے ۔ ایسا ہی بہت سی باریک باتیں ابتدائی زمانہ کے لحاظ سے پہلے ظاہر نہ کی گئی تھیں اب جب عقل انسانی میں پختگی بڑھ گئی تو زیادہ باریک باتیں نازل کی گئیں بخیر منھا او مثلھا کی ایک توجیہ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے تو یہ شریعت موسوی شریعت سے افضل ہے مگر پیشگوئی میں بلحاظ ایک نئی شریعت ہونے کے اسے مثل بھی کہا گیا ہے ۔ جیسا کہ استثناء ۱۸ : ۱۸ والی پیشگوئی ہے ۔

وجوہات کہ یہاں نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے نہ نسخ آیات قرآنی کا : سیاق و سباق کے لحاظ سے ان معنوں کی صحت پر کچھ شک نہیں ہو سکتا ۔ مگر مفسرین نے اس آیت سے قرآن کریم کی بعض آیات کا بعض سے منسوخ ہونا مراد لے لیا ہے جو بالکل بے تعلق مضمون ہے ۔ یہاں نہ پہلے نہ پیچھے کوئی ایسی آیت ہے جو دوسری سے منسوخ ہوئی ہو یا دوسری کی ناسخ ہو بلکہ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت تک کسی ایسی آیت کے نازل ہونے کا ثبوت نہیں ملتا جس نے کسی پہلی نازل شدہ آیت کو منسوخ کر دیا ہو ۔ پس جب یہ جھگڑا ابھی اب تک پیش نہیں آیا جب کسی کا اعتراض کرنا ہی ممکن نہ تھا تو یہاں نسخ آیات قرآنی کے مضمون کو بیان کرنا بالکل بے معنی بات ہے یہ دوسری قطعی دلیل اس بات پر ہے کہ یہاں نسخ آیات قرآنی کا ذکر نہیں بلکہ نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے ۔

قرآن کریم کا معجزہ کہ آنحضرت کبھی اسے بھولے نہیں : تیسری قطعی دلیل یہ ہے کہ یہاں نسخ کے ساتھ فراموش کرا دینے کا ذکر ہے لیکن قرآن کریم کے متعلق قطعی طور پر فرمایا سنقرئک فلا تنسیٰ (الاعلیٰ ۸۷ ـ ۶) ہم جو کچھ تجھ کو پڑھائیں گے تُو اسے نہیں بھُولے گا ۔ اور اس کے آگے جو یہ فرمایا الا ماشاء اللہ مگر جو اللہ چاہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ کچھ حصّہ بھول بھی جاؤ گے ۔ کیونکہ اس طرح عبارت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے ۔ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہیں بھُولے گا مگر بھول جائے گا ۔ یوں کوئی معمولی آدمی بھی گفتگو نہیں کر سکتا چہ جائیکہ قرآن جیسی پُرحکمت کتاب کی طرف یہ بات منسوب ہو ۔ الا ماشاء اللہ کے معنی صاف ہیں کہ اور بعض باتیں تو تم بھول بھی جاتے ہو مگر ہمارے پڑھانے کا یہ اثر ہے کہ جو ہم پڑھائیں گے اُسے ہرگز نہ بھولو گے ۔ اور امر واقع بھی یوں ہی ہے ۔ نبی کریم صلعم پر بیس بیس رکوع کی سورت ایک وقت نازل ہوئی ہے اور آپ کو کبھی اس کا ایک لفظ نہیں بھولا ۔ پھر بفرض محال اگر آنحضرت بھول جائیں تو ساتھ ساتھ جو لوگ حفظ کرتے چلے جاتے تھے اور جن کی تعداد گو پہلے تھوڑی تھی مگر اب مدینہ آ کر سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی وہ سب کے سب کس طرح بھول جاتے اور ایک بھولتا تو دوسرا فوراً اسے درست کر دیتا جس طرح آج بھی جب ایک حافظ قرآن ایک لفظ کو غلط پڑھتا ہے تو دوسرا اس کے پیچھے درست کرنے کو کھڑا ہوتا ہے ۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ نہ صرف ہر ایک آیت حفظ ہی کی جاتی ہے بلکہ لکھی بھی جاتی ہے اس تحریر کو کون محو کر دیتا تھا نہ اس کے محو کرنے کا یہاں کوئی ذکر ہے یہاں صرف فراموش کرانے کا ذکر ہے ۔ ہاں فراموش پہلی شرائع کی بعض باتیں ہو گئیں جو مرور زمانہ سے بالکل دنیا سے نابود ہو گئیں ۔ پس اس لحاظ سے بھی نسخ شرائع سابقہ کا ذکر ہے ۔ نہ نسخ آیات قرآنی کا ۔

نسخ کی کوئی روایت آنحضرت تک نہیں پہنچتی : رہا یہ سوال کہ قرآن کریم کی کوئی آیت جو اس وقت بین الدفتین موجود ہے آیا وہ منسوخ ہے ؟ کچھ روایات ضرور ایسی ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان میں سے کوئی روایت نبی کریم صلعم تک نہیں پہنچتی ۔ یعنی کسی روایت میں یہ نہیں کہ نبی کریم صلعم نے کسی آیت کو منسوخ فرمایا ، حالانکہ اگر نسخ آیات قرآنی کا مسئلہ درست ہوتا تو کوئی نہ کوئی روایت نبی کریم صلعم تک بھی پہنچ جاتی ۔ **صحابی کا قول نسخ پر حجت نہیں :** پس جب خود نبی کریم صلعم کسی آیت کو منسوخ قرار نہیں دیتے اور ہر آیت کا قابل عمل ہونا خود رسول اللہ صلعم کے منہ سے ثابت ہے تو محض کسی صحابی کے قول سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی ۔ صحابی کا قول تو ویسے بھی حجّت نہیں چہ جائیکہ آیات قرآنی کے بارہ میں جو قرآن شریف میں موجود ہیں کسی آیت کو محض ایک صحابی کے قول کی وجہ سے منسوخ مانا جائے ۔

روایات نسخ میں ایک دوسرے کی تردید : دوسری بات روایات نسخ کے متعلق یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں اکثر ان روایات کی یہ حالت ہے کہ جہاں ایک صحابی کی رائے ایک آیت کے منسوخ ہونے کے متعلق ہے وہیں دوسرے صحابی کی رائے اس کے غیر منسوخ ہونے کے متعلق ہے پس معلوم ہوا کہ خود روایات ایک دوسری کی تردید کرتی ہیں پس نسخ کا مسئلہ اور بھی کمزور ہو جاتا ہے ۔

روایات نسخ ضعیف ہیں : تیسری بات یہ ہے کہ ایسی کل روایات ضعیف ہیں ۔ چنانچہ طبرسی کا قول ہے الروایات فی النسخ کلھا ضعیفۃ ۔

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٠٧﴾

اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں اور نہ کوئی مددگار ہے ع١٣٩

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١٠٨﴾

بلکہ تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو، جس طرح پہلے موسیٰؑ سے سوال کیا گیا تھا اور جو کوئی ایمان کے بدلے کفر لے لیتا ہے وہ ضرور سیدھے رستے سے بھٹک گیا ع١٤٠

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٩﴾ الربع

اہل کتاب میں سے بہت سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں لوٹا کر کافر بنا دیں اپنے حسد کی وجہ سے، اس کے بعد کہ ان پر حق کھل گیا سو معاف کرو اور خیال میں نہ لاؤ یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے اللہ ہر چیز پر قادر ہے ع١٤١

تعداد آیات منسوخ میں بھاری اختلاف: چوتھی بات یہ ہے کہ بعض نے صرف پانچ آیات کو منسوخ کہا اور بعض نے کئی سو آیات کو منسوخ کہدیا ہے۔ اس قدر اختلاف بتاتا ہے کہ محض ایک رائے کی بات ہے اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب ایک شخص ایک آیت کو دوسری کے ساتھ تطبیق نہیں دے سکا تو اس نے اُسے منسوخ کہہ دیا۔

اختلاف قبول کر کے منسوخ کہنا قرآن کے خلاف ہے: یہ بھی نہیں سوچا کہ آیا فی الواقع جسے منسوخ کہدیا ہے وہ پہلے کی نازل شدہ ہے بھی یا نہیں اور تطبیق دینے کی بجائے منسوخ کہنا گویا قرآن کریم میں اختلاف قبول کرنا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اختلاف نہ ہونے کو بطور دلیل پیش کیا ہے ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (النساء ٤-٨٢) پس اگر قرآن کریم میں اختلاف قبول کیا جائے تو وہ من عند اللہ نہیں اور اگر اختلاف نہیں تو نسخ کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنے اپنے موقعہ پر دکھایا جائے گا کہ جہاں تطبیق نہ دے سکنے کی وجہ سے نسخ مانا گیا ہے وہاں تطبیق دی جا سکتی ہے پس نسخ آیات قرآنی کا مسئلہ بالکل باطل ہے اور یہاں سابقہ شرائع کے نسخ کا ذکر ہے۔

ع١٣٩ یہاں ملک کے لفظ میں نبوت دینے کی طرف اشارہ ہے دیکھو ع١٢٧ دوسری جگہ فرمایا فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتاب والحکمۃ و اٰتینا ھم ملکا عظیما (النساء ٤-٥٤) یعنی اب بھی ہم نے آل ابراہیم (محمد رسول اللہ صلعم) کو ہی کتاب اور حکمت دی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کو بڑا ملک دیا ہے۔ "تو" میں ہر مخاطب مراد ہے جیسا کہ ضمیر جمع نے بعد میں آ کر صاف کر دیا۔

ع١٤٠ یہودیوں کے گستاخانہ سوالات: یہاں یہودی مخاطب ہیں رسولکم سے مراد وہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا۔ ایسے گستاخانہ سوال یہودی ہی کرتے تھے جیسا کہ قرآن شریف میں دوسری جگہ صاف فرمایا یسئلک اھل الکتاب ان تنزل علیھم کتابا من السماء لقد سالوا موسٰی اکبر من ذٰلک (النساء ٤-١٥٣) اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو اُن پر آسمان سے کتاب اتارے سو موسیٰؑ سے انہوں نے اس سے بھی بڑھ کر سوال کیا۔ ایمان کے بدلے کفر لینے سے مراد یہی ہے کہ ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرے جیسا کہ یہودیوں نے کیا۔

ع١٤١ حسدا۔ حسد یہ ہے کہ ایک شخص سے ایک نعمت کے زوال کی خواہش کی جائے جس نعمت کا وہ مستحق ہے اور لبسا اوقات اس میں اس کے دور کرنے کی بھی کوشش ہوتی ہے (غ) اور جو دوسرے جیسی نعمت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ غبطہ ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ يَغْبِطُ وَالْمُنَافِقُ يَحْسُدُ یعنی مومن غبط کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے اور نہایہ میں ہے کہ حَسَد یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کا زوال چاہتا ہوا اس کے خود حاصل کرنے کی خواہش کرے اور غَبط یہ ہے کہ صرف یہ خواہش کرے کہ اسے بھی دوسرے جیسی نعمت مل جائے اور دوسرے سے زوال کی خواہش نہ کرے اور حدیث میں جو آتا ہے لاحسد الا فی اثنتین تو اس کے معنی کیے ہیں کہ کوئی حسد نہیں جو نقصان نہ پہنچائے مگر دو باتوں میں۔ مگر یہاں حسد کا استعمال غبط کے معنی میں ہے۔

اصفحوا۔ صفح کے معنی ہیں ترک ملامت کرنا اور یہ عفو سے بڑھ کر ہے (غ)

یہود کا بت پرستی کو توحید سے اچھا قرار دینا: یہاں بتایا کہ یہ یہود بھی گمراہ ہوتے ہوتے اس حد تک پہنچے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان حالت کفر کی طرف لوٹ جائیں یہ محض حسد ہے ورنہ کم از کم توحید کے مذہب کو بت پرستی سے تو اچھا سمجھتے۔ دوسری جگہ اہل کتاب کا قول کفار کے متعلق نقل کیا ہے ھٰؤلاء اھدٰی من الذین اٰمنوا سبیلا (النساء ٤-٥١) یہ مومنوں سے زیادہ ہدایت کی راہ پر ہیں۔ کفار قریش اور یہود کی اسلام کی بیخکنی کے لیے غرض واحد تھی۔ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمان دین اسلام پر نہ رہیں اور اسی غرض کے لیے جنگ کرتے تھے۔ ولا یزالون یقاتلونکم حتّٰی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا (٢١٧)

جنگوں میں مسلمانوں کا عفو پر عمل: اللہ کے اپنا امر یا حکم لانے سے منشاء یہ ہے کہ اسلام کی بادشاہت قائم ہو جائے فرمایا اس سے پہلے یہ تو نہیں ٹلیں گے پس تم ہی عفو و درگزر سے کام لو۔ مسلمانوں کا جنگ کرنا صرف اپنی حفاظت کے لیے اور اسلام کی حفاظت کے لیے تھا انتقام کے طور پر کبھی جنگ نہیں کی۔ عین جنگ کے اندر پھر فتح کے بعد اسی تعلیم عفو و درگزر پر عمل رہا۔ فتح مکہ کے بعد لا تثریب علیکم الیوم اسی حکم کی تعمیل میں فرمایا پس اس آیت کو منسوخ کہنا صریح غلطی ہے۔

وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۱۱۰﴾

اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ دو، اور جو کوئی بھلائی اپنے لیے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے پاس پاؤ گے، اللہ اُسے دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو ۱۴۲

وَقَالُوۡا لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ اِلَّا مَنۡ کَانَ ہُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی ؕ تِلۡکَ اَمَانِیُّہُمۡ ؕ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۱۱﴾

اور کہتے ہیں کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے اُن کے جو یہودی ہوں یا عیسائی، یہ اُن کی آرزوئیں ہیں کہہ اپنی سند لاؤ اگر تم سچے ہو ۱۴۳

بَلٰی ٭ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡہَہٗ لِلّٰہِ وَہُوَ مُحۡسِنٌ فَلَہٗۤ اَجۡرُہٗ عِنۡدَ رَبِّہٖ ۪ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

ہاں جس نے اپنے آپ کو اللہ کا فرماں بردار بنایا اور وہ احسان کرنے والا ہے تو اُس کا اجر اُس کے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱۴۴

ع ۱۴۲ نماز بطور علاج: کیا اس سے پہلے مسلمان نماز نہ پڑھتے تھے؟ کسی حکم کے دینے کا منشاء لازماً یہ نہیں ہوتا کہ اس سے پہلے اس کے خلاف ہو رہا تھا۔ یہاں اوپر کی آیت میں مسلمانوں کی مشکلات کا ذکر کیا کہ اہل کتاب اس قدر دشمن ہو رہے ہیں کہ اسلام سے ہی برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان مشکلات کا علاج یہاں بتایا کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ مصیبت میں نماز بہترین علاج ہے۔ گویا انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے مگر صرف نماز سے انسان اپنے کمال کو حاصل نہیں کرتا، جب تک کہ زکوٰۃ کی صورت میں ہمدردیٔ مخلوق ساتھ نہ ہو۔ آخر پر فرمایا کہ نماز پڑھ کر تم خدا کا کچھ نہیں بناتے اپنی ہی جان کی بھلائی کے لیے کچھ کام کرتے ہو جس کا نتیجہ بعد میں ظاہر ہوتا ہے۔ ضائع کچھ نہیں ہوتا اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔

ع ۱۴۳ بَرِہ (روشن ہُوا) سے بُرۡہَان وہ دلیل ہے جو دعویٰ کو روشن کر دے جو نہایت مضبوط اور لامحالہ سچی ہو (غ)

اِلّا من کان ھودًا او نصاریٰ۔ ھود جمع ھائد ہے اور ھاد کے لیے دیکھو ۹۲ قالوا میں یہود و نصاریٰ دونوں شامل ہیں اور یہ اصل میں دو جملوں کا اختصار کر کے ایک کر دیا ہے یعنی یہودی کہتے تھے کہ یہودیوں کے سوائے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔ عیسائی کہتے تھے کہ عیسائیوں کے سوائے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔ جیسا کہ آیت ۱۱۳ سے ظاہر ہے ان کے اسی قول کو امانی یعنی آرزو یا دعویٰ باطل قرار دیا ہے اور ان سے دلیل مانگی ہے۔ یہودی کہتے تھے بغیر شریعت موسوی کے نجات نہیں، عیسائی کہتے تھے بغیر کفارہ کے نجات نہیں مگر کوئی دعویٰ بلا دلیل قبول نہیں ہو سکتا۔ قرآن دعویٰ کی دلیل دیتا ہے: دونوں کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اس لیے عیسائیوں نے تو آخر مذہب ہی یہ بنا لیا کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں۔ یہودی بھی محض کورانہ تقلید کے طور پر مذہب کو پیش کرتے ہیں۔ دونوں کے خلاف اسلام روشن دلائل سے کام لیتا ہے یہیں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ اسلام ہر دعویٰ کی دلیل بھی پیش کرتا ہے۔

ع ۱۴۴ اسلم۔ سَلِمَ سے ہے جس کے معنی ہیں ظاہری اور باطنی آفات سے بچے رہنا اور اِسلام کے معنی ہیں سلامتی میں داخل ہونا اور اَسۡلَمۡتُ الشَّیۡءَ اِلٰی فلانٍ کے معنی ہیں میں نے چیز دوسرے کو سونپ دی اور اسلام شریعت میں دو طرح پر ہے ایک محض زبان کے ساتھ اقرار کرنا اور یہ ایمان سے کمتر ہے مگر اس کے ساتھ اسلام کے ظاہری احکام جاری ہو جاتے ہیں جیسے قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا (الحجرات ۴۹: ۱۴) میں اور دوسرا یہ کہ اقرار لسان کے ساتھ دلی اعتقاد اور عمل کے ساتھ وفا یعنی اقرار کو پورا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے آپ کو بکلی سپرد کر دینا بھی ہو۔ ان تمام باتوں میں جو اس کے قضا و قدر میں ہوں (غ) یہی دوسرے معنی یہاں مراد ہیں۔

وجہ۔ مُنہ ہے۔ اور چونکہ وجہ پہلی چیز ہے جو سامنے آتی ہے اور ظاہر بدن میں سب سے اشرف چیز ہے۔ اس لیے ہر سامنے آنے والی چیز پر اور ہر اشرف چیز پر اور اس کے آغاز پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اور لبسا اوقات وجہ کہہ کر ذات یعنی خود وہ چیز مراد لی جاتی ہے اور اس کے معنی توجہ بھی ہیں (غ)

نجات عمل سے ہے نہ الفاظ سے: یہود و نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ ان کے سوائے دوسرے لوگ جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ جب آیت ماقبل میں اس کو دعویٰ بلادلیل کہہ کر رد کیا تو اب یہ بتایا کہ مذہب دعوے کا نام نہیں بلکہ طریق عمل کا نام ہے اور جنت میں وہی داخل ہوتا ہے جو اس طریق عمل کو اختیار کرتا ہے جو جنت تک پہنچانے والی ہے منہ سے ایک یا دوسری بات کہہ دینا جنت میں نہیں پہنچاتا۔ اس میں ایک مسلمان کو تو یہ سمجھایا کہ نرا دعویٰ اسلام بھی جنت تک نہیں پہنچاتا جب تک وہ اس طریق عمل پر چلنے کے لیے پورا زور نہ لگائے جو اسلام نے بتایا ہے اور دوسرے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ وہ طریق عمل جو خدا تک پہنچاتا تھا وہ تم میں باقی نہیں رہا۔ طریق عمل جو جنت میں پہنچاتا ہے: وہ طریق عمل کیا ہے اپنی ساری توجہ کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگا دینا۔ اپنے آپ کو بکلی خدا کو سونپ دینا مگر نہ اس شخص کی طرح جو دنیا سے انقطاع کرلے۔ بلکہ خدا کی ایسی فرمانبرداری جس کا نتیجہ بنی نوع انسان کے ساتھ احسان اور مخلوق خدا کی خدمت گزاری ہو اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری جو نفس انسانی کا اپنی ذات میں کمال ہے اور مخلوق خدا کی خدمتگزاری جو دوسروں کی تکمیل میں معاون ہوتا ہے یہ سچے مذہب کے دو ستون ہیں

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪
وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ
وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا
يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١١٣﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ
فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ
لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى
الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١١٤﴾

اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی کسی (سچائی) پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہودی کسی (سچائی) پر نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں اسی طرح انہی کے قول کی مانند وہ لوگ کہتے ہیں جو کچھ نہیں جانتے سو اللہ اُن کے درمیان قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کریگا جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے ۱۴۵

اور اُس سے بڑا کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتا ہے کہ اُن میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور اُن کے ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے انکو مناسب نہ تھا کہ اُن میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور انکے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے ۱۴۶

اور ان کو کمال تک صرف اسلام نے پہنچایا۔

خوف و حزن سے نجات: اور آخر پر فرمایا کہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنت جو آخرت میں ملتی ہے اس کی ابتدا اسی زندگی سے ہوتی ہے اور اس زندگی میں وہ جنت یہ ہے کہ انسان پر خوف نہ رہے نہ وہ غمگین ہو جس کی تشریح کے لیے دیکھو ع ۵۹ یعنی وہ لوگ اللہ کی کامل فرمانبرداری جب کرتے ہیں تو شیطان بھی ان کا تابع ہو جاتا ہے اس لیے اس کے پھسلانے کا خوف ان کو باقی نہیں اور چونکہ ان کا وقت مخلوقِ خدا کی بہتری میں صرف ہوتا ہے اس لیے گزشتہ کے متعلق ان کو حزن بھی نہیں ہوتا۔ پس اس مقام پر پہنچ جانا یعنی ایک طرف گناہ کی غلامی سے آزاد ہونا اور شیطان کو فرمانبردار بنا لینا اور دوسری طرف مخلوق خدا کی بھلائی میں لگ جانا اس دنیا کی جنت ہے اور یہی آخرت کی جنت کی دلیل ہے۔

ع ۱۴۵ ہر مذہب میں سچائی کے ہونے کی تعلیم: جب اس بات کو بیان کیا کہ نجات کس طرح حاصل ہوتی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ کسی مذہب کے متعلق یہ نہ کہنا چاہیئے کہ اس میں کوئی بھی سچائی نہیں۔ یہود اور نصاریٰ ایک ہی کتاب بائبل کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر پھر بھی ضد میں آ کر یہی کہتے ہیں کہ دوسرے فریق کے مذہب میں کچھ بھی صداقت نہیں۔ یہ جاہل لوگوں کا کام ہے کہ جب اپنے مذہب کی صداقت کو بیان کرنا شروع کیا تو دوسرے کے سب کو سراسر باطل اور تمام قسم کی خوبیوں سے خالی کہدیا۔ نجات کامل بیشک اسی میں ہے کہ کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگ جائے اور مخلوق خدا کے ساتھ احسان اس کی زندگی کا مقصد ہو۔ مگر تاہم کچھ نہ کچھ صداقت ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ غلط عقاید پر اس دنیا میں گرفت نہیں: ہاں عقاید مذہبی کے اختلاف کا فیصلہ یہاں نہیں ہوگا۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی کا عقیدہ ذرا غلط ہوا تو اللہ تعالیٰ اُسے فوراً ہلاک کر دے یا کسی دُکھ میں مبتلا کر دے جو کمی غلط عقاید کی وجہ سے رہ جاتی ہے اس کا کھلا ظہور قیامت کے دن ہی ہوگا اور وہیں اس کے پُورا کرنے کا سامان بھی ملیگا۔ اگلی آیت میں فرمایا کہ جو لوگ عبادتگاہوں کو ویران کرتے ہیں اور خدا کی عبادت سے روکتے ہیں ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے۔

ع ۱۴۶ مَسْجِد۔ سجدہ کرنے کی جگہ یعنی عبادتگاہ کا نام ہے (ت) بیت المقدس کو بھی مسجد ہی کہا ہے۔ مگر دوسری عبادتگاہوں کے بالمقابل خصوصیت سے یہ لفظ اسلام کی عبادتگاہ پر بولا جاتا ہے۔ جیسے لھدّمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا (الحج ۲۲۔ آیت ۴۰)

خراب۔ عمارۃ یعنی آباد کرنے کی ضد ہے۔

خزی۔ انکسار کا پہنچنا ہے خواہ اپنی طرف سے ہو یا غیر کی طرف سے (غ) پس محض روکنے میں آخر کار ناکامی بھی خزی ہے اور دوسرے کا مغلوب ہو جانا بھی۔ خدا کی عبادت سے روکنے کی سزا اسی دنیا میں ملتی ہے: پہلی آیت میں اختلاف عقاید کا ذکر کیا تھا کہ اس کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا۔ یہاں فرمایا کہ جو لوگ دنیا میں شرارت میں حد سے بڑھ جاتے ہیں یہاں تک کہ مسجدوں میں خدا کی عبادت کو روکنے لگ جاتے ہیں اور ان کو ویران کرتے ہیں۔ ان کو سزا بھی دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے جس طرح ایک دوسرے کے مذہب کو ہر قسم کی خوبی سے عاری بتایا اسی طرح ایک دوسرے کو ان کی عبادتگاہوں سے بھی روکا اور ایک دوسرے کے ایسے دشمن ہو گئے کہ ہر فریق دوسرے کی بیخکنی کے در پے رہا جب اس کو طاقت ملی۔ اسی لحاظ سے مسجدوں سے روکنے کا ذکر کیا۔ مگر اس کو نبی کریمؐ کے اعدا کی حالت پر چسپاں کر کے بطور پیشگوئی ان اعدا کی ناکامی کا ذکر کیا۔ مساجد سے مراد مسجد حرام: نبی کریم صلعم کو اگر مشرکین نے مسجد حرام سے روکا (جس کی طرف لفظ مساجد میں اشارہ ہے اس لیے کہ وہ تمام دنیا کی مساجد کا مرکز ہے) تو یہود اور عیسائی بھی انہی کے معاون ہو گئے اس لیے ان کا انجام بھی اس پیشگوئی میں مذکور ہے اور جس طرح پہلی آیت میں یہ بتایا کہ کسی مذہب میں صداقت سے انکار نہیں کرنا چاہیئے یہاں یہ بتایا کہ تمام مذاہب

وَلِلّٰہِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ٭ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کا ہے، پس جدھر تم متوجہ ہو گے اُدھر ہی اللہ کی توجہ بھی ہوگی، اللہ فراخی والا جاننے والا ہے ۱۴۷

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ۙ سُبۡحٰنَہٗ ؕ بَلۡ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾

اور کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنالیا، وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے، سب اس کے فرمانبردار ہیں ۱۴۸

کے پیروؤں کو عبادت میں آزادی دینی چاہیئے۔

مسلمانوں کا مسلمانوں کو مساجد سے روکنا: آنحضرت صلعم کے زمانہ میں تو کافر ہی مساجد سے روکتے تھے مگر آج تو مسلمان خود بھی اپنے مسلمان بھائیوں کو مساجد سے روکتے ہیں اور ایک فرقہ کا مسلمان دوسرے فرقہ کے مسلمانوں کو اپنی مسجد میں آنے نہیں دیتا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں ذلت اُٹھا رہے ہیں۔

دنیا کی سزا آخرت کی سزا پر بطور دلیل: یہاں دنیا کی سزا کو آخرت کی سزا کے لیے بطور پیش خیمہ اور ثبوت بیان فرمایا ہے جس وقت یہ لفظ نازل ہوئے اس وقت دشمنانِ اسلام کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی طاقت اور قوت کا خاتمہ ہو کر ان کو ذلت کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں یہ غیر متوقع امر صفائی سے پیش آیا اور یہودیوں اور دُوسرے دشمنان اسلام کا چند ہی سال میں ذلیل ہو جانا قرآن شریف کی صداقت پر ایک بڑا بھاری نشان ٹھہرا۔

ع ۱۴۷ ثَمَّ۔ ظرف ہے اور اس سے دور کے مکان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

واسع۔ سَعَۃ فراخی ہے خواہ بلحاظ مکان ہو یا بلحاظ حالت یا فعل اور واسع اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک ہے اور اس کی قدرت اور علم اور رحمت اور فضلوں کی فراخی پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے ورحمتی وسعت کل شیٔ (الاعراف۔۱۵۶) اور فرمایا وسع ربی کل شیٔ علما (الانعام۔۸۰) (غ)

خانہ کعبہ سے روکا جانے پر مسلمانوں کو تسلّی: یہاں قبلہ کا ذکر سمجھ کر جس پر کوئی قرینہ نہیں بعض نے اسے قبلہ بیت المقدس کے ناسخ اور بعض نے فولّ وجھک سے منسوخ بتایا ہے مگر اس آیت میں قبلہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ چونکہ پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ مسلمانوں کو مساجد سے یا خدا کی عبادت سے روکا جاتا ہے تو یہاں مسلمانوں کو تسلّی دی ہے کہ اگر ان کو خانہ کعبہ سے روکا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی توجہ خانہ کعبہ پر محدود نہیں بلکہ اے مسلمانو! اگر تم مسلمان ہو تو جہاں جاؤ گے اللہ کی توجہ وہیں تمہارے ساتھ ہوگی اور دوسرے جس طرح پہلی آیت میں پیشگوئی کی تھی کہ مسجدوں سے روکنے والوں یعنی اعدائے اسلام کے لیے بالآخر ناکامی ہے۔ بشارتِ فتوحات: یہاں اسی کی مزید وضاحت یوں کی کہ مسلمانوں کو غالب کیا جائے گا اور جن مسجدوں سے ان کو روکا جاتا ہے صرف یہی نہیں کہ ان پر ان کا پُورا تصرف ہوگا بلکہ ان کو اس قدر فتوحات دی جائیں گی کہ وہ جدھر منہ پھیریں گے اُدھر ہی فتح و ظفر ان کے ساتھ ہوگی اور اُدھر ہی اللہ کی توجہ بھی ہوگی۔ کیونکہ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے ہمارے لیے اس میں یہ تسلّی ہے کہ وہ خدا جس نے ایک زمانہ میں مشرق میں اسلام کو غالب کیا وہی اب مغرب میں بھی اسے غالب کرے گا۔

ع ۱۴۸ ولد بمعنی مولود ہے جو جنا گیا۔ اور واحد جمع چھوٹے بڑے پر استعمال ہوتا ہے اور متبنّیٰ کو بھی وَلَد کہا جاتا ہے او نتخذہ ولدا (یوسف ۱۲۔۲۱) (غ)

لفظ ولد کا استعمال مجازی: اور مجازاً کہا جاتا ہے ارض البلقاء تلد الزعفران یعنی بلقاء کی سرزمین سے زعفران پیدا ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے اللیالی حبالیٰ لیس یدری مایلدن۔ راتیں حاملہ ہیں کوئی نہیں جانتا ان سے کیا ظاہر ہونے والا ہے اور کہا جاتا ہے صحبۃ فلان ولادۃ للخیر فلاں کی صحبت سے خیر پیدا ہوتی ہے (ت) اور تولید بمعنی تربیت آتا ہے اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی کو فرمایا تھا انا ولدتک جس کے معنی ہیں میں نے تمہاری تربیت کی ہے۔ نصاریٰ نے اسے وَلَد سمجھ لیا اور تحریف کی (ت)

قانتون۔ قنوت خضوع کے ساتھ طاعت کو لازم کر لینا اور محض خضوع اور محض طاعت پر بھی بولا جاتا ہے (غ)

عیسائی عقیدہ کی بنیاد: یہاں عیسائیوں کے عقیدہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سورت میں زیادہ تر بحث یہود کی غلطیوں سے کی ہے اور کسی قدر عیسائیوں کی اور آل عمران میں عیسائیت پر مفصّل بحث ہے، یہودیت سے کم۔ اتمام حجت کے لیے یہاں عیسائیوں کے عقیدہ کی اصل بنیاد کو لیا ہے یعنی مسیح کی ابنیت کا عقیدہ۔ کیونکہ کفارہ کا مدار بھی ابنیت مسیح پر ہی ہے۔

ابنیت مسیح کا عقیدہ: عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن نے عیسائیوں کی طرف اتخاذ ولد کا عقیدہ منسوب کیا ہے حالانکہ وہ ابن مانتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ولد کا لفظ صرف حقیقت پر بولا جاتا ہے۔ اور ابن مجازاً بھی بولا جا سکتا ہے۔ یوں تو قرآن شریف نے دونوں لفظ بولے ہیں یعنی یوں بھی فرمایا ہے وقالت النصاریٰ المسیح ابن اللہ (التوبہ ۹۔۳۰) مگر اکثر ذکر اس عقیدہ کا لفظ اتخاذ ولد میں ہی کیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ان کے عقیدہ کی نامعقولیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ خدا کا بیٹا بطور مجاز: ظاہر ہے کہ اگر عیسائی مسیح کو مجاز کے رنگ میں خدا کا بیٹا مانتے ہیں تو مجازاً یہ لفظ اوروں پر بھی بولا گیا ہے اسرائیل خدا کا بیٹا بلکہ نخست زادہ کہلایا (خروج ۴ : ۲۲) اور خود مسیح کہتے ہیں "مبارک وے جو صلح کرنے والے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے" (متی ۵ : ۹) اور پھر کہتے ہیں "اور جو تمہیں دُکھ دیں اور ستاویں ان کے لیے دعا مانگو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے بنو (متی ۵ : ۴۴ و ۴۵) یعنی ہر ایک شخص راستباز بن کر خدا کا بیٹا بن سکتا یا کہلا سکتا ہے۔ انجیل کی شہادت کہ مسیح مجازاً خدا کا بیٹا کہلایا: اور یہی مجازاً استعمال اس لفظ کا ہے اور انجیل گواہ ہے کہ مسیح نے

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا
فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾
وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ
تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا

مادہ کے بغیر آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے ۱۴۹ع اور جب ایک کام کا
حکم کرتا ہے تو اُسے کہہ دیتا ہے، ہو، سو وہ ہو جاتا ہے ۱۴۹ف
اور جو لوگ کچھ نہیں جانتے، کہتے ہیں کیوں اللہ ہم سے کلام نہیں کرتا
یا ہمارے پاس نشان نہیں آتا، اسی طرح انہی کے قول کی مانند اُن
لوگوں نے کہا، جو اُن سے پہلے تھے اُن کے دل ایک ہی جیسے ہیں

اپنے لیے بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا تھا جن معنوں میں دوسروں پر اس کا بولنا جائز ہے چنانچہ جب یہودیوں نے اسے کہا کہ ہم تجھے پتھراؤ کریں گے اس لیے کہ تو کفر بکتا ہے اور اپنے آپ کو خدا کہتا ہے تو حضرت مسیح نے یوں جواب دیا "اور کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا کہ میں نے کہا۔ تم خدا ہو جبکہ اس نے اُنہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا ...... تم اس شخص سے جسے باپ نے مخصوص کرکے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے اس لیے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں" (یوحنا ۱۰: ۳۳-۳۶) پس مجاز کے رنگ میں خدا کا بیٹا بننے سے تو مسیح کی کوئی خصوصیت نہ رہی۔ اور اگر اس کی خصوصیت قائم کی جائے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں تو پھر اسے حقیقی طور پر خدا کا بیٹا ماننا پڑے گا۔ اسی لیے قرآن کریم نے اتخذ اللہ ولدا کو ان کی طرف منسوب کیا اور اسی لیے اس پر یہ اعتراض کیا ولم تکن لہ صاحبۃ حقیقی بیٹا تو بغیر بی بی کے ہو نہیں سکتا اور تم خود بی بی کے قائل نہیں ہو۔

ابنیت کے عقیدہ سے خدا میں نقص ماننا پڑتا ہے: عیسائیوں کی اس خطرناک غلطی کا جہاں کہیں ذکر ہے اس کے بعد لفظ سبحان اللہ تعالیٰ کی شان میں بولا ہے سبحان کے معنی ہیں کہ وہ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ اور بیٹا بنانے میں نہ صرف اس کی طرف ایک ظاہری عیب ہی منسوب کرنا پڑتا ہے کہ جس طرح باپ بیٹے کا محتاج ہوتا ہے خدا بھی بیٹے کا محتاج ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی عیب ماننا پڑتا ہے کیونکہ بیٹے کی ضرورت یہ بتائی جاتی ہے کہ خدا باپ میں عدل ہے رحم نہیں اور بیٹے میں رحم ہے پس خدا کی صفات ناقص ہوئیں جہاں رحم جیسی چیز ہی موجود نہیں۔ اس لیے جواب دیا کہ وہ عقیدہ صحیح نہیں ہو سکتا جو خدا کی طرف عیب منسوب کرتا ہے۔

ابنیت کے تعلق سے بڑھ کر مخلوق ہونے کا تعلق ہے: اس کے بعد یہ فرمایا کہ زمین اور آسمان میں سب کچھ اسی کا ہے اور سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ یہاں بھی ابنیت کی تردید کی ہے اس لیے کہ فرمایا کہ خدا تو سب کا خالق اور سب کا مالک ہے اور سب اس کے پورے پورے فرمانبردار ہیں۔ حالانکہ باپ بیٹے کا نہ خالق ہوتا ہے نہ مالک اور نہ ہی بیٹا باپ کا کامل فرمانبردار ہو سکتا ہے پس جب خدا میں اور اس کی مخلوق میں باپ اور بیٹے کے تعلق سے بڑھ کر تعلق پہلے ہی موجود ہے تو پھر بیٹا بنانا لاحاصل ہوا۔

۱۴۹ع بدع یا ابداع کے معنی ہیں ایسا بنانا جس کا پہلے نمونہ موجود نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے جب یہ لفظ استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں بغیر آلہ اور مادہ اور زمانہ اور مکان کے کسی چیز کا وجود میں لانا (غ)، اور بدعت شریعت میں نئی بات داخل کرنے کا نام ہے۔

بغیر مادہ کے پیدا کرنے والا بیٹے کا محتاج نہیں: یہ آیت بھی ابنیت کے عقیدہ کی تردید کرتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ صاف فرمایا بدیع السموات والارض انی یکون لہ ولد ولم تکن لہ صاحبۃ وخلق کل شئ وھو بکل شئ علیم (الانعام ۶-۱۰۲) جب خدا چیزوں کا ایسا خالق ہے کہ اس کو آلہ اور مادہ کی ضرورت نہیں اور بیٹے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہے تو بیٹے کا تجویز کرنا خدا کی طرف پھر کمزوری کا منسوب کرنا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی درست نہیں کہ وحدت سے کثرت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ خدا ایک مدبر بالارادہ ہستی اور متصرف کامل ہے۔ بےجان قانون کی طرح نہیں۔

۱۴۹ف قضیٰ۔ قضاء کے معنی ہیں ایک امر کا فیصلہ کر دینا قول سے ہو یا فعل سے اور اعلام یعنی اطلاع دیدینے اور حکم کے قطع کر دینے کو بھی قضاء کہا جاتا ہے پس قضیٰ امرا کے معنی ہوئے کسی بات کا فیصلہ کر دیتا ہے یا کسی حکم کو جاری کرنا چاہتا ہے۔ اور قضاء اور قدر میں یہ فرق ہے کہ قدر کے معنی اندازہ کرنا ہیں اور قضاء اس پر اجرائے حکم کر دینا یا اس کا قطع کر دینا (غ) یا قدر اندازہ ہے اور قضاء اس کا نفوذ ہے گویا ہر ایک معاملہ قضاء سے پہلے حالت قدر میں ہوتا ہے لکھا ہے کہ نبی صلعم ایک غار کے پاس سے گزر رہے تھے جہاں کچھ پتھر گرنے کو تھے تو آپ بھاگ کر آگے نکل گئے کسی نے کہا اتفر من قضاء اللہ کیا آپ اللہ کی قضاء سے بھاگتے ہیں فرمایا افر من قضاء اللہ الیٰ قدر اللہ میں اللہ کی قضاء سے اس کی قدر کی طرف بھاگتا ہوں۔

حکم کُن: مادہ کے غیر مخلوق ہونے کے قائل اعتراض کرتے ہیں کہ کن کا حکم کس کو دیتا ہے جواب ظاہر ہے کہ اس امر یا چیز کو جو علم الٰہی میں موجود ہے حکم ہوتا ہے کیونکہ قضاء سے پہلے قدر ہے اور وہ چیز اندازہ الٰہی میں آچکی ہے گو ظاہر میں اس کا وجود نہیں۔ مادہ کا مخلوق ہونا تو خود بدیع لاکر بتا دیا۔ یہاں یہ بتاتا ہے کہ جو کچھ انسانوں کے نزدیک ناممکن ہے اللہ تعالیٰ وہ بھی کر دکھائے گا۔ اس کے ہاں ناممکن کچھ بھی نہیں اور انسان کی محدود طاقت پر اللہ تعالیٰ کی غیر محدود طاقت کا اندازہ کرنا غلط ہے۔

الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾
اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ لَا
تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۹﴾
وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ
مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَىِٕنِ
اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾ (نصف منزل)
اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ

ہم نے اُن لوگوں کے لیے کھولکر باتیں بیان کردی ہیں جو یقین رکھتے ہیں ع۱۵۰
ہم نے تجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا
اور تجھ سے دوزخ والوں کے متعلق بازپرس نہ کی جائے گی ع۱۵۱
اور یہودی تجھ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے اور نہ ہی عیسائی، یہاں تک
کہ تو اُن کے مذہب کی پیروی کرے، کہہ اللہ کی ہدایت وہی (کامل) ہدایت
ہے اور اگر تو اُن کی گری ہوئی خواہشوں کی پیروی کرے اسکے بعد جو
تیرے پاس علم آیا تو تیرے لیے اللہ کی سزا سے بچانیوالا کوئی دوست اور نہ مددگار ہوگا۔ ع۱۵۲
جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسکی پیروی کرتے ہیں جیسا اس کی پیروی کا حق ہے

ع۱۵۰ یوقنون۔ یقین کے معنی ع۱۵ میں بیان ہو چکے ہیں۔ تاج العروس میں ہے کہ یقین شک کے دُور ہونے اور علم اور تحقیق امر کو کہتے ہیں پس الیقن یا الیوقن کے معنی یہ نہیں کہ ایک بات کو یوں ہی مان لے بلکہ اس کے لیے اس امر کا علم حاصل ہونا اور اس کی تحقیق بھی ضروری ہے یعنی قطعی طور پر اس کو درست پانا۔ پس قوم یوقنون سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس قوت یقین سے کام لیتے ہیں جو انسان کے اندر رکھی گئی ہے جس طرح قوم یعقلون سے مراد وہ لوگ ہیں جو قوت عقل سے کام لیتے ہیں اور قوت یقین سے کام لینا یہ ہے کہ جب انسان ایک امر کو تحقیق کے بعد درست پاتا ہے تو پھر چھوٹے چھوٹے شبہات اس کے دل میں نہیں اُٹھتے۔ اکثر لوگ جو حق سے محروم رہ جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں قوت یقین نہیں ہوتی یا اس سے کام نہیں لیتے اور چھوٹے چھوٹے شبہات میں مبتلا رہتے ہیں۔

خدا کے عام لوگوں سے کلام نہ کرنے کا اعتراض: نصاریٰ کی غلطی کے ذکر کے بعد اب جاہل لوگوں کی ایک غلطی کا ذکر کیا ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ خدا اُن سے خود اس طرح کلام کرے جس طرح رسولوں سے کلام کرتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ان کا قول نقل کیا ہے حتیٰ نوتی مثل ما اوتی رسل اللہ (الانعام ۱۲۴) یعنی کہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہم کو بھی وہی کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں پر نازل کیا جاتا ہے۔ مطالبہ نشانِ ہلاکت: اور یا اگر ان سے کلام نہیں کرتا تو ان پر ایک عظیم الشان نشان بھیجے۔ اٰیۃ کی تنکیر اس کی عظمت کے لیے ہے اور مراد یہ ہے کہ ہلاکت کا نشان نازل ہو جیسا کہ دوسری جگہ صاف مذکور ہے فلیاتنا باٰیۃ کما ارسل الاولون (الانبیاء ۲۱ - ۵) یعنی جب پہلوں کی ہلاکت کا ذکر بار بار قرآن شریف میں ہے تو وہی ہلاکت کا نشان ہم پر کیوں نہیں اُترتا۔ دونوں باتوں کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے۔

ع۱۵۱ بالحق۔ حق کے معنی کے لیے دیکھو ع۶۵ یہاں بالحق سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اقتضائے حکمت کے مطابق یعنی ضرورت حقہ کے پیش آنے پر تجھے بھیجا ہے اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حق یعنی صداقت دے کر تم کو بھیجا ہے کیونکہ وہ چیز جو رسول اللہ صلعم لائے حق ہی ہے۔

بشیر۔ بشارت دینے والا۔ بشارت کے لیے دیکھو ع۱۲۳ الف سب سے بڑی بشارت جو انبیاء اللہ لاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قرب کا پیدا ہونا ہے جو انسان کا کمال حقیقی ہے۔

نذیر کے معنی منذر ہیں یعنی انذار کرنے والا (انذار کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۷) یعنی ایسی خبر دینے والا جس میں انسان کو انجام بد سے ڈرایا جائے۔

جحیم۔ جحمۃ۔ آگ کے شعلوں کی شدت کو کہتے ہیں۔ اسی سے جحیم ہے

خدا کس سے کلام کرتا ہے: پہلی آیت کے سوال کا جواب دیا ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا۔ اس کا جواب دیا ہے کہ ہم نے پیغمبر کو حق کے ساتھ خوشخبری دیکر بھیجا ہے اور وہ خوشخبری یہ ہے کہ اس کی اتباع سے انسان خدا کے قرب کو حاصل کر سکتا ہے اور جو خدا کے قرب کو حاصل کر لے گا خدا اس سے کلام بھی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ قدوس ہے ناپاک لوگوں سے جو طرح طرح کے گندوں میں مبتلا ہیں وہ کس طرح کلام کر سکتا ہے ہاں اگر وہ رسول کی بشیر کی حیثیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، تو اس کا اتباع کریں۔ نشان ہلاکت کا آنا: اور دوسرا سوال تھا کہ ہم پر وہ نشان ہلاکت کیوں نہیں آتا۔ جیسا پہلی قوموں پر آیا تو اس کا جواب دیا کہ اسی سے ان کو ڈرانے کے لیے تو ہم نے تمہیں بھیجا ہے۔ وہ تو آخر آئے گا۔ آخری الفاظ میں بتایا کہ راہ راست پر لانے کی ذمہ داری تم پر نہیں۔

ع۱۵۲ ملۃ۔ ملۃ کا اصل اَمْلَلْتُ الکتاب سے ہے یعنی میں نے کتاب لکھوائی۔ قرآن کریم میں ہے۔ ولیملل الذی علیہ الحق (۲۸۲) اور ملۃ دین کی طرح ہے یعنی وہ رستہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ سے لوگوں کو بتایا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں

ملۃ اور دین میں فرق: اور اس میں اور دین میں فرق یہ ہے کہ ملۃ صرف اس نبی کی طرف مضاف ہوتی ہے جس سے وہ مذہب چلتا ہے۔ جیسے ملۃ ابراھیم یا واتبعت ملۃ اٰبائی اور اللہ کی طرف یا احاد اُمت کی طرف یہ لفظ مضاف نہیں ہوتا اور بحیثیت مجموعی کل قوم کی طرف مضاف

أُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٢١﴾ ع
حق ہے، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اس کا انکار کرتا ہے سو وہی نقصان اُٹھانے والے ہیں۱۵۳

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٢﴾
اے بنی اسرائیل! میری نعمت کو یاد کرو، جو میں نے تم کو دی، اور یہ کہ میں نے تم کو قوموں پر فضیلت دی۱۵۴

ہوجاتا ہے جیسے یہاں ہے ملتہم اور دین خدا کی طرف یا احاد اُمت کی طرف جیسے دین اللہ یا دینی مضاف ہوتا ہے اور ملّۃ اس لحاظ سے کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رستہ بتایا اور دین جس کے معنی طاعت ہیں اس کے لحاظ سے جو اس کو قائم کرتا ہے (غ)۔

اھواء- ھَوٰی کی جمع ہے جس کے معنی ہیں نفس کا میلان شہوت یا خواہشات کی طرف (غ) ھَوٰی کے اصل معنی نفس کا ارادہ ہیں اور خیر اور شر دونوں میں اس کا استعمال ہے (ت)، مگر چونکہ اس کے معنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا بھی ہیں (ت) اس لیے اکثر استعمال اس کا ان خواہشات پر ہے جو معاصی میں داخل ہیں یا گری ہوئی خواہشات۔

عِلم کے معنی ہیں ادراك الشئ بحقیقتہ (غ) یعنی کسی چیز کا اپنی حقیقت کے ساتھ ادراک خواہ اس کی ذات کا ادراک ہو اور اس صورت میں ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے لا تعلمونہم اللہ یعلمہم اور خواہ کسی چیز کے لیے صرف یہ حکم ہو کہ اس کے لیے ایک دوسری چیز موجود ہے یا موجود نہیں جیسے فان علمتوھن مومنات (الممتحنۃ ۱۰) پھر علم کی ایک تقسیم نظری اور عملی ہے۔ نظری وہ ہے جو صرف علم حاصل کرلینے سے کامل ہوجاتا ہے جیسے موجودات عالم کا علم اور عملی وہ جو بغیر عمل میں آنے کے کامل نہیں ہوتا جیسے عبادات کا علم۔ اور ایک تقسیم علم کی عقلی اور سمعی ہے یعنی وہ جو غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے اور وہ جو سماعت سے حاصل ہوتا ہے (غ) یہاں اھواء کے مقابل پر علم کا لفظ اختیار کرکے بتایا ہے کہ حقیقی مذہب ایک علم یا سائنس ہے اس کی کوئی بات دلائل سے خالی نہیں۔ اور وہ ایک قاعدہ اور قانون کا رنگ اپنے اندر رکھتا ہے۔ ڈھکوسلوں کا نام مذہب نہیں۔

اسلام ایک علم اور کامل ہدایت نامہ ہے: یہاں ہر ایک شخص مخاطب ہے اور بتایا ہے کہ یہود اور نصاریٰ حقیقت کی طرف تو غور نہیں کرتے کہ اسلام میں کیا کیا صداقتیں ہیں اور کس طرح مذہب کو کمال تک پہنچا دیا ہے۔ وہ صرف اسی شخص سے خوش ہو سکتے ہیں جو اُن کے مذہب کو اختیار کرلے۔ مگر ان کا مذہب کیا ہے؟ اس کا نام یہاں اھواء رکھا ہے۔ اپنی چند خواہشات ہیں جن کو دین میں داخل کرلیا ہے اور بالمقابل اسلام ایک علم ایک سائنس ہے جس نے مذہب کے سارے اصول کو کمال صفائی کے ساتھ بیان کیا اور ان کے باہم تعلقات قائم کیے اور ان کی حقانیت کے دلائل دیئے۔ اسی کو یہاں الھدٰی کہا ہے یعنی کامل ہدایت نامہ۔ پس صرف یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے ایک مسلم اس کامل ہدایت نامہ کو کیونکر چھوڑ سکتا ہے۔ آج بہتیرے لوگ محض عیسائیوں کو خوش کرنے کے لیے دین اسلام کے پاک اصول کو چھوڑ کر جو کچھ عیسائی کہتے ہیں ان کا تتبع کرتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ ایک اللہ کو راضی کرنے کی کوشش چاہیئے تھی۔

۱۵۳ الکتاب سے مراد یہاں قرآن کریم ہے۔

یتلونہ حق تلاوتہ کے معنی مجاہد سے مروی ہیں یعملون بہ حق عملہ یعنی اس پر عمل کرتے ہیں جیسا عمل کرنے کا حق ہے۔ تلاوت کے معنی کے لیے دیکھو ۶۷۔

کامل علم کے بعد عمل کی ضرورت: یہ رکوع قرآن کریم کے کامل ہدایت ہونے پر تھا۔ سو آیت ماقبل میں بالصراحت یہ ذکر کرکے اب رکوع کی آخری آیت میں عمل کی طرف توجہ دلائی ہے، بمقابلہ یہود و نصاریٰ کے اپنی کتابوں پر عمل نہ کرنے کے۔ اور بتایا ہے کہ کامل ہدایت نامہ ہونے سے بھی صورت میں فائدہ ہوسکتا ہے جب اس پر عمل کیا جائے۔ اس لیے فرمایا کہ یہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے یعنی آنحضرت صلعم کے صحابہ یہ اس کی پیروی کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں جیسا پیروی اور عمل کرنے کا حق ہے۔ اولٰئك یومنون بہ کہہ کر بتایا کہ اصل ایمان تو یہی ہے کہ انسان اس پر عمل کرے۔

صحابہ کا بے نظیر عمل قرآن پر: فی الواقعہ اگر غور کیا جائے تو جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم پر عمل کیا کبھی کسی قوم نے کسی آسمانی کتاب پر اس طرح عمل کرکے نہیں دکھایا ہزاروں سالوں کی بدیوں اور ہزاروں سالوں کے رسم و رواج سے قرآن کی آیات کے نزول پر وہ یوں پاک ہوتے جاتے تھے کہ گویا کبھی ان میں یہ چیزیں تھی ہی نہیں۔ کوئی حکم قرآن شریف کا نازل نہیں ہُوا جس کو انہوں نے فوراً عمل میں لاکر نہیں دکھایا۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت: آج بھی لوگ مسلمان ہی کہلاتے ہیں مگر بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک بھی حکم قرآن شریف کا نہیں جس پر عمل ہو۔ الّا ماشاء اللہ معدودے چند اشخاص کو کچھ توجہ ہو تو الگ بات ہے۔ پس آج مسلمانوں کا شمار عملاً اس دوسرے حصّہ میں ہے جو فرمایا ومن یکفر بہ فاولٰئك ھم الخاسرون کیونکہ جب حق عمل ادا نہیں کرتے تو اولٰئك یومنون بہ میں بھی داخل نہیں ہوسکتے۔

۱۵۴ بنی اسرائیل کو تین مرتبہ خطاب: یہ تیسری مرتبہ بنی اسرائیل کو خطاب ہے۔ پہلے ان کو ان کی حالت موجودہ پر توجہ دلائی اور بتایا کہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہوجانے سے وہ دنیا میں معزز بن جائیں گے۔ دوسری مرتبہ ان کو حضرت موسیٰ اور بعد کے زمانہ اور حضرت موسیٰ اور انبیائے بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں کی طرف

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا
وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ
وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور اُس دن سے بچاؤ کرلو، جب کوئی جی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئیگا اور نہ اس کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائیگا اور نہ اُسے سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائیگی۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ
قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ
ذُرِّيَّتِیْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور جب ابراہیمؑ کو اُس کے رب نے چند احکام سے آزمایا تو اُس نے اُن کو پورا کیا، فرمایا میں تجھے لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں[۱۵۵]، (ابراہیمؑ نے) کہا اور میری اولاد سے؛ فرمایا میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچیگا[۱۵۶]

توجہ دلائی اب تیسری مرتبہ حضرت موسیٰؑ سے بھی پہلے کا زمانہ اور ابراہیمی وعدہ یاد دلاتا ہے اور یہی اس کا تعلق پہلے مضمون سے ہے گویا اس طرح تین دفعہ خطاب کرکے اور ابتدائی وعدے یاد دلا کر بنی اسرائیل پر اتمام حجت کیا ہے۔

ع۱۵۵ ابتلیٰ۔ بلی سے ہے جس کے لیے دیکھو ع۴۳ اَبلیٰ اور اِبتلیٰ کے معنی میں امام راغب نے لکھا ہے کہ دو مفہوم شامل ہیں ایک اس کے حال سے واقفیت حاصل کرنا، دوسرے اس کی خوبی اور نقص کا ظاہر کردینا اور بسا اوقات یہ دونوں باتیں مقصود ہوتی ہیں اور بسا اوقات ان میں سے ایک ہی مقصود ہوتی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ فاعل ہو تو صرف دوسرے معنی مراد ہوتے ہیں یعنی خوبی یا نقص کا ظاہر کردینا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ حالات سے تو واقف ہی ہے (غ) اور چونکہ اصل غرض ابتلا یا امتحان کی صرف خوبیوں یا نقصوں کا اظہار ہی ہوتا ہے اور حال سے واقفیت حاصل کرنا صرف ایک ذریعہ ہے جس کے بغیر انسان دوسرے کی جودت یا ردأت کا اظہار کرنے کے قابل ہی نہیں ہوسکتا اس لیے ع۲۷ میں جو اصول قائم کیا گیا ہے اس کے مطابق بھی ابتلیٰ کے یہی معنی ہیں یعنی مراد حضرت ابراہیمؑ کے کمالات کا ظاہر کرنا ہی ہے۔

ابراھیم۔ عبرانی نام ہے، بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دو عظیم الشان قوموں کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کا زمانہ غالباً کوئی ۲۳۰۰ سال قبل مسیح ہے۔ اور یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے نزدیک ایک عظیم الشان پیغمبر تھے۔ بلکہ مشرکین عرب بھی آپ کی اسی طرح عزت کرتے تھے۔ بائبل کے محرف ثابت ہونے کی وجہ سے یہ خیال بھی ہوا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کوئی تاریخی انسان نہ تھے۔ عرب سے تعلق: مگر عرب کی روایات اور عرب کا آپ سے تعلق اور خانہ کعبہ میں آپ کے نشانات اس خیال کو باطل ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

کلمات کے معنی ع۵۵ میں بیان ہوچکے۔ کلمات اللّٰہ سے مراد احکام الٰہی ہیں (غ) حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ یہ تیس احکام ہیں جن میں سے دس مومنوں کی صفت میں سورہ برأت میں ہیں دس احزاب میں دس معارج میں (ر)

اتم۔ کسی چیز کا تمام اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے سے باہر کسی کی محتاج نہ رہے دوسری جگہ فرمایا وابراھیم الذی وفّٰی (النجم ۵۳-۳۷) اور یہاں آگے آتا ہے اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العالمین (۱۳۱)

امام۔ اَمَّ سے ہے جس کے معنی ہیں اس نے قصد کیا اور امام وہ ہے جس کی پیروی کی جائے خواہ وہ انسان ہو جس کے قول یا فعل کی پیروی ہو یا کتاب یا اس کے سوائے کچھ اور ہو حق پر ہو یا باطل پر (غ) باطل پیشرووں پر بھی یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے وجعلناھم ائمة یدعون الی النار (القصص ۲۸-۴۱) اور یوم ندعوا کل اناس بامامھم (بنی اسرائیل ۱۷-۷۱) میں امام کے معنی کتاب بھی لیے گئے ہیں۔

کلمات سے حضرت ابراہیمؑ کی تکمیل نفس: وعدہ ابراہیمی کے ذکر سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کی عظمت کا ذکر کیا ہے۔ جو تینوں قوموں، یہود عیسائی اور مشرکین عرب کے نزدیک مسلّم راستباز تھے۔ پہلے احکام جو آپ کو دئے گئے وہ اپنی ذات کے کمال کے لیے تھے۔ جب آپ ان میں پورے اُترے تو پھر آپ کو امام بنایا گیا۔ یعنی دوسروں کا پیشرو مقرر کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی احکام الٰہی کا کامل فرمانبردار ہوتا ہے اسی لیے وہ دوسرے لوگوں کا پیشوا بنایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو شھداء علی الناس یعنی دوسری قوموں کا پیشرو بنایا گیا تھا۔ مگر جب وہ اپنی تکمیل نفس سے ہی غافل ہوگئے تو دوسروں کے پیشرو بننے کے بھی اہل نہ رہے۔

ع۱۵۶ ذریتی۔ ذریة اصل میں چھوٹی اولاد کو کہتے ہیں مگر چھوٹوں بڑوں سب پر بولا جاتا ہے۔ یہ یا ذرأ سے مشتق ہے جس کے معنے پیدا کرنا ہیں اور ہمزہ متروک ہوگیا ہے اور یا ذرّ سے مشتق ہے جس کے معنے پھیلانا ہیں (غ)

وعدہ ابراہیمی: چونکہ اصل مقصد وعدہ ابراہیمی کو یاد دلانا ہے اس لیے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کے متعلق جو وعدے تھے ان کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اصل صحیفے تو اب نابود ہیں ہاں حضرت موسیٰؑ کی کتاب پیدائش میں کچھ ذکر حضرت ابراہیمؑ کا اور آپ کی اولاد کے ساتھ وعدہ کا اب بھی موجود ہے۔ ان کئی بابوں کے مضمون کو یہاں چند پُرمعنی الفاظ میں جن میں سے ایک ایک اپنے اندر وہ حکمت کی باتیں لیے ہوئے ہے، جو کتاب پیدائش میں مفقود نظر آتی ہیں بیان کیا ہے۔ قرآن بائبل سے نہیں لیا گیا، کیونکہ بائبل کی اصلاح کرتا ہے: بائبل کے کئی بابوں کے قائم مقام یہ چند لفظ ہیں

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ اور جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن بنایا [۱۵۷] اور ابراہیمؑ

"کہا اور میری اولاد سے۔ فرمایا میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا" یعنی تیری اولاد کو بھی ہم دنیا میں پیشرو بنائیں گے عزت دینگے برکت دینگے، لیکن اگر یہ لوگ ظلم کی طرف جھک جائیں تو پھر وہ اس وعدہ کے مستحق نہ رہیں گے۔ کیا حق و حکمت کی بھری ہوئی بات کہدی ہے۔ مگر بائبل میں یہ مفقود ہے وہاں لفظ عام ہیں "تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہوگی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پاوینگی (پیدائش ۲۲ : ۱۷ و ۱۸) پس یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے بیانات بائبل سے نہیں لیے گئے۔ کیونکہ بائبل کے نقصوں کا وہ علاج کرتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی ان الفاظ میں بتایا ہے کہ جب وہ ظلم اختیار کریں گے تو وہ بھی وعدہ الٰہی کی برکات سے محروم کر دیئے جائیں گے۔

وعدہ ابراہیمی میں اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں شامل ہیں: من ذریتی کا لفظ یہاں لا کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس وعدہ میں حضرت اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں شامل تھے اور گو یہود اور عیسائی اس کا انکار کرتے ہیں مگر بائبل سے اب بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اول اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں کی پیدائش سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو فرمایا "میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا" (پیدائش ۱۲ : ۲ و ۳) یہاں برکت دینے کے لفظ قابل غور ہیں۔ کیونکہ ابراہیمؑ کو برکت دینے والے مسلمان ہی ہیں جو پانچوں نمازوں میں کما بارکت علٰی ابراھیم و علٰی اٰل ابراھیم پڑھتے ہیں۔ پھر حضرت ہاجرہ کے ساتھ وعدہ ہے "میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے نہ گنی جائے" (پیدائش ۱۶ : ۱۰) پھر اسمٰعیلؑ کا نام لیکر فرمایا: "اور اسمٰعیلؑ کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دونگا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہونگے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا" (پیدائش ۱۷ : ۲۰) یہی برکت دینے کا وعدہ حضرت ابراہیمؑ سے تھا وہی اسمٰعیلؑ سے بالخصوص ہے پس بائبل یہودیوں اور عیسائیوں کو جھوٹا ٹھہراتی ہے جو حضرت اسمٰعیلؑ کو ابراہیمی وعدہ میں شامل نہیں کرتے۔

وعدۂ ابراہیمی میں حضرت اسمٰعیلؑ کی شمولیت پر تاریخی شہادت: اگر تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو بھی وعدۂ ابراہیمی جس طرح بنی اسرائیل پر صادق آتا ہے۔ اسی طرح بنی اسمٰعیل پر بھی صادق آتا ہے۔ "اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔" دوسرا عہد اللہ تعالیٰ کا ابراہیمؑ کے ساتھ ہے "میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے ملک ہو" (پیدائش ۱۷ : ۷ و ۸) اب ایک طرف اگر بنی اسرائیل ختنہ کراتے ہیں اور اس عہد ابراہیمی کا نشان قائم رکھتے ہیں تو دوسری طرف بنی اسمٰعیل یعنی عرب کے لوگ بھی ختنہ کراتے اور اس عہد ابراہیمی کے نشان کو قائم رکھتے ہیں اور دنیا کی کسی اور قوم میں یہ نشان نہیں پایا جاتا۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت محمد مصطفٰے صلعم اصل موعود وعدہ ابراہیمی کے ظہور پر ایک ایسی قوم پیدا ہوتی ہے جو آپ کی روحانی اولاد ہونے کی وجہ سے اس عہد ابراہیمی کے نشان کو تا قیامت زندہ رکھتی ہے۔ دوسری طرف خدا کا عہد ابراہیمؑ کے ساتھ یہ تھا کہ کنعان کا ملک اس کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دیا گیا۔ مگر وہ ملک اول یہود پھر عیسائیوں پھر مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اپنے وقت میں وہ اس وعدے کے صحیح مصداق تھے۔ صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے اسی لیے بیت المقدس چھیننے کی کوشش کی گئی مگر آخر کار عیسائی ناکام رہے اور قریباً ایک سو سال کے بعد پھر مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ اب پھر بظاہر یہ ملک مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے مگر ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ پھر کوئی سامان پیدا کر دے کہ یہ ملک مسلمانوں کو واپس ملے یا اس کے مالک مسلمان ہو جائیں۔ بیت المقدس کا دو دو مرتبہ اصل حقداروں کے ہاتھ سے نکلنا: بنی اسرائیل کی تاریخ میں بھی دو ہی دفعہ بیت المقدس ان کے قبضہ سے نکلتا ہے پہلی مرتبہ وہ خود ہی دوبارہ اس میں آباد کر دیئے جاتے ہیں جب خورس شاہ ایران نے بابلیوں کو تباہ کیا دوسری مرتبہ جب حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کے بعد بیت المقدس تباہ ہوا تو اس کے تباہ کرنے والے یعنی رومی آخر خود عیسائی ہو گئے۔ اسی طرح پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اپنی قوت بازو سے بیت المقدس کو عیسائیوں کے ہاتھ سے لیا۔ دوسری مرتبہ شاید یونہی مقدر ہو کہ جس قوم نے اس کو لیا ہے وہ مسلمان ہو جائے۔

۱۵۷ البیت۔ بیت اصل میں اس مقام کو کہتے ہیں جو رات کو جائے پناہ کا کام دے۔ کیونکہ بات کے معنی ہیں رات کاٹی اور بیّت کے معنی ہیں رات کو مشورہ کیا یا کام کیا فرمایا بیت طائفۃ منھم (النساء ۴ - ۸۱) (غ) مطلق البیت سے مراد بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ ہے۔

دنیا کی پہلی عبادت گاہ: قرآن کریم میں اس کو اوّل بیت وضع للناس (اٰل عمران ۳ - ۹۵) فرمایا یعنی سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی بھلائی کے لیے مقرر کیا گیا۔ یعنی سب سے پہلی عبادت گاہ۔ اور ایک جگہ اس کو البیت العتیق (الحج ۲۲ - ۲۹) بھی فرمایا۔ یعنی قدیم گھر۔ ان دونوں ناموں کے علاوہ اس کا البیت کے نام سے مشہور ہو جانا صاف بتاتا ہے کہ اس گھر کو کوئی ایسی خصوصیت دنیا میں حاصل ہونے والی ہے جو کسی دوسرے گھر کو حاصل نہیں ہوئی۔

مثابۃ۔ ثوب سے ہے جس کے معنی کسی چیز کا پہلی حالت کی طرف رجوع کرنا ہیں (غ) اور اس کا مادہ وہی ہے جو ثواب اور مثوبۃ وغیرہ کا مادہ ہے اور مثابۃ وہ جگہ ہے جہاں لوگ بار بار لوٹ کر آئیں۔ تفرقہ کے بعد اجتماع مذاہب: اور بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں تفرقہ کے بعد لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ (ت) دونوں معنی کے لحاظ سے خانہ کعبہ اس لفظ کا مصداق ہے کیونکہ لوگ تا قیامت وہاں حج کے لیے آتے رہیں گے اور کیونکہ مذاہب عالم میں تفرقہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے یہ مقام پھر ان کے اجتماع کا اور کل نسل انسانی کو ایک کرنے کا موجب ہوا۔

امن۔ مصدر ہے۔ بطور مبالغہ یہاں لایا گیا ہے اور مراد مقام امن ہے۔

خانہ کعبہ کی قدامت پر مورخ کی شہادت: البیت یا بیت اللہ یا خانہ کعبہ وہ پاک گھر ہے جس کی شہرت اور عزت عرب میں ایسے قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے

وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَآ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

کے مقام کو قبلۂ نماز بناؤ ع۱۵۸ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں، سجدہ کرنیوالوں کے لیے ؏۱۵۹

جس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ سر ولیم میور ایک مخالفِ اسلام یہ تسلیم کرتا ہوا لکھتا ہے "مکہ کے مذہب کی نمایاں خصوصیات کے لیے ایک نہایت ہی قدیم زمانہ تجویز کرنا پڑتا ہے۔ ڈائیڈورس سکولس سنہ عیسوی سے بھی نصف صدی پیشتر لکھتا ہوا عرب کے ذکر میں لکھتا ہے کہ اس ملک میں ایک معبد ہے جس کی عرب لوگ بہت ہی عزت کرتے ہیں۔ ان الفاظ میں یقیناً خانہ کعبہ کا جو مکہ میں ہے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اور کسی معبد کا عرب میں نام بھی نہیں جس کی عزت عرب میں عام طور پر ہوتی ہو۔ زبانی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ترین زمانہ سے خانہ کعبہ کا حج عرب کے ہر گوشہ کے لوگ کرتے رہے ہیں۔ یمن اور حضر موت سے خلیج فارس کے کنارہ سے۔ شام کے بادیہ سے۔ حیرہ اور عراق عرب سے لوگ ہر سال مکہ میں جمع ہوتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اس قدر عام طور پر سارے ملک میں اس عزت کا حاصل ہونا یقیناً ایک ایسے قدیم زمانہ سے ہونا چاہیئے جس کے پرے اور کوئی قدیم زمانہ تجویز نہیں ہو سکتا۔" بائبل میں بیت ایل اور اس سے مراد: بائبل میں بھی بیت ایل کا ذکر آتا ہے جس کا تعلق ابراہیم کے ساتھ ہے مگر بائبل کا بیان بیت ایل کے مقام کی تعیین میں قابل اعتبار نہیں اور اس پر بعد کے خیالات کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ دنیا میں آج صرف ایک ہی مقام ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جس پر بیت ایل یا بیت اللہ کا نام بولا گیا ہے اور وہ خانہ کعبہ ہے

کعبہ کے متعلق دو پیشگوئیاں: یہاں اس کے متعلق دو پیشگوئیاں بھی ہیں۔ اوّل یہ کہ یہاں لوگ تا قیامت جمع ہوتے رہیں گے یہ کبھی متروک نہ ہوگا، نہ برباد ہوگا، نہ دنیا کی کوئی طاقت لوگوں کو وہاں جمع ہونے سے روک سکے گی اور تفرقہ کے بعد لوگوں کا یہاں اجتماع ہوگا۔ دوسرا یہ کہ یہ ہمیشہ امن کا مقام رہے گا چنانچہ اس کا نام ہی حرم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا اولم یروا انا جعلنا حرما اٰمنا ویتخطف الناس من حولهم (العنکبوت ۲۹ - ۶۷) کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے اور ان کے اردگرد کے لوگ زبردستی اُچک لیے جاتے ہیں۔ یعنی اس کے اردگرد دن رات جنگیں رہتی ہیں اور لوگوں کے لیے امن نہیں مگر اس مقام میں ایسا امن ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کو توڑ سکے۔ عرب کی خونخوار طبائع کو جن میں دن رات جنگیں رہتی تھیں اس مقدس گھر کے سامنے اللہ تعالیٰ نے ایسا جُھکایا کہ اس کی حدود کے اندر ان کی خونریزی کبھی ظاہر نہ ہوتی تھی۔ یہ خدائی تصرف تھا ورنہ اتنے بڑے ملک کا خود اتفاق کر کے اس بات کو عمل میں لانا اور عین جنگ کے جوش کے وقت ہیں اس پر قائم رہنا محال تھا جب مہذب سے مہذب قومیں بھی خونریزی کو اپنے انتہا تک پہنچا کر چھوڑتی ہیں۔ خانہ کعبہ پر کبھی اس کے دشمن قابض نہ ہوں گے: مقام امن کہنے میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ اس کا دشمن کبھی اس پر قابض نہ ہوگا بلکہ یہ انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہیگا جو دل سے اس کی عزت و احترام کرنے والے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے اور گو بت پرست بھی اس پر قابض رہے مگر وہ بھی دل سے اس کا احترام کرنے والے تھے اور جب ایک عیسائی بادشاہ نے اسے منہدم کرنے کی نیت سے حملہ کیا تو وہ اور اس کا لشکر تباہ ہو گئے۔ حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اس میں دجال اور طاعون کبھی داخل نہ ہونگے۔

ع۱۵۸ مقام ابراھیم۔ خانۂ کعبہ میں ایک معروف مقام ہے جو چھ ستونوں پر قائم اور آٹھ فٹ بلند ہے۔ یہاں طواف کے بعد دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے مگر یہاں مقام ابراہیم سے مراد بعض کے نزدیک مواقفِ حج ،بعض کے نزدیک عرفات مزدلفہ وغیرہ ہیں اور بعض کے نزدیک سارا حرم اور بعض کے نزدیک خود خانہ کعبہ اور یہی درست ہے۔

مصلیٰ۔ نماز کی جگہ کو کہتے ہیں اور مجازاً قبلہ مراد ہے (ر) جیسا حدیث مسجدی اٰخر المساجد میں مسجد یا نماز کی جگہ سے مراد قبلہ ہے۔

خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم: یہاں مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز ادا کرنا ہے۔ بعض نے مزدلفہ، عرفات وغیرہ میں ذکر مراد لیا ہے۔ مگر بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا یا رسول اللہ لو اتخذت من مقام ابراھیم مصلیٰ۔ یا رسول اللہ اگر آپ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنائیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اب یہ سورت مدنی ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے عرض کرنے کا یہ منشاء نہ ہو سکتا تھا کہ خانہ کعبہ میں چل کر آپ دو رکعت نماز پڑھیں۔ یا مزدلفہ عرفات میں ذکر کریں۔ کیونکہ خود حج ہی رکا ہوا تھا پس اس سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا تھا کہ خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا جائے کیونکہ آنحضرت صلعم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور سیاق مضمون بھی یہی چاہتا ہے۔ کہ جب یہ ذکر ہوا کہ خانہ کعبہ کو ہم نے لوگوں کے لیے مرجع اور امن بنایا ہے تو ساتھ ہی اس کے قبلہ بنانے کا ذکر ہو۔ یہی حکم یہاں دیا گیا ہے اور اس پر جو اعتراض ہوئے ان کا جواب سیقول السفہاء سے شروع ہوتا ہے۔

ع۱۵۹ عہدنا الیٰ۔ عَهِد فلانٌ الیٰ فلانٍ کے معنی ہیں کہ اس کے سامنے ایک عہد پیش کیا اور اس کی حفاظت کی تاکید کی (غ)، یعنی عہد کا صلہ الیٰ ہو تو اس کے معنی حکم دینا ہوتے ہیں۔

اسمٰعیل۔ حضرت ابراہیمؑ کے سب سے بڑے فرزند کا نام ہے جو حضرت ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے اور گو بائبل میں ان کو لونڈی کہا گیا ہے مگر وہ مصر کے شاہی خاندان میں سے تھیں۔ شاید قومی امتیاز کی وجہ سے ان کو لونڈی کہا گیا ہے۔ اسمٰعیل ان کا نام ان کی والدہ کو فرشتہ نے بتایا تھا جیسا کہ کتاب پیدائش میں مذکور ہے۔ اور یہ سمع اور ایل سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ نے سُن لیا۔ اسمٰعیلؑ اور ہاجرہ حکم خدا سے مکہ میں چھوڑے گئے: حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو کسی دوسرے مقام پر چھوڑ آئیں۔ چنانچہ اسی حکم کے مطابق (جیسا کہ حدیث صحیح سے

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

اور جب ابراہیمؑ نے کہا میرے رب! اسکو امن والا شہر بنا دے اور اسکے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے جو کوئی ان میں سے اللہ اور پچھلے آنے والے دن پر ایمان لائے، ع۱۶۰ فرمایا اور جو کافر ہوگا تو اُسے بھی تھوڑا فائدہ اُٹھانے دوںگا، پھر اُسے آگ کے عذاب کی طرف بے بس کر دوں گا اور وہ بُرا ٹھکانا ہے ع۱۶۱

ثابت ہے کہ جب حضرت ہاجرہ نے حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا کہ کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے تو انہوں نے فرمایا ہاں) نہ حضرت سارہ کے کہنے سے جیسا کہ بائبل میں ہے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ اور ہاجرہ کو خانہ کعبہ کے قریب چھوڑا جس کی صریح شہادت قرآن کریم کے ان الفاظ میں موجود ہے (ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتك المحرم (ابراھیم ۱۴: ۳۷) بائبل میں ہے کہ فاران میں ان کو چھوڑا۔ عیسائی اس سے مراد ملک شام کا ہی کوئی جنگل لیتے ہیں جو واقعات سے غلط ثابت ہوتا ہے اور نہ صرف قرآن کریم اس کی تردید کرتا ہے بلکہ عرب کا اسمٰعیلؑ کی اولاد سے ہونا ایک امر مسلم ہے جس کا کوئی عیسائی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ قیدار جو حضرت اسمٰعیلؑ کے بڑے بیٹے کا نام ہے (پیدائش ۲۵: ۱۳) اس کا استعمال بائبل میں قوم عرب کی جگہ پایا جاتا ہے (زبور ۱۲۰: ۵۔ یسعیاہ ۴۲: ۱۱ و ۶۰: ۷ وغیرہ) عرب کا اسمٰعیل کی اولاد سے ہونا: دوسری طرف عرب کی روایات حضرت اسمٰعیلؑ کے یہاں آنے کو یقینی ٹھہراتی ہیں۔ خود خانہ کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ کی یادگار موجود ہے۔ صفا اور مروہ میں حضرت ہاجرہ کی۔ اور عرب کا نہ صرف اپنا دعویٰ ہے کہ وہ اولاد اسمٰعیل ہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ تک برابر اُن کے نسب نامے چلتے ہیں۔

طھرا۔ تطہیر کے معنی میں ظاہری طور پر اور باطنی طور پر پاک کرنا دونوں شامل ہیں یہاں بتوں کی ناپاکی سے اور شرک باللہ سے تطہیر مراد ہے (ج)

طائفین۔ طائف۔ طوف سے ہے جس کے معنی کسی چیز کے گرد پھرنا ہیں۔ پس طائفین وہ ہیں جو اس کے طواف کے قصد سے آتے ہیں۔

عاکفین۔ عاکف۔ عکوف سے ہے جسکے معنی ہیں کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی تعظیم کے لحاظ سے اس کے ساتھ تعلق پیدا کر لینا (غ) اسی سے اعتکاف ہے جو آخری عشرہ رمضان میں مسجد میں رہنے کا نام ہے۔ عاکفین سے مراد بعض لوگوں نے مقیمین مکہ کو لیا ہے مگر مراد صرف عبادت کے لیے بیٹھنے والے ہیں۔ بحالت طواف طائف ہیں، بحالت عبادت عاکف، بحالت رکوع راکع (جمع رکع) بحالت سجدہ ساجد (جمع سجود)

تطہیر کعبہ: یہاں حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو خانہ کعبہ کی تطہیر کا حکم دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ وہاں پہلے سے موجود تھا مگر وہاں بت وغیرہ رکھ دیئے گئے تھے جس طرح آنحضرت صلعم کے زمانہ سے پہلے۔ اور تطہیر سے مراد بتوں سے پاک کرنا اور بت پرستی اور شرک کو دور کرنا ہی ہے۔ ہاں اس کی کامل تطہیر نبی کریم صلعم کے ہاتھ سے ہونی مقدر تھی۔ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے اس کی دوبارہ تعمیر بھی کی ہے جیسا آگے ذکر آتا ہے۔

ع۱۶۰ بلد ا۔ بلد وہ مکان ہے جو خطوط سے محدود ہو اور اس کے ساکنوں کے اجتماع اور ان کی اقامت سے اس کے اندر انس کی حالت پائی جائے (غ) جس طرح مطلق لفظ البیت خانہ کعبہ پر بولا گیا ہے اسی طرح مطلق البلد مکہ معظمہ پر بولا گیا ہے لا اقسم بھذا البلد (البلد ۹۰: ۱)

مکہ کے لیے دعائے ابراہیم: حضرت ابراہیمؑ کی دعا دو باتوں کے لیے ہے ایک یہ کہ اس مقام کو بلد یعنی شہر بنا دے۔ کیونکہ پہلے وہاں شہر نہ تھا گو خانہ کعبہ تھا اور دوسرے امن والا۔ اور پھر اس جنگل میں اس کے رہنے والوں کے لیے پھل مہیا فرما دے وادی غیر ذی زرع یعنی بے آب و گیاہ جنگل میں رکھ کر یہ دعا بتاتی ہے کہ کس قدر ایمان اللہ کی قدرت پر تھا۔ اور آج فی الواقع دنیا بھر کے پھل مکہ میں ملتے ہیں۔ مگر دعا میں صرف مومنوں کی شرط رکھی۔ یعنی آپ یہ چاہتے تھے کہ یہاں صرف مومن ہی آباد رہیں۔

ع۱۶۱ امتع۔ متاع اس نفع کا حاصل کرنا ہے جو ایک وقت تک ممتد ہو (غ) پس امتعہ کے معنی ہوئے ایک وقت تک نفع اُٹھانے دوں گا یعنی کفر یہاں ہمیشہ نہیں رہے گا۔

اضطر۔ اضطرار کے معنی ہیں انسان کو اس بات میں ڈالنا جو اس کے ضرر کا موجب ہو۔ اضطرار خارجی سبب سے بھی ہو سکتا ہے جیسے مغلوبیت سے بے بس ہونا اور داخلی سبب سے بھی بھوک وغیرہ سے (غ) مزید تشریح کے لیے دیکھو ع۲۱۱۔

مصیر۔ صیر کے معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں اور صار کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کیا۔ اور مصیر وہ آخری حالت ہے جس میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کرکے انسان آخر کار پہنچتا ہے (غ)

عرب سے کفر مٹ جانے کی پیشگوئی: اللہ تعالیٰ کا رزق تو کافر و مومن کے لیے یکساں ہے اس لیے فرمایا دنیا کا رزق سب کو یکساں ملے گا کافر ہو یا مومن ہاں کافر کے لیے یہ تھوڑے دن کا رزق ہے یعنی حیات دنیا کا اور آخرت کے ثمرات سے جو اعمال کا نتیجہ ہیں وہ محروم رہ جاتا ہے۔ یا تھوڑے دن کے فائدہ سے یہ مراد ہے کہ کفر آخر کار اس ملک سے مٹ جائے گا۔ جیسا کہ آنحضرت صلعم کی تشریف آوری سے ہوا۔

وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝۱۲۷

اور جب ابراہیمؑ گھر کی بنیادیں اُٹھاتا تھا اور اسمٰعیلؑ (بھی) اے ہمارے رب! ہم سے قبول فرما۔ تو سُننے والا جاننے والا ہے ۱۶۲

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبۡ عَلَيۡنَا ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ۝۱۲۸

اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا فرماں بردار بنا، اور ہماری نسل سے ایک گروہ اپنا فرماں بردار (بنائیو) اور ہمیں ہمارے (حج کے) اعمال بتائیو اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما تُو رحمت سے توجہ فرمانیوالا، رحم کرنے والا ہے ۱۶۳

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ

اے ہمارے رب! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول اٹھا جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک

ع۱۶۲ قواعد - قَاعِدَہ کی جمع ہے جس کے معنی بنیاد ہیں اور یہ قعد سے ہے جس کے معنی بیٹھنا ہیں (غ)

تقبل - قبل سے ہے جس کے معنی پہلے ہیں اور قَبِلَ کے معنی ہیں اس نے قبول کیا لا یقبل منہا شفاعة (۴۸) لا یقبل منہا عدل (۱۲۳) اور تَقَبَّلَ کے معنی ہیں ایسے رنگ میں کسی چیز کا قبول کرنا جس کا مقتضیٰ ثواب ہو جیسے ہدیہ کا قبول کرنا اولئك الذین نتقبل عنہم احسن ما عملوا (الاحقاف ۴۶ - ۱۶) — فتقبلہا ربّہا بقبول حسن (آل عمران ۳ - ۳۷) انّما یتقبل اللہ من المتقین (المائدہ ۵ - ۲۷)

السمیع - سمع اس قوت کا نام ہے جس سے سُنا جاتا ہے اور سُننے کے فعل کا بھی (غ) اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے جو سمیع ہے وہ بمعنی سامع ہے یعنی سننے والا - ہاں اس کا سُننا اس سے پاک ہے کہ وہ انسان کی طرح کان کا یعنی آلہ کا محتاج ہو (ت) اور یہی بات اس کی سب صفات میں پائی جاتی ہے۔

ابراہیم کا خانہ کعبہ کو تعمیر کرنا: اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے خانہ کعبہ کو بنایا۔ مگر یہ اس کے منافی نہیں کہ خانہ کعبہ ان سے پہلے بھی موجود تھا اس لیے کہ قرآن شریف اور احادیث سے اور خود تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ یہ دنیا میں خدا تعالیٰ کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے دیکھو ع۱۵۷ پس چونکہ ہدایت و رشد کے اوّل معلّم حضرت آدمؑ ہیں۔ خانہ کعبہ پانچ مرتبہ بنایا گیا: اول مرتبہ انہی کے ہاتھ سے بنا۔ اور دوسری مرتبہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اس کو بنایا۔ تیسری مرتبہ قریش نے آنحضرت صلعم کی بعثت سے کچھ پہلے اسے بنایا۔ جب حجر اسود سرورِ عالمؐ نے نصب فرمایا۔ اس کے بعد دو دفعہ پھر یہ بنایا گیا ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بنایا اور ایک دفعہ حجاج نے گویا کُل پانچ مرتبہ بنایا گیا۔ دو دفعہ آنحضرت صلعم سے پیشتر اور دو دفعہ آپ سے بعد اور ایک دفعہ آپ کی زندگی میں۔ جیسے معمار خانہ کعبہ کو ملے ایسے کبھی کسی اور گھر کو نہیں ملے۔ بیت المقدس کو حضرت سلیمانؑ نے بنوایا۔ خانہ کعبہ بنانے والے مزدور: مگر جس طرح حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور محمد رسول اللہؐ جیسے پاک اور فخرِ بنی نوعِ انسانوں نے خود کعبہ کے بنانے میں مزدوروں کا کام کیا ایسے مزدور نہ بیت المقدس کو نصیب ہوئے اور نہ کسی اور گھر کو۔

ع۱۶۳ مسلمین - مسلم کا تثنیہ ہے۔ اسلام کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۴۴ مسلم اس لیے مسلم کہلاتا ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لیے اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے یا شیطان کی غلامی سے محفوظ ہو جاتا ہے یا حق کا پورا پورا فرمانبردار ہو جاتا ہے (غ)

اُمَّۃ - اُمّ کے معنی ماں ہیں۔ مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے یعنی ہر ایک چیز کو جو کسی شے کے وجود یا تربیت یا اصلاح یا آغاز کے لیے بطور اصل ہو اُمّ کہا جاتا ہے اور اُمَّۃ کے معنی ہیں ہر ایک جماعت جن کو ایک امر جمع کرے خواہ ایک دین ہو یا ایک مکان یا ایک زمانہ اور خواہ یہ امر جامع تسخیر سے ہو یا اختیار سے (غ)، جمع اُمم ہے۔ اصطلاح شریعت میں اُمّۃ وہ ہے جسے ایک دین ایک جماعت بنائے۔

اَرِ - رؤیۃ کا لفظ صرف آنکھ سے ادراک پر نہیں بلکہ وہم و تخیل یا تفکر یا عقل کے ساتھ ادراک پر بھی آتا ہے (غ)

مناسِك - مَنۡسِك اور مَنۡسَك کی جمع ہے اور نُسُك کے اصل معنی عبادت یا بہت عبادت ہیں اور مناسک بالخصوص اعمال حج پر بولا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں عبادت کے لیے معمولی حالت سے بہت کچھ بُعد اختیار کرنا پڑتا ہے اور مَنۡسَك وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور اس کا قرب تلاش کیا جائے اور نسیکۃ ذبیحہ کو کہتے ہیں اور نہایہ میں ہے کہ نُسُك وہ امور ہیں جن کا شریعت حکم دیتی ہے اور ورع وہ جن سے وہ روکتی ہے۔

اس دعا میں دو امور کی طرف اشارہ ہے ایک اُمۃ مسلمۃ کی طرف کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں کے پُورا کرنے والی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں ایک ہی امت مسلمہ کہلائی گو سب انبیاء اللہ مسلم ہی تھے۔ ہاں جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت مسلمان معدودے چند آدمی تھے جو گھروں سے بھاگ کر دوسری جگہ پناہ گزین ہوئے تھے اور دشمن ان کو چاروں طرف سے تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پس اس آیت کے نزول کے وقت یہ ایک پیشگوئی تھی۔ آج خدا کے فضل سے وہ اُمۃ مسلمۃ چاروں طرف دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اعمال حج ابراہیمؑ کے قائم کردہ ہیں: دوسرے یہاں یہ بتایا کہ اعمال حج حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ

ع ۱۵ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾	کرے، تو غالب حکمت والا ہے ۱۶۴
وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرٰهٖمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ	اور کون ابراہیمؑ کے مذہب سے منہ موڑتا ہے سوائے اس کے
نَفْسَهٗ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَإِنَّهٗ	جس نے اپنے آپ کو احمق بنایا اور یقیناً ہم نے اسے دنیا میں برگزیدہ
فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾	کیا اور بے شک وہ آخرت میں اچھے لوگوں میں سے ہے ۱۶۵

کے ذریعہ سے قائم کیے گئے۔ یہ اعمال حج ہزارہا سال سے آج تک وہی چلے آتے ہیں پس یہ مشرکانہ رسوم نہیں بلکہ موحدین کے جد اعلیٰ کے قائم کردہ ہیں۔

۱۶۴ یزکّی۔ زکا کھیتی پر بولا جاتا ہے جب اس میں نمو اور برکت حاصل ہو۔ اور تزکیۃ نفس کا خیرات اور برکات سے بڑھانا ہے اور فعل تزکیہ کبھی بندہ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے لیے اکتساب کرتا ہے جیسے قد افلح من زکّٰھا (الشمس ۹۱ - ۹) اور کبھی خدا کی طرف کیونکہ فی الحقیقت وہی مزکّی ہے ولٰکن اللّٰہ یزکی من یشاء (النور ۲۴ - ۲۱) اور کبھی نبی کی طرف اس لیے کہ وہ واسطہ ہوتا ہے یعنی اس کی باتوں اور اس کے نمونہ سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے جیسے یہاں۔

یعلّم۔ اعلام اور تعلیم میں یہ فرق ہے کہ اعلام اخبار سریع کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جلدی سے یا ایک دفعہ ایک بات کا علم دے دینا۔ اور تعلیم میں تکریر اور تکثیر پائی جاتی ہے یہاں تک کہ اس سے متعلم کے نفس پر اثر باقی رہ جائے اور بعض نے کہا ہے کہ تعلیم یہ ہے کہ معانی کے تصور کے لیے نفس کو آگاہ کیا جائے (غ) تعلیم کتاب تلاوت سے الگ رسول کا کام ہے: اور یہاں کتاب کے پڑھ دینے سے تعلیم کو الگ کرکے بتا دیا کہ تعلیم کتاب سے مراد اس کے معانی پر آگاہ کرنا ہے اور یہ رسول کے کاموں میں سے ایک کام ہے کہ وہ مومنوں کو کتاب کے معانی سمجھائے اور اس کی تشریح کرے جن لوگوں نے رسول کا کام صرف کتاب کا پڑھ دینا سمجھ لیا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے۔

حکمۃ۔ حکم سے ہے جس کے اصل معنی ہیں اصلاح کے لیے روک دیا۔ اور حکمۃ کے معنی ہیں علم و عقل سے حق کو پا لینا (غ) یہاں حکمۃ سے مراد سنت۔ معرفت دینی۔ فقہ لی گئی ہے (ج) یہ ظاہر ہے کہ حکمۃ کتاب سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ اور اس کی تعلیم بھی رسول دیتا ہے اور وہ چیز وہی ہے جس کو سنت کہا جاتا ہے۔ یعنی تفصیلات شریعت کیونکہ دوسری وہی چیز ہے جس کی تعلیم رسول دیتا ہے۔

العزیز۔ اسمائے الٰہی میں سے ہے۔ عزّۃ انسان کی وہ حالت ہے جو اسے مغلوب ہونے سے بچاتی ہے۔ پس العزیز وہ ہے جو غالب ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں۔

دعائے ابراہیم: حضرت ابراہیمؑ کی اسی دعا کی طرف جو اس آیت میں مذکور ہے اشارہ کرتے ہوئے نبی کریم صلعم نے فرمایا انا دعوۃ ابی ابراھیم میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا ہوں یعنی اس دعا کی قبولیت میرے ذریعہ ظاہر ہوئی ہے۔ دعا کا اثر: اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح بعض وقت اللہ تعالیٰ ایک دعا کا اثر ہزارہا سال بعد ظاہر کرتا ہے۔ اس میں یہ سبق ہے کہ دنیا کی بہبودی اور بہتری ایک دن کا کام نہیں۔ بڑے کام ایک لمبے وقت کو چاہتے ہیں۔

اُمّتِ مسلمہ اور تزکیہ کا ذکر پیشگوئی کے طور پر: قرآن کریم نے یہ دعا دنیا کو اس وقت یاد دلائی جب ابھی نہ امت مسلمہ کا وجود تھا اور نہ اس امت مسلمہ کی تعلیم و تزکیہ کا۔ صرف چند مسلمان تھے جن کی جانیں معرض خطر میں تھیں اور سارا جزیرہ نمائے عرب کفر و شرک فسق و فجور سے بھرا ہوا تھا اور پھر یہ دعا کس طرح پوری ہوئی کہ نہ صرف سارا عرب ہی امّت مسلمہ بنا بلکہ یہ امت مسلمہ دنیا کے سارے ملکوں میں پھیلی اور ان کا ایسا تزکیہ ہوا کہ پھر یہ دنیا کے مزکّی بنے اور ان کو ایسی تعلیم کتاب و حکمت دی گئی کہ پھر یہ دنیا کے معلّم بنے۔ جیسا کہ آگے اسی مطلب کو ظاہر کرنے کے لیے فرمایا لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا یعنی رسول اللہ صلعم کی تعلیم اور تزکیہ کا یہ نتیجہ ہے کہ تم دنیا کے معلم اور مزکّی بننے کے اہل ہو گئے ہو اور اس لیے ہم نے تم کو دوسرے لوگوں کا پیشرو بنایا ہے۔

رسول کے چار کام: یہاں رسول کے چار کام بیان فرمائے ہیں۔ اوّل ان آیات کی تلاوت اپنی امت پر کرتا ہے جو اس پر نازل ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ کتاب جو اس پر نازل ہوتی ہے اپنے پیرووں کو سکھاتا ہے۔ تیسرے ان کو حکمت سکھاتا ہے۔ یعنی وہ باریک باتیں جو اس پر وحی خفی سے ظاہر ہوتی ہیں۔ چوتھے وہ ان کے لیے نمونہ بن کر اور اپنی قوت قدسی سے ان کو آلائشوں سے پاک کرتا ہے۔ جو شخص یہ چار کام نہیں کرتا وہ رسول نہیں۔ علمائے ربانی: ہاں علمائے ربانی اور امت کے لوگ بھی ایک رنگ میں یہ کام کرتے ہیں۔ مگر وہ رسول صلعم پر جو آیات نازل ہوئیں ان کی تلاوت کرتے ہیں اور رسول پر نازل شدہ کتاب کی تعلیم دیتے ہیں ان کی حکمت بھی رسول سے مستعار ہے اور ان کی قوت قدسی اسی رسول متبوع سے حاصل کی جاتی ہے۔

۱۶۵ یرغب۔ رغب کا اصل مفہوم کسی چیز میں وسعت ہے اور رغبۃ۔ رغبی۔ رغب ارادہ میں وسعت ہے رغب کا صلہ الیٰ یا فِی ہو تو مراد اس چیز کی خواہش اور آرزو ہوتی ہے جیسے انّآ الیٰ ربنا راغبون (القلم ۶۸ - ۳۲) میں اور صلہ عن ہو تو مراد اس سے خواہش اور ارادہ کا پھر جانا ہوتا ہے جیسے یہاں۔ (غ)

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

جب اسکے رب نے اسے کہا فرمانبردار رہ، کہا میں جہانوں کے رب کا فرماں بردار ہوں ۱۶۶

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ ﴿۱۳۲﴾

اور ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو یہی وصیت کی اور یعقوبؑ نے (بھی) اے میرے بیٹو! اللہ نے یہ دین تمہارے لیے چُن لیا ہے پس نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم فرماں بردار ہو ۱۶۷

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

یا کیا تم موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آئی جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا ہم تیرے خدا کی عبادت کرینگے اور تیرے بڑوں ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے خدا کی جو ایک ہی خدا ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ع۱۶۸

سفہ نفسہ۔ سفہ جسمانی ہلکاپن پر بولا جاتا ہے۔ اور کم عقلی کی وجہ سے جو ہلکاپن نفس میں پیدا ہوتا ہے اس پر بھی استعمال ہوتا ہے سَفِہَ لازمی ہے اور سَفِہَ نَفْسَہٗ اصل میں سَفِہَ نفسُہٗ تھا (غ) یا نَفْسَہٗ بطور تمیز ہے۔

اصطفینا۔ اصطفیٰ کا اصل صفو ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا ملاوٹ سے پاک ہونا اور اصطفاء کے معنی ہیں ایک چیز کے خالص حصّہ کو لینا۔ اللہ تعالیٰ کا اصطفاء دو طرح پر ہے ایک ملاوٹ اور کھوٹ سے پاک رکھنا۔ دوسرے چُن لینا اور برگزیدہ کرنا۔ ہمارے نبی کریم صلعم کا نام مصطفےٰ ہے کیونکہ آپ کو تمام کھوٹوں اور ملاوٹوں سے پاک پیدا کیا گیا۔

فیصلہ کے لیے ملّت ابراہیمی کا اصل: چونکہ حضرت ابراہیمؑ کا تقدس بہت سی قوموں میں مسلم تھا اس لیے اب ملّت ابراہیمی کے اصل الاصول کو بیان کیا اور بتایا کہ اس کو ایک امر مشترک کے طور پر قبول کر لو تو مذہبی جھگڑا آسان ہو جاتا ہے اور اس کو رد کرنا خود اپنے مذہب کے اصل الاصول کے خلاف چلنا ہے۔

ع۱۶۶ عملی اصول: پہلے ملّت ابراہیمی کا اصل عملی رنگ میں بیان کیا اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا کامل فرمانبردار ہو جو احکام الٰہی ہوں ان کے خلاف دنیا کے کسی مال، عزّت، شہرت، آرام، جان تک کی پروا نہ کرے۔ اسلام یعنی فرمانبرداری کے ساتھ ربوبیت عالمین کا ذکر اس بات کے بتانے کے لیے ہے کہ وہ فرمانبرداری مخلوق خدا کی بھلائی کے لیے ہے گویا جس خیال کو ایک جگہ اسلم وجھہ للہ وھو محسن سے ظاہر کیا ہے۔ اسی کی طرف یہاں اسلمت لوب العالمین میں اشارہ کیا ہے۔

مسلم کا مقام بلند: اسلام جس کو یہاں ملّتِ ابراہیمی کا عملی اصل الاصول قرار دیا گیا ہے۔ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی وہ کامل فرمانبرداری جس کو اسلام کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے اس امر کا مقتضی ہے کہ انسان کسی اور چیز کے آگے نہ جھکے خواہ دنیوی مال و عزت کا لالچ ہو، خواہ خدا کے نیچے کسی دوسری طاقت کا خوف، سارے لالچوں اور ساری مشکلات کے ہوتے ہوئے اپنے فرض کا بجالانے والا حقیقی معنی میں مسلم ہے۔ اور یہی اعلیٰ سے اعلیٰ مقام ہے جس پر انسان کھڑا ہو سکتا ہے۔

ع۱۶۷ وصّٰی۔ وصیة کے معنی ہیں دوسرے کے سامنے کوئی بات پیش کرنا جس پر وہ عمل کرے اس کو وعظ کے ساتھ ملاتے ہوئے (غ) اصل معنی کے لحاظ سے یہ ضروری نہیں کہ حالت استحضار میں یا بستر مرگ پر بات کہی جائے۔

یعقوب حضرت ابراہیم کے پوتے اور حضرت اسحاق کے بیٹے کا نام ہے ان کا دوسرا نام اسرائیل ہے۔ بائبل میں ہے کہ حضرت اسحاقؑ کے ہاں عیسو اور یعقوبؑ توام پیدا ہوئے اس طرح کہ یعقوب کا ہاتھ عیسو کی ایڑی پر تھا اس لیے ان کا نام یعقوبؑ ہوا۔ اسحاقؑ کے ساتھ جو برکات کے وعدے تھے وہ صرف یعقوبؑ کی نسل میں پورے ہوئے اور بنی اسرائیل یعقوب کی ہی اولاد ہیں۔

ابراہیم کا توحید پر قائم ہونا: اس میں یہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کیسے توحید الٰہی کے شیدا تھے کہ یہی وصیت انہوں نے اپنے بیٹوں کو کی اور ایسا ہی ان کے خاندان میں یہی اثر چلا یہاں تک کہ یعقوبؑ نے بھی اپنی اولاد کو یہی نصیحت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی وصیت بھی امور دینی کے متعلق ہوتی ہے یہ برگزیدہ وجود دنیا میں نیکی قائم کرنے آتے ہیں وہی ان کا ترکہ اور وہی ان کا ورثہ ہوتا ہے مال و دولت کا ورثہ نہیں چھوڑتے اسی لیے مخبر صادق نے فرمایا ما ترکنا ہ صدقة۔

ع۱۶۸ اٰبا۔ اب کی جمع ہے اور وہ والد ہے مگر اُمّ کی طرح اَبْ کا استعمال بھی ہر ایک اس چیز پر ہوتا ہے جو کسی چیز کے وجود میں لانے یا اصلاح یا ظہور کا باعث ہو (غ)، اور چچا اور باپ کو اکٹھے اَبَوین کہہ دیتے ہیں اسی طرح باپ اور دادا کو بھی اور باپ اور ماں کو بھی۔ یہاں حضرت اسمٰعیلؑ کو جو یعقوبؑ کے

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا
كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٤﴾

یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ان کے لیے ہے جو انھوں نے کمایا اور تمھارے لیے ہے جو تم نے کمایا اور اسکے متعلق تم سے بازپرس کیجائیگی جو وہ کرتے تھے[ع۱۶۹]

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ
مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٣٥﴾

اور کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ یا عیسائی تم ہدایت پالو گے۔ کہہ بلکہ (ہم) ابراہیمؑ کے مذہب (پر ہیں) جو راست رو تھا اور وہ شرک کرنیوالوں میں سے نہ تھا۔[ع۱۷۰]

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ
اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ
وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ
اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ
اَحَدٍ مِّنْهُمْ ڮ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾

تم کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اُتارا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اسکی اولاد کی طرف اتارا گیا، اور اس پر جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا، اور اس پر جو نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے دیا گیا ۔ ہم اُن میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں[ع۱۷۱]

چچا تھے آباء میں شامل کیا ہے۔

اسحاق ۔حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے کا نام ہے جو حضرت سارہ کے بطن سے تھے۔

یہاں عبادت کا لفظ اختیار کیا جو اسی عملی اصل کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔کیونکہ عبادت خود عمل سے ہے اور اصلی عبادت جوارح کی عبادت ہی ہے۔

ع۱۶۹ خلت ۔جب زمانہ کے لحاظ سے خلیٰ بولا جائے تو اس سے مراد ہوتی ہے مضی و ذھب یعنی وہ گزر چکا (غ) گویا دنیا سے ان کا تعلق منقطع ہو چکا اور وہ خدا سے جاملے۔

انبیاء سب ایک امت ہیں: یہاں ان سب انبیاء اور برگزیدوں کو ایک امت کہا ہے ۔کیونکہ وہ سب ایک ہی طریق کے پیرو تھے ۔گو شرائع کی فروعات میں اختلاف ہو۔ مگر یہاں چونکہ عملی اصل الاصول اسلام کا ذکر ہے اور سب انبیاء یقیناً اس اصول پر قائم تھے اس لیے ان کو ایک اُمت کہا ہے اور یہ کہہ کر کہ یہ امت گزر چکی بتایا ہے کہ ان کے اعمال اب تم کو فائدہ نہیں دے سکتے گو تم ان کی اولاد ہو۔

ع۱۷۰ حنیف ۔حنف سے ہے جس کے معنی ہیں گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونا (غ) اس کے خلاف جنف ہے جس کے معنی ہیں استقامت سے گمراہی کی طرف مائل ہونا ۔پس حنیف وہ ہے جو استقامت کی حالت پر قائم ہے ۔نہ افراط کی طرف جھکتا ہے نہ تفریط کی طرف۔

ملت ابراہیمی کا اعتقادی اصل : ملت ابراہیمؑ کے عملی اصل الاصول کا ذکر کرنے کے بعد اب اعتقادی اصل الاصول کا ذکر کرتا ہے اور پہلے مخالفوں کا قول نقل کرتا ہے کہ یہود تو کہتے ہیں کہ اعتقادات یہود کو قبول کرنے سے ہدایت ملتی ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی مذہب کے اعتقادات کو قبول کرنے سے ہدایت ملتی ہے ۔اس کے جواب میں فرمایا کہ نہیں تم دونوں شرک کی طرف جُھک گئے ہو ۔اصل الاصول ملت ابراہیمی کا یہی ہے کہ شرک سے اجتناب کلی ہو پس اعتقادی رنگ میں مذہب کی بنیاد یہ قرار دی جائے گی کہ خدا تعالیٰ کی توحید کو ہر قسم کے شرک کی آمیزش سے خالص کر کے قبول کیا جائے۔

ع۱۷۱ اسباط ۔سِبط کی جمع ہے جس کے معنی قبیلہ ہیں ۔یعنی وہ لوگ جو ایک آدمی کی نسل سے ہوں ۔یہ لفظ بالخصوص اولاد اسرائیل پر بولا گیا ہے کیونکہ اسرائیل کے بارہ بیٹوں میں سے ہر ایک ایک قبیلہ کا جد بنا۔

نفرق ۔تفریق، فرق سے تکثیر کے لیے ہے انبیاء میں تفریق نہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ بعض کو مانا جائے بعض کو نہ مانا جائے یہ مطلب نہیں کہ سب کا مرتبہ یکساں ہے کیونکہ اس کے خلاف فضلنا بعضہم علیٰ بعض (۲۵۳) موجود ہے۔

احد ۔نفی میں لفظ اَحَد جمع کا فائدہ دیتا ہے اس لیے تفریق کو احد کی طرف منسوب کیا گیا۔

جامعیت مذہب اسلام : اس آیت میں نہ صرف مذہب کے اصل الاصول ایک اللہ پر ایمان کا ذکر کیا ہے بلکہ سچے اور کامل مذہب کی جامعیت کا ذکر بھی کیا ہے اور اس کی غرض یہی ہے کہ یہ اصل الاصول ایک خدا پر ایمان ملت ابراہیمی کا ہی نہیں ۔دنیا کے کل نبی ایک ہی مذہب پر تھے ؛ بلکہ دنیا میں جس قدر بھی نبی ہوئے سب کے مذہب کا اصل الاصول یہی تھا اس لیے ایک مسلمان سب انبیاء پر ایمان لاتا ہے ۔کیونکہ وہ سب ایک ہی اصول پر قائم تھے اور ایک ہی غرض کو پورا کرنے آئے تھے ۔یہاں اوّل تو چار بڑے انبیاء کا ذکر کیا ۔یعنی ابراہیمؑ ۔اسمٰعیلؑ ۔اسحاقؑ ۔یعقوبؑ ۔پھر سب انبیائے بنی اسرائیل کا مجمل ذکر اسباط کے لفظ میں کیا ۔پھر یہود کے سب سے بڑے نبی موسیٰؑ کا ذکر کیا ۔پھر عیسائیوں کے نبی عیسیٰؑ کا ذکر کیا اور ان سب کے بعد ما اوتی النبیون کہہ کر یہ بتا دیا کہ سلسلہ ابراہیمی یا سلسلہ موسوی کے سوائے اور بھی دنیا میں نبی ہوئے ہیں ۔ان کی بھی یہی تعلیم اصلی تھی ان کو بھی ہم انبیائے برحق مانتے ہیں۔

ما انزل من قبلك کی تفسیر: اور یوں جو ابتدائے سورۃ میں فرمایا تھا کہ اس پر ایمان لائیں جو تجھ سے پہلے اتارا گیا ۔اس کی تشریح خود ہی فرما دی کہ اس سے

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ
اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾
صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫
وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾
قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ
اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

پس اگر وہ ایمان لائیں اس کی مثل جو تم ایمان لائے تو یقیناً انھوں نے
ہدایت پائی اور اگر پھر جائیں تو وہ صرف مخالفت پر ہیں پس اللہ ہی
انکے مقابلہ میں تیرے لیے کافی ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ۱۷۲
اللہ کا رنگ، اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہے اور ہم اسی کی عبادت
کرنے والے ہیں ۱۷۳
کہہ کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو اور وہ ہمارا رب اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لیے ہمارے
عمل اور تمہارے لیے تمہارے عمل ہیں اور ہم اسی کے لیے اخلاص رکھنے والے ہیں ۱۷۴

مراد وہ کلام ہے جو انبیا پر نازل کیا گیا خواہ وہ ایک قوم کے نبی ہوں یا دوسری کے۔

ع ۱۷۲ شقاق ۔شق سے ہے یعنی شگاف جو کسی چیز میں ہو شققنا الارض شقا (عبس -۲۶) اور شِقَّۃ اس ٹکڑے کو کہا جاتا ہے جو الگ ہو جائے ۔ اور اسی سے شقاق بمعنی مخالفت ہے ۔گویا شقاق میں شِقّ مخالف اختیار کر لی ہے اور شِق بمعنی مشقت بھی آتا ہے الا بشق الانفس (النحل[۱۶]-۷)

سیکفیکھم اللہ ۔کفایۃ کے معنی ہیں مشکلات کا سدِّ باب کر دینا اور کسی معاملہ میں مراد کو پہنچ جانا اور اس جملہ کے معنی ہیں کفاك اللہ شرھم یعنی اللہ ان کی شرارتوں سے بچا کر تمہیں مراد کو پہنچائے گا اور ان کی مخالفت تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔

اسلام کسی بزرگ کو جھوٹا نہیں کہتا : یہاں یہ بتایا کہ ایسے صاف اور جامع مذہب پر ایمان نہ لانے والے وہی لوگ ہوں گے جو حق کے دشمن ہیں کیونکہ اس مذہب کو مان لینا جو دنیا کے سارے انبیاء کو راستباز ٹھہراتا ہے ۔عین اقتضائے عقل و انصاف ہے اور یہ مذہب کسی بزرگ کو جھوٹا اور مفتری قرار نہیں دیتا ۔اگر یہ سیدھی سیدھی بات نہ مانیں تو سمجھ لو کہ صرف حق کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں مگر ان کی مخالفت کی پروا نہ کرو ان کی شرارتوں سے خدا تعالٰے تم کو محفوظ رکھے گا۔

ع ۱۷۳ صِبغۃ ۔صِبغۃ اصل میں رنگ کو کہتے ہیں اور یہاں مراد دین ہے ۔کیونکہ جس طرح رنگ کا اثر کپڑے پر ہوتا ہے اسی طرح مذہب کا اثر انسان پر ہوتا ہے ۔بعض نے اس کے معنی فطرت کیے ہیں اور مفردات میں ہے کہ صبغۃ اللہ میں اشارہ اس چیز کی طرف ہے جو انسانوں میں اللہ تعالٰی نے پیدا کی ہے یعنی عقل جس سے بہائم سے ان کی تمیز ہوتی ہے ۔مگر تاج العروس میں صبغۃ کے معنی دین دیئے ہیں اور ہر ایک وہ راہ جس سے اللہ تعالٰی کا قرب حاصل ہو۔ اور قرآن شریف میں وصبغ للاٰکلین (المومنون[۲۳]-۲۰) آتا ہے جہاں مراد سالن ہے اور عیسائیوں کے بپتسمہ کو یعنی جو وہ بچے کو پانی میں غوطہ دیتے ہیں صبغۃ یا اصطباغ کہا جاتا ہے (غ)

دین اسلام کا مقابلہ عیسائی بپتسمہ سے : یہاں دین الٰہی کا جس کو رنگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے لفظ صبغۃ اختیار کر کے عیسائیوں کے اصطباغ سے گویا اشارۃً مقابلہ کیا ہے کہ ایک طرف خدائی بپتسمہ یعنی دین الٰہی یا دین اسلام ہے جس کو لینے سے انسان کل انبیائے عالم کو راستباز قرار دیتا ہے اور دوسری طرف ایک انسانی بپتسمہ یعنی عیسائی مذہب ہے جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ سوائے مسیح کے دنیا میں کوئی راستباز نہیں یہ گویا سب کو جھوٹا قرار دیتا ہے ایسا مذہب دنیا میں کبھی غالب نہیں ہو سکتا ۔صبغۃ اللہ میں نصب یا تو اس لیے ہے کہ یہ اٰمنا باللہ الاٰیۃ میں اٰمنا کے لیے مصدر موکد ہے ۔یا اس لیے کہ تحریص دلانے کے لیے ہے اور بعض نے اس کو ملۃ ابراھیم سے بدل کہا ہے۔

ع ۱۷۴ خالص اور صافی میں فرق : مخلصون ۔ خالص اور صافی یکساں ہیں یعنی کھوٹ وغیرہ سے پاک ۔مگر صافی ابتدا سے ہی ایسا ہے ۔اور خالص جو بعد میں صاف ہو جائے (غ) مسلمانوں کا اخلاص یہ ہے کہ وہ یہودیوں کی تشبیہ سے اور نصارٰی کی تثلیث سے بری ہیں (غ) اور دوسری جگہ فرمایا مخلصین لہ الدین (البیّنۃ[۹۸]-۵) گویا فرمانبرداری کو اس کے لیے خالص کرنے والے ۔یہی معنی یہاں ہیں ۔یعنی ایمان اور اطاعت دونوں کو اللہ تعالٰے کے لیے خالص کرنے والے ۔ اور ہر قسم کے کھوٹ اور آمیزش سے پاک رکھنے والے۔

خدا کی ربوبیت کی وسعت : دنیا میں ہر ایک قوم اللہ تعالٰی کی روحانی ربوبیت کو اپنے تک محدود کرتی ہے ۔مگر اسلام اس خدا کو پیش کرتا ہے جو ربنا وربکم ہے یعنی ہم جو مسلمان ہیں وہ ہماری ربوبیت بھی فرماتا ہے ۔ اور عیسائی اور یہودی جو مسلمانوں کی مخالفت کر رہے ہیں ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ وہ تمہارا بھی رب ہے ۔یہ گویا رب العالمین کی کھلی تفسیر کر دی۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ	کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد
وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ	یہودی یا عیسائی تھے، کہہ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور
قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ	اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اس گواہی کو چھپا دے
كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ	جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے اور اللہ اس سے بے خبر
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٠﴾	نہیں جو تم کرتے ہو۔
تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا	یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی ان کے لیے ہے جو انھوں نے کمایا اور تمھارے لیے ہے جو تم نے
ع كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤١﴾	کمایا اور تم سے اس کے متعلق باز پرس نہ ہوگی جو وہ کرتے تھے۔

مسلمانوں کو تعلیم کہ اپنے دشمنوں سے ہمدردی کریں: اور ایک مسلمان کو سمجھا دیا کہ جو تمہارے دشمن ہیں جو تمہارے دین کے مخالف ہیں ان کا رب بھی وہی خدا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ ان کی بھی ربوبیت فرماتا ہے اور ایک مسلمان جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے یعنی صفات الٰہی کو اپنے اندر لینے کی کوشش کرتا ہے اور جس کا مذہب تخلق باخلاق اللہ ہے اس کے لیے بھی ضروری ہوا کہ وہ اپنے قلب میں اس قدر وسعت پیدا کرے کہ اس میں اپنے دشمنوں کے لیے بھی سچی ہمدردی اور خیر خواہی موجود ہو۔ یہ نہایت ہی مشکل مقام ہے مگر ربنا و ربکم کی تعلیم دینے والی کتاب اسی مقام پر مسلمانوں کو پہنچانا چاہتی ہے اور یہی نقشہ نبی کریم صلعم کی زندگی میں اور صحابہ کی زندگی میں نظر آتا ہے کہ کس طرح عملی طور پر دشمنوں سے محبت اور پیار کر کے دکھایا اور کس طرح ان کے سارے مظالم پر یکسر قلم پھیر دیا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم میں بتایا کہ اصل کامیابی تو اعمال سے ہے پس تم بھی اچھے عمل کرو مگر یاد رکھو کہ خالص نیکی کی راہیں صرف اسلام میں ہی ہیں اور وہ قوم جس کے اعمال صرف خدا کے لیے ہوں ضرور کامیاب ہو جاتی ہے۔ چونکہ ایمان سے عبادت اور عمل پیدا ہوتے ہیں اس لیے یہ ذکر بھی کر دیا۔

ع ۱۷۵ کفارہ مسیح اور انبیائے سابق: قرآن کریم نے یہاں یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ الزام دیا ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ پہلے نبی یہودی یا عیسائی تھے یعنی ان خاص عقائد کے پیرو تھے جن کی تعلیم تم دیتے ہو۔ یہ واقعات پر مبنی ہے۔ آج بھی عیسائی کہتے ہیں کہ یہ پہلے انبیاء کفارہ مسیح پر ایمان لاتے تھے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ نجات یافتہ نہیں ٹھہر سکتے۔ اس سے بڑھ کر کیا ظلم اور کیا اخفائے شہادت ہے کہ تمام انبیاء کی اصولی تعلیم پر جو خدائے واحد پر ایمان اور اعمال صالحہ کا بجا لانا ہے یوں پردہ ڈالا جائے۔ یہی حالت یہود کی تھی کہ وہ بھی بوجہ انبیاء کی اولاد ہونے کے اپنے آپ کو اعمال سے مستغنی خیال کرتے تھے۔

ع ۱۷۶ ایمان صحیح سے ہی چونکہ عمل خالص پیدا ہوتا ہے اس لیے پھر دوہرایا کہ گزشتہ لوگوں کے اعمال تمہارے کام نہ آئیں گے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ
قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ
الْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٤٢﴾
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ
عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۚ

بے وقوف لوگ بول اُٹھیں گے کس چیز نے اُن کو اُن کے قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے۔ کہہ مشرق اور مغرب اللہ کا ہی ہے، وہ جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے ۱۷۷
اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک اعلیٰ درجہ کا گروہ بنایا ہے تا کہ تم لوگوں کے پیشرو بنو اور رسول تمھارا پیشرو ہو ۱۷۸

ع ۱۷۷ قبلۃ۔ مقابلۃ سے لیا گیا ہے اور اصل میں اس خاص حالت کا نام ہے جس پر سامنے کھڑا ہونے والا ہو (غ)، چنانچہ دو آدمی جو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوں ان میں سے ہر ایک دوسرے کا قبلہ کہلائے گا (ج) اور اس کے مقابل دِبْرَۃ ہے جو پیٹھ کی طرف کی چیز کو کہتے ہیں۔ اور عرف میں قبلہ اس مکان مقابل کا نام ہو گیا ہے جس کی طرف نماز میں مُنہ ہو۔

تحویل قبلہ: یہاں سے وہ مضمون شروع ہوتا ہے جو تحویل قبلہ کے نام سے موسوم ہے یعنی بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کا قبلہ قرار دیا جانا اس کا تعلق پچھلے مضمون سے ظاہر ہے کیونکہ وہاں حضرت ابراہیمؑ اور خانہ کعبہ کا ہی ذکر ہے۔ گو الفاظ قرآنی کی ہم اور تاویل بھی کر سکیں۔ تحویل قبلہ پر احادیث: مگر روایات صحیحہ میں تحویل قبلہ کا کھلا ذکر ہے۔ چنانچہ بخاری میں ہی متعدد روایات طرق مختلفہ سے اس بارہ میں آئی ہیں۔ یعنی حضرت ابن عمرؓ کی روایت عبداللہ بن دینار کی روایت سے کہ مسجد قباء میں لوگ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے جب ایک شخص نے ان کو اطلاع دی کہ کعبہ کی طرف مُنہ کرنے کا حکم ہو چکا ہے اور لوگوں نے حالت نماز میں ہی شام سے مکہ کی طرف منہ پھیر لیا یہ روایت کتاب التفسیر میں امام بخاری نے پانچ مختلف طریقوں سے بیان کی ہے۔ اور براء کی روایت کہ نبی کریم صلعم نے مدینہ میں آ کر سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تب آپ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا۔ یہ بھی دو طریق پر آئی ہے۔ اور حضرت انسؓ کی روایت کہ انہوں نے فرمایا کہ اب ان لوگوں میں سے جنہوں نے دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی میرے سوا کوئی زندہ نہیں رہا اور پھر اس کی مؤید حضرت عمرؓ کی وہ روایت ہے جو واتخذوا من مقام ابراهيم مصلّٰى کے ماتحت امام بخاری کتاب التفسیر میں لائے ہیں کہ آپ نے فرمایا تین باتوں میں میری رائے کا توافق اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہوا جن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ لو اتخذت من مقام ابراهيم مصلّٰى۔ اگر آپ مقام ابراہیم یعنی کعبہ کو مصلّٰی یعنی قبلہ بنائیں۔ پس اس قدر روایات کے ہوتے ہوئے اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نبی کریم صلعم پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ ہجرت کے سولہ یا سترہ ماہ بعد خانہ کعبہ صریح وحی الٰہی کے ماتحت قبلہ قرار پایا۔

تحویل قبلہ دو دفعہ نہیں ہوئی: البتہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تحویل قبلہ دو دفعہ ہوئی وہ صریح غلطی پر ہیں۔ اس کے لیے نہ قرآن میں کوئی دلیل ہے نہ کسی حدیث صحیح میں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں بھی آنحضرت صلعم بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ البتہ وہاں خانہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کو سامنے رکھ لیتے تھے مدینہ میں جب تشریف لائے تو یہ دِقّت پیش آئی کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے میں خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ ہوتی تھی۔ اس لیے آپ کا دل یہ چاہتا تھا۔ جیسا کہ روایات میں صاف آیا ہے کہ آپ کا قبلہ خانہ کعبہ ہو جس کا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے تھا۔ مگر چونکہ آپ سے پہلے انبیاء جو گزرے ان کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا اس لیے آپ نے بھی اسی کو قبلہ رکھا یہاں تک کہ وحی الٰہی سے تحویل قبلہ ہوئی۔

وحی الٰہی قلب نبوی سے نہ پھوٹتی تھی: اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کا سر چشمہ نبی صلعم کا اپنا قلب نہ تھا ورنہ سولہ سترہ ماہ تک آپ کا دل تو یہ چاہے کہ خانہ کعبہ قبلہ ہو مگر وحی نازل نہ ہو یہ بے معنی بات ہے۔

ما ولّٰهم کے معنی: اس تحویل قبلہ میں کیا راز تھا۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ رہا یہ کہ آیا الفاظ ما ولّٰهم میں اسی تحویل قبلہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ علیحدہ سوال ہے ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر یہ پہلے تھے یعنی بیت المقدس کس چیز نے پھیر دیا۔ یہ تو صریح تحویل قبلہ کا ذکر ہو گیا اور یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان انبیاء کے قبلہ سے (جن کا ذکر ابھی نام لے کر ہوا ہے) جس پر وہ انبیاء تھے یعنی بیت المقدس کس چیز نے پھیر دیا جس میں تحویل قبلہ ضروری نہیں ٹھہرتی۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے یعنی خانہ کعبہ، کس چیز نے بھگا دیا۔ اور یہ اشارہ ہوگا ہجرت کی طرف کہ جب ان کا قبلہ خانہ کعبہ تھا تو وہاں سے بھاگ کر کیوں آئے لله المشرق والمغرب۔ جو جواب دیا ہے آخری معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا وہاں سے چلا آنا قبلہ ہونے کے منافی نہیں اس لیے کہ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے وہ ان کو اس قبلہ کا مالک بھی بنا دیگا۔ پہلے دو معنی اختیار کرنے کی صورت میں لله المشرق والمغرب سے یہ مراد ہو گی کہ اللہ کا تعلق تو کسی خاص سمت سے نہیں، سب سمتیں اسی کی ہیں۔ اگر ایک زمانہ میں قبلہ بیت المقدس تھا اور اب کعبہ ہے تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ ہاں یہ ضروری تھا کہ آخری نبی کا قبلہ وہ مقرر کیا جاتا جو دنیا میں خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر تھا اور اسی کی طرف الفاظ صراط مستقیم میں اشارہ ہے یا یہ اشارہ ہے کہ یہ صحیح تعلیم کہ خدا کا تعلق کسی خاص سمت سے نہیں ہم نے مسلمانوں کو دی۔

ع ۱۷۸ وسطاً۔ وسط کسی چیز کا درمیان ہے اور بعض اوقات بلحاظ اطراف کے جو افراط و تفریط کو ظاہر کرتی ہیں اعلیٰ اور اشرف چیز کو بھی وسط کہا جاتا ہے (غ) چنانچہ بخاری میں الوسط کے معنی العدل لکھے ہیں اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ محاورہ عرب میں خیار یعنی بہترین لوگ وسط کہلاتے ہیں اور یہاں مراد الیسا گروہ ہے

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ

اور ہم نے اُسے جس پر تو تھا قبلہ نہیں بنایا، مگر اس لیے کہ ہم اس شخص کو جو رسول کی پیروی کرتا ہے اس سے الگ کر دیں جو اپنی ایڑیوں پر واپس ہوتا ہے اور بیشک یہ ایک بھاری بات تھی مگر (نہ) اُن لوگوں پر جنھیں اللہ نے ہدایت کی۔[۱۷۹] اور اللہ (ایسا) نہیں کہ تمھارے ایمان کو ضائع

جو افراط و تفریط سے پاک ہونے کی وجہ سے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوا ہے۔

شہداء۔ شہید کے معنی کے لیے دیکھو ع[۳۷]۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ شہداء سے مراد ایسے لوگ ہیں جو جس بات کو سنتے ہیں اس کو اپنے دل میں حاضر رکھتے ہیں اور گواہ ہونے سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو علم انھوں نے رسول اللہ صلعم سے حاصل کیا ہے اسے لوگوں کو پہنچائیں۔ اس لحاظ سے شہداء کے معنی مزکی بھی ہو سکتے ہیں اور پیشرو یا امام بھی۔ اور یہاں یہی مراد ہے۔

قبلہ کے مضمون میں ختم نبوت کی طرف اشارہ: کذالک میں اشارہ پچھلی آیت کے مضمون کی طرف ہے یعنی خانہ کعبہ کو جو توحید کا اصل مرکز ہے قبلہ مقرر کرنے میں ہم نے یہ بتا دیا ہے کہ یہ نبی آخری نبی ہے اور اب اسی کے پیرو دنیا میں علم دین کو پھیلانے والے اور دنیا کے حقیقی پیشرو اور امام ہونگے جس طرح رسول اللہ صلعم ان کے پیشرو اور امام ہیں ویکون الرسول علیکم شہیدا کو پیچھے رکھ کر یہ صاف طور پر سمجھا دیا ہے کہ جس قدر نیکی کی تعلیم اور نفوس انسانی کے تزکیہ کرنے والے اب دنیا میں ہوں گے۔ ان سب کے پیشوا اور سردار اور مزکی محمد رسول اللہ صلعم ہوں گے اور یوں وہ سب ایک ہی سردار کے ماتحت ہونے کی وجہ سے دنیا میں اتحاد قومی اور وحدت انسانی کی بنیاد رکھنے والے ہوں گے۔ کمالات اُمت محمدیہ: اس آیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے کمالات کی طرف بلکہ کل اُمت محمدیہ کے کمالات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو کام دنیا میں انبیاء علیہم السلام کرتے تھے وہ اب محمد رسول اللہ صلعم کے نام لیوا کریں گے اور یا کذالک کہہ کر یہ اشارہ کیا کہ جس طرح یہ تعلیم کہ خدا کا تعلق کسی خاص سمت سے نہیں۔ تاہم ایک قبلہ یعنی سب کا ایک طرف منہ کرنا اتحاد کے لیے ضروری ہے ایک میانہ روی کی تعلیم ہے جو ہم نے تم مسلمانو کو دی ہے اسی طرح ہر امر میں ہم نے تم کو میانہ روی کی تعلیم دی ہے تاکہ تم ہمیشہ کے لیے دنیا کے پیشرو بنو۔

ع[۱۷۹] تحویل قبلہ کے ذریعہ تمحیص: وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیھا۔ ان الفاظ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ ہم نے اُسے قبلہ نہیں بنایا تھا جس پر تم اب تک تھے مگر اس لیے کہ کھرے کھوٹے کی تمیز ہو۔ یعنی بیت المقدس جو کچھ دیر تک قبلہ رہا اور اس کے بعد اب خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا گیا۔ تو یہ تمحیص کے لیے تھا۔ اور یہاں جعلنا کا مفہوم ایسا ہی ہے جیسے وما جعلنا الرؤیا التی ارینٰک الا فتنۃ للناس (بنی اسرائیل۔ ۶۰) میں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا تھا کہ رویا فتنہ ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم نہ دیا تھا۔ نہ ایسی کوئی وحی قرآن میں موجود ہے نہ کسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی طرف آپ نے وحی کے حکم سے منہ کیا ہو۔ ہاں جب آپ کو مدینہ میں آ کر خانہ کعبہ اور بیت المقدس میں سے ایک کو انتخاب کرنا پڑا تو آپ نے بیت المقدس کی طرف منہ کیا اور کعبہ کی طرف پیٹھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایک مدت تک آپ کو اسی حالت پر چھوڑ دیا اور وحی الٰہی نازل نہ کی اور اس کی غرض جیسا آگے آتا ہے تمحیص تھی اور دوسرے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ کنت بمعنی صرت لیا جائے یعنی ہم نے اسے جس پر تو اب ہُوا ہے قبلہ نہیں بنایا مگر اسی غرض کے لیے اور اس صورت میں مراد خانہ کعبہ ہوگا اور کنت علیھا سے مراد معتقد الاستقبالہا بھی ہو سکتی ہے یعنی جس کی طرف تمہاری توجہ کا عقد تھا۔

علم بمعنی تمیز: لنعلم کے معنی تا ہم الگ الگ کر دیں کیے گئے ہیں۔ کیونکہ علم بمعنی تمیز بھی آتا ہے خصوصاً جب اس کا صلہ من ہو جو تمیز کے لیے آتا ہے (ح) اور بعض نے علم بمعنی رویۃ لیا ہے (ج) یعنی تا ہم دیکھیں کہ کون ایسا ہے۔ اور کون ایسا۔ اور رویۃ معنی اس لیے صحیح ہیں کہ یہ وہ علم الٰہی ہے جو ایک واقعہ کے ظہور کے بعد ہوتا ہے۔ اور یہ فی الحقیقت رویۃ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم انسانوں کے متعلق دو قسم کا ہے۔ ایک یہ کہ علم جب ابھی تمام امور پردہ غیب میں ہیں۔ ایک وہ علم جو اظہار واقعہ کے بعد ہوتا ہے جس پر ایک فعل کے واقعہ ہو جانے کی وجہ سے جزا و سزا مترتب ہوتی ہے اس حصہ آیت میں تحویل قبلہ کی غرض بتائی ہے کہ کھرے کھوٹے الگ الگ ہو جائیں۔ ایک سچے دین کو تمحیص کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ تا گریزد ہر کہ بیرونی بود۔ اگر کچے پکوں کے ساتھ ملے رہیں تو دین کی اصل غرض پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ تمحیص کے لیے بعض واقعات ایسے پیدا کر دیتا ہے یہ تمحیص کوئی چھوٹی سی نہ تھی کہ جب رسول اللہ صلعم مکہ میں تھے تو بیت المقدس قبلہ رہا۔ حالانکہ وہاں مشرک ہی مشرک تھے جو خانہ کعبہ کی عزت کرتے تھے۔ مگر بیت المقدس کی عزت نہ کرتے تھے اور جب مدینہ میں آئے جہاں یہودیوں کا زور تھا تو خانہ کعبہ قبلہ ہوا۔ تاکہ وہی لوگ مسلمان ہوں جن کے دلوں میں صداقت اسلام مرکوز ہو چکی ہے اور کوئی ابتلا ان کے قدم کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ ایک اور غرض تحویل قبلہ میں یہ بھی تھی کہ قبلہ کوئی پرستش کی چیز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو شروع سے ایک ہی قبلہ ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ توحید کے احکام تو ابتدا میں ہی دیدیئے گئے پھر خانہ کعبہ کو قبلہ اس وقت بنایا جاتا ہے۔ جب مشکلات کا زمانہ گزر گیا ہے اگر ابتدا میں ہی خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا جاتا تو شاید عرب کے لوگ یہ سمجھ کر بھی ساتھ شامل ہو جاتے کہ کیا ہرج ہے ہمارے آبائی دین کے ہی یہ ارکان ہیں۔ مگر نہ صرف اس کو ابتدا میں قبلہ قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ مدینہ میں سولہ مہینے اس کی طرف پیٹھ بھی کروائی۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ پرستش کی چیز نہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۱۴۳)
قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ
قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ
شَطْرَهُ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُونَ
أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ

کرے اللہ لوگوں پر مہربان، رحم کرنے والا ہے ع۱۸۰
ہم یقیناً تیرے آسمان کی طرف توجہ کرنے کو دیکھتے ہیں پس ضرور ہم تجھے
اس قبلہ کا متولی بنا دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے سو تو اپنے منہ کو مسجد
حرام کی طرف پھیر دے اور جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اسی کی
طرف پھیر دو ع۱۸۱۔ اور وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی ہے یقیناً جانتے ہیں
کہ اُن کے رب کی طرف سے سچ ہے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں

ع۱۸۰ ایمان کے معنی یہاں حضرت ابن عباسؓ سے بخاری میں صلوٰۃ مروی ہیں۔ یعنی یہ منشاء ہے کہ جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں وہ ضائع نہیں ہوئیں۔ کیونکہ نماز تو خدا کی ہے اس کو قبلہ سے کوئی ایسا تعلق نہیں کہ اگر اس طرف منہ کرکے نہیں پڑھی گئی تو نماز ہی نہیں ہوئی۔ اس میں بھی اس غلط خیال کی تردید ہے کہ قبلہ مسلمانوں کی عبادت میں کوئی اصلی مقصود ہے۔ جیسا کہ مخالفین اسلام نے غلطی سے خیال کر لیا ہے۔ ایمان کا لفظ لانے میں بھی یہی اشارہ ہے کہ قبلہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس سے ایمان میں کوئی نقص پیدا ہوتا ہو۔

رؤف کے معنی ہیں اشد درجہ کی رحمت پائی جاتی ہے جو اپنے الطاف کے ساتھ خود ہی اپنے بندوں پر مہربانی کرتا ہے (ل) اور رأفۃ جس سے یہ مشتق ہے رحمت سے زیادہ خاص اور زیادہ رقت والی شے ہے (ل)

ع۱۸۱ تقلب وجھك فی السماء۔ تقلب۔ قلب سے ہے اور اس کے معنی بار بار پھیرنا ہیں فی یہاں بمعنی الی ہے۔ وجہ۔ توجہ یا منہ۔ توجہ یا منہ کے بار بار آسمان کی طرف پھیرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنا یا اس کی طرف سے کسی امر کا انتظار کرنا ہے۔ مگر یہاں مراد اس حکم کا انتظار نہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا جائے کیونکہ وہ حکم نازل ہو چکا اور اس پر اعتراضات کا جواب بھی ہو چکا۔ بلکہ یہ انتظار یا توجہ یا دعا اس لیے ہے کہ خانہ کعبہ جو مشرکین کے قبضہ میں ہے اور جسے اب قبلہ بنایا جاتا ہے کب بُت پرستی سے پاک ہوگا اور مسلمانوں کا اس پر کب قبضہ ہوگا۔

فلنولینك۔ ولیته کذا کے معنی ہوتے ہیں میں نے اسے فلاں چیز کا والی یا متصرف بنا دیا (غ۔ ر) یہی معنی یہاں مراد ہیں۔ منہ پھیرنے کے معنی نہیں۔ اس لیے کہ یہ آئندہ کے متعلق ہے اور منہ پھیرنے کا حکم پہلے ہو چکا (وتی مصدر تولیته) کبھی اقبال کے معنی میں آتا ہے جیسے فول وجھك یا لکل وجھة ھو مولیھا یعنی اس طرف متوجہ ہونا اور کبھی انصراف کے معنی میں جیسے ثم ولیتم مدبرین یا ما ولٰھم عن قبلتھم۔

شطر کسی چیز کے نصف یا وسط کو کہتے ہیں اور یہاں مراد اس کی جہت ہے (غ)

الحرام۔ حرام کے معنی ہیں الممنوع منه وہ جس سے روکا جائے خواہ بذریعہ تسخیر الٰہی ہو جیسے حرام علٰی قریة اھلکنٰھا (الانبیاء ۲۱-۹۵) میں (جہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہی ایسا ہے کہ جن پر موت وارد ہو جائے وہ اس دنیا میں واپس نہیں آسکتے) یا عقل یا شریعت کی رو سے یا کسی حکم کی وجہ سے جس کی اتباع ہوتی ہے یا غلبہ کی وجہ سے اور حَرَم کو حرم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی رو سے اس میں بہت سی باتیں منع ہیں جو دوسری جگہ کرنی جائز ہیں (غ) اسی مادہ سے محروم ہے۔ گویا وہ شخص جو ایک چیز کے حصول سے روک دیا گیا ہے محروم ہے۔

المسجد الحرام۔ اس وسیع احاطہ کا نام ہے جس کے اندر خانہ کعبہ ہے۔ یہ احاطہ کوئی دو سو پچاس قدم لمبائی میں اور دو سو قدم چوڑائی میں ہے اور خانہ کعبہ اس کے قریباً وسط میں واقع ہے جو لمبائی میں اٹھارہ قدم اور چوڑائی میں چودہ قدم ہے اور اس کے شمال مشرقی کونہ پر حجر اسود ہے۔ مگر بعض وقت المسجد الحرام کل حَرَم پر بول دیا جاتا ہے جس کے اندر خود مکہ معظمہ اور میدان منیٰ اور عرفات واقع ہیں اور جس کے اندر جنگ کرنا یا ہتھیار اُٹھانا یا شکار کرنا یا گھاس وغیرہ (سوائے اذخر کے) کاٹنا منع ہے۔ جیسے لمن لم یکن اھله حاضری المسجد الحرام (۱۹۶) میں یا لا تقاتلوھم عند المسجد الحرام حتٰی یقاتلوکم فیه (۱۹۱) میں۔

خانہ کعبہ کی تولیت: خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ مگر کعبہ کے اندر جو توحید کا مرکز تھا بُت بھرے ہوئے تھے۔ تو لازماً یہ خیال رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک میں پیدا ہوتا ہوگا کہ اس آلائش سے یہ مرکز توحید کب اور کس طرح پاک ہوگا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ ہم تم کو ہی اس قبلہ کا متولی بنائیں گے، جسے تم چاہتے ہو۔ اور اس کے بعد جو فرمایا کہ فول وجھك تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ حکم ابھی ملتا ہے۔ کیونکہ یہ عبارت تو بے معنی سی ہو جاتی ہے کہ ہم تیرا منہ اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ پس تو بھی اپنا منہ پھیر لے۔ بلکہ اصل مراد اسی خیال کا ازالہ ہے کہ خانہ کعبہ میں بُت ہیں تو فرمایا کہ اس وجہ سے مضائقہ نہ کرو۔ کیونکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے اور یہ مرکز توحید موحدین کے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ اس لیے بغیر کسی خیال کو دل میں لانے کے اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب خانہ کعبہ کا متولی کوئی غیر مسلم نہیں ہو سکتا۔

عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ جو وہ کرتے ہیں۔[۱۸۲]

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور اگر تو ان لوگوں کے پاس جنھیں کتاب دی گئی ہے سب نشان بھی لے آئے وہ تیرے قبلہ کی تابعداری نہ کریں گے اور نہ تو ان کے قبلہ کا تابع ہے اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع ہیں۔ اور اگر تو ان کی گری ہوئی خواہشوں کی پیروی کرے اس کے بعد جو تیرے پاس علم سے آچکا تو بیشک اس وقت تو ظالموں میں سے ہو گا[۱۸۳]

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے اسے اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے ایک فریق یقیناً حق کو چھپاتا ہے اور وہ جانتے ہیں[۱۸۴]

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

(یہ) حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس ہرگز جھگڑنے والوں میں سے نہ ہو[۱۸۴ الف]

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ

اور ہر ایک کے لیے ایک طرف ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے پس نیکیوں کو ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر لو۔[۱۸۵] جہاں کہیں تم ہو گے اللہ تم کو اکٹھا کرکے لائیگا

ع۱۸۲ اہل کتاب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پوری طرح کھل چکی تھی پیشگوئیاں ان کی کتاب میں موجود تھیں جن کے پورا ہونے کا ابھی تک اُن کو انتظار تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسمٰعیل کے ساتھ وعدہ تھا حضرت اسمٰعیل کو عرب میں چھوڑا گیا۔ بیت ایل سوائے عرب کے اور کہیں نہ تھا یعنی خانہ کعبہ کے سوائے کوئی گھر بیت اللہ نہیں کہلایا۔ حضرت ابراہیم کا تعلق اسی گھر سے تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگاریں یہاں موجود تھیں پس جب ابراہیمؑ کی دعاؤں کا موعود نبی آیا تو ضروری تھا کہ اس کا قبلہ بھی کعبہ ہوتا۔ اس لیے بھی کہ وہ جانتے تھے کہ نبی موعود عرب میں ظاہر ہونے والا ہے۔ بلکہ یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے یہودی ملک عرب میں کثرت سے آکر آباد ہو گئے تھے اور ان کی پیشگوئیوں میں اب تک بھی صراحت سے عرب کا نام پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یسعیاہ ۲۱: ۱۳ میں ان الفاظ کے بعد ”عرب کی بابت الہامی کلام“ آنحضرت صلعم کی ہجرت کی صاف پیشگوئی ہے تو اس قدر روشن نشان آپ کی صداقت کے جمع تھے کہ دل صداقت کا انکار نہ کرسکتے تھے۔

ع۱۸۳ قبلہ یہاں دین کے قائم مقام ہے کیونکہ یہ ایک ظاہر اور کھلا نشان دین کا تھا اور حدیث لاتکفر اهل قبلتك میں بھی اسی طرف اشارہ ہے اور یہ جو فرمایا کہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں تو حضرت موسیٰؑ کے پیروؤں میں یہودیوں کا قبلہ اور تھا سامریوں کا اور۔ پھر یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس تھا تو عیسائیوں نے بجائے اس کے مشرق کو اپنا قبلہ قرار دیا۔ مسلمانوں میں بہت سے اختلافات کے باوجود قبلہ کا اختلاف نہیں ہوا۔ اور وہ اصول دین پر بھی مجتمع ہیں۔

ع۱۸۴ اہل کتاب کا آنحضرت کو شناخت کرنا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت بوجہ ان پیشگوئیوں اور وعدوں کے جو اہل کتاب کو دیئے گئے تھے ان پر واضح ہو چکی تھی۔ مگر محض اس حسد کی وجہ سے قبول نہ کیا کہ بنی اسرائیل میں سے نہیں۔ دوسری جگہ بھی ہے فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ تمام علامات شناخت یقینی طور پر ظاہر ہو چکی تھیں۔ اس لیے اسی طرح آپ کا نبی موعود ہونا پہچانتے تھے جس طرح ایک انسان اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے یا ابناءھم سے مراد انبیائے بنی اسرائیل ہیں۔ یعنی جن نشانات سے ان کی صداقت کو پہچانتے تھے وہ سب نشانات یہاں بھی موجود ہیں۔

ع۱۸۴ الف الممترین۔ مِرْيَةٌ کسی امر میں تردد کو کہتے ہیں۔ جیسے فلا تکن فی مریة من لقائه (السجدة ۳۲-۲۳) وغیرہ مقامات پر اور امتراء کے معنی ہیں المحاجة فيما فيه مِرْيَةٌ (غ) یعنی اس امر میں جھگڑنا جس میں تردد ہو۔

یہاں خطاب مخالف کو ہے کیونکہ ابھی فرمایا تھا کہ یہ اہل کتاب جانتے ہیں انه الحق من ربهم تو اس لیے اب فرماتا ہے کہ یہ حق تمھارے رب کی طرف سے ہی ہے۔ پس جھگڑے کو چھوڑ دو اور حق کو قبول کرلو اور یا یہ خطاب عام ہے مگر اس صورت میں بھی مراد مخالف ہی ہیں۔

ع۱۸۵ لِكُلٍّ سے مراد ہر ایک قوم یا ہر ایک اہل مذہب یا ہر ایک شخص ہے۔

وِجْهَة۔ وَجْه قصد کو اور جِهَة اور وِجْهَة مقصد کو کہا جاتا ہے اور اصل میں جهة یا وجهة وہ ہے جس کی طرف ہم کسی چیز کے لیے توجہ کرتے ہیں (غ)

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۴۸﴾ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[186]

استبقوا۔ سَبْق۔ اصل میں چلنے میں آگے ہونے کو کہا جاتا ہے اور استباق کے معنی ہیں تسابق یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنا اور چلنے کے علاوہ اس قسم کے تقدم پر بھی بولا جاتا ہے جیسے بزرگی میں سبقت۔ اور السّابقون السابقون میں اور کئی دوسرے مقامات پر یہی سبقت مراد ہے (رغ)

اس رکوع میں ایک قبلہ اور پھر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کرنے کی وجوہات بیان فرمائی ہیں۔ مسلمانوں کا اگر ایک ظاہری قبلہ ہے تو ایک ان کے لیے باطنی قبلہ بھی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ دنیا کی ہر قوم نے اپنا ایک مقصد قرار دے لیا ہے اور وہ محض دنیا تک محدود ہے۔ پس اے مسلمانو! تم خیرات اور نیکیوں میں قدم بڑھاؤ اسی کو اپنا مقصد اسی کو قبلۂ ہمت قرار دو۔ اور ظاہری معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہُوا کہ ہر ایک قوم نے اپنے لیے ایک قبلہ ٹھہرایا ہُوا ہے پس تم اس قبلہ کی طرف سبقت کرو جو توحید کا مرکز اصلی ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی خیرات اور نیکیوں کا تم کو حقدار بناتا ہے۔ کیونکہ جس طرح شرک تمام بدیوں کی جڑ ہے توحید سے تمام نیکیاں پیدا ہوتی ہیں اور اگر لکل میں مراد ہر شخص لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ نماز پڑھنے میں ہر شخص کسی نہ کسی طرف منہ کرے گا اور الگ الگ طرف مُنہ کرنے میں سب کی توجہ ایک طرف نہیں رہ سکتی۔ اس لیے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو ایک طرف منہ کرنے کی ہدایت کرکے ان میں یک جہتی اور اتحاد کی بنیاد رکھ دی اور اس پر قائم ہوجانا بہت سی نیکیوں کو لے لینا ہے درحقیقت ایک قبلہ پر اتفاق اسلام کی اخوت عالمگیر کی بنیاد ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے لاتکفروا اھل قبلتک اپنے اہل قبلہ کی تکفیر مت کرو۔

مسلمان کعبہ کی پرستش نہیں کرتے: خانہ کعبہ کی جو کچھ عزت مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ اس کی وجہ سے ہے کہ یہ توحید کا اصل مرکز ہے اور نسل انسانی کے اتحاد کا بھی اصلی مرکز یہی ہے۔ بعض کوتہ اندیش مخالفین نے اس عزت کو پرستش کا قائم مقام قرار دیکر اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ کسی چیز کی عزت کرنا اور امر ہے اور اس کی پرستش امر دیگر ہے۔ پرستش یا عبادت میں تین باتوں کا پایا جانا ضروری ہے اول اس چیز کی عظمت سے اس قدر متاثر ہونا کہ اس کی طرف توجہ تام ہو۔ دوسرے اس کی حمد و ستائش کرنا۔ تیسرے اس سے دعا مانگنا۔ اب جب ایک مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کرتا ہے تو ان تینوں باتوں میں سے ایک بات کا بھی وہم تک اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ وہ اللہ اکبر کہتا ہُوا خدا کی عظمت کے سامنے کبھی دست بستہ کھڑا ہوتا کبھی جھکتا کبھی زمین پر گرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ہی حمد و ستائش کرتا ہے اور جو کچھ مانگتا ہے اپنے مالک حقیقی سے ہی مانگتا ہے۔ اس وقت نہ اس کے دل پر خانہ کعبہ کی عظمت کا کوئی اثر ہوتا ہے نہ اسکی طرف اس کی توجہ ہوتی ہے۔ نہ وہ خانہ کعبہ کی حمد و ستائش کرتا ہے۔ نہ خانہ کعبہ سے کوئی دعا مانگتا ہے۔ پس صرف حالت نماز میں خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کو خانہ کعبہ کی پرستش قرار دینا محض ایک جاہلانہ اور متعصبانہ خیال ہے۔ پھر اس وقت بھی تو مسلمانوں کی نماز اسی طرح ہوتی تھی جب خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کیے ہوئے ہوتے تھے اور بیت المقدس کی طرف منہ۔ تو کیا اس وقت وہ بیت المقدس کی پرستش کرتے تھے۔

خود خانہ کعبہ کے مشرکین عرب نے بھی باوجود اس کی اس عظمت کے جو اُن کے دلوں میں تھی کبھی پرستش نہیں کی۔ وہ ان بتوں کو ضرور پوجتے تھے جو انہوں نے اس کے اندر رکھے ہوئے تھے مگر اس گھر کی پرستش کبھی نہیں کی۔ بلکہ حجر اسود کی بھی جسے بوسہ دیا جاتا ہے عرب میں کبھی پرستش نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ بن گھڑا پتھر تھا نہ اس سے کبھی انہوں نے مرادیں مانگیں نہ اس کو اپنا معبود سمجھا۔ ہاں صرف طواف میں بوسہ دینا ثابت ہے اور مسلمان بھی بوسہ دیتے ہیں۔ مگر یہ محض ایک نشان محبت کے طور پر ہے کیونکہ وہ پتھر خود وہاں ایک نشان کے طور پر لگایا گیا ہے۔ یہی وہ پتھر ہے جس کی طرف حضرت داؤدؑ نے اپنی زبور میں بھی اشارہ کیا ہے "وہ پتھر جسے معماروں نے ردّ کیا ہے کونے کا سرا ہوگیا ہے۔ یہ خداوند سے ہوا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے" (زبور ۱۱۸: ۲۲-۲۳) یہی وہ بن تراشا پتھر ہے "جیسا کہ تونے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ سے آپ نکلا" (دانیال ۲: ۴۵) اب یہ ردّ کیا ہوا پتھر جو کونے کا سرا ہوگیا ہے۔ ساری مقدس تاریخ کو تلاش کرو تو سوائے بنی اسمٰعیل کے اور کسی کے لیے نشان نہیں ہوسکتا۔ مسیح کو یہودیوں کا ردّ کرنا ایک معمولی واقعہ ہے جو سارے انبیاءؑ کے ساتھ پیش آیا۔ مگر بنی اسمٰعیل کو بنی اسرائیل نے جن کی قوم مدت تک حکمران رہی بالکل ردّ کردیا۔ یہاں تک کہ اس قوم کو عہد ابراہیمی سے بھی اپنی طرف سے خارج کردیا۔ وہ نہ صرف اپنے ملک سے نکال کر ایک ریگستان میں رکھے گئے بلکہ ان کو ہمیشہ کے لیے ردّ شدہ تصوّر کرلیا گیا۔ پس یہی وہ پتھر تھا جس کو معماروں نے ردّ کردیا اور اسی کی یادگار میں خانہ کعبہ کا وہ پتھر ہے جو حجر اسود کے نام سے موسوم ہے اور اس کو بوسہ دینا اسی بات کی یادگار ہے کہ وہ ردّ کیا ہوا پتھر کونے کا سرا ہُوا۔ اسی کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی انگورستان والی تمثیل میں اشارہ کیا ہے جہاں یہ کہا ہے۔ کہ انگورستان کا مالک جب آئیگا تو انگورستان کو اور باغبانوں کے سپرد کردیگا۔ یہ انگورستان کیا ہے وہی خدا کی بادشاہت ہے جس کا ذکر خود حضرت مسیحؑ نے تمثیل کو واضح کرنے کے لیے ان الفاظ میں کیا ہے: "یسوع نے انہیں کہا کہ تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راجگیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لی جائیگی اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لائے دیجائیگی جو اس پتھر پر گریگا چور ہوجائیگا پر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالیگا (متی ۲۱: ۴۲ و ۴۴) یہاں مسیحؑ نے بنی اسرائیل کو صاف طور پر کہہ دیا کہ خدا کی بادشاہت تم سے لیکر ایک اور قوم کو دی جائے گی اور وہ قوم کونسی ہے وہ وہی قوم ہے جس کا نشان وہ پتھر ہے جسے راجگیروں نے ناپسند کیا یعنی قوم بنی اسمٰعیل۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حجر اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے۔

ع[186] کعبہ کی طرف منہ اتحاد پیدا کرتا ہے: ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہوسکتے ہیں کہ جہاں کہیں تم ہو اللہ تعالیٰ تم سب کا حشر ایک جگہ کرے گا اور یوں بھی ہوسکتے

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۹﴾

اور جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے، اور یقیناً یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔[۱۸۶]

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۰﴾

اور جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے اور جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اس کی طرف پھیر دو، تاکہ لوگوں کے لیے کوئی دلیل تمہارے خلاف نہ رہے مگر وہ جو اُن میں سے ظالم ہیں، سو اُن سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔[۱۸۸] اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت پا لو۔[۱۸۹]

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ

جیسا کہ ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم پر ہماری

ہیں کہ جہاں کہیں تم ہو تم سب پر موت وارد کرے گا اور یوں بھی کہ جہاں کہیں تم ہو اللہ تعالیٰ تمہاری نماز کو ایک ہی جہت کی طرف کرے گا (ض) فیأت بکم مجاز عن جعل الصلوٰۃ متحدۃ الجہۃ (د) اور مضمون کے لحاظ سے یہی آخری معنی ہی زیادہ موزوں ہیں۔ یعنی تم خواہ مشرق میں ہو خواہ مغرب میں خواہ شمال میں خواہ جنوب میں جہاں بھی دنیا میں پھیلے ہوئے ہو جب تم سب ایک خانہ کعبہ کی طرف منہ کرو گے تو تمہاری نماز اور اس کے ساتھ ہی تم میں ایک اتحاد ہو گا۔

اس میں ظاہر طور پر تو اسی قدر کہا ہے کہ جہاں کہیں تم ہو گے تم سب کی نماز ایک ہی جہت کی طرف ہو گی مگر اس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی بھی ہے کہ اے مسلمانو! تم جہاں کہیں دنیا میں ہو گے اللہ تعالیٰ اس اتحاد ظاہری کے ساتھ ایک اور اتحاد قائم رکھے گا اور اگر مذاہب کی تاریخ کو دیکھا جائے تو اسلام کا یہ ایک امتیازی نشان ہے کہ قومیت اور ملک کی حدبندیوں کو بالکل توڑ دیتا ہے اور مسلمانوں کو وہ کہیں بھی ہوں ایک کرتا ہے۔

ع[۱۸۷] قبلہ کی طرف منہ کرنے کے حکم کو تین دفعہ دہرانے میں حکمت: یہ حکم کہ جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے تین دفعہ دہرایا گیا ہے اوّل آیت ۱۴۴ میں دوم آیت ۱۴۹ میں تیسرے اس آیت میں مگر یہ تین دفعہ لانا تین مختلف غرضوں کے لیے ہے پہلی مرتبہ تو اس اطمینان کے لیے کہا تھا کہ خانہ کعبہ بُت پرستوں کے تصرف میں نہ رہے گا بلکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے اس لیے تم اپنا منہ بیشک ادھر پھیر دو۔ دوسری دفعہ آیت ۱۴۸ میں یہ بتا کر کہ ایک قبلہ پر قائم کرنے سے اصل غرض یک جہتی پیدا کرنا ہے پھر فرمایا کہ جہاں سے نکلو اس کی طرف منہ پھیر لو۔ اور اصل غرض کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ تیسری مرتبہ بیان فرمایا کہ تم اس کی طرف منہ پھیر لو تاکہ لوگوں کے لیے تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ رہے یعنی یہ درحقیقت ان پر ایک اتمام حجت ہے۔ اگر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر نہ کیا جاتا تو یہ اعتراض ہوتا تھا کہ جب دعائے ابراہیمی کا موعود نبی آ گیا تو اس کا قبلہ بھی وہی گھر چاہیئے جہاں حضرت اسمٰعیلؑ کو بطور نشان کے چھوڑا گیا تھا۔ چنانچہ آیت ۱۵۱ میں صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ یہی رسول ہے جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی۔

ع[۱۸۸] اہل کتاب کا اعتراض کہ کعبہ کو قبلہ بنانا عربوں کو ساتھ ملانے کے لیے تھا: الّا یہاں استثنائے منقطع ہے۔ مراد یہ ہے کہ لوگوں کے لیے حجت تو اب کوئی باقی نہیں رہی اور اتمام حجت ہو گیا مگر ظالم تو اب بھی نہیں ٹلیں گے۔ یا یہ کہ اب بھی حجت کریں تو یہ ظلم ہے اور ایسا کرنے والے ظالم ہیں۔ یہودی اس وقت کہتے تھے اور عیسائی آج تک کہتے ہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنانا عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے تھا۔ یہ اس شخص کی نسبت کہا جاتا ہے جس نے ہزارہا سال کی بت پرستی، شرابخوری، قماربازی، زناکاری، جنگ و جدال اور رسوم قبیحہ کو یوں ملک عرب سے مٹا دیا کہ گویا ان کا نام و نشان ہی نہ تھا۔ کیا اس کو ایک خانہ کعبہ چھڑانا مشکل تھا؟ نہیں اور ہرگز نہیں بلکہ اس نے خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھی تو کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور ڈیڑھ سال تک برابر نمازوں میں خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کرتے رہے اور سبھی مسلمان بھی کرتے رہے اور اس عرصہ میں اسلام کی ترقی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پس یہ ناحق کی حجت بازی ہے۔

ع[۱۸۹] عبادت الٰہی کا پہلا اور آخری گھر: دوسری غرض یہ بیان فرمائی کہ تاتم پر اتمام نعمت ہو اور تاکہ تم کامل ہدایت پانے والے بنو۔ ان سب چیزوں کا تعلق علم الٰہی میں خانہ کعبہ سے تھا جو خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر دنیا پر تھا۔ اوّل را بآخر نسبتے است۔ جو سب سے پہلا گھر تھا اسی کو دنیا کا آخری قبلہ قرار دیا۔ جہاں سے لوگ روئے زمین پر منتشر ہوئے وہیں پر پھر ان کا اجتماع ضروری ہُوا۔ مکّہ یوں بھی ناف زمین ہے۔ کیونکہ ملک عرب پرانی دنیا کے عین مرکز میں واقع ہوا ہے۔ دنیا توحید کو بھی بھول گئی تھی اور خانہ کعبہ کو بھی۔ دونوں کو آنحضرت صلعم واپس لائے۔

اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ وَیُعَلِّمُکُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمۡ مَّا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾

آیتیں پڑھتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور تم کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔[۱۹۰]

فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ وَاشۡکُرُوۡا لِیۡ وَلَا تَکۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾ ع

پس مجھے یاد کرتے رہو میں تمہیں یاد رکھونگا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔[۱۹۱]

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔[۱۹۲]

ع[۱۹۰] دعائے ابراہیمی کا رسول اور قبلہ ابراہیمی: یعنی تمہارا قبلہ خانہ کعبہ کو اسی طرح قرار دیا ہے جیسا کہ تم میں دعائے ابراہیمی والا رسول بھیج دیا چنانچہ انہی الفاظ کو یہاں دوہرایا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں اوپر آچکے ہیں۔ یہ اسی طرف اشارہ کرنے کو ہے کہ جب وہ دعا پوری ہو کر وہ رسول آگیا تو ضروری ہوا کہ وہ گھر بھی اس کا قبلہ قرار دیا جائے تاکہ تم دنیا میں نیکی کے معلم ہو۔ اسی لیے تحویل قبلہ پر اعتراض کا ذکر کر کے فرمایا تھا لتکونوا شھداء علی الناس۔

ع[۱۹۱] اذکرونی۔ ذکر کے معنی حفظ الشئ ہیں (ت) یعنی کسی چیز کا یاد رکھنا اور یہ دو طرح پہ ہے دل سے اور زبان سے اور ان میں سے ہر ایک دو قسم ہے۔ ایک بھولنے کے بعد کسی چیز کا ذکر دوسرے ہمیشہ اس کا محفوظ یعنی یاد رکھنا (غ) اور ذکر کے معنی ثناء بھی ہیں یعنی تعریف کرنا اور شرف بھی یعنی بزرگی دینا (ت) انہ لذکر لک ولقومک (الزخرف ۴۳-۴۴) ہیں اور صٓ والقراٰن ذی الذکر (صٓ ۳۸-۱) میں یہی آخری معنی مراد لیے گئے ہیں۔ اور الذکر قرآن شریف کا نام بھی ہے۔ یہاں اذکرونی میں بندہ کا اللہ کی ثناء کرنا مراد ہے اور اذکر میں بندہ کو اللہ کا شرف یا بزرگی دینا دوسرے لفظوں میں مخلوق خدا میں اس کا ذکر پھیلا دینا یا جس طرح قرآن کریم نے بدی کی سزا کا ذکر انہی الفاظ میں کر دیا ہے دیکھو [۲۷] اسی طرح نیکی کی جزا کا ذکر بھی انہی الفاظ میں کر دیا ہے اور مراد ذکر اللہ کی جزائے خیر دینا ہے۔ یہاں کفر سے مراد ناشکر گذاری یا نعمت کا اخفاء ہے دیکھو [۱۷]۔

اعلائے کلمۃ اللہ سے ہی مسلمان بڑے بن سکتے ہیں: یہ مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ تم میرا ذکر کرو یعنی میرے نام کو دنیا میں پھیلاؤ تو میں تمہیں بڑا بناؤں گا اور اگر تم اس نعمت کو چھپاؤ تو پھر تمہارے لیے سزا بھی ہے۔ چنانچہ اگلے رکوع کے دو حصے کیے ہیں ایک حصہ میں ہدایت کے پھیلانے میں مشکلات کے مقابلہ کا اور دوسرے حصہ میں کتمان ہدایت کا ذکر ہے۔ کاش آج مسلمان بڑا بننے کے لیے اس ارشاد الٰہی کی تعمیل کر کے اشاعت اسلام کے کام کو اپنا نصب العین بنائیں۔

ع[۱۹۲] صبر۔ صبر کے معنی کے لیے دیکھو [۶۸] اور یہ دو قسم ہے۔ ایک صبر حرام اور گناہ کی چیزوں کے ترک کرنے پر اور دوسرا صبر طاعات اور قربانیوں کے بجالانے پر۔ یہاں یہی دوسری قسم کا صبر مراد ہے کیونکہ جیسا کہ پچھلے رکوع کی آخری آیت سے ظاہر ہے۔ یہاں مضمون یہ ہے کہ ہدایت کے پھیلانے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا مقابلہ ضروری ہے۔

مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اور اس کے حصول کے لیے مشکلات: مسلمانوں کو یہ وعدہ دیا تھا کہ خانہ کعبہ بت پرستوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گا، بلکہ ہم تم کو اس کا متولی بنا دیں گے یہ ایک بڑا بھاری مقصد تھا ہدایت کا دنیا میں پھیلانا۔ شھداء علی الناس یعنی دنیا میں مزکی اور مبشر بننا۔ لوگوں کو نیکی کی تعلیم دینا یہ عظیم الشان کام مسلمانوں کے سپرد کیا گیا تھا اب بتاتا ہے کہ ان مقاصد کا حاصل ہونا آسان نہیں بلکہ اس میں بڑی بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔ ان مشکلات کے اندر مدد اللہ تعالیٰ سے چاہو۔ مگر دو ذریعوں سے ایک صبر کے ساتھ یعنی طاعات اور قربانیوں کے بجالانے پر مضبوط رہو اور جو تکلیفیں ان میں پیش آئیں ان کی پروا نہ کرو اور دوسرے نماز کے ساتھ یا دعا یعنی توجہ الی اللہ کے ساتھ کیونکہ نماز بھی اصل میں دعا ہی ہے۔ صبر اور صلوٰۃ کا مفہوم دو ضدوں کا ظاہر کرنے والا ہے۔ صبر کمال درجہ کی مضبوطی کا نام ہے۔ یہاں تک کہ انسان کسی مشکل اور رکاوٹ کی پروا نہ کرے۔ صلوٰۃ کمال درجہ کی عاجزی اور توجہ تام کا نام ہے یہاں تک کہ انسان اپنے مالک کے سامنے گر جائے۔ صبر اس علو کے مقام کو ظاہر کرتا ہے جو انسان کل دنیا کے مقابلہ پر اختیار کر سکتا ہے۔ صلوٰۃ اس انتہائی عاجزی کے مقام کو ظاہر کرتی ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اختیار کرنا چاہیئے۔ ان دونوں صفات کو اپنے اندر جمع کرنے سے ہی انسان کمال کو حاصل کر سکتا ہے۔ یعنی دنیا اور دنیا کی مشکلات اور دنیا کے جبارین کے سامنے علو اور مضبوطی دکھائے اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی دکھائے۔ عاجزی اور توجہ الی اللہ سے اس کے سامنے راہیں کھل جاتی ہیں مضبوطی اختیار کر کے ان راہوں پر چل سکتا ہے۔ اگر راہ ہی نہ کھلے تو مضبوطی کس کام کی۔ اگر راہ کھل جائے اور اس پر مضبوطی سے قدم مارنے والا نہ ہو تو راہ کھلنے سے فائدہ کیا۔ اس لیے نہ خالی صبر کمال انسانی تک پہنچاتا ہے نہ نری صلوٰۃ۔

دو موقعوں پر استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا ذکر اور دونوں میں فرق: یہی حکم صبر اور صلوٰۃ سے مدد چاہنے کا پہلے بھی سورۃ کے شروع میں آچکا ہے۔ وہاں بنی اسرائیل کو کہا تھا کہ صبر اور صلوٰۃ سے مدد چاہو تو پیغمبر کی صداقت تم پر کھل جائے گی۔ مگر اس موقعہ پر صلوٰۃ کے ذکر کو جاری رکھا وانھا لکبیرۃ اور یہاں صبر کے ذکر کو جاری رکھا۔ ان اللہ مع الصّٰبرین۔ یہ فرق اس لیے ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شناخت میں زیادہ ضرورت عاجزی اور دعا کی ہے اور کامیابیوں کے حصول میں زیادہ ضرورت صبر یعنی مضبوطی کی ہے۔ اس لیے ہر موقعہ پر جس کی زیادہ ضرورت تھی اس کے ذکر

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں اُنھیں مُردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم محسوس نہیں کرتے ۱۹۳۔

اور ضرور ہم کسی قدر ڈر اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تمہارا امتحان کریں گے اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دو ۱۹۴۔

کو جاری رکھا۔ چنانچہ اس رکوع میں بلکہ آگے دور تک صبر کا ذکر ہی چلتا ہے۔ دیکھو۔ والصّابرین فی الباساء والضرّاء وحین الباس (۲: ۱۷۷) اس سے قرآن کریم کا اعجازی کلام ہونا ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح ہر موقعہ پر اس کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ہاں یہ باریک فرق بہت تدبّر کو چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ قرآن شریف کو پڑھے اور اس پر غور کرے۔

۱۹۳ سبیل اللہ۔ سبیل اس رستہ کو کہتے ہیں جس میں سہولت ہو اور اس کی جمع سُبُل آتی ہے پھر ہر ایک اس ذریعہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے جس کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچ سکیں جیسے ادع الیٰ سبیل ربّک (النحل ۱۶: ۱۲۵) اذا لا تبغوا الیٰ ذی العرش سبیلا (بنی اسرائیل ۱۷: ۴۲) پس سبیل اللہ وہ راہ ہے جس پر چل کر انسان خدا کو پہنچ سکتا ہے اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا (العنکبوت ۲۹: ۶۹) یہ راہ جہاد ہے اسی لیے امام رازی نے لکھا ہے کہ فی سبیل اللہ عرف قرآن میں جہاد کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ جہاد قتال نہیں مگر اس جہاد کے لیے بعض وقت قتال کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور یہ اس وقت جب ان راہوں پر چلنے سے تلوار کے ذریعہ سے روکا جاتا ہے۔

اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے مُردہ نہیں: جب صبر کی ضرورت بتائی تو اب ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو صبر میں کمال دکھاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں فرمایا کہ ایسے لوگوں کو مُردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں۔ کہنے والے کون تھے؟ دوسری جگہ منافقوں کا قول مذکور ہے لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا (آل عمران ۳: ۱۵۶) اور مراد چونکہ صرف ایک امر کا ظاہر کرنا ہے اس لیے ہر مخاطب مراد ہے۔

ان کی زندگی کا مفہوم: اس سے کیا مراد ہے کہ ان کو مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں؟ امام راغب نے اس کے ایک معنی یوں کیے ہیں کہ یہاں نفی موت سے مراد غم اور ناکامی کی موت ہے، موت کے اس معنی کی تائید میں انہوں نے یہ آیت پیش کی ہے ویاتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت (ابراہیم ۱۴: ۱۷) اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں کام کرتے ہوئے مارے جائیں ان پر حزن و ناکامی کی موت نہیں آتی۔ اس لیے ان کو ناکام مت کہو بلکہ وہ کامیاب ہوں گے اس صورت میں یہ استعانت بالصبر والصلوٰة کا نتیجہ بتایا کہ ایسے لوگ ناکام کبھی نہیں ہوں گے۔

کافر کی بعد موت زندگی حیات نہیں: اگر عام معنی لیے جائیں تو ظاہر ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے۔ حالانکہ کافر موت کے بعد مطلق نیستی سمجھتے تھے۔ وہ زندگی بیشک سب کے لیے ہے نیکوں کے لیے بھی اور بدوں کے لیے بھی۔ مگر بدوں کے لیے چونکہ اس زندگی میں عذاب ہے جس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے لا یموت فیھا ولا یحییٰ (طٰہٰ ۲۰: ۷۴) وہ زندگی تو ضرور ہے اس لحاظ سے کہ نیستی نہیں مگر اس کو حیات یا زندگی بھی نہیں کہہ سکتے۔ پس زندگی حقیقت میں نیکوں کے لیے ہی ہے۔ پھر بالخصوص وہ لوگ جو یہاں شہید کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جیسے انبیاء علیہم السلام یا ان کے کامل متبعین جن کو صدیق اور شہید کہا گیا ہے یا وہ لوگ جو اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیدیتے ہیں یہ لوگ اپنے مشاہدہ یا یقین سے گویا عینی گواہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ہو جاتے ہیں اور وہ حجاب جو اکثر اہل دنیا کی صورت میں اس عالم میں رہتا ہے ان کی صورت میں اُٹھ جاتا ہے وہ اسی زندگی میں ایک نئی زندگی پا لیتے ہیں اور موت کے ساتھ ہی ان کی وہ نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کو خصوصیت سے احیاء یعنی زندہ کہا گیا ہے۔

شہداء کی موت اور ان سے استمداد کا ناجائز ہونا: جن لوگوں نے ظاہر الفاظ پر زور دے کر اس آیت کے یہ معنی کرنے چاہے ہیں کہ شہداء کبھی مرتے ہی نہیں اور پھر اس خیال کو شرک کی حد تک پہنچایا ہے یہاں تک کہ ان سے استمداد کرتے ہیں بلکہ بعض بیہودہ باتوں کا اعتقاد بھی ان کے متعلق رکھتے ہیں وہ قرآن شریف کے منشاء سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ انبیاء، صدیق، شہید، صالح سب مرتے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلعم کو ارشاد ہوتا ہے انک میت وانھم میتون (الزمر ۳۹: ۳۰) اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ شہداء کی روحیں (نہ جسم) جنت میں سبز پرندوں کی صورت میں ہوں گی۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے ان ارواح الشھداء فی حواصل طیور خضر تسرح فی الجنة حیث شاءت اور ایک حدیث میں بجائے حواصل کے صور کا لفظ ہے اور دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ مر کر انسان عالم الغیب نہیں بن جاتا کہ اس عالم میں کوئی شخص کچھ دعا کرے تو اس کا علم ایک ولی یا شہید کو ہو جائے عالم الغیب صرف ایک اللہ کی ذات ہے وہی سب کی دعائیں سنتا ہے اور وہی حاجات کو پورا کرتا ہے۔ نیک لوگ ہمارے لیے شفیع ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت کو ہمارے حق میں قبول بھی فرماتا ہے۔ مگر موت کے بعد وہ عالم برزخ میں جاتے ہیں اور اس عالم کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور نہ قرآن وحدیث سے بعد موت ان سے استمداد جائز ثابت ہوتی ہے۔

۱۹۴ مصائب میں حکمت: خدا کی طرف سے بلیٰ اظہار کمالات کا نام ہے دیکھو ۱۵۵ نیکوں پر جو تکالیف آتی ہیں جن میں اظہار صبر کی ضرورت پیش آتی ہے ان

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ ﴿۱۵۶﴾

جنھیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے کہتے ہیں ہم اللہ کے لیے ہی ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ۱۹۵

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

یہی وہ ہیں جن پر اُن کے رب کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے اور یہی وہ ہیں جو ہدایت پانے والے ہیں ۱۹۶

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

صفا اور مروہ اللہ کے نشانوں میں سے ہیں ۱۹۷، پس جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو کوئی شوق سے نیکی کرتا ہے تو اللہ بڑا قدر دان جاننے والا ہے ۱۹۸

کی حکمت یہاں بیان کی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے اندرونی کمالات کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کوئی قوم بڑی نہیں بنتی اور نہ کوئی انسان بڑا بنتا ہے جب تک کہ مصائب کی کٹھالی میں نہ پڑے پس قضاء و قدر کے مصائب انسان کو بڑا بنانے کے لیے ہیں، نہ عذاب کے طور پر، اصطفا کے رنگ میں نہ ہلاکت کے طور پر۔

صحابہ کا کمال صبر: اس آیت سے صحابہ کے کمال صبر پر شہادت ملتی ہے۔ وطن، گھر بار، اموال، جائدادیں سب کچھ چھوڑ کر اور صرف دین کو لے کر مدینہ میں پہنچے مگر یہاں ابھی اور مصائب کی خبر سنائی جاتی ہے کس قدر کمال صبر ہے کہ اس سے گھبراتے نہیں بلکہ ان نئے مصائب کو خدا کی راہ میں خوشدلی سے برداشت کرتے ہیں۔

ع ۱۹۵ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مصیبت کے وقت اس کلمہ کا منہ پر آنا رضا بالقضاء اور مقام توحید کا نہایت بلند مقام ہے۔ اس میں یہ بتایا کہ اگر مال و جان کا کچھ نقصان ہوا تو یہ چیزیں انسان کی زندگی کا اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے آپ کو لگا دینا ہے۔ دنیا کی چیزیں جن سے ہم فائدہ اُٹھاتے ہیں محض خدا کی امانتیں ہیں وہ جب چاہے اپنی امانتوں کو واپس لیلے۔ ہم خود بھی اس کی امانت ہی ہیں۔

ع ۱۹۶ صلوات۔ صلوٰۃ کی جمع ہے جس کے معنی دعا ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ اپنے بندہ کے حق میں اس کا تزکیہ یعنی گناہوں سے پاک کرنا ہے (غ) یا بندہ یا فرشتہ کی صلوٰۃ بندہ کے حق میں دعائے مغفرت ہے اور اللہ کی صلوٰۃ خود مغفرت ہے۔ علاوہ صلوٰۃ کے رحمت کا لفظ بھی فرمایا۔ یعنی صرف حفاظت ہی نہیں فرماتا بلکہ انعام و احسان بھی کرتا ہے۔

ع ۱۹۷ الصفا والمروۃ۔ صفا، صفاۃ کی جمع، صاف پتھروں کو کہتے ہیں اور مروۃ چھوٹے کنکروں کو۔ مکہ معظمہ کے پاس دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے نام ہیں۔

شعائر۔ شعیرۃ کی جمع ہے اور یہ شعر سے ہے جس کے معنی ہیں باریک علم حاصل کیا دیکھو ع۲۲ اور شعائر سے مراد ہر ایک وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے علم بنائی گئی ہو۔ اس لیے اعمال حج کو شعائر اللہ کہا گیا ہے یا شعائر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ معالم یعنی نشان ہیں جن کے قیام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس لیے قربانیوں وغیرہ کو بھی شعائر اللہ فرمایا ہے (ت)

صفا اور مروہ کے ذکر میں یہاں دوہرا اشارہ ہے۔ ایک تو صبر کے مضمون کے متعلق، کیونکہ صفا اور مروہ وہ مقام ہیں جہاں حضرت ہاجرہ حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں دوڑتی تھیں ان کے عظیم الشان صبر کا یہ ثمرہ اللہ تعالیٰ نے دیا کہ ان دو پہاڑیوں کو الٰہی نشان قرار دیا اور ہمیشہ کے لیے اس صبر کے نمونہ کی یادگار بنا دیا۔ جب حضرت ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ نے اس بے آب و گیاہ بیابان میں چھوڑا تو انہوں نے صرف اس قدر دریافت کیا ءَ اللّٰہ امرک بھا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم آپ کو دیا ہے کہ ہمیں یہاں چھوڑ دو۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاں۔ تو انہوں نے کہا اذا لا یضیعنا۔ پھر اللہ تعالیٰ ہم کو ضائع نہیں کریگا۔ اس کی طرف یہاں اشارہ کرکے یہ بھی بتا دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کا ہاجرہ کو یہاں چھوڑنا حضرت سارہ کی خوشی کے لیے نہ تھا جیسا کہ بائبل میں مذکور ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت تھا۔ پس دوسرا اشارہ صفا اور مروہ کے ذکر میں یہ بھی ہے کہ یہی وہ مقام ہے جس کا تعلق حضرت اسمٰعیلؑ سے ہے اور آپ کو یہاں چھوڑنے کے یہی معنے تھے کہ اس مقام سے ان کا کوئی خاص تعلق ہے۔

ع ۱۹۸ حج۔ حج کے معنی ع۱۰۱ میں بیان ہو چکے ہیں۔ عرف شریعت میں قصد بیت اللہ کا نام ہے۔

اعتمر۔ عمارۃ آباد کرنا ہے وعمروھا اکثر مما عمروھا (الروم ۳۰-۹) اور عمر گویا وہ مدت ہے جس میں روح سے جسم آباد رہتا ہے۔ اور اعتمار اور عُمرۃ کے معنی ہیں زیارۃ کرنا جس میں محبت کی عمارۃ یعنی اس کا قائم رکھنا ہے اور شریعت کی اصطلاح میں بیت اللہ کا قصد ہے اور حج اور عمرہ میں فرق یہ ہے کہ حج صرف خاص ایام ماہ ذی الحج میں ہوتا ہے اور عمرہ ہر وقت ہو سکتا ہے اور حج میں میدان عرفات میں اجتماع ہوتا ہے عمرہ

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ
وَ الۡهُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی
الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾
اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَ بَیَّنُوۡا فَاُولٰٓئِکَ
اَتُوۡبُ عَلَیۡهِمۡ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶۰﴾
اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ هُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ
عَلَیۡهِمۡ لَعۡنَةُ اللّٰهِ وَ الۡمَلٰٓئِکَةِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۶۱﴾

جو لوگ اس کو چھپاتے ہیں جو ہم نے کھلی باتوں اور ہدایت سے اتارا ہے اس کے بعد کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کھول کر کتاب میں بیان کر دیا یہی ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنیوالے ان پر لعنت کرتے ہیں۔ع۱۹۹

مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور کھول کر بیان کر دیا اُن پر میں (رحمت کے ساتھ) متوجہ ہوتا ہوں اور مَیں توبہ قبول کرنیوالا رحم کرنیوالا ہوں

جو کافر ہوئے اور مر گئے درآنحالیکہ وہ کافر ہی تھے یہی ہیں کہ اُن پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے ع۲۰۰

میں نہیں۔

جناح۔ جُنَاح پرند کے بازو کو کہتے ہیں۔ اور ہر چیز کے دو طرفوں کو اس کے جناح کہا جاتا ہے۔ واضمم یدك الیٰ جناحك (طٰهٰ ۲۲) میں جناح سے مراد جانب ہے اور جَنَحَ کے معنی ہیں مائل ہُوا وان جنحوا للسلم۔ فاجنح لها (الانفال۔ ۶۱) اور گناہ کو جو انسان کو حق سے ایک جانب مائل کر دے جُنَاح کہا جاتا ہے۔

یطوف۔ طواف کسی چیز کے گرد گھومنے کا نام ہے یہاں صفا اور مروہ کے طواف سے مراد سعی بین الصفا والمروۃ ہے۔

تطوع۔ طَوع کے معنی اَنْقِیَاد یعنی فرمانبرداری کے ہیں اور اسی سے اطاعت اور استطاعت ہے اور اسی سے ہی فطوّعت له نفسه قتل اخیه (المائدہ۔ ۳۰) جو اطاعت سے ابلغ ہے اور تطوع کے معنی ہیں تحمّله طوعًا یعنی برضا و رغبت ایک بوجھ اٹھایا (رغ) اس لیے تطوّع وہ عبادت ہے جو انسان خوشی سے اختیار کرتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار سعی بین الصفا والمروۃ میں کچھ مضائقہ کرتے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صفا اور مروہ پر دو بُت اساف اور نائلہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس رکن حج کو بجالانے میں ہرج نہیں۔ گویا یہ ایک پیشگوئی تھی کہ وہ بُت نہیں رہیں گے اور اس کے یہ معنی نہیں کہ سعی بین الصفا والمروۃ نہ کرے تو بھی ہرج نہیں کیونکہ اس کا ارکان حج میں سے ہونا احادیث صحیحہ اور تعامل اُمت سے ثابت ہے پس اشارہ صرف یہی ہے کہ سردست ان حالات میں بھی ارکان حج کو نہ چھوڑو۔ عروہ نے جب حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اس آیت کی رُو سے اگر سعی بین الصفا والمروۃ نہ کی جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں اگر یہ منشاء ہوتا تو عبارت یوں ہوتی فلاجناح علیه ان لا یطوف۔ حضرت ہاجرہ کے قصہ کی طرف اشارہ کر کے پھر مضمون کو عام کر دیا کہ جو کوئی بھی شوق سے نیکی کرتا ہے اسی کو بہتر بدلہ ملتا ہے کسی انسان سے اس کی خصوصیت نہیں۔

ع۱۹۹ یکتمون۔ ایک چیز کے اظہار کو عمداً ترک کر دینا باوجودیکہ اس کی حاجت معلوم ہوتی ہو کتم یا کتمان کہلاتا ہے۔

کتمان ہدایت اور اس کے نتائج: کتمان ہدایت سے وہی مراد ہے جو پچھلے رکوع کے آخر میں کفران نعمت سے مراد ہے تعلق مضمون کے لیے دیکھو ع۱۹۱ ہدایت کا چھپانا یہ ہے کہ انسان اس پر عمل نہ کرے دوسروں کو اس کی طرف نہ بلائے۔ اشارہ بالخصوص یہودیوں کی طرف ہے جو اس زمانہ میں کتمان ہدایت کرتے تھے مگر مسلمانوں کا بھی نقشہ کھینچ دیا ہے آج مسلمان نہ خود قرآن پر عامل ہوتے ہیں نہ دوسروں کو قرآن کی طرف بلاتے ہیں۔ اس لیے وہی بلائیں جن کے مستحق یہود تھے آج مسلمانوں کے لاحق حال ہو رہی ہیں۔ خدا کی رحمت سے دور پڑے ہوئے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جس شخص سے علم کی بات پوچھی جائے اور وہ اسے چھپائے قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی۔ یہاں اللہ کے لعنت کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کا اُن کو اپنی رحمت سے اور اپنی جناب سے دور کر دینا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والوں کی لعنت اپنی اپنی حالت کے مطابق ہے مثلاً فرشتوں کی لعنت یہ ہے کہ وہ نیکی کی تحریک سے دُور ہو جائیں لوگوں کی یہ کہ ان کو گھروں سے نکالدیں۔ یہودیوں کے لیے ان لعنتوں کا ذکر استثنا ۲۸ : ۱۵-۲۰ میں ہے۔ "تو شہر میں لعنتی ہوگا اور تو کھیت میں بھی لعنتی ہوگا.. ... تیرے بدن کا پھل تیری زمین کا پھل ...... لعنتی ہو جائیں گے۔ تو بھیتر آنے کے وقت لعنتی ہوگا اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہوگا۔" صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہود کے ان تذکروں سے بڑا فائدہ اُٹھایا۔ جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہنچایا تھا اسے انہوں نے ایک عظیم الشان امانت کے طور پر دوسرے لوگوں تک پہنچانے میں کمال احتیاط اور مستعدی سے کام لیا ایک طرف اگر اس میں کچھ گھٹانے بڑھانے میں ایسی احتیاط کی جس کی نظیر نہیں تو دوسری طرف اس کے پہنچانے میں جانیں تک دے دیں۔

ع۲۰۰ پچھلی آیت میں توبہ کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اس میں ان کا جو توبہ نہیں کرتے۔ یعنی وہی لوگ جن کا ذکر گزشتہ سے پیوستہ آیت میں ہے اور وہ توبہ نہیں کرتے۔ اللہ کی لعنت رحمت الٰہی سے دور ہو جانا ہے ملائکہ کی لعنت نیکی کے محرکوں سے بُعد یعنی نیکی کی توفیق چھن جانا ہے۔ لوگوں کی لعنت دربدر کیا جانا ہے۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

اسی میں رہیں گے نہ اُن کا دُکھ ہلکا کیا جائے گا اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی۔

ع ۳ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۳﴾

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بے انتہا رحم کرنے والا بار بار رحم کرنیوالا ہے ۲۰۱

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

آسمانوں اور زمین کی پیدایش میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں، اور کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں اس کے ساتھ لوگوں کو نفع دے، اور پانی میں جو اللہ بادل سے اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اس کے اندر ہر قسم کے جانور پھیلاتا ہے اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں، اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے اُن لوگوں کے لیے یقینی نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۲۰۲

ع ۲۰۱ اِلٰہ ۔ اس کا استقاق اَلَہَ سے ہے جس کے معنی ہیں اس نے عبادت کی اور اِلٰہ کے معنی معبود ہیں۔ اس کی جمع اٰلِهة آتی ہے (غ) معبودان باطل پر اس لفظ کا اطلاق ان کے معتقدین کے نقطہ خیال سے ہوا ہے۔

واحد ۔ وَحْدَۃ کے معنی انفراد یا اکیلا ہونا ہیں اور وَاحِد فی الحقیقت وہ ہے جس کی کوئی جزو نہ ہو مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے جس کا کوئی نظیر نہ ہو اس کو بھی واحد کہہ دیتے ہیں جیسے یگانہ کہہ دیتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی صفت میں واحد ہو تو اس کے معنی ہیں وہ جس کا نہ کوئی جزو ہو سکتا ہے اور نہ ہی جس میں کثرت ہو سکتی ہے (غ) اور اَحَدٌ مطلق سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے پر نہیں بولا جاتا (غ)

جس طرح پچھلے رکوع کی آخری آیت میں اس رکوع کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے اسی طرح اس رکوع کی آخری آیت میں اگلے رکوع کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی توحید الٰہی ۔ اور اس رکوع میں چونکہ صبر کی تعلیم تھی اور صبر کے معنی طاعات پر قائم رہنا ہے اور نیز ہدایت کے پھیلانے کی تعلیم تھی اس لیے بتا دیا کہ ہدایت کا اصل الاصول توحید الٰہی ہے۔ اور اسی پر سب سے پہلے انسان کو قائم ہونا چاہیئے۔ توحید کی تعلیم جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے کیا ہے؟ اگر ایک طرف واحد کہہ کر یہ بتایا کہ نہ اس کا کوئی جزو ہو سکتا ہے نہ اس کی ذات میں کثرت ہے اور نہ اس کی صفات میں اس کا کوئی شریک ہے۔ تو دوسری طرف الٰهكم الٰہ واحد کہہ کر بتایا کہ وہی انسان کا حقیقی محبوب اور مطلوب اور مقصود ہے۔ اسی لیے وہ ایک ہی عبادت کے لائق ہے اور دوسری کوئی چیز اس کے ساتھ عبادت کے لائق نہیں۔ وہ ذات میں بھی واحد ہے اور صفات میں بھی اور عبادت میں بھی مگر وہ انسانوں سے بے تعلق بھی نہیں۔ کیونکہ وہ رحمان و رحیم ہے۔

ع ۲۰۲ اختلاف ۔ خلف کے معنی پیچھے ہیں اور اختلاف کے معنی یہاں ایک کا دوسرے کے پیچھے آنا ہے اور اختلاف یہ بھی ہے کہ ہر ایک دوسرے سے الگ رستہ اختیار کرے (غ)

نہار ۔ نہر کے معنی ۳۹ میں بیان ہو چکے۔ نہار وہ وقت ہے جس میں روشنی کا انتشار ہو جو طلوع آفتاب سے غروب تک ہے۔ مگر اصطلاح شریعت میں طلوع فجر سے غروب آفتاب تک نہار ہے۔

فُلك ۔ کشتی ۔ واحد اور جمع دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور فَلك وہ ہے جس میں سیارے چلتے ہیں اور یہ کشتی کی مشابہت کے لحاظ سے ہے (غ)

بث ۔ کسی چیز کو پراگندہ کرنا اور اسے اٹھانا هباء منبثا (الواقعة ۵۶ ۔ ۶) اور بث غم کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ وہ فکر کو پراگندہ کرتا ہے (غ) اور بث فیها میں یہاں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے وجود میں لانے اور ظاہر کرنے کی طرف اسے جو موجود نہ تھا (غ)

دابة ۔ دبّ اور دَبِیب ہلکا چلنے کا نام ہے اور دابّة کا استعمال ہر حیوان پر ہوتا ہے (غ) یا ہر ایک زمین پر چلنے والے پر (ت)

تصریف ۔ صَرْف کے معنی ہیں ایک چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا اور یہی معنی تصریف کے ہیں مگر اس میں کثرت پائی جاتی ہے۔

ریاح ۔ اس کا واحد ریح ہے اور یہ اس ہوا کو کہتے ہیں جو حرکت میں ہو۔ عموماً قرآن شریف میں جہاں یہ لفظ واحد آیا ہے وہاں مراد عذاب ہے اور جہاں جمع ریاح آیا ہے وہاں مراد رحمت ہے (غ) واحد کی مثالیں ہیں انا ارسلنا علیهم ریحا صرصرا (القمر ۵۴ ۔ ۱۹) کمثل ریح فیها صر (اٰل عمران ۳ ۔ ۱۱۷) اشتدت به الریح (ابراهیم ۱۴ ۔ ۱۸) اور جمع کی مثالیں ہیں وارسلنا الریاح لواقح (الحجر ۱۵ ۔ ۲۲) یرسل الریح مبشرات (الروم ۳۰ ۔ ۴۶) اور یرسل الریاح

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ
جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے سوا اس کے ہمسر
بنا لیتے ہیں، ان سے اللہ کی محبت کی طرح محبت کرتے ہیں اور
جو ایمان لائے وہ اللہ کی محبت بہت بڑھ کر رکھتے ہیں اور اگر وہ
جو ظالم ہیں دیکھیں، جب عذاب کو دیکھیں گے کہ سب طاقت اللہ
کے لیے ہی ہے اور کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے ع۲۰۳

بشرا (النمل ۲۷-۶۳) اسی لیے ایک روایت میں نبی کریم صلعم کی یہ دعا ہے اللّٰھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحا (د)

سحاب۔ سحب کے اصل معنی جر یعنی کھینچنا ہیں یوم یسحبون فی النار علیٰ وجوھھم (القمر ۵۴-۴۸) اور سحاب بادل کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ پانی کو کھینچ لاتا ہے۔

مسخر۔ تسخیر یہ ہے کہ بوجہ غلبہ کے خاص غرض کی طرف چلائے یعنی خاص کام میں لگا دے (غ) پس مُسَخَّر وہ چیز ہے جو خاص کام میں لگا دی گئی اور اس کا مادہ سخر ہے جس کے معنی ہیں دوسرے کی تحقیر کے لیے اس پر ہنسنا۔

مناظر قدرت سے توحید باری کی شہادت: جب ہدایت کے پھیلانے کے لیے مصائب کے مقابلہ کو بھی ضروری قرار دیا تو اب بتاتا ہے کہ ہدایت کی جڑ خدا کی ہستی اور اس کی توحید ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس پر اگر ایک طرف مناظر قدرت سے شہادت ملتی ہے تو دوسری طرف فطرت انسانی بھی اس پر گواہی دے اٹھتی ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں مناظر قدرت کی شہادت کو پیش کیا۔ مگر مناظر قدرت بھی وہ پیش کیے ہیں، جن سے دنیا کا کوئی حصہ خالی نہیں۔ پہلے خود زمین و آسمان کی پیدائش ہے جو کچھ زمین و آسمان کے اندر ہے وہ اس میں آگیا۔ پھر تغیرات زمانہ ہیں۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات مناظر قدرت تو سب اس میں آگئے۔ پھر ان کی تفصیل کی ہے اور اس تفصیل میں سب سے پہلے کشتی کا سمندر پر چلنا ہے جو بتاتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیگر مخلوق پر حکومت عطا کی ہے یہاں تک کہ وہ سمندروں پر بھی حکومت کرتا ہے۔ جب مخلوق پر حاکم ہوا تو پھر مخلوق کو معبود بنانے کے کیا معنی۔ پھر اس سمندر کو مردہ زمین پر جگہ جگہ پانی برسانے کا ذریعہ بنایا اور اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کیا۔ پانی سے سبزیاں اُگتی ہیں اور یہی پانی جانوروں کی زندگی کا مدار ہے۔ پھر ان ہواؤں میں جو اس پانی کو جگہ جگہ پہنچاتی ہیں۔ اس بادل کے ذریعہ سے جو آسمان و زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے۔ ان تمام اختلافات کے اندر ایک ہی قانون کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ہی مدبر بالارادہ ہستی کے تصرف میں ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ سارے عالم میں ایک ہی قانون کام کر رہا ہو یہاں تک کہ آسمان کے ستاروں میں وہی قانون کام کرتا ہو جو زمین کے اندر کر رہا ہے اور اس قانون کے بنانیوالے دو ہوں۔

ع۲۰۳ حُبّ۔ حَبّ اور حَبَّۃ دانہ کو کہتے ہیں اور حَبَّۃُ القلب قلب انسانی کا مرکز ہے۔ پس حُبّ اصل میں حبۃ القلب میں اثر کر جانے کا نام ہے (غ)

یریٰ۔ رَأیٰ جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس کے معنی عَلِمَ یعنی جاننا ہوتے ہیں (غ) یہاں جملہ ان القوۃ للّٰہ جمیعًا دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

لو یری۔ کا جواب محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں وہ شرک اختیار کرنے کی جرأت نہ کرتے۔

فطرت انسانی کی شہادت توحید باری پر: مناظر قدرت سے فطرت انسانی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انسان کے دل میں محبت اس چیز کی ہوتی ہے جس سے منفعت پہنچتی ہے اور مناظر قدرت میں جہاں تک غور کرو سب منفعت کے سامان انسان کے لیے خدا تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں۔ پس فطرت انسانی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک خدا کی محبت سے ہی قلب لبریز ہوتا۔ مگر مشرک نہ مناظر قدرت پر غور کرتا ہے نہ فطرت کی شہادت کی پروا کرتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہمسر قرار دیکر اُن سے ایسی محبت کرتا ہے جیسی اسے خدا سے کرنی چاہیئے تھی۔ انداد یا ہمسروں سے مراد یہاں وہ بڑے لوگ ہیں جن کی فرمانبرداری کر کے لوگ معصیت میں پڑتے ہیں (ج) ہاں مومن کی محبت جو وہ اپنے مالک سے رکھتا ہے اس سے بھی بڑھ کر ہے جس قدر مشرک کو اپنے جھوٹے معبود سے ہوتی ہے۔

عقل اور محبت کا مقام: پہلی آیت میں اصول کی صحت معلوم کرنے کے لیے عقل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس آیت میں کام کرنے کا اصول محبت بیان فرمایا۔ چنانچہ والذین اٰمنوا اشد حبًّا للّٰہ یعنی جب عقل سے کام لیکر انسان ایمان لے آئے تو پھر کام کرنے کے لیے اپنے اندر وہ محبت کا ولولہ پیدا کرے جو تمام ولولوں سے بڑھ کر ہو۔ دنیا میں جس قدر لوگ کام کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی جذبہ محبت کے ماتحت ہی کرتے ہیں مگر فرمایا کہ مومنوں کا جذبۂ محبت خدا کی راہ میں کام کرنے کے لیے سب جذبات محبت سے بڑھ کر ہونا چاہیئے۔ اگر حبّ وطن یا حبّ قوم یا کسی پیر یا لیڈر کی محبت کوئی جذبۂ محبت پیدا کر سکتی ہے اور انسان سے بڑے بڑے کام کرا سکتی ہے تو ان تمام ولولوں سے بڑھ کر خدائی محبت کا

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا
وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾
وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ
مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ
أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ
مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾ ع

جب وہ جو پیشوا بنائے گئے تھے ان سے بیزار ہو جائیں گے جو
ان کے پیرو تھے اور عذاب کو دیکھیں گے اور انکے تعلقات کٹ جائیں گے ۲۰۴
اور وہ جو پیرو تھے کہیں گے کاش ہمارے لیے پھر کر جانا ہوتا تو
ہم اُن سے اسی طرح بیزار ہوتے جس طرح وہ ہم سے بیزار ہیں اسی طرح اللہ
ان کو اُن کے عمل اُن پر حسرتیں بنا کر دکھائے گا اور وہ آگ سے باہر
نکلنے والے نہ ہوں گے ۲۰۵

جذبہ ہونا چاہیئے۔ اور صرف اللہ کی محبت کے لیے کام کرنا جس کے سامنے دوسری تمام محبتیں ہیچ ہوں انسان کی زندگی کی اصل غرض ہونی چاہیئے۔ اشدّ حبّاً للہ کا نظارہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی میں عملی طور پر نبی کریم صلعم نے پیدا کر کے دکھا دیا کہ یہ کوئی خیالی مقام نہیں بلکہ ایک قوم نے اس اصول پر کام کیا اور دنیا اور دین کی خیرات ان کے اندر جمع ہو گئیں اور کامیابی کے اعلیٰ سے اعلیٰ منازل پر وہ پہنچ گئے۔ آج مسلمان اسی جذبہ محبت سے خالی ہیں۔ قوم اس وقت بنے گی، کامیابی کا منہ اس وقت دیکھیں گے جب خدا کی محبت کے جذبہ کے سامنے تمام دوسرے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ کیسا پُر حکمت کلام ہے۔ پہلے بتایا کہ صحیح راہ کو معلوم کرنے کے لیے عقل سے کام لو۔ اور جب اُسے معلوم کر لیا جب خدا کی ہستی کا یقین دل میں بیٹھ گیا تو پھر بتایا کہ محبت کے رنگ میں کام کرو۔ اکثر لوگ دنیا میں عقل اور محبت میں فرق نہیں کرتے اور عقل کی جگہ محبت سے اور محبت کی جگہ عقل سے کام لیتے ہیں اصول دین کو عقل سے نہیں جانچتے بلکہ اندھا دھند مان لیتے ہیں۔ اور کام کرتے وقت عاشقانہ جوش سے کام نہیں کرتے بلکہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔

ع ۲۰۴ تبرأ۔ بُرء اور براء اور تبری کے معنی ہیں اس چیز سے الگ ہو جانا جس کے پاس ہونا ناپسند ہو (غ) پس بیماری سے اچھا ہونے پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور کسی چیز یا شخص سے علیحدگی یا بیزاری پر بھی جیسے برآءۃ من اللہ ورسولہ (التوبۃ ۹-۱) ان اللہ بری من المشرکین ورسولہ (التوبہ ۹-۳) انا برآؤ منکم (الممتحنۃ ۶۰-۴) انني برآء مما تعبدون (الزخرف ۴۳-۲۶)

اسباب۔ سبب کی جمع ہے اور سبب وہ چیز ہے جس کے ذریعہ دوسری چیز تک پہنچا جائے (غ) یہاں اسباب سے مراد تعلقات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنا کام نکالتے تھے۔

جھوٹے پیشواؤں اور پیروؤں کی ایک دوسرے سے بیزاری: یہاں بتایا کہ جن کی محبت کی خاطر یہ لوگ خدا کی نافرمانی کرتے تھے وہ خود ان سے بیزار ہو جائیں گے قیامت کے دن تو اس بیزاری کا اور قطع تعلق کا نقشہ کامل طور پر ظہور پذیر ہوگا جو جھوٹے پیشواؤں اور ان کے پیروؤں میں واقع ہوگا مگر اس دنیا میں بھی بسا اوقات یہ نقشہ نظر آجاتا ہے۔ ایک بدمعاش بعض وقت دوسروں کو دل خوش کن نقشے دکھا کر ان کو بدی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن جب اس بدی کے بدنتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ خود بھی گرفتار بلا ہوتا ہے تو پھر اپنے دام افتادوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور وہ جو اس کے دام تزویر میں آگئے تھے وہ بھی جب بدی کے بدنتائج کو دیکھتے ہیں تو ان پیشواؤں پر لعنت بھیجتے ہیں جنہوں نے ان کو غلط راہ پر ڈالا تھا اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے۔ بدی کا نتیجہ چونکہ لازماً بد ہے اس لیے جب اس بدنتیجہ کا اثر اپنی ذات پر پڑتا ہے تو اس وقت بدی سکھانے والے اور سیکھنے والے ایک دوسرے سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بالمقابل جو شخص دوسروں کو نیکی کی تعلیم دیتا ہے اس کے ساتھ تعلق محبت ہمیشہ بڑھتا ہے۔

ع ۲۰۵ اعمال۔ عمل کی جمع ہے اور عمل ہر اس فعل کو کہتے ہیں جس کو کوئی جاندار قصد سے کرتا ہے (غ) فعل بلا قصد ہو سکتا ہے مگر عمل نہیں۔

حسرات۔ حسرۃ کی جمع ہے اور حسر کے معنی ہیں جس چیز پر کوئی دوسری چیز اُڑھائی گئی ہے۔ اس کا اس سے اُتار دینا یعنی ننگا کر دینا۔ اور حاسر یا حسیر یا محسور تھکے ماندہ کو کہتے ہیں۔ گویا اس کی قوتوں پر سے پردہ اٹھ گیا ہے، یا وہ ظاہر ہو گئی ہیں۔ فتقعد ملوماً محسوراً (بنی اسرائیل ۱۷-۲۹) ینقلب الیك البصر خاسئاً وھو حسیر (الملك ۶۷-۴) اور حسرۃ غم اور ندامت کا اظہار ہے اس چیز پر جو ہاتھ سے جاتی رہی ہو۔ گویا اس کے قویٰ شدت غم سے ننگے ہو گئے۔ یا قصور کے تدارک کے مقابلہ میں اس پر درماندگی کی حالت طاری ہو گئی۔ (غ)

بدی پر حسرت عذاب بن جاتی ہے: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال بد ایسی ندامت کا موجب ہوتے ہیں کہ وہی حسرت ہی اس کے لیے موجب عذاب اور ایک آگ ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا لیجعل اللہ ذلك حسرۃ فی قلوبھم (آل عمران ۳-۱۵۶) اور ایک جگہ فرمایا انہ لحسرۃ علی الکفرین (الحاقہ ۶۹-۵۰) اور پھر اس دلوں کی حسرت کی طرف ہی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ (الھمزہ ۱۰۴-۶، ۷) خدا کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں پر بھڑک اٹھتی ہے یہ بھی فطرت انسانی کی شہادت ہے کہ نیکی پر خواہ اس کی وجہ سے کتنا ہی دکھ کیوں نہ اٹھانا پڑے انسان کے دل میں ندامت پیدا نہیں ہوتی۔ مگر بدی پر خواہ اس سے کتنا ہی وقتی حظ کیوں نہ ملے آخر فطرت صحیحہ ملامت کرتی ہے یہاں تک کہ انسان اس بدی کا اس قدر عادی ہو جائے کہ اس کی فطرت ہی مسخ ہو جائے مگر بایں ہمہ فطرت ملامت کرتی ہے خواہ وہ ملامت بدی کے غلبہ کی وجہ سے کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾

اے لوگو! اس سے جو زمین میں ہے حلال اور پاکیزہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے نہ چلو، وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ع۲۰۶

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦٩﴾

وہ تمھیں صرف بدی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ پر وہ بات بناؤ جو تم نہیں جانتے ع۲۰۶د

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿١٧٠﴾

اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا۔ کیا اگرچہ انکے بڑے نہ کچھ عقل سے کام لیتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔ ع۲۰۷

ع۲۰۶ حلالاً۔ حَلّ کی اصل گرہ کھولنے سے ہے۔ واحلل عقدۃ من لسانی (طٰہٰ[۲۰]۔ ۲۷) اور کسی جگہ اُترنے کے وقت بوجھ کے اتارنے پر حَلَّ الاحمال بولا جاتا ہے اس سے مطلق نزول پر حُلُول کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے او تحل قریبا من دارھم (الرعد[۱۳]۔ ۳۱) اور احلّٰہ کے معنی دوسرے کو اتارا۔ واحلوا قومھم دار البوار (ابراھیم[۱۴]۔ ۲۸) اسی سے لفظ مَحَلّٰہ ہے جس کے اصل معنی اُترنے کی جگہ ہیں اور حل عُقدہ سے ہی حَلال کے معنی لیے گئے ہیں۔ گویا وہ چیز اس کے لیے کھول دی گئی یا آزاد کر دی گئی، اور جو شخص حالت احرام سے باہر نکل آئے اُسے بھی اسی لیے حلال یا مُحِلّ کہا جاتا ہے (غ) اور اصطلاح شریعت میں حَلال وہ ہے جس کی اجازت شریعت نے دی ہے یا جس سے روکا نہیں۔

خطوات۔ خُطوۃ کی جمع ہے جو چلنے والے کے دونوں قدموں کے درمیانی فاصلہ کا نام ہے (غ) شیطان چونکہ نافرمانی کی راہوں پر چلتا ہے اس لیے اس کے خطوات سے مراد ہر ایک اللہ تعالیٰ کی معصیت ہے۔

غذاؤں کا اثر اخلاق پر: جب ہدایت کے اصل الاصول توحید کا ذکر کیا تو اب کسی قدر ذکر ہدایت کی تفصیلات کا کیا ہے اور بتایا ہے کہ کھانے پینے تک کے احکام بھی شریعت میں دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ غذاؤں کا اثر اخلاق وروحانیت دونوں پر پڑتا ہے یہاں سے لیکر اکتیسویں رکوع تک یہ ذکر چلے گا مگر عموماً انہی احکام کو بیان کیا ہے جن کا تعلق صبر سے ہے کیونکہ یہی اصل مضمون ہے جس پر بحث شروع ہے۔ اس میں سب سے پہلی ضرورت حلال کھانے کی تباتئی۔ جو مال باطل طریق پر حاصل کیا جائے وہ حلال نہیں ہو سکتا۔ دوسری ضرورت طیّب کھانے کی تباتئی یعنی ستھری چیز۔ اس ایک لفظ کو لا کر بہت سی تفصیلات سے مستغنی کر دیا اور کسی قدر اختلاف رواج سے بھی طیّب کا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے اس لیے عام لفظ رکھا۔ یایھا الناس میں جو حکم دیا ہے وہ عام ہے۔ حرام خوری کو ترک کرنے سے بھی اللہ تعالیٰ سے محبّت پیدا ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ سعد بن ابی وقاص نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مَیں کس طرح مستجاب الدعوات بنوں تو آپؐ نے فرمایا اطب مطعمك تكن مستجاب الدعوۃ ستھرا کھانا کھاؤ مستجاب الدعوۃ ہو جاؤ گے۔ دنیا اور دین، ظاہری اور باطنی طہارت کے احکام کو کس طرح ملایا ہے۔

ظاہری اور باطنی طہارت کا تعلق: خود قرآن شریف نے بھی غذا کے حکم کے بعد یہ لفظ لا کر کہ شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ باطنی طہارت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غذا بھی اچھی کھاؤ۔ اخلاق بھی اچھے دکھاؤ۔ جیسا کہ اگلی آیت میں شیطان کی پیروی نہ کرنے کی وضاحت کر دی کہ بدی اور بے حیائی کی باتوں سے بچو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسان کی جسمانی اور روحانی حالتوں میں ایک تعلق بتاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات جسمانیات کی طرف سے مضمون کو روحانیات کی طرف اور روحانیات سے جسمانیات کی طرف منتقل کرتا ہے۔

ع۲۰۶د الفحشاء۔ فحش اور فحشاء اور فاحشۃ کے معنی ہیں وہ اقوال یا افعال جن کی قباحت بہت بڑی ہو (غ)، یا ہر ایک قبیح خصلت فاحشۃ ہے (ت) سوء کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۰۵ اور سوء اور فحشاء میں فرق یہ ہے کہ سوء وہ ہے جو اس کے کرنے والے کو نقصان پہنچائے اور فحشاء وہ ہے جس کا ذکر کرنا یا سننا بُرا معلوم ہو (ج)

تقولوا علی اللہ۔ قال علیہ کے معنی ہیں اس پر افترا کیا۔

بدی اور بیحیائی کا تعلق غذاؤں سے: یہاں یہ اشارہ ہے کہ حرام غذاؤں کے استعمال سے سوء اور فحشاء پیدا ہوتے ہیں جیسے مثلاً مُردار اور خون کے کھانے سے صحت جسمانی پر بُرا اثر اور گندے اخلاق، خنزیر کھانے سے بیحیائی۔ اور افترا علی اللہ اسے اس لیے کہا کہ وہ لوگ خود چیزوں کو حلال و حرام قرار دے کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے تھے آج یہ امر مسلّم ہے کہ ہر ایک قسم کی غذا اسی قسم کی صفات انسان کے اندر پیدا کرتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر اس حقیقت کی طرف توجہ دلا کر ایسی چیزوں سے روکا۔

ع۲۰۷ تقلید: قرآن کریم نے بسا اوقات کفار کا نقشہ پیش کر کے مسلمانوں کو سمجھایا ہے۔ آنکھیں بند کر کے تقلید بھی انہی کا طریق فرمایا۔ غرض یہ تھی کہ مسلمان اس راہ

وَ مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا کَمَثَلِ الَّذِیۡ یَنۡعِقُ
بِمَا لَا یَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُکۡمٌ
عُمۡیٌ فَہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

اور ان لوگوں کی مثال جو کافر ہوئے ایک شخص کی مثال کی طرح ہے کہ وہ اسے آواز دے رہا ہو جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا بہرے گونگے اندھے ہیں سو وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔^۲۰۸

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰکُمۡ
وَ اشۡکُرُوۡا لِلّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔^۲۰۹

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃَ وَ الدَّمَ وَ لَحۡمَ
الۡخِنۡزِیۡرِ وَ مَاۤ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ ۚ فَمَنِ
اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ ؕ

اس نے تم پر صرف مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لیے پکارا جائے حرام کیا ہے^۲۱۰ مگر جو شخص لاچار ہو جائے نہ خواہش کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو اس

پر نہ چلیں کیونکہ فلاں بات ہمارے بزرگ مانتے آئے ہیں، اس لیے اس کے خلاف ہم نہیں سن سکتے۔ مگر آج اندھا دھند تقلید کرنے میں مسلمان سب قوموں پر سبقت لے گئے ہیں یہاں تک کہ اپنے خیالات کے خلاف بات سن بھی نہیں سکتے غور کرنا تو ایک طرف رہا۔

ع۲۰۸ ینعق۔ نعق چرواہے کے بھیڑوں بکریوں کو آواز دینے پر بولا جاتا ہے (غ۔ ت)

دعاء ونداء۔ دعاء محض پکارنا یا بلانا ہے۔ اور نداء آواز کا بلند کرنا ہے اور مطلق صوت پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور نَدٰی اصل میں رطوبت کو کہتے ہیں اور نِدَاء کا استعارہ اس سے لیا گیا ہے کہ جس کے منہ میں رطوبت زیادہ ہو اس کی آواز اچھی ہوتی ہے (غ)

عقل سے کام لینے کی ہدایت: اس تمثیل میں کفار کو جو عقل اور ہدایت کی پروا نہیں کرتے چارپایوں سے تشبیہ دی ہے اور آنحضرت صلعم کو راعی سے۔ فی الحقیقت انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز عقل ہے پس جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ حیوانوں کے حکم میں ہی ہیں۔ اس لیے آخر پر ان کو بہرے گونگے اندھے کہا ہے۔

ع۲۰۹ اِن۔ مغنی میں ہے کہ اِن بعض وقت بمعنی اذ بھی آتا ہے یعنی جب یہاں یہی معنی ہیں۔ جیسے فاتقوا اللّٰہ ان کنتم مومنین ہیں۔ دیکھو ۵۲۳۔

ع۲۱۰ انما۔ کلمۂ تخصیص ہے۔ صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں مطلب یہ ہے کہ جو تم نے خود اپنے اوپر حرام کر رکھی ہیں۔ جیسے بحیرہ وغیرہ وہ خدا نے حرام نہیں کیں۔

المیتۃ۔ میتۃ حیوانات میں سے وہ ہے جس کی روح بغیر ذبح کرنے کے نکل جائے (غ) خواہ وہ اپنی موت مرے یا گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا گر جانے یا سینگ مارنے سے (ت) قرآن کریم نے یہ تصریح سورۂ مائدہ آیت ۳ میں کر دی ہے۔

اھل۔ ھِلال پہلی اور دوسری رات کے چاند کو کہتے ہیں اور اِھلال چاند دیکھنے کے معنے میں آتا ہے۔ پھر اس کا استعمال اس آواز پر ہوا جو چاند دیکھنے کے وقت بلند کی جاتی ہے پھر ہر آواز پر (غ) پس ما اھل بہ لغیر اللّٰہ وہ ہوا جس پر اللہ کے سوائے کسی دوسرے کا نام پکارا جائے۔ یعنی ذبح کرتے وقت بجائے اللہ کا نام لینے کے غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ جیسے کسی بُت کا یا اور کسی کا سوائے اللہ کے۔

مردار وغیرہ کی حرمت شریعت سے ہیں: یہاں ان چیزوں کی حرمت کا ذکر کیا جو اخلاق و روحانیت پر بُرا اثر ڈالتی ہیں ان کی حرمت کا حکم اس سے پہلے مکہ میں ہی سورہ الانعام اور سورہ النحل میں نازل ہو چکا تھا اور چوتھی بار زیادہ تصریح کے ساتھ اس کے بعد سورہ المائدہ میں نازل ہوا ہے۔ ان چار چیزوں میں سے اول الذکر تین چیزوں کی حرمت کا ذکر یہود کی شریعت میں بھی ہے۔ چنانچہ مردار کی حرمت احبار ۱۷: ۱۵ میں خون کی حرمت احبار ۷: ۲۶ میں سؤر کی حرمت، احبار ۱۱: ۷ میں ہے۔ اور گو عیسائیوں نے سؤر کو حلال کر کے اسے اپنی محبوب ترین غذا بنا لیا ہے مگر حضرت مسیح کے کلام میں سؤر کو پلید ہی قرار دیا گیا ہے جیسے اپنے موتیوں کو سوروں کے آگے مت پھینکو (متی ۷: ۶) سؤروں کے چرانے کا بھی بُرے پیرایہ میں ذکر ہے (لوقا ۱۵: ۱۵) پلید روحیں انسان سے نکل کر سوروں کے گلہ میں داخل کی جاتی ہیں (متی ۸: ۳۲) حضرت عیسیٰ نے جہاں بعض احکام شریعت موسوی میں ترمیم کی ہے وہاں سؤر کے گوشت کو ہرگز حلال قرار نہیں دیا۔ بلکہ خود پطرس بھی سؤر کے ساتھ ان لوگوں کو مشابہت دیتا ہے جو بار بار گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں یعنی اس کو ناپاک قرار دیتا ہے (۲ پطرس ۲: ۲۲)

حرمت کی وجہ: اسلام نے ان تین چیزوں کے علاوہ جن کا اثر صحت جسمانی کے علاوہ اخلاق پر بھی بُرا پڑتا ہے ایک چوتھی چیز حرام قرار دی ہے یعنی ہر جانور جو ویسے حلال ہو مگر ذبح کرنے وقت اس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور یوں شرک کو عملی رنگ میں جڑ سے کاٹا ہے۔ ان چیزوں کی حرمت کی وجہ دوسری جگہ خود کلام پاک میں دی ہے دیکھو الانعام ۔ ۱۴۵۔ جہاں پہلی تین چیزوں کو رجس کہا ہے یعنی پلیدی گویا ان کا اثر جسم اور اخلاق پر بُرا ہے اور ما اھل بہ لغیر اللّٰہ کو فسق کہا ہے۔ مُردار اور خون اور سؤر کے گوشت میں زہروں کا ہونا آج ایک مسلم امر ہے اور اخلاق پر جو بد اثر پڑتا ہے اس پر خود واقعات شاہد ہیں۔ مردار خوار قومیں جیسے ہمارے ملک میں چوہڑے ہمیشہ سے نہایت ذلیل حالت میں رہے ہیں۔ خون پینا درندوں کا کام ہے اور اس سے درندگی پیدا ہوتی ہے اس لیے اسلام نے ذبح کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے تاکہ خون بہ جائے۔ سؤر کے گوشت کے کھانے سے جو دیوثی اور بے غیرتی انسانوں میں

إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٧٣﴾
إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ
الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ أُولٰٓئِكَ
مَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ
اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿١٧٤﴾
أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾
ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ
ع الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿١٧٦﴾

پر کوئی گناہ نہیں اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۲۱۱
وہ جو اُسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب سے اُتارا ہے اور اس
کے عوض تھوڑی سی قیمت لیتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں سوائے
آگ کے کچھ نہیں ڈالتے اور اللہ قیامت کے دن ان سے کلام
نہیں کریگا اور نہ ان کو پاک کریگا اور اُن کے لیے دردناک دُکھ ہے ۲۱۲
یہی وہ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اور مغفرت کے بدلے
عذاب کو خرید لیا۔ سو اُن کا آگ پر جرأت کرنا کیسا عجیب ہے ۲۱۳
یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اُتارا ہے اور جو لوگ
کتاب کا خلاف کرتے ہیں وہ یقیناً دُور کی مخالفت میں ہیں ۲۱۴

پیدا ہوتی ہے۔ وہ آج کل کی مہذب قوموں کے فحش تعلقات اور عورتوں کے ننگے جسموں سے خود ظاہر ہے۔

سؤر کا گوشت عرب کے لوگ اسی طرح محبوب رکھتے تھے جس طرح آج یورپ اور امریکہ کی عیسائی اقوام۔ لحم الخنزیر اسی لیے کہا ہے ورنہ جس طرح اس کا گوشت حرام ہے اسی طرح دوسری اشیاء بھی۔ میتة سے مچھلی کو حدیث میں مستثنےٰ کیا ہے اس لیے کہ اس میں خون نسبتاً اس قدر کم ہوتا ہے کہ اس کا اثر بد صحت پر نہیں پڑ سکتا۔

ع۲۱۱ اضطر۔ ضُرّ سے ہے اسی سے ضرورت بمعنی حاجت ہے اور اضطرار باب افتعال ہے جس کی تا کو طا سے بدل دیا ہے اور اس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف احتیاج' اور اضطرہ کے معنی ہیں اس کو کسی چیز کا محتاج اور اس کی طرف مجبور کر دیا (ت) اور اضطرار انسان کی اپنی بے اختیاری اور دوسرے کے مجبور کرنے سے بھی ہوتا ہے اور ایسی صورت میں بھی کہ خود انسان اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جیسے غذا (غ)

غیر باغ۔ باغ۔ بغی سے ہے جس کے معنی ہیں میانہ روی سے تجاوز کی خواہش کرنا ع۱۱۵ پس غیر باغ سے مراد یہ ہوئی کہ وہ اپنے نفس میں اس کے لیے خواہش نہیں پاتا، جیسا کہ مفردات میں ہے غیر طالب مالیس له طلبه گویا دل کراہت کرتا ہے۔

لا عاد۔ عاد۔ عدو بمعنی تجاوز سے ہے ع۱۰۸ پس لا عاد سے مراد ہوئی کہ جس قدر کی ضرورت بقائے نفس کے لیے ہے اس سے تجاوز نہ کرے۔

ع۲۱۲ حرمت غذا اور تقویٰ کا تعلق: اس رکوع کا خاتمہ پھر کتمان ہدایت پر کیا ہے گویا ہدایت کے اصول و فروع کو بیان کر کے پھر اصل مضمون کی طرف توجہ دلا دی ہے اور ساتھ ہی پھر ظاہر سے باطن کی طرف رجوع کیا ہے۔ یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ برابر ظاہر سے باطن کی طرف اور باطن سے ظاہر کی طرف مضمون کا انتقال کرتا رہتا ہے توحید کے بعد غذاؤں کا ذکر کیا تا معلوم ہو کہ غذائیں بھی انسان کے خیالات پر اثر ڈالتی ہیں۔ غذاؤں کا ذکر کرتے ہوئے پھر کلام کا انتقال باطن کی طرف کیا اور آگ کھانے والوں کا ذکر کیا تا مسلمان قوم یہودیوں کی طرح ظاہر پرست نہ ہو جائے اور حقیقی نیکی اور تقویٰ کو صرف چند ظاہری امور کی پابندی پر محدود نہ کر دے اور اندرونی پاکیزگی اور حقیقی تقویٰ کی راہوں سے غافل نہ ہو جائے۔ آگ کھانے کا محاورہ اسی مناسبت سے اختیار کیا گیا ہے تا جسمانی غذاؤں کی حرمت کو ہی کافی نہ سمجھ لیا جائے۔

خدا کا دوزخیوں سے کلام نہ کرنا: یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا تو کلام سے مراد محبت کا کلام ہے جو ایک نعمت کے رنگ میں انسان کو دیا جاتا ہے اور یہ فرما کر کہ اللہ تعالیٰ ان کو پاک نہیں کرے گا اور نہ ان سے کلام کرے گا یہ بھی بتا دیا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہی گناہوں سے پاک کر دیتا ہے اور ان سے کلام کرتا ہے وہ گویا اسی عالم میں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کتمان ہدایت میں دونوں باتیں داخل ہیں، خود ہدایت پر عامل نہ ہونا اور دوسروں کو اس کا نہ پہنچانا۔

ع۲۱۳ ما اصبرھم: صبر کے اصل معنی اپنے آپ کو روک رکھنا ہیں۔ مگر بعض وقت جیسے یہاں یہ لفظ جرأت کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (غ) اسی کے مطابق مجاہد سے اس کے معنی مروی ہیں کیونکہ صبر اپنے حقیقی معنی میں تو ان کو میسر نہیں۔ صبر تو یہ تھا کہ وہ معصیت سے رُکتے۔ مراد یہ ہے کہ وہ ایسے اعمال کر رہے ہیں جو اُن کو آگ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ پس ان اعمال کی جرأت آگ پر جرأت ہے۔ ما یہاں تعجب کے لیے ہے استفہامیہ یا موصولہ بھی ہو سکتا ہے۔

ع۲۱۴ اختلفوا فی الکتاب۔ اختلاف کے معنی کے لیے دیکھو ع۲۰۲ اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے جیسا کہ نزل الکتاب بالحق سے ظاہر ہے اور ان کا اختلاف فی الکتاب یہ ہے کہ اس کے بارہ میں طریق حق پر چلنے سے پیچھے رہ گئے (ر) یعنی طریق حق پر نہ چلے اور کتاب کے بارہ میں اختلاف سے مراد اس کا

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ
وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى
الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَ
الْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي
الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَ
الْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ وَالصَّابِرِينَ
فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿١٧٧﴾

بڑی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مُونہوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو، لیکن بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لیے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلام آزاد کرنے میں مال دے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور اپنے اقرار کو پورا کرنے والے جب وہ اقرار کریں۔ اور صبر کرنے والے تنگی اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے سچ کر دکھایا اور یہی متقی ہیں [۲۱۵]

رد کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ انکم لفی قول مختلف (الذاریات ۵۱ - ۸) سے ظاہر ہے اور یہ اختلاف ان کا یہ تھا کہ کبھی اس کو سحر کہتے کبھی کہانت کبھی شعر کبھی افترا۔ چونکہ یہ امر حق تھا اس لیے اس کے رد کرنے میں وہ کسی ایک قول پر قائم نہ رہ سکتے تھے۔

ع ۲۱۵ البر من اٰمن۔ بِرّ کے اصل معنی التوسع فی الخیر ہیں یعنی نیکی میں وسعت اختیار کرنا۔ اس جملہ کی ترکیب ایسی ہے جیسے کہہ دیتے ہیں الجود حاتم مراد ہوتی ہے الجود جود حاتم یعنی سخاوت حاتم کی سخاوت ہے اسی طرح یہاں مراد ہے کہ راستبازی اس کی راستبازی ہے جو ایمان لاتا ہے وغیرہ۔ یا چونکہ زبان عربی میں مبالغہ کے وقت صفت کو بطور اسم استعمال کر لیتے ہیں جیسے بڑے سخی کو الجود کہہ دیتے ہیں اور جیسے قرآن کریم میں حضرت نوح کے بیٹے کو کہا گیا انہ عمل غیر صالح۔ اسی طرح یہاں بِرّ بطور مبالغہ بڑے راستباز کو کہا گیا ہے۔

علیٰ حبہ میں ضمیر عموماً مال کی طرف لی گئی ہے اور گو یہ سچ ہے کہ حقیقی ایثار یہی ہے کہ جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے جیسے فرمایا لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون (اٰل عمران ۳ - ۹۲) مگر یہاں یہ ضمیر اللہ کی طرف بھی جا سکتی ہے جیسے دوسری جگہ یطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکیناً و یتیماً و اسیراً (الدھر ۷۶ - ۸) فرما کر علےٰ حبہ کی تفسیر اس سے اگلی آیت میں خود ہی یوں کر دی انما نطعمکم لوجہ اللہ پس دونوں جگہ علیٰ حبہ سے مراد اللہ کی محبت کے لیے ہیں گویا یہ بتایا کہ خدا پر ایمان یہ ہے کہ اس کی محبت کے لیے اس کی مخلوق کی خدمت میں مشغول ہو جائے اور اپنے مال کو دوسروں کے لیے خرچ کرے اس لیے کہ وہ بھی اسی خدا کی مخلوق ہیں جس نے اس کو دیا ہے۔

ابن السبیل۔ ابن کے معنی کے لیے دیکھو ع ۶۱ اور سبیل کے لیے ع ۱۹۳ ابن السبیل مسافر کو کہتے ہیں۔

سائلین۔ سُؤال کسی چیز کے جاننے کی استدعا ہے یا مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا جو معرفت یا مال کی طرف پہنچا دے (غ) اور کسی شے کی معرفت کا سوال بعض وقت اس غرض کے لیے ہوتا ہے کہ ایک بات کا علم لیا جائے اور بعض وقت اس لیے کہ دوسرے کو ملزم کر کے خاموش کیا جائے (غ) اور اللہ تعالیٰ کا سوال بندوں سے کرنا اسی دوسری غرض سے ہے اور قرآن شریف میں اکثر استعمال لفظ سُؤال کا معرفت کی استدعا پر ہی ہے جیسے یسئلونک۔ سأل سائل۔ سئلھم۔ یسئلون وغیرہ اور سائل فقیر کو بھی کہتے ہیں (غ) یہاں سائلین سے مراد دونوں قسم کے سوال کرنے والے ہو سکتے ہیں۔

الرقاب۔ رَقَبَۃ کی جمع ہے جس کے معنی گردن ہیں مگر اس سے مراد کل بھی لے لیا جاتا ہے اور تعارف میں مملوک یعنی غلاموں اور لونڈیوں کو رقاب کہا جاتا ہے۔ جیسے راس بمعنی سر اور ظھر بمعنی پیٹھ سواری پر بولا جاتا ہے فتحریر رقبۃ مؤمنۃ (النساء - ۹۲) (غ) اور یہاں جو فی الرقاب فرمایا تو اس لیے کہ وہ مال ان کو نہیں دیا جاتا بلکہ اُن کے آزاد کرنے کے لیے یا ان کے بارہ میں صرف کیا جاتا ہے اور چونکہ انسان کو عموماً گردن سے مارا جاتا ہے اس لیے رقب کے معنی آتے ہیں اس کی حفاظت کی جیسے لا یرقبون فی مومن الا و لا ذمۃ (التوبہ ۹ - ۱۰) اور اسی سے رقیب حفاظت کرنے والے کے معنی میں صفات الٰہی میں سے ہے۔

الباساء۔ بُؤس اور باس اور باساء تینوں کے معنی شدت اور مکروہ ہیں یعنی سختی اور امر ناپسندیدہ (غ) اور بأس عذاب اور جنگ کی سختی کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کنا اذا اشتد الباس اتقینا برسول اللہ صلعم اور باس کے معنی صرف حرب یعنی جنگ بھی ہیں اور بأساء کے معنی بھوک ہیں (ت)

الضراء۔ ضُرّ سے ہے جس کے معنی سوء حال ہیں نفس کے متعلق ہو جیسے علم و فضل کی کمی سے یا بدن میں مثلاً کسی عضو کے نہ ہونے کی وجہ سے یا ظاہری

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مقتولوں کے بارے میں تم پر

حالت میں جیسے مال وجاہ کی کمی سے (غ) اور بأساء کے مقابلہ پر نعماء ہے اور ضراء کے مقابلہ پر سراء اور باساء کے ساتھ ضراء میں باساء سے مراد فقر یا بھوک ہے اور ضراء سے مراد بیماری یا اور تکالیف۔

صدقوا۔ صدق اور کذب کا اصل استعمال قول میں ہے۔ صدق یہ ہے کہ قول ضمیر کے مطابق ہو اور جس بات کی خبر دی ہے وہ بھی سچ ہو اور یہ دونوں افعال جوارح پر بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه (الاحزاب ۳۳-۲۳) میں صدقوا کے معنی ہیں عہد کو سچا کر دکھایا ان افعال کے ذریعہ سے جو کیے (غ) یہی معنے یہاں ہیں۔

تفصیلات شریعت کے ذکر میں اصل اصول کی طرف توجہ دلانا: پچھلے رکوع سے تفصیلات شریعت کا ذکر شروع کیا تھا اور اسی ذکر کو آگے بھی جاری کھا ہے۔ جیسے اس رکوع میں بھی قصاص اور وصیت کا ذکر ہے۔ چونکہ بعض قوموں نے تفصیلات شریعت پر اس قدر زور دیا کہ اصل غرض کو جو باطنی طہارت تھی بھول گئے اس لیے ان تفصیلات کے ذکر میں ایک خاص اصول سمجھایا اور وہ یہ کہ صرف ظاہری تفصیلات شریعت پر زور دینے سے جبکہ مغز شریعت کو مدنظر نہ رکھا جائے، کوئی انسان حقیقی راستبازی کو حاصل نہیں کر سکتا۔ تفصیلات شریعت میں سب سے بڑا حکم کعبہ کی طرف منہ کرنے کا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اسلام کا ظاہری نشان قرار دیکر فرمایا کہ اہل قبلہ کی تکفیر مت کرو۔ مگر باایں فرمایا کہ وہ راستبازی جس کی طرف اللہ تعالٰی تم کو بلاتا ہے ان تفصیلات شریعت پر عمل کر لینے کا نام نہیں یہاں تک کہ ایک خاص سمت کی طرف منہ کر لینا بھی وہ نیکی نہیں۔ یہاں پھر ان معترضین کا بھی جواب ہے جو کہتے ہیں کہ مسلمان خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے ایک مشرکانہ فعل کا ارتکاب کرتے ہیں کیونکہ فرمایا کہ کسی خاص سمت میں منہ کر لینا کوئی عظیم الشان نیکی بھی نہیں چہ جائیکہ اس سمت کی عبادت ہو۔ یہ آیت ان آیات قرآنی میں سے ایک ہے جنہوں نے اپنی علو مرتبت کا خراج سخت ترین دشمنوں سے بھی وصول کیا ہے۔

تکالیف میں صبر قوم کی کامیابی کا اصل گر ہے: اس آیت میں قوم کی کامیابی کا اصل گر یہ بتایا ہے کہ وہ مشکلات کے مقابلہ کے وقت گھبرائے نہیں۔ اسی لیے اس کا خاتمہ والصابرين في الباساء والضراء وحين الباس پر کیا ہے اور حالانکہ من اٰمن سے لیکر والموفون تک رفع ہے مگر والصّابرین کو منصوب کر دیا ہے اور یہ نصب علے المدح ہے۔ یعنی خصوصیت سے توجہ دلانا اس کی طرف مقصود ہے کہ یہی بڑا اہتم بالشان امر ہے یعنی تنگی اور تکلیف میں اور مقابلہ کے وقت نہ صرف انسان استقلال رکھے بلکہ قدم آگے بڑھائے اور یہی اصل مضمون اس سورت کا چلتا ہے۔

ایمان کا مفہوم: جن امور کو یہاں راستبازی صدق اور تقوٰی کا جزو قرار دیا ہے وہ یہ ہیں۔ اول اصول صحیحہ کا قبول کرنا جن میں سے پہلے اللہ پر ایمان ہے۔ اللہ تعالٰی کے علم کامل اور قدرت کاملہ پر ایمان لانے سے انسان کے اندر نیکیوں کی قوت پیدا ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالٰی کو سرچشمہ قدوسیت جانتا ہوا خود پاک ہونے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اللہ پر ایمان لاکر سارے اخلاق الٰہی کو اپنے اندر لینے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح ہر ایک قسم کی بُری باتوں سے رکتا اور ہر ایک قسم کی نیکی کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ دوسرے آخرت پر ایمان یعنی ہر ایک عمل کی جزا و سزا کا قائل ہونا اور اس لیے اپنے ہر ایک عمل میں اپنی ذمہ واری کو مدنظر رکھنا۔ تیسرے فرشتوں پر ایمان یعنی نیکی کی تحریک کو جب دل میں پیدا ہو فوراً قبول کر لینا۔ چوتھے کتاب پر ایمان یعنی اللہ تعالٰی نے جو ہدایات انسان کی بہتری کے لیے نازل کی ہیں ان پر عمل پیرا ہونا۔ پانچویں نبیوں پر ایمان، یعنی جس طرح پر انبیاء نے ان تعلیمات پر عمل کر کے دکھایا ان کے نمونہ اور نقش قدم پر چلنا۔

دوسرا عظیم الشان اصل کامیابی کا عملی رنگ رکھتا ہے اور وہ ایثار ہے یعنی اپنے مال کا دوسروں کی بہبودی کے لیے خرچ کرنا۔ ان میں مقدم انسان کے اپنے قریبی ہیں۔ اولاد۔ ماں۔ باپ۔ بھائی بہن اور رشتہ دار۔ پھر یتیم ہیں جن کا خبر گیر کوئی نہیں۔ اس لیے ہر ایک قوم کے فرد سے وہ ذوی القربٰی کا ہی تعلق رکھتے ہیں۔ پھر مسکین ہیں جو خود کام کاج کرنے سے عاجز ہیں یا جن کے پاس کام کرنے کا ضروری سامان نہیں پھر مسافر ہیں، پھر سائل ہیں، پھر گردنوں کا آزاد کرنا یا غلامی کی حالت میں پڑے ہوئے لوگوں کو اس حالت سے باہر نکالنا۔ غلامی کی حالت میں وہی لوگ آتے تھے جو جنگوں میں قید ہو جاتے تھے اور وہ گویا دشمن ہیں۔ پس یہاں دشمنوں سے پیار اور محبت کی نری منہ سے تعلیم نہیں بلکہ عملی رنگ میں ان سے نیکی کا حکم دیا کہ ان کی آزادی کا فکر کیا جائے۔ اس زمانہ میں تو کم ہی مسلمان ہیں جن کی گردنیں آزاد ہیں اور جو غلامی کی حالت میں نہیں پس مسلمانوں کی بہتری پر، ان کی تعلیم پر، ان کی ترقی پر روپیہ خرچ کرنا بھی اس کے اندر آجاتا ہے۔

نماز اور زکوٰۃ: اس کے بعد تیسرا اصل فرمایا نماز قائم کرے جو انسان کے اپنے نفس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے اور زکوٰۃ دے جو دوسروں کی بہبودی کے لیے ہے۔

اس کے بعد چوتھا اصل فرمایا کہ عہد کرے تو اس عہد کو پورا کرے خواہ اس کی وجہ سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے اور خواہ وہ اقرار کافر سے ہو یا مسلمان سے۔ آج مہذب ممالک میں اقرار کی پابندی اس وقت تک ضروری سمجھی جاتی ہے جب تک اپنا مطلب نکلتا ہو اور بس۔ اور آخر میں پانچواں اور سب سے ضروری اصل بیان کیا ہے اور وہ ہے صبر۔ تنگی میں جب فقر و فاقہ اٹھانا پڑے۔ دکھ درد اور تکلیف کی حالت میں جب انسان کو جسمانی

فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ
وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ
شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ
ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ
اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾

قصاص مقرر کیا گیا ہے[۲۱۶] (قاتل) آزاد ہو تو آزاد (ہی مارا جائے) اور غلام ہو تو غلام اور عورت ہو تو عورت[۲۱۷]، مگر جس کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دی گئی ہے تو عمدگی سے پیروی کرنی چاہیئے اور نیکی کے ساتھ اسے ادا کیا جائے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے پھر جو کوئی اسکے بعد زیادتی کرے اسکے لیے دردناک عذاب ہے[۲۱۸]۔

طور پر دکھ پہنچ رہا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر حین الباس مشکلات سے مقابلہ کے وقت میں یا دشمن سے مقابلہ کے وقت میں، جیسے جنگ کی حالت میں ہی اصل گر کامیابی کا ہے۔ اسی لیے اس کو آخر پر رکھا اور منصوب علی المدح کیا جن قوموں میں پہلی چار چیزیں نہیں، وہ بھی صبر سے کامیاب ہو جاتی ہیں مگر حقیقی نیکی اور راستبازی اُن کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔

آخر پر فرمایا کہ دعویٰ ایمان میں یہی لوگ سچے ہیں اور متقی بھی یہی ہیں۔

ع ۲۱۶ کتب۔ کتاب کے معنی کے لیے دیکھو ع ۹ مگر کتابۃ کے معنی اثبات یعنی ایک چیز کا قائم کرنا اور تقدیر یعنی اندازہ کرنا اور ایجاب یعنی واجب کرنا اور فرض کر دینا اور عزم بھی آتے ہیں کیونکہ پہلے ایک چیز کا ارادہ کیا جاتا ہے پھر کہی جاتی ہے پھر لکھی جاتی ہے گویا اس کا مبداء ارادہ ہے اور اس کا منتہا لکھنا (غ) اس لیے مقرر کرنے یا فرض کرنے کے معنی میں کثرت سے یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے جیسے یہاں اور آیت ۱۸۰ میں کتب علیکم..... الوصیۃ اور آیت ۱۸۳ میں کتب علیکم الصیام اور آیت ۱۸۷ میں وابتغوا ما کتب اللّٰہ لکم اور آیت ۲۱۶ میں کتب علیکم القتال اور بہت سے دیگر مقامات پر اور اسی لیے کتاب اللّٰہ سے مراد اللّٰہ کا حکم بھی ہوتا ہے جیسے اولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللّٰہ (الانفال۔ ۷۵) میں کتاب اللّٰہ سے مراد اللّٰہ کا حکم ہے (غ)

قصاص۔ قَص سے ہے جس کے معنی نقش قدم کے پیچھے چلنا ہے۔ فارتدا علٰی اٰثارھما قصصا (الکھف ۱۸۔ ۶۴) وقالت لاختہ قصیہ (القصص ۲۸۔ ۱۱) اسی سے قَصص اخبار بیان کرنے کے معنی میں ہے نحن نقص علیك احسن القصص (یوسف ۱۲۔ ۳) اور قصاص کے معنی ہیں تتبعُ الدّم بالقَوَد (غ) یعنی خون کا پیچھا کرنا اس طرح پر کہ قاتل کو قتل کیا جائے اور حدیث میں ہے من قتل عمداً فھو قَوَدٌ جس کے معنی ہیں کہ جو شخص عمداً قتل کرے اس کو مقتول کے بدلہ میں قتل کیا جائے (ل۔ قَوَد) پس قصاص فی القتلی یہ ہے کہ جس شخص نے کسی دوسرے کو قتل کیا ہے اسے قتل کیا جائے قصاص کے اس معنی کو مدّنظر رکھ کر اگلے الفاظ کے معنی میں کوئی دقت نہیں رہتی۔

اس آیت میں مقتول کے بارہ میں قصاص کا حکم دیا ہے یعنی قاتل کو قتل کر دیا جائے۔ اس کا ذکر یہاں اس مناسبت سے کیا ہے کہ مسلمانوں کے اب اپنے دکھ دینے والوں اور قتل کرنے والوں سے قصاص لینے کا وقت آگیا تھا۔ قرآن کریم میں قصاص کا حکم صرف قتل کی صورت میں ہے۔ زخموں میں قصاص کا حکم نہیں۔ صحابہ نے ضرورت زمانہ کے لحاظ سے کر لیا ہو تو جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا کے ماتحت ہے۔ اور اسی کے ماتحت ایک بدی کے مناسب حال اور سزا دی جا سکتی ہے۔ مگر قتل میں صراحت سے قصاص کا حکم ہے پس اللّٰہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں قاتل کے لیے قتل کی سزا کو ہی ضروری قرار دیا ہے اس سزا کو دنیا سے اُٹھانے کے لیے جتنی کوششیں کی گئی ہیں سب ناکام ہوئی ہیں۔ فرانس میں کچھ عرصہ کے لیے سزائے قتل موقوف کی گئی تھی جس کا نتیجہ جرائم قتل میں خطرناک اضافہ ہوا۔ پس یہ بتایا ہے کہ قتل میں قصاص تمدن و تہذیب کی ضروریات میں سے ہے۔

ع ۲۱۷ جب اوپر قصاص کا حکم صاف الفاظ میں بیان کر دیا یعنی یہ کہ قتل کا حکم قاتل پر ہے نہ کسی دوسرے پر، تو یہاں ایک ایسے امر کی طرف توجہ دلائی جس میں ایک رسم قبیح کی بیخکنی مقصود تھی۔ عرب میں رواج تھا کہ بعض قومیں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتی تھیں اس لیے ان کا غلام قتل ہو جائے تو وہ کہتے تھے کہ ہم اس کی جگہ آزاد کو قتل کریں گے۔ ایسا ہی یہ بھی رواج تھا کہ آزاد غلام کو قتل کر دے تو اس آزاد کو قتل نہ کیا جاتا تھا۔ ایسا ہی اب بھی رواج ہے کہ بعض قومیں جو اپنے آپ کو زیادہ مہذب خیال کرتی ہیں ان کا کوئی آدمی کسی ماتحت قوم کے آدمی کو قتل کر دے تو وہ اس سے قصاص نہیں لیتیں۔ پس جب اسلام نے قصاص کا حکم دیا یعنی یہ کہ قاتل کو قتل کیا جائے تو ساتھ ہی تمام امتیازات کو بھی اٹھا دیا۔ اور فرمایا کہ قاتل آزاد ہو تو وہی قتل کیا جائے۔ عورت قاتل ہو تو وہی قتل کی جائے غلام قاتل ہو تو وہی قتل کیا جائے اور سارے امتیازات قومی وامتیازات مرتبہ کو اٹھا دیا۔ چنانچہ حدیث میں بھی آتا ہے المسلمون تتکافأ دماءھم سب مسلمانوں کے خون برابر ہیں اور قاتل خواہ کوئی ہو یہ عذر نہیں کر سکتا کہ اس کا خون مقتول سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے امام ابوحنیفہ کے مذہب میں آزاد غلام کو قتل کر دے تو آزاد قتل کیا جائے گا اور یہی قرآن شریف کا مذہب ہے۔

ع ۲۱۸ خون بہا: اس حصہ میں یہ اجازت دی ہے کہ اگر مستغیث یعنی وارث قاتل خونبہا پر راضی ہو جائے تو دیت کا لے لینا جائز ہے۔ اس زمانہ میں بھی بعض حالات میں خون بہا لے لینا جائز ہے۔ جیسے ایک سلطنت کا باشندہ دوسری سلطنت کی کسی رعایا کو خاص حالات میں قتل کر دے تو ہرجانہ ہی کافی معاوضہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے اس لیے ہر قسم کی گنجائش اس کی تعلیم میں موجود ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو تاکہ تم بچے رہو۔ ع۲۱۹

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

تم پر جب تم میں سے کسی کے لیے موت آموجود ہو عمدگی کے ساتھ وصیت کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے اگر وہ بہت سا مال ماں باپ کے لیے اور قریبیوں کے لیے چھوڑے یہ متقیوں پر لازم ہے ع۲۲۰

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ

پھر جو کوئی اس کے بعد جو اس نے سن لیا ہے اسے بدل دے تو اس کا

ع۲۱۹ قصاص قوم کی زندگی کی بنیاد ہے: اگر دنیا میں قتل کی سزا قتل نہ ہوتی تو کسی قوم کے لیے بھی امن کی زندگی نہ ہوتی۔ جن قوموں نے قتل میں قصاص کو اُڑانے کی کوشش کی ہے۔ دنوں میں قتل کے واقعات ان میں اس قدر بڑھے ہیں کہ مجبوراً پھر اسی سزا کی طرف رجوع کرنا پڑا ہے۔ یہ بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں جب تم کو تلوار سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اب قصاص لیے بغیر تم بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

ع۲۲۰۔ خیر کے معنی لغت میں اور صحابہ سے مال کثیر مروی ہیں چنانچہ مفردات میں ہے کہ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ مال کو خیر نہیں کہا جاتا جب تک کہ وہ کثیر نہ ہو اور مکان طیب سے نہ ہو۔

حکم وصیت منسوخ نہیں: یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جن پر منسوخی کا حکم قطعی سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ پہلے وصیت کا حکم دیا گیا پھر سورہ نسأ میں وراثت کا حکم نازل کر کے اسے منسوخ کیا گیا۔ مگر اس کے متعلق غیر منسوخ ہونے کے اقوال بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے کہ ایک جماعت نے قائلین منسوخی کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے اسے غیر منسوخ قرار دیا ہے۔ بیضاوی میں بھی اس کے منسوخ نہ ہونے کا قول موجود ہے۔

قرآن و حدیث کی شہادت: حق یہ ہے کہ اس کے غیر منسوخ ہونے کی قرآن شریف اور حدیث صحیح سے کھلی کھلی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف سے تو یوں تائید ہوتی ہے کہ وراثت کے حکم میں ہر جگہ ساتھ ساتھ من بعد وصیة کا لفظ موجود ہے یعنی تقسیم ترکہ وصیت کے نفاذ کے بعد ہو۔ پس وہ وصیت اور کونسی ہے اگر یہ منسوخ ہے؟ اور دوسرے سورہ مائدہ میں جو آخری سورتوں میں سے ایک ہے صاف طور پر وصیت لکھا جانے اور اس پر عملدرآمد کرنے، گواہی لینے وغیرہ کا حکم موجود ہے (دیکھو المائدۃ ۵ آیت ۱۰۶ و ۱۰۷)

حدیث سے اس کا غیر منسوخ ہونا قطعی طور پر ثابت ہے۔ سعد بن ابی وقاص سے متفق علیہ حدیث ہے کہ میں فتح مکہ کے سال بیمار ہو گیا (یعنی آیت وراثت کے نزول کے مدت بعد) رسول اللہ صلعم میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ تو میں نے کہا یا رسول اللہ میرے پاس بہت سا مال ہے اور ایک ہی بیٹی میری وارث ہے میں سب مال کی وصیت کر دوں؟ آپ نے فرمایا، نہ۔ پھر میں نے دو تہائی کے لیے عرض کی۔ پھر نصف کے لیے آپ نے انکار ہی کیا۔ پھر میں نے ایک تہائی کے لیے عرض کیا تو آپ نے ایک تہائی کی وصیت کرنے کو قبول کیا اور فرمایا اگر تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑو تو اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو غریب چھوڑو۔ اس حدیث سے جو نبی کریم صلعم کی زندگی کے آخری ایام کی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ حکم وصیت اس وقت تک غیر منسوخ سمجھا جاتا تھا اور نہ صرف ایک صحابی نے ہی اسے غیر منسوخ سمجھا بلکہ خود آنحضرت صلعم نے بھی اسے غیر منسوخ قرار دیا اور وصیت کرنے کو جائز رکھا۔ ہاں نبی کریم صلعم نے یہ ضروری قرار دیا کہ ورثا کو بالکل محروم نہ کیا جائے۔ اس لیے ایک تہائی تک مال کی وصیت کر دی جائے۔ دوسرے اس سے معلوم ہوا کہ اس وصیت سے مراد خیراتی کاموں کے لیے وصیت ہے نہ رشتہ داروں اور قریبیوں کے لیے۔ اسی لیے میں نے آیت کے معنی کرنے میں یہ ترکیب اختیار کی ہے کہ للوالدین والاقربین کا تعلق ان ترک خیرا سے ہے یعنی جو شخص مال کثیر ماں باپ اور قریبیوں کے لیے چھوڑے وہ وصیت کرے۔ ماں باپ اور قریبیوں کے لیے وصیت کرنا مراد نہیں۔ تیسرے معلوم ہوا کہ خیر سے مراد آنحضرتؐ کے سامنے بھی مال کثیر ہی لیا گیا کیونکہ خود حضرت سعد نے یہ کہا کہ میرا مال کثیر ہے اور اسی بنا پر وصیت کی اجازت چاہی۔

ورثا کے لیے وصیت نہیں: پس حدیث متفق علیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کے معنی یوں سمجھے جاتے تھے اور خود آنحضرت صلعم نے یہی لیے کہ جب ایک شخص کا ترکہ بہت سا ہو تو وہ کچھ حصہ کی وصیت خدا کی راہ میں کر دیا کرے۔ ورثا کے لیے وصیت کی ضرورت تو اس لیے بھی نہیں کہ ان کے حصے خود قرآن شریف نے مقرر کر دیئے اور حدیث لا وصیة لوارث گو احاد میں سے ہے مگر قرآن کریم کے مطابق ہے۔ ہاں بعض صورتوں میں جب اقربا کو وراثت کا حصہ نہ ملتا ہو تو وہ بھی وصیت میں شریک ہو سکتے ہیں۔ دوسری روایات سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ کا فیصلہ: چنانچہ حضرت علیؓ کے متعلق روایت ہے کہ جب ان کے ایک آزاد کردہ غلام نے جس کا ترکہ سات سو درہم تھا وصیت کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اُسے روک دیا اور فرمایا یہ خیر یعنی مال کثیر نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ کا فیصلہ: اور حضرت عائشہ سے کسی شخص نے پوچھا کہ میرے پاس تین ہزار درہم ہے اور چار وارث ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ تھوڑی سی چیز ہے اپنے عیال کے لیے چھوڑ دو۔ یہ خیر یعنی مال کثیر نہیں ہے۔ پس ایک حدیث متفق علیہ میں رسول اللہ صلعم کا اپنا فیصلہ دوسرے

عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٨١﴾	گناہ انہی پر ہے جو اسے بدلتے ہیں اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔
فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ	مگر جسے وصیت کرنیوالے کی طرف سے طرفداری یا گناہ کا خوف ہو پھر وہ
ع ۲۲ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٨٢﴾	انکے درمیان صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے۔ ۲۲۱
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمہارے لیے روزے ضروری
الصِّيَامُ ۲۲۲ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ	ٹھیرائے گئے ہیں جیسے کہ ان لوگوں کے لیے ضروری ٹھیرائے گئے
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٨٣﴾	جو تم سے پہلے تھے ۲۲۲ تاکہ تم متقی بنو۔ ۲۲۳

حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ صدیقہ کا فیصلہ جن کا فہم قرآن مسلم امر ہے اس آیت کے معنی کا قطعی فیصلہ کرتے ہیں اور اسے غیر منسوخ قرار دیتے ہیں اور مراد اس سے صرف اسی قدر ہے کہ جو شخص اپنے ورثا کے لیے مال کثیر چھوڑے وہ کچھ حصہ اس مال کا فی سبیل اللہ بھی وصیت کرے مسلمانوں میں آج اس پر عمل متروک ہے۔ مگر دوسری قومیں ایسی وصیتیں کرتی ہیں کس قدر مصیبت ہے کہ پیروانِ قرآن قرآن پر عامل نہیں، منکرین قرآن اس پر عامل ہیں۔

اور اگر یوں بھی معنی کیے جائیں کہ اگر کوئی شخص مال کثیر چھوڑے تو اس کے لیے اپنے والدین اور قریبیوں کے لیے وصیت کرنا مقرر کیا گیا ہے تو بھی آیت کو منسوخ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں وصیّت پر عملدرآمد کرانے والے والدین اور اقربین مراد لیے جائیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ بعض صورتوں میں والدین کو ورثہ نہ ملتا ہو تو ان حالات پر یہ حادی ہو، جیسے مثلاً والدین کافر ہوں اور قریبی تو بہتیرے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو حصہ نہیں پہنچتا ان کے لیے وصیّت ہو سکتی ہے یا اگر کوئی اور صورت تسلیم نہ کی جائے تو حدیث لا وصیۃ لوارث کو آیت کے مقابلہ میں منسوخ قرار دیا جائے گا۔

ع۲۲۱ جنف حکم یعنی فیصلہ کرنے میں ایک طرف جھک جانے کا نام ہے۔ حق سے باطل کی طرف جُھکنا (غ)

وصیت کے وقت اصلاح: اثم سے مراد عمداً خلاف ورزی حکم الٰہی ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر وصیت کرنے والا کسی وارث کے حق کو تلف کر رہا ہو یا خلاف ورزی حکم الٰہی میں کوئی مال وصیّت کرنے لگے تو دوسروں کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کر دیں جیسا کہ سعد بن ابی وقاص کے معاملہ میں رسول اللہ صلعم نے کیا۔

ع۲۲۲ الصّیام۔ صَوم۔ اصل میں ایک فعل سے رُکنے کا نام ہے کھانا ہو یا کلام یا چلنا۔ انی نذرت للرحمٰن صوماً (مریم ۱۹۔ ۲۶) کلام سے رکنے کو صوم کہا ہے جیسے فلن اکلم الیوم انسیا سے خود ظاہر ہے۔ اصطلاح شریعت میں اس شخص کا جو احکام شریعت کا مکلف ہو چکا ہے، صبح کی سفیدی کے نمودار ہونے سے رات کی سیاہی کے نمودار ہونے (یعنی غروب آفتاب) تک ارادۃً کھانا کھانے پانی پینے اور جماع سے رکا رہنا ہے (غ) اور اس کے ساتھ جیسا کہ احادیث نے وضاحت کر دی ہے ہر ایک لغو یا ناجائز فعل یا قول کا ترک بھی شامل ہے۔

روزہ کا دنیا کی سب قوموں میں پایا جانا جس کی طرف یہاں قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے ایک حقیقت ہے اور دنیا کی کوئی قوم نہیں جس نے روزہ کو عبادات میں نہ رکھا ہو۔ صرف عیسائیوں نے شریعت کو جواب دیکر روزوں کا انکار کیا ہے گو اب ان کے حکما بھی کسی نہ کسی رنگ میں روزہ کی ضرورت کے گو جسمانی فوائد کی خاطر ہی سہی قائل ہو رہے ہیں۔ مگر تعجب یہ ہے کہ حضرت عیسٰےؑ کا اناجیل سے نہ صرف خود روزے رکھنا ثابت ہے بلکہ اپنے پیروؤں کے لیے روزے رکھنے کی تعلیم موجود ہے۔ اور عیسائیت کا موجودہ خیال کہ شریعت پر عمل کرنیکا فائدہ نہیں، پولوس کا خیال ہے۔ متی ۴: ۲ سے مسیح کا روزہ رکھنا ثابت ہے "اور جب چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا آخر کو بھوکا ہوا"۔ اور متی ۶: ۱۶ میں ہے "کہ جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ۔ اور متی ۶: ۱۵ میں روزہ کے ثواب کا ذکر ہے "اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے"۔ اگر عبادت پر ثواب ملتا ہے اور مسیح کی تعلیم بھی یہی ہے تو کفارہ کا عقیدہ باطل ہے اور لوقا ۵: ۳۲-۳۵ سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح نے کہا تھا کہ ان کے شاگرد اُن کے بعد بہت روزے رکھیں گے۔ "پر وے دن آوینگے کہ دولہا ان سے جدا کیا جائیگا ان دنوں میں وے البتہ روزہ رکھیں گے"۔

ع۲۲۳ یہ روزہ کی علت غائی ہے، پہلی قوموں میں جو روزہ رکھنے کا رواج تھا، وہ جیسا کہ پادری کروڈن نے بجوم بائبل میں لکھا ہے غم اور رنج اور مصیبت کے وقت تھا گویا ظاہر صورت میں غم اور مصیبت اختیار کی جاتی تھی اسلام نے روزہ کی غرض یہ بیان کی ہے کہ تم متقی بنو یعنی تمہارے اندر بدی کی طاقتیں کمزور اور نابود ہوں اور نیکی کی قوتیں نشوونما پائیں کیونکہ انسان کی ہر ایک قوت اپنے کمال تک پہنچنے کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ اسے نشوونما دی جائے اور روزہ میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری کے لیے حلال چیزوں کو ترک کیا جاتا ہے پس روزہ سے خواہشات کو ترک کرنے کی قوت انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے اور یہی قوت انسان کو اپنے نفس پر حاکم بنا کر اعلیٰ سے اعلیٰ پاکیزگی اور نیکی کے مقام پر پہنچاتی ہے۔ اسلام نے ہر ایک چیز کو ایک قاعدہ اور ضبط کے ماتحت کیا ہے اور وقت پر کھانا عین تعلیم اسلامی کے مطابق ہے۔ روزہ میں اس ضبط کو توڑنا مقصود نہیں بلکہ انسان کے اندر یہ قوت پیدا کرنا مقصود ہے کہ خواہشات حیوانی جو کھانے پینے اور زوج کی طرف رجوع کرنے سے تعلق رکھتی ہیں انسان کے اقتدار کے نیچے ہوں اور ایسا نہ ہو کہ انسان ان کا غلام اور محکوم بن جائے، روزہ میں خواہشات حیوانی پر قابو پانے کی عملی راہ بتائی ہے۔ پس اسلام دوسرے مذاہب سے یہ امتیاز رکھتا ہے کہ روزہ کو انسان کی زندگی کے اعلیٰ ترین

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ

چند دن[224]، پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور دنوں سے گنتی (پوری) کی جائے[225]۔ اور جو اس میں مشقت پاتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں[226]۔

مقصد کے حصول کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

ع۲۲۴ معدودات۔ آیت ۸۰ میں ایامًا معدودۃ آیا ہے۔ عدّ کے معنی اعداد کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانا یا گنتی کرنا ہے۔ وعدھم عدًّا (مریم ۱۹۔ ۹۴) فسئل العادین (المؤمنون ۲۳۔ ۱۱۳) یعنی گننے والے یا حساب رکھنے والے الف سنۃ مما تعدّون (السجدۃ ۳۲۔ ۵) اور پھر محض گنتی سے تجاوز کر کے کئی طرح پر عَدّ کا استعمال ہوتا ہے مثلاً کسی چیز کو معدود کہا جاتا ہے جب قلت ظاہر کرنا مقصود ہو اور اس صورت میں اس کا مقابل اس سے ہوتا ہے جو اپنی کثرت کی وجہ سے گنتی میں نہیں لائی جا سکتی (غ) اور یہی یہاں مراد ہے چنانچہ مقاتل کہتے ہیں کہ معدودیا معدودات کا لفظ جہاں جہاں قرآن شریف میں آیا ہے تو اس سے مراد چالیس سے کم ہے (د) خواہ چالیس ہوں جیسے آیت ۸۰ میں یا تیس جیسے یہاں آگے شہر رمضان کہہ کر بتا بھی دیا ہے یا تین جیسے واذکروا اللہ فی ایام معدودات (آیت ۲۰۳) میں اور آگے آتا ہے عدۃ من ایام اخر اور لتکملوا العدۃ۔ تو عدّۃ کے معنی الشئ المعْدُود ہیں یا گنی گئی چیز اور محض گننا بھی جیسے وما جعلنا عدتھم (المدثر ۷۴۔ ۳۱) اور عورت کی عدّت وہ دن ہیں جن کے گزرنے پر اس کا نکاح کرنا جائز ہے (غ)

یہاں ایامًا معدودات سے مراد رمضان کا مہینہ ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ عاشورا کا روزہ یا بعض اور روزے جو نبی کریم صلعم اس حکم کے آنے سے پہلے رکھتے تھے وہ محض نفل کے طور پر تھے نہ وحی الٰہی کے حکم سے اور اس لیے ایامًا معدودات میں ان کی طرف اشارہ نہیں۔ چنانچہ ابن جریر نے دونوں قسم کے اقوال نقل کر کے لکھا ہے کہ میرے نزدیک درست قول اسی شخص کا ہے جو کہتا ہے کہ ایامًا معدودات سے اشارہ شہر رمضان کی طرف ہے کیونکہ کوئی حدیث ایسی نہیں جس سے حجت قائم ہو سکے کہ کبھی اہل اسلام پر کوئی روزے سوائے رمضان کے فرض کیے گئے ہوں اور پھر وہ رمضان کے روزوں سے منسوخ ہو گئے ہوں (ج) اور بخاری میں جو عاشورا کا روزہ رکھنے کا حکم ہے تو یہ یا نزول آیت سے پہلے تھا یا صرف بطور نفل۔

ع۲۲۵ مرضٰی۔ مَرِیْض کی جمع ہے اور مَرَض اس اعتدال سے خروج کا نام ہے جو انسان سے خاص ہے اور یہ جسم میں بھی ہو سکتی ہے اور اخلاق میں جیسے بخل، نفاق، بزدلی وغیرہ کو بھی مَرَض کہا جاتا ہے (غ) اور مَرَض کے اصل معنی نقصان ہیں اس لیے ارض مریضۃ اس زمین کو کہتے ہیں جو کمزور ہو۔ اسی طرح شمس مریضۃ جب سورج پوری روشنی نہ دے (ت)

سفر۔ سَفْر کے اصل معنی کشف الغطاء ہیں یعنی پردہ کا اٹھا دینا (غ) اسی لیے سَافِر لکھنے والے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک چیز کو کھول دیتا ہے اور واضح کر دیتا ہے۔ اس کی جمع سفرۃ ہے بایدی سفرۃ (عبس ۸۰۔ ۱۵) (ن) اور سِفر کتاب کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ حقائق کا انکشاف کرتی ہے۔ اس کی جمع اسفار ہے کمثل الحمار یحمل اسفارا (الجمعۃ ۶۲۔ ۵) (غ) اور حدیث میں اسفروا بالفجر آتا ہے یعنی فجر کو اچھی طرح روشن ہو جانے دو (ن) اور مسافر کو مسافر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مکان سے الگ ہو گیا اور مکان اس سے (غ) پس سفر مکان سے دُور ہو جانے کا نام ہے۔

روزہ چھوڑنے کے لیے بیماری کی حد: بیماری کیسی ہو اس میں افراط و تفریط دونوں سے بچنا چاہیئے یہ کہنا کہ مرض ایسا خطرناک ہو کہ انسان کے فوراً مر جانے کا خطرہ ہو یا یہ کہ ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف ہو تو روزہ ترک کر دیا جائے دونوں غلط راہیں ہیں۔ اگر روزے رکھنے سے دوائی نہ پینا، یا بار بار ہلکی غذا کا نہ پہنچنا، یا اور کوئی وجہ بیماری کے بڑھانے کا موجب ہو تو روزہ ترک کرنا چاہیئے۔ ہاں بخاری میں عطا کا قول ہے۔ یفطر من المرض کلہ یعنی ہر ایک بیماری میں روزہ چھوڑ دے مگر اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شکایت پر روزہ چھوڑ دے کیونکہ کچھ نہ کچھ شکایت تو ہر ایک انسان کو رہتی ہے۔

سفر کس قدر ہو؟ بعض نے کہا لفظ عام ہے خواہ کسی قدر ہو۔ بعض نے ایک دن رات اس کی حد قرار دی ہے۔ امام شافعی نے ۱۶ فرسخ اور امام ابو حنیفہ نے تین منزل یعنی تین دن کا سفر یا ۲۴ فرسخ۔ قول اوّل قرآن کریم کے عام الفاظ پر مبنی ہے۔ امام شافعی نے ایک حدیث پر بنیاد رکھی ہے جس میں آتا ہے کہ چار برد سے کم میں قصر صلوٰۃ نہ کرو۔ اور برید بعض کے نزدیک چار فرسخ اور بعض کے نزدیک دو فرسخ ہے، پس ۲۴ میل یا ۴۸ میل کی حد اس حدیث کی رُو سے ہوئی۔ مگر قرآن کریم کے ظاہر الفاظ سے قول اول کو ہی ترجیح ہے کیونکہ بعض وقت ۲۴ میل سے کم سفر میں بھی روزہ چھوڑنا ضروری ہو سکتا ہے۔ ہاں سیر اور سفر میں ہر شخص فرق کر سکتا ہے۔ پھر سفر خواہ پیدل ہو خواہ کشتی پر خواہ گھوڑے پر خواہ ریل پر سفر ہی ہے، ان چیزوں سے سفر کے سفر ہونے کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

سفر اور بیماری میں روزہ ترک کرنے کی رخصت ہے یا وجوب: اس پر بہت بحث ہوئی ہے۔ صحابہ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ سفر میں روزہ ترک کرنا ضروری سمجھتے تھے اور بعض اگر قابل برداشت پاتے تو رکھ بھی لیتے تھے۔ لیکن اگر رخصت بھی اسے تصوّر کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی رخصتیں فائدہ اٹھانے کے لیے ہی ہیں اور محتاط مذہب یہی ہے کہ سفر اور بیماری میں روزہ نہ رکھا جائے۔ لیکن بایں اگر کوئی شخص رکھ لے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے گناہ کیا ہے یا یہ کہ اس کا روزہ نہیں ہوا۔

ع۲۲۶ یطیقون۔ طاقۃ کے معنی میں مفردات میں ہے الطاقۃ اسم لمقدار ما یمکن للانسان ان یفعلہ بمشقۃ یعنی طاقت اس مقدار کا نام ہے جو انسان کے لیے ممکن ہے کہ اس کو مشقت کے ساتھ کر سکے۔ کیونکہ یہ لفظ طَوْق سے مشتق ہے اور طوق وہ چیز ہے جو گردن میں ہو یعنی اس کا احاطہ

فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنۡ — پھر جو کوئی تکلف سے نیکی کرتا ہے وہ اس کے لیے بہتر ہے اور
تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾ — روزے رکھنا تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو ۲۲۷
شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ — رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت،
هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰی وَ — اور ہدایت کی اور حق اور باطل کو الگ کر دینے کی کھلی دلیلیں ہیں ۲۲۸
الۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡکُمُ الشَّهۡرَ — پس جو کوئی تم میں سے اس مہینے کو پائے تو چاہیے کہ اس کے روزے

کیے ہوئے ہو۔ اسی تشبیہ کے لحاظ سے طاقۃ کے یہ معنی ہیں (غ) اس لیے یطیقونہ کے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ جن کو روزہ رکھنے میں سخت مشقت اٹھانی پڑے اور تفسیروں میں ایک قول اس کے مطابق ہے۔ یصومونہ جهدهم وطاقتهم اور دوسری قرائتیں جیسے یُطَیَّقونہ یا یطوّقونہ اس معنی کی مؤید ہیں کیونکہ اول کے معنی یتکلفونہ ہیں اور دوئم کے معنی بھی یہی ہیں یعنی یکلفونہ یا یقلّدونہ ہیں جو طوق سے ہے اور مراد ہر صورت میں یہی ہے کہ ان کے لیے روزہ رکھنے میں سخت مشقت یا تکلیف ہے اور یطیقونہ کے معنی یتجشمونہ عبداللہ سے مروی ہیں (ث) یعنی تکلیف سے روزہ رکھ سکتے ہوں۔

فدیۃ۔ فدی اور فداء کے معنی ہیں انسان کا کسی مصیبت سے اپنی حفاظت کر لینا اس مال کے ذریعہ سے جو اس کے لیے خرچ کرے (غ)

آیت فدیہ صیام کی منسوخی میں اختلاف: بخاری میں ایک روایت حضرت ابن عمرؓ سے ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور سلمہؓ کی روایت میں ہے کہ جب یہ نازل ہوئی تو جو چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو چاہتا فدیہ دیدیتا۔ اور بخاری میں ہی حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ منسوخ نہیں بلکہ اس سے مراد بہت بوڑھے ہیں تو اختلاف کی اصل وجہ صرف یہ ہے کہ جو بزرگ اس آیت کے معنی کو دوسری آیت کے ساتھ تطبیق نہیں دے سکے انہوں نے اسے منسوخ کہدیا اور جن کے نزدیک تطبیق ہو گئی انہوں نے کہا غیر منسوخ ہے اور جب معنی میں تطبیق ہو سکتی ہے تو آیت کو منسوخ کہنا بے معنی ہے۔

روزہ کا فدیہ کون لوگ دے سکتے ہیں: ظاہر ہے کہ یطیقونہ میں ضمیر اسی کی طرف ہی جا سکتی ہے جس کا ذکر پہلے چلا آتا ہے نہ فدیہ یا طعام کی طرف جس کا ذکر ابھی نہیں آیا۔ پس یہ معنی کرنا ٹھیک نہیں کہ جو فدیہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ فدیہ دیدیا کریں اور نہ یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں اور پھر روزہ نہیں رکھتے وہ فدیہ دیدیا کریں کیونکہ یہ لفظ قرآن شریف میں نہیں، وہاں یطیقون ہے جس کے اس معنی پر جس کی تائید دوسری قرائتوں سے ہوتی ہے غور نہیں کیا گیا۔ پس اصل معنی یوں ہونگے کہ جو اس کو مشقت کے ساتھ کر سکتے ہیں وہ فدیہ دیدیا کریں۔ اوپر ساتھ ہی ذکر بیمار اور مسافر کا ہے پس صاف اور واضح منشاء الفاظ قرآنی کا یہ ہے کہ بیمار اور مسافر پیچھے گنتی پوری کر لیا کریں لیکن وہ جن کو پیچھے گنتی پورا کرنے میں مشقت ہے وہ فدیہ دیدیا کریں۔ ظاہر ہے کہ بعض لوگ اپنی عمر کا بڑا حصہ سفر میں ہی گزار دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ دائم المریض ہوتے ہیں اور اسی حکم میں بہت بوڑھے لوگ بھی ہیں کیونکہ بڑھاپا بھی حالت اعتدال سے انسان کو نکال دیتا ہے اور ابوداؤد کی حدیث کی رو سے اسی حکم میں حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت ہیں۔ کیونکہ اس میں حمل یا بچہ کے ضائع ہونے کا خوف ہوگا اور وہ بھی حالت اعتدال میں نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ فدیہ دیدیا کریں۔ پس اصل بات یہ ہے کہ یہ حکم صرف مریض اور مسافر کے لیے ہے جن کو رمضان کے روزوں کی جگہ پچھلے دنوں میں روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جب ان کی حالت ایسی ہو کہ وہ پچھلے دنوں میں بھی تعمیل حکم میں مشقت پاتے ہوں تو فدیۃ طعام مسکین دے دیا کریں اور حدیث نے یہ بتایا کہ بوڑھے مرد اور عورتیں بھی مریض کے حکم میں ہی داخل ہیں۔ چنانچہ بخاری میں ہے کہ حضرت انسؓ جب بہت بوڑھے ہو گئے تو روزہ کی بجائے فدیہ دے دیا کرتے تھے۔

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان الفاظ کو منسوخ صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ شہر رمضان والی آیت میں یہ دوہرائے نہیں گئے۔ حالانکہ یہ محض ایک رخصت کا رنگ ہے اور ضروری نہیں کہ اس کو بار بار دوہرایا جاتا۔ محض دوبارہ یہ لفظ نہ آنے سے ان کو منسوخ سمجھنا بالکل غلط استدلال ہے۔

اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں اور یہ فدیہ صدقۂ فطر کی صورت میں بروئے حدیث ضروری ہے اور یہ معنی بھی اس آیت کو دوسری آیات کے خلاف نہیں رہنے دیتے اور یہاں ذکر بھی ایک مسکین کے کھانے کا ہے۔

ع۲۲۷ تطوّع۔ تطوّع کے معنی گو عام طور پر شوق سے یا نفل کے طور پر نیکی کرنا ہیں۔ مگر اس کے اصلی معنی تکلف الطاعۃ ہیں (غ) یعنی طاعت بطور تکلف اختیار کرنا اور یہی معنی یہاں مراد ہیں اور بطور نفل نیکی اختیار کرنا خود اسی سے ماخوذ ہے۔

یہاں روزے کی علت غائی کی طرف پھر توجہ دلائی ہے کیونکہ روزہ رکھنا بطور تکلف اطاعت اختیار کرنا ہے اس لیے فرمایا کہ بطور تکلف اطاعت اختیار کرنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس لیے اگر تم روزہ رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ کیونکہ اس سے نیکی کی قوت ترقی پکڑتی ہے اور اگر شوق سے نیکی اختیار کرنا معنی لیے جائیں تو مراد یہ ہو سکتی ہے کہ زیادہ مسکینوں کو کھانا دیدے۔

ع۲۲۸ شهر۔ شُهْرَۃ کسی امر کی وضاحت ہے اور شَهْر مہینہ کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایک مشہور مدت ہے یا چاند دیکھنے کے وقت اس کی شہرت ہو جاتی ہے (غ)

رمضان۔ مہینہ کا نام ہے اور رمض سے مشتق ہے جس کے معنی دھوپ کی گرمی کی شدت ہیں (غ) مہینوں کے نام جب دوبارہ رکھے گئے تو اس مہینہ

فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ
الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا
الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

رکھے[۲۲۹] اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور دنوں سے گنتی (پوری) کی جائے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا اور کہ تم گنتی کو پورا کرو اور اللہ کی بڑائی کرو اس لیے کہ اس نے تمھیں ہدایت کی اور تاکہ تم شکر کرو[۲۳۰]

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ
دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي
وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿۱۸۶﴾

اور جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو میں قریب ہوں میں دعا کرنے والے کی دعا کو جب وہ مجھے پکارتا ہے قبول کرتا ہوں[۲۳۱] پس چاہیئے کہ میری فرمانبرداری کریں اور چاہیئے کہ مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں۔

میں گرمی کی شدت تھی۔

قرآن ۔ قرأ ئے مصدر ہے جس کے معنی پڑھنا ہیں۔ اور قرأ کے اصل معنی جمع کرنا ہیں اور پڑھنے میں حرف ایک دوسرے کے ساتھ ملائے جاتے ہیں (غ) پس ایک معنی کے لحاظ سے قرآن نام اس لیے رکھا گیا کہ یہ تمام علوم کو یا تمام کتب سماوی کی خوبیوں کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے (غ) اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ ایک پیشگوئی تھی کہ دنیا کی تمام کتابوں میں پڑھا جانے کے لحاظ سے اس کو خاص امتیاز حاصل ہوگا۔ چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے جس کا اقرار مخالفین اسلام کو بھی ہے کہ قرآن کے برابر دنیا کی کوئی کتاب نہیں پڑھی جاتی (دیکھو انسکلوپیڈیا بریٹینیکا) لاکھوں انسان اسکے حافظ ہیں جو دن رات اسے پڑھتے ہیں اور کسی کتاب کے اتنے حافظ دنیا میں نہیں پھر ہر مسلمان پانچ مرتبہ ہر روز اس کا کچھ نہ کچھ حصہ نماز میں پڑھتا ہے۔ یہاں بتا دیا کہ وہ گنتی کے دن جن کے روزے رکھنے کا حکم دیا رمضان کا مہینہ ہے اور اس مہینہ کو خاص فخر یہ حاصل ہے کہ اس میں قرآن اتارا گیا یعنی نزول قرآن اس میں شروع ہوا۔ ابن اسحاق کی روایت پر روح المعانی میں انہی معنوں کو ترجیح دی ہے۔ ای ابتدی فیه انزاله وکان ذلك لیلة القدر۔

یہاں قرآن کریم کے تین کمالات کا ذکر فرمایا۔ اول یہ کہ یہ ھدی ہے یعنی لوگوں کو سیدھی راہیں بتاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ بینات من الھدی ہے یعنی دلائل بھی دیتا ہے کہ کیوں فلاں راہ پر چلنا چاہیئے یا فلاں راہ سے بچنا چاہیئے۔ تیسرا یہ کہ اس کے دلائل حق و باطل میں فیصلہ کر دینے والے ہیں۔ یعنی فی الواقع ایک انسان کو حق الیقین کے مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔

ع[۲۲۹] ان الفاظ کی رو سے ان مقامات کو خارج کر دیا جہاں بہت لمبے دنوں کی وجہ سے بارہ مہینوں کی تقسیم مشاہدہ میں نہیں آتی، نہ ہلال نظر آتا ہے، کیونکہ شھد میں مشاھدہ ضروری ہے خواہ کسی طرح پر ہو۔ دیکھو ع[۳۷] ایسی صورت کے لیے دیکھو ع[۲۳۵]۔

ع[۲۳۰] بیمار اور مسافر کے پیچھے روزے رکھنے کے حکم کو اس لیے دوہرایا ہے کہ رمضان کی خاص برکات کے ذکر کی وجہ سے لوگ تکلیف مالایطاق میں نہ پڑیں۔ یرید اللہ بکم الیسر سے بھی ظاہر ہے کہ بیمار اور مسافر کے لیے رخصت سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

ع[۲۳۱] قریب۔ لفظ قرب مکان و زمانہ کے لحاظ سے بھی استعمال ہوتا ہے اور نسبت، مرتبہ، علم و قدرت کے لحاظ سے بھی۔ اللہ تعالیٰ کا قرب بندہ سے جیسا کہ نحن اقرب الیه من حبل الورید میں علم و قدرت کے لحاظ سے ہے اور کبھی بندہ کے اللہ تعالیٰ سے قرب کا ذکر ہوتا ہے اولئك المقربون وہ بلحاظ مرتبہ یا رعایت ہے، انی قریب میں اس قرب مخصوص کا ذکر ہے جو خاص بندوں کو اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اس کی طرز بھی آگے بتائی ہے کہ کس طرح ہو سکتا ہے وہ بذریعہ دعا ہے۔

اجیب ۔ جوب کے معنی جَوْبَة یعنی پست زمین کا قطع کرنا ہے۔ چنانچہ قطع کرنے یا تراشنے کے معنی میں ہی ہے جابوا الصخر بالواد (الفجر ۸۹-۹) اور کلام کا جَواب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بھی جَوب کو قطع کرتا ہے اور کہنے والے کے منہ سے سننے والے کے کان تک پہنچتا ہے۔ لیکن ابتدائی خطاب کو جواب نہیں کہا جاتا۔ پھر جواب دو طرح پر ہے اگر سوال میں کسی بات کا مطالبہ ہے تو اس کا جواب بات ہے اور اگر سوال میں کسی فائدہ کا مطالبہ ہے تو وہ فائدہ پہنچانا جواب ہے (غ)، پس اجیب کے معنی جواب دیتا ہوں بھی ہو سکتے ہیں اور قبول کرتا ہوں بھی۔ اور استجابة اور اجابة کے ایک ہی معنی ہیں یعنی قبول کرنا، اس فرق سے کہ اجابت میں ایسا جواب بھی ہو سکتا ہے جو درخواست کی نامنظوری لیے ہوئے ہو۔ اور استجابت میں قبولیت ضروری ہے۔ یہ فراء کا قول ہے (ر) پھر بندہ کی طرف سے استجابت یا اجابت فرمانبرداری کا اختیار کرنا ہے۔

یرشدون ۔ رُشد کے معنی ہدایت پانا ہیں (غ)

اس آیت کو جس میں قرب الٰہی کا ذکر ہے۔ رمضان کے احکام میں لانے سے یہ اشارہ ہے کہ رمضان میں قرب الٰہی کی راہیں بہت کھل جاتی ہیں۔ اس کا طریق

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا

تمھارے لیے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رغبت کرنا حلال کیا گیا ہے[۲۳۲] وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو[۲۳۳] اللہ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے[۲۳۴] سو اس نے تم پر رجوع برحمت کیا اور تم کو معاف کیا پس اب ان سے میل جول کرو اور جو اللہ نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے چاہو اور کھاؤ اور پیو

یہ بتایا کہ دعا کرو تو میرا قرب مل سکتا ہے۔ رمضان میں نبی کریم صلعم کا طرز عمل بھی یہی بتاتا ہے کہ آپ عبادت اور دعا پر بہت زیادہ زور دیتے تھے اور سخاوت بھی دیگر ایام سے بڑھ کر کرتے تھے گویا یہی مہینہ مسلمانوں کے لیے مجاہدات کا مہینہ ہے جس کے اندر تزکیہ نفس ہو کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے اور انسانی زندگی کی اصل غرض پوری ہو سکتی ہے۔ اذا سألك عبادی عنی میں اس تڑپ کا ذکر ہے جو مومنوں کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور دعوۃ الداع سے مراد اسی تڑپ کا اظہار ہے جب انسان دعا میں اسے اختیار کرتا ہے۔ پس یہاں جس دعا کی قبولیت کا ذکر ہے وہ صرف قرب الٰہی کو حاصل کرنے کی دعا ہے اور جو انسان ایسی دعا کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ بھی ضرور قبول فرماتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ میری فرمانبرداری کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ سیدھی راہ پالیں گے یعنی وہ راہ جو میرے قرب میں پہنچا دیتی ہے۔ فی الواقع فطرت انسانی جب صفائی پر ہوتی ہے اور روزہ سے اس میں صفائی ضرور آتی ہے تو اس کے اندر یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ قرب الٰہی کو حاصل کرے۔ اس قرب کو حاصل کرنے کے لیے بتایا کہ نرے روزے سے ہی نہیں بلکہ پھر دعا بھی ساتھ کرو۔ گویا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ میں روزہ اگر صبر کا پہلو ہے تو صلوٰۃ دعا کا پہلو ہے۔ پس یہ مہینہ عبادات کے لیے مخصوص ہے۔

سیاق و سباق عبارت سے ظاہر ہے کہ یہاں انہی دعاؤں کی قبولیت کا ذکر ہے جو قرب الٰہی کے حصول کے لیے کی جائیں۔ عام دعاؤں کا یہاں ذکر نہیں جو بندہ اپنی مصائب کے لیے کرتا ہے۔ ان کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے۔ فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء (الانعام ۶-۴۱) یعنی جس مصیبت کو دور کرنے کے لیے تم اسے پکارتے ہو اسے اگر چاہے تو دور کر دے۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ دنیوی معاملات میں اللہ تعالیٰ ساری دعاؤں کو قبول کرے، جسے چاہے اسے قبول کرے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا ولنبلونکم بشیء من الخوف ایۃ۔ یعنی آزمائش کے طور پر اللہ تعالیٰ کچھ تکلیف انسانوں پر بھی وارد کرتا رہتا ہے۔ ہاں قرب الٰہی کی راہیں اس قدر کھلی ہیں کہ جب انسان اس کے لیے قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی پکار کو سُن لیتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (العنکبوت ۲۹-۶۹)

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر بعض دعائیں قبول نہیں ہوتیں تو دعا ایک لغو امر ہے ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہے کہ بعض وقت دوا مفید نہیں پڑتی تو دوا کرنا ہی لغو امر ہے جس قدر اسباب دنیا میں ہیں وہ ایک حد تک ہی فائدہ پہنچاتے ہیں اور ہر دعا کو قبول کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ خدا حاکم نہیں بلکہ بندہ حاکم ہے کہ جو وہ مانگے خدا کو مجبوراً دینا پڑتا ہے۔ وہاں دعا کی قبولیت کا یقین اس سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض وقت اپنے بندوں کو قبل از وقت نتیجہ سے اطلاع دے دیتا ہے۔

ع۲۳۲ رفث۔ ازہری کہتے ہیں کہ یہ ایک کلمہ جامع ہے ان تمام باتوں کے لیے جو مرد عورت سے چاہتا ہے اور مفردات راغب میں ہے کہ اس کا استعمال جماع اور اس کے محرکات پر ہے جن کا کھلا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں مراد جماع ہے۔

رمضان میں عورت سے رغبت: بخاری میں براء کی روایت سے ہے کہ جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو لوگ سارا مہینہ عورتوں کے پاس نہ جاتے تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ اگر سو جاتے تو پھر اس کے بعد کھانا پینا، عورتوں کے قریب جانا جائز نہ سمجھتے تھے پس یہ حکم نازل ہوا کہ رات کو بی بی کو بلانا جائز ہے۔

ع۲۳۳ لباس وہ ہے جو انسان کے قبیح امر کو ڈھانک دے (غ) امام راغب کہتے ہیں کہ میاں کو بی بی کا اور بی بی کو میاں کا لباس اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی محافظت کرتے اور ایک دوسرے کو امر قبیح کے ارتکاب سے بچاتے ہیں۔ مجاہد اور دیگر سلف سے اس کے معنی سکن مروی ہیں۔ یعنی عورتیں مردوں کے لیے سکون و اطمینان کا موجب ہیں مرد عورتوں کے لیے اور قرآن کریم نے خود اس معنی کو واضح کر دیا ہے۔ جہاں فرمایا وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا (الاعراف ۷-۱۸۹) اسی سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا تاکہ وہ اس سے سکون پکڑے اور دوسری جگہ ہے خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا (الروم ۳۰-۲۱) تمہاری جنس سے تمہاری بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون پکڑو۔ رات کو بھی ایک جگہ سکون اور ایک جگہ لباس کہا ہے اور خود لباس کی غرض قرآن شریف میں یوں بیان کی ہے یواری سوآتکم وریشا (الاعراف ۷-۲۶) وہ تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانکتا ہے اور تمہارے لیے زینت کا موجب ہے۔ پس ایک لطیف استعارہ میں بتایا کہ میاں بی بی کا تعلق کس طرح ایک دوسرے کے لیے تسکین کا موجب ہے اور کس طرح ایک کی کمی دوسرے سے پوری ہوتی ہے۔

ع۲۳۴ تختانون۔ اختیان سے ہے امام راغب اختیان اور خیانۃ کے معنی میں یہ فرق کرتے ہیں کہ اختیان کے معنی ہیں خیانت کا ارادہ کرنا گویا خیانت ابھی وقوع میں نہیں آئی۔

نزول حکم قرآنی سے پہلے روزہ میں تشدد: چونکہ بعض صحابہؓ کا یہ خیال تھا کہ روزہ میں رات کے وقت بھی بی بی کے پاس نہیں جانا چاہیئے گو کوئی حکم الٰہی نازل نہ ہوا

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ
الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى
الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ
فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾
وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا
بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ
النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع

یہاں تک کہ تمھارے لیے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ ہو جائے پھر رات تک روزے کو پورا کرو[۲۳۵]۔ اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو تو اُن سے میل جول نہ کرو[۲۳۶]۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں پس تم ان کے قریب مت جاؤ[۲۳۷]۔ اس طرح اللہ اپنی باتیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ کریں [۲۳۸]

اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور (نہ) ان کے ذریعہ حاکموں تک پہنچو، تاکہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو۔

تھا اور خواہش طبعی چاہتی تھی تو اس صورت میں اس تحریک خواہش کو اختیان کہا ہے جو روایتیں اس موقعہ پر بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ایک شخص بغیر کھائے پیئے سو گیا اور اسی بھوک کی حالت میں روزہ رکھا تو اگلے دن اسے غش آ گیا۔ دوسری روایت حضرت عمرؓ کے متعلق ہے کہ وہ اپنی بی بی کے پاس گئے بعد اس کے کہ وہ سو گئی تھیں۔ یہ دونوں روایتیں کسی پہلے حکم کی موجودگی کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ اس حکم سے ایک غلط خیال کی تردید ہوئی۔ توبہ اور عفو کے لفظ عام ہیں ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پہلے کوئی برا فعل خلاف حکم الٰہی ہو چکا ہے۔ ایک سخت پابندی کی جگہ ایک نرم حکم دے دیا یہ توبہ ہے دیکھو ۵۷ نیز النساء۔۲۶ جہاں کھول کر بیان کر دینے کیا شریعت عطا فرمانے کو یتوب علیکم سے ظاہر کیا ہے اور عفو اس کو اس لیے کہا کہ ایک سختی جو مسلمانوں نے اپنے اوپر لازم کر لی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے دور کر دیا۔

۲۳۵ الخیط الابیض۔ خیط دھاگے کو کہتے ہیں اور خیاط سوئی کو حتی یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف۔۴۰) اور الخیط الابیض صبح کی سفید دھاری کا نام ہے اور الخیط الاسود اس کی سیاہی کا۔ یہ معنی خود نبی کریم صلعم سے مروی ہیں۔ چنانچہ بخاری میں عدی کہتے ہیں کہ میں نے رات کو ایک سفید دھاگا اور ایک سیاہ دھاگا اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیے اور جب آنحضرت صلعم کو یہ واقعہ سنایا تو آپ نے فرمایا ان وسادك اذا لعریض تمہارا تکیہ بڑا فراخ ہے۔ گویا یوں سمجھا دیا کہ وہ خیط ابیض اور خیط اسود تکیہ کے نیچے نہیں آ سکتے۔

یہاں روزہ کی حدود بیان کی ہیں۔ صبح صادق کے نمودار ہونے تک کھانا پینا جائز ہے اور آفتاب غروب ہوتے ہی افطار کر دینا چاہیئے۔ سحری کے وقت میں حتی الوسع تاخیر کی اور افطار میں حتی الوسع تعجیل کی تاکید نبی کریم صلعم نے فرمائی ہے۔

جہاں دن لمبے ہوں وہاں روزے کا حکم: ان حدود پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ بعض جگہ کئی کئی ماہ کا دن ہوتا ہے۔ سو اوّل تو یہ مقام آبادی بہت کم ہیں۔ دوسرے وہاں رمضان کا مہینہ ممیز نہیں ہوتا۔ پس شھد منکم الشھر میں وہ لوگ نہیں آتے۔ ہاں جہاں اٹھارہ انیس گھنٹے کا دن ہو وہاں روزہ رکھا جا سکتا ہے جن کے لیے تکلیف مالا لیطاق ہو وہ فدیۃ طعام مسکین پر عمل کریں۔

۲۳۶ تباشروا۔ بشرۃ ظاہر جلد کو کہتے ہیں یعنی چمڑے کے اوپر کا حصہ اور مباشرۃ دو انسانوں کے چمڑے کا ایک دوسرے کو لگنا ہے یعنی مرد اور عورت کے لمس بشرۃ الرجل بشرۃ المرأۃ (ر) اس کے اور لامسۃ کے جو لمس (چھونے) سے ہے ایک ہی معنی ہیں (ر) اور کنایۃً جماع مراد ہے جیسے اس قسم کے دوسرے الفاظ سے بھی اور یہی معنی یہاں مراد ہیں نہ مطلق چھونا۔

عاکفون۔ عاکف مقیم کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد اعتکاف ہے جو آخری عشرہ رمضان میں کیا جاتا ہے یعنی دس دن تک انسان بالکل مسجد میں رہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماہ رمضان کو مسلمان کا اصلی مجاہدہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے اس کے آخری دس یوم کو اور بھی اس مجاہدہ کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ ان ایام میں جو اعتکاف کرتا ہے اسے بی بی سے علیحدہ رہنا چاہیئے مگر کسی ضرورت کے لیے بی بی کا اس کے پاس آنا منع نہیں۔

۲۳۷ حدود۔ حدّ کی جمع ہے اور یہ اس روک کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان ہو اور ان کو ایک دوسرے سے ملنے سے روکے۔ اس لیے حدّ کسی چیز کا وہ وصف ہے جو اسے دوسری چیزوں سے ممیز کر دے (غ) اسی مادہ سے حادّ ہے۔ ان الذین یحادون اللّٰہ ورسولہ (المجادلۃ ۵۸۔۲۰) اور اسی سے حدید لوہا ہے اور حدید بمعنی تیز فبصرك الیوم حدید (قٓ ۵۰۔۲۲) اور حدود اللّٰہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں اس لیے کہ وہ حق و باطل میں حاجز یعنی روک ہیں۔

یہاں حدود کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے فمن رتع حول الحمی یوشك ان یقع فیہ جو شخص رکھ کے ارد گرد پھرتا ہے قریب ہے کہ اس کے اندر چلا جائے۔

۲۳۸ تدلوا۔ ادلاء سے ہے جس سے مراد ڈول کا ڈالنا یا نکالنا ہے اور استعارۃً کسی چیز کو ذریعہ بنانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ
لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا
الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ
وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

تجھ سے ہلالوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ یہ لوگوں کے فائدہ کے لیے اور حج کے لیے مقرر وقت ہیں[۲۳۹]۔ اور یہ بڑی نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے آؤ، لیکن بڑا نیک وہ ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے، اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو تاکہ تم کامیاب ہو[۲۴۰]۔

روزہ اور حرامخوری سے اجتناب: اس حکم کو رمضان کے حکم کے ساتھ لانے کا منشاء یہ ہے کہ جب تم میں یہ قوت پیدا ہوگئی کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حلال چیزوں کو بھی جب وہ ترک کر دینے کا حکم دے ترک کر دیتے ہو تو حرام اور باطل کو ترک کرنا کس قدر آسان ہے۔ زیادہ تر مال کی محبت ہی انسان سے گناہ کراتی ہے اس لیے روزہ گناہ سے بچانے کا بڑا موجب ہے۔ کیونکہ روزہ سے انسان کے اندر وہ قوت نشوونما پاتی ہے جس سے وہ مال کے ناجائز کھانے کو ترک کر سکتا ہے۔

ع۲۳۹ اھلّہ۔ ھلال کی جمع ہے پہلی اور دوسری رات کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد قمر (غ) ہلال کی رویت کے ساتھ قمری مہینہ کا آغاز ہوتا ہے۔

مواقیت۔ میقات کی جمع ہے اور یہ وہ وقت ہے جو کسی چیز کے لیے مقرر کیا جائے یا وہ وعدہ جس کے لیے کوئی وقت مقرر کیا جائے (غ) ان یوم الفصل کان میقاتاً (النبأ ۷۸-۱۷) الی میقات یوم معلوم (الواقعۃ ۵۶-۵۰)

ہلالوں کے متعلق سوال سے کیا مطلب ہے: ایسے جس قدر سوال ہیں ان سب میں احکام دریافت کیے ہیں یسئلونک عن الیتامیٰ۔ یسئلونک عن الخمر والمیسر۔ یتیموں کے احکام دریافت کرتے ہیں۔ شراب اور جوئے کے احکام دریافت کرتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ یتیم کس طرح بنتا ہے۔ شراب کس طرح بنتی ہے۔ جوا کس طرح کھیلا جاتا ہے۔ پس ہلالوں کے بھی احکام دریافت کرتے ہیں اور ہلالوں سے مراد مہینے ہیں۔ یہ سوال خاص مہینوں یا ہلالوں کے متعلق ہے جیسا کہ جواب سے ظاہر ہے ھی مواقیت للناس والحج اور یہ خاص مہینے فی الواقع رمضان کے اختتام کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی شوال، ذیقعد اور دس دن ذی الحج کے یہ حج کے مہینے ہیں۔ عرب میں یہ مشہور مہینے تھے جن کا نام لینے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ جیسا کہ فرمایا الحج اشھر معلومات جب رمضان کے اس قدر فضائل کا ذکر ہوا تو ان مہینوں کا سوال بھی پیدا ہوا، جو رمضان کے ساتھ شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر چونکہ حج کے مہینوں میں دو مہینے حرمت والے بھی ہیں ان کا ذکر بھی ساتھ ہی کر دیا۔ حرمت کے مہینے کل چار ہیں۔ یعنی محرم۔ رجب۔ ذیقعد۔ ذی الحج۔ عرب میں ان ایام میں جنگ بالکل بند ہو جاتی تھی۔ راستے کھل جاتے تھے۔ تجارتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ انہی میں حج کے ایام بھی آ جاتے تھے۔ اس لیے مواقیت للناس فرمایا یعنی لوگوں کی بھلائی کے لیے اوقات مقررہ، ورنہ عرب جیسی جنگجو قوم تھی اگر ان مہینوں کی وجہ سے انکی تجارتیں وغیرہ سال میں چار ماہ نہ کھلی رہتیں، تو بالکل برباد ہو جاتے۔ اگر کل مہینوں کے متعلق سوال ہو تو بھی ہرج نہیں کیونکہ سبھی مہینے لوگوں کے لیے وقت مقرر ہیں۔

ع۲۴۰ ابواب۔ باب کی جمع ہے۔ دروازہ کو کہتے ہیں۔ شہر کا ہو یا مکان کا یا کوٹھڑی کا۔ اور کسی چیز کا باب وہ ذریعہ ہے جس ذریعہ سے اس چیز تک پہنچ سکیں۔ جیسے حدیث میں ہے انا مدینۃ العلم وعلیؓ بابھا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فتحنا علیھم ابواب کل شیء (الانعام ۶-۴۴) اور الملٰئکۃ یدخلون علیھم من کل باب (الرعد ۱۳-۲۳) جس کے معنی کیے ہیں ہر ایک قسم کی خوش کرنے والی چیزوں سے (غ) امام راغب کے نزدیک ابواب الجنۃ اور ابواب جھنم سے وہ اسباب مراد ہیں جو انسان کو جنت یا دوزخ میں پہنچاتے ہیں۔

بیت۔ بَاتَ کے معنی ہیں رات کاٹی اور اس لیے بیت اصل میں وہ مکان ہے جہاں انسان رات کاٹے۔ پھر عام ہر ایک مسکن کو کہتے ہیں (غ) اور مجازاً دل کو جیسا کہ امام راغب نے اس حدیث کے معنی میں قول نقل کیا ہے۔ لاتدخل الملٰئکۃ بیتاً فیہ کلب ولا صورۃ۔ فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا اور تصویر ہو۔ کہ بیت سے مراد یہاں دل اور کلب سے مراد حرص ہے اور بعض کے نزدیک گھر کے دروازہ سے داخل ہونا کنایہ ہے سیدھی راہ اختیار کرنا اور پچھواڑے کی طرف سے آنا کنایہ ہے سیدھی راہ سے انحراف کرنے سے۔

عرب کی توہم پرستی: حسن اور اصم کا قول ہے کہ اہل عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص کسی مقصد کو سامنے رکھ لیتا اور اس کا حاصل کرنا مشکل ہوتا تو وہ ایک سال تک گھر کے پچھواڑے کی طرف سے داخل ہوتا اور اس کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتا۔ مسلمانوں کو بتایا ہے کہ تمہاری کامیابی کا مدار ایسی توہم پرستیوں پر نہیں بلکہ تقویٰ پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق اور ذمہ داریوں کی حفاظت پر۔ چونکہ اصل مضمون استعانت بالصبر والصلوٰۃ تھا اس لیے اس سے روکا ہے کہ کامیابی کا مدار توہم پرستی پر رکھا جائے۔ بخاری میں ہے کہ احرام کی حالت میں حمس کے سوائے دوسرے لوگ گھر کے پچھواڑوں سے داخل ہوتے تھے چونکہ حج کا ذکر آیا تھا اس لیے اس رسم کو دور کرنے کا حکم بیان دیا ہے چونکہ رمضان کو حج کے ساتھ خاص تعلق ہے یعنی جیسے رمضان کی دس راتیں بڑی فضیلت والی ہیں، جن کا ذکر آخری سے پہلی آیت رکوع گذشتہ میں کیا ہے، اسی طرح ذی الحج کی دس راتیں بھی خاص فضیلت رکھتی ہیں۔ اس لیے حج میں جو توہم پرستی کی باتیں تھیں ان کو دور کر دیا اور جو ارکان روحانی معنی

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا
تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾
وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ
مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَالْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ
الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں
اور زیادتی نہ کرو، اللہ زیادتی کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا۔[۲۴۱]
اور جہاں اُن کو پاؤ مارو اور انھیں نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں
نکالا ہے[۲۴۲] اور فتنہ قتل سے بڑھ کر سخت ہے[۲۴۳] اور مسجد حرام کے قریب
ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ اس کے اندر تمھارے ساتھ جنگ
رکھتے تھے ان کو باقی رکھا۔

ع۲۴۱ قاتلوا۔ مُقاتلۃ کے معنی مُحارَبَۃ ہے یعنی ایک دوسرے سے جنگ کرنا یا ایک دوسرے کو قتل کرنے کا قصد کرنا۔

یہاں سے جنگ کا ذکر شروع ہوتا ہے اور اس کا تعلق ماسبق سے دو طرح پر ہے ایک تو پہلے صاف کہا گیا تھا کہ تم کو خانہ کعبہ کا متولی بنایا جائے گا مگر اس کے لیے صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ خدا کی مدد چاہو اور اس راہ میں تم میں سے لوگ شہید بھی ہوں گے پس اب اسی مضمون کو کھول کر بیان کیا ہے کہ جنگ کی اجازت کس حد تک ہے دوسرے جب حرمت والے مہینوں کا سوال آیا اور ان میں جنگ کے بند رہنے کو لوگوں کے فائدہ کی بات قرار دیا، تو اب جنگ کے احکام کو بھی بیان کر دیا جو دراصل یسئلونک کا جواب ہے اور خود حج کا ذکر بھی چاہتا تھا کہ بتایا جائے کہ اسلام کا یہ عظیم الشان رکن کس طرح ادا ہو سکتا ہے جب خانہ کعبہ کافروں کے ہاتھ میں ہے۔ اسی لیے آگے آتا ہے۔ واخرجوھم من حیث اخرجوکم یعنی مکّہ سے تو یہ کافر ضرور نکالے جائیں گے مگر وہ بغیر جنگ کے ناممکن تھا۔ اس لیے احکام جنگ کا ذکر ضروری ہوا۔ سورہ حج میں بھی بعینہٖ اسی کے مطابق حج کے ذکر کے ساتھ جنگ کے اذن کا ذکر شروع ہوتا ہے اذن للذین یقاتلون (الحج ۲۲-۳۹)

یہاں حکم فی سبیل اللہ جنگ کرنے کا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ فتوحات ملکی کے لیے یہ جنگ نہیں۔ حفاظت قومی کے لیے بھی نہیں بلکہ اس لیے کہ اللہ کا نام یہ کافر نہ مٹا دیں اور مسلمانوں کو خدا کی عبادت سے جو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے نہ روکیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے بدر کے دن جو آپ کی پہلی جنگ تھی ان الفاظ میں دعا کی اللّٰھم ان اھلکت ھٰذہ العصابۃ فلن تعبد فی الارض ابدا۔ اے خدا اگر تو نے اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کر دیا تو زمین میں تیری پرستش پھر کبھی نہ ہو گی، اور خود قرآن شریف میں دوسری جگہ اسی جنگ کی غرض کو یوں بیان کیا ہے۔ ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد (الحج ۲۲-۴۰) اگر اللہ بعض لوگوں (یعنی کفار) کو بعض (یعنی مسلمانوں) کے ذریعہ سے نہ روک دیتا تو راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجا گھر اور دیگر مذاہب کے عبادت خانے اور مسجدیں سب ویران کر دی جاتیں اور یوں اللہ کا ذکر دنیا سے مٹا دیا جاتا پس اسی مذہبی آزادی اور امن کا قائم کرنا ہی فی سبیل اللہ ہے اور اسلامی جنگوں کی پہلی شرط یہی ہے۔

مگر اسی آیت میں جنگ کرنے کے متعلق دو اور شرائط بھی لگا دی ہیں۔ ایک یہ کہ ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں جو فی الواقع جنگ میں شامل نہ ہوں یا جو جنگ میں ابتدا نہ کریں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں اور دوسرے یہ کہ حد سے نہ بڑھو یعنی حالت جنگ میں اپنے حق سے یا ضرورت جنگ سے تجاوز نہ کیا جائے۔ خواہ مخواہ اتلاف جان ومال نہ ہو جہاں کہیں قرآن شریف میں کسی قوم سے قتال کا حکم یا اجازت ہے وہ انہیں تین شرائط کے ماتحت ہے اور بغیر اس کے جائز نہیں۔ ان تین شرائط نے اسلامی جنگوں کو نہ صرف یہودی جنگوں کے مقابلہ پر رحمت ہی رحمت کر دیا کیونکہ یہودی غیر قوم کے بوڑھوں بچوں عورتوں تک کو تہ تیغ کر دیتے تھے مویشیوں کو فنا کر دیتے تھے اور مکانوں کھیتوں باغوں اموال کو آگ میں جلا دیتے تھے بلکہ اس بیسویں صدی کی مہذب اقوام کی جنگ کے مقابل میں بھی اسلامی جنگ نری رحمت نظر آتی ہیں پھر ساتھ تقویٰ اور اعتدال اور انصاف اور عفو کا حکم بھی موجود ہے۔

ع۲۴۲ ثقفتموھم۔ ثقف کے اصل معنی کسی چیز کے پانے یا کرنے میں دانائی ہیں (غ) اور گو اصل معنی سے تجاوز کر کے مطلق پا لینے پر بھی اسی لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مگر یہاں اصل معنی ہی مراد ہیں جیسا کہ ابن جریر نے کہا ہے فی ای مکان تمکنتم من قتلھم وابصرتم مقاتلھم یعنی جہاں ان کو قتل کرنے کی قدرت ہو اور ان کے جنگ کرنے کو دیکھو۔

واقتلوھم میں ضمیر انہی لوگوں کی طرف جاتی ہے جن کا پیچھے ذکر ہے یعنی الذین یقاتلونکم وہ لوگ جو تم سے جنگ کرتے ہیں ان کو جہاں پاؤ مار دو۔ یہ نہیں کہ کسی غیر مسلم کو جہاں پاؤ مار دو۔ اور ثقفتموھم کا لفظ اختیار کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اندھا دھند مارنا مراد نہیں صرف جنگ میں مارنا جائز ہے۔

دوسرے فقرے میں جنگ کی حد کو بیان کیا ہے کہ کفار نے مسلمانوں کو بلا وجہ مکّہ سے نکالا تھا اور اب وہ وہاں اغراض مذہبی کے لیے یعنی حج کے لیے بھی نہ جا سکتے تھے اس لیے بتایا کہ جنگ ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے تم کو مکّہ سے نکالا ہے اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ مکّہ سے نکالے جائیں۔ اس میں آخری فتح کی صریح پیشگوئی بھی ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ تمہاری جنگ اپنے حقوق کو واپس لینے کے لیے ہے۔

ع۲۴۳ فتنۃ۔ اصل معنی فَتَن کے سونے کا آگ میں ڈالنا ہے تا کہ کھرا پن اس کے کھوٹ سے الگ ہو جائے۔ اس لیے محض آگ میں ڈال لینے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے یوم ھم علی النار یفتنون (الذاریٰت ۵۱-۱۳) اس لیے فتنۃ عذاب اور دُکھ وغیرہ دینے کے معنی میں آتا ہے (غ) قرآن شریف میں ان دکھوں اور تکلیفوں پر اس

حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

رہو، کریں پھر اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم ان کو مارو۔ کافروں کی یہی سزا ہے[۲۴۴]

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

پھر اگر وہ رُک جائیں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے[۲۴۵]۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو پھر اگر وہ رُک جائیں تو سزا ظالموں کے سوائے اور کسی کے لیے نہیں[۲۴۶]۔

لفظ کا استعمال ہوا ہے جو کفار مومنین کو دیتے رہے ان الذین فتنوا المؤمنین والمؤمنات (البروج ۸۵-۱۰) فاذا اوذی فی اللہ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللہ (العنکبوت ۲۹-۱۰) جہاں صاف اللہ کی راہ میں ایذا دیا جانے کو فتنہ قرار دیا ہے اور بخاری میں ابن عمر کی روایت سے ہے کان الاسلام قلیلا فکان الرجل یفتن فی دینہ اما قتلوہ و اما یعذبوہ حتی کثر الاسلام فلم تکن فتنۃ۔ اسلام حالت غربت میں تھا اس لیے ایک شخص کو اس کے دین کی وجہ سے دکھ دیا جاتا تھا یا اس کو قتل کر دیتے یا عذاب دیتے یہاں تک کہ اسلام بڑھ گیا پھر فتنہ نہ رہا اور مفردات میں ہے کہ فتنۃ بلاؤں اور مصیبتوں اور قتل اور عذاب وغیرہ افعال کریہہ پر بولا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے اور وہ بمقتضائے حکمت الٰہی ہوتا ہے۔ پس مطلب ان الفاظ کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو دین کی وجہ سے دکھ دیئے جاتے ہیں اور ملک میں بے امنی کی حالت ہے وہ قتل سے بڑھ کر ہے۔

ع ۲۴۴ مسجد حرام میں جنگ کی ممانعت: باوجودیکہ یہ بھی بتا دیا کہ مسجد حرام یعنی مکہ سے یہ لوگ نکال دیئے جائیں گے پھر بھی اس کی حرمت کی وجہ سے اس کے قریب بھی جنگ کرنے سے روک دیا۔ ہاں اگر کافر حدود حرم کے اندر جنگ میں ابتدا کریں تو پھر مسلمانوں کو بھی اجازت دی گئی۔

ع ۲۴۵ انتھوا۔ نہی کسی چیز سے روکنا۔ تنھون عن المنکر (اٰل عمران ۳-۱۱۰) ارایت الذی ینھٰی عبدا اذا صلّٰی (العلق ۹۶-۹ و ۱۰) اور انتھاء کے معنی اس چیز سے رُک جانا جس سے روکا گیا ہے (غ) فمن جاءہ موعظۃ من ربہ فانتھٰی (۲-۲۷۵) لئن لم تنتہ لارجمنک (مریم ۱۹-۴۶)

کفار کے جنگ سے رک جانے کی صورت میں حکم: چونکہ اصل حکم جنگ کا اس لیے دیا تھا کہ یہ تم سے جنگ کرتے ہیں پس مطلب یہ ہے کہ اگر جنگ سے رُک جائیں یا چونکہ اوپر فتنہ کا ذکر ہے یعنی مسلمانوں کو دُکھ دینے کا تو مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو دکھ دینا چھوڑ دیں تو تم بھی جنگ نہ کرو اللہ ان کے پہلے قصور بخش دے گا۔

ع ۲۴۶ فتنۃ کے معنی ابھی لغت سے قرآن سے حدیث سے بیان ہو چکے (ع ۲۴۳) پس قاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ سے مراد یہ ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ مسلمانوں کو دین کی وجہ سے دُکھ نہ دیا جائے۔ لیکن اس کے آگے جو الفاظ آتے ہیں ویکون الدین للہ اور دین اللہ کے لیے ہو۔ ان سے یہ غلط نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام ہی اسلام ملک میں ہو۔ مگر یہ معنی اول تو خود لاتکون فتنۃ کے خلاف ہیں اور دوسرے قرآن شریف کی ان آیات کے بھی خلاف ہیں جن میں کفار سے صلح کر لینے کا حکم ہے۔ وان جنحوا للسلم فاجنح لھا (الانفال ۸-۶۱) پھر نبی کریم صلعم کے عمل کے خلاف ہیں کہ آپ نے اس وقت تک جنگ نہیں کی کہ اسلام ہی اسلام ہو۔ صلح حدیبیہ میں کفار کی پیش کردہ شرائط پر صلح کی یہاں تک کہ جو کافروں میں سے مسلمان ہو کر آپ کے پاس آئے ان کو بھی واپس کر دینا منظور کیا۔ پھر فتح مکہ میں اہل مکہ کو حالتِ کفر پر چھوڑ کر معاف کر دیا۔ حتٰی کہ کفر کی حالت میں ان میں سے بعض لوگ مسلمانوں کے ساتھ جنگوں میں شامل ہوتے رہے۔ پھر آپ کے پاس نویں اور دسویں سال ہجرت میں وفد پر وفد مشرکوں کے آتے تھے۔ اگر مشرکوں سے جنگ کا حکم ہوتا تو یہ لوگ کس طرح حالت شرک میں رہ کر مدینہ میں آ سکتے تھے۔ پھر آپ کی وفات کے وقت بھی یہود و نصارٰی عرب میں موجود تھے دین اسلام تو پھر بھی اکیلا عرب میں نہ تھا۔ پھر لا اکراہ فی الدین میں تو اس کے بعد چل کر یہ کہا کہ دین میں جبر نہیں، تو یہاں بجبر مسلمان کرنے کی تعلیم کیونکر ہو سکتی ہے۔ پس جو معنی خلاف سیاق و سباق، خلاف قرآن، خلاف عمل نبوی ہیں وہ کسی طرح قابل قبول نہیں۔

یکون الدین للہ کے معنی صاف ہیں، دین اللہ کے لیے ہو۔ جب دین کے لیے کوئی دکھ دینے والا نہ ہو تو دین اللہ کے لیے ہوگا۔ یہی معنی لھدمت صوامع الآیہ میں ہیں کہ جنگ کی غرض دنیا میں مذہبی آزادی کا قائم کرنا ہے اور یہی معنی لا اکراہ فی الدین کے ہیں دین میں کوئی جبر نہ رہے۔ بخاری کی حدیث سے بھی یہی معنی ثابت ہیں جہاں یکون الدین للہ کے ماتحت امام بخاری حضرت ابن عمرؓ کی اس حدیث کو لائے ہیں کہ جب ان سے ابن زبیر کے معاملہ میں شامل ہونے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔ قاتلنا حتی لم تکن فتنۃ وکان الدین للہ وانتم تریدون ان تقاتلوا حتی تکون فتنۃ ویکون الدین لغیر اللہ۔ یعنی ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ نہ رہا اور دین اللہ کے لیے ہو گیا اور تم جنگ کرنا چاہتے ہو یہاں تک کہ فتنہ ہو اور دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے جس کے صاف معنی ہیں کہ ہم نے جنگ کر کے مذہبی آزادی کو قائم کیا تم جنگ کر کے مذہبی آزادی کو دور کرنا چاہتے ہو۔ کیونکہ ابن زبیر کے معاملہ میں دو مسلمان گروہ جنگ کرنے والے تھے اور کافروں کے غلبہ کا کوئی سوال نہ تھا۔

عدوان کے معنی یہاں زیادتی کی سزا ہے۔ دیکھو ۲۴۸ ۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے بدلے ہے اور تمام حرمت والی چیزوں میں بدلہ ہے[۲۴۷] پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اس کو اسی کے مطابق سزا دو جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے[۲۴۸] اور اللہ کے تقوے پر رہو اور جان لو کہ اللہ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

وَاَنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ
ع ۲۴ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۖ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو[۲۴۹] اور احسان کرو۔ اللہ احسان کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْىِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْىُ مَحِلَّهٗ ؕ

اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو، پھر اگر تم روکے جاؤ تو جو کچھ قربانی آسانی سے میسر آئے کرو اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ، یہاں تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔[۲۵۰] پھر جو

ع ۲۴۷ حرمت کے مہینوں میں جنگ سے رکنے کا حکم: یہاں صاف حکم دیا کہ حرمت والے مہینوں اور تمام حرمت والی اشیاء کا مسلمانوں کو پاس کرنا چاہیئے، یہاں تک کہ کافر ان میں ابتدا کریں، تب قصاص کے طور پر وہ بھی جنگ کریں۔ امام احمد نے جابر سے روایت کی ہے کہ نبی صلعم حرمت والے مہینوں میں جنگ نہ کرتے تھے اور جنگ کرتے کرتے حرمت والا مہینہ آجاتا تو وقفہ کر دیتے۔ چنانچہ واقعہ حدیبیہ میں آپ نے جنگ کرنے سے انکار کیا اور جنگ ہوازن میں حرمت والے مہینہ کی وجہ سے جنگ کو روک دیا (ت)

ع ۲۴۸ اعتداء کے اصل معنی مجاوزۃ الحق ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب دشمن نے حق سے تجاوز کیا ہے تو اب اس کے خلاف کارروائی حق سے تجاوز نہیں بلکہ عین حق ہے۔ اس لیے دوسرے اعتداء کے معنی مجازاۃ عدوان ہیں یعنی زیادتی کا بدلہ یا اس کی سزا۔ اور یہ اسی کے مطابق ہے جو جزاء سیئۃ کو قرآن کریم نے خود سیئۃ کہا ہے حالانکہ سزا فی الواقع برائی نہیں ہے۔ اسی لیے مفردات میں فاعتدوا علیہ کے معنی کیے ہیں قابلوہ بحسب اعتدائہ اس کی زیادتی کے مطابق اس کا مقابلہ کرو۔

ع ۲۴۹ التھلکۃ۔ ھلک سے ہے اور ھلاک موت کو بھی کہتے ہیں اور کسی چیز کے ہاتھ سے جاتے رہنے کو بھی گو وہ دوسرے کے پاس موجود ہو جیسے ھلک عنی سلطانیہ (الحاقۃ ۶۹-۲۹) اور بگاڑ اور فساد سے بھی ہلاک ہوتا ہے۔ یھلک الحرث والنسل (۲-۲۰۵) اور تھلکۃ وہ ہے جو ہلاکت کی طرف لیجائے۔ فی سبیل اللہ اموال کا خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے: اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ بخاری میں اس کے متعلق ہے نزلت فی النفقۃ یعنی یہ آیت خرچ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس مراد اس سے یہ ہوئی کہ خدا کی راہ میں جب جنگ کرو گے تو اموال کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ اس لیے اپنے اموال کو بھی خدا کی راہ میں خرچ کرو یا یہ مراد ہے کہ حفاظت دین کے لیے اگر اس وقت تلوار اٹھانے کی ضرورت ہے تو کبھی وہ وقت بھی آئے گا کہ صرف مال خرچ کرنے کی ضرورت ہو گی اس وقت مال خرچ کرنا اور ہلاکت سے بچنا۔ قسطنطنیہ کے حملہ میں جو صحابہ کے زمانہ میں ہوا ایک شخص صفوں کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا تو بعض نے کہا القی بیدہ الی التھلکۃ اپنے آپ کو اپنے ہاتھ سے ہلاکت میں ڈال دیا۔ حضرت ابوایوب انصاری نے فرمایا اس آیت کے یہ معنی نہیں۔ فکانت التھلکۃ فی الاقامۃ فی الاھل والمال وترک الجھاد۔ ہلاکت تو اس میں تھی کہ ایک شخص اپنے اہل اور مال میں بیٹھا رہے اور جہاد کو ترک کر دے۔ اسی کے مطابق آیت کا خاتمہ احسان کی ترغیب پر کیا ہے۔ آج بھی گھروں میں بیٹھ رہنے میں ہلاکت ہے اور اشاعتِ اسلام پر اموال کو خرچ کرنے کی ضرورت ہے اور اسی میں مسلمانوں کا بچاؤ ہے۔

ع ۲۵۰ احصرتم۔ اِحصار دشمن کے روکنے، اور بیماری کے روکنے دونوں پر بولا جاتا ہے اور حَصَر صرف آخر الذکر پر (غ)

الھدی۔ ھَدِیّۃ کی جمع ہے جس کے معنی تحفہ ہیں بل انتم بھدیتکم تفرحون (النمل ۲۷-۳۶) اور ھَدْی خاص ہے قربانی کے جانوروں کے لیے جو خانہ کعبہ کو لیجائے جاتے ہیں اونٹ ہو یا گائے بکری یا بھیڑ (غ)

مَحِل۔ حَلَّ سے ظرف مکان بھی ہو سکتا ہے اور ظرف زمان بھی۔ قربانی کے اپنے محِل پر پہنچنے سے کیا مراد ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک محلھا الی البیت العتیق (الحج ۲۲-۳۳) کے ماتحت قربانی کا بہرحال خانہ کعبہ میں پہنچانا ضروری ہے۔ مگر نبی کریم صلعم نے دشمن کے روکنے پر حدیبیہ کے مقام پر جو مکہ سے نو میل ہے قربانیاں کر دی تھیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ وہ جگہ بھی حرم میں داخل تھی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دشمن روک دے اور قربانیاں

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۗ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

شَدِيْدُ الْعِقَابِ ع (۱۹۶) ۲۴ع ۸

کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ دُکھ ہو تو اس کا فدیہ روزوں سے یا صدقہ سے یا قربانی سے دے [251]۔ پھر جب تم امن میں ہو تو جو کوئی حج کے ساتھ عمرہ کا فائدہ اٹھائے تو جو قربانی آسانی سے میسر آئے کر دے اور جو نہ پائے تو تین دن کے روزے حج میں رکھے اور سات، جب تم لوٹ کر آؤ، یہ پورے دس ہیں۔ یہ اُس کے لیے ہے جس کے اہل مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں [252] اور اللہ کے تقویٰ پر رہو اور جان لو کہ اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ

حج کے معلوم مہینے ہیں، پس جس نے ان میں اپنے اوپر حج لازم کر لیا تو حج میں نہ فحش کلام اور نہ گالی گلوچ اور نہ کوئی جھگڑا ہو۔ اور جو کچھ نیکی تم کرتے ہو، اللہ اُسے جانتا ہے [253] اور

حرم میں نہیں پہنچائی جا سکتیں تو کیا کرے۔ پھر اس علم کا حاصل ہونا جیسا کہ امام صاحب نے شرط لگائی ہے کہ قربانی حرم میں پہنچ گئی ہے نہ صرف قرآن شریف میں مذکور نہیں بلکہ ویسے بھی مشکل ہے۔ پس ایسی صورت میں مَحِلّ وہی ہے جہاں روکا گیا یعنی وہیں قربانی کر دے۔ ہاں بیماری کی صورت میں قربانی خانہ کعبہ میں بھی پہنچائی جا سکتی ہے تو اس صورت میں مَحِلّ بھی وہی ہوگا۔ آیت ماقبل سے یہ تعلق ہے کہ وہاں جنگوں کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ دشمن حج کرنے سے روکتے تھے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ جنگ کا ذکر یہاں بطور جملہ معترضہ آگیا ہے۔ اصل مضمون حج ہے جس سے رکوع شروع کیا تھا اور حج پر ہی ختم کیا ہے اور اگلے رکوع میں بھی حج کا ہی ذکر ہے۔ چونکہ حج میں اس وقت رکاوٹ تھی اس لیے درمیان میں جنگوں کا ذکر کرنا پڑا۔ اور سر منڈوانے سے مراد حالت احرام سے باہر نکلنا ہے۔ یعنی اس حالت سے جب انسان احرام باندھتا اور صرف دو بن سِلی چادروں میں ملبوس ہوتا ہے اور جب ارکان حج پورے ہو جاتے ہیں تو اس وقت سر منڈوا کر یا بال چھوٹے کرا کر حاجی حالتِ احرام سے باہر نکلتا ہے اس لیے سر منڈوانا گویا حالتِ احرام سے نکل آنا ہے۔

ع۲۵۱ نُسُك کے اصل معنی ع۱۶۳ میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہ نسیکة کی جمع بھی ہے جس کے معنی قربانی ہیں۔
یعنی بیماری کی وجہ سے سر کے بال کٹوانے پڑیں یا اور کوئی فعل حالت احرام کے خلاف کرنا پڑے۔ جیسے لباس کے معاملہ میں تو اس کا فدیہ دیئے صحیح بخاری میں تین دن کے روزے یا چھ مسکینوں کا کھانا یا قربانی سے اس کی تفسیر کی ہے۔

ع۲۵۲ تمتع بالحج الی العمرۃ۔ متاع کے معنی ع۱۶۱ میں بیان ہو چکے ہیں اور متعة الحج خاص اصطلاح ہے یعنی عمرہ کا حج کے ساتھ خاص طریق پر ملانا اور حج تین قسم پر ہے۔ افراد۔ قِران۔ تمتع۔ افراد یہ ہے کہ حج اور عمرہ علیحدہ علیحدہ کرے۔ مثلاً حج کے بعد عمرہ کے لیے احرام باندھے یا حج کے مہینوں سے پہلے عمرہ کر لے اور پھر اسی سال حج کے مہینوں میں حج کرے۔ قِران یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ اور حج کی اکٹھی نیت کرے اور دونوں کے لیے احرام باندھے اور جب تک دونوں نہ کر لے احرام نہ کھولے۔ یا حج کے مہینوں میں عمرہ کے لیے احرام باندھے اور احرام کھولنے سے پہلے حج کو ساتھ ملائے۔ اور تمتع یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کے لیے احرام باندھے۔ پھر عمرہ کر کے احرام کھول دے اور حج کے دنوں میں حج کے لیے احرام باندھے۔ گویا یوں عمرہ کو ساتھ ملا کر انسان فائدہ اٹھا لیتا ہے اس کے لیے بھی فدیہ قربانی یا دس روزے قرار دیئے۔

ع۲۵۳ فَرَضَ۔ فَرْض سخت چیز کے کاٹنے اور اس میں اثر کرنے کو کہتے ہیں اور اس لیے کسی چیز میں حکم کے قطع کرنے کو بھی فرض کہا جاتا ہے اور وہ ایجاب کی طرح ہے مگر ایجاب یا واجب کرنا بلحاظ وقوع اور ثبات بولا جاتا ہے اور فرض قطع حکم کے لحاظ سے (غ) پس فَرَضَ کے معنی لازم کر دیا یا واجب کر دیا۔ اور سورۃ انزلنٰها وفرضنٰها (النور ۲۴-۱) میں فرضنا کے معنی ہیں ہم نے تجھ پر اس پر عمل کرنا واجب کر دیا اور یہی معنی ان الذی فرض علیك القراٰن۔ (القصص ۲۸-۸۵) میں ہیں یعنی وہ جس نے قرآن پر عمل کرنا تجھ پر واجب کر دیا۔
فسوق۔ فِسْق کے معنی کے لیے دیکھو ع۴۱ مگر ابن عباس، ابن عمر، مجاہد وغیرہ سے یہاں سباب یعنی گالی دینا معنی مروی ہیں۔ بئس الاسم الفسوق

اللّٰهُ ۘ وَتَزَوَّدُوا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾	زاد (راہ) لے لیا کرو البتہ بہترین توشہ تقویٰ ہے۔ اور اے عقل والو میرا تقویٰ اختیار کرو۔ ۲۵۴
لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ	تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے رب سے فضل کی طلب میں لگو۔ ۲۵۵ پھر جب تم عرفات سے نکلو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کا

سے ظاہر ہے کہ فسوق ہر وہ نام ہے جسے انسان ناپسند کرے چنانچہ یہی معنی تاج العروس میں دیئے ہیں حدیث میں بھی ہے سباب المسلم فسوق پس یہاں گالی مراد ہے۔ حج کا ذکر گزشتہ رکوع سے چلتا ہے۔ یہاں اول فرمایا کہ حج کے مہینے مشہور ہیں۔ شوال، ذیقعد اور دس دن ذی الحج کے۔ حج کا احرام صرف انہی دو ماہ اور دس دن میں باندھا جا سکتا ہے۔

حج کی غرض: حج میں تین باتوں سے خصوصیت سے روکا ہے۔ ایسی کلام سے جو مرد و عورت کے تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ گالی دینے سے۔ جھگڑا کرنے سے۔ ان تینوں باتوں میں یہ اشارہ ہے کہ حج کی غرض کیا ہے اور وہ انسان کو کس مقام پر پہنچاتا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حج مومن کا عاشقانہ فعل ہے یعنی جذبۂ عشق الٰہی اس میں پایا جاتا ہے۔ اپنے محبوب کے کوچہ کی زیارت کے لیے وطن سے بے وطن ہوتا ہے۔ لباس بھی آسائش والا ترک کر دیتا ہے۔ وہاں جا کر اس کے گھر کے گرد گھومتا ہے، دوڑتا ہے۔ پس جب حج میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جذبۂ عشق الٰہی کے سامنے سارے جذبات اور محبتیں ٹھنڈی پڑ جائیں تو عشق و محبت دنیوی میں جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی محبت ہے یعنی مرد اور عورت کا تعلق اس کے متعلق کلام کرنے سے بھی روکا تاکہ اس اصل جذبہ عشق میں کسی اور محبت کی آمیزش نہ ہو۔ دوسری غرض حج کی مساوات انسانی کو دکھانا ہے۔ جہاں بادشاہ سے لیکر گدا تک ایک ہی لباس میں ملبوس کھڑے ہوں۔ کیونکہ خدا کے حضور سب انسان یکساں ہیں۔ اس لیے گالی دینے سے بھی روکا، مساوات انسانی مبنی ہے حفاظت خون پر حفاظت مال پر حفاظت عزت پر، اسی آخری بات کو لوگ جلد بھول جاتے ہیں۔ اسی لیے بتایا کہ حج میں کوئی ایسا فعل بھی نہ ہو جو مساوات نسل انسانی کے نقیض ہو۔ اور حج چونکہ روحانیت کی منزل کا آخری مقام ہے اور جھگڑے اطمینان قلبی کو تباہ کرنے والی چیز ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ حج میں جھگڑا بھی نہ کرو تاکہ تمہارے اس اطمینان روحانی میں جو حج میں حاصل ہونا چاہیئے کوئی امر مخل نہ ہو۔ اور آخر پر فرمایا کہ نیکی بھی کرو تا کہ اللہ جو تمہاری نیکیوں کو جانتا ہے تمہیں اجر دے گویا صرف چند ناپسندیدہ امور سے رکنا ہی ترقی کی آخری منزل نہیں بلکہ ان سے رکتے ہوئے ساتھ ہی نیکی میں ترقی کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ترقی کرے۔ دوسرے لوگوں کی خدمت کرے اور محبت اور الفت کے تعلقات کو جو محض خدا کے لیے ہوں بڑھائے۔

۲۵۴ تزوّدوا۔ اس کا مادہ زاد ہے اور زیادۃ بڑھانے کو کہتے ہیں (غ) ونزداد کیل بعیر (یوسف ۱۲-۶۵) مازادھم الا ایمانا وتسلیما (الاحزاب ۳۳-۲۲) فزادھم اللہ مرضا (۱۰) اور زاد اس ذخیرہ کی گئی چیز کو کہا جاتا ہے جو ما یحتاج وقتی سے زیادہ ہو اور تزوّد کے معنی زاد راہ لے لینا۔

حج میں زاد راہ کی ضرورت ہے: حج میں عاشقانہ رنگ تو سکھایا مگر وہ امور جن کو بعض لوگوں نے عاشقانہ فعل تصور کر کے اختیار کیا ہوا تھا اور حقیقت میں وہ نقص تھے ان سے روک بھی دیا۔ ابو داؤد میں ہے کہ اہل یمن حج کرتے تو زاد راہ نہ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں اور ایک روایت ابن عمرؓ کی ہے کہ بعض لوگ حالت احرام میں سفر خرچ کو پھینک دیتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یا سوال کرتے یا چوری یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے مال لیتے کیونکہ اس کے بغیر تو زندہ رہنا ناممکن تھا اس لیے فرمایا کہ زاد راہ ساتھ لے لیا کرو ورنہ کم از کم سوال تو کرنا پڑے گا۔ اس میں مسلمان کو اعلیٰ درجہ کی خودداری سکھائی ہے۔

آخرت کا زاد راہ: اس کے ساتھ ہی ظاہر سے باطن کیطرف کلام کو پھیر کر فرمایا کہ اس چھوٹے سے سفر کے لیے زاد راہ کی ضرورت ہے تو اس بڑے سفر کے لیے جو سفر آخرت درپیش ہے کس قدر زاد راہ کی ضرورت ہے اور وہ زاد راہ تقویٰ ہے۔

۲۵۵ تبتغوا۔ اس کا مادہ بغی ہے جس کے معنی میانہ روی سے آگے نکل جانے کو چاہتے ہیں۔ مگر ابتغاء میں تجاوز نہیں پایا جاتا بلکہ صرف کسی چیز کے طلب کرنے کی کوشش سے یہ لفظ مخصوص ہے (غ)

فضل کے اصل معنی زیادۃ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل بغیر اکتساب بھی ملتا ہے لیکن جیسا کہ مفردات میں ہے ایک فضل وہ بھی ہے جو اکتساب سے ملتا ہے اور ابتغاء کے ساتھ لانے سے یہ بتا دیا کہ وہ فضل طلب کرنے سے ملتا ہے جیسے فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (الجمعۃ ۶۲-۱۰) یا وآخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ (المزمل ۷۳-۲۰) ان تمام مقامات میں فضل سے مراد وہ مال ہے جو تجارت سے حاصل ہوتا ہے۔

بخاری میں ابن عباس کی روایت ہے کہ جاہلیت میں عکاظ اور مجنہ اور ذو المجاز میں منڈیاں لگتی تھیں۔ مسلمانوں نے خیال کیا کہ حج میں تجارت کرنا شاید منافی اغراض حج ہو۔ اس لیے فرمایا کہ اصل نیت حج ہو۔ فرض فیھن الحج اور اس کے احکام کو بھی مدنظر رکھو تو تجارت کر لینے میں حرج نہیں۔ ابو مسلم نے کہا ہے کہ یہ اجازت حج سے فراغت کے بعد ہے (د) اگر حج روحانی ترقی کا کمال ہے تو تجارت دنیوی ترقی کا کمال ہے اور مسلمانوں کو دونوں قسم کی ترقی اپنے اندر جمع کرنی چاہیئے۔ حج کے ساتھ بھی تجارت کی اجازت دیکر تجارت کی ضرورت کو بتایا مسلمانوں نے اگر روحانی ترقی کی راہوں کو چھوڑا ہے تو ساتھ ہی دنیوی ترقی کی راہوں کو بھی چھوڑا ہے اور تجارت ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسری قوموں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے۔

عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ
وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾
ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ
اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

ذکر کرو ع۲۵۶ اور اسے یاد کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت دی اور
گو اس سے پہلے تم یقیناً گمراہوں میں سے تھے ع۲۵۷
پھر تم وہاں سے ہو کر چلو جہاں سے لوگ ہو کر چلتے ہیں اور اللہ
کی حفاظت مانگو اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ع۲۵۸

ع۲۵۶ افضتم ۔ فاض الماء کے معنی ہیں پانی زور سے بہا ۔ تریٰ اعینھم تفیض من الدمع (المائدۃ ۵-۸۳) آنسوؤں کے جاری ہونے پر بولا گیا ہے اور لوگوں کے کثرت کے ساتھ ایک مقام سے آنے پر بھی بولا جاتا ہے ۔ گویا پانی کے بہنے کے ساتھ تشبیہ ہے (غ) جیسے یہاں اور اگلی آیت میں ۔ اور افاضۃ فی الحدیث بات میں لگ جانے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے لمسکم فیما افضتم فیہ (النور ۲۴-۱۴) ھو اعلم بما تفیضون فیہ (الاحقاف ۴۶-۸)

عرفات ۔ عرف سے ہے معرفۃ اور عرفان کسی چیز کے نشان میں تفکر اور تدبر سے اس کا پا لینا ہے اور یہ علم سے زیادہ خاص ہے اور معرفۃ کے مقابلہ میں انکار ہے اور علم کے مقابلہ میں جہل ۔ اور عرفات اس میدان کا نام ہے جہاں یوم حج یعنی نویں ذی الحج کو تمام حاجی اکٹھے ہوتے ہیں جس طرح یوم عرفۃ اس دن کا نام ہے کیا اسم با مسمیٰ میدان ہے کیونکہ واقعی اس میدان میں اور اس دن میں بندوں کو اللہ تعالیٰ کی ایک خاص معرفت حاصل ہوتی ہے اور سخت سے سخت دل بھی اللہ تعالیٰ کے حضور پگھل جاتے ہیں ۔ لاکھوں انسان ایک لباس میں ایک ہیئت میں صرف خدا کی عظمت کے نعرے لگاتے ہوئے لبیک اللّٰھم لبیک لا شریک لک لبیک سارے فرق مراتب کو فرق رنگ کو فرق قومیت کو پاؤں تلے روند دیتے ہیں اور نہ صرف خدا کی معرفت حاصل کرتے ہیں بلکہ نفس انسانی کی صحیح معرفت بھی یہاں حاصل ہوتی ہے میدان عرفات مکہ سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہے ۔ اسی میں وہ جگہ ہے جس کو جبل رحمت کہتے ہیں جس پر کھڑا ہو کر خطیب خطبہ پڑھتا ہے ۔

مشعر الحرام ۔ مشعر کے معنی ظاہری نشان ہیں اور مشعر الحرام مُزدلِفہ کا نام ہے جہاں عرفات سے واپس ہو کر رات کاٹی جاتی ہے ۔ وہیں نماز مغرب و عشاء جمع کر کے اور پھر فجر کی نماز پڑھی جاتی ہے ۔

ع۲۵۷ اسلام نے کیا انقلاب پیدا کیا : وہ جمگھٹا جس نے صرف میلے کا رنگ اختیار کر لیا تھا ۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اسلام نے ایسا داخل کیا کہ ایک اللہ ہی اللہ کا نام وہاں سنا جاتا ہے ۔

ع۲۵۸ استغفروا ۔ اِستِغفار کا مادہ غَفر ہے جس کے معنی ہیں الباس ما یصونہ عن الدنس (غ) اس کا پہنا دینا جو اسے میل سے (یا برائی سے یا معیوب ہونے سے) بچا رکھے اور اسی لیے کہتے ہیں ۔ اغفر ثَوْبَكَ فی الوعاء یعنی اپنے لباس کو صندوق میں محفوظ رکھ اور کہا جاتا ہے کہ کپڑے کو رنگ لو فَاِنَّہٗ اَغفَرُ لِلْوَسَخِ کیونکہ وہ میل سے زیادہ محفوظ رکھنے والا ہے (غ) پس غفر کے اصل معنی بروئے لغت محفوظ رکھنا ہیں ۔ اور اِستِغفار کے معنی حفاظت چاہنا اور لسان العرب میں ہے کہ غفر کے معنی ہیں تَغْطِیَۃ اور ستر یعنی ڈھانکنا اور غَفَرَ اللّٰہُ ذُنُوْبَہٗ کے معنی ہیں اللہ نے اس کے گناہوں کو ڈھانک لیا (ل) اور مِغفَر خود کو کہتے ہیں کہ وہ حفاظت کا کام دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ گناہ سے حفاظت دو طرح پر ہو سکتی ہے ان گناہوں سے جو انسان کر چکا ہے حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ ان کی سزا سے بچ جائے مگر اس سے بڑھ کر حفاظت گناہ سے یہ ہے کہ انسان گناہ کرنے سے ہی بچ جائے اس لیے غفر اور اِستِغفار میں گناہ سے حفاظت دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے اور کہیں اس سے مراد گناہ کی سزا سے بچنا ہوتا ہے اور کہیں خود گناہ سے بچنا ۔ چنانچہ قسطلانی شرح بخاری میں قد غفر لك ما تقدم من ذنبك کی تشریح میں لفظ غفر کے معنی ہرماوی سے یوں نقل کیے ہیں ۔ الغفر الستر وھو اما بین العبد والذنب واما بین الذنب وعقوبتہ یعنی غفر کے معنی بچانا ہیں اور وہ یا بندہ اور اس کے ذنب کے درمیان ہے یعنی بندہ کو قصور وار ہونے سے بچایا جائے اور یا گناہ اور اس کی سزا کے درمیان ہے یعنی جو گناہ ہو چکا ہے اس کی سزا سے بچایا جائے اور غفار اور غفور اور غافر جو اللہ تعالیٰ کی صفت میں ہیں تو وہ بھی ان دونوں معنوں پر مشتمل ہیں اور ان کے معنی محفوظ رکھنے والا بچانے والا اور اول الذکر دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور نہایہ میں ان کے معنی میں لکھا ہے الساتر لذنوب عبادہ وعیوبھم المتجاوز عن خطایاھم وذنوبھم یعنی اپنے بندوں کے قصوروں اور عیبوں کو ڈھانک دینے والا (یعنی ان سے قصور اور عیب ظاہر نہ ہونے دینے والا) اور ان کی خطاؤں اور قصوروں سے درگزر کرنے والا ۔ جہاں ساتر کے مقابلہ پر متجاوز لا کر بتا دیا ہے کہ پہلے حصہ میں ان قصوروں اور عیبوں کا ذکر ہے جو سرزد نہیں ہوئے اور خود قرآن شریف میں ہے فانہ کان للاوابین غفورا (بنی اسرائیل ۱۷-۲۵) اور اواب وہ ہے جو ہر وقت خدا کی طرف رجوع کرتا رہتا ہے ۔ اس کے لیے خدا کا غفور ہونا یہی معنی رکھتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچاتا رہتا ہے اور ان میں مبتلا ہونے نہیں دیتا ۔ اور اگر غفر کے معنی عذاب کے چھونے سے بچانا بھی لیے جائیں جیسا کہ بعض اہل لغت نے لکھ دیا ہے تو عذاب کے چھونے سے بھی انسان دونوں طرح سے بچتا ہے یعنی یہ کہ وہ بات ہی اس سے سرزد نہ ہو جو عذاب لاتی ہے یا اگر سرزد ہو گئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سزا سے بچا لے ۔

خود قرآن شریف میں اس لفظ کا استعمال دونوں معنوں میں یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہے ۔ اول جہاں عَفو اور غفر کا اکٹھا ذکر کیا ہے ۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

پھر جب تم اپنے حج کے ارکان کو پورا کر لو تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے بڑوں کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر[۲۵۹]۔ پھر لوگوں میں سے کوئی کہتا ہے اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں (ہی) دیدے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

اور کوئی ان میں سے کہتا ہے اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں (بھی) بھلائی (دے) اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا[۲۶۰]۔

وہاں ہمیشہ عفو کو پہلے رکھا ہے اور غفر کو پیچھے اور عفو کے معنی گناہ کو مٹانا ہیں یعنی اس کی سزا سے بچا لینا پس غفر کے معنی اس صورت میں سوائے گناہ سے حفاظت کے اور ہو ہی نہیں سکتے دیکھو ۳۶۵ دوسرے استغفار کا مرتبہ تمام نیکیوں میں بلند تر رکھا ہے الصابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین بالاسحار (آل عمران ۳-۱۶) جہاں پہلے مرتبہ پر صبر کرنے والے ہیں یعنی جو اپنے آپ کو مشکلات میں روک رکھتے ہیں۔ دوسرے پر صدق دکھانے والے تیسرے پر عاجزی کے ساتھ فرمانبرداری اختیار کرنے والے چوتھے پر اپنی قوتوں اور طاقتوں کو اللہ کی راہ میں لگانے والے اور سب سے اوپر صبح کے وقتوں میں استغفار کرنے والے دیکھو ۳۸۸ تیسرے استغفار کی ضرورت جنت میں بھی بتائی ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ محض بلندی درجات کی دعا ہے کیونکہ جنت میں تو داخل ہی تب ہوگا جب گناہ بخشے جائیں گے۔ اس لیے جب جنتیوں کی اس دعا کا ذکر کیا ربنا اتمم لنا نورنا واغفر لنا (التحریم ۶۶) تو معلوم ہوا کہ غفر اور استغفار سے یقیناً مراد اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہنا ہے۔

امتیاز قومی کو دور کیا: آیت کے پہلے حصہ میں جو ذکر ہے کہ جہاں سے لوگ لوٹیں وہاں سے لوٹو تو یہ بعض قوموں نے جو اپنے لیے امتیاز قائم کر رکھا تھا اس کو دور کیا ہے۔ قریش اور کنانہ جو حمس کے نام سے موسوم تھے۔ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کرنے کے لیے میدان عرفات میں نہ جاتے تھے اور مزدلفہ سے واپس آجاتے تھے۔ ایسے امتیازات کو دور کر کے مساوات کو قائم کیا اور حکم دیا کہ سب لوگ عرفات میں جائیں اور وہاں سے لوٹیں۔

اس کے بعد استغفار کا ذکر ہے بخاری میں اس کی تفسیر میں ہے واستغفروا اللّٰہ ان اللّٰہ غفور رحیم حتٰی ترموا الجمرۃ گویا رمی جمار یا کنکریوں کا پھینکنا اسی استغفار کے ذکر میں ہی آگیا اور یوں رمی جمار کی اصل حقیقت بتا دی۔ انسان میں اپنے مولیٰ کے لیے عاشقانہ حالت پیدا کرنا اور اس کی عملی تصویر کھینچ دینا تاکہ قلب پر دیرپا اثر ہو حج کی اصل غرض ہے اسی لیے سب لباس اتروا کر دو چادروں کے لباس میں ملبوس کر دیا اور عزت و وجاہت امارت، فیشن کے سارے امتیازات کو یکسر مٹا دیا۔ کنکریں پھینکنے میں ایک مسلمان کی یہ تصویر دکھانا مقصود ہے کہ وہ بدی کے ساتھ کبھی صلح نہیں کر سکتا، نہ بدی کی طاقتوں کی طرف سے لاپروا ہو سکتا ہے بلکہ ہمیشہ ان کے مقابلہ کے لیے تیار رہے اور ہر وقت ان کو اپنے آپ سے دور کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے کسی چیز کی طرف کنکر پھینکنے سے مراد ہوتی ہے کہ انسان اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیگا۔ اور اس کے خلاف جنگ کرے گا۔ اسی طرح ارکان حج میں دوڑنا اور تیز چلنا ہے جس میں بتایا ہے کہ ہر قسم کی ترقی روحانی ہو یا دنیوی جد وجہد سے ہے نہ حجروں میں بیٹھنے سے۔ توحید کے گھر کے گرد گھومنا کیا ہے نیکیوں کے اصل مرکز کے گرد پھرتے رہنا یہاں بھی استغفار کے معنی گناہوں سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہنا ہی ہیں۔

۲۵۹ باپ دادوں کی بڑائی کرنے سے روکا ہے: زمانہ جاہلیت میں حج سے فارغ ہو کر میلے لگاتے اور ان میں اپنے اپنے باپ دادوں کی بڑائی کا ذکر کرتے اس کی بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر سکھایا جو حقیقی ترقی کی راہ ہے۔ باپ دادوں کی بڑائی کا ذکر شاہراہ مقصود میں رکاوٹ ہے اس سے روکا۔ آج مسلمانوں نے بڑا کمال اسی کو سمجھا ہوا ہے پدرم سلطان بود۔ اپنی بڑائی کے لیے یہی کافی سمجھا ہوا ہے کہ ہم بادشاہوں اور سیدوں کی اولاد ہیں۔ اللہ کے ذکر سے انسان ان راہوں پر چل سکتا ہے جو خود اس کو مقام عظمت پر پہنچاتی ہیں جیسا کہ فرمایا فاذکرونی اذکرکم (۱۵۲)

۲۶۰ دعائے جامع دین و دنیا: اس آیت میں اور اس سے پہلی میں دو دعاؤں کا ذکر ہے۔ پہلی دعا ان لوگوں کی ہے جن کی ہمتیں دنیا تک محدود ہیں۔ خدا سے بھی کچھ مانگتے ہیں تو اس دنیا کی زندگی کے لیے ہی مانگتے ہیں۔ آج کل کی مہذب دنیا کا یہ نقشہ ہے۔ مگر مسلمان کو اللہ تعالیٰ یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم کو دین و دنیا دونوں کے کمال پر پہنچنا اپنے مدنظر رکھنا چاہیئے صرف ایک کمال مت چاہو۔ حج کے ذکر کے ساتھ اس دعا کا لانا جو دینی اور دنیوی ترقیات کو مسلمان کے اندر جمع کرنے کی تعلیم دیتی ہے نہایت موزون ہے۔ حج بھی کرو تجارت بھی۔ معراج روحانی بھی حاصل کرو معراج دنیوی بھی۔

دنیا کی حسنات کی طلب: حدیث بخاری میں ہے کہ نبی کریم صلعم کی دعا ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ تھی اور امام احمد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا کہ آنحضرت صلعم اکثر کونسی دعا مانگا کرتے تھے تو آپ نے یہی دعا بتائی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ایک شخص کی بیمار پرسی کو گئے اور اس کی حالت پوچھی تو اس نے کہا میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اے خدا جو سزا تو مجھے آخرت میں دینے والا ہے وہ دنیا میں ہی دے لے۔ تو آپ نے فرمایا بلکہ یوں دعا کیا کرو: ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔

أُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

یہی ہیں جنھیں اس سے حصّہ ملے گا جو انھوں نے کمایا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔[۲۶۱]

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيٓ أَيَّامٍ مَّعْدُودٰتٍ ۚ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوٓا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

اور گنتی کے دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ پھر جو کوئی جلدی کرکے دو دن میں چلا جائے اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کوئی پیچھے رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں (یہ)[۲۶۲] اس کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اللہ کے تقوے پر رہو اور جان لو کہ تم اس کے حضور اکٹھے کیے جاؤ گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾

اور لوگوں میں سے وہ (بھی) ہے کہ جس کی بات دنیا کی زندگی میں تجھے تعجب میں ڈالتی ہے اور وہ اللہ کو اس پر گواہ بناتا ہے جو اس کے دل میں ہے اور وہ جھگڑا کرنے میں بہت سخت ہے۔[۲۶۳]

ع۲۶۱ سریع الحساب۔ سریع سرع سے ہے اور سُرعۃ ضد ہے بطاء کی یعنی ایک کام میں تاخیر یا دیر یا سستی نہ کرنا۔ اور سریع وہ ہے جو سستی یا تاخیر نہیں کرتا۔ انھم کانوا یسارعون فی الخیرات (الانبیاء۲۱۔ ۹۰) یعنی نیکیوں کے کرنے میں تاخیر یا سستی نہ کرتے تھے۔ وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم (اٰل عمران۳۔ ۱۳۲) اپنے رب کی مغفرت حاصل کرنے میں دیر نہ کرو۔ اور حساب کے معنی مشہور ہیں اور معاملات میں حساب کو حساب اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے وہ اندازہ معلوم ہوتا ہے جس میں کفایت ہے نہ اصل مقدار پر زیادتی ہے نہ کمی (ت) اسی لیے حسیب جو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اس کے معنی کافی ہیں اور یہ جو فرمایا کہ اللہ سریع الحساب ہے تو اس کا جلدی حساب لینا یہی ہے کہ جو فعل انسان کرتا ہے اس کا حساب ساتھ ساتھ ہی ہوتا جاتا ہے اور اس کو ایک کا حساب لینا دوسرے کے حساب لینے سے روکتا نہیں کہ ایک کے معاملہ میں تاخیر کرنی پڑے صرف یہ معنی نہیں کہ قیامت کے دن حساب لینے میں اسے بہت دیر نہ لگے گی، اسے دنیا میں بھی دیر نہیں لگتی۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ الٰہی محاسبہ ہر آن جاری ہے کوئی فعل نہیں مگر اس کا نتیجہ ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہاں قیامت کے دن وہ محاسبہ جو بوجہ اپنی لطافت کے یہاں نظر نہیں آتا کھلے طور پر محسوس ہونے لگے گا۔ اسی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے لقد کنت فی غفلۃ من ھذا فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید (قٓ۵۰۔ ۲۲) یعنی نتائج تو ساتھ ساتھ ہی ظاہر ہو رہے تھے مگر اے انسان تو ان کی طرف سے غافل تھا آج وہ غفلت کا پردہ ہم نے دور کر دیا اور تیری نظر تیز ہو گئی۔ ان نتائج کو اب تو دیکھ سکتا ہے۔ پس حساب تو ساتھ ساتھ ہو رہا ہے وہاں اس کا رنگ نیا ظاہر ہوگا جو کھلا محسوس ہوگا اور اسی کے مطابق ہے جو فرمایا وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ ونخرج لہ یوم القیامۃ کتابا یلقاہ منشورا (بنی اسرائیل۱۷۔ ۱۳) یعنی ہر ایک انسان کے عمل کو ہم نے اس کے ساتھ لگا دیا ہے اور قیامت کے دن ایک کتاب ہم اس کے لیے نکال دیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔ گویا نتیجہ ہر عمل کا تو یہیں سے اس کے ساتھ لگا ہوا ہے ہاں قیامت میں وہ اس نتیجہ کو کھلا کھلا دیکھ لیگا۔ اسی لیے اس کے بعد فرمایا کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا (بنی اسرائیل۱۷۔ ۱۴) یعنی آج کسی اور حساب کرنے والے کی ضرورت نہیں۔ تیرا اپنا نفس ہی تجھ پر حساب کے لیے کافی ہے۔

ع۲۶۲ یہ ایام تشریق کی طرف اشارہ ہے جو یوم النحر یعنی عید کے دن کے بعد تین دن ہیں۔ ہاں دو دن میں بھی کوئی چلا جائے تو ہرج نہیں۔

ع۲۶۳ یعجب۔ عجب اور تعجّب اس حیرت کی حالت کا نام ہے جو انسان کو اس وقت پیش آتی ہے جب وہ کسی چیز کے سبب سے ناواقف ہو۔ اور اَعْجَبَ کے اصل معنی ہیں اسے تعجب میں ڈالا اور خوش کرنا بھی آتے ہیں (ت)

اَلَدّ اس جھگڑنے والے کو کہتے ہیں جو انکار میں نہایت سخت ہو جمع لُدّ ہے وتنذر بہ قوما لدا (مریم۱۹۔ ۹۷) اور الد گویا شدید اللدد ہے۔ یعنی جس کی گردن کی دونوں طرفیں سخت ہوں یا اکڑی ہوئی۔ جس چیز کا ارادہ کرلیتا ہے اس سے پھرتا نہیں (غ)

خِصام مصدر بمعنی مخاصَمۃ ہے یا خصم کی جمع۔ جھگڑا یا لڑائی کرنے والا۔

مفسرین کہتے ہیں اس میں شریق بن اخنس کا ذکر ہے مگر قرآن شریف کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ یہ ذکر عام ہے مفسدین کا ذکر ہے اب بھی بہتیرے ایسے مفسد ہیں۔ بہتیرے دل میں ایک قوم کی تباہی کو مدنظر رکھ کر ان کی جڑیں کاٹتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی یقین دلاتے جاتے ہیں کہ ہم تمہارے خیرخواہ ہیں اور یہ تجاویز تمہاری بہتری کے لیے ہیں۔ قرآن کریم کے عام الفاظ کو خاص خاص لوگوں پر محدود کرنا کلام الٰہی کی بے قدری کرنا ہے۔ اس مضمون کا تعلق پچھلے مضمون سے اس لحاظ سے ہے کہ پہلے ذکر جنگ کا تھا اور یہاں سمجھایا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ وہ باتیں تو چکنی چپڑی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو نسل انسانی کا بڑا ہمدرد ظاہر کرتے ہیں لیکن دل میں ظلم اور فساد ہوتا ہے گویا اسلام کے دشمنوں کا نقشہ کھینچا

وَإِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

اور جب حاکم بنتا ہے تو ملک میں کوشش کرتا ہے کہ اس میں فساد ڈالے اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ [۲۶۴]

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا تقوٰے اختیار کرو تو جھوٹی شیخی اسے گناہ میں لگا دیتی ہے سو اسکے لیے دوزخ بس ہے اور یقیناً وہ بُری جگہ ہے۔ [۲۶۵]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور لوگوں میں سے وہ (بھی) ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے۔ [۲۶۶]

ہے اور ایک یہ بھی تعلق ہے کہ ابھی حج کے احکام کا ذکر ہو رہا تھا اور حج میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ایسے ہی لوگ تھے کہ اپنے آپ کو مصلح بھی بتاتے تھے۔ مگر فی الحقیقت فساد پھیلا رہے تھے۔

ع ۲۶۴ تولّٰی کے معنی ضحاک سے غلب وصار والیا مروی ہیں یعنی غالب آئے اور حاکم بنے معمولی معنی پھر جانا یہاں مراد نہیں۔

حَرث۔ زمین میں بیج ڈالنے اور اس کو زراعت کے لیے تیار کرنے کو کہتے ہیں۔ اور جو چیز اس طرح ڈالی جائے یعنی کھیتی اس کو بھی حرث کہا جاتا ہے استعارۃً یہ لفظ عورت پر بھی استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح دانہ کا بقا زمین سے ہے نوعِ انسان کا بقا عورت سے ہے۔ بعض لوگوں نے نسل کے قرینہ کی وجہ سے یہاں عورت مراد لی ہے اور امام صادق سے منقول ہے کہ حرث سے مراد دین اور نسل سے مراد لوگ ہیں۔ مگر ظاہر معنی زیادہ قرینِ قیاس ہیں۔

نسل کے اصل معنی انفصال عن الشئ کے ہیں یعنی کسی چیز سے علیحدہ ہو جانا، اسی سے تیزی سے نکل آنا بھی اس کے معنی ہیں وھم من کل حدب ینسلون (الانبیاء ۲۱-۹۶) اور نَسْل اولاد کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ وہ باپ سے نکلتی ہے (غ)

پچھلی آیت کے مضمون کو مکمل کیا ہے کہ باتیں کرنے والے تو بہت ہیں۔ اور بڑے بڑے اصول بھی نسل انسانی کی خیر خواہی کے قائم کرتے ہیں۔ لیکن جب حکومت ملتی ہے تو بجائے ہمدردی مخلوق کے خود اپنی یا اپنی قوم کی بہتری کے لیے زمین کو ویران کر دیتے اور نسل کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اسی کو فساد قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ حکومت کی اصل غرض زمین کو سرسبز و شاداب بنانا اور لوگوں کی بہی خواہی کرنا ہے۔ آج کل کی مہذب قومیں لفظوں میں بڑے بڑے لمبے چوڑے اصول باندھتی ہیں اور اپنے آپ کو نسل انسانی کا سچا بہی خواہ ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن جب موقعہ ملتا ہے تو دوسری قوموں کو ذلیل کرنے میں اور ان کو انسانیت کی صفات سے محروم کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پر توجہ نہ کی اور حکومت کی اصل غرض کو نظر انداز کر کے اس حالت پر پہنچے کہ حکومت ان سے لے لی گئی۔ کیونکہ وہ نفس پرست بن گئے اور قوم کی بہتری ان کی اصلی غرض نہ رہی۔ بلکہ خود عیاشی کر لینے کو حکومت کی اصل غرض سمجھ لیا۔ اور آج بھی بہتیرے ایسے ہیں کہ قوم پرستی اور وطن پرستی کے بڑے بڑے جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن کسی بلند مرتبہ پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور اپنی ہی قوم کی جڑیں کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔

ع ۲۶۵ عزۃ کے اصل معنی وہ حالت ہے جو انسان کو مغلوب ہونے سے بچانیوالی ہو۔ مگر کبھی اس کا استعمال مذموم حمیۃ اور انفۃ پر ہوتا ہے یعنی جھوٹی شیخی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا بغیر اس کے کہ بڑا ہو (غ) یہاں یہی معنی ہیں۔

مِہاد۔ مَہْد اور مِہاد وہ مکان ہے جو تیار کیا گیا ہے اور جس پر چلا جاتا ہے (غ) اور یا یہ دونوں مصدر ہیں (ت) اور مَہَد کے معنی ہیں تیار کیا۔

جھوٹی شیخی حصول کمال میں مانع ہے: یہاں تو کفار کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ سچ ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے جو صحیح معنی میں تقوی اللہ ہے روکنے والی چیز جھوٹی شیخی اور انفۃ ہے۔ ناک رکھنے کے لیے بہت سی بیہودگیوں کا ارتکاب ہوتا ہے مگر آج کل اکثر مسلمانوں میں یہی جھوٹی شیخی پائی جاتی ہے ذلیل ہیں مگر اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں کہ گویا ان کے برابر عزت ہی کسی کی نہیں اور اسی جھوٹی شیخی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ اخلاق انسانی کے کمال کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی بڑائی کے خیال کو دل سے نکال دے۔

ع ۲۶۶ صحابہ کا بلند مقام: پہلے مفسد گروہ کے مقابل پر یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کو اپنا مقصد قرار دیکر اپنی ساری خواہشات کو اس ایک مقصد کے سامنے قربان کر دیتے ہیں ان کو بادشاہت بھی مل جائے تو ان میں اس سے کوئی شیخی اور بڑائی پیدا نہیں ہوتی بلکہ مخلوق الٰہی پر مہربانی کرنا یہ ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ اسی کی طرف واللہ رءوف بالعباد میں اشارہ ہے جب وہ اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے تو لازماً

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اتم سارے کے سارے فرمانبرداری میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ۲۶۷

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

پھر اگر تم اس کے بعد جو تمھارے پاس کھلے دلائل آچکے پھسل جاؤ، تو جان لو کہ اللہ غالب حکمت والا ہے ۲۶۸

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَ
۲۵ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ع ﴿۲۱۰﴾

وہ کسی بات کے منتظر نہیں مگر یہ کہ اللہ بادلوں کے سایوں میں اور فرشتے ان کے پاس آئیں اور معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے اور سب کام اللہ کی طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں۔ ۲۶۹

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ

بنی اسرائیل سے پوچھ کہ کس قدر کھلے نشان ہم نے ان کو دیے اور جو اللہ کی نعمت کو بدل دے اس کے بعد کہ وہ اس کے پاس

ان کا شیوہ بھی مخلوق خدا پر مہربانی ہے اس آیت میں بھی کسی خاص آدمی کا ذکر نہیں ہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کی حالتِ عامہ کا بیان کیا ہے جیسا دوسری جگہ فرمایا ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ (التوبۃ ۹-۱۱۱) اور پھر یہ سند بھی اس گروہ کو عطا فرمائی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (المجادلۃ ۵۸-۲۲) پس یہی وہ گروہ ہے جس نے اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اپنی ساری خواہشات کو قربان کر دیا۔

۲۶۷ سِلْم کے اصل معنی صلح بھی ہیں اور انقیاد و استسلام بھی آتے ہیں یعنی فرمانبرداری۔ صلح میں داخل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہاری صلح ہو۔ اور اس کا مطلب بھی فرمانبرداری ہے۔

کافّۃ ۔ کف سے ہے جس کے معنے ہتھیلی ہیں اور روکنا بھی اس کے معنی آتے ہیں اس لیے کہ ہاتھ سے روکا جاتا ہے اور کافّ اور کافّۃ (جس میں تا مبالغہ کے لیے ہے) روکنے والے کے معنی میں ہے اور جماعت کو بھی کافۃ کہا جاتا ہے۔ یعنی سب کے سب (غ) اور ایک چیز کے کل کو بھی کافۃ کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس کے اجزا کو پراگندہ ہونے سے روکنے والا ہے (ض)

اسلام میں کامل طور پر داخل ہونے کی ضرورت: ادخلوا فی السلم کافۃ سے مراد یہ ہے کہ کلی طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ تمہارے ظاہر باطن سے کوئی چیز نہ ہو جو اسلام کے جوئے کے ماتحت نہ ہو یا یہ کہ پورے پورے فرمانبرداری میں داخل ہو جاؤ۔ کسی قسم کا نفاق تم میں باقی نہ رہے۔ یہاں سب ایمان لانے والوں کو سب مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ اسلام کو اپنا مذہب کہتے ہو تو پھر اس میں پورے داخل ہو یہ نہیں کہ ایک حصّہ کو مان لیا اور ایک کو ترک کر دیا۔

۲۶۸ یعنی اگر تمہاری ذلت سے تم کو نقصان پہنچے تو یہ مت سمجھو کہ مسلمانوں کا خدا کمزور ہے ہاں تمہاری معیبت بھی کسی حکمت پر مبنی ہے۔

۲۶۹ ھَلْ ۔ حرف استخبار ہے کبھی استفہام کے لیے آتا ہے، کبھی تنبیہ کے لیے یا نفی کے لیے یا دوسرے کو ملزم کرنے کے لیے (غ) یہاں نفی مراد ہے۔

ظلل ۔ ظلۃ کی جمع ہے اور ظلّۃ وہ بادل ہے جو سایہ کرے (ظِلّ سایہ کو کہتے ہیں) مگر اس کا اکثر استعمال ایسے موقعہ پر ہے جسے ناپسند کیا جاتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں اس کا استعمال عذاب کے موقعہ پر ہی ہوا ہے عذاب یوم الظلّۃ (الشعراء ۲۶-۱۸۹) لھم من فوقھم ظلل من النار (الزمر ۳۹-۱۶) واذا غشیھم موج کالظلل (لقمان ۳۱-۳۲)

بادلوں کے سایے: اس آیت میں کلام کا رجوع پھر کفار کی طرف کیا ہے جو اسلام کی تباہی کے درپے تھے اور کہتے تھے کہ اگر اسلام سچا ہے تو ہم اس قدر مخالفت کے باوجود تباہ کیوں نہیں ہوتے۔ اور یہ بات کہ یہاں عذاب کا ذکر ہے خود لفظ ظلل کے استعمال سے ظاہر ہے۔ رہا یہ کہ اللہ کے آنے سے کیا مراد ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ہم قرآن کریم کے دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سورہ نحل میں ہے ھل ینظرون الا ان تاتیھم الملٰئکۃ او یاتی امر ربک کذٰلک فعل الذین من قبلھم (النحل ۱۶-۳۳) اس آیت کا مضمون آیت زیر بحث سے بہت ملتا ہے صرف یاتیھم اللہ فی ظلل من الغمام کی بجائے الفاظ یاتی امر ربک اختیار کیے ہیں اور یوں قرآن کریم نے اپنی تفسیر آپ کر دی ہے یعنی بادلوں کے سایوں میں آنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے امر کا آنا ہے۔ یعنی اس کی سزا جو وہ کفار پر وارد کرے (اور خود اس آیت میں قضی الامر کہہ کر بتا دیا ہے کہ مراد اللہ کے امر کا آنا ہے) اور ان الفاظ نے کہ کذٰلک فعل الذین من قبلھم اس کی اور بھی تشریح کر دی ہے۔ اسی طرح پہلے لوگوں نے کیا کیونکہ پہلے لوگ بھی حق کی مخالفت کر کے

مَا جَآءَتۡهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾
زُیِّنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا وَ
یَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۘ وَ الَّذِیۡنَ
اتَّقَوۡا فَوۡقَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَ اللّٰہُ یَرۡزُقُ
مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

آ گئی تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔[270]

جو کافر ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی آراستہ کی گئی ہے اور وہ اُن سے ہنسی کرتے ہیں جو ایمان لائے اور جو تقوےٰ کرتے ہیں۔ وہ قیامت کے دن ان سے اوپر ہونگے اور اللہ جسے چاہتا ہے بےحساب رزق دیتا ہے۔[271]

عذاب استیصال مانگتے تھے۔ یہ مانگنا منہ سے ہو یا اپنے افعال سے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے آنے سے مراد اس کا خود آنا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ آنے جانے سے پاک ہے بلکہ اس کے آنے سے مراد اس کی اس سزا کا آنا ہے جس سے کفار کی کوششیں اسلام کے خلاف نیست و نابود ہو جائیں اور مسلمان مظفر و منصور ہوں جیسے کہ سورہ الحشر میں ہے فاتھم اللہ من حیث لم یحتسبوا (الحشر ۵۹-۲) اللہ ان کے پاس ایسی طرف سے آیا جدھر سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ حالانکہ وہاں ذکر سزائے استیصال کا ہے۔ جیسا کہ پہلے الفاظ سے ظاہر ہے ھو الذی اخرج الذین کفروا من اھل الکتب من دیارھم لاول الحشر ما ظننتم ان یخرجوا وظنوا انھم مانعتھم حصونھم من اللہ فاتھم اللہ من حیث لم یحتسبوا یعنی یہود کے مدینہ سے نکالے جانے کو یعنی عذاب استیصال کو اور اسلام کے خلاف ان کی کوششوں کے نابود کر دینے کو اللہ کے آنے سے تعبیر کیا ہے اور یہی مراد یہاں ہے یعنی اللہ کے آنے سے مراد اس امر الٰہی کا آنا ہے جو ان کی مخالفت کا استیصال کلی کر دے اور ترکیب میں یا مضاف حذف ہے جیسا کہ اکثر کلام میں آیا ہے اور مراد یاتیھم امر اللہ ہے اور یا مفعول محذوف ہے اور مراد ہے یاتیھم اللہ بما وعدھم بہ یعنی اللہ ان پر وہ چیز لائے جس کا ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے۔

ملائکہ کے آنے سے مراد بھی کفار پر عذاب کا آنا اور مومنوں کی نصرت ہی ہے۔ سورہ فرقان میں ہے یوم یرون الملائکۃ لا بشرٰی یومئذ للمجرمین (الفرقان ۲۵-۲۲) یعنی فرشتوں کا آنا تو مجرموں کی سزا کے لیے ہی ہُوا کرتا ہے اور قرآن کریم میں ان تینوں جنگوں میں جن میں قریش کا مقابلہ رسول اللہ صلعم سے ہوا ہے، ملائکہ کے آنے کا ذکر ہے جس میں یہی اشارہ ہے دیکھو ع۵۱۱ اور ملائکہ کے آنے کی غرض کیا تھی اس کے لیے دیکھو ع۵۱۲۔

پس ملائکہ کے آنے سے مراد کسی قدر ان کو سزا کا مل جانا یا ان کی تھوڑی مغلوبیت ہے اور اللہ کے آنے سے مراد ان کی مخالفت کا آخری استیصال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تینوں جنگوں میں یعنی بدر، اُحد، احزاب میں نزول ملائکہ کا ذکر ہے، جب دشمن مسلمانوں پر چڑھ کر آیا مگر فتح مکہ کو جس میں نبی کریم صلعم خود مکہ پر چڑھ کر گئے اور کفار کی مخالفت کا پورا استیصال کیا گویا اللہ کے آنے سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس میں اسلام کا کامل غلبہ دکھایا گیا اور کفر کی طاقت ملک عرب میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔ ان باتوں کو جنگوں کے نام سے ظاہر نہیں کیا اس لیے کہ اگر اسلام کا غلبہ ایک وقت جنگ سے مقدر تھا تو دوسرے وقت دوسری راہوں سے ہو سکتا ہے اور امر اللہ میں دونوں باتیں آ جاتی ہیں۔

وقضی الامر کے یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ معاملہ کا فیصلہ ہو جائے اور یوں بھی کہ وہ انتظار کرتے ہیں حالانکہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو ہو چکا ہے اور یہ ہو کر رہے گا۔ دوسرے معنی زیادہ موزون ہیں اور اس میں گویا اسلام کے آخری غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کی کھلی پیشگوئی ہے۔

ع۲۷۰ سَلۡ میں ہر ایک مخاطب مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ضرور ہر شخص سوال کرے بلکہ خود بنی اسرائیل کو اور ضمناً سب کو جتانا مقصود ہے کہ وہ غور کریں کتنے نشان اُن کو دیئے گئے۔

اٰیۃ بیّنۃ۔ یہ کھلے نشان کیا تھے؟ اول وہ کھلی پیشگوئیاں جو آنحضرت صلعم کے ظہور کے متعلق ان کی کتابوں میں تھیں اور جو خود ان میں مشہور چلی آتی تھیں۔ دوسرے نبی کریم صلعم کی صداقت کے نشان جو وہ خود دیکھ سکتے تھے کیونکہ یہ اہل کتاب تھے اور سنت انبیاء سے واقف تھے۔

یبدل نعمۃ اللہ۔ اللہ کی نعمت اسلام ہے (ج) اس کی تبدیلی سے مراد اس کا انکار ہے۔ اس انکار کا نام تبدیلی اس لیے رکھا کہ بنی اسرائیل نے پہلے جس بات کو عقیدتاً قبول کیا ہُوا تھا، یعنی نبی آخر زمان کا آنا اب اس کا سرے سے انکار کر دیا۔ آج مسلمانوں نے بھی اس اللہ کی نعمت کو تبدیل کر رکھا ہے منہ سے اقرار اور عمل سے انکار ہے۔

پچھلے رکوع کے آخر پر ذکر تھا کہ مخالف نشان استیصال مانگتے ہیں کہتے ہیں کہ اگر یہ رسول سچا ہے تو ہم جو اس کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، تباہ کیوں نہیں ہوتے۔ اس لیے اس رکوع کی ابتدا اس آیت سے کی کہ نشانات صداقت تو بہتیرے ظاہر ہو چکے ہیں ان کو کیوں قبول نہیں کرتے اور اپنی تباہی کیوں چاہتے ہیں۔

ع۲۷۱ زُیِّنَ۔ زان یا زین۔ ایک چیز کے حسن کو ظاہر یا نمایاں کرنے کو کہتے ہیں قول سے ہو یا فعل سے (غ) فعل کے مجہول لانے سے یہ ظاہر کرنا مراد ہے کہ ان

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا ۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں۔ پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے اور جنھیں وہ (کتاب) دی گئی تھی، انہی نے آپس کی ضد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں پس اللہ نے اپنے حکم سے ان کو جو ایمان لائے اس حق کی طرف ہدایت دی جس میں لوگ اختلاف کرتے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کیطرف ہدایت کرتا ہے [۲۷۲]

لوگوں کو یہ چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اور اسی کی طرف ان کے دل کھچے چلے جاتے ہیں۔ اس سے اوپر نہیں اُٹھتے۔ کون اچھی کر کے دکھاتا ہے؟ ان کی اپنی گری ہوئی خواہشات اور پست خیالات۔ قرآن کریم میں اچھی چیزوں کی زینت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے جیسے ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینۃ فی قلوبکم (الحجرات ۴۹-۷) اور بری باتوں کے زینت دینے کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے وزین لھم الشیطان ما کانوا یعملون (الانعام ۶-۴۳) زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاءھم (الانعام-۱۳۸)

یسخرون۔ سخر کے معنی کسی پر ہنسنا اور اس کو اپنے ماتحت کر لینا یا اپنے کام میں لگا لینا دونوں آتے ہیں۔ کافروں کا مومنوں پر ہنسنا تحقیر کے رنگ میں تھا اس لیے کہ انہوں نے دین کی خاطر دنیوی عزت۔ مال۔ جائداد یں سب کچھ چھوڑ دیا تھا جن کی نظر میں دنیا کا مال ومتاع ہی سب کچھ ہو وہ ایک قوم کو غربت کی حالت میں دیکھ کر کہاں ان کی عزت کر سکتے ہیں۔ اس لیے بھی ہنستے ہونگے کہ مومنوں کے ساتھ بڑی بڑی فتوحات کے وعدے تھے اور یہاں حالت دگرگوں نظر آتی تھی۔ آخری الفاظ میں پھر فرمایا کہ ہم اس قدر اموال وفتوحات سے ان کو متمتع کریں گے جس کو یہ حساب میں بھی نہیں لا سکیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ عرب جن کے ہاں ایک ہزار سے آگے گنتی نہ تھی۔ ان میں سے ایک ایک لاکھوں اور کروڑوں کا مالک ہو گیا۔

والذین اتقوا فوقھم یوم القیامۃ اس بڑے دن جب سب حقائق آشکارا ہو جائیں گے معلوم ہوگا کہ فوقیت مال دنیا سے نہیں بلکہ تقویٰ سے یعنی رعایت حقوق الٰہی وحقوق العباد سے ہے صحیح اصول پر چلنے سے ہے۔ حق وانصاف کی پیروی کرنے سے ہے۔ قرآن شریف محض دنیا کی زندگی کو اور اس دنیا کی چیزوں کو بُرا نہیں کہتا۔ قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ (الاعراف ۷-۳۲) زینت کے سامان جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں ان کو کس نے حرام کیا۔ ہاں جب دنیا کی زندگی ہی غایت مقصد بنالی جاتی ہے اور خورد و نوش کو ہی زندگی کی اصل غرض سمجھ لیا جاتا ہے تو یہ وہ دنیا کی زندگی ہے جس کی مذمت کلام الٰہی کرتا ہے جن لوگوں کو دنیا کی زندگی یہاں تک پیاری معلوم ہوتی ہے کہ حق اور انصاف کی پیروی کرنے والوں پر وہ محض ان کی غربت کی وجہ سے ہنسنے لگتے ہیں وہ اصل مقصد زندگی سے بہت دور نکل گئے۔ اس لیے بتایا کہ حقیقی فوقیت اخلاق فاضلہ کے حاصل کرنے سے ہے۔ نہ مال دنیا سے آج عیسائی اقوام اسی غلطی میں پڑ کر مسلمانوں کے ہاتھ سے ہر قسم کے سامانِ دنیا کو چھیننے پر تلی ہوئی ہیں لیکن اگر مسلمان اخلاق قرآنی اپنے اندر پیدا کر لیں تو اس دنیا میں بھی اپنی فوقیت کا مشاہدہ کریں۔

۲۷۲ کان کا استعمال کئی طرح پر ہے۔ گزرے ہوئے زمانہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کے بیان میں ازلیت پر دلالت کرتا ہے جیسے کان اللہ بکل شئ علیما اور جب کسی شے کی جنس میں اس کے وصف کے متعلق استعمال کیا جائے جو اس میں موجود ہو تو یہ ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ وہ وصف اس میں لازم ہے جیسے کان الانسان کفورا۔ کان الانسان اکثر شئ جدلا جن کے معنی یوں ہونگے انسان ناشکر گزار ہے۔ انسان اکثر جھگڑالو ہے (غ) اسی طرح کنتم خیر امۃ میں حال کے معنی مراد ہیں یعنی تم بہترین امت ہو یہی معنی یہاں مراد ہیں۔

یحکم۔ حُکم کے اصل معنی ہیں اصلاح کے لیے روکنا اور کسی چیز پر حکم کے معنی یہ ہیں کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ یہ چیز یوں ہے یوں نہیں۔ خواہ دوسرے پر ایسا فیصلہ لازم کیا جائے یا نہ (غ)

انبیاء کی بعثت کا عام قانون: اس آیت کا مطلب بعض نے یوں بیان ہے کہ پہلے سب لوگ نیک تھے پھر ان میں اختلاف شروع ہوئے جن کے مٹانے کو نبی آئے اور بعض نے یوں کہ پہلے سب گمراہی پر جمع تھے تب اللہ تعالیٰ نے نبی بھیج کر نیکوں کو بدوں سے الگ کر دیا۔ مگر یہ دونوں باتیں قرآن شریف کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ رشد و ہدایت کا جو انبیاء کے ذریعہ سے قائم ہوتا ہے آدم کے ساتھ ہی شروع ہونا صاف الفاظ میں بیان فرمایا ہے

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ‌ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ‌ؕ اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ﴿۲۱۴﴾

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تمھیں اُن لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے گزر چکے، ان کو سختی اور دُکھ پہنچے اور خوب ہلائے گئے یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بول اُٹھے کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی سنو اللہ کی نصرت قریب ہے۔ ۲۷۳

کان کے وہ معنی لیکر جو اوپر بیان ہوئے اس آیت کے معنی بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ان سے یکساں ہی معاملہ ہوتا رہا۔ یعنی ان سب میں اللہ تعالیٰ نبی بھیجتا رہا۔ یہ نہیں کہ بعض قوموں کو محروم رکھا اور ایک کو نبی بھیجنے کے لیے خاص کر لیا۔ جیسا کہ بنی اسرائیل سمجھتے تھے اور فرمایا کہ سب نبی ہی حق کے پیروؤں کو کامیابی کی بشارت دینے والے اور حق کے مخالفوں کو ناکامی اور دُکھ کے انجام سے ڈرانے والے تھے اور ہر نبی کو اللہ تعالےٰ نے کتاب بھی دی تھی تاکہ وہ اس کے ذریعہ لوگوں کے باہمی اختلافوں کا فیصلہ کرے۔ باایں نبیوں کے آنے کے بعد پھر لوگوں نے باہم اختلاف کیا۔ اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے محمد رسول اللہ صلعم کو مبعوث کیا گیا۔ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو صحیح راہ کی ہدایت دی گئی اور ایک عظیم الشان حق کا قائم کرنا ان کے سپرد کیا گیا۔ اس مطلب کی صحیح حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ بخاری میں حضرت عائشہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم جب رات کو اُٹھتے تو ان الفاظ میں دعا کرتے اللّٰھم رب جبریل ومیکال واسرافیل فاطر السمٰوٰت والارض عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادك فیما کانوا فیه یختلفون اھدنی لما اختلف فیه من الحق باذنك انك لتھدی من تشاء الیٰ صراط مستقیم۔ اے اللہ جبرائیل اور میکائیل اور اسرافیل کے ربّ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے ان دیکھے اور ظاہر کے جاننے والے تو ہی اپنے بندوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ تو مجھے اپنے اذن سے اس بارہ میں ہدایت فرما۔ جو حق کے متعلق اختلاف کیا گیا ہے بیشک تو جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت فرماتا ہے۔ آیت اور حدیث کے پچھلے حصّہ کے الفاظ بہت ملتے جلتے ہیں اور اسی سے یہ پتہ لگتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گویا ان الفاظ قرآنی کا اپنے آپ کو اور اپنی اُمّت کو مصداق قرار دے رہے ہیں۔ پس آیت کے معنی یوں ہوئے کہ نبی سب قوموں میں آتے رہے تا اختلاف کو دور کریں پھر ان کے پیروؤں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلعم کو ان اختلافوں کے مٹانے کے لیے بھیجا اس لیے ان کی مخالفت تم کیوں کرتے ہو۔

ایک اور امر جس پر یہ آیت قطعی شہادت دیتی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک نبی کو خوشخبری دینے والا بھی بنایا ڈرانے والا بھی اور ہر ایک نبی کے ساتھ کتاب بھی اتاری۔ پس بغیر کتاب کے کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ جس طرح بغیر بشارت وانذار کے نہیں ہو سکتا۔ اور انزل معھم یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ہر نبی کے ساتھ ایک کتاب نازل ہوتی ہے اور یہ بھی یہی آیت فیصلہ کرتی ہے کہ ہر نبی صاحب حکم ہوتا ہے۔ یعنی تمام اختلافات میں وہ خود اپنی وحی سے جو اس کی کتاب کہلاتی ہے فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا لیطاع باذن اللہ یعنی وہ مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں ہوتا۔

۲۷۳ مثل کے معنی نمبر ۳۰ میں بیان ہو چکے مگر کبھی مراد اس سے کسی چیز کا وصف ہوتا ہے (غ) یہی معنی یہاں مراد ہیں یعنی حالت۔

زلزلوا۔ زلزال کے اصل معنی سخت حرکت دینا ہیں اور مراد مصائب کا آنا ہے (ت) لسان العرب میں اصابت القوم زلزلۃ لفظی معنی قوم پر زلزلہ آیا کے معنی تخویف وتحذیر کا آنا لکھے ہیں اور تاج العروس میں زلازل کے معنی بلایا شدائد اہوال لکھے ہیں۔ یعنی بلائیں مصیبتیں خوفناک حالات۔ حدیث میں ہے اللّٰھم اھزم الاحزاب وزلزلھم جہاں زلزلھم کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں کہ ان کے امر کو گھبراہٹ اور پریشانی کی حالت میں اور ناقابل قیام کر دے خود قرآن کریم میں جنگ احزاب کے ذکر میں ہے ھنالك ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالا شدیدا (الاحزاب ۳۳-۱۱) پس زلزلہ سے مراد یہاں شدائد و تکالیف کا آنا ہی ہے بالخصوص وہ شدائد جو جنگوں میں پیش آتی ہیں۔

حق کے قیام میں مشکلات: جب یہ بتایا کہ کتنا بڑا کام تم مسلمانوں کے سپرد کیا گیا ہے کہ کل دنیا کے اختلافات کو دور کرو۔ تو یہ بھی بیان کر دیا کہ حق کا دنیا میں قائم کرنا کس قدر مشکل کام ہے اور کس قدر دکھوں کا سامنا ہے چھوٹے پیمانہ پر حق قائم کرنے کے لیے بھی کیا کیا مصائب اٹھانے پڑے تو اب اس عظیم الشان امر کے قیام کے لیے کن کن تکالیف کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ مصائب ہی کامیابی کی کنجی ہیں ان میں پڑنے کے بغیر انسان پختہ نہیں ہوتا تو جنت میں کس طرح جا سکتا ہے۔ سوال تھا جنت میں داخل ہونے کے متعلق اور جواب میں فرمایا کہ اللہ کی نصرت قریب ہے پس مومنوں کے لیے جب خدا کی نصرت آتی ہے اور ان کو کامیاب کر کے منزل مقصود پر پہنچاتی ہے تو وہ بھی ان کے لیے ایک جنت ہی ہے۔ اس آیت میں صاف اشارہ جنگوں کی طرف ہے۔

یہ بھی بتایا کہ اللہ کی نصرت اسی کا نام ہے جب اسباب سے مایوسی ہو جائے اور چاروں طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آئے اور دشمن کا غلبہ بڑھتا چلا جائے یہاں تک کہ وہ مومن جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں بول اُٹھتے ہیں کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی۔ تب نصرت الٰہی آتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے کوئی ایسے سامان پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے اور جو بات اَن ہونی معلوم ہوتی تھی وہ ہو جاتی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ
مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو وہ ماں باپ اور قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے اور جو کچھ بھی تم نیکی کرو گے، تو اللہ اسے جانتا ہے۔ ۲۷۴

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَ
عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ
عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ
۲۶ ع ۱۰ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ ع

تم پر جنگ کرنی لکھی گئی اور وہ تم کو ناگوار ہے اور ہو سکتا ہے کہ تمھیں ایک چیز ناگوار ہو حالانکہ وہ تمھارے لیے اچھی ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بُری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۲۷۵

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ
قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ
اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ

تجھ سے حرمت والے مہینہ کی نسبت پوچھتے ہیں (یعنی) اس میں لڑائی کی نسبت، کہہ دے اس میں جنگ کرنی بہت بُری ہے، اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور اس کے لوگوں کا اس سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے

ع۲۷۴ خیر کے معنی مال کثیر ع۲۲ میں بیان ہو چکے۔ مگر خیر اس مال کو بھی کہتے ہیں جو محمود طریق پر جمع کیا گیا ہو (غ) جب حق کی خاطر دُکھ تکلیفیں اُٹھانے کا ذکر کیا اور جنگوں کی طرف اشارہ کیا تو ساتھ ہی انفاق یعنی مال خرچ کرنے کی ضرورت بھی بتائی۔ اور پہلے حصّہ آیت میں مال خرچ کرنے کا ذکر کر کے اور دوسرے میں نیکی کرنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ اپنے قویٰ کو اچھے موقعہ پر لگانا بھی انفاق میں ہی داخل ہے۔ کیا خرچ کریں؟ اس کا جواب یہ دیا کہ جو کچھ بھی خرچ کرو وہ ماں باپ وغیرہ کے لیے ہی ہے۔ گویا فرمایا کہ جو کچھ خرچ کر سکتے ہو کرو۔ آخر یہ خرچ کرنا تمہارے اپنے لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی ہے۔ یا تو یوں کہ انفاق کا پہلا مصرف والدین اور قریبیوں یتیموں وغیرہ کی خبرگیری ہی ہے اور یا یوں کہ تمہارے بہت سے قریبی اور بہت سے ضعیف لوگ تمہارے جہاد پر مال خرچ کرنے سے مصائب سے باہر نکل آئیں گے، کیونکہ جو مسلمان بھاگ آئے تھے ان کے عزیز و اقربا ابھی مکہ میں کافروں کے تسلط میں ہی تھے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کر کے کہ "کیا خرچ کریں" کا کوئی جواب یہاں نہیں ماذا کے معنی کیف کیے ہیں یعنی کس طرح خرچ کریں۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا ہے جواب موجود ہے اور آیت ع۲۱۹ میں اسی کی وضاحت ہے۔ یا مکرر سوال کی یعنی ایک یہاں اور ایک آیت ع۲۱۹ میں۔ یہ غرض ہے کہ یہاں اقربا اور یتامیٰ پر خرچ کرنے کا ذکر ہے وہاں دشمن کے مقابل پر۔

ع۲۷۵ کرہ کے معنی مشقت ہیں۔ یا وہ مشقت جو انسان کو خارج سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے ہی پہنچتی ہے۔ یعنی ایک چیز کا ناگوار خاطر ہونا اور کَرہ وہ مشقت ہے جو خارج کی طرف سے پہنچتی ہے (غ) اور کَرِھت کا استعمال دونوں معنی پر ہوتا ہے مگر کُرہ پر زیادہ ہے (غ)۔
مسلمان جنگ کو ناپسند کرتے تھے: لطیف اشارہ سے صراحت کی طرف انتقال کیا اور فرمایا کہ دشمنان دین اس قدر حق کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں کہ تم کو چار و ناچار حق کی حفاظت کے لیے جنگ کرنی پڑے گی۔ مگر وہ کیسی جنگ ہے؟ وہ تمہارے لیے مشقت ہے۔ وہ تم کو ناگوار ہے۔ تم اسے پسند نہیں کرتے۔ وجہ ظاہر ہے چاروں طرف پھیلے ہوئے دشمنوں کے ساتھ ایک مٹھی بھر مسلمان کیونکر جنگ کر سکتے تھے، پھر بے سروسامانی کمال کی اور بالمقابل قوم وہ جس کا پیشہ ہی جنگ کرنا چلا آیا ہے۔ پھر اصل غرض تو توحید الٰہی کا پھیلانا تھی یہ درمیان میں ایک نئی بات پیش آگئی اس لیے ناپسند تھی۔ اسلام پر یہ الزام دینے والے کہ لوٹ کی خاطر جنگ کی، غور کریں کہ قرآن شریف کیسے صاف الفاظ میں ان کی تردید کرتا ہے، لُوٹ مار کرنے والوں کے لیے تو جنگ کا حکم خوشی کا موجب ہوتا نہ ایک امر ناگوار۔
موجودہ حالت اور جنگ: ساتھ ہی مسلمانوں کو سمجھایا کہ ایک وقت ایک چیز تم کو ناگوار ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی اسی میں ہوتی ہے۔ ایک بات کو تم پسند کرتے ہو وہ آخر کار نقصان کا موجب ثابت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دو فقروں میں یہ اشارہ ہو کہ اس وقت تم جنگ کو ناپسند کرتے ہو مگر تمہاری بھلائی جنگ کرنے میں ہے کیونکہ اس کے بغیر تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایک وقت آئے گا کہ تم جنگ کو پسند کرو گے اس وقت وہ تمہارے لیے نقصان کا موجب ہوگی یہ دوسری حالت آج مسلمانوں پر ہے واقعات یہی بتاتے ہیں کہ ہر جگہ جنگوں میں مسلمانوں کا قدم پیچھے ہٹتا ہے۔

اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ — بھی بُرا ہے اور فتنہ قتل سے بڑھ کر بُرا ہے۲۷۶ اور وہ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے
حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۗ — رہیں گے یہاں تک کہ تمھیں تمھارے دین سے لوٹا دیں اگر انھیں طاقت
وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ — ہو۲۷۷ اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھرے پھر مرجائے۲۷۸ حالانکہ
هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی — وہ کافر ہی ہو، سو یہی ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں

ع۲۷۶ کبیر۔ اصل معنی صرف بڑا ہیں مگر بُرائی کے بڑا ہونے پر یہ لفظ خصوصیت سے بولا گیا ہے جیسے کبرت کلمة (الکهف ۱۸-۵) ہیں اسی لحاظ سے کبیرۃ بہت بڑے گناہ کو کہتے ہیں۔ (غ)

صَدّ کے معنی دونوں آتے ہیں یعنی پھرنا اور رُک جانا یا دوسرے کو پھیرنا اور روک دینا۔

حرمت کے مہینوں میں جنگ اور کفار کی مسلمانوں پر زیادتی: پچھلی آیت میں جنگ کے مسلمانوں پر فرض کرنے کا ذکر کیا تو یہاں چار حرمت والے مہینوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان میں جنگ ممنوع ہے۔ اور جب یہ بتایا کہ اسلام اس حرمت کا پاس کرتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ کافر جن کی طرف سے یہاں سوال ہوتا ہے خود سب حرمت والی چیزوں کی بے حرمتی کر چکے ہیں اللہ کی راہ سے لوگوں کو رُکا، مسجد حرام سے روکا بلکہ آخر کار مسلمانوں کو مسجد حرام سے نکال دیا۔ حالانکہ مسجدِ حرام کی حدود میں ان کے ہاں امن کا دیا جانا ایک مسلّم امر تھا۔ پھر ان سب باتوں کو لفظ فتنۃ سے تعبیر کیا ہے جب فرمایا کہ فتنۃ قتل سے بُرا ہے اس سے فتنہ کے معنی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ قرآن شریف میں کم سے کم چار اور موقعوں پر یہ لفظ صراحت سے ان دکھوں اور تکلیفوں پر استعمال ہُوا ہے جو مسلمانوں کو دین اسلام اختیار کرنے کی وجہ سے دی جاتی تھیں۔ سورہ عنکبوت ۲۹-۱۰ او النساء ۴-۱۰۱۔ البروج ۸۵-۱۰۔

کفار کا اعتراض عبداللہ بن جحش کے ابن حضرمی کو قتل کرنے پر تھا۔ ہجرت کے دوسرے سال میں جب کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ کے رنگ میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ نبی کریم صلعم نے عبداللہ بن جحش کو چند آدمیوں کے ساتھ قریش کی خبر لانے کے لیے بھیجا تھا اور جو ہدایت ان کو دی تھی اس میں صاف اسی قدر ذکر تھا کہ ان کی خبر لاؤ۔ اتفاق سے ان لوگوں نے تین قریش کے آدمیوں کو دیکھا اور ان پر حملہ کیا ان میں سے ایک یعنی عبداللہ ابن الحضرمی قتل ہوا دو قید ہوئے۔ یہ جمادی الثانی کا آخری دن تھا اور یہ امر مشتبہ رہا کہ آیا رجب کا چاند دیکھنے کے بعد انہوں نے حملہ کیا یا پہلے۔ مگر خود عبداللہ بن جحش کا بیان ہے کہ ہم نے ابن حضرمی کے قتل کے بعد رجب کا چاند دیکھا۔ انا قتلنا ابن الحضرمی ثم مسینا فنظرنا الی ھلال رجب فلا ندری اِفی رجب اصبناہ ام فی جمادی پس اس واقعہ سے حرمت کے مہینوں میں جنگ کا جائز ہونا ثابت نہیں ہوتا اس لیے حرمت کے مہینوں میں حرمت قتال کا حکم قائم ہے اور منسوخ نہیں ہُوا۔ چنانچہ جب ہجرت کے چھٹے سال آنحضرت صلعم حج کی نیت سے نکلے تو ہتھیار ساتھ لیکر نہیں نکلے۔ ہاں جب کفار کی طرف سے تیاری دیکھی تو اس وقت مجبوراً تیاری کی۔ ایسا ہی ایک اور موقعہ پر بھی آپ سے ثابت ہے کہ حرمت کے مہینوں میں جنگ کو روک دیا۔

ع۲۷۷ یَرُدُّوا۔ رَدّ کے معنی کسی چیز کا اپنی ذات میں پھیرنا یا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا آتے ہیں (غ)

استطاعوا۔ طوع سے ہے جس کے معنی انقیاد یعنی فرمانبرداری ہیں۔ اور استطاعت میں نیت اور تصور فعل اور مادہ قابلہ اور آلہ کا ہونا ضروری ہے (غ) ان استطاعوا (اگر طاقت رکھتے ہوں) سے یہاں یہ مراد ہے کہ باقی چیزیں تو موجود ہیں اور وہ اپنا زور لگا رہے ہیں مگر مادہ قابلہ نہیں یعنی مسلمان اپنے دین کو کبھی چھوڑ نہیں سکتے۔ معلوم ہوا کہ کافر مسلمانوں کے ساتھ اس لیے جنگ کرتے تھے کہ ان کو دین اسلام سے پھیر دیں۔ پہلے تکلیفیں دیں، پھر گھروں سے نکالا آخر تلوار لے کر کھڑے ہو گئے کہ اس کے زور سے مسلمانوں کو دین سے پھیر دیں گے۔ کس قدر خلاف واقعہ اتہام ہے کہ مسلمان کافروں کو مسلمان بنانے کے لیے جنگ کرتے تھے جس قدر صبر مسلمانوں نے جنگ سے رُکنے میں دکھایا ہے اگر آج اس کا دسواں حصّہ بھی مہذب قوموں میں ہو تو دنیا میں امن اور آشتی پھیل جائے۔ مسلمانوں نے جنگ اس لیے کی کہ ان کو دین اسلام سے پھیرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ نہ اس لیے کہ وہ دوسروں کو ان کے دین سے پھیرنا چاہتے تھے۔

ع۲۷۸ یرتدد۔ اِرتِدَاد کے اصل معنی ہیں اس طریق پر لوٹ جانا جس سے ایک شخص آیا تھا۔ جیسے فارتدّا علیٰ اثارھما قصصًا (الکهف ۱۸-۶۴) ہیں۔ اور اسلام سے کفر کی طرف لوٹ جانے اور اسلام کو چھوڑ کر کفر میں داخل ہونے پر بالخصوص یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور ردّۃ صرف اسی معنی کے لیے خاص ہے۔ (غ)

ہر مرتد کا حکم قتل نہیں: یہاں مرتد کے حالت کفر پر مرنے کا ذکر ہے نہ اس کے قتل کرنے کا۔ سورہ مائدہ کی آیت ۵۴ میں بھی مرتد کا ذکر ہے مگر وہاں بھی اس کو قتل کرنے کا حکم نہیں، نہ قرآن کریم میں کسی دوسری جگہ قتل مرتد کا حکم ہے۔ احادیث میں صرف ایک حدیث ہے حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے زمانہ میں جب بعض زنادیق کو جلایا گیا تو یہ فرمایا کہ ان کو قتل کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ نبی کریم صلعم نے فرمایا تھا من بدّل دینہ فاقتلوہ

الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٧﴾

کام نہ آئے [۲۷۹]۔ اور یہی آگ والے ہیں، وہ اسی میں رہیں گے۔

جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کردو۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ اس حدیث کے الفاظ میں جو عمومیت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ اس کی رو سے کوئی شخص کوئی سا ایک دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے اسے قتل کرنا چاہیئے۔ مثلاً یہودی عیسائی ہو جائے یا عیسائی مسلمان ہو جائے، تو واجب القتل ہوگا۔ مگر یہ بالبداہت باطل ہے اس لیے حدیث کے الفاظ کو مقید کرنا پڑے گا اور چونکہ اس کے راوی حضرت ابن عباسؓ ہیں جو سنِ شعور کو اس وقت پہنچے جب لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں اس لیے ماننا پڑے گا کہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو اسلام کو چھوڑ کر ساتھ ہی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار سے جا ملتے تھے اور ان کا قتل ضروری تھا۔ چنانچہ اس قید کی تحدید اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ نے عورتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ عورتیں جنگ میں حصہ نہ لیتی تھیں اور نبی کریم صلعم نے اسی بنا پر ان کے قتل کرنے کی ممانعت کر دی تھی اور عکل کی سزا والی حدیث سے بھی مرتد کے قتل کا حکم اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلعم کے پاس اسلام کا اظہار کر کے بعد میں بیماری کا عذر کیا تو آپ نے ان کو وہاں باہر رہنے کی اجازت دی جہاں بیت المال کے اونٹ تھے تا کہ کھلی ہوا میں رہنے سے صحت ہو اور دودھ پئیں، مگر انہوں نے چرواہے کو قتل کیا اور اونٹ لے کر چلتے بنے۔ پس ان کی سزا اس قتل اور ڈاکہ کی وجہ سے تھی نہ ارتداد کی وجہ سے۔ علاوہ ازیں اگر مدینہ میں کسی مرتد کو واجب القتل قرار دیا گیا ہو تو اس وجہ سے کہ جو شخص اس وقت اسلام کو ترک کرتا وہ دشمن سے جا ملتا جو اس وقت اسلام کی تباہی پر تلا ہوا تھا۔ گویا مسلمان اس وقت میدانِ جنگ میں ایک فوج کی صورت میں پڑے تھے اور ایک حدیث میں صاف لفظ ہیں کہ صحابہؓ نے شکایت کی کہ ہم کو دن رات ہتھیار باندھ کر رہنا پڑتا ہے پس اس وقت ارتداد کے معنی دشمن کے ساتھ جا ملنا تھا اور جو شخص اپنی فوج کو چھوڑ کر دشمن کے ساتھ جا ملتا ہے وہ آج بھی واجب القتل ہی سمجھا جاتا ہے۔ صلح کے وقت واجب القتل قرار نہ دینا خود اس سے ظاہر ہے کہ صلح حدیبیہ میں آنحضرت صلعم نے یہ شرط قبول کی تھی کہ کوئی مسلمان کفار کے ساتھ جا ملے تو وہ واپس نہیں کیا جائے۔ اگر قرآن میں مرتد کی سزا قتل ہوتی تو آپ اس کے خلاف شرط کبھی قبول نہ کرتے پس من بدل دینہ فاقتلوہ بھی انہی واقعات سے مخصوص معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے معنی کی عمومیت کو کوئی شخص بھی قبول نہیں کر سکتا۔

ہر مرتد کا نکاح فسخ نہیں ہوتا: پس مرتد کے لیے سزائے قتل از روئے قرآن و حدیث صحیح نہیں اور جس طرح وہ صحیح نہیں اسی طرح وہ احکام جو فقہاء نے اس پر متفرع کیے ہیں وہ بھی آج ان حالات میں جب مسلمان غیر مسلم سلطنتوں کے ماتحت ہیں درست نہیں مثلاً یہ کہ مرتد کے سارے حقوق زائل ہو جاتے ہیں پھر اس پر یہ حکم متفرع کیا گیا کہ اس کا نکاح بھی باقی نہیں رہتا۔ اب انگریزی عدالتوں نے باقی فتوٰی کو تو حالات ملکی کے لحاظ سے قبول نہیں کیا۔ یعنی مرتد کے حقوق کو زائل نہیں کیا مگر نکاح فسخ ہو جانے کو اس فتوٰی کی بناء پر مان لیا ہے حالانکہ حالات ملکی کے لحاظ سے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا سارا فتوٰی مانا جائے یا سارا چھوڑا جائے اور چونکہ پہلی صورت پر عمل نہیں ہو سکتا دوسری اختیار کرنی چاہیئے مگر ہمارے علماء کی حالت بھی عجیب ہے، دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح محض طلاق حاصل کرنے کے لیے آئے دن مسلمان عورتیں عیسائی ہو جاتی ہیں اور خاموش ہیں کیونکہ فقہاء کا فتوٰی ایسا ہی ہے یہ نہیں سوچتے کہ فقہاء کا فتوٰی تو ہندوستان میں ناممکن العمل ہے پھر اس کے ایک جزو پر جس سے قوم کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے عمل کے کیا معنی ہوئے قرآن و حدیث میں کوئی حکم نہیں کہ مرتد کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے فقہاء کا فتوٰی ہے لیکن اس کی اصل کو انگریزی عدالتیں قبول نہیں کرتیں یعنی مرتد کے حقوق کو زائل قرار نہیں دیتیں، پھر اسی کی فرع کو کہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے قبول کرنا محض مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ کیا علماء کا یہ فرض نہیں کہ جب اصل کو قابل قبول نہیں سمجھا گیا تو فرع پر عمل کے خلاف آواز بلند کریں۔ عامہ حالات میں ظاہر ہے کہ اگر عورت عیسائی ہو جائے تو نکاح نہیں ٹوٹتا کیونکہ عیسائی عورت کا نکاح مسلمان مرد سے جائز ہے لیکن مرد عیسائی ہو جائے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ مسلمان عورت کا نکاح عیسائی مرد سے جائز نہیں۔

ع ۲۷۹ حبطت۔ حَبْط کے اصل معنی ہیں کہ جانور بہت سا کھالے یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھول جائے (رغ) گویا اس کا کھایا ہوا کام نہ آیا۔ پس حبطِ عمل سے مراد عمل کا بے نتیجہ رہنا یا کام نہ آنا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں حبط عمل تین طرح پر ہے۔ اول یہ کہ دنیوی کام ہوں تو یہ آخرت میں کام نہ آئیں گے انسان تجارت کرتا ہے صنعتیں بناتا ہے تا کہ روپیہ کمائے اس کی مثال دی ہے وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلنٰہ ھباء منثورا (الفرقان ۲۵-۲۳) اس کی دوسری مثال عیسائی اقوام کی حالت ہے جو قرآن شریف نے بیان کی ہے الذین ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا اور اس کے آگے آتا ہے فحبطت اعمالھم (الکھف ۱۸-۱۰۴ و ۱۰۵) جہاں خود ضلّ سعیھم کہہ کر بتا دیا کہ ان کی کاریگریاں دنیا تک محدود ہیں دنیا میں کام آگئیں آخرت میں ان کا نتیجہ کچھ نہیں۔ کیونکہ تکمیل نفس انسانی سے ان کو کچھ تعلق نہیں۔ دوسری صورت حبط عمل کی امام راغب نے یہ بیان کی ہے کہ عمل تو آخرت کے ہوں لیکن ان کے کرنے والے کی نیت ان میں اللہ تعالیٰ کی رضا نہ ہو جیسا حدیث میں ہے کہ ایک شخص کو کہا جائے گا کہ تو قرآن اس لیے پڑھتا تھا کہ لوگ تجھے قاری کہیں سو انہوں نے کہا اب یہ تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اعمال بھی صالح ہوں نیت بھی ٹھیک ہو لیکن ان کے مقابل پر بُرے کام بڑھے ہوئے ہوں (رغ) تو اس صورت میں اعمالِ صالح کی بوجہ ان کے ناکافی ہونے کے غرض پوری نہ ہوئی جس طرح پانی کے ایک قطرہ سے پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ان کے علاوہ حبط عمل کی دو اور صورتیں ہیں۔ ایک وہ حبطِ عمل جو انبیاء کے مخالفین کے لیے خاص ہے۔ کیونکہ انبیاء دنیا میں حق پھیلانے کے لیے آتے ہیں ان کے مخالف اس کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں ان کی کوششیں رائگاں جاتی ہیں کیونکہ ضرور ہے کہ حق آخر کار دنیا میں غالب آئے۔ جیسا سورۃ آل عمران ۲۱ میں نبیوں اور نیک لوگوں کے قتل کرنے والوں کا ذکر

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَ
جٰهَدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۙ أُولٰٓئِكَ يَرْجُونَ
رَحْمَتَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾
يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور
اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار
ہیں اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ع۲۸۰
تجھ سے شراب اور جُوئے کے متعلق پوچھتے ہیں ع۲۸۱، کہہ

کر کے فرمایا اولٰئك الذین حبطت اعمالھم فی الدنیا والاخرۃ۔ دوسری صورت وہ ہے جس کا ذکر یہاں ہے، مسلمان تھا اچھے عمل کرتا تھا پھر کافر ہوگیا، بدی کی راہ اختیار کرلی۔ پہلی نیکیاں بھی ضائع ہوئیں کیونکہ زندگی کا رُخ ہی پلٹ گیا۔

ع۲۸۰ ھاجروا۔ ھجْر اور ھجران انسان کا دوسرے سے الگ ہوجانا ہے جسم سے ہو یا زبان سے یا دل سے (غ) اور مھاجرۃ: ایک دوسرے سے قطع تعلق کرلینا ہے، اور ظاہر معنی اس کے دارالکفر سے دارالایمان کی طرف خروج ہے (غ) جیسے آنحضرت صلعم اور صحابہ رضؓ کا مکّہ کو چھوڑ کر مدینہ میں آجانا۔ کیونکہ گو کافر تو دونوں جگہ موجود تھے مگر مکّہ دارالکفر اس لیے ہُوا کہ وہاں مسلمانوں کو دُکھ دیا جاتا تھا۔ اور امام راغب کہتے ہیں کہ ظاہری ہجرت کا اقتضائے اصلی یہی ہے کہ شہوات اور بُرے اخلاق اور خطاؤں کو چھوڑا جائے یہ وہ ہجرت باطنی ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ ہے المھاجر من ھاجر مانھی اللّٰہ عنہ مہاجر وہ ہے جو ان باتوں سے الگ ہوگیا جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔

جاھدوا۔ جَھد اور جُھد طاقت اور مشقت کو کہتے ہیں اور جہاد اور مجاھدہ کے معنی ہیں دشمن کی مدافعت میں وسعت وطاقت کا لگا دینا اور خرچ کردینا (غ)، امام راغب کہتے ہیں جہاد تین قسم ہے: ظاہری دشمن سے جہاد، شیطان سے جہاد، نفس سے جہاد، اور جاھدوا فی اللّٰہ حقّ جھادہٖ (الحج ۲۲-۷۸) میں وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللّٰہ (التوبۃ ۹-۴۱) میں، اور یہاں تینوں قسم کا جہاد شامل ہے اور آنحضرت صلعم کا ارشاد نقل کیا ہے جاھدوا اھواءکم کما تجاھدون اعداءکم اپنی خواہشات سے جہاد کرو جس طرح اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو، اور لفظ ھجر کی بحث میں ایک حدیث نقل کی ہے رجعتم من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہو۔ جہاں چھوٹے جہاد سے مراد دشمن کی جنگ اور بڑے جہاد سے مراد مجاہدہ نفس ہے ایسا ہی قرآن کریم میں ہے وجاھدھم بہٖ جھادا کبیرا (الفرقان ۲۵-۵۲) اس قرآن کے ذریعہ سے ان کفار کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔ ایسا ہی منافقوں سے جہاد کا حکم ہے حالانکہ کوئی جنگ منافقوں سے نہیں ہوئی۔

مقدم کونسی ہجرت اور جہاد ہیں: یہ آیت بتاتی ہے کہ نرا ایمان کافی نہیں۔ خدا کی رحمت کے امیدوار وہ لوگ ہیں جو ایمان کے ساتھ بدیوں کو ترک کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا سارا زور لگا دیتے ہیں۔ یہ ہجرت اور جہاد ہمیشہ ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ دارالکفر سے خروج یا دشمن سے جنگ کبھی کبھی پیش آنے والی باتیں ہیں اور جب اللہ کی رحمت کی ہر وقت ضرورت ہے تو یہاں مراد بھی یہی ہجرت اور جہاد ہیں۔ اسی ہجرت اور جہاد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمان اپنی اصلاح اور دین اسلام کی اشاعت کی طرف سے غافل ہو رہے ہیں اور تلوار اُٹھانے یا وطن چھوڑ جانے پر ہی سارا زور ہے۔ مسلمانوں کی زندگی اگر باقی رہ سکتی ہے تو اسی ہجرت اور جہاد کو اختیار کرکے۔ صحابہ رضؓ نے بھی پہلے اس کو اختیار کیا تب ہجرت ظاہری اور جہاد سیف کی اجازت ان کو ملی۔ مؤخر کو مقدم کرکے کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔

ع۲۸۱ الخمر۔ خمر کے اصل معنی کسی چیز کا ڈھانک دینا ہے اسی لیے خِمار اوڑھنی کو کہتے ہیں جس کی جمع خُمُر قرآن شریف میں آتی ہے ولیضربن بخمرھن (النور ۲۴-۳۱) اور خمر شراب کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ عقل کی جائے قرار پر پردہ ڈال دیتی ہے (غ) یعنی انسان عقل سے کام لینے کے قابل نہیں رہتا۔ پھر مفردات میں ہی ہے کہ بعض کے نزدیک خمر ہر ایک نشہ دینے والی چیز کا نام ہے اور بعض کے نزدیک صرف انگور اور کھجور کی شراب کا نام ہے اور یہ قیاس اس سے کیا گیا ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ خمر ان دو درختوں سے ہے یعنی کھجور اور انگور سے، مگر ظاہر ہے کہ ارشاد نبویؐ الخمر من ھاتین الشجرتین میں حصر مراد نہیں صرف دو زیادہ مروج قسموں کا نام لے دیا ہے۔ تاج العروس میں الخمر ما اسکر یعنی خمر وہ ہے جس سے نشہ ہو اصل قرار دے کر اس کے معنی پر اختلاف کا ذکر کیا ہے یعنی حضرت امام ابوحنیفہ کا قول کہ خمر صرف انگور سے ہے اور جمہور کا قول ہے کہ جس سے نشہ ہو وہ خمر ہے اور جمہور کے قول کو صحیح کہا ہے اور اس پر ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ شراب مدینہ میں حرام ہوئی حالانکہ وہاں انگور کی شراب قطعاً نہ ہوتی تھی صرف بُسر اور تمر کی ہوتی تھی۔ یعنی تازہ اور خشک کھجور کی اور اسی کے مطابق حضرت عمرؓ کا قول بخاری سے نقل کیا ہے۔ پس خمر کے اصل معنی ہر ایک نشہ دینے والی چیز ہیں۔

المیسر۔ میسر مصدر ہے جس کے معنی جُوآ ہیں یا اس لیے کہ یُسر کے معنی سہولت ہیں اور جوئے میں مال آسانی سے حاصل ہوجاتا ہے اور یا اس لیے کہ یسر کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہیں، اور میسر ان کے ہاں یہ تھا کہ اونٹ ذبح کیا جاتا اور اس کے ۱۸ یا ۱۰ حصّے کیے جاتے اور دس تیر ہوتے جن میں سے سات کے حِصّے ایک سے لیکر سات تک ہوتے اور تین خالی ہوتے پھر جس شخص کیلئے جو تیر نکلتا اس کے مطابق اس کا حِصّہ قرار پاتا۔ یہ بعینہٖ آج کل کی لاٹری ہے۔ میسر کے لفظ میں لاٹری اور ہر قسم کا جُوا داخل ہے۔

خمر و میسر کا آپس میں کیا تعلق ہے اور مضمون جنگ سے جو شروع ہے کیا تعلق ہے؟ خمر عقل کو تباہ کرنے والی چیز ہے میسر مال کو تباہ کرنے والی

فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۘ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۚ

ان دونوں میں بڑی بُرائی ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں اور ان کی بُرائی ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے[۲۸۱] اور تجھ

چیز اور دونوں عداوت اور فساد پیدا کرنے والی چیزیں ہیں اس لیے دونوں کا اکٹھا ذکر کیا۔ اور جنگ سے یہ تعلق ہے کہ فی الحقیقت تو جنگ کے لیے عقل اور مال دونو کی حفاظت بکار ہے مگر عموماً جنگوں میں بکثرت شراب پی اور پلائی جاتی ہے تاکہ سپاہی اندھے ہو کر لڑیں، مگر شراب سے جو وقتی جرأت پیدا ہوتی ہے وہ حقیقی جوہرِ شجاعت کو تباہ کرنے والی چیز ہے۔ اس لیے شراب سے روکا اور عرب کے لوگ اخراجات جنگ کا روپیہ جمع کرنے کے لیے اکثر جُوا کھیلتے تھے جیسے آج بھی لاٹری کا رواج ہے۔ اسی لیے جوئے کی ممانعت کے بعد فوراً یہ سوال ہے کہ پھر کیا خرچ کریں۔

۲۸۱ ع شراب اور جُوا مہذب قوموں کی اور بالخصوص عیسائی اقوام کی دو خطرناک بیماریاں ہیں اور ان کا علاج سوائے اسلام کے اور کسی مذہب نے نہیں کیا۔ بعض بدیاں ایسی موٹی ہیں کہ ان کے بدنتائج تک سب کی نظر پہنچ جاتی ہے اور بعض کے بدنتائج چونکہ ایک مدت کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لیے ہر ایک کی نظر ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ شراب مؤخر الذکر بدیوں میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکیلے کامل مذہب نے ہی شراب کے بدنتائج کو دیکھ کر اس سے روکا۔ یہودیوں میں شراب کی حرمت قطعی نہ تھی، بعض اوقات اس کی تعریف بھی کر دی ہے۔ دیکھو قاضیون ۹: ۱۳۔ ۲ سموئیل ۱۶: ۲۔ امثال ۳۱: ۶ حکمائے یہود نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جہاں شراب نہ ہو وہاں دوائیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہندوؤں میں بھی شراب کا استعمال کتب مقدسہ کی بنا پر جائز مانا گیا ہے۔ یجروید میں جو چیزیں دیوتاؤں کو پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک شراب بھی ہے۔ منوسمرتی میں ہے کہ "مانس اور شراب ان دونوں کے کھانے میں کچھ دوش نہیں۔" منوسمرتی سے ہی یہ ثابت ہے کہ بعض مذہبی تیوہاروں میں شراب پینے میں کچھ دوش نہیں۔ عیسائیت نے تو حد ہی کر دی کہ مذہب کی بنیاد ہی شراب پر گویا رکھ دی۔ انجیل (یوحنا ۲: ۱۔ ۱۱) میں حضرت مسیح کا سب سے پہلا معجزہ ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شادی میں جب شراب کچھ کم ہو گئی اور لوگ پورے بدمست نہ ہوئے تو حضرت مسیحؑ نے پانی کے مٹکوں کو شراب میں تبدیل کر کے اس کمی کو پورا کیا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اس معجزہ میں عیسائی مذہب کی آئندہ تاریخ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ قوم پانی کی جگہ شراب ہی پیئے گی مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی شخص عیسائی رہ نہیں سکتا جب تک سال بھر میں ایک دفعہ شراب نہ پیئے۔ کیونکہ عید فسح میں شراب جزو لازم ہے بلکہ اسی شراب کے گھونٹ کو مسیح کے خون کا قائمقام قرار دے کر اتحاد عیسائیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ گویا عیسائیت کا اجتماع روٹی کے ٹکڑے اور شراب کے پیالہ پر ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ عیسائیت کو چھوڑ کر سب مذاہب میں نیک اور راستباز لوگ شراب سے مجتنب رہے ہیں۔ گو وہ دوسروں کو اس سے نہ روک سکے ہوں۔ اور یہودیوں میں تو دو فرقے ایسے تھے جو شراب نہ پیتے تھے مگر شراب کے خطرناک دیو کو ہلاک کرنے کے لیے اسی عظیم الشان قوت قدسی کی ضرورت تھی جو محمد رسول اللہ صلعم کے سوائے اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اور آپ کی یہ قوت قدسی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ چیز جس کی خطرناک گرفت سے ایک انسان کا بچانا بھی مشکل ترین کام ہے اس سے آپ نے آناً فاناً ایک قوم کی قوم اور ملک کے ملک کو ایسا پاک کر دیا کہ شراب تو کیا وہ برتن بھی باقی نہ رہے جن میں شراب بنائی جاتی تھی۔ حالانکہ آپ کے ظہور کے وقت عرب کے ملک میں اس قدر کثرت سے شراب پی جاتی تھی کہ اس کی نظیر سوائے موجودہ زمانہ کے یورپ کے اور کہیں نہیں ملتی۔ ادھر حرمت شراب کے حکم کا نازل ہونا تھا ادھر شراب مدینہ کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح بہ رہی تھی۔ لوگ خارق عادت امور میں معجزات تلاش کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کون سا اعجاز ہو گا جس نے آن کی آن میں نسل انسانی کو اس خبیث چیز سے آزاد کر دیا۔ آج امریکہ بھی تیرہ سو سال بعد رسول اللہ صلعم کے اس فعل کی نقل کرنے لگا ہے مگر کہاں نبی کی قوت قدسی جو فوراً قوم کو پاک صاف کر دیتی ہے کہاں دنیاداروں کے ریزولیوشن جن سے بچنے کے لیے طرح طرح کے حیلے ابھی سے نکالے جا رہے ہیں۔

حرمت شراب کی تدریج میں حکمت: ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے جو فطرت انسانی کو پہچانتا ہے حرمت شراب کا حکم تدریجاً پہنچایا حالانکہ اور کسی بدی کی بیخکنی میں تدریج روا نہیں رکھی۔ چنانچہ اول یہ سمجھایا کہ اس میں کچھ فوائد تو ضرور ہیں جن کی وجہ سے دنیا آج تک اس میں مبتلا رہی مگر اس کا نقصان نفع سے بہت بڑھ کر ہے اور پھر فرمایا کہ نشہ کی حالت میں نماز میں مت آؤ۔ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء ۴-۴۳) یعنی شراب نوشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور بالآخر قطعی حکم حرمت سورہ مائدہ میں نازل فرمایا اس کو رجس (پلیدی) قرار دیا اس کو شیطان کا کام کہا۔ فاجتنبوا (اس سے بچو) کا حکم دیا اور آخر میں فھل انتم منتھون میں تاکید کے ساتھ زجر فرمایا۔ پس اس تدریجی مگر قطعی حکم حرمت شراب میں بھی ایک حکمت تھی۔

شراب تھوڑی اور بہت یکساں حرام ہے: یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ گو خمر کی حرمت اسی وجہ سے ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح دیگر نشہ پیدا کرنے والی اشیاء بھی اس حرمت کے اندر آ جاتی ہیں مگر یہ حرمت عام ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ تھوڑی شراب جس سے نشہ نہ ہو پی لینا جائز ہے۔ خصوصیت وجہ سے عمومیت حکم پر اثر نہیں پڑتا اور حدیث میں صاف ہے حرمت الخمر بعینھا قلیلھا وکثیرھا یعنی شراب فی ذاتہٖ حرام ہے تھوڑی ہو یا بہت اور یہ بھی ہے ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام جس چیز کی زیادہ مقدار سے نشہ ہو جائے یعنی انسان بدمست ہو جائے وہ تھوڑی بھی حرام ہے۔ اسی طرح خاص قسم کی شرابوں کا جواز نکالنا حکم قرآنی کا ابطال ہے۔ ہاں البتہ دوائی کے طور پر شراب کا استعمال ناجائز نہیں کہلا سکتا اس لیے کہ دوائی کے طور پر تھوڑی مقدار میں زہر بھی دی جا سکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حرام سے دوا نہ کرو۔ مگر حالت اضطرار میں سؤر بھی جائز ہے اس لیے حالتِ اضطرار اس سے مستثنےٰ ہے۔

قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١٩﴾
فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ
قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ
اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٠﴾
وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ
مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ
وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ
مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ

سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ جو کچھ (حاجت سے) بڑھ رہے[۲۸۲]
اسی طرح اللہ تمہارے لیے کھول کر باتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر کرو۔
دنیا اور آخرت میں۔ اور تجھ سے یتیموں کی نسبت پوچھتے ہیں کہ ان کی
اصلاح کرنا اچھا ہے اور اگر تم ان سے میل جول کرو تو تمہارے بھائی ہیں
اور اللہ بگاڑنے والے کو اصلاح کرنے والے سے (الگ) پہچانتا ہے اور اگر
اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈالتا۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔[۲۸۳]
اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں اور یقیناً
ایک مومن لونڈی ایک مشرک (بی بی) سے بہتر ہے گو وہ تمہیں اچھی لگتی ہو
اور مشرکوں کو (عورتیں) نکاح میں نہ دو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں اور یقیناً
ایک مومن غلام مشرک (آزاد) سے بہتر ہے گو وہ تمہیں اچھا لگے۔ یہ آگ

ع۲۸۲ العفو۔ عفو کے اصل معنی ہیں کسی چیز کے لینے کا قصد اور اس لیے جس چیز کا قصد آسان ہو اس پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ یہاں عفو کے معنی امام راغب نے مَا يَسْهُلُ اِنْفَاقُهٗ کیے ہیں یعنی وہ چیز جس کا خرچ کرنا سہل ہو اور ابن عمرؓ اور اکثر مفسرین تابعین نے اس کے معنی کیے ہیں وہ مال جو تمہارے اہل کی حاجت سے زیادہ ہو۔ اور ابن کثیر میں ہے کہ بعض نے اس کے معنی افضل اور طیب مال کیے ہیں اور جُوئے کی ناپاک کمائی کے مقابل پر یہ معنی نہایت موزوں ہیں، اور حاجت سے بڑھا ہُوا مال بھی صحیح معنی ہیں جن کی تائید میں صحیح مسلم کی ایک حدیث بھی ہے کہ جب ایک شخص نے ایک دینار کا ذکر کیا تو آنحضرت صلعم نے فرمایا اپنے نفس پر خرچ کرو اور دوسرے کا ذکر کیا تو فرمایا اپنے اہل پر خرچ کرو۔ اور تیسرے کا ذکر کیا تو فرمایا اپنی اولاد پر خرچ کرو۔ اسلام کی تعلیم عملی رنگ میں ہے۔ ضروریات انسانی کو وہ نظر انداز نہیں کرتا۔ ہاں بقدر حاجت اپنے نفس اور اہل اور اولاد اور اقارب پر خرچ کر کے اگر باقی کو خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے تو وہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ مسلمان اس پر عامل ہوں تو آج کروڑوں نہیں اربوں روپیہ ان کے قبضہ میں ہو سکتا ہے جو ضروریات دینی پر وہ خرچ کر سکتے ہیں۔

ع۲۸۳ تخالطوهم۔ خلط سے ہے جس کے معنی دو یا زیادہ چیزوں کے اجزا کو باہم ملا دینا ہیں اور دوست اور شریک اور ہمسایہ کو خَلِیط کہتے ہیں (غ) پس مخالطت سے مراد شرکت یا باہم مل جل کر رہنا ہے۔

اخوان۔ اَخ کی جمع ہے وہ جو ولادت میں ماں یا باپ یا دونوں کی طرف سے شریک ہو مگر استعارۃً قبیلہ یا دین یا صنعت یا معاملہ یا محبت کے شریک پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ)

اعنتکم۔ معانتۃ اور مُعانَدۃ ایک ہی ہیں۔ مگر معانتۃ زیادہ شدت کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ وہ ایسی معاندۃ ہے جس میں خوف اور ہلاکت ہو، اور عَنَت کسی ایسے امر میں مبتلا ہونے کا نام ہے جس میں ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو (غ) اور عنت مشقت، فساد، ہلاکت، گناہ، غلطی، خطا۔ زنا سب پر بولا جاتا ہے (ت) ذٰلك لمن خشى العنت منكم (النساء۴ - ۲۵) ودّوا ما عنتم (اٰل عمرٰن۳ - ۱۱۷) عزيز عليه ما عنتم (التوبة - ۱۲۸) اور عنت الوجوه للحى القيوم (طٰه۲۰ - ۱۱۱) میں عنت بمعنی ذلّت وخضعت ہے (غ) یعنی ذلیل ہو گئے۔ يعلم المفسد من المصلح۔ چونکہ علم کے معنی میں تمیز یا دو چیزوں کا الگ الگ کرنا بھی داخل ہے اس لیے اس کا صلہ مِنْ بھی آتا ہے اور ایسے موقعہ پر عموماً معنی تمیز کرنے کے ہوتے ہیں۔

یتیموں سے مخالطت یہ ہے کہ ان کو کھانے پینے میں، رہنے میں، تجارت میں شریک کر لیا جائے۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ دوسری طرف یتیم کے مال کی حفاظت کی سخت تاکید تھی۔ چونکہ یتامٰی کے بالکل علیحدہ رکھنے میں بھی نقصان تھا اور یتیم کے ولی کے لیے بھی سخت مشکلات ہوتیں اس لیے مخالطت کی اجازت دی۔ کھانے پینے اور معمولی میل جول کی تجارت کی شراکت سے بھی بڑھ کر ضرورت ہے تاکہ ان کے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا ہوں۔ ابو مسلم کے نزدیک مخالطت سے مراد مصاہرت ہے یعنی وہ تعلقات جو نکاح کے ذریعہ قائم ہوتے ہیں۔ آج کل جو اسلامی انجمنیں کچھ یتامٰی کی خبر گیری اپنے ذمہ لیتی ہیں تو ان کو ایسی صورت میں رکھا جاتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ ان کا میل جول بہت کم ہوتا ہے اور ایسا رنگ اختیار کیا جاتا ہے جس سے ان کو اپنے یتیم ہونے کا احساس تازہ ہوتا رہتا ہے اور اس کا اثر آخر کار اخلاق پر بہت بُرا ہوتا ہے کیا ہی اچھا ہو کہ یتیموں کو بصورت طالب علمی وغیرہ دوسرے طالب علموں کے اندر ملا کر رکھا جائے۔ اس سے بدتر حالت یہ ہے کہ یتیموں کو گداگری پر مقرر کیا جاتا ہے کہ اپنا یتیم ہونا پیش کر کے ریلوے اسٹیشنوں پر اور بازاروں میں چندہ جمع کرتے پھریں۔ یہ اسلام کی تعلیم کے سراسر منافی ہے۔

يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَى الْجَنَّةِ
وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ
ع ۲۷ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۲۱﴾
وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى
فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ
حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ
حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ
وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿۲۲۲﴾

کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنی باتیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔[۲۸۴]

اور تجھ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ یہ ضرر (کی بات) ہے۔ پس حیض میں عورتوں سے الگ ہو اور ان کے نزدیک نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ صاف ہو جائیں پھر جب غسل کر لیں تو ان کے پاس جاؤ، جس طرح تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔ اللہ (اپنی طرف) رجوع کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے اور وہ پاکیزگی اختیار کرنیوالوں سے محبت رکھتا ہے۔[۲۸۵]

ع۲۸۴ تنکحوا۔ نکح اس کا اصل ہے اور نکاح کے اصل معنی عقد زوجیت ہیں یعنی مرد اور عورت کا عقد۔ اور زنا شوئی کے تعلق پر بھی بطور استعارہ بولا گیا ہے (غ)

امۃ۔ مادہ امو ہے اور اَمَۃ مملوکہ عورت یعنی لونڈی کو کہتے ہیں۔

عَبْد۔ عبُودِیّۃ کے معنی تَذَلّل ہیں یعنی عاجزی اختیار کرنا اور عَبْد چار طرح پر بولا جاتا ہے اوّل بمعنی مملوک یعنی غلام اور اس کی جمع عَبِید آتی ہے دوئم وجود میں لایا جانے کے لحاظ سے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے ان کل من فی السمٰوٰت والارض الآ اٰتی الرحمٰن عبدا (مریم ۱۹-۹۳) تیسرا عبادت اور خدمت سے عَبْد اور یہ دو قسم ہیں ایک اللہ کے عَبْد یعنی خالص اس کی عبادت کرنے والے جیسے عبدنا ایوب۔ نزل الفراٰن علیٰ عبدہ۔ انہ کان عبدا شکورا۔ جہاں کہیں نیک بندوں کا عَبْد ہونا بیان کیا ہے وہ بمعنی عابد ہے لیکن عَبْد۔ عابد سے ابلغ ہے اور دُوسرے وہ جو دنیا کے بندے بن جاتے ہیں جن کی غرض دنیا اور اس کا مال ہوتا ہے۔ جیسے آنحضرتؐ نے فرمایا تَعِسَ عبدُ الدِرھم تَعِسَ عبد الدِینار اور عبد بمعنی عابد کی جمع عباد آتی ہے یہاں عَبْد بمعنی غلام ہے (غ)

مغفرت۔ غفر کے لیے دیکھو ع۲۵۸ یہاں مغفرۃ بمعنی حفاظت ہے کیونکہ جنت کے بعد مغفرت کو رکھا ہے اللہ جنت کی طرف بلاتا ہے اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے جس سے مغفرت کا بلند مقام معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً اللہ کی مغفرت گناہوں کی معافی سے بہت بڑھ کر مقام ہے۔ کیونکہ گناہوں کی معافی سے انسان جنت میں داخل ہو جاتا ہے مگر مغفرت کی ضرورت جنت میں داخل ہونے کے بعد بھی ہے۔

مشرکین سے تعلقات نکاح کی ممانعت: جنگوں کی وجہ سے یہ ضرورت پیش آ گئی تھی کہ کفار سے نکاح کے تعلقات جو باہم موّدت و محبّت کو چاہتے ہیں قطع کیے جائیں مگر اس ضرورت پر جو حکم دیا گیا وہ اپنے اندر عمومیت کا رنگ رکھتا ہے اور سب مشرکوں کے متعلق ہے کیونکہ جنگ مشرکوں سے تھی۔ یعنی مسلمان مرد کا مشرک عورت سے اور مسلمان عورت کا مشرک مرد سے نکاح منع کر دیا۔ جو پہلے نکاح ہو چکے ہوئے تھے ان کا حکم دوسری جگہ سورہ ممتحنہ میں ہے اور گو مسلمان مرد ول کا اہل کتاب کی عورتوں سے دوسری جگہ نکاح جائز قرار دیا گیا ہے۔ مگر مشرک عورت سے کسی صورت میں نکاح جائز نہیں۔ مشرک سے بیزاری عملی رنگ میں: قرآن کریم نے شرک کو تمام بدیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ اس لیے شرک کی تمام رسومات کی ایک ایک کر کے بیخکنی کی ہے یہاں تک کہ ان کھانے کی چیزوں کو بھی حرام قرار دیا ہے جو دیوتاؤں وغیرہ کے نام پر مخصوص کی گئی ہوں۔ اسی طرح مشرکین کے ساتھ تعلقات معاشرت کو بھی روکا ہے۔ یعنی نہ مشرک عورت مسلمان مرد کے گھر میں ہو، نہ مسلمان عورت مشرک مرد کے گھر میں۔ اور یوں شرک سے کامل بیزاری کی تعلیم عملی رنگ میں مسلمان کی زندگی میں داخل کر دی ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ مشرک ہیں۔ عیسائی جو حضرت مسیح کو خدا مانتے ہیں وہ بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔ مسیح پرست عیسائی عورتوں سے نکاح کا نتیجہ ہی ترک قوم کی تباہی ہے۔ یہ دنیوی نار ہے جس میں اس خلاف ورزیٔ حکم الٰہی نے مسلمانوں کو ڈالا ہے اور اس کے بالمقابل وہ جنت و مغفرت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ بلاتا ہے یعنی شرک سے کامل بیزاری۔ بعض فقہا کے نزدیک مشرک میں اہل کتاب شامل نہیں بلکہ خاص عرب کے مشرک مراد ہیں اور اس لیے ان کے نزدیک عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ وہ مشرکہ ہوں۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ مسلمان جن کو شرک اور مشرکانہ امور سے اس قدر قطع تعلق کی تعلیم دی گئی تھی آج سرتاپا خود مشرکانہ رسوم میں غرق ہیں اور قطع تعلق تو ایک طرف رہا خود ان تمام امور میں ملوث ہو گئے ہیں جن سے نہ صرف دُور رہنا بلکہ جن کا دور کرنا ان کا کام تھا۔

ع۲۸۵ المحیض۔ حیض وہ خون ہے جو خاص ایام میں خاص طور پر رحم سے جاری ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں ان کو ماہواری ایام کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ عموماً انتیس تیس دن میں ایک دفعہ یہ دن عورتوں پر آتے ہیں اور محیض حیض پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کے وقت پر بھی اور موضع پر بھی۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۲۲۳

وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا

تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتی ہیں پس جب چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ[۲۸۶] اور اپنے لیے (کچھ) آگے بھیجو اور اللہ کا تقوےٰ اختیار کرو، اور جان لو کہ تم اس سے ملنے والے ہو اور مومنوں کو خوش خبری دو۔

اور اللہ کو اپنی قسموں کی آڑ نہ بناؤ کہ نیک سلوک اور تقوےٰ اور

اذی۔ المکروہ الیسیر (ت) یعنی چھوٹی سی مکروہ یعنی ناپسندیدہ بات یا الشر الخفیف یعنی تھوڑی تکلیف اور جب زیادہ ہو تو اس کو ضرر کہا جاتا ہے (ت)

اعتزلوا۔ اعتزال عزل سے ہے کسی چیز سے الگ ہو جانا یہاں عورتوں سے الگ ہونا بطور کنایہ ہے یہ مراد نہیں کہ اس گھر میں نہ رہو یا اُن کو چھوؤ نہیں جس طرح ہماری زبان میں کہتے ہیں عورت کے پاس نہ جانا۔

یطھرن۔ طھر نقیض نجاست بھی ہے اور نقیض حیض بھی اور عورت کو جب حیض سے نکل جائے تو طاھر کہا جاتا ہے اور پلیدی اور عیب سے پاک ہو تو طاھرۃ کہا جاتا ہے اور طَھُرَت کے معنی ہیں خون حیض بند ہو گیا اور تطھرت اور اطَّھَّرت کے معنی ہیں اس نے غسل کیا (ت) جس طرح انسان کی طہارت کی حالت وہ ہے جس میں وہ ترقی اور نشو و نما کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ کیونکہ نجاست مانع ترقی ہے اسی طرح عورت میں حالت طہر وہ ہے جس میں استقرار حمل ہو سکتا ہے اس لیے گو حالت حیض میں عورت بذاتہ نجس نہیں ہوتی لیکن اس حالت پر طہر کا لفظ اسلیئے نہیں بولا گیا کہ وہ اس حالت میں نسل انسانی کی ترقی کی اس غرض کو پورا کرنیکے قابل نہیں ہوتی جس کے لیے قدرت نے اسے بنایا ہے۔ زبان بھی پُر حکمت ہے۔

مسائل طلاق کا تعلق جنگ سے: یہاں سے اکتیسویں رکوع کے آخر تک حیض طلاق اور بیوہ عورتوں کے متعلق مسائل کا ذکر ہے۔ یہ چند ایک فروعی مسائل ہیں جن کا باہم بھی تعلق ہے اور جنگ سے بھی۔ جنگ سے عورتیں بیوہ ہوتی ہیں اور ان کے نکاح اور عدت کے احکام کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ احکام مطلقہ عورتوں کی عدت وغیرہ کے احکام سے ملتے جلتے ہیں اس لیے طلاق کے مسائل کا ذکر آیا اور مسئلہ طلاق کا تعلق ایام ماہواری سے ہے کیونکہ ان ایام میں طلاق ناجائز ہے۔ اس لیے یہاں سے ابتدا کی پھر طلاق کے مسائل بتائے پھر بیوہ عورتوں کے علاوہ ازیں جنگ کی حالت میں قومیں اپنے عام قوانین کو درست نہیں کر سکتیں۔ اس کے برخلاف اسلام کی قریباً ساری شریعت حالتِ جنگ میں ہی نازل ہوئی گویا اگر ایک طرف جنگ درپیش ہے اور اس کا ایک لمبا سلسلہ کئی سالوں پر پھیلا ہُوا ہے تو دوسری طرف کل اصلاح قومی کے کام بھی انہی ایام میں تکمیل پاتے ہیں اور کون قوم اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے۔

یہاں سوال ایام حیض میں مقاربت کا ہے جیسا کہ جواب سے ظاہر ہے اس لیے ھو اذی میں اشارہ مقاربت کی طرف ہے یعنی ایام حیض میں عورت سے مقاربت ضرر رساں ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ حیض خود ضرر رساں ہے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک عورت حالتِ حیض سے نکل کر غسل نہ کرلے یا بوجہ کسی مجبوری کے تیمم کے ذریعہ سے طاہر نہ ہو جائے اس کے قریب جانا منع ہے اور قرآن کریم نے بھی لفظ تطھرن اختیار کر کے غسل کی طرف اشارہ کیا ہے مگر امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک جب حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت گزر جائے جو دس دن ہے تو پھر محض خون کا بند ہونا کافی ہے۔ آیت کے آخری الفاظ میں کہ اللہ تعالیٰ پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت کی طرف توجہ دلائی۔

۲۸۶ انّٰی۔ مفردات میں ہے کہ انّٰی میں حالت اور مکان دونوں کا تعلق ہوتا ہے اس لیے وہ اَین یعنی جہاں اور کَیف یعنی جس طرح دونوں معنی میں آتا ہے۔ ضحاک سے یہاں انّٰی کے معنی متیٰ یعنی جب مروی ہیں۔ اور روح المعانی میں ہے کہ یہ تینوں معنی جم غفیر سے ثابت ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں انّٰی شئتم من اللیل والنھار جب چاہو رات کو یا دن کو یہی معنی ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں۔

قرآن کریم ایک کامل کتاب ہے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ تمام حالات انسانی کے متعلق ضروری ہدایات دیتا۔ انہی میں مرد اور عورت کے تعلقات بھی ہیں۔ مگر قرآن شریف کا یہ کمال ہے کہ ان تعلقات کے اظہار میں بھی ایسے لفظ استعمال کیے ہیں جو نازک سے نازک کان پر گراں نہیں گزرتے اور یہ سب باتیں بھی بتا دیں ہیں۔ بائبل میں فحش قصے: بائبل جسے عیسائی دنیا مقدس کتاب کہہ کر اسے تمام عالم سے منوانا چاہتی ہے اس کے اندر ایسے مضامین محض قصوں کے رنگ میں ہیں کہ جن کو تنہائی میں بھی ایک شخص پڑھ کر شرم سے پسینہ پسینہ ہو جائے۔ اس تہذیب کے زمانہ میں سوامی دیانندجی نے جو کچھ نیوگ کے بارہ میں ستیارتھ پرکاش کے چوتھے باب میں لکھا ہے اور پھر اسی باب کی دفعہ ۱۴۳ میں جن خیالات کا اظہار گربھا دان سنسکار کے نیچے کیا ہے وہ مرد اور عورت کے تعلقات میں ایسے ننگے الفاظ ہیں جن کو ایک عامی آدمی بھی کسی مہذب مجلس میں ہرگز استعمال نہیں کر سکتا۔ مگر زمین عرب کا ایک اُمّی آج سے تیرہ سو سال پیشتر کس طرح ان نازک تعلقات کو پاک اور شستہ الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ یہ بجائے خود اس کا معجزہ ہے حالانکہ اسی زمانہ کے عربی اشعار میں جن تعلقات کا ذکر نہایت فحش الفاظ میں پایا جاتا ہے اور عام مذاق یہاں تک بگڑا ہوا ہے کہ ان اشعار کو فخریہ مجلسوں میں دہرایا جاتا ہے۔

عورت کے بمنزلہ کھیتی ہونے سے مراد: ایسا ہی یہ بھی ایک مضمون ہے جسے نجاست پسند لوگ خواہ مخواہ محل اعتراض بناتے ہیں۔ یہاں فرمایا کہ عورت تمہارے لیے بمنزلہ ایک کھیتی کے ہے گویا مرد و عورت کے تعلقات کا حقیقی مقصود نسل انسانی کا بڑھانا ہے تو چونکہ ایام حیض میں علاوہ بیماری اور ضرر کے اندیشہ کے

وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٢٤﴾

لوگوں کے درمیان اصلاح نہ کرو اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۸۷

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٢٥﴾

اللہ تمھاری بلا ارادہ قسموں پر تمھیں نہیں پکڑتا، لیکن وہ اس پر تمھیں پکڑتا ہے جو تمھارے دلوں نے کمایا ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔ ۲۸۸

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢٦﴾

ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں کے حق نہ دینے کی قسم کھا لیتے ہیں چار ماہ کا انتظار ہے پھر اگر وہ رجوع کریں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ۲۸۹

یہ مقصود بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایام حیض میں جو عورتوں کے قریب جانے سے منع کیا تھا کہ وہ ایک دُکھ اور ضرر کی بات ہے۔ اَنّٰی شِئْتُمْ سے مراد اس کی ایک دوسری وجہ یہاں بیان فرمائی ہے کہ جب اصل غرض نسل انسانی کی نشو و نما ہے جس طرح کھیتی میں اصل غرض بیج کی نشو و نما ہے تو ایام حیض میں عورت کے قریب جانا درست نہیں۔ بیشک ان کے پاس جاؤ مگر اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس کی کوئی غرض ہے۔ اس غرض کو مدنظر رکھو تو جب چاہو یا جس طرح چاہو یا جہاں چاہو، ان کے پاس جاؤ اور اس سے پہلی آیت میں صاف فرما دیا کہ ان کے پاس جس طرح تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے جاؤ۔ اللہ کا حکم فطرت انسانی کے مطابق ہے اور مذہب اسلام کو اسی لیے فطرت کا مذہب بتایا فطرت اللّٰہ التی فطر الناس علیہا (الروم ۳۰-۳۰) پس خلاف فطرت کی تو خود یہاں تردید موجود ہے۔ ایسی پاک کتاب پر محض اس لیے کہ الفاظ میں کنایہ اختیار کیا گیا ہے وہ اعتراض کرنا جو اس کے صریح مقصود اور منشاء کے خلاف ہے ایک ذلیل حرکت ہے۔

ع ۲۸۷ عُرضۃ۔ عَرَض سے ہے دیکھو ع ۱۰۶ اور عُرضۃ وہ چیز ہے جو کسی چیز کے سامنے حائل کر دی جائے (رغ) ڈھال کو بھی عرضۃ کہتے ہیں۔

ایمان۔ یمین کی جمع ہے۔ اصل معنی دایاں ہاتھ، استعارۃً قسم کے لیے استعمال ہوتا ہے باعتبار اس فعل کے جو حلف اُٹھانے والا یا معاہدہ کرنے والا کرتا ہے (رغ)

تبرّوا۔ برّ کے معنی کے لیے دیکھو ع ۶۷ اور برّ الوالدین کے معنی ہیں ان کے ساتھ احسان میں توسع یعنی فراخی (رغ) یہی معنی تبروا کے یہاں ہیں اور یہی الممتحنۃ ۶۰-۸ میں جہاں غیر مسلموں سے سلوک کا ذکر ہے۔

طلاق کے مسائل کے لیے ہی ایک امر کا ذکر ہو چکا اب اسی ذکر میں ایک دوسرے تمہیدی امر کا ذکر فرماتا ہے۔ طلاق کی ایک قسم عرب میں ایلاء کے نام سے مشہور تھی جس کا ذکر اگلی سے اگلی آیت میں آتا ہے جس میں مرد قسم کھا لیتا تھا کہ وہ عورت کے پاس نہیں جائے گا۔ چونکہ سب سے پہلے اس قسم کی طلاق کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے اس لیے تمہیداً قسم پر کچھ فرمایا اور اس قسم کو ان قسموں میں سے ایک قرار دے کر جن میں انسان ایک نیکی یا نگہداشت حقوق یا اصلاح کے کام سے رک جاتا ہے اس سے روکا ہے اور ساتھ ہی ایک عام اور وسیع تعلیم دیدی ہے کہ کبھی اپنے آپ کو ایسے امر کا پابند نہ کرو جس میں اچھے کام کرنے سے رک جاؤ۔ یا جو حقوق تمھارے ذمہ ہیں ان کی رعایت نہ کر سکو یا اصلاح کی بات کو ترک کرنا پڑے خواہ اللہ کی قسم ہی کیوں نہ کھالی ہو۔ یعنی اپنی طرف سے ایسا عہد اللہ کے ساتھ ہی کیوں نہ کر لیا ہو۔ جب ایسا عہد اللہ کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ وہ تو نیکی سکھاتا اور رعایت حقوق کی تاکید کرتا ہے تو دوسروں کے ساتھ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ جن ملازمتوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے حقوق چھیننے یا ان کو دکھ دینے کی نوبت پہنچے وہ بھی اس کے ماتحت آجاتی ہیں۔

ع ۲۸۸ اللغو۔ لغو کلام وہ ہے جو شمار کے قابل نہ ہو یعنی غور و فکر سے نہ کی جائے۔

حلیم۔ حلم کے معنی نفس اور طبیعت کو غضب کے جوش میں آنے سے روکنا ہے (رغ) اور حلیم جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں آیا ہے اس کے معنی لسان العرب میں الصبور دیئے ہیں جس کی تشریح یوں کی ہے کہ اسے نافرمانوں کی نافرمانی ہلکا نہیں بناتی نہ ان پر غضب اسے اپنے آپے سے باہر کر دیتا ہے۔ لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو انسان معمولی بات چیت میں عادت کے طور پر کھا لیتا ہے۔ عرب کے لوگ بات بات پر کہہ دیا کرتے تھے لا واللّٰہ۔ بلیٰ واللّٰہ ہمارے بعض فاضل بھی اپنی فضیلت کے اظہار کے لیے واللّٰہ باللّٰہ ثم تاللّٰہ کے سوائے گفتگو نہیں کر سکتے۔ بما کسبت قلوبکم سے مراد وہ قسمیں ہیں جو انسان قصد اور ارادہ سے کھاتا ہے۔ اس طرح کی قسم کے لیے دوسری جگہ کفارہ کا دینا مذکور ہے (المائدۃ ۵-۸۹) لغو قسم کھانے کی ممانعت: مگر لغو قسم پر جو بے سوچے سمجھے کھائی جائے یہ سختی نہیں رکھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لغو قسمیں کھانے سے نہیں روکا بلکہ والذین ہم عن اللغو معرضون (المومنون ۲۳-۳) میں ہر لغو بات اور فعل سے روکا ہے اور خود قسم کی حفاظت کا ذکر دوسری جگہ ہے واحفظوا ایمانکم (المائدۃ ۵-۸۹)

ع ۲۸۹ یؤلون۔ اِلی حرف ہے جو ہر شش جہات میں کسی نہایت کو ظاہر کرتا ہے اور اَلَوتُ فی الامر کے معنی ہیں میں نے اس امر میں کوتاہی کی۔ گویا اس میں کام کرنے والا انتہا کو دیکھ لیتا ہے اور آگے نہیں چلتا لا یالونکم خبالا (آل عمران ۳-۱۱۸) اور ایلاء وہ قسم ہے کہ جس کی غرض کسی کام میں یعنی کسی حق کی ادائگی میں کوتاہی کرنا ہو۔ اصطلاح شریعت میں ایلاء یہ ہے کہ مرد قسم کھالے کہ میں اپنی بی بی کے پاس نہ جاؤں گا۔ یعنی ایسی قسم جس میں عورت کے حقوق کی ادائگی میں کمی واقع ہو (رغ)

وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٧﴾ اور اگر طلاق کا پختہ ارادہ کریں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔[290]
وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۚ اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں[291] اور
وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ ان کے لیے جائز نہیں کہ اسے چھپائیں جو اللہ نے اُن کے رحموں میں پیدا کیا ہے

فاؤ۔ فَیْءٌ سے ہے جس کے معنے ہیں اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا (غ)

عورت کے پاس جانے کی قسم: سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی آدمی کسی عورت کو نہ چاہتا اور یہ بھی پسند نہ کرتا کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح کرے تو قسم کھا لیتا کہ میں اس کے قریب نہ جاؤں گا اور اس طرح پر اسے معلقہ چھوڑ دیتا نہ وہ خاوند والی ہوتی نہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی۔ اور اس کی غرض صرف عورت کو دُکھ پہنچانا تھا۔ اس لیے طلاق کے مسائل میں سب سے پہلے اس بد رسم کا علاج فرمایا۔ قرآن کریم نے اوّل تو ایلاءً کو ان قسموں میں داخل کر کے جو نیکی اور نگہداشت حقوق سے رُکنے کی قسمیں ہیں منع فرمایا ہے لیکن اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو پھر صرف چار ماہ کی مہلت دی ہے یا اس عرصہ میں رجوع کرے اور رجوع کو اچھی حالت ٹھہرایا ہے جیسا کہ لفظ فاؤ کے استعمال سے ظاہر ہے۔ چار ماہ گزرنے کے بعد بعض کے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے لیکن دوسری جگہ نکاح کرنے کے لیے اسے پھر عدّت پوری کرنی چاہیئے اور بعض کے نزدیک چار ماہ گزرنے پر عورت بذریعہ حاکم خاوند کو مجبور کر سکتی ہے کہ یا وہ رجوع کرے اور یا طلاق دیدے الفاظِ قرآنی پہلے خیال کے موید ہیں۔

ع[290] عزموا۔ عَزْم کسی کام کے کر گزرنے پر دل کو مضبوط کر لینا ہے۔

الطلاق۔ طلاق کے اصل معنی بندش سے آزاد کرنا ہیں اور معاہدہ نکاح سے آزاد کرنے پر بالخصوص بولا گیا ہے۔

یہاں سے طلاق کا مضمون شروع ہوتا ہے۔ عربوں میں طلاق کے متعلق حد درجہ کی آزادی تھی۔ عورت کی کوئی منزلت نہ تھی۔ نہ معاہدۂ نکاح کو کچھ وقعت دی جاتی تھی جب چاہا طلاق دیدی جب چاہا واپس لے لیا۔ یہودیوں کی شریعت میں بھی نسبتاً طلاق میں زیادہ آزادی تھی بالمقابل بعض اقوام مثلاً ہندوؤں میں نکاح کا فسخ ہونا کسی حالت میں بھی جائز قرار نہیں دیا ہے۔ عیسائی مذہب کی جو بنیادی اینٹ طلاق کے مسئلہ میں ہے وہ ایسا تنگ قانون ہے کہ آج عملاً تمام عیسائی اقوام خود اسے ترک کر چکی ہیں۔ انجیل میں ہے: "یہ بھی کہا گیا کہ جو کوئی اپنی جورو کو چھوڑ دے اسے طلاق نامہ لکھ دے پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو زنا کے سوائے کسی اور سبب سے چھوڑ دیوے اس سے زنا کرواتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے زنا کرتا ہے (متی ۵:۳۱-۳۲) اس بنیاد پر جو عمارت عیسائی اقوام نے قانون طلاق کی بنائی تھی آج اسے زمانہ نے پاش پاش کر دیا۔ کونسا عیسائی ملک ہے جس میں آج ان الفاظ کو ردّی کی ٹوکری میں نہیں پھینکا گیا۔ آئے دن ان کے خلاف قانون بنتے ہیں اور مسیح کو خدا خدا کر کے پکارنے والے پارلیمنٹوں میں اکٹھے ہوتے اور ان الفاظ کو ناممکن العمل قرار دیتے ہیں۔ کیوں نہ ہو خدا نے خود آ کر یہ تھوڑی سی شریعت بنائی تھی۔ پھر اس مذہب کو دنیا میں پیش کرنا کیا شرم کی بات نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں نے جب طلاق کے معاملہ میں افراط کی تو حضرت مسیحؑ نے جن کی تعلیم خود مختص القوم اور مختص الزمان تھی۔ وقتی علاج کے طور پر ہدایت دی تھی اور ہمیشہ تک رہنے والی شریعت جو تمام معاملات میں اعتدال کی راہ پر چلاتی بعد میں آنے والی تھی۔

اسلام نے طلاق میں اعتدال قائم کیا: چنانچہ اسلام نے طلاق کے مسئلہ کو صحیح بنیاد پر قائم کیا نہ تو یہودیوں اور عربوں والی آزادی باقی رکھی نہ ہندوؤں اور عیسائیوں کی تنگی کو ممکن العمل قرار دیا اور ایک ایسے میانہ راہ کی ہدایت کی جس کی طرف آج خود ساری دنیا کا رجحان ہو رہا ہے یعنی ایک طرف اگر طلاق کی اجازت دی تو دوسری طرف بہت سی قیود اور شرائط کے ماتحت اسے کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے اصل منشاء کو سمجھ کر فرمایا اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ تمام حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسند چیز خدا کو طلاق ہے۔ یہ لفظ ہر ایک مسلمان کے لیے سوائے اشد ضرورت کے کافی روک ہیں۔ طلاق کے مسئلہ میں جس قدر حد بندیاں قرآن شریف نے قائم ہیں ان کا ذکر آگے آتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اسلام نے ان وجوہ کو معین و مخصوص نہیں کیا جن پر طلاق دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اسلام کا وسیع قانون سب زمانوں اور سب قوموں کے لیے تھا۔ ایسی وجوہات کا معین کرنا درست نہ ہوتا۔ آج عیسائی اقوام کی جو سب ایک ہی مذہب کے پیرو ایک ہی درجہ تعلیم و ترقی پر یکساں قوانین معاشرت و تمدن کے پیرو ہیں یہ حالت ہے کہ ان میں سے کوئی دو قومیں اس بات پر متفق نہیں کہ وجوہات طلاق کن کن امور کو رکھا جائے پس اسلام نے ایک ایسی راہ بتائی ہے جو تمام نقصوں سے خالی ہے آج سے تیرہ سو سال پیشتر عرب کا ایک اُمّی اپنے ذہن سے یہ قانون بنا سکتا تھا جب آج بڑے بڑے مہذب اور تعلیم یافتہ بھی اس سے عاجز ہیں۔

ع[291] قروء۔ قَرْءٌ کی جمع ہے اور قُرْءٌ حقیقت میں حالتِ طہر سے حالت حیض میں داخل ہونے کا نام ہے اور چونکہ دونوں باتوں کا جامع ہے یعنی طہر اور حیض کا اس لیے بعض وقت دونوں پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے (غ) مفردات میں ہے کہ ہر ایک اسم جو دو صفتوں کو اکٹھا چاہتا ہو وہ الگ الگ بھی ہر ایک پر بولا جا سکتا ہے پس ثَلٰثَۃَ قُرُوْٓءٍ یہ ہے کہ عورت تین دفعہ حالت طہر سے حالت حیض میں داخل ہو۔

طلاق حالت طہر میں ہو سکتی ہے: ان الفاظ میں گو بظاہر عدت کا ہی ذکر ہے مگر لفظ قروء کو لا کر یہ بتا دیا ہے کہ طلاق دینے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ حالت طہر میں دی جائے۔ کیونکہ عدت شروع نہیں ہو سکتی جب تک حالت طہر موجود نہ ہو جس سے حالت حیض کی طرف انتقال ہو برخلاف بیوہ کے کہ وہاں عدت دنوں

اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِؕ
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا
اِصْلَاحًاؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۪
ع ۲۸ ۱۲ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۲۲۸

اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں ۲۹۲ اور اس (اثناء) میں اُن کے خاوند اُن کو واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ اصلاح چاہیں ۲۹۳ اور ان کے لیے پسندیدہ طور پر (حقوق) ہیں جیسے ان پر (حقوق) ہیں اور مردوں کو ان پر ایک فضیلت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ ۲۹۴

اور مہینوں کی گنتی سے ہوتی ہے) طلقوھن لعدتھن میں اسی طرف اشارہ ہے اور صحیح حدیث میں ہے کہ جب حضرت ابن عمرؓ نے حالت حیض میں طلاق دی تو آنحضرت صلعم سخت ناراض ہوئے اور رجوع کا حکم دیا۔ یہ شرط درحقیقت طلاق پر ایک روک ہے۔ کیونکہ حالتِ حیض میں تو مرد اور عورت الگ الگ ہوتے ہیں اس وقت طلاق کا دینا سہل ہے مگر حالت طہر میں میاں بی بی میں تعلقات محبت قائم ہوتے ہیں اس وقت طلاق دینا زیادہ مشکل ہے۔

دوسری حدبندی جو انہی الفاظ میں طلاق پر رکھی ہے وہ عدت یا زمانہ انتظار ہے۔ اس کی ایک بڑی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ تھوڑی علیحدگی میں ایک دوسرے کی قدر معلوم ہو جائے اور خیالات محبت اگر اس تعلق میں فی الواقع موجود ہیں تو ان خیالات منافرت پر جو عارضی طور پر پیدا ہو گئے ہیں غالب آجائیں۔ گویا طلاق دینے کے ساتھ فوراً واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ قریباً تین ماہ کا وقفہ دیا جاتا ہے جس میں اگر ممکن ہو تو اصلاح ہو جائے۔ نکاح تو بغیر میاں بی بی میں مودت و محبت کے اصل غرض کو پورا ہی نہیں کر سکتا اور اگر محبت نہ ہو تو نہ صرف میاں بی بی کے اخلاق ہی تباہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اولاد کے اخلاق بھی بگڑ جاتے ہیں ہاں بعض وقت اصل محبت تو موجود ہوتی ہے، مگر عارضی طور پر کوئی اسباب منافرت کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے دُور ہونے اور خیال محبت کے پھر غالب آنے کے لیے یہ وقفہ رکھ دیا۔ عدت کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس مدت میں حمل ظاہر ہو جائے۔ جیسا کہ اس سے اگلے الفاظ میں ذکر بھی کر دیا ہے۔

ع۲۹۲ ارحام۔ رَحم کی جمع ہے اور یہ معروف ہے۔

عدت کی ایک غرض تو ظاہر تھی جس کی طرف اوپر کے نوٹ میں توجہ دلائی گئی ہے اور وہ طلاق کی آزادی پر ایک حدبندی ہے۔ یہاں عدت کی ایک دوسری غرض کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی یہ کہ اگر عورت کو حمل ہو تو اس میعاد میں وہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔ چونکہ اولاد میاں بی بی کے تعلقات محبت میں ایک بڑا واسطہ بن جاتی ہے اس لیے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اکثر حالات میں بی بی کا صاحب اولاد ہونا طلاق کے لیے مانع ہو جاتا ہے

ع۲۹۳ بعولۃ۔ بَعل کی جمع ہے۔ بَعل اصل میں وہ ہے جو دوسرے پر فوقیت رکھتا ہو اور خاوند کو بھی بَعل کہتے ہیں۔

یہ طلاق پر تیسری حدبندی ہے یعنی اس وقفہ عدت کے اندر اگر اصلاح چاہیں (اور اصلاح کا تو حکم ہے) تو خاوند اس بات کا حق دار ہے کہ بی بی کو اس کی طرف لوٹایا جائے اس میں ہر ایک قسم کی جلد بازی کا جو طلاق کے معاملہ میں اختیار کی جا سکتی ہے علاج متصور ہے تین ماہ کے عرصہ میں انسان کو خوب غور و فکر کا موقعہ مل سکتا ہے اور عارضی رنجشیں دور ہو کر انسان ٹھنڈے دل سے غور کر سکتا ہے۔ اور اگر میاں بی بی میں کچھ بھی حقیقی محبت ہے تو وہ چنگاری تمام عارضی رنجشوں کو جلا کر اصلی تعلق کو قائم کر دیگی اور یہاں اصلاح کا ذکر کر کے اور احق کا لفظ لا کر بتا دیا کہ جہاں تک ممکن ہو پہلے تعلق کو قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ع۲۹۴ معروف۔ عرف سے ہے دیکھو ع۲۵۶ اور معروف اس امر کو کہتے ہیں جس کا اچھا یا پسندیدہ ہونا شریعت کی رُو سے پہچانا جا سکے (رغ)

دَرَجۃ۔ منزلۃ یا بلندی کا مرتبہ۔

عورتوں اور مردوں میں مساوات حقوق اور مردوں کی فوقیت: ان الفاظ میں قرآن کریم نے دو مشکلات کو کمال خوبی سے حل کیا ہے یعنی اوّل تو اس اصول کو قائم کیا کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ گویا بلحاظ حقوق مرد و عورت میں مساوات ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تمام مذاہب بے خبر معلوم ہوتے ہیں بلکہ آج تک مہذب اقوام نے بھی پورا پورا اس اصول کو قبول نہیں کیا۔ لیکن دوسری طرف مساواتِ حقوق سے ایک نقص پیدا ہوتا تھا۔ کہ پھر خانگی امور میں نظم کیونکر قائم رہے۔ کیونکہ کوئی نظم قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس میں ایک کو دوسرے پر کچھ فوقیت نہ دی جائے اور معاشرت یا خانہ داری جس پر نسل انسانی کی ساری بہبودی کا دارومدار ہے۔ تمدنِ انسانی کی پہلی کڑی ہے کیونکہ تمدن باہم مل جل کر رہنے کا نام ہے اور اس کی ابتدا معاشرت یا خانہ داری سے ہوتی ہے جس طرح تمدن میں مساوات کے ساتھ ایک فوقیت کی ضرورت ہے اسی طرح معاشرت میں یا گھر کے انتظام میں مساوات کے ساتھ ایک فوقیت کی ضرورت ہے تاکہ نظم قائم رہے پس مساوات حقوق کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی فرمایا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک فوقیت بھی ہے، اگر نری مساوات ہوتی تو خانہ داری تباہ ہو جاتی، اگر سلسلہ نظام عالم پر غور کیا جائے تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ مرد کو عورت پر ایک فوقیت حاصل ہے مرد میں قوت و شجاعت کے جوہر عورت سے بڑھ کر ہیں۔ گو عورت میں رحم و محبت کے جوہر مرد سے زیادہ ہوں مگر نظام عالم میں قوت و شجاعت حکومت کرنے کے لیے فوقیت دیتی ہے۔ پس نہ تو مردوں کو عورتوں کے حقوق کی مساوات کا انکار کرنا چاہیئے نہ عورتوں کو مردوں کی اس فوقیت کا جو قدرت نے

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ

(یہ) طلاق دو دفعہ ہے پھر پسندیدہ طور سے رکھنا یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرنا ہے[۲۹۵] اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم اس (مال) سے کچھ لو جو تم نے

ان کو دی ہے یہ ایک توازن ہے جس کے بغیر نظم خانگی برباد ہو جائے گا جس طرح تمدن میں ایک طرف مساوات حقوق قائم کی اور رعایا کے حقوق حکام پر قائم کیے ہیں۔ اسی طرح معاشرت میں مرد و عورت کے حقوق کی مساوات قائم کر کے عورت کے حقوق مرد پر قائم کیے ہیں۔

طلاق کے مضمون میں عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلانا اس غرض سے ہے کہ مرد یہ نہ سمجھ لیں کہ چونکہ طلاق کا دینا ان کے اختیار میں دیا گیا ہے اس لیے عورتوں کے کوئی حقوق ہی نہیں ان کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں اور یوں یہ چوتھی حد بندی طلاق پر ہے۔

ع ۲۹۵ امساك۔ کسی چیز سے تعلق رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے (غ)

تسریح۔ سرح اونٹ کو چرنے کے لیے آزاد چھوڑنا ہے اور عقدۂ نکاح سے آزاد کرنا تسریح ہے (غ) حین تسرحون (النحل [۱۶]۔ ۶)

طلاق دو دفعہ ہے۔ مفسرین کہتے ہیں وہ طلاق مراد ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہے جس کی عدت میں خاوند رجوع کر سکتا ہے۔ جس کو اصطلاح میں طلاق رجعی کہا جاتا ہے مگر حق یہ ہے کہ قرآن شریف نے دوسری کسی طلاق کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اور نہ قرآن شریف میں اور نہ حدیث صحیح میں کہیں یہ حکم ہے کہ طلاق دینے کے لیے تین دفعہ طلاق کا کہنا ضروری ہے۔ تمام مفسرین کا اسباب پر اتفاق ہے کہ یہ آیت ان تکالیف کو دور کرنے کے لیے نازل ہوئی جو عورتوں کو بار بار طلاق دیکر اور پھر عدت کے اندر رجوع کر کے پہنچائی جاتی تھیں۔ ترمذی میں اس مضمون کی حدیث بھی ہے کہ ایک شخص طلاق دیتا اور پھر رجوع کر لیتا گو ہزار مرتبہ ایسا کرے اس کا علاج قرآن شریف نے ان الفاظ میں کیا کہ طلاق اور پھر عدت کے اندر رجوع بار بار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف دو دفعہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر تیسری دفعہ طلاق دے تو پھر عدت کے اندر رجوع کا اختیار نہیں اور یہ طلاق پر پانچویں حد بندی ہے۔

پس الطلاق مرتان میں صرف عرب کی اس بیماری کا علاج ہے جو بار بار طلاق دیکر رجوع کرتے تھے۔ لیکن اس سے لوگوں نے طلاق رجعی اور طلاق بائن کی تفریق نکالی ہے اور وہ اس طرح کہ قرآن شریف جو دو مرتبہ طلاق کے بعد رجوع کی اجازت دیتا ہے تو اس کو باطل کرنے کے لیے لوگ عورت پر تین طلاق اکٹھی کہہ دیتے ہیں۔ یعنی بجائے ایک دفعہ کہنے کے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں تین دفعہ طلاق ایک ہی وقت میں کہہ دیتے ہیں اور اس کو طلاق بائن قرار دے لیا ہے یعنی اس کے بعد خاوند نہ عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے جیسا کہ آیت ع ۲۲۸ کا منشاء تھا۔ اور نہ بعد عدت کے دوبارہ اسے اپنے نکاح میں لا سکتا ہے جیسا آیت ۲۳۲ کا منشاء ہے فقہاء کے ایک گروہ نے اس قسم کی طلاق کو طلاق بائن تو قرار دیا لیکن فی الواقع یہ بتانے کو کہ یہ طریق اسلامی کے خلاف ہے اس کا نام طلاق بدعی رکھا ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس بدعت کو دور کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ اس کو تسلیم کر لیا۔ حالانکہ نبی کریم صلعم نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ رکانہ نبی کریم صلعم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بی بی کو طلاق بتہ دی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ تیرا ارادہ کیا تھا؟ تو کہا کہ میرا ارادہ ایک ہی طلاق دینے کا تھا۔ جس پر آپ نے رجوع کی اجازت دی اور نسائی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلعم کو کسی شخص کے متعلق خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بی بی کو تین مرتبہ اکٹھی طلاق دی ہے فقام غضبان ثم قال ایلعب بکتاب اللہ عز وجل وانا بین اظهركم (مشکوٰۃ) آپ سخت ناراض ہو کر اٹھے اور کہا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ ہنسی کی جاتی ہے اور میں تمہارے درمیان ہوں۔ پس آنحضرت صلعم اس کو کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیں اور آج یہ حالت ہے کہ مسلمانوں میں جب کوئی طلاق دے تو اس کا پہلا لفظ ہی تین طلاق ہوتا ہے اور یہ سارا الزام علما کے ذمہ ہے کہ وہ عوام کو اس سے آگاہ نہیں کرتے کہ یہ طریق طلاق وہ ہے جسے رسول اللہ صلعم نے کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیا ہے اگر مسلمانوں کو یہ علم ہو تو وہ کبھی جرأت نہ کریں کہ جب طلاق ایک مرتبہ کہنے سے بھی ہو سکتی ہے، تو خواہ مخواہ وہ طریق اختیار کریں جسے محمد رسول اللہ صلعم کتاب اللہ کے ساتھ ہنسی قرار دیں۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین دفعہ اکٹھی طلاق دینے کا رواج جاہلیت میں تھا اور نبی کریم صلعم نے تعلیم قرآنی کے ماتحت اسے روکا تھا مگر یہ بیماری آہستہ آہستہ پھر زور پکڑ گئی۔ یہاں تک کہ آج شاذ و نادر ہی کوئی مسلمان اس کے اثر سے خالی رہا ہے۔

اس بارہ میں حضرت عمر رض کے فیصلہ سے بھی ایک غلط نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم اور ابوبکر رض کے زمانہ اور حضرت عمر رض کی خلافت کے پہلے دو سال میں تین طلاق کو ایک ہی طلاق سمجھا جاتا تھا لیکن (لوگوں نے جب یہی طریق اختیار کر لیا تو) حضرت عمر رض نے فرمایا ان الناس قد استعجلوا فی امر كانت لهم فيه اناة فلو امضينا عليهم فامضاه یعنی لوگ اس معاملہ میں جلدی کرتے ہیں جس میں انہیں ڈھیل دی گئی تھی بہتر ہو کہ ہم ان پر اسی طرح حکم لگا دیں۔ سو ایسا ہی لگا دیا۔ اول تو ایک صحابی کا فعل حجت شرعی نہیں۔ دوسرے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رض نے یہ حکم بطور سزا جاری کیا تھا تاکہ لوگ تین دفعہ اکٹھی طلاق دینے سے رک جائیں۔ جب ان کی اصل غرض بھی اس بدعت سے لوگوں کو روکنا تھا تو ان کے فعل سے اس کا جواز کیونکر نکالا جا سکتا ہے اور ترمذی میں ہے فروی عن عمر بن الخطاب انه جعل البتة واحدة یعنی عمر رض بن خطاب سے روایت ہے کہ انہوں نے طلاق بتہ یعنی تین طلاق کو ایک ہی قرار دیا پس ممکن ہے کہ آپ نے وہ حکم صرف عارضی طور پر جاری کیا ہو۔ بہرحال ان کا یہ فعل کسی صورت میں تین اکٹھی طلاق کو تین علیحدہ علیحدہ طلاقوں کا قائم مقام نہیں بنا سکتا جب نبی کریم صلعم سے اس کے خلاف مروی ہے۔

فقہا نے طلاق کو تین قسم قرار دیا ہے۔ طلاق بدعی۔ یہی جس کا ذکر اوپر ہوا اور جو کسی صورت میں جائز نہیں مسلمانوں کو اس سے رُکنا چاہیئے۔ دوسری قسم کی طلاق

اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ
اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ

انھیں دیا ہے[296] سوائے اس کے کہ دونوں کو ڈر ہو کہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے پس اگر تمھیں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو پھر ان پر اس میں کچھ گناہ نہیں جو عورت فدیہ میں دیدے[297] یہ اللہ کی حدیں ہیں پس ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو اللہ کی حدوں سے آگے

وہ ہے جسے وہ حسن کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مرد تین طہروں میں الگ الگ تین طلاقیں دے اس کو بھی بائن قرار دیا ہے اس کی کوئی سند بھی صراحت سے نہیں ملتی۔ قرآن شریف میں تو قطعاً یہ ذکر نہیں کہ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں بلکہ صاف الفاظ ہیں فطلقوھن لعدتھن یعنی جب ایک طلاق دی تو اب اس کے لیے ایک عدت ہے جو تین قروء ہے اور جب ایک طلاق کے بعد تین قروء انتظار کا حکم صراحت سے قرآن شریف میں موجود ہے تو پھر دوسری تیسری طلاق کیا ہوئی؟ اور اس کے بعد وہ انتظار بموجب حکم قرآن کیوں نہ ہو؟ کسی حدیث میں بھی جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے کوئی ایسا حکم موجود نہیں کہ طلاق اس طرح دی جائے کہ ہر طہر میں ایک طلاق ہو۔ اس لیے یہ صورت بھی اختیار کرنے کے قابل نہیں۔

تیسری قسم طلاق کی وہ ہے جسے احسن کہا جاتا ہے یعنی یہ کہ مرد عورت کو طہر میں بغیر اس کے کہ اس کے پاس گیا ہو طلاق دے یعنی ایک ہی مرتبہ اور یہی وہ طلاق ہے جو قرآن کریم کی آیات سے صاف معلوم ہوتی ہے اور جس کا پتہ احادیث سے بھی لگتا ہے اور یہی وہ طریق طلاق ہے جسے اختیار کرنا چاہیئے دوسرے طریق اختیار کرکے مسلمانوں کو اس قدر ذلت دیکھنی پڑی ہے کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا اور قرآن شریف کی صراحت کے یہ خلاف ہے کہ مرد عورت کو طلاق دے تو اسے عدت میں رجوع کا اختیار نہ رہے۔ دوسرے طریقوں کو اختیار کرنے کا نتیجہ ہی وہ حیوانیت کا طریق ہے جسے حلالہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

طلاق ایک ہی ہے خواہ سو دفعہ کہے یا تین دفعہ اور خواہ اسے ہر روز کہتا جائے یا ہر ماہ میں ایک دفعہ کہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ ہاں جب پہلی دفعہ طلاق کا لفظ منہ سے نکالا ہے۔ اس وقت سے عدت شروع ہو جاتی ہے بشرطیکہ عورت کی حالت طہر میں ایسا کہا ہو اور اگر طہر میں ایسا نہیں کہا تو جیسا کہ حضرت ابن عمر کا واقعہ صحیح احادیث میں بتاتا ہے رجوع کرنا پڑے گا جیسا کہ نبی کریم صلعم نے خود ابن عمرؓ سے کرایا۔ باقی رہا یہ کہ حالت حیض کی طلاق، ایک طلاق گنی جائے گی یا نہ، سو نبی کریم صلعم کے فیصلہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طلاق نہیں گنی جائے گی۔ کیونکہ فرض کرو ایک شخص نے دو دفعہ اپنی بی بی کو طلاق دیکر رجوع کیا تیسری دفعہ حالت حیض میں وہ طلاق دیتا ہے تو اگر یہ طلاق سمجھی جائے تو رجوع ہو نہیں سکتا۔ حالانکہ نبی صلعم نے رجوع کو ضروری ٹھہرایا کہ سوائے حالت طہر کے طلاق نہیں۔

طلاق میں حسن سلوک کا حکم: طلاق کے مسئلہ میں فامساك بمعروف نہایت اعلیٰ درجہ کا قانون ہے اس میں خاوند کی طرف سے بی بی کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا حسن سلوک ضروری ٹھہرایا ہے اور حدیث میں ہے خیرکم خیرکم لاھلہ پس اگر طبائع میں کوئی ایسی ناموافقت ثابت ہو یا کوئی ایسے تنازعات پیدا ہو جائیں جن کی اصلاح نہیں ہو سکتی تو یہ چونکہ امساك بمعروف کے خلاف ہے اس لیے تسریح باحسان ضروری ہے یعنی عورت کے ساتھ کچھ احسان کرکے رخصت کر دینا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے اس کے کہ عورت کی طرف سے کسی فحش وغیرہ کا ارتکاب ہو اس کے ساتھ طلاق میں حسن سلوک کو قرآن کریم نے ضروری ٹھہرایا ہے۔ نبی کریم صلعم کو خود بھی ایک موقعہ پر جب بیبیوں نے کچھ زیادہ اخراجات طلب کیے یہی حکم ہوا تھا کہ یہ دنیا کا مال چاہتی ہیں تو انہیں کہہ دو امتعکن واسرحکن سراحاً جمیلا (احزاب ۳۳-۲۸)

[296] مہر کی ادائیگی ضروری ہے: مما اٰتیتموھن سے مراد مہر ہے کیونکہ مہر عورت کو دیدیا جاتا تھا اور قرآن کریم نے جہاں کہیں مہر کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مہر کی رقم عورت کو ادا کر دی جاتی تھی آج کل کی طرح ایک فرضی رقم نہ تھی۔ البتہ یہ جائز ہے کہ انسان کسی مجبوری کی وجہ سے فوراً اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تو اسے بطور قرضہ اپنے ذمے سمجھے اور جس قدر جلد ممکن ہو ادا کرے۔ اور یہ طلاق پر چھٹی حدبندی ہے۔ کیونکہ عموماً مہر کی رقم اس قدر ہوتی ہے کہ خاوند کو بلاوجہ طلاق دینے میں مانع ہوتی ہے اور مہر امیر اور غریب کی حیثیت کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہے۔ آج کل جو لوگوں نے ایک فرضی شرعی مہر تبیس روپیہ کا تجویز کیا ہوا ہے اس سے بہت قباحت پیدا ہو رہی ہے کیونکہ اس طرح پر جو ایک بڑا منشا مہر کا تھا کہ وہ طلاق کی آزادی پر روک ہے وہ باطل ہو گیا ہے اور مرد عورتوں کو جس طرح چاہتے ہیں تکلیف دیتے ہیں۔ مہر کا کوئی حصہ واپس لینے کی صرف دو صورتیں ہیں جن میں سے ایک کا ذکر تو آگے آتا ہے اور دوسری کا ذکر سورۂ نساء میں ہے الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ (النساء ۴-۱۹)

[297] جس صورت طلاق کا ذکر یہاں ہے اسے اصطلاح شرعی میں خلع کہتے ہیں۔ یعنی وہ صورت جہاں عورت طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے مگر الفاظ یہ ہیں کہ دونوں حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب عورت کی طرف سے خواہش طلاق ہو گی تو یہ خطرہ ہے کہ مرد اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے زیادتی کرے اور یوں گویا دونوں حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکے، عورت اس لیے کہ وہ طلاق چاہتی ہے اور مرد اس لیے کہ وہ زیادتی کریگا اور اسے روکنے کی کوشش کریگا۔ برخلاف پہلی صورت کے جہاں زیادتی صرف مرد کی طرف سے ہے یا خواہش طلاق صرف اسی کی طرف سے ہے،

حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى
تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

بڑھتے ہیں وہی ظالم ہیں ۲۹۸
پھر اگر وہ اسے (تیسری بار) طلاق دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے پھر اگر وہ اسے طلاق دیدے تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں اگر وہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں اگر ان کو یقین ہو کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے ۲۹۹ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں وہ انھیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں۔

خان خفتم میں حکام مراد ہیں یعنی اگر عورت طلاق حاصل کرنا چاہے تو اسے قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ وہ اگر دیکھے کہ خلع ہونا چاہیئے تو خلع کرادے۔ گویا جس طرح مرد پر ایک بھاری روک مہر کی رقم ہے عورت پر طلاق حاصل کرنے میں روک یہ ہے کہ اسے قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

جمیلہ کی طلاق کا واقعہ: صحیح حدیثوں میں جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی اور اس کے خاوند ثابت بن قیس بن شماس کا ذکر موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کو طلاق حاصل کرنے کا حق اسی طرح ہے جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق ہے جمیلہ طلاق چاہتی تھی اور قیس طلاق دینا نہ چاہتا تھا جمیلہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم اس کا باغیچہ جو اس نے مہر میں دیا تھا واپس کردو گی؟ اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے قیس کو حکم دیا کہ طلاق دیدو۔ حدیث میں اس بی بی کے یہ لفظ موجود ہیں ما اعیب علیہ فی خلق ولا دین نہیں نہ اس کے اخلاق پر عیب لگاتی ہوں نہ دین پر۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں لا اطیقہ یعنی لبغضا میں اس کی برداشت نہیں کرتی یعنی مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو مرد سے طلاق حاصل کرنے کا حق نہ صرف اس صورت میں حاصل ہے کہ اس کے اخلاق پر وہ عیب لگا سکے یعنی وہ اس سے بدسلوکی کرتا ہو یا دین پر عیب لگا سکے مثلاً جو زانی ہو یا فاسق فاجر ہو بلکہ محض ناموافقت طبع کی وجہ پر بھی طلاق مل سکتی ہے چونکہ عورت کو اس قدر وسیع حق طلاق حاصل کرنے کا دیا گیا۔ اس لیے جس طرح مرد کو طلاق میں جلدی کرنے کے متعلق فہمائش کی گئی ہے عورت کو بھی خصوصیت سے طلاق میں جلدی کرنے سے روکا گیا ہے۔ ابوداؤد ترمذی وغیرہ میں حدیث ہے ایما امرأۃ سألت زوجہا طلاقا فی غیر ما باس فحرام علیہا رائحۃ الجنۃ یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بلا کسی تکلیف کے طلاق مانگتی ہے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ناموافقت طبع خود ایک تکلیف ہے۔

ناموافقت طبع کو کیوں وجہ طلاق قرار دیا گیا ہے: بظاہر خیال ہوگا کہ اسلام نے اس طرح پر عورتوں کو طلاق حاصل کرنے میں بہت آزادی دے رکھی ہے کیونکہ وہ محض ناپسندیدگی اور ناموافقت پر بھی ایک عورت کو طلاق دلا دیتا ہے۔ مگر اسلام کی تعلیم فطرت انسانی کے صحیح علم پر مبنی ہے اگر مرد اور عورت میں ناموافقت ہے تو وہ نکاح کی غرض کو پورا نہیں کرسکتے کیونکہ ایک غرض نکاح کی یہ بھی ہے کہ میاں بی بی ایک دوسرے کا لباس بنیں ایک دوسرے کے لیے تسکین اطمینان اور راحت کا موجب ہوں جیسا ھن لباس لکم وانتم لباس لھن (البقرۃ ۲ - ۱۸۷) اور لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (الروم ۳۰ - ۲۱) سے ظاہر ہے۔ وہ بصورت ناموافقت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اولاد کا پیدا کرنا اور اس کی تربیت جو ایک اور غرض ہے وہ بھی پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ ماں باپ کے جھگڑوں کا اثر اولاد کے اخلاق پر بہت بُرا ہوتا ہے۔

ع ۲۹۸ ہندوستان میں عورت کی حق طلاق سے محرومی اور اس کے بد نتائج: طلاق کے مسئلہ میں ایک بڑا بھاری ظلم جو ہندوستان میں عورتوں پر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کا حق طلاق حاصل کرنے کا سوائے بہت ہی محدود صورتوں کے تسلیم نہیں کیا گیا۔ عورتوں کے ان حقوق سے جو قرآن شریف نے ان کو دیے ہیں محروم کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ ہزارہا عورتیں بلکہ لاکھوں مصیبت اور درماندگی کی حالت میں ہیں جن کو خاوند نہ بساتے ہیں نہ چھوڑتے ہیں۔ پھر سینکڑوں عیسائی اور آریہ بن جاتی ہیں یا کوئی اور مذہب اختیار کرلیتی ہیں۔ محض اس لیے کہ خاوند کے ظلم سے نجات حاصل ہو۔ مگر ہمارے علماء اور لیڈروں کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتا دیکھ کر خاموش ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ نے عورت کے حق طلاق کے لیے کس قدر زجر کے الفاظ بھی فرمائے ہیں۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور ان سے آگے بڑھنے والے ظالم ہیں۔ مسلمان ان الفاظ پر غور کریں کہ خدائے تعالیٰ ان کو ان کے رویہ کے لحاظ سے کس گروہ میں داخل کرتا ہے۔

ع ۲۹۹ یہ طلاق کی آزادی پر ساتویں حدبندی ہے اصل میں پہلی دو طلاقیں عارضی علیحدگی ہیں کیونکہ ان کے بعد میاں بی بی پھر پہلی صورت پر رہ سکتے ہیں لیکن اس عارضی علیحدگی کا فائدہ صرف دو دفعہ دیا ہے۔ کیونکہ اگر عارضی جدائی پر حدبندی قائم نہ کی جاتی تو یہ خود ایک بیماری بن جاتی اس لیے فرمایا کہ تیسری مرتبہ طلاق کا لفظ انسان خوب سوچ کر منہ سے نکالے کیونکہ پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس تعلق کو دوبارہ قائم کرنے سے محروم کر دیا جائے گا۔ سوائے ایک صورت کے کہ وہ بی بی کسی اور خاوند سے نکاح کرے پھر وہ خاوند بھی اسے طلاق دیدے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ
بِمَعْرُوفٍ ۖ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۗ وَلَا
تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ
وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا
ع اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾
وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ
اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ ذٰلِكَ يُوْعَظُ
بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ۗ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۗ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو یا انھیں اچھی طرح رکھو یا حُسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دو اور اُن کو دُکھ دینے کے لیے نہ روک رکھو تا کہ تم زیادتی کرو۔ اور جو ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ اور اللہ کی باتوں سے ہنسی نہ کرو اور اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے، یاد کرو اور اس کو بھی جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری جس کے ساتھ تمھیں نصیحت کرتا ہے اور اللہ کا تقوےٰ اختیار کرو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۳۰۰

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں، تو انھیں اس بات سے مت روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کرلیں جب آپس میں پسندیدہ طور پر راضی ہوں۔ اس کے ساتھ تم میں سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے یہ تمھارے لیے بہت پاکیزہ اور بہت صفائی

ان الفاظ سے جو ایک مسئلہ حلالہ کا اخذ کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کی جہالت کی وجہ سے اسلام پر ایک اور بدنامی کا دھبہ ہو رہا ہے۔ عام رواج یہ پڑا ہُوا ہے کہ جہاں کوئی شخص بیوی پر ناراض ہُوا جھٹ تین طلاق کہہ دی بعد میں پچھتایا تو مُلّا صاحب نے حلالہ کا مسئلہ پیش کر دیا یعنی ایک رات کے لیے کسی دوسرے شخص سے ایک فرضی نکاح ہو جائے اور صبح کو وہ طلاق دیدے یہ ایک لعنت ہے جو مسلمانوں کے گلے پڑی ہے اس لیے کہ وہ خلاف قرآن چلتے ہیں۔ حلالہ کی رسم بھی دراصل ایک جاہلیت کی رسم تھی اور حدیث میں صاف آتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے حلالہ کرنے والے پر اور اس پر جس کے لیے حلالہ کیا گیا ہے لعنت کی ہے (مشکوٰۃ) اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس حلالہ کرنے والا اور کرانے والا لایا جائیگا تو میں دونوں کو سنگسار کروں گا۔ اور حضرت عثمانؓ سے روایت ہے ایک مقدمہ آپ کے سامنے لایا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا ہے تا کہ اس کے خاوند کے لیے حلالہ کرے۔ تو آپ نے نکاح کو فسخ کرکے دونوں کو الگ الگ کر دیا اور فرمایا کہ وہ پہلے خاوند کے پاس نہیں جا سکتی جب تک کہ خوشی سے نکاح نہ کرے اور اس نکاح میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو (روح المعانی) تو جس لعنت کو رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ نے دُور کیا تھا وہ آج مسلمانوں کے گلے پڑی ہوئی ہے اور اس کو اتارنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

نکاح عارضی نہیں ہو سکتا: اگر کسی شخص کا یہ خیال ہو کہ قرآن شریف کے الفاظ سے اس مسئلہ کی تائید ہوتی ہے تو وہ اُصولِ قرآنی سے بے خبر ہے۔ قرآن شریف ایک رات یا مقرر وقت کے نکاح کو جائز ہی نہیں رکھتا۔ نکاح تو قرآن کریم کی اصطلاح میں وہی ہے جو زندگی بھر کے لیے ہو۔ پھر مرد و عورت کی رضامندی نکاح کے لیے ضروری ہے وہ حلالہ کے لعنتی طریق میں کہاں پائی جاتی ہے یہ صریح زناکاری ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کو دور کرنے کے لیے پُورا زور لگائے۔

ف۳۰۰ بلغن۔ بلوغ یا بلاغ۔ اصل میں تو کسی مقصد کے انتہا کو پہنچ جانے کا نام ہے مگر کبھی اس کے قریب پہنچ جانے پر بھی بولا جاتا ہے (غ)
یہاں اختتام میعاد کے قریب پہنچنا ہی مراد ہے کیونکہ اگر واقعی میعاد کو پورا کرلیں تو پھر امسکوھن یعنی روک رکھنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔
اجل۔ کسی چیز کے لیے جو وقت مقرر کر دیا جائے وہ اس کی اجل کہلاتا ہے (غ) یہاں مراد عورت کی عدت ہے۔ یہاں سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک طلاق ایک ہی ہے کیونکہ اس میں رجوع کا اختیار باقی ہے ورنہ عدت گزرنے کو ہو تو روک رکھنا بے معنی ہے۔
عورت کو خاوند کی طرف سے دُکھ ہو تو قاضی طلاق دلوا سکتا ہے: دوسری بات جو اس آیت سے ظاہر ہے یہ ہے کہ عورت کو دکھ دینے کے لیے روک رکھنا ناجائز ہے پس وہ تمام حالات جن میں عورتوں کو محض دکھ دینے کے لیے روک رکھنا ثابت ہو ایسے ہیں کہ قرآن شریف کے ماتحت قاضی طلاق دلوا سکتا ہے کثرت سے ایسے واقعات ہیں کہ جن میں خاوند یہ کہہ کر عورتوں کو معلق چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم نہ تمھیں طلاق دینگے نہ بسائیں گے۔ یہ قرآن شریف کے ساتھ ہنسی ہے

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾
وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ
كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۗ
وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ۗ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا
تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ
بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ
اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا

(کی بات) ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ [301]
اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دُودھ پلائیں، اس کے لیے جو دودھ پلانے کے زمانہ کو پورا کرانا چاہتا ہے اور جس کا بچہ ہے اس پر اچھے طور پر ان کا کھانا اور ان کا کپڑا ہے۔ کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالا جاتا مگر جہاں تک اس کی طاقت ہے نہ ماں کو اپنے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ باپ کو اپنے بچے کی وجہ سے اور وارث پر بھی ایسی ہی (ذمہ داری) ہے۔ پھر اگر وہ دونوں آپس کی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو اُن پر کوئی گناہ نہیں [302]، اور اگر تم چاہتے ہو کہ اپنی اولاد کے

جیسا کہ اس آیت میں صاف فرمایا۔

ع ۳۰۱ تعضلوھن۔ عضل کے اصل معنی ہیں عَضَلَةٌ (سخت گوشت جو پٹھے میں ہوتا ہے) کے ساتھ باندھنا اس لیے سختی کے ساتھ رد کنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ)

ازکیٰ۔ اطہر۔ ذکا کے معنی میں برکت اور نشو ونما کا خیال غالب ہے اور طہر کے معنی میں نجاست وغیرہ مانع ترقی اشیاء سے پاک ہونا۔

دیکھو ع ۶۶ و ع ۲۸۵۔

طلاق میں عدت گزرنے پر پہلے خاوند اور بیوی کا نکاح جائز ہے: جس طرح طلاق کے بعد عدت کے اندر رجوع کا حق حاصل ہے اسی طرح عدت گزر جانے پر پھر اسی خاوند اور بی بی کا نکاح بھی جائز ہے۔ چنانچہ یہی معنی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت ایسے شخص کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جو اپنی بی بی کو ایک بار یا دو بار طلاق دے چکا ہو۔ پھر اس کی عدت گزر جائے تب وہ یہ چاہے کہ پھر اس سے نکاح کرے۔ صحیح بخاری میں معقل بن یسار کا واقعہ بھی اسی معنی کی وضاحت کرتا ہے معقل کی ہمشیرہ کو ان کے خاوند نے طلاق دیدی، جب اس کی عدت گزر گئی تو پھر دوبارہ اس نے نکاح کی خواہش ظاہر کی۔ معقل نے انکار کیا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی تو معقل نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح پہلے خاوند سے کر دیا۔ بی بی رضامند تھی۔

تین طلاقوں کا عدم جواز: یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ اکٹھی تین طلاقیں ناجائز ہیں کیونکہ طلاق کے بعد جو میاں بی بی کو پھر دوبارہ نکاح کر لینے کی اجازت اس آیت سے ملتی ہے وہ اکٹھی تین طلاقوں سے باطل ہو جاتی ہے اور اس کو جواز کی اور اطہر کہا تو یہ بھی ظاہر ہے کیونکہ اس کے خلاف کر کے حلالہ کا گند قبول کرنا پڑا۔

ع ۳۰۲ یرضعن۔ تسترضعوا۔ اَرْضَعَ دودھ پلایا اور اِسْتَرْضَعَ دودھ پلانے والی کو رکھا۔

تضارّ۔ گو باب مفاعلہ ہے مگر اس باب میں بعض وقت ایک ہی مراد ہوتا ہے پس اس کے معنی ضرر پہنچانا ہی ہیں۔

وعلی الوارث۔ عطف ہے وعلی المولود لہ پر اور وارث سے مراد باپ کا وارث ہے یعنی باپ مرگیا ہو تو کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری اس کے وارث پر ہے۔

فصالا۔ فصل ایک چیز کو دوسری سے علیحدہ کرنا اور فصال بچّہ کو دودھ پینے سے علیحدہ کرنا ہے۔

تشاور۔ اس کا اصل شِرْتُ الْعَسَلَ سے ہے یعنی میں نے شہد نکالا پس تشاور اور مَشُوْرَة کے معنی ہیں بات کو ایک دوسرے کی طرف لوٹا کر استخراج رائے کرنا یعنی رائے کا نکالنا (غ)

دودھ پلانے کی مدت: طلاق کے مسائل میں اولاد کو دودھ پلانے کا سوال بالخصوص پیدا ہوتا ہے۔ مگر مسئلہ عام طور پر بیان کر دیا ہے گو روٹی اور کپڑا بوجہ دودھ پلانے کے دینا صاف بتاتا ہے کہ اصل ذکر مطلقہ عورتوں کا ہی ہے۔ دودھ پلانے کی مدت دو سال بیان فرمائی۔ مگر یہ حکم نہیں کہ ضرور اس عمر تک دودھ پلایا جائے کیونکہ خود اس آیت میں ہی فرمایا کہ اگر دونوں چاہیں تو دو سال سے پہلے دودھ چھڑا دیں جیسے کہ مجاہد سے یہ معنی مروی ہیں دو سال کی مدت دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ ہے اور دودھ پلانے سے جو حرمت رشتوں کی پیدا ہوتی ہے یہ اس کی میعاد ہے۔ دو سال سے زیادہ کے بچّے کو دودھ پلانے سے حرمت پیدا نہیں ہوتی گویا ضمناً یہاں اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔

اور دوسری جگہ جو فرمایا وحملہ وفصالہ ثلٰثون شھرا جس میں حمل اور دودھ چھڑانے کی میعاد اڑھائی سال قرار دی ہے تو یہ اس کے خلاف نہیں اس لیے کہ ادنیٰ مدت حمل چھ ماہ ہے اور اس لیے بھی کہ وہاں ماں کی تکلیف کا ذکر ہے اور حمل کا بوجھ چوتھے مہینہ میں ہی شروع ہوتا ہے اور یوں حمل کی تکلیف چھ ماہ اور دودھ

اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

لیے (اور) دودھ پلانے والی رکھ لو تو تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ جو تم نے دینا تھا عمدگی سے پورا دے دو اور اللہ کا تقوےٰ کرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے ۳۰۲ الف

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور تم میں سے جو مر جائیں اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں، وہ اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن انتظار میں رکھیں پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے حق میں پسندیدہ طریق پر کریں۔ اور جو تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے خبردار ہے ۳۰۳

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

اور اس کے لیے تم پر کوئی گناہ نہیں جو تم اشارۃً (بیوہ) عورتوں کو پیغام نکاح دو یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو اللہ جانتا ہے کہ تم ان کا خیال رکھو گے، لیکن ان سے خفیہ وعدہ مت کرو ہاں پسندیدہ بات بیشک کہو۔ اور نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو یہاں تک کہ مقرر کیا ہوا وقت اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور جان لو کہ اللہ اسے جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے پس اس سے خبردار رہو

پلانا دو سال کل اڑھائی سال ہوئے۔

۳۰۲ الف سلمتم ۔ تسلیم کا مادہ بھی اسلام کی طرح سَلْم ہے اور سَلْم اور سلامۃ تو ظاہری اور باطنی آفات سے محفوظ ہونا ہے (غ)، اور سَلَّمُوْ کے معنی وقاہ ہیں یعنی اسے بچایا (ت) جیسے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ (الانفال - ۴۳) اور سلمتہ الیہ کے معنی ہیں میں نے اس کو دیدیا (ت)، اور یہی معنی سلمتم کے یہاں ہیں اور تَسْلِیم اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر راضی رہنے کو بھی کہتے ہیں۔ اور حکم کی پوری پوری فرمانبرداری کو بھی۔ جب اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے (ت) جیسے ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً (النساء - ۶۵) اور تسلیم سلام کہنے کو بھی کہتے ہیں اور وہ دعا ہے کہ ایک شخص اپنے دین اور نفس میں آفات سے بچا رہے (ت)، فاذا دخلتم بیوتاً فسلموا علیٰ انفسکم (النور ۲۴ - ۶۱)

اٰتیتم ۔ ایتاء کے اصل معنی دینا ہیں۔ ما اٰتیتم سے مراد عورت کا مہر ہے دیکھو ۲۹۶ خواہ دیدیا ہو یا ابھی دینا ہو۔ مراد یہ ہے کہ کسی دوسری دودھ پلانے والی کے رکھنے سے مطلقہ کے حقوق میں کوئی کمی نہ ہو یا اس کے مہر کا کوئی حصہ واپس نہ لیا جائے۔

۳۰۳ یتوفون ۔ مادہ وفی جس کے معنی ہیں بلوغ التمام (غ) یعنی انتہا کو پہنچ جانا۔ وفی العھد اور اوفیٰ کے معنی ہیں عہد کو پورا کیا اور توفیۃ کے معنی پورا دینا اور استیفا کے معنی پورا لینا ہیں (غ) چنانچہ وفیت کل نفس ما کسبت ۔ توفون اجورکم۔ توفی کل نفس میں وفی کے معنی (جو توفیۃ یعنی باب تفعیل سے ہے) پورا دیدیا ہے وقد عُبّر عن الموت والنوم بالتَّوَفِّی (غ) یعنی توفی (باب تفعل) سے مراد موت اور نیند ہے اور موت اور نیند میں امر مشترک قبض روح ہے سو یہی معنی توفی کے ہیں اور اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ توفاہ اللہ کے معنی قبض روحہ ہی ہیں یعنی اس کی روح قبض کر لی نہ کچھ اور۔

یذرون مادہ ذر ہے مگر اس سے ماضی نہیں آتی مضارع اور امر ہی آتے ہیں۔ اور اس کی مصدر بھی استعمال میں نہیں آتی بلکہ اس کی جگہ لفظ ترک استعمال کرتے ہیں جو اس کے ہم معنی ہے یعنی چھوڑ دینا۔

کچھ مسائل طلاق کا ذکر ابھی باقی ہے اور درمیان میں تعلق دکھانے کے لیے بیوہ عورتوں کا ذکر دیا ہے اور کچھ ذکر بیوہ عورتوں کا پھر بعد میں آئے گا۔

بیوہ کی عدت چار ماہ اور دس یوم ہے لیکن حمل ہو تو اس کی عدت دوسری جگہ مذکور ہے اور وہ وضع حمل تک ہے خواہ چار ماہ سے کم ہو یا زیادہ (الطلاق ۶۵ - ۴)

اپنے بارہ میں پسندیدہ طریق سے کچھ کرنے سے مراد یا نکاح ہے یا نکاح کی غرض سے زینت وغیرہ کرنا۔ یہاں بیوہ عورت کے نکاح کرنے کو امر معروف قرار دیا گیا ہے جو مسلمان ہندوؤں کی طرح اس سے عار کرتے ہیں وہ قرآن کریم کے صریح حکم کے خلاف کرتے ہیں۔ فیما فعلن میں فعل کو خود ان کی طرف منسوب کرنے میں اشارہ

ع ۱۴ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾
لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ
تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ
عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًاۢ
بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾
وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ
وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا
فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ
بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا
اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ

اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔[۳۰۴]
تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دیدو جب کہ تم نے
ابھی ان کو چھوا نہ ہو، یا مہر مقرر نہ کیا ہو۔ اور ان کو کچھ سامان دو
فراخی والا اپنی قدر کے موافق اور تنگدست اپنی قدر کے مطابق اچھے
طریق پر نفع پہنچانا ہے یہ نیکی کرنے والوں پر ایک حق ہے۔[۳۰۵]
اور اگر تم اُن کو طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم نے اُن
کو چھوا ہو، اور تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو اُس کا
آدھا دے دو جو مقرر کیا ہو، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں یا وہ
شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (اپنا حق) معاف
کرے اور یہ کہ تم (مرد) معاف کرو تقوے سے بہت نزدیک

یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے نکاح کی خود مختار رہیں۔

۳۰۴ عرضتم عرض سے ہے تعریض ذو وجہین کلام کو کہتے ہیں جو صدق پر بھی محمول ہو سکتی ہے اور کذب پر بھی یا ظاہر پر بھی محمول ہو سکتی ہو اور باطن پر بھی، مطلب یہ ہے کہ ظاہر لفظوں میں پیغام نہ دے کہ میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں البتہ ایسے لفظ کہدے جیسے یہ کہ تم جمیلہ ہو یا مرغوب ہو جس سے اشارہ پایا جاتا ہو تو ہرج نہیں اور یہ حکم صرف ایام عدت کے لیے ہے۔

خِطبة ۔ خَطْب کلام میں مراجعت کو کہتے ہیں۔ اور خُطبة وہ کلام ہے جس میں وعظ ہو اور خِطبة وہ جس کا مقصد نکاح کے لیے عورت سے درخواست کرنا ہو (غ)

اکننتم ۔ کِنّ وہ ہے جس میں ایک شے کی حفاظت کی جائے اور اس کی جمع اکنان ہے وجعل لکم من الجبال اکنانا (النحل ۱۶-۸۱) اور کَنَنْت کے معنی ہیں کِنّ میں کر دیا یا محفوظ کر دیا جیسے لؤلؤ مکنون (الطور ۵۲-۲۴) بیض مکنون (الصّٰفّٰت ۳۷-۴۹) کتاب مکنون (الواقعۃ ۵۶-۷۸) اور اکننتُ دل میں چھپانے سے مخصوص ہے اور جعلنا علیٰ قلوبھم اکنّۃ ان یفقھوہ (الانعام ۶-۲۵) بنی اسرائیل ۱۷-۴۶، الکھف ۱۸-۵۷ میں اور قلوبنا فی اکنّۃ (حٰم السجدۃ ۴۱-۵) میں اکنۃ کنان کی جمع ہے اور وہ وہ پردہ ہے جس میں ایک چیز چھپائی جائے (غ)

ستذکرونھن ۔ ذکر کے ایک معنی کسی چیز کا خیال دل میں کرنا بھی ہیں (غ)

کتاب ۔ یہاں بمعنی ما کُتِبَ ہے اور کُتِبَ کے معنی فُرِضَ ہیں کیونکہ کتاب کے معنی فرض کر دینا بھی آتے ہیں اور مراد عدت ہے جو فرض کی گئی ہے۔

عدت میں بیوہ کو پیغام: بیوہ کی عدت کے اندر نہ اس سے صراحتاً نکاح کا ذکر کرنا جائز ہے نہ نکاح کا فیصلہ کرنا۔ اشارہ کے طور پر جتا دینا جائز ہے۔

۳۰۵ تمسّوھن ۔ مَسّ چھونا اور کنایۃً عورت کے پاس جانے پر بولا جاتا ہے (غ)

تفرضوا ۔ فریضۃ چونکہ کسی چیز پر عمل واجب کر دینا بھی فرض ہے دیکھو ۲۵۳ پس فریضۃ وہ مہر ہے جو واجب کر دیا گیا اور تفرضوا اس کے مقرر کرنے پر کہا گیا ہے اَوْ تفرضوا میں اَوْ بمعنی وَ یا حتّی ہے

متعوھن ۔ متاع ایک لمبے وقت تک نفع پہنچانا ہے۔ یہاں مراد اس سے وہ چیز ہے جس سے مطلقہ اپنی عدت میں فائدہ اُٹھائے۔

مُقتِر ۔ قتر ۔ اِسراف کے مقابل پر ہے تھوڑا خرچ کرنے کو کہتے ہیں جیسے لم یسرفوا ولم یقتروا (الفرقان ۲۵-۶۷) کان الانسان قتورا (بنی اسرائیل ۱۷-۱۰۰) یعنی بخیل اور مقتر تنگدست کو کہتے ہیں اور قُتَار دھوئیں کو کہتے ہیں جو بھنے ہوئے گوشت یا لکڑی وغیرہ سے اٹھتا ہے اور وہ بھی ایک قلیل یا غیر نافع چیز ہوتی ہے (غ)

طلاق قبل از تقرر مہر: یہاں اس حالت کا ذکر ہے جب میاں بی بی میں خلوت نہیں ہوئی بلکہ مہر بھی مقرر نہیں ہوا (اس سے معلوم ہوا کہ اگر مہر مقرر نہ ہوا ہو تو نکاح باطل نہیں ہوتا۔ البتہ خلوت سے پہلے مہر کا مقرر ہو جانا یا دیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ہے) اس صورت میں اگر طلاق دینے کی ضرورت پیش آئے تو مہر نہیں دیا جائے گا اور عدت بھی کوئی نہیں جیسے دوسری جگہ مذکور ہے یعنی عورت کا نکاح دوسری جگہ فوراً طلاق کے بعد ہو سکتا ہے، لیکن ایسی صورت میں بھی کچھ سامان دینا ضروری ہے وہ رقم حالات کے لحاظ سے ہوگی امیر کے لیے زیادہ غریب کے لیے کم خواہ انسان خود

بَیۡنَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۳۷﴾ ہے اور آپس میں نیک سلوک کرنا نہ بھلاؤ جو تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔ ۳۰۶

حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی ٭ تم اپنی نمازوں اور درمیانی نماز کی محافظت کرو اور اللہ کے فرمانبردار

وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ ﴿۲۳۸﴾ بن کر کھڑے ہو جاؤ۔ ۳۰۷

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا اَوۡ رُکۡبَانًا ۚ فَاِذَاۤ پھر اگر تم کو ڈر ہو تو پیدل یا سوار (جس طرح ہو نماز پڑھ لو) ۳۰۸ پھر

دیدے یا حاکم مقرر کردے یہ محسنوں یا نیکی کرنے والوں پر بالخصوص ایک حق ہے اور گویا عورت کی دل شکنی کے لیے ایک معاوضہ ہے لکھا ہے کہ نبی کریم صلعم چونکہ طلاق دینے سے بہت کثرت سے روکتے تھے اس لیے لوگوں کو گمان ہوا کہ ایسی صورت میں تو طلاق ناجائز ہوگی تو یہ آیت اتری کیونکہ فی الواقع حالات انسانی کے بیحد اختلافات میں ایسی ضرورت بھی پیش آ سکتی ہے۔

۳۰۶ الذی بیدہٖ عقدۃ النکاح - چونکہ طلاق دینے یا عقدہ نکاح کو کھولنے کا مجاز خاوند ہے اس لیے اس سے مراد خاوند ہی ہے اور یہی تفسیر نبی کریم صلعم سے مروی ہے (ث - ج)

الفضل - وہ عطیہ جس کا دینا دینے والے پر لازم نہیں دیکھو ع ۱۳۷ پس یہاں فضل ترک نہ کرنے سے مراد ہوئی ایسے عطایا کا دینا جس کو ہماری زبان میں سلوک کرنا کہتے ہیں۔

طلاق قبل از خلوت جب مہر مقرر ہو چکا ہو: خلوت نہیں ہوئی اور مہر مقرر ہو چکا ہے تو طلاق پر نصف مہر ادا کرنا ہوگا لیکن اس صورت میں عورت کو اختیار ہے کہ بغیر خلع کے بھی چاہے تو مہر چھوڑ سکتی ہے۔ لیکن زور اسی بات پر دیا ہے کہ رعایت حقوق یہ چاہتی ہے کہ مرد ہی اپنا حق معاف کریں یعنی اس صورت میں نصف نہیں بلکہ پورا مہر دیدیں۔ جیسا جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بی بی سے نکاح کیا اور قبل خلوت کے طلاق دیدی تو سارا مہر ادا کیا اور فرمایا کہ مجھ پر زیادہ حق ہے کہ میں اپنے حق کو چھوڑ دوں۔

ع ۳۰۷ محافظۃ - حافظوا باب مفاعلہ سے ہے۔ مفردات میں ہے کہ باب مفاعلہ کے استعمال میں یہ تنبیہ ہے کہ نماز پڑھنے والے نماز کی حفاظت کرتے ہیں اس کے اوقات کو نگاہ رکھتے ہوئے اور اس کے ارکان کی رعایت کرتے ہوئے اور پورے زور کے ساتھ اس کے قیام میں کوشش کرتے ہوئے، اور نماز اُن کی حفاظت کرتی ہے وہ حفاظت جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے کہ نماز بے حیائی اور بدی سے بچاتی ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشآء والمنکر (العنکبوت ۲۹ - ۴۵)

الوسطیٰ - وَسَط کا استعمال کبھی مکان کے لحاظ سے ہوتا ہے اور کبھی درجہ کے لحاظ سے یعنی جو چیز افراط و تفریط سے محفوظ ہو کر میانہ ہو (غ) گویا اعلیٰ درجہ کی چیز پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اس چیز پر بھی جو دوسری دو چیزوں کے درمیان ہو۔

مسائل طلاق کے ذکر میں نماز کا ذکر بے ربط خیال کیا جاتا ہے۔ ذیل کے امور ربط بتاتے ہیں۔ اول اصل ذکر جنگ کا تھا اور طلاق کے مسائل بھی اسی ذیل میں آئے تھے اور یہاں بھی بالخصوص جنگ کی نماز کا ذکر ہے۔ جیسے اگلی آیت سے ظاہر ہے دوم طلاق کے مسائل میں بار بار تقویٰ کی ہدایت کی ہے۔ نماز تقویٰ اللہ کی کنجی ہے اس لیے اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر اس کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے۔ سوم یہ بتانا مقصود ہے کہ نکاح طلاق وغیرہ سب فروعی مسائل ہیں۔ اصل جڑ نیکیوں کی نماز ہے پس تعلقات دنیوی میں پھنس کر ذکر الٰہی سے غافل نہیں ہو جانا چاہیئے۔

صلوٰۃ الوسطیٰ نماز عصر ہے: الصلوٰۃ الوسطیٰ کے متعلق بہت بحث ہوئی ہے۔ بخاری میں نبی کریم صلعم سے مروی ہے حبسونا عن الصلوٰۃ الوسطیٰ حتی غابت الشمس۔ یعنی (خندق کے دن کفار نے) ہمیں وسطی نماز سے روک رکھا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے نماز عصر کو صلوٰۃ وسطیٰ فرمایا ہے۔ یہ بلحاظ وقت بھی درمیان میں ہے اور بلحاظ مرتبہ بھی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ کیونکہ کاروبار کا وقت ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازیں پانچ ہیں کیونکہ صلوات جو جمع ہے تین یا زائد پر بولا جائے گا مگر ایک نماز کے وسط میں ہونے کے لیے تعداد جفت چاہیئے یعنی کم از کم چار نمازیں اور ہونی چاہئیں۔

ع ۳۰۸ رکبانا - رکبان - راکب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں سوار اور رُکوب اصل میں حیوان کی پیٹھ پر چڑھنے کا نام ہے اور پھر ہر سواری پر بولا جاتا ہے جیسے کشتی یا ریل۔ رجالا - رجال - رجل یا راجل کی جمع ہے جس کے معنے پیادہ چلنے والا۔ کیونکہ رِجْل پاؤں کو کہتے ہیں۔

حالت خوف میں نماز: جب نماز کی حفاظت کے لیے تاکید فرمائی تو یہ بھی بتا دیا کہ نماز ترک کسی صورت میں نہیں ہو سکتی یہاں تک کہ کسی قسم کا خوف ہو۔ دشمن کا خوف ہو یا کوئی اور مثلاً یہی کہ انسان ریل پر سوار ہے اور خوف ہے کہ اُتر کر نماز پڑھے تو ریل چلی جائے، تو فرمایا کہ حالت خوف میں بھی نماز ترک نہ کرو۔ ہاں جس حالت میں ہو اسی حالت میں پڑھ لو۔ یہاں تک کہ اگر انسان پیدل چل رہا ہے اور ٹھہرنے میں خوف ہے تو اسی حالت میں نماز پڑھ لے اور گھوڑے یا گاڑی یا کشتی یا ریل پر سوار ہے تو اسی حالت میں پڑھ لے۔ مگر نماز ترک نہ کرے۔ کتنے مسلمان ریل میں سفر کرتے ہیں اور بالکل فارغ ہوتے ہیں۔ مگر نماز نہیں پڑھتے۔ جو حکم اس قدر مؤکد تھا اس کی آج کیا گت بنی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک نماز سے بڑھ کر غیر ضروری چیز ہی کوئی نہیں۔

خوف میں نماز با جماعت: دشمن سے خوف کی حالت بھی یہاں آجاتی ہے۔ گو سورۃ النساء ۴ - ۱۰۱ میں دشمن کے فتنہ کا صریح الفاظ میں ذکر ہے مگر ان دونوں صورتوں

اٰمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

جب امن میں ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تمھیں سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے۔۳۰۹

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

اور تم میں سے جو مر جائیں اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں، اپنی عورتوں کے لیے وصیّت کر جائیں کہ ایک سال تک گھر سے نکالے بغیر خرچ دیا جائے۔ پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں جو انھوں نے بھلائی سے اپنے حق میں کیا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔۳۱۰

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو پسندیدہ طور پر فائدہ پہنچانا چاہیے

میں فرق یہ ہے کہ وہاں پھر بھی جمع ہو کر نماز پڑھنے کی صورت باقی ہے۔ یہاں ایسی صورت نہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ خوف اس سے بھی زیادہ ہے۔ بالفاظ دیگر جب تک دشمن سے خوف کی صورت میں اجتماع کی حالت میں نماز پڑھنا ممکن ہو۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۰۱ کے مطابق پڑھی جائے۔ اگر اس طرح ممکن نہ ہو تو پھر جس طرح انسان پڑھ سکے پڑھ لے۔ پیدل چلتا ہوا، سوار سواری کی حالت میں۔ اسی کی تائید میں بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے الفاظ ہیں جو اس کے آخر میں ہیں جس میں ایک ایک رکعت نماز باجماعت پڑھنے کا اور دوسری اپنی جگہ پوری کرنے کا ذکر ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو تو پھر پیدل یا سوار قبلہ کی طرف یا غیر قبلہ کی طرف جس طرح ہو نماز پڑھ لو۔

۳۰۹ امنتم۔ امن کے اصل معنے ہیں خوف کا جاتے رہنا اور اطمینان نفس یعنی بے آرامی کے بعد سکون کا ملنا (غ)

نماز ذکر اللہ کی بہترین صورت ہے: اذکروا اللہ۔ ذکر کے معنی کے لیے دیکھو ۱۹۱۔ اللہ کی یاد یا اللہ کی ثناء کو یہاں نماز کے قائم مقام رکھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی اصطلاح میں نماز ہی اللہ تعالیٰ کے ذکر کی اعلےٰ سے اعلےٰ صورت ہے۔

اہل قرآن کی غلطی: جب خوف کی حالت کا ذکر کیا کہ اس میں جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو تو ساتھ ہی امن کی نماز کا بھی ذکر فرمایا کہ پھر وہ اس تعلیم کے مطابق ہو، جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے جس سے معلوم ہوا کہ امن میں نماز کی صورت اللہ تعالیٰ اس سے پہلے مسلمانوں کو سکھا چکا تھا۔ مگر تعجب ہے کہ جو لوگ اہل قرآن کہلاتے ہیں وہ اس ارشاد خداوندی کے صریح خلاف نماز خوف سے نماز امن کے احکام کا قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ نماز تو مکہ میں ہی فرض ہوئی تھی جہاں بہرحال اس قسم کا خوف دشمن سے کوئی نہ تھا اور یہ ناممکن ہے کہ نماز کی فرضیت تو مکہ میں ٹھہرائی گئی ہو لیکن یہ نہ بتایا گیا ہو کہ وہ نماز کس طرح ادا کرنی ہے بلکہ اس کے لیے مسلمانوں کو اس وقت تک انتظار کرنا تھا۔ جب جنگ شروع ہو جائیں اور پھر خدائے تعالیٰ نماز خوف کی صورت بتائے تب وہ اس سے نماز امن کا قیاس کریں۔ لیکن اس آیت نے فیصلہ کر دیا۔ کیونکہ فرمایا کہ نماز امن تو ہم تم کو سکھلا چکے ہیں مگر اس کی تفصیلات تو قرآن شریف میں موجود نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ یہ تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی خفی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ اور آپ نے آگے لوگوں کو یہ تعلیم دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کو اللہ تعالیٰ کا اپنی طرف منسوب کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہ بھی وحی الٰہی سے تھی۔ مگر چونکہ وہ وحی متلو قرآن شریف میں تو ہے نہیں اس لیے اسے وحی خفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ خدا کی وحی سے تھا۔ وحی کی اقسام کے لیئے دیکھو الشوریٰ ۴۲: ۵۱۔

نماز کی تفصیلات قرآن میں برنگ اشارہ: اور اگر یہ کہا جائے کہ اشارات کے رنگ میں نماز کی رکعات ارکان وغیرہ کا ذکر قرآن شریف میں پہلے بھی ہو چکا تھا۔ تو اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن ان اشارات سے کوئی شخص نماز کی ایک صورت قائم نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہوتا کہ نماز کی ساری تفصیلات کو قرآن کریم میں ہی بیان فرما دے تو جس طرح روزوں کا ذکر ایک جگہ کر دیا۔ طلاق وغیرہ کے احکام کا ذکر ایک جگہ کر دیا۔ اور ان باتوں کو اشاروں پر نہیں چھوڑا اسی طرح نماز اس کے ارکان، اس کی رکعات اس کے اوقات اس کی ترتیب کا بھی ذکر بصراحت ایک جگہ کر دیتا اور یا اگر اشارات ہی دینے تھے تو باقی احکام کے متعلق بھی اشارات ہی ہوتے۔ حالانکہ اگر دوسرے احکام اشارات میں بھی ہوتے تو ہرج نہ تھا وہ فروعی امور تھے اور نماز کو تو عملی رنگ میں اصول دین میں سے قرار دیا ہے اور یہ ہر مومن کو روزانہ پانچ وقت پڑھنی ضروری ہے اور کوئی حکم ایسا نہیں جس کا اس قدر تعلق ہر انسان کی زندگی سے ہو کہ بار بار روز دہرایا جائے۔ پس حق یہی ہے کہ نماز کی اصل ہیئات چونکہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں اور اس کی تفصیلات بہت بسط کی محتاج تھیں۔ اس لیے ان تمام باتوں کو اپنی وحی خفی سے نبی کریم صلعم پر ظاہر کر کے تمام امت کو اس طریق پر تعلیم دیدی۔ اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ یہ نماز ہماری سکھائی ہوئی نماز ہے۔ محمد رسول اللہ صلعم کی تجویز کردہ نہیں ہے۔

۳۱۰ وصیۃ۔ نصب کی تقدیر یوں ہے۔ یوصون وصیۃ یا کتب اللہ علیھم وصیۃ۔ اور ایک قرأت کتب علیکم الوصیۃ ہے جو اس کی موید ہے۔
بیوہ کے ایک سال متاع کا حکم آیت ورثاء کے خلاف نہیں۔ اس آیت کے معنی ایسے صاف ہیں کہ اس کو منسوخ قرار دینے پر تعجب آتا ہے اس رکوع کا اصل

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٤١﴾
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾ ع ۲۱ ۱۵

یہ متقیوں پر ایک حق ہے۔
اسی طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے
تاکہ تم سمجھو۔ ۳۱۱

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ
وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ
اللّٰهُ مُوْتُوْا ۟ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ
فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٢٤٣﴾

کیا تو نے ان کے حال پر غور نہیں کیا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل پڑے اور وہ ہزاروں تھے۔ پس اللہ نے ان کو فرمایا کہ تم مرجاؤ، پھر ان کو زندہ کیا یقیناً اللہ لوگوں پر بڑے فضل کرنے والا ہے ، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ ۳۱۲

مضمون مطلقہ اور بیوہ عورتوں سے احسان ہے۔ پہلی اور آخری آیتوں میں مطلقہ کو متاع دینے یا اس کے ساتھ احسان کا حکم ہے اس میں بیوہ کو متاع دینے یا اس کے ساتھ احسان کا حکم ہے یہ قیاس کہ اس کو ورثہ کی آیت نے بیوہ کو حصّہ وارثت دیکر منسوخ کر دیا اس لیے غلط ہے کہ جب مطلقہ کو مہر سے علاوہ متاع یا سامان دینے کا حکم ہے جیسا کہ آگے آتا ہے تو بیوہ کو حصّہ وراثت کے ساتھ متاع دینے کے حکم میں کیا ہرج ہے مطلقہ کا متاع عدت تک کا خرچ ہے بیوہ کی حالت اس سے زیادہ بیکسی کی ہوتی ہے اس لیے اس کو عدّت سے کچھ زیادہ متاع کا حکم دیا اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ممکن ہے حمل ہو تو اس صورت میں نو دس ماہ حمل کے اور ایک دو ماہ اس کے بعد تکلیف کے کل ایک سال بن جاتا ہے اور مطلقہ کے لیے بھی تو حکم ہے کہ اگر حمل ہو تو وضع حمل تک اس کے اخراجات برداشت کیے جائیں - (الطلاق ۶۵ - ۶)

اسی طرح یہ آیت آیت ۲۳۴ کے مضمون کے بھی خلاف نہیں، کیونکہ وہاں بیوہ کی عدت چار ماہ دس یوم بتائی ہے، تو یہاں عدت کو منسوخ نہیں کیا بلکہ یہاں متاع کا ذکر ہے جو بیوہ کو دیا جائیگا ہاں یہ سچ ہے کہ وہ متاع اسی صورت میں ہے جب بیوہ نکاح نہ کرے۔ کیونکہ جب نکاح کرلے گی تو پھر اس کا دوسرا کفیل پیدا ہو جائیگا۔ اسی لیے اس آیت میں صاف فرمایا ہے کہ اگر بیوہ عدّت پوری کرکے خود نکل جائے اور نکاح کرلے تو پھر اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں فی ما فعلن فی انفسھن من معروف میں صاف نکاح کی طرف اشارہ ہے۔ پس وصیت صرف عورت کی ضرورت کے لیے ہے۔ اگر اس کو ضرورت نہیں تو وہ اختیار رکھتی ہے کہ اس سے فائدہ نہ اُٹھائے

نسخ اور عدم نسخ کے اقوال: رہا یہ کہ روایات میں اس آیت کی منسوخی کا ذکر ہے تو ساتھ ہی اسکی عدم منسوخی کا بھی ذکر ہے۔ اوّل تو جب تطبیق ممکن ہو گئی تو خواہ کسی صحابی کا بھی قول ہو کہ یہ آیت منسوخ ہے وہ روایت صحیح نہیں مانی جائے گی اور اگر اس کو صحیح مانا جائے تو صحابی کی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ دوسرے جب دو متضاد اقوال موجود ہوں تو کیا وجہ ہے کہ منسوخی کے قول کو صحیح مانا جائے اور غیر منسوخی کے قول کو صحیح نہ مانا جائے چنانچہ جہاں ابن زبیر کا قول منسوخی کے متعلق ہے وہیں بخاری میں مجاہد کا قول غیر منسوخی کا موجود ہے جو فرماتے ہیں کہ پہلے آیت ۲۳۴ نازل ہوئی اور وہ عدت اس کے خاوند کے اہل کے نزدیک گنی جاتی تھی۔ فانزل اللہ والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج یعنی اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی پس جب یہ آیت بعد میں نازل ہوئی تو اس کا منسوخ ہونا بے معنی ہے۔ پھر اس کا نزول ہی بے معنی ہے کیونکہ جس آیت کو ناسخ کہا جاتا ہے وہ پہلے نازل ہو چکی تھی پھر مجاہد نے صاف الفاظ میں اسے غیر منسوخ بھی قرار دیا ہے جس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ محض عورت کو اختیار دیا گیا ہے وہ چاہے اس سے فائدہ اٹھائے چاہے نہ اٹھائے پس یہ منسوخ کیونکر ہوئی۔ بلکہ نسخ کے قول کو لاکر پھر عدم منسوخی کے دلائل لانے سے امام بخاری نے اپنا مذہب بھی عدم نسخ کا ہی ظاہر کیا ہے۔

اور حدیث لا وصیۃ لوارث بھی جو خود احاد میں سے ہے قرآن کریم کی اس صریح تعلیم کی ناسخ نہیں ہو سکتی بلکہ خود اس حد بندی کے ماتحت مانی جائیگی جو قرآن شریف نے یہاں کردی۔ یعنی بیوہ کے لیے ایک سال تک نان ونفقہ اور مکان کی وصیت جائز ہے البتہ تعامل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم کے رنگ میں نہیں بلکہ محض سفارش کے رنگ میں فرمایا گیا ہے یا اجازت کے رنگ میں کہ اگر خاوند ایسی وصیّت کرے تو جائز ہے۔

۳۱۱ ان آیات سے ثابت ہے کہ ہر قسم کی مطلقہ عورتوں کو سامان دینا چاہیئے اور یہ مزید بطور احسان ہے۔ جو لوگ دوسروں کے حقوق کی پوری رعایت کرنے والے ہیں ان پر یہ بھی ایک حق ہے اس لیے فرمایا حقاً علی المتقین۔

۳۱۲ الم تر تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس واقعہ پر استعمال ہوتا ہے جو کمال شہرت حاصل کرچکا ہو اور مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ مخاطب اس امر پر غور کرے کیونکہ رویت جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے۔ کئی طرح پر ہے۔ آنکھ سے۔ تخیل سے۔ فکر سے۔ عقل سے اور لکھا ہے کہ صلہ الیٰ ہو تو اس

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔[۳۱۳]

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ط وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

کون ہے جو اللہ کے لیے اچھا مال الگ کرے تو وہ اسے اس کے لیے کئی گنا بڑھاتا ہے اور اللہ گھٹاتا اور بڑھاتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔[۳۱۴]

کے معنی ہوتے ہیں ایسی نظر جس سے اعتبار یعنی غور کرنا مقصود ہو۔ ابن جریر نے بھی اس کو رؤیۃ القلب ہی قرار دیا ہے۔

دیار۔ دار کی جمع ہے اور دار منزل کو کہتے ہیں یعنی جہاں کوئی شخص رہتا ہے۔

الوف۔ اَلف کی جمع ہے جس کے معنی ہزار ہیں۔ کیونکہ اِلف ایسے اجتماع کو کہتے ہیں جس میں اتحاد ہو۔ اور ہزار میں گویا اعداد کا اجتماع ہوتا ہے (غ) ابن زید الوف کو اِلف کی جمع قرار دیکر اس کے معنی مؤتلف القلوب کرتے ہیں (ر) یعنی ھم الوف کے معنی ہوئے وہ اجتماع و اتحاد کی حالت میں نکلے یا قوم کی قوم یا جماعت کی جماعت نکل پڑی۔

بنی اسرائیل کا مصر سے خروج اور اس کا ذکر قرآن کریم میں۔ اصل مضمون ضرورتِ جنگ پر ہے۔ اگلی آیت میں یہ صراحت ہے اور سارے رکوع کا مضمون یہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوم تھی جو گھروں سے نکلی؟ مفسرین کہتے ہیں داوردان کے رہنے والے تھے طاعون سے بھاگے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو مار کر پھر زندہ کیا تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ دوسرا قول ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک قوم تھی ان کے بادشاہ نے ان کو جہاد کی طرف بلایا انہوں نے انکار کیا خدا نے انہیں آٹھ دن تک مار کر پھر زندہ کیا۔ تاریخی ثبوت ان میں سے کسی کا نہیں۔ البتہ دوسری توجیہ مضمون رکوع کے مطابق ہے مگر الم تر بتاتا ہے کہ یہ کوئی بڑا مشہور واقعہ ہے اور یہ واقعہ جو مفسرین نے لکھا ہے نہ صرف غیر مشہور ہے بلکہ اس کی اصلیت ہی کوئی نہیں۔ وہ واقعہ جس کی طرف قرآن کریم نے توجہ دلائی ہے کوئی مشہور تاریخی واقعہ ہونا چاہیئے فی الحقیقت ایسا ہی ہے اور خرجوا کا استعمال اس کی تعیین کرتا ہے کیونکہ ساری تاریخ میں خروج کا ایک ہی واقعہ ہے جس کو سب لوگ جانتے ہیں۔ یعنی بنی اسرائیل کا خروج مصر سے جس کا ذکر حضرت موسیٰ کی کتاب میں ہے جس کا نام ہی خروج ہے قرآن کریم نے وہی لفظ خرجوا اختیار کر کے اس مشہور واقعہ کا صاف پتہ بتا دیا ہے۔ دوسری تعیین اس کی لفظ الوف سے ہوتی ہے کیونکہ بنی اسرائیل کے سوائے جن کی تعداد بائبل میں چھ لاکھ لکھی ہے ہزاروں کی تعداد میں اور کسی قوم کا خروج ثابت نہیں۔ الوف کے دوسرے معنی جماعت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بنی اسرائیل پر ہی صادق آتا ہے کیونکہ کتاب خروج میں ان کو بار بار جماعت کے نام سے پکارا گیا ہے اور یہ امر کہ یہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کا ذکر ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دو آیتیں چھوڑ کر جو اس مضمون کے متعلق ہیں پھر صاف الفاظ میں "موسیٰ کے بعد" کے بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے۔ یہ تیسرا قرینہ ہے اور چوتھا یہ کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ کے ساتھ نکل کر جنگ کرنے سے انکار کیا اور چالیس سال جنگل میں بھٹکتے رہے جو قومی موت تھی پس یہ جہاد کا انکار تھا اور یہی مضمون رکوع کا ہے۔

بنی اسرائیل کی موت اور زندگی: آیت کے دوسرے الفاظ بھی اس مفہوم کے خلاف نہیں بلکہ موافق ہیں مصر کو جہاں سے بنی اسرائیل نکلے تھے دیارھم کہا اس لیے کہ چار سو سال سے وہاں ان کی بود و باش تھی بلکہ وہ تو ان کے لیے بمنزلہ وطن ہی تھا۔ الوف کی تشریح ہو چکی ہے حذر الموت موت کے خوف سے نکلے وہ موت فرعون کی غلامی تھی جو ان کو کمزور کر کے ادنیٰ اور بیگار کا کام لیکر ان کو ذلت کی موت مارنا چاہتا تھا۔ جعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناءھم ویستحیی نساءھم (القصص ۲۸-۴) اور شروع سورۃ میں یسومونکم سوء العذاب آہی چکا ہے۔ پس یقیناً وہ موت کے خوف سے نکلے تھے۔ تو پھر فقال لھم اللہ موتوا کس طرح ہوا؟ جب انہوں نے حضرت موسیٰ کے ساتھ ہو کر جنگ کرنے سے انکار کیا تو حکم ہوا فانھا محرمۃ علیھم اربعین سنۃ یتیھون فی الارض (المائدہ ۵-۲۶) چالیس سال تک اس سرزمین وعدہ سے جو ان کی حیات قومی کا موجب ہونے والی تھی، محروم کر دیئے گئے؛ بیابان میں بھٹکتے رہے اور بائبل میں لکھا ہے کہ وہ نسل ہلاک ہو گئی گنتی ۱۴: ۲۹-۳۰، اور اس کے ساتھ ہی ہے کہ تمہاری دوسری نسل یعنی تمہارے بچے اس زمین میں داخل ہوں گے۔ سو یہ ان کی موت تھی ثم احیاھم۔ پھر ان کو زندہ کیا کیونکہ آخر کار وہ اس موعود سرزمین میں داخل ہوئے اور ایک بڑی قوم بنے۔ فاتح اور حکمران ہوئے اعلیٰ اخلاق سے متصف ہوئے۔ یہی قوم کی موت اور زندگی ہوتی ہے۔

۳۱۳ تاریخ اسرائیل سے مسلمانوں کے لیے سبق: بنی اسرائیل کے واقعات کے اندر مسلمانوں کو یہ حکم دینا بتاتا ہے کہ یہ ذکر کہانیوں کے طور پر نہیں بلکہ بتایا کہ تم بھی اگر خدا کی راہ میں جنگ کرنے سے انکار کرو گے تو موت وارد ہوگی۔ سو مسلمان جب غافل ہو گئے تو دوسری قوموں نے انہیں دبانا شروع کر دیا جس کا نتیجہ موجودہ موت ہے۔ نبی کریم صلعم کے صحابہؓ نے قرآن کریم سے فائدہ اٹھایا۔ اور جنگ کے موقعہ پر گو وہ بہت تھوڑے تھے اور دشمن بہت زبردست، عرض کیا کہ ہم حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی طرح نہیں کہتے بلکہ ہم آپ کے حکم کے ماتحت چلیں گے جہاں آپ لے جائیں۔

۳۱۴ یقرض۔ قرضا۔ قرض اصل میں ایک قسم کا کاٹنا یا قطع کرنا ہے تقرضھم ذات الشمال (الکھف ۱۸-۱۷) میں سورج کے غار کو سایہ میں چھوڑ کر آگے نکل جانے پر

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَاءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ

کیا تو نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں ؎ کے حال پر غور نہیں کیا جب انھوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اس نے کہا کہ تم سے کچھ بعید نہیں کہ اگر جنگ کرنا تم پر ضروری ٹھہرایا گیا تو جنگ نہ کرو، انھوں نے کہا کہ ہمارا کیا عذر ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں حالانکہ ہم اپنے گھروں سے اور اپنے بیٹوں سے جدا کیے گئے ہیں پھر جب ان کے لیے لڑائی کرنا ضروری ٹھیرایا گیا تو ان میں سے تھوڑوں کے سوائے (باقی) پھر گئے اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے ۳۱۵

اور ان کے نبی نے انھیں کہا کہ اللہ نے تمھارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسے ہم پر بادشاہی کس طرح مل سکتی ہے اور ہم اس کی نسبت بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں، اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔ (نبی نے) کہا اللہ نے اُسے تم پر

یہ لفظ بولا گیا ہے۔ قرض جسکو ہماری زبان میں ادھار کہتے ہیں اس کے معنی ہیں وہ مال جو انسان کو دیا جائے اس شرط پر کہ اس کا بدل لوٹایا جائیگا (غ) اس لیے اس کا استعمال ہر اس عمل پر ہوتا ہے جس کا بدلہ دیا جائے۔ تاج العروس میں ہے کہ قرض جو اصل میں قطع کرنے کو کہتے ہیں اس کے حسب مراتب بہت سے معانی نقل آئے ہیں اور جوہری کا قول نقل کیا ہے کہ قرض وہ ہے نیکی سے یا بدی جسے تم نے پہلے کیا ہے یعنی جس کا کوئی بدلہ ملنے والا ہے۔ اس پر امیۃ بن ابی الصلت کا شعر بطور شہادت پیش کیا ہے۔ کل امرئ سوف یجزی قرضہ حسنا۔ او سیئا مدینا مثل ما دانا۔ اور لکھا ہے کہ عرب کا محاورہ ہے وہ کہتے ہیں لک عندی قرض حسن وقرض سیئ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ تم نے مجھ سے کوئی اچھا یا برا فعل کیا ہے جس کا اچھا یا برا بدلہ تمھیں ملیگا۔ واصل القرض ما یعطیہ الرجل او یفعل لیجازی علیہ یعنی اصل قرض یہ ہے جو آدمی دے یا کرے تاکہ اسے اس پر بدلہ ملے اور اس آیت میں لفظ قرض کے معنی ابو اسحاق سے نقل کیے ہیں کہ وہ ہر وہ فعل ہے جس پر جزا چاہی جائے اور اخفش سے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع اور اس کی فرمانبرداری میں نیک کام کرے کیونکہ جب کوئی شخص دوسرے کے ساتھ کوئی بھلائی کرے تو عرب کے لوگ کہتے ہیں۔ قد احسنت قرضی یا قد اقرضتنی قرضا حسنا۔ اور بیضاوی میں ہے کہ اللہ کا قرض مثال ہے ایسے عمل کے آگے بھیجنے سے جس پر ثواب کی امید ہو اور اسی میں ہے کہ قرض حسن مجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

یضاعف۔ اضعاف۔ ضِعف کی جمع ہے اور کسی چیز کا ضعف وہ ہے جو اسے دوچند کر دے اور ضاعف کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ اس کی ایک مثل یا کئی مثلیں زیادہ کر دیں یا دوچند کیا یا کئی گنا کیا (غ) اور ضَعف اور ضُعف کے معنی کمزوری ہیں۔

یقبض۔ قبض کے اصل معنی ہیں پورے ہاتھ کے ساتھ کسی چیز کا لے لینا۔ اور اس کا استعمال دونوں طرح پر ہے یعنی ایک چیز کو دوسرے سے لیکر اپنے پاس رکھنا یا ایک چیز دوسرے کو دینے سے ہاتھ روک لینا۔ امام راغب نے یقبض ویبصط کی کئی توجیہات کی ہیں۔ اللہ کبھی ایک چیز لے لیتا ہے کبھی دیدیتا ہے۔ یا ایک قوم سے لے لیتا ہے اور ایک کو دیدیتا ہے۔ یا کبھی مارتا ہے، کبھی زندہ کرتا ہے اور ایک معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکی کو اپنی طرف لے لیتا ہے پھر اس کو بڑھاتا ہے۔

یبصط۔ اصل بسط ہے جس کے معنی ایک چیز کا پھیلانا اور اس کو وسعت دینا ہیں۔

پہلی آیت میں جنگ کا حکم دیا اب انفاق فی سبیل اللہ کا مجاہدات نیک عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فرماتا ہے کہ جو اعمال للّٰہی ایثار کے رنگ میں کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کبھی ضائع نہیں کرتا بلکہ انہیں بہت بڑھاتا ہے اضعافا کثیرۃ کا بڑھانا گویا بیحد و حساب اجر دینا ہے۔ اسلام کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔ مفصل ذکر انفاق کا آگے آتا ہے۔ آخر پر الیہ ترجعون اس لیے فرمایا کہ مال کمانے کو زندگی کی غرض نہ سمجھ لینا۔

ع ۳۱۵ الملاء۔ ملاء کے اصل معنی بھرنا ہیں۔ ملء الارض ذھبا (آل عمران ۳۔ ۹۰) اور مَلَاء اس جماعت کو کہتے ہیں جو ایک رائے پر جمع ہوں۔ پس آنکھوں کو تازگی اور نظارے سے بھر دیں اور نفسوں کو خوبصورتی اور جلال سے (غ)

اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ
وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٧﴾

برگزیدہ کیا ہے اور علم اور جسم میں اس کو بہت بڑھایا ہے اور اللہ
جسے چاہتا ہے اپنا مُلک دیتا ہے اور اللہ فراخی والا
جاننے والا ہے۔ ع٣١٦

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ
التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ
مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ
الْمَلٰۗىِٕكَةُ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ

اور اُن کے نبی نے انھیں کہا کہ اس کی بادشاہی کا نشان یہ
ہے کہ تمھارے پاس تابوت آئے جس میں تمھارے رب کی طرف سے
سکون اور اس کا بقیہ ہے جو موسیٰ کے سچے تابعداروں اور ہارون
کے سچے تابعداروں نے چھوڑا ہے فرشتے اُسے اٹھائے ہوں گے ع٣١٧ یقیناً

البعث۔ بَعث کے اصل معنی کسی چیز کا اُٹھانا اور سامنے لانا ہیں۔ مردوں کے اُٹھنے نیند سے اُٹھنے نبیوں کے بھیجا جانے کسی کے کسی کام پر مقرر کیا جانے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ)

مَلِکا۔ مَلِك وہ ہے جو لوگوں کے معاملہ میں امر و نہی پر متصرف ہو اور یہ انسانوں کی سیاست سے مخصوص ہے ملك الناس کہا جاتا ہے ملك الاشیاء نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بادشاہ کا تصرف لوگوں پر ایک محدود تصرف ہے۔ مالک کی طرح نہیں جس کا تصرف تام ہے دیکھو ع٣۔

عسیتم۔ عسیٰ خواہش اور امید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے طمع اور ترجّی کے لیے (غ) اور یہ افعالِ مقاربہ میں سے ہے۔ امر محبوب میں امید دلانے کے لیے اور امر مکروہ میں ڈرانے کے لیے آتا ہے (ت)

سموئیل کا ذکر اور مسلمانوں کو نصیحت؛ یہاں سے بنی اسرائیل کی ایک مثال شروع کی ہے جو حضرت داؤدؑ کے ذکر پر ختم ہوتی ہے یہ نبی جس کی طرف یہاں اشارہ ہے سموئیل تھے دیکھو ا سموئیل ٨: ١٨ و ١٩۔ اس وقت بنی اسرائیل فلستیوں سے مغلوب ہو چکے تھے اور کئی دفعہ شکستیں کھا کر ان کے ہزارہا آدمی کٹ چکے تھے قد اخرجنا من دیارنا سے مغلوب ہو کر ملک دے بیٹھنا اور من ابناءنا سے آدمیوں کا کٹ جانا یا غلامی میں لیا جانا مراد ہے۔ یہ تاریخی مثال اس رکوع کے باقی حصّہ میں اور کچھ اگلے رکوع میں مذکور ہے۔ غرض مسلمانوں کو سمجھانا تھا جو اپنے گھروں سے نکل چکے اور اپنے عزیز و اقارب سے الگ ہو چکے تھے کہ اب سوائے جنگ کے تم زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ بھی سمجھایا کہ دشمن کی کثرت سے مرعوب نہ ہونا۔

ع٣١٦ بسطة کے معنی سعة یا فراخی ہیں۔ بخاری میں بسطة کے معنی زیادة وفضلا دیئے ہیں۔

طالوت۔ بائبل میں اس بادشاہ کا نام ساؤل لکھا ہے۔ قرآن شریف نے طالوت استعمال کیا ہے جو طول سے مشتق ہونے کی وجہ سے قد کی لمبائی پر دلالت کرتا ہے اور ساؤل قد میں بھی سب سے لمبا تھا۔ ا سموئیل ١٠: ٢٣ ساؤل پر اعتراضات کا ہونا بھی بائبل سے معلوم ہوتا ہے۔ ا سموئیل ٩: ٢١ اور ١٠: ٢٧۔

بادشاہ کے انتخاب کے اصول: لوگوں کا اعتراض یہ ہے کہ یہ بادشاہ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اس کا کوئی خاص حق بادشاہت کے لیے نہیں۔ یعنی بادشاہت کے خاندان سے نہیں اور نہ مال و دولت اس کے پاس زیادہ ہے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ان اللہ اصطفٰہ علیکم یعنی اللہ نے نیکی کی وجہ سے اُسے تم پر برگزیدہ کیا ہے اور دوسرے اس کو علم زیادہ دیا ہے۔ تیسرے اس کو جسمانی قوت میں فضیلت ہے۔ بادشاہت وراثت سے نہیں: اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہت کے انتخاب میں قرآن کریم ان اصول کو مدنظر رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور وراثت کی بادشاہت یا دولتمند ہونے کے لحاظ سے بادشاہت کا انتخاب اس کے نزدیک ٹھیک نہیں۔ مسلمانوں نے بالکل خلاف تعلیم قرآن اور نمونہ خلفائے راشدین بادشاہت کو وراثت قرار دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ بجائے قوت کا موجب ہونے کے کمزوری کا موجب ہو گئے۔ کیونکہ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہے کہ بادشاہ بنانے کی اصل غرض یہ ہے کہ وہ قوم کو دشمن کے مقابل میں قوی بنائے لیکن بادشاہت جب بطور وراثت آجاتی ہے تو عیش پسندی کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے اور اصل غرض مفقود ہو جاتی ہے۔ پس بادشاہت یا امارت انتخاب سے ہے وراثت سے نہیں۔ اور انتخاب کے اصول یہ ہیں کہ جو شخص نیکی میں بڑھ کر اور علم میں زیادہ اور طاقتور ہو اسے بادشاہ بنایا جائے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نظم و نسق ملکی کے لیے بادشاہت کی ضرورت بھی ہے یعنی ایک ایسے شخص کی جو نظام حکومت کو قائم رکھنے والا ہو۔ نبوت اور بادشاہت چونکہ عموماً دو الگ الگ منصب رہے ہیں۔ اس لیے باوجود نبی کی موجودگی کے بادشاہ کی ضرورت پڑی۔

ع٣١٧ التابوت۔ تابوت کے ایک معنی صندوق مشہور ہیں اور اسے توب سے مشتق کہا گیا ہے کیونکہ چیزیں اس میں لوٹ لوٹ کر آتی ہیں۔ مگر دوسرا قول یہ ہے کہ تابوت کے معنی پسلیاں اور جو کچھ ان کے اندر آگیا ہے جیسے دل وغیرہ ہیں۔ اور صندوق پر بھی اس کا اطلاق ہو گیا ہے (ت) لسان العرب میں بھی تابوت کے معنی قلب یعنی دل دیئے ہیں اور مثل نقل کی ہے ما اَوْدَعْتُ تابوتی شیئاً فَفَقَدْتُہ میں نے اپنے تابوت یعنی دل کے سپرد کبھی کوئی شے نہیں کی جسے گم کر دیا ہو اور مفردات میں بھی

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع ۳۲/۱۶ اس میں تمہارے لیے نشان ہے اگر تم مومن ہو ع ۳۱۷ ا

یہ قول منقول ہے کہ تابوت سے مراد قلب اور سکینت ہے اور جو علم اس میں ہے۔ اور لکھا ہے کہ قلب کو سَفَطُ العِلْم کہا گیا ہے یعنی علم کا ڈبا اور اسے حکمت کا گھر اور اس کا برتن اور اس کا صندوق کہا گیا ہے اور قلب کا نام تابوت رکھا جانے کی وجہ سے ہی حضرت عمرؓ نے ابن مسعود کے متعلق کہا کہ وہ ایک برتن ہے جو علم سے بھرا ہُوا ہے۔ تفسیروں میں بھی تابوت کے معنی قلب منقول ہیں۔ بیضاوی میں ہے کہ ایک قول ہے کہ تابوت کے معنی قلب ہیں اور سکینۃ وہ علم ہے جو اس میں ہے اور ایسے تابوت یا دل کے آنے سے منشاء یہ ہے کہ اس کا قلب علم اور وقار کی جگہ ہو جائے گا حالانکہ پہلے ایسا نہ تھا۔

سکینۃ۔ سکن سے ہے اور حرکت کے بعد کسی چیز کے ٹھہر جانے کو سُکُوْن کہتے ہیں۔ پس سکینۃ اطمینان قلب ہے یا مرعوب نہ ہونا اور یہ جو بعض مفسرین نے یوں ہی لکھدیا ہے کہ وہ ایک شے ہے جس کا سر بلّی کے سر کی طرح ہے۔ امام راغب کہتے ہیں یہ صحیح نہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ سکینت اس حالت کا نام ہے جب انسان کا میلان شہوات کی طرف سے رک جائے۔

بقیۃ۔ بقاء کسی چیز کی پہلی حالت پر رہنا ہے اور باقیات سے مراد وہ عمل ہیں جن کا ثواب انسان کے لیے باقی رہ جاتا ہے اور بقیۃ اور باقیات کے معنی کل عبادۃ یقصد بھا وجہ اللّٰہ بھی دیئے ہیں (غ) یعنی ہر ایک عبادت جس کے ساتھ اللّٰہ کی رضا چاہی جائے اور بقیۃ کے معنی تاج العروس میں الحالۃ الباقیۃ من الخیر بھی دیئے ہیں یعنی خیر کی حالت جو باقی رہنے والی ہو۔

موسیٰ اور ہارون دونوں صاحب امت اور صاحب کتاب ہیں: آل موسیٰ و آل ھارون۔ آل کے معنی کے لیے دیکھو ع ۲۰۵۔ حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں کی علیحدہ علیحدہ آل کا ذکر بتاتا ہے کہ قرآن شریف دونوں کو صاحب اُمت نبی قرار دیتا ہے موسیٰ کی آل وہ لوگ ہوئے جو حضرت موسیٰ کی خاص برکات سے حصّہ لیتے ہیں اور حضرت ہارونؑ کی آل وہ لوگ ہوئے جو حضرت ہارون کی برکات سے حصّہ لیتے ہیں اور دوسری جگہ دونوں کو صاحب کتاب نبی بھی قرار دیا ہے اٰتینٰھما الکتاب المستبین (الصّٰفّٰت ۳۷-۱۱۷)

ع ۳۱۷ ا بائبل کا تابوت اور توریت و انجیل کا باہم اختلاف: تابوت جس کے یہاں بطور نشان آنے کا ذکر ہے وہ کیا تھا؟ ایک مشہور تابوت وہ ہے جس کا ذکر بائبل کے دونوں مجموعوں یعنی پرانے اور نئے عہدناموں میں پایا جاتا ہے۔ جو لمبائی میں اڑھائی ہاتھ اور چوڑائی اور اونچائی میں ڈیڑھ ڈیڑھ ہاتھ تھا اور اوپر سے خالص سونے میں منڈھا ہوا تھا اور اس کے اوپر سونے کا کلس تھا (خروج ۲۵: ۱۰۔۱۱ اور ۳۷: ۱) اور اس صندوق میں اسلاطین ۸: ۹ کے مطابق "سوا پتھر کی ان دو لوحوں کے جنھیں موسیٰ نے حورب پر اس میں رکھا تھا" اور کچھ نہ تھا۔ مگر عبرانیوں ۹: ۴ کے مطابق "اس میں ایک سونے کا برتن من سے بھرا ہُوا اور ہارون کا عصا جس میں شاخیں پھوٹی تھیں اور عہدنامہ کی تختیاں اور اس پر جلالی کروبی تھے" (اب یہ فیصلہ عیسائی کریں کہ ان دونوں الہامی کتابوں میں سے کونسی غلط ہے) یہ تابوت یا صندوق ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے قبضہ سے نکل کر فلستیوں کے قبضہ میں چلا گیا اور کچھ مدت بعد انہوں نے اسے واپس کر دیا اور آخر کار حضرت داؤد اسے یروشلم میں لے آئے اور حضرت سلیمان کے زمانہ میں بیت المقدس میں رکھا گیا اس کے بعد اس کا پتہ نہیں چلتا۔

قرآن میں کس تابوت کا ذکر ہے اور عیسائیوں کا اعتراض: بعض مفسرین نے یہی مذکورہ بالا تابوت مراد سمجھا ہے بعض کہتے ہیں کوئی اور تابوت تھا جو حضرت آدم پر اُترا بعض کہتے ہیں وہ تابوت ہے جس میں حضرت موسیٰ کی والدہ نے حضرت موسیٰ کو رکھ کر دریا میں ڈال دیا تھا۔ ان میں سے قول اوّل کو لیکر عیسائیوں نے بزعم خود قرآن شریف کی بڑی بھاری تاریخی غلط بیانی ثابت کی ہے کیونکہ انہوں نے سمجھا ہے کہ یہ تابوت بروئے تاریخ مذکورہ بائبل طالوت سے بہت پیشتر واپس آچکا تھا پس قرآن الہامی نہ ہُوا۔ حالانکہ اسی تابوت کے قصّہ میں پُرانے اور نئے عہدنامہ میں اتنا بڑا اختلاف موجود ہے اور وہ دونوں الہامی مانے جاتے ہیں اور کبھی کوئی ایماندار عیسائی سوال نہیں کرتا کہ ان میں سے کس کو جھوٹا کہا جائے۔ بہر حال اگر التابوت سے مراد یہی تابوت لیا جائے تو بائبل میں جہاں فلستیوں کے اس تابوت کو لے جانے اور پھر واپس کرنے کا ذکر ہے۔ وہاں سے ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے۔ چنانچہ پادری ڈملو کی تفسیر بائبل میں اس کا صاف اعتراف موجود ہے۔ اوّل تو سموئیل کی دونوں کتابوں کے متعلق یہ مسلّم ہے کہ یہ خود کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ ان کا ماخذ کوئی اور ابتدائی تحریر ہے۔ دوسرے تابوت کا ذکر اسموئیل کے پانچویں چھٹے باب میں ایسے بے ربط طریق پر ہے کہ پادری ڈملو اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ تابوت کا ذکر جو پانچویں اور چھٹے باب میں ہے اس سے اس بات کا پتہ نہیں ملتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے سوائے اس کے کہ یہ جنگ افیک کے بعد کا ہے۔" چھٹے باب کی پہلی آیت میں لکھا ہے کہ "صندوق سات مہینے تک فلستیوں کے ملک میں رہا" اور ساتویں باب کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تابوت بیس برس تک قریت یعاریم کے لوگوں کے پاس رہا" اور سارے بنی اسرائیل نے خداوند کے لیے نالے کیے" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہ مغلوب تھے۔ حالانکہ تابوت کا ان کے درمیان آنا بطور نشان تھا کہ وہ مظفر و منصور ہونگے پس یہ واقعات ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔ اگر قرآن کریم میں اسی تابوت کا ذکر سمجھا جائے تو چونکہ اس کی واپسی بنی اسرائیل کی فتح و ظفر کی نشانی تھی اور فلستیوں پر ان کا فتحیاب ہونا ساؤل یعنی طالوت کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے اس بنا پر قرآن شریف کا بیان ہی صحیح قرار پاتا ہے۔

لیکن لغت اس بات پر شاہد ہے کہ تابوت کے معنی قلب یعنی دل ہیں۔ اور مفسرین نے ان معنوں کو لیا ہے۔ پس قرآن کریم کے الفاظ کا منشاء صرف طالوت کے قلب کی طرف اشارہ کرنا ہی معلوم ہوتا ہے وہ اس پر معترض تھے ان کو بتایا گیا کہ اس کا قلب وہ پہلا سا نہیں۔ خدا نے اس میں سکینت وغیرہ عطا کر دی ہے گویا اسے ایک دوسرا دل دیدیا ہے۔ خود اسموئیل ۱۰: ۹ میں ہے" اور ایسا ہوا کہ جونہی اس نے سموئیل سے رخصت ہو کر پیٹھ پھیری وہیں خدا نے اسے دوسری

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ
مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ
مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ
اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهٗ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ
جُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا

پھر جب طالوت فوجوں کے ساتھ روانہ ہوا، اس نے کہا کہ اللہ نہر کے ذریعے تمھارا امتحان کرنے والا ہے پس جو اس میں سے پانی پی لیگا وہ مجھ سے نہیں ہے اور جو اسے نہ چکھے وہ مجھ سے ہے، مگر وہ جو اپنے ہاتھ سے ایک چلّو بھر لے، پھر اُن میں سے تھوڑوں کے سوائے (باقیوں نے) اس سے پیا[۳۱۸] پس جب وہ اس سے گزر گیا اور وہ جو ایمان لائے اس کے ساتھ تھے انھوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلے کی طاقت نہیں۔ جنھیں یقین تھا کہ وہ اللہ سے

طرح کا دل دیا۔ خود الفاظ قرآنی اسی معنی کے موید ہیں۔ یہ تابوت وہ نہیں جس میں الواح ہوں یا من کا طشت ہو بلکہ وہ ہے جس میں سکینت تھی اور سکینت قلب پر ہی نازل ہوا کرتی ہے جیسے فرمایا ھوالذی انزل السکینۃ فی قلوب المومنین (الفتح ۴۸-۴) وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی اور اسی سکینت نے ہی دشمن کا رعب ان کے دلوں سے دور کر دیا۔ پھر فرمایا کہ اس میں وہ اچھی باتیں تھیں جو آل موسیٰ یعنی موسیٰ کے برگزیدہ پیروؤں اور آل ہارون یعنی ہارون کے برگزیدہ پیروؤں نے چھوڑیں۔ موسیٰ قوم کے سردار تھے اور ان کے متبعین کامل اسی سرداری کے حقدار۔ ہارون عبادات وغیرہ کراتے تھے خدا نے طالوت کو دونوں اچھی باتوں کا وارث بنا دیا۔ پھر فرمایا تحملہ الملائکۃ اس تابوت کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ بائبل میں اس تابوت کے ذکر میں ہے کہ گائے رتھ میں جوڑ کر اس پر وہ صندوق واپس کیا گیا اور یہ سنت اللہ نہیں کہ فرشتے لکڑی کا صندوق اُٹھائے پھرتے ہوں۔ ہاں قلب کے حامل ملائکہ ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ لسان العرب میں حدیث کا یہ ٹکڑا درج کیا گیا ہے نزلت علیھم السکینۃ تحملھا الملائکۃ یعنی ان پر سکینت نازل ہوئی جس کو فرشتے اُٹھائے ہوئے تھے۔

۳۱۸ جُنُوْد۔ جُنْد کی جمع ہے لشکر کو کہتے ہیں اور ہر ایک جماعت کو بھی۔ جنود ابلیس، جنود ربک۔ اور یہ جُنْدٌ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں سخت زمین جس میں پتھر ہوں۔

نَھَر۔ نَھَر اور نَھْر پانی پینے کی جگہ اور نَھَر کے معنی فراخی یا وسعت بھی ہیں (غ) فی جنات ونھر (القمر ۵۴-۵۴) کی تفسیر میں ہے کہ اس سے مراد فراخی اور روشنی بھی لی جا سکتی ہے (ل) اور نھار یا دن وہ ہے جس میں روشنی پھیل جاتی ہے (غ)

مِنِّی سے مراد ہے وہ میرے ساتھیوں میں سے ہے۔ حدیث میں ہے لیس منّا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا۔

یطعمہ۔ طعم کا لفظ چکھنے پر بولا جاتا ہے۔ خواہ کھانے کی چیز ہو یا پینے کی۔

اغترف۔ غرفۃ۔ غَرْف کے معنی ہیں کسی چیز کا اُٹھانا اور لے لینا اور غرُفۃ وہ ہے جو اس طرح لیا جائے یعنی چلّو بھر۔ اور غُرْفَۃ کے معنی عُلِیَّۃ یعنی چوبارہ یا بلند عمارت بھی ہیں (غ) اولٰئک یجزون الغرفۃ (الفرقان ۲۵-۷۵) لنبوئنھم من الجنۃ غرفاً (العنکبوت ۲۹-۵۸) وھم فی الغرفات اٰمنون (السبا ۳۴-۳۷) جو دونوں غرفۃ کی جمع ہیں۔

نہر سے آزمائش: یہ آزمائش ہو سکتا ہے محض اس لیے کی گئی ہو کہ کون شخص بھوک اور پیاس کی شدت پر صبر کر سکتا ہے اگر مراد اس سے پانی کی نہر لی جائے اور اس طرح پر بہادروں اور دل کے کمزوروں کو الگ الگ کرنا ہو اور ہو سکتا ہے کہ نَھَر سے مراد وسعت اور فراخی ہو۔ کیونکہ یہاں طالوت کی اس فوجکشی کا ذکر ہے جب جالوت کے مقابلہ میں وہ نکلا اور اس سے پہلے ان کو عمالیقوں پر فتح حاصل ہو چکی تھی اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا تھا جس کا ذکر اسموئیل کے باب ۱۵ میں ہے اور حالانکہ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ مال غنیمت کو حرام کریں (یعنی تباہ کر دیں اور اپنے استعمال میں نہ لائیں) مگر طالوت کی فوجوں نے اس وقت عمدہ عمدہ مال غنیمت کو لے لیا اور اپنے تصرف میں لائے اور اس کے بعد یہ لوگ پھر فلستیوں کے مقابلہ میں بہت کمزور ہو گئے۔

جدعون کے ذریعہ سے پہلی آزمائش: لیکن اگر نَھَر سے مراد پانی کی نہر بھی ہو تو بھی عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ اس واقعہ کے یہاں لکھنے میں قرآن کریم نے تاریخی غلطی کی ہے صحیح نہیں۔ یہ سچ ہے کہ بروئے بائبل طالوت کے زمانے سے کوئی ڈیڑھ سو سال پیشتر جدعون کو پانی کے ذریعہ سے لشکر کو آزمانے کا حکم ہوا تھا جس کا ذکر قاضیون کی کتاب کے ساتویں باب کے شروع میں ہے "سو تو انہیں پانی پاس نیچے لا کہ وہاں میں تیری خاطر انہیں آزماؤں گا...... اور خداوند نے جدعون کو فرمایا کہ جو شخص پانی چپڑ چپڑ کے کتے کی مانند پیوے۔ تو ہر ایک ایسے کو علیحدہ رکھ اور ویسے ہر ایک کو بھی جو اپنے گھٹنوں پر جھک کے پیوے"۔ اب قاضیون کی کتاب جس میں یہ واقعہ درج ہے اس کے متعلق بھی یہ امر مسلم ہے کہ یہ اصلی نہیں بلکہ پرانے مسودات کی بنا پر لکھی گئی ہے۔ اس لیے اس کے بیان واقعہ پر اس قدر وثوق نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی تاریخی صحت پر شبہ نہ ہو سکے۔ خود اسی واقعہ میں کئی ایک غلط بیانیاں ہیں۔ پادری ڈٹلو اپنی تفسیر بائبل میں اعتراف

اللهِ ؕ كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةً ۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۲۴۹﴾
وَ لَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۵۰﴾ؕ
فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ وَاٰتٰٮهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ وَالۡحِکۡمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ

ملنے والے ہیں وہ بولے بسا اوقات چھوٹا گروہ بڑے گروہ پر اللہ کے حکم سے غالب آگیا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔[۳۱۹]
اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے نکلے، انھوں نے کہا اے ہمارے رب ہم پر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ اور کافر قوم پر ہمیں مدد دے۔[۳۲۰]
پس اللہ کے حکم سے انھوں نے اُن کو بھگا دیا اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا اور اللہ نے اسے بادشاہی اور حکمت دی اور جو کچھ چاہا اُسے سکھایا[۳۲۱] اور اگر اللہ بعض لوگوں

کرتے ہیں کہ "جن مقامات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ مشتبہ ہیں" اور کوہ جلعاد کے ذکر پر لکھتے ہیں "جلعاد یردن کے مشرق کو ہے یہاں مراد کوئی اور مقام ہونا چاہیے" پس جب یہ واقعات اس قدر مشتبہ ہیں تو ان کی بنا پر قرآن کریم کے بیان کی تردید کس طرح ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں خود بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ پکے اور کچے لوگوں میں امتیاز کے لیے اور بھی امتحان ہوئے اور ایک کا ذکر استثناء ۲۰: ۸ میں ہے اس لیے اگر جدعون کے وقت بھی ایسا واقعہ ہوا ہو اور طالوت کے وقت بھی تو کونسا امر بعید ہے۔ ایک کا ذکر بائبل نے کر دیا ایک کا قرآن شریف نے۔ یہ تو شاید کسی عیسائی کو دعویٰ نہیں کہ بنی اسرائیل کی ایسی مکمل تاریخ بائبل میں ہے کہ جس واقعہ کا وہاں ذکر نہ ہو وہ تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ بائبل میں یہ ذکر ہے کہ کتے کی طرح چپڑ چپڑ کے پانی پئے۔ قرآن شریف میں ہے کہ ایک چُلو بھر پانی پئے پیٹ بھر کر نہ پئے۔ یہ کلام زیادہ پر حکمت ہے۔

ع۳۱۹ جالوت۔ جال سے ہے اور جال فی الحرب کے معنی ہیں جنگ میں شدت سے حملہ کیا۔ بائبل میں اس کا نام جاتی جولیت دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اس قدر شدت سے حملہ آور ہوتا تھا کہ باوجود اس کے بار بار للکارنے کے بنی اسرائیل میں سے کوئی اس کے سامنے نہ نکلتا تھا۔

فئۃ۔ فَیٔ سے ہے جس کے معنے ہیں اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا اور فئۃ وہ گروہ ہے جو ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں اور ان کے بعض بعض کی مدد کے لیے لوٹ لوٹ کر آئیں (غ)

چھوٹا گروہ بڑے گروہ پر بسا اوقات دنیا میں غالب آتا رہتا ہے۔ یہ لوگ ایک بڑے امتحان میں سے ہو نکلے اور حکم کے ماتحت ہر دُکھ اور تکلیف کے اُٹھانے کے لیے عزم کر چکے تھے اس لیے اس بات کے اہل تھے کہ تھوڑے ہونے کے باوجود بھی بہتوں پر غالب آئیں اصل غرض مسلمانوں کو تشفی دینا تھا اور یہ بشرطیکہ وہ صابر بنیں۔ پھر جس صفائی سے تھوڑوں کے بہتوں پر غالب آنے کا نقشہ آنحضرت صلعم کی زندگی میں نظر آتا ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہمیشہ دشمن کی کثرت رہی اور مسلمان تھوڑے رہے ہمیشہ سامان زیادہ دشمن کے پاس رہا مگر مسلمانوں میں قوت ایمانی صبر برداشت کی طاقت ان کو نصرت الٰہی کا حقدار ٹھہراتی رہی۔ آج مسلمانوں کی مغلوبیت قوت ایمانی اور صبر ہی کی کمی کا نتیجہ ہے۔

ع۳۲۰ برزوا۔ براز کھلے میدان کو کہتے ہیں اور بَرَزَ کے معنے ہیں کھلے میدان میں آگیا۔ بعض وقت کسی شخص کی جو حالت پہلے چھپی ہوئی ہو اس کے ظاہر ہو جانے پر بھی بَرَزَ بولا جاتا ہے جیسے وبرزوا للّٰہ الواحد القہار (ابراھیم ۱۴-۴۸) وبرزوا للّٰہ جمیعا (ابراھیم ۱۴-۲۱) یوم ھم بارزون (المومن ۴۰-۱۶) (غ)

افرغ۔ فراغ خلاف شغل ہے اور اَفرغتُ الدّلو کے معنی ہیں جو پانی اس میں تھا بہا دیا اسی سے اِفراغ کے معنی بہا دینا لیے گئے ہیں (غ) اور فرّغ کے معنے فراخی اور بہانے کے بھی آتے ہیں (ل) یہاں افراغ صبر سے مراد صبر کا بہتات کے ساتھ عطا فرمانا ہے اور صَبر سے مراد یہاں استقلال ہے۔

ثبّت۔ ثبات اصل میں خلافِ زوال ہے اور بعض وقت ثبوت یا اِثبات دلائل سے ہوتا ہے اور تثبیت کے معنی قوت دینا ہیں یعنی قوی یا مضبوط کرنا (غ)

یہاں سے معلوم ہوا کہ دشمن کے مقابلہ میں غلبہ صبر اور ثابت قدمی سے ملتا ہے۔ اس لیے یہ دعا سکھائی جو لوگ ذرا ذرا مقابلہ پر ہمت ہار دیتے ہیں اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں وہ غالب نہیں ہو سکتے۔ جنگ میں بالخصوص صبر ہی سب سے زیادہ کام دینے والی چیز ہے۔

ع۳۲۱ داؤد۔ بنی اسرائیل میں ایک عظیم الشان نبی ہیں جو نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی رکھتے تھے ان کا زمانہ ۱۰۱۷ قبل مسیح ہے آپ کے والد کا نام یسی تھا جو بیت اللحم کا رہنے والا تھا۔

بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

کو بعض سے دفع نہ کرے تو زمین تباہ ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ جہانوں پر فضل کرنے والا ہے۔ ۳۲۲

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ اللہ کی باتیں ہیں، جن کو ہم حق کے ساتھ تجھ پر پڑھتے ہیں اور یقیناً تو مرسلوں میں سے ہے ۳۲۳

الحکمۃ حِکْمَۃ کے اصل معنی تو علم وعقل کے ساتھ حق کو پالینا ہیں (غ) یا علم وعمل کے ساتھ (ت) اور مختلف موقعوں پر مختلف معنی میں اس کا استعمال ہوا ہے۔ کبھی کتاب کے مقابلہ پر اس کا استعمال ہوا ہے تو اس سے مراد کتاب کا فہم یا تفصیلات شریعت یا سنت ہیں دیکھو ۱۶۴ یہاں ملک یا بادشاہت کے مقابلہ پر مراد اس سے نبوت ورسالت ہے۔ کیونکہ اس کے معنی نبوت ورسالت بھی آئے ہیں (ت) اور فی الحقیقت نبوت اور رسالت سے ہی انسان حق کو پاتا ہے اور اللہ کی طاعت تفقہ فی الدین اور عمل فہم وخشیت۔ ورع امر اللہ میں تفکر اور اس کا اتباع ان سب معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور حلم کے معنی میں بھی آیا ہے اور قرآن شریف اور توریت اور انجیل پر بھی بولا گیا ہے (ت) اور سدی سے بھی حکمۃ کے معنی نبوت مروی ہیں (غ)

بائبل میں طالوت کے متعلق متضاد بیان: بائبل میں حضرت داؤد کے ساؤل یعنی طالوت کے پاس جانے کے متعلق دو متضاد بیان ہیں دیکھو اسموئیل ۱۶: ۱۸ تا ۲۲۔ اور ۱۷: ۲۶ و ۵۵-۵۸۔ پہلا بیان یہ ہے کہ ساؤل نے داؤد کو بلا کر بربط بجانے پر رکھا تھا اور دوسرا یہ کہ جالوت کے مقابلہ میں دیکھا تو اسے معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے اور یہ امر بائبل کی رو سے مسلم ہے کہ داؤد نے ہی جالوت کو قتل کیا اور ملک اور حکمت دونوں داؤد کو دینے سے منشا یہ ہے کہ بادشاہت اور نبوت دونوں دیئے۔

۳۲۲ دفع۔ دَفَعَ کا صلہ جب اِلٰی ہو تو اس کے معنی اِنَالۃ یعنی دوسرے کو کسی چیز کا پہنچا دینا ہوتے ہیں جیسے فادفعوا الیھم اموالھم (النساء ۴-۶) جہاں مراد ہے کہ ان کے مال ان کے حوالے کردو اور جب صلہ عن ہو تو اس کے معنی حمایت ہوتے ہیں جیسے ان اللّٰہ یدافع عن الذین اٰمنوا (الحج ۲۲-۳۸) (غ) یہاں دفع اپنے اصل معنی میں ہے الازالۃ بقوۃ (ل) یعنی قوت سے دور کر دینا جس سے مراد لوگوں کی شرارت کا دور کرنا ہے۔

یہاں مذہبی جنگ کی حکمت بیان فرمائی۔ جب شریر لوگ دنیا میں زور پکڑ جاتے ہیں اور حق اور انصاف کو تباہ کرنا چاہتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو تباہ کر دیتا ہے اور ذو فضل کہہ کر بتا دیا کہ جنگ ایک وقت فضل ہوتا ہے۔ اس میں نبی کریم صلعم کی جنگوں کی طرف اشارہ ہے اس اصول کی تعلیم کہ جنگ کبھی فضل ہوتی ہے پہلے قرآن شریف نے ہی دی۔

۳۲۳ عیسائیوں کے اعتراض اور قرآن کی حقانیت: اس اور گزشتہ رکوع کی بیشتر باتوں پر عیسائیوں نے تاریخی طور پر غلط ہونے یا گڈمڈ ہونے کا اعتراض کیا ہے مگر کیسی حقانیت قرآن شریف کی نظر آتی ہے کہ جہاں اعتراض ہونا تھا وہیں خود ہی ان باتوں کا ذکر کر کے فرما دیا کہ یہ جو کچھ پڑھا گیا بالحق ہے یعنی یہ واقعات صحیح بھی ہیں اور ایک ضرورتِ حقہ کے لیے بیان کیے گئے ہیں اور جس قدر ضرورت تھی اسی قدر بیان کیے گئے ہیں۔ ضرورت یہ تھی کہ مسلمانوں کو جنگ درپیش تھی، وہ تھوڑے تھے۔ ان کو سمجھانا مقصود تھا کہ وہ بہتوں پر کس طرح غالب آئیں گے۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ منافق یا کچے لوگ تم سے جنگوں میں الگ ہو جائیں تو یہ تمہارے لیے کمزوری نہیں بلکہ قوت کا موجب ہوگا اور پھر فرمایا کہ ان جنگوں کی ضرورت اب فساد کو دُور کرنے کے لیے ہے۔ یقیناً تو مرسلوں میں سے ہے یعنی خود ان باتوں کو بیان نہیں کرتا بلکہ خدا کی بتائی ہوئی باتیں ہیں اور پھر پہلے بھی رسولوں کو جنگ کرنی پڑی تو اب اس رسول کی جنگوں پر کیا اعتراض ہے۔

٢٥٣ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ
اِن رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے[٣٢٤]،
مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ
اِن میں سے وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کو مراتب میں اُو
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ
بلند کیا[٣٢٥] اور ہم نے عیسٰی بن مریم کو کُھلے دلائل دیئے اور رُوح القدس

ع٣٢٤ تلك - یہ اشارہ ان رسولوں کی طرف ہے جن کا ذکر اسی سورت میں ہو چکا ہے - اور غور کیا جائے تو ما انزل من قبلك میں اور ما اوتی النبیّون من ربهم میں کل دنیا کے انبیاء کا ذکر ہو چکا - پس تلك الرسل میں کل دنیا کے رسولوں کی طرف اشارہ ہے۔

فضلنا - تفضیل - فَضِيْلَةٌ - فضل میں درجۂ بلند ہے اور تفضیل فضیلت کا عطا کرنا یا کسی ایسی صفت یا خصلت کا ایک میں رکھ دینا ہے جو اس کو دوسروں سے ممیّز کر دے (ت)

رسولوں کی فضیلت کا ذکر یہاں کس تعلق سے شروع کیا ؟ پیچھے فرمایا تھا تم رسولوں میں سے ایک ہو اور یہاں فرمایا ان رسولوں کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی تھی - گویا یوں فرمایا کہ تم رسولوں میں سے ایک ہو اور سب پر فضیلت رکھتے ہو اور یہ کوئی امر مستبعد نہیں اس لیے کہ رسولوں کو ایک دوسرے پر فضیلت ہونے میں کوئی ہرج نہیں - بغیر اس کے سلسلہ مضمون ٹھیک نہیں رہتا اسی کے مطابق روح المعانی میں ہے استئناف مشعر بالترقی کانہ قیل انك لمن المرسلین وافضلهم فضلا اور اصل میں یہ اشارہ یہاں اس لیے کیا کہ متعدد موقعوں پر رسول کریم صلعم کی فضیلت کا ذکر ہو چکا تھا - مثلاً کل جہانوں کی طرف مبعوث ہونے میں پھر قرآن کریم کی سب کتابوں پر فضیلت میں - پھر اس کے پہلی ساری شرائع کے ناسخ ہونے اور ان سے بہتر ہونے میں پھر آنحضرت صلعم کے تمام مذاہب عالم کے جھگڑوں میں فیصلہ کرنے والا ہونے میں اس لیے فرمایا کہ تم جو ان سب رسولوں کی جگہ لیتے ہو، یہ تمہاری فضیلت لا نفرق بین احد منهم (١٣٦) کے خلاف نہیں - کیونکہ پہلے رسولوں کو بھی ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے - اور یہاں چونکہ حضرت داؤد کو بادشاہت اور نبوت دونوں دینے کا ذکر آیا تھا - جو دوسرے انبیائے بنی اسرائیل پر ان کی ایک فضیلت تھی - اس لیے رسول اللہ صلعم کی فضیلت کا ذکر کیا کیونکہ آپ کو بھی نبوّت کے ساتھ اب بادشاہت مل رہی تھی - اور ایک کو دوسرے پر فضیلت دینے سے یہ منشاء نہیں کہ وہ دوسرا ناقص ہے - بلکہ دو کامل انسانوں میں جو چیز ایک کو دوسرے سے ممیّز کرتی ہے یا جو کوئی زاید بلند مرتبہ دیا جاتا ہے وہی اس کی فضیلت ہے - گویا کمال انسانی کے بھی مختلف مدارج ہیں -

آنحضرت صلعم کا جامع کمالات انبیاء بنی اسرائیل ہونا: ایک اور بات اس جگہ یاد رکھنے کے قابل ہے - نبی کریم صلعم کی اس فضیلت کا ذکر سلسلہ موسویہ کے دو عظیم الشان انبیاء داؤد اور عیسٰی کے درمیان کیا ہے - حضرت داؤد ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے ان انبیاء میں سب سے بڑھ کر ہیں تو حضرت عیسٰی اخلاقی اور روحانی تعلیم کے لحاظ سے - نبی کریم صلعم ان دونوں پہلوؤں سے دونوں سے بلند تر ثابت ہوئے علاوہ بریں ان دونوں نبیوں نے آنحضرت صلعم کے متعلق جو پیشگوئیاں کی ہیں ان میں آپ کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا ہے دیکھو زبور (١١٠) اور متی ٢١: ٣٣-٤٤ گویا باوجود اپنے اپنے کمالات ظاہری و باطنی کے انہوں نے آنحضرت صلعم کے کمالات ظاہری و باطنی کو اس بلند مرتبہ پر پایا کہ آپ کی ہر دو شانوں میں ان کو خدا کی شان نظر آئی -

آنحضرت صلعم کی یہ فضیلت جس کا ذکر اس لطیف پیرایہ میں کلام الٰہی میں پایا جاتا ہے اس کے برخلاف وہ احادیث نہیں جن میں ایسے الفاظ آتے ہیں کہ مجھے موسٰی پر فضیلت مت دو - یا یونس پر فضیلت مت دو - کیونکہ اصل میں وہ خاص موقع کی باتیں ہیں - بخاری کی اس حدیث میں جس میں موسٰی پر فضیلت نہ دینے کا ذکر ہے یہ واقعہ درج ہے کہ ایک صحابی کا ایک یہودی کے ساتھ اسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا اور آپ کو غالباً یہ خیال گزرا ہو گا کہ ایسا نہ ہو کہ اس طرح مقابلہ میں ایک نبی اللہ کی تحقیر ہو جائے

ع٣٢٥ کلم اللہ - کلام - الفاظ منظومہ کا نام ہے جو معنی رکھتے ہوں دیکھو ٣١ اللہ کا کلام کرنا کس طرح ہوتا ہے اس کی تصریح خود قرآن کریم نے الشوریٰ ٤٢: ٥١ میں فرمائی ہے جہاں فرمایا کہ صرف تین طرح پر اللہ تعالیٰ کا کلام بندہ کے ساتھ ہوتا ہے - ایک دل میں ڈال کر یعنی وحی خفی - ایک پردہ کے پیچھے سے یعنی رؤیا کشف الہام کی صورت میں - ایک ملک یعنی جبرئیل کو بھیج کر - ان کے علاوہ اور کوئی طریق کلام کا نہیں - امام راغب نے بھی دنیا میں اللہ کے انسان کے ساتھ کلام کرنے کو انہی تین طریقوں پر قرار دیا ہے -

رَفَعَ - رَفْع کے چار معنی ع٩٣ میں بیان ہوئے ہیں ان میں سے یہاں شرف منزلت مراد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کو رفع کرنا صرف اسی معنی میں آتا ہے نہ اس کو نیچی جگہ سے اُٹھا کر بلند جگہ پر رکھ دینے میں جس پر خود اللہ تعالیٰ کا اسم الرافع شاہد ہے جس کے معنی ہیں الذی یرفع المؤمن بالاسعاد و اولیاءہ بالتقریب (ل) وہ جو مومن کو نیک بخت بنا کر اور اپنے اولیاء کو اپنا قرب عطا فرما کر رفع کرتا ہے -

درجات کے پہلے یا کچھ محذوف ہے جیسے فی - اور یا درجۃ بمعنی رفعۃ لیکر انتصاب علی المصدر ہے یا حال ہے اور مراد ذو درجات ہے ان الفاظ کا کیا منشاء ہے ؟ صورت کلام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف بعض رسولوں کے ساتھ کلام ہوا اور بعض کے مرتبے بلند ہوئے ان سے کلام نہیں ہوا - اس لیے کسی نے کہا یہاں کلام بلا واسطۂ ملک مراد ہے جیسے طور پر حضرت موسٰی سے اور معراج کی رات آنحضرت صلعم سے مگر یہ ما کان لبشر (الشوریٰ ٤٢ - ٥١) کے حصر سے خارج ہے - اس لیے وہ کلام بھی ان تینوں اقسام میں سے ایک قسم کا ہو سکتا ہے جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے اور کسی نے کہا کلم اللہ سے مراد

بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ
وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ
مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ
ع اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ
مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا
خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

سے اس کی تائید کی اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو اُن کے بعد ہوئے[۳۲۶]
آپس میں نہ لڑتے۔ اس کے بعد اُن کے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں،
لیکن انھوں نے اختلاف کیا، پس اُن میں سے وہ ہے جو ایمان لایا
اور ان میں سے وہ ہے جس نے انکار کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس
میں نہ لڑتے لیکن اللہ جو کچھ ارادہ کرتا ہے، کر دیتا ہے۔[۳۲۷]
اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے
خرچ کرو اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت
ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ ہی کوئی سفارش اور کافر ہی ظالم ہیں[۳۲۸]

حضرت موسیٰ اور رفع بعضھم درجات سے مراد آنحضرت صلعم ہیں مگر یہ تخصیص بلا وجہ ہے۔ کلام تو سب سے ہوا۔ اصل میں یہ ترکیب ایسی ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا: ففریقاً کذبتم وفریقاً تقتلون (۸۷) ایک فریق کو تم نے جھٹلایا اور ایک فریق کو قتل کرتے ہو۔ یہ مراد نہیں کہ جن کو قتل کرتے ہو ان کو جھٹلایا نہیں بلکہ وہ پہلا مرتبہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک کے ساتھ تو اسی قدر مخالفت کی کہ ان کے جھٹلانے پر بس کی مگر دوسرے کے لیے قتل کے منصوبے بھی کیے اسی طرح پر یہاں مراد یہ ہے کہ کلام تو پہلا مرتبہ ہے۔ بعض رسولوں کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ نے کلام ہی کیا یعنی ان کو صرف تعلیم اور ہدایت کے ساتھ بھیجا اور بعض کو کچھ اور مراتب بھی دیئے جیسے بادشاہت جس کا اوپر حضرت داؤد کے ذکر میں بیان ہوا۔ نبوت اور بادشاہت دونوں اکٹھی بہت کم کو ملی ہیں اور ان سب کے سرتاج ہمارے حضرت محمد مصطفیٰ صلعم ہیں۔

۳۲۶ ان الفاظ کی تشریح پہلے ہو چکی ہے ۱۱۱۔ یہاں حضرت عیسیٰ کا نام اس لیے لیا کہ جب ایک طرف حضرت داؤد کی فضیلت اس رنگ میں بیان کی کہ ان کو دت کے ساتھ بادشاہت دی تو حضرت عیسیٰ جو بادشاہت سے بالکل خالی گذرے ان کا نام بھی لیا کہ ان کو اور رنگ کے کمالات دیدیئے گئے یا اس لیے کہ حضرت عیسیٰ قومی نبیوں میں سے آخری نبی ہیں اور اس سے اگلے الفاظ میں اس نبی کی طرف اشارہ ہے جو کل دنیا کی طرف آیا۔

۳۲۷ اقتتل۔ اقتتال اور مُقاتلة کے ایک ہی معنی ہیں یعنی باہم جنگ کرنا۔

سب قوموں کی طرف ایک رسول کے آنے کی ضرورت: یہاں فرماتا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو پہلے جو رسول قوموں قوموں کی طرف بھیجے گئے تھے ان کے بعد اُن کے پیرو باہم جنگ کرتے لیکن چونکہ ارادہ الٰہی یہی ہو چکا تھا کہ سب نبیوں کے آخر میں ایک نبی آئے اور وہ سب دنیا کی قوموں کو بھائی بھائی بنائے اس لیے اہل مذاہب نے باہم جھگڑے کیے اور گو مشیت کا معنی ارادہ بھی استعمال ہو جاتا ہے مگر اصل میں اللہ کی مشیت اس کا چیزوں کو خاص رنگ میں وجود میں لانا ہے پس چونکہ اس نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے کہ اس کے اندر قوائے مختلفہ جمع ہوں جن سے اس کی تمام ترقیات پیدا ہوتی ہیں اور قوائے مختلفہ کے غلط استعمال سے ہی جھگڑا پیدا ہوتا ہے اس لیے لوشاء اللہ ما اقتتلوا کے معنی صرف یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسان کو ایسا بناتا کہ اس کے اندر قوائے مختلفہ نہ ہوتے مگر اس کی مشیت نے یہی چاہا کہ وہ دوسری مخلوق سے بڑھ کر ترقی کرے اس لیے قوائے مختلفہ اس کے اندر رکھے یفعل ما یرید میں یا تو یہی اشارہ ہے کہ انہی قویٰ کے اچھے استعمال سے وہ نیک نتیجہ پا لیتا ہے اور بد استعمال سے برا اور یا یہ کہ ارادہ الٰہی یہ ہے کہ کل دنیا کے جھگڑوں اور اختلافوں کے فیصلہ کے لیے ایک رسول کل دنیا کی قوموں کی طرف بھیجے

۳۲۸ خُلّة۔ خلل دو چیزوں کی درمیانی کشادگی کو کہتے ہیں اور خُلّة محبت ہے یا اس لیے کہ وہ دل کے وسط میں ہوتی ہے اور یا اس لیے کہ وہ دل کے اندر گھس جاتی ہے۔ محبت کو بھی محبت اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حَبّة القلب کے اندر داخل ہوتی ہے (رغ)

قیامت میں بیع، خلت، شفاعت کے نہ ہونے سے کیا مراد ہے: قیامت کے دن جن تین چیزوں کے نہ ہونے کا ذکر کیا ہے یعنی تجارت، تعلقاتِ محبت۔ سفارش۔ وہ وہی ہیں جو انسان کے لیے خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے میں روک ہو جاتی ہیں۔ ایک شخص اپنی تجارت میں اس قدر غرق ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا ایک پیسہ بھی اس تجارت سے باہر نکلے۔ اس لیے خدا کی راہ میں دینے سے رکتا ہے۔ یا جہاں تعلق محبت ہوتا ہے وہیں سارا مال خرچ کر دیتا ہے اور خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔ یا سفارش یعنی کسی بڑے آدمی کا تعلق مانع ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب ضرورت جنگ کا مضمون ختم ہوا تو اسلام کی کامیابی کی بشارت دیتے ہوئے انفاق کی ضرورت اول ظاہر کی جس مضمون کو آگے دو رکوعوں میں بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور مال کے خدا کی راہ میں دینے میں جو چیزیں مانع ہیں ان کے متعلق فرمایا کہ یہ قیامت کے دن تمہارے کسی کام نہ آئیں گی۔ اور تلافی مافات نہ کریں گی۔ یہاں اصل مقصد بیان کرنے کا صرف اسی قدر ہے کہ اس دنیا کی تجارت۔ اس دنیا کی دوستی۔ اس دنیا کی سفارش وہاں نہ ہوگی۔ کیونکہ یہی چیزیں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے سے روک ہیں۔ اُس عالم کی خُلّت اور شفاعت اور چیزیں ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الا المتقین (الزخرف ۴۳: ۶۷) دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقیوں کے۔ معلوم ہوا

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ
سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ
اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا
بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہمیشہ زندہ خود قائم، قائم رکھنے والا ہے ۳۲۹ع۔ اس پر نہ اونگھ غالب آتی ہے اور نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کون ہے جو اس کے پاس سوائے اس کی اجازت کے سفارش کرے وہ جانتا ہے جو کچھ اُن کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ چاہے ۳۲۹ف اس کا علم آسمانوں اور زمین پر حاوی

کہ وہ خُلت جو اتقا سے پیدا ہوتی ہے اور جو درحقیقت اس عالم کی چیز نہیں، وہ باقی رہے گی اس دنیا کی دوستی نہ رہے گی۔ اسی طرح فرمایا لا تغنی شفاعتہم شیئًا الا من بعد ان یّاذن اللہ لمن یشآء ویرضٰی (النجم ۵۳-۲۶) پس وہ شفاعت جس کی بنا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے وہ اس کے اذن سے وہاں ہو گی۔ مگر وہ شفاعتیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہیں اور جن کا تعلق محض اس دنیا سے ہے وہ باقی نہ رہیں گی۔

کفار سے مشابہت نہ ہو: آیت کے آخری الفاظ۔ کافرہی ظالم ہیں۔ دو باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ مومنوں کو جو یہ ضرورت جنگ پیش آئی، تو یہ اُن کی خواہش سے نہیں بلکہ ظلم کافروں کی طرف سے ہے کہ وہ حق کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خدا کی راہ میں مال نہ خرچ کرنا جو ظلم ہے کیونکہ اس کا حق ادا نہیں ہوتا یہ کافروں کا کام ہے۔ مومن کے لیے یہ شایاں نہیں یا ڈرایا کہ انفاق سے انکار کر کے کافروں سے مشابہت پیدا نہ کریں۔

۳۲۹ع الحی۔ وہ جس کے لیے ہمیشہ کی زندگی ہے (ج) یعنی نہ اس کے اوّل کی کوئی حد بندی ہے نہ آخر کی۔ امام راغب نے جو اقسام حیات بیان کی ہیں ان میں سے چھٹی قسم جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کی ہے وہ ہے جس پر موت کا لفظ کبھی صادق نہیں آ سکتا۔ پھر بعض لوگوں نے توجیہات کی ہیں کہ وہ حیّ بالتدبیر ہے یعنی جس طرح چاہتا ہے امور میں تصرّف کرتا ہے اور جو اندازے چاہتا ہے مقرر کرتا ہے مگر حق یہ ہے کہ اگر حیات مخلوق کی ایک صفت ہے تو خالق کی صفت حیات ضرور ہے کیونکہ جو صفت خالق میں نہیں وہ مخلوق میں پیدا نہیں ہو سکتی وہ حیّ ہے اور حیات کا سرچشمہ ہے۔

القیوم و قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ القائم الحافظ لکلّ شیءٍ والمعطی لہٗ مابہ قِوامہ (غ) یعنی خود قائم اور ہر چیز کا حافظ اور اس کو وہ اسباب عطا فرمانے والا جن کے ساتھ اس کا قیام ہے۔ اس کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں القائم بذاتہ والمقوّم لغیرہ یعنی اپنی ذات میں قائم دوسروں کو قائم رکھنے والا۔

۳۲۹ل تاخذہ۔ اخذ یعنی پکڑنا کبھی قہر یعنی غلبہ کے ساتھ ہوتا ہے (غ) تاخذ کے معنی یہاں یہی ہیں یعنی اس پر غالب آتی ہے۔

سِنَة۔ اس کا مادہ وَسَن ہے دونوں کے معنی غفلت اور خواب ہیں (غ) یا سِنَة اونگھ ہے جو نیند تک نہ پہنچے جس پر یہ شعر بطور شہادت ہے فی عینہ سِنَةٌ ولیس بنایم (ل) اس کی آنکھ میں اونگھ ہے وہ سویا ہوا نہیں۔ سنة کو نوم پر مقدم کرنے کی وجہ: نیند سے پہلے اونگھ کا ذکر اس لیے کیا کہ تاخذہ کے معنی میں غلبہ ہے۔ اونگھ اس پر غالب نہیں آتی بلکہ نیند جو اس سے شدید تر ہے وہ بھی اس پر غالب نہیں آ سکتی۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص پر اونگھ تو غالب نہ آئے مگر نیند سے وہ مغلوب ہو جائے۔

شفاعت کے لیے ضرورت اذن: یشفع عندہ الا باذنہ۔ شفاعت پر دیکھو ع۱۷۔ یہاں شفاعت کے لیے اذن الٰہی کو ضروری قرار دیا ہے اور اس اذن کی ضرورت نہ صرف شفاعت کرنے والے کے لیے ہی بکار ہے بلکہ جس کے لیے شفاعت کی جائے اس کے متعلق بھی فرمایا لا یشفعون الا لمن ارتضٰی (الانبیاء ۲۱-۲۸) شفاعت کرنے والے بھی اسی کے متعلق شفاعت کریں گے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرے۔ پس شفاعت نہ تو شفاعت کرنے والے کے اختیار کی کوئی چیز ہے کہ جب چاہے شفاعت کرے اور نہ جس کیلئے شفاعت کی جائے اسے کوئی حق ہے کہ وہ اپنا شفیع پیش کرے۔ شفاعت میں اذن کا مفہوم اصل میں کیا ہے اس کی حقیقت حدیث شفاعت سے منکشف ہوتی ہے اس میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم فرماتے ہیں۔ کہ میں قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں سجدہ میں گر جاؤں گا یہاں تک کہ مجھے حکم ہو گا کہ کہو تمہاری بات قبول کی جائے گی اور شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کی یہ شفاعت بھی درحقیقت قیامت کے دن دعا کا ہی ایک رنگ ہے جس طرح اس دنیا میں آپؐ نے اپنے صحابہؓ کے لیے اور اپنی امت کے لیے دعائیں کر کے ان کو گناہوں سے پاک وصاف کیا۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی آپؐ ان کے لیے دعا کریں گے اور وہ آپؐ کی دعا قبول ہو کر آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اس دنیا میں نیک لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں وہ اِس رنگ کی شفاعت کا انکار نہیں کر سکتے اور یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب ہمارے نبی کریم صلعم کی شفاعت اس دنیا میں بھی ظاہر ہوئی، یہاں تک کہ صحابہؓ کو نہ صرف روحانی طور پر تزکیہ کے مقام پر ہی پہنچایا بلکہ ظاہری طور پر بھی بادشاہت ان کو عطا فرمائی، تو قیامت کے دن آپؐ کی شفاعت کا ظہور ہونا خود ایک ثابت شدہ امر ہے۔ اسلام نے ہر ایک سچائی پر ایسی کامل روشنی ڈالی ہے کہ اس کے کسی پہلو کو تاریکی میں نہیں چھوڑا۔

وَلَا يَـُٔودُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿٢٥٥﴾
لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ
الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ

ہے اور ان دونوں کی حفاظت ۳۲۹ب اس پر بوجھ نہیں ۳۲۹ج اور وہ بہت بلند عظمت والا ہے
دین میں کوئی زبردستی (منوانا) نہیں ہدایت (کی راہ) گمراہی سے واضح ہو چکی
ہے ۳۳۰ پس جو شخص شیطان کا انکار کرتا ہے اور اللہ پر ایمان لاتا ہے،

مابین ایدیھم وما خلفھم جو کچھ سامنے ہے وہ امر دنیا ہے اور جو پیچھے ہے وہ امر آخرت ہے (ج) یا اس کے خلاف (غ) یا مراد ہیں پہلی گزری ہوئی باتیں اور آئندہ ہونے والی یا محسوس اور غیر محسوس۔

یحیطون۔ اِحاطة۔ دو طرح پر ہے۔ ایک اجسام میں دوسرا علم میں۔ علم میں احاطہ سے مراد ہے کہ ایک چیز کے وجود اور جنس اور کیفیت اور غرض کو جو اس سے مقصود ہے پوری طرح جانا جائے۔ اور یہ بات سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاصل نہیں (غ) حتیٰ کہ ایک ریت کے ذرہ کے پورے علم کا بھی انسان احاطہ نہیں کر سکتا۔

۳۲۹ب کُرسی عرف عام میں وہ چیز ہے جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ مگر یہاں ابن عباس نے کرسی کے معنی علم کیے ہیں اور بعض نے ملک (غ) ابن عباس کی روایت بخاری میں ہے۔ اس معنی پر ذیل کے اعتراض کیے گئے ہیں۔ اول لغت عرب میں کرسی کے معنی علم نہیں آئے۔ جواب کرسی کے مادہ کرس میں علم کا مفہوم پایا جاتا ہے بلکہ ابن جریر کہتے ہیں کہ کرسی کا اصل مفہوم علم ہے اس لیے ایسے صحیفہ کو جس میں علم کی بات لکھی ہوئی ہو کراسة کہا جاتا ہے اور ایسا ہی تکرس کے معنی عَلِم یعنی جان لیا پر ایک راجز کا قول نقل کیا ہے اسی وجہ سے علماء کو کراسی (کرسی کی جمع) کہا جاتا ہے (ت) اور زمخشری نے قطرب سے یہ ضرب المثل نقل کی ہے خیر هذا الحیوان الاناسی وخیر الاناسی الکراسی (ت) یعنی حیوانوں میں سے سب سے بہتر انسان ہیں اور انسانوں میں سب سے بہتر علماء پس جب اصل معنی میں علم موجود ہے تو قرآن شریف کا اس لفظ کو صفات الٰہی میں استعمال کرنا بالکل درست ہے۔ کیونکہ نئے مفہوم کو پرانے الفاظ میں ہی ادا کرنا تھا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کرسی بمعنی علم کی روایت صحیح نہیں اور ابن عباس سے موضع قدمیه اس کے معنی ثابت ہیں۔ جواب وہ معنی بلحاظ ظاہر ہیں اور نہ صرف بخاری اس روایت کو قبول کرتے ہیں بلکہ اور کئی ذرائع سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حدیث میں ہے ما السموات السبع والارضون السبع عند الکرسی الا کحلقة ملقاة بارض فلاة یعنی ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے سامنے ایسی ہیں جیسے ایک انگوٹھی بیابان میں۔ جواب یہ حدیث کرسی بمعنی علم لیکر بھی ویسے ہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے آسمان اور زمین کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ خود قرآن شریف سے کرسی کے معنی علم ہی صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اول سیاق و سباق میں علم کا ذکر ہے کیونکہ حفاظت بھی بذریعہ علم ہی ہے دویم قرآن کریم میں ایسے بیانات تو بکثرت ہیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے یا اس کو وہ جانتا ہے۔ مگر یہ نہیں آتا کہ جو کچھ کرسی میں ہے وہ اس کا ہے یا اس کو وہ جانتا ہے اور یہ تو بہرحال ظاہر ہے کہ جیسے خدا کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں کی طرح نہیں۔ اس کی کرسی بھی ہمارے بیٹھنے کی جگہوں کی طرح نہیں بلکہ جیسے کرسی اہل علم کے لیے ہوتی ہے اور اصل غرض اس پر بیٹھنے کی علم ہے بس وہی غرض یہاں مراد ہے دیکھو ع۲۷ جو اونگھ اور نیند سے بالا ہے وہ بیٹھنے اور لیٹنے سے بھی غنی ہے ولا کرسی فی الحقیقة ولا قاعد (ض) فی الحقیقت نہ کرسی ہے نہ بیٹھنے والا۔

۳۲۹ج۔ یؤود۔ اَوْد سے ہے جس کے معنی جہد و مشقت کو پہنچنا ہیں۔

یہ آیۃ کریمہ آیت الکرسی کے نام سے مشہور ہے اور حدیث میں اس کی بڑی عظمت مذکور ہے۔ ہر فرض نماز کے بعد اس کے پڑھنے کی تاکید ہے ایک حدیث میں ہے کہ یہ سب سے زیادہ عظمت والی آیت ہے اور ایک میں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے اور احمد، ابوداؤد و ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اس آیت اور آل عمران کی پہلی آیت کو پڑھ کر فرمایا ان دونوں میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے اور ایک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم سورۂ بقرہ آل عمران۔ طٰہٰ میں ہے اور تینوں میں یہی اسم الحی القیوم آئے ہیں جو اور کسی سورت میں نہیں آئے اور یہ بھی ثابت ہے کہ جنگ بدر میں جب علیحدہ عریش بنا کر آنحضرت صلعم دعا میں مصروف تھے تو آپ کی زبان پر یہی لفظ بار بار آتے تھے یا حی یا قیوم۔

پس اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ حی و قیوم خدا مسلمانوں کو کافروں کے ہاتھ سے تباہ ہونے سے بچائے گا اور انہیں ایک زندہ قوم بنائے گا۔ نیز اس میں مذاہب باطلہ کا رد ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید کو بیان کیا۔ پھر الحی میں بتایا کہ زندگی اس کی صفت ہے اور اس دنیا میں جو کچھ حیات یا زندگی ہم دیکھتے ہیں یہ اسی کی صفت الحی کا ظہور ہے۔ یہ رد ہے ان لوگوں کا جو مادہ اور روح کو غیر مخلوق مانتے ہیں۔ پھر یہ بتایا کہ اسے اونگھ نہیں آتی۔ عیسیٰ مسیح جس کو خدا بنایا جاتا ہے سوتے تھے۔ ایسا ہی شفاعت کے مسئلہ میں افراط و تفریط کی غلطیوں کو دور کیا۔ جیسے مثلاً عیسائیوں نے تو ایسا دروازہ کھولا کہ جو مسیح کے کفارہ پر ایمان لایا جو چاہے کرے عیسیٰ مسیح اس کے شفیع بن جائیں گے۔ اس کے مقابل بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو ایسا قانون کے پنجہ میں جکڑا ہوا سمجھا کہ شفاعت سے کلی انکار کر دیا قرآن شریف نے باذنه کے ساتھ دونوں غلطیوں کو دور کیا کوئی شخص کسی پر ایمان لانے سے شفاعت کا حقدار نہیں ہو جاتا۔ اور احادیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن آنحضرت صلعم سجدہ میں گر کر دعا کریں گے یہاں تک کہ آپ کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی پس جو لوگ یہاں نیکوں کی دعا کے قبول ہو جانے کو مانتے ہیں وہ شفاعت کا جو وہ بھی ایک دعا کا رنگ اپنے اندر رکھتی ہے انکار نہیں کر سکتے۔

۳۳۰ اکراہ۔ انسان سے ایسا بوجھ اٹھوانا جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ
لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾
اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ
الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ

اس نے ایک محکم جائے گرفت کو مضبوط پکڑ لیا جو ٹوٹنے والی نہیں اور
اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۳۳۱
اللہ اُن لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے، وہ اُن کو سخت اندھیرے
سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جو کافر ہیں ان کے ولی شیطان
ہیں وہ انھیں روشنی سے نکال کر اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں یہ

الدین میں ال عہد کا ہے یا اضافت سے بدل ہے اور مراد دین اللہ ہے۔
غَیّ۔ غَیّ وہ جہالت ہے جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو مگر مطلق جہل کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے (غ) اس کے خلاف رُشْدٌ ہے یعنی ہدایت۔ رُشدٌ و غی سے حق و باطل مراد ہیں۔

انصار میں بچہ کو بطور نذر یہودی بنانے کا دستور: لکھا ہے کہ اہل مدینہ میں یہ دستور تھا کہ بعض عورتیں جب اولاد زندہ نہ رہے تو نذر مان لیتیں کہ بچہ کو اہل کتاب کے دین میں داخل کر دیں گے کیونکہ اس دین کو وہ اپنے دین سے بہتر سمجھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو انصار نے چاہا کہ جو اس طرح دین یہود میں داخل ہو گئے تھے ان کو اسلام میں داخل کریں تو یہ آیت نازل ہوئی جس میں اصول یہ بتایا کہ ایک دین سے دوسرے دین میں داخل ہونا اپنی خوشی کی بات ہے جبر اس میں جائز نہیں۔ اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قبیلہ بنی سالم بن عوف میں سے ایک شخص کے دو بیٹے عیسائی تھے جب وہ مسلمان ہُوا تو آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اُنہیں اسلام میں داخل ہونے کے لیے مجبور نہ کروں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

آیت لا اکراہ منسوخ نہیں: یہ الفاظ ایسے صاف اور اس قدر وسیع ہیں کہ دین اسلام پر بجبر پھیلایا جانے کے جس قدر اعتراضات ہیں ان سب کا ایک ہی جواب کافی ہے اور اس کو منسوخ کہنا محض ایک غلط خیال ہے زید یا بکر کے کہنے سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی۔ ہاں رسول اللہ صلعم کا کوئی فرمان ہو تو تسلیم کر لیا جائے اس کو آیت جاھد الکفار والمنٰفقین سے منسوخ قرار دینا اور بھی غلطی ہے۔ اس حکم کے ماتحت کسی ایک شخص کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا جسے بجبر مسلمان کیا گیا ہو۔ اور ایسا حکم تو اس سے پیشتر مکہ میں نازل ہو چکا تھا جاھدھم بہٖ جھادًا کبیرا۔ جب جاھد کا حکم اس کے دونوں طرف موجود ہے یعنی اس کے نزول سے پہلے بھی اور اس کے نزول کے بعد بھی تو اس کو منسوخ کہنا بالکل بے معنی بات ہے۔

حکم لا اکراہ اہل کتاب سے مقید نہیں: ایسا ہی اس کے حکم کو اہل کتاب پر محدود کرنا بھی صریحًا خلاف قرآن ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس حکم کے ساتھ تو دلیل بھی موجود ہے۔ پھر حکم کو منسوخ یا محدود کرنا اس دلیل کو غلط قرار دینا ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ ہدایت کی راہ گمراہی سے متمیز ہو چکی ہے اس لیے بجبر داخل کرنے کی ضرورت نہیں اب حکم منسوخ تب ہو جب یہ تمیز دور ہو جائے جو بالبداہت باطل ہے کیونکہ ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔ بلکہ اس کو اہل کتاب سے مقید کرنا تو ایک طرف رہا میں کہتا ہوں جو دلیل دی ہے اس کی رو سے تو دعویٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف اپنے پیرؤں کو بھی بجبر کچھ نہیں منواتا۔ بلکہ جو چیز منواتا ہے اس کی دلیل بھی دیتا ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ ہدایت کی راہ واضح ہو چکی بجبر منوانے کی ضرورت ہی کوئی نہیں۔ سب مذاہب کچھ نہ کچھ حصّہ انسان سے بجبر منواتے ہیں جسے طبیعت قبول نہیں کرتی مگر اسلام کچھ بجبر نہیں منواتا پس جبر کا کلی استیصال مذاہب میں سے اسلام نے ہی کیا ہے۔

۳۳۱ الطاغوت۔ طغی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں حد سے گزر گیا لمّا طغا المآء (الحاقۃ ۶۹ - ۱۱) اور طغیان نافرمانی میں حد سے گزرنا ہے۔ طاغوت اس مادہ سے وزن فَعَلُوت پر ہے اور اس سے مراد ہر ایک سرکش اور ہر معبود اللہ کے سوائے ہے واحد اور جمع میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ساحر۔ کاہن۔ مارد جن اور نیکی کے رستے سے پھیرنے والے کو طاغوت کہا جاتا ہے (غ) یہاں طاغوت کے معنی شیطان حضرت عمرؓ سے مروی ہیں۔ بعض نے کاہن بعض نے ساحر بعض نے باطل معبود۔ بعض نے اصنام یعنی بُت معنی لیے ہیں۔ فی الحقیقت غیّ یا گمراہی کی طرف لے جانے والی سب چیزیں طاغوت کے مفہوم میں شامل ہیں۔

استمسك۔ ایسی مضبوطی سے پکڑنا کہ اس پر ثبات کا قصد ہو۔

عُروۃ۔ اصل میں عُری سے ہے جس کے معنی ننگا ہونا ہیں۔ عراء وہ مکان جو بالکل کھلا ہو اور اس میں کسی قسم کا سترہ نہ ہو لنبذ بالعرآء (القلم ۶۸ - ۴۹) اور عُرا کے معنی جانب یا پہلو ہیں اور عروہ وہ چیز جو کسی کی جانب میں ہو اور جسے پکڑا جائے (غ) اس لیے ڈول اور کوزہ کی جائے گرفت کو عروہ کہا جاتا ہے۔

انفصام۔ فَصْم سے ہے جس کے معنی توڑنا ہیں۔

یہاں کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ کو اکٹھا بیان کیا ہے اور جس طرح کفر بالطاغوت سے مراد صرف یہی ہے کہ شیطان کی بات نہ مانے ایمان باللہ سے مراد صرف یہی ہے کہ اللہ کے احکام کی تعمیل کرے جو شخص اس اصول صحیح پر قائم ہو جاتا ہے اس نے ایک مضبوط جائے گرفت کو پکڑا ہے جو ٹوٹتی

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۵۷﴾
أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ
آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي
يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ۖ قَالَ
إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ
فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۲۵۸﴾

آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔ ۳۳۲
کیا تو نے اس (کی حالت) پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا اس لیے کہ اللہ نے اُسے مُلک دیا جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندگی بخشتا اور مارتا ہے اس نے کہا میں بھی زندگی دیتا اور مارتا ہوں، اور ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو تُو اسے مغرب سے نکال، پھر وہ جو کافر تھا حیران رہ گیا اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ ۳۳۳

نہیں یعنی اس کا عمل ضائع نہیں جاتا۔ جیسا کہ معاذ بن جبل کا قول ہے لا انفصام لھا دون الجنۃ ایمان یا اسلام کو عروہ سے تشبیہ دی ہے اور اس کو زور سے پکڑنا یہ ہے کہ انسان پوری کوشش سے اس پر عمل کرے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ ان الفاظ کو پڑھ کر آپ نے فرمایا ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتّٰی یغیروا ما بانفسھم آج وہی عُروہ وثقیٰ موجود ہے مگر اس پر مسلمانوں کی گرفت نہیں۔

۳۳۲ وَلِیّ۔ وَلاء اور تَوالی قرب کے لیے استعمال ہوتے ہیں خواہ مکان کے لحاظ سے ہو یا نسبت کے لحاظ سے یا دین کے یا صداقت کے یا نصرت کے یا اعتقاد کے اور وِلایۃ کے معنی نصرت اور وَلایۃ کے معنی تولّی امر ہیں یا دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی تولّی امر یعنی کسی معاملہ کا متولی ہونا اور وَلِیّ اور مَولیٰ دونوں فاعل کے معنی میں بھی آتے ہیں اور مفعول کے بھی یعنی بمعنی مُوالی۔ ولایت کرنے والا۔ یا موالی جس کی ولایت کی گئی۔ اور اللہ تعالیٰ (بمعنی موالی) بندہ کا وَلِیّ بھی کہلاتا ہے اور مَولیٰ بھی اور بندہ کو بھی خدا کا وَلِیّ کہا جاتا ہے (بمعنی مُوالیٰ) مگر مولیٰ نہیں کہا جاتا (غ) اور چونکہ وَلاء کے اصل معنی شدید تعلق قرب ہیں لیس بینھما مالیس منھما (غ) اس لیے اللہ کا بندہ کا ولی ہونا یا بندہ کا اللہ کا ولی ہونا اسی شدید قرب پر دلالت کرتا ہے اور دونوں میں نصرت دینے یا نصرت دیا جانے کے معنی بھی شامل ہیں اور وَلِیّ کے معنی محب بھی ہیں اور صدیق بھی اور نصیر بھی (ت) گویا وَلِیّ میں قرب اور محبت اور صداقت کا تعلق ہے جس کے ساتھ نصرت ملی ہوئی ہو۔ اس لیے قرآن کریم میں مومنوں کو مومنوں کے ولی کہا گیا ہے اور منافقوں کو منافقوں کے اور کفار کا وَلِیّ شیطان کو کہا گیا ہے جیسے یہاں بھی ہے اولیاۗئھم الطاغوت (اولیاء ولی کی جمع ہے) اور قیامت میں کفار کی ایک دوسرے سے ولایت اور شیطان کی موالاۃ کو منقطع قرار دیا ہے جیسے فرمایا یوم لا یغنی مولی عن مولًی شیئًا (الدخان ۴۴-۴۱)

اللہ کی ولایت مومنوں سے کیا ہے: اللہ کا مومنوں سے تعلق ہے وہ ان کا ولی ہے۔ اور اس کی ولایت یہ ہے کہ جب ایک شخص عملی رنگ میں ایمان لاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کفر شرک معاصی گندے رسم و رواج فاسد اعتقادات جہالت غرض ہر قسم کی تاریکی سے نکال روشنی میں لے آتا ہے پس سچے ایمان کی یہ علامت ہے کہ انسان تاریکی سے باہر نکل آئے کافر جو نیکی کی طرف قدم اُٹھانے سے انکار کرتا ہے اس کا تعلق روز بروز ظلمت سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک بدی سے دوسری بدی کی طرف قدم اُٹھتا ہے اور ایک نیکی سے دوسری نیکی کی طرف۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن شریف نے ہمیشہ نور کو واحد میں استعمال کیا ہے اور ظلمات کو جمع میں۔ کیونکہ نور یعنی حق ایک ہی ہے اور ظلمات یعنی باطل بہت سے ہیں۔ نور کے کمال کو ظاہر کرنے کے لیے بھی نورٌ علٰی نور فرمایا (النور ۲۴-۳۵) اور اسی کے مطابق ہے وانّ ھذا صراطی مستقیمًا فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل (الانعام ۶-۱۵۳) خدا کی طرف لے جانے والا رستہ ایک ہی ہے اس سے دُور لیجانے والے بہت ہیں۔

۳۳۳ بُہِتَ کے معنی ہیں دہشت زدہ اور متحیر رہ گیا۔ بُہتان ایسا جھوٹ جو سُننے والے کو متحیر کر دے (غ) بخاری میں ہے بُہِتَ ذَهَبَتْ حُجَّتُهٗ یعنی اس کو کوئی دلیل نہ سوجھی یا دلیل میں ہار گیا۔

لا یھدی القوم الظّٰلمین۔ قرآن کریم میں بار بار آتا ہے کہ اللہ ظالموں یا کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔ حالانکہ قرآن کریم کو ھدًی للناس بھی فرمایا ہے امام راغب کہتے ہیں کہ ہدایت اور تعلیم دو چیزوں کو چاہتی ہے۔ ہدایت یا تعلیم دینے والے کی طرف سے اس کا دیدینا اور جس کو ہدایت یا تعلیم دی جاتی ہے اس کا اس کو حاصل کر لینا۔ دونوں باتوں سے ہدایت اور تعلیم کامل ہوتی ہے۔ پس جب ہدایت یا تعلیم دینے والے نے اپنا کام کر دیا ہو اور جس کو ہدایت یا تعلیم پہنچائی گئی ہے اس نے اُسے قبول نہ کیا ہو تو نہ قبول کرنے کے لحاظ سے کہا جائیگا کہ اس نے ہدایت اور تعلیم نہیں دی (غ) کیونکہ وہ کام اپنے کمال کو نہیں پہنچا۔ مگر یہاں ہدایت سے مراد صحیح دلیل کا نہ ملنا ہے (ت)

اس رکوع میں تین آیتیں ہیں اور تینوں میں کسی نہ کسی رنگ میں احیائے موتٰے کا ذکر ہے۔ گو باقی باتیں مختلف ہوں۔ پس اس رکوع کا اصل منشاء احیائے موتٰی پر روشنی ڈالنا ہے اس سے پہلے رکوع میں مسلمانوں کو بشارت دی گئی تھی کہ وہ انہیں ایک زندہ قوم بنائے گا۔ اب تین مثالوں سے سمجھایا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کیا کرتا ہے۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ
عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ
بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ
ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ
یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ
عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ
یَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ
اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ
نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ

یا اس کی مثال پر (غور نہیں کیا) جو ایک بستی پر گزرا اور وہ ویران تھی اس کی عمارتیں گری ہوئی تھیں۔ اس نے کہا اللہ اسے اس کی موت کے بعد کب زندہ کرے گا۔ سو اللہ نے اسے ایک سو سال موت کی حالت میں رکھا پھر اُسے اُٹھایا کہا تو کتنا ٹھہرا۔ اس نے کہا میں ایک دن یا دن کا کوئی حصہ ٹھیرا ہوں، کہا بلکہ تو سو سال ٹھہرا۔ پس تو اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ، وہ نہیں سڑا اور اپنے گدھے کو دیکھ اور تا کہ ہم تجھے لوگوں کے لیے نشان بنائیں اور ہڈیوں کو بھی دیکھ، ہم انھیں کیوں کر اُٹھاتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں[۳۳۴]۔ پس جب اس کے لیے بات کھُل گئی تو اس نے کہا میں

حضرت ابراہیم کا بادشاہ سے جھگڑا: پہلی مثال حضرت ابراہیم کی ہے۔ حضرت ابراہیم کا ایک شخص کے ساتھ جھگڑا ہوتا ہے بظاہر وہ کوئی بادشاہ ہے جیسا کہ اس کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے انا احی وامیت۔ مگر ان اٰتٰـه الله الملك میں ضمیر حضرت ابراہیم کی طرف جاتی ہے اور مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو دیا تھا کہ زمین مقدس کا وارث آپ کو بنایا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے آپ کی نسل میں رہے گی۔ اسی پر جھگڑا ہے۔ ایک مادہ پرست انسان جس کے سر میں حکومت کا نشہ ہے کہتا ہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ یہ طاقتور قومیں جو اس وقت اس سرزمین کی مالک ہیں نابود ہو جائیں اور تمہاری نسل سے ایک زبردست قوم پیدا ہو جائے۔ تو حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ وہ جو میرا رب ہے وہی قوموں کو زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے۔ یہ میری طاقت کی بات بیشک نہیں مگر اللہ تعالیٰ کا یہی قانون ہے کہ آج ایک قوم طاقتور ہے تو کل اس کو تباہ کر کے دوسری اس کی جگہ لے آتا ہے۔ اس کا جواب اس بادشاہ کی طرف سے یہ ہے کہ میں بھی تو بڑا صاحب اقتدار ہوں میں خود جس کو چاہوں زندہ رکھوں جس کو چاہوں ماروں جس زمین کو چاہوں آباد کروں جس کو چاہوں ویران کر دوں۔ تو میری طاقت بھی خدا کے برابر ہوئی۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ اگر تمہاری طاقت خدا کے برابر ہے تو پھر خدا تو اپنے قانون کے مطابق سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ جس پر وہ کافر بادشاہ مبہوت رہ گیا اور کوئی بات نہ سوجھی۔ ویسے بھی عموماً بت پرست قوموں میں بادشاہ کو خدا کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم اس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر تم میں خدائی طاقتیں ہیں تو پھر خدا کے قانون کو ادل بدل کر کے دکھاؤ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس نے حضرت ابراہیم کو یہ جواب کیوں نہ دیا کہ تمہارا خدا اس کو مغرب سے نکال کر دکھائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا تو یہ دعویٰ نہ تھا کہ وہ اپنے خدا سے جو چاہیں کرا سکتے ہیں بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے اٹل قانونوں کی طرف ہی توجہ دلا رہے ہیں۔ انہیں قانونوں میں سے ایک قانون قوموں کے گرنے اور بننے کا ہے جس کا ایک متکبر بادشاہ انکار کر رہا ہے۔

۳۳۴ كالذی۔ کسائی اور فراء اور اکثر نحویوں نے الذی کے پہلے ك کو اسمیہ بمعنی مثل قرار دیا ہے۔ گویا عبارت یوں ہے او رایت مثل الذی مر (ر) کیا تو نے اس شخص کی مثال پر غور کیا۔

خاویة۔ خواء اصل میں خالی ہونے کو کہتے ہیں (غ) خوت الدار کے معنی ہیں گھر میں کوئی رہنے والا نہ رہا (ل)، بخاری میں ہے خاویة لا انیس فیھا۔

علیٰ عروشها۔ عروش۔ عَرْش کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چھتی ہوئی چیز اور یہاں بخاری نے معنی کیے ہیں اَبْنِیَتُهَا یعنی اس کی عمارتیں پس علیٰ عروشها سے مراد ہے اس کی عمارتیں گری ہوئی تھیں۔

اماته الله مائة عام۔ یعنی سو سال تک ایک حالت میں رکھا جس کو موت کی حالت سے تعبیر کیا ہے۔

یتسنه۔ سنه سے ہے اور سَنَةٌ سال کو کہتے ہیں سَنِهَت النخلة یا تَسَنَّهَت کے معنی ہیں اس پر سال گزر گئے اور یہی معنی سَنِهَ الطعام وتَسَنَّهَ کے ہیں (ل)، مگر چونکہ کھانے پینے پر ایک مدت گزر جانے سے وہ بُس جاتا ہے۔ اس لیے طعام یا شراب پر جب تسنه بولا جاتا ہے تو اس کے معنی لیے جاتے ہیں اس میں تغیر واقع ہو گیا یا سڑ گیا اور فراء نے لم یتسنه کے معنی کیے ہیں لم یتغیر بمرور السنین علیه یعنی سالوں کے گزرنے کی وجہ سے اس میں تغیر پیدا نہیں ہوا۔

نُنْشِز۔ نَشَز کے اصل معنی بلند زمین ہیں پھر بلند زمین کی طرف اُٹھ کر جانے پر بھی استعمال ہوا ہے اس لیے محض اُٹھنے پر بھی۔ واذا قیل انشزوا فانشزوا (المجادلة ۵۸-۱۱) اور اسی سے نشوز ہے جو میاں بی بی کے جھگڑے پر بولا جاتا ہے اور انشاز کے معنی مردہ کا زندہ کرنا بھی ہیں۔

نَكْسُوْ۔ کِساء سے ہے جس کے معنی لباس ہیں۔ کِسْوَة بمعنی لباس قرآن شریف میں آیا ہے او کسوتهم (المائدة ۵-۸۹) فکسونا العظام لحما (المومنون ۲۳-۱۴) میں انسان کی پیدائش کے ذکر میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔

قَالَ اَعۡلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۵۹﴾ جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۳۲ع
وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىۡ كَيۡفَ تُحۡىِ اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب مجھے دکھا تو کس طرح مردوں
الۡمَوۡتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنۡ کو زندہ کرتا ہے، کہا کیا تو نے نہیں مانا کہا ہاں مگر اس لیے کہ میرے دل

۳۳۲ع یہ دوسری مثال احیائے موتٰے کی ہے جو مسلمانوں کو بطور تشفی دی گئی ہے۔ گویا سمجھایا ہے کہ اگر کبھی تم پر موت بھی آجائے تو اللہ تعالیٰ پھر تم کو زندہ کرے گا۔ کالذی سے صاف ثابت ہے کہ یہ مثالی واقعہ ہے۔ گویا معنی یوں ہوئے کیا تو نے اس شخص کی مثال یعنی اس کی مثالی حالت پر غور نہیں کیا بس یہاں کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو ایک شخص کو عالم مثال یا عالم رویا میں پیش آیا ہے۔ جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں جن کا ذکر الفاظ قرآنی میں پایا جاتا ہے تو اس کو بالکل حزقیل کی اس رویا کے مطابق پاتے ہیں جس میں ان کو بتایا گیا تھا کہ یروشلم سو سال کی تباہی کے بعد پھر آباد ہوگا۔ اور یہ بخت النصر کے یروشلم کو تباہ کرنے کے بعد کا واقعہ ہے۔ بائبل میں اس رویا کا ذکر حزقیل چھتیسویں باب کے آخر اور سینتیسویں باب میں الفاظ ذیل میں ہے:-

"خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا۔ اور اس نے مجھے خداوند کی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے بھرپور تھی مجھے اُتار دیا.... اس نے مجھے کہا اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں؟ میں نے جواب میں کہا اے خداوند یہوداہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور ان سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیو تم خداوند کا کلام سنو خداوند یہوداہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو تمہارے اندر میں روح داخل کروں گا اور تم جیوگے اور تم پر نسیں ٹھہلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا اور تم میں روح ڈالوں گا اور تم جیوگے اور جانوگے کہ میں خداوند ہوں سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور جب میں نبوت کرتا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہوگئی پر ان میں روح نہ تھی...... اور ان میں روح آئی اور وے جی اُٹھے...... تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد! یہ ہڈیاں سارے اسرائیل ہیں۔ دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری اُمید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہوگئے اس لیے تو نبوت کر اور ان سے کہو کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھو اے میرے لوگ میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا۔"

حزقیل کے مکاشفہ کا ذکر قرآن کریم میں: اس سے ظاہر ہے کہ بائبل حضرت حزقیل کے ایک کشف کا ذکر کرتی ہے جس کی ابتدا یہ ہے کہ وہ ایک ہڈیوں سے بھری ہوئی وادی میں بحالت کشف گزرے گویا وہ ایک ویران بستی تھی جیسا کہ قرآن شریف نے فرمایا اور بائبل میں بھی سوال ہے اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں قرآن شریف میں بھی ہے انی یحی ھذہ اللہ بعد موتھا اور کشف میں ان کو دکھایا گیا کہ کس طرح ہڈیوں کو اُٹھایا جاتا اور ان پر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔ جس کو قرآن شریف نے کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحمًا میں بیان فرمایا۔ اور بائبل میں ہے کہ یہ ہڈیاں بنی اسرائیل ہیں۔ قرآن شریف میں بھی ہے ولنجعلک اٰیۃ للناس اور الناس سے مراد یہاں انہی کی قوم بنی اسرائیل ہے۔ پس یہ مطابقت صاف بتاتی ہے کہ دونوں جگہ ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے اور وہ واقعہ عالم مثال کا ہے جسے بائبل نے ان الفاظ میں ظاہر کیا کہ خداوند کی روح مجھ پر تھی اور قرآن شریف نے ایک لفظ سے اس واقعہ کے مثالی ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ہاں قرآن شریف میں کچھ امر زائد ہے۔ اور وہ ہے حالت موت کا سو سال رہنا۔ سو یہاں بائبل کی کمی کو بھی پورا کر دیا ہے۔ یروشلم کے لیے پیشگوئی: اور ایک پیشگوئی بھی کی ہے کیونکہ امر واقع یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر وہ مُردہ ہونے کی حالت ایک سو سال رہی تھی گو بائبل میں اس کا ذکر نہیں۔ بخت النصر نے ۶۱۳ قبل مسیح میں یروشلم پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا اور ۵۳۶ قبل مسیح میں بابلیوں کی تباہی کے بعد خورس شاہ ایران نے یہودیوں کو واپس آکر آباد ہونے کی اجازت دی اور ۵۲۰ قبل مسیح تک یہ دوبارہ آباد ہو تا رہا گویا یہ ۹۳ یا قریبًا ایک سو سال کا زمانہ موت کا گزرا اور پیشگوئی یہ تھی کہ قریبًا بالکل اسی قدر زمانہ یروشلم پر وہ گزرا جب عیسائیوں نے صلیبی جنگوں میں اسے مسلمانوں کے ہاتھ سے لے لیا تھا اور پھر دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھ میں اس کا آنا اس کی زندگی تھی اور شاید انہی واقعات کا اب پھر اعادہ ہونے والا ہے یا خدا چاہے تو مسلمانوں کو اب یروشلم پھر جلد دوبارہ دلا دے۔ قرآن شریف کا اس سو سال کے واقعہ کا ذکر کرنا اور بائبل میں اس کا ذکر نہ ہونا مگر تاریخی واقعات سے اس کا صحیح ثابت ہونا اور پھر پیشگوئی کے طور پر بھی اس کا ٹھیک صادق آنا ایسا باریک علم غیب ظاہر کرتا ہے جو عرب کے ایک امی کو تو کیا کسی انسان کو بھی حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

قبل اس کے کہ میں کچھ اور الفاظ کی تشریح کروں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تفاسیر کے مختلف اقوال میں جو اس آیت کے متعلق ہیں۔ عکرمہ اور ربیع اور وہب نے کہا ہے کہ یہ بیت المقدس کا ذکر ہے جس کو بخت النصر نے برباد کر دیا تھا اور روح المعانی میں ہے کہ یہ قول سب سے زیادہ مشہور ہے پس یوں سلف کی شہادت بھی اسی پر ہے۔

رویا میں سو سال کی موت کیوں دکھائی گئی: قابل تشریح یہ امر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا تو کتنا ٹھہرا، تو جواب میں نبی کہتا ہے دن یا دن کا کچھ حصہ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بلکہ تو سو سال ہی ٹھہرا۔ سو بلحاظ رویا کے تو دن کا کچھ حصہ ہی گزرا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ سو سال تو ٹھہرا ہے تو یہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے تھا کہ اصل غرض تم کو یہ سو سال کی موت کا رویا دکھانے کی یہی ہے کہ تمہاری قوم پر یہ موت سو سال تک رہے گی۔ سو چونکہ تم اپنی قوم کے قائم مقام ہو

لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع ۳

کو اطمینان حاصل ہو کہا تو چار پرند لے پھر انھیں اپنے ساتھ ہلا لے پھر ان میں سے ایک ایک حصہ ہر ایک پہاڑ پر رکھ دے، پھر ان کو بلاؤ، تیرے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے اور جان لے کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ ۳۳۵

اس لیے حالت لبث یا حالت موت فی الحقیقت سو سال ہی ہے ہاں تم کو ہم نے یہ نقشہ ایک رویا میں دکھایا ہے سو دیکھ لو تمہارا کھانا پینا سب اسی طرح موجود ہے اور تمہارا گدھا بھی اسی طرح زندہ موجود ہے (قرآن کریم نے کہیں نہیں فرمایا کہ گدھا مردہ تھا اس کی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا تھا۔ بلکہ صاف فرمایا کہ اپنے کھانے پینے کو دیکھ لو اور اپنے گدھے کو دیکھ لو) اس میں یہ اشارہ تھا کہ جس طرح تمہارے یہ کھانے پینے کے سامان اور تمہاری سواری کا سامان اصلی موجود ہے اسی طرح پر تمہاری قوم پھر اپنی اصلی حالت پر آجائے گی اور اپنے اصل وطن میں آباد ہو جائے گی۔ اور سو سال کو ایک دن میں گزار دینا اس میں یہ اشارہ تھا کہ وعدہ ابراہیمی کے اس کو خلاف نہ سمجھا جائے کہ یروشلم تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ سو سال خدا کے ہاں ایک دن کی طرح ہے۔

ع ۳۳۵ صُرْ۔ باب صار یصور مادہ صَوْر سے ہے جس کے معنی اَلْمَیْلُ یعنی مائل ہونا ہیں (غ۔ ل) خود اس آیت میں فَصُرْهُنَّ کی تفسیر وَجِّهْهُنَّ سے کی ہے (ل) یعنی ان کو اپنی طرف متوجہ کر اور زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ اہل لغت کے نزدیک فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ کے معنی اَمِلْهُنَّ وَاجْمَعْهُنَّ اِلَیْکَ ہیں (ل) ان کو مائل کر اور اپنی طرف اکٹھا کر اور یہ جو معنی منقول ہیں کہ صُرْتُ الشَّیْءَ قطعتہ فصلتہ یعنی میں نے اس کو قطع کر دیا اور اس کا فیصلہ کر دیا جس کی سند میں شعر پیش کیا ہے صر نابہ الحکم تو اس قطع کرنے سے مراد قیمہ کرنا نہیں بلکہ فیصلہ کے طور پر کسی بات کا قطع کرنا ہے اور دوسرے صُرْ کا صلہ جب الٰی ہو جیسے یہاں قرآن شریف میں ہے تو اس کے معنی قطع نہ موزوں ہیں اور نہ ہی لغت میں آئے ہیں۔ بلکہ اس صلہ کے ساتھ معنی صرف مائل کرنا ہی ہیں۔ مگر مفسرین کے خیال میں چونکہ یہ سمایا ہوا ہے کہ یہاں مراد قیمہ کرنا ہی ہے اس لیے یا تو فصرھن کے بعد فقطعھن محذوف فرض کرتے ہیں گویا مطلب یہ ہوا کہ پہلے ان کو ہلالے پھر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور یہ آخری حصہ اپنی طرف سے فرض کیا ہے اور یا صلہ الٰی کی تقدیم و تاخیر کر لی ہے یعنی یوں عبارت بناتے ہیں فخذ الیک اربعۃ من الطیر فصرھن (ل) مگر یہ بالبداہت غلط ہے کیونکہ اس طرح ایک فعل کا صلہ دوسرے فعل کی طرف منتقل کرنے سے امن اٹھ جاتا ہے۔ راغب نے صُرْ کے ایک معنی صِحْ بھی کیے ہیں یعنی ان کو آواز دو مگر اس سے مراد بھی یہی ہے بیضاوی نے صرف یہی معنی قبول کیے ہیں۔ فَاَمِلْهُنَّ وَاضْمُمْهُنَّ یعنی ان کو مائل کر اور ان کو ہلالے مگر پھر جزئھن محذوف مانا ہے یعنی ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر جزءً۔ جُزْء کسی شے کا حصہ ہے۔ چار پرندوں کی جزو یہی نہیں کہ سب کو قیمہ کیا جائے اور پھر ملایا جائے اور پھر حصہ لیا جائے۔ بلکہ چاروں میں سے ہر ایک چار کا جز ہے۔ قرآن شریف میں ہے لکل باب منھم جزء مقسوم (الحجر ۱۵۔ ۴۴) اس کے یہ معنی نہیں کہ سب لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کا قیمہ کر کے پھر حصے بنائے جائیں گے۔ بلکہ کل لوگوں میں سے چند لوگ ان کا ایک جز ہیں۔

یہ تیسری آیت ہے جس میں احیائے موتٰے کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں احیائے موتے کا دعویٰ ہے۔ دوسری میں ایک نظیر احیائے موتٰی کی تاریخ اسرائیل سے پیش کی ہے اور اب تیسری میں کیفیت احیائے موتٰی کا بیان کیا ہے۔ حضرت ابراہیم کا ایمان تو اس وعدہ الٰہی پر تھا وہ اطمینان قلب کے لیے اس کی کیفیت کا سوال کرتے ہیں۔ یہاں شک کوئی نہیں کیونکہ شک ایمان کے منافی ہے ایک کام کو ہم ہوتا ہوا دیکھتے اس کو صحیح مانتے ہیں۔ نطفہ سے انسان بنتا ہے۔ بیج درخت بنتا ہے۔ مگر کیفیت سے ناواقف ہیں کہ یہ کیونکر ہو جاتا ہے۔ پس واقعہ میں تو حضرت ابراہیم کو شک نہیں کہ احیائے موتٰی ہو جائے گا۔ وہ مانتے ہیں بلکہ ابھی ایک کافر بادشاہ سے بحث کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ احیائے موتٰے کیا کرتا ہے اب صرف وہ کیفیت احیائے موتٰے کا سوال کرتے ہیں۔
مُردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں: اس کیفیت کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک مثال دی ہے چار جانوروں کو لو اور ان کو ہلالو پھر چار مختلف سمتوں میں ان کو ایک ایک کر کے رکھ دو، پھر بلاؤ اور دیکھو کہ کس طرح تمہاری آواز پر بھاگے چلے آتے ہیں۔ اس مثال سے حضرت ابراہیم کو سمجھ میں آگیا۔ یعنی کیفیت کا پتہ لگ گیا کہ باوجودیکہ ایک پرند انسان سے بہت دور رہنے والی اور بھاگنے والی چیز ہے لیکن انسان جب اسے ہلالے تو یہاں تک اسے اپنے حکم کے تابع کر سکتا ہے کہ اس کی آواز پر وہ اُڑا چلا آتا ہے۔ تو جب انسان میں اور اس کی ہلائی ہوئی چیز میں ایسا شدید تعلق محض ایک عارضی تدبیر سے پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا تصرف جو خالق و مالک ہے کیوں اس سے بڑھ کر نہ ہو۔ ایک مردہ قوم کس طرح زندہ ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں وہ بھلائی کے کام جو اُن کی فلاح کا موجب ہوں اُن کو کرنے کی توفیق مل جاتی ہے اللہ تعالیٰ جس قوم کو زندہ کرنا چاہتا ہے اس کی زندگی کے اسباب جمع کر دیتا ہے کیونکہ وہی خالق اسباب ہے اس کے تصرف میں سب چیزیں ہیں خود لفظ طیر کے استعمال میں نیک و بد اعمال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ لفظ طائر نیک و بد اعمال پر استعمال ہوا ہے وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۱۳) جہاں طائر کے معنی ہی اعمال ہیں۔ اور چونکہ اس مثال سے حضرت ابراہیم کو اصل کیفیت معلوم ہو جاتی ہے اس لیے ان کو یہ ضرورت بھی پیش نہیں آتی کہ وہ ایسا کر کے بھی دیکھیں اور نہ ان کے قرآن شریف میں ایسا کرنے کا ذکر ہے کیونکہ یہ ایک مثال برنگ دلیل تھی اور حضرت ابراہیم جانتے تھے کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اور اگر اس کو وہی واقعہ سمجھا جائے جو مفسرین بیان کرتے ہیں تو اس سے کئی وساوس پیدا ہوتے ہیں کیونکہ اس صورت میں یہ معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیم کو واقعی شک تھا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے۔ جب تک چار مردہ جانوروں کو زندہ ہوتے نہیں دیکھ لیا اُن

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی مثال ہے جو سات بالیں اگائے ہر ایک بال میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا کر کے دیتا ہے اور اللہ کشایش والا جاننے والا ہے۔[۳۳۶]

کو یہ یقین نہ آیا جو ایمان کے منافی ہے اور بار ایں ایک واقعہ کو ہوتا دیکھ کر اس کی کیفیت کا پتہ نہیں لگتا۔ ہم ہر روز درخت سے بیج اور نطفہ سے انسان بنتا دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ کس طرح ایسا ہوتا ہے۔ پس کیف تحی الموتٰی کا یہ جواب کوئی نہیں کہ مُردہ جانوروں کو پھر زندہ ہوتے دیکھ لیا۔ کیف کا جواب صرف وہی دلیل ہو سکتی ہے جو قلب کو مطمئن کر دیتی ہے کہ فی الواقع عالم میں ایسا ہی ہو رہا ہے اور مزید برآں اس اطمینان قلب کی جو حضرت ابراہیم کو حاصل ہو گیا کیا ہم کو ضرورت نہیں۔ اگر تو ان کو اطمینان یوں ہوا تھا کہ ان کے سامنے چار مُردہ جانور زندہ ہو گئے تو ہم کو یہ اطمینان کبھی میسر آ سکتا ہی نہیں اور اگر وہ دلیل ان کے لیے موجب اطمینان ہوئی تھی تو ہمارے لیے بھی وہی دلیل کام دے سکتی ہے اور سکون و اطمینان کا موجب ہو سکتی ہے۔ بخاری میں جو حدیث اس آیت کی تفسیر کے رنگ میں مروی ہے وہ اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ یہ ایک دلیل ہے کوئی واقعہ نہیں۔ اس حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى۔ ہم ابراہیم سے زیادہ شک کے حق دار ہیں جب اس نے کہا اے میرے رب مجھے دکھا کہ تو کس طرح مُردے زندہ کرتا ہے۔ یعنی اگر حضرت ابراہیم کو شک پیدا ہوا ہوتا تو ہم کو اس سے بھی زیادہ ہونا چاہیئے تھا۔ بالفاظ دیگر جس اطمینان قلب کی ضرورت حضرت ابراہیم کو تھی اس کی ہم کو بھی ہے اس لیے جس راہ سے حضرت ابراہیم کو اطمینان ہو، ہمیں بھی ہونا چاہیئے لیکن ہم تو چار جانوروں کو قیمہ کر کے پھر بلائیں تو وہ کبھی اُڑتے ہوئے نہیں آتے، نہ نبی کریم صلعم کی موجودگی میں ایسا ہوا۔ پس وہ کونسا امر ہے جس سے ہمارا اطمینان قلب ہو۔ وہ یہی صورت ہے کہ ان الفاظ میں جو مثال ہے وہ ایک دلیل کے رنگ میں ہو تو دلیل ایک ایسی چیز ہے جو جس طرح آج سے ہزارہا سال پیشتر کسی کو مطمئن کر سکتی تھی اسی طرح آج کر سکتی ہے مگر واقعہ جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے وہ جب تک ہر شخص نہ دیکھے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ رہا ایمان کہ حضرت ابراہیم کے سامنے ایسا ہوا ہو گا سو وہ تو پہلے بھی حاصل ہے کہ خدا ایسا کر سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم کے سامنے ایسا ہونے سے اس میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ یہ دلیل نہ صرف دنیا میں احیائے موتٰی پر صادق آتی ہے بلکہ قیامت میں احیائے موتٰی پر بھی وہی کام دیتی ہے۔

۳۳۶ سبیل اللہ۔ دیکھو ۱۹۳ اللہ کی راہ یا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی راہ اس کا دین ہے پس انفاق فی سبیل اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت یا ترقی کے لیے اموال کا خرچ کرنا ہے اور چونکہ جہاد بھی حقیقتاً دین کی ترقی اور حفاظت میں کوشاں ہونا ہے اس لیے بعض نے کہا ہے کہ عرف قرآن میں فی سبیل اللہ جہاد سے مختص ہے۔ جہاد بالسیف ایک خاص اور وقتی ضرورت ہوتی ہے جہاد کبیر وہ ہے جو ہر وقت ہو سکتا ہے جیسا کہ فرمایا وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔ (الفرقان ۲۵-۵۲) یعنی اس قرآن کے ذریعہ سے ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔ پس انفاق فی سبیل اللہ کا اصل مفہوم ترقی دین اسلام پر خرچ کرنا ہے۔ گویا دیگر خیراتی کام بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔

سنبلۃ۔ اس کا اصل بھی سبل ہے اور معنی خوشہ ہیں۔ جمع سَنَابِل۔

قوم کی زندگی کے اسباب کیا ہیں: اس سے پہلے ضرورت انفاق کا مضمون چلا آتا ہے اس رکوع میں یہ ذکر ہے کہ انفاق کا نتیجہ کیا ہے اور اس نتیجہ کو ضائع ہونے سے کیونکر بچایا جا سکتا ہے اسی لیے اس میں اخلاص کی ضرورت اور ریا سے بچنے کا ذکر کیا ہے پچھلے رکوع میں مسلمانوں کو زندگی کی بشارت دی اور اس سے پچھلی آیت میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو زندہ کرنا چاہے تو اس کے اسباب اکٹھے کر دیتا ہے۔ اب انہی اسباب کا ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ افراد کی قربانیاں قوم کی زندگی کا موجب ہوتی ہیں۔ اور مالی قربانیوں کی ضرورت ہر وقت ہر قوم کو پڑتی ہے اس لیے ان کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی۔

بیج کی مثال اور انجیل سے مقابلہ: خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کو اس بیج کے بونے سے مشابہت دی ہے جس سے ایک دانہ سے سات سو دانہ بنتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی دو چند اور کئی گنا ہو تا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بغیر حساب رزق بھی اس کا نتیجہ ہے۔ جیسا موقعہ ہو جس قدر اس میں اخلاص ہو جس قدر اس کے لیے کوشش کی جائے اسی کے مطابق نتیجہ ہو گا۔ حضرت مسیح نے بھی انجیل میں ایک دانہ کے بڑھنے کی مثال دی ہے۔ مگر تیس گنا۔ ساٹھ گنا حد سو گنا بڑھنے کا ذکر کیا ہے (متی ۱۳: ۲۳) قرآن کریم سات سو گنا سے شروع کر کے اسے چند در چند کرنے کا وعدہ دیتا ہے اور یہ نرا وعدہ ہی نہیں بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں ہی اس وعدہ کا ثبوت بھی مل جاتا ہے۔ سیکڑوں دیئے تو لاکھوں اور کروڑوں پائے عرب کی دولت کیا ہو گی اس کو خرچ کر کے قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے مالک ہو گئے بعض لوگوں کو ایک یہ غلطی لگتی ہے کہ وہ ایک پیسہ جیب سے دیکر یہ چاہتے ہیں کہ فوراً دس پیسے ان کی جیب میں غیب سے آپڑیں دہ در دنیا سنا ہوا ہے مگر نظر اتنی تنگ ہے کہ کبھی اس کے معنوں پر غور نہیں کرتے دہ در دنیا تو ادنےٰ سے ادنےٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ تو سات سو گنا بلکہ اس سے بھی چند در چند کا وعدہ دیتا ہے مگر وہ آتا یوں ہے کہ قومی اور دینی مفاد پر جو اموال خرچ کیے جاتے ہیں وہ قوم کو خدا کے فضلوں کا وارث بنا دیتے ہیں اور جب قوم میں دولت آتی ہے تو بحصہ رسدی اس کے سب افراد اس میں حصہ دار ہو جاتے ہیں۔ قومی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ اسی کی طرف قرآن شریف بار بار توجہ دلاتا ہے۔ مگر تنگ دل انسان اپنا مال صرف اسی کو سمجھتا ہے جو اس کی جیب میں ہو۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ
اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٦٢﴾
قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ
يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ

وہ لوگ جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں،
پھر اس کے پیچھے جو خرچ کیا نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے
ہیں اُن کے لیے ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور انھیں
کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۳۳۷
نیک بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے
پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ بے نیاز بردبار ہے ۳۳۸
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ستا کر

اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے ہوگی: اب بھی مسلمانوں پر سے ذلت وادبار کی حالت دور نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خدا کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرنا نہ سیکھیں۔ اپنے شغلوں پر شادیوں اور ماتموں کے موقعہ پر بیدریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں مگر خدا کی راہ میں دینے کے وقت مفلس بن جاتے ہیں۔ دین اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے وابستہ ہے جب تک اس اصول قرآنی کو اپنی زندگیوں کا عملی رہنما نہ بنائیں کامیاب نہیں ہو سکتے مسلمانوں میں مال و دولت کی کمی نہیں مگر وہ دل نہیں جو خدا کے وعدوں پر سچا ایمان رکھتا ہو اس کی راہ میں مال و دولت کو لٹا دے۔

۳۳۷ مَنّ ۔ مِنّة کے معنی بھاری نعمت ہیں (مَنّ مشہور وزن ہے چالیس سیر) اور مَنّ ایک تو فعل سے ہے جس کے معنی ہیں اس کو بھاری نعمت دی اتنی بڑی نعمت جس کے بوجھ کے نیچے وہ دب گیا۔ جیسے فرمایا مَنّ اللّٰہ علی المؤمنین (اٰل عمران ۳ - ۱۶۳) فمنّ اللّٰہ علیکم (النساء ۴ - ۹۴) مَنَنّا علٰی موسٰی وھارون (والصفٰت ۳۷ - ۱۱۴) نرید ان نمن علی الذین استضعفوا (القصص ۲۸ - ۵) اور یہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور دوسرا مَنّ قول سے ہے یعنی لفظوں میں جتانا کہ ہم نے یوں کیا ہے اور یہ قبیح ہے (غ) اسی مَنّ کا یہاں ذکر ہے اسی کی مثل ہے یمنّون علیك ان اسلموا (الحجرات ۴۹ - ۱۷) اور مَنّ کے معنی قطع بھی آتے ہیں۔ گویا احسان جتانا اس نعمت کو قطع کر دیتا ہے۔

انفاق کی پہلی غرض ترقی دین ہے: یہاں بھی فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے مراد اولاً ترقی دین کیلئے خرچ کرنا ہی ہے جیسا کہ مفسرین نے اس کے ماتحت غزوۂ تبوک میں حضرت عبدالرحمٰنؓ کے آٹھ ہزار درہم میں سے جو اُن کے پاس تھے چار ہزار درہم دینے کا اور حضرت عثمانؓ کے ایک ہزار اونٹ بمع سامان دینے کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ اس پر آنحضرت صلعم حضرت عثمانؓ کے لیے بار بار دعا کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی یارب ان عثمان بن عفان رضیت عنه فارض عنه اے میرے رب عثمان بن عفان سے میں راضی ہوا تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ ان واقعات کو جن کا تعلق غزوہ تبوک سے ہے۔ اس آیت کے شان نزول میں بیان کرنا جو مدت پہلے کی نازل شدہ ہے بتاتا ہے کہ شان نزول سے مراد کسی واقعہ کا کسی آیت کے ماتحت آنا ہے نہ کچھ اور۔ ایسے چندوں کی صورت میں مَنّ یہ ہے کہ چندہ دیکر فخر کرے کہ میں نے اس قدر چندہ دیا ہے جیسے دوسری جگہ ہے یمنون علیك ان اسلموا خدا کی راہ میں دیکر یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک فرض تھا یا ایک امانت تھی جو ادا ہوگئی کیونکہ مومن کا مال تو خدا کا مال ہے جیسا ان اللّٰہ اشترٰی من المؤمنین انفسھم واموالھم سے ظاہر ہے اور اذی یہ ہے کہ دوسروں کو یہ کہکر دکھ پہنچائے کہ فلاں نے تھوڑا دیا ہے یا فلاں نے نہیں دیا۔

بغیر انفاق خوف وحزن کی حالت دور نہ ہوگی: انفاق فی سبیل اللہ کا نتیجہ نہ صرف اجر ہے جس کو بلحاظ اس کی عزت یا مکرمت کے یا تاکید کے طور پر عند ربھم فرمایا، بلکہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کی حالت بھی اسی کا نتیجہ ہے یعنی مالی قربانیوں سے قوم خوف وحزن کی حالت سے نکل کر کامیابی کی منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہے یعنی دشمن کا خوف باقی نہ رہے گا اور جس قربانی پر انسان کو کامیابی حاصل ہو اس پر وہ کبھی پچھتاتا نہیں۔ آج بھی مسلمان اگر خوف وحزن کی حالت سے نکلنا چاہتے ہیں تو یہی راہ ہے لیکن قربانی کے بغیر کچھ نہ بنے گا۔

۳۳۸ غَنِیّ ۔ الغنی جو اسمائے الٰہی میں سے ہے اس کے معنی ہیں وہ جو کسی کا محتاج نہیں اور ہر ایک شخص اس کا محتاج ہے (ن) اور یہ غنائے مطلق ہے اور وہ المُغنی بھی ہے یعنی اپنے بندوں کو غنی کرتا ہے مگر یہ غنائے مطلق نہیں جسے عدم حاجت سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ حاجات کا کم کر دینا ہے جیسا کہ فرمایا ووجدك عائلاً فاغنی (الضحٰی ۹۳ - ۸) یا جیسا حدیث میں ہے اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ (غ) اور محض مال کی زیادتی پر بھی بولا جاتا ہے جیسے من کان غنیًّا فلیستعفف (النساء ۴ - ۶)

بھلی بات بتانا بھی صدقہ ہے: قول معروف سے مفسرین نے سائل کو اچھی بات کہہ کر رد کر دینا اور مغفرۃ سے سائل کی پردہ پوشی یا خدا کی حفاظت مراد لی ہے۔ مگر چونکہ یہاں ذکر مال کے دینی ترقیات میں خرچ کرنے کا ہے اس لیے قول معروف سے مراد لوگوں کو بھلائی کی باتیں بتانا ہو سکتا ہے اور مغفرۃ سے یہ کہ ایسا شخص خود دوسروں کو معاف کرے یا اللہ تعالیٰ کی مغفرت حاصل کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ دے نہیں سکتے تو پھر قول معروف اور دوسروں کی پردہ پوشی سے ہی کام لو۔ یہ بھی ایک خدمت دینی بلکہ ایک صدقہ ہے۔

بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ
رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ
الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ
تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ
لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ
لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾
وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ
مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ
جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا
ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۶۵﴾

باطل نہ کرو[۳۳۹] اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔ سو اس کی مثال اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر مٹی ہو، پھر اس پر زور کا مینہ برسے اور اسے بالکل صاف کر کے چھوڑ دے اس میں سے کچھ بھی نہ پا سکیں گے جو کمایا تھا اور اللہ کافر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔[۳۴۰]

اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی رضا چاہتے ہوئے اور اپنے آپ کو مضبوط رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں، اس باغ کی مثال کی طرح ہے جو اعلیٰ درجہ کی زمین پر ہو پھر اس پر زور کا مینہ پڑے تو وہ اپنا پھل دو چند دے اور اگر اس پر زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکا مینہ ہی (کافی ہے) اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔[۳۴۱]

ع۳۳۹ تبطلوا ۔ باطل ۔ نقیض حق ہے یعنی وہ چیز جس کو ثبات نہ ہو اور ابطال یہ ہے کہ کسی چیز کو فاسد کر دیا جائے یا اسے بالکل نیست و نابود کر دیا جائے خواہ فی نفسہٖ وہ چیز حق ہو یا باطل (غ)

صدقات کا باطل ہونا یہ ہے کہ وہ عظیم الشان نتائج جو ان پر مترتب ہوئے تھے ان سے انسان محروم ہو جائے۔ صدقہ مثل ایک بیج کے ہے جو پھل لاتا ہے من اور اذیٰ ایسی آفات ہیں جو اس پھل کو تباہ کر دیتی ہیں جیسا کہ اس رکوع کی آخری تمثیل میں بتایا۔

ع۳۴۰ رِئَاء ۔ رأی کے معنی دیکھا اور رِئَاء دوسروں کو دکھانا اور شائع کرنا (غ)

صفوان اور صفا کے ایک ہی معنی ہیں صاف پتھر[۱۹۷] واحد صَفْوَانَۃٌ ہے۔

وَابِل ۔ اس بارش کو کہتے ہیں جو وزنی قطروں والی ہو۔ یعنی زور کی بارش ۔ اور اصل مادہ میں ثقل یا بوجھ کے معنی ہیں اسی لحاظ سے ہی وبال ایک امر کے ضرر دینے والے نتیجہ کو کہا جاتا ہے ذاقوا وبال امرھم (الحشر ۵۹-۱۵) اور وبیل وہ ہے جس کے وبال کا خوف ہو فاخذناہ اخذا وبیلا (المزمل ۷۳-۱۶) (غ)

صَلْد وہ سخت پتھر جس پر کوئی چیز نہیں اُگتی اس لیے رَأْسٌ صَلْدٌ اس سر کو کہا جاتا ہے جس پر بال نہ اگیں (غ)

ریا سے مال خرچ کرنے کی مثال اس پتھر سے دی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہے اور بیج جو ڈالا جائے اُگتا نظر آتا ہے، مگر جڑ نیچے نہیں جاتی اور زور کی بارش جو زمین کی روئیدگی کو ترقی دیتی ہے اس پتھر کی اوپر کی مٹی کو بیج سمیت بہا لے جاتی ہے۔

اس آیت میں اصل مقصود تو مسلمانوں کو ریا سے روکنا ہے۔ مگر اس کا پیرایہ یہ اختیار کیا کہ تم ریا سے خرچ کرنے والوں کی طرح نہ ہو جانا۔ کیونکہ ریا سے خرچ کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے یعنی یہ تو کافروں کا کام ہے مومن کا کام ہی نہیں۔ یوں اس فعل کو حد سے زیادہ قبیح بنا کر دکھایا ہے۔ انجیل میں بھی ریا سے روکا ہے مگر قرآن شریف نے بلاغت کو کمال تک پہنچایا ہے۔ رسوم و رواجات پر جو روپیہ خرچ ہوتا ہے وہ سب ریا سے ہے کیونکہ اس میں مدنظر صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایسا کہیں اور ایسا نہ کہیں۔ اگر خرچ نہ کریں تو لوگوں میں ناک کٹتی ہے۔ یہی ریا کی شناخت ہے۔ افسوس ہے کہ جس فعل کو ایسا قبیح بنا کر دکھایا گیا تھا کہ یہ مسلمان کا کام ہی نہیں ہو سکتا۔ اس میں آج اس کثرت سے مسلمان ملوث ہیں کہ شاذ و نادر ہی کوئی بچا ہو گا۔ رسم و رواج پر قرضے لیتے اور مکانات اور جائدادیں بیچ دیتے ہیں۔ لیکن خدا کی راہ میں دینے کے لیے پاس موجود ہو تو بھی حیلے تلاش کرتے ہیں۔ مومن کہلا کر کام کافروں سے بدتر ہیں پھر نتیجہ کیا ملے۔ کیوں ان کے علماء اور مشائخ ان کاموں سے ان کو نہیں روکتے۔

لایقدرون علی شیٔ مما کسبوا میں صاف پیشگوئی ہے کہ کفار جو کچھ خرچ کر رہے ہیں وہ محض ریاکاری ہے جب خدا کی رحمت کی بارش آئے گی تو ان کا سب کیا کرایا اس طرح تباہ ہو جائے گا جس طرح صاف پتھر پر سے مٹی۔ اور ہر ایک ریا سے خرچ کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

ع۳۴۱ من انفسھم ۔ میں من تبعیضیہ ہے یعنی کسی قدر اپنے نفسوں کو ایمان پر مضبوط کرنے کے لیے۔ انفاق مال سے کچھ مضبوطی ایمان کی حاصل ہوتی ہے اور اپنے سارے

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾ ع

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾

کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں اس کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں اور اسے بڑھاپے نے آ گیا ہو اور اس کی اولاد چھوٹی چھوٹی ہو، پھر اُسے ایک بگولا پہنچے جس میں آگ ہو، پس وہ جل جائے اسی طرح اللہ تمھارے لیے باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم فکر کرو۔[۳۴۲]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اُن اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور اس سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے اور ردّی چیز دینے کا قصد نہ کرو اس میں سے تم خرچ کرو گے حالانکہ تم خود اس کو لینے والے نہیں سوائے اس کے کہ اس کی قیمت کم کراؤ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔[۳۴۳]

قویٰ کو خدا کی راہ میں لگا دینے سے پوری قوتِ ایمانی حاصل ہوتی ہے۔

رَبْوَۃٍ۔ رَبا کے معنی ہیں بڑھا اور بلند ہوا۔ اور رَبْوۃ اعلیٰ درجہ کی زمین کو کہتے ہیں (غ)

اکل۔ جو چیز کھائی جائے۔ اس لیے پھل کو بھی کہتے ہیں۔

طل۔ نہایت کمزور بارش جس کا اثر بہت ہی کم ہو (غ)

یہ دوسری مثال ان لوگوں کی ہے جو اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بڑھایا ہے کہ اپنے نفسوں کے ثبات کے لیے۔ یہ انفاق مال کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ یعنی خدا کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے سے ایمان پر ثابت قدمی بڑھتی ہے کیونکہ مال انسان کی محبوب چیز ہے اور جس چیز پر وہ اپنا مال خرچ کرے گا اسی سے اسے محبت پیدا ہو گی پس خدا کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے سے خدا کی راہ میں ثابت قدمی اور وفاداری بڑھتی ہے۔

۳۴۲ نخیل۔ نخل کی جمع ہے۔ کھجور۔

اَعْناب۔ عِنَبٌ کی جمع ہے۔ انگور کی بیل اور انگور کے پھل دونوں پر بولا جاتا ہے۔

ثمرات۔ یا تو یہ مراد ہے کہ کھجور انگور کے سوائے اور بھی سب پھل ہیں اور یا یہ کہ اس میں ہر قسم کے منافع ہیں کیونکہ ثمر سے مراد بعض وقت مال بھی ہوتا ہے جس سے انسان فائدہ اُٹھاتا ہے (غ)

اعصار۔ عَصْر کے معنی نچوڑنا ہیں۔ جیسے فیہ یعصرون (یوسف[۱۲]۔ ۴۹) اور اعصار وہ ہوا ہے جو زمین سے اٹھتی ہے اور غبار کو اٹھاتی ہے پھر ستون کی طرح آسمان کی طرف بلند ہو جاتی ہے یعنی بگولا (ل)

من واذیٰ کا اثر صدقہ پر: یہ تیسری مثال من واذیٰ کے اثر کی ہے اصل مضمون من واذیٰ کا ہی تھا۔ اس سے روکتے ہوئے ریا کا ذکر کیا پھر رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرنے کا اور رکوع کے آخر پر پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا اور سمجھایا کہ ابتدا میں انسان رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اس لیے وہ جڑ پکڑتا اور باغ بن جاتا ہے لیکن من واذیٰ کا اثر اس پر ایک بگولے کی طرح ہوتا ہے جو ہری بھری کھیتی کو جلا دیتا ہے۔ گویا اس رکوع میں رضائے الٰہی کے لیے اور دین حق پھیلانے کے لیے خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے من واذیٰ اور ریا سے روکا ہے اور تینوں باتوں کی وضاحت تین مثالوں سے کر دی ہے۔

۳۴۳ کسبتم۔ کَسْب وہ ہے جس میں انسان اپنے آپ کو لگاتا ہے جس میں نفع اُٹھانے اور فائدہ حاصل کرنے کی غرض ہو۔ لفظ کسب کے مقابل پر مما اخرجنا لکم من الارض فرمایا۔ گویا پہلے میں تجارت صنعت وغیرہ ہے اور دوسرے میں پھل، کھیتیاں، معدنیات۔

تیمموا۔ تَیَمُّم کے معنی قصد کرنا ہیں (اصطلاح شریعت میں خاص معنی ہیں) اور اس کا اصل اَمٌّ ہے جس کے معنی ہیں قصد کیا (ل)

الخبیث۔ وہ چیز جس سے کراہت کی جائے بوجہ اس کے ردّی ہونے یا اس کے خسیس ہونے کے خواہ محسوس ہو یا معقول اور اس میں باطل اعتقاد اور جھوٹ باتیں اور بُرے فعل سب شامل ہو جاتے ہیں یحرم علیہم الخبائث (الاعراف[۷]۔ ۱۵۷) ونجیناہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبائث (الانبیاء[۲۱]۔ ۷۴) الخبیثات للخبیثین (النور[۲۴]

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ
بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ
وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۖۙ ﴿٢٦٨﴾
يُّؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ
الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا
يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾

شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تمھیں بخل کا حکم دیتا ہے
اور اللہ تمھیں اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ دیتا ہے اور
اللہ کشائش والا جاننے والا ہے۔ ۳۳۴
وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت دی جائے
تو اُسے بہت بھلائی دی گئی — اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر
(وہی جو) عقل والے (ہیں)۔ ۳۳۵

---

(۲) (غ) یہاں مراد ردّی چیز ہے۔

تغمضوا۔ غمض اور اغماض کے اصل معنی نیند ہیں (غ۔ل) اور بطور استعارہ تغافل اور تساہل پر استعمال ہوتا ہے اور اغماض فی البیع کے معنی ہیں، جب فروخت والی چیز کو زیادہ مانگے اور قیمت کو کم کردے (ن) یا اس کے ردّی ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت میں کمی کا مطالبہ کرے۔

اس سے پہلے رکوع میں بتایا تھا کہ انفاق کس طرح پھل لاتا ہے کس طرح بیج ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے کس طرح آفات سے محفوظ رہ سکتا ہے اس رکوع میں بتایا ہے کہ کونسا مال خرچ کرنا چاہیئے کس طرح پر یعنی علانیہ یا چھُپ کر خرچ کرنا چاہیئے اور کس پر خرچ کرنا چاہیئے۔ یوں انفاق کی تمام اصولی تفصیلات کو ان دو رکوعوں میں بیان کر دیا ہے۔

کونسا مال ہو جو خدا کی راہ میں دیا جائے۔ اوّل شرط یہ ہے کہ مال طیّب ہو یعنی جائز طور پر کمایا ہوا ہو اور اچھا ہو، دوسری یہ کہ ردّی مال نہ ہو جس کی تمہارے نزدیک بھی کوئی وقعت نہیں۔ ردّی چیز کو دیکر اعلیٰ درجہ کے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ آج کل کی بڑی اسلامی ہمدردی یہ ہے کہ کاروبار سے فارغ ہو کر دل بہلانے کے لیے چار باتیں اسلامی ہمدردی کی بھی کر دیں۔ یہ بھی وہی ردّی متاع ہے اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا تو نام بھی مسلمانوں کو بھولا ہوا ہے۔ حالانکہ انفاق کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے کیسا محبوب بناتا ہے کہ کوئی ناقص چیز بھی خدا کی راہ میں دینے کو پسند نہیں کرتا بلکہ یہی چاہتا ہے کہ جب کوئی دے اعلیٰ درجہ کی چیز دے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وشان کے لیے پاسِ ادب بھی سکھایا ہے۔ کیونکہ جب خدا کا نام درمیان میں آگیا تو پھر چیز خواہ کسی کو دی جائے اعلیٰ اور افضل دینی چاہیئے اسی کے مطابق آیت کا خاتمہ غنی حمید پر کیا ہے۔

۳۳۴ یَعِدُ۔ وعد کا لفظ خیر وشر دونوں پر بولا جاتا ہے یعنی اچھی چیز کے وعدہ دینے پر اور بُرے انجام سے ڈرانے پر اور وعید کا لفظ شر سے خاص ہے۔

الفحشاء۔ اصل میں ہر ایک قبیح فعل یا قول پر بولا جاتا ہے۔ لیکن عرب کے لوگ بخیل کو بھی فاحش کہتے تھے (ل) اس لیے بلحاظ قرینہ یہاں بخل معنے کیے گئے ہیں۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ جو خیالات بعض وقت اللہ کی راہ میں دینے میں مانع ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت میں شیطانی خیال ہیں کہ خدا کی راہ میں دیکر ہم غریب ہو جائیں گے۔ ایک حدیث میں آتا ہے نبی کریم صلعم نے فرمایا تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں جن میں سے ایک یہ ہے کہ خدا کی راہ میں دینے سے مال کم نہیں ہوتا اور حق بھی یہی ہے کہ آج تک کوئی شخص خدا کی راہ میں دینے سے فقر وفاقہ میں مبتلا نہیں ہوا گو سارا مال بھی خدا کی راہ میں دیدے۔ البتہ رسم ورواج کی پابندیوں سے بہتیرے تباہ ہو گئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ انسان کے لیے ایک لمہ شیطانی اور ایک لمہ ملکی ہوتا ہے۔ شیطانی تحریک بُرے کاموں کے لیے اور حق کی تکذیب کے لیے ہوتی ہے۔ اور ملک کی تحریک بھلائی کے لیے اور حق کی تصدیق کے لیے ہوتی ہے علاوہ ازیں ایسے معاملات میں اندازہ قومی حالت سے لگانا چاہیئے نہ افراد کی حالت سے۔ جب افراد قومی اپنے اموال کو قومی یا دینی ترقی کے لیے خرچ کرتے ہیں تو قوم غریب نہیں ہوتی بلکہ خدا کا فضل زیادہ سے زیادہ اس کے شامل حال ہوتا ہے۔

۳۳۵ الباب۔ اَلْبَاب لُبّ کی جمع ہے اور لُبّ کسی چیز کے خلاصہ یا مغز کو کہتے ہیں اور انسان میں لُبّ اس عقل خالص کو کہتے ہیں جو ہر قسم کے شائبوں سے پاک ہو یعنی نہایت خالص عقل۔ پس ہر لُبّ عقل ہے اور ہر عقل لُبّ نہیں (غ)

جب یہ بتایا کہ انفاق سے تنگدستی کا پیدا ہونا محض شیطانی ڈراوا ہے تو اب بتاتا ہے کہ مال خیر نہیں بلکہ اصول حقہ کو سمجھ لینا خیر کثیر ہے۔ اور یہ اصول حقہ یا اصول دین کی سمجھ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے دیتا ہے گویا اس اصول کو سمجھ لینا کہ خدا کی راہ میں مال دینے سے انسان تنگدست نہیں ہوتا اصول دین میں سے ایک اصل ہے اور اس کو سمجھ کر انسان خیر کثیر کا مالک ہو جاتا ہے اس کا بگڑنا کیا ہے۔ اس حکمت کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھا۔ اور باوجودیکہ وہ غریب تھے اپنے مالوں کو انھوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ دنیا میں بھی خیر کثیر کے مالک ہو گئے اس لیے کہ ایک زندہ اور کامیاب قوم بن گئے۔ آج مسلمان ان سے بہت زیادہ مالدار اور تعداد میں ہزارہا گنے زیادہ ہیں مگر اسی حکمت کی بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کا مال ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۲۷۰

اور جو کچھ خرچ کرنے کی چیز تم خرچ کرو یا کوئی منت مان لو، تو اللہ اُسے جانتا ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ۳۴۶۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۲۷۱

اگر تم خیرات کھلے طور پر دو تو کیا ہی اچھی بات ہے اور اگر تم اُسے چھپاؤ اور محتاجوں کو دو تو وہ تمہارے لیے اچھا ہے اور وہ بعض تمہاری برائیاں تم سے دور کردے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے ۳۴۷۔

میں جارہا ہے اور پھر بھی وہ قرآن کریم کی اس حکمت کی بات پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

۳۴۶ نذر۔ امام راغب نے نَذْر کے یہ معنی کیے ہیں کہ کسی امر کے حدوث کی وجہ سے تم اپنے نفس پر کسی ایسی بات کو واجب کرلو جو واجب نہیں۔ مگر قرآن کریم میں جہاں جہاں لفظ نذر آیا ہے کوئی شرط ساتھ نہیں۔ مثلاً انی نذرت للرحمٰن صوما (مریم ۱۹-۲۶) انی نذرت لك ما فی بطنی محررا (آل عمران ۳-۳۵)۔ نہایہ میں ابن اثیر نے نذر کے معنی صرف اس قدر لکھے ہیں کہ جب تم اپنے نفس پر عبادت یا صدقہ وغیرہ سے کوئی چیز بطور نفل واجب کرلو تو وہ نذر ہے اور پھر لکھا ہے کہ احادیث میں اس سے روکنے کا مکرر ذکر آیا ہے اور اس کا منشاء یہ ہے کہ یہ ایک ایسا امر ہے جو نہ کوئی نفع کھینچ لاتا ہے نہ کسی نقصان کو دور کرتا ہے نہ کسی قضاء و قدر کو رد کردیتا ہے پس اگر اس اعتقاد کے ساتھ انسان کسی امر کو اپنے اوپر واجب کرلے تو اس کا پورا کرنا یوفون بالنذر کے ماتحت ضروری ہے۔ اور گو مفسرین لکھتے ہیں کہ نذر شرط کے ساتھ یا بلا شرط ہوسکتی ہے مگر قرآن شریف میں یا حدیث میں شرط کا ذکر نہیں۔

یہاں ظالمین ان لوگوں کو کہا ہے جو خدا کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ نہیں کرتے یا معصیت میں اور رسم و رواج کی پابندی میں خرچ کرتے ہیں۔

۳۴۷ نعما۔ نِعْمَ اور ما سے مرکب ہے اور نِعْمَ فعل مدح ہے پس نعما کے معنی ہوئے کیا اچھی چیز ہے۔

یکفر۔ کفر اصل معنی ڈھانکنا ہیں (اور ابن اثیر نے بڑھایا ہے ایسا ڈھانکنا جو اسے ہلاک کردے یعنی ایک چیز کی ترقی کو روک دے) اور تکفیر کے معنی ہیں ایک چیز کا ڈھانک دینا اور اس کا دبا دینا یہاں تک کہ وہ بمنزلہ اس چیز کے ہوجائے جو کی نہیں گئی اور اسی سے کفارہ ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو گناہ کو ڈھانک دے (غ)۔

من سیاتہم۔ من بعضیہ ہے۔ صدقات سے ساری برائیاں دور نہیں ہوتیں۔ بعض قسم کی برائیاں دور ہوجاتی ہیں۔ اسلام نے جو کفارہ بتایا ہے وہ یہی ہے کہ بعض قسم کی نیکیوں سے بعض قسم کی بدیاں دور ہوجاتی ہیں اور دب جاتی ہیں یعنی ظاہر نہیں ہوتیں۔

علانیہ صدقات انجیل کی ناقص تعلیم: اس آیت میں انفاق کا طریق بتایا قرآن کریم ہر ایک مسئلہ پر انسانی ضروریات کے سارے پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر بحث کرتا ہے انجیل کی مشہور پہاڑی تعلیم میں صدقات کا مضمون اتنی ہی بات پر ختم ہوجاتا ہے کہ تم دکھاوے کے لیے خیرات نہ کرو، بلکہ تمہارا دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ مگر یہ بھی ایک غلطی ہے کہ جو صدقات علانیہ طور پر دیئے جائیں ان کو دکھاوے کے لیے سمجھ لیا جائے اور نہ ہی ضروریاتِ انسانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ انسان جب صدقہ کرے تو ایسے ہی طور پر کرے کہ دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ بڑے بڑے قومی چندے جن سے ضروریاتِ قومی پوری ہوتی ہیں وہ کبھی اس طریق پر نہیں دیئے جاسکتے اور جس کتاب نے اپنی تعلیم کو یہیں تک ختم کردیا وہ یقیناً ناقص ہے۔ قرآن شریف جس نے تعلیم کو کمال تک پہنچانا تھا وہ ایسی تعلیم دیتا ہے کہ علانیہ طور پر بھی مال خدا کی راہ میں دینا بہت اچھا ہے بلکہ اسے پہلے بیان کیا۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کو نیکی کی تحریک ہوتی ہے اور درحقیقت بڑے بڑے قومی کام علانیہ چندوں سے ہی سرانجام پاسکتے ہیں۔ آج عیسائی لوگ ان قومی چندوں میں علانیہ حصہ لیکر اپنے عمل سے انجیل کی تعلیم کو جھٹلا رہے اور قرآن کریم کی تعلیم کو سچا قرار دے رہے ہیں۔ ہاں جہاں اس قسم کی ضرورت کی عظمت اور وقعت کے لحاظ سے انہیں مقدم کیا۔ ساتھ ہی دوسرے پہلو کا بھی ذکر کردیا کہ غربا کی کچھ مدد کرو تو وہ چھپا کر دو۔ وہ بھی ایک ضرورت قومی ہے اور بہت لوگ مستحق امداد ہوتے ہیں جن کو علانیہ دینا موزوں نہیں اور نہ وہ علانیہ لینا پسند کرتے ہیں خصوصیت سے ایسے لوگ کون ہیں اُن کا ذکر اگلی سے اگلی آیت میں ہے۔

مخفی صدقات: قرآن شریف نے صرف ایک لفظ اخفا ہی ایسے صدقات کے متعلق استعمال فرمایا ہے مگر احادیث میں ایسے صدقات کا ذکر بہت پایا جاتا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سایہ میں لے گا۔ امام عادل۔ جوانی میں عبادت الٰہی کرنے والا۔ دو شخص جو اللہ کے لیے محبت کرنے والے ہوں۔ وہ شخص جو مسجد سے نکلتا ہے تو اس کا دل مسجد میں معلق ہوتا ہے۔ وہ جسے حسین مالدار عورت بلائے تو صرف خدا کے خوف سے بچے۔ اور وہ شخص جو صدقہ کرتا ہے تو اسے اتنا چھپاتا ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ نہیں جانتا جو اس کا دایاں ہاتھ خرچ کرتا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ مخفی صدقہ رب کے غضب

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

ان کی ہدایت تیرے ذمے نہیں لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور جو کچھ مال تم خرچ کروگے وہ تمھارے اپنے ہی لیے ہے۔ اور تم خرچ نہیں کرتے سوائے اس کے کہ اللہ کی رضا چاہو اور جو کچھ مال تم خرچ کروگے وہ تمھیں پورا دیا جائے گا اور تمھیں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ۳۴۸

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع

ان محتاجوں کے لیے جو اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں، زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے (سوال سے) بچنے کے باعث ناواقف ان کو دولت مند سمجھتا ہے، تو انھیں ان کی نشانیوں سے پہچان لیگا۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور جو کچھ مال تم خرچ کرو اللہ اسے یقیناً جانتا ہے۔ ۳۴۹

کو دُور کرتا ہے مگر ظاہر صدقہ بسا اوقات مقدم ہوتا ہے۔ خود زکوٰۃ جو ظاہر صدقہ ہے بوجہ فرضیت نفلی صدقات پر مقدم ہے۔

۳۴۸ لیس علیك ھدٰ ٰھم حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ پہلے پہلے مسلمان (بوجہ ان سختیوں کے جو کفار سے پہنچی تھیں) فی سبیل اللہ اپنے مشرک رشتہ داروں کی امداد کرنا پسند کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی قرآن شریف نے غیرمسلموں کی امداد بھی فقر اور تنگی کی حالت میں ضروری قرار دی ہے اور انسانی ہمدردی کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا اور فرمایا کہ ہدایت امر دیگر ہے۔ مگر احتیاج کے وقت انسان کی دستگیری ایک فرض انسانی ہے۔ یہ ذکر محتاجوں کو دینے کے ذکر کے ساتھ ہی کیا تا اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔

صدقہ سے فائدہ اپنے آپ کو اور قوم کو ہوتا ہے: اور یہ جو فرمایا فلانفسکم تو مراد یہ ہے کہ اس کا فائدہ خود تم کو یا تمھارے لوگوں کو ہی پہنچتا ہے۔ کیونکہ انفسکم میں دونوں مفہوم داخل ہیں، انسان کا اپنا نفس بھی اور اس کے بھائی بند بھی۔ اپنے نفس کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اس کے اندر نیکی کی قوت نشوونما پاتی ہے ہمدردیٔ انسانی جو انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے ترقی کرتی ہے۔ قوت ایمانی بڑھتی ہے اور اپنے بھائی بند کو یہ فائدہ ہے کہ قومی بہبودی کے کاموں سے ساری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے وما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللّٰہ میں یا تو یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کا جو انفاق ہوگا وہ رضائے الٰہی کے لیے ہی ہوگا۔ اور یا یہ کہ تم اس بات کا فکر مت کرو کہ جس کو دیا ہے وہ کون ہے تم نے تو خرچ محض رضائے الٰہی کے لیے کیا ہے سو وہ مل جائے گی پس صدقہ دینے کے وقت لوگوں کے اعمال کی فکر نہ کرو۔ صحیحین کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے کہا میں آج رات صدقہ کرونگا تو وہ صدقہ ایک زانیہ کے ہاتھ چلا گیا۔ دوسری رات صدقہ کیا تو وہ ایک غنی کے ہاتھ چلا گیا۔ تیسری رات کیا تو وہ ایک چور کے ہاتھ چلا گیا تو اسے کہا گیا تمہارا صدقہ قبول ہو گیا ہے، رہے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں گیا ہے سو شاید زانیہ زنا سے بچ جائے، غنی صدقہ دینے کی توفیق پائے۔ چور چوری سے رُک جائے۔ ماحصل اس تعلیم کا یہ ہے کہ ادنیٰ عذروں پر انسان صدقہ کو نہ روک رکھے۔ ایک سرسری نظر سے دیکھ لے جو مستحق نظر آئے یا جہاں نیکی کا کام ہو رہا ہو وہاں اعانت میں شامل ہو جائے۔ اسی کی طرف آیت کے آخری الفاظ میں اشارہ کیا کہ تمہارا انفاق ضائع نہیں جائے گا بلکہ اس کا اجر تم کو پورا پورا ملے گا اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

۳۴۹ التعفف۔ عَفّ سے ہے اور عِفّۃ کے اصل معنی ہیں تھوڑی چیز پا کر صبر کر لینا (غ) اور پھر اس کے معنی ہو گئے ہیں اس چیز سے رکنا جو حلال نہیں یا اچھی نہیں (ل)، اِستِعفاف اور تَعَفُّف کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حرام سے اور لوگوں سے سوال کرنے سے بچنا (ل)

سِیما۔ سَوم کے اصل معنی ہیں کسی چیز کی تلاش میں جانا (غ) اس سے سِیما اور سِیمیاء کے معنی علامت ہو گئے ہیں۔

الحافا۔ الحاف۔ سوال کرنے میں سخت الحاح کو کہتے ہیں (ل) اور یہ لحاف سے ہے کیونکہ اس سے انسان اپنے آپ کو سارا ڈھانک لیتا ہے۔ پچھلی سے پچھلی آیت میں جب محتاجوں کو دینے کا ذکر فرمایا تو یہ بیان کر کے کہ محتاج مسلم ہو یا غیرمسلم دیدو۔ اب یہ بتایا ہے کہ خصوصیت سے کونسے محتاج مستحق ہیں۔ وہ وہ فقراء ہیں جو اللہ کی راہ میں رُک گئے ہوں یعنی اپنے کاروبار نہ کر سکتے ہوں اور یہ تین قسم کے لوگ ہیں (۱) وہ مجاہدین یا خدا کی راہ میں کوشش کرنے والے جو اس لیے کہ ساری قوت اسی کام پر لگاتے ہیں اپنا ذریعہ معاش نہ رکھتے ہوں۔ نبی کریم صلعم کے زمانہ میں اصحاب الصفہ کا گروہ اسی ذیل میں شامل تھا۔ اب بھی جو لوگ تعلیم دین پاتے ہوں یا خدمت دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہوں اس ذیل میں آتے ہیں (۲) وہ لوگ جو کفار کے ظلم کی وجہ سے یا امن اُٹھ جانے کی وجہ سے اپنا کاروبار نہ کر سکتے ہوں (۳) وہ لوگ جو دینی جنگوں میں زخمی ہو گئے ہوں یا خدمت دینی ادا کرتے ہوئے کام کے ناقابل ہو گئے ہوں۔ لایستطیعون ضربًا فی

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٤﴾
اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا
يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ

جو لوگ رات اور دن چھپ کر اور ظاہر اپنے مالوں کو خرچ کرتے
ہیں تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور
ان کو کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ع۳۵۰
جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہونگے ، مگر اس طرح جیسے
وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا بنا دیا ہو۔۳۵۱ یہ
اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خرید و فروخت بھی سود ہی کی طرح ہے

الارض میں بتا دیا کہ وہ اللہ کی راہ میں ایسے رو کے گئے ہیں کہ زمین میں چل پھر کر اپنی معاش پیدا نہیں کر سکتے اور ان کی نشانی یہ بتائی ہے کہ ایسے لوگ سوال نہیں کرتے مانگتے نہیں۔ یوں ان کام کرنے والوں کو بھی کیا اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے۔ ان واعظوں کے لیے جو وعظ کر کے مداری کی طرح دستِ سوال کرتے ہیں اس میں سبق ہے اور فی سبیل اللہ دینے والوں کو بھی نصیحت ہے کہ وہ زیادہ تر اپنے اموال کن لوگوں پر صرف کریں۔

یہاں لفظ تعفف کے استعمال سے اور مستحقین کے متعلق یہ بتا کر کہ وہ سوال نہیں کرتے یہ بھی بتا دیا ہے کہ سوال کرنا اچھی بات نہیں کیونکہ تعفف بُری بات سے بچنے کا نام ہے تو معلوم ہُوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سوال کرنا مذموم امر ہے۔ مگر آج جدھر دیکھو بھیک مانگنے والے مسلمان نظر آتے ہیں۔ بخاری کی حدیث میں جو ان الفاظ کی تفسیر ہے یہ لفظ آتے ہیں کہ مسکین وہ نہیں جس کو ایک یا دو کھجوریں یا ایک دو لقمے دیدیئے جاتے ہیں اِنما المسکین الذی یتعفف مسکین یعنی لینے کا حقدار صرف وہی ہے جو سوال سے بچے اور ایک اور حدیث میں یہ لفظ آتے ہیں کہ وہ مسکین نہیں جو در بدر گھومتا پھرے اور تم اسے لقمہ لقمہ دو۔ اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے یہ خطبہ پڑھا کہ جو شخص اپنی حاجت غیروں کے پاس نہیں لے جاتا اللہ اسے غنی کر دیتا ہے اور جو سوال سے بچتا ہے اللہ اسے بچاتا ہے اور جو اپنے آپ کو روکتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے (من استغنی اغناہ اللہ ومن استعف اعفہ اللہ ومن استکف کفاہ اللہ) اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص سوال کرے اور اس کے پاس ایک اوقیہ کی قیمت کی قدر ہو تو وہ الحاف کرتا ہے۔ پس ان احادیث کی رو سے وہ بھیک مانگنے والے جو لقمہ لقمہ کے لیے در بدر پھرتے ہیں مستحق خیرات نہیں ہیں اور ایسا سوال کرنے کو اسلام نے بہت مذموم قرار دیا ہے۔ پس ایسے سائلین کے روکنے کا انتظام عین مطابق منشائے تعلیم اسلامی ہے۔

قرآن نے صدقات کی تعلیم کو کامل کیا: قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ اس میں تعلیم کمال کو پہنچ گئی ہے۔ اس کی تعلیم کے ہر شعبہ سے ظاہر ہے ان دو رکوع میں صدقات کے مضمون کا کوئی پہلو جس پر اصولی رنگ میں بحث ہو سکتی تھی نہیں چھوڑا صدقات کی ضرورت بتائی نتیجہ بتایا نتیجہ کے ضائع ہونے سے بچنے کی راہ بتائی۔ ریا سے روکا بتایا کہ کیسا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ پھر بتایا کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کوئی قوم غریب نہیں ہوتی۔ بلکہ خدا کے فضل کی زیادہ حقدار ہوتی ہے۔ پھر بتایا صدقات کس طرح دو، قومی کاموں میں علانیہ بھی دو۔ محتاجوں کو چھپا کر بھی دو پھر مسلمان محتاجوں کو بھی دو غیر مسلموں کو بھی دو۔ پھر دو تو یہ فکر نہ کرو کہ کس کے ہاتھ میں گیا۔ پھر بتایا کہ بھیک مانگنا مذموم فعل ہے اور مستحق امداد وہ لوگ ہیں جو بھیک نہیں مانگتے اور اپنی معاش کی فکر اس لیے نہیں کرتے کہ کسی دینی کام میں مصروف ہیں۔ اب انجیل اس تعلیم کا کیا مقابلہ کرے گی جس کی ساری دوڑ اس ایک دل خوش کن فقرہ پر ختم ہو جاتی ہے کہ دکھاوے کے لیے نہ دو۔ یہاں تمام ضروریاتِ انسانی کو مدِنظر رکھ کر تمام پہلوؤں پر بحث ہے۔

ع۳۵۰ صدقات اور سود کا تقابل: اس رکوع کا اصل مضمون تو حرمت سود ہے مگر یہاں بطور خلاصہ صدقات کے مضمون کو پھر بیان کر دیا ہے کیونکہ صدقہ وہ چیز ہے جو اغنیاء سے لیکر غربا کو دی جاتی ہے اور سود وہ چیز ہے جو غربا سے چھین کر اغنیاء کو دی جاتی ہے تو اس تعلق کے لحاظ سے سود کے ذکر سے پہلے پھر صدقات کی طرف توجہ دلائی کہ وہی اصل الاصول ہے جس پر دنیا کی خوشحالی کا انحصار ہے۔ کیونکہ مال کی تقسیم میں جب تک مساوات کے پہلو کو مدنظر نہ رکھا جائے کبھی دنیا میں خوشحالی نہیں رہ سکتی۔ صدقات کا دینا اور سود کا نہ لینا اسی مساوات کے دو پہلو ہیں۔

ع۳۵۱ یاکلون۔ اکل ابتداءً کھانے کے معنی میں آتا ہے۔ پھر ہر قسم کے انفاق مال پر بولا جاتا ہے کیونکہ کھانا سب سے بڑا امر ہے جس کے لیے انسان مال کا محتاج ہوتا ہے ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل (۱۸۸) ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلما (النساء ۴-۱۰) اور اکل المال بالباطل سے مراد ہے کا ایسے طور پر خرچ کرنا ہے جو حق کے منافی ہو۔ اور یاکلون فی بطونہم نارا (النساء ۴-۱۰) میں آگ کا کھانے کی طرح پیٹ میں ڈالنا مراد ہے۔

الربٰو۔ ربا الشئی کے معنی ہیں ایک چیز بڑھ گئی اور اس نے ترقی کی (غ) قرآن شریف میں سبزی کے بڑھنے پر آتا ہے ربت (الحج ۲۲-۵) اور ایسا ہی مال کے بڑھنے پر ہے لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ (الروم ۳۰-۳۹) اور ربٰو راس المال پر بڑھوتی کا نام ہے لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتی پر یہ لفظ بولا گیا ہے (غ) ابو اسحاق کا قول ہے کہ جو ربٰو حرام ہے اس کی صورت اس قرض کی ہے جس کے ذریعہ سے جتنا دیا تھا اس سے زیادہ لیا جائے یا جس کے ذریعہ کوئی اور فائدہ اٹھایا جائے اور جو حرام نہیں وہ یہ ہے کہ انسان بطور ہبہ یا تحفہ کوئی چیز دے یہ چاہتا ہوا کہ اس سے بڑھ کر اسکو ملے (ل) ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے

وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ
جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ
مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ

حالانکہ اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا ہے،
سو جس کے پاس اپنے رب سے نصیحت آگئی پھر وہ رک گیا تو اس کے
لیے ہے جو گزر چکا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر لینے

(جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ ایک شخص کا دوسرے پر قرضہ ہوتا تو وہ کہتا کہ تم اس قدر اس میں بڑھاؤ اور ادائیگی میں مہلت دیدو اور قتادہ کہتے ہیں کہ ربائے جاہلیت یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے سے ایک وقت مقرر کے لیے خرید و فروخت کا معاملہ کرتا، جب وہ وقت آجاتا اور رقم ادا نہ ہوتی تو رقم بڑھا دی جاتی اور مہلت دیدی جاتی۔

یتخبط۔ خبط سے ہے جس کے معنی سخت مارنا (ل) ہیں جیسے درخت پر پتے جھاڑنے کے لیے سونٹا مارا جاتا ہے اور حدیث میں تخبطنی الشیطان آتا ہے اس کے معنی کیے ہیں یصرعنی ویلعب بی (ن) یعنی مجھے پچھاڑ دے اور مجھے کھیل بنائے۔

مَسّ کے اصل معنی چھونا ہیں پھر ہر ایک ضرر جو انسان کو پہنچے بولا جاتا ہے مستھم الباساء۔ اور کنایۃً جنون پر بھی بولا جاتا ہے (غ) اور یہی معنی یہاں مراد ہیں جیسا اکثر تفاسیر میں ہے۔

صدقات اور ربا کے مضمون میں جو تعلق ہے وہ پچھلے نوٹ میں بیان ہو چکا ہے اور گو صدقات اور ربا کی آیات کا نزول مختلف زمانوں کا ہے مگر ترتیب میں ان کو ایک جگہ رکھنا صاف بتاتا ہے کہ ترتیب آیات آنحضرت صلعم کے ارشاد سے ہوتی تھی۔ مگر بخاری میں ابن عباس کے جو یہ لفظ ہیں کہ اٰخر اٰیۃ نزلت علی النبی صلعم اٰیۃ الربٰوا۔ یعنی آخری آیت جو نبی صلعم پر نازل ہوئی آیت ربا ہے یہ اس معنی میں درست نہیں کہ ربا کی حرمت کا حکم نزول قرآن کریم میں آخری آیت ہے حجۃ الوداع میں آنحضرت صلعم کا ربا سے منع کرنا صاف ثابت ہے۔ سو یہ آیت اس سے پہلے کی ہے اور حجۃ الوداع میں اکملت لکم دینکم کا نزول ثابت ہے اس لیے اس کے بعد کوئی حکم کی آیت نازل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ربا سے روکنے کا حکم بھی اٰخر اٰیۃ نزلت نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ اسے سورہ بقرہ میں بلحاظ نزول آخری آیت مانا جائے مگر اس سے بہتر توجیہ اس حدیث کی وہ ہے جو ۳۵۸ میں کی گئی ہے یعنی آیت ربا سے مراد اس رکوع کی آخری آیت ہے اور سورہ آل عمران میں بھی لاتاکلوا الربٰوا اضعافًا مضاعفۃ آتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ حرمت سود کا حکم دیر سے نازل ہوا ہو اور حرمت شراب کی طرح حرمت سود بھی تدریجاً ہوئی ہو اور سورہ آل عمران میں صرف سود در سود سے روکا ہو۔

اور یہ جو روایات میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ربا کی تفسیر نہیں کی جیسا حضرت عمرؓ کا قول جو مسند احمد میں مروی ہے اور اسی قسم کے اور بھی اقوال ہیں حالانکہ ربا جاہلیت میں ایک مشہور و معروف امر تھا تو اس سے مراد صرف اس قدر ہے کہ وہ امور جو ربا سے ملتے جلتے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ ان اقوال میں ربا کے ستر یا تہتر دروازوں کا ذکر آتا ہے اور جیسا کہ حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے فدعوا الربٰوا والریبۃ سو ربا اور شک کو چھوڑ دو یعنی ان امور کو جن کے متعلق شک ہو کہ وہ ربا سے ملتے جلتے ہیں ان میں سے بعض ملتی جلتی صورتوں کا ذکر احادیث میں آبھی گیا ہے۔ جیسے یہ کہ مخابرۃ سے روکا یعنی معین حصہ پر زمین کاشت کرنے سے یا مزابنۃ سے یعنی خشک کھجوروں سے تازہ کھجوریں خریدی جائیں جو خوشے میں ہوں۔ یا محاقلۃ سے یعنی اس دانہ کے خریدنے سے جو ابھی خوشوں میں ہو۔

سود کی ممانعت عام ہے: بعض لوگوں نے کہا ہے کہ صرف سُود در سُود منع ہے نہ کہ سود۔ حالانکہ ربا کے معنی میں سود صاف آتا ہے بعض نے کہا کہ یہ حکم صرف دارالاسلام کے لیے ہے لیکن اس طرح قرآن کریم کے کل احکام سے امن اُٹھ جائے گا جو مدینہ میں نازل ہوئے کہ وہ صرف دارالاسلام سے مخصوص ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سود کے حکم کی علت غربا سے ہمدردی ہے۔ جیسا کہ صدقات اور ربا کے مضمون کو ایک جگہ کرنے سے ظاہر ہے مگر علت گو کچھ ہو حرمت تو عام ہے جیسے شراب کی حرمت کی علت تو یہ ہے کہ اس سے نشہ ہو جاتا ہے نقصان پہنچتا ہے مگر ایک قطرہ بھی جائز نہیں گو اس سے نشہ نہ ہو۔ کیونکہ حکم عام ہے۔ البتہ سود دینے والے کے لیے بعض صورتیں اضطرار کی پیدا ہو سکتی ہیں کہ اس کے بغیر اس کی زندگی قائم نہ رہ سکے۔

بنکوں کا سود: ایک سوال یہ ہے کہ بنکوں میں جو روپیہ حفاظت کے لیے رکھا جائے اور اس پر حسب قواعد بنک سُود ملے اُس کا لینا جائز ہے یا نہیں اس میں شک نہیں کہ ربا میں یہ لازم بات ہے کہ روپیہ کسی کو قرض دیا گیا ہو۔ جتنی ربائے جاہلیت کی صورتیں بیان کی گئی ہیں ان میں یہ ضروری ہے اور بنک میں ایک شخص روپیہ قرض نہیں دیتا بلکہ بطور امانت رکھتا ہے تو گو یہ صورت کسی قدر مختلف ہے۔ مگر پھر بھی صورت ربا سے مشابہ ہے اس لیے محتاط طریق یہی ہے کہ وہ روپیہ سود کا مخالفین اسلام کے مقابل پر اشاعت اسلام یا جہاد میں خرچ کیا جائے اور اپنے مصرف میں نہ لایا جائے جیسا کہ نوٹ ۳۵۶ میں ہے۔ اور زمیندارہ بنکوں کی صورت بھی کسی قدر عام صورت ربا سے اختلاف رکھتی ہے کیونکہ وہاں وہی لوگ قرض لے سکتے ہیں جو خود حصہ دار ہوں اور یوں ایک رنگ میں نفع نقصان دونوں کے مالک ہو جاتے ہیں۔ مگر وہاں بھی احتیاط کا طریق یہی ہے جو بنک کے سود کے متعلق لکھا گیا۔ ہاں یہ جائز ہے کہ ایک شخص قرضہ لے اور واپس کرتے وقت اصل رقم سے کچھ بڑھ کر محض ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کے طور پر دیدے۔ یہ سود نہیں کیونکہ قرض دینے والے کو اس کا لینا مدنظر نہ تھا۔

ربا کی حرمت میں کئی ایک احادیث ہیں۔ ایک حدیث میں ربا کے کھانے اور کھلانے اور گواہ اور کاتب سب پر لعنت کی ہے۔ کیونکہ وہ سب سود کو مروج کرتے ہیں اور ایک اور حدیث میں ہے جو ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ سود کھائیں گے عرض کیا گیا سب لوگ؟ فرمایا من لم یاکلہ منھم نالہ من غبارہ جو ان میں سے سود نہیں کھائے گا اس کا غبار اس کو پہنچ رہے گا۔ آج یہ الفاظ مخبر صادق کے کیسے سچے نظر آتے ہیں۔

أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ لگے تو وہی آگ والے ہیں وہ اس میں رہ پڑیں گے۔[۳۵۲]

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی

سود کی ممانعت کی کیوں ضرورت ہوئی ؟ اس کی دو بڑی وجوہ اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمائی ہیں جن میں سے پہلی وجہ ان الفاظ میں ہے یتخبطہ الشیطان من المس سودخوار کی حالت ایسی ہوجاتی ہے جیسے ایک شخص کو شیطان نے مجنون بنا کر گرادیا ہو گویا وہ مال و دولت کی محبت میں مجنوں ہوجاتا ہے اور پھر وہ گرجاتا ہے یعنی شرف انسانیت کھو دیتا ہے ۔ یہ الفاظ نہایت سچے ہیں جب ایک انسان یا ایک قوم سودخوری میں ترقی کرتی ہے تو آخر مال و دولت کو اپنا معبود بنالیتی ہے اور ہمدردی انسانی کی اعلیٰ صفات سے محروم ہوجاتی ہے یہودیوں نے سودخوری میں ترقی کی ہمارے ملک کے بنئے بھی اسی کی مثال ہیں ۔ ان کی مال و دولت کی محبت اس حد تک ترقی کرگئی ہے کہ اپنے آرام اور آسائش پر اپنی اولاد پر بھی صرف کرنا ان کو دشوار نظر آتا ہے ۔ وہ مہذب قومیں جنہوں نے آج سودخوری میں ترقی کی ہے ان کا معبود صرف ایک مال رہ گیا ہے اسی کی وہ پوجا کرتے ہیں اس پر دین ایمان عزت عفت سب کچھ بیچنے کو تیار ہیں ۔

شراب اور سُود کے بدنتائج بہت باریک ہیں آنحضرت صلعم کی تعلیم اور کامل قوتِ قدسی: جس طرح اسلام سے پہلے کسی مذہب نے شراب کو حرام نہیں کیا اسی طرح سود کو بھی حرام نہیں کیا ۔ بات یہ ہے کہ ان دونوں کے خطرناک نتائج اس قدر باریک ہیں اور ان کا دور کرنا اس قدر مشکل ہے کہ اس کام کا اہل وہی انسان تھا جس نے سب نبیوں اور رسولوں کا سرتاج ہوکر آنا تھا ۔ اس کی وحی کو یہ کمال عطا کیا گیا کہ باریک سے باریک بدنتائج جو مدتوں بعد ظاہر ہوتے ہیں اسے دکھا دیئے جائیں اور اسی کو یہ قوتِ قدسی عطا کی گئی کہ خطرناک سے خطرناک بدیاں جو انسانوں کی طبائع کے اندر اس قدر دخل پاگئی ہیں کہ بظاہر جزو فطرت بنی ہوئی نظر آتی ہیں دنیا سے دور کرے جس طرح شراب کے بدنتائج اگر انسان یوں دیکھنا چاہے کہ ایک شخص حد اعتدال تک شراب پیتا ہے یا دو چار گھونٹ پیتا ہے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو نہیں دیکھ سکتا ۔ اسی طرح پر بظاہر اس میں کسی کا نقصان نظر نہیں آتا کہ زید بکر کو دس روپے قرض دے اور اس پر سال بھر میں دو روپے یا چار روپے سود لے لے اور بکر ان دس روپوں کو تجارت میں لگا کر ان سے فائدہ اٹھائے ۔ اتنے عظیم الشان مسائل میں ایک وسیع پیمانہ پر اور لمبے زمانہ میں نتائج کو پھیلا کر دیکھنا ضروری ہوتا ہے ، یوں تو بدی اور نیکی چیزیں ہی ایسی ہیں کہ ان کے نتائج فوری اور بدیہی نہیں ہوتے بلکہ کھلا نتیجہ ان کا اسی وقت نظر آتا ہے جب ان کا بار بار کثرت سے اعادہ ہو ۔ مگر جس قدر بدی باریک ہوگی اسی قدر اس کے نتائج اور لمبے زمانہ پر پھیلانے سے نظر آئیں گے ۔ خود زنا کی بدی ایسی ہے کہ اس کے بھی فوری بدنتائج لوگوں کو نظر نہیں آتے ۔ اس لیے آج طرح طرح کے پیرایوں میں زناکاری کو رواج دیا جاتا ہے ۔ پس سودخوری کے نتائج کو جب لمبے زمانہ پر پھیلا کر دیکھا جائے تو خود واقعات شہادت دے اٹھتے ہیں کہ وہ اخلاق انسانی اور عامہ آسائش انسانی کی ترقی میں بڑی بھاری روک ہے سودخوری کے ساتھ جوں جوں مال کی محبت ترقی کرتی ہے ۔ اصول ، اخلاق ، ہمدردی انسانی کی وقعت کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ آخرکار ایسا انسان یا ایسی قوم روپے کی محبت کے عوض تمام اعلیٰ اخلاق کو بیچ دیتی ہے ۔ اخلاق فاضلہ کی اعلیٰ منزل پر پہنچانے کے لیے ایک چھوٹی سی مالی منفعت کو قربان کر کے اسلام نے بتا دیا کہ واقعی وہ دنیا کا آخری اور کامل مذہب ہے سودخوری کے دوسرے عظیم الشان نقصان کی طرف اگلے الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے ۔ دیکھو اگلا نوٹ ۔

۳۵۲ بیع چیز کے دینے اور قیمت کے لینے یعنی فروخت کو کہتے ہیں اور شراء خرید کو ۔ مگر دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ اور معاملہ خرید و فروخت پر بھی استعمال ہوتے ہیں ۔

سَلَفَ ۔ متقدم یعنی پہلے آنے والے کو کہا جاتا ہے ۔ فله ما سلف سے یہاں مراد ہے کہ جو اس کا گناہ پہلے گزر چکا اس پر گرفت نہیں کی جائے گی (رغ)

اَمْر کے اصل معنی شان یعنی معاملہ یا حالت ہیں اور وہ ہر قسم کے اقوال و افعال کے لیے عام لفظ ہے (رغ) امرہ الی اللہ ایسا ہی محاورہ ہے جیسے ہم کہہ دیتے ہیں اس کا معاملہ سپرد خدا ۔ یعنی تم انسان اس کے متعلق زبان مت کھولو کہ پہلے یوں کرتا تھا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ جب ایک شخص ایک برائی سے رک جائے تو اس کی گزشتہ کمزوریوں کا ذکر کرنا قرآن شریف کی رو سے ایک نہایت قبیح امر ہے ۔

سود اور تجارت میں فرق : یہاں بتایا کہ لوگ سود کے جواز کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جیسا سود ویسی تجارت ۔ حالانکہ لین دین خرید و فروخت کو اللہ تعالیٰ حلال قرار دیتا ہے اور سود کو حرام ۔ پس معلوم ہوا کہ وہ دونوں یکساں نہیں ۔ ظاہری مساوات جس کی طرف لوگوں کی نظر جاتی ہے وہ تو یہ ہے کہ جب انسان مال خرید کر اس سے منفعت حاصل کرسکتا ہے اسی طرح روپے سے بھی اسے منفعت حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے مگر خدا کے ہاں ان دونوں میں فرق ہے ادنیٰ تامل سے کام لیا جائے تو وہ فرق نظر آتا ہے کہ سود میں محنت نہیں خرید و فروخت میں محنت کرنی پڑتی ہے ۔ اسلام نے چونکہ محنت کو انسانی ترقی کا ضروری جزو قرار دیا ہے اس لیے ایک ایسے معاملہ کو جس میں محنت نہیں ناجائز ٹھہرایا ہے اور نہ صرف سودخوری محنت سے خالی ہے بلکہ اس سے محنت کی بیوقری بھی ہوتی ہے ۔ اور وہ اس طرح کہ سرمایہ دار جب سود پر روپیہ دیتا ہے تو وہ شخص جو اس سے تجارت کرتا ہے اور اس پر محنت کرتا ہے بعض وقت نفع اٹھاتا ہے بعض وقت نقصان ۔ مگر سرمایہ دار ہمیشہ نفع لیتا ہے اور نقصان سے اسے کچھ واسطہ نہیں ۔ اگر بالفرض تجارت میں سارے مال کا بھی نقصان ہوجائے تو بھی سرمایہ دار نہ صرف اپنے سرمایہ کا حقدار ہے بلکہ وہ اس پر نفع بھی لیگا ، گویا محنت کی بمقابلہ سرمایہ یعنی روپیہ کے کچھ بھی قدر نہیں نقصان کی ذمہ دار وہ اور نفع سے فائدہ اٹھانے والا سرمایہ شراکت کی افضلیت : اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جہاں ایک شخص دوسرے سے روپیہ قرض لیکر تجارت چلاتا ہے تو سرمایہ دار اور محنت کرنے والا دونوں نفع نقصان میں حصہ دار ہوں یعنی بجائے قرض کے شراکت کا رنگ ہو ۔ اسلام کا اصل الاصول معاملات دنیا میں محنت کے وقر کو بڑھانا ہے ۔ اسی لیے اس نے ان امتیازات کو دور کردیا ہے جو مال کی کمی یا زیادتی

لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ۝٢٧٦
ناشکرگزار گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔ ۳۵۳

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝٢٧٧
جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں ان کے لیے ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی ڈر نہیں ، اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ ۳۵۴

سے پیدا ہوتے ہیں۔
سود خواری میں سرمایہ کی عزت محنت سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ یورپ کی موجودہ سود خوار قوموں میں اس اصول کا نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ انسانوں کا وہ حصّہ جن کا مدار زندگی محنت پر ہے غریب اور مفلس ہو گیا ہے اور ان کا افلاس روز بروز ترقی کر رہا ہے اور سرمایہ اور روپیہ چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اکٹھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکثر حالات میں یہ سرمایہ بھی محنت سے پیدا ہُوا ہے۔ مگر جب ایک دفعہ وہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر کوئی اصول ایسا نہیں کہ اس کو محنت کرنے والوں کی طرف واپس کرے بلکہ اصول سود خواری کی رو سے یہ سود خوار کے ہاتھ میں بلا محنت ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس غلط اصول کا نتیجہ ہی پہلے سوشلزم کا اور اب بولشوزم کا پیدا ہونا ہے جنہوں نے اس سرمایہ کے چند ہاتھوں میں اجتماع کو دیکھ کر اس کے خلاف یہ اصول قائم کیا کہ کوئی شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا آپ مالک نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ سب مل کر کمائیں اور مل کر کھائیں۔ گو اس میں محنت کی عزت نظر آتی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں اور اس میں بھی محنت کی بے وقری ہے کیونکہ جب محنت کے نتیجہ کا انسان مالک نہ ہوگا تو ترقی کے لیے اور زیادہ محنت کرنے کے لیے کوئی تحریک باقی نہ رہے گی۔

اصول محنت و مساوات دولت میں توازن اسلام نے قائم کیا: اِن مشکلات کا حل اسلام نے کیا کہ ایک طرف تو محنت کو یہ عزت دی کہ محنت سے کمائے ہوئے مال کو محنت کرنے والے کا حق قرار دیا تاکہ محنت کے لیے یہ موجب تحریک ہو اور دوسری طرف جب محنت سے سرمایہ ایک جگہ جمع ہونے لگے تو پھر اس کے واپس لوٹانے اور ایک حد تک دوسرے لوگوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کیا۔ گویا اصول محنت مساوات دولت کے خلاف تھا۔ اور مساوات دولت اصول محنت کے خلاف، اسلام نے ان دونوں کو نہایت خوبی سے جمع کیا ہے۔ یعنی اصول محنت کو بطور بنیاد قائم رکھا کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا اور مساوات دولت کے لیے کئی ایک قانون بنا دیئے۔ جیسے زکوٰۃ کا اصول کہ جمع شدہ دولت کا چالیسواں حصّہ ہر سال لازماً غربا کو دیا جائے۔ یا جیسے تقسیم ورثہ کا اصول کہ روپیہ ایک جگہ جمع ہو کر ایک شخص کی موت کے ساتھ تقسیم ہوتا رہے۔ ایسا ہی یہ اصول سود کی حرمت کا ہے کہ اس کی رو سے اغنیاء سے غربا کو مدد ملتی رہتی ہے۔

بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی تو آپ نے اسے پڑھ کر سُنایا۔ پھر شراب کی تجارت کو منع فرمایا۔ یہ اس لیے کہ احل اللہ البیع میں بیشک ہر قسم کی تجارت جائز ہے مگر وہ تجارت جائز نہیں جو کسی حکم الٰہی کی خلاف ورزی میں معاون ہو۔

۳۵۳ یمحق۔ محق نقصان کو کہتے ہیں اور محقہٗ کے معنی ہیں ایک چیز کو گھٹا دیا اور اس کو بے برکت کر دیا۔
کفار۔ کفر سے کفور اور کفار مبالغہ کے صیغے آئے ہیں اور کافر کی جمع کفار ہے۔ کفّار کفر پر اصرار کرنے والا ہے گویا وہ خدا کے حکم کے مقابلہ پر حلت ربا پر مصر ہے
اثیم۔ اِثم سے مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی وہ باوجود عقیدہ حرمت کے گناہ میں پڑتا ہے۔
یہاں بیان فرمایا ہے کہ سود سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے اور صدقات سے برکت پیدا ہوتی ہے۔ مسند امام احمد میں ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ان الربا وان کثر فان عاقبتہ تصیر الی قل یعنی سود گو بہت ہو جائے مگر انجام اس کا کمی کی طرف ہوتا ہے۔ اور صدقات کے متعلق بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص ایک کھجور کے برابر پاک کمائی سے صدقہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ پاک مال کے سوائے قبول نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دائیں ہاتھ سے قبول کرتا ہے پھر اس کو اس کے دینے والے کے لیے بڑھاتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کو پالتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے (کتاب الزکوٰۃ)

قوم کا مال کس طرح بڑھتا ہے: ان باتوں کی صداقت پر واقعات عالم شاہد ہیں کسی قوم کی دولت یوں نہیں بڑھتی کہ اس میں سے چند لوگوں کے صندوقوں میں بیشمار روپیہ پڑا ہو بلکہ قومی دولت بڑھی ہوئی اس وقت سمجھی جائیگی جب ہر ایک شخص کو اس دولت سے فائدہ پہنچ رہا ہو۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سود خواری اس کے منافی اور صدقات اور صرف صدقات ہی اس کے معاون ہیں۔

۳۵۴ جب ان لوگوں کا ذکر کیا جو احکام الٰہی کی اعتقاداً یا عملاً نافرمانی کرتے ہیں اور فرمایا کہ ایسے لوگ خدا کے محبوب نہیں ہو سکتے تو ساتھ ہی تقابل کے طور پر نیکوں کا ذکر کیا اور اعمال صالحہ کے دو ارکان نماز اور زکوٰۃ کا خصوصیت سے ذکر کیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا
بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۲۷۸
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ
اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۲۷۹
وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ
وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۲۸۰
وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۣ ثُمَّ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقوٰے کرو اور جو کچھ
سُود سے باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ ۳۵۵
پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی
کے لیے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کرو تو تمھارے لیے تمھارے اصل مال ہیں
نہ تم نقصان پہنچاؤ اور نہ تمھیں نقصان پہنچایا جائے۔ ۳۵۶
اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو فراخی تک مہلت دینی چاہیئے اور اگر
تم خیرات کرو تو تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۳۵۷
اور اس دن سے اپنا بچاؤ کرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے

ع ۳۵۵ بقایا سود کا ترک کرنا۔ حجۃ الوداع کا خطبہ: یہاں یہ حکم دیا ہے کہ جب حرمت سود کا حکم نازل ہوا یا جب کوئی شخص توبہ کرکے حکم الٰہی کی فرمانبرداری کی طرف رجوع کرتا ہے تو جو کچھ سود وغیرہ اس وقت باقی ہے اسے چھوڑ دے حجۃ الوداع میں نبی کریم صلعم نے جو خطبہ پڑھا تھا اس میں اور امور میں یہ بھی ذکر تھا کہ جس قدر جاہلیت کے سود کی رقمیں تھیں وہ سب موقوف کی جاتی ہیں یعنی اب قابل وصول نہ ہونگی اور فرمایا کہ پہلا ربا جو موقوف کیا جاتا ہے وہ عباس بن عبد المطلب کا ہے یعنی آپ کے چچا کا۔ یہ تعلیم کیوں مؤثر نہ ہو جس میں اصلاح گھر سے شروع کی جائے۔

ع ۳۵۶ اذنوا۔ اذن سے ہے اَذِنَ کے اصل معنی سُنا ہیں (کیونکہ اُذُنٌ کان کو کہتے ہیں) اور پھر اس کا استعمال اس علم پر بھی ہوتا ہے جو سننے سے حاصل ہو اور بالآخر مطلق علم پر بھی کیونکہ اکثر علم سننے سے حاصل ہوتا ہے (غ) ابن جریر نے اذنوا کے معنی کیے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم پالو اور ابن عباس نے استیقنوا معنی کیے ہیں یعنی یقیناً جان لو (ج)

یہاں سود لینے کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنا قرار دیا ہے۔ بعض لوگوں نے ظاہر الفاظ کا تتبع کرکے یہ خیال کر لیا ہے کہ سود لینے والے کو قتل کر دینا جائز ہے مگر یہ درست نہیں اور نہ حدود شرعی میں اس کا کہیں ذکر آتا ہے۔ یہ الفاظ صرف تنبیہ و تہدید کے لیے ہیں۔ مال کی محبت بعض وقت انسان کو اندھا کر دیتی ہے اس لیے اس سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

سود کا روپیہ اشاعت اسلام پر خرچ کرنا: یہاں سود لینے کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنا قرار دیا ہے تو اس سے بطور اشارہ لطیفہ یہ استنباط ہو سکتا ہے کہ اگر انسان کے پاس کوئی ایسا روپیہ سود کا آجائے جو اس نے سود حاصل کرنے کی نیت سے نہیں لیا یا جس میں کچھ شائبہ سود کا ہو تو اگر ایسے روپے کو اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں کے مقابلہ پر خرچ کر دیا جائے تو جائز ہے۔ اسی طرح جو لوگ بنکوں میں یا ڈاک خانوں میں روپیہ محض پس انداز کرنے کیلئے یا حفاظت کے لیے رکھوا دیتے ہیں ان کے لیے جائز ہے کہ سود کے روپے کو وصول کرکے اشاعت اسلام کے کام پر لگا دیں مگر اپنے کسی مصرف میں نہ لائیں۔ اسی طرح جن ملازمین کو بونس کا روپیہ ملتا ہے اگر اس میں کچھ حصہ سود کا ہو تو تقوے کا طریق یہ ہے کہ سود کے روپے کو تبلیغ دین پر لگا دیں یا جہاد میں صرف کر دیں۔ ایسا ہی اگر کوئی شخص بنک میں روپیہ محض اس غرض سے جمع کراتا ہے کہ اس کے پسماندگان کے لیے کچھ اندوختہ رہ جائے تو یہ بھی اس شرط پر جائز ہو سکتا ہے کہ اصل رقم کے علاوہ جو روپیہ ہے وہ اشاعت اسلام کے کام پر لگا دیا جائے۔ اگر کسی شخص کے پاس ناجائز کمائی کا روپیہ ہے اور وہ آیندہ اس طریق سے توبہ کرتا ہے اور مال مشتبہ کا الگ کرنا یا اصل حقداروں کو پہنچانا مشکل امر ہے تو اس کا بھی خیراتی کاموں پر لگا دینا جائز ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ناجائز طریق پر روپیہ کما کر خیرات میں دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ محض ایک حالت مجبوری ہے کہ روپے کو دوسری صورت میں تباہ کرنا پڑتا ہے تو اس صورت میں بہتر ہے کہ اسے اشاعت اسلام پر یا کسی خیراتی کام پر لگا دیا جائے۔

ع ۳۵۷ نَظِرَة۔ نظر سے ہے ڈھیل یا مہلت دینا۔
مَيْسَرَة۔ یُسر عُسر کی ضد ہے اور میسرۃ سے مراد یہاں غنا ہے۔
تصدقوا تَصَدَّق کے اصل معنی ہیں صدقہ دیا۔ لیکن جب انسان کا ایک حق ہو اور اسے وہ چھوڑ دے تو اس پر بھی تصدق بولا جاتا ہے (غ)
احادیث میں بھی قرضدار کو معاف کر دینے یا ڈھیل دینے کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ یہاں یا حکم ہے اور اس کی فرمانبرداری ضروری ہے یا سفارش ہے اور خدا کی سفارش سے بڑھ کر کیا چیز مومن کو محبوب ہونی چاہیئے۔ یہ وہ ہمدردی ہے جو اسلام سکھاتا ہے۔ مقروض تنگ دست ہو تو یا مہلت دو یا معاف ہی کر دو۔ آج کل کے قوانین کی طرح جیل خانہ میں نہیں بھجواتا۔

ع
تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ
اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ
بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ
اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا
يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ
الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ
يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ
فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ
اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ
وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا

ع۳۵۸ پھر ہر شخص کو جو اس نے کمایا پورا دیا جائیگا اور انھیں نقصان نہیں پہنچایا جائیگا۔
اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں مقرر وقت کے لیے قرض کا
معاملہ کرو تو اسے لکھ لو۔[۳۵۹] اور چاہیئے کہ تمھارے درمیان لکھنے
والا عدل کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے
جیسا اللہ نے اُسے سکھایا، اور ضرور لکھ دے اور چاہیے
کہ وہ جس پر حق ہے لکھائے اور وہ اللہ اپنے رب کا تقوےٰ
اختیار کرے اور اس سے کچھ کمی نہ کرے، پھر اگر وہ شخص جس پر
حق ہے کم عقل یا ضعیف ہو یا لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو
تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور دو گواہ
اپنے مردوں میں سے گواہی کے لیے بلا لیا کرو۔ پھر اگر
دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں
میں سے ہوں جن کو تم پسند کرو، تاکہ اگر ایک بھول جائے
تو ایک ان دونوں میں سے دوسری کو یاد دلا دے۔
اور گواہ جب بلائے جائیں انکار نہ کریں اور اس کے وقت

ع۳۵۸ آخری آیت جو آنحضرت پر نازل ہوئی آیات کی ترتیب آنحضرت کے حکم سے: اس آیت کے متعلق متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری آیت ہے جو نبی کریم صلعم پر نازل ہوئی اور اس کا نزول آپ کی وفات سے چند ہی یوم پیشتر تھا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا اجعلوھا بین اٰیۃ الربٰوا و اٰیۃ الدَّین یعنی اس کو آیت ربا اور آیت دَین کے درمیان رکھ دو (آیتِ دَین آگے آتی ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم ہر ایک آیت کا مقام خود بتلاتے تھے، اور بخاری کی یہ روایت جو ابن عباسؓ سے ہے کہ آخری آیت جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوئی آیت ربا تھی، اس کے خلاف نہیں امام بخاری نے جس باب کے نیچے اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ واتقوا یومًا ترجعون فیہ ہے چونکہ ربا کا مضمون اس آیت پر ختم ہوتا ہے اس لیے اسی کو آیت ربا کہدیا ہے۔ مضمون ربا کا خاتمہ اس آیت پر کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مال و دولت جس کی محبت کے لیے تم اپنے اخلاق کو تباہ اور روحانیت کو برباد کرتے ہو یہ انجام کار تمھارے کچھ کام نہیں آئے گی۔

۳۵۹ تداینتم۔ دَین قرضہ کو کہتے ہیں اور مُداینۃ اس سے مفاعلہ ہے ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرنا۔

حفاظت مال کی تعلیم: پچھلے تین رکوعوں میں ایک طرف انفاق فی سبیل اللہ پر زور دے کر اور دوسری طرف سود کو حرام قرار دے کر مال کی محبت کی جڑ کاٹی ہے تو اب یہ بھی بتادیا کہ مال کی حفاظت کی کس قدر ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ مال کی حفاظت کو ایک دینی حکم قرار دیا بلکہ ان لوگوں کو جو اپنے مال کی حفاظت نہیں کر سکتے سفیہ قرار دیا۔ یہی اسلام کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ انسانی قوٰے کے نشوونما میں اعتدال کے پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ مال سے محبت نکرنا، اخلاق فاضلہ کے لیے ضروری ہے مگر یہ نہیں کہ حقوق کی حفاظت نہ کی جائے کیونکہ مال سے انسان کے کام چلتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا التی جعل اللہ لکم قیامًا (النساء ۔ ۵) اور جو شخص مال کی حفاظت نہ کریگا وہ دوسروں کا محتاج ہو جائے گا اور احتیاج بھی اخلاق فاضلہ سے محروم کرتی ہے۔

لین دین کے معاملات چار طرح پر ہو سکتے ہیں: (۱) بیع العین بالعین یعنی لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود ہوں اس کو تجارت حاضرہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ قیمت دی اور چیز لی۔ تحریر کی ضرورت نہیں (۲) بیع الدین بالدین یعنی لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ یہ فرضی بیع ہے جیسا آج کل تجارت کے رنگ میں جوا کھیلا جاتا ہے جسے سٹہ کہتے ہیں۔ اسے اسلام نے منع کیا ہے (۳و۴) بیع العین بالدین یا بیع الدین بالعین یعنی ایک چیز موجود نہ ہو اور دوسری ہو یہی مُداینۃ ہے اس میں حکم ہے کہ ایسے معاملات کو لکھ لیا کرو اور گواہ بھی رکھ لیا کرو تا جھگڑے کم ہوں۔

عرب اُمی قوم تھی۔ معاملات سادہ رنگ کے تھے ان میں لکھنے کا رواج نہ تھا۔ کاغذ بھی کمیاب تھا۔ ایسی قوم کو تحریر معاملات کا اتنا موکد حکم بتاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کے ایک عظیم الشان متمدن قوم بننے کا اشارہ تھا۔ اس لیے اس قوم کی بنیاد ہی ایسی رکھی کہ آئندہ ضرورتوں کا سامان پہلے سے کر دیا۔

تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى
اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ
وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً
حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪
وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ
تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ
وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٢﴾

تک اسے لکھنے میں کاہلی نہ کرو تھوڑا ہو یا بہت ۔ یہ اللہ
کے نزدیک بہت انصاف کی بات ہے اور گواہی کو بہت
مضبوط رکھنے والی ہے اور اس سے بہت قریب ہے کہ تم شک میں نہ
پڑو لیکن اگر نقد سودا ہو جس کو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو پھر تم پر کوئی
گناہ نہیں کہ اُسے نہ لکھو اور جب خرید و فروخت کرو تو گواہ رکھ لیا
کرو اور نہ لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو۔ اور
اگر تم (ایسا) کرو گے تو یہ تمھاری طرف سے نافرمانی ہوگی اور اللہ کا
تقویٰ کرو اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ع۳۶۰

ع۳۶۰ کما علمه الله میں کما کے معنی لِاَجل کے بھی ہو سکتے ہیں یعنی اس لیے کہ اللہ نے اسے سکھایا اور کے معنی مثل بھی ہو سکتا ہے یعنی جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا۔ کاتب کے سیکھنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا کیونکہ اسی نے انسان کو استعداد دی اور اسی نے سامان مہیا کیے۔

بالعدل ۔ اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ کسی فریق کی طرف میلان نہ ہو اور یہ بھی کہ کتابت میں عدل ہو یعنی ایسی کتابت ہو جس پر وثوق کیا جا سکے (ر) پس ہر شخص کتابت کا اہل نہیں یوں وثیقہ نویسی کو ایک فن قرار دیا ہے۔

یُملل ۔ مَلَل کے اصل معنی ملال ہونے کے ہیں (ل) حدیث میں ہے فان الله لا يَمَلُّ حتى تَمَلُّوا (وہ عمل اختیار کرو جس کی طاقت رکھتے ہو کیونکہ اللہ ملول نہیں ہوتا یہاں تک کہ تم ملول ہو جاتے ہو۔ ملول ہونا انسان کے لیے ہے خدا کے لیے نہیں۔ اور اَمْلَلْتُ الکتاب اور اَمْلَيْتُ الکتاب کے ایک ہی معنی ہیں اسے کاتب پر ڈالا یعنی بول کر تا کہ وہ اسے لکھ لے (ل) قرآن شریف میں دوسری جگہ اِملاء آتا ہے فهى تملى عليه بكرة واصيلا (الفرقان ۲۵ : ۵) اور لفظ مِلّة بمعنی مذہب بھی مللت الکتاب سے ہی اخذ کیا ہے الذی علیه الحق ۔ جس شخص پر حق قائم ہو رہا ہے وہ لکھوائے اس سے بہت سے مظالم کا سدباب ہوتا ہے جو آج ساہو کاروں کی طرف سے غریب مدیونوں پر ہو رہے ہیں جو چاہتے ہیں خود بہیوں میں لکھ لیتے ہیں۔

یَبْخَس ۔ بَخْس ۔ ظلم کے طور پر کسی چیز کا کم کرنا (غ)

سفیہا ۔ دیکھو ع۲۵ جو لوگ اپنے اموال کو ٹھیک طرح سے خرچ کرنا یا اپنے حقوق کی حفاظت کرنا نہیں جانتے ان کو سفیہ کہا ہے۔

ضعیفا ۔ لڑکا ہو یا بہت بوڑھا۔

لا يستطيع ان يمل هو ۔ املا نہ کرا سکنے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں گونگا ہو۔ زبان سے ناواقف ہو۔ کوئی اور عارضہ ہو۔

ان لم يكونا رجلين ۔ دو گواہ مرد نہ ہوں ۔ یعنی نہ ملیں یا نہ رکھنا چاہو۔

تضل ۔ طریق مستقیم سے عدول کا نام ضلال ہے عمداً ہو یا سہواً تھوڑا ہو یا بہت (غ) چنانچہ محض نسیان یعنی بھول جانے پر بھی بولا جاتا ہے (غ)

تذکر ۔ اس کے معنی کیے ہیں۔ تعيد ذکره (غ) یعنی اس کے ذکر کا اعادہ کر دے۔

حاضرة ۔ موجود یعنی نقد تجارت۔

یضار ۔ یہاں ضر بمقابلہ نفع ہے (غ) یعنی مالی نقصان نہ پہنچایا جائے جب شہادت میں بلایا جائے اس کو اس کی صنعت یا معاش کا عوضہ دیا جائے۔

باہم معاملات میں اصول قوانین : اس ایک آیت میں ایک ترقی یافتہ قوم کی لین دین کی جملہ ضروریات کو مدنظر رکھا گیا ہے ۔ اول کاتبوں یا وثیقہ نویسوں کی ضرورت بتائی ۔ وہ لکھنے سے انکار نہیں کر سکتے اور لکھانے والے کو معاوضہ دینا ضروری ہے۔ دوم گواہ ہوں وہ گواہی دینے سے انکار نہیں کر سکتے ۔ مگر جو اُن کو بطور گواہ بلاتا ہے وہ ان کے کاروبار کے ہرجہ کا معاوضہ دے۔ سوم معاملہ کرنے والا بچہ ہو یا بوڑھا یا مال کی حفاظت نہ کر سکتا ہو یا کوئی اور امر مانع ہو تو اس کا ولی مقرر کیا جائے۔ غرض ایک ایک فقرہ میں ایک ایک قانون کی بنیاد قائم کر دی ہے آگے اس پر قانون بن سکتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شہادت میں دو گواہوں کا ہونا بلحاظ حالات عامہ ہے۔ عموماً دو گواہوں سے بات مضبوط ہو جاتی ہے۔ جھوٹ کی ملاوٹ کا احتمال کم ہو جاتا ہے۔ بیان کا جو حصہ ایک دوسرے کی تائید میں ہو وہ وزنی ہو جاتا ہے یہ حکم نہیں کہ اگر ایک ہی گواہ ہو تو فیصلہ نہ کیا جائے یا قرائن کی شہادت پر فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ حضرت یوسف کے معاملہ میں جہاں قمیص کے آگے یا پیچھے سے پھٹنے کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ قرائن کی شہادت پر بھی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا
فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ
بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ
اللّٰهَ رَبَّهٗ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۗ وَمَنْ
يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٣﴾ ع

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو (کچھ) باقبضہ گرو رکھ لیا جائے پھر اگر تم میں سے ایک دوسرے کا اعتبار کرے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے چاہیئے کہ وہ امانت کو ادا کرے اور اللہ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص اسے چھپاتا ہے تو اس کا دل ضرور گنہگار ہوتا ہے اور جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔[361]

عورت کی گواہی: اور ایک مرد کی جگہ جو دو عورتوں کی شہادت رکھی تو اس کی وجہ بھی خود ہی بتا دی کہ عورتوں کو چونکہ معاملات لین دین سے واسطہ کم پڑتا ہے، اس لیے ایسی باتوں کو شاید وہ اچھی طرح یاد نہ رکھ سکیں تو ایک کی کمی کو دوسری پُورا کر دے۔ اکیلی عورت کی شہادت ناقابلِ قبول ہونے کا ذکر کہیں نہیں۔ بلکہ لعان کے معاملہ میں جو وزن مرد کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے وہی وزن عورت کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے گویا مرد اور عورت کی شہادت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ولادت بکارت وغیرہ معاملات میں فقہا نے بھی عورت کی شہادت کو پُورا وزن دیا ہے۔

ع[361] رھان۔ رَھن کی جمع بھی ہے اور خود رَھن کی طرح مصدر بھی ہے اور وہ چیز ہے جو بطور ضمانت قرض کے لیے رکھی جائے (رغ)

امانۃ۔ اَمْن اور اَمَانَۃ اور اَمَان اصل میں مصدر ہیں جن کے معنی نفس کی طمانیت اور خوف کا جاتے رہنا ہے اور اَمَان اس حالت کا نام بھی ہے جس میں انسان ہو اور اس چیز کو بھی کہدیا جاتا ہے جس کے متعلق انسان کا اعتبار کیا جائے یا اسے امین سمجھا جائے اسی معنی میں امانت ہے (رغ) اور یہاں جب چیز کے متعلق اعتماد کیا گیا ہے وہ قرضہ ہے پس اسی کو امانت کہدیا ہے۔

قرض کا معاملہ تحریر سے دو صورتوں میں مستثنےٰ کیا۔ اوّل رہن باقبضہ کی صورت میں۔ دوم اعتماد ہو۔ رہن باقبضہ کا جواز تو یہاں صریح ہے۔ مگر آیا یہ شرط سفر اور کاتب کے نہ ملنے سے ہے، یا جواز تو عام ہے اور یہاں صرف یہ توجہ دلائی ہے کہ اگر سفر وغیرہ میں کاتب نہ ملے تو تمہارے لیے ایک دوسری صورت بھی جائز ہے۔ دوسری صورت کا صحیح ہونا جمہور کا مذہب ہے یعنی رہن باقبضہ بہر حال جائز ہے خواہ سفر میں ہو یا حضر میں، کاتب ملے یا نہ ملے احادیث صحیحہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ صحیحین میں حضرت انسؓ سے ہے ان رسول اللّٰہ صلعم توفی ودرعہ مرھونۃ عند یھودی علیٰ ثلثین وسقا من شعیر رھنھا قوتہ لاھلہ یعنی رسول اللہ صلعم فوت ہو گئے اور آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس وسق جَو پر رہن تھی جو آپ نے اپنے اہل کے گزارہ کے لیے لیے تھے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم نہ تو سفر میں تھے کیونکہ اہل کے گزارہ کا ذکر ہے اور نہ ہی کاتبوں کی آپ کے پاس کمی تھی۔ پس رہن باقبضہ کا جواز عام ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کس طرح گزارہ کرتے تھے اور بیت المال سے کس قدر لیتے تھے۔ آپ وفات کے وقت عرب کے بادشاہ تھے خراج کا لاکھ سے زیادہ درہم صرف بحرین سے آپ کے پاس آیا اور آپ نے مسجد کے صحن میں اسے رکھوا دیا اور تب اُٹھے جب تقسیم کر چکے۔ مال غنیمت سے ایک ایک کو سو سو اونٹ بھی دیئے۔ اپنی ذات کے لیے لیتے تو کون اعتراض کر سکتا تھا۔ مگر اپنی یہ حالت ہے کہ تھوڑے سے جَو کے لیے اپنی زرہ گرو رکھی ہوئی ہے جو لوگ آپ پر نفسانیت کا اعتراض کرتے ہیں کاش ان کے سینوں میں دل ہوتا۔

اس آیت سے اور احادیث سے جو اس بارہ میں مروی ہیں یہ بھی ثابت ہے کہ رہن باقبضہ ہی جائز ہے۔ بلا قبضہ رہن جائز نہیں اور وہ درحقیقت سود کی ایک صورت ہے۔ البتہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ رہن باقبضہ کی صورت میں مرہونہ چیز سے نفع اُٹھانا جائز ہے۔ مثلاً گھوڑا رہن رکھا تو اس کو چارہ دیا جائے اور اس سے سواری کا کام لیا جائے۔ جائداد غیر منقولہ کے رہن باقبضہ کا مسئلہ بھی اس سے اخذ کیا جا سکتا ہے یعنی زمین یا مکان کا رہن باقبضہ جائز ہے اور زمین کی پیداوار اور مکان کے کرایہ سے فائدہ اُٹھانا بھی جائز ہے بشرطیکہ لگان یا اخراجات وغیرہ بھی ادا کیئے جائیں۔ البتہ جو لوگ زمین یا مکان کو اپنے قبضہ میں نہیں لیتے اور مالک سے کچھ سالانہ منافع مقرر کر لیتے ہیں تو وہ صریح سود ہے۔

معاملہ دنیوی میں راستی کی اہمیت: پہلے ذکر کیا تھا کہ گواہ انکار نہ کرے۔ اب یہ حکم دیا ہے کہ گواہی کو نہ چھپائے اور جو چھپائے اس کا دل گنہگار ہوتا ہے۔ دل گنہگار کہنے سے یہ منشاء ہے کہ انسان ان لین دین کے معاملات کو معمولی نہ سمجھے جو شخص ان معاملات میں راستبازی سے کام نہیں لے سکتا وہ راستباز نہیں ہو سکتا۔ قلب چونکہ تمام نیکیوں کا مرکز ہے اس پر اثر پڑنے سے دوسری نیکیوں کی توفیق بھی چھن جاتی ہے پس یہ سمجھایا ہے کہ یہی چھوٹے چھوٹے معاملات ہی انسان کے قلب کو سفید یا سیاہ کر دیتے ہیں جو شخص انسانوں کے باہم معاملات اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں صداقت کا طریق اختیار نہیں کرتا وہ نماز اور روزہ سے نیک نہیں بن سکتا۔

یہاں صرف کتمان شہادت کو اس قدر بُرا بتایا ہے یعنی سچی شہادت چھپانے کو۔ تو جھوٹی شہادت کس قدر بڑا گناہ ہے۔ اگر سچی شہادت کا اخفا بھی

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ	اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور
تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ	اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ، اللہ اس کا
بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ	تم سے حساب لیگا، پھر وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾	عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۶۲
اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ	رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا

انسان کے دل کو سیاہ کر دیتا ہے تو اس شخص کی کیا حالت ہوگی جو جھوٹی گواہی دیتا ہے اور ابھی وہ لوگ مسلمان کہلاتے ہیں جو آٹھ آٹھ آنے پر کچہریوں میں جا کر جھوٹی شہادتیں دیتے اور علاوہ اپنا قلب سیاہ کرنے کے اسلام کو بھی بدنام کرتے ہیں۔ یہی سیاہ دلی ان لوگوں کے حصہ میں بھی آتی ہے جو حکام کے سامنے جھوٹے واقعات بیان کرتے ہیں یا سچے واقعات کا اخفا کرتے ہیں محض اس لیے کہ حکام ان سے خوش ہو جائیں۔

۳۶۲۔ یہ رکوع سورت کو ختم کرتا ہوا اس کے مضمون کا خلاصہ بیان کرتا ہے۔ یعنی مذہب اسلام کی وسعت کہ سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور کامیابی کی بشارت جو دعا کے رنگ میں فانصرنا علی القوم الکافرین میں سکھائی۔ ابتداء میں فلاح کا وعدہ اور آخرت پر نصرت کی دعا ایک ہی بشارت دیتے ہیں۔

الفاظ ان تبدوا ما فی انفسکم آیت کے آخر تک کو کئی مفسرین نے منسوخ قرار دیا ہے۔ ابن عمر سے بخاری میں دو روایتیں ان کی منسوخی کی ہیں مگر ابن جریر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عمر اس کی منسوخی کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے کہ ابن عمر نے اس آیت کو پڑھا تو بہت روئے ابن عباس کے پاس ذکر ہوا تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے اس کو پچھلی آیت نے منسوخ کر دیا۔ یہاں ابن عباس کو منسوخی کا قائل قرار دیا گیا ہے مگر ابن جریر کی دوسری روایت سے پایا جاتا ہے کہ ابن عباس اس کی منسوخی کے قائل نہ تھے۔ اسی بنا پر خود ابن جریر نے اس کے منسوخ ہونے سے انکار کیا ہے۔

پھر سورہ آل عمران میں جو اس کے بعد ہے بعینہٖ ایسے الفاظ ہیں قل ان تخفوا ما فی صدورکم او تبدوہ یعلمہ اللہ (آل عمران ۳: ۲۸) جہاں یعلمہ اللہ سے وہی مراد ہے جو یہاں یحاسبکم اللہ سے ہے اگر ان الفاظ کو لا یکلف اللہ نے منسوخ کر دیا ہوتا تو دوبارہ اسی مضمون کے لفظ کیوں نازل ہوتے اور یہ روایت کہ اس آیت کے نزول پر صحابہؓ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ یہ ہماری طاقت سے باہر ہے تو آیت لا یکلف اللہ نازل ہوئی خود عدم نسخ کی مؤید ہے اس لیے کہ اس میں یہ لفظ کہیں نہیں آتے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہو کہ پہلی آیت منسوخ ہو گئی۔ ہاں یہ کہا جائیگا کہ دوسری آیت نے پہلی کے معنی واضح کر دیئے۔

نسخ کا استعمال صحابہ میں: اور بتا دیا کہ وہ مراد نہیں جو بعض صحابہؓ نے خیال کر لیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ انسان کی وسعت سے بڑھ کر کوئی حکم نہیں دیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے اس قسم کی وضاحت معنی پر ہی صحابہ نسخ کا لفظ مجازاً استعمال کر لیتے تھے جہاں سے ناسخ منسوخ کی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ چنانچہ روح المعانی میں اسی کے مطابق خیال نقل کیا گیا ہے۔ ان المراد من النسخ البیان والیضاح المراد مجازاً مسند احمد کی روایت اس معاملہ کو بالکل صاف کر دیتی ہے جس میں ابن عباس سے ہے کہ جب یہ آیت ان تبدوا...... نازل ہوئی تو لوگوں کے دلوں میں ایک خیال گزرا جو پہلے کبھی نہ گزرا تھا (اور دوسری روایت میں ہے وہ سخت مغموم ہوئے کہ ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے) تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ قولوا سمعنا واطعنا وسلمنا فالقی اللہ الایمان فی قلوبہم یعنی کہو ہم نے سنا اور فرمانبرداری کی اور تسلیم کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان ڈالا اور پھر امن الرسول...... نازل ہوا جس سے معلوم ہوا کہ دوسری آیت کے نزول سے پہلے ہی وہ سمجھ چکے تھے اور ارشاد نبوی سمعنا واطعنا بتاتا ہے کہ یہ طاقت سے باہر کوئی چیز نہ تھی۔ پس یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نسخ کا لفظ محض واضح کرنے کے معنی میں صحابہؓ نے استعمال کیا ہے گویا ایک غلط خیال جو کسی کے دل میں ان الفاظ سے پیدا ہوا وہ منسوخ ہوا اصل الفاظ منسوخ ہونے کا منشاء نہیں ہوتا۔

چھپی اور کھلی باتوں پر خدا کا محاسبہ: اب معنی پر غور کرو تو اور بھی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منسوخ نہیں۔ ایک بات کو دل میں چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ اس کے مطابق تم سے حساب لیگا۔ ظاہر ہے کہ دل میں وہ بات چھپائی جاتی ہے جس کا انسان عزم کر چکا ہو کہ میں ایسا کروں گا۔ پھر اس کو چھپاتا ہے کہ لوگوں پر ظاہر نہ ہو اور جو کوئی وسوسہ دل میں گزرے اور نکل جائے اس پر دل میں چھپانا صادق نہیں آتا۔ جن کو غلطی لگی وہ یہی لگی کہ انہوں نے سمجھا کہ جو خیال دل میں گزرے اس پر محاسبہ ہوگا۔ حالانکہ یہ مراد نہ تھی جیسا کہ آنحضرت صلعم نے قولوا سمعنا وطاعۃ سے سمجھا دیا اور لا یکلف اللہ نے اس کی مزید توضیح کر دی۔ اس کی تائید دوسرے مقامات سے ہوتی ہے جہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ گرفت اس پر کرتا ہے جو دل کر گزرے اور محض خیال یا وسوسہ پہلے سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ سورہ النجم میں ہے اِلَّا اللَّمَمَ (النجم ۵۳: ۳۲) اور دل کا کر گزرنا پختہ طور پر ٹھان لینا ہے جیسا فرمایا بما کسبت قلوبکم اور بما تعمدت قلوبکم اور پھر محاسبہ بھی ہر ایک فعل پر برابر نہیں فیغفر لمن یشاء میں خود بتایا کہ بہتیری باتیں اللہ تعالیٰ معاف بھی کرتا رہتا ہے اسی کے مطابق صحیحین میں ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب بندہ بدی کا قصد کرے تو اس کے خلاف نہ لکھو اگر وہ فعل کر دے تو اس کو ایک بدی لکھو۔ اور جب وہ نیکی کا قصد کرے اور وہ نیکی عمل میں نہ آئے تو اسے ایک نیکی لکھو اور اگر عمل میں آجائے تو دس نیکیاں لکھو۔ یہ وسعتِ رحمت ہے۔

آیت کے پہلے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اور دوسرے میں علم کامل کا ذکر ہے اور یہی دو چیزیں ہیں جن سے جزا و سزا پر ایمان پیدا ہوتا ہے۔

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ
وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ
مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۟
غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا
مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا
تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا
وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا
مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَ اعْفُ عَنَّا ٝ

گیا اور مومن (بھی) سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں
اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ہم اس کے رسولوں میں سے
کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے، اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے فرمانبرداری
کی اے ہمارے رب تیری حفاظت (چاہیئے)۳۶۳ اور تیری طرف ہی انجام کار پہنچنا ہے۔
اللہ کسی پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر جس قدر اس کی طاقت ہو اسی کے لیے ہے
جو وہ (اچھی) کمائی کرے اور اسی پر ہے جو وہ (بری) کمائی کرے۳۶۴ اے ہمارے
رب ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں اے ہمارے رب اور
ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال۳۶۵ جیسا تو نے اُن پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے
اے ہمارے رب اور ہم پر ایسا بوجھ نہ رکھ جس کی طاقت ہم میں نہیں
اور ہمیں معاف فرما اور ہماری حفاظت فرما۳۶۶ اور ہم

ع۳۶۳ غفرانك۔ غفران۔ غفر سے مصدر ہے معنی کے لیے دیکھو ع۲۵۸ نیز ع۳۶۵ تقدیر یوں ہے نسالك غفرانك۔
سب انبیاء پر ایمان: اس سورت کے شروع میں وسعتِ اسلامی کی طرف توجہ دلائی یؤمنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك۔ درمیان میں بھی جہاں فرمایا کہ ہم صرف ابراہیم موسیٰ عیسیٰ پر ہی ایمان نہیں لاتے بلکہ جو کچھ بھی دنیا میں کہیں نبیوں کو دیا گیا اس کو بھی مانتے ہیں وما اوتی النبیّون من ربّھم (۱۳۶) اور اب پھر اور ما انزل من قبلك کی تفسیر ما اوتی النبیّون من ربھم سے کردی یعنی ما اُنزل میں صرف وہی چیز ہے جو نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی کیونکہ وحی الٰہی غیر انبیاء کو بھی ہوتی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں کئی جگہ ذکر ہے اور پھر دونوں کی تفسیر یہاں لفظ کتبہ لاکر کردی یعنی وہ ما انزل من قبلك اور ما اوتی النبیون من ربھم اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں جو اُن نبیوں کو دی گئیں اور اسی طرح کتبہ و رسلہ کی تفسیر ما انزل من قبلك سے کردی کہ وہ کتابیں اور رسول وہی ہیں جو تجھ سے پہلے دنیا میں ہو چکے بعد میں ہونے والا کوئی نہیں۔ اگر آپ کے بعد بھی رسول آنے والے ہوتے تو من قبلك کی حدبندی عائد نہ کی جاتی۔
ع۳۶۴ یکلّف۔ کلف سے ہے کَلَّفَہٗ کے معنی ہیں اس کو ایسا حکم دیا جو اس پر مشقت ہے (غ)
اِلّا وسعھا۔ وُسع کے معنی فراخی بھی ہیں اور قدرت یا طاقت بھی جو مکلّف کے اندازہ سے بڑھ کر ہو (غ)
مشقت سے راحت پیدا ہوتی ہے: صورت ثانی میں معنی یوں ہونگے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اس سے کم مشقت ڈالتا ہے جس سے اس کی طاقت درماندہ ہو جائے اور صورت اول میں یوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر جو مشقت ڈالتا ہے اس کا پھل وسعت ہوتا ہے یا جنّت (غ) یعنی جو باتیں تکلیف یا مشقت کی معلوم ہوتی ہیں انہی سے فی الحقیقت انسان کے لیے وسعت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا انّ مع العسر یسرا (الانشراح ۹۴-۶) یا فرمایا یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (۱۸۵)
کسبت۔ اکتسبت۔ گو کسب اور اکتساب دونوں بھلائی اور برائی پر استعمال ہوتے ہیں۔ مگر یہاں کسب بھلائی کے لیے اور اکتساب برائی کے لیے ہے جیسا لھا اور علیھا سے ظاہر ہے اصل فرق دونوں میں یہ ہے کہ کسب اپنے لیے بھی ہو سکتا ہے اور اپنے غیر کے لیے بھی اور اکتساب صرف اپنے لیے ہوتا ہے اس لیے بعض کے نزدیک کسبت سے مراد وہ افعال ہیں جو فعل خیر سے انسان دوسرے کے لیے کرتا ہے اور اکتسبت سے مراد وہ افعال ہیں جو اپنی ذات کے لیے کرتا ہے۔ گویا جو کچھ دوسرے کی بھلائی کو مدّنظر رکھ کر کیا جائے وہ بہرحال لھا ہے یعنی موجب نفع اور جو کچھ اپنے آپ کو مدّنظر رکھ کر کرتا ہے وہ علیھا ہے یعنی وبال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔
ع۳۶۵ تؤاخذنا۔ گناہ کی سزا پر لفظ مُؤَاخَذَۃ جو اخذ سے مفاعلہ ہے اس لیے اختیار کیا گیا کہ اس میں مجازات اور مقابلہ کے معنی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے نعمتوں کو اللہ تعالیٰ سے لیا پھر اُن کے مقابلہ پر شکر نہ کیا۔
اِصر کے اصل معنی بوجھ اور مضبوط باندھ دینا پھر کسی عہد کا گناہ جب اسے ضائع کر دیا جائے یعنی عہد شکنی کا گناہ (ل) اور حدیث میں بادشاہ کے متعلق آیا ہے کہ وہ زمین پر ظل اللہ ہے جب اچھا کرے تو اس کے لیے اجر اور تم پر شکر ہے اور جب برا کرے تو اس پر اِصر ہے (ل) یعنی اس عہد کے توڑنے کا گناہ جو سلطان اور رعایا کے درمیان ہے
ع۳۶۶ اِغفر۔ یہاں اور قرآن شریف کے بہت سے موقعوں پر غفر کے معنی خصوصیت سے گناہ سے محفوظ کرنا ہیں دیکھو ع۲۵۸ کیونکہ گناہ کی سزا سے بچانے

وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع

اور ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما تو ہمارا مولیٰ ہے۔ پس ہمیں کافر قوم پر مدد دے۔ ٣٦٧

کا ذکر واعف عنا میں موجود ہے۔ پہلا مرتبہ گناہوں کی سزا سے بچانے کا تھا اس کا ذکر عفو میں ہے۔ دوسرا مرتبہ خود گناہ سے بچانے کا ہے اس کا ذکر غفر میں ہے اور اسی لیے عفوؔ کو پہلے مرتبہ پر اور غفر کو دوسرے پر رکھا ہے اور جہاں کہیں قرآن شریف میں عفو اور غفر کا ذکر اکٹھا آیا ہے۔ عفو کو پہلے رکھا ہے کیونکہ وہ ادنےٰ مرتبہ ہے اور غفر کو پیچھے۔ بلکہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی صفات عُفُوّ اور غَفُور کو اکٹھا کیا ہے وہاں بھی عفو کو پہلے اور غفور کو پیچھے رکھا ہے۔ دیکھو النساءؔ ۴۳ و ۹۹۔ الحج ۲۲-۶۰۔ المجادلۃ ۵۸-۲ وغیرہ مقامات اور یہ یقینی شہادت اس بات پر ہے کہ قرآن شریف نے لفظ غفر سے مراد عفو سے بڑھ کر کچھ لیا ہے۔ اور چونکہ عفو گناہوں کے مٹانے کا نام ہے یعنی ان کی سزا سے درگزر کرنا اس لیے غفر سے ان موقعوں پر صرف گناہوں سے بچانا ہے جیسا کہ ۲۵۸ میں لغت کی شہادت سے دکھایا گیا ہے۔ اس جگہ اوّل عفو ہے دوم غفر سوم رحم اور یہ تینوں لفظ تین پہلے جملوں کے مقابل پر ہیں یعنی لاتؤاخذنا یا مواخذہ سے بچنے کے مقابل پر عفو کی دعا ہے گناہ یا عہد شکنی کے ارتکاب سے بچنے کے مقابل پر غفر یعنی گناہ سے حفاظت کی دعا ہے اور بوجھوں سے بچنے کے مقابل پر رحم کی درخواست ہے اسی طرح فاعف عنہم واستغفر لہم وشاورھم فی الامر (آل عمران ۳-۱۵۸) میں ان لوگوں سے جو جنگ میں بھاگ گئے تھے۔ پہلے عفو کا حکم ہے پھر ان کے لیے استغفار کا حکم ہے یعنی آئندہ ایسے گناہوں سے بچے رہیں۔ پھر ان کو مشورہ میں شریک کرنے کا حکم ہے جو ان کی اور بھی زیادہ عزت افزائی پر دلالت کرتا ہے پس عفو اور غفر جہاں اکٹھے ہوں وہاں غفر سے مراد گناہ سے حفاظت ہے نہ کچھ اور۔

٣٦٧ سورہ بقرہ کی آخری دو آیات کی احادیث میں بہت فضیلت آئی ہے۔ بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص سورہ بقرہ کی دو آخری آیات کو ایک رات میں پڑھے وہ اس کے لیے کافی ہو جاتی ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ خواتیم سورہ بقرہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ مسلم اور نسائی میں ہے کہ آپ کو بشارت دی گئی کہ فاتحہ اور خواتیم بقرہ دو ایسے نور ہیں کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیے گئے۔ فاتحہ کی عظمت کا ذکر پہلے ہو چکا ان دو آیتوں کو یہ عظمت حاصل ہے کہ اگر ایک میں مسلمان کے مذہب اور اس کے قلب کی وسعت بتائی گئی کہ وہ سب انبیاء پر ایمان لاتا اور کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا تو دوسری میں اسے یہ دعا سکھائی گئی کہ وہ کبھی کفر اور باطل پر راضی نہیں ہوتا بلکہ اس پر غالب آنے کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے۔ آج بھی مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ اس دعا سے کام لیں۔

خاص اس دعا میں تین باتیں ہیں۔ اول انسان کے عجز کا پہلو کہ نسیان اور خطا اس سے واقع ہو جاتا ہے۔ تو دعا سکھائی کہ اس پر گرفت نہ ہو۔ ایسی دعا انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ غافل نہ ہو ایسا نہ ہو کہ وہ احکام الٰہی کو بھول جائے اور احکام الٰہی کی فرمانبرداری میں بہت محتاط اور چست ہو تاکہ خطا سے بچا رہے اور جو نسیان وخطا باوجود کوشش کے واقع ہو جائے اس کے نتائج سے حفاظت سکھائی ہے دوسری دعا ہے کہ عہد شکنی کے بوجھ سے بچایا جائے یعنی اس قدر مخالفت احکام الٰہی کی نہ ہو کہ عہد کو توڑ ڈالے جس طرح پہلی قومیں توڑتی رہیں۔ اگر پہلی غفلت وعجز کے بدنتائج سے بچنے کی دعا ہے تو دوسری عمد کے بدنتائج سے اور تیسری دعا یہ ہے کہ ہم پر وہ بوجھ مصائب قضاء وقدر کا نہ ڈالا جائے جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ تکالیف شرعی تو اللہ تعالیٰ وسعت سے بڑھ کر نہیں ڈالتا مگر مصائب قضاء وقدر انسان پر بعض وقت ایسے آجاتے ہیں کہ ان کے بوجھ کے نیچے پس جاتا ہے پس ان سے بچنے کی دعا سکھائی ہے ان تینوں کے مقابل پر پھر تین دعائیں سکھائی ہیں۔ نسیان وخطا کے بالمقابل عفو کی درخواست یعنی یہ کہ نسیان وخطا انسان کی عاجزی سے واقع ہوتے رہتے ہیں ان کے بدنتائج سے بچایا جائے اور عہد شکنی کے بوجھ سے بچنے کے مقابل پر دعائے غفر (حفاظت) یعنی دیدہ دانستہ انسان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو اور قضاء وقدر کے مصائب کے مقابل پر رحم کی درخواست اور ان سب کا آخری مقصد کیا ہے کہ کافر قوم کے خلاف اللہ تعالیٰ کی نصرت ملے۔

سورت کی غرض وغایت مسلمانوں کو ایک زندہ اور کامیاب قوم بنانا: سورۃ کا خاتمہ اس پاک دعا پر کیا ہے جس میں سورۃ کی غرض وغایت بھی بتا دی ہے جس طرح اس کی ابتدا میں۔ یعنی یہ کہ یہ سورت مسلمانوں کو کامیابی کی راہ بتاتی ہے: شروع میں وعدۂ کامیابی دیا تھا۔ پھر کامیابی کے ذرائع اور وسائل بیان کیے کہ ان کو اختیار کرو۔ اور آخر پر دعا کی طرف متوجہ کیا کہ جو راہیں بتائی ہیں ان پر چلو پھر خدا سے بھی دعائیں کرو۔ اس سورت کی غرض مسلمانوں کو ایک زندہ اور کامیاب قوم بنانا اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔

اٰیاتُھا ۲۰۰ (۳) سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ رُکُوْعَاتُھَا ۲۰

نام اس سورت کا نام آل عمران ہے عمران حضرت موسیٰ اور ہارون کے والد کا نام ہے اور چونکہ اس سورت میں نبوت کے سلسلہ موسویہ سے رخصت ہونے کا ذکر ہے اور اس سلسلہ کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروؤں کی غلطیوں کا بالتفصیل ذکر ہے۔ اس مناسبت کے لحاظ سے اس کا نام آل عمران رکھا گیا اس میں بیس ۲۰ رکوع اور ۱۹۹ آیتیں ہیں۔

خلاصہ مضمون اس سورت میں عیسائی مذہب کے دعووں کی تردید کی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بتا کر کہ عالمگیر مذہب اسلام ہے جو ساری دنیا میں پھیلے گا جنگ احد کا ذکر کیا ہے جس میں بظاہر مسلمانوں کی ناکامیابی نظر آتی تھی مگر اس کی تہ میں بھی ایک عظیم الشان کامیابی تھی۔ غرض یہ ہے کہ اگر کفر کے مقابلہ میں اسلام کی حالت کسی وقت مصیبت اور درماندگی کی نظر آئے تو اس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ فی الواقع جو حالت جنگ اُحد میں مسلمانوں کی قریش کے مقابل پر ہو گئی تھی ویسی ہی حالت آج عیسائیت کے مقابلہ میں ہے یعنی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کچلا گیا۔ مگر اس بلا کے نیچے بھی ایک گنج کرم ہے۔

پہلے رکوع میں عقیدۂ الوہیتِ مسیح کی تردید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عیسائیوں کو ٹھوکر اس سے لگی کہ انہوں نے محکم اصولِ دین کو چھوڑ کر متشابہات کی پیروی کی اور یہ ذکر ایسے پیرایہ میں کیا ہے جس سے مسلمانوں کو بھی ساتھ ہی متنبہ کر دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کے معنی کرنے میں اس غلط راہ پر قدم نہ ماریں۔ بلکہ فروع کو اصول دین کے ماتحت کریں جن کا ذکر محکم الفاظ میں ہے برخلاف فروع کے جن کا ذکر متشابہ الفاظ میں بھی آجاتا ہے دوسرے رکوع میں یہ بتاتے ہوئے کہ جنگ بدر میں قدرتِ خداوندی کا ایک نظارہ تھا کہ کس طرح باطل اپنی ساری طاقتوں کے ساتھ حق کے سامنے مغلوب ہو جاتا ہے توحید الٰہی کو جسے عیسائیوں نے چھوڑ دیا سب مذاہب کی اصل بنیاد قرار دیتے ہوئے ضمناً پیش گوئی کی ہے کہ آخر کار توحید ہی غالب رہے گی۔ تیسرے رکوع میں بیان فرمایا کہ نبوت بنی اسرائیل کی قوم سے سلب ہوتی ہے اور ایک دوسری قوم کو دی جاتی ہے جو اس کی اہل ہے۔ چوتھے رکوع میں سلسلہ موسوی کے آخری برگزیدہ افراد کا ذکر فرمایا یعنی ذکریا اور ان کے فرزند یحییٰ کا اور مریم صدیقہ کا۔ پانچویں اور چھٹے رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، بچپن، بڑھاپے، نبوت، تعلیم نشانات وفات وغیرہ کا ذکر کر کے بتایا کہ وہ کسی بات میں انسان سے بڑھ کر نہیں اور دلائل کو پسِ پشت پھینکنے والوں کو مباہلہ کی طرف بلایا۔ ساتویں رکوع میں انہی عیسائیوں کو اصول مقابلہ مذاہب کی طرف بلایا یعنی سب مذاہب میں امر مشترک خالص توحید الٰہی ہے پس اس کو قبول کرو، اس کے ساتھ ہی حضرت ابراہیم کا ذکر کیا جن کا وجود عیسائیوں یہودیوں مشرکین عرب اور مسلمانوں میں بطور مشترک مسلم تھا۔ آٹھویں رکوع میں مثیل موسیٰ والی پیشگوئی کی طرف توجہ دلائی اور اہل کتاب کو ملزم کیا کہ تم دنیا کی امانتوں کی پرواہ نہیں کرتے اسی لیے خدا کی امانت کو بھی جو پیشگوئی کے رنگ میں تھی ضائع کر رہے ہو۔ نویں رکوع میں بتایا کہ موسیٰ ہی نہیں کل انبیائے عالم نے رسول اللہ صلعم کے ظہور کی پیشگوئیاں کی تھیں اسی لیے مذہب اسلام سب کا مصدق ہے۔ دسویں رکوع میں بتایا کہ یہ نبی ہی سب انبیاء کا موعود نہیں بلکہ خانہ کعبہ جو اس کا قبلہ ہے وہ دنیا میں خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے۔ گیارھویں رکوع میں بتایا کہ اس خیر و خوبی کے مذہب کو دنیا میں پھیلانے کے لیے مسلمان کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں حقوق کی نگہداشت کریں، وحدت اسلامی کو قائم کریں۔ دعوت الی الاسلام کے کام کو ترک نہ کریں۔ بارھویں رکوع میں بتایا کہ دشمنان اسلام سے کیسے تعلقات ہوں۔ تیرھویں رکوع میں جنگ اُحد کی ابتداء اور نصرت الٰہی کے وعدہ کا ذکر کیا۔ چودھویں میں کامیابی کے موٹے موٹے اصول بتائے پندرھویں میں بتایا کہ کوئی بھی مصیبت پیش آجائے مسلمان اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف نہیں جا سکتا۔ سولھویں میں تکلیف و غم و ہم کا ذکر کرتے ہوئے جو مسلمانوں کو پہنچا بتایا کہ اس کی وجہ نافرمانی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ سترھویں میں بتایا کہ اس جنگ نے مومنوں اور منافقوں میں تمیز کر دی اور آنحضرت ؐ کے اخلاق فاضلہ کا ذکر کیا کہ کس وسعتِ قلبی سے آپ نے کام لیا۔ اٹھارھویں میں بتایا کہ سچے مومن دشمن کی طاقت یا اس کی کثرت سے گھبراتے نہیں۔ انیسویں میں اہل کتاب کے بیہودہ اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ دُکھ پہنچتا ہی رہے گا اور اس پر صبر کی تلقین کی آخری رکوع میں پھر دعا سکھا کر کامیابی کا وعدہ دیا اور فرمایا کہ کامیاب اسی صورت میں ہو سکتے ہو کہ دشمن کے مقابلہ پر پورے تیار رہو۔

اس سورت کا تعلق سورۂ بقرہ سے اس قدر شدید ہے کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث کے مطابق ان دونوں کو الزھراوان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ جو زھرا کا تثنیہ ہے یعنی روشن و سفید دونوں میں توحید الٰہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات ہے پہلی پیشگوئیوں سے بھی اور دوسرے ذرائع سے بھی پس حدیث نے ان دونوں سورتوں کو بلحاظ ان کے شدید تعلق کے ایک کے حکم میں رکھا ہے یہ تعلق مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ جو باتیں سورہ بقرہ میں اشارہ کے رنگ میں بیان کی گئی ہیں ان کو یہاں واضح کر دیا ہے اور جو وہاں واضح کر دی گئی ہیں ان کا ذکر یہاں اشارہ اور کنایہ کے رنگ میں ہے۔ سورہ بقرہ میں زیادہ تر خطاب یہودیوں سے اور تھوڑا سا عیسائیوں سے ہے یہاں زیادہ عیسائیوں سے اور تھوڑا یہودیوں سے۔ سورہ بقرہ کو حضرت آدم کے ذکر سے شروع کیا جو پہلے نبی ہیں تو اس سورت کو حضرت عیسیٰ کے ذکر سے شروع کیا جو قومی نبیوں میں سے سب سے پیچھے آئے۔ وہاں توحید کا ذکر بت پرستی کے مقابلہ میں ہے تو یہاں عیسیٰ پرستی کے مقابلہ میں۔ وہاں نظائر قدرت سے توحید پر دلائل دیئے تو یہاں فطرت اور مذاہب کی متفقہ شہادت سے۔ وہاں خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا ذکر ہے تو یہاں اس کے اوّل بیت ہونے کا۔ وہاں جنگ کی ضرورت اصولی رنگ میں بیان کی تو یہاں ایک جنگ کے واقعات کا مفصل ذکر کیا۔ اس تفصیل کو جتنا چاہو بڑھا لو اور دونوں سورتوں کی ابتدا میں اور انتہا میں بھی تعلق ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتدا میں اگر اصول فلاح بتائے تو آل عمران کا خاتمہ بھی تفلحون پر کیا۔ گویا دونوں کا ایک ہی مضمون تھا اور دوسری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾
میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔

اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ﴿۲﴾
اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہمیشہ زندہ خود قائم قائم رکھنے والا ہے۔ [۳۶۸]

نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ۙ﴿۳﴾
اس نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری [۳۶۹] اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے ہے اور توریت اور انجیل کو۔

طرف اگر سورہ بقرہ کا خاتمہ فانصرنا علی القوم الکافرین پر کیا یعنی کافر قوم کے خلاف ہماری نصرت فرما تو آل عمران کی ابتداء میں ہی اس قوم کا ذکر کیا جس کے ساتھ اسلام کا سب سے بڑھ کر مقابلہ ہونا تھا۔ یعنی عیسائی قوم۔

زمانہ نزول | ترتیب نزول کے لحاظ سے اس سورت کا تعلق سورہ بقرہ سے وہی ہے جو ترتیب قرآنی کے لحاظ سے یعنی اس کا اکثر حصہ سورہ بقرہ کے اکثر حصہ کے بعد نازل ہُوا ہے سورہ بقرہ پہلے اور دوسرے سال ہجرت کی نازل شدہ ہے تو یہ تیسرے سال ہجرت کی۔ تیرھویں رکوع سے لیکر قریباً آخر تک اس سورت میں جنگ احد کے واقعات کا ذکر ہے جو ۳ سنہ ہجری میں ہوئی اس لیے یہ حصہ یقیناً ۳ سنہ ہجری کا نازل شدہ ہے۔ ابتدائی حصہ میں بالخصوص عیسائی مذہب کا ذکر ہے اسی میں آیت مباہلہ بھی ہے اور یہ مباہلہ وفد نجران سے تھا جو ۹ سنہ میں آیا مگر سورت کا یہ حصہ ۹ سنہ کا نازل شدہ یقیناً نہیں اور اندرونی شہادت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ مدینہ کا نازل شدہ ہے اور وفد نجران کے مقابلہ پر انہی پہلے کے نازل شدہ امور کو ہی آنحضرت صلعم نے پیش کیا۔ علاوہ ازیں اس حصہ میں جو اصول مقابلہ مذاہب قائم کیا ہے تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم یہ آیت ان خطوط میں موجود ہے جو ۶ سنہ ہجری کے آخر میں آپ نے قیصر وغیرہ کو لکھے۔ پس یہ حصہ یقیناً ۶ سنہ سے پہلے کا نازل شدہ ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ ۳ سنہ کا ہی ہے۔ ہاں ممکن ہے کہ صرف آیت مباہلہ کا نزول وفد نجران کے آنے پر ہُوا ہو۔

۳۶۸۔ اس آیت کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو آیۃ الکرسی کے صدر کے الفاظ ہیں جن کے لیے دیکھو ۳۲۹ و ۳۲۹ ج۔

چونکہ اس سورت کے ابتدائی حصہ میں عیسائیت کی تردید ہے اس لیے اس کی ابتداء میں ان صفات الٰہی کا ذکر کیا ہے جو عیسائی مذہب کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ اوّل توحید کا ذکر فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ حی اور قیوم ہے۔ ابن جریر نے ربیع سے ایک روایت بیان کی ہے جس کے رو سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صفات سے اور اگلی آیات کی مندرجہ صفات سے مسیح کی خدائی کے خلاف استدلال کیا ہے۔ میں اس روایت کا لفظی ترجمہ بیان دیتا ہوں۔ آنحضرت صلعم کی وفد نجران سے گفتگو: نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسیٰ بن مریم کے متعلق آپ سے بحث کی اور آپ کو کہا کہ اس کا باپ کون ہے اور اللہ پر جھوٹ اور بہتان کہا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے نہ اپنی جورو بنائی اور نہ بیٹا۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کہا کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں ہوتا مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہمیشہ زندہ ہے، کبھی نہیں مرے گا اور عیسیٰ پر فنا آئی۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کو قائم رکھنے والا۔ اس کی نگہبانی کرتا اور حفاظت کرتا ہے اور اس کو رزق دیتا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ عیسیٰ ان میں سے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ پر آسمان وزمین کی کوئی چیز مخفی نہیں؟ (آیت ۴) انہوں نے کہا ہاں۔ فرمایا کیا عیسیٰ کوئی بات جانتا ہے سوائے اس کے جس کا علم اسے دیا گیا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا ہمارے رب نے عیسیٰ کی صورت جس طرح چاہا رحم میں بنائی (آیت ۵) اور آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب کھانا نہیں کھاتا اور نہ پانی پیتا ہے اور نہ قضائے حاجت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورت حمل میں لیا کرتی ہے۔ پھر اس کو جنا جس طرح عورت اپنا بچہ جنا کرتی ہے پھر اس کو غذا دی گئی جس طرح بچوں کو غذا دی جاتی ہے۔ پھر وہ کھانا کھاتا تھا اور پانی پیتا تھا اور پاخانہ کرتا تھا۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا پھر جو تم دعوےٰ کرتے ہو وہ کیسے ہو سکتا ہے۔

اس گفتگو سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جن خاص صفات الٰہی کا ذکر بیان کیا ہے۔ ان کی خاص غرض حضرت عیسیٰ کی الوہیت کی نفی ہے۔ روایت میں جہاں حضرت عیسیٰ پر فنا آنے کا ذکر ہے وہاں اصل الفاظ ہیں ان عیسیٰ یاتی علیہ الفناء یعنی عیسیٰ پر فنا آتی ہے یا آئے گی مگر مضارع کبھی ماضی کے معنی میں بھی آجاتا ہے اور ممکن ہے کہ الفاظ روایت میں ہی کمی بیشی ہو گئی ہو کیونکہ عیسائیوں کا عقیدہ یہ کبھی نہیں ہوا کہ عیسیٰ پر فنا اب تک نہیں آئی اور آئندہ آئے گی۔ بلکہ ان کا کھلا عقیدہ یہی ہے کہ عیسیٰ پر فنا آئی مگر آئندہ نہیں آئے گی۔ اس لیے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے کہ عیسیٰ پر فنا آئے گی تو اس کا جواب ان کی طرف سے ہاں کبھی نہ ہوتا وہ ہرگز اس بات کے قائل نہیں کہ عیسیٰ پر آئندہ کوئی فنا آئیگی۔ اس لیے یقیناً آپ نے الفاظ ایسے فرمائے ہونگے جن کا ترجمہ یہ ہو کہ عیسیٰ پر فنا آئی اس کا جواب عیسائی بلاشبہ اثبات میں دیں گے کیونکہ وہ مانتے ہیں کہ عیسیٰ پر موت آئی مگر پھر وہ موت پر فتح پا گیا اور ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا۔

۳۶۹۔ حق کے اصل معنی ۶۵ میں بیان ہو چکے ہیں۔ کسی چیز کو جو وجود میں آئے مقتضائے حکمت کے مطابق ہونے کی وجہ سے حق کہا جاتا ہے اور انہی معنوں میں یہاں قرآن کو بالحق نازل کرنے کا ذکر فرمایا ہے یعنی وہ مقتضائے حکمت کے مطابق نازل ہوا ہے۔ پہلی وحی کے ہوتے ہوئے نزول قرآن کی ضرورت: یہ اس بات کا جواب

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۵ لوگوں کو راہ دکھانے کے لیے پہلے سے نازل کیا[ع۳۷۰] اور حق و باطل میں فیصلہ

ہے کہ جب پہلے بھی کوئی وحی نازل ہوتی رہی تھی تو قرآن کے نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور عموماً عیسائیوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ توریت انجیل کے ہوتے ہوئے قرآن شریف کی کیا ضرورت تھی۔ اس سورت میں آگے زیادہ تفصیل کے ساتھ بھی اس کا جواب آئے گا۔ مگر یہاں بھی اس کی ایک وجہ بتا دی ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں جو رسول اللہ صلعم کے متعلق پیشگوئیاں تھیں ان کی تصدیق کے لیے ضروری تھا کہ یہ کتاب نازل ہوتی گویا سالقہ وحی الٰہی بغیر نزول قرآن خود سچی نہ ٹھہرتی تھی۔ چنانچہ اس کو کھول کر آیت ۸۲ میں بیان فرمایا ہے۔ جہاں تصدیق کا صاف منشاء بتایا ہے واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم۔ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے ذریعہ سے یہ عہد لیا تھا کہ جو کچھ تم کو کتاب و حکمت سے دیا جاتا ہے پھر تمہارے پاس ایک رسول تمہاری وحیوں کی تصدیق کرتا ہوا آئے تو اس پر ایمان لانا ہوگا۔ پس ان کی پیشگوئیوں کا پورا کرنا بھی درحقیقت ان کی تصدیق ہے۔ قرآن کریم کے نزول کی دوسری ضرورتوں کو بھی اس سورت میں آگے چل کر بیان فرمایا ہے۔

ع۳۷۰ التوراۃ اصل لفظ کے عبرانی ہونے میں شبہ نہیں مگر عربی اور عبرانی زبانیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ یہ لفظ بھی ان دونوں زبانوں میں ملتا جلتا ہے۔ اہل عرب کے نزدیک توریت وری سے ہے اور کوفیوں کے نزدیک اصل میں تَفْعَلَة وزن پر ہے اور بصریوں کے نزدیک فَوْعَلٌ وزن پر۔ جس کا اصل وَوْرَاۃٌ تھا اور و۔ ت سے بدل گئی (رغ) اور وری کے معنی وری الزند سے آگ نکالنا ہیں۔ جس سے قرآن شریف میں بھی آتا ہے النار التی تورون ..... (الواقعۃ[۵۶]۔۷۱) اور وَارَیْتُ کے معنی سَتَرْتُ ہیں یعنی ایک چیز کو چھپا دیا جس سے ہے لباساً یواری سواٰتکم (الاعراف[۷]۔۲۶) حتّٰی توارت بالحجاب ..... (صٓ[۳۸]۔۳۲) پس توریت کو توریت یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر سے آگ نکالنے کی مثال ہے۔ یعنی بڑی مشقت سے اس سے کچھ روشنی پیدا ہوتی ہے۔ جیسا ابتدائے تاریخ عالم میں پتھر سے آگ نکالی جاتی تھی۔ جس کے بالمقابل قرآن کریم کو ایسا نور بیان فرمایا ہے یکاد زیتھا یضیٓءُ ولولم تمسسہ نار (النور[۲۴]۔۳۵) اس کا تیل خود بخود جل اٹھتا ہے، گو اسے آگ نہ چھوئے اور یا اس لیے کہ اس میں بعض مضامین مستتر یعنی مخفی حالت میں ہیں۔ جیسا جزاء و سزا کا مسئلہ۔ ان مسائل پر پوری روشنی قرآن کریم نے ہی ڈالی ہے۔

توریت اس مجموعہ کتب کا نام ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوا قرآن کریم نے ایک جگہ اس کے حضرت موسیٰ اور ہارون دونوں کو دیئے جانے کا ذکر فرمایا ہے و اٰتینٰھما الکتاب المستبین (والصّٰفّٰت[۳۷]۔۱۱۷) یہ جیسا کہ اب موجود ہیں کل پانچ کتابیں ہیں جو بائبل کی ابتدا میں ہیں اور ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔ پیدائش یا تکوین۔ خروج۔ احبار۔ اعداد یا گنتی۔ استثناء۔ پرانے عبرانی نسخوں میں پانچ کتابوں کی تقسیم بیّن نہیں ہے بلکہ پیدائش سے لیکر استثناء تک ایک ہی مجموعہ ہے جس کو کئی چھوٹے اور بڑے بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

الانجیل۔ سریانی میں بھی اس سے ملتا جلتا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی خوشخبری ہیں۔ اہل عرب نے انجیل کا مادہ نجل لیا ہے اور نجل کے معنی نسل اور ولد بھی ہیں اور اِسْتَنْجَلَ الْاَمْرُ کے معنی ہیں اِسْتَبَانَ واضح ہوگیا اور نَجَلْتُ الْاَرْضَ کے معنی ہیں زراعت کے لیے اسے پھاڑا (ل) انجیل کی جمع اناجیل ہے اور حدیث میں صحابہ کی صفت میں آتا ہے صدورھم اناجیلھم (ل) ان کے سینے ان کی انجیلیں ہیں اور یہ انجیل بمعنی بشارت سے ہی ماخوذ معلوم ہوتا ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سینے بشارتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یا یہ کہ جو عظیم الشان بشارت انجیل لائی تھی وہ اب صحابہ کے سینوں میں ہے کیونکہ وہ بشارت محمد رسول اللہ صلعم کے ظہور کی تھی۔

انجیل قرآن کریم کے نزدیک وہ کتاب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور جس شکل و صورت میں وہ عیسائیوں کے پاس تھی اس کو انجیل ہی کہا گیا ہے گو وہ چار کتابیں جو عیسائیوں کی اصطلاح میں اناجیل کے نام سے موسوم ہیں ان میں سے کوئی بھی حضرت عیسیٰ پر نازل شدہ انجیل نہیں بلکہ وہ چار الگ الگ اشخاص کی تصنیف ہیں ایک متی کی۔ ایک مرقس کی۔ ایک لوقا کی۔ ایک یوحنا کی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بائبل صرف توریت و اناجیل کے مجموعہ کا نام نہیں۔ یہودیوں کے نزدیک تو بائبل اس مجموعہ کا نام ہے جس کے شروع میں حضرت موسیٰ کی پانچ کتابیں ہیں۔ اور ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں انبیاء کی وہ اس میں شامل کرتے ہیں۔ ایوب۔ یونس۔ حزقیل۔ دانیال وغیرہم کی کتب کے علاوہ حضرت داؤد کی زبور بھی اسی مجموعہ میں شامل ہے۔ اور بعض کتب کی شمولیت کے متعلق اختلاف بھی چلا آیا ہے۔ یعنی عام مروج نسخہ میں ۳۵ کتابیں شامل نہیں جو سیپٹو ایجنٹ نسخہ میں ہیں اور عیسائی اس مجموعہ کا نام تو پرانا عہدنامہ رکھتے ہیں اور ہر چہار اناجیل اور اعمال حوارین اور پولوس اور دیگر رسولوں کے خطوط اور مکاشفات یوحنا کے مجموعہ کو نئے عہدنامہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور پھر پرانے اور نئے عہدنامہ کل کو بائبل کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس الہامی کتاب کی بھی عجیب کیفیت ہے کہ کتابوں کی کتابیں بعض نسخوں میں شامل ہیں اور بعض سے خارج کر دی گئی ہیں۔

اناجیل کے مصنف: اناجیل کے متعلق جیسا کہ ذکر ہوا۔ عیسائیوں کے ہاتھ میں نہ صرف مسیح ہی کی کوئی انجیل نہیں بلکہ وہ چار اناجیل جو انکے پاس ہیں وہ بھی ان لوگوں کی لکھی ہوئی ثابت نہیں ہوتیں جن کے ناموں پر وہ مشہور ہیں بلکہ ان کے لکھنے والے کوئی اور لوگ ہیں متی کی انجیل کی تصنیف پر بحث کرتا ہوا پادری ڈملو اپنی تفسیر میں لکھتا ہے "جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے یہ ظاہر ہے کہ اس انجیل کا براہ راست متی کی تصنیف ہونا غیر اغلب ہے"۔ (صفحہ ۶۲۰) اور آگے چل کر دکھایا ہے کہ متی نے کوئی کلمات وغیرہ مسیح کے جمع کیے ہونگے جس کو اس مصنف نے استعمال کیا ہے اور اس کی تصنیف کا زمانہ جو خود پادری صاحبان بتاتے ہیں ۷۰ء ہے۔ مگر

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٤﴾

انارا[۳۷۱]۔ وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب سزا دینے والا ہے[۳۷۲]

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿٥﴾

یقیناً اللہ تعالیٰ پر نہ زمین میں کوئی چیز چھپی ہے اور نہ آسمان میں[۳۷۳]

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦﴾

وہی ہے جو تمھاری تصویریں رحموں میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، غالب حکمت والا ہے[۳۷۴]۔

واقعات سے ۱۵۰ء عیسوی سے پیشتر مروجہ اناجیل اربعہ میں سے کسی انجیل کا کتاب کی صورت میں موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لوقا اور مرقس کی اناجیل کو عموماً ان مصنفوں کا سمجھا گیا ہے مگر نئی تحقیقات کی رو سے ان اناجیل کے ان کے مصنف ہونے پر شبہ کیا گیا ہے اور یہی حال یوحنا کی انجیل کا ہے جو پہلی صدی کے آخر کی لکھی ہوئی سمجھی جاتی ہے۔

محرّف کتابوں کا نام بھی توریت و انجیل ہی ہے: پس توریت و انجیل کا لفظ اپنی حقیقت کی رو سے تو انہی اصل کتابوں پر بولا جاسکتا ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہما السلام پر نازل ہوئی تھیں۔ مگر موجودہ محرف کتابیں جن میں ان کا کچھ بقیہ ہے ان کو بھی اسی نام سے موسوم کیا جائے گا اور یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ یہ کتابیں بھی ہم نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ اب بھی ان میں ہدایت کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ اور سب سے بڑی ہدایت ان میں یہی موجود ہے کہ دونوں کتابیں نبی کریم صلعم کی آمد کی پیشگوئی کرتی ہیں اور انجیل تو صاف طور پر کہتی ہے کہ کامل ہدایت کی راہیں سکھانے والا میرے (یعنی مسیح کے) بعد آنیوالا ہے۔

ع[۳۷۱] فرقان کے اصل معنی تو جیسا ع[۶] میں دکھایا جا چکا ہے حق و باطل میں فرق کرنے والا ہیں۔ اور قرآن کریم کا بھی یہ ایک نام ہے۔ قتادہ سے روایت ہے کہ یہاں فرقان سے مراد قرآن کریم ہے (ث) اور گو پہلے قرآن کریم کے نزول کا ذکر فرما چکا ہے مگر دوبارہ دوسرے لفظ کو لا کر بیان کرنے سے خاص مقصود ہے۔ وہاں فرمایا تھا کہ یہ کتاب مقتضائے حکمت کے مطابق نازل ہوئی ہے یعنی ضرورت حقہ کو پورا کرنے والی ہے تو ایک دلیل اس کی تو وہاں دی تھی کہ یہ مصدق ہے دوسری دلیل لفظ فرقان میں دی ہے۔ توریت و انجیل کے نزول کا ذکر کرکے ان کی تحریف کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جس کو بتفصیل سورہ بقرہ میں بیان کر دیا تھا۔ تو اس لیے جب تحریف ہوگئی تو حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کوئی کتاب نہ رہی پس اللہ تعالیٰ نے فرقان حمید کو نازل کیا کہ یہ حق و باطل میں فرق کرے۔

ع[۳۷۲] انتقام۔ نقم سے ہے نَقِمْتُ الشَّيْءَ وَنَقَمْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ناپسند کیا۔ زبان سے ہو یا سزا دیکر۔ اس لیے نقمة کے معنی عقوبت ہیں (غ) اِنْتَقَمَ اللّٰهُ مِنْهُ کے معنی ہیں عَاقَبَهُ یعنی اسے سزا دی (ل) اسی معنی سے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں منتقم یا ذو انتقام ہے یعنی سزا پہنچانے والا (ل)

ع[۳۷۳] حضرت مسیح کے اعتراف لاعلمی کی اناجیل سے مثال: یہاں اللہ تعالیٰ کی وسعت علم کو موکد الفاظ میں بیان فرمایا ہے اور غرض جیسا کہ نوٹ ع[۳۶۸] سے ظاہر ہے حضرت مسیح کے صفات باری سے عاری ہونے کا ذکر ہے۔ قرآن کریم ہمیشہ ایسے لطیف طریق پر بات کو بیان کرتا ہے کہ کسی دوسرے کو ناگوار نہ گزرے اور پھر ایک لفظ میں بہت سا مضمون بیان کر دیتا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ بیان فرماتا کہ مسیح کو کوئی علم نہ تھا مگر جس قدر ایسے برگزیدہ انسانوں کو ہوتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلعم نے اس آیت سے استدلال کرکے بیان فرمایا۔ اور اناجیل سے ان مثالوں کو پیش کرتا کہ کس طرح حضرت مسیح کا علم انسانی علم تک محدود تھا یوں فرمایا کہ وہ اللہ ہی ہے جس پر آسمان و زمین کی کوئی چیز مخفی نہیں گویا یہ بتا دیا کہ مسیح پر بہتیری چیزیں مخفی تھیں۔ چنانچہ اس کی شہادت خود اناجیل سے ملتی ہے۔ مثلاً انجیر کے درخت کا واقعہ، "دوسرے دن جب وہ بیت عنیاہ سے نکلے اس کو بھوک لگی اور دُور سے انجیر کا ایک درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر گیا کہ شاید اس میں کچھ پائے مگر جب اس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا" (مرقس ۱۱: ۱۲ و ۱۳) اس واقعہ میں یہ الفاظ "کہ شاید اس میں کچھ پائے" اور "انجیر کا موسم نہ تھا" قابل غور ہیں جو بتاتے ہیں کہ حضرت مسیح کو باوجود انجیر کا موسم نہ ہونے کے یہ خیال تھا کہ شاید وہاں کچھ انجیریں مل جائیں کس قدر علم کی عاجزی کا اظہار ہے۔ یہ تو عملی اعتراف عجز ہے دوسری جگہ لفظوں میں بھی اپنے علم کے ناقص ہونے کا اظہار کیا ہے: "لیکن اس دن اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا۔ مگر صرف باپ (متی ۲۴: ۳۶)

ع[۳۷۴] یصور۔ تصویر صورت بنانے کا نام ہے۔ اور صورة وہ ہے جس سے کسی چیز کے عین کا نقش ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسری اشیاء سے الگ ہوتی ہے۔ پھر یہ دو طرح پر ہے ایک محسوس جسے خاص و عام بلکہ حیوان بھی پہچان سکتے ہیں اور دوسرے معقول جسے صرف خواص ہی پہچان سکتے ہیں۔ جیسے وہ صورت جس سے انسان مخصوص ہے یعنی عقل اور رویّہ۔ اور وہ معانی جن سے ایک شے دوسری سے مخصوص ہوتی ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان کی صورت بنانے کا ذکر ہوتا ہے وہاں یہ دونوں صورتیں مراد ہوتی ہیں (غ) جیسے خلقنٰکم ثم صوّرناکم (الاعراف ۷: ۱۱) وصوّرکم فاحسن صورکم (المؤمن ۴۰: ۶۴) فی ای صورة ماشاء رکّبک (الانفطار ۸۲: ۸) اور یہاں بھی۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ تو امام راغب کہتے ہیں اس سے وہ صورت مراد ہے جس سے انسان مخصوص ہے یعنی وہ ہیئت جس کا ادراک آنکھ سے اور عقل سے ہوتا ہے جس سے انسان کو دوسری مخلوق پر فضیلت ہے اور صورتہ کی ضمیر

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡہُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ ہُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِہٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ

وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری اس میں سے (کچھ) محکم آیتیں ہیں جو کتاب کی اصل ہیں اور کچھ اور متشابہ ہیں ع۳۷۵۔ پھر جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اُس کے

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تشبیہ کے لیے نہیں یا اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بھی کوئی صورت ہے بلکہ علی سبیل الملك ہے یعنی اس کی ملک ہونے کے لحاظ سے اور علی سبیل التشریف لہ یعنی اس کی عزت کے لحاظ سے جیسے بیت اللہ۔ ناقۃ اللہ وغیرہ میں روحی میں ضمیر: اور ایسا ہی نفخت فیہ من روحی یا روح منہ میں بھی ملکیت اور عزت کے لحاظ سے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے۔

حضرت مسیح کا معمولی بچوں کی طرح حمل میں لیا جانا اور پیدا ہونا: اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر کہ وہ انسان کی صورت رحم میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے اس کی کمال قدرت کے اظہار کے لیے ہے کہ کس طرح تاریکیوں پر تاریکی میں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا فی ظلمٰت ثلٰث (الزمر ۳۹-۶) انسان کی نہ صرف جسمانی بلکہ اس کی اخلاقی اور روحانی تصویر بناتا ہے۔ یہ بھی الوہیت مسیح کے بطلان کی دلیل کے طور پر ہے جیسا کہ روایت منقولہ بالا سے ثابت ہے۔ یعنی یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جو حالات انسانوں پر گزرتے ہیں وہ حضرت عیسیٰ پر بھی گزرے، اور رحم میں اس پر وہ سب حالتیں یکے بعد دیگرے آئیں جیسا کہ عام انسانوں پر آتی ہیں۔ اور ابن جریر میں حضرت ابن مسعود اور ابن عباس اور دیگر صحابہ سے اس روایت کا اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ پہلے نطفہ ہوتا ہے پھر چالیس دن کے بعد علقہ کی صورت اختیار کرتا ہے الخ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح پر نطفہ سے لیکر وہ تمام حالات انسانی آئے ہیں جو دوسرے انسانوں پر آتے ہیں کوئی خصوصیت بربنائے پیدائش ان کے حالات میں نہیں۔ اسی کی طرف دوسری جگہ اشارہ ہے جہاں فرمایا فحملتہ پھر مریم نے ان کو حمل میں لیا (مریم ۱۹-۲۲) اور ع۳۶۸ میں جس روایت کا ترجمہ دیا گیا ہے اس میں نبی کریم صلعم کے یہ الفاظ ہیں ان عیسیٰ حملتہ امرأۃ کما تحمل المرأۃ ثم وضعتہ کما تضع المرأۃ یعنی عیسیٰ کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورتوں کو حمل ہوتا ہے اور اس کو جنا جس طرح عورتیں جنتی ہیں۔ تعجب ہے کہ ایسی صراحت کے ہوتے ہوئے مفسرین نے بعض عجیب قصے بنالیے ہیں اور بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ایک ہی گھڑی کے لیے حضرت مریم صدیقہ کو حمل ہوا تھا اور فوراً حضرت مسیح پیدا بھی ہو گئے۔

ع۳۷۵ محکمٰت۔ مُحْکَمٌ کی جمع ہے اور محکم وہ ہے جس میں لفظ اور معنی کی حیثیت سے کوئی شبہ وارد نہ ہو (غ) حَکَمْتُ۔ اَحْکَمْتُ۔ حَکَمْتُ کے اصل معنی مَنَعْتُ ہیں یعنی روک دیا (ل) پس فساد یا خلل کو روکنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس طرح حاکم کو حاکم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو ظلم سے روکتا ہے اور یہ وجہ بھی مُحکَم کی دی گئی ہے کیونکہ اس کا بیان خود اپنے آپ میں مضبوط ہوتا ہے اور دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا (ل) روح المعانی میں ہے۔ واضحۃ المعنی ظاھرۃ الدلالۃ محکمۃ العبارۃ۔

اُمّ۔ ماں کو کہتے ہیں اور ہر اُس چیز کو بھی اُمّ کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے وجود یا اس کی تربیت یا اس کی اصلاح یا اس کی ابتدا کے لیے بطور اصل ہو (غ) پس اُمّ درحقیقت وہ اصل ہے جس سے ایک چیز پیدا ہوتی ہے یا جس پر دوسری چیزیں متفرع ہوتی ہیں پس امّ الکتاب سے مراد اصول ہیں۔ جبیر سے مروی ہے۔ ھن ام الکتاب لانھن مکتوبات فی جمیع الکتب (ث) وہ امّ کتاب اس لیے ہیں کہ سب آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں یعنی اصول دین ہیں۔

اُخَرُ۔ اُخریٰ کی جمع ہے جو اٰخر کی تانیث ہے اور محذوف یعنی آیات کی صفت ہے۔ اصل اس کا تاخیر یعنی پیچھے رہنے کے لیے ہے مگر محض ایک چیز کے غیر پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

متشٰبھٰت۔ متشابہ شبہ سے ہے اور کسی چیز کا شِبہ وہ ہے جو بلحاظ کیفیت اس کی مثل ہو (غ)، اور قرآن میں متشابہ اسے کہا جاتا ہے جس کی تفسیر بوجہ اس کی غیر کے ساتھ مشابہت کے مشکل ہو۔ خواہ مشابہت لفظ کی حیثیت سے ہو یا معنی کی حیثیت سے (غ)

محکم اور متشابہ آیات پر راغب کی بحث: مفسرین میں اس بات کے متعلق کہ محکمات کون آیات ہیں اور متشابہات کون۔ مختلف آرائیں ہیں۔ امام راغب نے مفردات میں اس پر بڑی لمبی اور جامع بحث کی ہے۔ اوّل وہ کل آیات کی تقسیم تین طرح پر کرتے ہیں۔ محکم مطلق اور متشابہ مطلق اور ایک وجہ سے محکم اور ایک وجہ سے متشابہ۔ پھر متشابہ تین قسم ہے۔ لفظ کی حیثیت سے، معنی کی حیثیت سے اور لفظ اور معنی دونوں کی حیثیت سے۔ پھر لفظ کی حیثیت سے جو تشابہ ہے وہ دو قسم ہے ایک الفاظ مفرد میں، دوسرا کلام مرکب میں۔ الفاظ مفردہ میں تشابہ یا تو بوجہ غرابت لفظ کے ہوتا ہے جیسے اَبّ۔ یَزِفُّوْن اور یا اشتراک لفظی کی وجہ سے جیسے یدٌ۔ عینٌ وغیرہ کے استعمال میں اور کلام مرکب میں اختصار سے تشابہ واقع ہوتا ہے جس کی مثال دی ہے وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء اور یا بسط سے جیسے لیس کمثلہ شیءٌ اور معنی کے لحاظ سے متشابہ میں اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور یوم القیامۃ کے اوصاف داخل ہیں جسکی وجہ یہ دیتے ہیں کہ یہ صفات ہمارے تصور میں نہیں آسکتیں کیونکہ ہمارے ذہن میں وہی چیز آسکتی ہے جسکو ہم محسوس کرتے ہیں یا اس جنس کی چیز ہو جس جنس کی چیزوں کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ پس جنت دوزخ حساب کتاب وغیرہ کے متعلق جس قدر امور ہیں وہ متشابہات میں داخل ہیں اور جن میں تشابہ بحیثیت لفظ بھی ہو اور معنی بھی اس کو پانچ قسم بیان کیا ہے جن میں سے میں صرف یہاں اول دو قسم کو لیتا ہوں۔ کمیّت کے لحاظ سے جیسے عموم و خصوص جس کی مثال ہے فاقتلوا المشرکین (التوبۃ-۵) جہاں لفظ عام ہے مگر مراد خاص مشرک ہیں۔ وجوب و ندب کے لحاظ سے جیسے فانکحوا ما طاب لکم اور آخر پر لکھا ہے کہ

فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ
وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا
اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا
بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ

پیچھے پڑ جاتے ہیں جو اس میں سے متشابہ ہے فتنہ پیدا کرنے کے لیے، اور یہ چاہتے ہوئے کہ اس کی (من مانی) تاویل کریں اور اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ان کے جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے

مفسرین نے جو جو تشریحات محکم و متشابہ کی کی ہیں وہ سب اس تقسیم کے اندر داخل ہیں۔

ایک اور رنگ میں متشابہ کو تین قسم کیا ہے ایک وہ جس کی حقیقت پر انسان واقفیت حاصل نہیں کر سکتا جیسے امور متعلق قیامت وغیرہ ایک وہ جن پر واقفیت حاصل کر سکتا ہے جیسے الفاظ غریبہ اور مشکل احکام اور ایک ان دونوں کے درمیان جن سے راسخ فی العلم واقفیت حاصل کر سکتے ہیں مگر ہر شخص نہیں۔

۳۷۶ زیغ۔ استقامت سے ایک طرف جھک جانا زَیغ ہے فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم (الصف ۶۱-۵) مازاغ البصر وما طغی (النجم ۵۳-۱۷)

ابتغاء۔ بَغیٌ سے ہے جس کے معنی ہیں میانہ روی سے بڑھنے کو چاہنا اور بَغَیتُ الشئَ اور ابتغیتہٗ کے معنی ہیں قدر واجب سے بڑھ کر کسی چیز کو طلب کیا یا چاہا (غ) فتنہ کے متعلق اس کا استعمال خاص طور پر ہوا ہے لقد ابتغوا الفتنۃ من قبل (التوبۃ ۹-۴۸) یبغونکم الفتنۃ (التوبۃ ۹-۴۷)

الفتنۃ۔ فتنۃ کے اصل معنی ۲۴۳ میں بیان ہو چکے ہیں۔ مگر یہاں وہ معنی مراد نہیں اور اس لفظ کے کئی اور معنی بھی آتے ہیں منجملہ ان کے حق سے پھیر دینا بھی اس کے معنی آتے ہیں۔ چنانچہ فَتَنَ الرجُلَ کے معنی ہیں ازالہ عما کان علیہ (ل) یعنی جس حالت پر وہ تھا اس سے اس کو ہٹا دیا۔ اور اسی لحاظ سے وان کادوا لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک (بنی اسرائیل ۱۷-۷۳) میں یفتنونک کے معنی لکھے ہیں یمیلونک ویزیلونک یعنی تجھے مائل کر دیں اور ہٹا دیں۔ اور پھر لکھا ہے کہ لفظ فتنہ کے معنی کلام عرب میں حق سے ایک طرف جھکا دینا ہیں اور فتنہ کے معنی اضلال بھی آتے ہیں (ل) اور اس حدیث میں کہ انی اری الفتن خلال بیوتکم (میں فتنوں کو تمہارے گھروں کے اندر دیکھتا ہوں) فتنۃ سے مراد وہ اختلاف ہے جو مسلمانوں کے فرقوں میں ہو گا (ل) اور ان تینوں معنوں میں سے یعنی حق سے پھیرنا۔ گمراہ کرنا۔ اختلاف کوئی سے معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں پس ابتغاء الفتنۃ کے معنی ہوئے حق سے پھیرنے کو چاہتے ہوئے۔ یا گمراہی چاہتے ہوئے یا اختلاف چاہتے ہوئے۔ گویا متشابہات کی پیروی سے ان کی غرض حق کی بجائے غلطی کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یا لوگوں کو دین حق سے گمراہ کرنا یا اختلاف ڈالنا حضرت مجاہدؓ سے یہاں فتنہ کے معنی شبہات مروی ہیں (ج) یعنی لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنے کے لیے جیسا کہ اکثر مفسرین نے اسے کھول کر لکھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں شکوک اور شبہات پیدا کر کے دین سے پھیر دیں۔

تاویل۔ اَوْل سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا اصل کی طرف رجوع کرنا اور تاویل کے معنی ہیں رَدُّ الشئِ الی الغایۃِ المرادۃِ منہ علمًا کان او فعلًا (غ) ایک شے کا اس غایت کی طرف لوٹانا جس کا اس سے ارادہ کیا گیا ہو علمی طور پر ہو یا فعلی طور پر یہاں تاویل بلحاظ علم مراد ہے۔ اور ھل ینظرون الا تاویلہ یوم یاتی تاویلہٗ (الاعراف ۷-۵۳) میں اور ذالک خیر واحسن تاویلا (بنی اسرائیل ۱۷-۳۵) میں تاویل فعلی یعنی مآل یا انجام مراد ہے۔

اپنی خواہش کے مطابق تاویل: ابتغاء تاویلہ۔ تاویل کی ضمیر کہا گیا ہے کہ عہد کے لیے ہے۔ یعنی اس سے مراد مخصوص تاویل یا ایسی تاویل ہے جو محکمات کے خلاف ہو اور اپنی خواہش کے مطابق (ر) اس لیے مفسرین نے عموماً ابتغاء تاویلہ کے معنی کیے ہیں طلب تاویل الذی یشتھونہٗ یعنی اس تاویل کو چاہتے ہوئے جو ان کی اپنی خواہش ہوتی ہے اور یا یہ مراد ہے جیسا لفظ ابتغاء کے معنی بھی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اس کی تاویل کی طلب میں حد سے تجاوز کرتے ہیں اور وہ حد سے تجاوز کرنا یہ ہے کہ اسے محکمات کی طرف نہیں پھیرتے۔ متشابہ الفاظ کے معنی میں ابتغاء یہی ہے کہ انسان ایسا ان الفاظ کے پیچھے پڑے کہ دوسرے الفاظ یا اصول کی طرف توجہ نہ کرے اور اکثر متشابہ کی پیروی کرنے والوں کو یہی غلطی لگتی ہے کہ وہ ان الفاظ کے ایسا پیچھے پڑتے ہیں کہ باقی بڑی بڑی اور روشن اور واضح باتوں کی پروا تک نہیں کرتے اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ محض اپنی خواہش کی پیروی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پہلے انسان اپنے دل میں ایک خیال ٹھہا لیتا ہے۔ پھر متشابہ الفاظ کو لیکر اور الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے۔

۳۷۷ راسخون۔ رُسُوخ کے معنی ہیں کسی چیز کا نہایت ہی مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانا اور راسخ فی العلم علم میں متحقق کو کہتے ہیں (غ)

یہاں اللہ اور الراسخون فی العلم دونوں جگہ پر وقف ہے۔ اس لیے والراسخون فی العلم دونوں طرف ملتا ہے یعنی اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور راسخون فی العلم کے اور یہ بتانے کو وہ راسخ فی العلم کس طرح اس تاویل کو جانتے ہیں۔ یہ الفاظ بڑھا دیئے ہیں یقولون اٰمنا بہ کل من عند ربنا یعنی ہم متشابہات اور محکمات دونوں کو خدا کی طرف سے مانتے ہیں۔ گویا ان کا اصول یہ ہے کہ متشابہات کو محکمات پر عرض کرتے ہیں چنانچہ بخاری میں اسی طرح پر ان الفاظ کے معنی کیے ہیں والراسخون یعلمون یقولون اٰمنا بہ۔ یعنی راسخ بھی ان معنوں کو جانتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے اور حضرت ابن عباس سے مجاہد کی وساطت سے یہ قول مروی ہے کہ آپ نے فرمایا انا من الراسخین الذین یعلمون تاویلہٗ میں ان راسخوں میں سے ہوں جو اس کی تاویل کو جانتے

اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷ اور عقل والوں کے سوائے کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا۔ [۳۷۸]

ہیں اور حضرت ابن عباس کے متعلق صحیح حدیث میں آتا ہے اللّٰھم فقّھہ فی الدین وعلّمہ التاویل اے اللہ اس کو دین میں سمجھ دے اور اس کو تاویل سکھا۔ اور محکمات کے معنی تو واضح ہوتے ہیں اس لیے یہ دعا متشابہات کی تاویل کے متعلق ہی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر متشابہات کے معنی راسخین فی العلم کو بھی معلوم نہیں ہو سکتے تو ان کا انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کرنا بے معنی ہے۔ باقی رہیں بعض اشیاء جیسے جنت دنار وغیرہ کی حقیقت تو اس کے معلوم کرنے کی ہمیں بیاں کوئی ضرورت بھی نہیں، ہاں جب اس عالم سے کوچ کر کے دوسرے عالم میں منتقل ہو جائیں گے تو ان کی حقیقت بھی کھل جائے گی۔

ع۳۷۸ اس آیت کریمہ میں قرآن شریف نے محکم اور متشابہ کا ایک اصول بیان فرمایا ہے اس میں عیسائیت کے لطلان کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ عیسائیوں نے محکمات اور متشابہات میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہی غلطی کھائی ہے عیسائی مذہب کی بنیاد صرف متشابہات پر ہے سب سے بڑی دلیل حضرت مسیح کی خدائی کی یہ دیجاتی ہے کہ پیشگوئیوں میں آپ کو خدا کہا گیا تھا اور آپ کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا گیا ہے مگر یہ کس قدر بودی بنیاد ہے۔ پیشگوئی تو خود متشابہات میں سے ہوتی ہے اور پیشگوئیوں کی زبان میں استعارہ اور مجاز کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ چنانچہ خود مسیح کی آمد کے جو نشانات ہیں ان کو ہی دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ کس قدر مجاز اور استعارہ ان کے اندر ہے اور حق تو یہ ہے کہ جن پیشگوئیوں میں خدا کا لفظ آیا ہے وہ حضرت مسیح کے لیے نہیں بلکہ ہمارے نبی صلعم کی آمد کے متعلق ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود حضرت مسیح نے بھی خدا کے آنے کی پیشگوئی کو بیان کیا ہے۔ دیکھو متی ۲۱: ۳۳-۴۰ جہاں انگورستان کے مالک کی تمثیل میں بیٹے کے آنے کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ پھر انگورستان کا مالک خود آئے گا اور آگے آیت ۴۳ میں صفائی سے بتا دیا ہے کہ "خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک اور قوم کو جو اس کے میوہ لا دے دی جائے گی"۔ پس وہ خدا جس کے آنے کی پیشگوئیاں بائبل میں ہیں محمد رسول اللہ صلعم ہیں مگر باوجود ان پیشگوئیوں کے وہ خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے۔

لیکن اس بات کو چھوڑ کر بائبل میں لفظ خدا کا استعمال بطور مجاز نیک لوگوں کے حق میں موجود ہے "میں نے تو کہا کہ تم اللہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو"۔ (زبور ۸۲: ۶) یوحنا ۱۰: ۳۴ میں حضرت مسیح اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "جبکہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا"۔ پس اوّل پیشگوئی خود ایک استعارہ ہے اس لیے اس میں خدا کی آمد کا ذکر ایک استعارہ سے بڑھ کر نہیں۔ پھر وہ پیشگوئیاں بھی مسیح کے لیے نہیں بلکہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں۔ پھر بغیر پیشگوئیوں کے بھی اسی بائبل میں لفظ خدا بطور مجاز نیک لوگوں کے حق میں استعمال ہوا اس لیے اس کے معنی دوسری جگہ بھی یہی مراد ہوں گے۔ پس ایک متشابہ امر کی بنیاد پر تمام محکمات کو رد کرنا یہ عیسائی مذہب کی خطرناک غلطی ہے۔ اور خود حضرت مسیح نے بھی ان کو بتا دیا تھا کہ وہ جو لفظ خدا کا بیٹا اپنے لیے استعمال کرتے ہیں تو اسی مجازی معنی کی رُو سے، جس مفہوم کو مدنظر رکھ کر سارے راستبازوں کو خدا اور خدا کا فرزند قرار دیا گیا ہے چنانچہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی تو حضرت مسیح نے ان سے دریافت کیا کہ میں نے خدا کی طرف سے بہت سے نیک کام کیے ہیں میرے کس نیک کام کے عوض مجھے سنگسار کرتے ہو تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اچھے کام کے لیے ہم تم کو سنگسار نہیں کرتے بلکہ اس لیے کہ تو کفر کہتا ہے اور انسان ہو کے اپنے تئیں خدا بناتا ہے"۔ (یوحنا ۱۰: ۳۳) تو حضرت مسیح نے اس کا جواب یہ دیا "کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو۔ جبکہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا...... تم اسے جسے خدا نے مخصوص کیا اور جہان میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے کہ میں نے کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں" (یوحنا ۱۰: ۳۴-۳۶) اب اس سوال وجواب پر غور کرو اگر حضرت مسیح کا دعویٰ واقعی خدائی کا ہوتا تو جب آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ تم انسان ہو کر اپنے آپ کو خدا کہتے ہو تو اس کا جواب یوں دیتے کہ میں تو خدا ہی ہوں اور تمہاری پیشگوئیوں میں خدا کا آنا لکھا ہے مگر بجائے اس کے آپ یہ جواب دیتے ہیں کہ تمہارے بزرگوں کو بھی خدا کے کلام میں خدا کہا گیا ہے اگر ان کا خدا کہلانا کفر نہیں تو میرا خدا کا بیٹا کہلانا کیوں کفر ہو گیا۔ بالفاظ دیگر جن معنوں میں وہ خدا کہلائے انہی معنوں میں میں خدا کا بیٹا ہوں نہ وہ حقیقت میں خدا تھے نہ میں حقیقت میں خدا کا بیٹا ہوں مگر مجازی طور پر ان کو بھی خدا کہا گیا۔ مجازی طور پر میں بھی خدا کا بیٹا ہوں اس قدر صفائی کے ہوتے ہوئے عیسائیوں نے متشابہات کو لیا اور محکمات کو چھوڑ دیا اس لیے ان کے عقیدہ کے لطلان میں اس مسئلہ کی توضیح کرنی ضروری تھی۔ پس اس بحث کی ابتدا میں اصولی طور پر یہ بیان کر کے کہ خدا کی صفات مسیح میں نہ پائی جاتی تھیں۔ اب بتاتا ہے کہ ان کو ٹھوکر متشابہات سے لگی ہے اور یہ ان کے دلوں کی کجی کا نتیجہ ہے کہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اسی اثناء میں مسلمانوں کو بھی متنبہ فرماتا ہے کہ تم ایسی غلطی میں نہ پڑنا۔

حضرت مرزا صاحب کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرنا متشابہات کی پیروی ہے: مگر افسوس ہے کہ آج بعینہٖ یہی غلطی وہ لوگ کرتے ہیں جو حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں بھی دلیل صرف یہی ہے کہ پیشگوئی میں آنے والے مسیح کے لیے لفظ نبی کا آ گیا ہے۔ حالانکہ اوّل تو پیشگوئی میں استعارہ ہونا ایک مسلّم امر ہے دوسرے خود وہ پیشگوئی جس میں لفظ نبی ہے ساری کی ساری استعارات سے بھری ہوئی ہے بعینہٖ اسی طرح جب مسیح ثانی پر یہ اعتراض ہوا کہ تم نے اپنی تحریروں میں لفظ نبی استعمال کیا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ کیا پہلے کسی بزرگ نے نہیں کہا "او نبی وقت باشد اے مرید" یعنی مرشد نبیٔ وقت کا حکم رکھتا ہے جس میں صاف بتا دیا کہ میری تحریر میں لفظ نبی اصطلاح شرعی میں نہیں بلکہ لغوی معنی میں ہے اور مجازی رنگ میں۔ جس طرح پہلے بزرگوں نے بھی مجازی رنگ میں اسے استعمال کر لیا ہے اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ آخر تک صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ سُمّیتُ نبیًا من اللہ علیٰ طریق المجاز لا علیٰ وجہ الحقیقۃ میرا نام خدا کی طرف سے مجاز کے طور پر نبی رکھا گیا نہ حقیقت کے طور پر۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم نے محکمات اور متشابہات کی تفسیر میں اصول کیا بیان فرمایا ہے کیونکہ یہاں آ کر ایک دوسری دقت پیش آتی ہے کہ ایک ایک لفظ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٨﴾

اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ ہونے دے اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت کی اور اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرما، بیشک تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے۔[٣٧٩]

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿٩﴾ ع

اے ہمارے رب! ضرور تو لوگوں کو اس دن کے لیے اکٹھا کرنے والا ہے جس میں کچھ شک نہیں بیشک اللہ وعدہ کا خلاف نہیں کرتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْــــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ﴿١٠﴾

جنھوں نے انکار کیا، ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) کے سامنے ان کے کسی کام نہ آئے گی اور وہی آگ کا ایندھن ہیں۔[٣٨٠]

کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔ خود غرض لوگ اپنے حسب منشا جس کو چاہتے ہیں متشابہ بنا کر اسے کسی دوسری آیت کے ماتحت کر دیتے ہیں یا اس کی تاویل اپنے حسب منشا کر لیتے ہیں۔ ایک شخص اسی کو محکم کہتا ہے دوسرا اسی کو متشابہ کہتا ہے تو پس اس کا بھی کوئی علاج قرآن کریم نے بتایا ہے یا نہیں؟ اگر الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو ایک ایسی پکی بات بتا دی ہے کہ تمام جھگڑے اُٹھ جاتے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ محکمات کے متعلق فرما دیا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ ھن ام الکتاب وہ کتاب کی اصل یا جڑ ہیں۔ اب اُم یا جڑ اس چیز کو کہتے ہیں جو بطور اصل ہو۔ تو پس قرآن کریم ہمیں یہ ہدایت دیتا ہے کہ محکمات سے مراد اصولی امور ہیں۔ اور طرز تاویل یہ ہوگی کہ فروعات اور مخصوصات کو جو بطور شاخوں یا ولد کے ہیں۔ جڑ اور ام کی طرف لوٹانا پڑے گا یعنی اصول کے ماتحت کرنا پڑے گا۔ کیونکہ حق یہی ہے کہ جب تک مخصوصات اور فروعات کو اصول کے ماتحت نہ لایا جائے اس وقت تک حق بات انسان معلوم نہیں کر سکتا۔ مخصوصات کو اگر اصول اور قانون سے الگ کیا جائے تو اس کا نتیجہ وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمایا ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله ایک مخصوص امر کی تاویل کے پیچھے پڑ کر ایک فتنہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بعض کا مفہوم بعض کے خلاف ہو جاتا ہے پس ضروری ہوا کہ کسی امر مخصوص کے صحیح معنی سمجھنے کے لیے پہلے ایک اصول قائم کیا جائے اور اس اصول کے ماتحت اس کی تاویل کی جائے۔ یہی وہ راہ ہے جو قرآن کریم نے سکھائی ہے اور اس راہ پر چل کر نہ صرف بیرونی تفرقوں کا علاج ہی ہو سکتا ہے بلکہ مسلمانوں کے جس قدر اندرونی اختلافات ہیں ان کا بھی ایک حد تک فیصلہ ہو جاتا ہے اور جو اختلافات باقی رہ جائیں گے وہ اصولی اختلافات نہوں گے کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے تمام امور ضروریہ کی تکمیل کر دی ہے۔ اب فروعات تو اس قدر وسیع دائرہ رکھتی ہیں کہ تا قیامت بھی ان کو ایک دفتر میں اکٹھا نہیں کیا جا سکتا روز نئی نئی فروعات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ پس یہ ماننا پڑے گا کہ سب اصول کو قرآن کریم نے واضح کر کے بیان کر دیا ہے اور فروع میں سے حسب ضرورت کچھ لے لیا ہے اس لیے بھی فروع کو اصول کے ماتحت کر سکتے ہیں نہ اصول کو فروع کے ماتحت۔ اسی بات کی طرف عدم توجہی نے مذاہب میں غلطیاں پیدا کیں اور اسی اصول کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے مختلف اسلامی فرقوں نے ایک دوسرے کے خلاف قرآن سے ہی نتائج اخذ کیے اگر سب لوگ اس بات پر کاربند ہوں کہ اصول کو تو چونکہ محکم کرنے کا ذکر خود قرآن کریم میں ہے پس ہر ایک فراع کو قرآن کریم کے قائم کردہ اصول پر پیش کیا جائے تو بہت سے جھگڑے اُٹھ جاتے ہیں۔

ع[٣٧٩] الوھاب۔ اسمائے الٰہی میں سے ہے ھِبَة کے معنی ہیں اپنی ملک بلا عوض غیر کو دے دینا (غ) اور الوھّاب اس امر کو ظاہر کرنے کے لیے ہے اِنَّهٗ يُعْطِي كُلًّا عَلٰى قَدْرِ اسْتِحْقَاقِهٖ (ع) یعنی ہر ایک کو بقدر استحقاق دیتا ہے۔

اس دعا کی اس مقام پر تعلیم صاف اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ متشابہات کی پیروی میں لگ کر دین میں فتنہ پیدا کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو پہلے ہدایت پا چکے ہیں کیونکہ ان کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کے دلوں میں زیغ یعنی کجی ہوتی ہے اس لیے اب مومنوں کو اسی زیغ سے بچنے کی دعا سکھاتا ہے۔ نبی کریم صلعم کے دل میں اپنی امت کے لیے اس قدر رحمت جوش مارتی تھی کہ ان کی تعلیم کے لیے آپ اس دعا کو بہت کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے ان النبیّ صلعم کان یقول یا مقلب القلوب ثبت قلبی علیٰ دینك ثم قرأ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنك رحمة انك انت الوھاب (ت) یعنی نبی کریم صلعم یوں دعا کیا کرتے تھے اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر مضبوط رکھیو۔ پھر آپ یہ آیت ربنا لا تزغ قلوبنا پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی نسبت بھی روایت ہے کہ آپ سورۂ فاتحہ کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس میں مومن کو سکھایا ہے کہ اپنے نفس پر بھروسہ نہ کرے۔ بلکہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا طالب ہو۔

ع[٣٨٠] لن تغنی عنھم۔ اَغنی عنه کذا کے معنی ہیں کفاہ (غ) یعنی وہ شے اس کے لیے کافی ہوگئی اور یہی معنی اغناہ کے ہیں۔ جیسا کہ لکل امرئ منھم یومئذ شان یغنیه (عبس [٨٠]۔ ٣٧) اور اغنی عنه کا زیادہ استعمال ہے۔ ما اغنیٰ عنّی مالیه (الحاقة [٦٩]۔ ٢٨) ما اغنیٰ عنھم ما کانوا یمتّعون (الشعرآء [٢٦]۔ ٢٠٧) لا تغن عنی شفاعتھم (یٰس [٣٦]۔ ٢٣) ولا یغنی من اللھب (المرسلات [٧٧]۔ ٣١) انھم لن یغنوا عنك من اللہ شیئا (الجاثیة [٤٥]۔ ١٩)

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ
بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪
قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ
اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ⑫
قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ

(ان کا حال) فرعون کے لوگوں اور ان کے حال کی طرح ہے جو
ان سے پہلے تھے۔ انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا پس اللہ نے
انکو ان کے گناہوں کے سبب پکڑا اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ۳۸۱
جنھوں نے انکار کیا ان سے کہہ دے کہ تم جلد مغلوب کیے جاؤگے اور جہنم کی
طرف ہانکے جاؤگے اور کیا ہی برا بچھونا ہے۔ ۳۸۲
ان دو گروہوں میں جن کی آپس میں مٹ بھیڑ ہوئی یقیناً تمھارے لیے

من اللہ۔ مِن ابتدائے غایت کے لیے ہے اور مراد ہے من عذاب اللہ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اگلی آیت میں جو مثال دی ہے اس میں اللہ کے عذاب کا ہی ذکر ہے بعض نے مِن کو یہاں بدل کے معنی میں لیا ہے (مغنی) یعنی اللہ کی طاعت یا اس کی رحمت کے بدل میں یہ چیزیں کچھ کام نہ آئیں گی۔

کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی: جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ خاص خطاب اس سورت کے صدر میں عیسائیوں سے ہے۔ چنانچہ بعض نے یہاں مراد وفد نجران لیا ہے (ر) یعنی وہ وفد جو عیسویت کا قائم مقام ہو کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے مالوں اور جتھے پر جس قدر فخر عیسائی اقوام کو ہے شاید ہی کسی قوم کو ہوا ہو۔ مگر چونکہ الفاظ عام ہیں اس لیے ہر قسم کے کفار اس کے اندر شامل ہیں جو اسلام کو نابود کرنا چاہیں۔

ع۳۸۱ دأب۔ دَأَب کے معنی ہیں کوشش کی اور تھک گیا۔ پس دَأْب اور دَأَب دونوں کے معنی عادت اور شان یعنی حالت آتے ہیں (ل) مگر ازہری نے کہا ہے کہ دَأَب سے مراد ان کا کفر میں سخت زور لگانا داجتہادھم فی الکفر) اور نبی صلعم کی مخالفت پر ایک دوسرے کے مددگار بننا ہے۔ جیسا کہ فرعون کے لوگ حضرت موسیٰ کے خلاف ایک دوسرے کے مددگار ہوئے (ل)

ذنوب۔ ذَنْب کی جمع ہے وَالذَّنْبُ فِی الْاَصْلِ الاخذُ بذَنَبِ الشَّیْٔ (غ) ذَنْب اصل میں کسی چیز کی ذَنَب یعنی دم یا موخر حصہ کے پکڑنے کا نام ہے وَیُسْتَعْمَلُ فِی کُلِّ فِعْلٍ یُسْتَوخَمُ عُقْبَاہ اعتبارا بِذَنَبِ الشَّیْٔ (غ) اور ذَنْب ہر ایک اس فعل پر استعمال ہوتا ہے جس کا انجام ناگوار اور گراں ہو۔ گویا وہ بمنزلہ ایک چیز کی دم کے ہے لسان العرب میں ہے الذَّنْبُ الْاِثْمُ وَالْجُرْمُ وَالْمَعْصِیَۃُ یعنی ذنب اثم جرم اور معصیت تینوں پر شامل ہے اب اثم ہر ایک اس فعل کا نام ہے جو ثواب سے انسان کو روکتا ہے۔ جرم ان افعال کا نام ہے جن کی وجہ سے گویا جناب الٰہی سے قطع تعلق ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا اشتقاق جَرم بمعنی قطع سے ہے اور معصیت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو کہتے ہیں۔ خواہ عمداً ہو یا سہواً۔ گو جو نافرمانی سہو سے ہو وہ قابل مواخذہ نہیں پس معلوم ہوا کہ ذنب کا لفظ زبان عربی میں نہایت وسیع ہے اور اس سے مراد وہ افعال بھی ہو سکتے ہیں جو فی الحقیقت گناہ نہیں اور نہ نافرمانیاں ہیں۔ مگر ان کا انجام ناگوار ہے اور ایسی نافرمانی بھی اس سے مراد ہو سکتی ہے جس میں عمد اور ارادہ کا کوئی دخل نہیں اور ایسے سخت گناہ بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں جو جناب الٰہی سے قطع تعلق کا موجب بن جائیں پس لفظ ذنب کا صحیح ترجمہ گناہ نہیں بلکہ قریب تر لفظ جو اس کے مفہوم کو ادا کرتا ہے قصور ہے اور کبھی وہ اتنا چھوٹا ہوگا کہ اس میں کرنے والے پر کوئی الزام نہیں اور بعض وقت بہت بڑا جیسے یہاں۔

فرعون کے لوگوں کی حالت کا ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ جس طرح وہ دنیا میں مغلوب و ذلیل ہوئے اسی طرح مخالفین اسلام کی حالت بھی ہو گی۔

ع۳۸۲ تحشرون۔ حَشْر۔ کسی جماعت کو اپنی جائے قرار سے نکال دینا اور وہاں سے بے آرام کر کے جنگ وغیرہ کی طرف لے جانا ہے۔ چنانچہ اس روایت اَلنِّسَاءُ لَا یُحْشَرْنَ میں معنی یہ ہیں لَا یُخْرَجْنَ اِلَی الْغَزْوِ (غ) یعنی عورتوں کو جنگ کے لیے نکلنے پر مجبور نہ کیا جائے گا اور حشر کا لفظ سوائے جماعت کے نہیں بولا جاتا (غ) وابعث فی المدائن حاشرین (الشعراء ۲۶-۳۶) والطیر محشورۃ (صٓ ۳۸-۱۹) واذا الوحوش حشرت (التکویر ۸۱-۵) وحشر لسلیمٰن جنودہ (النمل ۲۷-۱۷) ھو الذی اخرج الذین کفروا من اھل الکتٰب من دیارھم لاول الحشر (الحشر ۵۹-۲) اور قیامت میں لوگوں کے اکٹھا کیے جانے پر بھی لفظ حشر بولا گیا ہے۔

کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی سخت ترین مخالفت کے وقت: اس آیت میں اور بھی صفائی سے بیان کیا ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت پر کمر بستہ ہونگے وہ ضرور پہلے اسی دنیا میں مغلوب ہونگے پھر جہنم کی طرف اکٹھے کر کے چلائے جائیں گے اور اس دنیا میں ان کی مغلوبیت آخرت میں جہنم کا ثبوت ہو گی۔ یہ پیش گوئی اس زمانہ کی ہے کہ ابھی نبی کریم صلعم کی جمعیت ملک عرب میں دشمنوں کے مقابلہ پر کچھ بھی نہ تھی اور مخالفت ایک مشرکین عرب کی طرف سے ہی نہ تھی بلکہ اندرونی مخالف منافق۔ اور بیرونی مخالف عرب کے سب مشرک اور یہود اور نصاریٰ اسلام کی مخالفت پر کمر بستہ ہو چکے تھے۔ ان حالات میں ایسے صاف الفاظ میں کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی کرنا اور پھر اس پیشگوئی کا آنحضرت صلعم کے سامنے پورا ہو جانا اسلام کی صداقت کے چمکتے ہوئے نشانوں میں سے ایک نشان ہے اور آج ایک مسلمان کے قلب کو اس بات سے قوت ملتی ہے کہ وہ خدا جس نے اپنا وعدہ ان حالات میں پورا کیا۔ وہ اسلام کی ہر ایک بیکسی کے وقت اس کا حامی ہو گا اور اس کے مخالفین کو مغلوب کرے گا۔

فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى	نشان تھا[۳۸۳]، ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑتا تھا، اور دوسرا کافر تھا
كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ	وہ اُن کو ظاہر آنکھ سے اپنے سے دوچند دیکھتے۔
وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ	اور اللہ اپنی مدد کے ساتھ جس کو چاہے قوت دیتا ہے بصیرت والوں

۳۸۳ے اس آیت میں بالخصوص اہل کتاب مخاطب ہیں۔ کیونکہ اس سورت کے ابتدائی حصہ میں اصل خطاب انہیں کے ساتھ چلتا ہے علاوہ ازیں اس میں مشرکوں اور مسلمانوں کے مقابلہ اور جنگ کی طرف توجہ دلائی ہے پس جس کو توجہ دلائی ہے وہ کوئی تیسرا گروہ ہے اور یہ عیسائی ہیں جن کے ساتھ اصل بحث چلتی ہے دو گروہوں کی مٹ بھیڑ سے مراد جنگ بدر ہے جیسا کہ اگلے الفاظ میں صاف اشارہ بھی ہے کہ ایک گروہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتا تھا اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا جو دیکھنے میں ان سے دوچند تھے۔

جنگ بدر میں آنحضرت صلعم کی صداقت کا نشان ایک تو اس طرح تھا کہ قرآن کریم کی مکی سورتوں میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان ایک مٹ بھیڑ کی خبر بار بار دی گئی تھی جس میں کفار کی ہزیمت اور مسلمانوں کی فتح کی پیشگوئی کی گئی تھی یہاں تفصیل کے ساتھ ان پیشگوئیوں کے ذکر کا موقعہ نہیں۔ صرف ایک پیشگوئی پر کفایت کی جاتی ہے۔ سورہ القمر میں آخری رکوع میں ہے ام یقولون نحن جمیع منتصر سیھزم الجمع و یولون الدبر بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر۔ کیا یہ (کفار) کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ان کی جماعت کو ہزیمت دی جائے گی اور وہ پیٹھیں پھیر کر واپس ہو جائیں گے۔ ہاں ایک گھڑی ان کے وعدے کا وقت ہے اور وہ گھڑی بڑی سخت اور تلخ ہو گی۔ کہا جائے گا کہ یہ تو قیامت کے متعلق ہے مگر جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں قرآن کریم نے پیشگوئی میں ایسی لطیف طرز اختیار کی ہے کہ قیامت کی رسوائی کے ساتھ اس دنیا کی مغلوبیت کا ذکر بھی کیا ہے تاکہ ایک کے پورا ہو جانے سے دوسرے کی صداقت پر شہادت ہو مگر یہاں ساعۃ سے مراد وہی ہزیمت کی ساعت ہے ورنہ قیامت کے دن ہزیمت اور جنگ کا کیا ذکر ہے۔ وہ تو اسی دنیا میں ہو گی اور یہ بھی ایک معنی میں ان کے لیے قیامت ہی ہے۔ ہاں پھر قیامت میں اس سے بھی زیادہ سختی اور تلخ کامی دیکھیں گے۔ اس بات کا ثبوت کہ خود نبی کریم صلعم اس پیشگوئی سے بدر کی جنگ مراد لیتے تھے۔ صحیح احادیث سے ملتا ہے چنانچہ اسی آیت کی تفسیر میں بخاری میں ہے عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال وھو فی قبۃ لہ یوم بدر انشدک عھدک ووعدک اللّٰھم ان شئت لم تعبد بعد الیوم ابدا فاخذ ابوبکر بیدہ وقال حسبک یا رسول اللہ فقد الححت علی ربک وھو فی الدرع فخرج وھو یقول سیھزم الجمع و یولون الدبر بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ بدر کے دن نبی صلعم ایک چھوٹے سے خیمہ میں تھے اور بارگاہ الٰہی میں یوں دعا کر رہے تھے۔ میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے اللہ اگر تیری ایسی ہی مشیت ہے (یہ فقرہ بحالت ظاہر تھا کیونکہ بظاہر مسلمان کفار کے سامنے اتنے تھوڑے اور بے سامان تھے کہ ان کے ہاتھوں ان کا کچلا جانا صاف نظر آتا تھا) تو آج کے دن کے بعد زمین میں تیری پرستش نہیں کی جائے گی۔ ابوبکرؓ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا یا رسول اللہ بس کیجیے۔ آپ نے اپنے رب پر الحاح کیا ہے۔ آپ نے زرہ پہنی ہوئی تھی پس آپ نکلے اور یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ سیھزم الجمع و یولون الدبر بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر۔ اسی قسم کی اور بہت سی پیشگوئیاں اسی جنگ کے متعلق قرآن کریم میں تھیں۔ پس ایک طرف پیشگوئیوں کا پہلے موجود ہونا دوسری طرف باوجود مسلمانوں کی قلت اور بے سروسامانی اور دشمن کی کثرت اور مسلح ہونے کے کفار کا ہزیمت اٹھانا ان دونوں باتوں نے جنگ بدر کو ایک عظیم الشان نشان بنا دیا تھا۔ تو اب دوسرے مخالفت کرنے والوں کو کہا جاتا ہے کہ اسی نشان پر غور کرو۔

بائبل میں جنگ بدر اور ہجرت کی پیشگوئیاں: اور اہل کتاب یعنی عیسائیوں کے لیے بالخصوص ایک نشان جنگ بدر میں یہ تھا کہ جنگ بدر کی پیشگوئی ان کی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلعم کی ہجرت اور بدر میں قریش کی طاقت کو کمزور کیا جانے کی پیشگوئی صاف الفاظ میں یسعیاہ نبی کی کتاب میں موجود ہے دیکھو یسعیاہ ۲۱: ۱۳ سے ۱۷ آیت تک

"عرب کی بابت الہامی کلام: عرب کے صحرا میں تم رات کو کاٹو گے۔ اے ودانیوں کے قافلو۔ پانی لیکے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو روٹی لیکے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھنچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا۔ ہنوز ایک برس۔ ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیراندازوں کے جو باقی ہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔"

اب صاف ظاہر ہے کہ بھاگنے والے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت ابوبکرؓ آپ کے ساتھ تھے اور درحقیقت ساری تاریخ مقدس میں ایک ہی شخص کے بھاگنے کو یہ عظمت حاصل ہوئی کہ اس سے ایک سنہ چل پڑا۔ پس اس بھاگنے میں آپ کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے اور الفاظ "عرب کی بابت الہامی کلام" اس واقعہ کو عرب پر ہی محدود کرتے ہیں۔ اب بھاگنے کے ذکر کے تعلق میں یہ کہا کہ ایک سال کے اندر قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ اور قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے سو ایسا ہی ہوا۔ کہ جنگ بدر کا وقوع جو ہجرت کے ایک سال کے گزر جانے کے بعد ہوا۔ اس میں قیدار کی حشمت جاتی رہی اور ان کے بہادر لوگ گھٹ گئے۔ قیدار کا لفظ بائبل میں بہت مرتبہ بنی اسماعیل کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ پس اہل کتاب کے

فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

کے لیے اس میں یقینی عبرت ہے[۳۸۴]

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے (جیسے) عورتیں اور بیٹے اور ڈھیروں ڈھیر سونا اور چاندی اور پلے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی، یہ اس ورلی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے[۳۸۵]

لیے یہ کھلا کھلا نشان جنگ بدر میں تھا۔

۳۸۴ عبرۃ۔ عَبْر کے اصل معنی ہیں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تجاوز کرنا۔ اسی سے عُبُور ہے اور اعتبار اور عِبْرۃ سے وہ حالت مراد ہے جس کے ساتھ ایک دیکھی ہوئی چیز کی معرفت سے اس چیز کی معرفت حاصل کی جائے جو دیکھی نہیں گئی (غ)

..یرونہم مثلیہم رای العین۔ ان کو ظاہر نظر میں اپنے سے دوچند دیکھتے تھے۔ یعنی مسلمان کفار کو بظاہر اپنے سے دوچند دیکھتے تھے اور سورہ انفال میں ہے واذ یریکموھم اذ التقیتم فی اعینکم قلیلا ویقللکم فی اعینہم اور جب تم میں مٹ بھیڑ ہوئی تو ان کو تمہاری نظر میں کم دکھاتا تھا اور تم کو ان کی نظر میں کم دکھایا۔ ان دونوں بیانات میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ کفار کی کل جمعیت ایک ہزار کے قریب اور مسلمان تین سو کے قریب تھے۔ تو یرونہم مثلیہم سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو وہ کوئی چھ سو کے قریب نظر آتے تھے وجہ یہ تھی کہ بقیہ حصّہ پہاڑ کی اوٹ میں تھا اور یہ دوچند دکھانا بے معنی نہ تھا بلکہ اس میں حکمت یہ تھی کہ یہ بھی ارشاد الٰہی ہو چکا تھا فان یکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبوا مائتین وان یکن منکم الف یغلبوا الفین باذن اللہ (الانفال۔ ۶۶) کہ اگر تم میں سے ایک سو صابر ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے۔ اور ایک ہزار تم میں سے ہوں گے تو دو ہزار پر غالب آئیں گے۔ تو چونکہ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو چکا تھا کہ تم دوچند جمعیت پر غالب آؤ گے گو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زیادہ پر غالب نہیں آئیں گے۔ تاہم اس لیے کہ مسلمانوں کے حوصلے مضبوط رہیں اور انہیں یقین کامل رہے کہ ہم دشمن پر غالب آئیں گے ان کو اسی قدر حصّہ دکھایا گیا جو تعداد میں انکی اپنی جمعیت سے دوچند تھا۔ تو اس طرح پر کفار مسلمانوں کو تھوڑے کرکے دکھائے گئے اور مسلمان بھی کفار کو تھوڑے سے دکھائے گئے۔ کیونکہ وہ تو واقعی تھے ہی تھوڑے۔ پس انہوں نے مسلمانوں کو ہیچ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ ہم فوراً ان کو نابود کر دیں گے۔ اگر یہ خیال ان کے دلوں میں نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ جنگ کو ٹال دیتے لیکن اللہ تعالیٰ اس میدان میں پیشگوئیوں کے مطابق کفار کی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا۔ پس قرآن کریم کی سب آیات ایک دوسری کی مؤید ہیں۔

۳۸۵ شہوات۔ شہوۃ کی جمع ہے اور اس کے اصل معنی نفس کا اس چیز کا اشتیاق ہے جس کا تم ارادہ کرو اور دنیا میں شہوات انسانی دو طرح پر ہیں ایک سچی اور ایک جھوٹی۔ شہوت صادقہ وہ ہے کہ اس خواہش کے پورا ہوئے بغیر بدن میں اختلال واقع ہو۔ اور کاذبہ وہ ہے جو ایسی نہ ہو اور کبھی مُشْتَہٰی کو (یعنی اس چیز کو جس کی خواہش کی گئی ہے) بھی شہوۃ کہا جاتا ہے (غ) اور یہاں مراد مشتہیات ہی ہیں۔

القناطیر المقنطرۃ۔ قناطیر قنطار کی جمع ہے قَنْطَرَۃ جسر یعنی پُل کو کہتے ہیں اور بلند عمارت کو بھی کہتے ہیں۔ اور قنطار ایک معیار ہے۔ جس کے متعلق اختلاف ہے۔ کسی نے کہا چالیس اوقیہ ہوتا ہے۔ کسی نے کہا بارہ سو دینار۔ کسی نے کہا بارہ سو اوقیہ۔ کسی نے کہا سترہ ہزار دینار۔ مگر حق وہ ہے جو ابوعبید نے کہا ہے کہ عرب قنطار کا وزن نہیں جانتے (ل) اور قَنْطَرَ الرجلُ کے معنے ہیں مال کثیر کا مالک ہُوا (ل) امام راغب کہتے ہیں کہ قناطیر قَنْطَرَۃ کی جمع ہے اور قَنْطَرَۃ اس مال کو کہتے ہیں جس سے انسان کی زندگی گزر جائے گویا پُل پر سے عبور کے لحاظ سے یہ معنی ہیں اور یہ غَیْرُ مُحَدُوْدِ الْقَدْرِ فِیْ نَفْسِہٖ ہے یعنی اس کا اندازہ محدود نہیں بلکہ جس طرح غنا کے لیے کوئی خاص مقدار معین نہیں اسی طرح قنطرۃ ہے اور القناطیر المقنطرۃ کے معنی کیے ہیں المجموعۃ قِنْطَارًا قِنْطَارًا۔

الخیل۔ خَیل کا لفظ اصل میں گھوڑے اور سوار دونوں پر یکجائی حالت میں بولا جاتا ہے (اس کی وجہ راغب نے لفظ خیال سے لی ہے کیونکہ خُیَلَاءَ متکبر کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑھ کر خیال کرتا ہے اور جو شخص گھوڑے پر سوار ہوتا ہے وہ بھی ایسا ہی خیال کرتا ہے) پھر علیحدہ علیحدہ گھوڑے اور سوار دونوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ) اور یہ اسم جمع ہے۔ واحد کے لیے فَرَس بولا جاتا ہے۔

المسوّمۃ۔ سَوم کے معنی کے لیے دیکھو ۲۷ ۔ اونٹ کو چراگاہ میں چھوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے اور سُوْمَۃٌ کے معنی اَعْلَمَتُہٗ بھی آتے ہیں (غ) یعنی میں نے اس پر نشان لگایا۔ پس الخیل المسوّمۃ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں اَلْمَرْعِیَّۃُ۔ وَالْمُعَلَّمَۃُ یعنی چرنے کے لیے چھوڑے گئے یا پلے ہوئے اور نشان لگائے گئے۔ مجاہد کہتے ہیں الخیل المسوّمۃ المطہمۃ الحسان (بخاری) یعنی خیل مسومۃ سے مراد موٹے خوبصورت گھوڑے ہیں۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

کہہ کیا میں تم کو اس سے اچھی بات بتاؤں، ان لوگوں کے لیے جو تقوےٰ اختیار کرتے ہیں ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں رہنے والے ہیں اور پاک ساتھی اور اللہ کی رضامندی ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ ۳۸۶

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾

وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس ہمارے گناہ بخش اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ ۳۸۷

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

صبر کرنے والے اور سچ کر دکھانے والے اور فرمانبردار اور خرچ کرنے والے اور صبح کے وقتوں میں استغفار کرنے والے۔ ۳۸۸

الانعام۔ نَعَم کی جمع ہے اور یہ لفظ اونٹ گائے اور بکری پر بولا جاتا ہے۔ مگر خصوصیت سے اونٹ پر بولا جاتا ہے۔ کیونکہ اونٹ ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھی۔ ماٰب۔ اَوْب سے مصدر بھی ہے اور اسم مکان وزمان بھی اور اَوب رجوع ہے مگر اَوْب صرف اس جاندار پر بولا جاتا ہے جو ارادہ رکھتا ہے اور رجوع عام ہے۔

عیسائیوں کے ساتھ بحث میں دنیا کی محبوب چیزوں کا ذکر بالخصوص کیا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ یہ قوم دنیا کی مرغوب چیزوں کی محبت میں پڑ کر اللہ کو بالکل بھول جائے گی۔ بالخصوص یہاں ڈھیروں ڈھیر سونے چاندی کا ذکر بتاتا ہے کہ یہ عرب کے لوگوں کا نقشہ نہیں جن کے پاس سونا چاندی اگر ہوگا بھی تو برائے نام اور آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے کہ حسن ماٰب اللہ کے پاس ہے گویا یہ بتایا ہے کہ مرغوبات دنیا کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا انجام کار مفید نہیں ان سے بیشک فائدہ اٹھائے مگر مدنظر خدا کی رضا ہو جیسا اگلی آیت میں کھول دیا۔

ع۳۸۶ رضوان۔ رضا سے ہے اور رضائے کثیر کو رضوان کہا جاتا ہے (غ) اور چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ کی رضا ہے اس لیے قرآن کریم میں لفظ رضوان رضائے الٰہی سے مخصوص ہے جیسے اِلَّا ابتغاء رضوان اللّٰہ (الحدید ۵۷-۲۷) یبتغون فضلا من اللّٰہ و رضوانا (الفتح ۴۸-۲۹، الحشر ۵۹-۸) یبشرھم ربھم برحمۃ منہ و رضوان (التوبۃ ۹-۲۱) اور رضا کو راغب نے دو طرح پر لکھا ہے۔ بندہ کا اللہ سے راضی ہونا اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کی قضا و قدر اس پر وارد ہو اسے بُرا نہ سمجھے اور اللہ کا بندہ سے راضی ہونا کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اپنے امر پر چلنے والا اور اپنی نہی سے رُکنے والا دیکھے۔

نعمائے جنت۔ خلود۔ ازواج کے متعلق دیکھو ع۳۹ یہاں انہی امور کا ذکر کرکے جن کا ذکر سورہ بقرہ میں کیا تھا۔ آخر پر لفظ رضوان من اللہ اور بڑھا دیئے ہیں اور دوسری جگہ رضوان من اللہ کو جنت کی سب سے بڑی نعمت فرمایا ہے و رضوان من اللّٰہ اکبر (التوبۃ ۹-۷۲) پس نعمائے جنت میں رضائے الٰہی کو داخل کرکے بتا دیا ہے کہ مومن کی اصل خوشنودی کا سامان رضائے الٰہی ہے اور پھر صحابہؓ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچکر کہ رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ بتایا کہ نعمائے جنت کا حصول بلکہ اعظم ترین نعمت جنت کا حصول اسی دنیا سے شروع ہوجاتا ہے۔

اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض قومیں محض مرغوبات دنیا میں منہمک ہوگئیں یا ہوجائیں گی۔ مگر مرغوبات دنیا میں انہماک کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ ہاں رضائے الٰہی اصل چیز ہے جس کے حصول کے لیے انسان کو پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہی دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت ہے واللّٰہ بصیر بالعباد یعنی اللہ بندوں کے عملوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ وہ ان کے اعمال حسنہ پر ان کو جزائے احسن عطا فرماتا ہے۔

ع۳۸۷ یہاں جو دعائے مغفرت ذنوب یعنی کمزوریوں کی حفاظت کی دعا ہے اس میں بالخصوص مراد کمزوریوں کے سرزد ہونے سے حفاظت ہے۔ ایمان لانے سے پچھلے گناہ تو معاف ہو ہی جاتے ہیں۔ پس وہ سب گناہوں سے پاک ہوکر پھر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہیں کہ آیندہ ان سے کمزوریاں سرزد نہ ہوں۔

ع۳۸۸ الصادقین۔ صدق اوّلاً قول کے لیے ہی آتا ہے۔ مگر اس کا استعمال لغت میں اور قرآن کریم میں افعال کیلئے بھی کثرت سے ہوا ہے۔ مثلاً صَدَقَ فی القتال کے معنی ہیں۔ جنگ کا حق پورا کیا اور جو کرنا واجب تھا اور جس طرح کرنا واجب تھا اسی طرح کیا اور قرآن کریم میں آتا ہے رجال صدقوا ما عاھدوا اللّٰہ علیہ (الاحزاب ۳۳-۲۳) یعنی انہوں نے عہد کو سچ کر دکھایا ان افعال کے ذریعہ سے جو انہوں نے ظاہر کیے (غ) ایسا ہی لقد صدق اللّٰہ رسولہ الرؤیا بالحق (الفتح ۴۸-۲۷) میں صدق بالفعل مراد ہے یعنی سچ کر دکھایا چونکہ یہاں صبر کے بعد صدق کا مرتبہ رکھا ہے اور صبر کے معنی امساک فی ضیق یعنی تنگی کی حالت میں اپنے آپ کو روک رکھنا ہے اس لیے صادقین سے صادق بالفعل یا جو کچھ کہا ہے اس کو سچ کر دکھانیوالے مراد ہیں صبر میں صرف اپنے آپ کو روک رکھنا ہے صدق میں قدم آگے بڑھانا ہے۔

القانتین۔ قنوت طاعت یعنی فرمانبرداری کو خضوع کے ساتھ لازم کر لینا ہے۔ صبر اور صدق کے ساتھ تیسرا مرتبہ قنوت کا ہے یعنی صبر اور صدق دکھائے مگر ایسی حالت میں کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کیا ہو اور پھر فرمانبرداری بھی ایسی ہو، جس میں خضوع یعنی عاجزانہ حالت پائی جائے۔ اپنے کیے پر فخر نہ ہو

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۱۸

اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور فرشتے اور علم والے بھی انصاف پر قائم ہو کر۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں غالب حکمت والا ہے۔[389]

بڑائی نہ ہو۔

المنفقین۔ یہ چوتھا مرتبہ ہے۔ صبر بھی دکھائے صدق بھی۔ فرمانبرداری بھی ہو۔ لیکن جب تک انسان انفاق فی سبیل اللہ نہیں کرتا یعنی اپنے سارے مال کو اپنی ساری طاقتوں کو خدا کی راہ میں لگا نہیں دیتا وہ کسی بڑی کامیابی کا وارث نہیں ہو سکتا۔

المستغفرین دیکھو ع۲۵۸ یہ پانچواں مرتبہ ہے۔ اور چاروں مراتب کے بعد اس کے لانے سے صاف بتا دیا ہے کہ یہ ترقی کے لیے آخری مرتبہ ہے۔ پس اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہنے والے ہیں یعنی باوجود صبر اور صدق دکھانے کے باوجود فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کر لینے کے باوجود اپنے مال اور قویٰ کو خدا کی راہ میں لگا دینے کے اپنے نفس پر کوئی بھروسہ نہیں کرتے۔ بلکہ حفاظت الٰہی کے طالب ہوتے ہیں۔ اور جس قدر زیادہ انسان استغفار کرتا ہے اسی قدر زیادہ وہ حفاظت الٰہی کے ماتحت آتا ہے اور اس لیے ہر قسم کے خطرات سے مامون ہو جاتا ہے۔

الاسحار۔ سَحَر کی جمع ہے اور سَحَر اصل میں آخر شب کے اندھیرے کا دن کی روشنی کے ساتھ مختلط ہو جانے کا نام ہے اور اس وقت کو بھی سَحَر کہتے ہیں (غ) صبح کے وقت استغفار سے مراد بعض نے اس وقت کی نماز کو لیا ہے جیسے کہ قتادہؓ سے روایت ہے (ج) اور بعض نے محض استغفار، مگر نماز میں بھی استغفار ہی ہوتا ہے صبح کے وقت کی خصوصیت کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح کے وقت دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ سحر کا وقت درحقیقت ایسا وقت ہے کہ ایک تو دنیا کے شور و شغف اس وقت کم ہوتے ہیں۔ دوسرے قوائے حیوانی بھی اس وقت کسی قدر کمزور ہوتے ہیں اور اس لیے انسان کی توجہ اور قوائے روحانی کے کمال کا وقت ہوتا ہے آج کل کی عیاشی بھی رات کے دو تین بجے ختم ہو جاتی ہے اور لمبی یا وبائی بیماریوں میں عموماً یہی وقت نزع کا ہوتا ہے جو سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ وقت قوائے حیوانی کی کمزوری کا ہوتا ہے اس لیے اس وقت کو دعائے استغفار کے لیے مخصوص کیا ہے۔ حدیث صحیح میں جس پر صحیحین اور سنن کا اتفاق ہے یہ آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ینزل اللہ تبارک وتعالیٰ فی کل لیلۃ الی السماء الدنیا حین یبقی ثلث اللیل الاخیر فیقول ھل من سائل فاعطیہ ھل من داع فاستجیب لہ ھل من مستغفر فاغفر لہ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات جب رات کا آخری تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے سماء الدنیا پر نزول فرماتا ہے۔ پس فرماتا ہے کیا کوئی سائل ہے میں اس کو دوں گا کیا کوئی دعا کرنے والا ہے میں اس کی دعا قبول کروں گا کیا کوئی مغفرت مانگنے والا ہے میں اس کو اپنی مغفرت میں لے لوں گا۔ اللہ تعالیٰ تو مکان کی قید سے پاک ہے پس اس کے نزول سے مراد بھی اس کی رحمت اور فضل کا خاص جلوہ ہے جس کے لیے کوئی جاذب دل ہونا چاہیئے افسوس کہ مسلمان اب اس قدر غفلت کی نیند سو رہے ہیں کہ اس قبولیت کے وقت سے کوئی فائدہ اٹھانے والا نہیں الا ماشاء اللہ۔ بلکہ دوسری قوموں کا تتبع کر کے رات کو لغویت یا عیاشی میں گزار کر اس وقت جو جاگنے کا وقت ہے سو جاتے ہیں۔

الصابرین وغیرہ یا تو الذین کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یا خود نصب علی المدح ہے۔

ع۳۸۹ قسط۔ قِسْط کے معنی عدل یا انصاف کا حصّہ ہیں (اور مراد اس سے انصاف ہے) اور یہی وجہ ہے کہ قَسَطَ کے معنی ہیں اس نے ظلم کیا گویا دوسرے کا حصّہ لے لیا اور اَقْسَطَ کے معنی ہیں اس نے انصاف کیا گویا دوسرے کا حصّہ دیدیا (غ) اسی لیے قاسِط ظالم کے معنی میں آیا ہے۔ واما القاسطون فکانوا لجهنم حطبا (الجن ۷۲۔ ۱۵) اور مُقْسِط اچھے معنی میں آتا ہے ان اللہ یحب المقسطین (المائدہ ۵۔ ۴۲)

قائما بالقسط کی دو توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ جمہور مفسرین نے تو اسے شہد سے حال لیا ہے مگر یہ بھی جائز ہے کہ اولوا العلم سے حال ہو اور تقدیر یوں ہوگی، واولوا العلم حال کون کل واحد منہم قائما بالقسط (ذ) یعنی اولوا العلم کی گواہی بھی یہی ہے اس حال میں کہ ان میں سے ہر ایک انصاف کے ساتھ کھڑا ہوا۔ میرے نزدیک یہ دوسری وجہ ہی درست ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر تین قسم کی شہادت پیش کی ہے اوّل خود اللہ تعالیٰ کی شہادت۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی شہادت اس کی فعلی کتاب سے ملتی ہے اور اس کے ہاتھ کی نکلی ہوئی چیزیں خود توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ دوسری شہادت ملائکہ کی ہے جن کا تعلق پاک فطرت انسانوں سے ہے کیونکہ فطرت انسانی جب گردوپیش کے حالات سے متاثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی توحید پر گواہی دیتی ہے۔ عموماً تمام لوگ یہاں تک کہ خدا کے منکر بھی مصائب کے وقت میں خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرتے ہیں اور بت پرست اور دوسری قسم کے مشرک جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے بتوں کو اور دوسرے شرکاء کو بھول جاتے ہیں اور خالص اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں۔ اور علم والوں کی شہادت درحقیقت دنیا کی الہامی کتابوں کی شہادت ہے کہ وہ سب بھی بہت سی باتوں میں باہم اختلاف رکھتی ہوئی اس بات پر متفق ہیں کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولوا العلم کے ساتھ قائما بالقسط کی شرط لگا دی ہے کہ اہل علم اگر انصاف پر قائم ہوں تو وہ بھی یہی گواہی دیں گے۔ یہاں توحید پر ایسی جامع شہادت پیش کرنے کا منشاء یہی ہے کہ عیسائیت پر اتمام حجت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی گواہی جو اس کی فعلی کتاب قدرت سے ملتی ہے اور ملائکہ کی گواہی جو نیک دل انسانوں کی صحیح فطرت سے ملتی ہے کیونکہ ملائکہ کا ان کے ساتھ

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا
اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ
مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾
فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ
مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ
اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾ ع
اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ
النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾

دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اور انھوں نے جن کو کتاب دی گئی اختلاف نہیں کیا۔ مگر اس کے پیچھے کہ ان کے پاس علم آچکا ہے آپس کی ضد سے اور جو شخص اللہ کی آیتوں کا انکار کرتا ہے تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے [ع۳۹۰]

پھر اگر تجھ سے جھگڑا کریں تو کہہ دے کہ میں نے اپنی توجہ کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیا ہے اور انھوں نے (بھی) جو میرے پیچھے چلتے ہیں اور ان لوگوں کو جنھیں کتاب دی گئی اور اُمیوں کو کہہ دے کہ کیا تم فرمانبردار ہو؟ پھر اگر وہ فرمانبردار ہو جائیں تو یقیناً انھوں نے راہ پالی اور اگر پھر جائیں تو تجھ پر پہنچانا ہی ہے [۳۹۱] اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔

وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور جو ان کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں سے انصاف کا حکم دیتے ہیں، تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دے [ع۳۹۲]

تعلق ہوتا ہے اور اہل علم کی انصاف کے ساتھ شہادت سب اس بات پر متفق ہیں کہ خدا ایک ہے۔ اور تثلیث کی کوئی شہادت ان تینوں ذرائع سے نہیں ملتی یعنی نہ قانونِ قدرت اس پر شاہد ہے، نہ فطرت انسانی اپنی صحیح حالت میں اس کی گواہی دیتی ہے اور نہ ہی دنیا کی الہامی کتابیں یہ شہادت دیتی ہیں حتیٰ کہ مروجہ اناجیل باوجود اپنی تحریفات کے تین خداؤں کی کوئی شہادت نہیں دیتی ہیں۔ پس جب توحید الٰہی پر اس قدر زبردست شہادت موجود ہے اور ان تین ذرائع یعنی قانون قدرت۔ فطرت انسانی اور الہامی کتابوں کی شہادت کے سوا کوئی اور ذریعہ شہادت مسلمہ فریقین نہیں ہوسکتا تو یہ عیسائی مذہب کے بطلان کی صریح دلیل ہے۔

ع۳۹۰ بغیا۔ بغی کے اصل معنی خواہش ہیں اس لیے بعض نے یہاں بغیا سے مراد لیا ہے طلب الریاسات والملك والسلطان (ج) یعنی ریاست حکومت اور غلبہ کی خواہش سے۔ اور یا اس سے مراد ضد اور حسد ہے۔

جب یہ بتا دیا کہ توحید الٰہی پر ہی تمام شہادتوں کا اتفاق ہے اور دین اسلام ہی وہ دین ہے جس نے توحید خالص کو سکھایا پس اسلام ہی اب سچا دین ہے جس کو قبول کرنے کے سوا کوئی شخص توحید خالص پر قائم نہیں ہوسکتا اور واقعات شہادت دیتے ہیں کہ یہ دعویٰ بالکل سچا ہے۔ ہر مذہب میں توحید کا کسی قدر شرک کے ساتھ اختلاط ہو گیا ہے مگر اسلام کی پاک کتاب نے اگر ایک طرف شرک کے خفی مراتب تک کو بیان کر دیا تو دوسری طرف وہ تعلیم تحریف سے بھی پاک ہے۔

ع۳۹۱ البلاغ۔ بلاغ کے معنی انتہائے مقصد کو پہنچنا بھی ہیں جو بلوغ کے معنی ہیں اور تبلیغ یا پہنچا دینا بھی اس کے معنی ہیں اور یہاں پیغام کا پہنچا دینا ہی مراد ہے۔

آنحضرتؐ کی بعثت اسود و احمر کی طرف: یہاں اہل کتاب اور اُمی دونوں کو خطاب کے لیے حکم دیا ہے اور اس میں درحقیقت کل دنیا آجاتی ہے۔ خواہ اُمی سے مراد مکہ کے لوگ لیے جائیں دیکھو [ع۱۰۲] کیونکہ انہی لوگوں کی طرف کوئی رسول نہ آیا تھا باقی کل دنیا کی قوموں کی طرف رسول آچکے تھے۔ پس وہ سب اہل کتاب میں داخل تھے اسی لیے اس آیت کے ماتحت مفسرین نے ان احادیث کو نقل کیا ہے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعثت الی الاسود والاحمر میں اسود اور احمر کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بغیر آنحضرت صلعم پر ایمان لانے کے نجات نہیں گو پہلے وہ لوگ کتاب بھی رکھتے ہوں۔ گویا آنحضرت صلعم کا پیغام صرف اُمیوں کے لیے نہ تھا بلکہ اہل کتاب کے لیے بھی تھا۔

ع۳۹۲ بشر۔ تبشیر۔ خیر اور شر یعنی اچھی اور بُری دونوں خبروں پر بولا جاتا ہے (ل) کیونکہ جس طرح خوشی کی خبر چہرہ (بشرۃ) پر انبساط پیدا کرتی ہے

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٢٢﴾

یہ وہ لوگ ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں کام نہ آئے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوں گے۳۹۳

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾

کیا تو نے اُن کو نہیں دیکھا، جن کو کتاب کا ایک حصّہ دیا گیا ہے وہ اللہ کی کتاب کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے پھر ایک گروہ ان میں مُنہ موڑتا ہُوا پھر جاتا ہے۳۹۴

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

یہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی اور اس بات نے ان کو اُن کے دین میں دھوکا دیا ہے جو وہ افترا کرتے تھے۳۹۵

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ

پھر کیا حال ہوگا، جب ہم ان کو اس دن اکٹھا کریں گے جس میں کوئی شک نہیں اور ہر ایک جان کو پورا دیا جائے گا، جو

اسی طرح ایک بُری خبر بھی چہرہ پر ایک تغیر پیدا کرتی ہے۔ بعض نے کہا کہ عذاب پر بشیر کا لفظ لانے کا یہ مطلب ہے کہ زیادہ سے زیادہ خوشی کی خبر جو وہ سنیں گے وہ بھی عذاب کی خبر ہے (غ) بالفاظ دیگر خوشی کی کوئی خبر وہ نہ سنیں گے۔ جیسا شاعر کہتا ہے تَحِيَّةُ بَيْنِهِمْ ضَرْبٌ وَجِيعٌ۔

نبیوں کا قتل: دکھ کی خبر تو موجود لوگوں کو یا بعد میں آنے والوں کو ہی دی جا سکتی ہے۔ اس لیے یا تو مراد یہ ہے کہ جو لوگ نبیوں کو قتل کرتے تھے اب جو اُن کے نقش قدم پر چل کر مخالفت کرتے ہیں ان کو عذاب کی خبر دے دو۔ اور یا نبیوں کے قتل سے مراد ان کی دعوت کا ابطال ہے یا ایسی مخالفت کہ گویا اپنی طرف سے تو قتل کا پورا سامان کر چکے گو حفاظت الٰہی نے بچا لیا۔ دیکھو ع۹۱۔

ع۳۹۳ حبط عمل پر دیکھو ع۲۷۹ جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے یہاں ان اعمال کے حبط کا ذکر ہے جو آنحضرت صلعم کی مخالفت میں حق کو مٹانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

ع۳۹۴ نصیب۔ نَصْب سے ہے جس کے معنی وضع ہیں اور نصیب حظ منصوب یعنی معین حصّہ کا نام ہے (غ)

تحریف بائبل: ان لوگوں سے جن کو کتاب کا ایک حصّہ دیا گیا۔ یہود و نصاریٰ مراد ہیں جن کو کتاب دی گئی مگر وہ اصل کتاب الٰہی ان کے ہاتھوں میں نہ رہی بلکہ صرف اس کا ایک حصّہ موجودہ محرف کتابوں میں باقی رہ گیا۔ قرآن کریم نے اس بیان کے ساتھ کہ اصل کتاب ان کے پاس نہیں بلکہ اس کا صرف ایک حصّہ ہے اپنا منجانب اللہ ہونا ثابت کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اس حقیقت پر جو اس وقت دنیا کی نظروں سے مخفی تھی۔ آج تیرہ سو سال بعد روشنی پڑتی ہے اور خود عیسائیوں کو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ توریت و اناجیل میں اصل کتابوں کا صرف ایک حصّہ باقی رہ گیا ہے اس لیے فرمایا کہ وہ کتابیں اب حق کے ساتھ فیصلہ نہیں کر سکتیں کیونکہ حق ان میں بہت کم رہ گیا اور اب ان کو کامل کتاب اللہ قرآن کی طرف بلایا جاتا ہے اور فیصلہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو مذہبی اختلافات ان کے درمیان ہیں ان کا فیصلہ کرے کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے اور آج یہ ثابت شدہ دعویٰ ہے کہ تمام اختلافات مذہبی کا یہ فیصلہ کرتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا وما انزلنا علیك الکتاب الا لتبین لهم الذی اختلفوا فیه (النحل ۱۶-۶۴) یعنی ہم نے قرآن کو اسی غرض سے اتارا ہے کہ جو اصولی اختلافات مذاہب میں پڑ گئے ہیں ان کا یہ فیصلہ کر دے۔

ع۳۹۵ غَرَّ۔ غَرَّہٗ کے معنی ہیں اُسے دھوکہ دیا اور باطل کے ساتھ اس کو طمع دی (ل) نیز دیکھو ع۵۸۲۔

یفترون۔ فَرْی سے ہے جس کے اصل معنی قطع یا شق کرنے کے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ فری ایسے قطع کرنے کو کہتے ہیں جو اصلاح کے لیے ہو اور اِفْرا وہ جو افساد کے لیے ہو اور افترا دونوں میں آتا ہے اور فِرْیَۃ کذب یعنی جھوٹ کو کہتے ہیں جس سے اِفْتَرٰی بمعنی اِخْتَلَقَ ہے۔ یعنی جھوٹ بنایا۔

دوزخ سے بریت کا دعویٰ: یہی مضمون البقرہ ۲-۸۰ میں ہے مگر یہاں مزید وضاحت موجود ہے کہ عیسائی بھی شامل ہیں کیونکہ یہاں دین کے بارہ میں کسی افترا کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ سب سے بڑا افترا دین کے بارہ میں جو کیا گیا اس کی مرتکب عیسائی قوم ہوئی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ رسول اور نبی کو خدا بنا دیا۔ اس سے اگلی آیت میں جو جواب دیا ہے ووفیت کل نفس ما کسبت وہ بھی عیسائی مذہب کے عقیدۂ کفارہ پر ایک زد ہے کیونکہ کفارہ کی رو سے صرف مسیح کے خون پر ایمان لانے سے ایک شخص نجات پا جاتا ہے۔ مگر اس کے خلاف قرآن کریم یہ اصول سکھاتا ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنے اپنے اعمال کا پورا بدلہ ملے گا۔

لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾
قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ
مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَ
تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ
الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾

اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا [۳۹۶]
کہہ اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہتا ہے ملک دیتا ہے
اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے
عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ تیرے ہی
ہاتھ میں (سب) بھلائی ہے تو ہر چیز پر قادر ہے۔ [۳۹۷]

ع ۳۹۶ فکیف۔ اس دن کے ہول اور عظمت کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔ اور مراد ہے کیف تکون حالھم ان کی حالت کیسی ہوگی۔ لیوم سے مراد فی یوم ہے یعنی اس دن یا لجزاء یوم یعنی اس دن کی سزا کے لیے۔

فعل اور اس کی جزا میں اتصال: دفیت کل نفس ما کسبت۔ جو کچھ کسی جی نے کام کیا ہے یا کمائی کی ہے وہی اس کو پورا دیا جائیگا۔ یہاں کام کی جزا دینے کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ خود اس کمائی کا ذکر کیا جو ہر جان کر رہی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہر ایک عمل کسی کمائی کا موجب ہے یعنی اس کا کوئی نتیجہ ساتھ ساتھ پیدا ہوتا جاتا ہے اور یہ وہ کمائی ہے جو ہر جان کر رہی ہے اور یہی نتائج پورے کے پورے قیامت کے دن مل جائیں گے۔ روح المعانی میں ہے کہ کمائی کا پورا دیا جانا اس لحاظ سے کہا ہے کہ کسب یعنی کام اور اس کی جزا میں کمال اتصال ہے۔

ع ۳۹۷ اللّٰھُمَّ اصل میں یا اللہ ہے اور یا کی بجائے آخر میں میم مشدد لایا گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی دعا سے مخصوص ہے۔ بعض کے نزدیک اس کی اصل ترکیب ہے یا اللہ امّنا بخیر۔ اے اللہ ہمارے ساتھ بھلائی کا قصد فرما (غ)۔ یا قرآن کریم میں اللّٰھم سے جس قدر دعائیں آئی ہیں ان میں اللّٰھم کے ساتھ کسی اور صفت الٰہی کا بھی ذکر ہے۔ جیسے یہاں۔ اور اللّٰھم فاطر السمٰوات (الزمر ۳۹-۴۶) سبحانك اللّٰھم (یونس ۱۰-۱۰)

الملك۔ مُلك کے معنی ہیں جس شے میں تصرف حاصل ہے حکم کے ساتھ اس کو ضبط میں رکھنا (غ) اور مِلك اس سے بمنزلہ جنس کے ہے یعنی ہر مُلک مِلک ہے مگر ہر مِلک مُلک نہیں۔ اور لسان العرب میں ملک اور ملکوت کے جب اللہ کی طرف مضاف ہوں ایک ہی معنی دیتے ہیں سلطانہ و عظمتہ یعنی اللہ تعالیٰ کا تسلط اور اس کی عظمت۔ مجاہد نے یہاں صرف نبوت معنی لیے ہیں اور قتادہ نے حکومت اور بادشاہت (ج) اور حق یہ ہے کہ دونوں شامل ہیں۔

تنزع۔ نزع کے معنی ہیں ایک چیز کو اس کی جائے قرار سے کھینچ لیا اور اس کا استعمال اعراض پر بھی ہوتا ہے مثلاً محبت اور عداوت کے نکال دینے پر ونزعنا ما فی صدورھم من غل (الحجر ۱۵-۴۷) اور اسی سے تنازع اور مُنازعۃ ہے ایک دوسرے کو کھینچنا جس سے مراد باہم جھگڑا ہے (غ)

خدا کی بادشاہت: یہاں مسلمانوں کو بتایا ہے کہ دنیا اور آخرت کی بادشاہت سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنی مشیت سے جس کو چاہتا ہے بادشاہت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے اور ان تغیرات پر تاریخ عالم شاہد ہے۔ مگر یہاں لفظ مُلك میں جس کے حقیقی معنی سلطنت عظمت ہیں نبوت اور بادشاہت دونوں شامل ہیں اور خاص لفظ ملك کو اختیار کرنے میں یہ حکمت ہے کہ تا یہ معلوم ہو جائے کہ یہ وہی خدا کی بادشاہت ہے جس کی انتظار چلی آتی تھی اور جس کے قرب کی خوشخبری حضرت مسیح علیہ السلام نے دی تھی اور جس کے جلد آنے کے لیے اپنے پیروؤں کو روزانہ دعا میں یہ سکھایا تھا کہ "تیری بادشاہت آوے" (متی ۶: ۱۰) سلسلہ بنی اسرائیل میں بھی یہ خدا کی بادشاہت موجود تھی مگر اس کا اپنے کمال کو پہنچنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے مقدر تھا۔ اس لیے خدا کی بادشاہت کا لفظ بالخصوص اسی پر بولا گیا ہے اور ان الفاظ میں یہ خوش خبری مسلمانوں کو سنائی اور دوسرے یہود و نصاریٰ کو توجہ دلائی کہ خدا کی بادشاہت اب بنی اسرائیل سے نکل کر دوسری قوم کے پاس جانے والی ہے اور یہ اس وعدہ کے مطابق تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اور جس کی خبر تمام نبیوں کے ذریعہ سے دی گئی تھی۔ چنانچہ سلسلہ موسوی کے آخری نبی حضرت مسیح علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ "جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دیدی جائے گی" (متی ۲۱: ۴۲ و ۴۳) یہ وہی خدا کی بادشاہت تھی جو اب اللہ تعالیٰ کے قدیم وعدے کے مطابق محمد رسول اللہ صلعم کو دی گئی تھی۔

لفظ عزت میں حکومت کی خوشخبری: یہاں علاوہ ملك کے عزت دینے کا ذکر بھی فرمایا ہے جس سے صاف مطلب یہ ہے کہ وہ مغلوب اور محکوم نہیں رہیں گے اور یہ پیشگوئی ملک و حکومت دینے کی اور مسلمانوں کو دنیا میں ایک معزز قوم بنانے کی اس وقت کی جاتی ہے جب ابھی عرب کے اندر مسلمان چاروں طرف کفار میں گھرے ہوئے تھے اور کفار کا ہی غلبہ تھا اور یہودی اور عیسائی اور مشرک سب اس بات پر اتفاق کر چکے تھے کہ اس چھوٹے سے گروہ کو نابود کر دیں۔ پس یہ مسلمانوں کے لیے بطور تسلی نازل ہوئی اور نہ صرف اس حالت میں ان کی تسلی کے لیے تھی بلکہ آئندہ بھی یہ ہمیشہ ان کے لیے جب

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَىِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾

تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور مُردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہے، اور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔[۳۹۸]

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ

مومن مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں[۳۹۹] اور جو ایسا کرے تو اس کا اللہ کے ساتھ کچھ تعلق نہیں

کبھی اسلام اسی قسم کی مشکلات میں مبتلا ہو موجب تسلی رہے گی۔

۳۹۸ تولج۔ وُلُوج تنگ جگہ میں داخل ہونے کو کہتے ہیں (غ) حتّٰی یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف ۷-۴۰) اور ایلاج اس طرح پر داخل کرنا۔ یہاں تاریکی کے روشنی میں اور روشنی کے تاریکی میں داخل کرنے پر یہ لفظ بولا ہے۔

عموماً مُردہ سے زندہ اور زندہ سے مُردہ کے نکالنے سے مراد نطفہ سے جاندار کا اور جاندار سے نطفہ کا پیدا کرنا مراد لیا گیا ہے۔ مگر یہاں مراد یہ نہیں جس کو پچھلی آیت میں بادشاہت کا دینا، معزز بنانا کہا تھا اسی کو یہاں دن اور زندگی قرار دیا ہے اور جس کو وہاں بادشاہت کا لے لینا اور ذلیل کرنا فرمایا تھا اسے یہاں رات اور مردگی سے تعبیر کیا ہے۔ قوموں کی زندگی اور مردگی عزت اور ذلت یہی چیز ہے۔ انقلابات زمانہ کی طرف توجہ دلائی ہے مسلمان بھی غور کریں اور جو آج برسر حکومت ہیں وہ بھی۔

۳۹۹ دون۔ یقال للقاصر عن الشیٔ دون یعنی کسی چیز سے پیچھے رہنے والے کے متعلق دُوْن کہا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک وہ دُنُوّ سے مقلوب ہے (غ) پس من دُون المؤمنین کے معنی ہوئے مومنوں کو چھوڑ کر یا مومنوں سے پیچھے رہتے ہوئے یا ان کے معاملہ میں کوتاہی کرتے ہوئے۔

موالات کفار: ان الفاظ کے معنی نہایت صاف ہیں مگر قرآن کریم کے پر حکمت کلام کو مدنظر نہ رکھنے سے بڑی بڑی مشکلات پیش آئی ہیں یہاں مومنوں کو کفار کی جس ولایت سے روکا ہے اس کے ساتھ من دون المؤمنین کے لفظ بڑھائے ہیں تو گویا یوں فرمایا کہ مومنوں کو نہیں چاہیئے کہ مومنوں کو چھوڑ کر یا مومنوں کے معاملہ میں پیچھے رہتے ہوئے یعنی ان کے فوائد کو نقصان پہنچاتے ہوئے کفار کی ولایت اختیار کریں ولی اور ولایۃ کے معنی کے لیے دیکھو ۳۳۲ جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس کے معنی میں قرب و محبت کے تعلقات کے ساتھ نصرت بھی شامل ہے۔ پس یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ شدید تعلق قرب و محبت و نصرت جو مومنوں کو باہم ہوتا ہے کفار کے ساتھ وہ نہیں ہو سکتا۔ گویا یہاں یہ فرمایا کہ کفار کے ساتھ بھی تم کو معاہداتِ نصرت وغیرہ کرنے ہونگے مگر ایسا نہ ہو کہ کفار کے ساتھ تمہارے تعلقات نصرت ایسے ہوں جیسے مومنوں کے ساتھ یا ایسے جن سے مومنوں کو ہی نقصان پہنچے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے ساتھ تعلق یا معاہدہ نصرت ہو سکتا ہے مگر ایسا کوئی معاہدہ جائز نہیں جس میں مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک عظیم الشان سلسلہ اخوت کل اقوام عالم میں قائم کرتا ہے اور تمام قومی اور ملکی تفرقوں کو مٹاتا ہے۔ خدائے عالم الغیب جانتا تھا کہ مسلمان مختلف ملکوں میں رہیں گے ان کے تعلقات مختلف قوموں سے ہونگے اور غیر مسلم اقوام سے بھی تعلقات اور معاہدات نصرت ہونگے پس شرط یہ لگا دی کہ کسی دوسری قوم کے ساتھ ایسا تعلق یا معاہدہ نصرت کا نہ ہو جس کی غرض اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو نقصان پہنچانا ہو کیونکہ اس کے بغیر اسلام کی اخوتِ عالمگیر کا سلسلہ قائم ہی نہ ہو سکتا تھا۔ پس جب مسلمانوں کو حکومت اور بادشاہت کی خوش خبری سنائی تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اُصولِ اخوت اسلامی کو کسی حالت میں نہ بھولیں اور کفار کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائیوں کو تباہ نہ کریں۔ اخوت اسلامی کا تعلق تمام تعلقات پر مقدم ہو اور اس کا ذکر بالخصوص ایسے موقعہ پر کرنا جہاں عیسائی مذہب کا ذکر ہو رہا ہے یہ بھی اس کلام کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت ہے۔ گویا بتا دیا کہ عیسائی قوموں کے ساتھ بالخصوص تمہیں یہ معاملہ پیش آنے والا ہے کہ وہ تم سے ایک دوسرے کے خلاف فوائد معاہدے کر کے تمہاری بیخکنی کے درپے ہونگے اور تمہیں نقصان پہنچائیں گے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی سلطنت شوکت عظمت کو نقصان پہنچنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہوئی ہے کہ وہ غیر قوموں کے ساتھ مل کر اپنے بھائیوں کو نقصان پہنچاتے رہے ہیں اور غیر قوموں بالخصوص عیسائی اقوام نے ہمیشہ اس ہتھیار کو استعمال کر کے مسلمانوں کی قوت و شوکت کو توڑا ہے اسی لیے خدا کے پُر حکمت کلام میں تؤتی الملك کے ساتھ تنزع الملك کا بھی ذکر ہے کہ کیا اب بھی مسلمان سمجھیں گے؟ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ کفار کے ساتھ تعلقات نصرت وغیرہ ہو سکتے ہیں تو یہ خود نبی کریم صلعم اور صحابہؓ کے نمونہ سے ظاہر ہے۔ حبش میں جو مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے وہ حبش کے عیسائیوں کی حمایت میں ان کے دشمنوں کے خلاف لڑے نبی کریم صلعم نے کئی مشرک قبائل سے معاہدات کیے اور یہودیوں سے بھی معاہدات کیے جن میں دشمنان اسلام کے مقابلہ میں ان قبائل نے یا غیر جانبدار رہنا منظور کیا اور یا مسلمانوں کو امداد دینا منظور کیا اس شرط پر کہ ان پر حملہ کے وقت مسلمان ان کی امداد کریں۔ جنگ حنین میں مشرکین مسلمانوں کی فوج میں موجود تھے۔ صحابہ کے وقت میں ایران کی جنگوں میں عیسائی فوج مسلمان فوج کے پہلو بہ پہلو لڑی۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام سب غیر مسلموں کے ساتھ یکساں سلوک کا حکم نہیں دیتا۔ اور ترک موالات بھی مدارج

مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ
تُقٰىةً ؕ وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ
اِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾
قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ
یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا

سوائے اس کے کہ تم ان سے کسی طرح بچاؤ کرو[۴۰۰]
اور اللہ تم کو اپنی سزا سے ڈراتا ہے۔ اور اللہ ہی کی
طرف انجام کار پہنچنا ہے[۴۰۱]۔
کہہ اگر جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو
اللہ اسے جانتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

رکھتی ہے۔ اس پر اصولی بحث سورہ ممتحنہ میں آئے گی۔

ع۴۰۰ لیس من اللہ فی شیئ۔ من اللہ قائم مقام من ولایۃ اللہ ہے اور فی شیئ میں تنوین تحقیر کے لیے ہے۔ یعنی اللہ کی ولایت سے وہ کسی چیز میں نہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو اللہ کی کچھ ولایت حاصل نہیں۔ یا اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

تتقوا منہم تقٰىۃ۔ وقایۃ کے معنی بیان ہو چکے ہیں ایذا اور ضرر کی باتوں سے اپنے آپ کو بچانا ع۱ اور یہی معنی تقوٰی کے ہیں جعل النفس فی وقایۃ مما یخاف (غ) جس سے خوف ہو اس سے اپنی حفاظت کر لیں اور اسی معنی کے لحاظ سے یہاں تتقوا کا صلہ من آیا ہے۔ یعنی ان کی طرف سے کسی نقصان کا خوف ہے تو اس سے تم اپنا بچاؤ کر لو۔ تقٰىۃ بھی اسی سے ہے یہ اصل میں وُقَیَۃ تھا و تا سے بدل گئی اور یائے متحرکہ نے الف کی صورت اختیار کر لی۔ پس تقاۃ کے معنی بچاؤ ہوئے اور نکرہ لانے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی طرح کا بچاؤ کر لیں۔

مسئلہ تقیہ: مفسرین نے یہاں تتقوا کے معنی تخافوا لیے ہیں اور معنی یوں کیے ہیں کہ کافروں کو کسی صورت میں دوست نہ بناؤ سوائے اس کے کہ ان سے تم کو خوف ہو اس چیز کا جس کا خوف واجب ہے یا کچھ خوف ہو گویا اس صورت میں ان سے ظاہر طور پر دوستی کا تعلق کر لو گو دل میں کچھ نہ ہو اور پھر اس سے مسئلہ تقیہ کو اخذ کیا ہے۔ مگر درحقیقت ان الفاظ کو مسئلہ تقیہ سے کچھ تعلق نہیں۔ قرآن کریم میں اکراہ یا جبر کی حالت میں دوسری جگہ یوں فرمایا ہے الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان (النحل ۱۶-۱۰۶) یہ مکی آیت ہے اور مفصل بحث اس پر اپنے موقعہ پر ہو گی مگر اس میں صرف اس قدر اجازت دی ہے کہ اگر قتل وغیرہ کے خوف کے وقت انسان کے منہ سے جان بچانے کے لیے کلمہ کفر نکل جائے تو اللہ معاف کر دے گا مگر ظاہر طور پر دوستی کا رنگ رکھنا حالانکہ دل میں دشمنی ہو یا بات بات پر جھوٹ بول کر پیچھا چھڑانا اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے یہ زندگی کا منافقانہ رنگ ہے جسے اسلام سخت ترین نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے پس اکراہ کی صورت میں اگر کوئی شخص کوئی بات کہہ دے تو وہ اسے معاف ہے گو یہ اعلیٰ مقام مومن کا نہیں۔

اہل تشیع میں تقیہ: لیکن اہل تشیع نے اس کو بہت وسیع کیا ہے اور ان کے نزدیک بوقتِ ضرورت ہر قول میں تقیہ جائز ہے ظاہر ہے کہ اس طرح جھوٹ پر جرأت ہوتی ہے اور ایک شخص کے کلام سے امن اُٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ اپنی ضرورت کا فیصلہ کرنے والا وہ خود ہوا دوسرے کو کیا علم ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے یہ صدق دل سے کہہ رہا ہے یا جھوٹ کہہ رہا ہے اور اس طرح پر منافقت دنیا میں بڑھتی ہے۔ چنانچہ ان کے بعض آئمہ کا ایک یہ بھی قول مشہور ہے کہ من صلی وراء سنی تقیۃ فکانما صلی وراء نبی (ر) یعنی جو شخص سُنّی کے پیچھے تقیہ کر کے نماز پڑھ لے گویا اس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔

کفار سے موالات کی ایک صورت: الفاظ الا ان تتقوا منہم تقٰىۃ کے معنی صاف ہیں مگر یہ کہ ان سے بچاؤ کر لو کسی طرح کا بچاؤ کر لینا۔ یعنی پورا پورا بچاؤ کر لو۔ گویا کفار سے یہ موالات کی صورت رکھی ہے کہ اس میں تمہارا اپنا بچاؤ مدنظر ہو یعنی کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے اس کو اختیار کر لینا جائز ہے مثلاً جنگ کی صورت میں ہی جب مسلمان مغلوب ہو جائیں تو مجبوراً اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے جو صورت اختیار کرنی پڑے کر لیں۔ مگر جو کچھ عہد کریں اس کی پابندی ضروری ہو گی۔ جیسے نبی کریم صلعم نے صلح حدیبیہ میں مغلوب فریق کی شرائط قبول کیں تو پھر ان کا ایفا بھی کیا یہانتک کہ کفار نے خود اس عہد کو توڑ دیا۔ ایسا ہی جو کفار جنگ نہیں کرتے مگر ویسے اسلام کے نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان سے بھی مسلمانوں کو بچاؤ کی صورت کر لینی جائز ہے مگر یہ بچاؤ اور حفاظت قومی ہے نہ فرداً فرداً۔

ع۴۰۱ یحذرکم اللہ۔ حَذَر کسی خوف والے امر سے بچنا ہے (غ) اسی سے تحذیر ہے۔ نفسہ سے مراد عقاب نفسہ ہی ہے نفس کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے مراد ذات ہے۔ سزا کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنے میں سخت تہدید ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو کفار کا خوف ہے تو اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی سزا کا خوف ہونا چاہیئے۔ پس ایسا نہ ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے دشمن سے خوف کرتے ہوئے اس کے ساتھ مل جاؤ۔ اور بعض کے نزدیک نفسہ میں نفس کی اضافت اللہ کی طرف ملک کی اضافت ہے اور نفس سے مراد انسانی نفس امارہ ہے (غ) گویا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے نفوس امارہ سے ڈراتا ہے۔

فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾
يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ
مُّحْضَرًا ۚۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ معانقة
اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ
اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ ع ٣
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[402]
جس دن ہر شخص جو کچھ اس نے نیکی کی ہے موجود پائے گا
اور جو کچھ اس نے بدی کی ہے، آرزو کرے گا کہ
اس کے اور اس کے درمیان لمبا فاصلہ ہوتا اور اللہ تم کو اپنی
سزا سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے[403]
کہہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو کہ اللہ تم سے
محبت کرے اور تمھیں تمھارے گناہ بخش دے اور اللہ بخشنے والا
رحم کرنے والا ہے۔[404]

ع۴۰۲ دشمنانِ اسلام کی مخفی تدابیر: پچھلی آیت میں اعدائے اسلام کا ذکر تھا اور اہل اسلام کو ہدایت کی تھی کہ وہ انہیں اپنا دوست نہ بنائیں اس آیت میں اعدائے اسلام کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ خواہ تم اپنی تدابیر کو جو اسلام کی بیخکنی کے لیے کر رہے ہو۔ اپنے دلوں کے اندر مخفی رکھو اور خواہ ان کو ظاہر کرو یعنی خواہ پوشیدہ طور پر دشمنی کرو یا ظاہر طور پر اللہ تعالیٰ کو سب علم ہے اور وہ کسی تمہاری تدبیر کو کارگر نہ ہونے دیگا۔ بلکہ اس کی سزا تم کو دے گا۔ ہمارے نبی کریم صلعم کا زمانہ تو ایسا تھا کہ اس وقت سب لوگ علی الاعلان ہی دشمن تھے سوائے تھوڑوں کے۔ اس لیے مخفی دشمنی کے ذکر میں اسلام کے آخری زمانہ کے دشمنوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا اظہار کرتے اور ان کی دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ مگر ہر وقت ایسی تدابیر کے سوچنے میں مصروف ہیں جن سے اسلام اور مسلمانوں کی بیخکنی ہو۔ سو یہ آیت مسلمانوں کے لیے باعثِ تسکین ہے کہ ان کا خدا مخفی تدابیر کا بھی وہی حشر کرے گا جو کھلی تدابیر کا کیا تھا۔ اس سورۃ کے صدر کا اصل مضمون اسی نتیجہ کا موید ہے۔

ع۴۰۳ وما عملت من سوء۔ مراد تو یہی ہے کہ جو کچھ بدی کی ہے اسے بھی موجود پائے گا لیکن محضرا کے لفظ کو خیر کے ساتھ رکھا ہے۔ کہ اصل غرض وہی ہے اور بدی کی سزا بتقاضائے ضرورت ہے اور نیز ما عملت من سوء کو اس لیے بھی علیحدہ رکھا گیا ہے کہ اس کے متعلق کسی تمنی کا ذکر اگلے الفاظ میں آتا ہے۔
بینہا میں ضمیر بعض نے یوم کی طرف لی ہے یعنی اس جزا و سزا کے دن میں اور اس میں زمانہ دراز ہوتا مگر چونکہ جو نیک اعمال کی جزا پاتا ہے وہ یہ خواہش نہیں کر سکتا اس لیے ما عملت کی طرف ہی اس کی ضمیر پھیرنا صحیح ہے۔
امد۔ اَمَد اور اَبَد کے معنی قریب قریب ہیں۔ لیکن ابد اس زمانہ کو کہا جاتا ہے جس کے لیے کوئی حد محدود نہیں اور امد اس کو جو جب مطلق ہو تو اس کی حد مجہول ہوتی ہے اور زمان میں اور اَمَد میں یہ فرق ہے کہ اَمَد بلحاظ غایت بولا جاتا ہے (غ)
اس آیت میں اسلام کے چھپے اور کھلے دونوں قسم کے دشمنوں کو یہ بتایا ہے کہ بدی کرنے والا انسان آخر اپنی بدی پر ضرور پچھتاتا ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے جب وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اس نے وہ بُرا کام نہ کیا ہوتا۔ اس میں فطرت انسانی کی شہادت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ جو لوگ اسلام کے ساتھ بدی کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آخرکار پچھتائیں گے۔ اس میں یہ بشارت بھی ہے کہ وہ انجام کار مسلمان بھی ہوں گے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ اس یوم مذکور کو دنیا کا یوم سمجھا جائے اور کوئی شبہ نہیں کہ اس زندگی میں بھی انسان پر ایک وقت آتا ہے جب وہ اپنی بدیوں پر افسوس کرتا ہے لیکن اگر اس یوم کو یوم قیامت لیا جائے تو آخرت کی جزا و سزا مراد ہوگی اور یہ محض وعید ہوگا۔ بدی اور نیکی کے نتائج پانے کے اس قانون میں ابطال کفارہ بھی کیا ہے۔

ع۴۰۴ کفار کے ذکر میں مسلمانوں کو ہدایات: یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ ان تمام آیات میں جن میں کسی خاص قوم سے خطاب ہے ایک طرف اگر ان پر اتمام حجت کرتا چلا جاتا اور لطیف سے لطیف امور کی طرف ان کو توجہ دلاتا ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو بھی کامل ہدایات دیتا چلا جاتا ہے۔ ان آیات میں جیسا کہ بیان ہو چکا خاص خطاب عیسائیوں سے ہے اور اس لیے ان کو بتایا ہے کہ تم خدا کے محب اور محبوب ہونے کے بڑے دعویدار ہو اور اس بات کے مدعی ہو کہ تمہارا مذہب خدا سے محبت سکھاتا ہے مگر خود مسیح جس کی پیروی سے تم خدا کی محبت کے مقام تک پہنچ سکتے تھے تم کو ہدایت دے گیا ہے کہ تمہاری خدا سے محبت اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ میرے پیچھے آنے والے کو مانو اور اس کی اتباع کرو۔ اور یوں یہاں مسیح کے ان الفاظ کی طرف اشارہ ہے جو یوحنا ۱۴: ۱۵ و ۱۶ میں مذکور ہیں "اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو اور میں اپنے باپ سے درخواست کرونگا اور وہ تمہیں دوسرا تسلی دینے والا بخشے گا۔" جس لفظ کے معنی تسلی دینے والا کیے گئے ہیں اس کے معنی شفیع بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ بائبل کے نئے ترجموں کے حواشی پر صاف نوٹ دیا ہوا ہے۔ اب جائے غور ہے کہ یہ دوسرا تسلی دہندہ دوسرا شفیع جو مسیح کے بعد دنیا میں آیا کون ہے؟ عیسائیوں کو حکم تھا کہ جب دوسرا شفیع آجائے تو اس کی اتباع کریں اور اسی بات پر قرآن کریم یہاں ان کو ملزم کرتا ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٢﴾
کہہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انکار کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٣﴾
اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور ابراہیمؑ کے گھرانے اور عمران کے خاندان کو قوموں پر چُن لیا۔[٤٠٥]

ذُرِّيَّةً ۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٤﴾
(یہ) ایک دوسرے کی نسل سے (تھے) اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔[٤٠٦]

دوسری طرف مسلمانوں کو بھی بتاتا ہے کہ وہ نرے زبانی دعووں سے یا اپنے تجویز کردہ طریقوں سے خدا کے محبوب نہیں بن سکتے بلکہ ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اس بات کو بیان کرنے کی ضرورت اس لیے تھی کہ اس رکوع میں ذکر یہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن قوموں کو پہلے چنا، کس طرح وہ آخر رضائے الٰہی کی راہ سے دور پڑ گئیں۔ اس لیے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ رضائے الٰہی کے مقدم کرنے کو کبھی نہ چھوڑیں اور نہ دنیا کی مرغوبات میں حد سے زیادہ منہمک ہوں تاکہ ان کا حشر دوسری قوموں کی طرح نہ ہو۔

الفاظ یغفر لکم ذنوبکم میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ گناہوں سے حفاظت کفارہ پر ایمان سے نہیں ہوتی۔ بلکہ ان راہوں پر چلنے سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والی ہیں اور جن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل طور پر دنیا پر ظاہر کیا جیسا کہ خود مسیح نے بھی کہا تھا "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔" پس جب تمام سچائی کی راہیں دکھانے والا ابھی آنا تھا تو کفارہ گناہوں سے کیونکر چھڑا سکتا ہے۔

ع٤٠٥ نوح عربی میں ناح کے معنی ہیں نوحہ کیا۔ رویا۔ اور اس کا مصدر نوح ہے حضرت نوح ایک عظیم الشان نبی گزرے ہیں جن کی پیدائش بائبل والوں نے کوئی تین ہزار سال قبل مسیح بیان کی ہے مگر نئے مفسرین بائبل اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم سے قبل کے واقعات کے متعلق کوئی صحیح تاریخی اندازہ موجود نہیں قرآن کریم سے ایسا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم کے بعد ایک عظیم الشان نبی حضرت نوح ہوئے ہیں۔ جن سے ایک نئے سلسلہ کی بنیاد پڑی۔ لیکن موجودہ نسل انسانی کا حضرت نوح کی اولاد سے ہونا قرآن شریف سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

عمران۔ یہ امر تاریخی طور پر ثابت ہے۔ کہ حضرت موسیٰ کے والد کا نام عمران تھا اور اس لیے موسیٰ اور ہارون سے جو سلسلہ نبوت شروع ہوا وہ آل عمران کے اندر داخل ہوگا۔ گویا آل عمران سلسلہ موسویہ کے قائم مقام ہے۔ مقاتل نے یہاں عمران سے مراد حضرت موسیٰ کے والد کو ہی لیا ہے۔ بہت سے مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ حضرت مریم کے والد کا نام بھی عمران تھا مگر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ گو اس کے خلاف بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔

حضرت عیسیٰ کے ذکر کی ابتداء: اس آیت سے اس رکوع بلکہ اس سورۃ کا اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو صاف کر کے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کو ظاہر کرنا ہے۔ اس قصہ کو شروع کرنے کے لیے ابتدا یوں کی ہے کہ عیسیٰ خدا کا ایک ہی برگزیدہ بندہ نہیں بلکہ جب سے نسل انسانی کی ابتدا ہوئی اسی وقت سے اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو برگزیدہ کرتا رہا ہے۔ حضرت آدم ان کے بعد ان کی نسل سے حضرت نوح جنہوں نے ایک نئے سلسلہ کی بنیاد رکھی پھر آل ابراہیم اور آل عمران جو آل ابراہیم کی ایک شاخ ہے اور اس آل عمران یعنی سلسلہ موسویہ کے بہت سے انبیاء میں سے ایک حضرت عیسیٰ ہیں۔ آل ابراہیم کے بعد آل عمران کا ذکر کر کے یہ اشارہ کیا ہے کہ آل ابراہیم کا دوسرا عظیم الشان سلسلہ، سلسلہ محمدیہ ہے جیسا کہ بالتفصیل آگے آئے گا۔ آدم سے شروع کرنے میں اور پھر قومی نبیوں کا ذکر کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح آدم اول کا پیغام بتقاضائے ضرورت تمام نبیوں سے ایک الگ رنگ رکھتا تھا۔ اسی طرح آدم آخر یعنی محمد رسول اللہ صلعم کا پیغام بھی بتقاضائے ضرورت تمام نبیوں سے الگ رنگ کا ہونا ضروری تھا۔ اور جس طرح پہلے آدم کا پیغام اس کی ساری ذریت کی طرف تھا گو وہ محدود ہو، کیونکہ یہ موجودہ نسل انسانی کی ابتدا تھی اور حضرت آدم اپنی ہی ذریت کی طرف مبعوث ہوئے اسی طرح آدم آخر کا پیغام ساری نسل آدم یعنی نسل انسانی کی طرف ہوا۔ گو وہ اسی وجہ سے سب سے زیادہ وسیع ہو گیا۔ کیونکہ آدم آخر کے وقت نسل انسانی تمام روئے زمین پر پھیل چکی تھی۔ آدم اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام تمام نسل انسانی کی طرف تھا۔ اور درمیان میں جس قدر نبی ہوئے ہیں ان کا پیغام ایک ایک قوم کی طرف تھا۔

تمام جہانوں پر چن لینے سے یہ مراد ہے کہ اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں یا قوموں پر ان کو چنا۔ کل دُنیا لازمی طور پر مراد نہیں۔ کیونکہ کل دنیا پر اصطفا کے لیے صرف ایک کا ذکر چاہیئے تھا۔ بہتوں کا ذکر بتاتا ہے کہ اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں پر ہی اصطفا مراد ہے۔

ع٤٠٦ ذریۃ۔ یہ بدل ہے۔ آل ابراہیم اور آل عمران سے یا حال ہے۔ اس لیے منصوب ہے۔

بعضها من بعض۔ مراد ایک دوسرے کی نسل سے ہونا ہے۔ یعنی آل عمران آل ابراہیم کی نسل ہے یا آل ابراہیم نوح کی نسل سے ہے۔ اور بعض کے نزدیک بعضها من بعض سے اشارہ اتحاد نسل کی طرف نہیں بلکہ ایک اور قسم کی یگانگت کی طرف ہے جو دین سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾

جب عمران کی ایک عورت نے کہا[407] میرے رب جو کچھ میرے پیٹ میں ہے مَیں نے آزاد کر کے تیری نذر مانا ہے پس مجھ سے قبول فرما کیونکہ تو سننے والا جاننے والا ہے[408]۔

اللہ تعالیٰ کی صفات سمع وعلم کے آخر لانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی دعاؤں کو سنتا اور پھر جانتا ہے کہ کون شخص کس بلند مقام پر کھڑا کیا جانے کے لائق ہے۔

ع۴۰۷ امراۃ عمران۔ امرأۃ عمران کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں۔ عمران کی بی بی (اس صورت میں عمران مریم کے والد کا نام ہوا اور بزرگوں کے ناموں پر نام رکھنا یہ ایک عام رواج تھا) یا آل عمران کی عورت۔ چونکہ اوپر آل عمران کی برگزیدگی کا ذکر تھا اور اسی کے متعلق مضمون چلتا ہے اس لیے اس دوسرے معنی کو ترجیح ہے۔ اور عمران کا آلِ عمران کی جگہ رکھا جانا عام محاورہ کے مطابق ہے چنانچہ بائبل میں بھی ایک بڑے مورث کے نام سے ایک قوم کو پکارا گیا ہے جیسا بنی اسرائیل کی جگہ بہت دفعہ صرف اسرائیل ہی آیا ہے اور بنی اسمٰعیل کو قیدار کے نام سے پکارا ہے جو عربوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ پس اس لحاظ سے قرین قیاس یہی ہے کہ عمران سے مراد سلسلہ آل عمران ہے اور یہاں ذکر انہی میں سے ایک عورت کا ہے اور چونکہ اوپر آل عمران کے اصطفا کا ذکر ہے جو عام ہے یہاں ان میں کی ایک خاص عورت کا ذکر فرمایا جس کے ذریعہ آل عمران کے آخری برگزیدہ انسان کا ظہور ہونا تھا۔ ایک دوسری مثال جو اسی ذکر کے اندر آئے گی وہ بھی آل عمران کی آخری یادگاروں یعنی زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کے متعلق ہے یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ مریم کو اخت ھارون (مریم[19] - ۲۸) اور ابنت عمران (التحریم[66] - ۱۲) کر کے پکارا گیا ہے اور گو بعض مفسرین نے ان دونوں ناموں عمران اور ہارون کی یہ توجیہ کی ہے کہ عمران حضرت مریم کے والد کا نام تھا اور ہارون آپ کے ایک بھائی کا نام تھا۔ اور اس کے خلاف شہادت نہ ہونے کی وجہ سے یہ بات بھی قابل قبول ہے۔ لیکن چونکہ اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ اور جس عمران کا اوپر ذکر کیا اس سے صاف طور پر مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں۔ اور ہارون جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ بھی اسی عمران کے بیٹے ہیں۔ اسی لیے اقرب الی الفہم یہی بات ہے کہ امرأۃ عمران اور اخت ھارون دونوں لفظوں میں انہیں اعلےٰ مورثوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کا کوئی نسب نامہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مگر یہ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ مریم کے والدین کا تعلق بنی اسرائیل میں خاندان کہانت سے تھا۔ اور اسی خاندان سے حضرت زکریا کا بھی تعلق تھا اور مریم کا ہیکل کی خدمت کے لیے مخصوص کیا جانا بھی اسی بات کو ظاہر کرتا ہے۔ اور چونکہ کہانت کا تعلق حضرت ہارون کے خاندان سے تھا اس لیے مریم کو اُخت ہارون اور اس کی والدہ کو امرأۃ عمران کے نام سے پکارا ہے عربی زبان میں لفظ اب۔ ام۔ اخ۔ اخت سب کے سب وسیع معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ نبی کریم صلعم فرماتے ہیں انا دعوۃ ابی ابراھیم میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ یہاں ابراہیم کو صاف طور پر اپنا اَب کہا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت صفیہؓ نے شکایت کی کہ مجھے یہودی عورت کہا جاتا ہے تو آپ نے فرمایا تو نے جواب میں یوں کیوں نہیں کہا ان ابی ھارون وعمی موسیٰ وزوجی محمدؐ میرا باپ ہارون ہے اور میرا چچا موسیٰ ہے اور میرا خاوند محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ یہاں صفیہؓ کا باپ اور چچا ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کو قرار دیا ہے اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی جملہ میں زوج تو اپنے حقیقی معنوں پر ہے اور اَب اور عَم دُور کے تعلق والوں پر بولے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ عمران اور ہارون کے لفظوں سے وہی عمران اور ہارون مراد نہ لیے جائیں اور امرأۃ اور اُخت کے وسیع معنی نہ لیے جائیں۔

ع۴۰۸ محررا۔ تحریر کے معنی انسان کا حُر کر دینا (غ) اور مفردات میں ہے کہ انسان حُرّ دو طرح پر ہوتا ہے ایک وہ جس پر کسی شے کا حکم جاری نہ ہو۔ جیسے الحر بالحر یعنی جسمانی طور پر آزاد۔ اور دوسرا اخلاقی طور پر آزاد ومن لم تتملکہ الصفات الذمیمۃ من الحرص والشرہ علی المقتنیات الدنیویۃ (غ) یعنی وہ شخص جس پر بری صفات حکمران نہیں۔ جیسے دنیوی مال ودولت پر حرص اور لالچ۔ راغب کے نزدیک محررا سے مراد اسی قسم کی صفات ذمیمہ سے آزادی ہے جیسا کہ اس کے مقابل پر کسی شخص کو عبد الدرھم کہہ دیتے ہیں۔ یا عبد الشھوۃ کہہ دیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک محررا سے مراد صرف اس قدر ہے کہ وہ اس سے دنیوی نفع نہ اُٹھائے گی، بلکہ اس کو عبادت الٰہی کے لیے مخصوص کیا جائیگا۔ اس لیے شعبی نے اس کے معنی مُخلص کیے ہیں۔ مجاہد نے خادماً للبیعۃ کیے ہیں۔ یعنی عبادتگاہ کی خادم اور بعض نے امر دنیا سے آزاد اس کے معنی کیے ہیں (غ) بظاہر ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے، یعنی اس کو خدمت دین کے لیے وقف کر دیا جائے گا۔

اولاد کو خدمتِ دین کے لیے وقف کرنا: گزشتہ قصّے تو سب مسلمانوں کی عبرت کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ اِس بیان میں یہ اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل کی اس گئی گزری حالت میں ان کے اندر ایسے لوگ ابھی موجود تھے جو محض خدمت دین الٰہی کے لیے اپنی اولاد کو وقف کر دیتے تھے اور درحقیقت کوئی دین قائم نہیں رہ سکتا۔ جب تک کہ اس کے اندر وہ لوگ موجود نہ ہوں جو اپنی زندگیوں کو دین کے لیے وقف کر دیں۔ کاش مسلمان آج اس سے سبق حاصل کریں اور ان میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو اپنی اولاد کو خدمت دین کے لیے وقف کر دیں اور بچپن سے ان کو خدمت دین کے لیے تیار کریں۔ مگر یہاں تو عربی پڑھانے سے بھی بھاگتے ہیں اس لیے کہ بی اے میں روٹیاں اچھی مل جاتی ہیں۔ رونے کا مقام ہے کہ اس قوم کی نظر اس قدر تنگ ہو جائے جس کے اصول دین میں آخرت پر ایمان تھا۔ مگر مسلمان یاد رکھیں کہ گو وہ ساری دنیا

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾

پھر جب اسے جنا، کہا میرے رب میں نے یہ لڑکی جنی ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے جو اس نے جنا، اور لڑکا اس لڑکی کی طرح نہیں[409]۔ اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں[410]۔

کے بادشاہ بھی پھر بن جائیں مگر دینِ اسلام کی شوکت و عظمت دنیا میں قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان میں وہ لوگ کثرت سے نہ ہوں جو خدا کے دین کے لیے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

ع۴۰۹ عورتیں بھی خدمتِ دین کر سکتی ہیں: واللہ اعلم بما وضعت جملہ معترضہ ہے۔ جب مریم کی والدہ نے بچّہ جنا اور اس بچّہ کو اس نے خدمتِ دین کے لیے وقف کرنے کی نذر مانی ہوئی تھی تو اس نے تعجب سے کہا کہ میں نے تو ایک لڑکی جنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جملہ میں بتایا کہ لڑکی بھی اس خدمت کو ادا کر سکتی ہے جس کے لیے اس نے لڑکے کو وقف کرنا چاہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے علم کے ذکر سے یہ مقصود ہے کہ اس بات پر تعجب نہ کرو کہ یہ خدمتِ دین کیونکر کر سکے گی۔ اللہ اس کے مقام عظمت سے خوب واقف ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ جو مریم کی والدہ نے نذر مانی ہے اس کو یہ لڑکی بھی پورا کر سکتی ہے۔

ولیس الذکر کالانثیٰ۔ یہ دوسرا جملہ معترضہ ہے اور الذکر اور الانثیٰ میں لام عہد کا ہے یعنی وہ لڑکا جسے تو چاہتی تھی اس لڑکی جیسا نہیں وہ تو صرف ایسا لڑکا چاہتی تھی جس کی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف ہو اور یہ ایک معمولی خواہش تھی کہ اس کے ہاں خادم دین لڑکا ہو اور خادم دین لڑکے ہر حیثیت کے ہو سکتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بہت بلند مرتبہ کی لڑکی عطا فرمائی جسے اس زمانہ کی ساری عورتوں پر بلند درجہ دیا جیسے واصطفاکِ علیٰ نساء العالمین سے ظاہر ہے۔

بعض مفسرین نے اسے جملہ معترضہ قرار دینے کے بجائے مریم کی والدہ کا قول قرار دیا ہے اور مراد یہ لی ہے کہ لڑکے لڑکیوں جیسے نہیں ہوتے یعنی ال جنس کا لیا ہے جو کچھ کام لڑکا کر سکتا ہے وہ لڑکی نہیں کر سکتی۔

ع۴۱۰ اعیذ۔ عَوْذ کے معنی ہیں کسی دوسرے کی طرف پناہ چاہنا اور اس کے ساتھ تعلق (غ) پس اعاذ کے معنی ہوئے اس کی پناہ میں دیا۔

رجیم۔ رَجم کے اصل معنی الرَّمْیُ بالرجام ہیں (غ) یعنی کنکروں کے ساتھ مارنا مگر بطور مستعاریہ لفظ رمی بالظن پر یعنی ظنون کے پھینکنے پر اور توہم پر اور شتم یعنی گالی دینے پر اور طرد یعنی دھتکارنے یا دور کرنے پر بولا جاتا ہے اور الشیطانِ الرّجیم میں الرجیم کے معنی ہیں بھلائی سے اور ملاء اعلیٰ کے منازل سے دُور کیا گیا (غ)

مریم کا بیاہا جانا اور صاحب اولاد ہونا: حضرت مریم کی والدہ کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم کو باوجود ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کرنے کے ان کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ کنواری رہے گی بلکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ جوان ہو کر بیاہی جائیگی اور صاحب اولاد ہو گی اس لیے انھوں نے نہ صرف مریم کے لیے دعا کی بلکہ مریم کی اولاد کے لیے بھی۔ رہبانیت یا تارک دنیا ہونے کا طریق عیسائیوں کی ایجاد ہے۔

حدیث مسّ شیطان: اس آیت کی تفسیر میں بخاری میں ہے عن ابی هريرة ان النبیّ صلعم قال مامِنْ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ اِلَّا والشَّیْطٰنُ یَمَسُّهٗ حِیْنَ یُوْلَدُ فَیَسْتَهِلُّ صَارِخًا من مَسِّ الشیطانِ اِیَّاہُ اِلَّا مَرْیَمَ وابنها۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ کوئی بچّہ پیدا نہیں ہوتا مگر کہ شیطان اسے چھوتا ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ پس وہ شیطان کے اس کو چھونے سے فریاد کرتا ہوا آواز بلند کرتا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے کے۔ اس کے بعد آتا ہے کہ ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ اگر چاہو تو پڑھو انی اعیذ ھابك وذریتھا من الشیطان الرّجیم گویا یہ حدیث ان کے نزدیک اسی آیت کی تفسیر ہے۔

بظاہر جو کچھ اس حدیث کا منشاء معلوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ تمام بنی آدم کو پیدائش کے وقت شیطان چھوتا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے کے۔ یہ بوجوہات قطعیۃ الدلالت باطل ہے۔ اوّل آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ نے جو مریم اور اس کی ذریت کے لیے شیطان سے پناہ مانگی ہے وہ مریم کے پیدا ہونے کے بعد بلکہ اس کا نام بھی رکھنے کے بعد مانگی ہے اور ظاہر ہے کہ نام کبھی بچّہ کے فوراً پیدا ہوتے نہیں رکھا جاتا اور حدیث جسے اس کی تفسیر قرار دیا جاتا ہے اس میں یہ ہے کہ ہر بچّہ کو پیدا ہوتے ہی شیطان مس کرتا پس یا اس اعاذہ کو اس مس شیطانی سے کوئی تعلق نہیں جس کا ذکر حدیث میں ہے ورنہ جب مس شیطانی کا وقت ہی گزر چکا تو پھر دعا کرنے کا کیا فائدہ تھا اور یا حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں بلکہ حدیث کا ظاہری مفہوم آیت کے خلاف ہے۔ دوم۔ اگر بچہ کا پیدا ہوتے ہی رونا مس شیطانی کا نتیجہ ہوتا ہے تو پانچ منٹ بعد رونا کس بات کا نتیجہ ہے یا کیا حضرت مریم اور حضرت مسیح بچپن میں کبھی روئے ہی نہیں۔ اگر بچپن میں کبھی نہ روئے تھے تو بڑے ہو کر کیوں روتے تھے۔ حضرت مسیح کے متعلق تو صاف لکھا ہے کہ وہ رو رو کر دعائیں کرتا تھا اور حضرت مریم کا دردِ زہ کے وقت یٰلیتنی متّ قبل ھذا کہنا بتاتا ہے کہ اس وقت وہ بھی روئی ہو نگی۔ جن وجوہات سے تمام بچے بعد میں روتے ہیں انہی میں سے کسی وجہ سے پیدا ہوتے ہی روتے ہیں اور حضرت مریم اور ان کا بیٹا بچپن کے ایام میں اسی طرح روتے تھے۔ جس طرح دوسرے بچے روتے ہیں ورنہ وہ بڑے ہو کر کیوں روتے۔ سوم۔ شیطان کا چھونا دو معنوں میں آتا ہے۔ ایک کسی تکلیف کے پہنچانے کے معنی میں جیسے انی مسنی الشیطان بنصب وعذاب

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا سو اس کے رب نے اس کو اچھی قبولیت سے قبول کیا اور

(ص ٣ - ١٤٨) اس معنی میں حضرت مسیح کو بھی دکھ پہنچا جب یہودیوں نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر صلیب پر چڑھایا اور دوسرے وسوسہ ڈالنے کے معنی میں جیسے اذا مسھم طائف من الشیطن تذکروا (الاعراف ٧ - ٢٠١) مگر بچہ کے دل میں عین پیدائش کے وقت شیطان کا وسوسہ ڈالنا بے معنی بات ہے۔ شیطانی وساوس کا تعلق سن تمیز سے ہے جس کو ہوش ہی نہیں اس کے دل میں شیطان کیا وسوسہ ڈالیگا۔ چہارم قرآن شریف اور حدیث صحیح کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر بچہ پیدائش کے وقت معصوم پیدا ہوتا ہے قرآن کریم میں ہے فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا (الروم ٣٠ - ٣٠) یعنی اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو فطرت صحیحہ پر پیدا کیا ہے اور حدیث میں اسی کی تفسیر میں ہے ما من مولود یولد الا علی الفطرۃ کوئی بچہ نہیں مگر صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور یہ بات اصول اسلام میں داخل ہے کہ ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے پس وہی مذہب یہ تعلیم نہیں دے سکتا کہ ہر بچہ کو پیدائش کے وقت شیطان چھوجاتا ہے۔

احادیث میں یحییٰ کا گنہگار رہونے سے استثناء: سوال ہوگا کہ کیا یہ حدیث صحیح نہیں بلاشبہ اس کے وہ معنی صحیح نہیں جو پادری صاحبان لیتے ہیں کہ اس سے تمام انبیاء کا سوائے مریم اور ابن مریم کے گنہگار رہونا لازم آتا ہے۔ گنہگار نہ ہونے کے بارہ میں تو اس سے زیادہ صریح الفاظ اور موجود ہیں ایک حدیث میں ہے ما من عبد یلقی اللہ الا ذا ذنب الا یحیی بن ذکریا (ث) کوئی بندہ نہیں مگر وہ خدا کو گنہگار رہونے کی حالت میں ملے گا سوائے یحییٰ بن زکریا کے اور اسی کی روایت حضرت ابوہریرہ سے یوں ہے کل ابن آدم یلقی اللہ بذنب یعذبہ علیہ ان شاء او یرحمہ الا یحیی بن زکریا (ث)

یحییٰ - مریم - ابن مریم کا ذکر بطور مثال: ان احادیث کی رو سے تو مریم اور ابن مریم دونوں ذا ذنب قرار پاتے ہیں۔ مگر نہیں ایسی احادیث میں صرف ان لوگوں کی پاکیزگی پر زور دینا مقصود ہوتا ہے جن پر جھوٹے الزامات لگائے گئے ہوں اور جس طرح یحییٰ سے مراد صرف حضرت یحییٰ نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو اس زمرہ صالحین میں داخل ہے جن میں سے یحییٰ ایک ہے مراد ہے اسی طرح مریم اور اس کے بیٹے سے بھی ہر وہ شخص مراد ہے جو مریم صفت ہے اور جو ابن مریم والے زمرۂ صلحا میں داخل ہے - اور یحییٰ اور مریم اور ابن مریم یہاں سب بطور مثال ہیں اور ان کے ناموں کا انتخاب اس لیے ہُوا کہ ان پر بہت سخت الزام لگائے گئے اور زمرۂ صلحا میں یہی لوگ آنحضرت صلعم سے قریب تر تھے۔

حدیث مسّ شیطان کا اصل مفہوم: اگر حدیث کے الفاظ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعی وہی توجیہ درست ہے جو اوپر کی گئی کہ مریم وغیرہ یہاں صفاتی نام ہیں اور بطور مثال رکھے گئے ہیں اصل میں حدیث میں بچہ کے رونے کا ذکر نہیں بلکہ بڑے آدمی کے فریاد رسی کے طور پر آواز بلند کرنے کا ذکر ہے اور مدد مانگنے کا ذکر ہے چنانچہ استہلال کے معنی رونا نہیں بلکہ آواز بلند کرنا ہے جس طرح رویت ہلال کے وقت آوازیں بلند کی جاتی ہیں تاکہ لوگوں کو خبر ہو جائے اسی سے اہلال ہے اور صارخ کے معنی بھی رونے والا نہیں بلکہ بالاتفاق صارخ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو مدد کے لیے کسی کے پاس فریاد لے جائے یعنی مستغیث کو (ل) اور صَرَخَ فُلَانٌ کے معنی ہیں استغاث فقال واغوثاہ اس نے فریاد کی اور کہا کوئی میری مدد کے لیے پہنچے اور قرآن کریم میں ہے فلا صریخ لھم (یٰس ٣٦ - ٤٣) جہاں صریخ کے معنی فریاد رس یا مددگار ہیں نہ رونے والا۔ پس مسّ شیطان کا جو نتیجہ لکھا ہے فیستھل صارخا تو وہ صرف اس قدر ہے کہ وہ شخص جس کو شیطان چھوتا ہے وہ فریاد کرتا ہوا آواز بلند کرتا ہے پس یولد سے مراد یہاں بچہ کا پیدا ہونا نہیں بلکہ انسان کی پیدائش روحانی ہے یا گناہ کا احساس اس کے اندر پیدا ہونا۔ اور اس پیدائش روحانی کو دو قسم پر تقسیم کیا ہے ایک وہ لوگ جو مریم صفت ہیں اور ان کو شیطان چھوتا بھی نہیں۔ یعنی وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا۔ اور دوسرے وہ لوگ جن کو شیطان چھوتا ہے۔ پھر وہ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں تو آخر کار شیطان پر غالب آجاتے ہیں اور یہ صرف اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ خود قرآن کریم نے اس کو بتصریح بیان فرمایا ہے وضرب اللہ مثلا للذین اٰمنوا امرأت فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتا فی الجنۃ ونجنی من فرعون وعملہ ونجنی من القوم الظلمین ० ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجھا فنفخنا فیہ من روحنا وصدقت بکلمت ربھا وکتبہ وکانت من القانتین (التحریم ٦٦ - ١١ و ١٢) یہاں مومنوں کی مثال دو عورتوں سے دی ہے اوّل فرعون کی بی بی۔ دوسرے مریم۔ اول کی صفت میں بیان فرمایا کہ ان کے دلوں میں یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے معلوم ہوا کہ ان لوگوں پر شیطان اپنی وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور بار بار تڑپ تڑپ کر اس کی طرف آتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ تو ہم کو فرعون سے نجات دے۔ اسی کے مطابق حدیث میں ہے فیستھل صارخا مومن پر جب شیطان حملہ کرتا ہے تو وہ خدا کی طرف فریاد لے جاتا ہے اور خدا سے مدد چاہتا ہے یہ اس کی روحانی پیدائش ہے۔ اور دوسرے کی صفت میں بیان فرمایا کہ وہ مریم صفت ہیں التی احصنت فرجھا۔ فرج کے معنی مواقع مخافت ہیں یعنی انہوں نے ان تمام راہوں کو مضبوط کر لیا ہوتا ہے جن سے شیطان حملہ آور ہو سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محفوظیت کے مقام پر پہنچ چکے ہیں جس کو انبیاء میں مقام عصمت کہا جاتا ہے اور حدیث گویا انہی روایتوں کی تفسیر ہے نہ آیت اعیذھا بک کی جس کے ساتھ اس کا کچھ تعلق نہیں پس جس طرح آیت قرآنی میں مریم صفت مومنوں کا ذکر ہے اسی طرح حدیث میں مریم کا نام لیکر مریم صفت مومنوں کا ذکر کیا اور یہی وجہ ہے کہ مریم کے ذکر کو مقدم کیا کہ وہی اصل مقصود ہے اور ابنھا یعنی ابن مریم کو پیچھے رکھا ہے کہ وہ بطور نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب مومن بھی اس محفوظیت کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر انبیاء بدرجہ اولیٰ اس مقام پر ہیں اگر ابن مریم کی کوئی بڑائی مقصود ہوتی تو حضرت عیسٰی کا نام پہلے لیا جاتا۔ یہی اصل توجیہ اس حدیث کی ہے جو اس کو قرآن اور حدیث اور واقعات کے مطابق ٹھہراتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اصل اصول مذہب کے قرآن شریف سے لیے جاتے ہیں اور احادیث کو قرآن کریم کے ماتحت کیا جاتا ہے کیونکہ احادیث میں اکثر روایت بالمعنی ہے اور لفظوں میں کمی بیشی ہے پس حین یولد کے لفظ کے معنی اگر ولادت

نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

اس کو عمدہ پرورش سے بڑھایا اور اسے زکریا کے سپرد کیا[411] جب کبھی زکریا اس کے پاس عبادت گاہ میں آتے اس کے پاس رزق پاتے کہا اے مریم یہ تجھے کہاں سے ملا، اس نے کہا یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے[412]

روحانی نہ کیے جائیں تو ان الفاظ کو زائد کہنا پڑے گا جو کسی راوی کی غلطی سے داخل ہو گئے۔

ع۴۱۱ تقبلہا ربہا بقبول حسن۔ تقبل کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۶۳ تقبل کے بعد قبول کے لانے میں راغب لکھتے ہیں حکمت یہ ہے کہ تقبل میں اقتضائے ثواب ہے اور قبول میں اقتضائے رضائے الٰہی ہ

انبتہا نباتا۔ نبت اور نبات اصل میں نامیات یعنی بڑھنے والی چیزوں میں سے وہ ہے جو زمین سے اُگتی ہے اور خاص استعمال اس کا ان اشیاء میں ہوتا ہے جن کی ساق یعنی تنہ نہ ہو پھر اس کا استعمال ہر بڑھنے والی شے پر ہوتا ہے خواہ وہ سبزی میں سے ہو یا درخت یا حیوان ہو یا انسان (غ) انبت کے بعد مصدر انباتاً کی بجائے نباتا آیا ہے اور یہ اسی کی جگہ ہے گو بعض نے نباتا کو یہاں حال کہا ہے مگر ابن جریر کہتے ہیں کہ عرب یہ کثرت سے کرتے ہیں کہ مصادر کو اصول افعال پر لاتے ہیں گو لفظ مختلف ہوں مثلاً تکلم فلان کلاماً کہیں گے تکلم فلان تکلماً نہیں۔ اس لحاظ سے تقبل کے بعد قبول اور انبت کے بعد نبات آیا ہے۔ مفردات میں ہے کہ انبت کا لفظ انسانوں پر بولنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی ایک وجہ سے نبات ہی ہیں کیونکہ ان کی ابتداء بھی زمین سے ہی ہوتی ہے گو نبات سے ان میں ایک وصف زائد ہو پس یہاں انبت سے مراد اس کا انماء یعنی بڑھانا ہے۔

کفل۔ کِفل یا کَفِیل وہ حصہ ہے جس میں کفایت ہو اس لیے کَفَالَۃ بمعنی ضمانت ہے اور تَکْفِیل دوسرے کی کفالت میں دیدینا (غ)

زکریا حضرت یحیٰی کے والد کا نام ہے اور یہ نام قرآن کریم میں زمرۂ انبیاء میں بھی آتا ہے۔ لوقا ۱ : ۵ میں زکریا کے متعلق ذیل کے الفاظ ہیں: "یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں اَبِیّاہ کے فریق میں سے زکریا نام ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی...... اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے تھے"۔ (اناجیل میں ایسے صریح بیانات کے ہوتے جہاں ایک کاہن اور اس کی بی بی خدا کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے بتائے جاتے ہیں اس کے پیروؤں کا یہ دعویٰ کہ شریعت پر کوئی شخص نہیں چل سکتا۔ ایک مضحکہ انگیز حرکت ہے) اناجیل میں زکریا کو صرف کاہن بیان کیا گیا ہے۔ البتہ پرانے عہدنامے میں ایک نبی ذکریاہ نام بیان کیا گیا ہے اور اس کی کتاب بھی مجموعہ عہدنامہ قدیم میں موجود ہے پس ممکن ہے کہ جہاں قرآن کریم نے زکریا کو زمرۂ انبیاء میں سے فرمایا (الانعام[6] - ۸۶) وہاں اشارہ ذکریاہ کی طرف ہی ہو کیونکہ جہاں زکریا کو انبیاء میں سے گنا ہے وہاں ان کے ہاں یحیٰی کے پیدا ہونے کا کوئی ذکر نہیں اور جہاں زکریا کے ہاں یحیٰی کے پیدا ہونے کا ذکر ہے جو تین جگہ آیا ہے یعنی یہاں اور سورۃ مریم میں اور سورۃ انبیاء میں وہاں زکریا کو نبوت عطا فرمانے کا کوئی ذکر نہیں اور ذکریاہ اور زکریا دونوں ناموں میں اس قدر مشابہت ہے کہ عربی میں آکر ان کا ایک ہی صورت اختیار کر لینا کوئی بعید بات نہیں۔ بلکہ بعض مقامات کے الفاظ قرآنی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ امر کہ مریم قرعہ اندازی سے زکریا کی سپردگی میں آئیں۔ اگر وہ نبی ہوتے تو کاہنوں پر خود ہی ان کا حق فائق ہوتا۔ یا زکریا کا یحیٰی کے متعلق دعا کرتے ہوئے یہ کہنا یرثنی ویرث من آل یعقوب (مریم[19] - ۶) میرا وارث ہو اور آل یعقوب کا وارث ہو۔ ظاہر ہے کہ نبوت کی طرف اشارہ آل یعقوب میں ہے۔ ورنہ یرثنی کافی تھا۔ ایسا ہی سورۃ انبیاء میں زکریا اور اس کی بی بی کا اکٹھا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے انہم کانوا یسارعون فی الخیرات ویدعوننا رغبا ورہبا (الانبیاء[21] - ۹۰) وہ بھلائیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور ہم کو امید اور خوف رکھتے ہوئے پکارتے تھے۔ ان قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زکریا نبی اور زکریا والد یحیٰی دو الگ الگ شخص ہیں۔

مریم کے متعلق بعض مفسرین کے خیالات: عجوبہ پسند طبائع نے یہاں بھی کچھ قصے بنا لیے ہیں کہ مریم ایک دن میں اتنا بڑھتی تھی جتنا کوئی دوسرا ایک سال میں بڑھے۔ حالانکہ یہاں صرف نباتاً حسنا عمدہ پرورش کا ذکر ہے۔ زکریا کی سپردگی میں ان کا دیا جانا حصول علم دین کے لیے تھا۔ یہ کہنا کہ پیدا ہوتے ہی اس کی ماں اس کو ہیکل میں لے گئی تھی۔ اسی عجوبہ پسندی کی وجہ سے ہے جو بہت سی تفاسیر میں دیکھی جاتی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کفالت کا وقت وہی ہوتا ہے جب بچہ تربیت کے قابل ہوتا ہے۔ مروجہ اناجیل میں مریمؑ کی پیدائش تربیت وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔

ع۴۱۲ کُلَّمَا۔ کُلَّ زمانٍ اَوْ کل وقت۔ جب کبھی۔

المحراب۔ حرب اس کا مادہ ہے جس کے معنی جنگ ہیں۔ مفردات میں ہے کہ مسجد کے محراب کو محراب اس لیے کہا جاتا ہے لِاَنَّہٗ مَوْضِعُ مُحَارَبَۃِ الشیطان والھویٰ یعنی وہ شیطان اور خواہشات کے جنگ کا مقام ہے۔ لیکن لسان العرب میں ہے کہ اَلْمِحْرَابُ صَدْرُ الْبَیْتِ وَاَکْرَمُ مَوْضِعٍ فِیْہِ یعنی محراب گھر کے صدر اور سب سے معزز مقام کا نام ہے اور زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ محراب اَرْفَعُ بَیْتٍ فِی الدَّار کا نام ہے یعنی گھر میں سب سے اعلیٰ درجہ کے

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی - کہا میرے

کمرہ کو کہتے ہیں (ل) لیکن یہ بنی اسرائیل کے ذکر میں ہے اور بنی اسرائیل میں محراب مسجد کو کہتے تھے جس میں وہ بیٹھا کرتے تھے (ل) یا جہاں نماز کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محراب وہ خاص جگہ تھی جہاں عبادت کے لیے وہ بیٹھا کرتے تھے اور یہ ان کی مساجد ہی تھیں۔

رِزق کے اصل معنی راغب کے نزدیک عطاء جاری ہیں خواہ دنیوی ہو یا اُخروی۔ مال ہو یا جاہ یا علم۔ اس لیے رُزِقتُ عِلماً علم دیا جانے پر بولتے ہیں۔ مفسرین نے تو حسب معمول اس کو غیر معمولی رزق قرار دیا۔ حالانکہ یہاں کوئی ایسے لفظ نہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں فاکھۃ الصیف فی الشتاء وفاکھۃ الشتآء فی الصیف یعنی گرمی کے پھل سردیوں میں اور سردی کے پھل گرمیوں میں۔ حالانکہ قرآن شریف میں نہ روٹی کا ذکر ہے نہ پھلوں کا۔ اول تو رزق سے مراد پھل ہی لینا اس پر کوئی دلیل نہیں۔ پھر پھل بھی خلاف موسم اور یہ بھی لکھا ہے کہ زکریا اس پر سات دروازوں پر قفل لگایا کرتے تھے ان قفلوں میں تو معمولی پھلوں کا پہنچنا بھی کافی اعجاز تھا خلاف موسم بتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور مجاہد سے روایت ہے وجد عندھا رزقاً ای عِلماً او قال صحفافیھا علم (ث) یعنی رزق سے مراد یہاں علم ہے یا صحیفے جن میں علم تھا۔

من عند اللہِ۔ عند ظرف مکان اور زمان ہے اور اس کے معنی حضُورُ الشَّیْءِ وَدُنُوُّہٗ یعنی کسی شے کا حضور اور اس کا قرب اور اس پر من داخل ہوتا ہے جس طرح لدُن پر من داخل ہوتا ہے۔ یعنی من عند نا۔ من لدنا۔ مفردات میں ہے کہ عند میں قرب ہے وہ بعض وقت بلحاظ مکان ہوتا ہے اور بعض وقت بلحاظ اعتقاد جیسے عندی کذا یعنی میرے اعتقاد میں یوں ہے اور کبھی مرتبہ کے لحاظ سے جیسے بَلْ اَحْیَاءٌ عند ربھم۔ ہیں اور کبھی محض حکم میں جیسے عندہٗ علم الساعۃ (الزخرف ۴۳- ۸۵) ومن عندہٗ علم الکتاب (الرعد ۱۳- ۴۳) ایسا ہی فاولٓئک عند اللہ ھم الکاذبون (النور ۲۴-۱۳) وھو عند اللہ عظیم (النور ۲۴- ۱۵)- ان تمام مقامات پر فی حکمہ مراد ہے یعنی اللہ کے حکم میں اسی طرح پر وان من شیءٍ اِلَّا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدرٍ معلوم (الحجر ۱۵-۲۱) اور یہی صورت یہاں ہے من عند اللہ یعنی اللہ کے حکم سے یہ چیزیں پہنچتی ہیں۔ مفسرین کا خیال ہے کہ اس کو من عند اللہ اس لیے کہا گیا ہے کہ بلا واسطہ بشر پہنچتا تھا مگر یہ ضروری نہیں ان من شیءٍ الّا عندنا خزائنہ جب سب چیزوں کے خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہیں تو جو کچھ پہنچتا ہے سب من عند اللہ ہی ہے چنانچہ ایک جگہ فرمایا کہ جب ان لوگوں کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ھذہ من عند اللہ یہ اللہ کا احسان ہے اور جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ھٰذہ من عندک یعنی تمہاری بے تدبیری سے ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا قل کل من عند اللہ (النساء ۴- ۸۷) بھلائی برائی ہر چیز اللہ کی طرف سے ہی ہے حالانکہ اسی کی تشریح آگے چل کر یوں کی ہے کہ بدنتائج انسان کے اپنے بداعمال سے ہیں اسی طرح فرماتا ہے ما النصر الا من عند اللہ (آل عمران ۳- ۱۲۵) حالانکہ نصرت اسباب کے ساتھ ہی آتی ہے۔ اگر مسلمان قتال نہ کرتے اور حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی طرح انکار کر دیتے تو یہ نصرت بھی نہ ملتی۔ پس بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ ہر چیز من عند اللہ ہی ہے۔

مریم کے پاس رزق کا پہنچنا: ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا اسباب بھی کوئی امر مہیا کر دے یا ایسے اسباب سے مہیا کر دے جن کے سمجھنے پر انسان قادر نہیں جیسے ویرزقہ من حیث لا یحتسب (الطلاق ۶۵- ۳) اللہ تعالیٰ متقی کو ایسے ذرائع سے رزق پہنچاتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اور اگر یہ مریم صدیقہ کی کرامت ہو کہ کسی ظاہری سبب کے بغیر ان کو پہنچ جاتا ہو، تو اس سے بھی ہمیں انکار نہیں۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ آیا قرآن کریم نے یہاں ایسا فرمایا ہے یا کسی حدیث صحیح میں ایسا آیا ہے کہ مریم کو بے موسم کے پھل سات قفلوں کے اندر پہنچ جایا کرتے تھے۔ اس کا جواب نفی میں ہے نہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فرمایا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور الفاظ ظاہری ہے سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مریم کے پاس کچھ رزق پہنچ جاتا تھا۔ ممکن ہے زائرین پہنچاتے ہوں جیسا کہ دستور ہے کہ جو لوگ خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ڈال کر ان کو پہنچا دیتا ہے۔ اور ممکن ہے یہاں رزق سے مراد جیسا مجاہد نے کہا ہے علم ہو اور اس علم کو ہی مریم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا ہو۔ تو اس پر ایک دن جب زکریا نے سوال کیا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے پہنچتا ہے تو اس نے وہی خدا پرستوں والا جواب دیا۔ جن کی نظر وسائل سے بلند ہوتی ہے اور وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم تو یہاں تک فرماتے ہیں والذی ھو یطعمنی ویسقین (الشعراء ۲۶- ۷۹) وہ اللہ ہے جو مجھے کھانا کھلاتا اور پانی پلاتا ہے۔ حالانکہ اپنے ہاتھ سے کھاتے اور پیتے تھے۔

کہا جائیگا کہ اگر کوئی غیر معمولی بات نہ تھی تو اس کا ذکر یہاں کیوں کیا۔ لیکن کیا قرآن کریم معمولی امور کا ذکر نصیحت کے لیے نہیں کرتا؟ بلکہ سبق تو انسان معمولی امور سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی امر تھا تو ہمیں اس سے فائدہ کیا یہ کوئی معجزہ تو ہے نہیں کہ مخالفین پر اتمام حجت کے لیے دکھایا گیا ہو۔ نہ کوئی ایسی کرامت ہے جو منکرین کے لیے ظاہر ہوئی ہو، بلکہ بات صاف ہے مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے دین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھی رزق کا کچھ سامان کر دیتا ہے اور کسی نہ کسی ذریعہ سے اس کو رزق پہنچا دیتا ہے۔ بلکہ آخر پر ان الفاظ میں کہ واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب یہ بھی بتا دیا کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب رزق دیتا ہے انہی الفاظ میں مسلمانوں کو بھی مخاطب فرمایا ہے۔

ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ زکریا ہمیشہ ہی جب اس کے پاس جاتے تو رزق پاتے۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی رزق ہوتا تو یہ سوال پہلے دن ہی ان کو کرنا چاہیئے تھا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے ملا۔ حالانکہ عبارت قرآنی بتاتی ہے کہ وہ جب کبھی مریم کے پاس جاتے ایسا پاتے اور سوال نہ کرتے۔ پھر انہوں نے کسی ایک موقعہ پر ایسا سوال کیا ہے جب انہوں نے مریم میں خدا پرستی کے آثار دیکھے ہیں۔ اگر یہ مراد ہوتی کہ پہلی مرتبہ ہی دیکھ کر سوال کیا تھا تو عبارت یوں ہونی چاہیئے

لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝۳۸

رب اپنی جناب سے مجھے پاکیزہ اولاد عطا فرما، تو دُعا سُننے والا ہے[۴۱۳]

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا

پھر فرشتوں نے اسے پکارا جبکہ وہ عبادت گاہ میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ اللہ تجھے یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے[۴۱۴] جو اللہ

تھی لما دخل علیھا۔

ع۴۱۳ هنالك ۔ هنا ظرف مکان ہے ۔ ل بُعد کے لیے اور کاف خطاب کے لیے ۔ یعنی جہاں وہ (مریم کے پاس محراب میں) تھے وہیں یہ دعا کی۔
نیک اولاد کی خواہش: معلوم ہوتا ہے حضرت زکریا بنی اسرائیل کی حالت کو دیکھ کر یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اب یہ قوم اس قابل نہیں رہی کہ اس کے اندر وہ پاک لوگ پیدا ہوں جو اس قوم کو راہ راست پر رکھ سکیں اور اسی لیے انہوں نے کبھی اولاد کے لیے دعا بھی نہیں کی تھی۔ چنانچہ دوسری جگہ ان کے یہ الفاظ مذکور ہیں۔ وانّی خفت الموالی من ورائی ۔ ان کا خوف اسی وجہ سے تھا کہ ان لوگوں کی عملی حالتیں ان کو اچھی نظر نہ آتی تھیں ۔ ورنہ انبیاء اور اولیاء کو مال و جائداد کے ورثوں کا فکر نہیں ہوا کرتا پس جب مریم کے اندر انہوں نے ایسی نیکی اور سعادت دیکھی تو ان کی طبیعت میں بھی ایک جوش پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی ایسی نیک اولاد عطا کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکوں کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے تو نیک اولاد کیلئے ہی پیدا ہوتی ہے باوجود بوڑھا ہو جانے کے زکریا نے اولاد کیلئے دعا نہ کی۔ کی تو یہی کی کہ اے خدا نیک اولاد دے یہ کہنا کہ دعا کی خواہش ان کے دل میں اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا اس بات پر قادر ہے ۔ درست نہیں ۔ اس لیے کہ وہ پہلے بھی مقبولین بارگاہ الٰہی میں سے تھے ۔ ہر ایک راستباز انسان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعائیں قبول کیا کرتا ہے ۔ اور حضرت زکریا کا تو اپنا قول دوسری جگہ قرآن میں منقول ہے ولم اکن بدعائك رب شقیا (مریم[۱۹]۔ ۴) یعنی جو دعا کی وہ قبول ہوئی ۔ پھر عورت کے بانجھ ہونے کا یقین تو بے اولادی سے ہوا پہلے وہ دعا کیوں نہ کرتے تھے ۔ اصل بات یہی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی حالت کو دیکھ کر یہی خیال کرتے تھے کہ یہ قوم اب اس قابل نہیں رہی کہ ان میں نیک لوگ پیدا ہوں ۔ مریم کی نیکی کو دیکھ کر ان کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہُوا اور ان کی رُوح بے اختیار بارگاہِ الٰہی میں پکار اُٹھی فھب لی من لدنك ولیا یرثنی ویرث من آل یعقوب واجعله رب رضیا (مریم[۱۹]۔ ۵ و ۶) اے خدا مجھے بھی اپنی جناب سے ایک وارث عطا فرما جو میرے علوم اور نیکیوں کا وارث ہو ۔ اور یعقوب کے سچے پیروؤں کے علوم اور نیکیوں کا وارث ہو اور اے میرے رب اسے اپنی بارگاہ میں پسندیدہ بنا ئیو۔ نیکوں کو دیکھ کر نیکوں کے دل میں نیک تڑپ پیدا ہوتی ہے ۔ اسی کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی۔

ع۴۱۴ ملائکہ کا کلام: فنادته الملائكة بعض کے نزدیک یہاں ملائکہ سے مراد جبرائیل ہے اور بعض کے نزدیک جماعت ملائکہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور الہام بھی ملائکہ کی وساطت سے ہی نازل ہوتا ہے دوسری جگہ فرمایا یا زکریا انا نبشرك بغلام اسمه یحیٰی (مریم[۱۹]۔ ۷) پس یہ وحی تھی جو زکریا کو ہوئی ۔ خواہ کوئی سے ملائکہ اس کے لانے والے ہوں اور دوسری جگہ قرآن کریم نے حصر کر کے بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام انسان سے تین ہی طرح پر ہوتا ہے ۔ دل میں بات ڈال کر رویا کشف الہام سے بذریعہ جبرائیل علیہ السلام جو انبیاء سے مخصوص ہے عام ملائکہ کا کلام کشف یا الہام کے رنگ میں ہوگا۔

یحییٰ ۔ مفردات میں ہے سَمَّاهُ بذلك من حَيْثُ انه لم تُمِتْهُ الذنوب کما اماتت کثیرا من وَلَدِ آدم صلعم یعنی اس کا نام یحییٰ رکھا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کہ گناہ سے اس پر موت نہیں آئے گی ۔ جیسا کہ بہت سے آدم کے بیٹوں پر آئی ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یحییٰ نام بتانے میں اشارہ یہ تھا کہ جیسے کہ بنی اسرائیل کی عامہ حالت اس وقت تھی کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا تھے اور اعلیٰ درجہ کے نیک اور راستباز انسان ان میں عموماً نہ تھے ۔ یہ لڑکا ایسا نہ ہوگا بلکہ وہ ایک روحانی زندگی کا وارث ہوگا اور گناہ کی موت اس پر نہ آئیگی ۔ بعض نے کہا ہے کہ یحییٰ نام اس طرف اشارہ کے لیے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو ایمان سے زندہ کرے گا ۔ یا اس لیے کہ وہ علم و حکمت سے زندہ ہوگا (ل) یا اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے لوگ ہدایت کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے (ر) اناجیل میں یہ نام یوحنا آتا ہے اور یوحنا بپتسمہ دینے والے کے نام سے یہ مشہور ہیں ۔ انہوں نے ہی حضرت مسیح کو بپتسمہ دیا تھا ۔ ان کا اور حضرت مسیح کا زمانہ ایک ہی تھا ان کا ظہور کچھ حضرت مسیح سے پہلے ہوا یہ عجیب بات ہے کہ سلسلہ موسوی کی ابتدا بھی دو نبیوں موسیٰ اور ہارون سے ہی ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ بھی دو نبیوں یحییٰ اور عیسیٰ پر ہی ہوتا ہے جس طرح حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی اصلاح کا سارا کام اکیلے نہ کر سکتے تھے اسی طرح حضرت مسیح بھی اکیلے اس قابل نہ تھے ۔ حضرت موسیٰ اور مسیح دونوں کا کام بڑا تھا اور یہی وجہ ہوئی کہ ان کے ساتھ دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت پیش آئی ۔ حضرت موسیٰ کے کام کا کچھ حصہ حضرت ہارون نے کیا ۔ حضرت یحییٰ نے حضرت مسیح کے لیے لوگوں کو تیار کیا۔

حضرت یحییٰ اور عیسیٰ دونوں کے لیے کتب سابقہ میں کچھ پیشگوئیاں تھیں ۔ حضرت یحییٰ کے متعلق پیشگوئی ان الفاظ میں ملاکی نبی کی کتاب میں تھی ۔ "دیکھو خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں ایلیاہ نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا" (ملاکی ۴: ۵) بظاہر اس پیشگوئی میں الیاس کے آنے کا ذکر ہے اور الیاس کے متعلق یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ وہ زندہ آسمان پر چلا گیا ہُوا ہے اور یہ صرف خیال ہی نہ تھا بلکہ ان کی کتاب میں یہ لفظ بھی تھے کہ "ایلیاہ بگولے میں ہو کے آسمان پر جاتا رہا" (۲ ۔ سلاطین ۲: ۱۱) الیاس کی دوبارہ آمد کی پیشگوئی کیوں کر پوری ہوئی: اب جب حضرت مسیح نے دعویٰ کیا تو یہودیوں نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ ہماری پیشگوئیوں میں لکھا ہے کہ مسیح سے پیشتر ضروری ہے کہ الیاس آئے ۔ چنانچہ شاگردوں نے یہ اعتراض حضرت مسیح کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا "ایلیاہ تو آچکا اور انہوں نے اس کو نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا اسی طرح ابن آدم بھی ان کے ہاتھ سے دکھ اُٹھائے گا" اس کے بعد لکھا ہے "تب شاگرد سمجھ گئے کہ اس نے ہم سے یوحنا بپتسمہ

بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٣٩﴾

کے ایک کلام کو سچا کرنے والا اور سردار اور بدیوں سے رُکنے والا اور نبی نیکوکاروں میں سے (ہوگا)۔[۴۱۵]

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿٤٠﴾

اس نے کہا میرے رب میرے بیٹا کیوں کر ہوگا اور مجھ پر بڑھاپا آچکا ہے اور میری عورت بانجھ ہے فرمایا اسی طرح ہوگا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔[۴۱۶]

دینے والے کی بابت کہا ہے" (متی ۱۷ : ۱۲ و ۱۳) اور دوسری جگہ اس کی وجہ یوں دی ہے "اور وہ ایلیا کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا"
گویا یحییٰ کی آمد ہی الیاس کی دوبارہ آمد تھی اس لیے کہ وہ اس کا مثیل ہو کر آیا۔ مگر یہودی اس تشریح سے مطمئن نہ ہوئے۔

ع۴۱۵ کلمۃ۔ یہ لفظ قرآن کریم میں وسیع معنی میں استعمال ہُوا ہے یعنی کلام کے ہم معنی جیسے عیسائیوں کے حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے پر فرمایا۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم (الکھف ۱۸ - ۵) اور ایک جگہ کافر کی طرف اس قول کو منسوب کر کے رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت (المومنون ۲۳ - ۱۰۰) فرمایا انھا کلمۃ ھو قائلھا۔
یہ تو کلمہ کے عام معنی ہیں۔ یہاں کس کلمہ کی تصدیق ہے؟ مفردات میں تین قول دیئے ہیں کلمۃ التوحید توحید کی بات کتاب اللہ یعنی اللہ کی کتاب عیسیٰ۔ اور عیسیٰ کا نام کلمۃ اس لیے رکھا گیا کہ دوسری جگہ کلمۃ القاھا الی مریم قرآن شریف میں آتا ہے۔ میرے نزدیک یہاں کلمہ عام معنی میں ہے یعنی اللہ کے ایک کلام کو سچا کر دکھائیگا اور اس کلمہ کے لفظ میں اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو یحییٰ کے متعلق بائبل میں پائی جاتی ہے اور جو پچھلے نوٹ میں مذکور ہو چکی ہے۔
سیّدا۔ سید سود سے ہے اور سواد سیاہی کو کہتے ہیں اور بڑی جماعت کو بھی اسی لحاظ سے سواد کہتے ہیں اور سیّد وہ ہے جو سواد یا جماعت کثیر کا متولی ہو (غ) یحییٰ کو سیّد اس لیے کہا کہ وہ بھی ایک جماعت کا پیشوا بننے والا تھا۔
حصورا۔ حصر سے ہے جس کے معنی تضییق یعنی روکنے کے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ حصور وہ ہے جو عورتوں کے پاس نہیں جاتا۔ یا نامردی کی وجہ سے یا پاکدامنی کی وجہ سے اور شہوت کے دُور کرنے میں کوشش کی وجہ سے اور پھر لکھا ہے کہ اس آیت میں یہ دوسری قسم کا ہی حصور مراد ہے یعنی پاکدامنی کی وجہ سے عورتوں کے پاس نہ جانے والا۔ کیونکہ اس سے ایک شخص تعریف کا مستحق ہو سکتا ہے اور یہی بات صحیح ہے۔ ورنہ نامرد تو دنیا میں بہتیرے ہوئے اور ہونگے۔ یہ کسی تعریف کے موقع پر نہیں بولا جا سکتا اور ابن عباس کی ایک روایت میں بھی یہ لفظ آئے ہیں الذی لا یاتی النساء مع القدرۃ علٰی ذٰلک (د) اور روح المعانی میں ہی یہ بھی ہے کہ جائز ہے کہ حصور سے مراد یہ ہو کہ جو شخص نفس کے روکنے کو کمال تک پہنچا دے اور باوجود قدرت کے شہوات سے اسے روک رکھے۔
یحییٰ اور عیسیٰ: عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ کا یہ کمال بیان کیا کرتے ہیں کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ قرآن کریم اس کے بالمقابل یحییٰ کو پیش کرتا ہے کہ اگر یہ کوئی خوبی ہے تو پھر حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ سے کم نہیں۔ حضرت یحییٰ کی زندگی دنیا کی ان معمولی آسائشوں سے بھی خالی تھی جو حضرت عیسیٰ کو میسر تھیں۔ چنانچہ انجیل میں ان کا یہ نقشہ کھینچا ہے کہ وہ مے نہ پیتے تھے اور کھاؤ پیو نہ تھے۔ اور حضرت مسیح کو لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ کھاؤ پیو ہے اور مے پیتا ہے" کیونکہ یوحنا نہ کھاتا آیا نہ پیتا اور وہ کہتے ہیں کہ اس میں بدروح ہے۔ ابن آدم کھاتا پیتا آیا اور وہ کہتے ہیں دیکھو کھاؤ اور شرابی آدمی" (متی ۱۱ - ۱۹)
قرآن کریم تو یحییٰ کو انبیاء میں سے ایک نبی بیان فرماتا ہے۔ مگر حضرت مسیح نے یوحنا کو نبیوں سے بھی بڑھ کر کہا ہے کہیں مسیح کے متعلق ایسا فقرہ ہوتا تو اس کی بنا پر اسے خدا بنا لیا جاتا، مگر یوحنا کو کچھ بھی نہیں سمجھا جاتا حالانکہ مسیح صاف کہتا ہے "تو پھر کیوں گئے تھے؟ ایک نبی کے دیکھنے کو؟ ہاں میں تم سے کہتا ہوں بلکہ نبی سے بڑے کو۔ ...... میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورت سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں ہوا" (متی ۱۱ : ۹ - ۱۱)۔
سوال یہ ہے کیا مسیح عورت سے پیدا نہیں ہوئے؟ پھر اس صریح بیان کے مطابق بڑا کون ہُوا؟ یحییٰ یا عیسیٰ؟ عیسائی خود ہی اس کا جواب دیں۔ اور جہاں فرشتہ زکریا کو یحییٰ کی بشارت دیتا ہے وہاں ان الفاظ میں بشارت ہے" اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب خوش ہونگے۔ کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پئیے گا اور اپنی ماں کے پیٹ سے ہی روح القدس سے بھر جائے گا" (لوقا ۱ : ۱۴ - ۱۵) اور احادیث میں بھی آتا ہے۔ ما من عبد یلقی اللّٰہ الا ذا ذنب الا یحیٰی بن زکریا۔ کوئی بندہ نہیں جو خدا کو ملے مگر وہ قصوروار ہوگا سوائے یحییٰ بن زکریا کے۔ یہ تمام باتیں اگر ان کو ظاہر پر حمل کیا جائے تو حضرت یحییٰ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بڑی فضیلت ثابت کرتی ہیں۔ عیسائی صاحبان اس پر غور کریں۔

ع۴۱۶ غلام۔ غلام اس کو کہتے ہیں جس کی مونچھیں نکل رہی ہوں (غ) یعنی نوجوان۔ یا پیدا ہونے سے لے کر جوانی تک غلام کہلاتا ہے اور کہل کو بھی غلام کہہ دیتے ہیں (ت)، قرآن کریم میں اکثر لڑکے کی بشارت غلام کے لفظ سے دی گئی ہے جس میں شاید یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ موعود لڑکا جوانی کی عمر کو پہنچے گا۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٤١﴾ ع ٤ ١٢

اس نے کہا میرے رب میرے لیے کوئی نشان مقرر کردے فرمایا تیرے لیے نشان یہ ہے کہ تین دن سوائے اشارہ کے لوگوں سے بات نہ کرے اور اپنے رب کو بہت یاد کر اور شام اور صبح تسبیح کر ۲۱۷

اور یہاں یعنی حضرت زکریا کے سوال میں شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ وہ لڑکا جس کے اب پیدا ہونے کی بشارت دی جاتی ہے وہ کب نوجوان ہوگا۔

الکبر۔ کِبَر یا بڑائی بعض وقت بلحاظ جسامت کے ہوتی ہے اور بعض وقت بلحاظ زمانہ کے اور بعض وقت بلحاظ منزلت اور رفعت کے (غ) یہاں کبر بلحاظ زمانہ کے مراد ہے یعنی مُسن ہونا یا بڑھاپا۔

عاقر۔ عَقر کے اصل معنی کسی چیز کا اصل ہیں یعنی اس کی جڑ اور اس سے عقرت النخل کے معنی آتے ہیں قَطَعْتُہٗ من اَصْلِہ (غ) یعنی میں نے کھجور کو جڑ سے کاٹ دیا اس طرح عقر کے معنی ذبح کر دینا یا کاٹ دینا ہو گئے ہیں چنانچہ عَقَرْتُ الْبَعِیْرَ کے معنی ہیں نَحَرْتُہٗ اسے ذبح کر دیا انہی معنوں میں آتا ہے فعقروھا (الشمس ۹۱-۱۴) فتعاطی فعقر (القمر ۵۴-۲۹) اور امرأۃ عاقر۔ اس عورت کو کہتے ہیں جو بچہ نہیں جنتی کَاَنَّھَا تَعْقِرُ مَاءَ الْفَحْلِ گویا وہ نر کے پانی کو کاٹ دیتی ہے یا ضائع کر دیتی ہے (غ)

کذالک اللہ یفعل مایشاء کی ترکیب یوں ہے۔ الامر کذالک یعنی ایسا ہی ہونا ہے اللہ یفعل مایشاء۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ پس یہ دو الگ الگ جملے ہیں پہلے میں مبتدا محذوف ہے۔

یہ سوال اللہ تعالیٰ کی قدرت کے استعظام پر اور ایک ایسے بڑے نشان کے ظاہر ہونے پر ہے۔ جو انسان بطور تعجب کرتا ہے۔ کیونکہ ظاہر حالات اس کے مخالف ہیں۔ اس میں کسی قسم کی بے ادبی خیال کرنا درست نہیں۔ اس لیے کہ ایسا ہی سوال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی بشارت پر کیا ہے قال ابشرتمونی علیٰ ان مسنی الکبر فبم تبشرون (الحجر ۱۵-۵۴)

ع ۲۱۷ ثلٰثۃ ایام۔ سورہ مریم میں اسی تذکرہ میں فرمایا ثلٰث لیال۔ یعنی تین راتیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض وقت ایک کا ذکر کر کے دونوں مراد لیتے ہیں جیسے سرابیل تقیکم الحر (النحل ۱۶-۸۱) میں اصل مراد ہے الحر و البرد۔ یعنی گرمی اور سردی سے بچاتے ہیں۔ یا مشرق کہکر مراد مشرق و مغرب لے لیتے ہیں اسی طرح ایام میں لیالی بھی شامل ہیں اور لیال میں ایام شامل ہیں۔ اور ایک جگہ ایام اور ایک جگہ لیال کہہ کر اس کو واضح کر دیا۔

رمزا۔ رَمْز کے معنی ہیں ہونٹوں سے اشارہ کرنا اور آواز مخفی اور آنکھوں سے اشارہ (غ) رَمْز کے اصلی معنی تحرک یعنی ہلانا ہیں۔ اور ابن عباس سے رمزا کے معنی الاشارۃ بالید والوحی بالرأس (ر) مروی ہیں یعنی ہاتھ سے اشارہ اور سر سے اشارہ۔

العشی۔ عَشِیّ اس وقت کا نام جو آفتاب کے ڈھلنے سے لیکر صبح تک ہو (غ) چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے الاعشیۃ اوضحاھا (النّٰزعٰت ۷۹-۴۶) اور عشاء صلوٰۃ مغرب سے لیکر عَتَمَہ تک بولا جاتا ہے یعنی تاریکی کے وقت تک وجاءو اباھم عشاء یبکون (یوسف ۱۲-۱۶)

ابکار یعنی بُکرۃ دن کے پہلے حصّہ کو کہتے ہیں (غ) اور ابکار اسی معنی میں مصدر ہے۔

زکریا کی خاموشی اضطراری تھی یا اختیاری: زکریا کا نشان مانگنا اس بات پر دلیل نہیں کہ آپ کو وعدہ الٰہی پر ایمان نہ تھا۔ حسن کہتے ہیں لیستلقی تلک النعمۃ بالشکر (م) تاکہ اس نعمت پر شکر کرے۔ یہاں لوگوں نے بعض لغو قصے بڑھا دیئے ہیں کہ شیطان نے زکریا کو کہہ دیا تھا کہ تمہیں فرشتے کی آواز نہیں آئی، بلکہ یہ شیطان کی آواز تھی اور کہ اسی لیے زکریا نے کہا تھا انّٰی یکون لی غلام اور اسی لیے نشان مانگا تھا۔ اس بات کی طرف تو مفسرین گئے ہیں کہ حضرت زکریا کا نہ بولنا کسی آفت کی وجہ سے نہ تھا۔ کیونکہ سورہ مریم میں صاف لفظ سویا بڑھا دیا ہے یعنی حالت صحت میں ہونے کے باوجود کلام نہ کرو۔ مگر اکثر کا خیال یہی ہے کہ زکریا کا نہ بولنا بطور اضطرار تھا۔ لیکن ابومسلم کہتے ہیں کہ یہ بطور اختیار تھا اور عطاء کہتے ہیں کہ یہ...... روزہ رکھنے کی طرف اشارہ تھا۔ کیونکہ ان میں دستور تھا کہ روزہ رکھتے تھے تو کلام نہ کرتے تھے (ر) یہ توجیہ بہت لطیف ہے۔ ایک تو اس پر انی نذرت للرحمٰن صوما فلن اکلم الیوم انسیا (مریم ۱۹-۲۶) شاہد ہے یعنی مریم کہتی ہیں میں نے رحمٰن کے لیے روزہ نذر مانا ہے اس لیے آج میں کسی انسان سے گفتگو نہ کرونگی۔ کیونکہ جہاں نہ بولنے کا حکم ہے وہیں یہ بھی حکم ہے کہ اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کرو اور صبح اور شام تسبیح کرو۔ اگر حضرت زکریا بولنے پر قادر نہ تھے تو تسبیح کا حکم ٹھیک نہیں رہتا۔ یہ کہنا کہ اختیاری طور پر نہ بولنا نشان نہیں لفظ نشان کے معنی کی غلط فہمی پر مبنی ہے حضرت زکریا نے یہی عرض کیا تھا کہ اجعل لی اٰیۃ میرے لیے کوئی نشان مقرر کردو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے لیے یہ نشان مقرر کرتے ہیں کہ تین دن روزہ رکھو اور لوگوں سے بات چیت نہ کرو۔

لوقا کا قصہ: انجیل لوقا میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ قابل قبول نہیں۔ وہاں لکھا ہے کہ فرشتہ نے زکریا کو یوں کہا "اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لیے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہونگی یقین نہ کیا" اور آگے لکھا ہے کہ جب زکریا باہر نکلا تو وہ لوگوں سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا (لوقا ۱: ۲۰-۲۲) حالانکہ زکریا نے جو کچھ کہا وہ اس سے بڑھ کر نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسے ہی حالات میں کہا۔ اور یہ مفسرین بائبل کو خود اعتراف ہے۔ پھر ایک ہی سوال پر ایک جگہ کوئی بات خلاف یقین نہیں اور دوسری جگہ یہ کہنا کہ یقین نہ کیا صحیح نہیں ہے۔

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور تجھے پاک بنایا ہے[۴۱۸] اور قوموں کی عورتوں میں سے تجھے چُن لیا ہے[۴۱۹]

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ

اے مریم! اپنے رب کی فرمانبرداری کر اور سجدہ کر اور

ع[۴۱۸] قالت الملائکۃ - دیکھو [۴۱۲] فنادتہ الملائکۃ پر - دونوں کا منشاء ایک ہی ہے - یہاں پر یہ بحث ہوتی ہے کہ آیا حضرت مریم نبیہ تھیں یا نہیں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ نبیہ تھیں - بعض نے انکار کیا ہے - قائلینِ اثبات نے اس بات سے حضرت مریم کی نبوت کا استدلال کیا ہے کہ ملائکہ نے ان سے کلام کیا اور لقانی نے کہا ہے کہ ملائکہ کا کلام کرنا ایسے لوگوں سے ثابت ہے جو بالاجماع نبی نہیں - چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص اپنے ایک بھائی کی زیارت کے لیے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے نکلا تو فرشتوں نے اسے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم سے ایسی محبت کرتا ہے جیسی تم اپنے بھائی سے محبت کرتے ہو - چنانچہ وہ کہتے ہیں من توھم ان النبوۃ مجرد الوحی و مکالمۃ الملک فقد حاد عن الصواب (ر م)

محض مکالمہ نبوت نہیں : یعنی جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ مجرد وحی اور مکالمہ کا نام نبوت ہے وہ صواب سے پھر گیا - اس کے ساتھ اختلاف بھی لوگوں نے کیا ہے غور کیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ غیر انبیاء سے مکالمہ الٰہی ایک امر مسلم ہے اور حدیث صحیح رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء (یعنی ایسے لوگوں کا وجود جن سے کلام الٰہی ہوتا ہے حالانکہ وہ نبی نہیں) اس پر ایسی کھلی دلیل ہے کہ جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا - پھر ایک مریم سے ہی کلام الٰہی از روئے قرآن ثابت نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی وحی کا ہونا ثابت ہے - و اوحینا الٰی ام موسٰی (القصص ۲۸ - ۷) پھر اوحیت الی الحواریین (المائدۃ ۵ - ۱۱۱) بھی موجود ہے - یعنی حواریوں کی طرف وحی کی - اب بہرحال حواریوں کی نفی نبوت پر حدیث شاہد ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - لم یکن بینی و بینہ نبیّ یعنی میرے اور عیسٰی کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا - پس صرف وحی پانا نبوت نہیں - ہاں لفظ نبی کے لغوی معنی چونکہ یہ ہیں کہ وہ خدا سے خبر پا کر پہنچاتا ہے گو وہ خبر کسی ہدایت دینی سے تعلق نہ رکھتی ہو بلکہ محض ایک ذاتی امر ہو یا ایک پیشگوئی ہو اس لیے لغوی معنی کے لحاظ سے بلاشبہ ہر اس شخص پر جس سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا لفظ نبی کا صادق آسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل میں صرف خواب بینوں کو بھی نبی کہہ دیتے تھے - مگر چونکہ اصلاح شریعت میں لفظ نبی انہی لوگوں پر صادق آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت دینی لے کر آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان سفیر ہوتے ہیں جیسا کہ راغب نے لکھا ہے (نوٹ ع[۹۱]) اس لیے جب محض مکالمہ مخاطبہ والے پر لفظ نبی بولا جائے گا تو صرف مجازی معنی میں بولا جائے گا - پس جن لوگوں نے حوّا اور اسیۃ اور اُم موسٰی اور سارۃ اور ھاجرہ اور مریم کو نبیہ کہا ہے (ر م) وہ محض اس لغوی یا مجازی معنی کی رو سے ہے اور اسی لیے انہوں نے لفظ رسول ان پر نہیں بولا جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ گو اللہ تعالیٰ ان سے کلام کرتا تھا مگر وہ کلام کسی دینی ہدایت کے متعلق نہ تھا - اور جن معنوں میں مریم نبیہ تھیں ان معنوں میں اس اُمت کے برگزیدہ لوگ بھی نبی ہیں - کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے بھی ہمکلام ہوتا ہے - اور سورۃ تحریم میں صاف طور پر اس امت کے برگزیدہ لوگوں کو مریم بنت عمران سے مثال دی ہے -

طھرك - طھارۃ کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں - طھارۃ دو قسم پر ہے - طہارت جسمانی اور طھارۃ نفس - اور گو بعض جگہ دونوں معنوں پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے و یحب المتطھرین (البقرۃ ۲ - ۲۲۲) یحبون ان یتطھروا (التوبۃ ۹ - ۱۰۸) مگر یہاں مقصود بالذات طہارت نفس ہی ہے - ایمان کی وجہ سے کفر سے پاک کیا - اور طاعت کے ساتھ نافرمانی سے پاک کیا (ر م) یا جیسا کہ کہا گیا ہے اخلاق ذمیمہ سے پاک کیا

ع[۴۱۹] عالمین پر فضیلت سے مراد : علٰی نساء العالمین - بنی اسرائیل کے ذکر میں فرمایا تھا وانی فضلتکم علی العالمین - ایسے موقعوں پر مراد ہمیشہ عالمی زمانہم یعنی اس زمانہ کے لوگ ہوتے ہیں چنانچہ ایک حدیث مرسل میں یہ تشریح آئی بھی ہے مریم خیر نساء عالمھا (ر) مریم اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے بہتر تھیں - عورتوں میں فضیلت : ہاں احادیث اس بارہ میں مختلف طور پر آئی ہیں اور ان میں سے جو ایک میں دوسری کے ساتھ اختلاف نظر آتا ہے کہ مثلاً کسی حدیث میں تو محض چار عورتوں کے افضل النساء ہونے کا ذکر آتا ہے جیسا ابن مردویہ کی روایت میں مریم، آسیہ، خدیجہ اور فاطمہ کا نام ہے اور ایک میں یوں آتا ہے کہ عورتوں میں سے سوائے تین کے کسی کی تکمیل نہیں ہوئی - مریم - آسیہ - خدیجہ اور عائشہ کی فضیلت سب عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت کھانوں پر (ث) اور ایک حدیث میں ہے کہ بہترین عورتوں کی مریم بنت عمران اور بہترین عورتوں کی خدیجہؓ بنت خویلد ہیں (ث) معلوم ہوتا ہے یہ فضیلت بعض پہلوؤں سے ہے -

عیسائیوں کا مریم کی فضیلت سے حضرت عیسٰی کی فضیلت پر استدلال : بعض عیسائی یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت عیسٰی کی والدہ کو اتنی بڑی فضیلت حاصل ہے جو محمد رسول اللہ صلعم کی والدہ کو حاصل نہیں - اس سے حضرت عیسٰی کی فضیلت لازم آتی ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ماں کی فضیلت کے بغیر اولاد افضل نہیں ہو سکتی؟ اگر اولاد کو فضیلت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ماں کو فضیلت حاصل ہو تو مریم کی ماں کو تو کوئی فضیلت حاصل نہ تھی مریم کو کیونکر فضیلت حاصل ہو گئی اور اگر یہ سلسلہ اور آگے چلایا جائے تو حضرت عیسٰی کی دادیوں نانیوں میں تو بعض ایسی عورتیں ملیں گی جن کے متعلق عیسائیوں کی کتابوں میں جو کچھ پایا جاتا ہے

وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾
ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَ
مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ
اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ

جھک جانے والوں کے ساتھ جھک جا[۴۲۰]
یہ غیب کی خبروں میں سے ہے، جو ہم تیری طرف وحی کرتے
ہیں[۴۲۱] اور تو ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنی قلمیں ڈالتے تھے کہ
ان میں سے کون مریم کا کفیل بنے اور نہ تو ان کے پاس تھا جب

کوئی مسلمان اس کو مان بھی نہیں سکتا۔ عجیب بات ہے کہ قرآن کی رو سے مریم صدیقہ کو جو فضیلت ملتی ہے وہ پہلے مل چکتی ہے اور وہ بیٹا جس کو اس وجہ پر افضل کہنے کی جرأت کی جاتی ہے نہ صرف ابھی پیدا ہی نہیں ہوا بلکہ ماں کے رحم میں بھی موجود نہیں اگر وہ پیدا نہ بھی ہوتا تو مریم کو جو فضیلت ملنی تھی وہ مل چکی۔ کیسا پُرحکمت کلام ہے۔ مریم کے اصطفا اس کی تطہیر اس کی فضیلت کے ذکر میں جو اس آیت میں موجود ہے حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے کی بشارت تک بھی نہیں۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ مریم کا ذکر اناجیل میں: ہاں جس ماں کی فضیلت کو حضرت عیسےٰ کی فضیلت کی وجہ قرار دیا جاتا ہے اناجیل کو اُٹھا کر دیکھو وہاں اسی ماں کو کس زمرہ میں داخل کیا گیا ہے "کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں اس نے خبر دینے والے کے جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں۔ کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے۔" (متی ۱۲: ۴۸-۵۰) اب اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے خیال میں اس کی ماں آسمانی باپ کی مرضی پر چلنے والی نہ تھی۔ ورنہ ماں کی طرف سے یوں بیزاری کا اظہار اور شاگردوں سے جو اس کی رائے میں آسمانی باپ کی مرضی پر چلنے والے تھے یوں محبت کا اظہار نہ ہوتا۔ پھر ایک جگہ مریمؑ نے کچھ کہنا چاہا تو آپ یوں اپنی والدہ محترمہ سے مخاطب ہوتے ہیں "اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام ہے" (یوحنا ۲: ۴) کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح اپنی والدہ محترمہ کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ ان کو تمام دنیا کی عورتوں سے بلند مرتبہ سمجھتے ہوں اور اپنی فضیلت کو بھی ماں کی بزرگی کی طرف منسوب کرتے ہوں بلکہ یہاں تو حالات کچھ اس کے برعکس نظر آتے ہیں۔ آنحضرتؐ کا اپنی بیٹی کی عزت کرنا: جائے غور ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی کی اس سے بہت بڑھ کر عزت کرتے ہیں جس قدر حضرت مسیح نے اپنی والدہ کی کی۔ آپ کبھی فاطمہؓ کو ایسے الفاظ میں خطاب نہیں کرتے۔ بلکہ ہمیشہ پیار محبت عزت کے الفاظ سے پکارتے ہیں۔ بلکہ حضرت فاطمہؓ کی تعظیم کے لیے بعض وقت اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بہرحال حضرت مریم کی فضیلت سے کوئی استدلال حضرت عیسیٰ کی فضیلت پر نہیں ہو سکتا۔

ع[۴۲۰] حکم دینے سے خلاف ورزی حکم پر استدلال غلط ہے: جب کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی حکم ہو (بلکہ عام حکم بھی ہو) تو عیسائی کہا کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف کیا تھا۔ اس لیے یہ حکم ہوا کہ ایسا کرو۔ اس موقع پر بھی انہیں غور کرنا چاہیئے کہ کیا مریم پہلے خدا کی فرمانبرداری یا عبادت نہ کرتی تھیں، سیدھی بات ہے۔ بعض وقت مشکلات کے لحاظ سے ایک بات کی تاکید کی جاتی ہے۔ مریم پر بھی بڑے ابتلاؤں کا وقت آنے والا تھا کہ لوگ اس پر طرح طرح کے الزام لگائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمانبرداری کی تاکید فرمائی۔

ع[۴۲۱] انباء۔ نباء کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایسی خبر جس میں کوئی عظیم الشان مطلب ہو۔ اور اس سے علم یا غلبہ ظن حاصل ہو (غ)

الغیب اس کا استعمال ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو حاسہ سے مخفی ہو یا انسان کے علم میں نہ ہو (غ) واقعات گزشتہ بھی اس لحاظ سے غیب میں داخل ہو جاتے ہیں جب ان کا صحیح علم نہ رہا ہو۔

واقعات گزشتہ کس صورت میں غیب میں داخل ہو جاتے ہیں۔ عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ تاریخی باتوں کو قرآن شریف نے انباء الغیب کہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت مریم صدیقہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق واقعات دنیا میں دشمن اور دوست دونوں میں نہایت غلط طور پر مروج ہو گئے اس لیے قرآن کریم نے اصل واقعات پر عالم کو مطلع فرما کر واقعی ایک غیب سے پردہ اُٹھایا ہے۔ اور مسیح اور مریم کی اصل حیثیت کو دنیا میں ظاہر فرمایا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسی گڑبڑی میں جہاں مسیح کے اصل حالات پر خطرناک تاریکی کا پردہ پڑ چکا تھا۔ ان کی اصلیت پر اطلاع پانا کسی عالم کا کام بھی نہ ہو سکتا تھا۔ چہ جائے کہ عرب کا ایک اُمی ان اصل حالات کو ظاہر کرتا۔ اصل انجیل جس میں خالص حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم تھی وہ دنیا سے بالکل نابود ہو چکی تھی اور اس کی جگہ بہت سی انجیلیں لے چکی تھیں۔ جن میں سے بعض کو کلیسا نے بلا دلیل الہامی مان لیا اور بعض کو وضعی قرار دے کر رد کر دیا اور مسیح کو خدائی کا مرتبہ دے کر اس کے خون کے کفارہ کو نجات کا موجب قرار دیا اور شریعت کو لعنت قرار دیا۔ اعمال کی ضرورت باقی نہ سمجھی۔ یہودیوں نے بوجہ اپنی عداوت کے جو اُن کو مسیح کے ساتھ تھی کوئی صحیح حالات حضرت مسیح علیہ السلام کے باقی نہ رکھے تھے ہاں وہ ان پر طرح طرح کے ناپاک الزام لگاتے تھے۔ جب اہل کتاب کے دونوں گروہ ایک شخص کے معاملہ میں اس طرح حدبندیوں کو توڑ کر دور نکل چکے تھے اور کوئی صحیح علم حضرت مسیح کے متعلق باقی نہ رہا تھا تو اب سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے ان واقعات کا صحیح علم دنیا پر دوبارہ نہ آ سکتا تھا۔ یہ واقعی غیب کی خبر تھی جو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر فرمائی اور آج دنیا آہستہ آہستہ اس بات کی قبولیت کی طرف چلی آتی ہے جس کا اعلان آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک اُمی نے جو ایک ناخواندہ قوم میں سے تھا دنیا میں کیا۔

مریم کی عصمت پر شہادت انباء الغیب سے ہے: اس لیے ذٰلك من انباء الغیب نوحیه الیك کے الفاظ ایک اعلیٰ درجہ کی صداقت کی طرف اشارہ کرتے

لَدَیۡہِمۡ اِذۡ یَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾ وہ آپس میں جھگڑتے تھے[۴۲۲]

ہیں اور دوسری وجہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت کی شہادت کو انباء الغیب سے کیوں قرار دیا یہ ہے کہ واقعی گواہ تو اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی کی معرفت اس کی شہادت ادا کی تا دنیا اس حقیقت پر بذریعہ وحی آگاہ ہو جس سے آگاہی کا اور کوئی واقعی ذریعہ نہ رہا تھا۔

۴۲۲؎ اقلام۔ قَلَم کی جمع ہے اور قَلَم (ل)، یا قِلَم (غ)، کی جمع بھی اقلام آتی ہے جو اس تیر کا نام ہے جو قمار میں کام دیتا تھا۔ اور قَلَم تیر کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کاٹا جاتا ہے۔ کیونکہ قَلَم کے اصل معنی کاٹنے کے ہیں اس لیے ناخن کٹوانے پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں زجاج وغیرہ نے اقلام سے مراد قداح یعنی قرعہ اندازی کے تیر ہی لیے ہیں اور بعض کے نزدیک معمولی قلمیں مراد ہیں جن سے کاہن لوگ لکھا کرتے تھے اور قلم کا لفظ تقدیر الٰہی کے متعلق بھی بولا جاتا ہے گو اس کی کیفیت کا علم کسی انسان کو نہیں دیا گیا۔ جیسا کہ ابن سیدہ کا قول لسان العرب میں منقول ہے والقلم الذی فی التنزیل الاعراف کیفیتہ اور ایک اعرابی کا قول نقل کیا گیا ہے سَبَقَ الْقَضَاءُ وَ جَفَّتِ الْاَقْلَامُ یعنی قضا و قدر کا فیصلہ ہو چکا اور قلمیں خشک ہو چکیں۔ مراد یہ ہے کہ جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے ہو چکا۔ پس لوح و قلم میں بغیر کسی تشبیہ کے مراد قضا و قدر ہے۔

اس آیت میں کس واقعہ کی طرف اشارہ ہے؟ بعض کے نزدیک یہ مراد ہے کہ صغر سنی میں جب وہ تعلیم و تربیت کے لیے ہیکل میں آئیں تو اس وقت کاہنوں میں جھگڑا ہوا کہ ان کا کفیل کون ہو اور بذریعہ قرعہ اندازی جو خواہ تیروں سے ہوئی یا قلموں سے حضرت زکریا مریم صدیقہ کے کفیل ہوئے اس صورت میں ماکنت لدیہم وغیرہ میں ضمیر کاہنوں کی طرف ہو گی جن کا کوئی ذکر پہلے نہیں۔ مگر یہ کہا گیا ہے کہ چونکہ زکریا کی کفالت میں مفہوم یہ پایا جاتا ہے کہ یہ کفالت کسی جھگڑے کے بعد ہوئی تھی اس لیے ان جھگڑنے والوں کی طرف ضمیر جاتی ہے یہ بہت بعید تاویل ہے۔

حضرت مریم کی دوسری کفالت مریم کی بلوغت پر تھی، بعض مفسرین کے نزدیک یہ اشارہ کسی ایسی کفالت کی طرف ہے جو مریمؑ کے بلوغ کو پہنچ جانے کے بعد وقوع میں آئی۔ جب زکریا اس کی کفالت سے عاجز آگئے (رح) یعنی پہلے کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور بعض نے دو دفعہ قرعہ اندازی لیکر اس آیت کو اسی دوسری قرعہ اندازی کے متعلق مانا ہے اور گو روح المعانی میں اس قول کو مرجوح لکھا ہے مگر فی الحقیقت اسے ترجیح ہے۔ کیونکہ قرآن کریم ایک پُر نظم کلام ہے اور تمام واقعات کا ذکر ایک ترتیب سے ہوتا چلا آرہا ہے پہلے مریم کی پیدائش کا ذکر کیا پھر اس کی کفالت زکریا کا ذکر۔ اسی ذکر میں زکریا علیہ السلام کی دعا اور یحییٰ کی بشارت کا ذکر ضمنی طور پر آگیا۔ اس کے بعد پھر اصل ذکر کی طرف رجوع کیا تو مریمؑ کے اصطفا و پاکیزگی برگزیدگی کا ذکر کیا۔ اسے فرمانبرداری اور نماز کا حکم دیا۔ یہ واقعات یقیناً زمانہ بلوغت سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے اس کے بعد پھر ایک گزشتہ واقعہ کی طرف اشارہ کرنا بلاغت کے خلاف ہے۔ پس یہ آیت یقیناً اس وقت کی طرف اشارہ کرتی ہے جب مریم صدیقہؓ سن رشد کو پہنچ چکی تھیں اب ان کی تربیت کا زمانہ ختم ہو گیا اور وہ ہیکل میں نہ رہ سکتی تھیں۔ اس لیے بھی کہ بلوغت کے ساتھ ایام حیض کا آنا ضروری تھا اور یہودیوں میں ایام حیض کے اندر عورت کو ناپاک سمجھ کر الگ رکھا جاتا تھا۔ مریم صدیقہ کا نکاح: پس یہاں جس کفالت کا ذکر ہے اس سے مراد کفالت نکاح ہے۔ ایک سن بلوغ کو پہنچی ہوئی عورت کے لیے اب یہ ضروری تھا کہ اس کے نکاح کا فکر کیا جاتا۔ اور مریم کی ماں نے مریم کو خدمت دین کے لیے نذر کر دینے کے بعد بھی یہ دعا مانگ کر کہ انی اعیذھا بك وذریتھا بتا دیا تھا کہ تارکہ بٹھانا اس کا منشا ہرگز نہ تھا۔ اور نہ تارکہ بٹھانے کا بنی اسرائیل میں کوئی دستور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف ہو چکی تھیں اس لیے انہیں یہ اختیار نہ تھا نہ ان کی والدہ کو یا والد کو اختیار تھا کہ ان کے نکاح کی تجویز کریں۔ بلکہ اس کے متعلق قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا مناسب سمجھا گیا۔ کیونکہ وہ بہت سے کام قرعہ اندازی سے کر لیا کرتے تھے اور اسے خدائی فیصلہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ خود کہانت کے کام کے سرانجام دینے میں قرعہ اندازی کو خدائی فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ اناجیل میں مرقوم ہے "اور جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے موافق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مقدس میں جا کر خوشبو جلائے" (لوقا ۱-۸ و ۹) باقی رہا ذکر خصومت سو یہ بھی کوئی بعید از قیاس بات نہیں ایسی نیک اور پاک بی بی کو اپنی زوجیت میں لانے کی خواہش بہتیرے دلوں میں پیدا ہوئی ہو گی علاوہ ازیں وہ ہیکل کی نذر ہو چکی تھیں گویا ماں باپ کا یا اپنا اختیار تو اس معاملہ میں رہا نہ تھا۔ اس لیے مناسب یہی سمجھا گیا کہ بذریعہ قرعہ اندازی ہی اس کا فیصلہ ہو۔ پس یہاں گویا درحقیقت یہ ذکر ہے کہ مریم کے لیے خاوند کا فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا گیا اور ضمیریں اس صورت میں عام ہیں یعنی وہ لوگ جو اس وقت تھے۔

اور یہ جو فرمایا کہ تم ان کے پاس نہ تھے تو اس میں یا تو یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مریم علیہا السلام کی بریت کی شہادت ایک ایسے شخص کی طرف سے ہے جس کا تعلق فریق مقدمہ سے کوئی نہیں اس لیے یہ نہایت سچی اور بے لوث شہادت ہے اور یا اس لحاظ سے کہا کہ وہ واقعات تمہارے ذریعہ سے ظاہر کیے جاتے ہیں جن کا علم دنیا میں مفقود ہو چکا تھا تم تو ان کے پاس نہ تھے پس یہ علم غیب سوائے خدا کے کون ظاہر کر سکتا تھا۔

ہاں ایک امکان یہ بھی ہے کہ یہ مریم کے اصطفائے روحانی کی طرف اشارہ ہو۔ ملائکہ کا ذکر پہلے آچکا ہے اور قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی برگزیدگی کے وقت ملاء اعلیٰ میں ایک خصومت ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ ما کان لی من علم بالملاء الاعلیٰ اذ یختصمون (صٓ - ۶۹) مجھے ملاء اعلیٰ کے متعلق کوئی علم نہ تھا، جب وہ جھگڑتے تھے۔ اس صورت میں اقلام سے مراد قضا و قدر ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ اس لفظ کے معنی میں پہلے بیان ہو چکا ہے اور ملائکہ کی طرف اس کو منسوب کرنا اس لیے درست ہے کہ گو سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے مگر وہ ملائکہ کی وساطت سے ہی ہوتا ہے جیسا کہ خدا ہی کلام کرنے والا ہے مگر یہاں قول ملائکہ کی طرف منسوب ہے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ — جب فرشتوں نے کہا، اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک
يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ — کلام کے ساتھ خوش خبری دیتا ہے[۴۲۳]۔ اس (مبشر) کا نام مسیح عیسیٰ بن
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا — مریم ہے[۴۲۴] جو دنیا اور آخرت میں وجاہت والا اور مقربوں

ع۴۲۳ کلمۃ اللہ سے مراد: ان اللہ یبشرك بكلمة منه اس کے معنی میں نے یوں کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلام کے ذریعہ بشارت دیتا ہے۔ مگر عام طور پر اس کے معنی یوں کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے گویا مسیح کو اللہ تعالیٰ کا ایک کلمہ کہا گیا ہے۔ اور عیسائیوں کا اس پر بہت زور ہے کہ مسیح کو کلمۃ اللہ کہہ کر قرآن شریف نے ایک ایسی خصوصیت دیدی ہے جو دوسرے کسی نبی کو نہیں دی۔ اور پھر اس خصوصیت کی بنیاد پر مسیح کو خدا بنایا جاتا ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جو وفد نجران نے نبی کریم صلعم کے مقابلہ پر پیش کی اور یہی وہ دلیل ہے جس پر آج بھی عیسائی زور دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے کیسا لطیف جواب بھی ان لوگوں کو دیدیا تھا کہ اس کی بشریت یا خدائی کا فیصلہ اصولی رنگ میں کرو۔ کیا جس شخص کے ساتھ کھانے پینے۔ قضائے حاجت کی ضروریات ماں کے رحم میں رہنے، پیدا ہونے بڑھنے، جوان اور پھر بوڑھا ہونے کے پھر وفات پانے کے عوارض پائے جاتے ہوں اس کو بشر کہیں گے یا خدا۔ مگر ہر ایک باطل پرست کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اصولی بحث سے گریز کرتا ہے اور خصوصیات میں جاکر پناہ ڈھونڈھتا ہے۔ اب اگر یہ بھی مان لیں کہ مسیح کو کلمۃ من اللہ کہا گیا ہے اور اور کسی نبی کا نام لیکر اس کے ساتھ کلمۃ اللہ کا لفظ نہیں بولا۔ تو کیا اس سے مسیح کی خدائی ثابت ہو سکتی ہے یا بشریت کے دائرہ سے وہ نکل جاتا ہے یہ محض ایک دعویٰ ہے جس کی دلیل کوئی نہیں کہ کیونکر صرف اس خصوصیت سے دائرہ بشریت سے نکل کر مسیح خدا بن جاتا ہے۔

بروئے قرآن کلمات اللہ بہت ہیں: پھر مسیح کو تو کلمة منه کہا یعنی اپنی طرف سے ایک کلمۃ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہی کلمہ نہیں بلکہ کلموں میں سے ایک کلمہ ہے اور اپنے کلمات کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قل لو كان البحر مدادا لكلمات ربى لنفد البحر قبل ان تنفد كلمات ربى (الکہف ۱۸: ۱۰۹) کہو اگر میرے رب کے کلمات کے لیے سمندر بھی سیاہی بن جائیں تو میرے رب کے کلمات اس قدر لاتعداد لاتحصے ہیں کہ سمندر ختم ہو جائیں مگر وہ کلمات ختم نہ ہوں۔ تو کیا صاف ظاہر نہیں کہ اس لاانتہا تعداد میں سے جو اللہ تعالیٰ کے کلموں کی ہے ایک کلمہ مسیح بھی ہے۔ پس خصوصیت بھی کوئی نہ رہی۔ پھر کلمة منه کے معنی تو صرف اس قدر ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک کلام ہے۔ کلمہ یا قول کے آنے سے مراد: اب جب کوئی شخص کوئی بات کرے اور وہ بات پوری ہو جائے تو کہتے ہیں جاء کلامه یا جاء قوله۔ اس کا کلام یا اس کا قول آگیا۔ اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ کلام یا قول مجسم ہو کر آگیا۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جو اس نے کہا تھا وہ پورا ہو گیا ہے پس اس معنی میں مسیح کو کلمۃ اللہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ایک بات کہی تھی وہ مسیح کے آنے سے پوری ہو گئی۔ پس مسیح کے آنے میں گویا خدا کا کلام آگیا چنانچہ یہی توجیہ مفسرین نے پسند کی ہے جیسا کہ امام رازی کہتے ہیں انه قد وردت البشارة فى كتب الانبياء الذين كانوا قبله فلما جاء قيل هذا هو تلك الكلمة۔ یعنی ان نبیوں کی کتابوں میں جو اس سے یعنی مسیح سے پہلے گزر چکے تھے مسیح کے متعلق بشارت تھی۔ پس جب مسیح آیا تو کہا گیا کہ وہ کلمہ آگیا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نسبت فرماتے ہیں انا دعوة ابى ابراهيم میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ حالانکہ آپ کوئی دعائے مجسم تو نہ تھے۔ مگر چونکہ آپ کے وجود میں حضرت ابراہیم کی دعا پوری ہوئی اس لحاظ سے آپ نے اپنے آپ کو دعا کہہ دیا ہے۔

کلمہ کی دوسری توجیہ: دوسری توجیہ یہ ہے کہ یبشرك بكلمة منه میں با ذریعہ کے لیے ہے یعنی معنی یہ ہیں کہ اے مریم اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلمہ کے ساتھ بشارت دیتا ہے اور یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے حضرت ابراہیم کو اسحاق کی بشارت ملی تو آپ نے فرمایا فبم تبشرون تو جواب اس کا یوں دیا گیا بشرناك بالحق ہم تمہیں حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں یہ مراد نہیں کہ الحق کی بشارت دیتے ہیں۔ اب یبشرك بكلمة منه اور بشرناك بالحق بالکل ایک جیسی مثالیں ہیں اگر ایک کے ذریعہ سے مسیح کلمۃ اللہ بن سکتا ہے تو دوسرے کے ذریعہ اسحاق الحق بن سکتا ہے۔ حالانکہ بات صرف اس قدر ہے کہ ایک جگہ تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ساتھ بشارت دیتا ہے اور دوسری جگہ مراد ہے کہ ہم تم کو حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں۔ اس صورت میں مفعول کو محذوف کرکے اس کی بجائے فرمادیا اسمه المسيح وہ جس کی بشارت ہم دیتے ہیں اس کا نام مسیح ہے۔ تو كلمة منه سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کی پیشگوئی ہے اور اسی کی موید یہ بات ہے کہ كلمة منه کے بعد فرمایا اسمه۔ حالانکہ كلمة مونث ہے۔ پس اسمه میں ضمیر مبشر بہ کی طرف جائے گی یعنی اس کا نام جس کی بشارت دی جاتی ہے۔

ع۴۲۴ اسم وہ ہے جس سے ایک چیز کی ذات اور اس کا اصل پہچانا جائے (غ) اسم سے مراد عَلَم بھی ہوتا ہے اور اسم سے مراد بلحاظ معنی لغوی علامت ممیزہ بھی ہوتے ہیں (ر د) یہاں دونوں معنوں کو جمع کر دیا ہے۔ کیونکہ المسیح جس کو مقدم کیا ہے وہ لقب ہے جو بعد نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ملتا ہے اور ابن مریم آپ کی کنیت ہے۔ المسیح۔ مَسْح کے معنی کسی چیز پر ہاتھ کا پھیرنا اور اس سے اثر کا دور کر دینا ہے (غ) اور پھر ان دونوں معنوں میں الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے وعُبّر عن السير بالمسح (غ) اور سیر یعنی چلنے کو بھی مسح کہتے ہیں۔ قيل سُمّى عيسى عليه السلام مسيحا لكونه ماسحا فى الارض اى ذاهبا فيها یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح اس لیے رکھا گیا کہ وہ زمین میں چلنے والے یا سیاحت کرنے والے تھے۔ اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علاوہ ملک شام کے دوسرے ممالک میں بھی پھرتے رہے اور کہ وہ افغانستان اور کشمیر میں آئے اور اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل زمانہ قید میں کچھ جلا وطن ہو کر افغانستان وغیرہ کی طرف

وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾	میں سے ہوگا[۴۲۵]
وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا	اور وہ لوگوں سے جھولے میں اور ادھیڑ عمر میں باتیں کریگا
وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾	اور نیکوں میں سے ہوگا[۴۲۶]

چلے آئے تھے اور افغان اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتے ہیں اور افغانستان اور کشمیر کے شہروں کے ناموں میں اور افغانوں اور کشمیریوں کے رسم و رواج میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے ضرور تھا کہ مسیح ان اسرائیلی اقوام کی طرف بھی آتے۔ دیگر وجوہات یہ دی ہیں کہ آپ کے ہاتھ لگانے سے بیمار اچھے ہوجاتے تھے یا آپ ماں کے پیٹ سے مَمسوح بالدُّھن پیدا ہوئے تھے اور پھر لکھا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ مسیح وہ ہے جس کی ایک آنکھ ماری ہوئی ہو۔ وقد رُوِی ان الدجال ممسوحُ الیمنی وعیسیٰ ممسوح الیُسریٰ قال ولیعنی بان الدجال قد مُسِحَتْ عنه القوۃ المحمودۃُ من العلم والعقل والحلم والاخلاق الجمیلۃ وان عیسیٰ مسحت عنه القوۃ الذمیمۃ من الجهل والشَّرَہِ والحِرصِ وسائرِ الاخلاق الذمیمۃ (رغ) اور روایت کی گئی ہے کہ دجال کی دائیں آنکھ ماری ہوئی ہوگی اور عیسیٰ کی بائیں آنکھ ماری ہوئی ہوگی اور مراد اس سے یہ ہے کہ دجال سے علم اور عقل اور حلم اور اچھے اخلاق کی قابل تعریف قوت جاتی رہی ہوگی۔ اور عیسیٰ سے جہل اور لالچ اور حرص اور بُرے اخلاق کی قابل نفرت قوت جاتی رہی ہوگی۔ امام راغب کی اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کا کانا ہونا محض بلحاظ صفات ہے اور ان بزرگوں نے ان پیشگوئیوں کو مجاز اور استعارہ پر حمل کیا ہے۔

ع[۴۲۵] وجیه کے معنی ہیں ذو جاہ یا ذو وجاهة یعنی مرتبہ یا وجاہت والا۔ حضرت موسیٰ کے متعلق فرمایا وکان عند الله وجیها (الاحزاب ۳۳-۶۹) اللہ تعالیٰ کے انبیاء سب ہی وجاہت والے ہوتے ہیں مسیح کو وجیہ کہنے کی وجہ یہاں اشارہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ سمجھیں گے کہ یہ شخص ذلیل ہوگیا مگر ایسا نہ ہوگا بلکہ اسے دنیا میں بھی ضرور وجاہت حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی۔ جس قدر تاریخ حضرت مسیح کی عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے وہ بظاہر انہیں ایک ذلت کی حالت میں چھوڑتی ہے۔ کیونکہ ان کا خاتمہ چوروں کے ساتھ صلیب پر ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ انبیاء کو کچھ نہ کچھ کامیابی دیکر اُٹھاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق وجیه فی الدنیا فرمانا یہی معنی رکھتا ہے کہ لوگ انہیں ناکام سمجھیں گے مگر فی الحقیقت وہ کامیابی کے بعد اٹھائے جائیں گے۔ یہ کامیابی حضرت عیسیٰ کو یہود بیت المقدس میں حاصل نہیں ہوئی۔ ان الفاظ سے یہ خیال اور بھی قوت پکڑتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعہ صلیب کے بعد بنی اسرائیل کی دوسری قوموں کی طرف چلے گئے جو بخت النصر کے زمانہ میں جلاوطن ہوکر دوسرے ممالک میں آباد ہوچکی تھیں۔

ومن المقربین۔ یعنی حضرت عیسیٰ خدا کے مقربوں میں سے ایک ہیں۔ کہتے ہیں ڈوبتا ہُوا تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ وہی حالت بعض وقت عیسائی مشنریوں کی ہوجاتی ہے۔ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ قرآن نے مسیح کو مقرب کہا اور مقرب ملائکہ ہوتے ہیں اس لیے مسیح کو بشر سے اوپر مانا ہے۔ چونکہ قرآن کریم سے محض بے خبر ہیں ان کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ جن مقربین میں سے مسیح کو کہا ہے ان مقربین میں اُمت محمدیہ کا ایک گروہ بھی داخل ہے السابقون السابقون اولٰئك المقربون (الواقعہ ۵۶-۱۰-۱۱) یعنی سابقین اس امت کے مقربین بارگاہ الٰہی ہیں۔ اور دوسری جگہ ہے عینا یشرب بها المقربون (المطففین ۸۳-۲۸) وہاں بھی امتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گروہ کو ہی مقرب قرار دیا ہے جیسا کہ اس سے پہلے الفاظ ان کتاب الابرار سے ظاہر ہے۔ پس جب صلحاء بھی مقربین بارگاہ الٰہی ہیں تو حضرت مسیح کو خصوصیت سے مقربوں میں سے ایک کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ انبیاء بدرجہ اولیٰ مقرب ہوئے۔ سو بات یہ ہے کہ یہودیوں نے عداوت سے اور عیسائیوں نے بیوقوفی سے (ضلالت محبت میں) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ ملعون قرار دیا۔ کیونکہ دونوں ان کی صلیب پر موت مانتے ہیں اور ملعون وہ ہے جو خدا سے دُور کیا گیا ہو اس لیے اس الزام لعنت سے صاف کرنے کے لیے قرآن کریم نے مسیح کو من المقربین کہا ہے اور دوسری جگہ اس قرب کو لفظ رفع سے ظاہر کیا ہے اور من المقربین خود بتاتا ہے کہ مسیح کے علاوہ اور بھی مقرب ہیں۔

ع[۴۲۶] المهد۔ مَهد کے ایک معنی ع[۲۶۵] میں بیان ہوئے ہیں۔ خصوصیت سے اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو بچے کے لیے تیار کی جاتی ہے یعنی جھُولا۔

کہل۔ کہل کی عمر کی مختلف حدیں اہل لغت نے بیان کی ہیں مگر صحیح وہ ہے جو راغب نے لکھا ہے اور لسان العرب میں بھی ہے کہ کہل وہ ہے جس کے سیاہ بالوں کے اندر سفید مل گئے ہوں۔

الصالحین۔ صالح۔ صلاح سے ہے جو فساد کی ضد ہے اور ان دونوں کا اکثر استعمال افعال میں ہے (رغ) مگر خود قرآن شریف میں لئن اٰتیتنا صالحا (الاعراف ۷-۱۸۹) میں صالح سے مراد صحیح سالم ہے جیسا کہ اس سے اگلی آیت میں فلما اٰتٰهما صالحا کہہ کر واضح کردیا۔ کیونکہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کی صلاحیت افعال کی فوراً معلوم نہیں ہوتی صلاحیت جسم کی معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے وہاں صالحا کے معنی ولدا سویا قد صلح بدنه کیے ہیں (ض) اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ صلاح کبھی استوائے خلق یعنی صحیح سالم ہونے میں ہوتی ہے اور کبھی دین میں۔

اس آیت میں تین باتیں بیان کی ہیں۔ حضرت مسیح کا جھولے میں باتیں کرنا۔ بڑھاپے میں باتیں کرنا۔ صالح ہونا۔ سب بچے عموماً جھولے میں ہی باتیں کرنا سیکھتے ہیں۔ کیونکہ دو سال کی عمر تک جھولے میں رہتے ہیں۔ لیکن حضرت مسیح کے متعلق جو یہ الفاظ آئے ہیں تو ان سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ آپ کا بچپن میں باتیں کرنا معجزہ تھا اور اس کی بشارت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ چونکہ کہولت میں باتیں کرنے کا ذکر ہے اس لیے اس کو بھی معمولی حالت سے الگ کرکے نزول ثانی میں باتیں کرنے

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ

اس نے کہا میرے رب میرے بیٹا کیوں کر ہوگا اور مجھے کسی انسان نے چھوا نہیں ، فرمایا اسی طرح ہوگا ، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جب کسی امر کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اُسے

پر محمول کیا گیا ہے لیکن اس کی غلطی خود اسی سے ظاہر ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو یہ بشارت دینے کے کیا معنی ؟ کیا ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول ثانی کا مسئلہ بھی بتا دیا گیا تھا ؟ اور اگر بتانا ہی تھا تو یہ بتایا جاتا کہ اسے آسمان پر زندہ اُٹھایا جائے گا۔ اور پھر آخری زمانہ میں نزول ہوگا۔ اتنی بات بتانے سے کہ وہ حالت کہولت میں لوگوں سے باتیں کریگا ان کو یہ کس طرح پتہ لگ سکتا تھا کہ یہ کسی نزول ثانی کا ذکر ہے پھر یہ دو تو معجزے ہو گئے۔ تیسری بات آپ کا صالح ہونا آیا یہ بھی معجزہ تھا ؟

جھولے کے کلام پر بحث: انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ لیکن مفسرین کو یہاں خود یہ سوال پیدا ہُوا ہے کہ حضرت مسیح کا جھولے میں باتیں کرنا کس کا معجزہ تھا ؟ حضرت مسیح کا ؟ تو وہ ابھی نبی نہیں بنے۔ اس لیے اس کو ارہاص کہنا پڑا حضرت مریم کا، تو وہ نبی نہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ ایک بچّہ کو چھوڑ کر خشک لکڑی سے بھی کلام کرا دے۔ جیسا کہ نبی کریمؐ کے ٹیک لگانے کی لکڑی کی آواز آپ کے معجزات میں سے ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ آیا قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ معجزہ ہے۔ اوّل۔ حضرت مریم کو یہ تو بتایا نہیں گیا کہ یہ بچّہ نبی ہوگا۔ صرف یہ بتایا گیا کہ وجیہ ہوگا، مقرب ہوگا۔ اور مقرب ہونے کے لیے نبی ہونا ضروری نہیں۔ پھر آپ کے معجزات پر کیونکر ایک بے محل کلام شروع کر دیا۔ دوم ماں کو بچّہ کی بزرگی، دینی اور دنیوی صلاح کی خبر سے تو خوشی پہنچتی ہے اور اس بشارت سے کیا حاصل کہ وہ ایک معجزہ بھی دکھائے گا۔ سوم اگر معجزات کی بشارت ہی مریم صدیقہ کو سنانی تھی تو جو اس سے بڑے بڑے معجزات تھے ان کا ذکر کیوں نہ کیا۔ چہارم جو کلام اس سے مراد لیا گیا ہے وہ وہ ہے جس کا ذکر سورۃ مریم ہے انی عبد اللّٰہ اٰتانی الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکًا این ما کنت واوصٰنی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ ما دمت حیا وبرا بوالدتی (مریم ۱۹ - ۳۰ سے ۳۲) اس پر مفصل بحث تو اپنے موقعہ پر ہو گی۔ لیکن اس قدر یہاں ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ یہ کلام جھولے کے بچّہ کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی ہے۔ مجھے نبی بنایا ہے۔ مجھے بابرکت بنایا ہے۔ جہاں کہیں جاؤں مجھے نماز کا حکم دیا ہے اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں ماں سے نیکی کرنے والا بنایا ہے۔ اب یہ سب کلام ایک بالغ انسان کا ہے جو نہ صرف مکلف ہو چکا ہے بلکہ جس کو کتاب و نبوت مل چکی ہے اور ظاہر ہے کہ کتاب و نبوت ملنے کے یہ معنی ہیں کہ انجیل آپ پر وحی ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے پہلے فرما دیا تھا کہ ہم تم کو نبی بناتے ہیں اور یہ بالبداہت غلط ہے علاوہ ازیں ابھی آگے آتا ہے ویعلمہ الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل جس سے معلوم ہُوا کہ انجیل کے نزول سے پہلے آپ لکھنا بھی جانتے تھے اور حکمت کی باتوں سے بھی آگاہ ہو چکے تھے اور تورات بھی پڑھ چکے تھے آخر اس معمہ کو بھی حل کرنا چاہیئے کہ ایک دن کا بچّہ یہ سب کچھ سیکھ چکا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی اس پر نماز اور زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی اور ما دمت حیا کی شرط نے بتا دیا کہ اس وقت بھی فرض تھی۔ جب یہ کلام کر رہے تھے۔ اگر بچپن کا کلام ہوتا تو بجائے اس کے یوں ہوتا کہ مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب میں بلوغت کو پہنچ جاؤں۔

پھر ان الفاظ کا کیا مطلب ہے ؟ تین باتیں بتائی ہیں۔ طفولیت میں کلام کرنا۔ کہولت کی حالت میں کلام کرنا۔ صالح ہونا۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں صالح سے مراد نیک کام کرنے والا نہیں بلکہ صحیح سالم تندرست بچہ مراد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اوپر آپ کو مقرب بارگاہ الٰہی کہدیا تو اب یہ بتانا کہ وہ نیک کام کرنیوالا ہوگا تحصیل حاصل ہے۔ نیک کام کرنے والے ہی مقرب ہُوا کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں حضرت مریم کو جب فرزند کی خوشخبری دی تو فرزند کے متعلق جن باتوں کا خیال والدین کو ہوتا ہے وہ بھی بتا دیں دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا۔ مقرب بارگاہ الٰہی ہوگا یعنی کمال روحانی کو حاصل کرے گا۔ کوئی جسمانی نقص بھی اس میں نہ ہوگا اور وہ بڑھاپے کی عمر کو بھی پہنچے گا۔ یعنی لمبی عمر بھی پائے گا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے قویٰ کے صحیح سالم ہونے کا علم تو فوراً ہو جاتا ہے مگر یہ بات کہ وہ باتیں بھی کرے کچھ مدت بعد ظاہر ہوتی ہے اس لیے اس کی الگ خوشخبری بھی سنا دی، پھر یہ بات کہ وہ عمر بھی پائے گا یہ بھی دیر میں ظاہر ہوتی ہے اس لیے اس کی خوش خبری بھی سنا دی ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہو کہ بچپن میں اس کی باتیں معمولی بچوں سے بڑھ کر دانت کی باتیں ہوں گی اور بڑی عمر کو پہنچ کر اس کا کلام معمولی لوگوں سے بڑھ کر پُر حکمت کلام ہوگا۔

بشارت کے ذکر میں نفی الوہیت مسیح: لیکن قرآن کریم ایک ایسا پُر حکمت کلام ہے کہ ایک ذکر کرنے سے کئی کئی باتیں بتا دیتا ہے۔ حضرت مریم کو جو خوشخبری دی اس کا ذکر قرآن شریف میں آخر کیوں کیا۔ ظاہر ہے کہ اس سارے بیان کی اصل غرض تو عیسائیوں پر اتمام حجت ہے۔ اس لیے جب وجیہ فی الدنیا کہا تو بتا دیا کہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ درست نہیں کہ دنیوی طور پر حضرت مسیح کو کوئی عزت حاصل نہیں ہوئی بلکہ ان کا خاتمہ ماریں کھاتے کھاتے ہو گیا۔ اور آخرت میں وجیہ کہہ کر یہ بتا دیا کہ یہودی بھی غلطی پر ہیں۔ اور مقرب کہہ کر یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال کی تردید کی کہ آپ نعوذ باللہ من ذٰلک ملعون ہوئے کیونکہ ملعون یعنی مطرود یا راندہ درگاہ کے مقابلہ پر مقرب بارگاہ الٰہی ہے اور عیسائی بھی آپ کو تین دن کے لیے ملعون قرار دیتے ہیں اور مھد اور کہولت کا ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ آپ پر وہ تمام تغیرات آئے جو بچوں پر جھولے کی حالت سے لیکر کہولت تک آتے ہیں۔ یعنی بڑھے، جوان ہوئے، پھر بڑھاپا یعنی انحطاط شروع ہُوا اور یُوں

لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ کہتا ہے ہو پس وہ ہو جاتا ہے۔ ۴۲۷ء

تردید الوہیت کی۔ اور اس کا اعتراف مفسرین کو بھی ہے وذکر احوالہ المختلفة المتنافية ارشادا الی انه بمعزل عن الالوهية (رض) جن لوگوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کو صرف بوجہ ان کے معجزہ ہونے کے ہی ذکر کیا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ کے متعلق کھانا کھانے کا ذکر کیا کانا یاکلان الطعام (المائدۃ ۵-۷۵) جس میں مراد نفی الوہیت ہے۔ ورنہ کھانا تو ساری دنیا کھاتی ہے حضرت مریم کے آپ کو حمل میں لینے کا ذکر کیا۔ دردِ زہ کے ساتھ جننے کا ذکر کیا۔ یہ سب کچھ عام طور پر ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ خدا نہیں ہو سکتا اور مہد اور کہولت کے ذکر کی اصل غرض ہے کہ خدا تعالیٰ پر یہ تغیرات نہیں آ سکتے۔

۴۲۷ء جس طرح حضرت زکریا کو باوجود دعا کے اور اس یقین کے کہ اس کی دعا رد نہ ہو گی بیٹے کی خوشخبری ملی تو ان کا خیال فوراً اس طرف گیا کہ اس قدر رکاوٹ کے باوجود کہ میں بڈھا ہو گیا اور میری عورت بانجھ ہے۔ بچہ کب ہو گا، کس طرح ہو گا۔ اسی طرح حضرت مریم کو جب بیٹے کی بشارت ملتی ہے تو وہ متعجب ہوتی ہیں کہ بچہ کب پیدا ہو گا یا کس طرح ہو گا جب ابھی تک مرد کے ساتھ تعلق ہی نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ایک ہی جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے یا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش اسلامی عقاید میں داخل نہیں عیسائیت کا اصول ہے: عیسائی حضرت مسیح کی پیدائش بن باپ مانتے ہیں اور مسلمان بھی عموماً ایسا ہی مانتے ہیں مگر عیسائیوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بن باپ نہیں مانتے اور مسلمانوں میں بھی۔ ہاں ان دونوں میں ایک فرق ہے۔ اگر فی الواقع حضرت مسیح بن باپ پیدا نہیں ہوئے تو اس سے مسلمانوں کے کسی عقیدہ میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا۔ کیونکہ ان کو بن باپ پیدا شدہ ماننا ان کے عقاید میں داخل نہیں۔ لیکن عیسائیت کی عمارت کی بنیاد ہی اکھڑ جاتی ہے اگر یہ ثابت نہ ہو سکے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ اگر وہ باپ رکھتے تھے تو نہ روح القدس سے حضرت مریم حاملہ ہوئیں۔ نہ مسیح میں الوہیت تھی نہ کفارہ صحیح رہا پس حضرت مسیح کا بن باپ پیدا نہ ہونا عیسائیت کو بیخ و بن سے اکھاڑتا ہے اور اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ ایک مسلمان حضرت مسیح کی نبوت کا اس صورت میں بھی قائل ہے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے ہوں اور اس صورت میں بھی کہ بن باپ پیدا نہ ہوئے ہوں۔ وہ صرف اس قدر دیکھ لے گا کہ قرآن کریم نے کیا فرمایا ہے یا نبی کریم صلعم کی احادیث سے کیا ثابت ہے اگر ان دونوں میں بن باپ پیدا ہونا مذکور ہو تو وہ مان لیگا ورنہ نہیں نہ ہی اگر وہ بن باپ پیدا ہوئے ہوں تو اس سے ان کی کوئی فضیلت ان انبیاء پر ثابت ہوتی ہے جو باپ سے پیدا ہوئے۔ کیونکہ یوں تو حضرت آدم اور حوا بھی بن باپ پیدا ہوئے اور بائبل میں ملک صدق کا ذکر موجود ہے جو "بے باپ بے ماں" تھا دیکھو عبرانیوں ۷: ۳۔ تو اس صورت میں یہ تینوں حضرت مسیح سے بھی افضل ٹھہرے مگر یہ استدلال ہی غلط ہے کہ بن باپ پیدا شدہ انسان بڑا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک مسلمان یہ بھی نہیں مانتا کہ حضرت مریم روح القدس سے حاملہ ہوئی تھیں۔ اگر وہ بن باپ بھی پیدا ہوئے تو یہ محض ایک عجوبہ قدرت خالقیت ہے کہ حضرت مریم میں دونوں قسم کی طاقتیں رکھ دی تھیں بلکہ یہ معجزہ بھی کوئی نہیں اس لیے کہ معجزہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر کسی کی شہادت ہو کوئی دیکھنے والا اس کا گواہ ہو مگر بغیر خاوند کے حمل ہونے کی گواہی سوائے مریم کے کوئی دوسرا دے ہی نہیں سکتا یہ کرامت یا معجزہ کیا ہو گا پس ہم نے صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ قرآن شریف یا احادیث نبوی سے اس بارہ میں کیا معلوم ہوتا ہے۔

نسل انسان کی پیدائش کے متعلق خدا کا بیان کردہ قانون: اب اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اس نے نسل انسانی کے لیے یہ قانون بنایا ہے ثم جعل نسله من سلٰلة من ماء مهين (السجدۃ ۳۲-۸) یعنی آفرینش اول کے بعد اس کی نسل کو نطفہ سے چلایا ہے اور فرماتا ہے انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج (الدھر ۷۶-۲) ہم انسان کو مرد و عورت کے ملے ہوئے نطفہ سے پیدا کرتے ہیں پس جب تک اللہ تعالیٰ بالتصریح یہ نہ فرمائے کہ عیسیٰ کو ہم نے اپنے اس قانون کے خلاف یا الگ رنگ میں پیدا کیا تھا اس وقت تک یہی ماننا ہو گا کہ وہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے وہ اسی رنگ کے تھے یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی سوال نہیں کہ اس کو ایسا کرنے کی قدرت ہے یا نہیں۔ اس کو بغیر باپ چھوڑ کر ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کرنے کی قدرت ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ قرآن شریف سے یا حدیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور جب وہ خود ایک قانون بتاتا ہے تو جب تک خود ہی نہ فرمائے کہ فلاں معاملہ میں اس نے اس قانون کے خلاف اپنی قدرت کا اظہار کر دکھایا اس وقت تک خود بخود ہمارا کسی امر کو اس قانون کے خلاف سمجھ لینا جائز نہیں۔ پس اگر کوئی شخص قرآن کریم کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ حضرت عیسےٰ کا بن باپ پیدا ہونا تسلیم کیا گیا ہے تو وہ ایسا مانے میرے نزدیک یہ نتیجہ الفاظ قرآنی سے نہیں نکلتا۔ گو میں اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت نہیں دیتا مگر تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ نیک نیتی سے جو کچھ منشائے قرآن سمجھے اس کو ظاہر کر دے۔ حضرت عیسیٰ کو باپ والا یا بن باپ ماننے سے ہمارے دینی اعتقادات یا ہمارے عمل پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔

مس بشر: کیا الفاظ لم یمسسنی بشر سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے لم یمسسنی میں گزشتہ کا ذکر ہے کہ مجھے بشر نے نہیں چھوا؟ اس میں آئندہ کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن کہا جائیگا کہ ہر ایک عورت جانتی ہے کہ بیٹا خاوند سے ہوتا ہے۔ مریم کو یہ کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ یہ اس لیے کہ حضرت مریم ہیکل میں رہتی تھیں اور انہیں ابھی علم بھی نہ تھا کہ ان کا نکاح ہونے والا ہے۔

توریت و انجیل کی تاریخی شہادت: توریت و انجیل میں بیشک تحریف ہوئی لیکن آخر ان کی پیشگوئیوں میں بہت کچھ صداقت موجود رہی ہے۔ اسی طرح تاریخی واقعات میں جس بات کو قرآن کریم نہ جھٹلائے اس کے رد کرنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں۔ اب اناجیل سے ثابت ہے کہ حضرت مریم کے ساتھ یوسف کا تعلق زوجیت

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ — اور وہ اسے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھائے گا ۴۲۸

وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ — اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا ۴۲۹ ۔ کہ میں تمہارے

کا تھا۔ اور اسی تعلق سے آپ کے ہاں بہت سی اولاد بھی ہوئی۔ ذیل کی عبارتیں قابلِ غور ہیں:۔

"پس یوسف...... اپنی بیوی کو اپنے ہاں لے آیا اور اس کو نہ جانا جب تک وہ بیٹا نہ جنی" (متی ۱: ۲۴ و ۲۵) "جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے باتیں کرنی چاہتے تھے۔ کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں" (متی ۱۲: ۴۶ و ۴۷) "کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں؟ اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہوداہ نہیں؟ اور کیا اس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں؟" (متی ۱۳: ۵۵) بہنوں کے لیے جمع کے صیغہ سے مفسرین بائبل نے یہ صاف استدلال کیا ہے کہ کم سے کم تین بہنیں آپ کی تھیں۔ بعض مفسرین نے اس مصیبت کو یوں ٹالنا چاہا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ یوسف کی پہلی بیوی کی اولاد تھی اور حضرت مریم ان کی دوسری بیوی تھیں۔ مگر ایک طرف تعلق زوجیت کا حضرت مریم اور یوسف میں موجود ہونا خود انا جیل سے ظاہر ہے دوسری طرف ماں کے ساتھ بھائیوں کا آنا صاف بتاتا ہے کہ یہ اسی ماں کی اولاد تھے۔ سوتیلے بھائی ہوتے تو مریم سے ان کا کیا تعلق تھا۔ تیسرے کہیں بھی سوتیلے بھائی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا اور جب لفظ بھائی مطلقاً استعمال کیا جائے گا تو اس سے مراد حقیقی بھائی لیا جائے گا۔ پس یہ انجیلی شہادت صاف بتاتی ہے کہ حضرت مریم کا تعلق زوجیت تو یوسف کے ساتھ ضرور ہوا اور اس تعلق سے اولاد بھی پیدا ہوئی اور اگر ایک طرف لم یمسسنی بشر اس وقت کے بعد مس بشر سے مانع نہیں تو دوسری طرف تاریخی ثبوت کھلا کھلا موجود ہے کہ واقعی میاں بیوی کے تعلقات حضرت مریم اور آپ کے شوہر میں رہے۔

حدیث کی شہادت کہ حضرت مسیح معمولی حالات میں حمل میں آئے اور پیدا ہوئے: والتی احصنت فرجھا (الانبیاء ۲۱-۹۱) سے بھی اس کے خلاف دلیل نہیں پکڑی جا سکتی کیونکہ احصان کے معنی قید نکاح میں آنا ہے جیسا کہ اپنے موقعہ پر دکھایا جائے گا۔ حدیث ایک بھی ایسی نہیں ملتی کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہو کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے بلکہ آپ کی جو گفتگو وفد نجران کے ساتھ لکھی ہے جس کو میں اوپر ع۳۶۸ میں نقل کر چکا ہوں اس میں نبی کریم صلعم کے یہ صاف الفاظ مروی ہیں الستم تعلمون ان عیسٰی حملتہ امرأۃ کما تحمل المرأۃ کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو اس کی ماں نے حمل میں لیا جس طرح عورتیں بچوں کو حمل میں لیا کرتی ہیں اور عورتیں بچوں کو اپنے خاوندوں سے ہی حمل میں لیتی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر صفائی سے جب عیسائیوں نے یہ سوال کیا وقالوا لہ من ابوہ یعنی اس کا باپ کون ہے؛ تو آپ نے یہ جواب نہیں دیا کہ اس کا باپ کوئی نہیں بلکہ جواب میں فرمایا الستم تعلمون انہ لایکون ولد الا وھو یشبہ اباہ کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے یہ بتا دیا کہ حضرت عیسیٰ کا باپ انسانوں میں سے ہی کوئی ہے کیونکہ اس کی شکل انسانوں سے ملتی ہے اگر آنحضرت صلعم نے اسبات کو ظاہر کرنا ہوتا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا تو جیسا کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے یوں فرماتے کہ وہ آدم کی طرح بن باپ ہے یا کلمہ کُن سے پیدا ہوا ہے۔ پس یہ تمام امور اس بات پر دلیل ہیں کہ قرآن کریم حضرت عیسیٰ کی پیدائش بن باپ بیان نہیں کرتا اور ولم یمسسنی بشر آیندہ مس بشر سے مانع نہیں ہوا۔

ع۴۲۸ ویعلمہ الکتاب...... یہ کس پر عطف ہے۔ کسی نے کہا کہ یبشرک (آیت ۴۴) پر عطف ہے۔ بعض نے کہا آیت سابقہ میں یخلق پر عطف ہے یعنی کذالک اللہ یخلق مایشاء ویعلمہ الکتاب.... مگر صحیح یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور واؤ استئناف کیلئے ہے جو ابتدائے کلام میں آجاتی ہے گویا یہ الگ کلام ہے۔

الکتاب سے یہاں مراد کتابت ہے یعنی ہاتھ سے لکھنا (ر۔ ث) حکمت کے معنی بھی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں حضرت عیسیٰ کو چار چیزوں کے سکھانے کا ذکر فرمایا ہے۔ تعلیم کے معنی ع۸۱ میں بیان ہو چکے ہیں۔ جہاں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کو علم دینا دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک جو بذریعہ وحی دیا جاتا ہے۔ دوسرا جو اُن ذرائع سے انسان حاصل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے دیئے ہیں اس طرح پر انبیاء کو بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ یہاں کس قسم کی تعلیم مقصود ہے۔ بعض نے کہا بذریعہ وحی۔ بعض نے کہا بذریعہ توفیق و ہدایت جو علم حاصل کرنے کے لیے دیدی۔ مگر صورت اول صحیح نہیں اس لیے کہ کتابت یعنی لکھنے کا علم تو معمولی طور پر حاصل کیا جاتا ہے اور اسی طرح توریت کا علم بذریعہ استاد کے حضرت مسیح نے حاصل کیا جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کتاب سے مراد جنس کتب الٰہی ہو۔ تو اس صورت میں کتاب اور حکمت اور توریت و انجیل کا علم دینے سے مراد اُن کا فہم بذریعہ وحی خفی دینا مراد ہو۔ اس میں بھی کوئی ہرج نہیں کہ ان چار چیزوں کا علم الگ الگ طریق پر دیا گیا ہو یعنی کتابت اور توریت کا علم تو اسباب معمولی سے ہو اور حکمت یعنی فہم اور انجیل کا علم بذریعہ وحی دیا گیا ہو۔

ع۴۲۹ ورسولاً الی بنی اسرائیل۔ اس کو یعلمہ پر عطف قرار دے کر یجعلہ مقدر مانا گیا ہے یعنی ویجعلہ رسولا الی بنی اسرائیل اور اللہ تعالیٰ اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنائیگا اور وہ یوں یوں کہے گا۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان سب اقوال کے بعد فلما احس عیسٰی منھم الکفر قال من انصاری الی اللہ ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ درمیان

جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ

پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک بات لایا ہوں[۴۳۰] کہ میں تمھارے لیے کیچڑ سے پرند کی شکل کی مانند تجویز کرتا ہوں[۴۳۱] پھر اس کے اندر پھونکتا

میں سے ان تمام واقعات کو جو حضرت مریم کے آپ کو حمل میں لینے، جننے، آپ کے بلوغ روحانی کو پہنچنے وغیرہ کے متعلق ہیں ترک کر دیا گیا اور بعض ان واقعات کا ذکر سورہ مریم میں جو اس سے پہلے کی نازل شدہ ہے آ بھی چکا ہے) اور اس زمانہ کا ذکر شروع کر دیا ہے جب حضرت عیسٰی کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا اور تقدیر عبارت یوں سمجھی جائے گی وجعل رسولا الی بنی اسرائیل یعنی حضرت عیسٰی جب پیدا ہو کر بلوغ روحانی کو پہنچے تو انہیں بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اسی دقت کو دیکھ کر بعض مفسرین نے بھی فلما احس عیسٰی منہم الکفر کے نیچے لکھ دیا ہے کہ رسولا الی بنی اسرائیل سے نیا کلام شروع ہوتا ہے جو کلام ملائکہ میں داخل نہیں اور تقدیر عبارت یوں نکالی ہے نجاء عیسٰی کما بشر اللہ تعالیٰ رسولا الی بنی اسرائیل یعنی جب عیسٰی آ گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بشارت دی تھی درآنحالیکہ وہ رسول تھے بنی اسرائیل کی طرف۔

اس موقعہ پر قرآن کریم نے یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ حضرت عیسٰی اصل میں صرف قوم اسرائیل کی طرف رسول تھے جس زمانہ میں نبی کریم صلعم کی بعثت ہوئی اس وقت عیسائی مذہب بہت سی قوموں میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ عیسائی بعض اقوام عرب کو بھی عیسائی کر چکے تھے اور باقی کو کرنے کی کوشش میں تھے۔ پس کوئی شخص عیسائی مذہب کی حالت کو دیکھ کر ہرگز یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ حضرت عیسٰی صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول ہو کر آئے لیکن جب اصلیت پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل پیغام حضرت مسیح کا بنی اسرائیل تک ہی محدود تھا۔ چنانچہ متی میں ذیل کا قصہ جو ایک کنعانی عورت کے متعلق لکھا ہے صاف اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے "اور دیکھو ایک کنعانی عورت ان سرحدوں سے نکلی اور پکار کر کہا اے خداوند ابن داؤد مجھ پر رحم کر...... اس نے جواب میں کہا کہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ مگر اس نے آ کر اسے سجدہ کیا اور کہا اے خداوند میری مدد کر، اس نے جواب میں کہا کہ لڑکوں کی روٹی لیکر کتوں کو ڈال دینی اچھی نہیں۔ اس نے کہا ہاں خداوند کیونکہ کتے بھی ان ٹکڑوں میں سے کھاتے ہیں جو اُن کے مالکوں کی میز سے گرتے ہیں۔ اس پر یسوع نے جواب میں اس سے کہا اے عورت تیرا بڑا ہی ایمان ہے جیسا چاہتی ہے تیرے لیے ویسا ہی ہو" (متی ۱۵ و۲۲ سے ۲۸) اب اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح سوائے بنی اسرائیل کے "اور کسی کے پاس" نہیں بھیجے گئے۔ ہاں دوسروں پر وہ اتنے مہربان ہو سکتے ہیں کہ جو روٹی بچے نہ کھائیں وہ کتوں کے آگے پھینک دی جائے اس لیے جب یہودیوں نے آپ کے پیغام کو رد کر دیا تو دوسری قوموں کو معلوم ہوتا ہے اسی حیثیت سے جس کا اوپر ذکر ہوا حضرت مسیح کے حواریوں نے داخل کر لیا۔ چنانچہ پولوس کی تقریروں سے اسبات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ جب یہودیوں کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو پھر دوسری قوموں کی طرف رُخ شروع ہوا۔ مگر حضرت مسیح کا پیغام بلاشبہ فی الاصل صرف بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ جب مذہب نے ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیا اور اس کو بت پرستوں کی قبولیت کے قابل بنا دیا گیا۔ کیونکہ بُت پرستی سے ملتے جُلتے عقائد اس میں داخل ہو گئے تو پھر سارا رُخ دوسری اقوام کی طرف ہو گیا۔

ایک اور امر جس کا یہ آیت فیصلہ کرتی ہے یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اُمتِ محمدیہ کی اصلاح کے لیے نہیں آ سکتے۔ نہ ہی دین اسلام کی توسیع تمام اقوام میں ان کا کام ہو سکتا ہے اگر انہوں نے امت محمدیہ کے لیے بھی رسول ہونا ہوتا تو قرآن کریم میں یہ لفظ جو ان کے کام کی صریح حدبندی کرتے ہیں وارد نہ ہوتے۔ پس جس شخص پر یہ حکم لگ چکا ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے لیے رسول ہو گا۔ اس کا ساری دنیا کی طرف رسول بننا محال ہے۔ مسلمانوں کو آنحضرت صلعم کے بعد کسی دوسرے نبی سے مستغنی کرنے کے لیے ہی یہ کلمات سکھائے تھے رضیت باللہ ربا وبالاسلام دینا و بمحمد نبیا محمد صلعم کے بعد جو کافۃ الناس کی طرف مبعوث ہو گئے اور جن کا زمانہ نبوت قیامت تک ممتد ہے کسی دوسرے رسول یا نبی کا محتاج اپنے آپ کو سمجھنا اس نعمت عظمٰے کی ناشکر گزاری ہے پس حدیث میں جو ابن مریم کے آنے کی پیشگوئی ہے اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اس امت میں سے کوئی شخص ابن مریم کے رنگ میں آ جائے جس طرح الیاس کے دوبارہ آنے کی پیشگوئی یوں پوری ہوئی کہ حضرت یحیٰی الیاس کے رنگ میں آ گئے دیکھو ع۴۱۴ حضرت عیسٰی کو قرآن کریم کی یہ تصریح امت محمدیہ میں آنے سے روکتی ہے۔

ع۴۳۰ انی قد جئتکم۔ بعض نے یہاں مخبرًا یا ناطقًا مقدر سمجھا ہے۔ مگر خود لفظ رسول میں پیغام کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے جب رسول بنائے جانے کا ذکر آیا تو ساتھ ہی جو کچھ اس رسول کی بعثت کا عظیم الشان مقصد تھا وہ ظاہر کر دیا اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم الشان بات لائے ہیں۔

ع۴۳۱ اخلق۔ خلق کے معنی کے لیے دیکھو ع۳۳ وَالْخَلْقُ لَا يُسْتَعْمَلُ فِيْ كَافَّةِ النَّاسِ اِلَّا عَلٰى وَجْهَيْنِ اَحَدُهُمَا فِيْ مَعْنَى التَّقْدِيْرِ...... والثانی فی الکذب (غ) اور کل لوگوں کے حق میں لفظ خلق صرف دو معنی میں بولا جاتا ہے ایک اندازہ کرنے کے معنی میں اور دوسرا جھوٹ کے معنی میں۔ اندازہ کے معنی کی مشہور مثال شاعر کا قول ہے وَلَاَنْتَ تَفْرِيْ مَا خَلَقْتَ ۔ وَبَعْضُ الْقَوْمِ يَخْلُقُ ثُمَّ لَا يَفْرِيْ یعنی تو جو ارادہ یا اندازہ یا تجویز کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے اور عمل میں لے آتا ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تجویزیں تو کرتے رہتے ہیں مگر ان کو عمل میں نہیں لاتے۔ اسی طرح ضرب المثل ہے

فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ج — ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اُڑنے والا ہو جاتا ہے ۔[۴۳۲]

ماخلقت الا فریت وما وعدت الا وفیت یعنی میں نے کوئی تجویز نہیں کی مگر اسے عمل میں لا دکھایا اور میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا مگر اسے پُورا کر دکھایا۔ جھوٹ کے معنی میں تخلقون افکاً قرآن شریف میں آیا ہے احسن الخالقین (المومنون ۲۳-۱۴) کے صحیح معنی احسن المقدرین ہی ہیں کیونکہ جہاں یہ لفظ آتا ہے وہاں خلقاً بعد وقت مختلف حالتوں میں انسان کے رہنے کا سوال ہے یعنی حالت نطفہ، حالت علقہ، حالت مضغہ وغیرہ اور صحیح یہی ہے کہ خلق کا لفظ پیدا کرنے کے معنی میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے پر بولنا جائز نہیں۔ گو بعض نے یہ کہہ دیا ہے کہ حضرت عیسٰے کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے مگر جیسا کہ میں آگے چل کر ثابت کرونگا قرآن کریم اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اور یہ کہنا کہ چونکہ یہاں لفظ من الطین موجود ہے اس لیے مادہ سے خلق کرنے میں اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے امتیاز ہو گیا یہ بھی درست نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بھی دونوں طرح خلق کرتا ہے مادہ سے بھی اور بغیر مادہ بھی۔ جیسے کہ ۳۲ع میں دکھایا گیا بیضاوی نے اخلق لکم کے معنی کیے ہیں اقدر لکم اور یہی درست ہے۔

لکم میں ل انتفاع کے لیے ہے اور مراد ہے تمہاری بھلائی کے لیے۔

الطین۔ طین اس مٹی کو کہتے ہیں جس میں پانی ملا ہوا ہو۔ اور اگر اس سے پانی کا اثر جاتا بھی رہے تو بھی اس کو طین ہی کہا جاتا ہے (غ) قرآن کریم میں خلق الانسان کو طین سے قرار دیا گیا ہے۔ بالمقابل وہ ہستیاں جو جن کے نام سے موسوم ہیں ان کی پیدائش نار یعنی آگ سے بتائی گئی ہے۔ بہ نسبت دوسرے عناصر کے طین یا مٹی میں اثر کی قبولیت کی استعداد بہت زیادہ ہے۔

ھیئۃ۔ ھیئۃ اس حالت کا نام ہے جس پر کوئی چیز خواہ وہ حالت محسوس ہو یا معقول (غ) یعنی حواس سے اس کا علم حاصل ہوتا ہو یا عقل سے۔ اسی مادہ سے ہے وھیئ لنا من امرنا رشدا (الکھف ۱۸-۱۰) ویھیئ لکم من امرکم مرفقا (الکھف ۱۸-۱۶)

الطیر۔ طائر ہر ایک جانور کو کہتے ہیں جو پر رکھتا ہے اور ہوا میں اڑتا ہے اور طائر بمعنی عمل بھی قرآن مجید میں آیا ہے وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ (غ) اور طائر انسان کا وہ حظ ہے جو علم الٰہی میں اس کے لیے مقدر ہو ما حصل لہ فی علم اللہ مما قدر لہ (ت) اور طیر۔ طائر کی جمع ہے اور واحد پر بھی بولا جاتا ہے (ل) اور طیر کی جمع طُیُور آتی ہے اور حدیث میں آتا ہے الرُّؤْیا لِاَوَّلِ عابرٍ وَھِیَ عَلٰی رِجْلِ طائرٍ۔ جہاں طائر کی تشریح یوں کی گئی ہے کُلُّ حَرَکَۃٍ من کلمۃٍ او جارٍ یجری فھو طائر مجازاً اراد علٰی رِجْلِ قَدَرٍ جارٍ وقضاءٍ ماضٍ من خیرٍ او شرٍ (ل) یعنی ہر ایک حرکت کسی کلام کی یا کسی جاری ہونے والے امر کی مجازاً طائر ہے اور حدیث میں علی رِجْلِ طائر کہنے سے منشاء یہ ہے کہ وہ ایک ایسے قدر یا اندازہ کے جو چلا جا رہا ہو اور ایسی قضاء کے جو گزر رہی ہو پاؤں پر ہے۔ قرآن کریم اور حدیث سے یہ مثالیں طائر کے معنی پر یہ دکھانے کے لیے بیان کی گئی ہیں کہ مجازاً اس لفظ کا استعمال ایسے معنوں پر کیا گیا ہے جو پہلے لغت میں موجود نہ تھے۔

۴۳۲ع النفخ۔ نفخ کے معنی پھونکنا ہیں۔ روح کے ساتھ بھی یہی لفظ نفخ آتا ہے جیسے آدم کے متعلق ونفخت فیہ من روحی (الحجر ۱۵-۲۹) ہر انسان کے متعلق ونفخ فیہ من روحہ (السجدۃ ۳۲-۹) مریم کے متعلق فنفخنا فیھا من روحنا (الانبیاء ۲۱-۹۱) مگر جہاں بغیر روح کے لفظ نفخ آیا ہے وہاں نفخ روح مراد نہیں بلکہ محض پھونکنا ہے خواہ حقیقی طور پر ہو یا بطور استعارہ جیسے قال انفخوا حتّٰی اذا جعلہ نارا (الکھف ۱۸-۹۶) جہاں آگ پر پھونکنا یا آگ کا جلانا مراد ہے یا نفخ فی الصور میں جہاں بگل میں پھونکنا یا بگل بجانا مراد ہے اور لفظ نفخ کا استعمال بطور حقیقت و بطور استعارہ احادیث میں بھی ہوا ہے۔ انہ نھی عن النفخ فی الشراب پانی میں پھونک مارنے سے آپ نے منع فرمایا۔ کیونکہ اس کے اندر تھوک پانی کے اندر جاتا ہے اور کراہت کا موجب یا بعض امراض کا موجب ہوتا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے اعوذ باللہ من نفخہ ونفثہ جہاں نفخ سے مراد شیطان کا حقیقی طور پر پھونکنا نہیں بلکہ روح شیطانی کا انسان کے اندر آ جانا ہے۔ اور وہ روح شیطانی استکبار ہے۔ چنانچہ نفخہ کی تشریح شارحین حدیث نے کبرہ کی ہے (ت) یعنی استکبار شیطانی۔ چونکہ یہاں لفظ نفخ کے ساتھ روح نہیں اس لیے نفخ روح یہاں مراد لینا صحیح نہیں یہ اسی قسم کا مگر پاک نفخ ہے۔ جیسے حدیث میں ایک نفخ کا ذکر ہے گو وہ ناپاک شیطانی نفخ ہے۔ شیطان کا نفخ کرنا اپنی ناپاکی یا کبر کا دوسرے میں پھونکنا ہے اور نبی کا نفخ کرنا اپنی پاکیزگی یا فرمانبرداری کا دوسرے میں نفخ کرنا ہے۔

باذن اللہ۔ اذن کے معنی کیلئے دیکھو ۱۲۳ع گو اِذن میں مشیت پائی جاتی ہے۔ مگر مشیت سے اس صورت میں کیا مراد ہے اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے ایمان لانے پر بھی باذن اللہ بولا گیا ہے جیسے وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ (یونس ۱۰-۱۰۰) اور نیکی میں ترقی کرنے پر بھی ومنھم سابق بالخیرات باذن اللہ (فاطر ۳۵-۳۲) مشیت کے ہونے سے جیسا کہ راغب نے لکھا ہے مراد یہی ہے کہ چونکہ انسان کے قوٰی کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے پس جو کچھ اثر وہ قوٰی قبول کرتے ہیں وہ بھی باذن اللہ ہی ہوتا ہے اس لیے جب ظالم کسی پر ظلم کرے اور اس کو دکھ پہنچے تو اس پر بھی باذن اللہ کہہ دیا جائے گا۔ گو اس کا یہ منشا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہوتا ہے کہ ایسا ہو۔ پس باذن اللہ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ کوئی خاص امر ہے جو اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کرتا تھا مگر حضرت مسیح کو اس نے اپنی طرف سے اجازت دیدی تھی اور اس لیے اس صفت میں وہ اللہ تعالیٰ کی خاص اجازت سے شریک ہو گئے درست نہیں۔ اذن کے لیے مشیت ضروری ہے اور اس کی مشیت کے یہ خلاف ہے کہ اس کی مخلوق اس کی کسی صفت میں کامل طور پر شریک ہو۔

مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام واقعی پرند بنایا کرتے تھے اور مشہور یہ ہے کہ آپ نے سوائے چمگادڑ کے اور کوئی جانور پیدا نہیں کیا (ر) اب یہاں

وَ اُبۡرِئُ الۡاَکۡمَہَ اور اللہ کے حکم سے

آکر دوگروہ ہوگئے ہیں ابن جریر کی ایک روایت میں تو ہے کہ حضرت عیسٰی لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے تو آپ نے کچھ گیلی مٹی لیکر کہا کہ میں اس سے پرند بنا دوں تو انھوں نے کہا کہ کیا تم ایسا کر سکتے ہو۔ عیسٰی نے کہا ہاں۔ تب عیسٰی نے ایک پرندہ کی شکل بنا کر اس میں پھونکا تو وہ پرند بن گیا۔ اور دوسری روایت کی رُو سے یہ ایک اقتراحی معجزہ تھا۔ اور بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ چمگادڑ بنا کر بتاؤ تب ہم ایمان لائیں گے اس لیے حضرت عیسٰی نے چمگادڑ کو بنایا مگر تعجب یہ ہے کہ اقتراحی معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ حالانکہ دوسری طرف یہ بھی مذہب ہے کہ اقتراحی معجزات نہیں دکھائے جاتے۔ لیکن وہب کہتے ہیں کان یطیر مادام الناس ینظرون الیہ فاذا غاب عن اعینھم سقط میتا لتمیز عن خلق اللہ تعالٰی بلا واسطۃ (د) یعنی وہ اُڑتا تھا جب تک لوگ اسے دیکھتے رہتے تھے جب نظر سے غائب ہو جاتا تو مُردہ ہو کر گر جاتا تا کہ اللہ تعالٰی کی مخلوق بلا واسطہ میں اور اس خلق میں تمیز رہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جب نظر سے غائب ہو کر گرا تو تمیز کہاں رہی لوگوں کے نزدیک تو خدا کی خلق میں اور حضرت عیسٰی کی خلق میں کوئی تمیز نہ رہی۔ پھر اگر یہ بچپن کا قصہ ہے تو معلوم نہیں بچپن میں جب ابھی دعویٰ نبوت نہیں اس معجزہ کے دکھانے سے حاصل کیا۔ اور معجزہ دکھایا بھی ہم عمر لڑکوں کو جاتا ہے۔ اب اگر حضرت عیسٰیؑ فی الواقع پرند بناتے تھے تو وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ پرند دوسرے پرندوں کی طرح جاندار بن کر ان میں مِل جاتے ہونگے اور یا محض پرندوں کی شکل تو بن جاتی ہو گی مگر ایک تماشہ کے طور پر ان کا اُڑنا ایک آنی نظارہ ہوگا۔ اور پھر وہ مٹی کی مٹی رہ جاتی ہو گی۔ اس دوسرے خیال کی تائید میں وہب سے روایت ہے اور اسی کو حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مجدد صدی چہاردہم نے بھی قریب قریب تسلیم کیا ہے۔ اب ہم اس کو ایک اصول کے ماتحت لا کر محکمات اور متشابہات کے قانون کے رنگ میں اس پر بحث کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی شخص فی الواقع خدا کی مخلوق جیسی مخلوق بنا سکتا ہے گو وہ خدا کے اذن سے ہی ایسا کرے اور گو وہ نبی ہو اور یہ امر بطور ایک اعجاز کے ہو۔ اب جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو خلق بمعنی پیدا کرنا صرف ذات باری کا خاصہ قرار دیا گیا ہے خواہ وہ خلق مادہ سے ہو یا بغیر مادہ کے اس کے ثبوت میں اوّل یہ آیت ہے ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم (الرعد[13]-۱۶) جس کے ساتھ ہی اللہ تعالٰی اپنا ایک عام قانون بیان فرماتا ہے۔ قل اللہ خالق کل شیٔ یعنی نہ صرف یہی غلط ہے کہ معبودان باطل نے کسی چیز کو پیدا کیا ہو۔ پھر وہ دونوں قسم کی مخلوق مل جل گئی ہو بلکہ دنیا اللہ تعالٰی کے سوا کوئی بھی کسی چیز کا خالق نہیں۔ دوسری جگہ فرماتا ہے خلق کل شیٔ فقدرہ تقدیرا (الفرقان[25]-۲) اسی نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے ایک قانون اور ایک حد بست مقرر کردی۔ پھر فرمایا ربنا الذی اعطٰی کل شیٔ خلقہ ثم ھدٰی (طٰہٰ[20]-۵۰) ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر ایک چیز کو اس کی پیدائش بھی عطا فرمائی پھر اس کو اس کا کمال حاصل کرنے کی راہ بھی بتائی۔ اور اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے متعلق جن کو خدا بنا لیا گیا ہے۔ اور بھی صراحت فرمائی جیسا کہ سب سے پہلی آیت میں ایسا ہی فرمایا والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئاً وھم یخلقون اموات غیر احیاء وما یشعرون ایان یبعثون (النحل[16]-۲۰ و ۲۱) اور وہ لوگ جنھیں یہ کافر سوائے اللہ کے پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ سب فوت بھی ہو چکے ہیں کوئی بھی ان میں سے زندہ نہیں اور ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔ اسی کے مطابق سورہ فرقان میں فرمایا۔ پس اللہ تعالٰی نے خلق یا پیدا کرنے کے متعلق اپنا قانون اصولی رنگ میں یہ بیان فرمایا کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے اور کہ اللہ کے سوائے کوئی خالق نہیں۔ اور جن لوگوں کو معبود بنایا گیا ہے۔ انہوں نے کوئی خلق نہیں کی اور ایسا کبھی ہو نہیں سکتا کہ انسان کی بنائی ہوئی چیز اور خدا کی خلق کی ہوئی چیز ایسی مل جل جائیں کہ ان میں امتیاز نہ رہے۔ ایسا ہی فرمایا افمن یخلق کمن لا یخلق (النحل[16]-۱۷) کیا جو خلق کرتا ہے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو خلق نہیں کرتا؟ اب اگر مسیح کا خلق طیور مانا جائے تو مسیح من یخلق ہونے کی وجہ سے انسانوں جیسا نہ ہوا بلکہ خدا جیسا ہوا تو چونکہ قرآن کریم میں اختلاف نہیں ہے لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا۔ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اختلاف ہوتا۔ اس لیے یہ کسی صورت میں قابل تسلیم نہیں کہ بار بار یہ قانون باندھ کر کہ اللہ کے سوا کوئی کسی چیز کا خالق نہیں اور پھر یہ بتا کر کہ جن لوگوں کو معبود بنایا گیا ہے انہوں نے ہرگز ہرگز کسی چیز کو پیدا نہیں کیا۔ پھر خود ہی یہ کہہ دے کہ مسیح نے بھی کچھ پرند پیدا کیے تھے۔ اس طرح پر صورت اوّل یعنی مسیح کا سچ مچ کے پرند بنا دینا جن پر ظاہری لغوی معنی کی رُو سے لفظ طیر کا صادق آسکے باطل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ محکمات قرآنی اور تصریحات کلام ربانی کے خلاف ہے اور یہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا کہ حضرت مسیح خدا کے اذن سے خلق کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالٰی اپنی صفات کے خلاف اذن نہیں دیتا۔ جب خلق کو اس نے اپنی صفت خاص میں بیان فرمایا ہے جس میں مخلوق کسی صورت میں شریک نہیں ہو سکتی تو اس کے خلاف اذن دینا گویا اپنی صفت کو ہی باطل کرنا ہے۔

طیر کی توجیہ کہ وہ جلد مٹی ہو جاتے تھے: اب دوسری صورت یہ ہے کہ جو کچھ حضرت مسیح بناتے تھے وہ اصلی اور حقیقی پرند تو نہ تھے۔ بلکہ محض پرند کی شکل ہوتی تھی جیسے مٹی کے کھلونے پرندوں کی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ بال و پر رُوح وغیرہ ان کے اندر کچھ چیز نہ تھی جس کی وجہ سے حقیقی طور پر لفظ پرند یا طیر کا ان کے لیے استعمال ہو سکے جیسے مٹی کے کھلونے پرندوں وغیرہ کی شکل میں بنے ہوئے بازار میں ملتے ہیں۔ ایسے ہی وہ بھی ہونگے اور حضرت مسیح کے نفخ سے صرف ایک آنی نظارہ اُن کے پرواز کا نظر آجاتا ہوگا جیسا کہ وہب نے بیان کیا ہے۔ تو اس صورت میں گو تشابہ فی الخلق واقع نہ ہونے کی وجہ سے محکمات مذکورہ بالا کے خلاف تو یہ امر نہیں ٹھہرتا مگر اس صورت میں اوّل تو لفظ طیر کا استعمال مجاز کے رنگ کا ہوا نہ حقیقت کے طور پر کیونکہ وہ واقعی پرند نہ تھے بلکہ ان کی شکل پرند سے مشابہ تھی۔ اور باوجود لفظ طیر کے مجازی معنی لینے کے اس میں اعجاز کا رنگ یا نبی کی شان کے شایان کوئی کام نہ رہا۔ بلکہ زیادہ تر ایک کھیل اور تماشہ کی صورت رہی اور نبی کی شان سے یہ امر بعید ہے کہ ان لوگوں کی طبائع کو جن کی اصلاح کے لیے وہ آتا ہے ایسے کھیلوں کی طرف متوجہ کرے کیا اس سے کسی پر اتمام حجت ہو سکتا ہے یا کوئی غرض

وَالْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ شب کور اور پھلوہری والے کو اچھا کرتا ہوں[۴۳۳] اور اللہ کے حکم سے مُردوں

اصلاح نفوس کی پوری ہو سکتی ہے نہ تو یہ فعل مخالف کے لیے مسکت ہو سکتا ہے اور نہ مسیح کے پیرو خود اس سے کوئی روحانی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اب بحث مذکورہ بالا سے یہ تو عیاں ہے کہ طیر کے ظاہری لغوی معنی پرند مفہوم آیت محکمات قرآنی کے خلاف ٹھہراتے ہیں۔ پس یہاں مجاز اور استعارہ کے رنگ کا کلام ماننا لازمی ہے۔ اور جب قرآن کریم میں مجاز اور استعارہ بہت مقامات پر پایا جاتا ہے اور اصول یہی ہے کہ جب قرائن یا محکمات ظاہر معنے لینے کے مانع ہوں تو مجاز ماننا پڑتا ہے تو یہاں مجاز ماننے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور وہب نے جو صورت پیش کی ہے وہ درحقیقت طیر کے استعمال کو برنگ مجاز اور استعارہ ہی قرار دیتی ہے نہ بطور حقیقت علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام میں مجاز اور استعارہ کا استعمال بہت پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ شاگردوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ آپ تمثیلوں میں لوگوں سے باتیں کرتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں تو مسیح نے کہا "اس لیے میں ان سے تمثیلوں میں بات کرتا ہوں کہ وے دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے۔" (متی ۱۳: ۱۲) حالانکہ یہ بھی تمثیل ہی ہے پھر لکھا ہے کہ "یہ سب باتیں یسوع نے ان جماعتوں کو تمثیلوں میں کہیں اور بے تمثیل ان سے نہ بولتا تھا تاکہ جو نبی نے کہا تھا پورا ہو کہ میں تمثیلیں لاکر کلام کرونگا" (متی ۱۳-۳۴ و ۳۵) پس یہ وجہ ہے کہ کیوں مسیح کا کلام اللہ تعالیٰ نے بھی تمثیل کے رنگ میں بیان فرمایا ہے۔ اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم اور کتب مقدسہ نے جہاں اس رنگ کے مجاز کو استعمال کیا ہے وہاں عموماً صورت یہی ہے کہ وہ جسمانیات سے اکثر روحانیات کی طرف لے جاتے ہیں شلاً زمین کے مردہ ہونے کا ذکر ہے تو مراد اس سے روحانی موت ہے۔ اندھوں اور بہروں کا ذکر ہے تو مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی آنکھوں اور کانوں سے کام نہیں لیتے۔ بارش کا ذکر ہے تو مراد وحی الٰہی کا نزول ہے۔ تاریکی کا ذکر ہے تو جہالت مراد ہے۔ دن اور روشنی کا ذکر ہے تو نور اور ایمان مراد ہے۔ اسی طرح چارپایوں سے کسی قوم کو مشابہت دی۔ تو مراد فہم سے کام نہ لینا یا زمینی باتوں پر جھکے رہنا ہے۔ کسی کو گدھا کہا تو مراد یہ ہے کہ جو کتابیں اس نے پڑھی ہیں وہ ایک بوجھ کے طور پر تو ہیں لیکن انسان جو اُن سے فائدہ حاصل کرتا ہے وہ نہ ہُوا۔ کسی قوم کو بندر بنایا تو مراد یہ ہے کہ وہ اچھے افعال کی نقل کرتے ہیں مگر حقیقت ان میں کوئی نہیں۔ طیر کے مجازی معنی: اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ طیر کو جو امتیاز دوسرے جانداروں پر حاصل ہے وہ پرواز کرنا یا زمین سے اوپر اڑنا ہے پس جب طیر کا لفظ کسی نبی کے کلام میں بطور استعارہ استعمال ہو جیسا کہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ یہاں سوائے استعارہ ماننے کے چارہ نہیں تو استعارہ میں اصل ذکر اسی بالا امر کا ہوگا یعنی زمین سے اوپر اُٹھ کر پرواز کرنا۔ جیسا کسی کے متعلق فرمایا اخلد الی الارض وہ زمین کے ساتھ لگ گیا۔ مراد یہ ہے کہ زمینی چیزوں کی طرف مائل ہو گیا اور اوپر کی طرف اس کی توجہ نہ ہوئی۔ پس برنگ استعارہ یہاں طیر سے مراد ایسے لوگ ہیں جو زمین اور زمینی چیزوں سے اوپر اُٹھ کر خدا کی طرف پرواز کر سکیں اور یہ بات آسانی سے سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ کس طرح نبی کے نفخ سے انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ زمینی خیالات کو ترک کر کے عالم روحانیت میں پرواز کرے۔

طیر کا استعمال بطور مجاز قرآن وحدیث میں: لفظ طیر کے اس مجازی استعمال پر ممکن ہے بعض طبائع میں خلش پیدا ہو لیکن جب ظاہری معنی ممتنع ہوئے تو سوائے مجاز کے چارہ نہیں اور لفظ طیر بطور مجاز قرآن کریم میں بھی استعمال ہُوا ہے اور حدیث میں بھی۔ تو ان حالات کے اندر اس آیت کے معنی کرنے میں سوائے اس مجاز کو ماننے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اور پھر یہ معنی بھی نرے قیاس پر ہی مبنی نہیں، بلکہ احادیث میں شہدا کو جو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام روحانیت پر پہنچ چکے ہیں طیر یعنی پرندوں سے مشابہت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بہشت میں سبز پرندوں کی شکل میں پھر رہے ہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ابن مسعود کی روایت سے ہے ان ارواح الشھداء فی اجواف طیر خضر شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں۔ اور ابن ماجہ میں حضرت ابن مسعود کی ہی روایت سے ہے ارواح الشھداء عند اللہ تعالیٰ کطیر خضر یعنی شہیدوں کی روحیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سبز پرندوں کی طرح ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندے ہیں اور بعض میں ہے کہ سفید پرندے ہیں۔

پس احادیث میں اس صراحت کے ہوتے ہوئے یہاں طیر یا پرندوں سے مراد شہداء کی قسم کے لوگ لینا یعنی ایسے لوگ جو عالم روحانیت میں پرواز کرنے والے ہوں یا سفلی تعلقات سے بلند پرواز کرتے ہوں عین مطابق منشائے قرآن کریم معلوم ہوتا ہے۔

اس استعارہ کو مدنظر رکھتے ہوئے باقی الفاظ کی تشریح میں کچھ مشکل باقی نہیں رہتی خلق کے معنی اندازہ کرنا نہ پیدا کرنا انسان کے لیے آتے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔ طین کا لفظ استعارہ کے رنگ میں فرمانبرداری کو چاہتا ہے۔ گویا طینی مخلوق میں فرمانبرداری کی استعداد زیادہ ہے نفخ سے مراد نفخ روحانی ہونے پر بھی اوپر دلائل دی جا چکی ہیں پس اب اس سارے کلام انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ سے مراد استعارہ کے رنگ میں یہ ہوئی کہ حضرت مسیح اپنے اس نفخ روحانی کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ استعدادیں جو طینی ہونے کی وجہ سے قبولیت کی استعداد زیادہ رکھتی ہیں۔ ان کا وہ طیر کی حیثیت پر اندازہ کرتے ہیں اور ان کے اندر بلند خیالی پیدا کرنے کی تجویز کرتے ہیں اور زمین سے ان کے تعلقات کم کرنا چاہتے ہیں۔ پس وہ ان کے اندر ایک نفخ روحانی کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا کے نبی درحقیقت نفخ روحانی ہی کرنے آتے ہیں اور نفخ روحانی سے قابل استعدادوں کو اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔

ع۴۳۳ اکمہ۔ سورج کے متعلق کَمِھَتْ کہا جاتا ہے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے سامنے غبار آگیا پس وہ تاریک ہو گیا۔ اسی سے کَمِہَ بَصَرُہٗ ہے اور اَکْمَہْ اس اندھے کو بھی کہتے ہیں جو ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہو اور بعد میں جس کی بصارت پر تاریکی آجائے اس کو بھی کہتے ہیں۔ اور اس معنی میں یہ لفظ اشعار میں بہت آیا ہے اور ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ اَکْمَہْ وہ ہے جو دن کو دیکھتا ہے اور رات کو نہیں دیکھتا (ل)، اور روحانی رنگ میں ایسے لوگ جو سورج کی تیز

اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ کو زندہ کرتا ہوں[۴۳۴] اور جو تم کھاؤ اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھو اس

روشنی میں تو حق کو دیکھ لیتے ہیں مگر ذرا سی مشکلات سامنے آتی ہیں تو کچھ نہیں دیکھتے۔

ابرص۔ بَرَص۔ اس سفیدی کو کہتے ہیں جو جسم میں نمودار ہوتی ہے جسے پھلوہری کہا جاتا ہے اور روحانی رنگ میں ایسی بدی جو ظاہر میں نیکی معلوم ہو۔

حضرت مسیح کے کلام میں بیماریوں سے مراد روحانی بیماریاں ہیں: حضرت مسیح کا معمولی بیماریوں کا علاج کرنا ان کی نبوت کے متعلق کوئی خاص امر نہیں۔ حالانکہ یہاں نشان کے طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر یہاں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کے علم کے بعد ان باتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جن میں خلق طیر اور اکمہ اور ابرص کے علاج کا ذکر ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں کتاب و حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ کیونکہ حکمت سے مراد یہاں علم طب نہیں۔ بلکہ حقیقت تک پہنچنا اور اصل بات کا فہم حاصل کرنا ہے۔ پس قرینہ چاہتا ہے کہ یہاں روحانی بیماریوں کے علاج کا ذکر ہے۔ کیونکہ تورات و انجیل روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے نازل ہوئی تھیں نہ جسمانی بیماریوں کے علاج کے لیے۔ اور خود انجیل میں حضرت مسیح کے اقوال اسی کے موید ہیں۔ متی ۱۳-۱۵ میں یہودیوں کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مسیح فرماتے ہیں "کیونکہ اس قوم کا دل موٹا ہوا اور وے اپنے کانوں سے اُونچا سُنتے ہیں اور اُنھوں نے اپنی آنکھیں موند لیں تا ایسا نہ ہو کہ وے آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سُنیں اور دل سے سمجھیں اور رجوع لاویں اور مَیں اُنہیں چنگا کروں"۔ اب یہاں سب روحانی حالت اور روحانی بیماریوں کا ذکر کر کے آخر پر یہ الفاظ ہیں کہ "مَیں انہیں چنگا کروں" جو ابری الاکمہ والابرص کے بالکل مطابق ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ چنگا کرنے سے آپ کا منشا یہ تھا کہ روحانی بیماریوں سے شفا دوں۔ پھر متی ۹-۱۲ میں فرماتے ہیں "بھلے چنگوں کو حکیم درکار نہیں بلکہ بیماروں کو"۔ اب یہاں تینوں لفظ یعنی بھلے چنگے حکیم اور بیمار۔ ظاہری معنی کے لحاظ سے استعمال نہیں کیے گئے۔ بلکہ روحانی صحت۔ روحانی طبیب اور روحانی بیمار مراد ہیں۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر صفائی اس سوال و جواب سے ہوتی ہے جو متی ۱۱-۳ تا ۵ میں مذکور ہے۔ جہاں یہ ذکر ہے کہ یوحنا نے دو آدمیوں کو مسیح کے پاس بھیجا تھا کہ دریافت کریں کہ وہ وہی مسیح ہے جس کی ان کو انتظار تھی۔ تو اس کے جواب میں حضرت مسیح نے یوں فرمایا "یسوع نے جواب میں انہیں کہا۔ کہ جو کچھ تم سنتے اور دیکھتے ہو جا کے یوحنا سے بیان کرو۔ کہ اندھے دیکھتے اور لنگڑے چلتے۔ کوڑھی پاک صاف ہوتے اور بہرے سنتے اور مُردے جی اُٹھتے ہیں اور غریبوں کو خوش خبری سنائی جاتی ہے"۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں آخری فقرہ میں غریبوں سے مراد مال و دولت سے محروم نہیں بلکہ دل کے غریب ہیں اور خوشخبری لفظ گاسپل یا انجیل کا ترجمہ ہے اس ایک فقرہ نے درحقیقت پہلے تمام فقروں کے معنوں پر روشنی ڈال دی ہے کہ یہاں بھی مراد روحانی بیماریاں ہی ہیں۔ ورنہ جسمانی بیماریوں کے ذکر میں غریبوں کو انجیل کا سنایا جانا ایک بے معنی بات ہے۔ پس ان تمام حوالجات سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے کلام میں جیسا کہ وہ انجیل میں اب ملتا ہے بیماروں کو شفا دینے سے مراد روحانی بیماریوں کا دُور کرنا ہے۔

قرآن کریم میں بیماریوں اور شفا سے مراد: اب ہم دوسری طرف قرآن کریم پر غور کرتے ہیں تو یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں روحانی بیماروں کو شفا دینا ہی نبیوں کا کام لکھا ہے وہ جن اندھوں، بہروں اور گونگوں کو اچھا کرتے ہیں ان کے متعلق فرماتا ہے فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور (الحج ۲۲-۴۶) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ اندھے وہ دل ہیں جو سینوں کے اندر ہیں اور اسی نابینائی کا ذکر قرآن کریم بار بار فرماتا ہے صم بکم عمی فھم لا یرجعون یہ ان کافروں کی حالت ہے جو انذار کی پروا نہیں کرتے۔ نہ باتیں سنتے ہیں نہ اُن پر غور کرتے ہیں، نہ منہ سے کلمۂ حق کہتے ہیں نہ خدا کے نشانات کو دیکھتے ہیں اس لیے حق کی طرف رجوع نہیں کرتے اور یہی نہیں کہ روحانی امراض کا ذکر ہی بار بار فرمایا ہے بلکہ شفا کا ذکر بھی اسی رنگ میں فرمایا۔ چنانچہ قرآن کریم کے متعلق ایک جگہ فرمایا ھدی و شفاء (حٰم ۴۱-۴۴) وہ ہدایت بھی ہے اور شفا بھی۔ لفظ شفا کو ہدایت کے ساتھ لگا کر بتا دیا کہ روحانی بیماریوں کی شفا مراد ہے نہ جسمانی بیماریوں کی۔ اور پھر فرمایا شفاء لما فی الصدور (یونس ۱۰-۵۷) یہ سینوں کے اندر کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے۔

عیسائیوں کی لفظ پرستی: پس انجیل اور قرآن کریم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء کا کام اور ان کی تعلیم روحانی بیماریوں سے نجات دینے کے لیے ہوتے ہیں اور کتب مقدسہ میں جن بیماریوں کا ذکر اکثر آتا ہے۔ وہ روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔ اور اسی قسم کی بیماریوں کا علاج حضرت مسیح کرتے تھے۔ عیسائیوں نے لفظ پرستی کی اور آپ کے کلام میں جو مجاز اور استعارہ تھا اسے حقیقت پر محمول کیا اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مریض دیئے گئے کہ ان کا علاج کرو، ان کا مرض مسیح کے مریضوں کے مرض سے بہت بڑھ کر ہے۔ یہاں تو شبکور اور برص والے ہیں۔ مگر آنحضرت صلعم کو اندھے اور گونگے اور بہرے دیئے جاتے ہیں۔ گونگا اور بہرہ صفاتِ حسنہ سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر وہ ساتھ اندھا بھی ہو تو کوئی ذریعہ اس کے علوم حاصل کرنے کا باقی نہیں رہتا اس میں درحقیقت یہ بتایا ہے کہ مسیح کے وقت کی بیماری ایسی خطرناک نہ تھی، جیسے نبی کریم صلعم کے زمانہ کی بیماری اور جس قدر بیماریاں خطرناک ہوں اسی قدر فاضل طبیب بھی بکار ہوتا ہے۔ پس دنیا کا سب سے بڑا طبیب ہی اس قابل تھا کہ ایسے لوگوں کو بھی شفا دے جو اندھے بھی ہیں اور گونگے بھی ہیں اور بہرے بھی ہیں۔

۴۳۴ موت اور حیات کے معنی ۷۹ میں بیان ہو چکے ہیں۔ قوت نامیہ، قوت حاسہ۔ قوت عاقلہ ہر ایک کے زوال کا نام عربی میں موت ہی ہے۔ یہاں کون سے مردے مراد ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم مُردوں کے اس دنیا میں دوبارہ واپس آنے کے متعلق اصولی رنگ میں کیا تعلیم دیتا ہے۔

مُردوں کا اس دنیا میں واپس آنا بروئے تصریح قرآنی ممنوع ہے: قبض روح کے متعلق اللہ تعالیٰ اپنا عام قانون ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمی (الزمر ۳۹-۴۲) اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے

بُيُوْتِكُمْ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ

کی خبر دیتا ہوں، یقیناً اس میں تمھارے لیے نشان ہے اگر

روحوں کو ان کی موت کے وقت۔ اور جو مرتے نہیں ان کی نیند میں پھر روک رکھتا ہے اس کو جس پر موت وارد کردی اور واپس بھیجتا ہے دوسرے کو ایک وقت مقرر تک۔ اس آیت کریمہ کی رُو سے قبض روح دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک موت کی حالت میں اور دوسرے نیند کی حالت میں۔ گویا ان دونوں حالتوں پر قبض روح کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قبض روح کی تیسری کوئی طرز بیان نہیں فرمائی اور ان دونوں طرزوں میں سے بھی ایک کے متعلق فیصلہ قطعی صادر فرما دیا کہ جس پر موت وارد کردے اس کو پھر اس دنیا میں واپس نہیں بھیجتا۔ ان کے زندہ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت کا وقت مقرر فرمایا ہے پس اس آیت کی رو سے کوئی شخص جس پر موت وارد ہوچکی ہے زندہ ہوکر اس دنیا میں نہیں آسکتا۔

پھر یہی اصول ایک اور آیت میں بیان کیا گیا ہے حتیٰ اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت کلا انھا کلمة ھو قائلھا ومن ورائھم برزخ الی یوم یبعثون (المؤمنون ۲۳ - ۹۹ - ۱۰۰) یہاں تک کہ جب ان میں سے ایک پر موت آجاتی ہے تو پھر وہ کہتا ہے میرے رب مجھے لوٹاؤ تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں نیک عمل کروں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے ادھر (یعنی بعد موت) ایک حالت برزخ ہے۔ اس دن تک کہ انکو اُٹھایا جائے۔ اب اس آیت میں بھی یہی اصول بیان فرمایا کہ موت کے بعد اس دنیا میں واپس آنا ممنوع ہے اور ایسی خواہش پوری نہیں کی جاسکتی بلکہ یوم البعث تک یعنی قیامت کے دن تک حالت برزخ میں رہنا ہوگا پس اس آیت کی رو سے بھی مردوں کا قبل از بعثت اس دنیا میں واپس آنا باطل ثابت ہوتا ہے۔

تیسری آیت جو اس پر شاہد ہے وہ ذیل کی آیت قرآنی ہے وحرام علیٰ قریة اھلکنھا انھم لا یرجعون (الانبیاء ۲۱ - ۹۵) اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کردیا ان کے لیے یہ قطعی ہوچکا کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ قریة سے مراد بستی کے لوگ ہیں یعنی جو لوگ مرجاتے ہیں وہ لوٹ کر اس دنیا میں نہیں آیا کرتے۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث نسائی اور ابن ماجہ میں مذکور ہے عن جابر بن عبد اللہ قال لقینی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فقال یا جابر مالی اراك منکسرا قلت یا رسول استشھد ابی وترك عیالا ودینا فقال الا ابشرك مالقی اللہ به اباك قال بلیٰ ...... قال یا عبدی تمن علی اعطك قال یا رب تحیینی فاقتل فیك ثانیة قال الرب تعالیٰ قد سبق منی انھم لا یرجعون یعنی جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلعم ملے اور فرمایا اے جابر کیا وجہ ہے میں تم کو غمگین پاتا ہوں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا باپ شہید ہوگیا اور عیال اور قرضہ پیچھے چھوڑ گیا۔ فرمایا۔ میں تم کو خوش خبری دوں کہ تیرے باپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور کیا معاملہ پیش آیا۔ عرض کیا فرمائیے (یہاں حدیث کا درمیانی ٹکڑا چھوڑ دیا گیا ہے) ...... اللہ تعالیٰ نے (جابر کے والد کو) فرمایا اے میرے بندے تو میرے سامنے کوئی خواہش کرتا کہ میں تجھے دوں۔ اس نے عرض کیا اے میرے رب مجھے زندہ کر دیجئے تاکہ میں دوبارہ تیری راہ میں مارا جاؤں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا میں پہلے وعدہ کرچکا ہوں کہ (جو مرجائیں گے) وہ لوٹ کر اُس دنیا میں نہیں جائیں گے۔ اب یہ حدیث قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ مُردہ کبھی اس دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ اور مردہ کا واپس آنا قانون الٰہی کے خلاف ہے کیونکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود جابر کے والد کو یہ کہا تھا کہ جو چاہتے ہو مانگو میں دونگا۔ مگر جب اس نے دوبارہ دنیا میں بھیجا جانے کی خواہش ظاہر کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے۔ اب یہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کا فرمانا، کہ جو مانگو دونگا۔ دوسری طرف مسلمانوں میں اس وقت ایسے آدمیوں کی سخت ترین ضرورت ہونا جو خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کریں۔ یہ دونوں باتیں اس امر کی مقتضی تھیں کہ اگر خدا کے قانون میں کوئی مُردہ اس دنیا میں واپس آسکتا ہے تو جابر کا والد سب سے بڑھ کر واپسی کا مستحق تھا مگر اللہ تعالیٰ نے باوجود یہ فرمانے کے جو مانگو میں تم کو دونگا۔ پھر بھی دوبارہ دنیا میں اُس کے آنے کی خواہش کو پورا نہیں کیا۔ اس بنا پر کہ یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے؛ تو کیا یہ وعدہ خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح کے زمانہ کے بعد کیا تھا کہ اب میں مُردوں کو زندہ نہیں کیا کرونگا۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر خدا مسیح کے ذریعہ سے مُردوں کو زندہ کرتا تھا تو خود ایک مُردہ کو زندہ کرکے کیوں واپس نہ بھیج دیا۔ قریبًا اسی مضمون کی ایک حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے جہاں اللہ تعالیٰ شہداء کی ارواح کو فرماتا ہے ماذا تبغون تم کیا چاہتے ہو؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ ہمیں کچھ حاجت نہیں۔ پھر یہ سوال ہوتا ہے یہاں تک کہ فلما راؤا انھم لا یترکون من ان یسئلوا قالوا نرید ان تردنا الی الدار الدنیا فنقاتل فی سبیلك حتیٰ نقتل فیك مرة اخریٰ لما یرون من ثواب الشھادة فیقول الرب جل جلاله انی کتبت انھم الیھا لا یرجعون۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ان سے بار بار سوال کیا جاتا ہے تو کہیں گے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں دار دنیا کی طرف واپس لوٹا دیں تب ہم تیری راہ میں جنگ کریں۔ یہانتک کہ تیری راہ میں دوسری مرتبہ قتل کیے جائیں کیونکہ وہ شہادت کا اس قدر ثواب دیکھ چکے ہونگے تو رب جل جلالہٗ فرمائے گا میں یہ لکھ چکا ہوں کہ اس دنیا کی طرف پھر ان کو نہیں لوٹایا جائیگا۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی مردہ دنیا میں زندہ ہوکر آسکتا ہے تو شہداء سب سے بڑھ کر حقدار ہیں کیونکہ ان کی زندگیاں محض اللہ کے لیے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ خود اُن کو فرماتا بھی ہے کہ تم جو کچھ مانگو میں دونگا۔ لیکن بااین ہمہ دوبارہ ان کو دنیا میں نہیں بھیجتا کیوں؟ اس لیے کہ فرماتا ہے یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین اصول کے رنگ میں کیسے محکم ہیں۔

قرآن کریم میں روحانی مُردوں کے احیاء کا ذکر: پس یہ آیتیں اور حدیثیں اس بات پر شاہد ہیں کہ مُردے ہرگز اس دنیا میں واپس نہیں آیا کرتے اور اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ یہاں بھی روحانی مُردوں کا احیاء مراد لیا جائے اور قرآن کریم میں روحانی مردوں کے احیاء کا ذکر بھی کثرت کے ساتھ اور بار بار آتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا اومن کان میتًا فاحییناه وجعلنا له نورا یمشی به فی الناس کمن مثله فی الظلمٰت لیس بخارج منھا (الانعام ۶ - ۱۲۳) کیا وہ شخص جو مُردہ ہو،

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٤٩﴾ تم مومن ہو[۴۳۵]
وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ اور اس کی تصدیق کرنے والا جو توریت میں سے مجھ سے پہلے ہے[۴۳۶]

پھر اُسے ہم زندہ کریں اور اس کو ایک روشنی دیدیں جس کے ساتھ وہ لوگوں کے اندر چلے اس شخص کی مثل ہو سکتا ہے جو تاریکیوں کے اندر ہی رہے۔ ان میں سے باہر نکلنے والا نہ ہو۔ اب یہاں ایک مردہ کا ذکر ہے اور اس کے زندہ کرنے کا بھی ذکر ہے مگر یہ کس قسم کا مردہ ہے اور اس کا احیاء کیا ہے۔ اس مردہ کو جب اللہ تعالےٰ اپنی جناب سے نور ایمان عطا فرماتا ہے تو اس نور کے ذریعہ سے پھر وہ لوگوں میں چلتا ہے۔ اور اس زندگی کے مقابل اس مردہ کی حالت ہے جو تاریکیوں میں پڑ رہتا ہے۔ پھر فرمایا۔ یا یھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ والرسول اذا دعاکم لما یحییکم (الانفال۔ ۲۴) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو فرمانبرداری کرو اللہ کی اور رسول کی جب وہ تم کو بلائے اس کے لیے جو تم کو زندہ کرے۔ پھر فرمایا وما یستوی الاحیاء ولا الاموات ان اللہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور (فاطر ۳۵۔ ۲۲) زندے اور مُردے یکساں نہیں، اللہ جسے چاہتا ہے سناتا ہے اور جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں تم ان کو نہیں سنا سکتے۔ یہاں نہ صرف رُوحانی زندوں کو احیاء اور روحانی مردوں کو اموات کے نام سے پکارا ہے۔ بلکہ اُن کو من فی القبور بھی قرار دیا ہے۔ یعنی ایسے لوگ جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

مسیح کے احیائے موتٰی سے روحانی مردوں کی زندگی مراد ہے: پس قرآن کریم مُردوں کے اس دنیا میں واپس آنے کا دروازہ قطعاً بند کرتا ہے۔ اور روحانی مُردوں کو قرآن کریم میں مُردے ہی کہا گیا ہے۔ بلکہ انبیاء کا یہ کام بتایا گیا ہے کہ وہ روحانی مردوں کو زندہ کریں۔ تو ہم احی الموتٰی باذن اللہ کے ایک ہی معنی لے سکتے ہیں کہ اللہ کے اذن سے میں روحانی مردوں کو زندگی دیتا ہوں۔

نبی کی قوت قدسی کا اظہار دو رنگوں میں: یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دراصل یہ تینوں فقرے یعنی اوّل خلق طیر۔ دوم اکمہ اور ابرص کو شفا دینا۔ سوم مردوں کو زندہ کرنا ایک ہی مطلب کے ظاہر کرنے والے ہیں۔ یعنی نبی کے نفخ روح سے ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے پھر وہ مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے جو طینی فطرت کے لوگ ہیں یعنی بوجہ فرمانبرداری کے مادہ کے استعداد قبولیت زیادہ رکھتے ہیں۔ ان میں تو نفخ روح کا اثر اس قدر ہوتا ہے کہ ان کے زمینی تعلقات منقطع ہو کر وہ بالکل خدا کے لیے ہی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ادنیٰ حالت ان لوگوں کی حالت ہے جن کو بیمار کہا یعنی اکمہ اور ابرص ان کی بیماریاں دور ہو کر وہ بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔ مگر سب سے ردی حالت ان لوگوں کی ہے جن میں سے روحانی زندگی مفقود ہو چکی ہے اور وہ مُردوں کے حکم میں داخل ہو چکے ہیں۔ مگر ان پر بھی نبی کی قوت قدسی کا اثر ہوتا ہے اور ان کو از سر نو زندگی دی جاتی ہے۔ اصل غرض بہرحال ایک ہی ہے یعنی انسانوں میں نفخ روح کرنا اور تین مختلف پیرائے اس کے صرف اس لیے بیان فرمائے کہ تا انسانوں کے تین مراتب پر یعنی اس حالت پر جس میں نبی ان کو پاتا ہے شاہد ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ان تینوں کو ایک ہی آیت قرار دیا ہے اور یوں فرمایا ہے انی قد جئتکم باٰیۃ من ربکم میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بات لایا ہوں۔ حالانکہ آگے ذکر تین باتوں کا ہے۔ اس سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ درحقیقت یہ تینوں باتیں ایک ہی مطلب کو ظاہر کرنے والی ہیں اور نبی کی قوت قدسی کا فیضان ہی وہ بات ہے جس کا یہاں ذکر مطلوب ہے۔

ع ۴۳۵ بما تاکلون۔ یہاں یا تو ما مصدریہ ہے اور مراد یہ ہے کہ تمہارے کھانے اور تمہارے ذخیرہ کرنے کی خبر دیتا ہوں۔ یعنی اس امر کی کہ کیا کھانا ہے اور کیا ذخیرہ کرنا ہے اور یا ما موصولہ ہے اور اس صورت میں خبر بمعنی امر ہے یعنی اس امر کی خبر دیتا ہوں کہ کیا کھاؤ اور کیا ذخیرہ کرو۔

تدخرون۔ اِدِّخار اصل میں اذتخار ہے جو ذخر سے ہے اور ادخرتہ کے معنی ہیں اَعْدَدْتُہٗ لِلْعُقْبٰی (غ) یعنی آئندہ کے لیے اسے سامان بنا کر رکھا۔ ذخیرہ کیا۔

مسیح کے متعلق غلط قصے: اس موقعہ پر جو قصے لکھے گئے ہیں کہ حضرت مسیح چھوٹے ہوتے باہر لڑکوں میں کھیلا کرتے تھے تو لڑکوں کو بتا دیا کرتے تھے کہ تمہاری ماں نے فلاں چیز فلاں جگہ چھپا کر رکھی ہے۔ اور اس طرح لڑکے گھر میں جا کر ماؤں کو تنگ کیا کرتے تھے۔ پھر لکھا ہے کہ ایک دن محلہ والوں نے سارے لڑکوں کو ایک مکان میں بند کر دیا اور جب مسیح اُن کو بُلاتے ہوئے آئے تو اُن کے متولیوں نے کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں اور جب مسیح نے اس مکان کی طرف جہاں وہ لڑکے بند تھے اشارہ کر کے کہا کہ یہاں کون ہے۔ تو اُنہوں نے کہہ دیا کہ سؤر۔ تو وہ سب لڑکے سؤر بن گئے۔ یہ بے سر و پا قصے گھڑ لیے گئے ہیں جن کی غرض صرف مسیح کی ہر بات کو عجوبہ بنانا ہے حالانکہ مسیح میں دیگر انبیاء بنی اسرائیل سے بڑھ کر کوئی بات نہ تھی۔ اس آیت کے معنی صاف اس قدر ہیں کہ حضرت مسیح ان کو بتاتے ہیں کہ کیا چیزیں کھاؤ اور کس قدر ذخیرہ کرو۔ گویا حلال و حرام کے متعلق بھی کچھ احکام دیتے تھے اور زیادہ تر ان کی تعلیم کا زور اس بات پر تھا کہ دنیا کے مال و دولت کا زیادہ ذخیرہ مت کرو اور اپنے لیے زمین پر خزانے مت جمع کرو۔ گو آپ کے پیروؤں نے آپکی ہر ایک تعلیم کی خلاف ورزی ہی کی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے پیروانِ مسیح کی حالت دیکھو جو دن رات دولت جمع کرنے کی فکر میں ہیں اور جن کا خدا ہی اب سیم و زر ہے اور حضرت مسیح کی اس تعلیم کو دیکھو "اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ۔ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں کیونکہ جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا۔" (متی ۶: ۱۹ تا ۲۱)

۴۳۶ ومصدقا عطف ہے باٰیۃ پر یعنی قد جئتکم باٰیۃ۔ وجئتکم مصدقا۔

حضرت مسیح کا توریت کا مصدق ہونے سے منشاء اس کی کمی کو پورا کرنا ہے: یہاں حضرت عیسٰی اپنے آپ کو توریت کا مصدق قرار دیتے ہیں۔ اس تصدیق کا منشا کیا ہے اس پر مفصل بحث ع۶۳ میں گزر چکی ہے جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس تصدیق سے جس کا صلہ لام آئے مراد یہ ہوتی ہے کہ پہلی کتاب اس بات کو چاہتی تھی کہ اس کی کسی کمی کو

وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾

اور تاکہ اس کا کچھ حصہ تمہارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کیا گیا ہے[۴۳۷]۔ اور میں تمہارے پاس تمہارے رب سے ایک پیغام لایا ہوں، پس اللہ کا تقوٰے اختیار کرو اور میری اطاعت کرو[۴۳۸]۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

اللہ ہی میرا رب اور تمہارا رب ہے، پس اس کی عبادت کرو یہی سیدھا رستہ ہے[۴۳۹]۔

پورا کرنے کے لیے یا اس کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی دوسرا نبی آئے۔ پس جب وہ دوسرا نبی آتا ہے تو اس پہلی کتاب کی تصدیق کرتا ہے یعنی اس کا منجانب اللہ ہونا بھی تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس کمی یا نقص کو بھی پورا کرتا ہے۔ **توریت اور انبیائے بنی اسرائیل**: توریت کی تعلیم جس طرح بعض پہلوؤں کی رو سے مختص القوم تھی، یعنی صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی اسی طرح اس کی تعلیم کے بعض پہلو مختص الزمان بھی تھے۔ اور انبیائے بنی اسرائیل وقتاً فوقتاً ظاہر ہو کر ایسی کمی کو پورا کرتے رہے اس لیے شریعتِ توریت ان میں بطور ایک بنیاد کے رہی۔ اور باقی انبیاء کی تعلیم اپنے اپنے زمانہ تک محدود رہی۔ وہ اپنے اپنے وقت میں تعلیم توریت کی کمی کو پورا کرتے رہے۔ اس لیے حضرت عیسٰی دنیا کی ساری کتابوں کے یا سارے رسولوں کے مصدق نہیں ہوئے بلکہ صرف توریت کے مصدق ہوئے کیونکہ ان کی بعثت کی غرض توریت کی تعلیم کی کسی کمی کو ہی پورا کرنا تھا اور اس تصدیق سے یہ نتیجہ قطعاً نہیں نکلتا کہ حضرت عیسٰی کے وقت تک توریت میں کوئی تحریف نہ ہوئی تھی۔ ہاں اللہ تعالیٰ انبیاء کو اس لیے مامور نہیں کرتا کہ وہ پرانی کتابوں کے ایک ایک حرف کو درست کر دیں۔ بلکہ اصل غرض اصلاح نفوس ہوتی ہے اسکے لیے موٹی موٹی ہدایات وہ انہیں دیدیتا ہے۔ یہ امر کہ حضرت مسیح نے توریت کی تعلیم کی کمی کو پورا کیا، خود قرآن کریم کے اگلے الفاظ سے ظاہر ہے اور بعثت انبیاء کی اصل غرض چونکہ بروئے قرآن کریم ہدایت کا لانا ہے جیسا کہ فاما یاتینکم منی ھدی سے ظاہر ہے اس لیے ہر نبی کوئی نئی ہدایت لاتا ہے خواہ وہ برنگ شریعت ہو یا برنگ نصیحت یا برنگ نمونۂ عمل۔

۴۳۷ **حضرت عیسٰی کا بعض احکام توریت کو منسوخ کرنا**: بعض الذی حرم علیکم یعنی بعض اس کا جو موسوی شریعت میں تم پر حرام کیا گیا ہے۔ اور یہ روایت قتادہ سے ابن جریر نے دی ہے کان الذی جاءبہ عیسٰی الین مما جاءبہ موسٰی یعنی جو کچھ حضرت عیسٰی لائے اس میں نرمی کا پہلو غالب تھا بہ نسبت اس کے جو موسٰی لائے۔ بعض مفسرین نے اس کے یوں معنی کیے ہیں کہ بعض وہ باتیں جو تم نے غلطی سے اپنے اوپر حرام کر رکھی تھیں ان کو حلال کرتا ہوں اور اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ حضرت عیسٰی نے توریت کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کیا۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اس وقت بھی اناجیل میں باوجود اس اقرار کے کہ میں توریت کو منسوخ کرنے نہیں آیا۔ توریت کے بعض احکام کے خلاف احکام موجود ہیں اور ان الفاظ سے کہ توریت کو منسوخ کرنے نہیں آیا حضرت عیسٰی علیہ السلام کا یہی منشاء تھا کہ بطور بنیاد وہ قائم رہے گی۔ لیکن کچھ تغیر و تبدل یا ترمیم اس میں ضرورت زمانہ کے لحاظ سے ہو گی اس سے شریعت توریت منسوخ نہیں ہوتی جیسا کہ انجیل کی اس قسم کی عبارات سے ظاہر ہے مثلاً "تکمیل کے رنگ میں" "تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کر..... لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصے ہو گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہو گا اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدر عدالت کی سزا کے لائق ہو گا اور جو اس کو احمق کہے گا وہ آگ کی جہنم کا سزاوار ہو گا۔" (متی ۵ : ۲۱ و ۲۲) اس سے حکم توریت کہ خون نہ کر منسوخ نہیں ہوتا بلکہ اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایسا ہی "تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کر۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے بری نظر سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔" (متی ۵ : ۲۷ و ۲۸) یا مثلاً ترمیم کے رنگ میں" یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑے اسے طلاق نامہ لکھ دے۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے وہ اس سے زنا کراتا ہے" (متی ۵ : ۳۱ و ۳۲) یا تنسیخ کے رنگ میں "تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے" (متی ۵ : ۳۸ و ۳۹) اب یہ جس قدر باتیں" کہا گیا تھا" میں حضرت مسیح نے بیان کی ہیں۔ وہ توریت کے احکام ہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ انبیائے بنی اسرائیل اس اختیار کے ساتھ آتے تھے کہ وہ توریت کو بطور بنیاد شریعت تسلیم کرتے ہوئے ان ہدایات کی تکمیل کریں یا ان میں ترمیم تنسیخ کریں۔

۴۳۸ **حضرت عیسٰی کا اپنی اطاعت کی طرف بلانا اور اس کی غرض**: اطیعون۔ میری اطاعت کرو۔ یہ تعلیم ہر ایک نبی دیتا ہے۔ چنانچہ سورہ شعراء میں جہاں بہت سے انبیاء کا ذکر کیا ہے قریباً ہر ایک نبی کی تعلیم میں یہ حصہ بھی پایا جاتا ہے فاتقوا اللّٰہ و اطیعون۔ اللہ کا تقوٰی کرو اور میری اطاعت کرو۔ باوجودیکہ شریعت حضرت موسٰی کی تھی جس پر حضرت مسیح نے بھی عمل کرنا اور کرانا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں کہتے کہ موسٰی کی اطاعت کرو۔ اس لیے کہ وہ خود مطاع ہیں اور کسی دوسرے کے مطیع نہیں بلکہ جو کچھ پاتے ہیں براہِ راست اللہ تعالیٰ سے پاتے ہیں۔ گویا ہر نبی بمنزلہ ایک بادشاہ کے ہوتا ہے اس کو بڑی صراحت سے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللّٰہ (النساء ۴-۶۴) یہاں حضرت مسیح کا اپنی اطاعت کے لیے حکم دینا یہی سمجھانے کو ہے کہ اگر وہ احکام توریت میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کریں تو ان کی بات ماننی ہو گی اور وہ اس بنا پر رد نہیں ہو سکتی کہ توریت کے خلاف ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کی اطاعت جزو دین ہے۔

۴۳۹ **اناجیل میں توحید کی تعلیم**: قرآن کریم نے جو کچھ حضرت مسیح کی تعلیم کا یہاں خلاصہ بیان کیا ہے وہ اب بھی اناجیل میں باوجود ان کی خطرناک تحریف کے موجود

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر جب عیسیٰؑ نے اُن سے کفر محسوس کیا تو کہا، کون اللہ (کے دین) میں میرے مددگار ہیں[۴۴۰]۔ حواریوں نے کہا، ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ اور گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں[۴۴۱]۔

ہے" تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (متی ۴: ۱۰) یہ کسی قائل تثلیث کی تعلیم نہیں ہوسکتی اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں پر اتمام حجت کے لیے اس قسم کے فقروں کو ان کی کتابوں میں باقی رہنے دیا ہے۔

ع۴۴۰ احس۔ احساس کے معنی ہیں حواس ظاہری سے کسی چیز کا معلوم کرلینا۔ حضرت عیسٰی کا ان سے احساس کفر کرلینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا کفر اس حد تک ظاہر ہوچکا تھا کہ فہم کے لیے اس کا ظاہر ہونا تو ایک طرف، احواس کے لیے بھی وہ ظاہر تھا (غ) دوسرے معنی کے لیے دیکھو ۵۳۹

من انصاری الی اللہ۔ انصار نصیر کی جمع ہے یعنی مددگار۔ ابن جریر نے من انصاری الی اللہ کی تشریح یوں کی ہے۔ من اعوانی علی المکذبین بحجۃ اللہ یعنی کون تکذیب کرنیوالوں کے خلاف اللہ کی حجت کے ساتھ میرا مددگار ہوگا اور وہ کہتے ہیں الی اللہ یہاں بمعنی مع اللہ ہے اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں؛ ملتجأ الی اللہ او ذاہبا او ضاما الیہ (ر) یعنی میرا مددگار کون ہے اس حال میں کہ میں اللہ کی طرف پناہ ڈھونڈھنے والا یا اس کی طرف جانے والا یا اس کے ساتھ تعلق کرنے والا ہوں اور آگے جو انصار اللہ آتا ہے تو اس سے مراد انصار دین اللہ ہے یا انصار رسول اللہ یعنی اللہ کے دین یا اللہ کے رسول کے مددگار۔

ع۴۴۱ الحواریون حواری کی جمع ہے اور یہ حَوْر سے مشتق ہے حَوْر کے معنی ہیں ایک چیز سے لوٹ آنا یا ایک چیز کی طرف لوٹ جانا اور اسی سے یحور ہے انہ ظن ان لن یحور (الانشقاق ۸۴-۱۴) اور تحاور جو ایک دوسرے کی طرف کلام کو لوٹانے کا نام ہے واللہ یسمع تحاورکما (المجادلۃ ۵۸-۱) اور حَوَر اصل میں بیاض یعنی سفیدی کو کہتے ہیں اور حَوْراء اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کی آنکھ کی سفیدی اعلیٰ درجہ کی سفید اور سیاہی شدت سے سیاہ ہو اور جس کا رنگ بھی سفید ہو۔ اسی وجہ سے اعراب یعنی بادیہ نشین لوگ شہروں کی عورتوں کو حواریات کہتے تھے۔ کیونکہ ان کے رنگ اعراب کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کے سفید تھے (ل) اور تحویر کے معنی تبییض آتے ہیں یعنی سفید کرنا۔ حواری نام کی وجہ: ابن اثیر راغب وغیرہ کے نزدیک لفظ حواری اسی سے مشتق ہے۔ اور یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے برگزیدہ احباب پر کیوں بولا گیا ہے اس کی وجہ اکثر نے یہی دی ہے کہ حواری قَصَّار کو کہتے ہیں یعنی جو کپڑے دھو کر ان کو سفید کرتا ہے اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے خاص احباب کو حواری کا خطاب اس لیے دیا گیا کہ وہ دھوبی کا کام کرتے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ کے حواریوں پر یہ نام آکر ہر ایک ناصر اور پسندیدہ دوست پر بولا جانے لگا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے والزبیر ابن عمتی وحواریّ من اُمتی یعنی زبیر میری پھوپی کا بیٹا اور میری امت سے میرا حواری ہے۔ اور زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ الحواریون خلصان الانبیاء و صفوتہم یعنی نبیوں کے خالص اور برگزیدہ دوست حواری کہلاتے ہیں جس کی وجہ بعض نے یہ دی ہے کہ وہ اپنی خلوص نیت اور سیرت کی پاکیزگی کی وجہ سے حواری کہلائے بعض نے کہا ہے اس لیے کہ وہ لوگوں کو گناہوں کی میل سے صاف کرتے تھے۔

بارہ حواریوں کے نام: حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حواری بارہ تھے جن کے نام اناجیل میں حسب ذیل دیئے گئے ہیں:۔ (لوقا۔ ۶-۱۴۔ مرقس ۱۰-۳)

(۱) شمعون جو پطرس کہلاتا ہے (۲) اس کا بھائی اندریاس (۳) زبدی کا بیٹا یعقوب (۴) اس کا بھائی یوحنّا (۵) فلپس (۶) برتلمائی (۷) توما (۸) متی محصول لینے والا (۹) حلفئی کا بیٹا یعقوب (۱۰) تدّی (۱۱) شمعون قنانی (۱۲) یہوداہ اسکریوطی۔ جس نے حضرت مسیح کو پکڑوا بھی دیا۔ ان بارہ کو یہ حکم دیا گیا" انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔" ان کا کام یہ قرار دیا گیا" بیماروں کو اچھا کرنا۔ مُردوں کو جلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا" اور ان کو حکم تھا کہ اپنے پاس کچھ نہ رکھیں"۔ نہ سونا اپنے کمربند میں رکھنا۔ نہ چاندی نہ پیسے راستے کے لیے نہ جھولی لینا نہ دو دو کرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی" (متی ۱۰: ۵-۱۰) ان بارہ کی ایمانی حالت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ایسے سخت الفاظ ہیں کہ یہ تسلیم کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ واقعی ان کی حالت ایسی ہو۔ کہیں ان کو "کم اعتقاد" کہا گیا ہے (متی ۱۶: ۸) کہیں "بے اعتقاد اور کج رو قوم" (متی ۱۷: ۱۷) کہیں ان کو "رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان" سے محروم قرار دیا گیا ہے (متی ۱۷: ۲۰) کہیں پطرس کو جو ان سب کا سردار تھا شیطان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہوداہ اسکریوطی آخر صرف تیس روپے لیکر حضرت مسیح کو پکڑوا دیتا ہے اور بارہ کے گیارہ رہ جاتے ہیں مگر الفاظ کو پورا کرنے کے لیے پیچھے پولوس کو داخل کرکے بارہ کی تعداد پھر بنائی جاتی ہے۔ مگر باقی کی کمزوری کا بھی یہ حال ہے کہ پطرس جس پر مسیح نے کلیسا کی بنیاد رکھی تھی (متی ۱۶: ۱۸) تین دفعہ مسیح کا انکار کرتا ہے اور جب لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ساتھ تھا تو جھوٹ بول کر اپنی جان چھڑاتا ہے کہ میں نہیں تھا (لوقا ۲۲: ۵۷-۶۲) اور باقی حواری حضرت مسیح کی گرفتاری کے وقت بھاگ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ساتھ جو وعدے کیے گئے تھے وہ بڑے عظیم الشان تھے۔

حواریوں کے ساتھ وعدے: چنانچہ پطرس کو کہا "میں آسمان کی بادشاہت کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھیگا وہ آسمان پر بندھے گا اور جو کچھ تو زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر کھلے گا" (متی ۱۶: ۱۹) اور بارہ حواریوں کے لیے یہ وعدہ تھا "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہولیے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کروگے" (متی ۱۹: ۲۸) قرآن کریم نے حواریوں کی ان کمزوریوں کا ذکر نہیں کیا صرف ان کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے یہ ان کی خدمت اور نصرت کی عزت کی ہے۔ یہ قرآن شریف کا احسان عیسائیوں پر تھا کہ ان کے رسول کو چھوڑ کر رسول

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

اے ہمارے رب ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے نازل کیا اور رسول کی پیروی کی پس تو ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ ۴۴۲

ع ۱۴ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

اور (کافروں نے) تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ سب تدبیر کرنیوالوں سے اچھا ہے ۴۴۳

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ

جب اللہ نے کہا، اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں ۴۴۴

کے اصحاب کی بھی خوبیوں کا ذکر کیا کمزوریوں کا نام تک نہیں لیا مگر اس احسان فراموش قوم نے سارا زور اس محسن کی عیب شماری پر لگا دیا اور وہ بھی سب جھوٹ۔

ع۴۴۲ الشاھدین یہاں شاھدین کی تفسیر میں کئی قول ہیں میرے نزدیک زجاج کا قول سب سے بہتر ہے ھم الشاھدون للانبیاء بالتصدیق (ر) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی سچائی پر ایمان لا کر ان کے لیے بمنزلہ گواہوں کے ہو جاتے ہیں یہ معنی اس لیے بھی چسپاں ہیں کہ انبیاء کی قوت قدسی کے یہ لوگ گواہ بن جاتے ہیں کیونکہ وہ عملی رنگ میں پاک ہو کر بمنزلہ گواہوں کے ہو جاتے ہیں۔

ع۴۴۳ مکروا۔ اَلْمَكْرُ اِحتیال فی خُفیۃ (ل) یعنی مکر خفیہ طور پر احتیال کو کہتے ہیں اور احتیال کیا ہے۔ اَلْحَوْلُ والْحَيْلُ والحِول والحِيْلَة .... والاحتیال ...... کل ذٰلك الحذق وجودۃ النظر والقُدرۃ علیٰ دِقّۃِ التصرُّف (ل) یعنی حَوْل۔ حَیل۔ حِوَل۔ حِیلۃ۔ احتیال ان سب الفاظ کے معنی دانائی اور نظر کی ذہانت اور باریک تصرفات پر قدرت رکھنا ہے گویا احتیال یا حیلۃ باریک مضبوط تدبیر کو کہتے ہیں۔ پس مَکر کے معنی ہوئے مخفی طور پر باریک مضبوط تدبیر کرنا۔ اور مفردات راغب میں مَکر کے معنی دیئے ہیں صَرْفُ الغَیْرِ عَمَّا یَقْصِدُہٗ بِحِیْلَۃٍ یعنی کسی غیر کا اس سے جس کا وہ قصد کرتا ہے باریک مضبوط تدبیر سے پھیر دینا اور پھر لکھا ہے کہ مَکر دو طرح پر ہے ایک محمود یعنی قابل تعریف اور وہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اچھا کام کرنے کا ارادہ کیا جائے اور اس کی مثال دی ہے ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔ اور دوسرا مذموم جس کے ساتھ فعل قبیح کا قصد کیا جائے اور اس کی مثال دی ہے واذ یمکربك الذین کفروا پس خیر اور شر دونوں پر مَکر کا استعمال ہوتا ہے اور تفسیر کبیر میں بھی اس پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ مَکر وہ رائے محکم اور مضبوط ہے جو نقص و فتور سے محفوظ ہو پس اس قدر تصریح کے ہوتے ہوئے معترضین اسلام کا اپنے ذہن میں اس مفہوم مکر کو رکھ کر جو زبان اُردو میں اس لفظ نے اختیار کر لیا ہے قرآن کریم پر یہ اعتراض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کا نام مکار ہے کم فہمی یا شرارت کی وجہ سے ہے۔ بسا اوقات ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں آ کر ایک خاص مفہوم کو اختیار کر لیتا ہے۔ پس اگر لفظ مَکر اُردو زبان میں بُرے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ عربی زبان میں یہ لفظ بُرے معنی میں استعمال ہوتا ہے صریح غلطی ہے اور قرآن کریم نے تو ایک جگہ لفظ مکر کے ساتھ خیر کا لفظ لگا کر جیسا واللہ خیر الماکرین اور دوسری جگہ سیئ کا لفظ لگا کر جیسا ولا یحیق المکر السیّئ الا باھلہ (فا طر ۳۵-۴۳) میں یہ بتا دیا ہے کہ اصل لفظ مکر میں بدی کا مفہوم نہیں کیونکہ جو فعل فی نفسہٖ بُرا ہو اس کے ساتھ خیر یا بھلے کا لفظ تو لگ ہی نہیں سکتا اور اس کے ساتھ ذم کا لفظ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی ومکروا میں ضمیر ان لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر ان الفاظ میں ہے فلمّا احسّ عیسٰی منھم الکفر۔ یعنی اعدائے مسیح کی طرف۔

اعدائے مسیح کے جس مکر یا باریک تدبیر کا یہاں ذکر ہے وہ یہ تھی کہ انہوں نے حضرت مسیح کو جھٹلانے پر کفایت نہیں اور نہ صرف انہوں نے یہ کافی سمجھا کہ اس کو مروا دیں۔ بلکہ انہوں نے باریک تدبیر کے ذریعہ اسے احکام وقت سے صلیب پر کھچوانے کی تدبیر کی جیسا کہ دوسری جگہ اس کی طرف اشارہ آتا ہے۔ اور جیسا اناجیل میں مفصل مذکور ہے۔

مسیح کو آسمان پر اٹھانا مخفی تدبیر نہیں کہلا سکتا: ومکر اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے بھی کوئی باریک تدبیر کی۔ یہ باریک تدبیر کیا تھی؟ عام طور پر یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح کو آسمان پر اُٹھا لینا اور آپ کا ہمشکل ایک حواری کو بنا کر اس کو مصلوب کرا دینا یہ خدائی تدبیر تھی۔ لیکن اس پر تین اعتراض پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ایک شخص کو یوں دشمنوں کے تصرف سے نکال لینا کہ اسے آسمان پر اٹھا لیا جائے یہ کوئی باریک مخفی تدبیر نہ ہوئی۔ دوسرا یہ کہ مکر تو اس تدبیر مخفی کو کہا جاتا ہے جو حیات نقص و فتور سے خالی ہو جب ایک حواری مارا گیا اور اسی صلیب کی موت سے مارا گیا تو یہ تدبیر تو سخت ناقص ہے مسیح تو لعنتی موت سے بچے لیکن ان کی جگہ ایک حواری جو انصار اللہ میں سے تھا اسی لعنتی موت میں گرفتار ہوا۔ تیسرا اور سب سے بڑا اعتراض اس پر یہ ہے کہ یہودیوں کی غرض تو پوری ہو گئی کہ مسیح کے کاروبار کا اور تبلیغ کا خاتمہ ہو گیا اور بنی اسرائیل اس کی ہدایت سے محروم رہ گئے۔ پھر یہ کیسی ناقص تدبیر ہوئی۔ واللہ خیر الماکرین کا لفظ اس پر نہیں بولا جا سکتا۔ الٰہی تدبیر جیسا کہ دوسری جگہ دکھایا جائے گا یہ تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ایک نہایت مخفی باریک تدبیر سے موت صلیب سے بچا کر باقی بنی اسرائیل کی طرف بھیج دیا اور اس طرح پر یہود کی کوشش دونوں طرح پر ناکام ہوئی۔ حضرت مسیح اپنی نبوت کا کام بھی کرتے رہے اور باریک رنگ میں صلیب کی موت سے بھی بچا دیئے گئے۔

ع۴۴۴ متوفیك۔ توفاہ اللہ اذا قبض نفسہ (ل) قبض روحہ (ت) یعنی محاورہ توفاہ اللہ کے معنی قبض نفس یا قبض روح ہیں توفاہ اللہ کے کوئی معنی سوائے قبض نفس یا روح کے کسی لغت میں نہیں آئے چونکہ یہاں زیر بحث خالی لفظ توفی نہیں بلکہ متوفیك زیر بحث ہے جس میں اللہ تعالیٰ فاعل اور حضرت عیسیٰ بطور مخاطب مفعول ہیں اس لیے متوفیك پر صرف توفاہ اللہ کے معنی سے ہی سند لائی جا سکتی ہے۔ اور تمام اہل لغت نے توفاہ اللہ کے محاورہ کو تسلیم کر کے الگ لکھا اور اس کے خاص معنے قبض روح یا قبض نفس دیئے ہیں اور یہ معنی نہ صرف لغت سے ثابت ہیں بلکہ خود قرآن کریم نے بھی صراحت فرمائی ہے اللہ یتوفی الانفس

رَافِعُكَ اِلَيَّ اور تجھے اپنی طرف

حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا (الزمر ۳۹-۴۲) اللہ کا نفوس کا توفی کرنا یا موت کے وقت ہوتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند میں بھی توفی نفس کرتا ہے تیسری کوئی صورت نہیں پس متوفیك کے معنی سوائے تیری قبض روح کرنے والا کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ یہاں مراد نیند میں قبض نفس ہے یا موت کے وقت۔ سو اس پر آگے بحث ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ توفی وفی سے ہے جس کے معنی پورا کرنا ہیں۔ مگر خاص ابواب میں یا خاص محاورات میں جاکر جو معنی ایک لفظ اختیار کرتا ہے ان کا مدار قیاس پر نہیں بلکہ سماع پر ہے۔ اگر لغت کا مدار بجائے سماع کے قیاس پر رکھا جائے تو آج سب الفاظ کے معانی سے امن اُٹھ جاتا ہے۔ پس وفی نے جو معنی باب تفعل میں اور اس باب کے اس خاص محاورہ توفاہ اللہ میں آکر اختیار کر لیے ہیں ان پر سماع کی شہادت سوائے قبض روح کے چونکہ اور کچھ نہیں اس لیے قیاس سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ وفی کے معنی پورا کرنا ہے اس لیے توفاہ اللہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے اسے مع جسم لے لیا توفاہ اللہ میں صرف نفس یا روح کا لینا اہل لغت کا فیصلہ ہے اور اشعار جاہلیت کی قرآن کریم کی حدیث کی علم ادب کی ایک بھی مثال اس کے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔

اور توفاہ اللہ صرف انسانوں پر بولا جاتا ہے نہ دوسرے حیوانات پر اور صرف نیند پر یا موت پر ہی بول سکیں گے اور جس طرح مجنون پر باوجود اس کی قوت عاقلہ ممیزہ کے جاتے رہنے کے توفاہ اللہ کا استعمال جائز نہیں حالانکہ نیند پر توفی کے استعمال کی یہی وجہ بیان کی گئی ہے کہ قوت ممیزہ عاقلہ جاتی رہتی ہے اسی طرح پر اگر یہ ممکن ہے کہ ایک شخص مع جسد عنصری آسمان پر چلا جائے تو اس پر بروئے لغت عرب توفاہ اللہ کا محاورہ بولنا جائز نہیں اس کے لیے کوئی اور لفظ چاہیئے اور لغت اور قرآن کریم کی اس شہادت کے مطابق ہی امام المفسرین حضرت ابن عباس سے متوفیك کے معنی خود بخاری میں ممیتك مروی ہیں یعنی تجھے موت دینے والا ہوں۔

متوفیك پر مفسرین کے خیالات: چونکہ یہ معنی اس عقیدہ کے خلاف تھے جو عیسائیوں میں مروج ہونے کی وجہ سے غلطی سے مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ ہیں۔ اور دوسری طرف اس کو نزول ابن مریم کی پیشگوئی کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے قوت مل گئی اس لیے ان معنوں کی کسی نے تو یوں توجیہ کر دی کہ موت کے بعد پھر زندہ کر دیا جو احیائے موتٰی کے اصول کے خلاف ہے جس کا ذکر ۲۳۴ میں ہو چکا اور بعض نے کہا تقدیم و تاخیر ہے اور یہ بات حضرت ابن عباس کی طرف بعض روایات میں منسوب کر دی گئی ہے۔ حالانکہ امام بخاری نے ابن عباس سے متوفیك کے معنی ممیتك روایت کرتے ہوئے تقدیم و تاخیر کو قبول نہیں کیا اور اسی لیے روایت کے اس حصہ کو غلط سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ پس قرآن و حدیث لغت اور امام المفسرین کی شہادت سب اس بات پر ہے کہ یہاں متوفیك کے معنی موت دینے والا ہیں اور جن لوگوں نے متوفیك کے معنی مستوفی شخصك من الارض کیے ہیں یعنی تیرے وجود کو زمین سے پورا لینے والا ہوں یا اٰخذك وافیا بروحك کیے ہیں تجھے تیری روح کے ساتھ پورا لینے والا ہوں یا موت توائے شہوانیہ مراد لیے ہیں انہوں نے لغت میں قیاس کو دخل دے کر خود معنی بنا لیے ہیں جن پر کوئی شہادت لغت کی قطعاً نہیں۔ اسی لیے محتاط مفسرین کو باوجود اس خیال کے بھی اسی طرف جانا پڑا کہ متوفیك کے معنی موت دینے والا ہوں ہی ہیں۔ ہاں انہوں نے اپنے خیال کے قائم رکھنے کو یہ بات بڑھا دی کہ کچھ وقت وفات پا کر پھر حضرت عیسٰی زندہ ہو گئے تھے۔ جیسا کہ ابن جریر نے وہب سے یہ روایت کی ہے قال توفی اللہ عیسٰی ثلاث ساعات من النھار یعنی انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی کو تین گھڑی دن کی مردہ رکھا اور حاکم نے ان ہی سے روایت کی ہے ان اللہ توفی عیسٰی سبع ساعات ثم احیاہ کہ اللہ تعالیٰ نے عیسٰی کو سات گھڑی مُردہ رکھا پھر زندہ کیا اور بعض نے کہا یہاں متوفیك سے مراد ہے تجھے سلانے والا ہوں اور پھر اس کی وجہ یہ بتائی ان اللہ تعالیٰ رفع عیسٰی الی السماء وھو نائم رفقابہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی سے نرم معاملہ کرنے کے لیے ان کو آسمان پر نیند کی حالت میں اٹھایا۔ پھر اتارتے وقت ایک اور توفی وارد کرنی ہوگی اس کا بھی کہیں ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر قرآن شریف نے ایسا ذکر نہیں کیا نہ کسی حدیث میں ہے اور بعض نے کہہ دیا کہ یہاں ترتیب مراد نہیں یعنی توفی پہلے نہیں بلکہ رفع کے بعد ہے مگر یہاں چار باتیں ہیں: توفی، رفع، تطہیر، فوقیت متبعین۔ متوفیك کو اگر اپنی جگہ سے اُٹھایا جائے تو پھر اس کے لیے کوئی بھی موزوں جگہ نہیں رفع کے بعد تطہیر سے پہلے اسے نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ تطہیر تو ہو چکی اور توفی قائلین حیات کے نزدیک ابھی ہوئی نہیں۔ تطہیر کے بعد اور فوقیت سے پہلے بھی اسے نہیں رکھا جا سکتا۔ کیونکہ فوقیت بھی ہو چکی اور فوقیت کے بعد بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کا زمانہ قیامت تک ممتد ہے۔ تو اس صورت میں وفات گویا بعد قیامت ہوئی جو بالبداہت باطل ہے۔ پس حق یہی ہے کہ جو ترتیب قرآن کریم نے رکھی ہے وہی درست ہے پہلے توفی ہے پھر رفع پھر تطہیر پھر فوقیت۔

حضرت مسیح کی وفات کے نام پر بعض لوگ باوجود اس تصریح کے جو قرآن شریف میں موجود ہے بہت گھبراتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہ کوئی نیا عقیدہ ہے جو اسلام میں داخل کیا جا رہا ہے اور سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف اور احادیث میں حضرت عیسٰی کے زندہ بر آسمان ہونے کا ذکر ہے۔ حالانکہ نہ صرف قرآن شریف وحدیث میں حیات مسیح کا مطلق کوئی ذکر نہیں بلکہ دونوں جگہ آپ کی وفات کا ذکر ہے۔ اور حیات مسیح پر جو اجماع اُمت سمجھا جاتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ چار ائمہ میں سے ایک امام مالک کھلے طور پر وفات مسیح کے قائل ہیں۔ چنانچہ یہ ان کا عقیدہ عتبیہ اور مجمع البحار میں صاف الفاظ میں لکھا ہوا موجود ہے۔ قال مالك مات۔ اور باقی تین اماموں میں سے صراحت سے کوئی حیات مسیح کا قائل نہیں۔ پس اصل عقیدہ اہل سنت والجماعت کا وفات مسیح ہے نہ حیات مسیح۔ پھر یہ بھی غور نہیں کیا جاتا کہ اس وقت عیسائی کس قدر مسلمانوں کے اس شہرت یافتہ خیال سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر ہیں فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ناواقف مسلمانوں کو یہ کہہ کر گمراہ کر رہے ہیں کہ تمام رسول بروئے قرآن کھانے کے محتاج تھے مگر مسیح علیہ السلام کا جسم ایسا ہے کہ وہ دو ہزار سال سے زندہ آسمان پر موجود ہیں۔ مگر اس طرح کھانے پینے کے محتاج نہیں جس طرح تمام بشر حتّٰی کہ رسول بھی اس جسم عنصری کی زندگی میں ہوتے ہیں اور اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ اس صورت میں مسیح الاٰن کما کان کے مصداق ہوئے ان کے جسم خاکی میں کوئی تغیر نہیں آتا اور یہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی صفت لازم ہے۔ اس لیے مسیح بشر سے

وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا — بلند کرنے والا ہوں[۴۲۵] اور تجھے ان (کے الزام) سے پاک کرنیوالا

زالا اور خالق کی صفات میں شریک ہے۔ اس طرح پر مسیح کی خدائی کو جس کے لیے ایک بھی دلیل کسی عیسائی کے ہاتھ میں نہیں، ثابت کرنے کیلئے مسلمانوں کا حیات مسیح کا عقیدہ کافی ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات ہیں جن سے حضرت مسیح کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے مگر ان پر اپنے اپنے موقعہ پر بحث آئیگی۔ آیت زیر بحث اکیلی بھی اس کو ثابت کر رہی ہے۔ کیونکہ اگر متوفیك کا وعدہ پورا نہیں ہوا تو باقی وعدے جو اس کے بعد آتے ہیں وہ بھی پورے نہیں ہوئے اور یہ بالبداہت باطل ہے اور یہ درحقیقت پچھلے رکوع کی آخری آیت کا جواب بھی ہے کہ دشمن تو تم کو صلیب کی موت مارنا چاہتے ہیں جو لعنتی موت ہے میں باریک تدبیر سے تمہیں بچاؤں گا اور طبعی موت ماروں گا۔ احادیث میں جہاں کوئی حدیث مرفوع حضرت مسیح کے زندہ ہونے پر یا آسمان پر مع جسد عنصری اُٹھائے جانے پر نہیں ہے، بہت سی احادیث سے حضرت مسیح کی وفات ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً مشہور حدیث معراج جس میں آپ نے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحیٰی کو ایک ہی جگہ پر دیکھا۔ حالانکہ اگر حضرت عیسیٰ زندہ تھے تو وفات یافتہ انبیا میں ان کا کیا کام تھا۔ پھر وہ حدیث جس میں صاف یہ لفظ آتے ہیں لو کان موسیٰ وعیسیٰ حیین لما وسعهما الا اتباعی اگر موسیٰ وعیسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں میرا اتباع کرنا پڑتا۔ اور وہ حدیث جس میں ہے ان عیسیٰ عاش عشرین ومائة سنة عیسیٰ ایک سو بیس[۱۲۰] برس زندہ رہے اور یہ وہ بات ہے جو نبی کریم صلعم فرماتے ہیں جبرائیل نے مجھے بتائی۔ پس وفات مسیح کا عقیدہ نہ صرف قرآن وحدیث سے ثابت ہے بلکہ آئمہ اہل سنت والجماعت کے چار ائمہ میں سے ایک امام کا کھلا مذہب ہے اور باقی تین خاموش ہیں اور آج وفات مسیح کو مان کر مسلمان عیسائی مذہب کی قوت کو ایسا توڑ سکتے ہیں کہ پھر یہ سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔

ع۴۲۵ رافعك الی۔ رفع کے چہار گونہ استعمال پر دیکھو ع۹۳ اور انسان کے رفع سے مراد بلندی درجات ہونے پر دیکھو ع۳۲۵ لسان العرب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الرافع ہے جس سے مراد ہے وہ جو مومن کو سعید بنا کر اور اپنے اولیاء کو قرب عطا کر کے رفع فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں اس لفظ کا آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے انسانوں کو رفع کرنے کا ذکر ہو۔ وہاں مراد بلندی درجات اور قرب کا عطا کرنا ہوتا ہے نہ ایک نیچی جگہ سے اٹھا کر کسی بلند جگہ پر ان کو رکھ دینا۔ پس امام راغب نے جو چار معنی رفع کے دیئے ہیں ان میں سے چوتھے معنی یعنی مرتبہ کی بلندی یہاں صادق آئیں گے کیونکہ یہ انسان کا رفع ہے جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور یہ رفع اس کے اسم الرافع کے تحت ہی ہوگا رفع کے یہ معنی عام طور پر زبان عرب میں مروج ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں نساء مرفوعات جس کے معنی لسان العرب میں دیئے ہیں نساء مکرمات یعنی معزز عورتیں۔ اور فرش مرفوعة قرآن کریم میں آتا ہے (الواقعة[۵۶]-۳۴) اس کے معنی دیئے ہیں ای مُقَرَّبَةٌ لهم یعنی جوان کے قریب کیے جائیں گے۔ ایسا ہی قیامت کے متعلق قرآن شریف میں آتا ہے حافضة رافعة (الواقعة[۵۶]-۳) جس کے معنی زجاج نے یوں کیے ہیں کہ گنہگاروں کو ذلیل کرے گی اور فرمانبرداروں کا رفع کرے گی یعنی ان کے مراتب بلند کرے گی۔ اور فی بیوت اذن الله ان ترفع (النور[۲۴]-۳۶) میں ترفع کے معنی لکھے ہیں تعظم (ل) ان کو عظمت دی جائے۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کے انسانوں کو رفع کرنے کا ذکر آتا ہے وہاں رفع کے معنی صرف قرب ہیں نہ جسم کا بلند کرنا۔ ولو شئنا لرفعنٰه بها (الاعراف[۷]-۱۷۶) جہاں تفاسیر میں بھی رفع الی منازل الابرار (ض) یا الی منازل العلماء الی الجنة (ف) وغیرہ لکھا ہے۔ یعنی نیکوں یا علماء کے مقام کی طرف یا جنت کی طرف اور اسی آیت کے نیچے ابن جریر لکھتے ہیں والرفع یعم معانی کثیرة منها الرفع فی المنزلة عنده ومنها الرفع فی شرف الدنیا ومکارمها ومنها الرفع فی الذکر الجمیل والثناء الرفیع۔ یعنی "رفع بہت سے معنوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ کے حضور بلندی مرتبہ ہے ان میں سے دنیا میں عزت اور مکرمت کا مقام ہے اور ان میں سے اچھے ذکر اور ثنائے بلند میں رفع ہے"۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا انسان کو رفع کرنا صرف ایک ہی معنی یعنی بلندی درجات میں آتا ہے اور کبھی کسی دوسرے معنی میں نہیں آیا۔

احادیث رفع کے معنی کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہے۔ سب سے زیادہ قابل غور وہ دعا ہے جو بین السجدتین کی جاتی ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں وارفعنی اے خدا مجھے رفع دے کیا آج تک کسی مسلمان کے وہم میں یہ گزرا ہے کہ اس دعا کا منشاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جسم سمیت آسمان پر اُٹھا لے۔ بلکہ اگر اللہ کے انسان کو رفع کرنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں تو یہ دعا تو آج تک کسی مسلمان کی قبول نہ ہوئی۔ کیونکہ کوئی مع جسم آسمان پر نہ گیا۔ ترمذی میں ایک حدیث میں ہے:۔ یرید الناس ان یضعوهم ویابی الله الا ان یرفعهم لوگ چاہتے ہیں کہ ان کو ذلیل کریں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے رفع کے سوائے اور کچھ نہیں چاہتا۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مع جسم آسمان پر اٹھالے جانا چاہتا ہے پھر احادیث تواضع میں بار بار آتا ہے کہ جو تواضع کرے اللہ تعالیٰ اس کا رفع کرتا ہے تواضعوا یرفعکم الله اور ایک حدیث میں آتا ہے فاذا تواضع رفعه الله بالسلسلة الی السماء السابعة (کنزل العمال جلد ۲ ص۲۶) جب بندہ تواضع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے زنجیر کے ساتھ ساتویں آسمان پر رفع کرتا ہے۔ یہاں رفع بھی ہے ساتواں آسمان بھی ہے زنجیر بھی ہے مگر پھر بھی رفع جسم مراد نہیں بلکہ قرب مراد ہے۔ پس لغت قرآن شریف۔ حدیث سب اسبات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے انسان کو رفع کرنے سے ہمیشہ اور ہر حال میں مراد قرب عطا کرنا ہوتا ہے خواہ کتنے بھی قرائن اس کے خلاف ہوں اور ایک بھی نظیر نہیں جہاں اللہ کے انسان کو رفع کرنے کے معنی سوائے اس کے کچھ اور آتے ہوں۔

خدا کی طرف جانا یا رفع سے مراد: اسی معنی پر ایک قرینہ رافعك الی میں لفظ الیّ بھی ہے۔ کیونکہ یہ رفع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے آسمان کی طرف رفع کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کوئی جسم نہیں جو آسمان پر ہو اور اس پر اتفاق ہے کہ اللہ کا مکان میں ہونا ممتنع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں اللہ کی طرف یا رب کی طرف جانے کا ذکر ہو کبھی بھی مراد انتقال جسمانی نہیں ہوتا بلکہ قرب روحانی مراد ہوتا ہے جیسے ارجعی الی ربك۔ انا الیه راجعون۔ انی ذاهب الی ربی۔ اتخذ الی ربه سبیلا۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں صفائی سے لکھ دیا ہے رفعه فی قوله ورافعك الی هو الرفعة بالدرجة والمنقبة لا بالمکان و

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ — ہوں جو کافر ہیں[۴۴۶] اور جنھوں نے تیری پیروی کی انھیں ان پر جنھوں نے انکار کیا قیامت

كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ — کے دن تک فوقیت دینے والا ہوں[۴۴۷] پھر میری ہی طرف تمھارا لوٹ آنا ہے پس

الجهة یعنی رافعك الیّ میں رفع سے مراد درجہ اور مرتبہ میں بلندی ہے نہ مکان اور جہت کی بلندی۔

۴۴۶ حضرت عیسیٰ کی تطہیر: مطهرك من الذین کفروا۔ طہارت دو طرح پر ہے ایک طہارت جسم اور دوسرا طہارت نفس۔ طہارت جسمانی تو یہاں مراد ہی نہیں ہو سکتی۔ طہارت نفس کے معنی عموماً مفسرین نے لیے ہیں اور معنی یوں کیے ہیں۔ مُخْرِجُكَ من جُمْلَتِهِم و مُنَزِّهُكَ اَنْ تَفْعَلَ فِعْلَهُمْ (غ) یعنی ان کی یعنی کافروں کی جماعت سے باہر نکالنے والا اور تمھاری تنزیہ کرنے والا اس امر سے کہ تم ان کے افعال کرو مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی یہاں نہیں لگتے اس لیے کہ کافروں کے فعل کرنے سے پاک کرنا تو نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے نہ نبی بنایا جانے کے بعد کا بلکہ نبی تو فطرتاً ہی گناہ سے پاک کیا جاتا ہے پھر ایسا وعدہ دینے کی ضرورت کیا تھی اور بعض نے کہا تطهیره علیه السلام بتبعیده منهم بالرفع (ر) یعنی رفع کر کے ان سے دور کر دینا ہی تطہیر تھی مگر یہ بھی تحصیل حاصل ہے اس تبعید کا ذکر تو رافعك میں آ چکا دوبارہ اس کے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ مطهرك من الذین کفروا میں درحقیقت ایک اور قسم کی تطہیر مراد ہے۔ انبیاء ویسے تو مطہر ہی ہوتے ہیں۔ مگر لوگ ان پر جھوٹے الزامات لگا کر ان کو نعوذ باللہ ناپاک مشہور کرتے ہیں۔ ان جھوٹے الزامات کی قرار واقعی تردید بھی درحقیقت ایک تطہیر ہے۔ اور یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح ہمارے نبی کریم صلعم کے متعلق فرمایا لیغفر لك الله ماتقدم من ذنبك وما تاخر جہاں مراد وہ ذنوب ہیں جو دوسرے لوگ آپ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ پس انبیاء کی تطہیر اور غفر تو پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے آئندہ جس تطہیر اور غفر کا وعدہ ہوتا ہے وہ ان امور سے تطہیر اور غفر ہے جو دشمن ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

۴۴۷ اتبعوك۔ تَبِعَ اور اِتَّبَعَ کے معنی ہیں اس کے نقش قدم پر چلا (غ) حقیقی معنی تو یہی ہیں۔ مگر چونکہ ہر ایک متبع کامل طور پر نقش قدم پر چلنے والا نہیں ہو سکتا، اس لیے الذین اتبعوك میں وہ لوگ بھی داخل ہو سکتے ہیں جو صرف نقش قدم پر چلنے کا دعویٰ کرتے ہوں جن مفسرین نے اس سے مراد مسلمانوں کو لیا ہے سخت غلطی کھائی ہے اس سے مراد صرف عیسائی ہیں اور مسلمان حضرت عیسیٰ کے متبع نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلعم کے متبع ہیں ابھی حدیث نقل ہو چکی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر موسیٰ اور عیسیٰ زندہ ہوتے تو وہ میرے متبع ہوتے۔ پس مسلمان حضرت عیسیٰ کے متبع نہیں اور اسی کی طرف قرآن کریم نے خود بھی رہنمائی فرمائی ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ صاف فرمایا: فآمنت طائفة من بنی اسرائیل وکفرت طائفة فایدنا الذین آمنوا علٰی عدوهم فاصبحوا ظاهرین (الصف۔ ۱۴)

فوق کا استعمال بلحاظ مکان اور زمانہ اور جسم اور عدد اور مرتبہ کے ہوتا ہے۔ یہاں مفسرین کو بالاتفاق تسلیم کرنا پڑا ہے کہ فوقیت مکانی مراد نہیں اور یہاں فوقیت سے غلبہ بلحاظ دلائل مراد لیا ہے یا ظاہری غلبہ یعنی حاکم و محکوم کا۔ یعلونهم بالحجة او السیف (ر)

الذین کفروا سے مراد کل غیر عیسائی یا غیر مسلم نہیں بلکہ صرف وہ لوگ جو بالخصوص حضرت مسیح کا کفر کریں اور اس لیے ان الفاظ میں صرف یہود کا ذکر مقصود ہے کہ وہ کل انبیائے بنی اسرائیل کو مانتے چلے آئے مگر حضرت عیسیٰ کا انکار کر دیا۔

یہاں حضرت مسیح کو کل چار وعدے دیئے گئے ہیں۔ جو بجواب تدابیر کفار ہیں جن کا ذکر پچھلی آیت میں الفاظ مکروا میں صاف طور پر فرمایا ہے۔ ان چار وعدوں میں سے پہلا وعدہ ہے کہ تمہیں طبعی موت سے وفات دوں گا۔ دوسرا وعدہ ہے کہ تمہارا اپنی طرف رفع کروں گا یعنی اپنا قرب عطا فرماؤں گا تیسرا وعدہ ہے کہ ان الزامات سے جو تم پر لگائے جائیں گے تم کو پاک و صاف کروں گا اور چوتھا وعدہ ہے فوقیت یعنی حضرت مسیح کے نام لیوا آپ کے منکروں پر بذریعہ دلائل یا قہری طور پر غالب رہیں گے۔ قرآن کریم کا لفظ لفظ اپنے اندر اعجاز رکھتا ہے۔ یہودیوں کی تدبیر کا ذکر تھا۔ وہ تدبیر کیا تھی؟ حضرت عیسیٰ کو بذریعہ صلیب مارنا۔ تو اول تو بذریعہ صلیب مارنے کی نفی کی اور اس کا جواب دیا متوفیك: بذریعہ صلیب تمہیں نہیں مار سکیں گے بلکہ تم اپنی طبعی موت سے مرو گے۔ پھر صلیب پر مارنے کا نتیجہ تھا کہ ایسا شخص ملعون ہو۔ کیونکہ استثناء ۲۱: ۲۲ و ۲۳ میں صلیب کا ذکر کر کے لکھا ہے "کیونکہ وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے خدا کا ملعون ہے"۔ اور گلیتیوں ۳: ۱۳ میں پولوس کہتا ہے "کیونکہ لکھا ہے جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے"۔ اور ملعون کے معنی ہیں خدا سے دور۔ اس لیے اس نتیجہ کی نفی کی کہ وہ خدا سے دور نہیں بلکہ مرفوع یعنی خدا کا مقرب ہوگا پھر صلیب پر مار کر اور کذاب مشہور کر کے غلط الزامات کا آپ پر لگانا تھا جیسے مثلاً یہ کہ آپ ناجائز تعلق سے پیدا ہوئے جیسا کہ تولهم علٰی مریم بهتانا عظیما سے ظاہر ہے اس کی نفی مطهرك من الذین کفروا میں کی یعنی فرمایا کہ تم پر سے یہ الزامات بھی دور کر دوں گا۔ یا یہ کہ تم پر سے ملعون ہونے کے الزام کو بھی دور کروں گا جو دوسرا نتیجہ صلیب کا ہے اور پھر وہ مصلوب کر کے تم کو ناکام کرنا چاہتے ہیں سو میں تمہارے پیروؤں کو تمہارے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔

اور چاروں وعدوں میں ایک اور بھی لطیف ترتیب ہے۔ رفع یعنی حقیقی قرب کا مقام بعد وفات ہی حاصل ہوتا ہے جب سارے حجاب دور ہو جاتے ہیں پس توفی کے بعد رفع فرمایا تو جب مقام قرب عطا ہوتا ہے تو دوسری طرف مخلوق میں بھی محبت اور عزت بڑھتی ہے یہی آپ کی تطہیر یعنی الزامات سے پاک کیا جانا ہے اور عزت اور محبت کے بعد متبعین کی کثرت اور غلبہ کا ہونا لازمی امر ہے۔ اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خیال کہ کبھی حضرت عیسیٰ پھر آئیں گے تو سارے اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے قرآن کریم کے خلاف ہے اس لیے کہ قرآن شریف قیامت تک مسیح کے پیروؤں اور مسیح کے منکروں کا وجود ضروری قرار دیتا ہے۔

فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

میں تمہارے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے ۴۴۸

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

سو وہ جنھوں نے انکار کیا میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت دکھ کا عذاب دوں گا، اور ان کے لیے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا ۴۴۹

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے سو ان کے اجر اُن کو پورے دے گا اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا ۴۵۰

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

یہ ہم آیتوں اور حکمت والے ذکر سے تجھ پر پڑھتے ہیں ۴۵۱

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ

بیشک عیسیٰؑ کی حالت اللہ کے نزدیک آدم کی حالت کی مانند ہے اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اسے کہا ہو جا، پس وہ

ع۴۴۸ ان الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ اختلاف عقائد کا فیصلہ قیامت کے دن ہی ہوگا۔ یعنی دنیا میں اختلاف عقائد کا فیصلہ کبھی نہیں ہوتا اور اختلاف عقائد قیامت تک رہے گا۔ اس سے بھی ان لوگوں کا خیال باطل ثابت ہوتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسےٰ پھر آئیں گے تو اختلاف عقائد دنیا سے مٹ جائے گا اور اس دنیا میں ہی سب فیصلے ہو جائیں گے۔

ع۴۴۹ مسیح کے منکروں کیلئے عذاب دنیا۔ جس اختلاف پر فیصلہ کا ذکر پچھلی آیت میں کیا تھا اب اس کی تفصیل فرماتا ہے کہ اختلاف کرنے والوں میں سے ایک گروہ تو حضرت عیسےٰ کے منکروں کا ہے ان کو دونوں جگہ سزا ملے گی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سو یہود کی دنیا کی سزا اظہر من الشمس ہے۔ یہ قوم باوجود مالدار ہونے کے ہمیشہ دنیا میں ذلیل رہی ہے اور جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کوئی ان کا یار و مددگار نہیں بنتا۔ ذلت سے بڑھ کر کوئی دکھ کا عذاب نہیں۔

ع۴۵۰ الظالمین۔ ظلم کے معنی کے لیے دیکھو ع۵۵ جہاں دکھایا گیا ہے کہ شرک بھی ایک ظلم ہے اور قرآن کریم میں ہے ان الشرك لظلم عظیم (لقمٰن ۳۱ - ۱۳) سب سے بڑا ظلم شرک ہے اور وہی یہاں مراد ہے اس لیے کہ یہ مسیح کو خدا بنانے والوں کا ذکر ہے۔

عیسائیوں کے دو گروہ: یہ ماننے والوں کا گروہ ہے جس کے یہاں دو حصے کر دیئے ہیں ایک حصہ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات والوں کا ہے یعنی وہ جو عقیدہ بھی صحیح رکھتے تھے اور عمل بھی اچھے کرتے تھے اور دوسرا حصہ الظالمین کا ہے جس سے مراد حضرت عیسیٰؑ کو خدا ماننے والے ہیں اور لا یحب الظالمین میں اسی رہ اشارہ ہے کیونکہ وہ خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ وہ مشرک ہیں ان کا دعویٰ محبت جھوٹا ہے خدا ان سے محبت نہیں کرتا۔ اس لیے بھی پہلے گروہ کے ساتھ جو حضرت مسیح کے صحیح معنی میں متبع تھے عملوا الصالحات کی شرط لگا دی ہے کہ یہ دوسرا گروہ کفارہ کو اصل بنیاد قرار دے کر اعمال صالحہ سے محروم ہو گیا ہے۔

ع۴۵۱ الاٰیات سے مراد یہاں حجج یا دلائل ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں جن کی طرف لفظ ذٰلك میں اشارہ بھی کیا ہے کیونکہ اٰیة کا استعمال محسوسات اور معقولات دونوں میں ہوتا ہے۔

الذکر۔ اصل میں یاد کرنے یا یاد دلانے کو کہا جاتا ہے اور یہاں ذکر سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ ذکر قرآن شریف کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور ذکر اس کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ان تمام باتوں کو جو فطرتِ انسانی میں مرکوز ہیں یاد دلاتا ہے۔ یا اس لیے کہ وہ انسان کو شرف اور بزرگی کے مقام پر پہنچاتا ہے۔

الحکیم۔ یہاں ذکر یا قرآن شریف کی صفت ہے اور یہ لفظ قرآن شریف کی دو صفتیں ہیں اور جگہ بھی آیا ہے یٰس والقراٰن الحکیم (یٰس ۳۶ - ۱) قرآن کریم کو حکیم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کی حکمت کی باتیں ہیں (غ) جس پر قرآن کریم بھی شاہد ہے۔ ولقد جاءھم من الانبآء ما فیه مزدجر حکمة بالغة (القمر ۵۴ - ۴، ۵)

حضرت مسیح کے حالات ان کی اُلوہیت کے خلاف دلیل ہیں: یہاں بالخصوص آیات یعنی دلائل کا لفظ لانا اور پھر ان باتوں کو پُر حکمت قرار دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ اوپر حضرت عیسیٰ کے متعلق کہا گیا ہے وہ دعویٰ نہیں بلکہ دلائل ہیں اور پُر حکمت باتیں ہیں۔ ان کی پیدائش، اُن کا بچپن، ان کی وفات کے حالات، ان کی تعلیم، ان کے نشانات یہ سب کچھ دلائل ہیں جو عیسائیت کے بطلان پر دی گئی ہیں جو لوگ ان باتوں کو محض قصوں کہانیوں کی حد تک سمجھتے ہیں وہ یہاں لفظ

فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾

ہو جاتا ہے۔[۴۵۲]

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾
فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ
مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا
وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا
وَاَنْفُسَكُمْ ۟ وقف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ
اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾

حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس تو جھگڑا کرنے والوں میں سے نہ ہو۔
پھر اگر کوئی اس کے بعد جو تیرے پاس علم آ چکا، اس کے بارے میں
تجھ سے جھگڑا کرے تو کہہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمھارے
بیٹوں کو اور اپنی عورتوں اور تمھاری عورتوں کو اور اپنے لوگوں
اور تمھارے لوگوں کو بلائیں پھر گڑگڑا کر دعا کریں اور جھوٹوں پر
اللہ کی لعنت کریں۔[۴۵۳]

حکیم کے لانے پر غور کریں۔

۴۵۲ مثل کے معنی کے لیے دیکھو ۳۸۔ یہاں مراد صفت یا حالت ہے اور فرمایا کہ عیسیٰ کی حالت اللہ کے نزدیک آدم کی حالت کی طرح ہے۔ اسے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اسے کہا ہو، سو وہ ہو گیا۔ آدم کا ذکر قرآن کریم میں دو رنگ میں آیا ہے۔ ابو البشر ہونے کے لحاظ سے یعنی بشریت کے لوازمات تامہ اس میں پائے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہونے کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ اوپر ذکر ہوا۔ اس میں بھی انہی دو باتوں کا ذکر ہے یعنی حضرت عیسیٰ میں بشر ہونے کی ساری صفات پائی جاتی ہیں اور دوسرے وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہیں۔ چنانچہ بشریت کے لحاظ سے آپ کی پیدائش، طفولیت، کہولت، وفات کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ یہی باتیں بشر کو خدا سے الگ کرتی ہیں۔ بشریت کے تقاضوں میں سے ہی پیدا ہونا اور مرنا اور اس دنیا کی زندگی میں ان تغیرات کے ماتحت آنا ہے جو طفولیت سے لیکر کہولت تک انسان پر آتے ہیں۔ خدا نہ پیدا ہوتا ہے نہ مرتا ہے نہ اس پر تغیرات آتے ہیں کہ بچپن کی حالت سے ترقی کرتا کرتا ترقی کے آخری مرتبہ پر پہنچ کر پھر اس کے قویٰ میں تنزل واقع ہونا شروع ہو اور برگزیدگی کے لحاظ سے آپ کے رسول ہونے اور دنیا میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنے اور رفعت مرتبہ وغیرہ کا ذکر ہے پس جو کمال آدم میں اللہ تعالیٰ نے رکھا تھا۔ وہ کمال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی دیا اور اس طرح عیسائیوں پر اتمام حجت کی اور اس اتمام حجت کا خلاصہ اس آیت میں ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ اس سورت کے صدر میں عیسائیوں کے ساتھ ہی بحث ہے اور غرض اس سارے بیان کی حضرت مسیح میں لوازمات بشریت کا ثابت کرنا اور یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ خدا نہ تھا۔ پس ساری بحث کو اب بطور خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ جو کچھ باتیں آدم میں پائی جاتی ہیں یعنی بشریت اور برگزیدگی وہی عیسیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ خدا تم اس کو کس بنا پر بناتے ہو۔ مماثلت کے لیے تو یہی دو امر کافی ہیں بشریت اور برگزیدگی اور اگر یہ کہا جائے کہ صورت پیدائش میں مشابہت ہے تو کوئی مشابہت فی الواقع نہیں آدم کو جس طرح بنایا مسیح کو اس طرح نہیں بنایا۔ مسیح کو ماں کے پیٹ میں رکھا۔ پھر بچہ بنایا۔ پھر بڑھایا۔ آدم کی خلق کے متعلق جو کچھ صورت سمجھی جاتی ہے اس کی رو سے آدم پر یہ حالات نہیں گزرے پس مشابہت صورت خلق میں نہیں نہ صورت خلق کا یہاں ذکر ہے بلکہ بشریت اور برگزیدگی میں مشابہت ہے اس لیے ان اللہ اصطفٰی آدم بطور تمہید بھی اس سے پہلے بیان کیا ہے۔ کن فیکون کا استعمال بھی یہی بتاتا ہے یعنی ہو جاتا ہے کہا گیا نہ ہو گیا۔ جس میں استمرار پایا جاتا ہے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون رہا ہے کہ وہ انسانوں کو برگزیدگی کے مقام پر کھڑا کرتا رہا ہے۔

خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون۔ میں بھی انہی دو مذکورہ بالا باتوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے یعنی خلقه من تراب یا مٹی سے پیدا کرنے میں بشریت کی طرف اشارہ ہے اور کن فیکون میں برگزیدہ کیا جانے کی طرف کیونکہ خلق کے بعد کن کا امر یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ اس کو ایک دوسری زندگی عطا فرمائی یعنی روحانی زندگی یا اپنا کلام اس میں نفخ کیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مٹی سے پیدا کیا جانا کوئی آدم اور عیسٰے علیہ السلام کے ساتھ مخصوص امر نہیں۔ بلکہ ہر فرد بشر کو اللہ تعالیٰ مٹی سے ہی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ کہف میں مومن اور کافر کے مکالمہ میں مومن کافر کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ اکفرت بالذی خلقك من تراب ثم من نطفة ثم سوٰىك رجلا (الکھف ۱۸: ۳۷) تو اس ذات پاک کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پھر تجھے ٹھیک مرد بنایا۔ ایسا ہی سورۃ الحج میں فرمایا۔ یٰایها الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنٰکم من تراب (الحج ۲۲: ۵) اے لوگو اگر تم بعثت کے بارے میں شک میں ہو تو غور کرو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پس مٹی سے ہی سب نوع بشر پیدا ہوئی ہے۔ ہاں پھر بعض کو اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اور ایک روحانی زندگی عطا فرماتا ہے۔ بن باپ پیدائش کا نہ یہاں کوئی ذکر ہے، نہ کوئی ایسا اعتراض موجود ہے جس کا جواب دیا ہو۔ کیونکہ اس کا ذکر اگر ہوتا تو وہاں ہوتا جہاں پیدائش کے حالات کا ذکر تھا۔ یہاں تو حضرت عیسیٰ کی وفات کے تذکرہ کے ساتھ ساری بحث کو ختم کر کے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے بلکہ فیکون کا لفظ آخر پر مضارع لا کر بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہر حال میں جاری ہے صرف دو مخصوص مثالوں پر محدود نہیں۔

۴۵۳ تعالوا۔ اصل میں یہ لفظ (علو سے مشتق ہونے کی وجہ سے) کسی بلند مکان کی طرف بلانے کے لیے آتا ہے پھر ایک مکان کی طرف بلانے کے لیے

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ یقیناً یہی سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی معبود

یہاں مراد ہے۔ رائے اور عزم کو پختہ کرکے آؤ۔

نبتھل۔ اَلْبَھْلُ وَالْاِبْتِھَالُ فِی الدُّعَاءِ الاِسْتِرْسَالُ فِیْہِ وَالتَّضَرُّعُ (رغ) یعنی بہل اور ابتہال دعا میں ٹھہر ٹھہر کر مانگنا اور تضرع کرنا ہے۔ اور آگے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے ابتہال کی تفسیر لعنت سے کی ہے وہ اس لیے ہے کہ اس میں ٹھہرنا لعنت کی غرض سے ہے۔ اور لسان العرب میں بھی ہے ابتھل فی الدعاء اذا اجتھد یعنی ابتہال دعا میں اجتہاد یا زور سے دعا کرنا ہے۔

دعوت مباہلہ عیسائیوں پر اتمام حجت کے لیے: اس مضمون کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے کہ اس کے بعد جو تیرے پاس علم آچکا یعنی دلائل جو اوپر دی گئیں۔ دلائل کی رُو سے جب اتمام حجت کر دیا اور عیسائیوں نے دلائل کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر مباہلہ کے لیے بلایا یعنی بالمقابل دعا کرنے کیلئے اور دعا پر پورا زور لگانے کے لیے یہ گویا ایک دوسرے رنگ کا اتمام حجت تھا۔ دعا کی قبولیت کے عیسائی بھی قائل ہیں اور انجیل میں ہے کہ متقی کی دعا سنی جاتی ہے چنانچہ عبرانیوں ۵: ۷ میں جہاں مسیح کے صلیب کی موت سے بچنے کے لیے رو رو کر دعائیں کرنے کا ذکر ہے "بہت رو رو اور آنسو بہا بہا کے اس سے جو اس کو موت سے بچا سکتا تھا دعائیں اور منتیں کیں" وہاں اس دعا کی قبولیت کا ذکر ان الفاظ میں ہے وسمع لہ من اجل تقوٰہ یعنی اس کے تقوٰی اور پرہیزگاری کی وجہ سے اس کی دعا سنی گئی پس جب عیسائیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ساری دنیا گنہگار ہے اور ہم ہی کفارہ پر ایمان لا کر متقی بنے ہیں تو ضرور تھا کہ اس پہلو سے بھی ان پر اتمام حجت کیا جاتا اور یہی اس آیت میں ذکر ہے۔

واقعہ مباہلہ وفد نجران سے: بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ میں روایت ہے۔ جاء العاقب والسید صاحبا نجران الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یریدان ان یلاعناہ قال فقال احدھما لصاحبہ لا تفعل فواللہ لئن کان نبیا فلاعنا لا نفلح نحن ولا عقبنا من بعدنا یعنی عاقب اور سید نجران کے قائمقام رسول اللہ صلعم کی طرف آئے کہ تا آپ سے ملاعنہ کریں راوی (حذیفہ) کہتا ہے پھر ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو کہا ایسا مت کر و خدا کی قسم اگر یہ نبی ہوا اور ہم نے اس سے ملاعنہ کیا تو نہ ہم اور نہ ہماری نسل ہمارے بعد کامیاب ہونگے۔

اور محمد بن اسحاق نے سیرۃ میں لکھا ہے کہ وفد نجران (جو عیسائی تھے) ساٹھ سوار رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے چودہ ان کی قوم کے سردار تھے۔ جن میں عاقب (جس کا نام عبد المسیح تھا) اور سید (ایہم) کا نام بھی لیا ہے اور عاقب ان کا سردار تھا اور سید ان کا لاٹ پادری تھا۔ ان لوگوں کا ڈیرہ نبی کریم صلعم نے مسجد نبوی میں کرایا اور جب ان کی نماز کا وقت آیا تو مسجد میں ہی انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی (اس سے نبی کریم صلعم کی وسعت قلبی کا اندازہ کرو کہ اپنی مسجد میں عیسائیوں کو نہ صرف ٹھہراتے ہیں بلکہ انکو اپنی طرز پر عبادت کرنے کی بھی اجازت دیتے ہیں) پس جب انہوں نے دلائل کو نہ مانا اور الوہیت مسیح کے عقیدہ پر اصرار کیا تو نبی کریم صلعم نے ان کو مباہلہ کے لیے بلایا۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں انہوں نے کہا کہ ہم کو مہلت دیجئے کہ ہم مشورہ کرلیں۔ سو جب انہوں نے مشورہ کیا تو یہی مشورہ قرار پایا کہ مباہلہ کرنے میں ہماری خیر نہیں اس لیے انہوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا اور جیسا کہ بخاری کی روایت میں آیا ہے جزیہ قبول کیا اور ابو عبیدہ ان کے ساتھ گئے۔ اور ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے ان کو مباہلہ کے لیے بلایا تو انہوں نے کہا ہم کل کریں گے۔ سو اگلے دن رسول اللہ صلعم علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ کو ساتھ لیے نکلے اور ان کو بُلایا۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وفد نجران نے مباہلہ سے انکار کر دیا۔ ان کے عیسائی حمایتی کہتے ہیں کہ وہ بد دعا کرنا نہ چاہتے تھے۔ یہ وکالت اس لیے بھی بے سود ہے کہ عیسائی تو اب تک نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کو دجال کہتے ہیں وہ کونسے ان کے بزرگ تھے جو دجال کے لیے بد دعا کرنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ احادیث صحیحہ سے صاف ثابت ہے کہ وہ ڈر گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کو اللہ تعالیٰ نے یہ علم دیا تھا کہ عیسیٰ پرستی کا عقیدہ دنیا میں بہت زور پکڑنے والا ہے اس لیے اس کے خلاف ہر رنگ سے اتمام حجت کیا ہے۔ اول دلائل کی رو سے، پھر بارگاہ الٰہی میں بالمقابل دعا سے فیصلہ کے طریق سے۔ اور سب سے آخر ایک اور طریق پر ان کو بلایا ہے جس کا ذکر اگلے رکوع میں آتا ہے۔

مباہلہ میں حضرت علیؓ کا نکلنا اور اہل تشیع: شیعہ کہتے ہیں علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ کے ساتھ لانے میں آپ نے حضرت علیؓ کی فضیلت کی طرف اشارہ کیا ہے حالانکہ بات تو صاف ہے ابناء میں حسنؓ حسینؓ بلکہ حضرت علیؓ داخل ہیں کیونکہ داماد بھی بیٹا ہی ہوتا ہے اور نساء میں حضرت فاطمہ اور انفسنا میں خود نبی کریم صلعم۔ مراد تو صرف یہ تھی کہ جو شخص جھوٹا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ایسا استیصال کر دے کہ اس کے بچے بھی تباہ ہو جائیں اور سلسلہ نسل منقطع ہو جائے۔ یہاں فضیلت کا کوئی سوال نہیں۔ دوسرے ایک روایت میں یہ لفظ بھی آتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ اور ان کے بیٹے اور حضرت عمرؓ اور ان کے بیٹے اور حضرت عثمانؓ اور ان کے بیٹے اور حضرت علیؓ اور ان کے بیٹے بھی نکلے تھے (م) بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ ابھی آنحضرت صلعم گھر سے ہی نکلے تھے۔ اور اگر فی الواقعہ مباہلہ ہوتا تو شاید بڑے بڑے صحابہ کو مع ان کی اولاد اور بیبیوں کے بھی بلاتے لیکن عیسائیوں نے پہلے ہی انکار کر دیا۔ پس اس روایت سے تو کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔

مباہلہ کب جائز ہے: ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مباہلہ اب بھی جائز ہے؟ نبی کریم صلعم نے بغیر امر الٰہی مباہلہ نہیں کیا اور جب امر ہوا تو صرف انہی لوگوں کو مباہلہ کے لیے بلایا جن کے ساتھ مباہلہ کرنے کا صراحت سے حکم آچکا تھا۔ اس لیے بدون امر الٰہی مباہلہ کرنا جائز معلوم نہیں ہوتا جس شخص کو اللہ تعالیٰ اصلاح کیلئے مامور کرے وہ اپنے اعدا سے خدا کی طرف سے حکم پانے پر مباہلہ کر سکتا ہے۔ ہاں ابن عباس کے متعلق ایک روایت عبد حمید نے بیان کی ہے کہ آپ کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہو گیا تھا تو آپ نے اسے مباہلہ کے لیے بلایا (د) مگر اول حضرت ابن عباس کا فعل کوئی حجت شرعی نہیں، دوسرے اگر باہمی جھگڑوں پر مباہلہ ہونے لگے تو دن رات مسلمانوں

اِلَّا اللّٰہُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۶۲﴾
ع ۶ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۶۳﴾
قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ
بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشۡرِکَ
بِہٖ شَیۡئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا
مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡہَدُوۡا
بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾

نہیں اور یقیناً اللہ ہی غالب حکمت والا ہے ۴۵۴
اور اگر وہ پھر جائیں تو اللہ فساد کرنے والوں کو جانتا ہے۔
کہہ اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے درمیان
اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت
نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی
کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے اور اگر وہ پھر جائیں تو تم کہو گواہ
رہو کہ ہم فرماں بردار ہیں ۴۵۵

کے باہم مباہلے ہی ہوتے رہیں اور بجائے اخوت اور محبت کے جس کا پیدا کرنا اسلام کی اصل غرض ہے ایک دوسرے کی بیخ کنی اور استیصال کے درپے ہی رہیں۔

۴۵۴ قصص کے معنی اثر یعنی نقش قدم بھی ہیں۔ اور قصص اخبار مُتَتَبَّعَۃ کو بھی کہتے ہیں یعنی خبریں جن کا تتبع کیا جائے۔ الحق قصص کی صفت ہے۔

آیت کے اخیر پر عزیز حکیم کی صفات لانے کا اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ نصرانیت کا غلبہ آخر دنیا سے دور ہو جائے گا۔ اور ما من الٰہ الا اللہ یعنی ایک ہی خدا کی عبادت رہ جائے گی۔

۴۵۵ سواء کے معنی وَسَط ہیں جب مکان سے تعلق ہو۔ اور کلمۃٌ سواءٌ سے مراد امام راغب عدل من الحکم لیتے ہیں۔ یعنی انصاف کی بات۔ اور ابن عباسؓ سے بھی عدل معنی مروی ہیں۔ مگر سواء مصدر بمعنی مستویۃ بھی ہو سکتا ہے اولا یختلف فیہ التوراۃ والانجیل والقرآن (ر) یعنی مشترک بات جس میں تورات انجیل اور قرآن اختلاف نہیں کرتے او لا اختلاف فیہا بکل الشرائع (ر) یعنی تمام شریعتیں اس پر متفق ہوں۔

شرک فی الصفات: لا نشرک بہ شیئا۔ شرک کے معنی کے لیے دیکھو ۱۲۱ یہاں مراد شرک عظیم ہی ہے۔ یعنی کسی چیز کو باری تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا اور یہ اس طرح پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی دوسرے کو کامل شریک ٹھہرایا جائے۔ جیسے مجوسیوں کا دو خالق تجویز کرنا۔ یا عیسائیوں کا مسیح کو صفات کاملہ باری تعالیٰ ازلیت ابدیت قدرت وغیرہ میں شریک ٹھہرانا۔ یا آریہ سماج کا مادہ اور روح کو باری تعالیٰ کی صفت ازلیت اور خود بخود اور غیر مخلوق ہونے میں شریک ٹھہرانا۔ یہ سب شرک عظیم میں داخل ہیں۔

اربابا من دون اللہ۔ رب کی جمع ہے دیکھو ع۲۔ اور ارباب سے مراد یہ ہے کہ ان کو مسبب الاسباب اور مصالح عباد کا متولی سمجھا جائے اور اس لیے ان کی اطاعت اس طرح کی جائے جس طرح رب کی اطاعت کی جاتی ہے خود قرآن کریم نے اس کی تصریح فرما دی ہے۔ اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ (التوبۃ ۹-۳۱) انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا ہے۔ ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم ان کی عبادت نہ کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا اما کانوا یحلون لکم و یحرمون فتاخذون بقولہم کیا یہ نہیں تھا کہ وہ تمہارے لیے حرام اور حلال ٹھہراتے تھے اور تم انہی کے قول کے پیچھے چلتے۔ تو انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی کرتے تھے۔ پس جو مسلمان اپنے پیروں اور علماء کے پیچھے اس طرح آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں کہ اپنی عقل و فکر سے کبھی کام نہیں لیتے۔ وہ بھی اسی فتویٰ کے ماتحت ہیں۔ اس آیت میں تین قسم کے شرک سے منع فرمایا ہے۔ ایک شرک فی العبادت، دوسرے شرک فی الصفات، تیسرے شرک فی الاطاعت۔ شرک فی العبادت کو الا نعبد الا اللہ میں لیا ہے یہ بہت موٹا شرک ہے کہ کسی چیز کے آگے سجدہ کیا جائے یا اس سے دعا کی جائے جیسے بت پرست کرتے ہیں۔ یا بعض عیسائی بھی حضرت مسیح سے یا حضرت مریم سے دعا کرتے ہیں بلکہ رومن کیتھولک ان کے بُت بھی رکھتے ہیں۔ اس سے اُتر کر شرک فی الصفات ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی چیز کو کامل شریک ٹھہرانا جس کا ذکر لا نشرک بہ شیئا میں کیا ہے کسی چیز کے شریک کرنے سے مراد یہی ہے کہ اس میں کامل طور پر کوئی صفت ایسی مانی جائے جیسے اللہ تعالیٰ کی صفت ہوتی ہے۔ اور تیسرا شرک فی الاطاعت ہے جس کا ذکر اربابا من دون اللہ میں کیا اور ان تمام قسم کے موٹے شرکوں سے منع فرمایا۔

اصول مقابلہ مذاہب اور صداقت اسلام: جیسا کہ پچھلے رکوع کے آخر میں مَیں نے کہا تھا جب دلائل اور دعاء دونوں سے اتمام حجت ہو چکا اور دلائل کے قبول کرنے سے انہوں نے انکار کیا اور دعا میں مقابلہ سے خائف ہوئے تو اب اُن پر ایک اور رنگ میں اتمام حجت کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمہارے اور ہمارے مذہب میں جو امر مشترک ہے اس کو دونوں بنیاد کے طور پر مان لیں تو بہت سا فساد مٹ جاتا ہے ایک عیسائیت کیا جملہ مذاہب اسلام کی یہ حجت قائم ہے کہ اگر سب مذاہب میں امر مشترک کو نکالا جائے تو وہ اسلام کا مذہب ہے اور اس لیے کسی مذہب کا پیرو بھی اسلام کی حقانیت کا انکار نہیں کر سکتا۔ ایک رنگ میں سب قومیں ہی اہل کتاب ہیں گو مخصوص طور پر یہود یا عیسائیوں کو اہل کتاب کے نام سے پکارا گیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر قوم میں ہم نے رسول بھیجا۔ پس اس رسول کی تعلیم ہی اس قوم کی کتاب ہے۔ اب اگر دنیا کی ساری قوموں کے معتقدات اور ساری مذہبی کتابوں کو دیکھا جائے تو ذات باری کے عقیدہ میں جو امر مشترک ان میں پایا جاتا ہے وہ ایک خدا کی ہستی ہے

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡٓ اِبۡرٰهِيۡمَ
وَمَآ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ
بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿٦٥﴾

اے اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ توریت اور انجیل اس کے بعد ہی اتاری گئیں - پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ع۴۵۶

هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ
فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ
وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿٦٦﴾

سنو! تم وہ ہو جو اس میں جھگڑ چکے جس کا تم کو علم تھا پھر اس میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو علم نہیں - اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ع۴۵۷

مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّ
لٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ
مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿٦٧﴾

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی، لیکن وہ راست رو فرمانبردار تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا ع۴۵۸

حتیٰ کہ کتب مقدسہ کے پیرووں کو چھوڑ کر بت پرستوں تک کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ ان کے بتوں سے اوپر ایک خدائے واحد ہے اور بُت بھی اسی کے دربار تک پہنچانے والے ہیں ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفٰی پس تمام مذاہب دنیا میں اگر امر مشترک تلاش کیا جائے تو وہ خدائے واحد کی پرستش کا عقیدہ ہے پھر ہر قوم نے اس خدائے ذوالجلال کے نیچے اپنے لیے طرح طرح کے خدا تجویز کر لیے کہیں رامچندر اور کرشن ہیں تو کہیں مسیح - پس اللہ تعالیٰ مذاہب میں فیصلہ کے لیے ایک سیدھی راہ بتاتا ہے کہ سب مذاہب میں امر مشترک کو لیلو اسی کو کلمۃ سواء فرمایا ہے تو یہ امر مشترک یہی ہوگا کہ صرف ایک خدا کی پرستش کی جائے - اس کلمۃ سواء میں درحقیقت تمام مذاہب کے عظیم الشان اصول کی طرف دنیا کو توجہ دلائی ہے اور گویا یہ اشارہ فرمایا ہے کہ جب اور کسی راہ سے نہ مانیں تو پھر مقابلہ مذاہب کا اصول پیش کرو اور امر مشترک کو بطور ایک بنیادی اصول کے مان کر آگے چلو تو اس سے بھی اسلام کی صداقت ہی نکلے گی -

مقوقس کے نام آنحضرت صلعم کا خط: یاھل الکتاب تعالوا - الایۃ یہ وہ الفاظ ہیں جن الفاظ میں صلح حدیبیہ کے زمانہ میں آنحضرت صلعم نے ہرقل اور مقوقس شاہ مصر کو مخاطب فرمایا تھا - مؤخر الذکر چٹھی کا اصل مسودہ مصر کی کسی خانقاہ میں ملا اور اب اس کا فوٹو شائع ہو چکا ہے جس میں بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو صحیح بخاری وغیرہ دیگر کتب حدیث میں ملتے ہیں - اس سے صداقت حدیث پر بڑی بھاری شہادت ملتی ہے -

ع۴۵۶ مذہب ابراہیمی بطور امر مشترک: لم تحاجون فی ابراھیم - حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو - حضرت ابراہیم کا ذکر بھی اسی اصول کے لحاظ سے کیا جس کا اوپر ذکر ہے - کیونکہ حضرت ابراہیم کا وجود بھی چاروں قوموں مشرکین عرب، یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں بطور ایک امر مشترک کے تھا کہ چاروں آپ کی بزرگی کو مانتے تھے - گویا یہ بتایا ہے کہ توریت اور انجیل تو حضرت ابراہیم کے بعد کی کتابیں ہیں - اصل الاصول وہ ہے جس پر ابراہیم بھی قائم تھے - اور وہی خدائے واحد کی عبادت ہے اسی لیے آیت ۶۷ میں فرمایا ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین اٰمنوا - کیونکہ یہ نبی اور مومن اس اصل الاصول یعنی خدائے واحد کی عبادت پر قائم ہیں - حالانکہ تم لوگ طرح طرح کی افراط و تفریط میں پڑ گئے ہو اور خدائے واحد کی عبادت کے ساتھ کسی نے اپنے احبار اور کسی نے اپنے مسیح کی عبادت کو ملا لیا ہے -

ع۴۵۷ ھا - حرف تنبیہ ہے اور ھٰؤلاء میں دوبارہ تاکید کے لیے آیا ہے اور اخفش کے نزدیک ھا قائم مقام ہمزہ استفہام کے ہے اور استفہام یہاں تعجب کے لیے ہے (ر)

یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت: فیما لکم بہ علم سے مراد حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کا معاملہ ہے کہ ان کے بارہ میں اہل کتاب یعنی یہود حضرت موسیٰ کے مذہب کے بارہ میں اور عیسائی حضرت عیسیٰ کے مذہب کے بارہ میں جھگڑا کر چکے اور ان جھگڑوں کا ذکر سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران میں ہو چکا - تو اب جب اصل الاصول یعنی حضرت ابراہیم کے مذہب کی طرف توجہ دلائی - کیونکہ اسی کے ساتھ وعدہ کے ماتحت یہود و نصاریٰ کا وجود پیدا ہوا - تو فرمایا کہ حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کے مذہب کے علم کا تو تم کو کچھ دعویٰ بھی ہے مگر حضرت ابراہیم کے مذہب کا ذکر تو تمہاری کتب مقدسہ میں بھی جیسی کچھ وہ تحریف شدہ موجود ہیں نہیں ہے پس اس پر تمہارا جھگڑا کرنا بالکل فضول ہے - یا فیما لکم بہ علم سے مراد وہ پیشگوئیاں ہیں جو اُن کی کتابوں میں آنحضرت صلعم کے متعلق پائی جاتی تھیں یعنی پیشگوں کے بارہ میں تو تم نے جھگڑا کر لیا - مگر یہ اصول مقابلہ مذاہب اور اصول مشترکہ کی طرف رجوع کرنا ایک ایسا امر ہے جس کا تم کو علم نہیں تھا - مگر بات صاف ہے اس میں جھگڑا کیوں کرتے ہو -

ع۴۵۸ ابراہیم سے نفی یہودیت و نصرانیت: مطلب یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے خاص عقاید ابراہیم کے نہ تھے - یہودیت اور نصرانیت کی نفی کے ساتھ لفظ حنیف کے معنی پر دیکھو ع۱۹۰ اور آخر پر حضرت ابراہیم سے مشرک ہونے کی نفی مشرکین عرب پر اتمام حجت کے لیے ہے - گویا ان تینوں قوموں کو ایک اصول کی طرف بلایا ہے کہ جس پر تم

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا ۗ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٨﴾

یقیناً ابراہیم سے بہت نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو وہ ایمان لائے اور اللہ مومنوں کا ولی ہے ؎۴۵۹

وَدَّتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّونَكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٦٩﴾

اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ تم کو گمراہ کریں، اور وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں اور وہ محسوس نہیں کرتے ؎۴۶۰

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٧٠﴾

اے اہل کتاب اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو، حالانکہ تم گواہ ہو ؎۴۶۱

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
ع وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٧١﴾

اے اہل کتاب کیوں حق کو باطل کے ساتھ ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو ؎۴۶۲

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ

اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ دن کی ابتدا میں اس پر ایمان لے آؤ جو اُن لوگوں پر اتارا گیا ہے جو

سب کا اتفاق ہے اسی کو بطور اصل الاصول لو۔ اور اس لیے بھی حضرت ابراہیم کا ذکر کیا ہے کہ اصل وعدہ اسی کے ساتھ ہے جس کے ماتحت عرب میں بھی ایک نبی پیدا ہوتا ہے پس یہ نبی اس کے مذہب کے اصل الاصول پر بھی قائم ہے۔

ع۴۵۹ اولی۔ وَلِیَ یلی سے افعل التفضیل ہے اور وَلاء کے اصل معنی قرب ہیں۔ پس اولیٰ کے معنی اقرب یا قریب ترین ہوئے۔ اور اولی بکذا سے مراد اَحْرٰی بکذا ہے (رغ) یعنی اس کا سب سے بڑھ کر اہل۔

اتبعوہ۔ نبی کے متبعین اس کی اُمت ہوتی ہے جو اس کے نقش قدم پر چلتی اور اس کی ہدایات سے نور حاصل کرتی ہے۔ اسی لیے یہاں ھذا النبی والذین اٰمنوا کو الذین اتبعوہ سے الگ کر دیا ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان ابراہیم کے متبعین میں سے نہیں ہیں گو آپ کا ملّتِ ابراہیمی پر ہونا بیان کیا گیا ہے۔ مگر وہ بحیثیت ایک متبع کے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہی اصول دین آپ کو بھی وحی ہوتے ہیں الذین اتبعوہ سے مراد حضرت ابراہیم کے پیرو ہیں جو آپ کے زمانہ نبوت میں آپ کی شریعت پر تھے۔

ع۴۶۰ طائفۃ۔ طوف سے ہے جس کے معنی گھومنا ہیں اور طائفۃ کا لفظ جب انسانوں پر بولا جائے تو اس سے مراد جماعت ہوتی ہے اور کسی چیز کے حصّہ یا ٹکڑہ کو بھی اس کا طائفہ کہا جاتا ہے (رغ)

یضلونکم۔ اضلال کے ایک معنی صراط مستقیم سے پھیرنے کے ہیں۔ لیکن ضَلَّ بمعنی ضاع و ھَلَكَ (ل) بھی آتا ہے اس لیے اضلال اِھلاك کو بھی کہتے ہیں ــــ اگر پہلے معنی مراد لیں تو ما یضلون الا انفسھم کے معنی ہونگے اپنے آپ کو اور بھی گمراہ کرتے ہیں۔ کیونکہ جب ایک شخص دوسرے کی گمراہی کے درپے ہو جاتا ہے تو اور بھی راہ حق سے دور چلا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ پہلے بھی گمراہ ہی ہوتا ہے۔ دوسرے معنی کی رُو سے مراد یہ ہوگی کہ تم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں خود ہی ہلاک ہونگے۔

عیسائیوں کی مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں: یہاں ایک پیشگوئی بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل مخاطب تو ان آیات کے نصاریٰ ہی ہیں جیسا کہ سفیان نے بھی کہا ہے کل شیٔ فی اٰل عمران من ذکر اھل الکتاب فھو فی النصارٰی (ر) یعنی آل عمران میں جو کچھ اہل کتاب کے متعلق آیا ہے وہ اصل میں نصاریٰ کے متعلق ہے۔ گو بعض وقت یہود یا دوسرے اہل کتاب بھی ان میں شامل ہو جائیں۔ اشارہ یہ ہے کہ یہ اہل کتاب یعنی نصاریٰ باوجود باطل پر ہونے کے اور ہر طرح سے ملزم ہونے کے اس قدر زور پکڑینگے کہ مسلمانوں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کریں یعنی اپنے دین کی طرف لے جانے کی۔ سو اس پیشگوئی کا ظہور اس زمانہ میں ہو رہا ہے۔

ع۴۶۱ اللہ کی آیتوں سے مراد یہاں قرآن کریم ہے جس کی صداقت وہ مشاہدہ کر رہے تھے۔ اور خود اس بات کے بھی گواہ تھے کہ ان کی کتابوں میں ایک رسول کے آنے کا ذکر ہے۔

ع۴۶۲ یہاں انہی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی جن کی طرف پچھلی آیت میں اشارہ کیا تھا۔

النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾
وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ
الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ
مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ
اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

یمان لائے ہیں اور اس کے آخر میں انکار کر دو تاکہ وہ لوٹ آئیں ۴۶۳
اور سوائے اس کے کسی پر ایمان نہ لاؤ جو تمہارے دین پر چلے ۴۶۴
کہہ (کامل) ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے کہ کسی شخص کو اس کی مثل
دیا جائے ، جو تمہیں دیا گیا یا وہ تمہارے رب کے نزدیک تمہارے
ساتھ جھگڑا کرینگے کہہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے

۴۶۳ وجہ النہار۔ وجہ چونکہ بدن کا وہ حصّہ ہے جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے اس لیے اس کا استعمال ہر چیز کے پہلے آنے والے حصّہ اور اس کے اشرف اور اس کی ابتدا پر ہوا ہے (غ) اس لیے وجہ النہار کے معنی اول النہار ہیں۔

یہودیوں کی چال کہ منافقانہ طور پر اسلام میں داخل ہو جائیں: اس آیت کے معنی کئی طرح پر کیے گئے ہیں۔ ایک معنی تو یوں ہیں کہ دن کے پہلے حصّہ میں دین اسلام کو قبول کر لو اور پچھلے حصّہ میں اس کا انکار کر دو۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ یہودیوں نے دین اسلام کو بدنام کرنے کے لیے یہ تجویز کی تھی کہ اپنے چند لوگوں کو تیار کیا کہ صبح جا کر نفاق کے طور پر مسلمان بن جائیں اور شام کو کہہ دیں کہ ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا کہ اس دین میں کوئی حق نہیں اور لعلھم یرجعون کے معنی ہوئے تاکہ مسلمان بھی اپنے دین سے لوٹ آئیں یعنی اس طرح وہ سمجھیں گے کہ اہل کتاب کو کوئی دشمنی تو نہیں وہ مسلمان تو ہو گئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے اس دین کے اندر داخل ہو کر اس کو جھوٹا پایا تو اسے چھوڑ دیا یہی بات درست ہو گی یوں وہ بھی اسلام چھوڑ کر پھر کفر کی طرف لوٹ آئیں گے۔ چونکہ دین اسلام کی یہ خوبی تھی کہ جب ایک شخص اس کے اندر داخل ہو جاتا تو پھر مرتد نہیں ہوتا تھا جیسا کہ ہرقل والی حدیث میں ابوسفیان کی زبان سے بھی شہادت موجود ہے کہ جب اس نے پوچھا فَهَلْ يَرْتَدُّ اَحَدٌ مِنْهُمْ سُخْطَةً لِدِيْنِهٖ بَعْدَ ان یدخل فیہ۔ کیا ان میں سے کوئی شخص دین میں داخل ہونے کے بعد اس سے بیزار ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ نہیں اور یہ دین اسلام کی صداقت پر بڑی بھاری شہادت تھی کہ مرتدین کا وجود باوجود سخت ایذا رسانیوں کے اور طرح طرح کی مشکلات کے لا نادر کالمعدوم کے حکم میں تھا اور مسلمانوں کی اس مضبوطی کو دیکھ کر ہی اہل کتاب اس قسم کے حیلے سوچتے رہتے تھے کہ کس طرح دین اسلام بدنام ہو یہ دلائل میں عاجز ہونے کا نتیجہ تھا جب دین اسلام کا ہر پہلو سے غلبہ دیکھا تو ان مخفی تدابیر پر اُتر آئے کہ شاید اسی طرح اسلام مٹ جائے، جیسا کہ آج بھی اہل کتاب اس قسم کی تدبیریں اسلام کے تباہ کرنے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔

ایک معنی ابو مسلم نے کیے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ دن کے پہلے حصّہ میں ایمان لانے اور پچھلے میں انکار کرنے سے مراد یہ ہے کہ نفاق کے طور پر مسلمانوں کی ہاں میں ہاں ملا دیا کرو۔ مگر فی الواقع اپنے دین پر مضبوط رہو اس لیے جب اپنے لوگوں کے پاس آؤ تو پھر اس کا انکار کرو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے واذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنّا واذا خلوا الیٰ شیاطینھم قالوا انّا معکم (البقرۃ ۲-۱۴) جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ معنی بھی صحیح اور مناسب موقع ہیں اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ محض نفاق کے طور پر مسلمانوں کے ساتھ مل گئے تھے تا اس طرح دین اسلام کو بدنام کریں۔

احکام اسلام میں تفریق کی چالبازی: تیسرے معنی اصم سے منقول ہیں۔ معناہ تفریق احکام الاسلام الی قسمین وذٰلک انہ قال بعضھم لبعض ان کذبتموہ فی جمیع ما جاء بہ علم عوامکم کذبکم لان کثیرا مما جاء بہ حق ولکن صدقوہ فی بعض وکذبوہ فی بعض لیحملوا کلامکم علی الانصاف فیقبلوا توالکم ویرجعوا من دین الاسلام والرغبۃ فیہ (رغ) اس کا مطلب یہ ہے کہ احکام اسلام میں تفریق کر کے ان کو دو قسم کے ٹھہرایا جائے اور وہ اس طرح کہ ان میں سے بعض نے بعض کو کہا کہ اگر تم اس کو ساری باتوں میں جھوٹا کہو گے تو عوام تم کو جھوٹا سمجھیں گے کیونکہ بہت سی وہ باتیں جو وہ لایا ہے حق ہیں اس لیے بعض باتوں میں اس کی تصدیق کرو اور اس کو سچا کہو اور بعض میں جھوٹا تاکہ لوگ تمہارے کلام کو انصاف پر حمل کریں اور تمہاری بات کو قبول کریں اور دین اسلام سے اور اس کی طرف میلان سے باز آ جائیں۔ اس قسم کی چالبازیاں اب بھی کی جاتی ہیں۔ بعض عیسائی یہ جتانے کے لیے کہ ہم بڑے انصاف پسند ہیں اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے یوں کہہ دیتے ہیں کہ بیشک پہلے آنحضرت صلعم صداقت پر تھے اور محض عرب کو بُت پرستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن بعد میں دنیوی اغراض مل گئیں اور ایک نیا دین بنا لیا گیا۔ اور جنگوں میں ناحق کا کشت و خون ہوا۔ آج کل پادریوں کی ایک اور چالبازی بھی ہے کہ جھوٹے قصوں کے طور پر ایک عیسائی اور ایک مسلمان کا مکالمہ شائع کر دیتے ہیں۔ جس میں مسلمان کے منہ میں کمزور دلائل ڈال کر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی صداقت پر شبہات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ غرض حق کے مقابل چالبازیوں سے کام عیسائی پہلے بھی لیتے رہے، اب بھی لیتے ہیں انہی چالبازیوں سے کہ دوست بنکر دشمن کا کام کرتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔

۴۶۴ یہ اہل کتاب کے قول کا بقیہ حصّہ ہے۔ اور مراد اس پر ایمان لانے سے جو تمہارے دین کا پیرو ہے یہ ہے کہ حقیقی ایمان تمہارا صرف اسی نبی پر ہو جو شریعت اسرائیلی کا پیرو ہو۔ پس جبکہ ایک طرف بعض لوگوں کو اس چالبازی کے لیے تیار کیا کہ وہ جھوٹے طور پر ایمان کا اظہار کر کے پھر انکار کر دیں یا کچھ حصّہ کو صحیح تسلیم کر لیں تو دوسری طرف اپنے پیروؤں کو یہ بھی کہہ دیا کہ تم صرف ایسے نبی کو مانو جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو۔ اور اس طرح آنحضرت صلعم پر ایمان لانے سے روکا کیونکہ آپ کی

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾
يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾
وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ

اسے دیتا ہے اور اللہ کشایش والا جاننے والا ہے۔[465]
وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔
اور اہل کتاب میں سے وہ ہے کہ اگر تو اس کو مال کے ڈھیر پر امین بنائے تو وہ اسے تجھے واپس دیدے اور ان میں سے وہ ہے کہ اگر تو اسے ایک دینار پر امین بنائے تو وہ اسے تجھے واپس نہ دے سوائے اس کے کہ تو اس (کے سر) پر کھڑا رہے یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر ان امیوں کے بارے میں کوئی (الزام کی) راہ نہیں اور وہ اللہ پر

شریعت میں بہت سی باتیں شریعت موسوی کو منسوخ کرنے والی تھیں اور یہ انکا قول اس کے مطابق ہے جو پچھلی سورت میں مذکور ہے قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما وراءہ (البقرۃ - ۹۱) اور اسی پر یہود آج تک قائم ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ جو نبی آئے شریعت موسوی پر ہی آنا چاہیئے۔

[465] مثیل موسیٰ کی پیشگوئی اور یہودیوں کے اس سے گریز کے حیلے: قل ان الھدیٰ ھدی اللّٰہ ان یؤتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم۔ ان الفاظ کی تفسیر کئی طرح پر کی گئی ہے لیکن سیاق وسباق کے لحاظ سے دو توجیہیں درست ہو سکتی ہیں اور ان میں کچھ اشکال بھی نہیں۔ اول یہ کہ الفاظ قل ان الھدیٰ ھدی اللّٰہ جملہ معترضہ کے طور پر ہوں اور ان یؤتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم پھر انہی لوگوں کا قول ہو اور اس سب کا جواب قل ان الفضل بید اللّٰہ میں دیا تو گویا جب یہودیوں نے اپنے پیروؤں کو یہ سکھایا کہ لا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم سوائے اس نبی کے جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو اور کسی کو نہ مانو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا (لا) ان یؤتی احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم (اور قل ان الھدیٰ ھدی اللّٰہ جملہ معترضہ کے طور پر رہا کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے ان کی ان فضول گوئیوں سے کیا بنے گا) یعنی اور اس بات پر بھی ایمان نہ لاؤ کہ کسی شخص کو اس کی مثل دیا جائے گا جو تم کو دیا گیا یعنی جیسی شریعت تم کو دی گئی اس کی مثل کسی اور کو دی جا سکتی ہے۔ گویا استثناء ۱۸: ۱۵ کی مثل والی پیشگوئی کو نہ مانو۔ کیونکہ اگر تم نے اس بات کو مان لیا کہ مثل والی پیشگوئی سوائے بنی اسرائیل کے کسی اور پر بھی پوری ہو سکتی ہے تو وہ یعنی مسلمان تمہارے رب کے نزدیک تمہارے ساتھ جھگڑا کریں گے۔ رب کے نزدیک جھگڑا کرنے سے مراد ہے فی کتابہ وحکمہ دیکھو ع[169] اور یحاجوکم کے معنی کے لیے بھی اسی نوٹ کو دیکھو۔ یحاجوکم میں ضمیر احد کی طرف جائے گی۔ کیونکہ وہ جمع کے معنی کے حکم میں ہے اور مراد مسلمان ہوں گے یا بنی اسمٰعیل جن کی طرف احد میں اشارہ ہے۔ یہ معنی بعینہٖ اس کے مطابق ہیں جو البقرۃ - ۷۶ میں ذکر کیا کہ یہودیوں کے علماء اپنے پیروؤں کو کہتے ہیں اتحدثونھم بما فتح اللّٰہ علیکم لیحاجوکم بہ عند ربکم۔ تم ان پیشگوئیوں کو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں مسلمانوں کو جا کر بتا دیتے ہو تاکہ وہ تمہارے رب کے حکم میں تمہارے ساتھ جھگڑا کر سکیں۔ گویا اسی بات سے یہاں منع کیا ہے کہ جب تم ان کے ساتھ ملو تو یہ پھر بھی تسلیم نہ کرو کہ مثل والی کوئی پیشگوئی ہے ورنہ مسلمانوں کو تمہارے خلاف یہ حجت مل جائے گی۔

اور دوسرے معنی یوں ہونگے کہ قل ان الھدیٰ سے عند ربکم تک سب قل کے ماتحت یہودیوں کی اس بات کا جواب ہو کہ لا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم۔ اس صورت میں الھدیٰ انّ کا اسم ہوگا اور ھدی اللّٰہ۔ الھدیٰ سے بدل ہوگا۔ گویا اس بات کا جواب کہ سوائے موسوی شریعت کے پیرو کے اور کسی نبی کو نہ مانو۔ اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ ان کو کہہ دو کہ کامل ہدایت (جو اللہ کی ہدایت ہے) یہ ہے کہ جو کچھ اے اہل کتاب تم کو دیا گیا یعنی موسوی شریعت اس کی مثل کسی اور کو دی جائے کیونکہ تمہارے ہاں تو یہ پیشگوئی موجود ہے کہ موسیٰ کی مثل ایک نبی آئے گا اور اس لیے یہ ضروری ہے کہ جو تم کو دیا گیا یعنی شریعت موسوی اس کی مثل کسی اور کو دیا جائے یا (یعنی اگر ایسا نہ ہو تو) مسلمان تمہارے رب کے حکم میں تمہارے ساتھ جھگڑا کر سکیں گے (اور وہ جھگڑے میں غالب رہیں گے اور اس غلبہ کی طرف لفظ یحاجوکم میں بھی اشارہ ہو سکتا ہے یا ایسے لفظ مقدر ہو سکتے ہیں جیسے فیدحض حجتکم کیونکہ سیاق عبارت اس کا متقضی ہے) دونوں صورتوں میں اشارہ اس عظیم الشان پیشگوئی کی طرف ہے جس کا کوئی جواب اہل کتاب کے پاس نہیں جو حضرت موسیٰ نے کی تھی اور جس کی صداقت کو کل انبیائے بنی اسرائیل نے تسلیم کیا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ نے بھی اس کو تسلیم کیا یعنی حضرت موسیٰ کی مثل ایک پیغمبر کا دنیا میں ظاہر ہونا جس کا ذکر استثناء ۱۸: ۱۵-۱۸ میں ہے۔ اب یہ موسیٰ کی مثل نبی کا کھڑا کیا جانا سوائے اس کے کیا معنی رکھتا ہے کہ جس طرح ایک شریعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے ذریعہ سے دی گئی اسی طرح ایک شریعت بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی کے ذریعہ سے دنیا کو دی جائے۔ یوں تو بنی اسرائیل میں نبی بہت ہوئے مگر موسیٰ کی مثل ہونے کا کسی نے دعویٰ نہ کیا حتّٰی کہ حضرت مسیح نے بھی نہیں کیا۔ جیسا کہ یوحنا ۱: ۲۱ سے ثابت ہے کہ یہودی تین کے منتظر تھے۔ الیاس کی دوبارہ آمد، سو وہ حضرت یحییٰ میں پوری ہوئی۔ مسیح کی آمد جس کا دعویٰ حضرت عیسیٰ نے کیا۔ موعود نبی کی آمد، جس کا دعویٰ نہ حضرت عیسےٰ نے کیا نہ حضرت یحییٰ نے اور نہ بنی اسرائیل کا کوئی نبی جو شریعت موسوی کا پیرو ہو ایسا دعویٰ کر سکتا

عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٥﴾ جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔[٤٦٦]

تھا کیونکہ نہ صرف وہ نبی بنی اسمٰعیل سے ہونا چاہیئے بلکہ پیشگوئی کے مطابق یہ بھی ضروری تھا کہ اسے حضرت موسیٰ کی مثل ایک شریعت دی جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت جو آپ کو بنی اسرائیل کے کل انبیاء میں ممتاز کرتی ہے۔ یہی ہے کہ آپ ایک جدید اور مستقل شریعت لائے اس لیے پیشگوئی میں موسیٰ کی مثل کا لفظ لانے سے سوائے اس کے کچھ منشاء نہیں ہو سکتا کہ وہ نبی بھی ایک جدید اور مستقل شریعت لانے والا ہو اس لیے قرآن کریم بنی اسرائیل کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ہم اسی نبی کو مانیں گے جو ہماری شریعت کا پیرو ہو۔ اس پیشگوئی کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس کے مطابق تو یہ ضروری ہے کہ جو شریعت تم کو موسیٰ کے ذریعہ سے دی گئی ویسی ہی شریعت کسی اور کو دی جائے۔ تم اصرار کرتے ہو کہ ہم اپنی ہی شریعت کے پیرو نبیوں کو مانیں گے۔ حالانکہ حضرت موسیٰ کی پیشگوئی اس امر کی مقتضی ہے کہ اس جیسی ایک اور شریعت بھیجی جائے پس تم اپنے اصرار میں غلطی پر ہو۔

نبوت ایک قوم سے مخصوص نہیں: اس کے بعد جو الفاظ آتے ہیں قل ان الفضل بید اللہ یوتیہ من یشاء اور یختص برحمتہ من یشاء یہ اہل کتاب کے اسی اعتراض کا جواب ہیں یہاں نبوت کو ایک فضل فرمایا۔ تو فضل ایک قوم سے مخصوص نہیں یہ موہبت ہے جس کو اللہ چاہے دے دے۔ اس کا مقابلہ البقرہ ١٠٥ سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح کا اعتراض اور جواب وہاں دیا ہے۔ وہی دوسرے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ وہاں بھی یہ کہہ کر کہ مایود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم جواب دیا تھا واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

٤٦٦ مادمت علیہ قائما۔ بعض نے یہاں لفظی معنی مراد لیے ہیں کہ واقعی اس کے سر پر کھڑا رہے اور اس سے ادھر ادھر نہ ہو مگر یہ بلا ضرورت تکلف ہے اس سے مراد مطالبہ اور تقاضا ہے جیسا کہ ابن قتیبہ نے کہا ہے اصلہ ان الطالب للشئ یقوم بہ والتارک لہ یقعد عنہ (رغ) اصلیت اس محاورہ کی یہ ہے کہ ایک شے کا طالب اس کی رعایت کو ملحوظ رکھتا ہے گویا وہ اس پر کھڑا ہوتا ہے اور ترک کرنے والا اس کی طرف سے سست ہو جاتا ہے یا بیٹھ جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں آتا ہے امۃ قائمۃ (آل عمران ١١٢) اور مراد ہے عاملۃ بامر اللہ یعنی اللہ کے حکم پر عمل کرنے والی۔

سبیل کے معنی راہ پھر ہر سبب جس کے ذریعہ سے دوسری چیز تک پہنچا جائے برا ہو یا بھلا (غ) یہاں مراد یہ ہے کہ ہم تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں۔ یعنی ہم پر کوئی پرسش یا الزام نہیں۔

اہل کتاب کے معاملہ میں اسلام کا منصفانہ رویہ: اہل کتاب کے بارہ میں قرآن کریم نے باوجود ان کی خطرناک عداوتوں کے اور دن رات اسلام کی بیخکنی کے درپے رہنے کے نہایت انصاف کا معاملہ کیا ہے۔ اگر ان کی بدیوں کا ذکر کیا ہے تو ان کی نیکیوں کا بھی اعتراف کیا ہے یہاں صرف ان کی بددیانتی کا ذکر نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی اس کے ان میں نیک لوگوں کے وجود کا بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ سونے کے ڈھیر پر بھی امین بنائے جائیں تو اس میں خیانت نہیں کرتے۔ گویا مسلمانوں کو بتایا ہے کہ کسی قوم کو بعض افراد کی وجہ سے بلا تمیز برا کہہ دینا یا برا سمجھ لینا ٹھیک نہیں اگر کسی کو اس میں برائی دیکھ کر برا کہو تو اس میں نیکی پاؤ تو اس کا بھی اعتراف کرو اور بلا تفریق مذہب وملت قوم و رنگ ہر ایک کے ساتھ نیکی اور انصاف کا معاملہ کرو۔

اصل ذکر تو یہاں دینی معاملات اور پیشگوئیوں کا تھا۔ اسی ذکر میں دنیوی معاملہ کا ذکر بھی کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین و دنیا کو کس طرح پر قرآن شریف نے اکٹھا کیا ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف اہل کتاب کو یہ الزام دیا ہے کہ جب دنیوی معاملہ میں ان کی حالت ایسی خراب ہے کہ ایک دینار کی امانت کا حق ادا نہیں کر سکتے تو دینی معاملہ میں کتاب کی حفاظت میں پیشگوئیوں کی حفاظت میں وہ کیونکر قابل اعتبار ہو سکتے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کو بھی سمجھایا ہے کہ دین و دنیا الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ دنیوی معاملات میں امانت و دیانت کا حق ادا نہیں کر سکتے، تو دین میں ان کا راہ راست پر ہونے کا دعویٰ کس کام کا ہے۔ چنانچہ یہاں معمولی دیانت کا ذکر کرتے ہوئے معاً روحانیت کی طرف انتقال کر کے فرماتا ہے ان الذین یشترون بعھد اللہ وایمانھم ثمنا قلیلا وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑا سا مال یعنی اس دنیا کی زندگی کا سامان لے لیتے ہیں وہ یوں تکلیف اٹھائیں گے۔ یوں قرآن کریم نے ایک مسلمان کو یہ بتایا ہے کہ وہ روحانیت کوئی چیز نہیں جس کے ساتھ لوگوں سے اچھا معاملہ نہیں۔

اُمی سے مراد: یہاں اُمیوں کے متعلق مفسرین نے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ بعض کے نزدیک تو مطلقاً عرب کے لوگ مراد ہیں اور یہ حالت اہل کتاب کے ان کے ساتھ معاملہ کی اسلام سے پہلے کی ہے۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مسلمان ہیں یعنی مشرکوں کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ ہوتا رہتا تھا جب اسلام آیا اور بعض لوگ مسلمان ہو گئے تو اہل کتاب نے ان کے اموال کو دبا لیا اور یہ عذر کر دیا کہ یہ لوگ چونکہ مرتد ہو گئے ہیں اس لیے اب ان کا کوئی حق ہم پر نہیں رہا۔ دونوں قسم کی روایات کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے مگر الفاظ میں عمومیت ہے اور ان تامنہ میں خطاب بھی عام ہے یعنی اے مخاطب۔ اور وجہ یہی ہے کہ اہل کتاب اپنے آپ کو عرب کے لوگوں سے بڑھ کر سمجھتے تھے اس لیے ان کے حقوق کو اپنے برابر خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا قول دوسری جگہ منقول ہے نحن ابنٰؤا اللہ واحباؤہ (المائدہ ١٨) ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں اور دوسرے لوگ ہمارے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ یہ غلط خیال اب بھی اہل کتاب میں مروج ہے کہ وہ عیسائی اقوام یا یورپین اقوام کے مقابل میں دوسری اقوام کے حقوق کو کمتر سمجھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام یورپین قومیں باوجود اعلیٰ تہذیب کے ایک نہایت ذلیل حالت میں ہیں جس سے ان کو صرف اسلام کی بلند تعلیم ہی نکال سکتی ہے جو یوں تعلیم دیتا ہے بلیٰ من اوفٰی بعھدہ عہد کسی شخص کے ساتھ ہو سپید رنگ کے آدمی سے ہو یا سیاہ رنگ کے فلاسفر سے یا جاہل سے اپنے ہم مذہب اور ہم قوم سے ہو یا غیر مذہب اور غیر قوم سے سب کے ساتھ پورا کرنا چاہیئے

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرتا ہے اور تقوےٰ کرتا ہے تو یقیناً اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔ [۴۶۷]

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی قیمت لے لیتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ اللہ ان سے کلام کریگا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کریگا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ [۴۶۸]

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

اور ان میں سے ایک گروہ ہے جو کتاب کے متعلق جھوٹ بناتے ہیں تاکہ تم اسے کتاب سے سمجھو، حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور

ایسا ہی امانت کا معاملہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایام جاہلیت کے خون وغیرہ انتقامات اور حقوق کو کالعدم قرار دیا تو ساتھ ہی امانت کے متعلق تاکید بھی فرمادی الا الامانۃ فانہا مودّاۃ الی البر والفاجر۔ مگر امانت کے حقوق باطل نہیں ہوتے اور امانت نیک کی ہو یا بد کی سب کی طرف ادا ہونی چاہیئے۔ اور چونکہ امانت اور معاہدات میں ہر ایک قسم کی ذمہ داریاں آجاتی ہیں اس لیے گویا یہ سمجھایا ہے کہ انسان کی ذمہ داری نیکوں کی طرف ہو یا بدوں کی، بڑوں کی طرف ہو یا چھوٹوں کی پوری ادا ہونی چاہیئے۔ حضرت ابن عباس کے متعلق روایت ہے کہ کسی شخص نے کہا کہ اہل ذمہ کی بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں جیسے مرغی بکری وغیرہ جنگ کے وقت ہم لے لیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ تو اہل کتاب کے قول کی مانند ہے کہ لیس علینا فی الامیین سبیل جب وہ جزیہ ادا کردیں تو ان کے اموال میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں سوائے اس کے جو وہ اپنی خوشی سے دیں۔

۴۶۷ اس چھوٹی سی آیت میں اسلام کی تعلیم کی وسعت ظاہر فرمائی ہے۔ ذکر تو صرف امانت کا تھا مگر ہر ایک قسم کی ذمہ داری کو اس کے اندر داخل کرنے کے لیے پہلے عہد کے پورا کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اور پھر تقویٰ کی طرف۔ عہد کو تو ہر ایک شخص سمجھتا ہے یعنی کوئی ذمہ داری جو انسان علی الاعلان اپنے اوپر لے لیتا ہے عہد میں داخل ہوجاتی ہے۔ مگر تقویٰ کے اختیار کرنے میں اشارہ زیادہ باریک امور کی طرف ہے۔ جن کا تعلق امانت سے ہے۔ کیونکہ امانت کی ادائیگی میں ہر قسم کے ان حقوق کی ادائیگی داخل ہے جو انسان کے ذمہ بطور امانت ہوں۔ خواہ وہ عہد کے اندر آتے ہوں یا نہ آتے ہوں۔ گویا کھلا عہد ہو یا بطور امانت کوئی ذمہ داری ہو خواہ کسی کے متعلق ہو تو ان عہدوں اور امانتوں کو ادا کرنا ضروری ہے اور اسی طرح پر انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب بنتا ہے اور چونکہ اتقا کا مرتبہ ایسا کامل ہے کہ ایفائے عہد بھی اس میں آجاتا ہے اس لیے آخر پر صرف یحب المتقین فرمایا اور ان عہود میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد بھی داخل ہے جس کے ایفا سے مراد یہ ہے کہ اس کے احکام کی جن کو انسان ایمان لاکر علی الاعلان قبول کرچکا ہے تعمیل کرے اسی لیے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے عہد کا ذکر شروع ہوجاتا ہے۔

۴۶۸ اس آیت میں ان لوگوں کا انجام بتایا ہے جو اللہ کے ساتھ عہد کرکے اور قسمیں کھا کر پھر ان کو ضائع کردیتے ہیں۔ یعنی اول ایمان کا اقرار کرتے بلکہ اس کے اوپر قسمیں کھاتے ہیں۔ پھر دنیا کے ادنےٰ ادنےٰ فوائد کے لیے یا اپنی اغراض نفسانی کے لیے اس عہد کی اور ان قسموں کی پروا تک نہیں کرتے۔ ثمنا قلیلا سے مراد متاع الدنیا قلیل ہے اور اشترا یہی ہے کہ وہ اس عہد کو ترک کردیتے اور دنیا کے حقیر فائدہ کو لے لیتے ہیں۔

عیسائی اور معاہدات: روئے سخن بالخصوص عیسائیوں کی طرف ہی ہے جن کے ساتھ یہ بحث چلتی ہے اس زمانہ میں تو عیسائیوں کی کیا طاقت تھی پیشگوئی کے رنگ میں آئندہ کا حال بتایا ہے اور آج ہم کو تمام عیسائی اقوام کی یکساں حالت نظر آتی ہے کہ معاہدات کو وہ ردّی کاغذ کے ٹکڑے سمجھتے ہیں اور اپنا مطلب نکالنے کا ذریعہ۔ ان کے انجام میں پانچ باتوں کا ذکر کیا ہے اوّل ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ یعنی صرف دنیا ہی دنیا۔ دنیا کا مال، دنیا کی حکومت ان کے مدنظر ہے اور دنیا تک ہی ان کی سب کوششیں محدود ہیں۔ دوم اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کرے گا نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دنیا میں مکالمہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے سے پیدا ہوتا ہے آخرت کا مکالمہ اسی کا نتیجہ ہے۔ سوم اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا نہیں یعنی اس کی جناب میں ان کی کچھ قدر نہ ہوگی۔ کسی کی طرف دیکھنے سے مراد یہی ہوا کرتی ہے کہ اس کی نگہ میں اس کی کچھ قدر قیمت نہیں۔ چہارم یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک نہیں کرے گا۔ کفارہ کا عقیدہ کس طرح ناپاکیوں سے باہر نکال سکتا ہے بلکہ اس سے اور گناہوں پر دلیری پیدا ہوتی ہے اور سب سے آخر فرمایا کہ آخری نتیجہ اس دنیا پرستی کا دردناک دکھ ہے۔

الْكِتٰبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٨﴾
مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ
كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ
كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ
وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾

وہ جانتے ہیں ؏۴۶۹
کسی بشر کے لیے شایاں نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور
حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں کو کہے کہ تم اللہ کو
چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ لیکن (وہ کہتا ہے)
تم ربانی ہو جاؤ اس لیے کہ تم کتاب سکھاتے تھے
اور اس لیے کہ تم (اسے) پڑھتے تھے ؏۴۷۰

؏۴۶۹ یلودن السنتہم ۔ اَلْسِنَۃ لسان کی جمع ہے اور یلودن السنتہم بالکتاب کے معنی مجاہد کے نزدیک یحرفونہ ہیں (ج) یعنی کتاب کی تحریف کرتے ہیں۔ اَلَیٌّ کے (جو یلودن سے مصدر ہے) اصل معنی فَتْلُ الْحَبْلِ ہیں یعنی رسّہ کا بٹنا یا مروڑنا مگر لَوَی لسانہٗ بکذا ایک خاص محاورہ ہے جس کے معنی میں راغب نے لکھا ہے کِنَایَۃٌ عَنِ الْکَذِبِ وتخرص الحدیث یعنی جھوٹ اور بات کے بنانے سے کنایہ ہے اور اسی کے مطابق مجاہد نے معنی کیے ہیں پس یہاں لفظی معنی زبان کو مروڑنے کے مراد نہیں بلکہ کتاب میں تحریف کے معنی ہیں یا کتاب کے متعلق جھوٹ بنانے کے۔ اور لَوَیْتُ عَنْہُ الْخَبَرَ کے معنی بھی ایسے ہی آتے ہیں اخبرتہ بہ علی غیر وجہہ (ل) یعنی جو اصل حقیقت معاملہ تھی اس کے خلاف اسے خبر دی۔ اور اللّوٰی اور الّیُّ کے معنی الباطل یعنی جھوٹ ہیں جس طرح الحَوّ اور الحَیُّ کے معنی الحق یعنی سچ بھی آتے ہیں۔

یہاں اب صاف طور پر ان کی تحریف کتاب اللہ کو بیان کیا ہے جس کی طرف پہلے امانت کے ادا نہ کرنے کا ذکر کر کے اشارہ کیا تھا اور جس طرح سورہ بقرہ میں یکتبون الکتاب بایدیہم ثم یقولون ھذا من عند اللہ کہہ کر یہ بتایا تھا کہ وہ تحریریں تحریف کرتے ہیں۔ یہاں کتاب کے پڑھنے میں ان کی تحریف کا ذکر ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ کچھ عبارتیں جھوٹ کے طور پر کتاب اللہ کی طرف منسوب کر کے پڑھ دیتے ہیں تاکہ تم ان عبارتوں کو کتاب کا حصہ سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا حصہ نہیں یعنی جو کتاب ان کے پاس ہے اس میں بھی وہ عبارتیں نہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں۔ یہاں دو باتوں کی نفی الگ الگ کی ہے۔ ایک یہ فرمایا کہ وہ کتاب میں سے نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود کتاب بھی ساری من عند اللہ نہیں یعنی پہلے اس میں تحریف موجود ہے مگر یہ اب پڑھنے میں اور بھی تحریف کر رہے ہیں اور کتاب کا لفظ من عند اللہ سے پہلے اس لیے آیا ہے کہ یلودن السنتہم بالکتاب میں کتاب کے متعلق جھوٹ بنانے کا ذکر تھا سو پہلے اس کی تردید کی۔ بعض مفسرین نے کتاب سے مراد توریت کو اور من عند اللہ سے مراد توریت سے پہلے انبیاء کی کتابوں کو لیا ہے (ق)

؏۴۷۰ ولکن کونوا ۔ تقدیر اس کی یوں ہے ولکن یقول کونوا۔

ربانیین ۔ ربانی کی جمع ہے۔ مفردات میں ہے کہ ربانی یا تو ربان کی طرف منسوب ہے۔ جیسے عطشان۔ سکران آتا ہے اور یا رب کی طرف منسوب ہے اگر رب کو مصدر تربیت کرنے کے معنی میں لیا جائے اور ربانی وہ علم ہے جو علم کو نشو و نما دیتا ہے اَلَّذِیْ یَرُبُّ الْعِلْمَ اور یا وہ جو علم کے ساتھ اپنی تربیت کرتا ہے اَلَّذِیْ یَرُبُّ نَفْسَہٗ بِالْعِلْمِ (غ) راغب کہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے متلازم ہیں۔ کیونکہ جو شخص اپنے نفس کی تربیت علم سے کرتا ہے وہ علم کو بھی نشو و نما دیتا ہے اور ایسا ہی اس کے برعکس اور بعض کے نزدیک رب کی طرف منسوب ہے جب اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہو اور یہ اس طرح ہے جیسے ایک شخص کے متعلق کہہ دیا جائے الھیّ (غ) یعنی اللہ کی طرف منسوب اور اس سے مراد ہوگی مقبلا الی معرفۃ الالہ وطاعتہ (ق) یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اطاعت کی طرف بڑھنے والا۔ اسی لیے ربانی سے مراد بعض نے اہل علم کو لیا ہے یا فقیہ کو بعض نے عالم حکیم کو بعض نے حکیم متقی کو۔ اور حضرت علی کا قول منقول ہے انا ربانی ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ میں اس امت کا ربانی ہوں اور جب حضرت ابن عباس فوت ہوئے تو ابن حنفیہ نے کہا مات ربانی ھذہ الامۃ اور بخاری میں ہے الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارھا ۔ یعنی ربانی وہ (فقیہ) ہے جو لوگوں کو علم کی آسان باتیں اس کی مشکل باتوں سے پہلے سکھاتا ہے۔ لفظ ربانی میں بھی عیسائی عقیدہ پر ایک زد کی ہے یعنی انسان رب کو پہنچنے والا تو ہو سکتا ہے مگر رب نہیں ہو سکتا۔

تدرسون ۔ درس الدار کے معنی ہیں بقی اثرھا (غ) یعنی اس کا اثر باقی رہا۔ اس لیے دَرَسْتُ الْعِلْمَ کے معنی ہیں تَنَاوَلْتُ اَثَرَہٗ (غ) یعنی اس کے اثر کو لیا اور چونکہ علم کا ایک دوسرے سے لینا قرأت کے ہمیشہ رہنے سے ہوتا ہے اس لیے درس سے مراد قرأت کا ہمیشہ رکھنا بھی ہے یہاں تعلیم سے الگ درس کا ذکر اسی معنی میں ہے۔

عیسائیت کی تحریف: تحریف کتاب کے ذکر میں اب ان کی ایک عظیم الشان تحریف کا ذکر کرتا ہے کہ انہوں نے بعض کلمات حضرت عیسیٰ کی طرف ایسے منسوب کر دیئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو کہ وہ یہ تعلیم دیتے تھے کہ وہ خدا ہیں حالانکہ انہی کی کتابوں میں حضرت عیسےٰ کے ایسے اقوال بھی موجود ہیں کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے اور اپنی عبودیت کا بھی اقرار ہے تو اس لیے فرماتا ہے کہ ایک ایسے بشر کے لیے جسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکم اور نبوت دے یہ کہاں شایاں ہے کہ وہ پھر لوگوں کو یہ بھی کہے کہ اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر میری عبادت کرو اور مجھے اپنا خدا مانو۔ وہ تو یہی تعلیم دیگا کہ تم ربانی بنو یا خدا تعالیٰ کی طرف قدم آگے بڑھانے والے بنو یا

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ
النَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا ۭ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ
بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝٨٠

اور نہ یہ کہ وہ تم کو حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خداوند بنالو کیا وہ تم کو کفر کا حکم دے گا اس کے بعد کہ تم مسلم ہو چکے ہو۔ [۴۷۱]

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ
اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ
رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ
وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ
عَلٰى ذٰلِكُمْ إِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا أَقْرَرْنَا ۭ قَالَ
فَاشْهَدُوْا وَأَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝٨١

اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعہ سے عہد لیا کہ جو کچھ مَیں نے تمھیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمھارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو انھوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں کہا پس گواہ رہو اور مَیں تمھارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ [۴۷۲]

عالم وفقیہ بنو۔ کیونکہ عیسائیوں نے جو بعض استعارات کی بنا پر مسیح کو خدا بنایا ہے تو درحقیقت انہوں نے فقاہت سے کام نہیں لیا ورنہ اگر تدبر کرتے تو ان کو صاف سمجھ آجاتا کہ حضرت مسیح کے کسی کلمہ میں اگر خدا کے بیٹے کا لفظ اپنے لیے آگیا ہے تو وہ خود ہی فرماتے ہیں کہ میرا خدا کا بیٹا اپنے آپ کو کہنا اس لیے قابل الزام نہیں کہ تمہارے بڑے یعنی بنی اسرائیل کے بزرگوں پر تو خدا کا لفظ بھی بولا گیا ہے گویا ان کی مراد یہ تھی کہ جس طرح وہ مجاز اور استعارہ کے رنگ میں خدا کہلائے اسی طرح میں مجاز اور استعارہ کے رنگ میں خدا کا بیٹا کہلایا۔ لیکن ایک قوم اٹھی جس نے نہ تو خدا کی طرف قدم اٹھانے میں ترقی کی نہ علم وفقاہت سے کام لیا اور لفظ پرستی اختیار کرکے مسیح کی طرف اس عقیدہ کو منسوب کردیا کہ وہ یہ تعلیم دیتا تھا کہ میں ہی خدا ہوں اس لیے میری ہی عبادت کرو۔
علمائے ربانی مثیل اور وارث انبیاء ہیں: تم ربانی بنو اس لیے کہ تم تعلیم کتاب اور درس کتاب دیتے ہو۔ معلوم ہوا کہ ربانیت کا مرتبہ محض تعلیم وتدریس سے اوپر ہے ایسے ہی علماء یعنی علمائے ربانی کے حق میں کہا گیا ہے العلماء ورثة الانبياء کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انہی کے حق میں ہے علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں۔
یہاں اشارہ صاف حضرت عیسٰی کی طرف ہے۔ اور آپ کو اور آپ کی طرح ہر نبی مرسل کو تین چیزیں دینے کا ذکر ہے۔ کتاب، حکم، نبوۃ۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کو لازماً کتاب وحکم ملتا ہے، حکم سے مراد فیصلہ کرنے کا اختیار ہے یعنی وہ خود صاحب اختیار ہوتا ہے اور وحی الٰہی کے ماتحت فیصلہ کرتا ہے دوسری جگہ اٹھارہ نبیوں کا ذکر کرکے فرمایا ہے اولٰئك الذين اٰتينٰهم الكتاب والحكم والنبوة (الانعام - ۹۰)

۴۷۱ ولا یامرکم۔ یا مر پر نصب ہے اس لیے کہ یقول پر عطف ہے اور لا مزید تاکید کے لیے ہے۔ یا ترکیب عبارت یوں ہے ما کان لبشر ان.... یقول..... ولا ان یامرکم۔
وفد نجران کا خیال کہ آنحضرت خود خدا بنتے ہیں: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد نجران کو بہت سمجھایا تو انہوں نے کہا اتریدان نعبدك ونتخذك ربا کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو رب بنالیں تو آپ نے فرمایا معاذ اللہ۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کہ یہ اس قدر زور جو حضرت مسیح کی خدائی کے خلاف دے رہے ہیں تو شاید اپنے آپ کو خدا منوانا چاہتے ہیں اور کیا غرض ہو سکتی ہے؟ اس آیت میں اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے کہ یہ تو کسی نبی کو بھی شایاں نہیں کہ وہ لوگوں کو یہ کہے کہ نبیوں یا فرشتوں کو اپنے خداوند مانو کیونکہ نبی تو مسلم فرمانبردار بنانے آتا ہے اور کسی دوسرے کی عبادت یا اس کو خدا ماننا یہ کفر میں داخل ہے پھر نبی اپنے کیے پر آپ پانی کیوں پھیرے گا۔ اس آیت میں اس استدلال کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی نبی کو یہ شایاں ہوتا تو کوئی نبی دنیا میں اور بھی ایسا ہوا ہوتا جس نے یہ تعلیم دی ہوتی مگر حضرت مسیح کے متنازعہ اقوال کو چھوڑ کر کیا دنیا کے کسی اور نبی کا ایسا قول دکھایا جا سکتا ہے؟ جب اس قدر نبی دنیا میں آئے اور کسی نے ایسی تعلیم نہیں دی تو معلوم ہوا کہ مسیح کی طرف ایسی تعلیم منسوب کرنا بھی درست نہیں۔

۴۷۲ میثاق النبیین۔ میثاق کی اضافت النبیین کی طرف دو طرح پر ہو سکتی ہے۔ یا تو انبیاء معاہد منہ ہیں اور میثاق النبیین سے مراد وہ میثاق ہے جو نبیوں سے لیا گیا اور یا انبیاء معاہد ہیں یعنی عہد لینے والے اور میثاق النبیین سے مراد وہ عہد ہے جو انبیاء نے لیا جیسے میثاق اللہ اس عہد کو کہہ سکتے ہیں جو اللہ نے لیا۔ قرآن کریم میں آتا ہے میثاقه الذی واثقکم به (المائدۃ - ۷) جہاں میثاقہ سے مراد اللہ کا میثاق یا وہ عہد ہے جو اللہ تعالٰی نے لیا اور چونکہ انبیاء علیہم السلام نے تو آنحضرتؐ کے وقت تک زندہ نہ رہنا تھا اور میت مکلف نہیں اس لیے دوسرے معنی ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ گویا ترکیب یوں ہوئی اذ اخذ

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ پھر جو کوئی اس کے بعد پھر جائے تو وہی بدعہد ہیں۔

اللہ المیثاق الذی وثقہ النبیون علٰے اممھم یہی معنی حضرت ابن عباس نے کیے ہیں جب آپ سے کہا گیا کہ فلاں شخص میثاق الذین اوتوا الکتاب پڑھتا ہے (اور یہ قرأت گویا تفسیر اصل الفاظ کی تھی) تو آپ نے فرمایا انما اخذ اللہ میثاق النبیین علٰے اممھم (د) یعنی اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا میثاق ان کی امتوں پر لیا۔ اور بعض نے یہاں النبیین سے مراد حذف مضاف پر امم النبیین لیا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں کی اُمتوں کا عہد لیا۔ ایک اور صورت وہ ہو سکتی ہے جو ترجمہ میں اختیار کی گئی۔ یعنی وہ عہد جو انبیاء کے ذریعہ سے لیا گیا قرآن کریم میں اس کی اور مثال بھی موجود ہے الم یؤخذ علیھم میثاق الکتاب (الاعراف۔ ۱۶۹) کیا ان سے میثاق کتاب نہیں لیا گیا۔ جہاں میثاق کتاب سے مراد وہ میثاق ہے جو کتاب میں مذکور ہے یا جو بذریعہ کتاب لیا گیا۔ کثیر علماء جیسا کہ امام رازی نے لکھا ہے اسی طرف گئے ہیں کہ یہاں مراد وہی میثاق ہے جو نبی اپنی امتوں سے لیتے تھے۔ المراد ان الانبیاء کانوا یاخذون المیثاق من اممھم بانہ اذا بعث محمد فانہ یجب علیھم ان یومنوا بہ وان ینصروہ وھذا قول کثیر من العلماء۔

لَمَا۔ اس کے معنی یہاں دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ یا تو ما موصولہ اور لام ابتدا کے لیے ہے اور معنی یوں ہونگے وہ جو میں نے تم کو کتاب و حکمت سے دیا اور یا ما متضمن معنی شرط ہے اور اخذ میثاق کو قسم لینے کے معنی میں لیکر لتومنن بہ کو جواب قسم سمجھا جائے اور جواب شرط یا جزا کے علیحدہ ذکر کی ضرورت جواب قسم کے آجانے کی وجہ سے نہ رہی۔

اخذتم سے مراد یہاں قبلتم ہے یعنی تم نے قبول کیا۔ جیسے ان اوتیتم ھٰذا فخذوہ میں۔

اِصْرِی۔ اِصر کے اصل معنی ع۳۶۵ میں بیان ہو چکے ہیں۔ الثقل والشد۔ بوجھ اور مضبوط باندھ دینا۔ اس کے معنی عہد شکنی کا گناہ بھی آتے ہیں ع۲۶۵ اور اِصْر اس عہد موکد کو بھی کہتے ہیں جو توڑنے والے کو ثواب سے پیچھے رکھتا ہے (غ) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِصر کے معنی یہاں مطلق بوجھ یا ثقل ہوں جو اس کے اصل معنی ہیں اور اخذتم اصری سے مراد ہو کہ یہ بوجھ جو میں تم پر ڈالتا ہوں کہ رسول موعود کی نصرت کرنا ہوگا اس بوجھ کو تم قبول کرتے ہو۔ چنانچہ دوسری جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا یضع عنھم اصرھم ان کے بوجھ کو ان سے ہٹاتا ہے۔ یعنی اس رسول کو قبول کرنے سے وہ بوجھ جو انسانوں پر رکھا گیا تھا قبول کرنے والوں کے ذمہ سے ہٹ گیا۔

آنحضرت جملہ انبیائے عالم کے موعود ہیں: اصل بحث اہل کتاب سے تھی ان پر کامل اتمام حجت کر کے اور پچھلے رکوع میں ان کو پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلا کر اب بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کی پیشگوئیاں صرف یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں ہی نہیں بلکہ اسلام جملہ انبیائے عالم کا موعود مذہب ہے اور اس رکوع میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم سب نبیوں کے موعود ہونے کے لحاظ سے اوّل النبیین اور بعثت میں آخری نبی ہیں۔ اور اس سے اگلے رکوع میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ خانہ کعبہ سب سے پہلا خدا کا معبد ہے جو زمین پر مقرر کیا گیا اور وہ آخری معبد بھی ہے اس لحاظ سے کہ اس کی خیر و برکت دائمی ہے اور کبھی منقطع نہ ہوگی گویا یہ دونوں رکوع اسلام کی کمال عظمت کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

اس بات پر کہ رسول مصدق جس کے آنے کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد آنحضرت صلعم ہیں قریباً قریباً اُمت کا اتفاق ہے۔ اور ابن جریر میں حضرت علیؓ سے یہ روایت ہے لم یبعث اللہ تعالی نبیاً آدم فمن بعدہ الا اخذ علیہ العھد فی محمد صلعم یعنی آدم سے لیکر آخر تک اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جس سے محمد صلعم کے متعلق عہد نہ لیا ہو اور یہی صحیح ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک قوم میں اور ہر ایک امت میں ایک رسول مبعوث کیا یا بعض قوموں میں ایک سے زیادہ رسول بھی مبعوث کیے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ جس قدر رسول آنحضرت صلعم سے پہلے آتے رہے یہ سب خاص خاص قوموں کی طرف آتے رہے۔ کل دنیا کی طرف مبعوث ہونا یہ صرف ایک ہی رسول کے لیے مخصوص رکھا گیا جو سب سے آخر اور سب کو ایک دین پر جمع کرنے کے لیے آیا۔ تو چونکہ اس رسول نے ساری قوموں کو ایک دین پر جمع کرنا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ساری قوموں سے بذریعہ اُن کے نبیوں کے یہ عہد لیا کہ جب وہ رسول آجائے تو تم سب نے اس کے دین پر چلنا ہوگا۔ کیونکہ اصل غرض یہی تھی کہ نسل انسانی کے اندر سے قومیت کی تفرقیوں کو مٹایا جائے اور سب کو بھائی بھائی بنایا جائے مگر مختلف قوموں میں مختلف نبیوں کے آنے سے قومی امتیازات ایک حد تک مضبوط ہوتے چلے گئے۔ کیوں کہ ہر قوم ہدایت کے لیے اپنے ہی نبی کو دیکھتی تھی اور اس کو دوسری قوم کے نبی کی تعلیم سے کوئی سروکار نہ تھا اور چونکہ تعلقات بین الاقوام بھی اس وقت نہ تھے۔ سب قومیں اپنے اپنے ملکوں میں علیحدہ علیحدہ پڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے ان حالات کا اقتضا بھی یہی تھا کہ ہر قوم کے اندر جدا جدا نبی مبعوث ہو مگر یہ علیحدگی جو ملکوں اور قومیتوں کی حد بندی سے پیدا ہوئی ہمیشہ کے لیے رہنے والی نہ تھی اس لیے یہ ضروری ہوا کہ جب وہ وقت آجائے کہ تعلقات بین الاقوام کی راہیں کھل جائیں تو قومی رسولوں کی بجائے ایک ہی رسول ساری دنیا کی طرف مبعوث ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی رسول دنیا میں ہوا جس نے علی الاعلان بار بار کہا کہ میں کل عالمین کی طرف آیا ہوں اور جس کے متعلق ارشاد ہوا کہ ہم نے تم کو کافۃ للناس بھیجا ہے جس نے قومیتوں کی ساری تفریقوں کو مٹایا اور نسل انسانی کو وہ حکم خداوندی سنایا جو ان کو بھائی بھائی بنانے والا تھا، یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثٰی وجعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم (الحجرات ۴۹۔ ۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم کو شاخیں اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب

اَفَغَيۡرَ دِيۡنِ اللّٰهِ يَبۡغُوۡنَ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّاِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ ۝۸۳	تو کیا اللہ کے دین کے سوا کچھ اور چاہتے ہیں اور جو آسمانوں اور زمین میں ہیں خوش اور ناخوش اسی کے فرمانبردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ۴۷۳

سے معزز وہ ہے جو سب سے متقی ہے۔ تو چونکہ اس رسول نے سب قوموں کو دین واحد پر جمع کرنا تھا۔ اس لیے سب قوموں سے یہ عہد لیا گیا کہ تم نے اس رسول پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنی ہوگی اور یہ عہد ہر ایک قوم سے بذریعہ ان کے نبی کے لیا گیا۔ یہی وہ مضمون ہے جس کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے اسی کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں آیا ہے انا اوّل النبیین خلقا واٰخرھم بعثا۔ کیونکہ اگر آپ اوّل النبیین خلقاً نہ ہوتے تو آپ کے متعلق ہر نبی سے وعدہ کس طرح لیا جاتا۔ اور بعثت میں آخری اس لیے ہوئے کہ تا کل نبیوں سے آپ کے متعلق عہد لیا جائے اور آپ بھی کل کی تصدیق کریں۔

آخری رسول کی سب سے بڑی علامت تصدیق رسل عالم ہے: اس رسول کی سب سے بڑی علامت جو یہاں بتائی وہ یہ ہے کہ وہ مصدق لما معکم ہے یعنی اس کی تصدیق کرتا ہے جو پہلی قوموں کے پاس ہے۔ یہ ایک امتیازی نشان ہے جو رسول عربی فداہ امی وابی میں پایا جاتا ہے کیونکہ یہی ایک رسول ہے جس نے اپنے سے پہلے دنیا کے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا، چنانچہ اس کا ذکر قرآن کریم میں بار بار ہے۔ ابتدائے قرآن میں ہی فرمایا یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک (البقرۃ ۲-۴) جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا اس سب پر ایمان لاتے ہیں اور پھر بار بار فرمایا لانفرق بین احد من رسلہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں بھی اس رسول مصدق کے اس امتیازی نشان کا ذکر فوراً کر دیا جیسا کہ آیت ۸۳ میں فرمایا قل اٰمنا باللّٰہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسٰی وعیسٰی والنبیون من ربھم لانفرق بین احد منھم پس درحقیقت یہاں بتا دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے کل نبیوں کی تصدیق فرماتے ہیں اور اس طرح پر قرآن نے خود ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ رسول مصدق لما معکم سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ محمد رسول اللہ صلعم ہی دنیا میں ایک رسول ہوا ہے جس نے دنیا کے کل نبیوں کی تصدیق کی ہے اور ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔

حواریان مسیح کی شہادت آنحضرتؐ کے لیے: حضرت مسیح کے حواریوں نے بھی اس بات کی شہادت دی ہے کہ وہ نبی مثل موسیٰ جس کی پیشگوئی استثناء ۱۸-۱۵ تا ۱۸ میں ہے اس کے متعلق دنیا کے کل نبیوں نے شہادت دی ہے۔ چنانچہ اعمال رسل باب ۳ آیت ۲۱ میں ہے "ضرور ہے کہ آسمان اسے لیے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے ایک نبی میری مانند اٹھائے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو۔" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے بعد تک اس پیشگوئی کا انتظار تھا۔ اور دنیا میں ایک ہی شخص ہوا ہے جس نے یہ دعویٰ کیا کہ میں وہ نبی ہوں جس کی بابت کل نبیوں نے خبر دی تھی اور جس طرح اس کی خبر سب نبیوں نے دی۔ اسی طرح اس نے سب نبیوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ قرآن کریم اگر تفصیلات میں پڑتا تو اتنی بڑی کتاب تو صرف نبیوں کی پیشگوئیوں کے ذکر کیلئے کافی ہوتی اس لیے یہاں یہ بتا کر کہ کل نبیوں سے یہ عہد لیا گیا تھا اس کا موٹا نشان یہ بتایا کہ کل نبیوں کا موعود کل کی تصدیق کرنے والا ہے اور ان من امۃ الا خلا فیھا نذیر کہنے والا دوسرا کوئی انسان دنیا میں نہیں گزرا اور یہ موٹا نشان بتا کر صرف سلسلہ بنی اسرائیل کے جد امجد اور انکے آخری نبی کی پیشگوئیوں کا ذکر صراحت سے کر دیا یعنی حضرت ابراہیم کی اس دعا کا ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیٰتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم (البقرۃ ۲-۱۲۹) اور حضرت مسیح کی اس پیشگوئی کا ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد (الصف ۶۱-۶) اور باقی سب کے متعلق کہہ دیا یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل (الاعراف ۷-۱۵۷) وانہ لفی زبر الاولین (الشعراء ۲۶-۱۹۶) چونکہ کثرت سے کتابوں میں اب بھی آپ کی پیشگوئی موجود ہے اس لیے اگر کسی کتاب میں سے ضائع بھی ہو گئی ہو تو اس پر تعجب نہیں۔

۴۷۳ یبغون۔ بغی کے اصل معنی میانہ روی سے تجاوز کو چاہنا ہے دیکھو ۱۱۵ گویا دین اللہ یا اسلام میانہ روی سکھاتا ہے اور جو اس کو چھوڑ کر کچھ اور چاہتا ہے وہ میانہ روی سے تجاوز کو چاہتا ہے۔

اَسْلَمَ۔ اسلام کے اصل معنی فرمانبرداری کرنا ہیں اور یہی وسیع معنی یہاں مراد ہیں جیسا کہ تمام مخلوق ارضی و سماوی کی طرف اسلم منسوب کرنے سے ظاہر ہے۔

طوعاً و کرھاً دونوں مصدر ہیں جو حال کی جگہ پر آئے ہیں یعنی مراد ہے طائعین و کارھین۔

طوع کے معنی ہیں فرمانبرداری اختیار کرنا یعنی رضا و رغبت سے اور کرہ اس کی ضد ہے۔

اس آیت میں اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گویا پہلی آیت میں بتایا تھا کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا موعود مذہب ہونے کے لحاظ سے ساری نسل انسانی کا مذہب ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اسلام اپنی حقیقت میں کل عالم کا مذہب ہے صرف زمین میں انسانوں کا ہی نہیں بلکہ من فی السمٰوٰت ومن فی الارض کا مذہب ہے کیونکہ اسلام کے اصل معنی فرمانبرداری ہیں اور مذہب کے رنگ میں قوانین شریعت کی فرمانبرداری کا نام اسلام ہے اور عام رنگ میں قوانین الٰہی کی فرمانبرداری بھی اسلام ہی ہے۔ پس اسلام جمیع مخلوقات کا مذہب ہے کیونکہ اس وسیع عالم میں جو چیز قوانین الٰہی کی

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ	کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا
مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ	اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ
اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ	اور (اس کی) اولاد پر اتارا گیا۔ اور جو موسےٰؑ
مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠	اور عیسےٰؑ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا
لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ	ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اُسی
لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾	کے فرماں بردار ہیں ع۴۷۴
وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ	اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہتا ہے،
يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ	تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾	نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا ع۴۷۵
كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ	اللہ ان لوگوں کو کس طرح ہدایت کرے جو اپنے ایمان کے

فرمانبرداری نہ کرے گی اس کا وجود ہی نہیں رہ سکتا بالفاظ دیگر ہر شے کا وجود ہی قوانین کی فرمانبرداری پر ہے۔ پس حقیقی معنی میں اسلام ہی عالمگیر مذہب ہے کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ سے لیکر بڑے سے بڑے کرہ تک سب اللہ تعالیٰ کے قوانین کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔

طوعاً وکرہاً فرمانبرداری سے مراد: طوعاً وکرھاً سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ خواہ کچھ ہو کوئی چیز قانون الٰہی کی فرمانبرداری سے باہر نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ فرمانبرداری تو طوعاً ہی ہوتی ہے یعنی اپنی رضا و رغبت سے۔ لیکن اگر ان چیزوں کو اختیار ہوتا کہ وہ فرمانبرداری کریں یا نہ کریں اور اپنی رضا و رغبت سے وہ فرمانبرداری نہ کریں تو کرہاً بھی ان کو فرمانبرداری اختیار کرنی پڑتی یا طوعاً وکرہاً میں دو قسم کی فرمانبرداری کا ذکر ہے۔ ایک تو وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش فرمانبرداری کے خلاف ہو سکتی ہی نہیں جیسے مثلاً ملائکہ یا خود زمین و آسمان اور ان کی طاقتیں جیسا کہ اتینا طائعین (حٰم السجدۃ ۴۱-۱۱) سے ظاہر ہے طبعی امور میں انسان بھی اسی طرح فرمانبرداری اختیار کرتا ہے۔ مگر وہ امور جن کا تعلق اختیار اور ارادہ سے ہے ان میں کرہ بمعنی مشقت کے ساتھ فرمانبرداری ہے یعنی اس کام کو انسان طبعاً نہیں کرتا بلکہ مشقت اس کے لیے بکار ہے اور یا کرہ بمعنی ناخوشی سے یوں فرمانبرداری ہے کہ کافر جب خوشی سے ان قوانین کی فرمانبرداری نہیں کرتا تو ناخوشی سے بھی اس کو کرنی پڑتی ہے کیونکہ ایسے قوانین میں فرمانبرداری دو طرح پر ہے جو شخص ان قوانین پر چلتا ہے وہ سُکھ پاتا ہے جو نہیں چلتا وہ دکھ اُٹھاتا ہے۔ پس جس نے قانون کی فرمانبرداری طوعاً نہ کی اس کو کرھاً یعنی دکھ اور سزا کے رنگ میں کرنی پڑی۔ اسی لحاظ سے مفسرین نے طوعاً فرمانبرداری مومن کے لیے اور کرھاً کافر کے لیے لکھی ہے (ث)

ع۴۷۴ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ واقعی یہی رسول مصدق ہے جو سب کا موعود تھا کیونکہ اس نے سب انبیاء پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔

ع۴۷۵ الخاسرون۔ خسر اور خسران راس المال کے کم ہو جانے کا نام ہے (غ)

اسلام کو چھوڑنا فطرت بگاڑنا ہے: جب دین اسلام سب انبیاء کا موعود بھی ہوا۔ سب رسولوں کا مصدق بھی ہوا بلحاظ اپنے معنی کے تمام ذرات عالم کا مذہب بھی ہوا، تو جو شخص ایسے کامل دین کو چھوڑ کر ناقص چیز کو قبول کرے وہ واقعی خسارہ میں ہے اور چونکہ خسران راس المال کے ضائع ہو جانے کا نام ہے اس لیے اس نے گویا اپنے راس المال کو بھی تباہ کر دیا۔ انسان کا راس المال مذہب کے معاملہ میں اس کی فطرت ہے اور حدیث شاہد ہے کہ کل مولود یولد علی الفطرۃ ہر ایک انسانی بچہ اسی فطری دین پر پیدا ہوتا ہے۔ پس جو شخص اسلام یا کامل فرمانبرداری کی راہوں کو ترک کر کے ادھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے اس نے اپنی فطرت کو بھی بگاڑ دیا۔

نجات اور دوسرے مذاہب: یہ آیت اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کامل راہیں نجات کی صرف اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ گو قرآن کریم دوسرے مذاہب میں خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے گو اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ سب مذاہب کی ابتدا خدا کی طرف سے ہی ہے مگر ساتھ ہی اس امر حق کا بھی اظہار فرماتا ہے کہ سب مذاہب میں غلطیوں کے راہ پا جانے سے اب انسان ان کے ذریعہ سے گناہ سے نجات یا اخروی نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی معنی ہیں اس حدیث صحیح کے من عمل عملاً لیس علیه امرنا فهو رد (ث) جو شخص ایسا عمل کرتا ہے جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے۔ ہاں ہر ایک نیکی کے کام پر خدا اور اس کے رسول کا امر موجود ہے پس نیکی کا کام کوئی بھی کرے مردود نہیں اور اس لیے یہ ضروری ہے کہ سب لوگ دین واحد پر جمع ہو کر گناہ کی غلامی سے بھی نجات حاصل کریں اور دنیا میں ایک عظیم الشان اخوت نسل انسانی کے قائم کرنے کا موجب بھی ہوں۔

اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾

بعد کافر ہوئے اور وہ گواہ ہیں کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۴۷۶

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾

ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور لوگوں سب کی لعنت ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾

اس میں رہیں گے نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی ۴۷۷

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

مگر وہ جنھوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کی تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۴۷۸

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾

جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے، پھر کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ قبول نہیں ہوتی اور وہی گمراہ ہیں۔ ۴۷۹

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ

جو کافر ہوئے اور مرگئے اور وہ کافر ہی تھے،

---

۴۷۶ اہل کتاب کا باوجود مشاہدہ صداقت نبوی سے انکار: گو بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں ایک خاص گروہ کا ذکر ہے جو اسلام لا کر پھر مرتد ہو گئے اور اہل مکہ سے جا ملے اور ان میں ابو عامر راہب کا نام بھی لیا گیا ہے۔ مگر حسن اور ابن عباس سے روایات صریحہ ہیں کہ ان آیات میں اہل کتاب کا ہی ذکر ہے اور یہی سیاق وسباق عبارت چاہتا ہے۔ اصل مخاطب تو اس رکوع میں اہل کتاب ہی ہیں۔ اسلام پر اس قدر کھلے دلائل کے باوجود ان لوگوں نے کوئی توجہ اسلام کی طرف نہ کی کفروا بعد ایمانھم سے یہ مراد ہے کہ وہ پہلے انبیاء پر ایمان لائے اور اس کے بعد اب محمد رسول اللہ صلعم کا کفر کرتے ہیں وشھدوا ان الرسول حق میں یہ اشارہ ہے کہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا یہ لوگ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔ جیسا دوسری جگہ فرمایا یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم (البقرۃ ۲: ۱۴۶) اور دوسری جگہ فرمایا لم تکفرون بآیات اللہ وانتم تشھدون (۶۹) بینات سے مراد وہ کھلے دلائل ہیں جن میں سے کئی ایک یہاں بھی بالتفصیل بیان ہو چکے ہیں۔ اللہ کے ان کو ہدایت نہ دینے سے یا تو یہ مراد ہے کہ ان کو ہدایت کی منزل مقصود پر نہیں پہنچاتا۔ یا یہ کہ ان کو کامیاب نہیں کرتا یا جنت میں نہیں پہنچاتا اور یا یہ کہ ایسے ظالموں سے ہدایت کی توفیق چھین لیتا ہے اور یہ ان کے دلائل کی طرف توجہ نہ کرنے اور باوجود مشاہدہ حق کو قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

۴۷۷ ان لعنتوں کے متعلق دیکھو ۱۹۹ دونوں جگہ اس لعنت کو دوزخ قرار دیا ہے اسی لیے فرمایا خالدین فیھا۔

۴۷۸ توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے: اسلام کوئی ایسی مہر کفار کے قلوب پر تجویز نہیں کرتا جو ٹوٹ نہ سکتی ہو۔ ان لوگوں کی زیادتیوں اور کفر پر اصرار وغیرہ کا سارا ذکر کر کے اور ان کی خطرناک سزا کا ذکر کر کے فرماتا ہے پھر بھی جو لوگ توبہ کریں اور توبہ کے ساتھ اصلاح کریں وہ اس سزا کے پانے والے نہیں ہونگے مگر توبہ کے ساتھ اصلاح شرط ہے اور اس پر غفر کا وعدہ ہے یعنی ان کی وہ طاقتیں جو ان سے بدیاں کراتی تھیں اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرے گا۔

۴۷۹ ازدیاد کفر: ازدادوا کفرا سے مراد اصرار علی الکفر ہے کیونکہ جب کفر پر اصرار ہوتا ہے تو وہ بڑھتا رہتا ہے اور یا عداوت میں بڑھتے جانا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے یہودیوں سے مخصوص کیا ہے کہ انہوں نے پہلے حضرت موسیٰ پر ایمان لا کر پھر حضرت عیسیٰ کا انکار کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے کفر میں بڑھ گئے۔ مگر یہ بلاوجہ تحدید ہے۔ سارے اہل کتاب مراد ہیں جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ اور کفر میں ان کا ترقی کرتے جانا مخالفت حق میں بڑھتے جانا ہے۔ ایسے لوگ اگر گھر میں بیٹھ کر توبہ بھی کریں تو یہ توبہ قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کے اعمال اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ اور حق کو وہ ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں توبہ کیسی! اور یا جیسا کہ ابن الانباری اور قفال نے کہا ہے یہ متعلق ہے ان لوگوں کے جن کا ذکر الا الذین تابوا میں پہلے آچکا ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر توبہ کر کے پھر کفر کی طرف لوٹ گئے اور کفر میں بڑھتے گئے تو وہ ان کی پہلی توبہ قبول نہ ہوئی۔

فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ
ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾ ع
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ
وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾
كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا
مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ
اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ
فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾

تو ان میں سے کسی سے زمین بھر کر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ اسے فدیہ دے ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کے لیے کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔ ۴۸۰

تم راستبازی کو ہرگز حاصل نہ کرو گے یہانتک کہ اس سے خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔ ۴۸۱

کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں قبل اس کے کہ تورات اتاری جائے۔ سوائے اس کے جو اسرائیل نے اپنی جان پر حرام کرلیا ۔ کہہ تو تورات لاؤ پھر اسے پڑھو، ۴۸۲ اگر تم سچے ہو۔

ع۴۸۰ ملء الارض ۔ ملء الشئ سے مراد ہوتی ہے۔ مقدار مایملاء یعنی وہ مقدار جس سے وہ شے بھر جائے ۔ پس اس قدر سونا مراد ہے جس سے زمین بھر جائے۔

مال دنیا آخرت میں کام نہ دیگا: اس آیت میں صاف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب جو دین حق سے منحرف ہو کر اس قدر سونا کمائیں گے کہ گویا ساری زمین ہی سونے سے بھر جائے گی تو اس قدر سونا بھی اس نقصان کی تلافی نہ کرسکے گا جو دین سے انحراف میں انہوں نے اُٹھایا ہوگا لو افتدٰی بہ اس لیے فرمایا کہ یوں قبول نہ کرنے میں اس قدر اظہار ناراضگی نہیں جس قدر اس میں بطور فدیہ کوئی چیز پیش کی جائے تو اسے قبول نہ کیا جائے ۔ گویا یوں فرمایا کہ ان کا ساری زمین کو سونے سے بھر دینا تو کسی کام ہی نہیں بطور فدیہ بھی دیں تو قبول نہیں ہوگا۔ اور من احدھم اسلیے فرمایا کہ جس قدر سونا سب مل کر پیدا کر سکتے ہیں اتنا اتنا اکیلا بھی کرے تو اسے کچھ کام نہ دے گا۔ بتایا ہے کہ اخلاق اور روحانیت کے مقابلہ میں سونا ہیچ ہے۔

ع۴۸۱ مال دنیا کو معبود بنانے والوں کے مقابل پر خیر و برکت حاصل کرنے کی راہ: مِمّا میں مِنْ تبعیضیہ بھی ہو سکتا ہے یعنی بعض حصہ اس کا خرچ کرو جس سے تم کو محبت ہے اور بیانیہ بھی ہو سکتا ہے۔

پچھلے رکوع میں اسلام کی صداقت کی اس عظیم الشان دلیل کی طرف توجہ دلائی تھی کہ یہ سب انبیاء کا موعود ہے اس رکوع میں ایک ایسی ہی اور عظیم الشان دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کا مرکز یعنی خانہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا معبد ہے اس لیے ضروری تھا کہ الگ الگ قوموں میں نبی بھیجنے کے بعد دنیا کا آخری معبد اور ساری نسل انسانی کی عبادتگاہوں کا مرکز اسی کو قرار دیا جاتا اور یوں اصولی طور پر دو عظیم الشان امور کی طرف اہل کتاب کو توجہ دلائی ہے مگر چونکہ سلسلہ مضمون اس رنگ میں چلتا تھا کہ اہل کتاب اگر ساری زمین کو بھی سونے سے بھر دیں تو وہ اُن کی بدیوں کا فدیہ نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے اب مسلمانوں کو بتایا ہے کہ وہ البر خیر وسیع یا سب قسم کی خیر کے ابواب میں کس طرح داخل ہو سکتے ہیں ۔ کیونکہ سونے سے زمین بھرنے والوں کے بالمقابل جنہوں نے اپنی ساری طاقتوں کو اس سفلی زندگی پر لگا دیا ہے اس گروہ کا ذکر ضروری تھا جو ہر قسم کی خیر اور نیکی کو حاصل کرے تو اس کا گر یہ بتایا کہ جن چیزوں سے تم کو محبت ہے وہ خرچ کرو تو جمیع ابواب خیر میں داخل ہو سکتے ہو بعض نے یہاں البر کے معنی جنت لیے ہیں مگر ماحصل دونوں کا ایک ہے کیونکہ جس نے جمیع خصائل خیر حاصل کر لیے وہ اسی دنیا میں جنت میں داخل ہو گیا۔ اب مما تحبون صرف مال اور زر ہی نہیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو اپنے وقتِ عزیز کو خدا کی راہ میں لگانا اپنی عزت اور مرتبہ کو جس سے انسان محبت کرتا ہے خدا کی راہ میں خرچ کر دینا اپنی ساری قوتوں اور طاقتوں کو لگا دینا یہ سب کچھ اس کے اندر داخل ہے ۔ ہاں مال و دولت جائداد سب سے زیادہ محسوس ہونے والی چیزیں ہیں بعض لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ آیت حکم زکوٰۃ سے منسوخ ہے حالانکہ یہ ایک ایسا محکم اور پختہ اصول ہے کہ جب تک انسان اس دنیا میں ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہو سکتا ۔ نسل انسانی کی ساری ترقیات کا مدار ہی محبوب اشیاء کے انفاق پر ہے صحابہ نے اس اصول کو خوب سمجھا تھا اور اپنی جانیں مال جائدادیں سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کرکے ہر قسم کی بڑائی کے وارث ہوئے۔

ع۴۸۲ الطعام میں ال عہد کے لیے ہے یعنی وہ طعام جو مسلمان کھاتے ہیں اور طعام ہر وہ چیز ہے جو بطور غذا کھائی جاتی ہے۔

یہودیوں کا اعتراض اونٹ کے گوشت کے متعلق: واحدی نے کلبی سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ہم دین ابراہیم پر ہیں (ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی) تو یہودیوں نے کہا کہ آپ اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں اور اونٹ کا گوشت نوح اور ابراہیم علیہما السلام پر بھی حرام تھا تو یہ آیت ان کی تکذیب کے لیے اُتری (د ر) گویا یہ الفاظ اس اعتراض کے جواب میں ہیں کہ کھانے کی چیزوں میں مسلمانوں کا ملت ابراہیمی سے کوئی اختلاف ہے اور جو

وقف جبریل

فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٩٤﴾

پھر جو کوئی اِس کے بعد اللہ پر جھوٹ بنائے تو وہی ظالم ہیں۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۖ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٥﴾

کہہ اللہ نے سچ فرمایا ہے، پس راست رَو ہو کر ابراہیم کے دین کی پیروی کرو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا ۴۸۳

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٦﴾

پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا، یقیناً وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت دیا گیا اور سب قوموں کے لیے ہدایت ہے ۴۸۴

کیا ہے کہ وہی چیزیں جو ابراہیم کے لیے حلال تھیں بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں مگر اسرائیل نے کچھ اپنے اوپر حرام کر لیا تھا وہ کیا تھا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کا گوشت تھا۔ اور حضرت یعقوب نے ایک لمبی بیماری میں مبتلا ہونے پر یہ نذر مانی تھی کہ وہ محبوب ترین طعام کو جو اونٹ کا گوشت تھا ترک کر دینگے بعض نے چربیوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے بعض نے کہا ہے کہ حضرت یعقوب نے عبادت کے رنگ میں اس کو ترک کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ایسا کیا تھا۔ بہرحال اہل کتاب کا جو اعتراض تھا کہ یہ چیزیں ہمیشہ سے حرام تھیں اور ملت ابراہیمی میں بھی حرام تھیں اس کا جواب دیا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو توریت لا کر پڑھو اور اس میں دکھاؤ کہ کہاں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم پر بھی یہ چیزیں حرام تھیں اسی کی طرف توجہ دلانے کے لیے فرمایا فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا اور توریت میں جو بہت سی چیزیں ان پر حرام کی گئیں تو اس کی وجہ قرآن کریم نے دوسری جگہ یوں بیان فرمائی ہے فبظلم من الذين هادوا حرمنا عليهم طيبات احلت لهم (النساء ۴ - ۱۶۰) اور دوسری جگہ فرمایا ذلك جزينهم ببغيهم وانا لصادقون (الانعام ۶ - ۱۴۷) یعنی حقیقت یہی ہے کہ توریت کے نزول سے پہلے بنی اسرائیل پر ہر ایک قسم کا طعام جو مسلمانوں کے لیے حلال ہے حلال تھا اور بنی اسرائیل پر بھی بہت سی چیزوں کی حرمت کی وجہ ان کی حرمت اصلی نہیں بلکہ سزا کے طور پر تھا۔

۴۸۳ قل صدق اللہ میں ہو سکتا ہے کہ اشارہ اس بیان کے متعلق ہو جو آیت ۹۲ میں پایا جاتا ہے مگر قرین قیاس یہ ہے کہ اس میں دین اسلام کی صداقت کا اظہار ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے وہ سب سچ ہے۔ یہود و نصاریٰ کو ملت ابراہیم کے اتباع کی دعوت: اس کے بعد فرمایا فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا یعنی اصول دین اسلام وہی ہیں جو ابراہیم کی ملت کے اصول تھے اور چونکہ وہ تم سب کا مسلّم بزرگ ہے۔ اس کے اصول دین سے تمہارا انحراف کرنا کسی صورت میں ٹھیک نہیں چونکہ گذشتہ ساری بحث میں اصول پر ہی توجہ دلائی گئی ہے۔ اس لیے ملت ابراہیم سے مراد یہاں اصول ملت ابراہیمی ہیں نہ اس کے فروع۔ اس سے پہلی آیت میں جو اللہ پر جھوٹ بنانے کا ذکر ہے اس میں بھی ان افتراؤں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو یہود و نصاریٰ نے دین کے معاملہ میں کر رکھے تھے۔

۴۸۴ اول سے مراد یہاں متقدم فی الزمان ہی ہے یعنی زمانہ کے لحاظ سے سب سے پہلا۔ جیسا کہ دوسری آیات و احادیث سے واضح ہوتا ہے اور مرتبہ کے لحاظ سے بھی وہ اول ہے کیونکہ آخری مرجع عالم بھی وہی قرار پایا۔

وضع۔ وُضع کا استعمال کئی طرح پر ہوتا ہے۔ ایجاد اور خلق کے معنی میں بھی آتا ہے (غ) جیسے والارض وضعها للانام (الرحمٰن ۵۵ - ۱۰) اور بچہ جننے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے فلما وضعتها قالت رب انى وضعتها انثىٰ والله اعلم بما وضعت (آل عمران ۳ - ۳۵) اور وَضْعُ البَيْتِ سے مراد ہوتی ہے بِنَاؤُهٗ (غ) یعنی اس کی تعمیر۔ اور وضع الکتاب سے مراد ہے ابرازُ اعمالِ العِبَادِ (ر) یعنی بندوں کے اعمال کا ظاہر کرنا۔ ووضع الكتاب (الکہف ۱۸ - ۴۹)

بكة۔ بكة اور مكة ایک ہی نام کی دو مختلف صورتیں ہیں چنانچہ راغب نے بھی مجاہد کے اس قول کو ہی ترجیح دی ہے کہ بكة مكة ہے اور ب اور م کے ایک دوسرے کی جگہ آجانے کی بہت سی مثالیں ہیں جیسے سَبَدَ اور سمد۔ لازب اور لازم۔ بعض لوگوں نے ان دونوں میں کچھ فرق کیا ہے۔ بعض کے نزدیک بطن مکہ کا نام بکّہ ہے بعض کے نزدیک مسجد کا نام بکہ ہے اور بعض کے نزدیک خاص البيت کا اور مکہ شہر کا نام ہے پھر اس کے اشتقاق کی وجہ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ تباك سے ہے جس کے معنی ازدحام ہیں۔ کیونکہ لوگ طواف کے لیے اس میں اکٹھے ہوتے ہیں اور بعض نے کہا کہ مکہ کا نام بکّہ اس لیے رکھا گیا ہے لانها تبُكّ اعناق الجبابرة یعنی وہ جباروں اور سرکشوں کی جو اس کے اندر یا اس کے متعلق زیادتی کرنا چاہیں گردنیں توڑتا ہے۔

مبارکا۔ برك کی اصل اہل لغت نے بَرَكَ البعيرُ سے لکھی ہے جس کے معنی ہیں اونٹ بیٹھ گیا اور اس جگہ کے ساتھ لگا رہا (ل)۔ اس وجہ سے لزوم اور ثبات کے معنی کے اظہار کے لیے بَرَكة کا لفظ بولا جاتا ہے اور گو اہل لغت نے نمو اور بڑھنا بھی بَرَكة کے معنی لکھے ہیں مگر اصل معنی اسکے لزوم اور ثبات ہی ہیں۔ جیسا کہ لسان العرب میں بھی ہے اور مفردات میں ہے البركة ثبوت الخير الالٰهي فى الشئ یعنی کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا ثابت ہو جانا اور مبارک کے معنی ہیں ما ياتى من قبله الخير الكثير (ل) جسکی طرف سے خیر کثیر آتی رہی اسلئے اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی یہ لفظ بولا گیا ہے فتبارك الله۔ پس بكة کو مبارک کہا کہ اس کی طرف سے خیر کثیر آتی رہے گی یہ خیر کثیر صرف عبادت میں اور اس کے ثواب میں یا قبولیت دعا میں یا يجبىٰ اليه ثمرات كل شئ (القصص ۲۸ - ۵۷) میں محدود نہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ انسان

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ۬ وَمَنْ
دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ
الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ
كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

اس میں کھُلے کھُلے نشان ہیں مقام ابراہیم، اور جو وہاں
داخل ہُوا امن والا ہو گیا اور لوگوں پر اللہ کے لیے اس گھر
کا حج کرنا ہے اس پر جو اس تک راہ پا سکے اور جس نے
انکار کیا تو اللہ جہانوں سے بے نیاز ہے ع۴۸۵

کے لیے تمام خیرات دینی کا یہ مرکز رہے گا۔ یہاں سے وہ سرچشمہ توحید کا پھوٹا جو قیامت تک منقطع نہیں ہوگا۔

ھدی۔ مراد ہے ذا ھدی یعنی ہدایت والا۔ کیونکہ یہیں سے وہ ہدایت نکلی جو تمام دنیا جہان کے لیے تھی تمام ہدائتیں ایک ایک قوم کے لیے آئیں۔ صرف ایک ہی ہدایت ہے جو علی الاعلان ساری دنیا کے لیے آئی اور وہ ہدایت اسی مقام مبارک سے نکلی۔

آیا خانہ کعبہ اول بیت یعنی دنیا کا سب سے پہلا معبد ہے؟ اس پر مخالفانہ شہادت کا ذکر ع۱۵۷ میں ہو چکا ہے۔ احادیث نبوی میں بھی صراحت سے اس کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم میں ہے کہ ابوذر رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ ای مسجد وضع اول کونسی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی؟ تو آپ نے جواب دیا المسجد حرام یعنی مسجد حرام یا خانہ کعبہ اور یہ جو ایک روایت حضرت علیؓ سے ابن ابی حاتم نے بیان کی ہے کہ ایک شخص نے حضرت علیؓ سے سوال کیا اھو اول بیت وضع فی الارض قال لا ولکنہ اول بیت وضع فیہ البرکۃ (ث) کیا وہ سب سے پہلا گھر ہے جو زمین پر بنایا گیا، تو آپ نے فرمایا نہیں لیکن وہ پہلا گھر ہے جس میں برکت ڈالی گئی۔ تو یہ بخاری اور مسلم کی حدیث کے خلاف نہیں اور حضرت علی سے بھی ابن ابی حاتم کی دوسری روایت اس کی توضیح کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت علی نے کہا کانت البیوت قبلہ ولکنہ اول بیت وضع لعبادۃ اللہ (ث) یعنی گھر تو اس سے پہلے بھی تھے مگر وہ پہلا گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مقرر کیا گیا اور یہی منشا حدیث متفق علیہ کا ہے کہ سب سے پہلی مسجد یا سب سے پہلا اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر جو دنیا میں مقرر ہُوا وہ خانہ کعبہ ہے۔

آدم کا کعبہ کو بنانا: اور بیہقی کی حدیث ذیل اسی کی موید ہے جس کو گو بعض لوگوں نے ابن لہیعہ کے نام کی وجہ سے کمزور کہا ہے۔ مگر چونکہ قرآن کریم کے صریح الفاظ اول بیت اور حدیث متفق علیہ کے مطابق ہے اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا اور وہ حدیث عمرو بن العاص سے مرفوع یوں ہے۔ بعث اللہ جبرئیل الی آدم وحوا فامرھما ببناء الکعبۃ فبناہ آدم ثم امر بالطواف بہ (ث) یعنی اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو آدم اور حوا کی طرف بھیجا اور ان کو کعبہ کے بنانے کا حکم دیا پس آدم نے اُسے بنایا پھر اسے اس کے طواف کا حکم دیا گیا۔ اور یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ بیت الحرام کے بعد بیت المقدس ہے اور دونوں میں چالیس سال کا فرق ہے۔ تو اس کا منشا صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے ان دونوں گھروں کے بنانے میں چالیس سال کا فرق ہے کیونکہ پہلے حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کے ساتھ خانہ کعبہ کو دوبارہ بنایا اور پھر اپنی نسل کی دوسری شاخ کے لیے بیت المقدس کو قبلہ بنایا۔

مکہ کے نام: مکہ کے کئی ایک نام آئے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ مثلاً ام القریٰ (الانعام-۹۲) بستیوں کی ماں۔ اور یہ نام مکہ کی وجہ تسمیہ کے ساتھ ملتا ہے کیونکہ مکہ بھی مَلَقَ سے ہے جس کے معنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ چُوسنا ہے اور ام القریٰ یا بستیوں کی ماں اسے اس لیے کہا کہ اس کی چھاتیوں سے ساری زمین توحید الٰہی اور دین حق کا دودھ چُوسے گی۔ اس لیے ساری دنیا کا یہی حقیقی مرکز ہے اور مفسرین نے اسے زمین کا مرکز کہا ہے جس سے مراد روحانی مرکز ہے اور البلد یا خاص شہر بھی اس کا نام آیا ہے اور البلد الامین یا امن والا شہر بھی کیونکہ اس جیسی کوئی جائے امن اور دنیا میں نہیں۔ اور احادیث میں دو عظیم الشان فتنوں کا ذکر کر کے جن میں سے ایک روحانی فتنہ ہے اور ایک جسمانی یہ بتا دیا ہے کہ اس میں دجال اور طاعون داخل نہیں ہونگے۔ یعنی ہر قسم کے فتنوں سے امن میں رہے گا اور خانہ کعبہ کے جو نام ہیں وہ بھی سب گویا مکہ کے ہی نام ہیں جیسے مقام ابراھیم۔ البیت خاص گھر۔ البیت العتیق قدیم گھر۔ البیت المحرم پاک گھر یا عزت دار گھر۔ البیت الحرام۔ الکعبۃ۔ دوسرے نام جو بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ہیں الحاطمۃ یعنی توڑ دینے والا جس میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے جو مکہ میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی ظالموں کی جو اس کی بےحرمتی کرنا چاہیں گردنیں توڑنے والا۔ الصماھون۔ ام رحم۔ صلاح۔ عرش۔ القادس۔ المقدس۔ الراس۔ کوثاء۔ البیسنۃ وغیرہ (ث)

آخری عبادت گاہ: جس طرح اس گھر کو اول بیت کہا ہے اسی طرح لفظ مبارک میں یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ خاتم النبیین کا یہ قبلہ خدا کی عبادت کا آخری گھر بھی ہے کیونکہ مبارک کے معنی ہیں جس کی خیر و برکت کبھی منقطع نہ ہو اور دائمی ہو۔ گویا جس طرح پہلے قبلے ایک وقت کے لیے تھے اور آخر ان کی خیر و برکت ایک وقت آکر منقطع ہونے والی تھی۔ یہ صورت اس پاک گھر کی نہ ہوگی۔ کیونکہ اس نے دنیا کی ساری بستیوں کا مرکز بننا تھا۔ اس کے بعد اور کوئی عبادتگاہ خدا کی اس دنیا پر قائم نہ ہوگی اور تاریخ خود اس پر شاہد ہے کہ اس کے بعد کوئی مقام اس قسم کا مرکز دنیا میں نہیں بنا۔ ھدی للعالمین کے لفظ میں انہی مطالب کی تصریح فرما دی کہ یہاں سے ہدایت نکلے گی اور وہ ہدایت عرب کے لیے نہیں بلکہ دنیا کی کل قوموں کے لیے ہوگی۔

ع۴۸۵ حَج اور حِج کے ایک ہی معنی ہیں دیکھو ع۱۰۲ فرق صرف اس قدر اہل لغت نے کیا ہے کہ حَج مصدر ہے اور حِج اسم ہے (غ)

استطاع الیہ سبیلا۔ استطاعت کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ استطاعت حد وسعت کا نام ہے۔ یعنی جس کو سہولت سے انسان کر سکے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استطاع الیہ سبیلا کا مطلب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا الزاد والراحلۃ (ث) یعنی زادراہ اور سواری۔ اور بعض نے صحت کو بھی داخل کیا ہے اور حق یہ ہے کہ سارے امور اس کے اندر داخل ہیں۔ مثلاً خود وہاں کا امن۔ رستہ کا امن۔ متعلقین کا گزارہ۔ امن کے نہ ہونے کی وجہ سے

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ ۖۗ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾
قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ

کہہ اے اہل کتاب کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو
اور اللہ اس پر گواہ ہے جو تم کرتے ہو۔
کہہ اے اہل کتاب کیوں اسے اللہ کی راہ سے روکتے ہو جو ایمان
لائے تم اس کے لیے ٹیڑھا پن چاہتے ہو، حالانکہ تم گواہ ہو اور

خود نبی کریم صلعم نے مدینہ میں آکر کئی سال تک حج نہیں کیا اور چھٹے سال میں حدیبیہ سے واپس آنا پڑا۔

مقام ابراھیم۔ یہ آیات بینات کی تشریح ہے یعنی وہ کھلی کھلی نشانیاں کیا ہیں۔ سب سے پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ مقام ابراہیم ہے۔ مقام ابراہیم کی تشریح ع۱۵۵ میں ہو چکی ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ سارا حرم ہی مقام ابراہیم ہے (ث)

مقام ابراہیم سے شہادت: خانہ کعبہ کا مقام ابراہیم ہونا یا اس میں مقام ابراہیم کا ہونا ایک کھلا نشان قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ خانہ کعبہ کے ساتھ اور عباداتِ حج کے ساتھ حضرت ابراہیم کا نام نامعلوم زمانہ سے چلا آیا ہے۔ اگر واقعی حضرت ابراہیم یہاں نہ آئے ہوتے، تو عرب کے بُت پرستوں کو جن کی روایات میں یہ ایک مسلّم امر چلا آیا ہے کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ ایک ایسے شخص کے نام کا تعلق جو علی الاعلان بُت شکن تھا، اس گھر سے قائم کرتے اور اس میں ایک مقام ابراہیم قائم کر کے اس کے مراسم حج وغیرہ کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض باتیں جن کی شہادت زبانی روایات میں پوری پوری نہیں رہ سکتی۔ ان کی شہادت ایک تعامل قومی میں رہ جاتی ہے اور وہ شہادت ایسی زبردست ہوتی ہے کہ جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ سو ایسی ہی ایک شہادت خانہ کعبہ کے ساتھ حضرت ابراہیم کے نام کے تعلق میں رہ گئی ہے جو آج بھی اہل کتاب پر اتمام حجت کے لیے کافی ہے کہ جس بیت اللہ یا بیت ایل کا ذکر بائبل میں ہے وہ حقیقت میں خانہ کعبہ تھا کیونکہ دنیا میں یہی ایک گھر ہے جس کا نام بیت اللہ ہے اور یہی ایک گھر ہے جس کے ساتھ حضرت ابراہیم کے نام کا تعلق ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور جس کی ساری عبادات اور رواجات حضرت ابراہیم کی طرف منسوب ہیں۔

دوسرا کھلا نشان خانہ کعبہ کے متعلق یہ ہے کہ من دخلہ کان اٰمنا یعنی یہ ایک امن کا مقام ہے۔ یہ بھی خصوصیت ساری دنیا میں صرف خانہ کعبہ کو ہی حاصل ہے کہ وہ امن کا مقام ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ مکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں ہُوا (یعنی ہمیشہ مقام حرمت رہا ہے) اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا اور وہ میرے لیے بھی صرف دن کی ایک گھڑی حلال ہُوا (یعنی وہ وقت جب فتح مکہ کے وقت آپ اس میں داخل ہوئے ہیں) سُن رکھو کہ وہ اس وقت سے حرمت کا مقام ہے۔ نہ اس کے کانٹے کاٹے جائیں گے، نہ اس کے درخت قطع کیے جائیں گے نہ اس کی گری ہوئی چیز اُٹھائی جائے گی، مگر اس شخص کے لیے جو اس کے (اصل مالک کو) پہنچانے والا ہو۔ پس مکہ کی حدود کے اندر کسی قسم کی جنگ جائز نہیں، یعنی ان حدود کے اندر مکہ معظمہ میں جنگ کرنا منع ہے۔ اور یہ حرمت اس کی عرب کے اندر ابتدا سے اللہ تعالیٰ نے ایسی محکم رکھی تھی کہ عرب جیسی جنگجو قوم جن کا شغل ہی دن رات جنگ کرنا تھا اور جہاں قبیلہ قبیلہ کے ساتھ اور قوم قوم کے ساتھ ہر وقت برسرِ پیکار تھے اس قوم میں بھی مکہ کی حدود کے اندر کسی کی طاقت نہیں تھی کہ تلوار کو نیام سے باہر نکال سکے۔ اور جو ہزارہا سال کی تاریخ میں کوئی ایک دو مثالیں اس حکم کی خلاف ورزی کی پیش کی جاتی ہیں تو وہ النادر کالمعدوم کے حکم میں ہیں۔ پھر ایک حدیث میں مکہ کی حرمت کے متعلق یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ اس کے اندر نہ دجال داخل ہوگا اور نہ طاعون۔ یہ امن اس مقدس سرزمین میں کیوں رکھا گیا اور کیوں ساری دنیا میں یہ ایک ہی جگہ امن کے لیے مخصوص ہوئی؟ درحقیقت یہ قوم کا خیال نہ تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک جنگجو قوم کے اندر اپنی طاقت اور قدرت کا ایک نشان رکھا ہُوا تھا تاکہ یہ ایک نشان ہو اس روحانی امن وامان کا جس کا جھنڈا اس مقام پر بلند ہو کر دنیا کی کل قوموں میں صلح واتحاد اور اخوت کی بنیاد رکھی جانی تھی۔ پس یہ دوسرا کھلا نشان ہے جو اس گھر کو عطا کیا گیا۔

خانہ کعبہ کا حج کبھی نہ رُکے گا: تیسرا نشان ان الفاظ میں مذکور ہے وللّٰہ علی الناس حج البیت۔ لوگوں کے لیے (من استطاع الیہ سبیلا کی شرط کے ماتحت) اللہ کے لیے اس مقدس گھر کا حج کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ ہر ایک مقدس مقام پر کوئی نہ کوئی زمانہ ابتلا کا بھی آجاتا رہا ہے۔ بیت المقدس کو کس شان وشوکت کے ساتھ سلیمان علیہ السلام نے بنایا، مگر تھوڑا ہی عرصہ بعد اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ حج اور زیارت کہاں کی؟ اسی طرح پر دنیا کے کل مقدس مقامات ایک نہ ایک وقت اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں پڑ کر تباہ وبرباد ہو گئے ہیں تو اس کے قیام کی طرف اشارہ فرمایا۔ کہ یہ نہ صرف ہمیشہ کے لیے قائم رہے گا بلکہ اس کا حج بھی لوگ ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ گویا کسی وقت یہ اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں نہ پڑے گا۔ اور یہ خصوصیت بھی ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو شروع سے قائم رکھا ہے۔ چنانچہ جب خانہ کعبہ کے اندر بت بھی تھے اور اس کے متولی مشرکانہ عقائد رکھتے تھے اس وقت بھی جب ایک عیسائی بادشاہ نے اس پر چڑھائی کی اور اس کو تباہ کرنے اور اس کے حج اور زیارت سے لوگوں کو روکنا چاہا۔ اور اس وقت اس کے متولیوں میں اس بادشاہ کی فوجوں سے مقابلہ کی کچھ بھی طاقت نہ تھی تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایسے سامان پیدا کر دئے کہ وہ بادشاہ مع اپنی ساری فوج کے تباہ ہو گیا۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک نشان ہے کہ ایک عالمگیر جنگ کے اندر بھی جب خود وہ سلطنت بھی جنگ میں مبتلا تھی، جو اس کی اصل متولی ہے یعنی ترکی قوم، خانہ کعبہ کا حج نہیں رُکا۔ اس آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے ومن کفر فان اللّٰہ غنی عن العالمین یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ بڑے بڑے لوگ اس کا کفر بھی کریں گے مگر وہ اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اگلی آیت میں صاف بتا دیا کہ یہ بڑے بڑے کفر کرنے والے اہل کتاب ہی ہیں۔ بعض نے یہاں کفر سے مراد صرف اس رکن کا کفر لیا ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٩﴾

اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو [۴۸۶]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿١٠٠﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم ان لوگوں میں سے ایک گروہ کے پیچھے لگ جاؤ گے جن کو کتاب دی گئی ہے تو وہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے [۴۸۷]

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٠١﴾ ع

اور تم کس طرح کفر کر سکتے ہو حالانکہ تم وہ ہو کہ تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول ہے اور جو اللہ کو مضبوط پکڑتا ہے وہ یقیناً سیدھی راہ کی طرف ہدایت پا گیا [۴۸۸]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقوےٰ کرو جیسا کہ اس کے تقوے کا

ع۴۸۶ عِوَجًا۔ عَوَج قائم رہنے کی حالت سے مڑ جانے کا نام ہے (غ) یعنی ٹیڑھا پن اور عَوَج اور عِوَج میں فرق یہ ہے کہ عَوَج اس ٹیڑھا پن پر بولا جاتا ہے جو آنکھ سے دیکھا جا سکے جیسے گڑی ہوئی لکڑی کا ٹیڑھا ہونا یا دیوار کا ٹیڑھا ہونا وغیرہ۔ اور عِوَج اس ٹیڑھا پن پر بولا جاتا ہے جس کا ادراک فکر اور بصیرت سے ہو (غ) جیسے دین معاش وغیرہ کے معاملہ میں اور تبغونہا عِوَجا کی تقدیر ہے تبغون لها عِوَجا کیونکہ بغی ایک مفعول کو چاہتا ہے اور جب دوسرا مفعول آئے تو لام بڑھایا جاتا ہے۔ اور بعض نے عِوَجًا کو حال لے کر ذا عِوَج معنی کیے ہیں یعنی تم اس کو تلاش کرتے ہو ٹیڑھے رہ کر۔ سچی بات میں وساوس کا پیدا کرنا اس میں ٹیڑھا پن چاہنا ہے۔

ع۴۸۷ تطیعوا۔ طَوع۔ اِنْقِیاد یعنی برضا و رغبت فرمانبرداری ہے اور اس کی ضد کُرہ یا ناپسندیدگی (غ) ابھی آ چکا ہے له اسلم من فی السمٰوات والارض طوعًا وکرھًا اور طاعۃ اور طوع ایک ہی ہیں مگر طاعۃ کا اکثر استعمال اس طرح ہے کہ جو حکم دیا گیا تھا اسے بجا لایا اور جو طریق مقرر کر دیا گیا تھا اس پر چلا (غ) اور اَطاعَ کے معنی ہیں ایک امر کی پیروی کی اور اس کی مخالفت نہ کی (ل) یا اس کے معنی ہیں لَانَ وانقادَ (ت) اس کے لیے نرم ہو گیا اور اس کا منقاد ہو گیا۔

کفار کی اطاعت: یہاں اہل کتاب کی اطاعت سے روکا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی اطاعت کرو گے تو وہ ایمان کے بعد تمہیں کافر بنا کر چھوڑیں گے۔ کسی دوسرے کی اطاعت یہ ہے کہ انسان برضا و رغبت جو وہ کہے مانتا چلا جائے اور جو وہ کرے اسی طرح کرتا چلا جائے پس اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہی ہو سکتی ہے یا اولوالامر کی جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔ صرف انہی کے حکم کے ماتحت کسی دوسرے کا حکم مانا جا سکتا ہے۔ اس لیے کفار کی اطاعت فی الواقع کوئی نہیں۔ اور سیاق عبارت کو دیکھا جائے تو اوپر ذکر شکوک و شبہات کا تھا۔ پس یہاں اطاعت سے مراد ان کے انہی وساوس کا قبول کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض بے ایمانوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایک وسوسہ دل میں پیدا کر دیا، انسان اگر اس کے پیچھے لگ جائے اور خود غور سے کام نہ لے تو ہلاک ہو جاتا ہے۔ ابن جریر نے مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ یہ آیت اوس اور خزرج کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی۔ اوس اور خزرج مدینہ کے دو بڑے قبیلے تھے جن میں مدت سے باہم جنگ چلی آتی تھی۔ جب یہ لوگ مسلمان ہو گئے تو پرانے کینے سب دور ہو گئے اور جنگ بند ہو گئی۔ ایک دن ایک اوس اور ایک خزرج کا آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی آ گیا اور اس نے موقعہ پا کر اوس اور خزرج کے پرانے جھگڑوں کا ذکر شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ یہ دونوں مسلمان ان واقعات کو یاد کر کے ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کو تیار ہو گئے اور دونوں نے اپنی اپنی قوم کو پکارا جو ہتھیاروں کے ساتھ نکل آئے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ لگا تو آپ ان کے درمیان آئے اور آپ کی وجہ سے سب لوگوں کا غضب جاتا رہا اور وہ نادم ہوئے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

ع۴۸۸ یعتصم باللہ۔ عَصْم کے معنی روک رکھنا اور اعتصام کے معنی اپنے آپ کو روک کر بچا رکھنا ہیں (غ) قرآن کریم میں آتا ہے لاعاصم الیوم من امر اللہ (ھود ۱۱-۴۳) آج کے دن کوئی شخص اللہ کے امر سے بچانے والا نہیں، ایسا ہی مالھم من اللہ من عاصم (یونس ۱۰-۲۷) ہیں۔ اور معصوم وہ ہے جو بچایا گیا ہو۔ اور اسی مادہ سے عِصْمَۃ ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے اور فاستعصم (یوسف ۱۲-۳۲) میں استعصم کے معنی امام راغب نے کیے ہیں تَحَرّیٰ مایَعْصِمُہٗ یعنی اس چیز کا قصد کیا جو اس کو بچا لے پس اعتصام باللہ سے مراد ہے اللہ کو پکڑ کر یعنی ذریعہ بنا کر اپنے آپ کو بچا لے۔ اور اعتصام کے معنی کسی دوسری چیز کو پکڑنا بھی ہیں (غ) جیسا آگے آتا ہے واعتصموا بحبل اللہ (۱۰۲)

یہاں اہل کتاب کے ان وساوس سے بچنے کا طریق بتایا ہے کہ جب وہ ایسے وساوس ڈالیں تو ان کے اثر بد سے مسلمان اس طرح بچ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آیت ماقبل میں اطاعت سے مراد وساوس کے پیچھے لگنا ہے۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ حق ہے اور تم نہ مرو مگر ایسی حالت میں کہ تم فرماں بردار ہو۔ ۴۸۹

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص اور سب کے سب اللہ کے عہد کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو ۴۹۰

ع ۴۸۹ اسلام کے کمالات اور امتیازی نشانوں کا ذکر کر کے اب مسلمانوں کو بتایا ہے کہ وہ کن اصول کو مدنظر رکھ کر دنیا میں ایک کامیاب قوم بن سکتے ہیں اور اس رکوع میں کامیابی کے تین عظیم الشان گر بتائے ہیں جن میں سب سے پہلی بات ہے اتقوا اللّٰہ حق تقاتہ تقویٰ اللہ کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں ع ۱ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق کی نگہداشت۔ یا ان حقوق اور ذمہ داریوں کی حفاظت جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ذمہ ڈال رکھی ہے خواہ ان کی طرف شریعت ہدایت کرتی ہو یا عقل انسانی، گویا قوم کے ہر فرد کے اندر پہلے فرداً فرداً ذمہ داری کا احساس پیدا ہونا ضروری ہے اور یہی کامیابی کی عمارت کی خشت اول ہے مگر صرف اس احساس کا پیدا ہونا بھی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ حق تقاتہ بڑھا کر بتایا کہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے قوم کے ہر فرد کو اپنی اپنی جگہ پر پورا زور لگانا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کا حق اس انسان نے ادا کر دیا جس نے اپنی طرف سے پورا زور لگا دیا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی فرماتا ہے لا یکلف اللّٰہ نفسًا الّا وسعہا پس اتقوا اللّٰہ حق تقاتہ سے وہی مراد ہے جو فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم (التغابن ۶۴-۱۶) سے ہے اور جن لوگوں نے پہلے الفاظ کو دوسرے الفاظ سے منسوخ سمجھا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے اور اسی کے مطابق دوسری جگہ جہاد کا حکم ہے جاھدوا فی اللّٰہ حق جہادہ (الحج ۲۲-۷۸) دونوں میں اپنی مقدرت کے مطابق زور لگانا ہے تکلیف ما لا یطاق اس میں داخل نہیں اور آخر پر فرمایا کہ لا تموتن الّا وانتم مسلمون جس میں یہ بتایا کہ تم پر کوئی آن ایسی نہ آئے کہ کامل فرمانبرداری کی حالت نہ ہو۔ کیونکہ موت کا وقت تو مقرر نہیں اور یہ بھی بتا دیا کہ اتقوا اللّٰہ حق تقاتہ سے مراد مسلم یا کامل فرمانبردار بننا ہے اور مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے ہر ایک مسلم بچا رہتا ہے۔

ع ۴۹۰ حبل اللّٰہ۔ حبل رسّہ کو کہتے ہیں اور استعارۃً ہر ایک اس ذریعہ یا سبب پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس سے کسی چیز کی طرف پہنچ سکیں استعیر للوصل ولکل ما یتوصل بہ الی شیءٍ (غ) والحبل العَھْدُ والذّمّۃ والامان یعنی حبل عہد اور ذمّہ اور امان کو بھی کہتے ہیں (ل) اور حدیث دعا میں آتا ہے یا ذا الحَبلِ الشدید جہاں حبل کے معنی ابن اثیر نے قرآن یا دین کیے ہیں اور حبل اللّٰہ کے معنی حضرت ابن مسعود سے سند صحیح سے قرآن مروی ہیں (د) ابو سعید خدری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی معنی روایت کیے ہیں کتاب اللّٰہ حبل متین ممدود من السماء الی الارض۔ کتاب اللہ وہ مضبوط رسہ ہے جو آسمان سے زمین تک ممتد ہے (ث) اور حضرت علیؓ کی روایت میں نبی کریم صلعم نے جب فرمایا کہ فتنہ ہو گا تو دریافت کیا گیا اس سے نجات کی راہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کتابُ اللّٰہِ فیہِ نَبَأُ مَا قبلکم وخبر ما بَعْدَکُمْ وحُکْمُ ما بَیْنَکُمْ وھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ المتین (غق) یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب جس میں تم سے پہلے کی اطلاع اور تم سے بعد کی خبر اور جو اختلاف تمہارے درمیان ہو اس کا فیصلہ ہے۔

تفرقوا۔ فَرْق جمع کے خلاف ہے اور اسی سے تفرّق ہے جو جماعت کے خلاف ہے۔ اختلاف کے ساتھ جماعت رہ سکتی ہے لیکن تفرقہ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ تفرقہ میں دو چیزیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور باہم ان کا تعلق نہیں رہتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی کا دوسرا گر بتایا ہے اور وہ اتحاد اور جماعت کا رنگ ہے کتنا بھی افراد قوم کے اندر انفرادی ذمہ داری کا احساس موجود ہو صرف اس سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ افراد قوم کے اندر ایک اجتماعی رنگ پیدا نہ ہو۔ وہی کوشش عظیم الشان نتائج پیدا کر سکتی ہے جس کے کرنے والی ایک قوم کی قوم ہو۔ پس بتایا کہ انفرادی احساس اور انفرادی کوشش کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سب مل کر ایک کام کو کریں۔ اور یوں وحدت قومی کو کامیابی کا دوسرا اصول قرار دیا۔ پھر یہ اصول وحدت نامکمل ہوتا اگر یہ نہ بتایا ہوتا کہ وہ کونسی خاص بات ہے جس پر اس اتحاد کی بنیاد رکھی جائے پس کمال بلاغت سے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اتحاد اسلامی کی بنیاد حبل اللّٰہ یعنی قرآن کریم ہے۔ اس میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ قرآن شریف کے متعلق مسلمانوں کا کبھی باہم اختلاف نہ ہو گا اور سب کے ہاتھ میں ایک ہی قرآن کریم ہو گا کیونکہ اتحاد کی بنیاد اسی چیز پر ہو سکتی ہے جس کے بارہ میں اختلاف کوئی نہ ہو۔ اور یہ کس قدر صداقت اسلام کی ایک بیّن شہادت ہے کہ آج تیرہ سو سال گزر جانے پر سارے عالم اسلامی میں سُنّی، شیعہ، خارجی سب کے ہاتھ میں قرآن شریف ایک ہی ہے اور ایک زیر و زبر تک کا فرق نہیں۔ وہ مذہب جو مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ساری رُوئے زمین پر پھیلا ہُوا ہے جس کے پیرو ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ایک دوسرے کے حالات سے ناواقف ہیں وہ سب قرآن کریم ایک ہی اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اس لیے جہاں مسلمانوں کو اُن کی کامیابی کا گر بتایا ہے وہیں درحقیقت یہ بھی پیشگوئی کر دی ہے کہ قرآن کریم پر مسلمانوں کا کبھی اختلاف نہ ہو گا۔

پس اس اتحاد کے ہوتے ہوئے اگر مسلمان باہم تفرقہ کریں تو کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ ان کے پاس اتحاد کی ایک ایسی مستحکم بنیاد ہے جو دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگوں نے اتحاد کی اس بنیاد کو چھوڑ کر اپنی اپنی روایات کو اصل بنیاد قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ ایک فرقہ کی روایات مثلاً اہل تشیع کی روایات کو دوسرا فرقہ تسلیم نہیں کرتا۔ پس جب امر متحد کو چھوڑ کر امر مختلف فیہ کو بنیاد قرار دیا جائے گا تو نتیجہ لازماً تفرقہ ہو گا۔ اسی لیے ساتھ ہی فرما دیا ولا تفرقوا یعنی تفرقہ سے بچنے کی یہی راہ ہے۔

قرآن کریم کو بنیاد اتحاد قرار دینے سے کیا منشا ہے؟ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے تمام اصول امور کو جن کی ضرورت دین کو ہے اپنے اندر جمع کر لیا ہے اور تمام اختلافات کا فیصلہ درحقیقت اس قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اس لیے جب قرآن شریف کو اتحاد کی بنیاد مانا جائے گا تو تمام روایات کو جو کسی فرقہ کے ہاتھ میں ہوں اصول قرآنی پر پرکھا جائے گا اور جو روایت قرآن کریم کے خلاف ہوا سے ترک کرنا ہو گا۔ یہ ایک بڑی سیدھی راہ ہے جس پر مسلمانوں کا اتحاد

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾	اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم باہم دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے بچالیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ ۴۹۱
وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ	اور چاہیئے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں ۴۹۲

قائم رہ سکتا ہے پھر قرآن کریم ہماری تمام تعلیم و تعلم کا اصل سرچشمہ ہونا چاہیئے۔ ہر ایک مسلمان اور کچھ جانے یا نہ جانے مگر قرآن ضرور جانتا ہو مگر آج اس کے خلاف یہ نظر آرہا ہے کہ جس چیز کو مسلمان نہیں جانتے وہ قرآن ہے۔

ع ۴۹۱ شَفَا کوئیں یا دوسری چیز کا شَفَا اس کے کنارہ کو کہتے ہیں اور ہلاکت سے قریب ہونے کو اس کے ساتھ مثال دی جاتی ہے (غ) شفۃ (ہونٹ) شفا سے چھوٹا ہے۔

نار۔ نار آگ کو بھی کہتے ہیں جو حواس کے لیے ظاہر ہوا در مجرد حرارت کو بھی کہا جاتا ہے اور نار جہنم کو بھی اور نار حرب یعنی جنگ کی آگ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے اوقدوا ناراللحرب میں (المائدہ ۵-۶۴) (غ)

انقذ۔ انقاذ۔ ہلاکت سے بچالینے کا نام ہے (غ)

قرآن میں اتحاد پیدا کرنے کی طاقت: اس حصّہ آیت میں مسلمانوں کو یہ توجہ دلائی ہے کہ ہم نے جو تم کو حبل اللہ یعنی قرآن کو اپنے اتحاد کی بنیاد قرار دینے کو کہا ہے تو یہ اس لیے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی طاقت رکھی ہے کہ یہ سخت سے سخت دشمنوں کو بھی بھائی بھائی بنادیتا ہے عرب کی قومیں اور قبیلے جن کی دشمنیوں پر صدیاں گذر کر ایک دوسرے کی عداوت اب ان کے خونوں میں داخل ہو چکی تھی اور دن رات وہ ایک دوسرے سے جنگ پر آمادہ رہتی تھیں۔ گویا آگ کے گڑھے میں گر کر بالکل بھسم ہو جانے کو تھیں۔ بیس سال کے عرصے میں قرآن کریم نے ان کے اندر ایک ایسا اتفاق اور ایسی اخوت پیدا کر دی کہ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں۔ پھر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایسی پاک کتاب کے پاس ہوتے ہوئے مسلمان ایک دوسرے کی تخریب کے درپے ہیں اور ایک دوسرے کو ہی دنیا سے نابود کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے حصّہ میں دعویٰ تھا کہ قرآن کریم تم میں اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرے حصّہ میں دلیل ہے کہ عرب جیسی جنگجو قوموں کے اندر اس نے اتحاد پیدا کر کے دکھادیا۔

ع ۴۹۲ اس آیت میں کامیابی کا تیسرا اصول دعوت الی الخیر کو بیان فرمایا ہے اور منکم کہہ کر بتا دیا کہ قوم میں ایک ایسا گروہ رہنا چاہیئے اس کی وجہ دوسری جگہ مذکور ہے ما کان المومنون لینفروا کافۃ (التوبۃ ۹-۱۲۲) یعنی سب کے سب اس کام کے لیے نہیں نکل سکتے۔ دعوت الی الخیر کیا ہے؟ اس سے مراد دعوت الی الاسلام یا دعوت الی القرآن ہے دوسری جگہ خود قرآن کو خیر فرمایا دیکھو البقرۃ ۲-۱۰۵) اور ع ۱۳۷ و اور خیر کے معنی بھلائی ہیں۔ اور حقیقی بھلائی کی سب راہیں قرآن کریم میں ہی ہیں۔ اس لیے ارشاد الٰہی یہاں یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی موجود رہے جو دعوت الی الاسلام کے کام میں لگی رہے۔ ابتدائے اسلام کا زمانہ تو وہ تھا کہ ہر ایک مسلمان کے اندر ایک ایسی روح دعوت الی الاسلام کی پھونکی گئی تھی کہ وہ سب کے سب ہی داعیان اسلام تھے۔ اور اس جوش اور تڑپ کو لیکر وہ دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف شہروں اور جزیروں میں نکل گئے اور تھوڑے ہی سالوں میں دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ یعنی اسلام کا نام دنیا کے دور دور ملکوں میں روشن کر دیا ہر ملک اور ہر شہر میں اسلام کا جھنڈا لگا دیا پھر بعد اس کے ایک ایسا زمانہ آیا کہ بادشاہوں اور امراء کی توجہ دعوت الی الاسلام کی طرف سے کم ہو کر وہ تو اپنے تعیشات میں گرفتار بلا ہو گئے۔ علماء کی توجہ بھی زیادہ تر فروعی اختلافات میں صرف ہونے لگی۔ پھر بھی بہت سے خدا کے بندے ان تمام جھگڑوں سے الگ ہو کر دعوت الی الاسلام کے کام میں لگے رہے۔ بہت سے وہ بزرگ جن کے ناموں پر آج ہزارہا لوگ قربان ہوتے ہیں ان کی یہ عزت محض اسلام کی خدمت گزاری سے ہوئی۔ وہ درحقیقت روحانی بادشاہ تھے اور جب دنیوی بادشاہوں نے دعوت الی الاسلام کے کام کو چھوڑ دیا تو ان روحانی بادشاہوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ مگر یہ کس قدر افسوسناک نظارہ ہے کہ آج ان داعیانِ اسلام کی گدیاں محض دنیا کے چند پیسے کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور ہر ایک گدی جس میں ہزاروں اور لاکھوں کی آمد ہے، وہ چند لوگوں کے پیٹ بھرنے یا ان کے تعیش کا سامان پیدا کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور نہ صرف دنیا کی محبت اور دنیوی جھگڑوں میں ہی گرفتار بلا ہو رہی ہے بلکہ طرح طرح کی بدعات میں مبتلا ہو کر خود مسلمانوں کو چاہِ ضلالت میں گرا رہی ہے اور دعوت الی الاسلام کا وہاں نام بھی نہیں، کیسے کیسے پاک اصول فلاح کے مسلمانوں کو اس پاک کتاب کے اندر دیئے گئے تھے، دوسرے لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور کامیابیاں حاصل کیں مگر مسلمانوں نے ان قومی اتّخذوا ھٰذا القراٰن مھجورًا کا مصداق اپنے آپ ہی کو ثابت کر دکھایا۔

دعوت الی الاسلام کی اہمیت: اللہ تعالیٰ نے کیوں دعوت الی الاسلام کے کام کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اسلام میں ایک جماعت کا موجود رہنا ضروری قرار دیا ہے

وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾
وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا
مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾

اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے روکیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں ۴۹۲؎
اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی باتیں آچکی تھیں اور انہی کے لیے بڑا عذاب ہے ۴۹۳؎

جو دعوت الی الاسلام کے کام میں ہی لگی ہوئی ہو۔ اس جماعت کے افراد کی زندگیوں کا مقصد اصلی اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے سوائے اور کچھ نہ ہو۔ اس لیے کہ بغیر اس کے مسلمان قوم ایک زندہ قوم نہیں رہ سکتی۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جس قوم نے اپنی ترقی کے لیے اپنی تعداد کو بڑھانے کے لیے جدوجہد ترک کر دی ہے، اس میں تنزل اور انحطاط شروع ہو گیا ہے۔ زندگی کے آثار اس میں سے دُور ہو گئے ہیں۔ اور وہ آخرکار مردگی کی حالت تک پہنچ گئی ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا تنزل ان کی سلطنت اور حکومت کے جاتے رہنے سے ہُوا ہے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ مسلمانوں کا تنزل اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے انہوں نے دعوت الی الاسلام کے کام کی طرف کم توجہی کر دی ہے اور سلطنتوں کا جاتے رہنا محض اس کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔ پھر جب مسلمان دعوت الی الاسلام کے کام پر پوری توجہ کریں گے تو پھر وہی کامیابیاں اور وہی شان وشوکت اُن کے لیے ہو گی جس کا وعدہ اولٰئک ھم المفلحون میں ہے۔

مجدد صدی کا دعوت الی الاسلام کے لیے جماعت تیار کرنا: اس زمانہ میں جب دعوت الی الاسلام کے کام کی طرف سے اکثر مسلمان غافل ہو رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو اپنی جناب سے یہ الہام کیا کہ وہ ایک جماعت اس غرض کیلئے تیار کریں اور یہ بھی اُن کو الہام کیا کہ "بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منار بلند تر محکم افتاد" جس میں درحقیقت وہی وعدہ ہے جو اولٰئک ھم المفلحون میں ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ نے بارہا یہ اعلان کیا کہ میرے آنے کی اصل غرض یہی ہے کہ تا اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ اور آپ جو اقرار اس سلسلہ میں داخل ہونے والوں سے لیتے تھے یا جو اقرار اب آپ کے جانشین لیتے ہیں وہ یہی ہے کہ "میں دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا"۔ اس اقرار کا اصل منشا بھی یہی ہے کہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جن کی متحد غرض خدمت دین ہو۔ گویا آپ نے مسلمانوں کے اندر اس حکم کی تعمیل کے لیے ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ایک جماعت بنانی چاہی ہے۔ پس ہر ایک شخص جو اس جماعت میں داخل ہوتا ہے وہ درحقیقت یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا اصل نصب العین صرف دعوت الی الاسلام رکھے گا۔ اور ظاہر ہے کہ بغیر ایک جماعت اور نظم واتحاد کے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اس کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں وہ اسلام کی خیرخواہی نہیں کرتے کیونکہ جس قدر یہ جماعت ترقی کریگی اسی قدر دعوت الی الاسلام کا کام بھی ترقی کرے گا۔

۴۹۲؎۔ دعوت الی الاسلام کے ساتھ دو باتیں اور بیان فرمائی ہیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ معروف وہ کام ہے جسے فطرت انسانی پہچانتی ہے یعنی نیک کام۔ اور منکر وہ ہے جس سے فطرت انکار کرتی ہے یعنی بُرا کام۔ بدترین حالت کسی قوم کی وہ ہوتی ہے جب اپنے لوگوں کو بُرا کرتے دیکھیں اور اس سے روکیں نہیں۔ یہودیوں کی بدترین حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے کانوا لایتناھون عن منکر فعلوہ (المائدہ ۵ - ۷۹) اور گو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر ایک مسلمان کے فرائض میں سے ہے۔ مگر دعوت الی الاسلام کا کام کرنے والے گروہ کے فرائض میں اسے خصوصیت سے داخل فرمایا ہے حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر افضل الجہاد ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا خدا کی زمین میں اس کا خلیفہ اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے۔ اسلام کا یہ فخر تھا کہ اس میں چھوٹے سے چھوٹا انسان بڑے سے بڑے کو نصیحت کر سکتا تھا۔ اور اس کی غلطی پر اسے بیدھڑک آگاہ کر سکتا تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسا کامل راستباز خلافت کے منصب پر آتے ہی کہتا ہے فان زغت فقومونی اگر میں کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کرو۔ فاروقؓ جیسے رعب والے انسان کے سامنے ایک بڑھیا یوں کہہ سکتی ہے کہ یا ابن الخطاب اللہ لیعطینا وانت تمنعنا قرآن تو عورتوں کے مہر کے متعلق فرماتا ہے ان آتیتم احدٰھن قنطارا فلا تاخذ وامنہ شیئا۔ اور آپ کہتے ہیں بڑے بڑے مہر نہ دو۔ تو حضرت عمرؓ اپنی رائے سے رجوع کرتے ہیں۔ لیکن آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ہر حلقہ میں ایک پیر یا گدی نشین ہے اور اس کا حکم ان کے لیے خدا کے حکم کے قائم مقام ہے۔ اس کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم میں یہ غلطی ہے یا فلاں بات تم نے ٹھیک نہیں کہی۔ گویا دعوت الی الاسلام کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ان کے درمیان سے اُٹھ گئے۔

۴۹۳؎ پہلے مذاہب کا تفرقہ اور اصولی اختلاف: اس آیت میں یہود ونصاریٰ کا بلکہ سب پہلے مذاہب کا ذکر ہے اور دو باتیں الگ الگ بیان کی ہیں ایک یہ کہ انہوں نے تفرقہ کیا اور دوسرے یہ کہ اختلاف کیا۔ تفرقہ سے مراد ان کی پراگندگی ہے یعنی الگ الگ راہوں پر ہو جانا اور کسی اصول پر متحد نہ رہنا۔ چنانچہ تمام مذاہب جو اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں ان میں اس قدر تفرقہ موجود ہے کہ باہم اصول میں وہ اختلاف رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے دین سے خارج قرار دیتے ہیں (گو بعض مسلمانوں نے بھی حماقت سے باوجود اصول میں متحد ہونے کے ایک دوسرے کو کافر اور بیدین کے فتوے دینے شروع کیے ہوئے ہیں) اور اختلاف کو چونکہ اس سے علیحدہ بیان کیا ہے اس لیے یہ اختلاف تعلیم حقہ سے ہے یعنی وہ سب کے سب فرقے تعلیم حقہ سے اختلاف کر رہے ہیں اور اس پر من بعد ما جاءھم البینات سے بھی شہادت ملتی ہے کہ منشاء تعلیم حقہ سے اختلاف کرنا ہے اور بینات سے مراد اسلام کی صداقت کی دلائل ہیں۔ جن میں سے بہت سی اسی سورت میں بیان ہو چکی ہیں۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

جس دن (کچھ) مُنہ سفید ہونگے اور (کچھ) منہ سیاہ ہوں گے پس جن کے منہ سیاہ ہوئے کیا تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے ہو تم عذاب چکھو اس لیے کہ تم کفر کرتے تھے ۴۹۴، ۴۹۵

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور جن کے مُنہ سفید ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہیں وہ اسی میں رہیں گے ۴۹۶

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

یہ اللہ کی باتیں ہیں جن کو ہم تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اللہ جہانوں کے لیے ظلم کا ارادہ نہیں کرتا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ ع

اور اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کی طرف ہی (سب) کام لوٹائے جاتے ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ

تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں (کی بھلائی) کے لیے ظاہر کی گئی ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو ۴۹۷ اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو یقیناً ان کے لیے اچھا ہوتا،

ع۴۹۴ مونہوں کی سفیدی اور سیاہی سے مراد: تبیضّ وجوہ وتسودّ وجوہ سفیدی اور سیاہی اصل رنگوں میں ہے لیکن عزت اور ذلت پر بھی ان الفاظ کا استعمال ہے جیسا کہ مفردات میں ہے لما کان البیاض افضل لون عندھم ...... عُبّر عن الفضل والکرم بالبیاض حتیٰ قبل لمر یتدنس بمعاب ھوابیض الوجہ یعنی چونکہ سفید عرب کے نزدیک سب سے افضل رنگ ہے اس لیے بیاض سے مراد فضل وکرم ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص عیب سے آلودہ نہ ہو اس کو ابیض الوجہ یا سفید منہ والا کہا جاتا ہے اور پھر اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے ابیاض الوجوہ عبارۃ عن المسرّۃ و اسوادھا عن الغم۔ یعنی مونہوں کی سفیدی کے معنی خوشی ہیں اور سیاہی سے مراد غم ہے۔ مفسرین کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو اسی طرف گیا ہے اور دوسرا گروہ لفظی سفیدی اور سیاہی مراد لیتا ہے۔ مگر خود قرآن کریم نے اس محاورہ کو دوسری جگہ استعمال کرکے بتا دیا ہے کہ اس کا منشاء کیا ہے جہاں فرمایا واذا بشر احدھم بالانثیٰ ظل وجھہ مسودا (النحل ۱۶ ۵۸) جب لڑکی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ فی الواقع سیاہ نہیں ہوتا، بلکہ مراد مغموم ہونا ہے اور لکھا ہے کہ جب حضرت امام حسنؓ نے حضرت معاویہ کو امارت سپرد کردی تو ایک شخص نے کہا یا مسود وجوہ المؤمنین اے مومنوں کے منہ سیاہ کرنے والے۔ جو لوگ ظاہر کی طرف گئے تھے انہوں نے بھی مراد نُور اور ظلمت کا مونہوں پر ہونا لیا ہے۔

ع۴۹۵ اکفرتم بعد ایمانکم سے کون لوگ مراد ہیں؟ منافقوں کا یہاں کوئی ذکر نہیں بلکہ ذکر پہلے لوگوں کا ہے جنہوں نے تفرقہ کیا اور دین حق سے اختلاف کیا۔ اس لیے ایمان سے مراد اُن کا پہلے انبیاء پر ایمان ہوگا اور کفر سے مراد دین اسلام سے انکار۔ بعض نے بعد ایمانکم کی تاویل یوں کر لی ہے کہ بعد اس کے کہ تمہارے لیے وہ امور ظاہر ہو گئے جن کا تقاضا یہ تھا کہ تم ایمان لاتے ہو۔

ع۴۹۶ ففی رحمۃ اللہ۔ یہاں جنت کی بجائے رحمۃ اللہ کا لفظ اختیار کیا ہے اور اسی میں خلود بتایا ہے۔ سچ ہے کہ اللہ کی رحمت ہی مومن کی حقیقی جنت ہے۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان جنت میں اپنے اعمال سے داخل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی رحمت اور فضل سے ہی جنت ملتی ہے۔

ع۴۹۷ کنتم۔ یہاں کنتم کے استعمال کی کئی ایک توجیہیں کی گئی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کنتم فی علم اللہ تم اللہ کے علم میں بہترین اُمت تھے۔ بعض نے کہا کنتم فی الامم قبلکم مذکورین بانکم خیر امۃ یعنی پہلی امتوں میں تمہیں بہترین اُمت کے نام سے یاد کیا گیا۔ جیسا کہ ذٰلک مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی الانجیل (الفتح ۴۸-۲۹) سے ظاہر ہے اور بعض نے کان کو زائد کہہ کر معنی انتم خیر امۃ کیے ہیں مگر دیکھو ع۲۷۲ جہاں دکھایا گیا ہے کہ وصف لازم کسی چیز کا ذکر کرنے کے لیے بھی کان کا استعمال ہوتا ہے پس یہاں خیر ہونا گویا اس اُمت کا وصف لازم قرار دیا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ تم بہترین امت ہو اور ہمیشہ بہترین اُمت ہی رہو گے۔

اخرجت۔ خرج کے معنی ہیں اپنی قرارگاہ یا اپنی حالت سے ظاہر ہوگیا یا نکل آیا خواہ اس کی قرارگاہ گھر ہو یا شہر یا لباس اور خواہ اس کا حال۔ اپنے نفس میں اس کی کوئی حالت ہو یا اسباب خارجی میں (رغ) یہاں اخرجت کے معنی اظھرت کیے گئے ہیں یعنی ظاہر کیے گئے (ر)

مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ ان میں کچھ مومن ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں ۴۹۸

امت محمدیہ کا کام دوسروں کی تکمیل ہے: للناس یہاں لام انتفاع کے لیے ہے یعنی تمہارا ظہور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہے۔ اسی لیے آگے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر کیا ہے یعنی تمہارا کام دنیا میں نیکیوں کی تعلیم دینا اور نیکیوں پر لوگوں کو قائم کرنا اور بدیوں سے روکنا ہے۔ اور اسی لیے تومنون باللہ کو جو کمال نفس کا مرتبہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے جو دوسروں کی تکمیل کے لیے ہے پیچھے رکھا ہے کیونکہ اصل غرض یہاں یہی ظاہر کرنے کی ہے کہ تمہارا کام دوسروں کی تکمیل ہے اور تومنون باللہ یا ان کے اپنے کمال نفس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ تا یہ معلوم ہو کہ وہ ایسی باتیں دوسروں کو نہیں کہتے جو خود نہ کرتے ہوں بلکہ اگر دوسروں کی تکمیل چاہتے ہیں تو اپنے نفس کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔

امت کی افضلیت: اس آیت میں مسلمانوں کو بہترین امت قرار دیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے ہے مگر اوّل تو یہاں لفظ کان کا استعمال اس کے خلاف ہے دوسرے کوئی وجہ اس قید کی نہیں۔ تیسرے حدیث سے بھی ثابت ہے کہ ساری اُمت کو ہی خیر الامم کہا ہے چنانچہ امام احمد نے یہ حدیث روایت کی ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطیت مالم یُعط احد من الانبیاء نُصِرت بالرُّعب و اُعْطِیتُ مفاتیح الارض و سُمِّیتُ اَحْمَد وَجُعِلَ التراب لی طَهُوْرًا و جُعِلت اُمّتی خیر الاُمم۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے وہ کچھ دیا گیا جو اور کسی نبی کو نہیں دیا گیا میری نصرت رعب سے کی گئی اور مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے اور میرا نام احمد رکھا گیا اور میرے لیے مٹی پاک کرنے والی بنائی گئی اور میری امت بہترین امت بنائی گئی۔ بیشک صحابہ رضی اللہ عنہم خود اس امت میں سے بھی بہترین گروہ ہے اور اس کی شہادت قرآن کریم سے ملتی ہے کہ ان کو رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی سند دی۔ لیکن یہاں ساری امت کی افضلیت کا دوسری امتوں پر ظاہر کرنا مقصود ہے اور اگر اس امت کے معلّم اور مزکّی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے تمام روحانی معلموں اور مزکیوں سے افضل ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آنجناب کے شاگرد تمام انبیاء کے شاگردوں سے افضل نہ ہوں۔

یہ افضلیت کس بات میں ہے؟ اس کی وجہ خود بتا دی ہے۔ ایک یہ کہ اُمت دنیا کے تمام لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ہر ایک نبی کی اُمت زیادہ تر اپنی قوم کی بہتری میں ہی کوشاں رہی مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے قومیت کا نشان مٹا کر ان کو تمام لوگوں کی بھلائی چاہنے والے قرار دیا گیا، وہ صرف مسلمانوں کا ہی بھلا نہیں چاہتے بلکہ ہر ایک قوم اور ہر ایک ملّت کے لوگوں کا بھلا چاہنے والے ہیں۔ قومی تفرقوں کو اسلام نے ہمیشہ کے لیے مٹا دیا اور دوسری وجہ ان کی فضیلت کی ان کا آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہونا ہے یعنی بھلائیوں کا حکم دینے والے اور بدیوں سے روکنے والے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے انبیاء کی امتیں یہ کام نہ کرتی تھیں؟ اصل بات یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام انبیاء کا کام ہے اور گو سابقہ امتیں بھی ایک حد تک اس کام کو کرتی تھیں، مگر ان کا کام بہت محدود تھا اور قومی رنگ میں محدود تھا۔ اور پھر ان کے اندر وقتاً فوقتاً انبیاء کی بعثت بھی ہوتی رہتی تھی۔ مگر یہ انبیاء کا کام اب پہلے سے ایک نہایت وسیع پیمانہ پر اسی اُمت کے سپرد کیا گیا ہے۔ کل دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور قوائے انسانی کی ساری شاخوں کی پرورش کرنا اور سب کا تزکیہ کرنا یہ وہ عظیم الشان کام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی نبی نے بھی کر کے نہیں دکھایا۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں اس وجہ افضلیت کو صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا وکذٰلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (البقرۃ ۲-۱۴۳) یوں ہم نے تم کو اعلیٰ درجہ کی امت بنایا ہے تا کہ تم لوگوں کے بشیر و نذیر بنو اور رسول تمہارا بشیر و نذیر ہو اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اس امت کے علماء کو ورثۃ الانبیاء انبیاء کے وارث اور کانبیاء بنی اسرائیل انبیائے بنی اسرائیل کے مثیل قرار دیا گیا ہے اگر اس امت میں کسی نبی نے آ کر بھی کام کرنا ہوتا تو امت کی بحیثیت اُمت افضلیت دیگر امم پر جاتی رہتی۔ پس نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسرائیلی اس اُمت کے اندر آ کر کام کر سکتے ہیں کیونکہ اس طرح بھی امت کی فضیلت جاتی رہتی ہے اور نہ کوئی دوسرا نبی اس امت کے اندر پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ اس طرح بھی امت کی افضلیت دوسری اُمم پر نہیں رہتی۔

فضیلت کا ثبوت: اور یہ دعویٰ کہ تم بہترین امت یا خیر الامم ہو بلا ثبوت نہیں چھوڑا گیا جس ردّی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو پایا کیا بلحاظ عقاید کے اور کیا بلحاظ اعمال کے اور کیا بلحاظ جہالت کے ایسی بدترین حالت کی قوم اور کسی نبی کو اصلاح کے لیے نہیں دی گئی۔ مگر باوجود ایسی ردّی حالت میں پانے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی نے ان کو ایمانی اور عملی پہلو کے لحاظ سے اور تعلیم اور تہذیب کے لحاظ سے ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچایا کہ کسی نبی نے اپنی امت کو اس مقام پر نہیں پہنچایا وہ نہ صرف زہد و عبادت میں تمام دنیا کی قوموں سے آگے بڑھ گئے بلکہ ہر طرح کے اخلاق فاضلہ کے زیور سے آراستہ ہو کر ہر پہلو میں دنیا کے ہادی اور رہبر بنے۔ کیا فتوحات ملکی کے لحاظ سے، کیا سیاست کے لحاظ سے، کیا تمدّن اور معاشرت کے لحاظ سے، کیا علوم کے لحاظ سے، کیا تہذیب کے لحاظ سے، کیا آزادیٔ خیال کو قائم کرنے کے لحاظ سے اور کیا مساواتِ نسل انسانی کے قائم کرنے کے لحاظ سے۔

ع۴۹۸ اھل الکتٰب۔ اہل کتاب کا لفظ یوں تو وسیع معنی میں آتا ہے۔ مگر اکثر جگہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں کو اس سے خطاب کیا ہے اور بعض جگہ صرف عیسائیوں کو بھی اس سے خطاب کیا ہے۔ مثلاً یا اھل الکتٰب لا تغلوا فی دینکم (النساء ۴-۱۷۱) اور یہاں اہل کتاب سے صرف یہودی مراد ہیں۔ جیسا کہ آیت ۱۱۱ کے مضمون سے ظاہر ہے جہاں الفاظ ضربت علیھم الذلۃ وباءو بغضب من اللہ وضربت علیھم المسکنۃ استعمال کر کے جو مخصوص طور پر یہود کی سزا کے بارہ میں سورہ بقرہ میں آ چکے ہیں صاف بتا دیا کہ یہاں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کی یہ سزا پہلی سورت میں بیان ہو چکی ہے۔ ایسا ہی الفاظ یقتلون الانبیاء بغیر حق سے بھی یہی ظاہر ہے کہ صرف یہود کا یہاں ذکر ہے کیونکہ قتل انبیاء کا الزام ہمیشہ انہی پر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اب اس سورت کے مضمون کو جنگ احد کے واقعات

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿١١١﴾

وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑیں گے سوائے ستانے کے اور اگر تم سے لڑیں گے تو تمہارے سامنے پیٹھ پھیر لیں گے پھر ان کو مدد نہ دی جائے گی ۴۹۹

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿١١٢﴾

اُن پر ذلت کی مار ہے، جہاں کہیں وہ پائے جائیں سوائے اس کے کہ) اللہ کے عہد اور لوگوں کے عہد کے ذریعہ سے (پناہ لیں) اور وہ اللہ کا غضب کما لائے، اور ان پر مسکینی کی مار ہے ۵۰۰ - یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے، اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے - یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے -

لَيْسُوْا سَوَاۗءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ

(سب) برابر نہیں، اہل کتاب میں سے ایک جماعت (حق پر) قائم ہے جو اللہ کی آیتوں کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے ہیں

کی طرف لاتا ہے - اور ان جنگوں میں ہمیشہ یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کو شرارت کا خطرہ رہتا تھا، کیونکہ ایک بڑی یہودی آبادی مدینہ منورہ میں تھی اس لیے اس جنگ کی تمہید میں ان کے ساتھ تعلقات کا ذکر کر دیا ہے اور واقعات جنگ کے ذکر کے اختتام پر بھی یہودیوں کا ذکر ہے اور بجائے کافر کے فاسق اس لیے کہا کہ ان لوگوں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عہد بھی لیا گیا تھا -

ع۴۹۹ اذی بمقابلہ ضرر و شر خفیف کو کہا جاتا ہے دیکھو ع۲۸۵ تکلیف دینے والی باتوں کو بھی اس سورت کے اخیر میں اذیٰ کے نام سے موسوم کیا ہے ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و من الذین اشرکوا اذی کثیرا (۱۸۵) حدیث میں جمعہ کے دن لوگوں کے اوپر سے گزر کر آنے جانے کو بھی اذیٰ کہا ہے اور رستہ میں چھوٹی چھوٹی تکلیف دینے والی چیزوں کو بھی اذیٰ کہا ہے اماطۃ الاذی عن الطریق -

یہود کی شکست کی پیشگوئی: اس میں پیشگوئی کی ہے کہ یہودیوں سے اہل اسلام کو کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے گی اور اگر وہ مسلمانوں سے جنگ کریں گے تو شکست کھائیں گے اور اس کے آخر پر ثم لا ینصرون بڑھایا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ منافق اور مشرک ان یہودیوں کو یہ وعدے دیتے رہتے تھے کہ اگر تم جنگ کرو گے تو ہم تمہاری مدد کریں گے جیسا کہ دوسری جگہ ذکر ہے الم تر الی الذین نافقوا یقولون لاخوانھم الذین کفروا من اھل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احدا ابدا و ان قوتلتم لننصرنکم واللہ یشھد انھم لکاذبون (الحشر ۵۹ - ۱۱) سو انہی وعدوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کی مدد کے لیے وہ ہرگز نہ نکلیں گے بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جنگ میں شکست کھانے کے بعد پھر ان کی کبھی عزت نہ ہو گی یعنی ایسا نہ ہو گا کہ شکست کھا کر پھر بھی غالب آجائیں بلکہ ہمیشہ کے لیے خذلان ہی ان کے شامل حال رہے گا -

ع۵۰۰ ذلۃ کے معنی ع۹۱ میں بیان ہو چکے ہیں - گو یہ لفظ محض محکومیت پر بھی صادق آتا ہے مگر انتہا اس کی یہ ہے کہ ایسی قتل و غارت ان پر واقع ہو کہ کسی حالت میں آرام نہ ملے - چنانچہ مفسرین نے بھی عموماً القتل والاسر وسبی الذراری مراد لیا ہے (ر) اور چونکہ محض محکومیت مسکنت میں شامل ہے اس لیے یہاں ذلت سے مراد یہی انتہائی ذلت قتل اور غارت کی ہے -

حبل کے معنی عہد اور ذمی اوپر بیان ہو چکے ہیں ع۴۹۰ حبل من اللہ سے مراد اللہ کا عہد یا ذمی ہے یعنی حکومت اسلامی جیسا کہ امر اللہ سے بھی کئی جگہ حکومت اسلامی ہی مراد لی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان بموجب فرمان الٰہی ان سے معاملہ کریں گے - اس لیے مسلمانوں کا عہد گویا اللہ کا عہد ہے اور حبل من الناس سے لوگوں کا عہد یعنی کوئی غیر اسلامی حکومت مراد ہے -

یہود کا انجام: اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہود کا انجام ذلت مسکنت اور اللہ کے غضب کے نیچے آجانا ہے اور یہی انجام ان کا دوسری جگہ سورۃ بقرہ میں بھی بیان ہو چکا ہے (البقرۃ ۲ - ۶۱) ذلت اور مسکنت ان کی دنیوی حالت کے متعلق ہے اور غضب من اللہ ان کی دینی حالت کے متعلق ہے - مگر ذلت یعنی قتل و غارت کی حالت سے وہ اس طرح سے نکل سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذمی میں آجائیں - یعنی حکومت اسلامی کے ماتحت آجائیں اور یا کسی دوسری حکومت سے معاہدہ کر کے رہیں (دو یہاں بمعنی او ہے) اور چونکہ غیر اسلامی سلطنتوں میں ان کو پورا آرام ملنا مقدر نہ تھا اس لیے حبل من الناس کو بعد میں رکھا ہے اور یا الناس سے مراد مسلمان ہیں یعنی اللہ کے عہد اور اہل اسلام کے عہد کے ذریعہ سے ہی یہ پورا امن حاصل کر سکیں گے اور اس طرح وہ ان دونوں کو حکم واحد میں رکھا ہے - مگر مسکنت یا محکومیت سے اور اللہ کے غضب سے یہ کسی حالت میں نہ نکلیں گے -

يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور سجدے کرتے ہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

وہ اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں اور نیکیوں کو جلدی لیتے ہیں اور وہی نیکوں میں سے ہیں ع۵۰۱

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور جو کچھ وہ نیکی کریں گے تو اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی اور اللہ متقیوں کو خوب جاننے والا ہے ع۵۰۲

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔـا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

جنھوں نے کفر کیا اُن کے مال اور ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) کے سامنے ان کے کسی کام نہ آئیں گے اور وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے ع۵۰۳

ع۵۰۱ قائمۃ - قیام مختلف معنی میں آتا ہے۔ ایک قیام ایک وجود کا ہے جو تسخیر سے ہو یا اختیار سے تسخیر سے جیسے قائم وحصید (ھود ۱۱-۱۰۰) اختیار سے جیسے امن ھو قانت اٰناء الیل ساجدا و قائما (الزمر ۳۹-۹) اور کسی چیز کا قیام اس کا نگاہ رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے یہی معنی یہاں ہیں اور ایک قیام کسی چیز پر عزم کر لینا ہے جس کی مثال ہے اذا قمتم الی الصلوٰۃ (غ) مفسرین نے مستقیمۃ عادلۃ یا قائم بحق العبودیۃ (غق) یا مستقیمۃ علی طاعۃ اللہ (ر) معنی کیے ہیں یعنی حالت استقامت میں رہنے والی عادل۔ یا حق عبودیت کی حفاظت کرنیوالی یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر استقامت اختیار کرنیوالی جماعت۔

اٰناء - انی یا اِنْیٌ کی جمع ہے رات کی گھڑی۔ اور اَنٰی کے معنی ہیں ایک چیز اپنے وقت اور انتہا کو پہنچ گئی حَانَ وَاَدْرَکَ اسی سے ہے۔ الم یان للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ (الحدید ۵۷-۱۶) اور اَنٰی الحرُّ کے معنی ہیں گرمی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ یطوفون بینھا و بین حمیم اٰن (الرحمٰن ۵۵-۴۴) اور عین اٰنیۃ (الغاشیۃ ۸۸-۵) میں یہی معنی ہیں اور اسی سے اِنٰی کے معنی پکنا ہیں۔ غیر ناظرین اِنٰہُ (الاحزاب ۳۳-۵۳) اور اِنَاء برتن کو کہتے ہیں جس کی جمع اٰنیۃ۔ ویطاف علیھم باٰنیۃ من فضۃ (الدھر ۷۶-۱۵) (ل)

اہل کتاب کے مومن: ان دو آیات میں اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے۔ مگر اہل کتاب میں سے ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ یہودیوں کے مذہب پر ہیں بلکہ وہ لوگ جو اُن میں سے نکل کر اسلام میں آ گئے تھے جن میں سے عبداللہ بن سلام اور اسد بن عبید اور ثعلبہ بن شعبہ وغیرہم ہیں جیسا کہ اس سورت کے آخر پر فرمایا وان من اھل الکتٰب لمن یؤمن باللہ وما انزل الیکم وما انزل الیھم (اٰل عمران ۳-۱۹۹) چونکہ پچھلی آیت میں یہود کی ذلت اور ان پر غضب کا ذکر تھا تو اس لیے اب فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی قوم کے ساتھ یہ کوئی خصوصیت ہے بلکہ یہ ان کے اعمال کی وجہ سے ہے اسی لیے اس دوسرے گروہ کا ذکر کر دیا جو اپنے اعمال و اعتقادات کی وجہ سے ان تمام باتوں سے نکل کر ایک اعلیٰ مقام پر پہنچ چکے ہیں۔

یہاں ان لوگوں کی کچھ صفات بیان فرمائی ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ مستقیم ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت پر استقامت اختیار کرنے والے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ رات کی گھڑیوں میں آیات اللہ کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ بھی مسلمانوں کا ہی خاصہ ہے۔ تیسری صفت یہ ہے کہ ھم یسجدون جس سے مراد یا نماز ہے کیونکہ رکوع اور سجدہ دونوں لفظ بوجا اپنی عظمت کے نماز پر بولے گئے ہیں اور یا یسجدون سے مراد یخضعون ہے یعنی خدا کے حضور جھکے رہتے ہیں یہ مراد نہیں کہ حالت سجدہ میں تلاوت آیات کرتے ہیں کیونکہ نبی کریم صلعم سے روایت ہے انی نھیت ان اقرأ راکعا وساجدا (غق) یعنی مجھے روکا گیا ہے کہ حالت رکوع یا حالت سجدہ میں قرآن شریف پڑھوں۔ ان تین صفات کے بعد جو عمل سے تعلق رکھتی ہیں ان کے عقیدہ کا ذکر فرمایا اور چوتھی صفت ان کی یہ فرمائی کہ وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں۔ ان الفاظ میں ہمیشہ قرآن شریف میں مسلمانوں کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں صفت ان کی یہ ہے کہ دوسروں کی تکمیل کرتے ہیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور چھٹی یہ کہ ہر قسم کی بھلائیوں میں سبقت کرتے ہیں کیونکہ ان تمام امور کو ایک انسان اس حالت میں بھی کر سکتا ہے کہ سستی سے اور کمزوردلی سے ان کی طرف رغبت کرے مگر ان کی صفت یہ ہے کہ تمام بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں کہ پیچھے نہ رہ جائیں جس سے معلوم ہُوا کہ ان کا دل ان باتوں کے اندر ہے۔

ع۵۰۲ یکفروہ - کفر کے اصل معنی ستر الشئی یعنی کسی چیز کا ڈھانک دینا ہیں۔ پس یہاں لن یکفروہ سے مراد ہے لن یحرموا ثوابہ یعنی اس کے ثواب سے محروم نہیں کیے جائیں گے۔ یا کفر بمقابلہ شکر ہے۔ چونکہ پہلی دو آیات میں کامل صالحین کا نقشہ کھینچا تھا اس لیے اب بتایا ہے کہ ہر ایک اگر اس کمال کو حاصل نہ کر سکے تو جتنی بھی نیکی کرے اس کی بھی اللہ کے ہاں قدر ہے۔

ع۵۰۳ قریباً یہی الفاظ سورۃ آل عمران کے شروع میں بھی آئے ہیں جہاں خاص طور پر نصاریٰ مخاطب تھے دیکھو ع۳۸۸ یہاں یہود اور مشرکین عرب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگیں کر رہے تھے خاص مخاطب ہیں

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ
قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ
اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً
مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا
عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ
وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا
لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾
هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ
قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ

اس کی مثال جو اس دنیا کی زندگی کے متعلق خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ہوا، جس میں سخت سردی ہو وہ ان لوگوں کی کھیتی کو پہنچے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اسے تباہ کر دے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ ع۵۰۴

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنوں کے سوائے (اپنے) رازدار نہ بناؤ، وہ تمھاری خرابی میں کمی نہیں کرتے، وہی چاہتے ہیں جو تمھیں تکلیف دے ان کے مونہوں سے بغض ظاہر ہو چکا ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ بڑھ کر ہے۔ یقیناً ہم نے تمھارے لیے باتیں کھول کر بیان کر دی ہیں اگر تم عقل سے کام لو۔ ع۵۰۵

سنو! تم وہ ہو جو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے حالانکہ تم ساری کی ساری کتاب پر ایمان لاتے ہو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو سخت

ع۵۰۴ صِرّ۔ صِرّ، صِرّۃ سردی کی شدت کا نام ہے (ل)، کیونکہ صَرّ کے اصل معنی شَدّ یعنی کس کر باندھنا ہیں اور اسی سے اصرار ہے اور صُرّۃ یعنی تھیلی جس میں روپے باندھے جاتے ہیں اور ریح صِرٌّ اور ریح صَرصَرٌ اس ہوا کو کہتے ہیں جس میں سخت سردی ہو یا بعض کے نزدیک سخت آواز ہو (ل) اور زجاج نے صر کے معنی صوت لہیب النار (م) کیے ہیں یعنی آگ کے شعلے کی آواز اور ابن عباس سے ایک روایت میں اس کے معنی نار یعنی آگ بھی آئے ہیں (رغ)۔ مراد اس سے ایسی ہوا ہے جو بوجہ شدت سردی (یا بوجہ شدت گرمی کے) کھیتی کو تباہ کر دے۔

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ ان لوگوں کے مال اور اولاد جن کے فخر پر وہ تخریب اسلام کے درپے ہیں ان کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے۔ یہاں ان کی ان کوششوں کا انجام ایک مثال کے رنگ میں سمجھایا ہے۔ ان کے خرچ کرنے کو ما ینفقون فی ھٰذہ الحیٰوۃ الدنیا قرار دیا ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے تھے محض نمود اور ریا کے لیے تھا۔ ان کے لشکروں کی تیاری اور دیگر ایذا رسانی پر مال خرچ کرنے کو ایک کھیتی سے تشبیہ دی ہے جس کو آخر ایک عذاب کی ہوا تباہ کر دے گی اور ان کے ہاتھ میں سوائے حسرت اور ندامت کے کچھ نہ آئے گا اور آخر پر فرمایا کہ ان کی کوششوں کی ناکامی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم کے طور پر نہیں بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ کیونکہ بجائے نیکی اور تائید حق کے اپنے اموال کو معصیت اور تخریب حق پر خرچ کرتے ہیں اور اس لیے وہ سزا کے مستحق ہیں۔

ع۵۰۵ بطانۃ۔ بَطْن اصل میں پیٹ ہے لیکن ہر چیز میں اس کے ظاہر کے خلاف کو اس کا بطن کہہ دیتے ہیں اور اسی طرح بطانۃ خلاف ظھارۃ ہے اور بطور استعارہ بطانۃ کا استعمال اس شخص پر ہوتا ہے جس کو تم اپنے معاملہ کے باطن یعنی راز پر اطلاع دینے کے لیے خاص کر لو (رغ) اور ایک حدیث میں جس کو بخاری نسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے بطانۃ اس ملک اور شیطان پر بولا گیا ہے جو انسان کا قرین ہے۔ مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِن نَّبِيٍّ وَّلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيْفَةٍ اِلَّا كَانَتْ لَهٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَةٌ تَاْمُرُهٗ بِالْخَيْرِ وَتَحُضُّهٗ عَلَيْهِ وَبِطَانَةٌ تَاْمُرُهٗ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّهٗ عَلَيْهِ وَالْمَعْصُوْمُ مَنْ عَصَمَهُ اللّٰهُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کوئی خلیفہ بنایا ہے مگر اس کے لیے دو صاحب سِرّ ہوتے ہیں ایک صاحب سِرّ جو اسے نیکی کا حکم کرتا ہے اور اس کی ترغیب دلاتا ہے۔ اور ایک صاحب سِرّ جو اسے برائی کا امر کرتا ہے اور اس پر اسے برانگیختہ کرتا ہے۔ اور معصوم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچالے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے خلفائے مامورین یعنی مجددین بھی یوں تو اس قانون کے ماتحت ہیں جس کے ماتحت سب انسان ہیں مگر اللہ اپنے فضل سے ہی جس کو چاہتا ہے بچا لیتا اس سے انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر بھی دلیل ملتی ہے۔

خبالا۔ خبال وہ فساد ہے جو کسی جاندار کو پا کر اس میں اضطراب پیدا کر دے جیسے جنون یا ایسی بیماری جو عقل و فکر پر اثر ڈالے (غ)۔

البغضاء۔ بُغض نفس کا اس چیز سے نفرت کرنا ہے جس کو تم ناپسند کرو (رغ)، اور بغضاء شدت بغض ہے۔

افواہ۔ اس کا واحد فم ہے جس کے معنی منہ ہیں مگر اصل اس کا فوہ ہے۔

الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿١١٩﴾
اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ
تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ
تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ
ع ١٢ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿١٢٠﴾

غصّے کے مارے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں کہہ اپنے غصّے میں مرجاؤ۔ اللہ سینوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے ع۵۰۶

اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچے اُن کو بُرا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی بُرائی پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور تقوے کرو تو اُن کی تدبیر تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچائے گی اللہ اس کا جو وہ کرتے ہیں احاطہ کیے ہوئے ہے ع۵۰۷

اس آیت میں اپنے دشمنوں کو راز دار دوست بنانے کی ممانعت کی ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ اپنے دشمن کو راز دار دوست بنانا اپنی ہی تخریب ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ من دونکم عام الفاظ ہیں ان کو دشمنوں کے ساتھ خاص کیوں کیا جائے تو اس کی وجہ خود آگے بیان کر دی ہے۔ کیونکہ ان کے متعلق خود فرمایا کہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ بلکہ چاہتے ہیں کہ ان پر کوئی ہلاک کرنے والی مصیبت آئے۔ پھر یہ ان کی باتیں مخفی ہی نہیں بلکہ یہ بغض ان کے الفاظ سے ظاہر ہو چکا ہے۔ ہاں جس قدر انہوں نے ظاہر کیا ہے اس سے بہت بڑھ کر ابھی ان کے سینوں میں مخفی ہے۔ یہ سب کچھ کھول کر مسلمانوں کو بتا دیا تاکہ وہ جلد ان کی ہلاک کر دینے والی دوستی سے بچیں۔

یہودیوں کی منافقت اور بدزبانی: یہود نے جیسا کہ اگلی آیت سے معلوم ہوگا۔ منافقانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ ادھر نبی کریم صلعم کے ساتھ معاہدہ کر رکھا تھا ادھر اندر ہی اندر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اور مسلمانوں کے دشمنوں کو مسلمانوں پر چڑھائی کرنے کے لیے اکساتے رہتے تھے۔ ان مخفی شرارتوں کے علاوہ ان کی بدزبانی بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی جیسا کہ قد بدت البغضاء من افواھھم سے ظاہر ہے نبی کریم صلعم کے سامنے بھی شرارت کے الفاظ بول دیتے تھے جیسا کہ سورہ بقرہ میں ذکر آچکا ہے مگر اس سے بڑھ کر بھی مسلمانوں کو بدزبانی سے ایذا پہنچاتے رہتے تھے۔ اور اشعار میں پاک دامن مسلمان عورتوں پر گندے حملے کرتے رہتے تھے۔

ع۵۰۶ وتؤمنون بالکتاب کلہ میں واؤ حالیہ ہے اور الکتاب سے مراد جنس کتاب ہے یعنی تم سب کتب الٰہی پر ایمان لاتے ہو جن میں ان کی کتاب بھی شامل ہے۔

عضوا علیکم الانامل۔ عَضّ دانتوں سے کاٹنے کو کہتے ہیں اور انامل۔ اَنْمَلۃ کی جمع ہے۔ اور اس کے معنی انگلیوں کی اطراف یعنی پورے ہیں۔ اور عضّ انامل خاص محاورہ ہے جس سے مراد اظہار ندامت ہوتا ہے (غ) کیونکہ یہ لوگوں کی عادت ہے کہ ندامت کے وقت ایسا کرتے ہیں۔ اور سخت غصّہ کے وقت بھی انسان ایسا ہی کرتا ہے۔ گویا اپنے آپ کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

الغیظ۔ غیظ شدید غضب کو کہتے ہیں اور یہ وہ حرارت ہے جو انسان قلب کے خون کے جوش میں آنے سے اپنے اندر پاتا ہے (غ)

قل موتوا بغیظکم۔ یہ ان کی حالت کا اظہار ہے گویا عملاً ان کو یہ کہہ دینا چاہیئے کہ وہ غیظ میں ہی مر جائیں اور مطلب یہ ہے کہ یہ غیظ ان کا جو مسلمانوں کی کامیابیوں پر پیدا ہوتا ہے روز بروز بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اور یوں بھی یہ الفاظ ان کو پہنچا ہی دیئے گئے۔

اس آیت میں اوّل مسلمانوں کو ان کی محبت سے روکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ان کی شرارتوں کے مسلمان اپنی پاک فطرتوں کی وجہ سے ان سے محبت ہی کرتے تھے۔ اور اگر معمولی حالات رہتے خواہ وہ اسلام میں داخل نہ ہوتے تو مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نہ روکتا۔ مگر روکنے کی وجہ بھی بتا دی کہ ان کا غیظ و غضب تم پر حد سے بڑھا ہُوا ہے۔ پہلے فرمایا ولا یحبونکم وتؤمنون بالکتاب کلہ یعنی حالانکہ تم تو ان کی کتاب پر بھی ایمان لاتے ہو پھر بھی وہ تم سے محبت نہیں کرتے حالانکہ حق یہ تھا کہ جب مذہب کے رو سے بھی مسلمان ان کی کتابوں کو اصولاً منزل من اللہ مانتے تھے تو وہ ان سے محبت کرتے تو فرمایا کہ جب باوجود اس کے تم ان کی کتاب پر ایمان لاتے ہو وہ تم سے محبت نہیں کرتے تو وہ تو نہ صرف تمہاری کتاب پر ہی ایمان نہیں لاتے بلکہ تمہارے ساتھ اس قدر بغض رکھتے ہیں کہ تمہارا سُکھ ان کے لیے موجب دُکھ ہے۔

ع۵۰۷ حسنۃ۔ حُسن۔ ہر ایک خوش کرنے والے امر کو کہتے ہیں جس میں رغبت کی جائے اور اسی سے حسنۃ جس سے مراد ہر ایک نعمت ہے جو انسان کو اس کے نفس یا بدن یا حالت میں پہنچے اور اس کی ضد سیئۃ ہے (غ) مزید تفصیل کے لیے دیکھو ع۱۰۵

کید۔ کید کے اصل معنی زبان عربی میں احتیال اور اجتہاد ہیں یعنی باریک یا خفیہ تدبیر اور کوشش کرنا (ل۔ غ۔ ن) اور امام راغب کہتے ہیں کبھی کید مقام مدح میں ہوتا ہے اور کبھی مقام ذم میں گو اس کا اکثر استعمال مقام ذم میں ہے کئی احادیث میں یہ لفظ آتا ہے۔ ایک میں ہے فی عقول کادھا خالقھا۔ جس کے معنی ابن اثیر کرتے ہیں ارادھا بسوء یعنی ان کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کیا ہے۔ ایک میں ہے دخل الیٰ سعد وھو یکید بنفسہ جہاں معنی کیے گئے ہیں۔ النزع یعنی آپ سعد پر داخل ہوئے اور وہ حالت نزع میں تھے۔ کیونکہ کید کے معنی السوق یعنی چلانا بھی آتے ہیں۔ گویا وہ اپنی جان کو نکال رہے تھے۔ اور ایک میں آتا ہے ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزا غزوۃ کذا فرجع ولم یلق کیدا یعنی آپ فلاں غزوہ میں گئے اور آپ واپس آئے اور

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۱۲۱﴾

اور جب تو سویرے اپنے گھر والوں سے چلا مومنوں کو لڑائی کے لیے مورچوں پر بٹھاتا تھا اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۵۰۸

کوئی کیدنہیں ملا- جہاں کید کے معنی حرب یعنی جنگ آئے ہیں یعنی جنگ کوئی نہیں ہوئی-

اس آیت میں ان کی خطرناک عداوت کا مزید بیان کیا ہے اور پھر ان کی چالوں اور تدبیروں سے بچنے کی راہ بتائی ہے- پہلے فرمایا کہ ان کی عداوت کا یہ حال ہے کہ تم کو سُکھ چھو بھی جائے تو ان کو بُرا لگتا ہے- اور تم پر دُکھ کی مصیبت وارد ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں- یہاں سُکھ کے لیے تمسسکم استعمال کیا ہے اور دُکھ کے لیے تصبکم یعنی وارد ہو جانا- یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ سُکھ کا محض چھو جانا یعنی ذرا سے سُکھ کا تم کو ملنا بھی ان کے لیے باعث تکلیف ہوتا ہے- حالانکہ دُکھ اور تکلیف جب کبھی کسی شخص کو پہنچے تو فطرت انسانی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ رنجش اور کدورت جو تھوڑی بہت باہم ہو وہ دُور ہو کر اس کی جگہ ہمدردی پیدا ہو جائے مگر ان کی عداوت اس قدر شدید ہے کہ مسلمانوں پر مصیبت وارد ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں-

ع۵۰۸ غدوت- اس کا مادہ غدا ہے اور غُدْوَۃ اور غداۃ دن کے ابتدا کو کہتے ہیں اور غداء اس طعام کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت کھایا جائے (غ) پس غدوت کے معنی ہوئے صبح کے وقت نکلا-

حضرت عائشہ رضؓ کا جنگِ اُحد میں شریک ہونا: من اھلك- اھل کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۳۷ ل خصوصیت سے یہ لفظ بی بی پر بولا جاتا ہے (غ) تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ اس جنگ میں نبی کریم صلعم کے ساتھ تھیں- چنانچہ صحیح بخاری میں غزوہ اُحد کے بیان میں حضرت انس رضؓ کی روایت میں حالت جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت عائشہ رضؓ اور اپنی والدہ ام سلیم کو دیکھا کہ پانی کی مشکیں بھر بھر کر اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر لاتیں اور زخمیوں کو پلاتی تھیں اور ام سلیط کے بھی زخمیوں کو پانی پلانے کا ذکر بخاری میں ہے اور ام عمارہ کا ذکر ہے کہ وہ نبی کریم صلعم سے دشمنوں کا دفاع بھی کرتی تھیں- عورتوں کا جنگوں میں شامل ہونا تاریخی امر ہے اور اُحد کے میدان میں بھی ان کی شمولیت ثابت ہے پس اھلك سے مراد یہاں حضرت عائشہ صدیقہ ہیں اور انہی کے گھر سے نبی کریم صلعم نے اُٹھ کر ہفتہ کے دن صبح ہی مومنوں کو لڑائی کے موقعوں پر آراستہ کیا-

تبوئ- بواء سے ہے اور بواء اصل میں مکان میں اجزا کی مساوات کو کہتے ہیں یعنی ہمواری کو، دیکھو ع۹۱ اور بَوَّاْتُ لہ مکانا کے معنی ہیں سَوَّیْتُہٗ (غ) یعنی اس کے لیے مکان کو ہموار کیا- مطلب یہ کہ اس کو ایسا مکان دیا جس میں وہ مضبوطی سے قدم جما سکے اور صرف جگہ یا مکان دینے پر بولا جاتا ہے ان تبوّا لقومکما بمصر بیوتا (یونس۱۰- ۸۷) ولقد بوّأنا بنی اسرائیل (یونس۱۰- ۹۳) یتبوأ منها حیث یشاء (یوسف۱۲- ۵۶)

مقاعد- مَقْعَدْ کی جمع ہے جس کے معنی بیٹھنے کی جگہ ہیں اور مقاعد للقتال قتال کے لیے بیٹھنے کی جگہیں ہیں جس سے مورچے مراد ہیں (غ) یہاں سے جنگ اُحد کا ذکر شروع ہوتا ہے اور طرز عبارت واذ غدوت من اھلك گویا یہ کسی پہلے بیان پر بطور عطف ہے ایسی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ مضمون ایک ہی چل رہا ہے ابو مسلم نے اسے لقد کان لکم اٰیۃ فی فئتین التقتا پر عطف قرار دیا ہے یعنی ایک تو نشان جنگ بدر میں تھا اور ایک نشان جنگِ اُحد میں ہے مگر میرے نزدیک اس کا تعلق پچھلے رکوع کی آخری آیت سے ہے کیونکہ وہاں فرمایا تھا کہ تم کو کوئی دکھ پہنچے تو اہل کتاب خوش ہوتے ہیں اور تم کو خوشی پہنچے، تو انھیں بُرا لگتا ہے تو اب اس واقعہ کا ذکر آتا ہے جس میں مسلمانوں کو کچھ دُکھ پہنچا اور وہ واقعہ جنگِ اُحد کا ہے اور اس رکوع میں اس جنگ کی طرف نکلنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے لشکر کو مورچوں پر بٹھانے اور نصرت ملائکہ کا ذکر ہے-

جنگِ بدر میں سخت ہزیمت اُٹھانے کے بعد قریش مکّہ نے ایک بڑی بھاری کوشش اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے اور پہلی ہزیمت کا داغ مٹانے کے لیے کی اور اگلے سال یعنی ۳ھ ہجری میں تین ہزار کا لشکر لیکر جس میں دو سو سوار تھے شوال کے مہینہ میں اُحد کے مقام پر جو مدینہ کے شمال میں صرف چار میل کے فاصلہ پر ہے پہنچ گئے ان کا وہاں ٹھہر جانا اس لیے تھا کہ تا مسلمان کسی طرح مدینہ سے باہر نکل آئیں کیونکہ مدینہ کے اندر رہنے سے ان کی حالت زیادہ مضبوط رہتی- چنانچہ بدھ کے دن وہ مقام اُحد پر پہنچے- ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تیاری کی اور جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ آپ چلے اور ہفتہ کے دن صبح صف آرائی کی اور اسی دن جنگِ اُحد ہوئی- بعض نے لکھا ہے کہ ۷ شوال تھی اور بعض نے اسے نصف شوال کہا ہے-

جنگ اُحد کے متعلق مشورہ: نکلنے سے پہلے نبی کریم صلعم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ ہم کو باہر نکل کر ان کے ساتھ جنگ کرنی چاہیئے یا مدینہ کے اندر رہ کر- اور اس مشورہ میں عبداللہ بن ابی کو بھی جو بعد میں راس رئیس المنافقین کے نام سے مشہور ہُوا بلایا، اس سے پہلے آپ نے اسے کبھی نہ بلایا تھا- عبداللہ نے یہ مشورہ دیا کہ مدینہ کے اندر ہی رہ کر جنگ کرنی چاہیئے- انصار کے بعض لوگوں نے بھی یہی مشورہ دیا مگر دوسرے لوگوں نے عرض کیا کہ ہم کو باہر نکلنا چاہیئے- کیونکہ اگر ہم باہر نکل کر نہ لڑیں تو ان کا خیال ہوگا کہ مسلمان ہم سے ڈر گئے اور محصور ہو کر جنگ کی- رسول اللہ صلعم کی اپنی رائے بھی پہلے گروہ کے ساتھ تھی- آنحضرت صلعم کی تین رؤیا: اور آپ نے تین خواب بھی اس بارہ میں دیکھے تھے ایک یہ کہ میرے لیے ایک گائے ذبح کی گئی ہے اس کی تعبیر آپ نے کی کہ ہمارے لیے بہتری ہے- دوسرا یہ کہ میں نے اپنی تلوار کی دھاریں بعض جگہ شکستہ دیکھی ہیں اور اس کی تعبیر آپ نے یہ کی کہ ہمارے غلبہ میں کچھ آثار ہزیمت کے ہونگے- تیسرا یہ کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے اور اس کی تعبیر آپ نے مدینہ سے کی یعنی اگر ہم مدینہ میں رہیں گے تو یہیں ایک مضبوط زرہ کا کام دیگا- مگر کثرت رائے یہی تھی کہ باہر نکلنا چاہیئے- اسی کے مطابق آپ نے فیصلہ کیا- یہ ہے مشورہ کی عزت اور شورٰی کے فیصلہ کی عزت جو نبی کریم صلعم نے جو خود مہبط وحی تھے کر کے دکھائی کہ اپنی رائے بلکہ اپنی رؤیاء کے خلاف شورٰی کے فیصلہ کو ترجیح دی-

إِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا ۙ وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٢٢﴾

جب تم میں سے دو گروہوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں اور اللہ ان دونوں کا ولی تھا اور اللہ پر ہی مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے ۵۰۹۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَّأَنتُمْ

اور یقیناً اللہ نے تم کو بدر میں مدد دی جب تم کمزور

واقعات جنگ اُحد: غرض جمعہ کے بعد ایک ہزار آدمی کو لیکر آپ باہر نکلے جب ایک مقام شوط پر پہنچے تو عبداللہ بن ابی ایک تہائی آدمیوں کو ساتھ لیکر اس لیے واپس آ گیا کہ میرے مشورے کے مطابق کیوں کام نہیں کیا گیا۔ سو آپ چھ اور سات سو کے درمیان آدمیوں کو لیکر اُحد کے مقام پر پہنچے اور اگلے دن علی الصباح پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھ کر اپنے لشکر کو جنگ کے لیے تیار کیا اور ایک مورچہ پر عبداللہ بن جبیر کے ماتحت پچاس تیر اندازوں کو کھڑا کیا اور ان کو حکم دیا کہ ہم کو فتح ہو یا شکست، تم نے کسی صورت میں اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا ہوگا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں نے ایسے جوش سے حملہ کیا کہ سات سو کے سامنے تین ہزار کے پاؤں اکھڑ گئے ان کے علمبردار یکے بعد دیگرے مارے گئے اور بہت سے آدمی ان میں سے زخمی ہو گئے آخر وہ قائم نہ رہ سکے اور بھاگ اُٹھے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور خوب دُور نکل گئے۔ تیر اندازوں نے سمجھا اب فتح کامل ہو گئی ہے اور اب اس جگہ کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اپنے امیر کے حکم کے خلاف جگہ کو چھوڑا۔ قریش کے رسالہ پر خالد بن ولید اور عکرمہ تھے انہوں نے جب اس مورچہ کو خالی دیکھا تو فوراً رسالہ کے ساتھ عقب سے حملہ کیا ادھر قریش کا بھاگتا ہُوا لشکر سنبھلا مسلمان تعاقب کی وجہ سے پہلے ہی منتشر تھے۔ اب دو طرف سے حملہ ہُوا۔ یہ ایک بڑا سخت وقت تھا اور فوج تتر بتر تھی اتنے میں نبی کریم صلعم نے اس حالت کو دیکھ کر بلند آواز سے پکارا الی عباد اللہ انا رسول اللہ اے اللہ کے بندو میری طرف آ جاؤ میں اللہ کا رسول ہوں۔ کفار کی اصل غرض تو یہی تھی کہ سب سے پہلے آنحضرتؐ کو ماریں۔ ان الفاظ کے ساتھ اگر ایک طرف کچھ صحابہؓ آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہو گئے تو دوسری طرف کفار کے حملے کا سارا زور اسی موقعہ پر ہو گیا۔ آنحضرتؐ کے سر میں زخم آیا اور کچھ دانت بھی زخمی ہو گئے اور آپ گر گئے مگر ساتھ ہی آپ کے صحابہؓ نے آپ کے ارد گرد اور دشمن کے مقابل پر ایک مضبوط دیوار بنالی اور سب مسلمان آہستہ آہستہ یہاں جمع ہو گئے۔ اور چند ایک نفوس مدینہ کی طرف بھاگ گئے۔ جب دشمن نے دیکھا کہ مسلمانوں کی پراگندہ جمعیت پھر اکٹھی ہو گئی ہے تو انہوں نے فوراً واپسی کی ٹھان لی اور مسلمانوں کو میدان جنگ میں چھوڑ کر مکہ کو واپس ہوئے۔ مسلمانوں کو نقصان ضرور پہنچا مارے بھی گئے زخمی بھی ہوئے مگر انہوں نے شکست نہیں کھائی۔ کفار سخت نقصان اور کھلی ہزیمت سے ضرور بچ گئے مگر انہوں نے فتح حاصل نہیں کی بلکہ صرف مسلمانوں کے تعاقب سے محفوظ ہو کر گھر کی راہ لی۔

آنحضرت صلعم کے مختلف کام: اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم ہر قسم کی ذمہ داری کے کام کو خود ہی کرتے تھے۔ یہاں مسلمان فوج کو مورچوں پر بٹھانا بھی آپ کا کام تبلایا ہے۔ گویا جرنیل یا کمانڈر کا اصل کام آپ خود ہی کرتے تھے۔ کس قدر مختلف شعبے کام کے آپ کی ذات میں جمع تھے خود ہی نمازوں کی امامت کرائیں خود ہی تعلیم دین دیں، خود ہی جھگڑوں کے فیصلے کریں۔ خود ہی قوانین بنائیں۔ خود میدان جنگ میں جا کر لڑیں اور خود ایک جرنیل کا کام بھی کریں۔ غرض کوئی پہلو ایسا نظر نہیں آتا جس میں آپ نے خود ہی ایک نمونہ قائم نہ کیا ہو۔

۵۰۹ ہمّت۔ هَمّ ایسے غم کو کہتے ہیں جو انسان کو پگھلا دے (غ) اس لیے اَهَمَّهُ الْاَمْرُ کے معنی ہیں اَقْلَقَهٗ۔ اَحْزَنَهٗ (ل) یعنی اس امر نے اس کو قلق میں یا حزن میں ڈالا۔ اسی لیے مہمات الامور ان سخت امور کو کہتے ہیں جو حزن میں ڈالنے والے ہوں اور هَمَّ بالشئ کے معنی ہیں اس کی نیت یا ارادہ کیا یا اس پر عزم کیا (ل) هِمَّة اور هُمام اسی سے ہیں هِمَّة کسی امر کے کر لینے کے قصد کا نام ہے اور ھمام۔ عظیم الهمّة آدمی کو کہتے ہیں اور یہاں هَمَّت کے معنی صرف دل میں ایک خیال کا لانا ہیں، جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے کہ ان سے وہ کمزوری سرزد نہیں ہوئی۔

تفشلا۔ فشل سے ہے جس کے معنی ہیں وہ کمزوری جس کے ساتھ بزدلی ملی ہوئی ہو (غ)

یتوکّل۔ وکل سے ہے وَكَلْتُ امری الی فلان کے معنی ہیں دوسرے کی طرف ایک امر کو لے گیا اور اس بارہ میں اس پر اعتماد کیا (ل) اور توکّل کا استعمال دو طرح پر ہے ایک صلہ لام کے ساتھ توکلت لفلان کے معنی ہیں توکلت له یعنی اس کی خاطر میں اس کا متولی ہو گیا اور توکلت علیه کے معنی ہیں اعتمدت علیه یعنی اس پر میں نے اعتماد کیا (غ) اور اللہ تعالیٰ کا وکیل ہونا اسی معنی میں ہے کہ وہ سب امور کا متولی ہے (غ)

یہ دو گروہ جن کا ذکر اس آیت میں ہے کون تھے؟ بخاری میں جابر بن عبداللہ سے روایت ہے فینا نزلت اِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ منکم ان تفشلا واللہ ولیهما قال نحن الطائفتان بنو حارثة وبنو سلمة وما نحب انها لم تنزل لقول اللہ واللہ ولیهما یعنی یہ آیت ہمارے متعلق اتری اور ہم بنو حارثہ اور بنو سلمہ وہ دو گروہ ہیں اور ہم کو یہ پسند نہیں کہ یہ نہ اُترتی کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ ان دونوں کا کارساز اور مددگار ہے۔ ان کا هَمّ یا ارادہ محض حدیث نفس کے طور پر تھا۔ اس لیے کہ اگر عزم ہوتا تو وہ کر بھی گزرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فوج کفار کے مقابلہ پر اس قدر قلت کو دیکھ کر کہ ایک اور چار کی نسبت سے بھی کفار زیادہ تھے ان کے دلوں میں یہ کمزوری کا خیال آیا۔

أَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۲۳﴾ إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ

تھے پس اللہ کا تقوٰے کرو تاکہ تم شکر گزار بنو غ۱۱۵ جب تو مومنوں سے کہتا تھا کہ کیا یہ تمھارے لیے کافی نہیں کہ تمھارا رب تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں

اللہ پر توکل کرنے سے کیا مراد ہے؟ لفظی معنی بھروسہ یا اعتماد کرنا ہیں مگر کیا خدا پر بھروسہ کرنے سے یہ مطلب ہے کہ ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہیئے اور کام کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ جو چاہے کرے۔ یہی معنی آجکل مسلمانوں نے توکل کے سمجھے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ اگر یہی معنی توکل کے نبی کریم صلعم اور آپ کے صحابہ نے سمجھے ہوتے تو نہ وہ جنگ کو نکلتے نہ دشمن کی خبر رکھتے نہ دُور دُور دشمنوں کی سرکوبی کے لیے فوجیں بھیجتے نہ مہمات کا فکر کرتے نہ ان کے لیے روپیہ جمع کرتے نہ ہتھیار فراہم کرتے، نہ دن رات مسلح رہتے اور یہ سب کچھ وہ کرتے تھے۔ خود اسی موقعہ پر جو توکل کی ہدایت ہوئی ہے تو کس معنی میں؟ دو گروہوں نے ارادہ کیا کہ جنگ سے واپس ہو جائیں مگر خدا نے ان کو اس ارادہ کے عمل میں آنے سے بچا لیا اور فرمایا کہ مومن خدا پر توکل کیا کرتے ہیں تو معلوم ہُوا کہ جنگ کرنا توکل تھا اور جنگ نہ کرنا خلاف توکل تھا۔ پس قرآن کریم کے اس استعمال نے بتا دیا کہ توکل اسباب سے کام لینے کا نام ہے اسباب کو ترک کرنے کا نام نہیں۔ اور فی الحقیقت وہ شخص خدا پر بھروسہ کرنے والا نہیں کہلا سکتا جو خدا کے پیدا کیے ہوئے اسباب سے کام نہیں لیتا بلکہ حقیقتِ توکل یہ ہے کہ اسباب خواہ کمزور بھی نظر آئیں تو بھی ان سے کام لے۔ کیونکہ یہاں دو گروہوں کو جنگ نہ کرنے کا خیال اس لیے پیدا ہوا کہ دشمن طاقتور تھا۔ اور ادھر تین ہزار کے مقابلہ میں سات سو تھے۔ تو حکم ہُوا کہ تم اپنا پورا زور لگاؤ اور یہ پروا نہ کرو کہ کیا ہوگا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ اسباب سے پورا کام لیکر نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دے یہ توکل ہے۔ کام کرے گو نتیجہ خلاف امید بھی ہو تو بھی کام نہ چھوڑے اور یہ سمجھ لے کہ میرا فرض تو کام کرنا ہے اس پر نتیجہ مترتب کرنا خدا کا کام ہے پس خدا پر بھروسہ کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ اسباب پر پورا زور لگائے نتیجہ کو سپرد خدا کرے یہ توکل انسان کی ہمت بڑھانے والی چیز ہے اور مصائب کے نیچے اس کو ہمت ہارنے سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے صبر کے ساتھ توکل کو جمع کیا ہے یہاں بھی یہی صورت ہے اور دوسری جگہ ہے ومالنا الا نتوکل علی اللہ وقد ھدٰنا سبلنا ولنصبرن علٰے ما اٰذیتمونا وعلی اللہ فلیتوکل المتوکلون (ابراھیم ۱۴-۱۲) الذین صبروا وعلٰے ربھم یتوکلون (النحل ۱۶-۴۲) اور ایک جگہ کمال صفائی سے عمل اور صبر اور توکل کو جمع کیا ہے نعم اجر العٰملین الذین صبروا وعلٰے ربھم یتوکلون (العنکبوت ۲۹-۵۸، ۵۹) عمل یعنی کام کرنے والوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے وہ جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ پس قرآن کریم کی اس صریح تعلیم کے مطابق توکل یہ ہے کہ انسان اسباب سے خوب کام لے اور نتیجہ خلاف بھی ہو تو گھبرائے نہیں بلکہ نتیجہ کو خدا پر چھوڑے۔

احادیث سے توکل کے معنی پر روشنی: احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ حج میں جو لوگ زادِ راہ لیے بغیر جایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے نحن المتوکلون ان کو قرآن کریم نے وتزودوا کہہ کر رد کیا بتا دیا کہ اسباب سے کام نہ لینا یہ توکل نہیں۔ نبی کریم صلعم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ اونٹ کو خدا کے توکل پر کھلا چھوڑ دوں تو فرمایا اعقلھا وتوکل اس کے گھٹنے کو رسّی سے باندھ دو اور توکل کرو۔ یعنی اسباب سے کام لو اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دو۔ اور اس کے خلاف جن احادیث سے نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے مثلاً یہ حدیث لو انکم تتوکلون علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا وتروح بطانا۔ یعنی اگر تم اللہ پر توکل کرو جو حق توکل کا ہے تو تم کو رزق دے جس طرح پرند کو رزق دیتا ہے کہ صبح کے وقت بھوکا نکلتا ہے اور شام کو پیٹ بھر کر آتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ طلب معاش کی ضرورت نہیں حدیث کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ حدیث میں یہ نہیں کہ پرند کو گھونسلے میں رزق بھیج دیتا ہے بلکہ پرند تلاش رزق کے لیے نکلتا ہے تو اسے بھی مل جاتا ہے۔ تو مطلب صاف یہ ہُوا کہ تم اگر تلاش کرو گے تو تم کو بھوکا نہیں مارے گا۔ مسلمانوں کے ادبار کے اسباب میں سے توکل کا غلط مفہوم بھی ایک بھاری سبب ہے۔

غ۱۱۵ بدر (مکہ اور مدینہ کے درمیان (مدینہ سے تین منزل اور مکہ سے دس منزل دور) ایک مقام کا نام ہے اور یہ ایک کنوئیں کے نام پر ہے جو اسی نام کے ایک شخص نے لگوایا تھا۔ اس مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی جنگ قریش مکہ سے ہوئی جس میں قریش مغلوب ہوئے۔

اذلّۃ۔ ذلیل کی جمع ہے اور ذُلّ نقیض عزّ ہے اور ذُلّ کے معنی رفق اور مرحمت بھی آتے ہیں (ل) اور دوسری جگہ اذلۃ علی المؤمنین (المائدہ ۵-۵۴) یہی مراد ہے اور یہاں اذلۃ کا لفظ محض ان کی تعداد کی قلت کو ظاہر کرنے کے لیے بولا گیا ہے بدر میں مسلمانوں کو اذلّۃ اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہ بسبب اپنی قلت تعداد کے غالب آنے کے قابل نہ تھے بلکہ بظاہر مغلوب کی حیثیت میں تھے اور ذلّ کے معنی مقابلہ سے عاجز ہونا بھی ہیں۔

اوپر کی آیت میں دو گروہوں کی کمزوری کے خیال کا ذکر کیا تھا۔ تو اب ان کی ہمت بندھاتا ہے کہ اگر یہاں تم تھوڑے ہو تو یہی حالت تمہاری بدر میں بھی تھی کہ وہاں بھی تم قلیل تھے۔ بلکہ سامان جنگ کے لحاظ سے تو بالکل مقابلہ کے قابل ہی نہ تھے۔ پھر جب وہاں اللہ تعالیٰ نے تمہیں مدد دی تو کیا اب نہ دیگا۔

فاتقوا اللہ لعلکم تشکرون۔ اللہ کا تقویٰ کرو تاکہ تم شکر کرنے والے بنو۔ مومن تو پہلے شکرگزار تھے پھر یہاں تقوٰے کرنے کا نتیجہ شکر گزار بننے سے کیا مراد ہے؟ اللہ تعالیٰ جب انسان کو کوئی نئی نعمت عطا فرماتا ہے تو اس کے لیے ایک نئی شکر گزاری کا موقع ہوتا ہے۔ پس شکر گزار بننے میں اس نئی نعمت کی طرف اشارہ ہے یعنی جیسا پہلے تمہیں نصرت ملی تو اس نعمت کی وجہ سے ایک شکر گزاری کا موقع ملا۔ اسی طرح اگر اب بھی تقوٰی اختیار کرو تو پھر تمہیں نصرت عطا ہوگی اور اس نعمت کی وجہ سے شکر گزاری کا موقع ملے گا۔

مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ سے تمہاری مدد کرے ۱۱۵

۱۱۵ فَور - فور شدت جوش کا نام ہے اور اس کا استعمال آگ کے متعلق ہوتا ہے جب وہ بھڑکے اور ہانڈی کے متعلق (جب وہ اُبلے) اور غضب کے متعلق (جب اس میں سخت جوش پیدا ہو) (غ) نارِ جہنم کے متعلق آتا ہے وھی تفور (الملک ۶۷-۷) فَعَلْتُ کذا من فوری سے مراد ہے ایسا کام جوش کی حالت میں کیا (غ)، فار الشئ فورًا...... جاش یعنی فور کے معنی جوش میں آنا ہیں (ل) اور اسی سے بطور استعارہ فور کے معنی فی الحال بھی ہیں اور یہی لفظ ہماری زبان میں فوراً استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اصل معنی جوش اور غلیان ہی ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔

مسوِّمین - اصل اس کا سَوم ہے جس کے معنی میں امام راغب لکھتے ہیں کہ اس کا اصل کسی چیز کی تلاش میں جانا ہے مگر پھر اس کا استعمال اس مرکب معنی کے دونوں اجزا پر الگ الگ ہُوا ہے یعنی صرف ذھاب (جانا) اور صرف ابتغاء (تلاش کرنا) اور لسان العرب میں ہے کہ سام چار معنی میں آتا ہے۔ چرنے کے لیے چھوڑا اور طلب کیا اور بیچا اور عذاب دیا۔ اور یہاں مُسوِّم میں یہی آخری معنی مراد ہیں۔ یعنی عذاب دینے والے اور اسی کے مطابق سَوَّمَتَ علی القوم آتا ہے اذا اَغَرْتُ علیھم فَعِثْتَ فِیھِمْ (ل) یعنی ان پر گھوڑے کو دوڑایا اور ان میں تباہی ڈالی۔ پس مُسوِّمین سے مراد ہے تباہی ڈالنے والے یا عذاب دینے والے اور عام طور پر نشان لگانے والے معنی کیے گئے ہیں۔

ان دو آیات میں سے پہلی آیت میں تین ہزار فرشتوں کے نزول کا ذکر ہے اور دوسری میں پانچ ہزار کا۔ بعض مفسرین نے یہ کوشش کی ہے کہ ان تمام کو جنگِ بدر کے متعلق ہی لگایا جائے۔ حالانکہ سورۃ انفال میں صراحت سے فرمایا۔ انی ممدکم بالف من الملئکۃ مردفین (الانفال ۸-۹) یعنی جنگ بدر میں کھلے طور پر ایک ہزار ملائکہ کی امداد کا ذکر ہے اور یہاں تین ہزار فرشتوں کی امداد کا ذکر ہے۔ اس لیے یہ واقعہ بدر کے متعلق نہیں۔ علاوہ ازیں یہاں اذ کے ساتھ بار بار جنگ اُحد کے واقعات کی طرف ہی توجہ دلائی ہے واذ غدوت من اھلك۔ اذ ھمت طائفتان۔ اور یہاں تیسری مرتبہ اذ تقول فرمایا۔ پھر اسی سورت میں دوسری جگہ یہ بھی فرمایا ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونھم باذنہ (آل عمرٰن ۳-۱۵۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی وعدہ نصرت کا بھی اس جنگ کے متعلق تھا۔ اور وہ وعدہ صرف انہی الفاظ میں ہے۔ الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثۃ الاف من الملئکۃ منزلین اور بالآخر یہ بات قابلِ غور ہے کہ جہاں بدر میں ایک ہزار دشمن ہے تو ایک ہزار ملائکہ کی نصرت کا ذکر ہے اور چونکہ اُحد میں تین ہزار دشمن ہے اس لیے تین ہزار ملائکہ کا تعلق اسی جنگ سے قرینِ قیاس ہے۔

اس کے بعد جو دوسری آیت میں پانچ ہزار ملائکہ کی آمد کا ذکر ہے وہ ایک تیسری جنگ کے متعلق ہے بدر اور اُحد کے متعلق نہیں اور وہ جنگ احزاب ہے جس کا ذکر یہاں ان الفاظ میں کیا گیا ہے ویاتوکم من فورھم ھذا اپنے پورے جوش میں تم پر ٹوٹ پڑیں۔ اور جہاں جنگِ احزاب کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے وہاں بھی اسی قسم کا نقشہ کھینچا ہے اذ جاءکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا ھنالك ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالا شدیدا (الاحزاب ۳۳-۱۰، ۱۱) یہ نقشہ صریحًا وہی دشمن کے جوش میں ٹوٹ پڑنے کا نقشہ ہے اور اس جنگ میں دس ہزار یا بعض اقوال میں چوبیس ہزار فوج کے ساتھ دشمن آیا تھا۔ کیونکہ قریش نے دوسری قوموں کو بھی اُکسا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ قریش خود بمشکل کوئی پانچ ہزار کے قریب ہی ہونگے اور اصل دشمن وہی تھے۔

تین ہی بڑی جنگیں تھیں جن میں دشمن یعنی کفار قریش مسلمانوں پر چڑھ کر آئے۔ جنگِ بدر، جنگِ اُحد، جنگِ احزاب۔ ان تینوں لڑائیوں میں مسلمانوں کی تعداد کفار کی تعداد کے مقابل کچھ نسبت نہ رکھتی تھی۔ تینوں جنگوں کی غرض مسلمانوں اور اسلام کا استیصال تھا۔ تینوں میں کفار اپنے مقصد میں ناکام ہو کر واپس ہوئے اور تینوں کے متعلق ہی نزول ملائکہ کا ذکر بھی ہے اور دشمن کی تعداد سے خاص نسبت رکھتا ہے۔ جنگ احزاب کے بعد پھر دشمن کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد چڑھائی ہوئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہونا تھا۔ اور اس موقعہ پر کفار کو مقابلہ کی جرأت مطلق نہ ہوئی۔ اب دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ کفار کو دو قسم کا وعدہ دیا گیا تھا جس کے متعلق وہ بار بار مطالبہ بھی کرتے تھے۔ ھل ینظرون الا ان تاتیھم الملئکۃ اویاتی امر ربك (النحل ۱۶-۳۳) کیا وہ اس امر کا انتظار کرتے ہیں کہ فرشتے ان پر آئیں یا تیرے رب کا امر ہی آ جائے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان تینوں جنگوں میں جہاں کفار کی چڑھائی مسلمانوں پر تھی ملائکہ کے ساتھ مسلمانوں کی نصرت فرمائی اور کفار کو سزا دی اور انکو اپنے ارادوں میں ناکام رکھا اور فتح مکہ میں گویا امر رب ہی آ گیا۔ کیونکہ اسلام کی حکومت قائم ہو گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ چڑھائی ایسی پُر شوکت تھی کہ وہ کفار جو ہزارہا کا لشکر لیکر مٹھی بھر مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ اب ان میں اتنی بھی ہمت اور جرأت نہ رہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دس ہزار قدوسیوں کے مقابلہ میں میدان میں بھی نکل سکیں اور امر رب کا مقابلہ کر کون سکتا تھا۔ پس ملائکہ کے نزول میں گویا در حقیقت اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا ہے جس کا مطالبہ بار بار کفار کی طرف سے ہوتا تھا۔

یہ نزول ملائکہ کوئی فرضی بات نہ تھی۔ بلکہ ایک حقیقت تھی ورنہ یہ ناممکن تھا کہ معدودے چند مسلمان اس قدر فوجوں کا مقابلہ کر کے کامیاب ہو سکتے۔ غور کا مقام ہے کہ ایک آدھ میدان میں اگر تھوڑے بہتوں پر غالب آ جائیں تو اسے اتفاق کہا جا سکتا ہے۔ گو وہاں بھی کوئی نہ کوئی وجوہ کامیابی کی ضرور ہونی چاہئیں مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ اول میدان بدر میں کفار کی جمعیت بڑی، میدان کا اچھا حصہ ان کے ہاتھ میں۔ پانی ان کے قبضہ میں، ان کی فوج میں تجربہ کار جنگی جوان

بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

ہاں اگر تم صبر کرو اور تقوےٰ کرو اور وہ اپنے پورے جوش میں تم پر حملہ کریں تمہارا رب پانچہزار (دشمن کو) تباہ کرنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾

اور اللہ نے اُسے صرف تمہارے لیے خوش خبری ٹھیرایا، اور تاکہ تمہارے دل اس سے اطمینان پکڑیں اور مدد تو اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہی ہے ۵۱۲

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

تاکہ ان لوگوں سے جو کافر ہوئے ایک حصّہ کو کاٹ دے یا ان کو ذلیل کرکے لوٹا دے سو وہ نامراد واپس جائیں ۵۱۳

بالمقابل مسلمانوں میں بچے اور بوڑھے شامل ہتھیار ندارد۔ میدان کی مشکلات۔ پھر بھی کفار سخت نقصان اُٹھاتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ پھر میدان اُحد میں بجائے تگنے کے اب کفار کی تعداد مسلمانوں سے چوگنی ہے۔ سواروں کی ایک بڑی جمعیت ان کی فوج میں ہے۔ خالد جیسے بہادر بھی ساتھ ہیں۔ مگر پھر بھی کفار خالی ہاتھ اور ناکام واپس جاتے ہیں۔ جنگِ احزاب میں کفار کی تعداد مسلمانوں سے دس گنی۔ علاوہ ازیں اندر یہودی دشمن۔ منافق جاسوسوں کا کام کرنے والے موجود۔ مگر وہاں بھی خدا نے اس بڑی فوج کو ناکام اور نامراد کرکے واپس پھیرا۔ اور وہ سخت پریشانی کی حالت میں بھاگے۔ یہ نزول ملائکہ کا ہی نتیجہ تھا۔

۵۱۲ یہاں فرمایا کہ نزول ملائکہ کے وعدہ کو اللہ تعالیٰ نے صرف تمہارے لیے بشارت ٹھہرایا اور تاکہ تمہارے دل اس کے ساتھ مطمئن ہو جائیں۔ اسی طرح سورۃ انفال میں فرمایا وما جعلہ اللّٰہ الا بشریٰ ولتطمئن بہ قلوبکم (الانفال۸-۱۰) اور وہاں آگے چل کر فرمایا اذ یوحی ربك الی الملٰئکۃ انی معکم فثبتوا الذین اٰمنوا سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب (الانفال۸-۱۲) جب تیرا رب ملائکہ کو وحی کرتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں سو ان لوگوں کو جو ایمان لائے ثابت قدم رکھو میں ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے کفر کیا رعب ڈالوں گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مومنوں کو ثابت قدم کرتا اور کفار کے دلوں میں رُعب ڈالتا ہے اور شاید یہی وجہ ہو کہ ملائکہ کی تعداد کو کفار کی جمعیت سے ہر میدان میں ایک خاص نسبت نظر آتی ہے۔

ملائکہ نے قتال نہیں کیا: اگر ملائکہ کا نزول ہُوا تو کیا انہوں نے انسانوں کی شکل میں ہو کر جنگ بھی کی ہے؟ جس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو نازل کیا وہ تو خود ہی بتا دی ہے اور حق یہی ہے کہ ملائکہ کا تعلق قلوب سے ہوتا ہے۔ پس مومنوں کو اطمینان قلب عطا کرنا اور کفار کے دل میں رعب ڈالنا یہ وہ غرض تھی جس کے لیے قرآن کریم کی تصریح کے مطابق ملائکہ کا نزول ہُوا۔ بعض مفسرین نے بھی اسی کے مطابق لکھا ہے۔ چنانچہ غرائب القرآن میں یہ قول مذکور ہے ومنھم من قال ان نصر الملائکۃ بالقاء الرعب فی قلوب الکفار و باشعار المؤمنین بان النصرۃ لھم۔ یعنی بعض نے کہا ہے کہ ملائکہ کی نصرت کافروں کے قلوب میں القائے رعب تھی اور مومنوں کو یہ علم دینے کہ نصرت ان کے لیے ہے۔ یہ جنگِ بدر اور جنگِ اُحد دونوں کے متعلق ہے اور جنگ اُحد کے متعلق تو قریباً قریباً اتفاق ہے کہ وہاں ملائکہ نے قتال نہیں کیا۔ چنانچہ امام مجاہد کا قول منقول ہے عن مجاھد انہ قال حضرت الملٰئکۃ یوم اُحد ولٰکنھم لم یقاتلوا یعنی آپ نے فرمایا کہ فرشتے اُحد کے دن موجود تھے لیکن انہوں نے جنگ نہیں کی۔ ایسا ہی حضرت ابن عباس سے مروی ہے عن ابن عباس انہ لم تقاتل الملٰئکۃ سوی یوم بدر وفیما سواہ کانوا عدداً و مدداً لا یقاتلون ولا یضربون یعنی سوائے بدر کے دن کے ملائکہ نے جنگ نہیں کی اور اس کے سوائے جہاں وہ آئے وہ تعداد اور مدد دینے کے لیے تھے۔ انہوں نے قتال نہیں کیا اور نہ کسی کو مارا۔ بدر کے دن ملائکہ کے قتال کرنے یا نہ کرنے پر بحث سورہ انفال میں ہو گی۔

۵۱۳ یقطع۔ قطع کے اصل معنی کاٹنا ہیں مگر ہلاک کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مفردات میں ہے لیقطع طرفا ای لیھلك جماعۃً منھم یعنی ان میں سے ایک جماعت کو ہلاک کر دے۔

طرفا۔ کسی چیز کی طَرَف سے مراد اس کی ایک جانب ہے اور اس کا استعمال اجسام میں اوقات میں اور اس کے سوائے بھی ہوتا ہے (غ) لیقطع طرفا میں مراد ایک حصّہ یا ایک جماعت ہے۔ جیسا اوپر ذکر ہُوا اور امام راغب کہتے ہیں کہ طرف کی تخصیص اس لیے کی کہ کسی چیز کی طرف یا ایک جانب کے کم کرنے سے اس کی توہین اور اس کے نابود کرنے کی طرف پہنچا جاتا ہے۔

یکبت۔ کَبْت سختی کے ساتھ اور ذلیل کرکے رد کر دینا ہے (غ) اور لسان العرب میں ہے الکبت الصرف والاذلال۔ یعنی کبت کے معنی پھیر دینا اور ذلیل کرنا ہے پس کبت اللّٰہ العدوّ کے معنی ہیں صرفہ واذلہ (ل) اسے واپس پھیر دیا اور ذلیل کیا اور کبت کسی چیز کے منہ کے بل گرا دینے کو بھی کہتے ہیں۔

خائبین۔ خاب لم ینل ما طلب (ل) خاب کے معنی ہیں جو کچھ طلب کیا تھا وہ نہ پایا۔ یعنی حصول مقصد میں ناکام ہُوا اور خیبۃ ظفر کا نقیض ہے پس جو خائب ہو وہ مظفر نہیں کہلا سکتا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

اس کام میں تیرا کچھ (دخل) نہیں خواہ وہ ان پر رحمت سے لوٹے یا انھیں عذاب دے کہ وہ ظالم ہیں [۵۱۴]

اُحد میں کفار کی ناکامی: جنگ اُحد میں نصرت الٰہی کی دو اغراض بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک کردے اور دوسرا یہ کہ ان کو سختی اور ذلت سے لوٹا دے اور وہ بلا نیل و مرام اور بلا حصول مقصد واپس جائیں۔ چنانچہ یہ دونوں باتیں اسی طرح وقوع میں آئیں۔ ابتدائے جنگ میں مسلمانوں نے کفار کے ایک حصّہ کو ہلاک کیا اور بہتوں کو زخمی کیا اور آخر کار بھی وہ ذلیل ہو کر لوٹے۔ اور جس غرض کو مدنظر رکھ کر آئے تھے اسے حاصل کیے بغیر واپس ہوئے اور یوں یہ آیت اس بات پر قطعی دلیل ہے کہ جنگ احد میں کفار کو فتح نہیں ہوئی بلکہ قرآن کریم نے انھیں نامراد قرار دیا ہے۔ کفار کا حملہ اس غرض سے تھا کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کردیں اور اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی اس غرض کو حاصل کیے بغیر واپس ہوئے اور یہ ان کیلئے بڑی ذلت تھی مسلمانوں کا لشکر اسی طرح میدان جنگ میں موجود تھا اس لیے وہ مدینہ پر حملہ آور نہیں ہو سکے اور وہ مسلمانوں کا ایک برائے نام قیدی بھی پکڑ کر نہ لے گئے۔ پس ایک طرف قرآن کریم اور دوسری طرف واقعات قریش کے لشکر کو ناکام ٹھہراتے ہیں۔

۵۱۴ لیس لك من الامر شیٔ۔ اسی سورت میں آگے آتا ہے لو کان لنا من الامر شیٔ ما قتلنا ھٰھنا (آل عمران ۳-۱۵۴) اگر ہمارا بھی معاملہ میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ یہی معنی یہاں ہیں۔ یعنی تیرا اس معاملہ میں کچھ دخل نہیں۔ اور وہ امر یا معاملہ کیا ہے۔ کفار کی سزا یا ان پر رجوع برحمت کرنا یعنی یہ معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے اور کسی انسان کا خواہ وہ نبی ہی ہو اس میں کچھ دخل نہیں۔

آنحضرت کا بد دعا کرنا: بخاری میں حضرت انس رض کی روایت ہے شُجَّ النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم یوم اُحُدٍ فقال کیف یفلح قومٌ شجّوا نبیّھم فنزلت لیس لك من الامر شیٔ۔ یعنی اُحد کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر میں زخم آیا تو آپ نے فرمایا کس طرح وہ قوم کامیاب ہوگی جنہوں نے اپنے نبی کو زخمی کیا تو یہ آیت لیس لك من الامر شیٔ نازل ہوئی۔ لیکن سالم نے ابن عمر رض سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلعم سے سُنا کہ جب آپ فجر کی نماز میں دوسری رکعت میں رکوع سے اُٹھتے تو سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لك الحمد کہنے کے بعد کہتے اللّٰھم العن فلانًا وفلانًا وفلانًا اے اللہ فلاں فلاں فلاں پر لعنت کر۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری لیس لك من الامر شیٔ اور دوسری روایت میں سالم نے ہی ابن عمر سے بجائے اللّٰھم العن فلانا کے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ آپ صفوان ابن اُمیّہ اور سہیل بن عمرو اور حارث بن ھشام پر بد دعا کیا کرتے تھے تو یہ آیت اُتری۔ یہ غزوۂ اُحد کے ذکر میں ہے اور اسی کے قریب قریب نسائی میں بھی روایت ہے۔ اور غزوۂ اُحد میں علاوہ اس کے بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور نبی کریم صلعم کو زخم پہنچے۔ کفار نے مسلمانوں کی لاشوں کی بھی بےحرمتی کی اور ان کا مثلہ کیا اور یہ واقعات ایسے دردناک تھے کہ ان پر ظالموں کی سزا کی خواہش بالکل حق بجانب تھی۔ لیکن ایک دوسری روایت کی بنا پر بعض مفسروں نے اس آیت کا نزول غزوہ بئر معونہ کے واقعہ کے متعلق بیان کیا ہے۔ اور وہ واقعہ یہ ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ نبی کریم صلعم نے اپنے ستر قاریوں کو ایک سردار قوم کی درخواست پر اس قوم کی تعلیم کے لیے بھیجا تو جب یہ رستہ میں ہی تھے تو ایک کنوئیں کے پاس جس کا نام بئر معونہ ہے اس قوم کے چند قبیلوں نے غداری سے ان سب کو قتل کر دیا اور یہ قبائل رِعل اور ذکوان اور عُصیّۃ اور بنی لحیان تھے۔ تو نبی کریم صلعم نے ایک مہینہ قنوت میں جو آپ نماز صبح کی دوسری رکعت میں بعد رکوع پڑھتے تھے ان پر بد دعا کی اور بخاری نے کتاب التفسیر میں جو حدیث ابوہریرہ رض سے روایت کی ہے اس میں یہ لفظ آتے ہیں وکان یقول فی بعض صلاتہٖ فی صلاۃ الفجر اللّٰھم العن فلانا و فلانا لاحیاء من العرب حتّٰی انزل اللہ لیس لك من الامر شیٔ یعنی آپ نماز فجر کے کسی حِصّہ میں کہا کرتے تھے اے اللہ فلاں فلاں پر لعنت کر عرب کے کچھ قبیلوں کا نام لیکر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری لیس لك من الامر شیٔ تو اس حدیث کی رو سے آیت کا نزول واقعہ بئر معونہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر یہ درحقیقت اختلاف نہیں اور دونوں روایتیں درست ہیں اور اصل بات یہ ہے کہ بئر معونہ کا واقعہ اور جنگ اُحد کا واقعہ بالکل قریب قریب ہیں اور ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جنگِ اُحد کے صرف چار ماہ بعد غزوہ بئر معونہ ہوا۔ تو اس لیے یہ واقعہ اور جنگ احد کا واقعہ ایک ہی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور غالباً دونوں پر نبی کریم صلعم نے اکٹھی بد دعا کی ہے اور امام احمد نے جو روایت سالم بن عبداللہ سے کی ہے تو اس میں حضرت ابن عمر کے الفاظ ان دونوں بد دعاؤں کو اکٹھا کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ قال سمعت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یقول اللّٰھم العن فلانًا وفلانًا اللّٰھم العن الحرث بن ھشام اللّٰھم العن سھیل بن عمرو اللّٰھم العن صفوان بن امیّۃ فنزلت ھٰذہ الایۃ لیس لك من الامر شیٔ۔ یعنی میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ کہتے سنا ہے کہ اے اللہ فلاں پر لعنت کر، فلاں پر لعنت کر اے اللہ حرث بن ہشام پر لعنت کر۔ اے اللہ سہیل بن عمرو پر لعنت کر اے اللہ صفوان بن اُمیّہ پر لعنت کر پس یہ آیت نازل ہوئی لیس لك من الامر شیٔ۔ اب اس میں فلاں اور فلاں کا ذکر الگ بھی ہے اور اس سے مراد وہی قبائل عرب ہیں جیسا کہ ابوہریرہ رض کی روایت میں یہ لفظ فلاں فلاں کی تشریح میں موجود بھی ہیں یعنی رعل اور ذکوان وغیرہ اور سرداران قریش کا ذکر الگ ہے تو پس اگر سالم بن عبداللہ کی دونوں روایتوں کو جو بخاری میں ہیں اکٹھا کیا جائے جن میں سے ایک میں لفظ فلاں وفلاں ہیں اور دوسری میں حرث بن ہشام وغیرہ کے نام ہیں تو وہ روایت بالکل صحیح ٹھہرے گی جس کو امام احمد نے بیان کیا ہے اور اس طرح پر معلوم ہوگا کہ درحقیقت نبی کریم صلعم نے ایک طرف اُحد کی تکلیفیں اُٹھا کر اور دوسری طرف اپنے ستر قاریوں کے دھوکے سے قتل کیا جانے پر دونوں قوموں پر اکٹھی بد دعا کی۔ اور تیس دن تک آپ کے بد دعا کرنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہے جس میں آپ کو اس بد دعا سے روکا گیا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۳

اور اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا
اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ ج

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو بڑھا بڑھا کر سُود نہ کھاؤ، اور اللہ کا تقوےٰ اختیار کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ع۵۱۵

آنحضرتؐ کو بددعا سے روکنے میں سبق: نبی کریم صلعم کو باوجود اس قدر خطرناک مصائب اعدا کے ہاتھ سے پیش آنے کے بددعا سے روکا جانے میں یہ سبق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں کیا کہ آپ کا وجود رحمۃ للعالمین کسی پر بددعا بھی کرے یہ عجیب بات ہے کہ وہ تینوں شخص جن پر آپ نے بددعا کی بعد میں مسلمان بھی ہو گئے۔ ایسا ہی وہ قبائل بھی مسلمان ہو گئے اس میں ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو بات بات میں اپنے مسلمان بھائیوں پر لعنت کرتے۔ اور ان کو بددعاؤں کی دھمکیاں دیتے ہیں بلکہ بددعائیں کرتے رہتے ہیں یہ محمد رسول اللہ صلعم کے طریق کے خلاف ہے۔

یہ سوال کیا جائے گا کہ تیس دن تک نبی کریم صلعم کیوں بددعا کرتے رہے؟ سو وہ واقعات جن پر آپ نے بددعا کی ہے ایسے دلخراش ہیں کہ ایک شخص جو مخلوق الٰہی پر رحم کرے یہی خیال کریگا کہ ایسے ظالموں کا وجود دنیا سے مٹ جائے۔ پس ایسے ظالموں کے لیے بددعا کرنا بالکل حق تھا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے دوسرے پہلو کی طرف نبی کریم صلعم کو توجہ دلائی ہے کہ وہ گناہوں کو معاف کر کے ایسے لوگوں پر بھی رجوع برحمت کر سکتا ہے۔ پس گو بددعا کرنے میں نبی کریم صلعم حق پر ہوں مگر درحقیقت آپ کا کام نہ تھا جس طرح اگر آپؐ اہل مکہ کو جنہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا فتح مکہ پر قتل کر دیتے تو آپ حق بجانب ہوتے مگر آپ نے افضل طریق کو اختیار کیا اور سب کو معاف کر دیا بلکہ اُن پر ملامت تک نہ کی، اسی طرح بتقاضائے بشریت آپؐ نے بددعا کی اور اس بددعا میں کوئی ناانصافی نہ تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک افضل مقام کی طرف توجہ دلائی۔ اور اب ہم مسلمانوں کے لیے وہی طریق مناسب ہے جس پر چلنے کی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ہدایت کی۔

رحمت کا غضب پر سبقت لیجانا: اس آیت میں رجوع برحمت کرنے کو عذاب پر مقدم کیا ہے (حالانکہ فانہم ظالمون میں صاف بتا دیا ہے کہ مستحق تو بیشک یہ عذاب کے ہیں) اور اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور عذاب کے ذکر میں مغفرت کو عذاب پر مقدم کیا اور اس طرح پر بتا دیا ہے کہ مغفرت اور رحمت کا جوش کس قدر وسیع ہے اور رحمت غضب پر سبقت لے گئی ہے پھر اس آیت کا خاتمہ تو فانہم ظالمون پر کیا یعنی لوگوں کی حالت کیسی ہے اور اگلی آیت کا خاتمہ واللہ غفور رحیم پر کیا یعنی اس کی صفات کا تقاضا غفر و رحم ہے گو انسان ظلم ہی کرے۔

ع۵۱۵ اضعافًا مضاعفۃ۔ اضعاف۔ ضعف کی جمع ہے ع۳۱۴ اور اضعافا مضاعفۃ۔ دبلو سے حال واقع ہُوا ہے۔ عرب میں یہ دستور تھا اور ایسا ہی دستور قریبًا تمام سود خواروں میں ہے کہ جب قرضہ کی میعاد پوری ہو جاتی اور قرضہ ادا نہ ہوتا تو سود کو اصل رقم میں بڑھا کر پھر از سرِ نو اس پر سود لگایا جاتا اور یوں تھوڑی مدت میں مدیون کی ناداری سے ایک چھوٹی سی رقم بڑی بھاری رقم بن جاتی۔ اور مطلب یہ نہیں کہ صرف کئی گنا کر کے سود مت کھاؤ اور تھوڑا کھا لو بلکہ مراد توبیخ ہے یعنی سود کی تو حالت یہی ہے کہ وہ کئی کئی گنا بن جاتا ہے پس تم سود مت کھاؤ۔

حرمت سود جنگوں کے روکنے میں معاون ہے: چونکہ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو اپنی کسی غلطی کی وجہ سے بہت سی تکلیف اُٹھانی پڑی اس لیے اسی جنگ کے ذکر میں اب اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کو کن راہوں پر چلنا چاہیئے اور ان کی کامیابی کی اصل راہیں کیا ہیں۔ سب سے پہلی آیت میں حرمت سود کا ذکر ہے تعلق یہ ہے کہ پہلے رکوع میں جنگ اُحد کا ذکر تھا اور اسی اثنا میں اہل اسلام کی نصرت اور کفار کے کاٹنے کا ذکر کیا تو اب ایک ایسے امر کی طرف توجہ دلاتا ہے جس پر عمومًا دنیا نے جنگوں کی کامیابی کا دارومدار رکھا ہے اور وہ سود ہے اور یہ صرف آج کی بات ہی نہیں کہ سود کے روپے کے ساتھ جنگوں کو جاری رکھا جاتا ہے اور جس قدر کوئی قوم زیادہ سُودی روپیہ لے سکتی ہے اسی پر اس کی جنگ میں کامیابی کا دارومدار ہے بلکہ عرب میں بھی جنگوں کا انحصار بہت کچھ سود پر تھا کیونکہ لوگ جو روپیہ جنگوں پر خرچ کرتے تھے وہ عمومًا سُود اور جوئے کی کمائی کا روپیہ ہوتا تھا۔ اسی لیے سورۃ بقرہ میں جنگوں کے ذکر میں شراب اور جوئے سے منع کیا تھا۔ تو اب جنگ کے ہی ذکر میں سود سے روکا ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان اکثر اموال المشرکین کانت قد اجتمعت من الربا و کانوا ینفقون تلک الاموال علی العساکر یعنی اکثر مال مشرکوں کے سود سے جمع ہوتے تھے اور یہی جمع شدہ مال وہ لشکروں پر خرچ کرتے تھے۔ اسلام نے جہاں ایک طرف ضرورتِ جنگ کو تسلیم کیا ہے اور ان حالات میں جب ایک قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہو اُسے ضروری قرار دیا ہے۔ دوسری طرف ان تمام موجبات کو جو جنگ کے بلا ضرورت جاری رکھنے کا موجب ہو سکتے ہیں دُور یا کم کرنا چاہا ہے اب سود پر روپیہ ملتا جانے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو اشخاص برسر حکومت ہوں وہ بلا ضرورت اور بغیر قوم کی خواہش کے جنگ کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگر سود کو اُڑا دیا جائے تو ہر قوم صرف اس حد تک جنگ جاری رکھ سکے گی، جب تک اس کی اپنی ہستی معرض خطر میں ہو اور اس حال میں قوم کا ہر ایک ہی خواہ اپنے مال اور اپنی طاقت کو جنگ میں کامیابی حاصل کرنے پر لگائے گا لیکن اگر قوم اپنے آپ کو ایسا معرض خطر میں نہیں سمجھتی اور اپنی طاقت اور مال کو جنگ پر لگانے کے لیے تیار نہیں بلکہ وہ جنگ کو بھی محض سود سے روپیہ حاصل کرنے کا اور دوسری

وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۵۱۶ع

قوموں کو سودی روپیہ دیکر اپنے نیچے دبا کر رکھنے کا ایک ذریعہ بنانا چاہتی ہے تو یہ جنگ بلا ضرورت ہے اگر ہمدردی انسانی جنگ کی محرک ہے تو روپیہ اور طاقت اس پر بلا معاوضہ خرچ ہونا چاہیئے۔ سود پر روپیہ دینا کسی ہمدردی انسانی کے باعث نہیں ہوتا بلکہ روپیہ کمانے کی غرض سے ہوتا ہے اس لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو سمجھایا جاتا کہ تمہاری جنگوں کا صرف ایک ہی موجب ہو سکتا ہے بقائے قوم یا قیام امن کی ضرورت۔ سو اس ضرورت پر تبقاضائے ہمدردی انسانی اپنے مال اور طاقت کو لگاؤ اور یہ نہ کرو کہ جنگوں کو روپیہ کمانے کا ذریعہ بنا کر بلاوجہ ان جنگوں کو طول دیتے جاؤ۔

حرمت سود کے دو موقعوں پر ذکر کرنے میں ایک بہ تعلق صدقات وانفاق اور دوسرے جنگوں کے تعلق میں ایک اور حکمت بھی معلوم ہوتی ہے۔ پہلی سورت میں اصل خطاب یہود سے تھا اور یہودیوں میں سود خواری نے بخل کا مرض پیدا کیا تھا کہ وہ خیراتی کاموں پر روپیہ لگانے میں بہت مضائقہ کرتے۔ اس لیے وہاں صدقات کا ذکر کرتے ہوئے سود سے روکا۔ اور اس سورت میں عیسائی بالخصوص مخاطب ہیں اس لیے یہاں عین جنگ کے ذکر میں سود خواری سے روکا ہے۔ کیونکہ عیسائی قوم نے سود خواری سے بڑا فائدہ یہ اٹھانا تھا کہ اس کے ذریعہ سے بلا ضرورت جنگیں کر کے نسل انسانی کو تباہ کریں۔

ع۵۱۶ مسلمانوں کی کامیابی اللہ اور رسول کی اطاعت میں ہے: اس آیت میں بتایا ہے کہ اصل کامیابی تمہاری یہ نہیں کہ تم جنگ کر کے بڑی فاتح قوم بن جاؤ۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہو۔ مسلمانوں نے جنگیں کیں بڑے فاتح بھی دنیا میں بنے۔ دنیا کے مالک بھی بنے مگر جب اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت چھوڑ دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ترقی کے اوج سے قعر مذلت میں گرے۔ اب بھی اگر وہ دنیا میں اُٹھ سکتے ہیں تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے نہ اپنی تجویز کردہ راہوں سے۔

رسول کی اطاعت شرک نہیں اور اللہ کی اطاعت میں داخل ہے: اس زمانہ میں جب مسلمانوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی بجائے اربابًا من دون اللہ کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے علماء اور پیروں کے پیچھے لگ گئے تو ایک گروہ نے تفریط میں مبتلا ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے جوئے کو بھی پھینک دینا چاہا اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کے شامل کرنے کو بھی شرک قرار دیا۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ انہوں نے شائد اطاعت اور عبادت کا مفہوم ایک لے لیا ہے۔ عبادت غیر اللہ کی خواہ نبی ہو بیشک شرک ہے لیکن اطاعت تو اولوا الامر یعنی حکام کی بھی ہو سکتی ہے پھر نبی کی اطاعت شرک کیونکر ہو گئی۔ یہ کہنا کہ رسول اللہ کی اطاعت ان آیات کے خلاف ہے ان الحکم الا للہ یقص الحق وھو خیر الفاصلین (الانعام ۶ - ۵۷) ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ (یوسف ۱۲ - ۴۰) یعنی حکم صرف اللہ کے لیے ہی ہے اور لا یشرک فی حکمہ احدا (الکھف ۱۸ - ۲۶) وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا صحیح نہیں اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ خود ہی یہ حکم دے کہ تم رسول کی اطاعت کرو تو پھر رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت میں داخل ہوئی اور وہ کوئی علیحدہ بات نہیں جس طرح ایک بادشاہ جب بعض وزرا کے سپرد ایک کام کر دیتا ہے یا وزرا گورنروں کے سپرد ایک کام کر دیتے ہیں علیٰ ہذا تو ان گورنروں اور وزرا کے حکم کی اطاعت بادشاہ کے حکم کی اطاعت ہی ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ لوگ بادشاہ کے حکم کے خلاف کوئی حکم جاری کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کرو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (النساء ۴ - ۵۹) تو کیا اب اولی الامر کی اطاعت شرک میں داخل ہے اور نعوذ باللہ خدا نے خود ہی شرک کی تعلیم دی؟ نہیں بلکہ ان کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت ہی ہے چونکہ اسی کے حکم کے ماتحت ہے اس کی اور مثالیں بھی ہیں ایک جگہ ہے افغیر اللہ ابتغی حکما (الانعام ۶ - ۱۱۴) کیا میں اللہ کے سوائے کوئی حکم چاہوں۔ دوسری جگہ ہے فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا (النساء ۴ - ۳۵) ایک حکم مرد کے اہل سے اور ایک عورت کے اہل سے مقرر کرلو۔ خدا بھی حکم اور یہ بھی حکم، مگر چونکہ وہ خدا کے حکم کے ماتحت حکم ہیں اس لیے یہ شرک نہیں۔

اور اطیعوا اللہ والرسول کی جو تاویل کی جاتی ہے کہ یہاں واؤ تفسیری ہے اور رسول کے معنی یہاں پیغام ہیں۔ نہ پیغامبر تو اس کے لیے کوئی دلیل چاہیئے۔ لیکن نہ صرف دلیل اس کی تائید میں کوئی نہیں بلکہ کئی دلائل سے اس کا بطلان ہوتا ہے اول یہ کہ واؤ تفسیر کے لیے آیا کرتی ہے یہ دعویٰ بلا دلیل ہے جس کی کوئی سند زبان عربی میں نہیں۔ ہاں واؤ کا استعمال بعض وقت عطف علی المرادف کے لیے ہوتا ہے۔ دیکھو مغنی اللبیب بیان واؤ یعنی دو مرادف لفظ (ایسے لفظ جن کے معنی قریبًا یکساں ہیں اور بہت باریک فرق ہے ایک دوسرے پر واؤ کے ذریعہ سے عطف ہو جاتے ہیں جیسے انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ (یوسف ۱۲ - ۸۶) میں بثّ اور حزن ایک دوسرے پر عطف ہیں مگر اللہ اور رسول کو آج تک کسی نے مرادف نہیں کہا کہ یہاں واؤ کا استعمال عطف علی المرادف کے طور پر لیا جائے۔ دوم رسول کے بہرحال دو معنی ان تاویل کنندگان کو بھی مسلّم ہیں ایک پیغامبر اور دوسرے پیغام۔ اور اللہ کے معنی ایک کے سوائے دوسرے آج تک کسی نے نہیں سُنے اور تفسیر مبہم یا ذو معنی لفظ کی واضح سے ہوا کرتی ہے نہ واضح لفظ کی مبہم سے۔ اب اللہ واضح ہے اس کی تفسیر ایسے لفظ سے جو دو معنی رکھتا ہے انسان بھی نہیں کرے گا۔ چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس بات کو منسوب کیا جائے۔ سوم اگر واضح لفظ کی تفسیر کی ضرورت ہی تھی تو ایک دفعہ تفسیر کر دینا کافی تھا۔ بار بار اس تفسیر کی کیا ضرورت تھی۔ چہارم گو لغت میں رسول کے معنی پیغامبر اور پیغام دونوں لکھے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے خود فیصلہ کر دیا جب فرمایا محمد رسول اللہ حالانکہ القرآن رسول اللہ کہیں نہیں فرمایا۔ پس جب قرآن شریف نے خود تصریح کر دی کہ رسول اللہ محمد ہیں تو اس معنی کو چھوڑ کر ہم دوسرے معنی کیوں اختیار کریں۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جلدی کرو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے وہ متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے ۵۱۷

۵۱۷ عَرْض ۔ عرض کے اصل معنی چوڑائی ہیں جو طول کے خلاف ہے اور اصل استعمال اس کا اجسام کے متعلق ہے۔ لیکن غیر اجسام میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے فذو دعآءٍ عریض (حٰمٓ السجدۃ ۴۱ - ۵۱) اور کہا گیا ہے کہ اس کے عرض سے مراد اس کی وسعت ہے مگر نہ بلحاظ مساحت کے بلکہ بلحاظ مسرت کے (رغ) اور اس کی مثال امام راغب نے یہ دی ہے کہ جیسا کہ اس کے خلاف کہہ دیا جاتا ہے الدُّنْیا علٰی فُلانٍ حَلْقَةُ خاتمٍ دنیا فلاں پر ایک انگوٹھی کا حلقہ بن گئی۔ یا کہا جاتا ہے وسعۃ ھذہ الدار تسعۃ الارض اس گھر کی وسعت زمین کی وسعت کی طرح ہے۔ اور تیسرے معنی عرض کے امام راغب نے یہاں بَدَل اور عِوَض کیے ہیں یعنی اس کی قیمت زمین و آسمان ہیں۔

کیا پاک تعلیم ہے۔ کہاں جنگوں کا ذکر اور کہاں یہ ہدایات۔ کیا خوبی سے بتا دیا کہ جنگ کوئی اصل غرض نہیں بلکہ اصل غرض اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا حاصل کرنا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے جو سامان مختلف کسی وقت میں ہوں ان کے حصول کے لیے جلدی کرنی چاہیئے اور چونکہ اوپر ذکر کیا تھا کہ نار کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے تو یہاں بتایا ہے کہ متقیوں کے لیے تو جنت تیار کی گئی ہے۔ پس اس کے حصول کے لیے جلدی قدم اُٹھانا چاہیئے اور جیسے کافر کے لیے آگ اور متقی کے لیے تو جنت آخرت میں ہے اسی طرح اس دنیا میں بھی کافر کے دل پر آگ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

وسعت جنت: یہاں جنت کے متعلق فرمایا کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اس سے کیا منشا ہے بعض کے نزدیک آخرت کے آسمان اور زمین اور ہوں گے اس لیے مراد یہ ہے کہ جنت کی چوڑائی اس دنیا کے آسمان و زمین کے برابر ہو گی۔ اور اس پر یوم تبدل الارض غیر الارض والسمٰوٰت (ابراھیم ۱۴ - ۴۸) کو بطور شہادت پیش کیا ہے (رغ) اور بعض نے اس کے معنی قیمت کر لیے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا۔ اور بعض نے کہا کہ یہ کلام کنایہ ہے حد درجہ کی فراخی سے (ر) گویا اتنی وسیع جنت ہو گی جو انسان کے وہم و گمان میں آ سکتی ہے۔ مسند امام احمد حنبل میں ایک حدیث ہے کہ ہرقل نے نبی کریم صلعم کو لکھا تھا کہ آپ مجھے اس جنت کی طرف بلاتے ہیں جس کا عرض آسمان اور زمین ہیں۔ تو پھر دوزخ کہاں ہے آپ نے فرمایا سبحان اللہ این اللیل اذا جاء النہار۔ پاک ہے ذات اللہ کی رات کہاں ہوتی ہے جب دن آ جاتا ہے اور ابن جریر میں بھی ایسی ہی روایت ہے اور ایک روایت سے حضرت عمرؓ کا یہی جواب یہود کو دینا معلوم ہوتا ہے اور ایک میں حضرت ابن عباس نے یہی جواب ایک اہل کتاب کو دیا۔ اور ایک روایت ابوہریرہ سے انہی الفاظ کی ہے کہ نبی کریم صلعم نے ایسا فرمایا تھا (ث) پس اس قدر مختلف طریقوں سے یہ روایت آتی ہے کہ الفاظ قرآنی کی تفسیر میں مقدم اسی کو کرنا ہوگا۔

مکان جنت کی کیفیت اس عالم کی طرح نہیں: اس مثال کی مفسرین نے عموماً یہ توجیہ کی ہے کہ جب ایک حصہ پر دن ہوتا ہے تو دوسرے حصہ پر رات ہوتی ہے۔ یہ تو صحیح ہے مگر اس صورت میں کوئی شخص یہ نہ کہے گا کہ دن سارے آسمان اور زمین پر محیط ہے۔ اصل یہ ہے کہ حضرت نبی کریم صلعم نے جنت و نار کی وسعت کو سمجھانے کے لیے مکان کی بجائے کیفیت کی مثال دی ہے۔ کیونکہ دن اور رات یا نور و ظلمت درحقیقت دو کیفیات ہیں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جنت و نار کی تمام چیزوں کی کیفیات وہ نہیں جو اس عالم کی ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین (السجدۃ ۳۲ - ۱۷) اور حدیث فرماتی ہے ما لا عین رأت ولا اذن سمعت و ما خطر علٰی قلب بشر۔ تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم اس عالم کے مکان کے تصور کے ماتحت جنت و نار کو نہ لاؤ، بلکہ اس کو سمجھانے کے لیے دو کیفیات روشنی اور تاریکی کی مثال دی ہے اور جب ہم زیادہ غور کرتے ہیں تو حق یہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ قرآن کریم میں جو نقشہ جنت و نار کا کھینچا گیا ہے اس میں ایک طرف تو ان دونوں میں اس قدر بُعد ہے کہ فرمایا لا یسمعون حسیسھا (الانبیاء ۲۱ - ۱۰۲) اہل جنت تو دوزخ کی آہٹ کو بھی نہ سنیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں کہ دوزخ کو اپنی آنکھوں سے تو دیکھیں گے مگر اس کی آواز کو نہ سنیں گے بلکہ اصل غرض صرف اظہار بُعد ہے اور دوزخ کا نظارہ آنکھ کے سامنے رہنا اس حقیقی راحت کے ساتھ کیونکر جمع ہو سکتا ہے، جس کا اہل جنت کو حاصل ہونا قرآن کریم سے صاف معلوم ہوتا ہے دوسری طرف اہل جنت اور اہل نار باہم بات چیت بھی کرتے ہیں اور دوزخ والے جنتیوں سے پانی بھی مانگتے ہیں اور دیگر نعماء کا بھی سوال کرتے ہیں اور جنتی ان کو جواب بھی دیتے ہیں پس وہ ایک دوسرے کی باتوں کو سنتے ہیں مگر اس خطرناک آگ کی آہٹ کو نہیں سنتے جس کی زفیر و شہیق کی دنیا میں کوئی نظیر ہی نہیں۔ پھر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں فاطلع فرآہ فی سوآء الجحیم (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۵۵) مگر آگ کی لپٹوں اور اس کی خطرناک اذیتوں کو نہیں دیکھتے اس سے معلوم ہوا کہ اس عالم مکان کا وہ رنگ نہیں جو اس عالم میں ہے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بعض کے نزدیک اتنی بڑی جنت جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے وہ ایک ایک شخص کیلئے ہوگی وقیل ان الجنۃ التی عرضھا عرض السمٰوٰت والارض انما تکون للرجل الواحد لان الانسان انما یرغب فیما یصیر ملکا لہ (رغ) اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک شخص کی جنت اس قدر وسیع ہے کہ سارے آسمانوں اور زمین پر محیط ہو گی لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کے دخل سے محفوظ ہو گی کیونکہ خاص اسی کی ملک ہو گی جس طرح ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ کی پوری پوری مغفرت کو حاصل کر سکتا ہے مگر اس کا اسے حاصل کرنا دوسرے کے لیے مانع نہیں اسی طرح ہر ایک شخص ساری جنت کو بھی حاصل کر سکتا ہے مگر اس کا اس کو حاصل کر لینا دوسرے کے حاصل کر لینے سے مانع نہیں۔ اس کی مثالیں اس دنیا میں بھی ملتی ہیں جیسے مثلاً سورج ہم میں سے ہر ایک کا بھی ہے اور سب کا بھی ہے جو فائدہ میں اس سے اُٹھاتا ہوں وہ دوسرے کے لیے مانع نہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ کچھ رنگ اس دنیا میں

الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ	جو لوگ آسودگی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں اور سخت غضب
وَ الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَ الۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ	کو دبا لینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ
وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۳۴﴾	احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۵۱۸
وَ الَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا	اور وہ کہ جب وہ کوئی بُرا کام کرتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر
اَنۡفُسَہُمۡ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِہِمۡ ۪	بیٹھتے ہیں اللہ کو یاد کرتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں

جنت و نار کا ہر ایک کو مل جاتا ہے۔ اس سے جو کچھ ہر ایک انسان خود سمجھ سکتا ہے وہ دوسرے کو الفاظ میں سمجھا نہیں سکتا۔

ع۵۱۸ السرّاء۔ الضرّاء۔ سراء سَرُّ ور سے ہے (مادہ سر رسے ہے) اور ضراء ضور سے ہے اور ضراء کے مقابلہ پر سراء بھی آتا ہے۔ اور نعماء بھی۔ پہلے کی مثال یہی ہے اور دوسرے کی مثال ہے۔ ولئن اذقناہ نعماء بعد ضراء۔ اور سراء حالتِ غناء کا نام ہے اور ضراء حالت فقر کا۔

الکاظمین۔ کظم۔ مَخۡرَجُ النفس کو کہتے ہیں یعنی سانس کے مخرج کو اور کُظُوم احتباس النفس یعنی سانس کا روکنا ہے اور اس سے مراد خاموش ہونا لیا جاتا ہے اور کظم غیظ سے مراد غضب کا روکنا ہے اور کَظَمَ السقاء کے معنی ہیں مشکیزہ کو بھر کر اس کا منہ باندھ دیا تاکہ پانی باہر نہ نکلے (غ) کظم غیظ کا استعارہ بھی اسی سے لیا گیا ہے غیظ کے لیے دیکھو ع۵۰۶

خوشحالی اور تنگی میں انفاق: اس آیت میں متقیوں کے چار اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ اوّل وہ خوشحالی اور تنگی میں برابر خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ دونوں آخری حدود کے اندر تمام درمیانہ حالتیں خود ہی آجاتی ہیں اور انسان کے لیے دو حالتوں میں خرچ کرنا ہی بہت مشکل ہوتا ہے ایک جب وہ حد درجہ کے آرام در راحت میں ہو کہ اس وقت خدا کو بھول جاتا ہے۔ اور دوسرے جب حد درجہ کی تنگی کی حالت میں ہو کہ اس وقت جو کچھ اسے ملے بمشکل اپنی ہی ضرورت پورا کرنے کے لیے مکتفی ہوتا ہے پس ان حالتوں کا ذکر کر کے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ایسا تعلق ہونا چاہیئے کہ جب تمام طرف راحت کے ہی سامان نظر آتے ہوں اور دنیا میں انسان اپنے آپ کو کسی کا محتاج نہ سمجھتا ہو تب بھی خدا کا محتاج اپنے آپ کو جان کر اس کی راہ میں دے اور مال کی محبت پر اللہ تعالیٰ کی محبت کو ترجیح دے اور جب یہ سمجھتا ہو کہ میں اس قدر تنگدست ہوں کہ میری ضرورتوں سے کچھ نہیں بچتا تب بھی اپنی ضرورتوں کو پیچھے کر کے اور محرومی کے باوجود اپنے آپ کو محروم کرتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرے ایک حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے پوچھا کہ تم میں سے کون ہے جس کے نزدیک اپنے مال سے اپنے وارث کا مال زیادہ محبوب ہو تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ سب کے نزدیک اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا نہیں بلکہ حالت اس کے برعکس ہے۔ مالك من مالك الا ما قدمت وما لوارثك الا ما اخرت (ث) تیرے مال سے کچھ بھی تیرے لیے نہیں مگر وہی جو تو آگے بھیجے اور جو تو پیچھے رکھتا ہے وہی تیرے وارث کا مال ہے۔

غضب کا دبانا: دوسری صفت کظم غیظ ہے۔ جو شخص اس بات پر قادر ہو کہ وہ غیظ یعنی سخت سے سخت غضب کو روک لے وہ گویا اپنے کل جذبات پر قادر ہو گیا۔ صحیح حدیث میں ہے۔ لیس الشدید بالصرعۃ ولکن الشدید الذی یملك نفسہ عند الغضب یعنی پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں دوسروں کو پچھاڑ لیتا ہے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غضب کے وقت اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے (متفق علیہ) اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا من کظم غیظا وھو یقدر علی انفاذہ ملأ اللہ جوفہ امنا وایمانا (ث) جو شخص سخت غضب کو روک لے در آنحالیکہ وہ اس کے نکالنے پر قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ کو امن اور ایمان سے بھر دیتا ہے اور ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان کو غضب آئے تو اس کے دبانے میں اس سے بھی مدد ملتی ہے کہ اس حالت میں وضو کرے اس سے غضب کی آگ فرو ہو جاتی ہے۔

تیسری صفت عافین عن الناس کی ہے۔ لوگوں کی خطاؤں پر درگزر کرنے والے یہاں تک کہ ان خطاؤں کو مٹا ہوا سمجھیں۔ یہ کظم غیظ سے بڑھ کر صفت ہے۔ اس لیے کہ کظم غیظ صرف غصہ کو روک لینے کا نام ہے اور عفو یہ چاہتا ہے کہ خطا کو بالکل کالعدم سمجھا جائے اور اس پر کسی قسم کی گرفت نہ کی جائے نہ کسی قسم کے انتقام کا خیال دل میں لایا جائے۔ حدیث میں آتا ہے ثلٰث اقسم علیھن ما نقص مال من صدقۃ وما زاد اللہ عبدا بالعفو الا عزا ومن تواضع اللہ رفعہ اللہ (ث) تین باتوں پر میں قسم کھاتا ہوں ایک یہ کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ جو شخص عفو کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو عزت میں ہی بڑھاتا ہے اور تیسرے یہ کہ جو اللہ کے لیے تواضع کرے اللہ اس کا رفع کرتا ہے۔

پھر خطاؤں کے عفو سے بڑھ کر محسنین کا مرتبہ ہے۔ جو کسی کی خطا پر غضب کو ہی نہیں روکتے اس سے عفو ہی نہیں کرتے بلکہ اس پر احسان بھی کرتے ہیں یہ کمال کا آخری مرتبہ ہے۔

اُحد کی جنگ میں بعض لوگوں کی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس لیے اب ان کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ نہ صرف اپنے غصہ کو دبا جائیں نہ صرف ان کی خطاؤں کو معاف کریں بلکہ ان پر احسان بھی کریں۔ ایسا ہی معاملہ احد کے موقع پر اور فتح مکہ میں قریش کے ساتھ نبی کریم صلعم نے کیا۔

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۖ وَلَمْ
يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٥﴾
اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا
فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٣٧﴾
هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ
لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٨﴾

اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشتا ہے اور جو کر بیٹھیں اس پر اصرار نہیں کرتے درآنحالیکہ وہ جانتے ہوں ۵۱۹

یہ لوگ ان کا بدلہ اپنے رب کی مغفرت اور باغ ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں، ان میں رہیں گے اور کام کرنے والوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے ۵۲۰

تم سے پہلے واقعات گزر چکے ہیں - پس تم زمین میں پھرو، پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ۵۲۱

یہ لوگوں کے لیے بیان اور متقیوں کے لیے ہدایت اور وعظ ہے ۵۲۲

ع ۵۱۹ فاحشۃ - فعل ہو یا قول جس کی قباحت بھاری ہو ع ۲۰۶۔ یہاں اوظلموا انفسھم کے بالمقابل فاحشۃ کو لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاحشۃ سے یہاں وہ امور مراد ہیں جن کی قباحت کا اثر دوسرے پر ہوتا ہے اور ظلموا انفسھم سے مراد وہ ذنوب ہیں جن کا بد اثر دوسروں پر تو نہ ہو مگر اپنے آپ کو ہی ان کا نقصان پہنچے۔

یصروا - صَرّ کے اصل معنی مضبوط باندھنا ہیں اور اصرار کے معنی ہیں کسی قصور پر پختہ ہو جانا اور اس میں مضبوط ہو جانا اور اس سے جدا ہونے سے رُکنا (غ) پہلی آیت کے متقی تو نہایت اعلیٰ درجہ پر ہیں۔ جو دوسروں کے قصوروں کو معاف کرنے والے اور ان سے احسان کرنے والے ہیں۔ اس آیت میں اس سے کم مرتبہ کے متقیوں کا ذکر ہے۔ ان سے بعض وقت کوئی بڑی قباحت والا کام سرزد ہو جاتا ہے یا اپنی ہی جان پر ظلم کرتے ہیں تو وہ استغفار کرتے ہیں۔ یہاں استغفار میں دونوں باتیں داخل ہیں جو کچھ کر چکے ہیں اس کے بد تاثرات سے بچنے کی دعا اور آئندہ ایسے گناہ میں پڑنے سے بچنے کی دعا۔

ع ۵۲۰ عاملین - عَمَل ہر وہ فعل ہے جو ایک جاندار قصد سے کرتا ہے۔ پس فعل عام ہے اور عمل خاص ہے - انسان کے سوائے دوسرے حیوانات سے بھی فعل سرزد ہو سکتا ہے مگر عمل نہیں (غ) عمل وہی ہے جو انسان کو کسی اچھے یا بُرے اجر کا مستحق ٹھہراتا ہے اور گو عمل اچھے اور بُرے دونوں پر آتا ہے مگر قرینہ صاف بتاتا ہے کہ یہاں عاملین سے مراد اچھے کام کرنے والے ہیں۔ آیت ۱۳۲ میں فرمایا تھا کہ مغفرت اور جنت کی طرف جلدی آؤ تو درمیان میں ان لوگوں کی صفات بیان کر کے جو مغفرت اور جنت کے حقدار ہوتے ہیں یہاں پھر ان کا اجر بیان فرمایا کہ ایسے لوگوں کو ضرور مغفرت اور جنت عطا ہوتی ہے۔ مغفرت کو قرآن کریم نے جنت کے ساتھ جمع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ مقام ہے۔ آیت کے آخر پر پھر نعم اجر العاملین لا کر بتا دیا کہ یہ عظیم الشان اجر کام کرنے پر ہی ملتا ہے۔

ع ۵۲۱ سنن - سُنّۃ کی جمع ہے (جس کا مادہ سنن ہے) اور سُنّۃ طریقہ کو کہتے ہیں اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے مراد آپؐ کا طریقہ ہے جس پر آپؐ چلتے تھے اور سُنّۃ اللہ کے معنی ہیں طریقۃ حکمتہٖ وطریقۃ طاعتہ (غ) یعنی اس کی حکمت کی راہ اور اس کی فرمانبرداری کی راہ اور یہاں لفظ عام ہے اور مراد اس کی سیاق عبارت سے ظاہر ہے یعنی اُمم سالفہ کی ہلاکت اور استیصال کے طریق - یا ان کے ساتھ جو واقعات گذرے اور مفضل نے یہاں مراد محض امم لی ہے کیونکہ عرب کے کلام میں سنّۃ بمعنی اُمّۃ بھی آیا ہے (ر) اور عطاء نے معنی شرائع اور ادیان لیے ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ تم سے پہلے قومیں گزر چکی ہیں یا دین ہو چکے ہیں یا واقعات ہلاکت ہو چکے ہیں - غرض سب کی ایک ہے۔

المکذبین - تکذیب کے معنی کسی شخص کو جھوٹ کی طرف منسوب کرنا یعنی اسے اپنے کلام یا دعوے میں کاذب قرار دینا - خواہ وہ سچا ہو یا جھوٹا۔ مگر قرآن شریف میں صادق کی تکذیب پر ہی یہ لفظ بولا گیا ہے - اس لیے کوئی قرینہ نہ ہو تو مُکَذِّب سے مراد سچائی کا جھٹلانے والا ہوگا - اس آیت سے پھر جنگ اُحد کی طرف رجوع کیا ہے اور پہلے مومنوں کو تسلی دی ہے کہ مکذبین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تم سے پہلے بہت مثالیں گزر چکی ہیں - اگر کوئی شخص چاہے تو زمین میں پھر کر دیکھ لے۔ فسیروا فی الارض میں سیر فی الارض کا امر لازمی نہیں بلکہ صرف ان کا حال معلوم کرنے کی ایک راہ بتائی ہے کہ چاہو تو زمین میں پھر کر دیکھ لو۔ ہر زمین میں یہی خدا کا قانون پاؤ گے کہ حق کی تکذیب کرنے والے برباد ہو گئے۔

ع ۵۲۲ ھذا میں اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے یا جو کچھ کفار اور متقیوں کے متعلق بیان ہوا ہے اس کی طرف یا انجام مکذبین کی طرف بیان - بان سے ہے اور بیان کے معنی الکشف عن الشئ (غ) کسی چیز کی اصل حقیقت کا واضح کرنا - اور یہ لفظ نطق سے عام ہے کیونکہ نطق انسان سے خاص ہے اور بیان

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

اور نہ سُست ہو اور نہ غمگین ہو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو ۵۲۳

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ
قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ
النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ
مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

اگر تم کو کوئی زخم پہنچا ہے تو یقیناً اسی طرح کا زخم (مخالف) قوم کو (بھی) پہنچا ہے اور ان دنوں کو ہم لوگوں میں نوبت بہ نوبت لاتے رہتے ہیں اور تاکہ اللہ ان کو جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے شہید بنائے اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا ۵۲۴

کسی خاص حالت پر دلالت کرنے کو بھی کہا جا سکتا ہے اور خبر دینے کو بھی خواہ وہ بذریعہ نطق ہو یا لکھ کر یا کنایہ کے طور پر (غ) اور بیان اور ہدیٰ میں یہ فرق ہے کہ بیان عام ہے یعنی خواہ کسی قسم کا بھی اظہار معنی ہو اور ھُدیٰ خاص ہے۔ موعظۃ کے لیے دیکھو ع ۹۵
یہاں قرآن کریم کو یا جس حالت کا یہاں ذکر کیا ہے اسے لوگوں کے لیے کھول کر بتا دینے والا کہا ہے۔ پھر اسے ہدایت کہا ہے یعنی بھلائی کی راہ بتانے والا بیان۔ یہ دونوں للناس ہیں یعنی سب لوگوں کے لیے اور بالآخر اسے متقیوں کے لیے وعظ کہا ہے۔ یعنی متقیوں کو بُری راہ سے ہٹا دینے والا اور خیر کی راہ پر چلانے والا۔

ع ۵۲۳ تھنوا۔ وَھن سے ہے جس کے معنی ہیں کمزوری جو جسمانی بناوٹ کے سبب سے ہو یا خُلق کے (غ) وھن العظم منی (مریم ۱۹ : ۴)
اِنْ بعض نے اِنْ کو اس موقعہ پر شرطیہ لیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طرز محض زیادہ ترغیب کے لیے اختیار کی گئی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو کہے ان کنت ابنی فلا تفعل کذا۔ اگر تو میرا بیٹا ہے تو ایسا مت کر۔ مگر کوفیوں کے نزدیک یہاں اِنْ بمعنی اِذْ ہے یعنی جب۔ کیونکہ شرط تو ہمیشہ آئندہ کے متعلق ہوتی ہے اور یہ امر واقع ہو چکا ہے اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ مثلاً لتدخلن المسجد الحرام انشاء اللّٰہ اٰمنین (الفتح ۴۸ : ۲۷) اور نبی صلعم کا قول اِنّا ان شاء اللّٰہ بکم للاحقون پس جہاں فعل محقق الوقوع ہے وہاں اِنْ کے معنی اِذْ ہوں گے (مغنی)
جنگ اُحد میں ستر مسلمان شہید ہو گئے اور بہت سی تکلیف ان کو پہنچی اور یہ امر طبائع میں کچھ سستی اور کمزوری پیدا کر سکتا تھا اور اس سے مسلمانوں کو غم بھی پہنچا تھا۔ تو تقویت کے لیے فرمایا کہ اس پر تم سے کوئی کمزوری ظاہر نہ ہو اور نہ اب جو کچھ ہو چکا ہے اس پر غمگین ہو۔ اور پھر ان کی تسلی کے لیے فرمایا کہ وہ جو وعدے تمہارے غلبہ کے ہیں وہ تو سچ ہو کر رہیں گے کیونکہ تم مومن ہو اور ہلاکت مکذبوں کا انجام ہے نہ مومنوں کا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب اُحد کے دن رسول اللہ صلعم کے ساتھی دشمن کے واپس لوٹنے پر گھبرا اُٹھے اور ادھر خالد کا لشکر عقب کی طرف سے حملہ آور ہوا تو مسلمان فوج کے گھر کر بالکل تباہ ہو جانے کا خطرہ ہو گیا تو اس وقت آنحضرت صلعم نے دعا کی اللّٰھم لا یعلنّ علینا اللّٰھم لا قوۃ لنا الا بك اللّٰھم لیس یعبدك بھٰذہ البلدۃ غیر ھؤلاء النفر (غ) اے اللہ یہ ہم پر غالب نہ آئیں۔ اے اللہ ہمیں کوئی قوت نہیں مگر تیرے ساتھ۔ اے اللہ سوائے اس گروہ کے اس شہر میں کوئی تیری عبادت کرنے والا نہیں۔ اور لکھا ہے کہ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بطور تسلی نازل کی۔

ع ۵۲۴ قَرْحٌ۔ قَرْح اس زخم کے اثر کو کہتے ہیں جو کسی خارجی شے سے انسان کو پہنچے اور قُرْح اس کو جو داخلی شے سے ہو اور قَرح اور قُرح میں بعض وقت یہ فرق بھی کیا جاتا ہے کہ اول الذکر کا استعمال زخم پر ہوتا ہے اور دوسرے کا درد پر جو اس سے پیدا ہو (غ) اور یہاں قَرح سے مراد وہ تکلیف ہے جو مسلمانوں کو جنگ اُحد میں پہنچی۔
الایام۔ ایام۔ یوم کی جمع ہے اور اس کا اصل اطلاق تو زمانہ کی ایک مدت پر ہی ہوتا ہے ع ۳ مگر عرب ایام کو بمعنی وقائع یعنی واقعات بھی استعمال کرتے ہیں (ل) مثلاً کہتے ہیں ھو عالم بایام العرب یعنی وہ عرب کے واقعات کا عالم ہے اسی لحاظ سے وذکرھم بایام اللّٰہ (ابراھیم ۱۴ : ۵) میں ایام اللہ سے مراد نعم اللّٰہ و نقم اللّٰہ لیے گئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کی عقوبتیں۔ اور مجاہد نے اس کے معنی صرف نعم اللہ کیے ہیں (ل)
نداولھا۔ دول سے ہے اور دَوْلۃ اور دُوْلۃ گردش یا نوبت کو کہتے ہیں۔ دَوْلۃ مال میں اور دُولۃ جنگ میں اور تداول القوم کذا سے مراد تناولوہ من حیث الدَّولۃ یعنی ایک چیز کو نوبت بنوبت لیا اور اسی سے ہے داول اللّٰہ کذا بینھم یعنی اللہ تعالیٰ ایک شے کو نوبت بنوبت ان پر لایا۔
یعلم اللّٰہ۔ لفظ علم کے اس استعمال کے لیے دیکھو ع ۱۶۹
قرآن کریم نے عموماً اللہ کے علم کو اس جگہ بیان کیا ہے جہاں مقصود اعمال کی جزا و سزا ہے۔ پس یہاں لیعلم اللّٰہ سے مراد وہ علم بھی ہو سکتا ہے جس کا تعلق جزا و سزا سے ہے کیونکہ گو اللہ تعالیٰ کو سب موجود و غیر موجود کا علم ہے عالم الغیب والشھادۃ اس کا نام ہے۔ مگر اس کی جزا و سزا محض علم پر نہیں ہوتی بلکہ وقوع پر ہوتی ہے پس لیعلم اللّٰہ سے مراد ہوئی تاکہ جزا دینے کے لیے جان لے اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ایسے علم

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو کھرا کردے جو ایمان لائے اور کافروں کو مٹا دے ۵۲۵

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے اُن لوگوں کو نہیں جانا جو جہاد کرتے ہیں اور (تاکہ) وہ صبر کرنے والوں کو جانے ۵۲۶

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ ع

اور یقیناً تم جنگ چاہتے تھے قبل اس کے کہ اُسے ملو، سو اب تم نے اسے دیکھ لیا اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو ۵۲۷

کے ساتھ جان لے جو ان کو ان کے غیر سے ممیز کردے۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ اُحد کی جنگ میں اگر تم کو کچھ تکلیف پہنچی ہے تو ویسی ہی تکلیف تمہارے دشمنوں کو بھی پہنچی ہے کیونکہ جنگ کے شروع میں کفار نے بھی نقصان اٹھایا تھا۔ یہ جنگ بدر کے متعلق نہیں ہے کیونکہ جنگ بدر کے واقعہ کو لیکر قرح مثلہ نہیں رہ جاتا بلکہ جیسا کہ خود قرآن کریم نے آگے چلکر فرمایا ہے اولما اصابتکم مصیبۃ قد اصبتم مثلیھا (آل عمران ۳-۱۶۴) جہاں دو مثلوں میں جنگ بدر اور جنگ اُحد ہیں۔

اس کے بعد ان الفاظ میں وتلك الایام نداولھا بین الناس فرمایا کہ دکھ اور تکلیفوں کے واقعات جیسے کافروں پر آتے ہیں مومنوں پر بھی آتے ہیں اور جنگوں میں ایسا ہو جاتا ہے کہ کبھی ایک فریق کو دکھ پہنچ جاتا ہے کبھی دوسرے کو۔ اس کا تعلق فتح وظفر سے کچھ نہیں۔

تکالیف کی غرض: اگر دُکھ اور تکلیفیں نوبت بہ نوبت آتی رہنے والی چیزیں ہیں تو اس کی غرض کیا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کو جو خدا پر ایمان لاتے ہیں دُکھ اور تکلیفیں پہنچیں؟ اس لیے کہ یہ دکھ اور تکلیفیں مومنوں کو منافقوں سے اور کھروں کو کھوٹوں سے الگ کرتی ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ایسا امتیاز ہوتا رہے۔ اور مومنوں کا ایمان ظاہر ہو کر وہ اس اجر کے مستحق قرار پائیں جو ایمان پر ملتا ہے اور دوسری ضرورت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اس اعلیٰ مقام پر پہنچائے کہ وہ خدا کی راہ میں اپنی جانیں دیدیں اور جو بچ گئے وہ بھی اسی مقام پر ہیں کیونکہ اپنی طرف سے انہوں نے بھی اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیدی تھیں گو اللہ تعالیٰ نے انہیں بچالیا۔ اور یا شہداء سے مراد پیشرو اور امام ہے۔ یعنی تم سے یہ قربانیاں کرا کر تم کو دنیا کے لوگوں کے لیے پیشرو اور امام بنائے کیونکہ بغیر دکھوں اور تکلیفوں میں پڑنے کے اور ان میں ثابت قدمی دکھانے کے کوئی شخص لوگوں کا پیشرو اور امام نہیں بن سکتا۔

۵۲۵ یمحق۔ محص کے اصل معنی ہیں ایک چیز کا ہر عیب سے جو اس میں ہو پاک کردینا۔ سونے کا محص یا تمحیص اسے کہتے ہیں کہ جو اس میں میل ہے اُسے دُور کرکے خالص سونا بنا دیا جائے (غ)

محق کے معنی ہیں بے برکت کرنا یا کم کرنا ۳۵۳ ایک چیز کو تھوڑا تھوڑا کرکے یا تدریجاً کم کرنا (ض)

تکلیف سے فائدہ اُٹھانا مومن کا کام ہے: یہاں دو مزید نتائج بیان فرمائے ہیں۔ مومنوں کی تمحیص اور کافروں کی بے برکتی یا نقصان یعنی جو تکلیف مومن کو پہنچتی ہے وہ اس کے ذنوب اور عیوب سے تطہیر کا موجب ہو کر اس کی ترقی کا موجب ہوتی ہے وہ تکلیف کے آنے سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کافر چونکہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس لیے اس کے لیے تکلیف کا نتیجہ نقصان اور بے برکتی ہوتی ہے۔

۵۲۶ لمّا۔ اصل میں لَمْ نافیہ اور ما ہے

یہ آیت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ علم سے مراد جزا و سزا کا علم ہے کیونکہ یہاں فرمایا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے گویا تمہارے جنت میں داخل ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اللہ تم میں سے جہاد کرنیوالوں اور صبر کرنیوالوں کو جان لے۔ اب جنت میں داخل ہونا جہاد کرنے اور صبر کرنے پر منحصر ہے، یعنی ان امور کے واقع ہونے پر۔ پس یہاں اللہ کے علم سے مراد ان چیزوں کے وقوع کا علم ہے جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جزا ملے کہ وہ لوگ جنت میں داخل ہوں۔

۵۲۷ الموت یہاں موت کا لفظ اسباب موت پر بولا گیا ہے (ج) آگے آتا ہے تم اسے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ موت کو کوئی شخص نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں اسباب موت دیکھے جا سکتے ہیں اس لیے بھی موت سے مراد اس کا سبب یعنی جہاد اور قتل ہے اور یا موت کی تمنی سے مراد صرف خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوددت انی اُقتل فی سبیل اللہ ثم اُحیٰی ثم اقتل ثم احیٰی ثم اقتل الخ

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ

اور محمد ایک رسول ہی ہے اس سے پہلے (سب) رسول مرچکے ہیں - پھر اگر وہ مرجائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ ع۵۲۸ اور جو کوئی اُلٹے پاؤں

بات سے محبت رکھتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو سب آرزؤں سے بہتر ہے۔

تمنون الموت سے اشارہ بعض صحابہؓ کی اس خواہش کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم کھلے میدان میں دشمن کے ساتھ جنگ کریں گے یا بعض صحابہؓ جو جنگ بدر میں رہ گئے تھے اس بات کے آرزومند تھے کہ انہیں بھی کسی جہاد میں شامل ہونے کا موقع ملے۔

ع۵۲۸ محمّد اس کا مادہ حمد ہے اور یہ سب سے زیادہ مشہور اسم ہمارے نبی کریم صلعم کا ہے اور اس کے معنی ہیں الذی کثرت الخصالۃ المحمودۃ (ل) وہ جس کی قابل تعریف خصلتیں بہت بڑھی ہوئی ہوں اور محمد اور احمد ہمارے رسول مصطفٰے صلعم کے ناموں میں سے ہیں (ل) لسان العرب میں سات نام دیئے ہیں جن کا نام ایام جاہلیت میں محمد رکھا گیا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے دادا عبدالمطلب نے یہ نام آپ کا رکھا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ یہ نام آپ کا مجھے رویا میں بتایا گیا ہے (س) اور حدیث متفق علیہ میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا انا محمد وانا احمد میں محمّد ہوں اور میں احمد ہوں۔ اور ایک حدیث میں ہے الم ترکیف صرف اللّٰہ تعالیٰ عنی لعن قریش وشتمھم یشتمون مذمما وانا محمد کیا تم نہیں دیکھتے کہ کس طرح اللہ تعالےٰ نے مجھ سے قریش کی لعنت اور ان کی گالی گلوچ کو پھیر دیا ہے وہ اسی مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور میں محمّد ہوں۔

خلت - خلا کے معنی ع۲۶ و ع۱۹۹ میں بیان ہو چکے ہیں۔ لیکن جب کسی انسان کے متعلق کہا جائے خلا تو اس سے مراد اس کی موت ہوتی ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ابن الاعرابی کا قول منقول ہے خلا فلان اذا مات اور یہ ظاہر بھی ہے کیونکہ انسان کا گزر جانا یہی ہے کہ وہ اس عالم سے دوسرے عالم کی طرف انتقال کر جائے اور اس کا دروازہ موت ہی ہے اور یہاں خلت کے مقابلہ پر مات او قتل لا کر صاف بتا دیا کہ جن کے خلا کا ذکر ہے وہ ان کا گزر جانا بذریعہ موت یا قتل ہی ہوا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلعم کا بھی ان دو طریقوں میں سے کسی ایک طریق پر گزر جانا ضروری ہے۔ پس قد خلت من قبلہ الرسل سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ سے پہلے رسول بذریعہ موت یا قتل گزر چکے۔ اگر کوئی تیسری صورت گزر جانے کی بھی قد خلت میں شامل ہوتی تو ضرور تھا کہ اس کا ذکر بھی خلت کے مقابلہ پر کر دیا جاتا۔ جیسے کہ مات کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہاں خبر تو مشہور صرف قتل کی ہوئی تھی۔ پس اگر پہلے رسولوں کے گزر جانے کے ساری صورتوں کا ذکر مقصود نہ ہوتا تو صرف افائن قتل کہنا چاہیئے تھا۔ اس کے ساتھ مات کہنے کی ضرورت نہ تھی۔

مات او قتل - موت سے مراد موت علی الفراش ہے۔ یعنی طبعی موت اور قتل سے مراد وہ موت ہے جو کسی ایسے واسطہ سے ہو جو جسم انسانی کا ناقص ہو۔

انقلبتم - انقلاب۔ قلب سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا ایک رُخ سے دوسرے رُخ کی طرف پھیرنا اور انقلاب کے معنی انصراف ہیں یعنی پھر جانا (غ)

اعقاب - عَقِب کی جمع ہے اور عَقِب ایڑی کو کہتے ہیں اور رَجَعَ علیٰ عَقِبِہ کے معنی کئے ہیں انثنٰی (غ) اُلٹا پھر گیا۔ یہی معنی انقلب علیٰ عَقِبَیْہ کے ہیں اور یہ بعینہٖ وہی خیال ہے جو ہماری زبان میں اُلٹے پاؤں پھر جانے سے ادا ہوتا ہے افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم میں ہمزہ انکاری ہے اور انکار سے مراد انکار انقلاب علی الاعقاب ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مرتد ہو جاؤ۔ اور بعض نے انقلاب علی الاعقاب سے مراد محض جنگ سے فرار لیا ہے۔ اس صورت میں اشارہ ان چند نفوس کی طرف ہے جو میدان جنگ سے بھاگ گئے تھے اور بعض نے انقلاب علے الاعقاب سے مراد صرف ایمانی کمزوری کا دکھانا لیا ہے۔ کیونکہ فرار کسی کمزوری کا نتیجہ ہی تھا اور چونکہ یہ آیت آنحضرت صلعم کی وفات کا ذکر کرتی ہے اس لیے اس میں ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے جو آنحضرتؐ کی وفات پر مرتد ہو گئے تھے۔

اُحد میں آنحضرتؐ کے قتل کی خبر کا مشہور ہو جانا: اس آیت میں جنگ اُحد کے اس نازک ترین موقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جب تیر اندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے قریش مکہ کا رسالہ خالد کے ماتحت لشکر اسلامی کی عقب کی طرف سے حملہ آور ہوا اور بھاگتا ہوا لشکر کفار بھی لوٹا اور مسلمان پریشانی کی حالت میں ہو گئے۔ اس حالت میں نبی کریم صلعم نے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے لیے بلند آواز سے یہ کہنا شروع کیا الیّ عباد اللّٰہ انا رسول اللّٰہ۔ اے اللہ کے بندو میری طرف آجاؤ میں رسول اللہ ہوں۔ اس آواز کے بلند ہوتے ہی کفار نے نہایت تندی سے آنحضرت صلعم پر حملہ کیا اور ابن قمۂ حارثی نے رسول اللہ صلعم پر ایک بڑا پتھر پھینکا جس سے آپ کے سامنے کے دانت مبارک شہید ہو گئے اور منہ اور سر زخمی ہو گیا اور یہ شخص آگے بڑھا کہ آپ کو قتل کر دے کہ مصعب بن عمیرؓ صاحب الرایۃ درمیان میں حائل ہو گئے اور خود شہید ہو کر نبی کریم صلعم کو بچا لیا اور آہستہ آہستہ رسول اللہ صلعم کے سامنے صحابہؓ کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔ مگر آپ زخم کی شدت سے گر گئے۔ ادھر جب ابن قمۂ آپ کو قتل نہ کر سکا تو اس نے یہ خبر اُڑا دی کہ محمد رسول اللہ صلعم قتل ہو گئے اور یہ آواز سارے لشکر میں بلند ہو گئی۔ اسی واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم

عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد بدلہ دیگا۔

مگر صحابہؓ کے قدم میں اس خبر سے کوئی تزلزل نہیں آیا سوائے چند نفر کے جو لشکر سے کٹ جانے کی وجہ سے بھاگ گئے بلکہ ان میں وہ لوگ تھے جنہوں نے کہا۔ ان کان محمد قد قتل فان رب محمد حی لا یموت ..... فقاتلوا علٰی ما قاتل علیہ اگر محمد صلعم قتل ہو گئے ہیں تو رب محمد زندہ ہے جو کبھی نہیں مریگا سو تم بھی اس بات کے لیے جنگ کرو جس کے لیے آپؐ جنگ کرتے تھے۔

اس آیت وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل سے ایک اور اہم مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے یہ وہ آیت ہے جس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلعم کی وفات پر استدلال کیا اور جس استدلال کے سامنے سارے صحابہؓ کی گردنیں جھک گئیں۔ نبی کریم صلعم کی وفات کی خبر جب شائع ہوئی تو کون مسلمان ہوگا جس کا دل چاہتا ہو کہ اس خبر پر یقین کرے۔ صحابہ کو جو آپؐ سے محبت تھی وہ ایسی تھی کہ وہ لوگ آپ کی وفات کا کلمہ بھی منہ پر لانا پسند نہ کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے عام مجمع میں یہ کہہ دیا کہ جو شخص رسول اللہ صلعم کو وفات یافتہ کہے گا میں اس کا سر اڑا دونگا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہ اتنے میں آئے اور سیدھے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر میں چلے گئے۔ کپڑا چہرہ مبارک سے اٹھایا اور دیکھا کہ آپ رفیق اعلٰی سے جاملے ہیں۔ تو آپ نے واپس مسجد میں آکر ایک خطبہ پڑھا۔ جس میں آپ نے فرمایا ایھا الناس من کان یعبد محمدا فان محمد اقد مات ومن کان یعبد اللہ تعالٰی فان اللہ حیٌّ لا یموت۔ اے لوگو! جو کوئی محمد (صلعم) کی عبادت کرتا تھا تو محمد (صلعم) فوت ہو گئے اور جو کوئی اللہ تعالٰی کی عبادت کرتا تھا تو اللہ تعالٰی ہمیشہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت قرآن کریم کی پڑھی وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل محمد صلعم ایک رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے سب رسول گزر چکے۔ اور اس سے یہ استدلال کیا کہ آنحضرت صلعم فوت ہو گئے تو سب لوگ خاموش ہو گئے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ استدلال اسی صورت میں کام دے سکتا تھا جب حضرت ابوبکر صدیق اور دیگر صحابہؓ کا یہ اعتقاد ہو کہ آنحضرت صلعم سے پہلے تمام رسول وفات پا چکے ہیں۔ کیونکہ اگر پہلے رسولوں میں سے کچھ ایسے بھی مانے جائیں کہ انہوں نے وفات نہ پائی ہو تو پھر ایک رسول کی وفات پر یہ کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اگر بعض رسولوں نے وفات پائی اور بعض نے نہیں پائی تو پھر کیوں رسول اللہ صلعم ان میں نہ ہوں جنھوں نے وفات نہیں پائی۔ ہاں اگر سب رسول ہی وفات پا چکے تو پھر آنحضرت صلعم کی وفات پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔ پس حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس استدلال کی صحت کے سامنے سارے صحابہ کا خاموش ہو جانا ایک قطعی شہادت اس بات پر ہے کہ وہ آنحضرت صلعم سے پہلے کل رسولوں کو وفات یافتہ مانتے تھے۔ گویا آنحضرتؐ سے پہلے کل نبیوں کی وفات پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔ یہ امر کہ اس سے سارے رسولوں کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے مفسرین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اور تمام رسولوں کا آنحضرت صلعم سے پہلے موت یا قتل سے جنکو قرآن کریم نے بمقابلہ خلا استعمال کیا ہے گزر جانا ہی مانا ہے۔ چنانچہ بیضاوی میں ان الفاظ وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل کی تفسیر یوں کی ہے فسیخلو اکما خلوا بالموت او القتل پس آپ بھی گزر جائیں گے جیسے وہ گزر گئے موت سے یا قتل سے جس سے سارے پہلے انبیاء کا موت یا قتل سے گزر جانا ثابت ہے۔ اور تفسیر غرائب القرآن میں ان الفاظ وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل میں دو دلیلیں مانی ہیں۔ جن میں سے دوسری دلیل کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے وثانیھما القیاس علٰی موت سائر الانبیاء وقتلھم یعنی دوسری بات تمام کے تمام انبیاء کی موت یا ان کے قتل پر قیاس ہے اور تفسیر روح المعانی میں انہی الفاظ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں اللہ تعالٰی نے یہ بیان کیا ہے وتبین ان حکم النبی صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم حکم من سبق من الانبیاء صلوٰت اللہ تعالٰی وسلامہ علیھم اجمعین فی انھم ماتوا ولقی اتباعھم متمسکین بدینھم۔ یعنی اللہ تعالٰی نے یہاں کھول کر بیان کر دیا ہے کہ نبی کریم صلعم کا حکم ان انبیاء کا حکم ہے جو پہلے گزر چکے سب پر اللہ کی صلوٰت اور سلام ہو اس بارہ میں کہ وہ مر گئے اور ان کے پیرو اُن کے دین پر متمسک رہے۔ اور پھر لکھا ہے فتکون جملۃ قد خلت الخ صفۃ لرسول منبئۃ عن کونہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم فی شرف الخلو فان خلو مشارکیہ فی منصب الرسالۃ من شواھد خلوہ لا محالۃ کانہ قیل قد خلت من قبلہ امثالہ فسیخلو اکما خلوا۔ یعنی اس صورت میں یہ جملہ قد خلت رسول کی صفت ہوگا۔ خبر دینے والا اس بات کی کہ آنحضرت صلعم کو شرف گزر جانے کا حاصل ہے کیونکہ منصب رسالت میں جو آپ کے شریک ہیں ان کا گزر جانا لا محالہ آپ کے گزر جانے کے شواہد میں سے ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ اس کی مثل اس سے پہلے گزر گئے۔ پس جس طرح وہ گزر گئے اسی طرح یہ بھی گزر جائے گا۔

علاوہ ازیں اس آیت کا مقابلہ اگر ایک دوسری آیت قرآنی سے کیا جائے جس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کا ذکر انہی الفاظ میں آتا ہے تو اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلعم سے پہلے کل رسول اس آیت کے نزول سے پیشتر مر چکے تھے اور وہ آیت یوں ہے ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل (المائدۃ ۵-۷۵) مسیح ابن مریم ایک رسول ہی ہے اس سے پہلے رسول گزر چکے۔ اب اس میں شک نہیں کہ یہ آیت حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات پر استدلال کے طور پر ہے کہ جس طرح پہلے رسول گزر چکے وہ بھی گزر گئے اور یہاں جو قد خلت من قبلہ الرسل فرمایا تو اس پر بہر حال قریباً سب کا اتفاق ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے تمام رسول وفات پا چکے۔ اب تعجب ہے کہ یہ آیت تو حضرت مسیح سے پہلے سارے رسولوں کے مرنے پر دلیل ہو اور بعینہٖ ایسی ہی آیت ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل آنحضرت صلعم سے پیشتر کے تمام رسولوں پر وفات کی دلیل نہ

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور کسی شخص کے لیے یہ نہیں کہ وہ اللہ کے اذن کے سوا مر جائے (موت کا) وقت لکھا ہوا ہے [۵۲۹] اور جو کوئی دنیا کا بدلہ چاہتا ہے ہم اُسکو اس سے دیدیتے ہیں اور جو کوئی آخرت کا بدلہ چاہتا ہے ہم اس کو اس سے دیدیتے ہیں اور شکر کرنے والوں کو ہم جلد بدلہ دیں گے [۵۳۰]

مانی جائے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آیت ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل سے تو حضرت مسیح سے پیشتر تمام رسولوں کی وفات ثابت ہے مگر آیت ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل سے ایک بھی رسول کی وفات ثابت نہیں کیونکہ باقی سب تو دوسری آیت کی رُو سے مر چکے اور اس آیت کی رو سے ایک حضرت مسیح بھی نہ مرے۔

ع۵۲۹ باذن اللہ - اِذن کے معنی اجازت اور رخصت کا اعلام ہے اور علم کے معنی میں بھی آتا ہے ع۱۲۳ اور ابو مسلم نے یہاں اذن کے معنی امر کیے ہیں (رغ) اور بعض نے اس کے معنی تخلیۃ اور اطلاق یعنی چھوڑ دینا لیے ہیں اور مراد ما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ سے یہ لی ہے کہ کوئی شخص قتل کے ذریعہ سے نہیں مر سکتا سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ قاتل کو چھوڑ دے کہ وہ مقتول کو مار ڈالے (رغ) گویا یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلعم پر ان لوگوں کو غالب نہیں آنے دیا کہ باوجود اسباب قتل کے جمع ہو جانے کے وہ آپ کے قتل پر مسلط ہو جاتے۔

کتابا مؤجلا - کتاب - مصدر ہے جو یہاں مقدر کتب الموت کے لیے بطور تاکید لایا گیا ہے اور مؤجل کے معنی وہ جس کے لیے اجل مقرر کی گئی ہے اور اجل وہ مدت معینہ ہے جو کسی چیز کے لیے مقرر کی گئی ہو اور عام طور پر انسان کی زندگی کی مدت معینہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے - ان الفاظ میں ان لوگوں کی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جنہوں نے یہ مشہور کیا تھا کہ آنحضرت صلعم فوت ہو گئے اور بالخصوص بعض منافقین نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہم عبداللہ بن ابی کے ذریعہ سے ابوسفیان سے امان طلب کرینگے (حالانکہ ابوسفیان خود مکہ کی طرف بہت دور نکل چکا تھا) اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوئی انسان بھی اذن الہٰی کے بغیر نہیں مرتا اس لیے گو محمد رسول اللہ صلعم کی موت کے سب سامان جمع ہو چکے تھے مگر اللہ تعالیٰ کا یہ اذن نہ تھا کہ آپ اس وقت وفات پائیں۔ گو الفاظ میں عمومیت ہے مگر اصل غرض آنحضرت صلعم کی حفاظت کی طرف ہی توجہ دلانا ہے - بیشک ایسے اسباب اس جنگ میں جمع ہو چکے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت نہ ہوتی تو آنحضرت صلعم وفات پا جاتے۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا تھا کہ آپ کو مخالفین پر غالب کرے گا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان وعدوں کو پورا فرمایا اور آنحضرتؐ کی حفاظت فرمائی اور الفاظ کو عام کر کے یہ بتایا ہے کہ کسی شخص کو بھی نہ چاہیئے کہ جب اس کا فرض اس کو موت کے مقام پر کھڑا ہونے کے لیے بلاتا ہو تو گھبرا کر وہاں سے بھاگے۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اسباب موت کے جمع ہونے کے باوجود بھی اس کو بچا لے۔

ع۵۳۰ ثواب - ثَوب سے مشتق ہے جس کے اصل معنی دو طرح پر ہیں - یعنی اول ایک چیز کا اپنی پہلی حالت کی طرف جس پر وہ تھی لوٹ آنا اسی معنی میں آتا ہے۔ ثاب فلان الی دارہ فلاں شخص اپنے گھر کی طرف لوٹ آیا اور دوسرے معنی ہیں رجوع الشئی الی الحالۃ المقدرۃ بالفکرۃ یعنی ایک چیز کا لوٹ کر ایسی حالت کی طرف آ جانا جو اس کے لیے بروئے فکر (عقل مقدر تھی اس معنی کے لحاظ سے ثوب لباس کو کہتے ہیں کیونکہ سوت کا کاتنا اس غرض کے لیے تھا کہ اس سے کپڑا بنے اور اسی معنی میں ثوابِ عمل ہے یعنی وہ چیز جو انسان کے اعمال کے بدلہ سے اس کی طرف لوٹ کر آتی ہے اور جزا یا بدلہ کو ثواب اس خیال سے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ اصل چیز ہی ہے - چنانچہ قرآن کریم میں بعض جگہ جزا کو نفس فعل ہی قرار دیا گیا ہے جیسے فرمایا من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ جو کوئی شخص ایک ذرہ کے برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لیگا اور یہ نہیں کہا کہ وہ اس کی جزا کو دیکھ لیگا (رغ)

لفظ ثواب کو جزائے اعمال کے لیے اختیار کر کے فلسفۂ اعمال کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب انسان ایک اچھا یا بُرا فعل کرتا ہے تو اس کے کرنے کے ساتھ وہ فعل ختم نہیں ہو جاتا (گو انسان ایسا ہی سمجھتا ہے کہ بس جو ہونا تھا ہو چکا، اسی لحاظ سے عمل کو دوسری جگہ طائر کہا ہے۔ گویا کرنے والے کے نزدیک وہ اُڑ جاتا ہے۔ گو قرآن کریم فرماتا ہے کہ وہ اڑتا نہیں بلکہ فی عنقہ یعنی اس کے ساتھ لازم ہو جاتا ہے) بلکہ وہی فعل ایک دوسرے رنگ میں لوٹ آتا ہے اور ہر ایک نتیجہ درحقیقت اصل فعل کی ہی ایک دوسری صورت ہے۔

لفظ ثواب خیر اور شر دونوں پر استعمال ہوتا ہے گو اس کا زیادہ استعمال خیر پر ہے۔

اس حصۂ آیت میں دو گروہوں کا ذکر کیا ہے من کان یرید ثواب الدنیا - اور من کان یرید ثواب الاٰخرۃ - مفسرین نے عموماً یہاں گروہِ اول سے مراد تیر اندازوں کا وہ حصہ لیا ہے جنہوں نے مال غنیمت کی خاطر نبی کریم صلعم کے حکم کے خلاف کیا اور اپنی جگہ کو چھوڑ دیا - مگر میرے نزدیک اس سے مراد منافق ہیں جنکو جیسا کہ اوپر ذکر ہُوا اڑتی اُڑتی افواہ آنحضرت صلعم کی وفات کی مدینہ میں پہنچی تو وہ خوش ہوئے کہ وہ ساتھ نہ تھے اور ان کو وہ تکلیف نہ پہنچی جو مسلمانوں کو پہنچی، تو ان کو بتاتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اگر کوئی شخص دنیوی فائدہ اپنے عمل سے حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ دیدیتا ہے اور جو انجام کی بھلائی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ وہ بھی دیدیتا ہے۔ جو انجام میں بھلائی کے لیے کوشش کرتا ہے اس کو ضرور ہے کہ ابتدا میں کچھ دُکھ اُٹھانا پڑے اور جو موجودہ وقت کی بھلائی

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ	اور کتنے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے ربانی لوگ لڑے ۵۳۱
كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ	پھر اس وجہ سے وہ سست نہ ہوئے جو ان کو اللہ کی راہ میں
اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ	مصیبت پیش آئی اور نہ کمزور ہوئے اور نہ عاجزی اختیار کی اور اللہ
يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾	صبر کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے ۵۳۲
وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا	اور اُن کی بات سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ اُنھوں نے کہا ہمارے
اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَ	رب ہمارے گناہ اور جو ہم سے زیادتی ہوئی ہمیں بخش دے اور ہمارے
ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾	قدموں کو مضبوط رکھ اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے ۵۳۳
فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ	سو اللہ نے اُن کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا اچھا ثواب دیا اور

چاہتا ہے اس کو وہ مل جاتی ہے۔ مگر انجام کار دکھ اٹھانا پڑتا ہے۔

۵۳۱ع کاین۔ بعض کے نزدیک اس میں نون اصلی ہے اور یہ لفظ لبسیط خاص اسی معنی کے لیے موضوع ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ مرکب ہے کاف تشبیہ سے اور ایّ سے جو ابہام کے لیے آتا ہے اور ایّ کی تنوین نے نون کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کی مثال کذا ہے جو ک اور ذا سے مرکب ہے اور کاین بمعنی کم ہے یعنی کتنے۔

ربیون۔ ربّی کی جمع ہے۔ امام راغب کے نزدیک ربّی اور ربّانی کے ایک ہی معنی ہیں جس کے لیے دیکھو ع۴۷۰ اور لسان العرب میں ربّی کو منسوب الی الرب ہی لکھا ہے گویا ربّی اور ربّانی کے ایک ہی معنی ہیں۔ مگر ابن عباسؓ سے اس کے معنی جموع یعنی جماعتیں مروی ہیں (ر) اور یہی معنی فرّاء اور زجاج نے کیے ہیں (رغ) اور اس صورت میں یہ ربة یا ربوة سے مشتق ہے جس کے معنی جماعت ہیں اور ضحاک نے اس کو ایک ہزار کے ساتھ مخصوص کیا ہے مگر یہاں تعداد اور گنتی کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں اور اس کا ذکر لفظ کثیر میں موجود ہے بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو جنگیں کرنی پڑیں اور ان کے ساتھ بڑے بڑے ربانی لوگوں کو علماء فقہا کو بھی جنگیں کرنی پڑیں تو ان کو ان جنگوں میں تکلیفیں بھی اُٹھانی پڑیں مگر اس کا نتیجہ یہ نہیں ہُوا کہ وہ کمزور ہو گئے ہوں۔

۵۳۲ع وھنوا۔ وھن کے معنی بیان ہو چکے ہیں۔ ضعفِ خُلق یا خَلق اور حدیث میں آتا ہے لا داھنا فی عزم جس کے معنی ہیں ضعیفا فی رای (ل) اور چونکہ یہاں ضعف کا الگ ذکر ہے اس لیے اس سے مراد ضعف رائے ہے یعنی ارادہ میں سُست ہو جانا۔ لسان العرب میں فما دھنوا کے معنی بیان کیے ہیں ما فتروا وما جبُنُوا عن قتال عدوھم یعنی دشمن کی جنگ میں وقفہ کیا اور نہ بزدل ہوئے۔ استکانوا اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے مفردات میں اس کا اشتقاق کان سے باب استفعال میں مانا ہے اور معنی تضرع ہیں یعنی عاجزی اختیار کی اور لسان العرب میں استکانة کا اصل سکن یا سکون سے مانا ہے اور معنی اس کے خضع و ذل ہی کیے ہیں یعنی عاجزی اور فرمانبرداری اختیار کی اور اس صورت میں تعلق اصل معنی سے ظاہر ہے اور لسان العرب میں ہے کہ اصل میں استکنوا تھا اشباع سے استکانوا ہو گیا ہے۔ دوسری جگہ قرآن شریف میں آتا ہے فما استکانوا لربھم (المؤمنون ۲۳-۷۶) اور غرائب القرآن میں ہے وھن وہ ضعف ہے جو دل سے تعلق رکھتا ہے اور ضعف مطلق قوت جسمانی میں کمزوری ہے اور استکانة اس عاجزی اور ضعف کا اظہار ہے۔

یہاں جو تین لفظ اختیار کیے ہیں یہ تین الگ الگ مراتب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے وھن یا رائے کی سستی اور ارادہ کی کمزوری ہے جس کا تعلق گویا دشمن کی تیاری سے ہے اور اس کی جموع کثیرہ اور اس کے سامان جنگ سے۔ دوسرا ضعف یا کمزوری کا پیدا ہو جانا ہے جس کا تعلق بعض کے قتل ہو جانے اور بعض کے زخمی ہو جانے سے ہے اور تیسرا اظہار عاجزی ہے جس کا تعلق دشمن کی آنی فتحیابی سے۔ گویا بہر حال انسان کو دشمن کے مقابلہ پر مضبوط اور قوی رہنا چاہیئے اور دب نہیں جانا چاہیئے۔

۵۳۳ع اسرافنا۔ اسراف۔ سَرَف سے ہے۔ ہر فعل میں جو انسان کرے حد سے گزر جانے کا نام سَرَف یا اسراف ہے۔ (غ) گو مال کے متعلق اس کے معنی کی زیادہ شہرت ہے۔

ثبت اقدامنا۔ لفظی معنی تو یہی ہیں کہ ہمارے قدموں کو مضبوط کر۔ مگر مراد اس سے یہ ہے کہ دلوں سے خوف دور ہو۔ اور ہر قسم کے خیالات فاسدہ سینوں سے نکلے رہیں (رغ) قدموں کی مضبوطی کو دل کی قوت سے شدید تعلق ہے۔

یہاں بتایا ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ سے اپنی کمزوریوں کا علاج اور خطاؤں کی معافی چاہو دوسری طرف دشمن پر نصرت کے طالب بنو۔ اگر اپنے ہی نفسوں میں کمزوریاں بھری رہیں تو دشمن پر فتح پانے سے انسان کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۵۳۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم اُن کی اطاعت کرو گے جو کافر ہوئے تو وہ تم کو اُلٹے پاؤں لَوٹا دیں گے، پس تم نقصان اُٹھانے والے ہو کر پھر جاؤ گے ۵۳۵

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

بلکہ اللہ ہی تمہارا مولیٰ ہے اور سب سے اچھا مددگار ہے ۵۳۶

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

ہم عنقریب اُن لوگوں کے دلوں میں رُعب ڈال دینگے جو کافر ہوئے اس لیے کہ اُنھوں نے اللہ کے ساتھ شریک بنایا ہے جس کی اُس نے کوئی سند نہیں اُتاری اور اُن کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کی کیا ہی بُری جگہ ہے ۵۳۷

۵۳۴ اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں کوشش کرتے ہیں اور دنیا کو دین پر قربان کر دیتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ دنیا کا ثواب بھی ضرور دیتا ہے اور آخرت کا ثواب تو نہایت اعلیٰ درجہ کا ملتا ہے۔ ان لوگوں کو یہاں محسن کہا ہے احسان کے معنی حدیث میں آئے ہیں تعبد اللّٰہ کانك تراہ اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ اسے دیکھ رہا ہے اور جو شخص اپنے فوائد دنیوی کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیتا ہے یہاں تک کہ اپنا سر بھی خدا کی راہ میں دیدیتا ہے یا دینے کے لیے تیار ہوتا ہے وہ واقعی احسان کی اس تعریف کے نیچے آتا ہے۔

۵۳۵ اطاعت کفار: ان تطیعوا الذین کفروا۔ اطاعۃ کے معنی گزر چکے کسی کے امر کی پیروی کرنا ۴۸۷ یہاں اطاعت سے مراد یا تو کافروں کے سامنے کمزور ہو کر عاجزی اختیار کر لینا اور ان کی ماتحتی قبول کر لینا ہے جیسا کہ آیت (۱۴۵) میں فرمایا تھا کہ نبی کے ساتھی ایسے کمزور نہیں ہوتے کہ دشمن کو ذرا غالب دیکھا تو فوراً اس کے آگے جھک گئے اور یہ اس لیے فرمایا کہ منافق جو راستہ سے واپس ہو گئے تھے اب اس مصیبت کو دیکھ کر اس بات پر تلے بیٹھے تھے کہ ابوسفیان مدینہ کا رُخ کرے تو فوراً اس کی اطاعت کر لیں۔ اس لیے مومنوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ان کافروں کی اطاعت کا نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ وہ دین اسلام سے تم کو پھیر دیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ولا یزالون یقاتلونکم حتّٰی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا (البقرۃ ۲-۲۱۷) اور یا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی رائے کو دین کے بارے میں مت قبول کرو اور ان کو اپنے خیر خواہ سمجھ کر ان کے پیچھے نہ چلو۔ فیما یامرونکم بہ وفیما ینھونکم عنہ فتقبلوا رایھم فی ذٰلك (ج) اور فی الحقیقت دونوں معنی درست ہیں اگر مسلمانوں کو کفار کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے یا وہ کہیں میدان جنگ میں غالب بھی آجائیں تو مسلمانوں کو نہیں چاہیئے کہ فوراً ہمت ہار کر ان کی اطاعت قبول کر لیں اور امور دینی میں بالخصوص اور ہر حال میں کافروں کے تتبع سے بچنا چاہیئے الذین کفروا سے مراد بعض نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو لیا ہے اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ منافق مراد ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو کہا کہ اپنے بھائیوں کی طرف لوٹ جاؤ اور ان کے دین میں داخل ہو جاؤ پہلے معنی کے لحاظ سے یہ آیت دونوں پر صادق آتی ہے۔ اور حسن کا قول ہے کہ یہود و نصاریٰ مراد ہیں جو مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات ڈال کر دین اسلام سے منحرف کرنا چاہتے تھے اور یہ تطیعوا کے دوسرے مفہوم کے لحاظ سے درست ہے اور بعض نے کہا کہ یہ آیت عام ہے اور صحیح یہی ہے کیونکہ ہر زمانہ میں ہی کافر ایک یا دوسرے معنی کے لحاظ سے اسلام کے خلاف لگے رہتے ہیں۔

۵۳۶ آنحضرتؐ کی غیرت توحید باری کی ایک مثال: بخاری میں ہے کہ اُحد کے دن جب مسلمان بہت سا نقصان اُٹھا کر آخر پھر ایک جگہ آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہو گئے اور آنحضرتؐ زخموں سے نڈھال ہو کر گر گئے تھے اور آپ کی وفات کی خبر بھی دشمنوں میں مشہور ہو چکی تھی تو ابوسفیان نے میدان سے واپس ہوتے وقت بلند آواز سے کہا کہ کیا قوم میں محمد صلعم ہیں تو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جواب نہ دو۔ پھر اس نے کہا کیا قوم میں ابوبکر ہیں، پھر آپ نے فرمایا کہ جواب نہ دو۔ پھر اس نے کہا قوم میں عمر ابن الخطاب ہیں اور ساتھ ہی کہا اگر یہ لوگ زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ تب حضرت عمر نے کہا کہ ہم سب تم کو ذلیل کرنے کے لیے زندہ ہیں۔ تب ابوسفیان پکارا اُعْلُ ھبل یعنی ہبل کی جے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا اس کو جواب دو اللّٰہ اعلٰی واجلّ۔ اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے زیادہ جلال والا ہے۔ پھر ابوسفیان نے کہا لنا العُزّٰی ولا عُزّٰی لکم۔ ہمارا (بت) عزّیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزّیٰ نہیں۔ پھر آنحضرت صلعم نے فرمایا اس کو جواب دو اور کہو، اللّٰہ مولٰینا ولا مولٰی لکم اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ آیت کے الفاظ بل اللّٰہ مولٰکم میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کو توحید الٰہی کے لیے کس قدر غیرت تھی۔ جب اپنی زندگی یا موت کا سوال ہُوا تو خاموشی کا حکم دیا لیکن جب بُت کی بڑائی کی گئی تو چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر حملہ تھا اس لیے آپ نے فوراً جواب دینے کا حکم دیا اور بتایا کہ ہم یعنی مسلمان کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہمارا مولیٰ اور مددگار اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بالآخر کافر ہی ذلیل ہونگے گو درمیان میں وہ مسلمانوں کو کچھ نقصان بھی پہنچا لیں۔

۵۳۷ الرُّعْب۔ رُعب انقطاع ہے جو خوف سے بھر جانے سے پیدا ہو اسی لیے باعتبار بھرنے کے رَعَبْتُ الْحَوْضَ کے معنی ہیں میں نے حوض کو بھر

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي	اللہ نے یقیناً اپنا وعدہ تم سے سچا کر دکھایا جب تم اس کے اذن سے اُن کو کاٹ رہے تھے ۵۳۸ یہاں تک کہ تم نے نامردی کی اور

دیا اور باعتبار انقطاع کے رَعَبْتُ السَّنَامَ کے معنی ہیں میں نے سنام کو کاٹ دیا (غ)۔

سلطان۔ اس کا مادہ سلط ہے۔ اور سلاطة کے معنی ہیں غالب آ کر مضبوط ہو جانا اور اسی معنی میں سلطان آتا ہے جیسے ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیه سلطنا (بنی اسرائیل۱۷-۳۳) انه لیس له سلطان علی الذین اٰمنوا (النحل۱۶-۹۹) انما سلطانه علی الذین یتولونه (النحل ۱۶) لاتنفذون الا بسلطان (الرحمٰن۵۵-۳۳) (غ) اور حجة یعنی دلیل کو سلطان اس لیے کہا گیا ہے کہ دلوں کو وہ پکڑ لیتی ہے اور ان پر غالب آجاتی ہے لیکن اس کا تسلّط بیشتر اہل علم و حکمت پر ہوتا ہے (غ)۔

مادی۔ اٰوی الی کذا کے معنی ہیں اِنْضَمَّ الیه اس کے ساتھ یا اس کی طرف مل گیا۔

مثوی۔ ثوی سے ہے اور ثواء کے معنی ہیں استقرار کے ساتھ ٹھہرنا یا قرار گاہ۔ نباکر ٹھہرنا (غ)۔

واقعات سے ظاہر ہے کہ اُحد کے میدان میں باوجود مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچانے کے کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب تھا۔ ان کو صاف معلوم ہو گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم بھی زندہ ہیں ابوبکرؓ و عمرؓ بھی زندہ ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث سے ظاہر ہے جس کا ترجمہ اوپر دیا گیا ہے تاہم ابوسفیان نے جب دیکھا کہ مسلمان آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہو گئے ہیں تو اس نے اپنی بہتری اسی میں دیکھی کہ فوراً مکّہ کی راہ لے اور یہ بھی بعض روایات میں آیا ہے کہ رستہ میں خود ان کو اپنی کرتوت پر ندامت بھی ہوئی اور انہوں نے باہم کہا کہ ہم نے اچھا نہیں کیا اور بغیر استیصال کے مسلمانوں کو چھوڑ آئے مگر پھر بھی اس رُعب کی وجہ سے لوٹ نہ سکے بلکہ اُلٹا نبی کریم صلعم نے ان کا تعاقب اگلے دن حمراء الاسد تک کیا۔ اور پھر رعب کی وجہ سے ہی تھا کہ اگلے سال باوجود وعدہ کر جانے کے ابوسفیان مقابلہ کے لیے نہ نکلا۔ اور جنگ احزاب میں جب دس ہزار آدمیوں کو ساتھ لیکر آیا تب بھی راتوں رات یہ عظیم الشان لشکر جس کے سامنے مسلمانوں کی کوئی حقیقت نہ تھی بھاگ اُٹھا۔ اور پھر اس کے بعد تو ایسے مرعوب ہوئے کہ نہ صرف خود ان کے حملوں کا انقطاع ہو گیا بلکہ جب آٹھویں سال ہجرت میں نبی کریم صلعم نے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے دس ہزار صحابہ کے ساتھ چڑھائی کی تو وہ کچھ بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ غرض ایک چھوٹی سی جماعت کے سامنے سارے ملک کا عاجز آجانا اسی رُعب خداوندی کی وجہ سے تھا۔

آنحضرت ؐ کا رعب آپ کی خصوصیات میں سے ہے: کئی صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے اپنی جو خصوصیات دیگر انبیاء پر بیان کی ہیں اُن میں آپ کے رعب کا دیا جانا بھی ہے۔ چنانچہ یہ حدیث متفق علیہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نُصِرْتُ بالرعب مَسِیرَةَ شَهْرٍ میری امداد ایک مہینہ کی مسافت کے برابر رُعب سے کی گئی ہے اور یہ رعب کوئی فرضی بات نہیں۔ نبی کریم صلعم کی زندگی آپ کے بعد صحابہ کی زندگی اور ایک مدّت تک مسلمانوں کی حالت اس کا کھلا کھلا نقشہ پیش کرتی ہے حتّٰی کہ آج سے ایک صدی پیشتر تک یورپ کی عورتیں اپنے بچوں کو ترکوں کے نام سے ڈراتی تھیں گو وہ ان سے میسرت شہر کے فاصلہ سے بھی زیادہ دور رہتے۔ اور آج مسلمانوں کی اس گئی گذری حالت میں بھی اکثر عیسائی مدبرین کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح کمزور کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کی قوت سے ڈرتے ہیں۔ کہیں پین اسلامزم کا ایک فرضی بت بنا کر اس سے یورپ خائف ہو رہا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی سیاسی طاقت جو کچھ ہے اس سے اتنی بڑی عظیم الشان سلطنتوں کا خائف ہونا جو کروڑوں کی تعداد میں افواج رکھتی ہیں اور جن کے آہن پوشوں ان کے ہوائی جہازوں کی سترہ انچ دہانوں کی توپوں کے سامنے مسلمان بالکل نہتے ہیں ایک مضحکہ انگیز خیال ہے۔ ایسا ہی حالانکہ مسلمان اپنے دین کی اشاعت کی طرف سے بالکل غافل ہیں اور قریباً ایک مردگی کی حالت کو پہنچے ہوئے ہیں مگر عیسائی مشنوں کو اگر کسی مذہب کا خوف ہے تو وہ اسلام ہے۔ یہ رعب حق ہے اور یہ اسی طرح رہے گا کیونکہ مخبر صادق کے الفاظ غلط نہیں ہو سکتے اور خدائی وعدہ جھوٹ نہیں ہو سکتا۔

اس رعب کی وجہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرما دی ہے بما اشرکوا باللہ اِس لیے کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ مشرک بزدل اور کمزور ہوتا ہے کیونکہ جو شخص ادنٰے سے ادنٰے طاقت کے سامنے سر جھکا دینے کو تیار ہے حتّٰی کہ باد و باران کی اور دوسری ارضی و سماوی طاقتیں تو ایک طرف رہیں بیجان چیزوں جیسے پتھروں اور بتوں اور مردہ انسانوں کو بھی اپنا خدا سمجھ کر ان کی عبادت کرتا اور ان سے دعائیں کرتا ہے اس کا دل کمزور ہو جاتا ہے برخلاف اس کے ایک خدا پر ایمان رکھنے والا موحد مسلمان ایک اللہ تعالیٰ کی طاقت کو ہی اپنے اوپر سمجھتا ہے۔ باقی سارے عالم کی طاقتوں کو وہ اپنے نیچے سمجھتا ہے اس لیے چونکہ حقیقی طور پر کسی چیز سے اس کا دل خائف نہیں ہوتا وہ قوی القلب ہوتا ہے اور ساری دنیا کی مخالفت کی بھی اسے کچھ پروا نہیں ہوتی۔

ع ۵۳۸ تحسون۔ حس سے ہے حاسّة اس قوت کا نام ہے جس کے ساتھ اعراض حسیہ کا ادراک ہوتا ہے۔ مفردات میں ہے کہ اَحَسَّ کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک قوت حاسہ کے ساتھ ایک چیز کو پالینا دیکھو ۴۴۰ اور دوسرا کسی چیز کے حاسہ کو لے لینا جس سے اس کا قتل مراد ہے اس لیے حَسَسْتُہٗ کے معنی قتلتہ آتے ہیں اور حَسِیس قتیل کو کہتے ہیں۔

ابتدائے جنگ میں کفار کا شکست کھا جانا اور وعدہ نصرت الٰہی کا پورا ہونا۔ یہاں سے جنگ اُحد کے واقعات کا ذکر پھر شروع ہوتا ہے۔ تیرھویں رکوع کی ابتدا میں کہا تھا و اذ غدوت من اھلك تبوئ المؤمنین مقاعد للقتال دوسرا واقعہ دیں فرمایا تھا اذ ھمت طائفتان منکم ان تفشلا تیسرا واقعہ تھا

الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا
تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ
يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ

حکم میں جھگڑا کیا اور نافرمانی کی اس کے بعد کہ جو کچھ تم پسند کرتے تھے
تم کو دکھا دیا ۵۳۹ تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور کچھ تم میں
سے وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے ۵۴۰ پھر تم کو ان سے ہٹا

اذ تقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثة الاف من الملئکة منزلین اس کے بعد اب چوتھے واقعہ کا ذکر فرماتا ہے ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونھم باذنہ اور درمیان میں وعظ و نصیحت کو بیان کیا ہے اور مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرنے کا سامان اور کامیابی کی راہیں بتائی ہیں اور یوں ملائکہ کی نصرت کے وعدہ کے بعد گویا اب فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ وعدہ سچا بھی کر دکھایا۔ اور اصل غرض کو اذ تحسونھم میں بیان کیا ہے یعنی تم نے ان کو قتل کرنا شروع کیا۔ لیکن باوجودیکہ صاف فرمایا کہ تین ہزار ملائکہ سے تمہاری نصرت کریں گے اور پھر صاف فرمایا کہ وہ وعدہ بھی ہم نے سچ کر دکھایا یعنی ملائکہ کو نازل بھی فرما دیا۔ مگر کس طرح ہوا اذ تحسونھم باذنہ جب اللہ تعالیٰ کے خاص ارادہ سے تم نے انھیں قتل کرنا شروع کیا۔ یہ نہیں کہ ملائکہ نے انھیں قتل کرنا شروع کیا بلکہ تم مسلمانوں نے قتل کرنا شروع کیا۔ گویا ملائکہ صرف معاون ہیں یا کفار کے دلوں میں رعب ڈالنے والے ہیں جیسا سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب سے ظاہر ہے اور جنگ کرنے والے کافروں کو قتل کرنے والے مسلمان ہیں۔

مسلمانوں کا کافروں کو قتل کرنا اور یہاں تک قتل کرنا کہ وہ میدان جنگ سے بھاگ اٹھے تاریخی واقعات ہیں کفار کے لشکر کو مسلمانوں نے یہاں تک تہ تیغ کیا کہ اُن کا صاحب لواء مارا گیا، بلکہ نو آدمی جن کے ہاتھ میں یکے بعد دیگرے جھنڈا آیا سب مارے گئے اور یہ بھی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اس قدر لوگ زخمی ہو گئے تھے کہ آخر سواریوں کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کو پیٹھوں پر اٹھا کر لے گئے اور کثرت سے زخمی ہو جانے کی وجہ سے ہی ان کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ باوجود مسلمانوں کے منتشر ہو جانے کے ان کا استیصال کر سکتے یا ان کو قید ہی کر لیتے اور یہ جو بعض عیسائی مورخوں نے لکھ دیا ہے کہ فی الحقیقت کوئی شکست کفار کو نہ ہوئی تھی بلکہ یہ ان کی ایک چال تھی۔ کوئی واقعہ جنگ کا اس کی تائید نہیں کرتا۔ جن کی تباہی کے لیے اس قدر سامان کر کے آئے ہوں ان کا اسی طرح میدان جنگ میں چھوڑ کر چلے جانا صاف بتاتا ہے کہ یہ چال کوئی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی غلطی سے خالد نے ایک فائدہ اٹھایا۔ اور صحیح روایات سے ثابت ہے کہ فی الواقع ان کا لشکر ہزیمت اٹھا چکا تھا اور قرآن کریم نے یہ صاف دعویٰ کیا ہے۔

ع ۵۳۹ تنازعتم - نزع کے معنی ہیں ایک چیز کو اس کی جائے قرار سے کھینچ لیا اور اعراض پر بھی استعمال ہوتا ہے جیسے دل سے محبت یا عداوت کے نکال دینے پر ونزعنا ما فی صدورھم من غل (الاعراف ۴۳) اور سلب یا ایک چیز کے لے لینے پر بھی استعمال ہوتا ہے جیسے تنزع الملک ممن تشاء (ال عمران ۲۵) اور تنازع اور منازعۃ کے معنی ہیں ایک دوسرے کو کھینچنا اور مراد اس سے مخاصمت اور مجادلہ ہے یعنی ایک دوسرے سے جھگڑنا (غ) گویا ہر جھگڑنے والا دوسرے کو اپنی جگہ سے کھینچتا ہے۔

یہ جنگ کی پانچویں حالت کا ذکر ہے۔ فشلتم اور تنازعتم اور عصیتم سب میں اصل ذکر صرف تیر اندازوں کے گروہ کا ہے گو بظاہر مخاطب سب نظر آتے ہیں قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ جب قوم کے بعض افراد کے کسی کام کا اثر کل قوم پر پڑے تو وہ کل قوم کا ہی ذکر کرتا ہے۔ جو کچھ تیر اندازوں نے کیا اس کا خمیازہ سارے مسلمانوں کو اٹھانا پڑا اس لیے سب کو ہی مخاطب کر لیا ہے۔

تیر اندازوں کی پہلی حالت کو فشلتم سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی تم میں بزدلی ظاہر ہوئی۔ یہ بزدلی دشمن کے مقابلہ کے معاملہ میں نہ تھی بلکہ جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے مال غنیمت کے خیال کے سامنے رسول اللہ صلعم کے حکم کی نافرمانی تھی۔ یہ درحقیقت بڑی بزدلی تھی کہ تھوڑے سے دنیوی فائدہ کے سامنے دل کمزور ثابت ہوا۔ پھر ان کی دوسری حالت کو تنازعتم فی الامر سے تعبیر کیا ہے۔ امر سے مراد نبی کریم صلعم کا امر ہے۔ جس میں آپ نے صاف طور پر فرمایا تھا لا تبرحوا ان رایتمونا ظھرنا علیھم فلا تبرحوا وان رایتموھم ظھروا علینا فلا تعینونا (بخاری) تم نے اپنی جگہ نہیں چھوڑنا اگر تم دیکھو کہ ہم ان پر غالب آ گئے ہیں تو اپنی جگہ نہ چھوڑو اور اگر دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ گئے ہیں تو تم ہماری مدد کے لیے نہ آؤ۔ اور تنازع یوں واقع ہوا کہ جب تیر اندازوں نے دیکھا کہ دشمن بھاگ گیا یہاں تک کہ ان کی عورتیں پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا کر بھاگیں جیسا کہ شدت کے وقت کی حالت ہوتی ہے تو تیر اندازوں نے کہنا شروع کیا الغنیمۃ الغنیمۃ۔ ان کے امیر نے انہیں سمجھایا کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو یہ حکم دیا ہے مگر اس وقت تھوڑے سے لالچ نے حکم کی تاویل کرا دی پچاس تیر اندازوں میں سے چالیس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ پس یہ تنازع بھی باہم تیر اندازوں کا تھا اور کوئی تنازع قطعاً ثابت نہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات تیر اندازوں کے متعلق ہیں۔ تیسری حالت ان کی یہ ہے کہ وہ نافرمانی کے مرتکب ہو گئے یعنی اپنی جگہ کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ نافرمانی کرنے والے صرف چالیس آدمی تھے۔ مگر یہاں بھی سب کے متعلق ہی فرمایا عصیتم تم نے نافرمانی کی کیونکہ ان کی نافرمانی کا اثر سب پر پڑا۔

ع ۵۴۰ مال غنیمت کے حصول کو غرض بنانا خلاف تعلیم قرآنی ہے: ان الفاظ میں انہی تیر اندازوں کے دو گروہوں کا ذکر صاف الفاظ میں ہے من یرید الدنیا وہ گروہ ہے جو مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ گیا اور حکم کی نافرمانی کی اور من یرید الاخرۃ میں عبداللہ بن جبیر اور ان کے وہ ساتھی داخل ہیں جنہوں نے اپنی جگہ کو نہیں چھوڑا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مال غنیمت کو لینا گو اسلام نے جائز رکھا ہے مگر اس کو حاصل کرنے کی غرض کو مدنظر

لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ	دیا تا کہ تمھیں امتحان میں ڈالے [541] اور یقیناً اس نے تمہیں معاف کر دیا
فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾	اور اللہ مومنوں پر فضل والا ہے [542]
اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ	جب تم دور نکلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف التفات نہ کرتے
يَدْعُوْكُمْ فِيْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ	تھے اور رسول تمھیں تمھارے پیچھے بلاتا تھا [543]۔ پھر تم کو ایک غم کے

رکھنے والوں کو یرید الدنیا کا خطاب دیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو اسلام پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس کی جنگیں مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لیے تھیں۔ ایسی غرض کو قرآن کریم صریح الفاظ میں ایک گرا ہوا خیال قرار دیتا ہے اور جن لوگوں کے دل میں کبھی ایسا خیال آیا ان کو کیسے سخت الفاظ میں سرزنش کی ہے۔

۵۴۱ صحابہ کی جانفشانی اور شجاعت کا اظہار: یہ جنگ کی چھٹی حالت ہے جب تیر اندازوں میں جھگڑا ہوا اور ان کا کثیر حصہ نافرمانی کا مرتکب ہوا۔ تو پہلا نقشہ اذ تحسونھم باذنہ کا یعنی مسلمانوں کے کافروں کو قتل کرنے کا بدل گیا اور مسلمانوں کو اللہ تعالٰے نے کفار سے ہٹا دیا۔ یعنی پہلے کافر بھاگ رہے تھے اور مسلمان ان کو مار رہے تھے۔ اب مسلمان بھاگ رہے ہیں اور کافر ان کو مار رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف ہٹانا منسوب کیا ہے نہ اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے زبردستی مسلمانوں کو پکڑ کر ہٹا دیا تھا بلکہ اس لیے کہ جب ایک گروہ نے غلطی کی اور اس غلطی کا خمیازہ بموجب قانون الٰہی ساری قوم کو بھگتنا پڑا تو چونکہ یہ ایک غلطی کی سزا تھی جو اللہ تعالیٰ نے دی اس لیے اس کا فاعل اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ مگر یہ سزا ایک رحمت کے رنگ میں تھی اور اس کی اصل غرض جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے یہ تھی کہ تا جن لوگوں کے اندر کوئی کمالات ہیں ان کا اظہار ہو جائے اور جن کے اندر کچھ کمزوری ہے یا جن کے اندر کچھ خباثت ہے ان کی کمزوری یا خباثت ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ جانفشانی جوانمردی شجاعت اور ہمت کا اظہار جو کچھ صحابہؓ نے اس میدان میں کیا اس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ باوجود اس خبر کے کہ محمد رسول اللہ صلعم قتل ہو گئے وہ دشمن کے مقابلہ سے رکے نہیں اور قتال میں مصروف رہے رسول اللہ صلعم پر ابن قمؔہ حملہ کرنے لگا ہے تو مصعبؓ بن عمیر صرف رسول اللہ کو بچانے کے لیے اپنا سر کٹوا لیتے ہیں ایک شخص تلوار کا وار آنحضرت صلعم پر کرتا ہے تو طلحہؓ اپنا ہاتھ آگے کر کے کٹوا لیتے ہیں اور نبی کریم صلعم کو بچا لیتے ہیں۔ صحابہ ایک آہنی دیوار سے زیادہ مضبوط دیوار کی طرح نبی کریم صلعم کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اس آہنی دیوار میں سے جب ایک شخص گرتا ہے تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے اور دشمن اپنی سخت سے سخت کوششوں کے باوجود نبی کریم صلعم تک جن کا قتل کرنا اس کا اصل مقصد تھا پہنچنے میں ناکام رہتا ہے۔ ابو دجانہ دشمن کی طرف پیٹھ کر کے رسول اللہ صلعم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں ان کے مقابل پر پانچ یا دس آدمیوں کے بھاگ جانے پر کیا سات سو صحابہ پر بزدلی کا الزام کوئی عقلمند دے سکتا ہے البتہ خبیث طبع منافقین اور یہودیوں کی خباثت اس سے ظاہر ہو گئی۔

۵۴۲ ولقد عفا عنکم تم کو معاف کر دیا۔ یعنی غلطی تو ایسی خطرناک تھی کہ معمولی حالات میں ایک قوم کے استیصال کے لیے کافی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ چونکہ مومنوں پر فضل کرتا ہے اس لیے اس نے اس غلطی کی پوری سزا تم پر وارد نہیں کی بلکہ عفو سے کام لیا اور تم کو استیصال سے بچا لیا۔ یہاں عفو عن الاستئصال مراد ہے (ر) اور اگر عفو گناہ مراد ہے۔ تو یہاں تیر اندازوں کی نافرمانی پر عفو کا ذکر ہے اور دوبارہ جو آیت ۱۵۴ میں ولقد عفا اللہ عنھم آتا ہے تو وہ بھاگنے والوں سے عفو کرنا ہے۔

ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے بڑے بھاری گناہوں کو جن کو کبیرہ گناہ کہنا چاہیئے۔ انسان کی بعض دوسری خوبیوں کی وجہ سے بلا توبہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی صفات میں دوسری جگہ آتا ہے۔ غافر الذنب وقابل التوب (المؤمن ۴۰: ۳) (بغیر توبہ) گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا۔

۵۴۳ تصعدون۔ صعد سے ہے اور صُعُود کے معنی ہیں بلند مکان میں جانا (غ) اور اصعاد (جس سے یہاں تصعدون آیا ہے) زمین میں دور نکل جانا ہے خواہ اوپر کی طرف جا رہا ہو یا نیچے کی طرف (غ) گو اس کا اصل صعُود سے ہی ہے۔ یعنی بلند مقامات کی طرف جانے سے لیکن پھر صرف دُور نکل جانے پر اس کا استعمال ہُوا ہے۔ گو اس میں صعود یعنی اوپر چڑھنے کا اعتبار نہ ہو۔ امام راغب نے اسی کو صحیح تسلیم کیا ہے اور اس کی مثال انہوں نے تعالَ سے دی ہے جس کی اصل علو سے ہے مگر اب اس کے معنی محض آنا ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اصعاد سے مراد ابعاد فی الارض نہیں۔ بلکہ اس سے اشارہ کیا ہے کہ جس بات کا انہوں نے قصد کیا اور جس کی طرف گئے اس میں انہوں نے علو اختیار کیا یعنی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ (غ)

تلوون۔ لوی کے اصل معنی فتل حبل یعنی رسّہ کا بٹنا ہے مگر لَوَیْتُ علیہ کے معنی ہیں عَطَفْتُ (ل) میں اس کی طرف مڑا اور حدیث میں آتا ہے لایلوی احدٌ علیٰ احدٍ جس کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں اس کی طرف التفات نہیں کرتا تھا اور نہ اس کی طرف پھر کر دیکھتا تھا۔

آنحضرت صلعم کی شجاعت: فی اخرٰکم سے مراد یا تو فی جماعتکم الاخری ہے یعنی تمہاری پچھلی جماعت میں گویا ایک جماعت آگے نکل گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گروہ میں پیچھے رہ گئے تھے اور یا اس سے مراد فی ورائکم ہے یعنی تمہاری پچھلی طرف کیونکہ جاء فلان فی اُخرالناس و اخراھم کے معنی ہوتے ہیں جاء خلفھم ان کے پیچھے آیا۔

لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ
وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾
ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً

بدلے (دوسرا) غم دے دیا، تاکہ تم اس پر غمگین نہ ہو جو تم سے جاتا
رہا اور نہ اس (مصیبت) پر جو تمہیں پہنچی اور اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔ [۵۴۴]
پھر غم کے بعد تم پر امن نازل کیا (یعنی) اونگھ جس نے تم میں سے ایک گروہ

یہ جنگ کا ساتواں مرحلہ تھا کہ جب مسلمان دشمن کی زد میں آکر بھاگ اُٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اجتماع کے لیے بلا رہے تھے اور بآواز بلند کہہ رہے تھے الیّ عباداللہ الیّ عباداللہ انا رسول اللہ۔ اے اللہ کے بندو! میری طرف آجاؤ میں اللہ کا رسول ہوں۔ ایسے خطرناک موقعہ پر اپنے آپ کو آگے بڑھانا اور دشمن کے حملہ کی زد میں لانا نبی کریم صلعم کی کمال شجاعت کو دکھاتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو اللہ کی نصرت پر کس قدر بھروسہ تھا کہ میدانِ جنگ میں دشمن کے غلبہ کے وقت آپ سب سے آگے ہوتے اور گویا دشمن کو اپنے اوپر حملہ کرنے کے لیے بلاتے ہیں۔ یہی نقشہ آپ کی قوتِ قلبی کا میدان حنین میں نظر آتا ہے۔ جب مسلمانوں کی جمعیت دشمن کی تیر اندازی کی وجہ سے پریشان ہو گئی اور لوگ بالکل تاب مقابلہ نہ لاکر منتشر ہوئے ہوئے بھاگ رہے تھے تو اُس وقت آپ دشمن کی صفوں کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھ رہے تھے انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب۔ میں نبی ہوں کوئی جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ احد کے میدان میں منتشر فوج کو جمع کرنے کے لیے آپ نے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ اور اس طرح یہ نمونہ دکھایا کہ ایک جرنیل کو میدان جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو کس طرح آگے کرنا چاہیئے اور اپنے سپاہیوں کو یہ دکھانا چاہیئے کہ وہ اپنی جان کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی آواز کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے آپ کے گرد جمع ہونا شروع کیا اور ان کی منتشر جمعیت مجتمع ہوگئی۔

۵۴۴ اثابکم۔ اثاب کے معنی اصل میں جزا دینا یا ایک فعل کے نتیجہ کا لوٹا کر لانا ہے دیکھو ع ۱۳۱ مگر بعض وقت صرف دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسے اثابہ اللہ ثوابہ میں اثابہ کے معنی صرف اعطاہ ہیں (ل) یعنی اس کو دیا اور ثواب چونکہ خیر اور شر دونوں میں استعمال ہوتا ہے اس لیے غلطی کی سزا پر بھی اثابہ بولا جاسکتا ہے۔

غمًا۔ غمّ کے اصل معنی ستر الشئی ہیں کسی چیز کا ڈھانک لینا اسی لیے غمام بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سورج کی روشنی کو ڈھانک لیتا ہے اور غم کو غم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لذت و سرور کو ڈھانک لیتا ہے۔

بغم۔ ب مصاحبت کے لیے ہے اور معنی یوں ہوں گے کہ تمہاری غلطی کی سزا میں ایک غم کے ساتھ دوسرا غم دیا اور یا معاوضہ کے لیے ہے اور معنی یوں ہونگے کہ ایک غم کے بدلے دوسرا غم دیا، پہلا غم تو یہ تھا کہ ان کے ہاتھ سے شکست خوردہ دشمن نکل گیا اور مسلمان مارے گئے اور زخمی ہوئے اور دوسرا غم یہ تھا کہ دشمن کا حملہ الیّ عباداللہ کہنے پر نبی کریم صلعم پر ہو کر آپ کو سخت زخم لگے اور قریب تھا کہ آپ کو شہید کر دیا جاتا بلکہ جھوٹ طور پر آپ کے قتل کی افواہ بھی اُڑائی گئی۔

مافاتکم۔ فوت کسی چیز کا انسان سے اس طرح دور ہو جانا ہے کہ اس کا پانا محال ہو جائے پس مافاتکم سے مراد وہ فوائد ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتے رہے اور وہ فتح کے ثمرات تھے مال غنیمت کا ہاتھ آنا دشمن کا قید کرنا وغیرہ۔

مااصابکم۔ مسلمانوں کی اپنی مصیبت اور ان کا زخمی ہونا اور مارا جانا ہے۔

ان الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک غم کی جگہ یا ایک غم کے ساتھ دوسرا غم تم کو دیدیا تاکہ تم غم نہ کرو نہ اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور نہ اس پر جو تم کو مصیبت پہنچی۔ یہ جنگ اُحد کا آٹھواں مرحلہ ہے۔

صحابہؓ کی محبت آنحضرت صلعم سے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر دشمن نے اپنے حملہ کا پورا زور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالا۔ اور قبل اسکے کہ صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہو سکیں، آپ کو سخت زخم پہنچے، یہاں تک کہ آپ گر گئے۔ ادھر اس آواز نے منتشر ہوئے ہوئے مسلمانوں کو اکٹھا کر دیا۔ مسلمانوں کو پہلا غم تو یہ تھا کہ دشمن ان کے تعاقب سے بچ گیا اور اُلٹا ان کو مصیبت پہنچی مگر اب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کو دیکھا تو وہ اپنا غم بھول گئے اور اس کی جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ دوسرا غم دیدیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ تا جو غنیمت تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور دشمن بچ کر چلا گیا اس پر تم کو افسوس نہ رہے اور نہ ہی جو دکھ اور مصیبتیں تم کو پہنچیں ان پر کچھ افسوس ہو کیونکہ رسول اللہ صلعم سے جو محبت مسلمانوں کو تھی وہ ایسی شدید تھی کہ آپ کی تکلیف کو دیکھتے ہی اُنہیں اپنے سب غم بھول گئے۔ وہاں میدانِ جنگ میں تو مرد تھے جو رسول اللہ صلعم کو ادنیٰ تکلیف سے بچانے کے لیے اپنی گردنیں کٹوانے کو تیار تھے بلکہ اسی میں راحت پاتے تھے۔ مدینہ میں عورتوں نے اپنے رشتہ داروں اور بیٹوں بھائیوں وغیرہ کی شہادت پر افسوس نہیں کیا جب ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلعم زندہ ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک واقعہ ایک بی بی کا لکھا ہے کہ اسے خبر دی گئی کہ اس کا باپ اور اس کا بیٹا اور اس کا خاوند جنگ میں شہید ہو گئے تو اس نے دریافت کیا کیا رسول اللہ صلعم تو زندہ ہیں؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ تو اس نے کہا کلّ مصیبۃ بعدک جلل۔ آپ کے بعد ہر ایک مصیبت ایک حقیر شے ہے۔ یہ وہ محبت تھی جو رسول اللہ صلعم کے ساتھ صحابہؓ مرد اور عورتوں کو تھی۔ اور درحقیقت صحابہؓ کی محبت کا نقشہ ہی اس حدیث میں کھینچا گیا ہے لا یؤمن احدکم حتّٰی اکون احبّ الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین تم میں سے کوئی ایمان نہیں لاتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اس کے بیٹے اور

نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ
أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ
الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا
مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهٗ
لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ
لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ
مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ
لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلٰى
مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ
وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

کو ڈھانک لیا[545] اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی فکر پڑ رہی تھی، وہ اللہ پر ناحق بدگمانی جاہلیت کی سی بدگمانی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کیا ہمارا بھی کچھ اختیار ہے۔ کہہ اختیار تو سب کا سب اللہ کا ہی ہے[546]۔ وہ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپاتے ہیں جو تجھ پر ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں اگر ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے ۔ کہہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو جن کے لیے قتل ہونا لکھا جا چکا تھا وہ ضرور اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے اور تا کہ اللہ اُسے ظاہر کر دے جو تمہارے سینوں میں ہے اور اسے خالص کر دے جو تمہارے دلوں میں ہے

سارے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ اس کامل ایمان کا نقشہ صحابہ کی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتا ہے۔

نبی کریم صلعم کا تنہا یا نو یا سات آدمیوں کے ساتھ رہ جانا احادیث سے ثابت ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سب لوگ بھاگ گئے تھے بلکہ نبی کریم صلعم ایک طرف اکیلے رہ گئے اور فوج منتشر حالت میں تھی اور اسی حالت میں نبی کریم صلعم پر سخت حملہ ہُوا یہاں تک کہ سات آدمی انصار میں سے یکے بعد دیگرے آپ کی حفاظت میں جنگ کرتے ہوئے مارے گئے اور حضرت طلحہؓ کے جسم پر ستر سے زیادہ زخم آئے اور ان کی انگلیاں بھی کٹ گئیں۔ اور آخر میں جب ابی بن خلف نے نبی کریم پر حملہ کیا تو آپ نے اپنا نیزہ اُسے مارا اور ساتھ ہی یہ لفظ بھی فرمائے اشتدّ غضب اللّٰہ علٰی من قتلہ رسول اللّٰہ صلعم بیدہ فی سبیل اللّٰہ۔ اللہ کا سخت غضب اس شخص پر ہے جس کو رسول اللہ صلعم نے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں قتل کیا۔ اور کسی جنگ میں آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا۔

ع۵۴۵ امنۃ۔ امن کی طرح مصدر ہے اور ترکیب میں انزل کا مفعول ہے۔

نعاسا۔ نعاس تھوڑی نیند کو کہتے ہیں جیسے اونگھ اور ایک قول یہ بھی ہے عبارۃ عن السُّکُوْنِ وَالْھُدُوْءِ (غ) یعنی اس سے مراد سکون اور اطمینان ہے۔ یہاں نعاساً امنۃ سے بدل واقع ہُوا ہے۔

یہ جنگ احد کا نواں مرحلہ ہے۔ مسلمان آنحضرت صلعم کے گرد جمع ہو گئے اور کفار اُن کے انتشار کو پھر اجتماع کے رنگ میں دیکھ کر میدانِ جنگ چھوڑ گئے اور مسلمان اسی میدان میں رہے اور دشمن کی طرف سے ایسے مطمئن ہوئے کہ بعض کو نیند آ گئی یا کامل سکون کی حالت وارد ہو گئی۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے گو تکلیف اُٹھائی مگر شکست نہیں کھائی۔ کیونکہ میدانِ جنگ میں وہ موجود رہے اور ایسے اطمینان کی حالت میں تھے اور دشمن کی طرف سے ایسے بےخوف کہ بعض کو نیند بھی آ گئی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر دشمن کی طرف سے کچھ خوف و خطر ہوتا تو نیند نہ آ سکتی تھی۔ بعض احادیث میں جو یہ لفظ آتے ہیں کہ راوی کہتا ہے میدان جنگ میں مجھے اس قدر نیند آئی کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ پڑتی تھی۔ اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ جب مجھے اونگھ آ رہی تھی تو مَیں نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سُنا۔ لو کان لنا من الامر شیئ ما قتلنا ھٰھُنا اور مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ مَیں خواب میں سُن رہا ہوں (ث) ظاہر ہے کہ یہ جنگ کا خاتمہ ہے۔

ع۵۴۶ اھمتھم۔ اھمت ھَمّ سے ہے جس کے معنی غم یا حزن ہیں۔ اور جب کوئی امر تمہیں قلق و حزن میں ڈالے تو کہا جاتا ہے اھمنی الامر (ل)

یظنون باللّٰہ غیر الحق۔ غیر الحق یا مصدر کے حکم میں ہے غیر ظن الحق۔ اور ظن الجاھلیۃ اس سے بدل ہے اور یا ظن الجاھلیۃ مصدر موکد ہے اور غیر الحق یظنون کی تاکید ہے۔

ظن الجاھلیۃ میں موصوف کی اضافت اس کی صفت کے مصدر کی طرف ہے اور مراد ہے ظن المختص بالجاھلیۃ یعنی الیسا ظن جو جاہلیت سے مخصوص ہے یا حذف مضاف پر مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے اور مراد ہے ظن اھل الجاھلیۃ یعنی اہل جاہلیت کا سا ظن۔ اہل جاہلیت سے مراد مشرک لوگ ہیں کیونکہ جاہلیت کا زمانہ قبل اسلام کا زمانہ ہے۔

الامر سے مراد یا تو معاملہ ہے...... یعنی اس معاملہ جنگ میں کچھ ہمارا دخل یا اختیار ہے اور یہی معنی میں نے اختیار کیے ہیں اور حکومت بھی بعض مفسرین

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾
اور اللہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔[۵۴۷]

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا ۚ
وہ لوگ جنہوں نے اس دن تم میں سے پیٹھ پھیر دی جس دن دو گروہ (جنگ میں) ملے شیطان نے ہی ان کی کسی کمائی کی وجہ سے ان کو پھسلانا چاہا اور یقیناً اللہ

ع وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۵۵﴾ ع
نے ان کو معاف کر دیا ہے اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔[۵۴۸]

نے مراد لی ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کیا وہ حکومت جس کا وعدہ محمد صلعم دیتے ہیں ہمیں مل سکتی ہے۔ یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ اُحد میں سخت تکلیف اُٹھانی پڑی۔

منافقوں کی چہ میگوئیاں: یہ گروہ جن کو اپنی ہی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی منافقین کا گروہ تھا جو عبداللہ بن ابی کے ساتھ جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ہی واپس ہو گیا تھا ان کو اسلام کی حفاظت سے بہت بڑھ کر اپنی فکر تھی کہ کہیں مارے نہ جائیں اس لیے وہ ساتھ شامل نہ ہوئے۔ یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاھلیۃ میں جس ظن کا ذکر ہے اس کی تصریح قرآن کریم نے خود دوسری جگہ فرما دی ہے جہاں منافقوں کے ایسے ہی ظنوں کا ذکر ہے بل ظننتم ان لن ینقلب الرسول والمومنون الی اھلیھم ابدا (الفتح ۴۸-۱۲) اُحد کی جنگ میں بھی منافقوں کو یہی خیال تھا کہ اتنے بڑے لشکر کے ہاتھ سے کھلے میدان میں مسلمان مارے جائیں گے۔ اب جو واقعات جنگ کی خبر ان کو پہنچی تو اور بھی باتیں بنانے لگے اور کچھ اپنے مشوروں کو اہمیت دینی شروع کی یقولون ھل لنا من الامر من شیء ہمارا بھی اس معاملہ میں کچھ اختیار ہوتا یعنی اگر ہماری بات مان لی جاتی تو یہ تکلیف پیش نہ آتی۔ عبداللہ بن ابی کا مشورہ یہ تھا کہ مدینہ میں ہی رہ کر جنگ کی جائے۔ اب اس نے اپنے اس مشورہ کے درست ہونے پر زور دینا شروع کیا کہ اگر میری بات مان لی جاتی تو یہ مصیبت کیوں پیش آتی اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یوں دیا ہے کہ سب اختیار اللہ کا ہی ہے۔ کیونکہ شوریٰ اسی کا حکم ہے اور شوریٰ پر عمل کر کے ہی نبی صلعم نے باہر نکلنے کا حکم دیا تھا۔ ایک تکلیف کے ڈر سے ایک اصول کو چھوڑنا درست نہیں۔ یہ وہ سبق ہے جو اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے اور یا مراد یہ ہے کہ جس حکومت میں سے تم کچھ حصہ چاہتے ہو وہ سب ہی اللہ تعالیٰ تمہیں دینے والا ہے۔

[۵۴۷] مضاجع۔ مضجع کی جمع ہے اور ضجع کے معنی لیٹ جانا یعنی اپنی کروٹ کو زمین کے ساتھ لگانا یا سو جانا ہیں۔ پس مضجع لیٹنے یا سونے کی جگہ ہے تتجافی جنوبھم عن المضاجع (السجدہ ۳۲-۱۶) میں سونے کی جگہ ہی مراد ہے۔

صحابہؓ کی جان نثاری پر قرآن کی شہادت: یہاں منافقوں کے دل میں جو خیال اٹھا اس کا ذکر کیا ہے اور اس کا جواب دیا ہے۔ فرمایا ان کے دل میں کچھ ہے جس کو ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں یعنی دل میں اگر ہمارا کچھ اختیار ہوتا یعنی ہماری بات مان لی جاتی یا معاملہ جنگ میں ہم کو اختیار دے دیا جاتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ ما قتلنا سے مراد ان کے بعض لوگوں کا قتل ہونا ہے۔ کیونکہ منافق ان لوگوں کے رشتہ دار ہی تھے جو میدان اُحد میں جنگ کر رہے تھے۔ ان کی ان بیہودہ گوئیوں کا یہ جواب دیا ہے کہ جن مسلمانوں نے جان نثاری کی ہے اور خدا کی راہ میں شہید ہو گئے ہیں وہ تو خدا کی راہ میں اس طرح جان دینے کو تیار تھے کہ مدینہ میں رہ کر جنگ ہوتی تو وہ کوئی اپنے گھروں میں چھپے نہ بیٹھے رہتے۔ بلکہ دشمن کے مقابلہ پر نکل کر جان نثاری کا سچا نمونہ دکھاتے لو کنتم فی بیوتکم سے مراد یہی ہے کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کرتے۔ ورنہ یوں تو منافق اپنے گھروں میں ہی رہے تھے۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ جو شہید ہوئے انہوں نے تو جان نثاری دکھائی اور خدا کی راہ میں اپنے آپ کو قربان کر دیا جنگ یہاں ہوتی یا وہاں وہ تو اسی طرح اپنے آپ کو قربان کر دیتے اور اگر کہنے والا گروہ ان لوگوں میں سے ہو جو جنگ میں شامل تھے مگر اُن کے دلوں میں کچھ کمزوری تھی تو مراد یہ ہوگی کہ اگر تم جنگ کے لیے نہ نکلتے تو تمہاری کمزوری کے سبب سچے مومن جنگ سے نہ رُک جاتے اور قتل کفار کے لیے ضرور باہر نکل آتے اور خدا کی راہ میں جانیں دیتے مگر جو کچھ ہُوا وہ بیفائدہ نہیں ہُوا۔

ولیبتلی اللہ ما فی صدورکم ولیمحص ما فی قلوبکم اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ بعض سینوں کے اندر مخفی تھا وہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا جن دلوں میں منافقت اور کھوٹ تھا ان کا کھوٹ ظاہر ہو گیا اور جن کے دلوں میں بعض کمزوریاں تھیں ان کی تمحیص کر دی گئی یعنی ان کی کمزوریاں دور کر دی گئیں۔

[۵۴۸] استزلھم۔ زلّ سے ہے ذَلّۃ اصل میں بلا قصد پاؤں کے پھسل جانے کو کہتے ہیں اور اِسْتَزَلَّہ کے معنی ہیں تَحَرّٰی زلّتہٗ (غ) یعنی اس کی زلّۃ کا قصد کیا۔ لفظ زلّۃ کو ان کی طرف منسوب کر کے بتایا کہ جو کچھ بھاگنے والوں سے ہوا وہ بلا قصد تھا ارادۃً وہ میدان جنگ کو چھوڑ کر نہیں بھاگے۔ مگر ببعض ما کسبوا میں بتا دیا کہ ان کا کچھ اپنا قصور بھی تھا۔ بعض مفسرین نے اس کو ان کی پہلی کسی غلطی پر لگایا ہے۔

جنگ احد میں بھاگنے والے: یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو جنگ میں شامل تو ہوئے مگر میدان جنگ سے بھاگ گئے کیونکہ منافق التقی الجمعٰن سے پہلے ہی واپس چلے گئے تھے۔ بھاگنے کے وجوہات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ جب تیر اندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے کفار کا ہزیمت خوردہ لشکر لوٹا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوا تو مسلمانوں کی فوج بوجہ تعاقب کے پراگندہ حالت میں تھی اور یکم تنہ ایک بڑی فوج کے حملہ کے سامنے وہ اپنی جمعیت کو قائم نہ رکھ سکے۔ اسی حالت میں نبی کریم صلعم نے آواز دے کر لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہا۔ مگر ایسی حالت میں سب کا جمع ہونا محال تھا۔ بعض لوگ بالکل علیحدہ ہو گئے اور ان کے لیے اصل جمعیت کے ساتھ ملنا مشکل ہو گیا۔ بعض ایسے لوگ میدان جنگ سے بھاگ گئے اور ان کے قدموں کو لغزش آ گئی۔ خواہ کچھ بھی واقعات ہوں۔ میدان جنگ سے بھاگنا اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کے لیے پسند نہ تھا۔ اگر وہ تھوڑی دیر اور

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کافر ہوئے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں جب وہ زمین میں سفر کرتے ہیں یا لڑائی کرتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے تاکہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں حسرت بنائے اور اللہ زندہ کرتا اور مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے ع۵۴۹

وہ ارادۃً نہیں بھاگے۔

ان بھاگنے والوں کی تعداد کس قدر تھی روایات میں عموماً قیاس سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیے بعض نے کہہ دیا ہے کہ فوج کی ایک تہائی بھاگ گئی تھی اور ایک تہائی مجروح ہو گئے تھے اور ایک تہائی نبی کریم صلعم کے ساتھ رہے۔ یہ بالبداہت غلط ہے کیونکہ سات سو کی کل جمعیت مسلمانوں کی تھی۔ اگر ان میں سے صرف دو سو آدمی نبی کریم صلعم کے ساتھ رہ گئے ہوتے، تو تین ہزار کفار کی فوج ان کو میدان جنگ پر قابض چھوڑ کر مکہ واپس نہ ہو جاتی۔ بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ چودہ یا تیرہ آدمی رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہ گئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد صرف وہ آدمی ہیں جو کفار کے دوبارہ حملہ کی ابتدا میں آنحضرت صلعم کے ساتھ رہ گئے تھے۔ کیونکہ سب لوگ تعاقب میں مصروف تھے۔ امام رازی جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہی درست معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں والذی تدل علیہ الاخبار فی الجملۃ ان نفرا منھم تولوا وابعدوا فمنھم من دخل المدینۃ ومنھم من ذھب الی سائر الجوانب واما الاکثرون فانھم نزلوا عند الجبل واجتمعوا ھناک یعنی مختلف روایتیں جس بات پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک نفر بھاگ گئے تھے اور دُور چلے گئے تھے اور عربی زبان میں نفر کا لفظ تین سے نو تک یا دس سے کم آدمیوں کے گروہ پر بولا جاتا ہے ان میں سے بعض مدینہ میں داخل ہوئے اور بعض دوسری اطراف میں بھاگ گئے۔ لیکن کثیر حصہ فوج کا پہاڑ کے پاس ہی رہا اور وہیں جمع ہو گئے۔ اور یہی قول قفال کا ہے جس نے ان کو نفرا قلیلا بھی کہا ہے (رغ)

بھاگنے والوں میں کون کون تھے۔ اکثر روایات میں صرف حضرت عثمانؓ کا اور ان کے ساتھ دو انصار سعد اور عقبہ کا نام پایا جاتا ہے کسی ایک آدھ ناقابل اعتبار روایت میں حضرت عمرؓ کا نام بھی ہے مگر وہ آنحضرتؐ کے ساتھ میدان جنگ میں تھے۔ چنانچہ صحیح حدیث بخاری کا حوالہ دیا جا چکا ہے جس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ میدان جنگ میں نبی کریم صلعم کے ساتھ موجود تھے بلکہ یہ بھی کہ آپ نے دشمن کے مقابلہ میں خاموش رہنا بھی گوارا نہیں کیا اور ابوسفیان کو جواب دیا کہ ہم سب تجھے ذلیل کرنے کے لیے خدا کے فضل سے موجود ہیں۔ ہاں حضرت عثمانؓ بھاگنے والوں میں سے تھے اور شیعہ اور خوارج نے یہ طعن آپ پر کیا ہے گو یہ طعن تعجب کی جگہ ہے جب اللہ خود فرماتا ہے ولقد عفا اللہ عنھم۔ جو کچھ بھی ان کا اس میں قصور تھا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابن عمرؓ کے سامنے اس طعن کا ذکر ہوا جو جواب آپ نے دیا وہی دوہرا دینا کافی ہے۔ اس جواب میں حضرت عثمانؓ کے بدر اور بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونے کی وجہ بھی درج ہیں۔

حضرت عثمانؓ پر طعن: عثمان بن مواہب سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا ایک شخص نے بیت اللہ کا حج کیا اس نے وہاں کئی لوگوں کو بیٹھے دیکھا اور پوچھا یہ کون لوگ بیٹھے ہوئے ہیں انہوں نے کہا قریش ہیں اس نے کہا یہ بوڑھا ان میں کون ہے انہوں نے کہا ابن عمرؓ۔ سو وہ شخص حضرت ابن عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا میں آپ سے کچھ سوال کرتا ہوں کیا آپ تبلائیں گے۔ چنانچہ اس نے کہا میں تم کو اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ عثمان بن عفان اُحد کے دن بھاگ گئے تھے۔ فرمایا ہاں۔ اس نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ وہ بدر کے دن غائب تھے اور اس میں شریک نہ تھے۔ فرمایا ہاں۔ کہا کیا تم جانتے ہو وہ بیعت رضوان سے پیچھے رہ گئے اور اس میں شریک نہیں ہوئے۔ فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا اللہ اکبر (گویا حضرت عثمان پر یہ مطاعن قائم کیے) ابن عمرؓ نے کہا آؤ میں تم بتاؤں اور جو کچھ تم نے پوچھا ہے اس کو کھول دوں۔ اُحد کے دن ان کا بھاگ جانا، سو میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے معاف کر دیا۔ اور بدر کے دن ان کا غیر حاضر ہونا۔ سو بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی صاحبزادی ان کے گھر میں تھیں اور وہ بیمار تھیں۔ سو نبی صلعم نے (ان کو تیمار داری کا حکم دیا اور) فرمایا کہ تم کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا ایک شخص کو جو اس جنگ میں شریک ہوگا اور ایک آدمی کا حصّہ بھی مال غنیمت سے ملیگا۔ اور آپ کا بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونا۔ سو بات یہ ہے کہ اگر عثمان سے زیادہ کوئی عزت اور شان والا مکہ میں ہوتا تو آنحضرت صلعم اسی کو مکہ والوں کی طرف بھیجتے سو آپ نے عثمان کو ہی بھیجا اور بیعت رضوان حضرت عثمان کے مکہ کو جانے کے بعد ہوئی۔ پس آنحضرت صلعم نے اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اسے عثمان کی بیعت قرار دیا۔ اب جا اور ان باتوں کو ساتھ لے جا یعنی یاد رکھ۔

ع۵۴۹ لاخوانھم۔ ل تعلیل کے لیے ہے۔ یعنی لاجل اخوانھم اپنے بھائیوں کی خاطر۔ یا بمعنی فی یعنی ان کی بابت۔

ضربوا فی الارض کے لیے دیکھو ع۸۸ یہاں مراد زمین میں سفر تجارت یا طلب معاش کے لیے ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیے جاؤ یا مرجاؤ تو اللہ کی مغفرت اور رحمت یقیناً اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

اور اگر تم مرجاؤ یا قتل کیے جاؤ تو یقیناً اللہ کی طرف ہی اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ع۵۵۰

انتظار کرتے تو اصل جمعیت کے ساتھ مل جاتے۔ ہر ایک کمزوری کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے شیطان کی طرف ہی منسوب کیا ہے مگر ساتھ ہی اس کو زلت کہہ کر بتا دیا کہ

غُزًّی۔ غاز کی جمع ہے جو غزا سے ہے اور غزوہ کے معنی ہیں دشمن کی جنگ کے لیے نکلنا (غ) غاز کے جو معنی مشہور ہیں کہ جو شخص کسی غیر مسلم کو قتل کر دے یا اس کے قتل کے لیے نکلے یہ صحیح نہیں بلکہ غازی وہ ہے جو دشمن کی جنگ کے لیے نکلے۔

لیجعل اللہ ذٰلک حسرۃ۔ لام عاقبت ہے یعنی ان کا ایسی باتیں کرنے کا نتیجہ سوائے حسرت کے کچھ نہیں۔ اور یا یہ لام لا تکونوا کالذین کفروا کے متعلق ہے۔ یعنی تمہارا ان جیسے نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ کافروں کے دلوں میں ایک حسرت رہے گی کہ یہ ہم سے کس طرح بڑھ گئے۔

مسلمانوں کو موت سے خائف نہ ہونا چاہیئے: اس آیت میں الذین کفروا کون ہیں یا تو یہ لفظ عام ہیں اور واقعی کافر مراد ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ان کے بھائی بند جب تجارت کے لیے یا دشمن کے ساتھ جنگ کے لیے نکلتے اور مارے جاتے تو ان کو افسوس ہوتا کاش وہ باہر نہ نکلے ہوتے اور ہمارے پاس ہی رہتے، تو موت سے بچ جاتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ محض ایک حسرت ان کے دل میں رہ جاتی ہے جس کا فائدہ کچھ نہیں۔ کیونکہ ایسا کہنے سے کہ یوں کرتے تو ایسا ہوتا فائدہ کچھ نہیں۔ باقی رہی موت و حیات سو وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے نہ گھر میں بیٹھنے والے سب موت سے بچے رہتے ہیں نہ باہر نکلنے والے سب مرجاتے ہیں مسلمانوں کو منع کیا ہے کہ تم ایسے نہ ہو جاؤ، بلکہ زمین میں تجارت یا طلب معاش کے لیے سفر کرنے یا دشمن کی جنگ کے لیے نکلنے میں موت کا خوف کبھی تمہارے لیے روک نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ کمزوروں کی باتیں ہیں جس کام کا کرنا ضروری ہے، خواہ اس میں موت آئے اس کو کرنا چاہیئے۔ بات بات میں موت سے ڈرنے والے کمزور دل ہوتے ہوتے آخر نکمے ہو جاتے ہیں۔ آج یہی حالت کثیر حصہ مسلمانوں کی ہے کہ موت سے ڈرتے گھروں سے باہر نہیں نکلتے حالانکہ ذلت کی زندگی موت سے بدتر ہے اور واللہ یحیی و یمیت میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ حقیقی احیاء و اماتت سانس آنے یا نہ آنے کا نام نہیں بلکہ جو لوگ تجارتوں کے لیے طلب معاش کے لیے خدا کے دین کو پھیلانے کے لیے دشمن کی جنگ کے لیے موت کو قبول کر کے نکل پڑتے ہیں ان کو کامیابی کی زندگی دی جاتی ہے اور جو موت کے خوف سے چھپ کر گھروں کے اندر بیٹھ رہتے ہیں وہ جہالت اور ذلت کی موت میں رہتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے ان لم تقتلوا تموتوا والذی نفسی بیدہ لالف ضربۃ بالسیف اھون من موت علٰے فراش یعنی اگر تم قتل نہ کیے جاؤ گے تو مرجاؤ گے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تلوار کی ہزار ضرب بستر پر مرنے سے آسان تر ہے۔

اور یا الذین کفروا سے مراد منافق ہیں۔ منافقوں کو بعض جگہ الذین اٰمنوا میں داخل کیا گیا ہے اور بعض جگہ ان کو الذین کفروا سے یاد کیا گیا ہے اور اکثر اوقات ایک علیحدہ گروہ قرار دیا گیا ہے اور اگلی آیت میں ان کے متعلق ہے کہ وہ بہ نسبت ایمان کے کفر سے قریب تر ہیں اور کہیں آتا ہے اٰمنوا ثم کفروا ایمان بھی لاتے ہیں کفر بھی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظاہر میں ایمان لاتے اور دل میں کافر تھے۔ لیکن چونکہ شریعت کا تعلق ظاہر سے ہے اس لیے مسلمانوں کو ان سے مسلمانوں کی طرح ہی سلوک کرنے کا حکم تھا مگر غزوۂ تبوک کے بعد بحکم الٰہی نبی کریم صلعم نے چند آدمیوں کو مسجد سے نکال دیا کیونکہ انہوں نے اپنی اصلاح آخر تک نہ کی۔ اب مسلمان جو جنگ اُحد میں مقتول ہوئے (یا جو جب تجارت وغیرہ کے لیے نکلتے تو دشمن انہیں مار ڈالتے) تو ان کی نسبت منافقین نے یہ کہنا شروع کیا کہ اگر وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے یعنی جس طرح سے ہم جنگ سے واپس آ گئے تھے وہ بھی واپس آ جاتے تو مارے نہ جاتے اور اخوان ان کو اس لیے کہتے تھے کہ قرابت میں وہ ان کے بھائی بند ہی تھے۔

ع۵۵۰ آیت ۱۵۶ و ۱۵۷ کا مضمون ملتا جلتا ہے اور جو کچھ پچھلی آیت میں فرمایا تھا اسی کی تائید ہے یعنی موت سے انسان کو خائف نہیں ہونا چاہیئے، مگر دونوں آیتوں میں ایک باریک فرق نظر آتا ہے آیت ۱۵۶ میں فرمایا اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیے جاؤ یا مرجاؤ اور یہاں مرجانے سے مراد بھی اللہ کی راہ میں ہی مرجانا ہے کیونکہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہوا انسان قتل بھی ہو جاتا ہے اور مر بھی جاتا ہے اور گو قتل ہمیشہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں اور اکثر اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے معمولی موت سے ہی مرتے ہیں جیسا کہ صحابہؓ میں بھی گو بہتیرے قتل ہوئے مگر پھر بھی کثیر حصہ معمولی موت سے عالم جاودانی کی طرف انتقال کر گیا۔ تاہم خدا کی راہ میں قتل ہونا چونکہ ایک عظمت کا مقام ہے اور چونکہ منافق زیادہ تر اسی سے ڈرتے تھے اور کمزور دل کو بھی قتل کا ہی زیادہ خوف ہوتا ہے اس لیے یہاں قتل کو مقدم کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے قتل ہو جاؤ یا مرجاو، تو زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ دنیا کا مال و دولت جمع کرنے میں کمی رہ جائے گی۔ سو یہ مال و دولت جس کو انسان جمع کرتا ہے کیا چیز ہے۔ اس سے بہت بڑھ کر اللہ کی مغفرت اور رحمت ہے جس کو خدا کی راہ میں کام کرنے والا پاتا ہے اس لیے ممّا یجمعون کی نسبت کفار کی طرف کی ہے کیونکہ مال و دولت کے جمع کرنے پر گرا رہنا یہ دنیا پرست کا کام ہے جسکو آخرت پر ایمان نہ ہو۔ اور آیت ۱۵۷ میں ترتیب لفظی کو بدل دیا ہے اور فی سبیل اللہ کا لفظ

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ

سو اللہ کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم ہے۔ اور اگر تو سخت کلام، سخت دل ہوتا تو تیرے اِرد گرد سے بکھر جاتے ۵۵۱ پس ان کو معاف کر اور ان کے لیے بخشش مانگ اور معاملات میں اُن کا مشورہ لے۔ پھر جب پختہ ارادہ کر لے تو اللہ پر بھروسہ

بھی اُڑا دیا ہے تو اس میں یہ بتایا ہے کہ اگر خدا کی راہ میں کام نہ کرو گے تو پھر بھی تو آخر مرو گے اور کچھ نہ کچھ قتل بھی ہو گے تو آخر معاملہ تو اللہ سے ہی پڑنا ہے اور اسی کے حضور تمہیں اکٹھا کیا جانا ہے یہ مال و دولت تو بہر حال ساتھ نہیں جائے گا۔

۵۵۱ فبما۔ ما تو مزید تاکید کے لیے ہے اور یا استفہامیہ تعجب کے لیے ہے یعنی کس قدر رحمت الٰہی ہے جو تم ان کے لیے نرم ہو۔

لنت۔ لین خشونت کی ضد ہے اور ان کا استعمال اولاً اجسام میں ہی ہے۔ پھر اخلاق پر بھی یہ لفظ بولے جاتے ہیں۔

فظ۔ فظظ کلام میں خشونت کو کہتے ہیں۔ اور فَظّ سخت گو ہے یعنی کلام میں سختی کرنے والا (ل) اور فظّ کریہ الخُلُق کو بھی کہتے ہیں (غ) یعنی بدخو کو۔

غلیظ القلب۔ غِلْظَۃ اور خشونت کے ایک ہی معنی ہیں۔ فظ اور غلیظ القلب میں فرق یہ ہے فَظّ بدخلق ہے جو دوسروں سے بری طرح پیش آئے اور غلیظ القلب وہ سخت دل ہے جس کا دل دوسرے کی مصیبت سے متاثر نہ ہو اور دوسروں کے لیے اس کے دل میں رقت محبت اور ہمدردی پیدا نہ ہو گو وہ ان کے ساتھ سختی نہ کرے۔

انفضّوا۔ فض اصل میں کسی چیز کے توڑنے کو اور اس کے اجزا میں تفریق کرنے کو کہا جاتا ہے (غ) اور اسی سے انفضّ القوم استعارہ کے رنگ میں لیا گیا ہے۔ اور فضّ کے معنی ہیں لوگوں کے حلقہ کو ان کے اجتماع کے بعد پراگندہ کر دینا (ل) پس انفضوا کے معنی ہوئے اس طرح پراگندہ ہو گئے۔

آنحضرتؐ کی لینت: اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق لینت اور عفو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پچھلے رکوع کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا تھا کہ جو لوگ بھاگ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا اور درمیان میں ایک نصیحت کرتے ہوئے اب نبی کریم صلعم کے عفو کا ذکر فرمایا۔ لکھا ہے کہ جو لوگ اُحد کی جنگ میں بھاگے تھے ان کے ساتھ نبی کریم صلعم نے کسی طرح کی سختی نہیں کی نہ کسی کو درشت لفظ کہا بلکہ محبت بھرے کلام میں ان سے گفتگو کی۔ محبت سے صرف اتنے الفاظ فرمائے لقد ذھبتم فیھا عریضۃ تم تو بہت دور نکل گئے اور جب حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی بی بی کے سامنے حضرت عثمانؓ کے متعلق کچھ سخت لفظ کہے تو آنحضرت صلعم نے حضرت علیؓ کو روک دیا اور ان کی بات کو ناپسند کیا۔ سو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلعم کے خلق لینت کے کمال کو ظاہر فرمایا ہے۔ آنحضرتؐ کی ذات بابرکات میں ہر قسم کے اخلاق فاضلہ اعلیٰ سے اعلیٰ پایہ کے پائے جاتے تھے۔ جیسا کہ آیۃ کریمہ انک لعلی خلق عظیم (القلم ۶۸ - ۴) اس پر شاہد ہے۔ ان اخلاق کا ذکر قرآن کریم میں مختلف موقعوں پر آتا ہے۔ یہاں آپ کے خلق لینت کے کمال کو دکھایا گیا ہے۔

آپؐ کے اخلاق اور خُلقِ لینت کا کمال: ہر ایک خُلق کا اظہار کامل رنگ میں اس وقت ہوتا ہے جب اس کے اظہار کے مخالف موقعہ ہو۔ جنگ کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس میں نرمی کے اظہار کا موقعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کے اندر جس قدر شدت ہے اس کا اظہار جنگ میں پورے زور کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ جب اُن احکام کی تعمیل میں جو کسی فوج کو دیئے گئے ہوں فرو گذاشت ہو یا ان احکام کی تعمیل نہ ہو تو پھر قواعد جنگ اس امر کے مقتضی ہوتے ہیں کہ سخت سے سخت سزا دی جائے۔ پس یا اوّل تو موقعہ اظہار لینت کا نہیں بلکہ اظہار شدت کا تھا۔ دوسرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی جس کی وجہ سے اس قدر عظیم مصیبت آپ کو اور مسلمانوں کو برداشت کرنی پڑی۔ اور یہ موقعہ سخت سے سخت سزا کو چاہتا تھا۔ مگر اس موقعہ پر نا فرمانی کرنے والوں کو ایک حرف بھی ملامت کا نہ کہنا ظاہر کرتا ہے کہ نبی کریم صلعم میں کس قدر کمال خُلق لینت کا موجود تھا کہ سخت سے سخت حالات کے ماتحت بھی، ہاں ان حالات کے ماتحت بھی جو بظاہر خلق لینت کے اظہار کے منافی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے اندر اس خلق کا اظہار ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے تعریف کے موقعہ پر بیان فرمایا ہے۔ ورنہ آپ کے خُلق لینت کے تو بیشمار موقع تھے۔ دن رات خدام سے، بیبیوں سے، دوستوں سے، دشمنوں سے لینت کا برتاؤ آپ فرماتے تھے مگر یہ موقع اس خلق کے کمال کو دکھانے والا تھا۔

نبی کریم صلعم کی نرمی اور رحمت کے متعلق اور بھی بہت سی آیات قرآنی شاہد ہیں جیسا کہ فرمایا عزیز علیہ ما عنتم (التوبۃ ۹ - ۱۲۸) کوئی دُکھ تم کو پہنچے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے اور فرمایا واخفض جناحک للمؤمنین (الحجر ۱۵ - ۸۸) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا انا لکم مثل الوالد بلکہ والد سے بہت بڑھ کر شفقت اور محبت آپ کے دل میں بھری ہوئی تھی۔ نبی کریم صلعم کے اس خلق کے اظہار میں یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کے پیرو بھی اور بالخصوص وہ لوگ جو دوسروں کے لیے پیشرو یا سردار کے طور پر ہوتے ہیں وہ اس قسم کے اخلاق اپنے اندر پیدا کریں تو ہی جماعت قائم رہ سکتی ہے۔ ورنہ کوئی جماعت نہیں بن سکتی۔ چنانچہ اس کی طرف ایک حدیث میں اشارہ ہے لا حلم احب الی اللہ من حلم امام ورفقہ ولا جھل ابغض الی اللہ من جھل امام وخرقہ (غق) یعنی کوئی حلم اور نرمی امام کے حلم اور نرمی سے بڑھ کر اللہ کو پسند نہیں اور کوئی جہل امام کی جہالت سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿۱۵۹﴾ کر۔ اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ع۵۵۲

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَإِنْ اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور

ع۵۵۲ استغفار کے معنی: نبی کریم صلعم کی لینت کا ذکر کرکے اب ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر آپ کو قائم کرتا ہے اوّل پچھلا گناہ معاف کردینا آیت ۱۵۴ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے معافی دی تھی مگر چونکہ رسول کے حکم کی نافرمانی ہوئی تھی اس لیے اب آپ کو عفو کرنے کا حکم ہوا۔ دوم ان کے لیے استغفار یا آئندہ اس قسم کی نافرمانی سے حفاظت چاہنا۔ یہاں استغفار گو دوسروں کے لیے ہے مگر اس کے معنی گناہ کی سزا سے حفاظت چاہنا نہیں بلکہ خود گناہ سے حفاظت چاہنا ہیں کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ تو خود اُن کے گناہ کو معاف کرچکا ہے۔ ولقد عفا اللّٰہ عنہم (۱۵۴) پس جس کو خدا معاف کرچکا اس کے لیے سزا سے بچانے کی دعا کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہ ایک اور قطعی شہادت ہے کہ استغفار سے مراد گناہ سے حفاظت بھی ہوتی ہے۔ سوم ان کو مشورہ میں شریک کرنا گویا ان کو اس قدر بلند مرتبہ دیا کہ پھر وہ مجلس شوریٰ کی شمولیت کے بھی اہل قرار دیئے گئے۔ شوریٰ کا حکم تو قرآن کریم میں پہلے سے موجود تھا وامرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ ۴۲-۳۸) یہاں اس کے ذکر میں دو غرضیں ہیں ایک تو یہ بتانا کہ ایک دفعہ نافرمانی سے مشورہ کی اہلیت نہیں چھن جاتی۔ آج مہذب قومیں جو پولیٹیکل مجرموں کو مجلس شوریٰ سے نہیں روکتیں اسلام کی تعلیم سے ابھی آگے نہیں بلکہ پیچھے ہیں اس لیے کہ یہ پولیٹیکل مجرم نہ تھے جنگی مجرم تھے جن کے لیے مہذب قوموں میں کورٹ مارشل ہے ان کے لیے یہ عنایت "معاف کردینا"، ان کی بلندی درجات چاہنا۔ پھر مجلس شوریٰ کے ان کو ممبر بنانا اسلام کے ساتھ ہی یہ تعلیم خاص ہے دنیا میں اور کہیں نہیں ملے گی اور دوسری غرض یہاں شوریٰ کے حکم کو دوہرانے کی یہ ہے کہ جنگ اُحد میں جو مصیبت پیش آئی وہ شوریٰ کے فیصلہ پر عمل کرنے سے ہی پیش آئی کیونکہ نبی کریم صلعم کی اپنی رائے تو یہی تھی کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے اس لیے حکم دیا کہ گو نتیجہ شوریٰ کا بُرا بھی نکلا اور اس موقعہ پر کثرت رائے نے غلطی بھی کھائی۔ مگر اصول شوریٰ پھر بھی قائم رکھنے کے قابل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس نتیجہ کو دیکھ کر اصول شوریٰ سے ہی بیزاری ہوجائے۔ اس میں کس قدر دوراندیشی کی تعلیم ہے کہ ایک چیز کے ذرا سے نقصان کو دیکھ کر فوراً اس سے بیزار نہ ہوجاؤ۔ ممکن ہے اس کے فوائد اس سے بڑھ کر ہوں۔

آنحضرتؐ کا شوریٰ پر عمل: اس آیت کے ساتھ امرھم شوریٰ بینھم کو اس قدر قوت دیدی ہے کہ کسی مسلمان کو یہ جرأت نہ ہونی چاہیئے کہ اصول شوریٰ کا انکار کرے یا اسے استخفاف کی نظر سے دیکھے۔ شوریٰ کو خود اللہ تعالیٰ نے اس قدر عزت کا مقام دیا ہے کہ اس کے نقصانات کو ناقابل التفات قرار دیا ہے اور پھر خود نبی کریم صلعم نے اس پر باقاعدہ عمل کرکے دکھایا کہ آپ کی امت کو اصول شوریٰ کسی حالت میں چھوڑنا نہ چاہیئے۔ تمام امور مہمہ میں آپؐ صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ بدر میں بعد مشورہ مدینہ سے نکلے۔ احد میں بھی۔ احزاب میں مشورہ کرکے خندق کھدوادی اور محصور ہوئے پھر صلح کی اس تجویز پر کہ ایک تہائی مدینہ کے پھل کفار کو دیدیئے جایا کریں مشورہ کیا اور اسے چھوڑ دیا۔ حدیبیہ میں بھی مشورہ کیا بلکہ ایک ایسے معاملہ میں جو صرف آپ کی ذات سے تعلق رکھتا تھا یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ پر افک کا معاملہ اس میں بھی مشورہ کیا اور حدیث میں ہے ماتشاور قوم قط الاھدوا لارشد امرھم کبھی کسی قوم نے مشورہ نہیں کیا مگر اپنے معاملہ میں نہایت سیدھی راہ کی طرف ہدایت کیے جاتے ہیں۔

کثرت رائے پر عمل۔ شوریٰ میں نبی کریم صلعم نے اپنی رائے کے خلاف بھی کیا ہے جیسے اُحد کے معاملہ میں بلکہ وہاں کچھ خواب بھی آپ کو آئے مگر چونکہ صریح وحی کوئی نہ تھی اس لیے مشورہ پر ہی عمل کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب کثرت رائے خلاف ہو تو امیر کو اپنی رائے ترک کردینی چاہیئے اور کثرت کی رائے پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اور یہ بات کہ کثرت رائے پر آپؐ عمل کرتے تھے اسی اُحد کے میدان میں نکلنے والے واقعہ سے ظاہر ہے کیونکہ وہاں کچھ آدمیوں کی رائے آنحضرت صلعم کے ساتھ بھی تھی۔ پس آپ کا اُن کی اور اپنی رائے کو چھوڑ دینا محض اسی وجہ سے تھا کہ کثرت رائے آپ کے خلاف تھی اور حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا اجتہاد تک کے بارے میں کثرت رائے پر فیصلہ کرنا ثابت ہے جس سے معلوم ہُوا کہ قانون سازی بالخصوص اور تمام امور مہمہ بالعموم کثرت رائے سے طے ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں نے اس اصول شوریٰ کو بہت جلد ترک کردیا اور یہی ان کی سلطنتوں کے تباہ ہونے کا موجب ہے۔

کیا اذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ سے شوریٰ کے خلاف کچھ نکلتا ہے ہرگز نہیں بلکہ وہ عزم شوریٰ کا ہی نتیجہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ مشورہ کرکے جب بات پختہ کرلو تو پھر نتیجہ کو خدا پر چھوڑو۔ جیسا اُحد کے موقعہ پر آپؐ نے کیا کہ جب مشورہ کرکے حکم دیدیا پھر بعض لوگوں نے اپنی رائے سے رجوع کیا تو آپؐ نے اس کی پروانہ کی۔ یہ خلاف عزم ہوتا۔ پھر جب نقصان پہنچا تب بھی آپؐ نے یہ نہ کہا کہ میری رائے پر کیوں نہ عمل کیا گیا۔ تفاسیر میں عزم سے مراد یہی لی گئی ہے کہ جو فیصلہ بعد شوریٰ قرار پائے اذا شاورتھم فی الامر وعزمت علیہ (ث) فاذا وطّنت نفسک علی شئ بعد الشوریٰ (ض) اذا عقدت قلبک علی الفعل وامضائہ بعد المشاورۃ (د) پس مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد ان کے اہم معاملات کی بنیاد ان کے قوانین کی بنیاد قرآن و حدیث کی صریح تعلیم اور نبی کریم صلعم کے کھلے کھلے عمل کے مطابق مشورہ میں کثرت رائے پر ہونی چاہیئے۔

اس صدی کے مجدد کا کثرت رائے کے اصول کو زندہ کرنا: اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے جب اشاعت اسلام کے لیے ایک کام شروع کیا تو اس کی بنیاد بھی شوریٰ اور کثرت رائے پر رکھی اور تمام اموال سلسلہ کو ایک انجمن کے سپرد کیا جس کے متعلق یہ صفائی سے لکھ دیا کہ تمام معاملات میں جو فیصلہ انجمن کا کثرت رائے سے ہوگا اسی پر عمل کرنا ہوگا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ جب قوم بڑھ جائے تو پھر اس کی کثرت رائے کو معلوم کرنے کے لیے خاص آدمیوں کے انتخاب کی ضرورت پیش آتی ہے۔

يَخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِيۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ
بَعۡدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾
وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنۡ يَّغُلَّ ؕ وَمَنۡ يَّغۡلُلۡ
يَاۡتِ بِمَا غَلَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى
كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾
اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰهِ كَمَنۡۢ بَآءَ بِسَخَطٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَمَاۡوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۶۲﴾

اگر وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کرے
اور اللہ ہی پر مومنوں کو توکل کرنا چاہیئے ۵۵۳
اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو خیانت کرے
وہ جو کچھ خیانت کی ہے قیامت کے دن لائے گا پھر ہر شخص کو
جو اس نے کمایا ہے پورا دیا جائیگا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا ۵۵۴
تو کیا جو شخص اللہ کی رضا کی پیروی کرے وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جو
اللہ کی ناراضگی کما لائے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی بری پہنچنے کی جگہ ہے ۵۵۵

ع ۵۵۳ یخذل ۔ خُذلان کے معنی ہیں اس شخص کا چھوڑ دینا جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہو کہ وہ اپنی نصرت سے اسے مدد دیگا ۔ (غ)

ع ۵۵۴ یَغُلَّ ۔ غَلَّ یَغُلُّ اذ خان (غ) یعنی غَلَّ جس کا مضارع یَغُلَّ آتا ہے (جو یہاں ہے) اس کے معنی ہیں خیانت کی ۔ اور بعض نے اسے غنیمت کی خیانت سے خاص کیا ہے مگر چونکہ الفاظ عام ہیں یعنی کسی نبی کو بھی یہ شایاں نہیں کہ وہ غلول کا ارتکاب کرے حالانکہ غنائم کا صرف آنحضرت صلعم کی امت کے لیے حلال ہونا حدیث سے ثابت ہے اور یہ آپ کی ایک خصوصیت ہے اس لیے یہاں یَغُلَّ کے عام معنی خیانت ہی مراد ہیں ۔

خیانت کی سزا کا ذکر بطور مثال ہے : ومن یغلل یأت بما غل ۔ یہ لفظ عام ہیں اور یہ مراد نہیں کہ جو نبی خیانت کرے بلکہ نبی کے متعلق تو فرمایا کہ اس کی تو شان ہی یہ نہیں کہ وہ خیانت کرے یعنی ایسا ہو سکتا ہی نہیں اور جب خیانت کا ذکر آیا تو یہ بھی بتا دیا کہ خیانت چھپی نہ رہ جائے گی بلکہ ایک دن آتا ہے کہ وہ کھلی کھلی ظاہر ہو جائے گی ۔ اکثر مفسرین نے اسکو ظاہر پر محمول کیا ہے کہ جس قدر خیانت کی ہے برنگ سزا خود وہی خیانت کا مال اس پر وارد کیا جائے گا مگر یہ بے وجہ ہے ۔ ایسے موقعہ پر مراد محض سزا ہوتی ہے جیسے توفی کل نفس ما کسبت میں مراد نیکی بدی کے اجر کا دیا جانا ہے ۔ ابو مسلم نے اس کو سزا کے لیے تمثیل کہا ہے (غق) اور یہ جو بعض احادیث میں ذکر آتا ہے کہ ایک شخص اونٹ گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا جس کی اس نے خیانت کی ہے تو وہ بھی سزا کیلئے بطور تمثیل ہے ۔ اور کم از کم یہ تو ظاہر ہے کہ اس دنیا کی سزا و جزا میں اس عالم کی چیزیں بطور مثال ہی بیان کی گئی ہیں جیسے مثل الجنة التی وعد المتقون (الرعد ۱۳ ۔ ۳۵) سے ظاہر ہے ۔

عصمت انبیاء پر شہادت : اس آیت پر یہ بتانا مقصود ہے کہ جنگ میں جو مصیبت پیش آئی وہ اس وجہ سے نہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم میں کوئی نقص ہو یا آپ نے کوئی کوتاہی کی ہو ۔ کیونکہ محمد رسول اللہ کا تو اتنا بلند مرتبہ ہے یہ کسی بھی نبی کی شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اس لیے کہ نبی معصوم ہوتا ہے ۔ اس بات پر کہ یہاں مصیبت کے اسباب کی طرف اشارہ ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے نہیں یہ بھی دلیل ہے کہ ان آیات کے بعد جن میں رسول اللہ صلعم کی عصمت اور آپ کی قوت قدسی کا اور آپ کے تزکیہ اور تعلیم قرآن و حکمت کا ذکر ہے فوراً بعد یہ آیت آتی ہے اولما اصابتکم مصیبة قد اصبتم مثلیها قلتم انّٰی ھذا یعنی تم اس مصیبت کے متعلق سوال کرتے ہو کہ کہاں سے آئی یہاں لفظ خیانت یا غلول اسی طرح وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے جس طرح امانت کا لفظ وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں ہر ایک قسم کی کمی شامل ہے اور یہ خود اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کے آگے فرمایا ہے کہ جو کوئی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اسے لائے گا یعنی جس قدر اللہ تعالیٰ کی امانتوں کے ادا کرنے میں کسی نے کمی کی ہے اس سب کے متعلق قیامت کے دن جوابدہی کرنی ہوگی اور پھر فرمایا کہ ہر جان کو جو اس نے کمایا پورا دیا جائے گا ۔ اس میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس قدر کوتاہی کسی نے فرائض و حقوق کی ادائیگی میں کی ہے اسی قدر اس پر ذمہ داری ہو گی اور اس سے اگلی آیت نے اور بھی مضمون کو صاف کر دیا ہے کیونکہ وہاں دو گروہ کر دیئے ہیں ایک اللہ کی رضا کی پیروی کرنے والا گروہ اور دوسرا اللہ کی ناراضگی کو خریدنے والا ۔ اور پھر آگے چل کر اور بھی صفائی سے کہا کہ نبی کی بعثت کی تو غرض ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو پاک کرے جس میں خود کسی قسم کی خیانت یا کوتاہی پائی جائے وہ دوسروں میں امانت اور کمال کس طرح پیدا کر سکتا ہے گویا یہاں ضمناً عصمت انبیاء کے اصول کو قائم کیا ہے ۔

بعض لوگوں نے یہاں یَغُلَّ کو خاص مال غنیمت سے مخصوص لیکر یوں توجیہ کی ہے کہ تیر اندازوں نے جب اپنی جگہ کو چھوڑا تو انہوں نے گویا ایک رنگ میں نبی صلعم پر بدظنی کی کہ آپ ان کو مال غنیمت کا حصہ نہیں دلائیں گے تو اس لیے فرمایا کہ نبی مال غنیمت میں خیانت نہیں کیا کرتا ۔ یہ اس کی شان سے بہت گری ہوئی بات ہے کہ ایسا کرے اور بعض وسعت کی طرف گئے ہیں یہاں تک کہ بعض کے نزدیک یہاں مراد امانت وحی کی ادائیگی میں خیانت نہ کرنا ہے ۔

ع ۵۵۵ سخط ۔ سَخَط وہ غضب شدید ہے جو عقوبت یعنی سزا کا مقتضی ہو (غ) اور اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انزال عقوبت یعنی سزا وارد کرنے کے معنی میں ہے ۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦٣﴾

وہ اللہ کے نزدیک درجے رکھتے ہیں - اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں ع556

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٦٤﴾

یقیناً اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب اُن میں اُنہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو اُن پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور اُنھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے - اگرچہ وہ پہلے ضرور کھُلی گمراہی میں تھے ع557

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾

اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی کہ اُس جیسی دو چند تم پہنچا چکے ہو، تم نے کہا یہ کہاں سے ہے، کہہ یہ تمھاری اپنی طرف سے ہی ہے - اللہ ہر شے پر قادر ہے ع558

ع556 تفاوت درجات: ھم درجات اس کی ترکیب ہے لھم درجات یعنی ان کے لیے درجات ہیں یہ اسی قسم کا بیان ہے جیسے حدیث میں آتا ہے الناس معادن کمعادن الذھب والفضۃ لوگ کانیں ہیں سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح اور بعض نے ذو درجات مراد لیا ہے یعنی لوگ صاحب درجات ہیں - بعض بڑے درجوں والے بعض کم درجوں والے اور روح المعانی میں ہے کہ مبالغہ کے لیے ان کو نفس درجات کہا ہے - ھم کی ضمیر کو بعض نے من اتبع رضوان اللہ کی طرف لیا ہے کیونکہ درجات کا لفظ عموماً ثواب میں استعمال ہوتا ہے مگر چونکہ لفظ درجات عام بھی آیا ہے جیسے ولکل درجات مما عملوا (الانعام - ۱۳۲) اس لیے اہل ثواب اور اہل عقاب دونوں کا ذکر ہے -

درجات - دَرَجَۃ کی جمع ہے اور دَرَجَۃ اور مَنْزِلَۃ ایک ہی ہیں لیکن درجہ اوپر چڑھنے کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور منزلۃ رفیعۃ یعنی بلند مرتبہ یا بلند مقام پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے (غ)

ع557 چونکہ اصل غرض اس رکوع کی یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو پاک کرتا اور ان کی منافقوں سے تمیز کرتا ہے اور انہی سامانوں میں سے جنگ احد ایک سامان ہے - اس لیے اب ان کو اپنا ایک عظیم الشان احسان یاد دلاتا ہے کہ ان میں سے ایسے رسول کا کھڑا کر دینا جو ان کو پاک کر دے کتنا بڑا احسان ہے اور دوسرے چونکہ اوپر فرمایا تھا کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے یعنی اس میں خود کوئی نقص اور کوتاہی ہو - تو اب بتاتا ہے کہ اس میں نقص اور کوتاہی کس طرح ہو سکتی ہے اور کوئی ناپاک امر اس کی طرف منسوب کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اس کا منصب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو آیات اللہ کے ذریعہ سے ہر قسم کی آلائشوں سے پاک کرے -

تعلیم اور تزکیہ کو چار دفعہ آنحضرت صلعم کا کام بیان کرنے میں حکمت: ہمارے نبی کریم صلعم کی تعریف ان الفاظ میں دو دفعہ پہلے آ چکی ہے - ایک حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں دوسرے اس دعا کے خانہ کعبہ کے تعلق میں پورا ہونے کے ذکر میں یعنی کعبہ کا قبلہ ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ رسول مزکّی جو حضرت ابراہیم کی دعا کا مقصد تھا وہ یہاں ظاہر ہو چکا ہے - اب تیسری مرتبہ مومنوں کے تزکیہ کو اس کی اصل غرض ٹھہرا کر پھر اس کو بیان کیا ہے اور یہاں ان کانوا من قبل لفی ضلٰل مبین کے لفظ بھی بڑھا دیئے ہیں یعنی معمولی حالات میں بھی تزکیہ کرنا ایک نہایت ہی مشکل کام ہے مگر اس رسول کے سامنے وہ قوم رکھی جاتی ہے جو حد درجہ کی جہالت اور گمراہی میں ڈوبی ہوئی ہے اور شاید اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح تم کو یہ رسول پاک کرتا ہے تمہارا بھی کام ہے کہ دوسرے لوگوں کو پاک کرو مگر اس کو کھول کر سورۃ جمعہ میں بیان فرمایا ہے جہاں چوتھی مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اوصاف بیان کیئے گئے ہیں - اثنائے ذکر جنگ میں ایسی آیات کے لے آنے سے یہ بھی تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ لڑائیاں یا ان میں کامیابی کوئی اصل غرض اسلام کی نہیں بلکہ اصل غرض تزکیہ نفوس اور تعلم و تعلیم کتاب و حکمت ہے -

ع558 آیت ۱۶۰ میں جس امر کی طرف اشارہ کیا تھا اب اس کی تصریح فرماتا ہے یعنی اس مصیبت کی وجہ ذات پاک نبوی تو نہیں ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کہاں سے آئی - مگر اس کا جواب دینے سے پہلے فرمایا قد اصبتم مثلیھا جس کی دو چند ویسی تم پہنچا چکے ہو - اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ تم کو مصیبت پہنچی تو تم کو اس قدر گھبراہٹ ہے کہ یہ کیوں آئی - حالانکہ تم ویسی دو چند دشمن کو پہنچا چکے ہو - اس دو چند مصیبت میں ایک تو جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں کفار

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ
فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۶۶
وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۖ وَقِيْلَ لَهُمْ
تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ
قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ

اور جو کچھ تمھیں اس دن مصیبت پہنچی جب دو گروہ (جنگ میں)
ملے تو اللہ کے اذن سے تھا اور تاکہ وہ مومنوں کو جان لے۔
اور تاکہ ان لوگوں کو جان لے جنھوں نے نفاق کیا[559] اور ان کو
کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا مدافعت کرو[560]۔ انھوں نے
کہا اگر ہم لڑائی جانیں تو ضرور تمھارا ساتھ دیں[561] وہ آج

کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے اور دوسرے جنگ اُحد کی ابتدائی حالت کی طرف کہ اس میں بھی بیس سے زیادہ آدمی قریش کے مارے گئے اور بہت سے آدمی زخمی ہوئے۔ پس جب تم ان کو دو چند مصیبت پہنچا چکے ہو تو پھر تھوڑی سی مصیبت اگر تم پر آ گئی تو اس پر اس قدر گھبراہٹ کیوں؟ دو چند مصیبت کا ایک چھوٹے سے گروہ سے ایک عظیم الشان اور طاقتور قوم کو پہنچ جانا تو صاف بتاتا ہے کہ نصرت الٰہی تمہارے ساتھ ہے اور ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم کا ثبوت ملتا ہے۔ ہاں اگر یہ کہو کہ جب نصرت الٰہی ہمارے ساتھ تھی تو پھر مصیبت کیوں آئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ھو من عند انفسکم یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے یعنی تم سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے نصرت الٰہی رک گئی۔ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی کی حتٰی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم (۱۵۱)

آخری الفاظ ان اللہ علٰی کل شیء قدیر میں یا تو یہ اشارہ ہے کہ یوں اس نے تمہیں سمجھا دیا کہ اللہ تعالیٰ کیسا قادر ہے کہ جب اس کی نصرت شامل حال ہو تو کمزوری بھی قوت بن جاتی ہے اور یا یہ مراد ہے کہ جب مومن اطاعت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نصرت کی قدرت نمائی کا نظارہ دکھاتا ہے اور جب اس سے نافرمانی وقوع میں آتی ہے تو اپنی نصرت کو روک دیتا ہے۔

ع۵۵۹ نافقوا۔ اس کا اصل نَفَقَ ہے جس کے معنی ہیں گزر گیا اور ختم ہوا۔ اس لیے خرچ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور اسی سے نَفَق ہے جس کے معنی ہیں جاری رستہ یا وہ رستہ جو دوسری طرف نکل جاتا ہو اور زمین میں سرنگ جو دوسری طرف نکل گئی ہو (غ) چنانچہ قرآن کریم میں بھی آتا ہے ان استطعت ان تبتغی نفقًا فی الارض (الانعام۔ ۳۵) اسی لحاظ سے نفاق سے مطلب ہے الدخول فی الشرع من بابٍ والخروج عنہ من باب (غ) یعنی ایک دروازہ سے شریعت میں داخل ہونا اور دوسرے دروازہ سے اس سے نکل جانا۔ اور منافق حقیقی طور پر وہ شخص ہے جو ظاہر میں ایمان لاتا ہے اور اندر سے کافر رہتا ہے۔ اسی سے نافق ہے یعنی اس نے نفاق کیا۔ پھر حدیث میں اس معنی کو وسیع کیا ہے جہاں یہ فرمایا کہ منافق کی چار علامتیں ہیں جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ منافق خالص ہے اور جس میں بعض پائی جائیں اس میں اسی قدر نفاق ہے اذا اؤتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر۔ یعنی جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے اور جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب عہد کرتا ہے تو بیوفائی کرتا ہے اور جب جھگڑا کرتا ہے ناحق کی طرف جاتا ہے۔ پھر وہ لوگ جو منہ سے بات کہتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے ان میں بھی نفاق کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کبر مقتًا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون (الصف۔ ۳)

پچھلی آیت میں جنگ اُحد کی مصیبت کی وجہ بتائی تھی اس میں اس کی غرض بتائی ہے پہلے فرمایا فباذن اللہ یہ مصیبت اللہ کے اذن سے آئی ہے اذن کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ اس کی اجازت یا اس کے علم سے اور یوں کہنے کی غرض یہ ہے کہ یہ مصیبت محض تمہارے لیے دُکھ بن کر نہیں آئی جس کے نیچے کوئی غرض نہ ہو۔ بلکہ اس میں ایک خاص غرض بھی ہے اور وہ غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں اور منافقوں کو الگ الگ کر دے۔ جاننے سے کیا مراد ہے دیکھو ع۱۴۹ وع۵۲۲

ع۵۶۰ ادفعوا۔ دفع کے معنی قوت کے ساتھ ازالہ کر دینا ہیں اور جب اس کا صلہ عن ہو تو اس کے معنی حمایت ہوتے ہیں (غ) یہاں کوئی صلہ مذکور نہیں مگر چونکہ قتال فی سبیل اللہ کے مقابل پر اس کو استعمال کیا ہے اس لیے مراد ہے ادفعوا عن انفسکم واھلیکم واموالکم یعنی اپنے آپ سے اور اپنے اہل سے اور اموال سے دشمن کو روکو یا ان کی حمایت کرو۔

قوم کو ہلاکت یا ذلت سے بچانے کا فرض: قتال فی سبیل اللہ تو ایمان کو چاہتا ہے اس لیے پہلے ان کو یہی کہا جاتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو اللہ کے دین کی حفاظت کرنا اور اس کو نیست و نابود ہونے سے بچانا تمہارا فرض ہے اس لیے اللہ کی راہ میں جنگ کرو، لیکن اگر تمہارا اس پر ایمان نہیں تو کم از کم اپنے لوگوں کو اہل و عیال کو دشمن سے بچانا تو ہر انسان کا فرض ہے پس تم اپنے اہل و عیال کو ہی بچاؤ اور ان کی حمایت میں ہی کھڑے ہو جاؤ۔ یہی آج مسلمانوں کی حالت ہے اور ان کے لیے اس میں سبق ہے۔ انہوں نے خدا کے دین کی خدمت کو چھوڑ دیا اور خدا کی راہ میں کوشش نہ کی مگر جس ذلت کی حالت کو پہنچ چکے ہیں اس کا تقاضا کم از کم یہ تو ہے کہ اپنی قوم اور اپنی ناموس کی حفاظت کے لیے اب بیدار ہو جائیں اور دیکھیں کہ بدوں ایثار اور قربانی کے وہ دنیا میں زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔

ع۵۶۱ لو نعلم قتالًا۔ اگر ہم لڑائی جانیں یا لڑائی سمجھیں اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر ہم یہ جانیں کہ فی الواقع جنگ ہوگی۔ گویا یہ بہانہ کیا کہ ہمارے نزدیک کوئی جنگ ہونے والی نہیں ہے اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اگر ہم سمجھیں کہ یہ کوئی جنگ ہے جس میں سات سو آدمی تین ہزار بہادر کے مقابل پر نکلتا ہے

لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۚ ﴿۱۶۷﴾

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

کے دن ایمان کی نسبت کفر سے بہت نزدیک ہیں ۵۶۲ع اپنے مونہوں سے کہتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ (خوب) جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں ۵۶۳ع

جنھوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا اور خود بیٹھے رہے کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ کیے جاتے، کہہ تو اپنی جانوں سے موت کو ہٹا رکھو اگر تم سچے ہو ۵۶۴ع

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انھیں مُردے مت خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں ۵۶۵ع

یہ جنگ نہیں کیونکہ جنگ میں کچھ نہ کچھ توازن فریقین کا ضروری ہے بلکہ یہ عمداً اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اگر آیت کے آخری الفاظ یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم (اپنے مونہوں سے وہ کہتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں) گو ان کے اسی قول کے متعلق لیا جائے تو پہلے معنی درست ہونگے۔

لا تبعنٰکم۔ تَبِعَ اور اِتَّبَعَ کے معنی پیچھے چلنا ہیں۔ یہاں پیچھے چلنے سے مراد جنگ میں ساتھ دینا ہے۔

۵۶۲ع ھم للکفر۔ للکفر اور للایمان میں ل بمعنی الی ہے یعنی ان کا قرب کفر سے ایمان سے ان کے قرب سے بڑھ کر ہے اور یا حذف مضاف ہے اور مراد ہے کہ وہ اپنے فعل سے بہ نسبت مومنوں کے کافروں کی نصرت کے قریب تر ہیں کیونکہ ان کے الگ ہو جانے سے کفار کو مدد پہنچی۔ بعض کے نزدیک اقرب قَرَب ہے جس کے معنی طلب الماء ہیں (ل) یعنی پانی کا طلب کرنا پس اقرب بمعنی اطلب ہُوا یعنی وہ کفر کو بہ نسبت ایمان کے زیادہ طلب کرنے والے ہیں۔

۵۶۳ع یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم۔ اس سے یا تو ان کے قول سابق کی طرف اشارہ ہے لو نعلم قتالا۔ دیکھو نوٹ ۵۶۱ع اور یا اس سے مراد ہے کہ منہ سے ایمان لاتے ہیں مگر ان کے دل میں ایمان نہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (الحجرات[۴۹]۔۱۴)

واللّٰہ اعلم بما یکتمون۔ بجائے محبت اسلام کے جس کا وہ منہ سے اظہار کرتے ہیں ان کے دلوں میں اسلام کا بغض ہے۔ مگر اللہ اس سے واقف ہے۔

۵۶۴ع قعدوا۔ قُعُود اصل میں قیام کے مقابل پر ہے۔ یعنی بیٹھے رہنا۔ مگر قاعد (بیٹھنے والے) سے مراد المتکاسل فی الشئ (رغ) لیا جاتا ہے۔ یعنی کسی چیز کے متعلق کسل یا سستی کرنے والا جو اس سے پیچھے رہ جائے۔

ادرؤا۔ دَرْءٌ کے معنی ہیں المیل الی احد الجانبین یعنی ایک جانب کی طرف مائل ہو جانا اور اس کا صلہ عن ہو تو درأت عنہ کے معنی ہیں دفعت عن جانبہ (رغ) اس کی جانب سے دفع یا رد کیا۔ یدرؤن بالحسنۃ السیئۃ (الرعد[۱۳]۔۲۲) ویدرؤا عنھا العذاب (النور[۲۴]۔۸)

ادائیگی فرض میں موت کی پروا نہ ہو: یہ بھی منافقین کا ذکر چلتا ہے جیسا کہ وقعدوا سے ظاہر ہے یعنی یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں جو جنگ سے پیچھے رہے یعنی جنگ میں شامل نہ ہوئے۔ وہ اپنے بھائیوں کے متعلق (کیونکہ ان لوگوں کے قریبی سب مومن تھے) کہتے کہ اگر وہ بھی ہماری فرمانبرداری کرتے یعنی دل سے ایمان نہ لاتے اور ہمارے ساتھ نفاق میں شامل رہتے یا جنگ میں نہ نکلتے تو قتل نہ ہوتے مگر چونکہ ان کی اصل غرض تو موت پر افسوس کرنا تھا کہ ہمارے بھائی بند مر گئے اس لیے خصوصیت اعتراض کو چھوڑ کر ایک عام جواب دیدیا ہے۔ قتال تو خود مسلمانوں کی زندگی کے قیام کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ پس جب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تو خواہ اس کے کرنے میں جان رہے یا جائے وہ کام کرنا ہوگا۔ یہ کوئی اصول زندگی نہیں کہ اگر ایک کام کے کرنے میں جس کی ضرورت انسانی زندگی کے بقا کے لیے ہے موت کا خطرہ ہو تو انسان وہ کام نہ کرے۔ اس طرح پر موت سے بچنا گویا انسانی زندگی کی اصل غرض ہو گئی اس لیے جواب میں فرمایا کہ اگر تم موت سے بچنے کو ہی انسان کی زندگی کی اصل غرض قرار دینے میں سچے ہو تو ضرور اس کے حصول کا سامان بھی تمہارے پاس ہوگا۔ پس اپنی جانوں سے موت کو دُور رکھ کر بتاؤ کہ تم نے اس مقصد کو حاصل کر لیا ہے ورنہ انسانی زندگی کے مقصد کو یوں کھویا اور شرف انسانیت کو بٹا لگایا اور موت تو پھر بھی آخر کار آ گئی اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتا جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے یعنی اپنی زندگی کا فرض ادا کرتے ہوئے مارے گئے۔ انہوں نے اصل مقصد زندگی کو تو پالیا۔ پس وہ مُردے نہیں۔

۵۶۵ع شہداء کی زندگی: ان الفاظ کا مطلب ۱۹۳ع میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ مگر وہاں فرمایا تھا بل احیاء (البقرۃ[۲]۔۱۵۴) یہاں فرمایا بل احیاء عند ربھم جس میں صاف بتا دیا کہ یہ ان کی زندگی حضور رب میں ہے جسمانی زندگی نہیں جو اسی زمین پر ہے یا عند ربھم میں مراد ان کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا ظاہر کرنا ہے

فَرِحِينَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

اس سے خوش رہتے ہیں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا اور اُن کی وجہ سے (بھی) خوش ہوتے ہیں جو اُن کے پیچھے سے اُنھیں نہیں ملے کہ اُن کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۵۶۶

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

اللہ کی نعمت اور فضل سے خوش ہوتے ہیں اور کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ۵۶۷

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾

وہ جنھوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی اس کے بعد کہ انھوں نے زخم کھایا، جنھوں نے ان میں سے احسان کیا اور تقوےٰ کیا ان کے لیے بڑا اجر ہے ۵۶۸

اور بہ کئی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء کو خاص مراتب قرب کے عطا ہوتے ہیں اور یہاں آخر پر فرمایا یرزقون ان کو رزق بھی ملتا ہے۔ یہ رزق وہی رزق ہے جو جنت میں ملتا ہے۔ کلما رزقوا منہا من ثمرۃ رزقا (البقرۃ ۲- ۲۵) گویا ان سے اگر یہ جسمانی رزق منقطع ہُوا تو کیا ہرج ہے۔ ان کو وہ رزق ملتا ہے جو اُن کو حیات جاودانی کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

۵۶۶ یستبشرون۔ استبشر سے مراد ہے کہ جو کچھ کشائش کی اس کو خوش خبری دی گئی تھی اس کو پالیا (غ) اور بشارۃ سے جو سرور حاصل ہُوا اس پر بھی استبشر بولا جاتا ہے۔ اس لیے بَشَرہ کے بعد فاستبشر بطور فعل لازم لایا جاتا ہے یعنی اس نے اسے خوشخبری دی پس وہ خوش ہوگیا۔ گویا صرف خوش ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔

من خلفھم سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کے پیچھے زندہ باقی رہے ہیں۔

اس آیت اور اس سے بعد کی آیت میں مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ زندگی کے مقصد کے حاصل کرنے میں جو لوگ اپنی جانیں دیتے ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں یہ دونوں گروہ خوش قسمت ہیں۔ گروہ اوّل یعنی شہداء کا گروہ تو ان خوشیوں اور راحتوں کو پالیتا ہے جو نیکوں کو زندگی بعد الموت میں ملنے والی ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں ان کیلئے یہ بشارت ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے اور نہ ان کو اعداء کا یا شیطان کا خوف رہے گا اور نہ ان کو یہ حزن یا غم ہوگا کہ کیوں انہوں نے خدا کی راہ میں قربانیاں کیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ اہل دنیا کو علم دیتا ہے کہ شہداء اس کی نعماء سے متمتع ہو رہے ہیں۔ اسی طرح وہ شہداء کو علم دے دیتا ہے کہ جو ان کے پیچھے رہے ہیں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

۵۶۷ خوف وحزن سے مراد: اس آیت میں پچھلی آیت کے آخری حصّہ کے مضمون کو دوہرایا ہے اور یہ مزید تاکید اور تصریح کے لیے ہے وہاں فرمایا تھا کہ ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوف انسان کو کسی امر مکروہ کے پہنچنے کا ہوتا ہے یا مصائب پیش آنے کا۔ تو اس کے مقابل میں فرمایا کہ نہ صرف انہیں امر مکروہ نہیں پہنچے گا بلکہ وہ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل سے مالا مال ہونگے اور حزن یا غم اسبات پر ہوتا ہے کہ جب اس کے ہاتھ سے کوئی اچھا موقع نکل جائے یا اس کی کسی کام پر لگائی ہوئی طاقت یا لگایا ہوا مال برباد ہو جائے جس کا آئندہ کے لیے کوئی اچھا اثر پیدا نہ ہو تو اس کے مقابل پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ یوں خوف وحزن کی تشریح خود فرمادی۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ پہلی آیت میں تو صرف خوف وحزن سے ان کے بچ جانے کی بشارت ہے اور اس میں نعمت اور فضل کے ملنے اور ان کے کاموں پر اجر کے ملنے کی بشارت ہے گویا وہاں دفع مضار کی بشارت ہے تو یہاں حصول منافع کی اور یا لاخوف علیھم ولاھم یحزنون روحانی طور پر نجات کی خوشخبری ہے اور اللہ کی نعمت اور فضل میں دنیوی فلاح اور دنیوی نعمتوں کی بشارت ہے۔

۵۶۸ اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ غزوہ حمراء الاسد کے نام سے موسوم ہے۔ اُحد کے واقعہ سے اگلے ہی دن نبی کریم صلعم نے مسلمانوں میں یہ منادی کرائی کہ ہم دشمن کے تعاقب میں نکلنے والے ہیں۔ چنانچہ جس قدر آدمی ساتھ چل سکتے تھے وہ ساتھ ہو لیے۔ ادھر ابوسفیان روحاء کے مقام تک پہنچا تو مشرکین ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ نہ تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کیا نہ تمہارے ہاتھ کوئی قیدی آئے اس لیے انہوں نے مشورہ کیا کہ واپس لوٹ کر پھر مسلمانوں کو تباہ کریں مگر ابھی اسی سوچ میں ہی تھے کہ ان کو خبر پہنچی کہ مسلمان ان کے تعاقب میں آرہے ہیں۔ اس پر وہ ایسے مرعوب ہوئے کہ وہاں سے فوراً کوچ کیا اور مکہ کو چلے گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ معلوم کرکے کہ وہ بہت دور نکل گئے ہیں حمراء الاسد سے جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے واپس آ گئے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾

وہ جن کو لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمھارے (مقابلے کے) لیے (لشکر) جمع کیے ہیں پس ان سے ڈرو تو اس (بات) نے ان کا ایمان بڑھایا اور انھوں نے کہا اللہ ہمیں کافی ہے اور کیا ہی اچھا کارساز ہے۔ ۵۶۹

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

پس وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس آئے انھیں کوئی دکھ نہ پہنچا اور انھوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بڑے فضل والا ہے ۵۷۰

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَاۗءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

یہ شیطان صرف اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے ۔ سو تم اُن سے مت ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو اگر تم مومن ہو ۵۷۱

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ

اور وہ لوگ تجھے غمگین نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں یقیناً وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے ۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے اور

نبی کریم صلعم اور آپؐ کے صحابہؓ کس قدر باہمت قوم تھی کہ اس قدر تکلیف دشمن کے ہاتھ سے اٹھا کر پھر بھی اس کا تعاقب کرتے ہیں۔

یہاں الذین استجابوا للہ والرسول فرمایا جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں حالانکہ جس واقعہ کا ذکر ہے اس میں حکم صرف نبی کریم صلعم کا تھا یعنی دشمن کے تعاقب کے متعلق ۔لیکن چونکہ قرآن کریم کی رُو سے رسول اللہ صلعم کے حکم کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے ۔ اس لیے بجائے صرف الرسول کہنے کے للہ والرسول کہا ہے۔

ع۵۶۹ جمعوا لکم مفعول محذوف ہے ۔یعنی جمعوا الجموع لشکر اکٹھے کیے ہیں۔

حسبنا اللہ ۔ حَسْبٌ ۔ کفایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ حسبنا اللہ یعنی اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور حسبھم جھنم ۔ جہنم ان کے لیے کافی ہے۔

جب ابوسفیان اُحد کے میدان سے چلا تو اس نے بآواز بلند کہا کہ اے محمد (صلعم) ہمارے اور تمہارے درمیان اگلے سال بدر صغریٰ پر جنگ ہوگی سو جب اگلا سال آیا تو ابوسفیان اپنی قوم کے ساتھ نکلا جب مرالظہران کے مقام پر پہنچا تو اس کا دل مرعوب ہوگیا اور اس نے واپسی کی ٹھان لی ۔ اتنے میں نعیم ابن مسعود اشجعی سے ملا تو ابوسفیان نے اس سے کہا کہ میں نے محمد صلعم سے وعدہ کیا تھا کہ بدر صغریٰ پر اگلے سال ہماری تمہاری جنگ ہوگی ۔ مگر کچھ خشک سالی ہے اور ہم واپس ہونا چاہتے ہیں لیکن اس طرح یہ خوف ہے کہ مسلمانوں کی جرأت بڑھ جائے گی اور وہ خیال کریں گے کہ ان لوگوں میں ہمارے مقابلہ کی طاقت نہیں اس لیے تم مدینہ جاؤ اور مسلمانوں کو ڈراؤ تاکہ وہ جنگ کے لیے نہ نکلیں اور تمہیں دس اونٹ دوں گا ۔ چنانچہ نعیم آیا اور اس نے مسلمانوں کو تیاری کرتے پایا تو اس نے کہا یہ بات ٹھیک نہیں پچھلے سال انہوں نے تم کو کس قدر نقصان پہنچایا اور اب وہ بہت بڑی تیاری کے ساتھ آرہے ہیں ۔ مگر مسلمانوں نے اس کی پروا نہ کی اور کہا حسبنا اللہ ونعم الوکیل ۔ چنانچہ مسلمان بدر صغریٰ پر پہنچ گئے جہاں بنی کنانہ کا ایک تجارتی میلہ لگا کرتا تھا اس میں مسلمانوں نے تجارت کرکے بہت سا فائدہ اُٹھایا اور چونکہ وہاں قریش نہیں آئے اِس لیے کوئی جنگ نہیں ہوئی ۔ ادھر ابوسفیان واپس مکہ میں پہنچ گیا اور اہل مکہ نے اس مہم کا نام جیش السویق رکھا یعنی صرف سُتّو پینے کی مہم تھی ۔ مسلمانوں میں یہ غزوہ بدر صغریٰ کے نام سے موسوم ہے۔

ع۵۷۰ اس آیت میں غزوہ بدر صغریٰ سے لوٹنے کا ذکر ہے ۔ اللہ کی نعمت اور فضل میں ان تجارتی منافع کی طرف اشارہ ہے جو اُن کو وہاں حاصل ہوئے اور لم یمسسھم سوء میں یہ بتایا ہے کہ کسی قسم کی بھی تکلیف ان کو نہ پہنچی کیونکہ کوئی جنگ نہ ہوئی اور اللہ کی رضا کی پیروی یہ تھی کہ باوجود بھاری لشکر کا خوف دلائے جانے کے انہوں نے کچھ پروا نہیں کی بلکہ اللہ کی رضا کو اپنے جان و مال پر مقدم کیا۔

ع۵۷۱ ذٰلکم الشیطان ۔ اس سے مراد وہی نعیم یا وفد عبد قیس ہے اور ذٰلکم کے لفظ میں اسی کی طرف اشارہ ہے بعض نے حقیقی شیطان ہی مراد لیا ہے۔

یخوّف اولیآءہٗ ۔ اس کے دو طرح پر معنی ہو سکتے ہیں یخوفکم باولیاءہٖ (گویا مفعول اوّل محذوف ہے) تم کو اپنے دوستوں یا رفیقوں سے ڈراتا ہے یعنی مسلمانوں کو کفار سے ڈراتا ہے کہ ان کا لشکر بہت بڑا ہے جیسا دوسری جگہ ہے ویخوفونک بالذین من دونہ (الزمر ۳۹-۳۶) یا اولیاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفار کی جمعیت کے خوف سے جنگ میں نہ نکلتے تھے یعنی منافقین اور مراد یہ ہے کہ شیطان اپنے دوستوں منافقوں وغیرہ کو ڈرا سکتا ہے مومن اس سے نہیں ڈرتے۔

لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٦﴾
ان کے لیے بڑا عذاب ہے ۵۷۲

إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٧﴾
جنھوں نے ایمان کے بدلے کفر خریدا وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿١٧٨﴾
اور جو کفر کرتے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو اُنھیں مہلت دیتے ہیں یہ ان کے لیے اچھا ہے ہم انھیں مہلت دیتے ہیں آخر وہ گناہ میں بڑھ جاتے ہیں اور انکے لیے ذلیل کرنیوالا عذاب ہے ۵۷۳

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ
اللہ ایسا نہیں کہ وہ مومنوں کو اس حالت پر چھوڑ دے جس پر تم ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے ۵۷۴ اور اللہ ایسا نہیں کہ تمھیں غیب پر اطلاع دے، لیکن اللہ اپنے

ع۵۷۲ الذین یسارعون فی الکفر۔ کفر میں شدت رغبت کا ذکر منافقین کے زیادہ موزوں حال ہے اور اگلی آیت میں الفاظ اشتروا الکفر بالایمان۔ ایمان کے بدلے کفر خریدا بھی منافقوں پر زیادہ چسپاں ہیں مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ ان کے منصوبوں سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا اور لن یضروا اللہ شیئا میں مراد اولیاء اللہ ہیں۔

اللہ کا یہ ارادہ کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو اُن کے اپنے افعال کا نتیجہ ہے کہ کفر کی طرف ان کی رغبت بہت زیادہ ہے۔ پھر انہوں نے اس کے خلاف منصوبہ بازیاں اور شرارتیں کرکے اسلام کو تباہ کرنا چاہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ان پر نافذ ہوگیا کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔

ع۵۷۳ نملی۔ ملا سے مشتق ہے۔ طویل مدت کو مَلاوَۃٌ من الدھر یا مِلیٌّ من الدھر کہا جاتا ہے (غ) جیسے واھجرنی ملیا (مریم ۱۹-۴۶) اس سے املاء کے معنی اِمہال یعنی مہلت دینا ہے۔

لیزدادوا اثما۔ لام کا استعمال بمعنی انجام کار بہت ہُوا ہے۔ یہ لام عاقبت کہلاتا ہے جیسے قرآن شریف میں آتا ہے فالتقطہ اٰل فرعون لیکون لھم عدوا وحزنا (القصص ۲۸-۸) دیکھو معنی حالانکہ آل فرعون کے اس کو اُٹھانے میں یہ غرض نہ تھی کہ وہ ان کا دشمن بنے بلکہ وہ اسے بیٹا بنانا چاہتے تھے یا اس سے کچھ نفع چاہتے تھے عسٰی ان ینفعنا او نتخذہ ولدا (القصص ۲۸-۹) اسی طرح جعلوا للہ انداداً لیضلوا عن سبیلہ (ابراھیم ۱۴-۳۰) حالانکہ ان کی غرض اس اتخاذ سے قرب الٰہی حاصل کرنا تھا جیساکہ فرمایا ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفٰی (الزمر ۳۹-۳) پس لیضلوا سے مراد ہے وہ انجام کار ان کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ پس جب دوسری جگہ فرمایا۔ اولم نعمرکم ما یتذکر فیہ من تذکر (فاطر ۳۵-۳۷) جس سے معلوم ہُوا کہ عمر اللہ تعالیٰ اس لیے دیتا ہے کہ تا انسان نصیحت حاصل کرے۔ پس لیزدادوا اثما میں لام عاقبت کا ہی ہو سکتا ہے۔ یعنی ہمارے مہلت دینے کا نتیجہ یہ ہے۔ بعض نے اس کو شبہ بالتعلیل کہا ہے مگر مآل ایک ہے۔

جنگ احد میں کفار کو قرار واقعی سزا نہ ملنے پر وہ سمجھتے تھے کہ بس اب ہم کامیاب ہو گئے فرماتا ہے کہ یہ تو ایک مہلت ہے۔ سو اگر وہ مہلت کو اپنی بھلائی کے لیے استعمال کرتے تو یہ ان کے لیے مفید تھا مگر وہ تو اس کو اور بھی شرارتوں اور منصوبہ بازیوں میں صرف کرتے ہیں اس لیے اس مہلت کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ان کا پیمانہ لبریز ہو جائے، اور ان پر گرفت کا موقعہ آجائے اور یہ گرفت کا موقعہ کیا ہے۔ عذاب مہین۔ ذلیل کر دینے والا دُکھ یا ذلت کا دکھ سو آخرکار اس قوم کو ذلیل کرکے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مغلوب اور مفتوح کی حیثیت میں لایا گیا۔

ع۵۷۴ یمیز۔ مَیز اور تمیز کے معنی ہیں الفَصلُ بین المتشابھاتِ (غ) ملتی جلتی چیزوں کو الگ الگ کر دینا۔

الطیب۔ طیب طاب سے ہے دیکھو ع۸۲ اور انسانوں میں سے طیّب وہ ہے جو جہل اور فسق اور بُرے اعمال کی نجاست سے پاک ہو اور علم اور ایمان اور اچھے اعمال کے زیور سے آراستہ ہو (غ) جیسے تتوفٰھم الملٰئکۃ طیّبین (النحل ۱۶-۳۲) یا سلام علیکم طبتم (الزمر ۳۹-۷۳) یا ھب لی من لدنک ذریۃ طیبۃ (اٰل عمران ۳-۳۸) اور اس کے مقابل پر خبیث ہے یعنی جس میں باطل اعتقاد جھوٹ بُرے اعمال ہوں دیکھو ۳۴۳۔

مصائب کی غرض: اس آیت میں بتایا ہے کہ ایک پاک گروہ کو مصائب کے ہاون میں کیوں ڈالا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ منہ کی باتوں سے خوش نہیں ہو سکتا۔ ان میں کچے اور پکے۔ منافق اور مومن یکساں ہو سکتے ہیں اس لیے ان دونوں گروہوں کو الگ الگ کرنے کے لیے مومنوں کی کمال وفاداری دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ مصائب لاتا ہے اور اس طرح ہر ایک ملے جلے گروہ میں سے خبیث و طیب کو الگ الگ کر دیتا ہے۔

يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ
وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٩﴾
وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ
هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا
بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿١٨٠﴾ ع
لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ

رسولوں سے جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے پس اللہ اور اس کے رسولوں
پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمھیں بڑا اجر ملے گا ۵۷۵
اور وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے
فضل سے دیا ہے یہ خیال نہ کریں کہ یہ اُن کے لیے اچھا ہے
بلکہ وہ اُن کے لیے بُرا ہے قیامت کے دن وہی اُن کے گلے کا ہار
بنایا جائیگا جس میں وہ بخل کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ
کی ہی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے ۵۷۶
یقیناً اللہ نے ان لوگوں کی بات کو سُن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ

ما انتم علیہ میں مخاطب منافق ہیں۔ کیونکہ انھی کا یہ اعتراض تھا کہ مصائب کیوں آتی ہیں اور کسی تکلیف کے آنے پر وہ بہت گھبرا اُٹھتے تھے۔

۵۷۵ یجتبی۔ جبیت الماء کے معنی ہیں۔ مَیں نے حوض میں پانی جمع کیا اور اس لیے حوض کو جابیۃ کہا جاتا ہے جس کی جمع جواب آتی ہے جیسے جفان کالجواب (السبا ۳۴۔ ۱۳) اور اجتباء کے معنی ہیں۔ الجمع علٰے طریق الاصطفاء (غ) یعنی اصطفاء کے طریق پر جمع کر دینا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے متعلق اجتباء کے معنی یوں کیے ہیں کہ وہ بندوں کو الٰہی فیض کے ساتھ بغیر بندہ کی کسی کوشش کے خاص کر لیتا ہے جس سے طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہوں۔ اور یہ نبیوں کے لیے ہے اور بعض ان لوگوں کے لیے جو صدیقوں اور شہیدوں میں سے ان کا قرب حاصل کر لیتے ہیں (غ)

کیوں ہر شخص کو وحی نہیں ہوتی: جب یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ مصائب اس لیے بھیجتا ہے کہ تا مومن اپنے کمال کو حاصل کریں۔ تو پھر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ اگر کمال تک ہی پہنچانا مقصود ہے تو اللہ تعالیٰ ہم کو خود ہی کیوں غیب پر یعنی اپنی رضا کی راہوں پر اطلاع نہیں دے دیتا، تاکہ ہم ان راہوں پر چلیں اور کمال کو حاصل کریں۔ گویا ہر ایک کو خود وحی کیوں نہیں ہو جاتی تاکہ وہ اپنے کمال کو حاصل کرلے۔ تو اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ اللہ کی شانِ قدوسیت کا تقاضا نہیں کہ تم جیسے ناپاک لوگوں کا اس سے تعلق ہو۔ پہلے تمھارا پاک ہونا ضروری ہے اور تمھارے پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ راہ رکھی ہے کہ اپنے ایک رسول پر فیضانِ الٰہی بغیر اس کی کسی سعی کے جاری کرکے اس کے ذریعہ سے دوسروں کو پاک کرتا ہے یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا کہ کہتے ہیں لن نؤمن حتّٰی نوتی مثل ما اوتی رسل اللہ (الانعام ۶۔ ۱۲۴) ہم تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہم کو وہ کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا جاتا ہے۔ وہاں بھی جواب یہی دیا ہے اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ (الانعام ۶۔ ۱۲۴) اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کو کہاں رکھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یجتبی من رسلہ من یشآء کے بعد فوراً فرمایا فاٰمنوا باللہ ورسلہ یعنی اسی طریق سے تم کمال کو حاصل کر سکتے ہو۔ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو منافقوں کے نام نہیں بتاتا مگر رسولوں کو بتا دیتا ہے۔

۵۷۶ یبخلون۔ بُخل۔ جُود یعنی سخاوت کی ضد ہے اور بُخل کے معنی ہیں مال کا وہاں سے روکنا جہاں سے روکنا مناسب نہیں (غ)

یُطَوَّقُوْنَ۔ طوق وہ چیز ہے جو گردن میں ڈالی جائے خواہ بلحاظ پیدائش ہو جیسے کبوتر کا طوق یا خود کیا جائے جیسے ہار۔ یطوّقون کے معنی ہیں ان کو طوق پہنایا جائے گا (غ) اور یہ تشبیہ کے طور پر ہے جیسا کہ خود حدیث میں ہے۔ یاتی احدکم یوم القیامۃ شجاعٌ اقرعُ لہٗ زبیبتانِ فیتطوّق بہ فیقول انا الزکوٰۃ۔ یہاں بھی طوق بننے سے مراد اس سے تشبیہ ہے (غ) اور اصل یہ ہے کہ تمام اعمال کا قرآن کریم نے گلے میں ڈالا جانا ہی بیان فرمایا ہے وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۱۳) پس جس طرح تمام اعمال انسان کے گلے کا ہار بن جاتے ہیں اسی طرح بخل بھی گلے کا ہار بن جائے گا۔ ایسے مقامات پر یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ مال جس کے متعلق اس نے بخل کیا تھا اکٹھا کرکے اس کے گلے میں ہار ڈال دیا جائے گا۔ بلکہ منشاء یہ ہے کہ اس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑے گا۔

میراث۔ ورث سے ہے۔ وراثۃ اور اِرْث کے معنی ہیں ایک شخص کی طرف کسی دوسرے سے مال کا منتقل ہونا بغیر کسی معاہدہ کے یا ایسے امر کے جو قائم مقام معاہدہ ہو (غ) اس لیے جو مال میّت سے منتقل ہوتا ہے اس کو اس نام سے پکارا جاتا ہے اور مال منتقل شدہ کو میراث کہا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے اِرْث بمعنی اصل بھی آتا ہے جیسے نبی کریم صلعم نے فرمایا فانکم علی اِرْثِ اَبِیکُمْ جہاں مراد ہے کہ تم اسی اصل پر ہو جس پر تمھارا باپ تھا (غ) اسی طرح جو چیز کسی کو بغیر محنت و مشقت کے حاصل ہو جائے اس پر بھی وارث ہونے کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بھی وارث کہا ہے اس لیے کہ سب کی سب اشیاء اللہ تعالیٰ کی طرف ہی پہنچنے والی ہیں (غ) اسی لحاظ سے یہاں میراث کا لفظ فرمایا۔ اور اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے ونحن الوارثون (الحجر ۱۵۔ ۲۳)

اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ
مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ
وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾
ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ
لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾
اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا
نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ
تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ
مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ

فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ہم لکھ رکھیں گے جو کچھ انھوں نے کہا ہے اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا بھی۔ اور ہم کہیں گے جلنے کا عذاب چکھو۔ ۵۷۷

یہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ۵۷۸

جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہماری طرف تاکیدی حکم بھیجا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ہمارے پاس وہ قربانی (نہ) لائے جسے آگ کھاتی ہو۔ کہہ مجھ سے پہلے رسول تمھارے پاس کھلی دلائل کے ساتھ اور اس کے ساتھ جو تم کہتے ہو آئے تو ان کو

---

۵۷۷ ذوقوا۔ ذوق کے معنی منہ کے ساتھ طعم کا پانا ہے۔ اور اصل میں لفظ ذوق تھوڑے کے متعلق استعمال ہوتا ہے کثیر کے لیے نہیں (غ)، مگر قرآن کریم میں عذاب کے لیے لفظ ذوق ہی استعمال ہوا ہے لبعض موقعہ پر تو یہ معنی لفظ کی صراحت سے نظر آتے ہیں جیسے ولنذیقنھم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر (السجدۃ ۳۲-۲۱) کیونکہ عذاب ادنیٰ یا اس دنیا کا عذاب بمقابلہ آخرت کے ایک بہت تھوڑی چیز ہے اور لبعض مقامات پر ذوق کا لفظ اختیار کرکے یہ اشارہ کیا ہے کہ جو کچھ عذاب آخرت ہے کچھ مزا اس کا انسان یہاں بھی چکھ لیتا ہے۔

الحریق۔ اَحْرَقَ کے معنی جلایا اور حریق کے معنی آگ ہیں (غ) عذاب الحریق کے معنی جلانے والا عذاب یا وہ عذاب جس میں جلن ہے۔

یہودیوں کا اسلامی چندوں پر استہزا؛ منافقوں کے جن کا ذکر ہو رہا تھا بڑے حامی اور جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن جو منافقوں کی طرح اندرونی دشمن تھے کیونکہ بظاہر مسلمانوں سے معاہدہ بھی کر رکھا تھا یہودی تھے انہی کا یہاں ذکر ہے جیسا کہ قتل انبیاء کے لفظ میں صاف بتا دیا۔ ایک طرف اسلام میں زکوٰۃ کا قائم کرنا دوسری طرف صدقات کی ترغیب پھر جنگوں کے لیے مالی قربانیوں کی ضرورت۔ علاوہ ان سب کے مسلمان اس وقت حالت غربت میں تھے۔ ادھر یہود ہمیشہ سے بوجہ اپنی سود خواری کے ایک مالدار قوم رہی ہے اس لیے یہ لوگ ایسی باتوں پر بھی استہزا کرتے رہتے تھے کہ اللہ تو فقیر ہے کیونکہ اس کے مخلص پرستار تنگی کی حالت میں ہیں اور ہم امیر ہیں اور پھر چندوں اور مالی قربانیوں کے مطالبہ پر بھی استہزا کرتے تھے کہ کیا خدا فقیر ہے جو اسے چندوں کی ضرورت پڑ گئی حالانکہ اس بات سے خوب واقف تھے کہ سنت اللہ یہی ہے کہ مومنین کو مالی و جانی ہر قسم کی امداد میں شامل ہونا پڑتا ہے مگر نحن اغنیاء کہنے والوں کو کچھ عذاب الحریق اس دنیا میں بھی پہنچا دیا جب ان کا غنا حالت فقر سے بدل گیا اور ان کو اپنے املاک وغیرہ چھوڑ کر ملک بدر ہونا پڑا اور جن کو وہ فقیر کہتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بے حساب رزق دیا۔ واقعی اس نظارہ کو دیکھ کر کیسی جلن ان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہوگی۔ یہ آنے والے عذاب الحریق کا مزہ اسی دنیا میں چکھا دیا۔

۵۷۸ لیس بظلّام۔ ظلّام مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بہت ظلم کرنے والا۔ مگر نفی مبالغہ سے یہ مطلب نہیں کہ تھوڑا ظلم کر لیتا ہے کیونکہ قرآن کریم خود فرماتا ہے ولا یظلمون فتیلا (النساء ۴-۴۹) ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور پھر فرماتا ہے ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ (النساء ۴-۴۰) اللہ تعالیٰ ایک ذرہ کے وزن کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ مبالغہ کی نفی کی وجہ صاف ظاہر ہے ان کے جس عذاب کا ذکر ہے وہ ایک سخت جلانے والا عذاب ہے اس عذاب کے اگر وہ حقدار نہ ہوتے تو اس کا پہنچانے والا بڑا ظالم ہونا چاہیئے تھا اس لیے فرمایا کہ اتنا بڑا عذاب جو ان کو دیا تو کیا اللہ کوئی بڑا ظالم ہے؟ ہرگز نہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ نفی کثرت سے اصل کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ ہر موقع پر صحیح نہیں۔ اور یہاں بالخصوص، روح المعانی میں اس کی ایک لطیف وجہ یہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جس قدر صفات ہیں وہ مبالغہ کے رنگ کی ہیں کیونکہ ہر ایک صفت اس میں اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے پس اگر ظلم بھی اس کی صفات میں ہوتا تو وہ ظلّام یعنی بڑا ہی ظالم ہوتا۔ اور جب اس میں ایک بات علیٰ وجہ الکمال نہیں تو معلوم ہوا کہ وہ مطلق نہیں پس جب وہ ظلّام نہیں تو اس کی صفت میں ظلم مطلق نہیں۔

عبید عبد ایک بلحاظ تسخیر کے ہے اور اس رنگ میں کل انسان اللہ تعالیٰ کے عبد ہیں بلکہ دیگر اشیاء بھی۔ اور ایک عبد بلحاظ اختیار رہتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرکے۔ عبید عبد کی جمع پہلے معنی میں ہے اس لیے عبد بمعنی غلام کی جمع بھی عبید آتی ہے کیونکہ وہ بھی تسخیر ہے اور دوسرے معنی میں اس کی جمع عباد ہے اسی لیے عباد کا لفظ اچھے موقع پر بولا گیا ہے جیسے عباد الرحمٰن (الفرقان ۲۵-۶۳) عبادہ الذین اصطفیٰ (النمل ۲۷-۵۹) اسر بعبادی (طٰہٰ ۲۰-۷۷) من عبادنا (الکھف ۱۸-۶۵) پس عبید کا لفظ زیادہ وسیع ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ نیک پر ظلم کرتا ہے نہ بد پر۔

قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ تم نے کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو۔ ۵۷۹

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو تجھ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے جا چکے ہیں

قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ جو کھلی دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے ۵۸۰

ع۵۷۹ قربان اصل میں وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے قرب الٰہی حاصل کیا جائے (غ)، مگر تعارف میں نسیکۃ یعنی ذبیحہ سے مخصوص ہو گیا ہے جیسے یہاں اور اذ قربا قربانا (المائدہ ۵-۲۷)

سوختنی قربانی: اس آیت میں یہودیوں کے ایک اعتراض کا ذکر ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ حکم ہے کہ کسی رسول کو نہ مانیں مگر اس کو جو ایسی قربانی لائے جسے آگ کھاتی ہو توریت میں ایسا کوئی حکم نہیں۔ البتہ توریت میں قربانیوں کے متعلق بہت سے احکام ہیں اور ایک قسم کی قربانی ان کے ہاں سوختنی قربانی کہلاتی تھی جو ساری کی ساری آگ میں جلا دی جاتی تھی۔ مگر ایسی قربانی کو انبیاء کہیں سے ساتھ نہ لاتے تھے۔ بلکہ وہی قربانیاں جو لوگ گزارتے تھے ان میں سے بعض قسم کی قربانیوں کو سالم آگ میں جلانے کا حکم تھا اور بعض قسم کی قربانیوں کا کچھ حصہ آگ میں جلایا جاتا تھا اور باقی کاہن کھاتے تھے دیکھو احبار ۱: ۶-۹ و ۶: ۱۴-۱۶ و ۲۶ وغیرہ پس شریعت موسوی میں قربانی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور آگ کھاتی تھی۔

شریعت موسوی کا ایک امتیازی نشان: پس قربان تا کلہ النار میں صرف شریعت موسوی یا اس کی سوختنی قربانیوں کا ذکر ہے نہ کچھ اور۔ سورۃ البقرہ میں یہ مفصل ذکر ہو چکا ہے کہ یہودیوں کو جب قرآن شریف پر ایمان لانے کے لیے بلایا جاتا تھا تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہماری طرف اتارا گیا۔ اور دوسری کسی قوم کو شریعت کا دیا جانا نہیں مانتے۔ یہی اعتراض ان کا یہاں بھی ہے صرف اس جگہ شریعت موسوی کا ایک امتیازی نشان بتایا ہے اور وہ امتیازی نشان یہ ہے کہ ان کے ہاں قربانیوں کو آگ کھاتی تھی مگر اسلام میں قربانی کا کوئی حصہ جلایا نہیں جاتا۔ گویا اسلام کی قربانی نے شریعت موسوی کی قربانی کو منسوخ کر دیا۔ اعتراض کا جواب یوں دیا ہے کہ تمہارے پاس تو ایسے رسول بھی آتے رہے جو شریعت موسوی پر عامل ہونے کی وجہ سے قربانیوں کو جلانے کا حکم دیتے تھے۔ پھر باوجودیکہ وہ بینات یعنی کھلے دلائل یا معجزات بھی لائے مگر تم نے ان کو قتل کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء کی مخالفت تمہارے خمیر میں داخل ہو گئی ہے۔ یہاں بینات یعنی دلائل و معجزات کا بالذی قلتم سے الگ ذکر کر کے یہ بتا دیا ہے کہ ان کا مطالبہ ایسی قربانی کا جسے آگ کھائے معجزہ کے رنگ میں نہ تھا بلکہ معمولی شریعت کا امر تھا اگر معجزات میں یہ امر داخل ہوتا تو بالذی قلتم کو بینات سے الگ نہ کیا جاتا۔

آگ کا آسمان سے اترنا: اور یہ جو مفسرین نے لکھا ہے کہ ایسی قربانی ہوتی تھی جسے ایک سفید آگ آسمان سے اتر کر کھا جاتی تھی۔ سو آسمان سے آگ اترنے کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ ہاں بائبل میں ایک موقعہ پر آگ کے آسمان سے اترنے کا ذکر ہے مگر وہ ایک خاص موقعہ ہے اور ہر اسرائیلی نبی کی صداقت کا یہ نشان بائبل سے ثابت نہیں ہوتا صرف ۲ تواریخ ساتویں باب کے شروع میں ہے "اور جب سلیمان دعا مانگ چکا تھا تو آسمان سے آگ اتری اور سوختنی قربانی کو اور ذبیحوں کو کھا گئی اور وہ گھر خداوند کے جلال سے بھر گیا۔" مگر سلیمان کو بنی اسرائیل نے قتل نہیں کیا نہ ان کے قتل کے درپے ہوئے۔ اور یہاں آتا ہے فلم قتلتموھم پس اس کی طرف اشارہ نہیں۔

ع۵۸۰ زُبُر۔ زبور کی جمع ہے اور زبور کے معنی ہیں لکھی ہوئی کتاب کیونکہ زَبَرَ کے معنی ہیں کتب یعنی لکھا۔ بعض نے پتھر میں نقش کرنا بھی اس کے معنی لکھے ہیں (ل)، اور زبور ہر ایک کتاب کو کہتے ہیں (ل) (اور زُبَر۔ زُبْرۃ کی جمع ہے جو اسی مادہ سے الگ لفظ ہے اور جس کے معنے لوہے کا بڑا ٹکڑہ ہیں۔ جیسے اٰتونی زبر الحدید (الکھف ۱۸-۹۶) اور پھر استعارۃً اس کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنا بھی آتے ہیں۔ جیسے فتقطعوا امرھم بینھم زبرا جہاں زبرۃ کی جمع بجائے زُبَر کے زُبُر آ گئی ہے)، زبرت الکتاب کے معنی کتبتہ کتابۃ عظیمۃ بھی ہیں (غ) یعنی میں نے اس کو بڑا بھاری لکھنا لکھا۔ اور زبور کے معنی ہیں کل کتاب غلیظ الکتابۃ ہر ایک کتاب موٹی کتابت والی۔

المنیر۔ نور روشنی کو کہتے ہیں مگر یہ دو قسم ہے ایک وہ جو معاون بصارت ہے یعنی ظاہری روشنی اور دوسرا وہ جو معاون بصیرت ہے یعنی باطنی روشنی جیسے نور عقل یا نور قرآن۔ اور قرآن کریم کو نور مجسم کہا ہے قد جاءکم من اللہ نور وکتٰب مبین (المائدہ ۵-۱۵) اور منیر کے معنی ذو نور ہیں۔ یعنی روشنی دینے والی۔

زبور اور کتاب: یہاں انبیاء کو تین چیزیں دینے کا ذکر ہے۔ بینات، زبور، کتاب منیر۔ بینات سے مراد دلائل نبوت یا معجزات ہیں۔ زبور کے معنی اوپر کتاب بیان ہو چکے۔ بینات پر زبر کا عطف ہونے سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ معجزات الگ امور ہیں اور زبور و کتاب منیر الگ یہ تو ثابت ہو چکا کہ زبور سے مراد کتاب ہی ہے نہ کچھ اور۔ اور قرآن کریم میں صحف یا کتب انبیاء پر یہ لفظ بولا گیا ہے جیسے انہ لفی زبر الاولین (الشعراء ۲۶-۱۹۶) اور امر مکتوب بالذکر ولقد کتبنا فی الزبور (القمر ۵۴-۴۳) ان دونوں آیات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زُبُر سے مراد انبیاء کے صحیفے ہی ہیں نہ کچھ اور پھر دو دفعہ یہ لفظ کیوں لایا گیا۔ یعنی زُبُر کے بعد پھر کتاب منیر کے لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ زبر سے مراد چھوٹے صحیفے اور کتاب منیر سے مراد توریت۔ انجیل و زبور ہیں۔ گویا بعض انبیاء کو چھوٹے صحیفے دیئے اور بعض کو ایسی عظیم الشان کتابیں جیسے توریت و انجیل و زبور۔ اور قتادہ سے مروی ہے کہ الکتاب المنیر سے مراد زبر ہی ہیں اور بعض وقت ایک شے کا دوسرے اعتبار سے ذکر کر کے اسے دوبارہ لایا جاتا ہے اور الکتاب المنیر کو واحد اس لیے لائے ہیں کہ جملہ کتب سماوی ایک لحاظ سے ایک ہی کتاب

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ
اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ
النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾
لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۟ وَلَتَسْمَعُنَّ
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ
الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا
وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

ہر ایک شخص موت چکھنے والا ہے اور تم کو صرف قیامت
کے دن تمہارے پورے اجر دیئے جائیں گے۔[۵۸۱] پس جو آگ سے
دُور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ ضرور مراد کو پہنچ گیا
اور دنیا کی زندگی نرا دھوکے کا سامان ہے[۵۸۲]
ضرور تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں آزمائے جاؤ گے اور
ضرور تم ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے
اور اُن سے جو مشرک ہوئے بہت سی دُکھ دینے والی باتیں سنو گے
اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے[۵۸۳]

ہیں اور زجاج کا قول ہے کہ ہر ایک کتاب ذی حکمت کو زبور کہہ دیا ہے اور جس میں احکام شرعی ہوں اس کو کتاب کہہ دیا ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبور کے معنی میں غلظت یا شدّت پائی جاتی ہے اور اس شدت کا تعلق اعدا سے ہوتا ہے اور اس کے مقابل کتاب منیر میں نور کی طرف توجہ دلائی ہے گویا وہ پیروؤں کو ایک نور عطا کرتی ہے۔ پس زبور اسی کتاب کو بلحاظ اس کی شدّت کے کہا ہے اور کتاب منیر اسی کو نور اور روشنی کے لحاظ سے کہا ہے اور حضرت داؤد کی کتاب کو جو بالخصوص زبور کے نام سے پکارا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ حضرت داؤد کی کتاب میں زیادہ حصّہ شدّت کا ہے۔

ع[۵۸۱] اس عبارت کا اس مضمون سے تعلق یوں ہے کہ پچھلی آیات میں اُن لوگوں کا ذکر تھا جو انبیاء علیہم السلام کی معاندانہ مخالفت کرتے ہیں اور ہر مخالفت کا بدلہ فوراً تو ملتا نہیں اس لیے وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی مخالفت سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس لیے فرمایا کہ بیشک ہر عمل کا کھلا کھلا بدلہ تو اس زندگی میں نہیں ملتا مگر ہر شخص پر موت آنیوالی ہے اور کھلے کھلے اور کامل اجور کے لیے اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت یا قیامت کا دن مقرر کیا ہے لیکن تُوفون یا پورا پورا دینا کہہ کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ کچھ نہ کچھ یہاں بھی انسان کو مل جاتا ہے اس میں معاندین اسلام کو دُوہرا زجر ہے ایک یہ کہ اپنی بداعمالیوں کی پوری سزا تو تم قیامت کے دن پاؤ گے اور دوسرے یہ کہ اس سزا کا کچھ حصّہ اس دنیا میں بھی مل رہے گا۔

ع[۵۸۲] زحزح۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ زحح ہے اور زحّ (مصدر زحزحة) کے معنی ہیں اس کے موضع سے اس کو ہٹا دیا اور الگ کر دیا اور اسے دور کر دیا (غ۔ل) اور بعض کے نزدیک زاح یزیح سے ہے۔ جس کے معنی ہیں تاخّر یعنی پیچھے رہ گیا (ل)

فاز۔ فوز کے معنی ہیں، بھلائی کا کامیابی سے پالینا مع سلامتی کے حصول کے اور مفازۃ اس سے مصدر ہے (غ)

غرور۔ غَرَّ سے مصدر ہے اور غَرَرْتُ فُلاناً کے معنی ہیں اس کو حالت غفلت میں پایا اور جو کچھ ارادہ کیا تھا اس سے حاصل کیا (غ) اور غرور، غارّ کی جمع بھی ہے جس کے معنی دھوکہ دینے والا ہیں۔

دنیا کی زندگی دھوکا ہونے سے مراد: اس آیت میں بتایا ہے کہ انسانی زندگی کے مقصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیئے۔ فوز مراد کو پالینا یا انسانی زندگی کے مقصد کو حاصل کر لینا یہ ہے کہ ایک شخص آگ سے دور کیا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے، لیکن بعض لوگ اس دنیا کی زندگی کو ہی غرض وغایت سمجھ لیتے ہیں۔ یہاں الحیٰوۃ الدنیا سے مراد صرف دنیا میں رہنا نہیں۔ کیونکہ دنیا میں نیک و بد سب رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسان کو پیدا کر کے دنیا میں رکھا ہے بلکہ جیسا کہ مقابلہ سے ظاہر ہے مراد یہ ہے کہ حیوانی زندگی کو غرض وغایت انسانی زندگی کی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ حیوانی زندگی تو لازماً منقطع ہونیوالی ہے اس لیے جس نے اس کو غرض وغایت بنایا اس نے بڑا دھوکا کھایا۔ کیونکہ جب یہ منقطع ہو گی تو ایسا شخص گویا خالی ہاتھ رہ گیا۔ قرآن کریم میں جہاں دنیا کی زندگی کی مذمّت ہے انہی معنوں میں ہے۔

ع[۵۸۳] عزم الامور۔ عزم کے لیے دیکھو ع[۲۹۰] عزم الامور سے مراد معزومات الامور ہیں۔ یعنی ایسے امور جن پر عزم کر لینا چاہیئے کیونکہ ان میں کمال خوبی اور شرف اور عزّت ہے۔ ہٹ اور ضد کا نام عزم نہیں۔ یا مراد ایسے امور ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے پختہ فیصلہ کر کے ان کو واجب کر دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مالی اور جانی نقصان اور ایذا کی پیشگوئی: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے دو سخت قسم کے ابتلاؤں کا ذکر کیا ہے جو ابھی پیش آنے والے تھے ایک مالی اور ایک جانی ابتلا۔ دوسرا اہل کتاب اور مشرکین سے ایذا کی باتیں سُننا۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی اس لیے ان مالی اور جانی ابتلاؤں کا اس میں ذکر نہیں ہو سکتا جو اس جنگ سے پہلے مسلمانوں کو اٹھانے پڑے ہجرت میں یا اس سے پہلے یا اس کے بعد جنگوں میں۔ اور نہ ہی ان ایذا کی باتوں کا ذکر ہو سکتا ہے جو مکہ میں مشرکین سے اور مدینہ میں یہود سے سننی پڑیں کیونکہ ان کے بعد کی یہ آیت ہے اور اس میں آئندہ کا ذکر ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس قدر مالی اور جانی ابتلا مسلمانوں کو جنگ اُحد میں یا اس سے پیشتر اُٹھانے پڑے اور جس قدر ایذا کی باتیں اس وقت تک سننی پڑیں۔ نبی کریم صلعم کے بقیہ حصّۂ زندگی

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ٘ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

اور جب اللہ نے ان سے اقرار لیا جنھیں کتاب دی گئی ہے کہ ضرور تم اس کو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے رہو گے اور اسے نہیں چھپاؤ گے پھر انھوں نے اس کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت لے لی، سو کیا ہی بُرا ہے جو وہ لیتے ہیں [۵۸۴]

ہیں اس قدر ابتلا نہیں اُٹھانے پڑے نہ اس قدر ایذا کی باتیں سننی پڑیں۔ بلکہ بعد میں روز بروز اسلام کی قوت بڑھتی گئی یہاں تک کہ سارے ملک عرب پر مسلمانوں کا تسلط ہو گیا پس یہ مالی اور جانی ابتلا اور یہ ایذا کی باتیں کسی آئندہ زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اُحد کی جنگ کے ذکر کے بعد ان کا ذکر اس لیے کیا کہ اس جنگ میں بھی مسلمانوں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ تو گویا فرمایا کہ اگر یہ مالی اور جانی نقصان تمکو پہنچا ہے تو ابھی اور بھی مالی اور جانی نقصان پہنچنے والے ہیں۔ اور یوں ان الفاظ میں یقیناً اہل اسلام کے ان مالی اور جانی نقصانوں کی طرف اشارہ ہے جو ہمارے اس زمانہ میں ان کو اٹھانے پڑے ہیں اور اسی لیے ان کے ساتھ ایذا کی باتوں کو جمع کیا ہے کہ یہ دونوں باتیں اسی زمانہ میں اکٹھی ہوئی ہیں۔ مالی اور جانی نقصان ظاہر ہیں ملکوں کے ملک چھن گئے۔ دولت اور املاک ہاتھوں سے نکل گئے۔ اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ شہید کیے گئے۔ مرد اور بچے اور عورتیں ہزارہا کی تعداد میں تہ تیغ ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی عیسائیوں اور مشرکوں کی طرف سے وہ کچھ ایذا کی باتیں اسلام کے مقدس پیشوا اور بزرگان دین کی نسبت سننی پڑیں کہ الامان۔ اس زمانے میں جو گندے اعتراض اسلام کے خلاف ہوئے ہیں اور جس قدر دشنام دہی کے رسائل تیار ہوئے ہیں ان کا اگر انبار لگایا جائے تو ایک پہاڑ بن جاتا ہے اور چونکہ اس سورت میں اصل عیسائیوں کا ذکر ہے اور اُحد کی جنگ کا ذکر بھی درمیان میں بطور ایک مثال کے آگیا تھا اس لیے سمجھایا کہ اسلام پر ایسے مصیبت کے زمانے پہلے بھی آئے ہیں کہ دشمنوں نے سمجھا کہ ہم نے اُسے کچل دیا ہے۔ مگر وہ مغلوب کبھی نہیں ہوا۔ ہمیشہ غالب ہی ہوا ہے۔ اس لیے اب بھی جب چاروں طرف سے مسلمان مصائب کا شکار بنے ہوئے ہیں یہ آیت قرآنی ہمیں تسلی دیتی ہے کہ اسلام اب بھی مغلوب نہ ہو گا۔

ان مصائب کا علاج: ان مصائب کا علاج صبر اور تقوٰی بتایا ہے۔ سو صبر دو قسم ہے ایک مصائب میں ہمت نہ ہارنا۔ دوسرا اللہ تعالٰے کی طاعت پر عمل کے لیے اور اس کے منہیات سے بچنے کے لیے مضبوط کھڑا ہو جانا۔ اور تقوٰی کو بعد میں رکھ کر بتایا کہ یہاں تقوٰی سے مراد اپنا بچاؤ کرنا ہے ان تدابیر سے جو اس وقت عمل میں لائی جا سکتی ہیں اور حقوق کی نگہداشت بھی مراد ہو سکتی ہے۔

۵۸۴ؑ اہل کتاب کا اپنی کتاب کو چھپانا: جب اہل کتاب کے مسلمانوں کو مالی اور جانی نقصان پہنچانے کا ذکر کیا اور ان کی سب و شتم سے پیشگوئی کے طور پر آگاہ کیا تاکہ مسلمان یہ جان لیں کہ ان کا خدا ان کے مصائب سے غافل نہیں تو ساتھ ہی اہل کتاب کے معاہدات کی طرف توجہ دلائی کہ ان کی کتابوں میں صریح پیشگوئیاں آنحضرت صلعم کی تشریف آوری کی موجود تھیں اور ان کو حکم تھا کہ ان کو ظاہر کریں اور چھپا کر نہ رکھیں مگر انہوں نے محض دنیا کی دولت اور دنیا کی عزت کی خاطر جو ثمن قلیل ہے ان معاہدات کو ان کُتب کو پس پشت پھینک دیا مگر جیسا کہ قرآن شریف کا قاعدہ ہے صرف اہل کتاب کو الزام دینا مقصود نہیں۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ تم پر بھی وہ وقت آئیگا کہ خدا کی کتاب قرآن کریم کو کھولکر لوگوں کے لیے بیان نہ کرو گے بلکہ اس کو چھپاؤ گے اور تم بھی اس کے عوض دنیا کی زندگی کے عارضی فائدے چاہو گے۔ چنانچہ جب مسلمانوں میں مال و دولت اور آسائش اور حکومت آئی تو انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا اور دنیا کے پیچھے پڑ گئے۔

مسلمانوں کی بیماری قرآن کو بیان نہ کرنا ہے: یہاں دو باتیں الگ الگ بیان کی ہیں ایک کھول کر بیان نہ کرنا دوسرے اس کا چھپانا۔ کتاب کا کھول کر بیان کرنا یہ تھا کہ جو احکام اس میں قابل عمل تھے ان کو عمل کے لیے پیش کیا جاتا۔ بجائے اس کے تفسیر کرنے بیٹھے تو یا تو قصوں میں پڑ گئے جن کا نام و نشان تک قرآن میں نہیں ہے یا دماغ سے عجیب عجیب نکتے اختراع کرنے شروع کیے یا اپنے معتقدات کی تائید میں الفاظ قرآنی کو توڑ مروڑ کر لگا لیا اور پھر ان قصوں نے اور عدم تبیین نے توجہ کو آہستہ آہستہ قرآن شریف کی طرف سے ہی ہٹا دیا یہاں تک کہ اس کو بالکل چھپا ہی دیا گیا۔ یہ گویا دوسرا مرتبہ تھا اور یہی آج مسلمانوں کی حالت ہے کہ قرآن شریف ان کے اندر بظاہر بڑی عزت کے مقام پر ہے مگر فی الحقیقت وہ بالکل مخفی ہو رہا ہے۔ عدم بیان کے بعد کتمان کا مرتبہ دوسرا تھا اور پہلے سے بڑھ کر تھا اس لیے لاتکتمونہ کو لتبیننہ کے بعد رکھا ہے حالانکہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کتمان پہلا مرتبہ اور عدم تبیین دوسرا مرتبہ ہے۔ آج اگر غور کیا جائے تو اس قدر مصائب کا آماجگاہ ہونے کے باوجود بھی مسلمان قرآن کے کتمان کے مجرم ہیں۔ ہر طرف توجہ ہوتی ہے مگر قرآن کریم کی طرف نہیں ہوتی۔ سجادہ نشین، علماء اور سیاسی لیڈر عموماً قرآن کی طرف سے لاپروا ہیں۔ بہتیری راہیں مسلمانوں کے لیے تجویز کرتے ہیں مگر قرآن کو تجویز نہیں کرتے۔ پس اہل کتاب کے اس ذکر میں مسلمانوں کے اصل مرض کو بھی بتا دیا ہے۔

لتبیننہٗ للناس۔ کتاب کا کھول کر بیان کرنا للناس یعنی سب لوگوں کے فائدہ کے لیے ہو۔ اس میں اگر ایک طرف مسلمانوں کی حالت کی اصلاح آجاتی ہے کہ ان کو اس کتاب پر چلایا جائے تو دوسری طرف غیر مسلموں کے سامنے حق کو پیش کرنا بھی اسی میں داخل ہے مسلمان دونوں سے غافل ہیں مگر بالخصوص یہ دوسرا امر تو ایسا بھلایا ہے کہ اس زمانہ کے مجدد کو تیس سال گزر گئے کہ اس نے مسلمانوں کو جگانا شروع کیا کہ اسلام کی اصلی کامیابی اسی میں ہے مگر کتنے ہیں جنھوں نے توجہ کی۔ جہاں اس قدر اسلام کی کامیابی کی راہوں پر کم و بیش عمل کر کے دیکھ لیا جاتا ہے اس بات کی طرف تجربہ کے لیے بھی لوگ نہیں آتے۔ حالانکہ تاریخ بتاتی ہے کہ

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا
وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا
فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

ہرگز خیال نہ کرو کہ جو لوگ اس پر خوش ہوتے ہیں جو انھوں نے کیا اور پسند کرتے ہیں کہ اس کے لیے ان کی تعریف کی جائے جو انھوں نے نہیں کیا۔ یہ ہرگز بھی خیال نہ کرو کہ وہ عذاب سے نجات پا گئے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۵۸۵

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ
ع عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾

اور آسمانوں اور زمین کا ملک اللہ کا ہی ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۵۸۶

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لیے نشان ہیں ۵۸۷

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى
جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ

جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں فکر کرتے رہتے ہیں، ہمارے رب تُو نے اسے بے فائدہ پیدا ۵۸۸

یہی بات پہلے اسلام کی اصل کامیابی کا موجب ہوئی۔

۵۸۵ اصل نقشہ تو اسلام کے دشمنوں کا کھینچا ہے جیسا روایات سے ثابت ہے۔ اہل کتاب ہوں یا منافق۔ اور اس زمانہ میں وہی لوگ جنھوں نے شوکت اسلامی کے مٹانے میں کوئی کوشش باقی نہیں چھوڑی خود مسلمانوں کے منہ سے اپنی تعریف سننے کے خواہاں ہیں۔ مگر سبق مسلمانوں کے لیے تھا۔ آج مسلمانوں کی قوم کو یہ بیماری کھا گئی ہے کام کرنے والے بہت قلیل ہیں اور تھوڑا سا کرتے ہیں تو اس پر اتراتے ہیں اور پھر اکثر کی حالت یہ ہے کہ کرتے کراتے کچھ نہیں۔ اپنی تعریف کے گیت لوگوں سے سننا چاہتے ہیں۔ سجادہ نشین، علماء، لیڈر الّا ماشاء اللہ سب اس بلا میں مبتلا ہیں۔ یہ لوگ عذاب الٰہی سے نڈر ہیں مگر وہ پہنچ کر رہے گا۔

۵۸۶ معاندین اسلام کو بتایا ہے کہ حق کی مخالفت کرکے وہ اپنے آپ کو کامیاب نہ سمجھیں۔

۵۸۷ اس رکوع میں اصل ذکر مومنوں کی کامیابی کا ہے اور اسی پر سورت کا خاتمہ ہے اور ان تمہیدی آیات میں کچھ صفات ان مومنوں کی بیان کی ہیں دو قسم کے نشانوں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک وہ جو خلق سماوات والارض سے تعلق رکھتے ہیں یعنی مخلوق الٰہی کے ساتھ خواہ وہ آسمانوں پر ہو اور خواہ زمین میں اس میں بھی نظر انسانی کو بہت وسیع کیا ہے ایک ملک تک محدود درکھنا تو ایک طرف رہا ساری زمین تک بھی محدود نہیں کیا بلکہ مومن کی نظر کو اس قدر بلند کیا ہے کہ وہ آسمانوں کی پیدائش پر بھی غور کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ترقی کرتا کرتا آسمانوں کی مخلوق کے حالات کو بھی معلوم کر سکتا ہے۔ دوسری قسم کے نشان جن کا یہاں ذکر کیا ہے وہ ہیں جو لیل ونہار کے اختلاف سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لیل ونہار کے اختلاف سے مراد زمانہ ہے۔ پس صرف مخلوق الٰہی میں ہی جیسے کہ وہ نظر آتی ہے نشان نہیں بلکہ زمانہ میں بھی نشانات ہیں اور قوموں اور اُمتوں پر جو اختلافات آتے رہتے ہیں وہ سب لیل ونہار کے اختلافات میں شامل ہیں۔

یہ دس آیات یعنی آخر سورت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو اُٹھتے ہوئے پڑھا کرتے تھے جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباس کی روایت سے ثابت ہے۔

۵۸۸ علیٰ جنوبھم۔ جنوب۔ جَنْب کی جمع ہے جس کے اصل معنے پہلو یا کروٹ ہیں (غ)

یتفکرون۔ فِکر اس کا اصل ہے اور فکرۃ کے معنی ہیں وہ قوت جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے (غ) اور تَفَکُّر اس قوت کے جولان کا نام ہے جو عقل کی نظر کے مطابق ہو اور یہ صرف انسان کے لیے ہے نہ حیوان کے لیے۔ (غ)

یہاں مومنوں کی دو بڑی صفات بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کا ذکر ہر حال میں کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ مخلوق میں فکر کرتے ہیں۔ اللہ کا ذکر صرف زبان سے نہیں ہوتا دیکھو ۱۹۱ بلکہ زبان اور قلب اور جوارح سب سے ہے اور ذکر قلب سے مراد یہ ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت عظمت الٰہی ہو اور عملی حالت میں ذکر الٰہی ہی وہ چیز ہے جس کو انسان اپنے تمام حالات میں آٹھوں پہر چلتا پھرتا ہو یا بیٹھا یا سوتا مدنظر رکھ سکتا ہے ان الفاظ سے صرف ذکر لسان اور اس سے نماز مراد لیکر استدلال بھی کیا گیا ہے کہ اس میں گویا یہ ہدایت ہے کہ انسان کھڑا ہو کر نماز ادا کرے۔ اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بیٹھ کر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو لیٹ کر۔

سُبۡحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَيۡتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىۡ لِلۡاِيۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۳﴾

نہیں کیا تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔[۵۸۹]

ہمارے رب جس کو تو آگ میں داخل کرے یقیناً اسے تو نے رسوا کیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

ہمارے رب ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ہے جو ایمان کے لیے بلاتا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ پس ہم ایمان لائے ہمارے رب تو ہماری کمزوریوں کی حفاظت فرما اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہم کو راستبازوں کے ساتھ وفات دے۔[۵۹۰]

قرآن کریم نے عبادت اور حصول علم کو اکٹھا کیا ہے: دوسری صفت مومنوں کی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کی خلق میں فکر کرتے ہیں اور ان کے فکر کا نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ وہ پکار اٹھتے ہیں ربنا ما خلقت ھذا باطلا یعنی ہر ایک چیز ایک حقیقت رکھتی ہے اور ایک غرض کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس حقیقی علوم کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ جس قدر علوم دنیا میں پیدا ہوتے ہیں وہ حقیقت اشیاء میں فکر کرنے سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا رہا کہ جب ایک قوم خدا کے ذکر کی طرف متوجہ ہوئی تو علوم سے غافل ہوگئی اور جب علوم کی طرف جھکی تو خدا سے غافل ہوگئی۔ چنانچہ عیسائیت کی تاریخ میں اس کا بہترین نظارہ نظر آتا ہے۔ جب ابتدا میں ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف میلان ہوا تو ایسی خطرناک رہبانیت اختیار کی کہ علوم میں ترقی کو کفر قرار دیا اور مدت تک جو کوئی ان میں علوم طبعی یا حساب وغیرہ کی طرف توجہ کرتا اسے ملحد و بیدین قرار دیا جاتا اور علوم کو شیطانی خیالات سمجھا جاتا۔ لیکن آج اس قوم کی یہ حالت ہے کہ یہاں تک علوم میں توغل ہے کہ خدا کا نام تک لینا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ اس سورت میں بالخصوص عیسائیت سے خطاب تھا۔ اس لیے اس کے خاتمہ پر جو صفات مومنوں کی بیان فرمائی ہیں ان میں ان دونوں باتوں کی طرف ایک ہی آیت میں توجہ دلائی ہے کہ ایک طرف ذکر الٰہی سے غافل نہ ہو اور دوسری طرف مخلوق میں تفکر سے کام لو۔ اور حقیقت اشیاء پر غور کر کے علوم کو حاصل کرو۔

۵۸۹ اشیاء میں فکر سے خدا کی طرف توجہ دلائی: آیت کے یہ آخری الفاظ سبحانک فقنا عذاب النار۔ گویا مخلوق الٰہی میں فکر کا نتیجہ ہیں۔ سبحانک میں جیسا کہ ۴۷ میں دکھایا جا چکا ہے مقصود اس امر کا ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سب عیوب اور نقصوں سے پاک ہے یہاں یہ لفظ اس لیے لایا گیا کہ جب یہ فرمایا کہ کوئی چیز بھی باطل پیدا نہیں کی گئی اور سب کے اندر کچھ حقیقت اور غرض ہے تو اس دوسرے پہلو سے بچانا بھی ضروری تھا کہ انہی اشیاء کو اور اس مخلوقات کو ہی کامل سمجھ کر دوسری غلطی میں انسان پڑ جائے تو اس لیے فرمایا کہ تمام عیوب سے پاک اور تمام نقصوں سے مبرا ایک ذات الٰہی ہے اور یہ اشیاء سب مخلوقیت کی مہر اپنے اوپر رکھتی ہیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ ہی سب نقصوں سے پاک اور مبرا ہے تو واجب ہے کہ ہر انسان اسی کی طرف رجوع کرے اور اس کا محتاج اپنے آپ کو بنائے اور سب سے پہلے آگ سے بچنے کی دعا سکھائی۔ کیونکہ آگ ہی قیامت کا بدترین عذاب ہے اور آگ یا جلن ہی اس دنیا میں انسان کے سارے امن و اطمینان کو برباد کر دیتی ہے۔ دنیا کی کامیابی بھی یہی ہے کہ انسان آگ سے بچے اور آخرت کی بھی یہی ہے کہ دوزخ سے نجات پائے۔

۵۹۰ منادی۔ ندا سے ہے اور نداء آواز کے بلند کرنے اور اس کے ظہور کو کہتے ہیں اور بعض وقت صوت مجرد پر یہ لفظ بولا جاتا ہے خواہ اس سے کچھ معنی مفہوم ہوں یا نہ جیسے الا دعاء ونداء (البقرۃ ۲۔ ۱۷۱) اور بعض وقت مرکب پر جس سے معنی مفہوم ہوں واذ نادی ربک موسٰی (الشعراء ۲۶۔ ۱۰) و اذا نادیتم الی الصلوٰۃ (المائدۃ ۵۔ ۵۸) اور نادی کا صلہ الی بھی آتا ہے اور ل بھی اور للایمان کے معنی لاجل الایمان ہیں اور ان اٰمنوا اس کی تفسیر ہے اور منادی یہاں رسول اللہ صلعم کو ہی کہا ہے۔ کیونکہ آپ نے دنیا کو بہت ہی بلند آواز سے پکارا۔ یہاں تک کہ اس بلند آواز کی یادگار اذان میں موجود ہے جس میں اصول دین کی طرف بلایا ہے اور بعض کے نزدیک قرآن شریف مراد ہے اور امام راغب کہتے ہیں کہ منادی میں اشارہ ہے عقل کی طرف اور کتاب کی طرف جو اتاری گئی اور رسول کی طرف جو بھیجا گیا اور تمام نشانات کی طرف جو اللہ تعالیٰ پر ایمان کی طرف دلالت کرنے والے ہیں اور اس کو منادی اس لحاظ سے کہا کہ اس کا ظہور ندا کی طرح ہے۔

اَنۡ مفسرہ ہے اور اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے پہلے بھی جملہ ہو جس میں قول کے معنی پائے جائیں اور بعد میں بھی جملہ ہو۔ اس صورت میں یہ پہلے جملہ کی تفسیر کرتا ہے۔

الابرار۔ بارّ کی جمع (برّ سے) ہے۔ دیکھو ۶۷ اور بارّ سے ابلغ برّ ہے جس کی جمع بَرَرَۃ ہے بایدی سفرۃ کرام بررۃ (عبس ۸۰۔ ۱۵۔ ۱۶) (غ)

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ آگ سے بچاؤ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ محمد رسول اللہ صلعم ہیں۔ پس آپ پر ایمان لانا پہلی ضرورت ہے اور جب انسان ایمان لاتا ہے تو پھر وہ یہ دعا بھی کرتا ہے کہ اس کے قصوروں کی حفاظت ہوتی رہے اور اس کی برائیاں اور کمزوریاں دور کی جائیں غفر ذنوب کے لیے دیکھو ۲۵۸ سیئات کا لفظ چونکہ تکالیف جسمانی پر بھی بولا گیا ہے۔ اس لیے غفر ذنوب کے ساتھ سیئات کے دور کیا جانے کی دعا میں تکالیف

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

ہمارے رب اور ہمیں وہ عطا فرما جس کا وعدہ تو نے ہمیں اپنے رسولوں کے ذریعے دیا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کر بیشک تو وعدہ کا خلاف نہیں کرتا۔ ۵۹۱

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِيْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

ان کے رب نے اُن کی دعا قبول کی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو ۵۹۲ سو جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے میں ضرور اُن کی تکلیفوں کو اُن سے دُور کردوں گا اور میں ضرور ان کو باغوں میں داخل کرونگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے بدلہ ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا بدلہ ہے ۵۹۳

جسمانی کے دور کیا جانے کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے زیادہ وضاحت کے لیے دیکھو ۵۹۳ جہاں دعا کی قبولیت کا ذکر ہے۔

۵۹۱ دین اور دنیا میں کامیابی کی دعا: اس سے پہلی آیت میں غفرِ ذنوب کی دعا تھی اس میں یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ وعدے پورے ہوں جن کا تعلق تصدیقِ رسل سے ہے یا جو رسولوں کی زبان پر کیے گئے تھے اور اس دعا کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں اٰتنا ما وعدتنا اور دوسرے میں لا تخزنا یوم القیامة یہ مقابلہ صاف دکھاتا ہے کہ پہلے وعدے دنیا کے متعلق ہیں اور دوسرے قیامت کے گویا لا تخزنا یوم القیامة کہہ کر یہ بتا دیا ہے کہ پہلے حصہ دعا کا مطلب بھی یہی ہے کہ دنیا میں ذلیل اور رسوا نہ ہوں بلکہ نصرت الٰہی کے ساتھ منصور و مظفر ہوں۔ اور سورۃ بقرہ میں ایسی ہی دعا پر خاتمہ کر کے صاف الفاظ میں فانصرنا علے القوم الکافرین کہہ دیا ہے۔

وعدہ کے ساتھ دعا کی ضرورت: ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک امر کا وعدہ ہو تو پھر اس کے لیے دعا کی کیا حاجت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے جو نصرت وغیرہ کے متعلق ہوں ان کا تعلق اعمال سے ہوتا ہے نہ خاص انسانوں سے پس اگر اعمال صالحہ اس حد کو نہ پہنچیں یا کوئی بدعملیاں درمیان میں روک ہو جائیں تو ان وعدوں کا ایفا بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے مومن کی دعا ان اسباب کے پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہے جن پر اس نصرت کا آنا لازم ہے اور ان اسباب کو پیدا ہونے سے روکتی ہے جو اس کے لیے رکاوٹ کا موجب ہو سکتے ہیں۔

۵۹۲ بعضکم من بعض سے یا تو یہ مراد ہے کہ تم سب ایک ہی اصل سے ہو۔ مرد سے عورت اور عورت سے مرد پیدا ہوتا ہے۔ اور یا یہ مراد ہے کہ تم مرد اور عورتیں سب ایک ہی سیرت اور ایک ہی خلق پر ہو جیسے حدیث میں آتا ہے سلمان منا اھل البیت سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے یعنی ہمارے خلق اور سیرت پر ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے من غشنا فلیس منا جو ہم سے کھوٹ کرے وہ ہم میں سے نہیں یا اتحاد اور اتصال اسلامی کا ذکر کیا ہے کہ تم سب ایک ہی ہو یعنی تمہارے تعلقات یگانگت کے ہیں۔

دعا کے ساتھ عمل کی ضرورت: سورۃ بقرہ کا خاتمہ بھی ایک دعا پر کیا تھا اور یہاں بھی دعا پر خاتمہ ہے مگر یہاں ساتھ قبولیت دعا کی بھی بشارت دیدی ہے یعنی یہ تمہاری دعا جو ہم نے خود تمہیں سکھائی ہے ضائع نہیں جائے گی بلکہ اللہ تعالیٰ قبول کر چکا ہے اور وہ قبولیت کا جواب جو مومنوں کی اس دعا پر دیا گیا یہ ہے کہ میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو خواہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرونگا یعنی ان کے عمل کو بار آور کیا جائے گا اور ان کا مقصود و مطلوب ان کو دیا جائے گا۔ یہ قبولیت دعا ہے کہ کام کرو گے تو اجر پاؤ گے۔ صرف دعا کوئی چیز نہیں جب تک کہ اس کے ساتھ عمل نہیں۔ مسلمانوں نے دعا کے مسئلہ کو کس قدر غلط سمجھ رکھا ہے۔ بعض تو قبولیت دعا کے ہی منکر ہو گئے بعض افراط کی طرف چلے گئے یعنی دعا کی طرف جھکے تو اسباب سے کام لینے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر یہ قرآن کی تعلیم نہ تھی۔

۵۹۳ سیئاتکم۔ سیئات۔ سیئة کی جمع ہے اور گو سیئة قبیح فعل کو بھی کہتے ہیں جو نیکی کے مقابل پر ہے مگر حسنة اور سیئة دونوں کا استعمال ایک اور معنی میں بھی ہوتا ہے یعنی وہ چیز جس کو طبیعت پسند یا ناپسند کرتی ہے جیسے فرمایا ان تمسسکم حسنة تسؤھم وان تصبکم سیئة یفرحوا بھا (آل عمران ۳ - ۱۱۹) ایسا ہی ذھب السیئات عنی (ھود ۱۱ - ۱۰) میں بھی سیئات سے تکالیف جسمانی مراد ہیں۔ دیکھو ۱۰۵۔

وہ عمل جن پر کامیابی ملتی ہے: پہلے حصہ آیت میں فرمایا تھا کہ عمل کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا۔ اب اس عمل کی کچھ تفصیل فرمائی ہے پہلا کام جو ان لوگوں نے کیا وہ ہجرت ہے۔ چونکہ وطن سے نکالے جانے کا ذکر بعد میں آتا ہے اس لیے یہاں مراد صرف ترک مانھی اللہ عنہ ہے اس کے بعد ہے کہ اپنے گھروں سے نکالے گئے اور رضائے الٰہی کو انہوں نے اس قدر مقدم کیا کہ وطن کی پروا بھی نہیں کی۔ پھر گھروں سے نکال دینے کے بعد بھی خدا کی راہ میں ان کو ایذا پہنچائی گئی۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾	جو کافر ہیں اُن کا ملکوں میں تصرف تجھے دھوکے میں نہ ڈالے۔ ۵۹۴
مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾	تھوڑا سا سامان ہے پھر اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔
لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ	لیکن جنھوں نے اپنے رب کا تقویٰ کیا اُن کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ	نہریں بہتی ہیں انہی میں رہیں گے یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے اور جو
عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾	اللہ کے پاس ہے وہ راستبازوں کے لیے بہت اچھا ہے۔ ۵۹۵

اوذوا فی سبیلی میں وہ ایذائیں مراد ہیں جو لبعد ہجرت کے ان کو برداشت کرنی پڑیں اور ان ایذاؤں کی انتہا یہ ہوئی کہ اُن کے اوپر چڑھائی کی گئی۔ تاکہ تلوار کے ساتھ ان کو نابود کیا جائے۔ اس لیے ان کو بھی بالمقابل جنگ کرنی پڑی جس کا ذکر لفظ قتلوا میں کیا ہے۔ پھر ان جنگوں کے اندر ان میں سے لوگ مارے بھی جاتے ہیں اس لیے وقتلوا پر ختم کیا۔ گو سارے نہ مارے جائیں مگر ایک قوم نے جب اپنے سر خدا کی راہ میں دیدیئے تو جتنے بھی ان میں سے کٹیں سبھی کو کہا جائے گا کہ انہوں نے اپنے سر کٹوا دیئے یہ وہ عمل ہیں جن پر خدا کی طرف سے اجر ملتا ہے۔

مومنوں سے وعدہ: یہ تو ان کے عمل ہوئے۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان اعمال پر کیا وعدہ ہے اوّل یہ کہ مَیں اُن کی تکلیفوں کو ضرور ان سے دُور کر دوں گا۔ یہاں سیئات سے مراد وہی تکلیفیں معلوم ہوتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا گو لفظ ایسا اختیار کیا ہے جس میں بدیوں اور گناہوں کو دُور کر کے ایک پاکیزہ بہشتی زندگی عطا کرنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اور دوسرا وعدہ قبولیت دعا پر یہ ہے کہ ان کو جنات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور یہ وعدہ گو اُخروی زندگی کے متعلق ہے مگر ہر ایک وعدہ کا کچھ نہ کچھ رنگ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس دنیا میں بھی دکھا دیا ہے اس لیے جس طرح سیئات کے دُور کیا جانے میں دونوں طرف اشارہ ہے قرین قیاس ہے کہ جنت آخرت کے وعدہ میں اشارہ کامیابی اور فتحمندی کی طرف بھی ہے۔ اور الفاظ قرآنی اس دنیوی وعدہ پر یوں صفائی سے صادق بھی آتے ہیں کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں صاف طور پر دجلہ (جس کی جگہ حدیث میں لفظ نیل ہے) اور فرات جیحون اور سیحون کو انہار الجنۃ قرار دیا ہے۔ پس اخروی جنّت کے وعدہ کے ساتھ اس دنیا میں بھی فتوحات کا وعدہ مخفی ہے۔ دو دفعہ لفظ ثواب کے لانے میں دونوں وعدوں کی طرف اشارہ ہے۔

گناہوں سے پاک کرنے والی چیزیں: یہ بھی قابلِ غور امر ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے کس قدر امور کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ مسیحی تو ایک صلیب مسیح کو لیے پھرتے ہیں کہ اس سے ساری دنیا گناہوں سے پاک ہو گئی۔ مگر یہاں ایک ایک مسلمان صلیب سے بڑھ کر مصیبت اٹھاتا ہے۔ منہیات کو ترک کرتا ہے وطن کو چھوڑتا ہے ایذا دیا جاتا ہے۔ تلوار سے اس کی جان لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور حق یہی ہے کہ ایک کی صلیب سے دوسرا نہیں بچتا بلکہ ہر شخص کو بجائے خود صلیب سے بڑھ کر مصائب اٹھانی ضروری ہیں۔

۵۹۴ تقلب۔ قَلْب سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا ایک طرف سے دوسری طرف پھیرنا اور تقلب کے معنی تصرف ہیں (غ)، اور تَقَلَّبَ فِی الْاُمُوْرِ وَ الْبِلَادِ کے معنی دیئے ہیں تَصَرَّفَ فِیْھَا یعنی ان میں تصرف حاصل کیا (ل)

عیسائیوں کے تصرف کی پیشگوئی: یہاں الذین کفروا سے مراد مفسرین نے عموماً مشرکین مکّہ کو لیا ہے اور پھر ملکوں میں ان کے تقلب سے مراد ان کی تجارتوں وغیرہ کا ہونا لیا ہے۔ عمومیت الفاظ میں کفار قریش بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ مگر یہاں ذکر اہل کتاب کا ہو رہا ہے۔ پچھلے رکوع کی آخری آیات میں انہی کا ذکر تھا واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب اب آگے بھی انہیں کا ذکر آتا ہے وان من اھل الکتاب لمن یؤمن باللہ بلکہ سیاق عبارت صاف بتاتا ہے کہ یہاں کفار سے مراد اہل کتاب ہی ہیں کیونکہ پہلے ان کافروں کا ذکر کر کے پھر یہ کہہ کر کہ متقیوں کے لیے یہ اجر ہے یوں شروع کیا ہے وان من اھل الکتاب جہاں واؤ عاطفہ بتاتی ہے کہ انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کو ابھی والذین کفروا کہا تھا۔ یہودیوں کا تصرف تو نہ اس زمانہ میں تھا نہ بعد میں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ذلّت و محکومیت کی پیش گوئی ان کے لیے ہو چکی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ اس سے مراد عیسائیوں کا تصرف ہے اور یہ آئندہ کے لیے ایک پیش گوئی ہے کہ کسی زمانہ میں تمام ممالک میں ان لوگوں کا تصرف ہو جائے گا۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا وھم من کل حدب ینسلون (الانبیاء ۲۱-۹۶) وہ ہر ایک بلند مقام سے نکل پڑیں گے یعنی تمام بلندیاں خواہ بلحاظ مکان ہوں یا بلحاظ مرتبہ ان کے تصرف میں آجائیں گی اور جب ان کے تصرفاتِ عالم کا نقشہ کھینچا تو ساتھ ہی ایک تسلّی بھی دیدی کہ اے مخاطب ان کا ملکوں پر قابض اور متصرف ہو جانا تم کو یہ دھوکہ نہ دے کہ اس عظیم الشان تصرف کے سامنے اب اسلام نہیں ٹھہر سکتا۔ بلکہ یہ چند روزہ سامان ہے۔

۵۹۵ نزل۔ مَا یُعَدُّ لِلنَّازِلِ مِنَ الزَّادِ (غ) یعنی وہ زاد یا سامان جو نئے مہمان کے لیے تیار کیا جائے۔

یہاں جنّات اور نہروں کو متقیوں کے لیے نُزُل کہنے کی وجہ سے جو مہمان کے لیے پہلا پیشکش ہوتا ہے۔ یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ اگر جنات یعنی خود بہشت ہی نزل یعنی مہمانی کا پہلا پیشکش ہیں تو پھر اصل نعماء جو ملنی چاہئیں کچھ اور ہیں اس لیے بعض نے ان اصل نعماء کو ما عند اللہ کا مقام یا عندیت یا رؤیت الٰہی قرار دیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنات کے وعدہ میں دو وعدے مضمر ہیں ایک اس دنیا میں فتوحات کا وعدہ اور ایک آخرت کی جنت کا وعدہ اس لیے نُزُلًا من عند اللہ میں اوّل الذکر کی طرف اشارہ کیا ہے وما عند اللہ خیر للابرار میں موخر الذکر کی طرف۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ
خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا
وَرَابِطُوْا ۫ ع ۲۰ ۱۱

اور اہل کتاب میں سے وہ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر جو تمھاری طرف اُتارا گیا اور اس پر جو اُن کی طرف اُتارا گیا۔ اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہیں لیتے، انہی کے لیے اُن کے رب کے پاس اُن کا اجر ہے بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے[ع۵۹۶]
اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلے میں بڑھ کر صبر دکھاؤ اور محافظت کرو[ع۵۹۷]

ع۵۹۶ عیسائیوں کے اسلام لانے کی پیشگوئی: اس آیت میں اہل کتاب میں سے بعض کے ایمان لانے کا ذکر ہے۔ مفسرین نے عبداللہ بن سلام اور آپ کے ساتھیوں کی طرف جو یہود میں سے تھے۔ یا چالیس اہل نجران کی طرف اور بتیس اہل حبش اور آٹھ اہل روم کی طرف جو عیسوی دین پر تھے اشارہ سمجھا ہے اور سب سے زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ نجاشی کی طرف اشارہ ہے جس کا غائبانہ جنازہ بھی نبی کریم صلعم نے پڑھا مگر میرے نزدیک جس طرح لتسمعن من الذین اوتوا الکتاب میں عیسائیوں کے آئندہ زمانے میں اسلام کے خلاف بدزبانی کی اور کا فروں کے تقلب فی البلاد میں عیسائیوں کے دنیا میں تصرف کی پیشگوئی ہے۔ اسی طرح اب یہ بشارت سنا دی ہے کہ ہمیشہ حالت یکساں نہ رہے گی بلکہ اہل کتاب کا ایک حصہ آخر قرآن کریم پر ایمان لائے گا اور اس کی صداقت کو تسلیم کرلے گا۔ ایسے اشارات قرآن کریم میں بہت ہیں جن میں نصاریٰ کے آنحضرت صلعم پر ایمان لانے کی توقع دلائی گئی ہے چنانچہ یہ جو فرمایا لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا ولتجدن اقربھم مودۃ للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصٰری (المائدۃ ۵ – ۸۲) اس میں بھی یہی اشارہ ہے کہ یہودیوں میں سے بہت کم لوگ ایمان لائیں گے مگر عیسائیوں میں سے بہت اسلام لائیں گے۔ پس ان سابقین کے ساتھ ہم اس آیت میں ان تمام لوگوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں جو وقتاً فوقتاً نصرانیت کے عقیدہ باطل کو ترک کر کے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کرتے رہے ہیں اور بالخصوص ان لوگوں کو جو ایک معقول تعداد میں اس زمانہ میں اسلام میں شامل ہو رہے ہیں اور جو آئندہ شامل ہوں گے۔

ع۵۹۷ صابروا۔ صبر سے مفاعلہ ہے راغب نے اس کے معنی کیے ہیں کہ اپنی خواہشات سے مجاہدہ کرو کیونکہ مصابرۃ میں مقابلہ پایا جاتا ہے اور لسان العرب میں اصبروا کے معنی کیے ہیں اثبتوا علیٰ دینکم اپنے دین پر مضبوط رہو اور صابروا کے معنی کیے ہیں صابروا اعداءکم فی الجھاد یعنی اپنے دشمنوں کے ساتھ جہاد میں ان سے بڑھ کر صبر دکھاؤ۔ بہرحال صبر میں تینوں قسم کا صبر شامل ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے یعنی صبر فی المصیبۃ، صبر علی الطاعۃ، صبر عن المعصیۃ اور مصابرۃ سے مراد مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھانا ہے خواہ حرص و ہوا کے مقابلہ میں ہو یا دشمن کے مقابلہ میں۔

رابطوا۔ ربط سے ہے اور رَبْطُ الفرس کے معنی ہیں گھوڑے کو حفاظت کے لیے مکان پر باندھنا۔ اور رباط اس مکان کو کہتے ہیں جس میں محافظین کا قیام ہو۔ مفردات میں ہے کہ مُرَابَطَۃ جس سے رابطوا ہے دو طرح پر ہے ایک حدود پر گھوڑوں کا باندھنا یعنی دشمن کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہنا اور دوسری مُرَابَطَۃ انسان کے نفس کے متعلق ہے گویا نفس کو حدود پر کھڑا کیا گیا ہے تاکہ وہ انسان کی حفاظت کرے اور نبی کریم صلعم سے اس کے معنی میں انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ بھی مروی ہے یعنی ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار۔ لسان العرب میں بھی دونوں معنی رباط یا مرابطۃ کے ہیں۔ یعنی ایک دشمن کی حد پر قائم رہنا اور دوسرا ایک امر کی محافظت کرنا۔

بدی اور دشمن دونوں کے مقابلہ کی ایک ہی وقت میں تیاری کی ضرورت: یہاں فلاح کے لیے تین باتیں بتائی ہیں۔ صبر۔ مصابرۃ۔ رباط ان تینوں الفاظ میں اگر ایک طرف نیکی پر قائم ہونے اور باہم اچھا معاملہ کرنے کی ہدایت ہے تو دوسری طرف بدی کے مقابلہ اور دشمن کے مقابل میں تیار رہنے کی ہدایت ہے۔ صبر تو یہ ہے کہ نیکی پر قائم ہو جائے اور معصیت سے رک جائے یا جو مشکلات اور مصائب قضا و قدر سے یا دشمن کی طرف سے پیش آئیں ان کو برداشت کرے اور ان کے نیچے ہمت کو نہ ہارے مصابرۃ ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرنا یا اپنی خواہشات کے ساتھ جہاد کرنا۔ یا اپنوں اور قریبیوں اور ہمسایوں سے جو دُکھ پیش آئیں اُن کو برداشت کرنا۔ یا مصائب اور تکلیفوں کی برداشت میں اپنے دشمن سے فوقیت لے جانا ہے۔ گویا دشمن کے مقابلہ میں اس سے بڑھ کر مصائب کو برداشت کرنے کے عادی بنو اور رباط سے مراد لزوم اور ثبات ہے یعنی نیکیوں کے کرنے پر یا بدی سے رُکنے یا مصائب و مکارہ کے اُٹھانے میں دوام اور مضبوطی اختیار کی جائے اور دشمن کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہے اور ایک لمحہ بھی اس کی طرف سے غافل نہ ہو۔ دشمن سے مراد ملکی دشمن ہی نہیں۔ جو لوگ دین پر حملہ کرتے ہیں ان کے مقابلہ میں دلائل اور جواب سے اسی طرح تیار رہنا چاہیئے۔ مگر افسوس کہ مسلمان اس قدر غفلت کی نیند سو رہے ہیں کہ ملک اور حکومت تو ہاتھ سے نکلے تھے۔ اب ان کے مذہب پر حملہ پر حملہ ہو رہا ہے۔ کتابوں پر کتابیں نکل رہی ہیں۔ اور وہ تاریک کوٹھڑیوں کے اندر آنکھیں بند کیے ہوئے یہی سمجھ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰ ع

اور اللہ کا تقوےٰ اختیار کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ ۵۹۷

رہے ہیں کہ کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ تیاری کیسی۔ یہاں تو ایسی غفلت اور نیند میں پڑے ہیں کہ موت قبول کرنے کو راضی ہیں مگر بیدار ہونا نہیں چاہتے۔ افسوس کہ جس قدر ہوشیار اور چوکس رہنے کی تعلیم اس قوم کو دی گئی تھی۔ اسی قدر زیادہ غفلت میں یہ مبتلا ہوگئے۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ اصول قرآنی کو محکم نہ پکڑیں۔

ف ۵۹۷ سورت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ اللہ کا تقوٰی اختیار کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔ جیسا کہ میں نے اس سورت کی تمہید میں کہا تھا کہ یہ سورۃ اور سورۃ بقرہ دونوں ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں اس لیے جن الفاظ سے سورۃ بقرہ کی ابتدا کی تھی انہی پر آل عمران کا خاتمہ کیا ہے کیوں کہ وہاں بھی ھدی للمتقین کہہ کر اور یہ بتا کر کہ متقی کون ہیں فرمایا تھا اولٰئک ھم المفلحون یہی کامیاب ہونگے اب اسی کو آخر میں بیان کیا ہے فلاح، نجات، کامیابی سب تقوٰی میں ہے۔ چونکہ صبر اور مصابرہ اور رباط میں صرف مصائب اور دشمن کا مقابلہ بھی مراد تھا اس لیے یہ بتانے کو کہ مسلمان کے لیے صرف مقابلہ کر لینا ہی کافی نہیں۔ آخر پر تقوٰی اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ بغیر تقوٰی اختیار کیے اگر دشمن پر غالب بھی آ گئے تو اصل غرض زندگی کی پھر بھی حاصل نہ ہوئی۔ وہ اصل غرض تقوٰی اللہ کی ہے جس کی طرف بار بار قرآن شریف میں توجہ دلائی ہے اور حدیثوں میں بھی ہے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو عامل مقرر کرتے وقت بھی تقوٰی اللہ کی نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ معاذؓ کو جب آپ نے یمن پر حاکم کر کے بھیجا تو اس کو بدیں الفاظ نصیحت کی اتق اللہ حیثما کنت واتبع السیئۃ الحسنۃ تمحھا وخالق الناس بخلق حسن (ت) اللہ کا تقوٰی کرو جہاں کہیں تم ہو اور بدی کا پیچھا نیکی کے ساتھ کرو وہ اس کو مٹا دیگی اور لوگوں کے ساتھ اچھے خلق سے پیش آؤ۔

سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ (۴)

اٰیَاتُھَا ۱۷۶ — رُکُوْعَاتُھَا ۲۴

نام اس سورت کا نام النساء ہے کیونکہ اس میں عورتوں کے حقوق اور معاشرت اور خانہ داری کے متعلق اُمور کا ذکر ہے جو اُمور خانہ داری سے تعلق رکھتے ہیں جس قدر تفصیل کے ساتھ اس سورت میں ان کا ذکر ہے۔ دوسری کسی سورت میں نہیں اور خود قرآن شریف نے جس قدر ان امور کو ضروری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور جس قدر عورتوں کے حقوق پر زور دیا ہے دوسری کسی کتاب میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اس سورۃ میں ۲۴ رکوع اور ۱۷۶ آیات ہیں۔

خلاصہ مضمون اس سورت کا خلاصہ مضمون تین بڑے بڑے عنوانوں کے نیچے آتا ہے یعنی یتیموں اور عورتوں کے حقوق اور ان سے تعلقات۔ منافقین۔ یہودی۔ ان تینوں مضامین کے باہمی ربط کی کنجی پچھلی سورت کے مضمون کے آخری حصّہ سے ملتی ہے۔ جہاں جنگ اُحد کا ذکر تھا۔ جنگ اُحد سے جو بڑے بڑے امور پیدا ہوئے وہ یہ تھے کہ اوّل بہت سے مسلمان مارے گئے اور اس طرح پر بہت سے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں رہ گئیں اس لیے یتامیٰ اور عورتوں کے حقوق پر بحث کی ضرورت پیش آئی۔ دوم جنگ اُحد میں منافق الگ ہو گئے اور وہاں بھی کچھ ذکر ان کا آیا تھا۔ یہاں زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ سوم اس جنگ نے یہودیوں کی چھپی ہوئی خباثتوں اور ان کی عداوت قلبی کو ظاہر کر دیا۔ اسی لیے سورۃ آل عمران کے آخر پر بھی ان کا کچھ ذکر آیا تھا۔ اس سورت میں ان کی فتنہ پردازیوں کا کسی قدر کھول کر ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ پہلے بھی راستبازوں سے اسی طرح شرارتیں کرتے رہے۔ اسی اثنا میں حضرت مسیح کے ساتھ جو انہوں نے کیا اس کا ذکر کیا ہے اور پھر بالآخر ان کے مقابل پر عیسائیوں کے غلو کا ذکر کیا ہے۔

زیادہ تفصیل کے لیے رکوع وار خلاصۂ مضمون دیا جاتا ہے۔ پہلے رکوع میں یتامیٰ کے حقوق اور ولیوں کی ذمہ واریوں کا ذکر ہے اور اسی اثنا میں عورتوں کے حقوق کی طرف بھی کچھ توجہ دلائی ہے کیونکہ ان کے کمزور اور ضعیف ہونے کی وجہ سے ان کے حقوق بھی یتامیٰ کی طرح پاؤں تلے روندے جاتے تھے۔ دوسرے رکوع میں حقوق وراثت پر مفصل ہدایات دیں اور اولاد، والدین، میاں بی بی، بھائی بند سب کے لیے حصّے مقرر کیے۔ تیسرے رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔ چوتھے رکوع میں ان عورتوں کا ذکر فرمایا جن کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے۔ پانچویں رکوع میں کچھ عام نصائح بیان فرما کر اور یہ بتا کر ایک دوسرے کے اموال کو ناحق نہ کھا جاؤ جیسا کہ عرب میں عورتوں اور بچوں کے مال کو کھا جاتے تھے فرمایا کہ عورتوں کے اپنے مال پر وہی حقوق ہیں جو مردوں کے اپنے مال پر ہیں۔ چھٹے رکوع میں میاں بی بی کے اختلاف کی صورت کا ذکر کر کے احسان کی تعلیم دی بخل سے روکا۔ اتفاق کی طرف توجہ دلائی اور رسول کی نافرمانی سے ڈرایا۔ ساتویں رکوع میں اصل غرض کی طرف توجہ دلائی یعنی تزکیہ نفس۔ اور چونکہ نماز تزکیہ نفس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس لیے نماز اور وضو اور تیمم کے متعلق کچھ امور بیان فرمائے۔ یہودی جن ناپاکیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جن کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ سرچشمۂ قدوسیت یعنی ذات الٰہی سے دور پھینکے گئے اُن سے ڈرایا۔ اور شرک کے خطرناک نتائج سے بچنے کے لیے ہدایت فرمائی۔ آٹھویں رکوع میں بتایا کہ یہودی کس طرح خدا کے احکام سے انحراف کر کے شیطان کے پیچھے لگ گئے اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ اپنے معاملات کو نااہلوں کے سپرد مت کرو اور اللہ اور رسول اور اولوا الامر کی اطاعت کرو۔ ہاں اولوا الامر سے اختلاف ہو تو پھر اللہ اور رسول کے حکم پر عمل کرو۔ نویں رکوع میں یہ بتایا کہ وہ لوگ جو رسول کے فیصلہ کی طرف نہیں آتے اور رسول اللہ کی اطاعت نہیں کرتے منافق ہیں اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ انعام پاتے ہیں اور ان کو نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین کی معیت عطا ہوتی ہے۔ دسویں رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ حفاظت کے لیے جنگ کی ضرورت ہے مگر منافق اپنے آرام اور آسائش کو مدنظر رکھ کر جنگ میں شامل نہیں ہوتے۔ حالانکہ بہت سے کمزور مرد اور عورتیں اور بچے کفار کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھا رہے ہیں۔ گیارہویں رکوع میں بیان فرمایا کہ منافق مصائب سے بچنے کے لیے جنگ سے دل چراتے ہیں اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مشورے کرتے ہیں اور مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلانا چاہتے ہیں اور فرمایا کہ نبی تو اکیلا بھی جنگ کے لیے مکلّف ہے اور اللہ تعالیٰ آخر اس جنگ کو روک دے گا۔ بارھویں رکوع میں بتایا کہ منافقوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ تیرھویں رکوع میں مومن کو قتل کرنے کی سزا بیان فرمائی اور مومنوں کو ہدایت کی کہ ہر ایک شخص کو اپنا دشمن نہ سمجھ لیا کریں۔ ہاں خدا کی راہ میں جہاد کی ضرورت بیشک ہے اور مجاہد کا مرتبہ بیٹھ رہنے والے سے بہت بڑھ کر ہے۔ چودھویں رکوع میں ان کمزور لوگوں کا ذکر کیا جو ابھی تک ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ پندرھویں رکوع میں بتایا کہ گو جنگ درپیش آ گئی ہے۔ مگر نماز (جو اصل غرض ہے) اسے کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہیئے اور حالت جنگ میں بھی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنی چاہیئے۔ سولھویں اور سترھویں رکوع میں منافقوں کے خفیہ مشوروں کا ذکر کیا۔ اٹھارھویں رکوع میں شرک کے ہر ایک پہلو سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ انیسویں رکوع میں پھر یتامیٰ اور عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی۔ بیسویں میں بتایا کہ اپنا ہو یا غیر ہر ایک کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو۔ اور بتایا کہ جو ایمان لا کر پھر کافر ہو جاتے ہیں یعنی منافق وہ سرسبز نہیں ہوں گے۔ اکیسویں رکوع میں منافقوں کی سزا کا ذکر کیا۔ بائیسویں میں یہودیوں کی غلطیوں اور شرارتوں کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ کس طرح پر انہوں نے ایک پاک دامن عورت مریم پر بہتان باندھے اور اس کے بیٹے مسیح رسول اللہ کو صلیب کی سزا دلا کر ملعون ثابت کرنا چاہا۔ مگر خدا نے اس برگزیدہ انسان کو صلیب کی موت سے بچایا اور اپنے قرب کے مراتب عطا فرمائے۔ پھر ان کی دوسری شرارتوں کا ذکر کیا۔ تیئسویں رکوع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی طرف توجہ دلائی اور اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے نبیوں سے ایک ہی طرح کلام کرتا رہا ہے اور جس طرح اس نے پہلوں سے کلام کر کے ان کو اپنی رضا کی راہوں پر خبردار کیا۔ اسی طرح اب اس نے اپنی رضا کی راہیں محمد رسول اللہ کے ذریعے سے کھول دی ہیں۔ اور اہل کتاب کو بتایا کہ اگر ایک طرف یہودی مسیح کو دکھ دینے کی وجہ سے قابل الزام ٹھہرے تو دوسری طرف عیسائیوں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنۡہَا

اے لوگو! اپنے رب کا تقوٰے اختیار کرو، جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا[۵۹۸] اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔

نے بھی غلو کر کے ایک انسان کو خدا بنالیا۔ چوبیسویں رکوع میں بتایا کہ مسیح خدا کا ایک بندہ ہے اور اسی میں اس کی شان ہے اور آخر سورت کا خاتمہ پھر وراثت کے ایک مسئلہ پر کیا۔ جس میں یہ بتانا مقصود تھا کہ اب نبوت کی وراثت بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل کو پہنچی ہے۔

تعلق سورۃ بقرہ اور آل عمران میں اصل غرض اس بات کا بتانا تھا کہ مسلمان کس طرح پر ایک کامیاب اور زندہ قوم بن سکتے ہیں۔ اس کے بعد اندرونی معاملات قومی پر ہدایات ضروری تھیں اور چونکہ قوم کی زندگی کی بنیاد میاں بی بی کے تعلقات پر ہے اس لیے ترتیب قرآنی میں پہلی دونوں سورتوں کے بعد اسی بات کی ضرورت تھی جس کا ذکر اس سورۃ میں یعنی النساء میں پایا جاتا ہے۔ معاشرت کے صحیح اصول کو جو پایہ قوم کی زندگی میں حاصل ہے علاوہ اس کے کہ خود واقعات عالم اس کی شہادت دیتے ہیں۔ کیونکہ قوم کے وسیع نظام میں گھر بمنزلہ ایک اکائی کے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی طرف توجہ دلائی ہے جب فرمایا خیرکم خیرکم لاھلہ گویا بتادیا کہ اخلاق انسانی جو انسان کے مختلف تعلقات میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کا معیار گھر کے تعلقات یعنی بی بی سے سلوک ہے اور ان کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے۔

ایک اور رنگ میں اس سورت کا ربط پہلی سورت سے اس سے ظاہر ہے کہ پچھلی سورت کے آخری حصہ میں جنگ اُحد کے واقعات کا ذکر تھا اور اس سورت میں انہی امور کا ذکر ہے جو جنگ اُحد سے پیدا ہوئے۔ جیسا کہ خلاصہ مضمون سورت ہذا کی ابتدا میں دکھایا گیا ہے۔ پس طبعی ترتیب یہی تھی کہ سورت النساء سورت آل عمران کے بعد رکھی جاتی۔

زمانۂ نزول جیسا کہ اوپر کے نوٹوں سے ظاہر ہے۔ اس سورت کا نزول جنگ اُحد کے بعد کا ہے اور بیشتر حصہ کا نزول چوتھے سال ہجرت میں ہُوا لیکن خاص خاص آیات کا نزول پیچھے کا بھی معلوم ہوتا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت موجود ہے کہ سورۃ النسآء اس وقت نازل ہوئی جب آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تھیں۔ پس اس کے مدنی ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ ایک آیت کے متعلق البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مکی ہے یعنی ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا اس آیت کا شانِ نزول واقعہ مفتاح کعبہ ہے یعنی فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عثمان کو خانہ کعبہ کی کنجی دینا جس کے قبضہ میں پہلے سے یہ کنجی چلی آتی تھی۔ لیکن اس لحاظ سے بھی یعنی اگر اس آیت کو فتح مکہ کے وقت کا نازل شدہ مانا جائے۔ یہ آیت مکی نہیں کہلائے گی۔ کیونکہ اصطلاح میں جو کچھ بعد ہجرت نازل ہُوا وہ سب مدنی ہے۔ خواہ وہ مکہ میں ہی نازل ہُوا ہے۔ اصل تقسیم قبل ہجرت اور بعد ہجرت کی ہے کیونکہ ان دونوں زمانوں کی نازل شدہ وحی میں ایک بیّن فرق معلوم ہوتا ہے۔ قبل ہجرت زیادہ تر اُصولی تعلیم ہے یعنی توحید رسالت معاد وغیرہ پر بحث اور بعد ہجرت تفصیلات شریعت پر زیادہ زور ہے۔ کیونکہ تفصیلات شریعت کی ضرورت بعد ہجرت پیش آئی جب مسلمان ایک قوم کے رنگ میں الگ ہو کر رہنے لگے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عموماً لمبی سورتوں کا نزول ایک لمبے زمانہ پر ممتد رہا ہے اور یہ بات مدنی سورتوں کے متعلق بالخصوص صحیح ہے، کیونکہ تفصیلات شریعت وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہیں اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ جس طرح مثلاً سورۃ بقرہ میں جو پہلے سال ہجرت کی سورت ہے بعض آیات بہت پچھلے زمانہ کی ہیں۔ جیسے آیت ربا۔ اسی طرح اس سورت میں بھی بعض آیات بہت پچھلے زمانہ کی ہوں اور سورۃ احزاب کی بعض آیات کو جن میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں کا ذکر ہے۔ اس سورت کی آیت تعدد ازدواج کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت تعدد ازدواج پچھلے زمانہ کی ہے۔ یعنی غالباً فتح مکہ کے قریب زمانہ کی ہے۔ اس پر مفصل بحث دوسری جگہ آئے گی۔

۵۹۸ نفس۔ اس کے کئی معنی ہیں۔ روح جیسے اخرجوا انفسکم (الانعام ۶-۹۲) اور نفس ناطقہ یا وہ چیز جو انسان کو حیوانات سے متمیز کرتی ہے مایکون بہ التمییز (ل) اس کی مثال دی ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتھا (الزمر ۳۹-۴۲) اور بعض نے روح اور نفس میں یہ فرق کیا ہے کہ روح وہ ہے جس سے زندگی ہے اور نفس وہ ہے جس سے عقل ہے اور زجاج کا قول ہے کہ ہر انسان کے دو نفس ہیں یعنی حیات اور تمیز اور نیند میں ہی موخر الذکر نفس قبض کیا جاتا ہے (ل) اور نفس سے مراد سارا انسان بھی لیا جاتا ہے۔ جیسے ان تقول نفس یحسرتی (الزمر ۳۹-۵۶) اور کسی چیز کا نفس اس کی ذات ہے اور کسی چیز کے عین اور اس کے جوہر اور اس کی کُنہ کو بھی نفس کہتے ہیں (ل)

نفس واحدۃ سے کیا مراد ہے۔ عموماً یہاں اس سے حضرت آدم ابوالبشر کو مراد لیا گیا ہے۔ مگر دوسری جگہ جہاں یہی لفظ استعمال ہوتے ہیں ھوالذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا (الاعراف ۷-۱۸۹) شخص کا ذکر نہیں بلکہ جنس کا ذکر سمجھا گیا ہے (ث) اور امام رازیؒ نے قفال سے اسی کی مثل قول نقل کیا ہے۔ ھذہ القصۃ علی تمثیل ضرب المثل یعنی ہر انسان کو خطاب ہے کہ اسے ایک ہی انسان سے یعنی اس کے والد سے پیدا کیا اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہاں خطاب اہل عرب سے ہے اور مراد صرف ان کا مورث اعلیٰ ہے۔ پس وہی دو معنی یہاں بھی لیے جا سکتے ہیں اور یوں نفس واحدۃ سے مراد حضرت آدم بھی ہو سکتے ہیں۔ کسی ایک قوم کا مورث اعلیٰ بھی ہو سکتا ہے اور مثل کے طور پر ہر شخص بھی مراد ہو سکتا ہے۔

یہاں چونکہ حقوقِ انسانی کی طرف بالخصوص توجہ دلائی تھی اور اس میں بالخصوص کمزوروں یعنی یتامیٰ اور عورتوں کے حقوق کی طرف اس لیے فرمایا کہ اس نے تم کو

زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَآءَلُونَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ

اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں ۵۹۹ اور اللہ کے (حقوق کی) جسکے ذریعہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں

ایک نفس یا ایک ہی جی سے پیدا کیا۔ گویا تم سب ایک ہی کنبہ کے لوگ ہو۔ پس تم سب کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں۔ سب انسانوں کو ایک ہی جی سے پیدا کیا۔ یہ بڑی بھاری صداقت ہے اور اس میں نسل انسانی کے اتحاد کی بنیاد ہے۔ یورپ نے موجودہ دہریت کی رو کے نیچے یہ بھی خیال کر لیا ہے کہ ایک ماں باپ سے سب انسان پیدا نہیں ہوئے۔ کیونکہ خط و خال نقوش قد و قامت رنگت کے فرق بہت زیادہ ہیں۔ ایک یورپ کا آدمی خواہ کتنی مدت بھی افریقہ میں رہے اور گو کتنی بھی سیاہی اس کی رنگت پر آجائے مگر وہ پورا حبشی کبھی نہیں بن سکتا۔ اور نہ ایک حبشی یورپ میں رہ کر یورپین کی سفیدی اور خط و خال حاصل کر سکتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ وہ لوگ جو بندر اور انسان کو متحد الاصل مان سکتے ہیں ایک یورپین انسان اور حبشی انسان کو متحد الاصل نہیں مان سکتے۔ اور اس طرح پر نسل انسانی میں ایک تفریق قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ سب نسل انسانی کے حقوق متساوی نہ سمجھے جائیں۔ جب تک نسل انسانی کا اتحاد قائم نہ ہو اس وقت تک تفرقیات قومی مٹ نہیں سکتیں۔ اور چونکہ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ سب نسل انسانی ایک ہو جائے اور سب تفرقیات قومی مٹ جائیں۔ اس لیے اس حقیقت کی طرف بھی اس نے توجہ دلائی ہے۔

آدم سے پہلی نسل کا وجود: ہاں قرآن کریم نے بائبل کی طرح یہ نہیں کہا کہ نسل انسانی چھ ہزار سال سے ہے اور نہ ہی اسبات کو منوایا ہے کہ حضرت آدم جنکا ذکر دوسری جگہ قرآن شریف میں آیا ہے سب سے پہلے بشر تھے۔ بلکہ بعض روایات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی آدم ہوئے ہیں اور ابتدا نسل انسانی کی کب سے ہے یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ چنانچہ امامیہ کی روایات میں ایک روایت ہے ان اللّٰہ تعالٰی خلق قبل ابینا اٰدم ثلٰثین اٰدم بین کل اٰدم و اٰدم الف سنۃ وان الدنیا بقیت خرابا بعدھم خمسین الف سنۃ ثم عمرت خمسین الف سنۃ ثم خلق ابینا اٰدم علیہ السلام (م) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے باپ آدم سے پہلے تیس آدم پیدا کیے ہر ایک آدم اور آدم کے درمیان ایک ہزار سال گزرے، اور ان کے بعد دنیا پچاس ہزار سال ویران رہی پھر پچاس ہزار سال تک آباد ہوئی پھر ہمارے جد امجد آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور محمد بن علی الباقر سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا قد انقضی قبل اٰدم الذی ھو ابونا الف الف اٰدم او اکثر (د) اس آدم کے پہلے جو ہمارے باپ ہیں دس لاکھ آدم یا اس سے بھی زیادہ پیدا ہوئے اور شیخ اکبر نے فتوحات میں لکھا ہے کہ ہمارے آدم سے چالیس ہزار سال پہلے ایک اور آدم تھے اور خصائص میں امام صادق سے روایت ہے ان اللّٰہ تعالٰی اثنی عشر الف عالم کل عالم منھم اکبر من سبع سمٰوٰت و سبع ارضین (د) یعنی اللہ تعالیٰ کے بارہ ہزار عالم ہیں ان میں سے ہر ایک عالم سات آسمانوں اور سات زمینوں سے بڑا ہے۔

ع ۵۹۹ حوا کا آدم سے پیدا ہونا: الفاظ خلق منھا زوجھا میں یہ اشارہ سمجھا گیا ہے کہ آدم سے اس کے جوڑے یعنی حوا کو پیدا کیا اور یہ اس طرح ہوا کہ آدم کی ایک پسلی نکال کر اس سے حوا بنائی گئی۔ مگر قرآن کریم نے ایسے ہی الفاظ دوسری جگہ استعمال کیے ہیں۔ ومن اٰیٰتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ (الروم ۳۰ - ۲۱) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے ہی نفسوں سے تمہارے لیے بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے تسکین قلب حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحم بنایا۔ اور دوسری جگہ ہے واللّٰہ جعل لکم من انفسکم ازواجا (النحل ۱۶ - ۷۲) اب یہاں تمام انسانوں کو یہ کہا ہے کہ تمہاری بیبیاں تمہارے نفسوں سے پیدا کیں۔ حالانکہ یہ مراد نہیں کہ تمہاری پسلیوں سے پیدا کیں پس مرد سے عورت کے پیدا کرنے کا منشاء بھی خود قرآن کریم نے بیان فرما دیا ہے یعنی یہ کہ تم ایک دوسرے سے تسکین حاصل کرتے ہو اور تم میں محبت و رحم باہم اس قدر ہے کہ گویا مرد اور عورت دونوں ایک ہی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ایک جگہ من انفسکم اور دوسری جگہ منھا کا استعمال بالکل درست ہے کیونکہ مرد اور عورت کا اس قدر گہرا تعلق ہے کہ گویا عورت مرد سے ہی بنی ہے یا خلق منھا زوجھا سے مراد یہ ہے کہ جس ایک جی سے اے مردو تم کو پیدا کیا اسی سے تمہاری ازواج کو پیدا کیا پس تم مرد اور عورت کے درمیان کوئی اس قسم کا تفرقہ نہ کرو کہ ایک کو تو گویا حقوق انسانیت حاصل ہیں اور دوسرے کو نہیں۔ انسان ہونے میں عورتیں تمہارے ساتھ یکساں حقوق رکھتی ہیں کہ جہاں سے مرد پیدا ہو وہیں سے عورت پیدا ہوئی۔ ہر رنگ میں یہ الفاظ عورت کو ایک نہایت ہی عزت کا مقام دیتے ہیں۔

عورت کا پسلی سے پیدا ہونا: اور یہ جو خیال ہے کہ حدیث سے حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ پسلی سے پیدا کرنے کا ذکر بیشک بائبل میں پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے "آدم پر ایک بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا" (پیدائش ۲: ۲۱ و ۲۲) مگر کسی حدیث میں یہ نہیں اور جس حدیث سے یہ نکالا جاتا ہے وہ دو طرح پر بخاری میں کتاب النکاح میں آئی ہے ایک جگہ ہے المرأۃ کالضّلع (باب المداراۃ) عورت پسلی کی طرح ہے اور دوسری جگہ ہے واستوصوا بالنساء خیرا فانھن خُلقن من ضِلَعٍ (باب الوصاۃ بالنساء) عورتوں کے حق میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ ان دونوں حدیثوں میں حضرت حوا کے حضرت آدم سے پیدا ہونے کا ذکر مطلق نہیں بلکہ عام طور پر تمام عورتوں کا ذکر ہے۔ اصل میں حدیث کی ایک روایت دوسری کی خود تشریح کرتی ہے خلق من ضلع سے کیا مراد ہے۔ المرأۃ کالضلع نے اس کو صاف کر دیا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ عورتیں پسلی سے تو پیدا نہیں ہوتیں پس مراد وہی ہے جو دوسری حدیث میں بیان کر دی کہ وہ پسلی کی طرح ہیں یعنی ان میں اعوجاج ہے۔ ایسی مثالیں خود قرآن شریف میں ہیں خلق الانسان من عجل (الانبیاء ۲۱ - ۳۷) مطلب یہ کہ اس میں جلد بازی پائی جاتی ہے اللّٰہ الذی خلقکم من ضعف (الروم ۳۰ - ۵۴) یعنی تم میں ضعف پایا جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا ۝۱ | کی نگہداشت کرو اللہ تم پر نگہبان ہے ۔ ؀۶۱

انسان اوّل کی پیدائش کس طرح ہوئی کوئی فلسفہ اس کو کھول نہیں سکتا۔ قرآن کریم کی غرض بھی چونکہ یہ نہ تھی، کہ انسان کی ابتدائے پیدائش کا ذکر کرے۔ بلکہ اس کی غرض صرف یہ بتانا ہے کہ انسان کیا کمالات حاصل کر سکتا ہے اس لیے زمین و آسمان کس طرح پیدا ہوئے مادہ کس طرح پیدا ہُوا۔ روحیں کس طرح پیدا ہوئیں۔ حیوان کس طرح پیدا ہوئے۔ درخت کس طرح پیدا ہوئے انسان کس طرح پیدا ہوئے ان سوالوں کو یہ پاک کتاب نہیں چھیڑتی اور نہ "کس طرح" کا جواب کبھی انسان اپنے ان قویٰ کے ساتھ دے سکتا ہے بلکہ دے سکنا تو ایک طرف رہا سمجھ بھی نہیں سکتا۔ خواہ ہم مسئلہ ارتقا کو لے لیں اور خواہ عام طور پر جو مسلمانوں میں خیال پایا جاتا ہے اس کو لے لیں اور خواہ جو بعض دوسرے مذاہب پیش کرتے ہیں اس کو لے لیں۔ انسان اوّل کی پیدائش کسی عجیب رنگ میں ہی ہوئی جو دنیا کے موجودہ قوانین قدرت سے الگ کوئی قانون ہے خود قرآن کریم نے یبدئ ویعید میں بدؤ اور عود کے دو قانونوں کا ذکر کیا ہے۔ پس انسان اوّل کی پیدائش کے لیے کوئی الگ حالات تھے۔ پہلی عورت بھی انہی حالات کے ماتحت پیدا ہوئی ہوگی۔

سوال یہ ہو سکتا ہے کہ عورت میں کیا ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے۔ ٹیڑھا پن سے مراد یہاں ایک طرف کا میلان ہے۔ آیا یہ ایک طرف میلان عورت میں مرد سے بڑھ کر ہے، واقعات مجبور کرتے ہیں کہ اس کا جواب ہم اثبات میں دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو قسم کی صفات دنیا میں کام کر رہی ہیں ایک نرمی کی صفت اور دوسری صفت خشونت۔ نرمی کی صفت میں اثر پذیری زیادہ ہے اور صفت خشونت میں اثر ڈالنا زیادہ ہے اب قدرت نے مرد و عورت کے ملاپ کے لیے اور ایک کو دوسرے کا زوج بنانے کے لیے یہ تقسیم کی ہے کہ نرمی کی صفت کو عورت میں زیادہ رکھا ہے اور صفت خشونت کو مرد میں زیادہ رکھا ہے اسی لیے مرد و عورت کا تعلق ایک دوسرے کی تسکین قلبی کا موجب ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک میں جو کمال ہے وہ دوسرے کے نقص کو پورا کر دیتا ہے۔ صفت خشونت کا تقاضا یہ ہے کہ اس صفت کا مالک ہر قسم کی مخالف قوں وغیرہ کا مقابلہ خوب کر سکتا ہے مگر اس کا نقص یہ ہے کہ اس میں محبت اور ہمدردی کی کمی ہوتی ہے۔ نرمی کی صفت کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں محبت اور ہمدردی زیادہ ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ صفت چاہتی ہے کہ اس کا مالک جلد اثر قبول کرے اس لیے اس میں نقص یہ ہے کہ وہ جلدی ایک طرف کا میلان اختیار کر لیتا ہے یہی وہ اعوجاج ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے اور یہ عورت کے اس نقص کی طرف توجہ دلاتا ہے جو اس میں صفت محبت و رحم کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہونا ضروری تھا۔ اسی لیے مرد کو منع کیا ہے کہ وہ اس کی اقامت کے درپے ہو جائے۔ چنانچہ خلقن من ضلع کے بعد آتا ہے فان ذھبت تقیمہ کسرتہ حالانکہ اگر یہ کوئی ٹیڑھا پن اپنے معمولی معنی میں ہوتا تو اس کی اصلاح تو مرد کا فرض تھا۔ یہ عورت کا ایک طبعی تقاضا ہے۔ اس لیے وہ اس کے خلاف نہیں کر سکتی اور جو اس سے اس کے خلاف کرانا چاہے گا وہ اس طبیعت کو توڑے بغیر ایسا نہیں کرا سکتا۔

؀۶۰۰ تساءلون۔ اس کا اصل تتساءلون ہے جو باب مفاعلہ سے ہے یعنی ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ اللہ تم کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے سوال کرنے سے یہ مراد ہے کہ اللہ کا واسطہ دیکر سوال کیا جاتا ہے اور یہ صرف عرب ہی نہ کرتے تھے کہ ان کو مخاطب سمجھا جائے بلکہ کل دنیا میں اللہ کا واسطہ دیکر سوال کیا جاتا ہے۔

الارحام۔ رَحِم کی جمع ہے یعنی عورت کا رحم اور استعارۃً قرابت پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ قریبی ایک ہی رحم سے نکلے ہوتے ہیں۔ اسی مادہ سے لفظ رحمۃ۔ رحمان وغیرہ ہیں۔ اسی بنا پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رَحِم کا لفظ میرے نام رحمان سے مشتق ہے۔ انا الرحمٰن وانت الرحم شققتُ اِسْمَكِ من اِسْمِی الارحام یہاں اللہ پر عطف ہے یعنی اتقوا اللہ والارحام اور اتقوا الارحام سے مراد ہے ارحام کے حقوق کی نگہداشت کرو جیسا کہ اتقوا اللہ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی نگہداشت کرو۔ دیکھو ؀۱

رقیبا۔ رَقَبَۃ گردن کو کہتے ہیں اور رَقَبْتُہٗ کے معنی ہیں حَفِظْتُہٗ میں نے اس کی حفاظت کی۔ اسی سے رقیب بمعنی حافظ یا نگہبان ہے اور الرقیب اسمائے الٰہی میں سے ایک ہے۔

حقوق العباد صلہ رحمی میں داخل ہیں: پہلے حصّہ آیت میں جو حکم اتقوا ربکم میں دیا گیا تھا اسی کی تفصیل یہاں کی ہے اور ایک طرف اگر حقوق اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے تو دوسری طرف حقوق العباد کی طرف صلہ رحمی کا حکم دیتے ہوئے توجہ دلائی ہے اور حقوق العباد کو صلہ رحمی میں اس لیے داخل کیا ہے کہ ساری نسل انسانی کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیکر گویا سب کو ایک ہی خاندان کے افراد قرار دیا اس لیے کہ اسلام کی صلہ رحمی کا حکم بھی درحقیقت کل نسل انسانی پر حاوی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس صلہ رحمی کا یہی وسیع مفہوم لیا ہے جہاں اہل مصر کو حضرت ہاجرہ کے تعلق کی وجہ سے اپنے ننہال قرار دیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ جب مصر کے لوگ نہایت تنگی کی حالت میں نبی کریم صلعم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے لوگوں کو صدقہ کی تحریص دلاتے ہوئے یہی آیت پڑھی یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ جس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ نے خود ساری نسل انسانی کو ایک ہی کنبہ قرار دیا ہے اور سب کے ساتھ نیکی کو صلہ رحمی میں داخل کیا ہے اور دوسرے صلہ رحمی سے ہی حقوق العباد کی بنیاد پڑتی ہے۔ کیونکہ انسان کے تعلقات زیادہ تر قریبیوں سے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے حقوق العباد کا بڑا حصہ صلہ رحمی میں آجاتا ہے اور ایک انسان جب قریبیوں سے حسن سلوک کرتا ہے جن سے اسے دن رات واسطہ پڑتا ہے۔ تو وہ دوسروں سے حسن سلوک کا بھی عادی ہو جاتا ہے۔

صلہ رحمی کی تاکید: یہاں اللہ تعالیٰ نے اتقوا اللہ والارحام کہہ کر اور رحموں کے حقوق کی نگہداشت کو اپنے حقوق کی نگہداشت کے ساتھ بیان کر کے حقوق رحم کی عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ صرف عبادت کوئی چیز نہیں جب تک کہ ہر طرح کے حقوق جو انسان کے ذمہ ہیں ادا نہ ہوں۔ احادیث میں صلہ رحمی کی

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

اور یتیموں کو اُن کے مال دو اور اچھی چیز کو ردی سے نہ بدلو اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ یہ بڑا گناہ ہے ۶۰۱۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ

اور اگر تمھیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو (ایسی) عورتوں سے نکاح کرلو جو تمھیں پسند ہوں ۶۰۲۔

بڑی تاکید آئی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رَحِم کا نام میرے ہی نام سے مشتق ہے فمن وصلها وصلته ومن قطعها قطعته جو شخص صلہ رحمی کرتا ہے میں بھی اس کے ساتھ ملتا ہوں اور جو شخص قطع رحمی کرتا ہے میں بھی اس سے قطع کرتا ہوں اور ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا الصدقة على المسكين صدقة وعلى ذى الرحم ثنتان صدقة وصلة۔ یعنی مسکین پر صدقہ صدقہ ہے اور قریبی پر صدقہ دوہری نیکی ہے وہ صدقہ بھی اور صلہ رحمی بھی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اپنے قریبیوں کے سوائے دوسروں کو کچھ دے ہی نہیں۔ اصل سوال استحقاق کا ہے جب دو یکساں محتاج ہوں تو قریبی کا حق بیشک زیادہ ہے اسی لیے قرآن شریف نے جہاں احسان وغیرہ کا حکم دیا ہے وہاں ذوی القربٰی کو مساکین پر مقدم کیا ہے۔

ع۶۰۱ الیتامٰی اصطلاح شریعت میں یتیم صرف اس کو کہا جاتا ہے جو حدِ بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔ حدیث میں ہے لا يتم بعد الحلم یعنی بلوغت کے بعد یتیمی نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ۱۸ سال کی عمر بلوغت کی حد ہے۔

الخبیث بالطیّب۔ خبیث کے معنی ردّی بھی ہیں اور باطل یا حرام بھی اور طیّب کے معنی ستھرا بھی ہیں اور پاکیزہ یا حلال بھی۔ پس اس کے دو طرح پر معنی ہوسکتے ہیں حلال مال جو تم خود کما سکتے ہو اس کے بدلے میں یتیموں کا مال نہ لو جو تم پر حرام ہے۔ یا اپنی ردّی چیزوں کے ساتھ ان کے مال کی عمدہ چیزوں کو نہ بدل دو اور الٰی اموالکم میں الٰی بمعنی مع ہے یعنی ان کے ساتھ ملا کر مت کھا جاؤ۔

حوبا۔ حُوب کے معنی اثم یعنی گناہ ہیں۔ اس کا اصل حَوب سے ہے جس کے معنی زجر یا روک دینا ہیں۔

یتامٰی کی خبرگیری کی تاکید: چونکہ عورتوں کے حقوق کی طرح یتامٰی کے حقوق بھی پامال ہوتے تھے اور یہ دونوں گروہ کمزور تھے جن کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لیے ابتدا یتامٰی کے حقوق سے کی ہے۔ یتامٰی کی خبرگیری کے لیے اسلام میں اس قدر تاکید پائی جاتی ہے کہ مکّی وحی میں جب زیادہ زور صرف توحید باری پر تھا یتامٰی اور مساکین کی خبرگیری پر بھی اسی طرح زور دیا جاتا تھا۔ گویا بتا دیا کہ ایک خدا کو وہی مانتا ہے جو اس کی بیکس مخلوق پر شفقت کرتا ہے۔

ان آیات میں جن یتامٰی کا ذکر ہے وہ صاحب جائداد یتامٰی ہیں۔ جس طرح آجکل دنیا میں ہو رہا ہے کہ اپنے بھائی کو کمزور دیکھا تو اس کا مال دبا لیا۔ کسی قوم کو کمزور دیکھا تو اس کا ملک دبا لیا، یہی حالت ملک عرب میں تھی کہ ان لوگوں کی جائدادوں کو جو ابھی بلوغ کو نہ پہنچے ہوتے کھا جاتے تھے۔ یہاں ان یتامٰی کے بارے میں تین حکم دیئے ہیں۔ اول یہ کہ یتیموں کو ان کے مال دو یعنی ان کی ضروریات کے مطابق ان پر خرچ کرتے رہو ایسا نہ ہو کہ ولی بنکر تم ایسے ان کے مالوں پر متصرف ہو جاؤ کہ ان پر اُن کے مال خرچ نہ کرو اور ان کی تعلیم و تربیت کیلئے ان کے مالوں کو نہ لگاؤ دوسرا حکم یہ ہے کہ ان کے مالوں کو جو تمہارے لیے حرام ہیں اپنی حلال کمائی کو چھوڑ کر نہ کھا جاؤ یا اپنی ردّی چیزیں ان کی اچھی چیزوں کی جگہ نہ رکھ دو۔ اور تیسرا حکم یہ ہے کہ اپنے مالوں میں ملا کر ان کے مال نہ کھا جاؤ یعنی بظاہر شراکت کا رنگ ہو مگر اصل غرض ان کے مال کو کھانے کی ہو۔

ع۶۰۲ طاب کے معنی ہیں ایک چیز کا عمدہ اور پاکیزہ ہونا (ل) پس ماطاب لکم سے مراد ہے جس کی طرف بوجہ اس کی عمدگی اور اچھا ہونے کے نفس مائل ہو۔ دیکھو ع۸۲ اور اگلی آیت میں اسی سے طِبْنَ خوشی سے دینے کے معنی میں آیا ہے۔

یتامٰی کے ذکر میں عورتوں سے نکاح کے ذکر کا کیا تعلق ہے؟ اس کی چار توجیہیں کی گئی ہیں اول وہ جو حضرت عائشہؓ سے بخاری میں مروی ہے یعنی یہ کہ یتامٰی سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں جو اپنے ولی کی حفاظت میں ہوں اور ولی ان کے مال اور خوبصورتی کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ان سے نکاح کرلیں مگر تھوڑے مہر پر اور پھر چونکہ ان کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہیں۔ اس لیے ان سے اچھا معاملہ نہیں کرتے تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر ایسی یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تم کو اس بات کا خوف ہو کہ ان کے معاملہ میں انصاف نہیں کرسکو گے تو ان کو چھوڑ کر دوسری عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کرلو۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ اس میں چار سے زیادہ نکاحوں سے روکا ہے۔ کیونکہ عرب میں لوگ دس دس عورتوں تک نکاح کرلیتے پھر جب اپنا مال کفایت نہ کرتا تو یتامٰی کا مال اس طرح اُڑا دیتے۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ یتیموں کے بارہ میں اگر تم کو ناانصافی کا خوف ہے تو عورتوں کے بارہ میں بھی ناانصافی سے بچو اور چار سے زیادہ بیبیاں نکاح میں نہ لاؤ۔ اگر ان میں بھی عدل نہ کرسکو تو ایک ہی بی بی ہو۔ چوتھی توجیہ یہ ہے کہ وہ یتامٰی کی ولایت کو ناانصافی کے خوف کی وجہ سے مشکل سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اس سے خوف کرتے ہو تو اسی طرح عورتوں کے بارہ میں زنا سے بھی خوف کرو۔ یعنی اگر زنا میں پڑنے کا خوف ہو تو چار تک عورتوں سے نکاح کرلو۔

لیکن ان الفاظ کی ایک اور توجیہ بھی ہوسکتی ہے اور وہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہاں مراد ماطاب لکم من النساء سے اُمہات الیتامٰی ہیں یعنی یتیم بچوں کی مائیں۔ اور الّا تقسطوا فی الیتامٰی میں مراد وہ یتیم بچے ہیں۔ تو گویا آیت کا مطلب یوں ہُوا کہ اگر تم کو خوف ہو کہ یتیم بچوں کے بارہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو

وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ — دو دو اور تین تین اور چار چار[۶۰۳] اور اگر تمہیں خوف ہو

ایسی عورتوں سے جن کے وہ بچے ہیں نکاح کر لو۔ کیونکہ نکاح سے وہ بچے اولاد کی حیثیت حاصل کر لیں گے اور ان کی ذمہ واری ان کی والدہ کے شوہر پر ہوگی اس معنی کی آیت ۱۲۷ بھی مؤید ہے۔ اس لیے کہ اس آیت یعنی یستفتونک فی النساء کے بارہ میں یہ مسلّم ہے کہ یہ اُم کحت کے بارہ میں نازل ہوئی جو یتامیٰ کی والدہ تھی۔ پس معلوم ہوا کہ وہ آیت اُمہات الیتامیٰ کے بارہ میں ہے اور اس لیے اس آیت میں جو اس پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے۔ واضح کرتا ہے کہ یہاں بھی ان عورتوں کے نکاح کا ذکر ہے جو امہات الیتامیٰ ہیں اس توجیہ کے لیے آیت میں کچھ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں اور سیاق مضمون بھی یہی چاہتا ہے کیونکہ اصل مضمون اس رکوع میں عورتوں سے نکاح کا نہیں بلکہ یتامیٰ کی خبرگیری ہے پس یتامیٰ کی خبرگیری کی ایک دقت رفع کرنے کے لیے انکے نکاح کو ایک علاج کے طور پر بتایا ہے۔

ما طاب لکم سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ نکاح کے لیے پسندیدگی شرط ہے اور پسندیدگی کے لیے دیکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح مُسلم میں ایک حدیث ہے کہ ایک صحابی سے جو ایک انصاری بی بی سے نکاح کرنا چاہتے تھے نبی کریم صلعم نے دریافت کیا، کیا تم نے اسے دیکھ لیا ہے اس نے نفی میں جواب دیا تو آپؐ نے فرمایا جاؤ اسے دیکھ لو کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ نقص ہوتا ہے۔ اور جمہور علما کا یہی مذہب ہے کہ نکاح کے لیے عورت کو دیکھنا جائز ہے ہاں اس میں اختلاف ہے کہ عورت کی رضامندی سے دیکھے یا نہیں امام مالک کہتے ہیں دیکھنے کے لیے عورت کی رضامندی ہونی چاہیئے۔ جمہور اس کے خلاف ہیں۔ اور امام مالک کا قول قابل ترجیح ہے اور اس سے ایک اور استنباط بھی ہو سکتا ہے یعنی جب مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے تو عورت کے بھی ایسے مرد کو دیکھ لینے میں کوئی امر خلاف شریعت نہیں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا عمل اس پر نہیں یعنی اکثر نکاح بن دیکھے ہوتے ہیں اسی کا نتیجہ بے اتفاقیوں کی کثرت اور طلاق کی زیادتی ہے۔

دوسری بات جو ما طاب لکم سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ نکاح چھوٹی عمر میں نہیں ہونے چاہئیں۔ اس لیے کہ ایک چھوٹی عمر کا بچہ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کس طرح کر سکتا ہے جب وہ اس کو سمجھنے کے ہی قابل نہیں۔

۶۰۳ مثنیٰ وثلٰث وربٰع۔ یہ لفظ اثنین اثنین اور ثلاثۃ ثلاثۃ اور اربعۃ اربعۃ کے قائم مقام ہیں یعنی دو دو، تین تین، چار چار۔ اور ان کے درمیان واؤ لانے سے مراد ان کا جمع کرنا نہیں یعنی یہ منشا نہیں کہ ایک ہی شخص دو دو بھی کر لے اور تین تین بھی کر لے اور چار چار بھی کر لے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر ایک کو اس کے حالات کے مطابق دو کی اجازت ہے، تو دوسرے کو اس کے حالات کے مطابق تین کی اجازت ہے اور کسی کو چار کی۔ دو اور تین اور چار کو جمع کر کے اس سے نو کی اجازت نکالنا یا دو دو، تین تین، چار چار کو جمع کر کے ۱۸ کی اجازت نکالنا خلاف قواعد تاویل ہے اور اَوْ کے ساتھ ان الفاظ کو اس لیے عطف نہیں کیا کہ پھر مراد یہ ہوتی کہ یا دو دو کی اجازت ہے یا تین تین کی یا چار چار کی۔ حالانکہ مطلب یہ تھا کہ کسی کو دو کی اور کسی کو تین کی اور کسی کو چار کی اجازت ہے اور اس ترکیب کے اختیار کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ جب یوں کہا جائے کہ اس مال کو دو دو اور تین تین اور چار چار کر کے تقسیم کر دو تو اس سے مراد صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ کسی کو دو اور کسی کو تین کسی کو چار دے دو۔ اور چار سے زیادہ کی اجازت اس سے نہیں نکلتی۔ اور نہ ہی یہ مراد ہوتی ہے کہ ایک ہی آدمی کو دو اور تین اور چار یا نو دیدو۔

یہ الفاظ اسلام میں مسئلہ تعدد ازدواج کی بنیاد ہیں۔ الفاظ صریحًا ایسے تھے کہ نہ مخالفین کو اعتراض کا موقعہ تھا۔ نہ موافقین کو غلطی لگ سکتی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ جہاں ایک طرف مخالفین نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ گویا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نکاح میں کئی بیبیاں ہوں، بعض مسلمان کہلانے والوں نے بھی اپنی خواہشاتِ نفسانی کو پورا کرنے کے لیے اسے حکم قرار دیا ہے اور یوں اس کی تاویل کر لی ہے کہ سب سے افضل تو یہ ہے کہ چار بیبیاں ہوں ورنہ تین ورنہ دو۔ جس خیال کو قرآن شریف کے صاف الفاظ دھکے دے رہے ہیں سوالات غور طلب اس مسئلہ میں یہ ہیں (۱) کیا ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا حکم ہے یا اجازت (۲) کیا اجازت ضرورت کے لیے ہے یا بلا ضرورت بھی ایک سے زیادہ بیبیاں نکاح میں لائی جا سکتی ہیں۔ (۳) کیا اگر قرآن کریم نے یہی تعلیم دی ہے کہ بوقتِ ضرورت تعدد ازدواج کی اجازت ہے تو اس مسئلہ پر اعتراض ہو سکتا ہے (۴) یہ کہ آیا ضرورت کے ہوتے ہوئے چار سے زیادہ بیبیاں نکاح میں لانا جائز ہے۔

یہ اجازت ہے نہ حکم: سب سے پہلے دیکھنا ہے کہ حکم ہے یا اجازت۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دو تین چار بیبیوں سے نکاح کرنا کسی شرط سے مشروط ہے اور وہ شرط یتیموں کے بارہ میں انصاف نہ کر سکنے کا خوف ہے پس اوّل تو یہ آیت صرف ان لوگوں کے لیے ہوئی جن کو یتامیٰ کی خبرگیری سے تعلق پڑتا ہے اور عام نہ ہوئی اور یہ خود اس کے حکم ہونے کے خلاف دلیل ہے۔ دوسرے یہ بے معنی بات ہے کہ کہا جائے کہ اگر تم کو یتیموں کے بارہ میں انصاف نہ کر سکنے کا خوف ہو تو تمہارے لیے ضروری ہے کہ دو یا تین یا چار بیبیوں سے نکاح کر لو۔ پھر جس قدر توجیہات الفاظ ان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ کی کی گئی ہیں یا کی جا سکتی ہیں ان سب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشروط اجازت ہے نہ حکم۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ تعدد ازدواج کی اجازت ہے، حکم نہیں تو دوسرا امر یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ اجازت ضرورت وقت پر استعمال کرنے کے لیے ہے یا بلا ضرورت بھی۔ سو اول تو لفظ اجازت خود بتاتا ہے کہ یہ صرف ضرورت کے لیے ہے۔ کیونکہ ہر ایک اجازت دنیا میں کسی ضرورت کے لیے ہی ہوا کرتی ہے۔ دوسرے خود قرآن کریم کے الفاظ اس بات کے مؤید ہیں۔ کیونکہ وہاں خود ایک شرط ساتھ لگا دی۔ گویا ایک ضرورت خود بتا دی۔ اب ضرورت میں توسیع تو ہو سکتی ہے یعنی جو کام ایک ضرورت کے لیے جائز ہے اس کا جواز اجتہادی رنگ میں کسی دوسری ملتی جلتی ضرورت کے لیے ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اس ضرورت کو بالکل اڑا ہی دیا جائے۔

اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً کہ عدل نہیں کر سکو گے

تعدد ازدواج کی ضرورتوں کی تصریح کیوں نہیں کی: ہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم نے ان ضروریات کی تصریح کیوں نہیں فرما دی اس کا جواب یہ ہے کہ جن امور کا تعلق انسانی ضروریات کے مختلف پہلوؤں سے ہے جو ملکوں اور قوموں اور زمانہ اور حالات کے تغیر سے بدلتے رہتے ہیں۔ وہاں قرآن حکیم ان ضروریات کو گننے کی لاحاصل کوشش سے احتراز فرماتا ہے۔ مثلاً طلاق کا مسئلہ ہے۔ قرآن کریم نے کہیں نہیں بتایا کہ فلاں فلاں ضروریات کے وقت طلاق دینا جائز ہے۔ حالانکہ یہ نہایت ہی بیّن امر ہے کہ طلاق کی اجازت ضرورت کے لیے دی ہے نہ بلا ضرورت۔ لیکن چونکہ طلاق کے لیے جو ضروریات پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ نہ صرف انسانوں کی مزاجوں کے اختلاف کے ساتھ ہی بدلتی رہتی ہیں۔ بلکہ قومی اور ملکی اور زمانی حالات کے تغیر سے بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے ان کا بتانا ایک لاحاصل کام تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے ممالک میں جہاں سب قوموں کا ایک ہی مذہب ہے ایک سی تعلیم ہے ایک سے خیالات ہیں۔ ایک سے حالات ہیں۔ کوئی دو ملک ضروریاتِ طلاق پر اتفاق نہیں کرتے۔ اسی طرح تعدد ازدواج کی ضروریات کو خاص کرنا محال ہے۔

تعدد ازدواج کی ضرورت: اب تیسری بات جس پر ہم نے غور کرنا ہے یہ ہے کہ آیا جس صورت میں قرآن کریم نے تعدد ازدواج کی اجازت ضرورت کے وقت دی ہے تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس بات سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ہر ایک قوم نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ اسلام نے ان ضروریات کا علاج تعدد ازدواج کی صورت میں رکھ دیا۔ دوسری قوموں نے اس کے لیے طرح طرح کے اور طریق اختیار کیے حتّٰی کہ بعض ملکوں میں قانوناً زنا کے پیشہ کو تسلیم کیا گیا ہے اور بعض نے اس کو اس حد تک رواج دیا ہے کہ قانونی جواز سے کچھ کم مرتبہ اس کا نہیں رہا۔ اسلام چونکہ عورت کی عزت اور عفت کا حامی ہے اور اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ عورتیں پیسوں کے عوض اپنی عفت کو فروخت کریں۔ اس لیے تعدد ازدواج کی صورت میں ان تمام مشکلات کو حل کر دیا ہے۔ پھر علاوہ دوسری ضروریات کے جنگ ایک ایسی ہی ضرورت ہے کہ وہ بعض حالات میں تعدد ازدواج پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جنگ کا سلسلہ دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔ اور جنگوں میں مردوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی رہتی ہے۔ اب چونکہ قدرتی حالت جس کے اندر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ وہ مرد و عورت کے باہمی تعلق کی حالت ہے اور اسی پر نسل انسانی کی ترقی موقوف ہے۔ اس لیے نسل انسانی کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہر ایک مرد اور ہر ایک عورت اپنے اس فرض کو پورا کرے۔ اب اگر مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے تو چونکہ بچّہ کا پیٹ میں رکھنا جننا پرورش کرنا عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ اس لیے نسل انسانی کا ہر ایک فرد جسے ممکن طور پر یہ موقعہ ہے اپنے اس فرض کو ادا کر سکتا ہے اور جو مرد بلا بیویوں کے رہ جائیں گے۔ وہ کسی صورت میں نسلِ انسانی کی ترقی کا موجب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے، اور یہی وہ صورت ہے جو جنگوں اور مردوں کی دوسری ضروریات کی وجہ سے اکثر حالات میں دنیا میں پیش آتی رہتی ہے تو جو عورتیں بلا خاوندوں کے ہوں گی وہ نسل انسانی کی ترقی میں صرف تعدد ازدواج کے ذریعہ سے معاون ہو سکتی ہیں۔ گویا اس صورت میں تعدد ازدواج ایک قومی فرض ہو جاتا ہے اور ایسے حالات میں جب پہلے ہی آبادی کم ہو جاتی ہے ان عورتوں کو خاوندوں کے بغیر چھوڑنا گویا عمداً نسل انسانی کی افزائش کی راہ کو روکنا ہے۔ اس سے علاوہ عموماً عورتوں کے معاش کا انحصار مردوں پر ہوتا ہے پس جو عورتیں جنگوں میں بیوہ رہ جاتی ہیں یا یتیم رہ جاتی ہیں ان کے متعلق پیچھے رہے ہوئے مردوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اُن کی خبر گیری اور پرورش کریں اور اس کے لیے ایک ہی راہ ہے، جو قدرت نے رکھی ہے یعنی ان کو نکاح میں لے آنا۔ یورپ بیشک تعدد ازدواج کا منکر ہوا ہے لیکن خدا تعالیٰ نے یورپ پر اتمام حجت بھی نہایت بیّن طور پر کیا ہے۔ کیونکہ وہاں باوجود امن کے عورتوں کی تعداد مردوں سے مدت سے بڑھی ہوئی چلی آتی تھی اور پچھلی باہمی جنگ نے اور بھی مردوں کی تعداد کو کم اور عورتوں کی تعداد کو زیادہ کر دیا ہے۔ آخر عقلمند غور کریں گے کہ جس صورت میں نسلِ انسانی کی افزائش کو جنگ سے سخت نقصان پہنچا ہے اور پیچھے کثرت سے عورتیں موجود ہیں جو اگر خاوندوں کے گھروں میں ہوں خواہ ایک خاوند کے گھر میں دو دو، تین تین چار چار عورتیں ہی کیوں نہ ہوں نسل انسانی کی افزائش کا موجب ہو سکتی ہیں تو یہ کس قدر دور اندیشی سے بعید ہے کہ ایک فرضی روک پیدا کر کے نسل انسانی کی افزائش کو اس طرح جنگ کے ساتھ یہ دوسرا صدمہ پہنچایا جائے یا دوسری صورت یہ ہوگی کہ ناجائز تعلقات سے بچے پیدا ہوں جو نہ صرف سوسائٹی اور قوم کے لیے ننگ اور عار کا موجب اور ماؤں کے لیے پرلے درجہ کی ذلت کا باعث ہوں۔ بلکہ ان کی خبر گیری کا بھی کوئی اہتمام نہ ہونے کے باعث وہ حقیقی طور پر قوم کی ترقی کا موجب نہیں ہو سکتے۔ اور چونکہ ان کا کوئی کفیل بھی نہ ہوگا۔ عقلمند انسانوں کا یہی کام ہے کہ فرضی اور وہمی رکاوٹوں پر آخر وہ غالب آ جاتے ہیں۔ اسی طرح یورپ کے عقلمند مجبور ہو کر اس امر کو قبول کریں گے کہ واقعی بعض حالات میں تعدد ازدواج ایک فرض قومی ہو جاتا ہے۔ بلکہ اب بھی جبکہ ایک خطرناک عالمگیر جنگ نے یورپ کے بیشمار مردوں کو خاک کے نیچے سلا دیا ہے ایک قوم اس بات پر بحث کر رہی ہے کہ موجودہ حالات کے ماتحت سوائے تعدد ازدواج کے قوم کے تباہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ خود انگلستان میں ہر سو مرد کے لیے ایک سو دس عورتیں ہیں۔

سب الہامی کتابیں اور سب راستباز تعدد ازدواج کے مجوز ہیں: اس ہدایت کا منجانب اللہ ہونا اس سے بھی ثابت ہے کہ دنیا کی الہامی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جس نے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا ہو۔ اور ہر قوم کے بڑے بڑے مقدس اور برگزیدہ لوگوں میں تعدد ازدواج کی مثالیں پائی جاتی ہیں حالانکہ اگر تعدد ازدواج جائز نہیں تو پھر یہ زنا ہے اور یہ کبھی وہم میں نہیں آ سکتا کہ تمام قوموں کے مقدس بزرگ نعوذ باللہ من ذٰلک ایک ایسے امر کا ارتکاب کرتے۔ وہ جنہوں نے اللہ کی رضا کے لیے سب کچھ دیدیا وہ ایک امر فاحش کا ارتکاب کبھی نہ کر سکتے تھے۔ پھر جب سب الہامی کتابوں نے ادنیٰ سے ادنیٰ گناہوں سے روکا تو کسی کتاب نے تعدد ازدواج سے کیوں نہ روکا۔ خود انجیل باوجود اس کے کہ اس وقت یہودیوں میں تعدد ازدواج پر عمل ہوتا تھا ایک حرف اس کے خلاف نہیں کہتی۔ ہاں پولوس کی تعلیم میں صرف پادریوں کو یہ ہدایت ہے کہ ایک بی بی پر قناعت کریں عوام کو پھر بھی اجازت رہی۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى   تو ایک ہی[۶۰۴] یا جس کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے[۶۰۵] یہ زیادہ

چار کی حدبندی: اس دوا کو تجویز کرتے ہوئے اسلام نے دو اور روکیں ایسی تجویز کر دی ہیں کہ حدِّ اعتدال سے اس کا استعمال نہ بڑھ جائے وہ دو روکیں یہ ہیں: کہ اوّل تو چار تک حدبندی کر دی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چار کی حدبندی کوئی نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک تو اجازت دیتے ہوئے ایک خاص عدد پر بس کر دینا خود اس اجازت کی آخری حد کو بتاتا ہے۔ دوسرے تعامل اس پر شاہد ہے۔ تیسرے بعض روایات سے یہی گواہی ملتی ہے۔ مثلاً نوفل بن معاویہ ایمان لائے تو ان کے ہاں پانچ بیبیاں تھیں۔ نبی کریم صلعم نے حکم دیا کہ چار رکھ لو اور ایک کو طلاق دیدو (ک) یا غیلان بن سلمہ ایمان لائے اور ان کی دس بیبیاں تھیں تو نبی کریم صلعم نے چار رکھ کر باقی کو طلاق کا حکم دیدیا اور اس حدیث کو ترمذی ابن ماجہ، بیہقی، دارقطنی اور امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے کہ عمیرۃ الاسدی ایمان لائے تو آٹھ عورتوں کے خاوند تھے نبی کریم صلعم نے چار رکھ کر باقی کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ باقی رہا نبی کریم صلعم کی بیبیوں کا معاملہ سو چونکہ یہ مضمون بطور خود علیٰحدہ بحث چاہتا ہے اس لیے اس پر سورۃ احزاب میں مفصل بحث ہوگی جہاں یہ ذکر ہے۔ اس قدر یہاں بتا دینا کافی ہوگا کہ نبی کریم صلعم کو بھی یہ حکم ہوا تھا کہ وہ اور بیبیاں نکاح میں نہ لائیں بلکہ جو اس وقت آپ کے نکاح میں تھیں ان کو طلاق دیکر ان کی جگہ اور شادی کرنے سے بھی روکا گیا تھا۔ لا یحل لك النساء من بعد ولا ان تبدل بهن من ازواج (الاحزاب[۳۳]-۵۲) اس لیے آپ کے عقد میں جو نو بیبیاں تھیں تو چونکہ یہ شادیاں اغراض دینی کے لیے ہوئی تھیں اس لیے آپ کو یہ حکم نہ ہوا تھا کہ چار رکھ کر باقی کو طلاق دیدیں۔ دوسری روک جو تعدادِ ازواج کے مسئلہ پر قرآن کریم نے ڈالی ہے وہ عدل کا قائم رکھنا ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

ع۶۰۴ اس حصّہ میں بتایا ہے کہ اگر ضرورت بھی پیدا ہو مگر ایک شخص دو بیبیوں میں عدل قائم نہیں رکھ سکتا، تو پھر ایک شوہر اور ایک بی بی کے اصول پر ہی عمل کرے۔ اس سے دو کھلے نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ایک شوہر اور ایک بی بی کا اصول ہی نکاح میں اصل الاصول ہے اور یہ ایسا مستحکم اصول ہے کہ گو یا ضروریات بھی دوسرے رنگ کی پیدا ہو جائیں جو تعدادِ ازواج کو ضروری ٹھہرا دیں، تاہم اگر ایک شخص صرف اس بات پر قادر نہیں کہ وہ دو بیبیوں میں عدل قائم رکھ سکے تو بھی وہ ایک بی بی سے زیادہ نکاح میں نہ لائے پس قرآن کریم نے صاف طور پر سمجھا دیا کہ نکاح میں قاعدہ یہی ہے کہ ایک بی بی اور ایک شوہر ہو۔ ہاں جب ضروریات پیدا ہو جائیں تو پھر تعدادِ ازدواج کی طرف بطور ایک استثناء کے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

عدل کی شرط: دوسرا نتیجہ جو ان الفاظ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ تعدادِ ازواج پر عدل کی روک ایک بڑی بھاری روک ہے اور دوسری جگہ فرمایا: ولن تستطيعوا ان تعدلوا بين النساء ولو حرصتم (النسآء[۴]-۱۲۹) تم طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کرسکو خواہ تم کتنا ہی چاہو۔ ان الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ غلطی بھی کھائی ہے کہ یہاں عدل کی شرط رکھ کر اور دوسری جگہ عدل کو انسانی استطاعت سے باہر قرار دیکر تعلیق بالمحال کر دی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شریعت میں ایک امر کی اجازت دینا اور پھر اس کو ایک محال امر کے ساتھ مشروط کرنا قرآن جیسی حکیم کتاب کی طرف منسوب نہیں ہوسکتا۔ اگر یہی منشاء تھا، تو صاف یوں ہی فرما دیا ہوتا کہ تعدادِ ازدواج کی تمہیں اجازت ہی نہیں۔ یہ محض یورپ کی تقلید نے باتیں کہلوائی ہیں۔ مگر مقلدین یورپ خوب یاد رکھیں کہ یورپ ایک سیہ کاری اور گند کے اندر مبتلا ہے جس سے اگر کبھی وہ باہر نکل سکتا ہے تو خدا کے بتائے ہوئے علاج تعدادِ ازدواج کے ذریعہ سے ہی نکل سکتا ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ جہاں عدل کے ساتھ تعدادِ ازدواج کو مشروط کیا ہے تو وہاں مراد ظاہری سلوک میں عدل ہے یعنی نان ونفقہ میں باری میں اور ظاہری امور میں اور جہاں یہ فرمایا کہ تم عدل کر ہی نہیں کرسکتے وہاں محبت میں مساوات مراد ہے یعنی دو بیبیوں سے یکساں محبت ہونا یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے اور اس پر خود قرینہ شاہد ہے کیونکہ وہاں آگے فرمایا فلا تميلوا كل الميل۔ یعنی محبت کے معاملہ میں بالکل ایک طرف سے نہ جھک جاؤ۔ یہاں تک کہ ایک غریب عورت بی بی کہلا کر پھر درمیان میں لٹکی ہوئی ہو۔ پس عدل کی اس تشریح کے سمجھانے کو ہی وہ لفظ اختیار فرمائے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اس میں پھر سمجھا دیا کہ تعدادِ ازدواج ایک بڑا مشکل مقام ہے جس کو بغیر سخت ضرورت کے اختیار نہ کیا جائے۔

ع۶۰۵ ما ملكت ايمانكم۔ اَیمان۔ یمین کی جمع ہے جو یمن سے ہے جس کے اصل معنی برکت ہیں (ر) اور یَمِین اصل میں دائیں ہاتھ یا دائیں طرف کو کہتے ہیں مگر کئی اور معنی میں بھی آگیا ہے مثلاً حق کی جانب۔ جیسے تاتوننا عن اليمين (الصّٰفّٰت[۳۷]-۲۸) یا سعادت و برکت کی جانب جیسے اصحاب اليمين (الواقعۃ[۵۶]-۲۷) اور قسم کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے گزر چکا اور معاہدہ کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے مولی اليمين سے مراد وہ شخص ہے جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو (غ) اور لاخذنا منه باليمين میں زجاج نے یمین کے معنی قدرت کیے ہیں (ل) ایک حدیث میں آتا ہے اَلْحَجَرُ الْاَسْوَدُ يَمِيْنُ اللّٰهِ جس کے معنی میں امام راغب لکھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے اس سعادت کی طرف پہنچا جاتا ہے جو اس کی طرف قریب کرنے والی ہے اور ابن اثیر میں ہے کہ یہ کلام مثال کے طور پر ہے کیونکہ جب بادشاہ کسی شخص سے مصافحہ کرتا ہے تو وہ اس کے ہاتھ کو چومتا ہے۔ پس اس لیے کہ اسے چوما جاتا ہے اسے یمین اللّٰہ کہا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ حجر اسود اس عہد کے لیے بطور ایک نشان کے تھا جو بائبل میں کونہ کے پتھر کے متعلق پایا جاتا ہے پس یمین اللّٰہ میں اسی اللّٰہ تعالیٰ کے عہد کی طرف اشارہ ہے۔

ملک یمین سے مراد امام راغب کے نزدیک صرف اسی قدر ہے جیسا فی یدی سے یعنی میرے ہاتھ میں یا میرے قبضہ میں۔ مگر جو مختلف معنی اوپر دیئے گئے ہیں ان کے لحاظ سے ما ملكت ايمانكم کے معنی ہونگے وہ جن کے مالک تمہارے معاہدات ہوئے یا جن پر تم قدرت پاکر مالک ہوگئے۔ چنانچہ اس حدیث میں کہ نبی کریم صلعم کے آخری الفاظ تھے الصلوٰة وما ملكت ايمانكم مراد زکوٰۃ لی گئی ہے (ن) اور الا ما ملكت ايمانكم (۲۴) میں ایک معنی منکوحہ عورتیں ہیں یعنی وہ جن کے تم بذریعہ معاہدات مالک ہوئے۔ اور قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں پر بھی یہی الفاظ بولے گئے ہیں جن سے مراد

اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ﴿۳﴾ نزدیک ہے تاکہ تم ناانصافی نہ کرو ۶۰۶

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ﴿۴﴾

اور عورتوں کو اُن کے مہر بلا بدل دو۔ پھر اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمھارے لیے خود دیں تو اسے مزے سے خوش گواری سے کھاؤ ۶۰۷

یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر تم نے قدرت پالی۔یعنی جنگ کر کے ان پر متسلط ہو گئے۔

یہاں او ما ملکت ایمانکم سے کیا مراد ہے؟ عموماً لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ طریق چار کی حد بندی کو توڑنے کے لیے ہے کہ لونڈیاں جتنی چاہے کوئی رکھے حالانکہ اس سے اصل غرض ہی باطل ہو جاتی ہے۔اگر حد بندی ضروری تھی تو اس کا اس طرح توڑ دینا جائز نہیں کہ لونڈیوں کی شکل میں جس قدر کوئی چاہے زیادتی کر لے۔اب ترکیب عبارت میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔یا تو یہ کہ اَوْ کے ذریعہ سے عطف النساء پر ہو۔یعنی ترکیب یوں ہو فانکحوا ماطاب لکم من النساء او من ماملکت ایمانکم یعنی نکاح کرو جو تم کو پسند ہوں عورتوں سے یا لونڈیوں سے الخ اس صورت میں لونڈیاں خود عورتوں والی حدبندی کے اندر ہیں یا واحدۃ کے بعد یہ کوئی الگ ہی صورت ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر ایک بھی میسر نہ آئے تو لونڈی سے نکاح کر لو اور اس کی مؤید وہ آیت ہے جس میں آگے چل کر لونڈی کے ساتھ نکاح اس شرط پر مشروط قرار دیا ہے جب زوجہ میسر نہ آئے۔چنانچہ فرمایا ومن لم یستطع منکم طولاً ان ینکح المحصنٰت المؤمنٰت فمن ماملکت ایمانکم من فتیٰتکم المؤمنٰت (النساءؔ۔ ۲۵) اور زیادہ سے زیادہ اس کو واحدۃ کے ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے یعنی اگر عدل نہ کر سکو تو ایک بی بی کے ساتھ چار کی حد تک لونڈیوں کو جمع کر سکتے ہو۔گو اس میں یہ لازم آئیگا کہ لونڈیوں کے معاملہ میں کسی عدل کی ضرورت نہیں۔حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ان کے حقوق نصف ہی سہی مگر پھر بھی عدل کی ضرورت تو ہے اس لیے پہلی یا دوسری توجیہہ ہی درست ہے۔

۶۰۶ تعولوا۔اس کا مادہ عَول ہے اور عَول اور غَوْل کا مفہوم ملتا جلتا ہے اس قدر فرق ہے کہ غَالَہٗ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ چیز ہلاک کر دے اور عالہٗ اس وقت جب وہ بوجھ کے نیچے دبا دے اور عَول وہ مصیبت ہے جو بھاری ہو اور اسی سے تعولوا کے معنی لیے گئے ہیں زیادہ لیکر انصاف کا ترک کر دینا (رغ) عَوْل کے معنی ہیں فیصلہ میں ظلم کی طرف مائل ہونا (ل) اور اصل میں یہ معنی بھی ثقل سے لیے گئے ہیں اس لیے کہ عال المیزان اس وقت کہا جاتا ہے جب ترازو بوجہ ثقل کے ایک طرف مائل ہو جائے اسی لیے دل کے میلان پر یہ لفظ بولا گیا ہے اور امام شافعیؒ نے اَنْ لَّا تَعُوْلُوْا کے معنی لیے ہیں تاکہ تمہارا عیال زیادہ نہ ہو اور کسائی نے بھی عال یعول کے معنی کثرت عیال فصحائے عرب سے نقل کیے ہیں (ر)

ذٰلك میں اشارہ فواحدۃ کی طرف ہے یعنی ایک بی بی سے ہی ایک شوہر کا نکاح ہونا زیادہ مناسب ہے تاکہ انسان ناانصافی سے بچا رہے گویا پھر دوسری بار فواحدۃ کے اصول پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ عام لوگوں کے لیے جو اعلیٰ درجہ کا ضبط اور انصاف نہیں رکھتے یہی مناسب ہے کہ وہ ایک ہی بی بی پر کفایت کریں، یا کثرت عیالداری کی مصیبت کے نیچے دب جانے سے بچنے کے لیے یہ زیادہ مناسب ہے کہ ایک ہی بی بی ہو پس ان الفاظ سے بھی یہی شہادت ملتی ہے کہ گو اسلام نے بعض ضروریات کے لیے مشروط اجازت تعدّد ازدواج کی دی ہے مگر آخر پر پھر سفارش یہی کی ہے کہ اصولاً ایک بی بی اور ایک شوہر کا ہونا ہی زیادہ مناسب طریق ہے اور دوسری بی بی کا عقد نکاح میں لینا اسی صورت میں ہے جب ضروریات انسانی مجبور کر دیں۔ان روکوں کا رکھنا خود بتاتا ہے کہ سخت ضرورت کے سوا تعدد ازدواج جائز نہیں۔

۶۰۷ صدقات۔صَدُقَۃ کی جمع ہے جس کا اصل صدق ہے اور صَدَقَۃ وہ مال ہے جو انسان قرب حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے اور صَدُقَۃ صُداق اور صِداق عورت کے مہر کو کہا جاتا ہے (رغ)

نِحْلَۃ۔وہ عطیہ جو تبرع کے طور پر ہو (رغ) یعنی اس کا معاوضہ کوئی نہ ہو۔اور یہ بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں کہ بغیر مطالبہ کے طیّبِ نفس سے دے۔امام راغبؒ کہتے ہیں کہ نحلۃ سے مراد ھبۃ اس لیے ہے کہ نحل یعنی شہد کی مکھی جب کسی چیز پر بیٹھتی ہے تو اس کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ موجب نفع ہوتی ہے اس لفظ سے مہر کی حقیقت پر قرآن کریم نے بڑی روشنی ڈالی ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ وہ کسی چیز کا معاوضہ یا بدل نہیں بلکہ وہ محض عطیہ بلا بدل کے طور پر خاوند کی طرف سے ایک تحفہ ہے۔

ھنیئا۔ھَنِیْءٌ۔ھناء سے ہے وہ چیز ہے جس میں کسی قسم کی مشقت نہ ہو۔اور اصل میں یہ لفظ کھانے پر بولا جاتا ہے۔

مریٔا۔مرء سے ہے اور مَرِیْءٌ اصل میں راس معدہ ہے اور کھانے کے متعلق مَرُؤَ یا اَمْرَأَ اس حالت میں کہا جاتا ہے جب وہ طبیعت سے موافقت کی وجہ سے معدہ سے مخصوص ہو یا ھنیٔ وہ ہے جس سے کھانے والا مزہ حاصل کرے۔اور مریٔ وہ جو انجام کار اچھا ثابت ہو۔

مہر دینے کی تاکید: چونکہ یتامیٰ کے ذکر میں عورتوں سے نکاح کا ذکر آ گیا اور عورتوں کا ایک خاص حق جو اسلام نے ہی دیا ہے مہر ہے اور عورتوں کے حقوق پر بھی اس سورت میں بحث ہونی تھی اس لیے بہ تعلق مضمون نکاح مہر کا ذکر بھی کر دیا۔اس آیت میں اوّل عورتوں کو مہر دینے کی تاکید فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کو بغیر ان کے مطالبہ کے مہر دیدو۔اسی لیے لفظ نحلۃ بڑھایا ہے جس میں ساتھ ہی یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ مہر کسی چیز کا معاوضہ قطعاً نہیں بلکہ محض

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝	اور کم عقل لوگوں کو تم اپنے مال نہ دے دو جن کو اللہ نے تمھارے لیے سہارا بنایا ہے اور تم انھیں ان کے ذریعہ سے کھانے کے لیے دو اور انھیں کپڑا پہناؤ اور انھیں بھلی بات کہتے رہو ۶۰۸
وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ	اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تب اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو اور فضول خرچی سے اور جلدی کر کے اُن کو کھانہ

ہبہ بلا بدل کے طور پر ہے اور اس کو قرض کے طور پر تسلیم کر لینا جیسا کہ آج کل رواج ہے اصل غرض کو باطل کرنا اور عورت کو عملاً اس کے حق سے محروم کرنا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ نکاح کرنے سے پیشتر انسان کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی قوت بازو سے کما کر عورت کو مہر دے سکے اور اس میں مال کمانے کی اہلیت پیدا ہو چکی ہو۔

مہر پر لڑکی کے والد کا کوئی حق نہیں: دوسرا حکم اس لفظ میں اولیاء یعنی باپ وغیرہ کو ہے کہ مہر کوئی ایسی چیز نہیں کہ وہ لڑکی کی قیمت کے طور پر خاوند سے وصول کریں۔ بلکہ وہ عورت کا مال ہے جو اس کو ملنا چاہیئے۔ عرب میں لوگ ایسا کر لیتے تھے جیسا کہ یہ رواج بعض اطراف ہند میں بھی پایا جاتا ہے کہ جب لڑکی کا نکاح کر دیتے تو اس کے مہر کو خود وصول کر لیتے، پس اس رسم بد سے روکا ہے۔

ع۶۰۸ قیام۔ قام کا مصدر ہے۔ دیکھو ع۵۰۱ مگر قیام اور قِوام کا استعمال اس شے پر بھی ہے جس کے ذریعہ سے کوئی چیز قائم ہو یا ثابت رہے (غ) یہی معنی یہاں ہیں۔ یہاں مال کو قیام کہا ہے یعنی وہ تمہاری زندگی کا موجب ہے اور دوسری جگہ انہی معنوں میں فرمایا جعل اللّٰہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس (المائدۃ ۵ - ۹۷)

ارزقوھم فیھا۔ اگر ارزقوھم منھا ہوتا تو اس کے معنی ہوتے کہ اس مال میں سے ان کو کھانے کے لیے دو اور یوں مال ضائع ہو جاتا۔ لیکن فیھا کہہ کر یہ بتا دیا کہ ان اموال کے ذریعہ سے ان کو رزق دو یعنی ان اموال کو ایسے منافع اور آمدنی کا ذریعہ بناؤ کہ اس نفع یا آمدنی سے ان کا گزارہ ہوتا رہے۔ اس آیت میں یتامیٰ کے ذکر کی طرف رجوع کیا ہے مگر بجائے صرف یتامیٰ کا نام لینے کے اس قسم کے تمام لوگوں کو داخل کر لیا ہے۔ سفہاء سے کیا مراد ہے۔ وارزقوھم فیھا فرما کر بتا دیا ہے۔ کیونکہ جب ان کو مال نہ دیا تو اب یہ حکم دیا کہ راس المال کو ایسے کم عقلوں کے ولی تباہ نہ کریں بلکہ اس مال کو تجارت یا کسی اور کام پر لگا کر اس سے منافع یا آمدنی سے ان کا گزارہ چلائیں۔ پس جو لوگ کسی قسم کی تجارت یا کوئی اور شغل معاش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اپنے راس المال کو تباہ کرتے چلے جاتے ہیں وہ سب کم عقلوں میں داخل ہیں۔ ان کے سپرد مال کرنے کی بجائے یہ حکم دیا کہ ان اموال کو تم کسی تجارت وغیرہ میں لگاؤ اور منافع سے اُن کو کھانے پینے کو دو۔ یہاں مخاطب حکام ہیں۔ اسی لیے اموالکم کہا کیونکہ فرداً فرداً جس قدر اموال ہیں وہ درحقیقت قوم کے اموال ہیں اور جس قدر مال ضائع ہوگا وہ قومی نقصان ہے۔ اسی لیے اموال کو قیام یعنی قوم کے بقاء کا موجب قرار دیا ہے۔ جس قوم کا مال تباہ ہو جاتا ہے وہ گر جاتی ہے۔

یتامیٰ وغیرہ کی تربیت: علاوہ کھانے اور لباس کے ایک اور ضرورت بتائی وقولوا لھم قولاً معروفا۔ ان کو بھلی بات کہتے رہو۔ مفسرین نے عموماً نصیحت کے چند فقرے اس سے مراد لیے ہیں، مگر قفال کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ غلاموں کی سی معاشرت نہ کرو بلکہ ان کو نیکیوں کی طرف توجہ دلاتے رہو اور بتاتے رہو کہ اسرافِ مال کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک اس میں ان کی تربیت کے اہتمام کی ضرورت بتائی ہے اور اسی لیے کھانے اور پہننے کے ساتھ اس کو تیسری ضرورت بتایا ہے یعنی ان کی تربیت پر روپیہ خرچ کرتے رہو۔ چنانچہ اگلی آیت میں جو فرمایا وابتلوا الیتامیٰ وہ اسی کی طرف اشارہ ہے کہ جب ان کی تربیت کا اہتمام کرو تو ساتھ ہی ان کا امتحان بھی لیتے رہو کہ آیا وہ جائداد کو سنبھالنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قول معروف صرف معمولی نصیحت کا نام نہیں، بلکہ اچھے اصول پر تربیت کرنا بھی قول معروف میں داخل ہے۔

قرآن شریف میں بار بار اموال کی حفاظت کا حکم اور اس کے متعلق قوانین بنائے گئے ہیں جو شاید اور کسی مذہبی کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ کہیں تجارتوں کا ذکر ہے کہیں لین دین کا ذکر ہے کہیں رہن کا ذکر ہے کہیں وصایا کو ضروری ٹھہرایا ہے کہیں مال متروکہ کے حصے بتائے ہیں کہیں عورتوں کو مہر میں سونے کے ڈھیر دینے کا ذکر ہے کہیں اموال کی حفاظت کے لیے تحریر اور گواہی کو ضروری بتایا جاتا ہے کہیں اموال کا ٹھیک انتظام نہ کرنے والوں کے لیے ولی مقرر کرنے کی ہدایت ہے۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ مال دنیا کو اسلام نے حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بلکہ اس کی حفاظت کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اور یوں اس کو ایک مذہبی فریضہ قرار دیا ہے۔ اور مال دنیا کی جہاں تحقیر کی ہے تو وہ صرف اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ زندگی کا مقصد حصول اور فراہمی مال کو نہ سمجھ لیا جائے۔

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ

جاؤ کہ وہ بڑے ہو جائینگے ۶۰۹ اور جو آسودہ ہے چاہیئے کہ وہ بچا رہے اور جو حاجتمند ہے وہ مناسب طور پر لے لے ۶۱۰۔ پھر جب تم ان

ع ۶۰۹ بلغوا النکاح۔ نکاح کے اصل معنی عقد یعنی شادی ہیں اور یہاں نکاح سے پہنچنے کو مراد حد بلوغ کو پہنچنا ہے۔ یعنی اس عمر کو جس میں انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی شادی کی جائے۔ بلوغ کی بجائے لفظ نکاح رکھنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نکاح یا عقد کا تعلق بلوغ سے ہے کیونکہ یہاں نکاح اور بلوغ کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ پس صغر سنی میں شادی کرنا ٹھیک نہیں۔ بلوغ کا سن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اٹھارہ سال اور امام شافعیؒ کے نزدیک پندرہ سال ہے اور ابن عباس سے بھی لڑکے کے بلوغ کو پہنچنے کی عمر اٹھارہ سال ہونے پر روایت ہے (د) صحیحین میں حدیث ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں اُحد کے دن چودہ ۱۴ سال کا تھا تو جب میں آنحضرتؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے جنگ میں نکلنے کی مجھے اجازت نہ دی اور خندق کے دن میں پندرہ سال کا تھا تو آپ نے اجازت دیدی۔ مگر جنگ میں نکلنے کا تعلق قوائے جسمانی پر ہے۔ اور یہ بھی حدیث سے معلوم نہیں ہوتا کہ ابن عمرؓ کی عمر کا سوال نبی کریم صلعم کے سامنے پیش ہوا۔ اس لیے محض اس بنا پر سن بلوغ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

اٰنَسْتُم۔ اٰنَسَ الشَّیْءَ (مادہ انس) کے معنی ہیں۔ اَحَسَّہٗ یعنی اس کو محسوس کیا یا عَلِمَہٗ اس کو جانا (ل)

رُشْدًا۔ رُشْد کے اصل معنی کسی امر کی طرف ہدایت پانا ہیں اور وہ غَیّ کا نقیض ہے۔ حدیث میں ہے تؤنس منہ الرشد جس کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں کہ اس میں عقل کی پختگی اور فعل کی راستی اور اچھا تصرف جانا جائے (ن) یہاں یہی مراد ہے اور ایک وہ رُشد ہے جو امور اُخروی میں ہدایت کی طرف لیجاتا ہے ولقد اٰتینا ابراھیم رُشدہٗ من قبل (الانبیاء ۲۱-۵۱)

بدار۔ بَدَرَ کے معنی اَسْرَعَ یا جلدی کے ہیں اور بدار مصدر ہے اور بَدْر پورے چاند کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ سورج کے غروب کے بعد فوراً نمودار ہو جاتا ہے گویا اس نے مبادرت سے غروب آفتاب کو پا لیا۔

چونکہ پچھلی آیت میں یتامیٰ وغیرہ کی تربیت کا ذکر تھا۔ اس لیے اب فرمایا کہ اس تربیت کا نتیجہ بھی معلوم کرتے رہو کہ وہ کس قدر ترقی کر رہے ہیں۔ اور کس قدر اہلیت اپنے اپنے کاروبار کی موزونیت کی ان میں پیدا ہو رہی ہے۔ اور یہ انتظام اس وقت تک رہے کہ وہ حدِ بلوغ کو پہنچ جائیں۔ لیکن حد بلوغ کو پہنچنے پر بھی مال اس صورت میں ان کے حوالہ کیا جائے کہ ان میں عقل کی پختگی اور اموال میں حسن تصرف اور ضبط وغیرہ کی قوت ان میں دیکھو۔ گویا مال انکے سپرد کرنے کی دو شرطیں ہیں ایک بلوغ اور دوم پختگی عقل اور پھر چونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب مالک اموال بلوغ کو پہنچنے والا ہوتا ہے تو ولی اس خیال سے کہ اب تو وہ اپنے مال کو اپنے تصرف میں لے لیگا۔ اس میں اسراف وغیرہ کرتے ہیں۔ اس لیے اس سے بھی روکا۔

تربیت اولاد: یہاں جو کچھ ہدایات یتامیٰ کے متعلق دی ہیں ان میں عام طور پر تربیت اطفال کی صورت بھی سمجھا دی ہے کیونکہ جو کچھ ایک ولی کا یتیم کے متعلق فرض ہے وہ باپ کا بیٹے کے متعلق بطریق اولیٰ ہے۔ پس ہر والد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت قول معروف کے ساتھ کرے یعنی اس کو نیکی کی راہ بھی بتائے اور اس کو معاش پیدا کرنے کے قابل بھی بنائے۔ پھر دیکھتا رہے کہ کس قدر ترقی وہ کر رہے ہیں یہاں تک کہ بلوغ کو پہنچنے تک ان میں عام طور پر رُشد پیدا ہو جانا چاہیئے یعنی ان کو اموال میں ضبط و تصرف کے قابل ہو جانا چاہیئے اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں نے اس فرض سے سخت غفلت اختیار کر رکھی ہے اور وہ اپنی اولاد کو اس قابل بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ امرا کے بچے تو عموماً ایسے فضول خرچ اور عیاش ہو جاتے ہیں کہ سوائے والدین کے مال کو تباہ کرنے کے اور کچھ جانتے ہی نہیں متوسط الحال لوگ بھی اپنی اولاد کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں ان کی تعلیم و تربیت پر کچھ خرچ کرنا بوجھ سمجھتے ہیں۔ ہر والد کا پہلا فرض یہ نہیں جیسا کہ آج کل مسلمانوں نے سمجھا ہوا ہے کہ اس کی شادی کر دی بلکہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کر کے اس کی حیثیت کے مطابق اسے معاش پیدا کرنے اور نیکی کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنائے شادی کرنا اس کا اپنا کام ہے جب کمانے کے قابل ہو جائیگا تو خود شادی کرے گا۔

ع ۶۱۰ یستعفف۔ اس کا مادہ عفّ ہے اور عِفّة کے اصل معنی ہیں تھوڑی چیز کے پا لینے پر اپنے آپ کو روک لینا۔ کیونکہ عُفَافَة یا عُفَّة کسی چیز کے بقیہ کو کہتے ہیں (غ) اور اسی سے عِفّة کے مشہور معنی پاکدامنی ہیں یعنی انسان میں ایک ایسی حالت کا پیدا ہونا کہ غلبہ شہوت سے رُکا رہے۔ اور استعفاف میں بوجہ تکلف مبالغہ ہے کیونکہ اس کے اصل معنی ہیں طلب عفت اور یہاں مراد صرف رُکے رہنا ہے یعنی یتیم کا مال کھانے سے رُکنا ہے۔

فقیر۔ فقر سے ہے جس کا استعمال چار طرح پر ہے۔ اوّل ضروری حاجت کا پایا جانا جو سب انسانوں کے لیے عام ہے۔ بلکہ کل موجودات کے لیے جیسا کہ فرمایا یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ (فاطر ۳۵-۱۵) یعنی تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو۔ دوسرا فقر مال کا نہ ہونا ہے جیسے انما الصدقات للفقراء تیسرا نفس کا فقر ہے جو تمنائے نفس کے مقابل پر ہے اور یہ حرص اور لالچ ہے اور چوتھا فقر وہ ہے جو اللہ کی جناب میں انسان کو ہونا چاہیئے جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْکَ وَلَا تُفْقِرْنِیْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْکَ اے اللہ مجھے اپنا فقیر بنا کر غنی کر دے اور اپنی طرف سے لاپروا رکھ کر فقیر نہ بنائیو۔ اس معنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے ربّ انی لما انزلت الیّ من خیر فقیر (القصص ۲۸-۲۴) اور یہاں لفظ فقیر اول الذکر معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی حاجتمند کے معنی میں اور اس کے مقابلہ پر غنی سے مراد یہ ہے کہ اس کے ذرائع آمد وغیرہ ایسے ہیں کہ اس کو مال یتیم سے لینے کی کچھ احتیاج نہیں۔

چونکہ یتامیٰ کے ولیوں کو ان کے مال میں ہر قسم کے تصرف سے روکا تھا اس لیے اب یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ بطور حق الخدمت بھی کچھ لینا جائز ہے یا نہیں

إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ
بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿٦﴾
لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ
وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ
الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ
أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿٧﴾

کے مال اُن کے حوالے کرو تو اُن پر گواہ کرلو اور اللہ
کافی حساب لینے والا ہے [۶۱۱]
مردوں کے لیے اس سے ایک حصّہ ہے (جو اُن کے) والدین
اور قریبی چھوڑیں اور عورتوں کے لیے اس سے ایک حصّہ ہے
جو (اُن کے) ماں باپ اور قریبی چھوڑیں، خواہ وہ تھوڑا ہو
یا بہت، ایک مقرر حصّہ [۶۱۲]

سو حق الخدمت کو بھی اس حد تک محدود کر دیا کہ جو شخص انتظام کرتا ہے وہ اپنا کوئی ذریعہ معاش نہیں رکھتا تو لے سکتا ہے ورنہ نہیں۔

ع ۶۱۱ حسیب۔ حَسْب کے معنی کفایۃ ہیں جیسے حسبنا اللہ (التوبۃ ۹-۵۹) حسبھم جھنم (المجادلۃ ۵۸-۸) اور حساب کے معنی مشہور ہیں۔ پس حسیب کے معنی یا تو کافی ہیں اور یا محاسب یعنی حساب لینے والا اور گو حسیب اور محاسب کے معنی صرف حساب لینے والے کے ہیں۔ لیکن مراد اس سے مکافیٔ بالحساب ہیں یعنی حساب لیکر بدلہ دینے والا۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت حساب کی طرف توجہ دلاکر ہر قسم کی زیادتی سے روکا ہے۔ کیونکہ صرف ہدایات کا دینا کافی نہیں جب تک کہ کوئی روکنے والی طاقت ساتھ نہ ہو۔ سو اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات ہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کو مخفی سے مخفی گناہوں سے روک سکتی ہیں۔

ع ۶۱۲ جاہلیت میں یتامٰی کی ورثہ سے محرومیت: یہاں سے وراثت کا مضمون شروع ہوتا ہے مگر اصل غرض اب بھی یتامٰی کے حقوق کی حفاظت ہی ہے۔ کیونکہ یتامٰی کو خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں میراث سے حصّہ نہ دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ عرب کے لوگ کہتے تھے لا یرث الا من قاتل علی ظھور الخیل کوئی ورثہ نہیں لے سکتا مگر وہ جو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جنگ کرتا ہے۔ چنانچہ جب اُم کحت نے رسول اللہ صلعم سے شکایت کی کہ اس کے خاوند اوس بن ثابت کے ترکہ میں سے اس کی بیٹیوں کو کوئی حصّہ نہیں ملا اور کُل پر اس کے بھائی قابض ہو گئے ہیں تو انہوں نے رسول اللہ صلعم سے یہی عرض کیا تھا یا رسول اللہ ولدھا لا یرکب فرسا ولا یحمل کلا ولا ینکی عدوا۔ یعنی اس کی اولاد نہ گھوڑے پر سوار ہوتی ہے نہ بوجھ اٹھاتی ہے نہ دشمن کو مارتی ہے پس اس آیت نے ایک نہایت قدیم رسم کو موقوف کیا اور ترکہ میں مرد و عورت، بڑے اور چھوٹے، جنگ کرنے والے اور گھر بیٹھنے والے سب کو یکساں حصّہ دار قرار دیا۔

آنحضرتؐ کی قوت قدسی کا کمال: کسی پیغمبر کی زندگی میں اس کمال قوت قدسی کا نظارہ نظر نہیں آتا کہ سینکڑوں یا ہزاروں سالوں کی دیرینہ رسموں کو ایک لفظ سے نابود کر دیا ہو۔ تقسیم مال کے معاملہ میں کسی انقلاب کے ایک لفظ سے پیدا ہو جانے پر تاریخ شہادت دینے سے عاجز ہے۔ بڑے بڑے اولوالعزم نبی دنیا میں ہوئے مگر یہ قوت کسی کو نہ ملی جس کا نظارہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک واقعہ میں نظر آتا ہے تمام رسوم و رواج کی خطرناک زنجیریں اور طوق ایک اشارہ سے کٹ جاتے ہیں۔ صدیوں کی عادات جو طبائع انسانی میں پہاڑوں کی طرح قائم ہو چکے تھے۔ ایک پھونک سے اُڑ جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس انسان کے سامنے کوئی چیز انہونی نہیں کوئی کام ناممکن نہیں۔ ملک عرب میں خدا جانے کب سے یہ رواج جاری تھا کہ ورثہ صرف ان لوگوں کو پہنچ سکتا ہے جو ملک یا قوم کی حفاظت کر سکتے ہیں جو کما کر کھلانے کی طاقت رکھتے ہیں اور کس قدر استحکام یہ حاصل کر چکا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی حمایت میں کب کسی نے آواز اُٹھائی۔ اور جب تمام ملک کے اہل الرائے تمام بہادر تمام سپاہی تمام شیخ اس بات پر متفق الرائے ہوں تو کون اس کے خلاف آواز اُٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے۔

آپ کی یتیموں اور بیواؤں کی بے نظیر حمایت: بےکس یتیم اور عاجز عورتیں کیا اپنے ہی حامیوں، اپنے ہی محافظوں کے خلاف آواز اُٹھا سکتی تھیں؟ ہرگز نہیں۔ مگر آسمان سے ایک آواز آتی ہے اور اس کے سامنے تمام گردنیں جھک جاتی ہیں۔ ایک بادشاہ جس کی زندگی کا انحصار اس کے سپاہیوں کی بہادری پر اور ان کے تلوار چلانے پر ہو کیا وہ اُن سپاہیوں کے حقوق چھین کر دوسروں کو دینے کا کبھی خیال بھی کر سکتا ہے۔ محمد رسول اللہؐ کے دشمن آئیں اور یہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا کے کسی بادشاہ سے مقابلہ کر کے دکھائیں۔ آپ کو اپنے سپاہیوں کی اسی طرح رعایت اور دلداری منظور تھی جیسا جنگ کے وقت سب بادشاہوں کو ہوتی ہے مگر بےکس بچوں اور ناتوان عورتوں کے حقوق کے سامنے اپنے سپاہیوں کی رعایت کرنا تو ایک طرف رہا ان سپاہیوں کے صدیوں کے قائم شدہ حقوق کو چھین کر یتیموں اور بیواؤں کو دلاتے ہیں اور آپ کے پیروؤں کی جان نثاری بھی دنیا میں ایسی عدیم المثال ہے کہ وہ بغیر چون و چرا کے اپنے حقوق کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی تھی جس نے دنیا میں ایسے ایسے انقلاب پیدا کر کے دکھائے جن کی نظیر دنیا میں کوئی دوسرا انسان نہیں دکھا سکتا۔ اور یہ انقلاب قوت ملکی کے بھروسہ پر نہیں، قوت قومی کی حمایت سے نہیں بلکہ قوت ملکی اور قوت قومی کے مقابلہ میں کر کے دکھائے۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا
لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٨﴾

اور جب تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو ان کو اس میں سے کچھ دو اور ان کو اچھی بات کہو ۶۱۳

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ
ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا
اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٩﴾

اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیئے جو اگر اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑیں تو ان کے لیے ڈرتے ہوں، پس چاہیئے کہ اللہ کا تقوےٰ کریں اور چاہیئے کہ سیدھی بات کریں ۶۱۴

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا
إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ
ع وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾

جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی کھاتے ہیں اور وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہونگے ۶۱۵

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ

اللہ تمھاری اولاد کے متعلق تمھیں تاکیدی حکم دیتا ہے ۶۱۶ مرد کے

---

۶۱۳ تقسیم ترکہ کے وقت غرباء کو کچھ دینا: القسمة سے مراد تقسیم مال وراثت ہے یا وصیّت کی تقسیم - اذا حضر القسمة سے یہ مراد نہیں کہ وہ اس وقت آکر دست سوال دراز کریں تو ہی ان کو کچھ دینا چاہیئے بلکہ ان کی محض موجودگی مراد ہے خواہ وہ کہیں ہوں - اس آیت میں بتایا ہے کہ ایک تو وہ ہیں جن کے حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے لیکن ان کے علاوہ دوسرے قریبیوں کو (جن کو یہاں اولی القربیٰ کہا گیا ہے) اور مسکینوں اور یتیموں کو بھی فائدہ پہنچانا چاہیئے - یہ وسعت تعلیم اسلام سے خاص ہے - چونکہ بعض مفسرین نے قسمة کے معنی وصیّت کی تقسیم کو بھی لیا ہے - اس لیے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں دونوں قسمتیں مراد ہیں - اگر شخص متوفی خود اپنے قریبی رشتہ داروں کے لیے (جو معین حصّہ نہیں لیتے) یا مسکینوں یتیموں کے لیے اپنے مال کے کسی حصّہ کی وصیت کردے تو بہتر ورنہ تقسیم ترکہ کے وقت ان کو کچھ دے دیا جائے - بعض لوگوں نے اس آیت کو بھی منسوخ کہہ دیا ہے جس کی تردید بخاری میں حضرت ابن عباس کی روایت سے موجود ہے، یعنی آپ نے فرمایا کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں -

۶۱۴ سدید - سدّ سے ہے جس کے معنی کسی اختلال کا بند کر دینا یا روک دینا ہیں - اسی لیے قول سدید اس بات کو کہا جاتا ہے جو صواب یعنی صحیح موقعہ پر پہنچنے والی ہو - کیونکہ وہ اختلال کو روک دیتی ہے یا سداد یعنی قصد کو حاصل کر لیتی ہے -

یہ فطرتِ انسانی کو اپیل کی ہے کہ جس طرح اگر تم مر جاؤ اور تمھاری چھوٹی چھوٹی اولاد رہ جائے تو تم یہ چاہتے ہو کہ دوسرے اس پر رحم کریں اور اس کے متکفل بنیں اسی طرح تم مسکینوں اور یتیموں کی خبر گیری کرو -

۶۱۵ سعیرا - سعر کے معنی التهاب النار یا آگ کا شعلے مارنا یا بھڑکنا ہیں - اور سعیر بمعنی مسعورة ہے یعنی بھڑکائی گئی آگ -

اس آیت کے ساتھ چونکہ مضمون اور رکوع ختم ہوتا ہے اس لیے پھر یتامیٰ کے مال کھانے کے جرم سے ڈرایا ہے اور بتایا ہے کہ مال یتیم کا کھانا گویا آگ کا کھانا ہے اور آگ کا کھانا بطور مجاز ہے اور ان اسباب کا مہیا کرنا مراد ہے جو انسان کو آگ میں لے جائیں گے -

۶۱۶ اولاد - ولد کی جمع ہے جس کے معنی مطلق مولود ہیں یعنی جنا گیا اور واحد اور جمع میں چھوٹے اور بڑے پر (غ) مذکر و مؤنث میں (رغق) اور ولد الولد یعنی پوتے پر اس کا استعمال جائز ہے -

اسلام کا قانون وراثت: اس رکوع میں ورثاء کے مختلف حصص بتائے ہیں - عرب میں جائداد متروکہ کا کوئی حصّہ ضعفا یعنی عورتوں اور چھوٹے بچوں کو نہ ملتا تھا - اسلام نے ہر ایک شخص کی متروکہ جائداد کے چند حصّے کر دیئے ہیں - کچھ خاوند یا بی بی کو مل جاتا ہے - کچھ ماں باپ کو کچھ اولاد کو - اور بعض حالات میں بھائیوں بہنوں کو - یا قریبی رشتہ داروں کے نہ ہونے کی صورت میں دور کے رشتہ داروں کو گویا ہر شخص کی جائداد میں سے ان لوگوں کو حصّہ دیا ہے جن سے انسان کو کچھ نفع عام طور پر پہنچتا رہتا ہے - اس لیے وراثت کو سب میں تقسیم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ تا سب وہ لوگ جن سے انسان کو منفعت پہنچتی ہے اس سے منفعت حاصل کریں -

اسلام کا اصول تقسیم وراثت حقوق انسانی کی مساوات پر مبنی ہے - اولاد میں ایک مساوات ہے وہ سب حصّہ دار ہونے چاہئیں - یہ نہیں کہ بیٹیوں کو محروم کر دیا جائے اور بیٹوں کو ساری جائداد دیجائے اور نہ ہی یہ قرین انصاف ہے کہ ساری اولاد کو محروم کر کے ایک کے سپرد کل جائداد کر دیجائے جیسا کہ بعض ممالک

حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ

لیے دو عورتوں کے حصّہ کے برابر ہو پھر اگر (اولاد میں) دو (یا اس) سے اوپر عورتیں ہوں تو ان کے لیے اس کی دو تہائی ہے جو چھوڑا ع۶۱۶ اور اگر

میں سب سے بڑا بیٹا ساری جائداد کا مالک ہو جاتا ہے اور باقی سب اولاد محروم رہ جاتی ہے اسی طرح پر اگر میاں بی بی کی جائداد کا وارث ہو سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ بی بی میاں کی جائداد میں حصّہ نہ لے۔ اسی طرح ماں باپ کے حقوق ہیں۔ گویا اس تقسیم وراثت میں بھی اسلام نے جمہوریت کا اصول قائم کیا ہے کہ جن کے یکساں حقوق ہیں وہ سب اپنے حقوق کو پائیں۔ رہا جائدادوں کا بننا یا تقسیم ہونا سو جس طرح ایک انسان اپنی سعی اور کوشش سے ایک جائداد بنا سکتا ہے اسی طرح دوسرا بھی بنا سکتا ہے۔ جو قوتیں ایک انسان کو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں وہی دوسرے کو بھی دی ہیں جو سامان ایک کے لیے مہیا کیے ہیں وہی دوسرے کے لیے بھی مہیا کیے ہیں۔ پس جو مساوات قانون قدرت میں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اسی کو تقسیم وراثت میں مدِّنظر رکھا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے چار اصول قائم کر کے تقسیم دولت کا صحیح اصول قائم کیا ہے۔ اور موجودہ زمانہ کی مشکلات تقسیم دولت کا علاج اگر یورپ کو کبھی ملیگا تو صرف تعلیم اسلام میں۔ یورپ میں دو خیالات کی رو اس وقت چل رہی ہے۔ ایک خیال تو یہ ہے کہ ہر ایک فرد اپنی کوشش اور محنت سے جس قدر مال حاصل کرے وہ سب اس کا مال ہے۔ اسی خیال کے ماتحت یورپ میں حد درجہ کی خود غرضی بڑھ گئی ہے اور ملک کی دولت عوام کے ہاتھ سے نکل کر چند افراد کے ہاتھ میں آگئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر حصّہ نسل انسانی کا معمولی سامان معیشت سے بھی محروم ہے اور چند کس کروڑ پتی ہیں اس نقص کو دیکھ کر ایک دوسرا خیال پیدا ہوا ہے جو بولشوزم کے نام سے موسوم ہے جس کا اصول یہ ہے کہ سب انسان ملک کی دولت میں یکساں حصّہ دار ہیں۔ سب کوشش کریں۔ مگر ان کی کوششوں کا ثمرہ جو کچھ ہو وہ سب مشترک ہونا چاہیئے اور سب کو دولت کا یکساں حصّہ ملنا چاہیئے۔ مگر اس تحریک میں یہ نقص ہے کہ جب ہر ایک شخص اپنی کوشش سے جو کچھ حاصل کرے اس کا مالک نہیں تو زیادہ محنت اور کوشش کے لیے کوئی تحریص باقی نہ رہے گی۔ اسلام نے اگر ایک طرف لیس للانسان الّا ما سعیٰ کا اصول قائم کیا ہے یعنی جو انسان جس کے لیے کوشش کرے وہ اس کا مال ہے۔

تقسیم دولت میں مساوات قائم رکھنے کے لیے چار علاج: تو دوسری طرف اس بات کو روکنے کے لیے کہ دولت چند مخصوص ہاتھوں میں جمع ہوتی چلی جائے کچھ علاج تجویز کر دیئے گئے ہیں۔ انہی علاجوں میں سے ایک زکوٰۃ ہے جس کے ذریعہ سے جمع شدہ دولت کا جو دولتمندوں کے قبضہ میں ہو چالیسواں حصّہ ہر سال کے آخر میں نکل کر غربا کو ملتا رہتا ہے۔ دوسرا سُود کی ممانعت ہے یعنی ایسے لوگوں سے جو بوجہ تنگدستی قرضہ لینے کے محتاج ہوتے ہیں۔ سود نہ لیا جائے۔ تیسرا یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو جو اپنی موت کے وقت مال چھوڑتا ہے یہ حکم دیا ہے کہ اس کا کچھ حصّہ خیراتی کاموں کے لیے وصیت کرے اور چوتھا اصول خود تقسیم ترکہ کا اصول ہے جو ہر حال میں چند نہایت قریبی رشتہ داروں میں قریباً یکساں تقسیم ہو جاتا ہے۔ عرب کے ملک میں آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایک اُمّی محض ان مشکلات کا حل بتا دیتا ہے جو آج بڑی بڑی مہذب قوموں کو پیش آرہی ہیں۔ کیا یہ اسلام کے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منجانب اللہ ہونے کا ایک کھُلا کھُلا نشان نہیں؟

وراثت کے لیے اسلام نے ذیل کے حقوق قرار دیئے ہیں: اوّل قرابت۔ جیسے اولاد، ماں باپ، بھائی، بہن۔ دوسرے نکاح یعنی خاوند بیوی۔ ان دونوں کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔ تیسرا حق ولاء قرار دیا ہے جو مخصوص حالات سے تعلق رکھتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے عمل سے ثابت ہے یعنی جو شخص ایک غلام کو آزاد کرے۔ تو وہ آزاد کرنے والا اس کا وارث ہو جاتا ہے۔ اور چوتھا حق اخوت اسلامی کا ہے جو اس صورت میں قائم ہوتا ہے جب وارث کوئی نہ ملے اس صورت میں ترکہ بیت المال میں مسلمانوں کی عام بھلائی میں صرف ہوتا ہے جیسا کہ بعض ذمہ داریوں کی ادائگی بھی خاص حالات میں بیت المال کے ذمہ ہوتی ہے اور اس کی بنا بھی حدیث پر ہی ہے کہ آپ نے فرمایا انا وارث من لا وارث لہ۔ جس کا کوئی وارث نہیں مَیں اس کا وارث ہوں۔

ظاہر ہے کہ اصل حق قرابت اور زوجیت کا ہی ہے، اور اسی پر قرآن کریم نے چند ہدایات دی ہیں اور ترتیب جس سے وارثوں کا ذکر کیا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی حکمت پر مبنی ہے۔ یعنی سب سے پہلے اولاد کا ذکر کیا اور اس کے بعد ماں باپ کا۔ قرابت میں اوّل درجہ کا حق انہی دو کا ہے اس کے بعد خاوند بیوی کے حصّوں کا ذکر کیا اور بھائیوں کے حق کو پیچھے رکھا۔ اس لیے کہ گو بھائیوں کا حق قرابت کے لحاظ سے ہے۔ مگر حقِ زوجیت بھائیوں کے حق قرابت پر فائق ہے اور بہن بھائی عموماً ترکہ اس صورت میں لیتے ہیں جب اوّل درجہ کی قرابت والے نہ ہوں۔

ع۶۱۶ فوق اثنتین کے معنی دو سے اوپر ہیں۔ مگر چونکہ یہاں دو کا حکم علیحدہ نہیں اور وہ بھی جماعت میں داخل ہیں۔ اس لیے مراد فوق اثنتین سے دو اور دو سے اوپر ہیں۔ اس کی مثال حدیث میں ہے لا تسافر المرأۃ سفرا فوق ثلاثۃ ایام الا ومعھا زوجھا او ذو محرم لھا۔ جس کے معنی ہیں کہ کوئی عورت تین یا تین دن سے زیادہ سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ اس کا خاوند یا ذو محرم ہو اور قرآن کریم میں ہے فاضربوا فوق الاعناق (الانفال۔ ۱۲) جہاں مراد گردن کاٹنا ہے۔ نہ گردن کے اوپر۔ علاوہ ازیں اس سورت کے آخر پر بعض حالات میں دو بہنوں کا حصّہ دو تہائی قرار دیا ہے فان کانتا اثنتین فلھما الثلثان مما ترک (۱۷۶) لیکن وہاں دو سے زیادہ بہنوں کے حصّہ کا ذکر نہیں۔ تو چونکہ قرآن کریم کی بعض آیات بعض کی تفسیر کرتی ہیں۔ اس لیے اگر ایک جگہ دو لڑکیوں سے زیادہ کے حصّہ کا ذکر ہے اور دو کا نہیں اور دوسری جگہ دو بہنوں کے حصّہ کا ذکر ہے اور دو سے زیادہ کے حصّے کا ذکر نہیں اور باقی امور میں وہ یکساں ہیں۔ تو صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ دو لڑکیوں کا حصّہ دو بہنوں سے کم نہیں ہو سکتا اور دو سے زیادہ بہنوں کا حصّہ دو سے زیادہ لڑکیوں کے حصّہ سے زیادہ نہیں

وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ
وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ
كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ
وَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ
لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ

اکیلی ہو تو اس کے لیے نصف ہے ع٦١٧ اور اس کے ماں باپ کے
لیے دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اسکا چھٹا حصّہ ہے جو چھوڑا ہے
اگر اس کی اولاد ہو۔ لیکن اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ
ہی اسکے وارث ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصّہ ہے اور اگر اسکے بھائی
ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصّہ ہے ع٦١٨۔ وصیّت (کی ادائیگی)

ہو سکتا۔ پس قرآن کریم کا ایسے موقعوں پر اجمال کو اختیار کرنا اس طرف توجہ دلانے کے لیے ہے کہ اس کی وضاحت خود دوسری جگہ قرآن شریف میں موجود ہے۔

ع٦١٧ اولاد کا حق وراثت: سب سے پہلے جیسا کہ حق تھا اولاد کا ذکر کیا۔ کیونکہ ایک تو اولاد کی پرورش ماں باپ کے ذمہ ہوتی ہے۔ دوسرے عموماً ماں باپ کی وفات سے اولاد ترکہ کو لیتی ہے۔ اور اولاد کی وفات سے ماں باپ کا ترکہ کو لینا کم واقع ہوتا ہے۔ سب سے پہلی صورت یہ ہے کہ صرف اولاد ہی لینے والی ہو۔ اور اس میں اول اس صورت کو لیا کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان میں تقسیم وراثت کا یہ قاعدہ بتایا ہے کہ لڑکے کا حصّہ لڑکی سے دوچند ہو۔ اور اس طرح ساری جائداد تقسیم ہو۔ اس صورت کا ذکر نہیں کیا جس میں صرف لڑکے ہوں۔ اس لیے کہ وہ خود اس سے ظاہر ہے اور جب صرف لڑکیاں ہی ہوں تو اس صورت میں فرمایا کہ ایک لڑکی ہو تو جائداد کی نصف کی وہ مالک ہو گی۔ باقی دور کے رشتہ داروں کو جائے گی اور اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو وہ سب بحصہ مساوی دو تہائی جائداد لیں گی اور باقی ایک تہائی اور رشتہ داروں کو جائے گی۔ یہ تقسیم صرف اس صورت میں ہے جہاں اولاد کے ساتھ ماں باپ یا خاوند لینے والے نہیں۔

پوتے کا حق: بظاہر یہاں صرف اولاد کا ذکر ہے یعنی بیٹوں اور بیٹیوں کا لیکن چونکہ لفظ ولد کا وسیع مفہوم ہے، اس لیے اس میں اولاد کی اولاد بھی داخل ہے مگر یہاں پر تعامل نے کچھ تفریق کر دی ہے۔ یعنی اوّل تو بیٹی کی اولاد کو ورثا میں شامل نہیں کیا اور دوسرے بیٹوں کی اولاد کو اس صورت میں ورثا میں شامل کیا ہے جب کوئی زندہ بیٹا موجود نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص کے دو زندہ بیٹے ہیں۔ اور ایک بیٹے کی جو مر چکا ہے اولاد موجود ہے تو اس بیٹے کی اولاد کو باقی بیٹوں کے ساتھ حصّہ نہ دیا جائے گا وہاں بروئے وصیت ان کو متوفی کچھ حصّہ دے سکتا ہے۔ جس کے لیے پہلے حکم بھی آ چکا ہے۔ اور اگر کوئی بیٹا زندہ نہ ہو تو پھر بیٹوں کی اولاد ان بیٹوں کے قائم مقام سمجھی جائے گی۔ مگر قرآن کریم کے کوئی لفظ یہ ہدایت نہیں کرتے نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسا فیصلہ کیا کہ ایک متوفی بیٹے کی اولاد کو زندہ بیٹوں کے ساتھ اپنے متوفی دادا کا حصّہ لینے سے محروم کر دیا ہو۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ولد کے لفظ میں شامل ہونے کی وجہ سے ایک متوفی بیٹے کی اولاد زندہ بیٹوں بیٹیوں کے ساتھ اپنے دادا کا حصّہ لینے کی حقدار ہے اور اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے جہاں پوتی کو بیٹی کے ساتھ شامل کر کے ابن مسعود نے دو بیٹیاں قرار دے کر دو تہائی جائداد ان دونوں کو دے دی (بخاری) گو اس میں ان کی آپس کی تقسیم میں پھر بیٹی کو ایک قرار دے کر اسے نصف دلایا اور بقیہ چھٹا حصّہ پوتی کو دلایا مگر بہرحال اس سے دلیل ملتی ہے کہ جب پوتی بیٹی کے قائم مقام ہو سکتی ہے تو پوتا بیٹے کے قائم مقام کیوں نہیں ہو سکتا۔ تعامل میں اصل تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل ہے۔ جب وہ نہیں تو باقی تعامل کوئی دلیل نہیں۔ اور بہرحال ایسی صورت میں آیت اذا حضر کے ماتحت ایسے پوتوں کے لیے وصیت کرنا ضروری ہے اور اگر ایسی وصیت نہ کی گئی ہو تو تقسیم وراثت کے وقت بھی ان کو حصہ دیا جا سکتا ہے۔

ع٦١٨ اس حصّہ میں ماں اور باپ کے حصّہ وراثت کا ذکر کیا ہے اور اس کی تین صورتیں قائم کی ہیں۔ اوّل یہ کہ ماں باپ ہوں اور اولاد بھی ہو اس صورت میں ماں اور باپ ہر ایک چھٹا حصّہ لیتا ہے اور باقی اولاد کو ملتا ہے۔ اگر اولاد میں لڑکے ہوں یا لڑکے اور لڑکیاں ہوں یا دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو سب ان کو مل جائے گا۔ اگر صرف ایک لڑکی ہو تو نصف وہ لے لیگی اور باقی چھٹا حصّہ پھر والد کو قریب ترین عصبہ ہونے کے لحاظ سے چلا جائے گا۔ کیونکہ اکیلی لڑکی کو بہرحال نصف سے زیادہ نہ ملے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ماں باپ ہوں اور اولاد کوئی نہ ہو تو اس صورت میں ماں کو ایک تہائی اور باقی دو تہائی باپ کو چلا جائے گا۔

تیسری صورت یہ بیان کی ہے کہ اولاد نہ ہو مگر بھائی ہوں۔ تو اس صورت میں ماں کو چھٹا حصّہ ملیگا۔ باپ کو کیا ملیگا؟ اس میں اختلاف ہے جمہور کے نزدیک بھائیوں کا ہونا صرف ماں کے تیسرا حصّہ پانے کے لیے روک ہے اور بھائیوں کو کچھ نہ ملیگا مگر حضرت ابن عباس کا مذہب ہے کہ جو ماں کا حصّہ کم ہوا ہے وہ بھائیوں کو ملے گا۔ بظاہر یہ کوئی وجہ نہیں کہ بھائی ہوں تو ماں کا حصّہ کم ہو جائے حالانکہ ورثہ پانے والا اور کوئی پیدا نہیں ہوا اس کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ بھائیوں کے ہونے سے باپ کا حصّہ بڑھ کر ⅚ ہو گیا اور ماں کے لیے صرف چھٹا حصّہ رہ گیا اس میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ عام اصولِ وراثت یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک کا حصہ کم ہونے کیلئے کوئی دوسرا اس کا پانے والا اور ہونا چاہیئے۔ مگر اس پر اعتراض ہے کہ یہاں یہ ذکر نہیں کہ بھائیوں کو کیا ملے۔ میرے نزدیک اس کا ذکر چونکہ آگے آ جاتا ہے اس لیے یہاں ذکر کی ضرورت نہ تھی اور ماں کا حصّہ اس لیے کم کیا گیا ہے کہ بھائی حصّہ پانے والے ہیں اور خود الفاظ قرانی بھی اس پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ پہلے جہاں ماں باپ کے ساتھ اور کوئی ورثہ پانے والا نہیں وہاں صاف لفظ بڑھا دیئے ہیں وورثہ ابواہ اس کے ماں باپ اس کے وارث ہوں۔ مگر جہاں بھائیوں

وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪

کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرضہ کے۔ تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمھارے لیے فائدے کے لحاظ سے زیادہ نزدیک ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے، اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۶۱۹ء

کا ذکر کیا، وہاں یہ لفظ نہیں بڑھائے جس سے معلوم ہُوا کہ اب وہ بھائی بھی ساتھ وارث ہیں۔

دوسرا سوال اس صورت کے متعلق یہ ہے کہ اخوۃ سے کیا مراد ہے اس پر تو اتفاق ہے کہ ایک بھائی ہو تو وہ ماں کا تیسرا حصّہ پانے میں مانع نہیں ہوگا اور تین ہونگے تو وہ ضرور مانع ہونگے مگر دو کے متعلق اختلاف ہے بعض نے کہا کہ اخوۃ چونکہ جمع ہے اس لیے دو اس میں داخل نہیں بعض نے کہا کہ دو پر بھی جمع کا حکم ہے جیسا کہ نبی کریم صلعم سے بھی مروی ہے الاثنان فما فوقھا جماعۃ۔ دو یا اس سے بڑھ کر جماعت ہے اور اکثر صحابہؓ کا مذہب یہی ہے کہ دو اخوۃ کے لفظ میں شامل ہیں۔

میرے نزدیک قرآن کریم نے وراثت کے معاملہ میں الفاظ کو وسیع معنی پر محمول کیا ہے ولد کو واحد جمع مذکر مؤنث میں یکساں استعمال کیا ہے۔ اب میں اگر باپ نہ ہو تو دادا مراد ہوگا۔ امّہ میں اگر ماں نہ ہو تو دادی مراد ہوگی۔ اسی طرح اخوۃ کا لفظ عام ہے اور اس میں بھائی اور بہنیں سب شامل ہیں خواہ ایک ہوں یا زیادہ۔ اور ان کے حصص کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔ جہاں کلالہ کی وراثت کا ذکر ہے۔ جہاں صاف یہ بیان فرمایا کہ اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو اس کو چھٹا حصّہ ملے گا اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں شریک ہونگے۔ پس ماں باپ کے ہوتے ہوئے اگر بھائی بہنیں ہوں تو اس کی صورت یہ ہے کہ ماں کو چھٹا حصّہ ایک بھائی یا بہن ہو تو اس کو چھٹا حصّہ اور باقی دو تہائی باپ کو۔ ایک سے زیادہ بھائی بہنیں ہوں تو ماں کو چھٹا حصّہ۔ سب بھائی بہنوں کو تیسرا حصّہ اور باقی نصف باپ کو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صورت تعامل کے خلاف ہے۔ مگر مسئلہ وراثت میں تعامل میں اختلاف چلا آتا ہے۔ نہ صرف بہت سے مسائل میں شیعہ سُنّی کا اختلاف ہے بلکہ خود علمائے اہل سنت والجماعت میں بھی اختلاف ہے اور صحابہؓ میں بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ کئی مسائل میں حضرت ابن عباس کا مذہب دوسرے صحابہ کے خلاف ہے۔ اگر لفظ کلالہ کے یہ معنی صحیح ہیں کہ کلالۃ اس کو بھی کہتے ہیں جس کا ماں باپ اور اولاد دونوں نہ ہوں جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے اور اس کو بھی کہتے ہیں جس کے ماں باپ ہوں اور اولاد نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے۔ تو دو جگہ مختلف کلالہ کے ذکر سے مراد یہ دونوں صورتیں ہوں گی۔ اور چونکہ قرآن کریم نے اس آیت میں صاف ذکر کیا ہے کہ اولاد نہ ہو اور ماں باپ کے ساتھ بھائی ہوں۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اس صورت میں جو بھائیوں کو ملنا چاہیئے اس کا ذکر بھی قرآن شریف میں ہے اور یہی وہ صورت ہے جس کا ذکر زوجین کے بعد آتا ہے۔

۶۱۹ء وصیت اور قرضہ: من بعد وصیّۃ یوصی بھا او دَین۔ یہ الفاظ ساری آیت پر حاوی ہیں۔ کیونکہ ان تمام کا ذکر کرکے آخر میں اس کا ذکر کیا ہے گویا خواہ صرف اولاد وارث ہو۔ یا ماں باپ اولاد کے ساتھ یا اولاد کے بغیر یا بھائیوں کے ساتھ وارث ہوں۔ تمام صورتوں میں اگر کوئی وصیّت ہو یا قرضہ ہو تو پہلے اس کی ادائگی ضروری ہے اور جو باقی بچ رہے وہ بموجب حصص مذکورہ بالا تقسیم ہوگا۔ قرضہ اور وصیّت میں سے قرآن کریم نے پہلے وصیّت کا نام لیا ہے مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ قرضہ سے پہلے وصیّت کا مال ادا کیا جائے۔ اس لیے کہ مال متروکہ قرار وہی پائے گا جو بعد ادائگی قرضہ ہو۔ اور اَوْ ترتیب کے لیے نہیں آتا۔ وصیّت کے ذکر کو مقدم اس لیے کیا کہ جب کوئی وصیّت کرے گا تو اس وصیت میں قرضہ کا ذکر تو خود ہی کرے گا۔ اس لیے صرف وصیّت کی تعمیل میں قرضہ کی ادائگی آجاتی ہے۔ اور اس کے بعد او دین کا لفظ اس لیے بڑھایا کہ اگر کسی نے وصیّت نہیں کی مگر قرضہ اس کے ذمہ ثابت ہے تو قرضہ بہرحال ادا ہی کرنا ہوگا۔

اٰباؤکم وابناءکم لاتدرون ایھم اقرب لکم نفعا۔ قرابت کے لحاظ سے اصل حقدار وراثت یا اولاد ہے یا ماں باپ مگر اولاد کو پہنچنا تو توانین دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن ماں باپ کو عموماً کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب ماں باپ کے حصص کا ذکر فرمایا تو بتا دیا کہ ماں باپ کے حقوق کو کم مت سمجھو انسان کو نفع ماں باپ سے بھی پہنچتا ہے اور اولاد سے بھی۔ پس جن سے انسان نفع اٹھاتا ہے اس کے ترکہ سے ان کو نفع پہنچنا چاہیئے اس لیے ماں باپ کے حقوق کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔

وصیّت کا حق کہاں تک ہے: ہر دفعہ جہاں حصص کا ذکر ہے ساتھ یہ لفظ بھی بڑھا دیئے ہیں کہ یہ تقسیم وصیّت کی تعمیل کے بعد ہوگی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وصیّت کی رو سے ایک شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے مال کو اپنے ورثا میں تقسیم کردے یا ان کو محروم کردے۔ یہ ایک ظاہر امر ہے کہ ایسی وصیّت خود احکام آیت کو باطل کرتی ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ خود ہی ایک تقسیم قائم کرکے پھر خود ہی ایسی بھی اجازت دے کہ وہ تقسیم باطل ہو جائے۔ اگر منشاء الٰہی یوں ہوتا کہ مال کی تقسیم تو وصیّت کے مطابق ہونی چاہیئے لیکن جس صورت میں وصیت نہ ہو تو پھر یوں تقسیم ہو تو حصص کے مقرر کرنے سے پہلے یہ ہدایت صاف طور پر دی جاتی کہ مال کی تقسیم تمہاری وصیتوں کے مطابق ہوگی۔ لیکن جہاں وصیت نہ ہو وہاں ذیل کی تقسیم ہو۔ برخلاف اس کے قرآن کریم نے پہلے حصص مقرر کرکے پھر وصیت

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ
لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ
وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ وَلَهُنَّ
الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ
وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ
مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ
بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ

اور تمھارے لیے اس کا نصف ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑیں
اگر ان کی اولاد نہ ہو۔ اگر ان کی اولاد ہو تو تمھارے لیے
اس کا چوتھا حِصّہ ہے جو انھوں نے چھوڑا ہے وصیت (کی
ادائیگی) کے بعد جو انھوں نے کی ہو یا قرضہ (کے) اور ان کے لیے
اس کا چوتھا حِصّہ ہے جو تم نے چھوڑا ہے۔ اگر تمھاری اولاد نہ ہو
اور اگر تمھاری اولاد ہو تو ان کے لیے اس کا آٹھواں حِصّہ ہے
جو تم نے چھوڑا ہے وصیت (کی ادائیگی) کے بعد جو تم نے کی ہو
یا قرضہ (کے) ۶۲۰ اور اگر کوئی مرد یا عورت جس کی میراث لی جاتی

کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وصیّت مال کے کسی خاص حِصّہ کے متعلق ہونی چاہیئے اور چونکہ حدیث صحیح سے ثابت ہے جس کا ذکر مفصل نوٹ نمبر ۲۲ میں ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کی اجازت نہیں دی اس لیے پہلی شرط اس وصیت کے لیے جس کا ذکر اس آیت میں ہے یہ ہے کہ وہ ایک تہائی مال سے زیادہ کے لیے نہ ہو، دوسری شرط کا ذکر بھی ایک حدیث میں ہے کہ لا وصیة لوارث یعنی جو شخص حصص مقرر کردہ کے مطابق وراثت پاتا ہے اس کے لیے وصیّت کوئی نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ حدیث نہ بھی ہوتی تب بھی یہ بات ظاہر تھی کہ جب ورثاء کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے حصص مقرر کر دیئے ہیں تو اب ایک شخص کو یہ اختیار ہو نا کہ وہ ورثاء میں سے کسی کے لیے کچھ وصیت بھی کر دے۔ پھر ایک نا انصافی ہو جاتی ہے کہ ایک وارث کو دوسرے سے بڑھ کر حقدار بنا دیا گیا۔ اس لیے حق یہی ہے کہ وارث کے لیے وصیت نہیں ہو سکتی پس یہ دو شرائط وصیت کے لیے ضروری ہیں۔ اوّل ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیّت نہ ہو دوسرے وارث کے لیے وصیّت نہ ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ وصیت کس قسم کی ہو۔ نوٹ نمبر ۲۲۰ سے معلوم ہوگا کہ اس وصیت کی غرض خدا کے لیے کچھ مال کا چھوڑنا ہے۔ خواہ وہ اشاعت دین کے لیے یا کسی غریب یا مفلس رشتہ دار کے لیے یا کسی یتیم کے لیے ہو بعض غریب اور یتیم رشتہ داروں میں بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو متوفی کے مال کا کچھ حِصّہ بطور ورثہ نہیں پہنچتا۔ مثلاً موجودہ تعامل کے مطابق بیٹوں کی موجودگی میں کسی متوفی بیٹے کے بیٹے یعنی یتیم پوتے۔ لیکن زیادہ تر اس کی غرض محض فی سبیل اللہ یا اشاعت دین کے لیے کچھ چھوڑنا ہے جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے۔ جس طرح قرآن کریم کے بہت سے اصول مسلمانوں نے ترک کر دیئے اور غیر مسلموں نے لے لیے ہیں۔ اسی طرح فی سبیل اللہ وصیّت کا معاملہ بھی ہے۔ مسلمانوں میں بہت کم ہیں جو اپنے مال کا کچھ حِصّہ خدا کی راہ میں وصیّت کر جائیں۔ لیکن عیسائیوں میں جا کر دیکھو تو جہاں بڑی بڑی جائدادیں ہیں کچھ نہ کچھ حِصّہ مال کا قوم کی بہتری یا اور کسی نیک غرض کے لیے وصیّت کر دیا جاتا ہے۔ پھر قرآن کے حکموں کی تعمیل اگر دوسرے کریں تو کیوں ان سے نفع نہ اُٹھائیں اور مسلمان اگر قرآن کو اپنا رہنما نہ بنائیں تو کس طرح پر وہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

۶۲۰ خاوند اور بیوی کے حصّے: یہ تیسری صورت ہے۔ اس میں متوفی کی بیوی یا خاوند زندہ ہے۔ اگر بیوی مر گئی ہے اور اولاد ہے تو خاوند کو چوتھا حِصّہ اور نہیں ہے تو نصف اور اگر خاوند مر گیا ہے اور بیوی زندہ ہے اور اولاد ہے تو بیوی کو چوتھا حِصّہ اور نہیں ہے تو بیوی کو آٹھواں حِصّہ۔ ایک سے زیادہ بیبیاں ہوں تو اسی حِصّہ میں شریک ہونگی اور باقی اولاد لے گی۔ لیکن اس صورت میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ خاوند یا بیوی بھی ہو اور ماں باپ بھی ہوں تو حصص کس طرح تقسیم ہونگے۔ اس صورت میں خواہ اولاد ہو یا نہ ہو بعض مشکلات پیش آتی ہیں۔ اگر اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں اور خاوند ہو۔ تو نصف خاوند کو چاہیئے، ایک تہائی ماں کو اور اس طرح پر باپ کا حِصّہ صرف چھٹا رہ جاتا ہے۔ جو ماں سے نصف ہے اور اگر اولاد میں مثلاً لڑکیاں ہوں اور خاوند ہو اور ماں باپ ہوں تو لڑکیوں کو دو تہائی چاہیئے ماں باپ کو ایک تہائی۔ تو خاوند کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ صورت اول میں یعنی جب اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں اور خاوند یا بیوی ہو تو اکثر اس طرف گئے ہیں کہ خاوند یا بیوی پہلے اپنا حِصّہ لے لیں گے اور باقی کی ایک تہائی ماں کو اور دو تہائی باپ کو جائے گا اور اس طرح پر حصص ٹھیک ہوں گے۔ یہی درست ہے اور یہ مذہب حضرت عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ و زیدؓ بن ثابت اور ابن مسعودؓ اور ساتوں فقہاء اور چار ائمہ اور جمہور علماء کا ہے (رث) کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ خاوند یا بیوی کو دیکر باقی مال ماں باپ کے حصص کے لیے کل مال قرار پائیگا اور ان کے حق میں ترکہ وہی ہے جو خاوند یا بیوی کو دینے کے بعد رہے اور اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ ما ترک نہیں کیونکہ ما ترک ہر ایک کے لیے الگ الگ ہے۔ اگر قرضہ ہو تو پہلے ترکہ میں سے قرضہ جانا چاہیئے۔ اگر وصیّت بھی ہے تو قرضہ کے بعد وصیّت والوں کو ملنا چاہیئے۔ اگر خاوند یا بیوی ہے تو وصیّت کے بعد اسے ملنا چاہیئے۔ پھر اس میں سے جو رہ جائے اس میں سے ماں باپ کا حِصّہ اور بقیہ اولاد کا حِصّہ ہوگا اور جس طور پر قرآن کریم نے حصص قائم کیے ہیں وہ خود اس اصول کی صداقت پر شاہد ہے۔ کیونکہ اول یہ ذکر کیا کہ صرف اولاد ہو ماں باپ نہ ہوں۔ پھر یہ ذکر کیا کہ ماں باپ ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو تو اگر پہلی صورت میں اولاد فوراً لیتی ہے تو اس صورت میں پہلے ماں باپ لیتے ہیں باقی اولاد لیتی ہے۔ تیسری صورت اب یہ

كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ ہے کلالہ ہو، اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر
فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ اور اگر وہ اس سے

ہے کہ خاوند یا بیوی ہو تو ظاہر ہے کہ جس طرح ماں باپ کو دے کر بقیہ اولاد کے لیے جاتا ہے۔ اسی طرح اگر خاوند یا بیوی کے ساتھ ماں باپ بھی ہیں تو خاوند یا بیوی کو دیکر ماں باپ کو دیا جائے گا۔ اس صورت میں جس کو خود علمائے امت نے ایک مشکل کو حل کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ عول وغیرہ کی تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ اور مسئلہ وراثت بالکل صاف ہو جاتا ہے اور اس میں سے بہت سی پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں۔ مسئلہ عول جو حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے وہ بھی اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے کہ خاوند یا بیوی کے حق کو فائق نہ کیا جائے۔ کیونکہ عول کی صورت ایسی ہے کہ مثلاً بیوی زندہ ہے دو یا زیادہ لڑکیاں ہیں ماں باپ ہیں اب بیوی کو آٹھواں چاہیئے لڑکیوں کو دو تہائی ماں باپ کو ایک تہائی۔ اور یہ حصے پورے نہیں ہوتے۔ حضرت علیؓ نے بذریعہ عول اس کا حل یوں کیا تھا کہ کل ستائیس حصے کیے جائیں۔ جن میں سے سولہ لڑکیوں کو دیئے جائیں۔ آٹھ ماں باپ کو، تین بیوی کو اس طرح مال تو پورا ہو گیا۔ مگر دو تہائی ایک تہائی آٹھواں حصہ کچھ بھی درست نہ رہا۔ اگر اس کی بجائے یوں کیا جاتا کہ بیوی کا حق نکال کر باقی میں سے ماں باپ کا تیسرا دیا جاتا اور پھر بقیہ لڑکیوں کو تو یہ مشکل ہی پیش نہ آتی۔ یا اگر بیوی کا حق پہلے نہ بھی نکالا جائے تو بھی لڑکیوں کو دو تہائی اس لیے نہیں دینا چاہیئے کہ ان کے ساتھ ماں باپ موجود ہیں اور لڑکیاں دو تہائی اس وقت لیتی ہیں جب دوسرا ساتھ لینے والا کوئی نہ ہو پس آٹھواں حصہ بیوی کا اور ایک تہائی ماں باپ کا نکال کر بقیہ لڑکیوں کو دیا جائے گا۔ کیونکہ اگر لڑکیوں کی بجائے لڑکے ہوتے یا لڑکے اور لڑکیاں ہوتیں تو ان کو بھی بقیہ ہی دیا جاتا اور لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ پانے کی بہر حال حقدار نہیں۔

اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ نا انصافی ہے کہ پہلے خاوند یا بیوی کو اپنا حصہ مل جائے تو باقی میں سے والدین کا چھٹا چھٹا حصہ نکلے اور پھر اس کا بھی بقیہ اولاد کو ملے تو یہ فی الحقیقت کوئی نا انصافی نہیں کیونکہ خاوند یا بیوی جو کچھ لینگے وہ بھی اولاد کی بہتری پر ہی صرف ہوگا اور حق یہی ہے کہ خاوند یا بیوی کا ایک گونہ اشتراک جائداد میں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دونوں اس کے بنانے والے ہیں خاوند کی جائداد کے بننے میں بیوی مددگار ہوتی ہے اور بیوی کی جائداد کے بننے میں خاوند مددگار ہوتا ہے اور اس طرح مسئلہ وراثت کی تمام دقتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی فیصلہ اس کے خلاف مروی نہیں۔ صرف ایک فیصلہ سعد بن الربیع کی بیٹیوں اور بیوی کا مذکور ہے جس میں بیوی کو آٹھواں حصہ، بیٹیوں کو دو تہائی اور بقیہ چچے کو دیا گیا۔ یہ روایت اوّل تو بہت اعلیٰ پایہ کی نہیں اور دوسرے اس میں کوئی تفصیلات نہیں جن سے ہمارے اس مفہوم کے خلاف کوئی نتیجہ نکل سکتا ہو۔

۶۲۱ع کلالۃ۔ اس کا مادہ کَلّ ہے جس کے معنی تھک جانا ہیں۔ راغبؒ کہتے ہیں یہ ان وارثوں کا نام ہے جو والد اور ولد کے سوا ہوں اور ساتھ ہی ابن عباسؓ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اولاد کے سوا جو وارث ہوں ان کا نام ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلالۃ وہ ہے جو مر جائے اور اس کی اولاد یا اس کا والد کوئی نہ ہو تو یہاں گویا میت کو کلالہ قرار دیا ہے۔ امام راغبؒ کہتے ہیں کہ دونوں قول صحیح ہیں اور اس کی تطبیق یہ ہے کہ کلالہ مصدر ہے جو وارث اور مورث دونوں کو جمع کرتا ہے۔

کلالہ کی وراثت: مفسرین میں دو گروہ ہیں۔ بڑا گروہ تو اس طرف گیا ہے کہ کلالۃ وہ ہے جس کا نہ والد ہو نہ ولد۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کلالہ وہ ہے جس کا ولد نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کا خیال بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے گو ایک روایت میں آتا ہے کہ چونکہ حضرت ابوبکرؓ نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ اسکا والد و ولد نہ ہو اس لیے میں خاموشی اختیار کرتا ہوں۔ مگر ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے اس کے وہی معنی کیے ہیں جو حضرت ابن عباسؓ نے کیے ہیں یعنی جس کا ولد نہ ہو۔ دیکھو غرائب القرآن وعن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ الکلالۃ من لا ولد لہ فقط اور ایک روایت حضرت عمرؓ سے یہ ہے کہ آپ کہا کرتے تھے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کو وضاحت سے بیان کر دیا ہوتا تو میرے نزدیک ساری دنیا سے زیادہ محبوب تھا۔ کلالہ۔ خلافت۔ ربا (خق)

قرآن کریم میں دو جگہ کلالہ کا ذکر آیا ہے۔ ایک یہاں اور ایک اسی سورت کے آخر میں۔ یہاں بھائی یا بہن کا حصہ چھٹا اور زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک اور وہاں بہن کا حصہ نصف۔ دو یا زیادہ بہنیں ہوں تو دو تہائی۔ صرف بھائی ہوں ایک یا زیادہ تو کل لیں۔ بھائی اور بہنیں ملے جلے ہوں تو سارا ورثہ مرد کو عورت سے دو چند حصہ دیکر تقسیم ہو۔ مفسرین نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہاں بھائی بہن سے مراد اخیافی بھائی بہن ہیں یعنی ماں کی طرف سے اور دوسرے موقعہ پر یعنی آخر سورت میں بھائی بہن سے مراد عیانی یا علاتی بہن بھائی ہیں یعنی ماں باپ دونوں کی طرف سے یا صرف باپ کی طرف سے۔ مگر نبی کریم صلعم کی کوئی حدیث اس کے متعلق نہیں۔ اس لیے دوسری توجیہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دونوں جگہ کلالہ سے الگ الگ مراد ہے۔

دو قسم کے کلالہ: یہاں کلالۃ سے مراد وہی صورت ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی اولاد نہ ہو۔ مگر ماں باپ ہوں اور بہن بھائی ہوں اور سورت کے آخر میں کلالۃ سے مراد وہ کلالہ ہے جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد اور یہی وجہ ہے کہ وہاں ساری جائداد بہن بھائیوں کو دلاتا ہے اور یہاں نہیں دلاتا کیونکہ وہاں اور کوئی وارث نہیں ہے اور یہاں ہی اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اوپر ایک صورت کا ذکر کیا تھا کہ بھائی ہوں اور اولاد نہ ہو تو ماں کو چھٹا حصہ ملے مگر بھائیوں کا حصہ بیان نہ کیا تھا۔ اس کا ذکر اب یہاں کر دیا ہے ورنہ یہ اعتراض باقی رہتا کہ ایک صورت کو قائم کر کے حصص کا ذکر نہیں کیا۔

كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

زیادہ ہوں تو تہائی میں شریک ہیں ۶۲۱ وصیت (کی ادائیگی) کے بعد جو کی گئی ہو یا قرضہ (کے) جو ضرر پہنچانے کے لیے نہ ہو ۶۲۲ - یہ اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہے اور اللہ جاننے والا بردبار ہے -

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾

یہ اللہ کی حدبندیاں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے -

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾ ع

اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی حدبندیوں سے آگے نکلتا ہے اسے آگ میں داخل کریگا وہ اس میں رہیگا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ۶۲۳

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا ارتکاب کریں تو اپنے میں سے چار گواہ اُن پر بلاؤ، سو اگر وہ گواہی دیں تو اُن کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ ان کو موت لے جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے ۶۲۴

اس طرح پر ان چار احکام میں ذیل کی چار صورتیں بیان کر دی ہیں - اول صرف اولاد ہو - دوم ماں باپ ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو - سوم خاوند بیوی ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو - چہارم ماں باپ ہوں اولاد نہ ہو اور بھائی ہوں، اور پانچویں صورت سورت کے آخر پر یہ بیان کی ہے کہ نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں صرف بھائی بہن ہوں - ان پانچوں صورتوں میں اگر خاوند یا بیوی ہو تو اس کا حق پہلے نکالو - پھر ماں باپ ہوں تو ان کا حق دو پھر اولاد کو - اور اولاد نہ ہو، یا ماں باپ اور اولاد دونوں نہ ہوں تو بھائی بہنوں کو -

۶۲۲ غیر مضار والا قرضہ: غَیْرَ مُضَآرٍّ - وصیت اور قرضہ کے پہلے ادائگی کا حکم تو ہر جگہ دیا ہے مگر یہاں غیر مضار ساتھ بڑھا دیا ہے - یعنی وصیت یا قرضہ ایسے ہوں جو ضرر پہنچانے والے نہ ہوں - اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اولاد کوئی نہیں - اور جب اولاد موجود نہ ہو - تو ممکن ہے کہ محض دُور کے ورثا کو نقصان پہنچانے کے لیے کسی قرضہ کا اقرار کر لیا جائے یا بلا ضرورت کوئی قرضہ لے لیا جائے اور اسی طرح محض نقصان پہنچانے کو کوئی وصیت کر دی جائے - اس لیے اس قید کی ضرورت یہاں پیش آئی ہے اور غیر مضار کا لفظ وصیت اور دین دونوں پر حاوی ہے -

۶۲۳ رواج اور قرآن: ان دونوں آیات میں بتایا ہے کہ یہ احکام گو دنیوی امور کے متعلق ہیں مگر ان کو استخفاف کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے کیونکہ اسلام کے احکام دینی اور دنیوی بہبودی سے یکساں تعلق رکھتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان احکام کی مخالفت کرنے والے جہنم میں جائیں گے اور ساتھ خالدا فیہا کے الفاظ بھی بڑھا دیئے ہیں - باوجود اس تاکید شدید کے مسلمانوں نے اس زمانہ میں بالخصوص پنجاب و ہندوستان کے دیہات میں صریحًا ان احکام کو پس پشت ڈالا ہے یہاں تک کہ واجب العرض میں صاف یہ لفظ لکھوا دیتے ہیں کہ ہم قرآن کی پیروی نہیں کریں گے رواج کی پیروی کریں گے - کیا اسی مخالفت کا نتیجہ ہی وہ نہیں جو خود قرآن کریم نے بیان فرما دیا ہے ولہ عذاب مھین یعنی ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ؟ واقعی مسلمان احکام قرآنی کی خلاف ورزی کی وجہ سے ہی ذلیل ہو رہے ہیں -

۶۲۴ یاتین - اتیان (اتی) کے اصل معنی آنا ہیں - مگر خود کسی انسان کے آنے پر یا کسی امر کے کرنے پر یا کسی تدبیر کے کرنے پر بولا جاتا ہے کیونکہ آنا بالذات یا بالامر یا بالتدبیر ہو سکتا ہے (غ) پس یہاں مراد ارتکاب فاحشہ ہے -

الفاحشۃ - ہر قول یا فعل جو بڑا قبیح ہو دیکھو ۲۰۶ گو اس میں شک نہیں کہ فاحشۃ کا لفظ قرآن شریف اور زبان عربی میں زنا پر بھی بولا گیا ہے مگر اصل استعمال

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾

اور جو دو² تم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو ان کو سزا دو پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کریں تو ان کو جانے دو اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے ع۶۲۵

اس کا ہر قبیح کام پر ہے اور اسی معنی میں زیادہ تر قرآن شریف میں بھی آیا ہے۔ جیسے واذا فعلوا فاحشۃ (الاعراف ۷-۲۸) فانہ یامر بالفحشآء والمنکر (النور ۲۴-۲۱) اور ابن اثیر کہتے ہیں کہ حدیث میں فحش اور فاحشہ اور فواحش کا ذکر بار بار آیا ہے اور وہ ہر قسم کے ذنوب اور معاصی پر مشتمل ہے جن کی قباحت سخت ہو اور کثرت سے فاحشہ بمعنی زنا بھی آیا ہے اور اصل میں ہر ایک قبیح خصلت قول ہو یا فعل فاحشہ کہلاتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت عائشہؓ نے ان یہودیوں کو جنہوں نے آنحضرت صلعم سے گستاخی کی تھی کچھ سخت لفظ کہا تو آپ نے فرمایا السامت کہو لان اللہ لا یحب الفحش اللہ تعالیٰ فحش کو پسند نہیں کرتا۔ اور یہاں فحش سے مراد صرف سخت گوئی ہے۔

عورت کی عصمت کو محفوظ کرنے کے اسباب: پہلے دو رکوعوں میں عورتوں کے حقوق کو بیان کیا ہے اس رکوع میں کچھ ان کی ذمہ داری کا ذکر ہے جس طرح اسلام نے سارے مذاہب سے امتیاز کے طور پر عورتوں کو بہت سے حقوق دیئے ہیں اور ان کے ساتھ حسن معاشرت کو تعلیم الٰہی کا حصہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان کی کچھ ذمہ داریاں بھی رکھی ہیں۔ اور یہ چاہا ہے کہ جس طرح سے وہ حقوق کو حاصل کرنے میں تمام دنیا کی عورتوں پر فائق ہیں۔ اسی طرح اپنے چال چلن میں اعلیٰ درجہ کی پاکبازی اور راستبازی اختیار کرنے میں بھی فوقیت لے جائیں۔ چونکہ اسلام کا اصل منشاء یہی تھا کہ عورت کی ذلت کے جس قدر اسباب ہیں ان سب کو دور کیا جائے اس لیے اگر ایک طرف اس کے حقوق کو محفوظ کیا ہے جس سے اس کی عزت اور مرتبہ بڑھتا ہے تو دوسری طرف اس کی عصمت کو محفوظ کرنے کے اسباب کا بھی ساتھ ہی ذکر کر دیا ہے تا عورت پر سے ہر قسم کی ذلت دور ہو۔ چنانچہ اس آیت کا مقصود بھی یہی ہے۔

مبادئ زنا کا علاج: اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں الفاحشۃ سے مراد زنا ہے اور یہاں زنا کی سزا بتائی ہے اور پھر اس کو سورۃ نور کی آیت جلد سے اور عملی حکم رجم سے منسوخ قرار دیا ہے بلکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ حدیث سے (یعنی مسلم کی حدیث جس میں ہے البکر بالبکر جلد مائۃ ونفی سنۃ والثیب بالثیب جلد مائۃ والرجم) اور حدیث منسوخ ہے آیت جلد سے اور آیت جلد منسوخ ہے دلائل رجم سے (دغق) لیکن جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے قرآن شریف میں کوئی حکم منسوخ نہیں نہ نبی کریم صلعم نے کسی حکم کو منسوخ قرار دیا۔ اور نہ کسی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے یہاں الفاحشۃ کے معنی زنا بتائے ہیں۔ اس لیے ہم فاحشہ سے مراد یہاں عام معنی ہی لیں گے۔ کیونکہ الفاظ کے معانی میں ہمیں وہ راہ اختیار کرنی چاہیئے جس سے ایک آیت دوسری کے خلاف نہ ہو پس الفاحشۃ سے یہاں مراد بےحیائی کا ارتکاب ہے جسے مبادئ زنا کہنا چاہیئے اور یہاں قرآن کریم نے ایک راہ بتائی ہے کہ کس طرح عورتوں کو زنا سے بچانے کے لیے وقت پر اس کا انسداد کرنا چاہیئے اور وہ یہ علاج ہے کہ جب کسی عورت سے مبادئ زنا کا ارتکاب ثابت ہو تو اس کا فوری علاج یہ ہے کہ انہیں گھروں میں بند کر دیا جائے یعنی ان کی آزادی سلب کر دی جائے اور ان کو باہر نکلنے سے قطعاً محروم کر دیا جائے یہاں تک کہ اسی حالت میں ان پر موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے اور وہ راہ توبہ ہے۔ یا اگر ایسی عورتیں ہیں جن کا ابھی نکاح نہیں ہوا تو نکاح سے ان کی حالت سدھر سکتی ہے (مفسرین نے بھی یجعل اللہ لھن سبیلاً میں نکاح مراد لیا ہے) اس طرح آزادی کے روک دینے سے دو غرضیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو خود بدی میں مبتلا ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ دوسروں کے لیے بدنمونہ نہیں بنتیں۔ ابو مسلم نے یہاں الفاحشۃ سے مراد سحاقت کو لیا ہے یعنی عورت کا عورت سے ارتکاب فاحشہ۔

تعلیم اسلام میں زنا سے بچانے کے سامان: اگر غور کیا جائے تو اسلام کی تعلیم نہایت تدریجی اور خوبصورت ہے۔ زنا جیسی بلا سے بچانے کے لیے کس قدر رکاوٹیں تجویز کی ہیں اول تو مردوں اور عورتوں کے کھلے میل جول اور عورتوں کے غیر محرم مردوں سے خلوت اختیار کرنے کو روکا ہے۔ پھر عورتوں کو اس بات سے روکا ہے کہ وہ بن سنور کر اور سنگار کر کے باہر نکلیں۔ بلکہ حکم دیا ہے کہ جب باہر نکلیں تو ایک سادہ کپڑا اوپر اوڑھ لیں جس سے ان کے لباس وغیرہ کی زینت ڈھک جائے۔ پھر یہ حکم دیا ہے کہ باہر نکلیں تو مرد و عورت دونوں نگاہیں نیچی رکھیں۔ پھر فرمایا کہ اگر عورت سے مبادی زنا کا ارتکاب ہوتا دیکھو تو اس کے باہر نکلنے کو قطعاً روک دو یہاں تک کہ وہ توبہ کرے یا جائز طور پر نکاح ہو کر خیالات شہوانی ویسے رک جائیں۔ اور سب سے آخر جب کسی طرح کوئی نہ رکے تو پھر زنا کے لیے خطرناک سزا کوڑوں کی تجویز کی ہے۔ عصمت کو قائم کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر اصلاح کی صورت ناممکن ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم کی تعلیم اخلاقی و روحانی کو کمال تک پہنچانے پر شاہد ہیں۔

ع۶۲۵ الّذان۔ گو اصل میں دو مردوں کے لیے ہے مگر بلحاظ تغلیب مذکر ایک مرد اور ایک عورت پر بھی بولا جا سکتا ہے۔

مبادئ زنا میں مرد کے لیے سزا: چونکہ پچھلی آیت میں عورتوں کی بےحیائی کے ارتکاب کا ذکر کیا تھا۔ تو یہ بتانے کے لیے کہ یہ امر صرف عورتوں میں ہی معیوب نہیں اور انہی کے لیے سزا نہیں بلکہ اگر مرد اور عورت دو کسی بےحیائی کا ارتکاب کریں اور دونوں سے مبادئ زنا کا ظہور ہو تو دونوں کو سزا دی جائے۔ عورت کی سزا کا ذکر تو اوپر آ چکا کہ اس کو باہر نکلنے سے روک دیا جائے۔ مرد کی سزا کو خاص الفاظ میں بیان نہیں کیا اس لیے کہ عورت تو گھر کے اندر رہ کر گھر کے کاروبار میں مدد دے سکتی ہے

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ
السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ
فَأُولَٰٓئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ
اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾

اللہ کے نزدیک توبہ صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو
جہالت سے بدی کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے
ہیں۔ پس انہی پر اللہ (رحمت سے) متوجہ ہوتا ہے
اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ ۶۲۶

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ
حَتَّىٰٓ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ
إِنِّي تُبْتُ الْـَٔانَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ

اور توبہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بدیاں کرتے رہتے
ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آموجود
ہوتی ہے کہتا ہے اب مَیں نے توبہ کی اور نہ ان لوگوں کے

کیونکہ اس کے کام کا دائرہ زیادہ تر گھر کے اندر محدود ہے۔ لیکن مرد کو ایسی سزا دینا گویا اسے کاروبار سے روکنا تھا۔ اس لیے عام الفاظ میں کہدیا کہ سزا تو دونوں کو دی جائے گی مگر اپنے اپنے حالات کے مطابق۔ الذان سے مراد مفسرین نے بھی یہاں مرد و عورت ہی لیا ہے گو اٰذوھما کی سزا کو نمائش یا تنبیہ و زجر یا ملکی سزا تک محدود رکھا ہے۔ ابومسلم نے الذان سے مراد دونوں مرد لے کر یہاں لواطت کا ارتکاب مراد لیا ہے۔ جیسے پہلی آیت میں سحاقت۔ اور یہی قول مجاہد کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے توبہ کرنے پر اُن سے اعراض کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہاں کس قسم کے مبادی مراد ہیں۔ اور یہاں توبہ کا لفظ پہلی آیت کے یجعل اللہ لھن سبیلا کی بھی تشریح کرتا ہے کہ وہاں بھی مراد اصل میں توبہ ہی ہے۔

ع۶۲۶ التوبۃ علی اللہ۔ عام طور پر یہی معنی کیے گئے ہیں کہ توبہ کا قبول کرنا اللہ پر ایسے لوگوں کے حق میں ہے۔ مگر چونکہ قبولیت توبہ کا ذکر صریح الفاظ میں آگے آتا ہے۔ اس لیے یہاں علیٰ کو اگر بمعنی عند لیا جائے جیسا کہ طبری نے لیا ہے (ر) تو وہ معنی ہونگے جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں کہ توبہ اللہ کے نزدیک صرف اُن لوگوں کی ہے جو ایسا کرتے ہیں اور یہ تو توبہ کرنے والوں کا ذکر ہوا، اس لیے آگے فرمایا کہ ایسوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے۔ اور اگلی آیت کی ترکیب لیست التوبۃ کے ساتھ بھی یہی معنی موزوں ہیں۔ یا توبۃ سے مراد توفیق توبہ بھی ہو سکتی ہے۔

جھالۃ۔ جہل کے معنی کے لیے دیکھو ع۹۶ مجاہد کا قول ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے خطا سے ہو یا عمداً وہ جاہل ہے یہاں تک کہ گناہ سے باہر نکلے (ث) اور قتادہ سے روایت ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلعم سب کا اس پر اتفاق تھا کہ ہر ایک چیز جس کے ساتھ ایک شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ جہالت ہے خواہ عمداً ہو یا سہواً (ث) اور خود قرآن کریم میں بھی جھالۃ کا لفظ صرف معصیت کے لیے استعمال ہُوا ہے ھل علمتم ما فعلتم بیوسف واخیہ اذ انتم جاھلون (یوسف ۱۲-۸۹) حالانکہ وہ جرم ان کا عمداً تھا۔

من قریب۔ اس کے لفظی معنی تو جلدی کے ہی ہیں لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی موت سے پہلے کسی وقت بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا۔ بشرطیکہ صدق دل سے ہو اور نہ کبھی کریگا۔ اس لیے اس لفظ میں وسعت ہے چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ من قریب سے مراد ہے کہ اس وقت کے اندر جو اس کے اور اس کے ملک الموت کی طرف دیکھنے کے درمیان ہے۔ گویا ملک الموت کے آنے یا حالتِ نزع سے پہلے پہلے کبھی ہو۔ اور امام احمدؒ اور ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے ایک حدیث نبی کریم صلعم سے روایت کی ہے جس کے راوی حضرت ابن عمرؓ ہیں قال ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر یعنی آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ کو قبول کرتا ہے جب تک کہ اس پر موت کا غرغرہ نہیں آتا۔

توبہ اور اس کی قبولیت: چونکہ پچھلی دونوں آیتوں کے مضمون کا تعلق توبہ سے بھی تھا یعنی حکم تھا کہ جن لوگوں سے زنا کے مبادی کا اظہار ہو اگر وہ توبہ کریں تو پھر ان کو کچھ مت کہو۔ اس لیے اب دو آیات میں توبہ کے مضمون کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ توبہ کے اصل معنی جیسا کہ دوسری جگہ بیان ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہیں خواہ ایسا رجوع کسی بدی کے ارتکاب کے بعد ہو یا ایک غفلت کی حالت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو یہاں جیسا کہ سیاق چاہتا تھا اس توبہ کا ذکر ہے جو بدی کے ارتکاب کے بعد ہو۔ سو اوّل تو یہاں یہ فرمایا کہ توبہ یا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جو جہالت سے بدی کرتے ہیں اور پھر فرمایا کہ قریب ہی توبہ یا رجوع بھی کر لیتے ہیں۔ جہالت کا لفظ اس لیے اختیار فرمایا کہ انسان جو بدی کرتا ہے وہ جہالت سے کرتا ہے۔ اور توبہ کے یہ معنی ہیں کہ اس جہالت سے نکل جائے اور اس کو سمجھ آجائے کہ یہ اچھا کام نہ تھا جو اس نے کیا۔ جب تک انسان کے قلب پر یہ کیفیت وارد نہ ہو کہ وہ بدی کو بدی سمجھے اور اس سے متنفر ہو۔ اس وقت تک رجوع بھی نہیں ہو سکتا اور من قریب کا لفظ گو موت سے پہلے ہر وقت پر حاوی ہے۔ مگر اسں کو اختیار فرما کر یہ توجہ دلائی ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اگر اس سے بدی ہو بھی جائے تو فوراً رجوع کرے۔ کیونکہ ایسی حالت میں رجوع کرنا بہت آسان ہوتا ہے اور بدی کا بیج جو انسان کے دل میں بویا گیا ہے ابھی اس نے جڑ نہیں پکڑی ہوتی۔ لیکن اگر جلدی رجوع نہ کرے اور بدی پر اصرار کرے یعنی بار بار اس کا ارتکاب کرے تو وہی بیج جڑ پکڑ کر مستحکم ہو جاتا ہے اور وہ بدی ایک بد عادت کے طور پر طبیعت میں ایسی جاگزین ہو جاتی ہے کہ پھر انسان کا اس سے رہائی پانا بہت ہی مشکل

وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

(ویسے) جو کافر ہونے کی حالت میں ہی مرجاتے ہیں یہی ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک دُکھ تیار کر رکھا ہے ۶۲۷

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمھارے لیے جائز نہیں کہ عورتوں کو زبردستی ورثہ میں لو ۶۲۸ اور نہ ان کو روک رکھو اس لیے کہ اس کا کچھ حصہ لے لو جو تم نے انھیں دیا ہے سوائے اس کے کہ وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں ۶۲۹

ہو جاتا ہے گویا جتنی جلدی توبہ کرنے میں کرے گا اتنی ہی جلد توبہ قبول ہو گی۔ اور جتنی دیر ایک بدی سے رجوع کرنے میں لگائے گا اسی قدر دیر توبہ کی قبولیت میں لگے گی۔

ع ۶۲۷ عدم قبولیت توبہ: جس طرح پہلی آیت میں توبہ کی سہل ترین حالت یعنی قبولیت سے قریب ترین حالت کا ذکر کیا ہے اس آیت میں توبہ کے نہ قبول ہونے کی حالت یعنی قبولیت سے بعید ترین حالت کا ذکر کیا ہے اور وہ حالت یہ ہے کہ انسان بدیاں کرتا جائے اور کبھی انجام کو نہ سوچے۔ پھر جب موت کا غرغرہ آ لگے اور دیکھ لے کہ اب جواب دہی سامنے ہے تو پھر توبہ کرے ایسے شخصوں کو مطلقاً توبہ فائدہ نہیں دیتی اس سے بھی سخت تر حالت ان لوگوں کی ہے یموتون وھم کفار موت بھی ان پر کافر ہونے کی حالت میں آتی ہے یعنی وہ موت کے وقت بھی یا حالت نزع میں بھی نہیں سمجھتے کہ توبہ کرنی چاہیئے ان کا کفر سخت ترین ہے۔ حالتِ نزع کی توبہ کیوں قبول نہیں ہوتی اس لیے کہ نزع کے وقت بھی انسان ایک گونہ دوسرے عالم میں داخل ہو چکا ہوتا ہے اور وہاں اللہ تعالیٰ نے اصلاح کے لیے اور سامان رکھے ہیں۔ توبہ یا رجوع کا موقعہ اس زندگی کے اندر اندر ہے۔ کیونکہ یہ زندگی ایک خاص رنگ میں اصلاح کے لیے دی گئی ہے اور ان دونوں انتہائی حالتوں کے درمیان یعنی ایک وہ حالت جس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا کہ نادانی سے کوئی بدی کی پھر فوراً اس سے رجوع کیا اور ایک یہ حالت جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ نزع کے وقت یا موت کے بعد رجوع چاہیئے مختلف حالات کے انسان ہیں جن کی توبہ کی قبولیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کس قدر جرأت ارتکاب معاصی پر کرتے ہیں اور کس قدر دیر رجوع میں لگاتے ہیں جتنی جرأت کم اور توبہ جلدی ہے اس کی قبولیت آسان جتنی جرأت زیادہ اور توبہ دیر سے ہے اسی قدر اس کی قبولیت مشکل ہے۔

ع ۶۲۸ یہاں سے عورتوں کی ان تکالیف کا ذکر شروع ہوتا ہے جو اسلام سے پہلے ان کے لاحق حال تھیں اور سب سے پہلے اس بد رسم کا ذکر کیا ہے جس کی رُو سے عورتیں مال متروکہ کی طرح وراثت کا حصہ قرار پاتی تھیں گویا اوپر جب اسلام میں عورتوں کے حقوق وراثت کا ذکر کیا اور انکو مال متروکہ کا حصہ دلایا تو اب جاہلیت کی رسوم کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ عورتوں کا مال متروکہ سے ورثہ پانا تو ایک طرف رہا وہ خود مال متروکہ کا حصہ قرار دی جا کر ورثہ میں لی جاتی تھیں۔ چنانچہ بخاری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے قال کانوا اذا مات الرجل کان اولیاءہ احق بامرأته ان شاء بعضھم تزوجھا وان شاء والم یزوجھا فھم احق بھا من اھلھا فنزلت ھذہ الایة۔ یعنی اہل جاہلیت کا یہ دستور تھا کہ جب ایک شخص وفات پا جاتا تو اس کے وارث اس کی عورت کے بھی حقدار ہوتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا۔ اور اگر وہ چاہتے تو اس کا نکاح کسی سے نہ کرتے۔ پس اس کے اہل کی نسبت وہ اس کے (مال کے) زیادہ حقدار ہوتے یعنی جب وہ مرتی تو اس کے وارث وہ خود ہوتے اور بعض روایتوں میں ہے کہ بجائے خود نکاح کرنے کے جس سے چاہتے اس کا نکاح کر دیتے اور مہر خود لے لیتے۔ اس مضمون کی بہت سی روایات ہیں کسی میں اہل یثرب کا یہ طریق بیان کیا گیا ہے۔ کسی سے پایا جاتا ہے کہ اہل تہامہ اپنی عورتوں سے بہت بدسلوکی کرتے تھے اور تمام روایات کا اس پر اتفاق ہے کہ میّت کے مال کے وارث اس کی بیوی کے بھی وارث ہوتے تھے پس اس رسم بد کی یہاں اصلاح کی ہے۔ زہری سے مروی ہے کہ وہ لوگ عورت کو بلا ضرورت روک رکھتے تھے یعنی حالانکہ اس سے بی بی کا تعلق نہ ہوتا تھا مگر اس غرض سے اسے طلاق نہیں دیتے تھے کہ جب وہ مرے تو اس کے مال کے وارث ہوں۔

ع ۶۲۹ فاحشة مبينة۔ فاحشة کے معنی ع ۶۲۴ میں بیان ہو چکے ہیں۔ باوجود مبینة کا لفظ ساتھ ہونے کے قتادہ، ضحاک، ابن عباس وغیرہم سے یہاں معنی نشوز اور سوء الخلق مروی ہیں۔ یعنی خاوند کی نافرمانی یا اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا اور بدخلقی۔ اور بعض نے زنا بھی معنی کیئے ہیں مگر حق یہ ہے کہ لفظ عام ہے اس لیے معنی اس کے وسیع ہیں اور زنا بھی یہاں مفہوم میں شامل ہو سکتا ہے اس کے لیے کوئی مانع نہیں۔

طلاق کے وقت عورت سے مال لینا: یہ دوسری تکلیف ہے جو عورتوں کو پہنچائی جاتی تھی۔ یعنی جب ایک شخص ایک بی بی کو ناپسند کرتا تو بجائے اس کے کہ اسے طلاق دے اسے روک رکھتا اور اس کو تنگی اور تکلیف میں رکھتا یہاں تک کہ وہ تنگ ہو کر اس بات کو منظور کرتی کہ اپنے مال میں سے کچھ اسے دے یا جیسا کہ اہل تہامہ کے ذکر میں لکھا ہے طلاق دیتے وقت یہ شرط کر لیتا کہ وہ اسی پہلے خاوند کے منشاء کے خلاف شادی نہ کرے گی اور غرض اس کی یہ ہوتی کہ جو کچھ مال اس پر پہلے

بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾

وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ﴿٢٠﴾

اور ان کے ساتھ پسندیدہ طور سے میل جول رکھو پھر اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے[۶۳۰]

اور اگر تم ایک بی بی کی جگہ دوسری بی بی (سے نکاح) کرنا چاہو اور تم اُسے سونے کا ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو، کیا تم اُسے بہتان سے اور کھلے گناہ کے ساتھ لو گے؟[۶۳۱]

خرچ کیا تھا اس کا کچھ حصہ اسے دوسرے خاوند کے نکاح میں دیکر خود وصول کرے (ث) اسلام نے مہر لینے سے روکا ہے سوائے ایک صورت کے ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ۔ ان سے زنا یا مبادی زنا یا نشوز کا ارتکاب ہو تو ایسی صورت میں چونکہ خلع ہوگا اس لیے یہ اختیار ہوگا کہ کچھ حصہ مہر کا جو دیا گیا تھا، واپس لیا جائے۔

ع ۶۳۰ عاشروا۔ اس کا مادہ عشر ہے جس کے معنی دس ہیں اور چونکہ دس کو عدد کامل سمجھا گیا ہے اس لیے عَشِیرۃ ایک شخص کے اہل کو کہتے ہیں جن سے وہ کثرت حاصل کرتا ہے۔ گویا وہ اس کے لیے عدد کامل کے طور پر ہوتے ہیں (غ) پھر ایک شخص کے سارے اقارب پر یہ لفظ بولا گیا ہے اور عاشرتہ کے معنی ہیں مصاہرت میں ہیں اس کے لیے دس کی مانند ہو گیا (خ)، یا عشرۃ کے معنی چونکہ مخالطت ہیں یعنی میل جول رکھنا۔ اسی سے معاشرہ کے معنی بھی مخالطت ہیں اور عشیر کے معنی قریبی اور صدیق یعنی دوست ہیں۔ اور عورت کا عشیر اس کا خاوند ہے اس لیے کہ وہ مرد اس عورت سے اور عورت اس مرد سے دوست کی طرح میل جول رکھتے ہیں۔

عورتوں سے سلوک: یہ تیسرا امر ہے جس کی طرف اسلام نے توجہ دلائی ہے۔ پہلے دو احکام میں صرف ایک بدرسم کو دور کیا ہے۔ مگر یہاں اس بدرسم کو کہ عورت کے ساتھ عام طور پر خانہ داری کی زندگی میں انصاف کا برتاؤ نہ ہوتا تھا۔ اس کی کوئی خاص عزت و منزلت نہ تھی بلکہ صرف خواہشات کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا گیا تھا دور کرنے کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ عورت و مرد کا کیا تعلق ہے۔ اور ایک ہی لفظ عاشروھن میں مرد و عورت کے سارے تعلقات کو روشن کر دیا ہے۔ میاں بی بی کا تعلق ایک دوسرے سے صدیق یا سچے دوست کا تعلق ہے جو ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ اور صرف لفظ معاشرت پر ہی انحصار نہیں رکھا جو بجائے خود صادقانہ تعلقات کا مقتضی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ تاکید کے طور پر لفظ بالمعروف بھی بڑھا دیا ہے یعنی ایسی معاشرت جو پہچانی گئی یا پسند کی گئی ہے اور ساتھ یہ بھی بڑھا دیا ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ وہ تمہیں ناپسند ہوں مگر ناپسندیدگی کا یہ نتیجہ نہ ہونا چاہیئے کہ ان سے اچھا میل جول نہ رکھا جائے بلکہ ایسی صورت میں اپنی طبیعت پر جبر کر کے بھی ان سے حسن اخلاق سے پیش آنا چاہیئے۔ کیونکہ جس طرح انسان کا یہ دن رات کا تجربہ ہے کہ ایک چیز کو وہ پہلے پسند نہیں کرتا مگر آخر کار اس سے بہت سے فوائد حاصل کرتا ہے۔ ایسا ہی عورتوں کے معاملہ میں بھی سمجھایا ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ تم بی بی کو ناپسند کرو لیکن اگر طبیعت پر جبر کر کے اس سے حسن سلوک کرو گے تو اللہ تعالیٰ ناپسندیدگی کو بھی دور کر دے گا۔ اور اس تعلق کو بہت سی بھلائی کا موجب کر دے گا۔

عورتوں سے حسن معاشرت کا حکم اسلام کی خصوصیات میں سے ہے اور اس کی نہایت عمدہ تفسیر حدیث و تعامل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتی ہے۔ آپ نے فرمایا خیرکم خیرکم لاھلہ۔ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل سے سب سے اچھا سلوک کرتا ہے اور حجۃ الوداع میں آپ کی آخری نصیحت تھی واستوصوا بالنساء خیراً۔ عورتوں سے اچھا سلوک کرنا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ نری میری تعلیم ہی نہیں بلکہ میرا عمل بھی ہے وانا خیرکم لاھلہ اور تاریخ شاہد ہے کہ آپ کے اخلاق اپنے اہل سے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ آپ ان سے ہنستے کھیلتے بھی تھے اور ہمیشہ کشادہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ان کو ہنساتے بھی تھے ان کے کاموں میں ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ بعض دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ کے ساتھ آپ دوڑے بھی ہیں۔

ع ۶۳۱ طلاق کب دینی جائز ہے۔ پچھلی آیت کے آخر پر فرمایا تھا کہ بی بی سے اچھا میل جول رکھو یہاں تک کہ ناپسند بھی ہو تو طبیعت پر جبر کر کے اس سے حسن سلوک کرو۔ لیکن بعض وقت ناپسندیدگی ناقابل علاج ہوتی ہے اور طبائع میں قطعاً میل جول نہیں ہو سکتا تو ایسی صورت میں ایک کو دوسرے کے ساتھ بندھے رکھنا ان کے اخلاق کو بھی تباہ کرتا ہے اور ان کی اولاد کو بھی۔ اس لیے اس آیت میں اس صورت کا ذکر کیا ہے۔ جب ناپسندیدگی قابل علاج نہ ہو۔ یوں یہاں یہ بھی بتا دیا ہے کہ طلاق اسی صورت میں دینی جائز ہے جب ناپسندیدگی یا ناموافقت طبع اس حد کو پہنچ جائے۔ یہاں یہ کیوں نہ کہا کہ تم اسے طلاق دینا چاہو اور یہ کہا کہ اس کی بجائے دوسری بی بی کرنا چاہو؟ اس لیے کہ اسلام انسان کی معمولی حالت اسی کو قرار دیتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہو۔ پس جب ایک بی بی کو طلاق دے گا تو لازماً دوسری سے نکاح کرے گا۔ اس آیت سے جو ایک نہایت ضروری حکم پر مشتمل ہے یعنی جب مرد کو عورت ناپسند ہو اور وہ اس سے حسن معاشرت نہ رکھ سکتا ہو تو اس بی بی کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کرے۔ عورتوں کے ادل بدل کرتے رہنے کا نتیجہ نکالنا بگڑے ہوئے دماغ کا کام ہو سکتا ہے۔ یہاں

وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

اور تم اُسے کس طرح لے سکتے ہو حالانکہ تم میں سے ایک دوسرے تک پہنچ چکا ہے اور وہ تم سے مضبوط عہد لے چکی ہیں ۶۳۲

تو صرف یہ حکم ہے کہ ایسی صورت میں بیشک ایک بی بی کو طلاق دینا جائز ہے اور اس طلاق شدہ کی جگہ دوسری بی بی سے نکاح کرنا بھی جائز ہے عیسائیت کے قانون کی طرح نہیں کہ اگر ایک سے اَن بن ہوئی یہاں تک کہ میاں بی بی قانوناً الگ الگ بھی کیے جائیں، کیونکہ اکٹھے وہ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ تو اب نہ بی بی کو اجازت ہے کہ دوسرا نکاح کرے نہ خاوند کو اختیار ہے کہ دوسری بی بی سے نکاح کرے۔ بلکہ اس لفظ استبدال میں عیسائیت کے اس بیہودہ قانون کی طرف ہی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ایک نکاح ناکامیاب ثابت ہُوا ہے اور کسی طرح پر وہ مودت و الفت پیدا نہیں ہو سکتی جو نکاح کا اصل منشاء ہے تو پھر ایسا تعلق قطع ہو کر دوسرا تعلق کیوں قائم نہ ہو طلاق دی ہوئی عورت کو بھی دوسرا خاوند کرنے کا اختیار ہے جیسا دوسری جگہ بالصراحت آ چکا ہے اور طلاق دینے والے خاوند کو دوسری بی بی سے نکاح کرنے کا اختیار اس لفظ استبدال میں دیا ہے۔ اور ایسی صورت میں جب نشوز یا فساد باہمی میں خاوند پر الزام ہو وہ عورت سے ایک حبہ اس مال کا واپس نہیں لے سکتا جو بطور تحفہ یا مہر اسے دیا یا دینا کیا ہو۔ گو وہ مال ایک قنطار یعنی سونے کے ڈھیر کے برابر بھی ہو۔ آیت کے آخری الفاظ میں فرمایا کہ کیا تم مال لینے کی خاطر عورت پر کوئی بہتان لگاؤ گے یعنی فاحشہ مبینہ کا الزام۔ یا کسی گناہ کا ارتکاب کرو گے یعنی جاہلیت کی طرح عورت کو دکھ دینا شروع کرو گے تاکہ وہ مال کا کچھ حصہ واپس کر کے خلع کرالے پس اسلام دئیے ہوئے مال کے (یا جو معاہدہ کے نیچے دینا ہوا اس کے) واپس لینے کی اس صورت میں اجازت نہیں دیتا۔

مہر کی مقدار: یہ آیت اس پر بھی صریح دلیل ہے کہ عورتوں کے مہر پر کوئی حد بندی نہیں یعنی جتنا مہر کوئی شخص چاہے دے سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بڑے بڑے فرضی مہر باندھے جائیں۔ بلکہ مہر وہی ہے جو ادا کر دیا جائے ایسے مہر باندھنا جو ایک انسان ادا ہی نہیں کر سکتا صریحاً خلاف قرآن کریم ہے۔ یہاں بیشک قنطار کا دینا بھی جائز رکھا ہے جو ایک غیر محدود مقدار ہے مگر اٰتیتم کا لفظ بڑھا کر اور دوسری جگہ اٰتوا النساء صدقاتھن نحلۃ کا حکم دیکر یہ صاف بتا دیا کہ مہر دینے کی چیز ہے ایسا مہر باندھنا جو دے نہیں سکتا۔ یا جو دینے کا ارادہ نہیں۔ خلاف قرآن شریف ہے اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا من خیر النساء ایسرھن صداقا۔ بہترین عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو اور ایک حدیث میں ہے اعظم النساء برکۃ ایسرھن صداقا۔ سب سے بڑھ کر برکت والی عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو۔ ہاں اگر ایک امیر آدمی اپنی عورت کا مہر لاکھوں روپے بھی باندھتا ہے تو اسے روکنا بھی درست نہیں۔

حضرت عمرؓ کا خطبہ تعیین مہر پر: روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر چڑھے اور فرمایا اے لوگو! تم کتنا اپنی عورتوں کے مہر کو بڑھاتے ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے درمیان مہر چار سو درم یا اس سے کم ہی ہوتے تھے اور اگر مہر میں زیادتی اللہ کے نزدیک تقوٰی اور عزت کا موجب ہوتی تو تم ان سے اس بارہ میں سبقت نہ لے جاتے۔ اس لیے میں چار سو درہم سے زیادہ مہر کو تسلیم نہیں کروں گا (اور ایک روایت میں ہے جس قدر چار سو درہم سے زیادہ ہوگا۔ اسے بیت المال میں داخل کر دونگا) پھر آپ منبر سے اُترے تو ایک عورت قریش میں سے سامنے آئی اور کہا اے امیر المومنین آپ نے لوگوں کو چار سو درہم سے زیادہ مہر دینے سے روکا ہے۔ آپ نے کہا ہاں! اس نے کہا کیا آپ نے نہیں سُنا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے وان اٰتیتم احدٰھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئا۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا اللّٰھم اغفر کل الناس افقہ من عمر۔ اے اللہ معاف فرمائیو سب لوگ عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں (اور ایک روایت میں ہے کہ اس عورت نے کہا اے خطاب کے بیٹے تو ہم کو روکتا ہے اور اللہ ہم کو دیتا ہے اور یہ آیت پڑھی تو آپ نے فرمایا نساء المدینۃ افقہ من عمر۔ مدینہ کی عورتیں عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں) تب حضرت عمرؓ پھر منبر پر چڑھا اور فرمایا اے لوگو! میں تم کو اس بات سے روکتا تھا کہ چار سو درہم سے زیادہ مہر دو۔ لیکن جو کوئی تم میں سے اپنے مال سے جس قدر چاہے دے سکتا ہے (ث)

یہ روایت بتاتی ہے کہ صحابہؓ کس طرح قرآن کریم کے سامنے گردنیں جھکاتے تھے۔ الفاظ کی صراحت کے بالمقابل آپ نے تاویل سے کام نہیں لیا۔ یہ نہیں کہا کہ یہ بطور فرض ہے جس طرح بعض مفسرین نے یہ تاویل کر لی ہے۔ بلکہ بھرے مجمع میں اپنی بات سے رجوع کیا یہی سب سے بڑی ضرورت اسلام کو آج ہے کہ اس کے پیرو اور اس کے علماء اور اس کے مشائخ احکام قرآنی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ عام لوگوں کے اندر یہ جرأت پیدا ہو کہ وہ اپنے پیروں اور علماء کو جب وہ خلاف قرآن و حدیث کہیں روک سکیں۔ اور ان پیروں اور علماء میں یہ تقوٰی ہو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم سن کر اپنی بات سے رجوع کریں۔

ع۶۳۲ افضٰی۔ فضا فراخ مکان کو کہتے ہیں۔ اور اسی سے اَفْضٰی فلانٌ اِلٰی فُلانٍ کے معنی ہیں۔ اس کی طرف پہنچ گیا گویا اس دوسرے شخص کو فضاء یا مکان قرار دیا گیا اور مفردات میں ہے کہ عورت کی طرف افضاء کنایہ میں زیادہ بلیغ اور تصریح میں زیادہ قریب ہے خَلَا بِھا سے یعنی اس سے خلوت کی۔ گویا مراد اس سے عورت سے خلوت کرنا ہے یہی معنی امام ابوحنیفہ رح نے لیے ہیں۔

میثاقا غلیظا۔ غِلْظَۃ۔ دِقَّۃٌ کی ضد ہے گویا غلیظ کے معنی موٹا ہیں۔ اور اس کا اصل استعمال اجسام میں ہے لیکن بطور استعارہ ..... معانی میں مثل کبیر اور کثیر کے استعمال ہوتا ہے اور میثاق کے ساتھ لانے سے اس کے معنی عہد موکد یا مضبوط عہد کے ہونگے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ میثاق غلیظ سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے بارہ میں مردوں سے لیا ہے۔ جیسے فامساک بمعروف اوتسریح باحسان ہیں مگر صحیح مسلم میں نبی کریم صلعم کے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ مروی ہیں واستوصوا بالنساء خیرا فانکم اخذ تموھن بامانۃ اللہ یعنی عورتوں کے ساتھ نیک معاملہ کرو۔ کیونکہ تم نے ان

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا
مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً
ع وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ
وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ
الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ
مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ
الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ
دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ
بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآئِلُ
اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ

اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے
ہیں مگر جو گزر چکا، یہ بے حیائی اور سخت بیزاری کی بات ہے
اور بری راہ ہے ۶۳۳
تم پر (یہ عورتیں) حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری
بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں
اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں
نے تم کو دودھ پلایا ہے اور تمہاری رضاعی بہنیں اور تمہاری
بیویوں کی مائیں اور تمہاری پالی ہوئی لڑکیاں جو تمہاری حفاظت
میں ہوں ان عورتوں (کے بطن) سے جن پر تم داخل ہو چکے ہو
اور اگر تم ان پر داخل نہ ہوئے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں
اور تمہارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پیٹھوں سے ہوں ۶۳۴

کو اللہ کی امانت سے لیا ہے گویا نکاح کو ہی امانت یا عہد قرار دیا ہے پس میثاق غلیظ سے مراد نکاح ہی ہے۔

عورت سے مہر کس صورت میں لیا جا سکتا ہے۔ اس آیت میں وجہ دی ہے کہ کیوں عورتوں سے مہر کا واپس لینا درست نہیں۔ اس لیے کہ تم ان سے خلوت کر چکے ہو۔ اور معاہدہ کر چکے ہو۔ اب جب تک ان سے کوئی امر خلاف معاہدہ سرزد نہ ہو۔ ان کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ بعض لوگوں نے اس آیت کو سورۃ بقرہ کی اس آیت کا جس میں بروئے خلع عورت سے مہر کا کچھ حصہ لے لینا جائز ہے ناسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اس آیت سے اسے منسوخ قرار دیا ہے۔ حالانکہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ سورۃ بقرہ کی آیت خُلع کا تو یہ منشاء ہے کہ اگر عورت بوجہ ناموافقت طبیعت یا کسی اور وجہ سے طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے اور خاوند کا کوئی قصور نہیں تو اس صورت میں مہر کا کچھ حصہ لے لینا جائز ہے۔ اور یہاں یہ فرمایا کہ اس صورت میں کچھ لے لینا جائز ہے۔ جب مرد عورت کو بوجہ فاحشۃ مبینۃ طلاق دینا چاہے۔ لیکن اور کسی وجہ پر طلاق دینا چاہے تو مہر کا لینا جائز نہیں۔ اور ان دونوں باتوں میں کوئی تناقض نہیں۔ عورت طلاق لینا چاہتی ہے تو مہر کا حصہ دے مرد طلاق دینا چاہتا ہے تو کچھ مہر سے نہیں لے سکتا۔ سوائے ایک صورت کے کہ عورت سے فاحشۃ مبینۃ کا ارتکاب ہو۔ پہلی حالت کا بیان سورۃ بقرہ میں ہے۔ اس دوسری حالت کا یہاں ذکر کیا ہے۔ کس قدر تعجب ہے کہ غور و خوض سے کام نہ لینے سے جھٹ ایک آیت کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے حالانکہ دونوں حکم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں بلکہ اس سے نظم قرآنی کا کمال معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح حصے حصے کر کے مضامین کو مکمل کر دیا ہے۔

۶۳۳ مقتًا۔ مقت۔ سخت بغض ہے اس شخص کے لیے جس کو تم فعل قبیح کرتا دیکھو (غ)

یہ پانچویں اصلاح ہے جو مرد و عورت کے تعلقات میں اسلام نے کی۔ عرب میں یہ رواج تھا جیسا کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اپنے باپوں کی بیبیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ گو معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم اچھی نہ سمجھی جاتی تھی اور اسی لیے وہ لوگ اسے نکاح مقت کہتے تھے تاہم اس رسم پر عمل ہوتا تھا۔ اسلام نے اس کو جڑ سے کاٹ دیا۔

الا مَا قد سلف کے لفظی معنی تو صرف اسی قدر ہیں کہ جو پہلے گزر چکا۔ حرمت سود کے معاملہ میں بھی یہی لفظ آتے ہیں۔ فمن جآءہ موعظة من ربّه فانتهٰی فله ما سلف (البقرۃ ۲-۲۷۵) جہاں فله ما سلف کے معنی بتائے گئے ہیں کہ جو گناہ اس سے ہو چکا اس سے درگزر کی جائے گی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نے سودی معاملہ کیا ہوا ہے وہ سود لیتا رہے۔ بلکہ صاف الفاظ میں وہاں یہ ہدایت موجود ہے وذروا ما بقی من الرّبٰوا (البقرۃ ۲-۲۷۸) جو سود اس وقت لینا باقی ہے وہ بھی ترک کرنا پڑے گا۔ اسی طرح یہاں بھی اِلَّا ما قد سلف کے معنی ہیں جو تمہارا فعل ہو چکا اس کی وجہ سے تم پر کوئی گرفت نہیں (غ) یہ مطلب نہیں کہ جو نکاح پہلے ہو چکا وہ اب باقی رہ سکتا ہے۔ چونکہ اس آیت کے نزول کے بعد ایسا نکاح ناجائز ہو گیا اس لیے وہ تو فوراً منسوخ ہو جائے گا۔ البتہ اس کے کرنے والے پر کوئی گرفت نہیں پس الا ما قد سلف میں استثنا گناہ سے ہے جواز فعل سے نہیں۔

۶۳۴ اُمهات۔ اُمّ کی جمع ہے اور اس میں قریب کی والدہ جس نے اسے جنا ہے اور بعید کی والدہ جس نے اس کے جننے والوں کو جنا ہے جیسے دادی، نانی شامل ہیں (غ)

تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۲۳﴾
الجزء ۵ وَّالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتۡ
اَيۡمَانُكُمۡ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمۡ

اور یہ کہ تم دو بہنوں کو اکٹھا کرو مگر جو گزر چکا۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔
اور تمام بیاہی ہوئی عورتیں سوائے ان کے جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہو چکے[۶۳۵]۔ یہ تم پر اللہ کا فرض کیا ہوا ہے اور جو

بنات ۔ بِنت کی جمع ہے اور اس میں اولاد کی بیٹی یا اولاد کی اولاد کی بیٹی بھی شامل ہیں۔

اَخوات ۔ اُخت کی جمع ہے یعنی بہن ۔ خواہ حقیقی بہن ہو، یا صرف باپ کی طرف سے یا صرف ماں کی طرف سے۔

عمات ۔ عَمَّۃٌ کی جمع ہے اور عَمّ باپ کا بھائی ہے اور عَمَّۃ اصل میں باپ کی بہن یا پھوپھی ہے ۔ ایسا ہی دادا کی بہن اور ماں کے باپ کی یا نانا کی بہن بھی عَمَّۃ کہلائے گی۔

خالات ۔ خَالَۃٌ کی جمع ہے اور وہ ماں کی بہن یا ماسی ہے ایسا ہی نانی کی بہن اور باپ کی طرف سے بھی خالہ ہو سکتی ہے ۔ یعنی باپ کی ماں یا دادی کی بہن۔

ربائبکم ۔ ربائب ۔ رَبِیبَۃ کی جمع ہے جو فعیل بمعنی مفعول ہے یعنی مَرْبُوبَۃ یا وہ لڑکی جس کو تم نے پالا ہے اور لفظ ربیب یا ربیبۃ اس اولاد سے مخصوص ہے جو پہلے خاوند سے ہو اور دوسرا خاوند اس کی پرورش کرنے والا ہو ۔ یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی اس کی پرورش کرنے والی ہو (رغ)

حجور ۔ حِجر کی جمع ہے اور مراد اس سے حفاظت میں آنا ہے کیونکہ حِجر کے اصل معنی منع ہیں یعنی روکنا ۔ جو پتھر کی سختی سے لیے گئے ہیں اور حجر حفاظت یا تربیت کو اس لیے کہتے ہیں کہ جو شخص بچے کو اپنی حفاظت میں لیتا ہے وہ اس کے اموال اور دیگر حالات میں تصرف سے اوروں کو روکتا ہے۔

حلائل ۔ حَلِیلَۃ کی جمع ہے (جو حَلّ سے ہے جس کے معنی کھولنا ہیں) اور حلیل خاوند کو اور حلیلۃ بی بی کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کے لیے حلال ہیں۔

چودہ وجوہ حرمت نکاح : اس آیت میں تیرہ قسم کی حرمت نکاح میں بیان کی ہے اور اس سے پہلی آیت کو ساتھ شامل کر کے کل چودہ وجہ سے حرمت ہے اور اس سے بعد کی آیت میں ایک عام حکم حرمت کا اور ہے ۔ مگر اصل وجوہ حرمت نکاح چودہ ہی ہیں ۔ ان میں سے سات بلحاظ نسب ہیں اور سات دیگر وجوہ سے ۔ جو سات وجوہ حرمت بلحاظ نسب ہیں وہ بھی دو قسم ہیں یعنی اول بلحاظ ولادت ہے اور اس میں دو ہی قسم آتی ہیں یعنی مائیں اور فرع یعنی بیٹیاں اور قسم دوم ۔ بلحاظ اخوت سے جو پانچ ہیں ۔ اپنی بہن، باپ کی بہن، ماں کی بہن، بھائی کی بیٹی ۔ بہن کی بیٹی اور دیگر وجوہ میں سات وجہ حرمت ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔ دودھ مائیں، دودھ بہنیں ۔ بیبیوں کی مائیں ۔ بیبیوں کی پہلی بیٹیاں بشرطیکہ ان بیبیوں سے خلوت صحیحہ ہو چکی ہو اور بشرطیکہ وہ بیٹیاں بطور ربیبہ ہوں (بعض کے نزدیک یہ دوسری شرط نہیں بلکہ محض عام صورت حال کا بیان ہے) بیٹوں کی بیبیاں ، باپوں کی بیبیاں (جس کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے) اور دو بہنوں کا ایک وقت نکاح میں رکھنا ۔ قرآن کا دعویٰ کامل شریعت ہونے کا کیسا صحیح ہے کہ ہر مسئلہ میں اصول خود قائم کر دیتے ہیں ۔ دوسری قومیں بھی کچھ نہ کچھ محرمات ضروری قرار دیتی ہیں ۔ مثلاً ماں یا بیٹی سے یا بہن سے نکاح کرنے کا رواج کسی قوم میں نہیں ۔ مگر ان کی کتب مقدسہ اس بارہ میں خاموش ہیں ۔ صرف توریت میں کچھ ذکر ہے ۔ جس کے لیے دیکھو احبار باب ۱۸ : ۶-۱۸۔

رضاعت کے رشتے : جو وجوہات حرمت اوپر بیان ہوئی ہیں ان میں صرف دودھ ماؤں اور دودھ بہنوں کا ذکر بالتصریح آیا ہے ۔ اور رضاعت کے باقی رشتوں کا کوئی ذکر نہیں ۔ لیکن متفق علیہ حدیث میں ہے یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب یعنی جن جن رشتوں کی بوجہ نسب ممانعت ہے انہی رشتوں کی بوجہ دودھ پلانے کے حرمت ہے ۔ قرآن کریم ایک جامع کلام ہے ۔ اس لیے حرمت بوجہ نسب کو دو اقسام پر تقسیم کر دیا ہے ایک حرمت بوجہ ولادت اور ایک حرمت بوجہ اخوت ، اس لیے جب دودھ کے رشتوں کی حرمت کا ذکر آیا تو کمال بلاغت سے حرمت بوجہ ولادت کا اصل موجب یعنی ماں ہونا (جس میں بیٹی ہونا بھی شامل ہے) بیان کر دیا ہے اور حرمت بوجہ اخوت کا اصل موجب یعنی بہن ہونا (جس میں باپ کی بہن، ماں کی بہن ، بھائی کی بیٹی بہن کی بیٹی شامل ہیں) ذکر کر دیا ۔ اور تفصیل کو چھوڑ دیا ۔ کیسا پر حکمت کلام ہے کہ ضرورت سے زائد ایک لفظ بیان نہیں کیا ۔ ہاں اسی سے یہ بھی سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم صلعم کا فہم بھی کیسا الٰہی روشنی سے منور ہے کہ اصل حقیقت تک فوراً پہنچ کر یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب کا حکم دیدیا اسی طرح دو بہنوں کو ایک وقت میں نکاح میں رکھنے کی جو حرمت ہے ۔ حدیث نے اسی حکم میں پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کو اور خالہ اور بھانجی کے جمع کرنے کو بھی شامل کیا ہے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے ۔ کیونکہ اصل تعلق وہاں بھی اخوت کا ہے ۔ گویا ایک عورت کے ساتھ اس کی بہن اس کے باپ کی بہن ، اس کی ماں کی بہن کو جمع کرنے کا حکم یکساں ہے ۔ رضاعت کے متعلق یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں دو سال کی عمر کے اندر اندر کے بچہ کو دودھ پلانا شرط ہے جیسا کہ یرضعن اولادھن حولین کاملین (البقرۃ ۲ ۔ ۲۳۳) سے ظاہر ہے اور دوسری حدیث میں ہے الرضاعۃ من المجاعۃ یعنی وہ دودھ پلانا حرمت کے حکم میں لاتا ہے جو بھوک کے وقت بچہ کو دودھ پلایا ہو یوں ہی بچہ کا ایک دو دفعہ منہ مار لینا کافی نہیں۔

۶۳۵ المحصنٰت ۔ مُحْصَنَۃ کی جمع ہے ۔ جو حِصن سے ہے اور اس کے اصل معنی قلعہ ہیں اور جمع حُصُون آتی ہے ما نعتھم حصونھم من اللہ (الحشر ۵۹ ۔ ۲)

وَّ اُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ ؕ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِہٖ مِنۡہُنَّ فَاٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ فَرِیۡضَۃً ؕ وَ لَا

اس کے سوا ہیں وہ تمھارے لیے حلال ہیں (اس طرح) کہ تم اپنے مالوں کے ساتھ ان کو چاہو نکاح میں لا کر نہ شہوت رانی کرتے ہوئے[۶۳۶] سو تم نے ان میں سے جس کے ساتھ نفع اٹھایا ہے انھیں ان کے مقرر شدہ مہر دے دو[۶۳۷] اور تم

اور اسی سے تَحَصَّنَ ہے جس کے معنی ہیں قلعہ کو اپنا مسکن بنالیا - اور اس سے تجاوز کر کے ہر قسم کے تحرّز پر یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے دِرْعٌ حَصِیْنَۃٌ زرہ جو بدن کی حفاظت کرتی ہے - فَرَسٌ حِصَانٌ وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو بچاتا ہے - اور قرآن کریم میں ہے اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ (یوسف ۱۲ - ۴۸) یعنی محفوظ مکان میں محفوظ کرو - اور امرأۃ حَصَانٌ کے معنی ہیں عفیفہ اور ذو حُرْمَۃ یعنی پاکدامن اور عزّت والی عورت - اور اِحْصَان کے معنی نکاح کرنا ہیں فَاِذَآ اُحْصِنَّ (۲۵) اور مُحْصَنَۃٌ حَصَان کو کہتے ہیں خواہ وہ بوجہ عِفّت کے محفوظ ہو یا بوجہ نکاح کے یا بوجہ اپنی بلند مرتبگی کے اور حریت کے (غ) اور عورت مُحْصَنَۃ ہوتی ہے بوجہ اسلام اور پاکدامنی اور آزادی اور نکاح کے (ل) اور ان چاروں معنوں میں اس لفظ کا استعمال قرآن کریم میں ہوا ہے - پس محصنات سے مراد مسلمان عورتیں یا پاکدامن عورتیں یا آزاد عورتیں یا منکوحہ عورتیں ہو سکتی ہیں -

ملک یمین کا حکم: اس آیت کی تفسیر مفسرین نے چار طرح پر کی ہے - اوّل محصنات سے مراد خاوند والی عورتیں لیجائیں تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ما ملکت ایمانکم سے مراد وہ عورتیں لی جائیں جو جنگ میں قید ہو کر ملک یمین ہو جاتی ہیں - دوسرے یہ کہ ملک یمین سے ملک نکاح مراد لیجائے تو پہلی صورت میں معنی یہ ہوئے کہ خاوند والی عورتوں سے نکاح کرنا منع ہے - سوائے ان خاوند والی عورتوں کے جو ملک یمین میں آجائیں - اور دوسری صورت میں یہ معنی ہوئے کہ خاوند والی عورتیں تم پر حرام ہیں سوائے اس صورت کے کہ وہ تمہاری ملک نکاح میں آجائیں بعد اس کے کہ ان کے پہلے خاوندوں سے جدائی واقع ہو جائے - کیونکہ جب تک پہلے خاوند سے جدائی نہ ہو، ملک نکاح میں ایسی عورت نہیں آسکتی - دوم محصنٰت سے مراد آزاد عورتیں لی جائیں تو اس صورت میں بھی دو طرح پر معنی کیے گئے ہیں - ایک یہ کہ ما ملکت ایمانکم سے مراد وہ عدد لیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے حد مقرر کر دی ہے یعنی چار اور دوسرے یہ کہ ما ملکت ایمانکم سے مراد یہ لی جائے کہ وہ عورتیں جو تمہارے قبضہ میں جائز طور پر آچکی ہیں یعنی ولی کی رضامندی سے اور گواہوں کی موجودگی و دیگر شرائط کے ساتھ - تو گویا ان دو صورتوں میں معنی یہ ہوئے کہ آزاد عورتیں چار کی تعداد سے زائد تمہارے لیے حرام ہیں یا یہ کہ آزاد عورتیں تمہارے لیے حرام ہیں سوائے اس کے کہ جائز طور پر وہ تمہارے نکاح میں آئیں - ان معانی میں سے مؤخر الذکر تین معنی پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا اور پہلے معنی بھی تھوڑے تدبر سے صاف ہو جاتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے تمام منکوحہ عورتوں سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتی ہوں نکاح حرام ٹھہرایا گیا ہے اور یوں دوسرے مذاہب کی عورتوں کے نکاح کو بھی صحیح تسلیم کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ کسی مذہب یا قوم کی عورت سے جو نکاح شدہ ہو مسلمان کا نکاح کرنا ناجائز ہے سوائے ایک صورت کے کہ کوئی ایسی منکوحہ عورت ملک یمین ہو جائے تو اس صورت میں اس سے نکاح کر لینا جائز ہے - یہاں نکاح کے بغیر کسی قسم کا تعلق مرد و عورت کا ہونا ہرگز تسلیم نہیں کیا گیا ہے - بلکہ صرف لونڈی سے نکاح کی اجازت ہے اور وہ نکاح دوسری شرائط کے ماتحت ہے جن میں سے بعض خاص شرائط کا ذکر آگے آیت ۲۵ میں آتا ہے اور عام شرائط دوسری جگہ قرآن کریم میں موجود ہیں مثلاً یہ کہ مشرک عورت سے نکاح جائز نہیں وغیرہ -

ان الفاظ کے ایک اور معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ تمام بیاہی ہوئی عورتیں تمہارے اوپر حرام ہیں سوائے ان بیاہی ہوئی عورتوں کے جن کے تمہارے اپنے داہنے ہاتھ مالک ہوں یعنی جو تمہارے اپنے نکاح میں ہوں - اس صورت میں اِلّا گویا استثنائے منقطع کا کام دے گا - اور ترکیب اس طرح پر ہوگی کہ تمام بیاہی ہوئی عورتوں سے نکاح کرنا تمہارے لیے حرام ہے مگر جو عورتیں تم نے خود بیاہی ہیں وہ تم پر حرام نہیں ملک یمین سے مراد ملک نکاح نہ صرف مفسرین نے لیا ہے بلکہ لغت بھی اس پر شاہد ہے کیونکہ یمین کے معنی معاہدہ بھی ہیں اور نکاح ایک معاہدہ ہی ہے -

۶۳۶ کتٰب اللہ علیکم کتٰب یہاں مصدر مؤکد ہے اور اس سے مراد ہے واجب یا فرض کیا گیا۔

ما وراء ذٰلکم اس کے سوا باقی عورتوں سے نکاح کرنا حلال ہے - لیکن بعض حالات میں اور وجوہات سے نکاح جائز نہیں ہوتا - وہ دوسری آیات کے ماتحت آتی ہیں - مثلاً تین بار کی مطلقہ لا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ یا مشرکہ عورت ولا تنکحوا المشرکات یا چار کے بعد پانچویں عورت - یا جس سے لعان ہو چکا ہے جس کے متعلق نبی کریم صلعم نے فرمایا لا یجتمعان ابدا ۔

مسافحین - سفح خون یا پانی کے بہانے کو کہتے ہیں اور سِفاح یا مُسافحۃ کے معنی ہیں عورت کا مرد کے ساتھ بدکاری کی حالت میں رہنا اور صحیح طور پر ان کا عقد نہ ہونا کیونکہ اس سے مقصود پانی کا بہانا یا شہوت رانی ہے اور فریقین کے کوئی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا نہیں ہوتیں -

یہاں پچھلی آیت کے مضمون کو صاف کر دیا - جو عورتیں حرام ہیں ان کو گن کر بتا یا کہ جو عورتیں حلال ہیں ان کے ساتھ تعلق اس صورت میں ہو کہ مہر دے کر انہیں قید نکاح میں لایا جائے اور بغیر نکاح کے ان کے ساتھ فجور کی حالت میں نہ رہیں - قید نکاح میں لانے کی شرط کافی تھی غیر مسافحین ان خیالات کی تردید ہے جو تہذیب کے ساتھ پھیل رہے ہیں کہ قید نکاح میں خواہ مخواہ کی پابندی ہے - قدرتی حالت میں مرد و عورت کا رہنا کافی ہے یعنی جس طرح حیوانات میں ایک جوڑا بن جاتا ہے - اسی طرح ایک مرد اور ایک عورت بلا قید نکاح کے مل کر رہ لیا کریں -

۶۳۷ استمتعتم - اصل اس کا متع ہے اور مَتاع کے معنی ہیں ایسا نفع اٹھانا جو لمبے وقت کے لیے ہو (غ) ومتعناھم الی حین (یونس ۱۰ - ۹۸) نمتعھم قلیلاً

جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ پر اس کے متعلق کوئی گناہ نہیں تم مقرر کرنے کے بعد آپس میں رضامند

(لقمان ۳۱-۲۴) سنمتعہم ثم نمسّہم مناعذاب الیم (ھود ۱۱-۴۸) اور استمتاع کے معنی ہیں طلب تمتّع یعنی انتفاع ممتدالوقت کا طلب کرنا۔ ربّنا استمتع بعضنا ببعض (الانعام ۶-۱۲۸) فاستمتعوا بخلاقھم فاستمتعتم بخلاقکم کما استمتع الذین من قبلکم بخلاقھم (التوبۃ ۹-۶۹) اور عام محاورہ میں کہتے ہیں استمتع الرجل بولدہ یعنی آدمی نے اپنے بیٹے سے فائدہ اٹھایا پس استمتاع کے معنی محض نفع اٹھانے کے ہیں نہ تعلقات زناشوئی اور مُتعۃ کے معنی یوں کیے گئے ہیں۔ التمتّع بالمرأۃ لاترید ادامتھا لنفسک (ل) یعنی عورت سے فائدہ اٹھانا جس کو تم اپنے لیے ہمیشہ رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ یا جیسا کہ امام راغبؒ نے لکھا ہے۔ ان الرجل کان یُشارطُ المرأۃَ بمالٍ معلومٍ یُعطیھا الی اَجلٍ معلومٍ فاذا انقضی الاجلُ فارقھا من غیر طلاقٍ یعنی ایک مرد ایک عورت سے شرط کر لیتا تھا کہ ایک معین مقدار مال کی اسے دیگا۔ اور ایک وقت مقرر تک اس سے فائدہ اُٹھائے گا۔ اور جب وہ مدت گزر جاتی تو بغیر طلاق کے اس سے الگ ہو جاتا۔

اجور۔ اَجر کی جمع ہے۔ جو اصل میں تو وہ چیز ہے جو ثواب عمل سے انسان کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ مگر عورت کے مہر پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

استمتاع اور متعہ میں فرق: ان الفاظ کی تاویل میں اہل تشیع کو یہ سخت غلطی لگی ہے کہ یہاں لفظ استمتعتم سے انہوں نے متعہ یا عارضی نکاح کا جواز نکالا ہے۔ حالانکہ استمتاع عام ہے اور مُتعۃ خاص معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اوپر لغت کے حوالہ سے دکھایا گیا ہے۔ بڑے اور چھوٹے انسانوں کا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا اور باپ کا بیٹے سے فائدہ اٹھانا استمتاع ہے اور اس کے معنی عارضی نکاح لینا صریح غلطی ہے۔ زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ اس آیت کے معنی میں ایک قوم نے بوجہ لغت سے جہالت کے بڑی سخت غلطی کھائی ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ گو متعہ کا ذکر یہاں مقصود نہ ہو۔ مگر کیا ان الفاظ کے اندر فما استمتعتم بہ منھن متعہ کا مفہوم شامل نہیں ہو سکتا؟ کیونکہ استمتاع کے معنی طلب منفعت ہیں اور متعہ میں بھی طلب منفعت ہے۔ الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن شریف نے قید لگا دی ہے کہ تم اپنے مال عورتوں پر اس رنگ میں خرچ کرو کہ ان کو قید نکاح میں لاؤ اور قید نکاح جب ایک دفعہ عاید ہو جائے گی تو اس سے زوجین کی زندگی میں نکلنے کی صورت سوائے طلاق کے اور کوئی قرآن شریف میں مذکور نہیں پس فما استمتعتم بہ منھن جو بطور نتیجہ وارد ہوا ہے وہ بھی اسی حالت یعنی قید نکاح کے متعلق ہی ہو سکتا ہے۔

نکاح اور مسافحت: قرآن شریف نے احصان یعنی نکاح کے مقابلہ پر مسافحت یعنی شہوت رانی کو رکھا ہے محصنین غیر مسافحین گویا جو احصان نہیں وہ مسافحت ہے اس لیے متعہ کو ہمیں ان دونوں میں سے ایک میں شامل کرنا پڑے گا۔ احصان اور مسافحت میں امر مشترک اس قدر ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کا تعلق ہوتا ہے دونوں میں امتیاز یہ ہے کہ احصان میں مرد و عورت کا تعلق ساری عمر کے لیے ہوتا ہے مسافحت میں نہیں احصان میں عورت کے مرد پر کچھ حقوق پیدا ہوتے ہیں شلاً ایک دوسرے کی زوجیت میں مر جائے تو حق وراثت پیدا ہوتا ہے مسافحت میں پیدا نہیں ہوتا۔ احصان میں اولاد کی پرورش کا ذمہ دار باپ ہے مسافحت میں نہیں۔ پس احصان میں وہی امر داخل ہو سکتا ہے جو اس کے امتیازی پہلوؤں میں اس کا شریک ہو۔ اب متعہ میں ایک مرد و عورت کا تعلق ہے اس حد تک اس کا مسافحت کے ساتھ اشتراک ہے اور احصان کی کوئی امتیازی خصوصیت اس کے اندر نہیں پائی جاتی۔ متعہ میں نہ تو کوئی تعلق عمر بھر کے لیے ہوتا ہے اور نہ اگر مرد و عورت میں سے ایک دوسرے کی زوجیت میں فوت ہو جائے تو کوئی حقوقِ وراثت پیدا ہوتے ہیں نہ اولاد کی پرورش کا ذمہ دار باپ ہوتا ہے۔ اس لیے صریحاً متعہ مسافحت میں داخل ہے نہ احصان کے اندر اور اگر یہ کہا جائے کہ متعہ میں اعلان ہوتا ہے تو اعلان ایک گونہ مسافحت میں بھی ہوتا ہے مسافحت کے معنی ہی علی الاعلان مرد اور عورت کا اکٹھا رہنا ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مسافحت کے ساتھ ایک جگہ چھپی آشنائی کو الگ بیان کیا ہے۔ محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان (المائدۃ ۵-۵) یہاں ان لوگوں کے لیے بھی جواب ہے جو نکاح کی غرض صرف شہوت رانی سمجھتے ہیں۔ اسلام نے نکاح کی غرض کو شہوت رانی سے اس قدر بلند قرار دیا ہے کہ شہوت رانی کو ناجائز قرار دیا ہے اور یوں بتایا ہے کہ نکاح صرف اس غرض کے لیے نہیں کہ مرد و عورت کے جذبات شہوانی پورے ہوں بلکہ اس کی غرض بعض حقوق و ذمہ داریوں کا پیدا کرنا ہے جن سے تمدن و معاشرت انسانی کی بنیاد پڑتی ہے نیز دیکھو ۶۳۹ء میں اخدان کی تشریح۔

احادیث میں متعہ کی حرمت: ہاں یہ سچ ہے کہ متعہ عرب میں مروج تھا۔ اس لیے اگر نزول حکم قرآنی سے پہلے نبی کریم صلعم نے اس کی اجازت دی ہو تو وہ دوسری بات ہے۔ علاوہ ازیں اگر روایات میں اجازت پائی جاتی ہے تو ممانعت بھی پائی جاتی ہے۔ اجازت نزول حکم سے پہلے کی ہے اور جب قرآن شریف میں حکم نازل ہو گیا تو روایات میں بھی ممانعت آ گئی۔ اب اجازت کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی شراب کے متعلق کسی روایت کو پیش کر دے کہ فلاں وقت فلاں صحابیؓ نے شراب پی تھی۔ چنانچہ اس کے مطابق صحیح مسلم میں سبرہ بن معبد کی روایت اپنے باپ سے ہے انہ غزا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم فتح مکۃ فقال یا ایھا الناس انی کنت اذنت لکم فی الاستمتاع من النساء وان اللہ قد حرم ذٰلك الی یوم القیامۃ فمن کان عندہ منھن شئ فلیخل سبیلہ یعنی اس نے فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جنگ کی تو آپ نے فرمایا کہ اے لوگو میں نے تم کو عورتوں سے متعہ کی اجازت دی تھی اور اللہ نے اس کو قیامت کے دن تک حرام کر دیا ہے پس جس شخص کے پاس ایسی کوئی عورت ہے اس کا راستہ آزاد کر دے اور دوسری روایت صحیحین کی حضرت علیؓ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں کے متعہ سے روک دیا اور گھریلو گدھوں کے گوشت کے کھانے سے اور تیسرا واقعہ حضرت عمرؓ کے عہد کا نہایت صاف ہے جس کے متعلق ابن ماجہ میں اسناد صحیح سے روایت ہے کہ آپ نے خطبہ پڑھا فقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذن لنا فی المتعۃ

الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾
وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ
الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ
مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ
وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ
غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ
فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ
نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ
لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا

ہو جاؤ۔ اللہ جاننے والا حکمت والا ہے [۶۳۸]
اور جو شخص تم میں سے یہ مقدور نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں
سے نکاح کرے تو تمہاری ان مومن لونڈیوں سے نکاح کرلے،
جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب
جانتا ہے تم آپس میں ایک ہی ہو سو انھیں ان کے مالکوں کی اجازت سے
نکاح میں لاؤ اور ان کو دستور کے موافق ان کے مہر دیدو پاکدامن ہوں
نہ کھلی بدکاری کرنے والی اور نہ درپردہ آشنا رکھنے والی۔ پھر جب
وہ نکاح میں لائی جائیں تو اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے لیے
آزاد عورتوں کی سزا سے آدھی ہے یہ تم میں سے اس کے لیے
ہے جسے ہلاکت میں پڑنے کا خوف ہو اور اگر تم صبر کرو تو تمہارے

ثلاثا ثم حرمها والله لا اعلم احدا تمتع وهو محصن الا رجمته ۔ یعنی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو تین مرتبہ متعہ کی اجازت دی پھر اس کو حرام کردیا اور مجھے جس شخص کے متعلق علم ہوگا کہ اس نے باوجود نکاح شدہ ہونے کے متعہ کیا ہے میں اسے سنگسار کروں گا۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو صحابہؓ اس کی مخالفت کرتے۔ مگر کوئی شخص اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کا خود اس پر اتفاق تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متعہ کو حرام کرچکے ہیں اور یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نبی کریم صلعم نے عام طور پر متعہ کی اجازت کبھی نہیں دی بلکہ صرف دو دفعہ جنگ کے موقع پر دی تھی اور وہ قریبًا حالت اضطراری ہوتی ہے مگر بعد میں اسے بھی روک دیا۔ پس روایات متعہ کو مان کر بھی اس کا عام جواز جیسا اہل تشیع میں مروج ہے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

متعہ کب حرام ہوا: البتہ سوال تاریخ کے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ کب متعہ حرام ہوا۔ حضرت علیؓ کی روایت مندرجہ بالا میں یہ ذکر ہے کہ متعہ خیبر کے دن حرام ہوا اور سبرہ کی روایت میں ہے کہ فتح مکہ میں حرام ہوا۔ ہم کو اس بارہ میں کسی فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ آیت خیبر کے دن نازل ہوئی تو اس وقت حرام ہوا ہوگا اور اگر فتح مکہ کے دن تو اس وقت۔ البتہ اگر حرمت خیبر کے دن تسلیم کی جائے تو اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ غزوہ اوطاس میں جو اس کی اجازت پائی جاتی ہے جس کا وقوع فتح کے سال ہوا وہ بے معنی ٹھہرتی ہے۔ ممکن ہے اس روایت میں کسی راوی کو غلطی لگی ہو اور ممکن ہے جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی صحیحین والی روایت میں غلطی ہوگئی ہے۔ اور لفظ یوم خیبر بجائے اکل لحوم حمر کے متعۃ النساء کے ساتھ لگ گئے ہیں۔ اور اس کی تائید بلاشبہ کئی واقعات سے ہوتی ہے جیسا کہ امام ابن قیم نے لکھا ہے۔ اول امام احمد کی اس روایت سے جو سفیان بن عیینہ نے کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم لحوم الحمر یوم خیبر وحرم متعۃ النساء یعنی رسول اللہ صلعم نے خیبر کے دن گدھے کے گوشت کو حرام فرمایا اور عورتوں کے متعہ کو حرام کیا۔ تو گویا یوں خیبر کا لفظ گدھوں کی حرمت کے متعلق تھا۔ کسی راوی نے اس کو متعۃ النساء کے متعلق کردیا۔ اور اس کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ خیبر کے دن کوئی متعہ کا سوال پیش نہیں ہوا۔ اور حضرت علیؓ نے جو ان دو باتوں کو اکٹھا کیا تو اس لیے نہیں کہ ان کی حرمت ایک دن ہوئی۔ بلکہ اس لیے کہ ابن عباسؓ ان دونوں مسائل میں دوسرا پہلو اختیار کرتے تھے۔ اس لیے حضرت علیؓ نے ان دونوں کا اکٹھا ذکر کیا۔ گو وہ الگ الگ وقت کے واقعات تھے۔

متعہ کے بارہ میں ابن عباس کا مذہب: باقی رہا سوال حضرت ابن عباسؓ کے متعہ کو حلال کہنے کا، سو اس کی تشریح انہوں نے خود ان الفاظ میں کردی قلت انما تحل للمضطر کما تحل المیتۃ والدم ولحم الخنزیر لہ ۔ میں نے کہا تھا کہ وہ مضطر کے لیے حلال ہے جس طرح اس کے لیے مردار اور خون اور سؤر کا گوشت حلال ہے۔ پس اضطرار کی حالت میں حلال قرار دینا یہ حلت کا فتویٰ نہیں۔ بلکہ حرمت کا فتویٰ ہے اور بعد میں حضرت ابن عباسؓ نے اس سے بکلی رجوع کرلیا۔

ع ۶۳۸ یہاں جس رضامندی کا ذکر ہے وہ مہر کی کمی یا بیشی کے متعلق ہے۔ یعنی مہر مقرر ہو جانے کے بعد میاں بی بی کی رضامندی سے کم بھی ہوسکتا ہے اور زیادہ بھی۔ اس آیت کا خاتمہ علیمًا حکیمًا پر کیا ہے۔ گویا بتایا ہے کہ قید نکاح کی پابندی بڑے علم و حکمت پر مبنی ہے اور یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو مرد اور عورت کے آزادانہ تعلقات کے حامی ہیں اور نکاح کی قید کو بے ضرورت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرف اقوام یورپ کا میلان ہے جن میں ولد الزنا بچوں کی نہ صرف کثرت ہوگئی ہے بلکہ ان پر فخر کیا جاتا ہے۔

ع خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٥﴾ لیے بہتر ہے اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۶۳۹ع

۶۳۹ع طَوْل - طُوْل لمبائی کو کہتے ہیں اعراض میں ہو، یا جواہر میں اور طَوْل - فضل اور مِنّ سے یعنی بزرگی یا زیادتی مال اور احسان سے مخصوص ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی آتا ہے ذِی الطَّوْلِ (المؤمن ۴۰-۳) یعنی حقیقی فضل و مِنّ کا مالک وہی ہے اور اولوا الطّول (التوبۃ ۹-۸۶) سے مراد صاحب وسعت لوگ ہیں اور یہاں بھی معنی فراخی یا وسعت ہی ہیں - اور مراد اس قدر مال ہے جس کو مہر اور نفقہ میں دے سکے (غ)

المحصنٰت سے مراد یہاں آزاد عورتیں ہیں کیونکہ ان کے مقابلہ میں لونڈیوں کا ذکر ہے -

فتیات - فتاۃ کی جمع ہے جو فتٰی کی مونث ہے اور فتٰی اصل میں اس کو کہتے ہیں جو تازہ جوانی کو پہنچا ہو - اور مراد اس سے غلام اور فتاۃ سے مراد لونڈی لی جاتی ہے -

باذن اھلھن - اَھل کے معنی ع۱۳۷ا میں بیان ہو چکے ہیں - یہاں مراد اس سے مولیٰ یا مالک ہے - مالک کی اجازت کی شرط اس لیے ہے کہ نکاح سے مالک کے بہت سے فوائد خدمت اور کام لینے کے کم ہو جاتے ہیں - چنانچہ حدیث سے ثابت ہے کہ جس طرح لونڈیاں اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتیں اسی طرح غلام بھی اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتا - ایما عبد تزوج بغیر اذن موالیہ فھو عاھر (ت)

اخدان - خِدْن کی جمع ہے جسکے معنی مصاحب یا صدیق ہیں اور اس کا اکثر استعمال ایسے شخص کے حق میں ہے جو شہوت کی وجہ سے مصاحب ہو (غ) مسافحت کے ساتھ اتخاذ اخدان کے ذکر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ میں چھپی ہوئی آشنائی کی طرف اشارہ ہے چنانچہ ابن عباسؓ نے مسافحات کے معنی الزوانی المعلنات کیے ہیں یعنی جو علی الاعلان زنا کرتی ہیں - اور بیضاوی میں اخدان کے معنی کیے ہیں الاخلاء فی السراء -

لونڈیوں سے نکاح: اس آیت میں لونڈیوں کے ساتھ نکاح کے احکام اور شرائط بیان کیے گئے ہیں - قرآن کریم میں دو جگہ آتا ہے لفروجھم حافظون الا علیٰ ازواجھم او ما ملکت ایمانھم (المؤمنون ۲۳ - ۵ و ۶ - المعارج ۷۰ - ۲۹ و ۳۰) پس جب ازواج یعنی بیبیوں کے متعلق احکام بیان کر دیئے تو ضروری تھا کہ ما ملکت ایمانھم کے متعلق بھی احکام کو بیان کر دیا جاتا جس طرح ایک آزاد عورت کو زوجیت میں لینے کی شرائط اللہ تعالیٰ نے بیان کر دی ہیں - اسی طرح ما ملکت ایمانکم کے ساتھ تعلقات زناشوئی قائم کرنے کے احکام بھی اس جگہ بیان کر دیئے ہیں تا کہ نکاح کا مضمون مکمل ہو جائے اور لونڈیوں کا ذکر الگ کر کے اور ان کے ساتھ آزاد مردوں کے نکاح کو بعض سخت شرائط کے ساتھ مشروط کر کے یہ بتا دیا ہے کہ قرآن کریم ما ملکت ایمانکم کو ازواج سے الگ رکھتا ہے - اور سوائے سخت مجبوری کے ان کے ساتھ نکاح سے روکتا بھی ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن شریف لونڈیوں کے متعلق یہی چاہتا ہے کہ وہ بلا نکاح یا حالت فجور میں رہیں - بلکہ اس سے صاف منع کرتا ہے ولا تکرھوا فتیٰتکم علی البغآء (النور ۲۴-۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور مت کرو - اور ان کو نکاح سے روکنا انہیں زنا پر مجبور کرنا ہے - پھر صاف الفاظ میں حکم دیتا ہے وانکحوا الایامٰی منکم والصّٰلحین من عبادکم وامآئکم (النور ۲۴-۳۲) یہاں صاف صالح غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کر دینے کا حکم دیا ہے پس اصل منشاء قرآن کریم کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لونڈیوں اور غلاموں کے آپس میں نکاح ہوں اور سوائے سخت ضرورت کے آزاد مرد یا عورت کی لونڈی یا غلام سے زوجیت نہ ہو -

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف غلاموں اور لونڈیوں کو ایک ذلیل حالت میں رکھنا چاہتا ہے - اس لیے باہمی تعلقات نکاح کو روکتا ہے اس کا جواب خود اسی آیت میں دیا ہے بعضکم من بعض تم سب ایک دوسرے سے ہو غلام اور لونڈیاں آزاد مرد اور آزاد عورتیں سب ایک ہی نسل انسانی کے افراد ہیں اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں - اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بتاتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں سے کھانے پینے میں لباس میں کام کے لینے میں مساوات کا سلوک ہوتا تھا پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ نکاح کے تعلقات پر ایسی سخت شرائط لگا دی ہیں یہاں تک کہ ان تصبروا خیر لکم میں فرما دیا ہے کہ ممکن ہو تو نہ ہی کرو -

پس جب مساوات کو بھی تسلیم کیا ہے - بلکہ غلاموں لونڈیوں کے ساتھ مساوات کے سلوک کا حکم دیا ہے تو نکاح سے ممانعت اس بنا پر نہیں ہو سکتی کہ ان کو ہمیشہ کے لیے ذلیل اور کم حیثیت پر رکھنا چاہا ہے - لیکن کوئی غرض ضرور ہے - اس غرض کا پتہ ہم کو خود نبی کریم صلعم کی زندگی سے لگتا ہے اور بعض احادیث سے بھی اس مضمون پر روشنی پڑتی ہے - نبی کریم صلعم نے کسی لونڈی سے اس کو لونڈی کی حیثیت میں رکھ کر نکاح نہیں کیا - بلکہ آزاد کر کے اور اس کو زوجیت کے پورے حقوق دیکر نکاح کیا ہے - چنانچہ اُم المؤمنین حضرت صفیہؓ ملک یمین میں داخل تھیں نبی کریم صلعم نے ان کو آزاد کیا اور ان کو قریشی بیبیوں کے برابر زوجہ ہونے کی حیثیت دی - یہی حالت حضرت ماریہ قبطیہؓ کی معلوم ہوتی ہے جن کے بطن سے ابراہیم پیدا ہوئے شاہ مصر نے انہیں بطور ایک لونڈی کے آپ کی طرف بھیجا تھا مگر آپ نے اس کو بھی اتنا مرتبہ دیا کہ وہ حجاب میں رہتی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زوجیت میں داخل تھیں اور یہی وجہ ہے کہ اس حکم کے ماتحت ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا (الاحزاب ۳۳-۵۳) یعنی تمہارے لیے جائز نہیں کہ آنحضرتؐ کی ازواجؓ سے آپ کے بعد کبھی نکاح کرو - حضرت ماریہ قبطیہؓ کا نکاح آنحضرتؐ کے بعد نہیں ہوا - اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ ان کی وفات تک ان کو دیگر ازواجؓ کی طرح برابر نفقہ دیتے رہے ایسا ہی ریحانہؓ کا حال ہے جن کے متعلق ایک روایت میں صاف ذکر ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا تھا اور جب آپ کی دوسروں کو یہ تعلیم تھی کہ لونڈیوں سے آزاد کر کے ان سے نکاح کرو تو خود ایسا کیوں نہ کرتے - چنانچہ بخاری باب اجر من اسلم من اھل الکتابین میں ذیل کی روایت ہے: الرجل تکون لہ الامۃ فیعلّمھا

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۲۶

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے کے لیے کھول کر بیان کر دے اور تم کو اُن کی راہیں دکھا دے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر توجہ فرمائے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ع۶۴۰

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۲۷

اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر توجہ فرمائے اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ تم بہت زیادہ جھک جاؤ ع۶۴۱

فیحسن تعلیمها و یؤدبها فیحسن ادبها ثم یعتقها فیتزوجها فله اجران۔ یعنی جس شخص کے پاس ایک لونڈی ہو پھر وہ اس کو تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے اور اس کو آداب سکھائے اور اچھے آداب سکھائے اور اسے آزاد کرے اور نکاح کرے تو اس کے لیے دو چند اجر ہے۔ پس لونڈیوں کے ساتھ نکاح کی ممانعت میں اول حکمت تو یہی تھی کہ تا مسلمان ان کو آزاد کر کے ان کو اپنی زوجیت میں لیں اور لونڈی کو ادنیٰ حالت میں نہ رہنے دیں۔ ہاں لونڈی کی یہ قدر آنحضرت صلعم نے سکھائی کہ اس کی احسن تعلیم اور احسن تادیب کی طرف توجہ دلائی مگر آج مسلمان اپنی بیٹیوں کی بھی اتنی عزت نہیں کرتے اور ان کی مناسب تعلیم و تادیب کا کوئی انتظام نہیں۔

دوسری حکمت اس میں یہ تھی کہ جو حالت ملک عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کی تھی یا جو اور دنیا میں تھی۔ اس کی وجہ سے ان میں بہت سے ذلیل اخلاق ہوتے تھے اور ماں چونکہ اولاد کی تربیت کرتی ہے۔ اور اولاد کے اخلاق ماں کے اخلاق سے ہی بنتے ہیں اس لیے اگر لونڈیوں سے عام اجازت نکاح کی ہوتی تو اخلاق قومی پر اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مشرک عورتوں کے نکاح سے بھی اسلام نے روک دیا اس لیے کہ ان کا اثر اولاد کی تربیت پر بُرا پڑتا تھا۔ اور اخلاق بگڑتے تھے۔ یہاں چونکہ مومن ہو کر ان کو ایک موقع اپنے آپ کو بہتر بنانے کا بھی تھا اس لیے مشروط اجازت دی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ بعض لونڈیاں اس ذلت کی حالت سے نکل بھی سکتی تھیں تو ایسے غلاموں اور لونڈیوں کے لیے اسلام نے مکاتبت کی شرط رکھی ہوئی تھی اور ہر ایک غلام اور لونڈی کو جو اپنی حالت کی اصلاح کرنا چاہے یہ حق تھا کہ وہ مالک سے آزادی حاصل کرے پس ان کے لیے آزاد ہو کر اور زوجیت میں مساوات کے حقوق حاصل کر کے نکاح کر لینے کا رستہ کھلا تھا۔

لونڈیوں سے نکاح کی شرائط: تیسری حکمت اس میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو قیدی جنگ میں پکڑے جاتے تھے ان کے متعلق حکم تھا کہ ان کو بعد میں احسان سے یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے ایسی صورت میں بھی ممکن تھا کہ ان کے پہلے خاوند اگر زندہ ہوں تو اسلام لے آئیں اور اس صورت میں انہیں واپس اپنے خاوندوں کے پاس جانا چاہیئے۔ لونڈی کے ساتھ جو نکاح میں جو شرائط رکھی ہیں وہ یہ ہیں۔ اول یہ کہ ایک مرد اس قدر فراخی اور وسعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد عورت سے نکاح کر سکے۔ کیونکہ لونڈی کا مہر اس کا نفقہ آزاد عورت سے بہت کم ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ عنت سے خائف ہو یعنی اگر نکاح نہ کرے تو کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ صحت جسمانی بگڑنے کا یا زنا میں پڑ کر ہلاکت میں پڑنے کا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ مالک کے اذن کے ساتھ نکاح ہو۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ لونڈی مومنہ ہو۔

مالک اور مملوک لونڈی: ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا مالک کے لیے محض ملک یمین کی وجہ سے لونڈی سے زن و شوہر کا تعلق رکھنا جائز ہے یا وہ بھی ان شرائط کے تحت ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ جہاں تک موجودہ زمانہ کا سوال ہے نہ وہ دینی جہاد اس وقت ہیں نہ ملک یمین کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تاہم ایک مسئلہ کے رنگ میں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن وجوہات کی بنا پر غیر مالک کو لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے سے حتی الوسع روکا ہے۔ وہی وجوہات مالک کے لیے موجود ہیں۔ بلکہ مالک کے لیے تو اور بھی آسان راہ ہے کہ اگر کوئی ملک یمین والی عورت اس کو پسند آئے تو وہ آزاد کر کے اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور چونکہ ایسی صورت میں آزادی عطا کرنا ہی مہر کے قائم مقام بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت صفیہؓ کی حالت میں ہوا۔ اس لیے اس کے لیے کوئی مشکل بھی نہیں۔ لیکن جب تک وہ اس کو لونڈی کی حیثیت میں رکھنا چاہتا ہے وہ ان تمام شرائط کا پابند ہے۔ ہاں بعض شرائط اس کی حالت میں خود زائل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مالک کے اذن سے نکاح کیا جائے سو اس کو کوئی اذن بکار نہیں۔ یا مثلاً یہ کہ مہر دیا جائے کیونکہ لونڈی کا مال مالک کا مال متصور ہوتا ہے اس لیے اس کو مہر دینے کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا اعلان سو وہ ضروری ہے۔

ع۶۴۰ شرائع کا نزول: پچھلے رکوعوں میں عورتوں کی وراثت اور حقوق اور نکاح کے متعلق احکام دیئے ہیں۔ اس رکوع میں اصل غرض تو ان حقوق کی محافظت کی طرف ہی توجہ دلانا ہے۔ مگر پہلی تین آیتوں میں نزول شریعت کے متعلق چند باتیں بتائی ہیں یعنی یہ کہ کیا ضرورت پیش آئی، کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے احکام نازل کرے چنانچہ اس آیت میں بتایا کہ اس کی غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کھول کر بیان کرے اور ساتھ ہی توجہ دلائی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قدیم قانون ہے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں ایسا کرتا آیا ہے سنن الذین من قبلکم میں یہی اشارہ ہے۔

ع۶۴۱ نزول شریعت کی غرض: اس آیت میں بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اس طرح پر شریعت کو تم پر نازل کرنا اس لیے ہے کہ وہ تم پر خصوصیت سے توجہ فرمانے کا ارادہ کر چکا ہے تاکہ اس کی خاص توجہ سے صحیح اصول پر چل کر تم دنیا میں عظیم الشان قوم بن جاؤ۔ مگر جو لوگ نری خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی اُن کی طرح میانہ روی سے ایک طرف جھک جاؤ اور جادۂ اعتدال سے منحرف ہو جاؤ۔ یہ لوگ کون ہیں۔ بعض نے کہا زانی۔ بعض نے کہا یہود و نصاریٰ

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

اللہ چاہتا ہے کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کر دے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے۔ [۶۴۲]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۟ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے مالوں کو آپس میں ناحق کے ساتھ مت کھاؤ سوائے اس کے کہ تمہاری باہمی رضامندی سے تجارت ہو [۶۴۳] اور اپنے لوگوں کو قتل نہ کرو۔ بیشک اللہ تم

بعض نے مجوس۔ لیکن قرآن کریم نے لفظ عام رکھے ہیں۔ شہوات کی پیروی کرنے والے جو کوئی بھی ہوں ہاں اگر خصوصیت سے کسی ایک قوم پر یہ لفظ چسپاں ہیں تو عیسائیوں پر کیونکہ وہ نہ صرف عملاً خواہشات کی پیروی کرتے ہیں بلکہ شریعت سے ایسے متنفر ہیں کہ اس کو نعوذ باللہ لعنت تک کہہ دیا ہے۔ عورتوں کے معاملہ میں بھی بجائے اسلام کی طرح سادگی کے ساتھ ان کے حقوق دینے کے اپنی خواہشات نفسانی کے لیے ان کے باہر بناؤ سنگار کر کے نکلنے پر ہی سارا زور دیتے ہیں۔ اور اسی کو عورت کا بڑا حق قرار دیتے ہیں حالانکہ اصل حقوق جو اسلام نے عورت کو دیئے ہیں ان کی طرف توجہ بھی نہیں اور وہ مسلمانوں کو بھی اپنی طرح شہوات کا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔

۶۴۲۔ نزول شریعت کی ضرورت: اس آیت میں وجہ بیان فرمائی کہ انسان چونکہ کمزور پیدا ہوا ہے اپنی ہدایت کی مخفی راہوں پر خود اطلاع نہیں پا سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ اپنے کلام کے یہ ہدایات اسے عطا فرمائی ہیں۔ گویا ان تینوں آیتوں میں تین اصولی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ یعنی اوّل نزول شریعت کوئی نئی بات نہیں پہلے لوگوں پر بھی شرائع نازل ہوتی رہیں۔ دوم خدا کی طرف سے مقرر کردہ شریعت نہ ہوگی تو لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کریں گے۔ سوم نزول شریعت اس لیے ضروری ہے کہ انسان ہدایت کی راہوں کو اپنی کوشش سے پانے سے عاجز ہے۔ جتنی دیر میں ایک راہ کے غلط ہونے کا اس کو تجربہ ہوگا اتنی دیر میں خود بوجہ اس غلط راہ پر چلنے کے ہلاک ہو جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود شرائع نازل کر کے انسان کے اس بوجھ کو ہلکا کر دیا۔ چنانچہ اس کی وجہ بھی ساتھ ہی بیان فرما دی ہے وخلق الانسان ضعیفا یعنی انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ خود بخود اپنے لیے اپنی حقیقی فلاح کے رستے بنا سکے بلکہ وہ ایک طاقتور ہستی کا محتاج ہے جس کو آیت ۲۶ میں علیم حکیم کہہ کر یہ بتا دیا ہے کہ ان راستوں کا بتانا اسی کا کام ہو سکتا ہے جو ہر شے کا عالم اور ہر ایک حکمت پر آگاہ ہے۔ انسان کا علم اور انسان کی حکمت چونکہ بہت کمزور ہیں۔ اس لیے اسے اللہ تعالیٰ کی امداد کی ضرورت ہے خلق الانسان ضعیفا کے یہ معنی نہیں کہ انسان شرائع پر عمل نہیں کر سکتا۔ بلکہ جیسا کہ ماقبل کی عبارت صاف بتاتی ہے۔ یہ مطلب ہے کہ وہ شریعت کو خود اپنے لیے تجویز نہیں کر سکتا یہی وہ بوجھ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اوپر سے ہلکا کر دیا ہے اس کو رستہ بتا کر اس پر چلنے کی ہدایت فرما دی ہے۔ باقی رہا شریعت کے بوجھ کے اٹھانے کی قابلیت یا ان راہوں پر جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں چلنے کی طاقت۔ سو اس کا ذکر دوسری جگہ فرمایا کہ خدا نے وہی راہیں انسان کو بتائی ہیں جن پر وہ چل بھی سکتا ہے جیسا کہ فرمایا لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی وسعت سے بڑھ کر مکلف نہیں کرتا۔

شرائع پر چلنے کی قابلیت اور عیسائی عقیدہ: عیسائیوں کا یہ کہنا کہ انسان شریعت کے بوجھ کو اٹھا نہیں سکتا محض جھوٹ اور خدا پر ایک الزام ہے کیونکہ اگر انسان واقعی اس قابل نہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے جن اپنی رضا کی راہوں کو اس پر بذریعہ شرائع کھولا ان پر وہ چل سکے۔ تو اس نے یہ عبث کام کیوں کیا کہ ہر زمانہ ہر ملک میں ہر قوم کے اندر نبی بھیجے۔ بلکہ بعض قوموں کے اندر جیسے بنی اسرائیل پے در پے نبی بھیجے اور ان انبیاء کے ذریعے اپنی رضا کی راہیں انسانوں پر کھولیں۔ حالانکہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق یہ بالکل ایک لغو امر تھا اور پھر کیوں خدا کو دو ایک نبی بھیجکر یہ پتہ نہ لگ گیا کہ انسانوں پر اپنی رضا کی راہوں کا کھولنا ایک لغو امر ہے وہ ان پر چل ہی نہیں سکتے۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں نبی بھیجتا چلا گیا۔ اسلام کا عقیدہ اس کے بالمقابل کیسا صاف اور کیسا واقعات حقہ کے مطابق ہے۔ انسان ضعیف ہے۔ اس حد تک کہ وہ خود بخود خدا کی رضا کی راہوں کو نہیں پا سکتا۔ اس لیے ابتدائے دنیا سے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ ہر قوم پر ہر زمانہ میں ہر ملک کے اندر اپنی رضا کی راہیں بتانے والے بھیجتا رہا پس خود دنیا کے یہ واقعات کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کی راہیں بذریعہ شرائع کے ظاہر فرماتا رہا۔ اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ انسان میں یہ قابلیت ہے کہ خدا کی رضا کی راہوں پر چل سکے اور اگر اس میں یہ قابلیت ہی نہیں تو پھر کفارہ نے اس کی مشکل کو کس طرح حل کیا۔ اگر اس طرح حل کیا ہے کہ انسانوں کے اندر یہ قابلیت پیدا کر دی ہے کہ خدا کی رضا کی راہوں پر چل سکیں تو پھر بھی آخر خدا کو یہی کرنا پڑا کہ ان کو اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کے قابل بنائے اور یہ پہلے ہی کیوں نہ کر دیا۔ کیوں بلاوجہ انسانوں کو اس قدر مصیبت میں ڈالا کہ ان پر تکلیف مالا یطاق ڈالی حالانکہ قصور اپنا تھا کہ انسان کو اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کے قابل ہی نہ بنایا تھا، اور اگر یہ کہا جائے کہ انسانوں کی قابلیت تو اب بھی وہی ہے، مگر اب کوئی انسان اس کی راہوں پر چلے یا نہ چلے وہ سب کو معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ کفارہ کو مان لیں تو اباحت اور گناہ کا دروازہ کھل جاتا ہے غرض صحیح اصول وہی ہے جو اسلام نے بیان کیا ہے۔

۶۴۳۔ لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل اس بات کو بیان کر کے کہ شرائع اور حقوق کا قائم کرنا ضروری تھا۔ اب نصیحت فرماتا ہے کہ جو جو حقوق کسی کے قائم

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿٢٩﴾ — پر رحم کرنے والا ہے ؏٦٤٤

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ — اور جو شخص حد سے نکل کر اور ظلم سے ایسا کرے گا ہم اسے آگ

نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿٣٠﴾ — میں داخل کریں گے اور یہ اللہ پر آسان ہے ؏٦٤٥

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ — اگر تم ان بڑی بدیوں سے بچتے رہو جن سے تم کو روکا جاتا ہے ؏٦٤٦ تو ہم تمھاری

کر دیئے گئے ہیں ان کے خلاف اب ایک دُوسرے کا مال کھانے کی کوشش نہ کرو، اور اکل سے مراد ہر قسم کا تصرف ہے اور باطل حق کا نقیض ہے اور حق طریق وہی ہے جس کو قرآن کریم نے بیان فرما دیا۔ مثلاً ورثہ کے ذریعے سے، ہبہ کے ذریعہ سے اور حقوق جو ایک دوسرے پر قائم کیے گئے ہیں ان کے ذریعے سے تو حق طریق ہیں ان کے سوائے جو طریق ہوگا وہ باطل ہوگا۔ یہی حکم البقرہ ۱۸۸ میں بھی آچکا ہے۔ یہاں عورتوں اور یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اُس کو دوہرایا ہے۔ منسوخی کے شائقین نے اس آیت کو بھی منسوخ کہہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ سورہ نور کی وہ آیت جس کی رُو سے باپوں، بھائیوں، چچوں، دوستوں کے گھروں سے کھانا جائز ہے وہ اس کی ناسخ ہے۔ گویا یہ بالباطل کھانا ہُوا۔

الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم یہاں الّا استثنائے منقطع ہے تراضی دونوں کا ایک دوسرے سے اظہار رضامندی ہے۔ تجارت کا ذکر بوجہ اس کی عظمت کے یہاں خصوصیت سے کیا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے تسعۃ اعشار الرزق فی التجارۃ (د) رزق کے دس حصّوں میں سے نو تجارت میں ہیں اور ایک حدیث میں ہے الطیب الکسب کسب التجار

؏٦٤٤ ولا تقتلوا انفسکم کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اپنے لوگوں کو قتل مت کرو۔ گویا ایک طرف اگر ایک دوسرے کے حقوق مالی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ناحق ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ تو دوسری طرف حقوقِ حفظ جان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یعنی ایک دوسرے کو قتل مت کرو اور انفسکم کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ سب مسلمان گویا ایک ہی نفس کے حکم میں ہیں۔ دوسرے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو قتل مت کرو اور اس صورت میں یا تو یہ مراد ہو سکتی ہے کہ ایک دوسرے کی حق تلفی کرنا یا یتیموں بیواؤں کے حقوق نہ دینا درحقیقت اپنے آپ کو یا اپنی قوم کو ہی قتل کرنا ہے۔ امام راغبؒ نے یہاں قتل نفس سے مراد اپنے آپ کو ان باتوں سے محروم رکھنا لیا ہے جن سے حیاتِ ابدی ملتی ہے کیونکہ اس کے آگے آتا ہے ومن یفعل ذٰلک عدوانا۔ اور یا یہ مراد ہو سکتی ہے کہ خودکشی مت کرو۔ کیونکہ بہت سے جاہل جب ان کو غم یا خوف یا سخت بیماری یا کوئی ذلت پہنچتی ہے تو اس کو ناقابل برداشت سمجھ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ اسلام نے خودکشی کو سخت جرم ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ خودکشی کرنے والا انسان درحقیقت تکلیف کے سامنے ہمت ہار دیتا ہے۔ اور جو تکلیف سے گھبرا کر ہمت ہار دے اس کا ایمان خدا پر نہیں۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ خودکشی کرنے والا جہنمی ہے (ت)، بلکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ خیبر کی جنگ میں ایک شخص کے متعلق جو اسلام پر تھا نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اہل نار میں سے ہے لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ اس دن اس نے خوب جنگ کی اور آخر زخمی ہوا۔ لیکن زخموں کی تکلیف کو برداشت نہ کر کے خودکشی کر لی۔ عمرو بن العاص نے اسی آیت سے استدلال کر کے شدت کی سردی میں حالت جنب میں ایک جنگ میں بغیر غسل کرنے کے تیمم کر کے نماز پڑھا دی۔ چنانچہ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ رات سخت سردی تھی اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولا تقتلوا انفسکم۔ اس لیے میں نے غسل نہیں کیا۔ تو نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے۔

شریعت کے احکام میں سب سے زیادہ وقعت اس بات کو دی ہے کہ ایک دوسرے کے مال باطل طور پر نہ کھائیں۔ درحقیقت دنیا کی اکثر بدیاں باطل طور پر مال کھانے سے ہی پیدا ہوتی ہیں مال کی محبت اور اس کی حرص ہی انسان سے اور قوموں سے اکثر ظلم کراتی ہے۔ اور قتل نفس کو اکل مال بالباطل کے بعد اس لئے رکھا کہ قتل کے واقعات بھی بہت سے مال کی وجہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ یورپ کی اس خطرناک جنگ کا موجب بھی جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں، یہی لالچ تھا۔

؏٦٤٥ آگ میں جلانا یا داخل کرنا اللہ پر آسان ہے۔ یہ اس لیے کہا کہ لوگ اس کو بڑا البعید سمجھتے ہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کہاں ہوگا فرماتا ہے اس میں استبعاد یا محال کوئی نہیں۔

؏٦٤٦ تجتنبوا۔ جنب سے ہے جس کے اصل معنی پہلو ہیں۔ اور اجتناب کے معنی کسی چیز سے ایک پہلو میں ہو جانا ہیں یعنی اس سے بچ جانا۔

کبائر۔ کبیرۃ کی جمع ہے جس کے اصل معنی صرف بڑا ہیں۔ اور کبیرۃ ہر اس گناہ کے معنی میں آتا ہے۔ جس کی عقوبت بڑی ہو (غ) اور ابن اثیر میں ہے کہ کبیرہ وہ فعل قبیح ہے جس سے شریعت نے روکا ہو اور اس کا امر عظیم ہو۔ قرآن شریف میں دوسری جگہ ہے الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم (النجم ۳۲) کبیرہ خاص خاص گناہوں کا نام ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض احادیث کی بنا پر چند خاص گناہوں کو کبیرہ کہا جاتا ہے مثلاً صحیحین میں حدیث ہے اجتنبوا السبع الموبقات سات ہلاک کر دینے والوں سے بچو۔ اور وہ سات گناہ یہ گنے ہیں۔ شرک۔ سحر۔ قتل۔ مال یتیم کا کھانا۔ سود کھانا۔ جنگ کے دن پیٹھ پھیر دینا۔ پاکدامن مومن عورتوں پر الزام لگانا۔ اور دوسری حدیث میں بجائے سحر کے ہے الانقلاب الی الاعراب بعد الھجرۃ ہجرت کے بعد بادیہ نشینی کی طرف لوٹ جانا۔ ایک اور میں بجائے اس کے والدین کی نافرمانی کہا ہے اور صحیحین کی ایک حدیث میں صرف تین کو کبیرہ (یا اکبر الکبائر) کہا ہے۔ شرک۔ والدین کی نافرمانی

عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾
وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى
بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ
وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْــَٔلُوا
اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ

بُرائیاں تم سے دُور کردیں گے اور تم کو عزت کی جگہ میں داخل کریں گے ۶۴۷
اور اس کی آرزو نہ کرو جس سے اللہ نے تم کو ایک دوسرے پر
فضیلت دی ہے، مردوں کا حصّہ ہے جو وہ کمائیں،
اور عورتوں کا حصّہ ہے جو وہ کمائیں۔ اور اللہ سے اس
کا فضل مانگتے رہو۔ اللہ ہر چیز کو جاننے

جھوٹی گواہی دینا اور ایک صحیحین کی حدیث میں ہی ای الذنب اعظم کا جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں مروی ہے۔ اللہ کا شریک ٹھہرانا۔ دریافت کیا گیا اس کے بعد فرمایا قتل اولاد اس خوف سے کہ اس کو کھانا دینا پڑے گا۔ دریافت کیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا ہمسایہ کی جورو سے زنا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اٰخر ولا یقتلون النفس التی حرّم اللہ اِلّا بالحق ولا یزنون (الفرقان ۲۵-۶۸) اور ایک حدیث میں ہے کہ شراب کے متعلق نبی کریم صلعم سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اکبر الکبائر ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ یہ بھی کبائر میں سے ہے کہ ایک شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ اور اس کی کیفیت یوں بیان فرمائی کہ دوسرے کے ماں باپ کو گالی دے تو وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے گا اور یہ بخاری کی حدیث ہے۔ اور بخاری ہی میں ہے سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر، اور ظاہر ہے کہ فسوق بھی کبائر میں سے ہے اور ترک صلوٰۃ کو بھی کفر کہا ہے۔ چنانچہ سنن میں ہے من ترک الصلوٰۃ فقد کفر اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا اکبر الکبائر میں سے ہے۔

ان تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے کبائر کو معین نہیں فرمایا اور الگ الگ موقعوں پر الگ الگ جواب دینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جیسا سائل کی حالت کا اقتضا تھا اس کے مطابق اس کو جواب دیا ہے۔ پس احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کبیرہ معین گناہوں کا نام نہیں۔ چنانچہ یہی حضرت ابن عباسؓ سے ثابت ہے۔ ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے کہا تھا، کہ کبیرہ سات ہیں تو آپ نے فرمایا وہ ستر سے زیادہ قریب ہیں اور دوسری روایت میں ہے سات سو سے زیادہ قریب ہیں اور ایک روایت میں آپ نے کبیرہ کے معنی یوں کیے ہیں۔ کل ما نھی اللہ عنہ فھو کبیرۃ جس چیز سے اللہ نے روکا ہے وہ کبیرہ ہے۔ اور دوسری روایت میں ہے کل ما عصی اللہ تعالٰی فیہ فھو کبیرۃ۔ ہر ایک چیز جس میں اللہ تعالٰی کی نافرمانی ہوتی ہے وہ کبیرہ ہے۔ اگر عظمت یا کبر کے لفظ کو مدنظر رکھا جائے تو قرآن کریم میں ایک طرف شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ دوسرے موقعہ پر قتل اولاد کے متعلق فرمایا اِنّ قتلھم کان خطأً کبیرا۔ تیسرے موقعہ پر جوئے اور شراب کے متعلق فرمایا فیھما اثم کبیر۔ اور عیسائیوں کے عقیدہ اتخاذ ولد کے متعلق فرمایا کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم (الکھف ۱۸-۵) ایک جگہ حرمت کے مہینوں میں جنگ کے متعلق فرمایا قل قتال فیہ کبیر (البقرۃ ۲-۲۱۷) اور اس سے بڑھ کر کفر باللہ۔ اور مسجد الحرام کا کفر، اور اس کے اہل کا اخراج قرار دیا وکفر بہ والمسجد الحرام واخراج اھلہ منہ اکبر عند اللہ (البقرۃ ۲-۲۱۷) اور اگر قتل کو کبیر کہا تو مسلمانوں کو اذیت دینا اس سے بھی بڑھ کر فرمایا والفتنۃ اکبر من القتل اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ کبیر یا اکبر الکبائر خاص قسم کے گناہوں کو نہیں کہا اور جس طرح کبائر سے چند خاص گناہ مراد نہیں اس کے مقابلہ پر جو صغائر کہلاتے ہیں ان سے بھی خاص گناہ مراد نہیں یوں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر ایک گناہ یکساں نہیں۔ جیسا جیسا جس جس گناہ کا اثر ہے اسی لحاظ سے اس کو بڑا یا چھوٹا کہا جائے گا مگر چھوٹے گناہوں پر اصرار بھی گناہ کو بڑا بنا دیتا ہے۔ اور یہ حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے لا کبیرۃ مع الاستغفار ولا صغیرۃ مع الاصرار۔ استغفار کے ساتھ کوئی کبیرہ نہیں اور جس پر اصرار ہو وہ صغیرہ نہیں رہتا۔

ع ۶۴۷ مُدخل۔ یا مصدر ہے بمعنی اِدخال اور یا اَدْخَلَ یُدْخِلُ سے ظرف مکان ہے

کریم۔ کَرَم جب اللہ تعالٰی کے وصف میں ہو تو اس کا احسان و انعام مراد ہوتا ہے اور جب انسان کے وصف میں ہو تو اخلاق اور افعال محمودہ پر استعمال ہوتا ہے جو اس سے ظاہر ہوں اور اس کا استعمال صرف محاسن کبیرہ پر ہوتا ہے اور ہر ایک چیز جو اپنی نوع میں معزز و ممتاز ہو۔ وہ کریم کہلاتی ہے (غ)، کم انبتنا فیھا من کل زوج کریم (الشعرآء ۲۶-۷) و زروع و مقام کریم (الدخان ۴۴-۲۶) انہ لقراٰن کریم (الواقعۃ ۵۶-۷۷) وقل لھما قولًا کریما (بنی اسرائیل ۱۷-۲۳)

اس آیت میں ایک پُر حکمت فلسفہ بدی سے بچنے کا پایا جاتا ہے۔ بدی کسی ایک چیز کا نام نہیں ہر شے کا نیک و بد استعمال ہو سکتا ہے اور ہر انسان کی زندگی میں الگ الگ موقعے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں وہ نیکی یا بدی کر سکتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی مذہب تمام بدیوں کو گننے لگتا اور اپنے پیروؤں کو یہ کہتا کہ ..... اب تم ان باتوں سے بچو تو وہ ایک نہایت ہی ناکام کوشش ہوتی۔ قرآن کریم نے یہ پُر حکمت طریق اختیار کیا ہے کہ چند موٹی موٹی بدیوں سے جن کو ہر انسان جانتا ہے روک کر یہ فرمایا کہ اگر تم ان سے بچو تو ہم تمہاری بدیاں دُور کردیں گے۔ ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حکمت کیا ہے یہ تو ایک فرضی بات ہے کہ بڑی بڑی بدیوں سے بچ جاؤ گے تو ساری بدیاں دور کردیں گے۔ مگر ایسا اعتراض وہی کرے گا جس نے بدی کے فلسفہ پر غور نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ بدی جس قدر زیادہ بیّن ہوگی یا جس قدر بڑی ہوگی اسی قدر انسان اس کا آسانی سے مقابلہ کر سکے گا۔ جو شخص فطرت انسانی پر غور نہیں کرتا وہ اسے مستبعد خیال کرے گا مگر فطرت انسانی ایسی ہی ہے کہ

شَیۡءٍ عَلِیۡمًا ﴿۳۲﴾ والا ہے ۶۴۸

جس چیز کا نقصان بہت بیّن ہوتا ہے اس سے بچنا انسان کے لیے آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ فطرت کے اندر جو خالق فطرت نے طاقتیں ودیعت کر رکھی ہیں وہ ایک کھلے نقصان کو دیکھ کر مقابلہ کے لیے باہر نکل کھڑی ہوتی ہیں اور انسان کا بدی پر غالب آنا یہی ہوتا ہے کہ اس کے اندر جو نیکی کی طاقتیں ہیں وہ مقابلہ کے لیے باہر نکل آئیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس چیز کا نقصان بہت بیّن ہوگا وہی بڑی بدی کہلائے گی پس اصل یوں ہے کہ بڑی بدی کا نقصان بہت کھلا ہوتا ہے۔ اور کھلے نقصان کو دیکھ کر انسان کے اندر جو نیکی کی طاقتیں ہیں وہ مقابلہ کے لیے نکل آتی ہیں۔ اور جب نیکی کی طاقتیں مقابلہ کے لیے نکل آئیں تو گو اگر فطرت بدی کے نیچے دبی ہوتی ہے تو ابتدا میں وہ کمزور ہونے کی وجہ سے دب بھی جائیں گی مگر آخر مقابلہ کرتے کرتے ان میں طاقت آجائے گی جس طرح بچہ جب کھڑا ہونے لگتا ہے یا چلنے لگتا ہے تو پہلے پہلے گرتا ہے مگر اس کی بار بار کی کوشش اس کی طاقت کو مضبوط کر دیتی ہے۔ اسی طرح انسان کی روحانی طاقتیں مقابلہ کے وقت نشوونما پاتی ہیں۔ پس جب ایک شخص بڑی بدیوں کا مقابلہ کرنے کا اپنے آپ کو عادی بنائے گا تو اس کی نیکی کی اندرونی قوتیں نشوونما پائیں گی اور ان قویٰ کے نشوونما کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان چھوٹی بدیوں سے بھی بچ جائے گا جن کے نتائج ایسے بیّن نہیں ہیں۔ کیونکہ اس کے اندر سے آہستہ آہستہ بدی کا میلان ہی دور ہو جائے گا، اور اس کی بدی کی طاقتیں بالکل مر جائیں گی اور یہی وہ مقام ہے جس پر اسلام پہنچانا چاہتا ہے نکفر عنکم سیاٰتکم سے مراد یہاں بدی کی طاقتوں کا دور کر دینا ہی ہے کیونکہ جب انسان سے بدی سرزد نہ ہوگی تو گویا اس کی بدیاں اس سے دور ہو جائیں گی۔

بدی کا کفارہ اسلام اور دیگر مذاہب میں: یہ وہ راہ ہے جس کو بدی کے کفارہ کے طور پر اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس کے بالمقابل کسی مذہب کا کفارہ لے لیا جائے وہ محض ایک طفلانہ خیال معلوم ہوتا ہے مثلاً عیسائیوں کا کفارہ ہی لے لو۔ کہ ایک شخص کے (یا خدا کے) مصلوب ہو جانے پر ایمان لانے سے انسان بدیوں سے پاک ہو جاتا ہے لیکن آج تک کوئی عیسائی یہ نہیں بتا سکتا کہ کس طرح اس بات کو مان لینے سے کہ یسوع مسیح صلیب پر مر گئے تھے ایک انسان کی بدی کی قوت کمزور ہو جاتی ہے یا وہ بدی سے پاک ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہندوؤں کا عقیدۂ تناسخ ہے۔ اگر کوئی شخص بیل یا کتے یا گدھے یا کیڑے مکوڑوں کی جون میں چلا جاتا ہے تو اس سے وہ گناہوں سے کیونکر پاک ہو جاتا ہے بالخصوص اس صورت میں جبکہ اس کو احساس تک نہیں ہوتا کہ فلاں جون اس کو کسی بدی کی سزا میں ملی ہے۔ تاکہ وہ آئندہ ہی اس سے رُکے۔ غرض اسلام کی پُرحکمت تعلیم کے سامنے واقعی یہ طفلانہ خیالات ہیں۔

۶۴۸ تتمنّوا۔ تمنی کا مادہ مَنی ہے جس کے اصل معنی تقدیر یا اندازہ کرنا ہیں اور تَمَنّیِ کے معنی ہیں کسی چیز کا صرف دل کے اندر اندازہ کرتے رہنا۔ اور دل کے اندر اس کی تصویر بناتے رہنا۔ اور اکثر تمنی یہی ہے کہ جس چیز کی حقیقت نہ ہو اس کا تصور کرتے رہنا (غ)

جب یہ حکم دیا کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریق پر نہ کھاؤ تو ایک قدم اور بھی آگے بڑھایا کہ جو فضیلت تم میں سے ایک کو دوسرے پر ملی ہے اس کا باطل تصور بھی نہ کیا کرو۔ ایک دوسرے کے مال کو باطل طریق پر کھانا ایک ظاہر فعل ہے جس کا علاج بہ رنگ سزا ظاہری حکومت بھی کرتی ہے اور ایک دوسرے کی فضیلت پر آرزوئے باطل کرنا ایک باطنی فعل ہے جس کا علاج صرف مذہب کر سکتا ہے۔ اور ظاہر کا علاج بہ نسبت باطن کے آسان بھی ہے اس لیے پہلے ظاہری فعل کی طرف توجہ دلائی تو پھر باطنی فعل کی طرف۔

تمنی سے روکنے کا مطلب: ان الفاظ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ جو چیز دوسرے کے قبضہ میں ہے مال یا جاہ اس کی آرزو مت کرو کہ وہ ہمارے پاس ہو اس کے پاس نہ ہو لیکن یہ چاہنا کہ جیسی چیز دوسرے کے پاس ہے ویسی ہی ہم کو مل جائے یہ رشک ہے حسد نہیں اور اصل بات یہ ہے کہ تمنی صرف دل میں تصور کرنے کا نام ہے اور جس فضیلت کا یہاں ذکر ہے اس سے وہ امور مراد ہیں۔ جو انسان خود بطور کسب نہیں لیتا بلکہ وہ وہبی امور ہیں یا ایسے حالات ہیں جن میں قدرت نے انسان کو رکھ دیا ہے۔ مثلاً کسی کو مرد بنایا۔ کسی کو عورت کسی کو قوی بنایا کسی کو ضعیف۔ کسی کو امرا کے گھر میں پیدا کر دیا کسی کو غربا کے گھر میں۔ کسی کو قوائے دماغی اعلیٰ درجہ کے دیدیئے کسی کو کم دیدیئے اور تمنی کے بالمقابل اکتساب کو لا کر اسے واضح بھی کر دیا۔ ایسی آرزوئیں کرتے رہنا کہ میں امیروں کے گھر کیوں پیدا نہ ہُوا۔ یا میں فلاں حالات میں کیوں پیدا نہ ہُوا۔ یا میرے گرد و پیش یہ امور کیوں نہ ہوئے یہ سب باطل آرزوئیں ہیں۔ اس لیے اوّل یہ حکم دیا کہ ایسی آرزوئیں مت کیا کرو۔ پھر اس کے بعد اصول بتایا کہ جن حالات میں انسان پیدا ہُوا ہے انہی حالات میں اس کو کام کرتے رہنا چاہیئے اور جس قدر طاقت اسے دی گئی ہے اسے خرچ کرتے رہنا چاہیئے اس کو عام فہم رنگ میں یوں بیان کر دیا کہ مرد جو کچھ کمائیں گے اس سے بہرہ ور ہونگے۔ عورتیں جو کچھ کمائیں گی اس سے بہرہ ور ہونگی۔ کیونکہ سب سے بڑی تقسیم مرد و عورت کی ہے مرد الگ حالت میں رکھا گیا ہے اور وہ اپنے کمال کو اور طریق پر حاصل کرتا ہے۔ عورت اور حالات میں رکھی گئی ہے اور وہ اپنے کمالات کو اور طریق پر حاصل کرتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ ہے وما خلق الذکر والانثٰی۝ اِنّ سعیکم لشتّٰی (اللیل ۹۲ - ۳ و ۴) مگر باوجود علیحدہ علیحدہ حالات میں رکھے جانے کے دونوں کے لیے اکتساب کی راہ کھلی ہے دین میں بھی اور دنیا میں بھی۔ عورتیں دینی ترقیات اسی طرح حاصل کر سکتی ہیں جس طرح وہ دنیوی ترقیات حاصل کر سکتی ہیں جن کے لیے اسلام نے لنساء نصیب ممّا اکتسبن کہہ کر ہمیشہ کے لیے دروازہ کھول دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جب عورتوں نے نبی کریم صلعم سے یہ عرض کیا کہ مرد تو ہم پر بہت سبقت لے گئے کہ ان کو جہاد کا موقعہ ہے اور وہ بہت ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔ اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں تو آپ نے فرمایا ان للحامل منکم اجرا کصائم القائم واذا ضربھا الطلق لم یدر احد ما لھا من الاجر فان ارضعت کان لھا بکل مصة اجر احیاء نفس (غ) یعنی تم میں سے حاملہ عورت کے لیے اس شخص کا اجر ہے جو دن کو روزے رکھتا اور رات کو ذکر الٰہی میں کھڑا رہتا ہے پھر جب

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝۳۳ ع

اور سب کے لیے اس میں جو وہ چھوڑے ہم نے ماں باپ اور قریبی وارث بنائے ہیں اور جن سے تمھارے داہنے ہاتھوں نے (عہد) باندھے ہیں تو ان کو اُن کا حصّہ دو ۔ اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ۶۴۹

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَي النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ

مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس لیے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے کچھ خرچ کیا ہے ۶۵۰ سو نیک عورتیں فرمانبردار پیٹھ

وہ جنتی ہے تو کوئی نہیں جانتا کہ اس کے لیے کس قدر اجر ہے۔ پھر اگر وہ دودھ پلاتی ہے تو ہر ایک مرتبہ جو بچّہ اس کا دُودھ چُوستا ہے اس کو ایک نفس کے احیاء کا اجر ملتا ہے۔

لا تتمنوا میں یہ سبق بھی دیا ہے کہ انسان کو ان حالات پر راضی رہنا چاہیئے جن میں اس کو پیدا کیا گیا ہے اور جن سے نکلنا اس کے اختیار میں نہیں۔ یہی اللہ کی رضا پر راضی ہونا ہے اور یہی قیام فی ما اقام اللہ ہے اور رضا بالقضاء کے یہ معنی نہیں کہ انسان ایک ذلّت اور دنو کی حالت سے نکلنے کی کوشش نہ کرے۔

۶۴۹ موالی۔ مولیٰ کی جمع ہے جو ولی سے ہے اور ولاء بمعنی قرب بھی استعمال ہُوا ہے۔ خواہ وہ قرب کسی لحاظ سے ہو۔ اس لیے وہ شخص جو غلام کو آزاد کرے، وہ غلام جو آزاد کیا جائے، حلیف یعنی جس سے معاہدہ ہو۔ ابن العم۔ وارث یعنی عصبۃ ان سب پر مولیٰ کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔ یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔

عقدت ایمانکم۔ عقد کے اصل معنی ہیں کسی چیز کی اطراف کو اکٹھا کر دینا۔ مگر اس کا استعمال بہت وسیع ہے۔ مثلاً عقد بیع۔ عقد عہد وغیرہ۔ اور ایمان سے مراد یا دا ہنے ہاتھ ہیں۔ کیونکہ عہد میں ہاتھ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے اور یا مراد قسمیں ہیں۔ اور عقدت کا مفعول محذوف ہے یعنی عہودھم۔ پس معنی یوں ہوئے جن لوگوں سے تمہارے داہنے ہاتھوں نے عہد باندھا ہے۔

مال کے حصول کے دوسرے جائز ذرائع: جب یہ فرمایا کہ انسان بذریعہ اکتساب ہی کچھ حاصل کرتا ہے تو دوسرے حصول کے ذریعوں کی طرف بھی توجہ دلائی اوّل یہ کہ ہر ایک کے لیے ہم نے وارث بنائے ہیں جو اس کے ترکہ کو لیتے ہیں اور وہ وارث ماں باپ یا قریبی ہیں۔ ورثہ کے علاوہ ایک حق بذریعہ معاہدات پیدا ہوتا ہے یعنی جس سے تم عہد کرو۔ اس کا بھی حق ہو جاتا ہے اس میں خاوند کا بی بی سے عہد بھی شامل ہے۔ مگر یہاں خصوصیت سے میاں بی بی کا عہد ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آگے الرجال قوامون علی النساء میں صاف بھی کر دیا ہے۔

معاہدہ یا مواخاۃ کے ذریعہ سے ورثہ کی منسوخی: والّذین عقدت ایمانکم فاٰتوھم نصیبھم کو بعض لوگوں نے منسوخ کہا ہے اور اسکے تین طرح پر معنی کیے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس سے مراد وہ حلیف ہیں جو ایّام جاہلیت میں لوگ بنا لیا کرتے تھے یعنی وہ ایک دوسرے سے معاہدہ کر لیا کرتے تھے کہ میرا خون تیرا خون ہے۔ میری صلح تیری صلح ہے۔ میری جنگ تیری جنگ ہے۔ تو میرا وارث ہوگا میں تیرا وارث ہونگا۔ ایسے حلیف کو متوفی کے ترکہ میں سے چھٹا حصّہ ملا کرتا تھا اور اس آیت میں گویا اسی کو جائز رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے مراد مُنہ بولے بیٹے ہیں جن کو متبنّٰی کہا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ آنحضرت صلعم نے ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کے درمیان مواخاۃ قائم کر دی تھی۔ اور یہ مواخاۃ ایک کو دوسرے کا وارث بنا دیتی تھی۔ اور پھر اس آیت میں اس قسم کے ورثہ کو جائز رکھ کر اس کو دوسری آیت واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ (الانفال-۵) سے منسوخ قرار دیا ہے حالانکہ سورۃ انفال پہلے کی نازل شدہ ہے۔ اور بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اس آیت ولکل جعلنا موالی میں موالی سے مراد وارث ہیں والّذین عقدت ایمانکم کے متعلق یہ ہے کہ جب مہاجر مدینہ میں آئے۔ مہاجر انصاری کا وارث ہوتا تھا اس کے ذی رحم کو چھوڑ کر بسبب اس اخوت کے جو نبی کریم صلعم نے ان کے درمیان قائم کر دی تھی۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی ولکل جعلنا موالی تو یہ بات منسوخ ہو گئی۔ پھر کہا والّذین عقدت ایمانکم ان کیلئے نصرت اور مہربانی اور نصیحت ہے اور میراث باقی نہیں رہی۔ ہاں اس کے حق میں وصیّت ہو سکتی ہے۔ پس جن لوگوں نے اس آیت کو منسوخ کہا ہے ان کو غلطی یہ لگی ہے کہ انہوں نے سمجھا کہ پہلے مواخاۃ والے کچھ ورثہ پاتے تھے تو وہ قرآن کریم کے اس حکم کے ماتحت پاتے تھے۔ حالانکہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوا کہ وہ کسی پُرانے رواج کے ماتحت ورثہ لے لیتے تھے اور خود اس آیت نے اس کو منسوخ کر دیا۔ ہاں یہ جائز رہا کہ بذریعہ وصیّت ان کو کچھ دیدیا جائے۔

۶۵۰ قوامون۔ قوّام کی جمع ہے جو قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے قام الرجلُ علی المرأۃ کے معنی ہیں مانھا یعنی اس کی مُونت یا روزی مہیّا کی اور قوّامٌ علیھا کے معنی ہیں مائنٌ لھا معنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اور الرجال قوّامون علی النساء کے معنی ہیں متکفلون بامور النساء مَعْنِیُّوْن

بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ پیچھے حفاظت کرنیوالی ہوتی ہیں اس کی وجہ سے جو اللہ نے (اُن کی)
فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ حفاظت کی ہے[۶۵۱] اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمھیں ڈر ہو[۶۵۲] تو ان کو وعظ کرو

بشؤنهن یعنی عورتوں کے امور کے متکفل ان کے حالات پر توجہ کرنے والے (ل) اور تاج العروس میں ہے کہ قام الرجل المرأۃ اور قام علیها کے معنی ہیں مانها وقام بشانها متکفلا بامرها یعنی اس کی مؤنت یا روزی مہیا کی اور اس کے امر کا تکفل کرتے ہوئے اس کی حالت کو قائم کیا اور قوام لها کے معنی مائن لها دیئے ہیں یعنی اس کیلئے روزی مہیا کرنے والا اور اس کے امر کا متکفل۔ پس قوام کے اصل معنی متکفل ہیں اس کے معنی محض محافظ یا محض حاکم درست نہیں اور تکفل میں روزی کا مہیا کرنا حفاظت کرنا اور تادیب سب امور شامل ہیں کیونکہ جو شخص جس کا متکفل ہوتا ہے اس کی جسمانی اور اخلاقی حفاظت بھی اس کے ذمہ ہوتی ہے۔

مردوں کے عورتوں پر قوام ہونے سے مراد: عورتوں کے ذکر کے ساتھ مردوں کے حقوق کا بھی ذکر ضروری تھا اس لیے بتایا کہ مرد عورتوں کے قوام یعنی متکفل ہیں۔ گھر بمنزلہ ایک چھوٹی سی بادشاہت کے ہے حدیث میں ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ تم میں سے ہر ایک بادشاہ ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اپنی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا اور اس کی تفصیل میں یہ بھی فرمایا کہ مرد بھی ایک بادشاہ ہے اور اس کے گھر کے لوگ بمنزلہ ایک رعیت کے ہیں اور عورت بھی اپنے خاوند کے مال کو صرف کرنے میں بمنزلہ ایک بادشاہ کے ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاں باہمی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا ہونگی وہاں ایک شخص کو رنگ حکومت بھی دینا پڑے گا۔ اسلام ایک عملی مذہب ہے اور جس مضمون کو قرآن شریف لیتا ہے ایک کامل حکیم کی طرح اس کے سارے پہلوؤں پر بحث کرتا ہے اس قدر باہمی حقوق اور ذمہ داریاں پیدا کرنے کے بعد یہ ضرور تھا کہ گھر کی چھوٹی سی سلطنت میں ایک کو دوسرے پر کچھ رنگ حکومت بھی دیا جاتا اور عملاً ساری دنیا کو دینا پڑا ہے کیونکہ اس کے بغیر نظم قائم نہیں رہ سکتا۔ اس رنگِ حکومت کو صراحت سے حکومت نہیں کہا اس لیے کہ خود دوسری جگہ فرما چکا ہے ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف (البقرۃ ۲۲۸) جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ اور گھر کے نظم میں مرد و عورت کا اشتراک ہے تاہم ان کے حقوق اور ذمہ داریاں الگ الگ قسم کی ہیں پس ان تمام امور کو مدنظر رکھ کر فرمایا کہ آخری ذمہ داری مردوں کی ہے اور وہ رنگ حکومت جس سے گھر کے امور طے ہوں مرد کو دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ خود ہی بیان فرمائی ہے۔ اول وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ چنانچہ مردوں کو عورتوں پر قوائے جسمانی میں فضیلت ہے اس لیے روزی کمانے کا کام اور ملک و قوم کی حفاظت کا کام ان کے سپرد کیا اور جو ملک کا محافظ ہے وہی گھر کا محافظ بھی ہو سکتا ہے مگر بعضهم علی البعض کہہ کر یہ بھی اشارہ کر دیا کہ بعض معاملات میں عورتوں کو بھی فضیلت ہے مثلاً یہ کہ وہ ایک رنگ میں مردوں کی مخدوم ہو گئیں۔ کیونکہ روزی کا مہیا کرنا، گھر کی حفاظت کرنا۔ یہ ایک خدمت ہے اور دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ مرد عورتوں پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں اور یہ وجہ اسی حکومت کے رنگ کے لیے بطور دلیل ہے جو تکفل کے مفہوم میں پایا جاتا ہے۔ یعنی مرد کو عورت پر اختیار اس لیے دیا گیا ہے کہ اس پر بوجھ بھی زیادہ ڈالا گیا ہے۔ کیونکہ وہ مال کمانے والا اور وہ مال کو خرچ کرنے والی ہے اور مال کے کمانے والے کو بہرحال اس کے خرچ کرنے والے پر اختیارات ہونے چاہئیں۔ اگر اس کے خلاف ہوگا تو موجب نقصان ہوگا۔ یہی معنی اس حدیث کے معلوم ہوتے ہیں لن یفلح قوم ولوا امرهم امرأۃ (بخاری) وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی جو اپنے امر کا اختیار عورت کو دیدیں۔ یعنی کمانے والے کا اختیار نہ ہو بلکہ خرچ کرنے والوں کا ہو، یوں اس حدیث میں جمہوریت کا اعلیٰ سے اعلیٰ اصول بیان کر دیا ہے اور یہ نظم کیسا اعلیٰ درجہ کا ہے کہ مرد کمائے اور عورت خرچ کرے اور مرد اس کا نگران ہو اور یہی اصول جمہوریت ہے کہ عوام جن کے اموال نظم ملکی پر خرچ ہوتے ہیں حکام ان پر نگران ہوں۔

۶۵۱ قٰنتٰت۔ قنوت کے معنی چونکہ خضوع کے ساتھ فرمانبرداری کا لازم کر لینا ہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر ہی بولا گیا ہے۔

حافظٰت للغیب۔ حفاظت کا مفعول مقدر ہے یعنی حقوق خاوند اور للغیب سے مراد ہے فی غیبتہ یعنی اس کی پیٹھ پیچھے اس بات کا ذکر کرنے کے بعد کہ مرد عورتوں کے متکفل ہیں۔ اب دو قسم کی عورتوں کا ذکر کرتا ہے پہلے صالحات یعنی اچھی عورتوں کا ذکر کیا ہے اور اس میں دو امور کے ذکر پر بس کی ہے۔ اول یہ کہ وہ قانتات ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والی ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ خاوند کے حقوق کی پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والی ہوں۔ خاوند کے حقوق کا بلحاظ ان کی عظمت کے ذکر کیا۔ گویا خدا کی فرمانبرداری کے بعد ان پر خاوند کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری ہے اور للغیب یا پیٹھ پیچھے کی شرط اس لیے لگائی کہ قرآن کریم کمال کی حالت کا بیان کر دیتا ہے جو عورت پیٹھ پیچھے خاوند کے حقوق کی نگہداشت کرتی ہے وہ اسکے سامنے تو ضرور ہی کرے گی۔ ان میں سب سے بڑی بات خاوند کا حق زوجیت ہے۔ گویا عورت کی عفت کو اس کا سب سے بڑا جوہر قرار دیا ہے۔ مگر خاوند کے اور بھی حقوق عورت پر ہیں۔ مثلاً اس کی پردہ کی باتوں کو ظاہر نہ کرے، اس کے مال کی حفاظت کرے، اس میں کسی قسم کا ناجائز تصرف نہ کرے، اس میں فضول خرچی نہ کرے، ضرورت اور ذرائع آمد سے زیادہ خرچ نہ کرے۔ بیہقی میں ایک حدیث بھی ہے جس میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا اذا غبت عنها حفظتك فی مالك ونفسها جب تم اس سے غائب ہو تو تمہارے مال میں اور اپنے نفس میں تمہاری حفاظت کرے۔

بما حفظ اللّٰہ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں یا تو ما موصولہ ہے اور عائد محذوف ہے۔ یعنی بمقابلہ ان حقوق کے جن کو اللہ نے ان کے لیے محفوظ کر دیا ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حقوق کو مردوں سے لیکر ان کو محفوظ کر دیا ہے اور ان میں خود یہ طاقت نہ تھی کہ وہ اپنے حقوق لیتیں اس لیے اب اس قدر حقوق لینے کے بعد ان پر یہ حق ہو گیا ہے کہ وہ بھی خاوندوں کے حقوق کی حفاظت کریں اور یہی معنی قابل ترجیح ہیں۔ مگر یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ عورتیں جو خاوندوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں تو وہ اللہ کی حفاظت سے ہی ایسا کرتی ہیں۔

۶۵۲ تخافون۔ خوف کے معنی ہیں۔ کسی امر مکروہ کی توقع ایسی علامت سے جو ظنی ہو یا علم کی حد تک پہنچی ہوئی ہو (غ) پس یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خوف

وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿٣٤﴾

اور خوابگاہوں میں انکو الگ کردو اور ان کو مارو پھر اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف کوئی راہ تلاش نہ کرو۔ اللہ بلند بہت بڑا ہے ۶۵۳

کسی فرضی خیال کا نام نہیں بلکہ کسی بدنتیجہ کے ظاہر ہونے کی توقع ہے جس کی علامات ظنی یا یقینی طور پر ظاہر ہو چکی ہوں۔ اور یہاں مراد یقینی طور پر ہی علامات کا ظاہر ہونا ہے۔ جس طرح اس سے اگلی آیت میں خِفْتُم سے مراد ہے تم پہچان لو (غ) اور جس طرح دوسری جگہ وان امرأۃ خافت من بعلہا نشوزا او اعراضا (النسآء-۱۲۸) میں خافت سے مراد علمت ہے۔ یعنی جان لے۔ اسی طرح واما تخافنّ من قوم خیانۃ فانبذ الیہم علی سوآء (الانفال-۵۸) میں بھی خوف سے مراد جان لینا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں خوف کی بنا پر حقوق اور ذمہ واریوں پر اثر پڑتا ہو، وہاں محض ظنی علامات پر کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی بلکہ یقینی علامات ہونی چاہئیں۔

نشوز۔ نشز سے ہے جس کے اصل معنی اُٹھنا ہیں جیسے واذا قیل انشزوا فانشزوا (المجادلۃ-۱۱) اور نشوز بین الزوجین یعنی میاں بی بی میں نشوز ان کا ایک دوسرے کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا ہے۔ یعنی ان میں موافقت کا نہ رہنا اس لیے لغت میں نشوز بین الزوجین کے معنی ہیں — کراھیۃ کل منھما صاحبہ وسوء عشرتہ (ل) یعنی ہر ایک کا اپنے رفیق سے کراہت رکھنا اور اس سے بدسلوکی کرنا لیکن بلحاظ حالات کے الگ الگ معنی یوں کیے ہیں۔ یعنی عورت کا نشوز مرد پر یہ ہے کہ اس کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی نافرمانی کی اور اس سے بغض رکھا اور اس کی اطاعت سے نکل گئی اور اس سے سخت دشمنی کی اور خاوند کا نشوز عورت پر بھی ہے اور یہ کہ اس کو مارے اور اس پر جفا کرے (ل) چنانچہ دوسری جگہ آتا ہے وان امرأۃ خافت من بعلہا نشوزا (۱۲۸) اور عورت کے مرد پر نشوز کے معنی اپنے خاوند سے بغض رکھنا اور اس کی طاعت سے اپنے آپ کو بالکل باہر نکال دینا اور اس کا اس سے ہٹ کر دوسرے کی طرف دیکھنا بھی کیے گئے ہیں (غ)

نشوز کرنے والی عورتیں: صالحات کے ذکر کے بعد جو اپنے خاوند کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اب ان عورتوں کا ذکر کرتا ہے جو حقوق خاوند کی حفاظت نہیں کرتیں اور جن سے خاوند کے خلاف ارتکاب نشوز معلوم ہو یعنی خاوند سے دشمنی بغض اس کی نافرمانی پر تلے رہنا۔ گھر میں نہ بسنا وغیرہ۔ یہ صرف وہ صورت ہے جس میں قصور صرف عورت کا ہو۔ جب مرد اور عورت دونوں کی طرف سے فساد کا خطرہ ہو اس کا ذکر اگلی آیت میں کیا ہے اور جب عورت کا قصور کوئی نہ ہو مرد کا ہی قصور ہو تو اس کے لیے آیت ۱۲۸ میں علاج بتایا ہے۔

۶۵۳ واھجروھن فی المضاجع۔ ھَجْر کے معنی انسان کا اپنے غیر سے الگ ہو جانا ہیں خواہ جسم سے الگ ہو یا زبان سے یا دل سے۔ اور ھجر فی المضاجع یعنی خوابگاہوں میں عورتوں سے مفارقت ان کے قریب نہ جانے سے کنایہ ہے (ع)

عورت کے نشوز کی صورت میں تین علاج بتائے ہیں۔ اوّل اوّل جب نشوز ظاہر ہو تو صرف نصیحت پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ اگر نصیحت سے فائدہ نہ ہو تو اس سے بجائے محبت کے کسی قدر سختی کا برتاؤ کرنا چاہیئے اور اس سے محبت کا میل جول اور محبت آمیز کلام ترک کر دیا جائے خوابگاہوں میں الگ کرنے سے یہی مراد ہے۔ ایک شریف عورت کے لیے خاوند کی طرف سے ایسا سلوک کافی سزا ہے۔ اور وہ فوراً اپنے رویہ میں اصلاح کرلے گی۔ لیکن جن عورتوں کو اس سے فائدہ نہ ہو اُن کی فطرت ہی ایسی ہو گی کہ سختی کے سوا ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی اور چونکہ طلاق کا ذراسی بات پر دینا ٹھیک نہیں۔ اس لیے ان کی اصلاح کے لیے ان کو مارنے کی اجازت بھی ہے۔

عورت کو مارنا کب اور کس حد تک جائز ہے: اس مارنے کی اجازت کو عیسائیوں نے اور بالخصوص آج کل کے مدعیان تہذیب عیسائیوں نے محل اعتراض ٹھہرایا ہے حالانکہ ظاہری ٹیپ ٹاپ کو چھوڑ کر بیشتر عیسائی گھروں میں جو سلوک عورتوں سے ہوتا ہے وہ اس سے بدتر ہے جو مسلمانوں کے گھروں میں ہوتا ہے۔ اسلام کی تعلیم ایک خاص طبقہ کے لیے نہیں۔ بلکہ تمام طبقات کے لیے ہے اس لیے اس کی ہدایات میں بھی وسعت پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے ان شریف عورتوں کا بھی ذکر کر دیا جن سے اگر نادانی سے کوئی قصور سرزد ہو تو تھوڑی نصیحت ہی ان کیلئے کارگر ہو جاتی ہے اور وہ اپنے قصور سے رجوع کرتی ہیں۔ پھر ان شریف عورتوں کا بھی ذکر کر دیا جن کے لیے خاوند کا محبت سے نہ بولنا ہی کافی سزا ہے۔ پھر اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ایک طبقہ عورتوں کا ہر ملک اور ہر قوم میں وہ ہے جن کے خیالات بہت سطحی ہیں۔ اور جن کے لیے نہ نصیحت کارگر ہوتی ہے۔ نہ محبت کے میل جول کے انقطاع سے ان پر کچھ اثر ہوتا ہے۔ ایسی عورتوں کے لیے دو ہی راہیں کھلی تھیں یا یہ کہ ان کو طلاق دیکر ہمیشہ کیلئے الگ کر دیا جائے یا یہ کہ ان سے کچھ اور زیادہ سختی برتی جائے۔ اسلام چونکہ طلاق کو ابغض الحلال عنداللہ قرار دیتا ہے۔ اس لیے طلاق سے پہلے اصلاح کی ہر ایک مناسب صورت کی تلقین دیتا ہے اور عورتوں کے اس طبقہ کے لیے جن کا اخلاقی احساس گرا ہوا ہو بطور اصلاح مارنے کی اجازت بھی دی ہے۔

اس دلیل کی صداقت خود نبی کریم صلعم کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ چنانچہ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ نے اس حدیث کو بیان کیا ہے کہ ایک موقعہ پر جب خاوندوں کی سختی کی شکایت نبی کریم صلعم کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا لقد اطاف بآل محمد النساء کثیر یشتکین من ازواجھن لیس اولئک بخیارکم۔ یعنی ہمارے

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا
حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ
اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾
وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا

اور اگر تم کو دونوں (میاں بیوی) میں باہم دشمنی کا ڈر ہو تو ایک فیصلہ
کرنیوالا اس (مرد) کے لوگوں میں سے اور ایک فیصلہ کرنیوالا اس (عورت) کے لوگوں
میں سے مقرر کرو اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے اللہ ان میں موافقت کر دے گا
بیشک اللہ جاننے والا خبردار ہے ۶۵۴
اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو

گھروں میں بہت سی عورتیں آئی ہیں جو اپنے خاوندوں کی شکایت کرتی ہیں۔ یہ لوگ تم میں سے اچھے لوگ نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ اجازت بی بی کو مارنے کی اعلیٰ طبقہ کے لیے نہیں بلکہ ادنیٰ طبقہ کے لیے ہے پس جب تک ایک ایسا طبقہ دنیا میں موجود ہے جن کے لیے مار کی سختی کی ضرورت بھی ہے اور بہتیرے عیسائی خاوند اپنی عورتوں کو بڑی بڑی بیدردی سے بھی مارتے ہیں، تو اسلام کا یہ حکم قابلِ اعتراض نہیں۔ ہاں مزید احتیاط کے لیے نبی کریم صلعم نے یہ بھی حکم دیدیا ہے کہ سخت ضرورت کے وقت اگر عورت کو مارا جائے تو وہ سخت مار نہ ہونی چاہیئے بلکہ ایسی مار ہو جس کا اثر نہ ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع میں فرمایا واتقوا اللّٰہ فی النساء فانھن عندکم عوان ولکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم احدا تکرھونہ فان فعلن واضربوھن ضربا غیر مبرح یعنی عورتوں کے بارہ میں اللہ کا تقوےٰ اختیار کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ تمہارے گھر میں کسی دوسرے کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کو مارو مگر صرف ایسا جس کا اثر نہ ہو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مارنے کی اجازت سخت جرم پر ہے۔ نبی کریم صلعم کا اپنا پاک نمونہ یہی ہے کہ آپ نے اپنی ساری عمر میں کبھی کسی بی بی کو مارا نہیں۔ حالانکہ آپ کے پاس نو بیبیاں تھیں اور سوتوں میں اکثر جھگڑے ہو جاتے ہیں جن سے مرد غضب میں آکر ان پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں۔ مگر آپ نے ایسے معاملات میں بھی ہمیشہ ایسی فراخدلی سے کام لیا کہ جو لوگ آنحضرت صلعم کو اپنا نمونہ بنانا چاہتے ہیں وہ کبھی بھی اپنی بیبیوں پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے بلکہ خیرکم خیرکم لاھلہ کو مدنظر رکھ کر کہ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بی بی کے ساتھ بہترین سلوک کرنیوالا ہو۔ اپنے حسن اخلاق کو گھر سے شروع کرنے کی کوشش کریں گے۔

آخر پر فرمایا کہ اگر بی بی اطاعت کرے تو پھر اس پر الزام لگانے کی راہ تلاش نہ کرو۔ اس کی اطاعت سے مراد یہاں اس کا اپنے نشوز کو ترک کر دینا ہی ہے۔ ان الفاظ سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اوپر کی ترتیب تدریجی ہے۔ اگر پہلے مرحلہ پر وعظ و نصیحت سے عورت مان جائے تو دوسرے مرحلہ کی نوبت نہیں آنی چاہیئے۔ ہاں پہلے مرحلہ پر نہ سمجھے تو پھر دوسرے طریق سے اس کو سمجھایا جائے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اوّل زبان سے نصیحت کرے اگر رک جائے تو اس پر کوئی الزام نہیں لیکن اگر انکار کرے تو اس سے مفارقت کرے پھر بھی انکار کرے تو مارے پھر بھی انکار کرے تو دو حکم مبعوث کیے جائیں۔

۶۵۴ حکما۔ حَکَم اور حَاکِم قریباً ایک ہی معنی میں آتے ہیں اور الحکم اور الحاکم اور الحکیم اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے شمار کیے گئے ہیں اور حَکَمَ کے اصل معنی ہیں روک دیا۔ اور حاکم کو حَاکِم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ظلم سے لوگوں کو روکتا ہے اور حَکَم حاکم سے زیادہ بلیغ ہے (غ)

یوفق۔ وفق سے ہے اور وِفْق کے معنی دو چیزوں میں مطابقت ہیں جیسے جزآءً وفاقا (النبأ۔ ۲۶)

میاں بی بی میں باہم فساد کی صورت میں دو حکم مقرر کرنے کا حکم یہ وہ صورت ہے جب دونوں یعنی میاں بی بی میں فساد اور عداوت کی صورت ہو۔ شقاق بینھما سے اس کو اس لیے تعبیر کیا کہ خاص طور پر ایک کی طرف فساد منسوب نہیں کیا جا سکتا پس یہ دیکھنے کو کہ ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے اور کس طرح پر موافقت میاں بی بی میں ہو سکتی ہے۔ دو حکم یا سرپنچ مقرر کرنے کا حکم ہے۔ ایک خاوند کے اہل میں سے ایک بی بی کے اہل میں سے۔ کیونکہ ایسے حکم بہ نسبت اجنبیوں کے اصل حالات سے اور دونوں کے مزاج سے زیادہ واقف ہونگے فابعثوا میں حکم حکام کو ہے۔ یعنی جو صاحب اختیار حاکم ہوں۔ اگر ایسے حاکم میسر نہ آئیں تو مسلمانوں کی جماعت ہی کا یہ کام ہے بجائے اس کے کہ ایسے معاملات میں حاکم خود تحقیقات کرے اسے دو حکم مقرر کر دینے کا حکم ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ باہمی فساد یا رنجش کے معاملات میں بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جو عوام میں ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہوتے اور عدالتوں کی کارروائی کھلی ہوتی ہے اور سب لوگوں کے علم میں آتی ہے جن لوگوں نے عیسائی ممالک میں مقدمات طلاق کی کارروائیوں کو عدالتوں میں دیکھا ہے اور پڑھا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ اس قسم کے مقدمات سے کس قدر فحش لٹریچر دنیا میں شائع ہوتا ہے اور اس کا کیسا مخرب اخلاق اثر دوسرے لوگوں پر ہوتا ہے۔ وہ اس حکم کی حکمت کو خوب سمجھ سکتے ہیں کہ بجائے عدالت میں فیصلہ کے حکم مقرر کرنے کی ہدایت کیوں کی ہے۔ پھر دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ حکم جو اہل میں سے مقرر کیے جاتے ہیں۔ وہ حالات سے طبعاً زیادہ واقف ہوتے ہیں اور غرض انکی زیادہ تر اصلاح ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے ایسے جھگڑے میں حکم مقرر کر کے ان کے فیصلہ کو قطعی قرار دیا۔ مسلمانوں کا عمل ان ہدایات پر بالکل نہیں رہا۔ اور اس لیے عورتیں سخت دکھ اٹھا رہی ہیں کس قدر قابلِ تعریف ضابطہ تھا کہ اگر اختلاف بڑھتا ہوا نظر آئے تو دو پنچ موافقت کرانے کی کوشش کریں۔ ہاں موافقت بالکل ناممکن ہو تو طلاق دلا دیں۔ اب ہر ایک گھر میں اپنی حکومت ہے اور مرد جس طرح چاہتے ہیں عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں جس کا نتیجہ ساری قوم بھگت رہی ہے اور قرآن کریم کی تعلیم پس پشت پھینکی جا رہی ہے۔

وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰی
وَ الْيَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی
وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ
وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ ﴿۳۶﴾

اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی
اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور
پاس والے ساتھی اور مسافر اور ان کے ساتھ بھی جن کے تمھارے
داہنے ہاتھ مالک ہوئے ۶۵۵ اللہ اسے پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنے
والا فخر کرنے والا ہے ۶۵۶

ع۶۵۵ الجار ذی القربیٰ۔ جار وہ ہے جس کی جائے سکونت تمہارے قریب ہو (غ) اور الجار ذی القربیٰ سے مراد یا قریب کا ہمسایہ ہے یا قریبی تعلق والا ہمسایہ بلحاظ نسب ہو یا اخوتِ دینی۔

الجار الجُنُب۔ جنب کے اصل معنی پہلو ہیں۔ جَنَبَ۔ اَجْنَبَ ایک پہلو پر یا دور ہو گیا۔ الجار الجنب دور کا پڑوسی ہے کیونکہ چالیس گھر تک پڑوس کا حق ہے اور یا مراد ایسا پڑوسی ہے جس سے نسب کا یا اخوت قومی کا تعلق نہیں۔ مثلاً ہندو یا عیسائی۔

الصاحب بالجنب کے لفظی معنی پاس کا ساتھی یا ہمنشین ہیں۔ رفیق سفر، رفیق تعلیم۔ رفیق پیشہ۔ رفیق مسجد سب اس کے اندر آجاتے ہیں۔

قرآن کریم ہمیشہ خاص سے عام اور عام سے خاص کی طرف رجوع فرماتا ہے۔ بیبیوں سے حسن سلوک کے نصائح کو تمام کرکے اور ان کے حقوق کی طرف توجہ دلا کر اب کل مخلوقات سے حسن سلوک کی طرف اور ان کے حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مگر مخلوقات سے حسن سلوک کی اصل بنا یہ ہے کہ ان سب کا خالق ایک ہے اس لیے اللہ کی عبادت سے شروع کیا۔ پھر ماں باپ سے احسان کا ذکر کیا پھر قریبیوں سے پھر یتیموں اور مسکینوں سے۔ پھر پڑوسیوں سے۔ احسان یا نیکی کرنے کی تعلیم ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ مگر اسلام نے پڑوسی کے حق کو بہت وسیع کیا ہے اور دو قسم کے ہمسایوں کا ذکر کیا ہے۔ اوّل قریبی یا قرابت والے ہمسائے۔ دوسرے دُور کے یا اجنبی ہمسائے۔ اور یوں یہود نصاریٰ مشرکین تک کو اس احسان میں شامل کر لیا ہے۔ احادیث اس بارہ میں بکثرت مروی ہیں کہ نبی کریم صلعم پڑوسیوں سے کس قدر حسن سلوک کی تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ صحیحین میں ایک حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جبرائیل مجھے ہمسایہ کے متعلق کہتے رہے یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ اس کو ورثہ دلایا جائیگا پھر صاحب بالجنب کے ساتھ احسان کی تاکید فرمائی۔ یعنی جو شخص ایک انسان کے پاس بیٹھتا ہو۔ مثلاً ایک استاد کے دو شاگرد یا ایک پیشہ کے دو شریک یا ایک دفتر کے دو ملازم یا ایک تجارت کے دو کرنے والے۔ یا ایسے شخص جو کبھی سفر یا حضر میں ایک دوسرے کے ہمنشین ہوئے ہوں۔ مسجد میں دو نماز پڑھنے والے بھی ایک دوسرے کے صاحب بالجنب ہو جاتے ہیں۔ پھر اس سے اُتر کر مسافر ہیں اس لیے کہ گو ان کا تعلق تو انسان سے کسی قسم کا نہیں مگر وہ مدد کے محتاج ہیں اور سب سے آخر وہ جن پر انسان کا تصرف ہے خواہ انسان ہوں جیسے نوکر یا غلام جو قید ہو کر انسان کے تصرف میں آجاتے ہیں۔ یا حیوان جو انسان کی ملک میں ہیں۔ کیونکہ حیوان بھی انسان کی نیکی کے محتاج ہیں۔ بیبیوں سے حسن سلوک کے ذکر کے بعد اس ذکر کو لانے کا منشاء یہ ہے کہ ایک نیکی سے دوسری نیکی کی طرف قدم اُٹھے جیسا کہ خیرکم خیرکم لاھلہ میں فرمایا ہے گویا بی بی سے حسن سلوک سے دوسروں سے حسن سلوک کی طرف قدم اٹھتا ہے

غلاموں سے حسن سلوک میں اسلام نے ایسا کمال دکھایا ہے جس کی نظیر کسی مصلح میں ہم کو نہیں ملتی۔ چنانچہ ہمارے نبی کریم صلعم کی آخری نصیحت مسلمانوں کو یہی تھی اور حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آخری وقت میں آپ یہ لفظ دہراتے جاتے تھے۔ الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم نماز اور تمھارے مملوک یعنی ان ہر دو کی بہت خبر رکھو اور بعض احادیث میں آتا ہے کہ جو کھانا پکے یا انسان خود کھائے اس میں سے کچھ اپنے غلام یا خادم کو بھی کھلائے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم کی حدیث ہے فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم۔ یعنی جس کے تصرف میں اس کا بھائی ہو تو چاہیئے کہ جو خود کھاتا ہے اُسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہے اُسے پہنائے اور ان پر اس قدر کام کی مشقت نہ ڈالو جس کے نیچے وہ دب جائیں اور اگر تم ان کو مشقت کا کام دو تو ان کی مدد کرو۔ ایسا ہی حیوانات کے ساتھ نیکی کا حکم بھی احادیث میں پایا جاتا ہے۔

ع۶۵۶ مختال۔ اس کا مادہ خیل ہے اور خیال ایک مشہور لفظ ہے اسی سے خُیَلَاء ہے جس کے معنی تکبر ہیں۔ کیونکہ انسان اپنے نفس کے لیے ایک فضیلت کا خیال باندھ لیتا ہے (غ) اور اسی سے حدیث میں آتا ہے من جرّ ثوبہٗ خُیَلَاءَ لم ینظر اللہ الیہ جو اپنا کپڑا تکبر سے نیچا چھوڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔ اور اختال کے معنی ہیں وہ متکبر ہوا۔ اور مختال وہ مالدار بخیل ہے جو بڑا بنتا ہے۔ وہ جاہل جو اپنے قریبیوں سے جب وہ محتاج ہوں یا اپنے ہمسایوں سے جب وہ محتاج ہوں عار کرتا ہے (ل)

فخور۔ فخر سے ہے جس کے معنی ہیں ان چیزوں میں جو انسان سے باہر ہیں اپنی بڑائی ظاہر کرنا (غ) جیسے مال اور مرتبہ۔ پس مختال اور فخور میں ایک فرق تو یہ ہے کہ مختال اپنے نفس کو فضیلت دینے سے کہلاتا ہے اور فخور مال و مرتبہ وغیرہ کی بڑائی کی وجہ سے۔ اور دوسرے یہ کہ مختال اپنے طرز عمل سے بنتا ہے یعنی اس کا سلوک دوسروں سے متکبرانہ ہوتا ہے اور فخور زبان سے اپنی بڑائی ظاہر کرتا ہے اور یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ انسان کے پاس مال کا ہونا یا اس کا بلند مرتبہ پر ہونا یا اس کا اپنے جسم اور لباس کو اچھی حالت میں رکھنا یہ امور تکبر میں داخل نہیں۔ بلکہ تکبر صرف وہی ہے جہاں دوسرے انسانوں کی حق تلفی ہو۔ چنانچہ

الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ
بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖ ۗ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿۳۷﴾

جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں،
اور اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا
ہے اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۶۵۷

وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ
وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ
وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِينًا فَسَآءَ قَرِينًا ﴿۳۸﴾

اور جو اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں
اور نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ پیچھے آنے والے دن پر
اور جس کا ساتھی شیطان ہو تو وہ بہت ہی بُرا ساتھی ہے ۶۵۸

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۗ وَكَانَ
اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيمًا ﴿۳۹﴾

اور ان پر کیا وبال آجاتا اگر یہ اللہ اور پیچھے آنے والے دن
پر ایمان لاتے اور اس میں سے خرچ کرتے جو اللہ نے ان کو دیا
تھا اور اللہ ان کو خوب جانتا ہے ۶۵۹

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ
تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ

اللہ ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر وہ نیکی ہو
(تو) وہ اس کو کئی گنا بڑھاتا ہے اور اپنے پاس

ثابت بن قیس سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپ نے یہ آیت ان اللہ لا یحب من کان مختالاً فخوراً پڑھی اور تکبر اور اس کی بُرائی کا ذکر کیا، تو ثابتؓ رو پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے دریافت کیا کہ کیوں روتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ میں تو ایک ایسا آدمی ہوں کہ خوبصورتی سے محبت رکھتا ہوں یہاں تک کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میری جوتی کا تسمہ بھی خوبصورت ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو تم اہل جنت میں سے ہو۔ انہ لیس بالکبر ان تحسن راحلتک ورحلک ولکن الکبر من سفہ الحق وغمص الناس (در) یہ تکبر نہیں کہ تم اپنی سواری اور پالان کو اچھا بناؤ بلکہ متکبر وہ ہے جو حق کو ہلکا جانتا ہے اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے۔ آج کل کی تہذیب اکثر لوگوں کو مختال اور فخور ہی بناتی ہے وہ خود بڑے بنکر لوگوں کو حقیر و ذلیل جانتے ہیں اور ان کو پورا انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں دیتے۔ احسان یا نیکی کا کرنا تو ایک طرف رہا جب پہلے حصۂ آیت میں مخلوق خدا سے احسان کی تعلیم دی تو اسی مناسبت سے اس کا خاتمہ ان لوگوں کے ذکر پر کیا جو بجائے دوسروں سے احسان کرنے کے ان پر اپنی بڑائی جتاتے اور ان کے حقوق کو پاؤں تلے روندتے ہیں۔

۶۵۷ اس آیت میں مختال و فخور کا ایک وصف بیان کیا ہے کہ یہ لوگ خود بخل کرتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی ہدایت کرتے ہیں۔ گویا یہ بدی ان کے نزدیک اس قدر محبوب ہو گئی ہے کہ وہ دوسروں کو بجائے نیکی کا حکم کرنے کے اس بدی کا حکم کرتے ہیں۔ پھر تیسرا مرتبہ ان کے انتہائے بخل کا یہ بیان کیا کہ جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ مثلاً علم کے متعلق بھی بخل کرتے ہیں۔ یا اپنے اخلاق میں بھی دوسروں سے بخل کرتے ہیں۔ اگر خود کچھ علم حاصل کرلیں تو اب یہ نہیں چاہتے کہ دوسروں کو بھی وہ علم دیں۔ اور آخر میں واعتدنا للکافرین کہہ کر یہ بتا دیا کہ یہ اوصاف کافروں کے ہیں۔

۶۵۸ قرین قرن سے ہے جس کے معنی دو یا زیادہ چیزوں کا اجتماع ہے۔ خواہ وہ اجتماع کسی معنی میں ہو۔ شیطان کا قرین انسان ہونا بدی میں اس کا ساتھی ہونے کے لحاظ سے ہے۔

اس میں مختال فخور کا دوسرا وصف بیان کیا کہ اگر ایک طرف بخل کرتا ہے، تو دوسری طرف محض دکھاوے کے لیے نمود کے طور پر رسم و رواج کے اتباع میں برادری اور بڑائی کے خیال سے اپنا مال خرچ بھی کرتا ہے۔ اگر آج مسلمانوں کی حالت دیکھی جائے تو کثیر حصہ اسی کا مصداق ثابت ہوگا۔ حکام کو خوش کرنے کے لیے، برادری میں ناک رکھنے کے لیے اور دکھاوے کے رنگ میں جائدادیں بھی بیچ لیں گے۔ مگر خدا کی راہ میں دینے کا نام آئے تو چند پیسے خرچ کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔

۶۵۹ ماذا علیہم۔ توبیخ کے لیے ہے اور مراد ہے کہ کیا وبال یا ضرر ان کو پہنچتا اگر یہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے۔

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ دکھاوے کے لیے خرچ کرنے والوں کا ایمان اللہ اور یوم آخر پر کچھ نہیں ہوتا جو شخص خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے ہچکچاتا ہے درحقیقت اس کا ایمان اللہ اور یوم آخر پر بھی کم ہوتا ہے۔ اور یہاں اٰمنوا باللہ والیوم الاٰخر سے مراد ایمان کامل ہی ہے۔ وہی ایمان جس کا ذکر اس قسم کی آیات میں

أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٤٠﴾ — سے بڑا اجر دیتا ہے ۶۶۰

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ — پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر ایک امت سے گواہ لائیں گے اور تجھ کو ہم ان پر گواہ لائیں گے ۶۶۱

يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ﴿٤٢﴾ — اس دن وہ جنھوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، آرزو کریں گے کہ کاش زمین اُن پر برابر کردی جاتی اور اللہ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے ۶۶۲

آتا ہے یٰایھا الذین اٰمنوا اٰمنوا باللہِ وَرسولہ۔

۶۶۰ مثقال۔ ثقل سے ہے اور مثقال کے معنی ہیں وہ جس کے ساتھ وزن کیا جائے اور وہ ایک خاص وزن بھی ہے جو چوبیس قیراط کے برابر ہے اور مطلق مقدار پر بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں مقدار ہی مراد ہے۔

ذرّۃ۔ ذرد سے مشتق ہے ذرّ الشیٔ کے معنی ہیں کسی چیز کو انگلیوں کی پوروں سے لینا پھر اس کو کسی چیز پر چھڑک دینا اور ذرّۃ (جس کی جمع ذَرّ آتی ہے) چیونٹی کے نئے پیدا ہوئے ہوئے چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں۔ ان میں سے سو کا وزن ایک جو کے دانہ کے برابر ہوتا ہے اور بعض نے کہا کہ ذرّہ کا وزن کچھ نہیں ہوتا اور وہ وہ چیز ہے جو کسی مکان میں سورج کی کرنیں داخل ہوں، تو اُڑتی ہوئی نظر آتی ہے (ل) کچھ وزن نہ ہونے سے بھی مراد اتنا کم وزن ہوتا ہے کہ ہوا میں وہ ذرات خود بخود اُڑتے ہیں بعض نے چھوٹی سُرخ چیونٹی کو ذرہ کہا ہے اور ابن عباسؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ اس چیونٹی کا سَر ذرّۃ کہلاتا ہے (ر)

یہ آیت پچھلی آیت کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے۔ پچھلی آیت میں انفاق اور حقوق العباد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا تھا کہ جو کچھ کوئی خرچ کرے گا اللہ اس کو جانتا ہے یعنی اس کا اجر دے گا۔ اگر اجر نہ دے تو گویا اس نے ایک نیک فعل کے اجر کو ضائع کر دیا۔ اور یہ ایک ظلم ہے مگر خدا کی ذات میں ایک ذرہ برابر بھی ظلم روا نہیں رکھا جا سکتا۔ پس اصل غرض یہی سمجھانا ہے۔ کہ اللہ کسی اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اگر وہ فعل حسنہ یعنی نیکی کا ہے تو ضائع کرنا کہاں۔ اس کو اللہ تعالیٰ کئی گنا بڑھاتا ہے اور یہ بھی اشارہ ہے کہ ان اصول کو چھوڑ کر مسلمان دکھ اور تکلیف اُٹھائیں گے وہ خدا کی طرف سے ظلم نہیں۔

۶۶۱ یہاں بتایا کہ مسلمانوں کے مصائب رسول کی تعلیم سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے رسول کی شہادت کا ذکر کیا اور بتایا کہ جس طرح دوسری اُمتوں کے رسول ان اُمتوں پر گواہ ہوں گے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمتِ محمدیہ پر گواہ ہونگے۔ ھٰؤلاء میں اشارہ بعض مفسرین نے انبیائے سابقین یا من کل اُمّۃ بشھید کی طرف لیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ھٰؤلاء سے مراد اُمتِ محمدیہ ہے اور یہ اسی کے مطابق ہے۔ جو دوسری جگہ فرمایا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (البقرۃ ۲ - ۱۴۳) اور صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ابن مسعود نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ تو ابن مسعود نے کہا یا رسول اللہ میں آپ کو پڑھ کر سناؤں اور آپ پر تو نازل ہی ہوا ہے۔ فرمایا ہاں مجھے پسند آتا ہے کہ میں دوسروں سے سنوں۔ تو حضرت ابن مسعود نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی۔ یہاں تک کہ آپ اس آیت پر آئے فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علٰی ھٰؤلاء شھیدا۔ تو آپ نے فرمایا بس کرو اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ابن ابی حاتم نے ایک دوسرے صحابی سے اس حدیث کو یوں بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابن مسعود اور صحابی تھے تو آپ اسی طرح قرآن کریم سن رہے تھے۔ جب پڑھنے والا اس آیت پر پہنچا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رو پڑے اور فرمایا یارب ھٰذا اشھدت علی من انا بین اظھرھم فکیف بمن لم ارہ (ث) اے رب ان پر تو میں گواہی دونگا (یعنی یہ کہ انہوں نے میری فرمانبرداری کی) جو میرے سامنے ہیں لیکن ان کی گواہی کس طرح دوں گا جن کو میں نے نہیں دیکھا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں ھٰؤلاء سے مراد آپ کے پیرو ہی ہیں اسی کی تائید میں ابن جریر نے ایک حدیث بیان کی ہے جس کے راوی ابن مسعود ہی ہیں کہ اس موقعہ پر پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شھیدا علیھم ما دمت فیھم فلمّا توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم یعنی میں ان پر گواہ ہوں جب تک میں ان میں ہوں۔ پھر جب تو مجھ کو وفات دے تو تو ہی اُن پر نگران ہے۔ اور اس کی تائید بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو آیت قرآنی فلمّا توفیتنی کے نیچے انہوں نے بیان کی ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا اس لیے تھا کہ آپ کو اُمت کی پچھلی حالت کی خبر دی گئی تھی۔

۶۶۲ الّذین کفروا وعصوا الرسول میں بعض نے وَعصوا الرسول کو جملہ معترضہ قرار دیا ہے بمعنی وقد عصوا الرسول یعنی انہوں نے رسول کی نافرمانی کی تھی۔ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کا کفر رسول کی نافرمانی ہے اور یا اصل مقصود تو رسول کی نافرمانی کرنے والوں کا ذکر ہے جیسا کہ پچھلی آیت سے ظاہر ہے۔ لیکن ساتھ کفار کا ذکر بھی بڑھا دیا ہے اور یوں بتا دیا ہے کہ رسول کی نافرمانی کرنے والا گروہ کافروں کے ساتھ ملتا ہے جزا و سزا کے وقت یہ خواہش کریں گے کہ مٹی میں ملے رہتے اور ان کی دوبارہ زندگی نہ ہوتی یا یہ کہ وہ پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔

جو لوگ حقوق العباد ادا نہیں کرتے یا حقوق اللہ ادا نہیں کرتے اور یوں رسول کی نافرمانی کرتے ہیں ان کے ذکر کو کفار کے ذکر کے ساتھ مقرون کر کے فرمایا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نماز کے نزدیک جاؤ جب تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ سمجھنے لگو جو کہتے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں سوائے اس کے راستہ گزر رہے ہو، یہاں تک کہ غسل کرو ^۶۶۳^ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے۔ یا

کہ جب جزا و سزا کا وقت آئے گا تو پھر ان لوگوں کو اپنی زندگی پر افسوس ہوگا اور وہ چاہیں گے کہ دوبارہ نہ اُٹھائے جاتے اور زمین میں ہی دبے رہتے۔ مگر وہ ایسا وقت ہوگا کہ جو کچھ کیا ہے سب ظاہر ہو جائے گا۔ اور جس طرح دنیا میں چھپ چھپ کر بدیاں کر لیتے ہیں وہ اخفا کا پردہ وہاں نہ رہیگا اور کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے اور یا لو تسوّٰی بھم الارض کی طرح یہ بھی ان کی خواہش ہے اور اس کا تعلق یود الذین سے ہے یعنی ایک تو یہ خواہش کریں گے کہ وہ دوبارہ زندہ نہ کیے جاتے اور دوسرے یہ کہ انہوں نے اللہ سے کوئی بات دنیا میں چھپائی نہ ہوتی اور اس کے دیئے ہوئے قوٰی کو ٹھیک محل پر لگایا ہوتا کیونکہ ان قوٰی کا اپنے محل پر نہ لگانا یہ بھی کتمان میں ہی داخل ہے۔

۶۶۳ الصلوٰۃ کے معنی بیان ہو چکے دیکھو ۱۲ع اور نماز کی جگہ کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں (رغ) لھدّمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد (الحج ۲۲-۴۰) جہاں صلوٰت سے مراد عام عبادتگاہیں ہیں۔ یا کنائس یعنی یہودیوں کی عبادتگاہیں۔ یہاں لفظ صلوٰۃ سے مسجد مراد ہے اور چونکہ اصل نماز مساجد میں ہی ہے۔ اس لیے نماز کا مفہوم خود اس کے اندر شامل ہے۔

سکارٰی۔ سکران کی جمع ہے۔ جو سُکر سے ہے۔ یعنی وہ حالت جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہوتی ہے (رغ) یعنی جب اس کے ہوش و حواس پورے درست نہیں ہوتے۔ اور اس کا اکثر استعمال شراب میں ہے یعنی شراب پی کر جب انسان کی عقل جاتی رہے تو اس کو سُکران کہا جاتا ہے۔ لیکن غضب و عشق وغیرہ سے بھی یہ حالت انسان کو پہنچتی ہے (رغ) اور لسان العرب میں ہے کہ سکر تین ہیں یعنی جوانی کا سکر اور مال کا سکر اور غلبہ کا سکر اور اسی میں آیت زیر بحث کی تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک یہاں سکر النوم مراد ہے۔ یعنی نیند کا نشہ یا وہ حالت جب نیند کے غلبہ سے انسان کی عقل میں فتور آجاتا ہے اور سَکرۃ الھم والنوم بھی کہا جاتا ہے یعنی غم اور نیند میں سکرۃ کی حالت ہو جانا۔ اور قرآن کریم میں سکرۃ الموت آیا ہے اور یہ وہ حالت ہے جب موت کی شدت سے غشی آتی ہے۔

جنب۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو حالت جنابت میں ہو اور اس کا استعمال مذکر مونث واحد جمع میں یکساں ہوتا ہے اور اس کا اشتقاق جنب سے ہے جس کے معنی پہلو ہیں (رغ) اور اس کو حالت جنابت اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس حالت میں حکم شریعت میں نماز سے ایک طرف رہنا چاہیئے۔ اور نہایہ میں ہے کہ جُنُب وہ ہے جس پر جماع اور خروج منی سے غسل واجب ہے۔

عابری سبیل۔ عابری عبور کرنے والے۔ عابری سبیل سے مراد حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک راستہ گزرتے ہوئے ہے۔ یعنی مسجد میں سے صرف گزر جانا حالت جنابت میں جائز ہے۔ بیٹھنا جائز نہیں۔ اور بعض نے عابری سبیل کے وسیع معنی مسافر لیے ہیں۔ یعنی حالتِ سفر کو حکم سے مستثنیٰ کیا ہے۔

پچھلے رکوع میں مسلمانوں کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی تھی اس رکوع میں یہودیوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکام سے انسان انحراف کرتا ہے تو اس کی نوبت کہاں تک پہنچتی ہے اور چونکہ پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑ کر انسان بڑی بڑی بلاؤں میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لیے سب سے پہلے نماز کے ذکر سے اس مضمون کو شروع کیا۔ کیونکہ نماز تزکیہ نفس انسانی کے لیے سب سے بہتر علاج ہے مگر ایک مسلمان کی نماز کیسی ہو اس کے ساتھ سکر اور جنابت کی حالت جمع نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے لذّت کو حاصل کر چکا ہے اس لیے وہ کمال لذّت جو ذکر الٰہی میں حاصل ہوتی ہے اس کو ادنیٰ لذات نفسانی سے ممتاز کر دیا ہے۔ جنابت اور حالت سُکر کو اکٹھا کرنے کی یہ بھی وجہ ہے کہ دونوں میں اعلیٰ درجہ کا جسمانی سرور انسان کو حاصل ہوتا ہے اور نماز کو دونوں حالتوں میں روک کر بتایا ہے کہ وہ روحانی سرور جو نماز سے حاصل ہوتا ہے اس کا کیا بلند مقام ہے کہ ان جسمانی سروروں کو اس کے مقابلہ میں کوئی وقعت حاصل نہیں۔ اسی مضمون کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ ہے حُبّب الیّ من دنیاکم الطیب والنساء وجُعلتْ قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (بخاری) تمہاری دنیا سے میری طرف خوشبو اور عورت کو محبوب بنا دیا گیا ہے۔ مگر میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور میری حقیقی راحت نماز میں ہے یعنی گو ان چیزوں میں انسان کے لیے سرور اور لذّت ہے مگر قرت عین یا حقیقی راحت صرف نماز میں یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں ہے۔

شراب کی قطعی حرمت سے پہلے حالت سکر سے روکا: وانتم سکارٰی کی تفسیر میں عموماً مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہاں سُکر سے مراد نشہ شراب ہے اور کہ یہ سورۃ مائدہ میں شراب کی حرمت کا قطعی حکم نازل ہونے سے پہلے کی آیت ہے جو حرمت شراب میں ایک ضروری تدریجی مرحلہ تھا اور بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی دعوت میں بعض مسلمانوں نے شراب پی لی اور جب نماز کا وقت آیا تو قرآن کریم کی سورۃ قل یاایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون کو غلط پڑھ دیا جس سے

أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً
فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ
وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ
يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ
تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾

تم نے عورتوں کو چھوا ہو پھر تم کو پانی نہ ملے،
تو پاک مٹی کا قصد کرو پھر اپنے مونہوں اور ہاتھوں پر مسح کرو
بیشک اللہ معاف کرنے والا مغفرت کرنیوالا ہے ۶۶۴
کیا تونے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جن کو کتاب کا ایک حصہ
دیا گیا وہ گمراہی کو خرید تے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم راستہ
سے بہک جاؤ۔

معنی میں فرق آگیا۔ اور اس پر یہ تحریم نازل ہوئی۔ لیکن اگر سُکر سے مراد شراب کا ہی نشہ لیا جائے تو بھی اصل غرض یہاں سُکر سے روکنے کی ہے۔ کیونکہ پانچ اوقات نماز کی تقسیم دن رات میں اس طرح ہے کہ جو شخص حالت سُکر میں ہوگا وہ کسی نہ کسی نماز میں شامل ہونے سے رہ جائے گا اور اصل مقصود یہ نہیں کہ جب نشہ ہو جائے تو نماز مت پڑھو۔ بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ نماز تو تم نے پڑھنی ہے مگر حالت نشہ میں نماز بے معنی ہے اس لیے نشہ کی حالت سے بچو۔ اور حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا اذا نعس احدکم وھو یصلی فلینصرف ولینم حتی یعلم ما یقول جب تم میں سے کسی کو اونگھ آجائے جب وہ نماز پڑھ رہا ہو تو چاہیئے کہ واپس چلا جائے اور سو لے یہاں تک کہ جو کچھ کہتا ہے اسے جانے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے نیند کی حالت کو اسی حکم میں شامل کیا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے حالت سکر سے مراد یہاں صرف نیند کا نشہ لیا ہے۔

نماز کے لیے حضور قلب کی ضرورت: الفاظ حتّٰی تعلموا ما تقولون سے اس حکم کی علّت غائی معلوم ہوتی ہے کہ نماز ایک بے معنی حرکت نہیں۔ نہ صرف کھڑے ہونے رکوع کرنے اور سجدہ کرنے کا نام نماز ہے۔ حالانکہ یہ نماز کے ارکان ہیں۔ نہ صرف چند الفاظ منہ سے کہنے کا نام نماز ہے حالانکہ اسکے بغیر نماز نہیں ہوتی بلکہ اصل نماز یہ ہے کہ انسان کا دل کسی خاص طرف لگا ہو۔ اور اس کو یہ علم ہو کہ میرے اس فعل کا اور میرے ان الفاظ کا یہ منشاء ہے پس اصل نماز تو قلب کی ہے۔ یعنی قلب پر ایک خاص حالت کا وارد ہونا۔ اور ظاہر افعال صرف اس حالت قلبی کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ کس قدر معمولی الفاظ میں ایک باریک حکمت کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔ دوسرے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کو نماز کے بالخصوص اور قرآن کریم کے عموماً معنی اور مفہوم معلوم ہونے چاہئیں جو لوگ صرف لفظوں کو بغیر ان کی اصلیت اور ان کے معنی جاننے کے رٹتے رہتے ہیں۔ وہ ایک نہ ایک رنگ میں حتّٰی تعلموا ما تقولون کے ماتحت آجاتے ہیں۔ پس مسلمانوں کے ہر بچہ کے لیے تعلیم لازمی ہے۔ کیونکہ جس نے تعلیم حاصل نہیں کی وہ الفاظ کے معنی کس طرح جان سکتا ہے۔

۶۶۴ الغائط۔ غوط اس کا مادہ ہے اور غاط کے معنی ہیں کھودا۔ (ل) اس لیے غائط وسیع پست زمین کو کہتے ہیں اور چونکہ لوگ قضائے حاجت کے لیے پست زمین میں جاتے تھے تا کہ نظروں سے پوشیدہ ہو جائیں اس لیے اتی الغائط سے کنایۃً بول و براز وغیرہ مراد ہو گیا اور شریعت نے اس میں توسیع کر کے اخراج ہوا کو بھی شامل کیا ہے۔

لٰمستم۔ لمس۔ مَسّ کی طرح ظاہر جلد کے چھونے کو کہتے ہیں اور ملامسۃ جس سے لٰمستم آیا ہے کنایۃً مرد اور عورت کے تعلق پر بولا جاتا ہے۔

صعید۔ صعود کے معنی اوپر چڑھنا ہیں اور صعید وجہ الارض یعنی سطح زمین کو کہا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک غبار کو جو اوپر چڑھ جاتا ہے (غ) اس لیے تیمم میں بعض کے نزدیک سطح زمین پر ہاتھ مارنا کافی ہے خواہ اس میں گرد و غبار ہو یا نہ ہو جیسے پتھر اور بعض کے نزدیک غبار کا ہاتھ کو لگنا ضروری ہے۔

امسحوا۔ مَسْح کے معنی کسی چیز پر ہاتھ کا گزارنا اور اس سے نشان کو مٹا دینا ہیں۔ الگ الگ دونوں مفہوموں پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

تیمم: جب حالت جنابت کا ذکر آیا اور اس کے ساتھ تطہیر یعنی غسل کا ذکر آیا جو اعلیٰ درجہ کی تطہیر ہے تو ساتھ ہی تیمم کا ذکر بھی کر دیا جو ادنی درجہ کی تطہیر ہے اور گو بظاہر معلوم نہ ہو کہ مٹی سے تطہیر کس طرح ہو سکتی ہے لیکن سچ یہی ہے کہ پانی اور مٹی دونوں پاک کرنے والی چیزیں ہیں۔ اور تیمم کو اس لیے بھی ضروری ٹھہرایا کہ تا نماز کے لیے ایک قسم کی تیاری انسان کے اندر پیدا ہو۔ اور شاید مٹی پر ہاتھ مارنے میں انسان کے عجز کی طرف بھی اشارہ ہو۔ اور یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ گو وضو اور غسل سے طہارت ظاہری بھی حاصل ہوتی ہے اور وہ اچھی چیز ہے۔ مگر نماز کا اصل مقصود طہارت باطنی ہے۔ یہاں بیماری اور سفر اور حدث اصغر اور حدث اکبر کو اکٹھے ساتھ جمع کیا ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ انسان سفر میں نہ ہو اور پھر بھی پانی نہ ملے مثلاً پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا ایسے مقامات میں جہاں پانی بافراط دستیاب نہیں ہوتا یا صرف پینے کے لیے دستیاب ہو سکتا ہے۔

تیمم کا طریق: مسح کے طریق میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک دو دفعہ مٹی پر ہاتھ مارنا چاہیئے۔ پہلی دفعہ منہ پر پھیر لے اور دوسری دفعہ کہنیوں تک ہاتھوں پر اور بعض نے ہاتھوں کو کہنیوں تک لیا ہے۔ مگر دو دفعہ ہاتھ مٹی پر مارنا ضروری قرار دیا ہے۔ مگر دو دفعہ ہاتھ مارنے کی روایات ضعیف ہیں اور احادیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی دفعہ ہاتھ مارنے اور صرف کفین تک ہاتھ پھیرنے کا طریق خود ہی بتایا ہے۔ چنانچہ عمارؓ نے یہ واقعہ خود بیان

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
وَلِيًّا ۡ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾
مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ
مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا
وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ
وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا
وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ
وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ
فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

اور اللہ تمھارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ ہی کافی دوست ہے اور اللہ ہی کافی مددگار ہے ۶۶۵
ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے بعض باتوں کی ان کے موقعوں سے تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے سُن لیا اور ہم نہیں مانتے اور سُن تو نہ سنوایا جائے اور رَاعِنا اپنی زبانیں مروڑتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے اور اگر وہ (یوں) کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم فرمانبرداری کرتے ہیں اور سنیئے اور اُنظرنا تو ان کے لیے بہت اچھا اور درست ہوتا لیکن اللہ نے اُن پر اُن کے کفر کی وجہ سے لعنت کی سو وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں ۶۶۶

کیا ہے کہ ایک دفعہ جب وہ کسی سریہ میں تھے تو جنابت کی حالت میں ہو گئے تو آپ تیمم کے لیے مٹی کے اندر لوٹے کیونکہ پانی نہ تھا۔ جب آپ نے یہ ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے اور فرمایا کہ تمہیں صرف اس قدر کافی تھا وضرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ الارض ثم نفخ فیہما ومسح بہما وجہہ وکفیہ یعنی نبی کریم صلعم نے زمین پر ہاتھ مارے پھر اس پر پھونک ماری (تاکہ زائد مٹی اُڑ جائے) پھر آپ نے اپنے منہ اور دونوں کفوں پر مسح کیا۔

۶۶۵ آیت ۴۴ و ۴۵ میں یہود کا ذکر ہے۔ جیسا کہ تصریح سے آیت ۴۶ میں بیان کر دیا ہے۔ یہود کی حالت پر مسلمانوں کو اس لیے توجہ دلائی ہے کہ جب انسان نیکی اور پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑتا ہے تو اس کی حالت کہاں تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ ان کی حالت کا انجام بتایا ہے کہ نیکی کی راہوں کو چھوڑ کر نیکی سے محبت ہونے کی بجائے نیکی سے اس قدر عداوت اور بدی سے اس قدر محبت ہو گئی ہے کہ بدی کو اختیار کرنے کے لیے اب اپنے مال بھی خرچ کرتے ہیں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ پاکیزگی کی راہوں کو چھوڑ کر تمہاری بھی یہی حالت نہ ہو جائے۔

۶۶۶ عن مواضعہ۔ مواضع۔ مَوضِع کی جمع ہے جو وضع سے ہے۔ کلمات کے مواضع ان کے مقام ہیں یا ان کے مفہوم مقام سے کلمات کا بدلنا تحریف لفظی ہے اور مفہوم سے بدلنا تحریف معنوی ہے۔ اور یہودی دونوں قسم کی تحریف کرتے تھے۔ مائدہ میں ہے من بعد مواضعہ (المائدۃ۔ ۴۱) ان کے موضعوں کے بعد ان کی تحریف کرتے ہیں یعنی حالانکہ ان کلمات کے موقع بیان کر دیئے گئے ہیں پھر بھی وہ تحریف کرتے ہیں۔

واسمع غیر مُسمَع کے ایک معنی تعریفی بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی سُن تجھے کوئی مکروہ بات نہ سنائی جائے اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اسمع لا سمعت سُن لے تو نہ سُنے۔ کیونکہ سن وہ نہیں سکتا جو بہرہ ہو۔ اور غیر مسمع میں سمع کے معنی قبولیت بھی ہو سکتے ہیں یعنی تیری بات قبول نہ کی جائے۔ پس یہ کلام راعنا کی طرح ذو وجہین ہے۔

طعن۔ اصل میں نیزہ مارنے پر آتا ہے مگر زبان کے ساتھ کسی کی عزت وغیرہ پر ہاتھ ڈالنے کو بھی طعن کہتے ہیں اس لیے طعن فیہ کے معنی ہیں اس کو عیب لگایا (ل)

اقوم۔ قام سے تفضیل ہے اور اقوم سے مراد اعدل ہے یعنی فی نفسہٖ زیادہ انصاف کی یا زیادہ راستی کی بات۔

یہودیوں کا نبی کریم صلعم سے طرز عمل: اس آیت میں یہودیوں کی قساوت قلبی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور نبی کریم صلعم کے ساتھ جو اُن کا سلوک تھا اس کا ذکر کیا ہے یہود و نصاریٰ کی اپنی کتب میں تحریف کا مفصل ذکر دوسری جگہ آ چکا ہے دیکھو ۱۰۰ مگر یہاں ان کی جس تحریف کا ذکر ہے وہ وہ ہے جو نبی کریم صلعم کے کلام میں وہ کرتے تھے۔ جیسا کہ سیاق کلام سے صاف ظاہر ہے۔ بعض یہودی آپ کے پاس آ بھی جاتے تھے۔ مگر بجائے اس کے کہ جو کچھ کہا جائے اس سے فائدہ اٹھائیں کبھی الفاظ کو توڑ مروڑ کر کبھی مفہوم کو بگاڑ کر کچھ اور کا اور بیان کرتے۔ یہ تحریف کلمات ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ جب کوئی اچھی بات بھی سنتے خواہ وہ اُن کے معتقدات کے خلاف نہ ہو تو بھی کہہ دیتے کہ ہم تمہاری بات نہیں مانتے سمعنا و عصینا۔ تیسرا امر یہ تھا کہ ذو معنی کلام کرتے۔ اس کی یہاں دو مثالیں دی ہیں۔ اسمع غیر مسمع اور راعنا۔ ان تینوں قسم کی باتوں کا ذکر کر کے یعنی اوّل نبی کریم صلعم کے کلام کو بگاڑنا۔ دوسرا بھلی بات کا انکار کر دینا۔ تیسرا ذو وجہین کلام کرنا فرمایا کہ طعنا فی الدین ایسا کرتے ہیں یعنی دین اسلام میں عیب لگاتے ہوئے اور یہ اُن کے نبی کریم صلعم کو بُرا کہنے کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا کہ اگر اس کی بجائے وہ اچھا طریق اختیار کرتے اچھی باتوں کو قبول کر لیتے۔ سمعنا و اطعنا۔ اور اگر بالمقابل کوئی بات اپنی پیش کرنا چاہتے تھے تو بجائے بد دعائیہ اور طنز کے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

اے لوگو! جن کو کتاب دی گئی ہے اس پر ایمان لاؤ، جو ہم نے اتارا ہے اس کی تصدیق کرتا ہُوا جو تمہارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم مونہوں کو مٹا دیں اور انھیں ان کی پیٹھ پر لوٹا دیں یا اُن پر لعنت کریں جس طرح کہ ہم نے سبت والوں پر لعنت کی اور اللہ کا حکم تو ہو ہی چکا ہوا ہے ع٦٦٧

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

اللہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شریک بنایا جائے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے وہ ایک بھاری گناہ افترا کرتا ہے ع٦٦٨

کلمات کے کہنے کے صرف اسمع کہدیتے کہ ہماری بات بھی سنئے اور جو بات سمجھ نہ آتی تھی اس کے متعلق صرف کہہ دیتے کہ ہماری رعایت کیجیئے یا ہمیں مہلت دیجیئے کہ ہم اس پر غور کریں تو یہ ان کی بھلائی کی بات تھی اور درست طریق بھی یہی تھا۔ اور یوں ایک پُر حکمت طریق سے ان کو سمجھایا ہے کہ ان کا طریق کس قدر خلاف عقل اور خلاف آداب ہے۔

ع٦٦٧ نطمس وجوھا۔ طمس کے اصل معنی ہیں محو کر کے نشان کا دُور کر دینا (غ)، فاذا النجوم طمست (المرسلٰت ۸) ربنا اطمس علیٰ اموالھم (یونس ۸۸) اور لو نشآء لطمسنا علیٰ اعینھم (یٰسٓ ۶۶) میں ان کی آنکھوں کی روشنی کا دُور کر دینا اور آنکھوں کا محو کر دینا مراد ہے (غ)۔

وجوہ۔ وجہ کی جمع ہے جس کے معنی منہ بھی ہیں اور توجہ بھی اور وجہ القوم کے معنی سردار بھی ہیں۔ وفلان وجہ القوم کعینھم ورأسھم (غ)

پس نطمس وجوھا سے مراد تغیر حالت ہے ایسا تغیر جو ان کو ذلیل کر دے جیسا کہ اگلے الفاظ فنردھا علیٰ ادبارھا سے ظاہر ہے اور یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ ان کے سرداروں کو مٹا دیں یا ذلیل کر دیں اور یہ بھی کہ انہیں گمراہی کی طرف لوٹا دیں (غ)

نردھا علیٰ ادبارھا۔ ردّ کے معنی کسی چیز کے بذاتہ لوٹا دینے کے یا ایک حالت سے دوسری حالت میں کر دینے کے ہیں اور ادبار۔ دُبر کی جمع ہے۔ جس کے معنی پیٹھ ہیں۔ اور مونہوں کو پیٹھوں پر پھیرنے سے مراد ہے کہ ان کی وجاہت اور اقبال کو سلب کر لیں اور ان پر ذلت اور ادبار نازل کر دیں (ض) اور ایک قول یہ بھی ہے نردھم الی حیث جاء و امنہ وھی اذلمات الشام (غق) یعنی ان کو لوٹا دیں جہاں سے وہ آئے تھے یعنی ملک شام کی طرف گویا بنی نضیر کی جلا وطنی کی طرف اشارہ ہے۔ ایسے محاورات میں لفظوں کے پیچھے پڑنا اور یہ خیال کرنا کہ سچ مچ منہ پیٹھوں کی طرف ہو جائیں صحیح نہیں آخر اسی قسم کا محاورہ یہ بھی ہے یردوکم علیٰ اعقابکم (اٰل عمرٰن ۱۴۹) انقلبتم علیٰ اعقابکم (اٰل عمرٰن ۱۴۴) جیسے وہاں محاورہ کے خاص معنی ہیں ویسے ہی یہاں ہیں۔

اصحٰب السبت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر دوسری جگہ آچکا ہے الذین اعتدوا منکم فی السبت (البقرۃ ۶۵)

مفعول۔ فعل تاثیر کا نام ہے جو مؤثر کی طرف سے ہو اور مفعول اصل میں تو وہ ہے جو واقع ہو چکا اور یوں بھی کہا جاتا ہے ھذا الامر مفعول جب اس کے حصول میں کوئی شک باقی نہ رہا ہو گو وہ فی الواقع وقوع میں نہ آیا ہو۔

یہود کی سزا: اس آیت میں یہود کو بتایا ہے کہ وہ اسی طرح پر عداوت اور قساوت قلبی پر اڑے رہیں گے تو ان کا انجام نہایت ہی بُرا ہوگا اور دو قسم کی سزا بیان کی گئی ہے۔ اول ان کا ذلیل کر دینا اور اقبال کا ان سے لے کر اس کی جگہ ادبار وارد کر دینا۔ دوسرے ان پر وہ لعنت وارد کرنا جو اصحاب سبت پر ہوئی تھی اور لعنت کے معنی چونکہ دور کر دینا ہیں اس لیے ایسی سزا جس میں یہ لوگ در بدر پھریں لعنت کے مفہوم میں آتی ہے۔ پس مراد یہ ہے کہ یا ان کو عرب میں ہی ذلیل کر دیں یا یہاں سے نکال دیں۔ اور وہ در بدر ہوتے پھریں۔ چنانچہ یہ دونوں قسم کی سزا ان پر وارد ہوئی۔

بندر بننے سے مراد: اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جو سزا اصحاب سبت پر وارد ہوئی وہ بندر بن جانا نہ تھا بلکہ بندروں کی طرح ذلیل ہو کر در بدر ہونا تھا کیونکہ اس سزا کو یہاں لفظ لعنت سے تعبیر کیا ہے اور دوسرے چونکہ ضروری تھا کہ وہی سزا نبی کریم صلعم کے اعدا پر بھی وارد ہو۔ اور نبی کریم صلعم کے اعدا بندر نہیں بنے بلکہ بندروں کی طرح تتر بتر ہوئے۔ اس لیے اعتداء فی السبت کرنے والوں کے بندر بننے سے بھی ان کا در بدر ہونا مراد ہے۔

ع٦٦٨ شرک کی اقسام: یہود کے ذکر میں شرک کا ذکر اس مناسبت سے ہے کہ یہودی بھی شرک میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ قریش سے ساز باز کے لیے بتوں تک کو سجدہ کر دینے سے پرہیز نہ کیا جیسا آگے مفصل ذکر آتا ہے اور دوسرے اس لیے کہ اصل غرض مسلمانوں کو پاکیزگی کی راہیں بتانا تھا تو ان کو سمجھایا ہے کہ شرک سب بدیوں کی جڑ ہے جس طرح توحید سب نیکیوں کی جڑ ہے اس سے سخت اجتناب کریں۔ شرک کیا چیز ہے ؟ صرف بتوں یا چاند سورج ستاروں

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾	کیا تونے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جو اپنے آپ کو پاکیزہ ظاہر کرتے ہیں بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کیا جائیگا [۶۶۹]

ہواؤں وغیرہ کا پوجنا ہی شرک نہیں بلکہ یہ شرک کی وہ موٹی قسم ہے جس میں بُت پرست اور عناصر پرست قومیں گرفتار ہیں۔ اور نہ صرف یہی شرک ہے کہ کسی انسان کو فی الواقع خدا سمجھا جائے۔ جیسے ہندو کرشن یا رامچندر کو یا عیسائی مسیح کو سمجھتے ہیں۔ بلکہ ایک بڑا شرک جو اس وقت مسلمانوں میں پھیل رہا ہے وہ پیر پرستی یا علما پرستی کا شرک ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ عدی بن حاتم (جو اس واقعہ کے وقت نصرانی تھے) رسول اللہ صلعم کے پاس گئے تو آپ سورۃ توبہ پڑھ رہے تھے۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ۔ تو عدی نے کہا ہم ان کی عبادت نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کیا یہ ٹھیک نہیں کہ جو چیز خدا نے حلال کی ہے وہ اسے حرام ٹھہراتے ہیں تو تم بھی حرام ٹھہراتے ہو۔ اور جو چیز خدا نے حرام کی ہے وہ اسے حلال بتاتے ہیں تو تم بھی حلال سمجھتے ہو۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا یہی ان کی عبادت ہے۔ گویا علماء اور پیروں یا سجادہ نشینوں کے اقوال کو جو کتاب اللہ کے خلاف ہوں بغیر سوچے سمجھے قبول کرتے جانا یہ بھی ایک شرک ہے اور یہ جو بعض مرید اپنے پیروں اور سجادہ نشینوں کے متعلق ایسے اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ ان کے پیر کہتے یا کرتے ہیں بس وہی حق ہے اور کتاب اللہ کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اس کی پروا بھی نہیں کرتے جیسا کہ اکثر مسلمانوں کی حالت اس زمانہ میں ہے۔ یہ وہی شرک ہے جس کا ذکر اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ میں ہے اور اس شرک نے مسلمانوں کو بالکل ذلیل کر دیا ہے پھر اپنے پیروں کی دعاؤں پر اعتماد بھی شرک کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ ہر ایک گروہ اپنے اپنے پیر کے متعلق یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کی دعا سے یا توجہ سے ہماری مصائب ٹل جاتی ہیں۔ اس شرک میں اور اس بت پرست کے اعتقاد میں جو سمجھتا ہے کہ بت کی عبادت سے میری مصیبت ٹل جاتی ہے۔ بہت کم فرق ہے۔ یہ تو ظاہر قسمیں شرک کی ہیں۔ قرآن کریم نے ایک اور قسم کے شرک کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ یعنی اپنی خواہشات کی پیروی کو بھی شرک قرار دیا ہے ارئیت من اتخذ الٰھہ ھوٰہ (الفرقان ۲۵-۴۳) پھر بعض اس سے بھی باریک قسم کے شرک ہیں۔

شرک کے نہ بخشنے کی وجہ: شرک کو کیوں ایسا خطرناک جرم قرار دیا ہے؟ کیا خدا کی شان اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے میں کچھ کم ہو جاتی ہے اس لیے وہ ایسا ناراض ہو جاتا ہے کہ بخشتا ہی نہیں؟ اگر ساری دنیا بھی خدا کے ساتھ شریک بنائے تو اس سے اس کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی اور اگر ساری دنیا موحد ہو جائے تو اس سے خدا کی شان بڑھ نہیں جاتی۔ بات یہ ہے کہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہرا کر انسان اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا۔ اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ صفات دیں۔ اس کو بتا دیا کہ اس عالم کی ساری طاقتیں اور ساری چیزیں ہم نے تیرے لیے مسخر کر دی ہیں وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا منہ (الجاثیۃ ۴۵-۱۳) پس اس کو سب مخلوقات سے اشرف بنایا۔ پھر یا اگر وہ بتوں کے آگے یا عناصر کے آگے یا سورج چاند کے آگے یا خود اپنے بھائی انسان کے آگے عبودیت کی ذلت اختیار کرتا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو اس اعلیٰ مرتبہ سے نیچے گرا دیتا ہے۔ پس خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا درحقیقت انسانیت کو ذلیل کرنا اور اس شرف کو چھوڑنا ہے جو خدا نے انسان کو دیا ہے اس لیے یہ سب سے خطرناک جرم ہے۔

شرک کی سزا: نہ بخشنے سے مراد کیا ہے؟ صرف یہ کہ ضروری ہے کہ انسان اس جرم کی سزا پائے۔ اس کے سوا جتنے گناہ ہیں ان کو خدا چاہے تو بغیر سزا دیئے معاف کر دے لیکن شرک کی سزا ضرور ملتی ہے۔ یہ حکم لگانا کہ شرک کی سزا کتنی بڑی ہوتی ہے۔ ہمارا کام نہیں لیکن چونکہ قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ سزا کی اصل غرض انسان کو ان آلائشوں سے پاک کرنا ہے جو خود اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے اندر پیدا کر لی ہیں۔ اس لیے ہم یہ مانتے ہیں کہ جب یہ غرض پوری ہو جاتی ہے تو وہ سزا بھی اُٹھ جاتی ہے۔ اگر ایک مسلمان کے شرک کی سزا کبھی ختم ہو سکتی ہے تو ایک غیر مسلم کے شرک کی سزا بھی منقطع ہو سکتی ہے صرف مراتب ہیں ایک زیادہ خطرناک شرک میں گرفتار ہے اور اس کا شرک اس کی توحید پر غالب ہے۔ یہ ان لوگوں کی حالت ہے جو خدا کے ساتھ اعتقاداً شریک مانتے ہیں۔ جیسے بُت پرست، مسیح پرست۔ کیونکہ ان کے عقاید کی بنیاد ہی شرک پر ہے۔ ایک وہ ہیں جن کے اعتقاد کی بنا تو توحید الٰہی پر ہے۔ مگر غلطی میں پڑ کر وہ قبروں یا پیروں سے اپنی حاجات مانگتے ہیں، یا اُن کو ایسا مرتبہ دیتے ہیں۔ کہ عملاً وہ خدا کے احکام کی پروا اپنے پیروں کے احکام کے خلاف نہیں کرتے۔ ان کی چونکہ بنیاد درست ہے، اس لیے ان کا شرک اس خطرناک حد تک نہیں پہنچتا جیسے پہلوں کا۔ آریہ سماج کا شرک بھی قسم اوّل میں ہی آتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی صفات میں دو اور چیزوں کو کامل طور پر شریک مانتے ہیں۔

شرک سے توبہ: یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص توبہ کرتا ہے وہ چونکہ اپنی اصلاح اسی زندگی میں کر لیتا ہے۔ اس لیے اس کا گناہ خواہ شرک بھی ہو معاف ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی اصلاح کرے۔ اس آیت کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ کسی گناہ پر بغیر توبہ یعنی رجوع کے انسان مر جائے تو اگر وہ گناہ شرک ہے تو اس کی سزا ضرور پائے گا۔ دوسرے گناہوں کو خدا چاہے تو بالکل بخشدے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے من قال لا الٰہ الا اللہ فقد دخل الجنۃ اور یہ قرآن کے صریح الفاظ سے ثابت ہے کہ توبہ سے شرک بھی بخشا جاتا ہے۔ اور شرک کو افترا اس لیے کہا کہ اس کو لوگوں نے انبیاء اور راستبازوں کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ کسی نبی یا کسی راستباز انسان نے کبھی شرک کی تعلیم نہیں دی پس یہ لوگوں کا افترا ہے۔

ع ۶۶۹ یزکّون۔ دیکھو ع ۶۶ و ع ۱۶۴ انسان کا اپنے نفس کا تزکیہ دو طور پر ہے۔ ایک فعل کے ساتھ یعنی اچھے کام کر کے انسان اپنے آپ کو بُرائیوں سے پاک کرے اور یہ وہ تزکیہ ہے جس کے حصول کے لیے قرآن کریم نے بار بار ہدایت فرمائی ہے جیسے قد افلح من زکٰھا میں۔ اور دوسرا قول کے ساتھ یعنی انسان اپنے

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۟﴿۵۰﴾ ع

دیکھ کس طرح اللہ پر جھوٹ بناتے ہیں اور یہی کھلا گناہ کافی ہے ۶۷۰

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾

کیا تونے اُن لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا وہ سحر اور کاہنوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے بارے میں جو کافر ہوئے کہتے ہیں یہ ان کی نسبت جو ایمان لائے زیادہ سیدھی راہ پر ہیں ۶۷۱

منہ سے اپنے آپ کو پاک کہے اور اس سے منع کیا ہے کیونکہ اس سے انسان کے نفس کے اندر کبر پیدا ہوتا ہے (غ)

فتیلا - فَتْل اصل میں رسہ کے بٹنے کو کہتے ہیں - اور فتیل وہ ہے جسے تم اپنی انگلیوں میں ملتے ہو جیسے دھاگا یا میل اور بطور مثال حقیر شے پر بولا جاتا ہے۔ اور فتیل اس کو بھی کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی شق میں ہوتا ہے (غ)

مسلمانوں میں پیرپرستی کی بیماری: اصل ذکر یہود کا تھا - اور انہی کو توجہ دلانے کے لیے شرک جیسے ظلم عظیم پر توجہ دلائی تھی مگر چونکہ ان کا شرک خاص قسم کا تھا اس لیے اس کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے - اور وہ شرک وہی تھا جس کا ذکر اوپر بھی ہو چکا، کہ وہ اپنے راہبوں اور پیروں کے دعوئی بزرگی پر ایسے فریفتہ ہوتے تھے کہ جو کچھ وہ کہدیں اسی کو خدا کا حکم سمجھ لیتے تھے - شرک کے ذکر کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر جو اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور پاک بتاتے ہیں صاف بتاتا ہے کہ یہاں علماء اور پیروں کی طرف اشارہ ہے جو اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور پاک بتاتے ہیں اس لیے کہ وہ اتفاق سے دوسروں کے مرشد بن گئے ہیں پس یہودیوں کی حالت کا نقشہ کھینچکر مسلمانوں کو پیرپرستی کے خطرناک مرض سے ڈرایا ہے - اور اگر غور کیا جائے تو اس پیرپرستی کی بیماری نے بت پرستی کی طرح عوام کو کالانعام بنا دیا ہے - وہ بیچارے اپنی عقل و فکر سے کام لینے کے قابل ہی نہیں رہے - جو کچھ پیر نے کہدیا وہی حق ہے - بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت تمادح یعنی ایک دوسرے کی مدح کرنے اور ایک دوسرے کو پاک کہنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ایک دوسرے کی مدح کرنے کی ممانعت: اور احادیث میں ایسی باتوں سے بہت ڈرایا ہے - مگر افسوس کہ یہی آجکل کی پیرپرستی کی بنیاد ہے - صحیح مسلم میں مقداد ابن الاسود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو حکم دیا ان نحثوا فی وجوہ المدّاحین التراب کہ ہم مدح کرنے والوں کے منہ پر مٹی پھینکیں اور صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دوسرے کی بڑی تعریف کرتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا ویحک قطعت عنق صاحبک تجھ پر افسوس تو نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی - پھر فرمایا اگر اپنے دوست کی تعریف کرنی ہو تو یوں کہا کرو کہ میں اُسے ایسا سمجھتا ہوں۔

ع۶۷۰ کفی بہ اثما مبینا - ان کا یہ دعویٰ کہ ہم پاک اور برگزیدہ ہیں یہی ان کا کافی گناہ ہے اثما مبینا اس لیے کہا کہ ہر ایک شخص جان سکتا ہے کہ ایسا دعویٰ ایک متکبرانہ دعویٰ ہے اور کسی شخص کو سزاوار نہیں کہ ایسا دعویٰ کرے اور کفی بہٖ اس لیے فرمایا کہ یہ تو پاک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں - حالانکہ اگر اور کوئی امر ان کے گنہگار ہونے پر شاہد نہ بھی ہوتا تو بھی ان کا یہی گناہ کافی تھا کہ وہ ایسا دعوئی کرتے ہیں۔

ع۶۷۱ الجبت - جِبْت اور جِبْس کے معنی ہیں، دھون دھان جس میں کوئی بھلائی نہ ہو اور کہا گیا ہے کہ تا اس میں س سے بدل ہے اور ہر ایک چیز جو اللہ کے سوائے پوجی جائے اسے جبت کہا جاتا ہے اور ساحر اور کاہن کو بھی جبت کہا گیا ہے (غ) اور حدیث میں آتا ہے ان العیافۃ والطرق والطیرۃ من الجبت یعنی پرندوں کا زجر اور زمین پر خط لگانا اور فال یہ سب کچھ جبت سے ہے اور حضرت عمرؓ کا قول بخاری میں منقول ہے کہ اَلْجِبْتُ السِّحْرُ یعنی جبت سحر ہے۔

طاغوت کے معنی ع۳۳۱ میں بیان ہو چکے ہیں - جابر بن عبداللہ کے متعلق روایت ہے کہ ان سے طاغوت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ھم کُہّانٌ یَتَنَزَّلُ علیہم الشیطانُ (بخاری) یہ کاہن ہیں جن پر شیطان اُترتے ہیں - اور اسی میں یہ بھی ہے کہ ہر ایک قبیلہ میں ایک کاہن تھا جس سے وہ فیصلہ کراتے تھے اور مجاہد کا قول منقول ہے الطاغوت الشیطان فی صورۃ الانسان - طاغوت شیطان ہے جو صورت انسان میں ہو جس سے فیصلہ کراتے ہیں اور وہ ان کا حاکم ہے (ث)

یہودیت پر عرب کی بت پرستی کا اثر: اس رکوع میں یہود کے ہی مزید حالات مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح حق سے انحراف کرتے کرتے ان کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ صریح کفر پر مائل ہو گئے - چنانچہ اس آیت میں یؤمنون بالجبت والطاغوت کہہ کر اسی کی طرف اشارہ کیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت عرب میں رہکر عربوں کی بت پرستی اور کہانت پر یہودیوں کا بھی اعتقاد ہو گیا تھا - اور یہ حال ہر قوم کا ہوتا ہے جو حق کے پھیلانے پر زور نہیں لگاتی کہ وہ آہستہ آہستہ دوسروں کے اثر کے نیچے آنا شروع ہوتی ہے - وہ یہودی جو عرب میں توحید کا پیغام لیکر آئے تھے بجائے اس کے کہ بُت پرستوں کو توحید کی طرف لاتے خود بت پرستی اور کہانت پر گر گئے - اس کی مثال مسلمانوں میں بھی ملتی ہے - جب تک وہ دوسروں کو توحید کا پیغام پہنچانے پر زور لگاتے تھے ان کے خیالات ہندوؤں میں اثر کرتے چلے گئے - مگر جب انہوں نے اس کو ترک کر دیا تو ہندوؤں کے بت

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾

یہی وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کرے تو تُو اس کے لیے کوئی مددگار نہ پائے گا۔

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾

کیا اُن کے لیے بادشاہت سے کچھ حصہ ہے تو پھر وہ لوگوں کو تل برابر بھی نہ دیں گے ۶۷۲

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾

بلکہ وہ لوگوں سے اس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے دیا ہے سو ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی بادشاہت دی ہے ۶۷۳

فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾

پس بعض اُن میں سے وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور بعض ۶۷۴ ان میں سے وہ ہیں جو اس سے رُکتے ہیں اور دوزخ جلانے کو کافی ہے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ

جو لوگ ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں ہم ان کو عنقریب آگ میں

سے خیالات ان میں مروج ہو گئے۔ حتیٰ کہ بعض صوفیوں کے گروہ ایسے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کی دعاؤں اور وظیفوں کو لے لیا ہے۔ اور ہندوؤں کے رسم و رواج تو بہت سے مسلمانوں میں آ گئے ہیں۔ یہ پیر پرستی اور قبر پرستی جو مسلمانوں کے اندر پائی جاتی ہے وہ بھی درحقیقت بت پرستی کا ہی ایک رنگ ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب کعب ابن اشرف اور حیی بن اخطب قریش کو نبی کریم صلعم کے خلاف اُکسانے کے لیے مکہ میں آئے اور خود بھی ان کی مدد کا وعدہ کیا تو قریش نے کہا کہ ہم تم پر اعتبار نہیں کر سکتے جب تک کہ تم ہمارے بتوں کو سجدہ نہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا اور کفار کے ساتھ مکر مسلمانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا بتاتا ہے کہ وہ بت پرستوں کو مسلمان موحدین سے اچھا سمجھتے تھے اور روایات میں صریحاً اُن کا ایسا کہنا بھی مذکور ہے۔

۶۷۲ نقیر۔ نقر کے اصل معنی کریدنا ہیں۔ چنانچہ منقار جانور کی چونچ کو کہتے ہیں جس سے وہ کریدتا ہے اور اس لوہے کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ چکی راہی جاتی ہے۔ اسی سے نقیر کھجور کی گٹھلی میں جو ننھا سا گڑھا ہوتا ہے اس کو کہتے ہیں اور بطور مثل نہایت خفیف شے پر بولا جاتا ہے جیسے ہماری زبان میں تل رائی وغیرہ۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلعم پر اس وجہ سے حسد کرتے ہیں کہ وہ بنی اسماعیل سے ہے اور کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے ہونا چاہیئے۔ مگر ان کے اخلاق تو اس قدر ذلیل ہو چکے ہیں کہ یہ اب بادشاہت کے قابل بھی نہیں رہے نبوت تو بہت بڑا انعام ہے اور اس کے لیے بہت ہی بڑا دل بھی چاہیئے اس لیے فرمایا کہ بادشاہت سے ان کے پاس کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس ہوتا تو وہ اس قدر بخیل ہیں کہ دوسروں کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیتے اس سے معلوم ہُوا کہ بادشاہت کے لیے بھی ایک وسیع دل چاہیئے۔ بخل اور بادشاہت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے مگر نبوت کے لیے اس سے بھی وسیع دل چاہیئے۔ مسلمانوں کو چونکہ نبی کریم صلعم کا وارث بنایا گیا ہے گویا اب علوم نبوت لتکونوا شھداء علی الناس کے ماتحت اسی سرچشمہ سے ملتے ہیں۔ اس لیے ان کو اپنے اخلاق انبیاء کی طرح وسیع کرنے چاہئیں۔

۶۷۳ یہاں آلِ ابراہیم کو یعنی مسلمانوں کو دو چیزیں دینے کا ذکر کیا۔ کتاب اور حکمت۔ اور ملک عظیم۔ کتاب اور حکمت میں تو نبوت کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ یہی دونوں چیزیں غرض و غایت نبوت ہیں اور نبوت کی عظمت کی وجہ سے مقدم اسی کو کیا ہے اور پھر ایک عظیم الشان بادشاہت کے دینے کا ذکر کیا حالانکہ ابھی مسلمانوں کو بادشاہت تو ملی نہ تھی۔ اور اگر تھی بھی تو مدینہ کی دیواروں کے اندر اور وہاں بھی ابھی یہودی مخالف۔ کچھ مشرک موجود اور کچھ منافق۔ پس ملک عظیم میں اسلام کی آئندہ بادشاہت کا وعدہ تھا۔ جو تھوڑے ہی سالوں میں دنیا کے کثیر حصہ میں پھیل گئی۔ اس وعدہ میں اہلِ کتاب کو یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ تم جس قدر چاہو ان کی مخالفت کر لو ان کو اللہ تعالیٰ اب عظیم الشان بادشاہت دنیا میں دینے والا ہے اور جس طرح وہ کتاب و حکمت جو مسلمانوں کو دی گئی اب ان سے چھن نہیں سکتی۔ کیونکہ ان کا نبی تا قیامت زندہ ہے۔ اسی طرح وہ بادشاہت بھی کبھی مسلمانوں سے چھن نہیں سکتی۔ ہاں اپنی سستی اور غفلت سے عارضی طور پر اس میں کمزوری آ سکتی ہے اور یہاں بجائے مسلمانوں کے آلِ ابراہیم اس لیے کہا کہ یہ وعدہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ تھا اور یوں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ مسلمان بھی اسی ابراہیمؑ کی آل ہیں جس کی آل بنی اسرائیل تھے۔

۶۷۴ اٰمن بہٖ۔ اس سے مراد محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان ہے جیسا کہ امام مجاہد سے مروی ہے اور صدّ عنہ میں وہ لوگ داخل ہیں جو خود اسلام میں آنے سے

نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ
جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾

داخل کریں گے، جب اُن کی کھالیں پک جائیں گی ہم اُن کی جگہ ان کو اور کھالیں دے دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھیں، بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے ۶۷۵

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫
وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے ان کو باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ اُنہی میں رہیں گے، ان کے لیے اُن میں پاک ساتھی ہوں گے اور ہم انھیں گھنے سایوں میں داخل کریں گے ۶۷۶

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى
اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ
تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ
بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے اہل کو ادا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کیا کرو، تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ بیشک یہ بہت ہی عمدہ بات ہے جس کی تمھیں اللہ نصیحت کرتا ہے اللہ سُننے والا دیکھنے والا ہے ۶۷۷

رُکتے تھے، یا دوسروں کو روکتے تھے۔ اگلی آیت اس کو بالکل صاف کر دیتی ہے کہ یہاں ایمان اور انکار محمد رسول اللہ صلعم کا ہی مراد ہے۔

۶۷۵ نضجت۔ نَضِج گوشت کے ہانڈی میں یا کباب کے طور پر پک جانے پر بھی بولا جاتا ہے اور پھل وغیرہ کے پکنے پر بھی اور نضیج الرائے اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی رائے محکم ہو۔

جلود۔ جلد کی جمع ہے اور بدن کے چھلکے یعنی چمڑے کو جِلد کہا جاتا ہے مگر بعض وقت مراد بدن بھی لے لیا جاتا ہے جیسے فرمایا تقشعر منه جلود الذین یخشون ربھم جہاں جلود سے مراد ابدان ہیں (غ)

چمڑوں کے پک جانے اور ان کے بدلنے سے کیا مراد ہے؛ جس طرح نعمائے جنت کی حقیقت کو اس دنیا میں کوئی نہیں جان سکتا۔ اسی طرح آلام نار کی حقیقت کو بھی کوئی نہیں جان سکتا۔ لیکن ایسے الفاظ میں قرآن شریف نے ان امور کو بیان کیا ہے جو انسان کے ذہن کے قریب ان باتوں کو کر دیں۔ انسانی تجربہ میں یہ ہے کہ جب ایک جگہ دُکھ سے پک جاتی ہے تو پھر اس کو کوئی دکھ محسوس نہیں ہوتا۔ پس یہ سمجھانے کے لیے کہ جو صورت اس دنیا میں ہو سکتی ہے کہ ایک چیز جل کر اس حالت پختگی کو پہنچ جائے کہ پھر اس پر آگ سے کوئی تکلیف وارد نہ ہو وہ صورت وہاں نہ ہوگی۔ یہ محاورہ اختیار کیا ہے۔ بعض نے یہاں تک بھی کہہ دیا ہے، المراد الدوام وعدم الانقطاع ولا نضج ولا احتراق (غق) اور قرآن کریم نے خود اس پکنے اور اس تبدیلی کی غرض لیذوقوا العذاب بتائی ہے یعنی تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں۔ ایسا نہیں ہوگا کہ اس طرح عذاب کے عادی ہو جائیں کہ وہ عذاب ان کو پھر محسوس ہونے سے رہ جائے۔

۶۷۶ ظِلًّا ظلیلا۔ مفردات میں ہے کہ ظِلّ ضِحّ یعنی دھوپ کی ضد ہے۔ اور وہ فئے سے عام ہے کیونکہ ظِلُّ اللیلِ اور ظِلِّ الجنة کہا جا سکتا ہے۔ ہر مقام کو جہاں سورج نہ پہنچے ظل کہا جا سکتا ہے اور فئے صرف اسی کو کہا جاتا ہے جس پر سورج پہنچ کر ہٹ گیا ہو۔ اور ظل سے مراد عزت اور حفاظت اور آسائش لی جاتی ہے اور ان المتقین فی ظلل (المرسلٰت۔ ۴۱) میں ظلال کے معنی عزت اور حفاظت ہیں اکلھا دائم وظلھا (الرعد ۱۳۔ ۳۵) ھم وازواجھم فی ظلال (یٰس ۳۶۔ ۵۶) اور عام محاورہ میں اظلّنی فلانٌ کے معنی دیئے ہیں۔ میری نگہداشت کی اور مجھے اپنے ظل میں اور اپنی عزت (یعنی روک میں) اور اپنی حفاظت میں لے لیا اور یہاں ظلا ظلیلا کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ خوش زندگی سے کنایہ ہے۔ اور لسان العرب میں ہے کہ ظل سورج کی شعاع کی روشنی ہے اس کی شعاع کو الگ کر کے۔ کیونکہ اگر روشنی نہ ہو تو ظل نہیں بلکہ ظلمت کہیں گے اور ظلیل ظل سے تاکید کے لیے صفت مشتق ہے اور ظل اللہ حدیث میں بادشاہ کے لیے آیا ہے اور یہاں فی الحقیقت سایہ مراد نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ خدا کی ذات اس سے پاک ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے سبعة یظلھم اللہ فی ظلہ اور دوسری میں اسی جگہ فی ظل العرش ہے اور یہاں بھی سایہ معنی نہیں ہو سکتے جب آیات اللہ کے انکار کرنے والوں اور ان کی سزا کا ذکر کیا تو اس کے ساتھ ہی جیسا کہ قرآن کریم کی عادت ہے ایمان اور اعمال صالحہ والوں کا ذکر بھی کیا۔

۶۷۷ الامانات۔ امانة کی جمع ہے اور اَمَانة اور امان۔ اَمْن سے مصدر ہے اور مفردات میں ہے کہ کبھی تو امان اس حالت کا نام ہوتا ہے جس پر انسان امن میں ہو اور کبھی اس چیز کا نام ہوتا ہے جس پر انسان کو امین بنایا جائے۔ جیسا تخونوا اماناتکم میں امانات سے مراد وہ چیزیں ہیں جن پر تم کو امین

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۵۹ ع

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحبان امر کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو، تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے ع۶۷۸

بنایا گیا ہے اور انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت (الاحزاب ۳۳: ۷۲) میں حضرت ابن عباسؓ سے امانت کے معنی فرائض مروی ہیں (ل) اور نہایہ میں ہے کہ امانت کا لفظ طاعت اور عبادت اور ودیعت اور ثقۃ اور امان پر بولا جاتا ہے اور ان میں سے ہر معنی میں حدیث آئی ہے۔

اس آیت میں بظاہر ایک نیا مضمون نظر آتا ہے۔ ابھی یہودیوں کی بے اعتدالیوں کا ذکر تھا۔ اب امانتوں کے ادا کرنے کا ذکر شروع ہو گیا۔ اور اسی آیت میں ایک تیسرا مضمون یہ شروع کر دیا گیا کہ لوگوں کے درمیان فیصلے عدل و انصاف سے کیا کرو۔ مگر فی الحقیقت ان تینوں مضمونوں میں ایک نہایت گہرا تعلق ہے۔ یہودیوں کی بے اعتدالیوں کے ذکر میں اصل منشا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مسلمانوں کو متنبہ کرنے کا تھا۔ یہودیوں کی بے اعتدالیاں کیا تھیں اور کس بات کا نتیجہ تھیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں۔ اس کی عبادت سے انحراف، اس کی ودیعت کی ہوئی طاقتوں کو غیر محل پر استعمال کرنا اور یہ درحقیقت امانت میں خیانت تھی۔ کیونکہ امانت کے اصل معنی اطاعت اور عبادت اور ودیعت وغیرہ ہی ہیں۔ یہود نے خدا کی امانتوں کو ضائع کیا۔ اس کی نافرمانی کی اس کی بتائی ہوئی راہوں سے الگ ہو گئے۔ اس کی دی ہوئی طاقتوں سے ٹھیک کام نہ لیا۔ پس مسلمانوں کو یہ حکم دینے میں کہ تم امانتوں میں خیانت نہ کرنا۔ گویا اصل مضمون کی طرف اور یہودیوں کے ذکر کے اصل مقصود کی طرف رجوع کیا ہے۔ پس جو حکم ادائے امانت کا یہاں ہے اس میں اگر امانت مال داخل ہے تو اصلی امانت یعنی اللہ کی اطاعت اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوت کو ٹھیک طور پر لگانا بھی شامل ہے اور الیٰ اھلھا کا لفظ اس لیے بڑھایا کہ انسان کی نیکی کا اصل معیار دوسرے انسانوں سے تعلقات میں پورا اترنا ہے۔ جو شخص اس معیار پر پورا نہیں اترتا اس کی نیکی برائے نام نیکی ہے۔ پس ہر انسان کو اس کا حق دینا اور اپنی ذمہ داری کو اس کے بارہ میں پورا کرنا فی الحقیقت ادائے امانت الیٰ اھلھا ہے۔ ایسا ہی ہم پیشوا بنائیں۔ تو ان لوگوں کو جو پیشوا بننے کے اہل ہیں۔ حاکم بنائیں۔ تو ان لوگوں کو جو حکومت کے اہل ہیں یہ سب کچھ ادائے امانت ہے۔ ایک تسبیح خوان زاہد کو اگر فوج کی سپہ سالاری دیدی جائے تو یہ ادائے امانت الیٰ اھلھا نہیں۔ ایک گوشہ نشین دنیا سے ناواقف کو اگر حاکم بنایا جائے تو یہ ادائے امانت الیٰ اھلھا نہیں۔

حاکم و محکوم کے تعلقات: لیکن انسان کا تعلق انسان سے ایک تو مساوات کی حیثیت میں ہے یعنی ہر انسان بحیثیت ایک انسان ہونے کے دوسرے پر کچھ حقوق اور دوسرے کے متعلق کچھ ذمہ داریاں رکھتا ہے۔ خاوند اور بی بی۔ آقا اور نوکر۔ بھائی اور اجنبی قریبی اور ہمسائے۔ ایک شہر اور ایک ملک کے رہنے والے ایک قوم کے افراد اور مختلف قوموں کے افراد یہ سب مساوات کی حیثیت میں ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اور یہی تعلقات انسان کی زندگی کا بیشتر حصہ ہیں۔ لیکن ایک اور قسم کے تعلقات بھی تمدن انسانی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہو گئے ہیں اور وہ ہیں حاکم و محکوم کے تعلقات پس جب ادائے امانت الیٰ اھلھا کا ذکر کیا جس میں بیشتر تعلقات انسانی کا ذکر آ گیا تو ایک خاص صورت حاکم و محکوم کے تعلقات کو بھی بتا دیا۔ حاکم کا کیا فرض ہے یہاں بتایا محکوم کا کیا فرض ہے اس سے اگلی آیت میں بتایا۔ چنانچہ یہاں فرمایا کہ جب تم کو لوگوں پر حاکم مقرر کیا جائے اور تم کو لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے ہوں تو اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے کہ عدل کے ساتھ فیصلے کرو۔ یہاں الناس کا لفظ وسیع اختیار فرمایا ہے۔ مسلمان ہوں یا ہندو یا عیسائی فیصلہ میں عدل ملحوظ ہونا چاہیئے۔ اور کسی خاص قوم کی طرف جھکنا نہیں چاہیئے۔

مفسرین نے عموماً اس آیت کی شان نزول میں عثمان بن ابی طلحہ کا قصہ لکھا ہے جس کے پاس خانہ کعبہ کی چابی تھی۔ یعنی وہ خانہ کعبہ کا حاجب یا محافظ تھا۔ کہ اول اس نے نبی کریم صلعم کو فتح مکہ کے دن چابی دینے سے انکار کیا بعد میں جب اس سے لے لی گئی تو حضرت عباسؓ (یا علیؓ) نے چاہا کہ حاجبگی عہدہ بھی سقایہ (یعنی حاجیوں کو پانی پلانے) کے ساتھ جمع کر دیا جائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلعم نے چابی واپس عثمان کو دی اور اسی کے خاندان میں یہ آج تک ہے۔ لیکن اگر فی الواقع نزول آیت اس موقع پر بھی ہوا ہو تو حکم اس کا پھر بھی عام ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے اعتراف کیا ہے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک عثمان بن ابی طلحہ مسلمان نہ ہوئے تھے۔ اس سے نبی کریم صلعم کی دریا دلی کا اندازہ کرو۔

ع۶۷۸ اولی الامر۔ اَمَرْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے مکلف کیا کہ وہ کچھ کرے پس اَمْر بمعنی حکم ہے اور اولی الامر سے مراد بعض کے نزدیک وہ امیر ہیں جو نبی کریم صلعم کے زمانہ میں مقرر کیے گئے اور بعض کہتے ہیں اہل بیت کے آئمہ مراد ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں۔ امر بالمعروف کرنے والے اور ابن عباسؓ کا قول ہے کہ فقہاء اور اہل دین مراد ہیں۔ یہ سب اقوال امام راغبؒ نے نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ سب اولی الامر کے اندر داخل ہیں۔ کیونکہ اولی الامر جن کی وجہ سے لوگ رُکتے ہیں چار قسم ہیں۔ یعنی انبیاؑء اور ان کا حکم عام اور خاص لوگوں کے ظاہر و باطن پر ہے اور والی یعنی بادشاہ اور ان کا حکم سب کے ظاہر پر ہے نہ ان کے باطن پر اور اہل حکمتؔ یا فلسفی جن کا حکم خاص لوگوں کے باطن پر ہے اور واعظ اور ان کا حکم عام لوگوں کے باطن پر ہے نہ ان کے ظاہر پر۔

اولی الامر کا حکم کس حد تک مانا جا سکتا ہے: پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ باہمی تعلقات میں ایک دوسرے کے حقوق ادا کرو جو حاکم ہیں وہ محکوم کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کریں۔ اب بتایا ہے کہ محکوم کا تعلق حاکم سے کیسا ہونا چاہیئے لیکن اس کے بیان کرنے سے پہلے بتایا ہے کہ حقیقی اطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہے۔ یعنی

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا	کیا تو نے ان (کی حالت) پر غور نہیں کیا جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا وہ چاہتے ہیں کہ شیطان سے فیصلہ کرائیں حالانکہ ان کو حکم

اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکموں کا پابند کر دینا ان دو کے حکم کی فرمانبرداری بلا قید ہے۔ لیکن ان کے ساتھ جو تیسرا حکم ہے کہ اولی الامر کی فرمانبرداری کرو۔ اس کے ساتھ صاف قید لگا دی کہ اگر کسی معاملہ میں جھگڑا ہو تو اسی کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ جس سے معلوم ہوا کہ اولوالامر کی فرمانبرداری کا اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی طرح مطلق اور بلا قید حکم نہیں بلکہ یہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ گویا اللہ اور رسول کا حکم ایک ذیل میں ہے۔ اولوالامر کا حکم دوسری ذیل میں ہے۔ اللہ اور رسول حکم دینے میں غلطی نہیں کر سکتے۔ نہ رسول کا حکم اللہ کے حکم کے خلاف ہو سکتا ہے لیکن اولوالامر حکم دینے میں غلطی کر سکتے ہیں اور اولوالامر کا حکم اللہ یا رسول کے حکم کے خلاف بھی ہو سکتا ہے پس اللہ اور رسول کے حکم کی ہر حال میں اطاعت کرنی ہو گی۔ اولوالامر کے حکم کی بھی عموماً اطاعت کرنی ہو گی، لیکن اگر وہ اللہ اور رسولؐ کے حکم کے خلاف ہو تو پھر ان کی اطاعت نہیں کرنی ہو گی۔

احادیث اس بارہ میں کثرت سے ہیں۔ بخاری اور دیگر کتب احادیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک لشکر بھیجا اور اس پر ایک انصاری کو امیر مقرر فرمایا۔ راستہ میں امیر کو اپنے ساتھیوں پر کچھ غصہ آیا اور اس نے کہا کہ کیا رسول اللہ صلعم نے تم کو حکم نہیں دیا کہ میری اطاعت کرو انہوں نے کہا بیشک دیا ہے۔ پھر اس نے آگ جلوائی اور کہا میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اس کے اندر داخل ہو جاؤ۔ ایک نوجوان نے کہا ہم تو آگ سے بھاگ کر رسول اللہ صلعم کی طرف آئے ہیں۔ پس جلدی مت کرو یہاں تک کہ رسول اللہ صلعم سے ملو۔ چنانچہ جب واپس آئے تو یہ واقعہ آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا اگر تم اس میں داخل ہو جاتے تو پھر نہ نکلتے انما الطاعة فی معروف۔ اطاعت (یعنی اولی الامر کی اطاعت) صرف معروف بات میں ہے یعنی اس بات میں جو خلافِ شریعت نہ ہو۔ اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا السمع والطاعة علی المرء المسلم فیما احب وکرہ مالم یؤمر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔ مسلمان شخص پر واجب ہے کہ وہ قبول کرے اور فرمانبرداری کرے خواہ ایک بات کو پسند کرے یا اسے ناپسند کرے جب تک کہ اسے (اللہ اور رسول کی) نافرمانی کا حکم نہیں دیا جاتا۔ لیکن اگر (اللہ اور رسول کی) نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر قبول کرنا نہیں اور نہ اطاعت کرنا ہے اور بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا قبول کرو اور اطاعت کرو خواہ تم پر حبشی غلام کو امیر بنایا جائے اور صحیحین میں ہے کہ جو شخص اپنے امیر سے کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اسے چاہیئے کہ صبر کرے کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر ہٹتا ہے پھر مرتا ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔

ان حادیث سے ظاہر ہے کہ اولی الامر کے احکام کی پابندی کی اصل بنیاد اتحاد جماعت ہے کیونکہ جب تک سب اپنے آپ کو ایک حکم کے ماتحت نہیں کرتے۔ اس وقت تک اتحاد قائم نہیں رہ سکتا اس لیے اگر امیر کوئی ایسا حکم دے جس کو ایک شخص ناپسند کرتا ہے تو بھی اسے ماننا چاہیئے بشرطیکہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر خلاف ہو تو اس صورت میں امیر کے حکم کی اطاعت نہ کی جائے اولی الامر منکم میں جیسا کہ اوپر دکھایا گیا ہے انبیاء علماء آئمہ دین۔ بادشاہ حکام سب شامل ہیں۔ مگر چونکہ خطاب الذین اٰمنوا کو ہے اس لیے منکم کی قید سے صاف نظر آتا ہے کہ یہاں مراد مسلمان حکام ہی ہیں ہاں یہ سوال علیحدہ ہے کہ آیا اگر کسی جگہ مسلمان غیر مسلم بادشاہ کے ماتحت ہوں تو اس کے احکام کی اطاعت کریں یا نہ بشرطیکہ وہ احکام خلافِ قرآن و حدیث نہ ہوں اس کے لیے نبی کریم صلعم کا اور ان صحابہؓ کا جو حبش میں گئے نمونہ کافی ہے۔ قرآن کریم سے اجتہاد کے رنگ میں اسی آیت سے ان کا حکم بھی مستنبط ہو سکتا ہے۔

یہ امر بھی یہاں یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی تنازعہ میں اصلی اور فیصلہ کن قول یا اللہ تعالیٰ کا کلام ہو سکتا ہے یا نبی کریم صلعم کی حدیث، پس جہاں کہیں مسلمانوں میں کوئی تنازعہ ہو اس پر فیصلہ کرنے کے لیے مقدم قرآن شریف اور بعدہٗ حدیث ہے۔ اور قرآن شریف کا تقدم اس سے بھی ظاہر ہے کہ دوسری جگہ بصورت تنازعہ فحکمه الی الله ہی فرمایا۔ یعنی اس کا حکم اللہ کے اختیار میں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح پر قرآن محفوظ ہے اس طرح پر حدیث محفوظ نہیں بلکہ حدیث کے الفاظ میں کمی بیشی کا ہو جانا۔ اور بسا اوقات روایت کا بالمعنی ہونا ایک امر مسلّم ہے۔

اہلِ قرآن اور رسول اللہ کی اطاعت: ایک اور امر جس کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے ان لوگوں کا خیال ہے جو اہلِ قرآن کہلاتے ہیں جن کے نزدیک رسول اللہ صلعم کی اطاعت شرک میں داخل ہے اس کی تردید ع ۵۱۶ میں ہو چکی ہے۔ اس موقعہ پر یہ لوگ یوں معنی کرتے ہیں "اے ایمان والو دین اسلام کے بارے میں حکم مانو اللہ تعالیٰ ہی کا، یعنی حکم مانو صرف کتاب اللہ ہی کا اور سلطنت کے بارے میں حکم مانو حکام وقت کا جو تم پر حکمران ہوں پس اگر جھگڑ پڑو تم آپس میں دین اسلام کے کسی امر میں تو اس کو رجوع کرو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف یعنی خالص کتاب اللہ کے ہی حکم کی طرف" (ترجمۃ القرآن بآیات الفرقان مولفہ مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی) اب قرآن شریف کو اپنی رائے کے ماتحت کرنے کے لیے کس قدر باتیں اپنے پاس سے ڈال کر تحریف کا رنگ اختیار کیا ہے۔

پھر ایک اور دقت یہ ہو گی کہ اس قدر زوائد کے بڑھانے سے نتیجہ کیا نکلا۔ اول یہ کہ سلطنت کے امور کا کوئی تعلق دین اسلام سے نہیں۔ یہ کیسی لغو اور بے معنی

اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ
يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿٦٠﴾
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ
عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿٦١﴾
فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَاۗءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ڰ بِاللّٰهِ

دیا گیا تھا کہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو گمراہی میں دور بھکالے جائے ٦٤٩

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف آؤ جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف، تو تو منافقوں کو دیکھے گا کہ وہ تجھ سے ہٹتے ہوئے رُکتے ہیں۔

تو پھر کیا حال ہوگا جب ان کو اس کی وجہ سے مصیبت پہنچے گی جو اُن کے اپنے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے

بات ہے۔ وہ دین اسلام جو معاشرت کے بارہ میں احکام دیتا ہے۔ تمدن کے بارہ میں احکام دیتا ہے، معمولی انسانی تعلقات کے بارہ میں احکام دیتا ہے۔ کیا وہ سلطنت کے بارہ میں کوئی احکام نہیں دیتا۔ بلکہ سلطنت کے بارہ میں جس قدر احکام ہوں ان کے لیے حکام وقت کو مقرر کردیتا ہے خواہ ایک بیدین ہی بادشاہ ہو سلطنت کے بارہ میں وہ جو حکم دے وہی ماننا ہوگا۔ یہاں تک کہ دین اسلام کے بارہ میں تو تنازع بھی جائز ہے مگر سلطنت کے احکام کے بارہ میں کوئی تنازع جائز نہیں۔ رسول سے اختیار چھینتے چھینتے ایک حصہ دین اسلام میں بادشاہ کو رسول سے بڑھ کر مرتبہ دیدیا کہ جس طرح اللہ تعالٰے کی اطاعت بلاچون وچرا اور بلا تنازع کرنی چاہیئے اسی طرح بادشاہ کی اطاعت بلاچون وچرا اور بلا تنازع کرنی چاہیئے اور کسی قسم کا اختلاف بادشاہ وقت کے ساتھ گویا حکم الٰہی سے انحراف ہے۔

اہل تشیع اور قادیانی احمدی: اس آیت میں اہل تشیع کا بھی جواب ہے جنہوں نے امام معصوم کا وجود مانا ہے اور احمدیوں میں سے قادیانی گروہ کا بھی جواب ہے جنہوں نے حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو نبی اور رسول مانا ہے کیونکہ اگر کوئی امام معصوم ہونا ہوتا جو غلطی کر ہی نہ سکتا یا کوئی نبی اور رسول ہونا ہوتا جس کی اطاعت اسی طرح کرنی ضروری ہوتی جس طرح آنحضرت صلعم کی تو ایسے شخصوں کا ذکر اس آیت میں بھی ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جو کوئی اس امت کے اندر ہوگا خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان انسان کیوں نہ ہو وہ اولی الامر میں ہی داخل ہوگا۔ اور اس کے ساتھ تنازع بھی ہو سکتا ہے اور ایسے تنازع کی صورت میں اصلی مرجع اللہ یعنی اس کی کتاب اور رسول یعنی سنّت نبوی ہی رہیں گے۔ الذین امنوا ایک حکم میں رہیں گے اور رسول ایک حکم میں یعنی وہ ہمیشہ مطیع رہیں گے اور رسول ہمیشہ مطاع رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ ان میں آئمہ اور علماء و فقہاء اور حکام کی اطاعت ضروری ہوگی مگر کوئی بھی ہو اس کے ساتھ تنازع ہو سکتا ہے اور اس لیے اصل مطاع بھی رسول اللہ صلعم ہی رہے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے ساتھ بھی بعض صحابہ کو اختلاف ہو جاتا تھا، اور کتاب اللہ ہی فیصلہ کرتی تھی۔ امام بخاری اور مسلم اور امام ابوحنیفہ اور مالک اور شافعی اور احمد اور ہر صدی کے مجدد دین اور مسیح موعود کے ساتھ بھی اگر کسی کو اختلاف ہو تو حکم کتاب اللہ اور سنّتِ نبوی ہونگے اور اصل اور صحیح مرجع ساری امت کے محمد رسول اللہ صلعم ہی ہونگے۔ اسی لیے خاتمہ پر فرمایا کہ یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے۔ کیونکہ اس میں امت کا اتفاق اور اتحاد قائم رہ سکتا ہے اپنے لیے الگ الگ مطاع بنالیے جائیں تو تفرقہ پیدا ہو کر ایک رسول کے بھیجنے کی جو غرض تھی وہ مفقود ہوتی ہے اور یوں بھی تمام کو ایک ذیل میں رکھ کر جمہوریت کا اعلیٰ درجہ کا اصول دنیا میں قائم کیا ہے۔

ع ٦٤٩ یزعمون۔ زعم اس قول کا بیان کرتا ہے جس پر جھوٹ کا گمان ہو (غ)، اس لیے قرآن میں یہ ایسے ہی مقامات پر بولا گیا ہے۔ جہاں اس کے کہنے والے کی مذمت مقصود ہو۔ جیسے زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا (التغابن ٦٤ - ٧) بل زعمتم الّن نجعل لکم موعدا (الکھف ١٨ - ٤٨) کنتم تزعمون (الانعام ٦ - ٢٢) زعمتم من دونه (بنی اسرائیل ١٧ - ٥٦)

یہودیوں کے حالات سے عبرت دلا کر مسلمانوں کو اخلاص اور ادائے امانت کی نصیحت کرتے ہوئے ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جو مُنہ سے ماننے کا دعویٰ کرتے تھے یا ہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے۔ مفسرین نے یہاں ایک مسلمان بشر اور ایک یہودی کے تنازع کا قصّہ لکھا ہے جس میں مسلمان نے (جو درپردہ منافق تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو نہ مانا۔ لیکن گو آیت کے الفاظ ایک چھوڑ صدہا واقعات پر صادق آسکتے ہیں کسی ایک خاص واقعہ سے اس کو مخصوص کرنا ٹھیک نہیں۔ آیت کے الفاظ عام ہیں اور اس میں عام منافقوں کا ذکر ہے۔ کیونکہ جب اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا تو ان لوگوں کا بھی ذکر کردیا جو منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے مگر دل سے احکام الٰہی کو نہ مانتے تھے۔ یہ لفظ کہ جو پہلے نازل کیا گیا اس پر بھی ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ ظاہر نہیں کرتے کہ یہ یہود میں سے تھے۔ کیونکہ ہر ایک مسلمان سارے پہلے انبیاء اور ان کی وحی پر ایمان لاتا ہے اور نہ ان کے طاغوت کی طرف اپنے فیصلے لے جانے سے خاص جھگڑوں میں حکم بنانا ہی مقصود ہے بلکہ تمام دینی معاملات میں بجائے اللہ اور رسولؐ کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے کے اللہ کے سوائے دوسروں کو حکم بناتے اور یتحاکموا الی الطاغوت سے یہ مراد ہوتا کہ وہ طاغوت کے پیچھے لگتے اور اس کا کہا مانتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اس کے مقابل پر فرمایا وقد امروا ان یکفروا به۔ طاغوت کے کفر کا یعنی اس کی بات نہ ماننے کا حکم ان کو دیا گیا تھا اس کی مزید وضاحت اگلی آیت سے ہوتی ہے۔

إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾
أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ ق
فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِيٓ
أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾
وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ
اللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ

آئیں گے کہ ہمارا تو سوائے بھلائی اور اتفاق کے اور کچھ منشا نہ تھا ۶۸۰
یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔ پس ان
سے مُنہ پھیر لے اور اُن کو نصیحت کر اور ان سے ان کے حق
میں اثر کرنے والی بات کہہ ۶۸۱
اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے اذن سے
اس کی اطاعت کی جائے ۶۸۲ اور اگر وہ اس وقت جب اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا

ع ۶۸۰ یحلفون۔ حِلف اصل میں اس عہد کو کہتے ہیں جو قوم کے درمیان ہو اور چونکہ ایسا عہد قسم پر لیا جاتا تھا اس لیے حلف ایسی قسم کو کہا جانے لگا جس پر عہد لیا جائے اور پھر ہر ایک قسم پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔

توفیق۔ وفق۔ دو چیزوں کے درمیان مطابقت کا نام ہے اور اسی سے توفیق ہے جو اتفاق کے ہم معنی ہے۔

یہاں بتایا کہ یہ منافق عنقریب قسمیں کھائیں گے کہ ہم جو دوسرے لوگوں سے تعلقات رکھتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم تم کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے تھے، بلکہ یہ کہ ان لوگوں کے ساتھ ہم نیکی کریں اور فریقین میں موافقت پیدا ہو۔ ان کی ان قسموں کے جھوٹا ہونے کا قرآن شریف میں بار بار ذکر ہے ویحلفون علی الکذب (المجادلۃ ۵۸-۱۴) اتخذوا ایمانہم جنۃ (المنٰفقون ۶۳-۲) وغیرہ اور یہاں بھی اگلی آیت میں یہ بتایا ہے۔ دوسری جگہ ان کا قول منقول ہے انما نحن مصلحون ہم دونوں فریق میں میل ملاپ کرانا چاہتے ہیں۔

ع ۶۸۱ فی انفسھم یہاں فی انفسھم کے معنی تین طرح پر ہو سکتے ہیں۔ اوّل قولا بلیغا فی انفسھم یعنی قولاً مؤثرا فی قلوبھم ایسی بات جو ان کے دلوں میں اثر کرنے والی ہو۔ دوم فی شان انفسھم یعنی ان کے اپنے بارہ میں یا وہ بات جو ان کی حالت کو ظاہر کرنے والی ہے۔ سوم خالیا بھم لا یکون معھم احد یعنی ان کو الگ کر کے یا خلوت میں۔

بلیغا۔ بلیغ۔ بلغ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک مقصد کی غایت کو پالینا (غ) اور قول بلیغ یا بلاغت والا کلام دو طرح پر ہو سکتا ہے جیسا کہ امام راغب نے کہا ہے۔ ایک یہ کہ بذاتہٖ بلیغ ہو۔ اور اس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ تین اوصاف ضروری ہیں۔ لغت کے لحاظ سے درست ہو۔ جو معنی مقصود ہیں اس کے ساتھ مطابقت ہو۔ اور فی نفسہٖ بات سچی ہو۔ اور دوسرے یہ کہ کہنے والے کے لحاظ سے اور جس کو بات کہی گئی ہے بلیغ ہو یعنی کہنے والا جو کہنے کا مقصد رکھتا ہو اس کو ایسے طور پر کہے کہ جس کو بات کہی گئی ہے وہ اسے قبول کر لے۔ اور یہاں ان دونوں معنوں کی طرف اشارہ ہے۔

ع ۶۸۲ چونکہ اصل مضمون اس رکوع کا یہی تھا کہ رسول اللہ صلعم کی اطاعت کی جائے اور اسی اطاعت نہ کرنے والوں کو ہی جب وہ منہ سے اطاعت کا اقرار بھی کریں منافق بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے اب کھول کر فرماتا ہے کہ رسول تو بھیجا ہی اس غرض کے لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے لیکن چونکہ اصل حق اطاعت کا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس لیے ساتھ باذن اللہ فرمایا یعنی یہ کہ اس اجازت کا اعلام اللہ کی طرف سے ہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام رسول کے واسطہ سے ہی پہنچتے ہیں۔

ہر رسول مطاع ہوتا ہے مطیع نہیں ہوتا: یہ آیت رسولوں کے ایک امتیازی نشان پر فیصلہ کن ہے۔ امام رازیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ کوئی رسول نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ایک شریعت ہو اور وہ اس شریعت میں مطاع ہو۔ اور اس کے بارہ میں اسی کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ اگر وہ صرف اپنے سے کسی پہلے رسول کی شریعت کی طرف ہی بلاتا ہے۔ تو فی الحقیقت وہ مطاع نہ ہوا بلکہ مطاع وہ پہلا رسول ہوا جس کی وہ شریعت ہے اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر ایک رسول کے لیے لازمی ہے کہ وہ مطاع بھی ہو۔ پس اس آیت میں ایک ایسا حصہ ہے کہ اس سے باہر نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر ایک رسول کے لیے خود مطاع ہونا لازمی ہے اس لیے چونکہ قرآن نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اس اُمّت کے اندر ہمیشہ کے لیے حقیقی مطاع ایک محمد رسول اللہ صلعم ہی ہونگے جیسا کہ فان تنازعتم فی شیءٍ فردوہ الی اللہ والرسول سے ظاہر ہے اس لیے آپ کے بعد اس اُمّت کے اندر کوئی رسول نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی رسول ہوگا تو وہ خود مطاع ہوگا۔ اور اس لیے محمد رسول اللہ صلعم مطاع نہ رہیں گے اور یہ خلاف قرآن کے ہے۔ پس ختم نبوت پر یہ آیت فیصلہ کن ہے جب اس کو فان تنازعتم کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے اور اب تا قیامت کوئی رسول قطعاً نہیں آسکتا نہ کوئی پُرانا رسول آسکتا ہے اور نہ نیا۔ کیونکہ جو کوئی بھی رسول ہو کر آئے گا وہ خود مطاع ہوگا اور یہ ہو نہیں سکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد: جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے منتظر ہیں وہ بھی اس آیت پر غور کریں اور جن لوگوں نے آج تیرہ سو سال بعد ایک رسول کا آنا مان لیا ہے وہ بھی غور کریں۔ اول الذکر سوچیں کہ اگر حضرت عیسیٰ آئیں تو لازماً منصب رسالت کے ساتھ آنے چاہئیں۔ کیونکہ ایک رسول کا منصب رسالت کسی صورت میں چھینا نہیں جا سکتا۔ یہ اللہ اعلم حیث یجعل رسٰلتہ کے خلاف ہے اور پھر یہ بھی ماننا

فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ
لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ
فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾

تیرے پاس آتے پھر اللہ کی بخشش مانگتے اور رسول ان کے لیے استغفار
کرتا تو یقیناً وہ اللہ کو توبہ قبول کرنیوالا رحم کرنے والا پاتے ۶۸۳
سو نہیں تیرے رب کی قسم وہ ایمان ہی نہیں لاتے جب تک کہ وہ تجھے اس
میں حکم نہ بنائیں جو ان میں آپس میں اختلاف ہو پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی
نہ پائیں جو تو فیصلہ کرے اور پوری پوری فرمانبرداری کریں ۶۸۴

پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نعوذ باللہ کسی نااہلیت کی وجہ سے ان کا یہ منصب چھینا گیا۔ لیکن اگر منصب رسالت کے ساتھ وہ آئیں تو پھر اس وقت مطاع وہ ہونگے نہ حضرت نبی کریم صلعم۔ گویا آنحضرت کی رسالت کا زمانہ ختم ہو جائے گا اور یہ عقیدہ نہایت فاسد ہے۔ اور وہ لوگ جو حضرت مرزا غلام احمد صاحب کو رسول بناتے ہیں وہ بھی غور کریں کہ وہ شخص جسے وہ رسول بناتے ہیں بار بار بیان کرتا ہے کہ میری گردن پر محمد رسول اللہ صلعم کی اطاعت کا جُوا اسی طرح پر ہے جیسے ہر ایک مسلمان کی گردن پر اور میں نے جو کچھ پایا اسی کی پیروی سے اور اسی کی اطاعت سے پایا۔ اس نے بار بار اپنا مطاع اور سب مسلمانوں کا مطاع رسول اللہ صلعم کو ہی بتایا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بعض انبیاء بھی تو حضرت موسیٰ کی شریعت کے پیرو تھے لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گو ان کو نئی شرائع نہ دی گئی ہوں۔ مگر وہ سابق شریعت میں کمی بیشی تغیر تبدل اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق کر سکتے تھے۔ اس لیے جو شریعت وہ پیش کرتے تھے وہ اپنی مہر سے پیش کرتے تھے۔ جس بات کو وہ درست کہہ دیں وہ درست اور جس کو وہ غلط کہہ دیں وہ غلط ماننی ضروری تھی۔ اس لیے بہرحال مطاع وہ خود ہی تھے۔ گو وحی الٰہی نے ان کو یہی ہدایت کی ہو کہ وہ موسوی شریعت کی پیروی کریں۔ لیکن اس امت کے اندر ایسا کوئی انسان نہیں ہو سکتا جو ایک شوشہ بھی شریعت کا کم و بیش کر سکے۔ اس لیے اس اُمت میں تا قیامت ایک ہی مطاع ہوگا اور وہ محمد رسول اللہ صلعم ہیں۔

ع۶۸۳ جب رسول کی اطاعت کے بارہ میں قطعی حکم دیدیا تو فرمایا کہ بعض وقت انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔ سو اگر ان لوگوں سے بھی کوئی غلطی ہو گئی تھی تو اس کا علاج تو یہ تھا کہ استغفار کرتے اور رسول اللہ بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو اللہ ان کو معاف کر دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلعم کا استغفار ساری اُمت کے لیے تھا۔ جس میں منافق تک بھی شامل تھے اور اپنی ذات تک محدود نہ تھا۔

استغفرلھم الرسول کے معنی مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی یوں کرتے ہیں "پھر معافی دیدے بالکل ان کو کتاب اللہ المجید"۔ مگر لطف یہ ہے کہ کتاب اللہ المجید کے معافی دینے کے بعد لوجدوا اللہ توابا رحیما ہے جس کے معنی مولوی صاحب کو بھی یہی کرنے پڑے ہیں "تو وہ ضرور ہی پائیں گے اللہ تعالیٰ کو بالکل معاف کرنے والا ہر طرح سے مہربان"۔ تعجب ہے کہ پہلے کتاب اللہ معافی دیتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے حالانکہ کتاب اللہ کا معافی دینا اور اللہ کا معافی دینا ایک ہی ہے اور پھر استغفار کے معنی معافی دینا کسی لغت میں میری نظر سے نہیں گزرے اور نہ مولوی صاحب نے خود ان معنوں کی کوئی سند دی ہے۔

ع۶۸۴ فلا۔ لا کو یہاں ... نے تاکید معنی قسم کے لیے صلہ مان کر گویا زائد مانا ہے۔ مگر درحقیقت ایسے مقامات پر لا نافیہ ہی ہوتا ہے اور نفی کسی پہلی چیز کی ہوتی ہے۔ خواہ مفہوم ہی ہو جیسے یہاں مراد ہے لیس الامر کما یزعمون۔ وہ بات نہیں جو گمان کرتے ہیں۔ کیونکہ شروع میں ان کے گمان کا ذکر تھا الم تر الی الذین یزعمون۔

وربک۔ واؤ قسم کے لیے ہے۔ قرآن کریم میں قسموں کا کیا منشا ہے اس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔ جہاں دوسری چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں۔ یہاں قسم "تیرے رب" کی ہے۔ اس لیے جو اعتراض قسموں پر عموماً کیا گیا ہے وہ یہاں وارد نہیں ہوتا۔ لیکن اس قدر یہاں بھی بتا دینا ضروری ہے کہ الفاظ جیسے انسانوں کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے افعال کا ذکر بھی انہی الفاظ میں ہی ہوگا۔ حالانکہ دونوں استعمالوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ دیکھو ع۲۷ اسی طرح قسم میں ہے۔ انسان جب قسم کھاتا ہے تو وہ گویا ایک زبردست شہادت پیش کرتا ہے اس لیے خدا کی قسم کا اصل منشاء ایک زبردست شہادت کا پیش کرنا ہے اور جہاں جہاں اور جس جس چیز کی قسم قرآن کریم میں کھائی گئی ہے وہ ایک شہادت کی طرف اشارہ ہے یہاں وہ شہادت جس کی طرف اشارہ ہے خود لفظ ربک میں ہے یعنی محمد رسول اللہ صلعم کی ربوبیت کرنے والی ہستی۔ وہ خدا جس نے محمد رسول اللہ صلعم کی ربوبیت کر کے آپ کو ایک اعلیٰ مقام پر پہنچایا اس کا رسول کو بھیجنا اس کی اپنے ہاتھ سے تربیت کرنا ایک بے معنی امر نہیں۔ اس نے اس لیے اس کی اپنے ہاتھ سے تربیت کی تا وہ انسانوں کی تربیت کرے اس لیے اگر اس کو مطاع اور حکم نہ مانا جائے تو وہ تربیت بھی نہیں کر سکتا۔ پس اللہ تعالیٰ کے محمد رسول اللہ صلعم کی تربیت کرنے کا یہ تقاضا ہے کہ آپ مطاع ہوں۔

حَرَج۔ نہایہ میں ہے کہ حرج کے اصل معنی ضیق یعنی تنگی ہیں۔ اور اسی میں ایک قول ہے کہ حرج اضیق الضیق ہے یعنی خفیف سے خفیف تنگی اور اسی سے گناہ معنی ہو گئے ہیں اور مفردات میں ہے کہ حَرَج اصل میں مجتمع الشئ کو کہتے ہیں اور اس سے ضیق کے معنی نکلے ہیں۔ مجاہد نے حرج سے مراد یہاں شک

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾

اور اگر ہم ان پر یہ لازم کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کردو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ، تو ان میں سے سوائے تھوڑے لوگوں کے یہ نہ کرتے اور اگر وہ کریں جو اُن کو نصیحت کی جاتی ہے تو یقیناً ان کے لیے بہتر اور ثابت قدم رکھنے میں زیادہ مضبوط ہوتا۔[685]

لیا ہے اور بعض مفسرین نے کسی قسم کی کراہت کا شائبہ کہا ہے (ر)

یسلموا تسلیما۔ تسلیم میں انقیاد ظاہر کی طرف اشارہ ہے جیسا لا یجدوا فی انفسھم حرجًا میں اس طرف اشارہ ہے کہ دل سے اس فیصلہ کو حق جانیں گویا جب یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلعم جو فیصلہ کریں اُسے دل سے سچّا سمجھو تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ظاہر طور پر بھی اس کے پابند ہو جاؤ۔ بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ بعض وقت انسان ایک بات کو سچ جانتا ہے مگر عناد کی وجہ سے اُسے قبول نہیں کرتا۔ میرے نزدیک تسلیم کو بعد میں بطور ترقی اس لیے بیان کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے فیصلوں کو دل سے سچّا ماننے والے تو بہت ہیں مگر ظاہر طور پر ان کی پابندی کرنے والے تھوڑے۔ تو فرمایا کہ صرف یہی کافی نہیں کہ تم کہدو کہ ہم دل سے سچا مانتے ہیں بلکہ اس فیصلہ کے پابند بھی ہو جاؤ۔

اِس آیت کی ذیل میں بخاری نے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں حضرت زبیر اور ایک انصاری کے جھگڑے کا ذکر ہے جو پانی کے متعلق تھا اور جس میں فیصلہ زبیرؓ کے حق میں ہُوا۔ اس حدیث کے آخر میں آتا ہے کہ زبیرؓ نے کہا احسبُ هٰذه الایات اِلَّا نَزَلَت فی ذٰلك یعنی میں گمان کرتا ہوں کہ یہ آیات اسی بارہ میں نازل ہُوئیں ان الفاظ سے لازمًا یہ مراد نہیں کہ یہ جھگڑا واقع ہوا تو اس کے فیصلہ کے متعلق یہ آیتیں نازل ہوئیں بلکہ ان آیات کا اس جھگڑے پر چسپاں ہونا مراد ہو سکتا ہے اور غالبًا یہی مراد ہے کیونکہ جس اطاعت کا ذکر یہاں چلتا ہے وہ اطاعت عام معاملات میں ہے نہ خاص قضایا میں۔ چنانچہ اس رکوع کی آخری سے پہلی آیت اس کا قطعی فیصلہ کرتی ہے جہاں فرمایا ومن یطع الله والرسول فاولئك مع الذين انعم الله علیھم جو شخص اللہؐ اور رسولؐ کی اطاعت کرے گا سو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا۔ ظاہر ہے کہ یہاں اطاعتِ سے مراد امور دینی میں اطاعت ہے یعنی ان راہوں پر چلنا جو اللہؐ اور رسولؐ نے بتائی ہیں اور خود اس آیت کے الفاظ بھی یہی بتاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں فرمایا جو کوئی اختلاف باہم مسلمانوں میں ہو اس میں حکم رسول اللہ صلعم کو بنایا جائے۔ تب ایک شخص حقیقت ایمان پر قائم ہوتا ہے اور جو شخص کچھ تو نبی کریم صلعم کی پیروی کرتا ہے اور کچھ اپنی خواہشات کی وہ حقیقت ایمان پر قائم نہیں اور پھر نبی کریم صلعم کے فیصلے پر شرح صدر سے راضی ہو یہاں تک اس فیصلے کو قبول کرنے میں کسی قسم کی تنگی بھی سینہ میں نہ آنے پائے اور پوری تسلیم کے ساتھ فرمانبرداری کریں۔ باہمی اختلافات کا اس لیے ذکر کیا کہ جو شخص اختلاف میں اپنے فیصلہ کو نہ صرف قبول کرلے بلکہ اس فیصلہ پر اس کا شرح صدر ہو جائے ایسا شخص ہر بات میں پوری پیروی کرسکتا ہے۔ اور اگر معمولی جھگڑے بھی یہاں مراد لیے جائیں تو بھی مطلب وہی ہے۔ کیونکہ دنیا کے جھگڑوں میں مدعی مدعا علیہ دونوں کا کسی کے فیصلہ پر شرح صدر ہو جانا سوائے اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس شخص کے احکام کی دل میں حد درجہ کی عزت ہو۔ گویا یوں فرمایا کہ دین کے معاملات میں تو تم پر رسول اللہ صلعم کی پیروی لازم ہی ہے مگر اس پیروی کو اس کمال تک پہنچانے کی ضرورت ہے کہ اگر کوئی تمہارا دنیوی جھگڑا بھی ہو تو اس جھگڑے میں جو کچھ فیصلہ نبی کریم صلعم کریں اس کو نہ صرف تم قبول کرو بلکہ یہ خیال بھی تمہارے دل میں نہ آئے کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے فیصلے محض قیاس اور اجتہاد سے نہیں ورنہ ان کے متعلق اس بات کا مطالبہ نہ ہوتا کہ دل میں بھی شرح صدر ہو اور ظاہرًا بھی تسلیم کامل ہو اور نہ یہ آیت جائدادوں اور مال کے جھگڑوں کے متعلق ہے۔ بلکہ دینی احکام کے بارہ میں ہے۔

اجتہاد نبوی میں وحی خفی: اور یہ بھی صاف ثابت ہے کہ نبی کریم صلعم کا اجتہاد محض انسانی قیاسات کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ضرور ایک وحی کی روشنی تھی (جس کو ہم وحی خفی کہتے ہیں کیونکہ کھلی وحی اس بارہ میں نہ ہوتی تھی) جس کی وجہ سے آپ ان فیصلوں میں قطعًا غلطی نہ کرسکتے تھے۔ ورنہ لا یجدوا فی انفسھم حرجًا غلط ٹھہرتا ہے۔

ع۶۸۵ اپنے آپ کو قتل کردینے کے حکم سے مراد: احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہؓ نے کہا کہ اگر ایسا حکم ہوتا تو ہم اس کی تعمیل کرتے، تو نبی کریم صلعم نے فرمایا للایمان اثبت فی قلوب اھله من الجبال الرواسی (ث) ایمان اس کے اہل کے دلوں میں مضبوط پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ خود شہادت دیتا ہے کہ تھوڑے ضرور ایسا بھی کرتے اور وقلیل من عبادی الشکور (السبا۔ ۱۳[34]) سے ثابت ہے کہ تھوڑے ہی اعلیٰ مقامات کو حاصل کیا کرتے ہیں۔ تیسری بات غور طلب یہ ہے کہ یہاں فرمایا ہے کہ اگر ان پر ہم یہ فرض کردیتے کہ اپنے آپ کو قتل ہی کردو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ۔ حالانکہ گھروں سے تو صحابہؓ کو نکلنا پڑا۔ تو پھر ان دونوں حکموں کو ایک حکم میں رکھنے کا کیا مطلب ایک یہ کہ اپنے آپ کو قتل کردو جو کسی نے نہیں کیا۔ اور دوسرا یہ کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ جو تمام مہاجرین نے کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اقتلوا انفسکم سے مراد بھی ایسا امر ہے جو اخرجوا من دیارکم کی طرح ممکن ہے یعنی دین کے لیے اس قدر قربانی کرنا کہ گویا انسان اپنے آپ کو اس راہ میں قتل کردے کیونکہ اشراف علی القتل یا اپنے آپ کو قتل ہونے کے لیے پیش کردینا یا اپنی جانوں کی پروا نہ کرنا گویا اپنے آپ کو قتل ہی کردینا ہے۔ اس کا تعلق اوپر کی آیت سے یہ ہے کہ اوپر بھی ایک حکم۔ بظاہر سخت حکم۔ رسول اللہ صلعم کے فیصلوں کو قبول کرنے اور کامل طور پر آپ کی اطاعت کرنے کا دیا ہے کہ ہمیشہ کے لیے ان سب انسانوں کا جو محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لائیں یہ فرض ہوگا کہ امور دینی میں آپ کے فیصلوں کو قبول کریں اور

وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝٦٧
وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝٦٨
وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ
الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ
وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝٦٩

اور یقیناً تب ہم ان کو اپنی جناب سے بڑا اجر دیتے۔
اور یقیناً ان کو سیدھے رستہ پر چلاتے۔
اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے تو یہ اُن کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام کیا (یعنی نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالح لوگوں (کے ساتھ) اور یہ اچھے ساتھی ہیں ۶۸۶

کسی قسم کا شائبہ کراہت کا ان کے دلوں میں نہ آئے، بلکہ شرح صدر سے قبول کریں۔ تو اب فرماتا ہے کہ یہ حکم دراصل سخت نہیں انسان اپنے گھر میں رہ کر اپنے کاروبار کو سرانجام دیکر رسول اللہ صلعم کے احکام کی فرمانبرداری بھی کرسکتا ہے۔ اس سے سخت تر مقام یہ ہے کہ انسان دین کے لیے ایسے کام کرے کہ اپنی جان کی پروا بھی نہ کرے جو قتل نفس کے قائم مقام ہے۔ مثلاً اعدائے دین کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو جانا یہ قتل نفس سے کم نہیں۔ اور پھر یہ سخت مقام ہے کہ دین کے لیے اپنے گھروں کو چھوڑ دو جیسا کہ صحابہ کرامؓ نے چھوڑ کر دکھایا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ مشکل کام ہم نے ساری اُمت پر ہمیشہ کے لیے فرض نہیں کر دیئے کیونکہ ان کے کرنے کے اہل بھی تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ ہاں سب لوگوں کو ہمیشہ کے لیے ہم یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ دین میں رسول اللہ صلعم کے فیصلوں اور آپ کی حدبندیوں سے باہر قدم نہ رکھیں۔ اپنے کاروبار دنیا کو بھی سرانجام دیں اپنے گھروں میں بھی رہیں اور ساتھ دین کی حدود کو بھی نگاہ رکھیں۔

لو انهم فعلوا ما يوعظون به میں یہ بتایا ہے کہ اگر وہ اطاعت رسول پورے طور پر کریں تو یہ ان کی دونوں طرح پر بھلائی کا موجب ہوگا۔ دنیا میں بھی ان کی بہتری کا موجب ہوگا اور ایمان میں بھی وہ مضبوط ہونگے اور ثابت قدمی میں بہت ترقی کریں گے۔ یا آخرت میں ان کی بھلائی کا موجب اور دنیا میں ان کی ثابت قدمی کا موجب ہوگا۔ اس سے یہ منشا نہیں کہ حفاظت دین کے لیے اپنے آپ کو قتل تک کے لیے پیش کرنا یا اپنے گھر کو چھوڑ دینا کسی پر بھی فرض نہیں بلکہ اس میں ایک پیشگوئی پائی جاتی ہے کہ وہ حالات دنیا میں پیدا ہو جائیں گے کہ ہجرت یعنی وطن کے چھوڑنے اور دین کی حفاظت کے لیے اپنی جان قربان کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ سوائے نادر صورتوں کے جو معدوم کے حکم میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بھی آتا ہے لا هجرة بعد الفتح۔

۶۸۶ صدّیقین۔ صِدّیق مبالغہ کا صیغہ ہے اسی لیے اس کے اصل معنی ہیں راستی میں کمال کو پہنچا ہُوا (ل) اور امام راغبؒ کہتے ہیں کہ صدیق وہ ہے جس کا صدق کثرت سے ظاہر ہو۔ اور کہا گیا ہے۔ بلکہ صدیق وہ ہے جو کبھی جھوٹ نہ بولے اور کہا گیا ہے بلکہ وہ جس کو اس قدر سچ بولنے کی عادت ہے کہ جھوٹ اس سے کبھی سرزد نہیں ہوسکتا اور بعض نے کہا ہے وہ شخص جو اپنے قول اور اعتقاد دونوں میں سچا ہو اور جس نے اپنے صدق کو اپنے فعل سے سچ ثابت کر دکھایا ہو یہ تو اس کے عام معنی ہیں اور اصطلاح شریعت میں ہر ایک شخص جو ہر ایک اللہ کے حکم کو سچا مان لے اور اس میں سے کسی کے بارہ میں اس کے دل میں کوئی شک واقع نہ ہو اور نبی کریم صلعم کی تصدیق کرے وہ صدیق ہے (ل) پس عام معنی سے یہ انتقال خاص معنی کی طرف یوں ہوا کہ ایک شخص اس قدر سچ بولنے کا عادی ہے کہ نہ صرف اس سے اپنی ذات میں کبھی کوئی جھوٹ سرزد نہیں ہوتا بلکہ جب راستی اس کے سامنے آتی ہے تو اس وجہ سے کہ اسے صدق سے گویا ایک قدرتی تعلق ہے وہ اس راستی کو فوراً پہچان لیتا ہے اور کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔ اصطلاح شریعت میں یوں کہنا چاہیئے کہ نور ایمانی اس میں اس قدر غالب ہوتا ہے۔ یا ایمان کے لحاظ سے وہ ایسے کمال کو پہنچا ہوا ہوتا ہے کہ راستی سے اس کو ایک قدرتی تعلق ہو جاتا ہے۔ پس صدیقیت کا مرتبہ درحقیقت کمال ایمانی کا مرتبہ ہے۔

شہداء۔ شہید مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی وہ کامل علم رکھنے والا جو اس علم کو بیان کر دے یا ظاہر کر دے گویا شہید کا کمال بلحاظ علم کے ہے جس طرح صدیق کا کمال بلحاظ ایمان کے ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ شہید مرتبہ علم میں متقدم اور مرتبہ ایمان میں متاخر ہے اور صدیق مرتبہ ایمان میں متقدم اور مرتبہ علم میں متاخر ہے اور اسی لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو مدار صدیقیت قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ کمال ایمانی کے لحاظ سے ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہُوا ہے۔ اور حضرت عمرؓ کو شہید کیونکہ کمال علمی کے لحاظ سے ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔

صالحین۔ صالح کا مادہ صلح ہے اور صلاح۔ فساد کی ضد ہے۔ کثرت استعمال میں وہ افعال سے مخصوص ہیں (غ) اور قرآن کریم میں بکرات آمنوا وعملوا الصالحات کہہ کر صلاح کو عمل سے وابستہ کیا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ صالح کا کمال عمل سے وابستہ ہے۔ اس لیے بعض نے ولایت کو صالحیت کا مقام قرار دیا ہے اور اس کا مدار حضرت علیؓ کو ٹھہرایا ہے۔

رفیق۔ (رِفق بمعنی نرمی سے) وہ ہے جو تم سے نرمی کرے۔ بالخصوص وہ شخص جو سفر میں ساتھی ہو (ل)

رسول کی اطاعت سے منعم علیہم کی رفاقت ملتی ہے۔ اس سارے رکوع میں رسول اللہ صلعم کی اطاعت پر ہی زور دیا ہے۔ اطاعت نہ کرنے والوں کو منافق قرار دیا ہے اور اب اطاعت کرنے والوں کے اجر پر اس کا خاتمہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جو لوگ رسول اللہ صلعم کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ

ع ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝۷۰ یہ فضل اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کافی جاننے والا ہے ۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے بچاؤ (کا سامان) لے لیا کرو،

ہونگے جو بڑے بڑے انعامات کے وارث ہوئے ہیں۔ اور وہ بڑے انعام پانے والے کون لوگ ہیں۔ جو نبوت کے مقام تک پہنچائے گئے ہیں اور کمال ایمانی کو حاصل کر لیتے ہیں اور کمالِ علمی کو حاصل کر لیتے ہیں اور کمال عملی کو حاصل کر لیتے ہیں تو گویا یوں فرمایا کہ اطاعت رسول سے انسان کو کامل انسانوں کی رفاقت حاصل ہو جاتی ہے گو وہ خود اس کمال کو پہنچے یا نہ پہنچے اور اس میں کیا شک ہے کہ کمال ایمانی اور کمال علمی اور کمال عملی کو حاصل کرنیوالے تھوڑے لوگ ہوتے ہیں اور اکثر لوگ بوجہ طرح طرح کے اشغال اور کدورتوں کے یا دیگر حالات کے کمال کو نہیں پا سکتے پس یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ایسے لوگوں کو بھی جنہوں نے حتی الوسع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی کوشش کی ہے گو انھوں نے ان کمالات کو حاصل نہ کیا ہو، ان کمالات والوں کی رفاقت عطا فرمائی۔ چنانچہ قرآن کریم کے اپنے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔ اوّل معیّت کا ذکر کیا پھر حسن اولٰئک رفیقا کہہ کر بتایا کہ ان کی رفاقت ان کو ملے گی۔ اور آخر آیت میں فرمایا ذٰلك الفضل من اللہ۔ یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے کہ صرف اطاعت پر ہی اتنا بڑا اجر عطا فرمایا اور پچھلی آیت کا مضمون بھی یہی چاہتا ہے۔

احادیث کی شہادت: احادیث کو دیکھا جائے تو ان سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ترمذی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء تاجر صادق امین نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نبی بن جاتا ہے اور صحیح حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلعم سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو ایک قوم سے محبّت کرتا ہے اور ان میں ملا نہیں یعنی ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچا تو آپ نے فرمایا المرء مع من احب آدمی ان کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبّت کرتا ہے (ت)۔ اور انس سے ایک روایت میں ہے انی لاحب رسول اللہ صلعم واحب ابابکر وعمر رضی اللہ عنہما وارجوان اللہ یبعثنی معھم وان لم اعمل کعملھم (ت)، مَیں رسول اللہ صلعم سے محبّت کرتا ہوں اور حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے محبت کرتا ہوں اور میں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کے ساتھ مبعوث کرے گا گو مَیں نے ان کے سے عمل نہیں کیے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جنت کے بعض اعلیٰ منازل کا ذکر کیا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ انبیاء کی منزلیں ہیں جن پر ان لوگوں کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ تو آپ نے فرمایا والذی نفسی بیدہ رجال اٰمنوا باللہ وصدقوا المرسلین (ت) قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ لوگ بھی ان کو حاصل کریں گے) جو اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک شخص کو غمگین دیکھا تو دریافت فرمایا۔ اس نے عرض کیا کہ اب تو ہم صبح شام آپ کے ساتھ ہوتے ہیں آپ کے چہرہ کو دیکھتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ لیکن بعد وفات آپ اعلیٰ مقام پر ہونگے جہاں ہم نہیں پہنچ سکیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

پس یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں کملین کی رفاقت اور معیّت کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ آیا یہ رفاقت محض آخرت کے لیے ہے یا دنیا میں بھی اس سے کچھ حظ ملتا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اسلام نے جتنے انعامات کا وعدہ دیا ہے ان کو کسی نہ کسی رنگ میں اس عالم میں بھی پورا کر دیا ہے۔ اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ مومنین کو اس دنیا میں بھی کچھ حظ ان مراتب کمال سے مل جاتا ہے لیکن اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس صورت میں مومنین کو ایسا حظ مل جاتا ہے تو کیا وہ منعم علیہم میں داخل ہو کر نبی، صدیق، شہید اور صالح بن جاتے ہیں یا نہیں، صالح کے مرتبہ پر ایک مومن کا پہنچ جانا اس سے تو قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔ شہید اور صدیق کے مرتبہ پر پہنچنے پر بھی بہتری آیات شاہد ہیں۔ جیسے فرمایا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (البقرۃ ۲-۱۴۳) والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اولٰئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم (الحدید ۵۷-۱۹) لیکن بذریعہ ایمان بذریعہ اطاعت بذریعہ اعمال صالحہ کسی کا نبوت کے مرتبہ پر پہنچ جانا اس کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں ملیگا۔ بلکہ رسالت کے متعلق فرمایا اللہ اعلم حیث یجعل رسٰلتہ (الانعام ۶-۱۲۴) اللہ خود بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔ صدیقیت کا مقام شہادت کا مقام صالح کا مقام یہ سب والذین جاھدوا فینا کے ماتحت انسان کی کوشش اور سعی سے مل جاتے ہیں۔ جیسا کہ والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اولٰئك ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم سے صاف ظاہر ہے۔ ایمان جب اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو وہی صدیق اور شہید کا مقام ہے۔ ایمان کے لیے اس سے آگے کوئی مرتبہ نہیں۔ اکتساب کا کمال انسان کو صدیقیت کے مرتبہ تک ہی پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ خود اس لفظ کے معنی میں بھی میں نے دکھایا ہے کہ یہ کمال ایمان پر دلالت کرتا ہے۔

اس اُمت میں صرف مبشرات یا نبوت اپنے لغوی معنی میں ہے: نبوت اگر کوئی کمال ایمان کا مرتبہ ہوتا تو اس کا ذکر قرآن شریف میں ہونا چاہیئے تھا کسی حدیث میں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر نہ تو قرآن شریف نے کہیں فرمایا کہ مومن جب ایمان میں ترقی کرتا ہے تو اسے نبی بنا دیا جاتا ہے نہ کسی حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ہاں قرآن کریم یہ ضرور فرماتا ہے کہ لھم البشرٰی فی الحیٰوۃ الدنیا (یونس ۱۰-۶۴) مومنوں کو اس دنیا کی زندگی میں بشارتیں دی جاتی ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ تتنزل علیھم الملائکۃ (حٰم السجدۃ ۴۱-۳۰) کہ ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ اور صحیح حدیث میں ہے لم یبق من النبوۃ الا المبشرات نبوت سے کچھ باقی نہیں رہا مگر مبشرات۔ اور دوسری حدیث صحیح میں ہے لقد کان فی من کان قبلکم رجال یُکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن فی امتی احد فعمر تم سے پہلے لوگوں میں ایسے لوگ ہوتے تھے کہ جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوتا تھا گو وہ نبی نہ ہوتے تھے۔ میری امت میں اگر کوئی شخص ایسا ہے تو عمر ہے۔ پس معلوم

ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ پھر گروہ گروہ ہو کر نکلو یا اکٹھے نکلو ۶۸۷

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ اور تم میں سے وہ بھی ہے جو ضرور پیچھے رہ جاتا ہے پھر اگر تم کو مصیبت

ہوا کہ نبوت کا ایک جزو۔ نبوت کا ایک رنگ یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے ہمکلام ہونا اس کا وجود اس امت میں قرآن وحدیث سے ثابت ہے یہی وجہ ہے کہ اس پر قریباً قریباً امت کا اتفاق ہے کہ نبوت اپنے لغوی معنی کی رُو سے یعنی محض خدا سے ہم کلام ہونے کے معنی میں تو اس امت میں جاری ہے مگر نبوت اپنے خاص یا اصطلاحی مفہوم میں مسدود ہے۔ چنانچہ روح المعانی میں ہے ان النبوۃ عامۃ وخاصۃ والتی لا ذوق لھم فیھا ھی الخاصۃ اعنی نبوۃ التشریع وھی مقام خاص فی الولایۃ واما النبوۃ العامۃ فھی مستمرۃ سارےۃ فی اکابر الرجال غیر منقطعۃ دنیا و اخری یعنی نبوت عام ہے اور خاص۔ اور وہ جس میں اس امت کے لیے ذوق نہیں وہ نبوت خاصہ ہے یعنی تشریعی نبوت اور وہ ولایت میں مقام خاص ہے اور رہی نبوت عامہ سو وہ اکابر امت میں جاری و ساری ہے اور دنیا و آخرت میں غیر منقطع ہے۔

ولایت یا محدثیت: گویا نبوت عامہ درحقیقت ولایت کا ہی نام ہے اس لیے اس کو محدثیت کے نام سے بھی پکارا ہے۔ کیونکہ اس میں محض اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کا شرف ہے اور وہ دنیا اور آخرت میں حاصل رہے گا۔ لیکن نبوت خاصہ یعنی جسے اصطلاحی شریعت میں نبوت کہا جاتا ہے یا جس کا نام نبوت تشریعی ہے کیونکہ جو شخص اس منصب پر فائز ہوتا ہے وہ شریعت لاتا ہے یا شریعت میں کمی بیشی یا ترمیم تنسیخ کرنے کا مجاز ہے۔ وہ اس اُمّت میں بند ہے کیونکہ شریعت کو نبی کریم صلعم نے کمال تک پہنچایا۔

اب ہم آیت کو چھوڑ کر واقعات کو لیتے ہیں تو صحابہؓ کی اللہ اور رسولؐ کی کامل فرمانبرداری سے قرآن شریف بھرا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے لیے رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کی سند قرآن کریم میں موجود ہے۔ وہ اللہ سے راضی اور اللہ ان سے راضی، اس سے بڑھ کر کامل اطاعت کا کوئی مرتبہ تصور میں نہیں آسکتا۔ لیکن ایک طرف اگر صحابہ رضی اللہ عنھم کی کامل اطاعت ایسی صفائی سے ثابت ہے تو دوسری طرف یہ بھی صفائی سے ثابت ہے کہ کوئی صحابی نبوت کے منصب پر کھڑا نہیں کیا گیا۔ یعنی نبی نہیں بنایا گیا، بلکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا لو کان بعدی نبی لکان عمر۔ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا۔ گویا حضرت عمرؓ میں وہ جوہر موجود تھے۔ مگر نبی چونکہ اکتساب سے کوئی نہیں بنتا۔ اور اللہ تعالیٰ کی مصلحت نے نبوت کا دروازہ آنحضرت صلعم کے ساتھ بند کر دیا۔ اس لیے نبوت کسی کو نہیں مل سکتی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تیرہ سو سال تک کوئی نبی اس لیے نہیں بنا کہ کسی نے اللہ اور رسول کی کامل اطاعت نہیں کی۔ وہ دشمن اسلام ہیں اور اسلام کو دنیا میں بدنام کرتے ہیں۔ اگر صحابہؓ کے گروہ نے کامل اطاعت نہ کی تھی، تو کیا خدا نے بھی غلطی سے رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کی سند اُن کو دیدی۔ غرض اگر کامل اطاعت سے کوئی نبی بن سکتا تو صحابہ کا گروہ اس کا حقدار تھا۔ کہ ان میں سیکڑوں نبی ہوتے۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہُوا۔ اس لیے اطاعت سے نبوت کا ملنا ایک غلط خیال ہے جس کی صاف تردید قرآن سے، حدیث سے اور واقعات سے ہوتی ہے۔ ہاں ایک رنگِ نبوت بیشک اس امت کے کاملین کو مل جاتا ہے اور یہ رنگ صحابہؓ کو بھی ملا۔ اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ کسی صحابی کو کسی نبی سے اور کسی کو کسی نبی سے آنحضرت صلعم نے تشبیہ دی حتیٰ کہ ابوذر غفاری کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مشابہت دی۔

ع ۶۸۷ حِذر ۔ حَذَر کے معنی ڈرانے والی چیز سے اپنا بچاؤ کرنا ہیں۔ پس حِذر سے مراد ہے جس میں بچاؤ کا سامان ہو جیسے ہتھیار وغیرہ (غ)

انفروا ۔ نَفَر کے معنی ہیں کسی چیز سے بھاگنا یا کسی چیز کی طرف بھاگنا (غ) اس لیے نفور، نفرت کے معنی میں آتا ہے یعنی ایک چیز سے بھاگنا اور نفر لڑائی میں نکلنے کو بھی کہتے ہیں اور نفر خدا کی راہ میں علم سیکھنے کے لیے نکلنے کو بھی کہتے ہیں جیسے فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین (التوبۃ ۹-۱۲۲)

ثبات ۔ ثُبَۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایک منفرد جماعت یا گروہ باقی سے الگ کیا گیا (غ) اس کا مادہ ثوب ہے جس کے معنی لوٹ کر آنا ہیں اسی ماڈہ سے مثابۃ کے معنی ہیں تفرقہ کے بعد ان کے اجتماع کا مقام اسی سے ثبۃ ہے (ل)

دشمن کے مقابلہ کے لیے تیاری کی ضرورت: مومنوں کو یہ بتا کر کہ رسول اللہ صلعم کی اطاعت میں ان کے لیے کیسی کیسی برکات ہیں اب اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ سخت ترین حکم جس کی اطاعت کے لیے تم کو بلایا جاتا ہے وہ جنگ کا حکم ہے لیکن وہ بھی تمہاری اپنی بہتری کا ہی موجب ہے۔ کیونکہ دشمن تم کو نیست و نابود کرنے پر تُلا ہوا ہے اس لیے تم کو ہر طرح پر اپنا بچاؤ کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ تو سب سے پہلی آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ اپنے بچاؤ کا سامان کر لو۔ قرآن کریم الفاظ ایسے اختیار فرماتا ہے کہ وہ جنگ اور صلح دونوں حالتوں پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ اس حکم کے نزول کے وقت چونکہ دشمن نے تلوار کے ذریعہ سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا چاہا اس لیے اسلحہ یعنی ہر قسم کے سامان حرب کی تیاری ہی ضروری تھی اور آیندہ بھی ضروری رہے گی۔ لیکن جہاں جیسا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو قلم یا زبان یا تدابیر سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو اس وقت بالمقابل تیاری بھی انہی چیزوں کی چاہیئے۔ مقابلہ تو کسی نہ کسی رنگ میں قیامت تک لگا ہی رہے گا۔ پس جیسا مقابلہ ہے ویسی ہی تیاری کی ضرورت ہے اور اسی قسم کی احتیاط بکار ہے۔ اب مذہب پر حملہ ہے تو اسی رنگ میں مسلمانوں کو بھی مقابلہ کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں اگر مسلمان سلطنتیں ایک طرف سامان جنگ و فوج کی تیاری سے حد درجہ غافل ہیں، تو مسلمان علماء دوسری طرف دین پر حملوں سے لاپروا ہیں۔

مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿٧٢﴾

پہنچے، کہتا ہے اللہ نے مجھ پر انعام کیا، کہ میں اُن کے ساتھ موجود نہ تھا ۶۸۸

وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧٣﴾

اور اگر تم کو اللہ کی طرف سے فضل پہنچے تو بول اُٹھتا ہے گویا کہ تم میں اور اس میں کوئی دوستی نہ تھی، اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا ۶۸۹

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٧٤﴾

سو چاہیئے وہ لوگ اللہ کے رستہ میں جنگ کریں جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچتے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے، پھر قتل کیا جائے یا غالب آجائے تو ہم اس کو جلد بڑا اجر دیں گے ۶۹۰

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۭ ﴿٧٥﴾

اور تمھیں کیا (عذر) ہے کہ تم اللہ کے رستے میں جنگ نہ کرو اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی ولی بنا اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی مددگار بنا ۶۹۱

ع۶۸۸ لیبطئن۔ یبطئ۔ بطوٴ سے ہے جس کے اصل معنی ہیں چلنے میں جلدی نہ اٹھنا، بلکہ پیچھے رہ جانا (غ) اور اسراع یعنی جلدی چلنے کا نقیض ہے اور بطّاء متعدی بھی ہو سکتا ہے اور لازمی بھی یعنی دوسروں کو پیچھے رکھنا یا خود پیچھے رہ جانا اور چونکہ یہاں مفعول مذکور نہیں اس لیے لازمی ہی لیا جائیگا۔

ع۶۸۹ کان لم تکن بینکم وبینه مودّة۔ جملہ معترضہ ہے۔ کیونکہ اس کا یہ کہنا یا لیتنی کنت معهم اے کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ گویا ظاہر کرتا ہے کہ اس میں اور تم میں کوئی تعلق محبت نہ تھا۔ یہاں باوجودیکہ مومنوں کو کامیابی ہوئی ہے لیکن اس شخص کے اس قول کو کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا محل اعتراض ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دنیا کا مال حاصل کر لینا کوئی کامیابی نہیں۔

ع۶۹۰ چونکہ پچھلی دو آیتوں میں کچھ کم ہمتوں کا یا دو دِلے لوگوں کا ذکر کیا تھا اس لیے اب یہاں ان کا ذکر کرتا ہے جو سب کچھ اللہ کی راہ میں دے چکے ہیں اور اپنا کچھ بھی باقی نہیں رکھا اور بتانا یہ مقصود ہے کہ ان کی غرض دنیوی کوئی باقی نہیں رہی حتی کہ جنگ کرنے میں بھی ان کی کوئی غرض دنیوی باقی نہیں نہ وہ اپنی فتح کا نقارہ چاہتے ہیں نہ کسی مال غنیمت کے طالب ہیں۔ بلکہ پہلے وہ دنیا کے سارے سامان کو خدا کی راہ میں دے چکے ہیں۔ یہ کتنی کڑی مشکل ہے۔ خدا کی راہ میں جنگ کرنے کے لیے بلایا بھی اسے جاتا ہے جو اپنا سب کچھ خدا کے لیے قربان کر چکا ہو۔

مال غنیمت کا حاصل کرنا غرضِ جنگ نہ ہو: مال غنیمت کے خیال سے جنگ کرنا تو ایک طرف رہا۔ جنگ جیسی خطرناک چیز کو کس قدر نفسانی خیالات سے پاک کیا ہے قرآن کریم کی دیگر آیات سے بھی اس بات کی تصریح ہوتی ہے۔ مثلاً احد کی جنگ میں جب تیر اندازوں کے ایک حصّہ نے مال غنیمت کی خاطر اپنی جگہ کو چھوڑ دیا، تو ان کے ذکر میں فرمایا منکم من یرید الدنیا (آل عمران ۳-۱۵۱) یہ دنیا طلبی تھی جو مسلمانوں کو شایاں نہ تھی۔ ایسا ہی احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کتاب الجهاد میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص ہے کہ جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے وھو یبتغی عرضاً من اغراض الدنیا۔ اور وہ کچھ دنیا کی غرض بھی رکھتا ہے آپ نے فرمایا لا اجر له اس کے لیے کوئی اجر نہیں۔

ع۶۹۱ مالکم کے معنی تو یہی ہیں کہ تمہیں کیا ہوا، یا تمہیں کیا عذر ہے۔ مگر اصل غرض استفہام کی تحریص ہے اور یہ بتانا ہے کہ اب ترک جنگ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا۔

المستضعفین۔ ضعف سے ہے جو خلاف قوت ہے اور کمزور کو ضعیف کہتے ہیں اور اِسْتَضْعَفْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اس کو کمزور پایا۔ ترکیب میں یا تو

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ
الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ
كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾ ع
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ
وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا

جو ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں،
اور جو کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں جنگ کرتے ہیں
پس تم شیطان کے مددگاروں سے جنگ کرو شیطان کی
جنگ یقیناً کمزور ہے ح۶۹۲
کیا تم نے ان (کے حال) پر غور نہیں کیا جن کو کہا گیا کہ اپنے ہاتھوں
کو روکے رکھو اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو ح۶۹۳ پھر جب

مستضعفین مجرور ہے اور مراد ہے فی سبیل المستضعفین یا فی خلاص المستضعفین یعنی کمزوروں کی خاطر یا کمزوروں کی خلاصی کے لیے۔ اور یا منصوب علی الاختصاص۔ یعنی بالخصوص کمزور لوگ جو ایسا ایسا کہتے ہیں۔

الولدان - ولید کی جمع ولدان آتی ہے۔ بعض کے نزدیک ولد کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور ولید اصل معنی کے لحاظ سے نئے پیدا شدہ بچے اور بڑے پر یکساں استعمال ہوسکتا ہے۔ گو عام طور پر نئے پیدا شدہ پر بولا جاتا ہے (غ) اور ولید لڑکے کو بھی کہا جاتا ہے اور غلام کو بھی۔ اس لیے بعض نے یہاں ولدان سے غلام اور لونڈیاں مراد لی ہیں۔ مگر لڑکے مراد لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں اس لیے کہ چھوٹے بچوں پر ظلم کیا جاتا تھا اور دعا کرنے میں چھوٹے بچوں کے شامل ہونے میں بھی کوئی امر مانع نہیں، یہ صورت حال کا بیان ہے۔ یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ ان پر دعا کرنا فرض تھا۔

ھٰذہ القریۃ اشارہ مکہ کی طرف ہے جہاں اب تک مسلمانوں پر ظلم ہو رہے تھے جو وہاں سے بوجہ کمزوری کے ہجرت نہ کر سکتے تھے کیونکہ کفار مانع تھے۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ جنگ کرنے کی بڑی بھاری ضرورت کیا ہے۔ سو اوّل تو اس کو فی سبیل اللہ کہہ کر بتایا کہ جنگ کی ضرورت دین الٰہی کی حفاظت ہے کیونکہ مخالف اس کو تلوار سے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔ اور دوسری ضرورت یہ بتائی کہ کمزور مرد عورتیں بچے اہل مکہ سے دُکھ اُٹھا رہے ہیں اور ان پر مظالم ہو رہے ہیں اور وہ اس قابل نہیں کہ ہجرت کر سکیں۔ حضرت ابن عباس کی روایت بخاری میں ہے کہ میں اور میری ماں مستضعفین میں سے تھے۔ سلمہ بن ہشام۔ ولید بن ولید اور ابو جندل کے نام بھی بعض روایات میں آئے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر کس قدر ظلم تھا کہ باوجودیکہ ان کا بیشتر حصہ اب مدینہ میں جا چکا تھا، مگر پھر بھی جو بعض کمزور لوگ یا عورتیں یا بچے رہ گئے تھے وہ بھی ان کے ظلم کا تختۂ مشق ہو رہے تھے۔ ولی اور نصیر کے الگ الگ لانے میں یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ ولی تو محض حفاظت کے لیے بکار ہوتا ہے اور نصیر وہ ہے جو مدد دے کر ظلم سے ہمیشہ کے لیے چھڑا دے۔ جیسے وانصرنا علی القوم الکافرین سے ظاہر ہے۔ بعض کے نزدیک ولیا سے مراد ولایت اور نصیر سے مراد نصرت ہے اور جناب الٰہی سے ولایت و نصرت مانگنے کے معنی یہیں کہ اللہ تعالیٰ خود ولی و ناصر ہو۔

ح۶۹۲ یہاں مسلمانوں اور کفار کی اغراض جنگ کا قطعی فیصلہ کیا ہے۔ مومن اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، لیکن اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اس لیے جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرے گا وہ بھی جنگ کے ذریعہ سے کسی پر ظلم کرنا روا نہیں رکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ سب مخلوق کو یکساں رزق دیتا ہے اور یکساں حقوق اس نے سب کو دیئے ہیں اس لیے جو اس کی راہ میں جنگ کرے گا وہ دوسروں کے حقوق دبانے کے لیے کبھی جنگ نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اس لیے خدا کی راہ میں جنگ کرنے والا کسی فساد کی خاطر جنگ نہیں کر سکتا۔ طاغوت کے معنی ہی سرکشی کرنے والا یا حد بندیوں سے نکلنے والا ہیں۔ اس لیے یہاں فی سبیل الشیطان نہیں فرمایا بلکہ فی سبیل الطاغوت فرمایا حالانکہ ساتھ ہی دوسری جگہ قاتلوا اولیاء الشیطان اور کید الشیطان کے لفظ استعمال فرمائے ہیں۔ گویا مراد طاغوت اور شیطان سے ایک ہی ہے۔ لیکن فی سبیل الطاغوت کہنے میں اشارہ یہ ہے کہ کافر حد بندیوں سے نکلنے کے لیے زیادتی اور ظلم کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ گویا ان کی غرض جنگ سے یہ ہے، ان کو کوئی تکلیف پیش نہیں آئی جس کے دور کرنے کے لیے جنگ کرتے ہوں۔ بلکہ ایک امن سے رہنے والی قوم پر ظلم اور زیادتی کرنے کے لیے جنگ کرتے ہیں۔

اس آیت میں یہ پیشگوئی صریح الفاظ میں ہے کہ کفار جنگ میں مغلوب ہوں گے۔ کیونکہ آخر پر فرمایا کہ شیطان کی جنگ کمزور ہے۔ کید کے لیے دیکھو ح۵۰۷ حالانکہ اس وقت تو کفار کا سخت غلبہ تھا بلکہ سارا ملک ہی مٹھی بھر مسلمانوں کے خلاف تُلا ہُوا تھا۔ پس یہاں شیطان کی جنگ کو کمزور کہنے سے اس کے انجام کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے یعنی انجام کار کمزور ثابت ہو گی۔ اس میں یہ بھی بتایا کہ ظلم اور زیادتی اگر غالب بھی ہوں تو چند روز کے لیے ہوتے ہیں۔

ح۶۹۳ اصلاح نفس جہاد پر مقدم ہے: اس رکوع میں یہ ذکر ہے کہ منافق لڑائی میں نکلنے سے ڈرتے ہیں۔ ہاتھوں کو روکنے اور نماز کو قائم کرنے کا حکم تو عام ہے یعنی سب مسلمانوں کو، مگر ڈرنے والا اور باتیں بنانے والا گروہ مسلمانوں کا نہیں بلکہ منافقوں کا ہے اور ان کو فریق منہم اس لیے کہا کہ بظاہر منافق مسلمانوں کے اندر ہی ملے ہوئے تھے۔ لوگوں سے اس طرح ڈرنے والے جیسے خدا سے ڈرنا چاہیئے۔ متاع دُنیا کی آرزو کرنے والے۔ پھر آیت ۸۱ کے راتوں کو مشورہ کرنے والے، مومن نہیں ہو سکتے۔ اور یہ جو کہا گیا کہ ہاتھوں کو روک رکھو، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلعم کو یہ حکم تھا کہ جب تک دشمن جنگ میں ابتدا نہ کرے اس وقت

كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ
يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ أَوْ أَشَدَّ
خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا
الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ
لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٧٧﴾
أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ

ان پر جنگ ضروری ٹھیرائی گئی تو اُن میں سے ایک گروہ لوگوں
سے اس طرح ڈرنے لگا جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیئے بلکہ اس
سے بھی بڑھکر۔ اور بولے اے ہمارے رب تو نے ہم پر جنگ کرنا
کیوں ضروری ٹھیرایا، کیوں تھوڑی مدت تک ہم کو ڈھیل نہ دی ٦٩۴
کہہ دنیا کا سامان تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو
تقوےٰ کرے اور تم پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائے گا ٦٩۵
جہاں کہیں تم ہو گے موت تمھیں آلے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں

تک جنگ نہ کریں، اس لیے جب تک دشمن نے پہل نہیں کی آپ کو یہی ہدایت تھی کہ جنگ نہ کی جائے اور اس کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا حکم ملانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جنگ اسلام کی اصل غرض نہیں بلکہ ضرورت وقتی ہے اور اصل غرض جس کے لیے نبی آتا ہے تکمیل نفس انسانی ہے اس لیے جن باتوں سے تکمیل نفس انسانی ہوتی ہے انھیں اختیار کیا جائے، یعنی نماز کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ جنگ سے رُکنے اور نماز و زکوٰۃ کا حکم دینے کا اکٹھا بیان کر کے یہ بتا دیا کہ انسان کے لیے دو جہاد ہیں۔ ایک جہاد اصلاح نفس کے لیے، دوسرا حفاظت دین کے لیے۔ ان میں جہاد اصلاح نفس مقدم ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس وقت دی اور وہ بھی شروط جب پہلے ان کو اصلاح نفس کے جہاد میں کامیاب ثابت کر دیا۔ نماز یا عبادت سے انسان کے اندر فروتنی اور نرمی کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ سے انسانی ہمدردی قوت پکڑتی ہے۔ جو قومیں اپنی تکمیل نفس کے بغیر جنگوں میں پڑ گئی ہیں ان میں صرف اخلاق خشونت ہی پرورش پاتے رہے اور نرمی اور فروتنی کے اخلاق بالکل دب گئے نتیجہ یہ ہُوا کہ ظلم خونخواری محکوم کو ذلیل حالت میں رکھنا، انتقام کی سخت خواہش یہ باتیں ان کے اخلاق میں پیدا ہو گئیں یہی نقشہ آج کل کی برائے نام مہذب اقوام میں بھی ہم کو نظر آتا ہے جو جہاں تک دوسری قوموں سے تعلقات کا سوال ہے حقیقی اخلاق سے محروم ہیں وہ دنیوی فوائد ان سے جس قدر چاہیں اُٹھا لیں مگر اخلاق میں ان کے معلّم نہیں ہو سکتے۔ اور نہ محکوم قوموں کے دلوں میں ان کی کوئی عزت ہو سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے اعتدال اور میانہ روی کی حالت پر رکھنا تھا اور ان کو دنیا میں اخلاق کے معلّم بنانا تھا۔ اس لیے پہلے ان کے نرمی اور فروتنی کے اخلاق کو کمال کو پہنچایا اور جب مصائب برداشت کرتے کرتے اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور انسانوں کی ہمدردی کرتے کرتے ان میں نرمی اور محبت کے اخلاق کمال کو پہنچ گئے تب جنگ کی اجازت دی گئی۔ پس مسلمان سپاہی کو جنگ کے لیے تیار کرنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کو ضروری ٹھہرایا۔ آج جو لوگ قوم کو ذلت کی حالت سے نکالنا چاہتے ہیں ان کے لیے ان الفاظ میں صحیح ہدایت موجود ہے اگر وہ غور کریں محض حصول سوراج کے پیچھے پڑ جانا اور اصل غرض کو جو اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا دینا تھا ایسا پس پشت ڈالنا کہ ان باتوں کا تقریروں اور لکچروں میں نام بھی نہ آئے اس میں اور جس کی چاہے پیروی ہو، قرآن کی پیروی نہیں اسلام کی غرض تکمیل نفس انسانی ہے اس کے دو ہی بڑے عملی ستون ہیں نماز اور زکوٰۃ جو سب سے پہلے ان کی تعمیر کا فکر نہیں کرتا اس کا قدم صحیح راہ پر نہیں اور نماز اور زکوٰۃ میں غفلت قوم کو عملی منافقت کی حالت سے باہر نہیں نکلنے دیگی۔

ع٦٩۴ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ میں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے یعنی جس طرح ایک مومن خدا سے ڈرتا ہے کہ اگر اس نے بدی کی اس کو ترک نہ کیا تو انجام ہلاکت ہے اسی طرح یہ منافق لوگوں سے خائف تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (اَوْ بمعنی بَلْ بھی آتا ہے) کیونکہ مومن کے لیے خوف اور رجا دونوں ہیں یعنی اگر وہ ایک طرف بدی کی ہلاکت سے خائف ہے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت پر بڑی بڑی امیدیں بھی رکھتا ہے۔ مگر منافقوں کے لیے سوائے خوف کے کچھ نہ تھا اس لیے وہ ان کا خوف بڑھتا ہی جاتا تھا کہ آج مارے گئے یا کل۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو فرمایا يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (المنافقون ٦٣ - ۴)

جب نرم دلی اور محبت کے اخلاق مسلمانوں کے اندر خوب پرورش پا چکے اور مصائب کی چکّی میں وہ خوب پس کر ایک کمال انسانی کو حاصل کر چکے تو اب وہ وقت آ گیا کہ جنگ ان کے لیے ضروری ٹھہرائی گئی۔ کیونکہ اب کفار نے اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے تلوار ہاتھ میں اٹھالی۔ مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو دشمن کی قوت کو دیکھ کر اس سے مرعوب تھے اور مرعوب بھی اس قدر کہ وہ سمجھتے تھے کہ اب دشمن ہم کو بالکل تباہ ہی کر دے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی قوت کس قدر تھی اور ایسے حالات میں مال غنیمت کے لالچ سے مسلمانوں کا جنگ کرنا محض ایک کہانی ہے جس کی ذرہ بھی اصلیت نہیں۔ مال غنیمت کیا یہاں تو جان بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

ع٦٩۵ اس حصہ میں بتایا کہ حق کی حفاظت اور حمایت کے لیے لڑتے ہوئے مرجانا اس ذلیل زندگی سے بہتر ہے جس میں صرف یہی غرض ہو کہ دنیا کا کچھ مال کما لیا جائے حفاظت حقوق کے سامنے مال دنیا کی کچھ عزت نہیں۔ اور پھر فرمایا کہ ظلم نہیں ہو گا یعنی جو کچھ دنیوی آرام یا مال یا مفاد حق کی خاطر ترک کرو گے تو وہ قربانی

فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ
یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ
سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا
یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا ۞ ۷۸
مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ؗ وَمَاۤ
اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ

ہی میں (کیوں نہ) ہو[۶۹۶] اور اگر ان کو بھلائی پہنچتی ہے،
کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو دکھ پہنچتا
ہے، کہتے ہیں یہ تیری وجہ سے ہے۔ کہہ سب اللہ
ہی کی طرف سے ہے۔ پھر ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ بات
سمجھنا ہی نہیں چاہتے[۶۹۷]
(اے انسان) جو کوئی بھلائی تجھے پہنچتی ہے سو وہ اللہ سے ہے
اور جو دکھ تجھے پہنچتا ہے تو وہ تیرے ہی نفس سے ہے[۶۹۸] اور ہم نے

ضائع نہ ہوگی۔

ع۶۹۶ بروج۔ بُرْج کی جمع ہے اور وہ اصل میں ہر ظاہر مرتفع کو کہا جاتا ہے اور شہر کے بُرج اس کے قلعے ہیں جو شہر کی فصیل پر بنائے جاتے ہیں اور آسمان میں جو بروج کا ذکر ہے والسمآء ذات البروج (البروج ۸۵-۱) جعل فی السمآء بروجًا (الفرقان ۲۵-۶۱) تو وہ کواکب یعنی ستارے ہیں۔ اور قصر یعنی محل کو بھی بُرج کہا جاتا ہے (ت) اسی مادہ سے عورت کا تبرّج اپنے محاسن کو ظاہر کرنا ہے۔ یہاں بروج سے مراد قلعے ہیں۔
مشیّدۃ۔ شِید سے ہے جس کے معنی ہیں ہر ایک چیز جس سے دیوار مزین کی جائے چونہ ہو یا پتھر اور تشییید البناء سے مراد عمارت کا مضبوط کرنا اور بلند کرنا ہے (ل) دوسری جگہ قصر مشید (الحج ۲۲-۴۵) آتا ہے اور وہ واحد کے لیے (ل) ہے۔
فرائض کی ادائگی موت سے خائف نہ ہو: یہاں لولا اخرتنا کا جواب دیا ہے اور وہ عام الفاظ میں ہے یعنی اگر جنگ میں مرنے سے بچ بھی جاؤ تو آخر موت سے تو نہیں بچ سکتے۔ خواہ زندگی کے لیے کتنی ہی حفاظت کے سامان بنا لو حتّٰی کہ بڑے بڑے مضبوط اور بلند قلعوں میں پناہ گزین ہو جاؤ۔ اس کا یہ منشا نہیں کہ زندگی کی حفاظت نہیں کرنی چاہیئے۔ زندگی خدا کی دی ہوئی ایک نعمت ہے اور اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ مگر تقوٰی یہ ہے کہ جو فرائض اللہ تعالٰی نے انسان کے ذمہ ڈالے ہیں۔ ان کی ادائگی کے لیے بڑی سے بڑی نعمت الٰہی کو بھی قربان کر دے۔ فرائض کی ادائگی کے وقت موت سے خائف ہونا کم ہمتی اور نامردی ہے۔

ع۶۹۷ حسنۃ ہر ایک وہ چیز ہے جو انسان کو خوش کرے اور دنیوی اور دینی بھلائی دونوں پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سیئۃ اس کی ضد ہے یعنی جو چیز انسان کو غم میں ڈالے امور دنیوی سے ہو یا اُخروی سے۔ دیکھو ع۱۰۵ و ع۵۰۷
بھلائی اور دکھ اللہ کی طرف سے ہونے سے مراد: جب جنگ احد میں کچھ تکلیف پہنچی تو منافقوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ نبی کریم صلعم کی سوء تدبیر سے ہے۔ کیوں باہر نکلے حالانکہ اس کی اصل وجہ رسول اللہ صلعم کی نافرمانی تھی۔ یوں انہوں نے آنحضرت صلعم کی نافرمانی کے لیے ایک راہ نکال لی تھی۔ چنانچہ جنگوں میں یہی ان کا وتیرہ رہا کہ جہاں دشمن کو قوی اور زبردست دیکھا وہاں پیچھے ہٹ گئے جہاں مقابل پر دشمن کمزور ہوا آپ بھی قدم آگے بڑھ بڑھ کر رکھنے لگے۔ جہاں کامیابی ہوئی اور کچھ مال ہاتھ لگ گیا۔ کہہ دیا یہ اللہ کی طرف سے ہے ھٰذہٖ من عند اللہ دوسری جگہ حضرت موسٰی کے ذکر میں ہے (الاعراف ۷-۱۳۱) کہ جب نعمت سے متمتع ہوتے ہیں تو کہتے ہیں لنا ھٰذہٖ یہ ہمارے لیے ہے ہم اسی کے حقدار ہیں۔ یہی مطلب یہاں ہے اور جہاں کچھ تکلیف پہنچی اُسے رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کر دیا جیسا حضرت موسٰی کے ذکر میں ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں پر جب تکلیف آتی یطیّروا بموسٰی ومن معہ (الاعراف ۷-۱۳۱) فرمایا کامیابی ہو یا کچھ تکلیف ہو سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ یعنی اللہ تعالٰی کی قضا و قدر سے ہی ہے جیسا حضرت موسٰی کی صورت میں جواب میں فرمایا انّما طائرھم عند اللہ جس سے مراد ہے کہ یہ ان کے اپنے خیر و شر کی وجہ سے ہے یعنی اپنے اعمال سے۔ کیونکہ جو دکھ انسان کو اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچتے ہیں وہ بھی اللہ تعالٰی کی قضا و قدر سے ہی ہیں اسی کی زیادہ تصریح اگلی آیت میں فرمائی۔

ع۶۹۸ من اللہ اور من عند اللہ میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ من اللہ ان امور پر بولا جاتا ہے جو اللہ کی رضا اور اس کے حکم سے ہوں۔ اور من عند اللہ عام ہے جو کچھ قضا و قدر ہے خواہ وہ نتیجہ اللہ کی رضا سے واقع ہو یا اس کی ناراضگی سے اور خواہ خدا نے اس کام کا حکم دیا ہو یا اس سے منع کیا ہو وہ سب من عند اللہ ہے اس لیے پچھلی آیت میں فرمایا تھا کل من عند اللہ سب کچھ اللہ کی قضا و قدر سے ہے۔ ہاں سب کچھ اللہ کی رضا کے مطابق نہیں اس لیے یہاں فرمایا اصابك من حسنۃ فمن اللہ کیونکہ اللہ کی رضا تو یہی ہے کہ انسان کو حسنہ یعنی بھلائی پہنچے۔ اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ انسان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم (الشورٰی ۴۲-۳۰) اور فرماتا ہے ولا یرضٰی لعبادہ الکفر (الزمر ۳۹-۷) وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پر راضی نہیں ہوتا گو اس کی قضا و قدر یہ ہے کہ کافر بھی ہوں۔ پس جس راہ پر اللہ تعالٰی انسان کو چلاتا ہے اس کا مآل حسنہ یعنی بھلائی ہے اس لیے رسول کی اطاعت سے انسان کو

لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۞ ۷۹
مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ
تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ ۸۰
وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ
بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِىْ تَقُوْلُ ۚ وَاللّٰهُ
يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۸۱
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ
عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۸۲

تجھے سب لوگوں (کی بھلائی) کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کافی گواہ ہے ۶۹۹
جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ یقیناً اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور
جو پھر جائے تو ہم نے تجھے ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا ۷۰۰
اور کہتے ہیں اطاعت (قبول ہے) پھر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں
ان میں سے ایک گروہ رات کو اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے جو تُو
کہتا ہے اور اللہ لکھ لیتا ہے جو یہ راتوں کو مشورہ کرتے ہیں سو اُن
کا کچھ خیال نہ کر اور اللہ پر بھروسہ کر اور اللہ کافی کارساز ہے ۷۰۱
پھر کیا قرآن میں تدبّر نہیں کرتے اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے
ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے ۷۰۲

کبھی دُکھ نہیں پہنچ سکتا وہ تکلیفیں جو انسان ایک غرض کے حصول کے لیے اٹھاتا ہے یا جو مومن اللہ کی راہ میں خوش دلی سے اٹھاتا ہے وہ سیئۃ میں داخل نہیں۔ جیسا ایک طالب علم کا امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے یا ایک شخص کا معاش کے لیے محنت اور مزدوری کرنا سیئۃ میں داخل نہیں۔

ع۶۹۹ اسی پہلی بات کی یہاں تائید کی۔ اسی لیے رسول بنا کر بھیجنے کا ذکر کیا تو الی الناس نہیں فرمایا بلکہ للنّاس فرمایا یعنی لوگوں کی بھلائی کے لیے پس رسول کی اطاعت میں لوگوں کی بھلائی ہے۔ اللہ کافی گواہ ہے یعنی نتیجہ ظاہر کر دے گا کہ واقعی اس کے احکام کی فرمانبرداری میں تمہاری بھلائی ہے۔

ع۷۰۰ حفیظ۔ حِفظ نسیان کی ضد ہے اور اس قوت کے استعمال پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے اس لیے اس کے معنی تعہد اور رعایت کے ہو گئے ہیں (غ) اور یہاں رسول کے حفیظ نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس کا کام نہیں کہ لوگوں سے اطاعت کرا بھی لے یا ان کو معاصی یا دُکھوں میں پڑنے سے بچا بھی لے۔

اس آیت میں بالکل صاف کر کے بتا دیا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت خدا کی ہی اطاعت ہے۔ پہلی آیت میں وارسلنٰک للناس رسولًا فرما کر اور یہاں من یطع الرسول کہہ کر واضح کر دیا کہ رسول سے مراد خود محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اہل قرآن کی اس تفسیر کے لیے کہ رسول سے مراد رسالت ہے یہاں گنجائش باقی نہیں۔ اور آپ کی اطاعت ضروری ہے اور اسی اطاعت کا ذکر ہی اس رکوع میں ہے اور گو یہاں ذکر جنگ کا ہے جس سے منافق دل چُراتے تھے مگر حکم عام ہے رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کہہ کر بتا دیا کہ جو کچھ حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ خواہ وہ بات اللہ تعالیٰ بذریعہ جبرئیل قلبِ رسولؐ پر نازل کرے یعنی وحی متلو ہو یا آپ کے دل میں ڈال دے یعنی وحی خفی ہو۔

ع۷۰۱ بیّت۔ بات کے معنی ہیں رات کاٹی اور بَیّت کے لیے دیکھو ع۱۵۷ اور بَیَات کے معنی ہیں رات کے وقت دشمنی کا قصد کرنا۔ یأتیھم باسنا بیاتًا (الاعراف ۔۹۷) اور ہر ایک فعل جس کے متعلق رات کو تدبر کیا جائے اس پر بُیّتَ بولا جاتا ہے (غ)

معلوم ہوا کہ یہ ذکر منافقوں کا ہی چلا آتا ہے کیونکہ مومن آنحضرتؐ کے خلاف راتوں کو مشورے نہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ان مشوروں کو محفوظ کر لینے سے مراد یہ ہے کہ ان منصوبہ بازیوں کی سزا ان کو ضرور مل کر رہے گی۔ اور اللہ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت میں اشارہ ہے کہ ان کے مشوروں سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

ع۷۰۲ یتدبرون۔ دُبُر پیٹھ کو کہتے ہیں اس لیے اِدبار کے معنی پیٹھ پھیرنا آتے ہیں من ادبر وتولّٰی (المعارج ۔۱۷) اور تدبیر کے معنی ہیں التفکیر فی دُبُرِ الامور (غ) یعنی امور کے نتائج میں فکر کرنا۔

رسول اللہ صلعم کے حالات میں اختلاف کثیر کے باوجود قرآن میں اختلاف نہ ہونا اس کے منجانب اللہ ہونے پر دلیل ہے: یہ جو کچھ منصوبے منافق کرتے تھے اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ آنحضرت صلعم کی نبوت پر ایمان نہ لاتے تھے بلکہ خیال کرتے تھے کہ یہ رسول اللہ صلعم خود ہی باتیں بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کو قرآن شریف میں تدبر کرنے کو کہا ہے اور فرمایا کہ اگر قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ رسول اللہ صلعم کو اس قدر مختلف حالات زندگی میں سے گزرنا پڑا کہ ایک منصوبہ باز انسان ان مختلف حالات میں ایک حالت پر نہ رہ سکتا تھا بلکہ آج اگر ایک تجویز اپنی کامیابی کی سوچتا تو کل دوسری۔ اور آج اگر ایک خیال اس کے دل میں موجزن ہوتا تو کل دوسرا۔ ایک طرح پر منافقوں کو ان کی اپنی حالت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح ان کے اپنے حالات میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اور یہ منصوبہ بازیوں کا لازمی نتیجہ ہے مگر محمد رسول اللہ صلعم کی حالت پر غور کرو کہ

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهٖ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهٗ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

اور جب کوئی امن یا خوف کی بات ان کو پہنچتی ہے، تو اس کو پھیلاتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول اور اپنے میں سے صاحبان امر کی طرف لوٹاتے تو اسے وہ جان لیتے جو ان میں سے بات کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں[۷۰۳] اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی

کس طرح ایک زمانہ آپ پر وہ ہے کہ آپ اکیلے غار حرا میں مخلوق خدا کی بہتری کے لیے آہ وزاری کرتے ہیں تو دوسرا زمانہ وہ ہے کہ آپ اب مدینہ میں ایک چھوٹی سی ریاست کے بادشاہ ہیں۔ اور ایک زمانہ وہ ہے کہ چاروں طرف آپ کی صداقت اور راستبازی کا شہرہ ہے تو دوسرا زمانہ وہ ہے کہ سب لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور کوئی بات تک نہیں سنتا۔ کبھی چاروں طرف سے دکھوں اور تکلیفوں میں گھرے ہوئے ہیں تو دوسرے وقت چاروں طرف جاں نثار موجود ہیں۔ کبھی دشمن آپ کو نقصان پہنچا جاتے ہیں تو کبھی آپ فاتح اور غالب ہوتے ہیں۔ ایک وقت اگر امام نماز بن کر ساتھیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ منازل روحانی کی سیر کراتے ہیں تو دوسرے وقت جرنیل بن کر مشکل سے مشکل مقامات میں سے اپنی فوج کو نکال کر ان کو میدان جنگ میں فاتح کے مقام پر پہنچاتے ہیں۔ کبھی عدالت کا کام آپ کے سپرد ہے تو کبھی قانون سازی بھی آپ کو خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ ابھی بادشاہ کی حیثیت میں اختیار حکومت کو برت رہے ہیں تو دوسرے لمحے میں دوستوں کے اندر اس قدر انکساری سے بیٹھے ہوئے ہیں کہ آپ کو کوئی پہچان بھی نہیں سکتا۔ ابھی وعظ و نصیحت میں مصروف ہیں تو ابھی گھر میں بی بی کو کسی کام میں مدد دے رہے ہیں اور ان تمام حالات متفرقہ میں قرآن کریم آپ پر نازل ہوتا رہتا ہے۔ منصوبہ باز انسان کی حالت ایسے اوقات میں لازماً بدلتی رہتی ہے اور اسکے خیالات میں بھی اسی طرح تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ مگر قرآن کریم کو اوّل سے آخر تک پڑھ جاؤ وہ سب کا سب ایک ہی رنگ میں رنگین اور ایک ہی اثر سے متاثر ہے اس کے خیالات میں باوجود اختلاف مضامین کے ایک ہی رَو دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے تاریخی بیانات میں کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا۔ اس کے نظم میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا۔ اس کے احکام میں کوئی متضاد امر نہیں۔ اس کی فصاحت و بلاغت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اس آیت میں منافقوں پر ہی نہیں بلکہ قرآن کریم کے کل مخالفین پر اتمام حجت کیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں اختلاف کا نہ ہونا اس کے منجانب اللہ ہونے پر ایک قطعی دلیل ہے اور یہ اختلاف کا نہ ہونا صرف ان حالات مختلفہ کے لحاظ سے اپنے اندر ایک اعجاز کا رنگ رکھتا ہے۔ جن میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تیئیس سال کے عرصہ میں گزرنا پڑا۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے۔ لیکن دنیا کے سارے مذاہب پر قرآن شریف میں بحث ہے کبھی ان مذاہب کے پیرو آپ کی دوستی کا دم بھرتے ہیں کبھی سخت ترین دشمن ہیں، مگر قرآن کریم نے جو پہلو اُن کے متعلق ایک دفعہ اختیار کیا وہی آخر تک قائم رکھا۔ پھر آپ نے ان کی کتابوں کو پڑھا نہیں بایں ہمہ مکّی اور مدنی دونوں سورتوں میں کثرت کے ساتھ ان کی تاریخ کے حوالجات پائے جاتے ہیں۔ کس قدر کمال ہے کہ ان واقعات میں نہ باہم کوئی اختلاف ہے۔ نہ صحیح تاریخ سے اختلاف ہے۔ مسیح کے حالات کو چار انجیل نویس جو ملہم مانے جاتے ہیں لکھنے بیٹھتے ہیں تو باہم اس قدر اختلاف ہو جاتا ہے کہ مسیح کے نسب نامے تک نہیں ملتے اور صریح متضاد بیانات ان اناجیل میں موجود ہیں یہ لکھے پڑھے ملہمین کی حالت ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمّی ہونے کے باوجود توریت اور انجیل کے بکثرت حوالجات قرآن کریم میں موجود ہیں پھر ان میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ جہاں بائبل اور قرآن کا اختلاف ہے وہاں آج واقعات کی شہادت سے حق قرآن کریم کے ساتھ ثابت ہو رہا ہے جس کی مثالیں اپنے اپنے موقعہ پر ان نوٹوں میں دی جا چکی ہیں اور قرآن کریم کا مشہور جرمن منقد ہر شفلڈ جس نے بڑے غور سے قرآن شریف کو پڑھا ہے توریت و انجیل کے مضامین کے حوالجات کی کثرت کو قرآن کریم میں دیکھ کر یہاں تک گھبرایا ہے کہ اس کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے غور سے ان کتابوں کو پڑھ کر ان کے مضامین کو ایک نوٹ بک میں لکھ لیا تھا اور بطور اشارہ قرآن کریم میں ان کو لاتے رہے پھر بائبل کے پیغمبروں کے علاوہ دوسرے پیغمبروں کا ذکر بھی قرآن کریم میں آیا ہے مگر وہ بھی اختلاف سے اسی طرح پاک ہے۔ غرض کہ یہ ایک بے نظیر اعجاز قرآن کریم کا ہے۔

قرآن میں اختلاف کا نہ ہونا ناسخ منسوخ کو غلط ٹھہراتا ہے؛ ساتھ ہی ان الفاظ میں ان مسلمانوں پر بھی اتمام حجت کیا ہے جو قرآن کریم میں نسخ کے قائل ہوئے ہیں اس لیے کہ نسخ کو قبول کرنے کے یہ معنی ہیں کہ قرآن شریف کی بعض آیات کو بعض کے ساتھ تطبیق نہیں دی جا سکتی جس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن کریم میں اختلاف ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس میں اختلاف نہیں۔ پس قرآن کریم میں نسخ کا قبول کرنا قرآن کریم کے اس صریح دعویٰ کے خلاف ہے جو یہاں کیا گیا ہے اور یہاں ایک اور بھی لطیف اشارہ موجود ہے کیونکہ یہاں جب قرآن میں اختلاف نہ ہونے کا دعویٰ کیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ قرآن میں تدبّر کیوں نہیں کرتے اگر تدبّر کریں تو معلوم ہو گا کہ اختلاف کوئی نہیں اور یہی سچ ہے کیونکہ کوئی بھی آیت جس کی منسوخی کا ایک گروہ قائل ہُوا ہو ایسی نہیں جس کی عدم منسوخی کا دوسرا قائل نہ ہو۔ کیونکہ اس دوسرے کے نزدیک تدبّر کرنے سے دونوں آیات میں تطبیق ہو گئی پس قرآن کریم کا دعویٰ ثابت شدہ ہے اور جہاں سطحی نظر سے اختلاف معلوم ہوتا ہے وہیں تدبّر کرنے سے وہ اختلاف دُور ہو جاتا ہے۔

۷۰۳۔ یستنبطون۔ استنباط کا اصل نبط سے ہے اور نَبَطَ البئرُ کے معنی ہیں کنوئیں کو کھود کر اس کا پانی نکالا۔ اسی سے فقیہ کا استنباط ہے جب وہ اپنے فہم اور اجتہاد سے مخفی معنی کو نکال لیتا ہے اس لیے استنباط کے معنی استخراج ہیں (ت) یا ایک بات کی تہ تک پہنچ کر صحیح نتیجہ نکال لینا یہاں اولی الامر کے ساتھ استنباط کا لفظ لا کر بتا دیا کہ اصطلاح قرآن میں اولی الامر سے مراد صرف صاحب حکومت نہیں بلکہ فقہاء اور ائمہ اور مجتہدین بھی اس میں داخل ہیں۔

لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

رحمت نہ ہوتی تو تھوڑوں کے سوائے تم ضرور شیطان کے پیچھے لگے رہتے۔ ع۴۰۴

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

پس اللہ کی راہ میں جنگ کر، تجھے اپنی ذات کے سوا کسی اور کے لیے مکلف نہیں کیا جاتا اور مومنوں کو بہت ترغیب دے قریب ہے کہ اللہ ان کی جنگ کو روک دے جو کافر ہیں اور اللہ طاقت میں سب سے زیادہ قوی اور عبرتناک سزا دینے میں سخت تر ہے ع۴۰۵

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

جو کوئی بھلی بات سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملے گا۔ اور جو کوئی بُری بات کی سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملیگا اور اللہ ہر چیز پر قابو رکھنے والا ہے ع۴۰۶

پچھلی آیت گویا ایک جملہ معترضہ کے طور پر تھی۔ اب پھر منافقوں کی حالت کو بیان کرتا ہے کہ کوئی بات امن کی ہو۔ یعنی حالات عامہ کے متعلق یا خوف کے متعلق یعنی دشمن کی چڑھائی وغیرہ کے۔ تو یہ لوگ اسے بہت پھیلاتے ہیں تاکہ بدامنی پھیلے حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ ایسی باتوں کو اولی الامر کی طرف لوٹاتے۔ جو قوت استنباط رکھتے ہیں۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت کے اہل بھی وہی لوگ ہیں جو قوت استنباط کو کام میں لاسکتے ہیں یعنی بعض حالات سے ایک صحیح نتیجہ نکال سکتے ہیں۔

اس آیت سے مسائل شرعی میں استنباط کا مسئلہ بھی نکلتا ہے۔ کیونکہ استنباط مسائل یہی ہے کہ ایک مسئلہ کا صریح حکم موجود نہیں ہوتا یعنی صورت پیش آمدہ میں کچھ حالات مختلف جمع ہوتے ہیں ان کو قرآن شریف اور سنت پر پیش کرکے ایک صحیح نتیجہ اخذ کرنا ہوتا ہے۔

ع۴۰۴ اللہ کا فضل اور رحمت محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت ہی ہے۔ یہ اخلاق رذیلہ جن کا نظارہ منافقین میں نظر آتا تھا دور نہ ہوتے اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مکارم اخلاق کے ساتھ مبعوث فرماکر ان کا علاج نہ کیا ہوتا۔ یا منافقین کے انجام کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر بھی فضل کرے گا اور تم میں سے بہتوں کو شیطان کی پیروی سے نکال دے گا۔ ورنہ تم ایسی غلط راہ پر پڑے تھے کہ اس سے نکلنا مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے تمہاری دستگیری فرماکر تم میں سے اکثر کو اس حالت سے باہر نکال دیگا الا قلیلا کے معنی دونوں طرح پر ہوسکتے ہیں یوں بھی کہ تھوڑوں کے سوائے تم شیطان کے پیچھے لگے رہتے اور یوں بھی کہ تھوڑی صورتوں کے سوائے تم شیطان کے پیچھے لگے رہتے۔

ع۴۰۵ حرض۔ حَرَض وہ ہے جو کسی گنتی میں نہ ہو اور جس میں کچھ بھلائی نہ ہو اس لیے جو ہلاکت کے قریب پہنچ جائے اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے حتّٰی تکون حرضا (یوسف ۔ ۸۵) اور تحریض کے معنی ہیں ایک چیز کی خوبیوں کو بکثرت بیان کرکے اس پر تحریض دلانا گویا اس میں حرض کا ازالہ ہے (غ)

تنکیل۔ نکل سے ہے۔ جس کے معنی قید ہیں اور تنکیل اور نکال کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ایسی سزا دینا جس سے دوسرے کو ایسا فعل کرنے سے روک دیا جائے یا عبرتناک سزا دیکھو ع۹۵۔

جنگ کے لیے آنحضرتؐ اکیلے مکلف تھے؛ چونکہ منافقوں کے جنگ کے وقت پیچھے رہنے کا ذکر تھا اس لیے فرمایا کہ تمہارا جنگ کرنا تو دین اسلام کی حفاظت کے لیے ہے۔ پس کوئی اور کرے یا نہ کرے تم اکیلے ہی جنگ کرو۔ ہاں مومنوں کو بھی ترغیب دو۔ مگر مکلّف تم اپنی ذات کے لیے ہو، دوسروں کے لیے تم مکلف نہیں یعنی ان کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ اکیلے جنگ کرنے کا حکم بتاتا ہے کہ نبی کریم صلعم کا بھروسہ تعداد پر نہ تھا بلکہ نصرت الٰہی پر تھا۔ لکھا ہے کہ جنگ اُحد کے بعد جب لوگ بوجہ مصیبت اور تکلیف پیش آنے کے بہت پژمردہ ہورہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ میں اکیلا ہی دشمن کے تعاقب میں نکلوں گا۔ یہ آپ کا عزم تو آپؐ کی شجاعت پر دلالت کرتا ہے کہ قوت قلبی کس قدر تھی۔ مگر جاں نثاروں کا گروہ آپ کو تنہا کب چھوڑتا تھا۔ یہاں ساتھ ہی یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ کافر اس جنگ کو جو اسلام کے خلاف انہوں نے کی ہے جاری نہ رکھ سکیں گے اللہ تعالیٰ آخر کار ان کو مغلوب کرکے روک دیگا اور جنگوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔

ع۴۰۶ یشفع۔ شفع کے لیے اور شفاعت کے لیے دیکھو ع۷۱ یہاں مراد ہے کہ ایک شخص دوسرے کے ساتھ مل جائے اور اس کی اچھی یا بُری بات میں مدد کرے (غ) اور ایک اور قول نقل کیا ہے کہ شفاعت سے مراد یہاں یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کے لیے اچھا یا بُرا رستہ بنادے جس پر وہ چلے اور یوں اس کا شفیع بن جائے جیسا کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا من سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فلهٗ اجرها واجر من عمل بها ومن سَنَّ سُنَّةً سيّئَةً فعليه وزرها ووزر من عمل بها جو کوئی اچھی راہ نکالے اس کے لیے اس کا اجر ہے اور اس کا اجر بھی جو اس پر عمل کرے اور جو کوئی بُری راہ نکالے اس پر اس کا بوجھ ہے اور اس کا بوجھ بھی جو اس پر عمل کرے (غ)

کِفل اور کفیل کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ایسا حظ جس میں کفایت ہو گویا وہ اس کے امر کا متکفل ہوجاتا ہے یؤتکم کفلین من رحمته (الحدید ۵۷۔ ۲۸) مگر امام راغب

وَإِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿٨٦﴾

اور جب تم کو کسی دعا کے ساتھ دعا دی جائے تو اس سے بہتر کے ساتھ دعا دو، یا اسی کو لوٹا دو۔ بیشک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔۶۰۷

اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ﴿٨٧﴾

اللہ، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ ضرور تم کو قیامت کے دن تک جس میں کوئی شک نہیں جمع کرے گا اور اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللَّهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا ۚ أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ ۖ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ﴿٨٨﴾

سو تمھارے لیے کیا وجہ ہے کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہ بنو حالانکہ اللہ نے ان کو اس کی وجہ سے اوندھا کر دیا جو انھوں نے کمایا، کیا تم چاہتے ہو کہ اسے ہدایت کرو، جسے اللہ نے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دے تو تُو اس کے لیے کوئی راستہ نہ پائے گا۔۶۰۸

کہتے ہیں کہ یہاں کِفل کے یہ معنی نہیں بلکہ وہ اس کِفل سے مستعار ہے جو ردّی شے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور شدّت کے معنی میں متعارف ہو گیا ہے گویا مراد یہ ہے کہ جو بُرے فعل میں دوسرے کا مددگار ہوتا ہے اور راستہ بناتا ہے وہ بھی اس فعل بد کے بُرے نتیجہ کی شدت کو پائے گا۔

مقیت۔ قوت سے ہے جو انسان کے بقا کا موجب ہے جمع اقوات ہے وقدّر فیہا اقواتہا (حٰمٓ السجدۃ ۴۱-۱۰) اور مقیت سے مراد ہے جو ہر چیز کو قوت دیتا اور اس کی حفاظت کرتا ہے اس لیے اس کے معنی مقتدر یا حافظ ہیں (غ)۔

جب یہ فرمایا کہ نبی اکیلا ہی جنگ کرنے کا مکلّف ہے۔ اگر دین اسلام کی حفاظت معرض خطرہ میں ہو تو بتایا کہ یہ ایک نیک راہ کا قائم کرنا ہے جو لوگ آئندہ اس پر عامل ہونگے وہ خود بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے مگر ان کی اس نیکی کے ثواب کے مستحق محمد رسول اللہ صلعم بھی ہونگے۔ ایسا ہی منافق جو بری راہیں نکالتے ہیں اُن کا بوجھ بھی اٹھائیں گے جو بعد میں ان بُری راہوں پر چلیں گے۔ گو وہ چلنے والے خود بھی اپنا بوجھ اُٹھائیں گے۔

۶۰۷ تحیّۃ کا مادہ حیّ یا حیاۃ ہے جس کے معنی زندگی ہیں اور تحیّۃ اصل میں یہ ہے کہ دوسرے کو حیّاک اللہ کہے یعنی زندگی کی دعا دے پھر ہر ایک دعا پر اس کا استعمال ہوا ہے اور ایک دوسرے کو ملنے پر جو دعا دی جاتی ہے وہ بھی تحیّۃ ہے اور اسلام کا تحیۃ السّلام علیکم ہے (غ) اور اس میں دعا بھی ہے حضرت عیسٰی نے بھی حواریوں کو اسی سلام سے خطاب کیا تھا (لوقا ۲۴: ۳۶) مسلمانوں نے السّلام علیکم کو ترک کر کے جس قدر طریق سلام کے نکالے ہیں وہ سب خلاف قرآن وسنّت ہیں۔

السلام علیکم کی سنت: پچھلی آیت میں جو اچھی راہ بتانے والے کو ہمیشہ کے ثواب کا مستحق ٹھہرایا تو یہاں دعائے ملاقات باہمی کا ذکر کر کے بتا دیا کہ چھوٹے چھوٹے امور میں بھی ایک انسان دوسرے کے لیے اچھی راہ قائم کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ پس فرمایا کہ دعائے ملاقات جو باہم میل جول میں دن رات تم کو دینی پڑتی ہے اس میں بھی بھلائی کی راہ اختیار کرو اور اپنے بھائی کی دعا سے بہتر دعا اسے لوٹاؤ۔ کوئی السلام علیکم کہے تو جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہو جیسا کہ حدیث میں ہے اور یہ جو حکم ہے کہ چھوٹا بڑے کو پہلے السلام علیکم کہے تو اس میں بھی یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے سے بڑے کی زیادہ دعا کا مستحق ہوگا اور آخر پر فرمایا کہ اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے تو مراد یہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بھلائی کا بھی حساب رکھتا ہے اور اسے ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اور یوں یہ بھی بتا دیا کہ چھوٹی باتوں سے ہی بڑے بڑے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو حقیر مت سمجھو مسلمانوں میں السلام علیکم باہمی محبت کو بڑھانے کا موجب ہے اور حدیث میں افشائے سلام کا حکم ہے خواہ اپنے مسلمان بھائی کو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو۔ مگر یہ سنت بھی مسلمانوں کے اندر سے متروک ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کے ترک کرنے میں پُرانے اور نئے فیشن کے لوگ یکساں شریک ہیں۔

۶۰۸ ارکسھم۔ رَکس کے معنی ہیں کسی چیز کا سر کے بل اُلٹا کر دینا یا اس کے اوّل کا آخر کی طرف اُلٹا دینا۔ پس ارکسھم کے معنی ہیں ان کو ان کے کفر کی طرف لوٹا دیا (غ)۔

بخاری مسلم وغیرہما نے زید بن ثابت سے روایت بیان کی ہے کہ جو لوگ اُحد کی جنگ میں رستہ سے واپس آ گئے تھے یعنی وہ تین سو آدمی جن کو عبداللہ بن ابی رستہ سے واپس لے آیا تھا یہ آیت اُن کے بارہ میں نازل ہوئی۔ کسی نے کہا یہ عرینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے مدینہ کی چراگاہ پر ڈاکہ مارا تھا۔ کسی نے کچھ خیال ظاہر کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ خود مدینہ میں اور مدینہ کے اردگرد منافقین کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کے نفاق کے مختلف مدارج تھے ان کا ذکر مجملاً بیان کر دیا ہے۔ پچھلے رکوع میں یہ ذکر تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کرتے بلکہ ان کے خلاف منصوبے کرتے ہیں۔ یہاں یہ بتایا کہ مسلمانوں کو اُن سے کیا سلوک کرنا چاہیئے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جس طرح وہ کافر ہوئے اور یوں برابر ہو جاؤ، سو اُن میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں[۷۰۹]۔ لیکن اگر وہ پھر جائیں تو ان کو پکڑو اور ان کو قتل کرو جہاں کہیں انھیں پاؤ اور ان میں سے کسی کو دوست اور نہ مددگار بناؤ[۷۱۰]۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾

مگر جو ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے[۷۱۱] یا تمھارے پاس آئیں اس حال میں کہ ان کے سینے تنگ ہیں کہ تمھارے ساتھ جنگ کریں یا اپنی قوم کے ساتھ جنگ کریں اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کو تم پر قابو دے دیتا سو وہ تم سے ضرور لڑتے پس اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں پھر تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی درخواست کریں تو اللہ نے تمھارے لیے اُن کے خلاف کوئی راہ نہیں رکھی[۷۱۲]۔

ع۷۰۹ منافقوں کا پہلا گروہ: پہلے اس گروہ کا ذکر کیا جو باطن میں کافر ہیں مگر ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ان کے متعلق صرف یہی حکم دیا کہ ان میں سے کسی کو اپنا ولی نہ بناؤ یعنی ان کے ساتھ قرب و نصرت کا تعلق نہ رکھو۔ ہاں ظاہر میں مسلمانوں والا تعلق ان سے رکھو۔ اللہ کی راہ میں ہجرت سے مراد ایک تو دار الکفر سے نکلنا ہے جہاں فرائض مذہبی ادا کرنے دیئے جاتے ہوں۔ اور دوسرے بموجب حدیث المھاجر من ھاجر ما نھی اللہ عنہ مہاجر وہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔ تیسرے حفاظت دین کے لیے وطن کا ترک کرنا یا ان حالات کے مطابق جنگ کے لیے نکلنا۔ یہی تیسری قسم کی ہجرت یہاں مراد معلوم ہوتی ہے۔

ع۷۱۰ یہاں اسی گروہ کی دوسری حالت کا ذکر ہے کہ در پردہ عداوت رکھتا ہوا وہ اب یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ علانیہ دین اسلام سے پھر کر دشمنوں کے ساتھ جا ملا ہے۔ ان کے لیے وہی حکم ہے جو کفار کے لیے حکم ہے۔ ایسے لوگ مدینہ کے ارد گرد تھے۔ جو مسلمانوں کا ذرا غلبہ دیکھ کر اظہار اسلام کرتے اور پھر موقع پاتے تو علی الاعلان اسلام سے منحرف ہو کر مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے جیسا کہ عرینہ نے کیا جنھوں نے اسلامی چراگاہ پر ڈاکہ مار کر مویشی لوٹ لیے اور محافظوں کو قتل کر دیا۔ پس جو منافق علانیہ دشمنوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ کرنے میں شامل ہوئے وہ اب دشمن ہوئے اور میدان جنگ میں مقابل نکل آنے کی وجہ سے قتل کی سزا کے مستحق ہوئے۔

ع۷۱۱ ان الفاظ میں منافقین کے ایک تیسرے گروہ کا ذکر ہے جو اسلام کے بعد پھر علی الاعلان کافر تو ہو گئے ہیں۔ مگر ایسی قوم کے ساتھ جا ملے ہیں جس کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہے جیسے نبی کریم صلعم نے ہلال بن عویمر اسلمی سے معاہدہ کر لیا تھا کہ نہ وہ آپ کے ساتھ مل کر قریش سے جنگ کریں گے اور نہ قریش سے مل کر آنحضرت صلعم کے خلاف جنگ کریں گے۔ پس اگر کوئی شخص ایسی قوم سے جا ملے تو گو بوجہ عہد کی خلاف ورزی کے وہ قتل کرنے کے قابل ہو مگر معاہد قوم میں چلے جانے سے اس کے بھی وہی حقوق پیدا ہو گئے جو اس معاہد قوم کے ہیں۔

ع۷۱۲ حصرت۔ حصر کے معنی تضییق یا تنگی ہیں اور یہاں مراد ہے کہ ان کے سینے بخل اور بزدلی کی وجہ سے تنگ ہو گئے ہیں۔ یہ چوتھے گروہ کا ذکر ہے جو دین اسلام سے پھر کر کسی معاہد قوم کی پناہ میں تو نہیں گئے مگر خود نہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم کے ساتھ یعنی کفار کے ساتھ۔ اور مسلمانوں سے صلح کی درخواست کریں تو ایسے لوگوں سے بھی جنگ جائز نہیں۔

مرتد کب قتل ہو سکتا ہے: اس سے صاف معلوم ہوا کہ مرتدین کے ساتھ اسی وقت جنگ جائز ہے جب وہ مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ جا ملیں یا خود مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں۔ لیکن اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کریں تو گو وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر کفار سے بھی جنگ نہ کریں تاہم ان کو مارنا یا ان سے جنگ کرنا جائز نہیں۔ بنی مدلج کے ساتھ اسی حکم کے ماتحت صلح کی گئی۔ یہ حکم کبھی منسوخ نہیں ہوا۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ
وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ
اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا
اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكُمْ
جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ؏ (۹۱)
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا
خَطَـــًٔـا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـــًٔا فَتَحْرِيْرُ
رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ
اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ
لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ
وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ
فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ
مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ
مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ

تم کچھ اور لوگ پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں جب کبھی وہ فتنہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں اس میں اوندھے گر جاتے ہیں پس اگر وہ تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے صلح کی درخواست کریں اور نہ (اپنے ہاتھ روکیں تو ان کو پکڑو اور ان کو قتل کردو، جہاں انھیں پاؤ اور یہ وہ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلی دلیل دی ہے ۱۳؎

اور کسی مومن کو شایاں نہیں کہ وہ مومن کو مار ڈالے، مگر غلطی سے، اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خون بہا دے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے سوائے اس کے کہ وہ معاف کردیں ۱۴؎ پھر اگر (مقتول) ایسے لوگوں سے ہو جو تمھارے دشمن ہیں اور وہ مومن ہو تو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیئے، اور اگر ایسے لوگوں سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے، تو خون بہا دینا چاہیے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے اور ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیئے۔ پھر جو شخص نہ پائے تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھے (تاکہ) اللہ اس پر رحمت سے متوجہ ہو اور اللہ جاننے والا

ع۱۳؎ اس آیت میں ایک پانچویں گروہ کا ذکر ہے ان کی غرض صرف اسی قدر ہے کہ کبھی اسلام ظاہر کردیں تاکہ مسلمانوں کے دشمنوں میں نہ گنے جائیں مگر حالت یہ ہے کہ جب کافران کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے بلاتے ہیں (فتنہ سے مراد یہاں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا ہی ہے دیکھو روح المعانی جہاں اس سے مراد قتال المسلمین لی گئی ہے) تو اس میں اوندھے منہ گر جاتے ہیں یعنی مسلمانوں کے ساتھ اپنے عہد و پیمان کی کوئی پروا نہیں کرتے مگر یاں ان کو بھی اس قدر موقعہ دیا ہے کہ اگر وہ پھر بھی مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے کنارہ کشی کرلیں اور صلح کی درخواست کریں اور عملاً مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے اپنے آپ کو روک دیں تو ان کو کچھ نہ کہا جائے لیکن اگر ان باتوں میں سے کوئی بھی نہ کریں تو پھر بلا شبہ مسلمان حقدار ہیں کہ جہاں ان کو پائیں قتل کردیں کیونکہ سوائے اس کے اسلام باقی نہیں رہ سکتا تھا اور مسلمان مار دیئے جاتے۔

ع۱۴؎ دیۃ اس کا اصل وَدِیَ یَدِیْ سے ہے اور وَدْی کے معنی بہنا ہیں اسی مادہ سے وادی ہے۔ یعنی وہ مقام جس میں پانی بہتا ہے اور دیۃ میں واؤ کے عوض ھا لائی گئی ہے (ت) اور دِیَۃ خون کا معاوضہ ہے جو مقتول کے وارثوں کو دیا جاتا ہے۔

مسلمان کا مسلمان کو غلطی سے مار دینا: جب منافقوں کے متعلق احکام کا ذکر کیا تو اب بعض ملتی جلتی صورتوں کا ذکر فرماتا ہے اور وہ یہ کہ بعض وقت شبہ میں لوگ قتل ہو جاتے تھے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں مگر ہو سکتا ہے کہ یہ محض دھوکہ دینے کے لیے ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک شخص غلطی سے یہ سمجھ کر کہ ایک دشمن اس کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے اسے قتل کردے۔ پس شروع یہاں سے کیا کہ مومن تو مومن کو کبھی قتل کر ہی نہیں سکتا ہاں غلطی سے بعض وقت ایسا ہو جاتا ہے کہ مومن کے ہاتھ سے مومن قتل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک قوم دشمن تھی اور مسلمانوں کے ساتھ برسرپیکار مگر ایک شخص ان میں سے مسلمان ہو گیا دوسرے نے اسے مسلمان نہیں سمجھا، یا کسی اور کو مارنے کا ارادہ تھا غلطی سے وہ فعل اس پر واقع ہو گیا۔ اور بعض وقت اجتہاد میں خطا سے بھی ایسا ہو جاتا ہے کہ مومنوں میں جنگ واقع ہو جاتی ہے ایک شخص نیک نیتی سے حق اپنی طرف سمجھتا ہے۔ دوسرا اپنی طرف جیسا کہ حضرت علی اور معاویہ کے معاملہ میں ہوا یہ بھی قتل خطاء کا رنگ ہے۔ مگر اس کا مفصل ذکر سورۃ الحجرات میں آئیگا جہاں دو مومن گروہوں کے باہم قتال کا ذکر آتا ہے۔

عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٩٢﴾

حکمت والا ہے۔

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿٩٣﴾

اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے، اسی میں رہے گا اور اللہ اس پر ناخوش ہے اور اس پر لعنت کرتا ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کرے گا۔ ع۷۱۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿٩٤﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تمہیں السلام علیکم کہے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔ تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو۔ پس اللہ تعالیٰ کے پاس غنیمتیں بہت ہیں۔ تم بھی پہلے ایسے ہی تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا، سو تحقیق کر لیا کرو۔ ع۷۱۶ اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ ع۷۱۷

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ

(دونوں) برابر نہیں مومنوں میں سے بیٹھ رہنے والے جن کو کوئی دکھ نہیں، اور اپنے مالوں اور جانوں کے

ع۷۱۵ مومن کا قتل عمد: اس آیت کی شان نزول میں روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک مومن کو قتل کر دیا۔ پھر کفر کی طرف لوٹ گیا۔ مگر یہاں لفظ عام ہیں اس لیے یہاں یہ بحث ہوئی ہے کہ ایسے شخص کی توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں۔ الفاظ مذکورہ آیت سے عموماً یہ سمجھا گیا ہے کہ توبہ قبول نہیں ہوتی مگر چونکہ صراحت سے یہ بات ان الفاظ میں نہیں پائی جاتی کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور قرآن کریم نے اصول یہ قائم کیا ہے کہ ہر امر میں توبہ قبول ہوتی ہے وانی لغفار لمن تاب (طٰہٰ۲۰ - ۸۲) اور قتل نفس کے بارہ میں ہے اِلَّا من تاب وامن (الفرقان۲۵ - ۷۰) اور جن کفار نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا آخر خود نبی کریم صلعم نے ان کو معاف کر دیا اور وہ مسلمان ہوئے اس لیے یہ دعویٰ کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔ ہاں ان الفاظ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص گویا کافر کے حکم میں ہے اور جس طرح یہاں قرآن شریف نے مومن کو قتل کرنے والے کو کافر کے حکم میں رکھا ہے اسی طرح حدیث نے مومن کو کافر کہنے والے کو کافر کے حکم میں رکھا ہے۔ جیسا کہ بخاری کی اس حدیث میں ہے ایما رجل قال لاخیہ یا کافر فقد باء بہا احدھما یعنی جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہتا ہے تو وہ کفران دونوں میں سے ایک پر ضرور پڑتا ہے۔

خلود کے معنی ع۳۹ میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس موقعہ پر مفسرین نے بھی اس کے معنی لمبا زمانہ قبول کیے ہیں والمراد بالخلود المکث الطویل (ض)

ع۷۱۶ قتل بربنائے کفر نہیں بربنائے جنگ ہے: یہاں سمجھایا کہ گو چاروں طرف تمہارے دشمن پھیلے ہوئے ہیں تاہم جب تک یہ امر محقق نہ ہو جائے کہ ایک شخص تمہارا دشمن ہے اُسے قتل نہ کرو۔ پچھلے رکوع سے ظاہر ہو چکا ہے اور قرآن شریف کے اور مقامات سے بھی ثابت ہے کہ کافر کو صرف اس حالت میں قتل کرنا جائز ہے جب وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے والوں میں سے ہو۔ اس لیے عام الفاظ میں کہا کہ تحقیق کر لیا کرو کہ کون دشمن ہے اور کون نہیں اور صرف دشمن کو مارو، دوسرے کو نہیں۔

ع۷۱۷ سلام سے مراد تحیہ اسلامی ہے یعنی السلام علیکم کہنا جو ظاہر نشان اسلام کا ہے اور ایک مسلمان اس کے ذریعہ سے فوراً پہچان سکتا ہے کہ اس کا مخاطب مسلمان ہے یا نہیں۔

مغانم۔ مَغْنَم کی جمع ہے۔ مایُغْنَمُ اور غَنَم اصل میں بکریوں کو کہتے ہیں اس لفظ سے واحد نہیں آتا اور واحد کے طور پر شاۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے (ت) اور غُنْم جو اس سے مصدر ہے اس کے معنی ہیں بکریوں کا پالینا اور فتح کر کے ان کا حاصل کر لینا۔ پھر جو کچھ دشمن کی طرف سے فتح کے ذریعہ سے حاصل ہو اس پر یہ لفظ بولا گیا ہے (غ) مگر مطلق الفوز بالشئی کے معنی میں بھی غنم آیا ہے (ح۔ ز) جہاں اس کی سند میں اشعار نقل کیے ہیں اور حدیث میں ہے الصوم فی الشتاء الغنیمۃ الباردۃ جہاں غنیمۃ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دوسری حدیث میں غُنْم بمعنی زیادت آیا ہے (ن) اور یہاں بھی مغانم وسیع ہے۔

اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى
الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ
الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى
الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٩٥﴾

ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اپنے مالوں اور جانوں کے
ساتھ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ نے
درجہ میں بزرگی دی ہے اور سب سے اللہ نے اچھا
وعدہ کیا ہے اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ
رہنے والوں پر بڑا اجر دیکر بزرگی بخشی ہے ۶۱۸

دشمن قوم میں سے السلام علیکم کہنے والے کا حکم: یہاں اس مشتبہ حالت کا ذکر کیا ہے جب قوم تو دشمن ہو مگر ایک شخص اس میں سے مسلمان ہو چکا ہے تو اس کے مسلمان ہونے کا ثبوت اسی قدر کافی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو السلام علیکم کہے اس صورت میں گو وہ دشمن قوم کا ایک جزو ہو مگر اُسے قتل کرنا نہیں چاہیئے۔ بعض ایسے واقعات بھی ہوئے اور جب ایک شخص نے نبی کریم صلعم کے سامنے یہ عذر کیا کہ جس شخص نے اظہار اسلام کیا تھا وہ محض اپنی جان بچانے کے لیے تھا تو آپؐ نے فرمایا ھلا شققت قلبہ تو نے اس کا دل پھاڑ کر دیکھ لیا تھا کذٰلک کنتم من قبل میں یہ بتایا کہ تم بھی کلمہ شہادت کے اقرار سے اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ جو بات تمہارے لیے کافی تھی وہ دوسرے کے لیے بھی کافی ہے۔

دوسری بات جو یہاں فرمائی وہ یہ ہے کہ مال غنیمت کے لالچ سے کسی کو قتل نہ کرو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حصول مقصد کے اور بہتیرے سامان بنا دیئے ہیں۔ مالِ غنیمت کے خیال کو یہاں دُنیا کا سامان کہا ہے اور یوں مسلمانوں کو بتایا ہے کہ جو شخص مالِ غنیمت کا خیال دل میں لاتا ہے وہ خدا کی راہ میں جنگ نہیں کرتا۔

السلام علیکم اسلام کا نشان ہے: یہاں قرآن شریف تو فرماتا ہے کہ السّلام علیکم کہنے والے کو بھی یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں مگر آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اگر سارے حالات بھی ایک شخص کے ایک مسلمان کے دیکھتے ہوں تو پھر بھی کفر کا فتویٰ لگانے سے نہیں ٹلتے۔ اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض السلام علیکم کہنے والے کے متعلق فرمایا تھا کہ تم نے کوئی اس کا دل پھاڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بالکل خلاف جب ایک شخص عقاید اسلامی کا اظہار کرتا ہے تو کہدیتے ہیں کہ یہ باتیں یہ منافقانہ کہتا ہے۔ مسلمان کی شناخت قرآن کریم نے تو اتنی موٹی قرار دی ہے کہ وہ السلام علیکم کہتا ہو اور بس اور آج علماء کی یہ حالت ہے کہ ایک شخص کے اقوال کو لیکر بال کی کھال اتارتے ہیں اور تب صبر کرتے ہیں جب کافر بنا لیتے ہیں۔

۶۱۸ جب یہ خطرات ساتھ لگے ہوئے تھے کہ غلطی سے کوئی مومن ہی قتل نہ ہو جائے تو بعض لوگ خیال کر لیتے کہ پھر ایسے حالات میں جہاد کرنے سے بہتر یہی ہے کہ انسان گھر میں ہی بیٹھ رہے۔ اس لیے فرمایا کہ جہاد بڑی افضل چیز ہے اور جہاد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نہ جہاد کرنے والوں پر بڑی فضیلت دی ہے۔ یہاں جہاد سے مراد صرف قتال لیکر اہل تشیع نے غلطی کھائی ہے اور کہا ہے کہ حضرت علیؓ چونکہ حضرت ابوبکرؓ کی نسبت زیادہ غزوات میں شامل ہوئے اس لیے وہ افضل ہوئے حالانکہ جہاد وسیع ہے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی سب جنگوں میں شامل نہیں ہوئے۔ مگر آپ کا کام اس سے بھی بالاتر تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی خدماتِ دینی حضرت علیؓ سے بہت بڑھ کر ہیں اور وہ خدمات دینی عظیم الشان جہاد کا حکم رکھتی ہیں۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محض جہاد کا نہ کرنا خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں۔ کیونکہ نہ جہاد کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے حسنٰے کا وعدہ دیا ہے۔ جماعت اسلامی میں دونوں قسم کے لوگ رہیں گے ایک وہ بلند مرتبہ لوگ جو جہاد میں لگے رہتے ہیں گو وہ اپنے دنیا کے کام بھی کرتے ہوں۔ مگر ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی وقت اعلائے کلمۃ اللہ سے غافل نہیں ہوتے۔ ان کے مال اور ان کی جانیں دین اسلام کی خدمت کیلئے وقف ہوتی ہیں۔ ان کا معاش کا سامان بھی خدمت دین کا ہی حصہ ہوتا ہے دوسرے وہ لوگ جو دنیا کے کاموں میں زیادہ منہمک رہتے ہیں ہاں احکامِ خداوندی کو بھی بجا لاتے ہیں اور اپنے مالوں میں سے ضروری حق ادا کرتے رہتے ہیں دونوں کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ ان کا انجام اچھا ہوگا۔ مگر جہاد کرنے والوں کے بلند مراتب سے ان دوسرے لوگوں کو کچھ نسبت نہیں۔ مگر یہ عامہ حالات کا ذکر ہے۔ خاص صورتوں میں بعض وقت ضروریات قومی ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جب ہر ایک متنفس کے لیے جہاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے ان حالات میں قدم پیچھے ہٹانے والا عتاب کے نیچے ہوتا ہے۔ جیسا کہ جنگ تبوک میں جو لوگ بلا وجہ پیچھے رہ گئے تھے ان پر عتاب ہوا۔ کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلعم کے حکم کی پروا نہ کی اور یوں اس میں شک نہیں کہ اوپر (۸۴) فرمادیا کہ قتال کے لیے مکلف صرف رسول اللہ صلعم ہیں باقی مومنوں کو صرف تحریض دلانا ہے کہ وہ ان بلند مراتب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں جو جہاد سے ملتے ہیں اور ناقص حالت پر راضی نہ ہو جائیں۔

غیر اولی الضرر۔ ضر رسوء حال یا نقصان ہے خواہ انسان کے نفس میں علم یا فضل یا عفت کی کمی سے ہو اور خواہ اس کے بدن میں کسی عضو کے نہ ہونے سے یا کسی اور نقصان بدنی کی وجہ سے ہو اور خواہ حالت ظاہری میں مال اور جاہ کی کمی سے ہو (غ)

اولوا الضرر سے مراد اور ان کا حکم: یہاں آخری دو قسم کا ضرر مراد ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اندھے یا لنگڑے وغیرہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور بدنی نقصان کے سبب سے جہاد میں نکلنے سے معذور ہیں اور وہ لوگ جو سامان نہ رکھنے کی وجہ سے معذور ہیں۔ اور جہاد کو وسیع معنی میں لیکر یعنی اس میں اعلائے کلمۃ اللہ کو شامل کرکے علم کی کمی والے لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اولی الضرر مجاہدوں کے برابر ہیں اس لیے کہ اولی الضرر کی مختلف حالتیں ہیں ایسے لوگ جو جنگوں میں

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾

اپنے ہاں مرتبے اور حفاظت اور رحمت۔ اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿٩٧﴾

اُن کو جن کی فرشتے جان قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنیوالے ہیں وہ کہیں گے تم کس حال میں تھے کہیں گے ہم ملک میں بے بس تھے (فرشتے) کہیں گے کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے ع۷۱۹

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٩٨﴾

مگر وہ کمزور مرد اور عورتیں اور بچے، کہ نہ وہ حیلہ کر سکتے ہیں اور نہ راستہ پا سکتے ہیں ع۷۲۰

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿٩٩﴾

سو یہ امید ہے کہ اللہ انھیں معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے ع۷۲۱

زخمی ہو کر بیکار ہو گئے ہیں یا خدمتِ دین میں بیمار ہو گئے ہیں وہ خدا کے نزدیک ایسے ہی ہیں گویا کہ ان اعمال کو پھر بھی بجا لا رہے ہیں۔ پھر ایسے لوگ جو دل میں تڑپ رکھتے ہیں مگر سامان ان کے پاس موجود نہیں وہ بھی قاعدین سے بہر حال بڑھ کر ہیں اور عنداللہ اپنی نیت کے مطابق اجر حاصل کرنے والے ہیں۔ جیسا ایک قوم کا ذکر قرآن شریف میں ہے تولّوا و اعینہم تفیض من الدمع حزنًا الّا یجدوا ماینفقون (التوبۃ ۹-۹۲)

ع۷۱۹ ظالمی انفسہم نفس پر ظلم کرنے والے سے مراد وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو دل سے صداقت اسلام کے قائل ہو گئے مگر باوجود استطاعت کے ہجرت اختیار کر کے مسلمانوں کے ساتھ نہ ملے اور کفار کے غلبہ کی وجہ سے اظہار اسلام نہ کر سکے اور ایسے منافق بھی مراد ہو سکتے ہیں جو اظہار اسلام بھی کرتے اور پھر کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ بھی کرتے، مگر بظاہر مراد قسم اوّل کے لوگ ہی ہیں۔

پچھلے رکوع کے آخر پر یہ بتایا تھا کہ خدا کی راہ میں جہاد کرنا بیٹھ رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لیے اب ان لوگوں کو سمجھاتا ہے جو کسی کمزوری کی وجہ سے اپنے آپ کو بالکل بے بس سمجھ لیتے ہیں۔ مکہ میں بھی بہتیرے ایسے لوگ تھے اور باہر بھی تھے جو دل سے مسلمان تھے مگر اپنے گھر بار کو نہ چھوڑ سکے۔ حالانکہ وہ یہ استطاعت رکھتے تھے کہ ہجرت کر کے دین اسلام کی خدمت بجا لائیں اور اس حالت سکون پر راضی ہو گئے۔ ان لوگوں کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے کہا گیا ہے۔ پھر ان لوگوں کی کیا حالت ہے جو آج دین اسلام کے غلبہ سے مایوس ہو کر سکون پر راضی ہو بیٹھے ہیں اور دین اسلام کے پھیلانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے۔

ع۷۲۰ حیلۃ۔ حَوْل سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا تغیر اور اس کا دوسرے سے انفصال اسی سے حال ہے جس میں انسان اپنے آپ کو پاتا ہے بلحاظ تغیرات جسمانی یا تغیرات نفس وغیرہ کے اور اسی سے حَوْل بمعنی قوت ہے جیسے لاحول ولاقوۃ میں اور اسی سے حَالَ بمعنی حائل ہونے کے ہے حیل بینہم وبین مایشتہون (السبا ۳۴-۵۴) اور حیلۃ بھی اسی سے ہے جہاں واؤ یا سے بدل گئی ہے اور اس کے معنی ہیں مایُتَوَصَّلُ بہ الی حالۃٍ ما فی خفیۃ، یعنی وہ تدبیر جس سے خفیہ طور پر کسی حالت کو پہنچا جائے (رغ) نیز دیکھو ع۴۴۳ اور یہاں حیلۃ کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ کفار کے غلبہ اور اذیت کی وجہ سے کھلے طور پر ہجرت نہ کر سکتے تھے۔

پہلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو استطاعت کے باوجود کفار کے اندر سے نہ نکلے اور اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو فی الواقع نکلنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے نہ ان کو راستہ ملتا تھا۔ یہاں رستہ نہ پانے سے مراد ہجرت کے لیے رستہ پانا ہے اور ولدان سے مراد بچے بھی ہو سکتے ہیں اور غلام لونڈیاں بھی دیکھو ع۶۹۱ لکھا ہے کہ اس آیت کا علم مکہ میں ہوا تو جندب بن ضمرہ نے جو بہت بڈھے ہو گئے تھے اپنے بیٹوں سے کہا مجھے اُٹھا کر لے چلو کیونکہ میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کو استطاعت نہ ہو سو وہ اس کو چارپائی پر ڈال کر لے چلے مگر ان کا انتقال رستہ میں ہی ہو گیا۔ صحابہؓ میں احکام الٰہی کی تعمیل کی یہ روح وہ نمونہ ہے جس کی نظیر دُنیا کی اور کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔

ع۷۲۱ مراغم۔ رغام اور رَغم کے معنی مٹی یا باریک مٹی ہیں اسی سے محاورہ علیٰ رغم انف ہے جس سے مراد ذلت قبول کرنا ہے۔ جیسے معقل بن یسار کی

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي
الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ
يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى
اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٠﴾ ع
وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ڰ اِنْ خِفْتُمْ
اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ
كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾

اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے وہ زمین میں بہتیری جگہ اور کشائش پائے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتا ہوا اپنے گھر سے نکلے پھر اس کو موت آئے تو اس کا اجر ضرور اللہ کے ذمہ ہو چکا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کو کم کرلو۔ اگر تمہیں ڈر ہو کہ جو کافر ہیں وہ تمہیں تکلیف پہنچائیں گے۔ کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں ع۲۲۲

حدیث میں کہ انہوں نے نزولِ آیت پر اپنی ہمشیرہ کی شادی اسی خاوند سے جس نے طلاق دیدی تھی قبول کی تو کہا رغم انفی اللہ تعالیٰ (ت) یعنی خدا کے لیے ذلت کو قبول کرتا ہوں اور مجازاً مراغمۃ سے مراد کسی کو چھوڑنا اور ناراض ہونا ہے اور مراغم بھاگنے کی جگہ، اور جانے کی جگہ کو کہا جاتا ہے اور یہی یہاں مراد ہے (ت)

مطلب یہ ہے کہ جب واقعی ہجرت کی ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ جگہ بھی مہیا کر دیتا ہے جیسے مسلمانوں کو مدینہ میں جگہ مل گئی۔ یا اس سے پیشتر حبش میں جگہ مل گئی۔ پس جب ضرورت ہجرت واقع ہو جائے اور بدوں ہجرت چارۂ کار نہ ہو تو پھر اس خیال سے ہجرت نہ کرنا کہ جگہ نہیں ملے گی صحیح نہیں اور یہ جو فرمایا کہ اگر رستہ میں ہی مرجائے تو اس کا اجر اللہ پر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کی غرض تو خدمت دین تھی ایک شخص مرگیا خدمت کا موقعہ نہ ملا مگر اللہ تعالیٰ اس کو اس کی نیت کے مطابق اجر دے گا۔

حالات موجودہ میں ہجرت: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہمیشہ ہی سچا ثابت ہوا ہے اور سچا ثابت ہوگا۔ پس یہ ناممکن ہے کہ واقعی تو ضرورت ہجرت ہو اور ہجرت محض اس لیے ترک کی جائے کہ ہجرت کی جگہ کوئی نہیں۔ یہ خدا کا وعدہ ہے کہ ہجرت کی جگہ ضرور مل جائے گی۔ اس لیے معلوم ہوا کہ پچھلے ایام میں جو تحریک ہجرت تھی۔ اس کے لیے فی الواقع ضرورت صحیحہ پیش نہ آئی تھی۔ روئے زمین پر چالیس کروڑ مسلمان ہیں اور کم وبیش سب عیسائی طاقتوں کے اثر کے نیچے ہیں۔ اب چالیس کروڑ کے لیے کوئی ہجرت کی جگہ نہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی مشکلات کا حل یہ نہیں کہ وہ سب کے سب عیسائی طاقتوں کی حکومت سے ہجرت کر کے نکل جائیں اگر علم الٰہی میں یہ علاج ان مشکلات کا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے لیے سامان بھی پیدا کر دیتا۔ ان سامانوں کا نہ ہونا یقینی شہادت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کی مشکلات کا علاج نہ ہجرت ہے اور نہ قتال جو بدوں ہجرت ہو نہیں سکتا۔ بلکہ ان کا علاج اپنی اصلاح ہے جس کی طرف مسلمان متوجہ نہیں ہوتے اور اس لیے قدم قدم پر ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔

ع۲۲۲ قصر صلوٰۃ سے مراد: تقصروا من الصلوٰۃ۔ قصر کم کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ تصریح نہیں کی کہ قصر ارکان صلوٰۃ میں ہو یا تعداد رکعات میں۔ مگر سنت صحیحہ سے سفر کی حالت میں قصر رکعات میں ہی ثابت ہے۔ من الصلوٰۃ کہہ کر بتا دیا کہ یہ قصر بعض نمازوں میں ہے سب میں نہیں۔ چنانچہ ظہر، عصر، عشا میں ہی چار رکعت کی جگہ دو رکعت سفر میں پڑھی جاتی ہیں۔ قصر صلوٰۃ کی ضرورت اس صورت میں فرمائی ہے۔ جب حالت سفر ہو۔ ضرب فی الارض کے معنی کے لیے دیکھو ع۸۸ سفر کی حالت کیا ہے اس کے لیے دیکھو ع۲۲۵ یہاں گو قصر صلوٰۃ ایک رخصت کے رنگ میں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جب خود اس کو ایک ضرورت کے مقام پر رکھ کر رخصت دی ہے تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا بھی درست نہیں اور نبی کریم صلعم سے سفر میں قصر صلوٰۃ پر ہمیشگی اختیار کرنا ثابت ہے اور یہ حدیث کہ آپ قصر بھی کرتے تھے اور پورا بھی کرتے تھے صحیح نہیں جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے پس سفر میں نماز کو قصر کرنا چاہیئے یعنی صرف فرض ادا کرے اور وہ بھی جن نمازوں میں چار ہیں ان میں صرف دو ادا کرے جب فرض کم ہو گئے تو نوافل خود ساقط ہو گئے۔ فجر کی دو سنتیں جو مؤکدہ ہیں اور نبی کریم صلعم نے کبھی ترک نہیں کیں اور وتر ادا کرلے۔ اور اس آیت کا تعلق ماقبل سے یہ ہے کہ جب جہاد اور ہجرت کی تحریص دلائی اور اس پر زور دیا تو یہ صورتیں سفر کو چاہتی ہیں پس نماز سفر کا حکم اور اس کے ساتھ ہی نماز جنگ کا حکم بیان فرما دیا۔

مگر علاوہ سفر کے یہاں قصر کے لیے بظاہر ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ کافروں کے تکلیف پہنچانے کا خوف ہو۔ تو کیا قصر نماز صرف خوف کی حالت میں ہے اور امن کی حالت میں نہیں؟ جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلعم سے ہر قسم کے سفر میں قصر ثابت ہے اور اسی پر امت کا تعامل ہے۔ یعلی بن اُمیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ سے سوال کیا کہ باوجود حالت امن میں ہونے کے آپ قصر کیوں کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ جس بات پر تمہیں تعجب ہوا ہے اس پر مجھے بھی تعجب ہوا اور

وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوْٓا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى أَنْ تَضَعُوْٓا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾

اور جب تو ان کے درمیان ہو پھر ان کے لیے نماز قائم کرے، تو چاہیئے کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو اور چاہیئے کہ وہ اپنے ہتھیار لیں پھر جب سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں اور چاہیئے کہ ایک دوسرا گروہ جنھوں نے نماز نہیں پڑھی آئے پھر وہ تیرے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لیے رہیں۔ کافر چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے اسباب سے غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اگر تمھیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو، یا تم بیمار ہو تو اپنے ہتھیار اتار رکھو اور اپنا بچاؤ لیے رہو، یقیناً اللہ نے کافروں کے لیے رُسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے [۲۲۳]

ہیں نے رسول اللہ صلعم سے یہی دریافت کیا تو آپ نے فرمایا صدقۃ تصدق اللہ بھا علیکم فاقبلوا صدقتہ یعنی قصر صلوٰۃ ایک صدقہ ہے جو اللہ نے تم پر کیا پس اس کے صدقہ کو قبول کرو۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ قصر صلوٰۃ یعنی چار کی بجائے دو رکعت فرض خوف سے مشروط نہیں۔ پس اس حدیث اور سنت صحیحہ ثابتہ سے معلوم ہوا کہ قصر صلوٰۃ دو طرح پر ہے ایک چار رکعت کی بجائے دو رکعت ظہر، عصر، عشاء میں۔ اور یہ صرف حالتِ سفر سے مشروط ہے اور دوسرا وہ قصر جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے جو حالتِ خوف سے مشروط ہے یعنی دو رکعت کی بجائے ایک رکعت باجماعت ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلا جانا۔ اور قرآن کریم کے الفاظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ کفار کے تکلیف پہنچانے کے خوف کا یوں کوئی ازالہ نہیں ہو سکتا کہ چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھ لی جائیں۔ صرف اتنے وقت کی کمی خوف کا علاج نہیں۔ دشمن اتنی دیر میں کہ دو رکعت ادا کی جائیں حملہ کر کے کام تمام کر دیگا بلکہ خوف کا علاج وہی ہے جو خود اگلی آیت میں بیان فرمایا کہ ایک گروہ دشمن کے مقابل رہے اور جب دوسرا گروہ ایک رکعت ادا کر کے دشمن کے مقابل پر چلا جائے تو پہلا گروہ امام کے ساتھ دوسری رکعت باجماعت ادا کر لے۔ تا دشمن نماز پڑھنے والوں پر حملہ ہی نہ کر سکے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بجائے چار کے امام نے بھی صرف دو رکعت ادا کی ہیں اور مقتدیوں نے امام کے ساتھ صرف ایک ایک رکعت ادا کی ہے۔ پس چار رکعت کی بجائے دو رکعت کا ہونا شرط اوّل کے ماتحت ہے یعنی سفر کی وجہ سے۔ اور دو رکعت کی بجائے صرف ایک ایک رکعت باجماعت ادا کرنا شرط دوم کی وجہ سے ہے یعنی دشمن کے خوف سے اور دشمن کے خوف کا یہی دوسرا قصر علاج ہے نہ پہلا قصر۔ اگر محض چار رکعت کی جگہ دو رکعت دشمن کے خوف کا علاج ہوتا۔ تو یہ دوسرا علاج نہ بتایا جاتا۔ پس اس سے صاف ثابت ہے کہ قرآن کریم کا منشاء یہی تھا جو رسول اللہ صلعم نے سمجھا اور عمل کر دکھایا یعنی سفر کی وجہ سے چار رکعت کی جگہ دو رکعت ادا کرو۔ اور خوف کی وجہ سے دو رکعت کی جگہ باجماعت صرف ایک رکعت ادا کر لو۔ اس سے اگر ایک طرف قرآن کا پُر حکمت کلام ہونا معلوم ہوتا ہے تو دوسری طرف نبی کریم صلعم کا وحی خفی سے اس کے باریک سے باریک مطالب پر آگاہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے من الصلوٰۃ کے بعد وقت اسی معنی کا موید ہے۔

[۲۲۳] عین حالت جنگ اور میدان جنگ میں ہونے کی صورتیں الگ الگ ہیں: حالت جنگ میں جب دشمن کا خوف ہو ایک صورت فان خفتم فرجالًا او رکبانا (البقرۃ: ۲۳۹) جیسا کہ ۳۰۸ میں دکھایا گیا وہ ایسے خوف کی حالت ہے۔ جب جماعت کا قیام نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری صورت یہاں بیان فرمائی ہے۔ اسی لیے یہاں فرمایا فاقمت لھم الصلوٰۃ یعنی ایسی حالت ہو کہ نماز باجماعت ہو سکتی ہے۔ ہاں دشمن کی طرف سے حملہ کا خوف ہے اور ظاہر ہے کہ میدانِ جنگ میں دشمن ایسے موقعہ کو ہاتھ سے نہ دے گا جب مسلمان مشغول نماز ہوں۔ پس یہ وہ صورت ہے جب میدانِ جنگ میں ہونے کی وجہ سے دشمن کے حملہ کا خوف ہے مگر فی الواقع حالت جنگ نہیں۔ کیونکہ اس میں اس قدر اہتمام بھی مشکل ہے اور اسی لیے یہاں بارش وغیرہ کی صورت میں ہتھیار کے رکھ دینے کی بھی اجازت ہے۔

غزوۂ ذات الرقاع میں میدانِ جنگ میں نماز: روایات میں اس بارہ میں اختلاف ہے کہ اس نماز کی کیفیت کیا تھی۔ مگر ترجیح اس روایت کو ہے جسے بخاری اور مسلم اور اصحاب سنن ثلاثہ اور امام احمد نے بیان کیا ہے اور جس کے مطابق حضرت علیؓ۔ ابن عباسؓ۔ ابن مسعودؓ و دیگر صحابہ کا مذہب ہے یعنی یہ کہ غزوۂ ذات الرقاع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں نماز ادا کی کہ ایک گروہ نے آپ کے پیچھے صف باندھی اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابل پر رہا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت ادا کر چکے تو آپ حالتِ قیام میں رہے یہاں تک کہ جو گروہ آپ کے پیچھے تھا وہ دوسری رکعت ادا کر کے پیچھے ہٹ گیا اور دشمن کے مقابل پر ہو گیا اور دوسرا گروہ جو پہلے دشمن کے مقابل پر رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑا ہوا اور آپ نے دوسری رکعت اس کے ساتھ ادا کی اور جب آپ نے سلام پھیرا تو اس گروہ نے اُٹھ کر بقیہ رکعت پوری کر لی۔ بعض روایات میں صرف ایک ہی رکعت کا ذکر ہے۔ یعنی مقتدیوں نے صرف ایک ہی رکعت باجماعت ادا کر کے نماز ختم کر لی۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرو اور جب مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو (اصلی حالت پر) قائم کرو، نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں فرض کی گئی ہے ۴۲۴

وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۗ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۗ
ع وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

اور (دشمن) قوم کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو، اگر تم دکھ اٹھاتے ہو تو جس طرح تم دکھ اٹھاتے ہو وہ بھی دکھ اٹھاتے ہیں اور تم اللہ سے وہ امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۴۲۵

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۗ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾

یقیناً ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اُتاری ہے تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے علم دیا ہے اور دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بننا۔ ۴۲۶

ع۴۲۴ یہاں اس حالت کی نماز کو قضائے صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ اور حالت امن کی نماز کو اقامت صلوٰۃ سے تعبیر کیا کیونکہ اقامت میں سب شرائط کا پورا کرنا آتا ہے جو حالت خوف میں نہیں ہو سکتیں جس سے معلوم ہوا کہ نماز سفر بحالت خوف میں اور نماز سفر بحالت امن میں فرق صرف یہ ہے کہ حالت خوف میں سب شرائط پوری نہیں ہو سکتیں اور یہ گویا دوسری قسم کا قصر ہے۔ نہ قصر تعداد رکعات۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے عام لفظ قصر صلوٰۃ ہی اختیار کیا ہے اور تعداد رکعات میں قصر کا ذکر نہیں کیا۔ گویا دو رکعت کی بجائے ایک رکعت جماعت کے ساتھ ادا کرنا بھی ایک رنگ قصر ہے اور اگر ایک ہی رکعت کا ادا کرنا لیا جائے، تو یہ قصر ظاہر ہے۔

ع۴۲۵ اس آیت کا تعلق ماقبل سے یہ ہے کہ وہاں دشمن سے اپنا بچاؤ کرنے کا ذکر ہے حتّٰی کہ نماز کے وقت بھی اپنا بچاؤ کر لینا چاہیئے اور یہاں یہ ذکر ہے کہ دشمن کا پیچھا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر دشمن کا پیچھا کرنے میں ہشیاری دکھائی جائے تو یہ خود اپنے بچاؤ کا سامان ہے اور یہ جو فرمایا کہ تم وہ امید رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے تو یہ ان صریح پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے جن میں اسلام کے آخری غلبہ کی خبر دی گئی تھی۔ اور جو مسلمانوں کے لیے قوت کا موجب تھیں۔

ع۴۲۶ ارٰىكَ اللّٰهُ کے معنی یہاں علّمك اللّٰه ہیں جو اللہ نے تجھے علم دیا ہے (غ) اور رؤیة بھی جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس کے معنی علم ہوتے ہیں (غ)

خائن۔ خیانت کرنے والا۔ اور خیانۃ اور نفاق اصل میں ایک ہیں خیانت باعتبار عہد و امانت کہا جاتا ہے اور نفاق باعتبار دین۔ اور خیانۃ سے مراد ہے حق کی مخالفت جو خفیہ طور پر نقض عہد سے کی جائے (غ) اور خوّان جو آگے آتا ہے اس سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔

خصیم۔ خَصم جھگڑا کرنے کو کہتے ہیں۔ اور خصیم وہ ہے جو کثرت سے مخاصمت کرے (غ)

طعمہ بن ابیرق کا واقعہ: منافق جو اسلام کا اظہار کرتے تھے، تو وہ سمجھتے تھے کہ ضرورت کے وقت مسلمان کہلانے کی وجہ سے ہماری رعایت ہو گی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم میں تو سخت ترین دشمن کے ساتھ اور بڑے سے بڑے دوست کے خلاف بھی عدل کا حکم تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کے بارے میں یہ خاص حکم اپنے نبی پر اُتارا۔ تاکہ ان کی یہ جھوٹی امیدیں منقطع ہو جائیں۔ ایک خاص واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایک انصاری طعمہ بن ابیرق تھا۔ اس نے ایک دوسرے شخص کے گھر سے ایک زرہ چُرائی اور پھر اس کو ایک یہودی کے پاس رکھ دیا۔ جب تحقیقات شروع ہوئی اور زرہ کا اثر طعمہ کے گھر تک پہنچا اور آخر وہ یہودی کے گھر سے برآمد ہوئی تو اس نے طعمہ کا پتہ بتایا مگر اس نے انکار کیا اور اس کے ساتھیوں نے بھی رسول اللہ صلعم کے سامنے اس کی بریّت کی مگر آپ نے فیصلہ اس کے خلاف دیا۔ اور اسی واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

آنحضرتؐ کی فوق العادت امانت اور دیانت: ان الفاظ سے کہ دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بننا یہ قیاس کر لینا کہ آپ نے کوئی طرفداری

وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾

اور اللہ کی حفاظت مانگ بیشک اللہ حفاظت کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے ؏۴۲۷

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾

اور ان کی طرف سے مت جھگڑ جو اپنے نفسوں کی خیانت کرتے ہیں اللہ بڑے خیانت کرنیوالے گنہگار کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾

یہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے۔ اور وہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو مشورے کرتے ہیں جس بات کو وہ پسند نہیں کرتا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

دیکھو تم وہ لوگ ہو جو دنیا کی زندگی میں اُن کی طرف سے جھگڑتے ہو۔ پر قیامت کے دن کون اُن کی طرف سے اللہ کے ساتھ جھگڑے گا۔ یا کون اُن کا وکیل بنے گا ؏۴۲۸

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾

اور جو شخص بدی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے بخشش چاہے وہ اللہ کو بخشنے والا رحم کرنے والا پائے گا۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾

جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ اپنی جان پر ہی اس کا وبال لیتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

کی ہوگی ایک نادانی کا خیال ہے۔ کسی حکم کا جو آپ کو قرآن میں دیا گیا ہے ہرگز یہ منشا نہیں کہ آپ نے اس کی خلاف ورزی کی تھی اس لیے اس حکم کی ضرورت پیش آئی۔ بلکہ اُمت کو تعلیم دینا مقصود ہے ورنہ آپ خود اعلیٰ سے اعلیٰ اصول پر قائم تھے اقم الصلوٰۃ کا حکم بار بار کیوں دیا جاتا تھا کیا اس لیے کہ آپ نے نماز ترک کر دی تھی؟ آپ نے جیسا کہ اوپر کی روایت سے ظاہر ہے۔ خائن کی طرف سے جھگڑا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے خلاف فیصلہ کیا تھا۔ پس ان الفاظ کے لانے کا منشاء منافقین کی جھوٹی امیدوں کا منقطع کرنا تھا۔ نبی کریم صلعم کی صداقت اور دیانت تو قبل از نبوت بھی عرب میں مسلم تھی۔ اگر آپ میں اس قسم کی طرف داری کا مادہ ہوتا تو عرب ایسی اکھڑ قوم آپ کو الامین کا خطاب کیونکر دیتی۔ پس اگر قبل از نبوت بھی آپ کی امانت و دیانت پر کوئی شخص حرف نہ رکھ سکتا تھا تو بعد از نبوت ان باتوں کا قیاس آپ کے خلاف کرنا صریح واقعات کا انکار کرنا ہے ہاں بلاشبہ آپ کی زندگی میں ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کے اندر بڑے بڑے لوگوں کا قدم ڈگمگا جاتا۔ مگر آپ کی فوق العادت دیانت اور امانت میں ایسے موقعوں پر کبھی بال برابر بھی فرق نہیں آیا۔ ایسے ہی مواقع پر وحی الٰہی نے بھی آپ کی دستگیری فرمائی ہے۔ چنانچہ خود طعمہ والے واقعہ سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب یہودیوں کے تعلقات آپ کے ساتھ کھلی دشمنی کے ہو چکے ہیں اور ادھر اسلام کو اس قدر مصائب اور مشکلات کا سامنا ہے کہ ایک ایک متنفس جو اس کی حمایت کے لیے کھڑا ہو سکتا ہو اس کا وجود از بس غنیمت ہے۔ ادھر بہت سے گواہ شہادت دینے والے موجود ہیں جو طعمہ کو بری ٹھہرا رہے ہیں۔ مگر نبی کریم صلعم کو نہ یہ پروا ہے کہ یہودی ہمارے دشمن ہیں نہ یہ کہ طعمہ کو ملزم قرار دینے سے اس وقت بہت سے مسلمان اور بھی اس کے ساتھ ہاتھ سے جاتے ہیں۔ آپ عین حق و انصاف کے مطابق یہودی کے حق میں اور مسلمان کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں۔ ایسے عدل و انصاف کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کوئی اور ملتی ہے تو پیش کی جائے۔

ع۴۲۷ جب ایک طرف اس اصول پر آپ کو قائم کیا کہ کسی خائن دغا باز کی حمایت آپ نہ کرینگے تو مشکلات کا تو اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس لیے فرمایا کہ مشکلات میں اللہ کی حفاظت چاہو۔ استغفار کے ان معنوں کے لیے دیکھو ع۲۵۸ و ع۳۸۸ خدا کی حفاظت کا کون انسان محتاج نہیں بلکہ جس نے ایک آن کے لیے بھی اپنے آپ کو خدا کی مدد سے مستغنی سمجھا وہ ہلاک ہو گیا۔ یا مراد یہ ہے کہ جو غلطی کرتے ہیں ان کے لیے استغفار کرو۔ اور سیاق اس کو بھی چاہتا ہے۔

ع۴۲۸ یہ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو اپنی کم فہمی سے منافقوں کے دھوکہ میں آ کر ان کے حامی بن جاتے تھے۔ جیسا طعمہ والے واقعہ میں طعمہ کے رشتہ داروں نے اس کی حمایت کی تو ایسے لوگوں کو سمجھایا ہے کہ یہ منافق درپردہ دشمن اسلام ہیں اور حق اور راستی سے دُور پڑے ہوئے ہیں تم ان کے حامی نہ بنو بلکہ حق کے حامی بنو۔ آیت ۱۰۷ میں ولا تجادل میں خطاب عام ہے جیسا کہ آیت ۱۰۹ کے الفاظ ھانتم

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾

اور جو شخص خود قصور یا گناہ کرے پھر ایک بے گناہ پر اُس کی تہمت لگائے یقیناً وہ اپنے اوپر بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ لیتا ہے۴۲۹

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

اور اگر تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ قصد کر ہی چکا تھا کہ تجھے گمراہ کریں اور وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں اور تجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور تجھے وہ سکھایا، جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۴۳۰

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

اُن کے بہت سے خفیہ مشوروں میں کوئی بھلائی نہیں سوائے اس کے کہ کوئی خیرات یا بھلے کام یا لوگوں میں اصلاح کے لیے حکم دے اور جو شخص اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے گا اسے ہم بہت بڑا اجر دیں گے۴۳۱

ھٰؤلاء جادلتم عنھم جمع لا کر صاف کر دیا۔

ع۴۲۹ خطیئۃ اور اثم کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۰۵ و ع۱۰۸ بلحاظ ان کے اصل معنی کے فرق یہ ہے کہ خطیئۃ وہ ہے جو بلا عمد سرزد ہو اور اثم وہ ہے جو عمد سے ہو اور یہی فرق ابن جریر نے کیا ہے یا خطیئۃ وہ ہے جس کا اثر انسان کی اپنی ذات تک محدود ہو اور اثم وہ جس کا اثر بد دوسرے پر پڑے۔

اس قسم کی کمینہ حرکت کو کہ انسان خود بُرا کام کرے اور دوسرے کے ذمہ لگا دے قرآن کریم نے منافقوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ حتّٰی کہ ایک یہودی کے متعلق بھی یہ جائز نہ تھا کہ خود بُرے فعل کا ارتکاب کر کے اس کے سر پر وہ تھوپا جاتا۔ یہ تو وہ اخلاق تھے جو قرآن کریم نے دشمنوں تک کے متعلق سکھائے تھے مگر آج کتنے مسلمان ہیں جو اپنے بھائیوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ اور آج غیر مسلموں کا مال لے لینا تو ایک طرف رہا مسلمان بھائیوں پر کفر کے فتوے لگا کر ان کے مال بھی بالباطل لے لینا جائز قرار دیا جاتا ہے اس سے بڑھ کر کیا خیانت ہو گی۔

ع۴۳۰ یضلوک۔ اضلال کے ایک معنی اِھلاک بھی آتے ہیں یعنی ہلاک کرنا اَضَلَّہٗ۔ ضَیَّعَہٗ و اھلکہ (ت) یہی معنی یہاں مراد ہیں جس طرح اِنَّ المجرمین فی ضلال وسعر (القمر ۵۴: ۴۷) میں ضلال کے معنی ہلاکت ہیں (ت) کیونکہ جب ان کے قصد اضلال کا ذکر کیا تو جواب میں تسلّی کے طور پر فرمایا کہ تجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اس سے پہلے اور پیچھے بھی منافقوں کے خفیہ مشوروں اور ان کے منصوبوں کا ہی ذکر ہے۔ پس سیاق و سباق عبارت کے لحاظ سے یہی معنی درست ہیں۔ اور اگر گمراہ کرنا معنی لیے جائیں تو بھی کوئی ہرج نہیں۔

یہاں یہ بتایا کہ منافق صرف اتنی کمزوری ہی نہیں دکھاتے کہ جنگ سے پیچھے ہٹتے ہوں بلکہ وہ اسلام کے چھپے ہوئے دشمن ہیں اور ہمیشہ اسلام کو تباہ کرنے کے منصوبے سوچتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی تسلّی دی کہ پیغمبر کو کتاب و حکمت دیکر بھیجا گیا ہے جس کی اس نے دنیا میں تعلیم دینی ہے پس وہ ہلاک نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری جگہ فرمایا ھمّوا بما لم ینالوا (التوبۃ ۹: ۷۴) جو کچھ قصد یہ منافق کرتے ہیں اس مقصد کو کبھی نہیں پائیں گے۔

ع۴۳۱ نجوٰی۔ اس کا اصل بھی وہی ہے جو نجاۃ کا اصل ہے اور ناجیتُہٗ کے معنی ہیں اس سے خفیہ طور پر مشورہ کیا اور اس کی اصل نجوۃ سے ہے جس کے معنی بلند زمین ہیں گویا وہاں اس کے ساتھ تنہا ہوا اسی سے نجوٰی مصدر ہے یعنی خفیہ مشورہ کرنا۔

یہاں منافقوں کے خفیہ مشوروں کا ذکر کر کے فرمایا کہ ان کے خفیہ مشوروں میں بھلائی کی کوئی بات تو ہوتی نہیں۔ کیونکہ وہ جب چھپ کر مشورہ کرتے ہیں تو نقصان پہنچانے کے لیے ہی کرتے ہیں اسی لیے یہاں کثیر کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور پھر فرمایا کہ بھلائی کا کام تو یہ ہے کہ کوئی شخص دوسروں کو صدقات دینے کے لیے کہے یا نیک بات کی ہدایت کرے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا کوئی کام کرے مگر یہ جب ملتے ہیں تو ان امور کے خلاف

وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ
لَهُ الۡهُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ
ع ۱۷ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۱۱۵﴾
اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَ یَغۡفِرُ مَا
دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ مَنۡ یُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ
فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۱۱۶﴾
اِنۡ یَّدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنۡ
یَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَیۡطٰنًا مَّرِیۡدًا ﴿۱۱۷﴾

اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لیے حق کُھل چکا اور مومنوں کے رستے کے سوائے اور راستہ کی پیروی کرے ہم اُسے پھیر دینگے جدھر وہ پھرتا ہے اور اُسے جہنم میں داخل کرینگے اور وہ بُری جگہ ہے ۴۳۲

اللہ یہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شریک بنایا جائے اور جو اس کے سوا ہو جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھیراتا ہے وہ گمراہی میں دُور نکل گیا ۴۳۳

اُسے چھوڑ کر وہ سوائے بیجان چیزوں کے اور کسی کو نہیں پکارتے اور وہ سرکش شیطان کے سوا اور کسی کو نہیں پکارتے ۴۳۴

ہی کچھ کرتے ہیں۔ اصلاح بین الناس کی حدیث میں بڑی تعریف آئی ہے یہاں تک کہ ایک حدیث میں جس کو ابو داؤد ترمذی احمد نے بیان کیا ہے یہ لفظ آتے ہیں کہ نبی کریم صلعم نے صحابہ کو فرمایا کہ میں تم کو ایسے عمل کی خبر دوں جس کا درجہ نماز اور روزے سے بڑھ کر ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا ہاں، تو فرمایا کہ لوگوں میں اصلاح کرنا۔ صرف مسلمانوں میں نہیں کہا بلکہ سب لوگوں میں۔ آج کل مسلمانوں کو اس نصیحت پر عمل کی بہت ضرورت ہے۔ کیونکہ ترقی کی جڑ اتفاق اور اتحاد ہے آج ان میں تفرقہ ڈلوانے والے بہت ہیں مگر اصلاح کرنے والوں کا وجود کالعدم ہے۔

اس آیت میں بھلائی کی ان سب قسموں کو جو ایک انسان دوسرے کے ساتھ کر سکتا ہے جمع کر دیا ہے۔ اوّل صدقہ رکھا یعنی جو مالی امداد کا محتاج ہو اس کو مالی مدد دینا۔ دوسری قسم کی بھلائی یہ ہے کہ انسان کسی کو اچھی راہ پر ڈال دے یعنی اسے معروف کا حکم دے اور تیسری یہ کہ فساد کو دُور کر کے اصلاح کر دے۔ یہ وہ کام تھا جو محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھی کر رہے تھے۔

۴۳۲ نولہ ماتولی۔ تولیۃ۔ دوسرے کے ساتھ قرب کا تعلق پیدا کرنا ہے پس نولہ ماتولی کے معنی ہوئے ہم اس کا تعلق اسی کے ساتھ جوڑ دینگے جس کے ساتھ وہ خود تعلق پیدا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا انسان سے معاملہ اس کے عمل کے مطابق ہوتا ہے: انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت یوں ہی نظر آتا ہے کہ انسان جس سے تعلق پیدا کرنا چاہے اس سے اس کا لگاؤ ہو جاتا ہے۔ نیکوں کے ساتھ تعلق اور محبت پیدا کرے ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ بدوں کے ساتھ کرے تو ان سے، پس جب ایک گروہ نے باوجود ہدایت کے کھل جانے کے، دن رات مسلمانوں میں رہنے کے، رسول اللہ صلعم کی دشمنی کے طریق کو اختیار کر لیا تو خدا ان کو مجبور کر کے دوسری راہ پر نہیں ڈالتا بلکہ اس کے قانونِ قدرت کے مطابق ان کو پھر وہی راہ اچھی لگتی ہے۔ جس کا انجام جہنم ہے یا یہ محاورہ ولیت وجہی کذا سے ہے جس کے معنی ہیں میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ گویا جدھر انسان توجہ پھیرتا ہے اسی طرف اللہ بھی اس کی توجہ کو پھیر دیتا ہے۔

اجماع اُمت: امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے تین سو مرتبہ قرآن شریف اس غرض کے لیے پڑھا کہ اجماع امت کے دلیل شرعی ہونے پر کونسی آیت حجت ہے اور آخر کو یہ آیت ملی۔ اس پر یہ اعتراض ہُوا ہے کہ سبیل المؤمنین کوئی الگ راستہ نہیں بلکہ قال اللہ وقال الرسول پر ایمان ہی سبیل المؤمنین ہے۔ اور وہ وہی ہدایت ہے جس کا ذکر یہاں موجود ہے۔ پس ان الفاظ سے اجماع اُمت پر کوئی دلیل پیدا نہیں ہوتی اور اگر سیاق و سباق عبارت پر غور کیا جائے تو یہ اعتراض بالکل صحیح ہے۔ یہاں ذکر رسول اللہ صلعم سے دشمنی کا ہے کہ کوئی شخص ایمان اور محبت کی بجائے کفر اور دشمنی کے طریق کو اختیار کرے اور ان میں سے اول الذکر مومنین کا رستہ ہے۔ اس سے بڑھ کر مومنین کے رستہ سے کچھ مراد نہیں اور نہ ہی اجماع کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں کیونکہ تمام مسلمانوں کا کس طرح ایک بات پر اتفاق ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ بات قرآن یا حدیث میں ہو۔

۴۳۳ پچھلے رکوع کے آخر پر منافقوں کے ذکر میں فرمایا تھا کہ صحیح رستہ وہی ہے جس پر مومن ہیں۔ اب اس رکوع میں ایک مشرک اور ایک موحد کا مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ منافقین نے کونسا طریق اختیار کیا ہے اور کہ یہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ شرک چونکہ سب بدیوں کی جڑ ہے اس لیے اس کا ذکر کیا۔ شرک کے نہ بخشنے پر دیکھو ۴۱۸ اور یہاں بتا بھی دیا کہ شرک کو اللہ تعالیٰ کیوں نہیں بخشتا اس لیے کہ وہ گمراہی میں اس قدر دور نکل جاتا ہے کہ وہاں سے واپس آنا مشکل ہوتا ہے شرک اور بُت پرستی کے برابر کسی بیماری کی جڑیں گہری نہیں۔

۴۳۴ اناث۔ انثیٰ کی جمع ہے اور جن سے وہ سوائے خدا کے اپنی حاجت برآری چاہتے ہیں ان کو اناث کہا ہے یا اس لحاظ سے کہ ان کے ہاں اکثر بتوں کے نام مؤنث تھے جیسے لات اور عزیٰ اور منات (غ)، اور حسن سے روایت ہے کہ ہر ایک قبیلہ کا ایک بُت ہوتا تھا جسے وہ انثیٰ بنی فلاں کہتے تھے یعنی فلاں قبیلہ کی دیوی۔ اور یا اس لحاظ سے کہ ان چیزوں کو جن میں روح نہ ہو اناث کہا جاتا تھا۔ اور یہ بھی حسن سے روایت ہے (ج)، امام

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۙ﴿۱۱۸﴾
وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ؕ﴿۱۱۹﴾
يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ

اُسے اللہ نے پھٹکار دیا ہے اور اس نے کہا میں ضرور تیرے بندوں سے ایک مقرر حصّہ لونگا۔
اور میں انھیں ضرور گمراہ کروں گا اور اُنھیں جھوٹی آرزوئیں دلاؤنگا اور انھیں کہوں گا سو وہ جانوروں کے کان چیرینگے[۳۵] اور انھیں کہوں گا سو وہ اللہ کے بنائے ہوئے (دین) کو بدل دیں گے[۳۶] اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بناتا ہے وہ یقیناً کھلا نقصان اُٹھاتا ہے۔
وہ ان کو وعدے دیتا ہے اور ان کو جھوٹی آرزوئیں دلاتا ہے اور

راغب نے بھی اناث سے مراد جمادات ہی لیے ہیں کیونکہ ان میں صرف قوت منفعلہ ہے یعنی دوسرے کا اثر قبول کرنا اور وہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ ان کے معبودوں کے لیے اختیار کرکے ان کو ان کی جہالت پر متنبہ کیا ہے کہ وہ اشیاء جو نہ دیکھتی ہیں نہ سنتی اور نہ کوئی کام کرنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ ان کو وہ اپنی مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ اسی کی مثل حضرت ابراہیمؑ کا قول ہے یا ابت لم تعبد مالا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنك شیئا (مریم ۱۹-۴۲) اور دوسری جگہ فرمایا: وجعلوا الملٰئکۃ الذین ھم عبٰد الرحمٰن اناثا (الزخرف ۴۳-۱۹) تو یہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے (غ)

مرید۔ مرد سے ہے۔ شجرٌ اَمْرَدُ اس درخت کو کہا جاتا ہے جس پر پتے نہ ہوں اور امرد مردوں میں سے وہ ہے جس کے منہ پر ابھی بال نہ نکلے ہوں اس لیے مرید اور مارد (وحفظا من کل شیطان مارد۔ الصّٰفّٰت ۳۷-۷) جنوں اور انسانوں میں سے وہ ہے جو ہر قسم کی بھلائی سے خالی ہو اور ایک روایت میں ہے اھل الجنۃ مُرْدٌ تو یہ ظاہر پر بھی حمل ہو سکتا ہے اور یہ بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں کہ وہ ہر قسم کے نقصوں اور قباحتوں سے خالی ہونگے اور مردوا علی النفاق (التوبۃ ۹-۱۰۱) سے مراد ہے کہ وہ ہر قسم کے محاسن سے خالی نفاق پر ہیں۔

شیطان کی عبادت سے مراد: ان الفاظ کے بڑھانے سے کہ وہ سرکش شیطان کے سوائے اور کسی کو نہیں پکارتے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو وہ خدا کرکے پکارتے ہیں۔ انہوں نے تو کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا یہ صرف شیطان کے بہکانے سے ان کو اپنا معبود سمجھتے ہیں، پس گویا اس کی اطاعت کرکے اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

[۳۵] لیبتکن۔ یُبَتِّكَ کا مادہ بَتْكٌ ہے اور بتك اور بَتّ کے معنی ایک ہیں۔ یعنی قطع کرنا اس فرق سے کہ اعضاء اور بالوں کے کاٹنے میں بتك کہا جاتا ہے اور ذرائع اور ملاپ کے کاٹنے پر بتّ (غ)

کان چیرنے کی رسم: ایام جاہلیت میں رسم تھی کہ جب اونٹنی پانچ بچے جن لیتی اور پانچواں نر ہوتا تو اس کے کان چیر کر اس کو چھوڑ دیتے اور نہ اس پر سوار ہوتے نہ اس سے کوئی کام لیتے۔ یہ ایک مشرکانہ رسم تھی یعنی بتوں کے نام پر ایسا کرتے تھے۔ اس کو بحیرہ کہتے جس کا ذکر دوسری جگہ آتا ہے ماجعل اللہ من بحیرۃ ولا سآئبۃ (المائدۃ ۵-۱۰۳) (ج) اور بعض نے کہا ہے کہ بتوں کی پرستش کا یہ ایک حصّہ تھا کہ جانوروں کے کان چیر دیتے تھے۔

[۳۶] خلق اللہ سے یہاں کیا مراد ہے۔ خود قرآن کریم نے اس کی تصریح دوسری جگہ فرما دی ہے فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذٰلك الدین القیم (الروم ۳۰-۳۰) اللہ کی دی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی پیدائش میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہ مضبوط دین ہے پس خلق اللہ کی تبدیلی سے مراد دین الٰہی کی تبدیلی ہے اور یہی معنی حسن، ضحاک، مجاہد اور بہت سے ائمہ سے مروی ہیں (ث ج) اور صحیحین کی حدیث میں ہے کل مولود یولد علی الفطرۃ۔ یعنی ہر ایک بچہ اسی فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے گویا ایک طرف اگر بڑی موٹی قسم شرک کی تباہی یعنی جانوروں کے کانوں کا چیرنا تو دوسری طرف اس کی باریک سے باریک صورت کو بیان کر دیا۔ یعنی الٰہی دین کو بدلنا جس سے مراد اللہ کے حلال کو حرام اور اسکے حرام کو حلال کرنا ہے اس کی تفسیر لعن اللہ الواشمات سے کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس سے خلق اللہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ ورنہ ہر ایک زینت خلق اللہ کی تبدیلی ہو جائے گی اور حدیث کا منشا صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں پر آپ نے لعنت کی ہے جو دیکھنے والوں کو زنا کی طرف بلانے کی غرض سے ہاتھوں وغیرہ پر نیل بھر لیتی ہیں اور تغیر خلق اللہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ مراد اس سے اس غرض کی تبدیلی ہے جس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو پیدا کیا ہے مثلاً حیوانوں کو سواری کے لیے پیدا کیا۔ بحیرہ سائبہ بنا کر ان کی پرستش کرنا تغیر خلق اللہ ہے سورج چاند کو انسان کے لیے مسخر کیا ان کی عبادت تغیر خلق اللہ ہے (ر)

الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿١٢٠﴾

شیطان صرف ان کو دھوکا دینے کو ہی وعدے دیتا ہے[437]

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿١٢١﴾

یہی ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ اس سے کوئی بھاگنے کی جگہ نہ پائیں گے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿١٢٢﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کو ہم باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ انھیں میں رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون بات کا سچا ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٢٣﴾

نہ تمھاری خواہشوں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی خواہشوں پر جو کوئی بدی کرے گا اس کا بدلہ اُسے دیا جائے گا۔ اور اللہ کو چھوڑ کر وہ نہ کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار پائے گا[438]

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿١٢٤﴾

اور جو نیک کام کرے، خواہ مرد ہو یا عورت، اور وہ مومن ہو ــ تو یہی جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرّہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا[439]

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾

اور دین میں اس سے اچھا کون ہے جس نے اپنی ساری توجہ کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیا اور وہ احسان کرنیوالا ہے اور راست رو ہوکر ابراہیم کے مذہب کی پیروی کرتا ہی اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا پیارا بنایا۔[440]

ع۴۳۷ یہ الفاظ بہت قابل غور ہیں نہ صرف شیاطین الجن کے وعدے ہی سراسر جھوٹ اور فریب ہوتے ہیں بلکہ شیاطین الانس جب لوگوں کو غلط راہ پر لگاتے ہیں تو وہ بھی جھوٹے وعدے دیکر ہی ایسا کرتے ہیں۔ جو شخص دوسرے کو بدی کی ترغیب دیتا ہے وہ اس کو خوب سجاتا ہے اور اکثر لوگ بدوں کی صحبت میں بیٹھ کر اسی لیے تباہ ہوتے ہیں کہ وہ ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔

ع۴۳۸ کیسا پاک مذہب ہے۔ آرزوؤں اور خواہشات پر اجر نہیں ملتے خواہ مسلمان ہوں خواہ یہود و نصارٰی۔ جو مسلمان نام کو مسلمان کہلاتے ہیں اور قرآن شریف کو اپنا دستور العمل نہیں بناتے وہ محض امانی کے پیرو ہیں اور قرآن کریم کی یہ آیت فیصلہ کرتی ہے کہ نری آرزوؤں سے کچھ نہیں بنتا جب تک اعمال ساتھ نہ ہوں مسلمان ہوکر بُرا کام کرے گا تو وہ بھی سزا پائے گا۔ غیر مذہب کا آدمی اچھا کام کرے گا تو اس کا اجر پائے گا صحیح اعتقاد عمل سے مستغنی نہیں کرتا بلکہ اعتقاد صحیح کی اصل غرض ہی عمل صحیح پر قائم کرنا ہے۔

ع۴۳۹ مرد اور عورت میں نتائج اعمال کے لحاظ سے کامل مساوات ہے: پس جس طرح مرد کے لیے نعمائے جنّت ہیں اسی طرح اور وہی نعمائے جنت عورت کے لیے بھی ہیں۔ قرآن کریم نے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ نہ کہیں یہ فرمایا ہے کہ مرد کے لیے عورت کی نسبت زیادہ انعامات ہیں۔ پس اگر عیسائیوں نے اسلام پر یہ جھوٹا الزام دیا ہے کہ ان کے نزدیک عورت کی روح ہی نہیں تو خود مسلمان بھی اس غلط فہمی میں ہیں کہ بہشت میں جو انعامات مرد کے لیے ہیں۔ وہ عورت کے لیے نہیں۔ قرآن کریم نے اعمال کے نتائج کے متعلق مرد اور عورت میں مساوات کامل رکھی ہے۔

ع۴۴۰ خلیل خُلّة سے ہے جس کے معنی محبت ہیں کیونکہ وہ نفس کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور خَلَل اس شگاف کو کہتے ہیں۔ جو دو چیزوں کے درمیان ہو یا وسط کو فتری الودق یخرج من خلالہ (النور ۲۴-۴۳) فجاسوا خلٰل الدیار (بنی اسرائیل ۱۷-۵)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو خلیل بنایا، جب بندہ اپنے مالک سے محبت کرتا ہے تو مالک بھی اپنے بندہ سے محبت کرتا ہے لیکن یہاں جو خوشخبری سنائی ہے وہ یہ نہیں کہ حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا بلکہ یہ ہے کہ جو کوئی شخص بھی اس ملّتِ ابراہیمی پر چلتا ہے اپنی توجہ کو اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں لگا دیتا ہے

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ	اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ کا ہی ہے
ع وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۝۱۲۶	اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔
وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ	اور تجھ سے عورتوں کے متعلق فتویٰ پوچھتے ہیں کہ اللہ تم کو ان کے بارے میں
فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ	فتویٰ دیتا ہے اور جو تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے ان عورتوں کے
يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ	یتیموں کے بارے میں ہے جن کو تم جو کچھ اُن کے لیے اور ناتواں
لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ	بچوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے نہیں دیتے ہو اور نہیں چاہتے ہو کہ
مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ	ان کے نکاح کرو اور یہ کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہو
وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ۝۱۲۷	اور جو کچھ بھلائی تم کرو تو اللہ اسے جاننے والا ہے ؏۷۴۱

اور مخلوقِ خدا کے ساتھ احسان کرتا ہے وہی خلیل اللہ یا اللہ کا پیارا بن جاتا ہے۔
اتباعِ ملّتِ ابراہیمؑ سے کیا مراد ہے؟ یہاں ملّت ابراہیم صرف حنیفیت کو کہا ہے۔ یعنی ان اصول دین کو جو افراط و تفریط سے پاک تھے دیکھو ؏۱۸۰ اور یہاں وہ اصول دین بھی بتا دیئے یعنی اسلم وجہہٗ للہ۔ وھو محسن اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور مخلوقِ خدا سے احسان پس انہی اصول میں جو اسلام کے بھی اصل الاصول ہیں اتباع مراد ہے۔ اپنی اصلی حالت میں اصول سب مذاہب کا ایک ہی تھا۔ یعنی خدائے واحد کی پرستش اور مخلوق خدا سے احسان کی تعلیم۔

؏۷۴۱ یستفتون۔ یفتی۔ فتی کے معنی نوجوان۔ اور فتویٰ جواب ہے ایسے احکام سے جو مشکل ہوں (غ) اور استفتاء ایسے مسائل میں فتویٰ مانگنا افتونی فی امری (النمل ۲۷۔ ۳۲) فاستفتھم (الصّٰفّٰت ۳۷۔ ۱۱)

یتامی النساء کے معنی دونوں طرح ہو سکتے ہیں۔ عورتوں کے یتیم بچے یعنی بیوہ عورتوں کے۔ اور یتیم عورتیں۔ اور لسان العرب میں ہے کہ یتیم اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کا خاوند نہ ہو۔ اور دوسری قرأت اس کی ییامی النساء ہے اور ییامیٰ۔ ایم کی جمع ہے یعنی وہ عورت جس کا خاوند نہ ہو اور اس کی جمع ایامیٰ قرآن شریف میں آتی ہے وانکحوا الایامیٰ (النور ۲۴۔ ۳۲)

ماکتب لھن۔ جو حصّہ ان کے لیے مقرر ہوا ہے اس سے مہر مراد نہیں بلکہ میراث کا حصّہ مراد ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہی کمزور بچوں کا بھی ذکر ہے بعض اور بچوں کو عرب لوگ میراث نہ دیتے تھے جیسا کہ ؏۶۱۲ میں ذکر ہو چکا ہے اس لیے جب قرآن شریف میں عورتوں اور بچوں کے ورثہ پانے کا حکم آیا تو بعض لوگوں کو ناگوار گزرا (ج)

ترغبون ان تنکحوھن۔ رغب کے معنی کے لیے دیکھو ؏۱۶۵ یہاں صلہ کوئی نہیں اس لیے دونوں معنی ہو سکتے ہیں کہ انکے نکاح میں رغبت کرتے ہو اور یہ کہ ان کے نکاح نہیں چاہتے ابن جریر نے دونوں قسم کی روایات بیان کی ہیں مگر کثرت دوسرے معنی کی طرف ہے اور سیاق بھی یہی چاہتا ہے اس لیے کہ مال کا ورثہ لینے کے لیے وہ نہ چاہتے تھے کہ ایسی عورتیں نکاح کریں۔

مسئلہ تعدد ازدواج پر مزید روشنی: اس رکوع کا تعلق ابتدائے سورت سے ہے اور اس میں اسی مضمون تعدد ازدواج کا ذکر ہے جس کا ذکر سورت کے شروع میں کیا تھا آیت ۱۲۹ اس امر کو بالکل واضح کر دیتی ہے۔ جہاں فرمایا کہ تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے۔ پچھلے رکوع سے اس کا تعلق یہ ہے کہ وہاں منافقوں کے ذکر میں جو شرک کی طرف جا رہے تھے مومنوں کا ذکر کر کے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور اس کی مخلوق سے احسان یہی دو ستون مذہب کے ہیں اس لیے اس رکوع میں پھر عورتوں کے حقوق کا ذکر کیا کہ ان سے احسان کرو۔

اس آیت کے شروع میں استفتاء اور افتاء کے الفاظ اختیار فرما کر اشارہ کیا ہے کہ لوگوں کو عورتوں کے مسئلہ میں ابھی کچھ مشکلات نظر آتی ہیں اور سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے جو آگے آتا ہے اور دوسرے مایتلی علیکم فی الکتاب کا حوالہ دیا ہے یعنی جو اس سورت میں پہلے پڑھا جاتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت بعد میں نازل ہوئی۔ اور جو پہلے پڑھا جاتا ہے اس کے متعلق فرمایا کہ وہ یتامی النساء کے بارہ میں ہے بخاری میں حضرت عائشہؓ سے ہے کہ اس سے مراد یتیم لڑکی ہے جس کا ولی اس کے مال کو اپنے ساتھ شریک کر لیتا ہے اور نہ خود اس سے نکاح کرنا چاہتا ہے نہ دوسرے سے نکاح کرنا پسند کرتا ہے اس خوف سے کہ اس طرح وہ مال اس کے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ یہ آیت اُم کحت کے بارہ میں نازل ہوئی جس کے یتیم بچے تھے۔ حق یہ ہے کہ قرآن کریم عورتوں اور یتیم بچوں کے معاملہ میں زیادہ تاکید اور تصریح فرماتا ہے اور سورت کے اصل مضمون کو یاد دلاتا ہے۔ عورتوں اور یتامیٰ سے اس قدر بدسلوکی ہوتی تھی کہ پھر اس حکم کے نزول کی ضرورت پیش آئی۔ اور مطلب یہ ہے

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾

اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کرلیں اور صلح اچھی چیز ہے اور طبیعتوں میں بخل ہوتا ہی ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقوےٰ کرو تو اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے ؏۶۴۲

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾

اور تم طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کرسکو، خواہ کتنا ہی چاہو۔ پس بالکل بھی نہ جھک جاؤ یہاں تک کہ اُسے اُدھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو اور اگر تم اصلاح کرلو اور تقوےٰ کرو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ؏۶۴۳

کہ وہ حکم جو پہلے دیا جاچکا ہے کہ تم دو دو تین تین چار چار عورتوں سے نکاح کرلو۔ وہ یتامی النساء کے بارہ میں ہے یعنی ایسی عورتوں کے بارہ میں جو بلا خاوند رہ گئی ہیں۔ جیسا کہ جنگوں میں بہت سی عورتیں بیوہ ہوگئیں اور یا اگر یتامی النساء کے دوسرے معنی لیے جائیں یعنی عورتوں کے یتیم بچے تو آیت ۳ کے معنی یوں ہونگے کہ عورتوں کے یتیم بچوں کے بارہ میں انصاف نہ کرسکو تو ان عورتوں سے نکاح کرلو جو اُن کی مائیں ہیں جس سے تعدد ازدواج کے مسئلہ کی صراحت ہوتی ہے کہ یہ مشکلات پیش آمدہ کے حل کرنے کے تھا۔ جب بہت عورتیں بلا خاوند رہ گئیں یا یتیم بچوں والی عورتیں رہ گئیں جن یتیموں کا کوئی خبرگیر نہ ہوتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایسی عورتوں سے دو دو تین تین چار چار تک نکاح کرلو اور یہ امر کہ یہاں اسی مسئلہ تعدد ازدواج کی طرف اشارہ ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کے بعد عدل کا ذکر صفائی سے کیا ہے اور یہ جو فرمایا کہ انکو تم ان کا مقرر حصہ نہیں دیتے نہ چھوٹے بچوں کو تو اس میں عرب کے اس پرانے دستور کی طرف اشارہ ہے، کہ وہ عورتوں اور بچوں کو محروم الارث کرتے تھے اور ترغبون ان تنکحوھن سے معلوم ہوتا ہے کہ بوجہ ان کی اولاد کی پرورش کی ذمہ داری کے وہ ان سے نکاح بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اسلام نے دونوں حکم دیئے کہ عورتوں اور کمزور بچوں کو حق ورثہ بھی دیں اور ایسی عورتوں سے جن کے یتیم بچے رہ گئے ہیں نکاح بھی کرلیں اور اس کے لیے تعدد ازدواج کی بھی اجازت دی کیونکہ اس صورت میں تعدد ازدواج کی اجازت نہ دی جاتی تو قوم تباہ ہوجاتی۔ اس کے ساتھ ہی آخر پر یہ کہہ کر کہ یتیموں کے معاملہ میں انصاف پر قائم رہو۔ اسی کی تاکید کی ہے۔ بیوہ عورتوں کی خبرگیری اور یتیم بچوں کی پرورش دونوں کا تقاضا تھا کہ یہ صورت اختیار کی جاتی۔

؏۶۴۲ شحّ اس بخل کو کہتے ہیں جس کے ساتھ حرص جمع ہو ومن یوق شح نفسہ (الحشر ۵۹ - ۹) اشحۃ علی الخیر (الاحزاب ۳۳ - ۱۹) (غ)

خاوند کا نشوز عورت پر: یہاں اس صورت کا ذکر کیا جب عورت کو خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا خوف ہو۔ جب بیوی کی طرف سے نشوز ہو، یا شقاق بینھما کی صورت ہو یعنی میاں بیوی میں جھگڑا ہو۔ تو ان دونوں صورتوں کا حکم پہلے گزر چکا ہے۔ اس خاص صورت کا ذکر کہ عورت کو خاوند کی طرف سے خوف ہو تعدد ازدواج کے جھگڑے سے ہی وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی لیے ان دونوں حکموں سے الگ کرکے اس کو یہاں بیان کیا اور اگلی آیت میں تو واضح طور پر بیویوں میں عدل کا ذکر کرکے اس مضمون کو کھول دیا۔ فرمایا کہ جب خاوند کی دوسری شادی کرنے سے عورت کو یہ خوف ہو کہ وہ اس کی طرف سے بالکل بے رغبت ہوجائے گا یا اس پر زیادتی کریگا تو وہ دونوں کوئی صورت صلح کی اختیار کریں۔ اور وہ صورت یوں بھی ہوسکتی ہے کہ خاوند ہی ازدواج ثانی کے ارادہ کو ترک کردے یا یہ کہ عورت کا اطمینان کردے کہ اس کو نقصان نہیں پہنچے گا اور یہ بھی فرمایا کہ صلح بہتر چیز ہے لیکن صلح کے ہونے میں شحّ مانع ہوجاتا ہے یعنی بخل و حرص۔ بخل تو یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی حق کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور حرص یہ کہ کسی دوسرے کا حق چھیننا چاہتا ہے۔ اگر یہ بخل و حرص نہ ہوں اور انسان کچھ اپنے حقوق کو چھوڑ دے اور کچھ دوسرے کے حقوق پر دست درازی کو چھوڑ دے تو صلح آسانی سے ہوسکتی ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ احسان و تقوٰی کی ہدایت فرمائی۔ یعنی دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور ان کے حقوق لینے سے بچو اور یہاں بالخصوص مراد عورتوں کے ساتھ معاشرت میں احسان کرنا اور ان کی حق تلفی سے یا ان پر نشوز کرنے یا ان سے اعراض کرنے سے بچنا ہے۔

؏۶۴۳ تمیلوا۔ مَیل وسط سے ایک جانب جُھک جانے کا نام ہے اور اس کا استعمال ظلم میں ہوتا ہے اور مِلت علیہ کے معنی ہیں اس پر حملہ کیا۔ فیمیلون علیکم میلۃ واحدۃ (۴ - ۱۰۲) اور مال کو مال اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ دوسری طرف جھکتا یعنی دوسرے ہاتھوں میں جاتا رہتا ہے آج ایک کے پاس ہے تو کل دوسرے کے (غ)

وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشائش سے غنی کر دیگا اور اللہ وسعت والا حکمت والا ہے ۴۴۴

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾

اور اللہ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور ہم نے اُن کو جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تم کو بھی یہی حکم دیا کہ اللہ کا تقویٰ کرو اور اگر تم انکار کرو، تو جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ کا ہی ہے اور اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾

اور اللہ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کارساز بس ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾

اے لوگو! اگر وہ چاہے تو تم کو لے جائے اور اوروں کو لے آئے اور اللہ اس پر قادر ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع ۱۹ / ۸ / ۱۲

جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اللہ کے ہاں دنیا اور آخرت (دونوں) کا ثواب ہے اور اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے ۴۴۵

مُعلّقة - عَلِقَ کسی چیز کے ساتھ لٹک جانا یا اس میں پھنس جانا ہے (غ) اسی سے علقة ہے جس سے بچہ بنتا ہے اور معلّقة کے معنی ہیں اَلّتی فُقِدَ زوجہا (ل) یعنی جس کا خاوند گم ہو گیا ہو لا اَیّم ولا ذات بعل - نہ وہ بلا خاوند ہو اور نہ خاوند والی (ل)

مرد کا عورتوں میں عدل کرنا دو طرح پر ہو سکتا ہے - ایک ظاہر حالات میں یعنی خرچ دینے میں باری میں - دوسرا محبّت میں سورت کے شروع میں فرمایا تھا کہ اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ضرورت کی حالت میں بھی ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرو - بلکہ ایک پر ہی اکتفا کرو - وہ عدل حالات ظاہر میں ہے یہاں خاوند اور بی بی میں رغبت اور محبت کا ذکر ہے - اس لیے ولن تستطیعوا ان تعدلوا میں جس عدل کی عدم استطاعت کا ذکر ہے وہ عدل تعلقاتِ محبّت میں ہے اور بتایا ہے کہ یہ انسان کی طاقت میں ہی نہیں کہ اگر دو بیبیاں اس کے گھر میں ہیں تو دونوں سے یکساں محبّت کر سکے - عدل ظاہری کی نفی یہاں نہیں ہے - کیونکہ وہ تو انسان کر سکتا ہے - یہ خیال کہ تعدد ازدواج کی اجازت دیکر پھر اسے ایک محال شرط سے وابستہ کر دیا ہے اور خود ہی اس شرط کو محال قرار دیدیا ہے صحیح نہیں اس لیے کہ تعدد ازدواج کی اجازت تو ایک خاص مشکل کو حل کرنے کے لیے دی تھی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور خدا کے کلام کو یہ شایاں نہیں کہ خود ایک ضرورت کو بیان کرے پھر خود ہی اس کے پورا کرنے کو ایک محال شرط سے وابستہ کر دے - اگر ضرورت تعدد ازدواج کی ہے تو پھر اس کا انکار اس بنا پر نہیں ہو سکتا کہ تم عدل نہیں کر سکتے کیا یہ خود خدا تعالیٰ پر اعتراض نہیں کہ ایک طرف تعدّد ازدواج کی ضرورت کو بیان کرتا ہے اور دوسری طرف تعدد ازدواج کو ایک شرط محال سے وابستہ کرتا ہے - اس آیت کے معنی صاف ہیں - کہ عدل ظاہری کا حکم تو ہم دے چکے ہیں - محبّت میں مساوات کے لیے ہم تم کو مجبور نہیں کرتے - ہاں ایک عورت کی طرف اس قدر بے رغبتی کرنا کہ وہ نہ خاوند والیوں میں داخل ہو نہ بغیر خاوند والیوں میں - آدھر میں لٹکی ہوئی ہو - اس سے منع فرمایا۔

۴۴۴ اگر بے رغبتی اس حد تک بڑھ جائے یا میل موافقت نہ ہو سکے تو دونوں کا جدا ہو جانا ہی بہتر ہے - ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ دونوں کو پہلے سے بہتر حالت میں کر سکتا ہے۔

۴۴۵ - خاتمہ کی چار آیات میں تقویٰ کی تاکید فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی جبروت و قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے - کیونکہ یہی چیز انسان کو تقویٰ پر قائم رکھ سکتی ہے دوسروں کے حقوق کی صحیح رعایت انسان تب ہی کر سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی قدرت و جبروت پر ایمان ہو ورنہ نیکی بھی خود غرضی کا رنگ رکھتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف پر قائم ہونیوالے اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو، گو (معاملہ) تمھاری اپنی ذات یا ماں باپ اور قریبیوں کے خلاف ہو اگر کوئی امیر ہو یا غریب تو اللہ دونوں کا (تمھاری نسبت) زیادہ خیر خواہ ہے سو تم خواہش کی پیروی نہ کرو تاکہ عدل کر سکو اور اگر تم پیچ دار بات کرو یا حق سے اعراض کرو تو یقیناً جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبر دار ہے ۶۴۶ے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور پچھلے دن کا انکار کرتا ہے وہ گمراہی میں دُور نکل گیا ۶۴۷ے

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ

بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کافر ہوئے، پھر ایمان

ع۶۴۶ قوامین - قیام کا استعمال دو طرح پر ہے کسی چیز کی مراعاۃ یا نگہداشت اور اس کی حفاظت اور دوسرا کسی چیز کا عزم اور یہاں مراد مراعاۃ ہے (غ) اور قوام چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس لیے مراد ہے مراعاۃ انصاف کو کمال تک پہنچانے والا - اور چونکہ قسط انصاف کا حصہ ہے اس لیے مراد ہر قسم کے حقوق کی ادائگی میں پوری مراعاۃ ہے۔

شہداء للّٰہ - اللہ کے لیے گواہی دینے والے یعنی گواہی میں ایسی حق بات کہنے والے کہ سوائے اللہ کی رضا کے اور کچھ مدنظر نہ ہو۔

اولٰی بھما - اَوْلٰی بمعنی احرٰی ہے - بڑھ کر اہل یا حقدار - اور مطلب یہ ہے کہ غنی کی رضا حاصل کرنا یا فقیر پر رحم کرنا حق سے تمہیں نہ پھیر دے کیونکہ غنی کے معاملہ میں اللہ کی رضا اور فقیر کے معاملہ میں اللہ کا رحم اس سے بڑھ کر ہے۔

تلوٗا - لَوٰی کے معنی جھوٹ بولنا بھی ہیں اور مائل ہونا بھی - چونکہ دو حکم اکٹھے ہیں یعنی انصاف کرنا اور سچی شہادت دینا - اس لیے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جس سے دونوں مطلب نکلتے ہیں یعنی شہادت کے معاملہ میں جھوٹ بولو یا عدل سے ایک طرف مائل ہو جاؤ۔

عدل و انصاف پر قیام کی نصیحت: اصل ذکر تو منافقوں کا تھا اور اسی میں مشرک اور موحد کا مقابلہ کرتے ہوئے عورتوں کے معاملہ میں عدل و انصاف کی طرف توجہ دلائی تھی اس آیت میں اسی کو عام کیا ہے اور دوسری طرف چونکہ ذکر منافقوں کا تھا - اسی لیے فرمایا کہ ایمان والوں کو چاہیئے کہ انصاف کے قوام بنیں یعنی اس کو ہمیشہ مضبوطی سے قائم رکھنے والے اور ہر ایک قسم کے حقوق پورے انصاف سے ادا کرنے والے فیصلہ کرنا صرف ایک موقعہ پر ہے جو بعض انسانوں کو پیش آتا ہے - قرآن کریم کے الفاظ تمام قسموں کے حقوق کی ادائگی پر حاوی ہیں گو اس میں شک نہیں کہ فیصلہ کا وقت سب سے زیادہ انسان کے لیے آزمائش کا وقت ہے - دوسری جگہ یوں فرمایا کہ لایجرمنکم شنان قوم علٰے الا تعدلوا (المائدۃ ۵-۸) کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے بھی عدل کے مقام سے نہ ہٹو - یہ مشکل سے مشکل مقام عدل کا ہے - انسان کی اپنی ذات یا اقربا کا معاملہ ہو یا کسی قوم سے عداوت ہو تو وہاں عدل قائم رکھنا مشکل ہے ایسا ہی شہادت حقہ کا ادا کرنا ایک مشکل بات ہے - بالخصوص جہاں اپنی ذات پر اس کا اثر پڑتا ہو یا ماں باپ یا قریبیوں پر - پھر بعض وقت انسان ایک امیر آدمی کے لحاظ سے انصاف اور شہادت حقہ کو چھوڑ دیتا ہے تاکہ اسے خوش کرے اور بعض وقت ایک غریب پر رحم کر کے - فرمایا تم دونوں باتوں کی پروا نہ کرو - اللہ کا حق ان پر تمہاری نسبت زیادہ ہے - اور اللہ کا حق یہی ہے کہ حق ظاہر ہو - اور کسی کی رعایت نہ ہو۔

عدل کی صفت سے انسان تب ہی متصف ہوتا ہے جب خواہشات کی پیروی ترک کر دے اس لیے بتایا کہ اس مقام پر پہنچنے کا طریق یہی ہے کہ تم خواہشات کی پیروی چھوڑ دو۔

ع۶۴۷ پہلے ایمان سے مراد ایمان ظاہر یا اقرار باللسان ہے اور دوسرے ایمان سے مراد تکمیل ایمانی ہے جس میں تصدیق بالقلب اور اس کے مطابق عمل بھی شامل ہیں - دیکھو ع۱۱ چونکہ اصل ذکر منافقین کا تھا اس لیے فرمایا کہ صرف منہ کا ایمان فائدہ نہیں دیتا جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔

كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

لائے پھر کافر ہوئے، پھر کفر میں بڑھ گئے، تو اللہ یہ نہیں کہ ان کی مغفرت کرے اور نہ یہ کہ ان کو راہ پر سیدھا چلائے ۴۸ع

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳۸﴾

منافقوں کو خبر دیدے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ ﴿۱۳۹﴾

جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے ہاں عزت چاہتے ہیں تو عزت سب اللہ کے لیے ہی ہے۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ ﴿۱۴۰﴾

اور وہ تم پر کتاب میں (یہ حکم) نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جاتا ہے اور ان پر ہنسی کی جاتی ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی دوسری بات میں لگ جائیں ضرور تم بھی اس وقت انہی کی طرح ہو، اللہ منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے ۴۹ع

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ

وہ جو تمہارے متعلق انتظار میں ہیں، پس اگر تم کو اللہ کی طرف سے فتح ملے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؛ اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم کو چڑھا نہیں لائے اور مومنوں سے تمہاری حفاظت نہیں کی ۔ سو اللہ

۴۸ع اس سے مراد منافق ہی ہیں۔ چنانچہ اگلی آیت میں تصریح موجود ہے۔ ایمان لانے پھر کافر ہونے پھر ایمان لانے پھر کافر ہونے سے مراد دو دفعہ کی گنتی ہی نہیں، بلکہ ان کے تردد کا ظاہر کرنا مقصود ہے اور یہ تردد بعض منافقوں کی صورت میں ظاہر میں بھی واقع ہوتا تھا اور بعض کی صورت میں صرف باطن میں تھا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا سے مراد یہ ہے کہ آخری حالت ان کی یہ ہے کہ کفر میں ترقی کرتے چلے گئے۔ ایسوں کی حفاظت اور ہدایت اللہ نہیں کرتا اس لیے کہ جب ایک شخص غلط راہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے مجبور کر کے نیک کام کی طرف نہیں لاتا جیسے نیک کو مجبور کر کے بدی کی طرف نہیں لے جاتا۔

۴۹ع يخوضوا۔ خَوض کے معنی پانی میں رستہ بنانا اور اس میں گزرنا ہیں۔ اور معاملات یا باتوں میں داخل ہونے پر استعارۃً بولا جاتا ہے اور اکثر استعمال اس کا ذم کے مقام میں ہے کنا نخوض ونلعب (التوبۃ۔ ۶۵) وخضتم كالذى خاضوا (التوبۃ۔ ۶۹) (غ) یعنی بیہودہ یا جھوٹی باتوں میں پڑنا اور خَوض کلام میں وہ ہے جس میں کذب اور باطل ہو (ل)

یہ حکم پہلے سورۃ الانعام میں نازل ہو چکا ہے۔ واذا رايت الذين يخوضون فى اٰيٰتنا فاعرض عنهم حتّٰى يخوضوا فى حديث غيره (الانعام۔ ۶۸) مکہ میں مشرکین عرب اپنی مجالس میں قرآن کریم پر ہنسی ٹھٹھا کرتے تھے۔ مدینہ میں یہودی اور منافق۔ روکنے کی وجہ یہاں بتا دی ہے کہ اس صورت میں تم بھی ان جیسے ہو گے۔ جب انسان ایک چیز کے متعلق استہزا کا طریق اختیار کرتا ہے تو جو شخص اس استہزا کو خوش ہو کر سنتا ہے اس کا قلب بھی اسی رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے یوں کفار کے ساتھ بیٹھنے سے بات چیت کرنے سے منع نہیں کیا۔ مگر اصول دین اور ائمہ دین کی تحقیر اور ان پر استہزا سننے سے روکا بالمقابل مسلمانوں کو یہ بھی تعلیم دی کہ تم ان کے معبودوں کی تحقیر و تذلیل نہ کرو ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله (الانعام۔ ۱۰۹) اصل میں منافقین کفار کے ساتھ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی ہنسی اڑایا کرتے تھے مسلمانوں کو روکا کہ ان کے دام میں نہ آ جائیں۔

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ
ع ۱۷ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ
وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ
يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز
کافروں کو مومنوں پر (غلبہ کی) راہ نہیں دے گا ع۵۰
منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور وہ ان کو دھوکا بازی کی
سزا دیگا ع۵۱ اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں کاہلی سے کھڑے ہوتے
ہیں لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم ع۵۲

ع۵۰ یتربصون ۔ ربص مادہ ہے اور تَرَبُّص کسی شے کے انتظار کو کہتے ہیں ۔ سامانِ تجارت ہو تو اس کے مہنگا ہونے یا ارزاں ہونے کا انتظار یا کسی معاملہ میں اس کے حصول یا زوال کا انتظار والمطلقات یتربصن (البقرۃ ۲ - ۲۲۸) تربّصوا فانی معکم من المتربصین (الطور ۵۲ - ۳۱)

نستحوذ ۔ حَوْذ کے معنی ہیں اونٹ کا چلانے والا اس کے چوتڑوں پر مار مار کر اس کو چلائے اور حاذ الابل کے معنی ہیں اونٹوں کو سختی سے چلایا اسی سے استحوذ ہے ۔ استحوذ علیھم الشیطان (المجادلۃ ۵۸ - ۱۹) کے معنی ہیں شیطان نے ان پر غالب آکر ان کو چلایا ۔ یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ ہم تم کو بڑی ترغیب دیکر اور بڑا زور دیکر مسلمانوں پر چڑھا کر لائے ۔

نَمْنَعُ ۔ مَنْع اصل میں عطاء یعنی دینے کی ضد ہے جیسے مَنّاعٍ للخیر (ق ۵۰ - ۲۵) یمنعون الماعون (الماعون ۱۰۷ - ۷) اور حمایۃ یا حفاظت کے معنی میں بھی آتا ہے ۔ یہی معنی یہاں ہیں (غ)

یہاں منافقوں کی دو رخی چال کا ذکر کیا ہے ۔ ایک طرف مومنوں کے ساتھ ملے رہتے ہیں انہیں غلبہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ تھے دوسری طرف کافروں کے ساتھ جب کسی جنگ میں کچھ فائدہ کافروں کو ہو جاتا ہے تو ان کو جتاتے ہیں کہ ہم ہی تمہارے اس فائدہ کا اصل موجب ہیں کیونکہ ہم ہی تم کو چڑھا کر لائے اور ہم نے پھر مومنوں کا ساتھ چھوڑ کر تمہارا ان سے بچاؤ کر دیا یعنی وہ اس قابل نہ رہے کہ تم پر حملہ کر سکتے اور یوں تمہارا بچاؤ ہو گیا ۔ پس جو کچھ تم کو حاصل ہوا صرف ہماری وجہ سے ہی حاصل ہوا ہے ۔ یہ ان کی شرارتیں ہیں جن کی وجہ سے ان کو اگلے رکوع میں انجام بد سے ڈرایا گیا ہے ۔

ایک نکتہ اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لڑائی کے اتار چڑھاؤ میں جو مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہو رہی تھی ۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی کامیابی کے لیے لفظ فتح اختیار فرمایا ہے اور کفار کے لیے لفظ نصیب یعنی کچھ تھوڑا سا حصّہ جس سے معلوم ہوا کہ کفار کو مسلمانوں کے مقابل پر فتح کبھی حاصل نہیں ہوئی ۔ ہاں کچھ تھوڑی تکلیف مسلمانوں کو پہنچ گئی ۔

ع۵۱ یخادعون ۔ خادع ۔ یخادعون یا مخادعۃ سے مراد ہے دھوکا دینا چاہتے ہیں دیکھو ع۲۱ اور خادع اسم فاعل ثلاثی سے ہے یعنی خَدَع سے جس کے معنی ہیں خَتَلَہ واراد بہ المکروہ من حیث لا یعلم (ت) یعنی اسے چھپکر آلیا اور اس سے ایسے معاملہ کا ارادہ کیا جسے وہ ناپسند کرتا ہے ایسے طریق سے جسے وہ نہیں جانتا ۔ گویا اس کے اصل معنی ہیں چھپ کر امر مکروہ کا وارد کرنا ۔

خدع کی نسبت اللہ کی طرف : پس اس تشریح کو مدِّنظر رکھتے ہوئے جو ع۲۷ میں کی گئی ہے کہ جب ایک فعل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس میں صرف اس فعل کا نتیجہ باقی رہ جاتا ہے اور ذریعہ جس سے وہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے مفقود ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف فعل خدع منسوب کرنے کا منشاء صرف اس قدر ہوا کہ وہ ان پر ایسا امر وارد کرے گا جسے وہ ناپسند کرتے ہیں اور یا بر طبق جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا معنی یہ ہیں کہ وہ ان کو ان کے خداع کی سزا دیگا (ل) اور مخادعۃ کے مقابل پر جب خَدَعتُہ کہیں تو مراد ہوتی ہے ظفرت بہ (ل) یعنی میں اس پر غالب آیا اور ان تینوں میں سے کوئی سے معنی لیے جائیں مطلب وہی ہے اور خدع کا استعمال لغت میں وسیع ہے ۔ خدعت الضب کے معنی ہیں گوہ چھپ گئی ۔ اور خدع الریق فی الفم کے معنی ہیں تھوک خشک ہو گئی اور کان فلان الکریم ثم خدع میں خدع کے معنی اَمسَکَ یعنی رُک گیا ۔ خدع المطر کے معنی ہیں بارش تھوڑی ہوئی اور السنون الخوادع کے معنی ہیں قحط کے سال جن کی خیر کم ہے کیونکہ بارش نہیں ہوتی اور حدیث میں جو آتا ہے الحرب خَدْعۃ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جنگ میں دھوکہ کھا گیا تو اس کا قدم پھسل جاتا ہے ۔ یعنی دشمن کے مخفی وار سے اپنا بچاؤ کرنا چاہئیے اور یا یہ لفظ خُدْعۃ ہے اور مراد ہے کہ وہ اپنے اہل کو دھوکہ دینے والی چیز ہے (ن)

پچھلے رکوع کے آخر پر منافقوں کی دھوکہ بازی کا ذکر کیا تھا کہ کس طرح مسلمانوں کے دشمنوں کو ان پر چڑھا کر لاتے اور پھر کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں تو فرمایا کہ یہ مومنوں کو اس طرح دھوکہ دیکر گویا خدا کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں مگر وہ دھوکہ دے نہیں سکتے بلکہ آخر کار مغلوب ہو کر خود نقصان اٹھائیں گے ۔ سورۃ بقرہ کے شروع میں منافقوں کے ذکر میں فرمایا تھا یخٰدعون اللہ والذین اٰمنوا اور یہاں صرف یخٰدعون اللہ ہے مگر مطلب ایک ہے وہاں اس کی سزا بیان فرمائی تھی وما یخدعون الا انفسھم خدا کو کیا دھوکہ دینا ہے بلکہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں ۔ یہاں بجائے ان الفاظ کے فرمایا دھو خادعھم مطلب وہی ہے کہ آخر اس دھوکہ بازی کا بُرا نتیجہ پاکر رہیں گے ۔

ع۵۲ کسالیٰ ۔ کسلان کی جمع ہے اور کَسَل کے معنی ہیں کاہلی یا بوجھل ہونا ایسے معاملہ میں جس میں سستی مناسب نہیں (غ)

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

درمیان میں پریشان ہیں۔ نہ اِدھر کے، نہ اُدھر کے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں چھوڑ دے، تو تُو اس کے لیے ہرگز راہ نہ پائے گا ۵۵۳؎

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کی سزا کے لیے اپنے خلاف کھلی دلیل بناؤ ۵۵۴؎

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾

منافق آگ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہیں، اور تو ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پائے گا ۵۵۵؎

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾

مگر وہ جو توبہ کریں اور اصلاح کریں اور اللہ (کے احکام) کو مضبوط پکڑیں اور اپنی فرماں برداری کو اللہ کے لیے خالص کریں، تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں۔ اور عنقریب اللہ تعالیٰ مومنوں کو بڑا اجر دے گا۔

یراؤن۔ رای کے معنی دیکھا اور مُراأۃ یا رئاء دوسروں کو دکھانا اور شائع کرنا (غ) یعنی ایک کام کا کرنا اس غرض کے لیے کہ دوسرے لوگ دیکھ لیں۔
نماز میں کسل اور راحت؛ جب منافقوں کی مسلمانوں کے ساتھ دھوکہ بازی کا ذکر کیا تو ساتھ ہی بتایا کہ وہ نماز میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف آتے ہیں تو اس کی غرض بھی صرف دھوکہ بازی ہے یعنی لوگ یہ خیال کریں کہ یہ مسلمان ہیں۔ اس لیے نماز میں خوش دلی یا شرح صدر کس طرح پیدا ہو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب تک نماز میں انشراح اور خوشی کی کیفیت پیدا نہ ہو وہ نماز صرف دکھاوے کی ہے۔ نماز جو خدا کے حضور حاضر ہونے کا نام اور اس کے سامنے عاجزی کا اظہار ہے اگر اس میں ایسی کشش اور جذب پیدا نہ ہو کہ اس کی طرف انسان کھنچا ہوا چلا جائے تو اس کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا اور بوجھ کے طور پر چند رکعت کا ادا کر لینا منافقوں سے مماثلت ہے۔ صحیح ایمان کا نشان یہ ہے کہ نماز میں راحت محسوس ہو اور وہ کیفیت پیدا ہو جس کا ذکر قرۃ عینی فی الصلوٰۃ میں ہے۔

۵۵۳؎ مذبذب۔ ذَبّ کے معنی دفع کرنا یا روکنا بھی ہیں اور طرد یا دور کرنا بھی (ل) پس مَذَبْذَب وہ ہے جو دونوں طرف سے مطرود ہو (ل) مگر امام راغب کہتے ہیں کہ مذبذب سے مراد مضطرب ہے کیونکہ ذَبْذَبَۃ جو اصل میں ہوا میں لٹکی ہوئی چیز کی آواز پر بولا جاتا ہے۔ ہر ایک اضطراب اور حرکت پر استعارۃً استعمال ہوتا ہے (غ) اور ذُباب (واحد ذبابۃ) اسی مادہ سے ہے اور مکھی کو کہتے ہیں۔
یہاں بتایا کہ منافق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا ایک طرف چلا جاتا ہے کبھی دوسری طرف۔ ایمان کو اللہ تعالیٰ نے ثبات سے مثال دی ہے اور اس سے اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے الابذکر اللّٰہ تطمئن القلوب (الرعد ۱۳-۲۸) اور کلمہ طیبہ کو اس درخت سے مثال دی ہے۔ جس کی جڑ مضبوط ہے اصلھا ثابت (ابراھیم ۱۴-۲۴) اور کلمہ خبیثہ کو اس سے جس کو قرار نہیں مالھا من قرار (ابراھیم ۱۴-۲۶) پس یہی معیار ایمان کا ہے۔

۵۵۴؎ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو ولی بنانے پر دیکھو ۳۹۹ منافقوں کے ذکر میں اس آیت کا لانا بتاتا ہے کہ یہ بھی ایک نفاق کی علامت ہے اور منافقوں کے ذکر میں پیچھے آ چکا ہے کہ وہ کفار سے تعلقات پیدا کر کے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں اسلام کے دشمنوں سے عزت کا خواہاں ہونا یہ بھی ان کی ولایت ہے۔

۵۵۵؎ دَرْك اور دَرَج ایک ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں یعنی اس سے بھی مراد درجہ ہی ہے۔ مگر استعمال میں یہ فرق ہے کہ اوپر کی طرف جانے کے لحاظ سے دَرَج بولا جاتا ہے اور پستی کی طرف جانے کے لحاظ سے درك اس لیے جنت کے درجات ہیں اور دوزخ کے دَرْك اور دَرْك سمندر کی غائت درجہ کی گہرائی کو بھی کہتے ہیں (غ) اسی مادہ سے ادراك وغیرہ الفاظ ہیں۔
منافق ارتکاب کفر بھی کرتا ہے اور چھپ کر اسلام کے ساتھ دشمنی بھی۔ پھر وہ اسلام کی صداقت کے نشان بھی دیکھتا ہے اس لیے سب سے نچلے طبقہ میں ہے، ذلیل ترین لوگ دنیا میں بھی وہی ہیں جو منہ سے کچھ کہتے ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ آج مسلمانوں کے اسلام میں کس قدر اخلاص ہے؟ اگلی آیت میں لفظ اخلاص لا کر صاف اس طرف اشارہ کیا ہے۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ﴿١٤٧﴾

اللہ تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا، اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ، اور اللہ قدر کرنے والا جاننے والا ہے ع۱۵۶

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيعًا عَلِيمًا ﴿١٤٨﴾

اللہ بری بات کے مشہور کرنے کو (کسی سے) پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ع۱۵۷

إِنْ تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوهُ أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا ﴿١٤٩﴾

اگر تم بھلی بات کو ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا بدی سے درگزر کرو تو اللہ معاف کرنے والا قدرت والا ہے ع۱۵۸

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١٥٠﴾

وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان راہ نکالیں۔

أُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ﴿١٥١﴾

وہ سچ مچ کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ع۱۵۹

ع۱۵۶ عذاب کی غرض اصلاح ہے: چونکہ منافقوں کا ذکر تھا اور ابھی ان کو یہ کہا گیا تھا کہ ان کے لیے آگ کا سب سے نچلا طبقہ ہے اس لیے اب بتاتا ہے کہ اس قدر شدید وعید کے باوجود بھی اگر یہ لوگ شکر کریں اور ایمان لائیں تو پھر اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ ان کو عذاب دے اس سے معلوم ہوا کہ عذاب کی اصل غرض انسان کی اصلاح ہے نہ کچھ اور۔ اگر انسان اپنے نفس کی اصلاح خود کرے تو عذاب بھی ٹل جاتا ہے۔ دوزخ کا عذاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہے جو شکر اور ایمان کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ شکر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کی جاتی اور ہر ایک طاقت سے اپنے محل اور موقعہ کے مطابق کام لیا جاتا دیکھو ع۷۵ ل اور ایمان کا یہ تقاضا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کیا جاتا۔

ع۱۵۷ الجھر۔ جَہر کسی چیز کے ظہور کو کہا جاتا ہے حاسۂ بینائی کی افراط سے ہو یا شنوائی کی۔ اوّل کی مثال ہے حتّٰی نری اللّٰہ جھرۃ (البقرۃ ۲-۵۵) ارنا اللّٰہ جھرۃ (النسآء ۴-۱۵۳) یہاں شنوائی کے لحاظ سے ہے ایسا ہی من اسرّ القول و من جھر بہ (الرعد ۱۳-۱۰) یعلم الجھر من القول (الانبیاء ۲۱-۱۱۰) ولا تجھر بصلاتک ولا تخافت بہا (بنی اسرائیل ۱۷-۱۱۰) ولا تجھروا لہٗ بالقول کجھر بعضکم لبعض (الحجرات ۴۹-۲) اور جھیر الصوت بلند آواز والے کو کہتے ہیں (رغ)۔ مگر یہاں مراد صرف اعلان ہے خواہ آواز سے ہو یا تحریر سے۔ یہ آیت قانون ازالۂ حیثیت عرفی کی بنیاد ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے کی نسبت کسی بُری یعنی ہتک آمیز بات کو شہرت دے ہوائے اس کے کہ ایک شخص مظلوم ہے یعنی اس کو نقصان پہنچا ہے تو اس کو حق ہے کہ وہ ظالم کی نسبت ہتک آمیز بات کا اعلان کرے مگر اس سے مراد وہی ہتک آمیز باتیں ہیں جو سچ ہیں ورنہ جھوٹ بات کہنے کا کسی صورت میں بھی حق نہیں۔ منافقوں کے ذکر میں اس آیت کا کیا تعلق ہے؟ بات یہ ہے کہ کئی رکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے حالات کو کھول کر بیان فرمایا اور جو کچھ ان کی چھپی ہوئی بدیاں تھیں ان کو ظاہر کیا اب ان کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے یہ سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خفیہ بدیوں کا یوں اعلان نہ کرتا اگر یہ لوگ ظالم نہ ہوتے ان کی شرارتوں کا کھلا ذکر اس لیے کرنا پڑا کہ یہ مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے اور ان کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔ آخر میں صفات سمیع علیم لانے سے مسلمانوں کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

ع۱۵۸ یہاں اپنے اسی قانون کو اور واضح کر کے بیان فرمایا ہے کہ کسی کے متعلق بھلی بات ہو تو اس کو بے شک ظاہر کرو یا چھپاؤ۔ اگر کسی نے بدی کی ہے تو اسے حتی الوسع معاف کرو۔ یہ وہ طریق ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ گویا بری بات کی تشہیر سے ہی نہیں روکا اسے معاف کرنے کی بھی ہدایت کی ہے ہاں اگر عفو سے اصلاح نہ ہوتی ہو اور ظلم انتہا کو پہنچ جائے تو پھر بیشک ظاہر کرے۔

ع۱۵۹ یہود و نصاریٰ اور منافقین کے باہم تعلقات تھے۔ اس لیے منافقوں کے ذکر کو ختم کر کے اب یہود و نصاریٰ کا ذکر اگلے رکوع میں شروع ہوتا ہے مگر ان آخری آیات میں ربط مضمون کو قائم کیا ہے۔ تعلقات کو چھوڑ کر حالت کے لحاظ سے منافقوں اور یہود وغیرہ میں یہ تعلق تھا کہ وہ دونوں ایمان اور کفر کے بین بین رستہ اختیار کر رہے تھے

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا
بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ
اُجُوْرَھُمْ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع
یَسْئَلُکَ اَھْلُ الْکِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْھِمْ
کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓی اَکْبَرَ
مِنْ ذٰلِکَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْھُمُ
الصّٰعِقَۃُ بِظُلْمِھِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ
بَعْدِ مَا جَآءَتْھُمُ الْبَیِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ
ذٰلِکَ ۚ وَاٰتَیْنَا مُوْسٰی سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۱۵۳﴾
وَرَفَعْنَا فَوْقَھُمُ الطُّوْرَ بِمِیْثَاقِھِمْ وَقُلْنَا
لَھُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَھُمْ لَا
تَعْدُوْا فِی السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْھُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ﴿۱۵۴﴾
فَبِمَا نَقْضِھِمْ مِّیْثَاقَھُمْ وَکُفْرِھِمْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ
وَقَتْلِھِمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِھِمْ قُلُوْبُنَا
غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ فَلَا
یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۵۵﴾
وَّبِکُفْرِھِمْ وَقَوْلِھِمْ عَلٰی مَرْیَمَ بُھْتَانًا عَظِیْمًا ﴿۱۵۶﴾

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے یہی وہ ہیں جن کو اللہ ان کے اجر دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو اُن پر آسمان سے ایک کتاب اتارے، سو موسیٰؑ سے انھوں نے اس سے بھی بڑھ کر سوال کیا اور کہا کہ اللہ کو ہمیں کھُلا کھُلا دِکھا۔ سو اُن کے ظلم کی وجہ سے اُن کو عذاب نے آپکڑا، پھر انھوں نے بچھڑا بنا لیا، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں، لیکن ہم نے یہ معاف کر دیا اور موسیٰؑ کو کھلا غلبہ دیا۔

اور ہم نے انکے اقرار کے وقت پہاڑ کو ان پر بلند کیا اور ہم نے ان کو کہا کہ فرمانبرداری کرتے ہوئے دروازے میں داخل ہو جاؤ اور ہم نے انکو کہا کہ سبت کے بارے میں حد سے نہ گزر جائیو اور ہم نے اُن سے مضبوط وعدہ لیا

سو اُن کے عہد کو توڑ دینے کی وجہ سے اور اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے اور ان کے نبیوں کو ناحق قتل کرنے اور ان کے یہ کہنے سے کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے اُن پر مہر لگا دی سو وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ع۶۶۰

اور ان کے کفر کے سبب سے اور ان کے مریم پر بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے ع۶۶۱

جس کی طرف الفاظ یرید ون ان یتخذ وا بین ذٰلک سبیلا میں اشارہ کیا ہے۔ منافق تو یوں کہ کبھی ایمان لائے کبھی کافر ہو گئے یا ظاہر میں ایمان لائے اندر سے کافر رہے اور یہود و نصاریٰ یوں کہ بعض رسولوں پر ایمان لائے اور بعض کا کفر کیا۔ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق سے مراد صرف یہی نہیں کہ اللہ کو مان لیا اور رسول کا انکار کر دیا جیسے برہمو ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہ بعض رسولوں کو مان لیا اور بعض کا انکار کر دیا جیسے تمام اہل کتاب کی حالت ہے اور یہ اس لیے کہ اللہ کے کسی رسول کا انکار گویا اللہ کا ہی انکار ہے۔

ع۶۶۰ لکھی لکھائی کتاب کے اُتارنے کا سوال اور اس کا جواب: ان تمام امور کا ذکر سورۂ بقرہ میں ہو چکا ہے۔ یہاں چونکہ حضرت مسیحؑ کے متعلق ان کے جرم کا ذکر کرنا تھا، اس لیے خلاصتہً ان کے پہلے جرموں کو بھی دوہرایا ہے۔ اور کتاب آسمان سے اتارنے سے مراد یہ ہے کہ کاغذوں پر لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اُترے جو گویا خدا نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہو تو فرمایا کہ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسا موسیٰؑ سے کیا تھا کہ خدا کو ان آنکھوں سے کھلا کھلا دیکھیں۔ جس طرح خدا تعالیٰ کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا، اسی طرح اس کا کلام بھی اس طرح پر لکھا ہوا نازل نہیں ہوتا جس طرح انسانوں کی بنائی ہوئی کتابیں ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ رسول کے قلب پر بتوسط جبرائیلؑ نازل کیا جاتا ہے چنانچہ یہ جواب صفائی سے اگلے رکوع کی پہلی آیت میں دیا ہے انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح ..... یعنی تمہاری طرف اسی طرح وحی ہوئی ہے جس طرح پہلے انبیاءؑ کی طرف ہوتی تھی۔

ع۶۶۱ ان کے کفر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت انکار ہے جیسا آگے ذکر آئیگا اور حضرت مریمؑ پر بہتان یہ تھا کہ ان کو نعوذ باللہ من ذٰلک زنا سے متہم کرتے تھے یہودیوں کی روایات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے ان کو یوسف کے متعلق متہم کیا ہو۔ یعنی شادی سے پہلے یوسف کے ساتھ کسی ناجائز تعلق ہونے پر الزام لگایا ہو۔ بلکہ مسیحؑ کی ایک سوانحعمری یہودی نقطۂ خیال سے لکھی ہوئی کچھ عرصہ ہوا طبع ہوئی تھی۔ اس میں ایک یہودی پینتھر نام کے ساتھ ناجائز تعلق ہونے کا اتہام حضرت مریم صدیقہ پر لگایا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کو بہتان عظیم قرار دیکر حضرت مریم کا دامن پاک کیا ہے اور یہ حضرت محمد مصطفٰے صلعم کا احسان عیسائیوں پر تھا جس کا معاوضہ

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ

اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا اور انھوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے صلیب پر مارا مگر وہ ان کے لیے اس جیسا بنا دیا گیا ۶۶۲ اور بیشک وہ لوگ

اس ناشکر گزار قوم نے یہ دیا ہے کہ اس پاکوں کے سردار محمد صلعم پر طرح طرح کے ناپاک اتہام لگائے۔ مگر سچ ہے پاکوں کے منہ سے پاک باتیں ہی نکلتی ہیں اور ناپاکوں کے منہ سے ناپاک۔

۶۶۲ قتلوہ۔ قتل کے معنی ہیں کسی شخص پر موت وارد کرنا ضرب سے یا پتھر سے یا زہر سے یا کسی وجہ سے (ل۔ت) یا جسم سے روح کو الگ کرنا (غ)

صلبوہ۔ صَلْب کے معنی ہیں الصدید الذی یسیل من المیت یعنی مخ یا پیپ جو مردہ جسم سے نکلتی ہے والصَّلب ھٰذہ القتلۃ المعروفۃ مشتق من ذٰلک لان وَدَکہ وصدیدہ یسیل (ل) یعنی صَلْب قتل کرنے کا یہ مشہور طریق ہے (جس کی تشریح کی حاجت نہیں) جو اسی سے مشتق ہے کیونکہ اس کی مخ اور پیپ نکلتی ہے اور یہی تاج العروس میں ہے۔ پس صَلْب لکڑی پر لٹکانے کا نام نہیں بلکہ قتل کرنے یعنی مارنے یا روح کو جسم سے الگ کرنے کا ایک خاص طریق ہے۔ پس جس طرح کسی شخص کے قتل کی نفی سے مراد یہ ہے کہ اس پر موت بذریعہ قتل وارد نہیں ہوئی نہ یہ کہ اسے کسی نے تلوار بھی نہیں ماری اسی طرح ما صلبوہ میں نفی صرف اس بات کی ہے کہ اس پر موت بذریعہ صلیب وارد ہوئی نہ اس بات کی کہ وہ لکڑی پر لٹکایا گیا ہو اور یہودیوں میں صلیب کی یہ طرز تھی کہ ایک ٹی کی شکل کی لکڑی پر یعنی + اس قسم کی لکڑی پر ایک شخص کو لٹکا دیا جاتا تھا اور اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں لگا دی جاتی تھیں۔ بائبل کے انسکلوپیڈیا میں ہے کہ لاش صلیب پر رہتی تھی۔ یہاں تک کہ بالکل سوکھ جاتی۔ اور یہودی انسکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ مصلوب کی موت بھوک اور طاقت کے زائل ہو جانے سے واقع ہوتی تھی اور لاش بعض وقت تین دن صلیب پر لٹکی رہتی تھی۔ ہاں موت جلد واقع کرنے کے لیے بعض وقت ٹانگیں توڑ دی جاتی تھیں۔ پس اہل عرب یہود اور بائبل کے محاورہ کی رو سے مصلوب وہی شخص کہلا سکتا تھا جس کی موت اس ذریعہ سے واقع ہو جائے۔

یہاں حضرت عیسیٰؑ سے قتل و صلیب ہر دو کی نفی کی گئی ہے اور یہ عطف خاص علی العام ہے گویا یہ بتایا ہے کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی طریق سے حضرت مسیح کی جان ان کے جسم سے جدا نہیں ہوئی نہ بذریعہ قتل، نہ بذریعہ صلیب۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح اب تک زندہ ہیں۔ کیا اگر ایک شخص کے متعلق کہا جائے کہ وہ قتل یا صلیب سے نہیں مارا گیا تو اس کی مطلق موت کی نفی ہو جاتی ہے؟ یہ کبھی کسی کے وہم میں بھی نہیں آ سکتا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ حضرت مسیح کی نفی قتل و صلیب سے ان کی موت کی نفی مراد لی جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن شریف خود بتاتا ہے کہ اگر حضرت مسیح کی موت بذریعہ قتل و صلب واقع نہیں ہوئی تو کیا ہوا۔ فرمایا ولکن شبہ لھم مگر وہ (یعنی مسیح) ان کیلئے مشابہ بنایا گیا۔ جس کے معنی غلطی سے یوں کیے جاتے ہیں کہ کوئی شخص مسیح کا مشابہ بنایا گیا۔ یہ صریح غلطی ایک قصہ کو ذہن میں رکھ کر کی گئی ہے ورنہ الفاظ قرآنی اس کو ہرگز برداشت نہیں کرتے۔ ضمیر جو شبہ میں ہے وہ صرف حضرت مسیح کی طرف جا سکتی ہے جن کا ذکر چل رہا ہے اور کسی ایسے شخص کی طرف ہرگز نہیں جا سکتی جس کا ذکر قرآن شریف میں کہیں بھی نہیں بلکہ کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں جو مسیح کی جگہ قتل و صلیب کی موت سے مرا ہو اور پھر تعجب پر تعجب یہ کہ اگر یہ معنی کیے جائیں تو ماقتلوہ و ما صلبوہ کا جواب بھی کوئی نہیں بنتا۔ کیونکہ ان دونوں باتوں میں کیا تعلق ہے کہ مسیح قتل یا صلیب کی موت نہیں مرا۔ بلکہ ایک اور شخص مسیح کی طرح ہو گیا۔ اس دوسرے کے مقتول یا مصلوب ہونے کا یہاں اشارہ تک نہیں۔

انجیل کی شہادت کہ مسیح صلیب پر چڑھائے گئے مگر زندہ رہے: اب واقعات تاریخی کو لو تو کیسی صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی معنی الفاظ قرآنی کے درست ہیں۔ ذیل کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسیح صلیب پر چڑھائے گئے مگر مصلوب نہیں ہوئے بلکہ زندہ اُترے البتہ صلیب پر چڑھنے کی وجہ سے وہ مصلوب یا مقتول سے مشابہ ہو گئے۔ اول حضرت مسیح ایک روایت کے مطابق صلیب پر چھ گھنٹے (مرقس ۱۵: ۲۵) اور ایک روایت کے مطابق تین گھنٹے سے بھی کم رہے (یوحنا ۱۹: ۱۴) دوم یوحنا ۱۹: ۳۲ سے ثابت ہے کہ مسیح کے ساتھ جو دو چور صلیب پر لٹکائے گئے جب ان کو اُتارا گیا تو ان کی ٹانگیں توڑی گئیں تب ان کی موت واقع ہوئی مسیح بھی ساتھ ہی چڑھائے اور ساتھ ہی اُتارے گئے مگر ان کی ٹانگیں نہیں توڑی گئیں۔ سوم سپاہیوں میں سے ایک نے مسیح کی پسلی بھالے سے چھیدی تو اس سے لہو اور پانی نکلا۔ یوحنا ۱۹: ۳۴۔ یہ صریح زندگی کی علامت ہے۔ چہارم جب کسی نے پلاطوس کو جا کر کہا کہ مسیح صلیب پر مر گئے تو اس نے متعجب ہو کر شبہ کیا کہ اس قدر جلد کس طرح مر گئے۔ مرقس ۱۵: ۴۴ پنجم مسیح کو دفن نہیں کیا گیا بلکہ ایک کھلی جگہ میں رکھ کر سامنے ایک پتھر رکھ دیا گیا جس سے ہوا اندر جاتی رہی مرقس ۱۵: ۴۶۔ حالانکہ جس کو دفن کیا جاتا ہے اس کے لیے ہوا کے آنے جانے کا راستہ نہیں رکھا جاتا۔ ششم جب تیسرے دن مریم مگدلینی وغیرہ آئیں تو پتھر کو دروازہ سے ہٹا ہوا پایا (مرقس ۱۶: ۴) جس سے معلوم ہوا کہ پتھر کو ہٹا کر مسیح کو اندر سے نکالا گیا۔ ہفتم یوحنا ۲۰: ۱۵ سے ثابت ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی نے حضرت مسیح کو دیکھا تو انھیں باغبان سمجھا جس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بھیس بدلا ہوا تھا۔ ہشتم کئی دن بعد جب حواریوں نے مسیح کو دیکھا تو اس کے ہاتھوں پر کیلوں کے زخموں کے نشان باقی تھے (یوحنا ۲۰: ۲۵ سے ۲۸) نہم لوقا ۲۴: ۳۹۔ ۴۴ سے ثابت ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد حواریوں کے ساتھ مل کر آپ نے بھونی ہوئی مچھلی اور شہد کھایا۔ دہم جلیل کو پیدل سفر کیا۔ متی ۲۸: ۱۰)

تاریخی واقعات اور اتمام حجت: اب ایک طرف یہ واقعات تاریخی ہیں کہ مسیح صلیب پر چڑھے مصلوب کی طرح ہوئے مگر مصلوب نہیں ہوئے یعنی صلیب پر مرے نہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اناجیل کے بیانات ہیں اور محرف و مبدل کتابیں ہیں اس لیے قابل قبول نہیں۔ محرف و مبدل کے یہ معنی سمجھ لینا

لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ ؕ مَا لَہُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ
اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوۡہُ یَقِیۡنًۢا ﴿۱۵۷﴾
بَلۡ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ

جنھوں نے اس کے متعلق اختلاف کیا اس بارے میں شک میں ہیں انکو
اس کا کچھ علم نہیں صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور انھوں نے اسکو یقینی طور پر قتل نہیں کیا ۶۶۳
بلکہ اللہ نے اسے اپنا قرب عطا فرمایا اور اللہ غالب

کہ ان میں جو کچھ واقعات تاریخی لکھے ہیں وہ سرتا پا غلط ہیں سخت غلطی ہے۔ تحریف عموماً عقاید کے معاملہ میں ہوئی ہے۔ ورنہ واقعات تاریخی جن پر سب اناجیل کا اتفاق ہو محرف کہہ کر رد نہیں کئے جا سکتے بھلا اگر یہ اناجیل محرف ہیں تو انجیل برنباس کے لئے کونسی سند قرآن شریف یا حدیث میں ہے کہ وہ غیر محرف ہے۔ اور یہاں اتمام حجت تو یہود اور نصاریٰ پر کرنا مقصود ہے۔ اب عقاید کے معاملہ میں اتمام حجت دلائل سے ہوگا اور واقعات تاریخی میں اتمام حجت کسی قوم کی مسلمہ تاریخ کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ اب مسلمہ تاریخ وہ ہے جو عیسائیوں کو مسلم ہے۔ ان پر اتمام حجت یوں تو ہو سکتا ہے کہ ان کو ان کی اپنی کتابوں سے دکھایا جائے کہ یہ واقعات جن کو تم تسلیم کرتے ہو صاف بتاتے ہیں کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا لیکن اگر ان کے سامنے ایک نئی کہانی بنا کر رکھ دی جائے کہ مسیح کا ہمشکل مصلوب ہو گیا تھا اور حضرت مسیح آسمان پر چلے گئے تو اس سے کہانی بنانے والا صرف اپنا دل خوش کر سکتا ہے۔ دوسری قوم پر اس سے کچھ اتمام حجت نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کا کمال تو یہ ہے کہ عیسائیوں پر اتمام حجت انہی کی تاریخ کو پیش کر کے کیا ہے۔ ایک اُمّی کا دوسری قوم کی کتابوں کی ایسی باریک باتوں تک پہنچنا بالکل ناممکن تھا۔ یہ خدائے عالم الغیب کا ہی کام تھا۔

مسیح کے ہمشکل کا قصہ: دوسری طرف جو روایت پیش کی جاتی ہے نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں نہ انجیل میں نہ کسی تاریخ میں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مسیح کا ہمشکل کسی کو بنا دیا گیا کہ یہودی اسے صلیب دے لیں۔ اس کی ضرورت کیا تھی؟ بھلا اگر کسی کو ہمشکل بنائے بغیر خدا تعالیٰ مسیح کو اُٹھا لیتا تو یہودی اس کو وہاں سے پکڑ لاتے؟ جو خدا نے ایک ہمشکل بنا کر ان کو دھوکہ میں ڈال دیا؟ پھر کیسی متضاد روایات بنائی گئی ہیں۔ ایک میں ہے کہ مسیح کے کہنے پر ان کے ایک حواری نے ہمشکل ہونا قبول کر لیا اور مصلوب ہُوا۔ ایک نبی اپنی جان بچا کر اپنے بے گناہ صحابی کو بے ضرورت مروا دے یہ بے معنی ہی نہیں سخت قابل اعتراض ہے۔ اس لئے دوسری روایت یوں بنائی ہے کہ وہ ایک منافق تھا تیسری یوں کہ جو پکڑنے آیا تھا وہ ہمشکل بنا دیا گیا۔ ان دونوں صورتوں میں شخص مذکور نے کچھ واویلا نہ کیا کچھ پتہ نہ بتایا کہ میں کون ہوں؟ یہ پہلے سے بڑھ کر تعجب کا مقام ہے اور ایک روایت میں ہے کہ یہودیوں نے جب مسیح کو نہ پایا تو خود ہی ایک یہودی کو پکڑ کر صلیب دیدیا تا کہ لوگوں کو پتہ نہ لگ جائے کہ مسیح آسمان پر چلا گیا ہے۔ اور کسی کو قریب نہ آنے دیا یہ سب اٹکل پچو باتیں ہیں ایک بات پر اعتراض ہوا تو دوسری بنا لی، دوسری پر اعتراض ہوا تو تیسری بنا لی۔ بھلا اگر مسیح حوالات میں نہ ملتے تو نتیجہ یہ نکالا جاتا کہ کہیں بھاگ گئے ہیں یا یہ کہ آسمان پر چلے گئے ہیں؟ آج تک کسی جیل خانہ کے مفرور کی نسبت یہ خیال کسی شخص نے نہیں کیا کہ وہ آسمان پر چلا گیا ہوگا۔ آسمان پر جاتے ہوئے تو ایک شخص نے بھی نہ دیکھا اور یونہی ان کے حوالات سے غائب ہو جانے پر سب لوگ سمجھ لیتے کہ ضرور آسمان پر ہی گئے ہیں یہ کس قدر بعید از قیاس بات ہے۔

مسیح کے آسمان پر جانے کا ذکر قرآن میں نہیں: علاوہ ازیں خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ مسیح اگر مقتول مصلوب نہیں ہوا تو کیا ہوا۔ سورۃ آل عمران میں یٰعیسٰی انّی متوفیک کا صریح وعدہ موجود ہے، یعنی میں تجھ کو طبعی موت سے مارنے والا ہوں اور یہ وعدہ وہاں کیا جہاں اس سے پہلے یہودیوں کی حضرت مسیح کے خلاف تدبیروں کا ذکر ہے اور وہ تدبیریں مصلوب کرنے کی تھیں سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم مصلوب کی موت نہیں مرو گے بلکہ میں تم کو طبعی موت سے ماروں گا اور سورۃ مائدہ میں اس وعدہ کے پورا ہو جانے کا ذکر ہے فلما توفیتنی جب تو نے مجھ کو طبعی وفات دی۔ آسمان پر زندہ لے جانے کا نہ کہیں وعدہ ہے نہ زندہ آسمان پر لیجانے کا کہیں ذکر ہے پس نفی قتل اور نفی صلب کر کے اور مقتول و مصلوب کا شبیہ قرار دے کر اور پھر طبعی وفات کا ذکر کر کے سارے معاملہ کو صاف کر دیا ہے۔

ع۶۶۳ وما قتلوہ یقیناً کے معنی تو صاف ہیں ما قتلوہ قتلاً یقیناً یعنی انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو یقینی طور پر قتل نہیں کیا بلکہ شکی طور پر قتل کیا اور تاریخ سے ظاہر ہے کہ خود ان کے اندر شکوک پیدا ہو چکے تھے۔ امام راغبؒ نے یوں معنی کیے ہیں ما علموا کونہ مصلوباً علماً یقیناً یعنی اس کے مصلوب ہونے کو علم یقینی کے ساتھ نہیں جانا اور یہ معنی بھی سیاق عبارت کے لحاظ سے درست ہیں کیونکہ پیچھے شک کا ذکر ہے اور بعض نے قتلوہ میں ضمیر کو علم کی طرف پھیرا ہے۔ کیونکہ قتلت العلم اور قتلت کذا علماً کے معنی ہیں اس کا پورا علم حاصل کیا (غ) اور دونوں معنوں کے لحاظ سے مطلب ایک ہے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے اسے یقینی طور پر قتل نہیں کیا یعنی قتل شکی رہا اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ کہ اس کے قتل ہو جانے کے بارہ میں ان کو یقین نہیں ہوا وہ شک میں رہے کسی دوسرے کے قتل کا کوئی ذکر یہاں نہیں۔

شک کا ہونا آسمان پر جانے کو غلط ٹھہراتا ہے: اختلاف کرنے والے لوگ یہود و نصاریٰ دونوں ہیں۔ سو تاریخ سے ثابت ہے کہ فی الواقع دونوں شک میں رہے اور کسی کو بھی قتل کا یقین نہیں ہوا۔ تین گھنٹے کے اندر اندر صلیب سے اُتر آنا۔ ٹانگیں نہ توڑا جانا۔ پیلاطوس کا شک کرنا۔ پتھر کا ہٹا ہوا پایا جانا۔ حواریوں سے خفیہ ملاقاتیں۔ کیا یہ صریح امور نہیں جن کا لازمی نتیجہ شک ہونا چاہیئے۔ جو دونوں گروہوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ اگر مسیح آسمان پر چلے گئے تھے اور ان کا ہمشکل مصلوب ہوا تھا تو شک کیسا اور علم کا نہ ہونا کیا معنی اور عدم یقین کی کیا وجوہات تھیں؟ یا تو یہودیوں نے مسیح کو آسمان پر جاتے دیکھا ہوگا تو ان کو یقین ہوگا کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا اور یا نہیں دیکھا تو ان کو یقین ہوگا کہ مسیح مصلوب ہو گئے دونوں صورتوں میں شک کوئی نہیں۔ رہے عیسائی

عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾ حکمت والا ہے ۶۶۴

وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾

اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر وہ اپنی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لاتا ہے اور قیامت کے دن وہ اُن پر گواہ ہوگا ۶۶۵

ان کو تو اس قصہ کی رو سے یقین تھا کیونکہ یہ سارا قصہ حواریوں کے سامنے ہوا کہ ایک مسیح کا ہمشکل ہو گیا۔ پس وہ تو یقین کے ساتھ جانتے ہونگے کہ مسیحؑ مصلوب نہیں ہُوا ان کو بھی شک کوئی نہیں ہو سکتا۔ شک کی صورت صرف وہی ایک ہے جو اوپر بیان ہوئی اور جس کا یقینی ثبوت اناجیل سے ملتا ہے۔

ع۶۶۴ بَلْ اضراب کے لیے آتا ہے اور اس سے مراد کبھی پہلے خیال کا ابطال ہوتا ہے اور کبھی ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف انتقال پہلے کی مثال ہے وقالوا اتخذ الرحمٰن ولدا سبحانہٗ بل عباد مکرمون۔ اور دوسرے کی قد افلح من تزکی وذکر اسم ربہ فصلی بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا (مغنی)

رفعہ اللہ الیہ پر دیکھو ع۴۴۵ اور ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کی ہے فرفعہ ایاہ توفیہ ایاہ وتطہیرہ من الذین کفروا یعنی اللہ تعالیٰ کے مسیح کے رفع کرنے سے مراد ہے ان کو وفات دینا اور کافروں سے ان کی تطہیر کرنا۔

پچھلے واقعات اور رفع مسیح میں کیا تعلق ہے، عام طور پر مفسرین نے یہ تعلق قائم کیا ہے کہ حضرت مسیح مقتول و مصلوب نہیں ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ مگر یہ معنی رفع کے سراسر خلاف لغت ہیں اور ناقابل قبول۔ اصل بات یہ ہے کہ پیچھے ذکر اس بات کا تھا کہ یہودی ان کو مقتول و مصلوب سمجھتے ہیں مگر یہود و نصاریٰ دونوں کو ان کے مقتول و مصلوب ہونے کا یقین نہیں بلکہ اللہ نے اسے رفع عطا فرمایا یعنی بلندی درجات اب خواہ بل کو پہلے مضمون کے ابطال کے لیے سمجھا جائے اور خواہ انتقال کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو مصلوب مان کر اسے قرب الٰہی سے دور پھینکتے ہیں مگر اللہ نے اسے قرب عطا فرمایا اب قرب بارگاہ الٰہی اور مصلوبیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لیے کہ یہودی جھوٹے مسیحوں کو مصلوب کرتے تھے اور اس لئے بھی کہ استثناء ۲۱: ۲۳ سے اور پھر گلتیوں ۳: ۱۳ سے ثابت ہے کہ صلیب کی موت کو لعنتی موت سمجھا جاتا تھا۔ اور لعنت کا مفہوم اللہ تعالیٰ سے دُوری ہے۔ پس لعنت کے ابطال کے لئے رفع کا ذکر کیا، کیونکہ لعنت دوری ہے اور رفع قرب۔

ع۶۶۵ حضرت ابوہریرہؓ کی طرف ایک روایت منسوب ہے جس میں نزول ابن مریم کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا فاقرؤا ان شئتم وان من اھل الکتاب یعنی جہاں رسول اللہ صلعم سے یہ روایت کی کہ ابن مریم حکم عدل ہو کر نازل ہوگا کسر صلیب کریگا اور قتل خنزیر کرے گا اور تمہارا امام تم ہی سے ہوگا۔ تو ساتھ اپنی طرف سے بڑھایا کہ چاہو تو یہ آیت پڑھ لو کہ اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر وہ اپنی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لاتا ہے یا لائے گا اور مراد اس سے یہ لی گئی ہے کہ سب یہودی حضرت عیسیٰ پر ان کے دوسرے نزول کے وقت ایمان لے آئیں گے۔ جو شخص یہ روایت بیان کرتا ہے کہ نازل ہونے والا ابن مریم تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا وہ یہ عقیدہ نہیں رکھ سکتا کہ حضرت عیسیٰ خود دوبارہ آئیں گے پس حضرت ابوہریرہؓ کا مطلب اس آیت کی طرف توجہ دلانے سے یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت عیسیٰؑ کے دوسرے نزول میں سب یہودی ایمان لے آئیں گے علاوہ ازیں یہاں صاف فرمایا کہ یوم القیامۃ یکون علیہم شہیدا۔ کہ مسیح قیامت کے دن ان پر گواہ ہونگے کن پر؟ یہودی مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ دوسری جگہ خود بتا دیا کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر حضرت عیسیٰ گواہ ہونگے وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم (المائدہ ۵-۱۱۷) یعنی عیسائی لوگ حضرت عیسیٰؑ کی اپنی امت پس یہاں اہل کتاب سے یہودی ہرگز مراد نہیں، عیسائی مراد ہیں اور پھر یہودیوں کا حضرت عیسیٰ پر دوبارہ نزول کے وقت ایمان لانا بے معنی ہے۔

حضرت عیسیٰ اگر دوبارہ آئیں تو لوگ ایمان اُن پر نہیں لائیں گے بلکہ آنحضرت صلعم پر لائیں گے: اگر دوبارہ نزول فرض بھی کر لیا جائے تو ایمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ لائیں گے نہ حضرت عیسیٰ پر۔ اس وقت حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہوئے کہ اس وقت کے نبی حضرت عیسیٰ ہونگے حالانکہ عام عقیدہ کے مطابق بھی وہ محض مجدد ہو کر آئیں گے نہ نبی ہو کر پھر ان پر ایمان لانے کے کیا معنی۔ اور پھر جو حضرت عیسیٰ پر ایمان لائیں گے یہاں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ ان پر قیامت کے دن شہید ہونگے گویا اُمت محمدیہ کے ایک بڑے حصہ پر جو حضرت عیسیٰ کے ذریعہ سے مسلمان ہوگا شہید حضرت محمد مصطفےٰ صلعم نہ ہونگے بلکہ حضرت عیسیٰ ہونگے حالانکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا فکیف اذا جئنا من کل اُمۃ بشہید وجئنا بک علیٰ ھٰؤلاء شہیدا (۴۱:۴) یعنی ہر امت میں اس کا رسول شہید ہوگا اور آپ یعنی محمد مصطفےٰ صلعم ان پر یعنی امت محمدیہ پر شہید ہونگے۔ مگر حضرت عیسیٰ کو دوبارہ لانے والے آنحضرت صلعم کو آدھی امت محمدیہ پر شہید ٹھیراتے ہیں اور باقی آدھی بلکہ زیادہ پر حضرت عیسیٰ کو شہید بناتے ہیں اور ساتھ ہی حضرت عیسیٰ کو اپنی ساری امت پر بھی شہید ٹھہراتے ہیں تلک اذا قسمۃ ضیزیٰ۔ کاش مسلمان غور کرتے تو حضرت عیسیٰ کے نزول ثانی کا مسئلہ کس قدر آسان تھا۔

پھر یہ حصر کہ سب کے سب یہودی ایمان لائیں گے اوّل تو کروڑہا یہودی نزول سے پہلے مر چکے وہ کس طرح ایمان لائیں گے، دوسرے قرآن شریف صاف فرماتا ہے وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ (آل عمران ۳-۵۵) پس حضرت عیسیٰؑ کے منکر بھی قیامت تک رہیں گے، اس لئے سب یہودیوں کا ایمان لانا صریح اس آیت کے خلاف ہے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ
طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾

سو اُن لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جو یہودی ہوئے ہم نے اُن پر اچھی چیزیں جو اُن کے لیے حلال کی گئی تھیں حرام کر دیں اور ان کے اللہ کی راہ سے بہت روکنے کی وجہ سے۔

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾

اور ان کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور ان کے لوگوں کا مال ناحق کے ساتھ کھانے کی وجہ سے اور ہم نے اُن میں سے کافروں کے لیے دردناک دکھ تیار کیا ہے۔[۷۶۶]

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ
قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ
سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع

لیکن اُن میں سے علم میں پختہ لوگ اور مومن اس پر ایمان لاتے ہیں، جو تیری طرف نازل کیا گیا، اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا اور نماز کے قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور آخر کے دن پر ایمان لانے والے، وہ ہیں جن کو ہم بڑا اجر دیں گے۔[۷۶۷]

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ
وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

بے شک ہم نے تیری طرف وحی کی، جیسے ہم نے نوحؑ اور اُس سے پچھلے نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم

جیسا کہ اوپر دکھایا گیا۔ یہاں اہل کتاب سے مراد عیسائی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں جب پھر یہودیوں کے ذکر کی طرف عود کیا تو صرف ضمیر پر اکتفا نہیں کیا نہ وہاں اہل کتاب کا لفظ استعمال کیا جیسے پہلے کیا تھا بلکہ صاف فرمایا فبظلم من الذین ھادوا اور مطلب صاف ہے کہ حالانکہ عیسائی خود حضرت عیسیٰ کے صلیب پر مرنے کے معاملہ میں شک میں ہیں اور ان کو یقین نہیں مگر ان میں سے ہر ایک اس پر اپنی موت سے پہلے ایمان ضرور لاتا ہے۔ عیسائیت کی بنیاد حضرت مسیح کے مصلوب ہونے پر ہے اگر مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تو نہ انہوں نے لوگوں کے گناہوں کی لعنت اٹھائی نہ وہ کفارہ ہو سکتے ہیں اور موت سے پہلے کا لفظ اس لیئے بڑھایا کہ موت سے پہلے ضرور ہے کہ پادری عیسائی عقیدہ کا اقرار کرائے پس مطلب صاف یہ ہے جو عین سیاق عبارت کے مطابق ہے کہ عیسائی خود شک میں ہی ہیں کہ صلیب پر موت واقع ہوئی یا نہیں مگر باایں اس بات پر اپنی موت سے پہلے ایمان ضرور لاتے ہیں گویا بتایا ہے کہ ان کا ایمان ان کی اپنی تاریخ کے خلاف ہے اور حضرت عیسیٰ قیامت کے دن ان پر گواہ ہونگے یعنی بتائیں گے کہ کس طرح انہوں نے ان کی تعلیم کے خلاف اور واقعات کے خلاف ایک عقیدہ قائم کر لیا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے صحیح معنی نہ سمجھے تھے۔ تو خود حضرت ابن عباسؓ نے ان معنوں کی تردید کی ہے۔ کیونکہ ابن جریر میں متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اس کے معنی یوں کرتے تھے کہ ہر یہودی اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لاتا ہے کہ وہ خدا کے رسول تھے اور دوسری قرأت قبل موتہم (ث) اس کی موید ہے اور حضرت ابن عباسؓ کا فہم قرآن بہرحال حضرت ابوہریرہؓ سے بڑھ کر ہے۔

اور جو معنی میں نے کیے ہیں ان میں مضمون کا انتقال عیسائیوں کی طرف ہوا ہے اور یوم القیامۃ یکون علیہم شہیداً سے یہ ظاہر ہے اور اگلے رکوع کے شروع میں بھی اسی لیئے عیسائیوں کے عقیدہ باطلہ کا ذکر ہے۔ گویا قرآن کریم نے اگر ایک طرف یہود کی تفریط کا ذکر کیا تو ساتھ ہی عیسائیوں کو بھی ان کے غلو پر ملزم کیا ہے۔

ع[۷۶۶] کونسی اچھی چیزیں ان پر حرام کی گئیں اور کس لیے؟ وجہ تو خود بیان فرما دی کہ ان کے ظلم کی وجہ سے اور سود اور ناحق مال کھانے سے۔ سود خوار ہو جانے کی وجہ سے اور لوگوں کا مال ناجائز لیکر ان میں دنیا کی محبت بہت بڑھ گئی ایثار اور قربانی کا مادہ کم ہو گیا۔ دوسری جگہ فرمایا ام لھم نصیب من الملک فاذاً لا یؤتون الناس نقیراً (النسآء - ۵۳) بادشاہت ان کو کس طرح ملے یہ تو لوگوں کو نقیر بھی نہ دیں۔ ایسے بخیلوں کو حکومت نہیں ملا کرتی۔ پس یہی وہ طیبات ہیں جو ان پر حرام کر دی گئیں۔ اور اس کے مقابل پر فرمایا کہ دردناک دکھ ہے سو وہ ذلیل اور دربدر ہونے کا دکھ ہے۔

ع[۷۶۷] یعنی یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو راسخ فی العلم ہیں نرے تقلید کے طور پر پہلوں کے پیچھے نہیں لگے ہوئے بلکہ خود تحقیق کر لیتے ہیں۔ وہ قرآن پر

وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِیْسٰی وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْنُسَ وَ ھٰرُوْنَ وَ سُلَیْمٰنَ ۚ وَ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾

نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور (اس کی) اولاد اور عیسٰیؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی کی اور ہم نے داؤدؑ کو زبور دی ۶۶۸

وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰھُمْ عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْھُمْ عَلَیْكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَكْلِیْمًا ﴿۱۶۴﴾

اور (کچھ) رسول ہیں جن کا حال ہم تجھ سے پہلے بیان کر چکے ہیں اور (کچھ) رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے تجھ سے نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰؑ سے بہت باتیں کیں ۶۶۹

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ

رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں

ایمان لاتے ہیں مقیمین الصلوٰۃ میں نصب علی المدح ہے کیونکہ یہاں پھر حق کی شناخت کا ذکر ہے اور وہ سوائے رجوع الی اللہ کے حاصل نہیں ہو سکتا۔

۶۶۸ وحی کے اقسام: اوحینا۔ وحی کے اصل معنی الاشارۃ السریعۃ ہیں یعنی تیزی سے اشارہ کرنا۔ اور یہ کبھی محض رمز کے طور پر ہوتا ہے یا جوارح کے اشارہ سے جیسے حضرت زکریاؑ کے ذکر میں فاوحی الیھم (مریم ۱۹-۱۱) اور کلمہ الٰہیہ جو انبیاءؑ اور اولیاءؑ کی طرف ڈالا جاتا ہے وہ بھی وحی کہلاتا ہے اور یہ تین طرح پر ہوتا ہے جیسا کہ ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من ورآئ حجاب او یرسل رسولا (الشوریٰ ۴۲-۵۱) سے ظاہر ہے (رغ) اور یہ تین قسم یہ ہیں: اوّل دل میں ایک بات کا ڈالنا جیسے آنحضرت صلعم نے فرمایا ان روح القدس نفث فی روعی دوم من وراء حجاب جیسے رویا کشف، الہام اسی میں وہ مبشرات آتی ہیں جن کا ذکر حدیث میں ہے کہ اس اُمت میں بعد انقطاع نبوت وہ رہ گئی ہیں اور تیسرا بذریعہ رسول جس کو دیکھا جاتا ہے اور اس کا کلام سُنا جاتا ہے یعنی بذریعہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اور یہ تیسری قسم صرف انبیاءؑ سے مخصوص ہے اور پہلی دو میں اولیاء اللہ بھی شامل ہیں اور یہاں مراد یہی تیسری قسم کی وحی ہے جس سے انبیاءؑ مخصوص ہیں۔

آنحضرت صلعم کی وحی دیگر انبیاءؑ کی طرح تھی: پچھلے رکوع کی آخری آیت میں یہ ذکر کیا تھا کہ اہل کتاب میں سے بھی جو محقق ہیں وہ آنحضرتؐ پر ایمان لاتے ہیں جیسے پہلے انبیاءؑ پر ایمان لاتے ہیں۔ اس لیے اب فرماتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی وحی کوئی الگ وحی نہیں۔ ساتھ ہی اہل کتاب کے اس سوال کا جواب ہے کہ ان پر آسمان سے کوئی کتاب اتارو۔ جو پچھلے رکوع کے شروع میں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وحی آنحضرت صلعم کو اسی طرح ہوتی ہے جس طرح پہلے انبیاءؑ کو ہوئی یہاں تک کہ موسیٰؑ کو بھی۔ آسمان سے کتاب نہ نوحؑ پر اُتری اور نہ اس کے بعد کسی نبی پر نہ موسیٰؑ پر بلکہ جو طریق اللہ تعالیٰ کے وحی کرنے کا ہے اسی طریق پر اب آنحضرتؐ کو بھی وحی ہوتی ہے اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح تمہاری طرف توحید کی وحی ہوئی ہے اسی طرح سب انبیائے سابق کی طرف بھی توحید کی ہی وحی ہوئی تھی۔

آنحضرتؐ سب انبیاءؑ کے کمالات کے جامع ہیں: یہاں چند ایک نبیوں کا نام لیا ہے اور اس میں اشارہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سب کے کمالات کے جامع ہیں سب سے پہلے نوحؑ کا نام لیا کیونکہ وہ پہلے تاریخی نبی مرسل ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد اور سب قوموں کے نزدیک مسلّم بزرگ ہیں اور ان کی اولاد کا ذکر ہے اور ان کے بعد حضرت عیسٰیؑ کا جو سلسلہ بنی اسرائیل بلکہ قومی نبیوں کے سلسلہ کے خاتم ہیں۔ اور حضرت عیسٰیؑ کے بعد پھر ان سے پہلے نبیوں کا ذکر ہے اور ان کو درمیان میں رکھ کر یہ بتایا ہے کہ سب کی تعلیم ایک ہی تھی یعنی توحید الٰہی اور حضرت عیسےٰؑ کے بعد حضرت ایوبؑ کا ذکر کیا کہ اگر عیسےٰؑ نے کچھ تکلیفیں اٹھائیں اور موت کی حالت تک پہنچے تو ایوبؑ نے جو آپ سے بہت پہلے سلسلہ موسوی میں ہو چکے ان سے بھی بڑھ کر تکلیفیں اٹھائیں اور کمال صبر کا نمونہ دکھایا جس طرح حضرت عیسٰیؑ نے کمال روحانیت کا نمونہ دکھایا۔ اور یونسؑ میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کی قوم تباہ کرنے والے عذاب سے بچ گئی۔ اور ہارونؑ میں خصوصیت ان کی عبادات کی امامت ہے اور سلیمانؑ اور داؤدؑ میں نبوت کے ساتھ شان و شوکت سلطنت ہے اور سلیمانؑ کا نام پہلے اکیلے لیا کہ ان کی شان و شوکت بہت بڑھ کر تھی اور داؤدؑ کا خصوصیت سے الگ ذکر اس لیے کیا کہ آپ کی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بہت ہے اور وہ تمام کمالات جو ان انبیاءؑ میں الگ الگ تھے۔ ان سب کے جامع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے۔

۶۶۹ اس آیت میں ایک تو یہ ذکر کیا ہے کہ ہم نے سب رسولوں کا ذکر قرآن شریف میں نہیں کیا جس سے معلوم ہوا کہ اور قوموں میں بھی خدا کے رسول ہوئے ہیں اور اس کی تفسیر ان من اُمۃ الّا خلا فیھا نذیر (فاطر ۳۵-۲۴) میں ہے اور یہاں اس امر کا خاص ذکر کرنے سے یہ مقصود ہے کہ آنحضرت صلعم صرف انہی رسولوں کے کمالات کو اپنے اندر نہیں رکھتے جن کے نام یہاں یا دوسری جگہ لیے گئے ہیں۔ بلکہ کل انبیائے عالم کے کمالات کے جامع ہیں۔

حضرت موسیٰؑ پر نزول جبرائیلؑ: اور دوسرا ذکر حضرت موسیٰؑ کا الگ کیا اور ان کے متعلق فرمایا کلم اللہ موسیٰ تکلیما اللہ نے موسیٰؑ سے بہت باتیں کیں یہ مطلب نہیں کہ کسی الگ طرز پر باتیں کیں۔ کیونکہ کلام تو سب رسولوں سے ایک ہی طرز پر ہوا۔ یعنی بذریعہ جبرئیلؑ اور بخاری کی روایت بھی اس پر شاہد ہے ھذا الناموس الذی نزل اللہ علیٰ موسیٰ اور زیادہ باتوں کا ذکر اس لیے کیا کہ آنحضرت صلعم کو حضرت موسیٰؑ سے خاص مماثلت ہے اور ان کو بھی مفصل شریعت دی گئی اور ان کی پیشگوئیاں آنحضرت صلعم کی نسبت اس کثرت سے ہیں کہ دوسرے کسی نبیؑ کی نہیں۔

لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

کو رسولوں کے بعد اللہ پر کوئی عذر نہ رہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے ۷۷۰

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ؕ

لیکن اللہ اس کے ساتھ گواہی دیتا ہے جو اس نے تیری طرف نازل کیا کہ اسے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا اور فرشتے گواہی دیتے ہیں اور اللہ ہی کافی گواہ ہے ۷۷۱

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾

وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا، وہ گمراہی میں دُور نکل گئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ۙ

وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا اور ظلم کیا اللہ ایسا نہیں کہ ان کو بخش دے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے۔

اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

مگر دوزخ کی راہ، اس میں ابد تک رہیں گے اور یہ اللہ پر آسان ہے ۷۷۲

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

اے لوگو، رسول تمھارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تمھارے پاس آیا، سو ایمان لاؤ تمھارے لیے اچھا ہے اور اگر تم انکار کرو تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ

اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو مت کرو ۷۷۳، اور اللہ کی نسبت سوائے حق کے کچھ نہ کہو۔ مسیح عیسیٰ بن مریم صرف اللہ کا رسول اور اس کی پیشگوئی ہے، جو

ع۷۷۰ حجۃ سے مراد یہاں عذر ہے جیسا کہ دوسری جگہ ہے ربنا لولا ارسلت الینا رسولا فنتبع اٰیٰتک (طٰہٰ ۲۰-۱۳۴) رسولوں کی تبشیر اور انذار پیغام رسانی سے زاید ایک بات ہے اور پیغام کی تائید ہے تاکہ پورا پورا اتمام حجت ہو جائے۔

ع۷۷۱ قرآن کی صداقت پر خود قرآن ہی گواہ ہے: کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا علم کامل ظاہر کیا ہے۔ آخر دنیا دیکھ لیگی کہ جو کچھ قرآن میں بتایا گیا تھا وہی حق ثابت ہوا۔ یہ اللہ کی گواہی ہے جو اسکے فعل سے ظاہر ہوگی آج کتنی باتیں دین اسلام کی حق ثابت ہو رہی ہیں جن کو ایک زمانہ میں غلط سمجھا گیا تھا۔ تثلیث اور کفارہ کے بطلان کو خود عیسائی قبول کرتے جا رہے ہیں اور توحید اور عمل کا سکہ دنیا پر جمتا جاتا ہے۔

ع۷۷۲ انکار اور ظلم کا نتیجہ اگر وہی ہو جو ایمان اور احسان کا ہے تو پھر امن ہی اٹھ جاتا ہے۔ فعل ظلم و انکار کا ہو تو اس کا نتیجہ بھی ویسا ہی ہوگا۔ انکار اور ظلم طریق جہنم ہے پس اس پر چل کر جہنم میں ہی پہنچے گا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے صاف اور واضح قانون کا ذکر کیا ہے ؎ گندم از گندم بروید جو ز جو ٭ از مکافاتِ عمل غافل مشو۔ ابد کے لیئے دیکھو ع۱۵۰۶

ع۷۷۳ تغلوا۔ مادہ غلا ہے اور غُلُوّ حد سے تجاوز کو کہتے ہیں۔ اور جب یہ کسی چیز کی قیمت میں ہو تو غلا کہلاتا ہے اور جب قدر و منزلت کے متعلق ہو تو غُلُوّ۔ اور فعل دونوں سے غلا یغلو آتا ہے اور غلی اور غلیان ہانڈی کے جوش میں آنے پر بولا جاتا ہے اسی سے ہے یغلی فی البطون کغلی الحمیم (الدخان ۴۴-۴۵-۴۶)

تقولوا علی اللہ۔ قال علیہ کے معنی ہیں اس پر افترا کیا یا جھوٹ بنایا۔

رکوع کی اس آخری آیت میں عیسائیت کی طرف مضمون کو منتقل کیا ہے اور بتا دیا ہے کہ سب انبیاء کی وحی کے ذکر میں یہی مقصود تھا کہ سب کی تعلیم توحید

اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۫ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا
خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ
اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝۱۷۱
لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا
لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ
يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ

اس نے مریم کی طرف القا کی اور اس کی طرف سے روح ہے[۷۷۴]
سو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو تین ہیں
باز آجاؤ، تمھارے لیے بہتر ہے اللہ صرف ایک ہی
معبود ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کا بیٹا ہو، اسی کا ہے
جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کافی کارساز ہے[۷۷۵]
مسیح ہرگز بُرا نہیں مناتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ
ہی مقرب فرشتے اور جو کوئی اُس کی بندگی کو بُرا منائے
اور تکبر کرے تو وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا

ہی تھی۔ اور یہ بھی کہ سب دنیا میں نبی آئے صرف ایک قوم کی طرف نہیں اور انسان کو خدا بنانے والے تثلیث کی تعلیم کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں یہ ان کا افترا ہے اور صرف بنی اسرائیل میں رسولوں کا آنا مانتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر یہود تفریط کر کے اور حضرت مسیح کا انکار کر کے غلط راہ پر چلے تو ایک دُوسری قوم نے اس مسیح کے حق میں غلو کیا اور کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر یہود نے مسیح کو مصلوب مان کر نعوذ باللہ من ذٰلك مفتری اور ملعون قرار دیا تو عیسائیوں نے بھی اسے مصلوب مان کر لعنت کو قبول کیا اور کہا کہ وہ ہمارے لیے ملعون ہوا۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف ملعون۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

ع۷۷۴ روح منہ۔ رُوح اور ریح ایک ہی مادہ سے ہیں اور روح کا لفظ کئی معنی میں استعمال ہُوا ہے۔ نفس یعنی سانس اور وہ جس سے انسان زندہ ہے۔ یعنی جان اور اس کے معنی وحی یا امر نبوت بھی آئے ہیں اور قرآن کو بھی روح کہا گیا ہے اور اس کے معنی رحمت بھی ہیں (ل) اور روح منہ سے مراد ہوئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح ہے اور حضرت عیسیٰ کو روح منہ کہا گیا ہے جس سے مراد ازہری کے نزدیک رحمت ہے (ل) اور لوگوں نے بھی یہاں رحمت مراد لی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے ورحمۃ منّا (مریم [19]-۲۱) اور اگر مراد حیات لی جائے تو جس طرح حضرت آدم کے متعلق فرمایا ونفخت فیہ من روحی (الحجر [15]-۲۹) اور جس طرح ہر بشر کے متعلق فرمایا ثم جعل نسلہ من سُلٰلۃ من ماء مھین ثم سوّٰہ ونفخ فیہ من روحہ (السجدۃ [32]-۸-۹) اسی طرح حضرت مسیح کو روح منہ فرمایا اور وحی اور روح منہ دونوں کا ایک ہی رنگ ہے اور اضافت بر سبیل تشریف ہے اور خصوصیت سے اس ذکر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہود حضرت مریم پر زنا کا الزام لگاتے تھے اور زنا کی اولاد کو بوجہ تقدیس ذات باری اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا تو یہ بتایا کہ وہ جائز تعلق سے ہے ناجائز تعلق سے نہیں آدم کے ذکر میں بھی اپنی روح پھونکنے سے یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ عیسائی عقیدہ جو آدم کو فطرتاً گنہگار ٹھہراتا ہے صحیح نہیں کیونکہ اس میں خدائی روح ہے یعنی وہ روح جو فطرتاً پاک ہے۔ پس جس طرح ایک غلط عقیدہ کی تردید کے لیے آدم میں اپنی روح قرار دی اسی طرح ایک ناپاک خیال کی تردید کے لیے مسیح کی روح کو اپنی طرف منسوب کیا۔

ع۷۷۵ یہاں تثلیث کی صاف تردید کی اور خدا کے رسولوں پر ایمان لانے کو ضروری ٹھہرایا یعنی حضرت عیسیٰ کو بھی رسولوں میں سے ایک رسول مانو۔ عیسائیوں کا اسلام پر افترا ہے کہ قرآن نے خدا اور مسیح اور مریم کو عیسائیت کی تثلیث سمجھا ہے۔ قرآن شریف نے مریم کی الوہیت کی تردید کی ہے مگر اس لیے کہ مریم کو خدا ماننے والا اس سے دعائیں مانگنے والا بھی ایک گروہ ہے۔ مریم کو تثلیث کا تیسرا اقنوم کہیں نہیں کہا۔ نہ تثلیث کے ذکر میں مریم کی الوہیت کا ذکر کیا ہے۔
انتھوا میں صرف ایک زبردست حکم دیا ہے۔ اس کی تردید کے لیے علیحدہ دلائل نہیں دیئے سوائے اس کے کہ ابنیت سے اللہ تعالیٰ کو پاک بیان فرمایا، کیونکہ تثلیث کی بنیاد مسیح کے بیٹا ہونے پر ہے اور تثلیث ایک ایسی بدیہی البطلان چیز ہے کہ اس کی تردید میں دلائل کی ضرورت بھی نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں۔ خدا باپ، خدا بیٹا، خدا روح القدس تین ہیں مگر تین خدا مت کہو بلکہ خدا ایک ہے۔ یہ تین میں ایک اور ایک میں تین۔ تین بھی ہیں اور ایک بھی۔ ایک ایسا معمہ ہے جو آج تک نہ کسی سے حل ہوا اور نہ ہوگا۔ عیسائیوں سے اس کی دلیل پوچھی جاتی ہے تو جواب ملتا ہے کہ عقل کو مذہب میں دخل نہیں۔ ایسا مذہب انسانوں کے لیے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مذہب کو خدا نے اسی مخلوق کے لیے بنایا ہے جس کو دوسری مخلوق سے عقل کا امتیاز حاصل ہے۔ اسی لیے قرآن شریف انتھوا کہہ کر چھوڑ دیا ہے جیسے بے سمجھ بچہ کو جو بے عقلی کی بات کرے حکم دے کر روکا جاتا ہے۔ ابنیت اور کفارہ کی دلائل دی جاتی ہیں۔ اسی لیے قرآن شریف نے بھی ان کا رد دلائل سے کیا ہے۔ تثلیث کی دلائل عیسائی بھی کوئی نہیں دیتے۔ زبردستی اسے منوانا چاہتے ہیں۔ اس لیے قرآن شریف میں بھی ان کو زور سے حکم ہی دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ میں صفات مختلفہ تو تمام خدا پرستوں نے مانی ہیں مگر اقانیم مختلفہ یا تین الگ الگ وجود صرف عیسائیوں کی ایجاد ہے۔ سورج کی کرنوں کی جو مثال وہ بعض وقت دیتے ہیں وہ صفات مختلفہ پر صادق آتی ہے نہ اقانیم متعددہ پر۔

فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا ۝١٧٢
فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدُهُمْ مِّنْ
فَضْلِهِ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنْكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا
فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۙ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ
مِّنْ دُونِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا ۝١٧٣
يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ۝١٧٤
فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ
فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ
وَّيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝١٧٥
يَسْتَفْتُونَكَ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۚ
إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَّلَهُ أُخْتٌ
فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَّمْ
يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا
الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً

کرے گا ۷۶۶

پھر جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے، تو ان کو وہ ان کے اجر پورے دے گا اور اپنے فضل سے ان کو زیادہ دے گا اور جنھوں نے برا منایا اور تکبر کیا تو ان کو وہ دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے سوائے نہ کوئی دوست اور نہ مددگار پائیں گے۔

اے لوگو یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے روشن دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمھاری طرف واضح کر دینے والا نور نازل کیا ہے ۷۶۷

سو وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور اس کو مضبوط پکڑا تو اُن کو وہ اپنی طرف سے رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور ان کو وہ اپنی طرف سیدھی راہ پر چلائے گا۔

تجھ سے فتوے مانگتے ہیں، کہہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے، اگر کوئی شخص مرجائے اس کی اولاد نہ ہو اور اس کی بہن ہو تو اس کے لیے جو اس نے چھوڑا اس کا نصف ہے اور اگر عورت کی کوئی اولاد نہ ہو تو وہ (بھائی) اس کا وارث ہو گا اور اگر دو (بہنیں) ہوں تو ان دونوں کے لیے جو اس نے چھوڑا اس کی

ع۷۶۶ یستنکف۔ نکف کے معنی علیحدہ کرنا ہیں۔ اور استنکاف کسی چیز سے عار رکھنے یا اس کو برا منانے کو کہتے ہیں (غ)
پچھلے رکوع کے آخر میں تثلیث کی غلطی کو رد کیا تھا جس کی بنا مسیح کی ابنیت پر ہے۔ اس لیے یہاں بتایا کہ کیا مسیح کو عبودیت سے کچھ عار تھی وہ اپنے لیے کوئی الگ مقام ابنیت کا تجویز کرتا۔ موجودہ اناجیل بھی اس پر شاہد ہیں کہ مسیح نے عبودیت کو کبھی عار نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کو اپنا فخر سمجھا ہے۔ آخر یہ کس کا قول ہے کہ "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر" (متی ۴: ۱۰) اور یہ کس نے کہا "تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے۔ نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا" یہ دو قول قرآن کریم کی صداقت پر کافی گواہ ہیں اور بتاتے ہیں کہ حضرت مسیح جب زندہ تھے عبودیت کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے بعد وہ قوم پیدا ہو گئی جن کو جب یہ کہا جاتا ہے کہ مسیح خدا کا بندہ تھا تو کہتے ہیں تم مسیح کی تحقیر کرتے ہو۔ جس بات کو مسیح اپنا فخر سمجھتا تھا یہ اس کو اس کی تحقیر قرار دیتے ہیں۔ مقرب فرشتوں کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ انسان تو انسان ہیں۔ وہ فرشتے جو ہر وقت بارگاہ الٰہی میں حاضر رہتے ہیں وہ بھی عبودیت کو ہی اپنا فخر جانتے ہیں۔ مخلوق کا کمال ہی عبودیت میں ہے اور اس لحاظ سے بھی ملائکہ کا ذکر یہاں کیا ہے کہ جس طرح عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بناتے ہیں عرب کے بت پرست فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے دونوں کی تردید ایک ہی جگہ کر دی۔

برا منانے اور تکبر کرنے والوں کی سزا کا ذکر چھوڑ دیا ہے صرف یہ کہہ کر کہ آخر اس کے حضور آئیں گے اور اگلی آیت میں پہلے مومنوں کا ذکر کر کے پھر منکروں کی سزا کا ذکر کیا۔

ع۷۶۷ ایک طرف اگر ایسے عقیدہ کا ذکر کیا جس کے ساتھ عقلی دلیل کوئی نہیں تو اس کے بالمقابل اب ایک روشن دلیل اور ایسے نور کا ذکر کیا جو سب چیزوں کو روشن اور واضح کر دیتا ہے۔ اور حق کو باطل سے الگ کر دیتا ہے جس کے سامنے عقل انسانی کو بیکار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے جوہر ظاہر ہوتے ہیں اور خود اس پر روشنی پڑتی ہے۔ نور مبین قرآن کریم ہے اور برہان رسول اللہ صلعم کا وجود ہے۔ کیونکہ آپ قرآن کریم کی تعلیم کو اپنے عمل سے اس طرح واضح کر دیتے ہیں،

رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ ع

دوتہائی ہے اور اگر بہت بہن بھائی مرد اور عورتیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصّے کی مانند ہے اللہ تمھیں کھول کر بتاتا ہے تاکہ تم غلطی میں نہ پڑو اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔[۸۷۷]

جس طرح برہان دعویٰ کو روشن کر دیتی ہے۔

۸۷۷؎ کلالہ کی وراثت: لفظ کلالہ پر مفصل بحث کے لئے دیکھو ع ۶۲۱ یہ حکم اور آیت (۱۲) کا حکم چونکہ ملتے جلتے ہیں اس لیئے دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا کلالہ کے وہاں اور معنی ہیں یہاں اور، اور یا وہاں بھائی بہنیں اور ہیں یہاں اور۔ صورت اوّل میں آیت (۱۲) میں اس کلالہ کا ذکر ہے جس کی صرف اولاد نہ ہو اس لیے بھائی بہنوں کو تھوڑا حصّہ دیا ہے اور یہاں اس کلالہ کا ذکر ہے جس کے نہ اولاد ہو نہ والدین اس لیے بھائی بہنوں کو پورا وارث کیا ہے یا زیادہ حصّہ دیا ہے لیس لہ ولد اس کے مخالف نہیں، کیونکہ ایک طرف کا ذکر کر کے دونوں کا مراد لینا عام ہے اور دوسرے اس لفظ میں ایک خاص اشارہ ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے صورت دوم میں آیت (۱۲) میں اخیافی بھائی بہنوں کا ذکر ہے یعنی جو ماں کی طرف سے بھائی ہوں بوجہ بُعد ان کو کم حصّہ دیا ہے اور یہاں اعیانی یعنی حقیقی اور علاتی یعنی باپ کی طرف سے بھائی بہنوں کا ذکر ہے اس لیے حصّہ زیادہ دیا ہے میرے نزدیک پہلے معنی کو ترجیح ہے گو مردی نہیں۔

ایک لطیف اشارہ: سورت کا خاتمہ ورثہ کی آیت پر کر کے سورت کے اصل مضمون کی طرف پھر توجہ دلاتی ہے اور ساتھ ہی اس طرف بھی کہ جس طرح کلالہ کے وارث اس کے بھائی ہوتے ہیں اسی طرح اب بنی اسرائیل حضرت مسیح کی آمد کے بعد جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ایک کلالہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ سلسلہ نبوت عملی طور پر ان میں منقطع ہو چکا۔ اس لیے اب نبوت بنی اسمٰعیل میں منتقل ہوتی ہے جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں اور دونوں خاندانوں کو بابرکت کرنے کا وعدہ ہی حضرت ابراہیمؑ سے تھا یہ ایک نہایت لطیف اشارہ ہے اور اسی لیے یہاں کلالہ کے ساتھ الفاظ لیس لہ ولد بڑھا دیئے ہیں یعنی اب وہ روحانی اولاد ان میں پیدا نہیں ہوتی۔

اٰیَاتُهَا ۱۲۰ سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ مَدَنِیَّۃٌ (۵) رُکُوْعَاتُهَا ۱۶

نام: یہ سورت جس میں ۱۶ رکوع اور ۱۲۰ آیات ہیں المائدۃ کے نام سے موسوم ہے اور یہ نام مائدہ کے اس ذکر سے لیا گیا ہے جو اس کے پندرھویں رکوع میں ہے مائدۃ کے معنی ہیں وہ خوان جس پر کھانا ہو یا خود وہ کھانا۔ اور ذکر یہ ہے کہ حواریوں نے حضرت مسیح علیہ السلام سے درخواست کی کہ ان کو کھانے کی چیزیں بکثرت ملیں عیداً لنا میں یہی اشارہ ہے کہ المائدہ سرور دائمی کا موجب ہوں بحضرت عیسیٰ نے انہیں روکا اور فرمایا کہ سرور تقویٰ اللہ سے پیدا ہوتا ہے مگر ان کے اصرار پر نزول مائدہ کی دعا کی۔ چونکہ اس سورت میں عیسائیت کی غلطیوں اور فاسد عقائد اور خیالات کا ذکر ہے اس لیے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ عیسائیوں کی طرح دنیا کی چیزوں کی حد سے زیادہ محبت میں مبتلا نہ ہو جائیں اور نہ دنیوی آسائشوں کی طلب میں منہمک ہو جائیں۔ اور اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے اس کا نام المائدہ رکھا ہے۔ علاوہ ازیں یہ سورت تمدن پر بھی بحث کرتی ہے اور متمدن قوموں کا میلان بھی عموماً دنیوی آسائشوں کی طرف حد افراط تک چلا جاتا ہے پس اس پہلو کے لحاظ سے بھی متنبہ کرنا ضروری تھا کہ متمدن بنو تو نرا روٹی کی فکر میں ہی نہ الگ جاؤ۔

خلاصۂ مضمون جس طرح پچھلی سورت میں معاشرت کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ بالخصوص یہودیوں کا اس سورت میں تمدن کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ بالخصوص عیسائیوں کا۔ اور دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرنے کو اس کی ابتدا اوفوا بالعقود سے کی ہے۔ کیونکہ اگر ایک طرف تمدن کی بنیاد معاہدات پر ہے خواہ وہ معاہدات کھلے الفاظ میں ہوں یا ان کا مفہوم پایا جاتا ہو، تو دوسری طرف شریعت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند عقود کو ہی کہتے ہیں اور عیسائیت نے چونکہ شریعت کا نہ صرف استخفاف کر کے اسے بالکل غیر ضروری قرار دیا حالانکہ اپنی آسمانی کتاب کا نام بھی نیا عہد نامہ ہی رکھا ہے بلکہ اسے نعوذ باللہ من ذٰلک ایک لعنت قرار دیا ہے۔ اس لیئے عیسائیت کے ذکر کی ابتدا اس حکم سے موزوں تھی اور دونوں باتوں کو اکٹھا کر کے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ جب نظام عالم جسمانی بدون قوانین و معاہدات ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا تو مذہب کا نظام بدون اتباع قوانین و بدون ایفائے معاہدات الٰہی کیونکر قائم رہ سکتا ہے اور اس حکم سے ابتدا کر کے پہلے رکوع میں کھانے پینے نکاح کے کچھ احکام کا ذکر کیا یہ بتانے کو کہ خواہشات حیوانی کی تعدیل کے لیے یہ احکام نہایت ضروری ہیں۔ اس رکوع میں تکمیل دین کی خوشخبری بھی ہے گویا بتایا ہے کہ تکمیل دین بغیر تکمیل شریعت نہ ہو سکتی تھی۔ دوسرے رکوع میں پھر ضرورت شریعت کو بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور صفات ملکوتی کی طرف توجہ دلائی ہے اول الذکر کے لیے نماز کا ذکر کیا اور اس کی ایک چھوٹی سی فرع طہارت جسمانی کی طرف توجہ دلائی ہے اور اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے تعلق کی ہدایت فرمائی تو دوسری طرف انسانوں کے تعلقات میں اعلیٰ درجہ کے اصول انصاف کی طرف توجہ دلائی یہاں تک کہ نہ صرف غیر قوموں بلکہ دشمن قوم سے بھی عدل و انصاف پر قائم رہنے کا صریح الفاظ میں حکم دیا۔ تیسرے رکوع میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنیوں کا ذکر ہے چوتھے میں بنی اسرائیل کی نافرمانی کا۔ پانچویں میں ان اہل کتاب کے جو بوجہ عہد شکنیوں کے حق سے بہت دور جا پڑے تھے منصوبوں کا ذکر ہے جو آنحضرت صلعم کے خلاف وہ کرتے تھے اور حفاظت جان و مال کی ضرورت کو واضح کیا ہے جس کے بغیر تمدن قائم نہیں رہ سکتا۔ چھٹے میں اسی ذکر کو جاری رکھتے ہوئے بتایا ہے کہ اہل کتاب کے باہمی مقدمات میں انہی کی شریعت کے مطابق فیصلے کر دو۔ ساتویں میں ان دنیوی جھگڑوں کے فیصلوں سے دینی جھگڑوں کے فیصلوں کی طرف رجوع فرمایا اور بتایا کہ دینی اختلافات میں فیصلے قرآن شریف ہی کرتا ہے جو کتب سابقہ پر محافظ ہے۔ آٹھویں رکوع میں یہود و نصاریٰ سے تعلقات کا اور نویں میں ان کی حالت کا ذکر ہے دسویں میں عیسائیت کے حق سے انحراف اور غلو کو واضح کیا۔ گیارھویں میں بتایا کہ با ایں عیسائی دین اسلام سے بہت قریب ہیں اور ان کے حق کو قبول کرنے کی خوشخبری سنائی۔ بارھویں میں عیسائیوں کی غلطیوں سے مسلمانوں کو متنبہ کیا جنہوں نے ایک طرف تو یہاں تک غلو کیا کہ عبادت کی خاطر اللہ تعالیٰ کی حلال چیزوں کو بھی حرام کر دیا اور دوسری طرف دنیا میں یہاں تک منہمک ہوئے کہ حرام چیزوں جیسے شراب وغیرہ کو بھی شیر مادر بنا لیا۔ تیرھویں رکوع میں خانہ کعبہ کی حرمت کا ذکر کیا کیونکہ اگر ایک دفعہ پہلے عیسائیوں نے اس پاک گھر کو ڈھانے کا ارادہ کیا تھا تو علم الٰہی میں وہ دوسرا وقت بھی آنے والا تھا جب اس پاک گھر کے متعلق عیسائی اقوام کے بد ارادے ہونگے چودھویں میں بتایا کہ شریعت گو ضروری شے ہے۔ مگر ہر امر میں افراط و تفریط سے بچو۔ اور چھوٹے چھوٹے غیر ضروری سوالات سے روک کر اہم امور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت بتائی۔ پندرھویں میں حواریوں کے مائدہ طلب کرنے کے ذکر میں عیسائیوں کے لذات دنیوی میں انہماک کی طرف توجہ دلائی۔ اور بتایا کہ اس قوم کی توجہ امور روحانی سے بالکل ہٹ کر کھانے پینے اور خواہشات نفسانی کی طرف رہ جائے گی اور سولھویں اور آخری رکوع میں بتایا کہ عیسائیت کا اصول باطل مسیح کی خدائی مسیح کی تعلیم نہیں۔

تعلق: اس سورت کا ربط پہلی سورت یعنی النساء سے یوں ہے کہ اس میں معاشرت کا ذکر تھا۔ اس میں تمدن کا ذکر ہے اور معاشرت اور تمدن کے اصول ایک دوسرے سے وابستہ ہیں دوسرا امر جو اس تعلق کو ظاہر کرتا ہے یہ ہے کہ جس طرح سورۂ بقرہ میں یہودیوں کا ذکر کر کے اس کے بعد آل عمران میں عیسائیوں کا ذکر کیا تھا۔ اسی طرح النساء میں یہودیوں کا ذکر کر کے اس سورت میں عیسائیوں کا ذکر بالتفصیل کیا ہے۔ تاکہ مغضوب اور ضالین کا تقابل جس کی طرف فاتحہ میں توجہ دلائی تھی قائم رہے زیادہ تفصیلی نگاہ ڈالی جائے تو دونوں سورتوں کا ربط اور بھی واضح ہو جاتا ہے پچھلی سورت کے آخری حصہ میں یہودیوں کی شرارتوں کا ذکر کرتے کرتے حضرت مسیح کے خلاف ان کی شرارت کا ذکر کیا تھا اور یہاں سے انتقال مضمون عیسائیت کی طرف ہو گیا تھا اور اس لیے وہیں عقیدۂ الوہیت مسیح کی بھی تردید کی تھی اور چونکہ الوہیت مسیح کے عقیدہ سے شریعت کی ہتک لازم آتی تھی۔ اس لیے سورۃ مائدہ کے شروع میں شریعت کی ضرورت پر اور اس کی پیروی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

عٓ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اقراروں کو پورا کرو۔ ۷۹ تمہارے لیے چوپائے جانور حلال کیے گئے ہیں، سوائے اس کے جو تم پر پڑھا جاتا ہے نہ شکار کو حلال جاننے والے جب تم حالتِ احرام میں ہو اللہ جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے۔ ۸۰

غرض ہر رنگ میں اس سورت کے اس مقام پر رکھنے میں قرآن کریم کے مضامین میں ایک ترتیب ابلغ اور محکم نظر آتی ہے۔

تاریخ نزول: ان مضامین پر جن کا ذکر اس سورت میں ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور یہی رائے اکثر محققین کی بھی ہے کہ اس سورت کے اکثر حصّہ کا نزول پانچویں اور ساتویں سال ہجری کے درمیان ہے۔ خاص خاص آیات کی خاص تاریخیں مقرر کرنا اکثر حالات میں ایک بے سود کوشش ثابت ہوتی ہے مثلاً عیسائی عموماً ان آیات میں جن میں یہودیوں یا عیسائیوں کے خلاف کچھ ہو اس زمانہ کی طرف منسوب کرنے کے عادی ہیں جب ملکی وجوہات کی بنا پر ان لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان مناقشات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ معیار صحیح نہیں۔ اسی سورت میں ایک طرف یہودیوں اور عیسائیوں کے خفیہ منصوبوں کا ذکر کر کے ان کو دوست بنانے سے روکا ہے تو دوسری طرف عیسائیوں کی نرمی اور ان کے اسلام سے قریب ہونے کا ذکر بھی ہے۔ ہاں ایک آیت بالخصوص قابلِ ذکر ہے یعنی اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي جس کے متعلق صحیح بخاری میں روایت موجود ہے کہ یہودیوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ ایک آیت تمہاری کتاب میں ہے وہ ہم پر نازل ہوتی تو ہم اسے عید کا دن بناتے تو حضرت عمرؓ نے ان کا اشارہ اسی آیت کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ہاں ہم بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ آیت کب اور کہاں اتری اور اس وقت جب اتری رسول اللہ صلعم کہاں تھے۔ یہ عرفہ کا دن تھا (اور غالباً جمعہ) اور میں بھی اُس وقت عرفہ میں تھا جب یہ آیت نازل ہوئی یعنی حجۃ الوداع میں۔ پس یہ آیۃ نزول میں بالکل آخری زمانہ کی ہے۔ لیکن ترتیب میں اس کو یہاں لا کر رکھا ہے تا کہ عیسائیت پر اتمام حجت ہو۔ اس سے نہایت صفائی سے معلوم ہوا کہ ترتیب قرآنی خود اللہ تعالیٰ کی وحی سے تھی اور آیات کو صورتوں میں اپنے مقام پر اور سورتوں کو اپنی اپنی جگہ خود نبی کریم صلعم نے رکھا۔

ع۷۹ عقود۔ عَقْد کی جمع ہے جس کے اصل معنی ہیں ایک چیز کی دو طرفوں کو اکٹھا کرنا (غ) یعنی گرہ دینا۔ اور مراد ہر مضبوط رابطہ اور پھر معاہدہ یا اقرار ہے اور اس میں ہر قسم کے معاہدات داخل ہیں خواہ وہ انسان کی حیوانی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں اور خواہ اس کی صفات ملکی سے اور خواہ وہ تکالیف شرعی کے رنگ کے ہوں جیسے اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت کا عہد خواہ وہ باہمی معاہدات نکاح یا باہم لین دین یا قوموں کے تعلقات یا دیگر امور کے متعلق ہوں بلکہ ہر قسم کے معاملات اس میں شامل ہیں جو تمدن انسانی سے پیدا ہوتے ہیں اور جن میں گو صراحت سے کوئی معاہدہ نہ ہو مگر سمجھوتہ ہوتا ہے اور بعض مفسرین نے عقود سے یہاں مراد وہ معاہدات لیے ہیں جو جاہلیت میں باہم نصرت وغیرہ کے معاہدات کیئے گئے تھے جس سے معلوم ہوا کہ کفار کے ساتھ معاہدات کے بھی پورا کرنے کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

اس حکم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامل وفاداری کی تعلیم دی ہے جو منہ سے کہیں اسے کر دکھائیں مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ وفاداری کا جوہر اپنے اندر پیدا کرے اور اگر ایک طرف یہ ضروری ہے کہ خدا کا بندہ ہونے میں پورا وفادار ہو تو یہ بھی ضروری ہے کہ اولاد ہونے میں، ماں باپ ہونے میں خاوند یا بیوی ہونے میں حاکم یا رعیت ہونے میں، دوست یا دشمن ہونے میں، لین دین میں اور ہر قسم کے معاملات میں وفاداری دکھلائے۔

اس سورت کو پابندی معاہدہ کے حکم سے شروع کرنے میں کئی مصالح ہیں ایک تو یہ کہ تمدن کی بنیاد پابندی معاہدہ پر ہے اور یہ سورۃ تمدن پر ہے دوسرے یہ کہ پچھلی سورت کے آخر میں عیسائی مذہب کا ذکر کیا تھا اور اس سورت میں خصوصیت سے عیسائی مذہب کا ہی ذکر ہے اور اس مذہب نے چونکہ کفارہ کا مسئلہ سکھا کر ایک حصّہ یعنی خدائی عقود یا تکالیف شرعیہ کو تو بالکل ہی جواب دیا اور دوسرے حصّہ یعنی انسانوں یا قوموں کے باہمی معاہدات کی بھی اس مذہب کے پیروؤں نے کم پروا کی ہے اس لیے مسلمانوں کو متنبہ کرنا ضروری تھا۔ تیسرے اس سورت میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنی کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اور پچھلی سورت سے اس کا یہ تعلق ہے کہ اس میں بھی بہت سے عقود کا ذکر ہے گویا ان کو بیان کر کے اور اور عقود کے لیے بطور تمہید فرمایا کہ سب عقود کو پورا کرو۔

ع۸۰ بهيمة۔ بُهْمَة سخت پتھر کو اور پھر اس سے تشبیہ کے لحاظ سے شجاع کو کہا جاتا ہے اور بهيمة اس کو کہتے ہیں جس میں قوتِ گویائی نہیں اور عرف میں درندوں اور پرندوں کے سوائے دوسرے حیوانات پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے (غ) یا ہر ایک چارپایہ پر خشکی میں ہو یا سمندر میں۔

الانعام۔ نَعَمٌ کی جمع ہے اور نِعْمَة حالت حسنہ کا نام ہے اور قلیل و کثیر سب پر بولا جاتا ہے وان تعدّوا نعمة الله لا تحصوها (ابراھیم ۱۴-۳۴) نعمتي التي انعمت عليكم (البقرة ۲-۴۰) فانقلبوا بنعمة من الله (آل عمران ۳-۱۷۴) اور اَنْعَام خصوصیت سے اونٹ پر بولا جاتا ہے کیونکہ اونٹ ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھی اور اس میں گائے بھیڑ بکری بھی شامل ہیں (غ) اور بهيمة الانعام کی اضافت بیان کے لیے ہے اور بعض نے تشبیہ کے لیے اضافت لی ہے یعنی انعام سے ملتے جلتے جانور۔

مُحِلِّی۔ اصل میں محلین ہے حَلّ کے معنی گرہ کا کھولنا ہیں واحلل عقدة من لساني (طٰہٰ ۲۰-۲۷) اور حلّ کا لفظ جو اترنے پر بولا جاتا ہے تو اس لحاظ سے کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے نشانوں کی بے حرمتی نہ کرو[۷۸۱] اور نہ حرمت والے مہینے کی اور نہ قربانیوں کی اور نہ اُن کی جو گانی پہنائے گئے ہوں اور نہ حرمت والے گھر کا قصد کرنیوالوں کی وہ اپنے رب سے فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں[۷۸۱] اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کرو اور کسی قوم کی دشمنی کہ انھوں نے تم کو حرمت والی مسجد سے روکا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کرو[۷۸۲] اور نیکی اور تقوٰے پر ایک دوسرے

اترنے کے وقت بوجھ کھولے جاتے ہیں او تحلّ قریباً من دارھم (الرعد ۱۳-۳۱) واحلّوا قومھم دار البوار (ابراھیم ۱۴-۲۸) مَحَلّۃ اصل میں مکان نزول ہے اور کسی چیز کا حلال ہونا حل عقدہ سے لیا گیا ہے (غ) اور کسی شخص کو حلال کہا جاتا ہے جب وہ حالت احرام سے نکل جائے (غ) واذا حللتم فاصطادوا (۲)

الصید۔ صاد سے مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں جو چیز انسان کے لیے ممتنع ہے اس کو کامیاب ہو کر حاصل کر لینا اور عرف شریعت میں حیوانات کا پالینا جو انسان کے قبضہ میں نہیں جب تک کہ وہ دوسرے کی ملک نہ ہوں اور اسی سے اصطیاد ہے فاصطادوا (۲) اور یہاں صید سے مراد ایسے حیوانات ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے کیونکہ حالت احرام میں سانپ اور بچھو اور دوسرے موذی جانوروں کا مارنا جائز ہے (غ)

حُرُم۔ حَرام کی جمع ہے اور حَرام اور مُحرِم کے ایک معنی ہیں اور وہ وہ شخص ہے جو حالت احرام میں ہو (غ) یعنی اس خاص حالت میں جو حاجی اختیار کرتے ہیں۔ مایتلیٰ علیکم سوائے اس کے جو تم پر پڑھا جاتا ہے۔ مراد مُردار وغیرہ ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

جو چیزیں انسان سے احکام الٰہی کی پابندی تڑواتی ہیں وہ اس کی خواہشات ہیں اور ان خواہشات میں سب سے بڑھ کر کھانے پینے کی خواہش ہے اس لیے سب سے پہلے کھانے پینے کی حلت وحرمت کے احکام کو بیان کیا اور اس لیے بھی کہ عیسائیوں نے جن سے اس سورت میں خاص بحث ہے کھانے پینے کی حلت وحرمت کو بالکل اٹھا دیا ہے اور کھانے پینے کی خواہشات ان پر یہاں تک غالب ہوئی ہیں کہ اس بارہ میں انہوں نے ہر ایک قید کو توڑ دیا ہے اور شریعت کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔

۷۸۱ شعائر۔ شعیرۃ کی جمع ہے یعنی وہ چیز جو علامت یا نشان قرار دی جائے (غ) اور اس سے مراد وہ تمام امور ہیں جن میں انسان شرعاً مکلف کیا گیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی سب حدود اور فرائض اور امر اور نہی داخل ہیں (ج) اس لیے حسن کا قول ہے کہ شعائر اللہ سے مراد دین اللہ ہے۔ بعض نے خاص شعائر حج سے مخصوص کیا ہے مگر اس کی کوئی وجہ نہیں۔

الشھر الحرام۔ جنس کے طور پر نام لے دیا ہے مراد سارے حرمت کے مہینے ہیں۔

ھَدْی۔ ھَدِیّۃ کی جمع ہے یعنی وہ چیز جو لے جائی جاتی ہے مگر ھَدْی ان قربانیوں سے مخصوص ہے جو خانہ کعبہ کو لے جائی جاتی ہیں (غ) اور ھَدِیّۃ تحفہ سے مخصوص ہے جو ہم ایک دوسرے کی طرف لے جاتے ہیں بل انتم بھدیتکم تفرحون (النمل ۲۷-۳۶) (غ)

قلائد۔ قِلادۃ کی جمع ہے قَلد کے اصل معنی بٹنا ہیں اور قِلادۃ وہ بٹی ہوئی چیز ہے جو گلے میں پہنی جاتی ہے یعنی ہار (غ) ان جانوروں کو جن کو قربانی کے طور پر لے جاتے تھے اور بطور عزت یا نشان ان کے گلے میں گانی یا ہار پہناتے تھے، قلاید کہتے تھے۔ اور حج کو جانے یا وہاں سے واپس آنے والے خود بھی اسی طرح ہار پہن لیتے تھے تاکہ ان کو کوئی دکھ نہ پہنچائے۔

آمّین البیت الحرام سے مراد وہ لوگ ہیں جو خانہ کعبہ کا قصد کرتے ہوں اَمَّ کے معنی ہیں قصد کیا۔ کافر مراد نہیں ہو سکتے اس لیے کہ یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا مومنوں کی ہی شان ہے۔

اوفوا بالعقود کی تفسیر میں پہلے شعائر اللہ یعنی حدود اللہ کا ذکر کیا کہ ان کی بے حرمتی نہ کرو یعنی حدود الٰہی کو پورا کر دیں تو عام سب حدود پر مشتمل ہے اور ان حدود الٰہی میں پھر خصوصیت سے خانہ کعبہ کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیزوں کا ذکر کیا کہ خواہ کیسی ہی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز ہو مگر جب خدا کا حکم اس کے متعلق آگیا تو اس کی عزت کرو۔ مسلمانوں کو حکم ہے دوسری قوموں کو بھی ضمناً سمجھایا ہے کہ خانہ کعبہ سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی بے حرمتی نہ کریں چہ جائیکہ خود خانہ کعبہ کے متعلق کوئی بُرا ارادہ کریں۔

۷۸۲ یجرمن یجرم کا اصل جَرْم جس کے معنی ہیں درخت سے پھل کاٹنا اور اَجْرَم کے معنی ہیں صار ذا جرم اور ہر ایک ناپسندیدہ امر کے اکتساب پر بولا

وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪
ع وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ
الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ
وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ
وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۟
وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا
بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَئِسَ

کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔
اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے[483]
مُردار تم پر حرام کیا گیا ہے اور خون اور سؤر کا
گوشت اور وہ جس پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا جائے اور
گلا گھُٹ کر مرا ہوا اور چوٹ لگ کر مرا ہوا اور گر کر مرا ہوا اور سینگ لگ کر مرا
ہُوا اور وہ جسے درندوں نے کھایا ہو ہاں جسے تم ذبح کر لو[484] (وہ کھا لو) اور وہ بھی
(حرام ہے) جو تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو۔ اور یہ کہ تم پاسوں سے
قسمت معلوم کرو، یہ سب نافرمانی ہے[485]۔ آج وہ لوگ جو کافر

جاتا ہے اسی سے مُجْرِم ہے اور جَرَمَ بمعنی کسب بھی آتا ہے یعنی کمایا (غ) اور یہاں یجرمنّ کے معنی یحملنّ بھی کیے گئے ہیں (ن)
شنآن کے معنی بغض ہیں اسی سے ہے اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (الکوثر ۱۰۸: ۳)

حدود اللہ کی طرف توجہ دلا کر اب انسانوں کے ایک دوسرے پر حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ دشمن کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرنا یعنی اس کے حقوق اس کو دینا یہ سب سے مشکل کام ہے اس لیے اس کا ذکر کر کے سمجھا دیا کہ جو دشمن نہ ہوں یا جن سے تعلقات محبت یا اتحاد ہوں ان کے حقوق کی نگہداشت کس قدر ضروری ہے اور پھر دشمن کے لفظ کو عام بھی نہیں رکھا کیونکہ بعض وقت محض غیریت قومی سے ایک قوم کو دشمن سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ ان صدوکم عن المسجد الحرام کہہ کر بتا دیا کہ وہ دشمن جو تم کو انتہا درجہ کے دکھ پہنچا چکے ہیں تم کو گھروں سے نکال چکے ہیں اور تمہارے مذہبی فریضہ تک کی ادائگی میں حائل ہوئے ہیں ان سے بھی عدل کرو یعنی ان کے حقوق ان کو دو۔ پس پابندیٔ معاہدہ سخت ترین دشمن کے ساتھ بھی چاہیئے اور نہ صرف پابندی معاہدہ بلکہ حالت تمدن اور معاشرت سے جو حقوق پیدا ہوتے ہیں وہ بھی دینے چاہئیں۔

۴۸۳ع قومیت کی بنیاد ایک دوسرے کی اعانت ہے: جب اس قدر انصاف کی تعلیم دی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قوم کیونکر بن سکتی ہے۔ جو اپنی قوم کے حقوق تھے کہ ایک دوسرے پر زیادتی نہ ہو وہ تو دشمن قوم کو دیدیئے اس لیے دونوں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمایا کہ دشمنوں کو تو ان کے حقوق دیتے ہو مگر اپنی قوم کے حقوق تو یہ ہیں کہ ایک دوسرے کی اعانت کرو ہاں اعانت صرف نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ہو۔ گناہ اور زیادتی میں اعانت نہ ہو۔ کیسا پاک اصول ہے جو تمدن کی بنیاد کے طور پر قائم کر کے دنیا میں صلح اور آشتی کی بنیاد ڈالی ہے اور تمام قومی عنادوں کی جڑ کاٹ دی ہے قوم اور ملک اور رنگ کے تفرقوں سے جو امتیاز لوگوں نے بنا رکھے ہیں اور اس طرح پر بعض قوموں نے دوسری قوموں پر محض قومیت کے فرق کی وجہ سے وہ سلوک جائز رکھا ہے جس کو اپنی قوم کے ساتھ ظلم قرار دیا گیا ہے ان تمام کو اسلام نے یکسر مٹا دیا ہے۔ ایک دوسرے کی اعانت کر کے قومیت بناؤ مگر اتلافِ حقوقِ نسلِ انسانی کا جہاں معاملہ ہو وہاں قومیت کی آڑ نہ تلاش کرو۔ کیونکہ قومیت میں ایک دوسرے کی اعانت صرف اچھے کاموں میں ہونی چاہیئے۔

۴۸۴ع منخنقۃ۔ خنق سے ہے جس کے معنی گلا گھونٹا ہوا یہاں تک کہ مرجائے۔ موقوذۃ۔ وقذ سے ہے جو چوٹ مارنے سے مرجائے۔ متردّیۃ۔ ردی سے ہے جس کے معنی ہلاک ہیں اور تردّی کے معنی ہیں ہلاکت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا ما یغنی عنہ مالہ اذا تردّی (اللیل ۹۲: ۱۱) اور متردّیۃ وہ ہے جو گر کر مر گیا ہو۔ نطیحۃ نطح سے ہے جو نطاح یعنی سینگ مارنے سے مرجائے (غ)
سبع۔ سَبْع عدد ہے یعنی سات اور سَبُع درندہ ہے گویا یہ نام اس کا قوت کے کمال کے لحاظ سے رکھا گیا ہے کیونکہ سات اعداد تامہ سے ہے (غ)
ذکیتم۔ ذکا سے ہے جو اصل میں آگ کے جلنے پر بولا جاتا ہے اور ذکیتُ الشاۃ کے معنی ہیں میں نے بکری کو ذبح کیا۔ گویا حرارت غریزی کا اخراج تذکیہ ہے یعنی خون کے نکل جانے کا۔ اس لیے شریعت میں اسے جانور کو ذبح کر کے مارنے پر بولا گیا ہے (غ)
یہاں حرمت کی چیزوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان جانوروں کو جو صدمات سے مرجائیں جیسے گلا گھُٹ کر یا چوٹ سے یا گر کر یا سینگ لگنے سے یا درندوں کے پھاڑ دینے سے مردار میں ہی شامل کیا ہے الا ما ذکیتم یہاں بطور استثنائے منقطع ہے۔ یعنی جس جانور کو ذبح کرو اُسے ہی کھاؤ اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ چوٹ سینگ لگا ہوا وغیرہ جانور اگر ابھی مرا نہ ہو اور ذبح کے قابل ہو تو وہ بھی ذبح کر کے کھایا جا سکتا ہے۔
ذبح کی غرض: اور لفظ تذکیہ میں بتا دیا کہ اصل ذبح یعنی خون نکالنا ہے اس لیے بجائے ذبح کے تذکیۃ کا لفظ اختیار کیا کیونکہ خون میں بہت قسم کی زہریں ہیں۔ اور تذکیہ اسی جانور کا ہو سکتا ہے جس میں زندگی باقی ہو۔ یعنی کچھ حرارت غریزی موجود ہو اس لیے بھی یہی لفظ زیادہ موزوں تھا۔

۴۸۵ع نُصُب کا واحد نصیب ہے وہ پتھر جو کسی چیز پر گاڑا جائے اور نصب کے اصل معنی وضع یعنی رکھنا ہیں۔ یہ کچھ پتھر تھے جن کی وہ لوگ عبادت کرتے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ

ہیں تمہارے دین سے ناامید ہو گئے، سو اُن سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔[٧٨٦] آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل

تھے اور ان پر جانور بھی ذبح کرتے تھے (غ) دوسری جگہ جمع نصاب بھی آئی ہے، والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان (المائدۃ ٥- ٩٠) یا وہ پتھر مراد ہیں جو کعبہ کے گرد گاڑے ہوئے تھے جن پر جانور ذبح کرکے خون ان پر چھڑکا جاتا تھا (ج) ماذبح علی النصب سے مراد ایسے جانور ہیں جو بتوں کے نام پر ذبح کیے جائیں۔

تستقسموا۔ استقسام قسم سے ہے اور قسم حظ یا نصیب یعنی حصہ کو کہا جاتا ہے (ل)، اور استقسام کے معنی ہیں اس کا طلب کرنا جو کسی کے لیے مقدر کیا گیا ہے یعنی ایک امر کو کرے۔ یا نہ کرے (ل) اور بعض وقت یہ صرف قَسْم یعنی حصّہ کے جدا کرنے پر بھی استعمال ہوتا ہے (غ)

ازلام۔ زُلَم یا زَلَم کی جمع ہے وہ تیر جس پر پَر نہ لگائے گئے ہوں (جن کی مدد سے تیر ہوا میں اُڑتا ہے۔ یعنی صرف تیر کی شکل پر لکڑی ہوتی تھی) اور اہل جاہلیت اس سے قسمت معلوم کرتے تھے (ل) اور قسم کے نیچے لکھا ہے کہ ازلام جُوئے کے تیر نہ تھے جن سے ذبح کردہ اونٹنی کے گوشت کے حصّے کیے جاتے تھے بلکہ قسمت معلوم کرنے کے تیر تھے۔

جاہلیت میں فال نکالنے کا دستور: اور حدیث ہجرت میں سراقہ کی روایت میں آتا ہے فاخرجت الازلام یعنی سراقہ کہتا ہے کہ جب میں رسول اللہ صلعم کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتا ہوا آپ کے قریب پہنچ گیا اور گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تو مَیں نے تیر سے فال نکالی (ل) اور بعض کے نزدیک یہ تین تیر ہوتے تھے جن سے ہر ایک اہم کام کے کرنے میں مثلاً سفر پر جانا یا شادی کرنا یا بیع یا جنگ پر جانا وغیرہ فال لی جاتی تھی کہ یہ کام کرنا چاہیئے یا نہیں۔ ایک پر لکھا ہوتا امرنی ربی میرے رب نے اس کام کے کرنے کا مجھے حکم دیا ہے اگر وہ تیر نکل آتا تو کام کر لیا جاتا اور ایک پر نہانی ربی لکھا ہوتا وہ نکلتا تو نہ کیا جاتا۔ اور ایک خالی ہوتا جس کے نکلنے پر فال دوبارہ نکالی جاتی۔ اور بعض کے نزدیک اصل میں سات تیر تھے جو ہبل کے بُت کے پاس جو قریش کا سب سے بڑا بُت تھا اور کعبہ میں تھا رکھے ہوئے تھے جن میں سے کسی پر دیت کے کسی پر پانی کی تقسیم کے کسی پر کسی قوم میں سے ہونے یا نہ ہونے کے احکام لکھے ہوئے تھے۔ اور کاہن سے تیر نکلوا کر اس کے مطابق عمل کیا جاتا۔ اور ایسی فال نکلواتے وقت چڑھاوا چڑھایا جاتا جس میں سو درہم اور اونٹنیاں ہوتی تھیں (ج) اور بعض نے ان سے جوئے کے تیر مراد لیے ہیں جن سے اونٹنی ذبح کرکے اس کے گوشت کے حصّے کیے جاتے تھے۔

غیر اللہ کے نام پر جانور کا ذبح کرنا: یہاں ایک تو اس گوشت کو حرام کیا جو بتوں وغیرہ پر چڑھاوے چڑھا کر جانور ذبح کیے جاتے یا ان کا خون بتوں پر چھڑکا جاتا گویا اس کو بھی ما اھل لغیر اللہ بہ میں داخل کیا جس طرح گلا گھٹکر مرے ہوئے وغیرہ کو میتۃ میں داخل کیا۔ اور جس طرح ما اھل لغیر اللہ بہ کو دوسری جگہ فسق یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی قرار دیا اسی طرح یہاں بتوں وغیرہ کے چڑھاووں کو فسق کہا ہے۔ اسی سے قبروں اور مزاروں کے چڑھاووں کا قیاس ہو سکتا ہے مگر اس میں صرف وہی جانور داخل ہونگے جو قبروں پر ذبح کیے جائیں۔

اور دوسری چیز جس کو یہاں حرام کیا ہے گو وہ کھانے کی چیز نہیں وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں فالوں کا نکالنا ہے جو پجاریوں کے ذریعہ سے بھی نکلوائی جاتی تھیں اور لوگ خود بھی نکال لیتے تھے اور چونکہ پجاریوں سے فال نکلوانے میں چڑھاوے بھی چڑھائے جاتے تھے تو شاید اس مناسبت سے اس کا ذکر یہاں کر دیا ہے یا اس لیے کہ حرمت صرف کھانے پینے کی چیزوں میں نہیں دوسرے افعال میں بھی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فال نکالنا کیسا ہے۔ قرآن کریم کے اس بیان سے تو فال نکالنے کی صاف حرمت نظر آتی ہے اور یہ عذر نہیں ہو سکتا کہ وہ فال دیوان حافظ یا کسی اور اچھی کتاب سے نکالی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم سے فال نکالنا بھی نعوذ باللہ قرآن کو ازلام کا مقام دینا ہے اور یہ جو نبی کریم صلعم کے فال حسن کا ذکر احادیث میں آتا ہے تو اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ نبی کریم صلعم کسی کام کے کرنے سے پہلے فال نکالا کرتے ہوں اور فال نکل آئی تو کام کر لیا ورنہ نہ کیا۔ بلکہ وہ صرف اس قدر ہے کہ کبھی کوئی اچھی چیز یا اچھا نام اتفاق سے سامنے آ گیا تو اس سے آپ کو خوشی ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کام کا انجام بھی نیک کرے گا۔ اور اس میں بھی کسی بُرے نام سے بدشگونی کبھی نہ لیتے تھے۔ کہ اس کی وجہ سے کام کرنے سے رُک جائیں جس طرح اہل جاہلیت کرتے تھے۔ ایسا ہی احادیث میں جو ذکر استخارہ کا ہے اس سے بھی ہرگز یہ مراد نہیں کہ استخارہ سے فال لی جاتی ہے کہ کوئی اچھا خواب آ جائے تو وہ کام کر لیا جائے ورنہ نہ کیا جائے بلکہ دعائے استخارہ میں صرف یہ دعا کی جاتی ہے کہ اے خدا اگر تیرے علم میں یہ امر جو میں کرنا چاہتا ہوں میرے دین و دنیا میں نافع ہے تو میرے لیے اس کے سامان مہیا کر دے اور اگر یہ میرے دین و دنیا کے لئے بُرا ہے تو اس سے مجھے پھیر دے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ صرف استعانت باللہ ہے نہ کچھ اور۔ اور قرعہ اندازی کو بھی فال نکالنے سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ قرعہ اندازی صرف یہ ہے کہ ایک تقسیم میں جب ترجیح کے لیے مرجح نہ ہو قرعہ اندازی سے جھگڑے کو ختم کر دیا جائے مثلاً شرکاء میں مال کا تقسیم کرنا کہ جب حصّے ایک جیسے ہو گئے تو اب بجائے اس کے کہ کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دے کر اسے ایک حصّہ چننے کا اختیار دیا جائے قرعہ اندازی سے جو جس کے حصّے میں آیا اسے دیدیا۔ ایسا ہی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے وصیت میں چھ غلام آزاد کیے اور اس کا کوئی اور مال نہ تھا تو آنحضرت صلعم نے ایک تہائی کی وصیت کو جائز رکھ کر دو غلاموں کو بذریعہ قرعہ اندازی آزاد کر دیا۔ کیونکہ مالک نے خود تعیین نہ کی تھی۔

٧٨٦ یئس۔ یأس۔ طمع یا آرزو کا باقی نہ رہنا ہے۔

وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ

کردیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کردیا اور تمہارا دین اسلام ہونے پر میں راضی ہوا۔[۷۸۶] پھر جو شخص بھوک سے مجبور ہو جائے گناہ کی طرف جھکنے والا نہ ہو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے

تخشوا۔ خشیۃ۔ وہ خوف ہے جس کے ساتھ تعظیم ملی ہوئی ہو۔ اور اکثر یہ اس کے علم سے ہوتا ہے جس سے خشیت ہو اسی لیے فرمایا انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰٓؤا (فاطر۳۵ ۔ ۲۸) (غ)۔

اسلام کے کمال غلبہ کی پیشگوئیاں: کافروں کے دین اسلام سے مایوس ہو جانے سے یہ مطلب ہے کہ یہ امیدیں جو اُن کو لگی ہوئی تھیں کہ دین اسلام کو مٹا دینگے یا مسلمانوں کو مجبور کر کے کفر کی طرف لوٹا لیں گے بوجہ غلبۂ اسلام کے منقطع ہو گئیں۔ اور اس میں ایک پیشگوئی بھی ہے کہ اب کافر دین اسلام کو کبھی بھی مٹا نہ سکیں گے آج بھی کفار اپنی اَن تھک کوششوں کے باوجود خوب جانتے ہیں کہ وہ دین اسلام کو اب دنیا سے نہیں مٹا سکتے اور یہ جو فرمایا کہ ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، تو مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دوبارہ غلبہ سے مت خوف کرو۔ ہاں احکام الٰہی کی خلاف ورزی اور حدود اللہ کے توڑنے سے بچو اور اس سے ڈرو یعنی اگر تم کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس وجہ سے پہنچے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرو گے۔ اور اگر تم اپنے عہد پر مضبوط رہو تو کفر کا خوف مت کرو کہ وہ بھی کبھی تم کو کھا سکتا ہے۔ اس میں بھی اشارہ دین اسلام کے کمال غلبہ اور اسلامی حکومت کے دنیا پر پھیل جانے کی طرف ہے یعنی اس قدر تمہارا غلبہ دنیا میں ہوگا کہ دنیا کی کوئی طاقت تم کو برباد نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر تم احکام الٰہی کی فرمانبرداری نہ کرو تو یہ تمہارا اپنا فعل تمہیں اس بلند مقام سے گرا دے گا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی خشیت جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آتا ہے کیا ہے؟ ایک ڈرنا انسان کا وہ ہوتا ہے کہ وہ ایک چیز سے خائف ہو کر بھاگتا ہے۔ لیکن جیسا کہ امام راغبؒ نے خشیۃ کے معنی میں لکھا ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے مراد وہ خوف ہے جس میں تعظیم ملی ہوئی ہو یعنی اس چیز کی عزت اور محبت دل میں ہو۔ اب ظاہر ہے کہ محبوب چیز کا خوف یہ نہیں ہوتا کہ انسان اس سے بھاگتا ہے، بلکہ اس کی صورت میں خوف یہ ہے کہ کوئی ایسی بات پیدا نہ ہو جائے کہ انسان اس اپنی محبوب چیز سے دُور ہو جائے یا کوئی امر اس کی ناراضگی کا انسان سے سرزد ہو۔ پس خشیۃ اللہ کے معنی یہی ہیں کہ حدود اللہ کے توڑنے کا خوف ہو اسی لیے قرآن شریف نے فرمایا کہ خشیۃ اللہ صرف علماء کے قلوب میں پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ حدود الٰہی کا علم رکھتے ہیں اور صفات الٰہی سے واقف ہوتے ہیں اور حدود اللہ کے توڑنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتے اور اپنے میثاق اور عہد پر قائم رہتے ہیں۔

۷۸۶ع اکملت۔ کسی چیز کا کمال یہ ہے کہ جو اس سے غرض تھی وہ حاصل ہو جائے اسی لیے جب کسی چیز کے متعلق کہا جائے کہ وہ کامل ہو گئی تو مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ جو غرض اس سے تھی وہ حاصل ہو گئی اور حولین کاملین (البقرۃ۲ ۔ ۲۳۳) میں مراد یہ ہے کہ یہ اس مدت کی غایت ہے جس کا تعلق بچہ کی صلاحیت سے ہے اور لیحملوا اوزارھم کاملۃ یوم القیٰمۃ (النحل۱۶ ۔ ۲۵) میں کمال عقوبت مراد ہے (غ) پس اکملت لکم دینکم سے مراد یہ ہوئی کہ جو غرض دین سے حاصل ہو سکتی ہے وہ بدرجہ کمال تمہارے اس دین سے حاصل ہو گی۔ اب اس کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت نہیں کہ وہ دین کو کامل کرنے کے لیے آئے جیسے پہلے آتے تھے۔

اتممت کسی چیز کا تمام اس کا اس حد تک پہنچ جانا ہے کہ وہ اپنے سے خارج کسی چیز کی محتاج نہ رہے اور وہ چیز جو اپنے سے خارج کسی چیز کی محتاج ہے اسے ناقص کہا جاتا ہے وتمّت کلمت ربّک (الاعراف۷ ۔ ۱۳۷) واللہ متم نورہ (الصف۶۱ ۔ ۸) (غ)

رضیت۔ بندہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے امر پر عمل کرنے والا اور اپنی نہی سے رکنے والا پائے (غ)

اسلام میں تکمیل: یہ آیت حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن (جو جمعہ تھا) میدان عرفات میں بعد از عصر نازل ہوئی۔ جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہود نے حضرت عمرؓ کو کہا کہ ایک آیت تمہاری کتاب میں ہے جو ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بناتے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں یہ آیت فلاں وقت فلاں دن نازل ہوئی آنحضرت صلعم سے پہلے جس قدر انبیاء آئے چونکہ وہ خاص خاص قوموں کی طرف خاص خاص زمانوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس لیے ابھی تکمیل دین کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ اور نہ وہ کامل دین ابھی آیا تھا جس نے ساری دنیا کو ایک ہی سلسلہ اخوت میں منسلک کرنا تھا چنانچہ اس کی شہادت مخصوص القوم نبیوں میں سے آخری نبی حضرت مسیحؑ کے کلام سے ملتی ہے "میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی روح حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتا دیگی"۔ (یوحنا ۱۶: ۱۲ و ۱۳) پس معلوم ہوا کہ حضرت مسیحؑ کی تعلیم تک ابھی دنیا پر "ساری سچائی کی راہیں" ظاہر نہ ہوئی تھیں۔ حضرت مسیحؑ کی زبان سے اس اعتراف کا اناجیل میں موجود ہونا اور نبی کریم صلعم پر دین کے کامل کیا جانے کی آیت کا نزول صاف بتاتا ہے کہ اسلام سے پہلے کوئی دین کمال کی حالت کو نہیں پہنچا، بلکہ ضروریات وقتی کو پورا کرنے والا تھا۔ مگر اسلام میں مذہب کمال کو پہنچا اور اس لیے ساری دنیا کا مذہب اسلام ہی ہو سکتا ہے نہ عیسائیت اور انہیں دو مذاہب کا اب مقابلہ دنیا میں ہے۔ اس آیت کے اس موقعہ پر رکھنے میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سورت میں عیسائیوں سے ہی زیادہ بحث ہے۔ ابتدا بھی انہی کے عقیدوں کی تردید سے کی ہے اور ختم بھی انہی کے عقیدوں کی تردید پر کیا ہے اور پھر اس کو وہاں رکھا ہے جہاں کمال درجہ کی تفصیلات شریعت ہیں یہ ظاہر کرنے کو کہ دین بغیر شریعت کوئی دین نہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کامل دین میں شریعت کی ضروری تفصیلات کو بھی کمال تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ④

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ

والا ہے ۸۸ؔ

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے کہہ تمھارے لیے ستھری چیزیں حلال کی گئی ہیں اور وہ جو تم شکاری جانوروں کو شکار کی تعلیم دیتے ہوئے سکھاؤ تم ان کو سکھاتے ہو اس (علم) سے جو اللہ نے تمھیں سکھایا سو جس کو وہ تمھارے لیے پکڑ رکھیں اس سے کھالو اور اس پر اللہ کا نام یاد کرو اور اللہ کا تقوٰے کرو۔ اللہ جلد حساب لینے والا ہے ۸۹ؔ

آج تمھارے لیے ستھری چیزیں حلال کی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی تمھارے لیے حلال ہے اور

نزول کے بعد آنحضرت صلعم پر کوئی تفصیل شریعت یعنی امر ونہی نازل نہیں ہُوا اور آپ اس کے بعد ۸۲ دن زندہ رہے۔

دین اسلام کے کمال میں کیا کیا باتیں داخل ہیں؟ جو جو غرض دین کی ہو سکتی ہے ان سب اغراض کو اسلام نے پورا کردیا۔ یہ ایک بہت لمبا مضمون ہے نمونہ کے طور پر دیکھ لو کہ کتاب ایسی کامل کہ فیھا کتب قیّمۃ سب مضبوط کتابیں اس کے اندر ہیں یعنی پہلی کل صداقتیں جن کا دنیا میں رہنا ضروری تھا اس کے اندر جمع کردی گئیں۔ بلکہ آئندہ بھی کوئی ایسی صداقت دینی ظاہر نہ ہوگی جو قرآن کریم کے اندر نہ ہو ولا یاتونک بمثل الا جئنٰک بالحق (الفرقان ۲۵-۳۳) کوئی نادر بات پیش نہیں کرسکتے۔ مگر ہم حق کے ساتھ اسے پہلے ہی تجھے بتا چکے ہیں۔ سب مذاہب پر بحث موجود۔ ہر ایک عقیدۂ حقہ کی تائید اور عقیدۂ باطلہ کی تردید موجود حتیٰ کہ ان عقاید کی بھی جو اس وقت اہل عرب کے علم میں نہ تھے۔ پھر سب مذاہب کو خدا کی طرف سے مان کر ان کے اختلافات میں فیصلہ کی ایک نہایت ہی لطیف راہ بتائی۔ پھر ہر ایک دعویٰ بھی خود پیش کیا۔ دلائل بھی خود دیئے۔ کوئی حملہ اس پر ایسا نہیں ہوسکتا۔ کہ اس کے کسی اصول کو غلط ٹھہرا دے جس نیکی اور خلق کو سکھایا کمال کے رنگ میں سکھایا کہ اس سے آگے اس نیکی یا خلق کا کوئی مرتبہ نہیں جس بدی سے روکا اس کے مبادی سے بھی بچنے کی راہیں ساتھ ہی بتائیں۔ یہاں تک کہ باریک سے باریک باتیں جو کسی بدی کی طرف لے جاسکتی ہیں ان کو بھی واضح کردیا۔ جو وعدہ دیا اس کو اسی دنیا میں پورا کرکے دکھایا اور صرف آخرت کے انتظار پر نہیں چھوڑا جس مقام پر انسانوں کو پہنچانے کا دعویٰ کیا تھا اس مقام پر پہنچا کر دکھا دیا۔ تعلیم ایسی کامل کہ سب ملکوں سب قوموں سب زمانوں کی ضروریات کے لیے کافی۔ وہ تعلیم جس کا محتاج ایک وحشی سے وحشی انسان اور ادنیٰ درجہ کی تہذیب والی قومیں ہو سکتی ہیں وہ بھی اس میں موجود ہے۔ اور وہ تعلیم جس کا ایک بڑے سے بڑا فلسفی اور سائنسدان اور تہذیب کی چوٹی پر پہنچی ہوئی قومیں محتاج ہو سکتی ہیں وہ بھی اس میں موجود ہے مافرطنا فی الکتاب من شئی (الانعام ۶-۳۸) پھر محمد رسول اللہ صلعم نے اپنی زندگی میں اخلاق کے سارے شعبے اور زندگی کے سارے پہلو عمل میں لا کر دکھا دیئے۔ اگر ہر ایک نبیؑ ایک روشن چراغ تھا جس نے ایک اندھیری رات میں ایک قوم کو روشن کیا تو محمد رسول اللہ صلعم آفتاب عالمتاب تھے جن کی شعاعوں نے سارے عالم کو منور کردیا۔ دنیا کے اور کسی نبیؑ یا کسی کتاب میں نہ یہ باتیں جمع ہوئیں اور نہ ہی کسی نے تکمیل تک پہنچانے کا دعویٰ کیا۔

اکمال دین کے ساتھ دو باتوں کا اور ذکر کیا۔ ایک اتمام نعمت اور وہ یہ کہ دینی اور دنیوی طور پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کسی چیز میں کسی دوسرے کا محتاج نہ رہنے دیا، بلکہ ہر قسم کی نعمتوں سے اُن کو یہاں تک حصّہ دیا کہ وہ دوسروں کے محتاج نہ رہے بلکہ دوسرے ان کے محتاج ہوگئے۔ یہ اتمام نعمت اکمال دین کا ہی نتیجہ تھا اور دوسری بات فرمائی کہ میں اس پر راضی ہوا کہ تم نے اسلام یعنی میرے امر کی فرمانبرداری اور میری اطاعت کی پابندی کو بطور دین اختیار کیا جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی کمال اطاعت کا ذکر ہے اور اس ذکر کی یہاں ضرورت اس لیے ہوئی (حالانکہ صحابہؓ تو شروع سے ہی اطاعت کرتے تھے) کہ یہاں اکمال دین کا ذکر ہے یعنی جس قدر ہدایات دین کی تھیں وہ سب دے دی گئیں تو ساتھ ہی فرمایا کہ ان سب میں تم نے فرمانبرداری کا بھی کمال دکھایا۔ مال وجان خدا کی راہ میں دیدینے کے بارہ میں۔ رسم ورواج کے چھوڑنے کے بارہ میں۔ عبادات کے بجالانے کے بارہ میں۔ ہر ایک قسم کی بدی سے اجتناب میں۔ غرض اللہ تعالیٰ کے ایک ایک حکم کی اطاعت میں جو کمال صحابہ نے دکھایا وہ نہ پہلے کسی قوم نے دکھایا نہ آئندہ دکھائے گی۔ گویا اسی اطاعت سے ہی اتمام نعمت ہُوا جب اطاعت چھوڑ دوگے اتمام نعمت بھی نہ رہے گا۔

۸۸ؔ مخمصۃ۔ خامص دُبلے پتلے آدمی کو کہا جاتا ہے پس مخمصۃ سے مراد بھوک ہے جس سے پیٹ دُبلا ہو جائے (غ)

۸۹ؔ جوارح۔ جارحۃ کی جمع ہے شکاری جانور کو کہتے ہیں، پرندہ ہو یا درندہ یہ نام اس لیے ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے کیونکہ جَرْح کے معنی زخم ہیں یا اس لیے کہ وہ کچھ کما کر لاتا ہے اور اسی دوسرے معنی کے لحاظ سے انسان کے اعضا کو جوارح کہا جاتا ہے (غ)

حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ
وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ
مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ
اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ
حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ

تمہارا کھانا اُن کے لیے حلال ہے[۹۰] اور پاکدامن مومن عورتیں
اور اُن میں سے پاکدامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی
جب تم اُن کو اُن کے مہر دے دو، نکاح میں لانے
والے، نہ کھُلی بدکاری کرنے والے اور نہ چھُپی دوستی رکھنے
والے[۹۱]۔ اور جو شخص ایمان سے انکار کرے تو اس کا
عمل ضائع ہو گیا اور وہ آخرت میں نقصان اُٹھانے

مکلّبین۔ کَلب کتّا ہے اور کَلَب حرص اور کتّے کی حرص میں مثال دی جاتی ہے اَحْرَص من کلب اور مُکَلِّب وہ ہے جو کتّے کو تعلیم دے (رغ)
یہاں شکار کو جائز قرار دیا ہے۔ اس قسم کے اشغال کو روکنے سے شجاعت کا جوہر انسان میں باقی نہیں رہتا۔ سدھائے ہوئے جانور کا مارا ہوا کھانا جائز ہے۔ بشرطیکہ اسے چھوڑتے وقت تکبیر پڑھ لی جائے اور بدیں شرط کہ وہ اس میں سے نہ کھائے اور بعض نے پرندوں کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے اور بعض کے نزدیک ایک تہائی سے کم کھائیں تو وہ بھی امساک میں داخل ہے اس پر بندوق تیر وغیرہ کے شکار کو قیاس کر لینا چاہیئے یعنی بندوق یا تیر وغیرہ سے مارا ہوا جانور بشرطیکہ شکار کے طور پر ہو جائز ہے اس شرط کے ساتھ کہ چلاتے وقت تکبیر کہی ہو۔ اور گو اس صورت میں اگر جانور کو زندہ پایا جائے تو اس کا ذبح کرنا ضروری ہے لیکن اگر شکاری جانور کے پکڑنے سے یا بندوق وغیرہ سے شکار مر جائے تو بھی جائز ہے اور یہ استثنا ہے اور اس طریق سے خون بھی عموماً بہ نکلتا ہے۔

[۹۰] اہل کتاب کا کھانا کھانا اور دعوت کرنا: ان الفاظ میں مسلمانوں کے لیے ان لوگوں کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے جو کسی مذہب کے پیرو ہیں جس کی بنیاد آسمانی کتاب پر ہو۔ اور ان کے لیے مسلمانوں کا کھانا جائز ہے یعنی ایک مسلمان کے لیے جائز ہے کہ ان کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دے طعامکم حل لھم میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا کھانا یا ذبیحہ نہایت پاکیزہ ہونے کی وجہ سے اہل کتاب میں سے کوئی اس کی حلت میں شبہ نہیں کر سکتا۔

اہل کتاب کا ذبیحہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہاں طعام سے مراد صرف ذبیحہ ہے۔ کیونکہ اسی میں اختلاف ہو سکتا تھا۔ بہرحال ذبیحہ اس میں شامل ہے۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کہ اگر اہل کتاب اللہ کے نام پر کسی جانور کو ذبح کریں تو اس کا کھانا مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر اہل کتاب اللہ کے نام پر ذبح نہ کریں تو اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں۔ اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ وہ جائز ہے حضرت ابن عمرؓ کے نزدیک جائز نہیں۔ قرآن کریم کے صریح الفاظ حضرت ابن عمرؓ کے قول کے مؤید ہیں ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ (الانعام ۱۲۱) اور اس سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ جس کی تاویل گروہ اوّل نے یوں کر لی ہے کہ اس سے مراد صرف بتوں کے ذبائح ہیں۔ سہل مذہب پہلا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو سب سے زیادہ ضرورت پیش آتی ہے وہ عیسائیوں کے مارے ہوئے جانوروں کے متعلق ہے سو یہ لوگ نہ ذبح کرتے ہیں نہ خدا کا نام لیتے ہیں، ایسے بحالت اضطرار کے سوا اس کا کھانا جائز معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی چیز جو اصولاً اسلام نے حرام قرار دی ہے وہ اہل کتاب کا طعام ہونے کی وجہ سے حلال نہیں ہو سکتی۔ مراد صرف یہ ہے کہ جو چیز پاک ہو تو اہل کتاب کے ہاتھ لگانے سے ناپاک نہیں ہو جاتی۔

[۹۱] اہل کتاب سے مناکحت: اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کے احکام کے ساتھ مناکحت کے احکام بھی بیان کر دیئے۔ کیونکہ کھانے پینے کی طرح مناکحت بھی انسان کی فطرتی خواہش ہے پس ظاہری خواہشات فطری کے سارے احکام کو اس رکوع کے اندر جمع کر دیا ہے قرآن کریم میں دوسری جگہ مشرکہ عورتوں سے نکاح کو منع کیا ہے اور ایک جگہ تمسکوا بعصم الکوافر فرمایا۔ چونکہ اہل کتاب میں سے بعض مشرک ہو سکتے ہیں بعض نہیں، اس لیے ان دونوں حکموں میں کہ مشرکہ عورت سے نکاح نہ کرو اور اہل کتاب کی عورت سے نکاح جائز ہے کوئی تضاد نہیں۔ اور وہ جو کافر عورتوں سے مطلق روکا ہے تو وہ حکم خاص مکہ والوں کے متعلق ہے اس لیے کہ وہ سب مشرک تھے اور علاوہ بریں جنگ کی وجہ سے بھی ان تعلقات کا قطع ہونا ضروری تھا۔ اور بعض کے نزدیک چونکہ اہل کتاب کی اصل بنیاد توحید باری پر ہے اس لیے سب اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ وہ عملاً یا اعتقاداً مشرک بھی ہوں مگر اقرب الی الصواب یہی ہے کہ صرف ان عورتوں سے نکاح جائز ہے جو اعتقاداً مشرک نہ ہوں۔

پس قرآن کریم نے یہ جائز رکھا ہے کہ ایک مسلمان مرد ایک غیر مسلم بی بی سے نکاح کر لے لیکن یہ جائز نہیں رکھا کہ ایک مسلم بی بی کا کسی غیر مسلم سے نکاح ہو کیونکہ غیر مسلم عورت مسلمان کے گھر میں آ کر ایک مسلم عورت کے حقوق حاصل کر کے فائدہ اُٹھاتی ہے مگر مسلم عورت غیر مسلم کے گھر میں جا کر پہلے حقوق کو بھی کھو بیٹھے گی۔ عورتوں کے حقوق کو ہر حال میں تلف ہونے سے بچایا ہے۔ علاوہ ازیں ظاہر ہے کہ اولاد باپ کے مذہب پر ہو گی۔ پس اس بات سے روکا ہے کہ ایک مسلمان بی بی کی اولاد شرک و کفر پر پرورش پائے۔ یہودی شریعت میں غیر یہود سے نکاح بالکل ناجائز تھا۔ "نہ ان سے بیاہ کرنا اس کے بیٹے کو اپنی بیٹی نہ دینا

ع الْخٰسِرِيْنَ ۵

والوں میں سے ہے ۷۹۲

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم نماز کو اُٹھو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں (دھو لیا کرو) ۷۹۳ اور اگر حالتِ جنابت میں ہو تو نہا لیا کرو،

نہ اپنے بیٹے کیلئے اس کی کوئی بیٹی لینا کیونکہ وہ تیرے بیٹے کو میری پیروی سے پھرا دینگے" (استثنا ۷: ۳ و ۴) مگر اسلام کو یہ خوف نہیں اور شریعت کو لعنت قرار دینے والے پولوس کا فتویٰ یہ ہے "تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جتے جاؤ" (۲۔قرنطیوں ۶: ۱۴) البتہ جہاں دوسری قومیں اپنی عورتوں کو مسلمانوں کے گھروں میں داخل کر کے ان سے حبائل الشیطان کا کام لینا چاہیں تو وہاں بچنا ہی مناسب ہے۔

آخری الفاظ میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض دوسری قوموں میں ایسے ناپاک تعلقات کو یعنی کھلی بدکاری کو یا خفیہ آشنائیوں کو جائز سمجھا جاتا ہے تم ایسی باتوں سے بچو۔

ع۷۹۲ ایمان کے انکار سے مراد یہاں اللہ تعالیٰ کی شرائع کا انکار ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔ کیونکہ ایمان میں عمل بالجوارح بھی شامل ہے دیکھو ع۱۱ پس اس معنی سے ایمان کا انکار خود اعمالِ صالح کا انکار ہے تو باقی اعمال کا حبط ہونا خود ظاہر ہے کیونکہ اصل غرض اعمالِ صالح سے ہے لیکن ایک طرف اگر ان شرائع کی طرف اس لفظِ ایمان میں اشارہ ہے جن کا ذکر پیچھے ہوا ہے تو دوسری طرف اگلے رکوع کے مضمون کی طرف بھی اسی لفظ میں اشارہ ہے۔ یعنی یہ کہ اگر تمہاری خواہشات بہیمی کے پورا ہونے کا سامان اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو خواہشات ملکوتی کے پورا کرنے کا سامان بھی اس نے پیدا کیا ہے اور یہی ایمان ہے جو فطرتِ انسانی کے اس حصّہ کا انکار کرتا ہے اس کے وہ اعمال جن کا اشتراک بہائم سے ہے بہیمی رہ جاتے ہیں اور آخرت میں کچھ کام نہیں دیتے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ضلّ سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا (الکھف ۱۰۴) اور انہی کے متعلق فرمایا اولٰئک الّذین کفروا باٰیٰت ربھم ولقائہٖ فحبطت اعمالھم (الکھف ۱۰۵) حبط کے معنی پر دیکھو ع۲۷۹۔

ع۷۹۳ قمتم۔ قیام کے ایک معنی عزم علی الشئ کے ہیں اور یہاں قمتم الی الصّلٰوۃ سے مراد یہی عزمِ نماز ہے (رغ)

مرافق۔ مرفق کی جمع ہے۔ رِفق کے معنی لطف اور نرمی ہیں اور مرفق کسی معاملہ کے متعلق ہو تو مراد ہوتی ہے وہ جس سے فائدہ پہنچے ویھیّئ لکم من امرکم مرفقا (الکھف ۱۶) اور کہنی کو بھی کہتے ہیں (ل) جیسے یہاں۔ کہنی سے انسان ٹیک لگانے کا فائدہ اُٹھاتا ہے۔

جب پہلے رکوع میں ان عقود یا احکام کا ذکر کیا جو انسان کے کھانے پینے اور مرد اور عورت کے تعلقات کی فطری خواہشات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جن خواہشات میں انسان کا اشتراک بہائم سے ہے اور یوں صفاتِ بہیمیہ کو حدِ اعتدال کے اندر لانے کی راہ بتائی۔ تو اب اس دوسرے رکوع میں مضمون کا انتقال ان عقود کی طرف کیا جو انسان کی اس اعلیٰ فطری خواہش سے تعلق رکھتے ہیں جو صلوٰۃ یا دعا کے نام سے موسوم ہے گویا اگر رکوع اول میں بہیمی خواہشات کا ذکر ہے تو اس رکوع میں ملکوتی صفات کا ذکر ہے کیونکہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی جو فطرتِ انسانی کا خالق و مالک ہے خواہش بھی انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اس لیے اس رکوع کو نماز کے متعلق بعض احکام سے شروع کیا ہے اور اسی قسم کے تفصیلی احکام سے شروع کیا ہے۔ یعنی وضو سے جیسے غذاؤں کے متعلق تفصیلی احکام دیئے تھے۔

تفصیلِ وضو کے ذکر میں حکمت وحی خفی: نماز کی تفصیل کا ذکر تو قرآن شریف میں نہیں کیا، لیکن وضو کا کسی قدر تفصیلی ذکر کر دیا ہے حالانکہ وضو اسی طرح پر برابر کئی سال سے نبی کریم صلعم اور مسلمان کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو نبی کریم صلعم کی وحی خفی کے منکر ہیں۔ کیونکہ جس طرح نبی کریم صلعم نے وضو کا طریق صحابہؓ کو سکھایا اسی کو سالہا سال بعد قرآن کریم کی وحی متلو میں بیان کیا گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلعم نے جب شروع میں وضو کا یہ طریق سکھایا تو وحی الٰہی ہی سکھایا تھا گو وہ وحی انہی الفاظ میں آپ پر نہ آئی تھی اسی کو وحی خفی کہتے ہیں۔

علاوہ بریں وضو کی جو نماز کے لیے محض ایک تمہیدی فعل ہے اور نماز کا کوئی حصّہ نہیں تفصیل بیان کرنے میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ نماز کی وہ تمام تر تفصیلات جو نبی کریم صلعم نے بتائیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

موزوں پر مسح: یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ وضو کی بھی پوری تفصیل کا یہاں ذکر نہیں کیا پہلے ہاتھوں کا دھونا پھر کلی کرنا پھر ناک صاف کرنا ان کو چھوڑ دیا ہے اور منہ دھونے کے ذکر سے شروع کیا ہے اس لیے کہ منہ کے دھونے سے پہلے خود ہی انسان ہاتھ دھوئے گا اور کلی کرنا یا مسواک کرنا اور ناک صاف کرنا منہ کی ظاہری صفائی کے لازم اجزا ہیں۔ پاؤں کا دھونا ضروری ہے اور خود شیعوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ائمہ وضو میں پاؤں دھوتے تھے۔ ہاں حالت وضو میں موزے یعنی جراب پہن لی جائے تو پانچ نمازوں تک اس پر مسح جائز ہے۔ اور وہ اس آیت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی تفصیل ہے جس طرح زخم وغیرہ میں کسی عضو پر مسح کر لینا اس کے خلاف نہیں۔

اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ
مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ
تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا
فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ
مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ
وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ
عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو، یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے ہو کر آئے یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو، پھر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اس سے اپنے مونہوں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔
اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کسی طرح کی تنگی کرے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو ع۶۹۳

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ
الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا
وَاَطَعْنَا ؗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷

اور اللہ کی نعمت یاد کرو (جو) تم پر ہے اور اس کے اس عہد کو بھی جو اس نے تم سے پختہ لیا جب تم نے کہا، ہم نے سنا اور ہم اطاعت اختیار کرتے ہیں - اور اللہ کا تقویٰ کرو۔ اللہ سینوں کی باتوں کو جانتا ہے ع۶۹۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ
شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ
قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ
لِلتَّقْوٰى ؗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ ع۶۹۵ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو یہ تقوے سے قریب تر ہے اور اللہ کا تقویٰ کرو، اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو ع۶۹۶

ع۶۹۳ ان تمام امور کا مفصل بیان ع۶۶۴ میں ہو چکا ہے۔ یہاں ان تفصیلات کو جو نماز کے لیے تمہیدی فعل ہیں دوہرانے کا منشا یہ ہے کہ اس کے متعلق بھی احکام اللہ تعالیٰ نے دے رکھے ہیں اسی لیے آخر پر نعمت پوری کرنے کا ذکر ہے۔ گویا شریعت کی ضروری تفصیلات کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا اور اب کسی نئی شریعت کی ضرورت نہ رہی۔ اور تطہیر کے لفظ کو بیان کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ باطنی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ اسلام ظاہری پاکیزگی کے قواعد کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی الدین علی النظافۃ۔ دین کی بنیاد نظافت پر رکھی گئی ہے۔

ع۶۹۴ میثاق۔ واثق۔ وثقت بہ کے معنی ہیں اس سے سکون پکڑا اور اس پر اعتماد کیا اور اوثق کے معنی اسے مضبوط باندھا اور میثاق وہ عہد ہے جو قسم سے موکد ہو (غ)

سدی کہتے ہیں کہ اس عہد سے مراد اس شریعت کی خوبی ہے جو عقول انسانی میں مرکوز ہے اور مقاتل نے کہا کہ یہ عہد الست بربکم قالوا بلیٰ والا ہے۔ اور بعض نے بیعت تحت الشجرۃ کو یہ عہد قرار دیا ہے (ج) شریعت کا دینا اور مسلمانوں کا دین اسلام میں داخل ہونا خود ایک عہد ہے مگر یہاں چونکہ اوپر انسان کی اس فطری خواہش کا ذکر ہے جو اس کو کشاں کشاں اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتی ہے اس لیے مراد وہی فطری عہد ہے جو الست بربکم میں لیا گیا ہے - اور نعمت اللہ سے مراد قرآن کریم ہے جو ان پر نازل کیا گیا۔ قرآن کے نزول نے جب اس فطری عہد کو یاد دلایا تو مومن سمعنا واطعنا کہہ اٹھے۔

ع۶۹۵ انسان کی وہ صفات جو خواہشات سفلی سے بالاتر ہیں جن کی طرف اس رکوع میں توجہ دلائی ہے۔ ان کا خلاصہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں آجاتا ہے ان دونوں کے قیام کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے قوامین للہ میں حقوق اللہ کی طرف اور شہداء بالقسط میں حقوق العباد کی طرف۔ قوام کے لیے دیکھو ع۴۳۶ ایک امر کے قیام کیلئے پورا زور لگانے والا۔ مگر یہاں بجائے اس امر کے ذکر کے صرف اللہ فرمایا۔ یعنی حقوق اللہ کی حفاظت پر پورا زور لگانے والے ہو (النساء ۴-۱۳۵) میں جہاں صرف حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی تھی۔ فرمایا قوامین بالقسط شہداء للہ۔

ع۶۹۶ اعدلوا۔ عَدْل کے معنی مساوات ہیں اور عَدْل ان معاملات میں کہا جاتا ہے جن کا تعلق بصیرت سے ہے اور عِدْل وزن ناپ وغیرہ میں جن کا تعلق حاسہ سے ہے اور عدل دو طرح پر ہے ایک احسان کے عوض احسان کرنا اور جو تکلیف دور کرے اس کی تکلیف دور کرنا۔ اور دوسرا قصاص سزاؤں وغیرہ کے بارہ میں (غ)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ⑨

اللہ نے اُن سے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ⑩

اور وہ جنھوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا، وہی دوزخ والے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪ ع ۳

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی نعمت یاد کرو (جو) تم پر رہی ہوئی، جب ایک قوم نے ارادہ کر لیا کہ اپنے ہاتھ تمھاری طرف بڑھائیں تو اس نے تم سے اُن کے ہاتھوں کو روکا اور اللہ کا تقویٰ کرو اور اللہ پر ہی مومنوں کو چاہیئے کہ بھروسہ کریں [۶۹۷]

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ

اور یقیناً اللہ نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا۔ اور ہم نے اُن میں سے بارہ[۱۲] سردار مقرر کیے ۔ اور اللہ نے کہا میں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو اور اچھا مال اللہ کو کاٹ کر دو گے ۔ تو میں بالضرور تمھاری برائیاں تم سے دور کر دونگا اور بالضرور تم کو باغوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں پس جو کوئی تم میں سے

حقوق العباد کی عظمت پر پھر زور دیا ہے۔ پچھلے رکوع میں صرف اس قدر فرمایا تھا کہ کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے تم اس پر زیادتی نہ کرو۔ یہاں انصاف کے لیے حکم دیا ہے اور انصاف حقوق میں یہ ہے کہ ان حقوق کو ادا کیا جائے۔ تقویٰ سے قریب تر کہہ کر بتا دیا کہ تقویٰ حفاظت حقوق سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ جب دشمنوں کے حقوق کی ادائیگی بھی ایسی ضروری ہے تو پھر اپنے عزیزوں اور دوستوں اور مسلمان بھائیوں کے حقوق کی ذمہ داری کس قدر بڑی ہے کہاں ہیں وہ مسلمان جو اس تعلیم میں مخاطب ہیں!

۶۹۷ یبسطوا۔ بَسْط کے معنی پھیلانا اور توسع ہیں اور بسط اللسان سے مراد گالی دینا اور بسط الید سے مراد کبھی پکڑنا کبھی حملہ کرنا یا مارنا ہوتا ہے۔ غ
کَفّ۔ کَف کے اصل معنی ہتھیلی ہیں اور پھر اس کے معنی ہیں کف سے دوسرے کو پہنچنا اور اس کو دفع کر دینا اور پھر جس طرح بھی کسی کو دفع کیا جائے اس پر بولا جاتا ہے (غ)

آنحضرتؐ کا دشمنوں سے بچانا: بعض مفسرین نے اس آیت کی تشریح خاص واقعات سے کرنی چاہی ہے مثلاً اس واقعہ سے کہ نبی کریم صلعم درخت کے نیچے سوئے ہوئے تھے اور تلوار درخت کے ساتھ لٹکائی ہوئی تھی تو ایک دشمن نے تلوار اُٹھا کر کہا کہ اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ تو آپ نے جواب دیا کہ خدا جس پر تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی تب آپ نے وہی تلوار اُٹھا کر اس سے یہی سوال کیا اور باوجود اس پر قابو پانے کے اسے مارا نہیں۔ یا اس واقعہ سے کہ یہود بنی نضیر نے نبی صلعم پر جب آپ دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے چکی کا پاٹ گرا کر آپؐ کو ہلاک کرنا چاہا تھا۔ مگر ان دو واقعات پر کیوں ان الفاظ کو محدود کیا جائے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے اور کیا قریش اور کیا دیگر مشرک قبائل عرب اور کیا یہودی اور کیا عیسائی اور کیا عرب اور کیا عجم سب آپ کو اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو ہلاک اور تباہ کرنے کے درپے تھے اور اللہ کے فضل نے ہی ان کو بچایا ہوا تھا۔ یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ تمھارے ساتھ ایسی عداوت کا اظہار تو یہ لوگ کر چکے ہیں مگر جب تم قوت پکڑو اور ان پر تم کو بادشاہت عطا ہو تو ان کے ساتھ انصاف ہی کرنا۔

ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾
فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا
قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ
مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ
وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

اس کے بعد انکار کریگا وہ بلاشبہ سیدھے رستہ سے بھٹک گیا ۷۹۸
سو اُن کے اپنا عہد توڑ دینے کی وجہ سے ہم نے اُن پر
لعنت کی اور ان کے دل سخت کر دیئے لفظوں کو اپنی جگہ
سے پھیرتے ہیں ۔ اور جو اُن کو نصیحت کی گئی تھی اس کا
ایک حصہ بھول گئے اور ان میں سے تھوڑے لوگوں کے
سوائے تو ان کی خیانت پر خبر پاتا رہے گا سو ان کو معاف کر
اور درگزر کر، اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۷۹۹

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا
مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠
فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ
بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور ان سے جو کہتے ہیں ہم نصرانی ہیں ہم نے اُن سے عہد
لیا مگر وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے جو انھیں نصیحت کی گئی تھی
سو ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور
بغض ڈال دیا اور عن قریب اللہ ان کو اس کی خبر دیگا
جو وہ کرتے تھے ۸۰۰

---

۷۹۸ نقیب ۔ نَقْب سے ہے جس کے معنی سوراخ کرنا ہیں اور نقیب وہ ہے جو قوم کے حالات کی تحقیق اور تفتیش کرتا ہے (غ) پس مراد سردار ہے جو قوم کے حالات سے واقف ہو۔

عزرتموھم ۔ تعزیر اس مدد کو کہتے ہیں جو تعظیم کے ساتھ ملی ہوئی ہو اور تعزیر سزا دینے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ تادیب ہے اور تادیب بھی ایک نصرت ہے کیونکہ انسان کو نقصان دینے والی چیز سے روک دیتی ہے اسی معنی سے نبی کریم صلعم کی حدیث ہے اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم ۔ جب دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ ظالم ہونے کی حالت میں اس کی کس طرح مدد کی جائے تو آپ نے فرمایا اس کے ظلم سے اس کو روک دو ۔ (غ)

اس رکوع میں یہود و نصاریٰ کی خلاف ورزئ عہد کا ذکر ہے جب مسلمانوں کو دو قسم کے عہد بتا دیئے تو اب مثال کے طور پر پہلی قوموں کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے عہد شکنی کی ۔ مگر یہود کا ذکر پہلی دو آیتوں میں کر کے پھر اس کی تفصیل اگلے رکوع میں کی ہے اور اس رکوع میں عیسائیوں کی خلاف ورزئ عہد کا ہی بالخصوص ذکر ہے۔

زمین کنعان اور اسرائیلی سردار: جس عہد کا یہاں ذکر ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کا عہد تھا اور بارہ سردار جو مقرر کیے گئے وہ سرزمین کنعان کے حالات کا پتہ لگانے کے لیے تھے اور نہروں والی زمین بھی وہی سرزمین کنعان ہے "پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تاکہ کنعان کی زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جاسوسی کریں" (گنتی ۱۳: ۱ و ۲) اور پھر ۴-۱۵ آیات تک ان بارہ سرداروں کے نام دیئے ہیں ۔ اور واپسی پر ان کا بیان اس سرزمین کے متعلق یوں دیا ہے "ہم اس زمین تک جہاں تو نے ہمیں بھیجا تھا پہنچے اس میں سچ مچ دودھ اور شہد بہتا ہے اور یہ وہاں کا میوہ ہے" (گنتی ۱۳: ۲۷)

۷۹۹ قاسیۃ ۔ قَسْوَة دل کی سختی کو کہتے ہیں (غ) دل کی سختی یہ ہے کہ ذکر اللہ اس میں اثر نہیں کرتا جیسا کہ خود دوسری جگہ فرمایا فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر ۳۹-۲۲)

خائنۃ ۔ یہاں مصدر کے معنی میں ہے یعنی خیانت ۔ دوسری جگہ ہے یعلم خائنۃ الاعین (المؤمن ۴۰-۱۹) یا مراد خیانت کرنے والی بڑی جماعت ہے (غ)

نسیان بمعنی ترک کے لیے دیکھو ۶۴ ۔

مسلمانوں کو بتا دیا ہے کہ اہل کتاب کی طرف سے ہمیشہ تم خیانت دیکھتے رہو گے ۔ باایں حکم دیا ہے کہ معاف بھی کرتے رہو ۔ تحریف کے لیے دیکھو ۶۱۱

۸۰۰ اغرینا ۔ غری کے معنی ہیں کسی چیز کے ساتھ لگ جانا یا چمٹ جانا اس لیے اغرا کے معنی ہیں کسی کے ساتھ لگا دینا (غ)

عیسائیوں کے اخذ میثاق سے مراد اُن کو احکام دینا ہے ۔ انجیل بھی اس پر شاہد ہے جس کی پہاڑی تعلیم میں بھی احکام پائے جاتے ہیں ۔ ایسا کرو ایسا نہ کرو ۔ ان کو بھی شریعت پر عمل کرنے کا حکم تھا ۔ نماز پڑھنے کا روزہ رکھنے کا بھی حکم تھا دوسرے لوگوں سے عدل و انصاف کرنے کا حکم تھا۔

عیسائیوں میں باہم بغض: یہودیوں کی عہد شکنی کی سزا فرمائی تھی لعنت یعنی ان کا دور کر دینا اور دربدر کر دینا ۔ عیسائیوں کی عہد شکنی کی سزا بتائی ہے ان

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ‌ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ‏ ﴿۱۵﴾

اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے، وہ بہت کچھ اس میں سے کھول کر بیان کرتا ہے جو تم کتاب سے چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کرنے والی کتاب آچکی ہے ۸۰۱

يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ‏ ﴿۱۶﴾

اس کے ساتھ اللہ اس کو جو اس کی رضا کی پیروی کرتا ہے سلامتی کی راہوں پر چلاتا ہے اور اپنے حکم سے ان کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور ان کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

لَـقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ‌ ؕ قُلۡ فَمَنۡ يَّمۡلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔـا اِنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّهۡلِكَ الۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا‌ ؕ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا‌ ؕ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ‌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ‏ ﴿۱۷﴾

وہ یقیناً کافر ہیں، جو کہتے ہیں کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے ــ کہہ کس کو اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی اختیار ہوا، جب اللہ نے مسیح ابن مریم اور اس کی ماں اور ان سب کو جو زمین میں تھے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور جو ان کے درمیان ہے اللہ کے لیے ہی ہے وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۸۰۲

ہیں باہم دشمنی اور بغض کا رہنا۔ یا یہود و نصاریٰ میں قیامت تک دشمنی اور بغض کا رہنا مراد ہے۔ مگر اوّل کو ترجیح ہے دونوں باتیں آج تک صحیح پائی جاتی ہیں اور قرآن کریم کے الفاظ کی صداقت ہمیشہ ہی ظاہر ہوتی رہے گی۔ چونکہ عیسائی قوموں کی غرض محض مال دنیا کا جمع کرنا ہے اور خلاق فاضلہ سے عاری ہیں اس لیے ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف منصوبے کرتے رہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عیسائی قیامت کے دن تک رہیں گے اور ان میں باہم دشمنی بھی رہے گی پس یہ خیال کہ کسی وقت کل کے کل مسلمان ہو جائیں گے اس آیت کی رو سے غلط ٹھہرتا ہے۔

۸۰۱ یہاں بتایا کہ یہ رسول اہل کتاب کے لیے بھی ہے۔ اہل کتاب پیشگوئیوں کا بھی اخفا کرتے تھے اور تعلیم کا بھی پس دونوں مراد ہو سکتے ہیں اور نبی کریم صلعم کے معاف کرنے سے مراد اُن کی بہت سی شرارتوں کا معاف کرنا بھی ہو سکتا ہے جو وہ رسول اللہ صلعم کے خلاف کرتے تھے۔

۸۰۲ مسیح کی موت ماننے کے سوائے الوہیت مسیح کا ابطال نہیں ہو سکتا: یہاں اوّل عیسائیوں کا قول نقل کیا ہے کہ مسیح خدا ہے اور ایسا کہنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ابطال الوہیت مسیح پر دلیل دی ہے۔ عام طور پر ان الفاظ کے معنی یوں کیے جاتے ہیں کہ اگر خدا یہ ارادہ کرلے کہ مسیح ابن مریم اور اس کی ماں کو ہلاک کردے تو پھر کون اللہ کے مقابلہ میں کچھ اختیار رکھتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس سے بودی اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ ایک طرف تو یہ فرض کرلیں کہ مسیح اب تک زندہ ہے اور اس سے جب ایک قوم اس کی الوہیت کی دلیل لے تو جواب میں ہم کہیں کہ خدا جب چاہے گا اسے مار دیگا اور تم اسے نہیں بچا سکو گے۔ جب یہ عقیدہ رکھا جائے کہ مسیح دو ہزار سال سے زندہ ہے اور وہ کھانے پینے کا محتاج بھی نہیں اور اس کے جسم میں کوئی تغیر بھی نہیں آتا تو یہ باتیں ظاہراً اسے بشر یا مخلوق کی حالت سے نکال کر صفات الوہیت اس کے اندر قرار دیتی ہیں اس حد تک تو ہم نے عیسائیوں کی بات کو مان لیا کہ بشر سے واقعی اس کو یہ فوقیت ہے کہ بشر کھانے پینے کا محتاج ہے مسیح نہیں اور بشر کے جسم میں تغیر آتا رہتا ہے مسیح کے جسم میں نہیں آتا۔ اور یہ صفات الوہیت کی ہیں۔ تو اب ہم انہیں گویا یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس میں اس وقت تو ضرور یہ صفات الوہیت ہیں مگر چونکہ جب خدا چاہے گا اسے مار دیگا۔ اس لیے وہ خدا نہیں۔ کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی عقلمند انسان اس کو عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت مسیح کے خلاف دلیل سمجھ سکتا ہے؛ پھر علاوہ ازیں اگر مسیح اس وقت تک نہیں مرے تو ان کی ماں بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق بھی وہی ان اراد کا لفظ پڑا ہوا ہے اور یہ ارادہ ابھی واقع نہیں ہوا۔ اور سارے لوگ بھی اسی ذیل میں آئے۔ گویا اس وقت سے جس قدر من فی الارض ہوئے ہیں ان سب کے متعلق ابھی ارادہ

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا
اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ
بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ
يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں، ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں کہہ پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمھیں کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم انھیں میں سے بشر ہو جنھیں اس نے پیدا کیا[۸۰۳] وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور وہ جو ان دونوں کے درمیان ہے اللہ کے لیے ہی ہے اور اسی کی طرف پھر کر جانا ہے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ
لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا
مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ
جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى

اے اہل کتاب یقیناً ہمارا رسول تمھارے پاس آیا ہے وہ رسولوں کے بند ہو جانے پر تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا نہیں آیا۔ اور نہ کوئی ڈرانے والا سو تمھارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا

الٰہی ہلاک کرنے کا نہیں ہوا نہ مسیح اب تک مرے نہ مسیح کی ماں نہ اس زمانہ سے اس وقت تک کوئی انسان ہی مرا ہے۔

پس جب مسیح کی ہلاکت کو بطور دلیل پیش کیا ہے اور دلیل یہ بن نہیں سکتی۔ اگر نزول قرآن کے وقت مسیح زندہ ہوں تو لازماً ماننا پڑے گا کہ نزول قرآن کے وقت مسیح فوت ہو چکے تھے جس طرح ان کی ماں فوت ہو چکیں جس طرح باقی اہل زمین فوت ہوتے رہے اور چونکہ ہلاکت کا ارادہ فعل محقق الوقوع ہے اس لیے اِنْ یہاں شرطیہ نہیں بلکہ بمعنی اِذْ ہے۔ یعنی جب خدا نے ایسا ارادہ کر لیا۔ جیسا کہ لتدخلن المسجد الحرام ان شآء اللّٰہ اٰمنین (الفتح ۴۸ – ۲۷) میں اور جیسا کہ اتقوا اللّٰہ ان کنتم مؤمنین (۱۱۲) میں اور جیسا کہ آنحضرت صلعم کے اس قول میں وانّا ان شاء اللّٰہ بکم للاحقون۔ کہ فعل کے محقق الوقوع ہونے کی وجہ سے اِنْ بمعنی اِذْ ہے اور یہ قول مغنی میں منقول ہے اور فمن یملک میں مضارع کا اختیار کرنا اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ جہاں فعل میں استمرار ہو وہاں گزشتہ کے متعلق مضارع کا استعمال ہوتا ہے جیسا کہ یحکم بہا النبیون الذین اسلموا (۴۴) میں یا جیسے فریقا کذبوا و فریقا یقتلون (۷۰) یا جیسے وکذٰلک نُرِی ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض (الانعام ۶ – ۷۵) میں۔ اور یہاں تو چونکہ من فی الارض کے متعلق ارادہ جیسا گزشتہ میں ہوا آئندہ بھی ہوتا رہتا ہے اس لیے فمن یملک نہایت ضروری تھا۔ یعنی اب بھی جب کبھی اللہ تعالیٰ اہل زمین کی ہلاکت کا ارادہ کرتا ہے تو کون اس کا مقابلہ کر سکتا ہے یا کون کسی کو بچا سکتا ہے۔ غرض دلیل ابطال الوہیت یوں بنتی ہے کہ جب مسیحؑ کو مارنے کا ارادہ کیا تو اس کو کون بچا سکا، جب مریمؑ کو مارنے کا ارادہ کیا تو اس کو کون بچا سکا جب دوسرے اہل ارض کو مارنے کا ارادہ کیا تو ان کو کون بچا سکا۔ اور اب بھی جب وہ اہل ارض کو مارنے کا ارادہ کرتا ہے تو کون بچا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مسیح اور مریم کے ذکر کے ساتھ من فی الارض لا کر یہ بھی بتا دیا کہ اپنے اپنے وقت میں یہ بھی من فی الارض ہی تھے اور دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہی تھے۔ جو زمین پر ہی رہے اور جب خدا نے چاہا تو انھیں مار بھی دیا پس یہ آیت بھی وفات مسیحؑ پر قطعی دلیل ہے اگر وفات مسیح پر دلیل نہیں تو ابطال الوہیت پر بھی کوئی دلیل نہیں۔ اور یہ صریحاً باطل ہے۔

جب من فی الارض کو ہلاک کرنے کا ذکر کیا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا یخلق ما یشآء جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے یعنی جیسے جیسے مارتا رہتا ہے پیدا بھی کرتا رہتا ہے۔

ع۸۰۳ یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ابنیت: یہاں فرمایا کہ عیسائی اور یہودی اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور اللہ کے پیارے قرار دیتے ہیں۔ ابن اللہ کا لفظ توریت اور انجیل دونوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ خروج ۴: ۲۲ میں ہے "اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا ہے۔" اور یرمیاہ ۳۱: ۹ میں ہے "میں اسرائیل کا باپ ہوں اور افرائیم میرا پلوٹھا ہے۔" اور انجیل متی ۵: ۹ میں ہے "مبارک وے جو صلح کرنے والے ہیں کیونکہ وہ خدا کے فرزند کہلائیں گے۔" پس ابناء اللہ کا لفظ تو یہود و نصاریٰ کے لیے توریت و انجیل میں موجود ہے مگر احباؤہ یعنی خدا کا حبیب یا پیارا ہونا یہ گویا بطور نتیجہ تھا یعنی یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ چونکہ ہم خدا کے بیٹے ہیں اور بیٹا باپ کا پیارا ہوتا ہے اس لیے ہم اس کے پیارے بھی ہیں۔ گویا کل مخلوق میں سے اپنی خاص نسبت اوّل الذکر بوجہ اولاد اسرائیل ہونے کے اور عیسائی بوجہ کفارہ پر ایمان لانے کے اللہ تعالیٰ سے قائم کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہارے گناہوں کی سزا تو یہاں بھی اسی طرح تم کو ملتی رہتی ہے جس طرح دوسری مخلوق کو، پس خاص تعلق ابنیت اور محبت کا تمہارا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ابن اللہ کا لفظ نہ توریت میں اولاد اسرائیل ہونے کی وجہ سے کہا گیا تھا نہ انجیل میں کفارہ پر ایمان کی وجہ سے بلکہ وہ محض اعمالِ صالحہ اور اعلیٰ درجہ کے اخلاص کی وجہ سے تھا اُن کو چھوڑ کر اب تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا۔ عیسائی کہتے ہیں حضرت عیسٰیؑ کے کفارہ سے آدم کا گناہ دُور ہو گیا۔ حالانکہ بائبل میں جو آدم کے گناہ کی سزا لکھی ہے کہ مرد پسینہ سے کمائے گا اور عورت درد سے جنے گی وہ سزا تو اسی طرح عیسائیوں میں باقی ہے۔ آج کل بھی عیسائی اقوام اپنے آپ کو تمام اقوام سے بڑھ کر قرار دیتی ہیں گویا دوسرے کبھی اس مقام کو حاصل کر ہی نہیں سکتے، جسے یورپ نے حاصل کیا ہے۔

ع ٤ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑲

آگیا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۸۰۴

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ⑳

اور جب موسٰیؑ نے اپنی قوم کو کہا اے میری قوم اللہ کی نعمت (جو) تم پر (ہوگی) یاد کرو جب اس نے تم میں نبی بنائے، اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ دیا جو قوموں میں سے کسی کو نہیں دیا ۸۰۵

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ㉑

اے میری قوم پاک سرزمین میں داخل ہو جاؤ، جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے اور پیٹھ پھیرتے ہوئے واپس نہ ہو آنا ورنہ تم نقصان اُٹھانے والے ہو جاؤ گے ۸۰۶

ع ۸۰۴ فترۃ تیزی کے بعد جو سکون ہو اور شدت کے بعد نرمی اور قوت کے بعد ضعف اسے فتور کہا جاتا ہے (غ) اور فترۃ کا زمانہ وہ کہلاتا ہے جو دو نبیوں یا رسولوں کے درمیان خالی زمانہ گزرتا تھا کیونکہ اس وقت کو داعی نہ ہوتا تھا (ل) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی فترت کا زمانہ نہیں کیونکہ دعوت الی الحق امت محمدیہ کا کام قرار پا گیا اور انقطاع رسالت ہو گیا۔ اس لیے کہ رسالت کی ضرورت کامل طور پر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پوری ہو گئی ۔

کوئی چھ سو سال کا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ایسا گزرا ہے کہ اس میں کوئی نبی دنیا میں ظاہر نہیں ہوا جس پر حدیث لیس بینی وبینہ نبی شاہد ہے یعنی میرے اور حضرت عیسٰیؑ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا تاریخ عالم بھی اس پر گواہ ہے۔

حضرت عیسٰیؑ اور آنحضرتؐ کے درمیان نبی: اور یہ جو بعض نے لکھا ہے کہ تین انبیاء اسرائیل سے اور ایک خالد بن سنان العبسی عرب سے ہوا سو ان پر نبوت کا نام محض بطور مجاز بولا جاتا ہے۔ چنانچہ ان تین کے متعلق جن کا ذکر سورہ یٰسین میں اذ ارسلنا الیہم اثنین کے نیچے سمجھا گیا ہے صاف طور پر مانا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسٰیؑ کے رسول تھے۔ اور ان پر مرسل کا لفظ بطور مجاز استعمال ہوا ہے اور خالد بن سنان یا حضرت عیسٰیؑ سے پہلے کے ہیں۔ (اور اس صورت میں ان کی بیٹی سے جس کے نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر ہے مراد ان کی نسل میں سے کوئی ہو جیسا کہ بعض محققین نے مانا ہے اور یا یہاں بھی لفظ کا استعمال بطور مجاز ہے اور وہ محض پیشگوئی کرنے والے تھے۔ اور حضرت عیسٰیؑ قومی نبیوں کے خاتم ہیں۔ اس زمانہ فترت میں تاریکی کل عالم پر محیط ہو گئی۔ اور آنحضرت صلعم نے توحید الٰہی کو دوبارہ دنیا میں قائم کیا اس لیے آپؐ آدم ثانی ہیں کہ نسل انسانی کی روحانی زندگی کو دنیا میں آپ نے ہی قائم کیا۔ اسی انقطاع کی طرف یہاں عیسائیوں وغیرہ کو توجہ دلائی ہے ۔

ع ۸۰۵ اس رکوع میں بتایا ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ جو خدائی وعدے تھے ان میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی کی وجہ سے کس طرح التوا ہو گیا پچھلے رکوع میں ان کی عہد شکنی کا عام ذکر تھا۔ یہاں ایک خاص مثال دی ہے اور یہود کو خاص کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اس رسول کے خلاف جو اُن کی اصلاح کے لیے آیا تھا کس طرح اب جنگ و جدال کے درپے ہیں۔ حالانکہ جب ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بت پرست قوم کے خلاف جنگ کا حکم ان کے نبی کی معرفت دیا گیا تھا تو اس وقت جنگ کرنے سے انکار کر دیا یوں ان کی عہد شکنی کا بھی ذکر کیا اور ان کی موجودہ منصوبہ بازی کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس کا زیادہ صراحت سے ذکر اگلے رکوع میں آئے گا۔

نبی بنانے اور بادشاہ بنانے کا ذکر، یا بطور وعدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وعدے ایسے ہیں کہ گویا جو کچھ اس نے کہا وہ ہو ہی چکا ہے یا انبیاء سے اشارہ حضرت موسٰیؑ اور حضرت ہارونؑ کی طرف ہے جو اس وقت موجود تھے اور ابن جریر میں جو ایک قول ہے کہ وہ ستر آدمی جو حضرت موسٰیؑ طور پر ساتھ لے گئے تھے نبی بنانے میں ان کی طرف اشارہ ہے تو یہ صرف اس معنی سے درست ہو سکتا ہے کہ ان کو سچے خوابوں اور الہامات سے مشرف کیا گیا ہو اور اس معنی میں لفظ نبی کا اطلاق بنی اسرائیل میں ہو جاتا تھا۔ اور بادشاہ بنانے سے ان کا حالت غلامی سے نکال کر جس میں وہ مصر میں تھے خود مختار اور اپنی قسمت کا آپ مالک بنا دینا مراد ہے کیونکہ اصل بادشاہت دوسرے کی ماتحتی سے آزادی ہے۔ جب قوم اپنی قسمت کی آپ مالک ہو گئی، دوسری قوم کی غلامی سے نکل گئی تو وہ بادشاہ بن گئی اور ابن جریر کی روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل میں جو شخص گھر اور عورت اور خادم کا مالک ہوتا تھا وہ بادشاہ سمجھا جاتا تھا تو اس میں بھی یہی اشارہ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ فرعون کی ماتحتی میں وہ بوجہ غلامی کے نہ اپنے گھروں کے مالک تھے اور خدمتگار رکھنے کی بجائے خود ان سے خدمتگاری کا کام لیا جاتا تھا۔ اور نبی بنانے کے متعلق کہا کہ تم میں نبی پیدا کیے مگر بادشاہت کو ساری قوم کی طرف منسوب کیا اس میں بتایا کہ بادشاہت درحقیقت قوم کی ہوتی ہے نہ چند افراد کی۔ اور یہ فضیلت کہ جو کچھ تمہیں دیا وہ دنیا کی اور کسی قوم کو نہیں دیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس زمانہ کی اور کسی قوم کو یہ نہیں دیا (دیکھو ع۳۰) یعنی نبوت کا سلسلہ ان میں بہت وسیع کیا اور پھر نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی دی۔

ع ۸۰۶ الارض المقدسۃ۔ تقدیس سے مراد اللہ تعالیٰ کا پاک کرنا ہے یعنی ایسی تطہیر جو نجاست محسوسہ سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس لیے بیت المقدس

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

انھوں نے کہا اے موسیٰؑ اس میں قوی ہیکل لوگ ہیں اور ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اُس میں سے نکل نہ جائیں ہاں اگر وہ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے ۸۰۷

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۬ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾

اُن میں سے جو ڈرتے تھے دو شخصوں نے جن پر اللہ نے انعام کیا تھا کہا ان پر دروازے سے داخل ہو جاؤ، سو جب تم اس میں داخل ہو جاؤ گے، تو یقیناً تم غالب ہو گے — اور اللہ پر ہی توکل کرو، اگر تم مومن ہو ۸۰۸

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

انھوں نے کہا اے موسیٰؑ ہم ہرگز اس میں کبھی داخل نہ ہوں گے، جب تک کہ وہ اس میں ہیں پس تو اور تیرا رب جاؤ اور جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں ۸۰۹

اور الارض المقدسۃ وہ جگہ ہے جو نجاست شرک سے پاک کی گئی (غ) اور قُدُس کے معنی برکت بھی ہیں (ل) اور الارض المقدسۃ سرزمین شام ہے جس میں بیت المقدس بھی شامل ہے اور فراء کا قول ہے کہ وہ دمشق اور فلسطین اور بعض علاقہ اُرْدُن ہے (ل۔ ج) اور ابن جریر کہتے ہیں کہ اہل تاویل اور سیرت اور علمائے خیر کا اس پر اتفاق ہے کہ ارض مقدسہ عریش مصر اور فرات کے درمیان واقع ہے اور بائبل میں اس کی برکتوں کا یوں ذکر کیا کہ "اس میں سچ مچ دُودھ اور شہد بہتا ہے" (گنتی ۱۳: ۱۷)

کتب اللہ لکم۔ اس میں اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے کی گئی تھی "خداوند نے ابرام سے عہد کر کے کہا کہ میں تیری اولاد کو یہ ملک دونگا مصر کی ندی سے لیکر بڑی ندی تک جو فرات کی ندی ہے" (پیدائش ۱۵: ۱۸) اور پیدائش ۱۷: ۸ میں ملک کنعان کا نام لیکر یہی وعدہ ہے اور حضرت ابراہیم کے وعدہ میں بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں شامل ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے ان کو ارض مقدس میں بحیثیت فاتح داخل ہونے کو کہا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ یہ سرزمین تمہیں ملے گی لیکن اس کے لیے جدوجہد ضروری ہے اور لا ترتدوا علیٰ ادبارکم سے مراد یہی ہے کہ دشمن سے ڈر کر پیٹھ نہ پھیر دو۔

۸۰۷ جبارین۔ جبّار۔ جَبْر سے ہے جس کے اصل معنی ہیں کسی قسم کے غلبہ سے کسی چیز کی اصلاح کرنا اور اس لیے کبھی صرف اصلاح اور کبھی صرف قہر یا غلبہ کے معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے (غ) اور الجبّار جو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے تو اس کے معنی ہیں العالی فوق خلقہ۔ اس لیے انسان کو جبار کہیں گے تو اس سے مراد متمرد عالی یا متکبر ہوگا کیونکہ جبار اور متکبر ہونا یعنی دوسروں پر علو اور بڑائی اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کو شایاں ہے انسان کو نہیں اس لیے لم یکن جبارا عصیا (مریم ۱۹: ۱۴) اور لم یجعلنی جبارا شقیا (مریم ۱۹: ۳۲) میں مراد متکبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے آگے سر نہ جھکاتا ہو۔ اور جبار اس کو بھی کہتے ہیں جو دوسرے پر مسلط کیا گیا ہو وما انت علیھم بجبار (قٓ ۵۰: ۴۵) میں یہی مراد ہے اور جبار ناحق قتل کرنے والے کو بھی کہتے ہیں واذا بطشتم بطشتم جبارین (الشعراء ۲۶: ۱۳۰) اور ان ترید الا ان تکون جبارا فی الارض (القصص ۲۸: ۱۹) میں یہی مراد ہے اور جبار عظیم قوی طویل کو بھی کہتے ہیں اور یہ معنی نَخْلَۃٌ جبّارۃ سے لیے گئے ہیں یعنی بلند یا بڑی کھجور جہاں ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ اور یہی معنی فیھا قوما جبارین میں ہیں یعنی بڑے قوی ہیکل یا طاقتور یا زبردست لوگ (ل)

گنتی ۱۳: ۳۱ میں ہے "ہمیں زور نہیں کہ ان لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وے ہم سے زیادہ زور آور ہیں"۔ اور ۳۳ میں ہے "ہم نے وہاں جباروں کو..... دیکھا"۔ اور ۱۴ باب کے شروع میں ذکر ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل ان سے خائف ہوئے۔ اور اس سرزمین میں داخل ہونے سے انکار کیا اور مصر کو واپسی کی ٹھانی یعنی جنگ پر اس حالت غلامی کو ترجیح دی۔ اس سے زیادہ جو قوما جبارین کی تفسیر میں قصے لکھے گئے ہیں وہ صرف قصے ہی ہیں۔

۸۰۸ ان دو شخصوں کے نام گنتی ۱۴: ۶ میں دیئے گئے ہیں۔ یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ۔

۸۰۹ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے حکم کی نافرمانی کی اور دشمن سے خائف ہو کر جنگ کرنے سے قطعی انکار کر دیا فاذھب انت وربک ایسی قوم کے منہ سے نکلنا جو بات بات پر تمرد اور سرکشی دکھاتے تھے کوئی عجیب بات نہیں مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنے رب کی مدد پر بھروسہ ہے سو تو اور تیرا رب جا کر جنگ کرو ہم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالتے اور جنگ میں نہیں جاتے۔

اصحاب موسیٰؑ اور اصحاب محمد صلعم: صحیح احادیث میں یہ ذکر ہے کہ بدر کے دن مقدادؓ نے نبی کریم صلعم سے عرض کی کہ ہم اصحاب موسیٰؑ کی طرح یہ نہ کہیں گے فاذھب انت

قَالَ رَبِّ إِنِّي لَآ أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِينَ ﴿٢٥﴾

(موسیٰ نے) کہا اے میرے رب میں سوائے اپنے اور اپنے بھائی کے اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا سو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں فیصلہ کر دے۔ ۸۱۰

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۛ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِينَ ﴿٢٦﴾ ع ۴/۸

(اللہ نے) کہا اب وہ (زمین) ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی ہے، اسی زمین میں سرگردان پھرتے رہیں گے سو تو ان نافرمان لوگوں پر افسوس نہ کر۔ ۸۱۱

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ ۘ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ ۖ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ ۖ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴿٢٧﴾

اور ان پر آدم کے دو بیٹوں کی خبر حق کے ساتھ پڑھ دو، جب انھوں نے کوئی قربانی پیش کی سو وہ اُن دونوں میں سے ایک سے قبول کی گئی اور دوسرے سے قبول نہ کی گئی اس نے کہا میں ضرور تجھے قتل کروں گا (اس نے) کہا اللہ صرف متقیوں سے قبول کرتا ہے۔ ۸۱۲

وربّک بلکہ ہم آپ کے ساتھ ہو کر آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں سے لڑیں گے۔ لیکن بعض احادیث میں یوم بدر کا لفظ ہے اور بعض میں نہیں۔ بخاری کتاب التفسیر میں بھی یوم بدر کا لفظ ہے اور ابن جریر نے روایت بیان کی ہے کہ یہ لفظ مقداد نے حدیبیہ میں کہے تھے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ گو سورتوں کا نزول لمبے عرصہ پر ممتد رہتا تھا، مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سورۃ مائدہ کا کوئی حصہ جنگِ بدر سے پہلے نازل ہو چکا ہو اور حدیبیہ سے پہلے اس کا نازل ہونا قرین قیاس ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کس طرح ان قصوں سے جو پہلی قوموں کے مذکور ہیں عبرت حاصل کرتے تھے۔

۸۱۰ حضرت موسیٰ کا یہ کہنا کہ میں اپنے نفس پر اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں اس لحاظ سے ہے کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے مقام پر کھڑا کیا تھا پس ان کا تو تنہا بھی جنگ کرنے کے لیے اگر حکم الٰہی آئے نکلنا ضروری تھا۔ اسی لیے یہاں ان دو کو بھی شامل نہیں کیا جن پر انعام کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔

افرق۔ فَرَقْتُ بین الشیئین کے معنی ہیں دو چیزوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا خواہ وہ ایسی علیحدگی ہو جس کو آنکھ دیکھ سکے (یعنی مکانی طور پر تفریق) اور خواہ ایسی علیحدگی جو بصیرت سے معلوم ہو سکے (یعنی حکم اور فیصلہ میں الگ الگ کر دینا) (غ) اور یہاں معنی اقض ہی لیے گئے ہیں (ج) اور فاسق یا نافرمان قوم ان کو بلحاظ کثرت کے کہا گیا ورنہ وہ دو جن پر انعام ہوا انہی میں شامل تھے۔

۸۱۱ یتیھون۔ تاہ یتیہ کے معنی ہیں تحیّر یعنی حیران رہا (غ) مطلب یہ کہ کسی مقصد کو حاصل نہ کر سکیں گے۔

تأس مادہ اسا ہے اور اُسوۃ یا اِسوۃ وہ حالت ہے جس پر انسان دوسرے کی اتباع میں ہو خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بُری اور اسی کے معنی حزن یعنی غم ہیں گویا وہ فوت شدہ چیز کا اتباع غم سے کرتا ہے اور اسیت علیہ اور اسیت لہٗ دونوں طرح پر آتا ہے اسی سے تاس ہے اور فکیف اٰسٰی علی قوم کفرین (الاعراف ۔ ۹۳)

گنتی ۱۴: ۲۳ میں ہے "وے اس زمین کو جس کی بابت میں نے ان کے باپ دادوں سے قسم کی تھی نہ دیکھیں گے"۔ اور ۲۹ میں ہے "تمہاری لاشیں اور ان سب کی جو تم میں شمار کیے گئے ان کی کل جمع کے مطابق بیس برس والے سے لے کے اوپر والے تک جنہوں نے میری شکایتیں کیں اس بیابان میں گریں گی"۔ گویا یہ نسل ہیں تباہ ہو جائے گی اور ان کی اولاد فاتح ہو گی۔ قرآن کریم نے چالیس سال کا لفظ اختیار فرما کر اسی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اوسط عمر ساٹھ سال ہے پس چالیس سال میں یہ لوگ جو اس وقت نافرمانی کر رہے ہیں اور جنگ کرنے کے قابل ہیں ہلاک ہو جائیں گے۔

۸۱۲ ہابیل اور قابیل کے قصّہ کی غرض: اس رکوع میں ایک مثال بیان کی ہے کہ کس طرح ایک انسان نے دوسرے کو محض اس کی نیکی پر حسد کی وجہ سے قتل کر دیا۔ اصل ذکر اہل کتاب کا تھا اور اس رکوع میں بھی بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے اور اگلے میں بھی ان کی تحریف وغیرہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی انہی کا ذکر چلتا ہے پس اصل غرض اس قصّہ میں بھی یہی بتانا ہے کہ یہود محض حسد کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف منصوبے کرتے ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین نے واتل کو اسی تعلق کی طرف توجہ دلانے کے لیے آیت ۱۱۔ اذ ھمّ قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم پر عطف قرار دیا ہے (ج) اور بعض نے اس کو آیت ۱۸ پر عطف کہا ہے جہاں یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں گویا بتایا کہ یہ دعویٰ اور یہ کام۔ اور پھر اس رکوع میں حفاظت جان و مال کی ضرورت کی طرف اسی لحاظ سے توجہ دلائی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کا یوں سدّباب نہ کرتا تو پھر دنیا سے امن بالکل اُٹھ جاتا پس اس ذکر کو بطور ایک مثال کے یہ سمجھانے کے لیے بیان کیا کہ وہ یہود جو جنگ سے اس قدر خائف تھے کہ باوجود حکم الٰہی کے اس سے انکار کیا۔ اب آنحضرت صلعم سے محض بربنائے حسد برسرِ پیکار تھے۔ یہی حالت آج کل عیسائیوں کی ہے کہ ایک طرف دعویٰ صلح اور محبت کا ہے اور یہی انجیل کی تعلیم کا ماحصل بتایا جاتا ہے اور دوسری طرف ذرا ذرا بات پر دنیا کی آزادی سلب کرنے کے لیے اور دوسری قوموں کو محکوم بنانے کے لیے لڑائیاں کرتے ہیں۔

آدم کے یہ دو بیٹے اکثر کے نزدیک حضرت آدم کے صلبی بیٹے ہابیل و قابیل تھے۔ حسن اور ضحاک کہتے ہیں بنی اسرائیل کے دو آدمی تھے۔ مضمون کی حیثیت کلی اسی خیال

لَئِنۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾

اگر تو میری طرف اپنا ہاتھ بڑھائے گا کہ مجھے قتل کر دے مَیں اپنا ہاتھ تیری طرف نہ بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں مَیں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہانوں کا رب ہے ۸۱۳

اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾

مَیں چاہتا ہوں کہ تو میرے (خلاف) گناہ اور اپنے گناہ کی سزا پائے اور یوں آگ والوں میں سے ہو جائے اور یہی ظالموں کا بدلہ ہے ۸۱۴

فَطَوَّعَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ قَتْلَ اَخِیْہِ فَقَتَلَہٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۳۰﴾

سو اس کے نفس نے اس کے بھائی کے قتل پر اُسے راضی کر دیا پس اس نے اسے مار ڈالا اور نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو گیا ۸۱۵

فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ

تب اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کریدتا تھا، تاکہ اُسے

کی موید ہے کہ یہ کوئی بہت ابتدائی واقعہ ہے کہ کس طرح اوّل اوّل انسان کا ہاتھ اپنے ہی بھائی کے مارنے کے لیے اٹھا۔ خواہ وہ حضرت آدمؑ کے صلبی فرزند ہوں یا نہ ہوں، کیا قربانی کی تھی اور کس طرح اس کی قبولیت کا پتہ لگا یہ نہیں بتایا۔ اس لیے ان تفصیلات میں پڑنا درست نہیں۔ قربان اصل میں ہر ایک وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے اور مشہور معنی میں اس کا استعمال عام ہے ۵۷۹ اور قبولیت کے آثار بسا اوقات اس دنیا میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ابو عامر جیسے راہب کی مکاری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار قبولیت کفار کی نظروں سے بھی مخفی نہ تھے صرف حسد کی وجہ سے آپؐ کی ترقی سے جلتے تھے اور آپؐ کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔

۸۱۳ بسط ید سے مراد ہاتھ بڑھانا یا حملہ کرنا ہے۔ اس کو معلوم بھی ہو گیا کہ یہ میرا بھائی میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تاہم اس نے کہا کہ مَیں تجھے قتل کرنے کے لیے کبھی ابتدا نہ کروں گا اور حدیث صحیح میں بھی ہے اذا التقی المسلمان بسیفیھما فقتل احدھما صاحبہ فالقاتل والمقتول فی النار یعنی جب دو مسلمان اپنی تلواروں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں ہیں۔ اور جب دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلعم مقتول کیوں؟ تو فرمایا کہ وہ اپنے ساتھی کے قتل کرنے پر حریص تھا پس یہ وہ صورت ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتے ہیں متقی کا یہ کام نہیں کہ گو اسے یہ بھی معلوم ہو کہ ایک شخص اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاہم بطور ابتدا اس پر ہاتھ اٹھائے ہاں جب حفاظت کا سوال ہو تو بلاشبہ تلوار اُٹھانا جائز ہے۔

۸۱۴ اثمی کے معنی ہونگے میرا گناہ مگر حقیقت میں مراد ہے میرے خلاف گناہ کیونکہ اوپر اس کو متقی قرار دیا جا چکا ہے۔ ابن عباسؓ ابن مسعودؓ اور بہت سے صحابہ سے اثمی کے معنی اثم قتلی مروی ہیں (ج) یعنی میرے قتل کا گناہ جو تو اپنے ذمہ لیگا۔ اور اثمک سے مراد اس کے پہلے گناہ ہیں جن کی وجہ سے اس کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ یہ ادنیٰ تعلق کی اضافت قرآن کریم میں بہت جگہ آجاتی ہے جس کے نہ سمجھنے سے لوگ ٹھوکر کھاتے ہیں اسی قسم کا ادنیٰ تعلق ما تقدم من ذنبک وما تاخر (الفتح ۴۸: ۲) میں ہے جہاں ذنبک سے مراد وہ ذنب ہے جو کفار آنحضرت صلعم کی طرف منسوب کرتے تھے۔

کسی کے ارادہ قتل پر اس کا قتل کرنا جائز نہیں؛ اصل نیت اور ارادہ اس کا تو یہی ہے کہ اپنے بھائی کے قتل کے لیے ابتدا نہیں کریگا گو وہ بھائی اس کے قتل کا ارادہ کر چکا ہے۔ یہاں اس کے نتیجہ کو بیان کیا ہے کہ مَیں ابتدا کر کے تمہارے وجود کو دنیا سے مٹانا تو نہیں چاہتا مگر چونکہ تم ارادہ کر چکے ہو کہ جب موقع پاؤ مجھ کو قتل کر دو اس لیے نتیجہ یہ ہو گا کہ تم دوہرے گناہ کو اٹھاؤ گے ایک تو پہلے ہی تم قرب الٰہی سے دور پھینک دیئے گئے ہو اس لیے کہ نیکی کی طرف قدم نہیں اُٹھاتے بلکہ بدیوں کا ارتکاب کرتے ہو۔ دوسرے مجھے قتل کر کے ایک اور گناہ سر پر لو گے پس اگر تمہارا پہلا گناہ قابل معافی بھی ہے تو یہ عمداً گناہ ضرور تمہیں آگ میں لے جائے گا۔ یہ بھی درحقیقت اس کو گناہ سے روکنے کے لیے نصیحت تھی کہ اس حد تک تم اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا نہ کرو۔

اسلامی تعلیم کا رنگ ہی یہاں ظاہر فرمایا ہے وہاں بھی یہی حکم ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم۔ تم جنگ میں ابتدا مت کرو۔ آج بھی بہتیرے لوگ ہیں جو کھلے طور پر نہیں تو مختلف تجاویز سے آہستہ آہستہ اسلام کا نام مٹانا چاہتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں کہ اُن کے ان ارادوں کی وجہ سے پہل کر کے ان کے خلاف ہاتھ اٹھائیں۔ ہاں اپنی حفاظت کر لینا امر دیگر ہے۔

۸۱۵ طوّعت۔ طوع کے اصل معنی انقیاد یعنی فرمانبرداری ہیں اور طوّعت لہٗ کے معنی ہیں انقادت لہٗ وسہّلت یعنی اسے اس کا فرمانبردار بنا دیا اور سہل کر دیا اور لکھا ہے کہ یہ تابّت عن کذا کے مقابلہ پر ہے یعنی نفس نے اس بات سے انکار کر دیا اور اس کو نہ مانا (غ) اور اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اوّل اوّل طبیعت میں اس کے متعلق روک تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ امر اسے آسان نظر آنے لگا اور آخر کار نفس اس پر راضی ہو گیا اور ایسا ہی ہوتا ہے یعنی ایسے خطرناک گناہ پر بلکہ ہر گناہ پر نفس تدریجاً ہی راضی ہوتا ہے کیونکہ فطرتاً انسان گنہگار نہیں۔

لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ
يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا
الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ
معانقۃ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۚۛ ۳۱
وقف النبی صلعم مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ
اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ
فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ
وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ

دکھائے کہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے کہنے لگا
مجھ پر افسوس مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ اس کوّے کی مانند
ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپاتا، تب وہ پچھتانے
والوں میں سے ہُوا [۸۱۶]
اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ مقرر کر دیا
کہ جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے (بدلے) یا زمین میں
فساد کے مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا
اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ رکھا [۸۱۷]

---

۸۱۶ بعث کے معنی یہاں بَيَّضَه ہیں یعنی مقرر کر دیا (غ) انسان کی تعلیم کے لیے کوّے کا آجانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔

غُرابا۔ غرب سورج کے غائب ہونے پر بولا جاتا ہے اور ہر ایک دور ہو جانے والے کو غریب کہا جاتا ہے اور جو چیز اپنی جنس میں نظیر کم رکھتی ہو اسے بھی غریب کہا جاتا ہے اور غُراب کوّے کو اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ وہ بہت دور نکل جاتا ہے (غ)

یبحث۔ بَحث کے معنی کَشْف یعنی ظاہر کرنا اور طلب ہیں اسی سے کسی امر کے متعلق بحث ہے (غ) اور اصل میں بحث کے معنی ہیں کسی چیز کا مٹی میں تلاش کرنا (ل) اسی لیے یہاں زمین کریدنا مراد ہے۔

یواری۔ وری سے ہے اور واری کے معنی سَتَر ہیں یعنی چھپایا۔ جیسے یہاں اور لباسا یواری سوآتکم (الاعراف۔ ۲۶) اور تواری کے معنی چھُپ گیا۔ حتیٰ توارت بالحجاب (صٓ۔ ۳۲) اور الوری کل مخلوق کو کہا جاتا ہے جو زمین پر ہے گویا وہ سطح زمین کو اپنے وجود سے چھپائے ہوئے ہیں اور وَرَاء کے معنی پیچھے ہیں جیسے ومن وراء اسحٰق یعقوب (ھود۔ ۷۱) فلیکونوا من ورآئکم (النساء۔ ۱۰۲) یا آگے جیسے وکان ورآءھم ملک (الکھف۔ ۷۹) اور فنبذوہ وراء ظھورھم (اٰل عمران۔ ۱۸۷) میں مراد ان کا عمل اور تدبر نہ کرنا ہے اور فمن ابتغی ورآء ذٰلک (المؤمنون۔ ۷) میں اس سے مراد اس سے زیادہ ہے اور ویکفرون بما ورآءہ (البقرۃ۔ ۹۱) میں اس کے بعد معنی ہیں (غ) اور ان سب میں ستر یا چھپے ہوئے ہونے کا خیال پایا جاتا ہے۔

سَوْاَۃ۔ ساء سے ہے اور سَوْاۃ۔ العورۃ اور الفاحشۃ کو کہا جاتا ہے یعنی ستر کی جگہ اور بے حیائی کی بات اور شرمگاہ کو بھی کہتے ہیں۔ اور ہر ایک عیب دار عمل اور امر پر بولا جاتا ہے (ل) اور مغیرہ کی حدیث میں لفظ سواۃ کا استعمال بیوفائی سے قتل کر دینے پر ہوا ہے جس کی تشریح میں ہے کہ سَوْاۃ اصل شرمگاہ ہے۔ پھر ہر ایک اس امر پر بولا جاتا ہے جس سے حیا کی جائے قول ہو یا فعل (ن)

یٰویلتیٰ۔ وَیل کے معنی قُبح ہیں یعنی برائی اور حسرت اور افسوس کے موقعہ پر بولا جاتا ہے جیسے وَیح ترحم کے لیے فویل لھم مما کتبت ایدیھم (البقرۃ۔ ۷۹) اور وَیلتی اور وَیلنا اپنے اوپر اظہار افسوس کے لیے ہیں۔

نٰدمین۔ نَدم اور ندامۃ کسی امر پر جو ہاتھ سے جاتا رہا ہے تبدیل رائے کی وجہ سے افسوس کرنا ہے (غ)

جانوروں سے سبق: ظالم انسان طاقت کے نشہ میں اپنے بھائی کی کچھ پروا نہیں کرتا، بلکہ اس کو اپنی راہ میں روک سمجھ کر نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ وہ چرند و پرند سے ہمدردی کا سبق سیکھ سکتا ہے۔ ایک حالت جہالت کی وہ ہوتی ہے جو ایک ہی قوم کا انسان اسی قوم کے دوسرے انسان کی تباہی کو اپنے لیے بہتری کا موجب سمجھتا ہے پھر اس سے اتر کر جہالت کی حالت وہ ہے جو ایک قوم دوسری قوم کی تباہی کو اپنی ترقی کا موجب سمجھ لیتی ہے اور کسی میں ذرا سا عیب دیکھا تو اس کو نیست و نابود کرنے پر تل گئے۔ کوّے کو مٹی کریدتے دیکھ کر کیا سبق اس قاتل نے حاصل کیا۔ اے کاش میں اپنے بھائی کی سَوْاۃ کو چھپاتا اگر سَوْاۃ سے مراد شرمگاہ لی جائے تو اس سے لاش کا چھپانا مراد ہوگا۔ اور ابتداء میں انسان کا کسی جانور سے سبق حاصل کر لینا کوئی بعید بات نہیں۔ گو یہاں نہ دوسرے کوّے کا ذکر ہے نہ اس کی لاش کو چھپانے کا۔ اس لیے ابومسلم نے کہا ہے کہ کوئی چیز کوّے نے زمین کرید کر چھپائی اور اگر سَوْاۃ سے مراد امر شائن یا عیب ہے تو کوّے کا مٹی کریدنا اشارہ ہے کسی بات کے مخفی کرنے کے لیے تو قاتل کو یہ ندامت ہوئی کہ میں نے اپنے بھائی میں کوئی چھوٹا سا عیب دیکھ کر بجائے اس کے کہ اس عیب کو چھپاتا اس کے لیے اسے جان سے مار دیا۔ کوّے کا بھیجنا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس لیے کہ انسان اس سے ایک مفید سبق حاصل کرتا ہے۔ کوّے میں دو باتوں کی خصوصیت ہے ایک یہ کہ اپنی جنس کی لاش کو کھلا نہیں رہنے دیتا دوسرے کوّوں کو جس قدر ہمدردی ایک دوسرے سے ہوتی ہے اس کی نظیر دوسرے جانوروں میں نہیں ملتی ایک کی آواز پر ہزاروں جمع ہو جاتے ہیں۔

۸۱۷ اجل۔ اَجَل کے اصل معنی کسی شے کا وقت مقرر ہیں ۳۰۰ اس لیے اٰجل۔ عاجل کی ضد ہے۔ یعنی دیر سے ہونے والی بات اور اس لیے اَجَل وہ بُرا فعل

جَمِيعًا ۗ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿٣٢﴾

اور یقیناً ہمارے رسول ان کے پاس کھلی دلائل لیکر آئے پھر اس کے بعد بھی ان میں سے بہت سے یقیناً زمین میں حد سے نکلنے والے ہیں۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۗ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٣٣﴾

ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، صرف یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جائے، یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے [۸۱۸]

ہے جس کے نتیجہ سے ایک وقت کے بعد خوف ہو (غ)

بنی اسرائیل کو چونکہ اس وقت خاص مخالفت رسول اللہ صلعم سے تھی اس لیے ان کا خاص ذکر کیا کہ یہ اب آنحضرتؐ کے قتل کے درپے ہیں حالانکہ کسی کا قتل کرنا اس وقت جائز ہوتا ہے جب اس نے کوئی خون کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد پھیلائے۔ ان دونوں باتوں میں سے آنحضرت صلعم کی طرف کوئی بھی منسوب نہ ہو سکتی تھی اور شاید لفظ نفس میں اشارہ بلحاظ عظمت آنحضرت صلعم کی طرف ہو کہ ایسے عظیم معلّم نیکی اور مصلح کو جو شخص قتل کر دے تو اس نے گویا سب کو ہی قتل کر دیا اور جو شخص اس کے بچانے میں حصہ لیتا ہے اس نے گویا سبھی لوگوں کو بچایا۔ یوں عام معنی کے لحاظ سے بھی درست ہے۔ بیگناہ کو جیسا ایک کو قتل کیا ویسا سب کو کیا اور ایک کی زندگی بچائی تو سب ہی کی بچائی اور یہ اسی کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا تھا ولکم فی القصاص حیٰوۃ (البقرۃ ۲۔ ۱۷۹) گویا قصاص بھی احیائے نفس ہے کیونکہ اس سے ہلاکت سے نجات ملتی ہے اور یا احیاء سے مراد کسی نفس کا رحمت اور شفقت کرکے موت سے بچانا ہے۔

[۸۱۸] یحاربون۔ حرب کے معنی لڑائی ہیں۔ اور یہاں یحاربون سے مراد فی الواقع جنگ کرنے والی قومیں نہیں بلکہ مراد اس سے صرف معصیت ہے (ل) اور یہ اس کی مثل ہے جو سود خوار کے بارہ میں فرمایا فاذنوا بحرب من اللّٰہ ورسولہ (البقرۃ ۲۔ ۲۷۹) یا منافقوں کے ذکر میں آتا ہے وارصادا لمن حارب اللّٰہ ورسولہ (التوبۃ ۹۔ ۱۰۷) کہ دونوں صورتوں میں جنگ نہیں بلکہ مخالفت مراد ہے ینفوا من الارض۔ نفی کسی چیز کے الگ ہو جانے پر بولا جاتا ہے اور نُفِیتُ الرجلَ کے معنی ہیں میں نے اسے نکال دیا اور ینفوا من الارض کے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ ان کا خون ہدر ہوگا اور یہ بھی کہ ان کو ساری عمر کیلئے قید کر دیا جائے اور یہ بھی کہ ان کو جلاوطن کر دیا جائے (ل) اور امام ابوحنیفہ اور احمد کے نزدیک یہاں مراد حبس یعنی قید کرنا ہی ہے۔

فساد یا ڈاکہ کی سزا: اس آیت میں کن لوگوں کا ذکر ہے اور کیا سزا ہے۔ اوپر فرمایا تھا کہ قتل کی سزا صرف دو صورتوں میں دی جا سکتی ہے ایک یہ کہ قتل کرے۔ دوسرے یہ کہ فساد کرے۔ اس لیے یہاں یحاربون اللّٰہ ورسولہ سے مراد زمین میں فساد کرنے والے لیے گئے ہیں۔ اور بالخصوص ڈاکو جو جان سے مار کر یا جان سے مارنے کا خوف دیکر لوگوں کا مال لوٹتے ہیں اور گو ابن جریر نے بعض روایات ایسی بھی بیان کی ہیں کہ یہ آیات اہل کتاب کے بارہ میں نازل ہوئیں جنہوں نے نبی کریم صلعم سے بدعہدی کرکے فساد کیا، یا مشرکین کے بارہ میں۔ عرینہ کی سخت سزا کے وجوہات: مگر اکثر مفسرین نے اسے عرینہ کے بارہ میں لیا ہے جن کے چند آدمی آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے پھر بیمار ہو گئے تو نبی کریم صلعم نے انہیں وہاں بھیج دیا جہاں مدینہ سے باہر صدقہ کے اونٹ تھے۔ تاکہ دودھ پئیں اور علاج کریں۔ انہوں نے تندرست ہو کر چرواہوں کو مار ڈالا اور اونٹ لے گئے اور ابن جریر نے انس سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے ڈاکے بھی مارے اور عورتوں کی آبرو ریزی کی تو آپ نے ان کے ہاتھ اور پاؤں کٹوا دیئے اور ان کی آنکھیں نکلوا دیں اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ان کی آنکھیں اس لیے نکلوائیں کہ انہوں نے چرواہوں کی آنکھیں نکال دی تھیں (ث) اور پھر اسی حالت میں ان کو دھوپ میں ڈلوا دیا یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ کیونکہ ان کا جرم خطرناک تھا اور عبرت ناک سزا کو چاہتا تھا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ایسے لوگوں کی سزا خاص کر دی گئی۔ گو قصاص کے رنگ میں وہ زیادہ سزا کے مستحق بھی ہوں۔

ڈاکہ کی چار قسم کی سزا: لیکن شان نزول کچھ بھی ہو یہاں حکم عام ہے اور ان لوگوں کے بارہ میں ہی یہ حکم تسلیم کیا گیا ہے جو ڈاکے مار کر بدامنی پھیلاتے ہیں اور چار قسم کی سزا ان کے لیے تجویز کی گئی ہے۔ قتل، صلیب۔ ہاتھ پاؤں کا کاٹنا۔ قید۔ ظاہر ہے کہ چار قسم کی سزا جرم کی چار نوعیتوں کے لحاظ سے ہو سکتی ہے اور وہ نوعیتیں ڈاکہ کے جرم کی یہ ہیں کہ مال لینے کے ساتھ قتل بھی کریں۔ یا صرف قتل سے ڈرا کر مال لیں۔ پہلی صورت میں سزا قتل یا صلیب ہے دوسری میں ہاتھ پاؤں کاٹنا یا قید۔ گو بعض روایات میں یہ ہے کہ قید کی سزا اس صورت میں ہے جب صرف ڈراتے ہوں اور مال نہ لیا ہو۔ مگر بغیر مال لینے کے ڈرانا بے معنی ہے۔ پھر قتل کی صورت میں دو حالتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ بعض ڈاکو بہت وارداتیں کرکے ایک دھاک بٹھا دیتے ہیں یا قتل کے ساتھ اور جرائم کا بھی ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسوں کی سزا قتل کے ساتھ صلیب بھی ہے

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣٥﴾

سوائے اُن کے جو توبہ کر لیں اس سے پہلے کہ تم اُن پر قابو پالو سو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۸۱۹

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقوےٰ کرو، اور اس کا قرب چاہو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو ۸۲۰

تاکہ عبرت بھی ہو اور عام طور پر لوگوں کو پتہ بھی لگ جائے اور اسی طرح جب قتل نہ ہو اور مال لیا جائے تو بھی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی قسم کا نقصان جسمانی بھی پہنچایا جائے اور کسی جرم کا ارتکاب ہو تو اس صورت میں ہاتھ پاؤں کا کاٹنا ہے یا یہ کہ قتل کی حالت کی طرح بہت وارداتیں کی ہوں اور اس کے سوائے صرف قید کی سزا ہے۔ چونکہ ڈاکہ کا جرم ان چار قسم کا ہوسکتا ہے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ چار قسم کی الگ الگ سزا ان جرموں کی نوعیت پر ہے۔ یہ سچ ہے کہ سزا کا تقرر امام کے اختیار میں ہے مگر امام خود فساد اور جرم کی نوعیت پر سزا دیگا ماحصل ایک ہے اور ابن جریر نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی اسناد میں نظر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت انسؓ نے عبدالملک بن مروان کو لکھا تھا کہ عرینہ کا گروہ اسلام سے مرتد ہوگئے اور اونٹوں کو لے گئے اور رستوں پر ڈاکے مارنے شروع کیے اور عورتوں کی آبروریزی کی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرائیل نے کہا کہ جو شخص ڈاکہ مار کر مال لیتا ہے اس کا ہاتھ بوجہ مال لینے کے اور پاؤں بوجہ رستوں پر ڈرانے کے کاٹا جائے اور اگر قتل بھی کیا ہو تو اسے قتل کیا جائے اور اگر قتل کے ساتھ رستوں پر ڈراتا اور عورتوں کی آبروریزی کرتا ہے تو صلیب دیا جائے (مخالف اطراف سے ہاتھ پاؤں اس لیے کٹوائے کہ چل پھر بھی سکے)۔

۸۱۹ توبہ پر معافی سزا: یہ تعلیم صرف اسلام سے خاص ہے کہ جب سچے طور پر ایک شخص توبہ کر لے تو اسے معاف کر دیا جائے گو کتنا بھی بڑا جرم ہو اور سچی توبہ کے لیے یہ شرط رکھ دی کہ ان پر قابو نہ پایا ہو اور انہوں نے ایسے افعال سے رجوع کر کے دوسری طرز زندگی اختیار کر لی ہو۔ جب جرم کی حالت میں پکڑے جائیں تو توبہ بے معنی ہے اور اگر ایک شخص توبہ کر کے پھر ایسا ہی فعل کرے تو اس کے لیے سخت تر سزا بھی موجود ہے۔

۸۲۰ وسیلۃ کے معنی امام راغب نے رغبت کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچنا کیے ہیں۔ التَّوَصُّلُ الی الشئی برغبۃ۔ اور آگے لکھا ہے کہ یہ قربۃ کی طرح ہے اور واسل اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کرنے والا ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ وسیلۃ مرتبہ اور درجہ اور قربت کا نام ہے اور وَسَّلَ فلان الی اللہ وسیلۃ کے معنی ہیں ایسا عمل کیا جس کے ساتھ اس کا قرب حاصل کیا اور پھر لکھا ہے کہ وسیلۃ پہنچنے اور قرب کو کہتے ہیں اور حدیث میں دعائے اذان میں آتا ہے اٰتِ محمدن الوسیلۃ جہاں مراد ہے القرب من اللہ تعالیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب (ت) اور صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آنحضرت صلعم نے اذان کی دعا سکھا کر فرمایا کہ وسیلۃ جنت میں اعلیٰ ترین درجہ ہے پس یہی معنی یہاں مراد ہے۔

حصول قرب الٰہی: اصل ذکر اہل کتاب کا تھا جنہوں نے دین کو چھوڑ کر اپنی نظر کو صرف دنیا تک محدود کر دیا اور دین میں بجائے توحید کے شرک کے طریق کو اختیار کیا اور پچھلے رکوع کی آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو مسلمان کہلا کر ڈاکے مارتے اور زمین میں فساد پھیلاتے اور اللہ اور رسول کی کھلی مخالفت کرتے تھے اس لیے بتایا کہ مومن کا اصل کام کیا ہے۔ پہلے تقویٰ کی نصیحت فرمائی یعنی رعایت حقوق کی پس کسی کو بھی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانا چاہیئے۔ پھر فرمایا کہ دنیا کے مال پر بہت نہ گر جاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنے کی تڑپ اپنے اندر پیدا کرو کیونکہ یہی انسان کی زندگی کی اصل غرض ہے، مگر یہ غرض حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے لیے زور نہ لگایا جائے اس لیے تیسری نصیحت جہاد کے لیے کی تاکہ کامیاب ہو جاؤ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (العنکبوت ۲۹-۶۹) اگلی آیت میں کھلے طور پر بتا دیا ہے کہ یہ دنیا کا مال جس پر اہل کتاب گر گئے ہیں اور جس کی خاطر حق اور صداقت کو اور خدا کو چھوڑ دیا ہے یہ صرف اس دنیا کی زندگی میں کچھ کام دیتا ہے آخرت میں یہ کام نہ آئے گا پس اس آیت میں صرف یہ بتایا ہے کہ اپنی زندگی کی اصل غرض کو چھوڑ کر مال دنیا پر بہت نہ جھک جاؤ کہ جائز و ناجائز طریق سے اسے جمع کرنے لگو۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کی تڑپ اپنے اندر پیدا کرو یہی معنی وسیلہ کے ہیں۔ اور اسی معنی پر خود قرآن کریم کی بھی شہادت ہے اولٰئک الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلۃ (بنی اسرائیل ۱۷-۵۷) یعنی جن کو لوگ یہ سمجھ کر پکارتے ہیں کہ وہ ان کے مصائب دور کر دیں گے وہ خود قرب الٰہی کو چاہنے والے تھے اور انہوں نے کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا اور ابن جریر نے وابتغوا الیہ الوسیلۃ کے معنی اطلبوا القربۃ الیہ کیے ہیں یعنی اس کا قرب مانگو اور اس معنی پر عنترہ کا شعر پیش کیا ہے ان الرجال لھم الیک وسیلۃ۔ اور حسن سے اور مجاہد سے اور قتادہ سے اس کے معنی قرب ہی روایت کیے ہیں اور اور کوئی معنی نہیں دیئے دوسروں کو وسیلہ بنانا۔ اور اگر اس کے معنی ما یتوصل بہ یعنی پہنچنے کا ذریعہ بھی لیے جائیں تو بھی اس سے مراد صرف یہی ہے کہ ان راہوں پر چلو جن راہوں سے اللہ کی طرف پہنچ جاؤ یعنی اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے یہ معنی نکالنا کہ جو لوگ مر چکے ہیں ان کو ذریعہ بناؤ ایک نہایت لغو حرکت ہے۔ یوں تو نبی کریم صلعم نے خود حضرت عمرؓ سے کہا تھا لا تنسنا یا اخی من دعائك اے بھائی اپنی دعاؤں میں ہم کو بھول نہ جائیو۔ اس لیے کسی سے دعا کرانا کوئی شرک نہیں۔ مگر جو لوگ وفات پاچکے ہیں ان سے استمداد صریح شرک ہے حتیٰ کہ جو دعا نبی کریم صلعم کے روضہ مبارک پر کی جاتی ہے اس میں بھی لازمی ہے کہ منہ خانہ کعبہ کی طرف کیا جائے اور قبر دائیں یا بائیں رہ جائے۔ قبر کو سامنے رکھ کر دعا نہ کی جائے۔ بلکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تو اس کی طرف دعا کے وقت پیٹھ کی جائے۔ قرآن کریم میں اس پر نصوص صریح ہیں کہ دعا سوائے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ
جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ
عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣٦﴾

جو لوگ کافر ہوئے اگر جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب ان کا ہو اور اس کی مثل (اور بھی) اس کے ساتھ ہو کہ اس کے ساتھ قیامت کے دن کے عذاب کا فدیہ دیں ان سے قبول نہ کیا جائیگا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

يُرِيدُونَ أَن يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا
هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٧﴾

چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور اُن کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے ۸۲۱

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا
جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ
عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣٨﴾

اور چور مرد اور چور عورت سو اُن دونوں کے ہاتھ کاٹ دو (یہ) اس کی سزا ہے) جو انھوں نے کیا اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا اور اللہ غالب حکمت والا ہے ۸۲۲

اللہ تعالیٰ کے دوسرے سے جائز نہیں ان تدعوهم لا يسمعوا دعاءكم ولو سمعوا ما استجابوا لكم (فاطر ۳۵-۱۴) له دعوة الحق والذين يدعون من دونه لا يستجيبون لهم بشيء الا كباسط كفيه الى الماء (الرعد ۱۳-۱۴)

پس اس قدر صراحت کے ہوتے ہوئے بزرگانِ دین کو وسیلے کہ کر ان کے ذریعہ سے قضائے حاجات چاہنا یا ان کی قبروں پر جا کر دعائیں کرنا یا ان کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا یہ سب مشرکانہ افعال ہیں اور نیکوں یا بزرگوں کا توسل ان کی زندگی میں بذریعہ ان کی دعا کے ہے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ کا قول منقول ہے جب انھوں نے امساک باران کے موقع پر حضرت عباس کو دعا کے لیے آگے کیا اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ ہم رسول اللہ صلعم سے توسل کرتے تھے یعنی آپ سے دعا کراتے تھے تو تو ہم پر باران رحمت نازل فرماتا تھا اب ہم تیرے نبی کے چچا سے توسل کرتے ہیں یعنی دعا کے لیے ان کو آگے کرتے ہیں۔ پس تو ہم پر باران رحمت نازل فرما پس توسل بزرگوں کا صرف اسی حد تک جائز ہے کہ ان کی زندگی میں ان سے دعا کرائی جائے۔

۸۲۱ دوزخ سے نکلنا: بہشت اور دوزخ کے ذکر میں قرآن کریم میں یہ ایک بین فرق نظر آتا ہے کہ جہاں بہشت کا ذکر ہے وہاں فرمایا وما هم منها بمخرجين (الحجر ۱۵-۴۸) یعنی وہ وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ اور دوزخ کے ذکر میں ہے وما هم بخارجين منها جس کی تفسیر خود دوسری جگہ یوں کر دی ہے کلما ارادوا ان يخرجوا منها اعيدوا فيها (السجدۃ ۳۲-۲۰) یعنی جب نکلنا چاہیں گے تو اس سے نہیں نکل سکیں گے اور جو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکال دیگا جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں کیونکہ وہ اپنے ارادہ سے نہیں نکلیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے رحم کے جوش میں آنے سے نکالے جائیں گے

۸۲۲ پچھلے رکوع میں حفظِ جان و مال کی ضرورت یہود کے ذکر میں بتائی تھی۔ یہ آیت اسی کا تتمہ ہے درمیان میں صرف مسلمانوں کو کچھ نصیحت ہے۔ اور ڈاکوؤں کے ذکر کے بعد جو بالجبر مال لیتے ہیں چور کا ذکر کیا جو چھپ کر مال لیتا ہے۔

قطع ید سے مراد: اور اس کی سزا قطع ید یعنی ہاتھ کا کاٹنا قرار دی ہے۔ ہاتھ کے کاٹنے سے مجازاً ہاتھ کا روکنا بھی مراد ہو سکتا ہے جیسے تقطعون السبيل میں رستے کے قطع کرنے سے مراد راستہ سے مسافروں کو روکنا ہے ایسا ہی قطع رحم بھی مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے اور قَطَعَ لِسَانَهٗ کے معنی ہیں اسے خاموش کر دیا۔ حدیث میں ہے کہ ایک شاعر نے شعر سنائے تو آپ نے فرمایا اِقْطَعُوا عَنِّیْ لِسَانَهٗ یعنی اسے کچھ دیکر خاموش کر دو (ل) پس قطع ید سے مراد بھی مجازاً ہاتھوں کا روکنا ہو سکتا ہے اور ظاہر معنی کو لیکر امام شافعی کے نزدیک دینار کا چوتھا حصہ نصاب ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دس درہم۔ بعض کے نزدیک پانچ درہم یعنی اس سے کم مال کی چوری ہو تو قطع ید نہیں۔ مگر قرین قیاس ہے کہ ہاتھ کاٹنا چور کی انتہائی سزا ہے۔ اور امام کو اختیار ہے کہ اس سے کم سزا دے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی جو ڈاکوؤں کی سزا بتائی ہے اس میں امام کے اختیار کو بڑا وسیع کیا ہے قتل و صلیب سے لیکر قید محض تک جو سزا چاہے دے۔ اور جب یہ آیتیں ایک دوسرے کے حکم کی تکمیل کرتی ہیں تو ماننا پڑے گا کہ جس طرح وہاں انتہائی سزا قتل ہے یہاں صرف انتہائی سزا قطع ید بتا دی ہے صحابہ کے عمل سے اس معنی پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ ڈاکو کو جو بجبر مال لیتا ہے جب قید کی سزا دینا جائز ہے تو چور کو کیوں نہیں۔ پھر ہاتھ پاؤں کا کاٹنا ڈاکو کی سزا بھی ہے۔ جیسے ہاتھ کا کاٹنا چور کی پھر ڈاکو کی سزا قتل و صلیب ہے جو چور کے لیے نہیں۔ اور یہ ڈاکو کی انتہائی سزا ہے اس سے نیچے اُتر کر ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا ہے جو چور کی انتہائی سزا قرار دی ہے اور اس سے اُتر کر قید کی سزا ہے جو ڈاکو کو دی جا سکتی ہے تو لازماً چور کو بھی دی جا سکتی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور بات یہاں قابلِ غور ہے۔ اُبَیّ کی قرأت میں بجائے سارق کے سَرّاق اور سارقۃ کے سَرّاقۃ ہے جو مبالغہ کے صیغے ہیں پس قرین قیاس یہ ہے کہ عادی چور کے لیے یہ سزا لازمی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ توبہ کی گنجائش بھی رکھی ہے ورنہ اگر پہلی چوری پر ہی سزائے قطع ید ہو تو توبہ کا کیا فائدہ۔ جب توبہ کی صورت

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٩﴾

پھر جو شخص اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو اللہ اس پر (رحمت سے) توجہ کریگا اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤٠﴾

کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کے لیے ہی ہے جسے چاہے عذاب دے اور جسے چاہے بخش دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰۤـئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ ۖۚ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٤١﴾

معٓ الوقف علی الاول اجوز

اے رسول وہ لوگ تجھے غمناک نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں ان میں سے جو اپنے مونہوں سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل ایمان نہیں لائے اور اُن میں سے یہودی ہیں وہ جھوٹ بولنے کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں ایک اور گروہ کی جاسوسی کرنیوالے جو تیرے پاس نہیں آیا، باتوں کو ان کی جگہ (جاننے) کے بعد بدلتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر تم کو یہ دیا جائے تو اُسے لیلو اور اگر یہ نہ دیا جائے تو بچو۔ اور جس کے دُکھ میں پڑا رہنے کا اللہ ارادہ کرلے تو اللہ کے سامنے تو اس کے لیے کچھ اختیار نہیں رکھتا یہی وہ ہیں کہ اللہ نے ارادہ نہیں کیا کہ اُن کے دلوں کو پاک کرے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے[۸۲۳]

میں ڈاکو کو بھی رعایت دی ہے تو چور کو رعایت کیوں نہ ملنی چاہیئے پس عادی چور کی لازمی سزا قطع ید ہے۔ اور معمولی چور کی انتہائی سزا۔ اور یوں امام کو قید کا اختیار ہے۔ قطع ید کو عبرتناک سزا قرار دینا بھی بتاتا ہے کہ یہ محض انتہائی سزا ہے اور سزا کے دینے میں امام حالات وقتی وملکی یا حالات قومی کو بھی مدنظر رکھ سکتا ہے اس لیے بعض حالات میں بلحاظ حالات قومی یا ملکی پہلی چوری پر بھی قطع ید کی سزا دیجا سکتی ہے۔ اس زمانہ میں اگر حالات وقتی کے لحاظ سے عادی چور کی سزا قطع ید ہو اور اس سے ادھر سزائے قید تو ہرج نہیں اور دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ عادی چور کی سزا سوائے ہاتھ کاٹنے کے اور کوئی مفید نہیں ہوسکتی۔ اگر غرض اصلاح ہو تو لمبی قیدیں ایسے حالات میں سوائے اخلاقی حالت پر بُرا اثر ڈالنے کے اور کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں اور ہاتھ کاٹنے سے نہ صرف جرم رک جاتا ہے بلکہ اصلاح کی بھی یہی ایک صورت ہے۔

ع۸۲۳ سمّٰعون للکذب کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ ایک جھوٹ قبول کرنے والے۔ کیونکہ سمع کے معنی قبول کرنا بھی آتے ہیں۔ دوسرے جھوٹ بولنے کی خاطر باتیں سننے والے۔ ایسا ہی سمّٰعون لقوم اٰخرین کے معنی بھی دو طرح ہو سکتے ہیں ایک اور قوم کی باتیں قبول کرنے والے یا ایک اور قوم کی خاطر باتیں سننے والے۔

یہاں پھر کلام کو اصل موضوع کی طرف پھیرا ہے اور یہودیوں کے ساتھ منافقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ منافقوں کی طرح یہودیوں کا ایک گروہ منافقانہ روش اختیار کیے ہوئے تھا ان کا ذکر ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو قبول نہیں کرتے، بلکہ مانتے اپنے سرداروں کی بات کو ہی ہیں۔ اور جو کچھ وہ کہدیتے ہیں اس کو پلّے باندھا ہوا ہے جس حد تک انہوں نے بات کو ماننے کو کہا مان لی اس سے آگے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخری فیصلے یہ لوگ رسول اللہ صلعم سے کراتے تھے۔ اور یہ اس معاہدہ کے مطابق تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری پر ہوا تھا۔ ایسے حالات میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان کے فیصلے توریت کے مطابق کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک زانی اور زانیہ یہودی آپ کے سامنے لائے گئے تو آپ نے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور یہی حکم توریت میں تھا۔ مگر جب ان سے دریافت کیا گیا کہ تمہاری کتاب میں کیا حکم ہے تو کہا کہ ان کے منہ کالے کیے جائیں اور انہیں ذلیل کیا جائے۔ تب بعض علمائے یہود سے توریت منگوا کر پڑھوائی گئی تو انہوں نے اس کو قبول کیا کہ زنا کی سزا اصل میں رجم ہے۔ حضرت مسیح کے وقت تک اس حکم کا توریت میں موجود ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ یوحنا ۸: ۴ و ۵ میں ہے کہ فریسیوں نے کہا

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ
فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ
عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ
شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ
بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾
وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ
فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ ع
اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ
يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا
لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ

جھوٹ کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں حرام کھانے والے ہیں
سو اگر تیرے پاس آئیں تو اُن کے درمیان فیصلہ کر یا ان سے منہ پھیرلے
اور اگر تو اُن سے منہ پھیرلے تو تیرا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے
اور اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر
اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۸۲۴
اور کیوں کر تجھے فیصلہ کرنے والا ٹھیراتے ہیں اور انکے پاس توریت ہے
اس میں اللہ کا فیصلہ ہے پھر اس کے بعد پھر جاتے ہیں
اور یہ مومن نہیں ۸۲۵
ہمیں نے توریت اتاری اس میں ہدایت اور روشنی ہے ۸۲۶ اس
کے مطابق نبی جو فرمانبردار تھے یہودیوں کے لیے فیصلے کرتے
تھے اور مشائخ اور علماء اس لیے کہ اللہ کی کتاب

آسے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی۔ موسٰی نے تو توریت میں ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسوں کو سنگسار کریں پر تو کیا کہتا ہے"۔ حالانکہ موجودہ توریت میں رجم نہیں اس سے تحریف توریت کا فیصلہ ہوتا ہے۔

ایسے ایسے اور واقعات بھی پیش آتے تھے جس طرح پر علماء عام لوگوں کو کہہ دیتے تھے اسی حد تک وہ قبول کرتے اس لیے اگلی آیت میں حکم دیا ہے کہ ان حالات میں چاہو تو فیصلہ سے انکار کردو۔

اس جگہ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یا محمد یا یا احمد کہہ کر قرآن شریف میں کہیں خطاب نہیں کیا گیا حالانکہ دیگر انبیاءؑ ورسل کو نام سے خطاب ہوا ہے جیسے یا اٰدم۔ یا موسٰی۔ یا عیسٰی۔ یا داؤد۔ یا ابراھیم۔ یا نوح آنحضرت صلعم کو خطاب یاایھا الرسول یا یاایھا النبی سے کیا ہے یعنی النبی یا الرسول کے نام سے اس کی وجہ گو آپ کی تشریف بھی ہو مگر اصل حکمت یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی اور رسول ہونے والا نہ تھا۔ اس لیے النبی اور الرسول کہہ کر خطاب کیا ہے اور دوسرے چونکہ کمالات نبوت آپ میں جمع ہوئے اس لیے بھی دوسرا کوئی نبی اس کا مستحق نہ تھا کہ اسے النبی اور الرسول کہہ کر خطاب کیا جاتا۔

۸۲۴ سحت میں اصل میں بیخکنی کرنے یا کچل ڈالنے کا خیال پایا جاتا ہے جیسے فیسحتکم لعذاب (طٰہٰ ۲۰-۶۱) اور سحت اس حرام مال کو کہتے ہیں جو کمانے والے کے لیے موجب عار ہو کیونکہ وہ دین کا استیصال کرتا ہے۔ رشوت کو بھی سحت کہا جاتا ہے (غ) باوجود ان کی سب شرارتوں کے پھر بھی آنحضرت صلعم کو حکم یہی ہے کہ جب فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو کیسے اعلیٰ اخلاق پر آپ کو کھڑا کیا گیا۔

۸۲۵ یہودیوں کا توریت کے فیصلوں کو قبول نہ کرنا: اسلام میں بہت سی باتوں میں بمقابلہ توریت سہولت اور نرمی تھی اس لیے یہودی سہل فیصلہ کی خاطر رسول اللہ صلعم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ یہودی رہ کر پھر رسول اللہ صلعم کو کس طرح حکم بنا سکتے ہیں۔ ان کے لیے توریت میں خدائی فیصلہ موجود ہے اگر اسی کو شریعت حقہ سمجھتے ہیں اور اسلام کو قبول نہیں کرتے تو پھر اس پر فیصلہ کریں۔ یہ کیا کہ مذہب تو یہود کا رکھیں اور فیصلہ یہودی شریعت کا قبول نہ کریں، ما اولٰئک بالمؤمنین میں یہی اشارہ ہے کہ ان کا ایمان نہ توریت پر ہے نہ یہ قرآن شریف کو مانتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا ایک قول منقول ہے کہ اگر میرے لیے حکومت ہو تو اہل توریت کو توریت کے مطابق فتویٰ دوں اور اہل انجیل کو انجیل کے مطابق (دیکھو روح المعانی) فاحکم بینھم بالقسط کے نیچے کس قدر فرق ہے کہ قرآن کریم اہل توریت کے فیصلے توریت کے مطابق اور اہل انجیل کے فیصلے انجیل کے مطابق کرتا ہے تو وہ لوگ ماننے کو تیار نہیں۔ اور مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کے فیصلے قرآن کریم کے مطابق ہوں تو انہیں میسر نہیں آتا

۸۲۶ پچھلے رکوع میں ان کے تنازعات باہمی کا ذکر تھا جو توریت کے مطابق نبی کریم صلعم کردیتے تھے۔ اس رکوع میں باہمی تنازعات سے اسلام کے ساتھ ان کے اختلافات کی طرف رجوع کیا بلکہ کل مذاہب کے اسلام سے اختلافات کا ذکر کرکے یہ بتایا ہے کہ ان اختلافوں کا فیصلہ کرنے کے لیے قرآن نازل ہوا ہے۔ توریت ہدایت اور روشنی کو لیے ہوئے نازل ہوئی تحریف سے اس ہدایت اور نور کا کچھ حصہ ضائع کردیا گیا، لیکن بلاشبہ اب بھی اس میں ہدایت اور نور موجود ہے۔ چونکہ اس رکوع میں اصل غرض ان کو قرآن شریف پر ایمان کی طرف بلانا ہے جسے سب کتب سابقہ کا محافظ قرار دیا گیا ہے (دیکھو آیت ۴۸) اس لیے

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

کی حفاظت کرنے کو انھیں کہا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے ۸۲۸ سو لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو۔ اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا، تو وہی کافر ہیں ۸۲۸

یہاں ھدی و نور میں بھی اشارہ ان پیشگوئیوں کی طرف ہے جو رسول اللہ صلعم کے ظہور کے متعلق ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

۸۲۷ النبیون الذین اسلموا۔ تمام نبی خدا کے کامل فرمانبردار تھے۔ اس لیے ان سب کو مسلم کہا ہے۔ یہاں مراد وہ خاص نبی ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے جیسا کہ آیت ۴۶ سے ظاہر ہے۔

احبار۔ حِبر یا حَبر کی جمع ہے اور حِبر کے معنی سیاہی ہیں (ل)، یا اثر مستحسن یعنی خوبصورت نقش (غ) فی روضۃ یحبرون (الروم ۳۰-۱۵) یعنی خوش ہوں گے یہاں تک کہ اس کی نعمتوں کا اثر ان پر ظاہر ہوگا اور تحبیر کے معنی خوبصورت بنانا ہیں۔ اسی سے حِبر بمعنی عالم ہے حسن کا قول ہے کہ ربانی سے مراد علمائے انجیل اور احبار سے مراد علمائے توریت ہیں۔

حفاظت توریت: استحفظوا۔ اِستحفظتہٗ کے معنی ہیں میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ اسے نگہ میں رکھے یا اس کی حفاظت کرے (ل)، اس لفظ کو اختیار کرکے بتایا کہ توریت کی حفاظت ہم نے قرآن کی طرح اپنے ذمہ نہ لی تھی۔ انا لہ لحافظون (الحجر ۱۵-۹) بلکہ مشائخ اور علمائے یہود کو کہا تھا کہ اس کی حفاظت کریں۔ الٰہی حفاظت اور انسان کی حفاظت میں یہ فرق ہے کہ توریت میں تحریف ہوگئی مگر قرآن محفوظ رہا۔

اس حصہ میں یہ بتایا کہ توریت کو ہم نے کس قدر عظمت دی تھی کہ اسی کے مطابق انبیاء بھی فیصلے کرتے تھے اور علماء اور مشائخ بھی یعنی یہود کے فیصلے اسی شریعت پر ہوتے تھے کیونکہ وہی بنی اسرائیل میں بطور رہنما دکے تھی۔ غرض یہ ہے کہ اس توریت کو اب تم کس طرح پس پشت پھینک رہے ہو اور اس کی پیشگوئیوں کی پروا نہیں کرتے کیا اس لیے کہ ان سے نبی کریم صلعم کی صداقت ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ آیت کے آخری حصہ کے الفاظ میں صاف یہ اشارہ موجود ہے۔

کیا ان الفاظ سے توریت کا غیر محرف ہونا یا محفوظ رہنا ثابت ہوتا ہے؟ یہ عیسائیوں کا دعویٰ ہے مگر تعجب ہے کہ جب قرآن کریم صاف الفاظ میں توریت کی تحریف کا ذکر چکا ہے یحرفون الکلم من بعد مواضعہ (۴۱) اور متعدد موقعوں پر تحریف کا ذکر ہے، بلکہ یہ بھی صاف الفاظ میں ذکر ہے کہ اپنے ہاتھ سے عبارتیں لکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے (البقرۃ ۲-۷۹) اور آج توریت کی تحریف خود عیسائیوں کے نزدیک ایک مسلم امر ہے، تو پھر قرآن کریم کے دوسرے موقعوں کے خلاف اور واقعات کے خلاف الفاظ کے معنی کیونکر کیسے جا سکتے ہیں۔ الفاظ قرآنی میں تو صرف اس قدر ہے کہ مشائخ اور علما کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ کتاب اللہ کی حفاظت کریں، مگر یہ کہیں ذکر نہیں کہ انہوں نے فی الواقعہ حفاظت بھی کی، بلکہ ان الفاظ سے تو صاف مترشح ہوتا ہے کہ توریت میں تحریف بھی ہوئی۔ کیونکہ اس کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہ لیا بلکہ انسانوں کو کہا کہ حفاظت کریں۔ اس سے محفوظ ہونے کا نتیجہ نکالنا ایسا ہی ہے جیسا یہ خیال کر لیا جائے کہ یہودیوں نے کبھی شرک نہیں کیا، نہ چوری کی، نہ خونِ ناحق کیا، اس لیے کہ ان کو حکم تھا کہ شرک نہ کرنا، چوری نہ کرنا وغیرہ۔ ہاں وہ حصہ جو تعامل میں آگیا وہ محفوظ ہو گیا کیونکہ اس کے مطابق فیصلے ہوتے تھے اور پیشگوئیاں بھی ایک حد تک محفوظ رہیں اس لیے کہ ان میں قوم کے لیے ایک حالتِ منتظرہ باقی تھی اور وہ عام طور پر شہرت پا گئی تھیں۔

ایک اور سوال یہ ہوا ہے کہ جب انبیائے بنی اسرائیل بھی توریت کے مطابق ہی فیصلے کرتے تھے تو معلوم ہوا کہ ان کو کوئی الگ کتابیں نہیں دی گئیں اور نہ اس شریعت میں کسی قسم کی کمی بیشی تغیر و تبدل ہوا۔ یہ دونوں نتائج غلط ہیں۔ الگ کتابیں ان انبیاء کو ملنے کا صریح ثبوت تو آیت ۴۶ سے ملتا ہے جہاں انہی میں سے ایک یعنی مسیح کو انجیل دینے کا ذکر ہے اور ایسا ہی داؤد کو زبور دینے کا ذکر ہے۔ اور پھر سب انبیاء کو کتابیں دینے کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے فان کذبوک فقد کذب رسل من قبلک جاءو با لبینٰت والزبر والکتاب المنیر (اٰل عمران ۳-۱۸۴) جہاں ذکر بنی اسرائیل کے رسولوں کا ہے جیسا کہ اس آیت کے سیاق سے ظاہر ہے، جس سے معلوم ہوا کہ وہ سب زبوریں لائے تھے اور یہ کتابیں آج تک توریت کے ساتھ ملحق ہو کر بائبل کا جزو بنی ہوئی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ توریت میں بیشک ایک شریعت بنی اسرائیل کو دی گئی مگر وقتاً فوقتاً جو انبیاء ظاہر ہوتے رہے وہ اس شریعت کی تکمیل کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی جو کچھ توریت میں تھا اس کے مطابق فیصلے بھی کرتے رہے۔ یہ دونوں امر ایک دوسرے کے نقیض نہیں۔ کیونکہ وقتی ضرورتوں کے مطابق تغیر و تبدل اصل شریعت کو باطل نہیں کرتا جس طرح باوجود تحریف ہو جانے کے فیصلے اس کے مطابق ہوتے تھے۔ اور یہ فرما کر "کہ انجیل میں ہدایت و نور ہے" (آیت ۴۶) جس طرح توریت میں ہدایت و نور تھا یہ بھی بتلایا کہ توریت وانجیل کی نوعیت ایک ہے ایسا ہی ان جملہ کتب کی جو دیگر انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئیں۔ مگر ایسی کسی کتاب کا قرآن کریم کے بعد آنا محالات سے ہے اور آیت اکملت لکم دینکم کے خلاف، اسی لیے قرآن کریم کے بعد کوئی نبی نہیں، کیونکہ جس طرح توریت کے ہوتے ہوئے بنی اسرائیل کو مزید ہدایت و نور کی ضرورت تھی اس طرح قرآن کریم کے بعد کسی ہدایت و نور کی ضرورت نہیں، اور نبیوں کی بجائے اصلاح کے لیے مجددین کی ضرورت ہے، نیز دیکھو ع ۸۳۰۔

۸۲۸ ان الفاظ میں صاف ان علمائے یہود کو ملزم کیا ہے جنھوں نے دنیا کی ریاست کو مدنظر رکھ کر حق کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، پہلے توریت میں ہدایت اور نور کی

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٤٥﴾

اور ہم نے اُس میں اُن پر یہ فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، اور آنکھ کے بدلے آنکھ، اور ناک کے بدلے ناک، اور کان کے بدلے کان، اور دانت کے بدلے دانت، اور زخموں میں بدلہ ہے۔ پھر جو شخص اُسے معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی ظالم ہیں ۸۲۹۔

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ﴿٤٦﴾

اور ہم نے ان کے قدموں پر عیسٰےؑ ابن مریم کو ان کے پیچھے بھیجا اس کی تصدیق کرتا ہُوا جو اس سے پہلے توریت میں سے تھا اور ہم نے اس کو انجیل دی، اس میں ہدایت اور نُور ہے اور اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے توریت میں سے تھا اور متقیوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے ۸۳۰۔

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ

اور (ہم نے کہا تھا) کہ انجیل کے پیرو اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اتارا اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ

طرف توجہ دلائی، تو اب بتایا کہ چند روزہ دنیوی زندگی کے فائدہ کے لیے اور لوگوں سے ڈر کر ان باتوں کو پس پشت نہ ڈالو اور اگر ان پیشگوئیوں کے مطابق فیصلہ کر کے حق کو قبول نہیں کرتے تو پھر تم کافر ہو۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں یہ مضمون نہایت صفائی سے موجود ہے وامنوا بما انزلت مصدقا لما معکم ولا تکونوا اول کافر به ولا تشتروا بایتی ثمنا قلیلا وایای فاتقون (البقرۃ ۵-۴۱) یا بما انزل اللہ سے مراد یہاں اور آیت ۴۵ و ۴۷ میں قرآن شریف ہے یعنی جو اب اللہ نے اتارا ہے اب اس پر عملدرآمد ضروری ہے اور یہ پچھلی آیت کے خلاف نہیں کیونکہ اس میں اسلام کی دعوت دی ہے کہ قرآن کریم کے کل فیصلوں کو صحیح تسلیم کریں۔ اور قرآن کریم کو مذہبی اختلافات میں حکم اور مہیمن قرار دیا ہے اور پچھلی آیت میں ان کے باہمی تنازعات میں توریت کے مطابق فیصلہ کرنے کا ذکر تھا۔

ع ۸۲۹ جان کے بدلے جان کا حکم تو قرآن شریف میں بیان فرما دیا ہے کتب علیکم القصاص فی القتلی (البقرۃ ۲۲-۱۷۸) لیکن زخموں میں قصاص یا دانت کا بدلہ دانت وغیرہ کا حکم قرآن شریف میں نہیں پایا جاتا، صرف توریت میں ہے اور ان احکام کا ذکر یہاں اس لیے کیا ہے کہ یہ شریعت موسوی کی بنیاد کے طور پر تھے اور یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ ہدایت و نور صرف پیشگوئیوں کا نام نہیں۔ آخری الفاظ میں پچھلی آیت کے آخری الفاظ کا اعادہ ہے۔ سوائے اس کے کہ وہاں نہ قبول کرنے والوں کو کافر کہا ہے اور یہاں ظالم۔ کافر اس لحاظ سے کہ وہ منکر ہوئے، ظالم اس لحاظ سے کہ ان پیشگوئیوں کو دوسری جگہ لگاتے ہیں اور ظلم وضع الشئ فی غیر محلہ کا نام ہے۔

ع ۸۳۰ حضرت عیسٰےؑ کا ذکر اس لیے علیحدہ کیا کہ وہ اس موسوی سلسلہ کے خاتم تھے، لیکن یہ صاف بتا دیا کہ حضرت عیسٰےؑ پہلے انبیائے اسرائیل کے نقش قدم پر آئے۔ اس لیے شریعت موسوی میں جو مقام ان انبیاء کا تھا وہی مقام حضرت عیسٰیؑ کا تھا پس حضرت عیسٰیؑ کو انجیل دینے کے یہ معنی ہوئے کہ ان پہلے انبیاء کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے وقت میں کتابیں دی تھیں چنانچہ دوسری جگہ ان انبیاء کا بیّنات اور زبر اور کتاب منیر کے ساتھ آنا صاف لکھا ہے (آل عمران ۲۰-۱۸۳)

اور یہ جو فرمایا کہ انجیل کو بھی ہدایت اور نور لیے ہوئے اتارا تو مطلب یہ ہے کہ یہ بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے جیسے توریت، کیونکہ جس طرح وہ ایک نبی کی وحی ہے انجیل بھی ایک نبی کی وحی ہے اور ہر ایک نبی کے لیے چونکہ یہ ضروری ہے کہ وہ ہدایت لائے، اس لیے انجیل کے ذکر میں وہی لفظ بڑھا دیئے جو توریت کے ذکر میں تھے اور بتا دیا کہ انجیل صرف پیشگوئیوں کا نام نہیں بلکہ پیشگوئیوں کے نور کے علاوہ اس میں بھی ہدایت موجود ہے۔ پھر فرمایا کہ وہ متقیوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی یعنی اس میں ہدایت کی کچھ تفصیلات اور وعظ و نصیحت کی طرز بھی اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔

اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾
وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا
لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ الْکِتٰبِ وَ مُھَیْمِنًا
عَلَیْہِ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَ لَا
تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ ؕ
لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّ مِنْھَاجًا ؕ
وَ لَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً

کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی نافرمان ہیں [۸۳۱]
اور ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری اس
کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے کتاب میں سے ہے اور اُس [۸۳۲]
نگہبان ۔ سو اُن کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ
نے اتارا اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا۔ اُن
کی خواہشوں کی پیروی نہ کر [۸۳۳] ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک
شریعت اور طریق مقرر کیا [۸۳۴] اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی گروہ بنا دیتا

[۸۳۱] ولیحکم یا تو بطور حکایت ہے یعنی ہم نے اہل انجیل کو انجیل دیکر یہ کہا تھا کہ جو کچھ اس میں اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں یا رسول اللہ کے زمانہ کے نصاریٰ مخاطب ہیں کہ آخر اس انجیل میں آنحضرت صلعم کی صداقت کی پیشگوئیاں ہیں پھر ان کو کیوں رد کرتے ہو اور رسول اللہ صلعم کی صداقت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے۔

آیت کے آخر پر پھر انہی الفاظ کا اعادہ ہے مگر یہاں کافرون اور ظالمون کی بجائے فاسقون لکھا ہے، یعنی ایسے لوگ نافرمان ہیں۔ اس لیے کہ حضرت مسیح نے فارقلیط کے متعلق کھلی پیشگوئی کی تھی کہ میرے بعد وہ آئے گا اور ان کو حکم تھا کہ آپ کی تصدیق کریں۔ پس حکم کی نافرمانی کے لحاظ سے وہ فاسق کہلائے۔ کافر ظالم فاسق انہی لوگوں کو کہا گیا ہے۔ کافر انکار کے لحاظ سے، ظالم پیشگوئیوں کو دوسری جگہ لگانے کی وجہ سے، فاسق حکم کی نافرمانی کی وجہ سے۔

گو اوپر کی آیات میں اہل کتاب مخاطب ہیں، لیکن تینوں آیتوں کے آخر میں یہ لفظ لا کر کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کافر ہیں، ظالم ہیں، فاسق ہیں، مسلمانوں کو بھی سمجھایا ہے کہ اگر وہ قرآن کے مطابق اپنا عملدرآمد نہ رکھیں گے تو وہ بھی اسی حکم میں ہیں۔ چنانچہ ابن جریر نے ان روایات کو بیان کیا ہے جن کی رو سے یہ آیات مسلمانوں کے حق میں بھی ثابت ہوتی ہیں، البتہ کفر سے مراد کفر دون کفر لیا ہے، اور ایسا ہی ظلم اور فسق سے۔ چنانچہ وہیں ابن عباسؓ کا قول منقول ہے لیس کمن کفر باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ یعنی یہ کفر ایسا کفر نہیں جیسے اللہ کا انکار اور فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں کا۔

[۸۳۲] الکتاب پہلی کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور دوسری کتاب سے کل کتب سابقہ۔ گویا الکتاب وہاں جنس کے طور پر ہے۔

مھیمن بعض کے نزدیک ھیمن اس کا اصل ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر نگہبان ہونا، اس لیے اس کے معنی محافظ ہیں اور بعض کے نزدیک مادہ امن ہے اور مھیمن کے معنی امین ہیں (ل) پہلی کتابوں پر محافظ یا امین ہونے سے ایک ہی مراد ہے کہ ان کی ضروری اور صحیح تعلیم کو محفوظ کر لیا ہے۔

قرآن کتب سابقہ کا مصدق بھی ہے اور محافظ بھی: توریت و انجیل کا ذکر کرنے کے بعد اب قرآن شریف کے نزول کا ذکر فرماتا ہے اور اس کی دو شانوں کا بیان کیا ہے۔ یعنی ایک تو وہ پہلی کتابوں کا مصدق ہے یعنی ان کا منجانب اللہ ہونا مانتا ہے اور ان کی پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کو سچا ٹھہراتا ہے اور دوسرے وہ ساری کتب سابقہ کا محافظ ہے یعنی ان کی اصلی تعلیم کی حفاظت کرتا ہے اور جو ان میں تحریف ہوئی تھی اس کو غلط ٹھہراتا ہے اور یوں ان کے اختلافات کا بھی فیصلہ کرتا ہے۔ انجیل کو بھی توریت کا مصدق کہا ہے مگر اس پر مھیمن قرار نہیں دیا۔ لیکن قرآن کو کل کتب سابقہ پر مھیمن قرار دیا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے بھی توریت و انجیل وغیرہا کی تحریف کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ قرآن کریم میں تحریف نہ ہوگی اور مھیمن کہہ کر شرائع سابقہ کے منسوخ ہونے کا فیصلہ بھی کر دیا ہے کیونکہ اب وہی تعلیم دنیا میں رہے گی جس نے پہلی صحیح تعلیموں کی جن کی ضرورت نسل انسانی کو ہمیشہ کیلئے تھی حفاظت کر کے اپنے اندر لے لیا اور توریت و انجیل کے ذکر کے بعد قرآن کو مھیمن کہنے کے صاف معنی ہیں کہ انجیل میں بھی کوئی تعلیم ہے جو توریت کی طرح محفوظ رکھی جانے کے قابل ہے۔

[۸۳۳] جب قرآن کریم کے مھیمن یعنی کتب سابقہ کے ناسخ ہونے اور ان کی صحیح تعلیم کے محافظ ہونے کا ذکر کیا تو اب فرمایا کہ مختلف مذاہب میں صحیح فیصلے اب قرآن شریف ہی کرے گا۔ اس لیے تم اسی کے مطابق ان کے اختلافات کا فیصلہ کرو اس بات پر کہ یہاں ذکر مقدمات کا نہیں بلکہ اختلافات مذہبی کا ہے یہ قطعی شہادت ہے کہ اس کے بعد فوراً یہ ذکر ہے کہ ہم نے تم میں سب کے لیے یعنی مختلف قوموں کے لیے ایک شریعت اور ایک طریق مقرر کر دیا تھا اور پھر آیت کے آخر پر صاف فرما دیا کہ جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم کو ان کی خبر دے گا۔ اور یہ اختلافات مذہبی ہی ہیں نہ مقدمات۔ اور یہاں خطاب بھی صرف یہود سے نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ دونوں قوموں سے تو کھلا خطاب ہے اور ضمناً سب قومیں آ گئیں۔ کیونکہ قرآن شریف کو مھیمن صرف توریت و انجیل پر نہیں کہا بلکہ مابین یدیہ من الکتاب پر یعنی جتنی کتب پہلے نازل ہوئیں سب پر، پس سب قوموں کے مذہبی اختلافات کا ذکر ہے جن کا فیصلہ قرآن شریف کرتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ صاف فرمایا وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ (النحل ۶۴) اور ہم نے تیری طرف کتاب نازل نہیں کی مگر اس لیے کہ جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں تو ان کو کھول کر بیان کرے۔ اس فقرہ میں کہ "ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر" بھی یہی اشارہ ہے۔

[۸۳۴] شرعۃ۔ منہاج۔ نہج طریق واضح یعنی کھلے رستہ کو کہتے ہیں، اور اسی سے منہاج ہے۔ اور شرع طریق واضح پر چلنا ہے، اور کھلے رستہ کو بھی شرع اور

وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

لیکن (وہ چاہتا ہے) کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہارے جوہر پرکھے سو نیکیوں کو آگے بڑھ کر لو[۸۳۵] تم سب کو اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے پس جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے وہ تمہیں بتا دیگا[۸۳۶] اور کہ ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو، جو اللہ نے اتارا اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر اور ان سے احتیاط کرتے رہو مبادا بعض ان باتوں سے ہٹا کر تجھے دکھ میں ڈال دیں جو اللہ نے تیری طرف اتاریں پھر اگر وہ گروہ پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے ان پر مصیبت ڈالے۔ اور بہت سے لوگ بلاشبہ نافرمان ہیں[۸۳۷]

شریعۃ کہا جاتا ہے، اور طریقہ الٰہیہ پر یعنی جو رستہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بتایا ہے اس پر بطور استعارہ بولا جاتا ہے (غ) امام راغب کہتے ہیں کہ ان دو لفظوں کے اختیار کرنے میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک راہ پر چلنے کے لیے مسخر کیا ہے جس کا تعلق مصالح عباد اور عمارت بلاد سے ہے، اور دوسرا وہ جس کا انسان اختیار سے قصد کرتا ہے جس میں شرائع کا اختلاف ہے یعنی جو دین اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ شِرْعَۃ وہ ہے جو قرآن شریف نے بتایا اور منہاج وہ جو سنت نے بتایا۔ اور ابن جریر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے یعنی سبیل اور سنت اور سنتیں مختلف ہیں۔ ایک شریعت تورات کی ہے، ایک شریعت انجیل کی، ایک شریعت قرآن کی، اس میں اللہ جو چاہتا ہے حلال کرتا ہے جو چاہتا ہے حرام کرتا ہے اور دین ایک ہی ہے یعنی توحید اور اخلاص۔ اور حضرت ابن عباسؓ کا قول ہی اس بارہ میں اصول محکم ہے اس لیے کہ یہاں دین اور طریق کا ذکر ہے۔ اور باتیں دو ہی ہیں جو نبی کے آنے سے تعلق رکھتی ہیں ایک وہ شریعت یا رستہ جو اس کی کتاب بتاتی ہے دوسرا وہ منہاج یا رستہ جو اس کا عمل بتاتا ہے، اور دونوں کھلے طریق ہیں، اور دونوں پر ہی عمل ضروری ہے اور ضروری رہا ہے، اور اسی معنی سے ہر نبی صاحب شریعت ہے گو وہ کوئی نئی شریعت عمل کے لیے لایا ہو یا نہ۔

ان الفاظ کے معنی یہ بھی لیے گئے ہیں کہ تم میں سے سب کے لیے ہم نے اب ایک شریعت اور منہاج مقرر کیا ہے یعنی اتباع دین محمدی، اور یوں بھی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک امت کو ہم نے الگ الگ شریعت اور الگ الگ منہاج دیئے۔ ایک شریعت اور منہاج اہل توریت کا ایک شریعت اور منہاج اہل انجیل کا اور یہی معنی سیاق کے لحاظ سے صحیح ہیں، کیونکہ پہلے توریت اور اہل توریت کا ذکر کیا، پھر انجیل اور اہل انجیل کا، پھر قرآن اور متبعین قرآن کا۔ اور بکلٍّ کہہ کر عام کر دیا کہ ہر امت یا قوم کے لیے اسی طرح شریعت اور منہاج مقرر کیے جس طرح ان کیلئے ہاں اس میں یہ اشارہ بھی ہے کیونکہ ذکر بالخصوص توریت اور انجیل کا ہے کہ اب ان کے طریق قابل عمل نہیں رہے نہ توریت کی حد درجہ کی سختی پر یہودی عمل کر سکتے ہیں، نہ انجیل کی حد درجہ کی نرمی پر۔ یہی واقعات شاہد ہیں کہ یہ طریق وقتی تھے اور اب اتباع صرف ایک طریق کا ہی ہو سکتا ہے جو محمد رسول اللہ صلعم کی وساطت سے بتایا گیا ہے۔

۸۳۵ یہاں ان اختلافات کی حکمت کو بیان کیا ہے جو طبائع انسانی میں پائے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب مذہب اسلام ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی صداقت ہے تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ سب لوگ فوراً قبول کر لیتے اور اختلاف نہ کرتے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اگر تم کو ایسا بنانا چاہتا کہ تم میں اختلاف طبائع ہی نہ ہوتا تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ سب ایک ہی گروہ بن جاتے، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا ہے کہ انسانوں میں اختلاف طبائع رکھے۔ اس اختلاف طبائع کی وجہ سے بعض لوگ ایک بات کو قبول کر لیتے ہیں تو بعض رد کر دیتے ہیں۔ مگر یہ اختلاف طبائع جو بعض انسانوں کو قبولیت حق سے محروم کر دیتا ہے ایک بے معنی اختلاف نہیں، بلکہ اس کے اندر بڑی حکمت یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر قوٰی اور استعدادیں رکھی ہیں وہ یوں نشو و نما پائیں۔ اگر اختلاف طبائع نہ ہوتا تو انسان کو کمالات حاصل کرنے کا بھی کوئی موقعہ نہ ہوتا۔ اس لیے نصیحت کے طور پر فرماتا ہے کہ نیکیوں کو آگے بڑھ کر لو تا کہ تمہارے کمالات جو تمہارے اندر مخفی ہیں نشو و نما پائیں اور ظاہر ہوں۔

۸۳۶ یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ اس رکوع میں اختلافات مذہبی کا جھگڑا ہے کیونکہ مذہبی اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن ہی ہوگا، یعنی وہیں پتہ لگے گا کہ کون انسان غلطی پر تھا اور کون حق پر۔

۸۳۷ یَفْتِنُوْكَ۔ فتن کے معنی ۲۲۳ میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں بلحاظ اس کے اصل معنی آگ میں ڈالنے کے، دکھ اور تکلیف میں ڈالنا ہی مراد ہے۔ یُوْقِعُوْنَكَ فِیْ بَلِیَّۃٍ وَّشِدَّۃٍ (غ) اس آیت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ یہاں جس فیصلہ کا ذکر ہے وہ اختلافات مذہبی میں فیصلہ ہے کیونکہ یہاں ان اصول سے ہٹانے کا ذکر ہے جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوئے اور وہ دین اسلام ہی ہے۔

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿٥٠﴾ ع
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٥١﴾

وقف غفران — وقف منزل عند المتقدمین

کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں اللہ سے بہتر فیصلہ دینے والا کون ہے؟ ۸۳۸

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست مت بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو کوئی تم میں سے انھیں دوست بناتا ہے تو وہ انہی میں سے ہے اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۸۳۹

اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی: ان الفاظ سے کہ ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور ان سے احتیاط کرتے رہو کہ بعض باتوں سے ہٹا کر دکھ میں نہ ڈال دیں" یہ نتیجہ نکالنا کہ نبی کریم صلعم نعوذ باللہ ان کی خواہشات کی پیروی کیا کرتے تھے پرلے درجے کی حماقت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ہدایت کی ضرورت نبی کریم صلعم کو تھی؟ جو مشکلات آنحضرت صلعم کو ان لوگوں کے ساتھ معاملات میں پیش آتی تھیں، اگر کوئی دوسرا آپ کی جگہ ہوتا تو یقیناً ان مشکلات کا مقابلہ نہ کر سکتا اور اس کا قدم ڈگمگا جاتا پس یہ ہدایت درحقیقت آپ کے اس مقام بلند کو ظاہر کرتی ہے کہ حالات تو ایسے ہیں جن کے نیچے ایک بشر قائم نہیں رہ سکتا مگر آپ کو جس مقام پر خدا نے کھڑا کیا ہے اُس لحاظ سے آپ سے ایسا نہ ہونا چاہیئے۔ علاوہ بریں اس خطاب میں ساری اُمت شامل ہے اور وہ اس ہدایت کے یقیناً محتاج ہیں۔ آج کس قدر مسلمان ہیں جو اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکے اور کس قدر ظاہری کشش کے سامان عیسائیوں کی تہذیب میں ہیں جو مسلمانوں کو حق سے پھیر کر فی الحقیقت ان کو دکھوں میں ڈال رہے ہیں گو وقت پر سمجھ نہ آئے۔

ع ۸۳۸ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں یعنی یہ یہود حق و حکمت کی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمائی ہیں۔ ممکن ہے اس آخری آیت میں پچھلے رکوع کی آخری آیات کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہو تا کہ اس کی طرف پھر توجہ دلائی جائے یعنی جب ان میں جھگڑے ہوتے ہیں تو پھر جاہلیت کے مطابق فیصلہ چاہتے ہیں جس میں قوی کا حق کمزور پر فائق سمجھا جاتا تھا۔ بنی قریظہ اور بنی نضیر میں بھی اسی کے مطابق عمل تھا۔ یعنی بنی نضیر زبردست تھے اور بنی قریظہ کمزور، اس لیے بنی نضیر بنی قریظہ سے دوچند دیت لیتے تھے۔

ع ۸۳۹ اہل کتاب سے موالات: اولیاء سے کیا مراد ہے دیکھو ۳۳۲۔ آل عمران ۳۔ ۲۷ میں عام طور پر کفار کو اولیاء بنانے سے روکا تھا، مگر وہاں شرط تھی کہ ایسی ولایت جو من دون المؤمنین ہو دیکھو ۳۹۹۔ یہاں بظاہر الفاظ عام ہیں، یہود اور نصاریٰ کو ولی مت بناؤ۔ یعنی نہ ان سے مدد لو نہ مدد دو۔ اگلی آیت سے ظاہر ہے کہ منافق یہود اور نصاریٰ کی پناہ تلاش کرتے تھے، اس خوف سے کہ اسلام مغلوب ہو جائے تو ساتھ ہی یہ بھی پس نہ جائیں اس لیے ان سے ساز باز رکھتے تھے۔ اور اگلے رکوع میں اسی مضمون کو دوہراتے ہوئے ان اہل کتاب کا مخصوص طور پر ذکر کیا ہے جو دین اسلام سے ہنسی کرتے ہیں (۵۷) اور وہیں اہل کتاب کی عداوت کا ذکر کیا ہے (۵۹) اور پھر ان کے فساد پھیلانے اور مسلمانوں کے خلاف لڑائی کی آگ جلانے کا ذکر کیا ہے (۶۴) پس یہ سیاق آیات اس بات پر قطعی شہادت ہے، کہ یہاں انہی یہود کی ولایت سے روکا ہے جو اسلام سے عداوت رکھتے ہوئے اسلام کی تباہی کے درپے تھے اور اسلام کے خلاف لوگوں کو اکساتے تھے۔ اور آیت کے شان نزول میں عبادۃ بن صامت کا یہود کی موالات سے بیزاری کا اظہار اور عبداللہ بن اُبی منافق کے ان کی موالات ترک کرنے سے انکار کا ذکر ہے (ج) اور دوسری روایت میں بنی قریظہ کے نقض عہد کا ذکر اسی آیت کے شانِ نزول میں ہے (ج) اور خود ابن جریر اس معنی کو ترجیح دیتے ہیں کہ یہاں ایسی ولایت سے روکا ہے جو من دون المؤمنین ہو یعنی مسلمانوں کے خلاف یا جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ روایات شانِ نزول قطعی طور پر صحیح نہیں اس لیے عموم الفاظ قرآنی کو مدنظر رکھ کر یہی معنی ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں نہ تو اس قسم کی تنگدلی ہے کہ اپنے متبعین کو دوسروں سے ملنے کی اجازت نہ دیتا ہو یا ان سے کسی قسم کے تعلقات ضروری سے جو مدنی حیثیت میں پیش آتے ہیں روکتا ہو بلکہ انہی اہل کتاب کی شریف بیبیوں کو زوجیت میں لانے کی اجازت دی ہے اور میاں بیوی میں جو تعلق محبت کا ہوتا ہے وہ خود ظاہر ہے۔ یہی اہل کتاب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایرانیوں کے مقابل جنگ میں شامل تھے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑتے تھے۔ پھر دشمنوں تک کے ساتھ پورا عدل و انصاف مدنظر رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ پھر صاف فرمایا کہ جو لوگ تمہارے خلاف فی الواقع جنگ نہیں کر رہے یا اعلانیہ دشمن کو مدد نہیں دے رہے اُن کے ساتھ بڑا نیکی کا سلوک کرو (الممتحنۃ۔ ۸)۔ ہاں وہ حکیمانہ مذہب ہے۔ جس بات سے مضرت پیدا ہوتی ہے اس کو سختی سے روکا بھی ہے۔ گو ایک خواب بین فلاسفر جس نے عملی رنگ میں قوم نہیں بنائی اس کی مصلحت کو نہ سمجھ سکے اور اس پر معترض بھی ہو، ان لوگوں میں جو ہمارے مذہب کے دشمن ہیں اور ان میں جو ایسے نہیں اسلام نے فرق کرنا سکھایا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ایسے لوگوں سے ساز باز رکھتا ہے وہ ان کے خیالات سے متاثر بھی ہوگا اور یوں انہی میں سے ہو جائیگا یہی معنی ہیں فانہ منھم کے ہاں اگر ایک طرف یہ معنی درست ہیں کہ جب ایک قوم دشمن اسلام ہو جائے تو تم فرداً فرداً اس سے تعلقات ولایت نہ رکھو تو دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کو بحیثیت قوم ہم اپنا ولی نہیں بنا سکتے کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ اسلام دنیا میں پھیلے پھر ان سے نصرت کی توقع رکھنے کے معنی ہی کیا ہوئے اور مسلمان کس طرح بحیثیت قوم ان سے نصرت کی توقع رکھ سکتے ہیں اور بڑی بات جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے یہی ہے کہ ان سے نصرت حاصل کرنے کا خیال

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ؕ ٥٢

پس جس کے دلوں میں بیماری ہے تو اُن کو دیکھے گا کہ اُن (کی دوستی) کے لیے جلدی کرتے ہیں کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے سو قریب ہے کہ اللہ فتح یا اپنی طرف سے کوئی امر لائے — پس ان باتوں پر جن کو اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں پشیمان ہوں گے ع۸۴۰

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ٥٣

اور جو ایمان لائے کہیں گے کیا یہ وہی ہیں جنھوں نے اللہ کی قسمیں بڑی مضبوط قسمیں کھائی تھیں کہ وہ یقیناً تمھارے ساتھ ہیں ان کے عمل ضائع ہوئے سو وہ نقصان اٹھانیوالے ہو گئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ؗ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ٥٤

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایک قوم لائے گا وہ ان سے محبت رکھے گا اور وہ اس سے محبت رکھیں گے۔ مومنوں کے سامنے نرم، کافروں کے مقابلہ میں غالب، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے اس کو دے اور اللہ فراخی والا جاننے والا ہے ع۸۴۱

ترک کردو۔

ع۸۴۰ دائرۃ۔ دَوْر کے معنی گرد پھرنا یا گھومنا ہیں، اور دار گھر کو اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ اس کو دیوار گھیرے ہوئے ہوتی ہے، اور پھر دار کے جائے قرار ہونے کے لحاظ سے شہر کو بھی دار کہا جاتا ہے، اور دار دنیا اور دار آخرت بھی کہا جاتا ہے، اور بہشت کو دار السلام اور دوزخ کو دار البوار یعنی امن کا گھر اور ہلاکت کا گھر کہا ہے اور دائرہ وہ خط ہے جو گرد گرد پھرتا یا احاطہ کر لیتا ہے، اور پھر اس سے مراد حادثات یا آفات لی جاتی ہیں کیونکہ وہ انسان کو گھیر لیتی ہیں علیہم دائرۃ السوء (التوبۃ ۹۸) اور اس کی جمع دوائر ہے یتربص بکم الدوائر (التوبۃ ۹۸) اور دائرۃ مکروہ یا ناپسندیدہ امر میں ہے جیسے دولۃ محبوب امر میں (رغ)

غلبۂ کفر سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے: مرض سے مراد ایمانی کمزوری یا نفاق ہے (ع۲۲ و ۲۲۵) منافق جیسا کہ اوپر عبداللہ بن ابی کا ذکر ہوا یہودیوں سے اور کفار سے اس خوف سے خفیہ تعلقات رکھتے تھے کہ مسلمان آخرکار مغلوب ہو جائیں گے اور اس طرح ہم بچ جائیں گے۔ اس زمانہ میں بہت سے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اسلام پر مصائب دیکھ کر عیسائیوں کی پناہ ڈھونڈھتے ہیں۔ اگر خدائی وعدوں پر ایمان ہوتا تو خدا پر بھروسہ کرتے اور ان لوگوں سے دوستی نہ گانٹھتے جو اسلام کی بیخکنی کے درپے ہیں۔ یہاں تسلّی کے لیے دو باتیں کہی ہیں، یا تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے مخالفوں پر فتح دیدے یعنی جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی کھلی کھلی فتح ہو جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا، اور اسی لیے اس کو مقدم کیا ہے۔ اور اس کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ اگر فتح نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے کوئی اور امر پیدا کر دے جو دین اسلام کے غلبہ کا موجب ہو جائے، یعنی گو مسلمانوں کو فتح کی بجائے شکست ملے۔ مسلمانوں کو موجودہ شکست میں یہ الفاظ تسلّی دینے والے ہیں جن سے بشارت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کا غلبہ کسی اور رنگ میں کر دیگا۔

ع۸۴۱ اذلّۃ۔ ذلیل کی جمع ہے اور ذُلّ جس سے یہ مشتق ہے مغلوب ہونے کا نام ہے (رغ) مگر اپنے لوگوں کے سامنے ذلیل ہونا یا مغلوب ہونا یہ ہے کہ انسان ان کے سامنے حد درجہ کی نرمی اختیار کرے جیسے مغلوب انسان کرتا ہے۔ چنانچہ والدین کے سامنے جناح الذل نیچا کرنے کو کہا گیا ہے جہاں ذُلّ سے مراد نرمی ہے یہاں بھی اذلّۃ سے مراد نرمی اختیار کرنے والے ہیں۔ دوسری جگہ اسی خیال کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے رحماء بینہم۔ پس اذلۃ علی المؤمنین سے مراد ہے مومنوں کے سامنے ایسے نرم جیسے مغلوب آدمی جھک جاتا ہے، اس سے بڑھ کر آپس کے تعلقات محبت نہیں ہو سکتے۔

اعزۃ۔ عزیز کی جمع ہے، اور عِزّۃ اس حالت کا نام ہے جب انسان مغلوب نہ ہو۔ اس کی اصل ارض عَزاز سے ہے جو سخت زمین کو کہتے ہیں اور عزیز

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ہُمۡ رٰکِعُوۡنَ ﴿۵۵﴾

تمھارے دوست صرف اللہ اور اس کا رسول ہیں اور وہ جو ایمان لائے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں ۸۴۲

وَ مَنۡ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَاِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۵۶﴾ ع

اور جو اللہ اور اس کے رسول کو اور ان کو جو ایمان لائے دوست بناتا ہے تو یقیناً اللہ کی جماعت ہی غالب ہے ۸۴۳

وہ ہے جو غالب آئے اور مغلوب نہ ہو الذی یُقۡہَر ولا یُقۡہَرُ (غ)۔ دشمن کے سامنے مغلوب نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کا اثر قبول نہ کرے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا اشداء علی الکفار۔ یوں تو مسلمانوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک کبھی نہ کبھی غیر مسلموں کے ماتحت بھی رہنا پڑا ہے۔ پس اعزۃ میں جسمانی مغلوبیت کی نفی مراد نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی مغلوبیت کی نفی مراد ہے۔ بلکہ جب غیر مسلم حکام کے ماتحت رہنا پڑے تو اس صفت عزیز کے اظہار کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ اس وقت الناس علیٰ دین ملوکھم والا معاملہ ہوتا ہے۔ لوگ بادشاہوں کے دین ان کے اوضاع و اطوار کی طرف زیادہ جھکتے ہیں۔ ان سے مرعوب ہو کر راہِ حق کو ترک کر دیتے ہیں۔ پس ایسے وقت میں مسلمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ جسمانی طور پر ان سے مغلوب ہونے کے باوجود بھی اخلاقاً ان پر غالب ہو، اور اس قسم کی ذلت ان کے سامنے اختیار نہ کرے جس سے اخلاق پر، مذہب پر، روحانیت پر بُرا اثر پڑے۔

جب ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو دنیا کی چند روزہ آسائش کے لیے اپنے دشمنوں کو اپنا دوست سمجھ لیتے ہیں، تو اب یہ بھی ذکر کیا کہ یہ لوگ بعض وقت اس قدر دب جاتے ہیں کہ ان کے اثر کے نیچے آ کر دین حق سے ارتداد اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بشارت دی کہ اگر کوئی مرتد ہوتا ہے تو ہو اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ایسے ایسے مضبوط قدم لوگ پیدا کرے گا کہ وہ کسی قسم کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے اور دین اسلام کی حمایت میں لگے رہیں گے خواہ کیسے بھی حالات پیش آئیں۔ یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک آدمی مرتد ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ ایک صادق الاعتقاد قوم کو اسلام میں لا داخل کرے گا۔

ابتدائی تاریخ اسلام میں واقعات ارتداد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تو شاذ و نادر ہی کوئی ارتداد کا واقعہ ہوا ہو۔ یہاں تک کہ ابوسفیان کی شہادت حالت کفر میں ہرقل کے سامنے یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اپنے دین سے بیزار ہو کر ارتداد اختیار نہیں کرتا۔ سب سے بڑا فتنۂ ارتداد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں اٹھا اور آپ کے ہاتھ سے فرو ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام میں اسود عنسی، مسیلمہ کذاب اور طلیحہ نے نبوت کے جھوٹے دعوے کیے اور ان کی قومیں یعنی بنو مدلج اور بنو حنیفہ اور بنو اسد اُن کی وجہ سے مرتد ہو گئیں۔ اُن سب کی سرکوبی حضرت ابوبکرؓ نے کی۔ ان کے علاوہ ذیل کے قبائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہوئے یعنی فزارہ، غطفان، بنو سلیم، بنو یربوع، سجاح کی قوم جس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور مسیلمہ سے شادی کی، کندہ، بنو بکر بن وائل۔ حضرت ابوبکرؓ کا قدم اس عظیم الشان فتنہ میں انبیا کی طرح مضبوط رہا اور یہ تمام قومیں پھر اسلام میں داخل ہوئیں۔ پس ابوبکرؓ اور آپ کے ساتھی یحبھم ویحبونہ کے مصداق ہیں، یعنی خدا ان سے محبت رکھتا تھا اور وہ خدا سے محبت رکھتے تھے۔ اور قرآن کریم کی یہ شہادت آپ کے حق میں ان تمام زبان درازیوں کا کافی جواب ہے جو اہل تشیع نے کی ہیں۔ اس زمانہ میں یعنی آج سے کوئی پچاس سال پیشتر البتہ ارتداد زیادہ واقع ہوا ہے اور یہ ارتداد اسلام سے عیسائیت کی طرف ہے گو اب اس کی رَو بہت کچھ رُک گئی ہے اور اس کے رُکنے کا زمانہ وہی ہے جو مجدد صد چہار دہم اور اس امت کے مسیح حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی ماموریت کا زمانہ ہے، اور وہی اصول اس فتنۂ ارتداد کو روکنے کا موجب ہوئے ہیں جن کی تعلیم آپ کے ذریعہ سے دی گئی۔ کاش مسلمان غور کرکے اس سلسلہ کو قوت دیتے، پھر دیکھتے کہ دین اسلام کس طرح دنیا میں غالب ہوتا ہے۔

۸۴۲ یہود و نصاریٰ کی موالات یعنی ان کی مدد پر بھروسہ کرنے سے روکا تو اب یہ بھی بتاتا ہے کہ مسلمان کا بھروسہ کس پر ہو۔ فرمایا کہ اپنا کارساز خدا کو سمجھو اور اپنے دوست رسول اور مومنوں کو بناؤ۔ اسی لیے ولیکم اللہ فرمایا یعنی حقیقی ولی یا ناصر اللہ ہی ہے۔ اولیاءکم اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا نہیں فرمایا۔ گو یا رسول اور مومن محض اس لیے ولی ہیں کہ وہ اللہ کے احکام کے فرمانبردار ہیں۔

حضرت علیؓ اور انگوٹھی دینے کا واقعہ: کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے حالت رکوع میں اپنی انگوٹھی ایک سائل کو دیدی تھی اور یہ آیت انہی کے لیے ہے کہ حالت رکوع میں وہ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اوّل تو یہ فعل خود کوئی ایسا قابل تعریف فعل نہیں کہ ایک شخص نماز پڑھتے پڑھتے اپنی انگوٹھی سائل کو دیدے، اس سے بڑھ کر ایثار کے کام تو ہیں جو حضرت ابوبکرؓ سے ظاہر ہوئے کہ بارہا اپنا سارا مال خدا کی راہ میں لٹا دیا مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی۔ دوسرا لوگ مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے آتے ہیں نہ زکوٰۃ دینے کے لیے۔ تیسرا یہاں تو ہے کہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور حضرت علیؓ کا انگوٹھی دینا زکوٰۃ نہ تھا، اور زکوٰۃ بیت المال میں دیجاتی تھی۔ ھم راکعون کے معنی تو صاف یہی ہیں کہ وہ احکام الٰہی کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا چونکہ دو عظیم الشان رکن اس فرمانبرداری کے تھے اس لیے ان کا علیحدہ ذکر کر دیا ہے اس سے حضرت علیؓ کی فضیلت اور امامت کی دلیل لینا بہت ہی بودی بات ہے۔

۸۴۳ حزب۔ حِزۡب وہ جماعت ہے جس میں شدت ہو اور اس کی جمع اَحۡزاب ہے لما را المؤمنون الاحزاب (الاحزاب ۳۳: ۲۲) وغیرہ میں مراد وہ قومیں ہیں جو نبی صلعم کی جنگ کے لیے مجتمع ہوئیں (غ)۔ اور لسان العرب میں ہے کہ احزاب وہ جماعتیں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی جنگ کے لیے اجتماع کریں، اور

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ
اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ
اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾
وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا
هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿٥٨﴾
قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ
اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ
مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٥٩﴾
قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً
عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ
وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ
الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب
دی گئی ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جو تمھارے دین کو ہنسی
اور کھیل بناتے ہیں اور (نہ) کافروں کو اور اللہ کا تقویٰ
کرو اگر تم مومن ہو۔[۸۴۴]
اور جب تم نماز کے لیے بلاتے ہو تو اس کو ہنسی اور
کھیل بناتے ہیں یہ اس لیے کہ یہ لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے[۸۴۵]
کہہ اے اہل کتاب تم ہم پر کس لیے عیب لگاتے ہو صرف
اس لیے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا
اور اس پر جو پہلے اتارا گیا اور تم میں سے اکثر نافرمان ہیں[۸۴۶]
کہہ میں تم کو بتاؤں کہ اللہ کے نزدیک اس سے بدتر بدلہ پانے والا
کون ہے وہ جس پر اللہ نے پھٹکار کی اور اس پر ناراض ہوا۔
اور اُن میں سے بندر اور سؤر بنائے اور وہ جس نے
شیطان کی پرستش کی - یہ مرتبہ میں بدتر اور سیدھے راستہ

حزب الرجل سے مراد ہے اَصحابُہٗ وجندہ الذین علی رأیہ (ل) یعنی اس کے دوست اور اس کے لشکر جو اس کی رائے پر ہوں۔ اسی معنی سے کافر منافق حزب الشیطان ہیں اور مومن حزب اللہ ہیں جو امر اللہ کا اتباع کرتے ہیں۔ یہاں یہ خوش خبری دی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسہ رکھنے والے ناکام نہیں ہوتے بلکہ یقیناً وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہونگے یہ بھی صریح پیشگوئی اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کی ہے۔

۸۴۴ کن اہل کتاب سے موالات جائز ہے :- یہ نص صریح ہے کہ ایسے اہل کتاب جو دین اسلام کو تباہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ اس پر استہزا کرتے ہیں ان سے معاہدات نصرت ہوسکتے ہیں، اور ان کو مدد دینا اور ان سے مدد لینا جائز ہے۔ اور چونکہ یہاں یہود و نصاریٰ کا نام نہیں لیا بلکہ اہل کتاب کا نام لیا ہے، اور اہل کتاب میں وہ سب قومیں شامل ہوسکتی ہیں جن میں انبیاء آئے اور وہ سب قوموں میں آئے، اس لیے سب قوموں کا قیاس اسی پر ہوسکتا ہے۔ یعنی مسلمان صرف ان لوگوں کو اپنا دوست بناسکتے ہیں جو دین اسلام سے استہزا نہیں کرتے۔ اور الکفار کو یہاں الگ کرنے سے ان خاص کفار کی طرف اشارہ مقصود ہے جو اس وقت اسلام کی بیخکنی کے درپے تھے۔ اور چونکہ اس رکوع میں یہود و نصاریٰ کی حالت کا ذکر کیا ہے، تو ان کا دین اسلام سے استہزا کرنا بھی ان کی اندرونی حالت پر شاہد ہے، کیونکہ اس میں سوائے نیکی کے اور کسی چیز کی تعلیم نہیں۔ پس اسلام سے استہزا خود نیکی سے استہزا بھی ہے۔ آج عیسائیوں کا یہی شیوہ ہے کہ دین اسلام سے استہزا کرتے ہیں۔

۸۴۵ لعب۔ اصل اس کا لُعاب یعنی تھوک ہے جو بہتی ہے۔ اس لیے لَعِبَ کے معنی ہوئے ایسا فعل کیا جس سے کوئی صحیح مقصد مدنظر نہ تھا (غ)
ندائے صلوٰۃ یعنی اذان کا ذکر کیا کہ اس کی بھی تحقیر کرتے ہیں اور اسے ایک لغو چیز سمجھتے ہیں۔ اذان کو یہاں اس قدر وقعت دی ہے کہ اسے شعار اسلامی میں سے ایک ایسی چیز قرار دیا ہے، جس کی تحقیر گویا دین اسلام کی ہی تحقیر ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے اس لیے کہ اذان اصول اسلامی کا ایک اعلان ہے اور یہ بات اسلام سے خاص ہے کہ اس کے اصول کی منادی اس قدر زور سے دنیا میں پانچ وقت ہوتی ہے تاکہ سب لوگ اسلام کے اصول سے واقف ہوجائیں۔ اور اس میں مذہب اسلام کی صداقت پر بھی ایک شہادت ہے۔ اس لیے کہ جب تک کسی کے دل میں صداقت کا پورا یقین نہ ہو اُسے یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اپنی باتوں کا اس قدر زور سے بار بار دنیا میں اعلان کرے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں اذان کو دین اسلام کے عظیم الشان ارکان میں سے قرار دیا ہے، حالانکہ یہ کلمات ایک رؤیا میں حضرت عمرؓ اور ایک اور صحابی کو بتائے گئے تھے، مگر ان پر تصدیق نبوی کی مہر نے انھیں دین اسلام کے ارکان میں داخل کردیا۔

۸۴۶ تنقمون۔ نَقِمَ منہ کے معنی ہیں اسے بُرا سمجھا یا اس پر عیب لگایا زبان سے یا سزا دینے سے (غ)، اسی دوسرے معنی میں ہے فانتقمنا منھم فاغرقنٰھم (الاعراف۔ ۱۳۶) اور نہایہ میں ہے اس قدر بُرا سمجھا کہ اس پر غضبناک ہوگیا۔
ان کے استہزا کا ذکر کرکے اب بتایا کہ یہ استہزا بھی دشمنی کی وجہ سے ہے۔ اس لیے سوال کیا ہے کہ کس وجہ سے تم ہم کو بُرا سمجھتے ہو حالانکہ کفار کو تم ایسا بُرا نہیں سمجھتے۔ لیکن مسلمانوں میں اور کافروں میں اگر فرق ہے تو یہی کہ مسلمان اللہ پر اور اس کی وحی پر ایمان لاتے ہیں۔ اصل وجہ مسلمانوں کو بُرا سمجھنے کی یہ بتائی ہے کہ اہل

عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ﴿۶۰﴾

سے بہت دُور بھٹکے ہوئے ہیں۔۸۴۷

وَاِذَا جَآءُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَقَدۡ دَّخَلُوۡا بِالۡكُفۡرِ وَهُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا كَانُوۡا يَكۡتُمُوۡنَ ﴿۶۱﴾

اور جب تمھارے پاس آتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور وہ یقیناً کفر کے ساتھ آئے اور وہ یقیناً اس کے ساتھ ہی نکل گئے اور اللہ اس کو خوب جانتا ہے جو چھپاتے ہیں۔۸۴۸

وَتَرٰى كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۲﴾

اور تو اُن میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور زیادتی میں اور حرام کھانے میں جلدی کرتے ہیں، بیشک جو وہ کرتے ہیں بُرا ہے۔

لَوۡلَا يَنۡهٰٮهُمُ الرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِهِمُ الۡاِثۡمَ وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ ﴿۶۳﴾

کیوں ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے یقیناً بُرا ہے، جو وہ کرتے ہیں۔۸۴۹

وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ يَدُ اللّٰهِ مَغۡلُوۡلَةٌ ؕ غُلَّتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَلُعِنُوۡا بِمَا قَالُوۡا ۘ بَلۡ يَدٰهُ مَبۡسُوۡطَتٰنِ ۙ يُنۡفِقُ كَيۡفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيۡدَنَّ

اور یہودی کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ بندھا ہُوا ہے، انہی کے ہاتھ باندھے گئے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کی وجہ سے اُن پر پھٹکار کی گئی۔۸۵۰ بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں جس

کتاب خود راستباز اور احکام الٰہی کے خاص کر فرمانبردار نہیں، بلکہ حالت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حصہ فاسق ہے۔ آج یورپ کو دیکھ لو کہ باوجود اپنے سارے فسق و فجور کے اسلام اور مسلمانوں کو اچھا نہیں سمجھتا، اور دنیا کی کسی دوسری قوم کو دبانے کا اس قدر فکر نہیں جس قدر مسلمانوں کو دبانے کا ہے۔

۸۴۷ بشر من ذٰلك۔ ذٰلك سے اشارہ اس کی طرف ہے جو وہ مسلمانوں پر عیب لگاتے تھے۔

قردۃ سے مراد اصحاب سبت اور خنازیر سے مراد حضرت عیسٰیؑ کے اصحاب مائدہ ہیں، یعنی جن کے لیے حضرت عیسٰی نے مائدہ طلب کیا (ر) ظاہر ہے کہ اصحاب السبت نے سبت کے دن جو ان کی عبادت کے لیے مقرر کیا گیا تھا عبادت کو ترک کر دیا اور دنیا میں غرق ہو گئے۔ اسی طرح یہ مائدہ والا گروہ حضرت عیسٰیؑ کے پیروؤں میں سے وہ گروہ ہے جو روٹیوں پر گر گیا، اور ان کے نزدیک مذہب کی غرض بھی سوائے حظ جسمانی کے اور کوئی نہ رہی۔ جس طرح بندر بننے سے مراد مسخ قلوب ہے، اسی طرح خنزیر بنانے سے مراد خنزیر صفت بنانا بھی ہو سکتا ہے (رغ) دیکھو ۹۴۔

مسیح موعود اور قتل خنزیر: حدیث میں مسیح موعود کے متعلق آتا ہے یکسر الصلیب ویقتل الخنزیر۔ حالانکہ مراد صرف یہ ہے کہ عیسائیت کے مذہبی غلبہ کو توڑے گا۔ ورنہ یہ کسی مصلح کا کام نہیں ہو سکتا کہ جنگلوں میں جا کر سُوروں کو مارتا پھرے۔ پس مراد غلبہ صلیبی کا دُور کرنا اور صفت خنزیریت کی ہلاکت ہے جو ایک خنزیر خور قوم میں ترقی کر گئی ہے۔

وعبد الطاغوت کا عطف مَن کے صلہ پر ہے، یعنی انہی میں سے وہ لوگ ہوئے جنھوں نے طاغوت کی پرستش کی۔ طاغوت سے مراد سرکش سردار اور پیشوا ہیں۔ عوام الناس ان کے پیچھے ایسے لگ جاتے ہیں کہ ان کی عبادت کرتے ہیں۔

۸۴۸ وہی لوگ جن کو اوپر بندر اور سُور کہا ہے انہی کے یہاں آنے جانے کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان کی منافقانہ روش کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

۸۴۹ اگلی آیت میں پھر یہود کا نام لیکر ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں یہود و نصارٰی دونوں کا ذکر ہے، اور حسن کا قول ہے کہ ربانی علمائے انجیل ہیں اور احبار علمائے توریت۔ جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ قردۃ میں بنی اسرائیل کے نافرمانوں کی طرف اور خنازیر میں عیسائی شہوت پرستوں کی طرف اشارہ ہے۔

۸۵۰ مغلولۃ۔ غُلّ کے معنی ہیں قید بہ یعنی باندھا گیا۔ خذوہ فغلوہ (الحاقۃ ۶۹: ۳۰)، اور اسی سے اغلال (بیڑیاں) ہیں۔ اور محاورہ میں مغلول الید بخیل کو کہا جاتا ہے۔ اور دوسری جگہ ہے لا تجعل یدك مغلولۃ الی عنقك (رغ) یہ یہودیوں کے استہزا کی مثال دی ہے۔ عیسائی آج اس سے بھی بڑھ کر استہزا کرتے ہیں یہودی تو مسلمانوں کے مالی مصائب پر یوں تمسخر کرتے تھے کہ مسلمانوں کا خدا بخیل ہو گیا ہے، اور عیسائی کہتے ہیں کہ اگر دین اسلام سچا ہوتا تو سیاسی رنگ میں اس کو زوال کیوں ہوتا۔ اس کا جواب جو غلت ایدیھم سے دیا ہے، اس سے مراد پیشگوئی کے طور پر یہ ہے کہ اسلام کی مخالفت میں ان کے ہاتھ ایسے باندھے جائیں گے کہ یہ مخالفت نہ کر سکیں گے۔

كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾

طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے[۸۵۱] اور وہ جو تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا ضرور ان میں سے بہتوں کو سرکشی اور کفر میں بڑھائیگا[۸۵۲] اور ہم نے اُن کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے ۔ جب کبھی وہ لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں اللہ اس کو بجھا دیتا ہے اور وہ زمین میں فساد پھیلاتے دوڑتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا[۸۵۳]

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾ ع

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقوٰی کرتے تو ہم ضرور اُن سے اُن کی بُرائیاں دور کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے ۔ اور اگر وہ توریت اور انجیل کو اور جو اُن کی طرف ان کے رب سے اتارا گیا ہے قائم رکھتے تو اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے رہتے ۔ ان میں سے ایک گروہ میانہ رَو ہے اور بہت سے ان میں سے بُرے کام کرتے ہیں[۸۵۴]

---

۸۵۱ یداہ مبسوطتان ۔ یَدٌ ہاتھ اس کی جمع اَیْدِی ہے اور استعارۃً کبھی ید نعمت کے لیے بولا جاتا ہے اور کبھی حفاظت اور ملک کے لیے اویعفوا الذی بیدہ عقدۃ النکاح (البقرۃ ۲۳۷) میں بھی یہی مراد ہے ، جیسے کہتے ہیں مالی بہ یَدان (رغ) یا جوج ماجوج کی حدیث میں ہے لایدان لاحد بقتالھم یعنی ان کے ساتھ جنگ کرنے کی کسی کو طاقت نہ ہوگی اور ید اللہ کنایہ ہے حفظ اور دفاع سے ، اور ید اللہ علی الجماعۃ میں مراد یہی ہے کہ اہل اسلام کی جماعت حفظہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگی (ن) وریدٌ مُطلقَۃٌ سے مراد ہے نعمتوں کا دینا اور یَدُہٗ مَغلُولَۃٌ سے مراد ہے بخل اور ہاتھ کا روک کھنا (غ) اسی سے ہے ۔ اَیَّدَہٗ اس کی تائید کی ، ایدناہ بروح القدس (غ) اور بَسْط یَدٌ سے مراد بھی وہی ہے جو ہمارے محاورہ میں کھلے ہاتھ سے مراد ہے ۔

جواب تو یہودیوں کے اعتراض کا دیا ہے کہ وہ کہتے تھے اللہ اپنے بندوں کو دیتا نہیں یعنی مسلمان غریب ہیں ، جس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں یعنی وہ دونوں قسم کی نعمتیں دینی بھی اور دنیوی بھی اپنی عبادت کرنے والوں کو دیگا ۔ اور یہ پیشگوئی ہے مگر لفظ ایسے اختیار فرمائے ہیں کہ جو کچھ عیسائی کہتے ہیں ۔ اس کا بھی جواب آگیا ہے یَدْ کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا بلحاظ اپنے اصل معنی کے ہے یعنی طاقت کے معنی سے کیونکہ ہاتھ ہی انسان کی طاقت کا موجب ہے ۔

۸۵۲ اسی طرح حضرت نوحؑ کہتے ہیں ۔ لم یزدھم دعاءی الا فرارا (نوح ۔ ۲) میرے بلانے نے ان کو بھاگنے میں ہی اور بڑھایا ۔ مطلب یہ ہے کہ جوں جوں قرآن اترتا ہے وہ مخالفت پر زیادہ اڑتے جاتے ہیں ۔

۸۵۳ یہود اور نصارٰی میں عداوت : بینھم میں ضمیر اہل کتاب کے دونوں گروہوں یہود و نصارٰی کی طرف جاتی ہے کیونکہ اصل خطاب اہل کتاب کے دونوں گروہوں سے چلا آتا ہے لا تتخذوا الیھود والنصارٰی اولیاء (۵۱) ۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ یہود و نصارٰی دونوں کا وجود قیامت تک رہے گا اور ان میں عداوت اور بغض بھی قیامت تک رہے گا ۔ حضرت عیسٰیؑ پر سب کا ایمان لانا خلافِ قرآن ہے ۔

اوقدوا نارا للحرب ۔ روح المعانی میں ہے کہ عرب میں دستور تھا کہ جب جنگ کا اعلان کرنا ہوتا تو ایک بلند مقام پر یا پہاڑ پر بڑی آگ جلا دیتے اور اس کو نار الحرب کہتے تھے ۔ اس آگ کے بجھانے کا مطلب ان کے شر کو دور کرنا ہے اور حرب سے مراد یہاں رسول اللہ صلعم یا دین اسلام کے خلاف جنگ یا شر کا ارادہ ہے ۔

۸۵۴ ما انزل الیھم من ربھم سے مراد قرآن شریف ہے ۔ چنانچہ پچھلی آیت میں بجائے اقامت تورات و انجیل و ما انزل کے لو انھم اٰمنوا واتقوا ہے یعنی وہ ایمان لاتے اور تقوٰی اختیار کرتے اور ایمان لانے سے مراد محمد رسول اللہ صلعم پر ایمان لانا ہی ہے ، ما انزل کے ساتھ توریت و انجیل کی اقامت کا کیوں ذکر کیا ، اس لیے کہ توریت و انجیل میں صریح پیشگوئیاں آنحضرتؐ کی تشریف آوری کی ہیں ۔

لاکلوا من فوقھم و من تحت ارجلھم ۔ اوپر کا رزق برکات سماوی ہیں اور نیچے کا رزق برکات ارضی ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ صرف رزق تحت ارجل کی طرف جھک گئے ہیں ۔ یعنی اس دنیا کی زندگی پر ۔ حالانکہ اگر یہ قرآن شریف کو قبول کرتے تو روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی برکات سے متمتع

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ۶۷

اے رسول جو کچھ تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا، پہنچا دے اور اگر تو (ایسا) نہ کرے تو تو نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۸۵۵

ہوتے۔

منھم امۃ مقتصدۃ۔ مقتصدۃ، قَصْد کے معنی رستہ کی استقامت ہیں اور اسی سے اِقْتِصاد ہے، جو دو طرح پر ہے، ایک اقتصاد ہر حال میں قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ اور یہ ایسے معاملات میں ہے جس میں افراط و تفریط کی دو طرفیں ہوں (گویا افراط و تفریط سے بچنے والا مقتصد ہے) جیسے جود اسراف اور بخل کے درمیان ہے۔ واقصد فی مشیك (لقمٰن ۳۱-۱۹) میں ایسا ہی اقتصاد ہے۔ اور دوسرا اقتصاد وہ ہے جو اچھے اور بُرے کے بین بین ایک چیز ہے جیسے عَدْل اور جَوْر کے درمیان، یا قریب اور بعید کے درمیان ایک کی مثال ہے فمنھم ظالم لنفسه ومنھم مقتصد (فاطر ۳۵-۳۲) دوسرے کی وسفرا قاصدا (التوبة ۹-۴۲) یعنی جو بہت لمبا نہ ہو (غ)۔ یہاں مقتصدۃ سے مراد نیک اور بُرے کے بین بین ہے۔

یہ وسعت مذہب اسلام میں ہی ہے کہ دوسرے مذاہب میں نیکی کو تسلیم کرتا ہے، ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ اسی میانہ رو گروہ کا اکثر حصہ اسلام میں آگیا۔ اور اب بھی یہی گروہ ہے جس کا قدم اسلام کی طرف اُٹھتا چلا آ رہا ہے۔

ع۸۵۵ عصمت انبیاء سے مراد۔ یعصمك۔ عصم کے معنی اِمْساك (غ) روک رکھنا یا مَنْع (ل) یعنی بچانا ہیں۔ امام راغب واللہ یعصمك من الناس کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ وعِصْمَةُ الانبیاء حِفْظُهُ ایاهم اوّلاً بما خَصَّهُمْ به من صفاءِ الجَوْهرِ ثم بما اَوْلاهم من الفضائلِ الجِسْمِیَّةِ والنَّفْسِیَّةِ ثم بالنُّصرة وبتَثْبِیتِ اقدامهم ثم بانزالِ السکینة عَلَیْهِم وبحفظ قلوبهم وبالتوفیق یعنی عصمت انبیاء سے مراد ان کا محفوظ رکھنا ہے اول تو اس جوہر کے صفا پیدا کرنے سے جس سے انبیاء کو مخصوص کیا گیا ہے یعنی وہ پیدائش سے گناہ سے پاک ہوتے ہیں۔ پھر جسمانی اور روحانی فضائل دینے سے، پھر ان کو نصرت اور ثابت قدمی عطا فرمانے سے، پھر ان پر سکینت نازل کرنے سے، اور ان کے قلوب کی حفاظت سے اور ان کو توفیق عطا فرمانے سے۔ پس یعصمك میں یہ سب باتیں داخل ہیں۔ اور روح المعانی میں ایک قول اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یعصمك سے مراد ہے صدورِ ذنب سے محفوظ رکھیگا، اور اس صورت میں من الناس سے مراد ہے من بین الناس یعنی لوگوں میں سے آپ کو اس پیغام رسانی کی وجہ سے گناہ کے صدور سے محفوظ رکھیگا اور یہ معنی بھی ہیں کہ لوگوں کے حملوں وغیرہ سے آپ کو محفوظ رکھے گا۔

تبلیغ حق اور عصمت کا تعلق: جب یہود و نصاریٰ کی عداوت و استہزا کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ ان میں سے میانہ روی تھوڑوں میں پائی جاتی ہے اور اکثر کی حالت بہت بُری ہے تو اب فرماتا ہے کہ تمہارا کام پیغام کا پہنچا دینا ہے۔ اور اگر کسی قوم کے غلبہ کی وجہ سے یا ان کے دنیوی جاہ و جلال سے ڈر کر ایک پیغام کو نہ پہنچاؤ گے تو تم نے کسی پیغام کو بھی نہیں پہنچایا۔ رسول میں اس کے پیرو بھی شامل ہیں جو اس کے بعد اس پیغام کو دنیا میں پہنچانے والے قرار پائے۔ ہاں ایسے حالات میں جب چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہوں تو اس پیغام کا پہنچانا جو سب کی غلطیوں کو دور کرتا ہے سب پر مُهَيمِن ہے، سب کو اپنا دشمن بنا لینا ہے۔ اس لیے ساتھ ہی یہ وعدہ دیا کہ ان دشمنوں سے اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے دین کو محفوظ رکھے گا۔ اور ضمناً اس میں رسول اللہ صلعم کی عصمت کو بھی بیان کر دیا۔ اور فی الحقیقت اس عصمت کا اور دشمنوں کے شر سے بچانے کا بڑا تعلق بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جب انبیاء کو ایک صفا جوہر سے بناتا ہے تو وہ غرض جس کے لیے وہ ایسا کرتا ہے پوری نہیں ہوتی اگر وہ ان کو دشمنوں کی شرارتوں اور منصوبوں سے محفوظ نہ رکھے یہاں تک کہ وہ اپنا پیغام پورے طور پر دنیا میں پہنچا دیں۔ پس عصمت حقیقی اور عصمت ظاہری ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اور یہاں دونوں مراد ہیں۔ بعض لوگوں نے صرف عصمت ظاہری یعنی دشمنوں سے بچانا مراد لیا ہے اور بعض نے صرف عصمت باطنی یعنی صدورِ ذنب سے محفوظ رکھنا۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ الفاظ دونوں قسم کی عصمت پر حاوی ہیں۔

اہل تشیع کا یہ خیال کہ اس آیت میں تبلیغ سے مراد حضرت علیؓ کی خلافت کی تبلیغ ہے، الفاظ سے ہنسی ہے۔ ماانزل الیك سے مراد گویا پیغام توحید اور نیکی کی دعوت نہیں بلکہ حضرت علیؓ کو عرب کی بادشاہت کا مل جانا ہے اور یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علیؓ کی خلافت کا ذکر کرنے سے ڈرتے تھے کہ صحابہؓ مخالف ہو جائیں گے بدترین حملہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جا سکتا ہے، یا اس کی مثل ہی نہیں اس سے بدتر ہے جو عیسائی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب سے شرک، بُت پرستی، شراب خوری، زنا، باہم جنگ و جدل سب کچھ چھڑا لیا مگر خانہ کعبہ کی عظمت کو نہ چھڑا سکتے تھے۔

اس موقع پر جو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بیان کی جاتی ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو علم محفوظ کیے ایک کو تو میں نے پھیلا دیا اور دوسرے کا نام لوں تو یہ میری گردن کاٹی جاتی ہے، تو اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ علم دین کا کوئی حصہ ایسا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو نہ پہنچایا تھا، اور چھپا کر ابوہریرہؓ سے ذکر کر دیا تھا۔ یہ خیال کم فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ سارے کا سارا علم دین قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا منشاء صرف حلوث فتن سے تھا جو اس زمانہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ چنانچہ اس کے مطابق ان کی دوسری حدیث ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں کہ میں ساٹھویں سال اور لڑکوں کی

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

کہہ اے اہل کتاب تم کسی (سچائی) پر نہیں، یہاں تک کہ توریت اور انجیل کو قائم رکھو اور اس کو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا اور جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا یقیناً اُن میں سے بہتوں کو سرکشی اور انکار میں بڑھائے گا، سو تو کافر قوم پر افسوس نہ کر ۸۵۶

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾

وہ جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی جو کوئی اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، تو اُن پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ پچھتائیں گے ۸۵۷

امارت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اور یہی وہ سال تھا جس میں یزید کو بادشاہت ملی اور دین میں فساد اسی سے شروع ہوتا ہے۔ تو چونکہ یہ احادیث دین میں داخل نہ تھیں صرف واقعات کی خبریں تھیں اس لیے حضرت ابوہریرہؓ ان کو عام طور پر بیان نہ کرتے تھے۔ رہا کتمان ہدایت یعنی دین کے کسی حصّہ کا نہ پہنچانا اس میں سخت وعید ہے جو خود قرآن شریف میں موجود ہے ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینٰت والھدیٰ من بعد ما بینّٰہ للناس فی الکتاب۔ اولٰئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللاعنون (البقرۃ ۲-۱۵۹) پس نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کا کوئی حصّہ چھپایا، نہ حضرت ابوہریرہؓ نے۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعدا مکّہ کی نسبت بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ وہاں صرف قریش تھے۔ یہاں ایک وہ منافقوں کا، ایک یہود کا، ایک عیسائیوں کا۔ پھر سب قبائل عرب خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور قریش نے اب اپنی ساری طاقت کو اکٹھا کر کے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی ٹھان لی تھی اسلئے وعدۂ حفاظت کی خاص ضرورت ہوئی۔ اور اس قدر دشمنوں میں جو شب و روز آپ کی جان کے درپے تھے آپ کا بچ رہنا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اور چونکہ اس رکوع میں عیسائیوں کے غلو کا خاص ردّ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ مخالفت دین اسلام کی اس قوم کی طرف سے ہونے والی تھی اور یہی سب سے بڑے دشمن عصمت انبیاء کے بن جانے تھے۔ اس لیے ان کے غلو کا ذکر کرنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کا ذکر کیا۔ تا ان پر اتمام حجت ہو اور تا مسلمان ان کی مخالفت سے گھبرائیں نہیں۔

کافر قوم کو ہدایت نہ دینے سے یہاں مراد یہ ہے کہ ان کے منصوبے کارگر نہ ہوں گے۔

۸۵۶ آنحضرت صلعم کی عصمت کا ذکر کر کے اب عیسائیت کے خلاف دلائل کی طرف رُخ کیا ہے۔ اور اس بحث میں سب سے پہلے ان کو اہل کتاب کہکر اصولی بحث کی طرف بلایا ہے، یعنی یہ کہ توریت و انجیل اور ان کتابوں کو جو تمہارے انبیاء کی وساطت سے تمہاری طرف نازل ہوئیں (ما انزل الیکم من ربکم) ان کو قائم کرو۔ جو کچھ ان میں ہے وہ بطور اصول تم تسلیم کرو۔ اگر اس کو تسلیم نہیں کرتے تو تم نے حق کو بالکل ترک کر دیا۔ جب اپنی ہی کتب مقدسہ کی شہادت کو قبول نہ کیا تو پھر واقعی یہ کہنے کا حق ہے کہ تم کسی شے پر نہیں۔ یہاں چونکہ عیسائیت کے ساتھ بحث شروع ہوتی ہے اس لیے ان کو بتایا ہے کہ اس بحث میں تمہارے ہاتھ میں کوئی بات نہیں جس کی طرف توجہ کی جائے جب تک کہ اپنی کتب مقدسہ کے اصول کو تسلیم نہ کرو اور ان لوگوں کی وحی کو نہ مانو جن کو تم انبیاء تسلیم کرتے ہو۔ ما انزل الیکم من ربکم سے مراد یہاں توریت و انجیل کے علاوہ انبیائے بنی اسرائیل کی دیگر کتب ہیں جو بائبل میں شامل ہیں اس لیے جب قرآن شریف کا یہاں ذکر کیا تو ما انزل الیک فرمایا۔ ان تمام کتابوں کے متفقہ اصول توحید الٰہی اور خدا کی طرف سے شریعت اور ہدایت کا ملنا اور اعمال صالحہ کا بجا لانا ہے۔ نہ کہیں تثلیث کا ذکر ہے نہ کفارہ کا، یہاں تک کہ خود انجیل میں خدائے واحد کے ایک ہونے کی شہادت موجود ہے، لیکن عیسائی ان تمام باتوں کو رد کر کے ایک نیا مذہب بناتے ہیں جس کی بنا تثلیث اور کفارہ پر ہے جو تعلیم انبیاء کے سراسر مخالف ہے۔

۸۵۷ قریباً یہی الفاظ پہلے بھی آچکے ہیں جہاں ان پر مفصل بحث گزر چکی ہے (دیکھو ۹۲) یہاں اس آیت کے لانے کا منشاء یہ ہے کہ تمام قوموں کو اور تمام کتب مقدسہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ یہی تعلیم دی ہے کہ خدا ایک ہے اور اعمال صالحہ کی ضرورت ہے۔ تثلیث اور کفارہ علی الترتیب ان دونوں اصول کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ پس ان کے خود غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿٧٠﴾

یقیناً ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور اُن کی طرف رسول بھیجے ، جب کبھی ان کے پاس رسول وہ چیز لے کر آیا جس کو ان کے دل نہیں چاہتے تھے ، ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرنے لگے ۸۵۸

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٧١﴾

اور اُنھوں نے گمان کیا کہ کوئی خرابی نہ ہوگی ، سو وہ اندھے اور بہرے ہوگئے ، پھر اللہ نے اُن پر رجوع برحمت کیا ، پھر اُن میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہوگئے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں ۸۵۹

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٧٢﴾

یقیناً وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے ۔ اور مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو ، جو میرا اور تمھارا رب ہے ـــــ جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ۸۶۰

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾

یقیناً وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے اور معبود تو سوائے ایک معبود کے کوئی نہیں ، اور اگر وہ اس سے نہ رُکیں گے جو کہتے ہیں تو ضرور ان کو جو اُن میں سے کافر ہیں دردناک عذاب پہنچے گا ۔

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٤﴾

تو کیا یہ اللہ کے حضور توبہ نہیں کرتے اور اس کی بخشش نہیں چاہتے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۔

ع ۸۵۸ عہد بنی اسرائیل کو یاد دلا کر بھی یہی بتایا ہے کہ اس عہد میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر ہی سارا زور ہے ، اور پھر فرمایا کہ تم لوگ ہمیشہ ہوائے نفس کے پیرو رہے ہو یہاں تک کہ انبیاء کو بھی جب انہوں نے تمہارے خلاف منشاء کچھ کہا جھٹلا دیا ۔ اب بھی تم ہوائے نفس کی وجہ سے آنحضرت صلعم کے قتل کے منصوبے کرتے ہو ۔

ع ۸۵۹ فتنۃ کے عام معنی مصائب یا دُکھ ہیں ، مگر یہاں حضرت ابن عباسؓ سے شرک معنی مروی ہیں (ج)

اندھے اور بہرے ہونے سے مراد یہی ہے کہ اصول حقہ کو ترک کر کے نئے اصول بنا لیے ۔ چنانچہ اس کی تشریح صاف اگلی آیت میں کر دی ہے ۔ پہلی مرتبہ اندھے اور بہرے ہونا حضرت عیسیٰؑ کے بعد کا فتنہ ہے ۔ جب عیسائیوں نے توحید اور شریعت کو ترک کر کے تثلیث اور کفارہ کے عقاید ایجاد کر لیے ۔ ان پر رجوع برحمت کرنا آنحضرت صلعم کا مبعوث فرمانا ہے ۔ مگر پھر بھی یہ راہِ راست پر نہ آئے ، اندھے اور بہرے ہی رہے بلکہ کثرت انہی کی ہو گئی اور موحد گروہ بالکل مٹ گیا

مفسرین نے یہاں یہود مراد سمجھے ہیں مگر میرے نزدیک یہ عیسائیوں کا ذکر ہے ۔

ع ۸۶۰ مسیح کی خدائی اور تثلیث : یہاں صراحت کر دی کہ وہ اندھا اور بہرہ ہونا جس کا ذکر اوپر ہے ، وہ توحید الٰہی سے انحراف ہی ہے ۔ عیسائیوں کے عقیدہ کو یہاں اور آیت ۱۷ میں یوں بیان کیا کہ وہ کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے ۔ اور اس سے اگلی آیت میں ، یعنی آیت ۷۳ میں اور النساء ۴ : ۱۷۱ میں ، تین خداؤں کا ماننا

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ
صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ
اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ
انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٧٥﴾

مسیح ابن مریم صرف رسول ہے۔ اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے۔ اور اس کی ماں صدیقہ تھی۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو کس طرح ہم اُن کے لیے باتیں بیان کرتے ہیں پھر دیکھو یہ کس طرح اُلٹے پھرے جاتے ہیں ٨٦١

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا
يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ وَ اللّٰهُ هُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٦﴾

کہہ کیا تم اللہ کے سوائے اُس کی عبادت کرتے ہو جس کو نہ تمہارے نقصان کا اختیار ہے اور نہ نفع کا اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا ہے ٨٦٢

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ
دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ
قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا
كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٧٧﴾ ع

کہہ اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور اُن لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ جو پہلے گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے ٨٦٣

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ
عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٧٨﴾

جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا، اُن پر داؤدؑ اور عیسیٰؑ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے بڑھ جاتے تھے ٨٦٤

ان کا عقیدہ بتایا بعض لوگوں نے اسے اختلاف سمجھ کر یوں توجیہ کی ہے کہ بعض فرقوں کا ایک عقیدہ تھا، بعض کا دوسرا۔ مگر اصل یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں درست ہیں اور ماحصل ایک ہی ہے۔ عیسائی مانتے تو یہی ہیں کہ تین اقنوم ہیں باپ، بیٹا، روح القدس، لیکن عملی رنگ میں مسیح ہی مسیح رہ جاتا ہے۔ کیونکہ نجات دہندہ وہی ہے اور سارا تعلق اسی سے ہے۔ سارا زور اسی کی خدائی ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے اور اسی کی خدائی کی اشاعت دنیا میں ہوتی ہے۔ پس دونوں باتیں درست ہیں۔ ایک ان کا کتابی عقیدہ ہے اور ایک عملی۔ اس عقیدہ کے بالمقابل مسیح کا قول پیش کیا ہے کہ وہ خود خدا کی عبادت کی طرف بلاتا تھا۔ اگر خدا ہوتا تو خود کیوں خدا کی عبادت کرتا اور اس کی عبادت کی طرف بلاتا۔ آیت ۴، میں ان کے بالآخر حق کی طرف رجوع کا ذکر کیا ہے اور اگلے رکوع میں ان کے اسلام کے قرب کے ذکر میں اسی کی تائید پائی جاتی ہے۔

٨٦١ مسیح کی خدائی کی تردید میں ان کی ماں کا ذکر قرآن شریف نے ہمیشہ کیا ہے یہ تبلانے کو کہ ایک عورت کے فرزند کو خدا بنایا جاتا ہے، اور دونوں کے کھانا کھانے کا ذکر اس لیے کیا کہ جو کھانا کھاتا ہے وہ تمام حوائج بشری کا محتاج ہے، جب کھانا کھائے گا تو پیشاب پاخانہ بھی کرے گا اور وہ خدا نہیں ہو سکتا جو کھانے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک نہایت ہی بیّن دلیل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ عیسائی توجہ نہیں کرتے۔ مگر ان پر کیا افسوس ہے جب مسلمانوں کی اپنی ہی یہ حالت ہے کہ ان کھلے الفاظ کے ہوتے ہوئے کہ مسیح کھانے کے محتاج تھے یہ مان رہے ہیں کہ دو ہزار سال سے اسی جسد عنصری کے ہوتے ہوئے کھانے کے محتاج نہیں نہ دیگر حوائج بشری کے، اور عیسائی ایسے عقیدہ سے اس کی الوہیت کی دلیل لیکر خود مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

٨٦٢ مسیح کو کوئی نفع نقصان نہیں پہنچاتے، اور مسیح کی پرستار قوم کا یہ خیال کہ ہمارا غلبہ مسیح کی پرستاری کی وجہ سے ہے باطل ہے۔

٨٦٣ یہاں یہ بتایا ہے کہ ایک انسان کو خدا بنانا یہ پہلی گمراہ قوموں کی پیروی ہے۔ یہ الزام جو قرآن کریم نے عیسائیوں پر دیا ہے اس کی صداقت کا اعتراف آج خود عیسائی کہلانے والے لوگوں کو ہے۔ پہلے بت پرستوں نے بھی اسی قسم کا مذہب بنایا ہوا تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو خدا اور خدا کے بیٹے کہتے تھے اور آج یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ پولوس نے محض یونانی بت پرستی کی تقلید میں یہ مذہب بنایا۔ کیا ایک عرب کا امی دنیا کی تاریخ سے ناواقف یہ کہہ سکتا تھا؟ نہیں یہ خدائے عالم الغیب کا کلام تھا جس نے اس حقیقت کو دنیا پر ظاہر کیا۔ اور آج خود یورپ کے محققین نے اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر یہ ایک بیّن شہادت ہے۔

٨٦٤ حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت داؤدؑ میں بنی اسرائیل نے جسمانی ترقی کا اور حضرت عیسیٰؑ میں روحانی ترقی کا کمال حاصل کیا۔ اور ان دونوں نبیوں نے آنحضرت

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٩﴾

وہ ایک دوسرے کو بُرے کام سے جو وہ کرتے تھے روکتے نہ تھے کیا ہی بُرا ہے جو وہ کرتے تھے[865]

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِى الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿٨٠﴾

تو اُن میں سے بہتوں کو دیکھے گا کہ جنھوں نے کفر کیا انھیں دوست بناتے ہیں کیا ہی بُرا ہے جو انھوں نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے کہ اللہ اُن پر ناراض ہُوا اور وہ عذاب میں رہنے والے ہوں گے۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِىِّ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۤءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨١﴾

اور اگر (یہی) اللہ پر اور نبی پر اور اس پر ایمان لاتے جو اس کی طرف اتارا گیا، تو ان کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے بہت نافرمان ہیں[866]

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٨٢﴾

تو یقیناً ان کے لیے جو ایمان لائے، دشمنی میں سب لوگوں سے زیادہ سخت یہودیوں کو پائے گا اور ان کو جو مشرک ہیں اور ان کے لیے جو ایمان لائے دوستی میں سب سے قریب تُو ان لوگوں کو پائے گا جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں یہ اس لیے کہ ان میں سے عالم اور راہب ہیں اور اس لیے کہ وہ تکبر نہیں کرتے[867]

صلعم کی بڑی مدح کی ہے اور آپ کی آمد کا بہت ذکر کیا ہے مگر دونوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ قوم نہایت سخت دل ہوتی جاتی ہے اور احکام الٰہی کی فرمانبرداری نہیں کرتی۔ اس لیے دونوں نے ان سزاؤں کا بھی جو ان پر آنے والی تھیں ذکر کیا ہے۔ یہی لعنت یعنی دوری ہے۔ حضرت داؤدؑ کے بعد بخت النصر کے ذریعہ سے اس قوم پر تباہی آئی اور حضرت عیسٰیؑ کے بعد طیطوس رومی کے ذریعہ سے، اور ان دونوں تباہیوں سے جس کا اصل باعث ان کی نافرمانی تھی یہ قوم بالکل ذلیل ہو گئی۔ اس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں ہے جہاں پہلے فرمایا لتفسدن فی الارض مرّتین (بنی اسرائیل ۱۷: ۴) اور پھر ان کی شرارت پر جو سزا ان کو دی گئی اس کا ذکر آیت ۵ و ۷ میں کیا۔

[865] قوم کی ترقی اسی وقت تک رہتی ہے جب ایک دوسرے کو بُرے کاموں سے روکنے والے ہوں۔ یہی مرض اب مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا ہے کہ بُرے کام ہوتے دیکھتے ہیں، خلاف قرآن وحدیث چاروں طرف ہو رہا ہے مگر جو خود شاید بچتے بھی ہوں، وہ دوسروں کو کچھ نہیں کہتے اور انہی مجلسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ غیرت اسلامی ہوتی تو کم از کم الگ ہی رہتے اور چاہیئے تو تھا کہ روکتے۔

[866] النبی کا لفظ قرآن شریف میں آنحضرت صلعم پر ہی بولا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہاں حضرت موسٰیؑ کو مراد لیا ہے۔ یعنی اگر یہ یہودی حضرت موسٰیؑ پر ایمان لاتے تو کافروں کو دوست نہ بناتے۔ مگر مراد اصل میں یہ ہے کہ کافروں اور مشرکوں کو تو ان لوگوں نے دوست بنا رکھا ہے جیسا کہ پچھلی آیت میں کہا اور وہ دوستی ملک عرب میں رہائش کی وجہ سے یا ہمسائیگی کی وجہ سے نہیں، کیونکہ اگر وہی لوگ آنحضرت صلعم پر ایمان لے آئیں تو پھر یہ ان کو کبھی دوست نہ بنائیں۔ گویا صرف اسلام کی دشمنی کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔

[867] قسیس۔ قِسّ کے اصل معنی رات کے وقت کسی شے کا طلب کرنا اور اس کا تتبع کرنا ہیں، اور قسّیس نصاریٰ کے علماء کو کہتے ہیں اس لیے کہ یہ لوگ عابد بھی ہوتے تھے۔ (غ)

رھبان۔ راھب کی جمع ہے اور رُھب اور رَھبَۃ کے معنی خوف ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب ملا ہوا ہو۔ اور رَھبانیۃ وہ عبادت ہے جس میں خوف کی وجہ سے غلو کیا جائے (غ) ورھبانیۃ نِ ابتدعوھا (الحدید ۵۷: ۲۷) اور راھب وہ لوگ ہیں جو تعلقات دنیوی سے بالکل الگ

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور جب اُسے سُنتے ہیں کہ جو رسُول کی طرف اُتارا گیا، تو تُو دیکھے گا کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں اِس لیے کہ اُنھوں نے حق کو پہچان لیا، کہتے ہیں ہمارے رب ہم ایمان لائے، سو تُو ہم کو گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے ۸۶۸

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور ہمارے پاس کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ایمان نہ لائیں اور ہم آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ داخل کرے۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

سو اللہ نے اُن کو اِن باتوں کا بدلہ باغ دیئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اُنھی میں رہیں گے اور یہ نیکی کرنے والوں کا بدلہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ ع

اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا، وہی دوزخ والے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ستھری چیزیں حرام نہ ٹھہراؤ

ہو کر عبادت میں ہی لگ جائیں اور ایسے لوگ عیسائیت میں بہت تھے۔

اصل منشا اس رکوع میں یہی بتانے کا ہے کہ عیسائی لوگ باوجود اپنے غلو کے دین اسلام کے قریب ہیں۔ اس لیے یہودیوں کی عداوت اور قساوت قلبی کا ذکر کر کے اب اصل مضمون کو بیان کیا ہے کہ ان میں مسلمانوں کے ساتھ محبّت زیادہ ہے۔ کیونکہ ان کے علماء بھی عابد لوگ ہیں اور ان میں راہب بھی ہیں جو دنیا کو ترک کر کے عبادت میں لگے ہوئے ہیں اور عبادت سے دل نرم ہوتا ہے۔ اس وقت یہودیوں اور عیسائیوں میں فرق بیّن تھا کہ یہود بالکل دنیا پر گرے ہوئے تھے۔ سود خواری اور مال دنیا کا کمانا اس سے بڑھ کر ان کی کوئی غرض نہ تھی اور عیسائیوں میں عبادت کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ اس لیے یہود میں قساوت قلبی زیادہ تھی۔ اور عیسائیوں میں نرمی زیادہ تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں نجاشی شاہِ حبش مسلمان ہوا۔ ہرقل نے بھی چاہا تھا کہ اسلام قبول کر لے مگر قوم کی مخالفت سے گھبرا گیا۔ مقوقس شاہِ مصر نے آپ کے خط کے جواب میں تحائف بھیجے۔ خود نجران کے وفد کو مباہلہ میں نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بالمقابل اس کے یہودیوں نے سخت عداوت کی۔ اور گو لفظ عام ہیں لیکن جو وجہ عیسائیوں کی نرمی کی دی ہے اس نے ان الفاظ کو بھی محدود المعنی کر دیا ہے۔

موجودہ عیسائی اور اسلام: پہلی حالت عیسائی قوم کی بلاشبہ یہی تھی کہ ان میں علماء بھی عابد تھے اور تارک الدنیا عبادت کرنے والے بھی تھے۔ مگر آخری حالت یہ ہے جیسا کہ سورۂ کہف میں اس قوم کا نقشہ کھینچا ہے کہ بالکل مال دنیا پر گر گئی الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا (الکہف ۱۸-۱۰۴) اور خدا تعالیٰ کی عبادت کی بجائے دولت کے دیوتا اور حکومت کے طاغوت کی پرستش شروع کر دی اس لیے حق سے دور جا پڑے بلکہ حق کی مخالفت پر سارا زور صرف کر دیا۔ لیکن باایں آیت کے الفاظ یہ امید دلاتے ہیں کہ یہ لوگ پھر اسلام کی طرف متوجہ ہونگے اور واقعات سے بھی یہی شہادت ملتی ہے کہ ایک چھوٹے سے پیمانہ پر اس قوم میں تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ سیکڑوں کی تعداد میں قابل اور فاضل لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

۸۶۸ نجاشی اور مسلمان مہاجر: اسی گروہ میں سے نجاشی شاہ حبش تھا جو مسلمان قریش کی اذیت سے بھاگ کر حبش میں چلے گئے۔ ان کو نجاشی نے پناہ دی۔ ان کے پیچھے قریش بھی پہنچے اور بہت سے تحفے وزراء وغیرہ کو دیکر یہ درخواست کی کہ مسلمانوں کو یہاں امن نہ دیا جائے۔ نجاشی نے اس درخواست کو رد کر دیا تو انہوں نے اس کو یہ کہکر اکسانا چاہا کہ یہ لوگ ہمارے مذہب کو ہی بُرا نہیں کہتے بلکہ تمہارے مذہب کو بھی بُرا کہتے ہیں۔ نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں بلایا۔ حضرت جعفرؓ نے اصل حال کہہ سنایا کہ ہم کس طرح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے اور گناہوں میں غرق تھے۔ پیغمبر نے ہمیں ضلالت سے نکال کر کس طرح اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ تب اس نے پوچھا کہ حضرت عیسےٰؑ کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو۔ انھوں نے سورۂ مریم کی آیات پڑھ کر سنائیں جن سے نجاشی پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ رو پڑا۔ اور شہادت دی کہ جو کچھ قرآن نے عیسیٰؑ کے بارے

أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾
وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪
وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾
لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ
وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ
فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ
اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ
اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ
ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا
حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ
وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ

جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔[۸۶۹]

اور اس سے جو اللہ نے تم کو دیا ہے حلال اور ستھری چیزیں کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ کرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔

اللہ تمہاری بلا ارادہ قسموں پر تم پر گرفت نہیں کرتا لیکن اس پر گرفت کرتا ہے جو تم قسم کو مضبوط کرو۔ سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کا کھانا ہے، درمیانہ کھانے سے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو لباس دینا یا گردن کا آزاد کرنا اور جو شخص نہ پائے، تو تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھالو۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔[۸۷۰]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو شراب اور جُوا اور بُت اور پاسے ناپاک کام صرف شیطان کے

میں بیان کیا ہے اس سے وہ ایک تنکے کے برابر بڑھ کر نہیں۔ آخر کار نجاشی مسلمان ہو گیا۔ یہ تو ایک نمونہ ہے اسی طرح کئی لوگ اسلام میں داخل ہوئے گو مقدر یہی تھا کہ عیسائیت جب پورا زور پکڑے تو اس کے بعد پھر اسلام کو اس پر پورے طور پر غالب کیا جائے۔ ہاں ایسے نمونے آج بھی بہتیرے ملتے ہیں لارڈ سٹینلے کے حالات میں ایک شخص نے لکھا ہے کہ وہ پچھلی رات تہجد کی نماز میں قرآن شریف پڑھ کر روتا تھا۔ اور بھی آج کئی ایک یورپین عیسائی ہیں جن کے دل قرآن کریم کے سامنے پگھل جاتے ہیں۔

الحق جو اس آیت میں اور اگلی آیت میں آتا ہے اس سے اشارہ حضرت عیسیٰؑ کی اس پیشگوئی کی طرف ہے جو یوحنا کے چودھویں اور سولھویں باب میں ہے جس میں موعود نبی کو روح حق کے نام سے پکارا گیا ہے۔

۸۶۹ رکوع سابق میں عیسائیوں کا اسلام کے قریب ہونا بیان کرتے ہوئے ان کے راہبوں وغیرہ کا محل مدح پر ذکر کیا تھا مگر چونکہ اسلام رہبانیت کو جائز نہیں ٹھہراتا اس لیے ساتھ ہی مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ تم نے اس قسم کی غلطیوں میں نہ پڑنا جن میں یہ عیسائی پڑے ہیں کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے محبت نہیں کرتا۔ جب تک کہ وہ خدا داد نعمتوں اور خدا داد طاقتوں کو ترک نہ کرے اس لیے فرمایا کہ جب ستھری چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال ٹھہرائی ہیں تو تم ان کو حرام نہ کرو۔ مثلاً بیوی بچوں کے تعلقات، کھانا پینا وغیرہ جو عبادت میں حد مقررہ سے گزر جاتے ہیں وہ بھی غلو کرتے ہیں، مگر اسلام غلو کو جائز نہیں رکھتا۔ اسی لیے رسول اللہ صلعم نے فرمایا ما بال اقوام حرموا النساء والطعام والطیب والنوم ان قوموں کا کیا حال ہو گا جنہوں نے عورتوں کو اور کھانے کو اور خوشبو کو اور نیند کو حرام کر دیا اور اس کے آخر پر فرمایا کہ میری امت کی رہبانیت جہاد کرنا ہے۔ اور ایک حدیث میں فرمایا فمن رغب عن سنتی فلیس منی جو شخص میری سنت سے دوسری طرف مائل ہوتا ہے وہ مجھ سے نہیں ہے۔ پہلی حدیث میں صاف عیسائی قوم کا نقشہ کھینچ کر مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔

۸۷۰ عقدتم۔ عَقْد کے معنی کسی چیز کی دونوں طرفوں کو اکٹھا کرنا یا گرہ دینا ہیں اور استعارۃً بیع، عہد، قسم وغیرہ کے موکد کرنے پر عَقْد۔ عَقَّد۔ عاقد وغیرہ بولا جاتا ہے (غ) سورہ بقرہ میں عقدتم الایمان کی جگہ جہاں مضمون یہی ہے کسبت قلوبکم فرمایا (البقرہ ۲ - ۲۲۵) یعنی ٹھان کر یا ارادہ اور عمد سے ایک کام کا کرنا۔

کفارۃ۔ کُفْر کے معنی چھپانا اور کفارۃ وہ ہے جو گناہ کو چھپا دے اسی سے قسم کا کفارہ ہے (غ)

اوسط۔ وَسَط یا اَوْسَط کے معنی درمیان کی چیز ہیں ابن جریر کہتے ہیں یہاں وسط سے مراد قلت و کثرت میں وسط ہے اور وہ کہتے ہیں کہ کفارہ میں نبی کریم صلعم

الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٩٠﴾

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ

وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ

عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ

اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾

عمل سے ہیں سو اس سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو ۔ع۸۷۱

شیطان صرف یہ چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب اور

جُوئے سے عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو اللہ

کے ذکر سے اور نماز سے روک دے ۔ سو کیا

تم رُک جاؤ گے ع۸۷۲

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا

الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٩٢﴾

اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور

بچتے رہو ۔ پھر اگر تم پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول

پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے ۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ

ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے کوئی

گناہ نہیں اس بارے میں جو وہ کھائیں جب کہ وہ تقویٰ کریں

اور ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں پھر تقویٰ کریں اور مان لیں پھر تقویٰ

کی سنت اسی اندازے سے دے دینا تھا، نہ لازمی طور پر کھانا پکا کر کھلانا اور زیادہ سے زیادہ اندازہ جو نبی کریم صلعم نے حکم دیا ہے نصف صاع یا دو مُد فی مسکین ہے اور کم سے کم ایک مد جو ۹ چھٹانک ہے ۔

تحریر ع۴۰۸ ایک انسان کا آزاد کر دینا ۔ رقبۃ کے لیے دیکھو ع۲۱۵ چونکہ قیدی جب پکڑا جاتا تھا تو اس کے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ دیئے جاتے تھے ۔ اس لیے رقبۃ جو گردن کے معنی میں ہے غلام پر بولا جانے لگا (ج)

حلفتم ۔ حَلِف اصل میں وہ قسم تھی جو ایک دوسرے سے عہد کے وقت لی جاتی تھی ۔ پھر ہر قسم پر بولا جانے لگا ۔ اسی لیے حلیف وہ ہے جس سے عہد کیا ہو ۔ (غ)

لغو قسم کے معنی پہلے گزر چکے ہیں دیکھو ع۲۸۸ یہاں اس کا ذکر اس لیے کیا کہ بسا اوقات لوگ بلا ارادہ قسم کھا کر ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں ۔ خدا کی قسم میں فلاں چیز نہیں کھاؤں گا وغیرہ ۔ ہاں جب انسان پختہ طور پر اور پورا عزم کر کے ایک قسم کھالے تو پھر کفارہ دینا چاہیئے مگر قسم کے کفارہ کے یہ معنی نہیں کہ انسان ایک جائز عہد کر کے اس پر قسم کھا لیتا ہے تو کفارہ دیکر اس کو بھی توڑ دے اس کا توڑنا تو کسی صورت میں جائز نہیں بلکہ قسم کی حفاظت کرنی ضروری ہے ۔ ہاں قسم کھا کر ایک جائز چیز کو اپنے لیے ناجائز کہدیا تو ایسی قسم کا کفارہ دے ۔ کیونکہ جائز کا ناجائز کرنا خلاف حکم خداوندی ہے ۔ قسموں کی حفاظت سے مراد یہ بھی ہے کہ قسم کو توڑو نہیں ۔ اور یہ بھی مراد ہے کہ قسم کم کھاؤ ۔

ع۸۷۱ رجس ۔ پلیدی یا ناپاکی ۔ جسے انسان کی طبیعت پلید قرار دے یا عقل یا شریعت (غ) خمر اور میسر آخری دو لحاظ سے رجس ہیں ۔ ایسا ہی انصاب و ازلام ۔ انصاب اور ازلام کا ذکر پہلے شروع سورت میں بھی آیا ہے ۔ انصاب سے مراد وہ پتھر ہیں جن کی عبادت کرتے تھے اور ازلام سے مراد اُن تیروں کے ذریعہ سے فال کا نکالنا جن پر لا نعم وغیرہ لکھا ہوتا تھا ۔ دیکھو ع۸۵۷ چنانچہ حدیث کے الفاظ میں شارب الخمر کعابد الوثن اسی طرف اشارہ ہے یعنی شراب کا پینے والا بتوں کے پوجنے والے کی طرح ہے ۔ بت پرستی کو شراب کے ساتھ ممنوع ٹھہرا کر بتایا ہے کہ مسلمانوں کو شراب سے ایسا ہی بچنا لازمی ہے جیسے بت پرستی سے ۔

یہ چیزیں تو پہلے حرام کی جا چکی ہیں یہاں دوہرا کر یہ اشارہ کیا ہے کہ وہ عیسائی جنہوں نے ایک وقت رہبانیت اختیار کر کے حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر دیا ۔ ایک دوسرا وقت آنے والا ہے کہ اس قدر دنیا میں غرق اور خدا سے دور ہونگے کہ حرام کو بھی حلال کر لیں گے اس لیے مسلمانوں کو شراب اور جوئے سے بالخصوص روکا ہے گو بتوں اور فال کے تیروں کا بھی ساتھ ذکر کیا ہے مگر اگلی آیت میں صرف شراب اور جوئے کے نقصانات کو بیان کر کے بتا دیا ہے کہ اصل غرض انہی سے روکنا ہے ۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اس آیت کے نزول پر حرمت شراب کی عام منادی کرائی گئی، تو اسی وقت مدینہ کی گلیوں میں تمام کی تمام شراب بہا دی گئی ۔ دیکھو ع۱۲۸

ع۸۷۲ جن قوموں نے شراب اور جوئے میں ترقی کی ہے ۔ اللہ کے نام تک کو بھول گئی ہیں ذکر تو ایک طرف رہا اور پھر ظاہر نقصان یہ بھی ہے کہ شراب اور جوئے سے باہم عداوت اور بغض پیدا ہوتا ہے جس کا یورپ آج کھلا نقشہ دکھا رہا ہے ۔ اس مقابلہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ سرور جس کو شراب خوار شراب میں تلاش کرتا ہے وہ اللہ کے ذکر میں ہی میسر آتا ہے ۔

ع اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

کریں اور احسان کریں اور اللہ احسان کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے [۸۴۳]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ
مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ
لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ
اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کچھ شکار سے تمھیں ضرور آزمائے گا جس کو تمھارے ہاتھ اور تمھارے نیزے پہنچ سکتے ہیں تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس سے غیب میں ڈرتا ہے سو جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے [۸۴۴]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ
وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا
فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ
بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًاۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ
اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ
صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا
سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو شکار کو نہ مارو جب تم حالت احرام میں ہو، اور جو کوئی تم میں سے اُسے جان بوجھ کر مارے تو (اس کا) بدلہ چارپایوں سے اس کا مثل ہے جو مارا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عدل والے کریں یہ قربانی کعبہ پہنچنے والی ہو یا کفارہ ہے مسکینوں کا کھانا یا اس کے برابر روزے رکھنا تاکہ اپنے کام کا بُرا نتیجہ چکھے جو گزر گیا، وہ اللہ نے معاف کر دیا اور پھر جو ایسا کرے تو اللہ اس کو اس کی سزا دے گا

ع۸۴۳ اس آیت سے عموماً مراد یہ لی گئی ہے کہ جو لوگ تحریم خمر سے پہلے وفات پا گئے ان پر کوئی گناہ نہیں، مگر ظاہر ہے کہ یوں تو اور بیسیوں احکام ہیں جن کے نازل ہونے سے پہلے بعض مسلمان فوت ہو گئے وہ ان پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے زیر مواخذہ نہ تھے جو اس حکم کی ضرورت پڑتی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تقویٰ کریں تو حرج نہیں کہ اتنی تھوڑی سی شراب پی لیں جس سے عداوت اور بغض پیدا نہ ہو۔ یہ بھی خوب تقویٰ ہے۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ جب شراب کو رجس قرار دیا جب اس کو بت پرستی کے ساتھ ملا کر اس کی حرمت کو بیان کیا۔ جب صاف کہہ دیا کہ اس سے بچو۔ تو تقویٰ اور شراب خوری ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

مراد اس آیت سے کیا ہے؟ اوپر حلال چیزوں کو حرام کرنے والوں کا ذکر تھا۔ اس لیے یہاں فرمایا کہ کھانے پینے سے انسان گنہگار نہیں ہوتا جو اُن چیزوں کا ترک کرنا بھی تقرب الی اللہ میں داخل ہو۔ چنانچہ سلف میں سے بھی بعض اس طرف گئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی جنھوں نے اپنے لیے گوشت حرام کر لیا تھا اور راہبانہ طریق اختیار کرنا چاہتے تھے۔ سو یہاں ایسے لوگوں کی غلطی کو بھی ظاہر کر دیا۔ ہاں قرب الٰہی کو حاصل کرنے کی راہ بھی ساتھ ہی بتا دی۔ اور اس میں تقویٰ کے تین مراتب بھی بیان کر دیئے۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ ایمان لائے اور اچھے کام کرے۔ دوسرا مرتبہ تقویٰ کا یہ ہے کہ تمام باتوں کو مان لے اور کسی پر اس کے دل میں خلش پیدا نہ ہو یعنی سب احکام الٰہی کی فرمانبرداری اختیار کرے اور تیسرا مرتبہ تقویٰ کا یہ ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ احسان کرے۔ رہبانیت میں زیادہ سے زیادہ پہلا مرتبہ تقویٰ کا آ سکتا ہے کہ ایمان لا کر کچھ اچھے کام کر لیے مگر کل احکام الٰہی کی فرمانبرداری راہب کیونکر کر سکتا ہے۔ پھر اس آخری مرتبہ مخلوق خدا کے ساتھ احسان کو وہ کیونکر پا سکتا ہے۔ مسلم ترمذی نسائی میں ایک حدیث ہے جو اسی معنی کی موید ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے کہا گیا ہے کہ تو بھی ان میں سے ہے یعنی یہ تینوں مراتب تقویٰ تم میں پائے جاتے ہیں۔

ع۸۴۴ اس رکوع میں اصل ذکر خانہ کعبہ کی عزت و حرمت کا ہے۔ اسی کے متعلق یہ احکام شکار بھی ہیں۔ اس مضمون کو بھی عیسائیت کے ذکر سے خاص تعلق ہے نبی کریم صلعم کی پیدائش کے سال میں ایک عیسائی بادشاہ نے خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا ذکر سورۃ فیل میں ہے۔ پھر آخری زمانہ میں غلبۂ عیسائیت کی صریح پیشگوئیاں قرآن شریف اور حدیث میں موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ عیسائیت کے غلبہ سے خانہ کعبہ کی حفاظت کا سوال پھر پیدا ہوتا ہے اس لیے عیسائی مذہب کے ذکر میں اس کا ذکر کیا ہے۔

خانہ کعبہ کی حرمت کو اس قدر بلند مقام پر رکھا ہے کہ حالت احرام میں شکار کو بھی منع کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں ایسے موقعہ پر جب آدمیوں کا اس قدر اجتماع ہو شکار کھیلنا ویسے بھی نقصان جان کا موجب ہو سکتا ہے۔

ہاتھوں کے پہنچنے سے مراد جال وغیرہ سے شکار کا پکڑنا ہے اور یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے ہاتھ سے ہی پکڑے اور نیزے کے شکار سے مراد ایسا شکار ہے جو اسے زخمی کر کے حاصل کیا جائے۔ تیر اور بندوق بھی اس میں آ جائیں گے۔ مجاہد کہتے ہیں پہلے سے مراد چھوٹا شکار دوسرے سے بڑا ہے (ج)

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

اور اللہ غالب سزا دینے والا ہے[۸۷۵]

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

تمھارے لیے دریا کا شکار اور اس کا طعام حلال کیا گیا ہے، تمھارے اور مسافروں کے فائدے کے لیے[۸۷۶] اور تم پر خشکی کا شکار حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم حالتِ احرام میں ہو اور اللہ کا تقویٰ کرو جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۗ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

اللہ نے کعبہ عزت والے گھر کو لوگوں کے لیے قائم رکھنے والا بنایا ہے اور حرمت والے مہینوں کو اور قربانیوں کو اور گانیوں والے جانوروں کو۔ یہ اس لیے کہ تم جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور یہ کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے[۸۷۷]

---

[۸۷۵] یہاں پہلی آیۃ کے حکم کی تصریح کر دی ہے اور حالت احرام میں شکار کرنا منع کیا ہے۔ درندوں یا موذی جانوروں کو مارنا اس میں شامل نہیں ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایسی صورت میں سزا کیا ہے کسی جانور کی قربانی کعبہ میں جو مقتول جانور کی مثل ہو۔ جس کا فیصلہ دو صاحب عدل کریں۔ صاحب عدل سے مراد ایسے لوگ ہیں جو فقاہت رکھتے ہوں اور حقوق کا موازنہ کر سکتے ہوں۔ خاص حالات میں قربانی ہو یا مساکین کا کھانا یا روزے اور کس قدر، یہ سب فیصلہ انہی دو آدمیوں پر چھوڑا ہے۔ قرآن کریم نے عموماً ایسے فیصلوں میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو رکھا ہے یہاں بھی دو کو رکھا ہے اور طلاق کے معاملہ میں بھی دو کو۔ منشا یہ ہے کہ دو آدمی ایک دوسرے سے آراء کا مقابلہ کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ ایک سے غلطی کا احتمال زیادہ ہو سکتا ہے۔ ججوں کے پنچ بٹھانا کوئی نیا خیال نہیں۔

[۸۷۶] طعام۔ طَعِمَ کے معنی غذا کے طور پر کسی چیز کو لینا ہیں اور طعام وہ چیز ہے جو اس طرح لی جائے (غ)۔ مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ ابن عباسؓ۔ ابن عمرؓ وغیرہم سے مروی ہے کہ صید وہ ہے جس کا شکار کر کے اسے مارا جائے اور طعام وہ ہے جسے دریا خود پھینک دے یا دریا کے پیچھے ہٹ جانے سے رہ جائے (ج)

سیارۃ۔ سیر سے ہے زمین میں چلنا۔ اور جو جماعت زمین میں چلے اسے سیارۃ کہا جاتا ہے وجاءت سیارۃ (یوسف ۱۲-۱۹)

آبی شکار کو مستثنٰی کر دیا ہے۔ یعنی اس کا پکڑنا حالت احرام میں جائز ہے۔ دریا وغیرہ کے شکار میں اتلاف جان کا خطرہ نہیں۔

[۸۷۷] الکعبۃ۔ کعب ٹخنے کو کہتے ہیں یعنی وہ ہڈیاں جو پنڈلی اور قدم کے درمیان اٹھی ہوئی ہوتی ہیں اور کَعَبَتِ الْجَارِیَۃُ اس لڑکی کے متعلق کہا جاتا ہے جس کے سینہ کا ابھار شروع ہو گیا ہو۔ اسی لحاظ سے کعب شرف اور علو کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے حدیث میں ہے لا یزال کَعْبُكَ عالیاً جو دعائے شرف و علو ہے وکُلُّ شیءٍ علا وارتفع فھو کَعْبٌ یعنی ہر ایک چیز جو بلند اور مرتفع ہو وہ کَعْب ہے (ل) اور کعبۃ کو اس کے ارتفاع اور مربع ہونے کے لحاظ سے ایسا کہا جاتا ہے (ل) مگر اصل یہی ہے کہ یہ نام صرف اس کے علو اور ارتفاع کی وجہ سے ہے اور علو اور ارتفاع سے مراد ظاہری بلندی نہیں بلکہ درجہ میں علو ہے کیونکہ اس گھر کو ابتدا سے علو اور ارتفاع کا مرتبہ حاصل رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ کعبہ اس کا نام بطور پیشگوئی کے رکھا گیا کہ اس کو دنیا میں علو اور ارتفاع حاصل ہوگا اور مربع ہونا کوئی خصوصیت نہیں جس کی وجہ پر یہ نام رکھا جاتا۔

قیاماً للناس۔ کسی چیز کے لیے قیام ہونا اس کی نگہداشت اور حفاظت کرنا ہے (غ) پس قیام للناس کے معنی ہوئے لوگوں کی نگہداشت اور حفاظت کا ذریعہ۔ اصمّ نے اس کے معنی کیے ہیں قائماً یعنی خود قائم رہنے والا۔ یا کبھی منسوخ نہ ہونے والا (غ) یعنی نہ کبھی یہ برباد ہوگا۔ اور نہ اس کے بعد کوئی اور دین دنیا میں قائم ہوگا کہ یہ منسوخ ہو جائے۔

اس آیت میں اصل مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کعبہ کو خدا نے قیام بنایا ہے۔ گویا یہ لوگوں کی حفاظت کا ذریعہ ہے یہاں خاص اہل عرب کا ذکر نہیں کیا بلکہ سب لوگوں کے لیے قیام کہا ہے اس لیے صرف اس قدر مراد نہیں ہو سکتی کہ عرب کے لوگوں کے لیے یہ معاش کا ذریعہ ہے اس لیے کہ تجارت کا مرکز ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جس طرح غذائیں جسمانی قیام کا موجب ہیں اسی طرح خانہ کعبہ لوگوں کے روحانی قیام کا موجب ہے جس کے ذریعہ سے دنیا کے امور دینی کی اصلاح ہوئی اور یہ بالکل سچ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے تو توحید اور روحانیت کا نام دنیا سے مٹ جاتا۔ پس یوں خانہ کعبہ دنیا کی روحانی زندگی کا موجب ہو کر دنیا کے لیے قیام کا موجب ہو گیا اور اسی لیے خانہ کعبہ کو بربادی سے بھی ہمیشہ کے لیے بچایا گیا۔ کیونکہ اس کو ظاہری نشان اس بات کا ٹھہرایا گیا کہ حق کبھی تباہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح قیام اپنے دونوں معنوں کی رو سے خانہ کعبہ پر صادق آتا ہے۔ یہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے برباد نہ کر سکے گی اور

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۹۸

جان لو کہ اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے اور کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۸۷۸

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ۹۹

پیغمبر پر سوائے پہنچا دینے کے کچھ نہیں - اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو -

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۱۰۰

کہہ ناپاک اور ستھرا برابر نہیں ، گو تجھے ناپاک کی بہتات تعجب میں ڈالے ، سو اے عقل والو اللہ کا تقوےٰ کرو تاکہ تم کامیاب ہو ۸۷۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۱۰۱

اے لوگو جو ایمان لائے ہو (بہت) چیزوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں تکلیف دیں اور اگر تم ایسے وقت میں ان کے متعلق سوال کرو جب قرآن نازل کیا جا رہا ہے تو تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی اللہ نے اسے معاف کر دیا اور اللہ بخشنے والا بُردبار ہے ۸۸۰

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا

تم سے پہلے ایک قوم نے ان (باتوں) کا سوال کیا - پھر ان کا

جو روحانیت اس سے پیدا ہوتی ہے وہ بھی کبھی برباد نہ ہوگی بلکہ دنیا کی زندگی کا موجب ثابت ہوگی -

باقی تین چیزوں کا ذکر بھی یہی بتانے کو ہے کہ نہ صرف خانہ کعبہ ہی آخر دنیا تک قائم رہے گا - بلکہ وہ چیزیں بھی جن کا اس سے تعلق ہے - حرمت والے مہینے جن میں حج کیا جاتا ہے اور ہدی اور قلائد جن کی قربانی کی جاتی ہے - پس مراد اس سے یہ ہے کہ اس کا حج بھی ہمیشہ ہوتا رہے گا - اور اس کے حج کا بند ہونا لوگوں کی ہلاکت کی نشانی ہوگی - یہاں حاجیوں کا ذکر نہیں کیا ، بلکہ ایام حج اور قربانیوں کا ذکر کر دیا ہے جب ان کی بھی حفاظت ہوگی تو حاجیوں کی خود حفاظت ہوتی - چنانچہ عطاء سے یہ معنی مروی ہیں کہ جب تک لوگ اس گھر کا حج کرتے رہیں گے ہلاک نہیں ہوں گے اور جب حج ترک ہو جائے گا تو ہلاک ہو جائیں گے -

اس کو بڑی عظیم الشان پیشگوئی قرار دیا ہے یعنی اس کی صداقت سے معلوم ہو جائے گا - کہ اللہ تعالیٰ غیب کا جاننے والا ہے - ایسا دعویٰ کسی گھر کے متعلق دنیا میں نہیں کیا گیا اور کیا عجیب بات ہے کہ باوجود ہزارہا قسم کے منصوبوں کے کوئی شخص خانہ کعبہ کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا - عیسائیوں پر یہ سب سے بڑھ کر اتمام حجت ہے کیونکہ سب سے زیادہ طاقت ان کو دی گئی ہے اور سب سے بڑھ کر زور بھی انہوں نے ہی لگایا ہے اشاعت مذہب کے ذریعہ سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی اس میں کامیاب نہ ہوئے ملکی طور پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس میں ناکام ہوں گے -

۸۷۸ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کعبہ کو نقصان پہنچانا چاہو گے تو اللہ کی طرف سے سخت سزا آئے گی مگر اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے کئی قصوروں سے درگزر بھی کرتا رہتا ہے

۸۷۹ ناپاک کی کثرت اب بھی ایک عالم کو تعجب میں ڈالے ہوئے ہے مگر ناپاک اور طیب برابر نہیں اور طیب آخر کار غالب آئے گا -

۸۸۰ اس ساری سورت میں شریعت پر زور دیا ہے اور اسکی تفصیلات کو بیان کیا ہے - مگر قرآن کریم نے ہر جگہ افراط و تفریط کے پہلوؤں کو مدنظر رکھا ہے - جس طرح پچھلے رکوع میں عبادت میں غلو کو روکا اسی طرح یہاں تفصیلات شریعت میں غلو کو روکتا ہے اس لیے فرمایا کہ تم بہت سوال نہ کیا کرو - اللہ خود جن احکام کو انسانوں کی رہبری کے لیے ضروری سمجھتا ہے دے دیگا - جس طرح شریعت کا نہ ہونا انسان کے لیے موجب تکلیف ہے - اسی طرح چھوٹے چھوٹے امور میں احکام شریعت موجب تکلیف ہو جاتے ہیں - اسلامی شریعت نے اعتدال کا پہلو اختیار کیا ہے - ضروری تفصیلات دے بھی دی ہیں - مگر بہت سی باتوں کو چھوڑ بھی دیا ہے تاکہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے اور چونکہ احکام قرآنی میں تو تبدیلی ہو نہیں سکتی ، لیکن اجتہاد حالات زمانہ کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اور بلاشبہ بہت سے تفصیلی امور میں تبدیلی حالات کے لحاظ سے تبدیلی حکم کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہی طریق احسن تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں احکام قرآنی نہ دیئے جاتے اور ضروریات پیش آمدہ کے مطابق اجتہاد سے کام لیا جاتا - حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ لوگ رسول اللہ صلعم سے چھوٹے چھوٹے سوالات کیا کرتے تھے جس پر آپ اظہار ناراضگی فرماتے ، وہ بھی اسی کا موید ہے -

عفا اللہ عنہا سے یہ مراد ہے کہ باوجود تمہارے ایسے سوالوں کے اللہ تعالیٰ نے تم پر مشقت نہیں ڈالی -

بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

انکار کرنے والے ہو گئے ۸۸۱

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ
وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اللہ نے نہ کوئی بحیرہ بنایا ہے اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام - لیکن جو کافر ہوئے وہ اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے ۸۸۲

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا
عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس کی طرف آؤ، جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف، کہتے ہیں ہمارے لیے وہ بس ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا - کیا اگرچہ ان کے بڑے نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں -

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا
يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى
اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جانوں کی فکر کرو - جو گمراہ ہوا وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تم ہدایت پر ہو تم سب نے اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے سو وہ تم کو اس کی خبر دیگا جو تم کرتے تھے ۸۸۳

ع ۸۸۱ پہلی قوم سے جب نام نہ لیا جائے عموماً بنی اسرائیل ہی مراد ہیں - ان کی شریعت میں بہت سے چھوٹے چھوٹے امور کا ذکر ہے شاید وہ ایسے سوال بھی کرتے ہوں اور ابن عباسؓ سے روایت ہے جیسے عیسائیوں نے مائدہ کا سوال کیا پھر ناشکری کی (ج)

ع ۸۸۲ بحیرۃ - بحر سے ہے جس کے معنی شق کرنا ہیں جس اونٹنی کا کان چیرا جائے اسے بحیرۃ کہتے تھے یعنی جب اونٹنی دس بچے جنتی اور آخری نر ہوتا تو اونٹنی کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا اور اس سے کسی قسم کا کام نہ لیا جاتا -

سائبۃ - ساب سے ہے جس کے معنی ہیں زمین پر چلا - وہ اونٹنی جو نذر مان لینے کی وجہ سے یا دس مادہ بچے جننے کی وجہ سے آزاد چھوڑ دی جاتی اور کسی چارہ یا پانی سے اس کو نہ روکا جاتا -

وصیلۃ - وصل سے ہے جس کے معنی ملانا ہیں اس کی بہت سی تشریحات کی گئی ہیں بعض کے نزدیک وہ بکری ہے جو سات دفعہ دو دو بچے جنے - آخر میں اگر ایک نر اور ایک مادہ ہو تو ماں کا دودھ صرف مرد پیتے اور زجاج نے کہا ہے کہ وہ وہ بکری ہے جو نر جنتی تو دیوتاؤں پر چڑھایا جاتا - لیکن اگر مادہ کے ساتھ نر ہوتا تو بچڑے بچا لیا جاتا -

حام حمی سے ہے محفوظ رکھنا - وہ نر جس سے سواری کا کام نہ لیا جائے - عموماً ایسے نر جن کی نسل شروع ہو جاتی یا دس بچے ایک مادہ سے ہو جاتے ان سے پھر سواری کا کام نہ لیتے تھے -

یہ تمام رسوم شرک سے تعلق رکھتی تھیں گویا بتا دیا کہ گو تفصیلات شریعت میں آزادی بھی بہت دی ہے مگر شرک چونکہ سب بدیوں کی جڑ ہے اس لیے اس کے متعلق ہر قسم کی رسوم جڑ سے کاٹنی ضروری ہیں مسلمان غور کریں کہ مشرکانہ رسوم سے اللہ تعالیٰ نے کس قدر بچنے کی تاکید فرمائی ہے اور ان کے گھروں میں کس طرح مشرکانہ رسوم جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں -

ع ۸۸۳ ضال قوم کی کثرت کے وقت علاج: ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت ان قوموں کے لیے ہے جو بعد میں آنے والی ہیں - ابن مسعودؓ کہتے ہیں یہ آخری زمانہ کے لیے ہے (ج) اور یہی بات حق بھی معلوم ہوتی ہے لا یضرکم من ضل میں بتا دیا ہے کہ جب ضالین کی کثرت ہو تو یہ مت گمان کرو کہ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں بشرطیکہ تم خود ہدایت پر قائم ہو - اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کو ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہدایت پر ہونے کا ایک جزو لازم ہے کہ دوسروں کو ہدایت کی طرف بلائے وتواصوا بالحق (العصر ۱۰۳: ۳) بلکہ ہدایت کی طرف بلانے میں تکلیفیں اٹھائے وتواصوا بالصبر (العصر ۱۰۳: ۳) پس یہ آیت مسلمانوں کو یہ نہیں بتاتی کہ جب چاروں طرف ضلالت پھیلی ہوئی دیکھو تو تم اپنی ہی فکر کرو - دوسروں کو دین کی طرف نہ بلاؤ بلکہ یہ مسلمانوں کی ایک گری ہوئی حالت کا نقشہ کھینچا ہے - جب ضالین ان کے چاروں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا
حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ
اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ
غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ
فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا
مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ
ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا
قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا
لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمھاری آپس میں گواہی وصیت کے وقت جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آموجود ہو۔ دو اپنوں میں سے صاحب عدل لوگوں کی ہے۔ یا کوئی اور دو تمھارے غیر میں سے، اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو پھر تم کو موت کی مصیبت پہنچے۔ ان دونوں کو تم نماز کے بعد روک لو۔ پس اگر تم کو شک ہو تو دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس کے عوض کچھ قیمت نہ لیں گے، گو وہ قریبی ہو۔ اور ہم اللہ کی شہادت کو نہ چھپائیں گے۔ بیشک اس صورت میں ہم گنہگاروں میں سے ہونگے ۸۸۴

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ
يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ
عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ
اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ
اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

پھر اگر معلوم ہو کہ ان دونوں نے گناہ سے حق لیا ہے تو دو اور ان دو کی جگہ کھڑے ہوں اُن میں سے جن سے دو پہلوں نے (گناہ سے) حق لیا ہے سو وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم حد سے نہیں بڑھتے۔ بیشک اس صورت میں ہم ظالموں میں سے ہوں گے ۸۸۵

طرف ہونگے اور ان کو بتایا ہے کہ تم کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ دوسروں کی وجہ سے نہیں تم اپنی فکر کرو اپنے حالات کو درست کرو خود ہدایت پر قائم ہو جاؤ پھر تم کو کوئی ضال نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کاش آج مسلمان اس پر توجہ کریں اور بجائے دوسروں کا رونا رونے کے پہلے اپنی حالت کی اصلاح کریں۔ نبی کریم صلعم سے جو تفسیر اس آیت کی ایک حدیث میں آئی ہے وہ بھی یہی بتاتی ہے ترمذی میں ہے آپ نے فرمایا یا ائتمروا بالمعروف وتناھوا عن المنکر فاذا رایتم شحا مطاعا وھوی متبعا واعجاب کل امرئ برأیه فعلیکم انفسکم لا یضرکم ضلالة غیرکم یعنی نیک باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے روکو پھر جب تم دیکھو کہ بخل کی اطاعت کی جاتی ہے اور حرص وہوا کی پیروی کی جاتی ہے اور ہر ایک شخص اپنی رائے پر خوش ہے تو تم اپنی جانوں کی فکر کرو، غیروں کی ضلالت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس حدیث کے آخر میں بھی ایسے الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری زمانہ کے لیے ہے اور مسند احمد میں حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے خطبہ میں فرمایا کہ تم اس آیت سے غلط مطلب نکالتے ہو میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ جب بُری بات کو دیکھ کر لوگوں کو اس سے نہیں روکیں گے اللہ تعالیٰ ان پر ایسی سزا بھیجے گا جو سب کو شامل کرے گی (رث) ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں احفظوھا والزموا اصلاحھا یعنی اپنی حفاظت کرو اور اپنی اصلاح کرو۔ یعنی ایک دوسرے کو امر و نہی کے احکام سناؤ۔

۸۸۴ کہا جاتا ہے کہ یہ آیت تمیم داری اور اس کے بھائی عدی کے بارہ میں نازل ہوئی مگر کہنا یوں چاہیئے کہ وہ قصہ بھی اس آیت کے ماتحت آتا ہے اور آیت عام ہے اس آیت میں وصیت کے متعلق شہادت کا حکم ہے اس کے یہاں لانے کی یہ وجہ ہے کہ جب چھوٹے چھوٹے سوالات سے روکا تو اب خود ہی یہ بھی بتا دیا کہ ضروری احکام کو قرآن شریف نے خود بیان کر دیا ہے۔ ایک طرف شرک کے متعلق ہر قسم کے رواجات کو رد کیا تو دوسری طرف حفاظت مال کے قوانین کی بھی ضروری تفصیلات کو بیان کر دیا یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وصیت کا حکم جو سورۃ بقرہ میں ہے وہ کبھی منسوخ نہیں ہوا کیونکہ اس آیت کا نزول آیت توریث سے بہت بعد کا ہے۔

اخران من غیرکم میں گواہی اپنوں کی یعنی مسلمانوں کی بھی جائز رکھی ہے اور غیروں کی یعنی غیر مسلموں کی بھی اور یہ جو فرمایا ان انتم ضربتم فی الارض یعنی سفر کی حالت میں ہو تو یہاں صرف ایک سخت ضرورت کی حالت کو بیان کیا ہے یہ شرط نہیں کہ اس کے سوائے گواہ یا وصیت نہ ہوں تحبسونھما میں جو روکنے کا ذکر ہے وہ شہادت لینے کے وقت ہے نماز کے بعد اس لیے کہا کہ نماز میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہ معاملہ ایک مشکوک شہادت کا ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ صلوٰۃ سے مراد ہر ایک اہل دین کی اپنی اپنی صلوٰۃ ہے یعنی اگر گواہ عیسائی ہوں تو ان کے مذہب کی صلوٰۃ کے بعد۔ پس یہاں مراد صلوٰۃ سے مطلق دعا ہی لینا چاہیئے۔

۸۸۵ عثر۔ عثر الرجل کے معنی ہیں وہ گر گیا پھر اس کا استعمال اس پر ہوتا ہے جو بغیر طلب کرنے کے کسی امر پر اطلاع پائے (غ)۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
ع ١٤ الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٨﴾

یہ بہت قریب (طریق) ہے کہ وہ شہادت کو سچ سچ ادا کریں یا ڈریں کہ ان کی قسموں کے بعد اور قسمیں لوٹائی جائیں گی - اور اللہ کا تقوٰی کرو اور سنو اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۸۸۶

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿١٠٩﴾

جس دن اللہ پیغمبروں کو جمع کرے اور کہیگا تمھیں کس طرح قبول کیا گیا - کہیں گے ہمیں کوئی علم نہیں - تو ہی غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے ۸۸۷

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ
نصف نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔــةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ

جب اللہ نے کہا اے عیسٰی ابن مریم میری نعمت کو یاد کر (جو میں نے) تجھ پر اور تیری ماں پر (کی) جب میں نے روح القدس کے ساتھ تیری تائید کی تُو لوگوں سے جھولے میں اور اور بڑھاپے میں باتیں کرتا تھا اور جب میں نے تجھے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھائی اور جب تو میرے حکم سے مٹی سے پرند کی صورت کی مانند اندازہ کرتا پھر اس میں پھونکتا، سو وہ میرے حکم سے اڑنے والا ہو جاتا اور تو شب کور اور

استحقا - اِسْتَحَقَّ الشَّیْءَ کے معنی ہیں - اِسْتَوْجَبَہٗ یعنی اسے واجب کر لیا (ل) پس استحقا اثما سے مراد ہوئی کہ انہوں نے گناہ کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہے یعنی گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور الذین استحق علیھم الاولین میں اوّلین استحق کا فاعل ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اثم جو ابھی آ چکا ہے اور علیھم سے مراد اُن کے خلاف ہے پس جملہ کے معنی یوں ہوئے کہ دو اور گواہ ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کے خلاف پہلے دو نے ارتکاب جرم کیا ہے یعنی وارثانِ میّت سے۔

یہاں یہ بتایا ہے کہ گواہوں کی گواہی جب اس کے خلاف قرائن ہوں دوسرے گواہوں سے رد کی جا سکتی ہے یہ نہیں کہ جھوٹے گواہوں کی گواہی کا کوئی علاج نہیں اور مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے گواہوں کے جھوٹ بولنے پر کوئی قرینہ ہے تو وہ لوگ جو مال کے حقدار ہیں ان کے خلاف گواہ پیش کر سکتے ہیں۔

۸۸۶ شہادت کے علٰی وجھھا ادا کرنے سے مراد اس کا سچ سچ ادا کرنا ہے اس قانون کے ماتحت ہر گواہ کو یہ فکر ہو گی کہ اس کی گواہی اگر وہ جھوٹ بولے تو رد بھی ہو سکتی ہے قسموں کے لوٹائے جانے سے مراد قسموں کا دوسروں کی طرف لوٹانا ہے یعنی اور گواہ بلائے جائیں گے۔

۸۸۷ ماذا اجبتم - اجابت کے معنی قبول کرنا ہیں جیسے اجیبوا داعی اللہ (الاحقاف ۴۶-۳۱) پس یہاں معنی ہیں بای اجابۃ اجبتم کس قسم کی قبولیت سے تمہیں قبول کیا گیا - اور جواب دینا مراد نہیں ورنہ ماذا کی جگہ بماذا ہوتا۔

اس رکوع میں اصل غرض تو عیسائیوں کا انہماک لذات دنیوی کا بیان کرنا ہے - لیکن اس کا آغاز ایک عام بیان سے کیا ہے کہ قیامت کے دن سب رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری قبولیت جو تمہارے پیروؤں نے کی کس رنگ میں کی تھی - یعنی آیا ان کے مدّنظر رضائے الٰہی تھی یا دنیا کی طرف جھک گئے اور حق کو چھوڑ دیا - اگلے رکوع میں یہی عام سوال خصوصیت سے حضرت عیسٰیؑ سے کیا ہے - یہاں بھی سوال کی اصل غرض عیسائیوں کی حالت کی طرف توجہ دلانا ہے - جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے جو حضرت عیسٰیؑ کو قبول تو یہاں تک کرتے ہیں کہ غلو کر کے بشر سے خدا بنا دیا - مگر زندگی کی غرض صرف دنیا اور اس کی لذات کا حصول ہے اور سوال مائدہ میں بھی اسی طرف توجہ دلائی ہے - یہی وجہ ہے کہ رسولوں کا جواب ہے کہ ہمیں کوئی علم نہیں - کیونکہ جو کچھ ان کی امتوں نے ان کے بعد کیا اس کا علم صرف علام الغیوب کی ذات کو ہی ہو سکتا ہے اور یہ سوال محض پیغمبروں کی امتوں پر بطور اتمام حجت ہے کہ انبیاء ان میں کس غرض کے لیے آئے تھے اور ان کا قدم کدھر جا رہا ہے - اگلا رکوع اسی کی مزید تشریح کرتا ہے اور خود اس رکوع کی آیت ۱۱۱ و ۱۱۲ بھی یہی بتاتی ہیں۔

وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی
بِاِذْنِیْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ
اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۱۰﴾
وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ
وَبِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾
اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ
هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا
مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾

مبروص کو میرے حکم سے اچھا کرتا اور جب تو میرے حکم سے مُردوں کو نکالتا اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا، جب تو ان کے پاس دلائل لے کر آیا تو جو اُن میں سے کافر ہوئے اُنھوں نے کہا یہ صرف کھلا جادو ہے ۸۸۸

اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ اُنھوں نے کہا ہم ایمان لائے اور گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں ۸۸۹

جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم کیا تیرا رب طاقت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے کھانا نازل کرے (حضرت عیسیٰؑ نے) کہا، اللہ کا تقویٰ کرو۔ اگر تم مومن ہو ۸۹۰

ع ۸۸۸ کففت۔ کَفّ کے اصل معنی ہاتھ سے روکنا ہیں پھر عام ہوگیا ہے یعنی کسی طرح پر روکنا (غ) اس لفظ کے استعمال سے بھی یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان پر چلے گئے کیونکہ بنی اسرائیل کو روکنا بتاتا ہے کہ وہ ان کو پکڑ نہیں سکے اور نہ ان کو ہاتھ لگا سکے۔ یہ استدلال بہت ہی عجیب ہے گویا سب پیغمبروں کو تو اُن کے دشمن ایذائیں پہنچاتے رہے مگر حضرت عیسیٰؑ کچھ ایسے نرالے رسول تھے کہ کسی دشمن کا ہاتھ بھی ان کو نہ چھو سکا بنی اسرائیل کو روکنے کا منشا تو صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے منصوبہ میں جو حضرت عیسیٰؑ کے خلاف کیا کامیاب نہ ہو سکے۔ ورنہ جو حالات دشمنوں سے سخت ترین تکلیفیں اُٹھانے کے اوروں کو پیش آئے وہ حضرت عیسیٰؑ کو بھی آئے۔ باوجود وعدہ لیعصمك من الناس کے اگر آنحضرت صلعم زخم کھا کر گر جاتے ہیں اور مشہور ہو جاتا ہے کہ محمد صلعم قتل ہو گئے۔ اگر ایک یہودی عورت آپ کو زہر دے سکتی ہے تو کففت میں کوئی نقص واقع نہیں ہو سکتا اگر یہودی مسیح کو پکڑ کر صلیب سے لٹکا دیں مگر اللہ تعالیٰ آپ کی جان بچا لے۔

سحر۔ سِحر کے معنی کے لئے دیکھو ع ۱۲۹ کفار انبیاء کو ساحر ہی کہتے رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق آتا ہے یٰاَیُّهَ السّٰحِرُ (الزخرف ۴۳-۴۹) اور آنحضرت صلعم کو بھی ساحر کہتے تھے۔ چنانچہ سورۃ یونس کے شروع میں ہے کہ لوگوں کو اس پر کیوں تعجب ہوتا ہے کہ ہم نے ایک شخص کی طرف وحی کی ہے کہ بدکرداروں کو ڈرائے اور نیکوں کو خوشخبری دے اور جب رسول یہ پیغام دیتا ہے تو کافر کہتے ہیں ان هٰذا لسحر مبین (یونس ۱۰-۲) امام راغبؒ نے سِحر کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کبھی کسی فعل کو اس کے حسن کی وجہ سے سحر کہا جاتا ہے جیسے ان من البیان لسحرا میں، اور کبھی اس کے فعل کی دقت یعنی باریکی کے لحاظ سے ایک چیز کو سحر کہا جاتا ہے۔ جیسے غذا کو اس کی باریک اور لطیف تاثیر کی وجہ سے سِحر کہہ دیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں بھی یہی دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک طرف اس کا حسن اور دلکشی کہ طبائع سلیمہ مجبور ہو کر اس کی طرف کھینچی چلی جاتی ہیں اور ان کا اثر بھی بہت باریک اور لطیف ہوتا ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ کفار انبیاء کو ساحر کہتے رہے اور اسی لیے یہودیوں نے بھی حضرت عیسیٰؑ کے کاموں کو سحر کہا۔

باقی تمام امور پر مفصل بحث سورۃ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ یہاں ان کو اس غرض کے لیے بیان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا اصل مقصد تو روحانی مردوں کو زندہ کرنا، روحانی بیماروں کو شفا دینا اور مستعد فطرتوں کو زمینی خیالات سے بلند کر کے روحانیات کی بلندیوں میں پرواز کرانا تھا مگر ان لوگوں نے روحانی امور کو بھی جسمانی خیال کیا اور پستی کی طرف جھک گئے۔

ع ۸۸۹ وحی کے معنی کیلئے دیکھو ع ۷۸ حواریوں کی طرف وحی کرنا صاف بتاتا ہے کہ وحی غیر انبیاء کو بھی ہوتی ہے یہ خیال کہ حواری بھی نبی ہوں گے بدیہی البطلان ہے۔ ان کی اصلاح کے لیے تو حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے پھر آگے ان کا سوال کہ ہم پر مائدہ آئے۔ تو ہم کو یقین آئے گا کہ تو ہم سے سچ بولتا ہے۔ صاف بتاتا ہے کہ وہ نبی نہ تھے۔ پس ان کی وحی انبیاء والی وحی نہ تھی اور باوجود اس وحی کے ان کو حضرت عیسیٰؑ کی صداقت پر یقین کامل نہیں ہوا۔

ع ۸۹۰ یستطیع۔ استطاعة طاقت رکھنے کو کہتے ہیں لیکن بعض اہل لغت نے یستطیع بمعنی یطیع یا یجیب بھی لکھا ہے یعنی قبول کرے گا۔

مائدة۔ مید سے ہے جس کے معنی کھانا دینا بھی آتے ہیں۔ مادنی اَطْعَمَنِی (غ) اور مائدة اس خوان کو کہا جاتا ہے جس پر کھانا ہو اور کھانے کو بھی کہا جاتا ہے (غ) اور یہاں مراد کھانا ہے نہ خوان جیسا کہ عیدا لاولنا و اٰخرنا بتاتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مائدہ سے یہاں مراد علم ہے اور علم کو مائدة اس لحاظ سے کہا کہ وہ قلوب کی غذا ہے (غ) مگر یہ خیال حضرت عیسیٰؑ کے خیالات کو مدنظر رکھنے سے پیدا ہوا ہے۔

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ
قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ
عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝١١٣

انھوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل اطمینان پائیں اور ہم جان لیں کہ ضرور تو نے ہم سے سچ کہا ہے اور اس پر گواہ ہو جائیں ۸۹۱

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ
اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ
لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ
وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝١١٤

عیسیٰؑ ابن مریم نے کہا اے اللہ ہمارے رب ہم پر آسمان سے کھانا نازل کر وہ ہمارے لیے عید ہو ہمارے پہلوں کے لیے اور ہمارے پچھلوں کے لیے) اور تیری طرف سے نشان ہو اور ہم کو رزق دے اور تو ہی بہتر رزق دینے والا ہے ۸۹۲

یہ آیت اس رکوع کے اصل مضمون کی طرف توجہ کو پھیرتی ہے۔ باوجودیکہ حواریوں کو الہام بھی ہوا کہ وہ رسول پر ایمان لائیں مگر اس زمانہ کے یہودیوں کی حالت ایسی پستی کی تھی کہ دنیوی آسائش کا خیال دل سے نہیں گیا۔ اور حواری تھے بھی معمولی درجہ کے لوگ، ماہی گیر، محصول لینے والے۔ اور ایسے لوگ عموماً بلند خیالات کے مالک نہیں ہو سکتے اس لیے کھانے کی درخواست کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کا جواب بڑا لطیف ہے۔ دعویٰ تو مومن ہونے کا کرتے ہو اور نبی مومنوں کو تقویٰ کی راہوں پر چلانے آتا ہے نہ جسمانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے۔ پس تم بھی مومن ہو تو تقویٰ کی راہوں پر چلو جو میری بعثت کی غرض ہے۔

۸۹۱ حواریوں کی روحانی حالت: ان الفاظ سے حواریوں کی اصل حالت کا اندازہ لگتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بار بار شکایت کرتے ہیں جیسا کہ اناجیل میں ہے کہ تم میں ایمان نہیں، اور اگر تم میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہوتا تو تم یوں کرتے اور ووں کرتے، اور کبھی پطرس جیسے مقرب حواری کو شیطان کے نام سے یاد کرتے ہیں، تو یہ بلا وجہ نہ تھا۔ اور وہ دیکھ رہے تھے کہ خواہشات دنیا کا ان پر غلبہ ہے۔ اور گو روحانیت میں کچھ ترقی کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر پھر بھی کھانے پینے کے جسمانی خیالات پیچھا نہیں چھوڑتے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں کی قوموں کی حالت کمزور نظر آتی ہے۔ ان کے بالمقابل نبی کریم صلعم کے صحابہؓ کا روحانی کمال ایک آفتاب کی طرح روشن ہے۔ تعجب ہے کہ باوجود الہام کے ابھی تک ان کو یقین کامل نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ ان سے جو کچھ کہتے ہیں سچ ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ سچ مچ قبروں سے مُردے نکال کر زندہ کر دیا کرتے تھے اور مٹی کی شکلیں بنا کر ان کو سچ مچ کے پرند بنا دیتے تھے، ان کے لیے بھی یہاں سبق ہے کہ اگر ایسے کھلے معجزات ہوئے ہوتے تو حواری حضرت مسیحؑ کو سچا جاننے کے لیے ایک مائدہ کے اُترنے کے کیوں محتاج ہوتے۔ قبروں سے مُردوں کا نکل آنا اور مٹی کی شکلوں کا پرند بن جانا تو مائدہ کے اُترنے سے بہت زیادہ کھلے معجزے ہیں۔ جو لوگ یہ دیکھ چکے ہوں وہ مائدہ کے محتاج نہیں ہو سکتے۔ پس کم از کم قرآن کے نزدیک مُردوں کے نکالنے وغیرہ معجزات سے ظاہری معنی ہرگز مراد نہیں۔

۸۹۲ عید۔ عود سے ہے جس کے معنی لوٹ کر آنا ہیں، اور عید وہ ہے جو لوٹ کر آئے۔ اور خوشی کے دن کے ساتھ یہ لفظ مخصوص ہو گیا ہے اور شریعت میں یوم الفطر اور یوم النحر سے مخصوص ہے (غ)

حضرت عیسیٰؑ کی دعائے مائدہ: ایک مرتبہ نصیحت کر کے آخر حضرت عیسیٰؑ دعا کرتے ہیں اور اپنی قوم کی خواہش کو پورا کرتے ہیں جس طرح حضرت موسےٰؑ کو اپنی قوم کی خواہش اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً کی وجہ سے یہ دعا کرنی پڑی: رب ارنی انظر الیک۔ مگر بجائے مائدہ کے جو صرف حواریوں پر نازل ہوا آپ ایسے مائدہ کی درخواست کرتے ہیں جو پہلوں اور پچھلوں کے لیے یکساں موجب سرور ہو۔ اس دعا کی قبولیت میں موجودہ حالات کچھ شک باقی نہیں رہنے دیتے۔ کھانے کے معاملہ میں عیسائیوں کے ہاں عید ہی عید ہے۔ پہلوں اور پچھلوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ان کو روٹی کے ساتھ کچھ فکر آخرت کی بھی تھی اب روٹی اور پیٹ کی پوجا ہی باقی رہ گئی ہے۔

آنحضرت صلعم کو اُمت کی روحانیت کا فکر: مگر کیا یہ حالت رشک کے قابل ہے؟ ہمارے نبی کریم صلعم نے جو دُعا اپنی امت کے برگزیدہ لوگوں کے لیے کی ہے وہ یہ ہے کہ اے خدا آلِ محمدؐ کا رزق کفاف ہو۔ یعنی اس قدر دنیا کے سامان میں انہماک نہ ہو کہ وہ آخرت کو بھول جائیں۔ یہ دنیا کا حقیقی روحانی معلّم ہے۔ جس کو اپنی امت کی روح کی فکر ہے۔ اس چیز کی فکر ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ مگر حضرت مسیحؑ پر کچھ الزام نہیں جس قسم کا قوم کا میلان دیکھا اسی قسم کی دعا کی اور وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ ابھی روحانیت کو ضروری کمال دنیا میں حاصل نہ ہوا تھا۔ اس لیے انبیاء اپنی اپنی قوم کی حالت کے مطابق ہی تعلیم دیتے تھے۔ حضرت مسیحؑ کے معجزات میں بھی کھانے پینے کا بہت ذکر ہے۔ کہیں تھوڑی سی روٹیاں بہت لوگوں کو کفایت کرتی ہیں (یوحنا ۶: ۱-۱۴) تو کہیں اٹھارہ من پانی کی شراب بن جاتی ہے اور لوگ پی پی کر بدمست ہوتے ہیں۔ (یوحنا ۲: ۱-۱۱) اور اسی معجزہ کا اثر آج یورپ میں نمایاں ہے دعا کرتے ہیں تو وہاں بھی روز کی روٹی کی دعا ہی سب پر مقدم کرتے ہیں "ہماری روزینہ کی روٹی آج ہم کو بخش" (متی ۶: ۱۱)۔ سو عیسائیوں کو روٹی بھی مل گئی اور شراب بھی۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا میں نیکی اور اخلاق کا معلّم بنے۔ روٹیاں بھی خدا دیتا ہے مگر سچ یہی ہے کہ انسانیت کا نصب العین کھانا پینا نہیں۔ بلکہ نیکی اور اخلاق ہیں۔ اتقوا اللّٰه ان کنتم مؤمنین۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ
یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا
لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع ۵

اللہ نے کہا میں اس کو تم پر اتارنے والا ہوں - پھر جو کوئی تم میں سے (اس کے) بعد ناشکری کرے تو میں اُسے ایسا عذاب دوں گا کہ تمام جہان میں اور کسی کو ایسا عذاب نہیں دونگا ۸۹۳

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ
قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ
لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ
كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ
نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

اور جب اللہ نے کہا اے عیسیٰؑ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا ۸۹۴ کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنالو؟ (عیسیٰؑ نے) کہا، تو پاک ہے مجھے کہاں شایاں تھا کہ میں وہ کہوں، جس کا مجھے حق نہیں - اگر میں نے ایسا کہا ہوتا، تو تجھے ضرور اس کا علم ہوتا، تو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے تو ہی غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے ۸۹۵

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا
مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ
الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا، کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب اور تمہارا رب ہے ۸۹۶ اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں تھا، پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے ۸۹۷

---

۸۹۳ یعنی دنیوی نعمتیں دی جائیں گی، لیکن ان کی ناشکری کا نتیجہ بھی پھر ویسا ہی بُرا ہوگا - عیسائی قوموں کے پاس دنیا کی دولت اور دنیا کی آسائشیں بہت جمع ہوگئی ہیں اور دنیا کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ حد درجہ کی آسائش کے بعد مصائب کا دور شروع ہوتا ہے۔

۸۹۴ حضرت عیسیٰؑ سے عالم برزخ میں سوال: یہ کلام عالم برزخ کا ہے جو نزولِ قرآن سے پہلے ہو چکا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں اسی کی تفسیر میں حدیث ہے کہ قیامت کے دن نبی کریم صلعم اپنی امّت کے بعض لوگوں کو دوزخ کی طرف جاتے دیکھیں گے۔ آگے لفظ ہیں فاقول کما قال العبد الصالح میں کہوں گا، جیسے عبد صالح یعنی عیسےٰؑ نے کہا، جہاں اپنے لیے صیغہ مضارع اور حضرت عیسیٰ کے لیے صیغہ ماضی استعمال کیا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے۔

مریم کی الوہیت: حضرت عیسیٰؑ کا خدا بنانا تو ظاہر ہے۔ مریمؑ کو بھی عیسائیوں کے بعض فرقوں نے صفات الوہیت دی ہیں۔ چنانچہ رومن کیتھولک اس کے بُت بنا کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ "خدا کی ماں" اس کا خطاب ہی بتاتا ہے کہ اس کو کیا مرتبہ دیا گیا ہے، اور انسکلوپیڈیا بریٹینیکا میں ہے کہ تھریس عرب وغیرہ مقامات میں بعض عورتیں مریمؑ کو خدا کی طرح پوجتی تھیں۔ اور مریمؑ سے دعاؤں کا مانگنا بھی جائز رکھا گیا ہے۔ گو قرآن شریف نے مریمؑ کو کہیں تثلیث کا اقنوم ثالث کرکے بیان نہیں کیا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر باپ، بیٹے، روح القدس کی بجائے تثلیث کے تین اقنوم ماں، باپ اور بیٹا تجویز کیے جاتے تو بہت زیادہ موزوں تھا۔

۸۹۵ پہلا جواب حضرت عیسےٰؑ نے یہ دیا ہے کہ میرے لیے یہ کہاں شایاں تھا کہ میں ایسا کہتا۔ مگر اس سے بھی پہلے کہا سبحانک یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات تمام عیوب سے پاک ہے اور اس کے ساتھ کوئی خدا یا معبود یا بیٹا بنانا اس کی صفات میں نقص پیدا کرنا ہے ما فی نفسی سے مراد ایسی باتیں ہیں جو انسان مخفی رکھے۔ کیونکہ دل میں جو بات رکھی جائے وہ مخفی ہوتی ہے ظاہر نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح ما فی نفسک سے مراد وہ باتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ مخفی رکھے۔ ان کا علم بندہ کو نہیں ہو سکتا۔

۸۹۶ یہ دوسرا جواب ہے کہ میں نے انہیں کیا کہا۔ وہ وہی تھا جو خدا نے حکم دیا یعنی یہ کہ "اللہ کی عبادت کرو، جو میرا اور تمہارا رب ہے" "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر" (متی ۴: ۱۰)

۸۹۷ حضرت عیسیٰؑ کا اقرار توحید اور تعلیم: یہ تیسرا جواب ہے کہ نہ صرف میں نے توحید کی تعلیم دی بلکہ جب تک ان میں تھا تو ان پر گواہ بھی تھا یعنی دیکھتا رہا کہ وہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور میری عبادت نہیں کرتے۔ پس یوں تین طرح نفی کی اول یہ کہ یہ نبی کو شایاں نہ تھا کہ ایسی تعلیم دیتا، دوسرے یہ کہ اس کے خلاف خدائے واحد کی عبادت کی تعلیم دی، تیسرے یہ کہ آپ کی زندگی میں وہ لوگ واقعی اس تعلیم پر قائم بھی رہے۔ ہاں ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میری وفات کے بعد ان کی کیا حالت ہو گئی۔ اس کو تو ہی جانتا ہے۔ مراد

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۱۸﴾

اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو ان کی حفاظت کرے تو تو ہی غالب حکمت والا ہے ع۸۹۸

قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۱۹﴾

اللہ نے کہا یہ وہ دن ہے کہ صادقوں کو ان کی سچائی نفع دیگی ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ہمیشہ انہی میں رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے یہ بڑی کامیابی ہے ع۸۹۹

لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور جو کچھ ان میں ہے اللہ کے لیے ہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ع۹۰۰

ظاہر ہے کہ غلط تعلیم میری وفات کے بعد ان میں پھیلی۔ جب تک میں ان میں تھا تب تک وہ صحیح تعلیم پر قائم تھے۔

یہ آیت حضرت مسیح کی وفات کو قطعی طور پر ثابت کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں عیسائیوں کا عقیدہ بگڑنے کا زمانہ حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد کا قرار دیا ہے اور چونکہ وہ عقیدہ نزول قرآن سے پہلے بگڑا ہوا تھا۔ اس لیے حضرت عیسیٰؑ کی وفات بھی نزول قرآن سے پہلے ہو چکی تھی۔ لفظ توفی کے معنی سو اس پر بحث ہو چکی ہے۔ دیکھو ع۴۴۴) علاوہ ازیں اس آیت کی جو تفسیر خود نبی صلعم سے مروی ہے وہ بھی اس کا قطعی فیصلہ کرتی ہے۔ حدیث بخاری میں ہے کہ جب قیامت کے دن میری امت کے بعض لوگ پکڑ کر دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نہیں جانتا کہ تیرے بعد انہوں نے کیا کیا فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم۔ یعنی میں وہی بات کہوں گا جو عیسیٰؑ نے کہی تھی اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو تو ہی ان پر نگہبان تھا۔ نبی کریم صلعم کا انہی الفاظ کو استعمال کرنا صاف بتاتا ہے کہ آپؐ کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی امت بھی حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد بگڑی۔ اور اسی طرح آپ کی امت آپ کی وفات کے بعد بگڑے گی۔ اس قطعیۃ الدلالت آیت اور اس حدیث صریح کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا انکار کرنا نصوص صریح کو رد کرنا ہے اور توفیتنی کے معنی سوائے وفات کے کچھ اور کرنا لغت کے خلاف ہے اور بخاریؒ نے ابن عباسؓ کے اثر متوفیک ممیتک کو یہاں بیان کر کے بتایا ہے کہ توفیتنی کے معنی سوائے وفات دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

ع۸۹۸ یہاں حضرت عیسیٰؑ شرک کی معافی کے لیے سفارش نہیں کرتے، بلکہ چونکہ یہ کلام عالم برزخ کا ہے جو نزول قرآن سے پہلے ہو چکا، اس لیے تغفر لہم سے مراد ان کی حفاظت کر دینا ہے اور وہ حفاظت بذریعہ رسول کے ہے جو صحیح پیغام پہنچا کر ان کو ان کی غلطی پر متنبہ کرتا ہے۔ اسی لیے آخری الفاظ انت الغفور الرحیم نہیں حالانکہ معافی کی سفارش ہوتی تو یہی ہونے چاہیئے تھے، بلکہ انت العزیز الحکیم ہیں۔ جو حضرت ابراہیمؑ نے بھی اس موقعہ پر بولے ہیں۔ جہاں ایک رسول کی بعثت کے لیے دعا کی ہے۔ ربنا وابعث فیہم رسولا منہم .... انک انت العزیز الحکیم (البقرۃ ۲ - ۱۲۹)۔ اور عزت یا غلبہ اور حکمت کی صفات کا ذکر ایسے ہی موقعہ پر موزوں ہے جہاں اصلاح کر دی جائے۔ یہی معنی سدی سے مروی ہیں ان تغفر لہم فتخرجہم من النصرانیۃ وتہدیہم الی الاسلام (ج) یعنی تغفر لہم سے مراد یہ ہے کہ ان کو نصرانیت سے نکال کر اسلام کی ہدایت فرمائے۔

ع۸۹۹ یوم سے مراد وہ یوم ہے جو اس حیات دنیا کے بعد شروع ہوتا ہے اور ینفع الصادقین صدقہم کے معنی اسی طرح پر ہیں جس طرح لیسئل الصادقین عن صدقہم (الاحزاب ۳۳ - ۸) میں یعنی کہ جس نے زبان سے سچائی کا اقرار کیا ہے اس کے فعل کے صدق کا سوال کرے۔ کیونکہ اعتراف حق کافی نہیں۔ جب تک کہ اس پر افعال صادقہ کی مہر نہ ہو (غ) صدق کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں، زبان سے سچ بولنا اور افعال سے سچ کر دکھانا۔ پس یہاں یہ بتایا ہے کہ اس زندگی کے بعد یا اس اُخروی زندگی میں انسان کو نفع پہنچانے والی دو چیزیں ہیں، ایک سچائی کا مان لینا، دوسرا اس پر عمل کرنا۔ تو وہ لوگ جنہوں نے سچائی کو قبول ہی نہ کیا وہ کیا نفع اٹھا سکتے ہیں۔

ع۹۰۰ سورت کے آخری الفاظ میں اپنی وسعت سلطنت پر فخر کرنے والی قوم کو بتایا ہے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کی ہی ہے انسانوں کا تصرف عارضی ہے حقیقی مالک ایک ہی ہے جو ہمیشہ رہے گا۔ ابن جریر میں ہے کہ مخاطب نصاریٰ ہیں۔

آیاتھا ۱۶۵

سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ مَکِّیَّۃٌ (۶)

رکوعاتھا ۲۰

نام۔ اس سورت کا نام الانعام ہے جس کے معنی چارپائے ہیں اور اس میں بیس رکوع اور ایک سو چھیاسٹھ آیات ہیں۔ سورت کا اصل مضمون توحید الٰہی کا بیان کرنا ہے اسی تعلق میں ان مشرکانہ رسوم کا ذکر آتا ہے جو چارپایوں کے متعلق عرب میں مروج تھیں یعنی بعض قسم کے اونٹوں بکریوں وغیرہ کی عزت و احترام جو شرک کی حد تک پہنچی ہوئی تھی ان کو سانڈھ کے طور پر چھوڑ دیتے تھے نہ ان پر کوئی سواری کر سکتا تھا نہ ان کو ذبح کیا جا سکتا تھا، نہ ان پر چرنے کے متعلق کوئی حد بندی عاید ہو سکتی تھی۔ اسی طرح کی اور بھی رسوم تھیں اسلام کی اصل غرض نہ صرف توحید کا وعظ تھا کہ چند بڑے بڑے عالی دماغ لوگ خوش ہو جائیں اور ان کے لیے ایک بلند خیالات کی دعوت کا سامان مل جائے بلکہ عوام الناس کی زندگی پر توحید کا عملی طور پر اثر ڈالنا اس کے مدنظر تھا۔ ان کے رسوم و رواج سے شرک سے تعلق رکھنے والی ہر بات کی بیخکنی کرنا اصل مقصود تھا۔ اس لیے توحید کو جس سورت میں بیان کیا اس کا نام ایسا تجویز کیا جس کا تعلق ہر فرد بشر کے گھر سے تھا اور ان رسوم سے تھا جو ہر گھر میں صدیوں سے گھر کی زندگی کا حصہ بنی ہوئی چلی آتی تھیں۔ یہ خیالی بات نہیں بلکہ حقیقت یہی ہے کہ توحید قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان رسوم کی بیخکنی نہ ہو جو شرک کے رنگ میں ہر گھر اور ہر انسان کی زندگی کا عملی طور پر جزو بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ملک ہندوستان کو لے لو۔ یہاں بُت پرستی اور انسان پرستی اور زنگارنگ کی من دُونِ اللہ پرستشیں ایک طرف رکھو اور گائے کی مشرکانہ عظمت کو دوسری طرف رکھو، ایک شخص کے لیے ان تمام قسم کی پرستشوں کو دور کرنا آسان ہے مگر گائے کی مشرکانہ عظمت کو جس کا تعلق ہر ہندو کے گھر سے اور ہر ہندو کی عملی زندگی سے ہے کوئی شخص دُور نہیں کر سکتا، سوائے اس کے جو توحید کامل کا زبردست معلم ہو۔ سوامی دیانند جی کے لیے یہ آسان امر تھا کہ ایک سطحی توحید کی تعلیم انہوں نے ہندوؤں کو دی اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو بُت پرستی سے چھڑایا مگر گائے کی مشرکانہ عظمت کو وہ دُور نہ کر سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی توحید سے یہ قوم اسی طرح دور پڑی ہوئی ہے۔ قرآن کریم کا اور رسول اللہ صلعم کا یہ کمال تھا کہ نہ صرف عملی طور پر خطرناک سے خطرناک بت پرستی کو دور کر کے توحید الٰہی کو قائم کیا، بلکہ شرک کی جڑوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور اپنی اصلاح کو مکمل نہ سمجھا جب تک کہ مشرکانہ رسوم کی بیخکنی نہ کر دی۔

خلاصۂ مضمون۔ سورت کا اصل مضمون توحید الٰہی ہے اور اول سے آخر تک اسی ایک مضمون پر زور دیا ہے، ہاں ضمناً کہیں رسالت کا ذکر اس تعلق سے آتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہی یہ توحید قائم ہوئی تھی۔ اور اسی ضمن میں مکذبین کی انجام کار ناکامی یا مومنین کی تدریجی اور آخری کامیابی کا ذکر بھی آگیا ہے مگر اصل غرض کو نہیں چھوڑا۔ پہلے رکوع میں شرک فی الذات کی تردید کی یعنی ان لوگوں کے شرک کی جو دو خالق تجویز کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی کچھ ذکر اس پیغام کا اور اس کی تکذیب کرنیوالوں کا کیا جو توحید کو قائم کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا، دوسرے رکوع میں شرک فی العبادت کی تردید کی، تیسرے میں بتایا کہ شرک ایک ایسی چیز ہے کہ مشرکوں پر بھی ایک وقت آئے گا کہ وہ خود شرک سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔ اس میں فطرت انسانی کی شہادت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، چوتھے میں مکذبین کے انجام کا، پانچویں میں عذاب استیصال کا ذکر ہے، چھٹے میں توحید کے ماننے والوں پر انعام و احسان کا ذکر ہے، ساتویں اور آٹھویں میں محاسبہ اعمال اور اس کی غرض کو بیان کیا، نویں میں بتایا کہ اس مذہب توحید پر حضرت ابراہیم ابوالانبیاء بھی قائم تھے، اور ان کی اپنی قوم سے بحث کا ذکر کیا۔ دسویں میں بتایا کہ سب انبیاءؑ کا مذہب توحید ہی تھا، گیارھویں میں آنحضرت صلعم کی وحی کا ذکر فرمایا۔ بارھویں میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا ذکر کر کے توحید پر دلیل دی ہے اور ساتھ ہی حق کی تدریجی کامیابی کا ذکر کیا تیرھویں میں شرک کے مختلف پہلوؤں کا ابطال کیا اور اللہ تعالیٰ کا بیٹی اور بیٹے سے پاک ہونا بیان کیا۔ چودھویں میں پھر مشرکین کی مخالفت، اور پندرھویں میں منصوبہ بازوں کے انجام کا ذکر کیا۔ سولھویں اور سترھویں میں شرک اور مشرکانہ رسوم کا ابطال کیا، اٹھارہویں میں ممنوع غذاؤں اور مشرکین کے باطل عذروں کا ذکر کیا، انیسویں میں توحید کے عملی پہلو کو بیان کیا کہ غرض صرف ایک اقرار نہیں صرف مشرکانہ رسوم کا ترک کر دینا نہیں بلکہ صحیح اصول زندگی پر عمل پیرا ہونا توحید کا اصل مقصد ہے، مال و جان کی حفاظت کے اصول بتائے اور بیسویں میں بتایا کہ توحید کامل کو عملی رنگ میں قرآن کریم نے پیش کیا ہے تو اس کا عملی نمونہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم ہیں اور اسی بلند مقام پر پہنچنے کے لیے ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیئے اور سورت کا خاتمہ اگر ایک طرف ابطال کفارہ پر کیا تو دوسری طرف آخری الفاظ میں یہ خوشخبری بھی سنائی کہ جب تم توحید کے ان صحیح اصول پر قائم ہو جاؤ تو تمہیں زمین میں بادشاہ بھی بنا دیں گے کیونکہ مخلوق کا خیرخواہ گروہ ہی ان پر حکومت کا اہل ہے اور ساتھ ہی ڈرایا بھی کہ اگر تم نے ان اصول کو ترک کر دیا تو وہ بادشاہت تم سے لے بھی لی جائے گی۔

ترتیب قرآنی میں الانعام کا مقام: یہ سورت نزول میں پہلی چار سورتوں سے بہت پہلے کی ہے اور مکّی ہے۔ مگر ترتیب میں اس کو بعد میں رکھا ہے حالانکہ اس کا مضمون جو توحید ہے چاہتا تھا کہ اس کو ابتدا میں رکھا جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ توحید کو قرآن کریم نے بنیاد ٹھہرایا ہے اس لیے قرآن شریف کی ابتدا الحمد للہ رب العلمین سے ہوتی ہے۔ پھر سورۃ بقرہ کی ابتدا بھی ایمان بالغیب سے ہوتی ہے۔ پھر سب سے پہلا حکم جو قرآن شریف میں ہے وہ بھی یاایھا النّاس اعبدوا ربکم اور فلا تجعلوا للہ اندادا ہی ہے۔ پھر سورۃ آل عمران کی ابتدا بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ مسئلہ توحید ایک علمی مسئلہ ہے اس لیے مسلمانوں کی تعلیم میں ابتدا ایک ایسی سورت سے کی جس میں ان کی فلاح و بہبودی کے طریق ان کو سمجھائے یعنی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران اسی مضمون کی تکمیل کرتی ہے اور ساتھ ساتھ دونوں میں یہود اور نصاریٰ کے عقاید باطلہ پر کی بھی تردید کی ہے۔ پھر سورۃ النساء میں معاشرت کے اصول کو بیان کیا۔ اور سورۃ مائدہ میں تمدن کے اور اس ساری عملی تعلیم کے بعد توحید کے مضمون کو بیان کیا تاکہ مسلمان سمجھ لیں کہ ان کی مقدم ضروریات کیا ہیں۔

مائدہ سے تعلق: اور سورۃ مائدہ جس کے بعد یہ رکھی گئی ہے اس سے بھی اس کا خاص تعلق ہے کیونکہ اس سورت میں عقود کے ایفاء کی طرف توجہ دلائی تھی تو سب سے بڑا عقد اللہ تعالیٰ کی توحید کو ماننا ہے اس کا ذکر بالتفصیل بیان کیا۔ بلکہ سورۃ مائدہ کے آخر کا تعلق بھی الانعام سے خصوصیت سے ہے کیونکہ اس سورت کے آخر میں عیسائی عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید کی، جو ایک عظیم الشان شرک تھا۔ تو اب شرک کے تمام دوسرے پہلوؤں کا ذکر کر کے توحید کے مضمون کو کمال تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ سورت توحید پر ہے اس میں عیسائی عقیدہ کا ذکر بالتفصیل نہیں کیا۔ بلکہ نہایت مختصر الفاظ پر بس کی ہے۔ انی یکون لہ ولد ولم تکن لہ صاحبۃ ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۬ۗ
ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ①
هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنیوالے کے نام سے۔
سب تعریف اللہ کے لیے ہے، جس نے آسمانوں اور زمین
کو پیدا کیا اور اندھیرا اور روشنی بنائے، پھر بھی جو کافر ہیں
اپنے رب کے ساتھ (دوسروں کو) برابر ٹھیراتے ہیں ۹۰۱
وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ایک میعاد

تاریخ نزول: اس پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ سورت ساری کی ساری ایک رات میں مکہ میں نازل ہوئی۔ دیگر روایات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورت سب کی سب ایک ہی مرتبہ مکہ میں نازل ہوئی۔ اور اس کی دو یا تین آیات کو جو بعض لوگوں نے مدنی کہا ہے تو یہ غلط فہمی ہے۔ یہود کا ذکر یا بعض تفصیلات شریعت کا مکہ میں نازل ہونا ایک مسلم امر ہے۔ غذاؤں کی حلت و حرمت کا حکم سورۃ نحل میں بھی موجود ہے۔ حالانکہ وہ بھی بالاتفاق مکی ہے اور سورۃ انعام سورۃ النحل کے بعد کی ہے۔ اس لیے کہ اس سورت میں سورۃ نحل کے حکم حلت و حرمت غذا کا حوالہ موجود ہے قل لا اجد فی ما اوحی الی محرما (۱۴۶) قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کی مکی زندگی کے آخری سال میں یہ سورت نازل ہوئی۔ ایک اتنی بڑی سورت کا یکمرتبہ نازل ہونا اور اس کا آنحضرت صلعم کو یاد رہ جانا قرآن کریم کے عظیم الشان اعجازوں میں سے ایک اعجاز ہے۔ بعض لوگوں کی قوت حافظہ بیشک بڑی زبردست ہوتی ہے بعض اشعار کو ایک ہی دفعہ سُن کر یاد کر لیتے ہیں۔ بعض قصص کو ایک ہی دفعہ سن کر دہرا سکتے ہیں لیکن یہ سورت نہ تو اشعار میں سے ہے نہ ہی اس میں کوئی قصص ہیں، یہ چیزیں حافظہ کے معاون ہو جاتی ہیں بلکہ اس میں توحید کا علمی اور بظاہر خشک مضمون ہے جس میں بظاہر کوئی ربط نہیں پھر یہ کوئی قصہ اور کہانی نہیں کہ دو چار لفظ ادھر ادھر ہو جائیں تو مضائقہ نہیں یا شعر نہیں کہ ایک لفظ کی جگہ دوسرے موزوں لفظ سے پُر ہو جائے تو ہرج نہیں۔ اس کی ایک زیر زبر میں فرق نہیں ہو سکتا ایک حرف کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اور پھر نزول کے ساتھ یہ لکھ بھی لی جاتی ہے اور اس لکھی ہوئی سے دوسرے لوگ اس کو یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم صلعم لکھے ہوئے کو پڑھ نہیں سکتے۔ پھر آپ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے نمازوں میں پڑھیں۔ ان حالات کے اندر کس قدر سخت حفاظت ہر زیر و زبر کی ہر حرف کی بکار ہے اور یہ سب حفاظت آپ اس حالت میں کرتے ہیں کہ ایک ہی دفعہ آپ نے بیس رکوع اور ۱۶۶ آیات کی اتنی لمبی سورت کو فرشتے کے منہ سے سُنا ہے۔ یہ وہ اعجاز تھا جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے سنقرئك فلا تنسیٰ (الاعلیٰ ۸۷: ۶) یعنی ہمارے پڑھانے کا نشان یہ ہے کہ تم اسے کبھی بھولو گے نہیں۔ کتنا بڑا دعویٰ ہے اور اس کا پورا ہونا جس پر تاریخ شاہد ہے کتنا بڑا اعجاز ہے اور یہ جو اس آیت میں آتا ہے سنقرئك فلا تنسیٰ اِلّا ما شاء اللّٰه تو بعض لوگوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ قرآن شریف بھول بھی جایا کرتے تھے نعوذ باللہ من ذٰلك اس طرح تو آیت کا مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھر آیت کا یہ مطلب ہوا کہ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہیں بھولے گا مگر جو اللہ چاہے بھول جایا کرے گا۔ تو نہ بھولنا ایک بے معنی بات ہوئی۔ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں تو یہاں اِلّا استثنائے منقطع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو ہم پڑھائیں گے وہ تو ہرگز نہیں بھولے گا مگر یہ اس لیے نہیں کہ تمہارا حافظہ اس قدر زبردست ہے کہ تم کبھی کوئی چیز بھولتے ہی نہیں بلکہ اور باتوں میں جو اللہ چاہے بھول بھی جاتے ہو لیکن جو بات وحی سے تم کو پہنچائی جاتی ہے وہ نہیں بھولتے اور یہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے پڑھانے میں اعجاز ہے کہ ایک انسان جو اور باتیں بھول بھی جاتا ہے وحی الٰہی کا ایک لفظ تک نہیں بھولتا اور پھر اس اعجاز کا کمال اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف اتنی اتنی لمبی سورتیں یک مرتبہ نازل ہوتی ہیں تو دوسری طرف کسی سورت کی کوئی آیت کسی وقت نازل ہوتی ہے۔ اور ان ٹکڑوں کو آپ اسی طرح لکھوا دیتے ہیں اور ساتھ ہی حافظوں کو اس ترتیب سے یاد کرا دیتے ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ آپ کے پڑھنے میں نہ کبھی کسی لفظ میں کمی بیشی ہوتی ہے اور نہ ترتیب وحی میں ہی تغیر واقع ہوتا ہے۔ حالانکہ اس ترتیب سے لکھا ہوا قرآن بھی کوئی موجود نہیں۔ یہ بات بجائے خود نبی کریم صلعم کا اتنا بڑا معجزہ ہے کہ جس کی نظیر دوسرے انبیاء میں کوئی نہیں ملتی۔

۹۰۱ یعدلون۔ عَدْل کے معنی کے لیے دیکھو ۶۹۶ اور بربھم یعدلون میں مراد ہے اس کا عدیل یعنی برابر یا شریک دوسرے کو ٹھراتے ہیں اور عدل عن الحق کے معنی آتے ہیں جار یعنی ظلم کیا (غ)

اس سورت کی اصل غرض توحید الٰہی کو بیان کرنا ہے۔ اس لیے پہلی آیت میں ہی سب سے موٹی قسم کے شرک یعنی شرک فی الذات کی تردید کی ہے اور وہ شرک ثنویہ کا ہے یعنی جو لوگ دو خدا مانتے ہیں، ایک خالق خیر اور ایک خالق شر یا ایک نور کا بنانیوالا اور ایک ظلمت کا۔ یہ عقیدہ آتش پرستوں میں پایا جاتا ہے اسلام نے شر یا بدی کا کوئی مستقل وجود نہیں مانا بلکہ بدی چونکہ محض ان قویٰ کے غلط استعمال کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں اس لیے خالق ایک ہی ہے یہی وجہ ہے کہ آسمان اور زمین کے ساتھ خلق کا لفظ لگایا اور ظلمت اور نور کے ساتھ جعل کیونکہ جو چیزیں اچھے استعمال کے لیے پیدا کی گئی ہیں انہی کے بُرے استعمال کا نام بدی ہے۔ ہاں جعل کا فاعل اللہ ہے کیوں کہ مسبب الاسباب وہی ہے۔ شر کا خالق الگ ماننے میں یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ شر یعنی بدی کا مقابلہ کر کے انسان اس پر غالب نہیں آسکتا۔ بلکہ مضطر ہے کہ انسان اس میں ہمیشہ کے لیے ملوث رہے۔ برخلاف اس کے اسلامی توحید کی رو سے بدی کوئی ایسی چیز نہیں جس پر انسان غالب نہ آسکے بلکہ انسان کی ساری جد وجہد کی اصل غرض یہی ہے اور یہی اس کا نصب العین ہونا چاہیئے کہ بدی پر غالب آئے اور ان لوگوں کے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے گئے ہیں جو بدی پر غالب آئے اور جنہوں نے شیطان کو بھی اپنا فرمانبردار بنا لیا۔

اَجَلًا ۭ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ﴿۲﴾	ٹھیرا دی اور ایک (اور) میعاد اس کے ہاں معین ہے پھر بھی تم جھگڑتے ہو ۹۰۲
وَ هُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴿۳﴾	اور آسمانوں اور زمین میں وہی اللہ ہے وہ تمہاری چھپی اور ظاہر (باتیں) جانتا ہے اور وہ جانتا ہے جو تم کماتے ہو ۹۰۳
وَ مَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴﴾	اور کوئی پیغام اپنے رب کے پیغاموں میں سے ان کے پاس نہیں آتا مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں ۹۰۴
فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۭ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۵﴾	سو انھوں نے حق کو جھٹلا دیا جب وہ اُن کے پاس آیا سو اُن کے اس (کے وقوع) کی خبریں آرہیں گی جس پر وہ ہنسی کرتے تھے ۹۰۵
اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۠ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۶﴾	کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ کس قدر اُن سے پہلے ہم نے نسلیں ہلاک کر دیں، جن کو ہم نے زمین میں وہ طاقت دی تھی، جو طاقت تم کو نہیں دی اور ہم نے اُن پر زور سے مینہ برساتا ہوا بادل بھیجا، اور نہریں بنادیں جو اُن کے نیچے بہتی تھیں۔ پھر ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا۔ اور ان کے پیچھے دوسری نسل پیدا کر دی ۹۰۶

ع ۹۰۲ معلوم ہوا کہ ہر انسان مٹی سے ہی پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ غذائیں جن سے انسان کا قیام ہے وہ مٹی سے ہیں گویا مٹی کا خلاصہ غذائیں ہیں اور غذاؤں کا خلاصہ وہ نطفہ جس سے انسان کی پیدائش ہوتی ہے۔ جب آسمان اور زمین کی پیدائش کا ذکر کیا تو انسان کی پیدائش کا بھی ذکر کیا۔ ایک میعاد ٹھہرانے میں انسان کی زمینی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک وقت کے لیے ہے یعنی موت تک، اور اجل مسمّی جو اس کے حضور ہے وہ دوسری زندگی کے متعلق ہے یعنی اس کا کھلا ظہور بھی ایک وقت مقرر کے بعد ہوگا یعنی قیامت کے دن۔ اس لیے اسے مسمّی یا معین کہا ہے۔ یوں مضمون کا انتقال توحید سے بعث بعد الموت کی طرف کیا گیا ہے۔

ع ۹۰۳ پہلی دو آیتوں میں یہ ذکر کر کے کہ خالق ایک ہی ہے اب فرمایا کہ آسمانوں میں اور زمین میں وہی ایک ہی اللہ ہے یعنی دوسرا کوئی اس کی ذات میں شریک نہیں اور اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی کہ اللہ جو ذات باری کا اسم ذات ہے اس میں ویسے بھی کوئی دوسرا شریک نہیں ہوا یعنی یہ نام کبھی کسی دوسرے معبود پر نہیں بولا گیا۔ حالانکہ اور ناموں میں لوگوں نے اشتراک کر لیا ہے، اور پھر اس کی قدرت کا ذکر کر کے جو خلق میں نمودار ہوئی جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوا اس کے علم کا ذکر کرتا ہے، اور ساتھ ہی چھپی اور ظاہر باتوں میں کمانے میں یہ اشارہ ہے کہ تمہارے اعمال سے ہی دوسری زندگی پیدا ہوتی ہے۔

ع ۹۰۴ اس راز کو کہ اعمال سے دوسری زندگی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی وحی نے ہی انسان پر ظاہر کیا اور حالانکہ یہ بات انسان کی بھلائی کے لیے بتائی تھی، مگر لوگ ہمیشہ ہی ایسے پیغام کو سن کر منہ پھیر لیتے رہے ہیں۔

ع ۹۰۵ جس سے وہ استہزا کرتے تھے۔ وہ عذاب تھا جس سے ان کو ڈرایا جاتا تھا۔ اس کی خبریں آنے سے مراد خود اس عذاب کا آنا ہے۔ دوسری جگہ ہے ولتعلمن نباہ بعد حین (صٓ ۸۸) یہاں بھی مراد وقوع ہی ہے۔

ع ۹۰۶ قرن۔ قرن یا اقتران کے معنی ہیں دو یا زیادہ چیزوں کا اجتماع کسی رنگ میں، اس لیے قرن (جمع قرون) وہ لوگ ہیں جو ایک زمانہ میں جمع ہوں یعنی ایک نسل (غ)
مکناھم۔ تمکین لکم۔ صلہ لام کے ساتھ اور بغیر صلہ کے دونوں طرح آتا ہے اور اس کا اصل مکان (یا مکن) سے ہے، اور مکنہ کے معنی ہیں اس کو مکان یعنی ثبات اور قرار دیا یا مضبوطی اور قوت دی، اور مکن لہ کے معنی بھی یہی کیے گئے ہیں اور یہ بھی کہ ان کو اسباب تصرف اور نعمتیں وغیرہ دیں، جیسے کذالک مکنا لیوسف (یوسف ۲۱-۱۲)
مدرارا اس کا اصل دَرّ ہے جو دودھ یا آنسوؤں کے کثرت سے بہنے پر بولا جاتا ہے اور مطلق دودھ کو بھی کہتے ہیں (ل) اور استعارۃً بارش کی کثرت پر بولا جاتا ہے اور دَرّ اچھے یا برے عمل کو بھی کہا جاتا ہے جس سے للہ درّک عام محاورہ ہے جو مدح اور ذم دونوں موقعوں پر بولا جاتا ہے (ل)

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷﴾

اور اگر ہم تجھ پر کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب اتارتے پھر وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے تو جو کافر ہیں وہ یہی کہتے کہ یہ صرف کُھلا جادو ہے[۹۰۷]

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ﴿۸﴾

اور کہتے ہیں اس پر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا اور اگر ہم فرشتہ اتاریں تو معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا، پھر ان کو ڈھیل نہ دی جائے گی[۹۰۸]

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ﴿۹﴾

اور اگر ہم اسے فرشتہ بناتے تو ہم اس کو ضرور انسان بناتے اور ان پر وہی اشتباہ ڈالتے، جو اشتباہ وہ اب ڈال رہے ہیں[۹۰۹]

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع

اور یقیناً تجھ سے پہلے رسولوں کے ساتھ ہنسی کی گئی، سو جو لوگ اُن میں سے ہنسی کرتے تھے ان کو اسی نے آگھیرا[۹۱۰] جس کے ساتھ وہ ہنسی کرتے تھے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾

کہہ زمین میں پھرو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہُوا۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ

کہہ، کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کہہ، اللہ کا۔ اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے وہ تم کو ضرور قیامت کے دن کے لیے جمع کر دیگا اس میں کوئی شک نہیں

پہلی نسلوں کی ہلاکت کا ذکر ان کی عبرت کے لیے کیا ہے، جن لوگوں کو دنیوی آسائشوں کا حصّہ زیادہ مل جاتا ہے وہ آخرت کی طرف سے غافل ہو جاتے ہیں اور اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہلاک ہو جاتے ہیں اور کوئی دوسری قوم ان کی جگہ کھڑی ہو جاتی ہے۔

ع ۹۰۷ روحانیت سے بے بہرہ لوگ امور روحانی کو بھی جسمانی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے چاہتے ہیں کہ کتاب لکھی لکھائی اوپر سے آئے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اس لیے اس کا کلام قلب پر نازل ہوتا ہے اگر لکھا لکھایا کلام اوپر سے نازل ہوتا تو قلب انسانی سے اس کا کچھ تعلق نہ ہوتا اور نہ دلوں کے اندر اس سے انقلاب پیدا ہوتا اور جو اصل غرض اس کلام کے آنے کی تھی وہی مفقود ہو جاتی۔ اور یہ جو فرمایا کہ اگر ہم اس طرح بھی اتاریں تو اسے سحر کہیں گے۔ تو یہ صرف فرض کر لینے کے طور پر نہیں بلکہ آخر کار اسی قرآن کو اللہ تعالیٰ نے کتابا فی قرطاس بھی بنا دیا مگر پھر بھی نہ مانا۔

ع ۹۰۸ یہ دوسرا اعتراض بھی روحانیت سے بے بہرہ لوگوں کا ہے۔ وہ جس طرح کلام الٰہی کو جسمانی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں اسی طرح فرشتوں کو بھی۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ فرشتے تو سزا دینے کے لیے ہوں گے، جب انسان نیکی کے محرک ملائکہ کی بات کو قبول نہیں کرتا تو پھر لازماً دوسری قسم کے ملائکہ یعنی سزا دینے والے اس کے لیے آتے ہیں۔

ع ۹۰۹ یلبسون۔ لَبْسٌ کے معنی ڈھانکنا جس سے لباس ہے لبس امرہ مراد اس کا مشتبہ کر دینا ہے (رغ)

کبھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بشر کیوں رسول ہُوا۔ فرشتہ کو خدا رسول بنا کر بھیجتا، تا یقین آجاتا۔ جواب دیا ہے کہ فرشتہ بھی انسانوں کی طرف رسول بن کر آتا تو انسان کی صورت میں ہی آتا۔ کیونکہ رسول کا تو بڑا کام یہ ہے کہ نمونہ بن کر دکھائے۔ اور انسان کے لیے انسان ہی نمونہ کا کام دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں فرشتہ تو غیر مرئی ہستی ہے جب تک وہ تجسم اختیار نہ کرے انسان اس کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اور جب ملک مجسّم ہو کر آتا تو پھر اعتراض ویسے کا ویسا ہی رہتا۔

ع ۹۱۰ حاق کے معنی زجاج نے احاطہ کیے ہیں یعنی گھیر لیا، اور بعض نے اس کے معنی لیے ہیں عاد علیہ وبال امرہ اس کے امر کا وبال اس پر لوٹ کر آیا۔ راغبؒ نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس کا اصل حقّ ہے۔

جب رسول بدی کے بد نتائج سے ڈراتا ہے تو بد کردار لوگ طاقت کے نشہ میں اس پر ہنسی کرتے ہیں مگر وہ بد نتائج آخر کار آگھیرتے ہیں۔

خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

جنھوں نے اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا وہ ایمان نہیں لاتے ۹۱۱

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾

اور اسی کا ہے جو کچھ رات اور دن میں بستا ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ۹۱۲

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾

کہہ، کیا میں اللہ کے سوا دوست بناؤں، جو آسمانوں اور زمین کی ابتدا کرنے والا ہے ۹۱۳ اور وہ کھانے کو دیتا ہے اور اسے کھانے کو نہیں دیا جاتا کہہ، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں (ان میں) سب سے پہلا بنوں جو فرمانبردار ہوئے اور تو ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو ۹۱۳

قُلْ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

کہہ، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں، تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۹۱۴

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

جس سے وہ (عذاب) آج پھیر دیا جائے تو اس پر اس نے رحم کیا اور یہ کھلی کامیابی ہے ۹۱۵

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ

اور اگر اللہ تجھے کوئی ضرر پہنچائے تو سوائے اس کے کوئی اس

---

۹۱۱ اس رکوع میں یہ بتایا کہ عبادت اور اطاعت صرف اللہ کے لیے ہی ہے کیونکہ وہی سب کا مالک ہے اور سب پر رحم کرتا ہے۔
اللہ کی رحمت کی وسعت: کتب علی نفسه الرحمة میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت بے پایاں کا ذکر کیا ہے، اور دوسری جگہ فرمایا ورحمتی وسعت کل شیء (الاعراف ۱۵۶) اور حدیث میں ہے ان رحمتی سبقت غضبی میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی، اور یوں اپنے بندوں کو تسلی دی ہے، اور عیسائیوں کے اس عقیدہ کی بھی تردید کی ہے کہ خدا میں عدل ہے رحم نہیں، بتایا ہے کہ رحم تو اس قدر غالب ہے کہ اسکو اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اس کا رحم بے پایاں جس طرح جسمانی دنیا میں کام کر رہا ہے اسی طرح عالم روحانی میں کام کرتا ہے، اور یہ جو اس کے بعد فرمایا کہ تمہیں قیامت کے دن کے لیے جمع کریگا تو اس میں گویا اسی رحمت کی وسعت کا ہی ذکر ہے کیونکہ اس رحمت کا عظیم الشان ظہور اسی عالم میں ہوگا، اور جنھوں نے اچھے کام کیے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ اپنے انعامات سے مالامال کریگا بلکہ بتا دیا کہ سب پر ہی رحمت ہوگی۔ ہاں جنھوں نے خدا کی رحمت کے سامانوں سے اس دنیا میں فائدہ نہیں اٹھایا وہ کچھ نقصان بھی اٹھائیں گے مگر آخر کار ان پر بھی رحمت ہوگی۔ رحمت کے غضب پر سبقت لے جانے کے کچھ معنی نہیں اگر یہ مانا جائے کہ کوئی حصہ بلکہ کثیر حصہ اور بڑا حصہ مخلوق کا ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہے گا اور عذاب جہنم سے کبھی بھی نجات نہ پائے گا۔

۹۱۲ مسکون کے مقابل پر تحرک ہے یعنی حرکت کرنا، اور رات کے مقابل پر دن، اور سکون کے لیے رات ہی زیادہ موزوں ہے اور مقابل کے لفظ کا ذکر نہیں کیا۔ جیسا کہ اکثر اضداد میں سے ایک کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ جس طرح مکان کے لحاظ سے سب کچھ اُسی کا ہے اسی طرح زمانہ کے لحاظ سے بھی سب کچھ اسی کا ہے اور عبادت اسی کی ہوسکتی ہے جو سب کا مالک ہے۔

۹۱۳ فاطر۔ فطر کے معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں۔ اور اس کی جمع فُطُور ہے هل ترىٰ من فطور (ملک ۳) اور اللہ کے مخلوق کے فاطر ہونے کے معنی ہیں کہ وہ اس کی ابتدا اور اختراع کرنیوالا اور اسی سے فِطرة ہے (ل) اور فاطر کا لفظ اختیار کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ اس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے ہوئی خواہ ان کی پہلی حالت کیسی بھی ہو۔ اور قرآن شریف میں ہی ہے کانتا رتقا ففتقنٰهما (الانبیاء ۳۰) یعنی وہ پہلے ایک غیر ممیز حالت میں تھے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ سب اجرام الگ الگ کر دیئے۔ پس جو کچھ بھی پہلی حالت فرض کی جائے اس کا بنانے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

۹۱۳ یہاں سب معبودان باطل کا رد کیا ہے۔ رزق کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے نہ کوئی دوسرا معبود کیونکہ وہی خالق اسباب بھی ہے، اس لیے فرمانبرداری کا حقیقی مستحق وہی ہے نہ کوئی اور۔

۹۱۴ آنحضرت صلعم سے یہ لفظ کہلوانا کہ میں بھی اگر نافرمانی کروں تو عذاب سے ڈرتا ہوں، آپ کے پیرووں کو سمجھانے کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے انھیں کس قدر خائف ہونا چاہیئے۔ اور کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کی نافرمانی کی جرأت ان کو نہیں کرنی چاہیئے۔

۹۱۵ جس شخص سے عذاب اس دنیا کی زندگی میں ہی پھیر دیا جاتا ہے وہ خدا کی رحمت بے پایاں کے نیچے آجاتا ہے۔ عذاب کا اس دنیا میں پھیر دینا یا دور کر دینا راہ راست کی ہدایت دینا ہے۔ یومئذ سے مراد قیامت کا دن بھی ہوسکتا ہے۔ مگر پہلے معنی کو ترجیح ہے۔

لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۷﴾

کا دُور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تجھے بھلائی پہنچائے، تو وہ ہر چیز پر قادر ہے ۹۱۶

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۸﴾

اور وہ اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے اور وہ حکمت والا خبردار ہے ۹۱۷

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۫ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾

کہہ، کون سی چیز شہادت میں سب سے بڑی ہے۔ کہہ، اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے ۹۱۸ اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اس کے ساتھ ڈراؤں اور اسے جس کو وہ پہنچے ۹۱۹ کیا تم گواہی دیتے ہو، اللہ کے ساتھ اور معبود ہیں؟ کہہ، میں گواہی نہیں دیتا۔ کہہ، وہ صرف ایک ہی معبود ہے اور میں اس سے بری ہوں جو تم شرک کرتے ہو ۹۲۰

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اسے پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ جو اپنے آپ کو نقصان میں ڈالتے ہیں، وہی ایمان نہیں لاتے ۹۲۱

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی باتوں کو جھٹلائے۔ ظالم کامیاب نہ ہوں گے ۹۲۲

---

۹۱۶ کاشف۔ کشف کے اصل معنی ظاہر کردینا ہیں، جیسے کپڑے کا منہ سے اُٹھا دینا۔ اسی سے غم اور تکلیف کے اُٹھا دینے پر بولا جاتا ہے (غ)
یعنی کوئی معبود باطل اس دُکھ کو دور نہیں کرسکتا جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت ملتا ہے۔ بھلائی پہنچانے کے ذکر کے بعد اس کے دور کرنے کا نام نہیں لیا، بلکہ فرمایا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے کیونکہ اصل منشائے الٰہی تو اسے خیر پہنچانے کا ہی ہے۔

۹۱۷ القاهر۔ قهر کے اصل معنی غلبہ اور دوسرے کو ذلیل کرنا ہیں، اور الگ الگ دونوں معنوں میں بھی اس کا استعمال ہے (غ) اسی سے القاهر اور القهار اسمائے الٰہی میں سے ہیں جن میں مراد صرف غلبہ ہے اور فاما الیتیم فلا تقهر (الضحیٰ ۹۳ - ۹) میں اور وانا فوقهم قاهرون (الاعراف - ۱۲۷) میں ذلیل کرنا مراد ہے۔

۹۱۸ اللہ کی شہادت اس کے فعل سے ادا ہوتی ہے، وہ اسباب دنیا میں پیدا کر دیئے جنہوں نے رسول اللہ صلعم کا حق ہونا ظاہر کر دیا اور یہی سب سے بڑی شہادت ہے جو فعل سے ظاہر ہو۔

۹۱۹ فطری روشنی اور اس پر مواخذہ: یہاں قرآن کریم کے ذریعہ سے انذار کیلئے دو گروہوں کا ذکر کیا ایک وہ جو اس کے براہِ راست مخاطب ہیں اور دوسرے من بلغ یعنی جن کو یہ پہنچے۔ ان الفاظ سے قرآن کریم کے انذار کا دامن سب قوموں اور تمام زمانوں پر قیامت تک پھیلا دیا ہے کیونکہ من بلغ سے باہر کوئی نہیں رہ جاتا۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن کو قرآن کریم کی تبلیغ نہ پہنچے وہ اس کو نہ ماننے کی وجہ سے مواخذہ کے نیچے نہیں، بلکہ فطرت انسانی کے خلاف جو کام وہ کریں اس کی وجہ سے مواخذہ کے نیچے ہوں گے۔ گویا ایک تو انسان کی فطرت کی دھیمی روشنی ہے جو طرح طرح کے عوارض کے نیچے دب جاتی ہے، اور ایک قرآن کریم کے آفتاب عالمتاب والی روشنی ہے، اس دوسری روشنی میں نہ چلنے کی وجہ سے گرفت انہی لوگوں پر ہوگی جن کو یہ روشنی پہنچ گئی ورنہ فطری روشنی کے لحاظ سے ہر انسان مواخذہ کے نیچے ہے۔

۹۲۰ اس میں اصل غرض کو کھول کر بیان کیا۔ وہ سب چیز کا مالک ہے، سب پر رحم کرنے والا ہے، سب کا خالق ہے وہی سب پر غالب ہے۔ پس اس کے سوائے دوسرا معبود کسی کو نہ بناؤ۔ یہی وحی الٰہی کی شہادت ہے اور یہی صحیح فطرت انسانی کی شہادت ہے۔

۹۲۱ پہلا حصہ آیت کا وہی ہے جو البقرہ ۲ - ۱۴۶ میں آچکا۔ وہ مدنی ہے اور یہ مکی۔ گویا جو کچھ مکہ میں فرمایا وہی مدینہ میں، حالانکہ اس وقت ابھی یہودیوں کی طرف سے مخالفت کا اظہار نہ ہوا تھا۔ لکھا ہے کہ قریش نے یہودیوں سے دریافت کیا تھا کہ آنحضرت صلعم کی نسبت ان کا کیا خیال ہے۔

۹۲۲ اللہ پر افترا ان کا یہ تھا کہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔ اس سورت کے سولہویں رکوع میں نہایت صفائی سے ان کے شرک اور مشرکانہ رسوم کو بار بار افترا علی اللہ کہا ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾

اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے تب ہم ان کو جنھوں نے شرک کیا کہیں گے وہ تمھارے شریک کہاں ہیں جن کے لیے تم جھوٹے دعوے کرتے تھے ۹۲۳

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾

تب اُن کا فتنہ نہ ہوگا مگر یہ کہ وہ کہیں گے کہ اللہ ہمارے رب کی قسم ہم مشرک نہ تھے ۹۲۴

انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ۚ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

دیکھ کس طرح اپنے اوپر جھوٹ بولتے ہیں اور جو وہ افترا کرتے تھے، اُن سے جاتا رہے گا ۹۲۵

وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾

اور اُن میں سے وہ ہیں جو تیری طرف کان دھرتے ہیں اور ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ اُسے سمجھیں نہیں اور اُن کے کانوں میں بوجھ (رہے) اور اگر یہ سارے نشان بھی دیکھیں تو اُن پر ایمان نہ لائیں۔ یہاں تک کہ جب تیرے پاس آتے ہیں تجھ سے جھگڑتے ہیں جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں ۹۲۶

---

۹۲۳ شرکاؤکم میں اضافت ادنیٰ ملابست ہے۔ مراد ان کے شریک نہیں بلکہ وہ ہیں جن کو وہ خدا کا شریک بناتے تھے۔
ایک اجتماع تو قیامت کے دن ہوگا، مگر نبی کریم صلعم کی تشریف آوری نے بھی ایک نمونہ قیامت صغریٰ کا دکھا دیا اور اس دنیا میں بھی ان مخالفین پر وہ وقت آگیا کہ جب ان سے سوال کیا گیا کہ وہ تمہارے خدائی کے شریک کہاں ہیں اور کیوں اب تمہاری مدد نہیں کرتے۔

۹۲۴ فتنتھم۔ فتنۃ سے مراد یہاں بعض مفسرین نے شرک لیا ہے، بعض نے جواب یا عذر، اور ان کے عذر کو فتنہ اس لیے قرار دیا کہ وہ جھوٹ ہے، مگر فتنہ کے اصل معنی بلا یا عذاب یا دکھ ہیں۔ اس لیے یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ایک تو یہ وقت ہے کہ مسلمانوں کو توحید کی وجہ سے دُکھ دیتے ہیں، لیکن وہ وقت بھی ان پر آئے گا کہ دکھ دینا تو ایک طرف رہا خود شرک سے اپنی بیزاری ظاہر کریں گے۔ الّا اس صورت میں استثنائے منقطع ہوگا۔
شرک نہ کرنے کا عذر: "ہم مشرک نہ تھے" یا تو جھوٹا عذر ہے اور اگلی آیت میں یہ اشارہ ہے، اور یا اشارہ ان کے اس خیال کی طرف ہے ما نعبدھم الّا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ (الزمر ۳۹-۳) یعنی ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ اس ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں، اس صورت میں اگلی آیت میں یہ فرمایا کہ جس بات کا اقرار ان کی فطرتیں کرتی ہیں، جیسا کہ قیامت کے دن وہ بول اُٹھیں گے، اس کے آج خلاف کر رہے ہیں۔ دوسری جگہ بھی جہاں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کا نقشہ کھینچا ہے یہی دکھایا ہے کہ جب دکھ اور مصیبتیں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں تب صرف خدا کو پکارتے ہیں۔ یوں بار بار اس فطرت کی شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کی گواہی انسان کو اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔ مگر پھر وہ جھوٹ بولتا ہے یعنی اپنی فطرت کی شہادت کے خلاف عمل کرتا ہے۔

۹۲۵ اپنے آپ پر جھوٹ بولنے میں ان کے اس دنیا میں عمل کی طرف اشارہ ہے کہ فطرت کی شہادت کچھ ہے لیکن یہ اپنے ہی خلاف جھوٹ بول کر کبھی تقرب کا عذر کرکے اور کبھی کچھ کہہ کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن انکار شرک کرکے اپنے ہی خلاف جھوٹ بولتے ہیں۔

۹۲۶ یستمع۔ استماع کے معنی اصغاء ہیں (غ) یعنی مائل ہونا اور مراد کانوں کا مائل کرنا ہے یعنی کان لگانا۔
یفقھوہ۔ فِقْہ اس علم سے جو موجود ہو علم غائب کی طرف پہنچنا ہے، اس لیے یہ عِلْم سے زیادہ خاص ہے لا یکادون یفقھون حدیثا (النسآء ۴-۷۸) اور تَفَقَّہَ معنی میں فقاہت کو طلب کیا۔ اور اس سے مخصوص ہوا لیتفقھوا فی الدین (التوبۃ ۹-۱۲۲)، اور فِقْہ احکام شریعت کا علم ہے (غ)
وقرا۔ وقر کان کے بوجھ کو کہتے ہیں، گدھے اور خچر کے بوجھ کو بھی وَقْر کہا جاتا ہے، اور وَقار سکون اور علم کو کہتے ہیں (غ)
اساطیر۔ اُسْطُورَۃ کی جمع ہے، اور یہ سَطْر سے ہے جس کے معنی لکھنا ہیں۔ ن والقلم و ما یسطرون (القلم ۶۸-۱) وکتاب مسطور (الطور ۵۲-۲) کان ذٰلک فی الکتاب مسطورا (الاحزاب ۳۳-۶)۔ اور اساطیر کہنے سے مراد ہے کہ جھوٹ بنا کر خود لکھ لیا ہے۔
اس امر پر کہ اللہ تعالیٰ ابتداً کے طور پر مُہر نہیں لگاتا، یا پردے نہیں ڈالتا مفصل لکھا جا چکا ہے (دیکھو ۱۸ع) ایسے الفاظ میں عموماً اس کفر پر اصرار کی حالت کو قرآن کریم بیان کرتا ہے جو کفار خود اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے پیدا کر لیتے ہیں، اور خود اس آیت اور اس سے اگلی آیت کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے۔ کیونکہ یہاں اول فرمایا کہ سارے

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ
يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾

اور وہ اس سے روکتے ہیں اور خود بھی دُور رہتے ہیں۔ اور وہ صرف اپنے آپ کو ہی ہلاک کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے ۹۲۷

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا
يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا
وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧﴾

اور اگر تو دیکھے جب آگ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔ تو کہیں گے کہ اے کاش ہم لوٹائے جائیں اور رب کی باتوں کو نہ جھٹلائیں اور مومنوں میں سے ہوں ۹۲۸

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ
وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٢٨﴾

بلکہ ان کے لیے ظاہر ہوگیا جو پہلے چھپاتے تھے اور اگر لوٹائے جائیں تو پھر وہی کریں جس سے روکے گئے تھے اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں ۹۲۹

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا
نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٢٩﴾

اور کہتے ہیں سوائے ہماری دنیا کی زندگی کے اور کچھ نہیں اور ہم نہیں اُٹھائے جائیں گے ۹۳۰

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ
هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ
ع فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٣٠﴾

اور اگر تو دیکھے جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے وہ کہیگا کیا یہ سچ نہیں، کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم۔ کہے گا تو عذاب چکھو اس لیے کہ تم کفر کرتے تھے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ۭ حَتّٰٓى
اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا

وہ لوگ ضرور گھاٹے میں رہے جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا یہاں تک کہ جب (مقررہ) گھڑی ان پر یکایک آجائے گی کہیں گے،

نشانِ صداقت بھی دیکھ لیں تو ایمان نہ لائیں، گویا وہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کفر کو کبھی نہ چھوڑیں گے خواہ کتنا بھی بین ثبوت مل جائے پھر فرمایا کہ جب رسول اللہ صلعم کے پاس آتے ہیں تو ٹھنڈے دل سے باتوں پر غور کرنے کی بجائے جھگڑنے کے لیے آتے ہیں، اور اس سے اگلی آیت میں ہے کہ نہ صرف وہ خود حق سے دور جاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دلوں پر پردوں کا ڈالا جانا عین قوانین آلٰہیہ کے مطابق ہے۔

۹۲۷ ینئون۔ نائی کے معنی اَعْرَضَ یعنی منہ پھیر لیا یا تباعد یعنی دور ہوگیا وَنَاٰ بِجَانِبِہٖ (بنی اسرائیل - ۸۳) (غ)

۹۲۸ وقفوا۔ وُقِفَ کے معنی ٹھہرانا یا کھڑا کرنا ہیں۔ اسی سے مَوْقِف ٹھہرنے کی جگہ ہے اسی سے وقف کرنا ہے۔

آگ کے سامنے لا کر کھڑا کر دینے سے مراد ہے کہ یقینی طور پر ان کو عذاب آنے کا مشاہدہ ہو جائے گا اور دوزخ سامنے ہوگا۔

۹۲۹ افعال بد کے بد نتائج اور ان کا اخفا و ظہور: پہلی آیت میں بتایا کہ آگ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو پھر دوبارہ دنیا میں جانے کی خواہش ظاہر کریں گے اور کہیں گے کہ اب ہم خدا کی باتوں کو نہ جھٹلائیں گے۔ یہاں جواب دیا ہے کہ ایسا کہنے میں وہ جھوٹے ہیں اور اس کی وجہ یہ دی ہے کہ کوئی نئی بات تو ہوئی نہیں بل بدالھم ما کانوا یخفون من قبل جو پہلے چھپاتے تھے وہ ظاہر ہوگیا۔ یعنی ان کے افعال بد کے بد نتائج۔ اگر یہ چاہتے تو ان نتائج کو پہلے بھی دیکھ سکتے تھے، کیونکہ سچ یہی ہے کہ بُرے فعل کے بد نتیجہ کو انسان دیکھ سکتا ہے مگر خود ہی اس کی طرف سے آنکھیں بند کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ نتیجہ ایک خطرناک رنگ میں ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ قیامت کے دن ہوگا یا جیسا کہ بعض وقت اس دنیا میں بھی ہوتا ہے، جب بدی اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر عالم دنیا میں دوبارہ جائیں تو پھر وہی کام کریں گے، کیونکہ ان کے بد افعال کے نتائج تو پھر اسی رنگ میں ہوں گے جیسے اب ہیں۔ اور ان کے اندر اخفا کا رنگ ہوگا وہ کھلا رنگ نہ ہوگا جس کا ظہور قیامت میں ہوتا ہے اس لیے وہ ان کاموں سے رُکیں گے بھی نہیں۔ اس دنیا میں بھی انسان کی یہی حالت ہے کہ ایک فعل کے بد نتائج کو دیکھتا ہے مگر ذرا ان سے نجات ہوئی پھر اس بد فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔

۹۳۰ بدی کی اصل وجہ یہی ہے کہ انسان زندگی بعد الموت کا انکار کرتا ہے۔ ہر ایک بد فعل کا نتیجہ چونکہ اس دنیا میں نہیں ملتا اس لیے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بد فعل کر لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ آخرت پر یقین ہی انسان کے اندر اپنے افعال کی ذمہ داری کا پورا پورا احساس پیدا کرتا ہے ان ھی الاحیاتنا الدنیا کہنے سے مراد یہ ہے کہ اپنی زندگی کی غرض کھانے پینے سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتے۔

عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ
اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۤءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ
الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾
قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ
فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

اے ہم پر افسوس اس پر جو ہم نے اس میں کمی کی — اور وہ اپنے بوجھ اپنی
پیٹھوں پر اُٹھائیں گے۔ سنو وہ بوجھ بُرا ہے جو اُٹھائیں گے [۹۳۱]
اور دنیا کی زندگی صرف کھیل اور بے حقیقت مشغلہ ہے اور آخرت
کا گھر یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ کرتے ہیں پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے [۹۳۲]
ہم خوب جانتے ہیں کہ تجھے وہ بات غم دلاتی
ہے جو وہ کہتے ہیں، پر وہ تجھے نہیں جھٹلاتے لیکن
ظالم اللہ کی باتوں کا انکار کرتے ہیں [۹۳۳]

---

۹۳۱ الساعۃ۔ ساعۃ اصل میں زمانہ کے اجزا میں سے کسی جزو کا نام ہے، اور اس سے مراد قیامت بھی لی جاتی ہے اور ساعۃ بمعنی قیامت تین طرح پر بولا جاتا ہے، یعنی محاسبہ کے لیے لوگوں کا اُٹھایا جانا، یا ساعت کبریٰ ایک نسل کا، یا ایک قوم کا فنا ہو جانا یا ساعت وسطیٰ۔ ایک انسان کی موت یا قیامت صغریٰ، جیسا کہ حدیث میں ہے من مات فقد قامت قیامتہ (دیکھو ۱۰۸)

بغتۃ۔ بَغْت کے معنی ہیں کسی چیز کا ناگہاں اس طرف سے آ جانا جہاں سے گمان نہ ہو (غ)

فرطنا۔ فَرَطَ کے معنی ہیں قصد کر کے آگے بڑھا، اور فارِط یا فَرَط متقدم یعنی آگے جانے والے یا آگے بڑھنے والے کو کہا جاتا ہے، جیسا کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا انا فَرَطُکم علی الحوض، یا جیسے چھوٹے بچے کے جنازے کی دعا میں ہے اَللّٰھُمَّ اجعلہ لنا فرطاً اور افراط یہ ہے کہ آگے بڑھنے میں حد سے تجاوز کرے اور تفریط یہ کہ آگے بڑھنے میں کوتاہی کرے ما فرطت فی جنب اللہ (الزمر ۳۹-۵۶) ما فرطتم فی یوسف (یوسف ۱۲-۸۰)

اوزار۔ وِزْر کی جمع ہے جس کے معنی بوجھ ہیں اور مراد گناہ ہے۔ اور وَزَر کے معنی جائے پناہ ہیں جو پہاڑ میں ملے (غ)

اللہ کی ملاقات یا لقاء اللہ کا مرتبہ انسان کے اعلیٰ سے اعلیٰ کمال کا مرتبہ ہے اور اس کا جھٹلانا گویا انسان کے کمال کی ترقیات کا جھٹلانا ہے جتنی اعلیٰ غرض انسان اپنے سامنے رکھتا ہے اسی قدر اپنے خدا داد قویٰ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور لقاء اللہ سے یا اخلاق اللہ میں رنگین ہونے سے بڑھ کر کوئی مقصد انسانی زندگی کا نہیں ہو سکتا جو اس شخص مقصد کو چھوڑتا ہے وہ اپنی اغراض کو صرف دنیوی زندگی تک محدود کر لیتا ہے اور اپنے اعلیٰ قویٰ کو بیکار کر دیتا ہے اور جس بوجھ سے وہ بچنا چاہتا ہے، یعنی خدا کے لیے جدوجہد، اس سے بہت بڑھ کر بوجھ اسے اٹھانا پڑتا ہے۔

۹۳۲ لھو وہ چیز ہے جو انسان کو اس بات سے جو اس کے لیے ضروری اور اہم ہے روک کر دوسری طرف مشغول کر دے (غ)

لہو اور لعب میں فرق: لھو اور لعب (دیکھو ۸۲۵) فرق یہ ہے کہ لعب میں خوشی کو فوراً حاصل کرنے کا خیال ہوتا ہے اور لہو صرف اصل مقصد سے روکنے والی چیز ہے گو اس سے فوری خوشی مقصود نہ ہو۔

حیٰوۃ الدنیا یا دنیا کی زندگی سے یہاں اور ایسے دوسرے موقعوں پر مراد وہ حصّہ ہے جو لقاء اللہ کے اعلیٰ مقصد سے خالی ہے، جو صرف کھانے پینے اور سفلی خواہشات کے پورا کرنے تک محدود ہے، اسی لیے اس کا مقابلہ آخرت سے کیا ہے۔ پس وہ اعمال جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا مدنظر ہے گو وہ کھانے پینے سے بھی تعلق رکھتے ہوں حیٰوۃ الدنیا کا نہیں بلکہ دار الآخرۃ کا حصّہ ہوں گے۔

یہاں یہ توجہ دلائی ہے کہ کھانا پینا اور خواہشات سفلی کا پورا کر لینا ان باتوں کا تو آخرت سے کوئی تعلق نہیں، یہ تو حیوانی زندگی کے ساتھ اشتراک ہے۔ پس جہاں تک آخرت کی تیاری کا سوال ہے، جہاں تک لقاء اللہ کے اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھنے کا سوال ہے، اس پر کھانے پینے وغیرہ سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ اس لحاظ سے یہ صرف ایک کھیل اور بے حقیقت بات ہے کیونکہ لھو وہ چیز ہے جو انسان کو اعلیٰ مقصد سے دور رکھتی ہے۔ اگر انسان خداداد عقل سے کام لے تو اسے سمجھ آ جائے کہ ایک اعلیٰ مقصد کو ترک کرنا اس کے لیے کس قدر نقصان دہ ہے۔

۹۳۳ یجحدون۔ جحود یہ ہے کہ جس چیز کا دل میں اثبات ہے اس کی نفی کی جائے اور جس کی دل میں نفی ہے اس کا اثبات کیا جائے وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم (النمل ۲۷-۱۴) (غ)

یہ آیت اس بات پر صریح دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم صلعم کا صدق دشمنوں تک کو مسلم تھا۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات جن میں ایسا اعتراف موجود ہے تاریخ میں موجود ہیں — حرث نے آپ سے کہا ما کذبتنا قط تو نے ہم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا، ابوجہل کے لفظ ہیں ان محمد الصادق وما کذب قط محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولا، اور سب اہل عرب آپ کو الامین کے نام سے پکارتے تھے۔ یہاں جب ان کے لقاء اللہ کی تکذیب کا ذکر کیا، تو ساتھ ہی فرمایا کہ یہ تجھے تو جھوٹا کہہ نہیں سکتے کیونکہ آپ نے کبھی جھوٹ نہ بولا تھا نہ کبھی کسی نے آپ کی طرف جھوٹ منسوب کیا۔ ہاں یہ آیت اللہ کا انکار ہے کیونکہ آپ کی صداقت کا انکار نہیں بلکہ اس پیغام کا انکار ہے

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور تجھ سے پہلے رسول یقیناً جھٹلائے گئے، سو انھوں نے جھٹلایا جانے پر اور ایذا دیا جانے پر صبر کیا یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد پہنچی اور اللہ کی باتوں کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں اور تیرے پاس پیغمبروں کی کسی قدر خبر بلاشبہ آچکی ہے ۹۳۴

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور اگر تجھ پر اُن کا منہ پھیر لینا دشوار گزرتا ہے، تُو اگر طاقت رکھتا ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرلے یا آسمان میں کوئی سیڑھی، پس ان کو کوئی نشان لادے اور اگر اللہ چاہے تو ان کو ہدایت پر جمع کردے، سو تو جاہلوں میں سے نہ ہو ۹۳۵

وقف غفران — وقف منزل

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور مُردوں کو اللہ اُٹھائے گا پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ۹۳۶

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً

اور کہتے ہیں اس پر کوئی (بڑی) نشانی اس کے رب کی طرف سے کیوں نہ اتاری گئی، کہہ، اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ نشان اتارے

جو منجانب اللہ آپ کو دیا گیا۔

۹۳۴ لا مبدل لکلمات اللہ۔ سیاق و سباق کی پروانہ کر کے پادریوں نے ان الفاظ سے وہ کام لیا ہے جو ڈوبتا ہوا تنکے سے لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی تکذیب پر آپ کو یہاں تسلی دیتے ہوئے یوں فرمایا ہے کہ پہلے رسول بھی جھٹلائے گئے یہاں تک کہ نصرت الٰہی آپہنچی ایسا ہی تمہارے ساتھ ہوگا۔ اور لا مبدل لکلمات اللہ کا صاف مفہوم یہی ہے کہ اس پیشگوئی کو کوئی بدل نہیں سکتا یعنی یہ پوری ہو کر رہے گی۔ اور آگے ولقد جاءك من نبای المرسلین موجود ہے یعنی جیسا پہلے رسولوں کے دشمنوں سے ہوا ایسا ہی تمہارے دشمنوں سے ہوگا۔ مگر پادری کہتے ہیں اس سے مراد ہے کہ کتب الٰہی میں کوئی تحریف نہیں کر سکتا حالانکہ قرآن شریف نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر سابقہ کتب الہامی میں تحریف ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور آج واقعات اور علوم نے اس کی تائید کی ہے۔

۹۳۵ سُلّم اس کا مادہ بھی سَلم یا سلامتی ہے۔ اور مراد اس سے وہ چیز لی جاتی ہے جس سے بلند مکان پر پہنچ سکیں اور اس سے سلامتی کی امید رکھی جائے یعنی سیڑھی، پھر اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے کسی بلند شے کو حاصل کر سکیں جیسے سبب (رغ) جیسے ام لھم سُلّم یستمعون فیہ (الطور ۵۲-۳۸)

یہاں خطاب ہر مخاطب کو ہے، لیکن اگر رسول اللہ صلعم کو بھی خطاب مانا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ نبی کریم صلعم کو جو ان کے ایمان لانے کی بڑی تڑپ تھی تو اس لیے ان کا اعراض بڑا شاق گزرتا تھا اور آپ چاہتے تھے کہ زمین و آسمان سے کوئی ایسے نشان ظاہر ہوں کہ وہ ایمان لائیں، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نشانوں کا دکھانا پیغمبر کی طاقت میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اس کے ذریعہ سے کوئی معجزہ دکھا دیتا ہے۔

اگر اللہ چاہے تو ان کو ہدایت پر جمع کردے یہ پیشگوئی تھی جو پوری ہوئی اور اگر معنی یوں کیے جائیں کہ اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جمع کر دیتا تو مراد یہ ہے کہ ان کو پیدا ہی ایسا کرتا کہ ان کو نیک و بد کی تمیز نہ دی جاتی اور نہ وہ عقل سے کام لے سکتے۔ جاہل اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جس کو کسی خاص بات سے ناواقفیت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس پیشگوئی یا اس قانون سے بے خبر نہ رہو۔

۹۳۶ بعث سے مراد بعث روحانی: مردوں کا بعث ایک تو قیامت کے دن محاسبہ کے لیے ہوگا، اور ایک بعث روحانی ہے جو نبی کریم صلعم کے ذریعہ ظہور میں آنا تھا۔ کیونکہ یہ بھی ایک موت سے اُٹھنا ہے (دیکھو ۹۴۹) یہاں یوم قیامت کا ذکر نہیں۔ اس لیے مراد اس سے بعث روحانی ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو بالکل مردہ ہیں اور بات کو سنتے نہیں یہ بھی آخر اُٹھیں گے گو ابھی صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے اعلموا ان اللہ یحیی الارض بعد موتھا (الحدید ۵۷-۱۷) اللہ زمین کو موت کے بعد پھر زندہ کرے گا، زمین کی موت اس کے رہنے والوں کی روحانی موت ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٧﴾

لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ۹۳۷

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿٣٨﴾

اور زمین میں کوئی جان دار نہیں اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں سے اُڑتا ہے مگر وہ بھی تمھاری طرح جماعتیں ہیں ۹۳۸ ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔ پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ۹۳۹

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٣٩﴾

اور جنھوں نے ہماری باتوں کو جھٹلایا ہے بہرے اور گونگے اندھیرے میں ہیں۔ جس کو اللہ چاہے گمراہی میں رہنے دے اور جسے چاہے اسے سیدھے راہ پر رکھے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٠﴾

کہہ، بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر آجائے، یا (مقررہ) گھڑی تم کو آلے، کیا تم اللہ کے سوائے (کسی اور کو) پکاروگے اگر تم سچے ہو ۔

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿٤١﴾ ع

بلکہ تم اسی کو پکاروگے سو جس کے لیے تم پکاروگے اگر چاہے تو اسے دور کردیگا اور تم انھیں بھول جاؤگے جنھیں تم شریک ٹھیراتے ہو ۹۴۰

---

۹۳۷ یہاں آیت سے مراد عذاب استیصال ہے، اور آیت کی تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ جب ان کو یہ کہا گیا کہ تم مردوں میں بھی اللہ تعالیٰ پیغمبر کے ذریعہ سے روح نفخ کرے گا تو بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے وہ اعدائے حق کی عادت مستمرہ کے مطابق ہلاکت مانگتے ہیں، چنانچہ اس رکوع کی آخری آیات میں صاف اس عذاب کا ذکر ہے۔ یہاں نشانات یا معجزات کے دینے سے انکار نہیں بلکہ یہ کہہ کر کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے بتادیا ہے کہ عذاب بھی آخر آرہے گا۔

۹۳۸ دابہ اور طیر کے انسانوں جیسی اُمت ہونے سے مراد؛ چرند اور پرند سب تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؛ یہاں ذکر کفار کا ہے جن کی نظر دنیا سے آگے نہیں جو لقاء اللہ کو جھٹلاتے ہیں اور اسی حیات دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ جن کی نظر کھانے پینے اور خواہشات سفلی سے اوپر نہیں اٹھتی ان کو بتایا ہے کہ اس لحاظ سے تو تم میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ دوسری جگہ ایسے ہی لوگوں کا ذکر کرکے فرمایا اولٰئک کالانعام بل هم اضل (الاعراف ۔ ۱۷۹) وہ چارپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ بہت زیادہ گمراہ۔ دوسری توجیہ ان الفاظ کی یوں ہوسکتی ہے کہ سب انسانوں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ دوسرے جاندار بھی تمہاری طرح ہیں۔ جو فطرت ان کو خدا نے دی ہے وہ اس کے مطابق چلتے ہیں، مگر تم اپنے فطری نور کی شہادت کو رد کرتے ہو جیسا کہ فرمایا وان من شیء الا یسبح بحمدہ (بنی اسرائیل ۔ ۴۴) تیسری توجیہ یہ ہے کہ انسانوں کے دو گروہوں کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے، ایک جو مثل چارپایوں کے زمین پر جھکے رہتے ہیں اور دوسرے جو طائر کی طرح عالم روحانیت میں پرواز کرتے ہیں یعنی کافر اور مومن۔

۹۳۹ الکتاب سے مراد یہاں قرآن شریف ہی ہے اس میں کوئی کمی نہیں رکھی یعنی خوب کھول کر سمجھایا ہے۔

ثم الٰی ربهم یحشرون۔ حشر کے اصل معنی اکٹھا کرنا ہیں آیا یہاں حشر سے مراد قیامت کے دن جمع کرنا ہے؛ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ بہائم کا حشر ان کی موت ہے (ج) بعض نے کہا کہ قیامت کے دن کا حشر مراد ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ بہائم میں بھی اللہ تعالیٰ عدل کرے گا لیکن اس طرح حیوانات کو بھی مکلف ماننا پڑتا ہے، پھر اس خیال کی کہ ان میں رسول مبعوث ہوتے ہیں کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس خیال کے رکھنے والوں کو ملاحدہ کہا ہے اور انسانی شریعت کے مکلف حیوانات کو ٹھہرانا خلاف قرآن ہے، کیونکہ اس میں عقل و فکر سے کام لینے کی تاکید کی ہے جو ان کو عطا نہیں ہوا۔ پس یا تو جو معنی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں وہی درست ہیں۔ یعنی ان پر موت آجاتی ہے اور یہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہے۔ مگر اس سے بھی بہتر توجیہ ان الفاظ کی یہ ہے کہ ربهم اور یحشرون میں ضمیر لوگوں کی طرف پھرتی ہے جن کا ذکر اوپر چلا آیا ہے نہ حیوانات کی طرف جنکا ذکر صرف بطور مثال ہوا ہے۔ بلکہ ربهم میں ضمیر جو ذوی العقول کے لیے ہے اس کی تائید کرتی ہے۔ پس مراد یہ ہے کہ انسانوں کی مثال تو دوسری جاندار مخلوق کی طرح ہے، جہاں تک اس سفلی زندگی کا سوال ہے جو خورد و نوش سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر ان میں ایک بات ان سے بڑھ کر یہ ہے کہ ان کا حشر بھی اپنے رب کی طرف ہوگا، یعنی اعمال کی جزا و سزا کے لیے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اگلی آیت میں اس دوسری زندگی کی تکذیب کرنے والوں کو صم بکم کہا ہے، یعنی جس طرح چارپایہ نہ آواز کا مفہوم سمجھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ یہی حالت ان کی ہے بما لا یسمع الا دعاء و نداء (البقرة ۔ ۱۷۱)

۹۴۰ ارءیتکم (رأی بمعنی علم یا جاننے سے) أَخْبِرُونِي کی جگہ پر ہے یعنی اس کے معنی ہیں مجھے بتاؤ، اور ارأیت پر کاف داخل ہوتا ہے تو ارأیتك۔ ارأیتکم وغیرہ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور بلاشبہ ہم نے تجھ سے پہلے قوموں کی طرف رسول بھیجے، تب ہم نے ان کو تکلیف اور دُکھ میں مبتلا کیا، تاکہ وہ عاجزی کریں ۹۴۱

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

توجب ان پر ہمارا عذاب آیا کیوں نہ انھوں نے عاجزی اختیار کی، لیکن ان کے دل سخت ہوگئے اور شیطان نے اُسے انکے لیے خوبصورت کردکھایا جو وہ کرتے تھے ۹۴۲

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾

سو جب انھوں نے اسے چھوڑ دیا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب اس پر بہت خوش ہوگئے جو انھیں دیا گیا تھا ہم نے انکو اچانک پکڑ لیا تب وہ مایوس ہوگئے ۹۴۳

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

پس اس قوم کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کی پرورش کرنے والا ہے ۹۴۴

اس کی صورتیں ہوجاتی ہیں، اور ارأیت اور ارأیتم اپنی اصل صورت پر قرآن کریم کی آیات میں جہاں جہاں آیا ہے صرف تنبیہ کے معنے میں آیا ہے (غ)

یہاں عذاب اللہ اور ساعۃ کو الگ الگ کرکے بیان کیا ہے، کیونکہ ساعۃ سے مراد ان کی تباہی یا ان کی قوت وشوکت کے جاتے رہنے کی گھڑی ہے جو ان کی ساعۃ وسطیٰ ہے، اور عذاب سے مراد اس سے چھوٹا عذاب ہے۔ عذاب یا ساعۃ کے وقت ان کا اللہ تعالیٰ کو پکارنا اور اپنے شرکاء کو چھوڑ دینا تنسون ما تشرکون واقعات میں سے ہے جیساکہ دوسری جگہ بھی فرمایا دعوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین (یونس ۱۰-۲۲) اور فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء میں بتایا کہ جب اضطرار کی حالت میں بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو بعض تکالیف کو جنھیں چاہے اللہ تعالیٰ دور بھی کر دیتا ہے۔ ان شاء میں بتا دیا کہ بعض وقت اس کی مشیت یہ بھی ہوتی ہے کہ جب عذاب استیصال آجاتا ہے تو پھر وہ دور نہیں کیا جاتا۔ اسی کے متعلق فرمایا ما دعاء الکافرین الا فی ضلال (الرعد ۱۳-۱۴)۔ اسی لیے اگلے رکوع کی پہلی آیت میں بتایا کہ معمولی عذاب بھیجنے سے ہماری غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کریں۔

ع ۹۴۱ یتضرعون - ضرع اور تضرّع کے معنی ہیں عاجزی اور پستی کا اظہار کیا (ل)

یہاں ایک عام قانون بیان فرمایا ہے کہ دکھوں اور تکلیفوں کے بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کی غرض صرف یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور تکبر کو چھوڑ کر خدا کے حضور عاجزی کا اظہار کریں پس دکھ اور تکلیف کے آنے سے انسان کو یہ فائدہ اٹھانا چاہیئے کہ خدا کی طرف جھکے اور دنیوی زندگی کی ظاہری نمائشوں پر فریفتہ نہ رہے۔ یہ وہ دکھ اور تکلیفیں ہیں جو عذاب استیصال سے پہلے آتی ہیں۔

ع ۹۴۲ یہاں صفائی سے بتا دیا کہ انسان جو عمل بد کرتا ہے تو ان کو مزین کرکے دکھانے والا شیطان ہوتا ہے نہ خدا۔ یہ آیت ان آیات کے حل کرنے میں اصول محکم کے طور پر ہے جہاں تزیین کے فاعل کا ذکر نہ ہو اور جس فعل کو اچھا کرکے دکھایا گیا ہے وہ فعل بد ہو۔

ع ۹۴۳ جب تھوڑی مصیبت سے قوم فائدہ نہیں اٹھاتی تو پھر بڑی مصیبت کا آنا لازمی امر ہے۔ مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑی تکلیف جب دور ہوجاتی ہے تو پھر ہر قسم کے آسائش کے سامان میسر آجاتے ہیں اور لوگ اس پر خوش ہوکر سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ ایک معمولی بات تھی۔ قالوا قد مس اٰباءنا الضراء والسراء (الاعراف ۷-۹۵)

ع ۹۴۴ دابر - دُبُر کے معنی پیٹھ ہیں اور دابر متاخر اور تابع کو کہتے ہیں یعنی جو پیچھے رہ جائے، مکان کے اعتبار سے ہو یا زمانہ کے یا مرتبہ کے (غ) اور اصل یا جڑ بھی اس سے مراد لی جاتی ہے (ج) دابر قوم کے کاٹ دینے سے مراد قوم پر عذاب استیصال کا آنا ہے جس سے ان کی شوکت وقوت ٹوٹ جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب کے سب لوگ مرجائیں۔ اہل مکہ کا عذاب استیصال ان کا مغلوب ہوجانا ہی تھا۔ اور جنگ بدر کے ذکر میں ہے ویرید اللّٰہ ان یحق الحق بکلمٰتہ ویقطع دابر الکٰفرین (الانفال ۸-۷) حالانکہ ان کے چند سردار مارے گئے تھے مگر چونکہ قوم کی قوت ٹوٹ گئی اس لیے اس کو جڑ کاٹنے سے تعبیر کیا ہے۔

قوم کب ہلاک ہوتی ہے: ظالم قوم کی ہلاکت کے بعد یہ لفظ لاکر الحمد للّٰہ رب العٰلمین یہ بتایا کہ کسی قوم کا استیصال اللہ تعالیٰ عالمین کی ربوبیت کے لیے کرتا ہے، یعنی جب قوم کی حالت ایسی ہوجاتی ہے کہ وہ ربوبیت عالمین میں ہارج ہوتی ہے اور نیکی کی بالکل جڑ کٹنے لگتی ہے، تب اس کا استیصال کر دیا جاتا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

کہہ، کیا تم نے غور کیا اگر اللہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں لے جائے اور تمھارے دلوں پر مہر لگا دے اللہ کے سوائے کون معبود ہے جو تم کو یہ لا دے۔ دیکھو ہم کس طرح باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں پھر بھی یہ پھر جاتے ہیں ۹۴۵

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

کہہ، بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر اچانک یا کھلا کھلا آجائے (تو) کیا سوائے ظالم لوگوں کے کوئی (اور) ہلاک کیا جائے گا ۹۴۶

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے مگر خوش خبری دیتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے۔ پس جو کوئی ایمان لائے اور اچھے کام کرے تو ان پر کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ پچھتائیں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور جو لوگ ہماری باتوں کو جھٹلاتے ہیں انھیں عذاب پہنچے گا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

کہدے، مَیں تم کو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ مَیں تم کو کہتا ہوں کہ مَیں فرشتہ ہوں مَیں کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا سوائے اسکے جو میری طرف وحی کی جاتی ہے کہہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں سو کیا تم غور نہیں کرتے ۹۴۷

---

۹۴۵ نصرف الآیات۔ تصریف کے معنی وہی ہیں۔ جو صرف کے ہیں یعنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا، مگر تصریف میں کثرت پائی جاتی ہے (رغ) یہ انہی لوگوں کو فرمایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل میں سخت دلی اختیار کر رہے ہیں۔ پہلی قوموں کا حال سُنا کر اب ان کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر تم اسی طرح مخالفت میں لگے رہو گے تو جانتے ہو نتیجہ کیا ہوگا؟ تمہارے کان ہوں گے پر سنو گے نہیں، آنکھیں ہوں گی پر دیکھو گے نہیں، دل ہوں گے پر سوچو گے نہیں۔ اللہ تعالےٰ کا لے جانا یہی ہے کہ ان کے فائدے سے محروم کر دے گا، کیونکہ اس کا قانون یہی ہے کہ جب ایک قوت سے انسان کام نہیں لیتا تو وہ بیکار ہو جاتی ہے۔

۹۴۶ بغتۃ۔ اچانک جس کے نشانات پہلے سے ظاہر نہ ہوں جھرۃ کھُلا کھُلا جس کے علامات بھی پہلے سے ظاہر ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب کبھی ایک رنگ میں ظاہر ہوتا ہے کبھی دوسرے میں۔

۹۴۷ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو خزانوں سے مالا مال کر دیا اور بہت سی آئندہ کی خبریں ان کو بتا دیں یہاں تک کہ جو جو حالات اس امت کو پیش آنے والے تھے۔ وہ سب بتا دیئے۔ اور جب چاروں طرف شرک و بے دینی کی ظلمت پھیل رہی تھی آپ ایک فرشتہ کی طرح ہر ایک قسم کی آلائش سے پاک رہے۔ لیکن ایمان لانے کے لیے، نیکی کرنے کے لیے یہ لالچ نہیں دیتے۔ نیکی کی خاطر نیکی کرنا اعلےٰ سے اعلےٰ رنگ میں اس کی تعلیم اگر کسی نے دی تو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ اس لیے فرمایا کہ ان کو کہہ دو کہ اللہ کے خزانوں کا مالک مَیں نہیں وہ جسے چاہے دے، غیب کا مالک مَیں نہیں، فرشتہ مَیں نہیں، تمہاری طرح بشر ہوں۔ پس مَیں تم کو حصول کمال انسانی کے لیے بلاتا ہوں، وہی اصل غرض میری دعوت کی ہے۔ مجھے قبول کرو تو اس میں کوئی دنیوی خوبی نہ ہو، کوئی نفسانی خواہش نہ ہو۔ فخر نوع انسان صرف کمال انسانی کی طرف بلاتا ہے۔

ان اتبع الا ما یوحیٰ الیَّ مَیں کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا، سوائے اس کے جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک تو رسول اللہ صلعم کی عصمت پر شہادت ہے کہ آپ صرف احکام الٰہی کی پیروی کرتے ہیں نہ کسی خواہش نفس کی، نہ کسی دوسرے کی۔ دوسرے آپ کے کمال کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ قرآن شریف میں وحی تعلیم کے رنگ میں مذکور ہے آپ اس سب کی پیروی کرتے ہیں گویا جن کمالات کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ قرآن علم ہے تو آپ عمل ہیں۔ تیسرے آپ کے پیروؤں کو بتایا کہ

وَ اَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۵۱﴾

اور اس کے ساتھ ان کو ڈرا جو خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ان کے لیے اس کے سوائے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا تاکہ وہ تقوٰے اختیار کریں ۹۴۸

وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ؕ مَا عَلَيۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ وَّمَا مِنۡ حِسَابِكَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ فَتَطۡرُدَهُمۡ فَتَكُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵۲﴾

اور اُن کو نہ نکال جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی رضا چاہتے ہیں۔ تجھ پر اُن کے حساب میں سے کچھ (ذمہ داری) نہیں اور نہ ان پر تیرے حساب میں سے کچھ (ذمہ داری) ہے کہ تو ان کو نکال دے پس ظالموں میں سے ہو جائے ۹۴۹

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لِّيَقُوۡلُوۡۤا اَهٰٓؤُلَاۤءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِنَا ؕ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰكِرِيۡنَ ﴿۵۳﴾

اور اسی طرح ہم ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ تکلیفوں میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ کہیں کیا یہ وہی ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے احسان کیا ہے کیا اللہ شکر کرنے والوں کو نہیں جانتا ۹۵۰

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا

اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری باتوں پر ایمان لاتے ہیں تو کہہ، تم پر سلامتی ہو، تمھارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے نادانی سے بُرائی کر بیٹھے

وہ اگر کمال کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اتباع قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان کے لیے ایک راہ ہے۔ اسی لیے آیت کا خاتمہ اس پر کیا ہے کہ اعمٰی اور بصیر برابر نہیں۔ اعمٰی وہ ہے جو ان کمالات سے غافل رہا، بصیر وہ ہے جس نے ان کو دیکھ لیا اور پھر ان کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔
ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق عمل امور دینی میں قابل اتباع نہیں منشائے الفاظ کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں تو یہ بتایا ہے کہ جو عمل رسول اللہ صلعم سے ثابت ہو۔ وہ آپ کی خواہش نفسانی سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ہے، خواہ وہ وحی جلی ہو یا خفی۔

۹۴۸ قرآن کریم کا انذار تو سب کے لیے ہے۔ یہاں خصوصیت سے بعض لوگوں کے انذار سے مراد یہ ہے کہ انہی کی صورت میں انذار کی غرض حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ انذار کی پروا نہیں کرتے اس لیے ان کو انذار کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ یہ انذار جس کا یہاں ذکر ہے اس قبیل سے ہے جیسا فرمایا انما تنذر من اتبع الذکر (یٰس ۳۶-۱۱) یا انما تنذر الذین یخشون ربھم بالغیب (فاطر ۳۵-۱۸)

۹۴۹ مسلمان غربا کے متعلق کفار قریش کا مطالبہ: پہلے مسلمان اکثر غربا میں سے تھے بعض حبشی غلام تھے۔ رسول اللہ صلعم ان کے ساتھ مل کر بیٹھتے اور باتیں کرتے تھے قریش اپنے فخر قومی پر نازاں تھے۔ رسول اللہ صلعم کو کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں کو پاس سے اُٹھا دو تو ہم تمھارے پاس بیٹھیں گے۔ مگر اسلام کا تو اصل مقصد ہی یہی تھا کہ انسانیت کے اشتراک کے سامنے تفریق رنگ و قوم، تفریق وجاہت و مرتبہ، تفریق مال و دولت کو مٹا دے۔ خدا کی رضا کو چاہنے والا ہی بڑا انسان ہے، خواہ کسی قوم سے ہو، یا کسی رنگ کا ہو۔ اسی کے مطابق یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کا ہرگز یہ منشا نہیں، نہ کہیں لکھا ہے، کہ رسول اللہ صلعم نے ان کو نکال دینے کا ارادہ کیا تھا۔ بلکہ یہ کفار کے اس مطالبہ کا جواب ہے۔

۹۵۰ فتن کے اصل معنی سونے کو آگ میں ڈالنا ہے تاکہ میل دور ہو جائے (غ)، اسی طرح جب ایک انسان کو دکھوں میں ڈالا جاتا ہے تو اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، جب غرض یہ ہو کہ اس کے کمالات اور خلوص کو ظاہر کیا جائے۔ کیونکہ تکالیف شاقہ میں پڑے بغیر کمالات ظاہر نہیں ہوتے۔ نبی کریم صلعم کے ساتھ غربا و ضعفاء ملے، ان کو کفار نے نہ صرف حقارت کی نظر سے دیکھا بلکہ ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ نتیجہ کیا ہوا (لیقولوا میں لام عاقبت کا ہے) کہ یہی غریب لوگ جب دکھوں میں ڈالے گئے تو ان کے کمالات دنیا میں ظاہر ہوئے، اور آخر کفار کو بھی تعجب ہوا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر احسان کیا اور ان کو ایسے بلند مقام پر پہنچایا۔ مگر کس لیے؟ اس لیے کہ وہ شاکر تھے، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی انہوں نے قدر کی اور ان کو ضائع نہیں کیا۔ اس میں دنیا کی کمزور قوموں کے لیے خوش خبری ہے کہ اگر وہ بھی خدا کی

بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۵۴

پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے، تو وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۹۵۱

وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ ۝۵۵ ع

اور اسی طرح ہم باتوں کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے۔

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ۝۵۶

کہہ، مجھے روک دیا گیا ہے کہ میں اُن کی عبادت کروں، جن کو تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو، کہہ، مَیں تمھاری خواہشات کی پیروی نہیں کرونگا اس صورت میں گمراہ ہونگا اور ہدایت پانیوالوں میں سے نہ ہونگا ۹۵۲

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ ۚ مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ۝۵۷

کہہ، مَیں اپنے رب سے ایک کھلی دلیل پر (قائم) ہوں اور تم نے اس کو جھٹلا دیا، وہ میرے پاس نہیں جس کے لیے تم جلدی کرتے ہو۔ حکم اللہ ہی کا ہے۔ وہ حق بیان کرتا ہے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ۹۵۳

قُلْ لَوْ أَنَّ عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ

کہہ، اگر وہ میرے پاس ہوتا جس کے لیے تم جلدی کرتے ہوتو

دی ہوئی نعمتوں کی قدر کریں تو ان کو بھی اللہ تعالیٰ بڑا بدلہ دے گا۔

۹۵۱ ناواقفیت سے غلطی ہو جائے تو وہ قابل معافی ہے، لیکن عمداً بدیوں پر اصرار کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو جان لینے کے باوجود بُری راہ کو چھوڑنے کی کوشش نہ کرنا اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔

۹۵۲ نہیت۔ نہی کے معنی کسی چیز سے روکنا، قول سے ہو یا فعل سے اس میں کوئی فرق نہیں۔ ونهى النفس عن الهوىٰ (النّٰزعٰت ۷۹ - ۴۰) میں یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے نفس کو کہتا ہے کہ تو بدی نہ کر، بلکہ اس سے مراد ہے عملاً شہوات سے اس کا الگ کر دینا اور جس چیز کی طرف نفس کی خواہش ہو اس سے بچ جانا۔ اسی لیے نہی عن المنکر کبھی ہاتھ سے ہوتی ہے، کبھی زبان سے اور کبھی دل سے۔ پھر خدا کی نہی کچھ اس عقل کی وجہ سے ہے جو اس نے ہم میں رکھی ہے اور کچھ اس شریعت کی وجہ سے جو اس نے ہم کو دی ہے (غ)

آنحضرت صلعم کا بت پرستی سے بچا رہنا: یہاں فرمایا کہ رسول اللہ صلعم کو غیر اللہ کی عبادت سے روکا گیا ہے۔ تو یہ روکنا قول سے تو نبوت کے بعد ہوا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فعل سے آپ کو بچپن سے بُت پرستی وغیرہ سے روک کے رکھا، جیسا کہ تاریخ کی اس پر گواہی ہے کہ آپ کبھی مشرک نہیں ہوئے اور اسی طرف عقل اور فطرت سلیم نے آپ کو ہدایت کی۔ یہاں شرک کو ان کی اھواء قرار دے کر بتا دیا کہ فطرت اور عقل جو اللہ نے انسان کے اندر ودیعت کی ہے وہ توحید کی طرف ہی ہدایت فرماتی ہے۔

۹۵۳ الفاصلین۔ فصل کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری سے الگ کر دینا یہاں تک کہ دونوں میں فرق ہو جائے۔ اس لیے مکان سے الگ ہونے کو بھی کہا جاتا ہے۔ ولمّا فصلت العير (یوسف ۱۲ - ۹۴) اور یوم الفصل وہ دن ہے جو حق کو باطل سے الگ کر دیتا ہے۔ اسی سے فیصلہ کرنا ہے (غ)

مفردات میں ہے کہ بینة کھلی دلیل کو کہتے ہیں، عقلی ہو یا محسوس۔ اور یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توحید پر قیام اور بت پرستی سے عملی بیزاری کو بینۃ کی وجہ سے بتایا ہے، یعنی جس چیز کی طرف وحی و عقل نے ہدایت کی ہے وہ ایک واضح دلیل ہے۔

وسعت رحمت الٰہی: محمد رسول اللہ صلعم جیسا وسیع دل انسان کوئی نہیں ہوا۔ اپنے دشمنوں سے جسقدر عملی نرمی اور محبت کا ثبوت آپ نے دیا ہے دوسرے کسی انسان کی زندگی میں وہ نہیں ملتا۔ لیکن خدا کا رحم اور محبت بہت بڑھ کر وسیع ہیں۔ فرماتا ہے کہ ان کے جرائم اس قدر ہیں کہ اگر انسان کے اختیار میں ان کا سزا دینا ہوتا تو خواہ رسول اللہ صلعم ہی ہوتے، ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ جیسا کہ اگلی آیت میں صاف فرمایا۔ مگر خدا بہت بردبار ہے اور انسان کو بڑی مہلت دیتا ہے۔ آج بھی اس کا وہی قانون کام کرتا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں فلاں قوم جلد تباہ ہو جائے مگر وہ جو فیصلہ کرنے والا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کب کس کی تباہی کا وقت ہے۔

حکم خدا کے ماتحت حکم: ان الحكم الا لله سے یہاں مراد صرف دشمنوں کی سزا کا حکم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اختیار میں ہے کسی انسان کے نہیں جیسا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اور کوئی حکم دینے والا ہے ہی نہیں کیونکہ یہ خلاف واقعات ہے۔ اہل قرآن کا اس آیت سے ان احکام دینی کے خلاف استدلال کرنا جو احادیث میں نبی کریم صلعم

لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۵۸

میرے اور تمھارے درمیان معاملہ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۵۹

اور اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں سوائے اس کے ان کو کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا، مگر وہ اسے جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں نہیں اور نہ تر اور نہ خشک۔ مگر وہ ایک کھلی کتاب میں ہے ۹۵۴

وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۶۰

اور وہی ہے جو رات کو تمھاری روح قبض کرتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم دن کو کرتے ہو پھر وہ تم کو اس میں اٹھاتا ہے تاکہ ایک مقررہ وقت پورا کیا جائے پھر اسی کی طرف تمھارا لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو خبر دیگا جو تم عمل کرتے تھے ۹۵۵

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ

اور وہ غالب ہے اپنے بندوں سے بالاتر (ہے) اور تم پر نگہبان

کی زبان سے مروی ہیں سیاق وسباق عبارت کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں ادنیٰ عقل سے بھی جو شخص کام لے وہ دیکھ لیگا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کسی کا کسی کو حکم دینا خدا کے حکم میں ہی داخل ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہی سب احکام دیئے۔

۹۵۴ مفاتح۔ مَفْتَح کی جمع ہے جس کے معنی خزانہ ہیں۔ مِفْتَح یا مِفْتَاح کی جمع بھی ہو سکتی ہے جس کے معنی کنجی ہیں۔ مگر اول معنی جو سدی سے مروی ہیں یہاں زیادہ موزوں ہیں۔ مفردات میں دوسرے معنی لیکر یوں توجیہ کی ہے کہ مراد اس سے وہ اسباب ہیں جن سے اس کے اس غیب تک پہنچا جاتا ہے جس کا ذکر فلا یظهر علٰی غیبه احدا (الجن ۲۶) میں ہے۔

کتاب مبین سے یہاں مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے جیسا کہ خود سیاق عبارت سے ظاہر ہے، کہ ہر ایک چیز کے علم کا ذکر کر کے آخر پر یہ لفظ لائے ہیں جو اس علم کے قائم مقام ہیں۔ اور مفردات میں ہے کہ کتاب اللہ سے مراد اس کا علم اور اس کا حکم بھی ہوتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ اعمال کی جزا و سزا کا تعلق علم سے ہے کوئی عمل ظاہر کرے یا چھپ کر کرے اللہ تعالیٰ اسے یکساں جانتا ہے۔ علاوہ ازیں خشک ہو کر گرنے والے پتے میں اس قوم کی طرف اشارہ بھی ہے جس کا عروج اب جانے والا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں دانہ جو اب اُگ کر درخت بنے گا خود اسلام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہونا ہے ہو کر رہے گا مگر اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ترقی تدریجاً ہوگی۔ بسا اوقات قرآن کریم کی دلیل دو کام کرتی ہے ایک طرف اللہ تعالیٰ کے علم کامل کا ذکر کیا جو اس کی توحید کی دلیل ہے، دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ قوموں کا زوال و عروج کس طرح ہوتا ہے، اور کہ قوم کا زوال اس وقت ہوتا ہے جب وہ خشک پتہ کی طرح خوبیوں سے خالی ہو جاتی ہے اور عروج ایک دانہ کی طرح ہوتا ہے جو زمین میں بویا جاتا ہے اور درخت بن جاتا ہے۔

۹۵۵ یتوفٰکم۔ توفی کے لیے دیکھو ۴۴۲۔ مفردات میں ہے قد عُبِّرَ عن الموت والنوم بالتوفی یعنی توفی سے مراد موت ہوتی ہے یا نیند۔ توفی اصل میں قبض روح کا نام ہے۔ پھر اس کا استعمال دونوں حالتوں پر ہے قبض تام جو موت کے وقت ہوتا ہے، اور قبض ناقص جو نیند کے وقت ہوتا ہے۔ مگر یہ لفظ قبض روح کے لیے خاص ہے۔ جسم انسانی کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانے پر کبھی نہیں بولا جاتا۔ نیند اور موت پر لفظ توفی کے مشترک طور پر بولنے میں یہ اشارہ ہے کہ جو چیز نیند کے وقت قبض کی جاتی ہے وہی موت کے وقت قبض کی جاتی ہے۔ اور وہ تمیز ہے جس پر انسان کے اعمال کا مدار ہے، اور جو حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز ہے۔ اسی لیے رات کی توفی کے بعد یہ فرمایا کہ جو دن کو تم کرتے ہو اسے جانتا ہے یعنی جب تمھاری تمیز تمھاری طرف لوٹ آتی ہے تب تمھارے اعمال محاسبہ میں آتے ہیں۔

جرحتم۔ جَرْح کے معنی ہتھیار کے ساتھ اثر کرنا یا زخم ہیں، اور جَرَحَ الشیُٔ کے معنی کَسَبَ ہوتے ہیں یعنی کمایا (ل)۔ اور جوارح انسان کے اعضاء ہیں جن سے کماتا ہے، اور اِجْتِرَاح کے معنی اکتساب اثم یا گناہ کا کمانا آتے ہیں (غ) ام حسب الذین اجترحوا السیات (الجاثیۃ ۲۱)

پچھلی آیت کی طرح اس آیت میں بھی ایک طرف علم الٰہی کا ذکر کیا جو اس کی توحید پر دلیل ہے، اور دوسری طرف بتایا کہ جو کچھ انسان حالت بیداری میں کرتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے اور اس پر وہ نتائج مترتب فرماتا ہے یہ کس طرح ہوتا ہے اور اس کی غرض کیا ہے۔ اگلے رکوع میں بیان فرمایا۔

حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ
تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾

بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے
ہمارے بھیجے ہوئے اسکی روح قبض کرتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ ۹۵۶

ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَی اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا
لَهُ الْحُكْمُ ۟ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ ﴿۶۲﴾

پھر وہ اپنے مولا برحق کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سو حکم اسی کا ہے،
اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ
وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً ۚ لَىِٕنْ
اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۶۳﴾

کہہ، کون تم کو خشکی اور تری کی مشکلات سے نجات دیتا ہے
(جب) تم اس کو عاجزی سے اور چھپ کر پکارتے ہو اگر وہ ہم کو
اس سے نجات دے تو ہم یقیناً شکر کرنے والوں میں سے ہونگے۔ ۹۵۷

قُلِ اللّٰهُ یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ
ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

کہدے، اللہ تم کو ان سے اور ہر سختی سے نجات دیتا ہے،
پھر تم شرک کرتے ہو۔ ۹۵۸

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ
عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ
اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ

کہہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے عذاب بھیجے
یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے یا تمھیں کئی فرقے بنا کر
ملا دے اور تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی (کا مزہ) چکھادے

---

۹۵۶ حَفَظَة ۔ حافظ کی جمع ہے، مراد اعمال انسانی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون (الانفطار ۸۲: ۱۰-۱۲) اور یقیناً تم پر حفاظت کرنے والے مقرر ہیں معزز لکھ لینے والے جو تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔

حفاظتِ اعمال کا قانون: اور یہ جو فرمایا له معقبات من بین یدیه ومن خلفه یحفظونه من امر الله (الرعد ۱۳-۱۱) تو اس سے بھی مراد یہی اعمال کی حفاظت کرنے والے ملائکہ ہیں۔ اور یحفظونہ اس لیے فرمایا کہ یہی چیز انسان میں سے حفاظت کے قابل ہے کیونکہ اسی سے انسان کی دوسری زندگی یا زندگی بعد الموت پیدا ہوتی ہے۔ ایسا ہی فرمایا قد علمنا ما تنقص الارض منهم وعندنا کتاب حفیظ (ق ۵۰-۴) یعنی جو چیز زمین ان سے کم کرتی ہے اس کو ہم جانتے ہیں اور ہمارے پاس کتاب ہے جو محفوظ رکھ لیتی ہے، یعنی جو حفاظت کے قابل چیز ہے وہ محفوظ رکھ لی جاتی ہے اور اجزائے زمینی زمین میں مل جاتے ہیں۔ اس حفاظت اعمال کو بتانے کی غرض یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کی اصلاح کرے اور جو کام کرے یہ سمجھ کر کرے کہ اس کا ایک نتیجہ بھی پیدا ہوگا جسے وہ دیکھ کر رہے گا۔

توفی میں جسم نہیں لیا جا سکتا: توفته رسلنا۔ رسول یا بھیجے ہوئے یہاں وہ ملائکہ ہیں جو ارواح کو قبض کرتے ہیں۔ اگر توفی کے معنی جسم کو لینے کے ہوتے، تو یہاں الفاظ چاہتے ہیں کہ وہی معنی لیے جاتے کیونکہ یہاں نہ صرف خدا انسان کو پورا لینے کے لیے اپنے رسولوں کو بھیجتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ساتھ کہہ دیا کہ وہ کوئی کمی نہیں کرتے یعنی کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑتے جو لینے کے قابل ہو۔ پس اگر توفی میں جسم خاکی بھی کبھی لینے کے قابل ہوتا تو سب انسانوں کے جسم خاکی بھی ملک الموت کو ساتھ لے جانے چاہئیں ثم ردوه الی الله (پھر اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں) اگلی آیت میں بھی قابل غور ہے۔ حالانکہ جسم خدا کی طرف نہیں لوٹائے جاتے بلکہ ارواح لوٹائی جاتی ہیں۔

۹۵۷ ظلمات سے مراد یہاں شدائد ہیں یعنی مشکلات، یومٌ مُظلمٌ اس دن کو کہتے ہیں جس میں بڑی تکالیف پیش آئیں (ل)

تضرعا۔ حالت عاجزی میں چونکہ انسان بے بس ہو کر گڑگڑاتا ہے اس لیے مراد علی الاعلان پکارنا ہے یعنی بلند آواز سے، اور آخرت سے دنیا کے عذاب کی طرف مضمون کو منتقل کر کے سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف بندہ کی اصلاح چاہتا ہے۔ چنانچہ جب اس دنیا میں انسان پر دکھ آتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس تکلیف سے نجات عطا فرما دیتا ہے۔

۹۵۸ کرب شدید غم کو کہتے ہیں اس کا اصل مفہوم زمین کو کھود کر الٹ پلٹ کرنا ہے، پس ایسا غم جو نفس میں اس طرح ہیجان پیدا کرے کرب ہے (غ)

بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا رحم اس قدر بڑا ہے کہ تم شرک کرتے کرتے بھی جب اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو تو وہ تمہاری مصیبت کو دور کرتا ہے، مگر باوجود اس کے پھر جب تکلیف سے نکلتے ہو تو خدا کو چھوڑ دیتے ہو۔ اس مہذب زمانہ میں بھی یہی حال ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس وقت کے بت مال و دولت اور سلطنت ہیں۔ ان کی پرستش دلوں پر ایسی غالب ہے کہ ان کے سامنے خدا کا نام بھی بھول جاتا ہے۔ ہاں جب تکلیفیں انتہا کو پہنچتی ہیں تو خدا یاد آتا ہے۔

بَعۡضٍ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَفۡقَهُوۡنَ ﴿۶۵﴾

دیکھ ہم کس طرح باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ لیں ۹۵۹

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوۡمُكَ وَهُوَ الۡحَـقُّ ؕ قُلْ لَّسۡتُ عَلَيۡكُمۡ بِوَكِيۡلٍ ؕ ﴿۶۶﴾

اور تیری قوم نے اسے جھٹلا دیا، حالانکہ وہ حق ہے۔ کہہ میں تم پر داروغہ نہیں۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسۡتَقَرٌّ‌ وَّسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۷﴾

ہر ایک خبر کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم جان لو گے ۹۶۰

وَاِذَا رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ يَخُوۡضُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰى يَخُوۡضُوۡا فِىۡ حَدِيۡثٍ غَيۡرِهٖ‌ ؕ وَاِمَّا يُنۡسِيَنَّكَ الشَّيۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّكۡرٰى مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۶۸﴾

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے، جو ہماری آیتوں کے متعلق بیہودہ باتیں کرتے ہیں تو اُن سے مُنہ پھیر لے۔ یہاں تک کہ اس کے سوائے کسی دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر شیطان تجھے بھلا دے تو یاد آ جانے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ ۹۶۱

ع۹۵۹ فوق اور تحت کے عذاب سے مراد: من فوقکم۔ او من تحت ارجلکم سے ایک مراد تو اوپر اور نیچے سے جیسے ہوا اولے، آندھیوں یا زلزلوں، غرق وغیرہ سے لی گئی ہے مگر زیادہ قرینِ قیاس ائمۃ السوء یعنی اعلیٰ اور سفلۃ الناس یعنی ادنیٰ طبقہ یعنی امراء یا ضعفاء ہیں (ج)۔ بعض وقت ایک قوم اس لیے ہلاک ہو جاتی ہے کہ اُن کا اعلیٰ طبقہ خراب ہو جاتا ہے، اور بعض وقت اس لیے کہ عوام الناس یا ادنیٰ طبقہ خراب ہو جاتا ہے، یا وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے ہیں یعنی عوام الناس تو وہ بڑوں کو ہلاک کر دیتے ہیں جیسے بولشویک۔

یلبسکم شیعا۔ لبس کے معنی خلط ملط کر دینا ہیں یعنی باہم فساد ہو جائے۔

اعدائے اسلام میں باہم جنگ کا عذاب: اس آیت میں نبی کریم صلعم کے مخالفین کا ذکر ہے جو توحید الٰہی کو دنیا میں پھیلنے سے روکتے ہیں۔ مگر قرآن کریم چونکہ ہمیشہ کے لیے ہے اور اس کا پیغام توحید بھی دنیا میں ہمیشہ ہی پہنچتا رہے گا اور لوگ بھی اس کی مخالفت ہمیشہ ہی کرتے رہیں گے اس لیے آئندہ زمانہ کے مخالف بھی اس میں شامل ہیں۔ حدیث میں بعض قوموں کا ذکر آتا ہے جو آخری زمانہ میں اسلام کو مٹانا چاہیں گے، اور ان کے متعلق آتا ہے لایدان لاحد بقتالھم ان کے ساتھ جنگ کرنے کی مسلمانوں کو طاقت نہیں ہو گی، اس لیے ان کے لیے عذاب بھی اسی رنگ کا ہو گا کہ وہ خود باہم جنگ و جدال سے ایک دوسرے کو کمزور کر دیں اور قرآن کریم میں جو عیسائیوں کا ذکر آتا ہے والقینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیامۃ (المائدۃ ۵-۶۴) وہ اسی کا موید ہے، یعنی باہم بغض و عداوت ان کے لیے عذاب کا رنگ اختیار کر لے گا۔ آج اگر ایک طرف عالمگیر جنگ قرآن شریف کی اس پیشگوئی کو سچا ثابت کر رہی ہے، تو دوسری طرف بولشوزم کا خطرہ بھی یذیق بعضکم باس بعض کا نظارہ ہی پیش نظر کر رہا ہے۔ ہاں چونکہ قرآن کریم کے ہر بیان میں دوہری غرض ہے اسلیئے مسلمانوں کو بھی ضمناً سمجھا یا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدال نہ کریں ورنہ یہ ان کی کمزوری کا موجب ہو جائے گا۔

حدیث میں آتا ہے کہ اس امت کی ہلاکت کا موجب ان کا باہمی فساد ہو گا۔ ابوداؤد میں ہے لا یسلط علیھم عدوا من سوی انفسھم فیستبیح بیضتھم۔ یعنی ان کے اپنے لوگوں کے سوائے دوسرا کوئی دشمن ان پر مسلط نہ کرے گا جو ان کو بالکل نیست و نابود کر دے۔ بلکہ باہم جنگ و جدال سے ہلاک ہوں گے۔ مسلمانوں کی تاریخ پر جو شخص غور کرے گا وہ دیکھ لے گا کہ مسلمانوں کے باہمی فساد ہی ان کی ہلاکت کا موجب ہوئے ہیں

آنحضرت کے لیے سُرخ و سپید خزانوں کا وعدہ: اسی حدیث میں آتا ہے کہ مجھے دو خزانے دیئے گئے ہیں، ایک احمر یعنی سُرخ، اور ایک ابیض یعنی سپید۔ یہ سپید خزانہ ملنا ابھی باقی ہے آپ کے خزانے آپ کی امت ہی ہیں۔ اسلام کی پہلی ترقی مشرقی ممالک کی طرف رہی۔ اب مغربی ممالک میں اس کے ظہور کا وقت آیا ہے اور یہی سپید خزانہ ہے پس عذاب استیصال اللہ تعالیٰ نے اسلام کے پہلے دشمنوں پر بھی اسی رنگ کا بھیجا کہ ان کی شوکت ٹوٹ کر وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اور پچھلے مخالفوں کے لیے بھی ایسا ہی مقدر معلوم ہوتا ہے۔

ع۹۶۰ مستقر۔ قرّ کے معنی ہیں ایسا ٹھہر گیا کہ وہاں سے ہلا نہیں۔ کیونکہ قرّ ٹھنڈک کو کہتے ہیں جو سکون کو چاہتی ہے جس طرح گرمی حرکت کو چاہتی ہے اسی سے قُرّۃ عین ہے۔ آنکھ کی ٹھنڈک اور زمین کو قرار اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہ انسان کے لیے استقرار کی جگہ ہے (غ)، اور مستقر استقرار کی جگہ ہے اور یہاں مراد وقت استقرار و وقوع ہے۔ مراد یہ ہے کہ پیشگوئی تو پوری ہو کر رہے گی مگر اپنے وقت پر۔

ع۹۶۱ خوض کے لیے دیکھو ع۴۲۹۔ مجلس استہزا میں شمولیت سے روکنے کی وجہ غیرت دینی ہے؛ یہاں مخاطب رسول اللہ صلعم نہیں ہیں بلکہ ہر ایک مسلمان سامع ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے اس لیے روکا ہے کہ ان کی صحبت کے اثر سے متاثر ہو جائے گا۔ اور دین کی عظمت دل سے نکل جائے گی۔ (دیکھو ع۴۲۹) جہاں منافقوں

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ
شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۞ ۶۹

اوران لوگوں پر جو تقوےٰ اختیار کرتے ہیں ان کے حساب میں سے کچھ (ذمہ داری) نہیں لیکن یہ نصیحت ہے تاکہ وہ بچیں ۹۶۲ع

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا
وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ
اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ
تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ
مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا
كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۞ ۷۰ ع

اوران لوگوں کو چھوڑ دے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور بے حقیقت تماشا بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈالا ہوا ہے اور اس (قرآن) کے ساتھ نصیحت کر کہ کوئی جان اس کی وجہ سے جو اس نے کمایا ہلاک (نہ) کی جائے اس کے لیے اللہ کے سوائے کوئی دوست نہیں اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ اور اگر ہر ایک قسم کا بدلہ دینا چاہے تو اس سے نہ لیا جائے گا۔ یہ وہ ہیں جو اس کی وجہ سے جو انھوں نے کمایا ہلاک کیے گئے ان کے لیے کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب ہوگا اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے ۹۶۳ع

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا
وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ
هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ
فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ
اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ

کہہ، کیا ہم اللہ کے سوائے اسے پکاریں جو ہم کو نفع نہیں دیتا اور نہ ہی ہمکو نقصان پہنچا سکتا ہے اور کیا ہم اپنی ایڑیوں پر لوٹائے جائیں اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں سیدھا رستہ دکھایا اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین کے اندر حیران بنا کر خواہشات کی پیروی میں لگا دیا اس کے ساتھی ہوں جو اس کو ہدایت کی طرف بلاتے ہوں کہ ہمارے پاس آجا۔ کہہ اللہ کی ہدایت ہی

کے ذکر میں پھر اس سے روکا ہے۔ قرآن کریم کی ہر ایک تعلیم اعلیٰ درجہ کے اعتدال پر مبنی ہے۔ تنگدل لوگوں کی طرح عام اصول نہیں بنا دیا کہ فلاں قوم چونکہ تمہاری مخالف ہے اس لیے ان کے پاس مت بیٹھو، ان سے بات چیت نہ کرو نہ ہی افراط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ صحبت بد کے اثر کی پرواہی کوئی نہ کی ہوتی۔ صورت اول میں دنیا کے کاروبار رک جاتے، صورت ثانی میں لوگ اپنے اخلاق اور روحانیت کو تباہ کر بیٹھتے۔ اس لیے فرمایا کہ مل کر بیٹھنے باتیں کرنے کی ضرورتیں تو ناگزیر ہیں مگر ایسا نہ ہو کہ ایسی صحبتوں کو عام کرتے کرتے یہاں تک نوبت پہنچے کہ مذہبی بے غیرتی کو قبول کر لو۔ اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر علانیہ ہنسی ہو رہی ہو تو ایسی مجلسوں میں بھی شریک رہو۔ اس خاص بات کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ روحانیت کو ایک بدیہی نقصان پہنچانے والی چیز ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب انسان اپنے اخلاق اور روحانیت کو کھلا نقصان پہنچتا دیکھے تو ایسی صحبت کو ترک کرے۔ آج کل کی بیشتر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مجالس بھی اس نقصان سے خالی نہیں۔ بوجہ ناواقفیت دین کے یہ لوگ بجائے کوئی مفید گفتگو کرنے کے ایسی باتوں میں لگے رہتے ہیں جن کا اثر دین کو نقصان ہے۔ کسی کی غیبت، کسی کی عیب جوئی کچھ ہنسی ٹھٹھا ہوتا ہے۔ پھر رات کو بہت دیر تک یہ مجالس گرم رہتی ہیں۔ نماز سے محروم رہتے ہیں۔ صبح دیر سے اٹھتے ہیں۔ دین و دنیا دونوں کو برباد کرتے ہیں۔

۹۶۲ع یہاں بتایا کہ ساتھ بیٹھنے سے یہ تو نہیں کہ انسان ان کے افعال کا ذمہ دار ہو جاتا ہے، بلکہ یہ ایک نصیحت ہے تاکہ مسلمان خود ان کے اثر بد سے بچتے رہیں۔ یا مراد یہ ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے پاس خاطر سے وہ لوگ بھی دین کے ساتھ استہزا کرنے سے بچ جائیں گے۔

۹۶۳ع تُبْسَل۔ بَسْل کے معنی کسی چیز کا روک دینا ہیں، اور یہاں مراد ثواب سے محروم کر دینا ہیں (غ) حرام اور بسل میں فرق یہ ہے کہ حرام وہ ممنوع ہے جو حکم سے ہو یعنی یہ کہہ دیا جائے کہ یہ چیز مت کھاؤ، یا قہر سے کہ اس سے جبراً روک دیا جائے۔ گویا یہ عام ہے اور بَسْل خاص ہے یعنی جس سے قہراً روک دیا جائے (غ)

حمیم۔ سخت گرم یا کھولتے ہوئے پانی کو کہتے ہیں۔ اور حَمّام مشہور ہے اور حمیم دوست کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ دوست کی وجہ سے خشمناک ہوتا ہے اور حُمّی بخار کو کہتے ہیں (غ)

ہم صحبتوں کو نصیحت کی ضرورت: یہاں یہ بتایا کہ یہ کافی نہیں کہ ایسے ہم نشینوں سے ہی بچے جو دین سے استہزا کرتے ہیں، بلکہ جن کے پاس بیٹھے ان کو نصیحت بھی کرتا رہے۔ بِهٖ میں ضمیر قرآن شریف کی طرف ہی جاتی ہے۔ اور نصیحت کا پیرایہ یہ بتایا کہ اپنے آپ کو ثواب یعنی اعلیٰ مقامات سے محروم کر لینا اچھا نہیں۔

هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾
وَ اَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ
الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾
وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ
بِالْحَقِّ ؕ وَ يَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۬ؕ قَوْلُهُ النصف
الْحَقُّ ؕ وَ لَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ
عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾
وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ
اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ
فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾

(کامل) ہدایت ہے اور ہمکو حکم دیا گیا ہے کہ ہم جہانوں کے پروردگار کی فرمانبرداری کریں ۹۶۴ اور کہ نماز کو قائم کرو اور اس کا تقوےٰ اختیار کرو اور وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور جس دن کہے گا کہ ہو، تو وہ ہو جائے گا ۹۶۵ اس کا فرمانا حق ہے۔ اور اسی کے لیے بادشاہت ہے، جس دن صور میں پھونکا جائیگا ۹۶۶ — وہ غیب اور ظاہر کا جاننے والا اور وہ حکمت والا اخبردار ہے۔

اور جب ابراہیم نے اپنے بزرگ آزر کو کہا کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے میں تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں ۹۶۷

ع۹۶۴ استہوت۔ اس کا مادہ ھویٰ ہے، جس کے معنی نفس کا شہوات کی طرف میلان ہے۔ اور ھُوِیٌ کے معنی سقوط من عُلُوٍّ الی سُفْلٍ ہیں یعنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا (غ) گویا شہوات کی طرف میلان بلندی سے پستی کی طرف گرنا ہے۔ استہوتہ کے معنی راغب نے کیے ہیں حَمَلَتْهُ علی اتباع الْهَوٰی یعنی اس کو خواہشات کی پیروی پر لگا دیا۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے بلند مقام سے گرا دینا بھی معنی ہو سکتے ہیں، ماحصل ایک ہے۔ ھویٰ کے دوسرے معنی کے لیے دیکھو ع۱۶۵۹۔
حَیْران۔ حَارَ یحار سے ہے جس کے معنی ہیں متردد ہُوا۔ پس حیران جو متردد ہو یعنی نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا۔
خدا کی فرمانبرداری کے خلاف دوسری حالت خواہشات کی پیروی ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ ایک مسلمان اگر اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی اتباع کرے، تو اس کی مثال اس شخص کی ہے جو شیاطین کے پیچھے لگ کر ایسا بھٹک جائے کہ پھر اسے رستہ نہ ملتا ہو۔ اور یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری میں انسان کے قلب کو اطمینان ملتا ہے مگر خواہشات کی پیروی میں ایک تردد اور اضطراب اس کے لاحق حال رہتا ہے۔ کبھی ایک طرف جھکتا ہے کبھی دوسری طرف اور یوں ایک بلند مقام سے گر کر ذلیل حالت میں آجاتا ہے اور اصحاب جو اسے بلاتے ہیں وہ اس کے پہلے ساتھی ہیں۔

ع۹۶۵ یوم یقول کن فیکون۔ اس میں اشارہ بعث بعد الموت کی طرف ہے۔ آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا یعنی کسی غرض کے لیے، پس اسی غرض کے لیے جو تکمیل نفس انسانی ہے جو خلاصہ موجودات ہے۔ یہ ضروری ہوا کہ اس عالم کی کمی کو اس عالم میں پورا کیا جائے، اور اعمال انسانی سے انسان کو پیدا کرنا اس کے لیے مشکل نہیں جس نے پہلے اتنی مخلوق پیدا کی۔

ع۹۶۶ صُوْر کے عام معنی قَرن یا سینگ کے ہیں جیسے بگل۔ لیکن لسان العرب میں صُوْر کو صُوْرَة کی جمع بھی قرار دیا ہے۔ اور قتادہ اور حسن کی قرات بجائے صُوْر کے صُوَر ہے جو صُوْرَة کی عام جمع ہے۔ اس پر دونوں طرح اعتراض کیا گیا ہے یہ کہ صُوَر قرأت درست نہیں۔ دوسرے یہ کہ صورة کی جمع صُوْر غلطی ہے۔ مگر دوسری قرأت صریحًا منقول ہے اور صُوْر صُوْرَة کی جمع لسان العرب میں مسلّم ہے اور ابوعبیدہ نے بھی یہ کہا ہے اور جوہری نے کلبی سے یہ کہا ہے، ہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حدیث میں صُوْر کی جگہ قَرن کا لفظ بھی آتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ نفخ فی الصور یا نفخ فی القرن سے سچ مچ کا سینگ مراد لینا بھی درست نہیں۔ ایسے الفاظ جو قیامت کے متعلق بولے گئے ہیں ان کی صحیح حقیقت کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں۔ صُوْر یا قَرن میں نفخ کرنے والے ملائکہ ہونگے، اور ملائکہ کا قرن بھی کسی اور رنگ کی شے ہی ہوگی نہ وہ سینگ جس کے ذریعہ سے انسان بگل بجاتے ہیں۔ اور اصل یہ ہے کہ مراد تو نفخ فی الصور سے حشر ہے نہ کچھ اور، بگل بھی جمع کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے۔ پس نفخ فی الصور سے اصل مراد صرف حشر یا اکٹھا کرنا ہی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ حشر جیسا کہ قرآن شریف کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے ارواح کا صورتوں میں پھونکا جانا ہے پس قرآن کریم نے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جو دونوں مفہوموں پر حاوی ہے اور یہ دوسرے معنی پہلے معنی کے کسی طرح منافی نہیں۔

ع۹۶۷ اب۔ ہر شخص کو جو کسی کے وجود میں لانے یا اس کی اصلاح یا اس کے ظہور کا سبب ہو اَب کہا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے معنی باپ بھی آتے ہیں، اور چچا، دادا، دیگر بزرگوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور معلّم پر بھی۔ وجدنا اٰباءنا علیٰ امة میں اٰباءنا سے مراد علماء لیے گئے ہیں۔ جنھوں نے ان کی علم سے ربوبیت کی کیونکہ دوسری جگہ ہے (انا اطعنا سادتنا وکبرآءنا (غ)
مذہب توحید کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم کا ذکر کیا ہے کیونکہ آپ سے موحدین کی ایک عظیم الشان نسل چلتی ہے جو دنیا میں معلم توحید ہوئی ہے اور یہ انبیاء میں آپ کا فخر ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۞ ٧٥
فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۞ ٧٦
فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۞ ٧٧
فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۞ ٧٨
اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت دکھاتے رہے اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو۔[۹۶۸]
سو جب اس پر رات چھا گئی، اس نے ستارہ دیکھا۔ کہا، کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا، کہا، مَیں ڈوب جانیوالوں سے محبت نہیں رکھتا۔[۹۶۹]
پھر جب چاند کو چمکتا ہُوا دیکھا۔ کہا، کیا یہ میرا رب ہے؟ سو جب وہ ڈوب گیا۔ کہا، اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں یقیناً گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔
پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا۔ کہا، کیا یہ میرا رب ہے؟ یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا۔ کہا اے میری قوم میں اس سے بری ہوں جو تم شریک بناتے ہو۔[۹۷۰]
میں نے یکسو ہو کر اپنا مُنہ اس کی طرف کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین

آزر کون تھا: آزر کو ابراہیم کا اَب کہا ہے۔ آیا مراد اس سے باپ ہے یا کوئی اور بزرگ؟ اس میں شک نہیں کہ پہلے خیال اسی طرف جاتا ہے کہ وہ آپ کے والد ہوں۔ اس کے خلاف ایک تو یہ امر ہے کہ توریت میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارح لکھا ہے، اور پھر عرب کے نسّاب بھی اس پر متفق ہیں اور زرقانی نے بھی تارح ہی لکھا ہے۔ مگر اس کا جواب تو یہ ہے کہ عربی میں آکر نام کی صورت بدل جاتی ہے۔ اور علاوہ ازیں یوسیبیئس ایک یہودی مورخ نے تارح کو آتھر لکھا ہے جو آزر سے بالکل ملتا ہے۔ لیکن دوسری دقت یہ ہے کہ خود قرآن کریم سے اس کے خلاف شہادت ملتی ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام آزر ہو۔ کیونکہ سورۃ ابراہیم میں یہ صاف ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم نے بڑھاپے میں یہ دعا کی ربنا اغفر لی ولوالدیّ وللمؤمنین یوم یقوم الحساب اے ہمارے رب میری حفاظت فرما اور میرے والدین کی اور مومنوں کی جس دن حساب ہو (ابراہیم: ۴۱) حالانکہ اس اَب کے متعلق ہے وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الّا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلمّا تبیّن لہ انہ عدو للّٰہ تبرّا منہ (التوبۃ۔ ۱۱۴) اور ابراہیم کا اپنے اب کے لیے استغفار صرف ایک وعدہ کے سبب سے تھا جو اس سے کیا تھا۔ پھر جب اس پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے بریت کی۔ پس اس اب کے لیے بڑھاپے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام مغفرت کی دعا نہ کر سکتے تھے۔ پس آزر حضرت ابراہیم کے والد نہ تھے کوئی اور بزرگ تھے۔

۹۶۸ انبیاء کے لیے نورِ عقل کی ہدایت: یہ بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ابتداء ہی شرک وغیرہ معاصی سے پاک ہوتے ہیں۔ اور قبل از وحی قانونِ قدرت کا مطالعہ بھی ان کو حق کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کی فطرت صحیح ہوتی ہے۔ ان کا نورِ قلب دھندلا نہیں ہوتا ان کی عقل ٹھوکر نہیں کھاتی ان کا فکر ان کو صحیح نتائج پر پہنچاتا ہے۔

۹۶۹ ھذا ربی۔ موقنین میں سے تو ابراہیمؑ پہلے ہی ہو چکے ہیں اور بُت پرستی سے، شرک سے بیزار۔ بلکہ دوسروں کے شرک پر تعجب کرتے ہیں، اتتخذ اصناماً الھۃ۔ اس لیے وہ ستارہ کو دیکھ کر کبھی دل میں یہ وہم بھی نہیں لا سکتے کہ وہ ان کا رب ہے۔ اگلی دو آیات کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ ان کا اپنی قوم کے ساتھ مباحثہ ہو رہا ہے کیونکہ جب ان کی قوم کا سب سے بڑا دیوتا سورج بھی ڈوب جاتا ہے، تو وہ صاف اس قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ مَیں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ اور پھر آگے صاف آتا ہے وتلک حجتنا اٰتینٰھا ابراھیم علیٰ قومہ۔ پس ھٰذا ربی استفہام انکاری ہے جس میں حرف استفہام محذوف ہے۔ جیسے موسیٰ کے قول میں فرعون کے لیے وتلک نعمۃ تمنّھا علیّ ان عبدت بنی اسرائیل جس کے معنی ہیں کیا یہ نعمت ہے؟ یا بطور استعجاب ہے۔

فلما افل۔ افول اجرام نورانی کے غائب ہونے پر بولا جاتا ہے، جیسے چاند ستارہ وغیرہ۔ ستارہ کے ڈوب جانے سے حضرت ابراہیمؑ قوم پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جو چیز کبھی سامنے آجائے اور کبھی غائب ہو جائے وہ خود انسان کی طرح کسی قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور معبود نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک جسمانی چیز ہے جو کبھی آنکھوں کے سامنے اور کبھی غائب ہے۔ انی لا احب الاٰفلین میں یہ اشارہ ہے کہ جس چیز سے تم محبت کرتے ہو وہ خود بے اختیار ہے۔ خدا سے محبت کرنے سے تو ایسا تعلق اس ذات پاک سے پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر وہ اس انسان سے الگ نہیں ہوتا۔ مگر ایسی چیز سے محبت کا کیا فائدہ جو خود قانون کے اندر اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ محبت کرنے والا تڑپتا رہ جائے وہ غائب ہو جاتی ہے۔

۹۷۰ معلوم ہوا کہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا سورج تھا کیونکہ اس پر لا کر ختم کر دیا۔ ھٰذا اکبر میں جو ھٰذا ربی کی طرح استفہام انکاری ہے یہ بتا بھی دیا ہے یہی

وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٧٩﴾

کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْئًا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٠﴾

اور اُس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا، کہا، کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو اور اس نے مجھے یقیناً ہدایت کی ہے اور میں اس سے نہیں ڈرتا جس کو تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو، ہاں یہ کہ میرا رب کچھ چاہے۔ میرے رب کا علم تمام چیزوں کو لیے ہوئے ہے پس کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے ٩٧١

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨١﴾

اور میں کس طرح اس سے ڈروں جس کو تم شریک بناتے ہو اور تم نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ اسے شریک بنایا ہے جس کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نہیں اتاری، پس دونوں گروہوں میں سے کون امن کا زیادہ حقدار ہے اگر تم جانتے ہو ٩٧٢

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٨٢﴾ ع

جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، انہی کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت پانے والے ہیں ٩٧٣

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٨٣﴾

اور یہ ہماری دلیل تھی، جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے خلاف دی، ہم جس کو چاہتے ہیں مرتبہ میں بلند کرتے ہیں۔ تیرا رب حکمت والا جاننے والا ہے ٩٧٤

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٤﴾

اور ہم نے اس کو اسحٰقؑ اور یعقوبؑ دیئے، ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوحؑ کو ہم نے پہلے سے ہدایت دی اور اس کی نسل سے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت دی) اور اسی طرح ہم احسان کرنیوالوں کو بدلہ دیتے ہیں ٩٧٥

وجہ ہے کہ البقرۃ - ٢٥٨ میں حضرت ابراہیمؑ نے سورج کو مغرب سے نکالنے کا مطالبہ کیا ہے۔

٩٧١ جیسا کہ باطل پرستوں کا قاعدہ ہوتا ہے، جب ابراہیمؑ کے دلائل کا کوئی جواب بن نہیں آیا تو معلوم ہوتا ہے اس کو ڈرایا ہے کہ ہمارے دیوتا تمہیں نقصان پہنچائیں گے، اسی کا جواب دیا ہے کہ مجھے ان سے کچھ خوف نہیں۔ ہاں مشیت ربی کے ماتحت کوئی نقصان پہنچے تو پہنچے۔ اس سے میں گھبراتا بھی نہیں۔

٩٧٢ مالم ینزل بہ سلطٰنا۔ کسی نبی کی تعلیم میں یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے شرک کا حکم دیا ہے، یا صرف یہ مراد ہے کہ کوئی عقلی دلیل شرک کی موجود نہیں۔

٩٧٣ ظلم کے مختلف معنی میں سے ایک شرک بھی ہیں۔ اور حدیث متفق علیہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ظلم کے معنی شرک بیان فرمائے اور قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال فرمایا ان الشرک لظلم عظیم (لقمان ٣١ - ١٣) اور خود اس سورت کا مضمون بھی توحید ہی ہے۔ پس ایمان کے بعد اگر شرک کی ملونی نہ ہو تو انسان امن کو پائے گا ورنہ نہیں۔

٩٧٤ یہ دلیل جس کا یہاں ذکر ہے توحید الٰہی پر ہے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا، اور اسی توحید پر قائم ہونے کو ہی بلندی درجات قرار دیا ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ توحید پر مضبوطی سے قائم ہو جانا تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور اسی سے مراتب بلند ہوتے ہیں۔

٩٧٥ یہاں ہدایت دینے سے مراد توحید الٰہی پر قائم کرنا ہے، ذریتہ میں ضمیر حضرت ابراہیمؑ کی طرف بھی جا سکتی ہے، مگر اولیٰ حضرت نوحؑ کی طرف پھیرنا ہے، اور قریب تر بھی نوحؑ ہی ہیں اور لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت سے نہیں۔

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِّنَ الصَّٰلِحِينَ ﴿٨٥﴾

اور زکریا اور یحییٰؑ اور عیسےٰؑ اور الیاسؑ کو، (یہ) سب صالحین میں سے تھے۔

وَإِسْمَٰعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَٰلَمِينَ ﴿٨٦﴾

اور اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ۔ اور (ان) سب کو ہم نے قوموں پر فضیلت دی ۹۷۶

وَمِنْ ءَابَآئِهِمْ وَذُرِّيَّٰتِهِمْ وَإِخْوَٰنِهِمْ ۖ وَاجْتَبَيْنَٰهُمْ وَهَدَيْنَٰهُمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٨٧﴾

اور ان کے باپ دادوں میں سے اور ان کی نسل سے اور ان کے بھائیوں سے اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ہمنے ان کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت دی۔

ذَٰلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٨٨﴾

یہ اللہ کی ہدایت ہے اس کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کے وہ عمل ان کے کام نہ آتے جو وہ کرتے تھے ۹۷۷

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ ءَاتَيْنَٰهُمُ الْكِتَٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ

یہ وہ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت دی ۹۷۸ سو اگر یہ لوگ اس کا انکار کریں، تو ہم نے اس کو ایسے لوگوں کے

ع۹۷۶ بعض انبیاء کے ناموں کو اکٹھا کرنے کی وجہ اور غیر تاریخی ترتیب میں حکمت: ان آیات میں اٹھارہ انبیاء کے نام لیے ہیں۔ یعنی اوّل ابراہیمؑ پھر آپ کا بیٹا اسحاقؑ پھر اسحاقؑ کا بیٹا یعقوبؑ پھر ابراہیمؑ کے جد نوحؑ جن کی ذریت کا آگے ذکر کیا ہے۔ یہاں تک تو ایک ترتیب ہے مگر اس سے آگے بلحاظ زمانہ کوئی ترتیب نہیں رکھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے زمانوں کی ترتیب کی خبر نہ تھی، کیونکہ اس سے اگلی ہی سورت میں نہایت صفائی سے انبیاء کا ذکر ترتیب تاریخی میں کیا ہے۔ بلکہ یہاں ایک اور رنگ کی ترتیب دی ہے یعنی اول ظاہری شوکت کے لحاظ سے داؤدؑ اور سلیمانؑ کا ذکر کیا۔ جن کو عظیم الشان بادشاہتوں کا مالک بنایا گیا۔ پھر دکھوں اور تکلیفوں میں صبر کے بلند مقام کے لحاظ سے ایوبؑ اور یوسفؑ کا ذکر کیا۔ ان دونوں کو صبر کے بعد اللہ تعالیٰ نے بلند مقام پر پہنچایا۔ پھر قوم کو نہایت ذلت کی حالت سے نکال کر اعلیٰ مقام پر پہنچانے کے لحاظ سے، اور قوم کو ایک قانون اور راہ بتانے کے لحاظ سے موسٰیؑ اور ہارونؑ کا ذکر کیا۔ یہ چھ نبی ایسے ہیں کہ کسی نہ کسی رنگ میں ان کو بادشاہت یا سرداری یا حکومت ملی ہے۔ اس لیے ان کے بعد نجزی المحسنین کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کے بعد زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ کا ذکر کر کے ان کو صرف صالحین کہنے پر اکتفا کیا ہے یعنی ان کے صرف ایک پہلو زہد کامل کی طرف توجہ دلائی ہے، اس لیے کہ دنیا میں ان کو کوئی حکومت کا رنگ نہیں ملا۔ زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ کا ایک ہی زمانہ اور ایک ہی رنگ، سادگی، زہد، عبادت کا ظاہر ہے۔ الیاس کا اسی رنگ میں آنا خود اس سے ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ کی آمد کو الیاسؑ کی آمد ثانی قرار دیا گیا۔ اور اس بات کی شہادت انجیل میں موجود ہے کہ یحییٰ الیاسؑ کے رنگ اور اس کی روح میں آیا (لوقا ۱-۱۷)۔ پھر اس کے بعد اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کا ذکر کر کے ان کی فضیلت کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ ان چاروں کی تحقیر کی گئی ہے۔ جیسے حضرت اسمٰعیلؑ کی تو نبوت سے ہی انکار کیا گیا ہے اور ان کو کسی ابراہیمی وعدہ کا وارث نہیں سمجھا جاتا، اور لوط کی بھی نبوت کا انکار کیا جاتا ہے، اور یونسؑ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ خدا کے حضور سے بھاگ گئے تھے۔ ان کی فضیلت کا خصوصیت سے اس لیے ذکر کیا کہ ان کی تحقیر ہوئی ورنہ دوسرے انبیاء کو بھی فضیلت دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح قرآن شریف ایک الزام کو دور کرنے کے لیے ایک نبی کے متعلق بعض تعریفی الفاظ بیان کرتا ہے۔ اسی اصول کو نہ سمجھنے سے عیسائیوں نے یہ ٹھوکر کھائی ہے کہ حضرت مسیح کے متعلق تعریفی کلمات سے ان کی دوسرے انبیاء پر فضیلت ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ مراد صرف الزامات کا دور کرنا تھا۔ اس طرح ظاہر الفاظ پر جائیں تو یہاں سے ان چار انبیاء کی دیگر سب انبیاء پر اور مسیح پر فضیلت مانیں۔

ع۹۷۷ یہاں ہدایت کا مقابلہ شرک سے کر کے صاف بتایا کہ ہدایت دینے سے مراد توحید پر قائم کرنا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی نبی شرک کا مرتکب نہیں ہوا کیونکہ کسی کا حبط عمل نہیں ہوا۔ اور جتنے اس قسم کے قصے بن گئے ہیں وہ سب بائبل میں تحریف ہے۔

ع۹۷۸ باوجود اس کے کہ بعض کو بادشاہت ملی بعض کو نہیں، ایک امر میں ان سب کا اشتراک بیان فرمایا ہے کہ ان سب کو کتاب اور حکم اور نبوت ضرور ملے ہیں۔ کتاب وہ وحی ہے جو نبی پر اس کی امت کی ہدایت کے لیے نازل ہوتی ہے، حکم وہ اختیار ہے جو نبی کو دیا جاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کا مطیع نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں کو اپنی اطاعت کی طرف بلاتا ہے جو اس کی اُمت کہلاتے ہیں۔ اور نبوت بلحاظ لغت وہ پیشگوئیاں ہیں جو اس کو دین کی تائید کیلئے دی جاتی ہیں اور یا اس سے مراد یہاں سفارت ہے (۹۱۰) اور گو کتاب اور حکم نبوت میں شامل ہیں مگر ان دو خاص باتوں کا ذکر اس لیے کیا تا معلوم ہو جائے کہ منصب نبوت کی یہ ضروری شرائط ہیں یعنی ایک کتاب کا دیا جانا، دوسرا حکم یا اختیار کا دیا جانا۔

وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ
اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ
اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ ع
وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا
مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ
مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى
نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ
تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ
تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ
ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾

سپرد کیا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں[۹۷۹]

یہ وہ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، سو ان کی ہدایت کی پیروی کر ۔ کہہ میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا ۔ وہ صرف جہانوں کے لیے نصیحت ہے[۹۸۰]

اور انھوں نے اللہ کو نہیں پہچانا (جس طرح) اس کے پہچاننے کا حق (تھا) جب یہ کہا کہ اللہ نے انسان پر کچھ نہیں اتارا ۔ کہہ، کس نے وہ کتاب اتاری، جو موسیٰؑ لایا ۔ لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی، تم اس کو ورق ورق کرتے ہو ۔ اس (کے ایک حصہ) کو ظاہر کرتے ہو اور بہت سا چھپاتے ہو اور تمھیں وہ باتیں سکھائی گئیں جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمھارے باپ دادا ۔ کہہ، اللہ ہی نے (اتارے) پھر ان کو چھوڑ دے اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں[۹۸۱] ۔

۹۷۹ ھٰؤلاء میں اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو ان انبیاء کے اتباع کہلاتے ہیں ۔ جیسے یہود و نصاریٰ ۔ دوسری قوم آنحضرت صلعم کے اتباع کی ہے جو سب انبیاء پر ایمان لاتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ جو انبیاء کے پیرو کہلاتے ہیں اور ضرورت نبوت سے واقف ہیں نہ مانیں، تو ہم ایک اُمّی قوم کو وہ علوم دے کر کھڑا کر دیں گے یہاں سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں انبیاء کے ذکر کے بعد اہل کتاب سے خطاب ہے آیت ۹۲ و ۹۳ میں اس خطاب کو واضح کر دیا ہے ۔

۹۸۰ اقتدہ میں ھا تسکیت کے لیے ہے اور اقتدا پیروی کو کہتے ہیں یعنی جس نمونہ پر ایک انسان پہلے چلا ہے اسی پر چلنا ۔
آنحضرت صلعم کو یہ ارشاد کہ تم ان انبیاء کی ہدایت کی اقتدا کرو اس سے کیا مراد ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے اللہ تعالیٰ وہ ہدایت تو خود آنحضرت صلعم کو دے چکا یعنی اپنی وحی سے دے چکا، اور مزید برآں ان انبیاء کی کوئی کتابیں دنیا میں موجود نہ تھیں کہ ان کو پڑھ کر عمل کرنے کی ہدایت ہوتی، اور جو کچھ ان کی تعلیم باقی رہ گئی وہ خود ظنیات میں سے تھی ۔ پس ان کی ہدایت کے اقتدا سے مراد صرف ان کے طریق کی موافقت ہے ۔ اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح توحید کے قائم کرنے میں انہوں نے مشکلات کا مقابلہ کیا اسی طرح تم بھی صبر سے اس کام کو کرو ۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ الفاظ قل لا اسئلکم علیہ اجرا بتاتے ہیں کہ یہاں مراد پیغام توحید کا پہنچانا ہے ۔ ہاں ان الفاظ میں ایک اور اشارہ معلوم ہوتا ہے ۔ ہدایت کے معنی منزل مقصود تک پہنچانا ہیں یعنی کمال انسانی کو حاصل کرنا ۔ اب اس رکوع کی سب سے پہلی آیت میں توحید الٰہی کو ہر قسم کی بلندئ درجات کا اصل موجب ٹھہرایا تھا اور فی الحقیقت مختلف قسم کے کمالات انسانی توحید کے مختلف پہلوؤں سے ہی پیدا ہوتے ہیں ۔ پس کسی نبی کی ہدایت اس کا ایک خاص کمال انسانی کو حاصل کرنا ہے ۔ کسی کمال انسانی کو ابراہیمؑ اپنے اندر لیتے ہیں، تو کسی کو موسیٰؑ، کسی کو ہارونؑ، کسی کو داؤد، کسی کو سلیمان، کسی کو عیسےٰ، کسی کو یحییٰ، کسی کو ایوبؑ ۔ وقس علیٰ ھذا ۔ پس فبھدٰھم اقتدہ کے معنی یہ ہوئے کہ جن جن کمالات کو ان انبیاء نے حاصل کیا ان تمام کمالات کو تم اکیلے اپنے اندر جمع کرو ۔ وہاں کوئی داؤد ہے، کوئی سلیمانؑ، کوئی ایوبؑ، کوئی عیسیٰؑ وغیرہ تو جن کمالات انسانی کا اظہار کرنے کے لیے یہ الگ الگ نبی ہوئے ان تمام کمالات کو تم اکیلے اپنے اندر لو ۔ یہاں اقتدا سے مراد شرائع کی پیروی لینا بالکل غلط ہے ۔ ایسی پیروی کا حکم ہوتا تو پھر پہلے اللہ تعالیٰ ان تمام کی کتابوں کو تحریف سے پاک کر کے آپ کو دیتا ۔ اور آنحضرت صلعم کا عمل بھی یہ ثابت کرتا یعنی عملاً آپ پہلی شرائع کی باتوں کو لے کر ان پر اپنے دین کی بنیاد رکھتے مگر ایسا نہیں ہوا ۔ پس یہ معنی نبی کریم صلعم کے عمل کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ۔ آخری الفاظ میں قرآن شریف کو عالمین کے لیے نصیحت قرار دینا اسی معنی کی تائید کرتا ہے، اور یا اولٰئک میں اشارہ اوپر والی قوم کی طرف ہے یعنی صحابہؓ کی طرف ۔ اور یہاں خطاب عام ہے یعنی اے مسلمانوں تم صحابہ کا اقتدا کرو ۔ اور حدیث میں ہے اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم ۔ میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جن کا اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے ۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقتدا سے مراد صرف مطابقت ہے ۔

۹۸۱ قدروا اللہ ۔ قَدْر کے اصل معنی کسی چیز کی مقدار کا واضح کر دینا یا اس کا اندازہ کرنا ہیں، اور یہاں مراد اس کا پہچاننا یا شناخت کرنا ہے (غ) بعض نے تعظیم کرنا یا وصف بیان کرنا بھی مراد لیا ہے غرض ایک ہی ہے ۔
قراطیس ۔ قرطاس کی جمع ہے جس کے معنی کاغذ ہیں ۔ قراطیس بنانے سے مراد ورق ورق کرنا یا ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے ۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى
وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٩٢﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ
وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ

اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا برکت دی گئی ہے اس کی تصدیق کرتی
ہوئی جو اس کے پہلے ہے تاکہ تو (اہل) مکہ کو ڈرائے اور ان کو
جو اس کے گرد ہیں — اور جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔
اس پر (بھی) ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ٩٨٢
اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے۔
یا کہے میری طرف وحی کی گئی اور اس کی طرف کچھ وحی نہیں کی گئی۔
اور جو کہے، مَیں اس کی مثل اتار سکتا ہوں، جو اللہ نے اتارا ٩٨٣

یہود کا انکار نبوت: پچھلے رکوع میں یہ ذکر تھا کہ سب انبیاء کا مذہب توحید تھا، اسی طرح محمد رسول اللہ کا مذہب ہے۔ بلکہ آپ سب کے کمالات کے جامع ہیں پس ان انبیاء کے پیرو کہلانے والوں کا رسول اللہ صلعم کا انکار کس قدر جائے تعجب ہے۔ مگر انہوں نے یعنی اہل کتاب نے انکار کیا بلکہ سرے سے ہی انکار کر کے کہ دیا کہ اب کسی بشر پر کچھ بھی نہیں اترتا۔ ما انزل اللّٰہ کا مطلب یہ نہیں کہ کبھی کچھ نہیں اتارا بلکہ یہ کہ اب کچھ نہیں اتارا۔ کیونکہ وہ دوسری شریعت کا انکار کرتے تھے۔ چنانچہ سدی کا قول ابن جریر میں منقول ہے کہ یہودی کہتے تھے ما انزل اللّٰہ علی محمّد من شیءٍ۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ کی کتاب کی طرف توجہ دلائی جس میں صاف وعدہ ہے کہ ایک نبی موسیٰ کی مانند کھڑا کیا جائے گا، مگر ساتھ ہی فرمایا کہ تمہاری جو اس کے پیرو کہلاتے ہو اب یہ حالت ہے کہ تم نے اپنی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، ایک حصہ کو ظاہر کرتے ہو مگر بہت سی باتوں کو چھپاتے ہو یعنی ان کو عمل میں نہیں لاتے۔ اس کا جواب چونکہ ان کے پاس کوئی نہیں یعنی وجہ انکار کوئی نہیں، اس لیے آنحضرت صلعم کو ارشاد ہوا کہ تم کہو وہ اللہ تعالیٰ نے ہی اتاری تھی اور اسی کے وعدہ کے مطابق اب یہ کتاب اُترتی ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں اور تصریح کر دی کہ یہ اسی پہلی کتاب کی تصدیق کرتی ہے پس اس کا انکار کیونکر کر سکتے ہو۔ یہ آیات مدنی نہیں گو خطاب یہود سے ہے۔ جیسا کہ پچھلے رکوع میں بھی ان کا ذکر کیا ہے ان یکفر بہا ھؤلاء، جیسا کہ اسی سورت کی آیت ۲۰ میں ذکر ہے کہ اہل کتاب آنحضرت صلعم کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ ان متواتر خطابوں کے ایک ایسی سورت میں ہوتے ہوئے جو بالاتفاق کلیۃً اور جملۃً واحدۃً مکہ میں نازل ہوئی یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوتا ہے کہ مکی سورتوں میں یہود یا اہل کتاب سے خطاب نہیں کیا سورۃ بنی اسرائیل مکی نہیں جس میں یہود سے خطاب ہے، یا سورہ مریم مکی نہیں جس میں عیسائیوں سے خطاب ہے۔

٩٨٢ مبارک۔ بَرْک کے اصل معنی کسی چیز کا لازم ہو جانا ہیں، اور بَرَکۃ کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا مضبوطی سے قائم ہو جانا ہے۔ پس مبارک وہ ہے جس میں ایسی بھلائیاں ہوں (غ)، بالفاظ دیگر جس کی خیر لازم ہو جائے اور منقطع نہ ہو۔ اور درود شریف میں جو آتا ہے بارک علی محمد تو اس کے معنے کیے ہیں کہ اے اللہ جو تو نے محمد (صلعم) کو بزرگی اور کرامت عطا فرمائی ہے اسے ثابت اور دائم رکھ (ل)۔ اور ابن عباسؓ سے بَرَکۃ کے معنی الکثرۃ فی کل خیر مروی ہیں۔ یعنی ہر بھلائی میں کثرت، اور قرآن کریم کے لیے جو مبارک آتا ہے اس کے معنی کیے ہیں جس کی جانب سے خیر کثیر آتی رہتی ہے (ل)

اُمّ القریٰ۔ مکہ کا نام ہے اس لیے کہ زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی (غ) یعنی وہ زمین کا مرکز ہے، اور اس کے لفظی معنی بستیوں کی ماں ہیں۔ مگر صرف عرب کی بستیوں کی نہیں۔ ماں اس کو اس لیے کہا کہ ساری دنیا کے لیے روحانی غذا یہیں سے ملتی ہے اور پھر اسے کل اہل دنیا کا قبلہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ اور لوگ اس کی طرف اکٹھے ہوتے ہیں جیسے بچے ماں کی طرف، اور یوں بھی پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے اور نئی دنیا اس کے نیچے ہے۔ پس وہ معنی اپنے ظاہر میں بھی درست ہیں جو امام راغب نے کیے ہیں۔ یہاں ام القریٰ سے مراد اہل ام القریٰ ہیں۔

من حولہا۔ جب مکہ بستیوں کا مرکز ہوا تو ظاہر ہے کہ من حولہا میں کل دنیا آگئی۔

قرآن کی فضیلت دیگر کتب پر: یہاں اس کتاب کی مزید فضیلت کا ذکر کیا۔ اوّل یہ کہ وہ مبارک ہے یعنی اس کی خیر کبھی منقطع نہ ہوگی جس طرح پہلی کتابوں کی خیر منقطع ہو گئی۔ قرآن کریم کو توریت اور انجیل کے مقابل یا پہلی کتابوں کے مقابل پر مبارک کہنے سے منشا یہ ہے کہ اس کی برکات دائم رہیں گی، دوسرے وہ مصدق ہے، تیسرے کل عالم کی طرف ہے جیسا کہ اُمّ القریٰ و من حولہا سے ظاہر ہے۔

یہ بھی بتا دیا کہ آخرت پر ایمان لانے والے اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ انکار صرف وہی کریں گے جو صرف دنیا پر جھکے ہوئے ہیں اور دنیا کی آلائشوں میں اس قدر مبتلا ہیں کہ کمال انسانی کے حصول کی طرف جو آخرت پر ایمان کی اصل غرض ہے، آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔

٩٨٣ یہ سب نبی کریم صلعم کے مختلف قسم کے مخالف ہیں۔ بعض شرک وغیرہ کے عقاید بناتے تھے، یا جیسے عیسائی جو اللہ تعالیٰ کی طرف ایک باطل تعلیم منسوب کرتے تھے اور یہ سب اللہ پر افترا تھا۔ بعض آپ کے مقابل پر جھوٹے مدعیان نبوت یا وحی تھے یا کہانت کرتے تھے۔ یا بعض جیسے نضر بن الحرث یہ کہتے تھے کہ ہم بھی قرآن جیسی وحی بنا سکتے ہیں۔ دوسری جگہ ان کا قول مذکور ہے لو نشاء لقلنا مثل ھٰذا (الانفال۔ ۳۱) اور یہ جو بعض مفسرین نے یہاں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا نام لیا

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ
وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ ۖ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ
بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ
وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٩٣﴾

اور اگر تو دیکھے جب ظالم موت کی سختیوں میں ہوں، اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلا رہے ہوں - اپنی جانوں کو نکالو، آج تم کو رسوائی کا عذاب اس کے بدلے میں دیا جائے گا جو تم اللہ پر ناحق کہتے تھے، اور تم اس کی باتوں سے تکبر کرتے تھے ۹۸۴

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ
مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ
وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ
اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ
ع وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٩٤﴾

اور یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو، جیسے ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تم کو عطا کیا تھا وہ تم اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے وہ سفارشی نہیں دیکھتے جو تم سمجھتے تھے کہ تمہارے بارے میں (ہمارے) شریک ہیں۔ یقیناً تمہارے تعلقات کٹ گئے اور وہ تم سے جاتا رہا جو تم جھوٹے دعوے کرتے تھے ۹۸۵

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۖ يُخْرِجُ الْحَىَّ
مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَىِّ ۚ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿٩٥﴾

اللہ ہی دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ زندہ کو مردہ سے نکالتا رہتا ہے۔ اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ یہی اللہ ہے پھر تم کہاں سے الٹے پھر جاتے ہو ۹۸۶

ہے کہ اس وحی کو لکھتے لکھتے ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین...... ثم انشأنٰہ خلقاً اٰخر اس عجیب بیان کو سن کر بول اٹھا فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ اور یہی اگلی وحی کے الفاظ تھے جس پر وہ مرتد ہو گیا تو یہ روایت معتبر نہیں۔

۹۸۴ غمرات۔ غمر کے اصل معنی کسی شے کے اثر کو دور کرنا ہیں اور غمرۃ بہت سے پانی کو کہتے ہیں، جو اپنی جائے قرار کو ڈھانک لیتا ہے اور اسی سے غمرۃ جہالت کے معنی میں آتا ہے الذین ھم فی غمرۃ ساھون (الذاریٰت ۵۱ - ۱۱) فذرھم فی غمرتھم (المؤمنون ۲۳ - ۵۴) اور موت کے شدائد کو بھی غمرات کہا جاتا ہے (رغ)

اخرجوا انفسکم حکم کے طور پر نہیں بلکہ موت کی سختی کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ وہ دنیا سے اس قدر محبت کرتے ہیں اور اپنے وقت کو ضائع کر دینے پر اس قدر متاسف ہوتے ہیں کہ نہیں چاہتے کہ ان کی جان نکلے۔ مسلم کو موت کے وقت یہ دکھ نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ لقاء اللہ کا امیدوار ہوتا ہے۔

۹۸۵ فرادی۔ فرید اور فرد کی جمع ہے اور فرد وہ ہے جس کے ساتھ اس کا غیر نہ ملے لا تذرنی فرداً (الانبیاء ۲۱ - ۸۹)

خوّلنا۔ خَوَل۔ مال یا مقبوضات کو کہتے ہیں اور تخویل کے معنی ہیں ان چیزوں کا عطا کرنا جنکے تعہد کا انسان محتاج ہے (رغ)

تقطع بینکم کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں وقع التقطع بینکم یعنی تمہارے درمیان انقطاع واقع ہو گیا۔ اور یوں بھی تقطع وصلکم بینکم تمہارے درمیان جو ملاپ یا تعلق تھا وہ کٹ گیا۔

یہاں سمجھایا ہے کہ آخری ذمہ داری ہر انسان کی فرداً فرداً ہے۔ وہ مال و متاع جس کے بھروسہ پر انسان خدا کو چھوڑتا ہے سب یہیں رہ جاتا ہے اور اس وقت کوئی ساتھی ساتھ نہ ہوگا۔ بڑوں اور چھوٹوں میں جو تعلقات ہیں وہ بھی کٹ جائیں گے اور جن کی خاطر برائیاں کی تھیں وہ ساتھ نہ ہوں گے۔

۹۸۶ فلق۔ فَلْق کسی چیز کا پھاڑ دینا اور اس کے بعض کا بعض سے الگ کر دینا، اور فَلَق صبح کو بھی کہتے ہیں (رغ)

الحب والنوٰی۔ حب اور حبّۃ گیہوں اور جو وغیرہ کے دانہ کو کہا جاتا ہے (رغ) اور نَوٰی۔ نواۃ کی جمع ہے کھجور کی گٹھلی اور نوی کے معنی نیت بھی ہیں (ل)

تؤفکون۔ اِفک ہر ایک چیز جو اس حالت سے پھیری گئی ہو جس پر اسے ہونا چاہیئے تو فکون کے معنی ہوں گے۔ اعتقاد حق سے باطل کی طرف، اور سچائی سے جھوٹ کی طرف، اور اچھے افعال سے فعل قبیح کی طرف پھیرے جاتے (رغ) اور لتافکنا عن اٰلھتنا (الاحقاف ۴۶ - ۲۲) وہ اپنے نقطۂ خیال سے کہتے ہیں اور اسی لیے اِفک جھوٹ کو کہا جاتا ہے۔ ان الذین جاء و بالافک (النور ۲۴ - ۱۱) اسی سے افاک ہے افاک اثیم (الشعراء ۲۶ - ۲۲۲)

اس رکوع میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے نظارے دکھا کر اس کی توحید کا اثبات کیا ہے، اور دوسری طرف ساتھ ساتھ ہی یہ بتایا ہے کہ وہ صداقت جو نبی کریم صلعم لائے ہیں ایک دانہ کی طرح نشو و نما پاتے پاتے آخر کار دنیا میں غالب ہو گی۔ ایک ہی ترکیب لفظی میں دونوں خیالات کو ظاہر کرنا کمال بلاغت اور کمال علم پر

فَالِقُ الْإِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾
وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا
بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٩٧﴾
وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ
فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿٩٨﴾
وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَخْرَجْنَا
بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا
نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ
مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ
اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا
وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ

وہ صبح کو پھاڑنے والا ہے اور اس نے رات کو آرام کے لیے بنایا اور سورج اور
چاند کو حساب کے لیے — یہ غالب علم والے کا اندازہ ہے ع۹۸۷
اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے تاکہ ان کے ذریعے سے
خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ پاؤ۔ ہم نے باتیں ان لوگوں کے
لیے کھول کر بیان کر دیں جو علم رکھتے ہیں ع۹۸۸
اور وہی ہے جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ پھر
ایک ٹھیرنے کی جگہ ہے اور ایک سونپا جانے کی جگہ، ہم نے باتیں اُن
لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھ سے کام لیتے ہیں ع۹۸۹
اور وہی ہے، جس نے اوپر سے پانی اُتارا، پھر اس کے ساتھ ہم
ہر طرح کی روئیدگی نکالتے ہیں، پھر اُس سے ہم سبز کونپلیں نکالتے
ہیں اس سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں، اور کھجور سے اِس کے
گابھے میں سے جھکے ہوئے گچھے۔ اور انگوروں کے باغ۔
اور زیتون اور انار۔ ایک دوسرے سے ملتے جلتے،
اور نہ ملتے جلتے۔ اُس کے پھل کو دیکھو، جب وہ پھل لائے۔

دلالت کرتا ہے۔

دانا اور گٹھلی کو پھاڑ کر اس میں سے پودے اور درخت بنانا کتنی بڑی قدرت کا کام ہے۔ حق بھی مثل ایک دانہ یا گٹھلی کے ہے۔ جس طرح ایک گٹھلی ایک ناواقف کی نظر میں نہیں جچتی اور وہ نہیں جانتا کہ اس سے ایک عظیم الشان درخت بن جائے گا، اسی طرح حق کے مخالف اس سے ناواقف ہیں کہ وہ حق جس کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں کس طرح ایک دن دنیا میں مقبول ہوگا۔ زندہ کو مردہ سے نکالنے کے یہی معنی ہیں کہ ایک کام کے لیے بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتے مگر اللہ تعالیٰ اس کو سرسبز کر دیتا ہے۔ اور جس طرح ایک گٹھلی زمین میں پھٹ کر اپنے موافق غذاؤں کو زمین سے اور ہوا سے حاصل کرکے ایک درخت بن جاتی ہے، اسی طرح جو امر حق ہے وہ بھی اپنی قوت کے سامان گرد و پیش سے حاصل کر کے دنیا میں آخر پھیل جاتا ہے۔ اور مُردہ کو زندہ سے نکالنا یہ ہے کہ مخالفت اور مقابلہ کی قوت کو جس میں زندگی کے سارے سامان نظر آتے ہیں توڑ کر بالکل مُردہ کر دے اور یا یہاں اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم کو جو اپنے آپ کو زندہ سمجھتے ہو مُردہ کر دیگا۔ اور ایک ایسی قوم کو جسے مردہ سمجھا جاتا ہے کامیاب اور بامراد کر دیگا۔ جاہلوں میں سے عالم اور عالموں میں سے جاہل پیدا کر دیگا۔ یخرج میں استمرار ہے اور مخرج میں اور اگلی آیت میں فالق میں پیشگوئی کا رنگ ہے۔

ع۹۸۷ تقدیر۔ قدر اور تقدیر کے ایک ہی معنی ہیں ایک چیز کے اندازہ کا واضح کر دینا، اور تقدیر کے معنی قدرت عطا کرنا بھی آتے ہیں (غ) اور اللہ کی تقدیر اشیاء دو طرح پر ہے، ایک ان کو قدرت عطا کرکے، اور دوسرے ان کو اقتضائے حکمت کے مطابق ایک خاص اندازہ اور خاص وجہ پر بنانا (غ)

رات کی تاریکی بھی سکون اور آرام کا موجب ہوتی ہے۔ پس اس کی مخلوق میں کوئی چیز بے فائدہ نہیں۔ مگر اس رات کی تاریکی کو پھاڑ کر اب صبح نمودار ہونے والی ہے۔ سورج اور چاند کو حساب کے لیے کہہ کر بتا دیا کہ کس طرح یہ سب عالم ایک نظام میں منسلک ہے جس کے بنانے والی بڑی طاقتور ہستی ہے (حساب اور حُسبان کے ایک ہی معنی ہیں)

ع۹۸۸ جس خدا نے اس قدر سامان انسان کے فوائد جسمانی کے لیے بنا رکھے ہیں، کیا اس نے اس کی اصل تکمیل کی غرض کا ہی کوئی سامان پیدا نہیں کیا، یہ نہیں ہوسکتا۔ پس جس کو یہ علم ہے کہ انسان کا اصل کمال محض کھانے پینے میں نہیں، وہ یقیناً جان لے گا کہ تکمیل روحانی کا سامان بھی ضرور خدا تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے اصحابی کالنجوم میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔

ع۹۸۹ مستقر کے اصل معنی جائے قرار، مستودع کے معنی جائے سپردگی ہیں۔ مفسرین نے مختلف توجیہات کی ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے مستقر زمین میں اور مستودع قبور میں قرار دیا ہے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ دونوں زندگیوں کے لیے یعنی دنیوی اور اُخروی کے لیے ایک ایک مستقر ہے اور ایک ایک مستودع۔ دنیوی زندگی کے لیے

وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۹۹
وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَ
خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ
ع سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۱۰۰
بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ
لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ
كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۰۱
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ
كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ

اور اسکے پکنے کو (دیکھو) یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں ع۹۹۰
اور اللہ کے لیے جنّ شریک بنا رکھے ہیں، حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا
اور اس کے لیے بے علمی سے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کر لیے ہیں۔
وہ پاک اور اس سے بلند ہے جو وہ بیان کرتے ہیں ع۹۹۱
آسمانوں اور زمین کا عجیب پیدا کرنے والا۔ اس کا بیٹا کس طرح
ہو سکتا ہے اور اس کی کوئی جورو نہیں، اور اس نے ہر ایک چیز
کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ع۹۹۲
یہ اللہ تمھارا رب ہے۔ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں
ہر چیز کا پیدا کرنے والا، سو اسی کی عبادت کرو اور وہ

مستقر رحم مادر ہے اور مستودع پیدائش کے بعد موت تک اور اُخروی زندگی کے لیے مستقر قبر ہے اور مستودع قیامت۔

ع۹۹۰ خضر مُخضر سبز رنگ کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد سبز کونپلیں ہیں فتصبح الارض مخضرۃ (الحج ۲۲ – ۶۳) ثیابا خضرا (الکہف ۱۸ – ۳۱)

متراکباً۔ رکوب کے اصل معنی انسان کا حیوان کی پیٹھ پر ہونا ہیں، اور متراکب وہ ہے جس کا بعض بعض پر چڑھا ہوا ہو یعنی تہ بتہ۔

طلع۔ طَلَع سورج کے نکلنے پر بولا جاتا ہے طلوع الشمس مطلع الفجر اور کھجور کے گابھ کو سورج کے طلوع سے مشابہت کے لحاظ سے طلع کہا جاتا ہے (غ)

قنوان۔ قِنو گچھا یا خوشہ کو کہتے ہیں تثنیہ اور جمع قنوان ہے۔

دانیۃ۔ دُنُو قرب کو کہتے ہیں ذات سے ہو یا حکم کے لحاظ سے۔ اور مکان اور زمانہ اور مرتبہ میں اس کا استعمال ہوتا ہے (غ) اور دانیۃ سے مراد جو بوجھ سے جھک کر قریب ہو گئے ہوں۔

حَبّ اور نوٰی کو پھاڑ کر اللہ تعالیٰ کیا بناتا ہے، مردہ دانہ زندہ ہو کر سرسبز ہوتا ہے کونپلیں نکلتی ہیں، اور آخر پھر دانے بن جاتے ہیں۔ گٹھلی سے باغ کھجور وغیرہ یہ بھی ایک وقت پھل لاتے اور پھر وہ پھل پکتے ہیں۔ اسی طرح حق بھی بڑھے گا، پھولے گا اور پھر پھلے گا۔ ایمان والوں کے لیے اس میں نشان اس لیے کہا کہ حق پر ان کا ایمان ہے اس کے بڑھنے پھلنے کو مثال سے سمجھا دیا۔ آج پھر حق ایک دانہ یا گٹھلی کی طرح زمین کی تاریکی میں بظاہر غائب ہوتا نظر آتا ہے مگر وہ اسی طرح درخت بن کر نکلے گا جس طرح پہلے درخت بنا تھا۔

ع۹۹۱ الجنّ۔ جَنّ کے معنی کسی چیز کا حاسہ سے چھپانا ہیں۔ جنّ علیہ اللیل (۶: ۷۶)، اور جنّ روحانی یعنی غیر مرئی ہستیاں ہیں جو حواس سے چھپی ہوتی ہیں اور یہ انس کے مقابلہ پر ہیں۔ اور اس لحاظ سے ملائکہ کو بھی ان میں داخل کیا گیا ہے۔ مگر بعض کے نزدیک جنّ صرف خاص قسم کی غیر مرئی ہستیاں ہیں۔ یعنی کل غیر مرئی ہستیاں تین قسم ہیں، اوّل اخیار یعنی ملائکہ، دوم اشرار یعنی شیاطین، سوم درمیانی جن میں اخیار بھی ہیں اور اشرار بھی یعنی جنّ (غ)

خرقوا۔ خَرْق کسی چیز کا قطع کرنا ہے۔ فساد کے طور پر بغیر تدبر اور تفکر کے اخرقتھا لتغرق اھلھا (الکہف ۱۸ – ۷۱)۔ اور یہ خَلْق کی ضد ہے۔ اور خَلْق ایک فعل کا کرنا ہے جو اندازہ اور نرمی سے ہو اور خَرْق بغیر اندازہ کے ہے (غ)

دو قسم کے شرک کا ذکر کیا ہے۔ ایک جنوں کو شریک بنانے کا، دوسرے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کرنے کا۔ بیٹا عیسائیوں نے بنایا ہے، اور بعض دیگر مذاہب نے۔ بیٹیاں عرب کے بُت پرست تجویز کرتے تھے۔ جن کے شریک بنانے میں مجوسیوں کے عقیدہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جو اہرمن کو خالق شر قرار دیتے ہیں اور تمام قسم کے شرکا وہی اس میں آجاتے ہیں کیونکہ وہ نظروں سے مستور ہی ہوتے ہیں۔

ع۹۹۲ شرک کا سب سے زیادہ دھوکا دینے والا پہلو خدا کا بیٹا بنانا ہے۔ اسی کو پہلے لیا ہے۔ اس کی اصل تردید تو بدیع کے لفظ میں ہے (دیکھو ع۱۴۹) لیکن ایک لفظ پرست قوم کو جس نے صرف ظاہر الفاظ سے دھوکا کھایا ہے اور حقیقت پر غور نہیں کیا ظاہر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، کہ بیٹا اکیلے باپ سے کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ جس جنس کا باپ ہے اسی جنس سے ماں تجویز کرو۔ ماں انسان اور باپ خدا! پھر تیسرا جواب دیا کہ سب چیز کا خالق اللہ ہے۔ اگر بیٹا ہے تو چاہیئے تھا کہ کچھ مخلوق وہ بھی پیدا کرتا۔ چوتھا جواب علم میں دیا ہے کیونکہ انجیل میں شہادت موجود ہے کہ بیٹا پورا علم نہ رکھتا تھا نہ اسے غیب کا علم تھا نہ قیامت کا۔ پس صفات میں کوئی اشتراک نہیں تو بیٹا کیسا، یوں اشتراک ناقص تو کل مخلوق کو حاصل ہے مگر اس سے اسے الگ کرنے کے لیے کسی بات میں اشتراک کامل بھی دکھانا چاہیئے اور وہ ہے نہیں۔

شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝١٠٢

ہر چیز کا کارساز ہے ۹۹۳

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝١٠٣

نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے اور وہ باریک باتوں کا جاننے والا اخبردار ہے ۹۹۴

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝١٠٤

تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیلیں آچکی ہیں سو جو کوئی دیکھتا ہے تو وہ اپنی جان (کی بھلائی) کیلئے ہے اور جو اندھا ہا اسی پر (وبال) ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں ۹۹۵

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝١٠٥

اور اسی طرح ہم باتوں کو بار بار بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ کہیں تو نے (خوب) پڑھا ہے اور تاکہ ہم اُسے ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کریں جو جانتے ہیں ۹۹۶۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١٠٦

اس کی پیروی کر تا رہ جو تیری طرف تیرے رب سے وحی کی گئی ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے کنارہ کر۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ

اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے اور ہم نے تجھ کو اُن پر نگہبان

---

۹۹۳ یہاں ہر قسم کے شرک فی العبادت کی تردید کی۔ اکثر لوگ اپنے معبودوں کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ سب کا کارساز وہی ہے۔

۹۹۴ تدرکہ۔ دَرْك کے لیے دیکھو ۵۵ ۔ نیچے جانے کے لحاظ سے دَرْك کہا جاتا ہے۔ جیسے اوپر جانے کے لحاظ سے دَرَج اور اس لیے سمندر کی انتہائی گہرائی کو بھی دَرْك کہا جاتا ہے اور پانی تک پہنچنے کے لیے جب ایک رسّہ کے ساتھ دوسرا رسّہ ملایا جاتا ہے تو اسے دَرَك کہا جاتا ہے اور انسان کو جو پیچھے آنے والی چیز سے پہنچتا ہے اسے بھی دَرَك کہتے ہیں۔ لا تخٰف درکا ولا تخشیٰ (طٰہٰ - ۷۷) اور ادراک کے معنی کسی چیز کی غایت کو پہنچ گیا۔ بلغ اقصی الشیء حتی اذا ادرکہ الغرق (یونس - ۹۰) یہی لفظ یہاں ہے اور ابصار سے مراد بعض نے یہاں آنکھ کو لیا ہے اور بعض نے بصیرت اور اس کے معنی اس کے مطابق ہیں جو حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے۔ یا من غایۃ معرفتہ القصور عن معرفتہ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی غایت معرفت اشیاء کا جاننا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شے اس سے نہیں یعنی اس جنس کی اور نہ اس کی مثل ہے بلکہ وہ ہر چیز کا موجد ہے جہاں تک انسان کی غایت معرفت پہنچ سکتی ہے اور تدارك فریادرسی اور نعمت میں اکثر آتا ہے لولا ان تدارکہ نعمۃ من ربہ (القلم ۶۸ - ۴۹) اور ادّارك بھی اصل میں تدارك ہی ہے حتی اذا ادارکوا فیھا جمیعا (الاعراف ۷ - ۳۸) یعنی ایک دوسرے کو مل گئے اور بل ادّٰرك علمھم فی الاٰخرۃ (النمل ۲۷ - ۶۶) یعنی آخرت کو پانے میں ان کا علم انتہا کو پہنچ گیا سو وہ اس سے جاہل رہ گئے (رغ)

اللطیف۔ لطافۃ اور لُطف کے معنی ہلکی حرکت اور باریک امور کو پانا ہیں۔ اور لطائف ان امور کو کہتے ہیں۔ جن کو حواس نہ پا سکیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے لطیف ہونے سے یہ مراد بھی ہوتی ہے کہ وہ دقائق امور سے واقف ہے۔ اور یہی یہاں مراد ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنے بندوں کی ہدایت کرنے میں ان سے نرمی کرتا ہے (رغ)

خدا تعالیٰ کا جسم نہیں کہ نظر انسانی اس کا احاطہ کرلے، اور نہ ہی عقل انسانی اس کی کُنہ تک پہنچ سکتی ہے حالانکہ جس قدر شریک ٹھہرائے جاتے ہیں وہ سب احاطہ نظر انسانی میں آجاتے ہیں۔ اس سے قیامت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کی تردید نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہاں دوسرے قویٰ دیئے جائیں گے اور یہاں ان آنکھوں یا اس عقل کے عجز کا ذکر ہے۔

۹۹۵ بصائر۔ بصیرۃ کی جمع ہے اور قلب کی قوتِ مدرکہ کو کہتے ہیں (رغ) مراد دلائل توحید باری تعالیٰ ہیں۔ میں حفیظ نہیں یعنی تمہارے اعمال کا نگران اور ان پر بدلہ دینے والا میں نہیں ہوں، خدا ہے۔

۹۹۶ دَرَسْتَ۔ دَرَس کے معنی ہیں اثر یا نشان باقی رہا اور چونکہ باقی رہنا مٹ جانے کو بھی چاہتا ہے اس لیے دُرُوس کے معنی مٹ جانا بھی آتے ہیں اور دَرَس العلمَ کے معنی ہیں حفظ کر کے اس کے نشان کو پالیا (رغ) اور درست الکتاب کے معنی ہیں اس کو بار بار پڑھ کر مطیع کرلیا، یہاں تک کہ اس کا یاد رکھنا آسان ہو گیا (ل)

لیقولوا میں لام عاقبت ہے یعنی جب باتوں کو طرح طرح کے پیرایوں میں بیان کیا جاتا ہے، کبھی فطرت انسان کی طرف اور کبھی قانون قدرت کی طرف اور کبھی امم سابقہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ باتیں پچھلی تعلیم سے لی ہوئی ہیں، اور خوب کوشش کر کے ان کو یاد کرلیا ہے۔ مگر صاحب علم لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ امر حق کو پہچان لیتے ہیں اور یہ جان لیتے ہیں کہ مختلف قسم کے دلائل ایک ہی نتیجہ پر پہنچاتے ہیں یہی اس کی صداقت کا بین ثبوت ہے۔

عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٧﴾
وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ
زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ
مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٨﴾
وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ
اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ
اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٩﴾

مقرر نہیں کیا اور نہ تو ان کا کارساز ہے ۹۹۷

اور اُن کو گالی نہ دو، جن کو یہ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں (ایسا نہ ہو) کہ وہ زیادتی کرکے بے علمی سے اللہ کو گالی دیں۔ اسی طرح ہم نے ہر ایک گروہ کے لیے ان کا عمل اچھا کرکے دکھایا ہے۔ پھر ان کے رب کی طرف اُن کا لوٹ کر آنا ہے سو وہ اُنھیں بتا دیگا جو وہ کرتے تھے ۹۹۸

اور وہ بڑے زور کی قسموں کے ساتھ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس نشان آئے تو ضرور اس پر ایمان لائیں گے کہہ، نشان صرف اللہ کے پاس ہیں، اور تمھیں کیا خبر ہے کہ جب وہ (نشان) آئیں گے تو یہ ایمان نہیں لائیں گے ۹۹۹

ع۹۹۷ شاء کے معنی کے لیے دیکھو ع۳۲، اس کے معنی کسی چیز کی ایجاد اور اس کا پالینا ہیں۔ دوسرے معنی ارادہ کے مرادف ہیں۔ ارادہ میں شے کا وجود میں لانا لازم نہیں گو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہو۔ یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (البقرۃ ۲-۱۸۵)۔ اور انسان کا ارادہ ہو سکتا ہے بغیر اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس چیز کے لیے ہو۔ جیسے انسان چاہتا ہے کہ نہ مرے اور یہ ارادہ الٰہی کے خلاف ہے، اور مشیت کے لیے پہلے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ہونا لازمی ہے ما تشاؤن الا ان یشاء الله (غ)۔

لو شاء الله ما اشرکوا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ایسی ہوتی تو یہ شرک نہ کرتے، اور دوسری جگہ کفار کا قول منقول ہے لو شاء الله ما اشرکنا (۱۴۹) حالانکہ کفار کے قول کی تردید کی ہے۔ ان دونوں مقامات میں فرق یہ ہے کہ کفار کے قول کا منشاء تو یہ ہے کہ خدا کی مشیت یہی ہے کہ ہم شرک کریں، اس لیے ان کو جواب بھی یوں دیا ہے لو شاء لہدٰکم اجمعین (۱۵۰) یعنی اگر مشیت سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور کرنا ہوتا تو ہدایت پر مجبور کرتا نہ شرک پر جیسا کہ دوسری مخلوق کو اپنی فرمانبرداری کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ اور اس جگہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ایسی ہوتی تو وہ شرک نہ کرتے تو مطلب یہی ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمھیں پیدا ہی ایسا کرتا کہ تم نافرمانی نہ کر سکتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انسان کا سارا شرف دوسری مخلوق پر اُڑ جاتا۔ اس لیے ماجعلنٰك علیهم حفیظا یہاں فرمایا کہ تم انہیں مجبور کرکے شرک نہیں چھڑا سکتے۔ اگر مجبور ہی کرنا ہوتا تو اللہ تعالیٰ پیدائش میں ہی ان کو مجبور کر دیتا، مگر اس کی مشیت ایسی نہیں ہوئی۔ اس نے قانون بنا کر راہ دکھا دی۔ اب انسان کا اختیار رہا اس پر چلے یا نہ چلے، شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ آخر شرک ان سے مٹ جائے گا۔

ع۹۹۸ دوسرے معبودوں کو گالیاں نہ دینے کی تعلیم: مخالفین کی باتیں نہایت درجہ دکھ دینے والی تھیں۔ بُرا کہتے تھے، ہنسی اڑاتے تھے، گالیاں دیتے تھے، اس لیے مسلمانوں کو اب ایک اصول بتایا کہ ایسا نہ ہو تم بھی ان کے معبودان باطل کو اسی طرح سب و شتم کرنے لگو۔ اور چونکہ یہاں شرک کی بُرائیوں کا ذکر تھا اس لیے ساتھ ہی یہ بتانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسرے کے عقاید میں جو بُرائی ہو اس کی اصلاح کے لیے اس کا بیان کر دینا تو ضروری ہے مگر حد سے تجاوز نہ ہو۔ گالی تک نوبت نہ پہنچے۔ ایک غلطی کا اظہار اور چیز ہے جس کی ضرورت ہمیشہ دنیا میں رہے گی مگر خواہ مخواہ بُرے الفاظ سے دوسرے کے دل کو دکھ پہنچانا جائز نہیں۔ یوں قرآن کریم ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم بھی دیتا چلا جاتا ہے۔ ایک ایسا عمدہ اصول بیان کر دیا ہے کہ جس سے مذہبی منافرت کی بجائے انسانوں میں باہم محبت پیدا ہو۔ عام طور پر اس اصول کو مدنظر نہ رکھنے سے مذہب کی خاطر انسان ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہیں۔ حالانکہ مذہب کی غرض یہ تھی کہ تمام انسانوں سے محبت اور آشتی ہو۔ اس زمانہ میں عیسائیوں اور آریوں نے اس اصول کو توڑ کر باہم بغض و تنفر کا خطرناک بیج بو دیا ہے۔ سینکڑوں کتابیں صرف دوسروں کی بُرائیاں بیان کرنے، ان پر ہنسی کرنے پر شائع ہوتی ہیں۔ اصول سے بحث نہیں کیونکہ وہاں اپنی کمزوری کو جانتے ہیں۔

تزئین اعمال: عملهم سے مراد ان کا وہ عمل ہے جو ان کو کرنا چاہیئے۔ وہ باتیں جو انسان کی بھلائی کا موجب ہیں ان کو قرآن کریم نے نہایت خوبصورت بنا کر دکھایا ہے تاکہ لوگ ان پر عمل کریں جیسے یہی اصول کہ جن کی دوسرے لوگ عزت کریں تم انھیں گالی مت دو۔ جو بُرے عمل انسان کرتا ہے وہ بھی اس کو بعض وقت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا مزین کرنے والا خدا نہیں بلکہ شیطان ہے جیسا کہ صاف فرمایا وزین لهم الشیطان ما کانوا یعملون دیکھو آیت ۴۳، ایسا ہی دیکھو آیت ۱۳۸ جہاں بُرے کام کی تزئین شیطان کی طرف منسوب کی ہے۔

ع۹۹۹ اس قدر کھلے دلائل کے باوجود پھر وہی نشان مانگتے ہیں (دیکھو آیت ۳۵)۔ فرمایا ایسے معجزات بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہیں۔ لیکن جو قوم اس قدر کھلے دلائل کو رد کر رہی ہے وہ ان معجزات سے کیا فائدہ اٹھائے گی۔ اس آیت سے انکار معجزات نکالنا آیت کے صریح منطوق کے خلاف ہے۔ اذا جاءت کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ جن قسم کے معجزات وہ چاہتے ہیں وہ بھی ان کو مل جائیں گے مگر ایمان تو دلائل سے ہی پیدا ہوگا نہ معجزات سے۔

وَ نُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَ اَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

اور ہم ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے جس طرح وہ اس پر پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکا ہوا چھوڑ دیں گے ۱۱۰

وَلَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَيۡهِمُ الۡمَلٰۤـئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الۡمَوۡتٰى وَحَشَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ كُلَّ شَىۡءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَجۡهَلُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

اور اگر ہم اُن پر فرشتے اتارتے، اور مُردے اُن سے باتیں کرتے اور سب چیزوں کو اُن کے سامنے لا اکٹھا کرتے وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے، مگر یہ کہ اللہ چاہتا، لیکن اُن میں سے اکثر جاہل ہیں ۱۱۱

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ يُوۡحِىۡ بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ

اور اسی طرح ہم نے ہر ایک نبی کے لیے اِنسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن بنایا، وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے

ع۱۱۰ نقلب۔ تقلب کے معنی ایک رُخ سے دوسرے رُخ کی طرف پھرنا ہیں۔ اور تقلیب ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرتے رہنا۔ تقلیبُ اللہ القلوب والبصائر کے معنی ہیں صرفھا من رای الی رای ان کا ایک رائے سے دوسری رائے کی طرف پھیرتے رہنا (غ) یعنی کبھی کچھ خیال کرنا کبھی کچھ۔

افئدۃ۔ فواد کی جمع ہے فَاَدَ کے معنی ہیں بھونا یا جلایا۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے دل کو فؤاد کہا جاتا ہے (غ) اور فواد بعض کے نزدیک دل کا بیرونی پردہ ہے اور قلب اس کا مرکز (ل)

نذر۔ وذر اس کا مادہ ہے مگر اس کی ماضی استعمال میں نہیں آئی۔ اور یَذَرُ الشیٔ کے معنی ہیں ایک چیز کو بے حیثیت سمجھ کر اسے پھینک دیا۔ ونذر ما کان یعبد اٰباؤنا (الاعراف۔ ۷۰) ویذرک والٰھتک (الاعراف۔ ۱۲۷) فذرھم وما یفترون (الانعام۔ ۱۱۲) وذروا مابقی من الربٰو (البقرۃ۔ ۲۷۸) ویذرون ازواجا (البقرۃ۔ ۲۴۰) (غ) آخری موقع پر اس لفظ کے استعمال میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ عورت کی حیثیت نہایت درجہ کی کس مپرسی کی رہ جاتی ہے اس لیے اس کی بے کسی کی طرف توجہ دلا کر وہاں اس کے حق میں کچھ وصیت کی سفارش فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف دلوں اور آنکھوں کے پھیرنے کی نسبت ویسی ہی ہے جیسے ازدیاد مرض کی (دیکھو ع۲۲) افعال انہی کے ہیں مگر نتیجہ دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور ان کے افعال ہونا خود اس سے ظاہر ہے کہ لم یؤمنوا بہ اوّل مرّۃ کا نتیجہ اسے بتایا۔ پہلے ایمان نہیں لائے نتیجہ یہ ہے کہ اب کبھی ایک رائے بدلتے ہیں کبھی دوسری اور سرکشی میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ چونکہ پہلے ایمان کی طرف انھیں دلائل سے بلایا تھا اور دلائل کو انھوں نے قبول نہ کیا، پھر معجزات دیئے تو کبھی سحر کہا، کبھی کاہن کہا، کبھی کچھ کہا، یہی تقلیب افئدہ ہے۔ حقیقت کی طرف دلائل رہنمائی کرتے ہیں، معجزات محض تائیدی امور ہیں۔ ان سے وہ شخص کیا فائدہ اٹھائے جو دلائل پر غور نہیں کرتا۔

ع۱۱۱ قُبُلًا۔ بعض نے اسے قابل کی جمع کہا ہے اور اس کے معنی ہیں ان کے حواس کے مقابل یا سامنے او یاتیھم العذاب قبلا (الکھف۔ ۵۵) اور بعض نے قبیل کی، جس کے معنی جماعت ہیں۔ یعنی جماعت جماعت کر کے سب چیزوں کو لے آتے (غ)

معجزات کے باوجود ایمان نہ لانے والے۔ پچھلے رکوع میں شرک کے مختلف پہلوؤں کا ابطال کر کے خاتمہ اس آیت پر کیا تھا کہ جن لوگوں نے کھلے کھلے دلائل کو رد کر دیا ہے اور معجزات کے طالب ہیں وہ معجزات کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے جیسے دلائل سے انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور قوت متفکرہ سے کام نہ لیا ایسا ہی معجزات کے وقت ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر وہ موٹے موٹے نشان بھی ظاہر ہو جائیں جو یہ مانگتے رہتے ہیں، تو بھی قساوت قلبی اس حد تک بڑھی ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے مخالفت کی ٹھان لی ہے وہ کبھی نہ مانیں گے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قوائے روحانی بالکل مُردہ ہو جاتے ہیں پس معجزات دیکھ بھی لیں تو محض ایک عجوبہ دیکھ لینے سے قوائے روحانی زندہ نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں سب لوگوں کا ذکر نہیں بلکہ صرف ان لوگوں کا ہی ہے جو مخالفت میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ ٹھان لیتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ حق کو قبول نہ کریں گے، بلکہ اس کی مخالفت کریں گے، چنانچہ اگلی آیت میں ایسے لوگوں کو شیاطین کے نام سے موسوم کیا ہے۔

کلام موتیٰ سے مراد: بہاں الّا ان یشاء اللہ کے لفظ آخر پر لا کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اگر اس قسم کے معجزات سے تو نہیں مگر اور اسباب سے جو اللہ تعالیٰ پیدا کر دے گا یہ لوگ مانیں گے بھی، فرشتے بھی آئے دیکھو ع۳۶۹ اور مُردوں نے بھی ان سے کلام کیا یعنی بہت سے لوگ جو قوائے روحانی کے لحاظ سے مر چکے تھے۔ ان کو خدا نے زندہ کر کے ایک روشنی عطا کی اگلے رکوع کی پہلی آیت کا ایک شخص مردہ ہو تو ہم اسے زندہ کر دیں اور اس کو نور دیدیں تو وہ اس کی طرح نہیں جو اندھیروں میں ہے اسی پہلی کتاب کی شہادت کلام موتیٰ ہے اور ہر چیز کے سامنے آ جانے سے ان کی سزا کے سب سامانوں کا اکٹھا ہو جانا مراد ہے۔

زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے سو اُن کو چھوڑ دے اور اسے جو وہ افترا کرتے ہیں ۱۰۰۲

وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل جھکے رہیں جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور تاکہ وہ اس پر راضی ہو جائیں اور تاکہ کیے جائیں جو وہ کر رہے ہیں ۱۰۰۳

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

تو کیا میں اللہ کے سوائے فیصلہ کرنے والا تلاش کروں اور وہ وہی ہے جس نے تمھاری طرف واضح کتاب آتاری اور وہ جن کو ہم نے کتاب دی، جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ آتاری گئی ہے سو تو جھگڑنے والوں میں سے نہ ہو ۱۰۰۴

ع۱۰۰۲ یوحی۔ وحی سے مراد یہاں اس کے اصل معنی اشارہ سریعہ کے ہیں یا دل میں ڈالنا اور ان کی وسوسہ اندازی کی طرف اشارہ ہے۔ زخرف زینت کو کہتے ہیں، جو طمع یا نقش و نگار سے ہو اور زخرف القول ملمع کی بات ہے (غ) یعنی جو اوپر سے اچھی نظر آتی ہو مگر اس کا انجام زیان ہو۔

لفظ کذٰلک میں پچھلی آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی جس طرح تمہارے مقابل پر یہ دشمن ہیں جو کھلے کھلے نشانوں اور واضح دلائل کو قبول نہیں کرتے۔ ایسا ہی پہلے انبیاء کے مقابل میں بھی ہوتے رہے۔ شیاطین الانس سے مراد انسانوں میں سے سرکش لوگ ہیں۔ جن شیطان وہ ہے جو نظر سے مخفی ہے مگر انسان جب دوسرے کا شیطان بنتا ہے تو جنّ سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے کیونکہ جنّ صرف وسوسہ اندازی کرتا ہے اور یہ باتوں سے اور عمل سے ترغیب دیتا ہے۔ مایفترون میں بتا دیا کہ یہ افترا کرنے والے یعنی انسان ہی ہیں۔ کیونکہ اصل فعل انہی کا ہے اور دوسری جگہ صرف یوں فرمایا وکذٰلک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمین (الفرقان - ۳۱) پس شیاطین الانس والجن سے یہاں مراد مجرم ہی ہیں دیکھو اگلا نوٹ۔

ع۱۰۰۳ تصغیٰ۔ صَغْو اسے ہے مائل ہونا۔ صَغَتِ الشَّمْسُ کے معنی ہیں۔ سورج غروب کی طرف مائل ہوا (غ) الیہ میں ضمیر زخرف القول یعنی ملمع کی باتوں کی طرف ہے یا شیاطین کی وحی کی طرف یا عداوت کی طرف۔

یقترفوا۔ قَرْف اور اقتراف اصل میں یہ ہے کہ درخت کی چھال اتار دی جائے استعارۃً اکتساب کے معنی میں آتا ہے اچھا ہو یا بُرا (غ)

جن شیطان سے مراد: یہ آیت عطف ہے غرورا پر، یعنی وہ ملمع کی باتیں جو ایک دوسرے کے دل میں ڈالتے ہیں وہ محض دھوکہ دینے کے لیے ہوتی ہیں، اور اس غرض کے لیے عام لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اعمال کی جزا سزا کو نہیں جانتے۔ ان کے دل ان ملمع کی باتوں کی طرف مائل ہو جائیں اور وہ ان کو پسند کرنے لگیں اور ایسے ہی کام کرنے لگیں جیسے وہ شیطان یعنی ان کے سردار خود کرتے ہیں۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیاطین صرف ان کے سردار ہیں جو پہلے خود حق کے دشمن بنتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے پیرووں کو بھی اس پر راضی کر لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ پیرو بھی تمام وہ شرارت کی باتیں کرنے لگتے ہیں جو ان کے سردار کرتے ہیں۔ اور یہاں بالخصوص انبیاء کی مخالفت کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد صرف اعدائے حق انسان ہیں۔ گو ان پر عام نظروں سے مستور ہونے کی وجہ سے جنّ کا لفظ بھی بولا گیا ہو، جیسا کہ مجاز کے رنگ میں ایک شاعر اپنی محبوبہ کو جنّی کے نام سے پکارتا ہے ویحک یا جنی، اگر سارے مضمون پر ایک یکجائی نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ بھی شبہ نہیں رہتا۔ اس رکوع کے آخر پر آیت ۱۲۲ میں پھر شیاطین (یعنی سرداروں) کے اپنے اولیاء کو وحی کرنے کا ذکر ہے۔ اور آیت ۱۲۴ میں کذٰلک لفظ لا کر اور انہی لوگوں کو اکابر مجرمیھا کہہ کر بالکل واضح کر دیا کہ شیاطین والجن سے مراد مجرموں کے سردار ہیں نہ کچھ اور۔

ع۱۰۰۴ مفصل۔ فصل کے معنی ہیں دو چیزوں کا ایک دوسرے سے الگ کر دینا (غ)، اور تفصیل کے معنی تبیین (ل) یا کھول کر بیان کرنا ہیں اور یہاں مراد ہے کہ جس بارہ میں میرا اور تمہارا جھگڑا ہے اسے کھول کر یہاں بیان کر دیا گیا ہے (غ)

مذہبی اختلافات میں کوئی شخص حکم نہیں بنایا جا سکتا: چونکہ قرآن کریم بار بار پہلے انبیاء کی شہادت کی طرف توجہ دلاتا تھا اس لیے مشرک یہ حیلہ کرتے تھے کہ یہودی یا عیسائی ہمارے اور تمہارے درمیان حَکَم بن جائیں۔ آج بھی بعض لوگ مسائل دینی میں بحث کرتے ہیں تو کہتے ہیں فلاں شخص کو حکم بنا لیں جس کے یہ معنی ہوئے کہ اس شخص کا فیصلہ مبرا عن الخطا ہے۔ اس کا جواب دیا ہے کہ جب کتاب مفصل ہے یعنی اس کے اندر دعاوی بھی ہیں اور دلائل بھی تو پھر دوسرے کو حکم بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے دعاوی اور دلائل پر غور کر کے خود ہی فیصلہ کر لو۔ یہاں مفصّل سے مراد یہ نہیں کہ تمام فروعات دین اس کے اندر تفصیل سے موجود ہیں بلکہ اصل مضمون جو اثبات توحید و رسالت پر ہے جس میں جھگڑا ہو رہا ہے اسی کے دعاوی اور دلائل کے کھول کر بیان کرنے کا ذکر ہے اور آخری حصّہ میں اہل کتاب کا

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾

اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف میں کمال کو پہنچ گئی کوئی اُس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ع۱۰۰۵

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور اگر تو اکثر ان لوگوں کی بات مانتا چلا جائے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کردیں، وہ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور وہ محض اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں ع۱۰۰۶

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

تیرا رب اس کو خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے گمراہ ہوتا ہے اور وہ سیدھی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

سو اس سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم اس کی باتوں پر ایمان لانے والے ہو ع۱۰۰۷

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَاۗىِٕهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور تمھارا کیا عذر ہے کہ تم اس سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اور اس نے تم کو کھول کر بتا دیا ہے وہ جو تم پر حرام کیا سوائے اس کے جس کے لیے تم لاچار ہو جاؤ اور یقیناً بہت سے اپنی بری ہوئی خواہشات سے لاعلمی کے ساتھ گمراہ کرتے ہیں۔ تیرا رب حد سے گزرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور کھلے اور چھپے گناہ کو چھوڑ دو۔ جو لوگ گناہ کماتے ہیں ان کو ضرور اس کے موافق بدلہ دیا جائے گا، جو وہ کماتے ہیں ع۱۰۰۸

ذکر کیا کہ وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم کا نزول حق کے ساتھ ہے کیونکہ ان کی کتابوں میں اس کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔

ع۱۰۰۵ دعاوی اور دلائل کا قرآن میں ہونا: پچھلی آیت کے مضمون کو اور واضح کیا ہے۔ وہاں کتاب کو مفصل کہا تھا یہاں بتا دیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ صدق و عدل میں یہ کتاب اس حد کمال کو پہنچ گئی ہے کہ اپنے سے باہر کسی چیز کی محتاج نہیں رہی۔ اتمام کے اس معنی کے لیے دیکھو ع۷۸۶۔ صدق میں اشارہ اس کے دعاوی کی سچائی کی طرف ہے اور عدل میں اس کے دلائل کے حق ہونے کی طرف۔ چونکہ احکام دینی میں فروع دین اس کے اصول سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اس لیے سارے فروع کا اس کے اندر تفصیل سے نہ ہونا خلاف اتمام نہیں ہاں اصول سب ضروری ہے کہ اس کے اندر مفصل ہوں یعنی دعاوی بمعہ اپنے دلائل کے ہوں۔

لا مبدل لکلماتہ میں ذکر انہی کلمات کا ہے جن کا ذکر تمت کلمت ربک میں ہے یعنی مراد اس سے قرآن شریف ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کلام اس کمال کو پہنچ گیا کہ اب اس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ یعنی کوئی شخص اس کلام کی جگہ صدق و عدل کے لحاظ سے بہتر کلام نہیں لا سکتا اور یہ دنیا کی آخری مذہبی کتاب ہے۔

ع۱۰۰۶ یہاں بتا دیا کہ پیروی علم صحیح کی کرنی چاہیئے۔ اٹکل پچو اور ظنی باتیں کرنے والے گو تعداد میں بہت ہوں مگر پیروی ان کی نہیں چاہیئے، بلکہ علم کی یعنی دلائل کی کرنی چاہیئے۔

ع۱۰۰۷ قرآن کریم نے توحید پر یہاں تک زور دیا ہے کہ جن غذاؤں کا تعلق مشرکانہ افعال سے ہے ان کو بھی حرام کر دیا ہے اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے۔

ع۱۰۰۸ ظاہری اور باطنی گناہ: غذاؤں کی حلت و حرمت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بتا دیا کہ کھلے اور چھپے دونوں گناہوں سے بچو۔ یہ نہ ہو کہ باطنی احکام کی طرف متوجہ ہو تو احکام ظاہری کی پروا نہ کرو یا کھلے گناہوں سے بچو تو مخفی طور پر ان کا ارتکاب کرلو۔ عرب کے لوگ اس بات کو عیب نہ جانتے تھے کہ چھپکر کوئی گناہ کر لیا جائے مثلاً چھپکر زنا کر لینے میں کوئی ہرج نہ سمجھتے تھے۔ ہاں ظاہر طور پر اس کے ارتکاب کو برا خیال کرتے تھے۔ بعینہٖ یہی حالت آج یورپ کی ہے اور قرآن کریم کا نزول جس طرح عرب کے لیے ہوا اسی طرح آج یورپ کے لیے یہ نزول ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ
عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ
لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ
ع وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾
اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ
نُوْرًا يَّمْشِىْ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ
فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ
زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ
مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ
اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾
وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ
حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔۘ اَللّٰهُ
اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ

اور اس سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔
اور یہ یقیناً نافرمانی ہے اور بیشک شیطان اپنے دوستوں کے
دلوں میں ڈالتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑتے رہیں اور اگر تم ان کی
بات مانو گے تو یقیناً تم مشرک ہوگے ع۱۰۰۹
اور کیا وہ جو مُردہ تھا پھر ہم نے اُسے زندہ کر دیا اور اُسے
روشنی دی جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلے، اس شخص کی مانند
ہے جس کی مثال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں ہے اس سے نکلتا نہیں اسی طرح
کافروں کو وہ کام اچھے معلوم ہوتے ہیں جو وہ کرتے ہیں ع۱۰۱۰
اور اسی طرح ہم نے ہر ایک بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو بنایا
تاکہ وہ اس میں منصوبے کریں اور وہ منصوبے نہیں کرتے مگر اپنی ہی
جانوں کے ضرر کے لیے اور وہ محسوس نہیں کرتے ع۱۰۱۱
اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے
یہاں تک کہ ہم کو اس کی مثل دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اللہ
خوب جانتا ہے کہ کہاں اپنی رسالت کو رکھے ع۱۰۱۲ ان لوگوں کو جنھوں نے

ع۱۰۰۹ یہ آیت اس بات کو بالصراحت بیان کرتی ہے کہ جس چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کا کھانا جائز نہیں۔ پس ذبیحہ اہل کتاب اسی حد تک جائز ہے کہ وہ اس پر خدا کا نام لیں۔

آخر آیت میں پھر دشمنان دین کی طرف اشارہ کر کے اس رکوع کے اور اگلے رکوع کے اصل مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ع۱۰۱۰ میت۔ موت کے معنی کے لیے دیکھو ع۸۹۔ مَیْت مَیِّت سے مخفف ہے اور یہاں مُردہ ہونے سے مراد جہالت ہے اور انّك ميّت (الزمر ۳۹۔ ۳۰) میں میّت سے مراد بعض کے نزدیک روح کا جسم سے الگ ہونا ہے اور بعض کے نزدیک محض تحلیل اور کمی ہے جو ہر آن واقع ہوتی رہتی ہے کیونکہ انسان جب تک اس دنیا میں ہے ہر آن اس پر ایک موت وارد ہوتی رہتی ہے جیسا شاعر کہتا ہے ؎ يَمُوْتُ جُزْءً فَجُزْءً (غ) حضرت ابن عباسؓ سے یہاں میّت کے معنی کافر ضال۔ احیاء سے مراد ہدایت۔ نور سے قرآن مروی ہیں (ر)

آنحضرتؐ کا مردوں کو زندہ کرنا: اسلام کے خلاف منصوبہ بازی کرنے والوں کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے پہلے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ساتھ ان لوگوں کو جن کے قوائے روحانی مر چکے ہیں کس مقام پر پہنچائیگا، وہ نہ صرف ان کو زندگی عطا فرمائے گا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کو ایک نور بھی عطا فرمائے گا اور وہ بھی صرف اپنی ذات کے لیے نہ ہوگا۔ بلکہ دوسرے لوگوں میں اس کو لیکر چلیں گے یعنی اوروں کو بھی فائدہ پہنچائیں گے۔ یہ آنحضرت صلعم کی قوت قدسی کا کمال تھا جس نے مُردگی کی حالت سے اُٹھا کر ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچایا اس کے مقابل ان لوگوں کا ذکر کیا جو تاریکی میں رہتے ہیں اور نور ایمان سے متمتع نہیں ہوتے اور پھر اس تاریکی سے اس قدر پیار کرتے ہیں کہ اس میں سے باہر نہیں نکلتے گویا ان کو اپنے بدعمل ہی بھلے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ع۱۰۱۱ اکابر۔ کبیر کی جمع ہے جس کے معنی رئیس یا سردار ہیں۔ انه لكبيركم الذى علمكم السحر (طٰہٰ ۲۰۔ ۷۱)

یعنی جس طرح ان کو اپنے بدعمل بھلے معلوم ہونے لگتے ہیں اسی طرح پھر ان کو حق کے خلاف منصوبہ بازی سوجھتی ہے۔ تاریکی سے پیار کرنے والے کبھی روشنی کو پسند نہیں کر سکتے اس لیے جب وہ نور دنیا میں آتا ہے اس کے بجھانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ مگر مآل ان منصوبہ بازیوں کا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔

ع۱۰۱۲ رسالت موہبت ہے: آیت سے مراد یہاں عام ہے کوئی حکم الٰہی، کوئی شریعت یا کوئی رسول آتا ہے تو بجائے اس کے کہ ایک حق بات کو قبول کریں یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ پیغامبری کا منصب ہم کو کیوں نہ ملا۔ دوسری جگہ آتا ہے بل یرید کل امرئٍ منهم ان یؤتی صحفا منشّرة (المدثر ۷۴۔ ۵۲) اس کا جواب دیا ہے کہ خدا پیغامبری کے منصب پر ہر کس و ناکس کو ممتاز نہیں فرمایا کرتا۔ تاریکی کے فرزندوں کو وہ پیغامبری دیدے تو پھر دنیا کی اصلاح کیا ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے

الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ (۱۲۴)

جرم کیے اللہ کی طرف سے ذلت اور سخت عذاب پہنچ کر رہے گا، اس لیے کہ وہ منصوبے کرتے تھے ۱۰۱۳

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۲۵)

سو جسے اللہ ارادہ کرتا ہے کہ ہدایت دے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کے لیے ارادہ کرتا ہے کہ اس کو گمراہی میں چھوڑ دے اس کا سینہ تنگ گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ اوپر کو چڑھ رہا ہے، اسی طرح اللہ ان لوگوں پر ناپاکی رہنے دیتا ہے، جو ایمان نہیں لاتے ۱۰۱۴

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (۱۲۶)

اور یہ تیرے رب کا سیدھا رستہ ہے ہم نے باتیں اُن لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۲۷)

ان کے لیے ان کے رب کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہی ان کا دوست ہے ان (اعمال) کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۱۲۸)

اور جس دن ان سب کو اکٹھا کرے گا، اے جنوں کے گروہ تم نے انسانوں میں سے بہت سے لے لیے — اور انسانوں میں سے ان کے دوست کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا اور ہم اس اپنی میعاد کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کی تھی۔ کہیگا آگ تمہارا ٹھکانا ہے اسی میں رہو گے، مگر جو اللہ چاہے بے شک تیرا رب حکمت والا علم والا ہے ۱۰۱۵

کہ اللہ تعالیٰ اپنا پیغمبر جن لوگوں کو بناتا ہے وہ اس منصب کے لیے خاص اہلیت رکھتے ہیں جس سے دوسرے عاری ہوتے ہیں۔ اسی سے عصمت انبیاء پر بھی دلیل پیدا ہوتی ہے اور اس بات پر بھی کہ منصب رسالت کسی کو کوشش سے یا دعا سے نہیں ملتا۔ بلکہ یہ ایک امر وہبی ہے جسے خدا چاہتا ہے دیتا ہے۔

ع ۱۰۱۳ صغار سے مراد ذلت ہے عند اللہ اکثر مفسرین کے نزدیک من عند اللہ کے ہم معنی ہے یعنی اللہ کی طرف سے ان کو ذلت پہنچے گی اللہ کے ہاں بھی اگر معنی کیے جائیں تو مراد یہی ہے منصوبہ بازیوں اور مخالفتوں کا انجام بتایا ہے کہ ذلیل ہو جائیں گے اور قوت و شوکت جس کے بل بوتے پر یہ کچھ کر رہے ہیں جاتی رہے گی۔ یہی اہل مکہ کا انجام ہوا یہی اب مخالفت کا انجام ہوگا۔

ع ۱۰۱۴ یشرح صدرہ۔ شرح کے اصل معنی بسط یا پھیلانا ہیں اور شرح صدر کے معنی امام راغبؒ نے کیے ہیں۔ الٰہی نور اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت اور اطمینان کے ساتھ قلب میں وسعت پیدا ہو جانا۔

یجعل صدرہ ضیقا حرجا۔ حَرَج سخت تنگی کا نام ہے جس کے اندر کوئی جگہ نہیں اور گناہ کو بھی حَرَج کہتے ہیں (غ)۔ ضیق صدر عبارت ہے اس سے کہ اس میں بھلائی کے لیے کوئی رستہ نہیں امام راغبؒ کہتے ہیں اس سے مراد حزن ہے۔

یصعد فی السماء سے مراد اوپر کو چڑھنا ہے جس سے دم رکنے لگتا ہے یصعد اصل میں یَتَصَعَّدُ ہے اور صُعُود اوپر کی طرف جانے کو کہتے ہیں۔

اس کا یہ منشا نہیں کہ خدا نے دو قسم کے انسان پیدا کیے ہیں اور بعض کا سینہ کھلا اور بعض کا تنگ پیدا کیا ہے۔ بلکہ یہ بتانا مراد ہے کہ امر حق کافر کو ایک پہاڑ کی طرح نظر آتا ہے حالانکہ فی الحقیقت وہی باتیں جن سے اس کے سینہ میں اتنی تنگی پیدا ہوتی ہے سینے کے کھولنے والی ہیں، اور ان سے انسان کے اخلاق وسیع ہوتے ہیں کافر کا سینہ بوجہ اپنے کفر کے تنگ ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر تنگی کفر کا نتیجہ ہے کفر تنگی کا نتیجہ نہیں۔

ع ۱۰۱۵ مَعْشَر کا اصل عَشْر (دس) سے ہے اور چونکہ دس کو عدد کامل سمجھا گیا ہے۔ اس لیے عشیرۃ ایک شخص کے اقارب کو کہا جاتا ہے جس سے وہ کثرت

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا
ع ١٥ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٢٩﴾
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ
رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ
وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا
شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ
كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿١٣٠﴾

اور اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیتے ہیں
بہ سبب اس کے جو وہ کماتے ہیں۔
اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمھارے پاس تم میں سے
رسول نہ آئے تھے جو تمھارے اوپر میری آیات کو بیان
کرتے اور اس تمھارے دن کی ملاقات سے تم کو ڈراتے تھے
کہیں گے، ہم اپنی جانوں کے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ اور ان
کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا اور وہ اپنی جانوں کے خلاف گواہی
دیں گے کہ وہ کافر تھے ع ١٠١٥

حاصل کرتا ہے (غ) اور اس سے معشر ہے جو اسی جماعت کو کہا جاتا ہے جن کا معاملہ ایک ہے کل جماعۃ امرھم واحد جیسے معشر المسلمین (ل) الجن۔ جن کے معنی ڈھانک دینا ہیں۔ اور جن وہ نوع ہے جس کو انسان کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی اور وہ اس سے پوشیدہ ہے۔ اسی نوع میں سے قرآن شریف نے ابلیس کو قرار دیا ہے کان من الجن (الکھف ۵۰) اور شیطان بھی دو طرح کے بتائے ہیں شیاطین الانس والجن یعنی ایک انسانوں میں سے اور ایک جن میں سے۔ لیکن تبریزیؒ نے شرح حماسہ میں لکھا ہے کہ عرب کے لوگ ایسے شخص کو جو معاملات میں تیز اور زود رس ہو جن کہہ دیتے تھے چنانچہ اسی بنا پر فما نفرت جنی میں جن سے مراد وہ رفیق لیے گئے ہیں جو جن کی طرح تھے اور لسان العرب میں ایک شعر نقل کیا ہے جس میں شاعر اپنی معشوقہ کو جنی کے نام سے خطاب کرتا ہے جہاں لسان العرب میں اس لفظ کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ وہ عورت جو جنیۃ کی طرح ہو اپنے حسن و جمال میں یا اپنے تلون طبع میں کیونکہ انسان جنوں سے تعشق نہیں کرتا۔ اور اشعار جاہلیت میں ہے بخیلٍ علیھا جِنَّۃٌ عَبْقَرِیَّۃٌ ایسے گھوڑوں پر کہ ان پر عبقری جن سوار تھے اور ایک میں ہے جن اذا فزعوا انس اذا امنوا جہاں باوجود جن اور انس کے مقابلہ کے جن سے مراد انسان ہی ہیں (یہ دونوں مصرعے میں نے سر سید احمد خاں کی تفسیر سے نقل کیے ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لوگ جن کو وسیع معنی میں استعمال کر لیتے تھے۔ یعنی خاص قسم کے آدمیوں کو بھی جن کہہ لیتے تھے۔

جن سے مراد خاص انسان ہونے پر دلائل: اس جگہ آیا جن سے مراد وہی غیر مرئی ہستیاں ہیں یا مراد خاص قسم کے انسان ہیں؟ اس کا فیصلہ خود قرآن شریف کی عبارت کرتی ہے۔ اول تو فرمایا استمتع بعضنا ببعض ہم ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اب انسان تو ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر وہ غیر مرئی ہستیاں انسانوں سے اور انسان ان غیر مرئی ہستیوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ پھر اس آیت میں تو جن و انس کو ایک دوسرے کے اولیا کہا ہے اور اگلی آیت میں فرمایا کہ اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کے اولیاء بنا دیتے ہیں۔ تیسرے اگلے رکوع کے شروع میں جنوں اور انسانوں کا ایک ہی معشر فرمایا جس کا اصل اطلاق ایک شخص کے اہل پر ہے اگر الگ نوع والے جن یہاں مراد ہوتے تو انسانوں کے ساتھ انہیں ایک معشر قرار نہ دیا جاتا۔ چوتھے وہیں فرمایا کہ جنوں اور انسانوں کے پاس انہی میں سے رسول آئے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ غیر مرئی ہستیاں ایک الگ نوع ہیں۔ ان کے پاس انسانوں میں سے رسول نہ آ سکتے تھے، مگر جہاں تک قرآن کریم نے رسولوں کا ذکر کیا ہے وہ سب انسان رسول ہی ہیں اور بنی آدم کے ساتھ ہی وعدہ تھا کہ اِمَّا یاتینّکم رسل منکم یقصّون علیکم اٰیاتی۔ اور ان غیر مرئی ہستیوں کو بھی یہ رسول یا ان کے پیرو ہی مسلمان کرتے ہیں۔ جیسا حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا۔ پس یہاں جنوں سے مراد وہ انسان ہیں جو جنوں کی طرح ہیں۔ وہی لوگ جن کو شرع میں اکابر کہا ہے اور بڑے لوگ اس لیے جن کہلا سکتے ہیں کہ وہ عوام الناس کی نظروں سے عموماً چھپے رہتے ہیں اور سلیمان علیہ السلام کے ذکر میں ان قوی ہیکل لوگوں کو جن اور شیاطین کہا ہے جن کو قید کر کے حضرت سلیمانؑ نے ان سے عمارتیں بنوانے اور غوطہ زنی وغیرہ کے کام لیے اور اگر شیاطین کا لفظ آئمۂ کفار اور ان کے سرداروں پر بولا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے تو جن کا لفظ انہی لوگوں پر بولا جانا کوئی جائے تعجب نہیں۔

خلود جہنم سے استثناء: حالانکہ یہاں صاف کفار کا ذکر ہے مگر جہنم میں ان کے رہنے کے ساتھ ایک استثناء بھی موجود ہے الّا ماشاء اللّٰہ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس حالت سے انہیں باہر بھی نکال دے۔

ع ١٠١٥ اس رکوع میں اصل ذکر بعض رسوم مشرکانہ کا ہے۔ مگر اس مضمون کو شروع کرنے سے پہلے پچھلے رکوع کے مضمون کی تکمیل کی ہے اور بتایا ہے کہ جس بات سے اب انکار ہے آخر اس کا اقرار کریں گے۔ اپنی جانوں کے خلاف گواہی دینے سے مراد اپنے گناہ کا اقرار ہے۔

کیا جنوں میں سے رسول آئے: اس آیت کے جنوں کو نوع انسانی کے جن نہ قرار دینے سے مفسرین کو یہ مشکل پیش آئی ہے کہ آیا جنوں میں علیحدہ جن رسول آئے۔ ظاہر ہے کہ یہاں منکم سے مراد یہ نہیں ہو سکتی کہ جنوں میں سے جن اور انسانوں میں سے انسان رسول آئے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نوع کے لیے رسول بھیجتا ہے وہ اس نوع میں سے بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان یہ کہتے ہیں کہ ملک یعنی فرشتہ ان کی طرف رسول کیوں نہ بھیجا گیا، تو اس کا جواب یہ دیا گیا

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

یہ اس لیے کہ تیرا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک کرنے والا نہیں حالانکہ ان کے رہنے والے بے خبر ہوں ؏۱۰۱۶

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور سب کے لیے درجے ہیں اس کے مطابق جو انھوں نے عمل کیے اور تیرا رب اس سے بے خبر نہیں جو وہ کرتے ہیں۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ؕ ﴿۱۳۳﴾

اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے، اگر چاہے تم کو لے جائے اور تمھارے بعد جس کو چاہے تمھارا جانشین بنا دے، جیسا تمھیں ایک اور قوم کی نسل سے پیدا کیا ؏۱۰۱۷

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ یقیناً آنے والا ہے اور تم اسے عاجز کرنے والے نہیں ؏۱۰۱۸

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

کہہ اے میری قوم تم اپنی طاقت کے مطابق عمل کرتے جاؤ، میں بھی عمل کرنے والا ہوں پھر تم کو معلوم ہو ہی جائے گا کہ کس کے لیے اس گھر کا (بہتر) انجام ہے۔ ہاں ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوتے ؏۱۰۱۹

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ

اور کھیتی اور چارپایوں سے جو اس نے پیدا کیے ہیں اللہ کے لیے حصہ

اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ ان کی طرف رسول بھیجا جاتا قل لو کان فی الارض ملٰئکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیہم من السماء ملکا رسولا (بنی اسرائیل-۹۵) یہ آیت اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ ایک نوع دوسری نوع کی طرف رسول نہیں ہو سکتی اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ رسول صرف احکام پہنچانے والا نہیں بلکہ ان احکام پر عمل کرکے دکھانے والا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتہ انسان کے لیے نمونہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی انسان جنوں کے لیے نمونہ نہیں ہو سکتا اور جس طرح ملک انسانوں کے لیے رسول کا کام نہیں دے سکتا انسان جنوں کے لیے رسول کا کام نہیں دے سکتا پس جنوں اور انسانوں کو ایک معشر قرار دیکر پھر ان میں سے رسول بھیجنے کا ذکر صاف بتاتا ہے کہ ایک ہی نوع کا یہاں کا ذکر ہے اور اس دوسری نوع کا ذکر نہیں جو غیر مرئی ہستیاں ہیں۔

؏۱۰۱۶ ہلاکت سے پہلے تنبیہ ہوتی ہے: یعنی رسولوں کے بھیجنے کی غرض یہ تھی کہ بے خبری میں لوگ ہلاک نہ ہوں۔ ان کے فرائض سے ان کو آگاہ کرنے والا کوئی ہو۔ قرآن شریف میں جنوں کی کسی بستی کی ہلاکت کا ذکر نہیں اگر جنوں کی طرف بھی انسان رسول مبعوث ہوئے ہوتے تو ان کی ہلاکت کا بھی کہیں ذکر ہوتا۔ بظلم کے معنے دو طرح پر ہو سکتے ہیں یعنی ایک یہ کہ ظلم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو یعنی اللہ ایسا نہ تھا کہ ظلم کرکے بغیر تنبیہ کیے اور رسول بھیجے ایک بستی کو ہلاک کر دے اور دوسرے یہ کہ بعض لوگوں کے ظلم یعنی کفر یا شرک کی وجہ سے یا عقاید کی غلطی کی وجہ سے انہیں ہلاک نہیں کیا جب تک پہلے رسول بھیجکر تنبیہ نہیں کر دی۔ اور مطلب یہ ہے کہ گو بوجہ ظلم کے ان لوگوں کی حالت بہت خراب تھی کفر اور شرک کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم اس قدر ہے کہ جب تک رسول بھیجکر ان پر اتمام حجت نہیں کر دیا اس وقت تک ان پر عذاب بھیجنا بھی پسند نہیں فرمایا۔ اسی کی طرف اشارہ آیت ۱۳۳ کے الفاظ ذو الرحمۃ میں ہے۔

؏۱۰۱۷ اس میں صاف پیشگوئی ہے کہ اس کافر قوم کی جگہ دوسری قوم لے گی اور وہ مسلمان قوم تھی۔

؏۱۰۱۸ معجزین۔ عَجُز انسان کے مؤخر یعنی پچھلے حصّہ کو کہتے ہیں اور اس لیے عَجْز کے معنی کسی شے سے پیچھے رہ جانا ہیں اور مراد اس سے لی جاتی ہے کہ کام کرنے میں کوتاہی کی جو قدرت کی ضد ہے اور معجزین سے مراد ہے کہ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے یعنی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے (رغ)

؏۱۰۱۹ مکانۃ - یہ ظرف ہونے کے لحاظ سے مکان یا حالت کے معنی میں بھی آتا ہے اور مصدر ہونے کے لحاظ سے اس کے معنی استطاعت بھی ہو سکتے ہیں۔

عاقبۃ الدار۔ الدار سے مراد دار دنیا ہے اور عاقبۃ سے مراد العاقبۃ الحسنیٰ یا اچھا انجام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہی اعمال کا نتیجہ ظاہر ہو جائے گا۔ نیکی کا نتیجہ اچھا اور بدی کا نتیجہ برا ہونے پر جس قدر یقین اور وثوق نبی کریم صلعم کے قلب مبارک میں تھا اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ایک طرف دشمنوں کی طرف سے تکلیف پر تکلیف پہنچتی ہے اور یہ زمانہ آپ کی انتہائی بیکسی کا ہے۔ مگر کس قدر یقین حق کی آخری کامیابی پر ہے کہ ایک پہاڑ میں جنبش آ سکتی ہے مگر اس یقین کو جنبش دینے والی کوئی چیز نہیں۔

نَصِيبًا فَقَالُوا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا
لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ
إِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلٰى
شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿١٣٦﴾

ٹھیراتے ہیں اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے ان کے خیال میں اور یہ
ہمارے شریکوں کے لیے ہے سو جو اُن کے شریکوں کے لیے ہوتا ہے
وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو اللہ کے لیے ہوتا ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ
جاتا ہے۔ بُرا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ع۱۰۲۰

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ
قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ
وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا
فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٧﴾

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے اُن کی
اولاد کا قتل کرنا اُن کے شریک اچھا کر دکھاتے ہیں،
تاکہ وہ انھیں ہلاک کر دیں اور ان کا دین اُن پر غلط کر دیں اور اگر اللہ چاہتا
تو ایسا نہ کرتے۔ سو اُن کو اور جو وہ افترا کرتے ہیں چھوڑ دے ع۱۰۲۱

وَقَالُوا هٰذِهٖ أَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا
يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ
حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُونَ
اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۗ سَيَجْزِيهِمْ
بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿١٣٨﴾

اور کہتے ہیں یہ چار پائے اور کھیتی منع ہے۔ اس کو کوئی نہیں
کھا سکتا، مگر وہ جس کو ہم چاہیں، ان کے خیال میں اور چار پائے جن
کی پیٹھوں (پر چڑھنے) کو حرام کر دیا گیا ہے اور چار پائے جن پر اللہ کا نام
نہیں لیتے اس پر افترا کرتے ہوئے وہ ان کو اس کا بدلہ دیگا
جو وہ افترا کرتے تھے۔

وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ
لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰى أَزْوَاجِنَا ۚ وَإِنْ
يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَآءُ ۗ سَيَجْزِيهِمْ

اور کہتے ہیں جو کچھ ان چار پایوں کے پیٹوں میں ہے وہ خالص
ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر وہ
(بچہ) مرا ہوا ہو تو وہ سب اس میں شریک ہوتے ہیں، وہ اُن کو اُن کے

ع۱۰۲۰ آنحضرتؐ نے مشرکانہ رسوم کا استیصال کیا: مشرکانہ رسوم اس قوم کے روزمرہ کے افعال کے اندر داخل ہو کر قومی خون کے اندر رچ گئی تھیں اور ان رسوم کا ان سے دور کرنا اور سینکڑوں سالوں کی عادات قومی کو بدل دینا کسی انسان کی طاقت میں نہ تھا۔ یہ کمال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی کو ہی دیا گیا کہ تمام رسوم کو چند سال کے عرصہ میں ایسا دور کیا کہ انکا کہیں نام و نشان بھی نہ رہا۔ خیرات کے لیے جو حصّہ الگ کرتے اس میں سے ایک حصّہ اللہ کے نام پر رکھتے اور مہمانوں مساکین وغیرہ پر خرچ کرتے اور ایک حصّہ بتوں کے لیے جو کاہنوں اور بتوں کے مجاوروں کو دیتے۔ پھر طرح طرح کی تجویزوں سے اس حصّہ کو جو خدا کے لیے ہوتا بتوں پر صرف کر دیتے۔ مثلاً اگر دیکھتے کہ جو حصّہ اللہ کے لیے مقرر کیا ہے وہ عمدہ حالت میں ہے تو اسے بھی بتوں کا چڑھاوا بنا دیتے۔ یا کچھ غلط واقع ہو جاتا تو سارا بتوں کا چڑھاوا قرار دے دیتے۔ آج مسلمانوں کے چندے خیراتی کاموں کے لیے اسی رنگ میں رنگین ہیں وعدہ کر لیتے ہیں مگر اپنی ضروریات آئیں تو جو حصّہ خدا کے لیے دینا گیا ہے اسے بھی وہیں خرچ کر لیتے ہیں اور یوں کبھی نہیں ہوتا کہ اپنی ضروریات کو کاٹ کر اللہ تعالیٰ کے لیے دیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

ع۱۰۲۱ یردوا۔ رَدَی کے معنی ہلاک ہیں وما یغنی عنه ماله اذا تردّی (الیل ۹۲: ۱۱) تاللہ ان کدت لتردین (الصّٰفّٰت ۳۷: ۵۶)

قتل اولاد کی رسم: قتل اولاد۔ ایک تو بیٹیوں کا زندہ گاڑ دینا تھا۔ اس صورت میں شرکاؤھم سے مراد اُن کے اکابر ہوں گے جو ایک جھوٹی غیرت کی وجہ سے بیٹیوں کو زندہ نہ رہنے دیتے تھے۔ انہی کا تتبع عوام الناس کرنے لگے، اور علاوہ ازیں ان میں یہ بھی رسم تھی کہ جب بیٹوں کی تعداد دس تک پہنچ جائے تو ایک کو بتوں کا چڑھاوا چڑھا دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ عبد المطلب نے کیا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کو بت پر چڑھاوے کے طور پر ذبح کرنے کے لیے چڑھایا۔ اور آخر ایک سو اونٹ آپ کی جگہ دیا۔ اسی لیے رسول اللہ صلعم نے فرمایا انا ابن الذبیحین میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں یعنی ایک حضرت اسمٰعیلؑ اور دوسرے آپ کے والد عبد اللہؑ۔

اولاد کو جاہل رکھنا بھی قتل کرنا ہے: اور قتلِ اولاد سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی پرورش ظلم شرک جہالت میں کرتے جیسا کہ امام راغبؒ نے لاتقتلوا اولادکم

وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾
قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ
بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً
ع عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾
وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ
مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا
اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ
مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ
اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾
وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا
مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

بیان کا بدلہ دیگا وہ حکمت والا علم والا ہے ۱۰۲۲
بیشک وہ گھاٹے میں ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے
لاعلمی میں قتل کر دیا اور جو اللہ نے ان کو رزق دیا تھا اس کو اللہ پر افترا
کر کے حرام کر دیا۔ بیشک وہ گمراہ ہوئے اور وہ ہدایت پانے والے نہیں ۱۰۲۳
اور وہی ہے جس نے باغ پیدا کیے ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور نہ
چڑھائے ہوئے اور کھجوریں اور کھیتی اس کے پھل مختلف قسم کے ہیں اور
زیتون اور انار، ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور نہ
ملتے جلتے۔ اس کے پھل سے کھاؤ جب وہ پھل لائے اور
اس کے کاٹنے کے دن اس کا حق دو اور بے جا خرچ نہ کرو،
وہ بے جا خرچ کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا ۱۰۲۴
اور چار پایوں میں سے جو اٹھائے جاتے ہیں اور جن پر سوار ہوتے ہیں
اس سے کھاؤ جو تم کو اللہ نے رزق دیا ہے اور شیطان کے قدموں
کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ۱۰۲۵

من املاق (۱۵۲) میں لکھا ہے قیل ان ذٰلك نهيٌ عن شغل الاولاد بما یصُدُّھم عن العلم۔

لبس۔ دین کو خلط کرنے سے مراد ہے کہ اصل دین توحید جو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا تھا اس پر نہ رہنے دیا۔

لوشاء اللہ ما فعلوہ میں پھر پیشگوئی ہے کہ یہ رسوم بد سب ان کے درمیان سے دور کر دی جائیں گی۔

ع ۱۰۲۲ حِجر اصل حَجَر سے لیا گیا ہے یعنی پتھر اور اس میں روکنے کے معنی آ گئے ہیں۔ جس طرح پتھر بوجہ اپنی صلابت کے روکتا ہے۔ اور اس لیے حِجر کے معنی میں تحریم کی وجہ سے ممنوع جیسے یہاں اور حِجر عقل کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اس چیز سے روکتی ہے جس کی طرف انسان کا نفس اسے بلاتا ہے جیسے قسم لذی حِجر (الفجر ۸۹-۵)

وصف کسی چیز کا ذکر اس کے حلیہ اور اس کی نعت کے ساتھ کرنا۔ اور وَصف حق بھی ہوتا ہے اور باطل بھی لما تصف السنتکم (النحل ۱۶-۱۱۶) سبحان ربك رب العزة عما یصفون (الصّٰفّٰت ۳۷-۱۸۰)

یہ تمام مشرکانہ رسوم عرب میں مروج تھیں مگر اسلام نے ایسا ان رسوم سے ملک کو پاک کیا کہ پھر ان میں سے کسی رسم کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ یوں اسلام نے صرف عقیدتاً توحید نہیں پھیلائی بلکہ ان کی عملی زندگی میں سے ہر ایک قسم کے شرک کو دور کیا۔

ع ۱۰۲۳ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل اولاد سے مراد ان کی جہالت اور مشرکانہ رسوم میں پرورش کرنا ہے۔

ع ۱۰۲۴ معروشات۔ عَرش چھتی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ اور عَرَشْتُ الکَرْم کے معنی ہیں اس کے لیے چھت کے طور پر کوئی چیز بنا دی ومن الشجر ومما یعرشون (النحل ۱۶-۶۸) پس معروش کے معنی ٹٹی پر چڑھایا ہوا (غ) اور معروشات سے مراد انگور وغیرہ ہیں جس کو کسی سہارے کی ضرورت ہوتی اور غیر معروشات وہ جو خود اپنے تنہ پر کھڑے ہوتے ہیں۔ (ج)

اکل۔ اَکل کھانا اور اکل یا اُکل وہ چیز ہے جو کھائی جائے مگر اُکل حظ یا رزق کے معنی میں بھی آتا ہے اور پھل کو بھی کہتے ہیں (ل)

مسرف۔ سرف کسی فعل میں حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے، خاص طور پر مال خرچ کرنے میں اور حد سے تجاوز دونوں طرح پر ہے۔ ضرورت سے زیادہ خرچ کرے یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر خرچ کرے خواہ قلیل ہی ہو (غ)، رسوم و رواج پر جو خرچ کیا جاتا ہے۔ وہ سب طاعۃ اللہ سے باہر ہونے کی وجہ سے اسراف میں داخل ہے۔

اول نباتات میں جو اللہ تعالیٰ کی نعماء ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں حق صرف خالق کا ہو سکتا ہے اس کے سوا اور کسی کا حق نہیں۔ اور وہ حق زکوٰۃ ہے۔ مشرک نباتات یعنی کھیتیوں میں اور چار پایوں میں بتوں کے حقوق مقرر کرتے تھے۔ خود کھانے کا ذکر ترتیب طبعی کے لحاظ سے پہلے رکھا ہے۔

ع ۱۰۲۵ حمولۃ۔ حمل سے ہے جس کے معنی اٹھانا ہیں۔ راغبؒ نے اس کے معنی کیے ہیں ما یُحمَل جو خود اٹھایا جائے۔ یعنی چھوٹا۔

فَرش۔ فرش کے معنی بچھانا ہیں اور زمین کو فراش کہا ہے کہ اس پر انسانوں کا استقرار ہے فَرش کے معنی ما یُفرش ہیں اور اس سے مراد ما یُرکب ہے

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰۤالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

آٹھ نر اور مادہ، دو بھیڑوں میں سے، اور دو بکریوں میں سے۔ کہہ، کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ، یا وہ جو دونوں مادہ کے رحموں میں ہے؟ مجھے علم کے ساتھ خبر دو اگر تم سچے ہو ۱۰۲۶

وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰۤالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع

اور اونٹوں میں سے دو، اور گایوں میں سے دو۔ کہہ، کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ، یا وہ جو دونوں مادہ کے رحموں میں ہے؟
یا تم گواہ تھے جب اللہ نے تم کو یہ حکم دیا۔ پس اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے تاکہ بے علمی سے لوگوں کو گمراہ کرے، اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا ۱۰۲۷

قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِىْ مَاۤ اُوْحِىَ اِلَىَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

کہہ، میں اس میں جو میری طرف وحی کی گئی ہے کسی چیز کو جو کوئی کھانے والا کھائے حرام نہیں پاتا، سوائے اس کے کہ مردار ہو یا خون گرایا گیا، یا سؤر کا گوشت، کیونکہ یہ (سب) ناپاک ہیں یا وہ نافرمانی ہو کہ اس پر اللہ کے سوائے دوسرے کا نام پکارا گیا ہو۔ پھر جو کوئی لاچار ہو جائے نہ خواہش کرنے والا نہ حد سے بڑھنے والا تو تیرا رب بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۰۲۸

یعنی جس پر سواری کی جائے (غ)

گزشتہ رکوع کی مشرکانہ رسوم کا ابطال کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان جانوروں کا پیدا کرنے والا خدا تعالیٰ ہے نہ تمہارے بت۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لیے انہیں پیدا کیا ہے وہ کام ان سے لو۔ حمولۃ اور فرش کے معنی میں بہت سا اختلاف ہے میں نے امام راغب کے معنوں کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ اگلی آیات میں اسی ترتیب سے ان جانوروں کا ذکر کیا۔ پہلے چھوٹے اور پھر بڑے۔

ع ۱۰۲۶ زوج۔ نر اور مادہ میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے پس آٹھ ازواج سے مراد ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ ملکر کل تعداد آٹھ ہے۔ جیسا کہ آگے خود تقسیم کر کے بتایا ہے۔

ضأن۔ ضائن کی جمع ہے بھیڑ نر کبش اور مادہ نعجۃ اور معز۔ ماعز کی بکرا۔ نر تیس ہے اور مادہ عنز۔

بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ نر کو حرام کیا ہے نہ مادہ کو نہ ان کے بچوں کو۔ مشرک بعض وقت نر کو بتوں کا چڑھاوا قرار دیکر ان سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ بعض وقت مادہ کو۔ اور جیسا کہ پچھلے رکوع میں ذکر ہے بعض وقت جو بچہ پیٹ میں ہو اسے مردوں کے لیے حلال اور عورتوں کے لیے حرام قرار دیتے تھے اس لیے نر اور مادہ کا ذکر الگ الگ کیا۔

۱۰۲۷ ابل میں سے دو جمل یعنی نر اور ناقۃ یعنی مادہ۔

بقر میں سے دو۔ نر کو ثور کہتے ہیں۔ مادہ کو بقرۃ جس کی جمع بقر ہے۔

ان تمام رسوم کو مشرکین اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرف منسوب کرتے تھے اور یہ سب ان کا افترا تھا۔

ع ۱۰۲۸ جب مشرکانہ رسوم کا ذکر ہوا جن کی رو سے حلال چیزوں کو حرام کیا جاتا تھا۔ تو یہ بھی بتا دیا کہ وحی الٰہی کس چیز کو حرام ٹھہراتی ہے لا اجد فیما اوحی الی

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿١٤٦﴾

اور اُن پر جو یہودی ہیں ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کیے تھے اور گایوں اور بھیڑ بکری سے ہم نے ان کی چربی حرام کی تھی، سوائے اس کے جو اُن کی پیٹھ پر یا انتڑیوں پر لگی ہو یا جو ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے اُن کو اُن کی بغاوت کی وجہ سے سزا دی تھی اور یقیناً ہم سچے ہیں ۱۰۲۹

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٤٧﴾

پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ، تمھارا رب وسیع رحمت والا ہے۔ اور اس کی سزا مجرم قوم سے نہیں ٹلتی۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿١٤٨﴾

جنھوں نے شرک کیا، اب وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے، اسی طرح وہ لوگ جھٹلاتے رہے جو اُن سے پہلے تھے۔ یہاں تک کہ ہماری سزا کا مزا چکھا۔ کہہ، کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے تو اس کو ہمارے لیے نکالو تم صرف ظن کی پیروی کرتے ہو اور تم نری اٹکلیں دوڑاتے ہو ۱۰۳۰

بتانا ہے کہ یہاں اشارہ سورۂ نحل کی طرف ہے جو بلحاظ نزول سورۂ انعام سے پہلے کی ہے اور سب سے پہلے اسی میں غذاؤں کی حرمت و حلت کا ذکر آیا ہے۔ یہاں زاید یہ بیان کر دیا ہے کہ پہلی تین یعنی مردار اور خون جو بہ گیا ہو اور سؤر کا گوشت یہ تینوں اپنی ناپاکی کی وجہ سے حرام کیے گئے ہیں۔ ان میں وہ مضرات ہیں جو انسان کے جسم پر اور اس کے اخلاق پر بُرا اثر پیدا کرتے ہیں۔ اور ما اھل بہ لغیر اللہ کو ان تینوں سے الگ کر کے اسے فسق قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کی ناپاکی اصل نہیں بلکہ وہ محض خدا کے حکم کی نافرمانی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ غذاؤں تک میں مشرکانہ رسوم کی بیخ کنی کر دی جائے۔

ع۱۰۲۹ ذی ظفر۔ ظُفُر انسان اور اس کے غیر دونوں پر بولا جاتا ہے اور ذی ظفر سے مراد ذی مخالب ہیں (غ) یعنی پنجہ والے۔ بہائم اور پرندوں میں سے وہ جن کی انگلیاں پھٹی ہوئی نہ ہوں جیسے اونٹ اور شتر مرغ اور بطخ (ج)

حوایا۔ حَوِیّۃ کی جمع ہے انتڑیاں اور حوی کے معنی ہیں جمع کیا اور اسے نگاہ رکھا (ل)

حرمت بطور سزا: مطلب یہ ہے کہ یہودیوں پر جو ان ممنوعہ غذاؤں یعنی سؤر وغیرہ سے علاوہ کچھ حرام کیا گیا تھا تو ان کی شرارتوں کی وجہ سے ایک وقتی سزا تھی۔ یعنی ان کے مادۂ سرکشی کو کم کرنے کے لیے بعض چیزوں سے انھیں بطور سزا محروم کر دیا گیا۔

ع۱۰۳۰ تخرصون۔ خَرص پھل کے تخمینہ کرنے کو کہا جاتا ہے اور تخرصون کے معنی ہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔ اور قُتِلَ الخرّٰصون (الذّٰریٰت۔ ۱۰) کے معنی ہیں کذابوں پر لعنت۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک قول جو صرف ظن اور تخمینہ کی بنا پر کہا جائے وہ خرص ہے خواہ ایک چیز کے مطابق ہو یا مخالف کیونکہ اس کا کہنے والا وہ بات علم یا غلبہ ظن یا سماع کی بنا پر نہیں کہتا بلکہ صرف گمان اور تخمینہ کی بنا پر اور اس طرح پر بات کہنے والا کاذب سمجھا جائیگا (غ)

لو شاء اللہ ما اشرکنا کی تفسیر: جب ہر قسم کے دلائل ابطال شرک کے ہو چکے۔ تو اب ان کے آخری عذر کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے۔ مطلب یہ کہ ہمارا شرک بھی مشیت الٰہی سے ہے۔ اس کا جواب کئی طرح پر دیا ہے۔ اوّل یہ کہ یہ محض تکذیب ہے پہلے لوگ بھی اسی طرح کے بودے عذر بنا کر انبیاء کو جھٹلاتے رہے۔ آخر عذاب کا مزہ چکھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہوتا کہ انسان شرک کریں تو پھر وہ شرک کی وجہ سے عذاب کیوں بھیجتا۔ دوسرا جواب اسی کے اندر ہے کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کیوں تکذیب کرتے ہو۔ اگر تم ایسے ہی مسلوب الاختیار ہو تو پھر تکذیب کیوں کرتے ہو۔ حق کے قبول کرنے میں مسلوب الاختیار بنتے ہیں۔ اس کی تکذیب کے وقت نہیں بنتے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ کوئی علم پیش کرو۔ اگر الٰہی منشا یہ ہوتا کہ لوگ شرک کیا کریں تو اس کی تعلیم بذریعہ انبیاء بھی یہی ہوتی مگر کسی نبی کی تعلیم شرک کی طرف نہیں بلاتی۔ اور آخر پر بتایا کہ یہ تمہاری باتیں نرے ظن اور اٹکلوں پر مبنی ہیں حالانکہ پیغمبر جو ابطال شرک کرتا ہے وہ یقینی علم کی بنیاد پر

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

کہہ دے، تو اللہ کی دلیل ہی فیصلہ کن ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا ۱۰۳۱

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

کہہ، اپنے وہ گواہ لاؤ، جو یہ گواہی دیں کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے۔ پھر اگر یہ خود گواہی دیں تو تو اُن کے ساتھ گواہی نہ دے اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کر، جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ان کی جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور وہ (دوسروں کو) اپنے رب کے برابر ٹھیراتے ہیں ۱۰۳۲

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

کہہ، آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے حرام کیا ہے تم پر واجب ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو۔ ہم تم کو رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی اور بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو اُن میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں اور اس جان کو جسے اللہ نے حرام ٹھیرایا ہے قتل نہ کرو مگر حق پر اس کام کو تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو ۱۰۳۳

کرتا ہے۔

جو کچھ یہاں مشرکوں کی حالت بیان کی ہے آج وہی مسلمانوں کے کثیر حصہ پر صادق آرہی ہے۔ ایک کثیر حصہ مسلمانوں کا ایسا ہے جو طرح طرح کے فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ خدا کے منشاء کے خلاف تو ہم چل ہی نہیں سکتے۔ پس وہ چاہتا ہی ہے تو ہم ایسا کرتے ہیں۔ اسی طرح مذہب کے معاملہ میں بڑی جرأت سے کام لیکر بغیر صحیح علم کے اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہیں اور اس کو یہاں کذب قرار دیا ہے۔

ع ۱۰۳۱ البالغۃ۔ بُلُوغ کے معنی غایت مقصد کو پہنچ جانا (غ) پس حجۃ بالغۃ وہ دلیل قطعی ہوئی جو مدعا کو ثابت کر دے۔

جو دلائل اوپر دیئے ہیں ان کو حجت بالغہ یا فیصلہ کن دلیل کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور آخر پر فرمایا کہ ارادہ الٰہی تو ہدایت کے لیے ہی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ وہ سامان بھی پیدا کر دیگا جو تم کو شرک سے نکال کر توحید پر قائم کر دیں یا لو شاء لھدٰکم اجمعین کے معنی یہ ہیں کہ اگر اس کی مشیت انسانوں کو مجبور کرنا ہوتی تو وہ ہدایت پر مجبور کرتا۔

ع ۱۰۳۲ هَلُمَّ۔ کسی چیز کی طرف بلانے پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اصل بعض کے نزدیک هَا لُمَّ ہے اور لُمَّ لَمَمْتُ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کی اصلاح کی اور بعض کے نزدیک هَلْ اَمَّ یعنی کیا تمہارے لیے اس میں اَمّ یعنی قصد ہے (غ)

مطلب یہ ہے کہ تم کوئی ایسا شخص پیش نہیں کر سکتے جس نے بربنائے وحی الٰہی یہ کہا ہو کہ یہ مشرکانہ باتیں جائز ہیں۔

ع ۱۰۳۳ حَرَّمَ رَبُّكُمْ کے آگے آتا ہے کہ کسی کو شریک نہ کرو۔ مگر شرک کرنے کو حرام نہیں کیا۔ بلکہ بلحاظ تاکید لا بڑھا دیا ہے یا علیکم سے اگلا بیان شروع ہوتا ہے یعنی تم پر واجب ہے کہ شرک نہ کرو پس جو کرنے کی باتیں تھیں وہ بتا دیں ان کے خلاف حرام ہے

من املاق۔ مَلَقَ۔ مہربانی اور لطف یا نرمی اور مدارات کو کہا جاتا ہے اس سے تَمَلُّق بمعنی چاپلوسی ہے اس لیے دعا اور تضرع کو بھی ملق کہا جاتا ہے اور املاق فقیر ہو جانے کو کہتے ہیں اور اصل اس کا یہ ہے کہ سارا مال خرچ کر دیا۔ پس اس کے پاس کچھ نہ رہا (ل) یہاں من املاق فرمایا۔ یعنی مفلسی کی وجہ سے دوسری جگہ ہے خشیۃ املاق یعنی مفلسی کے ڈر سے (بنی اسرائیل ۱۷-۳۱) ہو سکتا ہے کہ دونوں کے ایک معنی ہوں، ہو سکتا ہے کہ پہلے سے مراد وہ ہیں جو مفلس ہیں اور دوسرے سے وہ جو مفلس نہیں مگر مفلسی سے ڈرتے ہیں۔

توحید کا عملی رنگ: ہر قسم کے شرک کی بلکہ اس کے ساتھ ہی مشرکانہ رسوم کی تردید کر کے اب اس رکوع میں بتایا ہے کہ توحید کو قبول کرنا محض ایک عقیدہ کا مان لینا

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ
أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ
وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا
وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم
بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿١٥٢﴾

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، مگر اس طریق سے
جو بہت اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے
اور ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو، ہم کسی جی کو مکلف نہیں
کرتے مگر اس کی وسعت کے مطابق اور جب تم بات کہو تو عدل کرو اگرچہ قریبی
ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ اس کا تم کو حکم دیتا ہے
تاکہ تم نصیحت پکڑو ۱۰۳۴

وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ
وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن
سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٥٣﴾

اور کہ یہ میرا راستہ سیدھا ہے سو اس کی پیروی کرو
اور (دوسرے) راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تم کو اس کے راستہ
سے ہٹا دیں گے اس کا تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم تقوے کرو ۱۰۳۵

ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَى الَّذِي
أَحْسَنَ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى
ع ١٩ ٦ وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُم بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿١٥٤﴾

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اس پر (نعمت کا) اتمام کرنے کے
لیے جو نیکی کرتا ہے اور ہر (ضروری) چیز کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت
تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں ۱۰۳۶

نہیں بلکہ خاص اصول پر اپنی زندگی کو چلانے کا نام ہے۔ چنانچہ اول خلاصہ کے طور پر ہر قسم کے شرک کا ابطال یوں کیا کہ کسی چیز کو مسیح ہو یا ملائکہ ہوں یا بت ہوں یا اور چیزیں ہوں یا اہرمن ہو خدا کے ساتھ شریک مت ٹھہراؤ۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسرے احکام کا ذکر کیا جو انسان کی عملی زندگی کے لیے ہیں گویا بتا دیا کہ شرک سے بچنا یہی ہے کہ صحیح اصولِ زندگی پر عمل پیرا ہو۔ ان میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کی طرف توجہ دلائی پھر اولاد کے قتل اولاد سے یہاں بعض نے مراد عزل وغیرہ سے بچے ضائع کرنا لیا ہے اور بعض نے لڑکیوں کا زندہ گاڑنا مگر سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد جیسا کہ ۱۰۲۱ میں دکھایا جا چکا ہے یہی ہے کہ اولاد کو علم وغیرہ سے محروم مت کرو۔ کیونکہ اکثر لوگ محض اس خیال سے اولاد کو تعلیم نہیں دیتے کہ ہم مفلس ہیں۔ یا مفلس ہو جائیں گے۔ مفلسی کے خوف سے لڑکیوں کو مارتے تھے گویا والدین کے حقوق کے مقابل اولاد کے حقوق یہ بیان کیے کہ ان کو اچھی تعلیم و تربیت دی جائے پھر ہر قسم کی بےحیائی کی باتوں سے روکا خواہ ان کا اثر دوسرے پر نہ پہنچتا ہو اور بدترین بےحیائی زنا ہے جس سے نسل انسانی کی افزائش پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ پھر بقائے نسل انسانی میں جو سب سے بڑی ضرورت ہے یعنی حفاظت جان اس کی طرف توجہ دلائی ایک رنگ میں چاروں باتوں کا تعلق حفاظت جان سے ہے۔ ماں باپ کے ذریعہ سے جان پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی تربیت ہوتی ہے پھر اولاد کے قتل سے روکا۔ پھر بےحیائی سے جس کی سب سے قبیح صورت زنا ہے جس سے اولاد ضائع ہوتی ہے۔ پھر دوسرے کو قتل کرنے سے روکا ہے۔ آخر پر عقل سے کام لینے کو کہا ہے کہ اس کے بغیر نوع انسان کا بقا نہیں رہ سکتا۔

۱۰۳۴ اشد۔ شدّ کا استعمال مضبوطی عہد پر بھی ہے اور قوت بدنی پر بھی ھو اشد منہم قوۃ (حم ۴۱-۱۵) اور اشدّ وہ حالت ہے جب انسان کے قوائے جسمانی مضبوط ہو جائیں اور قوائے اخلاقی کی مضبوطی پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے حتّٰی اذا بلغ اشدہ و بلغ اربعین سنۃ (الاحقاف ۴۶-۱۵) (غ) اور یہاں مراد قوائے بدنی کی مضبوطی ہے۔

اس آیت میں حفاظت مال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سب سے پہلے یتیم کے مال کی حفاظت کی۔ پھر ناپ اور تول کو ٹھیک رکھنے کا حکم دیا۔ پھر حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں انصاف کا حکم دیا۔ اور بالآخر اللہ کے عہد کی طرف توجہ دلا کر تمام احکام شریعت کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا خاتمہ نصیحت پر کیا کیونکہ لوگ مال کے معاملہ میں یا شہادت کے ادا کرنے میں خدا کو یاد نہیں رکھتے۔

۱۰۳۵ حقوق اللہ یا اللہ کی توحید کے ساتھ حقوق العباد کو بیان کر کے اس سب کو صراط مستقیم کہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی ادائیگی بھی صراط مستقیم میں شامل ہے۔

۱۰۳۶ ثُمَّ یہاں ترتیب کے لیے نہیں۔ بلکہ مراد صرف ایک اور چیز کا ذکر ہے۔ دیکھو ۹۳۔

توریت کن معنوں میں اتمام نعمت ہے۔ تماماً۔ یعنی اتمام نعمت کے لیے۔ اس قوم کے حالات کے مطابق توریت سے ہی ان پر اتمام نعمت ہوا۔ ہاں کل دنیا پر اتمام نعمت قرآن سے ہوا۔

علی الذی احسن۔ اس سے مراد ہر ایک نیکی کرنے والا ہے۔ بعض نے مراد حضرت موسیٰ کو لیا ہے کہ انہوں نے تبلیغ میں احسان کیا یا مراد ہے احسن القیام یعنی کتاب

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ
وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور یہ کتاب جس کو ہم نے اتارا ہے برکت دی گئی ہے سو اس کی
پیروی کرو اور تقویٰ کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۱۰۳۷

اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ
مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾

ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ کتاب صرف ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتاری
گئی اور ہم ان کے پڑھنے سے یقیناً بے خبر تھے ۱۰۳۸

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ
اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا ؕ
سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا
سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

یا کہو اگر کتاب ہم پر اتاری جاتی تو ہم یقیناً ان سے زیادہ ہدایت
پر ہوتے سو ضرور تمھارے پاس تمھارے رب سے کھلی دلیل اور
ہدایت اور رحمت آگئی ۔ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے ، جو
اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے اور ان سے پھر جائے ۔ ہم
ان لوگوں کو جو ہماری آیات سے پھرتے ہیں ، بُرے
عذاب کی سزا دیں گے اس لیے کہ وہ پھر جاتے تھے ۱۰۳۹

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ
اَوْ يَاْتِىَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِىَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ
يَوْمَ يَاْتِىْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ
نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ

وہ کسی بات کا انتظار نہیں کرتے مگر یہ کہ ان کے پاس فرشتے آئیں
یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کے بعض نشان آئیں ۔ جس
دن تیرے رب کے بعض نشان آئیں گے کسی شخص کو اس کا
ایمان نفع نہیں دے گا ، جو پہلے ایمان نہ لایا تھا ۔

کے قائم رکھنے میں نیکی کرے یا تماماً سے مراد اس کے عمل احسان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نعمت کی زیادتی ہے۔
تفصیل کل شئی سے مراد صرف اسی قدر ہے کہ اس قوم کی ضرورت کے مطابق اس میں ہر شے کی تفصیل تھی جیسا کہ ایک ملکہ کے ذکر میں ہے واوتیت من کل شئی (النمل ۲۳) مراد صرف اس زمانہ کی ضروریات ہیں۔
چونکہ اگلے رکوع میں قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال کا ذکر ہے اس لیے اس کا خاتمہ حضرت موسیٰؑ پر کیا ہے اور اس لیے بھی کہ موسیٰؑ کی کتاب قرآن کی صداقت پر گواہ ہے اور خود اس رکوع سے یہ تعلق ہے کہ جیسے احکامِ شریعت توحید کے ساتھ اب دیئے ہیں ایسے ہی احکام موسیٰ کو بھی دیئے تھے۔

ع ۱۰۳۷ سورت کے خاتمہ پر اس رکوع میں دو باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک تو یہ کہ توحید کی تعلیم دنیا میں گو پہلے بھی آتی رہی جیسا کہ ابھی حضرت موسیٰؑ کی کتاب کے ذکر میں فرمایا تھا اور اپنے اپنے وقت میں ہر قوم پر اتمام نعمت وہی تعلیم تھی، لیکن وہ کامل تعلیم جو دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے بھیجی جاتی ہے وہ اس کتاب میں ہے، جو مبارک ہے، جس کی خیر دائمی ہے اور کبھی منقطع نہ ہوگی (دیکھو ع ۹۸۲) اور دوسرا اس توحید کا عملی نمونہ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کو پیش کیا ہے اور یوں بتایا ہے کہ توحید کی تعلیم علمی رنگ میں اپنے کمال میں اگر قرآن شریف میں موجود ہے تو عملی رنگ میں وہ محمد رسول اللہ صلعم میں ہے۔

ع ۱۰۳۸ یہاں مخاطب خصوصیت سے اہل عرب ہیں، اور ان تقولوا کا تعلق انزلناہ سے ہے یعنی اگر ہم کتاب نہ اتارتے تو تم ایسا کہہ سکتے تھے۔ اور صرف دو گروہوں کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ دو گروہ ملک عرب میں آباد تھے اور انہوں نے عرب کی اصلاح کے لیے کوشش بھی کی تھی، چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے یہودیوں اور پھر عیسائیوں نے اپنا پورا زور اہل عرب کو یہودی اور عیسائی بنانے پر لگایا، لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور ان کی دراست سے بے خبر ہونا اس لحاظ سے کہا کہ یہ کتابیں زبان عربی میں نہ تھیں اور ان کے ترجمے بھی وہ دوسری زبانوں میں کرنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی خیال تھا کہ ان کی مقدس کتابوں کو صرف مذہبی آدمی ہی پڑھ سکتے ہیں۔ یہودیوں کا تو اب تک یہی خیال ہے اور عیسائیوں میں پراٹسٹنٹ فرقہ کے پیدا ہونے کے بعد ترجمے شروع ہوئے۔

ع ۱۰۳۹ اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ لوگ جن پر اب ہم نے یہ کتاب اتاری ہے یہود اور نصاریٰ سے بڑھ کر اتباع کریں گے اور جس طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں اور حضرت عیسیٰ کے حواریوں نے تورات اور انجیل کی پیروی میں کمزوری دکھائی ایسی کمزوری رسول اللہ صلعم کے اصحابؓ سے وقوع میں نہ آئے گی۔ آخر میں تکذیب کرنے والوں کو ڈرایا ہے

أَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ إِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا
إِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٥٨﴾

یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی۔ کہہ، انتظار کرو ہم (بھی) انتظار کرنے والے ہیں ۱۰۴۰

إِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا
لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ إِنَّمَآ أَمْرُهُمْ إِلَى
اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿١٥٩﴾

وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور (کئی) فرقے ہو گئے، تیرا ان سے کچھ سروکار نہیں ان کا معاملہ اللہ کی طرف ہے پھر وہ ان کو بتا دیگا، جو وہ کرتے تھے ۱۰۴۱

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۚ وَ
مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى إِلَّا مِثْلَهَا
وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦٠﴾

جو کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے لیے دس اس کی مثل ہیں اور جو کوئی بدی کرتا ہے تو اس کی مثل ہی اس کو سزا دی جائے گی۔ اور اُن پر ظلم نہ کیا جائے گا ۱۰۴۲

قُلْ إِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ إِلٰى صِرَاطٍ

کہہ، بے شک مجھ کو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت

ع۱۰۴۰ اشراط ساعۃ۔ اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں ایک حدیث مروی ہے جو الفاظ مختلفہ میں اور کئی طریقوں میں آئی ہے اس میں کہیں تو یہ لفظ ہیں لا تقوم الساعۃ حتّٰی تطلع الشمس من مغربہا فاذا راٰھا النّاس اٰمن من علیہا فذٰلک حین لا ینفع نفسًا ایمانہا لم تکن اٰمنت من قبل۔ قیامت نہیں آئیگی جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ کرے پس جب لوگ اسے دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا کہ جب کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دیگا جو پہلے ایمان نہ لایا تھا اور کسی میں یہ لفظ ہیں کہ تین باتیں ہیں جب وہ ظاہر ہو جائیں گی تو کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دیگا جو پہلے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان میں خیر نہیں کمائی تھی۔ سورج کا مغرب سے طلوع کرنا اور دجال اور دابّۃ الارض اور کسی میں یہ لفظ ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی جب تک دس نشان نہ دیکھ لو۔ آفتاب کا مغرب سے طلوع اور دخان اور دابّہ اور خروج یاجوج و ماجوج اور ظہور عیسٰی بن مریم اور ظہور دجال اور تین خسف ایک خسف مشرق میں اور ایک مغرب میں اور ایک جزیرۃ العرب میں اور آگ جو قعر عدن سے نکلے گی۔ اب پہلی بات یہ ہے کہ ان احادیث کو اس آیت سے کچھ تعلق نہیں سوائے اس کے کہ ان میں بھی یہ لفظ آئے ہیں کہ اس وقت کسی شخص کو ایمان نفع نہ دیگا اور آیت میں بھی یہ لفظ آتے ہیں مگر صرف اس بنا پر ان اشراط الساعۃ کو بعض اٰیات ربک کی تفسیر نہیں کہا جا سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں فرشتوں اور رب کے آنے کا ذکر ہے اور اسکے ساتھ بعض آیات رب کے آنے کا ذکر ہے اور ان احادیث میں لیا کوئی ذکر نہیں بلکہ یہ کوئی اور نشانات ہیں۔ فرشتوں اور رب کے آنے سے کیا مراد ہے یہ ۲۶۹ میں دکھایا جا چکا ہے اور دوسری دقت یہ ہے کہ ان احادیث میں ان اشراط میں صاف طور پر دجال یا مسیح موعود کے آنے کا ذکر ہے اور یہ احادیث سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ دجال کو مسیح موعود ہلاک کرے گا اور غیر مسلم مسیح موعود کی دعوت سے ایمان لائیں گے۔ اگر ان کا ایمان لانا بے سود تھا تو مسیح کو بھیجنے کا فائدہ کیا تھا۔ پس ضرور ہے کہ ان احادیث کا مطلب کچھ اور ہو اور بعض باتیں ان میں استعارہ کے رنگ کی ہوں، مگر اس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ یہاں ہم نے صرف یہ دیکھنا ہے کہ بعض اٰیات ربک سے مراد کیا ہے سو اس تفسیر کو مدنظر رکھتے ہوئے، جو ملائکہ اور اللہ کے آنے کی ع۲۶۹ میں کی جا چکی ہے یعنی یہ کہ فرشتوں کے آنے سے مراد جنگوں میں عذاب کا آنا ہے اور رب کے آنے سے مراد دشمن کا استیصال قطعی ہے۔ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیات ربک کے آنے سے مراد موت کا آنا ہے۔ جو وہ بھی من مات فقد قامت قیامتہ‘ کے ماتحت قیامت ہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب موت کے آثار ظاہر ہو جائیں تو پھر کافر کو ایمان لانا کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ نہ ایسے شخص کو ایمان کچھ فائدہ دے سکتا ہے جو منہ سے ایمان لایا مگر اعمال اسکے مطابق نہ کیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان بغیر اعمال کے کام نہیں دیتا۔ پہلی آیت میں جس عذاب کا ذکر تھا اس کی یہاں زیادہ صراحت کر دی ہے اور یہ سب تکذیب کرنے والوں کے لیے ہے اور یہی اشارہ فانتظروا میں ہے۔

ع۱۰۴۱ شیعا۔ شیاع کے معنی انتشار اور تقویت ہیں اسی سے خبر کا شائع ہونا ہے اور شِیْعَۃ وہ ہیں جن سے انسان قوت پکڑتا اور جس سے وہ پھیلتے ہیں (غ) اور ہر ایک قوم جو ایک امر پر جمع ہو۔ وہ ایک شِیْعَۃ ہیں اور ازہری کہتے ہیں وہ بعض بعض کی اتباع کرتے ہیں اور وہ سب متفق نہیں ہوتے اور یہاں مراد ایسے ہی فرقے ہیں جو ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں (ل)

اس سے مراد عموماً یہود و نصارٰی لیے گئے ہیں مگر ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد اس اُمت کے اہل بدعت ہیں اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اوپر ایمان میں نیکی نہ کمانے والوں کا ذکر تھا۔ اس لیے ساتھ ہی ایسے لوگوں کا بھی ذکر کر دیا۔

ع۱۰۴۲ نیکی اور بدی کی جزا و سزا کا جو قانون یہاں بیان کیا ہے وہ دوسرے مقامات کے خلاف نہیں، ہر نیکی کا بدلہ ملتا ہے اور وہ دس گنا ہے یا اس سے بھی زیادہ ہر بدی کا بدلہ ملتا ہے اور وہ اس بدی کی مثل ہوتا ہے یا اس سے بھی کم یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے بالکل معاف ہی کر دے۔

مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٦١﴾

دی ہے۔ دین صحیح ابراہیم راست رو کے مذہب (کی طرف) اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٢﴾

کہہ، میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا، اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے ۱۰۴۳

لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٦٣﴾

اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں —

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۭ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٦٤﴾

کہہ، کیا میں اللہ کے سوائے کوئی رب چاہوں اور وہ ہر چیز کا رب ہے اور کوئی جی (بدی) نہیں کماتا مگر اس کا وبال اسی پر ہے۔ اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا، پھر تمہارے رب کی طرف تمہارا لوٹ کر آنا ہے پھر وہ تم کو اس کی خبر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے ۱۰۴۴

۱۰۴۳ آنحضرت صلعم کے اوّل المسلمین ہونے کی دلیل: اس آیت میں عملی رنگ میں کمال توحید کو بیان کیا ہے۔ موحد انسان اپنے کمال کو اس وقت پہنچتا ہے جب اس کا ہر فعل خیر عبادت کے رنگ میں ہو یا قربانی کے رنگ میں جب اس کا جینا مرنا اپنے لیے نہ ہو بلکہ صرف اپنے مولا کے لیے ہو رب العالمین کے لیے ہونے میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ عالمین کی ربوبیت میں لگ جاتا ہے اسی طرح موحد کامل بھی عالمین کی ربوبیت میں لگ جاتا ہے۔ پس توحید کا عملی رنگ مخلوق خدا کی ربوبیت ہے اور سب سے بڑی ربوبیت افضل المخلوقات انسان کی ربوبیت روحانی ہے جو انبیاء کے سپرد کی جاتی ہے اور اس ربوبیت روحانی کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہمارے نبی کریم صلعم کو حاصل ہوا کیونکہ جس قدر اصلاح نسل انسانی کی آپ نے کی وہ کسی نبی کے حصہ میں نہیں آئی۔ اس لیے آپ اوّل المسلمین کل مخلوقات میں سے ٹھہرے۔

چونکہ اس سورت میں اصل بحث توحید الٰہی پر تھی اس لیے اس کا خاتمہ اس پر کیا کہ محمد رسول اللہ صلعم توحید کے کس مقام کامل پر ہیں اور کہ توحید کا کمال عملی رنگ میں مخلوق خدا کی بھلائی میں لگ جانا ہے۔

ہر مسلم کا نصب العین: اسی طرح اگر غور کیا جائے تو جس قدر انسان کا فعل اغراض نفسانی سے دور ہوتا ہے اسی قدر اس کا پایہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ ایک انسان اپنی ذات کے لیے کچھ کرتا ہے۔ دوسرا اپنے عیال کے لیے۔ تیسرا اپنی قوم کے لیے۔ چوتھا اپنے ملک کے لیے، یہ سب تدریجاً ترقی ہے۔ لیکن سب سے بلند پایہ اس انسان کا ہے جو مخلوق خدا کے لیے کچھ کرتا ہے اس اور اس سے اگلی آیت میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی توحید کامل کے عملی نمونہ کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ یوں پیش کرنے میں اصل غرض یہ ہے کہ ہر مسلمان کا نصب العین یہی ہو کہ اپنے آپ کو اس مقام عالی پر پہنچائے۔ یہی وجہ ہے کہ قبل از فاتحہ جو دعا سکھائی گئی اس میں یہی لفظ آتے ہیں اِنَّ صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ ربّ العٰلمین لا شریک له وبذٰلك امرت وانا من المسلمین۔ جہاں صرف لفظ اوّل المسلمین کی جگہ جو آنحضرت صلعم کے لیے خاص ہے عام مسلمانوں کو من المسلمین کہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس دعا کے سکھانے میں غرض یہی ہے کہ ہر مسلمان توحید کامل کے اس عملی مقام پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

۱۰۴۴ وازرۃ۔ وَزَر۔ پہاڑ میں جائے پناہ کو کہا جاتا ہے کلا لا وزر (القیٰمۃ ۷۵۔ ۱۱) اور وِزر کے اصل معنی بوجھ ہیں (رغ) اور امام راغبؒ نے لیحملوا اوزارھم کاملۃ یوم القیامۃ (النحل ۱۶۔ ۲۵) کی تشریح میں لکھا ہے کہ یہ اس کی مثل ہے جو فرمایا ولیحملن اثقالھم واثقالا مع اثقالھم (العنکبوت ۲۹۔ ۱۳) اور مطلب اس کا اس حدیث کے مطابق ہے مَنْ سَنَّ سُنَّۃً سیئۃ کان لہ وزرھا ووزر من عمل بھا یعنی وہ ایک بُرے رستہ پڑ ڈالنے کا بوجھ بھی اُٹھائیگا۔

یہ نہر قانون توحید کا ضروری تتمہ تھا۔ ہر ایک انسان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔ ایک کی ذمہ داری دوسرا نہیں لے سکتا۔ یہی اسلام کا اصل الاصول ہے اور کفارہ کے عقیدہ پر یہ ایسا سخت حربہ ہے جس کا جواب عیسائیوں کے پاس نہیں۔ ایک عجیب جواب البتہ انہوں نے تراشا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ایک گنہگار دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا بیگناہ دوسرے کا گناہ اُٹھا سکتا ہے یہ منطق تثلیث کی منطق سے کم نہیں۔ جو شخص دوسرے کا بوجھ یا گناہ اُٹھائے گا وہی وازرۃ بن جائے گا۔ یہ بھی عجیب بوجھ اٹھانا ہے کہ دوسرے کا بوجھ بھی لے لیا اور پھر بھی بوجھ کوئی نہیں قرآن کریم کی یہ تعلیم کہ بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا اس کے خلاف نہیں جو فرمایا کہ وہ یعنی سردار یا پیشوا دوسروں کے بوجھ بھی اٹھائیں گے جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے کیونکہ وہاں مراد یہ ہے کہ ایک طریق بد قائم کرنے کا بوجھ ان کے سر پر ہوگا مگر یہ نہیں کہ اس طریق بد پر جو لوگ چلے ہیں وہ اس وجہ سے اس بدی کے بوجھ سے بچ جائیں گے۔ بدی کرنے کا بوجھ وہ خود ہی اُٹھائیں گے۔ بدراہ بتانے کا بوجھ بدی کرنے سے مزید شے ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۗ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾

اور وہی ہے جس نے تم کو زمین کا حاکم بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کیا۔ تاکہ تم کو اس کے بارے میں آزمائے جو تم کو دیا ہے تیرا رب جلدی بدی کی سزا دینے والا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۱۰۴۵

۱۰۴۵ مسلمانوں کی حکومت کمال روحانی کا نتیجہ تھی۔ سورت کا خاتمہ اس پر کیا کہ اللہ تعالیٰ تم کو زمین کا حاکم بناتا ہے جب انسان عملی رنگ میں توحید کے کمال پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اس بات کا اہل ہو جاتا ہے کہ مخلوق خدا پر حکمران ہو۔ جس کے مدنظر سوائے دوسروں کی بہتری کے کچھ نہیں اسی کو حکومت شایاں ہے۔ مگر وہ حکومت بھی آزمائش ہوتی ہے جب تک اس کی اہلیت رہتی ہے اسے باقی رکھا جاتا ہے۔ یہی حالت فی الواقع تاریخ اسلام میں نظر آتی ہے۔ گویا یہ آیت تاریخ اسلام کا ایک نہایت ہی مختصر مرقع ہے۔ مسلمانوں کو بادشاہت ان کی قوت اور ان کے سامان حرب کی وجہ سے نہیں ملی بلکہ اس وجہ سے کہ وہ مخلوق خدا کے خیر خواہ تھے جب وہ توحید کامل کے مقام پر کھڑے ہوئے اور سب قوموں سے یکساں سلوک کرنے والے ہوئے اور ان کی زندگیوں کی غرض انسان کی خدمت ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کے بادشاہ بنا دیا۔ یہ وہ بات ہے جس کا اعتراف خود عیسائیوں نے کیا ہے اور جب اس مقام عالی سے گر گئے اور خواہشات کے بندے بن گئے تو حکومت بھی ان سے لے لی گئی پھر دوسری قوم کھڑی کر دی جاتی ہے۔ بدی کی سزا بھی ملتی ہے مگر غفر و رحم کی صفت سب پر فائق ہے۔

آیاتہا ۲۰۶ (۷) سُورَۃُ الْاَعْرَافِ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتہا ۲۴

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓصٓ ۱ مَیں اللہ بہت جاننے والا بہترین فیصلہ کرنے والا ہوں ح۱۰۴۶

نام: اس سورت کا نام الاعراف ہے اور اس میں چوبیس رکوع اور دو سو چھ آیتیں ہیں۔ الاعراف کے معنی بلند مکان ہیں اور اس سورت کے پانچویں اور چھٹے رکوع میں کچھ لوگوں کا ذکر ہے جو اعراف پر ہوں گے اور یہ لوگ جیسا کہ ح۱۰۸۶ میں دکھایا گیا ہے، انبیاء کا گروہ ہے اور چونکہ اس سورت میں ضرورتِ نبوت پر بحث ہے اس لیے اس کے نام میں انبیاء کے مقام بلند کی طرف توجہ دلائی ہے۔

خلاصۂ مضمون: جس طرح پچھلی سورت میں توحید پر بحث تھی اس سورت میں نبوت پر بحث ہے۔ اسی اصل مضمون کے مطابق اس کی ابتدا اس بات سے کی ہے کہ نزولِ کتاب اللہ کی غرض کیا ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے یہ پہلے رکوع کا مضمون ہے۔ دوسرے رکوع میں حضرت آدمؑ کا ذکر کرکے ضرورتِ نبوت کو بتایا ہے۔ تیسرے میں بتایا ہے کہ وحی الٰہی ہی انسان کو شیطان کے حملوں سے محفوظ کر سکتی ہے۔ چوتھے میں وحی الٰہی کے ردّ کرنے والوں کا انجام بتایا ہے اور پانچویں میں قبول کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اسی رکوع کے آخر پر اور چھٹے رکوع کے شروع میں اعراف والوں کا ذکر ہے یعنی خود انبیاء علیہم السلام کے مقام بلند کا اور بقیہ رکوع ششم میں قبول کرنے والوں اور ردّ کرنے والوں کا مقابلہ ہے۔ ساتویں رکوع میں عالم جسمانی کی مثالیں دیکر حق کی تدریجی ترقی اور آخری کامیابی کی خوش خبری سنائی۔ آٹھویں میں حضرت نوحؑ کا، نویں میں حضرت ہودؑ کا، دسویں میں حضرت صالحؑ اور لوطؑ کا گیارھویں میں حضرت شعیبؑ کا ذکر کرکے سمجھایا کہ کس طرح حق کی مخالفت کرنے والے آخر کار ناکام ہوتے رہے اور بارھویں میں سزا کا عام قانون بیان فرما کر مخالفین قرآن کو تنبیہ کی اور پھر تیرھویں رکوع سے لیکر اکیسویں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مفصل ذکر کیا۔ چنانچہ تیرھویں میں حضرت موسیٰؑ کی بعثت کا ذکر کیا۔ چودھویں میں ساحروں کے آپ سے مقابلہ کا۔ پندرھویں میں بنی اسرائیل کی تکالیف کا ذکر کرکے ان کا علاج بتایا اور یوں مسلمانوں کو سمجھایا کہ ایسی ہی تکالیف اُن پر آئیں تو وہ بھی یہی طریق اختیار کریں۔ سولھویں میں فرعونیوں پر وباؤں کے آنے اور بنی اسرائیل کی نجات کا ذکر کیا۔ سترھویں میں حضرت موسیٰؑ کو شریعت ملنے کا۔ اٹھارھویں میں بچھڑے کی عبادت کا، انیسویں میں حضرت موسیٰ کی قوم کی بے اعتدالیوں کا ذکر کرتے ہوئے اصل غرض کی طرف توجہ دلائی ہے جس کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کا اتنا لمبا ذکر کیا۔ یعنی موسیٰؑ کا آنحضرتؐ کی نسبت پیشگوئی کرنا اور ان پیشگوئیوں کا توریت میں موجود ہونا۔ بیسویں میں آنحضرت صلعم کی رسالت عامہ کے ذکر کے بعد پھر قوم موسیٰ کے ذکر کی طرف رجوع کیا اور اکیسویں میں یہود کی خلاف ورزئ میثاق اور ان کی سزا کا ذکر کیا۔ بائیسویں رکوع میں میثاقِ شریعت سے میثاقِ فطرت کی طرف رجوع کیا۔ کیونکہ میثاقِ شریعت میثاقِ فطرت کو ہی قوت دینے کے لیے آتی ہے اور ہر انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر گواہ ہے اور اسی کی طرف انبیاء بلاتے ہیں۔ تیئیسویں رکوع میں آنحضرت صلعم اور اسلام کے اعدا کے انجام کا ذکر کیا کہ کس طرح ان پر سزا تدریجاً اور آہستگی سے وارد کی جائے گی۔ چوبیسویں اور آخری رکوع میں بتایا کہ اس مخالفت میں خود مسلمانوں کو کیا راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ یہ سورت کل کی کل نبوت پر ہے۔

بلحاظ مضمون الانعام اور الاعراف کا تعلق ظاہر ہے۔ الانعام کا مضمون توحید ہے اور الاعراف کا نبوت اور توحید کے بعد نبوت کا ذکر لازم تھا۔ مذہب کی یہی دو عظیم الشان بنیادیں ہیں اور یہ بھی ضروری تھا کہ توحید کے ذکر کے بعد نبوت کا ذکر آتا، اس لیے الانعام گو اس قدر لمبی نہیں مگر اسے الاعراف سے پہلے رکھا گیا۔ کیونکہ ترتیب مضمون کا تقاضا یہی تھا اور الانعام کے آخری حصّہ کو دیکھا جائے تو وہاں بھی نہایت صفائی سے توحید سے نبوت کی طرف مضمون کا رُخ بدل دیا ہے۔ جہاں آنحضرت صلعم کی توحید کے مقام بلند کو پیش کیا ہے قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین صرف یہ کہدینا کہ خدا ایک ہے انسان کو فائدہ نہیں دے سکتا جب تک کہ اس کی تمام حرکات و سکنات توحید باری کے رنگ میں رنگین نہ ہو جائیں اور یہ مقام بدون نبوت حاصل نہیں ہو سکتا۔ نظارۂ قدرت سے جس توحید پر انسان پہنچ سکتا ہے وہ محض ایک خشک عقیدہ ہے۔ مگر نبوت جس توحید پر لا کر کھڑا کرتی ہے وہ ایک باردار درخت ہے یوں توحید سے نبوت کی طرف مضمون کا انتقال سورۃ الانعام کے آخر میں کرکے سورۃ اعراف کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔

زمانۂ نزول: اس سورت اور سورۂ انعام کے نزول کا وقت قریباً ایک ہی ہے اور یہ دونوں سورتیں مکّی زمانہ کے آخر کی ہیں جب مخالفت کمال کو پہنچ چکی تھی۔ خاص خاص آیات اس سورت کی جن کو محض کی بنا پر مدنی کہا گیا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا تعلق سورت کے اصل مضمون سے اس قسم کا ہے کہ وہ علیحدہ زمانہ کی نہیں ہو سکتیں۔ عیسائی مورخین نے یہ کوشش کی ہے کہ آیت ۱۵۷ و ۱۵۸ کو جن میں آنحضرت صلعم کے متعلق پیشگوئیوں کا ذکر ہے جو توریت و انجیل میں ہیں مدنی قرار دیں کیونکہ ان میں توریت و انجیل کا نام آتا ہے مگر اس سے بڑھ کر بودی دلیل کوئی نہیں اور آیت ۱۵۶ جس میں قوم موسیٰ کا ذکر ہے اس کا تعلق ۱۵۷ سے جس میں نبی اُمّی کا ذکر ہے ایسا گہرا ہے کہ یہ دونوں آیتیں بلحاظ مضمون صاف طور پر ایک ہی وقت کی نظر آتی ہیں۔

ح۱۰۴۶ الٓمٓ کے ساتھ ص بڑھایا ہے جو صادق کے قائم مقام ہے جیسا کہ ضحاک سے روایت ہے (د) یا افصل سے یعنی بہترین فیصلہ کرنے والا، جیسا کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے (ج) نیز دیکھو ح۶۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ
حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝٢
اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا
تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝٣
وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا
بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝٤
فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ
اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝٥
فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ
لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٦
فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝٧
وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ
مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٨

یہ کتاب ہے تیری طرف نازل کی گئی پس تیرے سینے میں اس کی وجہ
سے کوئی تنگی نہ رہے کہ تو اس کے ساتھ ڈرائے اور مومنوں کے لیے نصیحت ہو ۱۰۴۷
اس کی پیروی کرو جو تمھارے رب سے تمھاری طرف اتارا گیا۔ اور اس کو
چھوڑ کر اور دوستوں کی پیروی نہ کرو بہت ہی کم تم نصیحت قبول کرتے ہو۔
اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں، سو ہمارا عذاب ان پر رات کو آیا
یا دوپہر کو سوتے ہوئے ۱۰۴۸
سو اُن کی پکار جب ہمارا عذاب اُن پر آیا سوائے اس کے
کچھ نہ تھی کہ انھوں نے کہا بیشک ہم ظالم تھے۔
سو یقیناً ہم ان سے پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور
یقیناً ہم رسولوں سے بھی پوچھیں گے ۱۰۴۹
پھر ہم ان پر علم کے ساتھ بیان کرینگے اور ہم کبھی غیر حاضر نہیں ہوتے۔
اور وزن اس دن حق ہے — سو جس کی نیکیاں بھاری ہوگئیں تو
وہی کامیاب ہونے والے ہیں ۱۰۵۰

ع ۱۰۴۷ ذکریٰ۔ ذِکْریٰ ذکر سے زیادہ بلیغ ہے اور اس کے معنی کثرت ذکر ہیں اور ذِکْر کسی شے کا قلب میں حاضر کرنا ہے (غ) قرآن شریف کا نام ذِکْر یا ذِکْریٰ یا تَذْکِرَۃ اس لحاظ سے ہے کہ وہ ان باتوں کو یاد دلاتا ہے جو فطرت انسانی میں ہیں مگر غفلت کی وجہ سے دبی رہتی ہیں وحی الٰہی ان کو یاد دلا کر انسان کو فطرت کے صحیح قوانین پر چلاتی ہے یا چونکہ ذکر کے معنی شرف ہیں (ل)، اس لیے قرآن کریم کا نام ذکر ہے کہ یہ انسان کو بلند مقام پر پہنچاتا ہے۔

فلا یکن فی صدرك حرج منه جملہ معترضہ کے طور پر ہے اور اصل غرض نزول کتاب کی بتائی کہ تو اس کے ساتھ ڈرائے اور مومنوں کے لیے وہ نصیحت ہو اور یہ جو فرمایا کہ تیرے سینہ میں تنگی نہ ہو تو یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس کتاب کے نزول نے پیغمبر خدا کو شرح صدر عطا کر دی تھی۔ جیسا کہ فرمایا الم نشرح لك صدرك (الم نشرح ۹۴ - ۱) پس نزول کتاب کا فائدہ تو یہ بتایا کہ مصلح کے سینہ میں تنگی نہ رہے کیونکہ اصلاح میں جو جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ ایک آدمی کے گھبرا جانے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ لیکن جب ایک شخص کو خدا ایک کام پر کھڑا کرتا ہے تو اسے وسعت اخلاق، کامیابی پر ایمان اور دیگر ان صفات سے متصف فرماتا ہے جن کے بغیر اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ سو اس جملہ معترضہ میں بھی ایک ضرورت نزول وحی کو ہی ظاہر کیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ان مشکلات کی طرف بھی اشارہ ہو، جو اس سورت کے نزول کے وقت آنحضرت صلعم کو پیش آ رہی تھیں کہ آپ کی دس بارہ سال کی کوششوں کے باوجود مخالفت بڑھ رہی تھی۔ تو گویا یوں فرمایا کہ مشکلات تو بیشک بہت ہیں مگر چونکہ کتاب خدائے علیم و صادق الوعد کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس لیے ان مشکلات کے سبب کوئی گھبراہٹ تمھارے سینہ میں نہ آئے۔

نزول کتاب کی اصل غرض دو لفظوں میں بتائی ہے۔ بدی کے انجام بد سے ڈرانا اور بتا دینا کہ بدی کا انجام نیک کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور دوسرا مومنوں کے لیے ذِکْر یا ذِکْریٰ یعنی ان کے لیے موجب شرف اور بلندئ مرتبہ ہے یا ان کو فطرت کے صحیح قوانین پر چلانا ہے اس لیے یہاں بشارت کی بجائے ذِکْریٰ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

چونکہ اس سورت میں اصل نبوت کی بحث ہے جیسا کہ پچھلی میں اصل توحید کی بحث تھی اس لیے اس کی ابتدا اس کلام سے نہایت موزوں ہے۔

ع ۱۰۴۸ بیاتا۔ بَیْت سے مصدر ہے اور اس کے اصل معنی قَصْد العدو لیلاً ہیں یعنی رات کے وقت دشمن کا قصد کرنا (غ)۔

قائلون۔ قال۔ یقیل سے ہے۔ دوپہر کے وقت آرام کرنے کو کہتے ہیں (غ)

ع ۱۰۴۹ کیا سوال ہوگا جن کی طرف رسول بھیجے گئے ان سے سوال ہوگا الم یاتکم نذیر (الملک ۶۷ - ۸) الم یاتکم رسل منکم (الانعام ۶ - ۱۳۱) کیا تمھارے پاس رسول نہ آئے تھے اور رسولوں سے سوال ہے ماذا اجبتم (المائدۃ ۵ - ۱۰۹) تمھاری قبولیت کیسی ہوئی۔

ع ۱۰۵۰ الوزن۔ اصل میں کسی شے کے اندازہ کے پہچاننے کو کہتے ہیں۔ راغبؒ کہتے ہیں کہ عام طور پر وزن وہ سمجھا جاتا ہے جو ترازو کے ساتھ ہو بلکہ حدیث میں بھی ترازو کا ذکر ہے، اور قرآن شریف میں ہے واقیموا الوزن بالقسط (الرحمٰن ۵۵ - ۹) اور وزنوا بالقسطاس المستقیم (بنی اسرائیل ۱۷ - ۳۵) اور یہاں مراد تمام افعال و اقوال انسانی

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝٩

اور جس کی نیکیاں ہلکی ہوگئیں تو وہی ہیں جنھوں نے اپنا نقصان کیا، اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کے بارے میں ناانصافی کرتے تھے —

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ
فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝١٠ ع ۱ / ۸

اور یقیناً ہم نے زمین میں تمھارا ٹھکانا بنایا اور تمھارے لیے اس کے اندر روزی کے سامان رکھے، بہت کم تم شکر کرتے ہو۔ ۱۰۵۱

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ڰ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ
اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝١١

اور یقیناً ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمھاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو، سو انھوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے (نہ کی)، وہ فرمانبرداروں میں سے نہ ہوا۔ ۱۰۵۲

میں عدل و انصاف کا ملحوظ رکھنا ہے اور ایسا ہی وانبتنا فیھا من کل شئ موزون (الحجر ۱۵-۱۹) جہاں مراد ہے کہ جو کچھ پیدا کیا اعتدال کی حالت میں پیدا کیا جیسا کہ فرمایا انا کل شئ خلقناہ بقدر (القمر ۵۴-۴۹) اس سے وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ الوزن یومئذن الحق (الاعراف ۷-۸) میں اشارہ محاسبہ میں عدل کی طرف ہے (غ) اور مجاہد کا قول ہے کہ وزن سے مراد یہاں قضاء یعنی فیصلہ ہے (ج)

وزن اعمال سے مراد: اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ میزان کا لفظ قرآن میں وسیع معنی میں آیا ہے۔ ایک جگہ رسولوں کے بھیجنے کے ذکر میں آتا ہے وانزلنا معھم الکتاب والمیزان ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری جس سے مراد کسی صورت میں ترازو نہیں اور نہ کسی مفسر نے ایسا کہا ہے۔ ایسا ہی والسماء رفعھا ووضع المیزان میں میزان کے رکھنے سے مراد کسی ترازو کا رکھنا نہیں بلکہ مراد عدل کا قائم کرنا ہے جس پر سارے آسمانوں اور زمین کا بھی مدار ہے۔ اور حق یہ ہے کہ احادیث میں بھی جس ترازو کا ذکر ہے اس سے مراد بھی محض اس قسم کا ترازو لینا جس سے اجسام کو وزن کیا جاتا ہے صحیح نہیں۔ اس ترازو کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اس دنیا کی چیزوں پر اس کا قیاس نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اگر کہیں اعمال کے وزن کا ذکر ہے تو کہیں کتب اعمال کا اور کہیں صاحب اعمال کا اور ایک قوم کے اعمال دنیوی کا ذکر کر کے جو قیامت میں کسی کام نہ آئیں گے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا (الکھف ۱۸-۱۰۵) ان کے لیے ہم قیامت میں کوئی وزن قائم نہیں کریں گے یعنی قیامت کے دن ان کے دنیوی صنعتوں پر زور لگا دینے کو کوئی وزن نہیں دیا جائے گا۔

موازین۔ موزون کی جمع بھی ہو سکتی ہے اور میزان کی بھی۔ پہلی صورت میں مراد اعمال موزونہ ہیں یعنی نیکیاں اور میزان یا میزانوں کا بوجھل یا ہلکا ہونے سے بھی مراد یہی لی گئی ہے کہ نیکیوں کا پلڑا بوجھل یا ہلکا ہو جائے جس میں علاوہ اس دقت کے کہ میزانیں بہت سی ہوئیں بہت کچھ محذوف ماننا پڑتا ہے۔ اس لیے صحیح یہی ہے کہ یہ موزون کی جمع ہے اور مجاہد سے موازین کے معنی حسنات یعنی نیکیاں ہی مروی ہیں۔

اعمال کا وزن یعنی ہر ایک عمل کا حساب میں آنا ایک ایسا امر ہے جس کی طرف صرف وحی الٰہی نے ہی ہدایت کی ہے۔ اس لیے قرآن کریم کے نزول کی اغراض کو بیان کرتے ہوئے وزن اعمال کا ذکر کیا ہے انسان کا کمال اسی پر منحصر ہے کہ جو اعمال اس کی فطرت کو صحیح راہ پر چلانے والے ہیں ان کو کرے اور جن سے فطرت انسانی کو نقصان پہنچتا ہے ان سے بچے۔ اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ جن کے وہ اعمال جو وزن میں آتے ہیں ہلکے رہے انہوں نے اپنی فطرت کو خسارہ میں رکھا۔

ع ۱۰۵۱ معایش۔ مَعِیشَۃ کی جمع ہے۔ یعنی عیش یا روزی کے سامان لفظ عیش حیوان کی زندگی سے مخصوص ہے یعنی ایسی زندگی سے جس سے جسمانیت کا جزو غیر منفک ہے اور حیٰوۃ کا لفظ وسیع ہے اللہ تعالیٰ اور ملک پر بھی بولا جاتا ہے (غ) قرآن شریف میں معیشۃ ضنکا (طٰہٰ ۲۰-۱۲۴) میں اور عیشۃ راضیۃ (القارعۃ ۱۰۱-۷) میں روحانی زندگی پر بھی لفظ عیش بولا گیا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا کہ جب تمھارے جسم کے لیے ہم نے زمین کے اندر ہر قسم کے سامان پیدا کر رکھے ہیں تو جو حصہ تم میں حیوانیت سے بالاتر ہے یعنی ملکیت کا حصہ یا تمھاری روحانیت کیا اس کے لیے کوئی سامان خدا تعالیٰ پیدا نہ کرتا۔ یوں اس آخری آیت میں ضرورت وحی کو بیان کرتے ہوئے اگلے رکوع کے ساتھ اس کا ربط کر دیا ہے۔

ع ۱۰۵۲ اس رکوع میں ضرورت نبوت بتائی ہے اور آدم کا ذکر کیا ہے جو سورۂ بقرہ میں مفصل گزر چکا ہے۔ مگر یہاں اس ذکر کے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو بالکل نئے ہیں۔

آدم اور ابن آدم کا معاملہ ایک ہے: سب سے پہلے یہاں یہ غور طلب ہے کہ اوپر کی آیت میں سارے انسانوں کو خطاب تھا اس عام خطاب کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تم سب کو پیدا کیا پھر تم سب کی صورت بنائی پھر فرشتوں کو آدم کی فرمانبرداری کے لیے کہا جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس رنگ میں ہر ایک ابن آدم آدم ہے اور فرشتوں سے آدم کی فرمانبرداری کرانے میں ابنائے آدم کا بھی ذکر ہے۔ اور فی الحقیقت غور کیا جائے تو اگر وہ واقعات ہمکو پیش نہیں آتے جو آدم کو پیش آئے تھے تو اس قصہ کا قرآن میں رکھنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے غرض تو ہماری تعلیم ہے پس آدم کے تذکرہ میں ہم کو سمجھایا ہے اور ابن آدم ہونے کی وجہ سے جو کچھ آدم کو پیش آیا وہی ابن آدم کو پیش آتا ہے ہاں جس طرح ابن آدم شیطان کو جسمانی رنگ میں نہیں دیکھتا بلکہ شیطان صرف وسوسہ اندازی کرتا ہے اسی طرح آدم کی صورت میں سمجھنا چاہیئے باقی امور کے لیے دیکھو ع ۵۲ و ع ۵۲ الف و ع ۵۳۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۖ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ﴿١٢﴾

(اللہ نے) کہا، تجھے کس چیز نے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے تجھے حکم دیا ۱۰۵۳ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا ۱۰۵۴

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَن تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ﴿١٣﴾

کہا، پھر اس حالت سے اُتر جا، تیرے لیے یہ شایاں نہیں تو اس پر تکبر کرے سو نکل جا، تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے ۱۰۵۵

قَالَ أَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٤﴾

کہا، مجھے اس دن تک مہلت دے جو وہ اُٹھائے جائیں ۱۰۵۶

ع ۱۰۵۳ بظاہر جہاں جہاں سجدے کا حکم آتا ہے ملائکہ کو آتا ہے۔ لیکن یہاں اذ امرتک سے معلوم ہوا کہ شیطان کو بھی حکم تھا۔ ملائکہ چونکہ اعلیٰ ہستیاں ہیں اس لیے ان کو حکم دینے میں جن یا شیاطین جو ادنیٰ ہستیاں ہیں وہ بھی شامل ہو گئیں۔

ع ۱۰۵۴ جنوں کا آگ سے اور انسان کا مٹی سے پیدا ہونا: سورۂ بقرہ میں فرمایا تھا کہ اس نے انکار اور تکبر کیا۔ یہاں اس کی تشریح کی ہے وہ اپنے آپ کو آدم سے افضل قرار دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ آدم کی پیدائش مٹی سے ہے اور میری پیدائش آگ سے ہے۔ دوسری جگہ عام طور پر جنات کے متعلق ہے والجان خلقنٰہ من قبل من نار السموم (الحجر ۱۵: ۲۷) جنوں کو ہم نے پہلے نار سموم سے پیدا کیا۔ یہ زمین بھی پہلے خود ایک شعلۂ نار تھی اس لیے پہلی مخلوق کا اسی رنگ کا ہونا عین قرین قیاس ہے اور آگ سے ہونے کی وجہ سے ہی وہ غیر مرئی ہستیاں بھی ہیں یعنی ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن اس سے علاوہ آگ یا مٹی سے پیدا ہونا یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ وہی صفت ان میں غالب ہو جیسے انسان کے متعلق فرمایا خلق الانسان من عجل (الانبیاء ۲۱: ۳۷) انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی اس میں جلد بازی ہے۔ یا فرمایا خلقکم من ضعف (الروم ۳۰: ۵۴) اب طین یا مٹی کی صفت نرمی ہے چنانچہ عرب کہتے ہیں مررت بصحیفۃ طین خاتمھا جس کے معنی کیے ہیں لین خاتمھا یعنی طین سے مراد نرمی ہے (ل) اور قرآن مجید میں دوسری جگہ دوسری ترکیب اختیار کی ہے ءاسجد لمن خلقت طینا (بنی اسرائیل ۱۷: ۶۱) ای خلقتہ فی حال طینتہ (ل) اور آگ کی صفت تیزی ہے اور حدیث میں ہے اتقوا الغضب فانہ جمرۃ توقد فی قلب ابن آدم غضب سے بچو وہ ایک انگارا ہے جو ابن آدم کے قلب میں جلایا جاتا ہے۔ پس شیطان کہتا ہے کہ میں ناری صفت ہو کر کس طرح طینی صفت انسان کے سامنے جھک سکتا ہوں۔

ع ۱۰۵۵ الصاغرین۔ صِغر کی ضد کبر ہے اور چھوٹا یا بڑا ہونا بلحاظ عمر بھی ہوتا ہے اور بلحاظ جسم بھی اور بلحاظ قدر و منزلت بھی اور صاغر وہ ہے جو ذلیل مرتبہ پر راضی ہو جائے (غ)

شیطان کے ہبوط سے مراد: منھا میں ضمیر کس طرف جاتی ہے یعنی کس سے نکل جا۔ مفسرین میں سے کسی نے سماء کہا ہے کسی نے زمرہ ملائکہ، مگر یہ دونوں باتیں نہ سند رکھتی ہیں نہ قیاس صحیح پر چاہتا ہے۔ سماء کا تو اوپر ذکر نہیں اور نہ یہ ہبوط مکانی تھا۔ ملائکہ کا ذکر اوپر ہے مگر دور، اور شیطان ملائکہ میں سے نہ تھا جس پر کان من الجن (الکہف ۱۸: ۵۰) نص صریح ہے۔ قریب تر ذکر اس کا اپنی فضیلت کو پیش کرنا ہے اور اسی سے ہبوط کا حکم ہے اس نے کہا تھا انا خیر منہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس حالت سے نکل جا اور اگلے الفاظ خود اس معنی کے موید ہیں۔ کیونکہ فرمایا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ خیر ہونا اور تکبر ایک جگہ جمع ہو سکیں۔ بلکہ متکبر ذلیل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں بھی ہے من تواضع للہ رفعہ اللہ و من تکبر وضعہ اللہ یعنی جو شخص اللہ کے لیے جھکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا رفع کرتا ہے اور جو تکبر کرتا ہے اللہ اسے ذلیل کرتا ہے۔ اصل سبق انسان کے لیے ہے کہ تکبر کا نتیجہ ذلت ہے جتنا انسان دوسروں سے اپنی بڑائی جتاتا ہے اسی قدر ان کی نظر میں ذلیل ہوتا ہے۔

ع ۱۰۵۶ یوم یبعثون سے کیا مراد ہے۔ اگر قیامت کا دن مراد لیا جائے جو مردوں کے جی اُٹھنے کا وقت ہے تو بھی کوئی ہرج نہیں کیونکہ جب تک یہ عالم موجود ہے اس وقت تک انسان کے ساتھ خواہشات سفلی اور ان خواہشات کے ساتھ شیطان کا رہنا ضروری ہے مگر بعث کا لفظ وسیع معنی میں آتا ہے۔ والبعث یکون بعثا للقوم الی وجہ من الوجوہ (ل) وتاویل البعث ازالۃ ما کان یحبسہ من التصرف (ل) یعنی جو چیز کسی امر میں تصرف سے روکتی ہو اس کا دور کر دینا بھی بعث ہے۔ پس یوم یبعثون سے مراد ہر انسان کی بعثت روحانی کا وقت بھی ہو سکتا ہے یعنی وہ وقت جب شیطان پر انسان کو پورا تصرف حاصل ہو جاتا ہے۔

شیطان کے مہلت مانگنے سے مراد: جیسا کہ ع ۴۵ میں دکھایا گیا ہے یہ کوئی واقعی مکالمہ نہیں۔ شیطان جو رحمت الٰہی سے دُور پڑا ہوا ہے اس کو مکالمہ سے کیا حصہ، صرف ایک حالت کا اظہار ہے۔ اور چونکہ مسلم کی حدیث سے ثابت ہے کہ ہر انسان کے لیے ایک الگ ملک یعنی فرشتہ اور ایک شیطان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا۔ پس یوم یبعثون میں اگر ایک طرف ذریت آدم کی طرف اشارہ ہے تو دوسری طرف ذریت ابلیس کی طرف بھی اشارہ ہے۔ کیونکہ ہر انسان کو بدی کی تحریک کرنے والا وہی شیطان ہے جو اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ پس شیطان نے جو مہلت مانگی ہے وہ اپنی ذریت کے لیے مانگی ہے۔ جس طرح آدم کے ذکر میں ابن آدم شامل ہے، شیطان کے ذکر میں ذریت شیطان شامل ہے۔ اس آیت میں اور اس سے اگلی آیات میں سب کو شامل کر لینا حالانکہ آدم کا ذکر شروع تھا صاف بتاتا ہے کہ اصل میں ذکر آدم میں بنی آدم کا ذکر ہی مقصود ہے۔

قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ⑮

کہا، تو ان میں سے ہے جن کو مہلت دی گئی ۱۰۵۷؎

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑯

کہا اس لیے کہ تو نے مجھے گمراہ ٹھیرایا میں ضرور تیری سیدھی راہ پر اُن کے لیے گھات میں بیٹھوں گا ۱۰۵۸؎

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ
خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ
وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ⑰

پھر میں ضرور ان کے سامنے سے اور اُن کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے اُن پر آؤں گا - اور تو اُن میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا ۱۰۵۹؎

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ
لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ
مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ⑱

کہا، اس (حالت) سے اُتر جا ذلیل دھتکارا ہوا ۱۰۶۰؎ جو کوئی ان میں سے تیری پیروی کرے گا، یقیناً میں تم سب سے جہنم کو بھروں گا ۱۰۶۰؎

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ
فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ⑲

اور اے آدم، تو اور تیری بیوی باغ میں رہو - پھر جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ، ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا

پھر شیطان نے اُن دونوں کو وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے لیے

۱۰۵۷؎ انك من المنظرین - ترکیب صاف بتاتی ہے کہ یہ تو پہلے سے ہی فیصلہ شدہ امر ہے۔ یہ نہیں کہ شیطان کی درخواست منظور ہوئی ہے۔ جب انسان کی اس زمینی زندگی کے لیے خواہشات سفلی کا اس میں رکھا جانا ضروری ہُوا - تو ان خواہشات سفلی کے محرک شیطان کا وجود بھی ضروری ہوا - علاوہ ازیں بغیر مخالفت اور مقابلہ کے اور دشمن پر غالب آنے کے کوئی کامیابی کامیابی ہی نہیں کہلا سکتی۔ شیطان یا دشمن پر غالب آنے میں ہی انسان کی اصل کامیابی ہے۔ اگر مقابلہ کوئی نہ ہوتا تو انسان کے کمالات کا اظہار بھی نہ ہو سکتا۔

۱۰۵۸؎ اغویتنی غی سے ہے جس کے معنی ہیں امام راغبؒ کہتے ہیں الغی جھلٌ من اعتقادٍ فاسدٍ یعنی غی وہ جہالت ہے جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو۔ اسی لیے عصی آدم ربہ فغوی (طٰہٰ ۲۰ - ۱۲۱) میں غوٰی کے معنی جَہِلَ کیے گئے ہیں۔ اور غوٰی کے معنی خاب یعنی ناکام رہا بھی کیے گئے ہیں اور فسد عیشہ بھی یعنی اس کی زندگی خراب ہو گئی ان کان اللہ یرید ان یغویکم (ھود ۱۱ - ۳۴) میں یغوی کے معنی دو طرح پر کیے گئے ہیں یعاقبکم علی غیکم یعنی تمہاری غیّ کی تمہیں سزا دے یا یحکم علیکم بغیکم یعنی تمہاری غی کا تم پر حکم لگائے (غ) انہی دو معنوں میں سے کوئی سے معنی یہاں ہیں اور ابن جریر کہتے ہیں اغویتنی اھلکتنی یعنی مجھے ہلاک کیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اغواء کے جو معنی بدی کی تحریک کرنا یا دوسرے کو بدراہ پر لگانا ہیں وہ یہاں قطعاً مراد نہیں کیونکہ سارے قرآن کریم میں کسی جگہ بھی یہ ذکر نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اسے نافرمانی کا حکم دیا تھا بلکہ حکم تو فرمانبرداری کا ہی دیا تھا۔

لاقعدن لہم - کسی چیز کے لیے قعود سے مراد اس کے لیے انتظار یا گھات میں بیٹھنا ہے (غ)

۱۰۵۹؎ شیطان کے چاروں طرف سے آنے کے معنی ہر طرح کی وسوسہ اندازی کرنا ہیں۔ جیسا کہ آگے آدم کے ذکر میں فوسوس لہما الشیطان سے ظاہر ہے اور جیسا کہ شر الوسواس الخناس سے ظاہر ہے۔ یہ مراد نہیں کہ وہ چاروں طرف سے اس پر غلبہ پالے گا۔ شیطان کو انسان پر کوئی غلبہ نہیں دیا گیا۔ ان عبادی لیس لك علیہم سلطان (الحجر ۱۵ - ۴۲) اور الگ الگ چاروں کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ من بین ایدیہم سے مراد ان کی دنیا ہے یعنی دنیوی لالچ دونگا اور خلفہم سے مراد آخرت ہے یعنی وسوسہ اندازی کروں گا کہ اعمال کی جزا و سزا کچھ نہیں اور عن ایمانہم سے مراد ہے کہ ان کو نیکیوں سے روکوں گا اور شمائلہم سے مراد ہے کہ بدی کے لیے اکساؤں گا (ج)

۱۰۶۰؎ مذءُومًا کے معنی مذموم ہیں یعنی عیب لگایا گیا (غ) کیونکہ ذأم عیب کو کہتے ہیں۔

مدحورا - دَحر کے معنی نکال دینا اور دور کرنا ہیں ویقذفون من کل جانب دحورا (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۸ و ۹)

بدی اور اس کا مظہر شیطان واقعی مردود اور حقیر ہے۔ بدی کو اگر کرنے والے سے الگ کر دیا جائے تو خود وہ بھی اس کو اچھا نہ سمجھے گا۔ کوئی جھوٹ بولنے والا دوسرے کے جھوٹ کو اچھا نہیں کہتا۔ کوئی زنا کرنے والا دوسرے کے زنا کو اچھا نہیں سمجھتا۔ دنیا میں گو بدی کرنے والے رہیں مگر بدی ہمیشہ مردود اور ذلیل رہے گی۔ پس شیطان اور جس چیز کی طرف وہ بلاتا ہے فطرت انسانی دونوں کو دھکے دیتی ہے مگر پھر بھی انسان اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا
نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ
اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٢٠﴾
وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾
فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ
لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا
مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ
اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ
لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٢﴾

اُن کے وہ عیب کھول دے جو ڈھانکے گئے تھے [1061] اور
اس نے کہا تمھارے رب نے تم کو اس درخت سے نہیں روکا مگر اس لیے کہ
تم فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ [1062]
اور ان سے قسم کھا کر کہا کہ یقیناً میں تمھارے خیر خواہوں میں سے ہوں [1063]
پس دھوکے سے ان کو گرا دیا، سو جب ان دونوں نے درخت
کو چکھا ان کے عیب اُن پر کُھل گئے اور وہ باغ کے پتوں سے
اپنے آپ کو ڈھانکنے لگے۔ اور ان کے رب نے انھیں پکارا
کیا میں نے تمھیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور تمھیں نہیں
کہا تھا، کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے [1064]

ع[1061] وسوس ۔ وَسْوَاس اصل میں اس ہلکی آواز کو کہتے ہیں جو ہوا سے پیدا ہوتی ہے اور شکاری کے چلنے کی آہٹ کو بھی وسواس کہا جاتا ہے (ل) اس لیے وسوسۃ ناقص خیالات ہیں ۔ جو دل میں آئیں (غ)

سوآت ۔ سَوْءَۃ کی جمع ہے جس کے معنی شرمگاہیں اور خلۃ قبیحۃ (ت) یعنی بری خصلت بھی اور اس کی اصل سوء یعنی بُرائی ہے ۔ لیث نے اس آیت کے الفاظ میں سَوْءَۃ کے معنی کیے ہیں عمل شائن او امر شائن یعنی ہر ایک عمل یا امر جو عیب لگانے والا ہو (ل) اور ابن اثیر نے اس کے ایک معنی کیے ہیں کل امر یستحیا منہ ہر ایک امر جس سے حیا آئے قول ہو یا فعل (ت) اور بحر المحیط میں سوءۃ کے معنی لکھے ہیں ما یسوء ھما من المعصیۃ یعنی نافرمانی جو ان کے دکھ کا موجب ہو ۔

بیان سے معلوم ہوا کہ شیطان کا آدم کو پھسلانا وسوسہ کے ذریعہ سے تھا جس طرح ہر انسان کو وہ پھسلاتا ہے اور وسوسہ ڈالنے کی غرض بھی یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ ان کی سوآت جو ان سے چھپا کر رکھی گئی تھیں یعنی ظاہر نہ ہوتی تھیں وہ ظاہر کر دے ۔ آیا فی الحقیقت اس سے مراد کوئی لباس ہے جو ان کو پہنایا گیا تھا اور شیطان کی غرض اس لباس کو اتار دینا تھا ۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ کوئی ظاہری لباس ہو تو کسی ممنوع درخت کے پھل کے کھانے سے اس کے رہنے یا اترنے کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا ۔ مفسرین نے بھی اس دقت کو محسوس کیا ہے ۔ ابن جریر وہب بن منبہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ ان پر ایک نُور تھا جس کی وجہ سے ان کی سوآت دیکھی نہ جا سکتی تھیں ۔ ظاہر ہے کہ نُور جن سوآت کو ڈھانک سکتا ہے وہ ظاہری شرمگاہیں نہیں بلکہ باطنی عیوب اور قبائح ہیں اور سوآت کے یہ معنی اوپر بیان ہو چکے ہیں اور اس آیت کے معنی کو آیت ، احل کرتی ہے یٰبنی اٰدم لا یفتننکم الشیطٰن کما اخرج ابویکم من الجنۃ ینزع عنھما لباسھما لیریھما سواٰتھما اے آدم کے فرزندو! تمھیں شیطان دکھ میں نہ ڈالے جس طرح تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکالا ان سے ان کا لباس اُتروا دیا تاکہ ان کو اُن کی سوآت دکھا دے ۔ جہاں مجاہد سے روایت ہے ھو لباس التقوٰی یعنی تقوٰی کا لباس تھا جو اتار دیا ۔ پس سوآت سے مراد بھی عیوب اور قبائح ہی ہو سکتے ہیں اور حدیث میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جہاں مغیرہ بن شعبہ کے متعلق یہ لفظ ہیں ھل غسلت سواٰتک الا امس جہاں سَوْءَۃ میں اشارہ اس بیوفائی کی طرف ہے جو مغیرہ سے ایام جاہلیت میں اپنے ساتھیوں سے وقوع میں آئی (ت) اور روح المعانی میں ایک قول اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے قیل ھو کنایۃ عن ازالۃ الحرمۃ واسقاط الجاہ یعنی اس سے مراد حرمت کا دور کرنا اور مرتبہ سے گرانا ہے ۔ پس خود قرآن کریم اور حدیث اور مفسرین کی رائے سے یہ ظاہر ہے کہ سوآت سے مراد یہاں ان کے عیوب اور کمزوریاں ہیں اور شیطان کی غرض پھسلانے میں یہ تھی کہ وہ پردہ جو انسان کی کمزوریوں پر پڑا رہتا ہے دور ہو جائے یعنی اس سے کمزوری کا اظہار ہو ۔

ع[1062] شیطان چونکہ جھوٹا تھا اس لیے واقعات کے عین خلاف اُن کے دل میں وسوسہ ڈالا یعنی یہ کہ بدی سے تم کو اس لیے روکا گیا ہے کہ تم فرشتے نہ ہو جاؤ ۔ یا موت سے بچے رہو ۔ گویا بدی کو اس قدر سجایا اور اس قدر اچھا دکھایا کہ انسان یہ خیال کرنے لگا کہ یہی میری موت سے بچنے کا ذریعہ ہے ۔ پہلا میلان انسان کا بدی کی طرف یہیں سے پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ارتکاب میں وہ کوئی لذت دیکھتا ہے یا اسے اپنی زندگی کے سامانوں کا موجب سمجھتا ہے ۔ شیطان چونکہ دھوکہ باز ہے اس لیے بدی سے جو حالت پیدا ہوتی ہے عین اس کے اُلٹ ہونے کا وسوسہ ڈالتا ہے ۔ بدی انسان کو ملکوتی صفات سے بہیمی صفات کی طرف لے جاتی ہے اور زندگی سے موت کی طرف ۔ اس لیے اس کا اُلٹ کہا کہ اس سے تم ملک بن جاؤ گے اور غیر فانی ہو جاؤ گے ۔

ع[1063] قاسم ۔ باب مفاعلہ یہ ظاہر کرنے کے لیے اختیار کیا ہے کہ اس نے یقین دلانے کے لیے قسم میں سخت زور لگایا ۔

ع[1064] دلّٰی ۔ دَلْو ڈول کو کہتے ہیں اور اِدْلاء توسّل کو جس کے لیے دیکھو ع[238] اور تَدَلّٰی بلندی سے پستی کی طرف آنا ہے اور دَلّٰی کے معنی یہاں اطماع یعنی طمع دلانا بھی کیے گئے ہیں ۔ جیسے پیاسے کو پانی کنوئیں کی طرف لیجاتا ہے اور پھر اس میں پانی نہ ملے اور دوسرے معنی اَوْقَعَ یعنی گرا دیا کیے گئے ہیں (ل)

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

انھوں نے کہا، اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اگر تو ہماری حفاظت نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہونگے۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾

کہا اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور سامان ہے۔

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع ٢

کہا، اسی میں تم جیو گے، اور اسی میں تم مرو گے، اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے۔ ۱۰۶۵

يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِىْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اے بنی آدم! بیشک ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمھارے عیبوں کو ڈھانکے اور زینت ہو اور تقویٰ کا لباس۔ یہی بہتر ہے یہ اللہ کی باتوں میں سے (باتیں) ہیں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔ ۱۰۶۶

یخصفٰن۔ خَصَفَ جوتی کے گانٹھنے یا اس کے بعض کو بعض پر چڑھانے پر بولا جاتا ہے اور حدیث میں ہے انہ کان یَخْصِفُ نَعْلَہ یعنی آنحضرت صلعم اپنی جوتی خود گانٹھ لیتے تھے (ل)

ورق۔ درخت کے پتوں کو کہتے ہیں وَرَقَۃٌ واحد ہے ما تسقط من ورقۃ (الانعام۔ ۵۹) اور ورق درہم کو کہتے ہیں فابعثوا احدکم بورقکم ھٰذہٖ (الکہف۔ ۱۹) اور اَوْرَقَ فلانٌ جس کے لفظی معنی ہیں وہ شخص پتوں والا ہوگیا۔ اس سے مراد ہے وہ اپنی حاجت نہ پا سکا۔ گویا کہ وہ بغیر پھل کے پتوں والا ہوگیا اور ثمر مال کو کہتے ہیں۔ (غ)

پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے سے مراد: جب اوپر کی تشریح سے ثابت ہوگیا کہ جو لباس اترا تھا وہ لباس تقویٰ تھا اور جو سوأت ظاہر ہوئی تھیں وہ اندرونی کمزوریاں تھیں تو باغ کے پتے لگانے کا مفہوم بھی ظاہری نہیں ہو سکتا بلکہ استعارۃً مراد اس سے ایسا فعل ہے کہ انسان اپنی کمزوری کا اخفا کرنے لگے اور ورق یا پتوں کا لفظ لا کر بتا دیا کہ یہ وہ انسانی کوشش ہے جو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتی جیسا کہ ورق والا ہو جانے سے مراد ہے حاجت کا نہ پانا گویا پھل اس سے نہیں ملتا صرف پتے ملتے ہیں اور پھل دینے والی وحی الٰہی ہے۔ معصیت کا ارتکاب پہلے پہلے انسان پر پشیمانی لاتا ہے وہی حالت آدم اور ان کی بی بی کی ہوئی۔ اور جب اپنی کمزوری کا احساس ہوگیا تو اب انسانی کوشش شروع کی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو بظاہر ایک جسمانی فعل معلوم ہوتا ہے اس کا اشارہ ایک روحانی امر کی طرف ہے۔ معصیت میں مبتلا ہونے سے لباس نہیں اترا کرتا ہاں احساس پیدا ہوتا ہے کہ انسان سے کمزوری سرزد ہوئی۔ اسی کو زیادہ واضح کرنے کیلئے اگلے رکوع کی پہلی آیت میں لباس کا ذکر کیا ہے انزلنا علیکم لباسا یواری سوٰتکم وریشًا ولباس التقوٰی ذٰلک خیر۔ جہاں لباس التقویٰ سے صاف بتا دیا کہ اسی لباس کا ذکر آدم کے متعلق ہے چنانچہ ینزع عنہما لباسہما میں مجاہد نے کہا ہے، ھو لباس التقوٰی یعنی وہ لباس جو اتار دیا وہ لباس تقویٰ تھا۔ پس باغ کے پتے لگانے سے مراد بھی اپنی انسانی کوشش ہے کیونکہ فطرت انسانی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک دفعہ اگر بدی سے مغلوب بھی ہو جائے تو دوسری دفعہ پھر اٹھنے کی کوشش کرتی ہے مگر یہ انسانی کوشش کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ حقیقی علاج انزلنا علیکم لباسا میں بتایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعہ سے وہ علاج کرتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں دو باتیں الگ الگ ہیں۔ ایک کھانا ایک لباس کسی چیز کے کھا لینے سے کسی لباس کا اتر جانا صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ دونوں سے مراد روحانی امور نہ لیے جائیں۔ یعنی کھانے سے مراد کسی بدی کا ارتکاب تھا لباس کے اتر جانے سے مراد اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ یہی ہم دن رات بنی آدم میں دیکھتے ہیں۔ اس لیے آدم کے لیے کوئی الگ معنی تجویز کرنا انسانی تجربہ کو باطل کرنا ہے۔

ع ۱۰۶۵ فیہا تحیون میں بتایا کہ زمینی زندگی تمہارے لیے ضروری ہے یعنی اس سے تمہاری ترقیات پیدا ہوتی ہیں۔ اور زمینی زندگی کا اختتام موت سے ہوتا ہے۔ نہ کسی اور طریق سے اور اس موت کے بعد پھر اٹھنا ہے جس میں اس زمینی زندگی کے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے۔ یہ حصر اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ ان انسانوں کی زندگی جو اس زمین پر ہیں۔ اسی زمین پر محدود ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر زندہ اٹھایا جانا اس آیت کے خلاف ہے۔ ایسا ہی زمینی زندگی کا انقطاع صرف موت سے ہو سکتا ہے پس جس شخص کی زندگی اس زمین پر ختم ہوگی لازمًا وہ موت کا مزہ چکھ کر ہوگی نہ کسی اور طرح۔

ع ۱۰۶۶ انزلنا۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی نعمتوں اور نعمتوں کا انزال یا نازل فرمانا صرف ان کا عطا کرنا ہے اور بعض وقت صرف ان کے حصول کے اسباب پیدا کر دینا اور ان اسباب کی طرف انسان کو ہدایت کر دینا ہی ہوتا ہے (غ)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾	اے بنی آدم شیطان تم کو دُکھ میں نہ ڈال دے، جس طرح تمہارے ماں باپ کو باغ سے نکلوا دیا۔ اُن سے ان کا لباس اُتروا دیا تا کہ اُن کو اُن کے عیب دکھا دے۔ ع۱۰۶۷ وہ اور اس کی جماعت تم کو ایسی طرح پر دیکھتے ہیں کہ تم ان کو نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے ع۱۰۶۸
وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾	اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں، کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا کرتے پایا اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ، اللہ کبھی، بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے ع۱۰۶۹
قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ	کہہ، میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے آپ کو

لباس۔ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو انسان کے کسی قبیح امر کو ڈھانک لے (غ)، اسی لیے بی بی کو خاوند کا اور خاوند کو بی بی کا لباس کہا ہے۔

ریش۔ پرند کے پروں یا کلغی کو کہتے ہیں جو بمنزلہ انسان کے لباس کے ہے۔

پچھلے رکوع میں یہ بتایا تھا کہ انسان صرف اپنی کوشش سے وساوس شیطانی سے نہیں بچ سکتا۔ اس لیے وحی الٰہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی مضمون کو جاری رکھتے ہوئے تمام نسل انسانی کو خطاب کر کے بتایا ہے کہ وحی الٰہی کی پیروی سے تم شیطان سے بچ سکتے ہو۔

لباس کے اتارنے سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس میں شک نہیں کہ جس لباس التقوٰی کا یہاں ذکر ہے وہ ایمان اور اعمال صالحہ کا لباس ہے۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ مجاہد سے مروی ہے تو ایک معنی تو یوں ہونگے کہ وہ ظاہری لباس جو تمہاری پردہ پوشی کرتا ہے۔ پھر صرف پردہ پوشی ہی نہیں بلکہ زینت کا کام بھی دیتا ہے۔ وہ تمہارے جسموں کی حفاظت اور زینت کے لیے بھی آخر خدا نے ہی بہم پہنچایا ہے۔ پس جس خدا نے تمہارے جسموں کے لیے یہ سامان بنایا، کیا اس نے انسان کی روحانی کمزوری اس کے اخلاقی عیوب پر پردہ پوشی اور اس کی روحانی زینت کے لیے ہی کوئی سامان نہیں بنایا؟ یوں لباس ظاہری سے لباس باطنی کی طرف توجہ دلائی۔ مگر یوں بھی اس کے معنی ہو سکتے ہیں۔ کہ انزلنا علیکم لباسا سے مراد وحی الٰہی ہی ہو۔ جو انسان کے عیوب کو ڈھانکنے اور اس کی زینت کا موجب ہے کیونکہ اگلی آیت میں صاف طور پر آدم کے لباس کے اُتر جانے کا ذکر کر کے سب انسانوں کو متنبہ کیا ہے کہ جس طرح شیطان نے تمہارے باپ اور ماں کا لباس اُتروا دیا تھا اسی طرح تمہارا لباس نہ اتار دے۔ دیکھو اگلا نوٹ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جس لباس کا ذکر ہے وہ لباس روحانی ہے اور اسی لباس کو جو انسان کے عیوب روحانی کے دور کرنے اور اس کی زینت کا موجب ہے لباس التقوٰی کہا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اس لباس کا پہن لینا یعنی وحی الٰہی پر عملدرآمد کرنا تمہاری بہتری کا موجب ہے اور انسان کی حقیقی زینت کا موجب یہی لباس روحانی

ع۱۰۶۷ قبیل۔ قبیلۃ کی جمع ہے اور اس جماعت کو کہتے ہیں جو اجتماع کا رنگ رکھتی ہو اور ان کے بعض بعض کی خاطر توجہ کرنے والے ہوں (غ)، وجعلناکم شعوبا و قبائل (الحجرات ۴۹-۱۳)

یہاں لفظ کما کے استعمال سے صاف بتا دیا کہ جو حملہ شیطان کا آدم پر تھا وہی ابن آدم پر ہوتا ہے۔ جس طرح اس کو دکھ میں ڈالا کہ باغ سے نکال دیا۔ اسی طرح ہر ابن آدم کو دکھ میں ڈالنے کا وہ موجب ہو سکتا ہے جس طرح شیطانی وسوسے سے ان میں ایک کمزوری نمودار ہو گئی۔ اسی طرح ہر انسان اس کمزوری کا شکار ہو سکتا ہے یہی معنی امام مجاہد نے کیے ہیں یعنی ینزع عنھما لباسھما کی تشریح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔۔۔۔۔ ھو لباس التقوٰی یعنی اس لباس کے اتروا دینے سے مراد لباس تقوٰی کا اُتروا دینا یا معصیت کرانا ہے۔ مزید تشریح کے لیے دیکھو ع۱۰۶۱ و ع۱۰۶۳

ع۱۰۶۸ اس سے صاف شہادت ملتی ہے کہ آدم نے بھی شیطان کو نہیں دیکھا جس طرح ہم نہیں دیکھتے نہ کوئی انسان جنوں کو دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ شیطان بھی جنوں میں سے ہے۔ ہاں شیاطین الانس کو بیشک دیکھ سکتا ہے اور جنوں کو دیکھنے وغیرہ کے جو قصے بنے ہوئے ہیں سب بے بنیاد ہیں ہاں کشفی نظر سے وہ دیکھے جا سکتے ہیں اور وہ انسانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کے سوا اور کوئی دخل ان کے کاروبار میں نہیں دیتے جیسا کہ اکثر قصے بنے ہوئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ شیطان کے لفظ کا استعمال اسم جنس کے طور پر ہوا ہے۔ کیونکہ شیطان کا ذکر کرتے کرتے یہاں اس کی جماعتوں کا ذکر بھی کر دیا۔

ع۱۰۶۹ عرب کے لوگ اپنے مشرکانہ رسوم ورواج کو جو ان کے باپ دادا سے چلے آتے تھے خدا کے حکم کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اصول کیا عمدہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ جو سرچشمۂ قدوسیت ہے وہ ناپاکی اور بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے سکتا۔ پس جس بات کو فطرت انسانی بے حیائی میں داخل کرتی ہے وہ خدا کا حکم نہیں ہو سکتا۔

عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۬ۚ
كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۟ؕ ﴿۲۹﴾
فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ
اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾
يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ
مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ
ع اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْۤ اَخْرَجَ
لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ
لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً
يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

ہر سجدے کے وقت میں سیدھا رکھو اور فرمانبرداری کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے اسے پکارو جس طرح تم کو پہلے بنایا تم لوٹ کر (بھی) آؤ گے[۱۰۷۰] ایک گروہ کو ہدایت کی اور (دوسرا) گروہ اس پر گمراہی ثابت ہوگئی۔ کیونکہ انھوں نے اللہ کے سوا شیطانوں کو دوست بنایا۔ اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں[۱۰۷۱]

اے بنی آدم! ہر سجدے کے وقت اپنی زینت کو لے لیا کرو، اور کھاؤ اور پیؤ اور زیادتی نہ کرو۔ وہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا[۱۰۷۲]

کہہ، کس نے اللہ کی زینت کو جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے اور کھانے کی ستھری چیزوں کو حرام کیا ہے۔ کہہ وہ دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لائے قیامت کے دن خالص (اس کے لیے)، اسی طرح ہم باتوں کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان

ع۱۰۷۰ قسط کے معنی عدل کا حصہ ہیں۔ پس اس میں ہر قسم کی طاعات داخل ہیں کیونکہ جو دوسرے کا حق لیتا ہے یا اس کا حق دیتا نہیں وہ عدل نہیں کرتا۔ افراط و تفریط قسط یعنی عدل کے خلاف ہیں۔

مَسْجِد۔ سجدہ کا وقت یا سجدہ کا مکان۔ مراد اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے۔

جب فواحش سے روکا تو ساتھ ہی بتایا کہ اللہ تعالیٰ حکم کن باتوں کا دیتا ہے۔ حقوق انسانی کی ادائگی تو قسط میں آگئی۔ اصول عدل کو ملحوظ رکھو اور دوسرے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف توجہ دلائی۔

کما بداکم تعودون میں توجہ دلائی کہ تمہاری تیاری ایک اور زندگی کیلئے ہونی چاہیئے۔ جس خدا نے پہلے بنایا وہی تم کو تمہارے اعمال کی جزاد سزا کے لیے پھر بنائیگا۔

ع۱۰۷۱ فریقا حق علیہم الضلالۃ یہاں انہی لوگوں کے وصف میں ہے جن کے متعلق دوسری جگہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا اضلال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس لیے گمراہ ٹھہراتا ہے کہ گمراہی کا فتویٰ ان پر صادق آتا ہے۔ یا گمراہی ان پر ثابت ہوتی ہے اور گمراہی کن لوگوں پر ثابت ہوتی ہے؟ جو شیطانوں کو دوست بنا کر ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور پھر طرفہ یہ کہ اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے ہیں جس نے بدی کو نیکی سمجھ لیا اس کا بدی سے نجات پانا محال تک پہنچ جاتا ہے۔

ع۱۰۷۲ سجدہ یا فرمانبرداری کے وقت میں زینت لینے سے مراد اکثر مفسرین نے کپڑوں کا پہننا لیا ہے اس لیے کہ عرب کے لوگ حج کے وقت یا دعا کے وقت کپڑے اتار دیا کرتے تھے یہاں تک کہ عورتیں بھی برہنہ ہوجایا کرتی تھیں۔ اس خیال سے کہ جن کپڑوں میں گناہ کیا ہے ان کپڑوں میں عبادت نہیں کرنی چاہیئے۔

لیکن ہوسکتا ہے کہ زینت سے مراد روحانی زینت ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو۔ تو ان سب سامانوں کو بھی ساتھ رکھو جو انسان کی حقیقی زینت کا موجب ہیں گویا اخلاق حسنہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرو۔ چنانچہ اس رکوع کی سب سے پہلی آیت میں جب لباس کو پردہ پوشی اور زینت کا سامان قرار دیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ اس سے بہتر ایک لباس اور بھی ہے اور وہ لباس تقویٰ ہے یعنی نیکی سے آراستہ ہونا پس اگر زینتکم سے لباس کا پہننا یا اچھے لباس میں ملبوس ہونا مراد ہے تو ساتھ ہی یہ بھی مراد ہے کہ حقیقی زینت روحانیت ہے اس کو بھی ساتھ رکھو اور اپنے آپ کو تقویٰ سے آراستہ کر کے مسجدوں میں جاؤ۔ اور جس طرح اخلاق حسنہ کی طرف توجہ دلائی۔ ساتھ ہی کھانے پینے کے متعلق بھی ہدایت فرمائی جس کے چار پانچ لفظوں میں نصف طب آجاتی ہے۔ کھاؤ اور پیو اور زیادتی نہ کرو۔ یعنی کھانے پینے تک میں افراط و تفریط سے بچو۔ اس میں ہر قسم کی افراط و تفریط آجاتی ہے۔ مثلاً خاص قسم کی چیزیں کھانا یا خاص قسم کی چیزیں ترک کر دینا سب اسراف میں داخل ہے۔

گوشت کھاتا ہے تو سبزی نہیں کھاتا۔ یا سبزی کھاتا ہے تو گوشت نہیں کھاتا۔ ایسا ہی جس مقدار غذا کی انسان کے لیے ضرورت ہے اس میں ضرورت سے زیادہ کھا لینا یا جس قدر ضرورت ہو اس سے کم کھانا یہ سب افراط و تفریط میں داخل ہیں اور کھانے پینے میں اصول اعتدال نہ صرف صحت جسمانی کو قائم رکھنے والی چیز ہے بلکہ اس سے انسان کی ساری خواہشات سفلی حالت اعتدال پر آجاتی ہیں۔ اور شیطان جو ان خواہشات سفلی کا محرک ہے وہ اس کا فرمانبردار ہوجاتا ہے۔

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں ۱۰۷۳ء

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

کہہ، میرے رب نے صرف بےحیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے جو اُن میں سے ظاہر ہوں اور جو چُھپی ہوں اور گناہ کو اور ناحق بغاوت کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک کرو، جس کے لیے اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور یہ کہ اللہ پر وہ بات کہو، جو تم نہیں جانتے ۱۰۷۴ء

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور ہر ایک قوم کے لیے ایک میعاد ہے، پھر جب اُن کی میعاد آ پہنچتی ہے تو ایک گھڑی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ پہلے جا سکتے ہیں ۱۰۷۵ء

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾

اے بنی آدم اگر کبھی تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں میری آیات تم پر بیان کریں، تو جو کوئی تقوے کرے اور اصلاح کرے ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ پچھتائیں گے ۱۰۷۶ء

۱۰۷۳ء اچھی چیزوں کا استعمال خلاف شریعت نہیں: اچھی چیزوں کو روحانی ہوں یا جسمانی اللہ تعالیٰ نے منع نہیں کیا۔ نہ اچھے کھانوں کو نعمائے دنیا بھی اگر مومن کو میسر ہوں تو ان سے فائدہ اُٹھائے۔ آنحضرت صلعم حالانکہ نہایت درجہ کی سادگی سے گزارہ کرتے تھے۔ نہایت ہی سادہ غذا نہایت ہی سادہ لباس نہایت ہی سادہ مکان لیکن اگر کھانے کے لیے کوئی اچھی چیز آجائے تو اسے ردّ نہ کرتے تھے پہننے کے لیے اچھا کپڑا مل جائے تو اسے پھینک نہ دیتے تھے۔ مسلمانوں میں افراط و تفریط ہے ایک گروہ تو دنیا کی آسائش کی تلاش میں اتنا منہمک ہوا ہے کہ اس سے اوپر نظر نہیں اٹھتی اور ایک گروہ وہ بھی ہے جو صاف کپڑا رکھنا صاف جسم رکھنا یا اچھا کھانا کھانا حرام سمجھتا ہے قیامت کے دن نعماء خاص طور پر مومنوں کا ہی حصّہ ہیں۔ یعنی کافر اس دن نعماء سے متمتع نہ کیے جائیں گے یا خالصۃ سے یہ مراد ہے کہ اس دنیا میں نعماء کے ساتھ رنج اور حزن کی باتیں بھی ملی ہوتی ہیں۔ نعمائے قیامت ان سے پاک ہونگی۔ تعلق اس آیت کا اصل مضمون سے یہ ہے کہ وحی الٰہی اچھی چیزوں کو حرام نہیں کرتی بلکہ اچھی چیزوں کی طرف ہدایت کرتی ہے۔

۱۰۷۴ء اس میں بتایا کہ وحی الٰہی صرف ان چیزوں سے روکتی ہے جو یا خود بُری ہیں یا ان کا انجام بُرا ہے۔ اول فواحش یعنی بےحیائی کی باتوں کا ذکر کیا خواہ وہ علانیہ کی جائیں یا چھپ کر۔ مثلاً زنا اور اس کے مبادی سب فواحش میں داخل ہیں علی الاعلان ہوں یا چھپ کر خواہ کوئی دیکھتا ہو یا نہ دیکھتا ہو۔ پھر اثم کا یعنی جسے انسان کی ضمیر بتا دیتی ہے کہ وہ بُرا کام ہے یا جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے اور پھر بغی کا یعنی دوسرے لوگوں پر زیادتی۔ اثم کا اثر لازماً دوسرے پر نہیں۔ بغی صرف دوسروں پر زیادتی ہے۔

۱۰۷۵ء لا یستاخرون کے معنی پیچھے رہنے کا ارادہ نہ کریں گے اور لا یستقدمون آگے جانے کا ارادہ نہ کریں گے (غ) یعنی وقت مقرر سے پہلے بھی وہ عذاب نہیں آ سکتا اور جب آ جائے تو ٹل بھی نہیں سکتا۔

۱۰۷۶ء رسولوں کے بھیجنے کا عام قانون اور ختم نبوت: یہاں اور اس سے پیشتر چند باتیں عام طور پر ساری نسل انسانی کو مخاطب کرکے کہی ہیں۔ یٰبنی اٰدم قد انزلنا علیکم لباسًا۔ یٰبنی اٰدم لا یفتننکم الشیطان۔ یٰبنی اٰدم خذوا زینتکم۔ اور یہاں یٰبنی اٰدم اما یاتینکم رسل جس کا مطلب یہ ہے کہ لباس سارے بنی آدم کے لیے ہے۔ شیطان کے فتنہ سے سب بنی آدم کو متنبہ کیا ہے۔ سب بنی آدم کو خدا کی عبادت کرتے وقت زینت اختیار کرنے کو کہا اور بالآخر سب بنی آدم کو بتایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی اپنا رسول بھیجے تو اس کو قبول کرنا چاہیے کیونکہ رسولوں کو قبول کرنے سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے اور ان کا ردّ کرنا موجب خسران ہے۔ بعض ختم نبوت کے منکر اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اس کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی رسول آتے رہنے چاہئیں اس آیت سے رسولوں کے آنحضرت صلعم کے بعد آنے کا نتیجہ اول بہاءاللہ نے اور بعد میں ان کی نقل کرکے میاں محمود احمد قادیانی کے مریدوں نے نکالا ہے حالانکہ اس آیت کو نہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے خود اور نہ ان کی زندگی میں ان کے مریدوں نے کبھی پیش کیا۔ ایک شرطیہ جملہ سے یہ نتیجہ نکالنا کمال نادانی ہے۔ مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ اگر بنی آدم کے پاس خدا کا رسول آئے تو اس کو قبول کرنے میں ان کی بہتری ہے۔ سو وہ رسول محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی ذات بابرکات کے متعلق یہ اعلان ہے کہ اگر اس کو قبول کرو گے تو تمہاری بہتری کا موجب ہے اگر ردّ کرو گے تو تمہارے نقصان کا موجب ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ رسل کا لفظ جمع کیوں استعمال کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس لیے کہ خطاب کل بنی آدم کو ہے اور بنی آدم کی طرف رسول بھیجنے کا عام ذکر ہے۔ تو بلاشبہ آنحضرت صلعم سے پہلے بنی آدم کے پاس رسول آتے رہے اور سب سے آخر حضرت

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلائیں اور ان سے تکبر کریں، وہ آگ والے ہیں اسی میں رہیں گے ۱۰۷۷

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ
مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا
يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا
عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے ان لوگوں کو ان کا حصہ نوشتہ سے ملتا رہے گا — یہاں تک کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس آئیں گے کہ ان کو وفات دیں کہیں گے، وہ کہاں ہیں جن کو اللہ کے سوائے تم پکارتے تھے - کہیں گے وہ ہم سے جاتے رہے اور اپنی جانوں پر گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے ۱۰۷۸

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا
دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا
فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا
هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۭ
قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

کہے گا، ان قوموں میں جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں سے گزر چکیں آگ کے اندر داخل ہو جاؤ - جب کبھی کوئی جماعت داخل ہوگی اپنی ساتھی (قوم) پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب سب اس کے اندر ایک دوسرے کو پالیں گے ان کے پچھلے ان کے پہلوں کو کہیں گے اے ہمارے رب انھوں نے ہمیں گمراہ کیا سو ان کو دوچند عذاب آگ کا دے کہے گا ہر ایک کے لیے دوچند ہے لیکن تم نہیں جانتے ۱۰۷۹

محمد مصطفےٰ صلعم کو بھیجا گیا کہ دنیا کی کل قوموں کو ایک سلسلہ اخوت میں منسلک کریں اور اس بات کی شہادت کہ آپ کے بعد رسول نہ آئیں گے دوسری جگہ سے ملتی ہے جہاں فرمایا الیوم اکملت لکم دینکم آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا - رسول تو دین سکھانے کے لیے آتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل کر کے پہنچا دیا تو پھر رسولوں کے آنے کی ضرورت بھی باقی نہ رہی جب کمال شریعت اور شریعت کے آنے کیلئے مانع ہوگیا تو کمال نبوت بھی اور نبی کے آنے کے لیے مانع ہوگیا - جو ضرورت تھی وہ پوری ہوگئی - آفتاب رسالت شمس نصف النہار کی طرح چمک رہا ہے اس لیے اب کسی رسول کی ضرورت دنیا کو نہیں - اور وہ لوگ جو رسول کے آنے کا جواز نکالتے ہیں مگر شریعت کا آنا نہیں مانتے ان کے لیے خود یہاں لفظ موجود ہیں یقصون علیکم اٰیتی یعنی رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغام بھی لائیں گے - وہی پیغام شریعت ہے اور اگر کہا جائے کہ یہ کسی پہلے رسول کی آیات ہیں تو پھر تکذیب تو ان آیات کی ہے - دیکھو اگلا نوٹ ایسے رسول کی تکذیب کوئی شے نہ ہوئی -

۱۰۷۷ رسول کے ساتھ پیغام کا آنا ضروری ہے : اس آیت سے صاف شہادت ملتی ہے کہ رسولوں کے آنے سے مراد ایسے رسولوں کا آنا ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغام بھی ہوتا ہے چنانچہ جس طرح پہلے فرمایا تھا اِمّا یاتینکم منی ھدی (البقرۃ ۲ - ۳۸) اور اس کے متعلق دو گروہوں کا ذکر کیا ایک فمن تبع ھدای اس ہدایت کی پیروی کرنے والے اور دوسرے والذین کفروا وکذبوا باٰیٰتنا یعنی اس ہدایت اس پیغام کا انکار کرنے والے اسی طرح یہاں دو گروہ ہیں ایک اصلاح کرنے والے دوسرے آیات یعنی پیغام الٰہی کی تکذیب کرنے والے پس دونوں آیتوں کا مطلب ایک ہے اور دونوں گروہوں کی جزا کا ذکر یکساں الفاظ میں ہے - دونوں میں سزا تکذیب پیغام کی ہے - اور رسولوں کے ختم ہو جانے پر واقعات عالم بھی گواہ ہیں جس قسم کے لوگ پہلے آیا کرتے تھے اور ایک عالم کو اپنے پیچھے لگا لیتے تھے اب تیرہ سو سال سے اس قسم کا کوئی انسان دنیا میں ظاہر نہیں ہوا -

۱۰۷۸ نصیبھم من الکتٰب - کتاب بمعنی مکتوب بھی ہو سکتا ہے یعنی جو حصہ ان کے لیے لکھا گیا ہے - مگر الکتٰب سے مراد یہی قرآن بھی ہو سکتا ہے - یعنی وہ قرآن کو رد کر کے اس حظ سے بہرہ ور ہونگے جو رد کرنے والوں کے لیے قرآن نے قرار دیا ہے -

شھدوا علٰی انفسھم اپنے نفسوں پر شہادت دینے سے مراد یہ ہے کہ الزام قبول کرلیں گے اور اپنے گناہوں کا اقرار لیں گے یا یہ کہ ان کی حالت خود بتادے گی کہ وہ کافر تھے اور جو طاقتیں انسان کی ترقی کے لیے انسان کے اندر ودیعت کی گئی تھیں ان کو انہوں نے دبایا -

۱۰۷۹ اختھا - اخ اور اخت کا لفظ ہر قسم کی مشارکت پر بول دیا جاتا ہے - خواہ ولادت کے لحاظ سے ہو یا رضاعت کے لحاظ سے یا دین یا صنعت یا معاملہ یا دوستی

ع وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٣٩﴾

اور ان کے پہلے ان پچھلوں کو کہیں گے تم کو ہم پر کوئی فوقیت نہیں۔ سو اس کے بدلے میں جو تم کماتے تھے، عذاب چکھو۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٠﴾

جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ان سے سرکشی اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے — اور وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو — اور اسی طرح ہم مجرموں کو سزا دیتے ہیں[ع۱۰۸۰]

لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾

ان کے لیے جہنم کا بچھونا ہے اور ان کے اوپر (اسی کے) اوڑھنے اور اسی طرح ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں[ع۱۰۸۱]

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ

اور جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ہم کسی شخص پر کچھ لازم نہیں کرتے مگر اس کے مقدور کے مطابق، یہی جنت والے ہیں

کے لحاظ سے۔ کفر میں شریک بھی سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور اسلام میں شریک بھی سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ یہاں اختہا بلحاظ سیاق ان کے اولیاء ہیں (غ) یا یہ کہ تابع متبوع پر لعنت کریں گے اور متبوع تابع پر۔

اخرٰہم۔ اولٰھم سے پچھلے اور پہلے بلحاظ مرتبہ مراد ہیں یعنی تابع اور متبوع۔ یا ضعفا اور کبرا۔

لکل ضعفٌ۔ یعنی اگر متبوع زیادہ عذاب کے مستحق ہیں اس لیے کہ انھوں نے دوسروں کو گمراہ کیا۔ تو تابع بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے آنکھیں بند کرکے تقلید کی۔ دوسری توجیہ دوچند عذاب کی یہ ہے کہ ظاہر و باطن کا عذاب مراد ہے۔ یوں ہر ایک کے لیے اس کا دوچند ہے جو نظر آتا ہے۔ گو دوسرا نہ جانتا ہو۔ امام راغب نے یہی معنی لیے ہیں ؂

ع۱۰۸۰ لا تفتح لهم ابواب السماء۔ مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال اوپر نہیں جاتے یا ان کی ارواح کا رفع نہیں ہوتا۔ صالح عمل کو اللہ تعالیٰ رفع دیتا ہے والعمل الصالح یرفعه (فاطر ۳۵-۱۰) ایسا ہی مومنوں کو اللہ تعالیٰ رفع دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا اسم الرافع ہے اس لیے خواہ یہاں کفار کے اعمال مراد لیے جائیں یا ان کی ارواح مطلب ایک ہی ہے ان کو رفع عطا نہیں ہوتا۔ اسی لحاظ سے فرمایا کہ ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے ؂

جمل۔ جمال حسن کو کہتے ہیں اور جمل اونٹ کو اس لیے کہ وہ اونٹ کو اپنے لیے خوبصورتی کا موجب سمجھتے تھے۔ اس کی جمع جمالة قرآن شریف میں آتی ہے کانه جمالة صفر (المرسلٰت ۷۷-۳۳) اور جمال بھی آتی ہے۔

سم۔ تنگ سوراخ کو کہتے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ یا ناک یا کان میں جو چھید کیا جاتا ہے اور سُم زہر کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اپنے لطفِ تاثیر سے بدن کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور سموم تیز گرم ہوا کو کہتے ہیں جو زہر کا سا اثر رکھتی ہے۔ فی سموم وحمیم (الواقعة ۵۶-۴۲) والجان خلقناه من قبل من نار السموم۔ (الحجر ۱۵-۲۷) (غ)

یلج الجمل فی سم الخیاط۔ جمل یا اونٹ کو عرب بڑائی میں بطور مثال بیان کرتے ہیں اور سوئی کے ناکے کو تنگی مسلک میں۔ یہاں یہ بتایا کہ ان کے اعمال نے ان کیلئے جنت میں داخل ہونا ایسا ہی مشکل کردیا ہے جیسا اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا مشکل ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو وہاں پہنچادے یا سزا دینے کے بعد تو یہ اور معاملہ ہے۔

اصل غرض بمقابلہ رد کرنے والوں کے وحی کو قبول کرنے والوں کا ذکر ہے اس مقابلہ کے اظہار کے لیے پہلی دو آیتوں میں پچھلے رکوع کے مضمون کو جاری رکھا ہے۔

ع۱۰۸۱ غواش۔ غاشیة کی جمع ہے ڈھانکنے والی چیز۔ اور ایسی مصیبت کو بھی کہا جاتا ہے جو ڈھانک لے تاتیہم غاشیة (یوسف ۱۲-۱۰۷) اور قیامت کو بھی هل اتٰك حديث الغاشية (الغاشية ۸۸-۱)

جہنم کے اوڑھنا اور بچھونا ہونے سے مراد یہ ہے کہ چاروں طرف سے عذاب ان پر محیط ہوگا۔

هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾

وہ اسی میں رہیں گے ۱۰۸۲

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور جو کچھ ان کے سینوں میں رنج ہوگے ہم نکال دیں گے ان کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم کو اس کے لیے ہدایت دی اور ہم تو ہدایت نہ پا سکتے اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ دیتا یقیناً ہمارے رب کے رسول حق کے ساتھ آئے اور انھیں پکارا جائے گا کہ اس جنت کا تم کو اس کے بدلے وارث بنایا گیا جو تم کرتے تھے ۱۰۸۳

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

اور جنت والے آگ والوں کو پکاریں گے، کہ بے شک ہم نے جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا تھا سچ پایا، تو کیا تم نے بھی جو تمھارے رب نے وعدہ کیا تھا سچ پایا؟ کہیں گے ہاں! تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں ۱۰۸۴

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ

اور ان کے درمیان ایک پردہ ہوگا ۱۰۸۵ اعراف پر کچھ مرد ہونگے، جو سب کو ان کے نشانوں سے پہچانتے ہونگے ۱۰۸۶ اور وہ جنت

۱۰۸۲ غِلّ۔ کے معنی عداوت ہیں (غ)، یا کینہ رنج حسد۔ نعمائے دنیا کے ساتھ یہ بھی لگا ہوا ہے کہ سینوں میں کسی قدر غل وغش رہتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کینہ یا حسد ہوتا ہے۔ جنت کی نعماء کے ساتھ یہ باتیں نہ ہونگی۔ درجات میں اگر ایک دوسرے سے بلند بھی ہونگے تو بھی دلوں میں کوئی حسد نہ ہوگا۔ وہ نعماء ہر قسم کی ردی آمیزش سے پاک ہوں گی اور یا یہ مراد ہے کہ مومنوں میں بھی بعض وقت غلط فہمیوں سے ایک دوسرے سے رنج ہو جاتا ہے۔ قیامت میں وہ نہ ہوگا۔

۱۰۸۳ اورثتموھا۔ وراثۃ اصل میں اس کو کہتے ہیں کہ کوئی مال کسی غیر سے بلا کسی عہد کے یا بلا ایسی چیز کے جو عہد کے قائمقام ہو پہنچے۔ پھر اس کا استعمال ایسے مال پر ہوتا ہے جو میت سے پہنچتا ہے اور ایسے حصول مال پر بھی ہوتا ہے جو بلا مشقت ملے۔ اور ایسا ہی جب کسی کو کوئی نعمت عطا کی جائے جو اس کے لیے خوشگوار ہو (غ) یہاں جنّت کو مومن کے لیے ورثہ بتانے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے۔ اعمال کا بدلہ بھی ساتھ فرمایا مگر سچ یہی ہے کہ اعمال صالحہ جو انسان کرتا ہے تو وہ اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ ان پر نعماء کا عطا کرنا یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

۱۰۸۴ عوج۔ عَوَج وہ ٹیڑھا پن ہے جو آنکھ سے نظر آجائے اور عِوَج وہ جو بصیرت سے معلوم ہو۔ یبغونہا عوجا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین کو استقامت دی ہے تو یہ اس حالت سے اس کو بدلنا چاہتے ہیں۔

۱۰۸۵ یعنی اہل جنت اور اہل نار کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔ پس وہاں کے حواس الگ ہی ہیں اور وہاں کی کیفیات بھی الگ ہیں۔ دونوں کے درمیان پردہ بھی حائل ہے باایں ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھتے بھی ہیں۔ یہاں کے مکان کی کیفیات وہاں کے مکان کی کیفیات نہیں۔ نیز دیکھو ۱۸۳۸۔

۱۰۸۶ الاَعْراف۔ عُرْف کی جمع ہے اور وہ ہر ایک بلند مرتفع مکان کو کہتے ہیں اور زجاج کا قول ہے کہ اعراف وہ بلند مکان ہیں جو دیوار کے اوپر ہوں اور ایسا ہی جو بلند زمین ہو وہ بھی عُرْف کہلاتی ہے۔ اور ہواؤں اور بادلوں کے اُعْراف وہ ہیں جو پہلے آئیں اور جو بلند ہوں (ل)

الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۟ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝۴۶

والوں کو پکاریں گے کہ تم پر سلامتی ہو وہ ابھی اس میں داخل نہیں ہوئے اور وہ امید رکھتے ہوں گے ۱۰۸۷

وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۷ ع

اور جب اُن کی آنکھیں آگ والوں کی طرف پھریں گی، کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو ظالم قوم کے ساتھ نہ کیجیو ۱۰۸۸

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۴۸

اور اعراف والے کچھ مردوں کو پکاریں گے جن کو وہ ان کے نشانوں سے پہچانتے ہونگے کہیں گے تم کو تمھاری جمعیت نے کچھ فائدہ نہ دیا اور (نہ) اس نے جو تم تکبر کرتے تھے ۱۰۸۹

اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝۴۹

کیا یہ وہی ہیں جو تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ اُن پر رحمت نہیں کرے گا۔ جنت میں داخل ہو جاؤ، تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم پچھتاؤ گے ۱۰۹۰

سیما۔ سام سے ہے اور اس کے معنی علامت ہیں۔
اصحاب اعراف کون لوگ ہیں۔ اکثر مفسرین کا یہ خیال ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہیں اور وہ اعراف کو حجاب قرار دیتے ہیں جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہے۔ مگر لفظ کے لغوی معنی کی رُو سے یہ تاویل درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اعراف بلند مقاموں کا نام ہے۔ دوسرے ان کے مرتبہ کی بلندی اس سے ظاہر ہے کہ وہ سب کو پہچانتے ہیں یعنی اہل دوزخ کو اور اہل جنت کو نشانوں سے پہچانتے ہیں یہ ان کی معرفت بلند کا نتیجہ ہے۔ تیسرے ان کو رجال کہا ہے اگر وہ گروہ مراد ہوتا جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہیں تو رجال کی خصوصیت کے کوئی معنی نہیں۔ کیونکہ ایسی عورتیں بھی ہونگی اور مرد بھی ہونگے۔ رجال کی خصوصیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسل اور انبیاء کا گروہ ہے کیونکہ رسالت مردوں سے مخصوص رہی ہے اور لسان العرب میں ایک قول اصحاب الاعراف کے متعلق یہ بھی منقول ہے کہ وہ انبیاء ہیں۔ اور گو ایک گروہ مفسرین کا اس طرف بھی گیا ہے کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں مگر اس میں بھی رجال کے لفظ کی خصوصیت باقی نہیں رہتی پس حق یہی ہے کہ یہ انبیاء کا گروہ ہے جو اپنی امتوں کو پہچانتے ہیں کہ کون جنت میں جائیں گے اور کون دوزخ میں، اس کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ انبیاء کو ایک خصوصیت دی گئی ہے کہ انہیں اپنی اپنی امتوں پر شہید کہا گیا ہے فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید (النساء ۴ - ۴۱) اور یہ ایک الگ ہی گروہ قرار دیا گیا ہے۔ ہاں اُمت محمدیہ کو یہ فضیلت دی گئی ہے کہ اس کے کامل الایمان لوگوں کو بھی اس گروہ میں داخل کیا ہے جیسے فرمایا لتکونوا شھداء علی الناس (البقرۃ ۲ - ۱۴۳) اور اسی کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے دوسری جگہ تین گروہ ہی بنائے ہیں، ایک سابقون یا مقربوں کا گروہ، ایک اصحاب الیمین یا اہل جنت کا گروہ، ایک اصحاب الشمال یا اہل دوزخ کا گروہ دیکھو سورۃ الواقعۃ اس لیے یہاں اہل جنت اور اہل نار کے علاوہ جس تیسرے گروہ کا ذکر ہو سکتا ہے وہ یہی سابقین اور مقربین کا گروہ ہے۔ اور لسان العرب میں ہے کہ ابن عباس سے دریافت کیا گیا کہ اس قول کے کیا معنی ہیں اھل القراٰن عُرَفاء اھل الجنۃ تو آپ نے فرمایا رؤساء اھل الجنۃ یعنی عرفا سے مراد سردارانِ اہل جنت ہیں۔

ع۱۰۸۷ یعنی اہل جنت ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہاں امیدوار ہیں لیکن یہ مقربین کا گروہ چونکہ بلند مقام پر ہے اس لیے اہل جنت کو پہچانتا ہے۔

ع۱۰۸۸ یہ اس لیے کہیں گے کہ ابھی وہ جنت میں داخل نہیں ہوئے صرفت ابصارھم میں انہی اہل جنت کا ذکر ہے۔

ع۱۰۸۹ جمعکم سے مراد جمعیت بھی ہو سکتی ہے اور مال و دولت کا جمع کرنا بھی، یہ الفاظ کہ اعراف والے دوزخ والوں میں سے خاص لوگوں کو پکاریں گے اور ان کی جمعیت اور ان کا تکبّر یاد دلائیں گے اسی نتیجہ کی موید ہیں جس پر ہم اوپر پہنچے ہیں کہ اصحاب اعراف سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں اور وہ رجال جن کو وہ پکاریں گے وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں اپنے مال اور جتھے کو حق کی مخالفت پر لگایا۔ ان لوگوں کو جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں حق کے ان مخالفین سے کیا تعلق اور ان کے انہیں پہچاننے کا کیا مطلب ؟ ہاں انبیاء ان کو پہچانتے ہوں گے اس لیے کہ ان کی مخالفت ان لوگوں نے کی اور اگلی آیت میں اپنے متبعین کا ذکر کرتے ہیں۔

ع۱۰۹۰ یہ اہل جنت کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو اب جنت میں جا رہے ہیں ان کے متعلق تم کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہیں کرے گا کیونکہ مخالفین حق مومنوں کو ذلیل سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اس قسم کے اقوال دوسری جگہ موجود ہیں اھٰؤلاء الذین من اللہ علیھم من بیننا (الانعام - ۵۳) کیا یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے احسان کیا ہے یعنی استہزا کے طور پر اُن کو کہتے تھے کیونکہ وہ غریب تھے آیت کے پچھلے حصہ

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۵۰﴾

اور آگ والے جنت والوں کو پکاریں گے، کہ ہم پر کچھ پانی بہاؤ، یا اُس سے (دو) جو اللہ نے تم کو رزق دیا ہے۔ کہیں گے اللہ نے ان کو کافروں پر حرام کیا ہے ۱۰۹۱

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾

جنھوں نے اپنے دین کو تماشا اور کھیل بنایا اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا سو آج ہم ان کو چھوڑ دیں گے جس طرح وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے، اور اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے ۱۰۹۲

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور یقیناً ہم نے ان کو کتاب دی جسے ہم نے علم کے ساتھ کھول کر بیان کیا ہے ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَاۤ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع ۱۲

کیا وہ اس کے (بتائے ہوئے) انجام ہی کا انتظار کرتے ہیں جس دن اس کا (بتایا ہوا) انجام آئیگا وہ لوگ جنھوں نے اسے پہلے بھلا رکھا تھا کہیں گے بیشک ہمارے رب کے رسول حق کے ساتھ آئے پس کیا ہمارے کوئی سفارشی ہیں جو ہمارے لیے سفارش کریں یا ہم لوٹائے جائیں تو اور عمل کریں اس کے خلاف جو ہم عمل کرتے تھے انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور وہ جو افترا کرتے تھے ان سے جاتا رہا ۱۰۹۳

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ

تمھارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ وقتوں میں پیدا کیے ۱۰۹۴

میں خطاب اہل جنت کو کرتے ہیں جو ان انبیا کے پیرو ہیں۔

۱۰۹۱ع جو لوگ اس دنیا میں کھانے پینے کے ہی خیال میں منہمک رہے وہاں بھی یہی خیال سر میں رہے گا اور ان کو جواب یہ دیا گیا ہے کہ وہ رزق اب مانگنے سے نہیں مل سکتا۔ ان کے قویٰ ہی اس قابل نہیں کہ وہ روحانی ثمرات حاصل کریں جن کا موقعہ انہوں نے خود گنوا دیا۔ وجہ اگلی آیت میں بتائی ہے۔

۱۰۹۲ع یعنی دنیا میں ان کو موقع دیا گیا تھا جس کو انہوں نے ضائع کر دیا، دین کو ایک کھیل سمجھا اور حیوانی خواہشات پر ہی گرے رہے، اس لیے ان کے روحانی قویٰ مر گئے اور وہ اس رزق کے اہل ہی نہیں رہے گویا اہل جنت بخل نہیں کرتے بلکہ انہیں بتاتے ہیں کہ وہ رزق تو خاص قویٰ کے حصول سے مل سکتا ہے مگر تم نے خود دنیا میں ان قویٰ کو بیکار کر دیا۔ نسیان کے معنی کے لیے دیکھو ع۶۷۔

۱۰۹۳ع تاویل کے معنی کے لیے دیکھو ع۳۷۶ یہاں مراد اس کا بیان کردہ انجام ہے یعنی وہ وعید جو اُن کو دیئے گئے۔ مطلب یہ ہے کہ اصلاح کا وقت تو یہی ہے کہ وعید کے آنے سے پہلے پہلے کرلے جب بدی کا انجام بد ظاہر ہو گیا تو پھر وہ ٹل کس طرح سکتا ہے۔

۱۰۹۴ع یوم کے معنی ع۳۰ میں بیان ہو چکے ہیں۔ ایک لمحہ سے لے کر پچاس ہزار سال کو بھی یوم کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ یوم جس کو ہم دن کہتے ہیں جو آفتاب کے طلوع اور غروب سے تعلق رکھتا ہے وہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بعد ظہور میں آیا۔ پس آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے ذکر میں کبھی بھی مراد چوبیس گھنٹے کا دن رات نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے عام معنی وقت ہی مراد ہیں جو تمام حدبندیوں سے آزاد ہے۔

آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کرنے سے مراد: اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ وہ حق جو وحی لائی ہے ضرور کامیاب ہوگا۔ مگر اس کی ترقی جیسا کہ قدرت کے تمام نظارہ میں ہے تدریجی ہوگی۔ اور اس لیے ابتدایوں کی کہ آسمانوں کو اور زمین کو بھی اللہ تعالےٰ نے چھ وقتوں میں پیدا کیا یعنی ان کی پیدائش کی جو آخری حالت ہے چھ زمانوں میں چھ حالتوں سے گزار کر ان کو اس حالت تک پہنچایا۔ ان معنوں کی صحت پر یہ امر شاہد ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سورۂ المؤمنون کے پہلے رکوع میں انسان کی پیدائش کے بھی چھ ہی مراتب بیان کیے ہیں۔ نطفہ، علقہ، مضغہ۔ مضغہ میں ہڈیوں کا پیدا ہونا، پھر سارے اعضا کا ٹھیک ہو کر ہڈیوں پر گوشت کا چڑھ

الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ قف یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا لا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ط اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ط

پھر وہ عرش پر متمکن ہے [1095] رات کو دن کا لباس پہناتا ہے وہ اس کے پیچھے لگاتار چلا آتا ہے اور سورج اور چاند، ستارے اس کے حکم سے کام میں لگائے گئے ہیں، سُن لو بنانا اور حکم دینا اسی کا کام ہے۔ اللہ

جانا، پھر اس میں زندگی کا پیدا ہونا۔ اور اس کے مقابل پر ہیں یعنی سورۃ المؤمنون میں چھ ہی مراتب خلق روحانی کے بیان فرمائے ہیں۔ زمین کی پیدائش کو اگر لیا جائے تو سائنس سے موجودہ حالت تک پہنچنے میں چھ مرتبے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک وہ حالت جب یہ انگارے کی صورت میں تھی۔ دوسری وہ حالت جب وہ انگارہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوا اور پانی وغیرہ الگ ہوئے۔ تیسری وہ حالت جب اس کی سطح کا اوپر کا حصّہ کافی موٹا ہو گیا اور پہاڑ وغیرہ بن گئے۔ چوتھی وہ حالت جب نباتات بنیں۔ پانچویں وہ حالت جب حیوانات پیدا ہوئے۔ چھٹی وہ حالت جب خلاصہ مخلوقات انسان بنا۔ اسی طرح زمین و آسمان کی ہر چیز کی پیدائش میں چھ مرتبے نظر آتے ہیں۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں بھی چھ مرتبے بتائے گئے ہیں یعنی اوّل مٹی کا پیدا ہونا پھر اس میں پہاڑوں کا بننا، پھر درختوں کا پیدا ہونا۔ پھر مکروہات کا پیدا ہونا، پھر نور کا پیدا ہونا، پھر جانداروں کا پیدا ہونا، پھر انسان کا پیدا ہونا۔ اور یوم الاحد یوم الاثنین وغیرہ کا جو ذکر بعض روایات میں ہے تو اس سے مراد واقعی یہی اتوار پیر وغیرہ کے ایام نہیں، بلکہ پہلا دوسرا دن مراد ہیں اور یوم الجمعۃ سے مراد جمع ہونے کا دن ہے یعنی جس میں آدم کی پیدائش کی وجہ سے ساری مخلوقات جمع ہو گئی۔ ابن جریر میں ایسی ہی ایک روایت کے بعد یہ لفظ آتے ہیں کہ ان چھ دنوں میں سے ہر دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا یہ دن مراد کبھی نہیں لیے گئے بلکہ اس سے مراد چھ اور زمانے ہیں خواہ وہ ایک ہزار سال کے ہوں خواہ پچاس ہزار کے خواہ دس لاکھ کے۔

۱۰۹۵ استوٰی کے لیے دیکھو ع۲۴؎ اس کا استعمال ایک چیز پر اس کی اپنی ذات میں حالت اعتدال پر ہونے پر ہوتا ہے اذا استویت انت (المومنون ۲۳۔ ۲۸) لتستووا علی ظهوره (الزخرف ۴۳۔ ۱۳) فاستوٰی علٰے سوقه (الفتح ۴۸۔ ۲۹) اس معنی میں استوٰی کے معنی متمکن اور مضبوط ہونا ہو سکتے ہیں یا قرار پکڑنا۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ استوٰی کا صلہ علیٰ ہو تو اس کے معنی استیلا یا غالب ہونا ہوتے ہیں اور استوٰی علی العرش کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں استوٰی لهٗ ما فی السمٰوات و ما فی الارض ای اِسْتَقَامَ الْکُلُّ عَلٰی مُرَادِهٖ بِتَسْوِیَةِ اللّٰهِ تعالٰی اِیَّاهُ یعنی جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس کے لیے حالت اعتدال میں ہو گیا یا اس کے ارادہ کے مطابق حالت استقامت میں ہو گیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اعتدال پر بنایا (غ)

العرش۔ راغب کہتے ہیں کہ عرش اصل میں مسقف چیز کو کہتے ہیں اور بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ یعنی تخت کو عرش اس کے علو کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ اس سے مراد عز یعنی غلبہ اور سلطان اور مملکت بھی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے ثُلَّ عَرْشُهٗ جیسا کہ حضرت عمرؓ کی روایت میں ہے اور مراد اس سے لی جاتی ہے کہ اس کا غلبہ اور قدرت جاتی رہی۔ اور پھر لکھتے ہیں کہ اللہ کا عرش ایک ایسی چیز ہے جس کو فی الحقیقت کوئی بشر نہیں جانتا۔ اور جو عوام الناس کا وہم ہے وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں عرش اللہ تعالیٰ کو اُٹھانے والا ہوتا۔ حالانکہ اللہ کی ذات اس سے پاک ہے۔ اور پھر لکھتے ہیں کہ بعض کے نزدیک ذو العرش وغیرہ میں عرش سے مراد اس کی مملکت اور غلبہ ہے نہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ۔ جس سے وہ پاک ہے۔

استوٰی علی العرش سے کیا مراد ہے۔ سو اوّل الفاظ کے استعمال سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ وہی لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتے ہیں جو انسان کے لیے ہوتے ہیں مگر ان کی حقیقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خدا کے بھی ہاتھ ہیں، وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے مگر اس کو انسانوں کے ہاتھوں پر ان کے سننے پر ان کے دیکھنے پر قیاس کرنا صریح غلطی ہے۔ اسی طرح اگر ایک عرش بادشاہ کا ہے اور ایک عرش خدا کا ہے تو ان دونوں سے ایک ہی معنی تخت مراد لینا صریح غلطی ہے۔ بادشاہ کی بادشاہت تخت سے وابستہ ہے مگر خدا کی بادشاہت ان باتوں سے پاک ہے۔ بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے سے مراد صرف اس قدر ہوتی ہے کہ اس کی قدرت اور حکومت کا نفاذ ہو گیا۔ یہی مراد تخت پر بیٹھنے کا ظاہری فعل خدا کے استوٰی علی العرش سے ہو سکتی ہے دیکھو ع۲۷؎ جہاں دکھایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف الفاظ منسوب ہوں تو جو ان میں آلہ یا ذریعہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتا بلکہ صرف فعل کی آخری غرض منسوب ہوتی ہے اور چونکہ انسان کے لیے استوٰی علی العرش سے مراد تخت پر بیٹھنے کے ذریعہ سے اس کی حکومت کا نفاذ پانا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا استوٰی علی العرش صرف نفاذ حکومت و قدرت ہے۔

قرآن کریم کو دیکھیں تو خود اپنے مطلب کو واضح کر دیا ہے سورۂ یونس میں فرمایا ثم استوٰی علی العرش یدبر الامر جہاں استوٰی علی العرش کی تفسیر خود ہی یدبر الامر سے فرما دی یعنی تدبیر امور کرتا ہے۔ پھر خاص اس موقعہ پر پہلے زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر ہے پھر استوٰی علی العرش کا اور آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر ہے له الخلق والامر پیدا کرنا بھی اسی کا کام ہے اور امر بھی اسی کا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ استوٰی علی العرش میں امر الٰہی کے نفاذ کا ذکر ہے اور خود طرز بیان بھی اسی کو چاہتی ہے۔ کیونکہ پیدا کرنا ایک کام ہے اور پیدائش میں نفاذ امر دوسرا کام۔ قدرت دونوں سے کامل ہوتی ہے پیدا بھی کرے اور اسی کا امر بھی اس میں نفاذ پائے۔ یہی معنی قفال نے کیے ہیں (ر)

کرسی اور عرش دونوں کے متعلق عوام میں ایک غلط فہمی ہے۔ اول الذکر کو بخاری نے رفع کر دیا ہے کیونکہ انہوں نے کرسی کے معنی علم کیے ہیں دیکھو ع۳۲۹ ب۔

تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

بابرکت ہے جو جہانوں کا رب ہے ۱۰۹۶

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾

اپنے رب کو عاجزی سے اور چھپ کر پکارو، وہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا ۱۰۹۷

وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

اور زمین کے اندر اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ اور خوف کرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے اس کو پکارو، اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں سے قریب ہے ۱۰۹۸

وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری دیتے ہوئے بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل کو اٹھا لاتی ہیں ہم اس کو ایک مردہ زمین کی طرف چلاتے ہیں پھر ہم اس سے پانی اتارتے ہیں۔ پھر اس سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں اسی طرح ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم نصیحت قبول کرو ۱۰۹۹

اس سے بھی عرش کے معنی قدرت یا نفاذ امر کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر کرسی سے مراد علم ہے تو عوام کا خیال تو خود باطل ثابت ہوا۔ مشہور معنی کے لحاظ سے جس قدر روایات بیان کی جاتی ہیں ان کو بیہقی نے بیان کر کے سب کو ضعیف قرار دیا ہے دیکھو روح المعانی۔ اور اس پر ایک یہ بھی شہادت ہے کہ قرآن کریم میں یہ بار بار ذکر ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین ہے اللہ تعالیٰ کا ہے اور کہ اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر یہ کہیں نہیں کہ جو کچھ کرسی اور عرش میں ہے وہ بھی اس کا ہے یا وہ اسے جانتا ہے حالانکہ اگر کرسی اور عرش دو ایسے فلک ہوتے تو ایسا ذکر ضرور ہونا چاہیئے تھا۔

۱۰۹۶ حثیثا۔ حَثٌّ کے معنی ہیں ملنے میں جلدی کرنا اور حثیث کے معنی ہیں جلدی کرنے والا (ل)

مسخرات۔ تَسْخِیْر کے معنی ہیں غالب ہو کر کسی خاص غرض کی طرف چلانا۔ پس مُسَخَّر وہ ہے جو اس طرح کام میں لگاتا ہے (غ) اور مُسَخَّر وہ جو اس طرح کام میں لگایا جائے اور سُخْرِیّ وہ ہے جس پر دوسرا غالب آجائے پھر وہ اپنے ارادہ سے مسخر ہو جائے لیتخذ بعضکم بعضًا سخریا (الزخرف ۴۳-۳۲) مگر یہ تسخیر سے بھی ہو سکتا ہے اور سُخْرِیَّۃ سے بھی یعنی تمسخر کرنے سے (غ)

تبارك۔ بَرَکَة کسی چیز میں الٰہی خیر کا قائم ہو جانا۔ اور تبارك میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان خیرات کے ساتھ مخصوص ہے جن کا ذکر تبارک کے ساتھ ہے۔

رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں یہ اشارہ ہے کہ اس ظلمت کے بعد جو دنیا میں پھیل رہی ہے اب نور ظہور پذیر ہوگا، اسی مناسبت سے سورج چاند اور ستاروں کا ذکر ہے۔

۱۰۹۷ اسلام پر مصائب کا زمانہ ہے۔ اس لیے دعا کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اب بھی مسلمان دعا کی طرف متوجہ ہوں تو مصائب سے نکلیں۔ لا یحب المعتدین میں بتایا کہ جو لوگ خدا کے حضور عاجزی سے دعا نہیں کرتے وہ دنیا میں ظلم اور زیادتی کرنے لگ جاتے ہیں مگر زیادتی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس لیے تم ہمہ تن دعا کی طرف متوجہ ہو جاؤ تاکہ کامیاب ہو کر ظلم اور زیادتی سے بچو اور اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے تضرع کی دعا وہ ہے جس میں انسان خدا کے حضور گڑگڑاتا اور زور سے دعا کرتا ہے۔ خفیہ یا چھپ کر دعا کرنا بھی اچھا ہے مگر دعا میں تضرع سے ایک خاص کیفیت انسان کے قلب پر پیدا ہوتی ہے۔

۱۰۹۸ یہاں مخلوق خدا کے ساتھ نیکی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ مخلوق خدا کے ساتھ نیکی بھی رحمت الٰہی کی جاذب ہے اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ وہ کامیاب ہوں تو پھر فساد نہ پھیلائیں۔

۱۰۹۹ اقلت۔ اس کا مادہ قِلَّة ہے۔ اور اَقْلَلْتُ کے معنی ہیں میں نے اسے تھوڑے بوجھ کا یا ہلکا پایا۔ اور یہ بعض وقت دوسری چیز کی قوت کی نسبت سے ہوتا ہے پس اَقَلَّت کے معنی ہیں ہواؤں نے اُسے اُٹھایا اور اپنی قوت کے لحاظ سے اسے قلیل پایا (غ) اس لفظ کے استعمال میں لطیف اشارہ ہے کہ ہواؤں میں کس قدر طاقت ہے جو لاکھوں اور کروڑوں من پانی کا بوجھ اُٹھائے پھرتی ہیں۔

قدرت کا ایک عام نظارہ بیان کر کے کہ ٹھنڈی ہوائیں کس طرح بارش کی خوشخبری لاتی ہیں اپنی روحانی بارش کی طرف توجہ دلائی کہ اس کے آگے آگے بھی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ یہ ٹھنڈی ہوائیں اسلام کی ہلکی ہلکی قبولیت کی خوشخبریاں ہیں پھر اس کے بعد وہ وقت بھی آتا ہے کہ یہ روحانی بارش ایک مُردہ زمین پر پڑ کر اسے زندہ کر دے۔ کذلك

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۝۵۸ ع

اور اچھی زمین کا سبزہ اس کے رب کے حکم سے خوب نکلتا ہے اور جو خراب ہے وہاں نکلتا بھی ہے تو ناقص — اسی طرح ہم ان لوگوں کے لیے جو شکر کرتے ہیں بار بار باتیں بیان کرتے ہیں ۱۱۰۰

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵۹

بیشک ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، سو اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۱۱۰۱

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۰

اس کی قوم کے سرداروں نے کہا، ہم یقیناً تجھ کو کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۱

اس نے کہا اے میری قوم مجھ میں کسی طرح کی گمراہی نہیں۔ لیکن میں جہانوں کے رب کا رسول ہوں ۱۱۰۲

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۲

میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ سے کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۱۱۰۳

نخرج الموتی میں مضمون کو بالکل صاف کردیا ہے اور اشارہ انہی مردوں کی طرف ہے جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا او من کان میتا فاحیینٰہ (الانعام ۶ - ۱۲۲)۔

ع ۱۱۰۰ نکد۔ نَکَدٌ یا نَکِدٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے طالب کی طرف تنگی سے نکلتی ہے (رغ)

قبولیت حق میں اختلاف استعداد: اس میں بتایا ہے کہ جس طرح بظاہر میں دیکھتے ہو کہ سب زمینیں یکساں نہیں۔ بارش تو ایک ہی سب پر ہوتی ہے مگر بعض کی استعداد قبولیت اچھی ہوتی ہے اور ان میں روئیدگی بھی اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ بعض زمین ناقص ہوتی ہے اس لیے روئیدگی اس میں نکلے بھی تو نہایت قلیل اور مردہ سی کہ ترقی نہیں کرتی۔ اسی طرح طبائع انسانی کی استعداد میں اختلاف ہے۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق خدا تعالیٰ کی اس روحانی بارش سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ سب پر یکساں توقع غلط ہے۔

ع ۱۱۰۱ نوح۔ نبی کا نام ہے اور نَوْح کے معنی نوحہ کرنا ہیں (رغ)

انبیاء کے ذکر کی غرض: وحی الٰہی کے جھٹلانے کے بُرے نتائج سے قریش اور دشمنان اسلام کو آگاہ کرکے اب کچھ مثالیں پہلی تاریخ سے پیش کی ہیں کہ کس طرح جن لوگوں نے پہلے پیغمبروں کے ساتھ عداوت کرکے ان کو تباہ کرنا چاہا ان کا انجام خطرناک ہُوا۔ پیغمبروں کا ذکر جو قرآن کریم میں آتا ہے اس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قصوں کے رنگ میں نہیں اور اسی لیے ساری تفصیلات کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ صرف ان امور کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے ذریعہ سے اعدائے اسلام کو متنبہ کرنا مقصود ہو۔ مثلاً تعلیم میں سے عموماً یہ موٹا اصول لے لیا ہے جو سب انبیاء کی تعلیم میں مشترک ہے کہ خدا ایک ہے اسی کی عبادت کرو تقویٰ اختیار کرو۔ خلق خدا کے ساتھ نیکی کرو۔ لوگوں نے کیا سلوک کیا اس کی تفصیلات کو عموماً چھوڑ دیا ہے امر مشترک کہ نبی کو جھوٹا کہا اس کے تباہ کرنے کی کوشش کی اس کی مخالفت پر کھڑے ہو گئے اس کو بیان کردیا ہے۔ اور پھر آخر بتادیا ہے اعدا ہلاک ہو گئے اور تعلیم حق پھیل گئی عموماً یہ ذکر مکی سورتوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا کسی کو وہم بھی نہ ہو سکتا تھا اور جہاں اعدا کی طاقت کے نیست و نابود ہونے کا کسی کو تب بھی نہ ہو سکتا تھا پس ان انبیاء کا ذکر درحقیقت ایک پیشگوئی کے طور پر ہے کہ جس طرح پہلوں کے اعدا تباہ ہو گئے اسی طرح محمد رسول اللہ صلعم کے دشمن بھی تباہ ہو جائیں گے۔

یہاں جن انبیاء کا ذکر کیا ہے وہ تاریخی ترتیب سے ہے اور چند نہایت مشہور انبیاء کا ذکر کردیا ہے۔ آدم کا ذکر تو پہلے ضرورت وحی میں ہی آچکا۔ اب سب سے پہلے نوحؑ کا ذکر کیا ہے۔ گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ عرب کے اردگرد جس قدر نبی ہوئے ان میں سے تاریخی طور پر جن انبیاء کا ذکر باقی رہ گیا ہے ان میں حضرت نوحؑ ہی سب سے پہلے نبی تھے۔ اس لیے ان کے ذکر سے ابتدا کی۔ حضرت نوحؑ کا ذکر علاوہ اس موقعہ کے ذیل کے مقامات پر آتا ہے:۔

آل عمران ۳ - ۳۲؛ الانعام - ۸۵؛ یونس ۱۰ - ۷۱ تا ۷۳؛ ہود ۱۱ - ۲۵ تا ۴۸ - ابراہیم ۱۴ - ۹؛ بنی اسرائیل ۱۷ - ۳؛ الانبیاء ۲۱ - ۷۶ - ۷۷؛ المؤمنون ۲۳ - ۲۳ تا ۲۹؛ الفرقان ۲۵ - ۳۷؛ الشعراء ۲۶ ۱۰۵ تا ۱۲۲؛ العنکبوت ۲۹ - ۱۴ - ۱۵؛ الصّٰفّٰت ۳۷ - ۷۵ تا ۸۲؛ الذاریات ۵۱ ۴۶؛ النجم ۵۳ - ۵۲؛ القمر ۵۴ - ۹ تا ۱۶؛ التحریم ۶۶ - ۱۰؛ الحاقّۃ ۶۹ ۱۱ - ۱۲؛ نوح ۷۱

ع ۱۱۰۲ بتایا کہ رسول میں ضلالت نہیں ہو سکتی عصمت انبیاء پر قرآن کریم کی یہ شہادت بھی کافی ہے۔

ع ۱۱۰۳ نصحت۔ نُصح ایسے فعل یا قول کا قصد ہے جس میں دوسرے کی صلاحیت یا بھلائی ہو اور اسی سے ناصح ہے اور نَصَح کے اصل معنی میں خالص کیا اسی سے ہے۔ توبۃ نصوحا (التحریم ۶۶ - ۸) یعنی خالص توبہ۔

أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾

اور کیا تم تعجب کرتے ہو کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے نصیحت آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تاکہ تم تقوٰے کرو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَأَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ ع ۸ ۱۵

پر انھوں نے اس کو جھٹلایا سو ہم نے اسے اور انھیں جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے بچالیا اور انھیں غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ اندھی قوم تھی ۱۱۰۴

وَإِلٰى عَادٍ أَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ أَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾

اور عاد کی طرف اُن کے بھائی ہُود کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے سوائے اس کے کوئی معبود نہیں پس کیا تم تقویٰ اختیار نہ کروگے ۱۱۰۵

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ إِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾

اس کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے، کہا ہم تجھے بے وقوف دیکھتے ہیں اور ہم تجھے جھوٹوں میں سے سمجھتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾

اس نے کہا اے میری قوم مجھ میں بے وقوفی کوئی نہیں لیکن جہانوں کے رب کا رسول ہوں۔

أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾

مَیں تمھیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمھارا امانت دار خیر خواہ ہوں ۱۱۰۶

أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

اور کیا تم تعجب کرتے ہو کہ تمھارے پاس تمھارے رب

ع ۱۱۰۴ طوفان نوحؑ: طوفان کے متعلق مفصل ذکر آگے آئے گا۔ لیکن کلام پاک کے یہ الفاظ واغرقنا الذین کذبوا بایٰتنا صاف بتاتے ہیں کہ صرف وہی لوگ غرق ہوئے جن کی طرف حضرت نوحؑ پیغام لائے اور جنہوں نے آپ کو جھوٹا کہا اور آپ کی مخالفت کی اور حضرت نوحؑ کا پیغام صرف اپنی قوم کی طرف تھا جیسا کہ آیت ۵۹ سے ظاہر ہے نہ کل عالم کی طرف اس سے سارے عالم پر محیط ہونے والے طوفان کا خیال غلط ٹھہرتا ہے۔

ع ۱۱۰۵ نوح کی قوم کے بعد بلحاظ ترتیب زمانی عاد کا ذکر کیا ہے یہ ایک بڑی زبردست قوم تھی جو عرب کے جنوب میں الاحقاف میں آباد تھی اور جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے ان کا عروج اس قدر ہوگیا تھا کہ یہاں سے نکل کر انہوں نے بہت سے ملکوں پر اپنا قبضہ جمالیا تھا۔ خود عاد جس کے نام پر اس قوم کا نام ہوا ارم کا پوتا تھا۔ جو نوح کا پوتا تھا اور اس قوم کو بعض وقت عاد اولیٰ بھی کہا جاتا ہے اور ثمود کو جو اس قوم کی ایک شاخ تھی عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔ اس قوم کے تاریخی نشانات اور کتبے بھی ملے ہیں۔ انہوں نے اپنے چار دیوتا قرار دیئے ہوئے تھے۔ ساقیہ۔ حافظہ۔ رازقہ۔ سالمہ یعنی بارش کا دیوتا۔ دشمنوں سے بچانے والا دیوتا۔ رزق کا دیوتا۔ صحت کا دیوتا۔ حضرت ہودؑ کو جو ان کی طرف مبعوث ہوئے ان کا بھائی اسی قوم میں سے ہونے کی وجہ سے کہا ہے۔

عاد کا ذکر علاوہ اس واقعہ کے ذیل کے مقامات پر ہے:۔

ہود ۱۱ - ۵۰ سے ۶۰؛ ابراہیم ۱۴ - ۹؛ الفرقان ۲۵ - ۳۸؛ الشعراء ۲۶ - ۱۲۳ سے ۱۴۰؛ العنکبوت ۲۹ - ۳۸؛ حٰم ۴۱ - ۱۳ سے ۱۶؛ الاحقاف ۴۶ - ۲۱ سے ۲۶؛ الذاریات ۵۱ - ۴۱ - ۴۲؛ النجم ۵۳ - ۵۰؛ القمر ۵۴ - ۱۸ سے ۲۱؛ الحاقۃ ۶۹ - ۴ و ۶ تا ۸؛ الفجر ۸۹ - ۶ تا ۸۔

ع ۱۱۰۶ امین۔ امن طمانیت نفس کا نام ہے اور امین وہ ہے جس کے متعلق ایسی طمانیت نفس حاصل ہو (غ) پس امین وہ ہے جو ایسی ہر طرح کی خوبیوں سے متصف ہو کہ اس کے متعلق سب کو طمانیت نفس حاصل ہو اور چونکہ امانۃ کا لفظ بھی ان تمام فرائض پر بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذمہ رکھے ہیں (ل) اس لیے امین وہ ہے جو تمام فرائض انسانی کو ادا کرنے والا ہو۔ ایک رسول کو امین یعنی ہر طرح سے راستباز قرار دے کر تمام رسولوں کی عصمت کے اصول کو بیان کر دیا۔ ورنہ یہ مطلب نہیں کہ حضرت ہودؑ تو امین تھے اور حضرت عیسٰیؑ امین نہ تھے اس لیے کہ ان کے متعلق یہ لفظ قرآن شریف میں نہیں آیا۔

عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

کی طرف سے تم میں سے ہی ایک شخص کے ذریعہ سے نصیحت آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور یاد کرو جب اس نے تم کو نوح کی قوم کے بعد بادشاہ بنایا اور تم کو پیدائش میں قوت میں بڑھایا سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ ؏۱۱۰۷

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾

انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور اس کو چھوڑ دیں جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ تو ہم پر لے آ جو تو ہمیں وعدہ دیتا ہے اگر تو سچوں میں سے ہے۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِىْ فِىْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾

اس نے کہا یقیناً تمھارے رب کی طرف سے تم پر پلیدی اور ناراضگی آچکی۔ کیا تم میرے ساتھ (ان) ناموں پر جھگڑتے ہو، جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں اللہ نے اُن کے لیے کوئی سند نہیں اتاری سو انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ؏۱۱۰۸

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾ ع

سو ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ مومن نہ تھے۔

وقف لازم

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِىْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا ؏۱۱۰۹ اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے کھلی دلیل آچکی۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے نشان ہے سو اس کو چھوڑ دو، اللہ کی زمین میں چرے اور اس کو کوئی دکھ نہ پہنچاؤ ورنہ تمھیں دردناک عذاب پکڑے گا ؏۱۱۱۰

؏۱۱۰۷ بصطة ۔ بَسْط سے ہے جس کے معنی فراخی ہیں (غ) وزادہ بسطة فی العلم والجسم (البقرۃ ۲ - ۲۴۷) اور بسطة یا بصطة سے مراد قوت اور زیادتی جسم ہے۔

الخلق سے مراد ابداع یعنی پیدائش یا بناوٹ بھی ہو سکتی ہے اور مخلوق بھی۔

قوم عاد قوت میں اور غالباً قوت جسمانی میں بھی اپنے ہمعصروں پر فوقیت لے گئی تھی اور بڑے حصّہ دنیا کو اپنی قوت سے اپنے تصرف میں کر لیا تھا۔

؏۱۱۰۸ اسماء کے لفظ میں ان دیوتاؤں کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اپنے لیے مقرر کر رکھے تھے دیکھو ؏۱۱۰۵ ان کو محض نام کہا ہے جن کے نیچے حقیقت کوئی نہیں۔

؏۱۱۰۹ قوم ثمود جو ارم کے ایک دوسرے پوتے کے نام پر مشہور ہوئی قوم عاد سے قریبی تعلق رکھتی ہے مگر عاد کے دو سو سال بعد اس کا عروج ہوا۔ یہ قوم مدینہ کے شمال میں الحجر کے علاقہ میں آباد تھی جو پہاڑی علاقہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ثمود ان کا نام ثَمَد سے ہے جس کے معنی قلیل پانی ہیں جس کا مادہ کوئی نہ ہو (غ)، یہ پہاڑی علاقہ تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ بارش کا پانی اکٹھا کر کے گزارہ کرتے تھے اور چشموں کی بہت قلت تھی۔ اس قوم کا ذکر علاوہ اس موقع کے ذیل کے مقامات پر ہوا ہے:۔

ہود ۱۱ - ۶۱ تا ۶۸؛ ابراہیم ۱۴ - ۹؛ الحجر ۱۵ - ۸۰ تا ۸۴؛ الفرقان ۲۵ - ۳۸؛ الشعراء ۲۶ - ۱۴۱ تا ۱۵۹؛ النمل ۲۷ - ۴۵ تا ۵۳؛ العنکبوت ۲۹ - ۳۸؛ حٰم ۴۱ - ۱۳ و ۱۴ و ۱۷ و ۱۸؛ الذاریات ۵۱ - ۴۳ تا ۴۵؛ النجم ۵۳ - ۵۱؛ القمر ۵۴ - ۲۳ تا ۳۱؛ الحاقۃ ۶۹ - ۴ و ۵؛ الفجر ۸۹ - ۹؛ الشمس ۹۱ - ۱۱ تا ۱۵۔

؏۱۱۱۰ ناقة اللہ ۔ یہ اضافت محض تعظیم کے لیے ہے جیسے بیت اللہ میں ۔ اور ادنیٰ ملابست کی اضافت ہے۔ کیونکہ اللہ کی طرف سے وہ اونٹنی بطور نشان قرار

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾

اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمھیں زمین میں ٹھکانا دیا، تم اس کے میدانوں میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر کوٹھیاں بناتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرو ۱۱۱۱

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾

سرداروں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے تکبر کیا، ان سے جو کمزور تھے جو ان میں سے ایمان لائے کہا کیا تم جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ بولے جو کچھ اسے دیکر بھیجا گیا ہے اس پر ایمان لانے والے ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

جو متکبر تھے بولے، جس پر تم ایمان لائے ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾

پس انھوں نے اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہا اے صالحؑ لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے، اگر تو پیغمبروں میں سے ہے ۱۱۱۲

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾

سو اُن کو زلزلہ نے آ پکڑا، تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے ۱۱۱۳

دی گئی کہ جو کوئی اس کو مارے گا وہ خود تباہ کر دیا جائے گا جس طرح بیت اللہ کو ایک نشان قرار دیا گیا کہ جو کوئی اس کو برباد کرنا چاہے وہ خود برباد کر دیا جائے گا باقی باتیں کہ یہ اونٹنی پتھر سے پیدا ہوئی تھی اور تنہا ساری قوم کا پانی پی جاتی تھی محض قصے ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ اونٹنی کا نشان تکذیب کے بعد دیا گیا اور وہ عذاب کے آنے کے لیے محض ایک نشان کے طور پر تھا جیسا کہ جاءتکم بینۃ من ربکم سے ظاہر ہے یعنی حق کی دلائل تو آ چکیں مگر چونکہ ان دلائل کی پروا نہیں کی اس لیے اب عذاب آتا ہے۔ یہ ذکر زیادہ تفصیل سے سورۂ ہود میں اور سورۂ شعراء میں موجود ہے اور موخر الذکر سورت میں لمبی بحث کے بعد وہ خود نشان مانگتے ہیں فات بایۃ ان کنت من الصٰدقین (الشعراء ۲۶ ۔ ۱۵۴) اور اس اونٹنی کے مارنے میں بھی درحقیقت ایک تمہید معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس کے بعد وہ خود حضرت صالحؑ کو مارنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حضرت صالحؑ کے خلاف ان کی اس سازش کا ذکر سورۂ النمل ۲۷ ۔ ۴۸ و ۴۹ میں موجود ہے کہ آپ کے اور آپ کے سب ساتھیوں کو قتل کرنے کا منصوبہ وہ کر چکے تھے لنبیّتنّہٗ واھلہٗ پس اس اونٹنی کا مار دینا آخری نشان تھا کہ اب وہ حضرت صالحؑ کو قتل کر دیں گے۔ اور حضرت صالحؑ کا یہ فرمانا کہ اسے چھوڑ دو اللہ کی زمین میں چرے یا یہ کہ اس کو بھی پانی پینے دو یہ بتانے کو تھا کہ اگر تمھیں عداوت ہے تو مجھ سے ہے ایک بے زبان جانور کو دکھ نہ پہنچاؤ۔

ع ۱۱۱۱ سھول۔ سَہْل کی جمع ہے۔ سہولت یا آسانی اور سَہْل صاف اور ہموار زمین کو کہتے ہیں جو حَزْن کی ضد ہے یعنی اونچی نیچی زمین۔ (غ)

اٰلاء۔ مادہ الیٰ ہے اور اس کے معنی نعمتیں ہیں واحد اَلًی یا اِلْیٌ ہے (غ)

تنحتون۔ نحت لکڑی یا پتھر اور سخت اجسام کے تراشنے پر بولا جاتا ہے۔

ع ۱۱۱۲ عقروا۔ عَقْر کسی چیز کا اصل ہے اور عَقَرْتہٗ کے معنی ہیں اس کے اصل یا سر کو کاٹ دیا۔ اور کھجور کا عقر اس کا کاٹ دینا اور اونٹ کا عقر اس کا ذبح کرنا یا مار دینا ہے (غ)

ع ۱۱۱۳ الرجفۃ۔ رجف اضطراب شدید کو کہتے ہیں یوم ترجف الارض والجبال (المزمل ۷۳ ۔ ۱۴) ترجف الراجفۃ (النزعٰت ۷۹ ۔ ۶) اور ارجاف کے معنی ہیں اضطراب شدید میں ڈال دینا قول سے ہو یا فعل سے والمرجفون فی المدینۃ (الاحزاب ۳۳ ۔ ۶۰) اور رجفۃ زلزلہ ہے۔

فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَكُمۡ وَلٰكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِيۡنَ ﴿۷۹﴾

پس اس نے اُن سے منہ پھیرا اور کہا اے میری قوم یقیناً میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمھارا بھلا چاہا، لیکن تم خیر خواہوں کو دوست نہیں رکھتے ؏۱۱۱۴

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۸۰﴾

اور لوطؑ کو (بھیجا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسی بےحیائی کرتے ہو جو تم سے پہلی قوموں میں سے کسی نے نہیں کی ؏۱۱۱۵

اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ ﴿۸۱﴾

تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے آتے ہو، بلکہ تم حد سے نکل جانے والے لوگ ہو۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۸۲﴾

اور اس کی قوم کا جواب کچھ نہ تھا مگر یہ کہ انھوں نے کہا ان کو اپنی بستی سے نکال دو یہ وہ لوگ ہیں جو پاک بنتے ہیں ؏۱۱۱۶

فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۖ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۸۳﴾

سو ہم نے اُسے اور اس کے اہل کو بچا لیا، مگر اس کی عورت وہ پیچھے رہنے والوں میں سے تھی ؏۱۱۱۷

جٰثمین۔ جثم پرند کے متعلق کہا جاتا ہے جب وہ زمین پر بیٹھ جائے اور اس سے لگ جائے۔ پس جٰثمین سے مراد ہے جہاں تھے وہیں رہ گئے (غ)، جیسا زلزلہ میں دبکر لوگ رہ جاتے ہیں یہاں الرجفۃ کا لفظ استعمال کرکے صاف بتا دیا کہ ثمود کی قوم کا عذاب بھونچال تھا صیحۃ صاعقۃ وغیرہ نام سب زلزلہ پر صادق آتے ہیں۔ کیونکہ سخت زلزلہ کے ساتھ خطرناک آواز بھی ہوتی ہے۔

؏۱۱۱۴ چونکہ اعدائے حق کی عادت ہمیشہ یہی چلی آئی ہے اور اس وقت بھی مخالفین حق کی یہی حالت تھی جیسے آج بھی ہے اس لیے استمرار کو ظاہر کرنے کے لیے مضارع استعمال کیا۔

؏۱۱۱۵ ترتیب زمانی کے لحاظ سے ثمود کے بعد ابراہیم کا ذکر چاہیئے تھا مگر اس ذکر کو بالکل چھوڑ کر لوط کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا ذکر پہلے الگ سورۃ الانعام میں کر دیا گیا ہے اور یہ علیحدہ ذکر بھی بلا وجہ نہیں جس قدر انبیاء کا یہاں ذکر کیا ہے وہ اس غرض کے لیے ہے کہ بتایا جائے کہ ان کے اعدا ہلاک ہو گئے اس لیے حضرت ابراہیمؑ کو جن کی قوم پر ایسے عذاب کے آنے کا کوئی ذکر نہیں ان انبیاء سے الگ کر دیا۔ اور آنحضرت صلعم کے اعدائے ساتھ سلوک حضرت ابراہیمؑ کے اعدا والا ہوا یعنی ان کو تباہ نہیں کیا گیا مگر ان کی قوت توڑ کر ان کا استیصال کرکے ایک رنگ میں دوسرے انبیاء کے اعدا کے ساتھ ان کو شامل کر دیا۔

حضرت لوط اور بائبل میں تحریف: حضرت لوط حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے مگر علیحدہ قوم کی طرف مبعوث ہوئے یعنی سدومیوں کی طرف بائبل میں جو ذکر لوط کا ہے اس میں حضرت لوط کو بدترین افعال شنیعہ کا مرتکب بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ نعوذ باللہ من ذٰلک اپنی بیٹیوں سے ناجائز تعلق کے مرتکب ہوئے۔ مگر جس طرح کئی ایک انبیاء کے متعلق بائبل میں تحریف ہو کر غلط باتیں راہ پا گئیں اسی قسم کی یہ ایک غلطی ہے جو بائبل کی تحریف کو ثابت کرتی ہے۔ چنانچہ خود سیل نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لوطؑ انبیاء میں سے تھے اور عیسائی اس بارہ میں مجبور ہیں گو بائبل کو تحریف کے الزام سے بچانے کے لیے انکار بھی کر دیں کیونکہ پطرس کی شہادت ۲ پطرس ۲: ۷و۸ میں یوں مرقوم ہے "اور راستباز لوط کو جو شریروں کی ناپاک چالوں سے دق ہوا رہائی بخشی کہ وہ راستباز اُن میں رہ کر ان کے بے شرع عملوں کو دیکھ سُن کے ہر روز اپنے سچے دل کو شکنجے میں کھینچتا تھا۔" بھلا جو شخص ایسے گندے فعل کا ارتکاب کرے یعنی بیٹیوں سے ناجائز تعلق رکھے وہ راستباز کہلا سکتا ہے، اور اس کا دل دوسروں کے اسی قسم کے گندے فعل سے کیوں دکھے گا۔ پس بائبل کو خود بائبل غلط ٹھہراتی ہے اور صحیح فیصلہ قرآن کا ہے کہ لوطؑ انبیاء میں سے تھے۔

لوط کا ذکر علاوہ اس مقام کے ذیل کے مقامات پر آیا ہے الانعام ۸۶؛ ہود ۷۰ تا ۸۳؛ الحجر ۶۱ تا ۷۴؛ الانبیاء ۷۴ و ۷۵؛ الشعراء ۱۶۰ تا ۱۷۴؛ النمل ۵۴ تا ۵۸؛ العنکبوت ۲۶ تا ۳۵؛ الصٰفٰت ۱۳۳ تا ۱۳۶؛ الذاریات ۳۲ تا ۳۷؛ النجم ۵۳ و ۵۴؛ القمر ۳۳ تا ۳۸؛ التحریم ۱۰۔

؏۱۱۱۶ حضرت لوطؑ باہر سے آکر ان کی بستی میں آباد ہوئے تھے۔ یہ محض ان کی اصلاح کے لیے تھا اور حکم خداوندی کے ماتحت آئے تھے۔

؏۱۱۱۷ اھل۔ ایک شخص کے اہل میں وہ سب لوگ داخل ہیں جن کو ایک گھر یا ایک نسب یا ایک شہر یا ایک دین جمع کرے (غ) یہاں اھلہ سے مراد حضرت لوطؑ کے متبع ہی ہیں (ج) اور بلاشبہ انبیاء کے ساتھ ان کے متبع ہی بچائے جاتے ہیں اور اوپر اناس یتطہرون میں حضرت لوطؑ کے پیروؤں کا ہی ذکر تھا۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٨٤﴾

اور ہم نے اُن پر ایک مینہ برسایا۔ پس دیکھ مجرموں کا انجام کیسا ہوا[۱۱۱۸]

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٨٥﴾

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو (بھیجا) — اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں یقیناً تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس کھلی دلیل آچکی[۱۱۱۹] سو ماپ اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم مان لو[۱۱۲۰]

وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨٦﴾

اور ہر ایک رستہ پر مت بیٹھو تم ڈراتے ہو، اور اللہ کی راہ سے اُسے روکتے ہو جو اس پر ایمان لاتا ہے اور اس میں ٹیڑھاپن چاہتے ہو — اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے پھر تم کو بہت کر دیا اور دیکھ لو کہ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا[۱۱۲۱]

وَ اِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٧﴾

اور اگر تم میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اس پر ایمان لایا ہے جو مجھے دیکر بھیجا گیا ہے اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

غابرین۔ غابر اس کو کہا جاتا ہے جو اپنے ساتھیوں کے چلا جانے کے بعد باقی رہ جائے اور غُبار وہ ہے جو مٹی اڑانے پر باقی رہ جاتا ہے اسی سے غَبَرَۃ ہے علیھا غَبَرَۃ (عبس ۸۰-۴۱) اور یہ کنایہ ہے غم کی وجہ سے چہرہ پر تغیر آجانے سے (غ)

ع۱۱۱۸ مَطَر مطلق بارش کو کہتے ہیں۔ لیکن مَطَرَ بھلائی میں اور اَمْطَرَ عذاب میں استعمال ہوتا ہے (غ)

یہ بارش کیا تھی اس کا ذکر دوسری جگہ آتا ہے کہ پتھروں کی بارش تھی (ہود ۱۱-۸۲۔ الحجر ۱۵-۷۴) جس سے معلوم ہوا کہ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا تھا۔

ع۱۱۱۹ شعیبؑ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے پانچویں پشت میں ہیں اس لیے ان کا ذکر تاریخی ترتیب میں حضرت لوطؑ کے بعد آیا ہے۔ بائبل میں ہے کہ مدیان ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کا نام تھا جو ان کی تیسری بی بی قتورہ کے بطن سے پیدا ہوا۔ اسی نام کا ایک شہر بحیرہ قلزم پر ہے جہاں مدیان کی نسل آباد ہوئی۔ شعیبؑ کا ذکر ذیل کے مقامات پر بھی آیا ہے:۔ ہود ۱۱-۸۴ تا ۹۵؛ الحجر ۱۵-۷۸ و ۷۹؛ الشعراء ۲۶-۱۷۶ تا ۱۹۱؛ العنکبوت ۲۹-۳۶ و ۳۷۔

ع۱۱۲۰ کیل۔ کَیْل (ماضی کَالَ) کے معنی غلّہ کا ماپ کر دینا اور اِکْتَالَ علیہ دوسرے سے ماپ کر لینا اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم (التطفیف ۸۳-۳) اور یہ گو ماپ میں خاص ہے مگر مراد تمام معاملات میں جہاں لینا یا دینا ہو انصاف کا مدنظر رکھنا ہے اور کیل بعیر (یوسف ۱۲-۶۵) سے مراد مقدار حمل بعیر ہے یعنی اونٹ کے بوجھ کی مقدار فارسل معنا اخانا نکتل (یوسف ۱۲-۶۳) (غ)

میزان۔ دیکھو ع۱۰۵۰ اور وزن کرنا یا وزن یا میزان کا قائم کرنا عام ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ تمام اقوال و افعال میں جنہیں انسان مدنظر رکھتا ہے عدل کی رعایت ملحوظ رکھے (غ)

تبخسوا۔ بَخْس تھوڑی ناقص چیز کو کہتے ہیں وشروہ بثمن بخس (یوسف ۱۲-۲۰) اور ظلم کے طریق پر کسی چیز کے کم کرنے کو کہا جاتا ہے (غ)

ع۱۱۲۱ رستوں میں بیٹھنا حقیقی معنی میں بھی ہو سکتا ہے یعنی ڈاکہ مارنے کے معنی میں، جیسے قطع طریق آتا ہے اور مجازی معنی میں بھی۔ یعنی مراد اس سے صرف لوگوں کا ڈرانا

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾

سرداروں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے تکبر کیا کہا، اے شعیبؑ ہم تجھ کو اور ان کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ضرور اپنی بستی سے نکال دینگے یا تمھیں ہمارے مذہب میں لوٹ آنا ہوگا۔ کہا، کیا اس حال میں بھی کہ ہم بیزار ہوں ۱۱۲۲

یقیناً ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا، اگر ہم تمھارے مذہب میں لوٹ آئیں اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی اور ہمیں شایاں نہیں کہ ہم اس میں لوٹ آئیں مگر جو اللہ ہمارا رب چاہے ۱۱۲۳ ہمارے رب کا علم تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ۱۱۲۴

اور اس کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے کہا اگر تم نے شعیبؑ کی پیروی کی، تو تم یقیناً نقصان اُٹھانے والے ہوگے۔

ہو اور کل صراط سے مراد ہر ایک حق کا رستہ ہے۔ نبی کریم صلعم کے اعدا بھی ایسا ہی کرتے تھے اور انہی کی طرف اشارہ کرنے کو اس کا ذکر کیا۔

ع۱۱۲۲ لتعودن۔ عود کے اصل معنی ہیں ایک چیز سے انصراف یعنی پھر جانے کے بعد اس کی طرف رجوع کرنا۔ خواہ اپنی ذات سے ہو یا محض قول سے یا عزیمت سے (غ) بعض اہل لغت نے عاد بمعنی صار بھی لیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کبھی حالت ضلالت میں نہیں ہوتے چہ جائیکہ ان کی طرف کفر منسوب کیا جا سکے عود کا لفظ محض اس لیے استعمال کیا کہ قوم کی حالت عام طور پر کفر کی تھی۔ یا وہ ایک قومی مذہب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کفار ملّتنا کہتے ہیں یعنی اس مذہب کو اپنا مذہب قرار دیتے ہیں اور حضرت شعیبؑ جواب میں ملتکم کہتے ہیں یعنی تمہارا مذہب اور اس لیے بھی عود کا استعمال جائز ہے کہ یہاں اکیلے حضرت شعیب کا ذکر نہیں بلکہ والذین اٰمنوا کا ذکر بھی ساتھ ہے اور یہ لوگ بلا شبہ حالتِ کفر سے نکل کر حالتِ اسلام کی طرف آئے تھے۔ قرآن کریم کی اس دلیل پر کہ جب ہم ایک عقیدہ سے دل سے بیزار ہیں، تو اس کی طرف کیونکر آ سکتے ہیں۔ وہ لوگ غور کریں جو ایسے مہدی کا آنا مانتے ہیں جو تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان کریگا۔ خواہ دل سے وہ ان عقاید کو ناپسند ہی کرتے ہوں۔

ع۱۱۲۳ الّا ان یشاء اللہ ربنا۔ ایک طرف تو یہ زور سے کہا ہے کہ ہم کہاں کفر کی حالت میں جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف استثنا بھی کیا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو جس طرح وہ چاہے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہر کہ عارف تر است ترساں تر۔ اور انبیاء کا ایمان بھی بین الخوف والرجاء ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی بشر ہیں لیکن اصل بات جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ حضرت شعیبؑ کو اور آپ کے ساتھیوں کو باکراہ کفر کی طرف لوٹانا چاہتے ہیں۔ اور مومن سب یکساں نہیں ہوتے بعض حالت اجبار و اکراہ میں نبی کا ساتھ نہیں دے سکتے اس لیے فرمایا کہ اگر اللہ کو منظور ہے کہ کوئی ان مومنوں میں سے پھر جائے تو جیسا وہ چاہے ورنہ ہم اپنے اختیار سے تو کبھی پھر نہیں سکتے۔ اس اکراہ و اجبار کے ذکر میں بھی مسلمانوں پر جو جبر کیا جاتا تھا اس کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی دوسرے کے ذکر میں بتا دیا کہ مسلمان ہو کر پھر کوئی شخص کفر کی طرف نہیں لوٹ سکتا اور مسلمانوں کے متعلق تاریخی شہادت موجود ہے کہ سوائے ان لوگوں کے جو پہلے منافقت کے طور پر اور اسلام کی دشمنی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام میں داخل ہوئے مسلمانوں میں سے کوئی لوگ مرتد نہیں ہوئے۔

ع۱۱۲۴ افتح۔ فاتح۔ فتح کے اصل معنی زنجیروں اور بیڑیوں کا دور کرنا ہیں پھر یہ یا مادی طور پر ہو سکتا ہے یعنی جو آنکھوں سے دیکھا جا سکے جیسے فتح الباب وغیرہ ولما فتحوا متاعھم (یوسف ۔۶۵) یا ذہنی طور پر جو بصیرت سے معلوم ہو سکے جیسے ہم و غم کا دور کرنا مال و دولت دیکر فتحنا علیھم ابواب کل شیء (الانعام ۴۴) لفتحنا علیھم برکات من السمآء والارض (۹۶) یا علوم کا عطا فرمانا جیسا کہ انا فتحنا لک فتحا مبینا (الفتح ۴۸-۱) میں بعض لوگوں نے مراد لیا ہے کہ مراد اس سے ان علوم و ہدایات کا دیا جانا ہے جو ثواب اور مقام محمود تک پہنچانے کا اور یوں غفر ذنوب کا ذریعہ ہو گئے۔ اور دو شخصوں کے درمیان فتح یا فتح قضیۃ کے معنی ہیں باہمی اختلاف یا جھگڑے کا فیصلہ کر دینا اور یہی معنی یہاں مراد ہیں (غ)

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِیۡنَ ﴿۹۱﴾

سو اُن کو زلزلے نے آ پکڑا، پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا شُعَیۡبًا کَاَنۡ لَّمۡ یَغۡنَوۡا فِیۡهَا ۚۛ اَلَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا شُعَیۡبًا کَانُوۡا هُمُ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۹۲﴾

وہ جنھوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا گویا کہ وہ وہاں بسے ہی نہ تھے۔ وہ جنھوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا، وہی نقصان اٹھانے والے ہوئے۔

فَتَوَلّٰی عَنۡهُمۡ وَقَالَ یٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَنَصَحۡتُ لَکُمۡ ۚ فَکَیۡفَ اٰسٰی عَلٰی قَوۡمٍ کٰفِرِیۡنَ ﴿۹۳﴾ ع

تب اس نے ان سے مُنہ پھیر لیا اور کہا اے میری قوم یقیناً مَیں نے تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے اور تمھارا بھلا چاہا، سو میں نہ ماننے والی قوم پر کیا افسوس کروں۔ ۱۱۲۵ع

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَةٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ یَضَّرَّعُوۡنَ ﴿۹۴﴾

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس کے رہنے والوں کو سختی اور دکھ نے پکڑا تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ ۱۱۲۵ع‌الف

ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَکَانَ السَّیِّئَةِ الۡحَسَنَةَ حَتّٰی عَفَوۡا وَّقَالُوۡا قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹۵﴾

پھر ہم نے دکھ کی جگہ سُکھ بدل دیا، یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے ہمارے باپ دادوں کو بھی دُکھ اور خوشی پہنچتے رہے تب ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور انھیں خبر بھی نہ ہوئی۔ ۱۱۲۶ع

وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰۤی اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَیۡهِمۡ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰکِنۡ کَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۹۶﴾

اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقوٰے اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے، لیکن انھوں نے جھٹلایا، تب ہم نے ان کو پکڑ لیا اس کی سزا جو وہ کماتے تھے۔

اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰۤی اَنۡ یَّاۡتِیَهُمۡ بَاۡسُنَا بَیَاتًا وَّهُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴿۹۷﴾

تو کیا، بستیوں والے نڈر ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آئے، جب وہ سوتے ہوں۔

ع۱۱۲۵ انبیاء میں غمخواری مخلوق کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے مگر جب حق تبلیغ ادا کر چکے تو اب افسوس کیا کریں جہاں تک ممکن تھا ان کی خیر خواہی کی جب انھوں نے نہ سنا اور نہ مانا تو پھر خدا کی قضا پر رضا کا اظہار کیا۔ اب افسوس کرنے سے کیا فائدہ۔ ہاں جب غمخواری کرنے کا وقت ہوتا ہے تو خطرناک مخالفت کے باوجود غمخواری بھی اس قدر کرتے ہیں اور کفار کی خاطر اس قدر ان کے دل میں درد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لعلك باخع نفسك الا یکونوا مومنین (الشعراء ۲۶: ۳) شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کر دیگا کہ وہ مومن نہیں ہوتے۔

ع۱۱۲۵-الف یضرعون۔ اصل یتضرعون ہے ضَرَعٌ اونٹنی بکری وغیرہ کے پستان کو کہتے ہیں اور ضرع البہم کے معنی ہیں چارپایہ کے بچّے نے اپنی ماں کے پستان کو لیا اسی طرح ضرع الرجلُ کے معنی ہیں وہ عاجز ہو گیا (غ) گویا اس میں عاجز ہو کر دوسرے سے قوت حاصل کرتا ہے اور یہی تضرع ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کر کے اس سے طاقت چاہنا۔ انبیاء اور ان کے مخالفین کی چند مثالیں پیش کر کے اب بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون اس دنیا میں عذاب کا اس لیے ہے کہ دکھوں اور تکلیفوں میں مبتلا ہو کر لوگ عاجزی اختیار کریں اور اللہ کی طرف رجوع کریں۔ گویا وہ بھی بندوں کی بھلائی کے لیے ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب آئے گا وہ محض سزا کے طور پر نہیں بلکہ انسان کی اصلاح اس کی اصل غرض ہے۔ اس لیے دوزخ کا عذاب بھی انسان کی اصلاح کے لیے اور بطور علاج ہی ہو سکتا ہے نہ صرف بطور سزا۔

ع۱۱۲۶ عفوا۔ عَفٰی کے معنی نشان کا مٹانا بھی آتے ہیں اور بڑھنا بھی جیسے عفا النَّبۡتُ (غ) یہی معنی یہاں ہیں یعنی ایک دکھ جب ایک قوم پر آتا ہے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ اُلٹا حق کے ساتھ عناد کرنے میں ترقی کرتی ہے تو پھر نتیجہ اس کا تباہی ہوتی ہے تاکہ کوئی دوسری قوم اس کی جگہ لے۔

أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا
ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿۹۸﴾

اور کیا بستیوں والے نڈر ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر دن چڑھے آئے، جب وہ کھیلتے ہوں ۱۱۲۷ع

أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ
ع اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۹۹﴾

سو کیا وہ اللہ کی تدبیر سے نڈر ہیں تو اللہ کی تدبیر سے کوئی نڈر نہیں ہوتا مگر وہی لوگ جو گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ
بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۚ
وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾

کیا ان کے لیے کھُل نہیں گیا جو اس کے (پہلے) رہنے والوں کے بعد زمین کے وارث ہوئے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں پکڑ لیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں سو وہ نہیں سنتے۔

تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَائِهَا ۚ
وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا
كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ
كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۰۱﴾

یہ بستیاں ان کے کچھ حالات ہم تجھ پر بیان کرتے ہیں اور یقیناً ان کے رسول ان کے پاس کھلی دلائل لیکر آئے مگر وہ ایسے نہ تھے کہ اس پر ایمان لاتے جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح اللہ نہ ماننے والوں کے دلوں پر مہر لگاتا ہے ۱۱۲۷د

وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ
وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿۱۰۲﴾

اور ہم نے اُن میں سے بہتوں میں عہد (کا نباہ) نہ پایا اور یقیناً ہم نے ان میں سے بہتوں کو نافرمان پایا ۱۱۲۸ع

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا
إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا ۖ فَانْظُرْ

تب ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ کو اپنی آیات کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا مگر انھوں نے ان کا انکار کیا، تو دیکھ

ع۱۱۲۷ پہلی آیت میں نائم یا سونے والوں سے اور دوسری میں کھیلنے والوں سے مراد غافل اور دنیا کے لہو ولعب میں مشغول اور حقیقت زندگی سے بے خبر لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس میں عرب والوں کو صاف تنبیہ ہے۔

د۱۱۲۷ یہد۔ هَدَيْتُ لَكَ کے معنی ہیں بَيَّنْتُ لَكَ یعنی ایک امر کو واضح کر دیا (ل)، اور یہاں اس کا استعمال بمنزلہ لازم کے ہے۔
یطبع۔ طَبع اصل میں یہ ہے کہ کسی شے کو کوئی سی صورت دی جائے اور یہ ختم سے عام اور نَقش سے خاص ہے اور طَبِيعَة گویا نفس پر کسی صورت کا نقش ہونا ہے خواہ وہ پیدائش کی وجہ سے ہو یا عادت سے اور پیدائش کے لحاظ سے اغلب ہوتا ہے اور طبع اور ختم ایک ہی طرح پر ہیں اور بعض نے طَبَع کے معنی دَنَس لیے ہیں یعنی اسے زنگ آلود کر دیا جیسے فرمایا بل ران علی قلوبہم (غ)
مہر لگانے سے مراد: یہاں صفائی سے بتایا کہ پہلے انسان گناہ کرتا ہے تب خدا کی طرف سے مہر لگتی ہے۔ اور خود لفظ طَبَع کا استعمال یہی بتاتا ہے کیونکہ ایک خاص صورت کا نقش کرنا ہے اور جس طرح عادت طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہے یہی حالت گناہ کی ہے کہ جب انسان بار بار گناہ کرتا ہے تو اس کا ایک نقش دل پر ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ بکثرت اس کو دُہرانے سے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ بوجہ عادت کے طبیعت کا ایک جزو ہو جاتا ہے اور مہر لگنا یہی ہے کہ جب انسان جھٹلا دیتا ہے تو پھر ایمان لانے کی توفیق نہیں ملتی۔ جھٹلانا حق کی مخالفت پر کھڑا ہو جانا ہے۔ اور مخالفت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے کسی اچھے پہلو کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا بلکہ سارا زور اس کے نیست و نابود کرنے پر لگاتا ہے اس لیے دل کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ پھر ایمان کی طرف اس کا میلان ہی نہیں ہوتا۔ پس یہی خدا کی مہر ہے۔

ع۱۱۲۸ عہد سے مراد یا تو عام ہے۔ یعنی جب کبھی وہ کوئی عہد کرتے ہیں۔ اس کو پورا نہیں کرتے۔ جو انسان کسی عہد کا پابند نہیں ہوتا وہ انسانیت کے اعلیٰ مقصد کو کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور یا عہد سے مراد عہد فطرت ہے یعنی جو کچھ ان کی فطرت میں مرکوز ہے اس پر وہ قائم نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ وہ نور فطرت بجھ جاتا ہے۔ دوسرے معنی قابل ترجیح ہیں۔

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا ۱۱۲۹

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ
رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور موسیٰؑ نے کہا اے فرعون میں جہانوں کے رب کی طرف سے
رسول ہوں۔

حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ
قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ
فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾

اس پر قائم کہ اللہ پر سوائے حق کے کچھ نہ کہوں۔ میں
تمھارے پاس تمھارے رب سے کھلی دلیل لایا ہوں،
سو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے ۱۱۳۰

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ
اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

اس نے کہا اگر تو کوئی نشان لایا ہے تو وہ لے آ،
اگر تو سچا ہے۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾

تب اس نے اپنا عصا ڈالا تو ناگہاں وہ صریح اژدہا تھا۔

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو ناگہاں وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید تھا ۱۱۳۱

ع ۱۱۲۹ درمیان میں بہت سے انبیاء کا ذکر چھوڑ کر حضرت موسیٰؑ کا ذکر شروع کیا ہے اور اس کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے جس کی وجہ آنحضرت صلعم کو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کئی ایک امور میں مماثلت کا ہونا ہے۔ کیونکہ آپ استثناء ۱۸ : ۱۸ کی مثل والی پیشگوئی کا مصداق ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا ذکر قرآن کریم میں ذیل کے مقامات پر آتا ہے:۔ البقرۃ ۲۔ ۴۹ تا ۷۲؛ النساء ۴۔ ۱۵۳؛ المائدۃ ۵۔ ۲۰ تا ۲۶؛ الاعراف ۔ ۱۰۳ تا ۱۵۶؛ یونس ۱۰۔ ۷۵ تا ۹۲؛ ہود ۱۱۔ ۹۶ تا ۹۹؛ بنی اسرائیل ۱۷۔ ۱۰۱ تا ۱۰۴؛ الکھف ۱۸۔ ۶۰ تا ۸۲؛ مریم ۱۹۔ ۵۱ و ۵۲؛ طٰہٰ ۲۰۔ ۹ تا ۹۸؛ المومنون ۲۳۔ ۴۵ تا ۴۹؛ الشعراء ۲۶۔ ۱۰ تا ۶۸؛ النمل ۲۷۔ ۷ تا ۱۴؛ القصص ۲۸۔ ۳ تا ۴۸؛ الصّٰفّٰت ۳۷۔ ۱۱۴ تا ۱۲۲؛ المومن ۴۰۔ ۲۳ تا ۵۵؛ الزخرف ۴۳۔ ۴۶ تا ۵۶؛ الدخان ۴۴۔ ۱۷ تا ۳۳؛ الذاریات ۵۱۔ ۳۸ تا ۴۰؛ الصف ۶۱۔ ۵؛ النازعات ۷۹۔ ۱۵ تا ۲۶۔

ع ۱۱۳۰ حقیق بمعنی جدیر ہے یعنی سزاوار اور علیٰ بمعنی ب یعنی اس بات کا اہل ہوں۔
حضرت موسیٰؑ کا اصل کام فرعون کو تبلیغ کرنا نہ تھا بلکہ بنی اسرائیل کو فرعون سے چھڑانا، کیونکہ وہ مبعوث صرف اپنی قوم کے لیے ہوئے تھے جیسا کہ فرمایا اخرج قومک من الظلمٰت الی النور (ابراہیم ۱۴۔ ۵) اسی لیے سب سے پہلے انھوں نے اس بات کو پیش کیا ہے کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے ہاں جب ان کا واسطہ فرعون سے پڑنا ضروری تھا تو فرعون کو نصیحت بھی ضروری تھی یہ بھی انھوں کی۔

ع ۱۱۳۱ عصا کے لیے دیکھو ۸۵ اور بیضاء کے معنی سفید یا روشن اور الید البیضاء کے معنی ہیں الحجة المبرھنة (ل) یعنی روشن یا واضح دلیل۔
حضرت موسیٰؑ کے ان دونوں معجزات کا ذکر بائبل میں بھی ہے۔ ان دونوں معجزات کا ظہور دو دفعہ ہونا قرآن شریف اور بائبل میں بھی مذکور ہے۔ یعنی ایک اس موقعہ پر جب حضرت موسیٰ کو رسالت کے عہدہ پر ممتاز کیا جاتا ہے اور دوسرا فرعون کے سامنے جب پہلے گئے ہیں تو اس وقت ان معجزات کا ظہور ہوا۔ البتہ بائبل میں دوسرے موقعہ پر یعنی فرعون کے سامنے ید بیضاء کے معجزہ کا ذکر نہیں جو صریحاً تحریف ہے اس لیے کہ خروج ۴ : ۸ میں حضرت موسیٰ کو خداوند کا یہ ارشاد ہے کہ "اگر وے تجھ پر ایمان نہ لاویں اور نہ پہلے معجزہ کے سننے والے ہوں تو وے دوسرے معجزہ کے معتقد ہونگے"۔ علاوہ ازیں دوسرے معجزہ کا دینا بے معنی تھا اگر فرعون کے سامنے اس کا اظہار نہ ہونا تھا۔
حضرت موسیٰ کے معجزات کا پہلا ظہور کن حالات میں ہوا: البتہ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ معجزہ کا ظہور عموماً اعدائے حق کے مقابلہ میں ہوتا ہے اور انہی کو عاجز کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن حضرت موسیٰ کو پہلے یہ معجزات اس وقت دکھائے جاتے ہیں جب وہ اکیلے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہیں اور جب ان پر وہ حالت طاری ہے جس حالت میں اللہ تعالیٰ کا کلام انبیاء علیہم السلام سے ہوتا ہے یہ حالت جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں خاص حالت ہوتی ہے جس میں نبی ایک امر کو دیکھتا ہے اور ایک آواز کو سنتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والے اسے نہیں دیکھتے اور نہ سنتے ہیں۔ چنانچہ احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض وقت حضرت نبی کریم صلعم اصحابؓ میں بیٹھے ہوتے تھے جب آپ پر حالت وحی وارد ہوتی اور آپؐ کی حالت بدل جاتی اور فرشتہ آپ کے سامنے آتا اور آپؐ سے کلام کرتا۔ مگر فرشتہ کو پاس بیٹھے ہوئے صحابہؓ نہ دیکھتے نہ ہی وہ فرشتہ کی آواز سنتے۔ اور آنحضرتؐ دیکھتے اور سنتے بھی۔ پس اس حالت میں بھی جب حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمکلام تھے۔ ان معجزات کا ظہور ایک کشفی رنگ رکھتا ہے ہاں فرعون کے سامنے بھی ان معجزات کا ظہور ہوا ہے۔ لیکن بعض اوقات کشفی نظارہ کے دیکھنے میں دوسرے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے تصرف تام سے شریک کر دیتا ہے اور یہی اعجاز ہے۔ ورنہ حضرت موسیٰؑ کے سونٹے میں یہ خاصیت نہ تھی کہ جب زمین پر ڈالیں تو اژدہا بن جائے۔ نہ ہی سوائے ان دونوں موقعوں کے اور کبھی دشمن کے بالمقابل بھی اس کے اژدہا بننے کا ذکر ہے وہ ایک معمولی سونٹا تھا۔ جیسا کہ خود حضرت موسیٰؑ کے الفاظ ہیں کہ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور بکریوں کے لیے اس سے پتے جھاڑتا ہوں اور اور کام بھی لے لیتا ہوں۔ کہاں سے وہ سونٹا آیا تھا اس کے متعلق کوئی صحیح اور معتبر روایت پیش نہیں کی جا سکتی۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾

فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا یقیناً یہ کوئی دانا جادوگر ہے [۱۱۳۲]

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

چاہتا ہے کہ تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے سو تم کیا مشورہ دیتے ہو [۱۱۳۳]

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

بولے ، اسے اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے اور شہروں میں نقیب بھیج دے۔

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

وہ تیرے پاس ہر دانا جادوگر کو لے آئیں [۱۱۳۴]

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْۤا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور جادوگر فرعون کے پاس آئے کہنے لگے ہم کو اجر تو ضرور ملے گا اگر ہم ہی غالب رہے۔

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

ہاں ! اور تم یقیناً (میرے) مقربوں میں سے ہوگے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِىَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

انھوں نے کہا اے موسیٰ یا تو تُو ڈال ، یا ہم (پہلے) ڈالنے والے ہوں۔

قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

کہا ، ڈالو ، سو جب انھوں نے ڈالا ، لوگوں کی آنکھوں کو دھوکا دیا اور اُن کو ڈرایا ، اور ایک بڑا فریب بنا کھڑا کیا [۱۱۳۵]

ہاں عصا کے اژدہا بننے اور ید بیضا کے ایک معنی بھی تھے یعنی اول میں یہ اشارہ تھا کہ حضرت موسیٰ کے پیرووں کی جماعت (کیونکہ عصا کا لفظ جماعت پر بھی بولا جاتا ہے دیکھو ع[۸۸]) اپنے فریق مخالف پر غالب آئے گی اور ید بیضا میں اشارہ حضرت موسیٰ کی دلائل نیرہ کی طرف تھا جو دلوں کو کھا جائے گی۔ چنانچہ فرعونیوں کا غرق ہونا اور ساحروں کا حضرت موسیٰ پر ایمان لانا ان دونوں معجزوں کی اصل حقیقت پر شاہد ہے۔

ع[۱۱۳۲] ساحر۔ سحر کرنے والا۔ اور سحر کے لیے دیکھو ع[۱۲۹] لسان العرب میں ہے کہ سحر وہ افسون ہے جو آنکھ پر قبضہ کر لیتا ہے یہاں تک کہ یہ گمان ہوتا ہے کہ اصل بات اسی طرح ہے جس طرح وہ دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں اور پھر لکھا ہے کہ سحر افسون ہے اور ہر ایک چیز جس کا ماخذ لطیف اور دقیق ہو وہ سحر ہے۔ اور پھر لکھا ہے کہ سحر نہایت درجہ کی ذہانت کا بیان ہے اور حدیث اِنَّ مِنَ البیان لسحرا کو پیش کیا ہے جس کے معنی ابو عبیدہ نے یوں کیے ہیں کہ ایک شخص کسی کی تعریف کرے یہاں تک کہ اپنی صداقت کا لوگوں کو قائل کر لے پھر مذمت کرے یہاں تک کہ لوگوں کو اپنی صداقت کا قائل کر لے اور ابن الاثیر نے اس کے معنی کیے ہیں کہ وہ سامعین کے دلوں کو اپنی طرف پھیر لیتا ہے گو سچ نہ بھی ہو (ل) الساحر العالم الفطن یعنی بڑے ذہین عالم کو ساحر کہا جاتا ہے (ت) انبیاء کو اُن کے مخالف کیوں ساحر کہتے تھے صرف اسی وجہ سے کہ ان کی باتوں کا اثر دلوں پر ہوتا تھا اور وہ دلوں کو پھیر دیتے تھے۔

ع[۱۱۳۳] تامرون۔ امر سے ہے اور استمار مشورہ کو کہتے ہیں اور یہاں تامرون اسی مشورہ کے معنی میں ہے۔ فماذا تامرون فرعون کا قول ہے جو ان کی بات سن کر کہا گیا ہے جیسا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے۔

ع[۱۱۳۴] ارجہ۔ اصل میں ارجئہ ہے اور ارجاء کسی معاملہ کو توقف یا تاخیر میں ڈال دینے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ فوراً ان کے معاملہ میں کارروائی نہ ہو جو اس علم کے ماہر ہیں وہ سب جمع ہو کر مقابلہ کریں۔

ع[۱۱۳۵] حضرت موسیٰ کا ساحروں سے مقابلہ اور ان کی رسیاں اور سونٹیاں: وہ کیا چیز تھی جو انھوں نے ڈالی۔ دوسری جگہ آتا ہے حبالھم وعصیھم (الشعراء ۲۶: ۴۴) ان کی رسیاں اور ان کی سونٹیاں۔ آیا یہ سچ مچ کی رسیاں اور سونٹیاں تھیں۔ حبل ہر ایک ذریعہ کو کہا جاتا ہے اس لیے اس سے مراد اس قدر ہو سکتی ہے کہ جو اُن سے بن پڑا اور عصا کا استعمال مجاز کے رنگ میں ہوا ہے۔ مثلاً قرعہ بعصا الملامۃ کے لفظی معنی ہیں اسکو ملامت کے سونٹے سے مارا مگر مراد صرف یہ ہے کہ خوب ملامت کی۔ ایسا ہی قشرت لہ العصا کے لفظی معنی ہیں میں نے اس کے لیے سونٹے کا چھلکا اتارا اور مراد ہے جو کچھ میرے دل تھا زبان سے ظاہر کر دیا اور تاج العروس میں العصا کے معنی اللسان یعنی زبان بھی دیئے ہیں۔ پس ممکن ہے کہ کوئی رسیاں اور سونٹیاں وہ ساتھ لائے ہوں اور ان کو ڈالا ہو اور ممکن ہے کہ مراد اس سے صرف باطل کی حمایت

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۟ۚ ۱۱۷
اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ تُو اپنا سونٹا ڈال، پس وہ فوراً اُسے نگل گیا جو وہ جھوٹ بناتے تھے [۱۱۳۶]

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۟ۚ ۱۱۸
سو حق ظاہر ہو گیا اور جو وہ کرتے تھے باطل ہو گیا۔

فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۟ۚ ۱۱۹
پس وہاں ہار گئے اور ذلیل ہو کر پھرے۔

وَ اُلْقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۟ۚۖ ۱۲۰
اور جادوگر سجدے میں گر گئے۔

قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۟ۙ ۱۲۱
کہا، ہم جہانوں کے رب پر ایمان لائے۔

رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۟ ۱۲۲
موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رب پر [۱۱۳۷]

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ
فرعون نے کہا تم اس پر ایمان لائے قبل اس کے میں تم کو

ہیں جھوٹے سامان اور جھوٹی تقریریں ہوں۔ ما یافکون سے جو آگے آتا ہے دوسرے خیال کی تائید ہوتی ہے اور دوسری جگہ انہی واقعات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ فحشر فنادٰی فقال انا ربکم الاعلٰی (النّٰزعٰت ۷۹: ۲۳و۲۴) یعنی لوگوں کو اکٹھا کیا اور یہ اعلان کیا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ جو اسی موقعہ کا ذکر ہے۔ گویا ساحروں سے یہ اعلان کرایا کہ وہی سب سے بڑا دیوتا ہے اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں ما علمت لکم من الٰہ غیری (القصص ۲۸: ۳۸) اور اس کے بالمقابل حضرت موسیٰؑ یوں فرماتے ہیں فلما القوا قال موسٰی ما جئتم بہ السحر ان اللہ سیبطلہ ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین ویحق اللہ الحق بکلمٰتہ ولو کرہ المجرمون (یونس ۱۰: ۸۱ و ۸۲) یعنی جو کچھ تم لائے ہو یہ تو سحر ہے اور اللہ اس کو یوں باطل کر دے گا کہ اپنے کلمات کے ساتھ حق کو حق کر دکھائے گا۔ پس یہ تمام امور اس کے موید ہیں کہ ایک طرف سے فرعون کی خدائی پر زور دیا جاتا تھا دوسری طرف حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلائل دیں۔ لیکن ظاہر الفاظ کو بھی اگر لیا جائے اور واقعی لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے فرعون نے چالاک آدمیوں سے کچھ فریب کاری اس قسم کی کرائی ہو جس سے لوگوں کو خیال ہو جائے کہ فرعون میں کچھ خدائی ہے تو یہ امر بھی بالکل قرین قیاس ہے کیونکہ عموماً مشرک قومیں تو ہم پرست بھی بہت ہوتی ہیں جو لوگ ہواؤں اور بجلیوں اور بارشوں اور آگ اور درختوں اور پتھروں اور جانوروں کے سامنے سر جھکا دیتے ہوں ان کو اس قسم کی شعبدہ بازی سے مرعوب کر لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ پس فرعون نے بڑے بڑے دانا آدمیوں کو اکٹھا کر کے ان سے کوئی اس قسم کی شعبدہ بازی کرائی اور اس خاص طرز کو ممکن ہے انہوں نے اس لیے اختیار کیا کہ فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ کے عصا کے اژدہا بننے کا معجزہ مشہور ہو چکا تھا انہوں نے سمجھا یہ کوئی چالاکی ہے ہم بھی اسی قسم کی چالاکی سے کام نکال لیں گے۔ مگر اس کا پول حضرت موسیٰ نے کھول دیا جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

[۱۱۳۶] تلقف۔ لقف کے معنی ہیں ایک چیز کو دانائی سے لے لینا خواہ منہ سے ہو یا ہاتھ سے (غ)

یافکون۔ اِفک۔ حق سے باطل کی طرف پھیرنے کو کہتے ہیں اس لیے ہر چیز کو جو اس حالت سے پھری ہوئی ہو جس پر اسے ہونا چاہیئے اِفک کہا جاتا ہے۔ اسی لیے اِفک مطلق کذب کو بھی کہتے ہیں انّ الذین جاءو بالافک (النور ۲۴: ۱۱) (غ)

ساحروں کی سونٹیاں اور عصائے موسیٰ: یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے عصا میں یہ صفت نہ تھی کہ جب ڈالا جائے تو اژدہا بن جائے اور حضرت موسیٰ نے اسے خود ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کی جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں ہوئی۔ عصا کے ڈالنے کا نتیجہ کیا ہوا۔ جو کچھ ساحروں نے افک یا جھوٹ بنایا تھا یا جو حق کو باطل سے پھیرا تھا اس کو وہ عصا کھا گیا اور ان کا کچھ باقی نہ رہنے دیا، کس طرح پر ہوا اس کی تفصیل قرآن شریف میں نہیں نہ کہیں یہ ذکر ہے کہ یہ عصا اژدہا بن گیا تھا نہ یہ ذکر ہے کہ ان کی سونٹیاں سانپ بن گئی تھیں۔ صرف اس قدر ذکر ہے کہ ان کے سحر سے وہ دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور حضرت موسیٰ نے جب عصا ڈالا تو وہ ساحروں کے جھوٹ کو کھا گیا اور حق ظاہر ہو گیا۔ اور یہ خیال کہ اژدہا بن کر ہی نگلا ہو گا محض خیال ہی ہے۔ یہی عصا جب سمندر سے گزرنے کے لیے ضرورت پیش آئی تو وہاں اژدہا نہیں بنا اور جو کچھ ہوا اس کا نتیجہ یہ بتایا کہ ساحر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے اور ان کے اس قول سے کہ اٰمنّا باٰیٰت ربّنا (۱۲۶) یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عصا کا معجزہ نہ تھا کیونکہ وہ ایک ہی آیت ہوتی اور ایمان درحقیقت معجزات پر نہیں لایا جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر۔ پس کیا بعید ہے کہ ایک بُت پرست قوم کے دل اللہ تعالیٰ کی توحید کی دلائل سے کھائے گئے ہوں۔

[۱۱۳۷] ساحروں کا ایمان لانا اور بائبل: جادوگروں کے ایمان لانے کا ذکر بائبل میں نہیں جہاں اس مقابلہ کا ذکر ہے مگر یہودیوں کی روایات میں یہ ذکر موجود ہے اور اس کی تائید خروج ۱۲: ۳۸ سے ہوتی ہے جہاں بنی اسرائیل کے مصر سے جانے کے ذکر میں لکھا ہے کہ "ایک دوسری بڑی گروہ مل جل کر ان کے ساتھ گئی" جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلیوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے اور یہودی انسکلوپیڈیا میں ہے "کیونکہ مصری جب موسیٰ کی بہاڑ سے واپسی کا وقت گزر گیا ان میں سے چالیس ہزار اکٹھے ہو کر آئے دو مصری جادوگروں ینیس اور یمبریس کے ساتھ" اور ینیس اور یمبریس وہی جادوگر تھے جو حضرت موسےٰ کے مقابلہ پر آئے جیسا کہ ۲ تمطاؤس ۳: ۸ سے ظاہر ہے۔

لَكُمْ ۚ إِنَّ هَٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوهُ فِي الْمَدِينَةِ
لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿١٢٣﴾
لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ
خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٢٤﴾
قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ ﴿١٢٥﴾
وَمَا تَنقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا لَمَّا
ع جَاءَتْنَا ۚ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿١٢٦﴾
وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ
وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ
وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي
نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٧﴾
قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ
وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن
يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٨﴾

اجازت دوں، یہ ایک حیلہ ہے، جو تم نے اس شہر میں بنا
لیا ہے تاکہ اس کے رہنے والوں کو اس سے نکال دو سو تم (نتیجہ) جان لوگے۔
میں ضرور تمھارے ہاتھ اور تمھارے پاؤں مخالف طرف سے کاٹ دوں گا
پھر میں ضرور تم کو صلیب کی موت ماروں گا۔
انھوں نے کہا، ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔
اور تو ہم سے دشمنی نہیں کرتا مگر اس لیے کہ ہم اپنے رب کی باتوں پر ایمان
لائے جب وہ ہمارے پاس آگئیں اے ہمارے رب ہم پر صبر ڈال اور ہمیں مسلمان مار ۱۱۳۸
اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا، کیا تو موسیٰؑ اور
اس کی قوم کو چھوڑتا ہے کہ ملک میں فساد کریں اور وہ تجھے اور تیرے
معبودوں کو چھوڑ دے اس نے کہا ہم ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے
اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان کے اوپر غالب ہیں۔
موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ سے مدد مانگو اور
صبر کرو - زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے
جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور (اچھا) انجام متقیوں کے لیے ہے ۱۱۳۹

ع۱۱۳۸ مومن اور کافر میں یہ فرق دکھایا ہے کہ یہی جادوگر جو حالت کفر میں روپوں کا اجر فرعون سے طلب کرتے تھے اب جان تک کی ان کو پروا نہیں اس لیے کہ خدا کو پا لیا۔

ع۱۱۳۹ بنی اسرائیل کے ذکر میں مسلمانوں کی مشکلات کا علاج: قرآن کریم نے جن گزشتہ واقعات کو بیان کیا ہے ان سب میں اور بالخصوص بنی اسرائیل کے ذکر میں اسلام کی تاریخ لکھی ہوئی ہے جو کچھ حالت بنی اسرائیل کو پیش آئی وہی مسلمانوں کو پیش آنے والی تھی۔ اس لیے بنی اسرائیل کے واقعات کا ذکر کرکے جوان کو حضرت موسیٰ کی معرفت علاج بتایا ہے وہ مسلمانوں کی مشکلات کا علاج ہے۔ بنی اسرائیل ایک دوسری قوم کی غلامی میں تھے اور دوسری قوم ان پر حکمران تھی۔ حاکم قوم ان کو روز بروز کمزور کرتی چلی جاتی تھی اور ایسی تدابیر ان کے متعلق اختیار کرتی تھی کہ جن سے ان کی قومی زندگی مٹتی چلی جائے۔ سب ذلت کے کام ان سے لیے جاتے تھے۔ ان کے بیٹوں کو قتل کیا جاتا اور عورتوں کو زندہ رکھا جاتا تھا تاکہ یہ قوم آہستہ آہستہ فنا ہو جائے۔ آج یہی نقشہ مسلمانوں کا نظر آتا ہے صرف اس قدر فرق ہے جو حالات زمانہ سے پیدا ہونا لازم تھا۔ آج مسلمان عموماً ساری دنیا میں اور بالخصوص اس ملک ہند میں ایک دوسری قوم کی غلامی میں ہیں۔ وہ دوسری قوم ان پر حکمران ہے اور حکومت کی تدابیر اس قدر مضبوط ہیں کہ محکوم قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ محکوم قوم کے اعلیٰ درجہ کے جوہر مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ دنیا کے مال کے لالچ کے لیے وہ دین ایمان بیچتے چلے جاتے ہیں۔ شجاعت اور مردانگی کا جوہر مفقود ہوتا چلا جاتا ہے دین اسلام کی محبت اور غیرت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیوی شان و شوکت تو مدت سے رخصت ہو چکی جو کچھ باقی رہی تھی اس کا اس جنگ نے فیصلہ کر دیا۔ ہاں وہاں اگر بیٹوں کو قتل کرتے تھے تو یہاں مجازی طور کا قتل ہے کیونکہ مردانگی اور شجاعت کی اعلیٰ صفات کا مر جانا یہی مجازاً قوم کے فرزندوں کا قتل ہے۔ آرائش و زیبائش جسمانی مال دولت دنیا، دنیا کی دلفریبی کے ظاہری سامانوں پر فریفتگی یہ وہ زنانہ صفات ہیں جو نستحی نساء ھم کے قائم مقام ہوئی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان مشکلات کا علاج کیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ آج ہماری قوم کو بالکل وہی حالات پیش آئے ہیں جو بنی اسرائیل کو فرعون کے ماتحت پیش آئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے جو حضرت موسیٰؑ کی زبان سے علاج بتایا ہے وہ ہماری ہی مشکلات کا علاج ہے اور وہ علاج کیا ہے استعینوا باللہ واصبروا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد چاہنا اور صبر اختیار کرنا۔ آج کل کے لیڈروں کی نظر میں یہ ایک لغو سی بات ہے وہ اس طرف توجہ نہیں کرتے ان کو اپنی قوت بازو پر بھروسہ ہے کہ ہم اس حاکم قوم کو عدم تعاون سے مار لیں گے اور اگر عدم تعاون سے یہ قوم نہ مری تو پھر ہم تلوار اٹھائیں گے۔ خدا کے کلام کی تصریح کے خلاف ان باتوں کی طرف جانا عمداً قوم کو ہلاکت میں ڈالنا ہے فرعون کی اس قدر زیادتیوں کے باوجود بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرنے کے باوجود خدا کی عبادت سے روکنے کے باوجود بنی اسرائیل کو جو ایک محکوم قوم تھی یہ حکم نہیں دیا جاتا کہ تم فرعون کے خلاف جنگ کرو۔ بلکہ یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی مدد چاہو اور صبر کرو۔ یہی علاج آج ہماری مشکلات کا تھا ہم بنی اسرائیل کی طرح دوسری قوم کی غلامی

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰي رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ
ع فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۲۹

انھوں نے کہا ہمیں دُکھ دیا گیا اس سے پہلے کہ تو ہمارے پاس آتا اور اس کے بعد کہ تو ہمارے پاس آیا، اس نے کہا قریب ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کردے، اور تم کو زمین میں جانشین بنائے، پھر دیکھے تم کس طرح عمل کرتے ہو ۱۱۳۹ف

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۱۳۰

اور البتہ ہم نے فرعون کے لوگوں کو قحط اور پھلوں کی کمی میں پکڑا، تاکہ وہ نصیحت قبول کریں ۱۱۴۰ف

فَاِذَا جَاۗءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰي وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۱

سو جب اُن کو سُکھ پہنچتا، کہتے یہ ہمارا حق ہے۔ اور اگر اُن کو دُکھ پہنچتا، موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی شومی بتاتے سنو ان کی شومی صرف اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن اُن میں سے اکثر نہیں جانتے ۱۱۴۱ف

ہیں ہیں اس ذلّت کی حالت سے ہم حاکم قوم سے جنگ کرکے نہیں نکل سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرکے خدا کے آگے گڑ گڑا اور اپنی کمزوری کا علاج اللہ تعالےٰ کی قوت کو سمجھ کر نکل سکتے ہیں۔ قرآن کریم کا ایک لفظ بھی اس بات کی تائید میں پیش نہیں کیا جا سکتا کہ محکوم ہو کر حاکم قوم کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت دی جائے اور درحقیقت یہ جنگ نہ ہوگی خودکشی ہوگی۔ قوم کے ملکی رہنماؤں کو اور علمائے اسلام کو یہ چاہیئے کہ حالات پیش آمدہ میں اپنی مشکلات کا حل قرآن کریم سے سوچیں۔ استعانت باللہ اور صبر سے ہی قوم کے اندر وہ جوہر پیدا ہونگے جن سے یہ قوم زندہ رہنے کے قابل بنے گی۔ رہا ان لوگوں کا سوال جو اس وقت اسلام کے دشمن ہمیں نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کی ہلاکت کے کوئی اسباب پیدا کردے اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کو دشمنانِ اسلام کے حلقہ سے نکال کر حلقہ بگوشانِ اسلام بنادے عسى الله ان يجعل بينكم وبين الذين عاديتم منهم مودة (الممتحنة ۷)۔ ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم اپنی اصلاح کریں اور اسلام کی خوبیوں کو دوسروں کے سامنے کھول کر رکھیں۔ یہی وہ راہ ہے جو حالات پیش آمدہ میں قرآن کریم نے ہمیں صراحت سے بتادی ہے۔ جب تک مسلمان اس راہ سے مُنہ موڑے رہے ہیں ذلت وادبار کی حالت سے باہر نہیں نکل سکتے۔

ف۱۱۳۹۔ بادشاہت کے حصول کا طریق: اس سارے بیان میں یہی بتایا ہے کہ جب ایک قوم حد سے زیادہ مخلوق کو دکھ دیتی ہے تو بادشاہت اس سے لیکر دوسری قوم کو دیدی جاتی ہے۔ باوجود ان سارے دکھوں کے جو بنی اسرائیل کو ملتے ہیں، باوجود اس کے کہ ایک سخت غلامی کی حالت میں وہ پڑے ہوئے ہیں اور حاکم قوم بڑی زبردست ہے اور یہ صرف چند بیگار کے کام کرنے والے لوگ ہیں جن کو حکومت میں بھی کوئی رسوخ حاصل نہیں حضرت موسیٰؑ کا ایمان کس قدر ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ تمہارا دشمن ضرور ہلاک ہوگا اور تم بادشاہ بنوگے مگر پھر تمہارے عملوں کو بھی اللہ تعالیٰ دیکھے گا جب تم اس طرح مخلوق خدا کو دکھ دینے لگوگے تو تم سے بھی حکومت لے لی جائیگی موسیٰؑ کے ساتھیوں کی تکالیف میں مسلمانوں کی اس وقت کی تکالیف کا نقشہ کھینچا ہے گو دونوں رنگوں میں کچھ فرق ہو کہ دوسری قوموں کے ہاتھ میں یہ لوگ ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں۔

ف۱۱۴۰ سنین۔ سنة کی جمع ہے جس کے معنی سال ہیں۔ مگر اس کا زیادہ استعمال قحط کے سال پر ہے (غ)، یہاں تک کہ اس سے مراد قحط کا سال ہی سمجھا جانے لگا۔

ف۱۱۴۱ یطیروا۔ طائرہ۔ طیر یعنی پرندسے ہے اور تَطَیُّر اور اِطَّیُّر پرندوں سے شگون لینے کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا استعمال ہر ایک قسم کی بدشگونی اور بری فال لینے پر عام ہوگیا ہے (غ)۔ اہل عرب اگر پرندوں کو بائیں جانب اُڑتا دیکھیں تو اسے بدشگونی سمجھتے تھے (ت)۔ اور طائرھم میں طائر سے مراد اُن کی شوم یعنی وہ بدقسمتی ہے جس کے متعلق وہ بدشگونی لیتے تھے۔ طائر اصل میں انسان کے عمل کو کہتے ہیں خیر ہو یا شر، کیونکہ وہ اس سے اُڑ جاتا ہے جیسا کہ کل انسان الزمنٰه طائرہ فی عنقه میں ہے (غ)۔ ابوعبیدہ کہتے ہیں حظ یا بہرہ پر جو انسان کو ملے یہ لفظ اطلاق پاتا ہے (ت)۔ طائرھم عند الله سے مراد ہے کہ جو کچھ ان پر مصیبت آتی ہے وہ ان کا حظ یا بہرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یعنی انہی کی بدعملیوں کی سزا ہے۔

مسلمانوں کے مصائب اور مجدد صدی چہاردہم: جب کوئی راستباز آتا ہے اور وہ ایک اچھی راہ کی طرف بلاتا ہے اور بُری راہ سے روکتا ہے اور لوگ اس کی بات کو نہ ماننے سے اور مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں اور راہِ حق کو قبول کریں یوں کہنے لگتے ہیں کہ یہ مصائب اس شخص کی وجہ سے ہی ہم پر آرہے ہیں۔ ان کو توجہ دلائی ہے کہ داعی خیر کی وجہ سے نہیں بلکہ انکے اپنے اعمال بد کی وجہ سے ان پر مصائب آتی ہیں۔ آج مسلمانوں کا یہی حال ہے جب چودھویں صدی کے سر پر ایک مجدد آیا اور اس نے بتایا کہ تمہاری کامیابی اپنی اصلاح اور اشاعت اسلام میں ہے تو بجائے اس کے کہ اس حق بات کو قبول کرتے اس کی مخالفت

وَقَالُوْا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا
بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ
وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۣ
فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾
وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ
كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ
وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾
فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ
بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾
فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾
وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ
مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا
فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا

اور انھوں نے کہا جو کوئی نشان بھی تو ہمارے پاس لائے تاکہ اس کے ساتھ ہم کو دھوکا دے تو ہم تیری بات کو نہیں مانیں گے[1142]

سو ہم نے اُن پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈکیں اور خون الگ الگ نشانیاں بھیجیں مگر انھوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم قوم تھے[1143]

اور جب اُن پر عذاب پڑتا کہتے اے موسیٰ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر جیسا اس نے تجھ سے عہد کیا ہے اگر تو ہم سے عذاب اُٹھا دے ہم ضرور تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور ضرور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔

پس جب ہم ان سے ایک وقت کے لیے جس کو وہ پہنچنے والے تھے عذاب اُٹھا دیتے تو فوراً عہد شکنی کرتے[1144]

پس ہم نے اُن پر سزا بھیجی اور ان کو دریا میں غرق کر دیا، اس لیے کہ وہ ہماری باتوں کو جھٹلاتے تھے اور اُن سے لاپروا تھے۔

اور ہم نے اس قوم کو جسے کمزور گنا جاتا تھا اس زمین کے مشرقی اور اس کے مغربی حصوں کا وارث کر دیا، جس میں ہم نے برکت دی تھی اور تیرے رب کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی اس لیے کہ انھوں نے صبر کیا اور

کی اور غلط راہوں پر پڑے وہ مصائب اور بھی بڑھیں تو اب لگے کہنے کہ ہماری مصائب تو اس کے آنے سے اور بھی زیادہ ہوئیں۔ کاش مسلمان ان آیات قرآنی سے کچھ سبق لیں۔

۱۱۴۲ مھما۔ مہ اور ما سے مرکب ہے اور مَہ اسم فعل بمعنی توقف ہے اور ما شرطیہ۔ یا ما ما سے مرکب ہے۔ پہلا ما شرطیہ ہے اور دوسرا تعمیم کے لیے۔
مطلب یہ تھا کہ یہ تمہارے معجزات محض دھوکہ ہیں۔ اس لیے ان کو دیکھ کر ہم ایمان نہیں لاتے۔

۱۱۴۳ طوفان۔ طَوْف سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کے گرد گھومنا۔ اور طوفان ہر وہ حادثہ ہے جو انسان کو چاروں طرف سے گھیر لے (غ) اسی سے اس کا استعمال بڑے سیل پر ہوا ہے۔ طوفان کے معنی بخاری میں موت کثیر دیئے ہیں۔
جراد۔ ٹڈی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کو سبزی سے خالی کر دیتی ہے (غ) اور جَرْدٌ کے معنی ہیں ایک چیز کا چھلکا اتار دیا۔
قُمّل۔ جوں، چچڑی، پسو وغیرہ پر بولا جاتا ہے ضفادع۔ ضَفْدَعٌ کی جمع ہے مینڈک۔
حضرت موسیٰ کے نو نشان: بائبل میں ذیل کی نشانیوں کا ذکر ہے۔ دریا کا لہو بن جانا۔ مینڈکوں کی آفت۔ جوئیں، مچھر، مویشی پر مری، پھوڑوں کی آفت۔ اولے ٹڈی تاریکی۔ قرآن کریم نے جو آفات بیان کی ہیں وہ سات ہیں۔ جن میں سے پانچ یہاں اور دو آیت ۱۳۰ میں یعنی قحط اور پھلوں کی کمی اور ان سات کے ساتھ عصا اور ید بیضا کے معجزات ملا کر کل نو نشان ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ذکر ہے۔

۱۱۴۴ ینکثون۔ نکث کاتے ہوئے اور بنے ہوئے کے توڑنے پر استعمال ہوتا ہے اور استعارۃً نقض عہد پر (غ) خروج ۸ سے ۱۱ باب تک ان نشانات کی تفصیل اور فرعون کے اقرار و عہد شکنی کا ذکر ہے۔

مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ — ہم نے وہ سب تباہ کر دیا جو فرعون اور اس کی قوم کرتے تھے اور جو وہ عمارتیں بناتے تھے ع۱۱۴۵

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ — اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے گزار دیا۔ تب وہ ایک قوم پر آئے جو اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ بولے اے موسیٰؑ ہمیں بھی ایک دیوتا بنا دے جیسے ان کے دیوتا ہیں۔ اس نے کہا تم لوگ جہالت کرتے ہو ع۱۱۴۶

اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ — یہ جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ تباہ ہونا ہے اور جو وہ کرتے ہیں باطل ہے ع۱۱۴۷

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ — کہا، کیا میں اللہ کے سوائے تمہارے لیے معبود چاہوں اور اس نے تم کو مخلوقات پر فضیلت دی ہے ع۱۱۴۸

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ — اور جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے بچایا وہ تمہیں

ع۱۱۴۵ الارض سے مراد ارض مقدس یعنی شام کی زمین ہے اس کے مشرق و مغرب کا مالک کر دیا۔ یعنی ساری ارض مقدس کا وارث کر دیا۔ گو یہ بہت بعد کا واقعہ ہے۔ تمت کلمۃ ربک الحسنی۔ تمام یا انتہا کو پہنچ جانے سے مراد اس کا پورا ہونا ہے۔ اور کلمۃ الحسنی یا اچھی بات وہ وعدہ ہے جو ان کو دیا گیا تھا کہ تمہیں ارض مقدس کا وارث بنایا جائے گا یا اس وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو اوپر فرمایا عسی ربکم ان یھلک عدوکم (۱۲۹)

یعرشون۔ کے معنی ابو عبیدہ نے یبنون کیے ہیں یعنی جو عمارتیں وہ بناتے تھے (رغ) یا باغات مراد ہو سکتے ہیں۔

اس امت کی کامیابی تلوار سے نہیں: یہاں بنی اسرائیل کی کامیابی کو ان کے صبر کا نتیجہ بتایا اور حسن سے مروی ہے کہ اگر لوگ جب ان کو اپنے بادشاہ کی طرف سے کسی قسم کی تکلیف پہنچے صبر کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تو بہت دیر نہ لگے گی کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو دور کر دے گا لیکن وہ گھبرا کر تلوار کی طرف جاتے ہیں سو اسی کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں اور انہی سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کو جو کچھ ملا ان کے صبر سے ہی ملا۔ اور یہ امت جب تلوار کی طرف دوڑے گی، تو کبھی نتیجہ اچھا نہ ہوگا (ر) ان روایات کو نقل کر کے مصنف روح المعانی لکھتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کو ۱۲۴۸ سال تک دیکھا کہ وہ جب تلوار کی طرف دوڑے ہیں تو ان کو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا، نہ ان کی مراد پوری ہوئی نہ کوئی محمود امر ہوا۔

ع۱۱۴۶ اصنام صَنَم کی جمع ہے اور وہ جسم ہے جو چاندی، تانبے لکڑی وغیرہ سے بنایا جائے۔ ان کی عبادت کرتے تھے اس خیال سے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اس سے حاصل ہوتا ہے اور بعض نے صنم سے مراد ہر اس چیز کو لیا ہے جس کی من دون اللہ پرستش کی جائے۔ بلکہ ہر چیز جو اللہ تعالیٰ سے دوسری طرف لے جانیوالی ہو (غ)

بنی اسرائیل پر مصریوں کا اثر: مصری لوگ ہر چیز کی پرستش کرتے تھے اس قسم کی بت پرست قوم میں رہ کر بنی اسرائیل کی عادات میں بُت پرستی داخل ہو گئی تھی اس لیے بار بار بت پرستی کی طرف ان کا میلان پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں پر ہمسایہ قوم کا اثر بہت ہوا ہے یہاں تک کہ قبر پرستی پیر پرستی کے رنگ میں طرح طرح کے مشرکانہ عقیدے ان میں پھیل گئے ہیں اور ہر قسم کی مشرکانہ رسوم و رواج ان میں جڑ پکڑ گئے ہیں۔

ع۱۱۴۷ متبر۔ تِبر اس سونے یا دوسری معدنی چیز کو کہتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی حالت میں یعنی ذرات کی صورت میں مٹی میں ملی ہوئی ہو اور تَتْبِیرٌ کے معنی ہیں ایک چیز کو توڑ دیا اور ہلاک کر دیا۔ پس مُتَبَّر کے معنی توڑ کر ہلاک کر دیا گیا۔ اور تبار ہلاکت ہے ولا تزد الظالمین الا تبارا (نوح ۷۱-۲۸) وکلا تبرنا تتبیرا۔ (الفرقان ۲۵-۳۹)

ما ھم فیہ۔ جس معاملہ میں یہ ہیں یعنی بت پرستی یا ان بتوں کو حصول قرب بارگاہ الٰہی کا ذریعہ خیال کرنا بالفاظ دیگر مذہب بت پرستی آخر کار دنیا سے اُٹھ جائے گا اب تک دنیا کی تاریخ سے اس پر شہادت ملتی ہے کہ بُت پرستی کا مذہب دنیا میں علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتا چلا گیا ہے۔ اور یقیناً وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ مذہب بالکل نابود ہو جائے گا اور خدائے واحد کی عبادت دنیا میں قائم ہوگی۔

ع۱۱۴۸ اس میں شرک کے خلاف اعلیٰ درجہ کی دلیل دی ہے جو فطرت انسانی کو اپیل کرتی ہے یعنی فرمایا کہ خدا نے انسان کو تو ساری مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔ پھر کیا اسی مخلوقات میں سے تمہارے لیے معبود تجویز کیا جائے اور فطرت انسانی کو اس چیز کے آگے جھکایا جائے جس پر اس کو فضیلت حاصل ہے۔

سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ع

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

بُرا دُکھ پہنچاتے تھے تمھارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمھارے رب سے بڑی آزمائش تھی۔

اور ہم نے موسیٰؑ سے تیس ۳۰ رات کا وعدہ ٹھیرایا اور ان کو دس (اور) سے پورا کیا تب اس کے رب کی مدت چالیس رات پوری ہوئی ۱۱۴۹ اور موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا میری قوم میں میری جگہ کام کر اور اصلاح کرنا اور فساد کرنیوالوں کی راہ کی پیروی نہ کرنا ۱۱۵۰

اور جب موسیٰؑ ہمارے وقت مقررہ پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا۔ کہا، میرے رب مجھے (اپنا آپ) دکھا کہ میں تیری طرف دیکھوں۔ کہا تو مجھے نہیں دیکھ سکتا لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر یہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تو تُو مجھے بھی دیکھ لے گا، پس جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر گیا، پھر جب ہوش میں آیا تو کہا تو پاک ہے میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں ۱۱۵۱

ع۱۱۴۹ سورۂ بقرہ میں صاف فرمایا کہ موسیٰ سے ہم نے چالیس رات کا وعدہ کیا تھا اور یہاں بھی چالیس رات کو ہی میقات ربہ یعنی رب کا مقرر کردہ وقت کہا ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ پہلے تیس رات کا وعدہ کیا تھا اور اس کے گزر جانے کے بعد پھر دس راتیں اور بڑھا دیں، بلکہ مطلب صرف ایک ماہ اور دس دن کو ظاہر کرنے کا ہے۔ کیونکہ تیس رات کا ایک پورا مہینہ بنتا ہے اور اس تقسیم میں اشارہ اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ سنت انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے بھی چالیس راتیں مقرر کی ہیں تیس راتیں رمضان کی اور دس ذی الحج کی جو خاص طور پر عبادت کی راتیں ہیں۔

ع۱۱۵۰ اخلفنی۔ خَلَفَ فلانٌ فلاناً سے مراد ہوتی ہے اس کی طرف سے حکومت کے کام کو سنبھالا۔ قام بالامر عنہ (غ)

ہارونؑ کی خلافت سے مراد: نبی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ دونوں تھے۔ مگر حکومت اور سرداری کا منصب حضرت موسیٰؑ کو حاصل تھا اس لیے اخلفنی سے مراد صرف یہی ہے کہ حکومت کا کام جو حضرت موسیٰ کے سپرد تھا وہ ان ایام میں حضرت ہارون کریں۔ نہ یہ کہ ان کی جگہ نبوت کا کام کریں۔ کیونکہ نبی وہ خود اصالتاً تھے۔

ع۱۱۵۱ تجلّی۔ جَلْوٌ کے معنی ہیں کھلے طور پر ظاہر یا الگ کر دینا اسی سے جَلَاء ہے یعنی وطن سے نکال دینا لولا ان کتب اللّٰہ علیہم الجلاء (الحشر ۵۹ ـ ۳) اور اسی سے جَلْوَۃ ہے اور تجلّی کبھی بالذات ہوتی ہے جیسے والنہار اذا تجلّٰی (الیل ۹۲ ـ ۲) اور کبھی امر اور فعل سے جیسے یہاں (غ)

صعقا۔ صَعِقَ الانسان کے معنی ہیں اس کو غش آ گیا اور ایسے شخص کو صَعِق کہا جاتا ہے (ل)

موسیٰ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا سوال: جیسا کہ ع۸۳ میں دکھایا جا چکا ہے۔ اصل سوال حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کا تھا لن نؤمن لک حتّٰی نری اللّٰہ جہرۃ (البقرۃ ۲ ـ ۵۵) انہی کی خاطر حضرت موسیٰ نے یہ سوال کیا تھا جس طرح حضرت عیسیٰ نے حواریوں کی درخواست کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا انزل علینا مائدۃ من السماء حالانکہ اس سوال کو ناپسند بھی کرتے تھے۔ اور اپنے متعلق درخواست اس لیے کی کہ بنی اسرائیل کے وہ سردار تو خدا سے بہت دُور پڑے ہوئے تھے اس لیے اگر انسان کے لیے ان آنکھوں سے خدا کو دیکھنا ممکن ہے تو خدا کا ایک نبی اسے دیکھ سکتا ہے جس کے ساتھ وہ کلام بھی کرتا ہے۔ جواب ملا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بلکہ وہ اپنی تجلیات سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اس کی تجلیات کیا ہیں۔ قدرت کے سب کام اس کی تجلیات ہیں ہیں۔ ہاں بعض تجلیات دوسروں سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنی تجلی کا ایک زبردست نمونہ دکھایا جس سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یہی وہ رنگ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا طاقتور ہاتھ دنیا میں کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بڑے بڑے انسان اور بڑی بڑی قومیں جو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے طاقتور ہاتھ کے سامنے یوں پاش پاش ہو جاتے ہیں کہ گویا کچھ بھی نہ تھے۔ اور شاید اس تجلی کے دکھانے میں بھی یہ اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے سامنے

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝۱۴۴

کہا اے موسیٰ میں نے تجھے اپنے پیغاموں اور اپنے کلام سے (دوسرے) لوگوں پر چن لیا — سو جو میں نے تجھے دیا ہے وہ لے، اور شکر کرنے والوں میں سے ہو ۱۱۵۲ع

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۗ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۱۴۵

اور ہم نے اس کے لیے تختیوں میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل فرض کر دی — سو اس کو مضبوطی سے پکڑ اور اپنی قوم کو حکم دے کہ اس کی بہترین باتیں پکڑے زمین میں تم کو نافرمانوں کا گھر (بھی) دکھا دوں گا ۱۱۵۳ع

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِىَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَىِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝۱۴۶

میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور اگر وہ ہر ایک نشان بھی دیکھ لیں تو اس پر ایمان نہ لائیں اور اگر وہ درستی کی راہ دیکھ لیں، تو اسے (اپنا) راستہ نہ ٹھیرائیں اور اگر وہ گمراہی کا رستہ دیکھ لیں تو اسے (اپنا) رستہ بنا لیں، یہ اس لیے کہ انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل رہے ۱۱۵۴ع

مشکلات کے پہاڑ بھی ہونگے تو اُڑ جائیں گے۔

حضرت موسیٰ کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس تجلی میں ایک اور اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی کامل تجلی حضرت موسیٰ کے لیے مقدر نہ تھی بلکہ اس کا ظہور محمد مصطفےٰ صلعم کے لیے مقدر تھا۔ اسی لیے حضرت موسیٰ کے اس ریزہ ریزہ شدہ پہاڑ کے مقابل پر رسول اللہ صلعم پر تجلی کے مقام کو بلد امین کے نام سے موسوم کیا ہے وطور سینین وھذا البلد الامین (التین ۹۵ - ۲و۳)

حضرت موسیٰ کے ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ سکنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قیامت کے دن بھی مومن اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ سکیں گے کیونکہ وہ اور حواس ہونگے۔

۱۱۵۲ع کلام الٰہی اور رسالت: یہاں رسالت اور کلام کو الگ الگ کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کلام ان سے بھی کرتا ہے جن کے سپرد رسالت کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ جیسے اس امت کے مجددین۔ رسالت پیغام ہے جو عموماً حکم کے رنگ کا ہوتا ہے اور کلام میں پیشگوئیاں وغیرہ داخل ہیں۔

۱۱۵۳ع کتبنا۔ کتاب۔ بمعنی اثبات۔ ایجاب۔ فرض بھی آتا ہے (غ) پس مراد یہاں فرض کر دینا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو انسان کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ اس کی تحریر انسان کی تحریر کی طرح نہیں ہو سکتی اس کا لکھنا اس کا فرض کر دینا ہے جیسے کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی (المجادلۃ ۵۸ - ۲۱) میں بھی یہی مراد ہے۔ ایسا ہی کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت (البقرۃ ۲ - ۱۸۰) میں یا کتب علیکم الصیام (البقرۃ ۲ - ۱۸۳) میں۔

اللہ تعالیٰ کے توریت لکھنے سے مراد: ان تمام موقعوں پر فعل کتاب اللہ کی طرف منسوب ہے اس لیے اگر توریت کو الواح میں خدا نے خود لکھا تھا تو قرآن میں بھی یہ احکام خود ہی لکھے۔ یہ کہنا کہ توریت اپنے ہاتھ سے لکھی۔ اور قرآن اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا ایک بے معنی تفریق ہے۔ اس بارہ میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے اگر کتابوں میں کوئی کتاب خصوصیت سے ممتاز ہے تو وہ قرآن کریم ہے۔ اس کے مقابل میں توریت کے علوم سمندر کے مقابل میں ایک چھوٹی سی ندی کا حکم بھی نہیں رکھتے۔

توریت میں ہر چیز کی تفصیل سے مراد: لکل شئ یعنی ہر چیز جن کی ان کو اس وقت حاجت تھی۔ کیونکہ باوجود اس تفصیل کے بعد میں جو انبیاء آئے ان کو کتابیں بھی دی گئیں جیسے داؤد کو زبور اور عیسٰے کو انجیل اور ان کتابوں میں ان باتوں کی تفصیل تھی جن کی ضرورت ان انبیاء کے وقت میں پیش آئی۔

باحسنھا۔ تعلیم جو خدا کی طرف سے آتی ہے سب ہی احسن ہوتی ہے مگر چونکہ یہاں ایک بلند مقام کی طرف اشارہ ہے اس لیے خصوصیت سے احسن وجہ پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے۔ اگر نبی کے پہلے متبعین ہی اعلےٰ مقامات پر نہ پہنچیں تو پچھلے بہت ہی گر جائیں گے۔ اسی کی طرف دار الفاسقین میں اشارہ کیا ہے یعنی اس قوم کی حالت ایک وقت نافرمانی کی ہو جانیوالی ہے اور فاسقوں کا جو انجام ہوتا ہے وہ بھی تم دیکھ لوگے دار الفاسقین سے یہی مراد ہے یا یہ کہ تم کو دکھا دونگا کہ فاسقوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

۱۱۵۴ع ہو سکتا ہے کہ اس کلام کا خطاب کفار مکہ سے ہو اور ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل سے ہی یہ خطاب منقول ہو۔ متکبر اپنے کبر کی وجہ سے حق اور صداقت سے

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ
حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا
مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٧﴾

اور جنھوں نے ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے عمل بے کار ہوئے ۔ ان کو کوئی بدلہ نہ ملے گا ، مگر وہی جو عمل کرتے تھے ۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ
حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ ۚ أَلَمْ
يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ
اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴿١٤٨﴾

اور موسیٰؑ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا اپنا لیا ، ایک جسم جس میں سے گائے کی آواز نکلتی تھی کیا انھوں نے نہ دیکھا کہ وہ ان سے کلام نہیں کرتا اور نہ ان کو رستہ دکھاتا ہے اس کو (معبود) بنالیا اور وہ ظالم تھے ۱۱۵۵

وَلَمَّا سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ
ضَلُّوا ۙ قَالُوا لَئِنْ لَمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا
وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿١٤٩﴾

اور جب وہ پشیمان ہوئے — اور دیکھ لیا کہ وہ یقیناً گمراہ ہوگئے کہنے لگے اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ۱۱۵۶

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ
أَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِنْ
بَعْدِي ۖ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَأَلْقَى

اور جب موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف لَوٹ کر آیا غضبناک افسوس کرتا ہوا ۱۱۵۷ — کہا میرے پیچھے تم نے میری بُری نیابت کی ۔ کیا تم نے اپنے رب کے امر کو جلد چاہا ۱۱۵۸ اور تختیاں

دور جا پڑتا ہے یہاں تک کہ غلطی اسے اچھی معلوم ہوتی ہے اور دلائل اور نشانات کی وہ کچھ پروا نہیں کرتا ۔ تکبر تمام بدیوں کی جڑ ہے ۔

ع ۱۱۵۵ حُلِیّ ۔ حَلْی کی جمع ہے ۔ زیورات ۔ اسی سے ہے یحلون فیہا من اساور من ذھب (الکھف ۔ ۳۱) وحلّوا اساور من فضۃ (الدھر ۔ ۲۱) اور حلیۃ کے معنی بھی زیور ہیں او من ینشؤا فی الحلیۃ (الزخرف ۔ ۱۸) جنگل میں اور مال و دولت تو کیا ہوگا ۔ زیورات جو کچھ پاس تھے ان کو اکٹھا کرکے یا ان میں سے بطور چندہ لیکر ایک بچھڑے کی صورت بنالی ۔

جسداً ۔ عجلاً سے بدل ہے یا اس کی صفت یعنی وہ محض ایک جسم تھا جس کے اندر کوئی جان نہ تھی ۔

خوار ۔ گائے کی آواز کو کہتے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا منقطع نہیں ہو سکتا : بچھڑے کے معبود بنانے کے خلاف جو دلیل یہاں دی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا تھا اور نہ رستہ بتاتا تھا پس معلوم ہوا معبود وہ ہو سکتا ہے جو کلام بھی کرے اور رستہ بھی دکھائے جو لوگ اس زمانہ میں خدا کا کلام کرنا بالکل منقطع مانتے ہیں وہ اس کی معبودیت کے خلاف اسی دلیل سے اپنے آپ کو ملزم ٹھہراتے ہیں ۔

ع ۱۱۵۶ سقط فی ایدیھم ۔ سُقُوط ایک چیز کا بلند مکان سے پست مکان میں گرنا ہے اور سقط فی ایدیہم بطور محاورہ کے نادم ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔

ع ۱۱۵۷ اسفا ۔ اَسَف وہ غم ہے جس کے ساتھ غضب بھی ملا ہوا ہو گو صرف بمعنی غم و بمعنی غضب بھی آتا ہے (رغ) حضرت موسیٰ کو بذریعہ وحی قوم کی اس لغزش کا علم ہو گیا تھا ۔ قال فانا قد فتنا قومک من بعدک واضلھم السامری (طٰہٰ ۔ ۸۵) اس لیے آپ قوم کے اس مشرکانہ فعل پر غصہ میں تھے ۔ ایسے امور میں غضب کا آنا مذموم نہیں بلکہ مستحسن ہے ۔

ع ۱۱۵۸ عجلتم امر ربکم کے معنی کئی طرح پر کیے گئے ہیں عجلتم عما امرکم بہ ربکم یعنی تمہارے رب نے جو وعدہ تم سے کیا تھا اس کے بارے میں جلدی کی ۔ کشاف میں عجلتم عن امر ربکم مراد لیکر عجل عن الامر کے معنی کیے ہیں ترکہ غیر تام یعنی اسے نامکمل چھوڑا ۔ لیکن سورۃ طٰہٰ میں اس کی تفسیر خود موجود ہے جہاں آیۃ ۸۶ میں ایسا ہی ذکر کرکے فرمایا افطال علیکم العھد ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم یعنی کیا چالیس رات کا عہد تمہیں لمبا معلوم ہوا ۔ یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو ۔ پس امر ربکم سے مراد رب کی سزا یا اس کا غضب ہی ہے اور امر بمعنی سزا قرآن کریم میں آیا ہے ۔ مراد یہ ہے کہ سزا تو قوم پر پیچھے دیر سے آیا کرتی ہے مگر تم نے اس کو میری زندگی میں اور میرے سامنے اس قدر جلدی لانا چاہا ۔

الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ
إِلَيْهِ ۚ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي
وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ بِيَ
الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿١٥٠﴾
قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي
ع رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٥١﴾
إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ
غَضَبٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾
وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِنْ
بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ
بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٥٣﴾
وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ
الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ
لِلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿١٥٤﴾
وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا
لِمِيقَاتِنَا ۖ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ

ڈال دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچا۔ اس نے کہا ماں کے بیٹے قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے مار دیں، سو دشمنوں کو مجھ پر مت ہنسا۔ اور مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ نہ ملا ع۱۱۵۹

(موسیٰؑ نے) کہا میرے رب میری اور میرے بھائی کی حفاظت فرما اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنیوالوں سے بڑھ کر رحم کرنیوالا ہے۔

جن لوگوں نے بچھڑا بنایا، ان کو اُن کے رب کی طرف سے ناراضگی اور دنیا کی زندگی میں رسوائی پہنچ کر رہے گی اور اسی طرح ہم جھوٹ بنانے والوں کو سزا دیتے ہیں ع۱۱۶۰

اور جنھوں نے برے کام کیے، پھر اس کے بعد توبہ کی اور ایمان لائے یقیناً تیرا رب اس کے بعد بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اور جب موسیٰؑ کا غصہ کم ہوا تختیاں لیں — اور ان کی تحریر میں اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت تھی جو اپنے رب سے خوف رکھتے ہیں ع۱۱۶۱

اور موسیٰؑ نے اپنی قوم کے ستر آدمی ہمارے وعدہ کے لیے چُن لیے ع۱۱۶۲ پھر اُن کو زلزلے نے آلیا۔ کہا، میرے

ع۱۱۵۹ تشمت۔ شمت سے ہے اور شماتۃ اس خوشی کو کہا جاتا ہے جو دشمن کے مبتلائے مصیبت ہونے پر ہو اور تشمیت چھینکنے والے کو جو دعا دی جائے اسے کہتے ہیں گویا اس طرح اس سے شماتت کا ازالہ کیا جاتا ہے۔ (غ)

ان الفاظ سے قرآن کریم نے حضرت ہارونؑ کے بچھڑا بنانے میں شرکت سے صاف انکار کیا ہے اور یوں بائبل کے اس بیان کو غلط ٹھہرایا ہے کہ ہارونؑ نے ہی یہ بچھڑا بنایا تھا حضرت ہارون جیسا کہ یہاں سے معلوم ہوتا ہے صرف اس لیے خاموش رہے کہ انھیں خوف تھا کہ اگر انہوں نے حکماً روکا تو لوگ انھیں قتل کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ کا سر پکڑ کر ان کو کھینچنا اس غصہ کی وجہ سے تھا جو ان کو صحیح طور پر تھا۔ اور انھیں یہ بھی خیال ہوگا کہ ہارونؑ نے کیوں ان کو حکماً اس سے نہیں روک دیا۔ آخر جب وجہ سنی تو بھائی کو اپنے ساتھ دعا میں شامل کیا۔ حضرت ہارون کا ابن ام سے خطاب کرنا رحمت کی طرف توجہ دلانے کو ہے۔

ع۱۱۶۰ ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ البقرۃ ۲-۵۴ میں جو فاقتلوا انفسکم کا حکم ہے اس سے مراد فی الواقع قتل نہیں کیونکہ یہاں سزا صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور دنیا میں رسوائی بتائی ہے اور اگلی آیت میں اس سزا کے ٹل جانے کی صورت توبہ بتائی ہے۔

ع۱۱۶۱ خروج ۳۲-۱۹ میں ہے کہ موسیٰ نے غصہ میں تختیاں توڑ ڈالیں مگر قرآن اس کا موید نہیں اور نہ یہ نبی کی شان کے شایاں ہے۔ قوم پر ناراض ہو کر احکام خدا کا استخفاف نبی کا کام نہیں ہو سکتا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم توریت سے نقل نہیں کرتا بلکہ اصل سرچشمہ کوئی اور ہے اسی لیے موقعہ موقعہ پر بائبل کی غلطیوں کی اصلاح کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی ایک واقعہ میں تین اہم امور میں بائبل کے قصہ کی اصلاح فرمائی ہے اوّل حضرت ہارون کی شرک عجل میں علیحدگی حالانکہ بروئے بائبل ہارون ہی بچھڑا بنانے والے تھے۔ دوم یہی تختیوں کا توڑنا، سوم بچھڑے کو جلا کر اس کی خاکستر کو پانی میں ملا کر بنی اسرائیل کو پلانا جو ایک بے معنی بات ہے۔

ع۱۱۶۲ ذکر عجل کے بعد کلام کا رجوع پھر اسی اصل واقعہ کی طرف کیا ہے جو حضرت موسیٰ کے طور پر جانے کا واقعہ ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ کی صرف ایک ہی میقات کا ذکر کیا ہے توریت میں دو دفعہ طور پر جانے کا ذکر ہے جس کی وجہ توریت کی تختیوں کا ٹوٹ جانا ہے یعنی چونکہ پہلی دفعہ جو

رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَإِيَّايَ ۖ
أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ۖ إِنْ هِيَ
إِلَّا فِتْنَتُكَ ۖ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَتَهْدِي
مَنْ تَشَاءُ ۖ أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا
وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ﴿١٥٥﴾
وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي
الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۚ قَالَ عَذَابِي
أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ
كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَ
يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٥٦﴾
الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ
الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ
وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ
عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ
وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ

رب اگر تو چاہتا ان کو اور مجھے پہلے سے ہی ہلاک کر دیا ہوتا
کیا تو ہم کو اس کے لیے ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے بیوقوفوں نے کیا یہ صرف
تیری آزمائش ہے ۔ تو اس کے ساتھ جسے چاہتا ہے گمراہ ٹھیراتا ہے
اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو ہی ہمارا ولی ہے سو ہماری حفاظت
فرما اور ہم پر رحم کر اور تو سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے ۱۱۶۳

اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں
ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں ۔ کہا ، میرا عذاب اس
میں جسے چاہوں مبتلا کروں اور میری رحمت ہر شے پر
حاوی ہے سو میں اس کو ان کے لیے لکھ دوں گا جو تقوےٰ کرتے ہیں
اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں ۱۱۶۴

اور وہ جو رسول نبی امّی کی پیروی کرتے ہیں ، جسے
وہ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں
وہ اُن کو بھلی باتوں کا حکم دیتا ، اور ان کو بُری باتوں
سے روکتا اور ان کے لیے ستھری چیزیں حلال کرتا اور
ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا اور ان سے ان کا بوجھ
اتارتا ہے اور وہ طوق بھی جو ان پر تھے ۔ سو جو لوگ

تختیاں حضرت موسیٰ لائے تھے وہ غصہ میں آکر توڑ دیں اس لیے دوبارہ پھر تختیاں دیں سے لینے گئے مگر چونکہ قرآن کریم اس تختیوں کے توڑنے کے واقعہ کو ہی تسلیم نہیں کرتا الخ دوسری میقات کا اس میں نہ کوئی ذکر ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور مفسرین کا یہ خیال کہ بچھڑے کی پرستش کی وجہ سے جو ناراضگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی اس کے لیے پھر جانے کی ضرورت پیش آئی یا حضرت موسیٰ پر ہارونؑ کے قتل کا الزام جب بنی اسرائیل نے لگایا تو اس کی صفائی کے لیے ہارونؑ کی قبر پر ان ستر آدمیوں کو لیکر حضرت موسےٰ گئے محض قصے ہیں ۔ پس یہ ستر آدمی وہی تھے جو اس وقت حضرت موسیٰ کے ساتھ گئے جب آپ کو شریعت دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے طور پر بلایا تھا ۔ اور انہوں نے ہی کہا تھا لن نومن لك حتی نری اللہ جھرۃ (البقرۃ ۲ ـ ۵۵) اور اس کے مطابق ابن جریر میں ایک روایت بھی موجود ہے اور ذکر عجل کے بعد پھر طور والے واقعہ کا ذکر اس لیے کیا کہ اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو توریت میں حضرت موسیٰ کو بتائی گئی جیسا کہ آیت ۱۵۷ میں صاف اس کی تصریح فرمادی ۔

ع ۱۱۶۳ الرجفۃ کے لیے دیکھو ۱۱۱۳ سورۂ بقرہ کی آیت ۵۵ میں اسی کو الصاعقۃ کہا ہے جس کو یہاں الرجفۃ کہا ہے اور دونوں جگہ ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے فاخذ تھم الرجفۃ وھی الصاعقۃ (ج) اب گو الصاعقۃ کئی معنوں میں آتا ہے مگر الرجفۃ صرف زلزلہ کے معنی میں آتا ہے اور چونکہ صاعقۃ کے معنی صوت شدید یعنی سخت آواز ہیں اس لیے اس سے مراد وہ آواز ہے جو بڑے زلزلہ سے پہلے آتی ہے ۔

یہاں بعض مفسرین نے صرف غشی کا واقع ہونا مراد لیا ہے قیل غشی علیھم ثم افاقوا (د) یعنی ان کو صرف غشی آئی تھی پھر آفاقہ ہو گیا او اصعقھم فسلب افھامھم (ج) یعنی ان پر صاعقہ بھیجا اور ان کے فہموں کو سلب کر لیا اور یہی حق ہے جیسا کہ ع ۹۵ میں دکھایا جا چکا ہے اور جو بیوقوفوں نے کیا اس سے مراد ان کا یہ کہنا ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کو کھلا کھلا نہ دیکھ لیں ہم ایمان نہ لائیں گے ۔

ع ۱۱۶۴ رحمتی وسعت کل شی ۔ اس قدر وسیع رحمت الٰہی کا علم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اللہ تعالیٰ نے دیا ، جو دنیا کی تمام اشیاء پر حاوی ہے جس میں مسلم اور کافر ، فرمانبردار اور عاصی دونوں آجاتے ہیں ۔ وہ رحمان ہے اور اس کی رحمت بلا عمل کام کرتی ہے اس لیے کفار کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہے ۔ مگر مومنوں کے لیے خصوصیت سے اس کا اثبات کیا ہے ۔

اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

اس پر ایمان لائیں اور اس کی تعظیم کریں اور اس کو مدد دیں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے وہی کامیاب ہوں گے ١١٦٥

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْیٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

کہہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ وہ جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر جو اللہ اور اس کے کلموں پر ایمان لاتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ ١١٦٦

ع ١١٦٥ الامی۔ اُمی ناخواندہ کو بھی کہتے ہیں اور اس شخص کو بھی جو ام القریٰ یعنی مکّہ کی طرف منسوب ہو دیکھو ع ١٠٣ اور نبی اُمّی سے مراد نبی عربی ہی ہے جیسا کہ آگے دکھایا جائے گا۔

اِصرھم۔ اِصر کے معنی کے لیے دیکھو ع ٣٦٥ یہاں مراد ایسا عہد ہے جس کا نقض خیرات سے محروم کر دیتا ہے جیسے وہ عہد جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ لیا جاتا ہے اور عام طور پر کسی امر کو کہا جا سکتا ہے جو خیرات سے روک دے (غ)

اغلال۔ غُلّ کی جمع ہے دیکھو ع ٨٥٠ وہ لوہا جس کے ذریعہ سے ہاتھ گردن سے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اس سے مراد بھی ایسی چیز ہے جو انسان کو کام سے روک دے۔

عزروہ۔ تعزیر۔ اس نصرت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تعظیم ملی ہوئی ہو اور اسی سے تعزیر سزا کے معنی میں ہے کیونکہ وہ بھی ایک نصرت ہے جو ظلم سے روکتی ہے (غ)

حضرت موسیٰ کو توریت ملنے کے ذکر میں اس پیشگوئی کا ذکر کر دیا ہے اور ضروری تھا کہ کیا جاتا جو توریت میں آنحضرت صلعم کی آمد کے متعلق ہے بلکہ اسی غرض کے لیے حضرت موسیٰ کا ذکر بھی کیا تھا اس پیشگوئی میں رسول نبی امّی کا ذکر کیا ہے۔ اُمّی کے معنی اگر ناخواندہ لیے جائیں تو پیشگوئی میں کسی ناخواندہ رسول کے آنے کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن اس کے معنی اگر منسوب بہ اُم القریٰ یعنی مکّی یا عربی لیے جائیں تو پیشگوئی میں رسول عربی کا ذکر ہے کیونکہ حضرت موسیٰ کی اس پیشگوئی میں جو استثناء ١٨: ١٥۔ ١٨ میں ہے۔ بنی اسرائیل کو خطاب کر کے یہ صاف ذکر ہے کہ تیرے بھائیوں میں سے ایک نبی اٹھاؤں گا اور ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کی بھائی قوم بنی اسمٰعیل ہی تھی۔ گویا یوں بتا دیا کہ وہ رسول عربی ہوگا۔ اور پھر فاران سے اس کے طلوع کا ذکر بھی موسیٰ کی کتاب میں موجود ہے۔

انجیل میں آنحضرتؐ کی پیشگوئی: دوسری بات اس رسول کے متعلق یہ بتائی کہ اس کا ذکر توریت میں ہی نہیں، بلکہ انجیل میں بھی ہے۔ انجیل میں یہ ذکر دو طرح پر موجود ہے۔ ایک اس طرح پر کہ اسی مثیل موسیٰ رسول کا ذکر انجیل میں ہے دیکھو یوحنا ١: ٢١ کہ وہ اس وقت تک نہ آیا تھا اور دوسرے اس طرح پر کہ انجیل میں حضرت عیسیٰ کی پیشگوئی دوسرے فارقلیط کے آنے کی ہے۔ دیکھو یوحنا باب ١٤۔ ١٦۔ یہ کھلی کھلی پیشگوئیاں ہیں جو اور کسی کے حق میں پوری نہیں ہوئیں۔

رسول موعود کی صفات: اس کے بعد اس رسول کی صفات بیان کی ہیں۔ اصر اور اغلال کے دور کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو دور کرتا ہے جن سے انسان نیکیوں کے کرنے میں رکتا ہے۔ گویا بدیوں کی جڑ کاٹتا ہے اور انسان کی ترقی کی حقیقی راہ کھولتا ہے۔ اہل کتاب کے لیے یہ ایک کھلا نشان آنحضرت صلعم کی صداقت کا تھا کہ کس طرح وہ لوگ جن کی اصلاح سے یہودی اور عیسائی دونوں عاجز آ چکے تھے آنحضرت صلعم کی قوت قدسی سے ہر قسم کی بدیوں سے پاک ہوتے چلے جاتے تھے۔ کس طرح صدیوں کی بدیوں اور رسم و رواج کی قیدوں سے وہ آزاد ہوتے چلے جاتے تھے۔ اس طرح پر نیکی کا دنیا میں پھیلانا سوائے صادق کے دوسرے کا کام نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے جب پیشگوئی کا ذکر کیا تو یہ بھی بتا دیا کہ جن بیڑیوں کو تم نہیں کاٹ سکے ان کو عرب کے ایک اُمی نے کاٹ دیا اور یہی اس کے منجانب اللہ ہونے کا کافی نشان ہے۔

ع ١١٦٦ ساری نسل انسان کا نبی: یہ اس نبی عربی کی خصوصیت بتائی اور بتایا کہ اس کے لیے یہ پیشگوئیاں اس کا توریت و انجیل میں ذکر بے معنی نہ تھا۔ بلکہ اس قدر اہمیت اس کے ذکر کو اس لیے دی گئی کہ اس نے دنیا کی سب قوموں کی طرف رسول ہو کر آنا تھا۔ آپ سے پہلے تمام رسول ایک ایک قوم کی طرف آئے جیسا کہ خود ان انبیاءؑ کے ذکر سے جو اس سورت میں ہو چکا ظاہر ہے کیونکہ اس وقت کے حالات اسی کے مقتضی تھے۔ لیکن اس کا نتیجہ قومی تفریق اور بُعد ہُوا اس لیے سب سے آخر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا رسول بھیجا جو ساری قوموں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرے اور ساری نوع انسانی میں وحدت پیدا کرے۔ دنیا کے جس قدر مذاہب اسلام سے پہلے ہوئے وہ سب قومی مذاہب تھے اور جس قدر نبی ہوئے وہ سب قومی نبی تھے۔ مگر کل نسل انسانی کا مذہب اور کل بنی نوع انسان کا نبی ایک ہی ہُوا ہے جس کے منہ میں یہ لفظ ڈالے گئے انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ
وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿١٥٩﴾

اور موسیٰؑ کی قوم میں سے ایک جماعت ہے جو حق کے ساتھ ہدایت کرتے اور اس کے ساتھ عدل کرتے ہیں ؏ ۱۱۶۷

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ
اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ
اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ
وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا
وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٠﴾

اور ہم نے ان کو بارہ قبیلوں میں (الگ الگ) قومیں بنا کر تقسیم کر دیا اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی جب اس کی قوم نے اس سے پانی مانگا کہ اپنے عصا کو چٹان پر مار۔ تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ہر ایک قوم نے اپنا گھاٹ جان لیا اور ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کیا، اور ہم نے اُن پر من اور سلوٰے اتارا۔ ستھری چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں کھاؤ اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ
سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٦١﴾
فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ
قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ
ع ۲۰ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٢﴾

اور جب ان کو کہا گیا اس بستی میں رہو اور جہاں سے چاہو اس سے کھاؤ اور کہو ہمارے گناہ معاف کیے جائیں اور دروازے میں فرمانبرداری کرتے ہوئے داخل ہو، ہم تمھاری خطائیں بخش دیں گے احسان کرنے والوں کو ہم بڑھ کر دیں گے۔ مگر ان لوگوں نے جو اُن میں سے ظالم تھے اس بات کے سوائے جو ان کو کہی گئی تھی دوسری بات بدل دی۔ سو ہم نے ان پر آسمان سے وبا بھیجی اس لیے کہ وہ ظلم کرتے تھے ؏ ۱۱۶۸

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ
وقف لازم الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ
حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا
معانقة يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ
النصف بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٣﴾

اور ان سے اس بستی کا حال پوچھ جو دریا پر واقع تھی۔ جب وہ سبت کے بارے میں حد سے بڑھتے تھے۔ جب ان کے سبت کے دن ان کی مچھلیاں پانی کے اوپر ان کے سامنے آجاتیں اور جس دن اُن کا سبت نہ ہوتا ان کے سامنے نہ آتیں۔ اسی طرح ہم انکو آزماتے رہے اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ؏ ۱۱۶۹

؏ ۱۱۶۷ یہ بتانا مقصود ہے کہ ساری قوم نافرمان نہ تھی، ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو حق کے ساتھ دوسروں کو ہدایت بھی کرتے۔ اس لیے خود بھی حق پر قائم ہوتے اور معاملات میں بھی حق کے ساتھ عدل کا معاملہ کرتے۔

؏ ۱۱۶۸ ان واقعات کو تیسری دفعہ بیان کیا ہے۔ پہلی دفعہ سورۂ بقرہ میں حضرت موسیٰؑ کے ذکر میں۔ دوسری دفعہ سورۂ نساء میں حضرت عیسیٰ کے ذکر میں، تیسری دفعہ یہاں آنحضرت صلعم کے ذکر میں اور ہر مقام پر لانے میں ایک خاص غرض ہے۔

؏ ۱۱۶۹ القریة اس بستی کو بعض نے ایلہ کہا ہے جو مدین اور طور کے درمیان بحیرہ قلزم پر واقع ہے اور بعض نے خود مدین۔ حیتان۔ حوت کی جمع ہے مچھلی۔
شرعا۔ شارع کی جمع۔ شرع سے ہے جس کے معنی میں اظہار و تبیین ہے اس لیے شرعا کے معنی ہیں ظاھرۃ علی وجہ الماء یعنی پانی کے اوپر نظر آنیوالیاں سبت کے دن مچھلیوں کا پانی کے اوپر آجانا اور دوسرے دنوں میں نہ آنا یہودیوں کے لیے موجب ابتلا ہُوا۔ اس لیے کہ سبت کے دن ان کو شکار کی ممانعت تھی

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ
مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا
مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٦٤﴾

اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تم کیوں اس قوم کو وعظ کرتے ہو جسے اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب دینے والا ہے، انھوں نے کہا تاکہ تمھارے رب کے سامنے معذور ہوں اور شاید کہ وہ تقویٰ کریں

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ
يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا
بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٥﴾

سو جب انھوں نے اسے چھوڑ دیا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی، ہم نے ان کو بچا لیا جو بدی سے روکتے تھے اور جو ظالم تھے ان کو سخت عذاب میں پکڑ لیا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

فَلَمَّا عَتَوْا عَن مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا
قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿١٦٦﴾

سو جب انھوں نے اس سے سرکشی کی جس سے روکے گئے تھے۔ ہم نے انھیں کہا ذلیل بندر ہو جاؤ [1170]

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ
يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۗ
إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ
لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٧﴾

اور جب تیرے رب نے خبر دے دی کہ ان پر قیامت کے دن تک ایسے لوگوں کو اُٹھاتا رہے گا جو اُن کو بُرا عذاب دیتے رہیں۔ بیشک تیرا رب بدی کی سزا جلد دیتا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا رحم کرنے والا بھی ہے [1171]

وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا ۖ مِّنْهُمُ
الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَٰلِكَ ۖ وَبَلَوْنَاهُم
بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿١٦٨﴾

اور ہم نے انھیں فرقے بنا کر ملک میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کچھ اُن میں سے صالح ہیں اور کچھ اور طرح کے ہیں، اور ہم اُن کو سکھوں اور دکھوں سے آزماتے رہے تاکہ وہ رجوع کریں۔

فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ
يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ

پھر اُن کے پیچھے ایسے ناخلف لوگ آئے جو کتاب کے وارث ہوئے وہ اس ادنیٰ زندگی کا سامان لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم کو بخش

اور مچھلیوں کے اس دن اوپر آنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس دن اس کا شکار نہ کیا جاتا تھا اور جانور کی یہ عادت ہے کہ وہ وقت کو پہچانتا ہے۔

اس رکوع میں بھی یہود کی سرکشی کی مثالیں دی ہیں۔ نبی کریم صلعم کو تسلی دینے کے لیے ان مثالوں کو اس وقت پیش کیا ہے جب ابھی یہود سے آپ کا معاملہ نہیں پڑا تاکہ جب یہ قوم آپ کے ساتھ سرکشی سے پیش آئے تو آپ کو رنج نہ ہو اور یہ علم ہو کہ اس قوم کی عادت ہی سرکشی رہی ہے۔ ان لوگوں نے کس قدر غلطی کھائی ہے جنھوں نے یہ خیال کیا ہے کہ پہلے پہلے نبی کریم صلعم یہود کو اچھا کہتے تھے اور جب مدینہ میں اس قوم نے آپ کی مخالفت کی تب ان کو بُرا کہنا شروع کیا۔ حالانکہ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ اور اس وقت بھی قرآن کریم یہود کے اسی نقشہ کو پیش کرتا ہے جس کو بعد میں سورۂ بقرہ میں مدینہ میں پیش کیا ہے۔

ع۱۱۷۰ ان کے قردۃ یا بندر بننے کی تشریح ع۹۴ میں گزر چکی ہے۔ یہاں یہ بات مزید قابل غور ہے کہ ایک طرف تو اُن کے بندر بنانے کا ذکر کیا اور ساتھ ہی دوسری آیت میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو حاکم بناتا رہے گا جو اُن کو سخت دُکھ دیتے رہیں گے۔ حالانکہ حاکم انسانوں پر بنائے جاتے ہیں اور عذاب بھی انسان کو ہی دیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کی صورتیں بندروں کی سی نہ بنی تھیں بلکہ انسانوں ہی کی رہی تھیں۔

ع۱۱۷۱ تاذن ۔ اِذن کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۲۳ اور تَاَذَّن کے معنی اَعْلَمَ ہیں یعنی یہ علم دیدیا یا خبر دے دی۔

یہودیوں کے متعلق پیشگوئی: یہودیوں کے ہاتھ سے حکومت اسلام کے آنے سے پہلے نکل چکی تھی اور جہاں جہاں یہ قوم محکوم ہونے کی حالت میں رہی سخت ذلت کی حالت میں رہی۔ ہاں اسلام کے آنے سے پہلے یہ قوم صرف چند ایک قریب قریب کے ممالک میں ہی آباد تھی۔ اسلام کے بعد دنیا کے تمام ملکوں میں پھیل گئی اور جہاں کہیں رہی حکام وقت کی طرف سے بڑی بڑی خطرناک تکلیفیں اٹھاتی رہی۔ اور اس مصیبت کے متعلق جس کے نیچے اس وقت یہودی تھے۔ قرآن کریم نے یہ پیشگوئی کی کہ آئندہ بھی وہ رہیں گے۔ ہاں انه لغفور رحیم میں خوشخبری بھی دی کہ کچھ رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف کریں تو ان کی بدیوں کو بخش بھی دے گا۔ یعنی اس سزا سے ان کو نکال دے گا۔

سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِثْلُهُ
يَأْخُذُوهُ ۚ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ
الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ
وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ۗ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ
لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۶۹﴾
وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا
الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ﴿۱۷۰﴾
وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ
وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ
بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۷۱﴾ ع
وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ
ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ
بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُولُوا
يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ﴿۱۷۲﴾

دیا جائے گا اور اگر ان کے پاس اسی قسم کا سامان اور آجاتا ہے اسے بھی لے لیتے ہیں۔ کیا ان سے کتاب کے ذریعے عہد نہ لیا گیا تھا۔ کہ اللہ پر سوائے حق کے کچھ نہ کہیں گے اور جو کچھ اس میں ہے اسے پڑھتے ہیں اور پچھلا گھر اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ کرتے ہیں ۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ع۱۱۷۲

اور جو لوگ کتاب کو مضبوط پکڑتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں ہم کبھی اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

اور جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو ہلایا گویا وہ سائبان تھا، اور انھوں نے خیال کیا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے مضبوطی سے پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے یاد رکھو تاکہ تم بچ جاؤ ع۱۱۷۳

اور جب تیرے رب نے بنی آدم سے (یعنی) ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی اور ان کو اپنے آپ پر گواہ ٹھیرایا، کیا میں تمھارا رب نہیں انھوں نے کہا ہاں! ہم گواہ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن کہو ہم تو اس سے بے خبر تھے ع۱۱۷۴

ع۱۱۷۲ خَلْف کے عام معنی پیچھے ہیں۔ لیکن بالخصوص یہ لفظ بُرے محل پر استعمال ہوتا ہے بمقابلہ خَلَف کے جو اچھی جگہ پر بولا جاتا ہے یعنی خَلْف کے معنی ہیں المتأخِّرُ لِقُصُورِ مَنْزِلَتِہ یعنی ایسا پیچھے آنے والا جو مرتبہ میں گر گیا ہو (غ)

عَرَض۔ متاع دنیا کو کہتے ہیں یا ایسے مال کو جس کے لیے ثبات نہ ہو (غ)

یقولون۔ قول۔ یہاں بمعنی اعتقاد ہے یعنی دین کو چھوڑ کر دنیا کو لیتے ہیں اور پھر امید رکھتے ہیں کہ ہم بخشے جائیں گے۔ منہ سے کہنا مراد نہیں۔

میثاق الکتاب سے مراد وہ میثاق ہے جو کتاب یعنی توریت میں مذکور ہے گویا اضافت بمعنی فی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں تو صالح بھی تھے مگر جو پیچھے آئے وہ اکثر ناخلف ہی تھے۔ مال دنیا کے حصول کے لیے دین اور اخلاق کی ان کو پروا نہ رہی۔ اور اعتقاد یہ رکھا کہ گناہ تو اللہ تعالیٰ بخش ہی دے گا۔ لیکن حالت یہ تھی کہ اپنے گناہوں پر اصرار تھا۔ حالانکہ مغفرت کی امید تو اس حال میں رکھنی چاہیئے جب انسان گناہ پر اصرار نہ کرے۔ یہ اصول گناہوں کی مغفرت کا بتایا۔ یہ بنی اسرائیل کے قصہ میں مسلمانوں کا نقشہ ہے۔

ع۱۱۷۳ نتقنا۔ نَتْق کے اصل معنی لغت میں الزَّعْزَعَةُ والْهَزُّ ہیں (ل) یعنی ایک چیز کو حرکت میں لانا اور ہلا دینا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ونَتَقُوا احلامُنا الاثاقلا ہاں اس کے معنی جذب اور اقتلاع بھی آئے ہیں یعنی ایک چیز کا کھینچ لینا اور جگہ سے اکھیڑ دینا لیکن جب نَتَقْتُ الشَّیْءَ کے معنی حَرَّکْتُہٗ صاف لغت میں موجود ہیں اور ابھی پیچھے رجفة یعنی زلزلہ کا ذکر گزر چکا ہے تو یہی معنی یہاں مراد لیے جائیں گے۔ اس لیے بھی کہ پہاڑ کو جگہ سے اُٹھا کر ہوتے کے لشکر پر لانا اور پھر اُن سے اقرار پابندیٔ معاہدہ لینا اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے خلاف ہے جو اپنی شرائع کے بارہ میں اس نے رکھا ہے فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔ (الکھف۔ ۲۹)

ظُلَّة۔ اس بادل کو کہتے ہیں جو سایہ کرے اور اکثر استعمال اس کا اس میں ہے جسے ناپسند کیا جائے۔ عذاب یوم الظلة (الشعراء۲۶۔ ۱۸۹) اور اس کی جمع ظلل ہے فی ظلل من الغمام (البقرة۲۔ ۲۱۰) واذا غشیھم موج کالظلل (لقمٰن۳۱۔ ۳۲) (غ)

اسی کیفیت کا ذکر کیا ہے جب وہ پہاڑ کے دامن میں تھے اور اوپر سے زور کا زلزلہ آیا جس سے ان کو معلوم ہوا کہ بس پہاڑ ان کے اوپر ہی گر پڑے گا۔

ع۱۱۷۴ میثاق فطرت۔ یہود کی خلاف ورزیٔ میثاق کا ذکر کرتے ہوئے اس میثاق کا ذکر کیا جس کا تعلق کسی خاص قوم سے نہیں بلکہ فطرت انسانی سے تعلق ہونے کی وجہ سے اس کا دائرہ سب انسانوں پر محیط ہے یعنی فطرت انسانی میں ایک نُور رکھا گیا ہے جو اسے حق کی طرف ہدایت کرتا ہے یا جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر شہادت

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

یا کہو صرف ہمارے باپ دادا نے پہلے شرک کیا اور ہم ان کے پیچھے (ان کی) اولاد تھے۔ تو کیا تُو ہم کو اس کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو غلط کاروں نے کیا[1175]

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

اور اسی طرح ہم کھول کھول کر باتیں بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ رجوع کریں ۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

اور ان پر اس شخص کی خبر پڑھ دے جس کو ہم نے اپنی آیات دیں پھر وہ انھیں چھوڑ نکلا[1176] تب شیطان اس کے پیچھے لگا سو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا

دیتا ہے ۔ وحی الٰہی اسی نور کی معاون ہو کر اس کی تکمیل کرتی ہے ۔ پس یہودیوں کو گویا دونوں طرح پر خطاب کیا ۔ اس خاص میثاق کی طرف بھی توجہ دلائی جو اُن سے ہوا تھا اور اس فطری میثاق کی طرف بھی جو سب انسانوں سے ہُوا اور یوں بھی وحی الٰہی کا مضمون جس پر اس سورت میں خاص بحث ہے نامکمل رہتا اگر اس نورِ فطرت کی طرف توجہ نہ دلائی جاتی جس کو چمکانے کے لیے وحی الٰہی آتی ہے ۔

آیا یہ عہد آدم کی ذریت کو یکمرتبہ پیدا کر کے لیا گیا تھا جیسا کہ حضرت عمرؓ کی حدیث میں ہے ؛ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس حدیث کی تشریح میں بھی غلطی کی جاتی ہے الفاظ حدیث یہ ہیں ان اللہ تعالیٰ خلق اٰدم ثم مسح ظہرہ بیمینہ فاستخرج منہ ذریۃ فقال خلقت ھولاء للجنۃ الخ یعنی اللہ نے آدم کو پیدا کیا پھر اس کی پیٹھ کو دائیں ہاتھ سے چھُوا پھر اس سے ایک ذریت نکالی اور کہا ان کو میں نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے ۔ ان الفاظ کو اس رنگ میں ظاہر پر محمول کرنا کہ گویا سچ مچ اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ بھی تھا جس کے ساتھ اس نے فی الواقع آدم کی پیٹھ کو چھُوا صحیح نہیں نہ ہی قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح انسانی کو پہلے پیدا کر دیا تھا ۔ بلکہ اس سے مراد ارواح کی وہ پیدائش ہے جو علم الٰہی میں ہے یا یوں کہو کہ یہ محض عالم مثال کا ذکر ہے ۔ کیونکہ فی الحقیقت پیدائش ہر ایک روح کی جسم کے ساتھ ہوتی ہے جیسا کہ صاف فرمایا ثم انشانٰہ خلقا اٰخر (المومنون ۲۳-۱۴) ہاں ہر ایک چیز جو ہونے والی ہے وہ علم الٰہی میں پہلے موجود ہے اس لیے حدیث میں ذکر عالم مثال کا ہے اور یہی بات آیت کے صریح الفاظ سے معلوم ہوتی ہے ۔ کیونکہ یہاں آدم کی پیٹھ سے اولاد نکالنے کا ذکر نہیں بلکہ بنی آدم کی پیٹھ سے نکالنے کا ذکر ہے ۔ اور پھر ایک طرف تو کہا کہ بنی آدم سے ان کی اولاد نکالی اور دوسری طرف ساتھ ہی بدل کے طور پر فرمایا من ظہورھم ان کی پیٹھوں سے ۔ پس اس سے مراد ہر ایک نسل کا اپنے آبا کی پیٹھوں سے پیدا ہونا ہے من ظہورھم کے لفظ نے صاف بتا دیا کہ اس سے مراد ایک نسل کے بعد دوسری نسل کا پیدا ہونا ہے ۔

اشہدھم علیٰ انفسھم اپنے آپ پر گواہ ٹھہرانے سے مراد یہ ہے کہ دلائل ربوبیت ان کی فطرت میں رکھ دیئے اور عقل انسانی میں ان کو مرکوز کر دیا اور اسی کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کل مولود یولد علی الفطرۃ یعنی ہر ایک بچہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے اور قرآن کریم میں فرمایا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا (الروم ۳۰-۳۰) اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت جس پر سب لوگوں کو پیدا کیا ۔ پس ان دونوں آیتوں اور حدیث کا مطلب ایک ہی ہے اور ابن جریر میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلعم کی اس حدیث کو سنکر الا انہا لیست نسمۃ تولد الا ولدت علی الفطرۃ حسن نے فرمایا کہ یوں ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے واذ اخذ ربک من بنی اٰدم من ظہورھم ذریتھم جس سے معلوم ہوا کہ اس آیت سے یہی مطلب انہوں نے بھی نکالا پس اشھدھم علیٰ انفسھم میں یہ بتایا کہ فطرت انسانی اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ انسان اپنا رب آپ نہیں بلکہ اس کا رب کوئی ذات کامل مستجمع جمیع صفات کاملہ ہے جہاں سے کچھ حصّہ انسان بھی پاتا ہے ۔

شہدنا ۔ بلیٰ کے ساتھ انسانوں کا قول بھی ہو سکتا ہے ۔ یعنی ان کی فطرت اس صداقت کا اقرار کرتی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے یعنی اس صداقت کی کہ فطرت انسانی اپنے رب کا اقرار کرتی ہے ہم گواہی دیتے ہیں ۔

[1175] مبطلون ۔ باطل وہ ہے جس کے لیے کوئی ثبات نہیں ۔ اور ابطال کے معنی کسی چیز کو بگاڑ دینا اور اس کو نابود کرنا ہیں ۔ اور مُبطل سے مراد حق کا ابطال کرنے والا (غ)

اس اعتراض کا جواب کہ تقلیداً بدیاں کرنے والے قابل الزام نہیں : مطلب یہ ہے کہ اصل مُبطل یعنی ابطال حق کرنے والے تو وہ لوگ تھے جنھوں نے پہلے شرک کر کے اس کی بنیاد رکھی ۔ اور پیچھے آنے والی نسل محض ناقل ہے کیونکہ آبا و اجداد کی تقلید فطرت انسانی میں ہے ۔ اس لیے پیچھے آنے والے اپنی بریت ظاہر کرتے ہیں ۔ اس کا جواب اسی فطرت انسانی کے میثاق میں ہے یعنی وہ عقل و فطرت جس میں ربوبیت الٰہی مرکوز ہے وہ تو سب انسانوں کو ہم نے یکساں دی ہے ۔ اس لیے تقلید غلط کاری کے لیے کوئی حجت نہیں ۔

[1176] انسلخ ۔ سَلْخ حیوان کا چمڑا اتارنے کو کہا جاتا ہے اور اس لیے محض کسی چیز کا کھینچ لینا یا نکال لینا مراد لیا جاتا ہے نسلخ منہ النھار (یٰسٓ ۳۶-۳۷) اور انسلخ نکل گیا ۔ فاذا انسلخ الاشھر الحرم (التوبۃ ۹-۵) (غ)

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ
اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ
الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ
تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ
لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾

اور اگر ہم چاہتے تو ان کے ذریعے سے اس کا مرتبہ بلند کرتے لیکن وہ زمین کے ساتھ لگ گیا اور اپنی خواہش کی پیروی کی ع۱۱۷۷ سو اس کی مثال کتے کی مثال کی مانند ہے۔ اگر تو اس پر حملہ کرے تو ہانپے اور چھوڑ دے تو ہانپے - یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں - سو یہ حال بیان کر دے، تاکہ وہ فکر کریں ع۱۱۷۸

سَآءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا
وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

ان لوگوں کی مثال بُری ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور اپنے آپ پر ہی وہ ظلم کرتے ہیں ع۱۱۷۹

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ
يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

جس کو اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو وہ گمراہ چھوڑ دے تو وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ
وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ

اور یقیناً ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے - ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں - اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں

اتبعہ - تبع کے معنی پیروی کی اور اَتْبَعَہٗ کے معنی ہیں لحقہ یعنی اسے پالیا یا پکڑ لیا - فاتبعوھم مشرقین (الشعراء ۲۶ - ۶۰) واتبعناھم فی ھذہ الدنیا لعنۃ (القصص ۲۸ - ۴۲) (غ)

اس سے مراد کوئی خاص شخص نہیں گو بعض نے بلعم کا اور بعض نے کسی راہب اور بعض نے اُمیہ کا نام لیا ہے - اس کا عام ہونا خود اگلی آیت سے واضح ہے جہاں یہ لفظ صاف ہیں ذٰلک مثل الذین کذبوا بآیتنا یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہمارے احکام کو جھٹلاتے ہیں - پس جس شخص کو احکام الٰہی پہنچیں اور وہ ان کی پروا نہ کرے یا ان کو قبول کر کے رد کر دے اس کا وہ نور فطری بھی بجھ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیطان جو اس کے پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے اسے آ پکڑتا ہے پھر جدھر اسے شیطان چلاتا ہے اسی طرف چلتا جاتا ہے۔

ع۱۱۷۷ آخلد - اِخلاد - خُلد سے ہے اور اس کے معنی کسی چیز کا باقی رکھنا یا اس پر باقی رہنے کا حکم لگانا ہے - پس اخلد الی الارض کے معنی ہوئے اس کی طرف مائل ہو گیا یہ خیال کرتا ہوا کہ وہ اس میں باقی رہ جائے گا (غ)

ان الفاظ نے لفظ رفع کے معنی جس کی بحث ع۴۴۵ میں گزر چکی ہے پوری وضاحت سے کھول دیئے ہیں - یہاں رفع کے بالمقابل اخلد الی الارض یا زمین سے پیوست ہو جانے کے لفظ بھی موجود ہیں مگر تاہم نہ رفع سے مراد آسمان پر جانا ہے نہ اخلاد الی الارض سے مراد سچ مچ زمین کے ساتھ لگا رہنا ہے - بلکہ دونوں جگہ مراد روحانی طور پر رفع اور روحانی طور پر زمین کے ساتھ لگنا ہے - یہاں مفسرین نے رفعناہ کے معنی الی منازل الابرار کیے ہیں یعنی بلند مراتب کی طرف رفع اور یہاں رفع الی السماء کا نام کوئی نہیں لیتا حالانکہ یہاں تو مذکور بھی نہیں کہ رفع کہاں ہوا ہے لیکن جہاں رفع کے ساتھ الی اللہ صاف پڑا ہوا ہے وہاں بڑی اللہ کو سماء پر بیٹھا ہوا مان کر آسمان پر رفع مراد لیا جاتا ہے یعنی حضرت عیسٰی کے متعلق - یہ ایک غلطی عیسائیت کے مروجہ خیال سے بعض مفسرین کو لگ گئی اور دوسروں نے اس کی پیروی کی ورنہ رفع قرآن کریم میں کہیں بھی جہاں انسانوں کے رفع کا ذکر ہو رفع جسمانی کے معنی میں نہیں آتا۔

ع۱۱۷۸ یلہث - لَہَثَ کے معنی ہیں کتے کا زبان نکالنا درانحالیکہ اس کا سانس تیز ہو رہا ہو پیاس سے ہو یا تھک جانے سے (غ)

کتے کی مثال: ایسے لوگوں کی مثال جو احکام الٰہی کو جھٹلاتے ہیں کتے سے دی ہے جو ہر حال میں ہانپتا ہے خواہ کوئی اس پر حملہ کرے یا نہ کرے گویا قلق اور اضطراب ہر وقت ایسے انسان کے لیے لاحق حال رہتا ہے اور اطمینان قلب اسے کسی حال میں میسر نہیں آتا - احکام الٰہی یا وحی الٰہی کی غرض تو یہی ہے کہ انسان کو سکون یعنی اطمینان قلب حاصل ہو پس اس کا رد کرنا لازماً موجب قلق واضطراب ہے - اور اطمینان قلب صرف ذکر اللہ سے میسر آتا ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۱۳ - ۲۸)

ع۱۱۷۹ مثلاً - بطور تمیز واقع ہوا ہے اور اصل ترکیب یوں ہے ساء مثلاً مثل القوم الذین۔

لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

جن سے وہ سنتے نہیں - وہ چار پایوں کی طرح ہیں، بلکہ زیادہ گمراہ - یہی بے خبر ہیں ع۱۱۸۰

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اور اللہ کے سب اچھے نام ہیں سو ان کے ساتھ اس کو پکارو اور ان کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں ٹیڑھی راہ چلتے ہیں۔ انھیں اس کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کرتے تھے ع۱۱۸۱

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ ع

اور ان میں جنھیں ہم نے پیدا کیا - ایک گروہ ہے جو سچی راہ بتاتے ہیں اور اسی پر انصاف کرتے ہیں ع۱۱۸۲

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾

اور جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہم ان کو تدریجاً پکڑیں گے جہاں سے وہ جانتے بھی نہیں ع۱۱۸۳

ع۱۱۸۰ جہنم کے لیے انسانوں کا پیدا کرنا: قرآن کریم کی بہترین تفسیر خود قرآن سے ہی ہوتی ہے جو فرماتا ہے وما خلقت الجنّ والانس الّا لیعبدون - (الذّٰریٰت ۵۱ - ۵۶) یعنی جنّ و انس کو پیدا کیا تو صرف اس غرض کے لیے کہ وہ عبادت کریں۔ پس جہنم کے لیے پیدا کرنا غرض پیدائش نہیں ہو سکتی - اس لیے جیسا کہ روح المعانی میں ہے اکثر مفسرین نے یہاں لام کو لام عاقبت کہا ہے جیسے فالتقطہ اٰل فرعون لیکون لھم عدوا وحزنا (القصص ۲۸ - ۸) یعنی ان کا انجام یہ ہے کہ وہ جہنم میں جاتے ہیں جس طرح شاعر کہتا ہے لدوا للموت وابنوا للخراب - موت کے لیے اولاد پیدا کرو اور ویران ہونے کے لیے عمارتیں بناؤ مطلب یہ نہیں کہ ان میں تمہاری غرض یہ ہے بلکہ انجام تو یہی ہے کہ جو پیدا ہوگا وہ مریگا جو عمارت بنی سو ایک دن ویران ہوگی - اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو پیدا کیا (اور پیدا کرنے کی غرض بھی دوسری جگہ عبادت بتادی) مگر نتیجہ یہ ہے کہ وہ گویا جہنم کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے - کیوں؟ اس لیے کہ دل اور کان اور آنکھ سے کام نہیں لیتے یعنی اس لیے کہ کام ایسے کرتے ہیں جن کا نتیجہ جہنم ہے - اصل سوال یہ ہے کہ آیا وہ لوگ برے عمل اس لیے کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو پہلے ہی جہنم کے لیے پیدا کیا ہے یا وہ جہنم کے لیے اس واسطے پیدا ہوئے کہ وہ بُرے کام کرتے ہیں - سو قرآن شریف کا ایک ایک لفظ اس پر شاہد ہے کہ کوئی شخص اس لیے بُرے عمل نہیں کرتا کہ خدا نے اسکو کوئی الگ قسم کے قویٰ کے ساتھ پیدا کیا ہے یہاں بھی یہی بات فرمائی - کہ ان کو بھی وہی دل دیئے ہیں جو دوسروں کو مگر دوسرے ان سے سمجھ کا کام لیتے ہیں وہ نہیں لیتے یوں نہیں فرمایا کہ ہم نے ان کو دل دیئے مگر فقاہت سے خالی یہ تو اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہوتا اس لیے فرمایا کہ دل بھی ہیں اور فقاہت کی قوت بھی ان میں ہے مگر وہ خود اس قوت فقاہت سے کام نہیں لیتے ایسا ہی ان کو دوسروں کی طرح آنکھ اور کان دیئے مگر وہ خود ان سے دیکھنے اور سننے کا کام نہیں لیتے یہ نہیں کہ ان میں دیکھنے یا سننے کی قوت نہیں! شرف انسانیت یہی تھا کہ انسان سُنکر اور دیکھ کر اور سمجھ کر ان نتائج پر پہنچتا جن پر حیوان نہیں پہنچ سکتا اس شرف کو انہوں نے گنوا دیا اسلیئے چار پایوں کی طرح ہو گئے آخر پر ان کو غافل اس لیے کہا کہ قصور اُن کا اپنا ہے کہ وہ اصل مقصد زندگی سے یا شرف انسانیت سے بے خبر ہیں وہ چاہتے تو خبردار ہو سکتے تھے۔

ع۱۱۸۱ الاسماء - وہ الفاظ جو معانی مختلفہ پر دلالت کریں - یا صفات بھی معنی لیے جا سکتے ہیں - پہلے معنی کے لحاظ سے بھی مراد ان کا مفہوم احسن ہونا ہی ہے۔
یلحدون - اَلحد کے معنی ہیں حق سے باطل کی طرف مائل ہوا - الحاد فی الاسماء سے مراد اس کی طرف ایسی صفات منسوب کرنا ہے جو صحیح نہیں یا اس کی شان کے شایاں نہیں (غ)

اسمائے الٰہی سے حصول کمال: یہاں اسمائے الٰہی کا ذکر اس لیے کیا کہ انہی اسماء سے ہی انسان کمال کو حاصل کرتا ہے گویا جس اللہ تعالیٰ کے اسم کو پکارتا ہے اسی کمال کو اپنے اندر بھی چاہتا ہے اور ہر ایک غلط عقیدہ کسی اسم الٰہی میں الحاد سے پیدا ہوتا ہے اور غلط عقیدہ سے خراب عمل پیدا ہوتا ہے۔

ع۱۱۸۲ اُمۃ یھدون کی تفسیر خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہے ھذہ اُمّتی یعنی میری امّت آیت ۱۵۹ سے مقابلہ کر کے جہاں من قوم موسیٰ امۃ یھدون فرمایا اسی نتیجہ کی تائید ہوتی ہے گویا وہاں قوم موسےٰ کا ذکر ہے تو یہاں اُمّتِ محمدیہ کا۔

ع۱۱۸۳ سنستدرجھم - دَرَجَۃ - مَنزِلَۃ کی طرح ہے لیکن اوپر چڑھنے کے لحاظ سے اور اس سے مراد بلند مرتبہ بھی لیا جاتا ہے للرجال علیھن درجۃ (البقرۃ ۲ - ۲۲۸) ھم درجات عند اللہ (اٰل عمران ۳ - ۱۶۲) اور دَرَج کتاب یا کپڑے کے لپیٹنے کو کہا جاتا ہے اور جو لپیٹا جائے اسے بھی دَرَج کہا جاتا ہے اور اس لیے استعارۃً موت کو بھی دَرَج کہا جاتا ہے اسی سے استدراج ہے جس سے مراد ہے ان کا لپیٹ لینا جس طرح کتاب لپیٹ لی جاتی ہے گویا ان کی حالت غفلت کا ذکر ہے اور استدراج کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کو تدریج سے یعنی آہستہ آہستہ پکڑیں گویا وہ تھوڑا تھوڑا کر کے اپنی ہلاکت کے قریب آتے جاتے ہیں (غ)

ہلاکت میں تدریج: اس رکوع میں آنحضرت صلعم کے مخالفین کے انجام کا ذکر ہے کیونکہ جب نبوت اور اس کی ضرورت پر مفصل بحث ہو چکی تو اب اس قوم کا ذکر ضروری

وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۱۸۳﴾

اور میں ان کو مہلت دیتا ہوں، میری تدبیر مضبوط ہے ۱۱۸۴

اَوَ لَمْ یَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸۴﴾

اور کیا انھوں نے فکر نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو جنون نہیں ہے وہ صرف کھلے طور پر ڈرانے والا ہے ۱۱۸۵

اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

اور کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں نظر نہیں دوڑائی اور جو چیز اللہ نے پیدا کی ہے اور یہ کہ شاید ان کا وقت نزدیک آ گیا ہو ۔ سو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے ۔

مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ؕ وَ یَذَرُهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

جس کو اللہ گمراہ قرار دے اس کے لیے کوئی ہادی نہیں، اور وہ ان کو ان کی سرکشی میں چھوڑتا ہے اندھے ہو رہے ہیں۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ۚ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؔۘ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ یَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

تجھ سے اس گھڑی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا واقع ہونا کب ہوگا؟ کہہ، اس کا علم تو میرے رب کو ہی ہے اس کو اس کے وقت پر کوئی ظاہر نہیں کریگا مگر وہی۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری بات ہے تم پر اچانک ہی آئے گی۔ تجھ سے پوچھتے ہیں، گویا کہ تو اس کے متعلق کاوش کرنے والا ہے ۔ کہہ، اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۱۱۸۶

تھا جو حق کو نابود کرنا چاہتی ہے تو اس کے متعلق فرمایا کہ ہم آہستہ آہستہ ان کو ہلاکت کی طرف لیجائیں گے اور ان کا نہ جاننا اس لحاظ سے ہے کہ جب ایسی حالت ہوتی ہے تو حق کے مخالف اس مخالفت کے نشہ میں اس قدر سرشار ہوتے ہیں کہ وہ آتی ہوئی ہلاکت کو محسوس بھی نہیں کرتے ۔ یہ مکی سورت ہے بعینہٖ اسی طرح مدینہ میں جا کر اعدائے حق کی مخالفت کا انجام ہُوا ۔ ایسے رنگ میں کہ محسوس بھی نہیں کرتے تھے ۔ حق کے مخالف اپنی تباہی کا سامان اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں مگر ایسے تدریج کے ساتھ پکڑے جاتے ہیں کہ وہ ہلاکت آتی ہوئی بھی ان کو نظر نہیں آتی ۔

۱۱۸۴ متین ۔ مَتْن بلند اور سخت زمین کو کہتے ہیں گویا وہ پیٹھ کی دونوں طرف سے مشابہ ہے اس لیے مَتُنَ کے معنی ہیں مضبوط ہُوا اسی سے متین ہے (غ)
مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چھوٹے دل کے انسان کی طرح نہیں کہ ذرا کسی نے مخالفت کی تو فوراً پکڑ لیا ۔ بلکہ وہ مہلت دیتا ہے اس لیے کہ انسان کی طرح اس کو یہ فکر نہیں کہ شاید پھر میرے قابو میں نہ آسکے بلکہ خدا تعالیٰ کی تدبیر بڑی مضبوط ہوتی ہے اور انسان اپنے اوپر قیاس کر کے جب ایک جرم پر ایک دفعہ نہیں پکڑا جاتا تو سمجھ لیتا ہے کہ پکڑنے والا ہی کوئی نہیں ۔

۱۱۸۵ جنۃ ۔ جَنّ کے معنی ڈھانکنا اور جِنّۃ جنوں کی جماعت کو بھی کہتے ہیں جیسے من الجنّۃ والنّاس (الناس ۱۱۴ ۔ ۶) وجعلوا بینہ وبین الجنۃ نسبا (الصّٰفّٰت ۳۷ ۔ ۱۵۸) اور جنون کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ نفس اور عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے (غ)
رسول کو جنون نہیں ہوتا: رسول تو بدی کے بد انجام سے ڈراتا ہے ۔ اور یہ کوئی جنون کی بات نہیں قرآن کریم میں غور کرتے تو معلوم ہوتا کہ یہ کسی بلند مقام پر پہنچانا چاہتا ہے اور یہ کام مجنون کا نہیں ہوتا ۔ یہ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ انہی لوگوں کو مجنون کہا گیا جو انسان کو بلند سے بلند مقام پر پہنچانا چاہتے ہیں اور بدی کے بد انجام سے ڈراتے ہیں ۔ حالانکہ بدی کا انجام بد ہونے پر کل دنیا کا تجربہ شاہد ہے ۔

۱۱۸۶ مرسی ۔ رَسَا کے معنی ایک چیز مضبوط ہو گئی ۔ گڑ گئی اور اَرْسٰی اسے مضبوط یا قائم کر دیا قدور رّٰسیٰت (السبا ۳۴ ۔ ۱۳) گڑی ہوئی دیگیں رواسی شٰمخٰت (المرسلٰت ۷۷ ۔ ۲۷) جہاں رواسی جمع ہے اور مراد پہاڑ ہیں بوجہ مضبوطی کے جیسا کہ فرمایا والجبال ارسٰھا (النّٰزعٰت ۷۹ ۔ ۳۲) اور مُرْسٰی مصدر بھی ہے اور اسم مکان اور زمان اور مفعول بھی ۔ یہاں مراد اس کے قائم ہونے کا زمانہ ہے اور بسم اللہ مجرٖىھا ومُرْسٰھا (ھود ۱۱ ۔ ۴۱) کشتی کا ٹھہرنا یا لنگر ڈالنا (غ)
یجلی ۔ جَلْو سے ہے جس کے معنے کھلے طور پر ظاہر کر دینا ہیں یہی معنی تجلیۃ کے ہیں ۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا
مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ
لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۖۛ وَمَا مَسَّنِيَ
السُّوْٓءُ ۚۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

کہہ، میں اپنی جان کے لیے نفع کا مالک نہیں، اور نہ نقصان کا مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب جانتا ہوتا، تو بہت بھلائی لے لیتا، اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی[1] میں صرف ڈرانے والا ہوں اور ان لوگوں کو خوشخبری دینے والا جو ایمان لاتے ہیں[۱۱۸۷]

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ
وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ
فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ
بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ
اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾
فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ

وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس سے آرام حاصل کرے۔ پھر جب وہ اس پر پردہ ڈالتا ہے تو وہ ایک ہلکا سا بوجھ اٹھا لیتی ہے اور اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے پھر جب وہ بوجھ معلوم کرتی ہے دونوں اللہ اپنے رب کو پکارتے ہیں کہ اگر تو ہمیں صحیح و سالم (بچہ) دے تو ہم ضرور شکر کرنے والوں میں سے ہوں گے[۱۱۸۸]

پھر جب وہ ان کو صحیح و سالم (بچہ) دیتا ہے وہ اس میں جو ان کو دیا اس کے شریک ٹھہراتے ہیں

ثقلت۔ ثِقَل یا بوجھ کا لفظ اصل اجسام میں بولا جاتا ہے لیکن معانی میں بھی اس کا استعمال ہے فھم من مغرم مثقلون (القلم ۶۸ - ۴۶) اور ثقل القول اس بات کو کہا جاتا ہے جس کا سننا پسند خاطر نہ ہو۔ اسی لحاظ سے یہاں ساعت پر ثقلت بولا ہے (غ)

حفی۔ اِحْفا کے معنی ہیں سوال میں الحاح کرنا یا کسی چیز کا حال معلوم کرنے میں زیادہ کاوش میں لگے رہنا (غ)

یہاں الساعۃ سے کیا مراد ہے ع۹۳۱ میں دکھایا گیا ہے کہ ساعتیں یا قیامتیں تین ہیں: صغریٰ۔ وسطیٰ۔ کبریٰ۔ ساعت وسطیٰ ایک قوم کی تباہی کا وقت ہے اب ظاہر ہے کہ یہاں اوپر ذکر صاف الفاظ میں اعدائے حق کے پکڑا جانے کا ہے۔ جیسا کہ رکوع کے شروع کی آیتوں میں صفائی سے فرمایا۔ تو پس جب ان کو استدراج کی خبر دی گئی۔ اور یہ کہ ان کو تھوڑے وقت کے لیے مہلت دی جاتی ہے تو وہ سوال کرتے ہیں کہ یہ ہماری تباہی اور ناکامی کا وقت کب آئے گا۔ کیونکہ اس وقت وہ زوروں پر تھے۔ اس کا جواب یہ دیا کہ کب وہ وقت آئے گا اس کے بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اوپر بتا دیا تھا کہ آہستہ آہستہ اور تدریجاً آئے گا۔ ہاں یہ فرمایا کہ وہ کوئی ایسی آسان شے نہیں جس کے متعلق تم بار بار جلدی کرتے ہو اور اس کا ثقیل ہونا اس لحاظ سے بھی ہے کہ وہ اس قوم کے لیے ایک امر ناخوشگوار ہے اور اس لیے بھی کہ اسے دوسری جگہ خافضۃ رافعۃ (الواقعۃ ۵۶ - ۳) کہا ہے یعنی بعض یعنی کفار کو ذلیل کر دیگی اور بعض یعنی مومنوں کو بلند مقام پر پہنچا دے گی۔

ع۱۱۸۷ مخالفین کو ان کے بد انجام سے ڈرانے کے بعد قبول کرنے والوں کو خوشخبریاں سُنا کر پھر بھی یہی فرمایا کہ رسول عالم الغیب نہیں جس قدر اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا اس قدر سنا دیا اپنے لیے بشر سے بڑھ کر طاقت کا دعویٰ نہ کرنا دکھاتا ہے کہ کس قدر سادگی آپ کے اصول دین میں تھی سب کچھ سنا تو دیا مگر یہ بھی بتا دیا کہ حق کو حق کی خاطر قبول کرو نہ اس لیے کہ بہت سی آسایش مل جائے۔ اسلام کے اصول کی کامیابی کا اصل راز ان کی سادگی ہے اور شروع سے ہی یہ رنگ نظر آتا ہے صاحب انجیل کی طرح بڑے بڑے دعوے نہیں کہ میں یہ ہوں اور میں وہ ہوں۔ مگر کام اتنا بڑا کیا کہ حضرت عیسٰی کا کام اس کے سامنے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

ع۱۱۸۸ تغشٰھا۔ غَشِیَ کے اصل معنی ستر یعنی ڈھانک دینا یا پردہ ڈالنا ہیں واذا غشیھم موج (لقمٰن ۳۱ - ۳۲) فغشیھم من الیم ما غشیھم (طٰہٰ ۲۰ - ۷۸) اذ یغشی السدرۃ ما یغشیٰ (النجم ۵۳ - ۱۶) وغیرہ اور کنایۃً اس سے مراد جماع لیا جاتا ہے (غ)

صالحا۔ صلاح۔ فساد کی ضد ہے اس لیے صالح بلحاظ افعال بھی ہو سکتا ہے یعنی اس کے افعال میں کوئی فساد نہ ہو اور بلحاظ جسم بھی یعنی جس کے جسم میں کوئی نقصان نہ ہو اور یہی یہاں مراد ہے اس لیے کہ بچہ کی صلاحیت اس کے جسم کے لحاظ سے ہی ہو سکتی ہے۔ اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ مخالفت میں کیا طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ مگر پہلے بتایا ہے کہ انسان کس طرح ناشکری اختیار کرتا ہے جب دکھ اور تکلیف کا وقت ہوتا ہے تو خدا کو پکارتا ہے جب آسایش اور نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔

آدم کی طرف شرک کی نسبت غلط ہے: یہاں لفظ تو عام ہیں مگر نفس واحدۃ کے لفظ نے بہت لوگوں کو اس طرف مائل کر دیا کہ یہاں آدم و حوا کا ذکر ہے حالانکہ کسی حدیث میں یہ نہیں اور دوسری طرف الفاظ کو عام رکھنے سے کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ کیونکہ جو انسان پیدا ہوتا ہے وہ ایک ہی نفس سے پیدا ہوتا ہے اور بی بی یا جوڑے کا اسی نفس سے پیدا ہونا صرف حوا کے لیے مخصوص نہیں بلکہ تمام انسانوں کو یہی کہا ہے کہ تم سب کی بیبیوں کو تمہارے ہی نفسوں سے پیدا کیا ہے ومن ایاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا (الروم ۳۰ - ۲۱) جہاں سارے لفظ وہی ہیں جو یہاں ہیں۔ پس آدم و حوا پر ان کا لگانا اور اس پر یہ قصے بڑھانا کہ آدم و حوا کی اولاد نہ جیتی تھی تب انہوں

فِيمَآ اٰتٰهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

سو اللہ اس سے بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾

کیا وہ اسکو شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کرسکتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ اور وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اپنی مدد کر سکتے ہیں۔

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ، تو وہ تمھاری پیروی نہیں کرتے، تمھارے لیے یکساں ہے کہ تم اُن کو پکارو یا تم چپکے رہو۔[1189]

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

وہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، تمھاری طرح بندے ہیں سو اُن کو پکارو، تو چاہیئے کہ تم کو جواب دیں اگر تم سچے ہو۔[1190]

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾

کیا اُن کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سُنتے ہیں کہہ، اپنے شریکوں کو پکارو، پھر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے کبھی مُہلت نہ دو۔[1191]

نے ایک بچہ کا نام عبدالحارث رکھا اور حارث شیطان کا نام ہے سب بے بنیاد باتیں ہیں اور محقق مفسرین نے ان کو رد کیا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان آیات میں بت پرستی کے شرک کا ذکر ہے جیسا کہ آیت ۱۹۵ میں واضح کر دیا ہے اور کم از کم بت پرستی کی ابتدا حضرت آدم کی طرف آج تک کسی نے منسوب نہیں کی۔

ع ۱۱۸۹ اس آیت میں خطاب مشرکوں کو ہے جیسا کہ اگلی آیت سے واضح ہوتا ہے اور ان کو بتوں کی بے بسی کی طرف توجہ دلائی ہے اور ھدی سے مراد حصول کامیابی کی راہ ہے اور اتباع یا پیروی کرنے سے مطلب حصول مراد میں امداد دینا ہے سواء علیکم اس کو واضح کرتا ہے کیونکہ اگر دعوت الی الحق مراد ہو اور خطاب مسلمانوں کو ہو تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تمھارے لیے ان کا بلانا نہ بلانا یکساں ہے۔ دعوت الی الحق سے بہر حال بلانے والے کو فائدہ پہنچتا ہے۔

ع ۱۱۹۰ بتوں کا عبد ہونا: بتوں کو عباد امثالکم اس لحاظ سے کہا کہ وہ انسان کی طرح بندگی یعنی عاجزی کی حالت میں ہیں مسخر ہیں۔ محکوم ہیں۔ یا اس لیے کہ بُت انسانوں کی صورت پر بنائے جاتے تھے۔ یا انسانوں کی یادگار کے طور پر۔ تو مطلب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ وہ تمھاری طرح عباد ہیں اور یہ جو فرمایا کہ تم دعا کرو، تو پھر چاہیئے کہ وہ جواب دیں (یا قبول کریں)، تو اس سے معلوم ہُوا کہ خدا ضرور دعا قبول کرتا ہے بلکہ اس کا جواب بھی دیتا ہے اور موحد اور مشرک میں فرق یہی ہے کہ موحد اس ہستی کو پکارتا ہے جو دعاؤں کا جواب دیتی ہے اور مشرک جن کو پکارتا ہے وہ جواب نہیں دیتے۔

ع ۱۱۹۱ یعنی مشرکوں کی اور ان کے فرضی خداؤں کی مخالفت حق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مکہ میں سورۂ اعراف کے نزول کا زمانہ وہ ہے جب مخالفت زور پر ہے اور ساتھی اول تو تعداد میں کچھ نہیں جو ہیں وہ بھی متفرق۔ پھر وطن سے بے وطن۔ مگر کس قدر تحدی ہے کہ سارا زور لگالو، ساری تدبیریں میری ہلاکت کی کرلو مجھے کوئی مہلت بھی نہ دو ایک بیکس انسان جو چاروں طرف سے ستایا جا رہا ہو جس کی زندگی معرض خطر میں ہو جس کے چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہوں ایسے لفظ منہ سے نہیں نکال سکتا۔ یہ پُرشوکت الفاظ اسی خدائے قادر کے منہ سے نکلے ہوئے ہیں جس کے سامنے انسانوں کی مخالفت کوئی وقعت نہیں رکھتی جس کے مقابلہ پر ساری دنیا اگر کوشش کرے تو ناکام ہوتی ہے۔ ایسی بیکسی کی حالت میں اس قدر پرشوکت متحدیانہ دعویٰ جو ساری دنیا کو مخالفت کے لیے بلا رہا ہو ثابت کر رہا ہے کہ وحی کے الفاظ نہ محمد رسول اللہ صلعم کے بنائے ہوئے ہیں نہ آپ کے قلب کا نقشہ ہیں بلکہ یہ کوئی خارجی شے ہے جو انتہائی درجہ کی بیکسی کے وقت ہبط وحی کی قوت کا باعث ہو رہی ہے۔ اگر آج بھی مسلمانوں کو اس کلام پر ایمان ہوتا تو وہ حالات پیش آمدہ میں اتنے مایوس نہ ہوتے۔ سب سے بڑی مایوسی جو آج مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ اسلام کے غلبہ کے متعلق ہے نہ اس امر کے متعلق کہ مسلمانوں کو بادشاہت نہیں ملے گی۔ اسی لیے اشاعت اسلام کے عظیم الشان مقصد کی طرف ان کا قدم نہیں اٹھتا۔ جب دل بیٹھے ہوئے ہوں تو

إِنَّ وَلِيِّ ۦَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِينَ ﴿۱۹۶﴾

میرا ولی اللہ ہے، جس نے کتاب اُتاری اور وہی نیکوں کی حمایت کرتا ہے۔

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿۱۹۷﴾

اور جن کو تم اُس کے سوا پکارتے ہو وہ تمھاری مدد نہیں کر سکتے اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں [ع۱۱۹۲]

وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوا ۖ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۹۸﴾

اور اگر تم اُن کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ نہ سُنیں اور تو اُن کو دیکھے گا کہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے نہیں [ع۱۱۹۳]

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِينَ ﴿۱۹۹﴾

درگزر اختیار کر اور نیک کام کا حکم دے، اور جاہلوں سے کنارہ کر [ع۱۱۹۴]

وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۰۰﴾

اور اگر شیطان کی فساد کی بات تجھے تکلیف دے تو اللہ کی پناہ پکڑ، وہ سننے والا جاننے والا ہے [ع۱۱۹۵]

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰۤئِفٌ مِّنَ

جو بدی سے بچتے ہیں جب ان کو شیطان سے کوئی خیال پہنچتا ہے (خدا کو)

قدم کس طرح اُٹھے۔

ع۱۱۹۲ اوپر کی آیات میں تو یہ بتایا تھا کہ وہ آنحضرت صلعم کے خلاف سارا زور لگا کر بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہاں بتایا کہ نہ صرف یہی بلکہ جب مشرک مغلوب ہونگے تو یہ بُت ان کی کچھ مدد نہ کر سکیں گے۔ ان کی مدد کرنا تو ایک طرف رہا اپنے آپ کو بھی تباہی سے نہ بچا سکیں گے۔ یوں نہایت صفائی سے یہ بتا دیا کہ انجام کار مشرک مغلوب ہونگے اور ان کے بتوں کی صفائی ہو جائے گی۔ یہی وہ بات تھی جس نے آخر کار ابوسفیان اور دیگر اہل مکہ پر اثر کیا کہ کس طرح جو کچھ بیکسی کی حالت میں رسول اللہ صلعم کے منہ سے کہلوایا گیا تھا وہ حرف بحرف پورا ہُوا اور مشرک باوجود اپنی ساری طاقت کے آخر کار مغلوب ہوئے۔

ع۱۱۹۳ اس آیت میں یا اس کے پچھلے حصہ میں خطاب بدل دیا ہے یعنی مسلمانوں کو خطاب ہے کہ اگر تم ان کفار کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو یہ بھی نہیں سنتے۔ یہاں سننے سے مراد قبول کرنا ہے اور اسی طرح یہ نظر تو تیری طرف کرتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔

ع۱۱۹۴ یہاں عفو کے معنی ما عفا وسھل وتیسر من اخلاق الناس حضرت عائشہؓ ومجاہد سے مروی ہیں یعنی جو کچھ لوگوں کے اخلاق سے آسانی سے میسر آئے اور سہل ہو اس کو قبول کر لو۔ اس پر راضی ہو جاؤ۔ اور ان پر مشقت نہ ڈالو۔ لیکن یہاں صاف ذکر مخالفین کا ہے۔ اور عفو سے مراد صاف یہی ہے کہ جو مخالفت کرتے ہیں دکھ دیتے ہیں۔ ان کے معاملہ میں تم عفو کرتے جاؤ۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک اس حکم پر عمل کیا کہ فتح مکہ کے وقت بھی جو دنیا دار فاتح کے لیے انتقام کا وقت ہوتا کمال درجہ کا عفو دکھایا۔ پس حکم دیا کہ ان کی مخالفت پر عفو اختیار کرو۔ چنانچہ سلف سے یہ معنی بھی مروی ہیں بلکہ شعبی کی ایک روایت میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی مروی ہیں ان تعفوا عن ظلمك یعنی جو تم پر ظلم کرتا ہے تم اس پر عفو اختیار کرو۔ ہاں نیک باتوں کے لیے کہتے جاؤ اور جاہل جو معاملہ تمھارے ساتھ کرتے ہیں اس سے اعراض کرتے رہو۔

ع۱۱۹۵ ینزغن۔ نزغ کے اصل معنی سوئی یا کسی نوک کا چمڑہ میں داخل کرنا ہیں اس لیے اس کے معنی دخول فی الامر لافسادہ ہی ہیں یعنی کسی امر میں اس کو بگاڑنے کے لیے مداخلت کرنا چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف یہی معنی آئے ہیں نزغ الشیطان بینی وبین اخوتی (یوسف ۱۲–۱۰۰) (رغ) شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈلوایا۔ اور لسان العرب میں ہے کہ نزغ وہ کلام ہے جس سے لوگوں کے درمیان فساد ڈال دیا جائے اور نزغ الرجل کے معنی ہیں ذکرہ بقبیح اس کا بُرے لفظوں میں ذکر کیا اور حدیث میں نوازغ کا لفظ آتا ہے جو نزغ بمعنی طعن وفساد سے ہے اور ایک اور حدیث میں ہے فنزغه انسان من اھل المسجد بنزیغة جس کے معنی کیے ہیں رماہ بکلمة سیئة یعنی اس کی نسبت بُرا کلمہ کہا (ن) اور نزغ کے معنی وسوسہ بطور مجاز ہیں اصل معنی نہیں اور نہ ہی وسوسہ یہاں معنی مراد ہو سکتے ہیں اس لیے کہ حدیث میں صاف آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا قرین جن مسلمان ہو گیا اور وہ سوائے بھلائی کے اور مجھے کچھ نہیں کہتا اعاننی علیه فاسلم فلا یامرنی الا بخیر (مسلم) پس یہاں نزغ شیطان اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی شیطان تیرا کام بگاڑنا چاہے یا تیری نسبت بُری باتیں کہتا پھرے اور شیطان سے مراد انسان شیطان ہی ہیں جو دن رات آپ کے کام کو بگاڑنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اور آپ کے متعلق بُرے کلمات کہہ کر لوگوں کو آپ کی باتیں سننے سے روکتے تھے۔ تو اس کا علاج بتایا کہ خدا کی پناہ میں آجاؤ۔ ان شیاطین کے انسان ہونے پر آیت ع۲۰۲ بھی شاہد ہے۔

الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿٢٠١﴾

یاد کرتے ہیں سو یکایک وہ روشنی حاصل کرنیوالے ہوجاتے ہیں ع۱۱۹۶

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿٢٠٢﴾

اور اُن کے بھائی بند اُن کو گمراہی میں بڑھا رہے ہیں - پھر وہ کمی نہیں کرتے ع۱۱۹۷

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٢٠٣﴾

اور جب تو اُن کے پاس کوئی آیت نہیں لاتا کہتے ہیں تو خود اسے کیوں نہیں بنا لاتا۔ کہہ مَیں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب سے میری طرف وحی کیا جاتا ہے یہ تمھارے رب کی طرف سے روشن دلیلیں ہیں اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ع۱۱۹۸

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٢٠٤﴾

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ع۱۱۹۹

ع۱۱۹۶ طائف کے معنی طواف کرنے والا یا گھومنے والا ہیں طھّرا بیتی للطائفین (البقرۃ ۲ - ۱۲۵) اور خیال یا لمّہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسے یہاں اور حادثہ پر جیسے فطاف علیہا طآئف (القلم ۶۸ - ۱۹) اور مجاہد اور ابن عباس سے مروی ہے کہ یہاں غضب مراد ہے (ج) کیونکہ وہ بھی ایک لمہ شیطانی ہے اور بعض نے کہا کہ طائف جنون ہے مگر چونکہ غضب بھی اپنے اندر جنون کا رنگ رکھتا ہے اس لیے اس پر بولا گیا

غضب کا علاج: پچھلی آیت میں ان باتوں کا ذکر کیا تھا جو شریر لوگ آنحضرت صلعم کے متعلق مشہور کرتے تھے اور آپ کو حکم دیا کہ تم ان کے معاملہ میں عفو سے کام لو اور اللہ کی پناہ چاہو اب اسی بات کو عام کیا ہے اور سب مسلمانوں کو بتایا ہے کہ اگر ان کو دکھ دینے والے کلمات سنکر غضب آئے تو یہ نہیں چاہیئے کہ ان کی طبائع انتقام کی طرف مائل ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کو یاد کریں تو غضب فرو ہوجائیگا اور یہاں طائف من الشیطان سے مراد غضب ہی ہے جیسا کہ مجاہد سے روایت ہے۔ سیاق عبارت بھی اسی معنی کو چاہتا ہے کیونکہ جب شیاطین کی طرف سے مخالفت ہوگی تو بعض وقت غضب آہی جائے گا اور غضب انسان کو اندھا کردیتا ہے اس لیے اس کا علاج یہ بتایا کہ پھر خدا کو یاد کرو۔ غضب خود فرو ہوجائے گا اور بصارت پیدا ہوجائے گی۔ دعوت الی الحق کا کام کرنے والے یا مبلغین اسلام کو اس پاک اصول کو کبھی ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے وہ کبھی غضب میں نہ آئیں بلکہ جب واقعات ایسے ہوں جن سے غصہ پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ غضب میں آکر وہ دوسروں کو بُرا کہیں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ حق کے ساتھ تنفر اور بڑھے گا بجائے اس کے اگر نرمی اختیار کی جائے تو اللہ تعالےٰ وہ راہ بھی بتا دیگا جس سے الزام کو دلائل سے دور کردیا جائے اسی کی طرف لفظ مبصرون میں اشارہ ہے۔ مگر آج ہمارے علما کی یہ حالت ہے کہ غیروں سے تو کیا نرمی سے پیش آئیں گے اگر ایک مسلمان کے منہ سے کچھ خلاف طبیعت سن لیں تو غضب سے آگ ہوجاتے ہیں۔

ع۱۱۹۷ اخوانہم۔ ضمیر شیاطین کی طرف جاتی ہے یعنی شیاطین کے بھائی۔

یمدّونہم۔ مَدّ کے معنی لمبا کیا، مہلت دی۔ گمراہی میں لمبا کرنے سے مراد گمراہی میں بڑھانا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ مَدّ بُرے موقعہ پر بولا جاتا ہے اور امداد اچھے موقعہ پر۔ جیسے وامددنا ھم بفاکھۃ (الطور ۵۲ - ۲۲) یُمدد کم ربکم بخمسۃ الٰف (آل عمران ۳ - ۱۲۵)

یقصرون۔ قَصر چھوٹا کرنا ہے اور اَقصر عنہ کے معنی ہیں کَفَّ مَعَ القُدْرَۃِ علیہ یعنی باوجود ایک امر پر طاقت رکھنے کے اس سے رُک گیا (غ)

شیاطین کے بھائی: یہاں سے معلوم ہوا کہ ایک تو شیطان ہیں اور دوسرے ان کے بھائی جو گمراہی میں ان کو بڑھاتے ہیں۔ اس لیے شیاطین سے مراد وہ شیطان نہیں ہوسکتے جو بدی کی تحریک کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو ان کے اتباع گمراہی میں کیا بڑھائیں گے بلکہ شیاطین سے مراد وہی کفار کے رؤسا ہیں جن کا ذکر واذا خلوا الٰی شیاطینھم میں ہے جب لوگ ان کے پیچھے لگتے ہیں تو پھر وہ گمراہی میں اور ترقی کرتے ہیں اس لیے کہ ان کو معاون مل جاتے ہیں اگر ان کے معاون نہ ہوں تو ان کی شرارتیں خود ہی ختم ہوجائیں۔

ع۱۱۹۸ اجتبیتھا۔ جبی کے معنی جمع کرنا ہیں یجبیٰ الیہ ثمرات کل شئ (القصص ۲۸ - ۵۷) اسی لیے بڑے حوض کو جس میں پانی جمع ہوتا ہے جابیۃ کہا جاتا ہے جس کی جمع جواب ہے وجفان کالجواب (السبا ۳۴ - ۱۳) اور اللہ کا اجتباء عبد طریق اصطفا پر جمع کرنا ہے اور یہاں اجتباء سے مراد یہ ہے کہ خود جمع کرکے کیوں نہیں لے آتا گویا یہ تعریض کی ہے کہ تم تو اختراع کے طور پر ایسی باتیں بنا لیا کرتے ہو (غ)۔ اس کا رد یوں کیا ہے کہ مَیں تو صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ مجھے خود کہاں اختیار ہے کہ نشان بنا لیا کروں۔

ع۱۱۹۹ فاتحہ خلف امام کا مسئلہ: ظاہر ہے کہ یہاں خطاب کفار سے ہے جن کا قول تھا لا تسمعوا لھذا القراٰن والغوا فیہ لعلکم تغلبون (حٰمٓ ۴۱ - ۲۶) اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور ڈال دو تاکہ تم غالب آجاؤ۔ مگر اس سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ جماعت کی حالت میں مقتدی کو نہ پڑھنی

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً — اور اپنے رب کو اپنے دل میں یاد کرتا رہ عاجزی سے اور ڈرتے ہوئے
وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ — اور ایسی آواز میں جو بہت بلند نہ ہو، صبح و شام کے وقتوں
وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ — میں اور غافلوں میں سے مت ہو ۱۲۰۰
اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ — جو تیرے رب کے پاس ہیں، اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے
عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ السجدة ۱ — اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ کرتے ہیں ۱۲۰۱

ع ۲۴

چاہیئے۔ چونکہ صریح احادیث موجود ہیں کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی اس لیے یہ استدلال درست نہیں۔ اول تو مقتدی کے فاتحہ پڑھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ امام کی قرأت فاتحہ کو سنتا نہیں۔ کیونکہ ہر ایک آیت پر جب امام وقفہ کرتا ہے تو اس وقفہ میں مقتدی اس فقرہ کو دوہرا سکتا ہے اور سورۂ فاتحہ کی آیات ایسی چھوٹی واقع ہوئی ہیں کہ اس وقفہ میں ان کو دوہرانا ذرا بھی مشکل نہیں۔ اس لیے فاستمعوا لہ میں اگر مسلمانوں کو خطاب بھی لیا جائے تو بھی سورۂ فاتحہ کے پڑھنے سے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ دوسرے کل رکعتیں فرض نماز کی سترہ ہیں جن میں سے صرف چھ رکعتوں میں قراۃ بالجہر ہوتی ہے اور باقی گیارہ میں خفیہ ہوتی ہے تو گویا قریباً صرف ایک تہائی رکعات میں فاتحہ بلند آواز سے پڑھی جاتی ہے اور دو تہائی میں منہ میں پڑھی جاتی ہے۔ اب ان دو تہائی رکعات میں تو سنتا ہی نہیں۔ نہ اس پر فاستمعوا کا حکم وارد ہوتا ہے اور یہ کہنا کہ مقتدی کو علم ہے کہ امام کچھ پڑھ رہا ہے نہایت بودی بات ہے۔ اس علم سے آواز پیدا نہیں ہو جاتی۔ پس کل رکعتوں میں ایک حکم اگر لگایا جائے تو ترجیح اسی کو ہوگی جس کا تعلق زیادہ رکعات سے ہے اور زیادہ رکعات میں کوئی شے فاتحہ کے پڑھنے میں مانع نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ باقی قرأت مقتدی کیوں نہ پڑھے تو جواب یہ ہے کہ نبی کریم صلعم کا حکم ایسا نہیں فاتحہ کے پڑھنے کے لیے ہے مگر باقی قرأت کے لیے نہیں۔ خود وہ لوگ جو فاتحہ خاموشی کی حالت میں بھی نہیں پڑھتے تسبیحات پڑھتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا حکم نبی کریم صلعم جیسا حکیم انسان نہ دے سکتا تھا کیونکہ فاتحہ کو تو ہر مقتدی جانتا ہے مگر باقی قرأت میں امام کا تتبع کرنا سو مقتدی میں سے ایک کے لیے بھی مشکل ہوتا اور لمبی آیات میں تو یہ ممکن ہی نہ ہوتا۔ اس لیے فاتحہ اور باقی قرأت کا حکم ایک نہیں، فاتحہ ایک خاص دعا ہے جو ہر ایک رکعت میں لازماً پڑھی جاتی ہے۔ باقی کسی حصۂ قرآن کو یہ امتیاز حاصل نہیں۔

ع ۱۲۰۰ یہاں خطاب عام ہے جیسا کہ عمومیت حکم سے ظاہر ہے۔

فی نفسک دل میں ذکر کرنے سے کیا مراد ہے؟ آواز کا ذکر تو آگے آتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں مراد ایسا ذکر ہے جس میں انسان کا دل ذکر میں مصروف ہو۔ یعنی الٰہی عظمت اور ہیبت اور جلال کا اثر دل پر ہو۔

خیفۃ۔ اصل خوفۃ ہے۔ تضرع بندہ کا عاجزی اختیار کرنا ہے اور خوف عظمت الٰہی کا ہے۔

دون الجھر۔ عاجزی اور خوف کا یہ تقاضا ہے کہ انسان بہت شور نہ ڈالے دون الجھر سے مراد یہ نہیں کہ آواز اونچی نہ ہو بلکہ یہ منشا ہے کہ زیادہ شور نہ ڈالے گویا آواز میں بھی اقتصاد ہو۔

غدو۔ قاموس میں اسے غُدْوَۃ کی جمع لکھا ہے اور یا یہ مصدر ہے صبح کا وقت۔ اور مفردات میں ہے کہ قرآن کریم میں غُدُوٌّ کے مقابل پر اصال آیا ہے جیسے یہاں اور غداۃ کے مقابل پر عشی جیسے بالغدوۃ والعشی (الانعام ـ ۵۲)

اٰصال۔ اصل یا اصیل کی جمع ہے عصر اور غروب آفتاب کے درمیان کا وقت ہے۔ مراد مطلق شام ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا حکم ہے اور وہ دو رنگ میں ہے ایک دل میں اور ایک آواز کے ساتھ جو وہ بھی دون الجھر من القول ہو۔ پس اصل مطلب یہ ہے کہ جب نماز میں یا ویسے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور سب سے بڑھ کر ذکر اللہ تعالیٰ کا نماز میں ہی ہے تو ایسا نہ ہو کہ منہ سے کلمات نکلتے ہوں مگر دل اور کہیں ہو۔ اس لیے فرمایا کہ زبان سے ذکر ہو تو دل میں بھی وہی کیفیت ہو اور دل عظمت الٰہی اور ہیبت اور جلال سے بھرا ہوا ہو۔ تاکہ ذکر کا اصل مقصد پورا ہو اور بالغدو والاٰصال میں نماز کے اوقات بھی آجاتے ہیں یعنی ایک طرف فجر کا وقت دوسری طرف ظہر سے لیکر عشا تک کا وقت۔

ع ۱۲۰۱ عند ربک۔ میں سب مقربین بارگاہ الٰہی داخل ہیں۔

ترتیب قرآن کریم میں یہاں سجدۂ تلاوت پہلی دفعہ آتا ہے۔ سجدۂ تلاوت قرآن کریم کی تلاوت میں خاص خاص موقعوں پر نبی کریم صلعم کا حکم ہے خواہ وہاں سجدہ کا حکم ہو یا اور کسی رنگ میں سجدہ کا ذکر ہو۔ سجدۂ تلاوت میں آنحضرت صلعم سے مختلف دعائیں مروی ہیں۔ مثلاً ایک یہ اللّٰھم لک سجد سوادی وبک اٰمن فوادی۔ اللّٰھم ارزقنی علماً ینفعنی و عملا یرفعنی اور ایک حدیث میں آپ کی یہ دعا آتی ہے سجد وجھی للذی خلقہ وشق سمعہ وبصرہ بحولہ وقوتہ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ سجدۂ تلاوت ایک شہادت ہے کہ مسلمان کو با قرآن پر ایمان لانے والے کو تعمیل حکم الٰہی میں کس قدر جلدی کرنی چاہیئے۔

آیاتها ۷۵ (۸) سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ مَدَنِیَّۃٌ رکوعاتها ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ
لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ
بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔
تجھ سے مالِ غنیمت کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ، مالِ غنیمت
اللہ اور رسول کا ہے سو اللہ کا تقوےٰ کرو اور اپنے اندر کے معاملات
کو سنوارو اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری
کرو اگر تم مومن ہو[۱۲۰۲]

نام ۔ اس سورت کا نام الانفال ہے اور اس میں دس رکوع اور ۷۵ آیات ہیں۔ الانفال کے معنی ہیں مالِ غنیمت یا وہ مال جو باقاعدہ جنگ میں دشمن سے ہاتھ آتا ہے۔ اس سورت میں اصل ذکر جنگ بدر کا ہے۔ اور یہ سب سے پہلی باقاعدہ جنگ ہے جو مسلمانوں اور کفار میں ہوئی اور اس میں دشمن سے مالِ غنیمت ہاتھ میں آیا اور قیدی بھی پکڑے گئے، ایسے مال کو جائز قرار دیا ہے۔ دوسری طرف ایک تجارتی قافلہ انہی قریش کا جا رہا تھا اور مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس قافلہ پر حملہ کر کے لوٹ لیا جائے۔ اس کو قرآن شریف نے عرض الدنیا یعنی دنیا کا مال قرار دیکر ناجائز قرار دیا تو گویا بتانا یہ مقصود تھا کہ جنگ میں جو مال دشمن سے ملے وہ جائز ہے لیکن مال کا حاصل کرنا اصل غرض نہیں، بلکہ جنگ کی اصل غرض کچھ اور ہے۔ اس لحاظ سے سورت کا نام الانفال قرار دیا۔

خلاصہ مضمون ۔ اس سورت کا اصل مضمون جنگ بدر اور اس کے متعلقہ واقعات ہیں اس لیے پہلی ہی آیت میں انفال یا مالِ غنیمت کا ذکر کیا ہے، مگر اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے کہ اصل غرض جنگ یا جنگوں کے ذریعہ سے حصول مال نہیں فوراً اس طرف توجہ دلائی ہے کہ آپس میں اصلاح کرو اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، اللہ کا ذکر کرو نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ دو تو پکے مومن بنتے ہو اور پھر اصل مضمون جنگ بدر کی طرف عود کیا اور بتایا کہ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ احقاق حق کرنا چاہتا تھا اور یہ کہ دشمن جو اسلام کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں ان کا استیصال کر دے۔ دوسرے رکوع میں جنگ بدر میں فتح کا اور ان اسباب کا جن سے فتح ہوئی ذکر ہے اور وہ محض اللہ تعالیٰ کی نصرت تھی۔ تیسرے میں پھر بتایا کہ فلاح کی حقیقی راہیں کیا ہیں اور مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی۔ چوتھے میں فرمایا کہ جنگ بدر کے بعد بھی کفار لڑائی میں نکلتے رہیں گے مگر آخر کار مغلوب ہوں گے اور مسلمان خانہ کعبہ کے متولی ہمیشہ کے لیے قرار دیئے جائیں گے۔ پانچویں میں بتایا کہ اجتماع بدر مصلحت الٰہی سے ہوا ورنہ مسلمانوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اتنی بڑی جمعیت سے مقابلہ کے لیے نکلتے۔ چھٹے میں مسلمانوں کو جنگ میں ثابت قدم رہنے کی نصیحت کی تاکہ نصرت الٰہی کے جاذب بنیں۔ ساتویں میں کفار کی بدعہدیوں کا ذکر کیا۔ آٹھویں میں بتایا کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیئے۔ نویں میں تسلّی دی کہ کفار کی زیادتی تعداد سے نہ گھبرائیں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دگنی اور دس گنی تعداد پر بھی غالب کر دکھائے گا اور اسی میں آخر پر بتایا کہ قیدی یا مال غنیمت باقاعدہ جنگ کی صورت میں لیے جا سکتے ہیں۔ دسویں میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات قومی بتائے اور فرمایا کہ دین کے معاملہ میں اگر کفار مسلمانوں پر زیادتی کریں تو دوسرے مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں سوائے اس صورت کے کہ ایسی کافر قوم سے مسلمانوں کا عہد ہو۔

تعلق ۔ اس سے پہلے سورۂ اعراف میں ضرورتِ نبوّت پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ گزشتہ اُمتیں جنہوں نے نہ صرف حق کو ردّ کیا بلکہ خود حق کا استیصال کرنا چاہا ان کا انجام کیا ہوا اور اس سورت کے آخر پر بتایا تھا کہ آنحضرت صلعم کے اعدا کو بھی ہم تدریجاً پکڑیں گے۔ اس تدریجی گرفت میں سب سے پہلے جنگ بدر کا مقام ہے جس میں کفار کے لیے ایک عبرت آموز سبق تھا اور آنحضرت صلعم کی صداقت کی ایک یقینی دلیل تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کے باوجود قلت کے غالب آنے کی پیشگوئیاں مدّت پہلے قرآن شریف میں مکہ میں ہو چکی تھیں۔ اس لیے سورۂ اعراف کے مضمون کا تقاضا تھا کہ اس کے بعد فوراً جنگ بدر کا ذکر ہوتا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کی تدریجی گرفت میں پہلی منزل تھی۔

زمانہ نزول ۔ اس سورت کی تاریخ نزول جنگ بدر کا ہی زمانہ ہے یعنی دوسرا سال ہجرت۔ بعض آیات جن میں کفار کی بار بار عہد شکنی کا ذکر ہے۔ بعد کے زمانہ کی معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ آیات جن میں آنحضرت صلعم کے خلاف کفار مکہ کے منصوبوں کا ذکر ہے یعنی ہجرت سے پہلے کے واقعات کا وہ درحقیقت مکی نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کو گزشتہ واقعات کا حوالہ دیکر یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اس وقت بھی اسلام کی تائید میں تھا جب آنحضرت صلعم اکیلے دشمنوں کے اندر رہ گئے تھے اور وہ دشمن آپ کے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور یوں ان کو تسلّی دی ہے کہ وہ اسلام کی ہمیشہ تائید فرماتا رہے گا۔

۱۲۰۲ غنیمت اور انفال میں فرق: الانفال۔ نَفَل کی جمع ہے جو اصل میں زیادت ہے۔ یعنی جس قدر واجب ہو جو اس سے زیادہ ہو وہ نَفَل ہے۔ اسی معنی میں نفل عبادت ہے۔ اسی لیے مالِ غنیمت کو نَفَل کہا جاتا ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہوا ہے کہ کس قسم کی غنیمت پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔ بعض نے اسے عین غنیمت کہا ہے یعنی انفال اور غنیمت ایک ہی

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝۲

مومن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں وہ اُن کو ایمان میں بڑھاتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں [۱۲۰۳]

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝۳

جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور اُس سے جو ہم نے اُن کو دیا ہے خرچ کرتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝۴

یہی سچے مومن ہیں ان کے لیے ان کے رب کے ہاں (بڑے) درجے اور حفاظت اور عزت والا رزق ہے [۱۲۰۴]

كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ ۝۵

جس طرح تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے حق کے ساتھ نکالا اور مومنوں میں سے ایک گروہ ناخوش تھا [۱۲۰۵]

ئے ہے۔ دو نام دو حیثیتوں سے رکھے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ وہ مال مظفر ہو کر ملتا ہے اسے غنیمت کہا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فضل ہے اسے انفال کہا جاتا ہے۔ اور بعض نے غنیمت اور نفل میں عموم و خصوص کے لحاظ سے فرق کیا ہے۔ یعنی غنیمت عام ہے محنت سے حاصل ہو یا بلا محنت فتح سے پہلے حاصل ہو یا پیچھے، اور نفل وہ ہے جو مال غنیمت میں سے تقسیم سے پہلے حاصل ہو۔ یا وہ جو بغیر جنگ کے حاصل ہو مگر ایسے مال کو فئے کہا جاتا ہے۔ گو فئے کے لیے ضروری ہے کہ جنگ کی تیاری ہو چکی ہو اور دشمن نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں نفل کے لیے یہ ضروری نہیں۔

لِلّٰہ والرسول سے مراد بیت المال ہے یعنی مسلمانوں کی عام اور مشترکہ ضروریات۔

اس سورت میں بالخصوص جنگ بدر کا ذکر ہے اور اس کا تعلق سورت ماقبل سے یوں ہے کہ وہاں انبیائے سابق کے مخالفوں کی ہلاکت کا ذکر ہے یہاں آنحضرت صلعم کے اعدا کی ہلاکت اور ان پر جو عذاب آیا اس کا ذکر ہے اس لیے اس کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ جنگ میں جو بعض قسم کا مال دشمن سے حاصل ہوتا ہے اس کو کس غرض پر صرف کیا جائے۔ اور اس کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی عام ضروریات پر خرچ ہو۔ لیکن یہ سمجھانے کے لیے کہ جنگ اصل ضروریات میں سے نہیں بلکہ محض ایک اتفاقی پیش آمدہ امر ہے۔ جنگ کے ذکر کو چھوڑ کر فوراً اس طرف توجہ دلائی کہ متقی باخلاق انسان بنو اور آپس میں صلح کرو۔

ع۱۲۰۳ وجل۔ استشعار خوف کا نام ہے یعنی خوف محسوس کرنا (غ) انا منکم وجلون (الحجر [۱۵]-۵۲) وقلوبھم وجلۃ (المومنون [۲۳]-۶۰)

زادتھم ایمانا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کم و بیش بھی ہوتا رہتا ہے۔ گویا برے اعمال سے اس میں نقص واقع ہوتا ہے اور اچھے اعمال سے ایمان بڑھتا ہے۔ بخاری میں حدیث مروی ہے کہ ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں۔ جن میں سے لا الہ الا اللہ سب سے بلند اور رستہ سے دکھ دینے والی چیزوں کو دور کرنا سب سے نچلی شاخ ہے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ آج مسلمانوں کا دعوٰی ایمان اور عملی حالت ان آیات اور احادیث کی تکذیب کر رہے ہیں۔

ع۱۲۰۴ ان تین آیات میں مومنوں کی صفات کو بیان کیا ہے تاکہ زندگی کے اصل مقصد کو سمجھ لیں۔ مسلمانوں کی تیاری جنگ کے لیے اس طرح پر نہیں ہوئی کہ انھیں فنونِ جنگ میں مہارت کا سبق سکھایا جاتا۔ بلکہ قیام نماز اور انفاق فی سبیل اللہ کا سبق ان کو پڑھا کر اور یہ بتا کر کہ دل میں خوف الٰہی ہونا چاہیئے اور متکبرانہ روش سے بچنا چاہیئے، ان کو جنگ کے لیے تیار کیا ہے۔ اسی سبق کا نتیجہ تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جنگیں بیوجہ خونریزی سے پاک تھیں اور بڑی بڑی فتوحات کے وقت دشمنوں کے ساتھ کمال عفو اور نرمی کا سلوک تھا اور مخلوق خدا کی ہمدردی مدنظر تھی۔

ع۱۲۰۵ کما میں اشارہ آیت ماقبل کے آخری الفاظ کی طرف ہے۔ یعنی مومن کا اصل کام تو وہی ہے جو ان آیات میں بیان ہوا یعنی دل میں عاجزی کا پیدا کرنا، نماز قائم کرنا۔ خدا کی راہ میں اپنی طاقتوں اور مال کا خرچ کرنا۔ اسی راہ پر چلنے سے بلند درجات اور رزق کریم ملتا ہے۔ چنانچہ انھی درجات بلند اور رزق کریم کے دینے کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہارے گھر سے حق کے ساتھ نکالا یعنی جنگ بدر کے لیے مدینہ سے تم کو حق کے ساتھ نکالا۔ بالفاظ دیگر اس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو نکلنے کا حکم دیا جب ضروریات حقہ پیش آ چکی تھیں۔

جنگ بدر جن حالات میں پیش آئی اس کے متعلق قرآن کریم سے بڑھ کر اور کوئی معتبر شہادت نہیں ہو سکتی۔ اور ان آیات میں مختصر مگر جامع الفاظ میں جنگ بدر کے تمام ابتدائی مراحل کی شہادت ہمیں ملتی ہے اس قدر تو مسلّم ہے کہ جب نبی کریم صلعم مدینہ سے نکلے ہیں اس وقت ایک طرف کفار کی ایک زبردست جمعیت ابوجہل کی کمانڈ کے ماتحت مکہ سے نکل چکی تھی بلکہ اس کی خبر بھی نبی کریم صلعم کو پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ مقام بدر جہاں مٹھ بھیڑ ہوتی ہے مکہ سے آٹھ یا نو منزل اور مدینہ سے تین منزل پر ہے۔ دوسری طرف یہ بھی درست ہے کہ ایک تجارتی قافلہ شام سے ابوسفیان کی سرکردگی میں مکہ کو واپس آ رہا تھا اور اس کی اطلاع بھی مسلمانوں کو تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا رسول اللہ صلعم اس قافلے کو لوٹنے کے لیے نکلے تھے یا اس لشکر کی مدافعت کے لیے۔ ارباب سیر نے بعض غیر محتاط روایات سے یہ غلطی کھائی ہے۔ کہ

يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا
يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۞ ٦
وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ أَنَّهَا
لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ
تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ
بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِينَ ۞ ٧

تیرے ساتھ حق کے بارے میں جھگڑتے ہیں اس کے بعد کہ وہ واضح ہو گیا
گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں ۱۲۰۶
اور جب اللہ تمھیں دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ دیتا تھا کہ وہ
تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جس کے پاس ہتھیار نہیں وہ تمھارے
لیے ہو اور اللہ ارادہ کرتا تھا کہ اپنی پیشگوئیوں کے ذریعے سے حق کو ثابت
کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے ۱۲۰۷

نبی کریم صلعم ابوسفیان کے تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کے گھر سے نکلے تھے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ آپ ابوجہل کے لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے جو مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے مکہ سے نکلا تھا اس امر پر کہ دوسری بات صحیح ہے پہلی شہادت الفاظ اخرجك ربك من بيتك سے ملتی ہے ظاہر ہے کہ بیت تو مدینہ ہی ہے اور مدینہ سے آپ کے نکلنے کو اللہ تعالےٰ کے حکم کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نبی کریم صلعم اپنی خواہش سے یا لوگوں کے مشورہ کی بنا پر نہیں نکلے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکلے ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی قافلہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا ہوگا۔ تو یہ اس لیے غلط ٹھہرتا ہے کہ یہ واقع نہیں ہوا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا تو ضرور تھا کہ واقع ہو کر رہتا۔ دوسری شہادت بالحق سے ملتی ہے۔ کسی فعل یا قول کا حق ہونا یہ ہوتا ہے جیسا کہ راغب نے لکھا ہے جب اس کا وقوع بحسب ما یجب و بقدر ما یجب و فی الوقت الذی یجب ہو یعنی اس کے مطابق جو واجب ہو اور اس اندازہ سے جو واجب ہو اور اس وقت میں جو واجب ہو۔ اب اگر تجارتی قافلہ پر حملہ کے لیے نکلا ہوتا تو یہ تینوں لحاظ سے کسی طرح پر بالحق نہ تھا۔ اس لیے کہ اول تو کسی راہ چلتے قافلہ پر حملہ بحسب ما یجب نہیں اس کا واجب ہونا چھوڑ اس کی ضرورت ہی کوئی نہیں اور پھر بقدر ما یجب بھی نہیں اس لیے کہ آنحضرت صلعم پوری تیاری کر کے نکلے ہیں جو ممکن تھی۔ حالانکہ قافلہ کے لیے پچاس مسلح آدمی کافی تھے۔ اور فی الوقت الذی یجب بھی نہیں اس لیے کہ قافلہ تو اس وقت بہت دور نکل چکا تھا۔ یہاں تک کہ جنگ بدر میں فتح حاصل کرنے کے بعد اتنا قریب بھی نہ تھا کہ اس پر حملہ کیا جاتا۔ پس اخراج بالحق اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلیں جو مدینہ پر مسلمانوں کو کچلنے کیلئے حملہ آور ہو رہا ہے یہ ایک ضرورت حقہ تھی اور پھر تیاری بھی اسی کے مطابق کی گئی اور پھر وقت بھی اسی کے مقابلہ کا تھا۔ اور قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلنا اس لیے بھی بالحق نہیں کہلا سکتا کہ قرآن کریم میں حکم ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم اور اس قافلہ نے آپ سے جنگ نہ کی تھی نہ ابھی تک قریش نے ہی آپ پر حملہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بدر کے دن نبی کریم صلعم پہلے کفار کے حملہ کے منتظر ہے اور جب انھوں نے حملہ کیا تب آپ نے مدافعت کا حکم دیا۔ تیسری قطعی شہادت اس بات پر کہ رسول اللہ صلعم جب مدینہ سے نکلے تو مدینہ پر حملہ آور لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلے ان الفاظ سے ملتی ہے کہ آپ جب مدینہ سے نکلے تو اس وقت مومنوں کا ایک حصہ ناخوش تھا۔ اس ناخوشی کی وجوہات اگلی آیت میں بتائی ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ اگر قافلہ پر حملہ کا مطلب ہوتا تو کوئی فریق ناخوش کیوں ہوتا اور اس کو مصیبت کیوں سمجھتا۔ تین سو چھوڑ پچاس آدمی بھی ایک قافلہ کو لوٹنے کے لیے کافی تھے۔ پس مدینہ سے نکلتے وقت مومنوں کی ایک جماعت کی ناخوشی صاف بتاتی ہے کہ وہ مدینہ پر حملہ آور لشکر کے مقابلہ کے لیے نکل رہے تھے۔

ع ۱۲۰۶ چوتھی شہادت اس بات کی من بعد ما تبین لھم الحق میں موجود ہے۔ کیونکہ نکلنے کو ناپسند کرنے والے اسے ضرورت حقہ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ ضرورت ظاہر ہو چکی تھی۔ ضرورت ظاہر اسی صورت میں کہلا سکتی ہے جب مسلمانوں کی ہستی معرض خطر میں ہو۔ اور دشمن حملہ آور ہو چکا ہو کیونکہ جنگ کی اجازت ہی انہی لوگوں سے تھی جو پہلے جنگ کریں۔ جیسا اذن للذین یقاتلون (الحج ۲۲-۳۹) سے اور پھر وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (البقرۃ ۲-۱۹۰) سے ظاہر ہے۔ قافلہ تو مسلمانوں سے جنگ کرنے نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ جنگ کی ضرورت کو الفاظ قرآنی میں واضح اور بین کہا جا سکے۔ پانچویں اور نہایت کھلی ہوئی شہادت الفاظ کانما یساقون الی الموت سے ملتی ہے۔ قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلنے کو کون موت کے منہ میں جانا کہہ سکتا ہے۔ ہاں وہ طاقتور لشکر جو مدینہ پر حملہ آور ہو رہا تھا اس سے مقابلہ کرنے کے لیے نکلنا واقعی موت کے مونہہ میں جانا تھا۔

ع ۱۲۰۷ غیر ذات الشوکۃ۔ شوك اصل میں کانٹوں کو کہتے ہیں اور اس سے مراد شدت اور ہتھیار بھی لیے جاتے ہیں (غ)

یحق۔ احقاق سے ہے یہاں مراد وہ احقاق حق ہے جو دلائل اور نشانات کے اظہار سے ہو۔

دو گروہوں کا ذکر اور خدائی ارادہ: اس آیت میں جنگ بدر کی وجوہات کو اور بھی کھول دیا ہے یہاں صاف بتا دیا ہے کہ دو گروہ تھے ایک مسلح اور ایک غیر مسلح یعنی تجارتی قافلہ اور تم (یعنی مسلمانوں میں سے وہ لوگ جن کے خوف کا ذکر اوپر ہے) چاہتے تھے کہ غیر مسلح گروہ یعنی قافلہ کے ساتھ مقابلہ ہو اور اللہ تعالیٰ اس کے خلاف چاہتا تھا یعنی مسلح لشکر سے مقابلہ ہو۔ تو جس صورت میں گھر سے نکالنے والا اللہ تعالیٰ تھا یعنی نکلنا اس کے حکم سے تھا تو صاف معلوم ہوا کہ یہ نکلنا مسلح لشکر کے مقابلہ کے لیے تھا۔ یعنی ابوجہل کے مقابلہ کے لیے اور تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے نہ تھا جو محض بعض کمزور دلوں کی خواہش تھی۔ یہ چھٹی دلیل ہے جو ہمارے مدعا کو ثابت کرتی ہے۔ اور جن روایات میں قافلہ پر حملہ کو مدینہ سے نکلنے کی وجہ بتایا گیا ہے وہ اسی بنا پر محمول ہو سکتی ہیں۔ ساتویں دلیل ان الفاظ میں

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۝٨
تاکہ حق کو سچ اور باطل کو جھوٹا کر دے، گو مجرم ناپسند کریں۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝٩
جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے سو اس نے تمہاری پکار سنی کہیں ایک ہزار آگے چلنے والے فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرنے والا ہوں ۱۲۰۸

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ
ع ۱۵ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝١٠
اور اللہ نے اسے صرف ایک خوشخبری ٹھیرایا اور تاکہ اس کے ساتھ تمہارے دلوں کو اطمینان ہو اور مدد تو اللہ کی طرف سے ہی ہے اللہ غالب حکمت والا ہے ۱۲۰۹

ہے ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمتہ یہ تو ظاہر ہے کہ کلمات سے مراد کوئی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اب اللہ تعالیٰ کے کلام کو ایک جنگ سے کیا تعلق ہے۔ سوائے اس کے کہ اس جنگ کے متعلق کوئی پیشگوئیاں ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم میں جنگ بدر کے متعلق اور مسلمانوں اور کافروں میں مقابلہ ہو کر مسلمانوں کے غالب آنے کے متعلق صریح پیشگوئیاں ہیں اور کلمات میں انہی پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے یوں یہ جنگ محض جنگ نہ تھی بلکہ ایک دلیل اور نہایت واضح دلیل اسلام کی صداقت کی تھی لیکن قافلہ پر حملہ کرنے کی نہ کوئی پیشگوئی تھی نہ کوئی ایسی پیشگوئی پوری ہوئی۔ آٹھویں دلیل الفاظ یقطع دابر الکافرین میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا منشا تمہارے مدینہ سے نکالنے میں یہ تھا کہ کافروں کی جڑ کاٹ دے یعنی ان کی طاقت کو کچل دے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کفار کی طاقت ایک قافلہ کو لوٹنے سے نہ کچلی جا سکتی تھی بلکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا پورا زور لگا کر ہلاک ہوں۔

۱۲۰۸ تستغیثون۔ غَوث کا استعمال نصرت کے محل پر ہوتا ہے۔ اور غَیث بارش ہے اور استغاثۃ طلب غوث اور طلب غیث دونوں پر بولا جاتا ہے (غ) یہاں طلب مدد ہی مراد ہے جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے۔ اور دوسری جگہ ہے فاستغاثہ الذی من شیعتہ (القصص [28]-۱۵) وان یستغیثوا یغاثوا بماء کالمھل (الکھف [18]-۲۹)

مردفین۔ ردف تابع یعنی پیچھے آنے والے یا پچھلے حصّہ کو کہتے ہیں اور اَردفتہ کے معنی ہیں اسے گھوڑے کے پچھلے حصّہ پر (یعنی اپنے پیچھے) سوار کر لیا اور رادِف پچھلے کو کہتے ہیں۔ اور مُردِف متقدم کو یعنی جس کے پیچھے دوسرا ہو (غ) یعنی رَدِفَ اور اَردَفَ کے الگ الگ معنی ہیں جنھوں نے مردفین کے معنی پیچھے آنے والے کیے ہیں انہوں نے رَدِفَ اور اَردَفَ کے ایک معنی کر لیے ہیں۔ رہا یہ کہ آگے چلنے والے فرشتوں سے کیا مراد ہے اور ان کے پیچھے کون ہے۔ سو ظاہر ہے کہ ملائکہ جیسا کہ آگے صراحت سے مذکور ہے۔ مسلمانوں کو ثابت قدم کرتے اور کفار کے دل میں رعب ڈالتے تھے۔ اذ یوحی ربک الی الملٰئکۃ انی معکم فثبتوا الذین اٰمنوا سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب (۱۲) اس لیے وہ عسکر اسلامی کے لیے متقدم تھے یعنی وہ آگے تھے اور ان کے پیچھے لشکر اسلامی تھا۔ راغب نے یہ معنی نقل کیے ہیں قیل المراد المتقدمین لِلعَسکَرِ یلقون فی قلوب العِدی الرُّعب۔

یہ بھی اسی وقت کا ذکر ہے جیسا کہ اذ کے استعمال سے ظاہر ہے جب نبی کریم صلعم مدینہ سے نکلتے ہیں۔ مسلمان اپنی کمزوری دیکھ کر اور دشمن کی طاقت دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتے ہیں۔ اگر قافلہ پر حملہ مقصود ہوتا تو طلب مدد کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب ایک گروہ ڈر رہا ہے کہ ہمیں موت کے مونہہ میں دیا جاتا ہے وہی وقت طلب مدد کا ہے۔ پس یہ نویں دلیل اس بات پر ہے کہ مسلمان گھر سے لشکر کفار کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے نہ قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے۔

ایک ہزار فرشتوں کی خصوصیت کیوں کی؟ ایک ہزار عدد کامل بھی ہے۔ مگر دوسری بات یہ بھی ہے کہ دشمن کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہی تھی اس لیے اسی قدر ملائکہ کی نصرت کا وعدہ دیا (دیکھو ۵۱۱)

۱۲۰۹ ملائکہ کے ذریعہ نصرت کا جو وعدہ دیا اس کے متعلق یہاں دو باتیں بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ تمہارے لیے یہ خوشخبری ہو کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ تین سو آدمی ایک ہزار کا مقابلہ کیا کر سکتے تھے۔ ملائکہ سے نصرت کا وعدہ دیکر فتح کی خوشخبری مسلمانوں کو دی اور بتایا کہ تمہاری تائید میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے یہ تو مسلمانوں کو پہلے سے خبر دی گئی تھی کہ کفار کے ساتھ ان کی جنگ ہو گی تو وہ مظفر و منصور ہوں گے اور کفار پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے سیھزم الجمع ویولون الدبر (القمر [54]-۴۵) یہاں یہ بھی بتایا کہ وہ مدد کیوں کر ہو گی اس لیے ملائکہ کا ذکر فرمایا کیونکہ تین سو آدمی ایک ہزار پر غالب نہ آ سکتے تھے سوائے اس کے کہ کوئی اور اسباب ان کے موافق اور دشمن کے خلاف پیدا ہو جائیں۔ تو ملائکہ کی نصرت کے وعدہ میں یہ بتایا کہ وہ اسباب کوئی انسانی تجاویز کا نتیجہ نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب پیدا ہوں گے اور ملائکہ چونکہ وسائط ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کام لیتا ہے اس لیے ان وسائط کا ذکر کیا۔

دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ تا تمہارے دلوں کو اس سے اطمینان ہو۔ قلوب میں اطمینان کا پیدا کرنا بھی ملائکہ کا کام ہے اور یہ عام تجربہ ہے کہ وہی شخص

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ	جب اس نے تم پر اپنی طرف سے امن کے لیے اونگھ ڈال دی[۱۲۱۰] اور
عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ	اس نے تم پر بادل سے پانی اتارا، تاکہ اس سے تم کو پاک کرے اور
وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ	تم سے شیطان کی ناپاکی کو دور کر دے اور تاکہ تمھارے دلوں کو

جب اس کے قلب میں اطمینان ہو تو بہت بڑے بڑے کام کر سکتا ہے۔ حالانکہ اگر اس کا قلب اطمینان سے خالی ہو تو اس کے جسمانی قوٰی اور ظاہری سامان اس کو کچھ بھی نفع نہیں دیتے۔

تیسری غرض سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب (۱۲) میں بیان فرمائی یعنی ملائکہ کے ذریعہ سے دشمنوں کے دل میں رعب ڈال دیا جائے گا اور یہ بھی صحیح ہے کہ مومن کتنے بھی ثابت قدم ہوتے لیکن اگر مقابلہ میں کفار بھی ثابت قدم ہوتے تو بھی مسلمانوں کو فتح نہ مل سکتی تھی اس لیے فرمایا کہ کافر مرعوب ہو جائیں گے اسی کی طرف ملائکہ کے لیے لفظ مردفین اختیار کرنے میں اشارہ ہے یعنی وہ مسلمان لشکر کے آگے آگے کفار کے دل میں رعب ڈالتے جائیں گے تاکہ کفار کے لشکر مسلمانوں کے سامنے قدم نہ جم سکیں۔

ان تین اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ صاف سمجھ آتا ہے کہ ملائکہ کا نزول ایک حقیقت تھی اور اسی نزول سے ہی مسلمانوں کے قلوب کو قوت ملی اور کفار کا لشکر مرعوب ہو گیا۔

ملائکہ نے بدر میں جنگ نہیں کی: رہا یہ سوال کہ آیا ملائکہ نے انسانوں کی صورت میں ہو کر یا کسی اور طرح پر فی الواقع کفار سے لڑائی بھی کی یا نہیں۔ اس بارہ میں مختلف رائیں ہیں۔ ایک روایت میں ایک انصاری کا ذکر ہے کہ وہ ایک کافر کا تعاقب کر رہا تھا کہ اتنے میں اس نے ایک کوڑے کی آواز سنی اور وہ کافر گر گیا۔ اور اس نے یہ ذکر رسول اللہ صلعم سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ ملائکہ کی امداد سے تھا۔ اور ایک میں ہے کہ ابوجہل نے ابن مسعود سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات تھی کہ ہم آواز سنتے تھے اور شکل نہ دیکھتے تھے، تو انہوں نے کہا یہ ملائکہ تھے۔ ان دونوں سے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو کسی نے دیکھا نہیں اور وہ جنگ کرتے تھے اور بعض لوگوں نے کہا کہ انہوں نے سفید کپڑے پہنے ہوئے انسانوں کی صورت میں لڑائی کی مگر قرآن کریم کی صراحت ان دونوں کے خلاف ہے اور اس آیت کے الفاظ قطعی ہیں۔ چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں والذی یدل علی صحۃ ان الملائکۃ ما نزلوا للقتال قولہ تعالیٰ وما جعلہ اللہ الا بشری الخ یعنی یہ آیت اس بات کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ بدر کے دن ملائکہ جنگ کرنے کے لیے نازل نہیں ہوئے اور اس کی تائید میں ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے عرش میں دعا کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو فرمایا ابشر بنصر اللہ ولقد رایت فی مناجاتی جبرائیل یقدم الخیل یعنی اللہ کی مدد سے خوش ہو جاؤ میں نے اپنی خواب میں جبرائیل کو دیکھا کہ وہ لشکر کے آگے آگے چلتا ہے اور اس کے بعد امام رازی لکھتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکے نزول کی غرض صرف یہی بشارت تھی اور اس سے ان کے جنگ پر اقدام کرنے کی نفی ہوتی ہے۔ اسی طرح روح المعانی میں اس آیت کے نیچے ہے۔ فی الایۃ اشعار بان الملئکۃ لم یباشر واقتالاً وھو مذھب لبعضھم اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے لڑائی نہیں کی اور یہ بعض کا مذہب ہے۔

نوٹ ۵۱۲ سے ظاہر ہے کہ اس بات پر قریباً اتفاق ہے کہ سوائے بدر کے اور کسی جنگ میں ملائکہ نے لڑائی نہیں کی اور جنگ بدر میں نہ لڑنا خود اوپر کی بحث پر ظاہر ہے اور اگر ادنیٰ تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب تین جنگوں میں ملائکہ کے نزول کا ذکر ہے اور دو کے متعلق اتفاق ہے کہ فرشتے لڑے نہیں۔ تو جس غرض کے لیے دو میں نزول ملائکہ ہوا اسی غرض کے لیے تیسری میں بھی ہوا، اس لیے جنگ بدر کو مستثنیٰ کرنا غلطی ہے۔ علاوہ ازیں خود قرآن کریم نے اس کا فیصلہ کیا ہے فارسلنا علیھم ریحا وجنودا لم تروھا (الاحزاب ۳۳ - ۹) ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر جنہیں تم نے نہیں دیکھا۔ یہ جنگ احزاب کے متعلق ہے۔ جہاں فرشتوں کو ایسے لشکر قرار دیا ہے جنھیں مسلمانوں نے نہیں دیکھا اور یہ قطعی شہادت اس بات پر ہے کہ فرشتوں کی امداد اور رنگ کی تھی۔ ان کا آنا یوں نہ تھا کہ تین سو مسلمانوں کے ساتھ ایک ہزار فرشتے مل کر تیرہ سو جنگ کرنے والے ہو گئے ہوں۔ ہاں تین سو کا ہزار پر غالب آنا یقینی شہادت ہے کہ مسلمانوں کو امداد غیبی پہنچی۔

ع۱۲۱۰ نعاس۔ تھوڑی نیند یا اونگھ کو کہتے ہیں مگر راغب نے یہاں نُعاس کے معنی سکون بھی قبول کیے ہیں۔ کیونکہ نیند خود بھی سکون ہے۔

جنگ بدر کے ابتدائی مراحل کو بیان کر کے اب میدان جنگ کی کسی قدر کیفیت بیان کی اور اس میں سب سے پہلے یہ بتایا کہ ہم نے تم پر نعاس وارد کر دی۔ نعاس کے عام معنی اُونگھ یا نیند کی مقاربت ہیں مگر کسی حدیث صحیح سے یہ ثابت نہیں کہ بدر کے دن لڑائی کے وقت مسلمانوں پر نیند وارد ہوئی تھی۔ البتہ اُحد کے دن خاتمۂ جنگ پر نیند کا وارد ہونا ایک مشہور واقعہ ہے۔ ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے کہ رات کے وقت نیند کا آنا مراد لیا جائے۔ کیونکہ جنگ اگلے دن صبح شروع ہوئی۔ پس یہاں یا تو یہ مراد ہے کہ رات کو میدان جنگ میں تمہیں نیند آ گئی اور یہ امن کی نشانی تھی یعنی مسلمانوں کے دلوں میں جو دشمن کا خوف تھا وہ جاتا رہا اور مجاہد سے مروی ہے کہ بارش نعاس سے پہلے آئی تھی (رش) اور یہ اس معنی کا موید ہے مگر رات کی نیند کے لیے نوم کا لفظ زیادہ موزوں تھا اور یا نعاس سے مراد یہاں سکون ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ جو حالت خوف تھی کہ بعض سمجھتے تھے کہ ہم موت کے مُنہ میں جا رہے ہیں۔ میدان جنگ میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو بدل کر دلوں میں سکون وارد کر دیا اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نبی کریم صلعم بہت دعا کرتے کرتے آخر عرش سے باہر تشریف لائے تو آپ کی زبان مبارک پر

عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝١١

قوت دے اور قدموں کو اس کے ساتھ مضبوط کرے ۱۲۱۱

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ
فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ
الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝١٢

جب تیرا رب فرشتوں کو وحی کرتا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں سو جو ایمان لائے ان کو ثابت قدم رکھو۔ میں ان کے دلوں میں جو کافر ہوئے رعب ڈال دونگا۔ سو گردنوں کے اوپر مارو اور ان کے پوروں کو کاٹ ڈالو ۱۲۱۲

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ
يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ۝١٣

یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ (بدی کی) سخت سزا دینے والا ہے ۱۲۱۳

ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابَ النَّارِ ۝١٤

اس (عذاب) کا مزہ چکھ لو اور (جان لو) کہ کافروں کے لیے آگ کا عذاب ہے ۱۲۱۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝١٥

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم ان سے جو کافر ہیں، جنگ کی حالت میں ملو تو اُن سے پیٹھ نہ پھیرو ۱۲۱۵

یہ لفظ تھے سیہزم الجمع ویولون الدبر یعنی کافروں کی جمعیت بھاگ جائے گی اور پیٹھ پھیر دیں گے جو ایک قرآنی پیشگوئی جنگ بدر کے لیے تھی۔

ع۱۲۱۱ یربط علیٰ قلوبکم۔ رَبط کے معنی باندھنا ہیں اور دلوں پر ربط سے مراد وہی ہے جو سکینت کے نازل کرنے اور روح القدس سے تائید کرنے سے (رغ)
دوسری نعمت مسلمانوں پر یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مینہ برسادیا اور اس مینہ سے کئی ایک فواید حاصل ہوئے۔ اوّل یہ کہ جہاں مسلمان اُترے تھے وہاں پانی کافی نہ تھا، دوسرے مسلمانوں کے اُترنے کی جگہ نشیب میں تھی اور ریتلی زمین تھی جس میں پاؤں دھنستا تھا پس بارش سے ایک تو پانی استعمال کے لیے یعنی وضو غسل کے لیے بافراط ہو گیا اور دوسرے زمین سخت ہو گئی اور اس پر قدم جمنے لگا اور تطہیر سے مراد یا تو وضو غسل وغیرہ ہی ہیں اور یا دلوں سے کمزور خیالات کا دور کرنا۔ شیطان کی ناپاکی دور کرنے سے یا تو ان وساوس کا دور کرنا مراد ہے جو شیطان بعض دلوں میں ڈالتا تھا کہ ایک تو تم پہلے ہی کمزور تھے دوسرے جگہ بھی اچھی نہیں ملی اور یا پیاس کا دور کرنا مراد ہے کیونکہ پیاس کو شیطان الفلا کہا جاتا ہے۔ اور دلوں کی قوت اور قدموں کی مضبوطی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ قدموں کی مضبوطی صرف یہی نہیں کہ ریتلی زمین پر بارش کی وجہ سے پاؤں جمنے لگا بلکہ یہ کہ دشمن کے مقابلہ پر قدم مضبوط ہو گئے۔

ع۱۲۱۲ یہ میدان جنگ کا دوسرا نظارہ ہے پہلا نظارہ وہ ہے جس کا ذکر پہلی آیت میں ہے اور یہاں عین حالتِ جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ ملائکہ کا جو کام تھا اس کی تصریح یہاں خود قرآن کریم نے فرمادی ہے۔ اس لیے اختلاف روایات کے اندر صحیح راہ قرآن کریم کے الفاظ کو مدنظر رکھنا ہے۔ ملائکہ کو حکم تھا کہ مسلمانوں کو ثابت قدم رکھیں اور ملائکہ کا تعلق چونکہ قلوب سے ہوتا ہے اس لیے ان کا ثابت قدم رکھنا اسی طرح پر تھا۔ جیسا کہ زجاج نے بھی لکھا ہے کہ ان کے دلوں میں ایسا القا کریں جس سے ان کا عزم پختہ ہو اور ان کی کوشش مضبوط ہو سالقی فی قلوب والا فقرہ الگ ہے۔ جس میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم کفار کو مارو یہ ملائکہ کی وحی میں داخل نہیں فوق الاعناق سے مراد بعض نے سر لیے ہیں کہ ان کے سر کاٹ دو۔ اور بعض نے فوق بمعنی علےٰ لیا ہے یعنی ان کی گردنوں پر تلواریں مارو۔
بنان۔ بنانۃ کی جمع ہے۔ انگلیوں کی پوروں کو کہتے ہیں کیونکہ انہی سے ہاتھ کام دیتا ہے اور اسی میں انسان کی ساری قوت مخفی ہے۔ پس مراد یہ ہے کہ جن ہاتھوں سے تم پر تلواریں اُٹھاتے ہیں ان ہاتھوں کو کاٹ ڈالو۔

ع۱۲۱۳ شاقوا۔ شق کے معنی شگاف ہیں ثم شققنا الارض شقا (عبس۸۰-۲۶) اور شِقّ کے معنی مشقت ہیں الا بشق الانفس (النحل۱۶-۷) اور شُقّۃ وہ جانب ہے جن تک پہنچنے میں مشقت ہو لبعدت علیہم الشقۃ (التوبۃ۹-۴۲) اور شقاق مخالفت ہے وان خفتم شقاق بینہما (النساء۴-۳۵) ومن یشاقق الرسول (النساء۴-۱۱۵) (رغ)

ع۱۲۱۴ یہاں صاف طور پر اس عذاب دنیا کو عذاب آخرت کے لیے پیش خیمہ بتایا ہے۔ یہ اس لیے کہ دونوں قسم کے عذاب کا ان سے وعدہ کیا تھا ولنذیقنہم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر۔ سو اس پہلے عذاب کا آجانا ثبوت تھا کہ دوسرا وعدہ بھی سچا ہے۔

ع۱۲۱۵ زحف۔ اصل میں پاؤں گھسیٹ کر چلنا ہے جس طرح بچہ چلتا ہے اور لشکر کے کوچ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اس لیے کہ کثرتِ سامان وغیرہ کی وجہ سے

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا
لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾
فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا
رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ
وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾
ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾
اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ
تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ
وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ
ع ۲ ۱۶ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

اور جو کوئی اس دن ان سے اپنی پیٹھ پھیرے سوائے اس کے کہ جنگ کے لیے ایک طرف پھر جائے یا کسی جماعت کے تو وہ اللہ کی ناراضگی لے پھرا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے [۱۲۱۶]

سو تم نے ان کو نہیں مارا بلکہ اللہ نے ان کو مارا - اور جب تو نے پھینکا تو تُو نے نہیں پھینکا ، بلکہ اللہ نے پھینکا - اور تا کہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھا انعام دے - اللہ سُننے والا جاننے والا ہے [۱۲۱۷]

یہ (تو ہو چکا) اور جان لو کہ اللہ کافروں کی جنگ کو کمزور کرنے والا ہے [۱۲۱۸]

اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو فیصلہ تمھارے پاس آ گیا [۱۲۱۹] اور اگر تم رک جاؤ تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر تم پھر (جنگ) کرو گے ہم بھی پھر (سزا) دینگے اور تمھارا جتھا تمھارے کچھ کام نہ آئے گا، اگرچہ بہت ہو اور (جان لو) کہ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے [۱۲۲۰]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور

وہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہے (رغ) اس لیے زحف کے معنی جنگ میں دشمن سے مٹھ بھیڑ بھی آئے ہیں جیسے حدیث میں ہے و ان فرّ من الزحف - جنگ کے ذکر میں بتایا ہے کہ مسلمان کا یہ کام نہیں کہ دشمن کو پیٹھ دکھائے استثنا کا ذکر اگلی آیت میں ہے چونکہ مسلمان کے لیے جنگ کے قوانین بھی منجانب اللہ ہیں اس لیے آج تک مسلمان ان احکام پر عامل ہیں - ترکوں کے متعلق بالخصوص یہ ایک مشہور امر ہے کہ گولی کا زخم ان کے سینہ پر یا سامنے کی طرف ہوتا ہے پیٹھ پر نہیں -

ع ۱۲۱۶ متحرفا - حرف سے ہے جس کے معنی کنارہ یا طرف ہیں پس تحرّف کنارہ کشی ہے -
متحیزا - حوز اس کا اصل ہے ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ جمع ہونا پس متحیزا کے معنی ہیں صائرا الی حَیِّزٍ (رغ) جنگ میں دشمن کے سامنے دو حال میں بھاگنا جائز ہے - اول اغراض جنگ کے لیے ، دوسرا بڑے حصّہ لشکر سے کٹ جائے تو اس کے ساتھ ملنے کے لیے -

ع ۱۲۱۷ یہاں دو باتوں کا ذکر ہے - ایک مسلمانوں کا کفار کو قتل کرنا ، دوسرے نبی کریم صلعم کا رمی یعنی پھینکنا حنین کے دن نبی کریم صلعم کی رمی مسلّم ہے مگر بدر کے دن بھی بعض احادیث میں رمی کا ذکر ہے - گو طیبی نے اس کے صحیح احادیث میں ہونے سے انکار کیا ہے اور وہ رمی یہ تھی کہ آنحضرت صلعم نے ایک مٹھی کنکروں کی دشمن کے لشکر کی طرف پھینکی جو اس کی ہزیمت کا موجب ہو گئی - ان دونوں باتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے اس سبب سے کہ دونوں میں ایک اعجازی رنگ ہے - تین سو مسلمان ہزار کے ساتھ مقابلہ کر کے ان کو کس طرح قتل کر سکتے تھے ایک مٹھی کنکروں کی دشمن کو کس طرح بھگا سکتی تھی - دونوں میں اللہ تعالیٰ نے اعجازی رنگ پیدا کر دیا - اللہ کے قتل اور رمی سے مراد یہی ہے کہ ان میں اعجازی طاقت پیدا کر دی -

ع ۱۲۱۸ ذٰلك میں اشارہ موجودہ جنگ کے نتائج کی طرف ہے و ان اللّٰہ موھن کید الکافرین میں یہ بتایا کہ اب ان کی جنگ جاری تو رہے گی لیکن اللہ تعالیٰ اس کو کمزور کر دے گا - یعنی آہستہ آہستہ یہ خود رک جائیں گے -

ع ۱۲۱۹ کفار جب مکہ سے چلے تو استار کعبہ کو پکڑ کر یہ دعا کی اَللّٰھم انصر اعلی الجُندین واَھدی الفئتین واکرم الحِزبین اے اللہ دونوں لشکروں میں سے اعلیٰ لشکر کو اور دونوں جماعتوں میں سے زیادہ ہدایت والی جماعت کو اور دونوں گروہوں میں سے زیادہ معزز گروہ کو مدد دے - بعض روایتوں میں ہے کہ ابوجہل نے میدانِ جنگ میں یہ دعا کی تھی کہ جو ہم دونوں فریق میں سے فساد اور قطع رحمی کا مرتکب ہے اس کو ہلاک کر دے - انہی دعاؤں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ہے کہ تمہاری اپنی دعا کے مطابق اللہ تعالیٰ نے فیصلہ دیدیا - اب اس فیصلہ کو تو قبول کر لو -

ع ۱۲۲۰ کفار کو نصیحت ہے کہ جنگ سے رُک جاؤ تو اسی میں تمہارا فائدہ ہے اور پھر جنگ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہی ہے کہ اور سزا بھگتو گے - اور یہی پیشگوئی کھلے الفاظ میں کر دی کہ کتنے بڑے بڑے لشکر لیکر آؤ کامیاب نہ ہو گے - ان حالات میں جب مسلمانوں کی جمعیت ابھی تین چار سو ہے - کل عرب کو مخاطب کر کے

وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ ﴿٢٠﴾

اس سے مت پھرو درانحالیکہ تم سنتے ہو ع۱۲۲۱

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾

اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنھوں نے کہا ہم سنتے ہیں، اور وہ قبول نہیں کرتے۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾

اللہ کے نزدیک سب جانداروں سے بدتر وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے ع۱۲۲۲

وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾

اور اگر اللہ ان میں بھلائی جانتا تو ان کو سناتا اور اگر ان کو سنائے تو وہ پھر جائیں اور وہ منہ پھیرنے والے ہوں ع۱۲۲۳

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول کا حکم مانو، جب وہ تم کو اس کام کے لیے بلاتا ہے جو تمھیں زندگی دیتا ہے ع۱۲۲۴ اور جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل (ہوتا) ہے اور کہ تم اس کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے ع۱۲۲۵

یہ کتنا الٰہی طاقت کا جلوہ ہے۔ ان الفاظ کی صداقت روز روشن کی طرح چمکی جس سے کوئی دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا۔

ع۱۲۲۱ پچھلے رکوع کے آخر میں کفار کو صاف کہہ کر کہ تمہارے بڑے بڑے جتھے اسلام کو نیست و نابود نہ کر سکیں گے بلکہ جنگوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کو سزا ملے گی اور مسلمانوں کو بتا کر کہ اللہ ان کے ساتھ ہے یعنی وہ کامیاب اور غالب ہونگے اس رکوع میں خود مسلمانوں کو تنبیہ کرتا ہے اور ان کو بتاتا ہے کہ یہ مت سمجھ لینا کہ بس حکومت اور بادشاہت کا مل جانا اور دشمنوں کا ناکام ہو جانا ہی فلاح ہے بلکہ تمہاری حقیقی فلاح اللہ اور رسول کے احکام کی پابندی میں ہے۔ ہماری موجودہ حالت کے لیے ہدایت ہے

لاتولوا عنہ۔ یہاں ضمیر اس امر کی طرف ہے جس پر فعل اطاعت دلالت کرتا ہے یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت سے روگردانی نہ کرو۔ درحقیقت ظاہر میں تو صرف رسول کی ہی اطاعت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغام بھی وہی پہنچاتا ہے اس لیے اگر ضمیر صرف رسول کی طرف ہو تو بھی ہرج نہیں یا چونکہ دوسرے رنگ میں رسول کی اطاعت بھی آخر اللہ کی اطاعت ہی ہے اس لیے اللہ کی طرف ضمیر لے لی جائے تو بھی ہرج نہیں ؞

ع۱۲۲۲ عقل اور مذہب: یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن شریف کی اصطلاح میں بہرے اور گونگے وہ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے، بعض پیشوایان دین علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ عقل کو مذہب میں کیا دخل ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو انسان ہو کر عقل سے کام نہ لے وہ چارپایوں بلکہ کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر ہے۔ اور یہ ظاہر بھی ہے کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل نہیں دی ہے، اس لیے انسان جس کو وہ نعمت ملی ہے جب اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو ان سے بدتر ہوا۔

ع۱۲۲۳ حالت عناد: وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے وہ خیر سے خالی ہیں۔ سننے سے فائدہ تب ہوتا ہے جب انسان اس پر غور کرے یعنی عقل سے کام لے، مگر وہ چونکہ غور نہیں کرتے اس لیے ان کا سننا نہ سننا برابر ہے۔ یہ ان کی حالت واقعی کا اظہار ہے۔ اس کے بعد ان کی حالت عناد کا ذکر کیا کہ انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو خیر و خوبی سے ہی محروم کر دیا ہے بلکہ حق کی عداوت میں یہاں تک ترقی کر گئے ہیں کہ اگر کلمہ حق ان کے کان میں ڈالا بھی جائے تو بوجہ عناد کے منہ پھیر لینگے۔ غور کرنا تو ایک طرف رہا وہ اعراض کرتے ہیں یعنی کچھ کی کچھ باتیں بناتے ہیں ؞

ع۱۲۲۴ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کا نتیجہ بتایا ہے کہ وہ تمہاری زندگی کا موجب ہے۔ آج مسلمان قوم جس موت کے نیچے ہے اسی کا علاج یہاں بتایا ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تو کوئی حکم نہیں ملا جس کی انہوں نے فرمانبرداری نہ کی ہو اور اسی لیے وہ ایک زندہ قوم تھے۔ مگر آج اسلام کا دعویٰ کرنے والے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ انہی کو یہ زندگی کا پیغام دیا ہے کیا مسلمان اس پر توجہ کریں گے؟ ان کی زندگی حکومت و بادشاہت سے نہیں بلکہ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری سے ہے۔ حکومت و بادشاہت تو محض غلام ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول جو مُردوں کو زندہ کرتا ہے اس سے مراد احیائے روحانی ہی ہوا کرتا ہے پس اگر حضرت عیسیٰ نے مُردے زندہ کیے تو ہمارے نبی کریم صلعم نے اس سے لاکھوں درجہ بڑھ کر مُردے زندہ کیے۔

ع۱۲۲۵ یحول۔ حَوْل کے معنی ایک چیز کا تغیر اور اس کا دوسرے سے الگ ہو جانا ہیں اور حال کا صلہ جب بَیْن ہو تو مراد اُن دونوں کے درمیان آ جانا ہوتا ہے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾

اور اس عظیم الشان فتنہ سے بچاؤ کرو جو خاص کر اُن لوگوں کو نہ پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں اور جان لو کہ اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے ۱۲۲۶

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٢٦﴾

اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے زمین میں کمزور تھے ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو زبردستی پکڑ نہ لے جائیں، سو اس نے تم کو پناہ دی اور اپنی نصرت کے ساتھ تمھاری تائید کی اور تم کو اچھی چیزوں سے رزق دیا تاکہ تم شکر کرو ۱۲۲۷

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٧﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو۔ اور (نہ) اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم جانتے ہو ۱۲۲۸

اللہ کے انسان اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اس سے سب سے زیادہ قریب ہے، یہاں تک کہ قلب انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ان دونوں کے درمیان میں بھی اللہ تعالیٰ حائل ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا نحن اقرب الیه من حبل الورید (ق ۵۰ - ۱۶) یعنی ہم انسان کی رگ حیات سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔ حالانکہ رگ حیات سے ہی انسان کی زندگی ہے۔ اور اللہ کے قریب ہونے کی طرف اس لیے توجہ دلائی کہ پھر اس کو چھوڑ کر دوسری طرف کیوں جاتا ہے۔ یا یہ فرمانبرداری میں جلدی کرنے کے لیے ترغیب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مہلت جو انسان کو دی گئی ہے انسان کے ہاتھ سے نکل جائے اور یہ بھی صحیح ہے کہ قلب انسانی اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہے اس کے عزائم بعض وقت رکھے کے رکھے رہ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی کسی مصلحت سے ان کو فسخ کر دیتا ہے اس لیے انسان کو جب نیکی کا موقعہ ملے اس سے فوراً فائدہ اُٹھائے ایسا نہ ہو کہ نیکی کو ترک کرتے کرتے اس کے قلب کی حالت یہاں تک پہنچ جائے کہ پھر وہ نیک تحریک ہی اس کے اندر نہ ہو۔ اور یا مراد یہ ہے کہ تم اگر فرمانبرداری کرو تو تمہارے ضعف کو اللہ تعالیٰ قوت سے بدل دے گا اور بزدلی کی جگہ تم میں ہمت پیدا کر دے گا اور خوف کی جگہ امن دے دیگا۔

۱۲۲۶ فتنۃ سے مراد دکھ یا عذاب ہے۔ اور تنوین اس کی عظمت کے لیے ہے جیسا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے اس میں مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ بعض وقت جب ایک قوم میں کثرت سے لوگ مستحق عذاب ہو جاتے ہیں تو پھر وہ دکھ ساری قوم کو ہی پہنچ کر رہتا ہے یعنی ظالموں کے ساتھ اچھے بھی پھر اس لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ حدیثوں میں مسلمانوں پر آخری زمانہ میں اسی قسم کے فتنوں کے آنے کا ذکر آتا ہے جو ساری مسلمان دنیا میں عام ہو جائیں گے۔ اور کوئی شخص ان کو روک نہ سکے گا اور ایک طرف سے اس کو روکنے کی کوشش کی جائے گی تو دوسری طرف سے نمودار ہو جائے گا۔

۱۲۲۷ یتخطفکم۔ خَطْف اور اختطاف کے معنی ہیں تیزی سے کسی چیز کا لے لینا یکا د البرق یخطف ابصارهم (البقرۃ ۲ - ۲۰) الا من خطف الخطفۃ (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۱۰) اور یتخطف الناس من حولهم (العنکبوت ۲۹ - ۶۷) میں معنی کیے ہیں لوگ قتل کیے جاتے ہیں اور گرفتار کیے جاتے ہیں (غ) یہی معنی یہاں ہیں۔

اٰوٰی ۔ اَوٰی کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ مل گیا یعنی اس کی پناہ لی اور اٰوٰی کے معنی اسے پناہ دی اور اَوٰی کے معنی رَجَعَ یعنی لوٹ آیا بھی آتے ہیں۔ اذ اوی الفتیۃ الی الکهف (الکهف ۱۸ - ۱۰) اٰوی الیه اخاه (یوسف ۱۲ - ۶۹) وتؤوی الیك من تشاء (الاحزاب ۳۳ - ۵۱) اور اسی سے مَاْوٰی ہے جو مصدر بھی ہو سکتا ہے جیسے جنۃ المأوٰی (النجم ۵۳ - ۱۵) اور اسم مکان بھی جیسے ماواهم جهنم (بنی اسرائیل ۱۷ - ۹۷) (غ)

ساتھ ہی اس فتنہ عظیم میں ایک خوشخبری بھی دی ہے کہ اگر تم اس وقت کمزور ہو گے تو پھر اس وقت کو بھی یاد کرو جب تم تھوڑے بھی تھے اور کمزور بھی یعنی اسلام کی ابتدائی حالت اور اس وقت تو تمہاری حیثیت اسی قدر تھی کہ لوگ اگر زبردستی تم کو پکڑ کر ہلاک کر دیتے تو تمہارے بس کی بات نہ تھی پس اگر اس وقت بھی تم کو اللہ تعالیٰ نے مصائب سے پناہ دی اور اپنی نصرتوں سے تم کو مضبوط کر دیا تو اب ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہو کر تم کیوں مایوس ہوتے ہو؟

۱۲۲۸ اللہ اور رسول کی خیانت یہ ہے کہ ان کی فرمانبرداری کا اقرار کر کے، مسلمان کہلا کر پھر ان کی فرمانبرداری نہ کریں۔ خیانت نقضِ عہد کا نام ہے دیکھو ۲۶ یا یہ کہ وہ کام کریں جس سے دین اسلام کو اور قوم مسلمان کو نقصان پہنچتا ہو کیونکہ دین ایک امانت تھی جو ان کے سپرد کی گئی تھی۔ مسلمانوں میں یہ خیانت ہی آج کل ان کی بڑی تباہی کا موجب ہو رہی ہے قومی اور دینی اغراض کو اپنی ذاتی اغراض پر قربان کر دیتے ہیں۔ چند پیسوں کے لیے قوم کو اور دین کو نقصان پہنچانے کے کام کر لیتے ہیں۔ ایک ادنیٰ خواہش کے سامنے اپنے اعلیٰ فرائض کو برباد کر دیتے ہیں۔ ایمان فروشی اور قوم فروشی ان کا عام شیوہ ہو گیا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں اسی سے تباہ ہوئیں کہ ایک شخص نے چند پیسے اپنی جیب میں ڈالنے کے لالچ سے اغراض قومی کو دوسری قوموں کے ہاتھ بیچ دیا۔ گویا اس حصۂ آیت میں اغراض قومی اور اغراض دینی کو مقدم کرنے

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

اور جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد آزمایش ہے اور یہ کہ اللہ کے ہاں بھاری اجر ہے ١٢٢٩

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ کا تقویٰ کرو تو وہ تمھارے لیے (حق و باطل میں) فرق کر دیگا اور تمھاری برائیاں تم سے دور کر دے گا۔ اور تمھاری حفاظت کرے گا اور اللہ بڑے فضل کا مالک ہے ١٢٢٩ا

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

اور جب وہ جو کافر ہوئے تیرے متعلق تدبیریں کرتے تھے تاکہ تجھے قید کریں یا تجھے قتل کریں یا تجھے نکال دیں اور وہ تدبیریں کرتے تھے۔ اور اللہ بھی تدبیر کرتا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے ١٢٢٩ب

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں کہتے ہیں ہم نے سن لیا۔ اگر ہم چاہیں، تو اس کی مثل کہہ لیں۔ یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ

اور جب انھوں نے کہا اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا

کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ قومی ترقی کا راز ہے۔ اپنی امانتوں کی خیانت یہ ہے کہ جو قویٰ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں ان کو اپنے محل اور موقع پر کام میں نہ لائے اور خدا داد طاقتوں کو بیکار کر دے۔ یہ انسانی یعنی افراد قومی کی ترقی کا راز ہے۔ جب تک مسلمان اندرونی اصلاح سے کام کو شروع نہ کریں گے ان کی سوراج اور حکومت حاصل کرنے کی خواہشات کا حشر بھی ناکامی کے رنگ میں ہوگا۔ اصل بیماری جب تک دور نہ ہو بادشاہت سے کیا ملے گا۔

ع١٢٢٩ مال اور اولاد مسلمانوں کے لیے فتنہ ہو گئے ہیں اس لیے کہ انھوں نے اسی کو غرض زندگی سمجھ لیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا اسی قدر فرض ہے کہ اپنے لیے کچھ مال کما لیں یا جمع کر لیں اور اپنی اولاد کا کچھ فکر کریں۔ اور اغراض قومی اور اغراض دینی کی اہمیت کو کچھ بھی نہیں سمجھا۔ اس لیے سزا بھی اسی مال اور اولاد پر ہی آکر پڑی۔ یعنی قوموں میں مفلس قوم رہ گئے اور اولاد دوسروں کی محکوم ہو گئی۔ وہ مال جس کو غرض زندگی سمجھا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اور وہ اولاد بھی ذلیل ہوئی جس کو مدنظر رکھ فرائض اعلیٰ کو ترک کر دیا تھا۔

ع١٢٢٩ا ایک فرقان ظاہری تو وہ تھا جو جنگ بدر کے ذریعے سے مسلمانوں کو عطا ہوا۔ یہاں اس دوسرے فرقان کا ذکر ہے جو اندرونی طور پر مومن کو عطا ہوتا ہے یعنی اس کے اندر ایک ایسا نور پیدا کر دیا جاتا ہے جس سے اسے دوسروں سے ایک امتیاز مل جاتا ہے۔ ظاہری فرقان یا فتوحات تب ہی مفید ہو سکتی ہیں جب اصلی فرقان یعنی اندرونی نور پیدا ہو۔

ع١٢٢٩ب یثبتوک۔ ثبات زوال کی ضد ہے اور ثابت بصر سے بھی ہوتا ہے اور بصیرۃ سے بھی اور بصیرۃ کے لحاظ سے ہی کہا جاتا ہے کہ فلاں امر ثابت ہے اور یثبتوک کے معنی ہیں تجھے قید کر دیں اور حیران کر دیں (رغ)، گویا اَثْبَتَہٗ کے معنی ہیں اسے ایک مکان میں قائم کر دیا جس سے وہ علیحدہ نہ ہو سکے اور اس حالت پر بھی اثبت بولا جاتا ہے جب بیماری یا زخم سے ایک شخص حرکت کے قابل نہ رہے (ل) پس یثبتوک کے معنی دونوں طرح ہو سکتے ہیں قید کر دیں یا ایسا زخمی کر دیں کہ حرکت کے قابل نہ رہے مگر پہلے معنی قابل ترجیح ہیں اس لیے کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ان میں سے بعض نے کہا اثبتوہ بالوثاق (ل)

اس میں مسلمانوں کی تکلیفوں کا وہ نقشہ کھینچا ہے جب خود رسول اللہ صلعم کو بھی کہیں امن نہ ملتا تھا اور دار الندوہ میں اکٹھے ہو کر کفار نے مختلف تجویزیں آپ کے متعلق کیں۔ یہ کہ آپ کو قید کر دیا جائے یا قتل کر دیا جائے یا نکال دیا جائے۔ باقی تجویزیں رد ہو کر آخر اس بات پر اتفاق ہوا تھا کہ آپ کو قتل کیا جائے۔ اس کے بالمقابل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی تمہارے بچانے کے لیے ایک تدبیر کی اور وہی تدبیر کارگر ہوئی۔ ایک طرف سارے اہل مکہ کی متفقہ تدبیر دوسری طرف ایک اکیلے انسان کو بغیر سر و سامان کے ان کے اندر سے نکال کر اور انہی کے گھر کے پاس رکھ کر بچایا جاتا ہے۔

خیر الماکرین۔ مکر کے معنی مخفی تدبیر اچھی ہو یا بری ع٤٢٣ میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ لفظ خیر کا ماکر کے ساتھ آنا خود بتاتا ہے کہ ماکر میں بجائے خود کوئی شر یا برائی نہیں کیونکہ بری چیز پر خیر کا لفظ بولا ہی نہیں جا سکتا۔

السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

ہم پر دردناک عذاب بھیج ۱۲۲۹ج

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ
وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان کو عذاب دیتا حالانکہ تو ان میں تھا
اور اللہ ان کو عذاب دینے والا نہ تھا حالانکہ وہ استغفار کرتے ہوں ۱۲۲۹د

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ
اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور ان کا کیا عذر ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے۔
اور وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں اور وہ اس کے متولی
نہیں اس کے متولی سوائے متقیوں کے اور کوئی نہیں ہو سکتے
لیکن ان میں سے بہت نہیں جانتے ۱۲۲۹ہ

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا
مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا
كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور ان کی نماز خانہ (کعبہ) کے پاس سوائے سیٹیاں بجانے
اور تالیاں پیٹنے کے اور کچھ نہیں۔ سو عذاب چکھو، اس لیے
کہ تم کفر کرتے تھے ۱۲۲۹و

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ
عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا
اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾

وہ جو کافر ہیں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، تاکہ اللہ کی
راہ سے روکیں، سو ان کو خرچ کرتے رہیں گے پھر وہ ان
کے لیے پچھتاوا ہوں گے۔ پھر وہ مغلوب کیے جائیں گے
اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ۱۲۲۹ز

ع۱۲۲۹ج جب ان سے پہلوں کا ذکر کیا جاتا جسے وہ کہانیاں قرار دیتے ہیں اور ان کی مخالفت حق کا انجام بتایا جاتا تو پھر یہ کہتے کہ اگر محمد رسول اللہ صلعم حق پر ہیں۔ تو ہم پر ایسا ہی عذاب کیوں نہیں آتا۔ بدر میں بھی ان کا اس قسم کی دعا کرنا ثابت ہے دیکھو ع۱۲۱۹۔

ع۱۲۲۹د کفار پر تاخیر عذاب کی وجہ: بتایا ہے کہ عذاب تو تم پر آنا ہی تھا۔ مگر اس وقت کس طرح آتا جب محمد رسول اللہ صلعم ابھی تمہارے درمیان موجود تھے۔ سنت اللہ عذاب کے متعلق یہی ہے کہ جب نبی قوم سے الگ ہو جاتا ہے تب عذاب آتا ہے۔ پس اہل مکہ پر عذاب ضروری تھا کہ ہجرت نبی کریم صلعم کے بعد آتا۔ دوسری وجہ یہ دی ہے کہ ابھی وہ استغفار کرتے تھے یعنی گو بظاہر عناد کی حالت میں عذاب تک مانگ لیتے تھے مگر پھر پچھتاتے تھے اور گھروں میں جا کر استغفار بھی کرتے تھے، لیکن جب آخر مقابلہ پر نکل کھڑے ہوئے اور تلوار ہاتھ میں لے لی کہ مسلمانوں کو بالکل نیست و نابود کر دیں تو وہ حالت استغفار پھر باقی نہ رہی۔ اور یا ھم یستغفرون میں اشارہ مسلمانوں کے استغفار کی طرف ہے کہ جب ان میں ایک قوم استغفار کرنے والی تھی تو عذاب ان پر کس طرح آتا۔

ع۱۲۲۹ہ یعنی عذاب کا آنا تو اس لیے ضروری ہے کہ وہ حق کی مخالفت کو ترک نہیں کرتے اور مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکتے ہیں۔ حالانکہ بوجہ اپنے مشرک ہونے کے وہ ولایۃ مسجد حرام کے مستحق بھی نہیں کیونکہ مسجد تو توحید کا گھر ہے اور وہی لوگ اب اس کے اولیا قرار پائیں گے جو مذہب توحید رکھتے ہیں یعنی اہل اسلام۔ متقیوں سے مراد یہاں شرک سے بچنے والے لوگ ہیں بمقابلہ ان مشرکوں کے جن کا ذکر ہے اور یہی ادنیٰ مرتبہ اتقا بھی ہے۔ اس میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ اہل اسلام ہی آیندہ خانہ کعبہ کے متولی رہیں گے۔

ع۱۲۲۹و مکاء۔ مکا پرند کی آواز نکالنے پر بولا جاتا ہے (غ) اور سیٹی بجانے پر بھی (ل)
تصدیۃ۔ صدی وہ آواز ہے جو صاف مکان سے لگ کر واپس آتی ہے یعنی گونج اور تصدیۃ وہ آواز ہے جو اس کے قائم مقام ہو یعنی جس میں کچھ فائدہ نہ ہو (غ)
مشرکین عرب کی عبادت کا رنگ: ابن عباس سے روایت ہے کہ مشرک حج کے وقت ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے اور سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے۔ یا اشارہ اُن کے ان افعال کی طرف ہے جو نبی کریم صلعم کو عبادت سے روکنے کے لیے کرتے تھے۔ گویا ان کی عبادت اب اسی قدر رہ گئی ہے کہ سیٹی اور تالیاں بجا کر دوسروں کی عبادت میں مخل ہوں۔ راغب کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ ان کی نماز یا دعا میں حقیقت کچھ نہیں۔ ایسی ہے جیسے سیٹی یا تالی یعنی بے معنی حرکت یا آواز۔

ع۱۲۲۹ز یہاں بتایا ہے کہ مسلمانوں سے ان کو عداوت اور کسی وجہ سے نہیں بلکہ محض اس لیے کہ وہ مسلمانوں کے دین کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ جنگ بدر میں بھی اگرچہ

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

تاکہ اللہ پاک کو ناپاک سے الگ کر دے اور ناپاک کو ایک دوسرے پر رکھتا چلا جائے پھر سب کو ایک ڈھیر بنا دے پھر اس کو جہنم میں ڈال دے وہی نقصان اُٹھانے والے ہیں ۱۲۲۹ح

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا، کہہ دو اگر وہ رُک جائیں، تو جو گزر چکا اُن کو معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر وہی کام پھر کریں تو پہلوں کا معاملہ گزر ہی چکا ہے ۱۲۲۹ط

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾

اور ان کے ساتھ جنگ کرو، یہاں تک کہ (دین کے لیے) دکھ دینا نہ رہے اور دین سب کے سب اللہ کے لیے ہوں پھر اگر وہ رک جائیں تو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں ۱۲۳۰

عام لوگوں کو اس بنا پر اُکسایا گیا تھا کہ ابن حضرمی کو مسلمانوں نے قتل کر دیا ہے مگر اصل کینہ یہی تھا کہ مسلمان ترقی کرتے جا رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ زور پکڑ جائیں تو پھر ان کا تباہ کرنا مشکل ہو جائے اور ابن حضرمی کا قتل محض ایک بہانہ بنایا گیا تھا۔ ابن حضرمی کے قتل کا واقعہ اتفاقی تھا اور وہ اس طرح پر تھا کہ آنحضرت صلعم نے عبداللہ بن جحش کی سرداری میں کچھ آدمی قریش کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجے تھے۔ غرض یہ تھی کہ ان کی تیاریٔ جنگ کا حال معلوم رہے اور تحریری پروانہ میں صرف اسی قدر ہدایت تھی کہ نخلہ تک جاؤ اور قریش کی خبر لاؤ۔ ان لوگوں نے غلطی سے ابن حضرمی کو جو اس وقت ایک قافلہ کو لیے ہوئے طائف سے آرہا تھا قتل کر دیا ایسا اتفاقی قتلوں میں عرب میں دستور دیت کا تھا، مگر ابوجہل نے اسے بہانہ بنا کر مدینہ پر چڑھائی کی۔ سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے اس لشکر کے لیے تیار کیے، جس پر بہت سا مال خرچ ہوا۔

جنگ بدر کے بعد اور لڑائیاں اور ان میں کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی: مگر علاوہ اس کے یہاں آیندہ کے لیے بھی پیشگوئی ہے کہ ابھی یعنی جنگ بدر کے بعد اور مال بھی اسلام کی مخالفت پر خرچ کریں گے مگر چونکہ ناکام رہیں گے اس لیے یہ خرچ ان کے لیے موجب حسرت رہے گا اور صرف مسلمانوں پر چڑھائی میں ہی ناکام نہ رہیں گے بلکہ آخر کار مسلمانوں سے مغلوب بھی ہو جائیں گے۔ جنگ بدر کے بعد بھی ایسی صریح پیشگوئی قیاس انسانی سے بالکل بالاتر تھی اس لیے کہ ان کی طاقت ابھی اسی طرح باقی تھی اور مسلمانوں کی تعداد تین چار سو سے زائد نہ تھی جو میدان جنگ میں لائی جا سکتی،،

ع۱۲۲۹ح الخبیث۔ الطیّب۔ خبیث اور طیب کے معنی کے لیے دیکھو ع۳۴۳ و ع۸۲ اور الخبیث اور الطیّب سے بُرے اور اچھے عمل بھی مراد ہو سکتے ہیں اور بُرے اور اچھے نفوس بھی یا کافر و مومن (غ) اور انسانوں میں طیب وہ ہے جو جہل اور فسق اور بُرے اعمال سے پاک ہو اور علم اور ایمان اور اچھے اعمال کے ذریعہ سے آراستہ ہو (غ)

یرکم۔ رَکم کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسرے کے اوپر رکھ کر جمع کرتا چلا گیا سحاب مرکوم (الطور ۵۲-۴۴) اور رُکام وہ ہے جو ایک دوسرے پر رکھ کر جمع کیا جائے ثم یجعلہ رکاما (النور ۲۴-۴۳)

یہاں ان کے مغلوب ہونے کا نتیجہ بتایا یعنی تاکہ پاک اور ناپاک الگ الگ ہو جائیں۔ خبیث اور طیب انسانوں پر بھی بولے جا سکتے ہیں اور مال وغیرہ پر بھی۔ اگر انسان مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ اس مغلوبیت پر کافروں اور مسلمانوں میں ایک کھلا کھلا امتیاز قائم ہو جائے گا اور ائمۃ الکفر یکے بعد دیگرے جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ یا ان کے لشکر یکے بعد دیگرے آتے رہیں گے مگر نتیجہ سب کا ناکامی ہوگا یہی ان کا جہنم ہے۔ اور اموال مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ مومنوں اور کافروں کے خرچ کیے ہوئے مال میں تمیز ہو جائے گی ایک کا مال خرچ کیا ہوا کامیابی کا موجب ہوگا، دوسرے کا ناکامی کا موجب۔ آیت کے آخری الفاظ پہلی صورت کو مرجح ٹھہراتے ہیں۔

ع۱۲۲۹ط۔ اس رکوع میں یہ دکھایا ہے کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کا دشمن کے مقابلہ میں نکلنا محض مصلحت الٰہی سے عمل میں آیا، ورنہ اگر کفار کی طاقت کا اندازہ ان کو ہوتا تو وہ جرأت نہ کرتے۔ اور ایسا اس لیے ہوا کہ تا اللہ تعالیٰ ایک کھلا ثبوت حقانیت اسلام کا دے اور حق و باطل میں کھلا کھلا فیصلہ کر دکھائے۔

سنت کے معنی طریق ہیں سنت الاوّلین سے مراد وہ طریق ہے جو پہلے سرکش لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے برتا، یعنی مراد پہلوں کا قائم کردہ طریق نہیں بلکہ وہ طریق ہے جو اللہ تعالےٰ نے ان کے خلاف قائم کیا یعنی جس طرح ان کو سرکشی کی سزا دی اسی طرح تمھیں بھی دے گا۔

ع۱۲۳۰ اس پر مفصل بحث ع۲۴۶ میں گزر چکی ہے۔ ہاں یہاں الفاظ الدّین کلّہ قابل غور ہیں جن کے معنی ہیں سب دین جیسے لیظھرہ علی الدّین کلّہ

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٤٠﴾

اور اگر پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے کیا ہی اچھا مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار ہے ؏

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤١﴾

اور جان لو کہ کوئی چیز تم فتح پا کر حاصل کرو، تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں (کے لیے)[1231] اگر تم اللہ پر ایمان لاتے ہو اور اس (پر) جو ہم نے اپنے بندہ پر حق و باطل میں فرق کرنیکے دن اتارا، جس دن دو گروہوں میں مٹھ بھیڑ ہوئی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے[1232]

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۬ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ

جب تم ورلے کنارے پر تھے اور وہ پرلے کنارے پر اور قافلہ تم سے نیچے تھا اور اگر تم (دونوں گروہ) آپس میں قرارداد کرتے تو تم میعاد میں اختلاف کرتے، لیکن (ایسا ہوا) تاکہ اللہ ایک امر کا فیصلہ کردے جو ہو کر رہنا تھا تاکہ جو ہلاک ہوتا ہے وہ کھلی دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ ہوتا ہے وہ

میں الدین کلہ سے مراد سب دین ہیں۔ سب دینوں کا اللہ کے لیے ہونا یہی ہے کہ جو دین کوئی چاہے اختیار کرے، کسی ایک دین پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ عین اس کے مطابق ہے جہاں دوسری جگہ اسلامی جنگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہم ایسی اجازت نہ دیتے تو گرجے اور راہبوں کی کوٹھریاں اور دوسرے مذاہب کے عبادت خانے سب تباہ ہو جاتے۔ گویا وہاں بھی سب مذاہب کی حفاظت اسلامی جنگوں کی غرض بتائی ہے اور یہاں بھی۔

[1231] غنمتم۔ غنم کے اصل معنی الفوز بالشیٔ یعنی کسی چیز کا حاصل کرنا۔ راغب نے لکھا ہے کہ غُنم اصل میں غنم یعنی بکریوں کا حاصل کرنا ہے جو بذریعہ فتح ہو۔ پھر ہر ایک چیز پر جو فتح کر کے دشمنوں سے حاصل کی جائے یہ لفظ بولا گیا ہے اس کے معنی لُوٹ صحیح نہیں۔

تقسیم غنیمت: مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہو۔ اللہ کے لیے ہونے سے مراد یہی ہے کہ وہ فی سبیل اللہ خرچ ہو یعنی بیت المال میں داخل ہو کر مسلمانوں کی ضروریات عامہ پر خرچ ہو اور باقی سپاہیوں وغیرہ میں تقسیم ہو یا ان کی تنخواہوں وغیرہ کے کام آئے۔ پھر ان ضروریات عامہ کی تفصیل کر دی یعنی رسول و قربیٰ اور یتیم اور مسکین اور مسافر کہا گیا ہے کہ ان میں برابر پانچ حصوں میں تقسیم ہو مگر یہ صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ امام مالکؒ کا مذہب یہی ہے کہ اس خمس کے برابر پانچ حصے کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ امام اپنی رائے کے مطابق ان اغراض پر جس طرح چاہے صرف کرے۔ خود رسول اللہ صلعم بقدر کفایت لیکر باقی سب ضروریات عامہ مسلمین پر خرچ کر دیتے تھے۔ جناب پیغمبر خدا کس قدر لیتے تھے یہ اس سے ظاہر ہے کہ خیبر کو فتح کر کے جب آپ واپس ہوئے اور حضرت صفیہؓ سے نکاح کیا تو آپ کی دعوت ولیمہ پر دہی ستو اور کھجوریں وغیرہ تھیں جو لوگ اپنے اپنے گھروں سے لائے تھے اور اس زمانہ میں جب آپ ملک عرب کے بادشاہ تھے آپ کے گھر کا سامان ایک کھجور کی چٹائی اور ایک پانی کی ٹھلیا تھی۔ اور بیبیوں نے جب کچھ اپنی آسودگی کے لیے مال مانگا تو حکم ہوا اگر مال دنیا چاہتی ہو تو آؤ تمہیں رخصت کر دوں اور جب آپکی بیٹی حضرت فاطمہؓ نے خادمہ مانگی کہ چکی پیسنے سے تکلیف ہوتی ہے تو فرمایا کہ نماز کے بعد تینتیس تینتیس مرتبہ سبحان اللہ و الحمد للہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ آپکے گھر میں مہینوں اس طرح گزر جاتے تھے کہ آگ نہ جلتی تھی اور صرف کھجوروں پر گزارہ کرتے تھے اور اسی خمس کے متعلق ایک حدیث میں آپ کے یہ لفظ آتے ہیں مالی الا الخمس والخمس مردود فیکم یعنی پانچواں حصہ جو میرے لیے ہے وہ بھی تمہارے اندر ہی واپس کیا گیا ہے۔

ذوی القربیٰ سے مراد نبی کریم صلعم کے ذوی القربیٰ ہی لیے گئے ہیں مگر اس سے مراد بھی یہ نہیں کہ ان کے اغنیاء کو دیا جائے، بلکہ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا وہ حق صرف اس قدر تھا کہ ان میں سے جو غربا ہوں ان کو دیا جائے اور ان کی بیوہ کا نکاح کر دیا جائے اور کسی کو جس کے پاس خدمت گار نہ ہو خادم دیدیا جائے اور ان کے خاص ذکر کی وجہ یہ ہے کہ بیت المال میں جو صدقات آتے تھے وہ ان پر حرام کیے گئے تھے اور صرف اسی مال میں سے ان کو دینا جائز تھا بلکہ یہاں ذوی القربیٰ سے مراد قرب نصرت لیا گیا ہے نہ قرب قرابت یعنی ان کو دینا ان کی نصرت کی وجہ سے تھا جو وہ دین کی نصرت کرتے تھے نہ ان کی قرابت کی خاطر۔

[1232] یوم الفرقان یوم بدر ہی ہے۔ کیونکہ حق و باطل میں فرق کر دیا جیسا کہ حضرت مجاہد و دیگر مفسرین سے مروی ہے اور جیسا کہ یوم التقی الجمعٰن سے بھی ظاہر ہے۔ اس دن کیا اُتارا تھا۔ وہ ساری باتیں جو حق و باطل میں فرق کا موجب ہوئیں، یعنی نشانات الٰہی، نصرت الٰہی، فرشتے وغیرہ۔

بَيِّنَةٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۴۲﴾

کھلی دلیل سے زندہ ہو اور اللہ یقیناً سننے والا اور جاننے والا ہے ۱۲۳۳

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَ لَوْ
اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ
فِي الْاَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ
عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾

جب اللہ نے تجھے تیرے خواب میں انھیں تھوڑا دکھایا، اور اگر وہ تجھے ان کو بہت دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے اور تم معاملہ میں جھگڑنے لگتے، لیکن اللہ نے بچالیا۔ وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے ۱۲۳۴

وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ
قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ
ع اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾

اور جب تم ایک دوسرے کے سامنے آئے تو تمھاری نظروں میں انھیں تھوڑا کرکے دکھایا اور ان کی آنکھوں میں تم کو تھوڑا کرکے دکھایا تاکہ اللہ ایک کام کا فیصلہ کردے جو ہو کر رہنا تھا اور اللہ کی طرف ہی سب کام لوٹائے جاتے ہیں ۱۲۳۵

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا
وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تمھارا کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو ۱۲۳۶

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا
وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ہمت ہار دوگے اور تمھاری ہوا جاتی رہے گی اور صبر کرو، اللہ

۱۲۳۳ العدوۃ۔ عدو بمعنی تجاوز سے ہے اور عُدوۃ وادی کے کنارے کو کہتے ہیں۔

دنیا۔ ادنیٰ کی تانیث ہے اور قریب سے مراد مدینہ سے قریب ہے۔

قُصوی۔ اقصیٰ کی تانیث ہے اور قصیّ بعید کو کہتے ہیں مکاناً قصیا (مریم۔ ۲۲) اور المسجد الاقصیٰ (بنی اسرائیل۔ ۱) من اقصا المدینۃ (یٰس۔ ۲۰، القصص۔ ۲۰) اور یہاں مراد مدینہ کی جانب سے دور کا کنارہ ہے۔

الرکب۔ قافلہ جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آرہا تھا۔ راکب کی جمع ہے۔

اسفل۔ نیچے یعنی ساحل سمندر کی طرف۔ کیونکہ وہ زمین نیچی ہے۔

اختلفتم فی المیعاد۔ ضمیر مسلمانوں کی طرف ہے۔ یعنی جنگ اگر کسی وعدہ کا نتیجہ ہوتا تو ضرور تھا کہ مسلمان وعدہ پورا کرنے سے رہ جاتے اس لیے کہ کفار کی طاقت کا پتہ ہوتا اور اپنے آپ کو ان کے مقابل میں کمزور خیال کرکے مقابلہ کے لیے نہ نکلتے۔ مگر یہ سب ایک فوری کارروائی تھی اور مسلمانوں کو کفار کی طاقت اور تعداد کا علم نہ تھا۔

مفعولا کے معنی کیا گیا۔ مراد یہ کہ ارادہ الٰہی میں ایسا ضروری ٹھہر چکا تھا کہ ضرور تھا کہ ہو کر رہتا۔ اس میں ان پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے جو جنگ بدر کے متعلق مدت پہلے سے قرآن شریف میں بیان ہو چکی تھیں اور جن میں وعدہ تھا کہ مسلمانوں اور کافروں میں مقابلہ ہو کر کفار مغلوب کیے جائیں گے۔

جنگِ بدر کیوں فرقان کہلائی: اس آیت میں اول دونوں فوجوں کی حالت بتائی ہے۔ مسلمان مدینہ کے قریب کے کنارہ کی طرف تھے اور کفار دور والے کنارہ کی طرف اس میں یہ بتایا ہے کہ مسلمان کفار سے پیچھے میدان جنگ میں نکلے۔ اور مقابلہ کی غرض یہ بتائی کہ وہ پیشگوئیاں پوری ہوں جو پہلے سے ہو چکی تھیں اور نتیجہ اس کا یہ بتایا ہے کہ کوئی ایسی مضبوط دلیل صداقت اسلام پر قائم ہو کہ ہلاک ہونے والے اور مخالفت کرنے والے بھی اس کھلی دلیل کو دیکھ لیں اور زندہ ہونے والی قوم یعنی مسلمان بھی اس کھلی دلیل کو دیکھ لیں۔ گویا بدر کی فتح اس لیے فرقان نہ تھی کہ کفار کو شکست اور مسلمانوں کو فتح ہوئی بلکہ اس لیے کہ عین ان پیشگوئیوں کے مطابق یہ سب کچھ وقوع میں آیا جو مدت پہلے سے شائع شدہ تھیں جن کا علم کفار کو بھی تھا اور مسلمانوں کو بھی۔

۱۲۳۴ نبی کریم صلعم کو رویا میں دشمن تھوڑا دکھایا گیا اس لیے کہ وہ مغلوب ہونے والا تھا۔ اور اس میں حکمت یہ تھی کہ تا مسلمانوں کے دلوں کو قوت رہے۔

۱۲۳۵ یہ دوسرا واقعہ ہے یعنی میدان جنگ میں جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو اس وقت بھی مسلمانوں کو کافر تھوڑے نظر آئے۔ صرف اپنے سے دوچند حالانکہ تھے سہ چند دیکھو ۳۸۴ اس سے بھی ان کے حوصلے بڑھے اور مسلمانوں کا کفار کی نظر میں تھوڑا ہونا تو مطابق واقع تھا۔

۱۲۳۶ یہاں پھر مسلمانوں کو فلاح کے اسباب کی طرف متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جنگ اور مقابلہ کے وقت بھی اللہ کو یاد رکھو کیونکہ اصل غرض صرف جنگ میں فتح حاصل کرنا نہیں بلکہ اصل غرض فلاح ہے یعنی زندگی کے مقصود حقیقی تک پہنچنا۔

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۴۶

صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔۱۲۳۷

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۴۷

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کے دکھاوے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے اور وہ اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ اور اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو وہ کرتے ہیں۔۱۲۳۸

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴۸ ع

اور جب شیطان نے اُن کو اُن کے عمل خوب صورت بنا کر دکھائے اور کہا آج لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور میں تمہارا حامی ہوں۔ پھر جب دونوں گروہ ایک دوسرے کے سامنے آئے اُلٹے پاؤں پھر گیا اور کہا میرا تم سے کچھ واسطہ نہیں، میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے، مَیں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔۱۲۳۹

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۴۹

جب منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے اُن لوگوں کو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے اور جو شخص اللہ پر بھروسا کرتا ہے تو اللہ غالب حکمت والا ہے۔۱۲۴۰

۱۲۳۷ ریحکم۔ ریح کے معنی ہوا ہیں۔ مگر مفردات میں ہے کہ کبھی ریح کا لفظ بطور استعارہ غلبہ پر بولا جاتا ہے اور قتادہ سے روایت ہے کہ ریح سے مراد ریح النصر یعنی مدد کی ہوا ہے (ج) کیونکہ ہوا بھی نصرت کے خاص سامانوں میں سے ہے۔ چنانچہ جنگ احزاب میں ایک ہوا نے ہی دشمن کے ٹڈی دل لشکر کو پراگندہ کر دیا اور ان کے قدم اُکھیڑ دیئے بتایا ہے کہ اتفاق اور مشکلات کے مقابلہ میں ثابت قدمی یہ دو بڑے کامیابی کے راز ہیں۔

۱۲۳۸ بطر بَطَر کے معنی نشاط ہیں یا متکبرانہ روش (ل) اور بَطَر اور طَرَب قریب قریب ہیں اور وہ خفت یعنی ہلکا پن ہے جو خوشی سے پیدا ہوتا ہے (غ) یا وہ کسی چیز سے کراہیت کرنا ہے حالانکہ وہ کراہیت کی مستحق نہ ہو یا نعمت کے وقت حد سے نکل جانا اور سرکشی کا طریق اختیار کرنا بطرت معیشتہا (القصص۔ ۵۸) میں اصل ترکیب ہے بطرت فی معیشتہا (ل)

ابوجہل اور اس کے ساتھی..... مکّہ سے نکلے..... تو بڑے ساز و سامان سے نکلے اور ان کو اپنی قوت پر بڑا فخر تھا۔ اور ان کا منشاء قبائل عرب پر بھی اپنا رعب بٹھانا تھا کہ ہماری طاقت بڑی ہے۔ مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ تم فاتح ہو کر کبھی اس غرض کے لیے جنگ نہ کرنا اور نہ اپنی قوت پر ناز کرنا۔

۱۲۳۹ جار ہمسائے کو کہتے ہیں اور جوار یا مُجَاوَرَۃ کے معنی دوسرے کی حفاظت میں آنا یا حفاظت میں لینا ہیں اور یہاں اسی معنی میں جار ہے اور جار عن الطریق کے معنی ہیں رستہ سے ہٹ گیا جو بلحاظ معنی قرب ہے اور اسی سے جَوْر بمعنی عدول یا ظلم ہے (غ)

قریش اور بنی کنانہ میں جنگ رہا کرتی تھی اس لیے جب قریش نے مدینہ پر حملہ کیا تو ان کو یہ بھی خیال تھا کہ کہیں بنی کنانہ جنگ پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ بنی کنانہ کا سردار سراقہ بن مالک تھا اس نے ابوجہل کو یقین دلایا کہ تمہاری طاقت بڑی ہے اور ہم تمہارے ساتھ جنگ نہ کریں گے بلکہ ہم تو تمہارے حمایتی ہیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ شیطان سراقہ بن مالک کنانی کی صورت اختیار کر کے آیا تھا لیکن اگر سراقہ ہی آیا ہو اور اسی کو شیطان کہا ہو جیسا کہ کئی جگہ پر سردارانِ کفار کو شیطان یا شیاطین کہا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ جب قریش کے پاؤں اکھڑتے دیکھے تو بھاگ گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب محض شیطان کی وسوسہ اندازی ہو نہ کوئی واقعی گفتگو۔

۱۲۴۰ اس رکوع میں اصل ذکر کفار کی بدعہدی کا اور بار بار عہد شکنی کا ہے اور فرعون کے ساتھ مثال دینے کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ وہ بھی اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ بدعہدی کرتا تھا فلمّا کشفنا عنہم الرجز الٰی اجل ہم بالغوہ اذا ہم ینکثون (الاعراف۔ ۱۳۵) ایسی بدعہدیاں نبی کریمؐ کے آخری زمانہ میں بھی بہت سی وقوع میں آئیں جیسا کہ سورۂ براۃ کے شروع میں ذکر ہے مگر ابتدا میں بھی حالت ایسی ہی تھی اور آنحضرت صلعم نے کفار قریش کی دستبرد سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے کئی ایک اقوام کے ساتھ جو حالت کفر پر تھیں عہد نامے کر رکھے تھے۔ مگر جب یہ لوگ ذرا مسلمانوں میں کمزوری دیکھتے تو فوراً عہد شکنی کرتے۔ کیونکہ ان کا اصول مہذب یورپ کے اصول کی طرح یہ تھا کہ کمزور قوم کے ساتھ ایفائے عہد کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا۟ ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَٰرَهُمْ وَذُوقُوا۟ عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝٥٠

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، ان کے مونہوں اور پیٹھوں کو مارتے ہیں اور جلنے کا عذاب چکھو۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۝٥١

یہ اس کی سزا ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور کہ اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَفَرُوا۟ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَأَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝٥٢

فرعون کے لوگوں کی طرح اور جو ان سے پہلے ہوئے انھوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا سو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑا اللہ طاقتور سزا دینے میں سخت ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا۟ مَا بِأَنفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝٥٣

یہ اس لیے کہ اللہ کبھی کسی نعمت کو نہیں بدلتا، جو اس نے کسی قوم پر کی ہو، جب تک کہ وہ خود اپنی حالتوں کو نہ بدلیں اور کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ [۱۲۴۱]

كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا۟ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَأَهْلَكْنٰهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوا۟ ظٰلِمِينَ ۝٥٤

فرعون کے لوگوں کی طرح اور جو اُن سے پہلے ہوئے انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کو جھٹلایا، سو ہم نے اُن کو اُن کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور سب ظالم تھے۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِندَ اللّٰهِ الَّذِينَ كَفَرُوا۟ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝٥٥

اللہ کے نزدیک بدترین جاندار وہ ہیں جو کافر ہوئے، پھر وہ ایمان لاتے ہی نہیں [۱۲۴۲]

الَّذِينَ عٰهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِى كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ۝٥٦

وہ جن سے تو عہد کرتا ہے پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں، اور وہ (خلاف ورزی عہد سے) نہیں بچتے [۱۲۴۳]

مسلمانوں کی کمزوری کو دیکھ کر اور بالمقابل چاروں طرف دشمنوں کو دیکھ کر منافق لوگ اور کمزور دل یہ کہتے تھے کہ مسلمان ان وعدوں پر بھروسہ کر کے اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں جو محمد رسول اللہ صلعم نے ان کو دے رکھے ہیں اس کا جواب دیا ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرنے والا دھوکا نہیں کھاتا یہی لوگ غالب ہوں گے کیونکہ اللہ غالب ہے۔

۱۲۴۱ قوم سے نعمت کب چھنتی ہے: یعنی اللہ تعالیٰ باوجود ان کے کفر کے بھی ان سے یہ نعمتیں نہ چھینتا اگر یہ اپنی حالتوں کو خراب نہ کر ڈالتے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎
اے کریمی کہ از خزانۂ غیب ٭ گبر و ترسا وظیفہ خورداری ٭ دوستاں را کجا کنی محروم ٭ تو کہ بر دشمناں نظرداری ٭ ہاں جب قوم سے حکومت کی اہلیت چھن جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو اُٹھا کر دوسری کو اس کی جگہ لے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی دی ہوئی نعمتوں کو نہیں لیتا جب تک کہ انسان خود ہی ان کو نہیں پھینکتا۔ آج مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی سلطنت دولت کی نعمتیں تب ہی گئیں جب انہوں نے اپنے حالات کو بدل ڈالا۔ پس مقدم ضرورت اپنی حالت میں اصلاح کرنے کی ہے اور اسی کی طرف سے مسلمان غافل ہیں۔

۱۲۴۲ یعنی ایسے کافر جنہوں نے یہ ٹھان لیا ہے کہ ایمان کسی صورت میں لائینگے ہی نہیں۔ اس لیے وہ حق کی مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں جیسا کہ ان کی عہد شکنی سے ظاہر ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ذکر ہے۔

۱۲۴۳ یہ حالت بھی اس وقت عام تھی۔ نبی کریم صلعم چاہتے تھے کہ ان قوموں کے ساتھ جنگ نہ ہو اس لیے آپ نے جہاں تک ہو سکتا تھا معاہدے کر لیے تھے مگر انفائے

فَاِمَّا تَثۡقَفَنَّهُمۡ فِی الۡحَرۡبِ فَشَرِّدۡ بِهِمۡ
مَّنۡ خَلۡفَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ یَذَّكَّرُوۡنَ ﴿۵۷﴾
وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَةً فَانۡۢبِذۡ
ع اِلَیۡهِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡخَآئِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾
وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا سَبَقُوۡا ؕ
اِنَّهُمۡ لَا یُعۡجِزُوۡنَ ﴿۵۹﴾
وَ اَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ
وَّ مِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ
اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمۡ وَ اٰخَرِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ ۚ
لَا تَعۡلَمُوۡنَهُمۡ ۚ اَللّٰهُ یَعۡلَمُهُمۡ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا
مِنۡ شَیۡءٍ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیۡكُمۡ

سو اگر تو ان کو جنگ میں پائے تو ان (کی عبرتناک سزا) سے اُن کو منتشر کر دے جو اُن کے پیچھے ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۔۱۲۴۴
اور اگر تجھے کسی قوم سے دغا بازی کا خوف ہو تو ان (کا عہد) برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے اللہ دغا بازوں سے محبت نہیں کرتا۔۱۲۴۵
اور جو کافر ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ آگے نکل گئے وہ عاجز نہیں کر سکتے ۔۱۲۴۶
اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو، تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو اور ان کے سوائے اوروں کو (بھی) جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور جو کوئی چیز تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تم کو پوری واپس دی جائے گی اور

عہد اُن اقوام میں بہت کم تھا، حتیٰ کہ یہودی جو اہل کتاب تھے وہ بھی ایفائے عہد کی پرواہ کرتے تھے اور بالخصوص مسلمانوں کی کمزوری ان کو اور بھی زیادہ عہد شکنی کی طرف مائل کرتی تھی۔ اتقاء سے مراد یہاں خلاف ورزی عہد سے بچنا ہی ہے۔ مفسرین نے اس آیت کے نیچے بنو قریظہ یا بعض اور قبائل یہود کا ذکر لکھا ہے۔ مگر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے شاذ و نادر کے جن اقوام نے آنحضرت صلعم سے معاہدات کیے تھے عموماً عہد شکنی ہی کرتی رہیں۔

۱۲۴۴ شَرِّد۔ شَرَدَ کے معنی ہیں بھاگ گیا (غ) اس لیے طرید۔ شرید اس شخص کو کہتے ہیں جو اکیلا رہ گیا ہو۔ اور تشرید کے معنی نکال دینا یا پراگندہ اور منتشر کر دینا ہیں۔ مفردات میں ہے کہ شَرَّدت بہ کے معنی ہیں اس کے ساتھ ایسا فعل کیا جس نے اس کے غیر کو بھگا دیا یعنی ایسی عبرتناک سزا جو دوسرے کو ایسا فعل کرنے سے روک دے۔

مراد یہ ہے کہ جو لوگ بار بار بدعہدیاں کرتے اور امن اٹھا دیتے ہیں ان کو اگر واقعی مسلمانوں کے خلاف جنگ میں پائے جائیں تو عبرتناک سزا دینی چاہیے تاکہ دوسرے لوگ اس قسم کی بدعہدی سے باز آئیں۔

۱۲۴۵ تخافن۔ خوف۔ مکروہ امر کی توقع ہے جو ظنی یا معلوم علامات سے حاصل ہو جس طرح رجاء اور طمع محبوب امر کی توقع ہے جو ظنی یا معلوم علامات سے حاصل ہو۔ اور ان خفتم شقاق بینهما (النساء۔ ۳۵) میں خفتم (یا تم ڈرو) کے معنی کیے گئے ہیں عرفتم تم پہچان لو گویا اصل مطلب یہ ہے کہ حالات کے جاننے کی وجہ سے تمہیں خوف ہو (غ) یہی معنی تخافن کے یہاں ہیں یعنی یہ کہ اگر حالات کی واقفیت کی وجہ سے تمہیں ڈر ہو کہ یہ قوم خیانت کرے گی۔

علیٰ سواء۔ برابری کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ ان کو مشکلات کی حالت میں پا کر چھوڑ دیا جائے یا عہد کو اس صورت میں توڑ دیا جائے کہ وہ سمجھ رہے ہوں کہ عہد باقی ہے۔ فریقین کو مساوی حالت میں رکھ کر ایسی صورت میں معاہدہ سے دست برداری کر لی جائے۔ دوسرے فریق کو نقصان پہنچانا مدنظر نہ ہو۔

یہ اسلام کی تعلیم کا کمال ہے کہ ایک خائن قوم کے ساتھ بھی خیانت کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ فرمایا کہ اگر کسی قوم کی خیانت کا علم ہو جائے تو ان کو برابری کا موقع دے کر معاہدہ سے دست برداری کر لی جائے۔

۱۲۴۶ کفر اسلام پر غالب نہیں آ سکتا۔ یعجزون کا مفعول ذکر نہیں کیا، لیکن اگلی آیت میں مسلمانوں کو خطاب کر کے اور ان کو دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار رہنے کا حکم دے کر صاف بتا دیا کہ یہاں بھی مسلمانوں کو عاجز نہ کر سکنا ہی مراد ہے۔ آج جب مسلمان چاروں طرف سے مایوس ہیں اور بظاہر دنیا پر کفر کا غلبہ ہو رہا ہے۔ یہ آیت کس قدر مایوس دلوں میں امید کی روشنی پیدا کر سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو چھوڑ کر اپنے دلوں کو مایوسی کا شکار کر دیا ہے۔ اگر قرآن کریم کے یہ وعدے جو ایک مرتبہ موجودہ حالت سے بڑھ کر مایوس کن حالات کے باوجود پورے ہو چکے ہیں ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے تو زندہ ایمان ان سے ایثار کے وہ کارہائے نمایاں کرواتا جو دنوں میں ان کی حالت بدل ڈالتے۔ خدا کی آواز اب بھی وہی یقین ہم کو دلاتی ہے۔ چنانچہ اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو آج سے کوئی چالیس سال پیشتر یہ الہام ہوا: "بخرام کہ وقتِ تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منارِ بلند تر محکم افتاد"۔ مایوسی مسلمانوں کیلئے نہیں نہ اسلام کے لیے مغلوبیت ہے۔ بلکہ جہاں اور جب لوگوں نے خیال کیا کہ اسلام مغلوب ہوا وہی اس کے غلبہ کا وقت تھا۔

وَ اَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۰﴾

تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔۱۲۴۷

وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَہَا وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۶۱﴾

اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی اس کی طرف جھک جا، اور اللہ پر بھروسہ رکھ، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔۱۲۴۸

وَ اِنۡ یُّرِیۡدُوۡۤا اَنۡ یَّخۡدَعُوۡکَ فَاِنَّ حَسۡبَکَ اللّٰہُ ؕ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۲﴾

اور اگر ان کا ارادہ ہو کہ تجھے دھوکا دیں، تو اللہ تجھے بس ہو ہی ہے، جس نے اپنی نصرت کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ تجھے قوت دی۔

وَ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۶۳﴾

اور اس نے ان کے دلوں میں الفت ڈالی اگر تو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب خرچ کر دیتا تو ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتا لیکن اللہ نے ان میں اُلفت ڈال دی وہ غالب حکمت والا ہے۔۱۲۴۹

ع۱۲۴۷ قوۃ۔ وہ چیز جو موجب تقویت ہو۔ مثلاً جنگ میں طرح طرح کے ہتھیار۔ جیسا کہ ابن عباسؓ نے لکھا ہے۔ اور قلعے۔ جیسا کہ عکرمہ نے کہا ہے اور رمی یعنی تیر (یا بندوق یا توپ) کا چلانا، جو ایک حدیث میں مروی ہے اور رمی کی تعریف احادیث میں آئی ہے اور اس کے سیکھنے کا حکم بھی احادیث میں پایا جاتا ہے۔

رباط الخیل۔ ربط باندھنا اور رباط اور مُرابطۃ کے معنی ہیں دشمن کی سرحد پر لگے رہنا۔ گویا ہر ایک نے اپنے گھوڑے تیار باندھے ہوئے ہیں اور محض حفاظت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ پر بھی رباط بولا گیا ہے (غ) پس جس طرح جہاد پر قائم رہنے اور تیار رہنے پر رباط بولا جاتا ہے اسی طرح طہارت اور نماز پر قائم رہنے پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ رباط کے ساتھ خیل کا لفظ لانے میں مزید مستعدی پر دلالت ہے۔

اٰخرین من دونہم۔ یعنی ان دشمنوں کے سوائے جو اب تمہارے مقابل پر ہیں کچھ اور دشمن بھی ہیں جن کو تم نہیں جانتے کسی نے کہا یہود بنو قریظہ۔ کسی نے منافق۔ کسی نے اہل فارس۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد جن ہیں۔ میرے نزدیک ایک معنی سے یہ آخری قول درست ہے۔ کیونکہ جنّ وہ ہیں جو نظروں سے مخفی ہوں پس اسلام کے وہ دشمن جو ابھی ظاہر نہ ہوئے تھے اور پھر وہ دشمن جن کا حملہ جنوں کی طرح وسوسہ اندازی سے ہو۔ جیسے آج کل کے عیسائی مشنری کہ ان کا حملہ اسلام پر کھلا نہیں بلکہ جن کی طرح مخفی حملہ ہے اور طرح طرح کے اعتراض کر کے وسوسہ اندازی کرتے ہیں انہی کی طرف یہاں اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

اس آیت میں دشمن کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو دو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ایک قوت یعنی دشمن کی مدافعت کا سامان مثلاً جنگوں میں آلات اور قلعے اور فنون جنگ سے واقفیت اور گولہ بارود۔ اور جہاد قلمی میں وہ علمی سامان جس سے دشمن کے اعتراضات کا مقابلہ ہو۔ اور دوسرے مستعد رہنا جس کو یہاں رباط الخیل کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دشمن کو اتنا موقعہ نہیں دینا چاہیئے کہ وہ سرحد سے آگے نکل سکے بلکہ اس کا مقابلہ سرحد پر کرنے کے لیے پورا تیار رہنا چاہیئے اگر ظاہری رنگ میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کی سلطنتوں کی تباہی کا موجب رباط الخیل سے غفلت ہوئی ہے نہ صرف یہی کہ مسلمان دشمن کے مقابلہ کے لیے سرحد پر تیار نہیں رہے بلکہ انہوں نے دشمنوں کو اپنے ملکوں میں گھس جانے کا موقعہ خود اپنے ہاتھ سے دیا اور دشمنوں نے اندر داخل ہو کر مسلمانوں کی جڑیں کاٹ دیں۔ اب دوسرے پہلو یعنی جہاد قلمی میں مسلمان اسی طرح غافل ہیں۔ دشمن طرح طرح کے سامانوں سے میگزینوں اور رسالوں اور کتابوں اور لکچروں اور تقریروں سے اور مشن قائم کر کے اسلام پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ مسلمان خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور دشمن کے مقابلہ کے لیے کوئی سامان نہیں نہ کوئی تیاری ہے۔ تیاری کا فائدہ بتایا کہ دشمن مرعوب رہے گا اور حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے گا بلکہ صلح کی طرف مائل ہوگا۔ اسی لیے اگلی آیت میں صلح کا ذکر ہے۔ آج بعض ناواقف لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ یورپ میں تبلیغ اسلام کی ضرورت نہیں، جب خود گھر میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایک ہی سامان سے دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں اور یورپ یعنی تثلیث کے مرکز میں توحید کی آواز کا بلند ہونا رباط الخیل ہے جس سے دشمن پر رعب بیٹھتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اپنا شکار سمجھے بیٹھے ہیں۔ مسلمان اگر ہمت کر کے یہ دکھا دیں کہ ان کے نزدیک خود عیسائی ان کا شکار ہیں تو دشمن کی آدھی سے زیادہ قوت ٹوٹ جاتی ہے۔

ع۱۲۴۸ اسلام صلح کو مقدم کرتا ہے: کیا یہ اس مذہب کی تعلیم ہو سکتی ہے جو بجبر اپنے آپ کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہو سخت ترین دشمنوں کا ذکر کر کے انکی غداری کا ذکر کر کے ان کے مقابلہ میں مستعد رہنے کا حکم دیکر پھر بھی فرمایا کہ اصل غرض جنگ نہیں اگر صلح کی طرف دشمن مائل ہو تو تم بھی صلح کر لو بلکہ اس سے اگلی آیت میں فرمایا کہ اگر میلان صلح میں غداری کا ارادہ بھی ان کا پنہاں ہو تو بھی تم صلح کی طرف ہی جھکو، رہی غداری تو اس کے مضرات سے اللہ تم کو بچا دیگا اس زمانہ میں مسلمان بادشاہوں کو یہ زرین اصول اور بھی زیادہ مدنظر رکھنا چاہیئے تھا ایک طرف اپنی طاقت اور قوت کو مضبوط کریں اور اپنی پوری تیاری دکھائیں تو دوسری طرف حتی الوسع جنگ سے بچیں۔

ع۱۲۴۹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کے بڑے پہلو کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ مسلمانوں میں باہمی الفت پیدا کر دی۔ بلاشبہ کسی قوم کے دلوں میں الفت و محبت کا پیدا ہو جانا اس کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ دلوں میں محبت ہو تو ایک دوسرے پر حسن ظن ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے کام کی قدر ہوتی ہے۔ ذاتی

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾

اے نبی! اللہ تیرے لیے بس ہے اور (اس کے لیے) جو مومنوں میں سے تیرا پیرو ہو ع۱۲۵۰

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾

اے نبی! مومنوں کو جنگ کی رغبت دے ع۱۲۵۱۔ اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں، تو دوسو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں، تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آئیں گے، یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ سے کام نہیں لیتے ع۱۲۵۲

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ

اس وقت اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کر دیا اور وہ جانتا ہے کہ تم میں کمزوری ہے، سو اگر تم میں سے ایک سَو صبر کرنے والے ہوں، دوسو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں

اغراض درمیان میں نہیں آتیں۔ آج مسلمانوں کا جو کام دیکھو اس کے خلاف نظر آتا ہے۔ ذاتی رنجشیں اور کدورتیں ہیں۔ بدظنی ہے۔ ایک دوسرے کی تحقیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کام میں برکت نہیں۔

لو انفقت میں بتایا کہ وہ ملک جس کی قوم قوم کے خلاف اور قبیلہ قبیلہ کے خلاف شب و روز برسرِ پیکار رہتا تھا، جن کی دشمنی کی آگ قریب تھا کہ انھیں بھسم کر دیتی۔ جیسا کہ فرمایا کنتم علٰی شفا حفرۃ من النار۔ وہ آگ یہی باہم دشمنی کی آگ تھی۔ اس قسم کی صدیوں کی خطرناک دشمن قوموں کو ملا کر ایک کر دینا ساری دنیا کے خزانے صرف کرنے سے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ پس وہ مذہب جس نے ایسی دشمن اقوام میں بھی الفت پیدا کر دی وہ آج بھی دنیا کی سخت ترین دشمن قوموں میں محبت پیدا کر سکتا ہے۔ کاش مسلمان آپس میں محبت کا نمونہ دنیا کی قوموں کو دکھاتے تو دیکھتے کہ قومیں اس طرح اسلام پر فدا ہوتی ہیں جیسے پروانے چراغ پر۔

ع۱۲۵۰ ظاہری سامانوں کی ضرورت بتا کر اور یہاں دشمن کے مقابلہ کی تیاری کو ضروری قرار دیکر فرمایا کہ یہ سب کچھ کر کے ان چیزوں پر بھروسہ نہ کرو۔ سامان سب کرو مگر بھروسہ اللہ کی ذات پر ہی رکھو۔ نبی کو اگر یہ واحدانہ تعلیم دی تو آپ کے مومن متبعین کو بھی یہی تعلیم دی۔ اور نبی کو اگر ان الفاظ میں بشارت دی کہ دشمن اگر قوی ہے تو تیرا نگہبان قوی تر ہے۔ تو یہی بشارت آج ہمارے لیے بھی ہے بشرطیکہ ہم متبع بنیں یہی اسلامی توکل ہے جسے لوگوں نے غلطی سے یوں سمجھا ہوا ہے کہ وہ کچھ نہ کرنے کا نام ہے حالانکہ یہاں زبردست سامانوں کی تیاری کی تعلیم کے بعد توکل کے لیے کہا۔

ع۱۲۵۱ حَرِض۔ حَرَض اس کو کہتے ہیں جس میں کچھ بھلائی نہ ہو، جو ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہو۔ حتّٰی تکون حرضا (یوسف ۱۲۔ ۸۵) اور تحریض کے معنی ہیں کسی چیز کو بہت اچھا کر کے دکھانا اس پر ترغیب دینے کے لیے، گویا تحریض حرض کا ازالہ ہے جیسے تمریض میں مرض کا ازالہ (غ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ مومنوں کو جنگ کی ترغیب دو۔ اور لفظ حَرِض جو یہاں استعمال فرمایا ہے وہ اس غرض سے ہے کہ تا معلوم ہو کہ جنگ میں حَرَض یعنی ہلاکت نہیں۔ جیسا کہ ظاہر نظر سے معلوم ہوتا تھا، یعنی جنگ میں ہلاکت نظر آتی تھی اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جنگ کو پسند نہ کرتے تھے دوسرا یہ امر قابل غور ہے کہ القتال سے مراد کیا ساری دنیا کے ساتھ جنگ ہے؟ نہیں بلکہ انہی دشمنوں کے مقابل پر جن کا ذکر اوپر ہو رہا ہے اور اسی قتال پر جس کی اجازت ہو چکی ہے اور وہ قتال کیا ہے قاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین یقاتلونکم جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں صرف ان کے ساتھ جنگ کرو۔ وہ بھی اللہ کی راہ میں نہ انتقام کے لیے نہ بدلہ لینے کے لیے۔ ہاں دین اسلام کی حفاظت کے لیے۔

ع۱۲۵۲ مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابل بہت ہی تھوڑی تھی پس ان کی تسلّی کے لیے فرمایا کہ تم صابر بنو۔ یعنی مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرو تو تم میں سے ایک آدمی دس پر غالب آئے گا۔ اس کی وجہ بتائی کہ تمہارے دشمن ایک ایسی قوم ہیں کہ وہ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ گویا اسلام مسلمانوں کے اندر وہ بہادری پیدا کرنا نہیں چاہتا، جو اندھا دھند کام کرے، بلکہ ایسی بہادری پیدا کرتا ہے جو فقاہت کا نتیجہ ہو۔ یعنی انسان سوچ سمجھ کر کہ اس کی زندگی کی غرض یہ ہے پھر اس اصل غرض پر اپنی زندگی کو لگائے۔ جس نے اپنی زندگی کی غرض کو نہیں سمجھا وہ اگر ایک وقت جوش کے ماتحت اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتا بھی ہے تو پھر جان بچانے کا خیال اس کی ہمت کو کمزور بھی کر دیتا ہے۔ یہی رنگ علمی پہلو میں بھی ہے بلکہ شاید لایفقھون اسی کی طرف اشارہ کرنے کو فرمایا۔ دس عیسائی مشنری ایک مسلمان مبلغ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے کہ ان کے عقاید کی بنیاد علم اور فقاہت پر نہیں۔

يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٦٦﴾
مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى
يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ
الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾

اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے اور اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔^١٢٥٣^
ایک نبی کے لیے شایاں نہیں کہ اس کے (قبضہ میں) قیدی ہوں جب
تک کہ وہ زمین میں جنگ کرکے غالب نہ آئے۔ تم دنیا کا مال چاہتے تھے
اور اللہ (تمھارے لیے) آخرت کو چاہتا ہے۔ اور اللہ غالب
حکمت والا ہے^١٢٥٤^

١٢٥٣ع اس آیت کو پہلی کی ناسخ سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہاں کوئی حکم ہی نہیں جو منسوخ ہو سکتا ہو۔ بلکہ صرف ایک خبر ہے ہاں ان دونوں خبروں میں کہ پہلی جگہ فرمایا کہ مسلمان دہ چند تعداد پر غالب آئیں گے اور یہاں فرمایا کہ دو چند تعداد پر غالب آئیں گے فرق نظر آتا ہے جس کو الآن کا لفظ ہی حل کرنے کے لیے کافی ہے یعنی ان دونوں آیتوں میں دو مختلف حالات کا ذکر کیا ہے۔ ایک مسلمانوں کی حالت نزول آیت کے وقت جس کو فیکم ضعفا سے تعبیر کیا ہے یعنی مسلمانوں میں اس وقت کمزوری ہے اور یہ زمانہ جنگ بدر کا ہے اس وقت دشمن کے مقابلہ پر مسلمانوں میں کئی قسم کی کمزوری تھی اول یہ کہ طاقت کے لحاظ سے وہ سب جنگ کے قابل نہ تھے ان میں بوڑھے اور بچے بھی تھے۔ جو میدان جنگ میں جانا پڑتا تھا ان میں کمزور و ناتوان بھی تھے اور تعداد اس قدر تھوڑی تھی کہ بلحاظ جنگی قابلیت کے میدان جنگ میں نکلنا پڑتا تھا۔ دوسرے یہ لوگ فنون سپاہگری سے واقف نہ تھے ان کو کسی جنگ کے لیے تیار ہی نہ کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ جنگ صرف دشمن کی زبردستی کی وجہ سے وقوع میں آئی۔ تیسرے یہ کہ آلات حرب ان کے پاس کافی نہ تھے کیونکہ جنگ یک بیک سر پر آپڑی۔ چوتھے یہ کہ دیگر ضروریات جنگ مثلاً گھوڑے باربرداری کا سامان بھی موجود نہ تھا اس لیے فرمایا کہ اس وقت تو تم ابھی جنگ کے لیے تیار ہی نہیں تم میں طرح طرح کی کمزوریاں ہیں باوجود ان کمزوریوں کے اگر تم صبر اختیار کرو تو پھر بھی اس قدر نصرت تم کو دی جائے گی کہ تم دو چند تعداد پر غالب آؤ گے اور پہلی آیت میں جہاں دہ چند پر غالب آنے کی خبر دی ہے اس میں اس حالت کا ذکر ہے جب مسلمان ہر طرح سے مسلح اور تیار ہوں جیسا کہ اس سے پہلے رکوع میں اس کا مفصل ذکر بھی کیا ہے کہ تم کو ہر ایک قسم کے آلات حرب اور سامان جنگ تیار کرنا چاہیئے اور فنون جنگ سے واقفیت حاصل کرنا چاہیئے جب تمہارے پاس یہ سب سامان ہوں تو تم دہ چند تعداد پر غالب آؤ گے۔ ہر حالت میں یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صبر کی شرط ساتھ ہے۔ اور اس آیت کے آخر پر بتا بھی دیا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یعنی نصرت الٰہی صبر کرنے والوں پر نازل ہوتی ہے۔

١٢٥٤ع اَسْرٰی۔ اسیر کی جمع ہے۔

یثخن۔ ثَخُنَ کے معنی موٹا یا سخت ہوا۔ اور اَثْخَنَ کے معنی غَلَبَ وَقَھَرَ جیسا کہ ابن الاعرابی کا قول لسان العرب میں منقول ہے یعنی غالب ہوا۔ ہاں اثخان فی القتل کے معنی بہت قتل کرنا ہیں اور عام طور پر کسی شے میں اثخان اس میں مبالغہ اور اکثار کو کہتے ہیں مگر مطلق اثخان کے معنی جیسا کہ دو جگہ یہ لفظ قرآن شریف میں آیا ہے غالب آنا ہی ہیں نہ خونریزی کرنا چنانچہ دوسری جگہ ہے حتّٰی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق (محمد ۴۷: ۴) جہاں اثخان کے بعد فرمایا کہ ان کو قید کرلو۔ اور قید وہی کیے جا سکتے ہیں جن پر غلبہ حاصل ہوا ہو نہ وہ جو قتل کردیئے گئے ہوں۔

امام احمد اور ترمذی وغیرہما کی روایات سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے یہ رائے دی کہ فدیہ لیکر ان کو چھوڑ دیا جائے اور حضرت عمرؓ نے یہ کہ مسلمان ابھی کمزور ہیں۔ قیدیوں کو قتل کردیا جائے۔ اور رسول اللہ صلعم نے حضرت ابوبکرؓ کو فرمایا کہ تمہاری مثال حضرت ابراہیمؑ کی مثال ہے کہ انہوں نے کہا تھا ومن عصانی فانک غفور رحیم اگر کوئی میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے یا حضرت عیسٰیؑ کی کہ انہوں نے کہا وان تغفر لھم فانک انت العزیز الحکیم اور حضرت عمرؓ کو فرمایا کہ تیری مثال نوحؑ کی مثال ہے۔ جنہوں نے کہا لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا۔ یا حضرت موسٰیؑ کی جنہوں نے کہا ربنا اطمس علی اموالھم۔ اور عمل آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے پر کیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن حضرت ابن عباس سے اس قدر مزید روایت ہے کہ اگلے دن حضرت ابوبکرؓ اور نبی کریم صلعم رو رہے تھے۔ تو حضرت عمرؓ نے وجہ دریافت کی تو اس آیت کا نزول وجہ بتائی گئی یعنی یہ کہ فدیہ لینا خلاف منشائے حکم الٰہی تھا۔ روایت کے اس حصہ کے غلط ہونے پر چونکہ قرآن کریم صراحت سے گواہ ہے اس لیے یہ کسی طرح قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مذیل کی وجوہات بتاتی ہیں کہ اسیران بدر کو فدیہ پر چھوڑنا عین حکم قرآن کے مطابق تھا۔

اوّل۔ اگلے رکوع کی پہلی آیت یوں ہے یاایھا النبی قل لمن فی اید یکم من الاسرٰی ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرا یؤتکم خیرا مما اخذ منکم اے نبی ان قیدیوں کو جو تمہارے ہاتھوں میں ہیں کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی جانتا ہے تو تم کو اس سے بہتر دیدیگا جو تم سے لیا گیا۔ یعنی جو فدیہ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر اللہ تعالیٰ تم کو دیدیگا۔ اگر قتل کرنا ضروری تھا تو ان کو یہ تسلی کسی طرح نہ دی جا سکتی تھی یہاں تو فدیہ کی رقم سے بھی بہتر کا وعدہ دیا جاتا ہے پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس آیت کے نزول کے وقت تک قیدی چھوڑے تو گئے نہیں تھے پس اگر رسول اللہ صلعم کو منشائے الٰہی یہ معلوم ہوتا کہ انھیں قتل کرنا ضروری ہے تو اس وقت قتل کرنے میں کون مانع تھا۔

دوم۔ یہ قیدی تو عین اس حکم کے مطابق لیے گئے تھے کہ دشمن پر غالب آکر قیدی پکڑ سکتے ہو بغیر غالب آنے کے نہیں اور جنگ بدر میں دشمن پر غلبہ مل چکا تھا اور

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾

اگر اللہ کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا، تو تمکو اس بارے میں جو تم کرنے لگے تھے بھاری عذاب پہنچکر رہتا ۱۲۵۵

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾ ع

اس سے جو تم نے فتح پاکر حاصل کیا ہے حلال طیب کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۲۵۶

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۰﴾

اے نبی ان کو جو تیرے ہاتھ میں قیدیوں میں سے ہیں کہدے، اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی جانے گا تو تم کو اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۲۵۷

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ

اور اگر وہ تجھ سے دغا کرنا چاہیں تو پہلے اللہ سے دغا کر چکے ہیں

باقاعدہ فوج سے جنگ ہو چکی تھی۔

سوم۔ دوسری جگہ صراحت سے یہ حکم قرآن شریف میں موجود ہے کہ جب دشمن پر غالب آکر قیدی پکڑو تو یا ان کو فدیہ لیکر چھوڑ دو یا بطور احسان۔ قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم قرآن شریف میں کہیں نہیں چنانچہ سورۂ محمدؐ ۴ میں فرمایا فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء یعنی جب کافروں سے تمہاری جنگ ہو تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب ان پر غالب آجاؤ تو ان کو قید کرلو۔ پھر اس کے بعد یا احسان کے طور پر چھوڑ دو یا فدیہ لیکر۔

چہارم۔ نبی کریم صلعم نے بعض جنگوں میں ہزاروں کی تعداد میں قیدی پکڑے لیکن کبھی ان کو قتل نہیں کیا (یہود کا معاملہ الگ ہے اس لیے کہ ان کے اپنے منتخب کردہ ثالث کا فیصلہ تھا اور ان کی شریعت کے مطابق تھا) بلکہ جنگ بدر میں تو فدیہ لیا باقی جنگوں میں عموماً بطور احسان ہی آزاد کیا جس سے معلوم ہوا کہ یہی عملدرآمد مطابق قرآن کریم تھا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ قرآن میں تو یہ حکم ہو کہ قیدیوں کو قتل کردو اور نبی کریم صلعم کا عمل اس کے خلاف ہو۔ مگر یہ محض ایک خیال ہے کہ قرآن میں کوئی ایسا حکم ہے نہ یہاں کوئی ایسا حکم ہے نہ کہیں دوسری جگہ قرآن شریف میں کوئی ایسا حکم ہے بلکہ اس کے خلاف آزاد کرنے کا حکم ہے۔

پنجم۔ فدیہ کے فیصلہ کی تعمیل ہونے میں بہت دن لگے یعنی جب تک مکہ سے زر فدیہ آئے اس وقت تک قیدی قبضہ میں تھے جب نبی کریم صلعم کو اپنی غلطی کی اطلاع مل گئی تھی تو اس کی اصلاح کیوں نہ کی؟ پھر بعض قیدیوں سے فدیہ بجائے روپے کے یہ لیا گیا کہ وہ کتابت سکھا دیں۔ یہ ایک دن کا کام نہ تھا بلکہ کئی مہینے اس پر لگے ہونگے۔

ششم۔ آیت ۶۹ میں فدیہ کو مما غنمتم میں داخل کر کے پھر اس کو صریح طور پر حلال ٹھہرایا ہے۔ غرض یہ بات بالکل خلاف صریح نص قرآن شریف ہے کہ ایسا ہوا ہو۔ اس آیت میں جو ذکر ہے وہ تو صاف ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ چاہتا تھا کہ قافلہ پر حملہ کیا جائے تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم (۷) جو شروع سورت میں گزر چکا ہے اس خیال کی نفی یہاں آخر پر اللہ تعالیٰ نے پھر کی ہے کہ قافلہ پر حملہ کرنا نبی کی شان کے شایاں نہ تھا۔ بلکہ ضروری تھا کہ میدان میں جنگ ہو کر پھر قید کیا جاتا۔ یہی اشارہ تریدون عرض الدنیا میں ہے اور یہ صرف اس گروہ کا ذکر ہے جو قافلہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے اور نبی کریم صلعم کو اس کے خلاف حکم تھا اور یہاں واللہ یرید الاٰخرۃ اسی کے مطابق ہے جو پیچھے فرمایا تھا ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمٰتہ (۷)۔

۱۲۵۵۔ فیما اخذتم۔ اخذ فی کذا کے معنی لسان العرب میں دیئے ہیں بدأ یعنی اس کام کو کرنا شروع کیا تھا یا اس کام کو کرنے لگا تھا اس لیے فیما اخذتم سے مراد فدیہ کا لینا درست نہیں بلکہ اس سے مراد ہے وہ کام جو تم کرنے لگے تھے۔ یعنی قافلہ پر حملہ کرنا۔ یعنی ایسا کرنا چونکہ مومنانہ شان کے خلاف تھا۔ گو عام جنگوں میں جائز ہوتا اس لیے اس کا نتیجہ عذاب ہوتا کتٰب من اللہ سبق میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ یہ پہلے سے فیصلہ ہو چکا تھا کہ یہ جنگ ہو۔ جیسا کہ فرمایا لیقضی اللہ امرا کان مفعولا (۴۴)۔

۱۲۵۶۔ ان الفاظ میں غنمتم کا ذکر کر کے اسی فدیہ کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی فدیہ کا لینا تمہارے لیے جائز ہے کیونکہ دوسرے مال غنیمت کا ذکر پہلے آچکا ہے اور قیدیوں کا فدیہ یقیناً مال غنیمت میں داخل ہے۔

۱۲۵۷۔ قیدیوں کے فدیہ کی مقدار: عام فدیہ بیس اوقیہ فی قیدی تھا (اور اوقیہ چالیس درہم ہے) اور حضرت عباس کا چالیس اوقیہ۔ بعض ان میں سے جنگ میں خلاف منشا بھی شامل ہوئے تھے۔ جیسے حضرت عباس اور ابوالبختری ان کے متعلق رسول اللہ صلعم نے حکم بھی دیدیا تھا کہ ان کو قید نہ کیا جائے۔

مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٧١
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا
مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى
يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ
فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ ۢ بَيْنَكُمْ وَ
بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝٧٢
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۗ اِلَّا
تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۝٧٣

سو اُس نے ان پر تم کو قابو دیدیا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ع۱۲۵۸
جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور
اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور
وہ جنھوں نے (ان کو) پناہ دی اور مدد دی یہ ایک دوسرے
کے دوست ہیں اور وہ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت نہیں کی
تم پر ان کی دوستی کا کوئی حق نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں
اور اگر تم سے دین کے متعلق مدد چاہیں تو تم پر مدد دینا فرض
ہے سوائے اس کے کہ (یہ مدد) ان لوگوں کے خلاف ہو جنکے اور
تمھارے درمیان عہد ہے اور اللہ جو تم کرتے ہو اسے دیکھتا ہے ع۱۲۵۹
اور جو کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اگر تم ایسا نہ کروگے
تو ملک میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا ع۱۲۶۰

ع۱۲۵۸ نبی کریم صلعم کی خیانت سے مراد یہ ہے کہ جو عہد کیا ہے کہ پھر مسلمانوں کے خلاف جنگ نہ کریں گے اس پر قائم نہ رہیں اگر ان کا یہ ارادہ ہو تو بھی تم فکر مت کرو اس لیے کہ وہ اس سے بڑھ کر خدا کی خیانت پہلے کر چکے ہیں یعنی بلا وجہ مسلمانوں پر چڑھ کر آئے تاکہ ان کو تباہ کریں اور خدا کا نام مٹا دیں۔

ع۱۲۵۹ اس آیت میں مسلمانان مدینہ کے ان مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کا ذکر ہے جو کفار کے اندر رہ گئے تھے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی ان کے متعلق فرمایا کہ اُن کی ولایت کا کوئی حق مسلمانوں پر نہیں، یعنی ان مہاجرین اور انصار پر جو مدینہ میں ایک جمعیت بن گئی تھی اور جن کی اپنی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ گو محض مسلمان ہونے کے لحاظ سے وہ ان کے بھائی ہوں مگر ولایت جس میں لین دین تجارت میراث، عہد نصرت وغیرہ کے تعلقات شامل ہیں وہ ان کے ساتھ نہیں۔ کیونکہ ان کا فر قوموں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم نہیں۔ اور عام حالت ان کافر قوموں کی یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے دشمن تھے اور عموماً ان سے برسر پیکار تھے۔ پس جن کافر قوموں سے مسلمانوں کے تعلقات ولایت نہیں جو مسلمان ان میں ملے رہ گئے ہیں اور وہاں سے ہجرت نہیں کرتے ان کو بھی انہی قوموں کے حکم میں رکھا ہے اور یہی حق بھی تھا اور دینی تعلق کی وجہ سے ایک حالت کو مستثنٰی کیا ہے یعنی اگر وہ مسلمان دین کے بارہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کو مدد دو اور ظاہر ہے کہ یہ مدد جنگ کی صورت میں ہوگی تاکہ ان کافر قوموں کے ظلم سے انہیں نجات حاصل ہو اس طرح پر ان کی مدد کرنا مسلمانوں کا فرض قرار دیا، لیکن اس سے پھر ایک حالت کو مستثنٰی کیا یعنی اگر ایک کافر قوم کے ساتھ تمہارا عہد ہو تو پھر دینی رنگ میں ان کی مدد کرنا جائز نہیں کیونکہ ایسی مدد اس معاہدہ کے خلاف ہوگی جو اس قوم کے ساتھ ہے اور معاہدہ بہر حال مقدم ہے اور ایسا ہی نبی کریم صلعم کا عمل بھی پایا جاتا ہے کہ آپ نے معاہدہ کو مقدم کیا۔ رہا یہ سوال کہ اگر ان مسلمانوں کی جو معاہد قوم میں ہوں دینی رنگ میں مدد کرنا جائز نہیں، تو کیا ان سے تعلقات ولایت بھی ہونگے یا نہیں سو یہ امر ظاہر ہے کہ جب ایک کافر قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہے تو ایک حد تک تعلقات ولایت تو ان سے قائم ہیں یعنی ان کے ساتھ لین دین تجارت وغیرہ ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات ایسے معاہدات کی رو سے جنگوں میں وہ مسلمانوں کے اور مسلمان ان کے معاون ہو جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جو مسلمان ان میں ہوں ان سے وہ تعلقات نہ ہوں صرف تعلقات وراثت کو ان کی صورت میں بھی جائز قرار نہیں دیا گیا (ج۔ ر)

ع۱۲۶۰ الا تفعلوہ میں کس حالت کا ذکر ہے جس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ زمین میں فتنہ و فساد کبیر ہوگا فتنۃ قرآن کریم کی اصطلاح میں مسلمانوں کو بوجہ اسلام ماننے کے جو دکھ دیا جاتا تھا اس پر بولا گیا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ الا تفعلوہ میں کسی فعل کے نہ کرنے کا ذکر ہے اور اوپر جس فعل کے کرنے کا حکم تھا وہ صرف یہی تھا ان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر یعنی مسلمانوں کو جہاں کفار بوجہ مسلمان ہونے کے اذیت پہنچاتے ہوں وہاں مسلمانوں کی مدد کرنا مسلمانوں کا فرض قرار دیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ دوسرے مسلمان خاموش بیٹھے دیکھتے رہیں۔ اس لیے اب یہ بتایا اگر ایسا نہ کرو گے یعنی وہ اپنے معاملہ میں تمہاری مدد چاہتے ہیں اور تم مدد نہیں کرتے تو پھر زمین میں فتنہ و فساد ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں فرمایا والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض یعنی کفار ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں تو تمہیں بھی ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے ہاں تمہاری ایک دوسرے کی مدد دین کے بارہ میں چاہیئے۔ کفار محض اغراض دنیا کو مدنظر رکھ کر بھی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ یہ گویا اصلاح ہے جو اسلام نے کی۔ اور دوسری اصلاح یہ کی کہ دینی ضروریات کے لیے بھی جنگ کرنی پڑے تو ان لوگوں کے خلاف جنگ نہ کرو جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے گویا عہد کی عزت سکھائی کہ دینی ضروریات کے پیش آنے پر بھی اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ
وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٤﴾

اور جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ جنھوں نے پناہ دی اور مدد دی ، یہی سچے مومن ہیں ۔ اُن کے لیے حفاظت اور عزّت کا رزق ہے ۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَ
جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا
الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ
اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٧٥﴾ ع

اور جو بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم میں سے ہی ہیں اور رشتہ کے تعلقات والے اللہ کے حکم میں آپس میں زیادہ حق دار ہیں ، اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۔ع ١٢٦١

ع ١٢٦١ جب اخوت ایمانی کے تعلقات کا ذکر کیا تو ساتھ ہی تعلقات رشتہ داری کا بھی ذکر کیا ۔ یعنی وہ تعلقات بھی اللہ تعالےٰ کے قائم کردہ ہی ہیں ۔ اس لیے وہ تعلقات جو اخوت ایمانی سے پیدا ہوئے ہیں ان کی غرض یہ نہیں ہو سکتی کہ تعلقات رشتہ داری جن کے لحاظ سے وراثت کے احکام اجرا پاتے ہیں باطل ہو جائیں ۔ جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو عموماً بیکسی کی حالت میں تھے ۔ آنحضرت صلعم نے ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کے درمیان اخوت قائم کر دی تھی ، جس کی ان سچے مومنوں نے یہاں تک عزت کی کہ گھر بار مال اسباب تک نصف نصف دینے کو تیار ہو گئے اور وفات کی صورت میں حصہ میراث بھی ۔ سو اس سے ذکا اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی مسلمانوں میں تعلقات اخوت کس قدر مضبوط تھے کہ ان میں افراط کا خطرہ ہو گیا تھا جس کو آیت قرآنی نے روک دیا ۔ آج اس کی بجائے منافرت اور تباغض و تحاسد میں کمال حاصل کیا جا رہا ہے ۔

آیاتها ١٢٩ (٩) سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ رکوعاتها ١٦

نام - اس سورۃ کا نام التوبۃ یا البراءۃ ہے اور بھی کئی ایک نام اس کے احادیث میں آئے ہیں جیسے المقشقشۃ یعنی شفا دینے والی گویا نفاق سے شفا دیتی ہے اور المنقرۃ - البحوث - المبعثرۃ وغیرہ جن ناموں میں اس کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کے ناموں میں ان کے مضمون کی طرف اشارہ ہے اس سورت میں ١٦ رکوع اور ١٢٩ آیات ہیں اور اس کا نام البراءۃ اس کی پہلی ہی آیت میں مذکور ہے براءۃ من اللہ ورسولہ جہاں ان کفار سے علیحدگی اور بیزاری کا اعلان ہے جو اپنے معاہدات پر قائم نہ رہتے تھے اور ایسا ہی اس سورت میں منافقین کو بھی بالکل الگ کر دیا جواب تک ملے جلے آتے تھے۔ پس اس کے نام میں یہ اشارہ ہے کہ شرک اور نفاق سے مسلمان الگ ہوتے ہیں اور کامل بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس کا دوسرا نام التوبۃ لقد تاب اللہ علی النبی (ع ١١) سے لیا گیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے ان فضلوں اور رحمتوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر کیے اس لیے کہ انہوں نے سخت تنگی کے وقت میں نبی کریم صلعم کی آواز پر لبیک کہا۔ یہاں تک کہ تیس ہزار آدمی اپنے سب کاروبار کو چھوڑ کر سخت گرمی کے موسم میں پکی ہوئی فصلوں کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو گئے اور ایک لمبا اور صعوبت والا سفر اختیار کیا۔ اور مسلمانوں میں سے صرف تین آدمی پیچھے رہے ؛

خلاصہ مضمون - جیسا کہ اس سورت کے نام البراءۃ سے ظاہر ہے، پہلے رکوع میں ان کفار سے علیحدگی کا اعلان ہے جنہوں نے بار بار عہد شکنی کر کے مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچا رکھی تھی۔ چونکہ اسلام نے ملک عرب میں جنگوں کا خاتمہ کر کے اپنے اصول کو پھیلانا تھا اس لیے اب وقت آ گیا تھا کہ کفار کی شرارتوں کا سد باب ہمیشہ کے لیے کیا جاتا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ صرف کفر و شرک اس علیحدگی کی وجہ نہیں۔ چنانچہ حکم دیا کہ جن کفار نے عہد شکنی نہیں کی، ان کے ساتھ تم بھی اپنے عہد کو پورا کرو۔ اور یہ بھی بتایا کہ باوجود مشرکوں کے معاہدات کے اختتام کے اگر ان قوموں میں سے کوئی شخص آ کر تمہاری پناہ مانگے تو اسے پناہ دیدو اور اسے اصول اسلام سمجھاؤ اگر وہ مسلمان نہ ہو تو پھر اسے صحیح سلامت اپنی قوم میں پہنچا دو۔ دوسرے رکوع میں وجوہات قطع تعلق دی ہیں اور کچھ ذکر ان لوگوں کا کیا ہے جن کے ساتھ ابھی جنگ ہونے والی تھی اس لیے کہ انہوں نے اسلام لانے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیا اور اسلام کو نیست و نابود کرنے کا ارادہ کیا۔ تیسرے رکوع میں بتایا کہ اسلام مسلمانوں سے پوری مالی و جانی قربانیاں چاہتا ہے۔ صرف یہ فخر کافی نہیں کہ ہم نے اس قدر مہمان نوازی کر دی یا مسجدوں کی مرمت کر دی یا مسجدیں بنالیں بلکہ اپنے عزیزوں اپنے اموال اپنی جائدادوں اپنی تجارتوں کو جب تک اسلام کے سامنے قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اس وقت تک مسلمان نہیں۔ چوتھے میں بتایا کہ اپنی کثرت پر فخر نہ کرنا بلکہ وہ چیز جو تمہیں کامیاب کر رہی ہے وہ نصرت الٰہی ہے اور فرمایا کہ مشرکوں کو آیندہ خانہ کعبہ کے پاس نہ آنے دو اور اس بات کا خوف مت کرو کہ اس سے تمہاری تجارتوں کو نقصان پہنچے گا۔ اور اہل کتاب بھی اگر تمہارے ساتھ جنگ کریں تو ان کا بھی مقابلہ کرو اللہ تعالیٰ انہیں بھی مغلوب کریگا پانچویں میں اہل کتاب کی اسلام کے خلاف کوششوں کا ذکر کر کے اسلام کے آخری غلبہ کی پیشگوئی کی۔ چھٹے رکوع میں غزوۂ تبوک کا ذکر کیا جس کی ضرورت عیسائیوں کی مچل سے پیش آئی اور منافقوں کے پیچھے رہ جانے کا ذکر کیا۔ ساتویں میں بتایا کہ منافق مصائب کے خوف کی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اس لیے بھی کہ وہ اسلام کو تباہ ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ آٹھویں میں منافقوں کی ایذا رسانی کا ذکر کیا۔ نویں میں نفاق کا انجام ناکامی بتایا۔ دسویں میں منافقوں سے جہاد کا اور گیارھویں میں ان سے کامل قطع تعلق کا حکم دیا۔ بارھویں میں اعراب کا ذکر کیا جن میں بہت سے منافق تھے۔ تیرھویں میں منافقوں کے مختلف گروہوں کا ذکر کر کے بتایا کہ ایک گروہ کو تو دو دفعہ عذاب ملیگا یہ دوسرا عذاب ان کی فضیحت تھی اور ایک گروہ کو اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق دیگا اور اسی میں مسجد ضرار کا ذکر کیا۔ چودھویں میں بتایا کہ مومنوں کا خدا کے ساتھ کیا عہد ہے اور وہ انہیں کس طرح پورا کرنا چاہیئے اور کس طرح پورا کر رہے ہیں۔ پندرھویں میں بتایا کہ مومنوں کے حقیقی مجاہدات جن سے وہ مقام قرب حاصل کر سکتے ہیں یہی خدمات دینی ہیں سولھویں میں بتایا کہ رسول اللہ صلعم تو اصل میں دنیا کو گناہ اور ہلاکت سے نکالنے کے لیے آئے ہیں اور اسی پر سورت کا خاتمہ کیا۔

تعلق : اس سورۃ کا الانفال سے یعنی پچھلی سورت سے ایسا شدید تعلق ہے کہ ان کو ایک ہی سورت کے دو حصے قرار دیکر درمیان میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی نہیں لکھی گئی۔ اور اسی تعلق شدید کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بسم اللہ کا نزول اس سورت کی ابتدا میں آنحضرت صلعم پر نہیں ہوا۔ سورۂ الانفال میں بالخصوص جنگ بدر کا ذکر تھا اور مخالفین کو سمجھایا تھا کہ یہ جنگ تمہارے لیے ایک نشان ہے اگر تم جنگ سے رک جاؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے اگر جنگ کو جاری رکھو تو تمہارا انجام ذلت اور مغلوبیت ہے سورہ براءت میں اس ذلت اور مغلوبیت کا نقشہ کھینچا ہے کہ کس طرح آخر کار کفر کا زور ٹوٹا اور اسے اسلام کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔ پھر سورۂ انفال میں ذکر تھا کہ مخالف بار بار عہد شکنی کرتے ہیں اس عہد شکنی کا آخری علاج اب سورۃ براءت میں بتایا۔ غرض غور کیا جائے تو دونوں سورتوں کا مضمون بالکل مسلسل معلوم ہوتا ہے حالانکہ الانفال اور اس کے نزول میں سات سال کے قریب فرق ہے جس میں طرح طرح کے واقعات پیش آئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الٰہی میں کس طرح پر ان واقعات اور امور میں ایک ربط تھا ؛

زمانۂ نزول : براءۃ من اللہ ورسولہ اور سورت کی ابتدائی آیات کا اعلان ہجرۃ کے نویں سال میں ذیقعد میں ہوا۔ پس یہ اسی سال کی نازل شدہ ہیں۔ بقیہ حصہ سورت میں سے کثیر حصہ کا تعلق جنگ تبوک سے ہے اور یہ جنگ نویں سال ہجرت میں پیش آئی۔ پس یہ سورت کل کی کل نویں سال ہجرت کی ہے۔ ہاں اگر ایک دو آیات جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے بعد میں نازل ہوئی ہوں تو ہو سکتا ہے مگر اصل سورت کا نزول یقیناً نویں سال ہجرت کا ہی ہے ؛

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ①

یہ علیحدگی (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکوں میں سے اُن لوگوں کی طرف جنکے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا ۱۲۶۲

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ②

پس چار مہینے ملک میں چلو پھرو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے ۱۲۶۳

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ③

اور (یہ) اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو حج اکبر کے دن اطلاع ہے — کہ اللہ اور اس کا رسول ان مشرکوں سے بیزار ہے، پس اگر تم توبہ کرو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر پھر جاؤ تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں، اور جنھوں نے انکار کیا ان کو دردناک عذاب کی خبر دے ۱۲۶۴

۱۲۶۲ براءة ۔ بُرءٌ اور بَرَاءٌ اور تَبَرِّی کے معنی ہیں اس سے علیحدگی جس سے انسان کو کراہت ہو۔ اسی لیے بیماری سے اچھا ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور جسے ناپسند کیا جائے اس سے علیحدگی پر بھی اور ایسے شخص کو بری اور قوم کو براء کہا جاتا ہے ان اللہ بری من المشرکین ورسولہ (التوبۃ ۳) انتم بریئون مما اعمل وانا بری مما تعملون (یونس ۴۱) اذ تبرا الذین اتبعوا (البقرۃ ۱۶۶) انا برءٰؤا منکم (الممتحنۃ ۴) (غ)

سورۂ انفال جنگوں کی ابتدا کی خبر دیتی ہے تو یہ سورۃ ان کے خاتمہ کی یا وہ کفار کی پہلی کارروائیوں کا ذکر کرتی ہے تو یہ ان کے انجام کا۔ پس سب سے پہلے رکوع میں ان مشرکین سے قطع تعلق کا ذکر ہے جنھوں نے باربار عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا مسلمانوں کو ایک بڑی تکلیف جو عرب کی مشرک قوموں سے پہنچتی رہتی تھی یہی تھی کہ ایک دن یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ عہد کر لیتے اور مسلمان ان کی طرف سے مطمئن ہو جاتے لیکن اگلے ہی دن ذرا مخالفین کا دباؤ پڑا تو عہد شکنی کر دیتے۔ اب جبکہ فتح مکہ کے بعد ملک عرب میں جنگوں کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ یہ ضروری ہوا کہ ان عہد شکنیوں کی گنجایش کا خاتمہ کیا جائے اور ملک میں ایک عالمگیر صلح کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ نویں سال ہجری میں حج کے موقعہ پر اس سورت کی پہلی چند آیات کا تمام اطراف ملک سے جمع شدہ قبائل میں اعلان کیا گیا۔ اس سال حج کے لیے نبی کریم صلعم خود تشریف نہیں لے گئے، بلکہ حضرت ابوبکرؓ کو حاجیوں پر امیر مقرر کر کے بھیجا اور آپ کی روانگی کے بعد حضرت علیؓ کو روانہ کیا کہ سورۂ توبہ کی پہلی آیات کا اعلان کر دیں۔ جس کے بعد ذیل کے امور کا اعلان کیا گیا: اول یہ کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک خانہ کعبہ کے قریب نہ جائے گا۔ دوم یہ کہ کوئی شخص ننگا ہو کر طواف نہ کریگا۔ سوم یہ کہ ہر ایک عہد پورا کیا جائے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ ان آیات میں تمام مشرکین عالم کا ذکر نہیں، بلکہ تمام مشرکین عرب کا بھی ذکر نہیں، جیسا کہ چوتھی آیت سے ظاہر ہے۔ یہ اعلان صرف ان لوگوں کے متعلق تھا جو باربار عہد کر کے خلاف ورزی کرتے تھے۔ کیونکہ جنھوں نے عہد کر کے خلاف ورزی نہیں کی ان کے ساتھ عہد پورا کرنے کا وہاں صریح حکم موجود ہے اور حضرت علیؓ نے جن باتوں کا اعلان کیا ان میں سے ایک عہدوں کا ایفا تھا۔ پس ان آیات سے مشرکین دنیا سے عام جنگ کا حکم نکالنا ایسی تاویل ہے جو صریح نص قرآنی کے خلاف ہے۔

۱۲۶۳ لکھا ہے کہ اس سال حج بسبب نسئی کے (یعنی اس تاخیر کے جو حج کے مہینوں میں کر لی جاتی تھی) ذلقعدہ میں ہوا۔ ہر حال میں چار مہینے اس وقت سے دیئے گئے جب یہ اعلان حج کے دن ہوا۔ یہ خیال کہ فتح مکہ کی وجہ سے چونکہ مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا تھا اس لیے ان معاہدات کے ختم ہو جانے کا اعلان کیا گیا۔ صحیح نہیں فتح مکہ کا واقعہ رمضان ۸ھ کا ہے اور یہ چودہ ماہ بعد کا واقعہ ہے باوجود فتح مکہ کے جس کا تعلق صرف قریش سے تھا دوسری اقوام عرب کی طرف سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی رہی تھیں بلکہ یہاں جو لفظ استعمال فرمائے ہیں کہ جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک یہ لوگ اسلام کے خلاف منصوبوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس لیے جیسا کہ اس سے پیشتر سورۂ انفال میں مدت پہلے حکم ہو چکا تھا واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سواء (الانفال ۵۸) جب باربار کی عہد شکنی کی وجہ سے ملک میں فتنہ و فساد کا خاتمہ نہ ہوتا تھا تو آنحضرت صلعم نے اس حکم الٰہی کے ماتحت نہایت صفائی سے چار ماہ کی مہلت دیکر ان عہدوں کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ اور یہ بات کہ اصل وجہ اس اعلان کی وہ فتنہ و فساد ہی تھا جو عہد شکنی سے پیدا ہوتا تھا نہ ان لوگوں کا کفر۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ چوتھی آیت میں ان کافر قوموں کو مستثنٰے کر دیا ہے جنہوں نے عہد کر کے عہد شکنی نہیں کی۔

۱۲۶۴ یوم الحج الاکبر۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد قربانیوں کا دن یعنی دسویں ذی الحج ہے یا عرفہ کا دن یعنی میدان عرفات میں اجتماع کا۔ چونکہ

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝٤

مگر جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا، پھر انھوں نے تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی، تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کر دیں۔ اللہ متقیوں سے محبّت رکھتا ہے ۱۲۶۵

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝٥

پھر جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور ان کو پکڑ لو اور ان کو روک دو، اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو پھر اگر توبہ کریں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۲۶۶

تاریخ سے یہی ثابت ہے کہ اعلان یوم النحر یعنی دسویں ذی الحج کو ہُوا اس لیے قول اوّل کو ترجیح ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی اسی کی موید ہے کہ آپ نے یوم النحر کو یوم الحج الاکبر فرمایا۔

۱۲۶۵ یہ استثناء صاف بتاتا ہے کہ مشرکین سے قطع تعلق کی وجہ صرف ان کی عہد شکنی ہوئی تھی جہاں عہد شکنی نہیں ہوئی ان کے ساتھ عہد پورا کرنے کو اتقاء قرار دیا ہے۔ گویا اس اعلان کی اصل وجہ شرک یا کفر نہیں بلکہ عہد شکنی ہے۔ مفسرین نے یہاں صرف بنی حمزہ اور بنی مدلج کا ذکر کیا ہے کہ کنانہ کے یہ دو قبیلے ایسے تھے جن کی مدت عہد باقی تھی۔ لیکن خود خزاعہ جن کی خاطر مکہ پر چڑھائی کی گئی مسلمانوں کے معاہد تھے اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا عہد مدت معینہ تک تھا شاید اور بھی اس قسم کے عہد ہوں۔

۱۲۶۶ الاشہر الحرام سے مراد یہاں وہی چار ماہ ہیں جن کے متعلق اوپر اعلان ہو چکا کہ ان میں جنگ نہ کی جائے گی۔ ان کو حرمت والے مہینے یا تو اسی لیے کہا کہ جنگ ان کے اندر رکی رہیگی اور یا اس لیے کہ ذیقعد اور ذی الحج اور محرم جو ان چار ماہ میں شامل تھے اور بیشتر حصّہ ان چار ماہ کا تھے۔ حرمت والے مہینے تھے۔

احصروھم۔ حَصْر کے معنی تضییق اور احصروھم کے معنی ہیں ضیقوا علیھم (غ) یعنی ان کو تنگ کرکے روک دو اَحْصَرہ العَدُوُّ اذا ضُیِّقَ علیه فحصر۔ یعنی جب دشمن کسی کو یہاں تک تنگ کر دے کہ وہ رک جائے تو احصرہ العدو کہا جاتا ہے اور حَصْر اور اِحْصار کے اصل معنی منع یعنی روک دینا ہیں (ل) اور گو حصر کے معنی حبس یعنی قید کرنا بھی ہیں۔ مگر چونکہ یہاں خذوھم پہلے آچکا ہے جس کے معنی ہیں گرفتار کر لو اس لیے حصر سے مراد کسی دوسری طرح پر روک دینا ہیں جیسے للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ (البقرۃ۔ ۲۷۳) میں کسی طرح رک جانا مراد ہے نہ قید سے اور ابن جریر نے واحصروھم کے معنی کیے ہیں وامنعوھم التصرف فی بلاد الاسلام و دخول مکۃ یعنی ان کو بلاد اسلامی میں آنے جانے اور مکّہ میں داخل ہونے سے روک دو۔

مرصد۔ رَصَد کے معنی گھات میں بیٹھنا اور مرصَد گھات کی جگہ ہے رَصَد اور ارصاد کے ایک ہی معنی ہیں وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ (التوبۃ۔ ۱۰۷)

وہ معترضین جو قرآن کریم کو اگر دیکھیں بھی تو بالکل سطحی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام میں ہر کافر کو قتل کر دینے کا حکم ہے۔ کیونکہ یہاں فاقتلوا المشرکین آگیا ہے۔ تعصب کی عینک کبھی انسان کی نظر کو صاف نہیں رہنے دیتی۔ یہاں شروع سے ایک خاص ذکر چلا آتا ہے یعنی ان مشرکوں کا ذکر جنھوں نے بار بار عہد کر کے خلاف ورزیاں کیں ینقضون عھدھم فی کل مرۃ (الانفال۔ ۵۶) پہلے بھی ان کے متعلق آچکا ہے۔ یہاں نہ ان مشرکوں کا کوئی ذکر ہے جن سے کوئی عہد ہی نہیں ہُوا نہ ان کا جنھوں نے عہد کر کے خلاف ورزی نہیں کی۔ بلکہ پہلی ہی آیت میں بیزاری کو صرف ان لوگوں تک محدود کر کے جن سے عہد ہوا الذین عاھدتم۔ ان تمام مشرکوں اور کفار کو اس سورت کے مضمون سے بے تعلق کر دیا جنھوں نے مسلمانوں سے کوئی عہد نہ کیا تھا۔ اور عہد کر کے پورا کرنے والوں کو الگ مستثنے کر دیا تو باقی صرف وہ چند مشرک رہ گئے جنھوں نے عہد کر کے بار بار اس کی خلاف ورزی کی اور سزا جو یہاں تجویز کی گئی ہے وہ محض ان کی بار بار کی عہد شکنی کی وجہ سے تھی۔ اس سزا میں بھی صرف قتل کرنا نہیں بلکہ قتل۔ گرفتار کر لینا۔ روک دینا ہے اور اس سزا کی غرض صاف معلوم ہوتی ہے کہ وہ شرارت کرنے سے رُک جائیں ان کو قتل کرنا مقصود اصلی نہیں بلکہ شرارت کو روکنا مقصود اصلی ہے اس لیے اگر کسی طریق سے رُک جائیں تو وہ طریق کافی ہے ورنہ گرفتار کیے جا سکتے ہیں اور یہ دونوں صورتیں نہ ہو سکیں تو پھر ایسے شریروں کو قتل کرنا حفاظت و امن قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے اور یا یہ سزائیں بلحاظ جرم کے الگ الگ

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷

اور اگر ان مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے، تو اس کو پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اسکے امن کی جگہ پہنچا دو یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو جانتے نہیں ۱۲۶۷ اور ان مشرکوں کے لیے اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک عہد کیوں کر ہو سکتا ہے، سوائے ان کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا، سو جب تک وہ تمھارے لیے قائم ہیں تم ان کے لیے قائم رہو۔ اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے ۱۲۶۸

ہیں یعنی جو بہت شریر ہیں ان کو قتل کر دو جو کسی طرح سے باز ہی نہیں آتے جو اس سے کم ہیں انہیں گرفتار کر لو جو بغیر قید کے رکے رہ سکتے ہیں ان کو دوسرے طریقوں سے روک دو اور جو پکڑے نہیں جاتے ان کے لیے گھات میں بیٹھو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ وہ بلاد اسلامی میں آئیں۔ جیسا ابن جریر نے واحصر وھم کی تفسیر میں لکھا ہے اور یہ اگلے الفاظ فخلوا سبیلھم سے ظاہر ہے جہاں فرمایا کہ ان کا رستہ کھلا چھوڑ دو اور آیت ۶ سے بھی یہی ظاہر ہے جہاں مشرکوں کی پناہ مانگنے کا ذکر ہے۔

اس سزا کی معافی کی صورتیں: اور اگر یہ کہا جائے کہ یہاں چونکہ ان لوگوں کے چھوڑ دینے کا حکم ہے جو توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اس لیے گویا باقی سب کو قتل کرنے کا حکم ہے تو یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ مجرم تو وہی ہیں جنھوں نے عہد شکنی کی۔ ہاں ان مجرموں کے بعض حالات میں چھوڑ دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو لوگ اس حکم کے ماتحت تھے ہی نہیں وہ بھی اس استثنا کی وجہ سے زیر مواخذہ آ گئے ہیں۔ یعنی سزا دینے کا حکم صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو عہد شکنی کریں پھر ان مجرموں میں سے ان کو مستثنےٰ کر دیا جو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ تو اس سے یہ لازم نہ آیا کہ جو مجرم تو کبھی تھے ہی نہیں نہ انھوں نے عہد کیا تھا نہ عہد شکنی کی تھی۔ تو اب وہ محض اس لیے کہ نماز نہیں پڑھتے مجرم بن کر مستحق سزا ہو گئے۔ محض نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے۔ زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے اسلام نہ لانے کی وجہ سے قرآن کریم نے کسی شخص کو مستحق سزا قرار نہیں دیا (اس کی سزا عالم آخرت میں ہے) ہاں عہد شکنی کے لیے مستحق سزا قرار دیا اور اس سزا کی جس کے وہ مستحق ہو چکے تھے اس صورت میں معافی کا اعلان کر دیا جب وہ مسلمان ہو جائیں اور یہ صرف ایک صورت ہے کیونکہ اسلام میں داخل ہونے سے ان کی شرارتوں کا کامل طور پر سدِ باب ہو جاتا تھا۔ دوسری صورتیں یہ بھی ہیں کہ ان کو گرفتار کر لیا جائے یا ان کو روک دیا جائے مگر چونکہ عرب میں ہر قوم بجائے خود آزاد تھی اس لیے روکنا بغیر اس کے نہ ہو سکتا تھا کہ وہ مغلوب ہو جائیں جس کے لیے قتال کی ضرورت پیش آتی اور اس میں بعض قتل بھی ہو جاتے یہی وجہ ہے کہ صرف قتل کا کہیں حکم نہیں۔ غرض تلوار یا اسلام کا پیش کرنا اسلام پر مخالفین کا محض افترا ہے۔

ف۱۲۶۷ استجارک۔ تیری مجاورت چاہے یعنی تجھ سے امن چاہے بعد انقضائے مدت معینہ کے۔ یہ لفظ خود بتاتا ہے کہ انہی مجرم عہد شکن مشرکوں کا ذکر ہے جو مجرم نہیں اس کو پناہ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں۔

چونکہ پچھلی آیت میں کہا تھا کہ جو مسلمان ہو جائے اسے معاف کر دو۔ لیکن اسلام لانے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں سے ملیں اور دین اسلام کے متعلق دریافت کریں اس لیے فرمایا کہ وہی مشرک جن کا ذکر ان آیات میں ہے کہ وہ مستحق سزا ہیں۔ اگر دین اسلام کے متعلق کچھ باتیں دریافت کرنے کے لیے تم سے امن مانگیں تو ان کو امن دو۔ پھر یہ نہیں کہ وہ سن کر مسلمان نہ ہو تو اسے مار ڈالو بلکہ اس حالت میں اسے امن کے ساتھ اپنی قوم کے مقام سکونت میں واپس پہنچا دو یہی تفسیر ابن جریر سے مروی ہے۔ ثم ابلغه مامنه يقول ثم ردّه بعد سماعه كلام الله ان هو ابی ان يسلم ولم يتعظ بما تلوته عليه من كلام الله فيؤمن الی مامنه يقول الی حيث يامن منك وممن فی طاعتك حتی يلحق بداره وقومه من المشركين۔ یعنی ابلغه مامنه سے مراد یہ ہے کہ پھر اسے لوٹا دو بعد اس کے کہ وہ اللہ کا کلام سن لے اگر وہ اسلام لانے سے انکار کرے اور جو کچھ اللہ کا کلام اس پر پڑھا گیا ہے اس سے نصیحت حاصل نہ کرے تو اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دیا جائے۔ یعنی ایسے مقام پر جہاں تجھ سے اور ان لوگوں سے جو تیری اطاعت میں ہیں امن میں ہو جائے یہاں تک کہ اپنے گھر پہنچ جائے اور اپنی مشرک قوم کے ساتھ مل جائے۔ کاش ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن کی کہانی بنانے والے کبھی ان الفاظ پر غور کرتے۔ یہ اس مشرک کا ذکر ہے جو مجرم ہو چکا ہے۔ اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا ہے وہ پناہ مانگتا ہے رسول اللہ صلعم اسے خدا کا کلام سناتے ہیں وہ اسلام لانے سے انکار کرتا ہے۔ یہاں تو کھلا حکم قتل کا ہونا چاہیئے تھا مگر حکم یہ ہے کہ اسے اپنے گھر حفاظت سے واپس پہنچا دو۔ اور وجہ کیا دی ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ اسلام کی تعلیم کی خوبی سے واقف نہیں اور نہیں جانتے کہ اللہ پر ایمان لانے سے انسان کیا فواید حاصل کرتا ہے۔

ف۱۲۶۸ اس رکوع میں انہی مشرکوں کا ذکر ہے جن کا ذکر پچھلے رکوع میں تھا یعنی عہد شکنی کرنے والے جیسا کہ خود مضمون بھی شاہد ہے اور ان سے قطع تعلق کی

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ
اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى
قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۸
اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ
سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۹
لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۱۰
فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۱۱
وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ
وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ لا
اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۱۲
اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا
بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ
اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۱۳

(عہد) کس طرح ہو حالانکہ اگر وہ تم پر غالب آئیں تو تمھارا کچھ لحاظ نہ
کریں نہ ناطے کا اور نہ ہی عہد کا وہ اپنے مونہوں سے تم کو راضی کرتے
ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں ع۱۲۶۹
اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت لے لی یوں اس کی راہ سے
روکا، بُرا ہے جو وہ کرتے ہیں۔
کسی مومن کا لحاظ نہیں کرتے نہ ناطے کا اور نہ ہی عہد کا۔
اور وہ حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔
سو اگر توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، تو
دین میں تمھارے بھائی ہیں۔ اور ہم ان لوگوں کے لیے باتیں
کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔
اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسموں کو توڑیں اور تمھارے
دین میں عیب لگائیں تو کفر کے سرداروں کے ساتھ جنگ
کرو، ان کی قسمیں کچھ نہیں، تاکہ وہ باز آئیں ع۱۲۷۰
کیوں اُن لوگوں کے ساتھ جنگ نہ کرو جنھوں نے اپنی قسمیں
توڑ دیں اور رسول کے نکال دینے کا قصد کیا اور انھوں نے
پہلے تمھارے ساتھ ابتدا کی، کیا تم اُن سے ڈرتے ہو بلکہ اللہ ہی زیادہ
حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

وجوہات بیان کی ہیں الا الذین عاھدتم وہی ہیں جن کا ذکر پیچھے آیت ۴ میں ہو چکا ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ عہد کو قائم کرنا بڑا اتقاء ہے۔ یہ عہد کی عزت ہے جو اسلام نے سکھائی ہے۔ مسلمان کبھی عہد نہیں توڑ سکتا۔ خواہ مفاد قومی کو بھی نقصان پہنچتا ہو۔

ع۱۲۶۹ یرقبون۔ رقب اس دیکھنے کو کہتے ہیں جو حفظ و رعایت کے طریق پر ہو۔
الّ۔ راغب کے نزدیک ہر حالت ظاہری پر بولا جاتا ہے خواہ قسم کے عہد سے ہو یا قرابت کے۔ مگر یہاں جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے قرابت ہی مراد ہے۔
ذمۃ۔ ذم کے معنی مذمت کرنا یا دوسرے کو بُرا کہنا ہیں ھذ موما مد حورا (بنی اسرائیل ۱۷-۱۸) اور ذمۃ عہد کے ضائع کرنے پر مذمت کا ہونا ہے (غ)
کفار کا مسلمانوں سے سلوک: یہ حالت عام اہل عرب کی تھی کہ جن کے ساتھ عہد ہو ذرا طاقت پکڑی تو عہد کو توڑ ڈالا جیسا کہ دوسری جگہ قرآن شریف میں مذکور ہے، تتخذون ایمانکم دخلا بینکم ان تکون امۃ ھی اربیٰ من امۃ (النحل ۱۶-۹۲) یہی حال ان کا مسلمانوں کے ساتھ تھا اور اس کی وجوہات تو اور بھی قوی تھیں (بلے) مسلمانوں کے دشمن تھے۔ عہد صرف ظاہری طور پر کر لیتے تھے۔ حالانکہ دلوں میں بغض مخفی ہوتا اس لیے موقع کی تاک میں رہتے۔ جب کسی مسلمان کو نقصان پہنچانے کا موقع ملتا نہ قرابت کا لحاظ کرتے نہ عہد کی خلاف ورزی کا۔

ع۱۲۷۰ حذیفہ سے یہ روایت ہے کہ اس آیت کے مذکور کفار سے جنگ نہیں ہوئی (ج) اور بعض نے ائمۃ الکفر سے مراد ابوجہل وغیرہ کو لیا ہے جو کسی صورت میں درست نہیں۔ گو آیت ۱۳ کے الفاظ سے خیال اس طرف جاتا ہو اس لیے کہ یہ سورت یقیناً نویں سال کی ہے اور ابوجہل وغیرہ جنگ بدر میں ہلاک ہو چکے تھے لیکن آیت ۱۲ و ۱۴ و ۱۵ کے الفاظ اس بات کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتے جو حذیفہ سے مروی ہے یعنی یہ کہ ان لوگوں سے کبھی جنگ نہیں ہوئی کیونکہ آیت ۱۴ میں صاف حکم ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کرو اور پیشگوئی موجود ہے کہ اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو عذاب دیگا۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مسلمان ہونے

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ
يُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ
صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾
وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى
مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾
اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ
ع ۸ وَلِيْجَةً ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾
مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ
اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۗ اُولٰٓئِكَ
حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾

اُن سے جنگ کرو اللہ ان کو تمھارے ہاتھوں سے عذاب دیگا
اور ان کو رسوا کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمھیں مدد دیگا اور
مومن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشے گا۔
اور اُن کے دلوں سے غصہ دور کردے گا اور اللہ جس پر چاہتا
ہے رجوع برحمت کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے [۱۲۷۱]
کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے اور اللہ نے تم میں سے
ان کو ابھی الگ نہیں کیا جنھوں نے جہاد کیا اور نہ اللہ کے سوائے اور
نہ اس کے رسول اور نہ مومنوں کے رسوائے کسی کو دلی دوست
بنایا ہے اور اللہ اس سے واقف ہے جو تم کرتے ہو [۱۲۷۲]
مشرکوں کا کام نہیں کہ اپنے اوپر کفر کی گواہی دیتے ہوئے اللہ کی
مسجدوں کو آباد کریں۔ ان کے عمل بے کار ہیں اور وہ
آگ کے اندر رہیں گے [۱۲۷۳]

کے بعد اپنے عہد وغیرہ کو توڑ دیں جیسا کہ آنحضرت صلعم کے آخری ایام میں مسیلمہ کذاب نے کیا اور آپ کی وفات کے بعد بعض دیگر اقوام عرب نے جن کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے فوج کشی کی ان کا زکوٰۃ دینے سے انکار کرنا بھی نکث ایمان تھا۔ اور طعن فی الدین کرنے والے مسیلمہ اور اسود اور دوسرے لوگ تھے۔ رہی یہ بات کہ ان کے متعلق آیت ۱۲ میں فرمایا وھموا باخراج الرسول سو مسیلمہ وغیرہ کا ایسا کرنا ظاہر ہے کہ وہ یہ قصد کر چکا تھا اور قریش کا آنحضرت صلعم کو نکالنا ان الفاظ میں نہیں آسکتا کیونکہ وہ تو یہ کام کر چکے تھے ان پر ھموا صادق نہیں آسکتا اور یہ الفاظ کہ یشف صدور قوم مومنین و یذھب غیظ قلوبھم بھی مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں پر ہی صادق آتے ہیں کہ ان کی وجہ سے جو مسلمانوں کو سخت رنج پہنچا تھا ان کی ہلاکت سے وہ دور ہو گیا۔ محض طعن فی الدین پر قتل کا فتویٰ ان الفاظ سے نہیں نکل سکتا۔

۱۲۷۱ یذھب غیظ قلوبھم۔ قلوبھم میں ضمیر مخالفین کی طرف ہے یعنی ان کے دلوں میں جو غیظ و غضب اسلام کی تباہی کے لیے پیدا ہو گا اللہ اس کو بھی دور کردے گا اور یہ دونوں طرح ہو سکتا ہے۔ کفار کے ذلیل ہو جانے سے بھی اور ان کے مسلمان ہونے سے بھی جس کی طرف و یتوب اللہ علی من یشاء میں اشارہ کیا ہے۔

۱۲۷۲ ولیجۃ۔ ولوج تنگی میں داخل ہونے کا نام ہے حتیٰ یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف ۔ ۴۰) تولج اللیل فی النھار (آل عمران ۳ ۔ ۲۷) اور ولیجۃ وہ ہے جو انسان کے اہل میں سے تو نہ ہو مگر انسان اسے ایسا دوست بنائے جس پر اعتماد ہو (غ)

یہ کون لوگ ہیں جن کو ممیز کرنے کا یہ ذکر ہے ظاہر ہے کہ اس سے سابقین اولین مراد نہیں، جو جہاد بھی کر چکے اور اپنا اخلاص اللہ اور رسول کے لیے بھی دکھا چکے ہیں۔ بلکہ ان کا ذکر ولا المومنین میں ہے اور حسبتم میں مخاطب وہ لوگ ہیں جو اِدھر اُدھر اقوام میں ملے جلے دین اسلام میں داخل ہو چکے تھے تو فرمایا کہ ابھی ضرورت ہے کہ تمہارا خلوص اللہ کے لیے ترقی کرے۔ اس لیے نئی مشکلات تمہارے رستہ میں آئیں گی۔ یا نئے مسلمان مراد ہیں جواب دین اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ان کو بتایا ہے کہ تم کو بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا پڑے گا اور اپنے خلوص کا ثبوت دینا ہوگا۔ یہ ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو اسلام پر بجبر مسلمان کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ جو مجبور ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔ انھوں نے جہاد کیا کرنا تھا اور اخلاص کیا دکھانا تھا۔ صرف منہ سے کچھ کہہ دینے پر تو اسلام راضی نہیں ہوتا۔

۱۲۷۳ یعمروا۔ عمارۃ۔ ویران کرنے کی ضد ہے یعنی آباد کرنا۔ اور مسجد کے آباد کرنے میں اس میں رہنا یا اس میں آنا بھی داخل ہے اور اس کا تعاہد مرمت وغیرہ بھی داخل ہے۔

مساجد اللہ۔ مشرک باقی مسجدوں سے تو کچھ تعلق نہ رکھتے تھے البتہ مسجد حرام پر اپنا حق جتاتے تھے کہ ہم اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں تو اسی کو یعنی مسجد حرام کو ہی مساجد اللہ کہا اسلیئے کہ وہ سب مسجدوں کا قبلہ ہے۔ یا ایک خاص دعویٰ کو عام لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

پچھلے رکوع کے آخر پر ذکر کیا تھا کہ ایک مسلمان کو صرف اتنی بات پر نہیں چھوڑا جاتا کہ منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہدے بلکہ جہاد اور خلوص کا ظاہر ہونا اس سے ضروری ہے اس لیے اب بیان بتایا کہ اسلام کیسی قربانیاں چاہتا ہے اور چونکہ کفار صرف اسی قدر کو بڑی خدمت سمجھتے تھے کہ خانہ کعبہ کے ہم خدمتگار ہیں۔ حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں مرمت وغیرہ کرتے ہیں اور یوں اس گھر کو آباد رکھتے ہیں تو یہ سمجھانے کے لیے کہ یہ کوئی بڑے مجاہدانہ کام نہیں کہ مسلمان بھی مسجدوں کے متولی ہونے کو اپنا فخر سمجھیں

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَٰجِدَ ٱللَّهِ مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَأَقَامَ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَى ٱلزَّكَوٰةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا ٱللَّهَ فَعَسَىٰٓ أُو۟لَٰٓئِكَ أَن يَكُونُوا۟ مِنَ ٱلْمُهْتَدِينَ ﴿١٨﴾

اللہ کی مسجدیں صرف وہی آباد کرتے ہیں، جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ دی، اور اللہ کے سوائے کسی کا خوف نہ کیا، سو امید ہے کہ یہ ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ ٱلْحَآجِّ وَعِمَارَةَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ كَمَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَجَٰهَدَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُۥنَ عِندَ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٩﴾

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کا آباد کرنا اس کی طرح ٹھیرایا ہے جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اللہ کے ہاں وہ برابر نہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔[۱۲۰۴]

ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَهَاجَرُوا۟ وَجَٰهَدُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ ٱللَّهِ ۚ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَآئِزُونَ ﴿٢٠﴾

جو ایمان لاتے ہیں اور ہجرت کرتے ہیں اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، اللہ کے ہاں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں اور وہی بامراد ہونگے۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَٰنٍ وَجَنَّٰتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ﴿٢١﴾

ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور رضا اور باغوں کی خوشخبری دیتا ہے ان کے لیے ان میں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہونگی[۱۲۰۵]

خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عِندَهُۥٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٢﴾

انہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوٓا۟ ءَابَآءَكُمْ وَإِخْوَٰنَكُمْ أَوْلِيَآءَ إِنِ ٱسْتَحَبُّوا۟ ٱلْكُفْرَ عَلَى ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿٢٣﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان پر کفر کو دوست رکھیں اور جو کوئی تم میں سے ان کو دوست بنائے گا، تو یہی ظالم ہیں۔

قُلْ إِن كَانَ ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَٰنُكُمْ

کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے

بلکہ خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانیاں بکار ہیں۔ شروع بیاں سے کیا کہ مشرک جوان کاموں پر فخر کرتے ہیں اول تو حق ہی کیا رکھتے ہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ کیونکہ مسجد اللہ کی عبادت کے لیے بنائی گئی ہے اور یہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ اپنے آپ پر کفر کی شہادت ہے کیونکہ اس وقت خانہ کعبہ بتوں سے بالکل پاک ہو چکا تھا تو اس لیے اب بُت پرستوں کا خانہ کعبہ میں جانا یا اس کی کوئی اور خدمت کرنا خود ان کے اپنے معتقدات کے خلاف تھا اور اس طرح پر شروع کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ آیندہ مشرک خانہ کعبہ کا حج نہ کریں اس کی وجہ بھی بتا دی۔ اور یہ جو فرمایا کہ ان کے عمل بیکار ہیں تو مراد اس سے وہ عمل ہیں جن پر ان کو بوجہ خدمت خانہ کعبہ فخر تھا۔ فرمایا کہ یہ عمل کچھ کام نہیں دے سکتا جب شرک و کفر میں مبتلا ہیں تو خانہ کعبہ کی خدمت یا خانہ کعبہ کا حج کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ خانہ کعبہ کی تولیت کسی مشرک یا کافر قوم کے سپرد نہیں ہو سکتی۔

۱۲۰۴ یعنی چھوٹے چھوٹے فیاضی کے کام اور جہاد فی سبیل اللہ جیسا عظیم الشان کام جو کہ حق کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے پوری جد و جہد کرنے کا نام ہے یکساں نہیں۔ اس کا شان نزول حضرت عباس کا جنگ بدر میں قید ہو کر آنا اور حضرت علیؓ پر فخر کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اس کا نزول ۹ھ کا ہے۔

۱۲۰۵ اللہ کی رحمت اور اس کی رضا جنت کی وہ عظیم الشان نعماء ہیں جن کا ذکر دوسری ساری نعماء سے الگ کیا ہے۔

وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا
وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا
أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي
سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ ط
ع وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِينَ ﴿٢٤﴾

بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے کنبے اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور مکان جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تمھارے نزدیک اللہ اور اسکے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۱۲۷۶

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ
حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ
عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا
رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِينَ ﴿٢٥﴾

یقیناً اللہ نے تمھیں بہت سے میدانوں میں مدد دی، اور حنین کے دن جب تمھاری کثرت تمھیں اچھی لگی، پھر وہ تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی، اور تم پر زمین باوجود فراخی کے تنگ ہو گئی تب تم پیٹھ دیتے ہوئے پھر گئے ۱۲۷۷

ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلٰى رَسُولِهِ وَعَلَى
الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ

تب اللہ نے اپنی تسکین اپنے رسول پر اور مومنوں پر نازل کی اور وہ لشکر اتارے، جن کو تم نہیں دیکھتے تھے اور ان کو جو

ع ۱۲۷۶ اس آیت میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا ایک اصول بیان کیا ہے جس کو آج مسلمانوں نے یہاں تک بھلا رکھا ہے کہ ایک م۔ ج مترجم قرآن نے اپنے ترجمہ کے حاشیہ پر لکھ دیا ہے کہ یہ حکم ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں کے لیے تھا ہمارے لیے نہیں۔ گویا یہاں تک اس حالت سے جو ان کی اصل زندگی کا موجب ہوئی تھی دور پڑ گئے ہیں کہ اب وہ اس اصول کو قابل عمل ہی نہیں سمجھتے اس آیت کی رُو سے مسلمانوں کو اس سے منع نہیں کیا گیا کہ وہ اپنے عزیزوں اور قریبیوں سے تعلق رکھیں یا مال کمائیں یا تجارتیں کریں یا بڑے بڑے مکانات بنائیں بلکہ ان کے سارے تعلقات دنیا کا ذکر کیا۔ ان کی ایسی تجارتوں کا ذکر کیا جن سے ذرا توجہ ادھر اُدھر ہو تو مندی پڑ جائیں۔ ان کے بڑے بڑے محلات و مکانات کا ذکر کیا۔ یہ سب کچھ مسلمان رکھیں، اس کے لیے کوشش کریں مگر اصول یہ رکھیں کہ یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیاری نہ ہوں یعنی اگر خدا کے لیے ان کو قربان کرنے کی ضرورت پڑے تو قربان کر دیں، حق کے قبول کرنے یا پھیلانے میں تعلقات رشتہ داری چھوڑنے پڑتے ہیں تو چھوڑیں، مال برباد ہوتے ہیں تو ہوں، تجارت جاتی ہے تو جائے۔ غرض ان چیزوں کو اسلام پر قربان کرنے کے لیے تیار رہیں اسی آیت قرآنی کا ہی خلاصہ ہے جو اس صدی کے مجدد نے اپنے ساتھیوں سے یہ اقرار لیا ہے "میں دین کو دنیا پر مقدم کروں گا۔" یہ سب چیزیں وسائل میں داخل ہیں مگر خدا اور اس کا رسول اصل غرض ہیں وسائل کو حصول غرض کے لیے قربان کرنا ضروری ہے۔ آخر پر فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرو گے اگر انہیں چیزوں کو تم اصل غرض زندگی بنا لو گے تو پھر تمہارے ساتھ فاسقوں والا معاملہ ہو گا۔

ع ۱۲۷۷ مواطن۔ مَوْطِن کی جمع ہے اور وَطَنٌ وہ جگہ ہے جہاں انسان اقامت رکھتا ہے اسے مَوْطِن بھی کہا جاتا ہے اور اس سے مراد لڑائی کا میدان بھی لیا جاتا ہے (ل)

جنگ حنین: حنین۔ مکہ اور طائف کے درمیان وادی ہے۔ مکہ سے صرف تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ مکہ کو فتح کرنے کے بعد رسول اللہ صلعم کو خبریں پہنچیں کہ ہوازن اور ثقیف مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ نے مناسب سمجھا کہ قبل اس کے کہ وہ زور پکڑیں اس شورش کو دبا دیا جائے۔ چنانچہ آپ کی دس ہزار جمعیت کے ساتھ جس کو لیکر مکہ فتح کیا تھا اور جس میں اب دو ہزار طلقاء مل کر کل تعداد بارہ ہزار ہو گئی تھی باہر نکلے۔ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر فخر ہوا۔ بالمقابل دشمن صرف چار ہزار تھے۔ ہوازن اور ثقیف مشہور تیرانداز تھے اور پہاڑوں کے تنگ رستوں پر قابض تھے۔ پہلے حملہ میں ہی مسلمانوں پر اس قدر زور سے تیروں کی بوچھاڑ ہوئی کہ جو فوج آگے بڑھی تھی اور جس میں اکثر طلقا تھے۔ اس نے پیٹھ پھیر لی اس کا اثر پچھلی فوج پر پڑا اور آن کی آن میں بارہ ہزار کی فوج بھاگ گئی۔ قدرت خداوندی کا نظارہ تھا، مگر نبی کریم صلعم اپنی خچر پر سوار اور حضرت عباس آپکی رکاب پکڑے ہوئے برابر دشمن کی طرف بڑھے جا رہے تھے اور بلند آواز سے یوں پکار رہے تھے انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب میں نبی ہوں کوئی جھوٹ نہیں میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ یہ ہمت اور شجاعت کا نظارہ ایسا تھا کہ بے اثر رہتا۔ تھوڑی ہی دیر میں لوگ آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ ساری فوج کا رخ پلٹا اور دوبارہ حملہ کر کے دشمن کو شکست دی۔ زمین کے تنگ ہونے سے مراد وہی پسپائی کی حالت ہے جب بھاگنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ یہاں اس گزشتہ واقعہ کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ مسلمان متنبہ رہیں کہ ان کے لیے فتح و ظفر کا موجب نصرت الٰہی ہے نہ ان کی کثرت وہ اپنی کثرت پر کبھی نازاں نہ ہوں۔

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦﴾
ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٧﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ
نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ
بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً
فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٨﴾
قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا
بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ
اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا
الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾ ع

کافر تھے عذاب دیا اور یہی کافروں کی سزا ہے ۱۲۷۸
پھر اللہ اس کے بعد جس پر چاہے رجوع برحمت کرے اور
اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، مشرک ضرور پلید ہیں۔
سو اپنے اِس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس نہ آئیں ۱۲۷۹
اور اگر تم کو مفلسی کا ڈر ہو تو اللہ اگر چاہے گا تم کو اپنے
فضل سے غنی کر دے گا۔
اللہ علم والا حکمت والا ہے ۱۲۸۰
اُن سے جنگ کرو، جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ
پچھلے دن پر اور نہ ہی ان چیزوں کو حرام ٹھیراتے ہیں، جو اللہ
اور اس کے رسول نے حرام کیں اور نہ سچے دین کو اختیار کرتے ہیں،
ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے
جزیہ دیں اور وہ محکوم ہوں ۱۲۸۱

۱۲۷۸ جنود الم تروها۔ ملائکہ کی نصرت ہے۔ اور لم تروها ان کو تم نے دیکھا نہیں ثابت کرتا ہے کہ ملائکہ کا نزول جو جنگوں میں ہوا وہ ان آنکھوں سے نہیں دیکھا گیا۔ ہاں کسی صحابی نے کشفی نظر سے دیکھ لیا ہو تو الگ بات ہے۔

۱۲۷۹ نجس۔ نجاسة پلیدی کو کہتے ہیں وہ بھی جو حاسہ سے معلوم ہو یعنی جسمانی پلیدی اور وہ بھی جو بصیرت سے معلوم ہو یعنی باطنی ناپاکی (غ) اور یہاں مراد روحانی نجاست ہے اور مبالغہ کے لیے اسم کو استعمال کیا ہے۔ گویا عین نجاست ہیں۔ مراد یہ نہیں کہ ان کے جسم پلید ہیں ان سے مسجد حرام پلید ہو جائے گی، بلکہ ان کے عقاید اور شرک ناپاک ہیں اور مسجد حرام کو اللہ تعالیٰ نے توحید کا پاک نشان بنایا ہے۔
مسجد حرام میں مشرکوں کے آنے کو روک دیا۔ اس لیے کوئی غیر مسلم حدود حرم میں داخل نہیں ہو سکتا اور یہ حکم حج سے مخصوص نہیں بلکہ عام ہے یعنی کسی وقت بھی غیر مسلم حدود حرم میں داخل نہ ہو۔ اور مشرک کے لفظ میں ہر غیر مسلم اس لیے داخل ہے کہ توحید کا مذہب سوائے اسلام کے کوئی نہیں رہا یہ حکم ہر ایک مسجد کے لیے نہیں بلکہ خاص مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کے لیے ہے۔ اور اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تا اسلام کا یہ مرکز غیر مسلموں کے تصرف میں نہ آنے پائے۔ بلکہ یہ امر کمال علم الٰہی پر دلالت کرتا ہے کہ ان حالات کا انکشاف آنحضرت صلعم پر کیا جو تیرہ سو سال بعد دنیا میں پیدا ہونے والے تھے کہ غیر مسلم طاقتیں مسلمانوں کے ملکوں میں تھوڑی تھوڑی آمد و رفت کرتے کرتے پھر تدریجاً کچھ رسوخ حاصل کرتے کرتے آخر ان ممالک پر متصرف ہو جائینگی اس لیے عالم الغیب اور حکیم خدا نے (جیسا کہ آخری الفاظ ان اللہ علیم حکیم میں اشارہ کیا) اپنے کامل علم و حکمت سے حدود حرم کو جو اسلام کا مرکز ہے غیر مسلموں کے دخول سے پاک رکھا۔ ہاں یہ حکم مسلمانوں کو دیا ہے جس میں یہ بھی بتا دیا کہ بادشاہت اس ملک کی تمہارے ہی ہاتھ میں رہے گی اور تم اس امر کے بجا لانے پر قادر رہو گے۔

۱۲۸۰ مکہ کے لیے فقر کی بیخوفی کی بشارت: عیلة کے معنی فقر ہیں اور عال کے معنی فقیر ہو گیا ووجدك عائلا فاغنی (الضحیٰ ۹۳-۸) مفلسی کے خوف کا ذکر اس لیے کیا کہ مکہ تو خود وادی غیر ذی زرع میں تھا۔ تجارت سے اس کی ساری رونق تھی۔ بالخصوص موسم حج میں تجارتی مال دور دور سے لوگ ساتھ لاتے تھے اور اہل مکہ کو بیٹھے بٹھائے تجارت سے نفع حاصل ہوتا تھا۔ سو فرمایا کہ یہ خوف مت کرو۔ اللہ تعالیٰ اسکے سامان اپنے فضل سے پیدا کر دے گا۔ وہ فضل کے سامان یہ تھے کہ سارے ملک عرب کو مسلمان کر دیا بلکہ سارے عالم میں اسلام کو پھیلا دیا۔

۱۲۸۱ الجزیة یہ لفظ جزا سے نکلا ہے جس کے معنی بدلہ ہیں۔ اس لیے جزیة کسی چیز کا بدلہ ہے وتسمیتها بذلك للاجتزاء بها فی حقن دمهم (غ) یعنی اس کا نام جزیہ اس لیے رکھا گیا کہ یہ ان کی جانوں کی حفاظت کا بدلہ ہے جن سے لیا جاتا ہے۔ گویا جزیہ ایک ٹیکس ہے جو غیر مسلموں سے اخراجات حفاظت ملک کے بدلہ میں لیا جاتا ہے۔ جس حفاظت کے لیے مسلمان اپنی جان دیتا ہے دوسرے سے صرف ایک قلیل رقم لی جاتی ہے۔ جب مسلمان کسی دوسری قوم پر حکومت کریں گے تو لازماً ان کے جان و مال کی حفاظت وہ کریں گے کیونکہ حفاظت کا کام حکومت کے سپرد ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی دشمن سے

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اور یہودی کہتے ہیں عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور عیسائی کہتے ہیں مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کے مُنہ کی باتیں ہیں[١٢٨٢] یہ ان کی بات کی نقل کرتے ہیں، جو پہلے کافر ہوئے۔

بھی ان کی حفاظت کریں گے۔ اس کے عوض ان سے ایک رقم لے لیجاتی تھی۔ جو اس حفاظت کا معاوضہ ہو جاتی تھی۔ اسی کو جزیہ کہا جاتا ہے اور یہ امر کہ یہ صرف حفاظت کا بدلہ ہے اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب اسلامی فوجیں حمص سے جو شام میں واقع ہے ہٹ آئیں تو حضرت ابو عبیدہ نے وہاں کے یہودیوں اور عیسائیوں کو بلا کر کئی لاکھ کی رقم جزیہ سب واپس کر دی کہ اب ہم چونکہ تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لیے یہ رقم ہم نہیں رکھ سکتے اور ایسا ہی اضلاع میں لکھ دیا کہ جہاں سے اسلامی لشکر ہٹ آئے وہاں کی رقم جزیہ واپس کر دی جائے۔

عن ید۔ ید کے معنی ہاتھ اور مجازاً قوت کے معنی میں آتا ہے۔ تو مراد ہوئی قوت کی وجہ سے یعنی مسلمانوں کے ان پر غالب ہونے کی وجہ سے اور راغب نے اس کے معنی کیے ہیں عَنْ مقابلَةِ نِعْمَةٍ علیهم فی مُقارَّتِہِمْ یعنی اس نعمت کے مقابل پر جو ان کو آرام دیا جانے سے ملی ہے اور بعض نے عن ید کے معنی عن غنی کیے ہیں یعنی غنی ہونے کی حالت میں جزیہ دیں اس لیے کہ فقیر عاجز سے جزیہ نہیں لیا جاتا (رد) یہ معنی اس لیے قابل ترجیح ہیں کہ محکومیت کا مفہوم صاغرون میں آجاتا ہے۔

صاغرون۔ صاغر کے معنی راغب نے لکھے ہیں جو چھوٹے مرتبہ پر راضی ہو۔ پس مراد حالت محکومیت ہے۔

اہل کتاب کے ساتھ جنگ کے احکام: یہ آیت مضمون سابق کے لیے بطور تتمہ کے ہے۔ قرآن کریم میں اور بالخصوص اس سورت میں جس قدر احکام جنگ کے متعلق اب تک آئے ہیں وہ سب مشرکوں کے متعلق ہیں اور یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید سوائے مشرکوں کے مسلمانوں کو دوسروں سے جنگ کی ضرورت ہی کبھی پیش نہ آئیگی اس لیے اہل کتاب کا نام بھی یہاں لے دیا ہے اور منشا صرف اس قدر ہے کہ جن حالات میں مشرکوں سے جنگ کی اجازت یا حکم دیا ہے انہی حالات میں اہل کتاب سے بھی جنگ جائز ہے۔ اور اہل کتاب کا نقشہ جو کھینچا ہے تو اس میں بھی بتایا ہے کہ یہ مذہب حق سے جس پر ان کو قائم کیا گیا تھا بالکل گر گئے ہیں۔ جس کی تفصیل اگلے رکوع میں آئے گی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہاں قاتلوا کا حکم ہے اور مقاتلہ میں دو فریق ہوتے ہیں اقتلوا کا حکم نہیں کہ انہیں قتل کرنے کا اختیار ہو اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے قتال پر جو حد بندی وارد ہو چکی ہے وہ اہل کتاب کی صورت میں باطل نہیں ہو جاتی اور وہ یہ ہے قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا یعنی جنگ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہو جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور پھر ضرورت جنگ سے نہ بڑھیں۔

کیا نبی کریم صلعم کا عمل اس کے مطابق تھا یا نہیں۔ رومن امپائر عرب کے شمال میں لگتی تھی اور آپ کو خبر پہنچی کہ یہ لوگ عرب پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپ نے فوراً تیس ہزار کی فوج جمع کی اور عرب کی شمالی حد پر پہنچ گئے۔ یہ غزوۂ تبوک ہے جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔ مگر وہاں آپ نے مقابلہ کے لیے کوئی لشکر تیار نہ پایا۔ اب اگر اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم مشروط نہ ہوتا تو ظاہر تھا کہ حکم بھی موجود ہے فوج بھی موجود ہے۔ مقابل میں تیاری نہ ہونے سے کامیابی کی امید بھی بہت زیادہ ہے مگر نبی کریم صلعم نے کیا کیا؟ بغیر جنگ کے واپس آئے۔ کیوں؟ اس لیے کہ الذین یقاتلونکم کی شرط پوری نہ ہوئی تھی۔ پس الفاظ قرآنی اور عمل نبی کریم صلعم دونوں اس پر شاہد ہیں کہ اہل کتاب سے جنگ بھی اسی طرح مشروط ہے جس طرح مشرکوں سے۔

ہاں یہاں یہ فرمایا کہ اہل کتاب یعنی دوسرے مذاہب تو ہمیشہ رہیں گے عرب کی بت پرستی کی طرح نابود نہ ہو جائیں گے۔ اس لیے فرمایا کہ جنگ ان سے کرنی پڑے اور وہ جزیہ قبول کریں تو جنگ مت کرو اور جزیہ کے لینے میں جو حاکم کا کام ہے اور ان کے لیے لفظ صاغر اختیار کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اہل کتاب کے ساتھ جنگوں میں مسلمان کامیاب ہونگے اور اہل کتاب مغلوب ہونگے۔

١٢٨٢ اہل کتاب کے ساتھ جنگوں کا ذکر کیا تو بتا دیا کہ یہ لوگ بھی اسلام کی کامیابی کو نہیں چاہتے اور اس کے خلاف کوشش کرتے ہیں مگر اسلام آخر کار غالب ہوگا۔ مگر اصل مضمون سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کی غلطیوں کا کچھ ذکر کیا ہے۔

حضرت عزیرؑ: عزیر یا عزرا یہودیوں میں ایک بڑے عظیم الشان نبی گزرے ہیں۔ علمائے طالمود نے ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز بیان کیے ہیں۔ یہاں تک کہ یہودی انسکلوپیڈیا میں ہے بعض نے کہا ہے کہ اگر موسیٰ پر شریعت نازل نہ ہوئی ہوتی تو عزیر پر نازل ہوتی۔ ممکن ہے اس زمانہ میں یہودیوں کی قوم اس قسم کے بیانات کی وجہ سے اور عیسائیوں کے مقابل میں آ کر سچ مچ عزیر کو ابن اللہ کہنے لگی ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں جس قدر مباحثات یہود کے ساتھ ہیں ان میں ان کو براہ راست یہ الزام نہیں دیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن اللہ ہونے کا عقیدہ اگر فی الواقع ان میں تھا تو ساری قوم کا نہ تھا کسی ایک شاخ کا ہوگا اور یا ممکن ہے کہ یہاں ابن اللہ کا استعمال اسی معنی میں ہوا ہو۔ جیسے دوسری جگہ ہے وقالت الیہود والنصاریٰ نحن ابناء اللہ واحباءہ (المائدۃ ۵ – ۱۸) اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ جہاں ابناء اللہ کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے۔ اور مطلب صرف یہی ہے کہ اس کے ایسے پیارے ہیں جیسے باپ کو بیٹا پیارا ہوتا ہے۔ اسی طرح عزیر کو ابن اللہ کہنے سے مراد یہی ہو کہ وہ ان کی عزت ان کے اصل مرتبہ سے بڑھ کر کرتے ہیں۔

مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۳۰
اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ
اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳۱
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ
وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ
كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۳۲
هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ
دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ
ع وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳

اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے اُلٹے پھرے جاتے ہیں [۱۲۸۳]
انھوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوائے رب بنالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو اور ان کو سوائے اس کے کچھ حکم نہ دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک ٹھیراتے ہیں [۱۲۸۴]
وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے مونہوں سے بجھادیں، اور اللہ کو کچھ منظور نہیں مگر یہی کہ اپنے نور کو پورا کرے، گو کافر بُرا ہی مانیں [۱۲۸۵]
وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس کو کل دینوں پر غالب کرے، گو مشرک بُرا ہی مانیں [۱۲۸۶]

ع۱۲۸۳ یضاھؤن ۔ ضاھی بغیر ہمزہ کے اور ہمزہ کے ساتھ دونوں طرح آیا ہے اور اس کے معنی ہیں مشابہت اختیار کی (غ)
قاتلھم کے معنی بعض نے کیے ہیں اللہ ان پر لعنت کرے اور بعض نے اللہ ان کو قتل کرے۔ راغب کہتے ہیں درست یہ ہے کہ یہ باب مُفَاعَلَة سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ گویا ایسا شخص اللہ کے ساتھ جنگ کا قصد کرتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ مقابلہ کرے گا وہ مغلوب ہوگا۔

ان الفاظ میں ایک ایسی بات کی خبر دی ہے جس کی اطلاع آج دنیا کو ہوئی ہے یعنی یہ کہ عیسائیوں نے خدا کا بیٹا تجویز کرنے میں پہلی کافر قوموں کی نقل کی ہے آج یونانیوں اور رومیوں کے مذہب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فی الواقع یہ خدا کا بیٹا بنانے کا عقیدہ ان میں مروج تھا اور وہیں سے پولوس نے اس کو لیا۔ کیونکہ جب اس نے دیکھا کہ یہودی تو حضرت عیسٰے کو قبول نہیں کرتے تو اس نے حضرت مسیح کے بعض الفاظ کو جو مجاز اور استعارہ کے طور پر تھے حقیقت پر محمول کرکے اور اصل بنائے مذہب قرار دے کر بت پرستی سے ملتا جلتا ایک مذہب بنا دیا جس کی وجہ سے غیر یہودی اقوام کا میلان عیسائیت کی طرف بہت ہوگیا۔ یہی الزام قرآن شریف نے دیا ہے کہ عیسائیوں کا مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینا ان کی ایجاد نہیں، بلکہ پہلی کافر قوموں کی ریس کرکے یہ مذہب بنالیا ہے یوں تو عرب کے لوگ بھی خدا کی طرف بیٹیاں منسوب کرتے تھے مگر من قبل کا لفظ بڑھا کر یہ صاف کردیا کہ قرآن کریم کی مراد عیسائیت سے پہلی کافر قومیں ہیں +

ع۱۲۸۴ ارباب ۔ ربّ کی جمع ہے دیکھو ع۲۔ جب کسی کی اطاعت میں غلو کیا جائے تو اسے بھی معبود یا رب ہی کہدیا جاتا ہے۔ چنانچہ عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ انھوں نے اس آیت کے نزول پر رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ لوگ احبار و رہبان کی عبادت تو نہ کرتے تھے تو آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں کہ جو اللہ نے حلال کیا ہے اسے وہ حرام کہہ دیتے تو لوگ بھی اسے حرام سمجھ لیتے اور جو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کہہ دیتے تو لوگ بھی اسے حلال سمجھ لیتے
مسیح ابن مریم کا نام الگ لینے سے بالخصوص عیسائیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جن کا ذکر اگلی آیت میں ہے اس معیار پر آج مسلمانوں میں جس قدر گدیاں ہیں اِلّا ماشاء اللہ ان سب کو ان کے مرید اربابا من دون اللہ سے کم نہیں سمجھتے، کیونکہ جو کچھ پیر کہدے اس کے مقابل شریعت کی پروا بھی نہیں کی جاتی ؛

ع۱۲۸۵ نور اللہ سے مراد نبوت محمدیہ ہے یا دین اسلام ۔ بافواھھم سے مراد ان کے اقوال باطلہ ہیں جن کے ساتھ دلیل کوئی نہیں۔
اس آیت میں ایک طرف تو یہ بتایا کہ عیسائیوں کے کیا کیا منصوبے اسلام کے خلاف ہیں اور وہ کس طرح اسلام کے نیست و نابود کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف نہایت پرزور الفاظ میں یہ خبر ہے کہ دین اسلام کامل ہو کر رہے گا۔

ع۱۲۸۶ یُظہر ۔ ظَہر کے معنی پیٹھ ہیں اور سواری کو بھی کہتے ہیں اور بطور استعارہ اس پر بھی بولا جاتا ہے جس سے قوت ملے۔ اور ظَھَر علیہ کے معنی ہیں غلبہ یعنی اس پر غالب آگیا۔ اسی سے یظھرہ غالب کرنے کے معنی میں ہے (غ)

یہ دوسری خوشخبری ہے۔ پہلی آیت میں تو یہ بتایا تھا کہ دین اسلام کو یہ نیست و نابود نہیں کرسکیں گے۔ اب فرمایا کہ یہی نہیں بلکہ یہ دین کل ادیان پر غالب کردیا جائیگا۔ عیسائی اس بات پر خوش ہو رہے ہیں کہ اب اسلام کی حکومت دنیا سے اُٹھ گئی اس لیے اب عیسائیت غالب آجائے گی۔ لیکن اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ اسلام کی حکومت باوجود مسلمانوں کی محکومی کے دنیا پر بڑھ رہی ہے۔ اسلام کی حکومت پہلے بھی دلوں پر تھی اب بھی دلوں پر ہے۔ ہاں مسلمانوں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو یقیناً بہت سے علماء اور راہب لوگوں کے مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۳۴﴾

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں، اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے ع۱۲۸۷

يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا

جس دن اس مال کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائیگا پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائینگی یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، سو اس کا مزہ

کو حکومت دیدی گئی تھی کیونکہ اس وقت بغیر اسلامی حکومت کے اسلام کا پھیلنا ناممکن تھا۔

عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ: اب بغیر مسلمانوں کی حکومت کے بھی اسلام پھیل سکتا ہے اور چونکہ عیسائیوں کا یہ اعتراض اسلام پر تھا کہ مسلمانوں کی حکومت کی وجہ سے ابتدا میں اسلام پھیل گیا اور بزورِ شمشیر پھیلا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری قوم کے ہاتھ میں حکومت اور تلوار دے کر ان کو اس بات پر بھی آمادہ کر دیا ہے کہ وہ سارا زور اسلام کے خلاف لگالیں بالآخر حق ہی غالب ہوگا۔ چنانچہ ایک طرف اگر اسلامی حکومتیں گرتی جاتی ہیں تو دوسری طرف اصول اسلام غالب آتے چلے جاتے ہیں۔ توحید اسلامی۔ مساوات نسل انسانی جس کی تعلیم اسلام نے دی اگر ایک طرف روز بروز ترقی کر رہے ہیں تو دوسری طرف تثلیث و کفارہ کے اصول خود بخود مٹتے چلے جاتے ہیں۔ ساری دنیا پر عیسائیت کی حکومت ظاہری کے باوجود اس کی حکومت باطنی گر گئی اور مسلمانوں کی محکومیت کے باوجود اسلام کی حکومت باطنی مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔

اکثر مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ اظہار دین اس امت میں مسیح موعود کے ظہور کے بعد ہوگا (ج)۔ البتہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اظہار اسلام سے مراد کل ملل کا ہلاک ہو جانا ہے۔ بلکہ غلبہ یا اظہار کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ دوسرے دین بھی رہیں گے مگر غالب دین اسلام ہوگا۔ اس زمانہ میں دین عیسوی کے عقاید خود بخود اس طرح دلوں سے نکلتے چلے جاتے ہیں اور خود عیسائی ان سے اس طرح بیزار ہو رہے ہیں اور دوسری طرف عقاید حقہ اسلامیہ کی قبولیت یوں خود بخود بڑھتی جاتی ہے کہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کا زمانہ آچکا ہے۔

ع۱۲۸۷ اس آیت میں اول علماء و مشائخ کے مال و زر بالباطل کھانے کا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ اس زمانہ میں علمائے یہود و نصاریٰ عوام کالانعام کو اس طرح دھوکہ دیکر ان کا مال کھاتے تھے کہ ہم کو راضی کرو گے تو اللہ راضی ہو جائے گا اور رشوتیں لیکر فتوی دیتے تھے۔ مگر یہ یہود و نصاریٰ کے علما تک محدود نہیں۔ بلکہ ان کے ذکر میں مسلمانوں کو سمجھایا ہے۔ چنانچہ ہمارے اس زمانہ میں اکثر علماء و مشائخ کی یہی حالت ہے کہ وہ بھی اپنی رضا میں خدا کی رضا بتاتے ہیں۔ یہی لوگ پھر اللہ کی راہ سے روکنے والے بھی ہو جاتے ہیں اس لیے کہ ذاتی اغراض درمیان میں آجاتی ہیں۔ اور یہ لوگ حق کے دشمن ہو جاتے ہیں اسی وجہ سے یہود و نصاریٰ کے علماء آنحضرت صلعم کے دشمن ہو گئے تھے اور آج بھی علماء و مشائخ نے اس حق کی مخالفت کی جو ایک مجدد کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ نے ظاہر فرمایا تھا اور جس نے سوائے خدمت دین اسلام کے اور کسی طرف نہیں بلایا۔

سونے اور چاندی کے جمع کرنے سے کیا مراد ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے اس بارہ میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ ان کے نزدیک سونے چاندی کا گھر میں رکھنا ہی منع تھا۔ اس بارہ میں ان کا صحابہؓ سے اختلاف بھی سخت تھا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ کعبؓ کے پیچھے ڈنڈا لیکر دوڑے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر پناہ لی جس کی وجہ سے آخر کار حضرت عثمانؓ کو حکم دینا پڑا کہ وہ ربذہ میں جا رہیں تاکہ فساد نہ ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال درست نہیں اس لیے کہ پھر زکوٰۃ کس چیز پر ہے اور وراثت کی تقسیم کا کیا مطلب ہے۔ خود نبی کریم صلعم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مال کو پاک کرنے کے لیے زکوٰۃ فرض کی گئی ہے پس مال کی وہی محبت بری ہے جب انسان اللہ کی راہ میں کچھ صرف نہ کرے۔ یا غربا کا اس میں کچھ حق نہ سمجھے۔ مال کے جمع کرنے کے بارہ میں افراط و تفریط دونوں راہوں سے بچنا چاہیئے آج اگر ایک طرف مال کے چند افراد کے ہاتھ میں جمع ہونے سے یورپ میں مصائب پیش آرہی ہیں تو ان کے بالمقابل بولشویکوں کا گروہ پیدا ہو گیا ہے جنہوں نے تفریط کی راہ اختیار کی ہے اسلام کی تعلیم اعلیٰ درجہ کے اقتصاد اور میانہ روی کی ہے۔ مال بھی جمع کرو مگر غربا کا حصہ دیتے رہو اور ملامت ان لوگوں کو کی ہے جو مال جمع کرتے ہیں پھر اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے صرف جمع کرنے والوں کو ملامت نہیں۔

مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿٣٥﴾

چکھو جو تم جمع کرتے تھے [۱۲۸۸]

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ
شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ
الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ
اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً
كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٦﴾

مہینوں کی گنتی اللہ (تعالیٰ) کے نزدیک اللہ کے حکم میں بارہ مہینے ہے، جس دن آسمان اور زمین پیدا کیے۔ ان میں سے چار حرمت والے ہیں یہ دین مضبوط ہے۔ سو ان میں اپنے اوپر ظلم مت کرو اور مشرکوں سے سب کے سب جنگ کرو، جس طرح وہ تم سے سب کے سب جنگ کرتے ہیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے [۱۲۸۹]

اِنَّمَا النَّسِيْۗءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ
عَامًا لِّيُوَاطِــــُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا
مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ
ع وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٧﴾

مہینوں کا پیچھے کر دینا کفر کی ایک زیادتی ہے وہ جو کافر ہیں اس سے گمراہ ہوتے ہیں ایک سال اسے حلال قرار دیتے ہیں اور ایک سال اسے حرام قرار دیتے ہیں تا کہ ان (مہینوں) کی گنتی کے مطابق کر لیں جو اللہ نے حرام کیے ہیں اور یوں جو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کر لیں ان کو ان کے بُرے کام اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا [۱۲۹۰]

ع ۱۲۸۸ یحمی۔ حُمّی وہ حرارت ہے جو گرم جواہر سے پیدا ہوتی ہے جیسے آگ اور سورج اور وہ بھی جو بدن میں قوت حارہ سے پیدا ہوتی ہے اور قوت غضبیہ جب جوش میں آئے تو اسے حَمِیَّۃ کہا جاتا ہے حمیۃ الجاھلیۃ (الفتح ۴۸-۲۶)

تکوی۔ کَوِی جانور کے داغ دینے پر بولا جاتا ہے اور مصدر کَیّ ہے۔

جباھھم۔ جَبْھَۃ ماتھے کو کہا جاتا ہے وہ جگہ جو سر میں سے سجدہ میں زمین پر لگتی ہے۔

جنوب۔ جنب کی جمع ہے کروٹ یا پہلو۔

پیشانی وغیرہ کا داغا جانا: آخرت کی سزا کا ذکر عموماً انہی الفاظ میں ہوتا ہے جس قسم کی بدی ہو۔ انسان مال جمع کر کے اس سے دوسروں پر وجاہت قائم کرتا ہے اور دوسروں سے متکبرانہ پیش آتا ہے اور حاجتمندوں پر پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ اس لیے وہ پیشانی جس سے وہ اظہار فخر کرتا ہے اور وہ پہلو جو وہ بوجہ تکبر پھیر لیتا ہے (واذا انعمنا علی الانسان اعرض ونا بجانبہ) اور وہ پیٹھ جو وہ حاجتمند پر پھیرتا ہے سب محل سزا ہو جاتے ہیں اور یوں سزا بھی محیط ہو جاتی ہے کہ سامنے پیشانی پر اور کروٹ پر اور پیٹھ پر سب طرف اس کا اثر ہے۔ دولت کا زا جمع کرتے جانا اور اس کا خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنا اس دنیا میں بھی دکھ کا موجب بن جاتا ہے اور وہ سکھ جو انسان اس سے چاہتا ہے حاصل نہیں ہوتا۔

ع ۱۲۸۹ اہل کتاب کا ذکر درمیان میں ضمنی طور پر آ گیا تھا۔ اصل مضمون مشرکین سے جنگ کا تھا۔ اور غزوۂ تبوک اور منافقین کا ذکر شروع کرنے سے پہلے اسی اصل مضمون کی طرف عود کیا ہے۔ تو چونکہ جنگوں کا ذکر تھا اس لیے حرمت کے مہینے جن میں جنگ کرنا منع کیا گیا ہے ان کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشرک لوگ نسئی کے ذریعہ سے حرمت کے مہینوں کو بدلتے رہتے تھے جس سے امن اُٹھ جاتا تھا چنانچہ خود اسی نویں سال میں حج ذیقعد میں ہوا تھا۔ اس لحاظ سے بھی کہ مشرکوں کے لیے یہ ایک اعلان تھا۔ یہ اطلاع ضروری تھی کہ آئندہ یہ تغیر و تبدل نہ ہو نگے پس فرمایا کہ مہینے تو بارہ ہی ہیں اور پہلے دن سے ہی بارہ ہیں۔ چنانچہ سب قوموں میں سال کے بارہ مہینے ہی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے چار حرمت کے مہینے ہیں جن کے بارہ میں اپنے آپ پر ظلم مت کرو، یعنی ان کے اندر جنگ مت کرو۔ اور اس کو یعنی حرمت کے تسلیم کرنے کو دین قیم کہا ہے۔ اس لحاظ سے کہ یہ ایک مضبوط اصول ہے جس سے جنگوں کے اندر قوموں کی زندگی وابستہ ہے۔ اور یا دین یہاں بمعنی حساب ہے یعنی یہ حساب مضبوط ہے۔ اس سے شک و شبہ پیدا نہیں ہوتا۔

حرمت کے مہینوں کو قائم کر کے پھر فرمایا کہ مشرکوں کے ساتھ سب کے سب جنگ کرو، جس طرح وہ سب کے سب تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں جس میں یہ اصول سمجھایا ہے کہ دشمن کے مقابل میں سب مسلمانوں کو ایک رہنا چاہیئے جس طرح دشمن مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک ہو جاتے ہیں۔

ع ۱۲۹۰ نسئی۔ نسٔ کے معنی تاخیر کرنا یا پیچھے ڈال دینا ہیں۔ اور نسیئۃ حرمت کے مہینوں کا پیچھے ڈال دینا ہے، جو عرب لوگ کرتے تھے (غ) بعض وقت یہ لوگ بول

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ ٱنفِرُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱثَّاقَلْتُمْ إِلَى ٱلْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُم بِٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا مِنَ ٱلْءَاخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَٰعُ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فِى ٱلْءَاخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٣٨﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمھیں کیا ہُوا کہ جب تم کو کہا جائے کہ اللہ کی راہ میں نکلو، تو تم بوجھل ہو کر زمین کی طرف جھک جاتے ہو کیا تم آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہو، سو دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں تھوڑا ہی ہے ع۱۲۹۱

إِلَّا تَنفِرُوا۟ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْـًٔا ۗ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

اگر تم نہ نکلو تو وہ تم کو دردناک عذاب دے گا اور تمھاری جگہ دوسرے لوگ لے آئے گا، اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ع۱۲۹۲

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ ٱللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ثَانِىَ ٱثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِى ٱلْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَٰحِبِهِۦ لَا تَحْزَنْ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَنَا ۖ

اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو یقیناً اللہ نے اس کی مدد کی، جب اس کو اُن لوگوں نے جو کافر تھے نکال دیا (اس حال میں کہ) وہ دو میں کا دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے جب اس نے اپنے رفیق کو کہا غمگین نہ ہو

کیا کرتے تھے کہ اگر جنگ ہو رہی ہو اور حرمت کا مہینہ آجائے تو اسے پیچھے ڈال دیتے یعنی اس کی بجائے کسی پچھلے مہینہ کو حرمت والا قرار دے لیتے۔ بعض اور اغراض کے لیے بھی ایسا کر لیتے تھے۔ اس سے ناواقفوں کو بڑی تکلیف ہوتی تھی اس لیے نسئی کو ناجائز قرار دیا گیا اور فرمایا کہ خدا کے حکم میں جب چار ماہ کی حرمت قرار دی گئی تو یہ نسئی نہ تھی یہ پیچھے کافروں نے اپنی اغراض کے لیے بنالی۔ اس لیے اب اس کو دور کیا جاتا ہے۔

ع۱۲۹۱ انفروا۔ نفر۔ قرار پکڑنے کی ضد ہے (ل) یا گھبرا کر ایک چیز سے ہٹ جانا یا ایک چیز کی طرف نکل پڑنا مازادھم الانفورا (فاطر ۴۲) اور جنگ میں نکلنے کو بھی نفر کہا جاتا ہے اور نَفَر اور نفیر کئی آدمیوں کو کہتے ہیں گویا ان کے لیے باہر نکلنا ممکن ہے (غ)

اثاقلتم۔ ثِقْل۔ خِفّة کے مقابلہ پر ہے اور اجسام اور معانی دونوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور ثقیل کا استعمال انسان میں اکثر ذم کے مقام پر ہوتا ہے کبھی مدح پر بھی اور چونکہ اجسام میں ثقیل وہ ہیں جن کا میلان نیچے کی طرف ہوتا ہے جیسے پتھر وغیرہ اور خفیف وہ جن کا میلان اوپر کی طرف ہو اس لیے اثاقل میں اشارہ یہاں پستی کی طرف جھک جانے کی طرف ہے (غ) اور اس کا اصل تثاقلتم ہے۔

یہاں سے جنگ تبوک اور اس کے متعلق واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ یہ مہم رجب ۹ھ میں تیار ہوئی اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ نبی کریم صلعم کو سلطنت روما کے متعلق یہ خبریں متواتر پہنچیں کہ وہ عرب پر حملہ کرنا چاہتے ہیں جنگ کے معاملہ میں آپ کا طریق نہایت احتیاط کا تھا۔ جب کبھی کسی قوم کی تیاری کی خبر آپ کو پہنچی آپ فوراً اس کے انسداد کے لیے مہم روانہ کر دیتے تھے۔ اس موقعہ پر بھی متواتر خبروں کے پہنچنے پر آپ نے تیاری کا حکم دیا۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ اوّل تو ایام قحط تھے۔ دوسرے ملک شام کی حدود تک ایک بہت ہی لمبا سفر تھا اور راستہ میں پانی اور رسد وغیرہ کی قلت تھی۔ تیسرے فصل بالکل پختہ کاٹنے کے لیے تیار تھی۔ اور اس حالت میں اس کو چھوڑنا بڑا مشکل تھا۔ چوتھے موسم سخت گرمی کا تھا۔ اور پانچویں مقابلہ عرب کی کسی قوم سے نہ تھا بلکہ ایک منتظم سلطنت کی باقاعدہ فوجوں سے مقابلہ تھا جو ہر قسم کے سامان جنگ سے آراستہ تھیں اور روما اور ایران کی سلطنتوں سے عرب کے لوگ ہمیشہ خائف رہتے تھے کیونکہ ان کی طاقت کے سامنے عربوں کی طاقت ہیچ تھی۔ مگر باوجود ان مشکلات کے مسلمانوں نے نبی کریم صلعم کی آواز پر لبیک کہا اور تیس ہزار آدمی آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور کسی نے مشکلات کی پروا نہ کی۔ بلکہ جو لوگ تنگدست تھے اور سواری کا انتظام ان کے لیے نہ ہو سکا وہ روتے ہوئے پیچھے رہے البتہ منافقوں کی تمیز کا یہ آخری موقعہ آپہنچا تھا۔ اور وہ طرح طرح کے عذر کر کے رہ گئے۔ یہ جنگ عیسائیوں سے تھی اور اس لیے اس کے ذکر سے پہلے اہل کتاب کے ساتھ جنگ کا ذکر بھی آچکا ہے۔ اور نبی کریم صلعم کی جنگوں میں یہ سب سے آخری جنگ تھی۔ شاید یہ اشارہ تھا کہ آخر کار مسلمانوں کا مقابلہ عیسائیوں سے ہی رہ جائے گا۔ اور یہاں جو اثاقلتم الی الارض کہا تو مطلب اس کا یہ نہیں کہ مومن زمین کی طرف جھک گئے تھے بلکہ یہ بطور حث ہے اور خطاب ان لوگوں سے ہے جو نرا منہ سے دعوئ ایمان کرتے تھے جیسا کہ آیت ۴۰ میں الا تنصروہ سے ظاہر ہے کیونکہ مومن مدد کرنے والے تھے۔

ع۱۲۹۲ یہ عذاب منافقین کو ہی ملا جس سے معلوم ہوا کہ یہاں خطاب منافقوں سے ہی ہے ولا تضروہ شیئاً یعنی جنگ کیلئے تمہارے نہ نکلنے سے اللہ تعالیٰ کا اور اس کے دین کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

اللہ ہمارے ساتھ ہے، سو اللہ نے اپنی تسکین اس پر اتاری اور اس کو ایسے لشکروں سے قوت دی جن کو تم نہ دیکھتے تھے اور اُن لوگوں کی بات کو جو کافر تھے نیچا دکھایا اور اللہ کی بات ہی بلند ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے ۱۲۹۳

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

ہلکے اور بوجھل نکل پڑو، اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ۱۲۹۴

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

اگر فائدہ جلد ملنے والا اور سفر میانہ ہوتا، تو ضرور تیرے پیچھے ہو لیتے، لیکن مشقت کا سفر انھیں بہت دور معلوم ہوا۔ اور اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ نکلتے، اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ جانتا

۱۲۹۳ غار۔ غَوْر سے ہے اور غَوْر ہر چیز کی گہرائی کو کہتے ہیں اور اسی سے پہاڑ کی غار ہے اور مَغَار اور مَغَارة بھی غار کی طرح ہے اور او مغٰرٰت (التوبۃ ۹: ۵۷) اور پانی کے بہت گہرائی میں چلے جانے پر بھی بولا جاتا ہے اصبح ماؤکم غورا (الملک ۶۷: ۳۰) اور اسی سے غَوْر کسی چیز میں فکر کرنا ہے (ل)

اس آیت میں مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسی کیسی مشکلات کے وقت میں اسلام کی نصرت کرتا رہا ہے اور نبی کریم صلعم کی انتہائی بےکسی کا نقشہ کھینچکر دکھایا ہے کہ مخالفین اسلام تو اس وقت بھی اسلام کو نیست و نابود نہ کر سکے تو اب مومنوں کو کیا خوف ہے جب اسلام اس قدر پھیل چکا ہے۔

وہ واقعہ جس کا یہاں ذکر ہے نبی کریم صلعم کی مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا واقعہ ہے جس کی طرف اذ اخرجہ الذین کفروا میں اشارہ ہے یعنی کافروں کی وجہ سے آپ کو نکلنا پڑا۔ آپ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ قاتلوں کا جتھا آپ کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس حالت میں آپ ان کے درمیان سے نکلتے ہیں اور سیدھے حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچتے ہیں اور یہ دونوں ساتھی رات کی تاریکی میں نکلتے ہیں۔ نبی کریم صلعم نے سب صحابیوںؓ کو ایک ایک کرکے اپنے سے پہلے رخصت کر دیا تھا۔ سوائے حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے۔ ان میں سے حضرت علیؓ تو آپ کے بستر پر لیٹ رہے اور ان کے پیچھے رہنے کی غرض یہ تھی کہ امانتیں وغیرہ ادا کریں جو نبی کریم صلعم کے ذمہ تھیں اور حضرت ابوبکر کو آپ نے ہجرت میں ساتھی بنانے کے لیے چنا ہوا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ آپ سے بار بار دریافت کرتے رہتے تھے اور آپ فرماتے تھے کہ ابھی ہجرت کی اجازت مجھے نہیں ملی۔ آخر وہ وقت آیا تو آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیکر نکلے جس کی طرف ثانی اثنین میں اشارہ ہے اور جو حضرت ابوبکرؓ کی علو مرتبت پر شاہد ہے۔ تیسرا مرتبہ اذ ھما فی الغار کا بیان کیا ہے یہ غار ثور ہے جو مکہ سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ رات کے وقت غار میں جاکر چھپنا کس قدر خطرات سے پُر ہے اور غار بھی نہایت بےآباد اور سنسان مقام میں جہاں انسان کا گزر نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اس غار میں پہلے داخل ہوئے اور اس کے سارے سوراخوں وغیرہ کو بند کیا اور ہاتھ پھیر کر اندر سے صاف کیا، تب اس بات کا اطمینان کرکے کہ کوئی موذی جانور اندر نہیں نبی کریم صلعم کو اندر داخل ہونے دیا اور اس تاریک پُرخطر جگہ میں یہ دونوں ساتھی چھپے۔ آخر کار دن چڑھا، کفار کو پتہ لگا ہر طرف تلاش شروع ہوئی سراغ غار کے مُنہ تک پہنچا ادھر حضرت ابوبکرؓ نے اوپر پاؤں کی آہٹ سُنی تو آپ کو نہ اپنے لیے بلکہ اپنے پیارے رفیق کے لیے جس کی خاطر سب کچھ قربان کر رکھا تھا فکر ہوا۔ کہ اب گریز کی کوئی جگہ نہیں۔ دو آدمی غار کے اندر ہیں اور دشمنوں کا جمگھٹا اس کے منہ پر، اس حالت میں وحی الٰہی کی تسکین کام دیتی ہے۔ ہم دو نہیں بلکہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ کیا عجب شان خداوندی ہے کہ ایک مکڑی غار کے منہ پر جالا تن دیتی ہے اور تلاش کرنے والے سراغ رسانی کرتے ہوئے غار کے منہ تک پہنچتے اور وہاں سے جالا دیکھ کر واپس ہو جاتے ہیں۔ مکڑی کا جالا جو اوھن البیوت ہے وہ کام دے جاتا ہے جو ایسے اوقات میں بڑے بڑے مضبوط قلعے نہیں دے سکتے۔ یہ نصرت الٰہی کا نظارہ تھا۔

ایدہ بجنود لم تروھا میں یا تو اشارہ اس وقت نزول ملائکہ کی طرف ہے جنہوں نے آنحضرتؐ اور ابوبکرؓ کو تسکین دی اور یا بعد میں جنگوں میں نزول ملائکہ کی طرف اشارہ ہے کلمۃ الذین کفروا یا کافروں کی بات یہ تھی کہ اسلام کو نیست و نابود کر دیا جائے گا کلمۃ اللہ اسلام کے غلبہ کی پیشگوئیاں تھیں۔

خطاب ثانی اثنین میں ان اللہ معنا میں حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت پر صریح دلیل ہے۔ اہل تشیع کو اس کی بڑی لمبی تاویلیں کرنی پڑی ہیں اللہ تعالیٰ کی معیت جو آنحضرت صلعم کو حاصل تھی اس میں حضرت ابوبکرؓ بھی شامل ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی نصرت کو اللہ تعالیٰ اپنی نصرت قرار دیتا ہے۔

۱۲۹۴ خفافا وثقالا ہلکا ہونا اور بوجھل ہونا کئی طرح سے ہو سکتا ہے اس لیے ان الفاظ کی کئی تاویلات کی گئی ہیں۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ خفافا یا ہلکا ہونے

ع ۱۲ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ ۱۲۹۵

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

اللہ تجھے معاف کرے تو نے کیوں اُن کو اجازت دی یہاں تک کہ جو سچے تھے وہ تیرے لیے الگ ہو جاتے اور تو جھوٹوں کو بھی جان لیتا۔ ۱۲۹۶

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾

جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں وہ تجھ سے اجازت نہیں مانگتے کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد نہ کریں اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

وہی تجھ سے اجازت چاہتے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان نہیں لاتے، اور ان کے دل شک میں پڑ گئے سو وہ اپنے شک میں متردد ہیں۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور اگر اُن کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو اس کے لیے سامان مہیا کرتے لیکن اللہ نے اُن کا اُٹھنا پسند نہ کیا، سو اُن کو بوجھل کر دیا اور کہا گیا بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ ۱۲۹۷

میں ہر وہ امر شامل ہے جس کی وجہ سے نکلنا سہل ہو جیسے قوت بدن صحت جسمانی۔ جوانی کی عمر۔ فراخیٔ مال۔ شغل سے فراغت۔ سواری کا ہونا اور اس کے خلاف جو کچھ ہو وہ ثقال میں داخل ہے۔ جیسے ضعف جسمانی، کمزوری۔ بیماری۔ بڑھاپا۔ تنگیٔ مال۔ صورت معاش کا نہ ہونا وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ جب ضرورت آ پڑے تو جس حال میں بھی ہو نکل پڑو۔

ع ۱۲۹۵ عَرَض۔ عَرْض چوڑائی یا وسعت کو کہتے ہیں اور عَرَض وہ ہے جسے ثبات نہ ہو اس لیے حدیث میں آتا ہے الدنیا عَرَضٌ حاضر پس عرض سے مراد تھوڑی دیر رہنے والا منافع یا مال دنیا ہے تریدون عرض الدنیا واللّٰہ یرید الاٰخرۃ (الانفال۔ ۶۷) یاخذون عرض ھذا الادنیٰ (الاعراف۔ ۱۶۹) (غ)

الشقۃ۔ وہ جانب جس کے پہنچنے میں مشقت اٹھانی پڑے اور شِق کے معنی مشقت ہیں الابشق الانفس (غ)

یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو پیچھے رہ گئے یعنی منافقین۔ چنانچہ ایک طرف لاتبعوک صاف بتاتا ہے دوسری طرف ان کا جھوٹی قسمیں کھانا اور پھر اگلے رکوع کا مضمون سب اس پر گواہ ہیں کہ اس رکوع میں منافقوں کا ذکر ہے۔

ع ۱۲۹۶ عفا اللّٰہ عنك۔ یہ کلمہ بعض وقت صرف محبت اور تعظیم کے لیے بولا جاتا ہے (ر) ایسا ہی موقعہ یہاں ہے۔ جنگ تبوک کی مشکلات کو دیکھ کر منافقوں نے جو ہمیشہ جنگوں میں پیچھے رہ جاتے تھے عذر پیش کر کر کے نبی کریم صلعم سے اجازت مانگی۔ آپ میں اس قدر حیا تھی کہ آپ نے ان کا پول کھولنا پسند نہ کیا اور ان کو اجازت دے دی۔ یہ اجازت دینا اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف نہ تھا۔ بلکہ محض ایک طبعی حیا کی وجہ سے اور درحقیقت ایک نہایت بلند مقام اخلاق تھا جس کو ظاہر کرنے کے لیے یہ فرمایا۔ گویا آپ میں صفت عفو اس قدر غالب ہے کہ اس پر ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تجھے بھی معاف کرے۔ یعنی جیسا معاملہ تو لوگوں سے کرتا ہے ایسا ہی اللہ تجھ سے کرے۔ اس میں صدور گناہ کا وہم بھی نہیں پایا جاتا۔ ہاں یہ فرمایا کہ اب موقعہ آ چکا تھا کہ یہ منافق الگ ہو جاتے روح المعانی میں علی بن الجہیم کا شعر متوکل کی مدح میں نقل کیا ہے جس میں یہی لفظ آتے ہیں عفا اللّٰہ عنك اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا لقد عجبت من یوسف علیہ السلام وکرمہ وصبرہ واللّٰہ تعالیٰ یغفر لہ حین سئل عن البقرات العجاف والسمان مجھے یوسف علیہ السلام پر اور آپ کے کرم اور صبر پر تعجب ہے اور اللہ ان کو بخشے جب ان سے دبلی اور موٹی گائیوں کے متعلق سوال کیا گیا۔ یہاں ذکر ان کے کرم و صبر کا ہے اور ساتھ دعائے مغفرت ہے۔ مطلب یہی ہے کہ جس طرح اس نے مغفرت سے کام لیا اللہ اس سے مغفرت کرے۔

ع ۱۲۹۷ اعدوا۔ عُدَّۃ۔ دونوں کا مادہ علاجب اور چونکہ بہتوں کو بھی گننے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے کثرت پر بھی اس کا استعمال ہوا ہے (قلت کے استعمال کے لیے دیکھو ع ۲۲۴) اور اَعْدَدْتَ کے معنی ہیں ایک چیز کو ایسا بنایا کہ دوسرا اس کو شمار میں لائے اور حسب حاجت لے لے۔ اعدت للکافرین (البقرۃ۔ ۲۴)۔ واعد لهم جنات (التوبۃ۔ ۱۰۰) اعتدنا جہنم للکافرین (الکہف۔ ۱۰۲) جو سب تیار کرنے کے معنی میں ہیں اور عُدَّۃ وہ شے کثیر ہے جو گنی جائے مال ہو یا ہتھیار (غ)

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اگر تم میں (مل کر) نکلتے تو تم میں سوائے فساد کے کچھ نہ بڑھاتے اور تمھارے اندر تمھارے لیے دُکھ چاہتے ہوئے چغلیاں پھیلاتے پھرتے اور تم میں اُن کے جاسوس بھی ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے ۱۲۹۸

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

یقیناً انھوں نے پہلے بھی دُکھ میں ڈالنا چاہا اور تیرے لیے تدبیریں کرتے رہے، یہاں تک کہ حق آگیا اور اللہ کا حکم غالب رہا اور وہ بُرا مانتے ہی رہے ۱۲۹۹

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

اور ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے مجھے اجازت دیجیے، اور مجھے دُکھ میں نہ ڈالیے، دیکھو دُکھ میں تو یہ پڑ ہی گئے اور دوزخ یقیناً کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۱۳۰۰

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾

اگر تجھے بھلائی پہنچے انھیں بُرا لگتا ہے اور اگر تجھے تکلیف پہنچے کہتے ہیں ہم نے اپنا کام پہلے ہی سے ٹھیک کر لیا تھا اور وہ پھر جاتے ہیں اس حال میں کہ خوشیاں مناتے ہوتے ہیں۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

کہہ ہم کو ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھی ہے وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ پر ہی مومنوں کو بھروسا رکھنا چاہیے ۱۳۰۱

ثبط۔ ثَبَّطَ کے معنی ہیں روک دیا یا ایک چیز سے ہٹا دیا۔

مطلب یہ ہے کہ ان کا ارادہ کبھی جنگ کے لیے نکلنے کا ہوا ہی نہیں اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ انھوں نے کوئی تیاری ہی نہیں کی ہاں اللہ تعالیٰ کو بھی ان کا نکلنا ناپسند ہی تھا کیونکہ ان سے بوجہ ان کی دلی بیماری کے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا۔ ان کا نہ اُٹھنا اور ان کا رُک رہنا ان کا اپنا فعل ہے مگر اس کو منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کیا ہے کیونکہ ان کے کسی پہلے فعل پر بطور سزا کے اللہ تعالیٰ نے ہی یہ نتیجہ مترتب کیا ہے ان کے نکلنے سے کیا نقصان ہوتا وہ اگلی آیت میں بیان کیا ہے۔

ع ۱۲۹۸ اوضعوا خلالکم۔ وَضَع کے معنی رکھنا اور جانور کے تیز چلنے پر بولا جاتا ہے (غ) اوضع اس کو تیز چلایا اور تیز چلنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ خلال۔ خَلَل کی جمع ہے دو چیزوں کے درمیان خالی جگہ (غ) اوضعوا کا مفعول نمائم مقدر ہے یعنی چغلیاں یا اوضعوا بالنمائم ترکیب ہے اور معنی ہیں مسعوا وَسْطَکُمْ بالنمائم۔

سماعون لھم۔ یعنی ان کی خاطر سننے والے یا اس غرض کے لیے بات سننے والے کہ ان کو پہنچائیں۔ جاسوس۔

چونکہ فی الواقع یہ لوگ مسلمانوں کی تباہی چاہتے تھے۔ اس لیے اگر وہ نکلتے تو فساد پھیلانے کی ہی کوشش کرتے۔ پس ان کا نہ نکلنا بہتری کا موجب ہی تھا۔ گو ان کا یہ فعل مستحسن نہیں۔

ع ۱۲۹۹ قلبوا لک الامور۔ تقلیب الامور یعنی امور کے ہیر پھیر کے معنی محاورہ میں تدبیریں ہیں (غ) کیونکہ تدبیر میں معاملات کے سب پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے۔ مراد ان کی منصوبہ بازیاں اور سازشیں ہیں جو نبی کریم صلعم کے خلاف کرتے رہتے تھے۔

امر اللہ جو اللہ نے پہلے فرما دیا تھا۔ اللہ کا حکم۔ وہی آخرکار غالب رہا۔

ع ۱۳۰۰ روایت ہے کہ بعض منافقوں نے یہ عذر بنا لیا کہ عیسائیوں کی عورتیں خوبصورت ہیں ہم ان کے ساتھ جنگ کرنے جائیں گے تو ان کی وجہ سے فتنہ میں پڑیں گے لیکن یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ آپ کے ساتھ نکلنے سے مال و عیال ہلاک ہو جائے گا ہمیں اس تکلیف میں نہ ڈالیے۔ جواب میں فرمایا دکھوں میں تو اپنے افعال سے پڑ چکے ہیں یعنی اس دنیا میں بھی دکھوں میں مبتلا ہونگے اور پھر جہنم آئندہ زندگی میں ہے۔

ع ۱۳۰۱ یعنی تم ہم کو مصیبت پہنچانے پر قادر نہیں مگر چونکہ بعض مصائب انسان کی ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ایسی مصائب جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر رکھی ہیں ان کو ہم خوشی سے اُٹھانے کو تیار ہیں کیونکہ وہ ہماری بہتری کا موجب ہیں ھو مولٰنا میں اسی طرف اشارہ ہے۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَآ إِلَّآ إِحْدَى
الْحُسْنَيَيْنِ ۖ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ
أَن يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِندِهِۦٓ
أَوْ بِأَيْدِينَا ۖ فَتَرَبَّصُوٓا إِنَّا مَعَكُم مُّتَرَبِّصُونَ ﴿٥٢﴾
قُلْ أَنفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَّن يُتَقَبَّلَ
مِنكُمْ ۖ إِنَّكُمْ كُنتُمْ قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴿٥٣﴾
وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ
إِلَّآ أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِۦ وَلَا
يَأْتُونَ الصَّلَوٰةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا
يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَٰرِهُونَ ﴿٥٤﴾
فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَٰلُهُمْ وَلَآ أَوْلَٰدُهُمْ ۚ
إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِى الْحَيَوٰةِ
الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَٰفِرُونَ ﴿٥٥﴾
وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ وَمَا هُم
مِّنكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ﴿٥٦﴾

کہہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ہی ایک کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمھارے حق میں انتظار کرتے ہیں کہ اللہ تم پر کوئی عذاب (یا) اپنی طرف سے لائے یا ہمارے ہاتھوں سے۔ سو انتظار کرو ہم بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں [ع۱۳۰۲]

کہہ دے خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہرگز قبول نہ کیا جائیگا کیونکہ تم نافرمان قوم ہو [ع۱۳۰۳]

اور کوئی چیز اُن کے حق میں مانع نہیں ہوئی کہ اُن کے خرچ اُن سے قبول کیے جائیں، سوائے اس کے کہ وہ اللہ کا اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں اور نماز کو نہیں آتے مگر اس حال میں کہ وہ کاہل ہوں اور خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ وہ ناخوش ہوں [ع۱۳۰۴]

سو اُن کے مال تجھے تعجّب میں نہ ڈالیں اور نہ ان کی اولاد ہی۔ اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں ان کو عذاب دے اور ان کی جانیں نکلیں جب وہ کافر ہوں [ع۱۳۰۵]

اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تمھیں میں سے ہیں اور وہ تم میں سے نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو ڈر رہے ہیں [ع۱۳۰۶]

ع۱۳۰۲ احدی الحسنین۔ دو بھلائیوں میں سے ایک۔ منافق کبھی تو خیال کرتے تھے کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے مارے جائیں گے کبھی نصرتوں کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ کامیاب ہو جائیں گے ان دونوں باتوں کو مسلمانوں کے حق میں بھلائی فرمایا اس لیے کہ اگر کفار کے ہاتھ سے مارے جائیں تو بہر حال مقصد زندگی تو حاصل کر لیا کہ حق کی خاطر اپنی جانیں دیدیں۔ نتیجہ تو پھر بھی اچھا ہوا۔ اور یا نصرت الٰہی کے ساتھ حق پھیل گیا اور کامیاب ہو گئے تو یہ بھی بھلائی ہے۔ دنیا کے مال کی خاطر دنیا کی عزت کی خاطر، دنیا کی حکومت کی خاطر وہ جنگ نہ کرتے تھے جو ان کا مارا جانا حصول مقصد زندگی کے منافی ہوتا۔ لیکن بالمقابل منافقوں کے لیے عذاب ہی تھا، کیونکہ اگر مسلمان مارے بھی جائیں تو بھی منافقوں کو اس سے فائدہ نہ تھا بلکہ ضرور تھا کہ وہ اپنے اعمالِ بد کی سزا پاتے یہ عذاب من عندہ ہے اور اگر مسلمان کامیاب ہوں تو پھر جو کچھ منصوبے مسلمانوں کی تباہی کے منافقوں نے کیے ضرور تھا کہ ان کی پاداش میں سزا پاتے۔ اس کی طرف بایدینا میں اشارہ ہے۔

ع۱۳۰۳ منافق کھلی مخالفت تو کر نہ سکتے تھے اس لیے کچھ نہ کچھ مال بھی ان کو خرچ کرنا پڑتا تھا اور بعض وقت جنگوں میں بھی نکلنا پڑتا تھا۔ مگر چونکہ اخلاص نہ تھا اللہ کے ہاں ان اعمال کی کوئی قدر نہ تھی۔

ع۱۳۰۴ نہ اللہ سے کوئی تعلق۔ کیونکہ نماز بھی مجبوری کی پڑھتے ہیں۔ نہ مسلمانوں سے حقیقی تعلق کیونکہ خرچ اخلاص سے نہیں کرتے بلکہ محض بحالت مجبوری کہ اپنے آپ کو ظاہر مسلمان کرتے ہیں۔ یہی بات ان کے نفقات کے نہ قبول ہونے کا موجب ہو گئی۔ کیونکہ قبول اخلاص ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں سستی یعنی ایسی حالت کہ انسان بوجھ سمجھ کر نماز پڑھے علامت نفاق ہے۔

ع۱۳۰۵ اللہ تعالیٰ کا مال اور اولاد کے ذریعہ ان منافقوں کو عذاب دینا یوں تھا کہ ان کو مال جنگوں وغیرہ میں خرچ کرنا پڑتا تھا اور زکوٰۃ بھی دینی پڑتی تھی۔ لیکن چونکہ دل سے یہ نہ چاہتے تھے اس لیے یہ خرچ ان کے لیے عذاب کا موجب ہو رہا تھا۔ اور ان کی اولاد کی وجہ سے یوں عذاب تھا کہ وہ لوگ دین اسلام کے خادم تھے اور اپنی جانیں خدا کی راہ میں دیتے تھے جس اسلام کو وہ خود نیست و نابود کرنے کے منصوبے کرتے تھے اسی کی خاطر ان کی اولاد اپنی جانیں قربان کر رہی تھی۔ عبد اللہ بن ابی کا لڑکا عبد اللہ مخلص مومن تھا۔

ع۱۳۰۶ یفرقون۔ فرق کے معنی الگ ہونا ہیں۔ اسی سے امن سے حالت مفارقت یعنی خوف بھی فرق کے معنی آتے ہیں۔ راغب کہتے ہیں فرق خوف کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ دل کی حالت خوف سے پراگندگی کی ہوتی ہے یعنی ان کا قسمیں کھانا کہ ہم مسلمان ہیں محض خوف کی وجہ سے ہے ورنہ دلوں میں کفر بھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا
لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

اگر کوئی پناہ کی جگہ یا غاریں یا گھسنے کی جگہ پائیں تو اس کی طرف
پھر جائیں اور وہ بے تحاشا بھاگ رہے ہوں ۱۳۰۷

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ
اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ
اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور اُن میں سے وہ بھی ہیں جو زکوٰۃ (کے بانٹنے) میں تجھے طعنہ دیتے ہیں
سو اگر ان میں سے ان کو دیدیا جائے تو راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان
میں سے ان کو نہ دیا جائے تو ناخوش ہو جاتے ہیں ۱۳۰۸

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ
وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ
وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

اور (کیا اچھا ہوتا) اگر وہ اس پر راضی ہو جاتے جو اللہ اور اس
کے رسول نے اُن کو دیا تھا اور کہتے اللہ ہمارے لیے بس ہے اللہ اپنے
فضل سے اور اس کا رسول (اور بھی) ہمکو دیگا ہم تو اللہ کی طرف ہی رغبت رکھنے والے ہیں ۱۳۰۹

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ
وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ
وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

زکوٰۃ صرف ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے
کارکنوں (کے لیے) اور جن کے دل مائل کرنا ہے اور غلاموں کے
آزاد کرنے اور قرضداروں (کے لیے) اور اللہ کی راہ میں اور مسافر
(کے لیے)، یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھیرایا گیا ہے۔ اور
اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۱۳۱۰

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ

اور ان میں سے وہ لوگ ہیں جو نبی کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے

مقابلہ کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے اظہار مخالفت نہیں کرتے۔

ع۱۳۰۷ ملجأ۔ لجأ کے معنی کسی چیز کی پناہ لینا یا اس سے ٹیک لگانا (ل) اسی سے التجا ہے۔

مُدَّخلا۔ ادَّخَلَ کے معنی ہیں اِجْتَهَدَ فی دخوله داخل ہونے میں زور لگایا۔ اسی سے مُدَّخل ہے (غ)۔

یجمحون۔ جمح کا اصل استعمال گھوڑے پر ہے جب وہ چلنے میں نشاط کی وجہ سے سوار پر غالب آجائے یعنی اس کے قابو سے نکل جائے (غ)

ع۱۳۰۸ یلمز۔ لمز کے معنی پیٹھ کے پیچھے بات کا کہنا اور معائب کے پیچھے لگنا ولا تلمزوا انفسکم (الحجرات ۴۹-۱۱) اور لُمَزۃ وہ ہے جو کثرت سے دوسروں کی عیب شماری کرے ویل لکل همزة لمزة (الهمزة ۱۰۴-۱)

یسخطون۔ سَخَط اور سُخْط غضب شدید کو کہتے ہیں جس کا اقتضاء عقوبت ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف انزال عقوبت ہے کمن باء بسخط من اللہ (آل عمران ۳-۱۶۲)

ع۱۳۰۹ مطلب یہ ہے کہ اسلام کی اصل غرض کوئی مال لوگوں کو دینا تو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنا اور اس کی رضا کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ پس ان کو چاہیئے تھا کہ اصل غرض کو مقدم رکھتے۔ ہاں اسلام نے دنیوی زندگی کے لیے بھی اعلیٰ درجہ کے اصول قائم کر دیئے ہیں منجملہ ان کے غربا کی خبرگیری ہے سو وہ بھی ہوتی رہتی ہے مگر جس شخص نے مال کو ہی زندگی کا مقصد قرار دے لیا وہ اصل راہ کو چھوڑ کر دور نکل گیا۔

ع۱۳۱۰ صدقات۔ صَدَقَة وہ ہے جو انسان اپنے مال سے قرب حاصل کرنے کے لیے خرچ کرے اور اصل میں صدقہ اسے کہا جاتا ہے جو بطور تطوع دیا جائے یعنی اپنی خوشی سے یا نفل کے طور پر اور جس کا دینا واجب ہے اسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے لیکن بعض وقت بلحاظ اصل معنی کے زکوٰۃ کو بھی صدقہ کہا جاتا ہے جب اس کا دینے والا صدق کا طالب ہو جیسے خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها (۱۰۳) یہاں بھی زکوٰۃ ہی مراد ہے (غ) کیونکہ جو نفل صدقات ہوں وہ ہر انسان جس طرح چاہے دے سکتا ہے معین تقسیم اسی کی ہو سکتی ہے جو بیت المال میں داخل ہو اور یہ زکوٰۃ ہی ہے۔

خرچ زکوٰۃ کی مدات: منافقوں کی ایذارسانی کا ذکر کرتے ہوئے پچھلے رکوع کے آخر پر فرمایا تھا کہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو مال زکوٰۃ کی تقسیم میں آنحضرت صلعم پر طعن کرتے ہیں کہ فلاں کو دیا فلاں کو نہ دیا اسلیئے یہاں بتلایا ہے کہ زکوٰۃ (صدقات سے یہاں خاص مال زکوٰۃ ہی مراد ہے۔ کیونکہ یہی صدقات بیت المال میں جمع ہوتے

هُوَ أُذُنٌ ۚ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ

ہیں یہ کان (کا کچا) ہے کہہ دے تمہاری بھلائی کے لیے ہی کان (دھرتا) ہے اللہ پر ایمان لاتا ہے اور مومنوں کی بات کو مانتا ہے اور ان لوگوں کے لیے رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور جو لوگ اللہ کے

تھے اور انہی کی تقسیم پر طعن ہو سکتا تھا) کی تقسیم کس طرح ہو۔ اس خرچ کی یہاں آٹھ مدات بیان کی ہیں۔ پہلے فقرا یعنی نادار لوگ۔ دوسرے مسکین جو گو بالکل نادار تو نہ ہوں مگر بغیر امداد اپنی روزی کمانے کے قابل نہ ہو سکیں۔ مثلاً اہل حرفہ کے لیے خاص ہتھیار۔ طالبعلموں کے لیے ذرائع حصول علم کا مہیا کرنا وغیرہ۔ امام شافعی نے فقیر اور مسکین میں اسی کے قریب قریب فرق بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں فقیر وہ ہے جس کے پاس نہ مال ہو نہ اس کے ہاتھ میں کوئی کسب ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس مال یا کسب تو ہو مگر اس کی ضروریات کے لیے مکتفی نہ ہو اس پر انہوں نے قرآن کریم کی آیت اما السفینۃ فکانت لمساکین (الکھف ۱۸-۷۹) کو پیش کیا ہے کیونکہ جن کے پاس کشتی تھی وہ نادار نہ تھے۔ تیسرے وہ لوگ جو صدقات کے انتظام پر متعین ہوں جیسے مال زکوٰۃ جمع کرنے والے اس کے تقسیم کرنے والے۔ چوتھے مؤلفۃ القلوب یعنی ایسے لوگ جن کے دلوں سے تنفر دور کرنا مقصود ہو اور ان کے دلوں کو حق کی طرف مائل کرنا ہو۔ روح المعانی میں ہے کہ اس میں تین گروہ آتے ہیں۔ اول ایسے لوگ جو اسلام نہیں لائے اور ان کو اسلام کے قریب لانے کی ضرورت ہے ان کو مال دینے کی غرض یہ نہیں کہ پیسوں سے ان کا ایمان خریدا جائے ایسے ایمان کو اسلام ایک لمحہ کے لیے نہیں چاہتا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حصول تعلیم اسلام کے لیے یا اسلام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ان کو مدد دینے کی ضرورت ہے تو دی جائے۔ دوم وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں مگر ان کا ایمان ابھی کمزور ہے یعنی نو مسلموں کی امداد اور ان کو تعلیم اسلام میں مضبوط کرنا۔ سوم وہ لوگ جن کے شر سے اسلام کو بچانا مقصود ہو۔ پانچویں فی الرقاب جس کے معنی گردنوں کو آزاد کرنا ہیں۔ اور یہ تین طرح پر ہو سکتا تھا اول یہ کہ حکومت کی طرف سے ان لوگوں کی امداد کی جائے جو غلامی کی حالت سے نکلنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اسلام نے غلام کو یہ حق دیا تھا کہ وہ اپنے مالک سے مکاتبہ کر لے لیکن اس کی آزادی مشروط ہو اس بات پر کہ ایک خاص رقم مالک کو جمع کر کے دے تو اس میں امداد دینا یا اس رقم کا مہیا کر دینا حکومت کا فرض ٹھہرایا کہ وہ بیت المال سے ان لوگوں کی امداد کرے۔ دوم یہ کہ حکومت خود مالکوں سے غلام خرید کر ان کو آزاد کرے۔ سوم یہ کہ اس سے اسیران جنگ کا فدیہ ادا کیا جائے۔ وہ اسیران جنگ ظاہر ہے کہ دشمن قوم میں سے اور پھر غیر مسلم ہونگے یہ تعلیم اسلامی کی وسعت ہے۔ چھٹے قرضداروں کا قرضہ ادا کرنے کے لیے یا جن پر جرمانہ ہو گیا ہو ان کا جرمانہ ادا کرنے کے لیے۔ ساتویں فی سبیل اللہ یعنی جہاد کے لیے خواہ وہ جہاد قلمی ہو یا سیفی۔ کفار کے حملوں سے اپنے مذہب کو محفوظ کرنے کے لیے اور اصول حقہ کو کافروں میں پھیلانے کے لیے۔ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کو مال زکوٰۃ لینا جائز ہے گو وہ غنی ہو کیونکہ اس کی غرض اس مال کو دشمنوں کے مقابلہ میں خرچ کرنا ہے۔ آٹھویں مسافر کے لیے۔ کیونکہ اپنے گھر سے باہر وہ بھی مفلس کے حکم میں ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ مراد اس سے ایسا مسافر ہے جو محتاج امداد ہو۔

فریضہ زکوٰۃ سے مسلمانوں کی غفلت: فریضۂ زکوٰۃ ایک ایسا فریضہ تھا جو مسلمانوں کی ساری قومی ضروریات کا متکفل ہو سکتا تھا مگر آج اس کی یہ حالت ہے کہ اول تو مسلمان مال زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور جو کرتے ہیں تو اس کے ایک جگہ جمع ہو کر ضروریات قومی پر خرچ ہونے کا کوئی انتظام نہیں بلکہ عموماً اپنے طور پر اور اکثر اوقات غیر مستحق لوگوں میں وہ مال تقسیم ہو کر اصل غرض اس فریضہ کی ضائع ہو جاتی ہے۔ فریضۂ زکوٰۃ ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا انتظام تقسیم دولت ہے کہ جس کے نہ ہونے کی وجہ سے یورپ کو طرح طرح کی مصائب کا سامنا درپیش ہے جن مصائب کا علاج سوائے زکوٰۃ کے اور کچھ نہیں۔ اور سوشلزم اور بولشوزم محض دھوکہ دینے والے خیالات ہیں جو عملی رنگ میں کبھی قائم نہیں ہو سکتے۔ تقسیم دولت کے مسئلہ میں یورپ کو جو سب سے بڑی مشکل پیش آئی ہے وہ یہ ہے کہ دولت کا رجحان یہ ہے کہ چند ہاتھوں میں زیادہ مقدار میں جمع ہوتی چلی جائے اور بیشتر حصہ نسل انسانی میں غربت یا مسکنت کی حالت میں رہے یا ایسی حالت کہ بمشکل وہ اپنی گزر کرنے کے قابل ہوں۔ اس کا علاج اسلام نے طرح طرح کے رنگوں میں کیا ہے انہی علاجوں میں سے ایک علاج زکوٰۃ ہے کہ اغنیا کی دولت میں سے ہر سال چالیسواں حصہ نکل کر غربا میں تقسیم ہوتا رہے۔ دوسرے دو علاج ایک تقسیم وراثت ہے اور دوسرا ممانعت سود۔

بیت المال کی ضرورت: مسلمانوں کے کل قومی کام آج صرف ایک فریضۂ زکوٰۃ کے قیام پر ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے جمع کرنے کا کوئی انتظام ہو۔ قرآن کریم نے تو زکوٰۃ کو ایک جگہ جمع کرنے کی ضرورت یہاں تک مقدم کی ہے کہ اخراجات زکوٰۃ میں ایک مد خصوصیت سے کارکنان زکوٰۃ کی قائم کر دی ہے جس پر خرچ کرنا ضروری ٹھہرایا ہے۔ گویا قرآن کریم کوئی حالت زکوٰۃ ایسی فرض نہیں کرتا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ آپ ادا کرے بلکہ اس کا قومی بیت المال میں جمع ہونا اور پھر وہاں سے تقسیم ہونا ضروری ہے۔ کاش مسلمان اس طرف توجہ کریں۔

اشاعت اسلام اور تعلیم پر زکوٰۃ کا خرچ کرنا: پھر مسلمانوں کی سب سے بڑی دو قومی ضرورتیں اس وقت ہیں ایک اشاعت اسلام دوسرے تعلیم ہر قسم کی۔ سو یہ دونوں کام زکوٰۃ کے مصارف میں داخل ہیں اور آج اگر زکوٰۃ کا روپیہ ایک جگہ جمع ہو تو مسلمانوں کے یہ دونوں کام عمدہ طور پر سرانجام پا سکتے ہیں۔ اشاعت اسلام پر تو آج زکوٰۃ کا روپیہ بالکل صرف نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا کوئی قومی انتظام ہی مسلمانوں نے نہیں رکھا، حالانکہ فی سبیل اللہ کا لفظ خصوصیت سے اشاعت اسلام کے لیے موجود ہے اور تعلیم پر شاید علماء کا فتویٰ نہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر اغنیا سے تعلیم کی فیس لی جائے اور تعلیم کا خرچ کل زکوٰۃ سے ادا کیا جائے تو اس طرح زکوٰۃ کا مصرف صرف غیر اغنیا کے لیے رہ گیا اس میں کونسا محذور لازم آتا ہے اصول تقسیم زکوٰۃ کہ اس کا خرچ عموماً غیر اغنیا کیلئے ہو قائم رہ گیا اور ظاہر ہے کہ بیشتر حصہ مسلمان

اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾
يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَ
الثلثة رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾
اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ
الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾
يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ
تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ
اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾
وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ
وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ
كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

رسول کو دُکھ دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے ع۱۳۱۱
تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو خوش رکھیں اور اللہ
اور اس کا رسول زیادہ حقدار ہیں کہ اس کو راضی کریں اگر وہ مومن ہیں ع۱۳۱۲
کیا ان کو معلوم نہیں ہوا کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت
کرتا ہے تو اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے اسی میں رہے گا
یہ بڑی رسوائی ہے ع۱۳۱۳
منافق ڈرتے ہیں کہ ان پر کوئی سورۃ (نہ) اتاری جائے، جو اُن
کو ان باتوں کی خبر دیدے جو اُن کے دلوں میں ہیں کہہ دے ہنسی کیے
جاؤ، اللہ اس کو کھولنے والا ہے جس کا تم کو ڈر ہے ع۱۳۱۴
اور اگر تو ان سے سوال کرے تو کہیں گے ہم تو یوں ہی باتیں اور
دل لگی کرتے تھے کہہ، کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول
کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے؟ ع۱۳۱۵

آبادی کا بلحاظ ضرورت تعلیم مساکین میں داخل ہے۔
یتامیٰ اور زکوٰۃ: بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ یتامیٰ پر زکوٰۃ کا روپیہ خرچ نہیں ہو سکتا۔ یہ انہوں نے اس سے قیاس کیا ہے کہ یتامیٰ کی مد مصارفِ زکوٰۃ میں نظر نہیں آتی، حالانکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یتامیٰ غنی بھی ہوتے ہیں اور فقیر بھی۔ اس لیے یتامیٰ کی مد قائم کرنا درست نہ تھا۔ ہاں جو یتیم فقرا یا مساکین یا اور کسی مد میں آتے ہوں وہ اس مد کی ذیل میں زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔

ع۱۳۱۱ اُذُن کے اصل معنی تو کان ہی ہیں مگر بطور استعارہ اس کا استعمال اس شخص پر بھی ہوتا ہے جو بات کو سن کر اسے فوراً قبول کرلے (غ)۔
منافقوں کی مراد آنحضرت صلعم کو اُذُن کہنے سے یہی تھی کہ جب ہم آپ کے سامنے جا کر قسم کھا لیتے ہیں تو ہماری بات کا اعتبار کر لیتے ہیں اس لیے آپ کی غیبت میں ہم جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں کریں جب سامنے جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہمارا منشا یہ تھا تو آپ اس بات کو مان لیں گے۔ درحقیقت یہ امر نبی کریمؐ کے خُلقِ عظیم میں سے تھا کہ آپ ان لوگوں کی طرح نہ تھے کہ کوئی بات کرے تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ تو جھوٹ کہتا ہے۔ حسنِ ظن اور حیا آپ کی طبیعت میں غالب امور تھے۔ چنانچہ اسی کے مطابق ان کی اسبات کا جواب دیا ہے کہ اگر آپ بات کو سن کر مان لیتے ہیں تو یہ تو تمہاری ہی بھلائی کے لیے ہے ایسا خلق دیکھ کر تو چاہیئے تھا کہ تم آپ پر ایمان لاتے نہ یہ کہ اور ایذا دیتے اور آپ کا مان لینا محض بلحاظ رحمت کے ہے کیونکہ وہ مومنوں کے لیے رحمت ہے یعنی محض تم پر شفقت جبلی کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ حق و باطل میں تمیز ہی نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ بعض کان کے کچے لوگ ہوتے ہیں کہ جو بات سُنی اس کو لے دوڑے۔ تحقیق اور تمیز کے متعلق دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا (الحجرات ۴۹-۶) اگر ایک فاسق کوئی خبر تمہارے پاس لائے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ تحقیق کرنا اور امر ہے اور دوسرے کو جھوٹا کہہ دینا اور امر۔

ع۱۳۱۲ یرضوہ پیچھے اللہ اور رسول دونوں کا ذکر ہے مگر یہاں ضمیر واحد ہے اس لیے کہ اصل رضا اللہ تعالیٰ کی ہی مطلوب ہے۔ بشر کی ناراضگی بلاوجہ بھی ہو سکتی ہے۔ گو وہ رسول بھی ہو کیونکہ اسے غلطی لگ سکتی ہے اور دوسرے رسول کی اطاعت فی الحقیقت اللہ کی اطاعت میں داخل ہے۔

ع۱۳۱۳ یحادد۔ حد سے ہے جس کے ایک معنی جہت کے ہیں پس محادّۃ ایک دوسرے سے عداوت اور مخالفت کی جانب میں ہو جانا ہے۔ اسی طرح لیشاقق کا لفظ ہے ایک شق میں ہو جانا (ل) اسی طرح معاداۃ ہے کہ عدوۃ بھی ایک کنارہ کو کہتے ہیں۔ راغب نے اس معنی کی وجہ ممانعت یا استعمال حدید دی ہے اور ممانعت کے معنی حد میں شائع ہیں۔

ع۱۳۱۴ ینزل علیہم میں ضمیر مومنوں کی طرف بھی ہو سکتی ہے اور منافق بھی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ جو کچھ نازل ہوتا تھا وہ ان پر بھی نازل ہوتا تھا۔ اسی طرح تنبئہم میں ضمیر دونوں طرف ہو سکتی ہے۔ منافقوں کا یہ حذر بھی بطور استہزاء تھا جیسا کہ قل استہزؤا سے ظاہر ہے۔

ع۱۳۱۵ خوض اصل میں ایسی چیز میں داخل ہونے کو کہتے ہیں جیسے پانی یا کیچڑ۔ اس لیے کسی ایسے امر میں داخل ہونے پر بولا جاتا ہے جو انسان کو ملوث کرے۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۭ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَاۗىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝٦٦

بہانے نہ بناؤ تم نے یقیناً اپنے ایمان کے بعد کفر کیا۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کریں گے تو ایک گروہ کو عذاب دیں گے۔ اس لیے کہ وہ مجرم تھے[١٣١٦]

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝٦٧

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک سے ہی ہیں۔ وہ بُرے کام کرنے کو کہتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں انھوں نے اللہ کو چھوڑ دیا، سو اللہ نے ان کو چھوڑ دیا، منافق ہی نافرمان ہیں[١٣١٧]

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ هِىَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝٦٨

اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کیا ہے، اسی میں رہیں گے وہ ان کو کافی ہے، اور اللہ نے اُن پر لعنت کی اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ

(تم منافق بھی) اُن کی طرح ہو جو تم سے پہلے ہو چکے، وہ تم سے طاقت میں زیادہ اور مالوں اور اولاد میں بڑھ کر تھے، سو انھوں نے اپنے حصے سے تھوڑا فائدہ اٹھایا پس تم بھی اپنے حصے سے تھوڑا سا فائدہ اُٹھا رہے ہو جیسے ان لوگوں نے جو تم سے پہلے تھے اپنے حصے سے تھوڑا سا فائدہ اٹھایا اور تم بیہودہ باتوں میں لگے رہے جیسے وہ لگے رہے[١٣١٨] ان کے عمل دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے — اور یہی

اکثر استعمال اس کا قرآن شریف میں ذم کے موقعہ پر ہی ہوا ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ بعض منافق یہی عذر کر دیتے ہیں۔ آج بعض مسلمان امور دینی میں ہنسی کرتے ہیں اور ان کا ذکر ایک مشغلہ کے طور پر کرتے ہیں۔ وہ غور کریں کہ جو کچھ منافقوں کے متعلق قرآن شریف نے فرمایا تھا اس کے مصداق وہ ہو رہے ہیں۔

١٣١٦ع لا تعتذروا۔ عُذْر اس چیز کا قصد کرنا ہے جس سے گناہ مٹ جائے اور اعتذر کے معنی عذر پیش کیا اور عَذَرَ کے معنی اس کا عذر قبول کیا۔ اور اَعْذَرَ کے معنی ایسی بات پیش کی جس سے معذور ہو گیا اور راغب نے ایک قول نقل کیا ہے کہ عُذْر کا لفظ عَذِرَة سے ماخوذ ہے جو نجس شے کو کہا جاتا ہے۔ اور عَذَّرْت فلاناً کے معنی ہیں اس کے گناہ کی نجاست کو عفو سے دور کیا (غ)

منافقوں کی آخری علیحدگی: یہ ایک پیشگوئی تھی جو پوری ہوئی منافقوں کا اکثر حصہ اسلام میں شامل ہو گیا کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اس حالت نفاق کو ترک نہ کیا۔ ان کو بالآخر مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس طرح پر کہ نبی کریم صلعم نے خطبہ میں اُن کے نام لیکر ظاہر کر دیا اور ان کو مسجد سے نکال دیا گیا اور ان سے زکوٰۃ نہ لی جاتی تھی یہی وہ عذاب تھا، جو اُن کو دیا گیا۔

١٣١٧ع بعضہم من بعض لفظی معنی ہیں بعض ان کے بعض میں سے ہیں۔ مگر مراد اُن کا تشابہ ہے جس طرح ایک ہی چیز کے مختلف اجزا میں تشابہ ہوتا ہے۔ گویا وہ سب ایک ہی ہیں کیا مرد اور کیا عورتیں۔

یقبضون ایدیہم۔ قَبْض کے معنی ہیں کسی چیز کا پورے کف سے لے لینا اور کسی شے پر قَبَضَ الیَدُ سے مراد اس کا جمع رکھنا ہے اس کے لے لینے کے بعد اور یقبضون ایدیہم کے معنی ہیں خرچ کرنے سے رُکتے ہیں (غ)

نسوا اللہ فنسیہم میں بتا دیا کہ جس طرح کا فعل انسان کرتا ہے اسی طرح کی سزا اللہ کی طرف سے ملتی ہے یہاں نسی بمعنی ترک ہے دیکھو ع۶۴۔

١٣١٨ع کالذی خاضوا کی ترکیب دو طرح ہو سکتی ہے کالخوض الذی خاضوہ یا الذی کی اصل الذین ہے اور نون تخفیف کے لیے گرا دیا گیا ہے اور مراد

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾

کیا ان کے پاس ان کی خبر نہیں آئی ، جو اُن سے پہلے تھے ، نوحؑ کی قوم اور عادؑ کی اور ثمودؑ کی اور ابراہیمؑ کی قوم کی اور مدین کے رہنے والوں کی اور تباہ شدہ بستیوں کی — ان کے رسول ان کے پاس دلائل لے کر آئے سو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے ۱۳۱۹ع

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں ۔ ان پر اللہ رحم کرے گا ۔ اللہ غالب حکمت والا ہے ۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں انھیں میں رہیں گے اور ہمیشگی کے باغوں میں پاکیزہ رہنے کی جگہ کا ۔ اور اللہ کی رضا سب سے بڑھ کر (نعمت) ہے یہی بڑی بھاری کامیابی ہے ۱۳۲۰ع

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ

اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان کے مقابلہ میں شدّت اختیار کر ، اور اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے

ہے کالذین خاضوا۔

ع۱۳۱۹ المؤتفکات ۔ مؤتفکۃ کی جمع ہے اور ائتفاک کے معنی (جو افک سے ہے) انقلاب ہیں اور مراد اس سے یہ سب لوگ جو ہلاک ہوئے ۔ اور نضر بن انس نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا اے بیٹے بصرہ میں نہ اُترنا فانہا احدی المؤتفکات اور بعض نے اسے صرف لوطؑ کی بستیوں سے خاص کیا ہے (ل) اور مفردات میں ہے کہ مؤتفکۃ وہ ہوائیں ہیں جو اپنے چلنے سے پھر جائیں ۔

ع۱۳۲۰ عدن ۔ عَدَنَ بمکان کے معنی ہیں استقر یعنی مکان میں استقرار پکڑا پس جنات عدن وہ باغ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے یعنی ان سے کبھی نکالے نہ جائیں گے اسی سے مَعْدِن ہے (غ)

رضوان من اللہ اکبر ۔ اللہ کی رضا کو یہاں جنت کی سب سے بڑی نعمت فرمایا ہے ۔ ابو سعید خدری کی حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے اسی کی موید ہے ۔ یہ ایک فیصلہ کن دلیل ہے کہ مسلمانوں کا بہشت کیسی چیز ہے جس کی سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے ۔ پھر یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ کی رضا مومن کو اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے اور صحابہؓ کے متعلق تو نص صریح ہے رضی اللہ عنہم ۔ پس مومن کی جنت اسی دنیا سے شروع ہوتی ہے اور وہ جنت وہی چیز ہے جس میں مومن اور غیر مومن کا اشتراک نہیں ۔ دنیا کی لذات فانی میں تو نہ صرف اشتراک موجود ہے بلکہ بعض وقت کفار اس سے زیادہ حظ اُٹھا لیتے ہیں ۔ مومنوں کا ذکر ان دو آیات میں کفار کے مقابلہ کے لیے کیا ۔ جن کا ذکر منافقین کی تنبیہ کے لیے آ گیا تھا کہ تمہارا انجام بھی اسی طرح بُرا ہو گا جس طرح تم سے پہلے کفار کا انجام بُرا ہوا ۔

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾
يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا
كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ
وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ
اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ
فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا
يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِى الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ

اور وہ بری جگہ ہے [۱۳۲۱]
اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا اور یقیناً انھوں نے کلمۂ کفر کہا اور (اپنے (اظہار) اسلام کے بعد کافر ہو گئے اور ایسی چیز کا قصد کیا جس کو نہیں پا سکے [۱۳۲۲] اور وہ برا نہیں کہتے مگر اس لیے کہ اللہ نے اپنے فضل سے اور اس کے رسول نے اُن کو غنی کر دیا [۱۳۲۳] سو اگر توبہ کریں تو ان کے لیے بہتر ہوگا اور اگر پھرے رہیں تو اللہ ان کو دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور زمین میں ان کا کوئی دوست نہ ہوگا اور نہ کوئی

۱۳۲۱ جاہِد۔ جُہد سے ہے جس کے معنی زور لگانا، کوشش کرنا ہیں اور جہاد اور مجاہدۃ دشمن کی مدافعت میں اپنی طاقت کا خرچ کرنا ہے۔ راغب کہتے ہیں جہاد تین طرح پر ہے۔ دشمن ظاہری سے مجاہدہ اور شیطان سے مجاہدہ اور اپنے نفس سے مجاہدہ۔ اور جاھدوا فی اللہ حق جھادہ اور جاھدوا باموالکم وانفسکم وغیرہ میں تینوں قسم کا جہاد شامل ہے۔ اور پھر نبی صلعم کی حدیث نقل کی ہے جاھدوا اھواءکم کما تجاھدون اعداءکم اپنی خواہشات سے اسی طرح جہاد کرو جس طرح اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو اور پھر کہتے ہیں کہ مجاہدہ کبھی ہاتھ سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے جیسا کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا جاھدوا الکفار بایدیکم والسنتکم کافروں کے ساتھ جہاد کرو اپنے ہاتھوں سے اور اپنی زبانوں سے۔ پس جہاد لسانی بھی ہو سکتا ہے اور سیفی بھی۔

اغلظ علیہم۔ غِلَظ اصل میں رقت کی ضد ہے اور اس کا استعمال قوت اور مضبوطی پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں آتا ہے میثاقا غلیظا (النساء ۴: ۲۱) جس سے مراد مضبوط یا موکد عہد ہے۔ ایسا ہی فآزرہ فاستغلظ (الفتح ۴۸: ۲۹) مراد مضبوط ہونا، یا موٹا ہونا ہے اور غَلَظ اس زمین کو کہتے ہیں جو نرم نہ ہو بلکہ سخت ہو جس میں کوئی چیز آسانی سے داخل نہ ہو سکے (ل)، واغلظ علیہم کے کیا معنی ہیں؟ دوسری جگہ آتا ہے ولیجدوا فیکم غلظۃ (التوبۃ ۹: ۱۲۳) چاہیئے کہ کافر تم میں شدت پائیں۔ پس یہاں بھی معنی وہی لیے جائیں گے یعنی ان کے مقابلہ میں شدت اختیار کرو۔

منافقوں کے ساتھ ایک مدت تک نبی کریم صلعم نرمی برتتے رہے ان کی شرارتوں پر چشم پوشی سے کام لیتے رہے ان کے جنگوں میں نہ نکلنے پر کبھی سخت گیری نہیں کی بلکہ ان کے عذروں کو قبول کر لیتے جیسا کہ اس جنگ میں بھی ہوا۔ مگر اب چونکہ وہ موقعہ پہنچ چکا تھا کہ منافقوں اور مومنوں کو الگ الگ کر دیا جائے اور زیادہ ان کے مسلمانوں میں ملا رہنے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس لیے اب حکم ہوتا ہے کہ کافروں اور منافقوں دونوں کے خلاف جہاد کرو۔ ظاہر ہے کہ یہاں جہاد سے مراد جہاد سیفی نہیں۔ کیونکہ منافقوں کے ساتھ کبھی جہاد سیفی نبی کریم صلعم نے نہیں کیا پس اس سے مراد دوسرا جہاد ہے جس کے معنی محض کوشش اور زور لگانے کے ہیں یعنی اب ان کو اپنے میں سے نہ سمجھو اور ان کے خلاف پورا زور لگاؤ۔ اور دوسری بات فرمائی واغلظ علیہم نبی کریم صلعم کے غلیظ القلب ہونے کی تو قرآن کریم نے نفی کی ہے لو کنت فظاً غلیظ القلب لا انفضوا من حولک (آل عمران ۳: ۱۵۹) اگر تو سخت گو سخت دل ہوتا تو تیرے پاس سے بھاگ جاتے معلوم ہوا نبی کریم صلعم نہ سخت کلامی کرنے والے تھے نہ سخت دل تھے۔ پس جب قرآن شریف خود آپ کی یہ صفت بیان فرماتا ہے تو واغلظ علیہم نہ آپ کے لیے سخت گوئی کرنے کا حکم ہو سکتا ہے نہ سخت دلی اختیار کرنے کا۔ بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ تم جو اس قدر نرمی ان کے مقابلہ میں برتتے رہے ہو اگر یہ نرمی سے درست ہونے والے ہوتے تو ہو جاتے اس لیے اب وہ چشم پوشیاں اور عفو اور درگزر جو اُن کے قصوروں اور شرارتوں پر آپ کرتے رہے ہیں ان کو ترک کر کے ان کے مناسب حال شدت کا طریق اختیار کریں۔ کیونکہ دشمن کے مقابلہ میں نرمی اور درگزر سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے۔ جب وہ طریق عداوت کو نہیں چھوڑتے تو نرمی کا طریق اب اُن کے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتا۔

۱۳۲۲ منافقت کا نتیجہ ناکامی اور شیعوں پر اتمام حجت: ھموا بما لم ینالوا۔ منافقوں نے اسلام کو تباہ کرنے کا قصد کیا مگر اس مقصد کو حاصل نہ کر سکے۔ شیعہ جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو منافق کہتے ہیں قرآن کریم کے اس نص صریح کے خلاف کرتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ منافقوں کو ان کے ارادہ میں کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ مگر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو وہ کامیابیاں اللہ تعالیٰ نے دیں اور ایسی ایسی نصرتیں ان کے ذریعہ سے اسلام کو عطا فرمائیں کہ بہت سے انبیاء کو بھی وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

۱۳۲۳ ما نقموا الا ان اغنٰھم اللہ ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہے مالی عندک ذنب الا انی احسنت الیک میں نے تیرا کوئی گناہ نہیں کیا سوائے اس کے کہ تیرے ساتھ احسان کیا۔ اللہ نے تو ان کو اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ کیونکہ جو وسعت و غنا فتوحات کے بڑھنے کے ساتھ مسلمانوں کو ملے اس میں یہ منافق بھی شریک تھے۔ مگر نتیجہ اُلٹ ہوا کہ بجائے اس کے کہ نفاق کو چھوڑتے اور برا کہنا شروع کیا۔

وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾
وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ
فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾
فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا
وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾
فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ
يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ
وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾
اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ
نَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾
اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا
جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ

مددگار رہوگا) ع۱۳۲۴

اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر وہ ہم کو اپنے فضل سے دیدے
تو ہم ضرور صدقہ دیتے اور ہم ضرور نیکوکاروں میں سے ہوں گے۔
پھر جب اس نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخل کیا اور
پھر گئے اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں ع۱۳۲۵

سو اس نے انھیں بدلہ دیا (کہ) ان کے دلوں میں نفاق (پیدا کردیا)
اس دن تک کہ وہ اس سے ملیں اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے اس
کے خلاف کیا جو اس سے وعدہ کیا تھا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے ع۱۳۲۶
کیا اُن کو معلوم نہیں کہ اللہ ان کے بھیدوں کو اور ان کے خفیہ
مشوروں کو جانتا ہے اور کہ اللہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔
جو ان مومنوں پر طعن کرتے ہیں جو دل کھول کر صدقہ دیتے ہیں
اور جو سوائے اپنی سخت مشقت کے کچھ نہیں پاتے تو ان پر ہنسی
کرتے ہیں اللہ اُن کو ہنسی کی سزا دے گا ع۱۳۲۷ اور ان کے لیے

ع۱۳۲۴ دنیا کا عذاب الیم کوئی سزا ہے جو ان کو اس دنیا میں دی جائے۔ اس صورت میں صرف مسلمانوں سے ان کی تمیز کردینا ہی ان کے لیے عذاب الیم تھا اور جب یہ سزا ان کو ملی تو ان کا کوئی دوست و مددگار نہ بنا جو اس سزا کو ٹال دیتا۔

ع۱۳۲۵ ثعلبہ بن حاطب اور منافقوں سے زکوٰۃ کا نہ لیا جانا: ثعلبہ بن حاطب ایک غریب آدمی تھا جس نے رسول صلعم سے دعا کرائی کہ اس کے پاس مال بہت ہو تو وہ سب حقوق دیگا۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کی زندگی میں ہی اس کا مال بڑھ گیا یہاں تک کہ اس نے نماز وغیرہ بھی ترک کردی اور منافقانہ رویہ اختیار کیا اور جب نبی کریم صلعم کے عامل اس کے پاس زکوٰۃ وصول کرنے گئے تو انکار کردیا۔ پھر جب منافقین کو مسلمانوں کی جماعت سے الگ کردیا گیا تو یہ شخص رسول اللہ صلعم کے پاس آیا کہ اس کے مال میں سے زکوٰۃ لی جائے آپ نے فرمایا اب نہیں لی جاسکتی۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد یہی ثعلبہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس حاضر ہوا کہ اسکے مال میں سے زکوٰۃ لی جائے آپ نے بھی انکار کردیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات پر حضرت عمرؓ کی خدمت میں یہی درخواست لیکر حاضر ہوا انہوں نے بھی انکار کردیا۔ پھر اسی طرح حضرت عثمانؓ نے بھی۔ یہ واقعہ اس آیت کے شان نزول میں بیان کیا گیا ہے مگر مراد اسی قدر ہے کہ اس پر اس آیت کا مضمون صادق آیا اور ہزاروں اور انسانوں پر بھی آتا ہے بہتیرے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرکر کے لیتے ہیں پھر حقوق مال ادا نہیں کرتے اور مال کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں۔ ان لوگوں کی سزا قرآن کریم نے یہ بیان کی ہے کہ ان کے دلوں میں نفاق پیدا ہوجاتا ہے ہاں اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقوں کے ساتھ کیا جہاد تھا کہ ان میں سے ایک شخص حضرت عثمانؓ کی خلافت تک زندہ رہتا ہے وہ مدینہ میں یا اس کے پاس موجود ہے مگر اس کی سزا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس سے زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔

ع۱۳۲۶ اس سے معلوم ہوا کہ نفاق کا ان کے دلوں میں پیدا ہونا خود ان کے پہلے اعمال کی سزا تھی کہ اللہ تعالیٰ سے عہد کرکے خلاف ورزی کرتے رہے ہر ایک خدائی مُہر بطور سزا ہی لگتی ہے۔ اسی کے مطابق ہی جو منافق کی علامات میں لکھا ہے کہ اذا وعد اخلف جب وہ وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے واذا حدث کذب اور جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے جھوٹ بولنا اور وعدہ خلافی منافقت میں داخل ہیں۔

ع۱۳۲۷ مطوع اصل میں مُتَطَوّع ہے ایسا شخص جو بطور تطوّع یا تبرع یعنی رضا و رغبت سے یا دل کھول کر دیتا ہے (ن) ان پر منافق طعن کرتے۔ کہ دکھاوے کے لیے بڑی بڑی رقوم دیتے ہیں۔

لا یجدون الا جہدہم جَہد اور جُہد کے معنی مشقت میں (غ)، مراد غریب لوگ ہیں جو سخت محنتیں کرتے مزدوری کرتے اور جو کماتے اس میں سے جو چند پیسے بچتے وہ لاکر خدا کی راہ میں حاضر کردیتے۔ منافق ان پر ہنسی کرتے کہ بھلا اُن کے مٹھی بھر دانوں کا بھی خدا محتاج ہے۔

سخر اللہ منہم کے معنی ہیں جازاہم علی سخریتہم ان کی ہنسی کا ان کو بدلہ دے۔ جیسے اللہ یستہزی بہم میں دیکھو ع۲۷

مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٩﴾

دردناک عذاب ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٨٠﴾ ع

اُن کے لیے بخشش مانگ یا ان کے لیے بخشش نہ مانگ۔ اگر تو ان کے لیے ستر مرتبہ بھی بخشش مانگے تو اللہ ان کو نہیں بخشے گا یہ اس لیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ١٣٢٨

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾

جو پیچھے چھوڑے گئے وہ اللہ کے رسول کے خلاف بیٹھ کر خوش ہونگے اور ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ اور کہا گرمی میں مت نکلو۔ کہہ دوزخ کی آگ گرمی میں بہت بڑھ کر ہے، کاش یہ سمجھتے ١٣٢٩

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾

سو تھوڑا ہنسیں اور بہت روئیں۔ اس کی سزا جو وہ کماتے تھے ١٣٣٠

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا

پس اگر اللہ تجھے ان میں سے کسی گروہ کی طرف لوٹا کر لائے اور وہ نکلنے کے لیے تجھ سے اجازت مانگیں تو کہہ دے میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کرو گے تم پہلی مرتبہ بیٹھنے پر راضی ہو گئے، سو اب پیچھے رہنے

ع ١٣٢٨ اس آیت کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ منافقوں کی حالت ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی صورت میں نہیں بخشے گا خواہ نبی ان کے لیے استغفار کرے یا نہ کرے۔ لیکن اس سے ممانعت استغفار نہیں نکلتی۔ اسلیئے وہ حدیث صحیح اس آیت کے خلاف نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلعم نے عبداللہ بن ابی راس رئیس المنافقین کا جنازہ پڑھا۔ بلکہ حضرت عمرؓ کو جنھوں نے اس آیت کے مضمون کی طرف توجہ دلا کر روکنا چاہا۔ آپ نے فرمایا اخِّر عنی یا عمر لو اعلم انی لو زدت علی السبعین یغفر له لزدت علیها اے عمر ہٹ جا اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ اگر میں ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کروں تو اسے بخش دیا جائے گا تو میں ضرور ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کرتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ستر کا لفظ نبی کریم صلعم نے بھی عدد کامل کے معنی میں ہی لیا اور اس سے یہ مراد نہیں لی کہ ستر سے زیادہ بار استغفار ہو تو اللہ تعالیٰ بخشدے گا بلکہ یہ تو آپ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فرمایا ہے کہ استغفار کرو یا نہ کرو اللہ انہیں نہیں بخشے گا۔ اور اس سے پہلے سورۂ منافقون میں نازل ہو چکا تھا استغفر لهم او لا تستغفر لهم لن یغفر اللّٰه لهم جہاں سبعین مرة مذکور نہیں۔ پس یہ آپ کا استغفار اسی غلبۂ رحمت و شفقت سے تھا جس کی وجہ سے آپ رحمۃ للعالمین کہلائے کہ ایسی آیت کے ہوتے ہوئے راس الرئیس منافقین کی نماز جنازہ پڑھی۔ ہاں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کا یہ بھی ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مواعید کو بھی ٹال دیتا ہے۔ اسی بنا پر آپ نے یہ دعا کی۔ لیکن جب لا تصل (٨٤) کا حکم صریح آگیا تب آپ رک گئے۔ اگلا رکوع منافقوں سے قطع تعلق پر ہے۔

ع ١٣٢٩ المخلفون۔ خَلَّفَهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے پیچھے چھوڑا پس مخلفون وہ ہیں جو پیچھے چھوڑے گئے اس لیے کہ انہوں نے جھوٹے عذر بنا کر اجازت حاصل کر لی تھی۔

خِلٰف۔ خالف سے مصدر ہے اور اس کے معنی مخالفت ہیں (رغ۔ ج) یعنی رسول اللہ صلعم کی مخالفت میں یا مخالفت کی خاطر خوش ہوئے اور بعض نے خلف کے معنی بعد بھی کیے ہیں مگر پہلے معنی قابل ترجیح ہیں۔

ع ١٣٣٠ مطلب یہ ہے کہ یہ تو رسول اللہ صلعم کی اس مخالفت سے خوش ہو رہے ہیں۔ حالانکہ ان کو چاہیئے کہ اپنی اس حالت پر بہت روئیں اور تھوڑا ہنسیں۔ یعنی ان کی ایسی حالت کہ بُرے کام پر خوش ہو رہے ہیں رونے کے قابل ہے خوشی کا مقام نہیں۔ اور ضحك اور بکاء سے خوشی اور غم مراد ہیں۔ یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ خوش تو

مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ۝٨٣
وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا
وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝٨٤
وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا
يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا
وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝٨٥
وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ
وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا
الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝٨٦
رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝٨٧
لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ
جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ
لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٨٨
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
ع الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝٨٩
وَجَاۗءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ

والوں کے ساتھ بیٹھے رہو[١٣٣١]
اور تو ان میں سے کسی پر جو مر جائے نماز (جنازہ) کبھی نہ پڑھنا
اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہونا، کیونکہ انھوں نے اللہ اور اس کے
رسول کا انکار کیا اور وہ مر گئے اِس حالت میں کہ وہ نافرمان تھے[١٣٣٢]
اور ان کے مال اور ان کی اولاد تجھے تعجب میں نہ ڈالیں۔ اللہ یہی
ارادہ کرتا ہے کہ ان کی وجہ سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور ان
کی جانیں نکل جائیں اور وہ کافر ہوں۔
اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور
اس کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو تو ان میں سے فراخی والے تجھ سے اجازت
مانگتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں چھوڑ ہم بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ رہ جائیں۔
وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے
دلوں پر مہر لگا دی گئی، سو وہ سمجھتے نہیں۔
لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے اپنے مالوں اور
اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں اور انہی کے لیے (سب)
بھلائیاں ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔
اللہ نے اُن کے لیے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں،
انہی میں رہیں گے یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔
اور دیہاتیوں میں سے بہانے کرنیوالے آئے کہ انھیں اجازت دی

ہو رہے ہیں مگر یہ ان کی خوشی بہت تھوڑے دن ہے اور آخر کار رونا یا غم ہی ہوگا۔

ع١٣٣١ فان رجعك الله۔ کیونکہ یہ وحی اس حالت میں ہوئی، جب آپ سفر تبوک پر تھے۔
خالفین۔ خالف کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں پیچھے رہنے والا النقصان یا قصور کی وجہ سے۔ جیسے متخلف اور خالفۃ خیمہ کے پچھلے ستون کو کہتے ہیں اور کنایۃً عورت کو اس لیے کہ وہ کوچ کرنے والوں سے پیچھے رہ جاتی ہے اور اس کی جمع خوالف ہے (غ) جس کا استعمال (٨٧) میں ہوا ہے۔
یہ ان منافقین سے جو توبہ نہ کریں اور دین اسلام میں سچے دل سے داخل نہ ہوں تعلقات ظاہری کا انقطاع ہے کہ آیندہ ان کو کسی جنگ میں نکلنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

ع١٣٣٢ یہ انقطاع تعلقات روحانی ہے کہ آپ کو ان کے جنازہ سے بھی روک دیا گیا۔ کیونکہ ان کی عداوت اب حد سے بڑھ گئی تھی اور اخفا کی حالت سے نکل چکی تھی۔ لاتقم علی قبرہ سے مراد قبر پر دعا کے لیے کھڑے ہونا ہے۔ اس آیت کا نزول عبداللہ بن ابی کے جنازہ کے واقعہ کے بعد کا ہے اور یہ متعدد احادیث سے جو بخاری اور دیگر صحاح میں ہیں ثابت ہے۔ چونکہ حضرت عمرؓ عبداللہ بن ابی کا جنازہ پڑھنے کو پسند نہ کرتے تھے اس لیے یہ ان مواقع میں سے ایک موقع ہے جن پر حضرت عمرؓ کی رائے کا وحی الٰہی سے توافق ہوا۔ یہاں سے ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وحی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے خیالات کا نتیجہ نہ تھی۔ کیونکہ آپ کی شفقت تو جبلی تھی استغفر لھم ولا تستغفر لھم لن یغفر لھم کے ارشاد نے بھی آپ کو دعائے مغفرت کرنے سے نہ روکا۔ اللہ تعالیٰ بخشے یا نہ بخشے یہ اس کا اختیار رہا۔ آپ نے اپنی شفقت جبلی سے اور رحمت وسیع سے دعائے مغفرت بھی کی اور اپنی قمیص بطور تبرک عطا کر دی۔ اب اس کے خلاف وحی ہونا صاف بتاتا ہے کہ یہ آپ کی رائے اور خیالات سے الگ کوئی امر تھا۔

لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٩٠﴾

جائے اور جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا وہ بیٹھے رہے۔ جو اُن میں سے کفر پر ہے انھیں دردناک دکھ پہنچے گا ۱۳۳۳

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاۗءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩١﴾

نہ کمزوروں پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ اُن پر جو خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے جب وہ اللہ اور اس کے رسول سے اخلاص رکھیں نیکی کرنے والوں پر (الزام کی) کوئی راہ نہیں، اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۳۳۴

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿٩٢﴾ۭ

اور نہ ان پر (الزام ہے) کہ جب وہ تیرے پاس آئے کہ تو انھیں سواری دے تو نے کہا مجھے کچھ نہیں ملتا جس پر تمھیں سوار کروں وہ واپس چلے گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اس غم سے کہ وہ (مال) نہیں پاتے جسے خرچ کریں ۱۳۳۵

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَاۗءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٣﴾

الزام صرف ان پر ہے، جو تجھ سے اجازت مانگتے ہیں۔ حالانکہ وہ دولت مند ہیں۔ راضی ہو گئے کہ عورتوں کے ساتھ رہیں اور اللہ نے اُن کے دلوں پر مُہر لگا دی سو وہ نہیں جانتے۔

۱۳۳۳ معذرون۔ لسان العرب میں ہے کہ مُعتَذِر سچا بھی ہوتا ہے اور جھوٹا بھی، یعنی محض عذر کرنے والا خواہ وہ عذر درست ہو یا غلط اور عَذَّر کے معنی قَصَّر ہیں یعنی کوتاہی کی اور مُعَذِّر وہ ہے جو عذر پیش کرے اور اس کا عذر درست نہ ہو یعنی جھوٹا عذر بنانے والا یا بہانہ کرنے والا۔

الاعراب۔ اصل میں عَرَب کی جمع ہے مگر یہ ان لوگوں کے لیے خاص ہو گیا ہے جو بادیہ کے رہنے والے ہوں (غ) ہمارے ہاں اس کے مقابل پر دیہاتی کا لفظ ہے یعنی گاؤں کے رہنے والے لوگ۔

اس رکوع میں بالخصوص ان لوگوں کا ذکر ہے جو بادیہ کے رہنے والے تھے اور جن میں ایسے بھی لوگ تھے جو منافقانہ طور پر اسلام کا دعویٰ کرتے تھے اور ایسے بھی تھے جو سچے دل سے مسلمان تھے جیسا کہ آیت ۹۹ سے ظاہر ہے۔ مجاہد کہتے ہیں یہاں جن کا ذکر ہے وہ بنی غفار کا ایک گروہ تھا وقعد الذین میں اسی گروہ کا ذکر ہے۔ اور کذبوا اللّٰہ ورسولہ میں ان کے جھوٹے عذروں کا ذکر ہے۔ یعنی یہ لوگ جھوٹے عذر کر کے جنگ سے پیچھے رہ گئے۔

۱۳۳۴ نصحوا۔ نَصَحَ الشَّیُٔ کے معنی ہیں خَلَصَ یعنی خالص ہوئی اور نُصْحٌ غِشٌّ یعنی کھوٹ کی ضد ہے (ل) اور حدیث میں ہے اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ لِلّٰہِ ولرسولہ ولکتابہ ولائمۃ المسلمین وعامتہم یعنی دین نصیحت ہے اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور اس کی کتاب کے لیے اور مسلمانوں کے ائمہ کے لیے اور ان کے عام لوگوں کے لیے۔ جس کی شرح ابن اثیر نے یوں کی ہے کہ نصیحۃ سے مراد ارادۂ خیر ہے اس کے لیے جو منصوح ہے یعنی جس پر وہ فعل نصیحت واقع ہوتا ہے۔ پس اللہ کے لیے نصیحت اس کی وحدانیت کا اعتقاد اور اس کی عبادت میں اخلاص اور رسول کے لیے نصیحت اس کی نبوت اور رسالت کی تصدیق اور جو امر یا نہی وہ دے اس کی فرمانبرداری ہے اور کتاب اللہ کے لیے نصیحت کتاب پر عمل اور آئمہ کے لیے نصیحت ان کی اطاعت فی المعروف اور عوام کے لیے نصیحت ان کو اچھی باتوں کی طرف ہدایت کرنا ہے اور توبۃ نصوحا (التحریم ۶۶-۸) کے معنی ہیں خالص توبہ جس کے بعد اس بات کی طرف لوٹ کر نہ جائے جس سے توبہ کی ہے (ل)

جب پچھلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا جنھوں نے رسول اللہ صلعم سے جھوٹے عذر کر کے اجازت لے لی تھی کہ وہ جنگ میں نہ جائیں تو اب اس آیت اور اس سے اگلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا جو فی الحقیقت معذور تھے۔ اس میں تین گروہوں کا ذکر کیا ۱ کمزور جیسے بچے بوڑھے۔ ۲ بیمار۔ ۳ وہ لوگ جن کے پاس خرچ کرنے کو موجود نہیں۔ ایسے لوگ جہاد سیف میں معذور ہیں۔

۱۳۳۵ لتحملھم۔ حَمل کا لفظ اٹھانے کے معنی میں بہت سے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ گناہ کے اُٹھانے پر بھی استعمال ہوا

يَعۡتَذِرُوۡنَ اِلَيۡكُمۡ اِذَا رَجَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ ؕ قُلۡ لَّا تَعۡتَذِرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَـكُمۡ قَدۡ نَـبَّاَنَا اللّٰهُ مِنۡ اَخۡبَارِكُمۡ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمۡ وَرَسُوۡلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۴﴾

وہ تمھارے پاس بہانے لائیں گے جب تم لوٹ کر ان کی طرف جاؤ گے کہہ، بہانے مت بناؤ ہم تمھاری بات ہرگز نہ مانیں گے، اللہ نے تمھارے حالات کی خبر ہمیں دیدی ہے اور اللہ اور اس کا رسول تمھارے عمل کو دیکھے گا، پھر تم غائب اور حاضر کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمھیں خبر دے گا جو تم کرتے تھے ۱۳۳۶

سَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَـكُمۡ اِذَا انْقَلَبۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ لِتُعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ ؕ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ ؕ اِنَّهُمۡ رِجۡسٌ وَّمَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۹۵﴾

وہ تمھارے پاس اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم اُن کی طرف واپس جاؤ گے تاکہ تم اُن سے درگزر کرو، سو اُن سے درگزر کرو وہ ناپاک ہیں اور اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے ۱۳۳۷

يَحۡلِفُوۡنَ لَـكُمۡ لِتَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ ۚ فَاِنۡ تَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرۡضٰى عَنِ الۡقَوۡمِ

وہ تمھارے پاس قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم اُن سے راضی ہو جاؤ تو اللہ نافرمان لوگوں

ہے۔ مگر یہاں جس خاص موقع پر استعمال ہوا ہے اس کی تشریح میں لسان العرب میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے سفر کو جاری نہ رکھ سکے تو وہ دوسرے کے پاس جاتا اور کہتا ہے اِحۡمِلۡنِیۡ تو مراد ہوتی ہے کہ مجھے سواری کا جانور دو۔

تفیض من الدمع۔ فاض پانی کے بہنے پر بولا جاتا ہے جب وہ گر رہا ہو اسی معنی میں یہاں تفیض ہے اور دوسری جگہ ہے افیضوا علینا من الماء (الاعراف ۷–۵۰) اور اسی سے فیاض سخی کو کہا جاتا ہے اور اسی سے افاضوا فی الحدیث استعارۃً بات میں لگ جانے کے معنی میں ہے لمسّکم فیما افضتم فیہ (النور ۲۴–۱۴)

یہ ان لوگوں میں سے جو اس جنگ میں جانے میں فی الواقع معذور تھے چوتھا گروہ ہے۔ کسی نے کہا یہ بنو مقرن تھے جو مزینہ میں سے تھے کسی نے کہا عرباض بن ساریہ کا ذکر ہے کسی نے کہا مختلف قبیلوں کے سات آدمی تھے (ج) کسی نے ابوموسیٰ اشعری اور بعض اہل یمن کو اس کا مصداق ٹھہرایا (ر) ممکن ہے یہ سب ہی ہوں تخصیص کی ضرورت نہیں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ ہر موقع پر اس کے مناسب حال انتظام نہ ہونے سے انسان معذور ہوتا ہے۔ چونکہ یہ لمبا سفر تھا بغیر سواری کے نہ پہنچا جا سکتا تھا اس لیے سواری کا نہ ملنا بھی صحیح عذر تھا۔

لیکن جو نقشہ یہاں ان معذورین کا کھینچا ہے وہ صحابہ رضؓ کے قلب کی کیفیت کا ایک عجیب نقشہ ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جن کے پاس خرچ کرنے کو ہے وہ خوشی سے اللہ کی راہ میں دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب خرچ کرنے کو نہیں پایا اور رسول اللہ صلعم بھی سواری مہیا نہ فرما سکے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جذبہ محبت جو رسول اللہ صلعم کی فرمانبرداری کراتا تھا کس قدر زبردست تھا۔ آج مسلمانوں کی انفاق مال میں یہ حالت ہے کہ اوّل تو اسلام کی حالتِ زار دیکھ کر اسے چاروں طرف سے مصیبتوں میں مبتلا پاکر بھی ان کے دل دینے کے لیے نہیں پگھلتے اور اس قدر دل سخت کر لیتے ہیں کہ ایک پیسہ تک جیب سے نہیں نکلتا اور جو کچھ دیتے ہیں تو وہ بھی ایک گونہ جبر و اکراہ سے۔ دل نہیں چاہتا مگر لحاظ سے یا اور وجوہ سے کچھ دینا پڑتا ہے اسلام اس مقام کو چاہتا ہے کہ جو دے اس کا دل خوشی سے بھرا ہوا ہو کہ اس نے کچھ خدمت کی اور جو نہ دے سکے اس لیے کہ اس کے پاس نہیں اس کا دل غم سے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہوں۔

۱۳۳۶ چونکہ ان آیات کا نزول سفر تبوک میں ہوا، اس لیے پہلے باطل عذروں کے ساتھ جو اجازت کے لیے ان لوگوں نے کیے تھے جن کا ذکر جاء المعذرون (۹۰) میں ہے یہاں ان عذروں کا ذکر کیا ہے جو جنگ سے واپسی کے بعد پھر یہ لوگ کرینگے پہلی دفعہ یہ عذر قبول کر لیے گئے اب فرمایا کہ کہہ دو کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے تمہارے معاملہ پر روشنی ڈالی ہے اور تمہارا فیصلہ کر دیا ہے اس لیے اب عذر بے سود ہے۔

۱۳۳۷ منافقوں سے اعراض: ان کی قسمیں کھانے کی غرض یہ بتائی کہ مسلمان ان سے اعراض کریں یعنی ان کو ان کی کمزوریوں پر ملامت نہ کریں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ان سے اعراض ہی کرو یعنی کسی قسم کا تعلق نہ رکھو اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ ناپاک ہیں یعنی ان کے خیالات ناپاک ہیں وسوسہ اندازی ان کا کام ہے

الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

سے راضی نہیں ہوتا۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾

دیہاتی کفر اور نفاق میں بڑے سخت ہیں اور اسی کے زیادہ لائق ہیں کہ اس کی حدوں کو نہ جانیں جو اللہ نے اپنے رسول پر اتارا ہے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے ۱۳۳۸

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَاۗىِٕرَ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾

اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اُسے چٹی سمجھتے ہیں اور تم پر زمانہ کی گردشوں کی تاک میں رہتے ہیں بُری گردش انھیں پر پڑیگی اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۱۳۳۹

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۭ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۭ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ ع ۱۲

اور بعض گاؤں والے ایسے بھی ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں قرب اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ ٹھیراتے ہیں، سنو وہ ان کے لیے قرب کا ذریعہ ہے اللہ انھیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۳۴۰

ع۱۳۳۸ اجدر۔ جدیر ایک چیز کا منتہی ہے یعنی جس کی طرف ایک امر کا انتہا ہو جس طرح جدار یعنی دیوار کی طرف ایک امر کا انتہا ہو جاتا ہے اور جدار دیوار کو بلحاظ اس کی بلندی کے کہا جاتا ہے اور حائط احاطہ کرنے کے لحاظ سے جداراً یرید ان ینقض (الکھف ۱۸-۷۷) جمع جدر ہے او من وراء جدر (الحشر ۵۹-۱۴) اور اس لیے جدیر کے معنی ہیں گویا وہ اسی چیز کے لیے بنائے گئے ہیں۔

یہ قرآن شریف کا کمال تھا کہ ایسے سخت لوگوں کو بھی جو علم سے اس قدر دور تھے کہ حدود اللہ کا علم حاصل کرنے کیلئے گویا پیدا ہی نہیں ہوئے ان کو بھی حدود اللہ پر قائم کر دکھایا۔ اعراب کے اس نقشہ میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ دنیا کی کوئی قوم نہیں جس کی اصلاح قرآن شریف نہیں کر سکتا۔

ع۱۳۳۹ مغرمًا۔ غرم وہ ہے جو انسان کو اس کے مال میں نقصان پہنچے حالانکہ اس کا اپنا کوئی ایسا فعل نہیں نہ خیانت ہے یہاں اور انا لمغرمون (الواقعہ ۵۶-۶۶) میں چٹی مراد ہے اور قرضدار کو غارم یا غریم کہا جاتا ہے والغارمین (التوبة ۹-۶۰) اور غرام اس شدت اور مصیبت کو کہا جاتا ہے جو انسان پر آپڑے گویا وہ اس سے ایسا چمٹ جاتا ہے جیسے غریم۔ ان عذابہا کان غراما (الفرقان ۲۵-۶۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کو ظاہرداری کے لیے کچھ مال بھی خرچ کرنا پڑتا تھا اسے وہ چٹی سمجھتے تھے۔ بہتیرے مسلمان جو آج کچھ دینی کاموں میں خرچ کرتے ہیں اسے چٹی سمجھتے ہیں۔ قرآن نہیں پڑھتے کہ ان کو معلوم ہو کہ وہ صحابہؓ کے نقش قدم پر نہیں چلتے اور منافقین کا خرچ کیے ہوئے مال کو چٹی سمجھنا اس وجہ سے تھا، جیسا کہ خود بتایا کہ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان ہلاک ہو جائیں گے۔ یہ نویں سال ہجرت کی آیت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک بھی مخالفین کو یہ امید لگی ہوئی تھی کہ مسلمان تباہ ہو جائیں گے اس لیے اسلام میں داخل ہونا کسی لالچ کی بنا پر نہ ہو سکتا تھا۔

ع۱۳۴۰ قربات۔ قُربة کی جمع ہے۔ ہر ایک قدم جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتا ہے قُربة ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب بندہ پر فیض اور افضال سے ہے، نہ مکان سے اور قُرب اصل میں یہ ہے کہ بہت سی وہ صفات جو اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں ان سے بندہ مخصوص ہو گو اس حد تک وہ صفات اس میں نہ پائی جائیں جس حد تک اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں جیسے حکمت اور علم اور حلم اور رحمت اور غنا اور یہ تب ہوتا ہے جب پہلے انسان جہل اور طیش اور غضب وغیرہ بُری صفات سے پاک ہو (غ)

صلوٰت۔ صلوٰة کی جمع ہے جس کے اصل معنے دعا ہیں۔ دیکھو ع۱۲ یہی معنی یہاں مراد ہیں۔

قرآن کریم کا پیدا کردہ انقلاب: یہاں نہ صرف ایک حق بات کو ظاہر کیا کہ اعراب میں یا دیہاتیوں میں اگر سخت لوگ ہیں تو اچھے بھی ہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ کس طرح قرآن کریم کی بدولت ایک قوم ایک ایسے ذلیل مقام سے جس پر عرب کے دیہاتی تھے بلند مقام پر ترقی کر گئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا حاصل کرنا ان لوگوں کی غرض ہو گئی گویا کوئی دنیوی غرض نہیں کہ اس طرح مال خرچ کرنے سے حکومت اور سلطنت مل جائے گی بلکہ محض قرب الٰہی کا حصول غرض ہے — یہ فی الواقع بڑا ہی بلند مقام ہے آج کتنے مسلمان ہیں جو قرب الٰہی کے حصول کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کرنے کے لیے تیار ہوں ہاں حکومت اور سلطنت کے حصول کے لیے

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ
وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ
رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ
لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۰۰

اور پہلے سبقت لے جانے والے مہاجرین اور انصار میں سے
اور وہ جنھوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی اللہ ان سے راضی ہوا
اور وہ اس سے راضی ہوئے، اور اس نے ان کے لیے باغ تیار
کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ انھیں میں ہمیشہ رہیں
گے یہ بڑی کامیابی ہے [۱۳۴۱]

بہتیرے اپنے مال دینے کو تیار ہیں کاش مسلمانوں کے لیڈر اس بات پر غور کر کے قوم کو صحیح راہ پر ڈالیں۔ صلوٰت الرسول کا لفظ یہاں لا کر یہ بتایا ہے کہ گناہوں کے پاک کرنے میں رسول اللہ صلعم کی دعاؤں نے بھی ایک عظیم الشان کام کیا ہے اور قرب الٰہی آپ کی دعا کے بغیر میسّر نہیں آ سکتا۔ آپ کی یہ قوتِ قدسی اور یہ دعا اور توجہ اب بھی کام کرتی ہے۔ جو لوگ پیروں کے پیچھے پڑ کر ان کو ارباب من دون اللہ بنا رہے ہیں اور اپنے اموال کو ان کی نذروں نیازوں میں تباہ کرتے ہیں۔ اگر یہی اموال دین اسلام کی ترقی کے لیے خرچ کرتے تو رسول اللہ صلعم کی دعا ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے قرب کے مقام پر پہنچا دیتی مگر یہ افسوس کا مقام ہے کہ ایک طرف یہ لوگ اپنے اموال کو برباد کرتے ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے بھی روز بروز دُور پڑتے چلے جاتے ہیں۔ رسول کے دین کی ترقی میں جو شخص کوشاں ہو گا وہ یقیناً قرب الٰہی کے حصول میں ترقی کرے گا۔ یہی وہ طریق ہے جس پر رسول اللہ صلعم نے اپنے صحابہؓ کو چلایا اور یہی ہم کو صحابہؓ کی زندگیوں میں کام کرتا نظر آتا ہے۔ ایک بھی مثال ایسی نہیں کہ صحابہؓ میں کوئی پیر بن کر لوگوں کا مال نذر و نیاز کے رنگ میں کھاتا ہو۔

۱۳۴۱ سابقون۔ سَبْق کے اصل معنی چلنے میں آگے بڑھنا ہیں۔ اور اِستِباق ایک دوسرے سے آگے بڑھنا انّا ذھبنا نستبق (یوسف ۱۲۔ ۱۷) واستبقا الباب (یوسف ۱۲۔ ۲۵) اور پھر ہر قسم کے تقدم پر بولا جاتا ہے ما سبقونا الیہ (الاحقاف ۴۶۔ ۱۱) اور کلمۃ سبقت من ربّک (یونس ۱۔ ۱۹) میں مراد نفوذ یا پہلے ہو چکنا ہے اور فضیلت اور بزرگی کے حاصل کرنے پر بولا جاتا ہے السابقون السابقون (الواقعۃ ۵۶۔ ۱۰) سے مراد اعمال صالحہ سے ثواب اور جنّت کی طرف پہلے جانے والے ہیں گویا یسارعون فی الخیرات کے قائم مقام ہے وھم لھا سٰبقون (المؤمنون ۲۳۔ ۶۱) میں یہی مراد ہے اور ما نحن بمسبوقین (الواقعۃ ۵۶۔ ۶۰) میں مراد ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ سے نکل نہیں سکتے۔ ایسا ہی ولا تحسبن الّذین کفروا سبقوا (الانفال۔ ۵۹)

اولون۔ اَوْل۔ اَوْل سے ہے جس کے معنی ہیں اصل کی طرف رجوع کرنا۔ اور اوّل وہ ہے جس پر اس کا غیر مترتب ہو۔ اور اوّل ہونا کئی لحاظ سے ہو سکتا ہے جیسے زمانہ کے لحاظ سے جو عام ہے یا ریاست اور مرتبہ کے لحاظ سے جیسے اول امیر ہے پیچھے وزیر وغیرہ اور انا اوّل المسلمین (الانعام۔ ۱۶۴) انا اوّل المؤمنین (الاعراف۔ ۱۴۳) میں مراد یہ ہے کہ اسلام اور ایمان میں دوسروں کو میرا اقتدا کرنا چاہیئے اور لاتکونوا اوّل کافر بہ (البقرۃ ۲۔ ۴۱) میں بھی یہی مراد ہے کہ ایسے کافر مت بنو جو دوسرے تمہارا اقتدا کریں۔

مہاجرین۔ مہاجر کے لیے دیکھو ع ۲۸۰ مہاجرین اصطلاح اسلام میں وہ لوگ ہیں جن کو رسول اللہ صلعم کے اتباع کی وجہ سے اپنے وطن چھوڑنے پڑے یہاں تک کہ فتح مکّہ کے بعد عموماً ترک وطن کی ضرورت نہ رہی۔

انصار نصیر کے معنی ناصر یا مدد کرنے والا اور اس کی جمع انصار ہے مگر اصحاب نبی صلعم کے ایک گروہ کے لیے یہ خاص نام ہو گیا ہے جیسے ایک قبیلہ کا نام ہوتا ہے (ل) اور یہ اہل مدینہ کا وہ گروہ ہے جن کی وجہ سے دین اسلام کو وہ عظیم الشان نصرت ملی کہ سب مسلمان ہجرت کر کے وہاں چلے گئے۔

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ اللہ کی رضا بندہ سے یہ ہے کہ وہ اسے اپنے اوامر کی تعمیل کرتا ہوا اور اپنی نہیوں سے رکتا ہوا پائے اور بندہ کی رضا اللہ سے یہ ہے کہ جو کچھ اس کی قضا و قدر سے اس پر وارد ہوا سے ناپسند نہ کرے (غ)

اصل ذکر تو اس رکوع میں انہی لوگوں کا ہے جن سے کوئی کمزوریاں سرزد ہوئیں یا جو منافق تھے لیکن چونکہ پچھلے رکوع کے آخر میں اعراب کے اس گروہ کا ذکر آیا تھا جو اللہ تعالیٰ کا قرب چاہنے کے لیے اپنے مال خرچ کرتے تھے۔ اس لیے یہاں ان کامل مومنین کے گروہ کا ذکر بھی کیا جو دوسرے مسلمانوں کے لیے بطور مقتدا ٹھہرے اور یہ گروہ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کا ہے۔ سابقون اوّلون سے کیا مراد ہے۔ بعض نے کہا وہ جنھوں نے دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ بعض نے کہا اہلِ بدر، بعض نے اہل بیعت رضوان۔ بعض نے کہا جو ہجرت سے پہلے ایمان لائے اور انصار میں سے سابق اوّل اہل بیعت عقبہ اولیٰ و ثانیہ کو کہا ہے، لیکن اکثر اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد کل مہاجرین اور انصار ہیں اور سابق اوّل ہونا بلحاظ دوسرے مسلمانوں کے ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ سابق اور اوّل ہونے میں گو زمانہ کو بھی خاص دخل حاصل ہے اس لیے کہ جس قدر زیادہ مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اسی قدر زیادہ کمال ایمان بھی ان لوگوں کو حاصل ہوا اور جو لوگ پہلے ایمان لائے ان میں سے اکثر نے بہت بڑی بڑی ترقیاں کیں مگر سابق اور اوّل سے اصل مراد جیسا کہ ان الفاظ کی تشریح میں دکھایا گیا ہے اعمال صالحہ کے لحاظ سے سابق ہونا اور دوسروں کے لیے مقتدا ہونے کے لحاظ سے اوّل ہونا ہے۔ یوں بلحاظ زمانہ عبید اللہ مہاجرین اوّلین میں سے تھا مگر نصرانی ہو گیا۔ اس لیے حقیقتاً سابقون اولون بلحاظ زمانہ نہیں بلحاظ اعمال ہیں۔ اسی لیے جب ان کے اتباع کا ذکر کیا تو باحسان کا لفظ بڑھایا۔ یا نیکیوں میں ان کی اتباع کرنے والے گویا ان کا تقدم اور ان کی سبقت نیکیوں کے

ع وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۚ ﴿۱۰۱﴾

اور بعض تمھارے اردگرد کے دیہاتیوں میں سے منافق ہیں اور بعض مدینے کے رہنے والے بھی نفاق پر اڑے بیٹھے ہیں - تو اُن کو نہیں جانتا ، ہم انھیں جانتے ہیں ہم ان کو دوبار عذاب دیں گے پھر وہ بھاری عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے ۱۳۴۲

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

اور کچھ اور ہیں جنھوں نے اپنے قصور مان لیے ایک نیک کام اور دوسرا بُرا ملایا ، قریب ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۳۴۳

لینے میں تھی - یہ سابقین مقربین بارگاہ الٰہی ہیں والسابقون السابقون اولٰئک المقربون (الواقعۃ ۵۶ - ۱۰و۱۱) اور جنھوں نے احسان میں ان کی پیروی کی ان کو بھی ان کے ساتھ یہ مرتبہ ملا کہ اللہ ان سے راضی ہُوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور یہ بلند ترین مقام ہے جس پر انسان پہنچ سکتا ہے - اور فی الحقیقت جو کمال صحابہؓ نے اللہ کے اوامر و نواہی کی تعمیل میں دکھایا اس کی نظیر دنیا دکھانے سے عاجز ہے - قرآن کریم میں کوئی حکم نازل نہیں ہُوا جس کی تعمیل انہوں نے لفظاً نہیں کر دکھائی اور پھر اللہ تعالیٰ کے قضا و قدر پر ایسے راضی ہوئے کہ سر دیگر ، جان دیگر ، مال دیگر ، اولاد دیگر خوش ہوتے تھے ۔

ع ۱۳۴۲ مردوا - مارد اور مرید کے معنی راغب نے کیے ہیں خیرات سے خالی اور اسی سے اَمْرَد وہ ہے جس کی ڈاڑھی کے بال ابھی نہ نکلے ہوں اور حدیث میں جو آئے اهل الجنۃ مُرْدٌ تو اس کے ایک معنی یہ کیے گئے ہیں کہ وہ برائیوں اور عیبوں سے خالی ہوں گے اور مردوا علی النفاق کے معنی کیے ہیں ارتکسوا عن الخیر و هم علی النفاق یعنی نیکی سے محروم رہ گئے درانحالیکہ وہ نفاق پر تھے (غ) اور مَرَدَ کے معنی مَرَنَ بھی ہیں یعنی عادی ہو گیا اور مَرَدَ علی الشر کے معنی ہیں عتا و طغی یعنی سرکشی کی اور حد سے بڑھ گیا (ل)

منافقین کی سزا : چونکہ اصل ذکر اعراب یعنی بادیہ نشین منافقین کا چل رہا تھا - اس لیے اسی مضمون کی طرف رجوع کیا ہے اور فرمایا کہ ان میں سے تو منافق ہیں مگر اہل مدینہ میں سے جو شہری لوگ ہیں وہ نفاق پر سخت اڑے بیٹھے ہیں ان کا نفاق اس وقت سے شروع ہوا جب نبی کریم صلعم مدینہ میں تشریف لائے اور اب نویں سال تک انہوں نے اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تھی اور گو ان کے عمل سے ان کی حالت ظاہر تھی مگر تاہم یہ لوگ اس قدر چالاک تھے کہ مسلمانوں کے سامنے قسمیں کھا کھا کر اپنا مومن ہونا ظاہر کرتے تھے - (اتخذوا ایمانهم جنۃ (المنافقون ۶۳ - ۲) اس لیے فرمایا کہ تم انہیں نہیں جانتے ہم جانتے ہیں - اور ہم جانتے ہیں میں یہ اشارہ ہے کہ ہم اب تمہیں ان کے نام بتاتے ہیں یہی وہ لوگ تھے جنھیں مسجد سے نکال دیا گیا - اور ان کی سزا بتائی کہ دو دفعہ ان کو عذاب دیں گے پھر عذاب عظیم کی طرف لوٹائے جائیں گے - عذاب عظیم آخرت کا عذاب ہے اس لیے دو دفعہ کا عذاب اس دنیا میں ہونا چاہیئے اکثر مفسرین نے اس دو دفعہ میں عذاب قبر کو شامل کیا ہے حالانکہ عذاب قبر عذاب آخرت میں شامل ہے اور وہ منافقوں سے خاص نہیں - اور ایک عذاب پر حضرت ابن عباسؓ سے روایت موجود ہے کہ آنحضرت صلعم نے خطبۂ جمعہ میں ان منافقوں کے نام لیکر ان کو مسجد سے نکال دیا یہ ان کی رسوائی ان کے لیے واقعی سخت عذاب کا موجب تھی اس لیے کہ اب تک وہ اپنی منافقت کو جھوٹی قسمیں کھا کر چھپاتے تھے - اب وہ سب پردہ فاش ہو گیا اور دوسرے عذاب پر قرآن کریم اپنی نص صریح سے شاہد ہے ولا تعجبک اموالهم واولادهم انما یرید اللہ ان یعذبهم بها فی الدنیا (۸۵) ان منافقوں کے مال اور اولاد تجھے تعجب میں نہ ڈالیں اللہ چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ انہیں دنیا میں عذاب دے اور یہ یوں عذاب کا موجب تھا کہ ان کی اولادیں اُن کی آنکھوں کے سامنے مسلمان بنیں اور اسلام کی تائید اور نصرت میں جانوں تک دیتے تھے اور ان کو مال بھی ظاہرداری کے لیے اسلام کی تائید میں خرچ کرنے پڑتے تھے جیسا کہ آیت ۹۸ سے ظاہر ہے جہاں فرمایا کہ وہ اس خرچ کو چٹی سمجھتے ہیں - دل سے تو اسلام کے دشمن تھے اور اسلام کی تباہی چاہتے تھے اور ان کے مال اور اولاد اسلام کی تائید میں خرچ ہو رہے تھے اس سے بڑھ کر عذاب کیا ہو سکتا تھا پس یہی دو عذاب دنیا تھے ۔

ع ۱۳۴۳ اعترفوا - عَرَفَ کے معنی پہچانا یا جان لیا - اور اِعْتَرَفَ کے معنی اقرار کیا اور اصل اس کا گناہ کی معرفت کا اظہار ہے جو جحود کی ضد ہے (غ) اور اعترف بمعنی عَرَفَ بھی آتا ہے (ل) اور اعتراف ذنب کے لازماً یہ معنی نہیں کہ گناہ کر کے دوسروں پر ظاہر کرتا پھرے بلکہ رسول اللہ صلعم کے سامنے ایک شخص نے آ کر اپنے کسی گناہ کو ظاہر کیا تھا تو آپ نے منہ پھیر لیا اور دو دفعہ اسی طرح کیا گویا اس کو پسند نہ کیا اور حضرت عمرؓ کا قول منقول ہے اَطْرُدُوا الْمُعْتَرِفِیْنَ یعنی جو لوگ ان باتوں کو جن میں حد اور تعزیر واجب ہے خود ظاہر کرتے ہیں ہم ان کو شہر سے نکال دیں گے گویا اسے ناپسند کیا (ل) اصل اعتراف ذنب یہ ہے کہ انسان کا اپنا نفس یہ محسوس کرے کہ اس سے ایک برا فعل سرزد ہوا ہے اور اس کے ازالہ کی کوشش کرے یہی اقرار ہے ۔

منافقوں کی توبہ : مفسرین نے یہاں ابولبابہ اور بعض دوسرے لوگوں کا ذکر کیا ہے ، مگر یہ سب بطور مثال ہے قرآن کریم نے منافقوں کے ذکر کو یہاں ہر پہلو سے پورا کر دیا ہے - چونکہ یہاں

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾

ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے لے تاکہ اس سے تو انھیں پاک اور صاف کرے، اور ان کے لیے دعا کر، کیونکہ تیری دعا ان کے لیے تسکین ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے[١٣٤٤]

اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور زکوٰۃ لے لیتا ہے اور کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے[١٣٤٥]

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾

اور کہہ عمل کرو اللہ تمھارے عمل کو دیکھے گا اور اس کا رسول اور مومن بھی۔ اور تم غائب اور حاضر کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے، سو وہ تمھیں خبر دے گا جو تم عمل کرتے تھے[١٣٤٦]

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

اور کچھ اور اللہ کے حکم کے لیے پیچھے رکھے گئے ہیں یا انھیں عذاب دے اور یا ان کی توبہ قبول کرے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے[١٣٤٧]

منافقوں کی سزا کا ذکر تھا اور اوپر ان منافقوں کا ذکر ہوا جو نفاق پر اڑ گئے اور ان کی فضیحت کا ذکر تھا تو اب ایک اور گروہ کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا اور ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخت دشمن اسلام نہ تھے یا کمزوری کی وجہ سے منافقین سے ملے ہوئے تھے اور سوائے ان تھوڑوں کے جنکے نام لیکر انہیں مسجد سے نکالا گیا بڑا حصہ منافقوں کا ایسا ہی تھا جو سچے دل سے مسلمان ہو گئے اور عسی اللہ ان یتوب علیہم میں جو امید دلائی ہے وہ ان کے حق میں پوری ہوئی۔

١٣٤٤ تطہرهم وتزکیهم۔ تطہیر اور تزکیۃ میں فرق یہ ہے کہ طُہر نجاست کا نقیض ہے اور تطہیر کے معنی نجاست سے پاک کرنا ہیں اور تزکیۃ کا اصل زکا ہے جو نمو پر بولا جاتا ہے اور اس لیے تزکیۃ کے معنی ہیں خیرات اور برکات سے نفس کو ترقی دینا۔ پس تطہیر صرف برائیوں سے پاک کرنا ہے اور تزکیہ نیکیوں میں ترقی کرنا۔ صل علیہم میں یہاں صرف دعا مراد ہے یعنی ان کے لیے استغفار کرو، نماز جنازہ مراد نہیں۔

توبہ کرنے والے منافقوں سے زکوٰۃ کا لینا اور مسلمانوں کے لیے سبق: یہاں رسول اللہ صلعم کو یہ حکم دیکر کہ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لیلو یہ بھی بتا دیا ہے کہ آیت ١٠١ کے منافقوں سے جنھیں مسجد سے نکال دیا گیا زکوٰۃ نہیں لینی چاہیئے جو مسلمان زکوٰۃ ادا نہیں کرتے وہ غور کریں کہ ان کا حشر کس گروہ میں ہوگا۔ نام کا مسلمان کہلانا کوئی فائدہ نہ دیگا جس طرح منافقوں کو فائدہ نہ دیا۔ پھر اس زکوٰۃ لینے کا فائدہ یہ بتایا کہ اس سے ان کی تطہیر اور ان کا تزکیہ ہوگا یعنی جو گناہ کر چکے ہیں ان سے پاک ہونگے اور آئندہ نیکیوں میں ترقی کریں گے اور نبی کریم صلعم کو ان کے لیے دعا کا حکم دیا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلعم کے پاس جب زکوٰۃ کا مال آتا تو آپ دینے والے کے لیے دعا کرتے اور اسی طرح جو امام ہو اس پر واجب ہے دعا کو دوسروں کے لیے موجب تسکین فرمایا ہے۔

١٣٤٥ یاخذ الصدقات۔ اَخذ کے معنی لے لینا ہیں لیکن یہاں اللہ تعالیٰ کا صدقات کو لینا استعارۃً بمعنی قبولیت ہے۔

١٣٤٦ اللہ تعالیٰ تو اعمال کو دیکھتا ہی ہے مطلب یہ ہے کہ تمھیں آئندہ اپنے صدق اور اخلاص کا ثبوت دینا ہوگا دوسری جگہ فرمایا قل للمخلفین من الاعراب ستدعون الی قوم اولی باس شدید تقاتلونہم او یسلمون (الفتح ٤٨ - ١٦) اور چونکہ یہاں بھی پیچھے فرمایا تھا کہ آئندہ یہ منافق جنگ میں ساتھ نہ نکلیں (٨٣) اس لیے جنھوں نے توبہ کی ان کو پھر موقعہ ملتا ہے کہ اسلام کے لیے اپنے صدق اور اخلاص کو دشمن کے مقابلہ میں نکل کر دکھائیں۔ اس لیے اللہ کے ساتھ رسول اور مومنوں کا لفظ بڑھایا ہے یعنی وہ اس قسم کے عمل ہونگے جن کو رسول اور مومن بھی دیکھ سکتے ہیں اور وہ جنگوں میں نکلنا ہے۔ آج بھی مسلمان اپنے اخلاص کا ثبوت اسی طرح دے سکتے ہیں کہ خدا کی راہ میں اور اس کے دین کی ترقی کے لیے اپنے مالوں کو بے دریغ خرچ کریں اور اپنی جانیں دیدیں۔

١٣٤٧ مرجون۔ اَرجَا الامر کے معنی ہیں اَخّرہٗ یعنی اسے پیچھے ڈال دیا اور ہمزہ ترک بھی کر دیا جاتا ہے (ل)

منافقین سے تشابہ: یہ کون تھے؟ ابن عباس مجاہد عکرمہ وغیرہ اسی طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد وہی تین شخص ہیں جن کا ذکر آیت ١١٨ میں ہے مگر اس رکوع میں منافقین کا ذکر ہے اور ان تین کا ذکر آگے چل کر مومنوں کی ذیل میں بھی کیا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان تینوں نے غزوۂ تبوک میں شمولیت پر اپنے آرام کو مقدم کیا اور یوں منافقوں کے ساتھ خود تشبیہ پیدا کر لی۔ اس لحاظ سے ان کا ذکر یہاں کیا اور ان کی توبہ کا ذکر مومنوں کی ذیل میں کیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ فی الواقع منافقین میں شامل نہ تھے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور کچھ وہ ہیں جنھوں نے ضرر اور کفر اور مومنوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے مسجد بنائی اور اس شخص کے لیے گھات جس نے پہلے سے اللہ اور اسکے رسول کے ساتھ لڑائی کی اور وہ یقیناً قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ سوائے بھلائی کے کچھ نہ تھا۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں ۱۳۴۸

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

اس میں کبھی کھڑا نہ ہو یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوے پر رکھی گئی ہے زیادہ لائق ہے کہ تو اس میں کھڑا ہو اس میں ایسے لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ پاک رہیں اور اللہ پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے ۱۳۴۹

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

تو کیا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقوے اور رضا پر رکھی اچھا ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھوکھلے گرتے ہوئے کنارے پر رکھی سو وہ اس کو جہنم کی آگ میں لے گرا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ۱۳۵۰

ع ۱۳۴۸ اس آیت میں منافقوں کے اس گروہ کا ذکر ہے جنہوں نے وہ مسجد بنائی جو مسجد ضرار کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بارہ آدمی تھے جنہوں نے ابو عامر راہب کی سازش سے ایک مسجد قبا کے پاس بنائی۔ ابو عامر خزرج میں سے ایک شخص تھا جو زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گیا۔ اور بوجہ اس کی عبادت کے خزرج اس کی عزت کرتے تھے۔ جب بدر میں رسول اللہ صلعم کو فتح ہوئی تو ابو عامر بھاگ کر قریش سے جا ملا اور ان کو رسول اللہ صلعم کی جنگ کے لیے اکسایا اور اُحد میں خود بھی آیا۔ اور انصار کو ورغلانا چاہا مگر نامراد رہا۔ آخر جب رسول اللہ صلعم کے امر کو غالب ہوتے دیکھا تو ملک شام میں چلا گیا تاکہ ہرقل سے رسول اللہ صلعم کے خلاف مدد لے اور وہاں سے کچھ وعدہ پا کر اس نے اپنی قوم کے بعض آدمیوں کو خط لکھا کہ وہاں ایک علیحدہ مسجد بنائیں جہاں منصوبہ بازی کا کام آسانی سے ہو سکے۔ اسی بنا پر یہ مسجد بننی شروع ہوئی۔ رسول اللہ صلعم تبوک کے لیے تیار تھے جب یہ لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس آئے کہ آپ اس میں نماز پڑھیں، آپ نے فرمایا سفر سے واپسی پر دیکھا جائے گا۔ واپسی پر مدینہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وحی کے ذریعہ سے اصل حقیقت سے آپ کو اطلاع دی اور آپ نے اس مسجد کو گروا دیا۔ اس کے بنانے کی اوّل غرض ضراراً فرمائی، یعنی مسلمانوں کو ایذا پہنچانا۔ سو ظاہر ہے دوسری غرض کفر کا پھیلانا وہ بھی ظاہر ہے۔ تیسری تفریقاً بین المومنین جس سے مراد یہ ہے کہ الگ مسجد بنانے کی غرض مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا تھا تاکہ بعض لوگوں کو دھوکہ دیکر اپنے ساتھ ملالیں اور ارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ سے مراد ابو عامر کے لیے گھات ہے۔ کیونکہ غرض یہ تھی کہ ابو عامر اس مسجد کے ذریعہ سے رسول اللہ صلعم کے حالات سے آگاہی وغیرہ حاصل کرتا رہے، جس سے آپ کے خلاف سازش میں اسے مدد ملے۔

ع ۱۳۴۹ اسس۔ اُس اور اساس بنیاد کو کہتے ہیں جس پر عمارت بنائی جائے اور جہاں سے کسی چیز کی ابتدا ہو اسے بھی کہتے ہیں اور انسان کا اُسّ اس کا قلب ہے (ل) تقوٰی پر بنیاد ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے بنانے میں تقوٰی مدنظر تھا۔

اس مسجد سے مراد مسجد قبا ہے۔ گو بعض روایات میں مسجد نبوی کا ذکر بھی ہے مگر قول اوّل کو ترجیح ہے اور یہ جو فرمایا کہ اس میں لوگ ہیں جو پاک ہونا چاہتے ہیں تو مراد ظاہری طہارت نہیں گو چند روایات اس کی تائید میں ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف نے اس تطہیر کا ذکر پہلی شرارتوں کے مقابل پر کیا ہے۔ ظاہری طور پر پاکیزہ کپڑوں سے تو مسجد ضرار میں بھی جا سکتے تھے۔ مراد قلوب کی پاکیزگی ہے یعنی ہر قسم کی شرارت سے پاک ہونا جیسے تقوٰی پر بنیاد رکھنے سے مراد یہ نہیں کہ تقوٰی کوئی جسمانی شے تھی جس پر بنیاد رکھی گئی۔

ع ۱۳۵۰ بنیان۔ بَنیٰ سے جس کے معنی ہیں عمارت بنائی اور بُنیان دیوار کو بھی کہتے ہیں کانہم بنیان مرصوص (الصف ۶۱-۴) اور ہر چیز کو جو بنائی جائے۔ چنانچہ دوسری جگہ آیا ہے فاتی اللہ بنیانہم من القواعد (النحل ۱۶-۲۶) جہاں مراد ان کی تدابیر کی عمارت ہے۔ چنانچہ بناء کا لفظ جسم انسانی پر بھی بولا گیا ہے من ھدم بناء ربہ اور

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١١٠﴾	اُن کی عمارت جو انھوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں کی بےچینی کا موجب رہے گی، یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۱۳۵۱
إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١١﴾	اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں (اس کے) بدلے میں کہ اُن کے لیے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، سو مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔ یہ وعدہ اس کے ذمے سچا ہے، توریت اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو کون پورا کرنے والا ہے سو اپنے سودے پر جو تم نے اس سے کیا ہے خوش ہو جاؤ، اور یہی بڑی کامیابی ہے ۱۳۵۲

بِنْيَة فطرت کو کہا گیا ہے (ل)

شفا۔ شَفا کنوئیں وغیرہ کے کنارے کو کہتے ہیں اور ہلاکت سے قرب میں مثال کے طور پر بولا جاتا ہے جیسے یہاں اور شِفاء بیماری سے بھی ہوتی ہے جو گویا سلامتی کے کنارہ کو پالینا ہے (غ)

جرف۔ جَرْف کسی چیز کا بہت سا یا سارے کا سارا لے لینا ہے اور جرف وادی اور نہر کی جانب کا نچلا حصّہ ہے جسے سیل بہا لیجاتا ہے اور اس کا اوپر کا حصّہ آگے بڑھا ہوا رہ جاتا ہے پھر جب وہ اوپر کا حصّہ پھٹ جائے تو اسے ھار کہا جاتا ہے۔ حدیث میں جو طاعون جارِف کا ذکر ہے اسی مادہ سے ہے (ل)

ھار۔ انھار و ھارَ البناءُ دیوار گر گئی۔ انہار اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو بلند جگہ سے نیچے گر جائے۔

یہاں مراد سچ مچ عمارتوں کا بنانا نہیں، بلکہ مومن اور منافق کی حالت کو تشبیہ دی ہے۔ ایمان کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے اور نفاق کی بنیاد نہایت کمزور ہے

۱۳۵۱ ریبة۔ ریب سے اسم ہے اور بنوا ریبة فی قلوبهم کی تفسیر میں ہے تَدُلُّ علی دغلٍ وقِلّةِ یقینٍ یعنی یہ کھوٹ اور قلت یقین پر دلالت کرتا ہے (غ)

تقطع قلوبهم۔ قَطع کے معنی ہیں کسی چیز کا علیحدہ کر دینا جسم سے ہو یا معنًا جیسے ویقطعون ما امر اللہ بہٖ ان یوصل (البقرۃ ۲۷) اور دلوں کے کٹنے سے مراد یہ ہے کہ مر جائیں یا یہ کہ ایسی توبہ کریں جس سے ان کے دل ندامت کے مارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں (غ)

یہاں خود ان کی اس عمارت کو ریبة کہا ہے یعنی شک اور قلق اور اضطراب جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مراد ان کا دین ہے۔

۱۳۵۲ مسلمانوں کا عہد: جب منافقوں کا ذکر ہو چکا تو اب بتایا کہ وہ لوگ جو فی الواقع مومن ہیں ان کا کیا طریق ہے۔ جان اور مال دو ہی چیزیں انسان کو بہت پیاری ہیں سو سب سے پہلے یہ فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں اور اس کا معاوضہ جنت قبول کر چکے ہیں۔ گویا اللہ پر ایمان کی حقیقت یہ بتائی کہ انسان اپنی محبوب ترین چیزوں کو اپنا نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا مال سمجھے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں کے ساتھ عہد ہے جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں گے اس وقت تک اللہ تعالیٰ سے جنت کے مستحق ہونگے اور وعدۂ جنت میں اس دنیا کی کامیابی کا وعدہ بھی شامل ہے۔ جیسا کہ متعدد مقامات سے ظاہر ہے، لیکن اگر مسلمان اپنے عہد پر قائم نہ رہیں تو معاوضہ کے بھی وہ مستحق نہ ہونگے پس ہر ایک شخص کو جو مسلم کہلاتا ہے یا ایمان کا دعویٰ کرتا ہے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی جان اور اپنا مال دونوں بیچ چکا ہے اور ان پر اس کا کوئی حق نہیں اور اب وہ بطور ایک امین کے ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کو لگائے۔

صحابہؓ نے اس عہد کو کس طرح پورا کیا: اس وعدہ کے بعد اُن کے کاموں کا ذکر کیا اور چونکہ پچھلے رکوعوں میں منافقوں کی سب سے بڑی علامت یہ بتائی کہ وہ لڑائی کے لیے نہیں نکلتے اس لیے مقابلہ کے طور پر یہاں مومنوں کے جنگ کرنے کا ذکر کیا۔ منافق نمازیں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ زکوٰۃ بھی دیدیتے تھے اور احکام ظاہری نکاح وغیرہ کے معاملات میں بھی شریعت قرآنی پر عمل کر لیتے تھے مگر جنگوں کے پیش آنے پر اُن میں اور مومنوں میں مابہ الامتیاز یہ ہو گیا کہ وہ جنگوں میں نہ نکلتے تھے۔ اس لیے یہاں مومنوں کے ساتھ وعدہ کا ذکر کر کے عمل کے رنگ میں اس چیز کو پیش کیا جو منافقوں اور مومنوں میں مابہ الامتیاز تھا۔ یعنی جنگ کرنا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ظاہر ہے کہ جان اور مال کو دینے کا پورا امتحان جنگ میں ہی ہوتا ہے اس لیے وعدہ کے ذکر کے ساتھ اس چیز کا ذکر کیا جو ایفائے وعدہ کے لیے ایک محک کے طور پر کام دے سکتی تھی لیکن یقاتلون سے یہ مراد لینا کہ خواہ مخواہ لوگوں کو مارتے پھرتے ہیں پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ جنگ کی ضرورت جو پیش آئی وہ خود کھول کر قرآن شریف بیان فرما چکا ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (البقرۃ ۱۹۰) انہی جنگوں میں نہ شامل ہونے پر منافقوں کو الزام دیا انہی میں شمولیت اختیار کرنے کو مومن کے وعدہ کا ایفا قرار دیا۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، خدا کی راہ میں سفر کرنیوالے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، بھلائی کا حکم دینے والے اور بُرائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدّوں کی حفاظت کرنے والے اور مومنوں کو خوش خبری دے ۱۳۵۳

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾

نبی کے لیے شایاں نہیں اور (نہ) ان کے لیے جو ایمان لائے کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش مانگیں، گو وہ قریبی ہوں - اس کے بعد کہ اُن پر کُھل گیا کہ وہ دوزخ والے ہیں ۱۳۵۴

تیسری بات جو یہاں بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ یہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ کا مومنوں کے ساتھ ہے یہ توریت اور انجیل اور قرآن سب میں پایا جاتا ہے گویا سب انبیاء یہی وعدہ لیتے تھے - ظاہر ہے کہ جس وعدہ کا اوپر ذکر ہے وہ یہی ہے کہ جنت کے عوض اپنی جانوں اور مال کو بیچ دیا ہے بالفاظ دیگر وعدہ یہ ہے کہ مومن جان اور مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیگا اور اللہ تعالیٰ اُسے جنت دے گا - عیسائی جو قرآن کریم کے بیانات کو توڑ مروڑ کر محل اعتراض بنانے کے عادی ہیں کہتے ہیں یہ قرآن کریم نے جھوٹ کہا ہے ایسا کوئی وعدہ توریت اور انجیل میں نہیں - غالباً یہ لفظ قلم سے نکالتے وقت پادری صاحبان کا خیال یقاتلون کی طرف تھا کیونکہ اسلام میں قتال کی اجازت انہیں سب سے بڑا عیب نظر آتا ہے حالانکہ جس مصیبت کی حالت میں پہنچ کر مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی کوئی عقلمند ایک لمحہ کے لیے بھی ان حالات میں جنگ کرنے پر اعتراض نہیں کرسکتا اور موسوی شریعت میں تو ایسی کوئی شرائط جنگ کے لیے قطعاً نہیں اور خود عیسائی قومیں جب اپنے آپ کو طاقتور پاتی ہیں تو ادنےٰ ادنےٰ بہانوں پر جنگ کے لیے آمادہ ہو جاتی ہیں مگر بہرحال یقاتلون میں کسی وعدہ کا ذکر نہیں - ایفائے وعدہ کا ذکر ہے اور وعدہ کا ذکر اشتریٰ من المؤمنین میں ہے اور یہ سچ ہے کہ یہی وعدہ توریت اور انجیل میں موجود ہے - جب ایک دولتمند حضرت مسیح کے پاس آیا اور پوچھا کہ اے نیک استاد میں کونسا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں، تو حضرت عیسیٰ نے جواب دیا "اگر تو کامل ہوا چاہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا تب آکے میرے پیچھے ہولے" (متی ۱۹: ۲۱) اور حضرت موسیٰ کی بھی یہی تعلیم تھی "تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ" جنت یا آسمان کی بادشاہت دنیا پر لات مارنے کے بغیر نہیں ملتی ٭

ع ۱۳۵۳ السّائحون - سَاحَۃ فراخ مکان کو کہتے ہیں اور ساحۃ الدار گھر کے صحن کو کہتے ہیں فاذا نزل بساحتھم (الصّٰفّٰت - ۱۷۷) اور ساح فی الارض کے معنی ہیں زمین میں گزرا یا سیاحت کی فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھر (التوبۃ - ۲) اور سائح اس پانی کو کہتے ہیں جو دائم طور پر جاری ہو - اور سیّاح اور سائح سیاحت کرنے والے کو کہتے ہیں (غ) اور سائحون جو یہاں آیا ہے اور سائحات (التحریم - ۵) کے معنی روزہ رکھنے والے صحابہ اور تابعین سے مروی ہیں - بلکہ ایک حدیث میں یہی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ سائحون کے معنی صائمون ہیں اور ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے سیاحت کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا کہ میری امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے (ش) مگر عموماً روزہ رکھنے والے معنی ہی قبول کیے گئے ہیں اور مفردات میں بھی ہے السائحون ای الصائمون اور السائحات ای الصائمات پھر اس کے بعد لکھا ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ روزہ دو طرح پر ہے ایک حقیقی یعنی کھانے پینے کا ترک کرنا اور دوسرا حکمی یعنی جوارح کا معاصی سے محفوظ رکھنا - اور سائح اسی روزہ کا رکھنے والا ہے -

پہلی آیت میں مومنوں کے عہد کا ذکر کیا اور اس میں ان کی صفات بیان کیں - سب سے پہلے تائب یعنی سب قسم کے گناہوں سے توبہ کرنے والے پھر عابد یعنی تو جے کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگانے والے - پھر حامد یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے اور جس کی حمد کی جائے اس کی صفات کو انسان اپنے اندر لیتا ہے پس حامدون اخلاق الٰہی کے رنگ میں رنگین ہونیوالے ہیں - پھر سائحون یعنی روزہ رکھنے والے یا اپنے جوارح کی پوری حفاظت کرنے والے، پھر اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی کی حالت اختیار کرنے والے - پھر دوسروں کو نیکی کی راہ پر ڈالنے والے اور بُرائی سے روکنے والے اور سب سے آخر حدود اللہ کی حفاظت کے لیے کھڑے ہو جانے والے یہ وہ مومن ہیں جن کے لیے خوش خبری ہے -

ع ۱۳۵۴ اس آیت کی رو سے ان مشرکوں کے لیے استغفار منع کیا گیا ہے جن کے متعلق یہ کھلے طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ اصحاب جحیم ہیں صحیح بخاری اور دیگر صحاح میں اس کا شان نزول ابوطالب کی وفات کو بیان کیا گیا ہے جو ہجرت سے پیشتر کا واقعہ ہے اور اس سورت کا نزول ۹ سنہ ہجری کا ہے - اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم برابر اس کے لیے استغفار کرتے رہے جب تک کہ کفار سے قطع تعلق کی وجہ سے اس سورت کے نزول کے وقت آپ کو روکا نہیں گیا اور بعض احادیث میں اس کا شان نزول آپ کا اپنی والدہ کے لیے استغفار کرنا بتایا گیا ہے - ابوطالب نے آنحضرت صلعم کا زمانہ پایا - مگر آپ کی والدہ جو آپ کی بعثت سے چونتیس سال پیشتر وفات پا چکی تھیں ان کے متعلق ایسا خیال جائے تعجب ہے - فرعون نے جب حضرت موسیٰ سے دریافت کیا فما بال القرون الاولیٰ (طٰہٰ - ۵۱) تمہارے آنے سے پیشتر جو نسلیں گزر چکیں ان کا کیا حال ہے تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا علمھا عند ربی (طٰہٰ - ۵۲) بعثت نبی سے پیشتر جو لوگ ہوتے ہیں یا جن کو تبلیغ نہیں پہنچی ان پر

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور ابراہیمؑ کا اپنے بزرگ کے لیے بخشش مانگنا صرف ایک وعدے کی وجہ سے تھا جو اس نے اُس سے کیا تھا پھر جب اس پر کُھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے وہ اس سے الگ ہو گیا۔ یقیناً ابراہیمؑ بہت نرم دل اور بُردبار تھا۔۱۳۵۵

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور اللہ (کی شان) نہیں کہ ایک قوم کو گمراہ قرار دے جب انھیں ہدایت دے چکا جب تک کہ ان کے لیے بیان نہ کر دے جس سے انھیں بچنا چاہیئے۔ اللہ سب باتوں کا جاننے والا ہے۔۱۳۵۶

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کی ہی ہے۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ کے سوائے تمھارا کوئی حمایتی نہیں

مواخذہ بھی صرف اس روشنی کے مطابق ہوتا ہے جو عقل اور فطرت کے ذریعہ سے ان کو دی گئی ہے نبی کے انکار کا لفظ ان پر نہیں آتا اور آنحضرت صلعم کی والدہ کا صحیح فطری مذہب پر قائم ہونا خود وتقلبك فی الساجدین (الشعراء ۲۶ - ۲۱۹) کی اس تفسیر سے ظاہر ہے جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ مراد اس سے آپ کا انتقال ایسے آباء اور امہات میں ہوتے رہنا ہے جو ساجدین میں داخل تھے۔

استغفار کی ممانعت کو اس بات کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ ان کا دوزخی ہونا صراحت سے معلوم ہو جائے۔ مفسرین نے صرف دو ہی صورتیں ایسی تبیین کی ٹھہرائی ہیں ایک یہ کہ ایک شخص حالت کفر پر مر جائے دوسرا یہ کہ وحی سے معلوم ہو جائے کہ ایک شخص ناقابلِ اصلاح ہے اور قرآن کریم نے خود جو تصریح فرمائی ہے وہ اگلی آیت میں مذکور ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ کا استغفار سے اس وقت رکنا بیان کیا گیا ہے جب یہ واضح ہو گیا کہ وہ شخص خدا کا دشمن تھا۔ پس اصل بات تو یہی ہے کہ استغفار سے روکنے کی غرض صرف یہی ہے کہ جو شخص کھلے طور پر حق اور صداقت کا جو اللہ تعالیٰ نے بھیجی ہے دشمن ہو اس کے لیے طلب حفاظت الٰہی یا طلب معافی بے معنی ہے خدا کے دشمنوں سے ایسا تعلق مومن کو شایاں نہیں اور کسی شخص کی ایسی دشمنی پر قطعی یقین تو وحی الٰہی سے ہی پیدا ہوتا ہے گو بعض وقت واقعات بھی بتا دیتے ہیں مگر اس نہی میں عام مشرک یا کافر شامل نہیں ہاں جو لوگ حالت شرک یا کفر پر مر جائیں ان کی نماز جنازہ کے نہ پڑھنے کا استدلال بھی اس سے کیا جا سکتا ہے اور اصل تو یہ ہے کہ نماز جنازہ صرف مسلمان کا حق مسلمان پر ہے انسانی ہمدردی کا حق اور ہے اور اسلامی ہمدردی عامہ انسانی ہمدردی کے حق کے علاوہ ہے نماز جنازہ بغیر تعلق اخوت اسلامی جائز نہیں ہاں اللہ تعالیٰ اپنی وسیع رحمت سے جس طرح چاہے ان سے معاملہ کرے۔ مگر نماز جنازہ انہی لوگوں کی ہو سکتی ہے جو ظاہر طور پر اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

۱۳۵۵ وہ جو کثرت سے تأوّہ کرے یا اٰوہ کہے اور تأوُّہ ہر وہ کلام ہے جو حزن پر دلالت کرے اور مراد اس سے ایسا شخص لیا جاتا ہے جو بہت خشیۃ اللہ کو ظاہر کرے (غ) نرم دل اس لیے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے کہ کثرت خشیۃ اللہ سے نرم دلی پیدا ہوتی ہے۔ ابن جریر میں جو اقوال اس کے معنی میں نقل کیے گئے ہیں ان میں الرحیم کو ترجیح ہے یعنی اس سے مراد رحم کرنے والا ہے۔

ابراہیمؑ اور آزر: حضرت ابراہیمؑ کا اپنے اب یا بزرگ کے لیے استغفار سے روکا جانا یہاں سے صراحت سے ثابت ہے حالانکہ والدین کے لیے استغفار آخر عمر تک کرتے رہے ربنا اغفر لی ولوالدی (ابراہیم ۱۴ - ۴۱)

اب کے لیے دیکھو ح ۹۶۷ باوجود اس کے کہ وہ حضرت ابراہیم ...... کا بزرگ تھا جب اس کی حالت معمولی کفر کی حالت سے نکل کر یہاں تک پہنچ گئی کہ کھلے طور پر اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو گیا تو پھر اس کی بخشش کی دعا کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس ناحق اور باطل کو جو حق اور صداقت کو کچلنا چاہتا ہے دنیا میں سبز کرے ہاں جب تک ایسا نہ ہو اس وقت تک غیروں کے لیے بھلائی مانگنا بھی مقام مدح پر ہے۔ وعدہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اس کی تصریح دوسری جگہ ہے۔ دیکھو مریم ۱۹ - ۴۷ - جہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود آزر کے حضرت ابراہیمؑ کو سنگسار کرنے کی دھمکی دینے اور ان سے علیحدگی اختیار کر لینے کے حضرت ابراہیمؑ نے استغفار کا وعدہ کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک استغفار کو نہیں چھوڑا جب تک کہ آزر کی دشمنی اور استیصال حق کی کوشش انتہا کو نہیں پہنچ گئی۔

۱۳۵۶ ان الفاظ سے یہ مراد لی گئی ہے کہ مسلمانوں کے مشرکوں کے لیے استغفار کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ضلالت قرار نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اس حکم کو کھول کر قرآن کریم میں بیان کر دیا۔ ہاں حکم کے آ جانے کے بعد جو شخص ایسا کرے وہ ضلالت میں ہوگا اور لیضل کے معنی گمراہ قرار دینا ہی لیے گئے ہیں۔

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

اور نہ کوئی مددگار ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

اللہ نبی پر اور اُن مہاجرین اور انصار پر مہربان ہُوا جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں اس کا ساتھ دیا، اس کے بعد کہ قریب تھا کہ اُن میں سے ایک گروہ کے دِل پھر جاتے، پھر اُن پر مہربان ہُوا، وہ ان پر مہربان رحم کرنے والا ہے ۱۳۵۷

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ ع ۱۴

اور اُن تین پر جو پیچھے رکھے گئے تھے، یہاں تک کہ زمین باوجود فراخی کے اُن پر تنگ ہوگئی اور وہ اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور یقین کر لیا کہ اللہ (کی سزا) سے سوائے اس کے کوئی پناہ نہیں، تب وہ ان پر مہربان ہوا تاکہ وہ پھر آئیں اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۳۵۸

۱۳۵۷ تاب لفظ تاب کے معنی پر یہ آیت کھلی شہادت ہے کہ اس سے مراد صرف گناہ پر رجوع ہی نہیں بندہ کی طرف سے ہو یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلکہ جیسا کہ ۵۰۷ میں بیان کیا گیا ہے ایک اچھی حالت سے اس سے زیادہ اچھی حالت کی طرف رجوع کرنا بھی تاب میں داخل ہے۔ یہاں نبی اور مومنین کا قطعاً کوئی گناہ نہیں بلکہ الذین اتبعوہ فی ساعۃ العسرۃ میں ان کی تعریف ہی کی گئی ہے تاہم فرمایا تاب اللّٰہ علی النبی۔ اور مراد صرف اس قدر ہے کہ بڑے بڑے فضل کیے۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو لغت میں تاب کے معنی دیئے ہیں کہ اصل معنی عاد الی اللّٰہ ورجع واناب ہیں۔ یعنی اللہ کی طرف عود کیا اور لوٹ آیا اور جُھک گیا (ل)

ساعۃ العسرۃ۔ عُسر۔ یُسر کی ضد ہے اور یہاں ساعۃ العسرۃ سے مراد غزوۂ تبوک لیا گیا ہے۔ جس میں صحابہؓ کو تکالیف شاقہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ بعض وقت ایک کھجور کو دو آدمیوں نے بانٹ کر اس پر پانی پی کر گزارہ کیا اور دو دو تین تین آدمی ایک اونٹ پر سوار ہوتے یہ ان کے کمال صدق اور اخلاص کا ثبوت تھا اس لیے خصوصیت سے اس کا ذکر کیا۔

مسلمانوں کی جاں نثاری کا کمال: اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اس سخت مصیبت اور مقابلہ کے وقت مسلمانوں نے خوش دلی سے آنحضرت ؐ کی آواز پر لبیک کہا، صرف ایک گروہ کے متعلق ذکر کیا کہ ان کے دلوں میں کچھ کمزوری کا خیال آیا تھا مگر اس پر بھی کاد کا لفظ بول کر بتا دیا کہ فی الواقع کوئی زیغ ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ آنحضرت صلعم کی قوت قدسی کا اثر تھا کہ صحابہؓ کو اس مقام اتباع تک پہنچایا کہ وہ سب کے سب ہی ایک رنگ میں رنگین تھے۔

۱۳۵۸ خلّفوا۔ خَلَّفتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے اپنے پیچھے چھوڑا مگر مخلّفون سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں پیچھے رہ گئے اور یہی مراد خلّفوا سے ہوسکتی ہے یعنی جو پیچھے رہ گئے۔ مگر عموماً مراد اس سے لی گئی ہے کہ ان کا حکم پیچھے رکھا گیا یعنی وہ جن کے متعلق فرمایا تھا اٰخرون مرجون لامر اللّٰہ (۱۰۶) خود کعب نے جو ان میں سے ایک تھے یہی معنی خلّفوا کے لیے ہیں۔

ضاقت۔ ضِیق وسعت کی ضد ہے اور اس کا استعمال فقر اور بخل اور غم وغیرہ پر ہوتا ہے وضائق بہ صدرک (ھود ۱۱۔ ۱۲) یضیق صدری (الشعراء ۲۶۔ ۱۳) ولا تک فی ضیق مما یمکرون (النحل ۱۶۔ ۱۲۷) میں اور یہاں مراد حزن ہے (غ)

رحبت۔ رُحب مکان کی وسعت کو کہتے ہیں اور اس کا استعمال ضیق کی طرح بطور استعارہ بھی ہو جاتا ہے جیسے یہاں اور اسی سے مَرحبا ہے (غ)

یہ تین شخص جن کا یہاں خصوصیت سے علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ کعب بن مالک۔ مرارۃ بن الربیع اور ہلال بن اُمیہ تھے۔ ان کا ذکر صحیح احادیث میں ہے اور ایک طویل حدیث میں خود کعب نے یہ ذکر کیا ہے۔ غزوۂ تبوک میں تیاری کو ایک سے دوسرے دن پر ملتوی کرتے کرتے یہ لوگ پیچھے رہ گئے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلعم بہت دور نکل گئے۔ تب انہوں نے ارادہ ترک کر دیا۔ واپسی پر جب بہت سے منافقین نے جھوٹے عذر پیش کیے تو کعب اور ان کے دونوں ساتھیوں نے رسول اللہ صلعم سے سچ سچ کہہ دیا کہ ہمارا عذر کوئی نہ تھا رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ان کے بارہ میں نازل نہ ہو مسلمان ان سے قطع تعلق کریں۔ پچاس دن تک ان تینوں کی یہ حالت رہی کہ کوئی شخص ان سے کلام تک نہ کرتا تھا۔ کعب کہتے ہیں کہ میں مسجد میں رسول اللہ صلعم کیساتھ نماز بھی پڑھنے آتا مگر کوئی شخص

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١١٩﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کا تقویٰ کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ ۱۳۵۹

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ

مدینہ کے رہنے والوں اور ان کے اردگرد کے دیہاتیوں کو نہ چاہیے کہ اللہ کے رسول کے پیچھے رہ جائیں اور نہ (یہ کہ) اپنی جانوں کو اس کی جان سے زیادہ چاہیں، یہ اس لیے کہ انھیں اللہ کی راہ میں نہ پیاس پہنچتی ہے اور نہ تکان اور نہ بھوک اور نہ وہ کسی ایسی جگہ چلتے ہیں جس سے کافروں کو غصہ آتا ہے اور نہ دشمن سے کچھ چیز حاصل کرتے ہیں مگر اس کے لیے اُن کا نیک عمل لکھا جاتا ہے۔ اللہ نیکی

مجھ سے کلام نہ کرتا۔ انہی ایام میں جب ایک دن میں بازار میں پریشان پھر رہا تھا ملک غسان کے ایک قاصد نے میرا پتہ دریافت کیا اور مجھے بادشاہ کا ایک رقعہ دیا جس میں لکھا تھا کہ ہم نے سُنا ہے تمہارے ساتھ سختی ہوئی ہے اور ذلت کا برتاؤ کیا جاتا ہے تم ہمارے پاس چلے آؤ تو ہم تم سے ہمدردی کریں گے۔ کعب کہتے ہیں میں نے سمجھا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے اور اس رقعہ کو لیکر تنور کا رُخ کیا اور اسے جلا دیا۔ پچاس دن کے بعد اس آیت کے نزول پر رسول اللہ صلعم نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو یاد فرمایا اور بشارت دی۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے صحابہؓ کو سچائی سے کس قدر محبت تھی کہ اس کی خاطر خود رسول اللہ صلعم کی ناراضگی کی بھی پروا نہیں کی۔ ایک طرف اگر یہ صحابہ کا گروہ جان نثاری میں اور مال و جان کے قربان کرنے میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتا۔ تو دوسری طرف اخلاق فاضلہ میں بھی تاریخ عالم دوسرا کوئی ایسا گروہ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان تینوں میں سے کعب علاوہ تبوک کے صرف بدر میں غیر حاضر تھے اور دوسرے دونوں اصحاب بدر میں بھی شامل تھے۔ بایں غزوہ تبوک میں نہ جانے کی وجہ سے ان پر ایسی سختی ہوئی۔ وہ مسلمان غور کریں جو آج خدمت اسلام کو ایک بے معنی چیز ٹھہرا کر صرف اپنے نفسوں کے فکر کو کافی سمجھے ہوئے ہیں یا زیادہ سے زیادہ کسی نے نماز پڑھ لی اور سمجھ لیا کہ ہم جنت کے وارث ہو گئے۔

منجملہ اور امور کے جو ان تین شخصوں کے ذکر میں مقصود ہیں ایک یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جان نثاری اور اطاعت کس حد تک پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مقام بلند عطا فرمایا جو کسی قوم کی قوم کو دنیا میں نہیں ملا رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ایک طرف اس جنگ کی مشکلات کو رکھو۔ خطرناک گرمی، عرب کا ملک، فصلیں پکی ہوئیں، لمبا سفر، سواریوں کا پورا انتظام نہیں، نہ سامان رسد کا۔ عظیم الشان شہنشاہ کی فوج سے مقابلہ ہے۔ سب لوگ اپنی تجارتیں کرکے اور کاروبار کرکے معاش پیدا کرنے والے ہیں کوئی فوج باقاعدہ نہیں مگر تیس ہزار تو ساتھ ہوتے ہیں اور صرف تین پیچھے رہ جاتے ہیں کیا ایسی اطاعت اور ایسی جان نثاری کی کوئی مثال دنیا میں مل سکتی ہے (منافقوں کو الگ رکھو کیونکہ وہ دل سے ہی دشمن اسلام تھے) گویا دس ہزار میں سے صرف ایک کمزوری دکھاتا ہے اور وہ کمزوری بھی خود عظیم الشان مدح کا پہلو ساتھ لیے ہوئے ہے کہ اس میں ان کی صداقت کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔

۱۳۵۹ معیت صادقین کا حکم: یہ آیت قرآن کریم کی ترتیب ابلغ اور محکم پر گواہ ہے۔ پچھلی آیت میں ان تین شخصوں کا ذکر تھا جو ہمیشہ غزوات میں شامل ہوتے ہوتے غزوہ تبوک سے رہ گئے تو ان پر اس قدر عتاب اللہ تعالیٰ کا ہوا کہ پچاس دن تک کسی مسلمان کو ان سے بولنے کی اجازت نہ تھی، حالانکہ وہ نمازیں پڑھتے اور سب مسلمانوں والے کام کرتے اور مسلمانوں کی جماعت میں سے تھے۔ تو سمجھایا کہ ضروریات دینی میں جو مسلمان ان ضروریات کو محسوس کرکے ان کے پورا کرنے کا تہیہ نہ کریں۔ وہ اس بات کے اہل نہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوں۔

صادقین سے مراد راستباز خادمان دین ہیں جیسے مجدد: اب نبوت کا سلسلہ تو منقطع ہونا تھا مگر ضروریات دینی ختم ہونے والی نہ تھیں۔ اس لیے اس کے فوراً بعد مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہے کہ جو صادق راستباز تمہارے اندر پیدا ہوں اور ضروریات دینی کی طرف قوم کی رہنمائی کریں تو قوم کا ان کے ساتھ ہو جانا اس وقت کا سب سے اہم فرض ہوتا ہے اور صادقین سے مراد یہاں ایسے ہی لوگ ہیں جو خدمت دین میں صدق دکھاتے ہیں نہ صرف سچ بولنے والے صادق کے اس معنی کے لیے دیکھو ع۳۸۸ اور قرآن شریف نے خود فرمایا ہے انما المؤمنون الذین اٰمنوا باللّٰہ و رسولہ ثم لم یرتابوا و جاھدوا باموالھم و انفسھم فی سبیل اللّٰہ اولٰئک ھم الصٰدقون (الحجرات ۴۹-۱۵) اور یہاں بھی اگلی آیت میں مصائب اٹھانے کے ذکر میں یہی اشارہ ہے کہ صادق کہلانے کا وہی مستحق ہے جو خدا کی راہ میں دُکھ اٹھاتا اور کام کرتا ہے۔ آج مسلمان قرآن شریف سے اس قدر دور پڑے ہوئے ہیں کہ کثرت سے یہی کہتے اور جواب دیتے ہیں کہ فلاں شخص مجدد زمانہ ہے تو ہو ہم نمازیں پڑھتے ہیں۔ کاش کبھی قرآن پر تھوڑا سا بھی غور کرتے تو معلوم ہوتا کہ صادقوں کے ساتھ ہونے کے حکم کو یہاں لا کر قرآن شریف نے اسے کس قدر اہمیت دی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٢٠﴾
وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً
وَّلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ
اللّٰهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢١﴾
وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً فَلَوْلَا
نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا
فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا
إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾ ع ۱۵

کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔۱۳۶۰
اور نہ وہ کچھ خرچ کرتے ہیں تھوڑا یا بہت اور نہ کسی میدان
سے گزرتے ہیں مگر وہ ان کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ اللہ انھیں
اس کا بہترین بدلہ دے جو وہ کرتے تھے۔۱۳۶۱
اور مومنوں کو یہ بھی مناسب نہیں کہ سب کے سب نکل پڑیں تو کیوں نہ
ان کی ہر ایک جماعت میں سے ایک گروہ نکلے، تاکہ وہ دین میں
سمجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کو ڈرائیں جب وہ ان کی طرف
واپس جائیں تاکہ وہ بھی بچیں۔۱۳۶۲

۱۳۶۰ یرغبوا۔ رغب کے معنی کیلئے دیکھو ۱۶۵ کسی چیز کے ساتھ رغبت ہونا اس کے لیے حرص اور اس میں طمع ہے حدیث میں ہے کیف انتم اذا مُرِج الدینُ وظَهرتِ الرغبة۔ تمہاری کیا حالت ہوگی جب دین ابتری کی حالت میں ہوگا اور رغبت ظاہر ہوگی جس سے مراد مال کے جمع کرنے کی حرص ہے (ل) یہاں بھی اپنی زندگی پر حرص مراد ہے۔

ظمأ۔ ظِمْءٌ۔ وہ وقفہ ہے جو دو دفعہ پانی پینے کے درمیان ہو اس لیے ظَمَأٌ پیاس ہے اور ظَمْآن پیاسا۔ لا تظمؤا فیہا (طٰہٰ ۲۰-۱۱۹) یحسبه الظمآن ماء (النور ۲۴-۳۹) (غ)

نصب۔ نَصْب کے اصل معنی گاڑ دینا ہیں اور نُصُب ... اور نَصَب تکان کو کہتے ہیں مسی الشیطان بنصب (صٓ ۳۸-۴۱) (غ) لا یمسہم فیہا نصب (الحجر ۱۵-۴۸)

مخمصة۔ خَمْصُ البطن پیٹ کی لاغری کو کہتے ہیں اس لیے مخمصة بھوک ہے جس سے پیٹ کی لاغری پیدا ہوتی ہے (غ)

یطؤن۔ موطئا۔ وَطِئَ کے معنی پامال کیا اس لیے زمین کو پامال کرنا یا زمین پر چلنا۔ جیسے یہاں اور مَوْطِئ کے معنی موضع یعنی جگہ (ل) اور اللّٰھم اشْدُدْ وَطْأَتَكَ علی مُضَر میں مراد ہے اس کو ذلیل کردے یا فرمانبردار کردے اور مُواطاۃ کے معنی مطابقت ہیں۔ گویا جہاں ایک پاؤں رکھتا ہے وہیں دوسرا رکھتا ہے اسی معنی میں ہے لیواطؤا عدۃ ما حرم اللہ (التوبۃ ۹-۳۷) ایسی جگہ چلتے ہیں جس سے کافروں کو غضب آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ دشمن اس سے مرعوب ہوتا ہے۔

ینالون۔ نیلا۔ نَیْل وہ ہے جسے انسان اپنے ہاتھ سے لیتا ہے اور نُوْل (نالَ ینال) اور تَنَاوُل کے معنی لینا یا حاصل کرنا ہیں (غ) دشمن سے کچھ لیتے ہیں یعنی فتح یا کوئی اور فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ دشمنان دین کے مقابلہ پر جو کام کیے جائیں وہ سب عبادت میں داخل ہیں اور انسان کے لیے اعمال صالحہ کا کام دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں اس سے بڑھ کر کونسا کام ہو سکتا ہے جس سے دین اسلام کو زندگی ملے۔ عمل صالح درحقیقت وہی عمل ہے جو انسان کے لیے موجب بقا ہے مگر انسان کی زندگی سے بڑھ کر حق اور صداقت کا زندہ رہنا ہے اس لیے حق اور صداقت کو زندہ رکھنے کے لیے جو کام کیے جاتے ہیں وہ انسان کے بہترین اعمال صالحہ ہیں۔ کیونکہ ان سے انسان کا اپنا بھی بقا ہے۔ کس قدر لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ صرف اندر بیٹھ کر خدا کا نام لے لینے کو عمل صالح سمجھتے ہیں اور طرح طرح کے مجاہدات اختیار کیے جاتے ہیں حالانکہ دشمنان دین کا مقابلہ کرنا وہ مجاہدہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو چلایا اور یوں بتا دیا کہ یہ بہترین مجاہدہ ہے۔ ہاں دشمنان دین کا مقابلہ جب وہ تلوار اٹھائیں تو تلوار سے ہے۔ لیکن آج سب سے بڑا مقابلہ علم اور دلائل کے رنگ میں ہے اور جس طرح پر ایک مجاہد بالسیف کا بھوک پیاس کو برداشت کرنا، دکھ اٹھانا، دشمن کو زک دینا، رستے طے کرنا عمل صالح ہے اسی طرح ایک مجاہد بالقلم یا باللسان کا انہی باتوں کو برداشت کرنا یا ان کو کر دکھانا عمل صالح ہے جس سے نہ صرف انسان کو خود قلب کی صفائی میسر آتی ہے بلکہ وہ حق اور صداقت کے بقا میں بھی معاون ہوتا ہے اور یوں تمام مجاہدات سے افضل یہ مجاہدہ ہے۔ یہاں لفظ ایسے اختیار کیے ہیں جن میں مجاہدات سیف اور مجاہدات علمی دونوں آ جاتے ہیں بلکہ یہاں اصل مقصود علمی مجاہدات کا ذکر ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کہ رکوع کی آخری آیت میں صاف بتا دیا ہے جہاں جہاد سیف کیلئے نکلنے کا ذکر حذف کر کے جہاد علمی کے لیے نکلنے کا ذکر کیا ہے۔

۱۳۶۱ یقطعون وادیا۔ قطع کسی چیز کا الگ کر دینا ہے اور قطع الطریق سے مراد سیر یعنی چلنا بھی ہوتا ہے۔ جیسے یہاں قطع وادی کے معنی وادی میں سے گزرنا ہیں اور رستے چلنے والوں سے مال چھیننا بھی مراد ہوتا ہے جیسے وتقطعون السبیل (العنکبوت ۲۹-۲۹) (غ)

پچھلی آیت میں خود تکلیف بھوک پیاس وغیرہ کے اٹھانے یا دشمن پر کسی قسم کا غلبہ حاصل کرنے کا ذکر تھا اس میں بتایا کہ خواہ کوئی ایسی تکلیف نہ پہنچے اور خواہ اس سے کوئی غلبہ حاصل نہ ہو محض خدا کی راہ میں خرچ کرنا اور خدا کی راہ میں نکلنا بجائے خود ہی ایک عمل صالح ہے۔

۱۳۶۲ یتفقهوا۔ فِقہ علم شاہد سے علم غائب کی طرف پہنچنا ہے علم عام ہے اور یہ خاص ہے لا یکادون یفقہون حدیثا (النساء ۴-۷۸) اور احکام شریعت کے علم پر بالخصوص بولا جاتا ہے اور تَفَقَّہَ کے معنی ہیں اس علم کو طلب کیا پھر اس میں خصوصیت پیدا کی (غ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اُن کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیئے کہ وہ تم میں شدت پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے ۱۳۶۳ع

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور جب کوئی سورت اُترتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھایا ہے۔ سو جو ایمان لائے ان کا ایمان بڑھایا اور وہ خوش ہوتے ہیں۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

اور جن کے دلوں میں بیماری ہے تو ان کی پلیدی پر پلیدی کو زیادہ کیا اور وہ مر گئے اور وہ کافر ہی رہے ۱۳۶۴ع

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

اور کیا دیکھتے نہیں کہ وہ ہر سال میں ایک بار یا دو بار آزمائے جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں ۱۳۶۵ع

یہ عجیب بات ہے کہ اس سورت کے نزول کے ساتھ جس میں جنگوں کا مضمون اس قدر بھرا ہوا ہے فی الحقیقت جنگوں کا خاتمہ ہوا۔ اور اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مختلف اقوام عرب کے وفد آنے شروع ہوئے وہ قومیں جو اب تک اسلام کی تباہی پر تلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھی جب دیکھا کہ اسلام کی قوت کو وہ توڑ نہیں سکتے تو ٹھنڈے دل سے اسلام کی صداقتوں پر غور کرنے لگے۔ ان کے سامنے یہ نظارہ تھا کہ کس طرح محمد رسول اللہ صلعم ایک اکیلے شخص تھے سارا عرب آپ کا مخالف ہی نہیں خطرناک دشمن تھا جان لینے کے درپے تھا۔ منصوبے کیے کوشش کی لڑائیاں کیں مگر اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور اب غزوۂ تبوک کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان قیصر روم کا بھی مقابلہ کر سکتے ہیں تو انہوں نے مقابلہ کو چھوڑ دیا اور دل ان کے پہلے سے اندر سے کھائے ہوئے تھے پس قوم پر قوم آنے لگی اور اسلام کے اصول معلوم کر کے دین اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ ان مختلف اقوام کی تعلیم کا ایک انتظام تو یہ ہو سکتا تھا کہ جو مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر تعلیم حاصل کر چکے تھے وہ باہر نکل جائیں مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سب کے سب ہی باہر نکل جاتے اس لیے فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ ہر ایک قوم میں سے کچھ آدمی مدینہ میں آکر تعلیم حاصل کریں اور پھر یہی لوگ جا کر اپنی قوم کو تعلیم دیں جو ان میں سے مسلمان ہو گئے تھے ان کو اسلام کی تعلیم دیں جو مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کو اسلام کی طرف بلائیں ولینذروا قومھم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی قوموں کا بڑا حصہ کفر پر تھا گو ان میں سے تھوڑے لوگ مسلمان ہو گئے تھے علاوہ ازیں دین اور علم کے تمام اقوام میں پھیلانے کا یہی بہترین ذریعہ تھا اگر اہل مدینہ ہی اس کام کے لیے مخصوص رہتے تو دوسری قومیں سمجھتیں کہ علم انہی کا خاص ورثہ ہے مگر دین اور علم کی اشاعت میں اسلام کی تعلیم جمہوریت کے لیے یہ خلاف تھا اس لیے حکم دیا کہ سب قومیں تعلیم حاصل کریں اور اس کا طریق یہ ہے کہ ہر قوم میں سے کچھ آدمی آکر علم سیکھ جائیں اور پھر اپنی قوم کو جا سکھائیں۔ یوں جنگوں کا خاتمہ اور صلح اور امن کی بنیاد رکھا جانا اسلام کی فتوحات حقیقی کی ابتدا تھی۔ اور جنگوں کے خاتمہ پر اس آیت کو لا کر اسلام کی اصل غرض بھی بتا دی۔ آج بھی اسلام کو ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو دین میں تفقہ حاصل کر کے دنیا کی مختلف قوموں کی طرف نکل جائیں اور جب ان قوموں سے کچھ لوگ اسلام لے آئیں تو پھر وہی لوگ دین اسلام کو سیکھ کر اپنی اپنی قوم کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ جب تک مسلمانوں کی طرف سے پہلا قدم نہ اُٹھے گا اسلام کبھی دنیا میں نہیں پھیل سکتا۔

ع۱۳۶۳ قریب کے کفار سے جنگ: قاتلوا الذین یلونکم من الکفار۔ عام حکم نہیں جس سے پہلے احکام قتال کے متعلق منسوخ ہو جاتے ہوں۔ مثلاً جن کفار کے ساتھ معاہدات تھے ان کے متعلق خود حکم دے چکا ہے کہ ان عہدوں کو پورا کرو یہی تقویٰ ہے۔ پھر یہودی خیبر میں رہے حالانکہ کافر تھے آنحضرت صلعم نے ان سے جنگ نہیں کی اور ایک یہود پر کیا انحصار ہے۔ بہتیرے قبیلے اور قومیں تھیں جن کے خلاف آپ نے جنگ نہیں کی پس یہ حکم بھی قتال کے اس پہلے حکم کے ماتحت ہے، جو درحقیقت تمام احکام قتال پر حاوی ہے یعنی ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ پھر الذین یلونکم کہنے کی ضرورت کیا تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو دکھ اور تکلیفیں انہی لوگوں سے پہنچتی تھیں جو قریب تھے دور والوں نے دکھ کیا دینا تھا۔ اسی طرف الذین یلونکم میں اشارہ کیا ہے اور غلظۃ پر دیکھو ع۱۳۲۱ مراد یہ ہے کہ محض قرب کے لحاظ سے قوم کی مصیبت کو نہ بھول جاؤ۔

ع۱۳۶۴ رجس یا پلیدی ان کا نفاق ہے جیسا کہ فی قلوبھم مرض سے ظاہر ہے اور پہلی آیت میں مومنوں کے ایمان کے بڑھنے کا ذکر ہے اس کے مقابلہ پر یہاں ان کے نفاق کے بڑھنے کا ذکر ہے۔ قرآن کریم کے نزول سے بالخصوص ان سورتوں کے نزول سے جن میں جنگ اور دشمن کے مقابلہ کا یا منافقوں کے نفاق کا ذکر ہوتا جس طرح مومنوں کا ایمان ترقی کرتا اسی طرح منافقوں کا نفاق ترقی کرتا۔

ع۱۳۶۵ منافقوں کو نصیحت کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں: کسی قسم کا فتنہ یعنی آزمائش یا دکھ مراد ہے۔ بعض نے کہا قحط اور بیماریاں، بعض نے کہا غزوات اور

وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَىٰكُم مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ ٱنصَرَفُوا۟ ۚ صَرَفَ ٱللَّهُ قُلُوبَهُم بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴿١٢٧﴾

اور جب کبھی کوئی سورۃ اترتی ہے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں، کیا تمھیں کوئی دیکھتا ہے؟ پھر پھر جاتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ سے کام نہیں لیتے ع۱۳۶۶

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِٱلْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٨﴾

یقیناً تمھارے پاس تمھیں میں سے ایک رسول آیا ہے ۔ تمھارا تکلیف پانا اس پر شاق گزرتا ہے ، وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) خواہشمند ہے مومنوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے ع۱۳۶۷

فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُلْ حَسْبِىَ ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ ٱلْعَرْشِ ٱلْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾ ع ۱۶ ۵

سو اگر پھر جائیں تو کہہ اللہ میرے لیے کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا ، اور وہ عرش عظیم والا رب ہے ع۱۳۶۸

جہاد ۔ یفتنون کا لفظ زیادہ تر پہلے پر صادق آتا ہے ۔ کیونکہ بھوک بیماری وغیرہ سے جو انسان کو تکلیف پہنچتی ہے ۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو انسان گناہ سے توبہ کرے مگر ان منافقوں کی حالت ایسی تھی کہ اس سے بھی فائدہ نہ اٹھاتے تھے اور غزوات اور جہاد کے ذریعہ سے بھی آزمائش تھی ۔ اس لیے کہ یہ لوگ اس انتظار میں رہتے تھے کہ ان جنگوں میں مسلمان مارے جائیں گے ، مگر ہر جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی کامیابی اور دشمن کی نامرادی ہوتی تھی اور یفتنون میں جس دُکھ کا ذکر ہے وہ جنگوں کی صورت میں یہ تھا کہ کچھ اموال ان منافقوں کے بھی خرچ ہوتے تھے اور کچھ لوگ بھی ان میں سے شریک جنگ ہو کر مارے جاتے تھے ۔

ع۱۳۶۶ سورت کے نزول سے مراد یہاں ایسی سورت کا نزول معلوم ہوتا ہے جس میں منافقوں کا ذکر ہو اور ان کا ایک دوسرے کی طرف دیکھنا یا تو اس غرض سے ہے کہ اب یہاں سے چلنا چاہیئے اور یا بطور تمسخر آنکھوں سے اشارہ کرنا مراد ہے ۔ اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا کیونکہ وہ سمجھ سے کام نہیں لیتے ۔

ع۱۳۶۷ عزیز علیہ ۔ عَزَّ کے معنی ہیں غَلَبَ یعنی غالب ہوا ۔ اور عَزَّ علیہ کذا کے معنی ہیں صَعُبَ وہ چیز اس پر شاق گزری (غ)

ما عنتم یعنی عَنَتُکُمْ عنت کے معنی کے لیے دیکھو ع۲۸۳ مشقت فساد ہلاکت گناہ غلطی سب پر بولا جاتا ہے (ل)

قلب رسول کی اصلی کیفیت : یہاں سورت کا خاتمہ ہوتا ہے ۔ اس میں کچھ جنگوں کا ذکر ہے کچھ منافقوں کا ذکر ہے ۔ اس لیے آخر پر بتایا کہ یہ کوئی رسول کے آنے کی غرض نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ رسول کی حالت تو یہ ہے کہ جو کچھ تم پر تکلیفیں اور مصیبتیں آتی ہیں وہ اس پر بھی شاق گزرتی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ تم ان مصائب سے باہر نکل جاؤ اور وہ تم پر حریص ہے یعنی تمھاری بہتری کو چاہتا ہے ۔ یہاں تک لفظ عام ہیں یعنی جو کچھ دنیا میں گناہ اور غلطیاں ہیں اور جو کچھ ان کی وجہ سے دنیا اپنے آپ کو مشقت اور ہلاکت میں ڈال رہی ہے اس سے رسول اللہ صلعم کا دل پگھلتا ہے جنگ میں انسانوں کا خون بہتا ہے اس سے اسے خوشی نہیں ہوتی اگر لوگ کفر اور نفاق اختیار کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں تو اس سے اسے راحت نہیں ہوتی بلکہ ان چیزوں کو دور کرنے کی تڑپ اس کے دل میں ہے ۔ اس آخری پیغام میں رسول کے قلب کی پہلی حالت کا ذکر کیا جو دنیا میں گناہ اور ہلاکت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا اور خدا سے مدد چاہی اور بالمؤمنین رؤف رحیم میں بتایا کہ اگر تم مومن بن جاؤ تو پھر وہ رسول تو تمھارے لیے مجسم راحت و رحمت ہی ہے صرف جب لوگ شرارت میں حد سے بڑھے تو ضرورت وقتی کے لحاظ سے حق کو تباہی سے بچانے کے لیے اسے تلوار اٹھانی پڑی ۔ رؤف اور رأفۃ کے لیے دیکھو ع۱۸۰ اور رأفۃ کو رحمۃ پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ رافۃ میں دفع مضرت ہے اور رحمۃ میں جلب نفع (ر)

ان لوگوں کو جن سے جنگ تھی یا جن کا ذکر اس سورت میں ہے یعنی کافر اور منافق یہ بتایا ہے کہ اصل وہ کونسی تڑپ ہے جو رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک میں ہے ۔

ع۱۳۶۸ رب العرش العظیم ۔ عرش کے لیے دیکھو ع۱۰۹۵ یہ ترکیب ایسی ہی ہے جیسے رب العزۃ میں یعنی یہ اضافت اختصاص کی ہے ۔

جب یہ بتایا کہ رسول صرف تمھاری خیر خواہی چاہتا ہے تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ اگر باوجود اس کے کہ تم صرف ان کو دکھوں اور ہلاکت سے نکالنا چاہتے ہو اور ان کی بھلائی چاہتے ہو پھر بھی یہ تمھیں قبول نہ کریں اور تمھاری مخالفت پر اڑے رہیں تو تم کوئی پروا مت کرو ۔ فقل حسبی اللہ ۔ اللہ تو تمھارے لیے کافی ہے ۔ ایک اللہ پر ہی اپنا بھروسہ رکھو ۔

بعض روایات میں ہے کہ سورۃ توبہ کی آخری دو آیتیں سب سے آخر نازل ہوئیں ۔ مگر بخاری نے واتقوا یوماً ترجعون فیہ (البقرۃ ۲۸۱) کو آخر ما انزلت حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے ۔ ہاں سورۃ توبہ آخری سورتوں میں سے ہے اور روایت کا مطلب شاید یہی ہو کہ سورۃ توبہ میں سب سے آخر ان کا نزول ہوا ۔

آیاتہا ۱۰۹ (۱۰) سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

ع الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۱ میں اللہ دیکھتا ہوں ع۱۳۶۹ یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں ع۱۳۷۰

نام: اس سورت کا نام یونس ہے اور اس میں گیارہ رکوع اور ۱۰۹ آیات ہیں۔ اس کا نام یونس اس بات کی طرف توجہ دلانے کیلئے ہے کہ جس طرح حضرت یونسؑ کی قوم آخر ایمان لا کر ہلاکت سے بچ گئی تھی ویسا ہی معاملہ آنحضرت صلعم کی قوم سے ہوگا یعنی یہ قوم تباہ نہ کی جائے گی بلکہ آخر راہِ راست پر آ جائے گی۔

خلاصہ مضمون: اس سورت میں زیادہ تر توجہ اللہ تعالیٰ کے رحم کی طرف دلائی ہے کہ وہ کس طرح مصائب میں انسان پر رحم فرماتا ہے اور کفار کو اللہ تعالیٰ کے بے انتہا رحم سے فائدہ اُٹھانے کی نصیحت کی ہے۔ پہلے رکوع میں وحی الٰہی کا ذکر کیا اور بتایا کہ صرف اس دنیا کی زندگی پر خوش نہ ہو جانا چاہیئے اور اسی کو غرض وغایت نہ سمجھ لینا چاہیئے، بلکہ اصل زندگی انسان کی دوسری ہے اور اسی کی طرف وحی الٰہی ہدایت کرتی ہے دوسرے رکوع میں وحی الٰہی کی تکذیب اور اس پر عذاب کے آنے کا ذکر ہے۔ تیسرے رکوع میں بتایا کہ تم پر چھوٹے چھوٹے دُکھ اور تکلیفیں آتی ہیں اور تکلیف کے وقت فطرت انسانی اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتی ہے پس تم بھی ان مصائب سے یہ فائدہ اٹھاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرو اور جب آرام ملے تو خدا کو بھول نہ جاؤ۔ چوتھے میں ہستی باری اور توحید پر دلائل دیئے ہیں۔ پانچویں میں پھر تکذیب پر عذاب کا ذکر کیا ہے۔ چھٹے میں بتایا کہ قرآن شریف تو تمہیں بلند مقامات کی طرف لے جاتا ہے تم اس کی تکذیب کرنے کی بجائے ان مقامات عالیہ کی طرف رخ کیوں نہیں کرتے۔ ساتویں میں مومنوں کے مقامات عالیہ کا ذکر کیا۔ آٹھویں میں حضرت نوحؑ اور موسیٰؑ کی مثالیں پیش کیں نویں میں فرعون کی تباہی کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس قدر سخت انسان بھی جب آخر ہلاکت کا نشان اس پر آیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا، مگر وہ جھکنا بعد از وقت تھا تم قبل از وقت اس مثال سے فائدہ اٹھاؤ اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ اس کی لاش کو ہم نے نشان کے طور پر رکھنے کے لیے سمندر سے باہر نکال پھینکا اور یہ خبر قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس وقت کسی کو اس بات کی خبر نہ تھی اور آج واقعات نے ثابت کر دیا کہ واقعی وہ لاش محفوظ ہے۔ دسویں میں بتایا کہ اگر تم اب بھی تکذیب سے رک جاؤ تو عذاب ٹل سکتا ہے اور گیارھویں میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا ذکر کر کے سورت کو ختم کیا۔

تعلق اور ترتیب: اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے یہ ہے کہ اس کا خاتمہ اس بات پر کیا تھا کہ یہ رسول جو تمہارے پاس آیا تو تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اسے رنج ہوتا ہے۔ اس لیے اس سورت میں بتایا کہ گو وحی الٰہی کی تکذیب اور ساری ہمت اس دنیا پر صرف کر دینے پر عذاب کا آنا لازمی ہے تاہم اللہ تعالیٰ کا رحم بھی بے انتہا ہے اگر انسان ذرا بھی اس کی طرف متوجہ ہو تو وہ بھی اس پر رحمت سے متوجہ ہوتا ہے پچھلی سورت میں زیادہ تر کفار کی سزا کا ذکر تھا تو اس سورت میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کا رحم غالب ہے بشرطیکہ کوئی فائدہ اُٹھانے والا ہو۔ عام ترتیب قرآن شریف میں یہ سات سورتیں یعنی یہاں سے لیکر النحل تک قریباً ایک ہی مضمون کی ہیں اور ان میں اثبات نبوت ہے گویا جب سورۂ الاعراف میں جو اثبات نبوت پر ہے انبیاء کی تکذیب کا ذکر کیا تو اس کے بعد الانفال اور البراءۃ میں آنحضرت صلعم کے مخالفین کی سزا کا کچھ ذکر کر کے پھر اسی اصل مضمون اثبات نبوت کی طرف توجہ کی اور سلسلہ مضمون کو جاری رکھا بلحاظ نزول یہ ساتوں سورتیں یعنی یونس سے لیکر النحل تک ایک ہی زمانہ کی ہیں اور یہ آنحضرت صلعم کی مکی زندگی کا پچھلا زمانہ ہے جب کفار کی مخالفت حد سے زیادہ بڑھ گئی اور ان میں پیشگوئیوں کے رنگ میں آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ آخر حق غالب آئے گا اور باطل ہلاک ہو جائے گا۔

ع۱۳۶۹ الٓرٰ۔ مقطعات کے لیے دیکھو ع۸۔ یہ مجموعہ حروف اس سورت کے علاوہ چار اور سورتوں کی ابتدا میں آتا ہے یعنی ہود[11]، یوسف[12]، ابراہیم[14]، الحجر[15] اور ان چاروں کے درمیان سورۂ الرعد[13] ہے جو المٓرٰ سے شروع ہوتی ہے۔ ان چھ سورتوں کا مضمون بھی ملتا جلتا ہے اور زمانہ نزول بھی قریباً ایک ہی ہے۔ یہ حروف انا اللہ اریٰ کے قائم مقام ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس سے روایت ہے (ج) اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کی صفت لانے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے اور اس کے مطابق جزا دے گا۔

ع۱۳۷۰ الحکیم۔ یہاں کتاب کی صفت ہے حکمۃ اور الحکیم کے معنی کے لیے دیکھو ع۵۰ لے و ع۱۶۴ و ع۳۲۱ قرآن کریم کو حکیم اس لیے کہا کہ اس میں حکمت ہے اور بعض نے حکیم سے مراد محکم لیا ہے اور دونوں باتیں درست ہیں کیونکہ وہ محکم بھی ہے اور حکم کے لیے فائدہ دینے والا ہے اور حُکم حکمۃ سے وسیع ہے ہر ایک حکمت حُکم ہے مگر ہر حکم حکمت نہیں کیونکہ حکم صرف یہ فیصلہ کرنے کا نام ہے کہ یہ چیز یوں ہے یوں نہیں۔ اور حکمت یہ ہے کہ علم اور عقل سے حق کو یعنی صحیح بات کو پالے (غ)۔ یہاں قرآن کریم کو الکتاب الحکیم فرمایا، دوسری جگہ بھی ہے والقرآن الحکیم (یٰسٓ[36]-۲) اور ایک جگہ آتا ہے حکمۃ بالغۃ (القمر[54]-۵) اور کئی جگہ پر کتاب کے مقابل پر حکمت کا ذکر کیا ہے جیسے یعلمھم الکتاب والحکمۃ (الجمعۃ[62]-۲) واذکرن مایتلیٰ فی بیوتکن من اٰیٰت اللہ والحکمۃ (الاحزاب[33]-۳۴) تو یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ یہ ساری کتاب حکمت سے ہی بھری ہوئی ہے۔ اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں، یعنی اس میں جو کچھ ہے وہ حق ہے اور علم اور عقل کے مطابق ہے اور پھر اس کی بعض باریک حکمت کی باتوں کو نبی رسول نے الگ کر کے کھول دیا تو وہ بھی حکمت ہے اور قرآن کو حکیم کہنے میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ مذہب کی بنا اصل میں حکمت پر ہے اور یہ ایک سائنس ہے جس کے قوانین اور قواعد عقل و علم کے مطابق ہیں۔ چند بے جوڑ باتوں کا نام مذہب نہیں جیسا پہلے لوگوں نے خیال کر رکھا تھا۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى
رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ
عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا
لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى
عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ
فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ
اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ
وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۴

کیا لوگوں کو تعجب ہے کہ ہم نے اُن میں سے ایک مرد کی طرف وحی کی کہ لوگوں کو ڈرا، اور انھیں خوشخبری دے جو ایمان لائے کہ ان کے لیے اُن کے رب کے ہاں راستی کا قدم ہے۔ کافروں نے کہا، یہ تو صریح جادوگر ہے[۱۳۷۱]

تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر غالب ہے ہر کام کی تدبیر کرتا ہے، کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر اس کے حکم کے بعد۔ یہ اللہ تمھارا رب ہے، سو اس کی عبادت کرو تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے[۱۳۷۲]

اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے وہی مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا تاکہ انھیں جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں انصاف کے ساتھ بدلہ دے اور جو کافر ہیں ان کے لیے کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب ہے، اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے[۱۳۷۳]

ع۱۳۷۱ قدم صدق۔ قَدَم پاؤں کو کہتے ہیں اور اس سے مراد تقدم و تاخر لیا جاتا ہے جو باعتبار زمانہ بھی ہوتا ہے اور باعتبار شرف بھی (غ) یعنی قدم سے مراد یہاں مجازاً سبقت ہے اور وہ سبقت بلحاظ شرف و فضیلت ہے اور صدق کا استعمال قول پر عام ہے مگر کذب کی طرح افعال جوارح میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور ہر ایک فضیلت والے فعل کو ظاہری ہو یا باطنی صدق کہا جاتا ہے فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر (القمر ۵۴ - ۵۵) رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق (بنی اسرائیل ۱۷ - ۸۰) واجعل لی لسان صدق فی الآخرین (الشعراء ۲۶ - ۸۴) اور اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے صالح بنائے تاکہ جو لوگ بعد میں اس کی ثنا کریں وہ ثنا سچ ہو جھوٹ نہ ہو (غ) اور قدم صدق سے مراد فضیلت میں قدم آگے بڑھانا ہے (غ) اور اللہ تعالیٰ کی صفت میں جو قدیم کا لفظ متکلمین میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے تو امام راغب کہتے ہیں کہ قرآن اور آثار صحیح میں اس کا کچھ اثر نہیں پایا جاتا۔

اس بات کے بیان کو کہ بدی کا انجام بد ہے اور نیکی کرنے والے ترقی کریں گے۔ منکر سحر قرار دیتے ہیں اور آنحضرت صلعم کو ساحر کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سحر اور ساحر کا استعمال قرآن مجید میں کس رنگ میں ہوا ہے۔ مخالفین انبیاء کو ان کے معجزات کی وجہ سے ساحر نہیں کہتے بلکہ ان کے حسن بیان کی وجہ سے ساحر کہتے ہیں۔ بات تو صاف تھی دلوں پر اثر کرتی تھی۔ مگر اس سے بچنے کے لیے کہتے تھے ساحر ہے اس کی باتوں کا اعتبار نہ کرو۔

ع۱۳۷۲ ستۃ ایام اور عرش اور تدبیر امر پر دیکھو ع۱۰۹۴ و ۱۰۹۵ پہلی آیت میں وحی الٰہی کا ذکر تھا جو بدی اور نیکی کی جزا کو ضروری قرار دیتی ہے اور اس کے لیے ایک دوسری زندگی کا وعدہ دیتی ہے اس پر کفار کو تعجب ہوتا ہے تو عظمت الٰہی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، کیا وہ دوسری خلق پر قادر نہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا افعیینا بالخلق الاول بل ہم فی لبس من خلق جدید (ق ۵۰ - ۱۵) انسان کی عقل اور اس کا علم تو اس موجودہ مخلوق کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے تو اور خلق کے انکار کے کیا معنی۔ اور چھ وقتوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ خلق بھی بتدریج ہوئی وہ دوسری خلق بھی بتدریج ہوگی۔ اور شفیع کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ پیدا کرنے والا وہ ایک ہے کوئی اس کے ساتھ شامل نہیں کیونکہ شفع وتر کے مقابل پر ہے۔ پس اور کوئی مستحق عبادت بھی نہیں الا من بعد اذنہ میں دوسری شفاعت کی طرف بھی اشارہ ہے جو گنہگاروں کے لیے ہوگی اور اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جو اور اس کے شفیع سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس کی مخلوق ہے۔ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے خالق ہونے کی طرف توجہ دلانے میں اصل غرض دوسری زندگی کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اگلی آیت سے ظاہر ہے۔

ع۱۳۷۳ یہاں پچھلی آیت کے اشارہ کو واضح کر دیا ہے اور وعد اللہ اس وعدہ کے لیے بطور مصدر موکد ہے جو الیہ مرجعکم جمیعا میں پایا جاتا ہے اور حقا

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾

وہی ہے، جس نے سورج کو چمکتا ہُوا اور چاند کو روشن بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جان لو، اللہ نے یہ حق کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے وہ ان لوگوں کے لیے کھول کر باتیں بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں ۱۳۷۴

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ﴿۶﴾

رات اور دن کے ادل بدل میں اور (اس میں) جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے، ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو تقوٰے سے کام لیتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۙ﴿۷﴾

جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی ہیں اور اسی پر مطمئن ہو گئے ہیں۔ اور وہ جو ہماری آیتوں سے بے خبر ہیں۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸﴾

ان کا ٹھکانا آگ ہے، اس کا بدلہ جو وہ کماتے تھے ۱۳۷۵

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۹﴾

جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں، ان کا رب اُن کے ایمان کی وجہ سے انھیں راہ دکھائے گا، نعمتوں والے باغوں میں ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں ۱۳۷۶

وعداللہ کی تاکید کیلئے ہے۔ اور الیہ مرجعکم سے مراد موت کے بعد لبعث کے ذریعہ لوٹ کر جانا ہے اور یہی وعدہ حق ہے ورنہ موت کو تو سب جانتے ہیں اور آگے پہلی پیدائش کا ذکر کیا۔ اور اس دوبارہ پیدائش کی غرض یہ بتائی کہ نیک اور بدعمل کرنے والے اس کے مطابق پھل پائیں۔

ع۱۳۷۴ ضیاء۔ ضَوْءٌ وہ ہے جو روشنی کرنے والے اجسام سے پھیل جاتی ہے آگ کی روشنی پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے (غ) اور بعض نے ضوء اور نُور کو مترادف کہا ہے اور بعض کے نزدیک ضوء وہ ہے جو بالذات ہو جیسے سورج اور آگ اور نور وہ ہے جو بالعرض ہو اور دوسرے سے حاصل کیا گیا ہو (ت) جیسے چاند کی روشنی قرآن کریم نے یہاں یہی فرق رکھا ہے اور دوسری جگہ آگ کے متعلق ہے فلما اضاءت ما حوله (البقرۃ ۲ - ۱۷) اور یکاد زیتها یضئ ولو لم تمسسه نار (النور ۲۴ - ۳۵) کے معنی بعض نے یوں کیے ہیں کہ یہ آنحضرت صلعم کے لیے بطور مثال ہے یکاد مَنظرہٗ یَدُلُّ علٰی نبوته ولو لم یتل قرآنا (ت) یعنی آپ کا منظر ہی آپ کی نبوت پر دلالت کرتا تھا گو آپ قرآن نہ پڑھتے اور حدیث میں جو آتا ہے لا تستضیئوا بنار اھل الشرك جسکے لفظی معنی ہیں مشرکوں کی آگ سے آگ روشن نہ کرو تو مراد اس سے صرف یہ ہے کہ اپنے معاملات میں مشرکوں کو مشیر نہ بناؤ اور ان کی رائیں نہ لو (ت) نور کے لیے دیکھو ع۵۸۰۔

منازل۔ مَنْزِل یا مَنْزِلَة جائے نزول کو کہا جاتا ہے اور مرتبہ اور درجہ کو بھی کہا جاتا ہے (ل) قدرہ منازل کے معنی ہونگے اس کا اندازہ کیا کئی منزلیں یعنی اسے منزلوں والا بنایا اور منزلوں سے مراد اس کا بڑھنا گھٹنا ہے۔

اس ظاہری نظام کو جس پر انسان کی زندگی کا انحصار ہے بیان کرنا اس غرض سے ہے کہ عالم جسمانی سے عالم روحانی کے نظام کی طرف توجہ دلائی جائے جیسا اگلی آیت سے ظاہر ہے اور بتایا جائے کہ وہ خدا جس نے انسان کی حیوانی زندگی کیلئے یہ سامان پیدا کئے ہیں اسی نے روحانی زندگی کے سامان بھی پیدا کیے ہیں +

ع۱۳۷۵ دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ اسی حیوانی زندگی کو ہی اصل زندگی قرار دیا جائے اور کھانے پینے اور آسائش جسمانی کو ہی مقصد زندگی سمجھ لیا جائے ایسے لوگ حقیقی راحت کو کبھی نہیں پاتے جب اس دنیا میں بھی نہیں پاتے تو آخرت میں کہاں پائیں گے۔

ع۱۳۷۶ ہدایت کے معنی کے لیے دیکھو ع۵ بایمانهم یعنی وہ ایمان ہی ان کے لیے اس منزل مقصود تک پہنچنے کا موجب ہو جاتا ہے۔ گو یا بغیر ایمان کے انسان منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ یہی ایمان انسان کے لیے نور بن جاتا ہے اس دنیا میں بھی جیسا کہ فرمایا یخرجهم من الظلمات الی النور (البقرۃ ۲ - ۲۵۷) اور آخرت میں بھی یوم تری المومنین والمومنات یسعٰی نورهم بین ایدیهم (الحدید ۵۷ - ۱۲) مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمل صالح کوئی چیز نہیں بلکہ عمل صالح کی توفیق ایمان سے ملتی ہے۔ ایمان ایک روشنی ہے صرف روشنی فائدہ نہیں دیتی جب تک انسان اس میں چلے نہیں ؞

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ
فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ
ع الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ ۱۰

اُن میں اُن کی دعا ہے اے اللہ تو پاک ہے اور ان میں اُن کی آپس کی دعا سلام ہے اور ان کی آخری دعا ہے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے ۱۳۷۷

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ
بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۭ فَنَذَرُ
الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا فِيْ
طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۱۱

اور اگر اللہ لوگوں پر مصیبت جلد بھیجے جیسے وہ بھلائی کو جلد چاہتے ہیں تو ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا — سو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، ہم ان کو اُن کی سرکشی میں بھٹکتے چھوڑ دیتے ہیں ۱۳۷۸

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا
لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَاۗىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا
عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ
مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۱۲

اور جب اِنسان کو دُکھ پہنچتا ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے اپنی کروٹ پر یا بیٹھا یا کھڑا - پھر جب ہم اس کا دُکھ دُور کر دیتے ہیں تو اس طرح گزر جاتا ہے گویا کہیں کسی دُکھ کے لیے جو اسے پہنچا ہو پکارا ہی نہ تھا - اسی طرح خطا کاروں کو بھلا معلوم ہوتا ہے جو وہ کرتے ہیں ۱۳۷۹

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا
ظَلَمُوْا ۙ وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ
مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ
الْمُجْرِمِيْنَ ۱۳

اور یقیناً ہم نے تم سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا، جب انھوں نے ظلم کیا اور ان کے رسول اُن کے پاس کھلی دلائل لے کر آئے اور نہ تھے کہ ایمان لاتے، اسی طرح ہم مجرم لوگوں کو سزا دیتے ہیں -

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ

پھر ہم نے اُن کے بعد تمھیں زمین میں جانشین بنایا، تاکہ

ع ۱۳۷۷ مومن کے مُنہ سے تو اس زندگی میں بھی یہی کلمات نکلتے ہیں سبحانک اللھم - الحمد للہ رب العٰلمین پانچ وقت کی نمازیں یہی بار بار کہتا ہے مسلمان مسلمان سے ملتا ہے تو اسے سلامتی کی دعا دیتا ہے اور عملاً بھی اس کی سلامتی کا خواہاں ہوتا ہے المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں - پس مومن کا بہشت اسی دنیا کی زندگی سے شروع ہوتا ہے اور جنات نعیم کا نقشہ یہاں کیا لطیف کھینچا ہے اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد اور ایک دوسرے پر سلامتی ؞

ع ۱۳۷۸ اجل - اصل میں تو کسی چیز کے لیے مدت معینہ کو کہا جاتا ہے اور اس سے مراد موت بھی لی جاتی ہے کیونکہ اس سے دنیا میں بقا کی مدت پوری ہو جاتی ہے (غ) اور یہاں چونکہ قوم کا ذکر ہے اس لیے مراد قوم کی ہلاکت ہے -
بُرائی مانگنے کی ممانعت: جب کفار کو اُن کی بد کرداریوں کے انجام سے ڈرایا جاتا تھا تو کہتے تھے وہ عذاب آتا کیوں نہیں اسی کی طرف اس سوال میں اشارہ ہے جو بار بار کرتے تھے متی ھذا الوعد - متی ھذا الفتح اور ایک جگہ ہے اللّٰھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم (الانفال - ۳۲) اسی طرح وہ عذاب بار بار مانگتے تھے - تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دکھ اور تکلیف کو جلد نہیں بھیجتا گو انسان اپنی بیوقوفی سے اس کے لیے جلدی کرتا ہے جس طرح بھلائی کے لیے جلدی کرتا ہے - کفار تو عذاب کے لیے جلدی کرتے تھے مگر آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ذرا ذرا باتوں پر اپنے ہی عزیزوں کے لیے عذاب مانگتے ہیں یا کوئی اپنے بچے پر خفا ہوتا ہے تو اس کے لیے موت مانگتا ہے - کسی کو اپنے بھائی سے ذرا اختلاف ہوتا ہے تو اس کے لیے بد دعاؤں پر اُتر آتا ہے - اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی رحمت کو چاہیں اپنے لیے دکھ اور تکلیف نہ چاہیں -

ع ۱۳۷۹ اس آیت میں بتایا کہ دکھ تو مانگتے ہیں لیکن دکھ پہنچتا ہے تو پھر خدا کو پکارتے ہیں - اور یہ بھی بتایا کہ دکھ ہم اس لیے بھیجتے ہیں تاکہ انسان اپنی اصلاح کرے مگر

بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۴)
وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ
الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ
غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ
اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ
اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ
رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۵)
قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ
اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا
مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۶)
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ

ہم دیکھیں تم کیا کرتے ہو ۔
اور جب اُن پر ہماری کھلی آیات پڑھی جاتی ہیں، تو جو
ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ، کہتے ہیں اِس کے سوا
کوئی اور قرآن لا ، یا اسے بدل دے ۔ کہہ ، میرا کام
نہیں کہ اپنی طرف سے اسے بدل دوں ۔ میں تو کسی چیز کی
پیروی نہیں کرتا سوائے اس کے جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے
اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں[۱۳۸۰]۔
کہہ، اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تم پر نہ پڑھتا اور نہ وہ تمھیں اِس
کا علم دیتا ۔ میں تو تم میں اِس سے پہلے ایک عمر رہا ہوں ،
تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے[۱۳۸۱]
تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ

انسان جلد بھول کر پھر خطاکاری کی طرف چلا جاتا ہے۔

ع ۱۳۸۰ نشأۃ ثانیۃ یعنی دوسری زندگی جو ہر عمل کی جزا و سزا کو ضروری ٹھہراتی ہے اور جس کو مدنظر رکھتے ہوئے انسان کو اپنے ہر عمل کے نتیجہ پر پہلے غور کرنا چاہیئے ۔ دنیا پرست لوگوں کے لیے جو خواہشات حیوانی سے اوپر اٹھنا نہیں چاہتے ناقابل قبول چیز ہے اس لیے کہتے ہیں کہ یہ قرآن جو ایک دوسری زندگی پر اس قدر زور دیتا ہے اسے ہم قبول نہیں کر سکتے ۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح ان کے کاہن ان کے حسب منشا باتیں عالم بالا کی بیان کر دیتے ہیں اسی طرح رسول اللہ صلعم کریں اور ان کے کھانے پینے شہوات مجبت دنیا وغیرہ امور میں کوئی دخل نہ دیں، نہ ان کی بت پرستی کو برا کہیں ۔ جواب کیا لطیف دیا ہے ۔ میں تو خود صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں ۔ اگر یہ میری بنائی ہوئی بات ہوتی تو میں خود اس پر کیوں عمل کرتا ۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم تمام احکام قرآنی کی تعمیل کرتے تھے ۔ اور سوائے وحی کے اور کسی چیز کی پیروی نہ کرتے تھے ۔ اس لیے تفصیلات شریعت کے دینے میں بھی آپ نے اتباع وحی الٰہی ہی کیا۔

ع ۱۳۸۱ ادرٰکم ۔ دَرَیْتُ کے معنی ہیں میں نے اس چیز کی معرفت حاصل کی اور اَدْرَیْتُهٗ کے معنی ہیں دوسرے کو اس کا علم دیا اَدْرَاهُ بِهٖ اَعْلَمَهٗ (ل) لا تدری لعل اللہ یحدث بعد ذٰلك امرا (الطلاق ۶۵-۱) وان ادری لعله فتنة لکم (الانبیاء ۲۱-۱۱۱) وما ادرٰك (المرسلٰت ۷۷-۱۴) وما یدریك (الاحزاب ۳۳-۶۳) اسی مادہ سے مداراۃ ہے جس کے معنی حسن خلق اور نرمی ہیں۔

آنحضرت کی صداقت و امانت کا اعتراف : مطلب یہ ہے کہ وہ تو اس کے ذریعے سے تمہیں گمراہی سے نکال کر دین اور دنیا میں شرف دینا چاہتا ہے اسی لیے اس نے اسے اتارا ۔ اور یہ جو فرمایا کہ میں نے تمہارے اندر ایک عمر بسر کی ہے تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے تو یہ ان کی اس بات کا جواب ہے کہ کوئی اور قرآن بنا لو یا اسے بدل دو مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بنانا میرا کام نہیں میں نے تمہارے اندر چالیس سال کاٹے ہیں ۔ کیا تم نے کبھی میری صداقت اور دیانت و امانت پر حرف رکھا جس شخص نے چالیس سال تک ایسی صداقت اور راستبازی کا نمونہ دکھایا کہ ملک عرب نے اسے الامین کے نام سے پکارا ، جس شخص نے اتنی مدت انسان پر جھوٹ نہیں بولا ، کیا اب ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اتنا بڑا افترا کرے کہ شب و روز جھوٹ باتیں اس کی طرف منسوب کرے اور ایک دن نہیں دو دن نہیں بلکہ برابر سالہا سال تک جھوٹ پر جھوٹ بناتا چلا جائے ۔ یہ دلیل ان عربوں کے لیے جو آپ کی چالیس سالہ اخلاق و عادات سے واقف تھے دلوں کو کھا جانے والی تھی صحیح بخاری میں ہے جب ابوسفیان سے ہرقل نے آنحضرت صلعم کے حالات دریافت کیے اور اس وقت ابوسفیان رسول اللہ صلعم کے سخت ترین دشمن تھے اور ان پر یہ سوال ہوا ھل کنتم تتھمونه بالکذب قبل ان یقول ما قال یعنی کیا اس دعوٰی سے پہلے تم ان پر جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے ، تو ابوسفیان نے اقرار کیا کہ ایسا نہ تھا ۔ اور ہرقل نے اس سے استدلال کیا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص ایسا راستباز ہو کبھی لوگوں پر جھوٹ نہ بولے ۔ پھر اللہ پر جھوٹ بولے ۔ ایسا ہی نجاشی کے سامنے حضرت جعفرؓ نے کفار قریش کے سامنے یہ شہادت دی جس کا وہ انکار نہیں کر سکے نعرف صدقه ونسبه وامانته ۔ ہم آپ کے صدق اور عالی نسبی اور امانت کو پہچانتے ہیں بعض سعید فطرت لوگ آتے اور آپ کی وجہ مبارک کو دیکھ کر پکار اٹھتے ، لیس بوجه رجل کذاب یہ کذاب کا منہ نہیں ۔ اس مضمون کو اگلی آیت میں صاف کر دیا ہے جہاں فرمایا فمن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبا اللہ پر جھوٹ بنانا سب سے بڑا ظلم ہے ، جو انسان پر جھوٹ نہیں بناتا وہ اللہ پر جھوٹ بنانے کا مرتکب کیونکر ہو سکتا ہے یہاں قرآن کریم کے

كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا
يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿١٧﴾
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ
وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا
عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ
فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ
وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿١٨﴾
وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً
فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ
رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٩﴾
وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ
رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ

باندھا یا اس کی آیات کو جھٹلایا۔ مجرم کامیاب نہیں ہوتے [۱۳۸۲]

اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتا ہے اور نہ انھیں نفع دیتا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ کیا تم اللہ کو ایسی بات بتاتے ہو جو نہ آسمانوں میں اس کے علم میں ہے اور نہ زمین میں، وہ پاک ہے اور اس سے بلند ہے جو وہ شرک کرتے ہیں [۱۳۸۳]

اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں، سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو ان میں ان باتوں کا فیصلہ کر دیا جاتا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں [۱۳۸۴]

اور کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے نشان کیوں نہ اتارا گیا۔ کہہ، غیب صرف اللہ کے لیے ہے، سو انتظار کرو میں

اعجاز کا ذکر نہیں ؏

ع۱۳۸۲ پیشگوئی کہ مفتری اور مکذب فلاح نہیں پا سکتے اور اس کا پورا ہونا: کئی زمانہ ہے آنحضرت صلعم سخت مصائب میں ہیں۔ بات کوئی مانتا نہیں۔ چند ملنے والے یا تکلیفیں اٹھا رہے ہیں یا تتر بتر ہو چکے ہیں مگر اپنی صداقت اور راستبازی پر اور اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ پر کتنا بڑا ایمان ہے کہ اس وقت فرماتے ہیں کہ ان دونوں گروہوں میں سے یعنی ایک طرف آپ اور ایک طرف آپ کو جھوٹا کہنے والے ایک گروہ نہایت ہی ظالم ہے اور مجرم ہے اور مجرم کو کبھی فلاح نہیں مل سکتی۔ اگر میں نے اللہ پر جھوٹ بنایا ہے تو مجھ سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں اگر تم خدا کی باتوں کو جھوٹ قرار دیتے ہو تو تم سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔ پھر اس بیکسی کے وقت کے لفظ جب مخالفت کا پورا زور صرف ہو جانے کے بعد اس قدر سچے ثابت ہوئے اور کوئی دنیوی طاقت حق اور صداقت کی رَو کو نہ روک سکی بلکہ اس کی ہر ایک طاقت اس کے سامنے خود بہ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہی عربوں کو ایک دوسرا نقشہ بھی دکھا دیا کہ جب آپ کی کامیابیوں کو دیکھ کر مسیلمہ اور اسود نے نبوت کے دعوے کیے تو افترا کرنے والوں کا انجام بد بھی اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا۔

ع۱۳۸۳ عرب کے بت پرست بتوں کو اپنا شفیع سمجھتے تھے یعنی کہتے تھے ہم خدا تک نہیں پہنچ سکتے یہ ہمیں اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا واسطہ ہیں۔ بعینہٖ جس طرح آج کثرت سے مسلمان پیروں کو اپنا شفیع سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو سکیں یا اس سے کوئی دعا کر سکیں۔ ان کے پیر ان کے شفیع ہیں۔ ہندوؤں کا عامی عقیدہ تو نہایت سطحی ہے مگر ان کا فلسفیانہ عقیدہ اسی کے قریب قریب ہے وہ بتوں میں اللہ تعالیٰ کا حلول مان کر ان پر اپنی توجہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں اصل غرض ان کی عبادت نہیں خدا کی عبادت ہے۔ مگر چونکہ ایک غیر جسم غیر مرئی چیز پر ہم اپنی توجہ نہیں لگا سکتے اس لیے ان کو توجہ کے لیے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ بعینہٖ اس کی مثال ہے جو عرب کے بت پرست کہتے تھے مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ (الزمر ۳۹-۳) اللہ کو مان کر ایسی باتوں کو پیش کرنے پر فرمایا کہ تم سمجھتے ہو کہ تم کو بعض ایسی باتیں بھی معلوم ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ کو نہیں اس نے یہ تعلیم آج تک کسی نبی کی معرفت نہیں دی کہ کسی اور کو شفیع بنا کر اس کی عبادت کیا کریں۔ بلکہ وحی الٰہی یہی راہ بتاتی ہے کہ ہر انسان خود ان راہوں پر چل کر جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں قرب الٰہی کا مقام حاصل کر سکتا ہے اور لایضرھم ولاینفعھم میں بتایا کہ جب دنیا میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے تو اللہ تعالیٰ کے حضور کیا نفع دیں گے۔ عیسائیوں نے بھی حضرت مسیح کو بعینہٖ ایسا ہی شفیع مانا ہوا ہے۔

ع۱۳۸۴ مخالفت کا قانون مستمرہ: ماکان الناس الا امۃ واحدۃ پر دیکھو ع۲۷۲ مراد یہ ہے کہ جیسے پہلے لوگ تھے ویسے ہی یہ تمہارے مخالف ہیں انہوں نے بھی حق کی مخالفت کی یہ بھی حق کی مخالفت کرتے ہیں اختلاف کے اس معنی کیلئے دیکھو ع۲۱۴ کلمۃ سبقت من ربک سے مراد یہ ہے کہ ان کی سزا کا ایک وقت مقرر ہو چکا ہے وہ جلدی چاہتے ہیں مگر وہ اپنے وقت پر آئے گی۔ یہی مضمون اس رکوع کا ہے اور یوں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب سے آگے ہے سبقت رحمتی غضبی ؏

إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾

بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ع۱۳۸۵

وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّن بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِي آيَاتِنَا ۚ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾

اور جب ہم لوگوں کو تکلیف کے بعد جو انھیں پہنچتی ہے رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ ہماری آیتوں کے حق میں تدبیریں کرنے لگتے ہیں، کہہ، اللہ سب سے جلد تدبیر کر سکتا ہے ہمارے بھیجے ہوئے لکھتے جاتے ہیں جو تم تدبیریں کرتے ہو ع۱۳۸۶

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٢٢﴾

وہی ہے جو تمھیں خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ اُنھیں اچھی ہَوا کی مدد سے لیکر چلتی ہیں اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں انھیں تند ہوا آلیتی ہے اور ہر طرف سے ان پر لہریں چڑھ آتی ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ہلاکت میں گھر گئے۔ اللہ کو اُسی کی خالص فرمانبرداری کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔ اگر تو ہمیں اس سے نجات بخشے، تو یقیناً ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے ع۱۳۸۷

فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ

پھر جب انھیں نجات دیتا ہے تو وہ زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ اے لوگو! تمھاری سرکشی تمھاری اپنی ہی جانوں پر ہے

ع۱۳۸۵ آیۃ میں اشارہ اسی نشان ہلاکت کی طرف ہے۔ اور تنکیر عظمت کے لیے ہے اسی لیے جواب دیا ہے کہ وہ نشان تو آکر رہے گا میں بھی انتظار کرتا ہوں تم بھی کرو۔ ہاں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سا دن اور کونسا وقت ہوگا کیونکہ غیب کی ساری تفصیلات کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

ع۱۳۸۶ رحمت سے مراد وسعت آسائش صحت وغیرہ ہیں۔ رحمت کے چکھانے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور دُکھ کے متعلق کہا جو انہیں پہنچ جاتا ہے۔ دوسری جگہ ہے واذا مرضت فھو یشفین (الشعراء ۲۶ - ۸۰) اللہ تعالیٰ انسان کے لیے رحمت ہی رحمت چاہتا ہے "تکلیف میں بھی راحت پنہاں ہے۔ مگر بجائے اس کے کہ فراخی اور آسائش کی قدر کریں شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مکر کے لیے دیکھو ع۲۴۳۔

ع۱۳۸۷ عاصف۔ نباتات کے تنہ پر جو پتے ہیں اور جو خشک ہو کر چُورا چورا ہو جاتے ہیں انہیں عَصف کہتے ہیں اور والحب ذو العصف (الرحمٰن ۵۵ - ۱۲) میں عصف سے مراد وہ چھلکا ہے جو کھانے میں نہیں آتا کعصف ماکول (الفیل ۱۰۵ - ۵) (ل) اور ریح عاصف یا عاصفۃ وہ تند ہوا ہے جو چیزوں کو توڑ کر چورا کر دیتی ہو (غ)

احیط بھم۔ حاط کے معنی ہیں حفاظت کی (ل) اسی سے احتیاط ہے اور اسی سے حائط ہے جس کے معنی دیوار ہیں کیونکہ وہ ایک چیز کو گھیر کر اندر لے لیتی ہے اور اِحاطۃ کے لیے دیکھو ع۳۲۹ الا انہ بکل شیٔ محیط (حٰم السجدۃ ۴۱ - ۵۴) یعنی سب جہات سے ہر چیز کی حفاظت کرتا ہے اور منع کے معنی میں بھی آتا ہے الا ان یحاط بکم (یوسف ۱۲ - ۶۶) اور احاطت بہ خطیئتہ (البقرۃ ۲ - ۸۱) بلیغ استعارہ ہے۔ کیونکہ انسان جب گناہ کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے تو یہ اسے اس سے بڑے گناہ کی طرف کھینچے جاتا ہے۔ اور اس طرح گناہ سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے اور احیط بھم میں اور واخری لم تقدروا علیھا قد احاط اللہ بھا (الفتح ۴۸ - ۲۱) میں اور عذاب یوم محیط (ھود ۱۱ - ۸۴) میں احاط بالقدرۃ مراد ہے یعنی اپنی قدرت سے اس کا احاطہ کر لیا ہے (غ) اور جب ایک شخص کی ہلاکت قریب آگئی ہو تو کہا جاتا ہے احیط بفلان جیسے احیط بثمرہ (الکھف ۱۸ - ۴۲) ای اصابہ ما اھلکہ یعنی اسے ہلاکت نے آلیا، (ل) اور یہی مراد یہاں ہے یعنی مراد ہے ہلاکت میں گھر گئے۔

جو کچھ اوپر بیان فرمایا تھا اس کی ایک مثال دی ہے کہ کس طرح مصیبت کے وقت انسان خدا کو پکارتا ہے گویا بتایا ہے کہ فطرت انسانی میں یہ بات مرکوز ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سہارا تلاش کرے مگر مصیبت سے نکل کر آسائش کی زندگی پھر دل پر غفلت کا پردہ ڈال دیتی ہے۔ اور ابتدا تو خطاب سے کی ہے کنتم مگر جرین میں غائب کی طرف التفات کلام کر دیا ہے غرض ان کے بُعد کی طرف توجہ دلانا ہے جو آسائش کے وقت انسان کو ہو جاتا ہے اور یا چونکہ مثال میں دکھ تو بعض کا ہے اور مثال کی غرض سب کو سمجھانا ہے اس لیے مخاطب سے غائب کی طرف التفات کیا۔

عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ
اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

دنیا کی زندگی کا سامان (لے لو) پھر تمھیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے، پھر ہم تمھیں بتائیں گے جو کچھ تم کرتے تھے۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ
مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰٓى
اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ
وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰهَآ
اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا
كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

دنیا کی زندگی کی مثال صرف پانی کی طرح ہے جسے ہم بادل سے اتارتے ہیں، پھر اس سے زمین کا سبزہ مل نکلا۔ جسے لوگ اور چار پائے کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین اپنا سنگار کر لیتی ہے اور خوب صورت بن جاتی ہے اور اس کے مالک سمجھتے ہیں کہ وہ اس پر پوری طاقت رکھتے ہیں۔ ہمارا حکم رات یا دن کو اس پر آتا ہے تو ہم اسے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیتے ہیں گویا کل وہ تھی ہی نہیں اسی طرح ہم باتوں کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں[۱۳۸۸]

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا ہے[۱۳۸۹]

ع۱۳۸۸ اختلاط۔ خَلْط دو یا زیادہ چیزوں کے اجزا کا جمع کرنا ہے خواہ وہ دونوں سیال ہوں یا دونوں جامد یا ایک سیال اور ایک جامد اور خلیط شریک ہمسایہ یا دوست کو کہتے ہیں وان کثیراً من الخلطاء (ص۳۸-۲۴) اور اسی سے اختلاط ہے (غ) مگر ابن عباس نے یہاں مختلف سبزیوں کا اگنا مراد لیا ہے گویا وہ ایک دوسرے سے مل جل گئیں (ج) اور ایک ہی چیز کا بہت بڑھ جانا بھی مراد ہو سکتا ہے گویا اس کے اجزا ایک دوسرے سے مختلط ہو گئے (ر) اس صورت میں با سبب کے لیے ہوگی۔ یعنی بارش کے سبب سے سبزیوں میں بہت نشو و نما ہوا۔ اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ زمین کی نبات اس پانی کے ساتھ مل گئی کیونکہ روئیدگی اسی سے پیدا ہوتی ہے کہ پانی کے اجزا سبزیوں کے اجزا سے مل جل جاتے ہیں۔

زخرف۔ زُخْرف۔ زینت کو اور کسی چیز کے حسن کے کمال کو کہتے ہیں اور یہاں مراد زمین کی زینت ہے جو نبات سے اسے ملتی ہے یا اس زینت کا تمام کمال کو پہنچ جانا۔ اور زخرف سونے کو بھی کہتے ہیں اور زخرف القول (الانعام۶-۱۱۲) ایسی باتیں جو خوب سجائی گئی ہوں۔ (ل)

حصید۔ حَصد کھیتی کے کاٹنے پر بولا جاتا ہے اور یہی معنی حصاد کے ہیں واتوا حقه یوم حصاده (الانعام۶-۱۴۱) اور یہاں حصید سے مراد کٹی ہوئی کھیتی ہے جو گویا تباہ کر دی گئی۔ اسی معنی میں ہے منها قائم وحصید (ھود۱۱-۱۰۰) اور حب الحصید (ق۵۰-۹) میں مراد وہ دانا ہے جو کاٹا جاتا ہے (غ)

تغن۔ غنی کے معنی تو عدم حاجت ہیں اور غنی فی مکان کذا سے مراد ہے اس مکان میں مدت تک رہا گویا اپنے غیر سے مستغنی تھا (ل) کان لم یغنوا فیها (الاعراف۷-۹۲) (غ) اور یہاں لم تغن سے مراد ہے گویا کل اس کی نبات تھی ہی نہیں۔

اس مثال میں بھی وہی بات سمجھائی ہے جو پہلی مثال میں تھی۔ زمین کی زینت کے سامان اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہی کرتا ہے مگر جب لوگ اس آسائش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طاقت و قدرت سے غافل ہو کر اپنے آپ کو ہی قادر سمجھ لیتے ہیں انهم قادرون علیها۔ تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا دوسرا نظارہ بھی دکھا دیتا ہے تاکہ انسان سمجھ لے کہ اس کی طاقت سب طاقتوں سے اوپر نہیں بلکہ یہ کوئی اور عظیم الشان طاقت ہے جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔

ع۱۳۸۹ دار السلام۔ سَلْم اور سَلامَة کے معنی آفات ظاہری اور باطنی سے پاک ہونا ہیں اور دار السلام سے مراد دار السلامة ہے (اس لیے وہاں کا قول بھی سلاماً سلاماً ہے) لهم دار السلام عند ربهم (الانعام۶-۱۲۷) اور السلام اللہ تعالیٰ کا بھی اسم ہے السلام المؤمن المهیمن (الحشر۵۹-۲۳) کیونکہ وہ ہر قسم کے عیوب اور نقائص سے پاک ہے (غ)

دنیا کی نعمتوں کے مقابل جن میں دکھ اور تکلیفیں ملی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ ایسے گھر کی طرف بلاتا ہے جو دکھوں اور تکالیف سے پاک ہے۔ انسان اگر

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

جو نیکی کرتے ہیں ان کے لیے نیک بدلہ ہے اور بڑھ کر، اور اُن کے منہ کو نہ سیاہی ڈھانکے گی اور نہ ذلّت - یہی جنت والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے ع۱۳۹۰

وَ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور جو بدیاں کماتے ہیں (تو) بدی کا بدلہ اسی کی مثل ہے اور ان پر ذلت چھا جائے گی کوئی انھیں اللہ سے بچانے والا نہ ہوگا گویا کہ اُن کے مونہوں پر رات کا سیاہ ٹکڑا اُوڑھا دیا گیا ہے - یہی آگ والے ہیں، وہ اسی میں رہیں گے -

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے پھر انھیں جنھوں نے شرک کیا تھا کہیں گے تم اور تمھارے شریک اپنی جگہ ٹھیرے رہو پھر ہم اُن میں جدائی ڈال دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہ کرتے تھے ع۱۳۹۱

سکھ کو چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی سکھ کی طرف بلاتا ہے مگر انسان عارضی سکھ کو مدّنظر رکھ کر خود اپنے لیے دکھ کا سامان کر لیتا ہے۔

ع۱۳۹۰ الحسنیٰ ۔ حُسن (دیکھو ع۱۰۶) اور حُسنیٰ میں فرق یہ ہے کہ حسن کا استعمال عام ہے اور حسنیٰ کا حرف احداث پر (غ) حسن اور حسنیٰ دونوں مصدر ہیں اور گو حسنیٰ کے معنی زیادہ تر جنت یا المنزلۃ الحسنیٰ لیے گئے ہیں ۔ مگر لسان العرب میں ہے کہ اس سے اصل مراد المجازاۃ الحسنیٰ ہے اچھا بدلہ اور ابن جریر میں بھی اس کے مطابق اقوال موجود ہیں۔

زیادۃ ۔ تو اصل میں ایک چیز پر کچھ بڑھانے کا نام ہے مگر یہاں چونکہ نعمائے جنت میں اس کا ذکر ہے اس لیے مراد نظر الی وجہ اللہ لی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا دیکھنا جو بہشت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے ۔ راغب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رویت کو زیادہ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جس کا تصوّر بھی دنیا میں ممکن نہیں ۔ ابن جریر میں کچھ اور اقوال بھی منقول ہیں ۔ مثلاً بڑھا ہوا اجر یا دس گنا اجر ۔ یا اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رضوان ۔ یا اس دنیا میں نعمتیں ٭

یرھق ۔ رَھِق کے معنی کسی امر نے غالب آکر اس کو ڈھانک لیا ہیں سارھقہ صعودا (المدثر ۷۴-۱۷) (غ)

قتر ۔ قَتَرَۃ اس غبار کو کہتے ہیں جس پر سیاہی غالب ہو جیسے دھواں (ل) نیز دیکھو ع۳۰۵ ٭

احسان یعنی اپنے نفس میں نیکی کرنے یا دوسروں سے نیکی کرنے کا انجام یہ ہے کہ بدلہ نیک ملتا ہے کچھ اور بھی ملتا ہے اور چہرہ پر سیاہی چھا جانا جو ناکامی اور نامرادی کا لازمی نتیجہ ہے وہ پیدا نہیں ہوتی نہ انسان کو ذلیل ہونا پڑتا ہے ابن جریر نے ان الفاظ کی یوں تفسیر کی ہے لا یغشی وجوھھم کابۃ ولا کسوف حتی تصیر من الحزن کانما علاھا قتر یعنی ان کے مونہوں کو رنج وملال اور تاریکی نہیں ڈھانکے گی یہاں تک کہ غم کے مارے وہ ایسے ہو جائیں کہ گویا ان پر دھواں چھا گیا ہے ۔ اس کے مقابل پر بدی کے انجام بد کا اگلی آیت میں ذکر کیا ہے۔

ع۱۳۹۱ مکانکم ۔ فعل محذوف ہے الزموا مکانکم یعنی اپنی جگہ ٹھہرے رہو ٭

زیلنا ۔ زال کے معنی ایک چیز اپنے طریق سے ہٹتی ہوئی علیحدہ ہو گئی ۔ اس سے زوال وغیرہ ہیں ۔ اور تزیلوا (الفتح ۴۸-۲۵) کے معنی تفرقوا الگ الگ ہو گئے ۔ باب تفعیل یہاں تکثیر کے لیے ہے (غ) پس زیلنا کے معنی ہیں فرقنا ٭

تین قسم کے معبود: شرکاؤکم اور شرکاؤھم سے مراد وہ ہیں جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہراتے تھے حضرت مسیح فرماتے ہیں ما قلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ ربی وربکم (المائدۃ ۵-۱۱۷) اور ملائکہ کے متعلق ہے اھٰؤلاء ایاکم کانوا یعبدون (السبا ۳۴-۴۰) یہاں فرمایا کہ وہ ان کے شرکاء کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہ کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان دونوں یعنی عابد اور معبود کو الگ الگ کر دے گا اور دوسری جگہ ہے انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم (الانبیاء ۲۱-۹۸) لو کان ھٰؤلاء اٰلھۃ ما وردوھا (الانبیاء ۲۱-۹۹) تو معلوم ہوا کہ ان دونوں مقامات پر الگ الگ قسم کے معبودین کا ذکر ہے ایک تو اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں یا ملائکہ کو معبود بنا لیا گیا ہے ۔ یہ آیات ان کے متعلق ہیں اور جہاں معبودین کے دوزخ میں

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ
كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝۲۹

سو ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ گواہ بس ہے کہ ہم تمھاری
عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ
وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ
ع ۸ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۳۰

وہاں ہر شخص اس کی خبر پالے گا جو آگے بھیجا تھا اور وہ
اللہ اپنے سچے مولیٰ کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جو وہ
افترا کرتے تھے اُن سے جاتا رہے گا[۱۳۹۲]

النصف

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ
يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ
مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ
اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۳۱

کہہ کون تمھیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے، یا کس
کے اختیار میں کان اور آنکھیں ہیں اور کون زندہ مُردے
سے نکالتا ہے اور مُردہ زندہ سے نکالتا ہے اور کون کاروبار
عالم کی تدبیر کرتا ہے، تو کہیں گے اللہ۔ پس کہہ پھر کیا تم
تقوےٰ اختیار نہیں کرتے[۱۳۹۳]

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ
الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ښ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۳۲

تو یہی اللہ تمھارا سچا رب ہے اور حق کے بعد کیا ہے
مگر گمراہی۔ پھر تم کہاں سے پھرے جاتے ہو۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ
فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۳

اسی طرح تیرے رب کی بات ان پر صادق آئی جنھوں نے نافرمانی
کی کہ وہ ایمان نہیں لاتے[۱۳۹۴]

پڑنے کا ذکر ہے تو مراد وہ لوگ ہیں جو خود اپنے آپکو بڑا بنا کر دوسروں سے اپنے آپ کو خدا کی طرح منواتے ہیں اور پتھروں اور درختوں اور ہواؤں وغیرہ کو معبود بنا لیتے ہیں تو ان کا ذکر ان دونوں میں نہیں کیونکہ حشر صرف انسانوں کا ہوگا نہ جمادات اور نباتات کا۔

۱۳۹۲ع الحق۔ اسمائے الٰہی میں سے ہے دیکھو ع۶۵ تبلوا بلی سے خبر پا لینے کے معنی میں ہے دیکھو ع۱۵۵
جب اعمال کی سزا کے بھگتنے کا وقت آتا ہے تو غلط سہارے سب گر جاتے ہیں اور اصل حقیقت انسان کے سامنے منکشف ہو جاتی ہے۔ یہ تجربہ ہر انسان یہاں بھی کر سکتا ہے۔ ہر ایک غلط کار کو اپنی غلطیوں کی سزا آخر خود بھگتنی پڑتی ہے اور جو اس کو ان غلطیوں میں ڈالتے ہیں نتیجہ بھگتنے کے وقت وہ الگ ہو جاتے ہیں۔ رکوع کے پہلے حصہ میں بتایا تھا کہ مصیبتوں کے وقت فطرت انسانی صرف اللہ تعالیٰ کے آگے جھکتی ہے اور معبودان باطل کو اس وقت انسان بھول جاتا ہے ان چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کے مقابلہ میں آخری آیات میں اس مصیبت عظمیٰ کی طرف توجہ دلائی ہے جو بدکرداروں کے لیے نتائج اعمال کے رنگ میں ظہور پذیر ہوگی اس وقت انکشاف کامل ہوگا کہ غیر اللہ معبود کسی کام نہیں آ سکتے بلکہ وہ معبود بھی انکار کریں گے کہ ان کی عبادت کی جاتی تھی۔

۱۳۹۳ع یملک السمع والبصر سے مراد ہے کہ کون ان قوتوں کو وجود میں لانے والا اور کون ان کی حفاظت کا متولی ہے (رغ)

مشرکین کا اقرار توحید: پچھلے رکوع میں یہ بتایا تھا کہ مصیبت کے وقت فطرت انسانی اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتی ہے اور معبودان باطل کو بھول جاتی ہے اسی اس ہولناک وقت کی طرف توجہ دلائی تھی جو نتائج اعمال کے بھگتنے کا وقت ہوگا کہ خود وہ معبود بھی انکار کریں گے۔ اسی مضمون کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ایک بُت پرست کی فطرت بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت دے اٹھتی ہے اور بعض باتوں میں تو مجبوراً اسے بھی ماننا پڑتا ہے کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ چنانچہ آسمان اور زمین سے رزق کا دینا۔ آسمانی رزق سے مراد یا تو وحی کا نزول ہے اور زمینی رزق سے مراد جسمانی سامانوں کا عطا کرنا۔ اور یا آسمان کا رزق پانی ہے جو اوپر سے برستا ہے اور زمین کا رزق اس پانی سے روئیدگی کا نکلنا ہے ایسا ہی سمع اور بصر پر اختیار یعنی قوائے انسانی پر کیونکہ سمع اور بصر دو اعلیٰ ترین قوائے انسانی ہیں۔ پھر مردوں سے زندوں کو اور زندوں سے مردوں کو نکالنا جسمانی رنگ میں ہو یا قوموں کی احیاء و اماتت ہو اور خلاصہ ان سب امور کا تدبیر امر میں آ جاتا ہے۔ جس سے مراد نظام عالم کا چلانا ہے۔ مسیح کی پرستش کرنے والا یا شجر یا حجر کی پرستش کرنے والا مانتا ہے کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے ہی ہیں اس لیے فرمایا پھر مستحق پرستش دوسرے کس طرح ہو گئے جیسا کہ اگلی آیت میں واضح کر دیا +

۱۳۹۴ع فسق۔ یہاں عام معنی میں ہے یعنی عہد فطرت کی خلاف ورزی مراد ہے کیونکہ اوپر عہد فطرت کی طرف اشارہ ہے جو اس عہد کی نافرمانی کرتے ہیں

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

کہہ کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو پہلے پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوہراتا ہے۔ کہہ اللہ ہی پہلے پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوہراتا ہے پھر تم کہاں سے الٹ جاتے ہو؟[۱۳۹۵]

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

کہہ کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو صحیح راہ بتاتا ہے، کہہ، اللہ ہی صحیح راہ بتاتا ہے، تو کیا وہ جو صحیح راہ بتاتا ہے زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا، سوائے اس کے کہ اُسے راہ دکھائی جائے تمھیں کیا ہوگیا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟[۱۳۹۶]

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور ان میں اکثر اٹکل پر ہی چلتے ہیں، حق کے مقابلے میں اٹکل کچھ کام نہیں دیتی اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں[۱۳۹۷]

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾

اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا اوروں کا افترا ہو، بلکہ یہ اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے، اور کتاب کی تفصیل ہے جس میں کچھ شک نہیں، جہانوں کے رب کی طرف سے ہے[۱۳۹۸]

وہ اس دوسرے عہد یعنی شریعت یا وحی کو بھی قبول نہیں کرتے۔

۱۳۹۵ بدء الخلق اور عود: خلق کے لوٹانے سے مراد بعد موت زندگی بھی ہو سکتی ہے تو گو وہ اس کے قائل نہ تھے مگر مراد یہ ہو سکتی ہے کہ جب وہ پہلی بار بھی خلق نہیں کر سکتے تو دوسری زندگی جو اللہ تعالیٰ کے اور بھی عجائبات قدرت سے ہے اور ایک حقیقت ہے اس پر وہ کیونکر قادر ہو سکتے ہیں اور یا پہلی خلق سے مراد بار اول اشیاء کو وجود میں لانا اور اعادہ سے مراد ایک قانون کے ماتحت ان کو بار بار پیدا کرتے رہنا ہے جیسے انسان اول کو پیدا کیا یہ بدء ہے پھر اس سے آگے ایک قانون کے ماتحت نسل چلائی یہ اعادہ ہے اس صورت میں معنی ظاہر ہیں۔

۱۳۹۶ یَهِدِّیْ۔ اصل میں یَهْتَدِیْ ہے اور اهتداء کے معنی ہدایت پانا ہیں۔ اور هَدٰی لے جانا بھی ہیں جیسے هَدَیْتُهٗ الی الطریق یا للطریق۔ یا هدیت العروس الی زوجها اور یہاں هدی اور اهتدی کے معنی محض انتقال مکان کے کیے گئے ہیں لا یقدر ان ینتقل عن مکانه الا ان ینقلوه (ل) یعنی اس بات پر قادر نہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ خود جا سکے سوائے اس کے کہ دوسرے اُسے لے جائیں اور قرآن شریف میں ہے او اجد علی النار هدی (طٰهٰ ۲۰-۱۰) جہاں هدی سے مراد صرف رستہ ہے (ل) اور دوسری جگہ ہے فاهدوهم الی صراط الجحیم (الصّٰفّٰت ۳۷-۲۳) اور ایک ہدایت اعطیٰ کل شئ خلقه ثم هدی (طٰهٰ ۲۰-۵۰) والی ہے جس سے مراد اپنے دائرہ استعداد میں ترقی ہے دیکھو ح۵۔

معبودان غیر اللہ کا عجز: تیسری بات جس کی طرف توجہ دلائی (پہلی تدبیر امر ہے آیت ۳۱۔ دوسری خلق آیت ۳۴) وہ ہدایت کا دینا ہے یہ بھی کوئی بت یا کوئی معبود باطل نہیں دیتا صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے اور معبودان باطل کے متعلق جو فرمایا کہ لا یهدی الا ان یهدی تو یا عباد امثالکم (الاعراف ۷-۱۹۴) مراد ہیں کہ وہ خود محتاج ہدایت ہیں اور یا هدی سے مراد ان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا ہے یعنی وہ خود چلنے کے قابل بھی نہیں اور یا وہ ہدایت عامہ مراد ہے جو جاندار اور بیجان اور ذی عقل اور غیر ذی عقل سب کو دی جاتی ہے کہ اس کا دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے۔

۱۳۹۷ غیر اللہ کی پرستش اس لحاظ سے ظنی ہے کہ ان کے پرستار کو یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے کوئی نفع پہنچے یا کسی نقصان سے بچ جائے اس کے مقابل حق یعنی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے معلوم ہوا قرآن شریف ظنی باتوں کے اتباع سے روکتا ہے اور ان باتوں کی طرف بلاتا ہے جو ثابت شدہ حقائق ہیں۔

۱۳۹۸ یہاں دو باتیں بالخصوص بتائیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قرآن افترا نہیں۔ ایک پہلی کتابوں کا مصدق ہونا یعنی ان پیشگوئیوں کو پورا کرنے والا

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٨﴾

کیا کہتے ہیں کہ اسے از خود جھوٹ بنا لیا ہے کہہ ایک سورۃ اس جیسی لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بُلا سکو بُلا لو، اگر تم سچے ہو۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿٣٩﴾

بلکہ اُسے جھٹلاتے ہیں جس کے علم کا وہ احاطہ نہیں کر سکتے اور ابھی اس کی حقیقت ان تک نہیں آئی اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، تو دیکھ لو ظالموں کا انجام کیسا ہوا ؏۱۳۹۹

وَمِنْهُم مَّن يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُم مَّن لَّا يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٤٠﴾ ع

اور کچھ ان میں سے وہ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے اور کچھ وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائینگے اور تیرا رب فساد کرنیوالوں کو خوب جانتا ہے۔

وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنتُم بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٤١﴾

اور اگر تجھے جھٹلائیں تو کہہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم اُس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو ؏۱۴۰۰

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤٢﴾

اور اُن میں سے بعض وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تو بہروں کو سنائے گا گو وہ عقل سے کام نہ لیں۔

وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو تیری طرف نظر اُٹھاتے ہیں تو کیا

ہے جو اس کے آنے سے ہزار ہا برس پہلے موجود ہیں ان پیشگوئیوں کو محمد رسول اللہ نے نہیں بنایا۔ اور دوسرا یہ تفصیل کتاب ہے یعنی وہ باتیں جو پہلی کتابوں میں مجمل اور مبہم رہ گئی ہیں ان کی تفصیل یہ قرآن شریف فرماتا ہے جیسے مسئلہ معاد یا مسئلہ صفات الٰہی کہ پہلی کتابیں اس بارہ میں بہت ہی اجمالی تعلیم دیتی ہیں ایسا ہی ان کتابوں میں دلائل کا نام و نشان نہیں۔ اگلی آیت میں اس دعوے کو اور مضبوط کیا کہ اگر تم پھر بھی اسے افترا سمجھتے ہو تو اس جیسی ایک ہی سورت لے آؤ۔ اس کے لیے دیکھو ؏۳۷ اور قرآن کا ذکر یہاں اس لحاظ سے کیا کہ اس میں دلائل توحید الٰہی ہیں۔

؏۱۳۹۹ یحیطوا بعلمہ۔ کسی چیز کا احاطہ از روئے علم کامل طور پر صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے دیکھو ؏۳۲۹ ولیکن انسان بھی اس میں سے جس قدر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے حاصل کرتے رہتے ہیں ولا یحیطون بشیء من علمہ الا بما شاء (البقرۃ ۲ - ۲۵۵) یہاں ان کے احاطہ بالعلم نہ کرنے سے مراد اُن کا تدبر نہ کرنا ہے کیونکہ انسان کو جو علم ملتا ہے تدبر سے ملتا ہے۔

تاویل کے معنی کے لیے دیکھو ؏۳۷۶ اصل حقیقت یا انجام دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ یہاں انجام مراد ہے۔

علوم قرآنی اور تکذیب کرنے والوں کا غور نہ کرنا: مثل لانے کی تحدی کے بعد اس کتاب کے علوم کی طرف توجہ دلائی ہے جھوٹ تو کہہ دیا مگر اس کے علوم کی خبر تک نہیں۔ اس کے مضامین عالیہ پر کبھی غور نہیں کیا اگر غور کرتے تو خود وہ باتیں ہی ان کے دلوں کو کھینچ لیتیں تو یہ کس قدر جرات ہے کہ بغیر ایک چیز کا علم حاصل کرنے کے اس کی تکذیب شروع کر دی چونکہ حقیقت معنی کا ذکر احاطہ بالعلم میں آچکا ہے اس لیے تاویل سے مراد تاویل فعلی یا انجام ہے اور اسی انجام تکذیب کی طرف آیت کے آخری الفاظ میں توجہ دلائی کیف کان عاقبۃ الظالمین۔ پس مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے علوم پر غور کرتے تو اس کی تکذیب نہ کرتے اور جو تکذیب کی ہے تو اب اس کا انجام وہی ہوگا جو اُن کو پہلے سے بتا دیا گیا ہے۔

؏۱۴۰۰ پچھلے رکوع کے آخر پر توحید کے ذکر میں قرآن کریم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ تکذیب میں انہوں نے جلدی کی ہے اس کا انجام آ کر رہے گا۔ اسی رکوع میں اسی عذاب کا ذکر ہے جو تکذیب پر آتا ہے اور پہلے بطور تمہید بیان فرمایا کہ ہر ایک کی ذمہ داری اپنے اپنے اعمال کی ہے اس لیے جو حق کی مخالفت کرتا ہے اور اس کا استیصال چاہتا ہے وہ لازماً سزا پاتا ہے۔

تَهۡدِی الۡعُمۡیَ وَلَوۡ كَانُوۡا لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۴۳﴾

تو اندھوں کو راہ دکھائے گا گو وہ سوجھ نہ رکھتے ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ شَیۡـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾

اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ آپ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ع۱۴۰۱

وَیَوۡمَ یَحۡشُرُهُمۡ كَاَنۡ لَّمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ یَتَعَارَفُوۡنَ بَیۡنَهُمۡ ؕ قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِیۡنَ ﴿۴۵﴾

اور جس دن اُن کو اکٹھا کرے گا گویا نہ رہے تھے مگر دن کی ایک گھڑی، ایک دوسرے کو پہچانیں گے اور وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور وہ ہدایت پانے والے نہ ہوئے ع۱۴۰۲

وَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِلَیۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیۡدٌ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾

اور اگر ہم ان وعدوں میں سے جو انھیں دیتے ہیں کچھ تجھے دکھا دیں یا تجھے وفات دیں تو ہماری طرف ہی انھیں لوٹ کر آنا ہے پھر اللہ اس پر گواہ ہے جو وہ کرتے ہیں ع۱۴۰۳

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوۡلُهُمۡ قُضِیَ بَیۡنَهُمۡ بِالۡقِسۡطِ وَهُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۴۷﴾

اور ہر ایک قوم کے لیے ایک رسول ہے، سو جب ان کا رسول آجاتا ہے ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا ع۱۴۰۴

وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۸﴾

اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو۔

قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِیۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا

کہہ مَیں اپنے لیے نہ بُرے کا مالک ہوں نہ بھلے کا، سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔ ہر ایک قوم کا ایک وقت ہے جب ان کا

ع۱۴۰۱ جب اعمال کی ذمہ داری کا ذکر کیا تو بتایا کہ بعض لوگ بظاہر کان تو لگاتے ہیں یعنی آواز تو ان کے کان میں پڑتی ہے مگر عقل سے کام نہیں لیتے اس لیے سن کر فائدہ نہیں اُٹھاتے اور آنکھوں سے دیکھتے تو معلوم ہوتے ہیں مگر چونکہ بصیرت سے کام نہیں لیتے اس لیے ان کا دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے اور یہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سزا بطور ظلم نہیں دیتا۔

ع۱۴۰۲ آرام اور مصیبت کا مقابلہ: دنیا میں جو مدت رہے ہیں وہ ایک گھڑی بھر سے بھی کم معلوم ہوگی انسان کتنی بھی عمر آسایش اور آرام میں گزارے جب مصیبت آتی ہے تو وہ سب ایک گھڑی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو پہچاننے سے بھی یہی مطلب ہے کہ گویا علیحدہ ہوئے کوئی عرصہ نہیں گزرا۔

ع۱۴۰۳ آنحضرتؐ کے مخالفین پر قیامت تک سزا کا آتا رہنا: مطلب یہ ہے کہ سزا کے سارے وعدوں کا آپ کی زندگی میں پورا ہونا ضروری نہیں اور حق تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا دامن جب قیامت تک ممتد ہے اور قرآن کریم میں سب ہی مکذبین اور مخالفین کا ذکر ہے تو ان کی سزائیں سب کی سب آنحضرتؐ کی زندگی میں کس طرح وارد ہو سکتی تھیں اور بعض کا آپ کو دکھایا جانا تاریخ سے ثابت ہے اور یہ جو فرمایا کہ اللہ اس پر گواہ ہے جو وہ کرتے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جس جس کو وہ جس سزا کے لائق سمجھے گا دیتا رہے گا۔

ع۱۴۰۴ ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے یہ وہ عظیم الشان صداقت ہے جو اسلام سے پہلے کسی نے نہیں سکھائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ کل دنیا کی طرف ہوئی اس لیے سب عالم ایک ہی اُمت کے حکم میں ہو گیا۔ رسول کا اب کسی قوم کے پاس آنا ان کو تبلیغ ہونا ہے۔ جس قوم پر آپ کی تعلیم کی تبلیغ ہو گئی۔ اسی کے متعلق اس آیت کا مضمون صادق آگیا اور بینہم سے مراد رسول اور اس کے مخالف ہیں کہ ان کے درمیان فیصلہ ہو جاتا ہے یعنی مخالفین پر سزا وارد ہوتی ہے اسی کے متعلق اگلی آیت میں سوال ہے کہ وہ سزا کب آئے گی اور قرآن کریم میں متی ھٰذا الوعد۔ متی ھٰذا الفتح اکثر دنیوی عذاب کے متعلق ہی ہے۔

جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ آگے بڑھتے ہیں[۱۴۰۵]

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

کہہ بتاؤ اگر اس کا عذاب رات یا دن کو تم پر آجائے تو اس میں سے وہ کیا ہے جس کے لیے مجرم جلدی کر رہے ہیں[۱۴۰۶]۔

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

(اور) کیا پھر جب وہ آہی جائے گا اس پر ایمان لاؤ گے۔ اب (ایمان لاتے ہو) اور (پہلے) اس کے لیے جلدی مچاتے تھے۔

ثُمَّ قِیْلَ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر انھیں جنھوں نے ظلم کیا تھا کہا جائے گا دیرپا عذاب چکھو تمھیں بدلہ نہیں دیا جاتا مگر وہی جو تم کماتے تھے۔

وَیَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِیْ وَرَبِّیْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۵۳﴾ ع

اور تجھ سے دریافت کرتے ہیں کیا یہ سچ ہے، کہہ ہاں! میرے رب کی قسم یہ یقیناً حق ہے اور تم (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے[۱۴۰۷]۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِی الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور اگر ہر شخص کے لیے جس نے ظلم کیا وہ (سب کچھ) ہو جو زمین میں ہے تو اس کے ساتھ فدیہ دینا چاہیگا اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو ندامت کو چھپائیں گے اور ان میں انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا[۱۴۰۸]۔

ع۱۴۰۵ جب یہ سوال ہوا کہ وہ سزا ہم پر کب آئے گی تو فرمایا کہ جواب میں کہہ دو کہ تمہیں سزا پہنچانے کا اختیار مجھے کہاں ہے میں تو اپنی جان کے لیے بھی کسی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس قسم کے الفاظ جو قرآن کریم میں بار بار آئے ہیں نہ صرف آپ کے پیرووں کو غلو سے روکتے ہیں بلکہ دوسری طرف یہ بھی بتاتے ہیں کہ حق کے قبول کرنے میں کسی نفع نقصان کا لالچ نہ دیں بلکہ حق کی خاطر حق کو قبول کرنے کے لیے بلائیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہر قوم کے لیے ایک میعاد مقرر ہے تو اس میں یہ تعلیم دی ہے کہ جس طرح انسان پیدا ہوتے اور مرتے ہیں اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی اور مرتی ہیں اور ہر ایک قوم کے لیے علم الٰہی میں ایک وقت مقرر ہوتا ہے جب وہ صف لپیٹ لی جاتی ہے۔ پس کسی قوم کو اپنی طاقت پر فخر نہیں کرنا چاہیئے جس طرح کسی انسان کو اپنی قوت پر فخر نہیں کرنا چاہیئے۔

ع۱۴۰۶ تعیش اور غفلت سے عذاب آتا ہے: رات کے وقت غافل لوگ عیش و عشرت میں مصروف ہوتے ہیں اور خدا کو بھول جاتے ہیں۔ دن کے وقت اپنے کاروبار کی مصروفیت میں خدا سے دور پڑ جاتے ہیں۔ یہی اشارہ دن اور رات کے وقت عذاب کے آنے میں ہے۔ فرمایا جب عذاب خود ہی آنے والا ہے تو پھر جلدی مانگنے سے کیا حاصل ہے۔

ع۱۴۰۷ ای۔ حرف جواب اور تصدیق ہے جس کے معنی نَعَم ہیں یعنی ہاں اور اس کا استعمال اس طرح پر قسم کے ساتھ خاص ہے پھر اسی عذاب کے متعلق سوال ہے کہ کیا ایسا سچ مچ ہوگا۔ جب ایک قوم طاقت کے نشہ میں ہوتی ہے تو اسے کبھی خیال نہیں آتا کہ اس کے لیے بھی کوئی وقت آنے والا ہے جب اس کی طاقت نابود کر دی جائے گی۔ یہ بار بار کے سوال اسی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔

ع۱۴۰۸ اسرّوا۔ سِرّ اور اِسرار خلاف اعلان ہے سرا وعلانیة (البقرۃ ۲۷۴) اور سِرّ وہ بات ہے جو دل کے اندر چھپائی ہوئی ہو اور اسرّوا کے معنی انہوں نے چھپایا۔ مگر بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں ظاہر کیا۔ کیونکہ دوسری جگہ ان کا قول منقول ہے یٰلیتنا نرد ولا نکذب بایات ربنا (الانعام۔ ۲۷) مگر وہ ندامت صرف اسی قدر نہیں جس کا یہاں اشارۃً ذکر ہے۔ ہاں اسرار جب دوسرے کی طرف ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے اس پر ظاہر کرنا اور اس کے غیر سے چھپانا واذ اسر النبی الی بعض ازواجه حدیثا (التحریم۔ ۳) واسررت لهم اسرارا (نوح۔ ۹) گویا ایک رنگ میں اظہار اور ایک رنگ میں اخفا (غ) اور بعض اہل لغت نے اسرار کو اضداد میں سے قرار دیا ہے یعنی اس کے معنی ظاہر کرنا بھی ہیں اور چھپانا بھی (ت)

ندامت کو چھپانے سے مراد یہ ہے کہ بڑے لوگ اپنے تبعین سے ندامت کو چھپائیں گے۔ تکذیب پر جس عذاب کا وعدہ تھا اسی کا یہاں ذکر ہے۔ وہ

أَلَآ إِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ
أَلَآ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾

سنو اللہ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سنو
اللہ کا وعدہ سچا ہے ، لیکن اُن میں سے اکثر
نہیں جانتے ۔

هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٦﴾

وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾

اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے
نصیحت آگئی ہے اور اس کے لیے شفا جو سینوں میں ہے۔
اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ؏۱۴۰۹

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ
فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿٥٨﴾

کہہ ، اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر ہاں اسی پر چاہیئے
کہ خوش ہوں، وہ اس (دولت) سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں ؏۱۴۱۰

قُلْ أَرَءَيْتُمْ مَّآ أَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ
رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ
آٰللّٰهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٩﴾

کہہ، کیا دیکھتے ہو جو اللہ نے تمھارے لیے رزق اتارا ہے،
پھر تم اس سے حرام اور حلال ٹھیراتے ہو۔ کہہ ، کیا اللہ
نے تمھیں اس کا حکم دیا ہے ؛ یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو ؏۱۴۱۱

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

اور جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں قیامت کے دن کی نسبت اُن کا کیا

دنیا میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے گو کامل طور پر قیامت میں ظہور پذیر ہوگا۔

؏۱۴۰۹ صدور۔ صَدْر سینہ کو کہتے ہیں اور راغب نے بعض حکماء کا قول نقل کیا ہے کہ جہاں قلب کا ذکر ہے تو اشارہ عقل اور علم کی طرف ہے جیسے ان فی ذٰلک لذکری لمن کان لہ قلب (قٓ۔ ۳۷) اور جہاں صدر کا ذکر ہے تو اس کی طرف اور تمام قویٰ مثلاً شہوت ہوا، غضب وغیرہ کی طرف ہے (رغ) پس شفاء لما فی الصدور سے مراد ہوئی کہ سب قویٰ کی اصلاح ہے۔

تکذیب کے انجام بد سے ڈرا کر اور پچھلی آیات میں یہ بتا کر کہ واقعی طاقت اور قدرت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور جو بر سر طاقت ہیں وہ خوب یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہی زندہ کرتا اور مارتا ہے اب اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تم تکذیب میں کیوں جلدی کرتے ہو۔ قرآن تو تمہارے رب کی طرف سے ایک وعظ ہے اور وعظ روکنا ہے اس طرح کہ بدی کے بد انجام سے ڈرایا جائے۔ دوسری بات فرمائی کہ انسان کو جو کچھ قویٰ دیئے گئے ہیں ان کے لیے یہ دوا ہے یعنی ان کی اصلاح کرتا ہے تیسری بات ہدایت ہے کہ ان کو صحیح راہ پر لگاتا ہے۔ اور چوتھی رحمت کہ اس سے اچھے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی اخلاق فاضلہ کی بلند ترین منازل پر یہ پہنچاتا ہے جو دنیا کے لیے موجب رحمت ہے۔

؏۱۴۱۰ اخلاق اور مال: یہاں اسی بات کو واضح کر کے بیان کیا ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ فضل اور رحمت ہے جو تم کو بلند مقامات پر پہنچاتا ہے اور اس مال و دولت سے جس کے جمع کرنے کی فکر میں تم اس کی تکذیب کرتے ہو وہ بہت بہتر ہے۔ گویا سمجھایا ہے کہ اخلاق فاضلہ دولت سے اچھی چیز ہے قرآن کریم تم میں وہ اخلاق فاضلہ پیدا کرتا ہے۔ تم دولت کے جمع کرنے کے لیے بڑی کوشش کرتے ہو، لیکن ان اخلاق کے لینے کے لیے کیوں متوجہ نہیں ہوتے دولت سے انسان عزت اور راحت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر دولت سے یہ چیزیں کبھی نہیں ملتیں اور جو عزت اور راحت ہمیشہ کے لیے اخلاق فاضلہ سے ملتی ہے وہ دولت سے عارضی طور پر بھی نہیں مل سکتی۔

؏۱۴۱۱ رزق۔ عطائے جاری کو کہتے ہیں دنیوی ہو یا اخروی۔ اور مال اور جاہ اور علم سب رزق میں داخل ہیں (رغ)

ایک معنی تو ظاہر ہیں کہ مشرک بعض قسم کی چیزوں کو حرام قرار دے لیتے تھے ھٰذہ انعام وحرث حجر (الانعام ۶-۱۳۸) مگر سیاق وسباق کے لحاظ سے یہ مراد معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اخلاق سے بھی رزق دیا ہے اور قیام جسم کے لیے بھی پھر تم اس رزق سے جو اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اپنے آپ کو بکلی محروم رکھ کر اسے گویا حرام ٹھہرا رہے ہو۔ ھو خیر مما یجمعون سے یہی معلوم ہوتا ہے اگلی آیت بھی اس معنی کی موید ہے کیونکہ فرمایا کہ یہاں تو اس رزق سے تم دن کاٹ لو گے مگر قیامت کے دن کی نسبت جہاں یہ رزق ساتھ نہیں ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے یعنی اس کے لیے کیوں کچھ بھی تیاری نہیں کرتے۔

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾

خیال ہے ؛ یقیناً اللہ لوگوں پر فضل کرتا ہے لیکن اُن میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾

اور تو کسی حال میں نہیں ہوتا اور نہ اس میں کچھ قرآن پڑھتا ہے اور نہ تم کچھ کام کرتے ہو، مگر ہم تم پر موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور تیرے رب سے ذرہ کے وزن کے برابر بھی کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہتی ہے اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک کھلی کتاب میں ہے ۱۴۱۲

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

سنو اللہ کے دوستوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱۴۱۳

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ؕ ﴿۶۳﴾

جو ایمان لائے اور تقوےٰ کرتے تھے۔

ع۱۴۱۲ شان ۔ حال اور معاملہ کو کہتے ہیں۔ جو واقع ہو اور جو سنوار والا ہو۔ اور یہ لفظ صرف بڑے اہم احوال اور امور پر بولا جاتا ہے (غ)

تفیضون ۔ افاض فی الحدیث کے معنی ہیں بات کو پھیلایا یا اس میں کثرت سے لگ گئے (ل) دیکھو ع۱۳۳۵ اور یہ خوض کے ہم معنی بھی ہے (غ) جس کا اکثر استعمال مذمت کے مقام پر ہے۔

یعزب ۔ عازب وہ شخص ہے جو چارہ کی تلاش میں اپنے اہل سے دُور نکل جائے (غ) اس لیے عزب بمعنی غاب یا بَعُد ہے۔ یعنی غائب ہُوا یا دُور ہُوا۔

کتاب ۔ کتاب سے مراد ہمیشہ لکھے ہوئے اوراق نہیں ہوتے بلکہ بعض وقت اس سے مراد ہوتی ہے وہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اندازہ کیا ہے اور بعض وقت مراد اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کا ایجاب اور اس کا حکم ہوتا ہے (غ) اور یہاں کتاب مبین سے مراد علم الٰہی ہے اور مبین اس کو اس لحاظ سے کہا کہ نتائج اعمال ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

جب کفار کو یہ توجہ دلائی کہ وہ بجائے تکذیب کے قرآن کریم سے فائدہ اٹھائیں کیونکہ اس میں شفا اور ہدایت ہے تو اب یہ بتایا کہ یہ قرآن اپنی پیروی کرنے والوں کو کن مقاماتِ عالیہ پر پہنچاتا ہے۔ اور اس پہلی آیت میں تلاوت قرآن کا ذکر کیا خواہ خطاب خاص نبی صلعم سے لیا جائے یا عام۔ اور آپ کے یا آپ کے سچے متبعین کی ساری شانیں ہی اچھی ہیں۔ مگر تلاوت قرآن کا بالخصوص ذکر کیا۔ منہ میں ضمیر اسی شان کی طرف ہے اور یا اللہ کی طرف یعنی اللہ کی طرف سے نازل شدہ قرآن کی تلاوت کرتے ہو یا قبل الذکر ضمیر قرآن کی طرف ہے اور خطاب واحد کے بعد خطاب کو جمع کرکے بتا دیا کہ اصل خطاب سب سے ہی ہے اور ما تعملون من عمل میں سب مومن مراد ہیں جو کسی کام میں لگے ہوں تو ان کو خوش خبری دی ہے کہ تمہارا کوئی نیک عمل ضائع نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے اور افاضۃ کے اصل معنی چونکہ کثرت یا زور سے کسی بات یا کام میں لگنا ہیں اس لیے یہ معنی بھی درست ہیں اور بعض نے اذ تفیضون فیہ میں مراد مخالفین کو لیا ہے کہ قرآن کے بارے میں جھوٹ کو شائع کرتے ہو مگر پہلے معنی ہی قابل ترجیح ہیں (ج) اور اگلی آیت میں صفائی سے اولیاء اللہ کا ذکر کرکے بتا بھی دیا کہ یہاں مراد وہی لوگ ہیں جو نبی صلعم کے اتباع میں اعمال صالح میں لگے رہتے ہیں۔

ع۱۴۱۳ اولیاء اللہ ۔ ولی کے معنی کے لیے دیکھو ع۳۳۲ اولیاء اللہ کہنے سے یہ منشا ہے کہ وہ اللہ کے دین کی نصرت کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ ان کا ناصر ہوتا ہے۔

قرآن کس مقام بلند پر پہنچاتا ہے : تکذیب کرنے والوں کے مقابلہ پر یہاں انصار اللہ کا ذکر کیا جن کو یہاں اولیاء اللہ کے نام سے پکارا ہے اور اگلی آیت میں بتا دیا کہ وہ کون لوگ ہیں جو ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں پس اس کے بعد جو نصرت دین کرتے ہیں وہی اولیاء اللہ ہیں۔ ان کا اس مقام بلند پر پہنچ جانا یقینی بیان کیا ہے جو نجات کامل کا مفہوم ہے کہ نہ ان پر خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے اور یہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر انسان اس دنیا میں پہنچ سکتا ہے اور حقیقی راحت انسان

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں خوشخبری ہے ۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں ، یہ بڑی بھاری کامیابی ہے ۱۴۱۴

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾

اور اُن کی بات تجھے غمگین نہ کرے ، عزت سب اللہ کے لیے ہے ، وہ سننے والا جاننے والا ہے ۱۴۱۵

کو اسی وقت میسر آتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جس پر پہنچ کر انسان یہیں جنت کو پالیتا ہے۔

۱۴۱۴ البشریٰ - بشارۃ اور بشریٰ - اس خبر کو کہا جاتا ہے جو خوش کرنے والی ہو۔ ولما جاءت رسلنا ابراھیم بالبشریٰ (العنکبوت ۲۹ - ۳۱) یٰبشریٰ ھٰذا غلام (یوسف ۱۲ - ۱۹) اور لبشیر وہ ہے جو ایسی خبر دیتا ہے فلما ان جاء البشیر (یوسف ۱۲ - ۹۶) اور ہواؤں کو بھی مبشر کہا ہے یرسل الریاح مبشرات (الروم ۳۰ - ۴۶) اور آنحضرت صلعم نے فرمایا انقطع الوحی ولم یبق الا المبشرات اور وہ رویائے صالحہ ہیں جو مومن دیکھتا ہے یا جو اس کو دکھائی جاتی ہیں (غ)

اولیاء اللہ کو اگر ایک طرف یہ خوشخبری دی تھی کہ ان کے لیے خوف وحزن باقی نہ رہے گا تو اب دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بشارتیں ہوں گی اور یہی وہ بلند ترین مقام ہے جس کو قرآن کریم نے فوز عظیم کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حدیث صحیح میں اس کی تصریح موجود ہے جہاں فرمایا لم یبق من النبوۃ الا المبشرات یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان جو سفارت کا کام انبیاء کرتے تھے اس میں سے اب صرف مبشرات باقی رہ گئی ہیں جو مومنوں کو ملتی رہیں گی۔ نبوۃ یا سفارۃ تو کئی ایک چیزوں کے مجموعہ کا نام تھا۔ مثلاً مبشرات کے علاوہ کتاب کا ملنا جیسا کہ وانزل معھم الکتاب (البقرۃ ۲ - ۲۱۳) سے ظاہر ہے یا کسی نمونہ کا ظاہر کرنا وغیرہ۔ اس سفارت میں ایک حصہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تائیدات اور نصرتوں کی خوشخبری اسکے بندوں کو پہنچائی جائے سو وہ حصہ باقی رہ گیا یعنی کل میں سے ایک جزو اور بلحاظ اس اصل پیغام کے جو اللہ تعالیٰ کی راہوں کا بتانا اس کے امر ونواہی کا پہنچانا وغیرہ ہے۔

مبشرات چالیسواں جزو نبوت ہیں: اسے نبوت کا صرف چالیسواں اور چھیالیسواں یا ساٹھواں حصہ قرار دیا ہے اور مبشرات کی تشریح حدیث میں رویائے صالحہ سے کی ہے اور اس میں الہام بھی داخل ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے اس کلام کو جو بذریعہ رویا یا کشف یا الہام انسان تک پہنچایا جاتا ہے من وراء حجاب میں داخل کیا ہے۔ اور حدیث نے بلحاظ کثرت کے جو رویا کو حاصل ہے اسی کو اصل قرار دیا ہے پس یہ آیت بھی جس کی تفسیر یہ حدیث کرتی ہے ختم نبوت پر دلیل ہے کیونکہ اس کی رو سے صرف مبشرات باقی رہ گئی ہیں اور متعدد حدیثوں میں ہے کہ رسول اللہ صلعم سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد رویائے صالحہ ہے دیکھو ابن جریر اور ابن کثیر۔

انقطاع نبوت سے انقطاع مقامات عالیہ نہیں ہوا: یہاں آیت کے آخر پر یہ لفظ لا کر ذٰلک ھو الفوز العظیم یہی بڑی بھاری کامیابی ہے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر انسان پہنچ سکتا ہے اس سے اوپر کوئی مقام نہیں اور یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ اب نبوت نہیں تو کچھ بھی نہیں یا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا دروازہ بند ہو گیا۔ حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلعم نے فرمایا ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت ولا رسول بعدی ولا نبی قال فشق ذٰلک علی الناس فقال ولکن المبشرات۔ یعنی رسالت اور نبوت منقطع ہو گئی اور میرے بعد کوئی رسول نہیں اور نہ کوئی نبی ہے تو یہ بات لوگوں پر شاق گزری تو آپ نے فرمایا لیکن مبشرات باقی ہیں جس میں یہی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اللہ تعالیٰ کا مکالمہ و مخاطبہ جو اصل نعمت ہے وہ باقی ہے، کیونکہ وہ معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے اور اسی کی طرف اشارہ ہے رجال یکلمون من غیران یکونوا انبیاء میں، ہاں نبوت کی اصل غرض چونکہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں کا ظاہر کرنا تھا اور تکمیل دین کے بعد اس کی ضرورت نہ رہی اس لیے اب نبوت نہیں مگر مقامات عالیہ تک پہنچنے کی سب راہیں موجود ہیں بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر، چنانچہ احمد اور ابن ابی حاتم اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ان اللہ تعالیٰ عباداً لیسوا بانبیاء ولا شھداء یغبطھم النبیون والشھداء علی مجالسھم وقربھم من اللہ (د) یعنی اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جو نبی اور شہید نہیں لیکن نبی اور شہید ان کے مرتبہ اور ان کے اللہ تعالیٰ کے قرب پر رشک کریں گے اور ابو ہریرہؓ سے اسی کی مثل روایت ہے ان من عباد اللہ عباداً یغبطھم الانبیاء والشھداء اور جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون ہیں تو آپ نے ان کے متعلق کچھ باتیں بیان کر کے یہی آیت پڑھی الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون (یونس ۱۰ - ۶۲) (ج) اور ایسی ہی روایت ابو داؤد میں ہے (ش)۔ اور ان روایات کا ماحصل یہی ہے کہ قرب الٰہی کے مراتب اسی طرح لوگوں کو ملتے رہیں گے اور انقطاع نبوت سے مقامات عالیہ سے محروم نہیں کیے جائیں گے۔

۱۴۱۵ مومنین کے ان مدارج عالیہ کو کفار کیا سمجھ سکتے تھے جن کی نظریں دنیا تک محدود تھیں اور جنہیں مال و دولت دنیوی اور حکومت ظاہری پر ناز تھا اس لیے تسلی کے طور پر فرمایا کہ ان باتوں سے غمگین مت ہو۔ عزت و ذلت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مومن اگر اس وقت دنیوی طور پر بیکسی کی حالت میں ہیں تو یہ بھی کوئی غم کی بات نہیں اصل عزت سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ ان کو بھی دے دیگا سمیع علیم میں ان کے اعمال حسنہ کے نتائج کی

أَلَآ إِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ۚ إِنْ يَّتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾

سنو اللہ کے لیے ہی ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور جو اللہ کے سوا (اوروں کو) پکارتے ہیں وہ (ان) شریکوں کی پیروی نہیں کرتے وہ صرف (اپنے) خیال کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں ۱۴۱۶ع

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۗ إِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

وہی ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن روشنی دینے والا (بنایا)، یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو سنتے ہیں ۱۴۱۷ع

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۗ هُوَ الْغَنِىُّ ۗ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْأَرْضِ ۗ إِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا ۗ أَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

کہتے ہیں اللہ نے بیٹا بنایا وہ (اس سے) پاک ہے، وہ بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمھارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں، کیا تم اللہ پر (جھوٹ) کہتے ہو جو تم نہیں جانتے ۱۴۱۸ع

قُلْ إِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

کہہ، وہ جو اللہ پر جھوٹ بناتے ہیں، کامیاب نہیں ہوتے۔

مَتَاعٌ فِى الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

دنیا کا سامان ہے پھر ہماری طرف انھیں لوٹ کر آنا ہے پھر ہم انھیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوْحٍ ۘ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِىْ وَتَذْكِيْرِىْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوْٓا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ

اور ان پر نوحؑ کی خبر پڑھ، جب اس نے اپنی قوم کو کہا اے میری قوم! اگر میرا کھڑا ہونا اور میرا اللہ کی آیات سے نصیحت کرنا تم پر بھاری ہے، تو میرا بھروسا اللہ پر ہے سو اپنا کام درست کر لو اور اپنے شریک جمع کر لو، پھر تم کو

طرف اشارہ کیا۔

۱۴۱۶ع پہلی آیت کے مضمون کو اور واضح کیا ہے کہ حکومت اور بادشاہت سب اللہ کی ہے اور کسی کو خدا کا شریک سمجھ کر پکارنا اس خیال سے کہ اس سے کچھ نفع پہنچے گا بے سود ہے اس لیے کہ یہ صرف جھوٹ اور وہم کی پیروی ہے حقیقت میں وہ کوئی شے ہی نہیں جس کی وہ پیروی کرتے ہیں ما یتبع الذین یعنی ای شیٔ یتبع یہ کس چیز کی پیروی کرتے ہیں گویا وہ کچھ بھی نہیں خوص کے معنی کے لیے دیکھو ۱۰۳۰ع۔

۱۴۱۷ع رات کا آرام انسان کو کام کے قابل بناتا ہے اور دن کی روشنی میں وہ کام کرتا ہے یہ دن اور رات اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں پس نفع نقصان کا مالک وہی ہے جو سامانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ یا یہ اشارہ ہے کہ جس طرح رات جسمانی سکون کا موجب ہے اسی طرح روحانی سکون کا موجب بھی ہے کیونکہ رات کی عبادت سے خصوصیت سے تسکین قلب حاصل ہوتی ہے اور ایسا ہی دن جس طرح جسمانی طور پر روشنی دیتا ہے ایسا ہی روحانی طور پر بھی۔

۱۴۱۸ع شرک اتخاذ ولد: جب شرک کا ذکر کیا تو اس سب سے بڑے شرک کا بھی ذکر کیا جو دنیا میں پھیل جانے والا تھا اور یہ بھی بتایا کہ اس شرک کی بھی کوئی دلیل ان کے ہاتھ میں نہیں اور آیت ۷۰ میں ان کی ظاہری حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا کی زندگی کے سامان اگر انہیں بہتات سے ملیں تو یہ عارضی اور چند روزہ بات ہے۔ حقیقی راحت کے سامانوں سے وہ محروم ہیں اس لیے انجام دکھ ہی دکھ ہے۔

أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ
وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾
فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ
اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ
اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾
فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ
وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾
ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ
فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا
بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ
نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾
ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ
اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا

اپنے کام میں شبہ نہ رہے، پھر میرے ساتھ (وہ) کرگزرو اور مجھے مہلت نہ دو[1419]

پھر اگر تم پھر جاؤ تو مَیں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے، کہ مَیں فرماں برداروں میں سے رہوں۔

پر انھوں نے اسے جھٹلایا سو ہم نے اسے اور انھیں جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے بچایا اور انھیں جانشین بنایا اور انھیں غرق کردیا جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا تو دیکھ لے جو ڈرائے گئے تھے ان کا انجام کیسا ہُوا۔

پھر ہم نے اس کے بعد اپنی (اپنی) قوم کی طرف رسول بھیجے اور وہ اُن کے پاس کھلی دلائل لائے مگر وہ ایسے نہ تھے کہ اس پر ایمان لاتے جسے پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں[1420]

پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اپنی آیتوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، پر

ع۱۴۱۹ مقام مصدر بھی ہو سکتا ہے اور قیام سے اسم مکان اور اسم زمان بھی اور یہاں مصدر بھی ہو سکتا ہے یعنی مراد یہ ہو کہ میرا تمہارے درمیان ٹھہرنا تمہیں بُرا معلوم ہوتا ہے اور یا اسم مکان لیکر اس سے ایماء اپنے نفس کی طرف ہو سکتا ہے۔

اجمعوا امرکم۔ اَجْمَعْتُ کذا اکثر اس موقعہ پر بولا جاتا ہے جہاں جمع سے کسی امر کی طرف اجتماع فکر سے پہنچنا مراد ہو۔ فاجمعوا کیدکم (طٰہٰ ۲۰-۶۴) اور اجمع المسلمون علی کذا سے مراد ہے کہ مسلمانوں کی رائیں اس امر پر مجتمع ہو گئیں۔ اور ان الناس قد جمعوا لکم (اٰل عمران ۳-۱۷۰) میں راؤں کا اجتماع بھی مراد ہو سکتا ہے اور لشکروں کا بھی۔ اور اَمْرٌ جَامِعٌ اس عظیم الشان امر کو کہتے ہیں جس کے لیے لوگ اکٹھے ہو جائیں واذا کانوا معہ علیٰ امر جامع (النور ۲۴-۶۲) (غ)، اور جَمَعَ امرہٗ اور اَجْمَعَہٗ کے معنی ہیں عَزَمَ علیہ یعنی اس پر عزم کرلیا اور اجمعوا امرکم وشرکاءکم میں و بمعنی مع ہے یعنی اجمعوا امرکم مع شرکاءکم اور بعض نے واو عواشر کاءکم مراد لیا ہے۔

غمۃ۔ غَمّ۔ کے اصل معنی ڈھانکنا ہیں اور اَمْرٌ غُمَّۃٌ اس امر کو کہتے ہیں جو مبہم اور مشکوک ہو (ل)

اقضوا الی۔ قضاء۔ کسی امر کا فیصلہ کردینا ہے قول سے ہو یا فعل سے اور یہاں قضاء فعل سے ہے یعنی اس اپنے فیصلہ کو میرے متعلق عمل میں لے آؤ فاذا قضیتم مناسککم (البقرۃ ۲-۲۰۰) اور ایما الاجلین قضیت (القصص ۲۸-۲۸) میں بھی قضائے فعلی ہی ہے۔

اعدائے رسول کو چیلنج: رسول اللہ صلعم کی تکذیب کا ذکر تھا۔ اسی میں قرآن کریم کے مومنوں کو مقامات عالیہ پر پہنچانے کا ذکر آیا۔ اب پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا ہے اور مثال کے رنگ میں پہلے انبیاء کی تکذیب اور اس کے نتائج کو پیش کیا ہے مگر اصل ذکر آنحضرت ؐ کا مقصود ہے اور آپ کے ہی مخالفوں کو ان الفاظ میں خطاب ہے کہ تم جو کچھ طاقت رکھتے ہو میرے خلاف کرگزرو۔ میری ہلاکت کا عزم کرلو۔ کوئی اشتباہ باقی نہ رہے، مہلت بھی نہ دو اور جو کرنا چاہتے ہو فوراً کرگزرو۔ اس شدید مخالفت کے اندر اور کفار کے اس جوش کے اندر جو ان میں پہلے ہی پھیلا ہوا تھا۔ ان الفاظ میں دشمنوں کو یہ کہنا کہ تم سے جو کچھ ہو سکتا ہے میری مخالفت پر زور لگالو اور میری تباہی کے سامان کرلو انسان کا کام نہ ہو سکتا تھا۔ چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں۔ چند بے بس دوست ہیں۔ وہ گھروں سے نکل چکے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت پر کس قدر ایمان ہے کہ یہ پیغام پورے زور کے ساتھ دشمنوں کو پہنچاتے ہیں۔

ع۱۴۲۰ الی قومھم میں بتایا کہ ہر ایک رسول کو ایک خاص قوم کی طرف بھیجا گیا۔ ان رسولوں کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ حضرت نوحؑ کی بعثت بھی عام نہ تھی جیسا کہ انا ارسلنا نوحًا الی قومہ (نوح ۷۱-۱) سے ظاہر ہے اور اس کا سارا خطاب اپنی قوم سے ہی پایا جاتا ہے۔ اور جو فرمایا کہ جس بات کو پہلے جھٹلایا اس پر ایمان نہ

وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿٧٥﴾

انھوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِندِنَا قَالُوا
إِنَّ هَٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٧٦﴾

سو جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا انھوں نے کہا یہ کھلا جادو ہے۔

قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ ۖ
أَسِحْرٌ هَٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ ﴿٧٧﴾

موسیٰؑ نے کہا، کیا تم حق کو (یہ) کہتے ہو کہ جب وہ تمھارے پاس آیا، کیا یہ جادو ہے؟ اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتے۔

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ
آبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ
وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِينَ ﴿٧٨﴾

انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس (راہ) سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا اور تم دونوں کے لیے ملک میں بڑائی ہو اور ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں ۱۴۲۱؎

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيمٍ ﴿٧٩﴾

فرعون نے کہا ہر ایک علم والے جادوگر کو میرے پاس لے آؤ۔

فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا
مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿٨٠﴾

سو جب جادوگر آ گئے، موسیٰؑ نے انھیں کہا، ڈالو جو تم ڈالتے ہو۔

فَلَمَّا أَلْقَوْا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُم بِهِ السِّحْرُ ۖ
إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ
عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨١﴾

تو جب ڈال چکے موسیٰؑ نے انھیں کہا، جو تم لائے ہو یہ دھوکا ہے اللہ اس کو ابھی باطل کر دکھائے گا کیونکہ اللہ فساد کرنے والوں کے کام کو نہیں سنوارتا۔

وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ
كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿٨٢﴾ ع

اور اللہ اپنے کلمات سے حق کو سچا کر دکھائے گا، گو مجرم بُرا منائیں ۱۴۲۲؎

فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ
عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَن
يَفْتِنَهُمْ ۚ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ
وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ ﴿٨٣﴾

پھر موسیٰ پر کوئی ایمان نہ لایا مگر اُس کی قوم کے کچھ لوگ فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ہوئے کہ اُنھیں دُکھ دے گا اور فرعون یقیناً ملک میں سرکش تھا اور وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا ۱۴۲۳؎

لائے تو مطلب یہ ہے کہ ہر رسول کے ساتھ اس کی قوم نے یکساں سلوک کیا یعنی پہلے ہی بغیر سوچے سمجھے جھٹلا دیا پھر مخالفت اور تکذیب پر اڑ گئے، کیونکہ دلوں میں نفرت اور بغض بیٹھ گیا۔

۱۴۲۱؎ تلفت۔ لَفَتَ کے معنی صَرَفَ ہیں یعنی پھیر دیا۔ اسی سے التفات ہے ایک طرف سے ہٹ کر دوسری طرف متوجہ ہونا۔

ان آیات میں سحر اور ساحر دھوکہ اور دھوکہ باز کے معنی میں ہی ہے۔

۱۴۲۲؎ موسیٰؑ کا غلبہ بذریعہ کلمات: یہ آخری الفاظ بتاتے ہیں کہ احقاق حق بذریعہ ان کلمات کے ہوا، جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو سکھائے تھے اور یہی بات حضرت موسیٰ کے آخری غلبہ کا موجب ہوئی۔

۱۴۲۳؎ ذریة۔ دیکھو ۱۵۶؎ اور اس میں باپ بیٹے اولاد عورتیں سب شامل ہیں انا حملنا ذریتہم فی الفلک المشحون (یٰس ۳۶-۴۱) (ل) اور حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے کسی جنگ میں ایک عورت کو قتل ہوا ہوا دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ جنگ کرنا نہ چاہیئے تھا۔ اور پھر آپ نے خالد کے پاس آدمی بھیجا اور حکم دیا لا تقتل ذریة ولا عسیفا۔ جہاں ذریة کی تشریح میں ابن اثیر لکھتے ہیں۔ یجمع نسل الانسان من ذکر وانثی (ن) یعنی ذریة سے مراد نسل انسان ہے مرد اور عورتیں دونوں

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرمانبردار ہو۔

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾

تو انھوں نے کہا اللہ ہی پر ہم بھروسا کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا ع۱۴۲۴

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر لوگوں سے چھڑا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو ایک دوسرے کے مقابل بناؤ اور نماز قائم کرو اور مومنوں کو خوشخبری دے ع۱۴۲۵

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں آسایش کا سامان اور بہت سا

اس میں شامل ہیں۔

ذریۃ من قومہ میں مراد بعض نے قوم بنی اسرائیل اور بعض نے قوم فرعون لی ہے، مگر ترجیح قول اول کو ہے (ج) سیاق عبارت یہی چاہتا ہے۔ کیونکہ آگے ذکر موسیٰ کی قوم کا ہی چلتا ہے اور ذریۃ سے مراد یہاں ابن عباس کے نزدیک قلیل ہے یعنی تھوڑے لوگ اور بعض نے اولاد مراد لی ہے یعنی ان کے باپ تو گزر جانے سے مرچکے تھے اور ملائھم میں ضمیر ذریۃ کی طرف بلحاظ معنی جاتی ہے یا قوم کی طرف یا تو فرعون کی قوم کے سرداروں کو بنی اسرائیل کے سردار کہا ہے اس لیے کہ بنی اسرائیل محکوم تھے اور یا ملائھم سے مراد واقعی بنی اسرائیل کے بڑے لوگ ہیں کیونکہ فرعون انہی لوگوں کے ذریعہ سے بنی اسرائیل پر ظلم کرتا تھا جیسا کہ دوسری جگہ قارون کا ذکر صاف الفاظ میں ہے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ خود غرض لوگ اپنے ذاتی رسوخ اور مالی فائدہ کے لیے اپنی ہی قوم کی جڑیں کاٹنے کے لیے مستعد رہتے ہیں، جیسے آج کل بھی بہتیرے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ کوئی عہدہ ان کو حکومت میں ملتا ہے یا کسی عزت کی خواہش ہوتی ہے تو اپنی ہی قوم کی بیخ کنی کو اس کا ذریعہ بناتے ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سے بھی بہت سے لوگ فرعون اور اپنے نمبرداروں کے خوف سے حضرت موسیٰ پر ایمان نہ لائے اور یہ ابتدا کا ذکر ہے اور یہاں قوم فرعون کا ذکر نہیں۔ گو ان میں سے بھی چند ایک لوگ جیسے خود ساحر اور رجل مومن مذکورہ سورۃ المومن حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے۔

ع۱۴۲۴ فتنۃ کے اصل معنی دکھ اور عذاب ہیں اور یہاں مراد فتنہ کا محل ہے۔ گویا اس عذاب اور تکلیف سے نجات مانگی ہے جو فرعون کی طرف سے ان کو پہنچتا تھا۔

ع۱۴۲۵ قبلۃ سے مراد یہاں مجازاً نماز کی جگہ یا مسجد ہے جیسے دوسری جگہ مصلّٰی یا نماز کی جگہ سے مراد قبلہ ہے دیکھو ع۱۵۸۔

بنی اسرائیل کی نجات کا سامان: بنی اسرائیل مصر میں تو رہتے ہی تھے اس لیے حضرت موسیٰ کو یہ وحی کرنے کا کیا مطلب ہے۔ حضرت موسیٰ کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنی قوم کو فرعون کے پنجہ سے چھڑا لاؤ، چنانچہ حضرت موسیٰ کا پہلا مطالبہ فرعون سے یہی تھا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو فارسل معی بنی اسرائیل (الاعراف ع۱۰۵) لیکن فرعون نے اس کی اجازت نہ دی اور اپنے شدائد اور مظالم کو بنی اسرائیل پر اور سخت کیا اور چونکہ خود بنی اسرائیل بھی عرصہ دراز تک محکومیت کی حالت میں رہنے سے ان اخلاق فاضلہ سے عاری ہو چکے تھے جن سے قوم کو بادشاہت مل سکتی ہے اس لیے حکم ہوا کہ ابھی کچھ مدت ملک مصر میں رہنا ہوگا مگر یہ تمہارا رہنا بیکار نہ ہو، بلکہ انہی گھروں کو مسجدیں بناؤ اور اللہ تعالیٰ سے دعا میں لگ جاؤ اور نماز کو قائم کرو تا کہ تمہارے اندر اخلاق فاضلہ پیدا ہوں جیسا کہ دوسری جگہ بھی فرمایا استعینوا باللہ (الاعراف ع۱۲۸) یہی ان کی مشکلات کا علاج تھا۔ قوموں کے اندر جب ان کی حالت گر چکی ہو اخلاق فاضلہ کا پیدا کرنا آسان امر نہیں ہوتا ایک عرصہ دراز کو چاہتا ہے۔ آج مسلمان اس صریح تعلیم قرآن کی پروا تک نہیں کرتے اور حکومت اور بادشاہت کو اپنا پہلا اور آخری نصب العین بنا کر راہِ صواب سے اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں اور اپنی قوم کی اصلاح اس طریق سے کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جس طریق سے ایسے ہی حالات کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنی قوم کی اصلاح کا حکم دیا تھا۔

ہارونؑ کو وحی: یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی وحی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کو ہوتی تھی۔ اور یہاں ذکر بھی دو باتوں کا ہے۔ ایک مصر میں اقامت کرنے کا دوسرا نماز کا اور نماز کی امامت کا کام حضرت ہارونؑ کے سپرد تھا۔

رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾

مال دے رکھا ہے اے ہمارے رب اس لیے کہ وہ تیرے رستہ سے بہکائیں اے ہمارے رب ان کے مالوں کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے سو وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھیں[۱۴۲۶]

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

فرمایا تم دونوں کی دعا قبول ہوئی سو تم دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے رستہ کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا پار کر دیا، پھر فرعون اور اس کے لشکروں نے شرارت اور زیادتی سے اُن کا پیچھا کیا یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا کہا، میں مانتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں[۱۴۲۷]

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾

کیا اب (ایمان لاتا ہے) اور پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ ع۱۴

سو آج ہم تیرے بدن کو بچا دیں گے۔ تاکہ تو اُن کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں نشان ہو اور یقیناً بہت سے لوگ ہمارے نشانوں سے بے خبر ہیں[۱۴۲۸]

ع۱۴۲۶ لیضلوا میں لام عاقبت کا ہے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مال اس لیے دیا تھا کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں۔ بلکہ مال دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا۔
اشدد۔ شَدَّ کے معنی مضبوط باندھنا ہیں وشددنا اسرھم (الدھر ۷۶-۲۸) فشدوا الوثاق (محمد ۴۷-۴) (غ)، اور شدّ علیہ کے معنی ہیں حَمَلَ علیہ اس پر حملہ کیا (ت)
حضرت موسیٰ کی دعا فرعون کی تباہی کے لیے: حضرت موسیٰ کی یہ دعا اس وقت کی ہے جب فرعون کے سامنے ہر قسم کے نشان اور دلائل دیئے جا چکے ہیں۔ اور بار بار نشان دیکھ کر اور ایمان لانے کا وعدہ کر کے وہ اس سے انحراف کر چکا ہے اور بنی اسرائیل پر سختی کو اور بڑھا دیا ہے لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لک (الاعراف ۱۳۴) جب چھوٹی چھوٹی تکالیف سے انسان اپنی اصلاح نہیں کرتا تو پھر بڑی تکالیف اس پر آتی ہیں۔ اسی کی طرف آیت کے آخری الفاظ میں اشارہ ہے۔ فرعون کو جس چیز نے حق سے روکا وہ مال ہے اس لیے اس کی تباہی کی دعا کی۔ گویا جس مال نے حق سے روکا تھا وہ بھی باقی نہ رہے اشدد علی قلوبھم کے معنی عموماً مفسرین نے یوں کیے ہیں کہ ان کے دلوں پر مہر کر دے یا ان کے دلوں کو سخت کر دے مگر شدّ کا صلہ علی ہو تو اس کے معنی حملہ کرنے کے لغت میں آئے ہیں۔ اور دلوں پر حملہ کرنے سے مراد دلوں کی محبوب چیزوں کو الگ کر دینا ہے گویا وہ چیزیں جن کی محبت نے انہیں حق سے پھیرا ہے ان سے چھین لی جائیں اور اگر دلوں کو سخت کرنے کے معنی ہی لیے جائیں تو یہ دعا چونکہ ان کی سزا کے لیے ہے اس لیے ایسے اعدائے حق کے لیے ایسی دعا بھی قابل اعتراض نہیں، گو اس میں سختی کا پہلو غالب ہے۔

ع۱۴۲۷ فرعون کی توبہ یا مرتے وقت ایمان لانے کا ذکر بائبل میں نہیں مگر قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کو ایک دوسرے امر کے ساتھ وابستہ کیا ہے یعنی اس کی لاش کے باہر پھینکنے سے، دیکھو اگلی سے اگلی آیت اس کا ذکر بھی کسی تاریخ میں نہیں، مگر آج واقعات نے اس کو صحیح ثابت کر کے اس دوسرے امر کی صداقت پر بھی مہر لگا دی اور یوں بتا دیا کہ قرآن کریم بائبل سے نہیں لیتا اور عجیب بات یہ ہے کہ گو بائبل میں یہ ذکر نہیں مگر طالمود میں خروج ۹: ۱۶ کی تفسیر کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ فرعون نے توبہ کی تھی۔

ع۱۴۲۸ فرعون کی لاش اور قرآن کریم کا معجزہ: ننجیک ببدنک۔ نجات کے ساتھ بدن کے لفظ کو اس لیے بڑھایا تا کہ معلوم ہو کہ یہ لاش بلا روح تھی (ج)

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ
وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا
حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ
بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٩٣﴾
فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ
فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ
لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ
مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٩٤﴾

اور بلاشبہ ہم نے بنی اسرائیل کو صدق کے مقام میں ٹھیرایا اور
ان کو ستھری چیزوں سے رزق دیا تو انھوں نے اختلاف نہیں
کیا یہاں تک کہ ان کے پاس علم آیا تیرا رب قیامت کے دن ان میں
فیصلہ کرے گا جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے تھے [1429]
(اے سننے والے) اگر تجھے اس میں شک ہے جو ہم نے تیری طرف
اتارا تو ان لوگوں سے پوچھ جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں یقیناً
تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آیا ہے پس تو جھگڑا
کرنے والوں میں سے نہ ہو [1430]

قرآن کریم کی صداقت کے عظیم الشان نشانوں میں سے یہ ایک نشان ہے کہ اس بات کا پتہ دیا جس کا اس زمانہ میں کسی کو علم تک بھی نہ تھا، لیکن آج واقعات اسے صحیح ثابت کرتے ہیں بلکہ اس کی صحت کا ایسا پختہ ثبوت ملتا ہے کہ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ نہ بائبل میں نہ اور کسی کتاب میں فرعون کی لاش کو باہر پھینکنے کا ذکر ہے۔ مگر قرآن کریم نے یہ ذکر ایسے کھلے الفاظ میں کیا ہے کہ ان الفاظ کے یہی معنی تمام مفسرین کرتے آئے ہیں کہ فرعون کی لاش کو اللہ تعالیٰ نے سمندر سے باہر نکال پھینکا تھا۔ حضرت موسیٰ کے مقابل میں جو فرعون تھا اس کا نام تاریخ سے رعمیس ثانی ثابت ہے اور انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں مضمون ممی کے نیچے لکھا ہے کہ رعمیس ثانی کی لاش آج تک ان لاشوں میں محفوظ ہے جو مصالح وغیرہ کے ذریعہ سے رکھی جاتی ہیں۔ آج ان الفاظ لتکون لمن خلفک اٰیۃ کی شوکت کے سامنے دنیا کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے کہ یہ کلام صرف خدائے عالم الغیب کا ہو سکتا تھا۔ آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایک عرب کے اُمّی کی زبان سے ایک بات کا اظہار کرایا جاتا ہے جس سے دنیا بے خبر تھی اور آج واقعات اسے صحیح ثابت کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے آیات اللہ سے بے خبر ہونے میں بھی اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ تک بے خبر رہنے کے بعد دنیا کو یہ پتہ ملے گا۔ دنیا کی کوئی مذہبی کتاب اس قسم کا بیّن ثبوت خدائے عالم الغیب کی طرف سے ہونے کا پیش نہیں کر سکتی۔

ع[1429] مبوا صدق۔ مبوا۔ بواء سے مکان کے معنی میں ہے اور صدق کے مقام سے مراد اچھا مقام ہے دیکھو ع[1371] اور خلیل کا قول ہے کہ ہر کامل چیز کو صدق کہا جاتا ہے اور مبوا صدق کے معنی کیے ہیں منزل صالح (ت) یعنی ایسا مقام جو ہر طرح کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بنی اسرائیل پر نعمت اور ان کی مخالفت رسول: آیت کے پہلے حصہ میں یہ ذکر ہے کہ فرعون کے ہاتھ سے نجات دلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مقام صدق عطا فرمایا اور مقام یا جگہ کا کمال یہ ہے کہ اس میں رہنے والوں کو ہر طرح کے فوائد حاصل ہوں اور وہ اچھی سے اچھی جگہ اور اعلےٰ مقام ہو اور یہاں اشارہ ارض مقدس کی طرف ہے جہاں نہ صرف وہ دوسری قوم کی غلامی سے آزاد تھے بلکہ ان کو عمدہ سے عمدہ چیزیں بھی وہاں میسّر تھیں اور طیّبات کے رزق میں بادشاہت بھی شامل ہے اور علوم بھی جو بذریعہ انبیاء ان کو دیئے گئے اور دوسری جگہ اس کی تصریح یوں فرمائی ہے اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا واٰتٰکم مالم یؤت احدا من العٰلمین (المائدۃ ۵-۲۰) کیونکہ رزق کا لفظ وسیع ہے۔ یہ تو ان پر اللہ تعالیٰ کا انعام تھا دوسرے حصہ آیت میں ان کی موجودہ حالت کا ذکر کیا جب باوجود علم کے انہوں نے اختلاف کیا اور اختلاف سے مراد رسول اللہ صلعم کے معاملہ میں اختلاف یا آپ کی مخالفت ہے دیکھو ع[212] ن

ع[1430] شک۔ کسی شخص کے نزدیک دو امور کا جو ایک دوسرے کے نقیض ہیں یکساں اور مساوی ہونا شک ہے اور یہ یا یلئے ہوتا ہے کہ اس شخص کے نزدیک دونوں میں یکساں نشانات پائے جاتے ہیں یا دونوں میں یکساں نشان نہیں پائے جاتے اور شک کبھی تو کسی شے کے متعلق ہوتا ہے کہ وہ موجود ہے یا نہیں اور کبھی اس کی جنس کے متعلق ہوتا ہے کہ یہ کس جنس میں سے ہے اور کبھی اس کی بعض صفات میں ہوتا ہے اور کبھی اس غرض میں ہوتا ہے جس کے لیے وہ چیز وجود میں لائی گئی ہو اور شک ایک قسم کی جہالت ہے مگر جہالت عام ہے اور یہ خاص اور ہر ایک شک جہالت ہے گو ہر جہالت شک نہیں (غ)

آنحضرت صلعم کو قرآن کریم کے متعلق کبھی شک نہ تھا نہ ہو سکتا تھا: یہاں خطاب کس سے ہے؟ یہ ایک ایسا بیّن امر ہے کہ جس پر چنداں بحث کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم میں بسا اوقات خطاب عام ہوتا ہے گو مخاطب واحد ہو اور ہر مخاطب واحد نبی صلعم نہیں۔ بلکہ بعض جگہ نبی کے نام سے بھی خطاب ہو تو مراد کام ہوتی ہے یا یھا النبی اذا طلقتم النساء (الطلاق ۶۵-۱) یہاں ایسے مخاطب کا ذکر ہے جس کو قرآن کے بارے میں شک ہے اور شک کے معنی اوپر بیان ہو چکے کہ دو نقیض باتوں میں مساوات اور اعتدال مثلاً شک اس شخص کو ہوگا جو فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے یا افترا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ نبی صلعم کو ایسا خیال ہونا قطعی طور پر ناممکن ہے یہاں تک کہ بڑے بڑے مخالفین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم اپنے آپ کو سچائی پر یقین کرتے تھے اور کئی زمانہ کے متعلق جبکہ یہ سورت ہے بالخصوص یہ اعتراف اکثر عیسائیوں کو ہے۔ پھر قرآن کے بارہ میں آپ کو شک ہونا بالکل بے معنی بات ہے۔ اگر نعوذ باللہ من

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۹۵﴾

اور تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں ورنہ تو نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۹۶﴾

وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات پوری ہو گئی، ایمان نہیں لائیں گے۔

وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۹۷﴾

اور گو اُن کے پاس سب نشان آجائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھیں[۱۴۳۱]

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۹۸﴾

تو کیوں کوئی بستی ایسی نہ ہوئی کہ ایمان لاتی تو اس کا ایمان اسے نفع دیتا، مگر یونسؑ کی قوم، جب وہ ایمان لائے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے ذلت کا عذاب دور کر دیا اور ایک وقت تک ان کو سامان دیا[۱۴۳۲]

ذلک آپ افترا کر رہے تھے تو بھی آپ کو علم تھا کہ میں افترا کر رہا ہوں۔ اور اگر افترا نہیں کر رہے تھے تو بھی علم تھا کہ میں افترا نہیں کر رہا ہوں۔ قرآن کے متعلق کسی دوسرے کو شک ہو سکتا ہے خود رسول اللہ صلعم کو دونوں صورتوں میں شک نہیں ہو سکتا یعنی خواہ دشمن سچے ہوں یا جھوٹے آپ کو شک کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ شک جہالت کا نام ہے اور آپ کو علم ہے کہ یہ کیا ہے شک کا لفظ انہی لوگوں کے متعلق ہو سکتا ہے جو ایک درمیانی اور تذبذب کی حالت میں ہیں۔ نہیں جانتے کہ اسے سچا کہیں نہ یہ کہ اسے جھوٹا کہیں کبھی ایک بات کہتے ہیں کبھی دوسری پھر جس شخص کے اندر اس قدر قوت یقین بھری ہوئی ہو کہ سینکڑوں دلوں کے اندر ایسا یقین پیدا کر دے کہ وہ موت کے مُنہ میں جانا قبول کر لیں مگر قرآن کو نہ چھوڑیں کیا اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس کو شک ہو اور اس سے اگلی آیت نے یہ بالکل واضح کر دیا کیونکہ وہاں فرمایا کہ تو جھٹلانے والوں میں سے نہ ہو۔ یہاں بھی خطاب واحد ہے اگر شک کرنے والے نعوذ باللہ نبی صلعم ہیں تو جھٹلانے والے بھی وہی ہوں گے جو ایک ایسی بدیہی باطل بات ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل بکار نہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ صفائی سے آیت ۱۰۴ میں فرمایا یایھا النّاس ان کنتم فی شک من دینی اے لوگو اگر تمہیں میرے دین کے متعلق کچھ شک ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہی لوگ جن کو یہاں بصیغہ واحد خطاب کیا ہے وہاں بصیغہ جمع خطاب کر کے بات کو صاف کر دیا ہے کہ شک کرنے والے دوسرے لوگ تھے اور اسی آیت کے آخر پر ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں۔ پس آپ ہی شک کرنے والے کس طرح ہو سکتے ہیں اور ھما انزلنا الیك اس کے خلاف نہیں کیونکہ قرآن شریف میں بار بار قرآن کریم کے سب کی طرف نزول کا ذکر ہے یایھا النّاس قد جاء کم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نورًا مبینا (النساء ۲۴-۱۷۴) اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔

بعض مفسرین نے غلطی سے فسئل الذین یقرؤن الکتاب من قبلك میں عبداللہ بن سلام کا ذکر کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ مدینہ میں ایمان لائے اور یہ سورت مکی ہے اور وہ رسول اللہ صلعم کی صداقت پر ایمان لائے تھے نہ کہ رسول اللہ صلعم ان سے دریافت کر کے اپنی صداقت پر ایمان لائے تھے اور یہ غلطی خود اس سے ظاہر ہے کہ ابن جریر میں کئی روایتیں موجود ہیں کہ نبی کریم صلعم نے نہ کبھی شک کیا اور نہ سوال کیا بلکہ بعض روایتوں میں یہ لفظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا اشك ولا اسئل نہ میں شک کرتا ہوں اور نہ سوال کرتا ہوں۔ جس میں صاف طور پر یہ سمجھا دیا کہ میرے متعلق یہ آیت نہیں بلکہ اس میں خطاب دوسرے لوگوں سے ہے اور یہ امر واقعات تاریخی میں سے ہے کہ نبی کریم صلعم نے کبھی کسی اہل کتاب سے کسی امر کے متعلق اس غرض سے سوال نہیں کیا کہ وہ کسی حقیقت کو آپ پر منکشف کر دے۔

ع[۱۴۳۱] اللہ تعالیٰ کا وہ کونسا کلام تھا جو ایسے لوگوں کے حق میں پورا ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہ وہی سزائے تکذیب ہے جس کا ذکر چل رہا ہے اور پچھلی آیت میں اس تکذیب کا ذکر پھر بھی کر دیا ہے۔

ع[۱۴۳۲] یونس۔ بائبل میں یہ نام یوناہ ہے اور ان کی ایک مختصر سی کتاب بائبل کے مجموعہ کتب انبیاء میں موجود ہے۔ ان کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح ہے۔ قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کا ذکر علاوہ اس مقام کے الانعام ۶-۸۶؛ الانبیاء ۲۱-۸۷؛ الصّٰفّٰت ۳۷-۱۳۹ تا ۱۴۸؛ القلم ۶۸-۴۸ تا ۵۰ میں ہے ان کا پیغام اہل نینوہ کی طرف تھا اور نینوہ اس زمانہ میں ایک ایسی عظیم الشان سلطنت کا دارالخلافہ تھا جو دنیا کے بڑے حصہ پر محیط تھی۔

اہل نینوئی اور عذاب: جہاں انبیاء کے مکذبین کی ہلاکت اور تباہی کا ذکر کیا ایک ایسے نبی کا بھی ذکر کر دیا جس کے مخالفین باوجود نہ ماننے کے آخر توبہ کر کے عذاب الٰہی سے بچ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی طرف حضرت یونسؑ کو بھیجا گیا۔ ابن کثیر میں ہے کہ حضرت یونسؑ نے اہل نینوی کو عذاب سے ڈرایا مگر انہوں نے نہ مانا تب یونسؑ ان کے درمیان

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے، تو کیا تُو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں ۱۴۳۳

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اور کسی شخص کے لیے نہیں کہ سوائے اللہ کے اذن کے ایمان ۱۴۳۴ لائے اور وہ پلیدی کو انہی پر ڈالتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِى الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

کہہ دیکھو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور نشان اور ڈرانے والے ان لوگوں کے کچھ کام نہیں آتے جو ایمان نہیں لاتے۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ تو صرف ایسے ہی دنوں کا انتظار کرتے ہیں جیسے اُن پر آئے جو اُن سے پہلے گزر چکے کہہ انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ۱۴۳۵

ثُمَّ نُنَجِّىْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۰

پھر ہم اپنے رسولوں کو اور انھیں جو ایمان لائے بچاتے ہیں، اسی طرح ہمارا ذمہ ہے ہم مومنوں کو بچائیں گے ۱۴۳۶

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ شَكٍّ

کہہ اے لوگو! اگر تمھیں میرے دین میں شک ہے تو میں اُن کی

سے چلے گئے تا کہ عذاب کے مقام سے الگ ہو جائیں، تب ان لوگوں نے..... اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ نے وہ عذاب دور کر دیا۔ پھر دو گروہ ہیں ایک کہتے ہیں کہ ان سے صرف عذاب دنیا دُور کیا گیا اور عذاب اُخروی نہیں (گویا وہ فی الواقع ایمان نہ لائے تھے صرف عذاب کے خوف سے کچھ رجوع کیا) اور دوسرے کہتے ہیں کہ عذاب اُخروی بھی ان سے دور کیا گیا اور وہ ایمان لے آئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انذاری پیشگوئیاں ٹل بھی جاتی ہیں۔ حالانکہ ایک نبی کی زبان سے وہ ظاہر بھی کر دی گئی ہوں اور گو رجوع کامل ہو جس میں ایمان صحیح ہو یا ناقص ہو کہ صرف عذاب کے خوف سے رجوع کیا جائے۔

حضرت یونسؑ کے اس ذکر میں جو خصوصیت سے مکذبین کے انجام میں لایا گیا ہے یہ اشارہ ہے کہ آپ کے مخالفین بھی آخر رجوع کریں گے اور وہ تباہ نہ کیے جائیں گے اسی مخالفین پر رحم کیا جانے کی طرف ہی اشارہ اس حدیث میں معلوم ہوتا ہے جو نبی کریمؐ نے فرمایا لا تفضلونی علی یونس مجھے یونس پر فضیلت مت دو۔

ع ۱۴۳۳ یہ تو مکی زمانہ ہے اس لیے یہ شک پیدا نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ صلعم تلوار سے لوگوں کو مسلمان کرنا چاہتے تھے مطلب صرف یہ ہے کہ ایمان کا معاملہ تو خوشی کا ہے اس لیے جو ایمان لاتے ہیں لائیں۔

ع ۱۴۳۴ اذن سے کیا مراد ہے دیکھو ع ۱۲۳ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے اذن سے ہی ہوتا ہے وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ (آل عمران ۱۴۵) مگر فرمایا کہ کفر کی پلیدی اور ناپاکی انہی لوگوں پر اللہ تعالیٰ باقی رکھتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ سو جب ایک انسان عقل سے کام نہ لے گا، تو اللہ کا اذن بھی اس کے متعلق نہ ہو گا۔

ع ۱۴۳۵ ایام کے لیے دیکھو ع ۵۲۴ مراد واقعات ہیں جو پہلوں پر گزرے یعنی جیسے مصائب ان پر آئے یہاں فرمایا کہ یہ ایام بھی آئیں گے انتظار کرو۔ اگلی آیت میں رسول اور مومنوں کے نجات پا جانے کو پھر بطور پیشگوئی واضح الفاظ میں بیان فرمایا۔

ع ۱۴۳۶ اعدائے دین کے ظلم سے نجات: جب پچھلی آیت میں عذاب کے انتظار کے لیے کہا تو اب بتایا کہ جب عذاب آتا ہے تو رسول اور اس کے ساتھ مومن نجات پا جاتے ہیں یعنی دشمنوں کے ظلم سے رہائی حاصل کر لیتے ہیں تو اس میں رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھیوں کو تسلّی دی اور دوبارہ فرمایا اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دینگے یعنی اعدائے دین کے ظلم سے چھڑانا صرف رسول سے مخصوص نہیں بلکہ جب کبھی مومنوں پر مصائب آئیں گی تو اسی طرح ہم ان کو بھی نجات دیتے رہیں گے بلکہ درمیان میں حقا علینا لا کر اسے اور بھی موکد کیا ہے۔ اس قدر تاکید کے باوجود آج کس طرح مسلمان ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں مصائب میں گرفتار ہیں۔ مگر کیوں؟ اس لیے کہ مومن نہیں بنتے۔ اگر مسلمان سچے دل سے مومن بن جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مصائب کو خود دور فرما دے۔

مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ
يَتَوَفّٰىكُمْ ښ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٤﴾
وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾

عبادت نہیں کرتا جن کو تم اللہ کے سوائے پوجتے ہو۔ لیکن
مَیں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں وفات دیتا ہے،
اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں مومنوں میں سے ہوں ۱۴۳۷
اور یہ کہ یکسو ہو کر اپنے تئیں دین پر قائم رکھ، اور
مشرکوں میں سے مت ہو ۱۴۳۸

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ
وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا
مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾

اور اللہ کے سوا اُسے نہ پکار، جو نہ تجھے نفع دیتا ہے
اور نہ تجھے نقصان دیتا ہے اور اگر (ایسا) کیا تو تُو بھی اس
وقت ظالموں میں سے ہوگا۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ
لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا
رَاۗدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٧﴾

اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اس کے دور
کرنے والا کوئی نہیں اور اگر وہ کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے
فضل کو رد کرنے والا کوئی نہیں وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے
اسے پہنچاتا ہے اور وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمُ الْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا
يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ
عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٨﴾ ۭ

کہہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق
آچکا سو جو کوئی راہ پر چلتا ہے وہ اپنے بھلے کو ہی راہ پر چلتا ہے
اور جو کوئی گمراہ ہوتا ہے اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے،
اور مَیں تم پر مختار نہیں۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى
ع يَحْكُمَ اللّٰهُ ښ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ ع

اور اس کی پیروی کر جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کر یہاں تک
کہ اللہ فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ۱۴۳۹

ع ۱۴۳۷ اللہ تعالیٰ کی توحید کے مضمون کو قرآن شریف نے بار بار دہرایا ہے اس صراحت کے ہوتے ہوئے کسی کو آپ کے دین میں کیا شک ہو سکتا تھا۔ یہاں پھر وضاحت کر دی جن کی تم عبادت کرتے ہو اس کی میں عبادت نہیں کرتا بلکہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں وفات دیتا ہے اس خاص صفت کے اختیار کرنے میں ایک تو یہ اشارہ ہے کہ جن انسانوں کو تم نے خدا یا خدا کی طرح سمجھا ہوا ہے وہ بھی آخر مرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ تمہارا کوئی معبود تمہیں موت سے نہیں بچا سکتا۔

ع ۱۴۳۸ اس آیت میں خطاب پھر بدل گیا ہے اوپر کی آیت میں تھا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں اور یہاں ہے کہ تو اپنی توجہ کو دین کے لیے مضبوط رکھ اور مشرکوں میں سے نہ ہو جس سے صاف ظاہر ہے کہ دوسرا مخاطب مراد ہے اگلی آیت اور بھی اس کی وضاحت کرتی ہے۔ ۱۰۷ آیت تک یہی عام خطاب ہے اسی لیے آیت ۱۰۸ میں پھر دوبارہ فرمایا قل۔

ع ۱۴۳۹ اس رکوع میں مومنوں اور کافروں کو الگ کر کے آخر پر فرمایا کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی وحی کی پیروی کیے جاؤ۔ مشکلات سے اللہ تعالیٰ خود باہر نکالے گا اور دونوں گروہوں میں فیصلہ کر کے دکھا دے گا کہ حق پر کون ہے۔ ایسی صریح آیات کا جن میں حق کی آخری کامیابی کو روز روشن کی طرح ظاہر کیا گیا ہے یہ اثر تھا کہ جب کفار کی مخالفت فتح مکہ کے ساتھ ٹوٹ گئی تو گروہوں کے گروہ اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے۔

اٰیَاتُهَا ۱۲۳ (۱۱) سُوْرَةُ هُوْدٍ مَكِّيَّةٌ رُكُوْعَاتُهَا ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ
مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ①
اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ط اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ
نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ②

میں اللہ دیکھتا ہوں، یہ کتاب جس کی آیتیں پُرحکمت بنائی گئی ہیں پھر کھول کر بیان کی گئی ہیں حکمت والے خبردار (خدا) کی طرف سے ہے ۱۴۴۰ کہ اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو میں اس کی طرف سے تمہارے لیے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ
يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى
وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ط وَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ③
اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ج وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ④

اور کہ اپنے رب سے بخشش مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو، وہ تمہیں ایک وقت مقرر تک اچھے سامان سے فائدہ پہنچائے گا اور ہر ایک بزرگی والے پر اپنا فضل کرے گا — اور اگر تم پھر جاؤ تو میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۱۴۴۱ اللہ کی طرف ہی تم سب کو لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس سورۃ کا نام ھود ہے اور اس میں دس رکوع اور ایک سو تئیس آیتیں ہیں گو اس میں حضرت نوحؑ اور دیگر انبیاء کا بھی ذکر ہے مگر اس کا نام ہود اس خصوصیت کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے کہ حضرت ہود پہلے نبی ہیں جو عرب میں ہوئے۔

خلاصہ مضمون یہ سورت پچھلی سورت سے ملتی جلتی ہے اور یہ دونوں ایک ہی مضمون کی تکمیل کرتی ہیں مگر یہاں زیادہ تر مثالوں سے مطلب کو واضح کیا ہے۔ پہلے رکوع میں حق اور اس کے مخالفین کا ذکر ہے۔ دوسرے میں بتایا کہ بعض لوگ صرف دنیا کی طلب میں لگ جاتے ہیں اور اس کے مقابل پر طالبان حق کا ذکر کیا۔ تیسرے اور چوتھے رکوع میں حضرت نوحؑ کا ذکر ہے، پانچویں میں حضرت ہودؑ کا، چھٹے میں حضرت صالحؑ کا، ساتویں میں حضرت ابراہیمؑ اور لوطؑ کا، آٹھویں میں حضرت شعیبؑ کا، نویں میں شقی اور سعید دونوں گروہوں کا الگ الگ ذکر کیا اور ان کا انجام بتایا اور دسویں میں نبی کریمؐ اور آپ کے ساتھیوں کو عظیم الشان مصائب میں تسلی دی۔

تعلق: یہ سات سورتیں یعنی یونس سے لے کر النحل تک قریباً ایک ہی مضمون پر ہیں یعنی صداقت وحی پر۔ پچھلی سورت میں زیادہ تر علمی بحث تھی اس میں گزشتہ انبیاء اور ان کے مخالفین کی مثالیں دے کر سمجھایا ہے۔

زمانہ نزول اس سورت کا وہی ہے جو سورت یونس کا ہے۔ اس بات سے کہ یہاں دس سورتوں کے مقابل میں لانے کی تحدی ہے اور سورۂ یونس میں ایک سورت کی۔ جو اس میں ترقی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ ہود بلحاظ نزول سورۂ یونس سے پہلے کی ہے۔

ع ۱۴۴۰ احکمت۔ اَحْكَمَ۔ اور حَكَمَ کے ایک معنی آتے ہیں مَنَعَهٗ عن الفَسَادِ یعنی اسے بگڑنے سے محفوظ کیا۔ اور اس لیے یہاں ایک معنی کیے گئے ہیں باطل سے اسے محفوظ کیا اور اَحْكَمَ الامر کے معنی ہیں اَتْقَنَهٗ یعنی اسے مضبوط کیا اور اَحْكَمَتْهُ التجارِب کے معنی ہیں تجربوں نے اسے حکیم یعنی صاحب حکمت بنا دیا (ل)، اسی آخری معنی میں لفظ اُحْكِمَ کا استعمال یہاں معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ احکمت اٰیاتہٗ کے مقابلہ پر اللہ تعالیٰ کا اسم حکیم اور فصلت کے مقابلہ پر خبیر لایا گیا ہے۔

قرآن میں اصول و فروع کا ضروری علم: پچھلی سورت میں صرف الکتاب الحکیم فرمایا تھا، یہاں تفصیل آیات شاید اس اشارہ کے لیے بڑھایا ہو کہ اس سورۃ میں اسی مضمون کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور احکام سے اصل مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف سارا پُرحکمت کلام ہے اور اس کی بنیاد علم پر ہے اور دوسری طرف اس میں تمام تفصیلات ضروری موجود ہیں۔ ضروریات انسانی کا کوئی پہلو نہیں جس پر اس میں بحث نہ ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا تبیانا لکل شیء (النحل ۱۶-۸۹) گویا اس کے اصول بھی کامل ہیں اور فروع بھی۔

ع ۱۴۴۱ پہلے حصہ میں بیان فرمایا کہ اگر تم گناہوں سے استغفار کرو اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی طرف رجوع کرو، تو اس سے تمہاری دنیا بگڑ نہیں جاتی، بلکہ اس زندگی میں بھی اچھا سامان ملتا ہے اور دوسرے حصہ میں ذی فضل سے مراد عمل صالح میں زیادتی والا ہے اور فضلہ میں ضمیر یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل عظیم سے اسے دیتا ہے اور یا ضمیر اسی ذی فضل کی طرف ہے اور مراد اس کے فضل یعنی عمل صالح کی جزا ہے۔

اَلَآ اِنَّھُمۡ یَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَھُمۡ لِیَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡہُ ؕ اَلَا حِیۡنَ یَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِیَابَھُمۡ ۙ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَ مَا یُعۡلِنُوۡنَ ۚ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۵

سنو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں تاکہ اس سے چھپے رہیں سنو جب یہ اپنے کپڑے لپیٹ لیتے ہیں، وہ جانتا ہے جو یہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے ع۱۴۴۲

وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُھَا وَ یَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّھَا وَ مُسۡتَوۡدَعَھَا ؕ کُلٌّ فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ۝۶

اور زمین میں کوئی جاندار نہیں، مگر اللہ کے ذمہ ہی اس کا رزق ہے اور وہ اُس کے ٹھیرنے کی جگہ اور اُس کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے، سب کچھ ایک کھلی کتاب میں ہے ع۱۴۴۳

وَ ھُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّ کَانَ عَرۡشُہٗ عَلَی الۡمَآءِ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ لَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّکُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَیَقُوۡلَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۝۷

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقتوں میں پیدا کیا، اور اس کا عرش پانی پر ہے تاکہ تمھیں آزمائے کون تم میں سے اچھے عمل کرنے والا ہے، اور اگر تو کہے کہ تم موت کے بعد اُٹھائے جاؤگے تو جو کافر ہیں، کہیں گے یہ تو صریح جادو ہے ع۱۴۴۴

ع۱۴۴۲ یثنون ۔ ثنی الشیٔ کے معنی ہیں اس کے ایک حصّہ کو دوسرے پر لوٹایا یا تہہ کیا۔ اور مروڑا بھی اس کے معنی آتے ہیں۔ اور یثنون صدورھم کے معنی ہیں کہ محبت ظاہر کرتے ہیں اور سینوں میں بغض چھپاتے ہیں۔ (ل) اور مجاہد نے مراد شک اور امترا لیا ہے (ج) اور یا اس سے مراد حق سے اعراض ہے کیونکہ جو شخص ایک چیز کو لیتا ہے اس کا سینہ اس کے سامنے ہوتا ہے اور جو اعراض کرتا ہے وہ اس سے پیٹھ پھیر لیتا ہے (ر)

لیستخفوا منه میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اپنی اس عداوت کو جو حق سے رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ سے چھپانا چاہتے ہیں۔

یستغشون ثیابھم کے معنی ہیں کپڑوں کو لپیٹتے ہیں اور مراد اس سے یا تو یہ ہے کہ اپنے کانوں پر لپیٹ لیتے ہیں۔ گویا سننے سے اعراض کرتے ہیں اور یا یہ دوڑ جانے سے کنایہ ہے جس طرح شَمَّرَ ذَیلًا اور القیٰ ثَوبَہٗ دوڑنے سے کنایہ ہے (غ) وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذانھم واستغشوا ثیابھم (نوح ۷۔) میں یہی دو معنی مراد ہو سکتے ہیں اور یہ جو اس سے مراد لی گئی ہے کہ سونے کے وقت کپڑے اوڑھ لیتے ہیں (ر) تو یہ معنی اس موقعہ پر چسپاں نہیں اور یا مراد صرف چھپنا ہے۔

ع۱۴۴۳ دابۃ کے معنی کے لیے دیکھو ع۲۰۲ اور مستقر اور مستودع کے لیے ع۹۸۹

تمام جانداروں کا رزق اللہ کے ذمہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کے سب سامان پیدا کر رکھے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ انسان کو معاش یا رزق کی فکر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ آیت ۳ کے مضمون کی طرح اس کا مضمون ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے سے انسان سے دنیا کے سامان چھن نہیں جاتے بلکہ رزق تو ہر حال میں پہنچ سکتا ہے نیکی کے اختیار کرنے سے رزق نہیں رک جاتا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کفار طرح طرح کی اذیتیں مسلمانوں کو پہنچاتے تھے اور اس سے قبل شعب ابی طالب میں محصور کر کے سامان خوراک وغیرہ بھی ان تک پہنچنا بند کر دیا تھا۔ پس جب پچھلی آیت میں کفار کی عداوت کا ذکر کیا تو یہاں مسلمانوں کو تسلی دی کہ وہ رزق کے سامانوں کو تم سے نہیں چھین سکتے۔ اس کے یہ معنی لینا کہ گھر بیٹھے رہو وہیں رزق پہنچ جائے گا درست نہیں۔ ہر ایک جانور اپنے رزق کی تلاش میں نکلتا ہے۔ چڑیا اور چیونٹی بھی رزق کی تلاش میں نکلتی ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے سامان ان کے لیے بھی پیدا کر رکھے ہیں انسان کے لیے بھی اور یہاں پر دابۃ یعنی جاندار کا ذکر ہے اور جاندار اور بےجان میں جیسے نباتات وغیرہ امتیاز یہ ہے کہ جانداروں کو اپنا رزق اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے تلاش کرنا پڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قابل بنایا ہے کہ وہ چلیں اور پھریں اور نباتات وغیرہ اپنا رزق اسی حالت میں پالیتی ہیں جس حالت میں وہ ہوتی ہیں اور یہ جو فرمایا کہ اس کا مستقر اور مستودع جانتا ہے تو اس میں دونوں زندگیوں کی طرف اشارہ ہے جس کی تصریح اگلی آیت میں فرمائی۔

ع۱۴۴۴ چھ یوم میں آسمان اور زمین کی پیدائش کے لیے دیکھو ع۱۰۹۴ ابن جریر نے ضحاک اور کعب سے روایت کی ہے کہ یہ یوم ہزار سال کا تھا۔ مگر اصل حقیقت وہی ہے جو وہاں بیان ہوئی ہے کہ مراد چھ ایام سے چھ حالتیں ہیں اور یہ علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے کہ ہر حالت میں کتنا وقت لگا۔

کان عرشه علی الماء۔ عرش کے لیے دیکھو ع۱۰۹۵ مفسرین نے یہ مراد لی ہے کہ خلق سے پہلے اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ اور مسلم میں ہے کان

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۸

اور اگر ہم اُن سے عذاب کو ایک مقرر وقت تک پیچھے ڈال دیں تو کہیں گے اسے کس چیز نے روک رکھا ہے، سنو جس دن ان پر آئیگا پھر ان سے ٹلنے گا نہیں اور وہ چیز اُن کو گھیر لے گی، جس پر یہ ہنسی کرتے تھے ۱۴۴۵

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۹

اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت چکھائیں پھر اُسے اس سے لے لیں تو وہ ناامید ناشکر گزار ہو جاتا ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۱۰

اور اگر دُکھ کے بعد جو اُسے پہنچا ہو ہم اسے سکھ چکھائیں تو کہتا ہے سب تکلیفیں مجھ سے جاتی رہیں یقیناً وہ اترانے والا شیخی کرنے والا ہے ۱۴۴۶

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۱۱

مگر جو صبر کرتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں یہی ہیں جن کے لیے حفاظت اور بڑا اجر ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ

تو کیا تو اس کا کچھ حصّہ جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے،

اللہ تعالیٰ ولم یکن معہ شئ وکان عرشہ علی الماء جس کی تشریح میں ابن الکمال لکھتے ہیں کہ اس نے عرش سے مراد اس کی قیومیت ہے اور ماء میں اشارہ صفت حیات کی طرف ہے (د) جہاں تک عرش کا سوال ہے ح۱۰۹۵ میں دلائل قطعیہ سے دکھایا جا چکا ہے کہ جس طرح کرسی سے مراد علم ہے، عرش سے مراد قدرت ہے۔ پس عرش کے یا نفاذ قدرت کے پانی پر ہونے سے کیا مراد ہے؟ دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے جعلنا من الماء کل شئ حی (الانبیاء ۲۱-۳۰) ہر ایک زندہ چیز کو پانی سے بنایا اور یہاں اس سے پہلی آیت میں دابۃ یعنی جانداروں کا ذکر ہے پس قرینہ چاہتا ہے کہ جب آسمانوں اور زمین کی پیدائش کا ذکر کیا تو جانداروں کی پیدائش کا بھی ذکر کیا اور اس سے انسان کی زندگی کی طرف اشارہ کر کے آگے فرمایا لیبلوکم ایکم احسن عملا جس کی تقدیر بعض مفسرین نے بھی یوں نکالی ہے دخلقکم لیبلوکم یعنی تمہارے پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ اس بات کو انجام کار ظاہر کرے کہ اچھے عمل کون کرتا ہے۔ پس عرشہ علے الماء میں انسان کی زندگی کی ابتدا کی طرف اشارہ ہے اور یہ حقیقت آج تمام سائنس دانوں کے نزدیک مسلم ہے کہ زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی۔ اور اصل غرض یہ بتانا ہے کہ جو پہلی زندگی کو اس قدر باریک راہوں سے وجود میں لایا اس کے اس ارشاد پر کہ موت کے بعد بعث ہوگا اور ایک دوسری زندگی ہوگی کیوں اس قدر تعجب کرتے ہو کہ اسے سحر مبین کہتے ہو۔ اور یہاں سحر مبین کسی معجزہ کو نہیں کہا۔ بلکہ اس بیان کو کہ موت کے بعد بعث ہوگا سحر مبین کہا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ یہ محض دھوکہ ہے ایسا کہاں ہو سکتا ہے۔

ح۱۴۴۵ اُمّۃ کے لیے دیکھو ح۱۶۳ مگر علاوہ اس معنی کے اور بھی بہت سے معنوں میں یہ لفظ آتا ہے اس کے ایک معنی وقت بھی ہیں (ل) گویا وہ ایک امّت یا جماعت کے رہنے کا زمانہ ہے (ج) یہی معنی یہاں ہیں اور بعض نے امۃ معدودۃ سے مراد لوگوں کی جماعت ہی لی ہے یعنی اس جماعت سے پیچھے ہٹا کر دوسری جماعت تک اسے ملتوی کر دیں مگر معاندین کو چھوڑ کر دوسروں پر لانا یہ سنت اللہ نہیں۔

عذاب سے یہاں صریحاً عذاب دنیا ہی مراد ہے۔ بعض نے اسے جنگ بدر کا عذاب کہا ہے مگر آخر تک جو کچھ کفار کی حالت ہوئی وہ سب ہی مراد ہے۔

ح۱۴۴۶ فرح۔ فَرَح وہ خوشی ہے جو لذت عاجلہ کی وجہ سے ہو یعنی جلد آنے جانے والی سے اس لیے اس کا اکثر استعمال لذات بدنی میں ہے ولا تفرحوا بما اٰتاکم (الحدید ۵۷-۲۳) وفرحوا بالحیٰوۃ الدنیا (الرعد ۱۳-۲۶) فرحوا بما عندھم من العلم (المومن ۴۰-۸۳) اور فَرِح کے معنی اس طرح خوش ہونے والا۔ اور صرف دو جگہ پر فَرَح کی رخصت دی گئی ہے فبذٰلک فلیفرحوا (یونس ۱۰-۵۸) ویومئذ یفرح المؤمنون (الروم ۳۰-۴) (غ) اور فرح بمعنی بَطَر یعنی حد سے زیادہ خوش ہوا اور تکبر کیا یا اَشِر یعنی ڈینگ ماری بھی آتا ہے (ل) فخور کے لیے دیکھو ح۶۵۶۔

جسمانی دُکھ اور سُکھ: دنیا طلب انسان کی تھڑدلی کا ذکر کیا ہے پہلی آیت میں یہ کہ ذرا سکھ کے بعد دکھ آتا ہے تو پھر چاروں طرف سے ناامید ہو بیٹھتا ہے اور پہلی نعمت کی بھی ناشکری کرتا ہے اور اس میں یہ کہ دکھ کے بعد سکھ ملتا ہے تو خوشی میں پھولا نہیں سماتا اور اس پر اتراتا ہے اور دوسروں پر فخر کرتا ہے اور یہ سمجھا یا ہے کہ دنیا کے دکھوں اور تکلیفوں کے آنے پر نہ تو خدا کے فضل اور رحمت سے ناامید ہونا چاہیئے اور نہ ان کے چلے جانے پر اترانا چاہیئے گویا دنیا کے مال اور آرام کو عارضی چیزیں سمجھے۔ یہ زندگی کی غرض نہیں اگلی آیت میں بتایا کہ اخلاق انسانی میں اصل چیز صبر ہے اور زندگی کی غرض اعمال صالحہ سے پوری ہوتی ہے اور دنیا طلب کے مقابلہ پر اعمال صالحہ کرنے والوں کا ذکر کیا۔

وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿١٢﴾

چھوڑ دے اور تیرا سینہ اس پر تنگ ہوگا کہ وہ کہتے ہیں اس پر خزانہ کیوں نہیں اُترا یا اس کے ساتھ فرشتہ (کیوں نہیں) آیا تو تو ڈرانے والا ہے اور اللہ ہر چیز کا کارساز ہے ۱۴۴۷

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٣﴾

یا یہ کہتے ہیں کہ اس نے جھوٹ بنایا ہے؛ کہہ پھر اس جیسی دس سورتیں بنائی ہوئی لے آؤ اور اللہ (تعالیٰ) کے سوائے جسے بُلا سکتے ہو، بلا لو، اگر تم سچے ہو ۱۴۴۸

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١۴﴾

پھر اگر وہ تمھاری بات قبول نہ کریں، تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سو کیا تم فرماں بردار ہوتے ہو؟ ۱۴۴۹

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿١٥﴾

جو دنیا کی زندگی اور اس کی زینت ہی چاہتا ہے ہم انھیں ان کے عمل اسی (زندگی) میں پورے دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے کچھ نہیں اور جو کچھ انھوں نے اس (زندگی) میں کیا تھا کسی کام نہ آئیگا اور جو کچھ وہ کرتے تھے باطل ہے ۱۴۵۰

۱۴۴۷ لعلك تارك۔ لعل یہاں ترقی کے لیے نہیں بلکہ تبعید کے لیے ہے یعنی یہ امر بعید ہے کہ تو ایسا کرے بالفاظ دیگر تو ایسا نہیں کر سکتا اور یا استفہام انکاری ہے اور بعض نے ترجی مراد لیکر یعنی شاید معنی لیکر یہ کہا ہے کہ یہ ترجی دوسرے لوگوں کی طرف سے ہے جو مخاطب ہیں یعنی کافر چاہتے ہیں یا ایسی آرزو رکھتے ہیں کہ آنحضرت صلعم تبلیغ کا کچھ حصّہ چھوڑ دیں (ر)

ضائق به صدرك دیکھو ۱۳۵۸ مراد یہاں مغموم ہونا ہے کیونکہ غم سے بھی سینہ میں تنگی پیدا ہوتی ہے۔

کنز۔ مال کو جوڑتے چلے جانا اور اس کی حفاظت کرنا کنز ہے والذین یکنزون الذهب والفضة (التوبة ۹-۳۴) اور اسم کے معنی مال عظیم یا خزانہ ہیں (غ) دنیاداروں کے خیالات دنیوی زندگی تک ہی محدود ہوتے ہیں اس لیے کہتے ہیں نبی یا مصلح اخلاق آئے تو وہ بھی خزانہ ساتھ لائے۔ حالانکہ اس کے آنے کی غرض یہ ہے کہ مال دنیا کو اپنا محبوب نہ بنائیں پس مال دنیا کی محبت کو وہ کم کرنے آتا ہے مسلمان بھی آج ایسا ہی مصلح چاہتے ہیں جو ان کو بہت سا دنیا کا مال دیدے۔ دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ فرشتہ ساتھ ہو گویا روحانیات کو بھی مادی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ فرشتے تو نبی کریم صلعم پر نازل ہوتے تھے، مگر ان کے دیکھنے کے لیے دوسری آنکھیں چاہئیں۔ ایسے ایسے اعتراض سنکر نبی کریم صلعم کے دل پر کیا کیا غم نہ گزرتا ہوگا تو فرمایا کہ ان باتوں پر غم مت کرو کوئی ان باتوں کی وجہ سے تم نے وحی کو تو ترک کرنا ہی نہیں (ر)

۱۴۴۸ قرآن افترائے انسان نہیں: یہاں دس سورتوں کے مقابلہ میں لانے کی تحدی ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت سورۂ یونس سے پہلے کی نازل شدہ ہے۔ کیونکہ سورۂ یونس میں ایک سورت کے لانے کا مطالبہ ہے اس سے بھی پہلے کل قرآن کی مثل لانے کا مطالبہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

۱۴۴۹ یعنی اگر وہ لوگ جنہیں تم مدد کے لیے بلاؤ وہ تمہاری بات کو قبول نہ کریں یا اس کا جواب نہ دیں یعنی دس سورتیں قرآن شریف کی مثل نہ لا سکیں تو سمجھ لو کہ یہ بشر کی طاقت سے بالاتر بات ہے انزل بعلم الله میں صاف بتا دیا کہ اس کے اندر مضامین ایسے کامل اور ایسی علم کی باتیں ہیں جو بشر کے علم میں نہیں آسکتیں تو اصل مطالبہ محض فصاحت لفظی کا نہیں، بلکہ یہ کہ ایسی سورتیں لاؤ جن میں ایسا علم ہو۔

۱۴۵۰ اللہ تعالیٰ کا قانون ایسا ہے کہ جو شخص جس راہ پر اپنے آپ کو ڈالتا ہے۔ اسی میں کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ اس لیے جو لوگ دنیا کی زندگی کو غرض بنا لیتے ہیں

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۷﴾

تو کیا وہ شخص جو اپنے رب سے کھلی دلیل رکھتا ہے اور اس کی طرف سے ایک گواہ اس پر عمل کرتا ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی - یہی اس پر ایمان لاتے ہیں - اور جو کوئی فرقوں میں سے اس کا انکار کرتا ہے تو اس کا ٹھکانا آگ ہے ، سو تو اس میں کسی شک میں نہ رہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے ، لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے ع۱۴۵۱

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۱۸﴾

اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے - وہ اپنے رب کے سامنے لائے جائیں گے اور گواہ کہیں گے یہی ہیں جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا - سنو ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے ع۱۴۵۲

انھیں دنیا کی زندگی میں بہتیرا کچھ مل جاتا ہے مگر آخرت میں اور انجام کار یہ باتیں کچھ فائدہ نہیں دیتیں ۔ حرص دنیا کو بڑھانے کا انجام آگ ہے ۔ یہاں کے عمل وہاں حبط ہیں یعنی بے نتیجہ اس سے حبط اعمال کے مفہوم کا بھی پتہ لگتا ہے ۔ اس حیوانی زندگی میں آسایش کے لیے جو کچھ کیا تھا وہ وہاں کچھ کام نہیں دے گا یہ ان اعمال کا حبط ہے ۔

ع۱۴۵۱ یتلوہ ۔ تلی کے معنی پیروی کی یا عمل کیا دیکھو ع۶۷ و ع۱۵۳ یہاں یہی معنی مراد ہیں یَقْتدِی بہ و یعمَلُ (غ) اس کی پیروی کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے اور یتلوہ میں ضمیر بلحاظ معنی بینة کی طرف جاتی ہے کیونکہ بینة سے مراد قرآن شریف ہے ۔

احزاب ۔ حِزْب کی جمع ہے اور وہ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں شدت ہو (غ) حزب الشیطان (المجادلة ۵۸-۱۹) حزب اللہ (المجادلة ۵۸-۲۲) ای الحزبین احصیٰ لما لبثوا امدا (الکھف ۱۸-۱۲) لما را المؤمنون الاحزاب (الاحزاب ۳۳-۲۲) ۔

بینة قرآن ہے : دنیا اور اس کی زینت کے طالب کے مقابل پر یہاں ایک دوسرے فریق کا ذکر کیا ہے جن کا مقصد زندگی بہت بلند ہے ۔ افمن کان علی بینة من ربه عام ہے جس سے مراد مومن ہے اور بینة من ربه قرآن کریم ہے جس کو دوسری جگہ بینات من الھدیٰ فرمایا ہے (البقرة ۲-۱۸۵) اور ایک جگہ بینة کہا ہے حتّیٰ تاتیھم البینة (البینة ۹۸-۱) جس سے مراد رسول اللہ صلعم بھی ہو سکتے ہیں اور قرآن کریم بھی اور ہر نبی کے حق میں اس کی وحی بینة ہے جیسا کہ آگے حضرت نوح صالح وغیرہ کے ذکر میں آتا ہے اور شاھد منه یا اللہ کی طرف سے گواہ رسول اللہ صلعم ہیں جو اس قرآن کو پڑھتے ہیں اور اس پر عمل کر کے دکھاتے ہیں اور شاھد اور شہید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نبی ہی ہوتے ہیں اور یتلوہ کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں اس قرآن کو پڑھتا ہے یا اس قرآن پر عمل کرتا ہے ۔ اور دوسرے معنی قابل ترجیح ہیں کیونکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ مومن کے ہاتھ میں صرف ایک بینة یعنی کتاب یا روشنی ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک کامل نمونہ بھی موجود ہے جو اس بینة پر عمل کر کے اس کے رستہ کو بالکل صاف کر دیتا اور اس میں بھی اس کتاب پر عمل کرنے کی طاقت پیدا کر دیتا ہے ۔ تو کہاں وہ دنیا طلب انسان جس کی ہمت کی غایت دنیا کا مال اور اس کی زینت ہے اور کہاں یہ حق پرست انسان اسی مقابلہ کو ظاہر کرنے کے لیے رکوع کی آخری آیت میں فرمایا مثل الفریقین کالاعمیٰ والاصم والبصیر والسمیع ۔

اور یہ جو فرمایا ومن قبله کتاب موسیٰ اماماً ورحمة یعنی اس سے پہلے حضرت موسیٰ کی کتاب کی پیروی کی جاتی تھی اور وہ رحمت تھی تو اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اسی طرح پر کتابوں کو نازل کرنا اور انبیاء کو ان کتابوں کی تعلیم عملی کا نمونہ بنانا یہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سے سنت رہی ہے تا کہ لوگ دنیا کو اپنی زندگی کی غرض و غایت نہ بنائیں یہی وجہ ہے کہ آگے جن انبیاء کا ذکر آتا ہے وہ سب اپنی امتوں سے یہی خطاب کرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ایک بینة پر ہیں اور رحمت کے پرتو ہیں ۔ کیونکہ ہر نبی کی وحی اس کے حق میں بینة ہی ہے ۔ مگر اس میں ایک دوسری غرض یہ بھی ہے کہ یہ بینة (یعنی قرآن) ایسی صاف ہے کہ اس کی شہادت حضرت موسیٰ کی کتاب اور پہلی کتابوں میں بھی ہے ۔

ع۱۴۵۲ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر جھوٹ افترا کرنے والے اعدائے حق ہوتے ہیں اشہاد سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا فکیف اذا جئنا من کل اُمة بشھید (النساء ۴-۴۱) اور ان کا افترا دو طرح پر ہے ایک افترا کر کے لوگوں کو راہِ حق سے روکتے ہیں دوسرے دینِ حق میں کجی پیدا کرنا چاہتے

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

جو اللہ (تعالٰے) کی راہ سے روکتے اور اس کے لیے کجی چاہتے ہیں اور وہ آخرت سے بھی منکر ہیں۔

اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

وہ زمین میں (خدا کو) عاجز کرنے والے نہیں اور نہ اُن کے لیے سوائے اللہ کے کوئی مددگار ہونگے اُن کے لیے دوگنا عذاب ہے وہ نہ سُن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے ۱۴۵۳

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾

یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں رکھا اور ان سے گم ہوگیا جو وہ جھوٹ بناتے تھے۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾

ضرور ہے کہ وہ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانیوالے ہوں

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور اپنے رب کے آگے عاجزی کرتے ہیں، وہی جنت والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے ۱۴۵۴

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع

ان دونوں گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا اور بہرا اور دیکھنے والا اور سننے والا، کیا دونوں کی حالت یکساں ہے؛ توکیا پھر تم نصیحت قبول نہیں کرتے ۱۴۵۵

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ میں تمہیں کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾

کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو میں تم پر ایک دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

ہیں جیسا کہ اگلی آیت میں صراحت کردی۔

۱۴۵۳ ما کانوا یستطیعون السمع۔ حضرت ابن عباس سے اس کے یہ معنی مروی ہیں کہ وہ حق کو نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے ایسے طریق پر جس سے ان کو فائدہ ہوتا اور ہدایت پاتے اس لیے کہ وہ کفر میں مشغول رہتے تھے (ج) اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص دن رات ایک بات کی مخالفت میں لگا رہے تو اس میں حق بات کے سننے کی بھی تاب باقی نہیں رہتی اور یہی یہاں مراد ہے۔

۱۴۵۴ اخبتوا۔ خَبْت پست زمین کو کہتے ہیں اس لیے اِخبات کے معنی نرمی اور تواضع اختیار کرنا ہیں۔ اور مُخبت نرمی اختیار کرنے والا یا جھک جانے والا ہے وبشر المخبتین (الحج ۲۲-۳۴) (غ)

۱۴۵۵ دنیا طلب اور حق طلب کا مقابلہ: یہاں دنیا طلب دنیوی زندگی کو اپنی غرض بنا لینے والے اور اس شخص کا جو زندگی کی اصل غرض وغایت کو سمجھ چکا ہے کھلے لفظوں میں مقابلہ کیا ہے۔ ایک کی مثال اندھے اور بہرے کی ہے کیونکہ وہ اصل غرض زندگی سے اندھا ہے اور دوسرے کی مثال بصیر وسمیع کی ہے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾

تو اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ ہم تجھے اپنے ہی جیسا انسان دیکھتے ہیں اور ہم نہیں دیکھتے کہ تیری پیروی کی ہو مگر ان لوگوں نے جو ہم میں سے نیچ ہیں (اور وہ بھی) سرسری نظر سے اور ہم تم میں اپنے اوپر کوئی بڑائی نہیں دیکھتے، بلکہ تمھیں جھوٹا خیال کرتے ہیں ع۱۴۵۶

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

کہا، اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب سے ایک کھلی دلیل پر ہوں اور اس نے اپنے پاس سے مجھے رحمت عطا فرمائی ہو، پھر وہ تم پر مشتبہ رہ گئی! کیا ہم اسے تمھیں لگا دیں، حالانکہ تم اسے ناپسند کرنے والے ہو ع۱۴۵۷

ع۱۴۵۶ اراذل - اَرْذَل کی جمع ہے اور رَذْل اور رَذِیل اور ارذل کمینہ اور خسیس شخص کو کہتے ہیں اور ہر چیز میں سے جو ردّی ہو اس پر بھی بولا جاتا ہے (ل) ومنکم من یرد الی ارذل العمر (النحل ۱۶-۷۰) واتبعک الارذلون (الشعراء ۲۶-۱۱۱)

بادی الرای - بَدَا کے معنی ظاہر ہُوا اور بَدَء کے معنی شروع کیا اور بادی دونوں سے ہو سکتا ہے کیونکہ ہمزہ یا سے بدل جاتا ہے۔ صورت اوّل میں بادی الرای کے معنی ہونگے سرسری نظر سے۔ صورت ثانی میں پہلی نظر میں۔ ماحصل ایک ہے مطلب یہ ہے کہ تیرا اتباع جن لوگوں نے کیا ہے انہوں نے غور و فکر سے کام نہیں لیا۔

سب سے پہلا اعتراض انبیاء پر یہی ہوتا ہے کہ یہ ہماری طرح بشر ہیں۔ کھانے پینے اور حوائج بشری کے محتاج ہیں۔ حالانکہ بشر ہی بشر کے لیے رہنما اور ہادی کا کام دے سکتا ہے۔ جو شخص حوائج بشری کا محتاج نہیں وہ بشر کے لیے نمونہ کا کام کیونکر دے سکتا ہے۔ اگر خالی تعلیم انسانوں کی رہنمائی کے لیے کافی ہوتی اور کسی نمونہ کی ضرورت نہ ہوتی تو بلا شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ تعلیم بذریعہ ملک یا کسی اور ذریعہ سے بغیر وسیلہ بشر کے انسانوں کو پہنچا دی جاتی۔ مگر چونکہ جس طرح تعلیم کی ضرورت ہے اسی طرح نمونہ کی ضرورت ہے اور بغیر نمونہ کے تعلیم عبث ہے اور نمونہ بشر کے لیے بشر ہی ہو سکتا ہے اس لیے یہ اعتراض کم فہمی سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ نبی کے پیرو شروع میں غریب لوگ ہوتے ہیں۔ امراء جو نشۂ دولت اور حکومت میں مست ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف کہاں رجوع کرتے ہیں انہی کو یہاں اراذل کہا ہے گویا دولت و مرتبہ دنیوی کو وہ لوگ شرف اور بزرگی کا معیار قرار دیتے ہیں اور مزدوری کر کے کمانے اور کھانے والے ان کو رذیل نظر آتے ہیں۔ حجام ہو یا دھوبی یا مزدور۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مزدوری اور محنت ہی شرف انسانیت ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ لوگ جو حضرت نوحؑ کے ساتھ تھے حجام اور موچی تھے۔ حضرت مسیحؑ خود بلحاظ پیشہ بڑھئی تھے آپ کے حواری ماہی گیر اور دھوبی تھے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ چھوٹوں کو نبی کی تعلیم سے بلند مقامات پر پہنچاتا ہے اور سرکشوں متکبروں کو جو حق کی مخالفت کرتے ہیں نیچا دکھاتا ہے۔

آنحضرتؐ اور محنت: دنیا نے محنت اور مزدوری کی قدر کو نہیں سمجھا۔ قرآن کریم نے اس پر بہت زور دیا ہے اور نبی کریم صلعم نے قرآن کریم کی اس تعلیم کا عملی نمونہ یوں بن کر دکھایا کہ ہر قسم کے کام یہاں تک کہ ٹوکری اٹھالینا، بھاوڑا چلالینا۔ بکریوں کو دوہ لینا۔ اپنے کپڑے جوتی وغیرہ کی مرمت کر لینا سب کام اپنے ہاتھ سے کیے تا دنیا کو یہ معلوم ہو کہ ہر قسم کی محنت و مزدوری قابل عزت شے ہے۔ جن لوگوں نے اس پاک اصول سے روگردانی کی ہے ان کے لیے بولشوزم کی صورت میں سزا پیدا کر دی گئی ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ تم کو یعنی نبی اور اس کے متبعین کو ہم پر کوئی فضیلت نہیں۔ اس سے بھی مراد دنیوی طور پر فضیلت اور مرتبہ ہے۔ حالانکہ اصل فضیلت وہ ہے جو اخلاق اور روحانیت سے پیدا ہوتی ہے جس کے سامنے دنیا کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ وہ تہذیب کے مدعی جو آج ایشیا کے باشندوں کو اراذل کی طرح سمجھتے ہیں اپنی گردنیں ایک ایشیائی (بلحاظ پیشہ) نجار کے سامنے جھکاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسے خدا بناتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ اصل حکومت دنیا میں اخلاق اور روحانیت کی ہے۔

ع۱۴۵۷ عمیت - عمیٰ بصر یعنی آنکھ اور بصیرت یعنی رائے کی روشنی کا جاتے رہنا ہے اور دونوں معنی میں قرآن شریف میں بکثرت اس کے مشتقات کا استعمال ہُوا ہے جاءہ الاعمیٰ (عبس ۸۰-۲) پہلے معنی میں ہے صم بکم عمی (البقرۃ ۲-۱۸) فعموا و صموا (المائدۃ ۵-۷۱) دوسرے معنی میں ہے اور دونوں معنوں کو لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب (الحج ۲۲-۴۶) میں اکٹھا کر دیا ہے اور عُمِیَ علیہ کے معنی ہیں اس پر وہ بات مشتبہ ہو گئی گویا اس کی نسبت وہ اعمیٰ کے حکم میں ہے اسی معنی میں یہاں ہے اور عماء بادل اور جہالت کو بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا عماء میں ہونا: اور حدیث میں جو آتا ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے پہلے ہمارا رب کہاں تھا تو آپ نے فرمایا فی عماءٍ تحتہ عماءٌ وفوقہ عماءٌ تو یہ اشارہ ہے ایسی حالت کی طرف جو انسان کی سمجھ سے باہر ہے اور وہ اس پر واقف نہیں ہو سکتا (غ)

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ
اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ
اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿٢٩﴾
وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ
طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٣٠﴾
وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ
وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ
وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ
لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣١﴾
قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ
جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٣٢﴾

اور اے میری قوم میں اس کے بدلے تم سے مال نہیں مانگتا،
میرا اجر صرف اللہ پر ہے اور میں انھیں نکال نہیں سکتا جو
ایمان لائے ہیں وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں لیکن میں
تمھیں ایسی قوم دیکھتا ہوں جو جاہل ہو[1458]
اور اے میری قوم کون اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کرسکتا ہے اگر
میں انھیں نکال دوں تو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے۔
اور میں تمھیں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں
اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں
اور نہ میں کہتا ہوں کہ جنھیں تمھاری نظریں حقیر دیکھتی ہیں اللہ
ان کو بھلائی نہیں دیگا۔ اللہ جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔
(ایسا کروں) تو بیشک میں ظالموں میں سے ہونگا[1459]
انھوں نے کہا اے نوحؑ! تو ہم سے جھگڑا اور ہم سے بہتیرا جھگڑ
چکا تو جس کا وعدہ دیتا ہے وہ لے آ، اگر تو سچوں میں
سے ہے۔

نلزم۔ لُزُوم۔ کسی چیز کا بہت لمبے زمانہ تک ٹھہرنا ہے (گویا وہ دوسری چیز سے لگ گئی) فسوف یکون لزاما (الفرقان ۲۵: ۷۷) یعنی لازم ہو جائے گا یا
ساتھ لگ جائے گا۔ والزمھم کلمۃ التقوی (الفتح ۴۸: ۲۶) (رغ)

شروع سورت میں طالب دنیا اور طالب حق کا مقابلہ جس رنگ میں دکھایا تھا کہ ایک دنیا کی زندگی اور اس کے سامان کو ہی اپنا مقصد بنالیتا ہے۔ اور
دوسرا اپنے رب سے بینہ پر ہوتا ہے اسی کی مثال اب سب انبیاء میں دی ہے اور بتایا ہے کہ وہی بات جو نبی اور اس کے پیروؤں کے لیے روشن دلیل ہے ان
کے منکرین کو تاریک اور مشتبہ معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ ان کے دلوں پر طرح طرح کے پردے مال دنیا کی محبت کے پڑے ہوئے ہوتے ہیں وہ دلوں پر زنگ کی وجہ سے
اس روشنی کو نہیں دیکھ سکتے جو ایک صاف دل انسان کو نظر آتی ہے ان کی فطرت کے آئینہ پر زنگ لگ چکا ہوتا ہے اور مومن کی فطرت کا آئینہ صاف ہوتا ہے۔

ع۱۴۵۸ تمام انبیائے عالم کی ایک ہی شان نظر آتی ہے کہ دنیا کے مال کی ان کے دلوں میں کچھ عظمت نہیں ہوتی اور نہ ہی جو محنت اور خدمت قوم کی یا نسل انسانی
کی وہ کرتے ہیں اس کا کوئی معاوضہ لیتے ہیں۔ ایک نمایاں شان ان کی یہ ہوتی کہ وہ ایثار اور بےنفسی کا کامل ترین نمونہ انسانوں کے لیے ہوتے ہیں جو کچھ مال ان
کے ہاتھ میں ہو وہ بھی مخلوق خدا کی خدمت میں صرف کر دیتے ہیں اور مال کمانے کی ان کو قطعاً کوئی فکر نہیں ہوتی۔ یہ نمونہ بھی اپنے کمال میں محمد رسول اللہ صلعم کی زندگی
میں ہی نظر آتا ہے اور درحقیقت تمام انبیاء کے تذکرہ میں اصل غرض محمد رسول اللہ صلعم کے مقام بلند کی طرف توجہ دلانا ہے جس سے مخاطب روشنی حاصل کرسکتے تھے
ہاں سبھی انبیاء کا نمونہ یہی ہوتا ہے کہ وہ مال نہیں چاہتے اور نہ دنیاداروں اور صاحبان مال و دولت سے انھیں کچھ اُنس ہوتا ہے بلکہ ان کے تعلقات انہی لوگوں
سے ہوتے ہیں جو اخلاق اور روحانیت کو مدنظر رکھتے ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ جو لوگ اپنے رب سے ملنے والے ہیں یعنی مال دنیا کی جگہ اللہ تعالیٰ کے لقا کو اپنی زندگیوں
کا مقصد اور منتہا ٹھہراتے ہیں وہی اس بات کے اہل ہیں کہ نبی کے پاس رہیں دنیاداروں کی خاطر ان لوگوں کو نبی کس طرح جواب دے سکتا ہے۔

ع۱۴۵۹ تزدری۔ اس کا اصل زری ہے اور زَرَیْتُ علیہ کے معنی ہیں میں نے اس پر عیب لگایا۔ اور اِزْدِراء اس سے باب افتعال ہے جس کی تا دال سے بدل گئی
ہے۔ اور تزدری اعینکم کے معنی ہیں تمھاری آنکھیں ان پر عیب لگاتی یا انہیں حقیر قرار دیتی ہیں۔ یا وہ تمہیں حقیر معلوم ہوتے ہیں۔

دعوت انبیاء کا دنیوی مال وجاہ کے لالچ سے برتر ہونا: یہ باتیں اس لیے کہی جاتی ہیں کہ کسی قسم کے دنیوی لالچ کو مدنظر رکھ کر کوئی شخص اس کی تعلیم کو قبول نہ کرے رسول کے
قبضے میں مال وخزانے نہیں ہوتے کہ اپنے متبعین کو مالامال کردے نہ وہ غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کو غیب دانی سے تکلیف سے بچالے نہ وہ خود ملک
ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کہ آپ ہی حوائج بشری سے پاک ہو۔ ہاں جنھیں دنیا کے لوگ حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں اس لیے کہ ان کے پاس بہت مال نہیں یا وہ بڑے مرتبہ پر نہیں ان
کے متعلق وہ بھلائی کا امیدوار ہوتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو دیکھ کر اس کے مطابق ان کو اجر دیتا ہے۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾

اس نے کہا اس کو اللہ ہی لے آئے گا جب وہ چاہے گا اور تم (اسے) عاجز نہیں کر سکتے۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ؕ﴿۳۴﴾

اور تمھیں میری نصیحت نفع نہیں دے سکتی اگر میں چاہوں کہ تمھاری خیر خواہی کروں اگر اللہ کا ارادہ ہو چکا ہو کہ وہ تمھیں ہلاک کرے وہ تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۱۴۶۰

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع ۳

کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ بنالیا ہے کہہ، اگر میں نے یہ جھوٹ بنایا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہے اور میں اس سے بری ہوں جو تم گناہ کرتے ہو ۱۴۶۱

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۚۖ﴿۳۶﴾

اور نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم سے کوئی ایمان نہیں لائے گا، مگر وہی جو ایمان لا چکا، سو تو اس پر غم نہ کر، جو وہ کرتے ہیں ۱۴۶۲

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ اور ان کے بارے میں مجھے کچھ نہ کہہ جو ظالم ہیں وہ غرق کیے جائیں گے ۱۴۶۳

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۣ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا

اور وہ کشتی بنانے لگا اور جب اس قوم کے سردار اس پر گزرتے ہیں اس پر ہنستے ہیں، کہا اگر تم ہم پر ہنستے ہو، تو ہم بھی تم پر

۱۴۶۰ یغویکم اس کے لیے دیکھو ۱۰۵۸ انسان کی خیر خواہی دوسرے کے کام نہیں آسکتی جب وہ خود غلط راہ پر قدم مارتا ہوا اتنی دور نکل جائے کہ اللہ تعالیٰ اس پر گمراہ ہونے کا یا ہلاکت کا حکم لگا دے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا حکم اسی وقت لگاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص اپنی اصلاح کسی صورت میں نہیں کرتا۔

۱۴۶۱ اجرام۔ جَرْم کے معنی قَطع یعنی کاٹ دینا ہیں درخت کے کاٹنے پر بولا جاتا ہے اور شجرۃ جریمۃ کٹے ہوئے درخت کو کہتے ہیں اور اَجْرَمَ کے معنی ہیں حانَ جرامُہ یعنی اس کے کاٹنے کا وقت آگیا۔ اور جُرم گناہ کو کہتے ہیں (ل) اور مادہ کے معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جرم وہ گناہ ہے جو قطع کر دیتا ہے یعنی ایسا سخت گناہ جو اللہ تعالیٰ سے قطع تعلق کر دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں اجرام اور مجرم سخت گناہوں پر بولا گیا ہے۔ اس جگہ اجرامی سے مراد اللہ تعالیٰ پر افترا کرنے کا گناہ اور تجرمون سے مراد مخالفین حق کے وہ گناہ ہیں جو وہ حق کو نیست و نابود کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

اس آیت میں خطاب کو بدل دیا ہے اور ذکر آنحضرت صلعم کے مخالفین کا ہے۔

۱۴۶۲ تبتئس۔ اس کا اصل بؤس یا بأس ہے جس کے معنی شدّت و مکروہ ہیں اور اس کے معنی ہیں لاتَلْتَزِمُ البؤس ولا تحزن بؤس کو لازم نہ کر اور غم نہ کر (غ)

حضرت نوح کو قوم کی سخت دلی دیکھ کر سخت غم ہوتا تھا اور سبھی انبیاء کو ہوتا ہے، آنحضرت صلعم کے متعلق ہے لعلک باخع نفسک الّا یکونوا مومنین۔ (الشعراء ۲۶-۳) ان حالات میں اطلاع دی ہے کہ یہ قوم اب ہلاکت کے قابل ہی ہے۔ حضرت نوحؑ کی دعا ربّ لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا (نوحؑ-۲۶) اس وحی کے بعد ہی معلوم ہوتی ہے۔

۱۴۶۳ باعیننا۔ عَین آنکھ ہے، لیکن جو شخص کسی کی حفاظت کرے اسے بھی عین کہہ دیا جاتا ہے اور فلانٌ بِعَیْنِیْ کے معنی ہیں میں اس کی حفاظت اور نگہداشت کرتا ہوں اور عین اللّٰہ علیك کے معنی ہیں تم اللہ کی حفاظت اور اس کی حمایت میں رہو۔ اسی سے یہ محاورہ ہے۔ دوسری جگہ ہے تجری باعیننا (القمر ۵۴-۱۴) یعنی کشتی ہماری حفاظت میں چلتی تھی اور حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے ولتصنع علیٰ عینی (طٰہٰ ۲۰-۳۹) یعنی میری حفاظت میں پرورش پائے (غ)

تخاطبنی۔ خَطب اور مُخاطَبَۃ بات کا ایک دوسرے کی طرف لوٹانا ہے (غ) اور اللہ تعالیٰ سے مخاطبت یہ ہے کہ اس کا حکم سُن لینے کے بعد کہ ایک قوم ہلاک کی جائے گی پھر اس کی سفارش کی جائے۔

چونکہ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے سیلاب سے تباہ کرنا تھا اس لیے حضرت نوح کو پہلے سے کشتی بنانے کا حکم دیا۔ پس یہ کشتی وحی الٰہی کے مطابق بنی اور اپنی حفاظت

مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝٣٨
فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ
يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝٣٩
حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ
قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ
وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ
وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝٤٠
وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا

ہنستے ہیں جیسے تم (ہم پر) ہنستے ہو۔ ۱۲۶۴
سو تم جان لوگے کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے
اور کس پر قائم رہنے والا عذاب اُترتا ہے۔
یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور وادی نے جوش مارا۔
ہم نے کہا اس میں ہر ضرورت کی شے کے نر و مادہ دو دو لے لو
اور اپنے اہل کو مگر جس کے متعلق پہلے حکم ہو چکا اور ان کو بھی جو ایمان
لائے اور اس کے ساتھ تھوڑے ہی ایمان لائے تھے۔ ۱۲۶۵
اور اس نے کہا اس میں سوار ہو جاؤ اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور

[حاشیہ: [illegible] ۱۲]

کا ذکر اس لیے فرمایا کہ دشمن بہت تھے پس تسلی دی کہ وہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

۱۲۶۴ نسخر منکم۔ حضرت نوح یا مومنوں کا واقعی ہنسی کرنا مراد نہیں اس لیے کہ استہزا مومن کی شان نہیں۔ یہ محض اُن کے فعل کے مقابل پر ذکر ہے جیسے جزاء سیئة سیئة مثلها ہیں اور کشاف نے اس کے معنی استجہال لیے ہیں کیونکہ استہزا کا اصل سبب جہالت ہے تو سخریة سے مراد اس کا سبب لیا ہے گویا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنی جہالت کی وجہ سے ہم پر ہنستے ہو مگر ہم تمہیں جاہل سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اصل حقیقت کی تمہیں خبر نہیں۔

۱۲۶۵ فار کے معنی ہیں جاش یعنی جوش میں آیا۔ ہانڈی کے اُبال پر۔ آدمی کے غضب میں آنے پر۔ مشک کے پھیل جانے پر فار بولا جاتا ہے اور پانی جب پھوٹ کر چشمہ سے نکلے تو اس پر بھی فار بولا جاتا ہے فار الماء من العین اور فوارة وہ جگہ ہے جہاں سے پانی پھوٹ کر نکلے منبع الماء اور پانی کے حوض کو بھی فوّارة کہا جاتا ہے (ت)

تنور۔ کو بعض نے فارسی سے معرب کہا ہے اور بعض نے اس کا مادہ نور یا نار قرار دیا ہے۔ اور تنور کے ایک معنی تو مشہور ہیں جس میں ہماری زبان میں بھی یہ استعمال ہوتا ہے یعنی جہاں روٹی پکائی جاتی ہے۔ اس کے دوسرے معنی جو تاج العروس میں دیئے ہیں وجه الارض یعنی سطح زمین ہیں اور یہ معنی حضرت علی اور ابن عباس سے مروی ہیں اور پھر لکھا ہے کلّ مَفْجَرِ ماءٍ تَنُّوْرٌ یعنی ہر ایک پانی پھوٹ نکلنے کی جگہ کو تنور کہا جاتا ہے محفل ماء الوادی یعنی وادی کے پانی کے اکٹھا ہونے کی جگہ کو بھی تنور کہتے ہیں اور قتادہ سے ہے کہ بلند اور اشرف زمین کو تنور کہا جاتا ہے اور حضرت علیؓ سے ایک معنی بھی مروی ہیں کہ فار التنور سے مراد یہاں صبح کا پھوٹ نکلنا ہے اور ہردی کا قول نقل کیا ہے کہ یہ ایک پانی کا مشہور چشمہ ہے (ت)

یہاں اس سیلاب کے آنے کا ذکر ہے جو طوفان نوح کے نام سے مشہور ہے۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ اس کی ابتدا یوں ہوئی تھی کہ ایک تنور سے پانی پھوٹ نکلا تھا۔ لیکن قرآن شریف نے خود دوسری جگہ یوں فرمایا ففتحنا ابواب السماء بماء منهمر (القمر ۵۴ - ۱۱) یعنی اوپر سے بہت پانی برسایا اور خود یہاں جب طوفان کو ٹھہرانے کا وقت آتا ہے تو حکم ہوتا ہے یا سماء اقلعی (۴۴) اے بادل تھم جا جس سے معلوم ہوا کہ بادلوں سے پانی برسنا شروع ہوا تھا اور یہ جو زمین کے اسی آیت میں پانی جذب کر لینے کا حکم ہے تو ظاہر ہے کہ پانی زمین میں ہی جذب ہو کر اوپر سے خشک ہوتا ہے۔

فار التنور سے مراد: تنور کے لفظ سے یہ غلط استدلال کیا گیا ہے کہ پہلے تنور سے پانی پھوٹ کر نکلا۔ تنور کے معنی بروئے لغت اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ابن جریر نے جو اقوال بیان کیے ہیں ان میں اوّل حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ تنور کے معنی وجه الارض ہیں۔ اور حضرت نوحؑ کو حکم ہوا تھا اذا رایت الماء علی وجه الارض فارکب اور ابن عباسؓ کہتے ہیں العرب تسمی وجه الارض تنور الارض دوسرا قول حضرت علیؓ کا منقول ہے کہ اس سے مراد تنویر الصبح یعنی صبح کی روشنی ہے تیسرا قول قتادہ کا منقول ہے کہ اس سے مراد بلند اور اشرف زمین ہے اور چوتھا قول روٹی کے تنور سے پانی نکلنے کا ہے ابن کثیر کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آیا تو پے در پے بارش شروع ہوئی نہ آسمان کھلتا تھا نہ بارش بند ہوتی تھی۔ اور اس کی تائید میں انہوں نے آیت ففتحنا ابواب السماء بماء منهمر نقل کی ہے اور پھر فار التنور کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کر کے لکھا ہے ای صارت الارض عیونا تفور حتّی فار الماء من التنانیر یعنی ساری زمین پر پانی ہی پانی بہ نکلا یہاں تک کہ تنوروں سے بھی پانی بہ نکلا۔ پس قرآن کریم سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ کثرت بارش سے اتنا بڑا سیلاب آیا جس میں قوم نوح کی ساری بستیاں بہ گئیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بستیوں کے اوپر پہاڑ بھی تھے جیسا کہ ساٰوی الی جبل سے ظاہر ہے اور پہاڑوں کی بارش سے وادی میں پانی کا زور اور بھی زیادہ ہو گیا۔

حضرت نوح نے کشتی میں کیا کیا لیا: اور یہ جو فرمایا کہ ہر شے کے زوجین لے لو تو ہر شے سے مراد یہ نہیں کہ تمام روئے زمین پر پھر کر جانوروں کو اکٹھا کر۔ ایسا کام ایک نبی کے سپرد کرنا بے معنی بات ہے کہ وہ ساری زمین پر پھر کر ہر قسم کے جانداروں کے نر و مادہ لیتا پھرے اور پھر اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر انسان حاوی کہاں

وَ مُرْسٰهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۱﴾
وَ هِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫
وَ نَادٰی نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَ كَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ
ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۴۲﴾
قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ
الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ
اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَیْنَهُمَا
الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ﴿۴۳﴾
وَ قِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَ یٰسَمَآءُ
اَقْلِعِیْ وَ غِیْضَ الْمَآءُ وَ قُضِیَ الْاَمْرُ
وَ اسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ وَ قِیْلَ بُعْدًا

اس کا لنگر ڈالنا ہے یقیناً میرا رب بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ع۱۲۶۶
اور انھیں پہاڑ جیسی لہروں میں لیے چلی جارہی تھی، اور
نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا اور وہ الگ ہو رہا تھا اے میرے بیٹے
ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ مت ہو ع۱۲۶۷
اس نے کہا میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لونگا جو مجھے پانی سے بچالے۔
کہا آج کی سزا سے کوئی بچانے والا نہیں، مگر وہی (بچے گا)
جس پر وہ رحم کرے۔ اور ایک لہر اُن کے درمیان حائل
ہوئی اور وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔
اور کہا گیا اے زمین اپنا پانی جذب کرلے اور اے بادل تھم جا
اور پانی خشک ہو گیا اور کام کا فیصلہ ہو گیا اور (کشتی) جودی
پر ٹھیر گئی، اور کہا گیا ظالم قوم کے لیے

ہو سکتا ہے۔ اور یہ فرض کرلینا کہ ایک ایک جوڑے کو خود اللہ تعالیٰ نے وحی کردی کہ وہ زمین کے تمام گوشوں سے بھاگ کر حضرت نوح کے پاس جمع ہو گئے اور باقی اسی نوع کے جانوروں کو وحی نہ کی تو طوفان کے آنے سے پہلے اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر کہ درند چرند پرند درخت سب حضرت نوحؑ کے پاس جمع ہوئے تھے لوگ کیوں ایمان نہ لے آتے یہ تمام بے ضرورت اور بے سند باتیں ہیں جو غلطی سے تراشی ہوئی ہیں۔ کل سے مراد یہاں ہر اپنی ضرورت کی شے ہے جیسا جب توریت کو تفصیل کل شئی (یوسف ۱۲-۱۱۱) کہا تو مراد اسی سے اس وقت کی ضرورت ہے یا ایک ملکہ کے متعلق کہا اوتیت من کل شئی (النمل ۲۷-۲۳) تو مراد تمام عالم کی اشیاء نہیں بلکہ اس کی اپنی ضرورت کی اشیاء ہیں اسی طرح یہاں ہے اور زوج چونکہ جوڑے کے ہر فرد کو کہا جاتا ہے اس لیے زوجین سے مراد ایک نر اور ایک مادہ ہے اور اثنین میں اسی کی تفصیل ہے۔ اور بعض نے لفظ کل کو وسیع کرکے اور پھر اس خیال کے نیچے کہ یہ طوفان کل روئے زمین پر محیط تھا، نہ صرف درند و پرند کا ساتھ لینا بیان کیا ہے بلکہ درختوں کے مختلف اقسام کا ساتھ لینا بھی فرض کرلیا ہے اور پھر اس پر عجیب عجیب قسم کی کہانیاں بنائی ہیں مثلاً یہ کہ چوہوں نے جب کشتی کے رسوں کو کاٹنا شروع کیا تو حضرت نوحؑ نے دعا کی تو شیر کی چھینک سے بلیاں پیدا ہو گئیں۔ اور ایسا ہی جب غلاظت بڑھ گئی، تو ہاتھی کے چھینکنے سے سؤر پیدا ہو گئے۔ اور شیر سے بچاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ نے شیر کو تپ چڑھا دیا۔ ایسے ہی اور بہت سے فضول قصے جمع کر دیئے گئے ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں مثلاً یہ کہ شیطان بھی گدھے کی دم پکڑ کر چڑھ گیا تھا۔ قرآن و حدیث ان تمام لغویات سے پاک ہیں۔

طوفان نوح کل روئے زمین پر نہ تھا: یہ ساری مصیبتیں اس لیے پیش آئیں کہ بائبل کے بیان کو صحیح سمجھ کر یہ فرض کرلیا گیا کہ طوفان کل روئے زمین پر آیا تھا۔ حالانکہ قرآن شریف صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ قوم نوح کے لیے آیا تھا۔ قرآن شریف نے کہیں نہیں فرمایا کہ حضرت نوحؑ کو کل دنیا کی طرف بھیجا گیا تھا بلکہ بار بار یہی کہا کہ ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا اور پھر یہی فرمایا کہ مکذبوں کو غرق کیا گیا اور ابھی اوپر آچکا ہے انہ لن یؤمن من قومک الا من قد اٰمن یہاں صرف حضرت نوحؑ کی قوم کا ذکر ہے نہ کل عالم کا اور الارض کا لفظ عام ہے کسی حصہ ارض پر یا کسی ملک پر بھی بولا جاتا ہے حضرت نوح کی قوم کل دنیا پر آباد نہ تھی بلکہ خاص قطعہ زمین میں تھی نہ ایک اکیلا آدمی کل روئے زمین پر پھر سکتا تھا۔ ہمارے نبی کریم صلعم کو جب اللہ تعالیٰ نے کل عالم کی طرف مبعوث کیا تو آپ کی تبلیغ بھی بذریعہ آپ کے متبعین کے آہستہ آہستہ دنیا میں پہنچنی مقدر ہوئی اگر یہ ممکن ہوتا کہ کل روئے زمین پر ایک ہی شخص ایک دفعہ پھر نکلے اور اس کی تکذیب پر فوراً ساری دنیا ہلاک ہو جائے تو یہ آنحضرت صلعم کے لیے ہونا چاہیئے تھا، نہ حضرت نوحؑ کے لیے جو صرف ایک قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ بھی ان مقامات میں سے ایک ہے جہاں قرآن کریم نے بائبل کی غلطی کی اصلاح کی ہے۔

ع۱۲۶۶ مجرے۔ یہاں یا مجہول کی آواز سے پڑھا جاتا ہے یعنی مجرے۔ اور اس کا اصل جَرْی ہے جس کے معنی ہیں تیزی سے گزرنا جیسے پانی۔ جنات تجری من تحتها الانهار۔ فیها عین جارية (الغاشية ۸۸-۱۲) اور کشتی کے چلنے پر بھی بولا جاتا ہے (غ) کشتی کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے یعنی اس کی اعانت یا اس کی قدرت یا اس کے امر اور اذن سے۔

ع۱۲۶۷ معزل۔ عَزَل کے معنی علیحدہ ہونا۔ اور کان فی معزل سے مراد یہ ہے کہ حضرت نوح سے علیحدہ تھا یعنی مومنوں میں سے نہ تھا۔ حضرت نوحؑ نے چاہا کہ اب بھی ایمان لے آئے۔ یا مراد یہ ہے کہ کشتی سے دور تھا۔

لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ — دُوری ہے [1468]

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا اے میرے رب، میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

کہا، اے نوحؑ! وہ تیرے اہل سے نہیں ہے، کیونکہ وہ بدعمل ہے، سو مجھ سے ایسا سوال نہ کر، جس کا تجھے علم نہیں، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو ناواقفوں میں سے نہ ہو [1469]

قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾

کہا، اے میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے ایسا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو میری حفاظت نہ کرے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں نقصان اٹھانیوالوں میں سے ہونگا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ

کہا گیا اے نوحؑ ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اُتر (جو) تجھ پر اور (کئی) جماعتوں پر (ہونگی) جو تیرے ساتھ والوں سے ہوں اور ایسی اُمتیں بھی

ع ۱۴۶۸ ابلعی۔ بَلِع کے معنی ہیں جَرَع یعنی گھونٹ گھونٹ کرکے یا تھوڑا تھوڑا کرکے نگل لیا (ل) اور یہاں اس لفظ کو اس لیے استعمال کیا کہ زمین بھی پانی کو آہستہ آہستہ جذب کرتی چلی جاتی ہے۔

اقلعی۔ قَلَع کے معنی ہیں جڑ سے اُکھیڑ پھینکا اور اَقْلَعَ کے معنی کسی چیز سے رک گیا اور اَقلَعَ السحاب کے معنی ہیں بادل برسنے سے رک گیا (ل)

غیض۔ غاض کے معنی ہیں نَقَصَ ایک چیز کم ہوگئی یا دوسرے نے اسے کم کردیا۔ ما تغیض الارحام (الرعد ۱۳ - ۸) یعنی رحم اسے خراب کردیتے ہیں یا ان کی حالت ایسی کردیتے ہیں جیسے زمین پانی کو نگل جاتی ہے۔

جودی۔ قیل ھو اسم جَبَلٍ بین الموصِل والجزیرۃ وھو فی الاصل منسوب الی الجود (غ) یعنی کہا گیا ہے کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو موصل اور جزیرہ کے درمیان ہے اور وہ اصل میں جود (یعنی بخشش) کی طرف منسوب ہے۔

جب وہ بستیاں ہلاک ہوچکیں تو مینہ تھم گیا اور زمین نے پانی کو جذب کرلیا اور کشتی جودی پر ٹھہر گئی۔ ابن جریر میں بعض روایات میں ہے شمخت الجبال و تواضع جس کے معنی یہ سمجھے گئے ہیں کہ دوسرے پہاڑوں نے تکبر کیا اور جودی نے تواضع اختیار کی مگر شمخ کے اصل معنی بلند ہونا ہیں اور وضع کے معنی پست ہونا اور مراد صاف یہ معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے پہاڑ بلند تھے جو غرق نہیں ہوئے اور جودی پست تھا یعنی کوئی چھوٹا ٹیلا تھا جس پر کشتی آ لگی۔

ع ۱۴۶۹ انه عمل غیر صالح۔ میں ضمیر سوال کی طرف نہیں بلکہ اس بیٹے کی طرف ہے اور مراد ہے ذو عمل یعنی وہ غیر صالح یا بُرے کام کرنے والا ہے جیسا ولکن البر من اٰمن میں مراد راستبازی نہیں بلکہ راستباز ہے۔ دیکھو ع ۲۱۵۔

نوح کے بیٹے کا اہل میں سے نہ ہونا: ان آیات میں ظاہر الفاظ کے لحاظ سے بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ حضرت نوح کا بیٹا نہ تھا۔ بلکہ حضرت نوح کی بیوی کا کسی پہلے خاوند سے بیٹا تھا۔ یہ فی الواقع صحیح ہو یا نہ ہو۔ یہاں یہ مراد نہیں بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح کے اہل کو جو بچانے کا وعدہ تھا تو حضرت نوح نے ظاہر الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے عرض کیا کہ اہل میں تو وہ داخل تھا یعنی بلحاظ نسب اس لیے وہ کیوں مطابق وعدہ نہ بچایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صالحین کے اہل صرف بلحاظ نسب نہیں ہوتے بلکہ بلحاظ عمل بھی۔ چونکہ وہ بدعمل ہے' بُرے کام کرتا ہے اس لیے وہ تمہارے اہل میں داخل نہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ایسا سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں۔ تو مطلب یہ ہے کہ دعا ایسے امور کے لیے کرنی چاہیئے جن کے متعلق یہ علم ہو کہ ان کا حصول درست اور حکمت الٰہی کے مطابق ہے۔ ایک عورت یہ دعا کرے کہ میں مرد بن جاؤں تو یہ عبث ہے۔ کفار کے ایمان کے بارہ میں یا ان کی مغفرت کیلئے دعا اس وقت تک کی جاسکتی ہے جب تک کہ ان کے ایمان لانے کا موقع باقی ہے۔ جب وہ شخص حالت کفر میں غرق ہوگیا تو اس کے متعلق دعا بے سود تھی اس لیے اس سے روک دیا۔

سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٤٨﴾

ہونگی جنھیں ہم کچھ سامان دینگے پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔[١٤٧٠]

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا
كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ
ع هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٩﴾

یہ غیب کی خبروں سے ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، تو انھیں اس سے پہلے نہ جانتا تھا اور نہ تیری قوم، سو صبر کر انجام متقیوں کے لیے ہے[١٤٧١]

معانقة ۞ الوقف على الاخیر احسن والخ

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ
اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿٥٠﴾

اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہوؑد کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، تم صرف جھوٹ بنانے والے ہو۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۗ اِنْ اَجْرِيَ
اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٥١﴾

اے میری قوم میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا میرا اجر صرف اس پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ
يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ
قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿٥٢﴾

اور اے میری قوم اپنے رب کی بخشش مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو، وہ تم پر زور سے برستا ہوا بادل بھیجے گا اور تمھاری طاقت کو بڑھا کر زیادہ طاقتور کریگا اور مجرم ہو کر پھر نہ جاؤ۔[١٤٧٢]

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ
بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ
لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٣﴾

انھوں نے کہا اے ہوؑد تو ہمارے پاس کوئی کھلی دلیل نہیں لایا اور ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تجھ کو ماننے والے ہیں۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا
بِسُوْٓءٍ ۗ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا
اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾

ہم تو یہی کہیں گے کہ ہمارے کسی معبود نے تجھے آسیب پہنچایا ہے، اس نے کہا، میں اللہ کو گواہ ٹھیراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں اس سے بیزار ہوں جسے تم اس کے سوائے شریک کرتے ہو[١٤٧٣]

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٥٥﴾

تو تم سب میرے لیے تدبیر کرو، پھر مجھے مہلت نہ دو۔

ع[١٤٧٠] امم ممن معك یعنی ایسی امتیں جو تیرے ساتھیوں میں سے بن جائیں گی جس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ حضرت نوح کے ساتھ تھے ان میں سے بھی آگے قومیں بنیں۔ اور امم سنمتعھم میں بظاہر دوسری قوموں کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت دنیا میں موجود تھیں یا انہی کی نسل میں سے پیچھے آنے والی امتیں مراد ہیں۔

ع[١٤٧١] پچھلے رکوع کے آخر پر بھی انتقال مضمون آنحضرت صلعم کے اعدا کی طرف کیا تھا یہاں بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ نوح اور اس کے مخالفوں کا قصہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے مخالفوں کے لیے بطور پیشگوئی ہے اور یہی انباء الغیب ہیں جن کا یہاں ذکر ہے جیسا کہ آخری الفاظ فاصبر ان العاقبۃ للمتقین سے ظاہر ہے

ع[١٤٧٢] مینہ برسانے سے مراد اللہ تعالیٰ کے افضال ہیں اگر ایک قوم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور ظلم اور زیادتی سے رک جائے تو اللہ تعالیٰ کے افضال اس پر اور بھی زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی قوت بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہے۔

ع[١٤٧٣] اعتریٰ۔ عری کے معنی ننگا ہوا۔ اور عریان ننگے کو کہتے ہیں الا تجوع فیہا ولا تعری (طٰہٰ ۔ ١١٨) اور عراء میدان ہے یعنی جس کو کسی پردہ وغیرہ نے نہ ڈھانکا ہوا ہو لنبذ بالعراء (القلم ۔ ٤٩) اور عراہ اور اعتراہ کے معنی ہیں قصد عراہ (غ) اس کی جانب کا قصد کیا یا اس سے کچھ لینے کا قصد کیا اور یہاں مراد مصیبت کا وارد کرنا ہے مطلب ان کا یہ تھا کہ ہمارے کسی معبود نے تم کو مجنون بنا دیا ہے۔

إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ ۚ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٥٦﴾

میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب اور تمھارا رب ہے۔ کوئی جاندار نہیں مگر وہ اس کی چوٹی کو پکڑے ہوئے ہے، میرا رب سیدھے رستہ پر ہے ۱۴۷۴

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿٥٧﴾

سو اگر تم پھر جاؤ تو میں نے تمھیں پہنچا دیا ہے جو مجھے دیکر تمھاری طرف بھیجا گیا ہے اور میرا رب تمھارا جانشین دوسرے لوگوں کو بنا دے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے، میرا رب تمام چیزوں پر نگہبان ہے ۱۴۷۵

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَنَجَّيْنَاهُمْ مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿٥٨﴾

اور جب ہمارا حکم آگیا ہم نے ہودؑ کو اور انھیں جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچالیا اور ہم نے انھیں سخت عذاب سے بچایا۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٥٩﴾

اور وہ عاد ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر سرکش دشمن (حق) کے حکم کی پیروی کی ۱۴۷۶

وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ﴿٦٠﴾

اور اس دنیا میں لعنت ان کے پیچھے لگی اور قیامت میں بھی سنو! عاد نے اپنے رب کا انکار کیا، سنو! ہودؑ کی قوم عاد پر پھٹکار رہے ۱۴۷۷

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو، تمھارے لیے اس کے

۱۴۷۴ آخذ بناصیتها۔ ناصیة پیشانی کے بالوں کو کہتے ہیں۔ اور عرب اخذ ناصیة کا استعمال انتہائے ذلت اور عاجزی کے موقعہ پر کرتے تھے ان کا مطلب اس سے ہوتا تھا کہ دوسرا شخص اسے جس طرح چاہتا ہے چلاتا ہے اور یہ بھی ان میں دستور تھا کہ ایک قیدی کو جب چھوڑنا ہوتا تو نشان کے طور پر اس کی پیشانی کے بال کاٹ دیتے تھے مطلب یہ ہے کہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے کامل تصرف میں ہیں اور رب کے صراط مستقیم پر ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ سب سے عدل و انصاف کا معاملہ کرتا ہے اچھے سے اچھا، بُرے سے بُرا۔

۱۴۷۵ تولوا اصل میں تتولوا ہے یہاں بعض نے خطاب کا انتقال کفار قریش کی طرف سمجھا ہے اور یہی درست بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہودؑ کے ذکر میں سمجھانا تو انہی لوگوں کو اصل مقصود تھا۔

۱۴۷۶ عنید۔ عَنَدَ کے معنی حد اور اندازہ سے نکل گیا اور عَنَدَ عن الحق حق سے پھر گیا اور معاندۃ اور عِناد یہ ہے کہ ایک چیز کو پہچانے پھر اس کا انکار کردے۔ پس عنید وہ حق سے پھرنے والا باغی ہے جو باوجود علم کے حق کو رد کرتا ہے (ل)

تلک میں اشارہ یا تو ذہنی ہے اور اشارہ بعید تحقیر کے لیے یا ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہے یا ان کی ویران شدہ سرزمین کی طرف اشارہ ہے۔

۱۴۷۷ بُعد۔ بُعْد۔ قرب کی ضد ہے۔ اور محسوس اور معقول میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور بَعِدَ کے معنی ہیں مر گیا اس لیے اس کا استعمال ہلاکت میں ہوتا ہے بعدت ثمود (ہود ۱۱۔ ۹۵) اور بُعْد اور بَعَد ہلاکت کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور دوری کے لیے بھی فبعداً للقوم الظالمین (المؤمنون ۲۳۔ ۴۱) (رغ) اور یہاں چونکہ قوم ہلاک تو ہو چکی ہے اس لیے مراد رحمت الٰہی سے دوری ہے یا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عاد ہلاک ہوئے ایسی اور قومیں بھی ہلاک ہوں گی۔ جو وہی راہ اختیار کریں۔

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿٦١﴾

سوا اور کوئی معبود نہیں، اس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور اس میں تمھیں آباد کیا سو اس کی بخشش مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو میرا رب نزدیک (اور) قبول کرنے والا ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿٦٢﴾

انھوں نے کہا اے صالح اس سے پہلے تجھ پر ہمیں امید تھی، کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ اس کی عبادت کریں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے اور یقیناً ہمیں اس کے متعلق شک ہے جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔[۱۲۷۸]

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿٦٣﴾

اس نے کہا اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب سے کھلی دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائی تو کون اللہ کے خلاف میری مدد کریگا اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم سوائے گھاٹے کے میرا کچھ نہیں بڑھاتے۔

وَ يٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾

اور اے میری قوم یہ تمھارے لیے اللہ کی اونٹنی ہے (یہ) ایک نشان (ہے) سو اسے چھوڑ دو، اللہ کی زمین میں چرے اور اُسے کوئی دُکھ نہ پہنچاؤ، ورنہ تمھیں نزدیک کا عذاب آ پکڑے گا۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾

مگر انھوں نے اسے مار ڈالا تو اس نے کہا اپنے گھر میں تین دن فائدہ اُٹھالو، یہ وعدہ ہے جو کبھی جھوٹ نہ ہوگا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾

سو جب ہماری سزا آگئی تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے (اس سے) بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے تیرا رب طاقتور غالب ہے۔

وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا

اور جو ظالم تھے انھیں ہولناک آواز نے آ پکڑا سو وہ اپنے گھروں

ع۱۲۷۸ مرجو۔ رجاء الیافظن ہے جس کا اقتضا خوش کرنے والی بات کا حصول ہو یعنی کسی بہتری کی امید (غ) پس مرجو وہ شخص ہے جس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہوں۔

مریب۔ راب اور اراب کے معنی ہیں ریب میں ڈالا۔ اور ریب یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق کسی امر کا وہم کیا جائے۔ پھر وہ چیز اس وہم سے صاف ہو جائے (غ)

مخلوق خدا کی خدمت فطرتِ انبیاء ہے: حضرت صالح کے متعلق ان کی قوم کا یہ اعتراف کہ آپ سے اس سے پہلے ہماری بہت امیدیں وابستہ تھیں بتاتا ہے، کہ انبیاء علیہم السلام شروع سے ہی قوموں کی امیدگاہ ہوتے ہیں۔ ان کا دل اور دماغ اور ان کی قوت عملی ایسی زبردست ہوتی ہے کہ قوم میں وہ اس دعوے سے پہلے ایک نمایاں امتیاز حاصل کر لیتے ہیں تاریخی رنگ میں اس کا بہترین نظارہ ہمارے نبی صلعم کی زندگی میں نظر آتا ہے کہ ہر قسم کے باطل سے متنفر کھیل کود سے الگ ہر وقت خدمت قومی میں لگے ہوئے ہیں۔ بعثت سے پہلے ثمال الیتامی عصمة الارامل ہیں غریبوں اور بیکسوں کے ملجا اور ماویٰ ہیں۔ دن رات مخلوق خدا کی فکر ہے نیکی اور راستبازی ایسی مسلّم کہ کوئی شخص آخر تک حرف نہیں رکھ سکا۔ درحقیقت قرآن کریم نے جو مختلف نقشے انبیاء کے کھینچے ہیں وہ آنحضرت صلعم کے متعلق ہی توجہ دلانے کے لیے ہیں۔ مگر جب یہ لوگ ان ساری باتوں کے باوجود قوم کے اندر سے بدی کی جڑ کاٹنا چاہتے ہیں تو شیاطین کا گروہ ان کا دشمن ہو جاتا ہے۔

فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾
میں اوندھے پڑے رہ گئے[۱۴۷۹]

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَا۠ كَفَرُوْا
گویا کہ ان میں بسے ہی نہ تھے، سنو ثمود نے اپنے رب کا انکار

ع ۶ رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾
کیا، سنو ثمود پر پھٹکار ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى
اور یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیمؑ کے پاس خوش خبری لیکر

قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ
آئے۔ کہا سلامتی ہو، اس نے کہا سلامتی اور دیر نہ کی کہ تلا

جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾
ہُوا بچھڑا لے آیا[۱۴۸۰]

۱۴۷۹ صیحۃ آواز بلند کرنے کا نام ہے (غ) جس کو یہاں صیحۃ کہا۔ اسی کو (الاعراف ۷۸) میں رجفۃ یا زلزلہ کہا جس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی عذاب کی مختلف حالتوں کے یہ نام ہیں۔ زلزلہ سے پہلے بھی خطرناک آواز آتی ہے یہاں قریباً قریباً انہی الفاظ میں اونٹنی اور اس کے مارا جانے اور عذاب آنے کا ذکر ہے جیسے سورۂ اعراف میں۔ دیکھو الاعراف۔ رکوع ۱۰۔

۱۴۸۰ حنیذ۔ دو (گرم) پتھروں کے درمیان رکھ کر کباب کیا ہوا اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس سے رطوبت نکل جائے (غ)

حضرت ابراہیمؑ کا ذکر یہاں اصل مقصود نہیں بلکہ مقصود حضرت لوط کا ذکر ہے لیکن چونکہ جو رسول لوط کی قوم پر عذاب کی خبر لائے تھے۔ وہی حضرت ابراہیم کے لیے بھی بشارت لائے تھے۔ اس لیے قرآن کریم نے یہاں اور کئی اور موقعوں پر جہاں قوم لوط کے عذاب کا ذکر کیا ہے اسے حضرت ابراہیم کے ہاں فرزند کی بشارت سے شروع کیا ہے اس اکٹھے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی تباہی نہیں چاہتا بلکہ ان پر بڑے بڑے انعام کرتا رہتا ہے۔ ہاں جب ایک قوم بدی میں حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو نسل انسانی کو بچانے کے لیے اس کی تباہی ضروری ہو جاتی ہے اور حضرت ابراہیم کو قوم لوط کے عذاب سے پہلے اپنی ایک عظیم الشان رحمت کی خبر دی اور بتایا کہ اگر ایک قوم تباہ ہوتی ہے تو تمہاری ہی نسل سے ایک دوسری قوم کھڑی کی جاتی ہے۔

یہ رسول فرشتے تھے یا انسان: یہ رسول کون تھے؟ ان کے آنے کی غرض بتائی انا ارسلنا الی قوم لوط (۷۰)، کون تھے روایات میں ہے کہ وہ فرشتے تھے اور ان کی تعداد بارہ سے لیکر تین تک بیان کی جاتی ہے اور بعض روایات میں ہے کہ وہ جبرائیل، میکائیل اور عزرائیل تھے بائبل میں پیدائش ۱۸ باب میں بھی یہی ذکر ہے اور وہاں بھی ان کو آدمیوں کی شکل میں فرشتے ہی قرار دیا ہے اور ان کی تعداد بھی تین ہی لکھی ہے۔ مگر تمام واقعات جن کا ذکر ہے انہیں انسان ٹھہراتے ہیں مثلاً ابراہیمؑ کا ان کی مہمانی کرنا اور ان کا کھانا کھانا پھر حضرت ابراہیم کا ان کے ساتھ چلنا وغیرہ اور وہیں حضرت ابراہیم کو ان کا بیٹے کی بشارت دینا اور پھر سدوم یعنی حضرت لوط کی بستی کی طرف جانا مذکور ہے۔ قرآن کریم میں صراحت سے یہ ذکر کہیں نہیں کہ یہ فرشتے تھے البتہ یہ ذکر ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ ان کے سامنے کھانا لائے تو انہوں نے کھایا نہیں۔ مگر ان کے دوسرے سارے حالات انسانوں سے ملتے ہیں اور کھانا نہ کھانے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، ممکن ہے اس وقت انہیں بھوک ہی نہ ہو یا روزہ سے ہوں اور آنحضرت صلعم کی کوئی حدیث ایسی نہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ فرشتے تھے۔ رہا یہ کہ انہوں نے حضرت ابراہیم کو بیٹے کی بشارت دی تو یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ اس زمانہ میں کوئی ایسے صالح لوگ ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ خوش خبری دی ہو اور انہوں نے اس کا ذکر حضرت ابراہیم سے کیا حالانکہ حضرت ابراہیم کو اس سے پہلے خود بھی اولاد کی خوشخبری دی تھی مگر چونکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش سے وہ پیشگوئی پوری بھی ہو چکی تھی اس لیے ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم کا خیال یہ ہو کہ اب اور اولاد ان کے ہاں نہ ہو گی تب اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے ذریعہ سے ان کو یہ خبر پہنچائی کہ سارہ کے بطن سے بھی ان کے ہاں اولاد ہو گی۔ اور اصل میں یہ حضرت لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے تھے جو ایک بدکار قوم تھی اور خلاف وضع فطرت انسانی افعال شنیع کا ارتکاب کرتی تھی اور ان کو وہاں بھیجنے کا منشا اس قوم پر اتمام حجت کے رنگ میں معلوم ہوتا ہے یعنی آپس میں تو ایسے افعال کرتے تھے مگر جب مہمانوں پر دست درازی کریں جو نہ صرف ان افعال بد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ جن کی تکریم لازم تھی تو اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر بھڑک اٹھے۔ اگر یہ فرشتے ہوتے جن کی وساطت سے اللہ تعالیٰ اپنا کلام انسانوں کو پہنچاتا ہے تو پھر اس کی صورت وہی ہونی چاہیئے تھی جو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمائی ہے او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشآء (الشوریٰ ۴۲-۵۱) یعنی ملک رسول کو بھیجتا ہے تو وحی کرتا ہے اور کلام وحی اور اس ملک کا آنا اس رنگ میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک دوسرے عالم میں آتا ہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلعم پر جب جبرئیل وحی لیکر آتا تو کوئی دوسرا شخص اُسے نہ دیکھ سکتا نہ اس کے کلام کو سُن سکتا۔ حالانکہ سب سے زیادہ پر زور اور پر شوکت وحی رسول اللہ صلعم کو ہی ہوئی پس حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کو وحی اس رنگ میں ہی ہو سکتی تھی جس طرح ہمارے نبی کریم صلعم کو ہوئی اور ان واقعات میں چونکہ وہ رنگ نہیں اس لیے ماننا پڑے گا کہ یہ کوئی صالح انسان تھے۔ جن کو بطور ایک نشان کے قوم لوط کی طرف بھیجا گیا اور اسی لحاظ سے ان کو رسول کہا گیا جیسا کہ ایک جگہ حضرت صالح کی اونٹنی کے متعلق بھی فرمایا کہ ہم نے اس اونٹنی کو بھیجا انا مرسلوا الناقۃ فتنۃ لھم (القمر ۵۴-۲۷)

حضرت ابراہیمؑ کا فوراً بھنا ہوا بچھڑا لے آنا بتاتا ہے کہ کس قسم کی مہمان نوازی اخلاق انسانی کو کمال تک پہنچانے کے لیے بکار ہے حضرت ابراہیمؑ ان کے

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ
نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا
لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۭ﴿۷۰﴾
وَامْرَاَتُهٗ قَاۗىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا
بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَاۗءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾
قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا
بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ ھٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾
قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ
اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ
حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾
فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَ

مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں اُٹھتے، اُس نے انھیں اجنبی سمجھا اور اُن سے دل میں ڈرا، انھوں نے کہا، نہ ڈر ہم لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں [۱۴۸۱]

اور اس کی عورت کھڑی تھی سو وہ خوش ہوئی تو ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے پیچھے (ایک پوتے) یعقوبؑ کی خوش خبری دی [۱۴۸۲]

اس نے کہا مجھ پر تعجب ہے! میں جنوں گی حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے یہ تو بڑی عجیب بات ہے [۱۴۸۳]

انھوں نے کہا، کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے؟ اے اہل بیت اللہ کی رحمت اور برکتیں تم پر ہیں، وہ تعریف کیا گیا بزرگ ہے۔

سو جب ابراہیمؑ سے ڈر جاتا رہا اور اسے خوش خبری پہنچی

سوال نہیں کرتے کہ تم کھانا کھاؤ گے یا نہیں بلکہ فوراً بہتر سے بہتر غذا جو اُن کی مقدرت میں ہے لا حاضر کرتے ہیں گویا اس میں یہ تعلیم دی ہے کہ مہمان سے دریافت کرنا بھی مہماں نوازی میں ایک قسم کا نقص ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اس قدر تکلیف کرتے ہیں حالانکہ وہ مہمان کھانا کھاتے بھی نہیں۔ اور اس واقعہ کا ذکر اس غرض کے لیے کیا ہے کہ ہر نبی کی زندگی میں جس خاص خلق کا ذکر کیا ہے وہ بدرجہ اتم ہمارے نبی کریم صلعم میں موجود تھا اور خاص خاص اخلاق کی طرف توجہ دلانے کی غرض یہی ہے۔

سلام کا لفظ اختیار کر کے بتایا ہے کہ صلحا کا سلام ایک دوسرے کو ہمیشہ یہی رہا ہے یہاں تک کہ وہ قوم جس کو آج سوائے گڈ مارننگ اور گڈ ایوننگ کے اور کچھ آتا ہی نہیں ان کی کتاب مقدس میں خود حضرت مسیحؑ کا سلام جو انھوں نے حواریوں کو کیا یہی لکھا ہے "یسوع انہیں ملا اور کہا سلام" (متی ۲۸: ۹)

۱۴۸۱ نکر۔ اَنْکَرْتُ اور نَکِرْتُ ایک معنی میں ہیں اور انکار عرفان یعنی پہچاننے کی ضد ہے اور نَکِرَهُمْ اسی معنی میں ہے (غ)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ان کے ہاں مہمان آتا اور وہ کھانا نہ کھاتا تو سمجھتے تھے کہ یہ کسی بد ارادہ سے آیا ہے (ج)

اَوْجَس۔ وَجْس صوت خفی یعنی ایسی آواز کو کہتے ہیں جو سنی نہ جائے اور ایجاس ایسی آواز کا اندر پانا ہے (غ)

حضرت ابراہیمؑ نے ان کے نہ کھانے کو دستور ملک کے مطابق اس بات پر محمول کیا کہ ان کا ارادہ اچھا نہیں۔ اس لیے آپ نے دل میں ان سے خوف محسوس کیا۔ جس کا جواب انہوں نے دیا کہ تمہارے لیے تو خوشخبری ہے۔ ہاں اگر ہم بُرائی کی خبر لائے ہیں تو وہ قوم لوط کے لیے ہے۔

۱۴۸۲ ضحکت۔ ضَحِك۔ چہرہ کا انبساط ہے اور دانتوں کا ظاہر ہونا ہے جو دل میں خوشی پیدا ہونے سے ہو اور استعارۃً استہزا یا تمسخر پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے وکنتم منہم تضحکون (المؤمنون ۲۳-۱۱۰) اور اذا ھم منہا یضحکون (الزخرف ۴۳-۴۷) اور صرف خوش ہونے پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے مسفرۃ ضاحکة (عبس۔ ۳۸ و ۳۹) فلیضحکوا قلیلا (التوبة ۹-۸۲) اور مجرد تعجب پر بھی اس کا استعمال ہے (غ)۔

وراء۔ اس کا مادہ وری ہے اور اس کے معنی دونوں طرح آتے ہیں۔ پیچھے اور آگے گویا وہ وہ چیز ہے جو تم سے چھپی ہوئی ہو آگے ہو یا پیچھے (ت)۔ پس من وراء اسحاق کے معنی ہوئے اسحاق سے آگے یعنی اگلی نسل میں یا اسحاق کی اولاد گویا صرف بیٹے کی خوشخبری نہیں بلکہ ایک قوم کے پیدا ہونے کی خوش خبری ہے اس لیے بتایا کہ اس بیٹے کے بھی بیٹا ہوگا اور تاج العروس میں ہی ہے الوراء ایضاً ولد الولد یعنی بیٹے کے بیٹے کو بھی وراء کہا جاتا ہے۔ یہی معنی حضرت ابن عباس سے مروی ہیں (ج)

امراته قائمة میں بتایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی بی بی بھی مہمانوں کی خدمت میں مشغول تھیں اور ان کے ضحك سے مراد اگر ہنسنا یا خوش ہونا لیا جائے تو اس لیے ہو سکتا ہے کہ ان کو اطمینان ہو گیا کہ یہ لوگ ہمارے متعلق کوئی بُری خبر نہیں لائے، بلکہ قوم لوط کے لیے لائے ہیں اور اسحاق کی خبر پر یہ خوشی نہیں کیونکہ وہ خبر ابھی بعد میں ملتی ہے اور یا ضحك بمعنی تعجب ہے اور تعجب انہیں اس بات پر ہوا کہ حالانکہ دونوں میاں بی بی ان کی خدمت میں مشغول رہے مگر انہوں نے کھانا نہ کھایا۔

۱۴۸۳ یویلتی۔ وَیْل کے اصل معنی برائی ہیں۔ مگر یہ کلمہ یا ویلتا اہل عرب تعجب کے وقت بھی بولتے ہیں (ج)

جَآءَتۡهُ الۡبُشۡرٰى يُجَادِلُنَا فِىۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ ﴿۷۴﴾
اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ ﴿۷۵﴾
يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ
قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمۡ اٰتِيۡهِمۡ
عَذَابٌ غَيۡرُ مَرۡدُوۡدٍ ﴿۷۶﴾
وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِىۡٓءَ بِهِمۡ
وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوۡمٌ عَصِيۡبٌ ﴿۷۷﴾
وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ يُهۡرَعُوۡنَ اِلَيۡهِ ؕ وَمِنۡ
قَبۡلُ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ
يٰقَوۡمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىۡ هُنَّ اَطۡهَرُ لَـكُمۡ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِىۡ ضَيۡفِىۡ ؕ
اَلَيۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِيۡدٌ ﴿۷۸﴾

لوط کی قوم کی نسبت ہم سے جھگڑنے لگا۔ ۱۴۸۴
یقیناً ابراہیمؑ بُردبار، نرم دل (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا تھا۔ ۱۴۸۵
اے ابراہیمؑ یہ خیال چھوڑ دے، کیونکہ تیرے رب کا حکم آچکا ہے اور اُن پر وہ عذاب آنے والا ہے جو ردّ نہیں ہو سکتا۔

اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے وہ ان کی وجہ سے مغموم ہُوا اور انکے معاملے میں ہاتھ کو تنگ پایا اور کہا یہ دن بڑا سخت ہے۔ ۱۴۸۶
اور اس کے پاس اس کی قوم دوڑتی آئی ۱۴۸۷ اور وہ پہلے سے بُرے کام کرتے تھے۔ اس نے کہا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں ہیں یہ تمھارے لیے سب سے بڑھ کر پاک ہیں سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟ ۱۴۸۸

۱۴۸۴ روع۔ رُوع دل کو کہتے ہیں حدیث میں ہے اِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ روح القدس نے میرے دل میں ڈالا۔ اور رَوْع وہ چیز ہے جو دل کو پہنچے اور خوف کو جو دل میں ڈالا جائے رَوْع کہا جاتا ہے (غ)، اور حدیث میں ہے اللّٰھم امن رَوْعاتی اور رَوْعات رَوْعَة کی جمع ہے یعنی ایک مرتبہ خوف (ل)۔

یجادلنا فی قوم لوط یعنی لوط کی قوم پر جو عذاب کی خبر اُنہیں ملی تو اس کے ٹل جانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اسے مجادلہ اس لیے کہا کہ ارادۂ الٰہی ظاہر ہو چکا تھا۔

۱۴۸۵ منیب۔ نَوْب کے معنی ایک چیز کا بار بار لوٹ کر آنا اور نائبة حادثہ کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ لوٹ لوٹ کر آتا ہے اور انابة یہ ہے کہ توبہ اور اخلاص عمل سے بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے خرّ راکعاً واناب (صٓ ۳۸-۲۴) وانیبوا الی ربکم (الزمر ۳۹-۵۴) منیبین الیه (الروم ۳۰-۳۱)

۱۴۸۶ سئ بہم۔ سُوء وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈالے (غ) اس لیے سئ بہم کے معنی ہیں ان کی وجہ سے مغموم ہُوا۔

ضاق بہم ذرعاً ذِراع ہاتھ ہے یعنی کہنی سے لیکر درمیانی انگلی کے آخر تک ہے ذرعها سبعون ذراعاً (الحاقة ۶۹-۳۲) اور ذَرْع کے معنی طاقت بھی آتے ہیں جس طرح ید کے معنی طاقت ہیں اور ضاق بالامر ذَرْعُهٗ کے معنی ہیں اس کی طاقت اس معاملہ میں کمزور ہوئی (ل)۔

عصیب۔ عَصَب پٹھے کو کہتے ہیں اور عَصْب کا استعمال ہر سختی اور مضبوطی پر ہے اور عصیب کے معنی سخت ہیں (غ)۔

جب اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے حضرت لوط کے پاس آتے ہیں تو ان کو اپنی قوم کی بدکاری کی وجہ سے یا اس لیے کہ ان کی قوم اس بات کو پسند نہ کرتی تھی کہ اجنبی لوگ ان کے پاس آکر ٹھہریں جیسا کہ اولم ننهك عن العالمین (الحجر ۱۵-۷۰) سے ظاہر ہے۔ ان کی حفاظت کی فکر ہوئی اور ان کو خوف ہوا کہ وہ ان مہمانوں کی حفاظت نہ کر سکیں گے اس لیے وہ مغموم ہوئے۔

۱۴۸۷ یہرعون۔ ھَرَعَ اور اُھْرِعَ کے معنی ہیں اس کو سختی سے اور ڈرا کر خوب چلایا (غ) اور ابن جریر نے یہرعون کے معنی میں یہ شعر نقل کیا ہے فجاؤا یہرعون وھم اساری ✽ نقودھم علی رغم الانوف جس سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ قیدیوں کو سختی کے ساتھ اور ڈرا کر چلایا جاتا ہے اور وہیں ہے کہ جب انسان سردی یا غضب یا بخار سے کانپتا ہو تو اس پر بھی اُھرع کا استعمال ہوتا ہے اور یہاں ان کے تیز چلنے کو طلب فاحشہ سے منسوب کیا گیا ہے (ج)۔

ضیف۔ ضَیْف کے اصل معنی مَیْل یعنی مائل ہونا ہیں پس ضَیْف وہ ہے جو تمہارے پاس ٹھہرتا ہوا تمہاری طرف مائل ہو یعنی مہمان اور چونکہ اس کا اصل مصدر ہے اس لیے واحد جمع میں یکساں استعمال ہوتا ہے اور اسی سے ضِیافة ہے اور اضافة کا استعمال جو نحو میں ہوتا ہے وہ بھی اسی سے ہے (غ)۔

حضرت لوطؑ کی قوم کے متعلق یہرعون کا لفظ بتاتا ہے کہ وہ کسی خوف کے مارے دوڑے آئے اور ممکن ہے کہ وہ اسی خوف سے آئے ہوں کہ حضرت

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿٧٩﴾

انھوں نے کہا تُو جانتا ہے ہمارا تیری بیٹیوں پر کوئی حق نہیں اور تو خوب جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں ۱۴۸۸؎

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿٨٠﴾

اس نے کہا کاش مجھ میں تمھارے (مقابلہ) کے لیے طاقت ہوتی بلکہ میں ایک مضبوط سہارے کی پناہ لیتا ہوں ۱۴۸۹؎

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿٨١﴾

انھوں نے کہا اے لوطؑ ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں وہ تجھ تک نہ پہنچ سکیں گے تو کچھ رات سے اپنے اہل کو لے نکل سوائے تیری عورت کے اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اس پر وہی مصیبت آنے والی ہے جو ان پر آرہی ہے ان کا مقرر وقت صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں؟ ۱۴۹۰؎

فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا

سو جب ہمارا حکم آگیا ہم نے اُسے تہ و بالا کر دیا۔

لوط اجنبیوں کو اپنے پاس جمع کر رہے ہیں گو اگلے الفاظ اس معنی کی تائید نہیں کرتے جہاں ان کی پہلی بدکاریوں کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی وہ اسی ارادہ سے آئے تھے۔ اور اس قوم کی بےحیائی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ علی الاعلان اور مہمانوں کے ساتھ بھی بےحیائی کے ارتکاب کی خواہش سے اندھے ہو گئے اور کسی قسم کا لحاظ ان کو باقی نہ رہا۔

حضرت لوطؑ کی بیٹیاں: ھٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ ھُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ اس کے ایک معنی تو یہ کیے گئے ہیں کہ حضرت لوط نے اپنے مہمانوں کو بچانے کے لیے فرمایا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں تم ان سے نکاح کر لو۔ کیونکہ وہ لوگ پہلے حضرت لوط سے ان کی بیٹیاں نکاح میں مانگتے تھے تو آپ انکار کرتے تھے۔ اپنے مہمانوں کی حفاظت کے لیے آپ نے اس بات کو بھی قبول کیا کہ وہ اپنی لڑکیاں ان کو نکاح میں دے دیں اور بعض کہتے ہیں کہ ان الفاظ سے صرف ان کو شرم دلانا مقصود تھا حقیقت میں نکاح میں دینا مقصود نہ تھا اور مجاہد اور قتادہ ابن جریج وغیرہم سے روایت ہے کہ ھٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ میں اشارہ عورتوں کی طرف تھا کہ قضائے شہوت کے لیے تمہاری بیویاں موجود ہیں اور وہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں پس تمام حرام اور فاحش طریقوں کو چھوڑ دو اور عام عورتوں کو بناتی اس لحاظ سے کہا کہ نبی اپنی امت کے لیے باپ کے حکم میں ہوتا ہے (ج)۔ یہ آخری تاویل کسی قدر کمزور ہے اس لیے کہ نبی کا باپ ہونا مومنوں کے حق میں ہوتا ہے نہ کفار کے، مگر پھر بھی مجازاً بناتی سے مراد عام عورتیں لی جا سکتی ہیں اور یہی معنی قابل ترجیح ہیں کہ آپ نے مرد اور عورت کے قدرتی اور پاکیزہ تعلق کی طرف توجہ دلائی۔ بائبل میں ایک نہایت فحش قصہ حضرت لوط کی بیٹیوں کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کو شراب پلا کر اس سے زنا کیا۔ انبیاء کے متعلق ایسے ناپاک قصے بیان کر کے بھی یہ کتاب مقدس کہلاتی ہے اور عیسائی اسے فخر سے دنیا میں پھیلا رہے ہیں کچھ تھوڑی سی حیا ہوتی تو اس قسم کے فحش قصوں کو ہی اس کتاب سے نکال دیتے۔

۱۴۸۸؎ اس جواب میں کہ تمہاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تم دوسری قوم سے ہو اس لیے ہم تمہاری بیٹیوں سے نکاح نہیں کر سکتے یا یہ کہ تم ان کے متعلق پہلے انکار کر چکے ہو۔

۱۴۸۹؎ رُکن۔ ایک چیز کا رُکن اس کی وہ جانب ہے جس سے وہ سکون پکڑتی ہے اس لیے استعارۃً اس کے معنی قوت ہیں یعنی سہارا اور اسی سے رَکَنَ کے معنی ہیں ایک جانب مائل ہُوا لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (ھود-۱۱۳) اور عبادت کے ارکان وہ باتیں ہیں جن پر اس کی بنا ہے اور جن کے ترک کرنے سے وہ باطل ہو جاتی ہے (غ)۔

رکن شدید سے مراد: پہلے اپنی کمزوری کا اعتراف ہے کاش مجھ میں یہ طاقت ہوتی کہ میں تمہارا مقابلہ کر کے اپنے مہمانوں کو تم سے بچا سکتا لیکن چونکہ مجھ میں یہ طاقت نہیں اس لیے پھر فرمایا اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ بلکہ میں ایک مضبوط سہارے کی پناہ لیتا ہوں اور گو اس مضبوط سہارے سے بعض مفسرین نے مراد کنبہ لیا ہے مگر حدیث نبوی سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا سہارا ہے۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں رَحِمَ اللّٰهُ لُوْطًا فَاِنَّهٗ كَانَ يَاْوِيْ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ (ج) اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط پر رحم کیا کیونکہ وہ ایک مضبوط سہارے کی پناہ لیتا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کی۔

۱۴۹۰؎ اسریٰ۔ سَرٰی اور اَسْرٰی کے معنی ہیں رات کے وقت چلا قِطْعٌ مِّنَ الَّيْلِ رات کا کچھ حصہ ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿٨٢﴾

اور ہم نے اس پر سخت پتھر پے در پے برسائے [1491]

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٣﴾ ع ٨

تیرے رب کے ہاں سے نشان لگائے ہوئے اور وہ ظالموں سے دُور نہیں [1492] النصف

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمھارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں اور ماپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو، میں تمھیں اچھی حالت میں دیکھتا

یلتفت - التفات کے لیے دیکھو ع۱۴۲۱ حضرت ابن عباس سے یہاں لا یتخلف معنی مروی ہیں یعنی پیچھے نہ رہے (ر) اور بعض نے پھر کر دیکھنا مراد لیا ہے۔

وہ لوگ اس وقت کس طرح اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے اس کی تفصیل قرآن کریم نے نہیں دی بعض آثار میں ہے کہ وہ اندھے کر دیئے گئے۔

ع۱۴۹۱ عالی۔ سافل۔ سُفل۔ عُلُوّ کی ضد ہے اور اَسْفَل اَعلیٰ کی (غ)، والرکب اسفل منکم (الانفال^۸ - ۴۲) میں مراد ایسی طرف ہے جو بوجہ ساحل سمندر کے قریب ہونے کے مدینہ سے نیچی تھی یعنی سطح سمندر سے اس کی بلندی کم تھی اذ جاؤکم من فوقکم ومن اسفل منکم (الاحزاب^۳۳ - ۱۰) میں بھی پست زمین مراد ہے وجعل کلمۃ الذین کفروا السفلیٰ (التوبۃ^۹ - ۴۰) میں مغلوبیت مراد ہے ثمّ رددناہ اسفل سافلین (التین^۹۵ - ۵) میں ذلیل حالت مراد ہے۔

سجّیل - کو سنگِ گِل (یعنی مٹی کا پتھر) اسے معرب خیال کیا گیا ہے لیکن اس لفظ کا مادہ سجل زبان عربی میں موجود ہے اور اس کے مشتقات بکثرت عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے سجّیل کو معرب خیال کرنا صریح غلطی ہے۔ سَجْل بڑے ڈول کو کہتے ہیں جو پانی سے بھرا ہوا ہو اور حدیث میں ہے الحرب بیننا سِجَال یعنی کبھی ایک طرف کو غلبہ ہوتا ہے کبھی دوسری طرف کو اور ایک حدیث میں سورت کی قرأت کے متعلق ہے فَسَجَلَہا یعنی اس کو ملی ہوئی قرأت کے ساتھ پڑھا۔ کیونکہ سجل کے معنی صَبَّ یعنی گرانا بھی آتے ہیں اور اَسْجَلَ کے معنی اَرْسَلَ یا اَطْلَقَ آتے ہیں یعنی بھیجا اور چھوڑ دیا یا آزاد کیا۔ اور سِجِلّ کتاب عہد کو کہتے ہیں اور ابوعبیدہ کہتے ہیں من سجّیل کے معنی ہیں کثیرۃ شدیدۃ یعنی بہت اور سخت اور بعض کے نزدیک سجّیل اَسْجَلَ بمعنی اَرْسَلَ سے ہے یعنی چھوڑ دیا گویا وہ پتھر ان پر بھیجے گئے یا چھوڑے گئے اور یا سجّیل سے مراد سِجِلّ ہے یعنی لکھے ہوئے گویا وہ ان کے لیے مقدر ہو چکے تھے اور سجّیل اور سجّین کے ایک ہی معنی ہیں اور سجّین یعنی کتاب مرقوم قرآن شریف میں ہے وما ادراٰک ما سجّین کتاب مرقوم (التطفیف^۸۳ - ۸ و ۹) (ل) اور ابن جریر نے بعض اہل علم کا قول نقل کیا ہے کہ سجّیل سے مراد سخت ہے۔

منضود - نَضَد سامان کے ایک دوسرے کے اوپر رکھنے پر بولا جاتا ہے (غ) اور منضود کے معنی ہیں یَتْبَع بعضُہٗ بعضًا (ج) ایک دوسرے کے پیچھے آتے تھے بالفاظ دیگر پے در پے برس رہے تھے۔ اور قرآن کریم میں ہے طلحٍ منضود (الواقعۃ^۵۶ - ۲۹) اور ایسا ہی طلع نضید (قٓ^۵۰ - ۱۰) یعنی تہ بتہ۔

لوط کی بستیاں کس طرح تباہ ہوئیں: فجعلنا عالیہا سافلہا کی تفسیر میں مفسرین نے بعض آثار کی بنیاد پر لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل نے زمین کے اس ٹکڑے کو اُٹھا کر اتنا اونچا کیا کہ آسمان والوں نے مرغوں کی آواز اور کتوں کا بھونکنا سنا اور پھر اسے وہاں سے پھینکا، مگر کسی حدیث میں یہ نہیں اور اگر اس سے یہ مراد ہوتی تو پھر ساتھ پتھر برسانے کا ذکر بے معنی ہے کیونکہ جب زمین کے نیچے کا حصہ اوپر آ گیا اور اوپر والا نیچے چلا گیا تو پتھر کہاں برسے گویا قرآن کریم نے پتھر برسانے کا ذکر کر کے خود بتا دیا کہ عالی کو سافل بنانے سے مراد تہ و بالا کرنا ہے اور دوسری جگہ اس قوم کے عذاب کو کہیں صرف امطرنا علیہم مطرا (النمل^۲۷ - ۵۸) کہا ہے اور کہیں انا ارسلنا علیہم حاصبا (القمر^۵۴ - ۳۴) گویا صرف پتھروں کی بارش کا ذکر کیا ہے۔ پس یہی اصل عذاب تھا اور اسی کے ذریعہ سے وہ زمین تہ و بالا کر دی گئی۔ اور ظاہر ہے کہ پتھروں کی بارش آتش فشاں پہاڑوں سے ہوتی ہے اور پے در پے بھیجنے سے بھی یہی منشا ہے۔

ع۱۴۹۲ پتھروں کو مسومۃ یا نشان لگائے ہوئے اس لیے کہا کہ گویا وہ ان کے لیے مقدر ہو چکے تھے۔ اور ما ھی من الظالمین ببعید میں یہ بتایا کہ وہ جگہ ان ظالموں سے جو اس وقت حق کی مخالفت کر رہے ہیں دور نہیں یعنی اسے دیکھتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ہے کہ اس پر تم گزرتے ہو اور یا مراد یہ ہے کہ ایسا ہی عذاب ان ظالموں کے لیے تیار ہے۔

عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿۸۴﴾
وَيَٰقَوْمِ أَوْفُوا۟ ٱلْمِكْيَالَ وَٱلْمِيزَانَ بِٱلْقِسْطِ
وَلَا تَبْخَسُوا۟ ٱلنَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا
تَعْثَوْا۟ فِى ٱلْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۸۵﴾
بَقِيَّتُ ٱللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۚ
وَمَآ أَنَا۠ عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ﴿۸۶﴾
قَالُوا۟ يَٰشُعَيْبُ أَصَلَوٰتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ
مَا يَعْبُدُ ءَابَآؤُنَآ أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِىٓ أَمْوَٰلِنَا
مَا نَشَٰٓؤُا۟ ۖ إِنَّكَ لَأَنتَ ٱلْحَلِيمُ ٱلرَّشِيدُ ﴿۸۷﴾
قَالَ يَٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ
مِّن رَّبِّى وَرَزَقَنِى مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ
وَمَآ أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَآ أَنْهَىٰكُمْ
عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا ٱلْإِصْلَٰحَ مَا
ٱسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِىٓ إِلَّا بِٱللَّهِ ۚ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿۸۸﴾
وَيَٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِىٓ أَن
يُصِيبَكُم مِّثْلُ مَآ أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ
قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَٰلِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ
لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ ﴿۸۹﴾

ہوں اور میں تم پر گھیر لینے والے دن کے عذاب کے آنے سے ڈرتا ہوں۔[۱۴۹۲ع]

اور اے میری قوم! ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور فساد پھیلاتے ہوئے زمین میں حد سے نہ بڑھو۔

جو اللہ کے پاس باقی رہتا ہے وہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو، اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوں[۱۴۹۴ع]

انھوں نے کہا اے شعیبؑ کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا اپنے مالوں میں جس طرح چاہیں (نہ) کریں بیشک تو بڑا بُردبار سیدھی راہ پر چلنے والا ہے[۱۴۹۵ع]

اس نے کہا اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب سے ایک کھلی دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے اچھی روزی دی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تمھاری مخالفت کر کے وہ کام کروں جس سے میں تمھیں روکتا ہوں میں سوائے اصلاح کے کچھ نہیں چاہتا جہاں تک میری طاقت ہے اور مجھے توفیق ملنا اللہ کی مدد سے ہی ہے اسی پر میں بھروسا رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں —

اور اے میری قوم میری دشمنی تم سے ایسا نہ کرائے کہ تم پر ایسی ہی مصیبت آپڑے جیسی نوحؑ کی قوم، یا ہودؑ کی قوم، یا صالحؑ کی قوم پر پڑی اور لوطؑ کی قوم بھی تم سے دور نہیں[۱۴۹۶ع]

۱۴۹۳ع خیر۔ وہ چیز ہے جس میں سب رغبت کریں۔ اور اس کی ضد شر ہے اور ایک چیز کو دوسری کے مقابلہ میں بھی خیر کہا جاتا ہے جیسے مال کثیر کو خیر کہا جاتا ہے اور یہاں مراد دنیوی نعمتیں یا آسایش کی حالت ہے باقی کے لیے دیکھو ع۱۱۲۰۔

۱۴۹۴ع بقیة الله۔ بقاء کسی چیز کا پہلی حالت پر ثابت رہنا ہے۔ اور اپنے نفس میں باقی رہنے والی صرف ذات باری ہے۔ باقی سب کا بقا اسی کی ذات سے ہے ایسا ہی بقا اہل جنت کا ہے اور الباقیات الصالحات، (الکھف ۱۸۔ ۴۶) وہ اعمال ہیں جن کا ثواب انسان کے لیے باقی رہتا ہے اور بقیة الله سے مراد بھی یہی ہے اور اس کی اضافت اللہ کی طرف ہے (غ) اور اس کے معنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا اللہ تعالیٰ کا رزق بھی کیے ہیں (ج)

۱۴۹۵ع بظاہر ان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نماز پڑھتے ہو تو پڑھو ہماری باتوں میں دخل کیوں دیتے ہو۔ ہم اپنے پرانے طریق پر عبادت کرتے ہیں جس طرح ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ رہے مال سو وہ ہماری چیز ہے جس طرح پر چاہیں کریں کم دیں یا زیادہ دیں اور یہ جو کہا کہ تم حلیم رشید ہو تو بعض نے اسے بطور تہکم مراد لیا ہے یعنی تم اپنے زعم میں حلیم و رشید ہو۔ مگر قرین قیاس یہ ہے کہ وہ حضرت شعیبؑ کی حلیمی اور رشد کے قائل تھے۔

۱۴۹۶ع رزق حسن سے مراد یہاں نبوت و حکمت ہے (ر) کیونکہ یہی وہ رزق ہے جو انبیاء کو خصوصیت سے ملتا ہے اور ان کی اس بات کا کہ ہماری باتوں میں دخل نہ دو یہ جواب دیا ہے کہ میں تمھاری اصلاح چاہتا ہوں اور یہ کہ میں خود اسے اچھا سمجھتا ہوں اس سے ظاہر ہے کہ میں خود بھی اس پر عامل ہوں۔

۱۴۹۶ع الف یہاں کیسی صفائی سے بتا دیا کہ جس طرح ہودؑ اور صالحؑ اور لوطؑ کی قوم پر عذاب آیا اسی طرح حضرت نوحؑ کی بھی قوم پر عذاب آیا جس سے معلوم ہوا

وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۹۰

اور اپنے رب کی بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پھر آؤ، میرا رب رحم کرنے والا محبت کرنے والا ہے ع۱۴۹۷

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۹۱

انھوں نے کہا اے شعیبؑ ہمیں بہت سی وہ باتیں سمجھ نہیں آتیں جو تو کہتا ہے اور ہم تجھے اپنے اندر کمزور دیکھتے ہیں اور اگر تیرے بھائی بند نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے اور تو ہم پر غالب نہیں ع۱۴۹۸

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۹۲

اس نے کہا اے میری قوم کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر اللہ سے زیادہ ہے اور تم نے اسے پیٹھ کے پیچھے ڈال رکھا ہے میرا رب اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو تم کرتے ہو ع۱۴۹۹

وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَ ارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۹۳

اور اے میری قوم اپنی طاقت کے مطابق عمل کرو، میں بھی عمل کرنے والا ہوں، تم جان لوگے کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے اور کون جھوٹا ہے اور دیکھتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۹۴

اور جب ہمارا حکم آگیا ہم نے شعیبؑ کو اور انھیں جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت کے ساتھ بچالیا اور جنھوں نے ظلم کیا اُن کو سخت آواز نے آپکڑا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہی رہ گئے۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ

گویا کہ اُن میں بسے ہی نہ تھے سنو مدین پر پھٹکار ہے جیسے

کہ طوفان نوح کا عذاب صرف قوم نوح کے لیے تھا نہ کل عالم کے لیے، سارے قرآن شریف میں جہاں جہاں حضرت نوحؑ کا ذکر آتا ہے ان کی قوم کا اسی طرح ذکر ہے جس طرح دوسرے انبیاءؑ کی قوموں کا۔

ع۱۴۹۷ ودود۔ وُدٌّ کے لیے دیکھو ع۱۳۷ا اس میں محبت سے بڑھ کر ایک چیز کے ہونے کی تمنی بھی ہے اور ودود وہ ہے جو بندوں سے مودت رکھتا ہے یعنی بندوں کے لیے مراعاۃ یا ان کی حفاظت بھی اس میں شامل ہے۔ اور یا ودود کے معنی میں یہ داخل ہے کہ اللہ ایک ایسی قوم کو لاتا رہتا ہے جو اس سے محبت کرے اور جن سے وہ محبت کرے (غ)

ع۱۴۹۸ رہط کسی شخص کا رَھْط اس کی قوم یا قبیلہ ہے۔ اور تین یا سات سے دس تک کے عدد کو ظاہر کرتا ہے (ل)

شعیبؑ کی نابینائی کی روایت: انبیاء کی تعلیم ایسی سادہ ہوتی ہے کہ عام انسان اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم سمجھتے نہیں گویا اس بات کے قائمقام ہے کہ ہم پروا نہیں کرتے۔ کیوں کہ تم ہم میں کوئی طاقتور آدمی نہیں ہو کہ تمہاری بات کی ہم پروا کریں۔ ضعیف سے یہی مراد ہے اور یہ جو حضرت ابن عباسؓ سے ضعیف کے معنی اندھا مروی ہیں تو یہ درست نہیں اس لیے کہ انبیاء ایسے عیوب سے پاک ہوتے ہیں اور یہاں لفظ ہیں کہ ہم تم کو اپنے اندر ضعیف پاتے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے مقابلہ میں تم کمزور ہو اور اگر ضعیف سے اندھا مراد لیا جائے جس پر لغت کی بھی شہادت نہیں تو معنی کچھ نہیں بنتے۔ کیونکہ اپنے اندر اندھا پانا بے معنی ہے۔

ع۱۴۹۹ ظِہْرِی۔ ظَہْر کے معنی پیٹھ ہیں اور ظِہْرِیّ اسے بھی کہتے ہیں جسے سواری کے لیے تیار کیا جائے اور اسے بھی جسے پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا جائے (غ) یہی دوسرے معنی یہاں ہیں۔

كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾

ثمود پر پھٹکار ہوئی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾

اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنے نشانوں اور کھلی سند کے ساتھ بھیجا۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾

فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، مگر انھوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی اور فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾

وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا سو ان کو آگ پر پہنچا دیگا اور کیا ہی بُری گھاٹ ہے جس پر پہنچے ع۱۵۰۰

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾

اور اس دنیا میں بھی لعنت اُن کے پیچھے لگی رہی اور قیامت کے دن بھی بُرا انعام ہے جو دیا جائے گا ع۱۵۰۱

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿١٠٠﴾

یہ بستیوں کے کچھ حالات ہیں جو ہم تجھ پر بیان کرتے ہیں ان میں سے کچھ آباد اور (کچھ) اجڑی ہوئی ہیں۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿١٠١﴾

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا سو جب تیرے رب کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبود ان کے کچھ کام نہ آئے جنھیں وہ اللہ کے سوائے پکارتے تھے اور اُن کے حق میں ہلاکت ہی بڑھائی ع۱۵۰۲

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿١٠٢﴾

اور اسی طرح تیرے رب کی پکڑ ہوتی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے درانحالیکہ وہ ظالم ہوں ہاں اس کی پکڑ دردناک سخت ہوتی ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿١٠٣﴾

یقیناً اس میں اس کے لیے نشان ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے، یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور یہ حاضری کا دن ہے ع۱۵۰۳

ع۱۵۰۰ اورد ۔ وُرُود پانی کا قصد کرنا ہے پھر اس کے غیر میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں اور دوسرے مقامات پر آگ پر استعمال ہوا ہے گویا پانی کی جگہ آگ پائیں گے (غ) اور وَرَدَ کا استعمال صرف پہنچنے پر ہے جب ابھی اس میں داخل نہ ہوا ہو جیسے ولمّا ورد ماء مدین (القصص ۲۸ ۔ ۲۳) اور جب ایک شخص کسی شہر تک پہنچ جائے مگر اس میں ابھی داخل نہ ہوا ہو تو کہا جاتا ہے وَرَدَ بَلَدَ کذا اور بعض کے نزدیک داخل ہو جائے یا نہ ہو دونوں حالتوں میں وَرَدَ کا استعمال ہوتا ہے ۔ اور جوہری کا قول ہے کہ ورود بالاجماع پہنچنے پر استعمال ہوتا ہے جب اس میں داخل نہ ہوا ہو (ل) اور وِرْد وہ لوگ ہیں جو پانی پر پہنچتے ہیں یا اونٹ وغیرہ اور پانی کی جگہ کو بھی وِرْد کہا جاتا ہے اور وِرْد قرآن کریم کے اس حصّہ کو بھی کہا جاتا ہے جو مقرر طور پر پڑھا جائے (ل) اور وَارِد کے معنی ہیں آگے چلنے والا جو پانی لاتا ہے ۔ فارسلوا واردھم (یوسف ۱۲ ۔ ۱۹) (غ)

ع۱۵۰۱ رفد ۔ رِفد عطیہ کو کہتے ہیں اور رفد عطیہ دیا (غ)

ع۱۵۰۲ تتبیب ۔ تَبّ اور تباب خسران یعنی گھاٹے میں پڑے رہنا ہے تبّت یدا ابی لھب (اللھب ۱۱۱ ۔ ۱) وما کید فرعون الا فی تباب (المؤمن ۴۰ ۔ ۳۷)

ع۱۵۰۳ مشہود ۔ شہود کے معنی حاضر ہونا اور مشہود یہاں بمعنی شاھد ہے یعنی جس کا مشاہدہ ضرور ہوگا مطلب یہ کہ آکر رہے گا (غ)

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝۱۰۴

اور ہم اِسے ایک مقرر وقت کے لیے ہی پیچھے ڈال رہے ہیں۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ۝۱۰۵

جس دن وہ آجائے گا کوئی شخص سوائے اس کے حکم کے بات نہیں کریگا، پھر ان میں سے بدقسمت اور خوش قسمت ہوں گے ۱۵۰۴

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝۱۰۶

سو جو بدقسمت ہیں وہ آگ میں ہوں گے اُن کے لیے اس میں چیخنا اور چلّانا ہوگا ۱۵۰۵

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝۱۰۷

اسی میں رہیں گے، جب تک آسمان اور زمین ہیں مگر جو تیرا رب چاہے، کیوں کہ تیرا رب جو چاہے کر گزرے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝۱۰۸

اور وہ جو خوش قسمت ہیں وہ جنت میں ہوں گے، اُسی میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے یہ بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی ۱۵۰۶

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَاۗءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ

سو اُن کے متعلق کچھ بھی شک نہ کر جن کی یہ عبادت کرتے ہیں وہ اسی طرح عبادت کرتے ہیں جیسے پہلے ان کے باپ دادا عبادت

۱۵۰۴ شقی۔ سعید۔ شُقَاوۃ۔ سعادۃ کی ضد ہے اور سَعْد اور سَعَادۃ انسان کے لیے بھلائی کے پانے پر امور الٰہیہ کی اعانت ہے اور شقاوۃ اور سَعَادۃ دنیوی بھی ہے اور اُخروی بھی اور سب سے بڑی سعادت جنت ہے (غ) یا سَعْد۔ یُمن یعنی برکت ہے۔

یہاں شقی اور سعید کی تقسیم اس لحاظ سے ہے کہ جو لوگ جنّت میں داخل ہونگے وہ سعید ہوئے اور جو آگ میں وہ شقی ہونگے۔

۱۵۰۵ زفیر۔ شہیق زفیر سانس کا اندر کو کھینچنا یہاں تک کہ پسلیاں اس سے پھول جائیں اور شہیق..... سانس کا لوٹانا اور زفیر اس کا مدیا اندر کھینچنا ہے اور جَبَلٌ شَاهِقٌ بڑے بلند پہاڑ کو کہتے ہیں اور اسی سے شہیق ہے (غ) دوزخ کے متعلق دونوں لفظ آتے ہیں سمعوا لها شهيقا (الملک[۷]۔)، سمعوا لها تغيظا و زفيرا (الفرقان[۲۵]۔ ۱۲) اور لسان العرب میں ہے کہ گدھے کی آواز کا پہلا حصّہ زفیر ہے پچھلا شہیق۔ کیونکہ زفیر سانس کا اندر لیجانا ہے اور شہیق اس کا باہر نکالنا۔ اور اسی میں ہے کہ زفیر یہ ہے کہ انسان کا سینہ غم سے بھرا ہوا ہو پھر وہ اسے نکالے۔

۱۵۰۶ مجذوذ۔ جَذّ کے معنی ہیں کسی چیز کا توڑنا اور اس کا فنا کر دینا فجعلهم جذذا (الانبیاء[۲۱]۔ ۵۸) اور غیر مجذوذ کے معنی ہیں غیر مَقْطُوْعٍ عنهم یعنی جو ان سے کبھی قطع نہ کی جائے گی (غ)

یہاں جنت اور دوزخ کے ذکر میں کہ ان کے اندر ہمیشہ کے لیے رہنا ہوگا ایک بیّن فرق نظر آتا ہے یعنی دونوں میں اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ فرما کر دوزخ کی صورت میں پیچھے یہ لفظ لائے گئے ہیں کہ تیرا رب جو چاہے کر گزرے یعنی چاہے تو انہیں دوزخ سے نکال دے اور بہشت کی صورت میں یہ کہ یہ عطا کبھی منقطع نہ ہوگی یعنی بہشت سے کبھی کوئی شخص باہر نہ نکالا جائے گا یہ کھلا فرق جو صاف بتا رہا ہے کہ دوزخ کے لیے وہ ہمیشگی نہیں جو جنت کے لیے ہے ہماری توجہ کو اس طرف پھیرتا ہے کہ آیا کبھی دوزخی دوزخ سے باہر بھی نکالے جائیں گے۔ ابن جریر نے چار مختلف توجیہات پہلی آیت کی تفسیر میں روایت کی ہیں۔ اوّل یہ کہ الا ما شاء ربك میں جو استثنا ہے وہ اہل توحید کے لیے ہے یعنی سب دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے سوائے اہل توحید کے کہ جو ایسے لوگ گنہگار ہوں گے ان کے لیے ہمیشگی نہیں ہوگی دوم یہ کہ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ میں جو استثنا ہے وہ گنہگار اہل توحید کے دخول کے متعلق ہے یعنی سب گنہگار داخل نار ہونگے مگر اہل توحید نہیں۔ تیسرا یہ کہ یہ سب لوگوں کے متعلق ہے یعنی سب دوزخیوں کو آخرکار دوزخ سے نکال دیا جائے گا۔ چوتھا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہل نار کے متعلق اپنی مشیت کی خبر نہیں دی، چاہے اللہ تعالیٰ ان کی سزا میں زیادتی کر دے اور چاہے کمی کر دے ان چاروں توجیہات میں سے دوسری صریحاً غلط ہے اس لیے کہ فساق اہل ایمان کا نار میں جانا صریح آیات قرآنی اور احادیث سے ثابت ہے اور چوتھی میں جو یہ حصہ ہے کہ استثنا سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چاہے تو دوزخ والوں کا عذاب بڑھا دے یہ بھی بالبداہت باطل ہے کیونکہ استثنا خلود سے ہے اس میں گھٹانے بڑھانے کا سوال نہیں خلود کا استثنا یہی ہو سکتا ہے کہ انہیں باہر نکال دے اس لیے پہلی اور تیسری توجیہ

مِنْ قَبْلُ ۚ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝۱۰۹ ع

کرتے تھے اور ہم ان کو ان کا حصہ بغیر کم کیے پورا پورا دینے والے ہیں۔

باقی رہ جاتی ہے۔ اول ہم پہلی توجیہ کو لیتے ہیں۔

عصاۃ مومنین اور کفار کے خلود عذاب میں قرآن کریم نے کوئی فرق نہیں رکھا: جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اہل ایمان میں سے نافرمان لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے مگر معتزلہ اس کے قائل نہیں ان کے نزدیک جو دوزخ میں پڑیں گے وہ ہمیشہ دوزخ میں ہی رہیں گے اور خوارج بھی اس کے قائل نہیں۔ جمہور کے مذہب کی بنا ان احادیث پر ہے جن میں شفاعت کا ذکر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا قرآن شریف نے نافرمانوں اور کافروں کی سزامیں کوئی ایسا امتیاز رکھا ہے اس کے لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں ہر شخص جس نے قرآن شریف کو پڑھا ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کریم نے ایسا کوئی فرق نہیں رکھا بلکہ دونوں کے لیے یکساں خلود رکھا ہے اور نہ صرف ہر ایک بدکار کے لیے دوزخ جگہ بتاتی ہے بغیر اس امتیاز کو ظاہر کرنے کے کہ وہ ایمان کا دعویٰ کر کے بدکاری کرتا ہے یا علی الاعلان کافر ہو کر۔ بلکہ صاف طور پر صرف حکم الٰہی کے نافرمانوں کا ذکر کر کے جن سے مراد صریحًا اسلام کا دعویٰ کرنے والے ہیں ان کے خلود فی النار کا ذکر کرتا ہے مثال کے طور پر اس آیت کو لو جو احکام وراثت کے بعد آتی ہے اور جس میں صریحًا مسلمانوں کا ذکر ہے جو ان احکام وراثت کی نافرمانی کرتے ہیں اور اس میں یہ لفظ ہیں ومن یعص اللہ ورسوله ویتعد حدوده یدخله نارا خالدا فیها وله عذاب مهین (النسآء۔ ۱۴) اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اس کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرے اسے آگ میں داخل کرے گا اسی میں وہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ اور جگہ پر بھی اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کی سزا ایسے ہی الفاظ میں بیان فرمائی ہے بلکہ ابدا کا لفظ بھی ساتھ بڑھایا ہے ومن یعص اللہ ورسوله فان له نار جهنم خالدین فیها ابدا (الجن۔ ۲۳) اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے ابد تک اسی میں رہے گا۔ ان نافرمانی کرنے والوں میں سے مسلمان کہلا کر نافرمانی کرنے والوں کو باہر رکھنا صریح الفاظ قرآنی کے خلاف ہے۔ پس جہاں تک خلود اور ابد کا سوال ہے وہ فساق اہل توحید اور کفار پر یکساں حاوی ہے پس اگر ایک کے لیے کوئی استثنا ہے تو دوسرے کے لیے بھی استثنا ہے۔ اگر کوئی صحیح حدیث نبی کریم صلعم کی ہوتی جس میں آپ نے فرمایا ہوتا کہ الا ماشاء ربك میں جو استثنا ہے وہ صرف اہل توحید کے لیے ہے تو بیشک وہ حجت تھی مگر کسی تابعی یا تبع تابعی کا یہ خیال اسے حجت نہیں بنا سکتا۔ بلکہ قرآن کریم نے دوسری جگہ صرف کفار کا ذکر کر کے جو اسلام کو قبول نہیں کرتے یوں فرمایا قال النار مثوٰکم خالدین فیها الا ماشاء اللہ (الانعام۔ ۱۲۸) یہاں بھی استثنا صرف کفار کے لیے موجود ہے۔ یعنی خلود سے نکل بھی سکتے ہیں۔ ہاں احادیث شفاعت، سو ان پر آگے بحث آتی ہے۔

جہنم پر فنا آنے کی شہادت: پس اب صرف ایک ہی توجیہ باقی رہ جاتی ہے اور اس کی تائید میں نہ صرف صحابہؓ کے اقوال موجود ہیں بلکہ احادیث شفاعت بھی اسی کی موید ہیں۔ اقوال صحابہؓ میں سے حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اہل نار کو آگ کھا جائے گی اور ابن مسعودؓ کا قول ہے لیاتین علی جهنم زمان تخفق ابوابها لیس فیها احد وذلك بعد ما یلبثون فیها احقابا۔ یعنی دوزخ پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس کے دروازے کھٹکھٹائیں گے اس میں کوئی نہیں ہوگا اور یہ اس کے بعد ہوگا جو اس میں احقاب تک رہ چکے ہونگے۔ یہ دونوں قول ابن جریر میں منقول ہیں اور وہیں شعبی کا قول ہے جهنم اسرع الدارین عمرانا واسرعهما خرابا یعنی دوزخ دونوں گھروں میں بننے میں بھی جلدی بنتا ہے اور ویران ہونے میں بھی سب سے جلدی ویران ہوگا۔ اور تفسیر فتح البیان میں اسی آیت کی تفسیر میں منادی الکبیر کی عبارت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار کا عذاب جہنم میں ہمیشہ کے لیے ہوگا اور اس کے سوائے جس قدر اقوال ہیں ان کی تاویل واجب ہے۔ مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا قول کہ دوزخیوں کو ایک وقت تک عذاب ہوگا۔ پھر ان کی طبیعت ہی اس کے موافق ہو جائے گی اور اس وجہ سے وہ اس سے بھی لذت حاصل کریں گے اور کہ وعدہ کو سچا کرنا قابل تعریف امر ہے نہ وعید یعنی سزا کے وعدہ کو بلکہ اس سے تجاوز کرنا قابل تعریف امر ہے اور آگے لکھا ہے کہ ایک جماعت اس بات کی قایل ہے کہ دوزخ فنا کر دیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک وقت رکھا ہے جس پر پہنچکر وہ ختم ہو جائے گا اور پھر لکھا ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کے اقوال نقل کیے ہیں کہ دوزخ فنا ہو جائے گا اور ابن قیم نے اس کی تائید کی ہے۔ مگر یہ مذہب متروک ہے اور جمہور نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ عصاۃ مومنین ہی دوزخ سے نکالے جائیں گے نہ کفار اس کلام کو نقل کر کے فتح البیان میں ان اقوال کو لکھا ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کا قول لو لبث اهل النار فی النار کقدر رمل عالج لکان لهم علی ذلك یوم یخرجون فیه یعنی اگر اہل دوزخ دوزخ میں اتنی مدت بھی رہیں جیسے ریت کے انبار پر انبار تو بھی ایک دن ان پر آئے گا جس میں وہ نکالے جائیں گے اور اس روایت کے رجال کو ثقات قرار دیا ہے۔ اور ایک قول حضرت ابو ہریرہؓ کا ہے سیاتی علی جهنم زمان لا یبقی فیها احد جہنم پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس میں کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ اور ابن مسعود کا قول جو اوپر نقل ہو چکا اور ابن عمرو ابن العاص کا قول لیاتین علی جهنم یوم تصفق فیها ابوابها لیس فیها احد جہنم پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کے دروازے بند ہو جائیں گے اس میں کوئی نہیں رہے گا۔ اور پھر لکھا ہے کہ جس طرح کے اقوال حضرت عمرؓ اور ابو ہریرہؓ اور ابن مسعودؓ کے بیان ہوئے ہیں اس قسم کے اور اقوال سلف نے صحابہؓ سے روایت کیے ہیں مثلاً ابن عباسؓ ابن عمرؓ جابرؓ ابی سعید سے اور ایسے ہی اقوال تابعین کے بھی ہیں اور پھر لکھا ہے کہ اس سے اس کی صحت ثابت ہوتی ہے جو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے کہا ہے

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾

اور ہم نے ہی موسیٰؑ کو کتاب دی پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے نہ ہو چکی ہوتی، تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور وہ اس کے بارے میں سخت شک میں ہیں ۱۵۰۷

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور یقیناً تیرا رب سب کے سب کو ان کے عمل پورے پورے دیگا، کیونکہ یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ اس سے خبردار ہے ۱۵۰۸

اور ابن حجر اور مناوی نے جو کچھ اس پر کہا ہے اس کا بودا پن ثابت ہوتا ہے۔ اور یہی حق بھی ہے اس لیے کہ ان صریح اقوال کی یہ تاویل کہ عصاۃ مومن نکلیں گے اور کفار دوزخ میں ہی بھرے رہیں گے کسی طرح بھی درست نہیں جہنم کے دروازے بند ہو جانا۔ اس میں کسی کا نہ رہنا سب کا ایک دن نکل آنا یہ صاف بتاتا ہے کہ جہنم سے آخر کار سب نکال دیئے جائیں گے۔

اور حدیث شفاعت بھی اسی کی موید ہے۔ صحیح حدیث میں ہے شَفَعَتِ الملائکۃُ وشَفَعَ النبیّون وشفع المومنونَ ولم یَبْقَ اِلّا ارحمُ الراحمین فَیَقْبِضُ قبضۃً من النّار فیُخرج منہا قوماً لم یعملوا خیراً قطُّ یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتے بھی شفاعت کر چکے اور نبی بھی شفاعت کر چکے اور مومن بھی شفاعت کر چکے اور اب سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا باقی رہ گیا پس ایک مٹھی دوزخ سے بھرے گا اور اس سے ان لوگوں کو باہر نکال دے گا جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی نہ کی تھی۔ اب اس حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ پہلے تین قسم کی شفاعت ہے مومنوں کی نبیوں کی فرشتوں کی۔ ظاہر ہے کہ مومنوں کی شفاعت بہت محدود ہے صرف اپنے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے، اس سے بڑھ کر انبیاء کی شفاعت ہے اور وہ اپنی امتوں کے لیے۔ اس کے بعد فرشتوں کی شفاعت ہے اس کا دائرہ اس سے بھی وسیع ہے کیونکہ وہ تمام نیکی کرنے والوں کے لیے ہے اور ارحم الراحمین ایک ایسی قوم کو نکالے گا جس کا تعلق نہ کسی مومن سے تھا، نہ کسی نبی سے نہ نیکی کے محرک فرشتوں سے اور اس لیے انہوں نے کبھی کوئی نیکی نہ کی تھی اور خدا کی مٹھی سے باہر کون رہ جائیگا والارض جمیعاً قبضتہ یوم القیامۃ والسمٰوٰت مطویّٰت بیمینہٖ (الزمر ۳۹ - ۶۷)

اور اس کے بالمقابل خلود اور ابد کی بحث بے سود ہے اس لیے کہ جو خلود اور ابد عصاۃ مسلمین کے لیے ہے وہی کفار کے لیے ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں جو بات ایک کو مستثنیٰ کر سکتی ہے وہی دوسرے کو۔ اور اصل بات یہ ہے کہ خلود کے لیے دیکھو ۳۹ و ہمیشگی لازم نہیں بلکہ یہ بقائے طویل کا نام ہے۔ رہا لفظ ابد۔ سو مفردات میں تَاَبَّدَ الشَّیْئُ کے معنی میں لکھا ہے وَیُعَبَّرُ بِہٖ عَمَّا یَبْقٰی مُدَّۃً طَوِیْلَۃً یعنی اس سے مراد وہ چیز لی جاتی ہے جو مدت طویل تک باقی رہے اور پھر ابد کی جمع آباد زبان عربی میں آتی ہے حالانکہ اگر اس کے معنی ہمیشگی ہوتے تو جمع نہ ہو سکتی تھی اور اس طرح اس کی تاکید بھی آتی ہے اَبَدٌ اَبِدٌ وابید حالانکہ اگر غیر محدود زمانہ اور ہمیشگی لازماً اس کے معنی میں ہوتی تو تاکید بھی نہ آسکتی تھی اور امام راغب لکھتے ہیں کہ حق یہ تھا کہ ابد کی جمع کوئی نہ آتی کیونکہ یہ تصور نہیں آسکتا کہ ایک ابد کے ساتھ دوسرا ابد ملایا جا سکے لیکن آباد کہا جاتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اس کو اس کے ایک حصّہ کے لیے خاص کر لیا گیا ہے جو اس میں شامل ہے جیسا کہ اسم جنس کو اس کے بعض سے خاص کر لیا جاتا ہے گو غیر محدود زمانہ کا حصّہ کوئی نہیں کہلا سکتا تاہم اس توجیہ کا بھی صاف مطلب یہ ہے کہ ابد کے لفظ کا استعمال محدود لمبے زمانہ پر بھی ہو سکتا ہے اور غیر محدود زمانہ پر بھی۔ اگر غیر محدود زمانہ بھی اس سے مراد لیا جائے تو بھی الّا ماشاء ربك کے استثنا نے دوزخیوں کو اس سے باہر نکال دیا ورنہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن شریف نے دوسری جگہ لابثین فیہا احقابا (النبأ ۷۸ - ۲۳) کہہ کر یہ صاف بتا دیا کہ دوزخ کا ابد بھی ایک محدود زمانہ ہے برخلاف بہشت کے ابد کے کہ اس کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں فرمایا جو محدود زمانہ پر ہی بولا جا سکتا ہو جیسا کہ احقاب ہے جو حقبۃ کی جمع ہے۔ اور دوسرے بہشت کی ابدیت کو عطاء غیر مجذوذ قرار دے کر بھی واضح کر دیا کہ یہ نعما ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں۔

۱۵۰۷ حضرت موسیٰؑ کا ذکر پچھلی سورت میں ہو چکا ہے اس لیے یہاں صرف اسی پر اکتفا کیا ہے غرض وہی ہے جو دوسرے انبیاء کے ذکر میں ہے یعنی آنحضرت صلعم کو تسلی دینا۔ اختلاف فی الکتاب کے لیے دیکھو ۲۱۴ اور وہ بات جو پہلے ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی سزائیں بوجہ اپنے رحم عظیم کے تاخیر کرتا رہتا ہے جیسا کہ آیت ۱۱۹ میں وضاحت کر دی ہے۔

۱۵۰۸ کلا میں تنوین مضاف الیہ کے قائم مقام ہے یعنی سب اختلاف کرنے والے یا سب کے سب مومن ہوں یا کافر۔

لَمّا کا استعمال کلام عرب میں کئی طرح پر ہے حین یعنی وقت کے معنی میں ولما ورد ماء مدین (القصص ۲۸ - ۲۳) فلما بلغ معہ السعی (والصّٰفّٰت ۳۷ - ۱۰۲) یعنی جب ایسا ہوا۔ اور لَمْ جازمہ کے معنی میں یعنی صرف نفی کے لیے جیسے بل لما یذوقوا عذاب (صٓ ۳۸ - ۸) ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم (التوبۃ ۹ - ۱۶) اور اِلّا کے معنی میں ان کل نفس لما علیہا حافظ (الطارق ۸۶ - ۴) جس کے معنی ہیں کوئی نفس نہیں مگر اس پر حافظ ہے یا وان کلٌّ لَّمّا

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ
وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾
وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ
النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ
اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

سو سیدھی راہ پر چلتا رہ جیسا تجھے حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی جو توبہ کر کے
تیرے ساتھ ہوا اور حد سے نہ بڑھو جو کچھ تم کرتے ہو وہ اُسے دیکھ رہا ہے ن۱۵۰۹
اور ان کی طرف نہ جھکو جو ظالم ہیں، ورنہ تمھیں آگ چھو جائے گی اور
اللہ کے سوائے تمھارے کوئی حمایتی نہ ہوں گے، پھر تمھیں مدد
بھی نہیں ملے گی ن۱۵۱۰

جمیع لدینا محضرون (یٰس ۳۶ - ۳۲) یعنی ما کل الا جمیع کوئی نہیں مگر سب کے سب ہمارے حضور حاضر کیے جائیں گے گویا یہ لَمْ اور مَا سے مرکب ہے جیسے اِلَّا اِن اور لا سے یا دو نفیوں کا اجتماع ہے جو دونوں مل کر اور ایک لفظ ہو کر نفی کی حد سے نکل گئے۔ اور اس کے معنی اِلَّا ہونے پر بطور شہادت یہ آیت قرآنی بھی پیش کی گئی ہے ان کل الا کذب الرسل (ص ۳۸ - ۱۴) اور کبھی کسی چیز کے انتظار کے لیے آتا ہے جس کے ہونے کی توقع کی جاتی ہے (ل)

یہاں اگر اِن کلا ہوتا جو نافیہ ہے تو لَمَّا کے معنی اِلَّا لیکر ترکیب درست ہو جاتی مگر یہاں اِنَّ کُلًّا ہے۔ تو بعض نے اس صورت میں بھی معنی اِلَّا ہی لیے ہیں اور بعض نے لَمَنْ مَا اس کا اصل قرار دیا ہے یعنی کوئی بھی ہو جس میں نون کو میم سے تبدیل کر کے تین میموں کے جمع ہو جانے کی وجہ سے ایک حذف کیا گیا اور باقی دو میں سے ایک دوسرے میں مدغم ہو گیا (ل) اور بعض نے یوں توجیہ کی ہے کہ لَمَّا یہاں بغیر تنوین وہی معنی رکھتا ہے جو لَمًّا تنوین کے ساتھ یعنی تنوین صرف قرأت میں حذف ہو گئی ہے اور مراد لَمًّا ہے اور لَمًّا کے معنی ہیں جمع کر کے جیسے وتاکلون التراث اکلا لما (الفجر ۸۹ - ۱۹) جس کا مادہ لَمّ ہے جس کے معنی ہیں الجمع الکثیر الشدید یعنی کثرت اور شدت سے جمع کرنا (ل)، تو یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا اجر انہیں پورا پورا دیا جائے گا اور یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ سب کے سب یہ مضبوط بات اور حق ہے کہ ان کے اعمال کا بدلہ پورا پورا انہیں ملے گا۔

۱۵۰۹ استقم۔ انسان کی اِستِقَامَۃ یہ ہے کہ مستقیم یعنی سیدھی راہ پر لگا رہے (غ)، یعنی کسی حال میں اس سے ادھر ادھر نہ ہو۔

صحابہؓ کی استقامت: اس آیت میں نہ صرف نبی کریم صلعم کو حکم ہے کہ آپ کسی صورت میں صراط مستقیم سے ادھر اُدھر نہ ہوں بلکہ یہ بھی ساتھ ہی حکم ہے کہ آپ کے ساتھی بھی جادۂ مستقیم سے ذرہ بھر انحراف نہ کریں۔ بغیر اس استقامت کے وہ کامیابیاں جن کا وعدہ دیا گیا ہے میسر نہیں آسکتیں؛ نبی اپنی ذات میں تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کر کے دکھاتا ہے بلکہ کتاب کی تعلیم عمل کے رنگ میں لا کر دکھاتا ہے لیکن ساتھیوں کا بھی اس استقامت کی راہ پر چلنا بہت ہی دشوار امر ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شَیَّبَتْنِیْ ھود یعنی سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ ساتھیوں کو اس راہ پر قائم کرنا یہ ایک نہایت ہی دشوار امر تھا۔ کتنے انبیاء ہیں کہ ان کے ساتھیوں نے ان کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا حضرت موسیٰ کے ساتھی کہتے ہیں فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون (المائدۃ ۵ - ۲۴) حضرت عیسیٰؑ نے جب اپنے حواریوں کو کہا کہ آج کی رات میرے ساتھ مل کر دعا ہی کرو تو وہ اس سے بھی عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ مگر یہ فخر سرور دو عالمؐ کے حصہ میں ہی آیا کہ آپ کے صحابہ نے صراط مستقیم پر الیسا دوام اختیار کیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی وہ اپنے ہر عمل میں صرف قرآن شریف کو ہی اپنا ہادی بناتے تھے اور اس کی تعلیم سے ایک بال بھر انحراف کو بھی آگ میں گرنے کے برابر سمجھتے تھے۔ علاء بن عبداللہ کا قول ہے کہ لا تطغوا میں جو خطاب ہے اس سے مراد اصحاب نبی صلعم نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد آنے والے تھے (فتح البیان)

ومن تاب معک۔ یہاں جس بات میں معیت کا ذکر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری یا اس کے اوامر اور نواہی پر استقامت ہے اور تاب سے مراد ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور یوں رجوع کر کے رسول اللہ صلعم کی معیت اختیار کی اور اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کو قبول کیا جس طرح خود مامور یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قبول کیا تھا۔ پس یہاں نہ صرف رسول اللہ صلعم کی معیت ہے بلکہ وہ معیت بھی اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی پر استقامت میں ہے یا اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے اس سے صحابہ کے مقام بلند پر شہادت ملتی ہے کہ طاعۃ اللہ میں وہ رسول اللہ صلعم کی معیت میں تھے۔ جو نادان نبیوں کی معیت (النساء ۴ - ٦۹) سے مراد نبی ہونا لیتے ہیں وہ ان الفاظ پر غور کریں کہ یہاں خود سرور دو عالم کی معیت آپ کے برگزیدہ صحابہ کو حاصل ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ سب خاتم النبیین بن گئے تھے۔

ع۱۵۱۰ الذین ظلموا سے مراد مشرک اور رکن یا میلان سے مراد ان سے محبت قلبی یا ان کے افعال پر راضی ہو جانا خیال کیا گیا ہے یہ کہنا چاہیئے کہ یہ باتیں بھی اس کے اندر آجاتی ہیں اور الفاظ قرآنی میں عمومیت اور وسعت ہے۔ جب پہلی آیت میں طاعۃ اللہ پر استقامت کا حکم دیا اور ہر قسم کے ظلم یا طغیان سے روکا تو یہاں اور بھی ترقی کی یعنی نہ صرف انسان ہر قسم کے ظلم سے بچے بلکہ ظالم کی طرف میلان سے بھی بچے۔

ما سوی اللہ کا سہارا: چونکہ ان سورتوں کے نزول کا زمانہ اسلام اور مسلمانوں پر سخت ترین مصائب کا زمانہ تھا اور مصائب میں انسان ہر قسم کا سہارا تلاش کرتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ ان تکالیف میں تم کفار کی طرف جھک کر ان مصائب سے نکلنے کا خیال کرو پھر اللہ تعالیٰ کی ولایت تمہارے لیے نہ ہو گی آج بھی مسلمانوں کو اس ہدایت کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ وہ بجائے طاعۃ اللہ پر استقامت کے دوسرے لوگوں کے سہارے تلاش کرتے ہیں اور یہ سہارے

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿١١٤﴾

اور دن کی دونوں طرفوں میں اور پہلی رات نماز کو قائم رکھ ۔ کیوں کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں ۔ یہ نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے ١٥١١

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٥﴾

اور صبر کر کیونکہ اللہ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾

پھر کیوں تم سے پہلی نسلوں میں اچھے عملوں والے لوگ نہ ہوئے جو ملک میں فساد سے روکتے ، ہاں تھوڑے سے ان میں سے جنھیں ہم نے بچایا (ایسے تھے) اور جو ظالم تھے وہ ان آسائشوں کے پیچھے پڑے رہے جو انھیں دی گئی تھیں اور وہ مجرم تھے ١٥١٢

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿١١٧﴾

اور تیرا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے اور ان کے رہنے والے نیکوکار ہوں ١٥١٣

ایک ایک کر کے گرتے چلے جاتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنا سہارا انہیں بنانے اس لیے ناکامی پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ۔

١٥١١ اوقاتِ نماز : طرفی النہار ۔ طرف ایک جانب کو کہتے ہیں وقت کے لحاظ سے ہو یا جسم کے یا اور رنگ میں (غ) ، اور نہار عرف شریعت میں طلوع فجر یعنی پو پھٹنے سے لیکر غروب آفتاب تک کا وقت ہے (غ) پس اس کی طرفیں یا دو طرفیں طلوع آفتاب سے پہلے اور زوال آفتاب کے بعد کے اوقات ہوئے جیسا کہ خود اس کی تشریح دوسری جگہ فرما دی ہے اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق الیل وقراٰن الفجر (بنی اسرائیل ١٧ - ٧٨) یعنی فجر کو ایک جانب اور آفتاب کے ڈھلنے کو دوسری جانب قرار دیا ہے پس طرفی النہار میں نماز فجر ، ظہر اور عصر آئینگی ۔

زلفا ۔ زلف اور زُلفیٰ اور زُلفۃ کے معنی قریب ہونا اور مرتبہ ہیں وما اموالکم ولا اولادکم بالتی تقربکم عندنا زلفی (السبا ٣٤ - ٣٧) وازلفت الجنۃ للمتقین (الشعراء ٢٦ - ٩٠) وازلفنا ثم الاٰخرین (الشعراء ٢٦ - ٦٤) فلما راوہ زلفۃ (الملک ٦٧ - ٢٧) اور مزدلفۃ جو مکہ معظمہ میں ایک مقام کا نام ہے وہ بھی قرب کے معنی کے لحاظ سے ہی ہے کیونکہ عرفات سے نکلنے کے بعد اس مقام پر پہنچ کر منیٰ سے حاجی قریب ہو جاتے ہیں اور زُلَفٌ زُلفۃ کی جمع ہے اور رات کی پہلی گھڑیوں پر جو دن سے قریب ہیں یہ لفظ بولا جاتا ہے اور زلفا من الیل (ھود ١١ - ١١٤) مغرب اور عشا کی نمازوں کے اوقات ہیں (ل)

جب ظالموں کی طرف جھکنے سے روکا تو ساتھ ہی بتایا کہ اللہ کی طرف جھکو اور نماز اس کا ذریعہ ہے ۔ اسی لیے قرآن کریم نے مصائب میں نماز سے استعانت کا بار بار ذکر کیا ہے بظاہر خیال ہو سکتا ہے کہ نماز کو مصائب سے نجات سے کیا تعلق ہے مگر اس کی حقیقت کو ایک موحد ہی سمجھ سکتا ہے کہ کس طرح جب انسان تمام سہاروں کو چھوڑ کر ایک اللہ تعالیٰ کو اپنا سہارا بناتا اور اس کے آگے گرتا ہے ، تو وہ جو تمام طاقتوروں سے بڑھ کر طاقتور ہے اس کا ہو جاتا ہے ۔ اگلی آیت میں صبر کا حکم اسی حقیقت کی مزید وضاحت کرتا ہے ۔ یہاں پانچوں نمازوں کا بھی ذکر کر دیا ہے ان الحسنات یذھبن السیئات کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بھلائی کے اختیار کرنے سے انسان دکھوں اور تکلیفوں سے نجات پاجاتا ہے اور نماز حسنات کا رستہ کھولتی ہے اور ان الفاظ میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا قانون بھی بیان فرمایا ہے کہ بدی کا کفارہ نیکی ہے جب انسان نیکی کو اختیار کرتا ہے تو اس کی بدیاں دور ہو جاتی ہیں ۔ بدی کو دبانے والی نیکی کی طاقت ہے اس لیے کہ نیکی اور بدی ایک ہی قوٰی کے اچھے اور برے استعمال کا نام ہے جب انسان ان قوٰی کو صحیح موقعہ پر لگانا سیکھ لے گا تو بدی خود ہی دور ہو جائے گی یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نیکی کی قوت اس قدر زبردست ہے کہ بدی کی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔

١٥١٢ اترفوا ۔ ترف کے معنی تنعم یا آسودگی ہیں اور مُترف وہ ہے جسے فراخی اور آسودگی متکبر کر دے (ل) وارجعوا الی ما اترفتم فیہ (الانبیاء ٢١ - ١٣) اخذنا مترفیھم بالعذاب (المؤمنون ٢٣ - ٦٤) امرنا مترفیھا (بنی اسرائیل ١٧ - ١٦)

گویا اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ایسے عقلمند ان میں کیوں نہ ہوئے کہ وہ لوگوں کو فساد سے روکتے جس سے معلوم ہوا کہ تباہی زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے آتی ہے ظالم لوگ آسائش دنیوی کے پیچھے پڑ کر ظلم میں یہاں تک ترقی کرتے ہیں کہ آخر مجرم کی سزا کی نوبت آ جاتی ہے ۔

١٥١٣ اس کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو محض ان کے شرک کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا ۔ اگر وہ ملک میں فساد پھیلانے والے نہ ہوں ۔ گویا

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً
وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾
اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ
وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ
مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾
وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الرُّسُلِ
مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاۗءَكَ فِيْ هٰذِهِ
الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰي لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾
وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰي
مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾
وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ
يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ
عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی گروہ کر دیتا اور
وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہتے ہیں۔
مگر جس پر تیرا رب رحم کرے اور اسی کے لیے اس نے انھیں پیدا کیا ہے
اور تیرے رب کی بات پوری ہو گئی، میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں
سب سے بھر دوں گا۔ ع۱۵۱۴
اور سب جو ہم رسولوں کے حالات سے تجھ پر بیان کرتے ہیں اس
سے ہم تیرے دل کو مضبوط کرتے ہیں اور اس میں تیرے پاس حق
آگیا اور (وہ) مومنوں کے لیے وعظ اور نصیحت (ہے)۔ ع۱۵۱۵
اور جو ایمان نہیں لاتے انھیں کہہ دے اپنی جگہ کام کیے جاؤ
ہم بھی کام کرتے ہیں۔ ع۱۵۱۶
اور انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔
اور آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ کے لیے ہی ہے اور اسی کی طرف
ہی سب کام لوٹائے جاتے ہیں سو اس کی عبادت کرو اور اس
پر بھروسا کرو اور تیرا رب اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔

کسی قوم کو ہلاک اس وقت کیا جاتا ہے۔ جب وہ زمین میں شرارت اور فساد اور ظلم میں حد سے تجاوز کر جاتی ہے محض عقاید باطلہ کی وجہ سے نہیں۔

ع۱۵۱۴ پیدا کرنے کی غرض رحم کرنا ہے: اس سے پہلی آیت میں بیان فرمایا تھا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی گروہ بنا دیتا یعنی ان میں کوئی اختلافات نہ ہوتے مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت نے انسان کو کچھ قوٰی دے کر ان کے استعمال کا اسے اختیار دیا ہے اس لیے وہ اختلاف کرتے ہی رہیں گے یعنی احکام الٰہی کے بارہ میں اختلاف کریں گے جس سے مراد ان کی مخالفت ہے۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ وہ لوگ مخالفت نہیں کرتے جن پر تیرے رب نے رحم کیا یعنی مومن یا اہل حق اور اس سے آگے جو لفظ آتے ہیں ولذٰلك خلقهم اسی لیے انہیں پیدا کیا تو گو ابن جریر نے دونوں قسم کی روایتیں جمع کی ہیں یعنی بعض اقوال کی رو سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اختلاف کے لیے پیدا کیا اور بعض کی رو سے یہ کہ انہیں رحم کے لیے پیدا کیا مگر پہلے معنی کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے نہیں ہوتی۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انسانوں کو پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ وہ اختلاف کرتے رہیں دوسری جگہ فرمایا وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (الذٰریٰت - ۵۶) تو غرض حقیقی تو یہی ہے کہ وہ عبادت کریں۔ اور یہ اس کے ہم معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ان کو پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ وہ اس کی نافرمانی کریں۔ اور پھر صاف الفاظ میں فرمایا ورحمتی وسعت کل شیء (الاعراف - ۱۵۶) پس جب رحمت ہر چیز پر ہے تو معلوم ہوا اسی کیلئے پیدا کیا ہے۔ ابن کثیر میں حضرت ابن عباس کا قول منقول ہے للرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ ولم يَخْلُقْهم للعذاب یعنی رحمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ عذاب کے لیے پیدا نہیں کیا۔ اور حدیث میں ہے میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی پس جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رحم کے لیے ہی پیدا کیا ہے تو آخر کار سب پر رحم ہی ہو گا اور یہ اس کے مطابق ہے جو ع۱۵۰۶ میں دکھایا گیا کہ دوزخ پر آخر فنا آئے گی۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوزخ بھی اللہ تعالیٰ کے رحم کا ایک رنگ اپنے اندر رکھتا ہے جس طرح یہاں مصائب میں پڑ کر انسان آرام پاتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو یہاں آسایش جسمانی کے درپے رہتے ہیں ان کے لیے ایک اور قسم کے دکھوں میں سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا رحم حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک پھوڑے کا چیرنا پھاڑنا بیمار کو عذاب کے رنگ میں نظر آتا ہے مگر طبیب جانتا ہے کہ ایسی حالت میں یہی رحم ہے یہی حالت عذاب نار کی ہے اسی لیے یہ فرما کر کہ اللہ تعالیٰ نے رحم کے لیے انسانوں کو پیدا کیا ہے اس کے بعد فرمایا کہ دوزخ کو بھی جنوں اور انسانوں سے بھرا جائے گا تو اس کی غرض بھی وہی ہے۔

ع۱۵۱۵ یہاں سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص کی غرض نبی کریم صلعم کو تسلی دینا ہے گویا ان انبیاء کے حالات میں اور ان کے مخالفین کی ہلاکت میں نبی کریم کے حالات اور آپ کے مخالفین کی ہلاکت کو بطور پیشگوئی بیان کیا گیا ہے۔ فی هٰذه سے مراد یہ سورت ہے یا ان حالات کا بیان۔

ع۱۵۱۶ نرے عقاید نرے لفظ نرے دعاوی سے کچھ نہیں ہوتا اعملوا علی مکانتکم انا عاملون اسی میں کامیابی اور ناکامی کا راز ہے۔ عمل سے ہی انسان بنتا ہے عمل سے ہی قوم زندہ ہوتی ہے۔ آج عمل کو چھوڑ کے ہی مسلمان موت کی حالت تک پہنچ گئے ہیں اگر زندہ ہوں گے تو پھر عمل سے ہی زندہ ہوں گے۔

ایاتها ۱۱۱ (۱۲) سُورَۃُ یُوسُفَ مَکِّیَّۃٌ رکوعاتها ۱۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۟﴿۱﴾ مَیں اللہ دیکھتا ہوں، یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲﴾ ہم نے یہ قرآن عربی میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھو ۱۵۱۶ ؎

نام: اِس سورت کا نام یوسفؑ ہے اور اس میں بارہ رکوع اور ایک سو گیارہ آیتیں ہیں اس کا نام حضرت یوسفؑ کے تذکرہ سے لیا گیا ہے جو اس کا واحد مضمون ہے۔

خلاصہ مضمون: اس سورت کا مضمون ایک ہی ہے یعنی حضرت یوسفؑ کا ذکر سوائے اس کے کہ ابتدا میں یہ بتا دیا ہے اس ذکر کی اصل غرض کیا ہے اور آخر میں بالوضاحت آنحضرت صلعم کے مخالفین کو توجہ دلائی ہے۔ پہلے رکوع میں حضرت یوسفؑ کے رویا کا ذکر ہے کہ اسے ایک عظیم الشان انسان بنایا جائیگا اور اس میں گویا آنحضرت صلعم کی ظاہری اور باطنی عظمت کی طرف اشارہ ہے دوسرے رکوع میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے یوسف سے سلوک کا ذکر ہے اس سے بہت بڑھ کر بُرا سلوک اور بہت زیادہ خطرناک منصوبے آنحضرتؐ کے خلاف ہوئے۔ تیسرے میں ذکر ہے کہ کس طرح طرح طرح کی ترغیبات کے اندر حضرت یوسفؑ نے استقامت دکھائی اور اس میں آنحضرت صلعم کی استقامت کا ذکر ہے کیونکہ اسی قسم کی ترغیبات آنحضرتؐ کے سامنے بھی پیش کی گئی تھیں۔ چوتھے رکوع میں حضرت یوسف کے قید میں پڑنے کا ذکر ہے اور گو آنحضرت صلعم کو اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ رکھا مگر شعب ابی طالب میں یہ مشابہت بھی پوری ہوگئی۔ پانچویں رکوع میں ذکر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے حالت قید میں بھی جب موقعہ ملا تو وعظ و نصیحت کو نہیں چھوڑا۔ آنحضرت صلعم نے شعب میں محصور ہونے کے زمانہ میں بنو ہاشم میں اپنے سلسلہ وعظ و نصیحت کو جاری رکھا اور انہی ایام میں ان لوگوں میں سے بہتوں کے دلوں میں اسلام گھر کر گیا۔ چھٹے رکوع میں شاہ مصر کی خواب کا ذکر ہے جس میں سات سال کے قحط کا ذکر ہے اور اس کی تفسیر میں خود بخاری میں اس سات سال کے قحط کا حوالہ دیا گیا ہے جو مکہ میں ہوا۔ ساتواں رکوع حضرت یوسفؑ کی بریت اور عزت کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح نبی کریم صلعم کی بریت ہوئی اور مدینہ میں سب قوموں نے آپ کو اپنا حکم قرار دیا۔ آٹھویں اور نویں رکوع میں حضرت یوسفؑ اور آپ کے بھائیوں کے باہمی معاملات کا ذکر ہے۔ عرب میں قحط کے وقت جب ابوسفیان نے آنحضرت صلعم سے کہا کہ آپ کے بھائی بند ہلاک ہو رہے ہیں تو آپ نے بھی دعا کی اور آپ کی دعا سے قحط دور ہُوا۔ دسویں رکوع میں بھائیوں کا اعتراف اور حضرت یوسفؑ کی معافی کا ذکر ہے اور نبی کریم صلعم نے فتح مکہ کے وقت وہی لفظ لاتثریب علیکم الیوم دوہرا کر بتایا کہ حضرت یوسفؑ کے ذکر میں آپ کا ہی نقشہ کھینچا گیا تھا۔ گیارھویں رکوع میں یہ ذکر ہے کہ کس طرح وہی بھائی آخر مصر میں آ کر حضرت یوسفؑ کی حکومت میں شریک ہوئے اور یہ اشارہ تھا کہ عرب کے لوگ بھی آخر اس عظیم الشان حکومت کے وارث ہونگے جو نبی کریم صلعم کی طفیل ان کو ملے گی۔ بارھویں رکوع میں مضمون کو عام کر کے آپؐ کے مخالفین کو توجہ دلائی۔

تعلق: الرا کے مجموعہ میں یہ تیسری سورت ہے جب پچھلی دو سورتوں میں پہلے علمی بحث سے اور پھر انبیائے سابق کے مخالفین کے انجام کا ذکر کر کے آنحضرت صلعم کے مخالفین کو سمجھایا تو اب یہاں بالخصوص ایک ایسے نبی کا ذکر کیا جس کے حالات کے ساتھ آنحضرت صلعم اور آپؐ کے مخالفین کے حالات کی کھلی کھلی مشابہت پیش آنے والی تھی اور پچھلی سورت کے آخر میں بتایا تھا کہ ذکر انبیاءؑ میں آنحضرتؐ کا ہی ذکر ہے۔

زمانہ نزول: سورت کی آخری سے پہلی آیت بالصراحت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سورت کا نزول اس زمانہ کا ہے جب قریش کی مخالفت انتہا کو پہنچ گئی اور لوگوں نے آپؐ کے وعظ و نصیحت کی طرف بالکل توجہ چھوڑ دی جس کے بعد نصرت الٰہی کا اس رنگ میں ظہور ہُوا کہ آپؐ کے لیے مدینہ میں ایک مضبوط جماعت کھڑی ہوگئی۔

۱۵۱۶ ؎۔ عربیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کو عَرَب کہا جاتا ہے اور عَرَبِیّ کے معنی مُفصِح یعنی فصاحت سے بیان کرنے والا ہیں اور اِعْرَاب کے معنی بیان ہیں اور حدیث میں ہے اَلثَّیِّبُ تُعْرِبُ عَنْ نَفْسِهَا یعنی بیوہ خود بات کو کھول کر بیان کر دے یعنی رضامندی نکاح کے معاملہ میں۔ اور عَرَبِیّ فصیح واضح کلام کو کہا جاتا ہے جیسے یہاں۔ یا بلسان عربی مبین (الشعراء ۲۶ - ۱۹۵) یا حکما عربیا (الرعد ۱۳ - ۳۷) جہاں معنی کیے گئے ہیں فصاحت سے بیان کرنے والا جو حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے اور بعض نے اس کے معنی شریف کریم کیے ہیں جیسے دوسری جگہ کتاب کریم (النمل ۲۷ - ۲۹) فرمایا اور یا عربی کے معنی ہیں نبی عربیؐ کی طرف منسوب (رغ) اور عَرَب عَجَم کے خلاف ہے اور اَعْجَم وہ شخص ہے جس کی زبان میں عُجْمَة یعنی ابہام ہو خواہ وہ عربی ہو یا غیر عربی اسی معنی میں ہے ولو جعلناہ قرانا اعجمیا (حٰم السجدۃ ۴۱ - ۴۴) (رغ)۔

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی (د) اس صورت میں عربی ام الالسنۃ یعنی سب زبانوں

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝٣	ہم اس قرآن کی تیری طرف وحی کرنے سے تجھے نہایت اچھا بیان سناتے ہیں، گو تو اس سے پہلے بے خبروں میں سے تھا ۱۵۱۶ب
إِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِأَبِيْهِ يٰٓأَبَتِ إِنِّيْ رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝٤	جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا، مَیں نے دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کرتے ہیں ۱۵۱۶ج

کی ماں قرار پائے گی اور اسی کے موافق بعض کا مذہب ہے کہ عربی سب سے پہلی لغات ہے اور دوسری سب زبانیں اس کے بعد پیدا ہوئیں (ر) اور ایک حدیث میں ہے کہ اہل جنت کی زبان عربی ہو گی۔ پس اگر قرآن عربی سے مراد عرب کی زبان میں نازل ہونا لیا جائے تو لعلکم تعقلون میں یہ اشارہ ہے کہ یہ زبان جو ام الالسنۃ ہے اسی میں اللہ تعالیٰ کا آخری کلام نازل ہوا اور یہ عجیب بات ہے کہ کم از کم گزشتہ تیرہ چودہ سو سال کی زبان عربی جو علمی رنگ میں استعمال ہوتی تھی اس میں آج تک کچھ بھی فرق نہیں آیا اور آج تیرہ سو سال بعد وہی زبان علمی ہے جو اس وقت عرب میں تھی۔ حالانکہ دوسری زبانیں اس سے نصف وقت میں بھی اس طرح تغیر سے پاک نہیں رہیں جس سے اس بات پر شہادت ملتی ہے کہ یہ زبان ابتدا سے اسی حالت میں رہی ہے۔ عربی کے ام الالسنۃ ہونے پر مفصل بحث کے لیے دیکھو کتاب ام الالسنۃ جو خواجہ کمال الدین صاحب کی تصنیف ہے اور اس کی طرف اس زمانہ میں توجہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے دلائی ہے۔

زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہاں قرآن عربی سے مراد وہ کتاب ہے جو اپنے مضامین کو کھول کر اور فصاحت سے بیان کرتی ہے تاکہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ جو کوئی شخص چاہے قرآن کریم کا مقابلہ دوسری مذہبی کتابوں سے کر کے دیکھ لے کہ جس طرح کھول کر یعنی مدلل طور پر اور با ایں فصاحت سے قرآن کریم نے مضامین کو بیان کیا ہے اس سے دوسری کتابوں کو نسبت ہی نہیں۔

ع۱۵۱۶ب قصص کے لیے دیکھو ع۷۵۴ قَصَص کے معنی بیان ہیں۔ یا وہ خبر جو بیان کی جائے اور قِصّۃ کی جمع قِصَص ہے اور احسن القصص کے معنی احسن البیان ہیں یعنی نہایت اچھا بیان (ل)

الغافلین غَفْلَۃ بھول جانا ہے جو یادداشت یا احتیاط کی کمی سے انسان کے لازم حال ہوتا ہے (غ) یا اس چیز کا احساس نہ ہونا جس کا احساس ہونا چاہیے یا کسی چیز سے ذہول (ت)

اس ذکر کو جو اس سورت میں ہے نہایت عمدہ بیان کہا ہے۔ اس لیے کہ گو یہ محض ایک انسان کی زندگی کے تھوڑے سے حالات کا بیان ہے مگر اوّل سے لیکر آخر تک اعلیٰ درجہ کے اخلاقی سبقوں سے بھرا پڑا ہے۔ اور علاوہ ازیں یہ گویا نبی کریم صلعم اور آپ کی قوم کے تعلقات کا مرقع ہے اور اسی کی طرف وَ ان کنت من قبلہ لمن الغافلین میں اشارہ ہے گو یہ الفاظ ظاہر معنی میں بھی درست ہیں کہ آنحضرت صلعم نے نہ ان ذکروں کو کہیں سے سنا تھا اور نہ ان کتابوں کو پڑھا تھا اور صرف وحی کے ذریعہ سے آپ پر ان حالات کا انکشاف ہوا مگر قرآن کے لیے ظہر و بطن دونوں ہیں اور اس ظاہری معنی کے ساتھ اس حقیقت کی طرف بیان اشارہ کیا ہے کہ ابھی تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری قوم تمہارے ساتھ کیا کیا سلوک کرے گی اور اس طرح تم کو گھر سے نکالا جائے گا اور کسی دوسرے مقام پر پہنچ کر تمہیں وہ عزت کا مقام ملیگا جس کے سامنے تمہاری قوم کو آخر اسی طرح سر جھکانا پڑے گا جس طرح یوسفؑ کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے جھکایا۔ ان حالات کا آنحضرت صلعم کے حالات سے مطابق ہونا اور آپ کی زندگی کا نقشہ اس سورت میں کھینچا جانا خود نبی کریم صلعم کے ان الفاظ سے ظاہر ہے جو آپ نے اپنی قوم کے آخر کار اظہار عاجزی پر فرمائے لاتثریب علیکم الیوم جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو کہے تھے۔ اور اس آیت کے اندر جو الفاظ بظاہر زاید معلوم ہوتے ہیں بما اوحینا الیک ھذا القرآن یعنی اس قرآن کی وحی کے ذریعہ سے تو ان کی غرض یہ ہے کہ یہ قصہ نہیں کیونکہ قرآن شریف قصوں سے پاک ہے بلکہ اس کی غرض اخلاق کی تعلیم ہے اور جس رنگ میں یہ تذکرہ بائبل میں مذکور ہے اگر اس کے ساتھ ہی اس کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قرآن کریم میں اول سے آخر تک اس تذکرہ سے ایسے اخلاق سکھائے گئے ہیں جو بائبل میں نہیں پائے جاتے اور اسی لیے بائبل کے ساتھ کہیں کہیں اختلاف بھی ہے۔ گویا بتا دیا ہے کہ اگر یہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے نہ سکھایا گیا ہو تو محض بائبل کی نقل ہوتی۔

ع۱۵۱۶ج ابت۔ اصل میں ابی ہے میرے باپ اور یا کو تائے تانیث سے بدلا گیا ہے۔

رایت کے معنی یہاں ہیں خواب میں دیکھا۔ ماضی دونوں معنی میں آتی ہے خواب میں دیکھنا معنی ہوں تو مصدر رُؤیا آتا ہے ویسے دیکھنے کے معنی میں رُؤیۃ مصدر ہے

کوکب۔ نَجْم یعنی ستارہ کو کہتے ہیں اور نور کو اس کے ساتھ تشبیہ کی وجہ سے بھی کَوْکَب کہہ دیا جاتا ہے اور سردار قوم کو بھی کوکب کہا جاتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کے رویا سے آپ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلعم کو بھی قبل از نبوت سچے خواب آتے تھے اور آپ کے خواب فلق

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۵

اس نے کہا اے میرے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تیرے لیے کوئی مخفی تدبیر کریں گے کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶ ع

اور اسی طرح تیرا رب تجھے چن لے گا اور تجھے باتوں کی حقیقت سکھائے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور یعقوبؑ کی اولاد پر پوری کرے گا، جیسے اس نے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر اسے پورا کیا، تیرا رب جاننے والا حکمت والا ہے ۱۵۱۶د

الصبح کی طرح سچے ہوتے تھے۔ گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کا سجدہ کرنا کسی تمثل کے رنگ میں ہوگا۔ کیونکہ سجدہ کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ماتھا زمین پر رکھا جائے سو یہ چیزیں اپنی اصل ہیئت میں ایک انسان کی رویت میں اس مفہوم کو پورا نہیں کر سکتیں۔ پس یا تو ان چیزوں نے انسان کا تمثل اختیار کر کے حضرت یوسف کو سجدہ کیا اور یا یہ سجدہ کسی رنگ کا اظہار فرمانبرداری تھا جس کی کوئی تصریح یہاں موجود نہیں۔ اس خواب کی تعبیر کیا تھی اس کا ذکر اگلی آیت میں اور پھر سورت کے آخر میں آتا ہے اور گیارہ ستاروں کے نام جو ایک حدیث میں دیئے ہیں تو ابن جوزی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

۱۵۱۶د احادیث۔ حدیث حدث سے ہے اور حُدُوث کے معنی ہیں کسی چیز کا ہونا بعد اس کے کہ وہ نہ تھی۔ اور حدیث ہر ایک کلام کو کہتے ہیں جو سماعت سے یا وحی سے انسان کو پہنچے بیداری کی حالت میں ہو یا خواب میں۔ اسی لیے خود قرآن کریم کو بھی حدیث کہا ہے افمن ھذا الحدیث تعجبون (النجم ۵۳-۵۹) ومن اصدق من اللّٰہ حدیثا (النساء ۴-۸۷) (غ)

بائبل اور قرآن میں فرق: بائبل میں ہے کہ یوسف نے یہ خواب حضرت یعقوب کے سامنے بیان کیا تو "اس کے باپ نے اُسے ڈانٹا اور اس سے کہا کہ یہ کیا خواب ہے جو تو نے دیکھا ہے کیا میں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جھک کے تجھے سجدہ کریں گے" (پیدائش ۳۷: ۱۰) یہ کلام ایک نبی کی شان کے مطابق نہیں، کیونکہ وہ گویا اس خواب کو بے معنی یا جھوٹا قرار دیتا ہے قرآن کریم میں اس کے خلاف اس کو سچا قرار دیا ہے۔ اور اس کی تعبیر یہ کی ہے کہ یوسف ایک عظیم الشان انسان ہوگا اور یہ ان واقعات کے بھی مطابق ہے جو کتاب پیدائش میں موجود ہیں۔

سورج اور چاند اور گیارہ ستاروں کے سجدہ کرنے سے کیا مراد ہے؟ روح المعانی میں ہے کہ سورج کی تعبیر بادشاہ اور سونا اور زوجہ جمیلہ ہے اور قمر کی تعبیر امیر اور کواکب کی رؤسا۔ تو اس صورت میں سورج اور چاند اور ستاروں کے سجدہ سے مراد کسی بادشاہ اور امیر اور رؤسا کا آپ کی اطاعت کرنا ہوگا اور مصر میں آپ واقعی ایسے بلند مرتبہ پر پہنچے کہ شاہ مصر اور اس کے رؤسا سب آپ کے سامنے جھک گئے اور سب پر آپ کو فوقیت ملی اور کواکب کی تعداد یا تو اس لحاظ سے ہوگی کہ وہاں کے بڑے بڑے رؤسا یا وزراء کی تعداد گیارہ ہو اور یا محض ایک عدد کامل کے طور پر مگر مفسرین زیادہ تر اس طرف گئے ہیں کہ گیارہ ستاروں سے مراد ان کے گیارہ بھائی اور شمس اور قمر سے مراد والد اور والدہ ہیں۔ مگر محض بھائیوں یا ماں باپ پر کسی شخص کی فوقیت اس قدر بلند مرتبہ کا پتہ نہیں دیتی جیسا بادشاہ یا وزراء پر فوقیت کا حاصل ہونا۔ بلکہ حضرت یعقوب نے جو تعبیر کی ہے وہ دین و دنیا میں بلند مراتب پر پہنچنا ہے جیسا کہ آگے آتا ہے۔

حضرت یعقوب کی تعبیر: حضرت یعقوب نے تین باتوں کی خبر دی ہے اول اجتباء جس کے معنی کے لیے دیکھو ۵:۵ مفسرین میں سے بعض نے کہا نبوت کے لیے چن لینا مراد ہے۔ بعض نے کہا سجود کے لیے بعض نے اور توجیہات کی ہیں (ر) مگر اجتباء کے اصل معنی کے لحاظ سے مراد اچھی صفات کا آپ میں جمع کر دینا ہے اور اللہ تعالیٰ کا اجتباء نبیوں اور صدیقوں اور شہداء کے لیے ہوتا ہے دوسری بات تاویل احادیث کا علم دینا ہے اور اس سے مراد بعض نے تعبیر رؤیا کو لیا ہے اور بعض نے عواقب امور کو اور بعض نے احادیث انبیاء اور کتب سابقہ کو۔ مگر جس طرح احادیث کا لفظ وسیع ہے اور اس میں رؤیا اور وحی آجاتے ہیں اسی طرح یہاں بھی معنی میں توسیع مراد ہے۔ یعنی ہر ایک بات کی تہ تک پہنچنا اور اعلیٰ درجہ کے فہم کا ملنا۔ اسی اعلیٰ درجہ کے علم میں تعبیر رؤیا بھی شامل ہے جو محض اس کا ایک حصہ ہے اور تیسری بات اتمام نعمت ہے اور اس سے مراد دنیا اور آخرت کی نعمت کا مل جانا یا اکٹھا ہو جانا ہے جیسے نبوت کے ساتھ بادشاہت یا دوسروں کی غلامی سے آزادی روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی نعمتیں مل جانا یہی اتمام نعمت ہے۔ حضرت یعقوب نے یہ سب کچھ بظاہر اس خواب سے ہی سمجھا ہے اور ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی بھی اطلاع دی ہو کہ یوسف ان بلند مراتب پر پہنچنے والا ہے مگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سورج چونکہ اصل سرچشمہ نور ہے اس لیے اس کے سجدہ سے مراد کمال دینی ہے کیونکہ انسان کے اصل فضائل دینی ہیں اور قمر چونکہ سورج سے نور مستعار لیتا ہے اس لیے مراد کمال دنیوی ہے اور یہ حضرت یوسف کو کمال دینی کی طفیل حاصل ہوتا ہے اور آپ کی راستبازی اور علم ہی آپ کو حکومت تک پہنچاتے ہیں اور کواکب سے چونکہ علم حاصل کیا جاتا ہے (بالنجم

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ ۝٧

بیشک یوسفؑ اور اس کے بھائیوں (کے ذکر) میں پوچھنے والوں کے لیے نشان ہیں ۱۵۱۷

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝٨

جب انھوں نے کہا کہ یوسفؑ اور اس کا بھائی تو ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم قوی جماعت ہیں، یقیناً ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے ۱۵۱۸

اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ۝٩

یوسفؑ کو مار ڈالو یا اُسے کسی اور ملک میں نکال دو تاکہ تمھارے باپ کی توجہ صرف تمھاری طرف ہی ہو جائے اور اس کے بعد تم نیک لوگ بن جاؤ ۱۵۱۹

قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ۝١٠

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا، یوسفؑ کو قتل نہ کرو اور اسے کنوئیں کی گہرائی میں ڈال دو تا کوئی قافلہ اسے نکال لے جائے اگر تم کچھ کرتے ہو (تو یہ کرو) ۱۵۲۰

ھم یھتدون (النحل ۱۶-۱۶) اس لیے کواکب کے سجدہ سے مراد علم کا حاصل ہونا ہے۔

۱۵۱۷ پوچھنے والوں سے مراد یہاں نبی کریم صلعم کے حالات کو دریافت کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کے لیے یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کے معاملہ میں نشان ہیں یعنی جو معاملہ یوسفؑ کے ساتھ ہوا وہی آنحضرت صلعم کے ساتھ ہوگا۔ آپ کو قتل کرنے یا ملک سے نکالنے کی تجویز ہوگی اور بالآخر جس طرح یوسفؑ کے بھائی عاجز آ کر حالت میں یوسفؑ کے سامنے حاضر ہوئے اسی طرح آپ کے مخالف بھی عاجز اور مغلوب ہو کر آپ سے معافی مانگیں گے۔

۱۵۱۸ عصبة ۔ عَصَب پٹھوں کو کہتے ہیں اور عَصْب کے معنی باندھنا ہیں اور عُصْبَة اور عِصابة جماعت کو کہا جاتا ہے دس سے چالیس تک جس کا واحد کوئی نہیں۔ مفردات میں ہے جماعة مُتَعَصِّبَة مُتَعاضِدَة یعنی ایسی جماعت جو ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں اور عَصَبَة ایک شخص کے بیٹوں اور باپ کی طرف سے قریبیوں کو کہا جاتا ہے اور اسی مادہ سے مشہور لفظ تَعَصُّب ہے جس کے اصل معنی جمع ہو جانے کے ہیں۔ پھر کسی دوسرے فریق کے خلاف جمع ہو جانا ظالم یا مظلوم ہو کر اور عَصَبِيَّة یہ ہے کہ ایک شخص کو عَصَبَة کی مدد کے لیے بلائے اور حدیث میں ہے لَيْسَ مِنَّا مَن دعا الی عَصَبِيَّة او قاتل عَصَبِيَّة جو شخص عصبیت کی طرف بلاتا ہے یا عصبیت کے لیے جنگ کرتا ہے (یعنی محض اپنے قریبیوں کی حمایت کے لیے اور یہ نہیں دیکھتا کہ حق کس طرف ہے) وہ ہم میں سے نہیں۔

ضلال کے معنی یہاں خطاءُ الرائے ہیں (ر) یعنی غلطی ۔

یوسفؑ کے بھائی سے مراد یہاں ان کا حقیقی بھائی ہے جس کا نام بن یامین تھا یہ دونوں ایک والدہ سے تھے۔ محض اس لیے کہ باپ کو ایک بیٹے سے زیادہ پیار ہے ان کے سینوں میں حسد کی آگ جلی انہیں یہ شکایت نہیں کہ ہمارا باپ ہم سے محبت نہیں کرتا بلکہ یہ ہے کہ یوسفؑ سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ یہ کوشش نہیں کرتے کہ باپ کی محبت ان سے کس طرح بڑھے، یہ کوشش کرتے ہیں کہ یوسفؑ کی محبت درمیان سے اُٹھ جائے۔ یہی حسد ہے جس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔

۱۵۱۹ اطرحوا ۔ طَرْح کسی چیز کا پھینکنا اور اس کا دور کر دینا ہے (غ)

تکونوا من بعدہ قوماً صالحین سے مراد یہ ہے کہ اس گناہ سے توبہ کر کے پھر تم صالح بن سکتے ہو اور یا مطلب یہ ہے کہ یوسف کے درمیان سے نکل جانے سے تم اپنے امور دنیا میں سنوار والے ہو جاؤ گے کیونکہ باپ کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو گی۔

۱۵۲۰ غَیٰبت ۔ اس کا اصل غَیب سے ہے اور غَیَابَة زمین کی پستی یا گہرائی کو کہتے ہیں (غ)

جُبّ ۔ جَبّ کے معنی کسی چیز کا جڑ سے کاٹ دینا ہیں اور جُبّ اس کنوئیں کو کہتے ہیں جس کی اینٹوں سے منڈیر نہ بنائی گئی ہو (غ) جس کی دیوار بنائی گئی ہو وہ بِئْر ہے اور بعض کے نزدیک جُبّ ایسا کنواں ہے جس کی گہرائی بہت زیادہ ہو (ل)

یلتقط ۔ لَقْط ۔ اور اِلْتِقاط کسی چیز کا زمین سے لے لینا ہے یعنی زمین پر پڑی ہوئی چیز کا اُٹھا لینا اور لُقَطَة گری ہوئی چیز کو اور لَقِیط پھینکے ہوئے بچے کو کہتے ہیں جسے کوئی شخص پا لے (ل)

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝۱۱

انھوں نے کہا اے ہمارے باپ کیا وجہ ہے کہ تو یوسف کے معاملہ میں ہمارا اعتبار نہیں کرتا حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں۔

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۱۲

کل اسے ہمارے ساتھ بھیجیے کہ وہ کھائے (پیئے) اور کھیلے (کودے) اور ہم اس کے نگہبان ہیں ۱۵۲۱

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝۱۳

اس نے کہا مجھے اس بات سے غم ہوتا ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تم اس کی طرف سے بے خبر رہو ۱۵۲۲

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝۱۴

انھوں نے کہا اگر اسے بھیڑیا کھا جائے حالانکہ ہم ایک قوی جماعت ہیں تو اس صورت میں بیشک ہم گھاٹے میں رہنے والے ہونگے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۵

سو جب اسے لے گئے اور اتفاق کر لیا کہ اسے کنوئیں کی گہرائی میں ڈال دیں اور ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تو انھیں ان کے کام کی خبر دیگا اور وہ نہیں جانتے ہونگے ۱۵۲۳

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ۝۱۶

اور رات کو اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔

سَیَّارۃ۔ سَیْر کے معنی چلنا اور سَیَّارَۃ چلنے والی جماعت کو کہتے ہیں (غ)

پیدائش ۳۷: ۲۲ میں ہے کہ ایسا کہنے والا رُوبن تھا۔

ع۱۵۲۱ یرتع۔ رَتْع کا استعمال اصل میں حیوانات پر ہے یعنی چرنا۔ استعارۃً انسان پر بولا جاتا ہے (غ) یا بافراغت کھانا پینا (ل)

ع۱۵۲۲ اس کے بیجانے سے غم ہوتا ہے گویا ان کا دل اندر سے بول رہا تھا کہ وہ محض شرارت کے لیے یوسف کو لے جا رہے ہیں۔

ع۱۵۲۳ بائبل میں حضرت یوسف کی طرف اس وحی کا ذکر نہیں اور اتنی بات سے دونوں تذکروں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے بائبل میں یہ محض ایک کہانی کا رنگ رکھتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب کا بیٹا گم ہو گیا اور پھر مل گیا۔ قرآن کریم میں یہ طرح طرح کے روحانی اور اخلاقی سبقوں سے بھرا ہوا ہے۔ مثلاً یہی واقعہ کہ عین اس وقت جب بھائی اپنی طرف سے یوسف کا کام تمام کر چکے تھے اور کوئی امید کی جھلک باقی نہ رہی تھی اور زندگی کا خاتمہ سامنے نظر آتا تھا ایک خارجی آواز آتی ہے کہ تم پر وہ زمانہ آئے گا کہ تم انہی بھائیوں کو ان کی اس حرکت کی خبر دو گے اور تمہارا مقام اس قدر بلند ہوگا کہ ان کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ تم اس مقام پر پہنچے ہوئے ہو۔ یہ آواز نہ صرف یوسف کے اندر اللہ تعالےٰ کی ہستی پر ایمان کامل پیدا کرتی ہے اور اس کو آئندہ زندگی میں مصائب کی برداشت کے قابل بناتی ہے اور بڑے بڑے ابتلاؤں میں نیکی پر قائم رہنے کی قوت دیتی ہے بلکہ اس ذکر کے پڑھنے والے کے اندر بھی یہی تمام باتیں پیدا کرتی ہے ایک اتنے ذکر کو چھوڑ دینے سے بائبل میں یہ ذکر محض ایک قصہ رہ جاتا ہے اور قرآن کریم میں یہ ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی سبق بن جاتا ہے۔

وحی قبل از نبوت: اس وحی کے ہونے سے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ حضرت یوسف اس وقت نبی بھی ہو گئے تھے۔ آیت ۲۲ میں بتایا ہے کہ حکم اور علم روحانی بلوغ کو پہنچنے پر ملا تھا اور وہ اس واقعہ کے بہت بعد تھا۔ وحی غیر نبی کو بھی ہو جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ کی ماں اور حواریوں کو وحی ہونے کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے پس حضرت یوسف کی یہ وحی بھی قبل از نبوت ہے جس طرح ان کا رویا قبل از نبوت تھا اور اس میں محض ایک آیندہ کی خبر ہے اور آیندہ کی اخبار غیر نبی پر بھی ظاہر کی جاتی ہیں جیسے کہ اس امت میں محدثین پر جن کے متعلق احادیث میں آتا ہے رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء یہ خیال کرکے کہ وحی سوائے نبی کے نہیں ہو سکتی بعض نے اوحینا الیہ میں مراد حضرت یعقوب کو لیا ہے کیونکہ حضرت یوسف کی عمر اس وقت ۱۷ سال کی تھی مگر اس سے بھی اس ذکر کی اصل عظمت مفقود ہو جاتی ہے وھم لا یشعرون سے مراد یہ ہے کہ ایسی حالت میں تم ان کو یہ خبر دو گے کہ تمہارے اس مقام کی وجہ سے یہ نہ جانتے ہونگے اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ تم کو ہم نے یہ خوش خبری دی ہے تو تمہارے بھائیوں کو اس بات کی کچھ بھی خبر نہیں۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا
يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ
الثلٰثة وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾
وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ
بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ
جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾
وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ
فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ
وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

کہا، اے ہمارے باپ ہم ایک دوسرے سے آگے نکلتے ہوئے چلے
گئے اور یوسُف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑا تو بھیڑیا اسے
کھا گیا اور تو ہماری بات مانے گا نہیں اگرچہ ہم سچے ہوں [۱۵۲۴]
اور اس کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے، اس نے کہا
بلکہ تمھارے دلوں نے تمھارے لیے ایک (بڑی) بات کو اچھا کر دکھایا تو
نیک صبر ہی ہے اور اس پر اللہ کی ہی مدد طلب کیجاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو [۱۵۲۵]
اور ایک قافلہ آیا تو انھوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا اور اس نے
اپنا ڈول ڈالا، کہا، خوش خبری ہو یہ لڑکا ہے اور اُسے
مالِ تجارت قرار دے کر چُھپا رکھا، اور اللہ جانتا ہے

ع ۱۵۲۴ ولو کنا صادقین سے مراد یہ ہے کہ اگر ہم آپ کے نزدیک صادق القول بھی ہوتے تو بھی اس معاملہ میں آپ ہماری بات کا یقین نہ کرتے اور جب آپ پہلے بھی ہمارے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تو ہماری بات کو آپ مانیں گے تو نہیں۔

ع ۱۵۲۵ سوّلت۔ تسویل کے معنی ہیں جس چیز کی خواہش ہو اسے نفس کا اچھا کر دکھانا اور اس کے بُرے پہلو کو بھی اچھے رنگ میں دکھانا۔ الشیطان سوّل لہم (محمد۔ ۲۵) اور سُوْل اُمنیّۃ کے قریب قریب ہے فرق یہ ہے کہ امنیۃ یا آرزو وہ ہے جس کا انسان اپنے نفس میں اندازہ کرتا ہے اور سُوْل وہ ہے جس کو وہ طلب کرتا ہے گویا یہ امنیۃ کے بعد کا مرتبہ ہے اور اس کا اصل مسؤل ہے قد اوتیت سؤلک یا موسٰی (طٰہٰ۔ ۳۶) اور سُوْل وہ حاجت نفس ہے جس کا پورا ہونا انسان چاہتا ہے (غ)

یہاں پھر بائبل کے ذکر میں اور قرآن شریف میں ایک بین فرق نظر آتا ہے۔ بائبل میں ہے کہ جب یہ خبر حضرت یعقوب کے پاس پہنچی تو انہوں نے اس کو باور کر لیا اور کہا "یوسف بےشک پھاڑا گیا تب یعقوب نے اپنے کپڑے پھاڑے اور ٹاٹ اپنے کولے پر ڈالا اور بہت دن تک اپنے بیٹے کے لیے غم کیا" (پیدائش ۳۷: ۳۳ و ۳۴) یہ بات شانِ نبوت سے بعید ہے۔ قرآن کریم نے اس کے بجائے کیسے پاک لفظ فرمائے ہیں فصبر جمیل اتنے بڑے عظیم الشان صدمے پر بھی نہ صرف صبر کیا بلکہ صبر کو جمیل فرمایا یعنی خوبی کی بات یہی ہے۔ اس میں دوسروں کے لیے بھی سبق ہے کہ وہ سخت سے سخت مصائب کے وقت واویلا اور جزع فزع سے بچیں اور صبر کا طریق اختیار کریں اور اللہ تعالیٰ کے قضا و قدر پر راضی ہوں صحیح حدیث میں ہے کہ جب حضرت عائشہؓ پر بہتان باندھا گیا تو اس صدمہ عظیم میں انہوں نے یہی فرمایا کہ میں وہی کہتی ہوں جو یعقوب نے کہا فصبر جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون ایک اور بڑا فرق جو قرآن شریف اور بائبل میں ہے یہ ہے کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب کو یقین تھا کہ حضرت یوسُف مارے نہیں گئے بلکہ زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ آخر ان باتوں کو پورا کرے گا جو رویا میں ان کو دکھائی گئیں جس طرح بائبل کے اس بیان کی بجائے کہ حضرت یعقوب نے یوسُف کا رؤیا سنکر اسے ڈانٹا، قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس خواب کی تعبیر بتائی کہ یوسُف کو دینی اور دنیوی عظمت ملے گی۔ اسی طرح اس پر پورا ایمان رکھتے ہوئے اپنے بیٹوں کو صاف کہہ دیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو یہ سب غلط ہے اور واللہ المستعان میں بتایا کہ اللہ تعالےٰ ان باتوں کو پورا کرے گا جو اس نے دکھائی ہیں۔

حضرت یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی یہ لوگ لگا لائے تھے۔ بائبل میں ہے کہ یہ ایک "بوقلمون قبا" تھی جو حضرت یعقوب نے یوسُف کو بنوا کر دی تھی، لیکن جیسی بھی ہو اُن کی غرض تو اپنی بات کی تائید تھی کہ بھیڑیا یوسُف کو کھا گیا اور اس کی قمیص باقی رہ گئی اور اس پر خون کے نشان بھی ہیں۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت یوسف کے ذکر میں تین مرتبہ قمیص کا ذکر آتا ہے۔ جس قمیص کو یوسف کے بھائیوں نے بطور شہادت پیش کیا اسی سے حضرت یعقوب معلوم کرتے ہیں کہ جھوٹ موٹ کے نشان ہیں گویا یوسف کے زندہ ہونے کی وہ شہادت بنی، دوسرے موقعہ پر ایک قمیص سے ہی یوسُف کی بریت کی شہادت ملی، اور تیسرے موقعہ پر اپنی قمیص کو ہی حضرت یوسُف نے اپنے باپ کے پاس بھیجا۔ گویا وہ یوسُف کی شان و شوکت کی شہادت بنی۔ بالفاظ دیگر یوسُف کی زندگی، یوسف کی عصمت اور یوسف کی شان و شوکت کی گواہی قمیص سے ہی ملتی ہے اور رویا میں قمیص کی تعبیر علم ہے جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ پر میں نے لمبی قمیص دیکھی اور اس کی تعبیر علم کی اور یہاں اس سورت میں بھی جس طرح قمیص کا ذکر تین دفعہ آتا ہے تین ہی دفعہ حضرت یوسف کے تاویل احادیث کے علم کا ذکر بالخصوص آتا ہے یعنی آیت ۶ میں اور ۲۱ میں اور ۱۰۱ میں ❊

بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۚ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢١﴾

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٢﴾

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ

جو یہ کرتے ہیں ۱۵۲۶

اور اسے تھوڑی سی قیمت چند درہموں پر بیچ ڈالا اور وہ اس کے بارے میں بے رغبت تھے ۱۵۲۷

اور جس نے اسے مصر میں خریدا تھا، اس نے اپنی عورت سے کہا، اسے عزت کی جگہ دے، شاید یہ ہمیں نفع دے، یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔ اور اسی طرح ہم نے یوسفؑ کو ملک میں جگہ دی، تاکہ ہم اسے باتوں کی حقیقت سکھائیں۔ اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۱۵۲۸

اور جب وہ اپنی بلوغت کو پہنچا، ہم نے اُسے حکم اور علم دیا اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں ۱۵۲۹

اور جس کے گھر میں تھا، اس نے اسے اپنے ارادہ سے پھیرنا چاہا اور دروازے بند کر لیے اور کہا ادھر آؤ، اس نے کہا اللہ کی پناہ (مانگتا ہوں) میرے رب نے میرے مقام کو بہت

ع۱۵۲۶ بضاعۃ۔ مال کا وافر حصہ جو تجارت کے لیے رکھا جائے ھذہ بضاعتنا ردت الینا (۶۵) اور اس کا اصل بَضْع سے ہے جس کے معنی ہیں گوشت کا ٹکڑا جو کاٹا جائے اور حدیث میں ہے فاطمۃ بَضْعَۃٌ مِنّی یعنی فاطمہؓ گویا میرے جسم کا ٹکڑا ہے اور بِضْع وہ ہے جو دس سے کاٹا جائے یعنی تین سے ۹ تک پر بولا جاتا ہے (غ)۔

ع۱۵۲۷ زاھدین۔ زھید بہت تھوڑی سی چیز کو کہتے ہیں اور الزاھِدُ فی الشّیٔ کے معنی ہیں اس کی طرف سے بے رغبتی دکھانے والا، گویا اس کی طرف سے نہایت تھوڑی چیز پر راضی ہو جاتا ہے (غ) یہی معنی یہاں ہیں اور زُھد دین سے خاص ہے جو دنیا کی رغبت اور حرص کی ضد ہے (ل) بائبل میں ہے کہ پہلے یوسف کے بھائیوں نے یوسف کو مدیانیوں (قافلہ والوں) کے ہاتھ بیچا پھر مدیانیوں نے اسے مصر میں جا بیچا۔ قرآن شریف سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ والے اسے چھپا کر لے گئے اور مصر میں جا بیچا اور ان لوگوں کو اس کے بارہ میں کچھ زیادہ رغبت نہ تھی۔

ع۱۵۲۸ مکنا۔ تمکین کے معنی ہیں مضبوطی اور قوت دینا اور اسباب تصرف دینا دیکھو ع۹۰۶ مگر مکانۃ منزلۃ اور مرتبہ کو کہتے ہیں (ت) علاوہ ازیں اسباب تصرف دینے سے مراد بھی معزز بنانا ہی ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ خریداری وہ نہیں جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہے۔ یہ اس صورت میں ہو گا جب پچھلی آیت میں فروخت کنندہ حضرت یوسف کے بھائی سمجھے جائیں یہاں حضرت یوسف کو ایک معزز عہدیدار کے ہاں مقام عزت ملتا ہے اور یہاں ان کے استحکام اور علم کی زیادتی کا موجب بن جاتا ہے۔ اللہ کا اپنے امر پر غالب آنا یہ ہے کہ وہ جس طرح پر چاہے ہوتا ہے کوئی اس کے امر کو روک نہیں سکتا اور یہ اشارہ ہے یوسف کو مقام عزت ملنے کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حالت غلامی میں بھی عزت کے مقام پر رکھا۔

ع۱۵۲۹ بلوغ سے مراد: اَشُدّ جسمانی مضبوطی اور روحانی مضبوطی دونوں پر بولا جاتا ہے مگر چونکہ سترہ سال کی عمر کے حضرت یوسف اس وقت تھے جب کنعان سے نکلے اس لیے جسمانی مضبوطی وہ اسی وقت حاصل کر چکے تھے اور یہاں جس اشد کا ذکر ہے وہ روحانی مضبوطی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اب انہیں حکم اور علم عطا ہوتا ہے اور یہ دونوں باتیں روحانی بلوغ سے تعلق رکھتی ہیں اور آگے ذکر بھی ہے کہ اسی طرح احسان کرنے والوں کو ہم بدلہ دیتے ہیں۔ حکم سے مراد یہاں بعض نے نبوت کو لیا ہے مگر یہ درست نہیں کیونکہ اس وقت تک انہیں تبلیغ کا ہی کوئی موقعہ نہ ملا تھا۔

لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾
وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ
بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ
وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ
دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ
مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ

اچھا بنایا۔ ظالم کامیاب نہیں ہوتے ۱۵۳۰
اور اس عورت نے اس کا قصد کیا اور وہ بھی اس کا قصد کرتا،
اگر وہ اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل نہ دیکھ چکا ہوتا، یوں ہُوا تاکہ ہم
اس سے بدی اور بےحیائی کو پھیر دیں وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھا ۱۵۳۱
اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور اس عورت نے اس کی قمیص
پیچھے سے پھاڑ دی اور دونوں نے اس کے خاوند کو دروازے پر پایا،
بولی اس کی کیا سزا ہے جو تیری عورت سے بُرا ارادہ کرے سوائے

ع۱۵۳۰ راودتہ۔ رَوْد کے معنی ہیں کسی چیز کی طلب میں نرمی سے تردد کرنا اور اِرَادَۃ اصل میں وہ قوت ہے جو شہوت اور حاجت اور امل سے مرکب ہو یعنی جس میں خواہش اور حاجت اور امید یا آرزو پائی جائے اور ارادہ کی ابتدا نفس کا کسی چیز کی طرف کھچنا ہے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ حکم لگایا جائے کہ ایسا ہو یا ایسا نہ ہو اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق ارادہ کا لفظ بولا جائے تو مراد اس سے منتہا ہوتا ہے یعنی ایک بات میں حکم لگانا جیسے ان اراد بکم سوٓء او اراد بکم رحمۃ (الاحزاب ۳۳-۱۷) یا اذا اراد اللّٰہ بقوم سوء فلا مردّ لہ (الرعد ۱۳-۱۱) اور انسان میں ارادۃ عموماً نفس کا کسی چیز کی طرف کھچنا ہے اور کبھی اس سے مراد قصد یا طلب کرنا ہوتا ہے جیسے لایریدون علوّا فی الارض (القصص ۲۸-۸۳) اور ارادۃ جس طرح قوت اختیاری سے ہوتا ہے کبھی قوت تسخیری اور حسی سے ہوتا ہے یعنی بے جان چیزوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے جدارا یرید ان ینقضّ (الکہف ۱۸-۷۷) اور حیوانات پر بھی بولا جاتا ہے اور مُرَاوَدَۃ (جس سے یہاں فعل ماضی آیا ہے) یہ ہے کہ تم اپنے غیر سے ارادہ میں جھگڑا کرو اور جو وہ ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف ارادہ کرو یا جس چیز کو وہ طلب کرتا ہے اس کے خلاف طلب کرو اور راودتہ عن نفسہ کے معنی ہیں تَصْرِفہ عن رَأْیِہ یعنی اس کو اپنی رائے سے یا ارادہ سے پھیرنا چاہا (غ)

غلّقت۔ غَلْق کے معنی بند کرنا اور اِغْلاق یا تَغْلِیْق (جس سے یہاں فعل ہے) کثرت سے بند کرنا یعنی بہت دروازوں کا بند کرنا یا بار بار بند کرنا (غ) ھیت اور ھَلُمَّ کے معنی قریب قریب ہیں یعنی آؤ (غ) ھَیْتَ لَکَ۔ اَقْبِلْ یعنی آگے آؤ (ل) بعض نے اسے عبرانی سریانی وغیرہ کہا ہے مگر مجاہد کہتے ہیں کہ یہ عربی ہے (د)

عصمت یوسفؑ: قرآن کریم نے جو لفظ اختیار کئے ہیں ان سے حضرت یوسفؑ کے ارادہ عصمت کی مضبوطی پر کافی شہادت ملتی ہے کیونکہ راودت میں بتایا کہ اس عورت کا ارادہ یوسفؑ کے ارادہ کے خلاف تھا اور عن نفسہ میں اور بھی اس کو موکد کیا ہے حضرت یوسفؑ نے اس عورت کی تمام کارروائیوں اور ارادوں کا ایک ہی جواب دیا ہے معاذ اللّٰہ۔ معلوم ہوا کہ آپ کے ارادہ عصمت میں ادنیٰ جنبش بھی نہیں آئی انہ ربّی سے مراد بعض نے اس عورت کا خاوند لیا ہے مگر ایک متقی آدمی کے مُنہ میں ربی سے مراد اللہ تعالیٰ ہی لینا بہتر ہے۔ اور اچھی جگہ دینا بھی حضرت یوسفؑ عزیز کی طرف منسوب نہیں کر سکتے کیونکہ وہ محض ایک واسطہ ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو حقیقی سبب ہے کیونکہ عزیز کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ہی یوسفؑ کی عزت کی طرف پھیرا کس قدر کامل ایمان ہے کہ فرماتے ہیں اگر میں ایسا کام کروں تو یہ ظلم ہے اور ظالم کامیاب نہیں ہوتا۔ ایسے موقعہ پر جہاں تنہائی ہو، ایک عورت جو مالکہ ہے اپنے غلام کو اپنی طرف بلائے دروازے بند ہیں۔ حضرت یوسفؑ کا عصمت کے بلند مقام پر کھڑا ہونا اس ذکر کے پڑھنے والوں کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا روحانی سبق ہے اور حقیقت میں اگر عزیز مصر کی عورت نے حضرت یوسفؑ کو مقام عصمت سے پھیرنے کی کوشش کی تو قریش مکہ نے بھی آنحضرت صلعم کو جن کو وہ امین جانتے اور کہتے تھے۔ مقام عصمت سے ہٹانے کے لیے خوبصورت سے خوبصورت عورت دینے کا لالچ دیا جس کا جواب آپ نے یہ دیا کہ دنیا کی حکومت اور دولت اور خوبصورتی کیا حقیقت رکھتی ہیں اگر سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ میں رکھ دیں تو بھی میں اپنے مقام کو نہ چھوڑوں۔

ع۱۵۳۱ وھمّ بہا لولا ان راٰ بُرھان ربہٖ۔ لسان العرب میں ابو عبیدہ کا قول منقول ہے کہ یہ تقدیم و تاخیر ہے یعنی مطلب یہ ہے لولا ان راٰ برھان ربہ لھمّ بہا اگر یوسفؑ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ چکا ہوتا تو اس کا قصد کرتا۔

یوسفؑ کے دل میں بدی کا خیال بھی نہیں گزرا: بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ حضرت یوسفؑ معصیت کا خیال دل میں لائے تھے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی کچھ ایسے اقوال منقول ہیں۔ مگر یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی پہلی آیت اس کے خلاف ہے اور جو کچھ وہاں فرمایا ہے، اسی کی مزید تشریح یہاں ہے، وہاں مراودۃ کا ذکر تھا یعنی اس عورت کا یوسفؑ کو اپنے ارادہ اور رائے سے پھیرنے کی کوشش کرنا اسی کوشش کا ذکر ولقد ھمّت بہ میں ہے مگر اس مراودۃ یا اس عورت کی کوشش کا نتیجہ وہاں بتایا تھا قال معاذ اللّٰہ انہ ربی احسن مثوای انہ لا یفلح الظالمون یہاں فرمایا وھمّ بہا لولا ان راٰ برھان ربہ اگر حضرت یوسفؑ کے دل میں کوئی خیال معصیت کا آتا تو قرآن کریم آپ کی طرف الفاظ معاذ اللّٰہ منسوب نہ کرتا۔ اور پھر دوسری جگہ خود اس عورت کی شہادت حضرت یوسفؑ کی

اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾

اس کے کہ اسے قید کیا جائے یا دردناک سزا ہو۔

قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۲۶﴾

(یوسفؑ نے) کہا اس نے مجھے میرے ارادہ سے پھیرنا چاہا اور اس کے لوگوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہو تو وہ سچی ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہے ۱۵۳۲

وَاِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۷﴾

اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہو تو وہ جھوٹی ہے اور وہ سچوں میں سے ہے

فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَیْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾

سو جب اس نے اس کی قمیص کو پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو کہا یہ تم عورتوں کی چال ہے بلاشبہ تمھاری چال بڑی بھاری ہے۔

عصمت پر موجود ہے ولقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم (۳۲) میں نے اس کو اس کے ارادہ سے پھیرنا چاہا مگر وہ مضبوط رہا اور عصمت اختیار کی یہاں صرف مراودتہ اور اس کے محفوظ رہنے کا ذکر ہے اگر کوئی اور واقعہ بھی ہوا ہوتا جیسا کہ ان مفسرین نے خیال کر لیا ہے جنہوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جلس منھا مجلس الرجل من امراتہ تو وہ عورت یوسفؑ کے معصوم ہونے کی شہادت نہ دیتی، جہاں کہیں اس واقعہ کا ذکر ہے دو ہی باتوں کا بیان ہے عورت کی کوشش اور یوسفؑ کا بچا رہنا۔ جب دوسری عورتوں نے یوں شہادت دی حاش للہ ما علمنا علیہ من سوٓء تو اس عورت نے بھی یہی کہا الئٰن حصحص الحق انا راودتہ عن نفسہ وانہ لمن الصادقین (۵۱) نہ دوسری عورتیں یوسفؑ میں کسی ادنٰے بدی کے خیال کے شہادت دیتی ہیں نہ عزیز کی عورت وہی صدق جو پہلے قرائن سے ظاہر ہو چکا اب خود عزیز کی عورت اس کا کھلا اعتراف کرتی ہے غرض یہ خیال کہ حضرت یوسفؑ نے اس عورت سے ارادۂ بد کیا تھا بالکل باطل اور قرآن کریم کے مخالف ہے حل سراویل تک نوبت پہنچنے سے پہلے بہت سے مبادی ہوتے ہیں جو انسان ان میں مبتلا ہو جائے وہ معصوم نہیں کہلا سکتا۔ نہ ہی جب وہ اپنی بریت کا اظہار کرے تو اسے صادق کہا جا سکتا ہے اور خود اس آیت میں ہے کذٰلک لنصرف عنہ السوٓء والفحشآء جہاں ظاہر ہے کہ فحشاء بیحیائی کے فعل کا ارتکاب ہے خواہ وہ زنا ہو یا مبادی زنا اور سوء بیحیائی کا خیال دل میں لانا ہے پس اللہ تعالٰی حضرت یوسفؑ سے نہ صرف زنا اور ہر قسم کے مبادی زنا کی نفی کرتا ہے بلکہ ان گندے خیالات کے آپ کے پاک دل میں آنے کی بھی نفی کرتا ہے۔ اور ھم بھا لولاان راٰ برھان ربہ کی جس طرح ترکیب ہے ایسے ہی دوسری جگہ ہے ان کادت لتبدی بہٖ لولا ان ربطنا علٰے قلبھا (القصص۲۸-۱۰) یعنی حضرت موسٰیؑ کی والدہ اس بات کو ظاہر کر دیتی اگر ہم نے اس کا دل مضبوط نہ کر دیا ہوتا اور روح المعانی میں ہے کہ جواب کا شرط پر مقدم ہونا ممتنع نہیں تاہم اس کی ترکیب ایسی ہے جیسے عرب کہتے ہیں انت ظالم ان فعلت کذا جہاں ظلم کا اثبات نہیں بلکہ نفی ہے اسی طرح یہاں حضرت یوسفؑ کے ھمّ کی نفی ہے اور تفسیر بحر المحیط میں ہے کہ بعض لوگوں نے یوسفؑ کی طرف وہ بات منسوب کی ہے جو ایک فاسق کی طرف بھی منسوب نہیں کی جا سکتی حالانکہ حضرت یوسفؑ سے ھم کے واقع ہونے کا نہیں بلکہ اس کی نفی کا ذکر ہے۔

برھان ربہ کو کسی نے حضرت یعقوبؑ کا بطور تمثل نظر آنا اور نصیحت کرنا کہا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس عورت نے اپنے بت پر پردہ ڈالا تو حضرت یوسفؑ نے کہا کہ اگر تجھے اس پتھر سے شرم آتی ہے جو نہ سنتا ہے نہ عقل رکھتا ہے تو میں اپنے خدا سے شرم نہ کروں جو ہر وقت اور ہر حال میں دیکھتا ہے اور بعض نے کہا کوئی تحریر سامنے آ گئی یا جبرئیل نے آ کر روک دیا مگر قرآن شریف نے خود اس دلیل کا ذکر پہلی آیت میں کیا ہے انہ ربی احسن مثوای انہ لا یفلح الظالمون اور یہی وہ برہان رب تھی جس نے حضرت یوسفؑ کو بچا لیا یعنی ان کا کامل ایمان اللہ تعالٰی پر اور اس کی ربوبیت پر اور اس بات پر کہ ظالم کو فلاح نہیں ملتی۔

۱۵۳۲۔ شاہد کون تھا: یہ شاہد بعض کے نزدیک ایک چھوٹا بچہ تھا اور بعض کے نزدیک دانا عمر رسیدہ آدمی دونوں قسم کے اقوال ابن کثیر میں اور ابن جریر میں موجود ہیں اس کی گواہی اسی قدر تھی کہ اس نے ایک مضبوط قرینہ کی طرف توجہ دلائی یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرائن کی شہادت بھی مقدمات کے فیصلہ کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم نے بڑی وضاحت سے حضرت یوسفؑ کی بریت یہاں بھی کی ہے اور آگے چل کر بھی، مگر بائبل میں صرف اس قدر ذکر کر کے کہ جب عزیز کی عورت نے اُسے بُلایا تو وہ اپنا پیراہن اس کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگا" (پیدائش ۲۹: ۱۲) بریت کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اسی جرم کی بنا پر اسے قید کیا جاتا ہے اور پیراہن چھوڑ کر بھاگنے کا واقعہ اس جرم میں تائیدی شہادت بن جاتا ہے اور اس الزام سے حضرت یوسفؑ کی "قطعاً" کوئی صفائی نہیں ہوتی۔ یہ کتاب کیونکر اخلاق کا سبق سکھا سکتی ہے جس میں ایک پاک انسان پر تہمت کا ذکر کر کے اسے اس تہمت سے بری نہیں کیا جاتا اور اس سے پہلے باب میں اسی کتاب پیدائش میں حضرت یوسفؑ کے ایک بھائی یہوداہ کے متعلق ایک نہایت گندے اور فحش قصے کا ذکر کیا ہے جو اگر کسی ناول میں بھی ہوتا تو اسے پڑھنے کے ناقابل قرار دیا جاتا مگر بائبل باوجود ان گندے قصوں کے کتاب مقدس کہلاتی ہے اور قرآن کریم کو باوجود اس کی اعلٰی اخلاقی تعلیم کے رد کیا جاتا ہے۔

يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٟ وَاسْتَغْفِرِي لِذَنْبِكِ ۚ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾

یوسف! اس سے درگزر کر اور (اے عورت!) اپنے قصور کی معافی مانگ کیونکہ تو خطا کاروں میں سے ہے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

اور شہر میں عورتوں نے کہنا شروع کیا کہ عزیز کی عورت اپنے غلام کو اس کے ارادہ سے پھیرنا چاہتی ہے اس کی محبت اس کے دل میں بیٹھ گئی ہے ہم اسے صریح غلطی میں پاتی ہیں ۱۵۳۳ع

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾

جب اُس نے اُن کی چال سُنی ان کو بلوا بھیجا اور ان کے لیے کھانا تیار کیا اور اُن میں سے ہر ایک کو ایک (ایک) چھری دی اور (یوسف کو) کہا ان کے سامنے نکل - سو جب انھوں نے اسے دیکھا، اسے بہت بڑا سمجھا اور اپنے ہاتھ کاٹے — اور بول اٹھیں اللہ پاک ہے یہ انسان نہیں، یہ تو ایک بزرگ فرشتہ ہے ۱۵۳۴ع

۱۵۳۳ع مدینة - مَدَنَ بالمکان کے معنی ہیں مکان میں ٹھہرا اور اسی سے مَدِینة ہے جس کے معنی شہر ہیں اور مدینة اس قلعہ کو بھی کہتے ہیں جو کسی زمین کے وسط میں بنایا جائے اور اس زمین کو بھی جس میں ایسا قلعہ بنایا جائے اور بالخصوص یہ لفظ نبی کریم صلعم کے شہر پر بولا جاتا ہے اور جب اس کی طرف کسی چیز کو منسوب کیا جائے تو مَدَنِیْ کہا جاتا ہے اور عام معنی میں مدینة کی طرف منسوب ہو تو مَدِینی۔

العزیز - عزیز - غالب کو کہتے ہیں اور بادشاہ کو اور مصر کے بادشاہوں کا یہ خطاب تھا (ت) مگر یہاں بادشاہ مراد نہیں۔ اس لیے کہ اس کا ذکر لفظ مَلِكُ میں الگ آتا ہے بلکہ اس کے عظیم الشان امراء میں سے ایک مراد ہے جس کے سپرد کل کاروبار سلطنت کا انصرام معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب یہی حیثیت حضرت یوسف کو ملتی ہے تو پھر اسے اسی خطاب العزیز سے پکارا جاتا ہے۔ بائبل میں اس کا نام فُوطیفار لکھا ہے جو فرعون کا ایک امیر اور لشکر کا رئیس تھا۔

شغف - شَغَاف - غلافُ القَلْب یا دل کے پردے کا نام ہے اور شغفہا حبا کے معنی ہیں کہ اس کی محبت اس کے دل کے پردے کے نیچے داخل ہو گئی یا اس کے دل پر غالب آ گئی (ل)

۱۵۳۴ع بمکرھن - مَکْر باریک تدبیر کو کہتے ہیں عورتوں کی گفتگو کو جو انہوں نے عزیز کی عورت کے متعلق کی مکر اس لیے کہا کہ انہوں نے اسے یوسفؑ کے دیکھنے کا حیلہ بنایا اور یا ان کی غیبت اور بُری باتوں کے ذکر کو مکر اس لیے کہا کہ اخفا میں وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مکر سے مراد یہ ہو کہ انہوں نے کہلا بھیجا ہو کہ ہم ایک تجویز کرتے ہیں جس سے یوسفؑ کو قابو میں لایا جا سکتا ہے اور اسی غرض کے لیے انہیں بلایا گیا ہو۔ اس صورت میں پچھلی آیت کے آخر پر ضلال مبین یا صریح غلطی سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے ٹھیک طریق اس غرض کے حصول کا اختیار نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہ اسے چاہیے تھا کہ پہلے یوسفؑ کو کسی اور کی معرفت اس بات پر راضی کر لیتی۔

متکا - تَوَکَّأَ اور اِتَّکَأَ (مادہ وکا ہے) کے معنی ہیں ٹیک لگائی هی عصای اتوکّٶا علیها (طٰہٰ - ۱۸)[20] علی الارائك متکئون (یٰسٓ - ۵۶)[36] اور متکا تکیہ وغیرہ کو بھی کہتے ہیں اور طعام یا کھانے کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ کھانے کے لیے ٹیک لگائی جاتی تھی اور اس امت کو ٹیک لگا کر کھانے سے منع کیا گیا ہے اور بعض نے متکا کے معنی مجلس بھی کیے ہیں (ل) اور ترنج بھی اس کے معنی ہیں (غ) اور ان سب کے مطابق ابن جریر میں روایات بھی موجود ہیں۔

سکین - سکن سے ہے چھری کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اس چیز کو جسے اس سے ذبح کیا جائے حالت سکون میں کر دیتی ہے (ل)

اکبرن - اَکْبَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہیں رَاَیْتُہٗ کَبِیْرًا اسے بڑا دیکھا (غ)

حاش للہ کے معنی بُعْدًا منہ اور تنزیہ کے طور پر اس کا استعمال ہوتا ہے (غ) یعنی ہر ایک عیب اللہ سے دور ہے۔

عورتوں کا یوسفؑ کو یکایک دیکھ کر جب وہ کھانے میں مصروف تھیں اور اس غرض کے لیے ان کے ہاتھوں میں چھریاں تھیں حیرت زدہ ہو جانا اور اپنے ہاتھوں کو کاٹ لینا کوئی ایسا تعجب انگیز واقعہ نہیں جس کا انکار کیا جائے۔ ہاں ہاتھوں کے کاٹنے سے مراد یہاں یہ نہیں کہ ہاتھ کٹ کر الگ ہو گئے

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

(عزیز کی عورت نے) کہا یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں اور میں نے اسے اس کے ارادے سے پھیرنا چاہا مگر یہ بچا رہا اور اگر جو میں حکم دوں اس نے نہ کیا تو اسے ضرور قید کر دیا جائے گا اور وہ ذلیل لوگوں میں سے ہوگا ۱۵۳۵

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾

(یوسفؑ نے) کہا اے میرے رب! مجھے قید اس سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہے اور اگر تو ان کی چال کو مجھ سے نہ پھیرے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا ۱۵۳۶

تھے بلکہ چھری سے ان پر زخم ہو جانا مراد ہے اور گو یہ مجاز ہے مگر مفسرین نے بھی عموماً اسی معنی کو ترجیح دی ہے یہاں تک کہ عکرمہ سے ایک معنی مروی ہیں کہ ہاتھوں کو نہیں بلکہ آستینوں کو کاٹ لیا تھا۔ اور مجاز کے رنگ میں ہی یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ حیرت سے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا جیسا غضب کے وقت انگلیوں کے کاٹنے کا محاورہ ہے عضوا علیکم الانامل من الغیظ (آل عمران ۳ - ۱۱۹) اور ان کا یہ کہنا کہ یہ بشر نہیں بلکہ فرشتہ ہے صرف حُسن صورت کے لحاظ سے نہیں بلکہ عصمت پر مضبوطی کے لحاظ سے یہ لفظ زیادہ موزوں ہیں اور قرین قیاس ہے کہ حضرت یوسف نے اس حسن و زینت کے مجمع کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا جس پر انہیں اور بھی زیادہ تعجب ہوا۔ ایک دوسری توجیہ ان الفاظ کی وہ بھی ہو سکتی ہے جس کی طرف لفظ مکر کی تشریح میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی عزیز کی عورت نے ان کو ایک چال کرنے کے لیے بلایا تھا اور وہ تجویز انھوں نے اسے پہلے بتا دی ہوگی اس لیے دعوت کا سامان تیار کر کے چھریاں وغیرہ ان کے ہاتھ میں دیدیں اور یوسفؑ کے نکلنے پر ان سب نے یا بعض نے چھریوں کو عمداً ہاتھوں پر لگا لیا اور پھر یوسفؑ پر زور ڈالا کہ یہ واقعہ تمہارے خلاف بطور شہادت ہو جائے گا ورنہ تم عزیز کی عورت کی بات مان لو۔ اور پھر بھی جب حضرت یوسف نے انکار ہی کیا تو وہ بول اُٹھیں کہ یہ بشر نہیں جو کسی بات کی پروا بھی نہیں کرتا بلکہ فرشتہ ہے اس صورت میں اگلی آیت میں لمتننی فیہ سے مراد ہوگی کہ تم مجھے ملامت کرتی تھیں کہ میں اسے راضی نہیں کر سکی اب تم نے بھی زور لگا کر دیکھ لیا مزید تشریح کے لیے دیکھو ح ۱۵۳۶

ان واقعات کا ذکر بھی بائبل میں نہیں مگر جس مقام عصمت کو حضرت یوسف کے بیان میں ظاہر کرنا مقصود ہے اس کی اصل غرض حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ یہ نہ دکھایا جائے کہ ایک ہی عورت نہیں بلکہ کل شہر کے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں کی حسین عورتیں حضرت یوسف کو اپنے مقام عصمت سے ایک بال برابر ادھر اُدھر نہیں کر سکیں۔ اسی بلند مقام پر ہر مسلم کو پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ سبق بائبل کے قصہ سے نہیں ملتا۔

ح ۱۵۳۵۔ استعصم۔ یعنی اس چیز کو طلب کیا جو اسے بچائے رکھے (غ)، یا حالت عصمت میں رکھے۔

عزیز کی عورت نے حضرت یوسف کو ان سب کے سامنے دھمکی دی کہ اگر وہ اس کی ناجائز خواہش کو پورا نہ کرے گا تو ذلیل کر دیا جائے گا اور قید کر دیا جائیگا اور یہ کہہ کر اس کے بارہ میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں ان کی ہمدردی کو اپنی طرف مائل کیا ہے۔

ح ۱۵۳۶ اصب صَبَاءً کے معنی ہیں نَزَعَ وَ اشْتَاقَ وَفَعَلَ فِعْلَ الصِّبْيَانِ یعنی ایک چیز کی طرف کھچا چلا گیا اور مشتاق ہوا اور لڑکوں کا سا کام کیا کیونکہ صَبِی لڑکے کو کہا جاتا ہے۔

عورتوں کا یوسف پر دباؤ ڈالنا: یہاں ان عورتوں کے سارے مشوروں کا ذکر نہیں جو اس وقت انہوں نے کیے یا جو کچھ حضرت یوسف کو کہا مگر مما یدعوننی الیہ اور کیدھن سے صاف ظاہر ہے کہ ان عورتوں نے حضرت یوسف کو کسی بات کے لیے کہا ہے اور کوئی چال چلی ہے جس سے حضرت یوسف کو سخت فکر ہوا ہے اب بلانے والی ایک نہیں اور نہ چال چلنے والی اکیلی عزیز کی عورت ہے بلکہ یہ عورتیں بھی اس چال میں شامل ہو گئی ہیں اور وہ بھی کسی رنگ میں حضرت یوسف کو اسی بات کی طرف بلاتی ہیں جس کی طرف عزیز کی عورت نے بلایا تھا۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ عورتیں عزیز کی عورت کے منشا کو پورا کرنے میں معاون ہو گئیں اور انہوں نے ہاتھوں کے کاٹنے کو اس بات کی طرف منسوب کیا ہے کہ حضرت یوسف نے ان کی عفت پر حملہ کیا ہے اور ان کے ہاتھوں وغیرہ پر اس وجہ سے زخم آ گئے ہیں۔ اس لیے باوجود اس بات کے کہ عزیز اپنی بیوی کے معاملہ میں مطمئن ہو چکا تھا کہ قصور عورت کا ہے حضرت یوسف کو قید کیا جاتا ہے دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف کو جب قید خانہ سے رہائی کا حکم جاتا ہے تو وہ اپنی بریت سے پیشتر اس سے نکلنا پسند نہیں کرتے اور اس بریت کے لیے عزیز کی عورت کی طرف سے بریت نہیں چاہتے بلکہ یوں کہتے ہیں ما بال النسوة التی قطعن ایدیھن ان ربی بکیدھن علیم (۵۰) ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے میرا رب ان کی چال سے خوب واقف ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ہاتھ کاٹنے کا واقعہ یا تو فی الواقع کوئی چال تھی۔ یا اسے بطور ایک چال کے استعمال کیا گیا۔ اور ان عورتوں کا جواب ما علمنا علیہ من سوء (۵۱) ہم نے یوسفؑ میں کوئی بُرائی نہیں

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۴

سو اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان کی چال کو اس سے پھیر دیا وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ۝۳۵ ع

پھر اس کے بعد کہ نشانیاں دیکھ چکے تھے، انھیں یہ سُوجھا کہ اسے ایک وقت تک قید کر دیں ۱۵۳۷۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۶

اور اس کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان اور داخل ہوئے ان میں سے ایک نے کہا میں نے اپنے آپ کو شراب نچوڑتے ہوئے دیکھا اور دوسرے نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اُٹھائے ہوئے ہوں جن میں سے پرند کھا رہے ہیں۔ ہمیں اس کی تعبیر بتا، کیونکہ ہم تجھے نیکوکاروں میں سے دیکھتے ہیں ۱۵۳۸۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۷

اس نے کہا جو کھانا تمھیں دیا جاتا ہے تمھارے پاس آنا نہیں پائیگا کہ میں اس کی تعبیر تمھیں بتا دوں گا قبل اس کے کہ وہ (کھانا) تمھارے پاس آئے یہ وہ علم ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا کیونکہ میں نے اس قوم کے مذہب کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں ۱۵۳۹۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ

اور میں اپنے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور

پانی۔ یوسفؑ کی بریت کرتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کی طرف سے کسی بُرائی کا الزام پہلے دیا گیا تھا۔ قرآن کریم کی یہ صراحت صاف بتاتی ہے کہ اس موقع پر ان عورتوں نے یا تو عمداً ہاتھ کاٹے تھے اور یا اگر استعجاب میں ہاتھ کٹ گئے تھے تو اسی واقعہ کو یوسفؑ کے خلاف ایک نئے الزام کی صورت میں کھڑا کیا گیا۔

معصیت پر قید کو ترجیح: اور اس موقع پر حضرت یوسف کو بتایا گیا کہ عزیز کی عورت کی خواہش کو پُورا کر دو، ورنہ جیلخانہ میں جانا ہوگا۔ اسی پر آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ یعنی قید خانہ کو اختیار کرنا آسان ہے اور معصیت میں پڑنا مشکل ہے اسی ایمان پر اللہ تعالیٰ ہر مسلم کو قائم کرنا چاہتا ہے کہ معصیت اسے قید سے اور ہلاکت سے بڑی مصیبت معلوم ہو۔

۱۵۳۷ آیات یا نشانوں سے مراد حضرت یوسف کی بریت کے نشان ہیں۔ باوجود اس کے کہ قرائن کی شہادت سب حضرت یوسف کے حق میں تھی مگر چونکہ معاملہ قومی تھا اس لیے حضرت یوسف کو قید کر دیا۔

۱۵۳۸ دونوں قیدی جب حضرت یوسف کے پاس رہ کر نیکی کو دیکھتے ہیں تو اپنی خوابیں آپ کے پاس بیان کرتے ہیں۔

۱۵۳۹ چونکہ انہوں نے خود کہا تھا کہ ہم آپ کو احسان کرنے والوں میں سے دیکھتے ہیں اس لیے حضرت یوسف نے اوّل ان کو نصیحت شروع کی کہ شاید وہ بھی اصلاح کی راہ پر آجائیں۔ بائبل میں یہ حصّہ بھی مفقود ہے اور صرف خوابوں اور خوابوں کی تعبیر کا ذکر ہے ایک ایک قدم پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے کس طرح حضرت یوسف کے ذکر کو مفید نصائح سے بھر دیا ہے حالانکہ بائبل میں یہ ایک خشک کہانی ہے اور یوں بتا دیا ہے کہ زنداں کے پتھر کی دیواریں بھی انسان کو نیکی سے نہیں روک سکتیں جو اس کی زندگی کی اصل غرض ہے اور یہ جو شروع میں کھانے کا ذکر کیا ہے تو مراد یہ نہیں کہ کھانے کی کیفیت بتا دوں گا بلکہ تاویلہ سے مراد خواب کی تعبیر ہی ہے جو انہوں نے دریافت کی ہے۔ مگر چونکہ آپ ان کو کچھ وعظ کرنا چاہتے تھے اور دنیادار وعظ سے جلد اُکتا جاتے ہیں اس لیے فرمایا کہ تمہارا بڑا کام تو اب کھانے سے پیٹ بھرنا ہے۔ سو اس سے پہلے پہلے میں تمہیں تعبیر بھی بتا دوں گا اور نصیحت کو بھی ختم کر دوں گا۔

وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَن نُّشْرِكَ بِاللَّهِ مِن شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِن فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٨﴾

یعقوبؑ کے مذہب کا پیرو ہوں، ہمارا کام نہیں کہ کسی چیز کو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائیں۔ یہ ہم پر اور لوگوں پر اللہ کا فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے [1540]

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾

اے میرے قید خانہ کے دو ساتھیو! کیا الگ الگ خداوند اچھے ہیں یا اللہ (جو) اکیلا سب پر غالب (ہے) [1541]

مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٠﴾

اسے چھوڑ کر تم صرف ناموں کی پوجا کرتے ہو، جو تم نے اور تمھارے بزرگوں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اللہ کے سوا اور کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو یہ سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ [1542]

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا ۖ وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِن رَّأْسِهِ ۚ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ ﴿٤١﴾

اے میرے قید خانہ کے دو ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرا صلیب دیا جائے گا، تو پرند اس کے سر سے (نوچ کر) کھائیں گے اس بات کا فیصلہ ہو چکا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو۔

وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ﴿٤٢﴾ ع ۵

اور اُسے جس کے متعلق اسے خیال تھا کہ وہ ان دونوں میں رہائی پا جائیگا کہا میرا ذکر اپنے آقا کے پاس کرنا، مگر شیطان نے اسے اپنے آقا کے پاس ذکر کرنا بھلا دیا سو (یوسفؑ) کئی سال قید خانہ میں پڑا رہا [1543]

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ

اور بادشاہ نے کہا میں نے سات موٹی گائیں دیکھی ہیں، انھیں

ع ۱۵۴۰ یہاں صرف اصل اصول مذہب کا ذکر ہے یعنی توحید باری جو سب مذاہب میں یکساں ہے پس مراد یہ ہے کہ جو اصول ان کے مذہب کے ہیں وہی میرے مذہب کے اصول ہیں۔

ع ۱۵۴۱ گویا شرک کرنے والا مختلف آقاؤں کی غلامی اختیار کرتا ہے اور مختلف آقاؤں کا غلام کبھی خوشحال نہیں ہو سکتا۔ اللہ سب پر غالب ہے پس جو اس کی غلامی اختیار کرتا ہے اسکو اور کسی کی احتیاج نہیں رہتی۔

ع ۱۵۴۲ اسماء سے مراد یہاں صرف الفاظ ہیں جن کے نیچے حقیقت کوئی نہیں ان الحکم الا للہ میں بتایا کہ وہی حکم درست ہے جو اللہ دے اور اللہ نے آج تک اپنے کسی نبی کے ذریعہ سے یہ حکم نہیں دیا کہ خدا تعالےٰ کے سوائے اوروں کی بھی پرستش کرو۔ بلکہ وہ ہمیشہ ہی حکم دیتا رہا ہے کہ اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو۔

ع ۱۵۴۳ ذکر ربہ میں اضافت ادنیٰ ملابست ہے اور مراد ہے ذکر یوسف عند ربہ یہ درخواست استعانت غیر اللہ میں داخل نہیں بلکہ چونکہ انہوں نے آپ کی نیکی کو دیکھ کر خود اعتراف کیا تھا اس لیے آپ نے یہی چاہا کہ یہی شہادت حقہ وہ بادشاہ کے دربار میں بھی ادا کر دے تا اسے معلوم ہو جائے

سِمَانٍ يَّأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ
سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا
الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ
لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

سات دُبلی (گائیں) کھا گئی ہیں - اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی ، اے درباریو! میرے خواب کی تعبیر بتاؤ ، اگر تم خواب کی تعبیر کر سکتے ہو؟ [۱۵۴۴]

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ
بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

انھوں نے کہا پریشان خواب ہیں — اور ہمیں (ایسے) خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں [۱۵۴۵]

وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ
اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

اور جو ان دونوں (قیدیوں) میں سے رہا ہوا تھا اس نے کہا اور ایک مدت کے بعد اُسے یاد آیا میں تمھیں اس کی تعبیر بتاؤں گا مجھے بھیجو۔ [۱۵۴۶]

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ
بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ
وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ
لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

یوسفؑ ! اے صدیق ! ہمیں سات موٹی گائیوں کی تعبیر بتاؤ ، جنھیں سات دبلی (گائیں) کھا گئی ہیں۔ اور سات ہری بالیں اور دوسری سوکھی - تاکہ میں لوگوں کے پاس واپس جاؤں تاکہ وہ جان لیں -

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا
حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا

(یوسفؑ نے) کہا تم حسب معمول سات سال کھیتی کرو گے ، تو جو کچھ کاٹو اسے اپنے خوشہ میں ہی رہنے دو ، سوائے تھوڑے

کہ یوسف پر ناحق الزام لگایا گیا ہے۔

[۱۵۴۴] سمان - سَمِین کی جمع ہے اور سِمَن ھُزال کی ضد ہے یعنی فربہی اور لاغری - اور اَسْمَنَ کے معنی اسے موٹا کر دیا لا یسمن ولا یغنی من جوع - (الغاشیۃ ۸۸ - ۷) اور سَمْن گھی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ موٹا کرتا ہے (غ)

عجاف - اعجف اور عجفاء کی جمع ہے ، جو ہزال سے بہت پتلا ہو گیا ہو۔

خضر - اَخْضَر کی جمع ہے - سبز - یابس - یَبْس سے ہے جس کی رطوبت جاتی رہی ہو (غ)

تعبرون - عَبْر کے معنی ہیں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تجاوز - پھر پانی پر سے گزرنے سے عُبُور مخصوص ہے اور تَعْبِیْر رویا سے خاص ہے (اور رویا کے لیے تاویل کا لفظ بھی بولا جاتا ہے مگر یہ عام لفظ ہے دوسری جگہ بھی بولا جاتا ہے) گویا رویا کے ظاہر سے باطن کی طرف گزرنا ہے عبرۃ وغیرہ کے لیے دیکھو [۳۸۴]۔

[۱۵۴۵] اضغاث - ضِغْث کی جمع ہے - اور ضَغْث ایک چیز کے ایک حِصّہ کو دوسرے حِصّہ سے ملا دینا ہے اور ضغث الحدیث کے معنی ہیں بات کو خلط ملط کر دیا - اس لیے ایسی خوابیں جو بوجہ پریشانی کے ایک دوسرے سے مل گئی ہوں ان کو اضغاث کہا جاتا ہے - جن کی اختلاط کی وجہ سے تعبیر نہیں ہو سکتی (ل)

احلام - حِلْم کے معنی ہیں غضب کے ہیجان سے نفس اور طبیعت کا ضبط میں رکھنا اور اس کی جمع بھی اَحْلام آتی ہے ام تامرھم احلامھم بھذا (الطور ۵۲ - ۳۲) جہاں مراد عقل ہے گو حِلْم کے اصل معنی عقل نہیں اور حُلُم اور حُلْم کی جمع بھی اَحلام ہے جس کے معنی خواب ہیں اور حُلُم بلوغت کو بھی کہتے ہیں واذا بلغ الاطفال منکم الحلم (النور ۲۴ - ۵۹) اور حُلم بمعنی خواب اور رؤیا میں فرق یہ ہے کہ ابتداءً زبانِ عرب میں دونوں خواب پر بولے جاتے تھے مگر شارع علیہ السلام نے رویا کو اچھے خواب سے اور حلم کو بُرے خواب سے مخصوص فرما دیا جیسا کہ فرمایا الرُّؤیا من اللہ والحلم من الشیطان رویا اللہ کی طرف سے ہے اور حلم شیطان کی طرف سے ہے اور اسی سے احتلام ہے (ل) یہی فرق قرآن کریم نے بھی رکھا ہے کیونکہ بادشاہ اپنے خواب کو رویا کہتا ہے اور اہل دربار اسے احلام قرار دیتے ہیں۔

[۱۵۴۶] ادّکر - اصل میں اِذْتکر ہے یعنی ذِکْر سے باب افتعال - تا دال سے بدل گئی اور ذال اس میں مدغم ہو گئی۔

مِمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝۴۷
کے جس سے تم کھاؤ[۱۵۴۷]

ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ
يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا
مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝۴۸
پھر اس کے بعد سات سخت (سال) آئیں گے وہ سب کچھ کھا جائیں گے جو تم نے ان کے لیے پہلے جمع کیا ہے، مگر تھوڑا، جو تم بچا لوگے[۱۵۴۸]

ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ
ع يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝۴۹
پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا، جس میں لوگوں پر مینہ برسایا جائے گا اور اس میں وہ (انگور) نچوڑیں گے[۱۵۴۹]

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ
الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ
مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ
اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝۵۰
اور بادشاہ نے کہا اُسے میرے پاس لے آؤ، سو جب ایلچی اس کے پاس آیا تو اس نے کہا اپنے آقا کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، میرا پروردگار ان کی چال سے خوب واقف ہے[۱۵۵۰]

ع ۱۵۴۷ دأبا دیکھو ع ۳۸۱ مفردات میں ہے کہ دَأَب کے معنی اِدَامَةُ السَّيْرِ ہیں یعنی ہمیشہ چلتے رہنا۔ وسخر لکم الشمس والقمر دائبین (ابراھیم ۱۴۔ ۳۳) پس دَأَب سے مراد عادت مستمرہ ہے (رغ)

حضرت یوسف تعبیر کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس لیے جب سات موٹی گائیوں اور سات سبز خوشوں کی تعبیر ان الفاظ سے کی کہ سات سال حسب معمول کھیتی کرو گے یعنی فصلیں اچھی لگیں گی تو ساتھ ہی بتا دیا کہ جتنا کھانے کی ضرورت ہو اسے نکال کر باقی کو خوشوں میں چھوڑ دو اس کی غرض یہ تھی کہ تا کیڑے سے محفوظ رہے اور خراب نہ ہو جائے۔

ع ۱۵۴۸ یہ سات دُبلی گائیوں کی تعبیر ہے جو موٹی گائیوں کو کھا گئیں اور سات خشک خوشوں کی۔ اور قلیل جو محفوظ رکھا ہے وہ بیج وغیرہ کے لیے ہے۔

بخاری میں سورۂ یوسف کی تفسیر میں اس موقعہ پر وہ حدیث لکھی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم صلعم کی دعا سے قریش پر سات سال قحط کے آئے قال اللّٰھم اکفنیھم بسبع کسبع یوسف یعنی نبی کریم صلعم نے دعا کی کہ اے اللہ ان پر سات سال کا قحط بھیج کر جیسے یوسفؑ کے وقت میں سات سال کا قحط پڑا تھا مجھے ان کی شرارتوں سے بچا۔ چنانچہ اس دعا کا اثر یہ لکھا ہے فاصابتھم سنۃ حصّت کل شیء حتی اکلوا العظام حتی جعل الرجل ینظر الی السماء فیری بینہ وبینھا مثل الدخان۔ یعنی ان پر ایسا قحط پڑا جس نے سب چیزوں کو برباد کر دیا یہاں تک کہ لوگوں نے ہڈیاں کھا کر گزارہ کیا اور ایک شخص آسمان کی طرف دیکھتا تو اپنے اور اس کے درمیان دھواں سا دیکھتا۔ چنانچہ یہ پیشگوئی قرآن شریف میں دوسری جگہ موجود ہے فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین (الدخان ۴۴۔ ۱۰) اس حدیث کو سورۂ یوسف کی تفسیر میں لانے کا صاف منشاء یہ ہے کہ سورۂ یوسف میں بھی آنحضرت صلعم کا ہی ذکر ہے اور یہی منشا ان الفاظ کا ہے آیات للسائلین جو شروع سورت میں ہیں۔

ع ۱۵۴۹ عام کے معنی سال ہیں جس طرح سَنَة کے معنی سال ہیں لیکن سَنَة کا استعمال زیادہ تر ایسے سال پر ہے جس میں خشکی اور شدت ہو اور عام کا اس پر جس میں بارش اور ارزانی ہو۔

یغاث۔ دیکھو ۱۲۰۸ غَوْث مدد ہے اور غَيْث بارش اور مدد دینے پر اَغاث کہا جاتا ہے اور بارش برسانے پر غَاثَ (رغ)

یہ محض خوشخبری کے طور پر ہے کہ قحط کے سات سال ختم ہو کر پھر بارش ہو گی اور حدیث میں ہے کہ جب سات سال قحط کے قریش پر گزرے تو ابوسفیان آنحضرت صلعم کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کی قوم کے لوگ بھوک سے مر رہے ہیں تب نبی کریم صلعم نے دعا کی اور بارش ہوئی اسی کی طرف اشارہ کرنے کو یہاں آخر پر بارش کے سال کا ذکر کیا۔

ع ۱۵۵۰ بال۔ شان یا وہ حال ہے جس کی پروا کی جائے حدیث میں کل امر ذی بال اہم امور یا معاملات کو کہا گیا ہے۔ اس لفظ کو اختیار کرنے میں یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ جس کے صاف کرنے کو حضرت یوسف اہمیت دیتے تھے۔

بائبل حضرت یوسف کو الزام سے پاک نہیں کرتی: بائبل میں یہ ذکر بھی موجود نہیں۔ بلکہ صرف اس قدر ہے کہ جب فرعون نے یوسفؑ کو خواب کی تعبیر کے لیے بلوایا تو حضرت یوسف فوراً حاضر ہوئے اور بادشاہی دربار میں آ گئے۔ برخلاف اس کے قرآن شریف اس حصہ کا ذکر کر کے یہ بتاتا ہے کہ خدا پرستوں کی نگاہ میں دنیوی وجاہت کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ حضرت یوسف جانتے تھے کہ ان کے خواب کی تعبیر کی وجہ سے بادشاہ ان کی عزت کرے گا مگر وہ قیدخانہ

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْــٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ؗ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۵۱

(بادشاہ نے) کہا، کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسفؑ کو اپنے ارادے سے پھیرنا چاہا انھوں نے کہا اللہ پاک ہے ہم نے اس میں کوئی بدی معلوم نہیں کی، عزیز کی عورت نے کہا اب حق کھل گیا، میں نے ہی اسے اس کے ارادے سے پھیرنا چاہا اور یقیناً وہ سچوں میں سے ہے ؁۱۵۵۱

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝۵۲

(یوسفؑ نے) کہا یہ اس لیے ہے کہ وہ جان لے کہ میں نے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی اور کہ اللہ خیانت کرنیوالوں کی چال کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا ؁۱۵۵۲

سے نکلنا بھی پسند نہیں کرتے جب تک کہ اس الزام سے تمام لوگوں کی نظر میں پاک نہ ہو جائیں جو الزام لگا کر انہیں قید خانہ میں ڈالا گیا تھا۔ حضرت یوسف کا ان عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کے معاملہ کو اس قدر وقعت دینا بتاتا ہے کہ یہی ان کے خلاف بڑی بھاری گواہی تھی۔

بخاری میں اس موقعہ پر تفسیر میں ہے ولو لَبِثْتُ فی السِّجْن مالَبِثَ یُوسُفُ لاجَبْتُ الداعی یعنی اگر میں قید خانہ میں اسی طرح رہتا جس طرح یوسفؑ رہا تو میں بلانے والے کی بات کو مان لیتا۔ اس کا مطلب صرف حضرت یوسف کے اس فعل کی عزت ہے کہ کس قدر اپنی عفت کے معاملہ کو انہوں نے صاف کرنا چاہا اور قید خانہ کو الزام سے ملوث رہنے پر ترجیح دی۔ رہا یہ کہ آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ میں ہوتا تو قید خانہ میں نہ رہتا۔ تو وہ دوسرے نقطۂ خیال سے ہے اس لیے کہ آپ کا کام حضرت یوسف کے کام کے مقابل میں اتنا بڑا تھا کہ آپ کو ان باتوں کی پروا نہ تھی کہ لوگ کیا کہتے ہیں آپ کے مدنظر صرف دوسروں کی اصلاح کا عظیم الشان کام تھا۔ اگر اتنا بڑا کام حضرت یوسف کے سپرد ہوتا تو وہ بھی الزام کی پروا نہ کرتے۔ ہاں یہ مرتبہ اس سے بھی بلند تر ہے۔ رہا تہمت سے بچنے کا معاملہ سو آنحضرت صلعم کی یہی تعلیم ہے کہ تہمت کے موقعوں سے بچو اور خود آپ جب اپنی بی بی کے ساتھ کسی موقعہ پر کھڑے تھے اور پاس سے ایک صحابی کا گزر ہوا تو آپ نے اسے بلایا اور فرمایا کہ یہ میری بیوی ہے اور فرمایا کہ شیطان انسان کے دل میں طرح طرح کے وساوس ڈالتا رہتا ہے۔

ع۱۵۵۱ خطب دیکھو ع۱۴۶۳ اور خَطْب امر عظیم کو کہتے ہیں جس میں ایک دوسرے سے بہت خطاب ہو (غ)۔

حَصْحَصَ۔ حَصَّ کے معنی ہیں قطع کرنا چنانچہ حِصّہ وہ ہے جو کل سے کاٹ دیا جائے اور حَصَّ اور حَصْحَصَ کے معنی ہیں ایک امر بالکل کھل گیا اور جس چیز نے اسے مغلوب کیا ہوا تھا وہ دور ہوگئی (غ)

ہاتھوں کا کاٹنا یوسفؑ کے خلاف سازش تھی: بادشاہ نے ان عورتوں سے یہ یوں خطاب کیوں کیا کہ کیا بات تھی جب تم نے یوسفؑ کو ورغلانا چاہا۔ اس کی وجہ دو معلوم ہوتی ہیں، اول حضرت یوسف کی راستبازی کا اثر جو ان پر اپنے مصاحب کے بیان سے ہوا اور خود اس خواب کی تعبیر میں جس علم کا اظہار ہوا اس نے بھی سب لوگوں کی گردنیں یوسفؑ کے سامنے جھکا دیں۔ دوسرے حضرت یوسف نے قید خانہ سے بادشاہ کو جو کچھ کہلا بھیجا اس میں یہ بھی لفظ تھے کہ ان عورتوں کا ہاتھ کاٹنا ان کا کید یا چال تھی جو میرے خلاف انہوں نے کی اور گو لوگوں کی نظروں سے وہ مخفی رہی مگر اللہ تعالیٰ تو اسے خوب جانتا تھا۔ یوسفؑ کے یوں کہلا بھیجنے سے بھی بادشاہ کو یقین ہوگیا کہ یہ سب یوسفؑ کے خلاف ایک سازش کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ عورتوں نے اس بات کو محسوس کر کے کہ یوسفؑ کی راستبازی اب کھل چکی ہے اور یہ بھید بھی چھپا نہیں رہ سکتا صاف اقرار کیا کہ یوسفؑ نے ہرگز ان کے متعلق کسی قسم کا برا ارادہ نہیں کیا۔ تب عزیز کی عورت بھی بول اٹھی کہ سچائی پر جتنے پردے ڈالے گئے تھے وہ اب دور ہو گئے جس سے معلوم ہوا کہ قطع ید کے ذریعہ سے یوسفؑ کی سچائی پر پردہ ڈالا گیا تھا۔

ع۱۵۵۲ بظاہر یہ کلام عزیز کی عورت کے کلام کے سلسلہ میں ہے۔ اور اس سے اگلی آیت کا مضمون بھی۔ مگر اس پر یہ صادق نہیں آتا۔ اور مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ کلام حضرت یوسف کا ہے اور عموماً مفسرین اسی طرف گئے ہیں عزیز کی عورت یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ میں نے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی۔ خیانت کر کے تو اس نے اسے قید خانہ میں ڈلوایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحقیقات میں تو آخر ایک وقت لگتا تھا۔ تو لوگوں نے حضرت یوسف کو کہا ہو گا کہ تم خواہ مخواہ کیوں قید خانہ میں پڑے ہوئے ہو۔ جس پر انہوں نے یہ فرمایا کہ تا بادشاہ کو علم ہو جائے کہ میں نے اس کی یعنی عزیز کی خیانت نہیں کی۔ اور یا اخنہ میں ضمیر بادشاہ کی طرف ہی لی جائے تو بادشاہ کی خیانت سے بھی مراد عزیز کی خیانت ہی ہوگی کیونکہ اتنے بڑے عہدیدار شاہی کی خیانت بادشاہ کی ہی خیانت تھی۔ اور ہدایت سے مراد یہاں منزل مقصود پر پہنچانا ہے دیکھو ع۵ ؛

وَمَآ أُبَرِّئُ نَفْسِىٓ ۚ إِنَّ ٱلنَّفْسَ لَأَمَّارَةٌۢ بِٱلسُّوٓءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىٓ ۚ إِنَّ رَبِّى غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥٣﴾

اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں ٹھیراتا، کیونکہ نفس تو یقیناً بدی کا حکم دیتا رہتا ہے، مگر جس پر میرا رب رحم کرے، میرا رب حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۵۵۳

وَقَالَ ٱلْمَلِكُ ٱئْتُونِى بِهِۦٓ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِى ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُۥ قَالَ إِنَّكَ ٱلْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿٥٤﴾

اور بادشاہ نے کہا اُسے میرے پاس لے آؤ، میں اسے اپنے لیے خاص کرلوں، پس جب اس سے گفتگو کی، کہا آج تو ہمارے ہاں صاحب مرتبہ امین ہے ۱۵۵۴

قَالَ ٱجْعَلْنِى عَلَىٰ خَزَآئِنِ ٱلْأَرْضِ ۖ إِنِّى حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾

(یوسفؑ نے) کہا مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کردو، میں نگہبان خبردار ہوں ۱۵۵۵

وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِى ٱلْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَن نَّشَآءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾ وَلَأَجْرُ ٱلْءَاخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَكَانُوا۟ يَتَّقُونَ ﴿٥٧﴾ ع

اور یوں ہم نے یوسفؑ کو ملک میں طاقتور بنایا، وہ اس میں جہاں چاہتا اختیار رکھتا تھا، ہم اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں اور ہم احسان کرنیوالوں کا اجر ضائع نہیں کرتے اور بلاشبہ آخرت کا اجر اُن کے لیے بہتر ہے جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

وَجَآءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا۟ عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُۥ مُنكِرُونَ ﴿٥٨﴾

اور یوسفؑ کے بھائی آئے، پھر اس کے پاس گئے، تو اُس نے اُن کو پہچان لیا، اور وہ اُسے نہ پہچان سکے ۱۵۵۶

۱۵۵۳ راستبازوں کا طریق: یہ آیت بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ یہ عزیز کی عورت کا کلام نہیں۔ حضرت یوسف نے جب اس قدر اپنی بریت پر زور دیا تو یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ آپ اپنی بریت کو اس طرح قائم کرنے میں گویا اپنے لیے اس مرتبہ کا دعویٰ کرتے ہیں جو کبھی کسی راستباز نے نہیں کیا کہ میرا نفس ایسا پاک ہے کہ اس سے نافرمانی ہو سکتی ہی نہیں۔ اس لیے آپ نے ساتھ ہی اس طرف توجہ دلائی کہ یہ محض اللہ کے فضل سے ہے کہ اس نے مجھے اس قدر بدی سے دور رہنے کی توفیق دی یہ کوئی میرے نفس کی خوبی نہیں۔ کیونکہ نفس انسانی تو سب انسانوں کا یکساں ہی ہے اور اس کی پہلی حالت یہی ہوتی ہے کہ وہ بدی کا حکم کرتا رہتا ہے۔ ہاں جن پر اللہ کا رحم ہوتا ہے ان کا نفس یا پہلے سے ہی سدھرا ہوا ہوتا ہے جیسے انبیاء کی حالت میں کہ وہ معصوم ہوتے ہیں اور بعض اولیاء کی حالت میں کہ وہ محفوظ ہوتے ہیں اور یا بعد میں اصلاح پر آجاتا ہے انسان کی پہلی یعنی حیوانی حالت کا نام یہاں نفس امّارہ رکھا ہے گویا ابھی حیوانیت اس پر غالب ہے۔ دوسری حالت کا نام نفس لوّامہ ہے یعنی اس حالت میں اگر کبھی ارتکاب معصیت کا ہو جائے تو نفس ملامت کرتا ہے اور معصیت پر راضی نہیں ہوتا اور تیسری کا نام نفس مطمئنہ اور یہ کامل اصلاح کی حالت ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں پر چلتا ہے۔

۱۵۵۴ استخلص۔ اِسْتَخْلَصَ اور اَخْلَصَ ایک معنی میں آتے ہیں۔ اَخْلَصَهٗ اختَارَهٗ یعنی اسے اختیار کر لیا یا چن لیا (ل) اور خلصوا نجیًّا (۸۰) میں خَلَصوا کے معنی ہیں انفردوا خالِصِینَ عن غیرِھم (غ) یعنی الگ ہو گئے ایسی حالت میں کہ دوسرا کوئی ان سے ملا ہوا نہ تھا۔

مکین کے معنی ہیں بَیّن المکانۃِ یعنی جس کا مرتبہ اور عزت واضح ہو (ل) اور ذی قوۃ عند ذی العرش مکین (التکویر۔ ۲۰) میں مکین کے معنی کیے ہیں مُتَمَکِّنٍ ذی قَدْرٍ و مَنْزِلَۃٍ (غ) یعنی قدر و مرتبہ والا۔

۱۵۵۵ حضرت یوسف کا مصر پر مالی تصرف: حضرت یوسف کی جب بادشاہ نے خود عزت افزائی کی تو انہوں نے ملک کے خزانوں یعنی مالی حالت کا انتظام اپنے لیے طلب کیا اس لیے کہ آنے والے قحط کے مقابلہ پر اس کی ضرورت تھی کہ مالی انتظام امین اور سمجھدار ہاتھوں میں ہوتا اسی کی طرف حفیظ اور علیم میں توجہ دلائی ہے دینداری اور راستبازی اس کا نام نہیں کہ تسبیح لیکر دنیا سے الگ ہو کر بیٹھ رہے بلکہ دنیا کے کاروبار کو اور خدمات ملکی کو امانت کے ساتھ سرانجام دینا بھی اعلیٰ درجہ کی راستبازی ہے۔ بائبل میں اس موقعہ پر ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسف کو کل اختیارات حکومت دیدیئے تھے قرآن شریف نے اجعلنی علٰی خزائن الارض فرمایا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مالی تصرف ہی اصل حکومت ہے آج یورپ کی طاقتیں جب کسی سلطنت کو دبانا چاہتی ہیں تو پہلے اس کے مالی معاملات میں دخل دینا شروع کرتی ہیں جس کی ابتدا قرضہ دینے سے ہوتی ہے۔

۱۵۵۶ بہت سے درمیانی واقعات کو چھوڑ دیا ہے فراخی کے سات سال گزر جاتے ہیں اور قحط شروع ہوتا ہے غلّہ کی تلاش میں یوسفؑ کے بھائی بھی مصر میں آتے

وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿۵۹﴾

اور جب انھیں ان کے سامان سے تیار کر دیا، کہا اپنے اس بھائی کو بھی میرے پاس لاؤ جو تمھارے باپ کی طرف سے ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں ماپ بھی پورا دیتا ہوں اور اچھی طرح اتارتا ہوں ۱۵۵۷

فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿۶۰﴾

لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو تمھیں میرے پاس سے (غلّہ کا) ماپ نہ ملے گا اور میرے پاس نہ آؤ۔

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿۶۱﴾

انھوں نے کہا ہم اس کے باپ کے ارادے کو پھیر دینگے اور ہم (یہ) کر کے ہی رہیں گے۔

وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۶۲﴾

اور اس نے اپنے نوکروں سے کہا ان کا سرمایہ ان کی بوریوں میں رکھ دو کہ جب وہ اپنے گھر والوں کی طرف واپس جائیں تو اسے پہچان لیں تاکہ پھر واپس آئیں ۱۵۵۸

فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿۶۳﴾

پس جب وہ اپنے باپ کے پاس واپس گئے کہا اے ہمارے باپ! غلّہ ہم سے روک دیا گیا اس لیے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج کہ ہم غلہ لائیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں ۱۵۵۹

قَالَ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِن قَبْلُ ۖ فَاللَّهُ خَيْرٌ حَافِظًا ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿۶۴﴾

کہا، کیا میں اس کے لیے تمھارا اعتبار کروں مگر اسی طرح جیسے پہلے اس کے بھائی کے بارے میں تمھارا اعتبار کیا تھا سو اللہ ہی بہتر نگہبان ہے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے ۱۵۶۰

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ

اور جب انھوں نے اپنا اسباب کھولا اپنے سرمایہ کو اپنی طرف لوٹایا ہوا پایا

ہیں اور حضرت یوسف کے سامنے لائے جاتے ہیں مگر چونکہ آپ محض بچے تھے جب ان سے جدا ہوئے اور حالات میں بہت تغیر آچکا تھا اسلئے وہ آپکو نہ پہچان سکے۔

ع۱۵۵۷ جھز۔ جہاز۔ جَہاز۔ وہ سامان وغیرہ ہے جو تیار کیا جائے اور تَجْہیز اس کا اُٹھانا یا بھیجنا ہے۔

کَیل۔ غلہ کے ماپ سے مخصوص ہے دیکھو ع۱۱۲۰ اس لیے غلہ کے لیے بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔

منزل۔ نُزُول کے معنی حلول یا اُترنا ہیں اور نَزِیل مہمان۔ نُزُل ضیافت یا مہمانی کا سامان ہے اسی لحاظ سے اِنزال مہمان نوازی کرنا ہے اور مُنْزِل جو مہمان نوازی کرتا ہے۔

حضرت یوسف نے بات چیت کر کے سب حالات ان سے دریافت کر لیے اس لیے بھائی کو ساتھ لانے کا حکم دیا اور ماپ پورا دینا اور مہمان نوازی کا ذکر بطور احسان جتانے کے نہیں بلکہ اظہار واقعات کے لیے ہے تاکہ وہ دوبارہ آئیں۔ مہمان نوازی عرب کی خاص صفت رہی ہے اس لیے مصر میں حضرت یوسف کی مہمان نوازی کی برابری کوئی نہ کر سکتا تھا۔

۱۵۵۸ رحال۔ رَحل کی جمع ہے۔ وہ چیز جو سواری کے لیے اونٹ پر رکھی جائے اور کبھی اس سے اونٹ بھی مراد لیا جاتا ہے۔ اور کبھی وہ چیز جس پر منزل میں بیٹھا جائے اور رِحْلَة کے معنی ارتحال یا کوچ کرنا ہے رحلة الشتآء والصیف (القریش ۱۰۶-۲)

غلہ کی قیمت واپس کرنے کی غرض یہ تھی کہ وہ لوٹ کر آئیں یہ مراد ہو سکتی ہے کہ اتنے بڑے احسان کو دیکھ کر وہ پھر غلّہ کے لیے اسی طرف رُخ کریں گے اور یہ بھی کہ شاید اس روپے کو واپس کرنے کے لیے آئیں۔

ع۱۵۵۹ نکتل۔ اصل نکتیل ہے یعنی باب افتعال ہے یا الف سے بدل گئی جو بوجہ التقائے ساکنین گرا دیا گیا۔

ع۱۵۶۰ مطلب یہ کہ تم پر اعتبار کروں تو ویسا ہی اعتبار ہو گا جیسا یوسفؑ کے معاملہ میں کیا تھا۔ حفاظت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے یہی راستبازوں کا طریق ہے یوں ان سے سخت اقرار بھی لیا مگر پھر بھی بھروسا ان پر نہیں بلکہ اللہ پر ہے اسباب سے بھی کام لیتے ہیں مگر ان اسباب کو کامیابی کا مدار نہیں سمجھتے۔ حل کے لیے دیکھو ۲۶۹

رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۗ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۗ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۗ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾

کہا اے ہمارے باپ ہم اور کیا چاہتے ہیں یہ ہمارا سرمایہ ہمیں واپس کیا گیا ہے اور ہم اپنے اہل کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کرینگے اور ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ لائینگے یہ غلہ (جو ہم لائے ہیں) تھوڑا ہے۔[1561]

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

اس نے کہا میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجونگا جب تک مجھے خدا کا عہد نہ دو کہ تم اسے ضرور میرے پاس لے آؤ گے، سوائے اس کے کہ تم سب ہی گھیر لیے جاؤ۔ پس جب انھوں نے اپنا عہد اسے دیدیا اس نے کہا جو ہم کہتے ہیں اللہ ہی اس کا ذمہ دار ہے[1562]

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۗ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۗ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور اس نے کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا، اور الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا اور اللہ کے مقابل پر میں تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتا۔ حکم صرف اللہ کا ہے اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی پر چاہیے کہ سب بھروسا کرنے والے بھروسا کریں[1563]

ع۱۵۶۱ نمیر۔ میرۃ طعام کو کہتے ہیں اور مَارَ یَمِیْرُ غلہ لایا۔

یسیر۔ یُسر ضد عُسر ہے اور یسیر سہل کو کہتے ہیں مگر تھوڑی چیز کو بھی یسیر کہا جاتا ہے (غ) یہاں یہی مراد ہے کہ جو غلہ ہم پہلے لائے ہیں وہ تھوڑا ہے یا قحط کے ایام کے لیے وہ مکتفی نہیں ہوسکتا۔

ع۱۵۶۲ باوجود عہد موکد لے لینے کے آخر پر پھر معاملہ کو سپرد خدا ہی کیا ہے۔ وکیل اصل میں تو وہ ہے جس کے سپرد کوئی معاملہ کیا جائے اور چونکہ جس کے سپرد کوئی معاملہ کیا جاتا ہے وہ اس پر نگہبان بھی ہوتا ہے اس لیے نگہبان معنی کیے گئے ہیں یوں بھی ترجمہ ہوسکتا ہے کہ اللہ ہی ہے جس کے سپرد یہ معاملہ کیا جاتا ہے یحاط بکم سے مراد گھیرے جانا بھی ہوسکتا ہے اور ہلاک ہونا بھی کیونکہ جسے دشمن گھیرلے وہ ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔

ع۱۵۶۳ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونے کی نصیحت کی غرض: مفسرین کا زیادہ رجحان اسی طرف ہے کہ حضرت یعقوب نے ان کو نظر لگنے کے خوف سے یہ کہا تھا بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ جب وہ گئے تو یوسف نے ان سے سختی کی اور کہا تھا کہ تم جاسوس ہو (پیدائش ۴۲: ۹) حضرت یعقوب نے خیال کیا ہو کہ اکٹھے داخل ہوں تو پھر حکومت مصر کو شبہات نہ گزریں اور ایسا نہ ہو کہ بادشاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اس شبہ میں گرفتار ہوجائیں اور یوں بادشاہ کی مہربانی بھی کچھ کام نہ آئے اس لیے انہوں نے داخلہ کے وقت احتیاط کا پہلو اختیار کرنے کی تاکید کی اور اس کی تائید دو اور باتوں سے ہوتی ہے اول یہ کہ جب ان سے اقرار لیا تو وہاں بھی ایک استثنا کیا تھا یعنی فرمایا تھا الّا ان یحاط بکم سوائے اس کے کہ تم سب گرفتار ہوجاؤ۔ اور دوسرے اس سے کہ ساتھ ہی فرمایا ما اغنی عنکم من اللہ من شیٔ اگر اللہ کی طرف سے ضرور کوئی مصیبت تم پر آنے والی ہے تو اس کا علاج تو میں نہیں کرسکتا۔ اور اگلی آیت میں اسی بات کا ذکر کرکے فرمایا انّہ لذو علم لما علّمناہ یعنی اسے کچھ علم بھی تھا جو ہم نے دیا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب کو کسی وحی یا رویا کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ان پر اس دفعہ کچھ مصیبت آنے والی ہے، لیکن چونکہ پیشگوئی میں تفصیلات سے اطلاع نہیں دی جاتی عموماً اجمالی رنگ میں ایک واقعہ دکھایا جاتا ہے۔ اس لیے آپ کا خیال اس طرف گیا کہ پہلی مرتبہ جو ان پر جاسوسی کا شک ہوا شاید اسی وجہ سے بلا میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ مگر چونکہ یہ خیال محض اجتہاد پر مبنی تھا اس لیے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ اللہ کی طرف سے جو مصیبت آنے والی ہے اسے تو میں دور نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اگلی آیت میں پھر جب ان کے داخلہ کا ذکر کیا کہ وہ عافیت سے شہر میں تو داخل ہو گئے تو ساتھ ہی پھر بڑھایا کہ جو مصیبت آنے والی تھی وہ اس طرح پر دور نہ ہوسکی۔ کیونکہ وہ مصیبت جیسا آگے ذکر آتا ہے اور راہ سے آنے والی تھی۔ حضرت یوسف کے معاملہ میں بھی مصیبت کا کچھ نقشہ حضرت یعقوبؑ کو دکھا دیا گیا تھا اس لیے انہوں نے فرمایا تھا اخاف ان یاکلہ الذئب (۱۳) پیشگوئیوں میں عموماً تعین واقعات کا نہیں ہوتا۔

رہا نظر کا لگنا، سو خوبصورتی کی وجہ سے جیسے نظر ایک کو لگ سکتی ہے ویسے ہی بہتوں کو بھی لگ سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر نظر کی احتیاط کی وجہ سے ہوتا تو پہلی مرتبہ کیوں ایسی ہدایت نہ کرتے۔ دس اور گیارہ میں تو ایسا فرق نہیں ہوجاتا واقعات اسی کے موید ہیں، کہ پہلی مرتبہ انہیں ان پر کسی تکلیف کا آنا

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُم مَّا كَانَ يُغْنِي عَنْهُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾ ع

اور جب وہ داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے حکم دیا تھا وہ اللہ کے مقابل پر ان کے کچھ بھی کام نہ آسکتا تھا، ہاں یعقوبؑ کے دل میں ایک حاجت تھی جسے اس نے پورا کیا اور بلاشبہ وہ علم والا تھا اس لیے کہ ہم نے اسے علم دیا تھا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ ۖ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾

اور جب وہ یوسفؑ کے پاس آئے اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی کہا میں تیرا بھائی ہوں، سو اس پر افسوس نہ کر جو یہ کرتے رہے ہیں ۱۵۶۴

فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾

پھر جب اُن کا سامان دے کر تیار کر دیا (ایک نے) پانی پینے کا کٹورا اس کے بھائی کی بوری میں رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکارا، اے قافلے والو! تم تو چور ہو ۱۵۶۵

نہیں دکھایا گیا۔ دوسری مرتبہ دکھایا گیا اس لیے جو کچھ ان کی سمجھ میں آیا اس کے مطابق نصیحت کر دی مگر پھر بھی صادق راستبازوں کی طرح اس احتیاط پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ بھروسہ تو اللہ پر ہی ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ صلحا توکل کے یہ معنی نہیں سمجھتے کہ اسباب سے کام نہ لیا جائے۔ یہ بھی بیان بڑھا دینا ضروری ہے کہ نظر کے لگنے کا ذکر احادیث میں ہے اور نظر لگنا حق ہے بلکہ آج تو جن لوگوں نے مسمریزم کے ادنیٰ کرشموں کو دیکھا ہے وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ نظر بھی کیا کیا عجائبات دکھا سکتی ہے اور کس طرح پر نظر کے ذریعہ سے معمول پر اس قدر اثر ڈالا جا سکتا ہے کہ وہ عامل کے ہاتھ میں مردہ کی طرح ہو جاتا ہے یہ رسول اللہ صلعم کی صداقت پر دلیل ہے کہ کس طرح ہر قسم کے توہمات کو دور کرتے ہوئے ایک بات کو جس کی اصل انسان میں موجود تھی بلا خوف لومۃ لائم بیان کر دیا۔

ع۱۵۶۴ یعنی اپنے بھائی کو خصوصیت سے اپنے پاس جگہ دی اور اسے علیحدگی میں بتا دیا کہ میں تمہارا بھائی ہوں اس لیے جو کچھ انہوں نے کیا اس پر غم نہ کر یعنی جو معاملہ میرے ساتھ کیا۔ اس پر اب کوئی افسوس نہ کر۔

ع۱۵۶۵ سقایۃ۔ سَقْیٌ اور اَسْقٰی کے معنی ہیں پینے کو دیا اور اسقاء۔ سَقْیٌ سے زیادہ بلیغ ہے یعنی اسقاء یہ ہے کہ اس کے لیے پینے کی چیز ٹھہرا دے یہاں تک کہ وہ اسے خود لیکر جس طرح چاہے پیئے۔ سقاھم ربھم شرابا طھورا (الدھر ۷۶-۲۱) واسقیناکم ماء فراتا (المرسلات ۷۷-۲۷) نسقیکم مما فی بطونھا (المومنون ۲۳-۲۱) اور سِقَایَۃ وہ ہے جس میں پینے کی چیز ڈالی جائے یعنی گلاس یا پیالہ جس میں پانی پیا جائے اور آگے اسی کو صُواع کہا ہے اور صاع ماپنے کا پیمانہ ہوتا ہے پس اسی کو صواع اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہی ماپ کا بھی پیمانہ تھا (غ)

عِیر اس جماعت کو کہا جاتا ہے جن کے ساتھ غلہ کے بوجھ ہوں یعنی آدمیوں پر اور اونٹوں پر جن پر بوجھ لدے ہوئے ہوں۔ یہ لفظ بولا جاتا ہے گو اس کا استعمال الگ الگ دونوں پر بھی ہوتا ہے۔

بن یامین کی بوری میں پیالہ رکھنے والے حضرت یوسف نہ تھے: جَعَلَ السقایۃ میں ضمیر کس طرف جاتی ہے؟ مفسرین کا خیال یوسفؑ کی طرف ہے۔ گویا حضرت یوسف نے خود بوری کے اندر پیالہ رکھا۔ مگر اس پر قرآن شریف کے الفاظ کئی قسم کی مشکلات وارد کرتے ہیں۔ خود ایسی کارروائی کر کے پھر سب لوگوں میں یہ اعلان کرانا کہ یہ قافلہ والے چور ہیں ایتھا العیر انکم لسارقون ایک نبی کے کس طرح شایانِ شان ہو سکتا ہے یہ تو ایک معمولی آدمی بھی کرے تو قابلِ گرفت ہے قرآن شریف میں ہے ومن یکسب خطیئۃ او اثما ثم یرم به بریئا فقد احتمل بھتانا واثما مبینا (النساء ۴-۱۱۲) ایک شخص خود ایک گناہ کرے پھر اس کا الزام دوسرے پر لگائے تو وہ ارتکاب بہتان کرتا ہے۔ مفسرین اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ان کو سارق اس لحاظ سے کہا کہ انہوں نے خود یوسفؑ کو اپنے باپ سے چرایا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو الزام اہل مصر کے سامنے اعلان ہوا وہ تو یہ تھا کہ تم نے پیالہ چرایا ہے اور اس کے وہ مرتکب نہ تھے۔ اور آخر کار انہی میں سے ایک کی بوری سے اُسے نکال کر اہل مصر کی نظر میں انہیں چور ٹھہرا بھی دیا۔ پس قرآن کریم کا منشا ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت یوسف نے خود وہ پیالہ بوری میں رکھا یا رکھوایا۔ اس سے پہلے جب روپیہ ان کو واپس کیا گیا تو یہ لفظ ہیں کہ اپنے نوکروں کو کہا کہ ان کا روپیہ اُن کی بوریوں میں رکھ دو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ بوریوں کا بھرنا بھرانا حضرت یوسف کا اپنا کام نہ تھا اور نہ وہ کام آپ کے سامنے ہوتا تھا اس لیے اگر پیالہ حضرت

قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ۝۷۱
قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ
بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ۝۷۲
قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ
فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ۝۷۳
قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ۝۷۴
قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ
جَزَآؤُهٗ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝۷۵
فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ
اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ۭ كَذٰلِكَ كِدْنَا

انھوں نے کہا اور وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے تم نہیں پاتے ۱۵۶۶
انھوں نے کہا ہم بادشاہ کا پیالہ نہیں پاتے اور جو شخص اسے لائے
اس کے لیے ایک اونٹ کا بوجھ (انعام) ہوگا اور میں اس کا ذمہ دار ہوں ۱۵۶۷
انھوں نے کہا اللہ کی قسم تم جانتے ہو ہم اس لیے نہیں آئے کہ ملک
میں فساد کریں اور ہم چور نہیں ہیں ۱۵۶۸
انھوں نے کہا پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے نکلے۔
انھوں نے کہا اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کی بوری میں وہ نکلے وہی
اس کا بدلہ ہوگا، ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں ۱۵۶۹
تب اس نے ان کے بھائی کے شلیتے سے پہلے ان کے شلیتوں سے
شروع کیا تب اسکے بھائی کے شلیتے سے اسے نکالا اسی طرح ہم نے

یوسف نے رکھوانا ہوتا تو اسی طرح اپنے نوکروں کو حکم دیتے جس طرح روپیہ رکھنے کے لیے دیا تھا اس لیے اس کا رکھنے والا کوئی اور تھا۔ قرآن شریف سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت یوسف کے ساتھ ان کے بھائیوں نے ایک بھاری شرارت کی تھی اسی طرح بن یامین کے ساتھ بھی کی چنانچہ جب حضرت یوسف اپنے آپ کو ان پر ظاہر کرتے ہیں تو یوں فرماتے ہیں هل علمتم ما فعلتم بيوسف و اخيه (۸۹) اب ظاہر ہے کہ اور کوئی واقعہ بن یامین کے ساتھ ایسا نہیں ہوا جس میں ان کے ساتھ قریباً قریباً ویسا ہی سلوک ہوا ہو جیسا یوسف کے ساتھ ہوا تھا۔ صرف یہی ایک واقعہ ہے اور ان کی شرارت کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ انہوں نے چوری کا جھوٹا الزام یوسف پر بھی لگایا قالوا ان يسرق فقد سرق اخ له من قبل (۷۷) اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی یوسف نے بھی چوری کی تھی۔ حالانکہ یہ دونوں جھوٹ تھے گویا بجائے صفائی کی شہادت پیش کرنے کے اور چوری کے الزام کی تائید کا مطلب یہ کہ یہ دونوں بھائی چور ہیں اور حضرت یعقوب سے جب انہوں نے جاکر یہ ذکر کیا کہ تیرے بیٹے نے چوری کی ہے تو انہوں نے اس کا الزام انہی پر دیا بل سولت لكم انفسكم امرا (۸۳) جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ تمہاری ہی کوئی شرارت ہے پس اصل واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان بھائیوں میں سے کسی نے محض شرارت کے طور پر پیالہ اٹھا کر بن یامین کی بوری میں رکھ دیا تاکہ یوسف کی طرح وہ بھی حضرت یعقوب کی نظروں سے دور ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بائبل میں یہی ذکر ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے نوکروں کو پیالہ رکھنے کا حکم دیا تھا مگر بائبل نے قبیح ترین افعال انبیاء کی طرف منسوب کیے ہیں۔ حضرت لوط کی طرف زنا وہ بھی بیٹیوں کے ساتھ، حضرت ہارون کی طرف شرک۔ حضرت سلیمان کی طرف بت پرستی۔ حضرت داؤد کی طرف زنا۔ اور قرآن کریم نے ایسے تمام ناپاک الزامات سے انبیاء علیہم السلام کی بریت کی ہے اور عصمت انبیاء کا اصول سکھایا ہے اس لیے حضرت یوسف کی طرف ایسا فعل اگر بائبل منسوب کردے تو اس کی معمولی تحریفات میں سے ایک ہے مگر قرآن کریم ایسا نہیں کر سکتا۔

ع۱۵۶۶ اقبلوا۔ اِقبال کے معنی متوجہ ہونا ہیں۔ فاقبل بعضهم على بعض (الصّٰفّٰت ۳۷-۵۰)

ع۱۵۶۷ زعیم۔ زعم کے لیے دیکھو ع۶۷۹ ضمانت جو قول سے ہو اور ریاست کو زَعَامَة کہا جاتا ہے اور ضامن اور رئیس کو زعیم کہا جاتا ہے اس لیے کہ ان دونوں کے قول میں جھوٹ کا ظن ہوتا ہے (غ)

صواع الملك کا لفظ خود ظاہر کرتا ہے کہ جو چیز گم ہوئی وہ یوسف کا پیالہ نہ تھا بلکہ شاہی پیالہ تھا۔ اس لیے بھی اس کا تعلق حضرت یوسف سے نہیں۔ قرین قیاس ہے کہ یہ سونے کا ہو، اس لیے اس پر اتنی تحقیقات بھی ہوئی۔

ع۱۵۶۸ تاللہ۔ تا کلمہ کے شروع میں قسم کے لیے آتی ہے (غ) اور اکثر نحویوں کے نزدیک یہ واؤ کا بدل ہے۔ مگر سوائے اللہ کے لفظ کے دوسرے پر نہیں آتی (ر)

ع۱۵۶۹ جزاؤہ میں ضمیر فعل کی طرف ہے جیسا پچھلی آیت میں یعنی چوری کی سزا یہ ہے فہو جزاؤہ یعنی وہ خود اس کے عوض گرفتار کیا جائے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ پہلے یہ دریافت کرتے ہیں کہ تمہارا گم کیا ہوا ہے تو جب یہ علم ہو جاتا ہے کہ یہ پیالہ کے لیے ہی آئے ہیں تب سزا یہ بتاتے ہیں کہ جس کی بوری میں ہو وہ پکڑا جائے کیونکہ جانتے تھے کہ بن یامین کی بوری میں ہے۔

لِيُوْسُفَ ۭ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝۷۶

یوسفؑ کے لیے ارادہ کیا وہ اپنے بھائی کو شاہی قانون کے مطابق لے نہ سکتا تھا، سوائے اس کے جو اللہ چاہے ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کرتے ہیں اور ہر ایک علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے عـ۱۵۷۰

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ۝۷۷

انھوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی، سو یوسفؑ نے اُسے اپنے دل میں چھپایا اور اسے اُن پر ظاہر نہ کیا۔ کہا تم بُری حالت کے لوگ ہو اور اللہ بہتر جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو عـ۱۵۷۱

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۷۸

انھوں نے کہا اے عزیز اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے تو ہم میں سے ایک کو اس کی جگہ رکھ لے ہم تجھے نیکو کاروں میں سے دیکھتے ہیں

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا

اس نے کہا اللہ کی پناہ کہ ہم کسی اور کو پکڑیں مگر جس کے پاس

عـ۱۵۷۰ ادعیۃ ۔ وِعاء کی جمع ہے۔ اور وَعیٰ کے معنی ہیں کسی بات کا یاد رکھنا وتعیہا اذن واعیۃ (الحاقۃ ۶۹ - ۱۲) اور اِیعاء کے معنی ہیں سامان کا وِعاء میں محفوظ کر لینا جمع فاوعیٰ (المعارج ۷۰ - ۱۸) (غ) اور وِعاء وہ برتن ہے جس میں کوئی چیز محفوظ کی جائے۔

کِدنا ۔ کاد بمعنی اراد کے لیے دیکھو عـ۹۷ یہاں یہی معنی ہیں۔

دین ۔ کے معنی شرلعیت دیکھو عـ۳ اسی لحاظ سے یہاں قانون کے معنی میں استعمال ہوا ہے قتادہ سے حکم اور قضا معنی مروی ہیں۔

بن یامین کا حضرت یوسف کے پاس رہ جانا: جن واقعات کا ذکر ہے ان سے یہ نہیں پایا جاتا کہ یہ سب کچھ حضرت یوسفؑ کی موجودگی میں ہو رہا ہے بلکہ بظاہر وہی شخص جو تحقیقات کے لیے آیا ہے سب کچھ یہ خود ہی کر رہا ہے اور بن یامین کی بوری کو پیچھے رکھنا اگر عمداً تھا، تو شاید اس لیے ہو کہ بن یامین کی خصوصیت سے یوسف کے ہاں عزت ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمارا ارادہ یوسف کے لیے ایسا ہی ہوا کہ ان کا بھائی ان کے پاس رہ جائے کدنا بمعنی اردنا ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ آگے آتا ہے اِلّا ان یشاء اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے ایسا ہوا۔ اور اگر کدنا بمعنی تدبیر بھی لیا جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تدبیر ہم نے یوسف کے لیے کی یہ نہیں فرمایا کہ یوسف نے یہ تدبیر کی اور اس صورت میں کدنا کے لفظ میں یہ اشارہ ہوگا کہ ان کے بھائیوں کی تدبیر تو یہ تھی کہ بن یامین کسی طرح واپس حضرت یعقوب کے پاس نہ جائے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو یوسف کے حق میں کر دیا کہ بھائی بھائی کے پاس رہ گیا۔ وہ خود بغیر افشائے راز کے اسے رکھ نہ سکتے تھے اور اس حقیقت کو وہ بھی ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے مشیت الٰہی سے یہ ایک سامان پیدا ہو گیا کہ بن یامین حضرت یوسف کے پاس رہ گئے۔ گو وہ ذی علم تھے مگر یہ سامان اس خدا کی طرف سے ہو گیا جو اُن سے بڑھ کر علیم تھا۔ اگر یوسف نے خود یہ کام کیا ہوتا تو یہاں نرفع درجات من نشاء کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ کیونکہ بہرحال یہ ایک چالبازی تھی اور چالبازی کے موقعہ پر رفع درجات موزوں نہیں ہاں خود بخود اس سامان کا پیدا ہو جانا رفع درجات پر گواہ ہے یعنی جب انسان اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے فائدہ کے سامان خود بخود پیدا کر دیتا ہے۔

دوسرے دین کے بادشاہ کے قانون پر عمل: اس آیت سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے مذہب کے بادشاہ کے ماتحت ہے تو اسی کے قانون پر عمل بھی کرنا پڑتا ہے۔ حضرت یوسف ایک ایسے بادشاہ کے ماتحت تھے جو ان کے دین پر نہ تھا بایں اس کے قانون پر ہی عمل کرتے تھے اس چھوٹے سے واقعہ کے اظہار سے ایک عظیم الشان اصول قائم کر دیا ہے۔

عـ۱۵۷۱ حضرت یوسف پر جو چوری کا الزام انھوں نے لگایا ہے تو مفسرین اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یا تو بائبل کے بعض بیانات میں ادل بدل کرتے ہیں یا خود کوئی کہانی تجویز کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ الزام دینے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایک بے گناہ کی جان تک لینے سے دریغ نہ کیا اور پھر حضرت یعقوب کے سامنے جا کر جھوٹ بولا۔ اس لیے اگر اس دوسرے موقعہ پر بھی انھوں نے جھوٹ سے کام لیا تو یہ کونسا امر مستبعد ہے بات تو صاف ہے وہ اپنے آپ کو تو الگ کرتے ہیں اور یوسف کے بھائی پر چوری کا الزام ثابت کرنے کے لیے تائیدی شہادت یہ دیتے ہیں کہ اس کا بھائی بھی چور تھا کیونکہ ان کی غرض تو یہی تھی کہ کسی طرح بن یامین بھی حضرت یعقوب کی آنکھوں سے دور ہو جائے گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو نیک لوگ ہیں یوسف اور اس کا بھائی دونوں چور ہیں۔ یوسف نے اپنے دل میں کس بات کو چھپایا؟ اس تہمت کے جواب کو ان پر ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے ورنہ یوں جواب دیتے کہ تم میرے منہ پر جھوٹا الزام لگاتے ہو۔

ع مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿٧٩﴾

ہم نے اپنا سامان پایا تو تو ہم ظالم ہوں گے ۱۵۷۲

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٠﴾

جب اس سے مایوس ہو گئے تو مشورہ کرنے کے لیے الگ ہو گئے سب سے بڑے نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمھارے باپ نے تم سے اللہ کا عہد لیا تھا اور پہلے جو یوسف کے معاملہ میں تم قصور کر چکے ہو، سو میں ہرگز اس ملک کو نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ میرا باپ مجھے اجازت نہ دے، یا اللہ میرے لیے فیصلہ نہ کرے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ۱۵۷۳

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾

اپنے باپ کی طرف واپس جاؤ — اور کہو اے ہمارے باپ تیرے بیٹے نے چوری کی اور ہم وہی گواہی دیتے ہیں جو ہمیں معلوم ہے اور ہم غیب کے نگہبان نہ تھے ۱۵۷۴

وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٨٢﴾

اور اس بستی سے دریافت کر جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿٨٣﴾

اس نے کہا بلکہ تمھارے دلوں نے ایک (بُری) بات کو اچھا کر دکھایا سو نیک صبر ہی ہے، امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے، وہ علم والا حکمت والا ہے ۱۵۷۵

۱۵۷۲ ان بھائیوں میں بعض اچھے دل کے بھی تھے ان میں سے ہی وہ بھی تھا جس نے پہلے موقعہ پر کہا تھا لا تقتلوا یوسف اب بھی ان میں سے کوئی حضرت یوسف کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ بن یامین کی جگہ کسی دوسرے کو قید کر لیا جائے جس کو حضرت یوسف رد کرتے ہیں۔

۱۵۷۳ استایئسوا۔ اِستَایئس اور یَئِسَ کے ایک ہی معنی ہیں امید منقطع ہو گئی (غ) یعنی حضرت یوسف نے انکار کر دیا۔

نجیا۔ نَجْوٰی کے لیے دیکھو ۷۳۱ نجی کے معنی ہیں۔ مُنَاجِی یعنی خفیہ مشورہ کرنے والا اور واحد اور جمع دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ وقربناہ نجیا (مریم ۱۹-۵۲)

ابرح۔ بَرِحَ کے معنی زَالَ آتے ہیں لن نبرح علیه عاکفین (طٰہٰ ۲۰-۹۱) لا ابرح حتی ابلغ مجمع البحرین (الکہف ۱۸-۶۰) اور بَرِحَ الارض کے معنی ہیں اس زمین سے الگ ہو گیا۔ (ل)

یہ مشورہ کرنے کے لیے الگ ہوئے کہ اب حضرت یعقوبؑ سے جا کر کیا کہیں۔ اس مشورہ کی ضرورت بھی نہ ہوتی اگر ان کے دل صاف ہوتے اب چاہتے تھے کہ کوئی بات بنائیں جس پر حضرت یعقوب کو اطمینان ہو جائے ان میں سب سے بڑا بوجہ اس عہد کے جو حضرت یعقوب سے کیا تھا جانے سے ہی انکار کرتا ہے، جب تک کہ باپ کی طرف سے اجازت نہ ملے یا اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے یعنی کوئی ایسے اسباب پیدا ہو جائیں کہ عہد کی ذمہ داری اس پر نہ رہے۔

۱۵۷۴ یہ کلام اسی بڑے بھائی کا سمجھا گیا ہے مگر بعض نے کہا کہ یہ یوسف کا کلام ہے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ان کے مشورے کا آخری نتیجہ ہے یعنی آخر کار سب اس رائے پر پہنچے کہ یوں ہی کہا جائے کہ بن یامین نے چوری کی۔ اور غیب کے حافظ نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ جو کام ہماری آنکھوں کے اوجھل ہوا یعنی بن یامین کا چوری کرنا اس کی ہم حفاظت کیونکر کر سکتے تھے۔ یا مراد یہ ہے کہ جب عہد کیا تھا تو اس وقت اس غیب کی بات کا ہمیں علم نہ تھا کہ یہ چوری کریگا۔

۱۵۷۵ بن یامین پر چوری کا الزام بھائیوں کا منصوبہ تھا: درمیانی واقعات کو چھوڑ کر اب بتایا ہے کہ جب اسی کے مطابق انہوں نے حضرت یعقوب سے کہا تو انہوں نے جواب میں وہی لفظ کہے جو حضرت یوسف کے ماجرا کے وقت کہے تھے بل سولت لکم انفسکم امرا فصبر جمیل جس سے معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب نے اس بات کو ان کی طرف منسوب کیا ہے کہ یہ بھی تم نے ایک منصوبہ بنایا ہے جس طرح یوسف کے معاملہ میں بنایا تھا اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب سولت لکم انفسکم کہہ کر کہ تم نے اب بھی کوئی بُرا کام کیا ہے جو تمہیں اچھا معلوم ہوا کوئی جھوٹا الزام ان پر نہ دے سکتے تھے بلکہ یہ بات ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ	اور ان سے منہ پھیر لیا اور کہا ہائے افسوس یوسفؑ کی وجہ سے اور اس کی آنکھیں
وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾	غم سے ڈبڈبا آئیں ۔ پس وہ (غم کو) دبائے تھے ۱۵۷۶
قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ	انھوں نے کہا اللہ کی قسم تو یوسفؑ کا ذکر کرتا ہی رہے گا یہاں تک کہ تو
حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾	مرنے کے قریب ہوجائے یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہوجائے ۱۵۷۷
قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّىْ وَحُزْنِىْٓ اِلَى اللّٰهِ	کہا میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت اللہ سے ہی کرتا ہوں اور

سے معلوم ہوگئی تھی جس طرح یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ وہ دونوں واپس مل بھی جائیں گے۔

۱۵۷۶ ابیضت ۔ بَیاض کے معنی سفیدی ہیں اور اَبْیَض سفید بَیَّضَ الشَّیْءَ فَابْیَضَّ یعنی بَیَّضَ کے معنی سفید کردیا اور ابیضّ کے معنی وہ سفید ہوگئی اور بَیَّضْتُ السِّقَاءَ کے معنی ہیں مشکیزہ کو پانی سے بھر دیا (ل) اسی لحاظ سے اِبْیَضَّ کے معنی ہوں گے وہ پانی سے بھر گیا اور پانی اور دودھ کو یا پانی اور روٹی کو یا پانی اور گیہوں کو اَبْیَضَان کہا جاتا ہے یعنی دو سفید چیزیں۔

حضرت یعقوب کا غم میں رو رو کر اندھا ہوجانا خلاف قرآن ہے : ابیضت عیناہ من الحزن کے معنی مفسرین نے عموماً یوں کیے ہیں کہ غم کی وجہ سے حضرت یعقوب روتے رہتے تھے اور روتے رہنے سے ان کی آنکھیں جاتی رہیں یعنی وہ اندھے ہوگئے گویا ابیضاض اندھا ہوجانے سے کنایہ ہے۔ لیکن یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک خدا کا نبی بیٹے کے جاتے رہنے سے تبلیغ و اصلاح کے کام کو چھوڑ کر جو اس کی بعثت کی اصل غرض ہے رونے لگ جائے اور یہاں تک روئے کہ روایات میں ہے کہ اسّی سال تک آپ یوسف سے جدا رہے اور اس سارے عرصہ میں ایک لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ آپ کے دل میں غم نہ ہوا اور رخساروں پر آنسو نہ ہوں اور اسی حالت میں آپ روتے روتے اندھے ہوگئے، مخلوق کی اصلاح تو ایک طرف رہی ایسا شخص تو خدا تعالےٰ کی بھی عبادت نہیں کرسکتا۔ اگر ایک عامی آدمی اپنے کسی عزیز کی وفات پر ایک ماہ بھی اس طرح روئے تو وہ ملامت کے قابل ہوگا، چہ جائیکہ خدا کا نبی اسّی سال تک اس حال میں رہے پھر ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہا ہو فصبر جمیل پھر اللہ تعالیٰ نے اُسے یقین بھی دلا دیا ہو کہ وہ بیٹا زندہ ہے۔ یہ بات کسی طرح قابل تسلیم نہیں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آنحضرت صلعم بھی اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات پر روئے تھے اور فرمایا تھا القلب یحزن والعین تدمع دل میں غم ہے اور آنکھوں میں آنسو ہیں۔ مگر یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ آنحضرت صلعم ایک دو سال روتے رہے تھے یا ایک دو ماہ ہی روتے رہے تھے۔ بلاشبہ عزیزوں کی جدائی پر آنکھوں میں آنسو بھر آنا تقاضائے فطرت ہے اور اگر حضرت یعقوب میں اسی حد تک مانا جائے تو یہ تبقاضائے محبت پدری ہے لیکن اسّی سال تک دن رات روتے چلے جانا یہاں تک کہ انسان اندھا ہوجائے اس کے برابر اہل دنیا کی بھی کوئی جزع فزع نہیں اور اس سے بڑھ کر بے صبری کوئی نہیں اور نبوت کا کام تو پھر گویا یوسف کی پرستش ہوئی نعوذ باللہ من ذٰلک۔ ابیضا عین کے معنی لغت میں اندھا ہونا کہیں نہیں لکھے ہاں یہ مراد سمجھی گئی ہے مگر اس سے یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ آنکھوں میں آنسو بھر کر آنکھیں سفید ہوگئیں جس کو ہماری زبان میں ڈبڈبانا کہتے ہیں اور یہ وہ امر ہے جو ایک نبی کی شان کے لائق ہے کہ جب آپ کو یہ خبر پہنچتی ہے کہ بن یامین پکڑے گئے تو حضرت یوسف کا صدمہ تازہ ہو کر آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں مگر بایں وہ اپنے رنج اور غم کو دباتے ہیں جیسا کہ لفظ کظیم لا کر ظاہر کیا گیا ہے جس کے معنی غصہ یا غم وغیرہ دبانے کے ہیں کہ وہ ظاہر نہ ہونے پائے دیکھو ۱۵۷ جس کی آنکھوں سے اسّی سال تک آنسو خشک نہ ہوں اسے کظیم کس زبان سے کہا جائے گا؟

یہ معنی حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہیں۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے انہ لما قال یا اسفی علی یوسف غلبہ البکاء وعند غلبۃ البکاء یکثر الماء فی العین فتصیر العین کانہا ابیضت من بیاض ذٰلک الماء ...... فلو حملنا الابیضاض علی غلبۃ البکاء کان ھذا التعلیل حسنا ولو حملناہ علی العمی لم یحسن ھذا التعلیل فکان ما ذکرناہ اولی وھذا التفسیر مع الدلیل رواہ الواحدی فی البسیط عن ابن عباسؓ یعنی جب آپ نے یوسف پر اس وجہ سے افسوس کیا تو بکاء (رونا) آپ پر غالب آگیا اور رونے کے غلبہ کے وقت آنکھ میں پانی بہت ہوجاتا ہے گویا اس پانی کی سفیدی سے وہ سفید ہوجاتی ہے.... پس اگر ہم سفید ہوجانے کو غلبۂ بکاء پر حمل کریں تو یہ وجہ اچھی ہے اور اگر اسے اندھا پن پر حمل کریں تو یہ وجہ اچھی نہیں۔ اس لیے جو ہم نے بیان کیا ہے وہ اولیٰ ہے اور یہ تفسیر مع دلیل کے واحدی نے بسیط میں ابن عباس سے روایت کی ہے۔

۱۵۷۷ تفتؤا ۔ لا تفتؤا مراد ہے اور ما فَتِئْتُ کے معنی وہی ہیں جو ما زلت کے معنی ہیں اور لا کے محذوف ہونے پر یہ دلیل ہے کہ قسم کا جواب اگر مثبت ہو تو اس پر علامت اثبات ضرور داخل ہوتی ہے اور علامت اثبات ل اور نون تاکید ہے۔

یوسفؑ کی اس یاد کو بھائیوں نے بُرا منایا کیونکہ اُن کے دل اُنہیں ملزم کرتے تھے اس لیے وہ ناپسند کرتے تھے کہ حضرت یعقوبؑ اس کا نام بھی لیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب آپ بوڑھے ہو کر موت کے قریب ہوگئے ہیں تاہم یوسف کے ذکر کو نہیں چھوڑتے۔ اس سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت یعقوبؑ ہر وقت یوسفؑ کا ذکر کرتے رہتے تھے، بلکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مدت بعد یہ ذکر کیا جس کی وجہ سے بھائیوں کو یہ بات کہنے کی ضرورت پیش آئی۔

وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۶﴾
يٰبَنِىَّ اذۡهَبُوۡا فَتَحَسَّسُوۡا مِنۡ يُّوۡسُفَ وَاَخِيۡهِ
وَلَا تَايۡــَٔسُوۡا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ‌ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايۡــَٔسُ
مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۸۷﴾
فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلَيۡهِ قَالُوۡا يٰۤاَيُّهَا الۡعَزِيۡزُ
مَسَّنَا وَاَهۡلَنَا الضُّرُّ وَجِئۡنَا بِبِضَاعَةٍ
مُّزۡجٰىةٍ فَاَوۡفِ لَنَا الۡكَيۡلَ وَتَصَدَّقۡ
عَلَيۡنَا‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجۡزِى الۡمُتَصَدِّقِيۡنَ ﴿۸۸﴾

اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ع۱۵۷۸
اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسفؑ اور اس کے بھائی کا
پتہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو، کیونکہ اللہ کی
رحمت سے سوائے کافر لوگوں کے اور کوئی مایوس نہیں ہوتا ع۱۵۷۹
پھر جب اس کے پاس آئے کہا اے عزیز ہمیں اور ہمارے گھر
والوں کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم تھوڑا سا سرمایہ لیکر آئے ہیں سو ہمیں
(غلہ کا) پورا ماپ دے اور ہمیں خیرات دے اللہ خیرات دینے والوں
کو (اچھا) بدلہ دیتا ہے ع۱۵۸۰

ع۱۵۷۸ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے رنج و مصائب کو دوسروں پر ظاہر کرنے سے حتی الوسع بچنا چاہیئے اور صرف اپنے مولےٰ کے سامنے ظاہر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہی غم و رنج کو دور بھی کر سکتا ہے۔ حدیث میں ہے مِن كُنُوزِ الْبِرِّ اخفاء الصدقة وكِتْمَانُ المصائبِ صدقہ کا اخفا اور مصائب کا چھپانا نیکی کے خزانے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کا روتے رہنا اس آیت کے بھی خلاف ہے۔

ع۱۵۷۹ تحسسوا حس سے باب تفعل ہے حاسہ سے کسی چیز کا پالینا اور مراد اس سے اس کے احوال کا دریافت کرنا ہے۔

رَوۡح وسعت پر بولا جاتا ہے اور یہاں مراد اس سے کشایش اور رحمت ہے (غ) اسی مادہ سے ریح اور رُوح ہیں۔

حضرت یوسف کی تاریخ کا یہ حصّہ کہ بھائی دوبارہ حضرت یعقوب کے پاس گئے اور بن یامین کی گرفتاری کا قصّہ سنایا بائبل میں مذکور نہیں بلکہ حضرت یوسف اپنے آپ کو اسی وقت ظاہر کر دیتے ہیں جب بن یامین کو پکڑا جاتا ہے اور بھائی حیران ہیں کہ اب کیا کریں۔ قرآن کریم نے اس حصّہ کو بیان کر کے اور بائبل سے اس موقعہ پر اختلاف کر کے یہ دکھایا ہے کہ باوجود اسباب مایوسی کے انتہا کو پہنچ جانے کے، باوجود ایک صدمہ کے ساتھ دوسرا صدمہ وارد ہو جانے کے مایوسی حضرت یعقوبؑ کے قریب بھی نہیں آئی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ان تکالیف کے دور کرنے پر آپ کا ایمان بڑھتا ہی چلا گیا اور یہ وہ عظیم الشان سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نیک لوگوں کی زندگیاں بیان کر کے سکھانا چاہتا ہے کہ وہ کس طرح پر مایوسی کے اسباب کے کمال کو پہنچ جانے کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی مایوسی کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ بلکہ جس قدر تاریکی بڑھتی ہے اسی قدر ان کا ایمان بڑھتا ہے کہ روشنی ضرور نمودار ہو گی۔ چنانچہ اس مضمون کو خود قرآن شریف نے سورت کی آخری آیات میں کھول دیا ہے دیکھو آیت ۱۱۰۔ افسوس ہے کہ بائبل میں نہ تو اسباب مایوسی انتہا کو پہنچتے ہیں اور نہ ہی حضرت یعقوبؑ کی زندگی میں وہ دلوں کو ابھارنے والا نظارہ نظر آتا ہے جو یہاں ان الفاظ میں قرآن کریم نے دکھایا ہے لا تايئسوا من روح الله انه لا يايئس من روح الله الا القوم الكافرون۔ یہ وہ ایک اور عظیم الشان سبق ہے جو اس سورت سے ہمیں ملتا ہے مگر بائبل کے قصہ سے نہیں ملتا۔ بائبل میں یہ ایک کہانی ہے مگر قرآن کریم میں قدم قدم پر اس کے اندر وہ اخلاقی سبق بھر دیئے ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھائے تو اس کی زندگی اس دنیا میں جنت کی زندگی بن جاتی ہے۔

مسلمانوں کے مایوس دلوں کے لیے مرہم۔ اور ایک مسلمان کے دل میں اس ذکر کو پڑھ کر یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر چاروں طرف مغلوبیت حق کا نظارہ ہی نظارہ نظر آتا ہو اور کفر اپنی ترقی کی انتہا کو پہنچ گیا ہو اور نیکوں کو پاؤں تلے روندا جاتا ہو اور مکار اور فریبی دنیا میں مالک نظر آتے ہوں اور سب چیزیں ان کے قبضۂ قدرت میں معلوم ہوتی ہوں تو بھی وہ مایوس نہیں ہوتے اور اللہ کی رحمت کے آفتاب کے طلوع پر یقین رکھتے ہیں اس لیے کہ حق کا غلبہ یقینی ہے۔ تعجب ان مسلمانوں پر ہے جو قرآن کریم میں ایسی آیات کے ہوتے ہوئے پھر کفار کی نقل کرتے اور ذرا ذرا مشکلات پیش آنے پر گھبرا ہی نہیں اُٹھتے بلکہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ آج جب اسلام ہر طرف مغلوب نظر آتا ہے اس ایمان کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب مسلمانوں میں یہ ایمان پیدا ہو جائے گا تو وہی اسلام کی شان و شوکت بھی وہ دوبارہ دیکھ لیں گے جس کی تڑپ ان کے دلوں میں ہے۔

ع۱۵۸۰ مزجٰة۔ تَزۡجِيَة (زجا) کسی چیز کا دھکیلنا ہے تاکہ وہ آگے چلے جیسے ہوا کا بادل کو چلانا يزجى سحابا (النور ۲۴-۴۳) يزجى لكم الفلك (بنی اسرائیل ۱۷-۶۶) پس جو چیز قلیل ہو گویا کسی شمار میں نہیں اور رد کی جائے اسے مزجاة کہا جاتا ہے (غ)

اس دفعہ بموجب ارشاد حضرت یعقوب وہ یوسفؑ کی تلاش میں آئے ہیں اور اپنی مفلسی اور غربت کی طرف توجہ دلانا اس لیے تھا کہ اگر یہی یوسفؑ ہیں تو ان کا دل پگھلے اور وہ اصلیت کا اظہار کر دیں چنانچہ یہی اثر اس کا ہوا۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾

اس نے کہا، کیا تم جانتے ہو تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی سے کیا کیا، جب تم جاہل تھے ۱۵۸۱ع

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَھٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

انھوں نے کہا، کیا تُو ہی یوسفؑ ہے؟ اس نے کہا، میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر احسان کیا ہے، ہاں جو کوئی تقوٰے اور صبر کرتا ہے، تو اللہ بھی نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ۱۵۸۲ع

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِــِٕيْنَ ﴿۹۱﴾

انھوں نے کہا اللہ کی قسم اللہ نے تجھے ہم پر فوقیت دی ہے، اور یقیناً ہم خطا کار تھے ۱۵۸۳ع

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

کہا، آج تم پر کچھ الزام نہیں۔ اللہ تمھیں معاف کرے اور سب رحم کرنیوالوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے ۱۵۸۴ع

۱۵۸۱ع بن یامین سے بھائیوں کی شرارت: یہی ایک موقعہ ہے جس پر حضرت یوسف نے ان بھائیوں کا سلوک یاد دلایا ہے وہ بھی ملامت کے لیے نہیں بلکہ اس بات کے ظاہر کرنے کے لیے کہ اللہ تعالٰی کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ گو تم نے میرے ساتھ ایسا سلوک کر کے پھر میرے بھائی سے بھی اس قسم کا سلوک کیا تاہم آج تم پر ان باتوں کے لیے کوئی ملامت نہیں لا تثریب علیکم الیوم (۹۲) یہی وجہ ہے کہ یہ نہیں بتایا کہ وہ معاملہ کیا تھا صرف اتنا کہہ کر چھوڑ دیا کہ تم نے کچھ معاملہ ہم دونوں سے کیا اسے تم جانتے ہو۔ اس سے یہ یقینی طور پر معلوم ہوا کہ بن یامین کے ساتھ کوئی شرارت اسی رنگ کی ان بھائیوں کی طرف سے ہوئی تھی جیسے یوسفؑ کے ساتھ اور قرآن کریم میں ایک ہی ایسے واقعہ کا ذکر ہے یعنی پیالہ کی چوری بائبل میں بھی اور کوئی واقعہ مذکور نہیں جس سے معلوم ہو کہ بن یامین کے ساتھ کوئی اس قسم کا سلوک ہوا تھا جس کا الزام یہاں ان پر دیا گیا ہے۔

۱۵۸۲ع اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا قد من اللہ علینا یعنی ان تمام واقعات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اللہ تعالٰی نے ہم سب پر احسان کیا اور دکھ سے راحت پیدا کر دی۔ اس بات سے بھی اللہ تعالٰی کی رحمت کی وسعت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس کے فضل کی طرف کہ بظاہر انسان پر دکھ بھی آتے ہیں تو کس طرح وہ اپنے فضل سے انہیں راحت میں تبدیل کر دیتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہر ایک راحت دکھ سے ہی پیدا ہوتی ہے جب تک انسان تکلیفوں میں مبتلا نہ ہو کبھی حقیقی راحت کو نہیں پا سکتا اس لیے مصائب کو خوش دلی سے برداشت کرنا چاہیئے اس لیے کہ ان میں بھی انسان کی بہتری ہے اسی لیے اس کے بعد فرمایا جو کوئی بھی تقوٰی اور صبر کرے تو اللہ تعالٰی محسنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا یعنی مصائب میں رعایت حقوق کو اور صبر کو ہاتھ سے نہ دے اور ان الفاظ میں عام قانون کو بیان کرنے کا یہی منشا ہے کہ یہ یوسفؑ سے خاص معاملہ نہیں بلکہ جو انسان مصائب کی کٹھالی میں پڑتا اور صبر کرتا ہے اور تقوٰی کو ہاتھ سے نہیں دیتا وہی سونا بنا کر نکالا جاتا ہے۔

۱۵۸۳ع اٰثر۔ اَثَرْ کسی چیز کا اس بات کا حصول ہے جو اس کے وجود پر دلالت کرے اور اس کی جمع اٰثار ہے ثم قفینا علٰی اٰثارھم برسلنا (الحدید ۵۷-۲۷) وَاٰثاراً فی الارض (المؤمن ۴۰-۲۱) فانظر الٰی اٰثار رحمۃ اللہ (الروم ۳۰-۵۰) اور اس لیے اٰثار پہلے لوگوں کے نقش قدم کو بھی کہتے ہیں یعنی ایسا راستہ جو ان لوگوں کی طرف لیجاتا ہے جو پہلے گزر چکے فہم علٰی اٰثارھم یھرعون (الصّٰفّٰت ۳۷-۷۰) ھم اولاء علٰی اثری (طٰہٰ ۲۰-۸۴) اور اَثَرْتُ الْعِلْمَ کے معنی ہیں میں نے علم کی روایت کی اٰثارۃ من علم (الاحقاف ۴۶-۴) گویا یہ وہ چیز ہے جو لکھی جائے یا روایت کی جائے تو اس کا اثر باقی رہ جائے اور استعارۃً اٰثر کے معنی بزرگی لیے جاتے ہیں اور اسی سے اِیثار ہے جس کے معنی فضیلت دینا ہیں جیسے یہاں اور یؤثرون علٰی انفسھم (الحشر ۵۹-۹) بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا (الاعلٰی ۸۷-۱۶) (غ) یعنی ترجیح دیتے ہو۔

۱۵۸۴ع تثریب۔ ثَرَّبَ علیہ کے معنی ہیں اسے ملامت کی اور اس کے قصور پر اسے عیب لگایا اور اسے وہ یاد دلایا۔ اور یَثْرِب مدینہ طیّبہ کا پہلا نام ہے اور نبی کریم صلعم نے یثرب کی بجائے اس کا نام طَیِّبَۃ رکھا، کیونکہ ثَرْب کلام عرب میں فساد کو کہتے ہیں (ل) قرآن شریف میں ایک موقعہ پر صرف دوسروں کا قول نقل کرتے ہوئے اسے یثرب کے نام سے پکارا ہے یا اھل یثرب لا مقام لکم (الاحزاب ۳۳-۱۳)

عفوِ یوسفؑ اور عفوِ خاتم النّبیّین: کتنا بڑا دل ہے اور کتنا بڑا عفو ہے کہ وہ لوگ جو جان لینے کے در پے تھے انہیں یہ کہا کہ آج تم پر اس کی وجہ سے کوئی ملامت بھی نہیں، مگر اس مقام سے کس قدر بلند وہ مقام ہے جس کی طرف یوسف علیہ السلام کے ذکر میں اشارہ ہے یعنی آنحضرت صلعم کا مقام جن کی جان

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع

یہ میری قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے سامنے ڈال دو، تا وہ یقین کر کے آجائے اور اپنا سب کنبہ میرے پاس لے آؤ۔ ۱۵۸۵

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

اور جب قافلہ (مصر سے) چلا، ان کے باپ نے کہا، یوسفؑ کی خوشبو پاتا ہوں اگر مجھے بہکا ہوا نہ سمجھو۔ ۱۵۸۶

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾

انھوں نے کہا اللہ کی قسم تو اپنی پُرانی غلطی میں ہے۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ

پھر جب خوش خبری دینے والا آپہنچا (اور) اسے اس کے سامنے

لینے کی ایک دفعہ نہیں متعدد مرتبہ کوشش کی گئی۔ اور آپ کو تیرہ سال کے عرصہ میں مکہ میں بڑے بڑے دکھ پہنچائے گئے اور نہ صرف آپ کو بلکہ ہر اس شخص کو جو آپ کا دم بھرتا حد درجے کے دکھ دیئے جاتے بعض کو جان سے مارا گیا۔ اور یہ دکھ اس قدر شدّت میں بڑھے کہ ان لوگوں نے اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر خود جلاوطنی اختیار کی پھر یہ تیرہ سال کے مسلسل دکھ بھی مکہ کو چھوڑنے پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اب تلوار لیکر مدینہ پر چڑھائی کی جاتی ہے اور مٹھی بھر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ با ایں ان سب جرموں کے مرتکب جب مغلوب ہو کر آپ کے سامنے آتے ہیں تو یہی لفظ آپ کی زبان مبارک سے نکلتے ہیں لاتثریب علیکم الیوم اور سید البشر کے عفوِ عظیم کا یہ نمونہ دنیا میں ہمیشہ کے لیے اپنی نظیر آپ ہی رہتا ہے۔ اخلاقِ یوسفی میں اگر لاتثریب ایک عظیم الشان مقام ہے جس کا اثر دس بھائیوں تک محدود تھا، تو اخلاق محمدی کے علو شان کو کون پہنچ سکتا ہے جو ایک مجرم قوم کی قوم کو جن کے جرم انتہا کو پہنچ چکے تھے اسی لاتثریب کے ماتحت ایسا بخشتا ہے کہ ایک حرف ملامت زبان پر نہیں لاتا۔

۱۵۸۵ بصیر۔ بَصَر قوت مدرکہ اور دیکھنے کی قوت دونوں کو کہا جاتا ہے ۱۲۱ اور رجل بَصِیْرٌ کے معنی ہیں مُبْصِر اور بعض نے کہا اس سے مراد آنکھوں سے دیکھنے والا ہے (ل) اور راغب یہ کہہ کر کہ ضریر یعنی اندھے کو عکس کے طور پر بصیر کہا جاتا ہے لکھتے ہیں کہ قابل ترجیح یہ ہے کہ یہ اُسے کہا جائے جس کے لیے بصیرت قلب کی قوت ہو (غ) بہرحال بصیر کا لفظ اپنے اصل معنی کے لحاظ سے دونوں معنی دیتا ہے آنکھ سے دیکھنے والا۔ اور دل کی قوت مدرکہ سے ایک بات کو پالینے والا۔

یہاں اس سورت میں قمیص کا ذکر تیسری دفعہ آیا ہے دیکھو ۱۵۲۵ پہلی دفعہ قمیص حضرت یوسف کی زندگی کا نشان ٹھہری، دوسری مرتبہ آپ کی پاکدامنی کا نشان ہوئی اور یہ قمیص آپ کی حکومت کا نشان ہوئی۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت عثمانؓ کو فرمایا اِنَّ اللّٰهَ سَيُقَمِّصُكَ قَمِيْصًا وَاَنَّكَ تُلَاصُ عَلٰى خَلْعِهٖ فَاِيَّاكَ وَخَلْعَهٗ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا اور تمہیں اس قمیص کے اتارنے کو کہا جائے گا مگر خبردار اس قمیص کو نہ اتارنا۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد خلافت ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ وہ قمیص اصلی تھی اور صرف بطور نشان حکومت بھیجی گئی تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف کو عطا فرمائی تھی۔ یعنی تاکہ حضرت یعقوب کو یقین آجائے کہ جو کچھ ان کے بھائیوں نے حضرت یوسف کی حکومت اور اختیارات کے متعلق کہا ہے وہ سچ ہے اور ہو سکتا ہے کہ قمیص سے مراد یہاں واقعی حکومت ہی ہو اور قمیص کو لے جانے کے معنی یہ ہوں کہ یہ خبر لے جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکومت عطا فرمائی ہے۔ بائبل میں یہ ذکر نہیں کہ قمیص بھیجی گئی تھی صرف اسی قدر ذکر ہے کہ ان کو کہا تھا میرے باپ کو خبر سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہاں حکومت دی ہے اور وہاں یہ بھی ذکر ہے کہ جب بھائیوں نے یہ باتیں حضرت یعقوب کو سنائیں "تو یعقوب کا دل سنسنا گیا کیونکہ اس نے اُن کا یقین نہ کیا"۔ شاید اسی کے ازالہ کے لیے یات بصیرا اور فارتد بصیرا (رکوع ۹) فرمایا یعنی اسے یقین ہو گیا۔ مفسرین نے ایک توجیہ یہ قبول کی ہے کہ جب حضرت یعقوب کو یہ خبر پہنچے گی تو اس سے اس کے دل کو قوت ملے گی اور قویٰ میں جو ضعف آگیا ہے وہ دور ہو جائے گا۔ اور بصارت کی کمی بھی دور ہو جائے گی (ر) گویا اس صورت میں بھی انہوں نے اندھا پن سے اچھا ہونا مراد نہیں لیا اور نہ یعقوبؑ کو اندھا مانا ہے بلکہ غم سے بصارت میں کچھ کمی مراد لی ہے جو اس خبر سے دور ہو جائے گی اور یقین کے معنی اس لیے بھی درست ہیں کہ گویا وحی الٰہی کے اشارات سے حضرت یعقوب کو یہ علم تھا کہ یوسفؑ زندہ ہیں اور واقعات کی شہادت سے وہ بات اب یقین کامل کی حد تک پہنچ گئی۔

۱۵۸۶ ریح کے مشہور معنی ہوا ہیں اور خوشبو اور بدبو کو بھی ریح یا رائحۃ کہا جاتا ہے وقد یکون الرِّیح بمعنی الغلبۃ والقوۃ (غ) یعنی ریح کے معنی غلبہ اور قوت بھی آتے ہیں۔

تفنّدون۔ فَنَد رائے کی کمزوری ہے اور تفنید دوسرے کی طرف اس کا منسوب کرنا (غ)

یوسف کی ریح سے مراد یا تو یہ ہے کہ مجھے خوشبو آرہی ہے کہ یوسفؑ زندہ ہے اور یا مراد یہ ہے کہ اس کی قوت و شوکت کی خوشبو آرہی ہے۔ ادھر حضرت یوسف اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں ادھر بمغوائے مفہوم دل را بدل رہ است حضرت یعقوب کو علم ہو جاتا ہے۔

فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۚ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾

پیش کیا تو وہ یقین کرنے والا ہوا۔ کہا کیا میں تمھیں نہیں کہتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ﴿٩٧﴾

انھوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہمارے لیے ہمارے قصوروں کی معافی مانگ، ہم قصوروار ہیں۔

قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٩٨﴾

کہا، مَیں اپنے رب سے تمھارے لیے بخشش مانگوں گا وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ ﴿٩٩﴾

پھر جب وہ یوسفؑ کے پاس آئے، اس نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں خدا چاہے تو امن سے داخل ہو جاؤ۔

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا ۖ وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۚ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِمَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿١٠٠﴾

[1587] اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ اس کی خاطر سجدہ میں گر گئے اور اس نے کہا اے میرے باپ! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے، میرے رب نے اسے سچ کر دیا۔ اور اس نے مجھ پر احسان کیا، جب مجھے قید خانہ سے نکالا اور تمھیں بادیہ سے لے آیا اس کے بعد کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا، میرا رب جو بات چاہے اسے باریک تدبیر سے کرتا ہے۔ وہ علم والا حکمت والا ہے [1588]

۱۵۸۷ العرش۔ بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کو بوجہ اس کے علو کے عرش کہا جاتا ہے جیسے یہاں ایکم یاتینی بعرشہا (النمل ۲۷ - ۳۸)

خروا له سجدا۔ خرّ کے معنی ہیں اس طرح گرا کہ اس سے خریر سنی گئی اور خریر پانی یا ہوا وغیرہ کی اس آواز کو کہا جاتا ہے جو اوپر سے نیچے گرے فکانما خرّ من السماء (الحج ۲۲ - ۳۱) فخرّ علیہم السقف (النحل ۱۶ - ۲۶) دوسری جگہ ہے خرّوا سجدا و سبحوا بحمد ربہم (السجدۃ ۳۲ - ۱۵) امام راغب کہتے ہیں کہ خرّ کا استعمال دو باتوں پر دلالت کرتا ہے ایک گرنا اور دوسرے تسبیح کی آواز اور آگے سبحوا بحمد ربہم اس لیے بڑھایا کہ معلوم ہو کہ خریر تسبیح کی آواز کو کہا ہے نہ کسی اور شے کو (غ) یہاں بھی یہی لفظ خروا له سجدا اختیار کر کے یہ توجہ دلائی ہے کہ سجدہ میں تسبیح و تحمید الٰہی کی آواز نکلتی تھی۔ پس معلوم ہوا یہ سجدہ یوسفؑ کو نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے تھا جس کی تسبیح اور تحمید وہ کر رہے تھے اور له کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ یوسفؑ کی اس عزت و مرتبت کی وجہ سے جس میں اب وہ سب شریک ہو گئے تھے سب نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کیا۔

بدو۔ بَدَ ءَ کے معنی ظاہر ہوا، اور بَدْو۔ حضر یعنی شہر کے خلاف ہے کیونکہ اس میں ہر چیز جو درمیان میں آئے ظاہر ہو جاتی ہے۔ پس بَدْو بادیہ ہے اور بادیہ میں رہنے والے کو باد کہا جاتا ہے۔ سواءً العاکف فیہ والباد (الحج ۲۲ - ۲۵) لو انہم بادون فی الاعراب (الاحزاب ۳۳ - ۲۰)

سجدہ یوسفؑ کو نہ تھا: باپ اور ماں یا باپ اور خالہ کو تخت پر بٹھانا امتیاز کے لیے تھا۔ اس پر سب سجدہ میں گرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و حمد کرتے ہیں جیسا کہ خروا کے استعمال سے ظاہر ہے یہ سراسر غلط خیال ہے کہ یہ سجدہ یوسفؑ کو تھا تو پھر حمد و تسبیح کس کی تھی؟ اور ظاہر ہے کہ جس کی حمد و تسبیح تھی اسی کو سجدہ تھا۔ اور یہ کہنا کہ پہلی شرائع میں غیر اللہ کو سجدہ جائز تھا ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہہ دے کہ پہلی شرائع میں شرک جائز تھا۔ شرک یا غیر اللہ کو سجدہ سب شرائع میں ناجائز تھا اور اصول دین ہمیشہ سے ایک ہی رہے ہیں۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

میرے رب تو نے مجھے حکومت سے حصّہ دیا اور مجھے باتوں کی حقیقت سکھائی ، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا ولی ہے ، مجھے فرمانبرداری کی حالت میں وفات دے اور مجھے نیکوں کے ساتھ ملا [۱۵۸۸]

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو ان کے پاس نہیں تھا جب انھوں نے اپنے معاملہ پر اتفاق کرلیا اور وہ باریک تدبیر کر رہے ہیں [۱۵۸۹]

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور اکثر لوگ گو تم کتنا ہی چاہو ایمان نہیں لاتے ۔

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ ع

اور تو ان سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا وہ صرف تمام قوموں کے لیے نصیحت ہے ۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور آسمانوں اور زمین میں کتنے نشان ہیں جن پر لوگ گزرتے

اور حضرت یوسف کا یہ فرمانا کہ یہ میرے رویا کی تعبیر ہے تو اس سے سجدہ مراد لینا دوسری غلطی ہے ۔ بلکہ لفظ ھذا میں اسی یوسفؑ کی عظمت و شوکت کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے سب نے سجدۂ شکر کیا ۔ اور خود حضرت یوسف اگلی آیت میں اس کی تصریح کرتے ہیں کہ تو نے مجھے حکومت اور علم دیئے ہیں یہی مراد سورج اور چاند اور ستاروں کے سجدہ کرنے سے تھی ورنہ یہ کونسی بڑی بات ہے کہ کسی شخص کو اپنے بھائیوں میں اس قدر عظمت حاصل ہو جائے کہ وہ اس کی عظمت کا اعتراف کریں ح ۱۵۱۶ میں اس رویا کی تعبیر کے متعلق مفصل لکھا جا چکا ہے اور حضرت یوسف نے کیسے لطیف پیرائے میں بھائیوں کا ذکر کیا ہے یہ نہیں کہا کہ میرے بھائیوں نے شیطان کے ورغلانے سے مجھ سے بُرا سلوک کیا بلکہ یہ کہا کہ شیطان نے مجھ میں اور ان میں فساد ڈلوایا گویا ان کا خاص قصور نہ تھا ۔

ح ۱۵۸۸ راستبازوں کی خواہش کیا پاک ہوتی ہے ۔ حکومت بھی ملی علم بھی ملا اور علم بھی علم دین ۔ مگر دل میں ایک ہی تڑپ ہے اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں جئیں اور مریں اور صلحا کے زمرہ میں ہوں ۔ یہی زندگی کا اصل مقصد ہے ۔ مسلمانوں کو سبق دیا تھا مگر کون آج قرآن کی طرف توجہ کرتا ہے راستبازی کا پھل حکومت بھی ہے مگر جو حکومت کو پہلے چاہتے ہیں اور کہتے ہیں راستباز بعد میں بنیں گے ۔ وہ قرآن کی بتائی راہ پر نہیں چلتے ۔ وہاں اس میں محمد رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھیوں کو یہ بھی وعدہ ہے کہ جس طرح یوسفؑ آخر کار بادشاہ بنے اور بھائیوں کو ان کے سامنے اعتراف عجز کرنا پڑا ۔ اسی طرح آنحضرت صلعم کی مخالفت کرنے والے بھی آخر کار مغلوب ہونگے اور مسلمانوں کو بادشاہت ملے گی ۔ اور چونکہ یہاں بھائیوں کے قائم مقام عرب کے لوگ نہیں اس لیے جس بادشاہت کا وعدہ دیا جاتا ہے ، وہ صرف عرب کی بادشاہت نہیں بلکہ اتنی بڑی بادشاہت ہے کہ جس سے عرب کے لوگ بھی فائدہ اٹھائیں جس طرح یوسفؑ کی بادشاہت سے بھائیوں نے فائدہ اُٹھایا ۔ پس اس میں صاف اشارہ عرب سے باہر کسی عظیم الشان بادشاہت کا ہے ۔ چنانچہ صحیح حدیث میں جو مسلم ترمذی ابو داؤد میں ہے ذیل کے لفظ آتے ہیں اِنَّ رَبِّیْ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَاُرِیْتُ مَشَارِقَہَا وَمَغَارِبَہَا وَاِنَّ مُلْکَ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مَا زُوِیَ لِیْ مِنْہَا ۔ میرے رب نے زمین کو میرے لیے سکیڑ دیا یعنی اس کا نقشہ میرے سامنے پیش کیا اور مجھے اس کے مشرقی اور مغربی ممالک دکھائے گئے اور میری اُمت کی بادشاہت وہاں تک پہنچے گی جو مجھے نقشہ میں دکھایا گیا ۔

ح ۱۵۸۹ آنحضرتؐ کی مخالفت اور اس کا انجام : حضرت یوسف کے تذکرہ کو توفنی مسلما والحقنی بالصالحین پر ختم کر کے انتقال مضمون آنحضرت صلعم اور آپ کے خلاف تدابیر کرنے والوں کی طرف کیا ہے چنانچہ اس آیت میں الفاظ وھم یمکرون وہ باریک تدابیر کر رہے ہیں صاف اس پر شاہد ہیں اور اگلی آیات کا مضمون بھی صاف یہی ظاہر کرتا ہے پس انباء الغیب سے مراد بھی وہ خبریں ہیں جو بطور پیشگوئی حضرت یوسف کے تذکرہ میں ہیں یعنی مخالفین کی سازشیں اور کوششیں اور سات سال کا قحط اور بالآخران کی ناکامی اور مغلوب ہو کر آنحضرت صلعم کی خدمت میں آنا اور آنحضرت صلعم کا ان کو معاف کرنا اور آپ کو وسیع حکومت کا ملنا اور ان کا اس میں حصّہ دار ہونا ۔ اور اگر حضرت یوسف کے تذکرہ کی طرف بھی ذٰلک من انباء الغیب میں اشارہ لیا جائے تو اس معنی سے بالکل بجا ہے کہ کتنی وہ باتیں قرآن شریف نے بیان کی ہیں جن سے اعلےٰ درجہ کے اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں حالانکہ بائبل میں وہ باتیں موجود نہیں اور وہاں یہ قصہ اس سے بڑھ کر وقعت نہیں رکھتا جو کسی نے کہا ہے پیرے بود پسرے داشت گم کرد باز یافت ۔

يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

ہیں اور وہ ان سے منہ پھیرے ہوئے ہیں ع۱۵۹۰

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر وہ شرک (بھی) کرتے ہیں ع۱۵۹۱

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

تو کیا وہ اس بات سے نڈر ہو گئے ہیں کہ ان پر اللہ کے عذاب کی بھاری مصیبت آ پڑے یا ناگہاں وہ گھڑی ان پر آ جائے اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

کہہ دے یہ میرا رستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر میں اور جو میری پیروی کرتے ہیں اور اللہ سب نقصوں سے پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ع۱۵۹۲

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ

اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی بستیوں کے رہنے والوں میں سے مردوں کو ہی بھیجا تھا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے

ع۱۵۹۰ کاین۔ ایّ حرف استفہام ہے۔ ایہم یکفل مریم (آل عمران ۔۴۴) ایہم اشد علی الرحمٰن عتیا (مریم ۔۶۹) ایاما تدعوا (بنی اسرائیل ۔۱۱۰) اور ندا میں جب منادیٰ پر ال داخل ہو تو مذکر اور مونث میں ایھا اور مونث میں ایتھا یا کے ساتھ بڑھایا جاتا ہے۔ جیسے یاایہا الناس، یاایہا الذین اٰمنوا۔ یا الناس یا یا الرجل نہیں کہا جائیگا ایتہا العیر (۔۷۰) اور کاین میں ک حرف تشبیہ ہے اور ایّ حرف استفہام اور ن تنوین کی جگہ ہے۔ اور یہ سب بمنزلہ ایک لفظ کے ہے جس کے معنی ہیں رُبّ یعنی بہت (ل)

چونکہ اس رکوع میں عبرت دلانا مقصود ہے اس لیے بطور تمہید عام لوگوں کی حالت غفلت اور لاپروائی کا ذکر کرتا ہے کہ کتنے نشانوں پر گزر جاتے ہیں مگر ان پر غور نہیں کرتے بلکہ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں۔ ایک ہی چیز کو دو آدمی دیکھتے ہیں ایک کے نزدیک اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی، دوسرا اس سے بڑے بڑے قیمتی سبق حاصل کر لیتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اپنی عادت ایسی بناؤ کہ ہر نشان سے عبرت حاصل کرو، ہر تذکرہ سے فائدہ اٹھاؤ۔

ع۱۵۹۱ ایک حالت تو کفار کی ہے کہ اللہ پر ایمان بھی لاتے ہیں اور پھر شریک بھی ساتھ ٹھہراتے ہیں۔ کوئی مشرک قوم نہیں مگر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بھی ساتھ ساتھ اقرار کرتی ہے۔ عرب کے لوگ باوجود پتھروں اور درختوں اور بتوں کی پرستش کے، ہندو باوجود اپنے کروڑ ہا دیوتاؤں اور دیویوں اور بتوں کے خدا کو ایک مانتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر عیسائی ہیں کہ تین خدا کہتے ہوئے خدا کو ایک بھی کہتے ہیں اور تین ایک اور ایک تین کے عقدہ لاینحل کو قبول کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر فطرت انسانی کی شہادت ہے اور کوئی قوم اس فطری گواہی کا انکار نہیں کر سکتی گو اس فطرت کی شہادت کے ساتھ خواہشات نفسانی کو ملا کر اور بھی ہزار ہا رب بنا لیے ہیں۔ مگر سب سے بڑھ کر قابل افسوس مسلمانوں کی حالت ہے کہ جنھیں ہر قسم کے شرک سے پاک کر کے ایک توحید پر کھڑا کیا گیا تھا۔ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کو مانتے ہوئے ہزار ہا قسم کے شرک ساتھ ملا لیے ہیں من اتخذ الٰھہ ھوٰہ کا شرک تو خفی ہے مگر موٹے شرک جیسے قبر پرستی، پیر پرستی انہوں نے مسلمان قوم کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس موقعہ پر شرک کا ذکر اس لیے کیا کہ جو لوگ شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے اور اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اوپر ذکر آیات اللہ کی طرف توجہ نہ کرنے کا ہی تھا۔ مسلمان بھی پیر پرستی میں پڑ کر اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ چکے ہیں اس لیے ان مصائب سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے اور عبرت حاصل نہیں کرتے، جو خود ان پر وارد ہو رہی ہیں۔

ع۱۵۹۲ جب یہ ذکر کیا کہ یہ تمام لوگ توحید کے ساتھ شرک کو ملا رہے ہیں تو اپنے رستہ کا بھی ذکر کیا کہ وہ توحید خالص ہے جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہے سب سے زبردست بات جو یہاں بیان فرمائی یہ ہے کہ میں جس بات پر قائم ہوں علی بصیرت ہوں میں ہی نہیں میرے پیرو بھی گویا اچھی طرح اس راہ کے حق ہونے کو دیکھ رہے ہیں اور یقین کامل سے اس پر قائم ہیں پس محمد رسول اللہ صلعم کی پیروی انسان کو علی بصیرت ایمان پر قائم کرنے والی چیز ہے افسوس کہ کتنے مسلمان ہیں جو آج آپ کی پیروی کی برکت سے اس علی بصیرت مقام پر ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ انہیں اپنے دین کی صداقت کی دلائل کا کچھ بھی علم نہیں رہا۔ اس سے زیادہ دوسرے لوگوں کو علم ہے حالانکہ ہر ایک مسلمان پر یہ حق تھا کہ وہ اپنے دین کی صداقت کے دلائل سے پورا واقف ہوتا تا کہ علی بصیرت اپنے مذہب پر ہو کر دوسروں کو بھی دعوت دے سکتا۔

مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ
اتَّقَوْا ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾
حَتّٰىٓ اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ
قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ
نَّشَآءُ ۗ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾
لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۗ
مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ
ع شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور آخرت کا گھر ان کے لیے بہتر ہے جو تقوےٰ اختیار کرتے ہیں
تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔
یہاں تک کہ جب رسول (لوگوں کی طرف سے) نا امید ہو گئے اور لوگوں
نے سمجھ لیا کہ ان کے ساتھ جھوٹ بولا گیا ہماری مدد انکے پاس آپہنچی۔ سو
جسے ہم نے چاہا بچ گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے پھیرا نہیں جاتا۔ ۱۵۹۳
ان کے ذکر میں عقل والوں کے لیے عبرت ہے یہ کوئی ایسی بات
نہیں جو بنائی گئی ہو لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے
ہے اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ہدایت ہے اور ان لوگوں
کے لیے رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں ۱۵۹۴

۱۵۹۳ یہاں بہت لوگوں کو ضمیروں کی غلط فہمی ہوئی ہے ظنوا میں مراد وہ لوگ ہیں جن کی طرف رسول بھیجے گئے۔ یعنی ان کو اس قدر مہلت دی جاتی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ رسولوں نے جو عذاب کے وعدے ہمارے ساتھ کیے تھے وہ سب انہوں نے جھوٹ ہی کہا تھا۔ چنانچہ مفردات میں ہے ظنّ المرسَلُ الیہم ان المرسَلَ قد کَذَبُوهم فیما اَخبروهم به انهم اِن لم یُؤمنوا بِهم نَزَلَ بهم العذاب واِنّما ظنّوا ذٰلك مِن اِمهالِ الله تعالیٰ اِیّاهم وَ اِملائه لهم یعنی وہ لوگ جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے انہوں نے ظن کیا کہ رسولوں نے ان سے جھوٹ بولا تھا جو یہ خبر دی تھی کہ اگر تم ہم پر ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب اُترے گا۔ اور یہ ظن انہوں نے اس لیے کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مہلت دی اور لمبا وقفہ دیا اور رسولوں کے مایوس ہونے سے مراد صرف یہ ہے کہ جب ان کی تبلیغ کی طرف لوگوں نے توجہ ہی چھوڑ دی تو انہوں نے سمجھا کہ اب یہ قطعاً ایمان نہ لائیں گے تو ایسے اوقات میں نصرت الٰہی آتی ہے اور فی الواقع نصرت الٰہی اسی کا نام رکھا جاتا ہے جب اسباب کوئی باقی نہ رہیں اور چاروں طرف سے مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہو۔

۱۵۹۴ قرآن تفصیل کل شئی ہے سے مراد: ما کان یعنی ما کان القراٰن یہ قرآن کوئی افترا کی بات نہیں۔ کیونکہ ایک تو یہ پہلی وحی کی مصدق ہے۔ دوسرے ان تمام اصول دین کی اس نے تفصیل کر دی ہے جو پہلی کتابوں نے مجمل چھوڑ دیئے تھے جیسے مسئلہ توحید نبوت معاد جنت و نار تقدیر وغیرہ۔ کیونکہ جس قدر قرآن کریم نے ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور کسی کتاب نے نہیں ڈالی بلکہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ڈالی اور قرآن کریم نے نہ صرف ان تمام باتوں کو بالتفصیل بیان کر دیا جو پہلے بیان نہ کی گئی تھیں بلکہ اس تفصیل میں دلائل بھی شامل ہیں۔ یعنی جو دعویٰ کیا اس کے دلائل بھی دیئے۔ پھر اصول باطلہ کی تردید بھی کی، رہیں فروع سو ان کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے نبی کریم صلعم نے بھی بہت کچھ انہیں بیان کر دیا اور آئندہ وقتاً فوقتاً بھی ضرورتیں پیش آتی رہیں گی۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ یہ لوگوں کو راہ دکھاتی ہے اور سب ہی کو دکھاتی ہے اور چوتھی یہ کہ جو اسے مان لیتے ہیں ان کے لیے رحمت ہو جاتی ہے۔

(۱۳) سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَدَنِيَّةٌ

اٰیَاتُھَا ۴۳ — رُکُوْعَاتُھَا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ① — میں اللہ خوب جانتا اور دیکھتا ہوں ۔ یہ کتاب کی آیتیں ہیں اور وہ جو تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا ہے ، حق ہے لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے ۱۵۹۵ء

نام: اس سورت کا نام الرعد ہے اور اس میں چھ رکوع اور تینتالیس آیتیں ہیں ۔ یہ نام اس لحاظ سے رکھا گیا ہے کہ وحی الٰہی کو قرآن شریف نے بار بار بارش سے تشبیہ دی ہے اور اس سورت میں بالخصوص یہ ذکر ہے کہ وحی الٰہی سے ہی مُردہ دل زندہ ہوتے ہیں جس طرح بارش سے مردہ زمین میں جان پڑجاتی ہے اور بارش میں کڑک کو ان حملوں سے بھی تشبیہ دی ہے جو دشمن حق کے نیست ونابود کرنے کے لیے کرتے تھے اور اس سے مراد وہ مصائب بھی ہیں جو مخالفین حق پر آتی ہیں اور در حقیقت یہ مصائب اس تصادم کا نتیجہ ہوتی ہیں جو حق اور باطل کے درمیان ہوتا ہے جس طرح کڑک بھی بادل میں ایک تصادم کا نتیجہ ہے اس لیے دونوں پر اس کا اطلاق ہے تو اس سورت میں جہاں اسلام کی آخری کامیابی اور غلبہ کا ذکر ہے وہاں ان چھوٹی چھوٹی مصائب کا آنا اس آخری کامیابی کے لیے بطور نشان قرار دیا ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام الرعد رکھا ہے ۔

خلاصہ مضمون: سب سے پہلے اس سورت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ وحی الٰہی سے انسان کیونکر فائدہ اٹھاتا ہے اور مثالیں دیکر سمجھایا ہے کہ زمین اور آسمانوں میں تمام نظم کا انحصار زوجیت پر ہے یعنی ایک چیز اثر ڈالنے والی موجود ہے تو دوسری اس کے بالمقابل اثر قبول کرنے والی چیز ہے ۔ اسی طرح قلب انسانی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور بدون اس تعلق کے جو انسان اور خدا کے درمیان وحی الٰہی سے پیدا ہوتا ہے قلب انسانی اپنے کمال کو حاصل نہیں کر سکتا ۔ پہلے رکوع میں یہ بیان کرکے دوسرے میں بتایا کہ تعلق باللہ کے نتائج اور در حقیقت تمام اعمال کے نتائج عورت کے حمل سے مشابہت رکھتے ہیں یعنی اس عالم میں ظاہر کوئی نتیجہ کھلے طور پر نظر نہیں آتا مگر اندر ہی اندر وہ نتائج تیار ہوتے رہتے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ ان نتائج کو قبول کرنے والے دل مراتب میں فرق رکھتے ہیں اور ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے ۔ تیسرے رکوع میں ان لوگوں کے جو وحی الٰہی کو قبول کرتے ہیں اور ان کے جو اسے رد کردیتے ہیں انجام کا مقابلہ کیا ۔ چوتھے میں بتایا کہ قرآن کریم ایک طرف قلوب انسانی کے اندر اور دوسری طرف ظاہر میں بھی ایک انقلاب عظیم پیدا کرکے دکھائے گا ۔ پانچویں رکوع میں بتایا کہ پیروان حق اور مخالفین حق میں ایک کھلا فیصلہ کردیں گے اور چھٹے میں ان نشانوں کی طرف توجہ دلائی جو حق کی آخری کامیابی پر اس وقت بھی نظر آرہے تھے جب بظاہر اسلام چاروں طرف سے مشکلات میں گھرا ہؤا تھا اور بتایا کہ دشمنوں کے دلوں کو فتح کرتے چلے جانا اس کی آخری کامیابی کا بین نشان ہے ۔

تعلق: الرا کے مجموعہ میں یہ چوتھی سورت ہے ۔ اس سے پہلی سورت میں جب حضرت یوسفؑ کے ذکر میں سمجھایا کہ آخر کار محمد رسول اللہ صلعم کے سامنے آپ کے دشمن اور آپ کے خلاف منصوبے کرنے والے کس طرح مغلوب ہونگے تو اس میں اسی حق کی آخری کامیابی اور اس کی وجوہات کو کھول کر بیان فرمایا اور یہ بھی بتایا کہ اس آخری غلبہ کے نشان کس طرح اب بھی ظاہر ہو رہے ہیں

زمانہ نزول وہی ہے جو باقی اس مجموعہ کی سورتوں کا ہے ۔ اس سورت میں جو دشمنوں کے مکر یعنی آنحضرت صلعم کے خلاف منصوبوں کا ذکر ہے ۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ سورت ہجرت سے کچھ پہلے کی ہے ۔ جب آپ کے خلاف منصوبے ترقی پر تھے ۔ اور زمین کے گھٹانے کا ذکر جو آیت ۴۱ میں ہے بتاتا ہے کہ اسلام کی کامیابی اب دور دور ہونے لگی تھی ۔ اور غالباً مدینہ میں اسلام کے پھیل جانے کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے ۔ جس سے اس مجموعہ سور کے زمانہ نزول پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ یہ گیارھویں بارھویں سال ہجرت سے تعلق رکھتی ہیں ۔

۱۵۹۵ء الٓمّٓرٰ کے معنی حضرت ابن عباس سے مروی ہیں انا اللہ اعلم واری (د) گویا الٓمّٓر میں جو ان سورتوں کے شروع میں آتا ہے ر بڑھادیا ہے جو اعلم کا قائم مقام ہے اور اس میں حق کو تباہ کرنے والوں کی سزا کے ساتھ علمی رنگ میں ان کی آخری ناکامی اور نامرادی کے دلائل دیئے ہیں ۔ اس لیے یہاں علم اور رویت دونوں صفات کو جمع کیا ہے ۔

حقانیت قرآن: آیات الکتاب ۔ عموماً جہاں اس طرح کی ترکیب آئی ہے کہیں فرمایا تلک آیات الکتاب الحکیم جیسے سورۂ یونس کے شروع میں ، کہیں تلک آیات الکتاب المبین جیسے سورۂ یوسف کے شروع میں ۔ دونوں جگہ وصف نے بتا دیا کہ قرآن شریف مراد ہے یہاں لفظ کو عام رکھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ جنس کتاب مراد ہے یعنی یہ وحی الٰہی کی آیات ہیں اس لیے ساتھ ہی فرمایا کہ یہ جو تیری طرف نازل ہوا ہے حق ہے ۔ اور اسی کی حقانیت پر اس سورت میں دلائل علمی بھی دیئے ہیں ۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ
تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ
مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ
لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝۲
وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا
رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ
جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ
النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے بلند کیا جنہیں تم دیکھتے ہو، پھر عرش پر قرار پکڑا اور سورج اور چاند کو کام پر لگایا ہر ایک ایک مقرر وقت تک چل رہا ہے۔ وہ کاروبار کی تدبیر کرتا ہے، باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو[۱۵۹۶]

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے، اور ہر قسم کے پھلوں سے اس میں دو دو (یعنی) جوڑے بنائے، وہ دن پر رات کا پردہ ڈالتا ہے اور اس میں اُن لوگوں کے لیے یقینی نشان ہیں جو فکر کرتے

۱۵۹۶ع عمد۔ عَمْد کے معنی ہیں کسی چیز کا قصد کرنا اور اس سے سہارا لینا۔ پس عَمْد اور تَعَمُّد خلاف سہو ہے یعنی ارادۃً ایک کام کرنا ومن یقتل مومنا متعمداً (النساء۴-۹۳) ولکن ما تعمدت قلوبکم (الاحزاب۳۳-۵) اور عَمُود خیمہ کی چوب کو کہتے ہیں جس پر خیمہ کا سہارا ہوتا ہے اور ہر چیز جس پر انسان سہارا لے لوہے کی ہو یا لکڑی کی یا ستون اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اس کی جمع عُمُد اور عَمَد آتی ہے فی عَمَدٍ ممدّدۃ (الھمزۃ۱۰۴-۹) (رغ)

آسمانوں کے غیر مرئی ستون: رفع السمٰوٰت بغیر عمدٍ ترونھا۔ ابن عباس اور مجاہد سے یہ معنی مروی ہیں اور الفاظ بھی خود اسی معنی کو چاہتے ہیں کہ آسمانوں کو بلند رکھا ہوا ہے بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھتے ہو گویا آسمانوں اور زمین کے درمیان کوئی ایسے ستون ہیں جنہیں ہم نہیں دیکھتے یعنی ان کا باہم کوئی تعلق تو ہے مگر وہ ان آنکھوں سے نظر آنے کے قابل نہیں۔ اور چونکہ یہاں ساری بحث ہی بعض تعلقات پر ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے، جیسے سورج اور چاند کا تعلق یا جیسے زمین اور آسمان کا تعلق۔ یا جیسے پہاڑوں اور دریاؤں کا تعلق رات اور دن کا تعلق وغیرہ اس لیے یہی معنی درست ہیں اور آج سائنس بھی اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ ہر ایک نظام کے اندر وہ تعلقات موجود ہیں جو اس کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ بغیر ان تعلقات کے جیسے کشش ثقل وغیرہ یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا سو یہی وہ ستون ہیں جنہیں ہم نہیں دیکھتے۔

نظام سماوی میں تعلقات اور اثرات: قرآن کریم کے حق ہونے کے دعوٰی کے بعد فوراً یہ مضمون شروع ہو جاتا ہے کہ آسمان ایسے بنائے اور سورج اور چاند سے یہ کام لیا اور اس کا نتیجہ بھی بتایا کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ ان باتوں کا باہم کیا تعلق ہے۔ قرآن شریف نے بڑی کثرت سے ظاہری امور کو امور باطنی کے لیے بطور شہادت پیش کیا ہے اور صحیفۂ قدرت کے نظاروں سے عالم روحانیت کے نظاروں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ لقاء اللہ یا اللہ کی ملاقات یہ چاہتی ہے کہ انسان اور اس کے رب کے درمیان کوئی تعلق ہو جسے حاصل کیے بغیر نہ صرف انسان کمال کو ہی نہیں پہنچ سکتا، بلکہ وہ سارا نظم ہی تباہ ہو جاتا ہے۔ اور مذہب کی اصل غرض اسی تعلق کی طرف توجہ دلانا ہے اس لیے فرمایا کہ مخلوق پر غور کرو وہاں تم بڑے سے بڑے اجرام میں بھی ایک تعلق کو موجود پاؤ گے جس تعلق سے ہی وہ اپنے وجود کی غرض کو پورا کر رہے ہیں اور جس کے قیام بغیر نظام عالم تباہ ہو جائے۔ مثلاً یہی نظام شمسی لے لو جو ہماری زمین کے لیے بمنزلہ ایک سماء کے ہے۔ یہ سب نظام کواکب اور سورج کے ایک دوسرے سے تعلقات پر مبنی ہے اسی طرح پر اس نظام کا تعلق کسی اور نظام سے ہے جیسا کہ موجودہ تحقیقات نے ثابت کیا ہے پھر سورج اور چاند کے لفظ لا کر توجہ دلائی کہ کس طرح سورج کے نور کا اثر چاند قبول کرتا ہے حالانکہ چاند بالذات روشن نہیں اور یدبّر الامر کہہ کر توجہ دلائی کہ اس عالم کا سارا نظام کاروبار کی کل تدبیر اسی ایک اصول پر ہے کہ ایک چیز اثر ڈالتی ہے اور دوسری اثر قبول کرتی ہے یفصل الایات یوں ہم کھول کر باتیں بیان کرتے ہیں تاکہ تم کو یقین آ جائے کہ لقاء اللہ بھی ایک حقیقت ہے یعنی اسی طرح انسان کا بھی ذات باری سے ایک تعلق ہے جو گو آنکھوں سے نظر نہیں آتا مگر ان لوگوں کی زندگیوں میں نظر آتا ہے جو اس تعلق کو کمال کو پہنچاتے ہیں کہ کس طرح وہ عام انسانوں سے ممیز ہو جاتے ہیں اسی مضمون کو اگلی آیت میں اور واضح کیا ہے اور دوسری جگہ صراحت سے بیان فرمایا ہے والسماء بنینٰھا باید وانا لموسعون و الارض فرشنٰھا فنعم الماھدون ومن کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون ففروا الی اللہ (الذٰریٰت۵۱-۴۷، ۴۸، ۴۹ و ۵۰) اے انسان غور کر کہ آسمان کو ہم نے کس طرح وسعت دی ہے اور زمین کو کیا اچھا بچھایا ہے رہا یہ ان دونوں میں کیا تعلق رکھا ہے کہ ایک میں اثر ڈالنے کا مادہ ہے تو دوسرے میں اثر قبول کرنے کا اگر ایک بھی ان دونوں میں سے اپنا کام چھوڑ دے تو کس طرح یہ نظام بگڑ جاتا ہے۔ پھر ان دو پر کیا انحصار ہے، ہم نے ہر چیز کے ہی جوڑے پیدا کیے ہیں (ساری مخلوق میں غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ایک چیز کے اثر ڈالنے اور دوسری کے اثر قبول کرنے سے ہی سلسلہ نظام عالم چلتا ہے) پس اے انسان تو بھی اللہ کی طرف بھاگ آ کیونکہ اس کے بغیر وہ نظام روحانی قائم نہیں رہ سکتا جو انسان کی زندگی کی علت غائی ہے۔

يَتَفَكَّرُوْنَ ③
وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ
مِّنْ أَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ
وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ
وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ
إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ④
وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَإِذَا كُنَّا
تُرٰبًا ءَإِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ أُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ وَأُولٰٓئِكَ
الْأَغْلٰلُ فِيْ أَعْنَاقِهِمْ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ
النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ⑤

ہیں ۱۵۹۷
اور زمین میں پاس پاس ٹکڑے ہوتے ہیں اور انگوروں کے
باغ اور کھیتی اور کھجوریں ایک ہی جڑ سے کئی کئی
نکلی ہوئیں اور الگ الگ جڑوں سے نکلی ہوئیں سب کو ایک
ہی پانی دیا جاتا ہے اور ہم ان میں سے بعض کو بعض پھل میں فضیلت دیتے ہیں اس
میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں ۱۵۹۸
اور اگر تو تعجب کرے تو ان کا یہ کہنا جائے تعجب ہے کہ کیا جب ہم
مٹی ہو جائیں گے تو پھر ایک نئی پیدائش میں آئیں گے۔
یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کا انکار کرتے ہیں اور یہی ہیں
جن کی گردنوں میں زنجیریں ہیں اور یہی آگ والے ہیں
وہ اسی میں رہیں گے ۱۵۹۹

۱۵۹۷ ہر چیز کے ازواج: رفع سماوات کے مقابل یہاں مدالارض سے شروع کیا۔ اور یوں آسمان اور زمین کے تعلق زوجیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پھر جس طرح وہاں سورج اور چاند ہیں۔ یہاں پہاڑوں اور دریاؤں کا کیا عجیب تعلق ہے کہ پہاڑ بادلوں کو کھینچتے ہیں اور یہاں پانی برستا ہے تو اس سے دریا بنتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ تمام قسم کے پھلوں میں بھی جوڑے ہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے جس کا آج ہی دنیا کو علم ہوا، زمانۂ نزول قرآن کے وقت دنیا اس سے بیخبر تھی۔ پھر اور ترقی کرکے فرمایا رات کی تاریکی کا پردہ دن پر ڈالتا ہے گویا رات اور دن میں بھی ایک تعلق زوجیت ہے۔ ورنہ رات دن کو ثمرات سے کیا تعلق۔ فرمایا نشان تو اس میں ہیں مگر فکر کرے بغیر ان کا علم نہیں ہوتا۔

۱۵۹۸ قطع۔ قِطَع قِطْعَة کی جمع ہے ایک ٹکڑا قطعاً من الّیل (یونس۱۰-۲۷) اور قِطْع اور قِطعة کے ایک ہی معنی ہیں فاسر باھلک بقطع من الیل (ھود۱۱-۸۱)

متجاورات۔ جار کے معنی ہیں ہمسایہ اور پھر محض قریب پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ اور جَاوَرَ۔ تَجَاوَرَ کے معنی ہیں ایک دوسرے کے پاس ہوئے لا یجاورونک فیھا الا قلیلا (الاحزاب۳۳-۶۰) (غ) اور مُتَجَاوِر ایک دوسرے کے پاس۔

صنوان۔ صِنو شاخ جو درخت کی جڑ سے نکلے اور صِنْوَانِ اس کا تثنیہ اور صِنْوَانٌ جمع ہے (غ)

جب یہ بیان کیا کہ انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے تو اب باوجود اس تعلق کے اختلاف مراتب کی وجہ بیان فرمائی کہ یہ اختلاف خود اس استعداد سے بھی پیدا ہوتا ہے جو قبولیت کے لیے چیزوں میں ہے چنانچہ زمین تو ایک ہی ہے مگر اس کے مختلف قطعات کو دیکھو کہ پاس پاس قطعات ہوتے ہیں پھر ان میں سے بعض ایک قسم کے پھل کو اچھا اگاتے ہیں بعض دوسری قسم کے، پھر باوجود اس کے کہ ایک ہی پھل ہو اور ایک ہی پانی ملتا ہو اُن کے ذائقوں میں اختلاف ہوتا ہے اسی لحاظ سے یہاں لفظ اُکُل اختیار کیا ہے کہ پھل اور ذائقہ دونوں پر آسکے اس کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۰۲۴ اس میں مسئلہ تناسخ کی بھی تردید کر دی ہے کہ اگر انسانوں میں اختلاف مراتب ہے تو یہ اختلاف تقاضائے قدرت سے ہے بدون اس اختلاف کے دنیا رہ ہی نہیں سکتی یہاں تک کہ زمین کے مختلف قطعات میں بھی اختلاف ہے پس جن لوگوں نے محض اختلاف مراتب و استعداد انسانی کو دیکھ کر یہ خیال کر لیا ہے کہ یہ کسی پہلی زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے انہوں نے عقل سے کام نہیں لیا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ اختلاف تمام عالم میں موجود ہے اور موجودات اس اختلاف کے بغیر ہو ہی نہ سکتی تھی اختلاف مخلوق کا خاصہ ہے۔ ہاں اس اختلاف میں جو وحدت نظر آتی ہے وہ اسبات کی شہادت ہے کہ ایک ہی خالق کے ہاتھ سے یہ نکلی ہوئی چیزیں ہیں۔

۱۵۹۹ اغلال۔ غَلَل کے معنی درمیان میں ہونا ہیں اور غُلّ وہ چیز ہے جس سے انسان قید کیا جائے یعنی اس کے اعضا اکٹھے باندھ کر درمیان میں کر دیئے جائیں اس کی جمع اَغلال ہے اور انا جعلنا فی اعناقھم اغلٰلا (یٰس۳۶-۸) سے مراد ہے مَنَعَهُمْ فِعْلَ الْخَيْرِ یعنی انہیں نیکی کے کاموں سے روک دیا۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسا دلوں پر مہر وغیرہ کا لگانا (غ) اور والاغلال التی کانت علیھم میں زجاج کا قول ہے کہ اس سے مراد ان کی وہ رسوم ہیں جن میں جکڑے ہوئے تھے یا ایسی باتیں جو ان میں روک کے طور پر تھیں جیسا مثال کے طور پر کہتے ہیں ھٰذا طوق فی عنقك حالانکہ

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٦﴾

اور بھلائی سے پہلے تجھ سے دکھ کی جلدی کر رہے ہیں اور ان سے پہلے عبرت ناک مثالیں گزر چکی ہیں اور تیرا رب لوگوں کو باوجود ان کے ظلم کے معاف کرتا رہتا ہے اور تیرا رب بدی کی سزا دینے میں سخت (بھی) ہے ع۱۶۰۰

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿٧﴾ ع

اور جو کافر ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس پر اپنے رب کی طرف سے نشان کیوں نہیں اتارا جاتا تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لیے راہ دکھانے والا ہے ع۱۶۰۱

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ

اللہ جانتا ہے جو ہر ایک مادہ حمل میں لیتی ہے اور جسے رحم گھٹاتے ہیں اور جسے وہ بڑھاتے ہیں اور ہر ایک چیز اس کے ہاں

طوق فی الحقیقت مراد نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ تم پر لازم کر دیا گیا ہے اور اذا الاغلال فی اعناقھم (المؤمن ۴۰-۷۱) میں مراد ایسے اعمال ہیں جن میں وہ جکڑے ہوئے ہیں (ل) اور تفاسیر میں بھی یہاں یہ معنی جائز قرار دیتے ہیں کہ مراد ایمان سے روکنا وغیرہ ہے (ر) یا ان کے بُرے رسوم و رواج جو زنجیروں کی طرح ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں (ح)

بعث بعد الموت اور اس کا انکار: تعلق باللہ کا کمال چونکہ زندگی بعد الموت میں حاصل ہوتا ہے اس لیے اب مضمون کا انتقال اس طرف کیا ہے اور اس زندگی بعد الموت کو خلق جدید یا ایک نئی پیدائش قرار دیا ہے وہ یہ زندگی نہیں اور دوسری جگہ صفائی سے فرمایا وننشئکم فی ما لا تعلمون (الواقعۃ ۵۶-۶۱) یعنی ایسی زندگی تمہیں دینگے جس کو تم نہیں جانتے۔ اس خلق جدید کے انکار کو انکار رب قرار دیا ہے۔ اولٰئک الذین کفروا بربھم اس لیے کہ گو ایسے لوگ خدا کو مانتے ہوں مگر اس کی صفت ربوبیت کا وہ انکار کرتے ہیں کیونکہ اس کی صفت ربوبیت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان کو اس کے کمال روحانی تک پہنچائے۔ اور وہ کمال زندگی بعد الموت میں حاصل ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ ان کی گردنوں میں طوق ہیں یعنی جو لوگ لقاء اللہ کے منکر ہوتے ہیں ان کے قوائے روحانی نشوونما پانے سے رک جاتے ہیں جس طرح وہ شخص جس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے جائیں کاروبار سے رک جاتا ہے اور یہ سچ ہے کہ لقاء اللہ سے انکار کر کے قوائے روحانی کا نشوونما رک جاتا ہے اور اس طرح رک جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اصحاب النار ہیں گویا قوائے روحانی کی نشوونما سے جنت پیدا ہوتی ہے اور ان کے نشوونما کے رک جانے سے آگ پیدا ہوتی ہے اور یہی انسان کا دوزخ ہے ومن کان فی ھذہٖ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی (بنی اسرائیل ۱۷-۷۲)

ع۱۶۰۰ مثلٰت مُثُلَۃ کی جمع ہے اور وہ وہ سزا ہے جو انسان پر آئے تو اس کو ایک مثال بنا دے۔ جس سے دوسرا رک جائے (غ)، بخاری میں ہے کہ یہ مَثُلَۃ کی جمع ہے جس کے معنی اشباہ و امثال ہیں۔

دُکھ کو بھلائی سے پہلے چاہتے ہیں اور اس کے لیے جلدی کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر حق کو قبول کریں اس پر عمل کریں تو ان کے لیے بھلائی ہے اگر اسے رد کریں تو ان کے لیے دُکھ ہے۔ پس رد کرنے میں جلدی کرنا گویا دکھ کے لیے جلدی کرنا ہے اپنے فائدہ کی بات کو چھوڑ کر دکھ کو قبول کرتے ہیں اور یہ بھی غور نہیں کرتے کہ پہلے لوگوں نے یہی راہ اختیار کر کے کیسی سزا پائی۔

ع۱۶۰۱ اٰیۃ سے مراد یہاں وہی نشان ہلاکت ہے جس کی طرف پچھلی آیت میں بھی اشارہ ہے یستعجلونک بالسیئۃ یعنی حق کی مخالفت کرتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت کی وجہ سے پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا تو کہتے ہیں وہ نشان ہلاکت کیوں نہیں آتا، جس سے ڈرایا گیا تھا۔ اس کا جواب دیا ہے کہ نبی صرف منذر ہے یعنی بدی کے بد انجام سے ڈرا دینا اس کا کام ہے اس انجام کو لانا اس کے اختیار میں نہیں یہ نشان کا انکار نہیں بلکہ بتایا ہے کہ جب ڈرایا جاتا ہے تو وہ عذاب بھی آ کر ہی رہے گا۔ اور یہ جو بڑھایا ولکل قوم ھاد تو مطلب یہ ہے کہ چونکہ آپ کو ہر قوم کا ہادی بنا کر بھیجا گیا ہے اس لیے وہ باتیں جن سے آپ ڈراتے ہیں وہ بھی ہر قوم کے لیے ہیں پس جو کوئی قوم بھی آپ کی مخالفت کرے گی اسی کے لیے یہ انذار بھی ہے۔ یہ آیت علاوہ اس کے کہ آنحضرت صلعم کی بعثت عامہ کا ذکر کرتی ہے۔ ختم نبوت پر بھی دلیل ہے اس لیے کہ کل اقوام عالم کی ہدایت اور انذار ہمیشہ کے لیے آپ کے سپرد کیا گیا۔ عذاب انذار کا نتیجہ ہے جب انذار آپ کی طرف سے ہوا تو عذاب بھی آئے گا وہ آپ کے انکار کی وجہ سے آئے گا اور یہ انذار اگر آپ کے پیرو کریں تو بھی آپ کی طرف سے ہی ہو گا کیونکہ اس حق کے بعد جو نبی صلعم لائے دوسرا کوئی حق آنے والا نہیں۔ بعض نے ولکل قوم ھاد کے معنی یوں بھی کیے ہیں کہ ہر قوم میں ایک ہادی ہو گزرا مگر یہ معنی یہاں موزوں نہیں۔

شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ ۸
اندازہ سے ہے ع۱۶۰۲

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ ۹
وہ غائب اور حاضر کا جاننے والا بہت بڑا بلند ہے ع۱۶۰۳

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ۝ ۱۰
برابر ہے تم میں جو چھپ کر بات کرے اور جو اُسے پکار کر کہے اور جو رات کو چھپ رہا ہو اور جو دن کو چل رہا ہو ع۱۶۰۴

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا
اس کے لیے اس کے آگے اور پیچھے (اعمال کا) پیچھا کرنے والے ہیں جو اسے اللہ کے حکم سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو (نہ بدلیں) اور جب اللہ کسی قوم کے لیے تکلیف کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کسی طرح رد نہیں ہو سکتی

ع۱۶۰۲ تحمل ۔ حِمْل ظاہری بوجھ پر اور حَمْل باطنی بوجھ پر بولا جاتا ہے جیسے پیٹ میں بچہ اور بادل میں پانی اور درخت میں پھل وان تدع مثقلۃ الی حملہا (فاطر ۳۵-۱۸) اور اِحْتَمَل اور حَمَلَ کے ایک ہی معنی ہیں (غ)

پیچھے بھی اعمال کی جزا و سزا کا ذکر ہے اور آگے بھی اور درمیان میں یہ ایک آیت ہے پس اس سے مراد صرف اس قدر لینا کہ اللہ کو یہ علم ہے کہ عورت کے پیٹ میں لڑکا یا لڑکی ہے اور مدت حمل آٹھ یا نو یا دس مہینے ہے درست نہیں۔ بلکہ جس طرح پچھلے رکوع میں آسمان اور زمین کی اور پھر ہر شے میں ایک اثر ڈالنے والے اور ایک اثر قبول کرنے والے کی مثالیں دی تھیں، اسی طرح یہاں عورت کے حمل کو بطور ایک مثال کے بیان کیا ہے۔ گویا عمل کرنے والا بمنزلہ ایک مادہ کے ہے اور جو عمل وہ کرتا ہے وہ بطور حمل کے ہے۔ جس طرح عورت کے پیٹ میں وہ چیز نظروں سے مخفی ہوتی ہے جو اندر ہی اندر تیار ہو رہی ہے اسی طرح اعمال کے نتائج نظروں سے مخفی ہوتے ہیں لیکن ایک صورت وہ اندر ہی اندر تیار کرتے جاتے ہیں۔ گویا وحی الٰہی اثر ڈالنے والی چیز ہے انسان اثر قبول کرنے والا ہے۔ اعمال جو اس اثر سے پیدا ہوتے ہیں وہ بمنزلہ حمل کے ہیں اور یہ جو فرمایا کہ بعض کو رحم تکمیل تک نہیں پہنچاتے اور بعض کو بڑھاتے ہیں تو یہی حالت اعمال میں ہے بعض وقت ایک انسان اچھے عمل کرتا ہے جن سے اچھے نتائج کی توقع ہونی چاہیئے مگر ایک مرتبہ کوئی ایسی آفت آ جاتی ہے کہ وہ نتیجہ تکمیل پذیر ہونے سے رہ جاتا ہے جس طرح حمل بعض وقت پوری پرورش نہ پانے کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں اور بعض پوری قوت پا کر کمال کو پہنچ جاتے ہیں اور آخر پر کل شئی عندہٗ بمقدار کہہ کر انہی نتائج اعمال کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی ہر چیز کا (اور یہاں ذکر بالخصوص اعمال کا ہے) اسی پر قیاس کر لو۔ چنانچہ اگلا سارا مضمون اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔ یہاں تک کہ آیت ۱۱ میں صاف فرمایا کہ ہر عمل کو اللہ تعالیٰ کے محفوظ کرنے والے فرشتے محفوظ کرتے رہتے ہیں گویا وہ ایک نتیجہ پیدا کرتا رہتا ہے۔

ع۱۶۰۳ الکبیر۔ کِبْر کے لیے دیکھو ع۵۳ اور کِبْر کے معنی رفعت اور شرف بھی ہیں یا شرف میں رفعت اور الکبیر اور المُتَکَبِّر اللہ تعالیٰ کے اسماء میں اسی معنی میں ہیں یعنی عظمت و کبریائی والا اور کبریاء کمال ذات اور کمال وجوب پر دلالت کرتا ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کے وصف میں نہیں آتا (ت) اور چونکہ کبیر اور صغیر نسبتی اسماء ہیں اور کبیر کا اطلاق بمعنی رئیس وغیرہ بھی ہو جاتا ہے جیسے انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر (طٰہٰ ۲۰-۷۱) اس لیے اللہ اکبر میں یہ بتانا مراد ہے کہ وہ سب سے بڑا ہے۔ جیسے الاعلیٰ میں دوسروں پر اس کا علو مراد ہے۔

المتعال۔ عُلُوّ پستی کی ضد ہے اور علا یعلوا سے مصدر عُلُو اور عَلِیَ یَعلیٰ سے علاً ہے اور ان میں سے پہلا اچھے اور بُرے دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے اور دوسرا صرف اچھے معنی میں اور پہلے کی مثالیں قرآن شریف میں بہت ہیں۔ ان فرعون علا فی الارض (القصص ۲۸-۴) وکانوا قوماً عالین (المؤمنون ۲۳-۴۶) لایریدون علواً فی الارض (القصص ۲۸-۸۳) ولتعلن علواً کبیرا (بنی اسرائیل ۱۷-۴) اور دوسرے یعنی عَلِیَ سے عَلِیٌّ ہے جس کے معنی رفیع القدر ہیں اور مراد یہ ہے کہ وہ اس سے بلند ہے کہ وصف کرنے والوں کا وصف یا عارفوں کا علم اس کا احاطہ کر سکے اور تعالیٰ سے بھی یہی مراد ہے اور باب تفاعل اس صورت میں مبالغہ کے لیے ہے (غ) اسی سے متعال ہے۔

ع۱۶۰۴ مستخف۔ خَفِیَ کے معنی چھپ گیا اور اِخفاء چھپانا، اِستخفاء طلب اخفاء یعنی چھپانے کی کوشش کرنا لیستخفوا منہ (ھود ۱۱-۵) (غ) اسی سے مُستَخفی اسم فاعل ہے۔

سارب۔ سَرَب کے معنی نشیب کی طرف جانا ہیں فاتخذ سبیلہ فی البحر سربا (الکہف ۱۸-۶۱) اور سارب مطلق چلنے والے کو کہتے ہیں (غ) ہو سکتا ہے کہ یہاں ان خفیہ منصوبوں اور کھلی شرارتوں کی طرف بھی اشارہ ہو جو نبی کریم صلعم کے خلاف کی جاتی تھیں۔

فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾
هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾
وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

اور ان کے لیے اس کے سوائے کوئی حمایتی نہیں ع۱۶۰۵
وہی ہے جو تمھیں ڈرانے اور امید دلانے کو (بجلی کی) چمک دکھاتا ہے اور بھاری بادل اٹھاتا ہے ع۱۶۰۶
اور گرج اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور فرشتے اس کے خوف سے اور وہ بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے انھیں گراتا ہے اور وہ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور وہ بڑی قوت والا ہے ع۱۶۰۷

ع۱۶۰۵ معقبات۔ عُقِب سے ہے اور تعقیب کے معنی ایک چیز کو دوسری کے پیچھے لانا ہیں۔ لا معقب لحکمہ (الرعد ۱۳-۴۱) یعنی جب اس کا حکم آجائے تو پھر اس کے پیچھے کوئی دوسرا حکم لانیوالا نہیں مطلب یہ کہ آخری حکم اسی کا ہے اس کا رد کرنے والا کوئی نہیں۔ اور معقبات کے معنی کیے گئے ہیں وہ فرشتے جو انسان کی حفاظت کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں (غ) اور جو شخص ایک کام کرے پھر اس کی طرف عود کرے تو یہ تعقیب ہے اسی لیے اس شخص کو مُعَقِّب کہا جاتا ہے جو نماز کے بعد نماز پڑتا ہے یا غزوہ کے بعد غزوہ کرتا ہے (ل) اور یا ملائکہ کو معقبات اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ انسان کے اقوال اور افعال کا پیچھا کرتے ہیں یعنی اسے لکھ کر محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں (ر) اور معقبۃ میں تا مبالغہ کے لیے ہے۔ یا معقبۃ معقب کی جمع ہے اور معقبات جمع الجمع ہے۔

معقبات سے مراد کراماً کاتبین ہیں: معقبات کون ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مصائب وغیرہ کے پہنچنے سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں مگر یہ معنی نہ تو لفظ معقبات کے لحاظ سے چسپاں ہیں اور نہ ہی سیاق و سباق کے لحاظ سے۔ معقبات کے ایک معنی کے لحاظ سے یہ وہ فرشتے ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور یہ فرشتے وہی ہیں جو انسان کی حسنات اور سیئات کو لکھنے والے ہیں اور یہی ملائکۃ اللیل اور ملائکۃ النہار کہلاتے ہیں اور دوسرے معنی کے لحاظ سے تو بالکل صاف ہیں انہم یعقبون اقوال الشخص وافعالہ ای یتبعونہا ویحفظونہا بالکتابۃ پس یہ وہی ملائکہ ہیں جن کو دوسری جگہ کراماً کاتبین کہا ہے اور سیاق اور سباق کے لحاظ سے بھی ظاہر ہے کہ یہاں ذکر انسان کی بلاؤں سے حفاظت کا نہیں ہے بلکہ اس کے اعمال کی حفاظت کا ہے جیسا کہ اس سے پچھلی آیت سے اور اگلے الفاظ لا یغیر ما بقوم سے ظاہر ہے اور خود قرآن کریم کی شہادت بھی بالصراحت موجود ہے کہ انہیں ملائکہ کو حافظ اور نگہبان کہا گیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید (قٓ-۱۸) کوئی بات منہ سے نہیں نکلتی مگر اس کے پاس ایک حفاظت کرنے والا تیار رہتا ہے۔ اور دوسری جگہ ہے وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون (الانفطار-۱۰، ۱۱) تم پر حفاظت کرنے والے ہیں کراماً کاتبین وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ اور یہی مراد یحفظونہ من امر اللہ سے ظاہر ہے اور یحفظونہ میں ضمیر یا اس عمل کی طرف ہے جو انسان کرتا ہے اور یا خود کرنے والے انسان کی طرف ہے کہ اس کی حفاظت سے مراد اس کے اعمال کی ہی حفاظت ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو حفاظت کے قابل ہے اور اس کتاب کے متعلق ہی دوسری جگہ فرمایا وعندنا کتاب حفیظ (قٓ-۴)

اعمال کی ذمہ داری کے احساس میں ہی شرف انسانیت ہے جس قدر انسان ترقی کرتا چلا جاتا ہے اسی قدر اس میں اپنے اعمال کی ذمہ داری کا احساس زیادہ سے زیادہ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور اس احساس ذمہ داری کو مذہب نے اور بالخصوص اسلام نے کمال تک پہنچا دیا، جب یہ قانون بتا دیا کہ کسی حال میں ہو ہر ایک عمل لکھ لیا جاتا ہے یعنی محفوظ کر لیا جاتا ہے اس لیے کوئی عمل بھی انسان کا بلا نتیجہ نہیں رہتا اس اصول کے تسلیم کرنے میں نسل انسانی کی حقیقی بہتری ہے اس لیے اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ اگر کوئی قوم اپنی بہتری چاہتی ہے تو اس کے افراد اپنی حالت کو تبدیل کریں، بدون اس کے قوم کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی۔ آج مسلمان اس اصول کو فراموش کر کے ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں اور اپنے نفسوں کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے تو وہ ٹلتا نہیں تو مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تو انسان کے اعمال پر ہے۔ جب ایک قوم کے اعمال کا یہ تقاضا ہو جاتا ہے کہ اس پر مصیبت آئے تو پھر واویلا سے وہ دور نہیں ہوتا ہاں پھر بھی اصلاح کریں تو اللہ تعالیٰ اسے دور کر دیتا ہے۔

ع۱۶۰۶ برق۔ وہ چمک اور رَعد وہ گرج ہے جو بادل سے پیدا ہوتی ہے۔
سحاب الثقال۔ ثقال۔ ثقیلۃ کی جمع ہے بھاری۔ سحاب چونکہ اسم جنس ہے اس لیے اس کی صفت جمع لائی گئی۔

ع۱۶۰۷ محال۔ کا اصل مَحَلَ سے ہے اور اس کے معنی عقوبت کا وارد کرنا ہیں اور بعض کے نزدیک مِحَال کا اصل حَول بمعنی قوت سے ہے (غ)
چونکہ اس رکوع کا مضمون بھی صداقت وحی ہے اور قرآن کریم میں وحی کی مثال بارش سے دی ہے او کصیب من السماء فیہ ظلمٰت ورعد

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا
كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا
هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾
وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ سجدہ
قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ

اسی کا حق ہے کہ اُسے پکارا جائے اور وہ جنھیں وہ اس کے سوائے
پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کو قبول نہیں کرتے۔ مگر اس شخص کی طرح
جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلاتا ہے تاکہ وہ اس کے
منہ تک آپہنچے اور وہ اس تک پہنچنے والا نہیں اور کافروں کی دعا ضائع ہی ہوتی ہے ۱۶۰۸
اور جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں چار و ناچار اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں،
اور اُن کے سائے بھی صبح اور شام (سجدہ کرتے ہیں) ۱۶۰۹
کہہ کون آسمانوں اور زمین کا رب ہے؟ کہہ دے اللہ! کہہ

وبرق (البقرۃ ۲-۱۹) اسی مناسبت سے یہاں بارش اور بادل اور رعد اور برق کا ذکر کیا ہے اور آگے آیت ۱۷ میں اس کی اور وضاحت کر دی ہے، وحی الٰہی کو نزول باراں سے یہ مشابہت ہے کہ جس طرح بارش سے زمین کی مخفی طاقتیں کام کرنے لگ جاتی ہیں وحی الٰہی سے بھی انسانوں کی مخفی طاقتیں کام کرنے لگ جاتی ہیں اور ایک مردہ قوم میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی کچھ مشکلات بھی ہوتی ہیں اور صاعقہ کے بھیجنے سے مراد یہ ہے کہ کچھ لوگ بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس باران رحمت سے فائدہ اٹھائیں اُلٹا جھگڑا کر کے اس کے تباہ کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر کچھ عذاب بھی آتا ہے مگر آخری نتیجہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد ہے دکھ اور تکلیف کی بھی یہی غرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح ہو۔

ع ۱۶۰۸ لہ دعوۃ الحق۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی جاتی ہے وہ برمحل ہے اور قبول ہوتی ہے یا اس کا فائدہ پہنچتا ہے اور اس دعوت یا دعا سے مراد یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہے مضمون یہاں بھی وہی ہے جو پیچھے چلا آتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کر کے انسان فائدہ اٹھاتا ہے مگر یہاں اسے توحید کی طرف منتقل کر کے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے جو اور بتوں وغیرہ سے تعلق پیدا کیا جاتا ہے تو اس کا نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یہ دی ہے کہ ایک پیاسا آدمی ہاتھ پھیلا کر پانی سے آرزو کرتا رہے کہ وہ خود چل کر اس کے مُنہ تک پہنچ جائے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ قوتیں دی ہیں کہ وہ ان سب چیزوں کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے اور وہ اس کی خادم ہیں۔ مگر غلط کار انسان انہیں اپنا مخدوم بنا لیتا ہے اور اپنی پیدائش اور ان چیزوں کی پیدائش کی علت غائی کو بھی باطل کرتا ہے دعاء الکافرین سے مراد یہاں وہی دعا ہے جو وہ اپنے بتوں وغیرہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور کافر جو بعض وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے جیسا کہ مشرکوں کے ذکر میں آتا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو بھی سن لیتا ہے دعوا اللہ مخلصین لہ الدین لئن انجیتنا من ھٰذہ لنکونن من الشاکرین۔ فلمّا انجٰھم (یونس ۱۰-۲۲ و ۲۳)

ع ۱۶۰۹ طوعاً و کرھاً۔ طَوْع انقیاد یعنی فرمانبرداری ہے اور کَرْہ اس کی ضد ہے اور طوعاً و کرہاً سے مراد ہے کہ بہرحال اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں جو برضا و رغبت فرمانبرداری نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا نہیں کرتے وہ اس کا نتیجہ کسی اور رنگ میں بھگتتے ہیں اور اسی کو کرھاً فرمانبرداری کہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے قانون میں جکڑے ہوئے ہیں اگر قانون کو نہ مانیں اور اس کو توڑ دیں تو پھر آخر اس کی سزا اُٹھانی پڑتی ہے۔ یہ بھی آخرکار سجدہ ہی ہے گو نقصان کے رنگ میں۔ اور من فی السمٰوات والارض سے مراد یا ملائکہ اور جن و انس ہیں اور یا سب مخلوق اس میں شامل ہے۔

ظلال یا سائیوں کے سجدہ سے کیا مراد ہے۔ اس کی تصریح خود قرآن شریف نے دوسری جگہ کر دی ہے اولم یروا الیٰ ما خلق اللہ من شیٔ یتفیّئوا ظلالہ عن الیمین والشمائل سجّدًا للہ وھم داخرون (النحل ۱۶-۴۸) مطلب یہ ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کے ماتحت چلتے ہیں تو انسان اس قانون سے باہر کیونکر نکل سکتا ہے جب اس کا سایہ تک بھی قانون میں جکڑا ہوا ہے مگر آیا ظل یا سایہ سے مراد صرف انسان کا وہ سایہ ہے جو سورج کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ظل عربی زبان میں بہت وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی پردہ اور سواد اور کسی چیز کا اپنا وجود بھی مراد لے لیا جاتا ہے حضرت ابن عباس کی حدیث میں آتا ہے ان الکافر یسجد لغیر اللہ وظلّہ یسجد للہ جہاں ظِلّ کے معنی اس کا جسم لیے گئے ہیں جس سے سایہ پیدا ہوتا ہے (ن) اور ظلال البحر سے مراد اس کی موجیں لی گئی ہیں (ل) اور ظِلّ کے معنی خیال بھی آئے ہیں (ل)، اور ظل کے معنی حالت بھی ہیں (انتقلت عن ظلی یعنی میں اپنی حالت سے الگ ہو گیا (ت)

اور ظِلّ کا لفظ دو حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے ایک میں ہے سَبْعَۃٌ یُظِلُّھُمُ اللہ فی ظِلِّہٖ جہاں اللہ کے ظل سے مراد اس کی رحمت لی گئی ہے اور السلطان ظِلُّ اللہِ فی الارض جہاں ظل اللہ کے معنی ستر اللہ یا خاصۃ اللہ لیے گئے ہیں (ن۔ت) اور دونوں حدیثوں سے ظاہر ہے کہ ظل سے مراد اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا ظہور لیا گیا ہے جس طرح سایہ کسی شخص کا ظہور ہوتا ہے۔ پس ظلال کے ظاہر معنی لیتے ہوئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان خود تو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری چار و ناچار اختیار کرتا ہی ہے مگر اس کی صفات کا جو ظہور اعمال کے رنگ میں ہوتا ہے جسے انسان

قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

تو کیا تم اس کے سوائے حمایتی بناتے ہو، جو اپنے بھلے بُرے کے مالک نہیں، کہہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں، یا کیا اندھیرا اور روشنی برابر ہیں یا کیا انھوں نے اللہ کے کوئی ایسے شریک بنائے ہیں جنھوں نے (کچھ) پیدا کیا ہو، جیسے اللہ پیدا کرتا ہے پھر پیدائش ان کی نظر میں مل جل گئی، کہدے اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ اکیلا ہے سب پر غالب ۱۶۱۰ع

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ

وہ بادل سے پانی اتارتا ہے پھر نالے اپنے اپنے اندازے کے موافق بہ نکلتے ہیں پس سیلاب جھاگ کو اوپر اُٹھا دیتا ہے، اور اس میں جسے آگ میں تپاتے ہیں، زیور یا اور سامان بنانے کے لیے اسی طرح جھاگ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال دیتا ہے۔

سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے اور وہ (پانی) جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، زمین میں ٹھیرا رہتا ہے۔ اسی طرح

کا ظل کہنا چاہیئے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے قوانین کے ماتحت اور اس کا فرمانبردار ہے۔ یعنی انسان جیسا بھی چاہے عمل کرے وہ گو اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرے مگر جو وہ عمل کرتا ہے چونکہ اس پر نتیجہ پھر اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق مترتب ہوتا ہے اس لیے وہ اس کا ظل یا عمل یا اس کی صفات کا ظہور اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کرتا ہے اور ظلّ بمعنی حالت اوپر بیان ہو چکا یہ معنی اس کے مطابق ہیں اور میرے نزدیک حضرت ابن عباس کی اس حدیث کے جو اوپر نقل ہو چکی الکافر یسجد لغیر اللہ فظله یسجد للہ کے یہی معنی ہیں اور یہی معنی ظلال کے الجنة تحت ظلال السُّیُوف میں ہیں یعنی تلوار سے جو جہاد فی سبیل اللہ کیا جاتا ہے اس سے جنت حاصل ہوتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ صوفی جسے ظلی نبوت کہتے ہیں وہ فی الواقع نبوت نہیں بلکہ نبوت کی بعض صفات کی جھلک ہے، جو ایک سچے پیروی کرنے والے میں پیدا ہو جاتی ہے جس طرح ظل اللہ اللہ نہیں اسی طرح ظل نبی نبی نہیں اور نہ ظلی نبوت نبوت ہے اللہ اور نبی کے ظل ایسے ہی ہیں جیسے صاف پانی یا آئینہ میں آفتاب کا عکس کہ وہ آفتاب کی شکل پر نظر آتا ہے مگر فی الحقیقة آفتاب نہیں ۔

ع۱۶۱۰ غیر اللہ سے تعلق بیہودہ ہے: توحید کے مضمون کو جاری رکھا ہے تاکہ لوگ صرف ایک اللہ سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کریں جس سے انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے ایک انسان کو خدا سمجھ کر یا خدائی کا مرتبہ دیکر یا کسی اور چیز کو اپنا معبود بنا کر اور اس سے تعلق پیدا کر کے انسان کو حقیقتاً کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اس لیے کہ یہ چیزیں تو خود اپنی ذات کے لیے بھی نفع نقصان کی مالک نہیں اعمیٰ وہ جاہل ہے جو غیر اللہ سے تعلق پیدا کرتا ہے اور بصیر مومن ہے ظلمات سے مراد کفر اور ضلالت ہیں اور نور سے ایمان۔ آیت کے آخری حصہ میں خلق کو دلیل عبادت قرار دیکر جیسا کہ بارہا پہلے بھی بیان ہو چکا ہے یایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم (البقرۃ-۲۱) فرمایا کہ جن کو معبود بناتے ہو کیا ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اس نے کچھ پیدا کیا ہو خلقوا کخلقه کی شرط اس لیے لگائی کہ انسان بھی تو دن رات چیزیں بناتے رہتے ہیں اور خلق بمعنی اندازہ بھی کرتے رہتے ہیں مگر کیا اللہ تعالیٰ کی مخلوق جیسی بھی وہ کوئی چیز پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک چیونٹی کیا ایک چیونٹی کا پاؤں بھی نہیں بنا سکتے۔ مسیح کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا گیا ہے، جو مسلمان یہ مانتا ہے کہ آپ چمگادڑ بناتے تھے جو خدا کی مخلوق جیسی مخلوق ہے یا کوئی اور پرند بناتے تھے جو خدا کی مخلوق سے مل جل گئے ہیں وہ عیسائیوں کے ہاتھ میں مسیح کی خدائی کی ایک دلیل دیتا ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿١٧﴾
لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ
وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ
مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ
لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ
ع وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٨﴾
اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ
الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿١٩﴾
الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا
يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿٢٠﴾
وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ
يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ
سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ
السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٢﴾

اللہ مثالیں بیان کرتا ہے ع۱۶۱۱
جنھوں نے اپنے رب کی بات مانی ان کے لیے بھلائی ہے
اور جو اس کی بات نہیں مانتے اگر ان کے لیے وہ سب
کچھ بھی ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور
بھی، تو وہ سب اپنے چھڑانے کو دے دیں ان کے لیے بُرا حساب ہے
اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے ع۱۶۱۲
بھلا کیا وہ جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری
طرف اتارا گیا ہے سچ ہے۔ اس جیسا ہے جو اندھا ہے،
عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں ع۱۶۱۳
جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اقرار کو نہیں
توڑتے۔
اور جو اُسے جوڑتے ہیں، جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ
جوڑا جائے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور بُرے حساب
کا خوف رکھتے ہیں۔
اور جو اپنے رب کی رضا چاہتے ہوئے صبر کرتے ہیں
اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور اس میں سے جو ہم نے دیا ہے،
چھپ کر اور ظاہر خرچ کرتے ہیں اور بُرائی کو بھلائی سے دفع
کرتے ہیں انھی کے لیے (اس) گھر کا انجام اچھا ہے ع۱۶۱۴

ع۱۶۱۱ زبدا رابیا۔ زَبَد کے معنی جھاگ ہیں۔ رابیا۔ رَبَا سے ہے جس کے معنی ہیں بڑھا اور اوپر آگیا اور یہاں زبدا رابیا سے مراد ہے جھاگ جو اوپر آجاتی ہے اور اخذۃ رابیۃ (الحاقۃ ۶۹-۱۰) کے معنی ہیں شدت میں بڑھی ہوئی گرفت۔
حلیۃ۔ زیور ومن ینشؤا فی الحلیۃ (الزخرف ۴۳-۱۸) جمع حُلِیّ ہے۔ من حلیہم عجلا (الاعراف-۱۴۸)
جفاء۔ اَجْفَأَتِ القِدْرُ کے معنی ہیں ہانڈی نے (جھاگ کو) باہر پھینک دیا اور جُفاء وہ چیز ہے جو وادی باہر پھینک دیتی ہے یعنی ردی چیز (غ)
اس مثال کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی واضح کردیا کہ یہ حق اور باطل کی مثال ہے۔ باطل ایک وقت اوپر نظر آتا ہے مگر وہ جھاگ کی طرح ہوتا ہے اور حق اس پانی کی طرح ہے جو لوگوں کو نفع دیتا ہے بقدرھا میں یہ بتا دیا کہ جس طرح وادی اپنے قدر کے مطابق بارش کے پانی کو لیتی ہے اسی طرح ہر انسان اپنی استعداد کے مطابق وحی الٰہی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ آج بھی باطل جھاگ کی طرح اوپر آیا ہوا ہے یہ جھاگ جاتا رہے گا اور حق رہ جائے گا۔
ع۱۶۱۲ آخری آیت میں پھر تعلق باللہ کی طرف توجہ دلائی کہ اس کا نتیجہ بہتری ہے اور وہ بہتری جو اس ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے وہ دنیا کے سارے مال و دولت سے حاصل نہیں ہو سکتی دنیا کا سارا مال بھی اکٹھا کیا جائے تو اخلاق فاضلہ کو پیدا نہیں کر سکتا۔
ع۱۶۱۳ جب پہلے دو رکوعوں میں یہ بیان کردیا کہ وحی الٰہی انسان کے اخلاق پر اور اس کی روحانیت پر کیا اثر پیدا کرتی ہے تو اب مومن اور کافر کا اور ان کے انجام کا مقابلہ کیا ہے۔
ع۱۶۱۴ عقبی الدار۔ عُقُوبۃ۔ اور مُعَاقَبَۃ اور عِقَاب تینوں لفظ عذاب یا سزا سے مختص ہیں گو اصل تینوں کے معنی میں انجام یا پیچھے لانا ہے

جَنّٰتُ عَدۡنٍ يَّدۡخُلُوۡنَهَا وَمَنۡ صَلَحَ
مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَاَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ
وَالۡمَلٰٓئِكَةُ يَدۡخُلُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ كُلِّ بَابٍ ۝۲۳
سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَى الدَّارِ ۝۲۴
وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ
مِيۡثَاقِهٖ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ
اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۙ
اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ۝۲۵
اَللّٰهُ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ
وَفَرِحُوۡا بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ؕ وَمَا الۡحَيٰوةُ
ع الدُّنۡيَا فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝۲۶
وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ
عَلَيۡهِ اٰيَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ قُلۡ اِنَّ اللّٰهَ

ہمیشگی کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور (وہ بھی) جو
ان کے ماں باپ سے اور ان کی بیویوں اور اولاد میں سے
نیک ہوں اور فرشتے اُن پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے ۱۶۱۵
تم پر سلامتی ہو اس لیے کہ تم نے صبر کیا سو کیا ہی اچھا اس (گھر) کا انجام ہے ۱۶۱۶
اور وہ جو اللہ کے عہد کو اس کے پکا کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اسے
کاٹتے ہیں جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ جوڑا جائے ، اور زمین
میں فساد کرتے ہیں یہی ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور
جن کے لیے (اس) گھر کا بُرا (انجام) ہے ۱۶۱۷
اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور
(جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے اور لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو جاتے
ہیں حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں صرف عارضی سامان ہے ۱۶۱۸
اور جنھوں نے کفر کیا کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے نشان
کیوں نہیں اتار دیا جاتا ۔ کہہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑتا ہے

اور عُقُب اور عُقۡبیٰ اور عَاقِبَة یہ تینوں لفظ ثواب سے خاص ہیں یعنی جہاں اچھا بدلہ یا اچھا انجام بتانا مراد ہو وہاں ان لفظوں کا استعمال ہوتا ہے ۔ خیر ثوابا وخیر عقبا (الکھف ۱۸-۴۴) والعاقبة للمتقین (القصص ۲۸-۸۳) (غ) پس عُقۡبیٰ سے مراد ثواب یا اچھا انجام ہے اور تلک عقبی الذین اتقوا وعقبی الکافرین النار (۳۵) میں کافروں کے لیے عقبی کا لفظ صرف مقابلہ کے طور پر اختیار کیا ہے اور شاید اس لیے بھی کہ پھر آگ سے ہی ان کی اصلاح ہوگی اور الدار سے مراد یہ دار دنیا ہے یعنی جو دنیا میں رہ کر یہ کام کرتے ہیں ان کے لیے اس گھر کا انجام بھی اچھا ہوتا ہے اس کی تصریح اگلی آیت میں ہے اس گھر کے انجام کو جنات عدن کہنے میں اشارہ ہے کہ وہ اس دنیا میں ہی جنت میں داخل ہو جاتے ہیں ۔

ان تین آیتوں میں مومنوں کے اوصاف بیان کیے سب سے آخر میں فرمایا کہ وہ بُرائی کو بھلائی سے دور کر دیتے ہیں ۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو بُرائی کرتا ہے ضرور اس سے بھلائی کرتے ہیں کیونکہ بعض وقت بُرائی کی سزا دینی پڑتی ہے اور بُرائی کرنے والے کو تکلیف پہنچانی ضروری ہوتی ہے ۔ یہ ناقص تعلیم انجیل کی مشہور پہاڑی وعظ میں ہے جو ایک وقتی تعلیم تھی ۔ مگر جس پر دنیا ہمیشہ کے لیے کبھی بھی عامل نہیں ہو سکتی ۔ ہر طمانچہ مارنے والا ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے آگے دوسری گال کر دی جائے ۔ اس لیے اس کامل تعلیم میں یہ ہدایت فرمائی کہ بدی کو دور کرنا اصل غرض ہونی چاہیے ۔ ہاں اسے بھلائی سے دور کرو ۔ اس میں یہ بات بھی آگئی کہ تم سے کوئی بُرائی کرے تو تم اس سے نیکی کرو اور یہ بھی کہ بدی کا دور کرنا اصل غرض سمجھو پس جہاں نیکی کرنے سے بُرائی دور نہیں ہوتی تو اچھے طریق سے اسے دور کرو ۔ اور یہ بھی اس میں آجاتا ہے کہ اپنی طاقتوں کو نیکی پر لگا کر اپنی برائیوں کو دور کر دیتے ہیں ۔

ع ۱۶۱۵ عزیزوں کا جنت میں انسان کے ساتھ ہونا : ماں باپ اور بیبیوں اور اولاد کا ذکر اس لیے کیا کہ ان سے ہی انسان کی راحت کمال کو پہنچتی ہے اور گو وہ اس کمال کو نہ پہنچے ہوں مگر انہی جنات میں وہ بھی ہونگے ۔ یعنی ان کے ساتھ ہوں گے ہاں من صلح کی شرط لگا دی ہے کہ صلاحیت ان میں ہو اور اس لیے بھی یہ ذکر کیا ہے کہ جو لوگ ان اوصاف والے ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ان کا نیک اثر ان کے ماں باپ بی بی اولاد پر بھی پڑتا ہے اور فرشتوں کا ہر دروازہ سے داخل ہونا یہ ہے کہ جتنے اسباب نیکی کے ہوتے ہیں وہ ان سب سے بہرہ ور ہوتے ہیں دیکھو ع ۲۴۰ اس لیے ملائکہ بھی ہر باب جنت سے ان پر داخل ہوتے ہیں ۔

ع ۱۶۱۶ ابن جریر میں ہے کہ آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ شہداء کی قبور پر جاتے تو یہ لفظ دہراتے تھے ۔

ع ۱۶۱۷ یعنی اس دنیا کی زندگی میں رہ کر انہوں نے اپنے لیے بُری کمائی کی اس لیے اس گھر کا انجام بھی ان کے لیے بُرا ہو ۔

ع ۱۶۱۸ یہاں بتایا کہ رزق کی فراخی اور تنگی پر نہ جانا چاہیئے یہ دنیا کے عارضی سامان ہیں ۔ دونوں حالتوں میں رہ کر اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے ۔

يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝۲۷
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ
اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى
لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝۲۹
كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ
اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ
قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ
تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ۝۳۰
وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ
اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ
الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ

اور اسے اپنی طرف رستہ دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ع١٦١٩

جو ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں سُن رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔ ع١٦٢٠

جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں ان کے لیے انجام کار خوشحالی اور اچھا ٹھکانا ہے۔ ع١٦٢١

اسی طرح ہم نے تجھے ایک امت میں بھیجا ہے جس سے پہلے امتیں گزر چکی ہیں تاکہ تو ان پر وہ پڑھے، جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور وہ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں۔

کہہ وہ میرا رب ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اس کی طرف میرا رجوع ہے۔ ع١٦٢٢

اور اگر قرآن ایسا ہوتا جس سے پہاڑ دور کر دیئے جائیں یا اس سے زمین کاٹ دی جائے یا اس کے ذریعہ سے مُردوں سے باتیں کی جائیں ۔ بلکہ سب باتیں اللہ کے اختیار میں ہیں ع١٦٢٣ ۔ تو کیا جو ایمان

ع١٦١٩ اسی نشان ہلاکت کا مطالبہ پھر ہے جس کا مطالبہ آیت ۷ میں تھا۔ انہیں مثالیں دیکر سمجھایا جاتا ہے کہ وحی الٰہی سے وہ اسی طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جس طرح زمین بارش سے فائدہ اٹھاتی ہے مگر ان کا مطالبہ وہی ہے اس کا جواب اسی رکوع کی آخری آیت میں ہے کہ پہلے ان پر چھوٹی چھوٹی مصائب آتی رہیں گی یہاں تک کہ وہ نشان ہلاکت آجائے۔

آیت کے پچھلے حصہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اسے وہ ضرور اپنی طرف رستہ دکھا دیتا ہے اور جو رجوع نہیں کرتا خود قدم نہیں اُٹھاتا اللہ تعالیٰ اسے پکڑ کر نہیں لاتا بلکہ جس طرح وہ خود گمراہی میں رہنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اسے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔

ع١٦٢٠ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان قلبی میسر آتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے تمام پاک لوگوں کی زندگیاں روشن کرتی ہیں کہ کس طرح مصائب کے اندر مشکلات کے اندر، ناکامیوں کے اندر قید میں پڑ کر ان کے دلوں میں راحت ہوتی ہے، اور اللہ کے ذکر کے سوائے اطمینان قلبی میسر نہیں آتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے جسے تمام طالبان دنیا کی زندگیاں اظہر من الشمس کرتی ہیں کہ کس طرح جب ملک پر ملک فتح ہوتا چلا جاتا ہے تو دل میں اور آگ بھڑکتی ہے اور جب خزانہ پر خزانہ حاصل ہوتا جاتا ہے تو ہوس دنیا کی آگ اور تیز ہوتی جاتی ہے۔ نہ فتوحات نے اور نہ مال دنیا نے کسی شخص کے دل میں کبھی اطمینان پیدا کیا ہے۔ اور چونکہ قلب انسانی کو جب تک اطمینان میسر نہیں آتا اس وقت تک وہ ترقی کے قابل بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کے وہ جوہر نشوونما پاتے ہیں جن کے لیے یہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ بتا کر کہ صرف اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان قلب میسر آتا ہے توجہ دلائی ہے کہ قلب انسانی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کر کے ایک انقلاب عظیم پیدا ہوتا ہے

ع١٦٢١ طوبیٰ۔ طاب سے مصدر ہے اور اس کے معنی میں مختلف روایات ہیں۔ خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک۔ خیر کثیر کرامت وغیرہ (ر) مفردات میں ہے کہ طوبیٰ کہا گیا ہے کہ جنت میں ایک درخت کا نام ہے۔ اور ترجیح اس کو دی ہے کہ وہ جنت کی ہر ایک نعمت ہے جیسے بقا، جس کے ساتھ فنا نہیں۔ عزت جس میں زوال نہیں۔ غنا جس میں فقر نہیں۔

ع١٦٢٢ متاب۔ اصل میں متابی ہے۔ میرا متاب اور متاب کے معنی کامل توبہ ہیں۔ یعنی ہر ایک قبیح بات کا ترک کرنا اور ہر ایک جمیل کا اختیار کرنا (غ)

ان دونوں باتوں کا کہ ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی جس طرح پہلے بھیجتے رہے اور یہ لوگ رحمان کا انکار کرتے ہیں یہ تعلق ہے کہ نزول وحی اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت سے ہے جس طرح اس نے انسانوں کے لیے دوسرے سامان اپنی قدرت کاملہ سے مہیا کیے ہیں اسی طرح ابدی زندگی کے حصول کے لیے وحی کا سامان رکھا ہے الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (الرحمٰن ۵۵ : ۱ و ۲) جو لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں وہ اس ابدی زندگی کو حاصل کر لیں گے۔

ع١٦٢٣ جبال۔ جَبَل کی جمع ہے یعنی پہاڑ، مگر یہ لفظ عظیم الشان انسانوں پر بھی بولا جاتا ہے بعض وقت ثبات کے معنی کے لحاظ سے جو اس میں پایا جائے

يَايْــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ
لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ
تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ
وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿٣١﴾ ع

لاتے ہیں انھوں نے جان نہیں لیا کہ اگر اللہ چاہتا، تو سب ہی لوگوں کو ہدایت دیتا ۱۶۲۴ اور جنھوں نے کفر کیا انھیں اس کی وجہ سے جو وہ کرتے ہیں کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی، یا اُن کے گھر کے قریب اُترے گی، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے اللہ وعدے کا خلاف نہیں کرتا ۱۶۲۵

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ
فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫
فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾

اور تجھ سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ ہنسی کی جاتی رہی۔ سو میں نے کافروں کو مہلت دی، پھر انھیں پکڑا۔ سو میری سزا کیسی تھی ۱۶۲۶

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا
كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ

پھر کیا وہ جو ہر شخص پر اس کا کیا لیے کھڑا ہے (انھیں سزا نہ دے گا) اور انھوں نے اللہ کے شریک بنا رکھے ہیں،

(غ) اور فراء کا قول ہے الجَبَلُ سَیِّدُ القوم وعالمھم (ل) یعنی قوم کے سردار اور ان کے عالم کو جَبَل کہا جاتا ہے اور طاقتور آدمی کے لیے کہا جاتا ہے فُلان جَبَلٌ من الجبال (ل) وہ شخص پہاڑوں میں سے پہاڑ ہے۔

قرآن کے کمالات: لَوْ کی جزا محذوف ہے ایسی صورتوں میں جواب اس لیے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے اگر کوئی قرآن ایسا ہو سکتا ہے تو یہی ہے لکان ھذا القراٰن (ر) اور دوسری جگہ صفائی سے فرمایا لو انزلنا ھذا القراٰن علی جبل لرایتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ (الحشر ۵۹-۲۱) بلکہ للہ الامر جمیعًا کہہ کر صاف بھی کر دیا کہ یہ سب باتیں اسی قرآن سے ہو جائیں گی۔ پہاڑوں کے دور کر دینے یا اپنی جگہ سے ہٹا دینے سے مراد ان عظیم الشان آدمیوں کا دور کر دینا ہے جو اس کی راہ میں روک ہو رہے تھے۔ جیسا کہ لفظ جبل کی لغوی تشریح سے ظاہر ہے۔ زمین کے کاٹنے سے مراد ملک میں نہروں اور چشموں کا چلانا ہے (ر-ج) اور مجازاً مراد علوم روحانی کی نہریں اور چشمے ہیں جیسا کہ اسی سورت میں وادیوں کے بقدر استعداد پانی کے لینے سے یہی مراد ہے ۱۶۱۱ اور مُردوں کے کلام سے مراد روحانی مُردوں کا زندہ ہونا ہے جیسا کہ خود دوسری جگہ قرآن شریف نے فرمایا اومن کان میتا فاحییناہ (الانعام ۶-۱۲۲) اور اذا د عاکم لما یحییکم اور بل کا یہاں لانا اسی لیے ہے کہ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ ایسا کہاں ہو سکتا ہے تو یاد رکھو کہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور ہو کر رہیں گی۔ گویا پہلے آیت ۲۸ میں یہ بتایا کہ اس قرآن کے ذریعہ سے قلوب انسانی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گا تو اس کے بعد اب بتایا کہ یہ انقلاب دلوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ظاہر میں بھی اور کھلے رنگ میں یہ ایک انقلاب عظیم پیدا کر کے دکھائے گا۔

۱۶۲۴ یائس کے معنی یہاں یَعْلَم کیے گئے ہیں بعض نے کہا یہ معنی لغت ہوازن میں ہیں (ر) اور بعض کے نزدیک یہ مجاز ہے کیونکہ مایوس ہونے والے کو یہ علم ہوتا ہے کہ یہ بات نہیں ہو گی (ر) اور مفردات میں ہے کہ مومنوں کی اس سے یاس اس بات کی مقتضی تھی کہ اس کے نہ ہونے کے علم کے بعد حاصل ہو۔ اس لیے ان کی یاس کا قائم ہونا ان کے حصول علم کے قیام کا مقتضی ہوا۔

یہاں بھی اسی کے مطابق خوشخبری ہے جو پہلے حصّہ آیت میں تھی کہ یہ سب رکاوٹیں دور ہو کر مردے بولنے لگیں گے کیونکہ یہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو سب لوگوں کو ہدایت دیدے۔

۱۶۲۵ قارعۃ - قَرْعٌ کے معنی ایک چیز کا دوسری پر مارنا ہیں اور قارِعَۃ مصیبت کو کہا جاتا ہے یا سخت مصیبت کو اور یہاں قارعۃ کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلعم کا کوئی سریّہ ہے (ل) اور قیامت کو بھی القارعۃ کہا ہے۔

یہ کفار کے مطالبہ نشان کا جواب ہے جو دو دفعہ آچکا ہے اور اس لیے اس کی تفسیر میں یہی قول صحیح ہے کہ یہاں کفار سے مراد قریش اور عرب ہیں۔ اور قارعۃ سے مراد جنگیں ہیں اور وعد اللہ سے مراد اسلام کا آخری غلبہ اور اس کی حکومت ہے جو فتح مکّہ سے قائم ہوئی اور قریبًا من دارھم میں یہ اشارہ ہے کہ وہ مصائب خواہ خود ان مخالفین اسلام پر نازل ہوتی رہیں یا ان کے آس پاس نازل ہو کر ان کی تنبیہ کا موجب ہوتی رہیں اور تحل میں خطاب رسول اللہ صلعم کی طرف بھی ہو سکتا ہے یعنی تو ان کے گھر کے قریب نازل ہو جیسے حدیبیہ میں ہوا۔

۱۶۲۶ یہاں کافروں کے استہزا کا ذکر اس لیے کیا کہ جب انہیں عذاب کا وعدہ دیا جاتا تھا تو وہ ہنسی کرتے تھے کہ یہ شخص جو کوئی طاقت نہیں رکھتا کوئی اس کی بات نہیں سنتا اس کے سامنے ہم ذلیل اور مغلوب ہونگے۔

اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ
اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾
لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ
الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾
مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ
وَّظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ
وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

کہہ اُن کے نام لو ۔ آیا تم اللہ کو جتاتے ہو جو زمین میں ہے وہ نہیں جانتا، یا سرسری بات کر دیتے ہو (جس کی کوئی حقیقت نہیں) بلکہ جو کافر ہیں انھیں اپنی چال اچھی معلوم ہوتی ہے اور وہ رستے سے رُک گئے اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ۱۶۲۷
ان کے لیے دنیا کی زندگی میں عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی سخت ہے اور کوئی انھیں اللہ (کی سزا) سے بچانے والا نہیں۔
جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں کو دیا گیا ہے (یہ ہے) اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اس کے پھل ہمیشہ رہیں گے اور اس کی آسائش (بھی) یہ ان کا اچھا انجام ہے جو تقوے اختیار کرتے ہیں ۔ اور کافروں کا انجام آگ ہے ۱۶۲۸

ع ۱۶۲۷ من هو قائم ۔ قائم کے معنی یہاں حافظ ہیں کیونکہ قیام بمعنی مراعاۃ بھی آتا ہے (غ) مراد ایسا شاہد یا دیکھنے والا ہے جو اس عمل کو محفوظ بھی رکھتا ہو یعنی اس پر جزا و سزا مترتب کرتا ہو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کو جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی جزا یا سزا دیتا ہے کوئی عمل ضائع نہیں ہونے دیتا۔ یہ تو اللہ کی شان ہے اور انہوں نے اس کے شریک بنا رکھے ہیں۔

شرک کا ابطال: بتانا یہ مقصود ہے کہ غور کرو کیا وہ شریک بھی کچھ لوگوں کے اعمال کی جزا و سزا دیتے ہیں کیا ان کو بھی تھوڑی بہت قدرت ہے کہ لوگوں کے اعمال کو دیکھیں پھر ان پر جزا و سزا مترتب کریں۔ مفسرین نے اسے مبتدا قرار دے کر کمن لیس کذالك کو محذوف قرار دیا ہے یعنی کیا وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو ایسا نہیں اور قائم علیٰ کل نفس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ تم جو تدبیریں ہمارے رسول کے خلاف کر رہے ہو ہم انہیں بھی محفوظ کر رہے ہیں اسی کی وضاحت آیت کے آخر میں مکرھم میں موجود ہے۔

سموھم ۔ سَمَّاہُ کے معنی ہیں اس کے لیے اسم یا عَلَم قرار دیا (ت) سمیتہا مریم (آل عمران ۳ - ۳۶) میں مریم علم ہے اور اسم وہ ہے جس سے مسمی کا ذکر بلند ہوتا ہے اور وہ اس سے پہچانا جاتا ہے اس لیے ایک چیز کے وصف پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے لیسمون الملائکۃ تسمیۃ الانثیٰ (النجم ۵۳ - ۲۷) میں مراد یہ نہیں کہ ملائکہ کے لیے کوئی علم تجویز کرتے ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں یعنی ان کی صفت عورت ہونا بیان کرتے ہیں۔ ھل تعلم لہ سمیا (مریم ۱۹ - ۶۵) میں سمی یا ہمنام سے مراد اس کی نظیر ہے یعنی ایسا موصوف جس پر اس کی صفات صادق آسکیں اور ان صفات کا وہ مستحق ہو اور محض نام مراد نہیں کیونکہ نام تو اوروں کے بھی اللہ کے ناموں پر رکھ لیے جاتے تھے۔ ایسا ہی سموھم میں یہ مراد نہیں کہ ان کے نام کیا ہیں وہ بتاؤ مثلاً لات یا عزیٰ ۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جن کو تم خدا کہتے ہو ان کے متعلق حق امر کو ظاہر کرو اور بتاؤ کہ ان اسماء کے معانی بھی ان میں پائے جاتے ہیں (غ) اور بعض نے یوں معنی کیے ہیں کہ وہ تو ذکر کے قابل ہی چیزیں نہیں ہیں (ر)۔

معبودان باطل: ام تنبئونه بما لا يعلم في الارض ام بظاهر من القول ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ایسے کوئی شرکاء نہیں تو تم شریک قرار دیکر اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جو اس کے علم میں نہیں اور ایسی چیز فی الحقیقت موجود نہیں ہو سکتی ۔ اور ظاهر من القول سے مراد باطل لیا گیا ہے گویا ایسی بات جس کے نیچے حقیقت کوئی نہیں اور ایک معنی اس کے یہ بھی لیے گئے ہیں کہ کوئی کتاب اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہو جس میں کھلے طور پر ان چیزوں کا نام خدا رکھا ہو (ر) اور بلحاظ سیاق یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو خود ہر عمل پر قائم یعنی اس کا شاہد ہے تو تم اس کے ساتھ شریک ٹھہرا کر آیا اسے کچھ ایسی باتوں کی ان شریکوں کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو وہ نہیں جانتا یا کسی ظاہر بات کی خبر پہنچاتے ہو یعنی تمہارا یہ خیال ہے کہ کچھ ایسے مخفی امور ہیں جن کا علم اللہ کو نہیں ان شریکوں کے ذریعہ سے وہ علم اسے حاصل ہو جاتا ہے ۔ یا یہ خیال ہے کہ ظاہر اور کھلی باتوں کی اللہ تعالیٰ کو خبر نہیں ہوتی یہ باتیں ان شریکوں کے ذریعہ سے اس تک پہنچائی جاتی ہیں۔

ع ۱۶۲۸ مثل ۔ مَثَل اور مِثْل سے مراد بعض کے نزدیک کسی چیز کا وصف بھی ہوتا ہے اور یہ اس کی مثال دی ہے (غ) اور اکثر مفسرین نے یہاں مراد الصفة الغريبة لی ہے یعنی نادر صفت مگر جب خود قرآن کریم اور حدیث صحیح نے بیان کر دیا کہ جنت کی نعماء ایسی چیزیں ہیں جنھیں آنکھوں نے نہیں دیکھا اور کانوں نے نہیں سنا اور دل میں نہیں گزریں تو لازماً ان کا ذکر اس دنیا کی چیزوں کے رنگ میں بطور مثال سمجھانے کے لیے ہے اور اسی لیے قرآن شریف نے ان کے لیے یہاں اور سورۃ

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

اور وہ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور کچھ فرقے اس کی بعض باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ مجھے صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ شریک نہ کروں اسی کی طرف میں بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا ٹھکانا ہے۔[1629]

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ ع

اور اسی طرح ہم نے اسے اتارا فیصلہ عربی میں — اور اگر تو ان کی خواہشوں کی پیروی کرے اس کے بعد جو تیرے پاس علم آگیا، تو تیرے لیے اللہ کے مقابلہ پر کوئی حمایتی نہ ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔[1630]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے اور انھیں بیویاں اور اولاد بھی دی اور کسی رسول کے لیے نہ تھا کہ سوائے اللہ کے حکم کے نشان لاتا۔ ہر میعاد کے لیے ایک حکم معین ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔[1631]

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ

اور اگر ہم تجھے وہ بعض باتیں دکھا دیں جو اُن سے وعدہ کرتے ہیں

محمد ۴۷: ۱۵ میں مَثَل کا لفظ استعمال کیا ہے جو اپنے اصل معنی پر ہے اور اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ یہ لازمی بات ہے کہ یہ نعماء کسی نہ کسی رنگ میں اس عالم میں بھی ان لوگوں کو ملیں جنھوں نے حق کو قبول کیا ہے مگر وہ نتائج عملی رنگ اختیار نہیں کرتے جب تک کہ قبولیت حق عمل میں نہ آئے ظل کے معنی آسائش اس لحاظ سے کیے گئے ہیں کہ جنت کی شان ہے لا یرون فیہا شمسا (الدھر ۷۶: ۱۳) ظل کے اس معنی کے لیے دیکھو ع ۶۴۶۔

ع ۱۶۲۹ الذین اٰتینٰہم الکتٰب سے مراد اصحاب نبی یا مومن ہیں اور احزاب سے مراد یہود و نصاریٰ (ج) اور یہی سیاق چاہتا ہے۔

ع ۱۶۳۰ عربی سے مراد یہاں واضح لیا گیا ہے جس کے لیے دیکھو ع ۱۵۱۶۔

ع ۱۶۳۱ کتاب۔ راغب کہتے ہیں کہ کتاب سے مراد کبھی وجود میں لانا اور فنا کرنا بھی ہوتا ہے اور یہی اس کی مثال دی ہے۔ اور لکل اجل کتاب کے معنی کیے ہیں کہ ہر وقت کے لیے اقتضائے حکمت سے کوئی چیز وجود میں لائی جاتی ہے اور کوئی فنا کی جاتی ہے اور یہی مطلب عندہٗ ام الکتاب کا ہے۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو فرمایا کل یوم ھو فی شان (الرحمٰن ۵۵: ۲۹) (غ)

پہلے کفار کے استہزا کا جواب دیا ہے کہ بیوی بچے ہونا خلاف رسالت کوئی امر نہیں۔ پہلے بھی رسولوں کی بیبیاں اور اولاد تھی اس کے بعد اس نشان کا ذکر کیا ہے جس کا وہ بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ پہلے رسول بھی اپنے اختیار سے اپنے مخالفوں کو ہلاک نہ کر دیتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار کی بات ہے جب چاہے اور جس طرح چاہے کرے۔ اور پھر اپنا عام قانون بیان کیا کہ ایک قوم کی جو اجل ہوتی ہے اس کے لیے بھی ایک مقرر وقت ہوتا ہے کہ کب اسے مٹایا جائے اور کب اس کی جگہ دوسری قوم کو کھڑا کیا جائے اور ام الکتاب سے مراد لوح محفوظ کو بھی لیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا علم جس میں سب احکام اصل میں موجود ہوتے ہیں اور روح المعانی میں ایک روایت کی ذیل میں بیان کیا ہے کہ ام الکتاب سے مراد اصولی احکام ہیں جن میں کبھی نسخ نہیں ہوتا اور قرآن کریم میں دوسری جگہ یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے اٰیات محکمات ھن ام الکتاب (آل عمران ۳: ۷)

یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت سے اسباب پر بھی شہادت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنی قضا و قدر کو بھی ٹال دے اور یہی حق ہے واللہ غالب علٰی امرہ (یوسف ۱۲: ۲۱) میں اس طرف اشارہ ہے چنانچہ اگلی آیت میں صاف فرما بھی دیا کہ بعض عذاب جن کا وعدہ دیا جاتا ہے ہم چاہیں تو دور بھی کر دیں اور عذاب کا وعدہ کر کے اس کا نہ لانا اللہ تعالیٰ کے وسیع عفو و کرم کا نتیجہ ہے جو انسان کے حیطۂ خیال سے باہر ہے وہ کسی حالت میں بھی انسان کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔

نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿٤٠﴾

یا تجھے وفات دے دیں تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٤١﴾

اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں اور اللہ فیصلہ کرتا ہے کوئی اس کے فیصلہ کو رد کرنیوالا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے ۱۶۳۲ع

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا ۖ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٤٢﴾

اور ان لوگوں نے بھی (حق کے خلاف) تدبیریں کیں جو ان سے پہلے تھے مگر سب تدبیر اللہ کے اختیار میں ہے وہ جانتا ہے جو ہر شخص کماتا ہے۔ اور کافر جان لیں گے کہ اس گھر کا اچھا انجام کس کے لیے ہے ۱۶۳۳ع

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿٤٣﴾ ع

اور کافر کہتے ہیں تو بھیجا ہوا نہیں کہہ میرے اور تمھارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے، اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے ۱۶۳۴ع

۱۶۳۲ع اطراف۔ طرف کی جمع ہے جس کے لیے دیکھو ۵۱۳ع اور طَرَفُ الْقَوْم کے معنی ہیں ان کا رئیس اور اطراف کے معنی رؤسا اس لیے یہاں اطراف کے گھٹانے سے مراد علماء کی موت یا اس کے اہل کی موت اور پھلوں کی کمی لی گئی ہے اور اَطْرافُ الرِّجال سے مراد اشراف بھی ہیں (ل) اور مجاہد نے یہاں یہی معنی زمین کی اطراف کے گھٹانے کے لیے ہیں (ج)

حق کے آخری غلبہ کا کھلا نشان اس کی قبولیت ہے: جب نشان ہلاکت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس کا لانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور پھر اس سے پچھلی آیت میں فرمایا کہ اگر محمد رسول اللہ صلعم وفات بھی پا جائیں تو بھی حساب لینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے تو اب انہیں یوں توجہ دلاتا ہے کہ وہ اگر غور کریں تو ان کی آخری مغلوبیت کے نشان تو ابھی سے ظاہر ہو رہے ہیں کہ ہم زمین کے کناروں کو گھٹاتے چلے آتے ہیں یعنی ان کے بڑے بڑے آدمیوں کو کم کرتے چلے آتے ہیں اور دور دور اطراف عرب میں اسلام کا چرچا شروع ہو گیا ہے اور یہ کم کرنا صرف ان کی موت سے نہ تھا بلکہ ان کے مسلمان ہو جانے سے چنانچہ حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور حمزہؓ جیسے انسان اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور بعض مخالف مرتے بھی جاتے تھے مگر عظیم ترین کامیابی اسلام کی جو اس زمانہ سے خاص تعلق رکھتی ہے مدینہ میں اسلام کا پھیل جانا اور بعض اور جوانب میں اس کی قبولیت کے آثار کا ظاہر ہونا ہے اور یہی ظاہر طور پر زمین کی اطراف کا گھٹتا چلا آنا تھا اور یہ اسلام کا اعجاز تھا کہ جس قدر اس کی مخالفت بڑھتی چلی جا رہی تھی اسی قدر دلوں پر اس کا اثر زیادہ ہوتا چلا جاتا تھا اور اسی قدر وہ اسباب پیدا ہوتے چلے جاتے تھے جن سے اس کا چرچا دور دور پھیلتا چلا جاتا تھا اور اگر مکہ میں اس کی ترقی رکتی معلوم ہوتی تھی تو عرب کے اور اطراف میں اس کا قدم آگے بڑھ رہا تھا اور دوسری جگہ فرمایا افلا یرون انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها افهم الغالبون (الانبیاء ۲۱-۴۴) یعنی یہ زمین میں اسلام کی قبولیت کا پھیلتے جانا کفر کے غلبہ کا نشان نہیں بلکہ اس کی مغلوبیت کا نشان ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں بھی کفر کی آخری مغلوبیت کی طرف ہی توجہ دلائی ہے تو سمجھایا کہ تمہیں آخری مغلوبیت تو اسی سے نظر آ جانی چاہیئے کہ تمہارے بڑے بڑے آدمیوں کے دلوں پر اسلام تسلط کرتا چلا جا رہا ہے۔ درحقیقت حق کے آخری غلبہ کی اس سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ دشمنوں کے دلوں پر وہ اثر پیدا کر دیتا ہے۔ کاش آج بھی مسلمان دیکھتے کہ کس طرح اسلام اور محمد رسول اللہ صلعم کی صداقت یورپ کے دلوں کو کھائی جا رہی ہے اور اس نشان سے سبق حاصل کر کے اپنا زور ان لوگوں کو مسلمان بنانے پر لگاتے اور مایوسی کو اپنے پاس نہ آنے دیتے۔ آخری الفاظ میں توجہ دلائی ہے کہ مخالف کی ناکامی کا فیصلہ اللہ کے ہاں سے ہو چکا ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے یعنی ان کی بدکاریوں اور شرارتوں کا اسی دنیا میں حساب لے لیگا۔

۱۶۳۳ع اس آیت میں کیسی صفائی سے بتایا کہ ان کی تدابیر اور منصوبے جو اسلام اور رسول اللہ صلعم کے خلاف کر رہے ہیں ناکام ہوں گے۔ للہ المکر جمیعا یعنی ان کی تدابیر کا کارگر یا ناکام ہونا اللہ کے اختیار میں ہے مگر یعلم ما تکسب کل نفس میں اپنا قانون بتایا کہ ایک کی ہلاکت اور دوسری قوم کا قیام ان کے اعمال کی وجہ سے ہے کافر جان لیں گے کہ کامیاب کون ہوتا ہے۔ اس قسم کے الفاظ کو پڑھتے ہوئے ان حالات کو مدنظر رکھنا چاہیئے جن میں یہ کہے گئے وہ وقت آنحضرت صلعم اور مسلمانوں پر سخت ترین مصائب کا تھا اور ہر طرف سے ناکامی ان کو گھیرے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ مکہ کے لفظ میں یہ صاف اشارہ ہے کہ اس وقت آپ کے خلاف دشمنوں کے منصوبے ترقی پر تھے اور یہ ہجرت سے پہلے کا زمانہ ہے۔

۱۶۳۴ع اہل عرب نے کیوں بالآخر اسلام کو قبول کیا: اللہ کی گواہی عملی رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی پیشگوئیاں جو اس قدر صفائی سے ان کو سنائی جاتی تھیں جب اپنے وقت پر آ کر پوری ہوئیں تو سب عرب کی گردنیں اسلام کے سامنے جھک گئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شہادت آنحضرت صلعم کی سچائی پر تھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی شہادت انہی پیشگوئیوں میں مذکور تھی اس لیے ساتھ ان لوگوں کا نام بھی بڑھا دیا جن کے پاس کتاب یعنی قرآن کریم اور اس کی ان پیشگوئیوں کا علم تھا۔ من عندہ علم الکتاب سے یہی مراد ہے ای علم القران (ر) اور بعض نے پہلی کتابوں اور ان کی پیشگوئیوں کا علم بھی مراد لیا ہے۔

سُوْرَۃُ اِبْرٰھِیْمَ مَکِّیَّۃٌ (۱۴)

اٰیَاتُھَا ۵۲ — رُکُوْعَاتُھَا ۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔
الٓرٰ قف کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۵ بِاِذْنِ رَبِّھِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۱	میں اللہ دیکھنے والا ہوں۔ (یہ) کتاب (ہے) جو ہم نے تیری طرف اتاری تاکہ تو لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لیجائے۔ اس کے رستہ کی طرف جو غالب تعریف کیا گیا ہے ۱۶۳۵

نام: اس سورت کا نام ابراہیم ہے اور اس میں سات رکوع اور ۵۲ آیات ہیں۔ اس سورت میں اعدائے رسل کے رسولوں کو دُکھ دینے اور گھروں سے نکالنے اور رسولوں کی آخری کامیابی کا عام ذکر ہے مگر اس کے چھٹے رکوع میں حضرت ابراہیم کی اس دعا کا ذکر ہے جو آپ نے مکّہ اور اہل مکّہ کے لیے کی تھی۔ اور جس دعا میں یہ ذکر ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو ایک خاص غرض کے لیے خانہ کعبہ کے قریب ایک وادی غیر ذی زرع میں چھوڑا گیا اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان کا اس طرح چھوڑا جانا سلسلہ نبوت میں ایک پرحکمت فعل تھا۔ کیونکہ آخر اسی دور افتادہ شاخ سے اور اسی بے آب وگیاہ میدان سے توحید کا وہ چشمہ پھوٹنا تھا جس نے ساری دنیا کو سیراب کرنا تھا اس لحاظ سے اس سورت کا نام ابراہیم رکھا گیا اور اس دعائے ابراہیمی کا یہ اثر تھا کہ آنحضرت صلعم کے اعدا کو ہلاک نہیں کیا گیا۔

خلاصۂ مضمون: اس سورت میں سب سے پہلے یہ بیان فرمایا ہے کہ آنحضرت صلعم کی بعثت تمام دنیا کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کے لیے ہے اور پہلے ہی رکوع میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ مماثلت کا اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ حضرت موسیٰ کا پیغام صرف اپنی قوم تک محدود تھا۔ رسول عربیؐ کا پیغام محدود نہیں۔ دوسرے رکوع میں مخالفین رسل کا ذکر ہے کہ وہ کس طرح رسولوں کے پیغام کو نہ صرف پس پشت ڈالتے ہیں بلکہ اس کی مخالفت پر سارا زور لگاتے ہیں۔ تیسرے میں بتایا ہے کہ جب ان کی مخالفت حد کو پہنچ جاتی ہے یہانتک کہ وہ اس سرزمین سے بھی رسولوں کو نکال دیتے یا نکال دینے کا عزم کرلیتے ہیں تو آخر خدائی فیصلہ ہوتا ہے اور حق کامیاب اور باطل ناکام ہوتا ہے۔ چوتھے رکوع میں حق و باطل کا مقابلہ کرکے دکھایا ہے اور سمجھایا ہے کہ حق اس لیے کامیاب ہوتا ہے کہ اس کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور اس کے اصول و فروع ایک علم کی طرح ہوتے ہیں اسے کوئی چیز نابود نہیں کرسکتی۔ پانچویں رکوع میں بتایا کہ یہ حق جو وحی الٰہی کی صورت میں آسمان سے آتا ہے اس سے فائدہ نہ اٹھانا خود اپنے آپ کو ایک عظیم الشان نعمت الٰہی سے محروم کرنا ہے۔ چھٹے رکوع میں دعائے ابراہیم ہے اور بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم کا حضرت اسماعیلؑ کو مکّہ میں چھوڑنا خاص ارادۂ الٰہی کے ماتحت تھا۔ تاکہ سلسلہ نبوت اپنے کمال کو پہنچے۔ اور ساتویں رکوع میں رسول اللہ صلعم کے مخالفین کی آخری مغلوبیت کا نقشہ کھینچا ہے۔

تعلق: الرا کے مجموعہ میں یہ پانچویں سورت ہے اور اس میں ایک عمومیت کے رنگ میں رسولوں اور ان کے اعدا کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے سمجھایا ہے کہ حق ایک ایسی چیز ہے کہ وہ نابود ہو سکتی ہی نہیں وہ ایک درخت ہے جس کی جڑ زمین میں مضبوط ہوتی ہے اور جس کی شاخیں آسمان میں پھیل کر چاروں طرف سے اپنی خوراک حاصل کرتی ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے تباہ نہیں کرسکتی اور باطل کی چونکہ جڑ کوئی نہیں ہوتی اس لیے دنیا کی کوئی طاقت اسے قائم نہیں رکھ سکتی اس لیے رسول جو حق کو ساتھ لاتے ہیں انجام کار غالب ہی ہوتے ہیں۔

زمانہ نزول: اس سورت میں بھی کئی ایک صریح اشارات موجود ہیں کہ یہ مجموعہ مکّہ کے آخری زمانہ کا ہے یہاں نہایت صفائی سے لنخرجنکم من ارضنا میں بتا دیا کہ کفار اب اپنی آخری تدبیر پر عزم کر رہے تھے اور ان کی اس عظیم الشان تدبیر کا ذکر یہاں ان الفاظ میں ہے وقد مکروا مکرھم وعند اللہ مکرھم۔ وان کان مکرھم لتزول منہ الجبال یہ وہی ان کی آخری چال تھی جس میں رسول اللہ صلعم کا کام تمام کرنے کا فیصلہ وہ کرنے والے تھے۔

۱۶۳۵ ظلمات۔ ظلمۃ اور ظلمات کے لیے دیکھو ح ۳۰۔ اور اس سے مراد جہالت شرک فسق کو لیا جاتا ہے جیسا کہ نور سے مراد انہی باتوں کی ضد ہوتی ہے (غ) پس ظلمات سے نور کی طرف لے جانے سے مراد ہے کہ ہر قسم کی جہالت توہمات اور فاسد اعتقادات سے نکال کر صحیح علم اور صحیح خیالات کی طرف لے جائے۔ یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ مذہب فی الحقیقت ایک علم ہے اور محض چند باتوں کے فرض کر لینے کا نام نہیں۔

قرآن شریف کے نازل کرنے کی غرض لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لانا ہے بالفاظ دیگر توہم پرستی اور جہالت کو دور کرکے علم صحیح اور خیالات صحیحہ کا دنیا میں پھیلانا اور یہاں الناس کا لفظ لاکر اور آیت ۵ میں حضرت موسیٰ کی وحی کی یہی غرض قرار دیکر مگر قومک لفظ لاکر دونوں نبیوں کی مماثلت کو ظاہر کرتے ہوئے فرق بھی بتا دیا ہے کہ ایک کی غرض صرف اپنی قوم تک محدود تھی اور دوسرے کا پیغام تمام لوگوں کے لیے ہے اور یہاں اس راہ کو عزیز وحمید کی راہ قرار دیکر بتا دیا کہ یہی صفات اس کے بندوں میں بھی پیدا ہو جائیں گی۔

اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ ۲
الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى
الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۳

اللہ (کی طرف) جس کے لیے سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور کافروں پر سخت عذاب کی وجہ سے افسوس ہے۔ جو دنیا کی زندگی آخرت پر پسند کرتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں - اور اس میں ٹیڑھا پن ڈھونڈتے ہیں - یہی پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں ؎۱۶۳۶

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ
لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ
يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۴

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں تاکہ انھیں کھول کر بتا دے، پھر اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ بننے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے وہ غالب حکمت والا ہے ؎۱۶۳۷

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ
قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬
وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۵

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لا - اور ان کو اللہ (کی نعمتوں) کے دن یاد دلا، یقیناً اس میں ہر ایک صبر کرنے والے شکر کرنے والے کے لیے نشان ہیں-

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ
يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا اللہ کی نعمت کو یاد کرو (جو) تم پر (ہوئی ہے) جب اس نے تمھیں فرعون کی قوم سے چھڑایا جو تمھیں سخت عذاب دیتے تھے اور تمھارے بیٹوں کو مار ڈالتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں

ع۱۶۳۶ یستحبون - حُب کے لیے دیکھو ع۲۰۳ اِستحباب یہ ہے کہ انسان کسی چیز کا قصد کرے کہ اس سے محبت کرے اور اس کا صلہ علیٰ لانے سے اس میں ایثار کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں (رغ) یعنی ایک چیز کو دوسری پر ترجیح دینا یا ایک سے بڑھ کر دوسری سے محبت کرنا اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا یا اس سے آخرت سے بڑھ کر محبت رکھنا کافروں کا کام ہے اور اس کا نتیجہ وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ آج مسلمانوں کی سب سے بڑی بیماری یہی دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا ہے۔ یعنی فواید دنیوی کی فوائد دینی سے بڑھ کر پروا کرنا اور فوائد دنیوی کی خاطر فوائد دینی کو قربان کر دینا - اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ فوائد دینی کی خاطر فوائد دنیوی کو قربان کر دیا جاتا مگر آج سب قومیں قومی فوائد کے لیے ایثار کرتی ہیں اور مسلمان سب سے پیچھے ہیں اس لیے نفع بھی دوسری قومیں ہی اُٹھاتی ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں قربانی کی روح پیدا نہیں کی جائیں گی اُس وقت تک ان میں زندگی کے آثار کبھی پیدا نہیں ہو سکتے۔

ع۱۶۳۷ آنحضرت کی بعثت عامہ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب: عیسائی معترضین کہتے ہیں کہ یہاں جو اصول بیان کیا گیا ہے اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلعم صرف عرب کی طرف مبعوث ہوئے تھے کیونکہ آپ کی زبان عربی تھی اور اسے قطعی نتیجہ کہا جاتا ہے یہاں یہ فرمایا ہے کہ ہر ایک نبی اپنی قوم کی زبان میں ہی بھیجا جاتا ہے یہ نہیں فرمایا کہ ہر ایک نبی صرف اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے اور یہ دو بالکل جدا باتیں ہیں آنحضرت صلعم کی قوم عرب تھی مگر آپ کی بعثت عرب اور عجم دونوں کی طرف تھی جیسا کہ قرآن کریم نے بار بار فرمایا ہے کہ آپ کو کافۃ للناس ...... بھیجا گیا اور جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آپ کی بعثت اسود اور احمر سب کی طرف تھی - ہاں یہ سچ ہے کہ پہلے تمام انبیاء ایک ایک قوم کی طرف ہی بھیجے گئے جیسا کہ ہر نبی کا ذکر کر کے فرمایا کہ وہ الی قومہ بھیجا گیا یعنی اپنی قوم کی طرف یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق فرمایا و رسولا الی بنی اسرائیل مگر آنحضرت صلعم کی نسبت کہیں نہیں فرمایا کہ آپ کو عرب کی طرف یا صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا بلکہ سب سے پہلی آیت میں ہی یہ فرق ظاہر کر دیا ہے دیکھو ع۱۶۳۵ اور یہ بھی صحیح ہے کہ نبی صلعم نے اپنی قوم کو تیار کیا کہ وہ آپ کا پیغام تمام دنیا میں پہنچائے۔

ع ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۶
وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ
وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۷
وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۸
اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ
مع قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ
وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا
اللّٰهُ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا
اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا
بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا
النصف تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۹
قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ
لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا
تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ

تمھارے رب کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی۔
اور جب تمھارے رب نے بتا دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمھیں زیادہ دونگا
اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بھی سخت ہے ۱۶۳۸
اور موسیٰؑ نے کہا اگر تم اور جو زمین میں ہیں سب کے سب انکار
کرو تو اللہ یقیناً بے نیاز تعریف کیا گیا ہے ۱۶۳۹
کیا تمھارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی، جو
تم سے پہلے تھے (یعنی) نوحؑ کی قوم اور عادؑ اور ثمودؑ کی۔
اور ان کی جو اُن کے پیچھے ہوئے۔ انھیں اللہ کے سوائے
کوئی نہیں جانتا، ان کے رسول کھلی دلائل لے کر آئے تو انھوں
نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈالے اور کہا ہم اس کا انکار کرتے
ہیں جو تمھیں دیکر بھیجا گیا ہے اور یقیناً ہمیں اس کے بارے میں سخت
شک ہے جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ۱۶۴۰
ان کے رسولوں نے کہا کیا اللہ میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین
کا پیدا کرنے والا ہے وہ تمھیں بلاتا ہے تاکہ تمھارے قصور تمھیں
بخش دے اور تمھیں ایک مقرر وقت تک مہلت دے۔
انھوں نے کہا تم بھی ہمارے جیسے انسان ہو۔ تم چاہتے ہو کہ
ہمیں اس سے روک دو جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے

ع۱۶۳۸ یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک عام قانون بیان فرمایا ہے کہ جب نعمت کے لیے انسان شکر کرتا ہے تو وہ اور زیادہ ملتی ہے۔ اور ناشکری کا نتیجہ دکھ ہے شکر کے معنی کے لیے دیکھو ع۷۵ و اور شکر نعمت عملی رنگ میں یہ ہے کہ حصول نعمت کے لیے جو اسباب اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں ان سے فائدہ اٹھائے یہ قانون جسمانی اور روحانی دونوں نعمتوں پر یکساں حاوی ہے۔ زمین میں اللہ تعالیٰ نے طاقت رکھی ہے کہ وہ بیج کو نشوونما دے اس نعمت کا شکریہ ہے کہ زمین میں بیج ڈالا جائے قلب انسانی میں طاقت رکھی ہے کہ وحی الٰہی کے اثر سے اس کی مخفی قوتیں بڑھیں اس نعمت کا شکر اس وحی کی قبولیت ہے جو اس طرح پر قدر کرتا ہے وہ فائدہ اٹھاتا ہے جو نہیں کرتا اس کا انجام محرومی اور دکھ ہے۔

ع۱۶۳۹ مطلب یہ ہے کہ کفر (انکار یا ناشکری) سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ کسی کے شکر کرنے سے یا ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ کو فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ناشکری یا کفر سے اس کا کچھ بگڑتا ہے اس لیے کہ وہ غنی ہے یعنی اسے کسی کی احتیاج نہیں۔ اور اس کی حمد میں بھی اس سے فرق نہیں آتا۔

ع۱۶۴۰ ردوا ایدیھم فی افواھھم اس کے معنی تین طرح پر ہو سکتے ہیں منکروں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈالے گویا غیظ و غضب سے اپنے ہاتھ کاٹے جیسا کہ دوسری جگہ ہے عضوا علیکم الانامل من الغیظ (آل عمران - ۱۱۹) یا اپنے ہاتھ اپنے مونہوں پر رکھے گویا خاموشی کی طرف اشارہ ہے یا اپنے ہاتھ نبیوں کے مونہوں میں ڈالے گویا انہیں خاموش کرا دیا۔ اور ردّ کا استعمال یہ ظاہر کرنے کو ہے کہ وہ بار بار ایسا کرتے رہے (رغ)۔

یہاں بیان کو حضرت موسیٰ کے ذکر سے لوٹا کر عام کر دیا ہے اور پھر فرمایا کہ اتنی قومیں ہوئی ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا گویا ان کی تاریخ بھی محفوظ نہیں رہی۔ انہیں الفاظ کی بنا پر حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ نساب یعنی وہ لوگ جو سلسلہ نسب حضرت آدم تک پہنچا کر بس کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں مگر ہمارے تاریخ نویسوں نے بعض حالات میں نسابوں کے بھی کان کتر دیئے ہیں۔

اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۰﴾
قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِیَكُمْ
بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَی اللّٰهِ
فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾
وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا
سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰی مَاۤ اٰذَیْتُمُوْنَا ؕ
ع ۲/۱۴ وَ عَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾
وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ
مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ
فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۳﴾ ۙ
وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ
ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَ خَافَ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾
وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۱۵﴾ ۙ

تھے تو ہمارے سامنے کوئی کھلی سند لاؤ[1641]

ان کے رسولوں نے انھیں کہا کہ ہم تمھارے جیسے ہی انسان ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم تمھارے پاس سوائے اللہ کے حکم کے کوئی سند لائیں - اور چاہیئے کہ مومن اللہ ہی پر بھروسا کریں۔

اور کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسا نہ کریں اور اسی نے ہمیں ہمارے رستوں کی ہدایت کی ہے اور ضرور ہم اس پر صبر کریں گے جو تم ہمیں ایذا دیتے ہو اور چاہیئے کہ اللہ پر بھروسا کرنیوالے اللہ پر ہی بھروسا کریں[1642]۔

اور جو کافر تھے انھوں نے اپنے رسولوں سے کہا ہم تمھیں اپنے ملک سے نکال دیں گے یا تمھیں ہمارے مذہب میں آجانا ہوگا۔ سو اُن کے ربّ نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم یقیناً ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔

اور یقیناً ہم ان کے بعد تمھیں زمین میں آباد کریں گے۔ یہ اس کےلیے ہے جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے اور میرے (عذاب کے) وعدے سے ڈرتا ہے[1643]

اور انھوں نے فیصلہ چاہا اور ہر ایک سرکش باغی نامراد ہوا[1644]

ع ۱۶۴۱ سُلطان کے معنی کے لیے دیکھو ع ۵۳۶ پہلی آیت میں رسولوں کا بینات یعنی کھلی دلائل کے ساتھ آنا بیان کیا تھا۔ یہاں وہ سلطان کا مطالبہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حق کے غالب ہو جانے کا مطالبہ کرتے ہیں جیسا کہ انہیں کہا جاتا تھا۔

ع ۱۶۴۲ جو کچھ یہاں عام رسولوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے اس سب میں ذکر آنحضرت صلعم کا ہی اصل مقصود ہے۔

ع ۱۶۴۳ مقامی - میرا مقام - اور مَقام مصدر بمعنی قیام بھی ہو سکتا ہے اور اسم مکان یا زمان بھی یعنی کھڑا ہونے کی جگہ یا وقت (غ) پس یہاں مقامی کے معنی میرا قیام یعنی میرا حفظ اعمال کے ساتھ قائم ہونا بھی ہو سکتے ہیں یا میرا عدل و انصاف پر قائم ہونا۔ اور اس کے معنی میرا موقف یعنی میرے حضور سب انسانوں کے کھڑا ہونے کی جگہ بھی ہو سکتے ہیں ⁂

اخراج رسل اور ان کی آخری کامیابی: سب رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قانون ایک ہی رہا ہے۔ آخری کامیابی سب کو ملتی ہے۔ مگر اس زمانہ میں سے بھی سب کو گزرنا پڑتا ہے جب باطل کی فوجیں پورے زور پر ہوتی ہیں اس وقت رسولوں کو وعدہ دیا جاتا ہے کہ حق کو مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر وہ ضرور غالب آئیگا اور باطل کو نیست و نابود کر دیا جائے گا آیت ۱۳ میں ارضنا سے مراد خاص وہ ملک ہے جہاں مخالفین کا غلبہ ہے مگر آیت ۱۴ میں الارض وسیع ہے حق کو قائم کر دیا جائے گا خواہ کہیں ہو اسی جگہ پر واپس لانے کا وعدہ رسول اللہ صلعم سے خاص تھا لرآدّك الی معاد (القصص ۲۸ - ۸۵) اور لتعودن فی ملتنا کے لیے دیکھو ع ۱۱۲۲ ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا نزول اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب آنحضرت صلعم کے اخراج کی تجویزیں ہو رہی تھیں ⁂

ع ۱۶۴۴ استفتحوا۔ اِسْتِفْتَاح فَتْح سے ہے جس کے معنی زنجیروں بیڑیوں کا دور کرنا ہیں یعنی کھولنا اور یہ جسمانیات پر بھی بولا جاتا ہے یعنی جو چیزیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور علوم وغیرہ پر بھی یعنی جو بصیرت سے تعلق رکھتی ہیں اور فتح القَضِیَّۃ فتاحًا کے معنی ہیں مقدمہ کا فیصلہ کر دیا گویا اس کی زنجیریں یا مشکلات وغیرہ کو دور کر دیا ربنا افتح بیننا وبین قومنا بالحق وانت خیر الفاتحین (الاعراف ۷ - ۸۹) اور فَتْح بمعنی ظفر و نصرت بھی آتا ہے اور اِسْتِفْتَاح کے معنی طَلَبُ الفتح بھی ہو سکتے ہیں۔ اور طَلَبُ الفتاح بھی یعنی فتح چاہنا یا فیصلہ چاہنا (غ)

استفتاح انبیاء بھی کرتے ہیں جیسے ربنا افتح بیننا وبین قومنا بالحق (الاعراف ۷ - ۸۹) سے ظاہر ہے اور ان کے مخالف بھی جیسے ربنا عجل لنا

مِّنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ
مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿١٦﴾
يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ
الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ
بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿١٧﴾
مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ
كَرَمَادِ ۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ
عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى
شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿١٨﴾
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ
بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿١٩﴾
وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿٢٠﴾
وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا
لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ

اس کے سامنے دوزخ ہے اور اُسے کھولتا ہُوا پانی
پلایا جائے گا ۱۶۴۵
وہ اسے گھونٹ گھونٹ پیئے گا اور اُسے گلے سے نہیں اتار
سکے گا اور ہر طرف سے اُسے موت آرہی ہوگی اور وہ مرے گا نہیں
اور اس کے سامنے سخت عذاب ہوگا ۱۶۴۶
ان لوگوں کی مثال جو اپنے رب کا انکار کرتے ہیں یہ ہے کہ ان کے عمل
راکھ کی طرح ہیں، جس پر آندھی کے دن ہوا زور سے چلے
جو کچھ انھوں نے کمایا تھا، اس میں سے کوئی چیز ان کے ہاتھ نہ
آئے گی - یہ پرلے درجہ کی گمراہی ہے ۱۶۴۷
کیا تو غور نہیں کرتا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا
کیا، اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور نئی مخلوق
لے آئے ۱۶۴۸
اور یہ اللہ پر کچھ بھی مشکل نہیں -
اور سب اللہ کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے - تب کمزور انھیں
جو متکبر تھے، کہیں گے ہم تمھارے پیرو تھے، تو کیا

قطنا (صٓ ۳۸ - ۱۶) فاتنا بما تعدنا (الاعراف ۷ - ۷۰) اور جنگ بدر کیلئے جب قریش نکلے ہیں تو اس وقت ابوجہل نے بھی دعا کی تھی دیکھو ع ۱۲۱۹ د

ع ۱۶۴۵ صدید - صَدّ اور صُدُود کسی چیز سے روکنا یا رکنا ہے اور صَدِید پیپ وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو چمڑے اور گوشت کے درمیان حائل ہو اور یہ دوزخیوں کے طعام کے لیے بطور مثال بیان کیا گیا ہے (غ) اور صدید اس گرم پانی کو بھی کہا جاتا ہے جو ابالا گیا ہو - یہاں تک کہ گاڑھا ہو جائے اور تلچھٹ کو بھی (ل)

ع ۱۶۴۶ یتجرع - جَرِعَ اور تَجَرَّعَ پانی کے نگلنے پر بولا جاتا ہے اور جُرْعَة اور جَرْعَة ایک گھونٹ اور ایک مرتبہ پینے کو کہتے ہیں (ل) اور نہایہ میں ہے کہ تَجَرُّع کے معنی ہیں جلدی سے پانی پی جانا اور بعض کے نزدیک گھونٹ گھونٹ پینا معنے ہیں -

یسیغ - سَاغَ - کھانے یا پانی پر بولا جاتا ہے جو گلے سے آسانی سے اُتر جائے سائغا للشاربین (النحل ۱۶ - ۶۶)

جب استفتاح کا نتیجہ یہ فرمایا کہ حق کو نابود کرنے کی کوشش کرنے والے نامراد ہو جائیں گے تو اس عذاب دنیا کے بعد عذاب جہنم کا ذکر کیا - موت کے معنے کے لیے دیکھو ع ۶۹ اور یہاں مراد وہ دُکھ اور مصائب ہیں جو موت تک پہنچا دیتے ہیں مگر چونکہ موت وہاں نہیں ہے اس لیے وہ مرتا نہیں لایموت فیہا ولا یحییٰ (طٰہٰ ۲۰ - ۷۴)

من ورائہ کے معنی آگے اور پیچھے دونوں ہو سکتے ہیں اس لیے من ورائہ عذاب غلیظ میں عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے -

ع ۱۶۴۷ یوم عاصف - عاصف اصل میں ہوا کی صفت ہے دیکھو ع ۱۳۸۷ یوم کی طرف اس کا اسناد بطور مجاز ہے -

کافروں کے اعمال کو راکھ سے مثال دی ہے جو ایک تیز ہوا کے سامنے اڑ جاتی ہے اس لیے کہ ان کی ساری دوڑ خواہشات حیوانی تک تھی - اس کے خاتمہ کے ساتھ ہی وہ عمل بھی برباد ہو گئے اور آخرت میں کچھ کام نہ دیں گے -

ع ۱۶۴۸ آیت کے دونوں حصوں میں کیا تعلق ہے ؛ حق کے ساتھ زمین و آسمان کو پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہر فعل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اس لیے انسانوں کے افعال بھی بلا نتیجہ نہیں رہ سکتے اور ایک قوم کے اعمال و افعال ہی اس کے زوال کا موجب ہوتے ہیں -

أَنتُمْ مُّغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ
شَيْءٍ ۚ قَالُوا لَوْ هَدٰنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۖ
سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجَزِعْنَا أَمْ صَبَرْنَا مَا
لَنَا مِنْ مَّحِيصٍ ﴿۲۱﴾ ع

آج تم کچھ اللہ کا عذاب ہم سے دُور کر سکتے ہو؟
وہ کہیں گے اگر اللہ ہمیں راہ دکھاتا تو ہم تمھیں راہ دکھاتے
ہمارے لیے برابر ہے کہ ہم واویلا کریں یا صبر کریں، ہمارے
لیے کوئی گریز کی جگہ نہیں ۱۶۴۹

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللّٰهَ
وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ ۖ
وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطٰنٍ إِلَّا أَن
دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي ۖ فَلَا تَلُومُونِي
وَلُومُوا أَنفُسَكُم ۖ مَّا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ
وَمَا أَنتُم بِمُصْرِخِيَّ ۖ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا
أَشْرَكْتُمُونِ مِن قَبْلُ ۗ إِنَّ الظّٰلِمِينَ
لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۲﴾

اور جب بات کا فیصلہ ہو جائے تو شیطان کہے گا اللہ نے تمھیں
سچا وعدہ دیا تھا اور میں نے تمھارے ساتھ وعدہ کیا تو تم سے
وعدہ خلافی کی اور میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا — مگر میں نے تمھیں
بلایا تو تم نے میری بات مان لی، سو مجھے ملامت نہ کرو اور
اپنے آپ کو ملامت کرو، نہ میں تمھاری فریاد رسی کر سکتا ہوں
اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو، میں اس کا انکار کرتا ہوں
جو تم نے پہلے مجھے شریک بنایا — ظالموں کے لیے
دردناک دکھ ہے ۱۶۵۰

وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جَنّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ
فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾
أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً
طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ

اور جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے باغوں میں داخل
کیے جائیں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اپنے رب کے حکم سے انھیں
میں ہمیشہ رہیں گے ان میں ان کی دعائے ملاقات سلام ہوگی۔
کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے اچھی بات کی مثال کس طرح بیان کی ہے
جیسا ایک پاکیزہ درخت اس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں

ع۱۶۴۹ تبعا ۔ تابع کی جمع ہے۔

لو ھدٰنا اللہ لھدینٰکم۔ یہاں راہ دکھانے سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ راہ حق دکھاتے مگر سیاق یہ چاہتا ہے کہ اس سے مراد عذاب سے مخلصی کی راہ ہے۔ کیونکہ ان کا سوال یہ ہے کہ کیا تم کچھ عذاب ہم سے دور کر سکتے ہو۔

جزعنا ۔ جَزْع کے اصل معنی رسہ کا درمیان سے کاٹ دینا ہیں اور جَزَع اس حزن یا غم کو کہتے ہیں جو انسان کو اپنے سامنے کی چیز سے پھیر دے اور اسے اس سے کاٹ دے (غ) اور یہ صبر کے مقابل پر ہے حُزن اور صبر جمع ہو سکتے ہیں۔ مگر جَزَع اور صبر جمع نہیں ہو سکتے۔

محیص ۔ حَیص کے معنی ہیں ایک چیز سے الگ ہو جانا اور مَحِیص مَھرَب یعنی بھاگنے کی جگہ (ل) اور حَیْص بَیْص کے معنی شدت ہیں۔

ع۱۶۵۰ مصرخ ۔ صَرخَۃ ۔ اس زور کی آواز کو کہتے ہیں جو مصیبت کے وقت دوسرے کو مدد کو بلانے کے لیے بلند کی جاتی ہے۔ اور صَارِخ فریاد کرنے والا اور مُصْرِخ وہ جو فریاد سنکر مدد کو آئے اور صَرِیخ دونوں پر بولا جاتا ہے فَلَا صَرِیخَ لَھُم (یٰس ۳۶ - ۴۳)

شیطان کا انکار شرک: انی کفرت بما اشرکتمون من قبل کے ایک معنی تو وہ ہیں جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ خدا کا شریک ہونے کا میں پہلے ہی منکر تھا یا میں نے کبھی یہ دعوی نہیں کیا کہ میں خدا کا شریک ہوں یا تم مجھے خدائی طاقتوں میں اس کا شریک مانو اور یہ معنی بالکل سیاق کے مطابق ہیں کیونکہ اوپر وہ صاف کہتا ہے کہ اللہ کے وعدے تو سچے ہوتے تھے اور میرے وعدے جھوٹے۔ پس اسی سے تم سمجھ سکتے تھے کہ اگر مجھ میں بھی کوئی خدائی طاقت ہو تو میں بھی اپنے وعدوں کو پورا کروں۔ اور اب جو تم مجھ سے مدد مانگتے ہو تو میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ کیونکہ میں کوئی خدا کا شریک تو ہوں نہیں۔

وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾
تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَ
يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾
وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨ اجْتُثَّتْ

آسمان میں (پھیلی ہوئی) ہیں ۱۶۵۱
وہ اپنے رب کے حکم سے اپنا پھل ہر موسم میں دیتا ہے اور اللہ تو
لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔
اور ناپاک بات کی مثال گندے درخت کی طرح ہے جو زمین کے

چھوٹوں کی غلطی سے بڑے گمراہ ہوتے ہیں: دوسرے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ میں نے جو خدا کا انکار کیا تو اس کی وجہ خود تمہارا شرک ہے اگر تم مجھے خدا کا شریک نہ بناتے تو میں بھی اس کا کافر نہ ہوتا اور اس صورت میں شیطان سے مراد وہی سردار ہو گا جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہے انا کنا لکم تبعاً۔ گویا جب کمزوروں نے بڑوں سے درخواست کی کہ ہم تمہاری بات مان کر تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے تو وہ بڑے یہ جواب دیتے ہیں کہ تمہارے پیچھے چلنے نے ہی تو ہمیں کافر بنایا اور یہ بالکل سچ ہے کہ اکثر لوگ دنیا میں جو اپنے لیے خدا کی برابری کا دعویٰ کرتے ہیں اور جو چاہتے ہیں اپنے پیروؤں سے منواتے ہیں تو اس کی وجہ عوام الناس کی حماقت ہوتی ہے جب لوگ ایک شخص کو بڑا بنانا شروع کریں تو وہ کیوں بڑا نہ بنے گویا جب عوام نے یہ کہا کہ ہم تمہاری پیروی کی وجہ سے ہلاک ہوئے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی بڑا بنانے سے کافر ہوئے اور کفر میں بڑھتے گئے گویا تم ہماری ہلاکت کا موجب ہوئے اور ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ میں اس بات کا انکار کرتا ہوں کہ تم نے مجھے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں شریک بنایا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا اور میں بُرے کاموں کی طرف بلاتا تھا۔

اس آیت میں یہ دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے سچے ہوتے تھے اور شیطان کے وعدے جھوٹے اور اس کا نظارہ ہم اس دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ نیکی پر خوشی کا وعدہ جو اللہ تعالیٰ دیتا ہے ہمیشہ سچا ثابت ہوتا ہے اور بدی پر خوشی کا وعدہ جو شیطان دیتا ہے ہمیشہ جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ اور جو لوگ بد صحبت میں بیٹھ کر تباہ ہوتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ جس جس شیطان نے جو جو کہہ کر ان کو بدی کی طرف مائل کیا تھا وہ آخر کار سب جھوٹ نکلا۔ دوسری بات یہ ہے کہ شیطان کا نیکوں پر تو کیا بدوں پر بھی کوئی تسلط نہیں۔ وہ صرف ایک تحریک ہوتی ہے جو انسان اپنی بدبختی سے جھٹ پٹ قبول کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر شیطان کو مسلط نہیں کیا بلکہ لوگ خود اس کا اتباع اختیار کرتے ہیں۔

ع۱۶۵۱ اصل۔ کسی چیز کا اَصْل اس کا سب سے نیچے کا حصہ ہے (ل)، یا وہ چیز جو اس کے لیے بطور بنیاد ہے کہ اگر اس کو اٹھایا جائے تو ساری شے ساتھ اُٹھ جائے (غ)۔

فَرْع کے معنی شاخ ہیں اور اس کی جمع فُرُوع ہے اور یہ دو لحاظ سے ہے ایک طول یعنی بلندی کے لحاظ سے کیونکہ فَرَعَ کے معنی طال ہیں اور دوسرا بلحاظ عرض جیسے تَفَرَّعَ کے معنی پھیل گیا۔

اس آیت میں کلمہ طیبہ اور آیت ۲۶ میں کلمہ خبیثہ کی مثال دی ہے جس سے مراد حق اور باطل ہیں کلمہ طیبہ سے کسی نے لا الٰہ اِلَّا اللّٰہ کسی نے قرآن، کسی نے دعوت الی الاسلام مراد لی ہے۔ مگر کلمہ حق میں یہ سب کچھ داخل ہے ایسا ہی کلمہ خبیثہ سے مراد کفر، کذب وغیرہ لیا گیا ہے جو سب کچھ باطل میں داخل ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ حق بات کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑ زمین میں مضبوط لگی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوں، یعنی بلند بھی ہوں اور ویسے بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ یہ مثال صرف سمجھانے کے لیے ہے آیا مراد اس سے کھجور کا درخت ہے؟ صحیح حدیث میں مسلم کی مثال کھجور کے درخت سے دی ہے کیونکہ اس کی کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ مگر یہاں مسلم کی مثال نہیں بلکہ حق بات کی مثال ہے اور اس میں سمجھایا ہے کہ جس طرح ایک درخت جس کی جڑ زمین میں لگی ہوئی ہو اس کی شاخیں آسمان میں پھیل جاتی ہیں اسی طرح کلمہ حق ہوتا ہے کہ اس کا اصل مضبوط ہوتا ہے اور اس کی فروع سب اس اصل سے تعلق رکھتی ہیں گو کتنی بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ پس وہ فروع سب ایک اصل کے ماتحت ہوتی ہیں اور اصل اور فروع کا تعلق اسی طرح دلائل عقلی سے روشن ہوتا ہے جس طرح درخت کی جڑ اور شاخوں کا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس مثال میں یہ بھی سمجھایا ہے کہ جس طرح درخت کی جڑ پانی کے ذریعہ سے غذا حاصل کرتی ہے اور اس کی آسمان میں پھیلی ہوئی شاخیں ہوں اور دھوپ وغیرہ سے بھی ساتھ ساتھ اپنی غذا حاصل کرتی چلی جاتی ہیں اسی طرح حق کے اصل اصول تو وحی الٰہی سے قائم ہوتے ہیں جو بمنزلہ پانی کے ہے مگر اس کی فروع کو علاوہ اس غذا کے حالات پیش آمدہ سے بھی جو ان کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں غذا ملتی رہتی ہے یہ اجتہاد کے ذریعہ سے ان فروع کا نشو و نما پاتا ہے۔

اشجار بہشت اعمال انسانی سے پیدا ہوتے ہیں: یہاں بہشت کے ذکر کے بعد فوراً اس مثال کو بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مثال کا تعلق بہشت سے بھی ہے۔ بہشت کا نقشہ عموماً ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور یہاں کلمہ حق کو درخت سے مثال دیکر بتا دیا کہ بہشت کے درخت اور ثمرات اسی کلمہ حق کا ہی نتیجہ ہیں جس کو قبول کر کے انسان اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ گویا ہر کلمہ حق بمنزلہ ایک بیج کے ہے جس سے ایک ایسا درخت بن جاتا ہے جو ہمیشہ اپنا پھل دیتا رہتا ہے (آیت ۲۵) یعنی دنیا کے درختوں کی طرح نہیں کہ سال میں ایک آدھ دفعہ پھل دے دیا بلکہ اس کا پھل ہر وقت موجود رہتا ہے یہی انسان کے اعمال ہی آخر کار باغوں اور پھلوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہاں اس عالم میں وہ زیادہ تر نظروں سے مخفی رہتے ہیں عالم آخرت میں کھلے کھلے نظر آجاتے ہیں۔ گویا ہر شخص کے اعمال کے مطابق ہی اس کے لیے بہشت تیار ہوتا ہے۔

مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾
يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ
ع اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿٢٧﴾
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ
كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾
جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۗ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾
وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ
قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿٣٠﴾
قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً
مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ
وَلَا خِلٰلٌ ﴿٣١﴾
اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

اوپر سے ہی اُکھاڑ پھینکا جائے اس کو کچھ بھی قرار نہیں ۱۶۵۲
اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں یقینی بات کے ساتھ مضبوط کرتا
ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو ہلاک
کرتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۱۶۵۳
کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری
سے بدلا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتارا ۱۶۵۴
(یعنی) دوزخ میں اس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔
اور اللہ کے شریک بناتے ہیں تاکہ اس کے رستہ سے گمراہ کریں، کہہ
(دنیا میں) فائدہ اُٹھا لو آخر کار تمھیں دوزخ کی طرف ہی جانا ہے۔
میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہہ دے کہ وہ نماز کو قائم کریں
اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا ہے چھپے اور کھلے خرچ کریں اس سے
پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ لین دین ہوگا اور نہ دوستی
کام آئے گی ۱۶۵۵
اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے

۱۶۵۲ اجتثت۔ کسی چیز کا جُثّہ اس کا وہ وجود ہے جو نظر آرہا ہو۔ اور اِجْتِثَات اس کے جُثّہ کا نکال پھینکنا ہے۔
جس طرح حق بات کی مثال ایک مضبوط جڑ والے درخت سے دی ہے باطل کی مثال اس درخت سے دی ہے جس کی جڑ زمین کے اندر مضبوط نہیں بلکہ ذرا سے مقابلہ پر وہ سارے کا سارا اکھڑ جاتا ہے اور یہی باطل کا قاعدہ ہے کہ اسے قیام کچھ نہیں ہوتا۔ ایک دلیل سے پاش پاش ہو جاتا ہے ان دو مثالوں کو لا کر یہ بتایا کہ قرآن کی حقانیت ایسی زبردست ہے کہ کوئی دلائل اسے توڑ نہیں سکتیں بلکہ جوں جوں عقلی دلائل ترقی کریں گی توں توں اس کی مضبوطی اور اس کی شاخوں کی بلندی ظاہر ہوتی جائے گی اور باطل کو کبھی بھی قرار نہیں ہوگا۔ یہی حال تمام ان عقاید کا ہے جو اسلام کے خلاف ہیں کہ وہ کسی اصل کے ماتحت نہیں اس لیے فوراً گر جاتے ہیں۔

۱۶۵۳ اس آخری آیت میں بتا دیا کہ اصول حقہ کا یہ اثر مومن کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے یہاں بھی اور آخرت میں۔ پس جس شخص کو ایسی مضبوطی حاصل نہیں اس کا ایمان بھی ناقص ہے۔
یضل اللہ الظالمین میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام سے تو لوگوں کو مضبوط ہی کرتا ہے مگر جو لوگ خود ظلم کا طریق اختیار کرتے ہیں انہیں انکی گمراہی کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے۔

۱۶۵۴ بوار۔ کساد یا سرد بازاری کا بہت ہو جانا ہے اس لیے اس کے معنی ہلاکت ہو گئے ہیں بَارَ یَبُوْرُ۔ تجارۃ لن تبور (فاطر ۳۵-۲۹) و مکر اولئک ھو یبور (فاطر ۳۵-۱۰) و کنتم قوما بورا (الفتح ۴۸-۱۲)
نعمت سے مراد وحی الٰہی یا قرآن ہے اور اس کے تبدیل کرنے سے مراد اس کا قبول نہ کرنا اور اس کی جگہ کفر کا لینا ہے گویا اس نعمت کو دیکر کفر لیا۔ یہ اہل مکہ کی طرف اشارہ ہے جو اب نعمت الٰہی کی قبولیت کی جگہ رسول اللہ صلعم کو جو اس نعمت کے لانے والے تھے گھر سے نکال رہے تھے جس کا نتیجہ ان کی قوم پر ہلاکت کا آنا ہوا۔

۱۶۵۵ نماز کا قائم کرنا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ان مشکلات کا علاج بتایا جو کفار کی طرف سے اس وقت پیش آرہی تھیں۔ بیع اور خلت کے نہ ہونے پر دیکھو ۳۲۸۔

وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ﴿٣٢﴾

پانی اتارا پھر اس کے ساتھ تمھارے لیے پھلوں سے رزق نکالا اور کشتیوں کو تمھارے کام میں لگایا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور دریاؤں کو تمھارے کام میں لگایا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿٣٣﴾

اور سورج اور چاند کو جو ایک قانون پر چل رہے ہیں تمھارے کام میں لگایا اور رات اور دن کو بھی تمھارے کام میں لگایا۔

وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ﴿٣٤﴾ ع

اور جو کچھ تم مانگو اس میں سے تمھیں دیتا ہے اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انھیں گن نہ سکو گے، یقیناً انسان بڑا ہی ظالم بڑا ناشکر گزار ہے ۱۶۵۶

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ﴿٣٥﴾

اور جب ابراہیمؑ نے کہا، میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کر ہم بتوں کی پرستش کریں ۱۶۵۷

۱۶۵۶ تحصوا۔ حَصٰی کنکری کو کہتے ہیں اور چونکہ پہلے کنکریوں سے گنتی کی جاتی تھی (یا چونکہ کنکریوں سے گنتی سکھائی جاتی ہے) اس لیے اِحْصَاء کے معنی گنتی کے ذریعہ سے کسی چیز کا حاصل کر لینا یا اس کا احاطہ کر لینا ہیں واحصٰی کل شیءٍ عددا (الجن ۷۲-۲۸) علم ان لن تحصوہ (المزمل ۷۳-۲۰)

ظَلُوم اور کَفَّار۔ ظالم اور کافر سے مبالغہ کے صیغے ہیں بڑا ظالم بڑا ناشکر گزار۔

سورج چاند وغیرہ کی تسخیر: اوپر کی دونوں آیتوں میں جب یہ ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کشتیوں اور دریاؤں کو۔ سورج اور چاند کو۔ رات اور دن کو انسان کے لیے مسخر کر رکھا ہے اور اس کے کام میں لگا دیا ہے تو یہاں اس کو عام کر کے بیان فرمایا کہ یہ کیا ہر چیز کو تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور تم اس سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ ہاں ان چیزوں سے پھر تم اس قدر فائدہ اٹھاتے ہو جس قدر مانگو اور وہ مانگنا اپنے عمل سے ہے۔ ہوائیں بادل بجلیاں آگ پانی یہ سب چیزیں انسان کی خدمت میں لگائی ہیں۔ کیونکہ انسان ان سے منفعت حاصل کرتا ہے مگر پھر جس قدر زیادہ ان سے وہ خود کام لے اسی قدر زیادہ نفع اٹھائے گا۔ پس جس طرح دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ کی روحانی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ ان کو کیوں ظلم اور ناشکری سے پھینکتے ہو۔ وحی الٰہی اسی طرح تمھیں روحانی طور پر فائدہ پہنچانے والی چیز ہے جس طرح جسمانی رنگ میں یہ نعمتیں اس لیے جب تم اسے رد کرتے ہو تو اس کے فائدے سے محروم ہو کر اسی طرح دکھ اٹھاتے ہو جس طرح جسمانی نعمتوں سے محروم ہو کر بھی نتیجہ دکھ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس میں یہ بھی سمجھایا ہے کہ جن چیزوں کو تم اپنا معبود بناتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمھاری خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔

۱۶۵۷ سلسلۂ نبوت کا نظم: اس سارے رکوع میں صرف اس دعا کا ذکر ہے جو حضرت ابراہیم نے مکہ اور اہل مکہ کے لیے اور اپنی اولاد کے لیے کی۔ اور اس سے پہلے اور پیچھے دونوں طرف مخالفت حق اور اس کے انجام کا ذکر ہے یہ مضمون بے تعلق نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مذہب اور وحی الٰہی کا سلسلہ سب ایک نظم میں منسلک ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کو اپنے اسی ارادہ کے مطابق دنیا میں مبعوث فرمایا ہے جو وہ مدتوں پیشتر انبیاء پر ظاہر فرما چکا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم گویا ایک جڑ کی طرح ہیں کیونکہ وہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کے لیے بطور جد کے ہیں اور یوں گویا یہ بھی ایک تشریح ہے اس اصول کی جو آیت ۲۴ میں بیان فرمایا کہ حق ایک درخت کی طرح ہے جس کی جڑ زمین میں قائم ہے اور شاخیں چاروں طرف آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں اور حضرت ابراہیم کے مذہب کا اصل الاصول بھی وہی توحید الٰہی تھا جو سب مذاہب کے لیے بطور ایک جڑ کے ہے۔ کوئی مذہب نہیں جس نے ایک خدا کے ساتھ تعلق قائم کرنے کو بطور اصل اور جڑ نہ ٹھہرایا ہو۔ اسی لیے حضرت ابراہیم کی دعا میں بھی سب سے پہلے ذکر توحید الٰہی کا کیا ہاں اس توحید کے ذکر کے ساتھ یہ بھی دعا ہے کہ مکہ امن والا شہر ہو سو اسلئے کہ اس میں خانہ کعبہ تھا جو وہ بھی توحید کے لیے بطور نشان ابتدائے عالم سے قائم کیا گیا اور ایک خدا کی پرستش کا سب سے پہلا معبد دنیا میں یہی ہوا۔

حضرت ابراہیم کی یہ دعا عصمت انبیاء کے خلاف نہیں۔ اس لیے کہ وہ عصمت حاصل ہی اس سے ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتے اور اس سے مدد طلب کرتے رہتے ہیں اسی لیے حفاظت الٰہی ان کے شامل حال رہتی ہے عصمت انبیاء کا اگر یہ مطلب ہوتا کہ وہ کوئی علیحدہ قوٰی کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں تو انبیاء

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٦﴾

میرے رب! انھوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے، سو جو میری پیروی کرے تو وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے؏۱۶۵۸

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿٣٧﴾

ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے عزت والے گھر کے پاس اس وادی میں بسایا ہے جہاں کھیتی نہیں ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں سو تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے اور ان کو پھلوں سے رزق دے، تاکہ وہ شکر کریں؏۱۶۵۹

کی عصمت ہمارے لیے کچھ مفید نہ ہو سکتی تھی۔ ان کی عصمت کا راز ہی یہ ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر حال میں حفاظت الٰہی طلب کرتے رہتے ہیں اور اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کرتے اور ان کی عصمت کے اس راز کو سمجھ کر ہی ہم بھی گناہوں سے بچ سکتے ہیں کہ ان کی طرح اپنے نفسوں پر بھروسہ نہ کریں بلکہ ہر حال میں حفاظت الٰہی کے طالب ہوں لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین نبی کریم صلعم کی دعا ہمارے لیے کیسی اچھی تعلیم ہے۔

؏۱۶۵۸ آیت کے پہلے حصہ میں بتوں کو لوگوں کے گمراہ کرنے والے ٹھہرایا ہے اور یہ اسناد بطور مجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بت پرستی سے لوگ گمراہ ہو گئے ورنہ بت تو بے جان ہیں وہ گمراہ نہیں کرتے پچھلے حصہ میں انبیاء کی وسعت قلبی اور رحم دلی کا نقشہ ہے۔ وہ نافرمانوں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی صفت غفر اور رحم کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی اس دعا میں آپ کے اس فرزند کی حالت قلبی کا بھی نقشہ کھینچا ہے جو رحمۃ للعالمین کرکے بھیجا گیا۔ اس لیے اس کے دشمن یوں تباہ نہ ہوئے جیسے انبیائے سابق کے مخالفوں کی ہلاکت کا نقشہ قرآن شریف نے کھینچا ہے بلکہ زیادہ حصہ اللہ تعالیٰ کے غفر اور رحم کی صفات کے نیچے آکر ہدایت پر آگیا۔ اور چونکہ جو نقشہ حق کے مخالفین کی ہلاکت کا اس سورت میں کھینچا ہے اس میں خاص مقصود تو نبی کریم صلعم کے ہی دشمن ہیں اس لیے حضرت ابراہیم کی اس دعا میں یہ بتایا ہے کہ کچھ ہلاک ہو کر بہت غفر اور رحم کے نیچے آ جائیں گے۔

۱۶۵۹ تھوی۔ ھَوٰی کے ایک معنی ؏۹۶۴ میں بیان ہو چکے ہیں۔ اور گو یہ لفظ مطلق عموماً مذموم ہوتا ہے یعنی ادنیٰ یا گری ہوئی خواہشات پر بولا جاتا ہے مگر اچھے معنی میں بھی اس کا استعمال ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے متعلق تقرّب الی اللہ بھوانہٗ اپنی ہوا یعنی محبت سے اللہ کا قرب حاصل کیا۔ اور اچھے کاموں کی محبت کے متعلق ہی اس کا استعمال رسول اللہ صلعم کے لیے بھی ہوا ہے۔ جیسے حضرت عائشہؓ کی حدیث میں یسارع لك ربك فی ھواك یعنی جن اچھی باتوں کی طرف آپ کا میلان ہے ان میں آپ کا رب آپ کو بہت جلد عطا فرماتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ھوی کے معنی کسی چیز کی محبت اور اس کا دل پر غالب آجانا ہیں (ل) حدیث میں ہے یاخذ کلّ واحد من البیع ماھوی جس کے معنی ہیں ما احبّ یعنی جس چیز سے محبت کرتا ہے (ن) اور ھوٰی یھوی ھویًا اور ھویًا دونوں طرح آتا ہے اور ھَوِیّ کے معنی نیچے کی طرف آنا ہیں اور ھُوِیّ کے معنی اوپر کی طرف جانا یا اس کے خلاف اور ھوٰی یھوی کے معنی چلنے میں تیزی بھی ہیں اور تھوی الیھم میں معنی ان کی طرف مائل ہونے کے بھی کیے گئے ہیں اور بلند ہونے کے بھی اور ان کا ارادہ کرنے کے بھی اور ان کی طرف جلدی کرنے کے بھی (ل) اور ھواء وہ ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان ہے اور آیت ۴۳ میں افئدتھم ھواء اسی لحاظ سے ہے یعنی جیسے خلا میں ہوا ہوتی ہے (غ) گویا وہ خالی ہیں یعنی عقل سے خالی یا خوف کی وجہ سے کسی چیز کو محفوظ نہ رکھ سکیں گے (ل)

یہ حضرت اسمٰعیل کے خانہ کعبہ کے پاس چھوڑنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں لفظ اَسْكَنْتُ لا کر بتا دیا ہے کہ یہ چھوڑنا محض اخراج کے طور پر نہ تھا بلکہ مصلحت الٰہی کا تقاضا تھا کہ حضرت ابراہیم کی اولاد کا ایک حصہ یہاں آباد ہو اور حدیث میں بھی ہے کہ یہ چھوڑنا حکم الٰہی سے تھا۔ اور واد غیر ذی زرع اسے کہا اس لیے کہ وہ پتھریلی زمین ہے جہاں سبزی وغیرہ نہیں ہوتی اور بارش بھی بہت کم ہوتی ہے اس لیے وہ زراعت کے لیے موزوں نہ تھی۔ اس لفظ کے لانے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ انہیں محض رضائے الٰہی کے ماتحت یہاں چھوڑا ہے کسی غرض دنیوی کے لیے نہیں اسی کی تائید کے لیے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا لیقیموا الصلٰوۃ یعنی غرض یہ ہے کہ قیام صلوٰۃ ہو جس میں حصول رضائے الٰہی مدنظر ہے نہ کوئی دنیوی غرض۔ اور عند بیتك المحرم کے لفظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیت الحرام یعنی خانہ کعبہ وہاں موجود تھا۔ حالانکہ حضرت ابراہیم کے بنانے کا جو ذکر ہے، اس میں حضرت اسمٰعیل کی شمولیت موجود ہے و اذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمٰعیل (البقرۃ - ۱۲۷) لیکن جب اسمٰعیل کو وہاں چھوڑا تو ان کی عمر چھوٹی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں مکہ کے رہنے والوں کے لیے محبت کا پیدا کرنا خود خانہ کعبہ کی محبت کے قائمقام ہے یہ دعا بھی کیا عجیب ہے اس مقام کے لیے جذب اور کشش پیدا ہونے کی دعا ہے جہاں کوئی بھی ظاہری سامان کشش کا نہیں، یہاں تک کہ وہ جگہ زراعت سے بھی خالی ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ تا ایک اللہ کے نام کے سوائے یہاں کوئی دوسری کشش نہ ہو اور صرف دینی

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝۳۸

ہمارے رب تو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور اللہ پر کوئی چیز بھی چھپی نہیں رہتی (نہ) زمین میں اور نہ آسمان میں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝۳۹

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسمٰعیل اور اسحاق دیئے، یقیناً میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ۝۴۰

میرے رب مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے (بھی) ہمارے رب اور میری دعا کو قبول فرما۔

ع ۱۸ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝۴۱

ہمارے رب! میری حفاظت فرما اور میرے باپ کی اور مومنوں کی بھی جس دن حساب قائم ہو۔ ۱۶۶۰

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ڛ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝۴۲

اور اللہ کو اس سے بے خبر نہ سمجھ جو ظالم کرتے ہیں، وہ صرف ان (کے معاملہ) کو اس دن تک پیچھے ڈال رہا ہے جب آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ ۱۶۶۱

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْــِٕدَتُهُمْ هَوَاۗءٌ ۝۴۳

بھاگے جا رہے ہونگے اپنے سر اٹھائے ہوئے ان کی نگاہ ان کی طرف نہ پھرے گی اور ان کے دل خالی ہوں گے۔ ۱۶۶۲

فوائد کے لیے ہی یہ جگہ مخصوص رہے ہاں یہ بھی دعا ہے کہ کھانے کو بھی اُنہیں ملتا رہے گو وہ اشیائے خوردنی وہاں باہر سے ہی جائیں۔ اگلی آیت میں یہ بتایا ہے کہ نیت اور ارادہ کا جاننے والا اللہ تعالیٰ ہے ہماری نیتوں میں کوئی دنیا کی ملونی نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو ایسا بابرکت کیا کہ ساری دنیا کے دل اس کی طرف کھچے چلے جاتے ہیں۔

۱۶۶۰ع یہ ضروری نہیں کہ یہ ساری دعا ایک ہی موقعہ کی ہو۔ اس کا آخری حصہ جو آیت ۳۹ سے شروع ہوتا ہے بڑھاپے کے زمانے کا ہے جب حضرت اسمٰعیل اور اسحاق دونوں پیدا ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت ماں اور باپ کے لیے دعائے استغفار کرنا صاف بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے جس اَبْ کا ذکر دوسری جگہ ہے وہ کوئی اور بزرگ تھے۔ کیونکہ ان سے بعد میں بیزاری کا اظہار بھی کیا تھا۔ فلمّا تبیّن لہ انّہ عدو للہ تبرا منہ (التوبة ۹-۱۱۴)

۱۶۶۱ع یوخر: تاخیر ضد تقدیم ہے یعنی کسی معاملہ کا پیچھے لانا۔

تشخص۔ شَخْصُ انسان کا سواد ہے جو دور سے نظر آتا ہے۔ اور ہر جسم جس کے لیے ارتفاع اور ظہور ہو۔ اس لیے شَخَصَ کے معنی اِرْتَفَعَ آتے ہیں یعنی ایک چیز بلند ہو گئی اور شَخَصَ الْبَصَرُ کے معنی ہیں آنکھ کھل گئی اس طرح کہ پھر جھپکی نہ جائے اور حدیث میں میت کے ذکر میں ہے شَخَصَ بَصَرُہٗ جس سے مراد ہے پلکیں اوپر اٹھ گئیں اور نظر محدود ہو گئی (ل) فاذا ھی شاخصة ابصار الذین کفروا (الانبیاء ۲۱-۹۷)

عذاب کے وقت کا نقشہ: ظالم جو حق کو مٹانا چاہتے ہیں اور جب اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتے چلے جاتے ہیں تو اکثر دلوں میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ دیکھتا نہیں پھر انہیں پکڑتا کیوں نہیں جس کا جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ان کے معاملہ میں تاخیر کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دن آپہنچتا ہے جب آنکھیں پھٹی رہ جاتی ہیں اور وہ موت کا وقت ہے۔ مراد اس سے یا تو واقعی مجرم کی موت ہو سکتی ہے اور یا عذاب کا دن جب اکثر دلوں پر وہ کیفیت وارد ہوتی ہے جس کا نظارہ موت کے وقت دیکھا جاتا ہے اور اگلی آیت سے ظاہر ہے کہ یہ عذاب کا دن ہے جب عذاب کی سختی سے مجرموں کی کیفیت اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو حالت نزع میں ہو۔

۱۶۶۲ع مھطعین۔ ھَطَعَ اور اَھْطَعَ کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف آیا اپنی آنکھ اس پر لگائے ہوئے اور اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ خوف سے دوڑتا ہوا اور یہ صرف خوف کی حالت پر بولا جاتا ہے اور ایک قول میں مُھْطِع وہ ہے جو عاجزی اور ذلت کی حالت میں دیکھے اور مُقْنِع وہ جو سر اٹھائے ہوئے ذلت کی حالت میں دیکھے مھطعین الی الداع (القمر ۵۴-۸)

وَأَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ
فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخِّرْنَا
إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۙ نُجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ
الرُّسُلَ ۗ أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِنْ
قَبْلُ مَا لَكُمْ مِنْ زَوَالٍ ﴿٤٤﴾

اور اس دن سے لوگوں کو ڈرا جب اُن پر عذاب آجائے گا جو ظالم ہیں کہیں گے ہمارے رب! ہمیں ایک قریب وقت تک تاخیر دے، ہم تیری دعوت کو مانیں اور رسولوں کی پیروی کریں اور کیا تم پہلے قسمیں نہ کھایا کرتے تھے کہ تم پر زوال نہیں آئے گا ع۱۶۶۳

وَسَكَنْتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا
أَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ
وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ ﴿٤٥﴾

اور تم اِن لوگوں کی جگہوں میں آباد ہوئے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور تمھارے لیے کھل چکا ہے کہ ہم نے ان سے کیا کیا اور ہم نے تمھارے لیے مثالیں بیان کیں ع۱۶۶۴

وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ
مَكْرُهُمْ ۗ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ
لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿٤٦﴾

اور انھوں نے اپنی چال چلی اور ان کی چال اللہ کے اختیار میں ہے اور گو اُن کی چال ایسی ہی ہو کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں ع۱۶۶۵

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ
رُسُلَهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٤٧﴾

سو یہ گمان نہ کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے اپنے وعدے کا خلاف کرے گا، اللہ غالب سزا دینے والا ہے ع۱۶۶۶

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ
وَالسَّمَاوَاتُ ۖ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿٤٨﴾

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی اور (لوگ) اللہ اکیلے سب پر غالب کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے ع۱۶۶۷

مقنعی ۔ قَنَاعة تھوڑی چیز پر راضی ہو جانا ہے اور قُنُوع سوال کرنا ہے جس سے قانع ہے (اطعموا القانع والمعتر (الحج ۲۲-۳۶) جس سے مراد سائل ہے یا ایسا سائل جو تھوڑے پر راضی ہو جائے اور الحاح نہ کرے اور اَقْنَعَ رأسَهٗ کے معنی ہیں اپنا سر اٹھایا۔ کیونکہ قِنَاع وہ ہے جس سے سر ڈھانکا جاتا ہے (غ)

یہاں وہ نقشہ کھینچا ہے جب بڑے بڑے مغرور اور متکبر انسان آخرکار مغلوب ہوتے ہیں اور انھی لوگوں کے سامنے جن پر انہوں نے ظلم کیا تھا ذلت کی حالت میں آتے ہیں شرمندگی کے مارے سر نیچا بھی ہے اور دہشت کی وجہ سے اُٹھا ہوا بھی ہے۔

ع۱۶۶۳ زوال ۔ زال کے معنی ہیں ایک چیز اپنی حالت یا طریق سے الگ ہو گئی لتزول منه الجبال (۴۶) ان تزولا (فاطر ۳۵-۴۱) ولئن زالتا (فاطر ۳۵-۴۱) اور زوال صرف اس چیز کے متعلق کہا جاتا ہے جو پہلے ثابت یعنی مضبوط ہو اور پھر وہ حالت اس کی بدل جائے اور زوال آفتاب بھی اسی لحاظ سے ہے کہ دوپہر کے وقت وہ ثابت معلوم ہوتا ہے (غ)

یہاں صاف اشارہ ہے کہ مخالفین کے اقتدار اور قوت کے ٹوٹنے کا وقت آجائے گا اس لیے ان کو وہ وقت یاد دلایا ہے جب اپنی طاقت کے نشہ میں سرشار وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری قوت اور سلطنت کبھی زوال نہ دیکھے گی۔

ع۱۶۶۴ اس سے مراد وہ قومیں ہیں جو پہلے عرب میں یا اس کے اردگرد حکمران تھیں جن کے تذکرے اور انجام قرآن شریف میں مذکور ہیں۔

ع۱۶۶۵ قریش کی تدابیر: اس میں قریش کا ذکر ہے اور یہ ان کی چال وہی ہے جس کا ذکر دوسری جگہ فرمایا اذ یمکربك الذين كفروا ليثبتوك او يقتلوك او يخرجوك (الانفال ۸-۳۰) اور یہ ان کی چال تو اس قدر مضبوط تھی کہ پہاڑوں کو بھی اڑا دیتی مگر اللہ جو سب سے طاقتور ہے اس کے اختیار میں ہی ہر بات ہے اس لیے وہ ان کی چال کو سرسبز نہ ہونے دے گا۔ یہی معنی ہیں عند الله مكرهم کے۔

ع۱۶۶۶ اس پر اس قدر زور اس لیے دیا کہ ابھی بڑی بڑی مشکلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آنے والی تھیں۔ جہاں بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ دین اسلام کا خاتمہ ہو گیا اس لیے فرمایا کہ یہ کبھی ہو نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہو کر رہے گا۔

ع۱۶۶۷ وعدۂ عذاب دنیا کے لیے ہی ہے: قرآن کریم میں جس قدر وعدے عذاب کے کفار کے ساتھ ہیں وہ آخرت پر بھی چسپاں ہو سکتے ہیں اور دنیا پر بھی۔ یہی

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿۴۹﴾

اور تُو اُس دن مجرموں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھے گا [۱۶۶۸]

سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

اُن کے کُرتے رال کے ہونگے اور ان کے مونہوں کو آگ ڈھانک لے گی [۱۶۶۹]

لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

تاکہ اللہ ہر نفس کو وہ بدلہ دے، جو اس نے کمایا، بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع ۷ ۱۹

یہ لوگوں کو کھولکر پہنچا دینا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے ڈرائے جائیں اور تاکہ وہ جان لیں کہ وہ صرف ایک ہی معبود ہے اور تاکہ خالص عقل والے نصیحت حاصل کریں [۱۶۷۰]

زمین وآسمان کا بدل جانا قیامت میں بھی درست ہے اور ایک معنی میں جب عرب اسلام کے سامنے جھک گئے اور چاروں طرف بت پرستی کی جگہ توحید کا نقارہ بج گیا۔ بتوں کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ شراب خوری اور زنا مٹ گئے۔ جہالت کی جگہ علوم کی نہریں بہنے لگیں تو یہ بھی واقعی زمین وآسمان کے بدل جانے کا ہی نظارہ تھا اور اگلی آیت میں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہونے کا نظارہ بھی جنگوں میں دیکھ لیا گیا۔

ع ۱۶۶۸ مقرنین۔ قرن یا اقتران دو یا زیادہ چیزوں کے اجتماع کا نام ہے اور قَرَّنَ میں تکثیر پائی جاتی ہے قَرِین ہمنشین۔ قُرُون نسل اسی معنی کے لحاظ سے ہیں او جاء معه الملائكة مقترنين (الزخرف ۴۳۔ ۵۳)

اصفاد۔ صَفَد کی جمع ہے جس کے معنی زنجیر ہیں۔

ع ۱۶۶۹ سرابیل۔ سِربال کی جمع ہے۔ کرتہ کسی چیز کا بھی ہو۔ سرابیل تقیکم الحر وسرابیل تقیکم باسکم (النحل ۱۶۔ ۸۱)

قطران۔ قُطر کے معنی جانب ہیں جس کی جمع اقطار ہے اَنْ تنفذ وا من اقطار السموات والارض (الرحمٰن ۵۵۔ ۳۳) ولو دخلت علیهم من اقطارها (الاحزاب ۳۳۔ ۱۴) اور قَطَّرَ اور تَقَطَّرَ کے معنی ہیں اپنی جانب پر گرا جس سے مراد بارش کا گرنا ہے اور قطران وہ چیز ہے جو هِنَاء یعنی رال سے گرتی ہے اور اٰتونی افرغ علیہ قطرا (الکہف ۱۸۔ ۹۶) میں قِطر پگھلا ہوا تانبا ہے (غ)

ع ۱۶۷۰ نتیجۂ تبلیغ: نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو شناخت کرلیں۔ سو ایسا ہی ہوا کہ کل عرب نے توحید الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا اور جو نظارہ عرب میں پیش آیا اس کو دنیا بھی عنقریب کسی نہ کسی رنگ میں دیکھ لے گی۔

سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ (۱۵)

آیاتھا ۹۹ — رکوعاتھا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اللہ بے انتہا رحم والے باربار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ۱
میں اللہ دیکھنے والا ہوں۔ یہ کتاب کی آیتیں ہیں اور قرآن کی جو کھول کر بیان کرنیوالا ہے [1671]

ربع رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ ۲
بسا اوقات کافر چاہیں گے کہ کاش! وہ مسلمان ہوتے [1672]

نام: اس سورت کا نام الحجر ہے اور اس میں چھ رکوع اور ننانوے آیات ہیں۔ حجر کے معنی پتھر ہیں۔ اور الحجر اس وادی کا نام ہے جس میں حضرت صالحؑ کی قوم یعنی ثمود رہتے تھے۔ اس قوم کا مسکن نہ صرف اہلِ مکہ کے بالکل قریب تھا بلکہ اس رستہ پر تھا جو مکہ سے شام کو جاتا تھا اور جس پر ان کے قافلے آتے جاتے تھے۔ اور سخت دلی میں بھی معلوم ہوتا ہے یہ قوم اپنی نظیر آپ ہی تھی۔ جو کچھ انہوں نے حضرت صالحؑ کے خلاف منصوبے اور سازشیں کیں وہ بعینہٖ ایسے تھے جیسے قریش نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیے۔ اسی مناسبت سے اس سورت کا نام الحجر ہے اور اس کے ساتھ ہی اس سورت میں دو اور قوموں کا ذکر ہے یعنی حضرت شعیب کی قوم اور حضرت لوط کی جن کے مسکن اسی راستہ پر تھے جس پر ثمود کا مسکن تھا اور یہ تینوں قومیں ایک ہی عذاب یعنی زلزلہ سے تباہ ہوئیں۔

خلاصہ مضمون: پہلے رکوع میں قرآن کریم کی حفاظت ابدی کا ذکر ہے یعنی نہ صرف یہ حق جو قرآن لایا ہے دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہے گا بلکہ تحریف وغیرہ سے بھی یہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگا، دوسرے رکوع میں بتایا کہ شیاطین اس حق کو نابود نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود اس سے نابود ہو جائیں گے اور کہانت نجوم وغیرہ اس کی بدولت مٹ جائیں گے۔ تیسرے میں بتایا کہ شیطان کے پیچھے لگ کر انسان حصول مقصد زندگی میں ناکام رہتا ہے اور چوتھے میں اس کے متعلق متقی کی کامیابی کا ذکر کیا۔ پانچویں میں لوطؑ اور شعیبؑ کی قوموں کی تباہی کا اور چھٹے کے شروع میں قوم ثمود کی بربادی کا ذکر کر کے اعدائے اسلام کو انذار کیا۔

تعلق: الٓرٰ مجموعہ کی یہ چھٹی سورت ہے۔ اس کے بعد جو ساتویں سورت اس مجموعہ میں آتی ہے الٓرٰ سے شروع نہیں ہوتی۔ جب پچھلی سورت میں مثال سے سمجھایا کہ حق کو کوئی طاقت نابود نہیں کر سکتی، تو اب یہاں نہایت صفائی سے قرآن کریم کی حفاظت ابدی کا ذکر کیا اور بتایا کہ باطل حق کو نابود نہیں کرے گا، بلکہ خود حق کے سامنے نابود ہو جائے گا۔ اور حق کا مقابلہ کرنے والوں میں سے وہ تین مثالیں پیش کیں جو اہل مکہ کی نظر کے سامنے شب و روز آتی تھیں۔ باقی تو عموماً تذکرے تھے جو وہ سنتے تھے مگر ان قوموں کا انجام اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے تھے۔

زمانہ نزول: اس سورت میں بھی کئی اشارات موجود ہیں کہ یہ مکہ کے آخری زمانہ کی نازل شدہ سورت ہے۔ بالخصوص مقتسمین کے ذکر میں ان کا قسمیں کھا کر آپ کے خلاف آخری تدابیر اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

[1671] یہاں قرآن مبین کا عطف الکتاب پر ہے۔ الکتاب سے مراد بھی قرآن شریف ہی ہے مگر چونکہ یہ لفظ جنس کتاب پر بھی بولا گیا ہے اور اس کے لانے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح پہلے انبیاء پر کتابیں نازل ہوتی رہیں اسی طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وحی ہے اس لیے قرآن کا لفظ ساتھ لا کر بتا دیا کہ آیندہ یہی کتاب دنیا میں پڑھی جائے گی اور ساتھ اس کی صفت بھی بیان کر دی کہ یہ ان تمام باتوں کو کھول کر بیان کرنے والی ہے، جو پہلی کتابوں میں اجمال کے طور پر بیان ہوئی ہیں اور قرآن کی تنکیر بمقابلہ الکتاب کے یہاں اس کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

[1672] رُبما۔ رَبّ کے معنی تربیت ہیں اور اسی سے اَرَبَّتِ السَّحَابَۃُ کے معنی ہو گئے ہیں بادل ہمیشہ رہا گویا بلحاظ اس کی تربیت یعنی سبزیوں کو نشو و نما دیتا رہنے کے اس میں اقامت کے معنی آ گئے اس لیے رَبّ میں استقلال کے معنی ہیں اور رُبّ اور رُبَمَا اس چیز پر بولا جاتا ہے جو بار بار ہوتی رہے (غ)
کافروں کی مسلمان ہونے کی آرزو: کب ایسی آرزو کریں گے؟ قیامت کے دن تو ایسا کرنا ظاہر ہی ہے جب انکشاف حقیقت پورے طور پر ہو جائے گا اور ضحاک کا قول ہے کہ موت کے وقت دنیا میں ہوگا۔ اور حضرت ابن مسعود کا قول ہے کہ یہ آیت کفار قریش کے بارہ میں ہے اور یہ ان کا آرزو کرنا بدر کے دن تھا، جب اہل اسلام کا غلبہ دیکھا (ر) ظاہر ہے کہ یہ پیشگوئی کا رنگ ہے اور رُبما لا کر بتایا کہ یہ اکثر اوقات میں ہوگا پس یہ ان کی آرزو ہر غلبہ کے وقت میں ہوگی جو اسلام کو حاصل ہوگا۔ یہاں تک کہ اس کے کامل غلبہ کا وقت آ جائیگا اور سیاق عبارت اسی کو چاہتا ہے کیونکہ ابھی پچھلی سورت کے آخری رکوع میں کفار کی مغلوبیت کا نقشہ کھینچا جا چکا ہے اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے کہ جب یہ اپنی مغلوبیت کے نظارہ کو دیکھیں گے تو پھر یہ بھی آرزو کریں گے کہ ہم مسلمان ہی ہوتے۔ یہی مضمون اگلی آیت کا بھی ہے جہاں صاف فرمایا کہ ایک غلط آرزو نے انہیں حق کی طرف سے غافل کر رکھا ہے اور اس سے بعد کی آیتیں جہاں ملائکہ کے آنے کا ذکر ہے

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۳

انھیں چھوڑ دو کھائیں اور فائدہ اُٹھائیں اور آرزوئے (دنیا) انھیں غافل کیے رکھے عنقریب جان لیں گے۔

وَمَآ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا، مگر اس کے لیے ایک میعاد مقرر تھی۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُوْنَ ۝۵

کوئی جماعت اپنے وقت سے پہلے نہیں جا سکتی اور نہ وہ پیچھے رہ سکتے ہیں۔

وَقَالُوْا يَآأَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶

اور کہتے ہیں اے شخص جس پر نصیحت اتاری گئی ہے، یقیناً تو پاگل ہے۔

لَوْ مَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷

تو فرشتوں کو ہمارے پاس کیوں نہیں لے آتا، اگر تو سچوں میں سے ہے۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا إِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝۸

ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر جب حکمت چاہتی ہو اور اس وقت اُن کو مہلت بھی نہ دی جائے گی ۱۶۷۳ع

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹

ہم نے خود یہ نصیحت اتاری ہے اور ہم خود ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ۱۶۷۴ع

جو جنگوں میں ہوا، سب اسی طرف اشارہ کر رہی ہیں کیونکہ اسلام میں اُن کو بُرائی تو کوئی نظر نہ آتی تھی، ہاں ان کے دلوں میں یہ تکبر بھرا ہوا تھا جس طرح آج مخالفین اسلام کے دلوں میں بھرا ہوا ہے کہ ہم اسلام کو تباہ کر کے رہیں گے سو ہر مغلوبیت کا نظارہ ان کے دلوں میں یہ آرزو پیدا کرنے والا تھا کہ کاش ہم مسلمان ہی ہو گئے ہوتے یہاں تک کہ کامل غلبۂ اسلام کے وقت جو فتح مکہ میں ہوا وہ آخر مسلمان ہو بھی گئے اس وقت بھی ان کو افسوس ہوتا ہی ہوگا کہ ہم نے کیوں خواہ مخواہ ایسی صداقت کی مخالفت کی اور اتنی مدت تک اس سے اپنے آپ کو محروم رکھا۔

ع۱۶۷۳ بالحق یا اقتضائے حکمت سے (دیکھو ع۶۵) فرشتوں کے اتارنے سے مراد یہ ہے کہ وہ تو تمہاری سزا کے لیے نازل ہونگے اس لیے آگے فرمایا کہ جب فرشتے آجائیں گے تو پھر سزا بھی ساتھ ہی آجائے گی۔ فرشتوں اور سزا کا آنا دو الگ الگ باتیں نہیں ان سب آیات میں ان کی مغلوبیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ جو مجنون کہتے ہیں (آیت ۶) تو مراد یہ ہے کہ یہ پاگلوں کی سی باتیں ہیں کہ ہم بھی کبھی مغلوب ہو جائیں گے۔

ع۱۶۷۴ الذکر قرآن شریف کے ناموں میں سے ایک نام ہے دیکھو ع۱۹۱ و ع۴۵۱ اور یہاں یہی مراد ہے۔ جیسا کہ آیت ۶ میں نزل علیہ الذکر کہہ کر صاف کر دیا ہے اور خود سیاق عبارت یہی چاہتا ہے کہ یہاں ذکر حفاظت قرآن کا ہے اس لیے کہ کفار کو اپنے ظاہری غلبہ پر فخر تھا اور پچھلی سورت میں ان کی تدابیر کا ذکر ہو چکا کہ وہ حق کو کس طرح ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں تو اب صفائی سے بتا دیا کہ کفار کا کتنا بھی غلبہ ہو وہ اس حق کو جو قرآن شریف میں نازل ہوا اب دنیا سے مٹا نہیں سکتے۔ نہ صرف یہ کہ وہ مٹا نہیں سکتے بلکہ اس میں کسی قسم کی تحریف کمی بیشی بھی نہ ہوگی کیونکہ اس کی حفاظت کو ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ برخلاف دیگر کتب سماوی کے جن کی حفاظت ان کے پیرؤوں کے سپرد کی گئی تھی جیسا کہ بما استحفظوا من کتاب اللہ (المائدۃ ۵ - ۴۴) سے ظاہر ہے۔

حفاظت قرآن سے مراد یہ ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی تغیر تبدل نہ ہو۔ یہ ایک دعوٰی ہے جس کی صداقت آج دشمنوں تک کو مسلم ہے۔ میور کہتا ہے جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔ پھر وان ہیمر کا قول نقل کرتا ہے "ہم ایسے ہی یقین سے قرآن کو بعینہٖ محمد (صلعم) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں جیسے مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں"۔ اور واقعات خود بھی بتاتے ہیں اس لیے کہ وہ کتاب جس کے پہلے دن سے لکھے جا کر بکثرت نسخے ہر قوم اور ہر ملک میں شائع ہوئے اور آخر مشرق سے مغرب تک پھیل گئے ان ہزار در ہزار قدیم ترین نسخوں میں ایک بھی ایسا نسخہ نہیں ملتا جس میں ایک حرف کا یا ایک زیر و زبر کا فرق ہو۔ اہل تشیع میں سے محقق اس کی حفاظت کے ہی قائل ہیں اور اگر نہ ہوں تو اس الزام کے نیچے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی خلافت میں قرآن کو کیوں مکمل نہ کیا۔ یہ ایک وسیع مضمون ہے جس پر پوری تحقیقات میں نے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ⑩

اور ہم تجھ سے پہلے اگلی اُمتوں میں رسول بھیج چکے ہیں۔

وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑪

اور کوئی رسول اُن کے پاس نہیں آتا رہا مگر اس سے وہ ہنسی کرتے تھے۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ⑫

اسی طرح ہم اسے مجرموں کے دلوں میں داخل کرتے ہیں۔ ۱۶۷۵

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ⑬

وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اور پہلوں کا بھی یہی طریق رہا۔ ۱۶۷۶

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ⑭

اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں پھر وہ اس میں چڑھنے لگیں ۱۶۷۷

لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ⑮ ع

تو کہیں گے ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے، بلکہ ہم وہ لوگ ہیں جن پر جادو کر دیا گیا ہے ۱۶۷۸

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ⑯

اور یقیناً ہم نے آسمان میں ستارے بنائے اور اسے دیکھنے والوں کے لیے سجایا۔

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ⑰

اور اُسے ہر شیطان مردود سے محفوظ کیا ـــ

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ

ہاں جو چھپ کر کچھ سُن لے تو اُسے روشن کرنے والا انگارا

اپنی کتاب جمع قرآن میں شائع کی ہے۔ اور یہاں اس کو دوہرانے کی گنجائش نہیں۔

۱۶۷۵ نسلك۔ سُلُوك کے معنی ہیں النَّفَاذُ فی الطریق ایک رستہ پر چلنا۔ فاسلکی سبل ربك (النحل ۱۶-۶۹)۔ لتسلکوا منها سبلا فجاجا (نوح ۷۱-۲۰) اور دوسرے کو کسی رستہ پر چلانے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے ما سلککم فی سقر (المدثر ۷۴-۴۲) اور جیسے یہاں (غ)

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ وہ ہر رسول سے استہزا کرتے ہیں یہاں کذلك سے شروع کر کے بتایا کہ جس طرح وہ وحی الٰہی کے متعلق طریق استہزا اختیار کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی ان کو اسی رستہ پر چلاتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا انہیں ایک راہ پر چلانا ان کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ صرف انہی لوگوں کو ایمان نہ لانے کی راہ پر چلاتا ہے جو استہزا کرتے ہیں اس لیے کہ استہزا کرنے والا کبھی غور کرتا ہی نہیں اور بغیر غور کرنے کے انسان صحیح نتیجہ پر پہنچ نہیں سکتا۔

۱۶۷۶ سنة الاوّلین سے مراد اللہ تعالیٰ کی سنت اولین میں ہے یعنی جن لوگوں نے استہزا کو اپنا طریق رکھا وہ ہمیشہ حق سے محروم ہی رہے۔

۱۶۷۷ یعرجون میں عموماً مراد خود کفار کو لیا گیا ہے کہ وہ آسمان پر چڑھنے لگیں۔ مگر قتادہؓ اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ مراد ملائکہ ہیں (د) اور سیاق عبارت بھی یہی چاہتا ہے کیونکہ فرشتوں کے متعلق ہی ان کا اقتراح تھا تو فرمایا کہ اگر آسمان کا دروازہ کھول دیں اور فرشتے نازل ہوں اور ان کو سزا دے کر پھر چڑھنے بھی لگیں تو پھر بھی یہ مانیں گے نہیں اور صورت اول میں آسمان پر چڑھنے سے مراد سچ مچ اوپر چڑھنا نہیں بلکہ استعارہ کے رنگ میں یہ مراد ہو گی کہ بعض سماوی باتیں ان کو سمجھ بھی آنے لگیں۔ پھر بھی ان کو یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے اور یہ ذکر شدید ترین مخالفوں کا ہے۔

۱۶۷۸ سُکِّرَتْ۔ سَکْر کے معنی حَبْس الماء یعنی پانی کا روک دینا بھی ہیں اور حالت سکر وہ حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان پردہ حائل کر دیتی ہے (غ) اس لیے سُکِّرَ بَصَرُهٗ کے معنی ہیں اس پر پردہ ڈال دیا گیا اور یہاں یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ انہیں دیکھنے سے روک دیا گیا (ل)

مسحور۔ سِحْر کے لیے دیکھو ۱۲۹ مسحورون سے مراد ہے کہ ہمیں صحیح طور پر شناخت کرنے سے سحر کے ساتھ روک دیا گیا ہے (غ)

اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں بتایا ہے کہ جب انسان لہو و لعب دنیا کو اور اس حیوانی زندگی کو ہی اپنا مقصد بنا لیتا ہے تو کتنے کھلے نشان اس کے سامنے ظاہر ہوں پروا نہیں کرتا۔

شِهَابٌ مُّبِیْنٌ ⑱ آلیتا ہے ع۱۶۷۹

ع۱۶۷۹ بروج ۔ بُرُج کی جمع ہے اور مراد ستارے ہیں دیکھو ع۶۹۶ قرآن کریم نے خود اس معنی کو واضح کر دیا ہے جب دوسری جگہ بجائے بروج کے لفظ کواکب اختیار فرمایا انّا زیّنّا السّماء الدّنیا بزینۃ ن الکواکب وحفظاً من کلّ شیطان مّارد (الصّٰفّٰت ۳۷ - ۶ و ۷) تیسری جگہ انہی کواکب کو مصابیح کہا ہے ولقد زیّنّا السّماء الدّنیا بمصابیح وجعلنٰھا رجوماً للشّیاطین (الملک ۶۷ - ۵)

رجیم دیکھو ع۱۴۳ لسان العرب میں رَجْم کے معنی حسب ذیل دیئے ہیں ۔ قتل ۔ پتھر مارنا ۔ طرد یعنی دور کرنا ۔ ظن ۔ سب و شتم اور رجیم کے یہ معنی لینا کہ اسے سچ مچ پتھر مارے جاتے ہیں یا شہاب اس پر پھینکے جاتے ہیں اس لیے اسے رجیم کہا جاتا ہے درست نہیں ۔ بلکہ رجیم بمعنی ملعون ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کیا گیا ہے اور یہ معنی لسان العرب میں قبول کیے ہیں اور قرآن کریم نے خود اسے صاف کیا ہے جہاں آیت ۳۴ میں شیطان کو بوجہ ایک اچھی حالت سے دور کیا جانے کے رجیم کہا ہے نہ اس لیے کہ اسے کسی نے پتھر مارے تھے اور یہ بھی قبول کیا ہے کہ رجوماً للشّیاطین (الملک ۶۷ - ۵) میں (اور ایسا ہی یہاں) شیاطین سے مراد انسان شیطان ہیں یعنی کاہن وغیرہ جو اٹکل پچو باتیں اخبار غیبی کے متعلق کرتے رہتے ہیں ۔ اور یہ معنی ابن اثیر سے لیے ہیں ۔

استرق ۔ سَرِقَۃ کسی چیز کا چھپکر لینا ہے جو لینے والے کی نہیں اور اِسْتَرَقَ السَّمْعَ چھپ کر بات سننے کو کہتے ہیں (غ)

شہاب روشن شعلہ کو کہتے ہیں جو جلتی ہوئی آگ سے لے لیا جائے یا جو فضا میں نظر آتا ہے (غ) اِنّیٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیٓ اٰتِیْکُمْ مِّنْھَا بِقَبَسٍ (طٰہٰ ۲۰ - ۱۰)

شیاطین کا ملائکہ کی باتوں کو سننا : آیت ۱۶ میں یہ بیان فرمایا کہ آسمان میں بروج بنائے اور آیت ۱۷ میں یہ کہ ان ستاروں کو ہر شیطان مردود سے محفوظ رکھا ہے بعینہٖ یہی مضمون سورۂ الصّٰفّٰت میں ہے جہاں بروج کی بجائے کواکب کا لفظ رکھ کر بتا دیا کہ بروج سے مراد کواکب یا ستارے ہی ہیں ۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آسمان یا ستاروں کو شیاطین سے حفاظت میں رکھنے سے کیا مراد ہے اور دوسرا یہ کہ استراق سمع کیا ہے یا چھپکر کس چیز کو شیاطین سنتے ہیں اور تیسرا یہ کہ شہاب ثاقب کے پیچھے آنے سے کیا مراد ہے ۔ وہ بات جسے مفسرین نے عام طور پر قبول کیا ہے اس کی بنیاد بخاری کی ذیل کی حدیث پر ہے جو اسی آیت کی تفسیر میں ہے ملخصاً اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے (اور اس حدیث کی دوسری روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ وحی بھیجنے کے لیے کلام کرتا ہے) تو فرشتے اظہار عاجزی کرتے ہیں اور ایسی آواز سنتے ہیں جیسے پتھر پر زنجیر مارنے کی آواز ہوتی ہے جب ان کا ڈر جاتا رہتا ہے تو دوسرے فرشتے ان سے دریافت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا تو وہ کہتے ہیں حق فرمایا اور وہ علی و کبیر ہے تو چھپ کر سننے والے بھی اس میں سے کچھ سُن لیتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے اوپر تہ بتہ ہوتے ہیں پھر شہاب یعنی انگارا کبھی تو اس سننے والے کو ہلاک کر دیتا ہے اور کبھی وہ انگارے سے ہلاک ہونے سے پیشتر اپنی بات دوسرے کو پہنچا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین تک اس بات کو پہنچا دیتے ہیں اور وہ ساحر (یا کاہن) کے منہ میں ڈالی جاتی ہے جو اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر اسے بیان کرتا ہے اور جب وہ ایک بات سچی نکل آتی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو اس نے سچ بولا تھا ۔ اور طبرانی کی روایت میں یوں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ وحی بھیجنے کے لیے کلام کرتا ہے تو آسمان کانپ اٹھتا ہے اور آسمان والے کلام سنتے ہی بیہوش ہو جاتے ہیں اور سجدہ میں گر پڑتے ہیں ۔ سب سے پہلے جبرئیلؑ سر اُٹھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے ان سے فرماتا ہے تب فرشتے ان سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا تو وہ فرماتے ہیں الحق وھو العلی الکبیر ان احادیث سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ جب جبرائیلؑ سے یا ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا تو جواب صرف اسی قدر ہوتا ہے الحق وھو العلی الکبیر اور دوسری طرف یہ کہ شیاطین اس کلام کو سُن لیتے ہیں حالانکہ خود قرآن کریم صراحت سے اس عظیم الشان وحی کے متعلق جو قرآن کریم میں ہے فرماتا ہے کہ شیاطین اسے قطعاً نہیں سُن سکتے وما تنزّلت بہ الشّیاطین وما ینبغی لھم وما یستطیعون انّھم عن السّمع لمعزولون (الشعرآء ۲۶ - ۲۱۰ تا ۲۱۲) جہاں آخری الفاظ میں فرمایا کہ وہ سننے سے الگ کیے گئے ہیں اور انہیں اس بات کی طاقت ہی نہیں ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ قرآنی وحی کے متعلق نہیں بلکہ دوسرے امور کے متعلق ہے تو اس کی بھی قرآن کریم تردید فرماتا ہے ام لھم سلّم یّستمعون فیہ فلیأت مستمعھم بسلطان مّبین (الطور ۵۲ - ۳۸) یعنی ان کے قبضہ میں کوئی ایسے ذرائع ہیں جن سے وہ غیب کی باتیں سن لیتے ہیں تو ان کے سننے والے کوئی کھلی دلیل لائیں جس سے معلوم ہوا کہ کوئی ذریعہ اخبار غیبی کے اس طرح پر سننے کا نہیں ہے اس لیے قرآن کریم کی صراحت کے مقابل پر حدیث کو قبول نہیں کیا جا سکتا ۔ اور مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے شیاطین کو آسمانوں میں جانے کی کوئی رکاوٹ نہ تھی جب حضرت عیسٰیؑ پیدا ہوئے تو انہیں تین آسمانوں سے روک دیا گیا اور پھر آنحضرت صلعم کی ولادت پر سارے آسمانوں سے روک دیا گیا اور یہ بات حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے مگر اس کی سند قرآن و حدیث میں قطعاً کوئی نہیں ۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کی ساری آیات میں شیاطین سے مراد کاہن اور منجم ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ نجوم یعنی ستاروں سے کچھ علم حاصل کر کے آیندہ کی خبریں بتا سکتے ہیں ۔ چنانچہ رجوماً للشّیاطین میں ابن اثیر نے بھی اسی معنی کو قبول کیا ہے کہ رجوماً سے مراد ظنون اور شیاطین سے مراد منجم اور کاہن ہیں جیسا کہ لسان العرب کے حوالہ سے اوپر دکھایا جا چکا ہے اور خود الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو یہی حق ثابت ہوتا ہے اس لیے کہ وہاں یعنی سورۂ ملک میں مصابیح یعنی ستاروں کو رجوماً للشّیاطین کہا ہے پس اگر مطلب یہ ہوتا کہ ان ستاروں کو شیاطین پر پھینکا جاتا ہے تو آج تک یہ آسمان کے ستارے ختم ہو گئے ہوتے یا ان میں معتد بہ کمی نظر آتی اور واقعات بھی اس کو غلط ٹھہراتے ہیں یہاں تک کہ مفسرین کو خود یہ کہنا پڑا ہے کہ مراد خود ستاروں کا پھینکنا نہیں بلکہ ستاروں میں سے شعلہ لیکر پھینکنا ہے ۔ اس تاویل بعید کی نسبت یہ سیدھی تاویل کیوں قبول نہ کی جائے کہ رجوماً للشّیاطین سے مراد منجموں کے ظنون فاسدہ لیے جائیں جیسا کہ رجماً بالغیب (الکھف ۱۸ - ۲۲) میں رجم کا لفظ اور واذا خلوا الٰی شیٰطینھم (البقرۃ ۲ - ۱۴) میں شیاطین

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور ہم نے اس میں پہاڑ بنائے اور اس میں ہم نے ہر ایک چیز اندازہ کی ہوئی اُگائی۔

کا لفظ انہی معنوں میں آتے ہیں۔ تو گویا ایک طرف یہ فرماکر کہ ہم نے ستاروں کو شیاطین سے محفوظ کیا ہے یہ بتایا کہ فی الواقع ان منجموں اور کاہنوں کو علم غیب میں کچھ دسترس نہیں جیسا کہ ام لھم سلم یستمعون فیہ (الطور ۵۲-۳۸) سے اور ام عندھم الغیب فھم یکتبون (الطور ۵۲-۴۱) سے بھی ظاہر ہے اور دوسری طرف رجوماً للشیاطین کہہ کر یہ بتایا کہ یہ محض ظنون اور اٹکلیں ہیں جو وہ دوڑاتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ستاروں سے یہ علم حاصل کرتے ہیں حالانکہ یہ علم کوئی نہیں اور نہ ستاروں تک وہ پہنچ سکتے ہیں بلکہ محض اٹکل پچو باتیں ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ استراق سمع سے کیا مراد ہے۔ اور تیسرا یہ کہ شہاب کے پیچھے آنے سے کیا مراد ہے یہ دونوں سوال باہم ملے ہوئے ہیں۔ اگر استراق سمع سے یہ مراد لی جائے کہ واقعی شیاطین جن کچھ اللہ تعالیٰ کے رازوں کو بھی چھپ کر سن لیتے ہیں تو اللہ کی قدرت کاملہ پر اعتراض ہوتا ہے کہ شیاطین بھی چھپ کر اس کے بھیدوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے بھیدوں کی اس قدر بھی حفاظت نہیں کر سکتا جس قدر ایک انسان کر سکتا ہے۔ دنیا کی حکومتیں تک تو اپنے اسرار پر دوسروں کو آگاہ نہیں ہونے دیتیں تو کیا اللہ تعالیٰ میں اتنی قدرت بھی نہیں۔ پھر خدا کے خبر دینے میں اور شیاطین کے اس طرح خبر حاصل کر لینے میں بھی مابہ الامتیاز اُٹھ جاتا ہے کیونکہ یہ تو پھر محض شیاطین کا اختیار رہا کہ ایک سچی بات کے ساتھ سو جھوٹی باتیں نہ ملائیں۔ علاوہ ازیں باوجود شہاب ثاقب کے پیچھے آنے کے بھی وہ خبر کے پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں گویا اول تو اللہ تعالیٰ اپنے رازوں کو شیطانوں سے نہیں بچا سکتا۔ پھر جب پتہ لگ بھی جاتا ہے اور راز کو بچانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ کوشش بھی ناکام ہوتی ہے ان باتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا اس کی صفات کاملہ میں نقص قبول کرنا ہے۔ اور یہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور راستبازوں کو بھی ان کے دشمنوں کے ہاتھ سے دکھ پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ عین اس کی صفات کا تقاضا ہے کہ بشر رسول سارے ان حالات کے ماتحت ہو جو دوسرے انسانوں کو پیش آتے ہیں۔ اور اس کی قدرت کاملہ کا اظہار یہی ہے کہ باوجود دشمنوں کے ہاتھ میں پڑ جانے کے بھی وہ آخر کار اس کو بچا لیتا ہے مگر وہ راز جن کا علم اللہ تعالیٰ سوائے اپنے رسولوں یا برگزیدوں کے دوسروں کو نہیں دینا چاہتا شیاطین بھی اس علم کو حاصل کر لیں تو یہ اس کی صفات کاملہ میں نقص ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی درست نہیں کہ یہ سلسلہ شہاب کا حضرت عیسٰیؑ کے وقت سے شروع ہوا جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے۔ کہ اس سے پہلے شیاطین ان رازوں سے اچھی طرح واقف ہو جایا کرتے تھے اور کوئی روک نہ تھی حضرت عیسٰیؑ کے وقت میں تین آسمانوں سے اور آنحضرت صلعم کے وقت میں سب آسمانوں سے انہیں روک دیا گیا کیونکہ شہب کا سلسلہ اس وقت سے ہے جب سے دنیا ہے۔ اور یہ بے معنی بات ہے کہ پہلے یہ سلسلہ شہب یوں ہی تھا حضرت عیسٰیؑ کے وقت سے شیاطین کی سزا کے لیے ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کے قانون اس طرح تبدیل نہیں ہو جاتے سلسلہ شہب جس غرض کے لیے ہے وہ ہمیشہ سے ایک ہی ہونی چاہیئے۔ اور اس بحث میں عجیب تر وہ آیت قرآنی ہے جس میں فرمایا وانا کنا نقعد منھا مقاعد للسمع فمن یستمع الاٰن یجد لہ شھاباً رصداً (الجن ۷۲-۹) جس سے معلوم ہوا کہ پہلے وہ گھات میں بیٹھ کر باتیں سن لیا کرتے تھے صرف رسول اللہ صلعم کے ظہور پر شہاب کا آنا شروع ہوا اور یہ جن بھی انسان ہی ہیں جیسا کہ اپنے موقعہ پر دکھایا جائے گا) اس مشکل کو قرآن شریف دو لفظوں میں حل کر دیتا ہے جہاں یلقون السمع (الشعراء ۲۶-۲۲۳) میں القائے سمع شیاطین کی طرف ہے۔ یعنی یہ منجم یا کاہن شیاطین سے کچھ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جس طرح القائے سمع سے مراد فرشتوں کی باتیں سننا نہیں اسی طرح استراق سمع سے مراد چھپ کر فرشتوں کی باتیں سننا نہیں اور جسے ایک جگہ استراق سمع کہا ہے اسے دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے الا من خطف الخطفۃ (الصّٰفّٰت ۳۷-۱۰) اور یہ ایک دفعہ اچک لے جانا درحقیقت ایک آدھ بات میں کامیاب ہو جانا ہے۔ جب انسان اٹکل پچو باتیں کرتا ہے اور قیاس سے کام لے کر کچھ آیندہ کی خبریں دیتا ہے تو بیس باتوں میں سے دو چار سچی بھی نکل آتی ہیں۔ چونکہ جس طرح رسول کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے کاہنوں اور منجموں کا تعلق شیاطین سے ہوتا ہے اور یہ کاہن اور منجم ان باتوں کو مخفی طور پر حاصل کرنے کا دعوٰی بھی کرتے ہیں اس لیے ان باتوں کو القائے سمع اور استراق سمع فرمایا۔

شہاب کا شیطان کے پیچھے آنا: اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ شہاب مبین یا شہاب ثاقب (الصّٰفّٰت ۳۷-۱۰) سے کیا مراد ہے۔ شہاب کا لفظ بروئے لغت ہر شعلہ پر بھی صادق آتا ہے اور اس شعلہ پر بھی جو فضائے آسمان میں بعض وقت دکھائی دیتا ہے۔ شہاب کا گرنا یا جس کو ہم ستارے کا ٹوٹنا کہتے ہیں اصل میں کیا چیز ہے۔ وہ بعض پتھر ہیں جو فضائے آسمان میں چکر لگاتے ہیں جس طرح بڑے بڑے سیارے چکر لگاتے ہیں جب ان میں سے کوئی ہمارے کرہ ہوائیہ میں داخل ہوتا ہے تو ہوا کی رگڑ سے بوجہ اپنی تیزیٔ حرکت کے جل اُٹھتا ہے اور شعلہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے پھر بعض وقت اس کا کچھ حصہ زمین پر بھی گر پڑتا ہے اگر ان پتھروں سے اللہ تعالیٰ کوئی اور کام بھی لیتا ہے تو اس کے رازہائے سربستہ سے کون آگاہ ہو سکتا ہے اگر شیاطین کی ہلاکت بھی ان کی ایک غرض ہو تو یہ کوئی بعید بات نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم کے ظہور پر یہ شہب کثرت سے گرے اور ایسا ہی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے وقت میں، شاید اسی سے مفسرین نے یہ استدلال کیا ہو کہ حضرت عیسٰیؑ کے وقت میں شیاطین تین آسمانوں سے اور آنحضرت صلعم کے وقت میں سارے آسمانوں سے روک دیئے گئے (یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ جو لوگ حضرت عیسٰیؑ کے جسم کے ساتھ آسمان پر چڑھ جانے کے قائل ہیں وہ انہیں چوتھے آسمان پر جگہ دیتے ہیں اور یہ آسمان بموجب اس خیال کے ابھی ایسا تھا جہاں شیاطین کا دخل تھا) سوال صرف یہ ہے کہ آیا یہاں شہاب سے مراد یہی ظاہری شہاب ہے اس پر آیت وانا کنا نقعد منھا مقاعد للسمع فمن یستمع الاٰن یجد لہ شھاباً رصداً (الجن ۷۲-۹) سے کھلی روشنی پڑتی ہے۔ یہ

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرٰزِقِينَ ﴿۲۰﴾

اور تمھارے لیے اس میں روزی کا سامان بنایا اور اس کے لیے بھی، جسے تم رزق نہیں دیتے ۱۶۸۰

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴿۲۱﴾

اور کوئی چیز نہیں مگر اس کے خزانے ہمارے ہی پاس ہیں اور ہم اسے ایک مناسب اندازے سے اتارتے رہتے ہیں ۱۶۸۱

وَأَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَسْقَيْنٰكُمُوهُ وَمَآ أَنْتُمْ لَهُ بِخٰزِنِينَ ﴿۲۲﴾

اور ہم (پانی سے) بھری ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں۔ تب ہم بادل سے پانی اتارتے ہیں، پھر ہم وہ تمھیں پلاتے ہیں اور تم اس کا خزانہ نہیں رکھتے ۱۶۸۲

وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِ وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُونَ ﴿۲۳﴾

اور یقیناً ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں ۱۶۸۳

شہاب ظاہری پہلے بھی تھے مگر آیت کہتی ہے کہ پہلے ایسے نجومی آزادی سے اپنا کام کرتے تھے اب ان سے کچھ اور سلوک ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں شہاب سے مراد یہ شہاب ظاہری نہیں۔ بلکہ اس شہاب سے استعارۃً کوئی ایسی روشنی مراد ہے جو ان کاہنوں کے استراق سمع کے اثر کو زائل کر دیتی ہے یعنی کچھ ان کی اٹکل پچو باتیں جو سچی نکل آتی ہیں تو اس سے لوگوں پر ایک اثر ہوتا ہے پہلے اس اثر کو دور کرنے والی کوئی چیز نہ تھی اور اس لیے لوگ کہانت اور نجوم کے اثر کے قائل تھے لیکن اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی روشنی آگئی ہے جو اس کے اثر کو دور کر دیتی ہے۔ یہ شہاب پیغمبر کے آنے سے خاص ہے۔ شہاب ظاہری پیغمبر کے آنے سے خاص نہیں۔ پس اس شہاب سے مراد پیغمبر کی وہ کھلی پیشگوئیاں ہیں جو نجومیوں کی دھندلی پیشگوئیوں کے اثر کو باطل کر دیتی ہیں۔ یہی چیز ہے جو پیغمبر سے خاص ہے سوائے اس کے اس آیت کے کوئی معنے نہیں ہو سکتے اور شہاب کے لفظ کا یہ استعمال کچھ بھی بعید نہیں جب خود رسول اللہ صلعم کو بھی النجم الثاقب فرمادیا ہے بلکہ والنجم اذا ھوٰی (النجم ۵۳-۱) اور فلا اقسم بمواقع النجوم (الواقعۃ ۵۶-۷۵) میں خود مفسرین کو یہ امر مسلم ہے کہ نجم سے مراد قرآن کریم کا ایک ٹکڑہ ہے پس یہی مراد شہاب سے بھی لی جائے گی جب ظاہری معنی کو واقعات غلط ٹھہراتے ہیں۔

سیاق مضمون خود اس معنی کو چاہتا ہے اس لیے کہ پچھلے رکوع میں حفاظت قرآن شریف کا ذکر تھا اور چونکہ اس کے اعدا میں اگر ایک طرف سیاسی طاقت تھی تو دوسری طرف نجومیوں اور کاہنوں کی طاقت تھی جو لوگوں کو اپنے اثر باطل سے مرعوب کر رہے تھے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ بتایا جاتا کہ ان کا اثر بھی دور کیا جائیگا۔ چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نجوم اور کہانت جو ملک عرب میں بت پرستی کی طرح مروج تھے نبی کریم صلعم کے ظہور سے بالکل نابود ہو گئے اور وہ سرزمین اس نجاست سے بھی پاک ہو گئی۔

۱۶۸۰ من لستم لہ برازقین سے مراد مجاہد کے نزدیک چارپائے وغیرہ ہیں۔ مطلب یہ کہ انسانوں کے لیے بھی اس میں سامان بنایا اور دوسری مخلوق کے لیے بھی جو گو تمہارے ماتحت ہے مگر رزق اسے تم نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔

۱۶۸۱ اس سے معلوم ہوا کہ تمام وہ چیزیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے ان کے اصل خزانے اللہ کے پاس ہیں۔ یعنی ان کا وجود میں لانا اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ ایک معین اندازہ سے یعنی اپنے قانون کے مطابق وہ چیزیں انسانوں کو پہنچاتا ہے۔ انزال اور تنزیل کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ ایک چیز کے اسباب مہیا کر دیئے جائیں یا اس کی طرف ہدایت کر دی جائے (غ) گو وہ چیز زمین پر ہی موجود ہو۔

۱۶۸۲ لواقح۔ لِقاح ماء الفحل کو کہتے ہیں اور لَقِحَت اصل میں اونٹنی کے حاملہ ہونے پر استعمال ہوتا ہے پھر عورت کے اور لواقح لاقح کی جمع ہے اور مراد اس سے حمل والی ہیں بلحاظ اس پانی کے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں، کیونکہ اس پانی سے زندگی ملتی ہے اور اس کے مقابل پر الریح العقیم (الذّٰریٰت ۵۱-۴۱) یا بانجھ ہوا وہ ہے جس میں پانی نہیں یا جس سے فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ وہ عذاب کے رنگ میں ہے (ل)

خازنین۔ خزن کے معنی ہیں ذخیرہ کے طور پر کسی چیز کی حفاظت کرنا، پھر عام طور پر حفاظت کرنا اس کے معنی ہو گئے ہیں اور اس سے پچھلی آیت میں جو عندنا خزآئنہ آیا ہے تو وہاں خزائن کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اپنی قدرت سے جس چیز کو چاہتا ہے وجود میں لاتا ہے اور لا اقول لکم عندی خزائن اللہ (الانعام ۶-۵۰) میں خزائن سے مراد اس کی مقدورات ہیں یا اس کی جود اور اس کی قدرت اور یہاں خازن کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں یعنی شکر کے ساتھ اس کی حفاظت کرنے والے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اسے بادلوں میں محفوظ کرتا ہے جیسا دوسری جگہ ہے افرءیتم الماء الذی تشربون ء انتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون (الواقعۃ ۵۶-۶۸و۶۹) (غ)

۱۶۸۳ جس طرح پانی والی ہوائیں زندگی بخشتی ہیں اسی طرح وحی الٰہی بھی مردہ زمین کو زندہ کر دے گی اور جس طرح شہاب کی روشنی تاریکی کو دور کر دیتی

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

اور ہم تم میں سے آگے بڑھنے والوں کو خوب جانتے ہیں اور ہم پیچھے رہنے والوں کو بھی جانتے ہیں ۱۶۸۴ء

وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع

اور تیرا رب انھیں اکٹھا کرے گا، وہ حکمت والا علم والا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

اور ہم نے انسان کو سوکھی ہوئی مٹی سے سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکا ہو پیدا کیا ۱۶۸۵ء

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ

اور جنوں کو ہم نے (اس سے) پہلے تیز آگ سے

ہے اسی طرح کہانت اور نجوم کی تاریکی قرآن شریف سے دور ہو جائے گی۔ اسی احیا اور اسی امانت کی طرف یہاں اشارہ ہے۔

۱۶۸۴ء المستقدمین - المستاخرین سے پہلے گزرے ہوئے لوگ اور پیچھے آنے والے لوگ بھی مراد لیے گئے ہیں اور نیکی میں قدم آگے رکھنے والے یا معصیت کر کے پیچھے رہنے والے بھی (ج) اور سیاق عبارت پچھلے معنی کو صحیح ٹھہراتا ہے کیونکہ یہاں ذکر انہی لوگوں کا ہے جو خدا کی وحی سے زندگی حاصل کر کے قدم آگے رکھتے ہیں یا ظلمتوں اور تاریکیوں کی موت میں رہ کر زندگی کی اصل غرض کے حاصل کرنے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

۱۶۸۵ء صلصال - اصل میں آواز کے تردد کو کہتے ہیں جو خشک چیز سے پیدا ہو یعنی کھنکھنانا اور سوکھی ہوئی مٹی کو صلصال کہا جاتا ہے اور سڑی ہوئی مٹی کو بھی صلصال کہتے ہیں کیونکہ صَلَّ اللَّحْمُ کے معنی ہیں گوشت سڑ گیا یعنی بدبودار ہو گیا (غ) اور مجاہد کہتے ہیں کہ صلصال سے مراد حما مسنون ہے یعنی سڑی ہوئی مٹی (ل)، مگر قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے صلصال کالفخار (الرحمٰن ۵۵: ۱۴) اس لیے پہلے معنی ہی درست ہیں کیونکہ فخار اُسے کہتے ہیں جو آگ میں پکائی گئی ہو۔

حما - حَمْأَة اور حمأ سیاہ سڑی ہوئی مٹی کو کہا جاتا ہے۔ جیسے کنوئیں کا سیاہ کیچڑ اور عین حمئة (الکہف - ۸۶) سے مراد ذاتِ حَمَأ یعنی سیاہ کیچڑ والا ہے اور حَمَأ حَمْأَة کی جمع بھی ہے (غ)

مسنون - سن دانت کو کہتے ہیں السن بالسن (المائدہ ۵-۴۵) اور سَنَّ کے معنی صاف کیا اور صیقل کیا اور اسی سے سُنَّةُ مُنْهُ کو اس کی صفائی کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور سَنَّ کے معنی ایک چیز کو شکل وصورت دینا ہیں اور مَسْنُون کے معنی مُصَوَّر یعنی تصویر بنایا گیا ہیں اور یہاں مَسْنُون کے معنی مُصَوَّر، صورت دیا گیا۔ اور مُنْتِن بدبودار اور مُتَغَيِّر تبدیل شدہ کیے گئے ہیں (ل) اور مفردات میں صرف متغیر اس کے معنی دیئے ہیں اور لسان العرب میں اخفش کا قول منقول ہے کہ یہ تغیر اس وقت واقع ہوتا ہے جب پانی جاری نہ ہو یعنی چلتے پانی میں تغیر واقع نہیں ہوتا ٹھہرے ہوئے پانی میں ہوتا ہے۔

ابتدائے پیدائش: اس رکوع میں اصل مضمون تو شیطان کی انسان سے دشمنی ہے جو اسے ایک غلط راہ کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے اعلیٰ قویٰ کی تکمیل میں روک ہوتا ہے اور اسے حصول مقصد زندگی میں ناکام رکھتا ہے مگر ابتدا ہر دو کی پیدائش سے کی ہے۔ اور سب سے پہلے انسان کے اصل کی طرف توجہ دلائی ہے یا زندگی کی ابتدا کی طرف۔ کوئی سے بھی مدارج ہوں جن میں سے ہو کر انسان بنا اور کتنی بھی مدت اس کے بننے میں یا بننے پر گزر گئی ہو زندگی کی ابتدا کا جو کچھ پتہ آج سائنس سے ملتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر یہاں دو تین لفظوں میں قرآن شریف نے کر دیا ہے۔ یعنی سب سے پہلی حالت زمین کی جو انسانی زندگی کی معاون ہوئی وہ صلصال تھی یا سوکھی ہوئی مٹی اور دوسری جگہ اسے صلصال کالفخار (الرحمٰن ۵۵-۱۴) کہہ کر بتا دیا کہ گویا وہ آگ سے پک کر نکلی ہے اس میں یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ زمین کی موجودہ سطح گویا آگ سے پک کر تیار ہوئی ہے اور اسی کی شہادت آج سائنس سے ملتی ہے کہ ابتدا میں یہ زمین ایک آگ کا ٹکڑا تھا۔ تدریجاً ٹھنڈا ہوتے ہوتے اس کی اوپر کی سطح سخت ہو گئی۔ قرآن کریم نے اسے صلصال کالفخار کہہ کر اس کی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اگلی آیت میں اس کی ناری حالت کا ذکر بھی ان الفاظ میں کیا ہے کہ جنوں کو اس سے پہلے نار سے پیدا کیا گویا اس سے پہلے پہلی حالت زمین کی نار کی تھی اور ناری صفت کے مطابق جو ہستیاں پیدا ہوئیں وہ جن ہیں اور یہاں من صلصال کہکر پھر جو فرمایا من حما مسنون۔ تو بتایا کہ صلصال کی حالت سے تبدیل ہو کر پھر حماء کی حالت ہوئی یعنی اس مٹی کے ساتھ پانی ملا — اور پھر اس میں تغیر آیا اور ابن عباس سے حما مسنون کے معنی طین رطب یعنی گیلی مٹی مروی ہیں (ج) اور ابتدائے زندگی کی تاریخ پر جو روشنی سائنس نے ڈالی ہے وہ یہی ہے کہ زندگی کی ابتدا ایسی مٹی سے ہوتی ہے جس میں پانی ملکر اس میں ایک تغیر واقع ہو جائے۔ ایک اُمّی کے مُنہ سے آج سے تیرہ سو سال پیشتر یہ الفاظ کہلوا کر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس علم کامل کا ثبوت دیا ہے جس کے مقابل پر انسانی علوم ہیچ ہیں۔ اور صلصال میں چونکہ آواز کا خیال پایا جاتا ہے اور مسنون میں شکل وصورت دینے کا اس لیے ان الفاظ کے اختیار کرنے میں ساتھ ہی انسان کی ان دو صفات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اسے دوسرے حیوانات سے متمیز کرتی ہیں یعنی ایک گویائی اور دوسرے خاص قسم کی شکل وصورت۔

نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

پیدا کیا ۱۶۸۶

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو سُوکھی ہُوئی مٹی سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکا ہو پیدا کرنے والا ہوں ۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو جب میں اسے تکمیل کو پہنچاؤں اور اپنی روح اس میں پھونکوں تو تم اس کے لیے فرمانبرداری کرتے ہوئے گر پڑنا ۱۶۸۷

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾

پس کُل فرشتوں سب کے سب نے فرمانبرداری کی ،

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

مگر ابلیس (نے نہ کی) اس نے انکار کیا کہ فرمانبرداری کرنے والوں کے ساتھ ہو

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾

فرمایا اے ابلیس کیا وجہ ہے کہ تو فرماں برداری کرنیوالوں کے ساتھ نہیں ہوتا ؟

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

اس نے کہا مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں ایک انسان کی فرمانبرداری کروں جسے تو نے سوکھی ہوئی مٹی سے متغیر شدہ کیچڑ سے پیدا کیا ہے ۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾

کہا ، تو اس (حالت) سے نکل جا کیونکہ تو دور کیا گیا ہے ۔

وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾

اور تجھ پر قیامت کے دن تک لعنت ہے ۔

ع۱۶۸۶ جان ۔ جنّ کے لیے دیکھو ع۱۰۱۵ اور جانّ کو بعض نے جنوں کا باپ کہا ہے جیسے آدم انسانوں کا باپ ہے اور بعض کے نزدیک جانّ جنّ ہی ہیں اور یہ اسم جمع ہے اور بعض نے جان کو جنوں کی ایک نوع قرار دیا ہے لم یطمثھن انس قبلھم ولا جآن (الرحمٰن ۵۵ - ۵۶) اور جانّ سانپ کی بھی ایک قسم ہے جو پتلا ہلکا سا ہوتا ہے ۔ کانھا جآن (النمل ۲۷ - ۱۰ ؛ القصص ۲۸ - ۳۱) اور جان شیطان کو بھی کہتے ہیں (ل)

سموم ۔ سَمّ اور سُمّ ہر ایک تنگ سوراخ کو کہتے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ حتٰی یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف ۷ - ۴۰) اور اسی سے سَمّ کے معنی داخل ہونا آتے ہیں ۔ اور سَمّ زہر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی باریک تاثیر سے جسم میں داخل ہو جاتی ہے اور سَمُوم گرم ہوا کو کہتے ہیں کہ وہ بھی زہر کی طرح جسم پر اثر کرتی ہے فی سموم وحمیم (الواقعۃ ۵۶ - ۴۲) ووقٰنا عذاب السّموم (الطور ۵۲ - ۲۷) (غ) اور سموم کے معنی ایسی گرم ہوا بھی کیے گئے ہیں جو قتل کر دے اور بعض نے اس کے معنی آگ کا شعلہ کیے ہیں اور یا اس کے معنی سخت تیز آگ کے ہیں (ج)

اس میں زمین کی ابتدائی حالت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے یعنی نسل انسانی کی آبادی کے قابل ہونے سے پہلے اس میں ایسی مخلوق تھی جو آگ سے پیدا ہوئی تھی ۔ اور یہ کوئی بعید بات نہیں کہ جس قسم کے حالات ہوں اسی قسم کی مخلوق ہو ۔ انسان کا خود خاص حالات میں پیدا ہونا بتاتا ہے کہ مختلف حالات کے لحاظ سے مختلف قسم کی مخلوق ہو سکتی ہے ۔ محض یہ بات کہ ہمیں وہ ناری ہستیاں نظر نہیں آتیں ان کے وجود کے خلاف کوئی دلیل نہیں ۔

ع۱۶۸۷ سویت ۔ سَوَّیْتُهٗ ۔ فاستوٰی اور اِسْتَوٰی کے معنی ہیں ایک چیز اپنے کمال کو پہنچ گئی ۔ پس سَوّٰی کے معنی ہیں اس کو کمال کو پہنچایا ۔ ثمّ سوّٰك رجلا (الکھف ۱۸ - ۳۷) الّذی خلق فسوّٰی (الاعلٰی ۸۷ - ۲) اور یہاں مراد جسمانی تسویہ ہے نیز دیکھو ع۴۴

روحی ۔ ابن الانباری کا قول ہے کہ روح اور نفس ایک ہی ہیں سوائے اس کے کہ روح مذکّر ہے اور نفس مؤنث (ت) اور نفس کے لیے دیکھو ع۵۹۸ جہاں ایک معنی قوت ممیزہ بھی اس کے دیئے گئے ہیں اور روح کے معنی جان بھی آتے ہیں اور نفس بھی (یعنی نفس ناطقہ) اور وحی اور قرآن وغیرہ (ل) ۔

اللہ کی روح کا انسان میں نفخ : روحی کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف بر سبیل تشریف ہے جیسے بَیْتِی میں (غ) اور یہاں روح سے مراد نفس ناطقہ یا وہ چیز ہے جس سے انسان تمیز کرتا ہے یہاں روح جان کے معنی میں اس لیے نہیں ہو سکتی کہ یہ روح انسان اور دوسرے حیوانات میں اشتراک رکھتی ہے اور سجدہ کا حکم کسی خصوصیت کی وجہ سے ہے اگر جان کے ڈالا جانے کی وجہ سے یہ حکم ہوتا تو دوسرے جاندار بھی اس میں شامل ہوتے اور سورۂ بقرہ میں اوّل انسان کو علم دیا جاتا ہے تب ملائکہ کو سجدہ کا حکم ہوتا ہے ۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہاں نفخ روح سے مراد اس قوت ممیزہ کا نفخ ہے جس سے انسان علم حاصل کرتا ہے اور روح سے مراد وحی بھی نہیں ہو سکتی ۔ اس لیے کہ یہ وہ روح ہے جو تمام انسانوں میں نفخ ہوتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ثم جعل نسلہ من سلٰلۃ من مّآء مّھین ثمّ سوّٰہ ونفخ فیہ من روحہٖ (السجدۃ ۳۲ - ۸ و ۹)

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾
کہا میرے رب تو مجھے اس دن تک مہلت دے جس دن وہ اُٹھائے جائیں

قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۳۷﴾
کہا تو اُن میں سے ہے جنھیں مہلت دی گئی ۔

اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾
ایک معلوم وقت کے دن تک ع۱۶۸۸

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۳۹﴾
کہا میرے رب جیسا تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا میں انھیں زمین میں ع۱۶۸۹ نافرمانی کو خولصورت بنا کر دکھاؤنگا اور ان سب کو (حصول مقصد میں) ناکام رکھونگا

اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۴۰﴾
سوائے تیرے بندوں کے جو اُن میں سے خالص کیے گئے ہیں ۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ ﴿۴۱﴾
فرمایا یہ سیدھا رستہ میری طرف ہے ع۱۶۹۰

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾
کہ میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں مگر جو جاہلوں میں سے تیرے پیچھے چلے ع۱۶۹۱

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۳﴾
اور یقیناً ان سب کے وعدہ کی جگہ دوزخ ہے ۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِکُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ ع
اس کے سات دروازے ہیں ، ہر ایک دروازے کے لیے ان میں سے ایک حصّہ الگ کر دیا گیا ہے ع۱۶۹۲

ع۱۶۸۸ جب تک اس دنیا پر انسان ہے اس وقت تک شیطان کا رہنا بھی ضروری ہے مگر اس کی بھی ذریت ہے اور ہر انسان کے لیے ایک علیحدہ شیطان کا ہونا حدیث سے بھی ثابت ہے کان شیطان آدم کا فر او شیطانی مسلما ۔ دیکھو سورۂ اعراف کا دوسرا رکوع ۔

ع۱۶۸۹ دنیوی زندگی کو مقصد ٹھہرانا اصل حصول مقصد میں ناکامی ہے : فی الارض میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا کی زندگی انہیں اچھی کرکے دکھاؤں گا یہاں تک کہ وہ اس دنیوی زندگی کو ہی اپنا اصل مقصد بنا لیں ۔ اس لیے آخر پر لاغوینھم کا لفظ استعمال کیا ہے اور غیّ کے معنی وہ جہالت ہیں جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو اور غوی کے معنی خاب یعنی ناکام ہوا اور اِغواء کے معنی ناکام رکھنا ہیں دیکھو ع۱۰۵۸ یعنی اصل مقصد زندگی کی طرف ان کی توجہ نہ ہونے دونگا اور یوں انہیں اس مقصد کے حصول میں ناکام رکھوں گا ۔

ع۱۶۹۰ یہاں عَلَیَّ بمعنی اِلَیَّ ہے (ج) یعنی مجھ تک پہنچانے والا یہ صراط مستقیم ہے اور یا عَلَیَّ کے معنی ہیں میں اسے ضرور ملحوظ رکھوں گا ۔

ع۱۶۹۱ عباد یا عبد کے لیے دیکھو ع۲۸۴ عبادی سے مراد یہاں عموماً وہی عبادك منهم المخلصين لیے گئے ہیں جن کا ذکر آیت ۴۰ میں ہے مگر قرینہ یہ چاہتا ہے کہ یہاں لفظ عام ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عباد مخلصین سے تو شیطان خود ہی مایوس ہے کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ہی شیطان کی غلامی سے آزاد کر رکھا ہے اس لیے وہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں انھیں چھوڑ کر باقی سب کو ناکام کر دونگا یعنی دنیا ہی اُن کا مقصد ہو جائے گی اور وہ اصل مقصد زندگی کے حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہارا تسلط اور غلبہ تو کسی بندہ پر بھی نہ ہوگا ، ہاں جو خود بخود اپنے فاسد اعتقاد کی وجہ سے جاہل رہ کر تیری پیروی کرے تو کرے ۔ یہ آیت اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ شیطان کا بندوں پر تسلط کوئی نہیں ، وہ خود اس کے پیچھے لگتے ہیں ۔

ع۱۶۹۲ الْبواب ۔ باب کی جمع ہے ۔ کسی چیز میں داخل ہونے کا راستہ ۔ اور اصل میں مکانوں میں داخل ہونے کا رستہ ہے اور ایک علم کو دوسرے علم کا باب کہا جاتا ہے یعنی اس کے ذریعہ سے اس دوسرے علم تک پہنچا جاتا ہے ۔
علیؓ باب علم ہیں ؟ : اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا (میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے) پس باب سے مراد یہی ہے کہ اس کے ذریعہ سے مجھ تک پہنچ سکتے ہو ۔ اور یہ کوئی خصوصیت نہیں ..... بلکہ جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے اصحابی کالنجوم فَبِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ ۔ میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جس کی پیروی کروگے ہدایت پالو گے ۔ مراد صرف یہ ہے کہ صحابہؓ مثل دروازوں کے ہیں اور حقیقی علم صرف رسول اللہ صلعم ہی ہیں اسی لیے صحابی کا قول حجت شرعی نہیں ۔ اور فتحنا علیهم ابواب کل شیء (الانعام ۔ ۴۴) میں بھی ذرائع ہی مراد ہیں اور ابوابُ الجنّة اور ابوابُ جَهَنّم سے مراد وہ باتیں ہیں جن کے ذریعہ سے ان تک پہنچا جاتا ہے (غ) اور حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ابواب جہنم

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾
متقی باغوں اور چشموں میں رہیں گے۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾
ان میں سلامتی سے امن کی حالت میں داخل ہو جاؤ۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾
اور جو ان کے دلوں میں کچھ کدورت ہوگی ہم اسے نکال دینگے وہ بھائی بھائی تختوں پر آمنے سامنے ہونگے ۱۶۹۳

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾
انھیں ان میں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾
میرے بندوں کو خبر دے کہ میں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں۔

وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾
اور کہ میرا عذاب دردناک عذاب ہے ۱۶۹۴

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾
اور انھیں ابراہیمؑ کے مہمانوں کی خبر دے دو۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾
جب وہ اس کے پاس آئے تو کہا سلامتی ہو، اس نے کہا ہم تم سے ڈرتے ہیں۔

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾
انھوں نے کہا نہیں ہم تجھے ایک صاحب علم لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں

سے مراد طبقات جہنم ہیں نہ دروازے (ج) اور ان سات طبقوں کے نام جَهَنَّم۔ لَظٰی۔ حُطَمَة۔ سَعِیْر۔ سَقَر۔ جَحِیْم۔ هَاوِیَة لیے گئے ہیں (ج) اور قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساتوں دوزخ کے مختلف نام ہیں اور ہر ایک ان میں سے کسی وصف کے لحاظ سے دوزخ کا نام ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سات کا استعمال ایسی حالت میں عدد کامل کے طور پر ہو۔ یعنی بہت سے دروازے ہیں۔ سَبْعَة کے لیے دیکھو ۴۴ اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہ سات دروازے ان کے اعمال کے مطابق سات منزلیں ہیں (ج) اور یہی اصل حقیقت ہے کہ ہر ایک شخص کا دوزخ اس کے اعمال کے مطابق ہے۔ کسی موٹی تقسیم کے لحاظ سے ان کی سات قسمیں بھی ہو سکتی ہیں۔

۱۶۹۳ سرر۔ سریر کی جمع ہے اور مادہ اس کا سِرّ ہے جس کے معنی بھید یا چھپی ہوئی چیز ہیں اور سُرور خوشی کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ وہ چھپی ہوتی ہے اور سریر تخت کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس پر سرور کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور یہ صرف اہل نعمت کے لیے ہے اور جس پر میت کو رکھا جائے اسے بھی سریر کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں خوشی کا تفاول ہے جو موت کے بعد ملیگی اور دنیا کے غموں سے نجات ہے۔ (غ)

چونکہ پچھلے رکوع میں شیطان کا ذکر تھا اور ان لوگوں کے انجام کا جو اس کی اتباع کرتے ہیں، اس لیے یہاں تقابل کے طور پر ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو شیطان کے اتباع سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ یعنی متقی متبعین شیطان یا حیوانی زندگی کو مقصد بنا لینے والے کیلئے اگر آخر کار آگ ہے تو متقی کے لیے جنت ہے۔ اس جنت کا نقشہ یہاں جن الفاظ میں کھینچا ہے اس کی طرف کم لوگ توجہ کرتے ہیں۔ انسان کے اپنے نفس کے لیے وہاں ہر قسم کے عیوب سے سلامتی ہے اور ہر قسم کے خطرات سے امن ہے پھر دوسروں سے بھی تعلقات ہیں اور وہ تعلقات اس اعلیٰ درجہ کی محبت کے ہیں جو اخوت کے نام سے موسوم ہے مگر اخوت بھی ایسی جس میں رنج وحسد کوئی نہیں جس سے دنیا کی محبتیں اور اخوتیں عموماً آلودہ رہتی ہیں۔ پھر سب سے بڑھکر یہ کہ ان نعمتوں کا دوام ہے۔ یعنی ان سے کبھی کوئی نکالا نہیں جائیگا جو بلا یہاں دنیا کی نعمتوں سے لگی ہوئی ہے کہ آج ایک شخص کو ملتی ہیں تو کل ان سے محروم ہو جاتا ہے مگر ایک چیز کی مداومت سے انسان تھک جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ یہ مداومت ایسی نہ ہوگی۔ جس میں تکان ہو یہ کمال راحت کا نقشہ ہے جس سے بڑھ کر راحت کے لیے اور الفاظ تجویز نہیں ہو سکتے اور متقی کو جو اس دنیا میں جنت ملتی ہے اس میں بھی یہ سب کیفیات ایک نہ ایک رنگ میں موجود ہوتی ہیں فی جنات وعیون یعنی باغوں اور چشموں میں ہونگے اور دوسری جگہ فرمایا فی جنّات ونہر (القمر ۵۴: ۵۴) باغوں اور نہر میں ہوں گے جس سے معلوم ہوا کہ یہ چشمے اور نہریں ایسی ہیں کہ ان میں انسان رہ بھی سکتا ہے۔

۱۶۹۴ اجب دونوں راہیں بتا دیں تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کی طرف بھی اشارہ کیا یعنی ایک طرف غفر ورحم اور دوسری طرف سزا دینے کی صفت۔ کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ان دونوں باتوں پر اس کا ایمان نہ ہو اسی رجاء وخوف کے درمیان ایمان ہے کہ اس کی رحمت بھی بہت وسیع ہے مگر اس کی سزا بھی سخت ہے اور آگے حضرت ابراہیمؑ اور لوطؑ کے ذکر میں یہی دو نقشے پیش کیے ہیں۔

قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰ أَن مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ﴿٥٤﴾

اس نے کہا کیا تم مجھے خوشخبری دیتے ہو حالانکہ مجھے بڑھاپے نے آلیا ہے تو تم کا ہے کی خوش خبری دیتے ہو۔

قَالُوا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُن مِّنَ الْقَانِطِينَ ﴿٥٥﴾

انھوں نے کہا ہم حق کے ساتھ تجھے خوشخبری دیتے ہیں، پس تو ناامیدوں میں سے نہ ہو[1695]

قَالَ وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿٥٦﴾

اس نے کہا اور سوائے گمراہوں کے اپنے رب کی رحمت سے کون مایوس ہوسکتا ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿٥٧﴾

کہا، تو اے رسولو! تمھارا کام کیا ہے؟

قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ﴿٥٨﴾ۙ

انھوں نے کہا، ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمُنَجُّوهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٥٩﴾ۙ

سوائے لوطؑ کے پیروؤں کے ہم ان سب کو ضرور بچالیں گے۔

ع إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَا إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ ﴿٦٠﴾

مگر اس کی عورت ہم مقدر کر چکے ہیں کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہو[1696]

فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ﴿٦١﴾ۙ

سو جب رسول لوطؑ کی آل کے پاس آئے۔

قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنكَرُونَ ﴿٦٢﴾

اس نے کہا تم اجنبی لوگ ہو۔

قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٦٣﴾

انھوں نے کہا بلکہ ہم وہ بات تیرے پاس لائے ہیں جس میں یہ جھگڑتے تھے

وَأَتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿٦٤﴾

اور ہم حق کے ساتھ تیرے پاس آئے ہیں اور یقیناً ہم سچے ہیں[1697]

۱۶۹۵ء یقنط۔ قنوط کے معنی بھلائی سے مایوس ہوجانا ہیں اور قانط (۵۵) اور قنوط (حٰمٓ السجدۃ ۴۱۔ ۴۹) مایوس ہونیوالا ہے (غ)

یہاں انھی واقعات کا ذکر ہے جو سورۂ ہود میں ۶۹۔۷۳ میں بیان ہوچکے ہیں۔ یہاں ان آنیوالوں کو مہمان کہا ہے اس سے بھی یہ پتہ لگتا ہے کہ یہ انسان تھے اور حضرت ابراہیمؑ کا یہ کہنا کہ تم کس ذریعہ سے مجھے خوشخبری دیتے ہو صاف بتاتا ہے کہ وہ انھیں ملائکہ نہ سمجھتے تھے اور یہ ناممکن ہے کہ فرشتہ نبی پر نازل ہو تو وہ اسے شناخت نہ کرے کہ یہ فرشتہ ہے اور ان کا جواب کہ ہم تجھے حق کے ساتھ خوشخبری دیتے ہیں اسی بات کا موید ہے گویا وہ بتاتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے آگاہ کیا ہے جو امر حق ہے۔

۱۶۹۶ء الّا آل لوط میں الّا استثنائے منقطع ہے اور مطلب صرف اس قدر ہے کہ آل لوط اس مجرم قوم میں داخل نہیں اور اگلے رکوع کی پہلی آیت میں صاف فرمایا کہ رسول آل لوط کے پاس آئے۔ حضرت ابراہیمؑ اور لوطؑ کے اس واقعہ کو اکٹھا بیان کرنے پر دیکھو ع۱۲۸۰۔ قدرنا میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے کیونکہ قضاء و قدر نہ ملائکہ کے اختیار میں ہے نہ انسانوں کے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اس میں بُعد کوئی نہیں کہ ان مرسلوں کے کلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام شروع ہوگیا ہو۔ دوسری جگہ انھی مرسلوں کا کلام یوں نقل کیا ہے قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین۔ لنرسل علیھم حجارۃ من طین۔ مسوّمۃ عند ربك للمسرفین فاخرجنا من کان فیھا من المومنین فما وجدنا فیھا غیر بیت من المسلمین وترکنا فیھا اٰیۃ للذین یخافون العذاب الالیم (الذّٰریٰت ۵۱۔ ۳۲ تا ۳۷) جس میں لازماً کہیں نہ کہیں ضمیر کو بدل کر اللہ تعالیٰ کی طرف لانا پڑتا ہے کیونکہ آخری الفاظ ترکنا کسی طرح ان ملائکہ کی طرف منسوب نہیں ہوسکتے اور اس موقعہ پر تفاسیر میں فاخرجنا سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایتاً قول مانا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں انا لمنجوھم سے کلام حکایتاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

۱۶۹۷ء حضرت لوطؑ نے بھی ان مرسلوں کو انسان ہی سمجھا: جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے ان آنے والوں کو ملائکہ نہیں سمجھا حضرت لوطؑ نے بھی نہیں سمجھا۔ کیونکہ نبی ملائکہ کو منکر یا اجنبی لوگ نہیں کہہ سکتا اور ان کا حضرت لوطؑ کو یقین دلانا کہ ہم سچے ہیں صاف بتاتا ہے کہ یہ انسان تھے فرشتوں کو ایسا یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اتیناك بالحق کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ایک حق بات ہم آپ کے پاس لائے ہیں یعنی عذاب الٰہی جس کا آنا حق ہے مگر یہ خطاب حضرت لوطؑ کے لیے موزون نہیں ان کی قوم کے لیے موزون ہوسکتا ہے اس لیے میں نے دوسرے معنی اختیار کیے ہیں کہ ہم اقتضائے حکمت کے مطابق آپ کے پاس آئے ہیں تاکہ اس قوم پر اتمام حجت ہوجائے اور یہ اپنی شرارت کو اس انتہا تک پہنچا دیں جس کے بعد قوم کو مہلت نہیں دی جاتی۔ یہاں جن واقعات

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

سو اپنے اہل کو کچھ رات رہے لیکر چلا جا اور خود ان کے پیچھے چل اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جاؤ جہاں تمھیں حکم دیا گیا ہے ۱۶۹۸

وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور ہم نے اس کے ساتھ اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ ان کی جڑ صبح ہوتے ہی کاٹ دی جائے گی ۱۶۹۹

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور شہر کے لوگ خوش خوش آئے۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾

(لوطؑ نے) کہا یہ میرے مہمان ہیں تو تم مجھے رسوا نہ کرو ۱۷۰۰

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾

اور اللہ کا تقویٰ کرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾

انھوں نے کہا کیا ہم نے تمھیں جہان (کے لوگوں) سے روکا نہیں ۱۷۰۱

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾

کہا یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم (ان سے نکاح) کرنا چاہتے ہو۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾

تیری زندگی کی قسم وہ اپنی بدمستی میں اندھے ہو رہے تھے ۱۷۰۲

کا ذکر ہے وہی سورۂ ہُود کے ساتویں رکوع میں بیان ہو چکے ہیں دیکھو ع ۱۴۸۶ سے ع ۱۴۹۱ تک۔

ع ۱۶۹۸ خود ان کے پیچھے چلو۔ یہی انبیاء کی طرز ہے سب سے بڑھ کر خطرے کے مقام میں خود رہتے ہیں نبی کریم صلعم نے بھی سب صحابہؓ کو مکہ سے رخصت کر کے سب سے آخر خود ہجرت کی تاکہ کمزور ناتوان وغیرہ پیچھے نہ رہ جائیں۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی تاکید اس لیے کی کہ وہ ایک خطرناک مقام تھا۔ ایسا نہ ہو کہ نکل کر اس انتظار میں ٹھہر جائیں کہ اس قوم پر کیا سزا آتی ہے۔ اور جہاں حکم دیا جاتا ہے وہاں چلے جاؤ۔ یہ حکم الٰہی حضرت لوطؑ کو علیحدہ دیا گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ سارا کلام فاسر باھلك سے لیکر حضرت لوطؑ کی طرف وحی ہے جیسا کہ اسی آیت میں اس وحی کا صاف ذکر بھی ہے۔

ع ۱۶۹۹ قضینآ۔ قضا کے معنی فصل امر یعنی ایک بات کا قطعی فیصلہ کر دینا ہیں اور جہاں وحی الٰہی سے ایک امر کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے یہاں اور وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب (بنی اسرائیل - ۴) میں بھی قضاء بالاعلام مراد ہے یعنی ایک بات کا قطعی خبر سے علم دے دینا (غ)

اس سے معلوم ہوا کہ ان رسولوں کا آنا اور وحی الٰہی دو الگ الگ امر ہیں۔ اگر یہ رسول فرشتے ہوتے تو علیحدہ وحی الٰہی کی ضرورت نہ تھی بلکہ فرشتوں کا آنا ہی کافی تھا۔ مگر چونکہ رسول اپنی وحی پر ہی عمل کرتے ہیں اس لیے حضرت لوطؑ کی طرف وحی بھی ہوئی۔

ع ۱۷۰۰ تفضحون فضح کے معنی (جس سے فضیحت ہے) کسی برائی کی تشہیر ہے۔

ع ۱۷۰۱ پیدائش ۱۹ : ۹ میں ہے "یہ ایک مرد یہاں گزران کرنے آیا" مطلب یہ ہے کہ ہماری قوم میں سے نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسی وجہ سے انہوں نے حضرت لوطؑ کو اس بات سے روک دیا تھا کہ آپ کے پاس کوئی مہمان آکر رہے یعنی کوئی غیر قوم کا آدمی آکر ٹھہرے۔ یہی مطلب ان الفاظ کا ہے۔

ع ۱۷۰۲ لعمرك۔ عَمر اور عُمر کے ایک ہی معنی ہیں دیکھو ع ۱۲۱ قسم میں عَمر کا لفظ آتا ہے۔ یہاں قسم کھانے والا کون ہے اور کس چیز کی قسم ہے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلعم کی زندگی کی قسم کھائی ہے اور بعض کے نزدیک حضرت لوطؑ کے مہمانوں نے لوطؑ کی زندگی کی قسم کھائی ہے اور گو اس میں قالوا محذوف ماننا پڑے گا مگر قرینہ اسی کو چاہتا ہے اور اس طرح پر حذف قرآن شریف میں کئی جگہ آتا ہے اور یہاں ذکر قوم لوط کا ہی ہے پہلی صورت میں آنحضرت صلعم کی زندگی کی قسم کھانے سے کیا منشاء ہے۔ انسان جب خدا کی قسم کھاتا ہے تو اس کا منشا عموماً یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اسبات پر گواہ ٹھہراتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی قسم میں مراد صرف اس قدر ہوگی کہ کسی چیز کو بطور گواہ پیش کیا جاتا ہے۔ تو اس صورت میں نبی کریم صلعم کی زندگی کو بطور گواہ پیش کیا ہے اور یہ سچ ہے کہ ایک راستباز، ہاں تمام راستبازوں کے سردار کی زندگی ان لوگوں کے اندھا اور بدمست ہونے پر گواہ ہے جو بدی میں منہمک ہو جاتے ہیں اور لسان العرب میں ابن عباس کے اس قول کو نقل کر کے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں نبی کریم صلعم کی زندگی کی قسم کھائی ہے اور آپ کے سوائے اور کسی کی زندگی کی قسم نہیں کھائی اس کا انکار بھی نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ دوسروں نے اس کے معنی کیے ہیں لَدِیْنُكَ الذی تعمر یعنی تیرے اس دین کی قسم جسے تو مروج کرتا ہے (ل)

فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُشۡرِقِيۡنَ ﴿۷۳﴾
سو ایک خطرناک آواز نے انھیں سورج نکلتے ہی آپکڑا ع۱۴۰۳

فَجَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ﴿۷۴﴾
پس ہم نے اُسے تہ و بالا کر دیا ، اور ہم نے اُن پر سخت پتھر برسائے ۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِيۡنَ ﴿۷۵﴾
یقیناً اس میں فراست والوں کے لیے نشان ہیں ع۱۴۰۴

وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيۡلٍ مُّقِيۡمٍ ﴿۷۶﴾
اور وہ (شہر) ایک دائمی رستے پر ہے ع۱۴۰۵

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۷۷﴾
یقیناً اس میں مومنوں کے لیے نشان ہیں ۔

وَ اِنۡ كَانَ اَصۡحٰبُ الۡاَيۡكَةِ لَظٰلِمِيۡنَ ﴿۷۸﴾
اور بَن کے رہنے والے بھی ظالم تھے ع۱۴۰۶

فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ ۘ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۷۹﴾
سو ہم نے انھیں سزا دی اور یہ دونوں (شہر) کھلے رستے پر ہیں ع۱۴۰۷

وَ لَقَدۡ كَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۸۰﴾
اور حجر کے رہنے والوں نے رسولوں کو جھٹلایا ع۱۴۰۸

ع۱۴۰۳ مشرقین ۔ شَرَقَتِ الشَّمۡسُ کے معنی ہیں سورج طلوع ہوا ۔ اور اَشۡرَقَ کے معنی روشن کر دیا بالعشی والاشراق (صٓ ۳۸ ۔ ۱۸) اور مَشۡرِق جدھر سے سورج طلوع ہوتا ہے مکاناً شرقیاً (مریم ۱۹ ۔ ۱۶)

ع۱۴۰۴ متوسّمین ۔ وَسۡم کے معنی نشان کرنا ہیں اور سِمَة نشان ہے ۔ یہی معنی سِیۡمَا کے ہیں سیماھم فی وجوھھم (الفتح ۴۸ ۔ ۲۹) تعرفھم بسیماھم (البقرۃ ۲ ۔ ۲۷۳) (اور یہاں فا کی جگہ عین نے لے لی ہے) اور وَسۡم یَسِم کے معنی ہیں کسی نشان لگانے والی چیز کے ساتھ نشان لگایا سنسمہ علی الخرطوم (القلم ۶۸ ۔ ۱۶) اور تَوَسَّمَ کے معنی فراست یا فطنت ہیں اور مُتَوَسِّم وہ ہے جو عبرت حاصل کرے یا فراست سے کام لے (غ)

ع۱۴۰۵ مقیم ۔ اِقَامَة کے معنی دوام بھی آتے ہیں یعنی ہمیشہ رہنا جیسے عذاب مُقِیۡم (المائدۃ ۵ ۔ ۳۷) (غ) یہاں مراد دائمی رستہ ہے ۔
مراد یہ ہے کہ لوط کی یہ بستیاں ایک ایسے رستہ پر ہیں جو ہمیشہ چلتا ہے اس لیے یہ تباہ شدہ بستیاں بھی نظروں کے سامنے آتی رہتی ہیں آج بھی یہ رستہ اسی طرح جاری ہے ۔

ع۱۴۰۶ ایکۃ ۔ بہت سے درختوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے سے پھنسے ہوئے ہوں اور ایسی جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں اس طرح درخت ہوں یعنی بَن کو (ل) اور اصحاب الایکۃ یا تو بَن کے رہنے والے ہیں اور یا ایکۃ شہر کا نام ہے ۔
اصحاب الایکۃ کون تھے ؟ ان کا ذکر یہاں اور صٓ ۳۸ ۔ ۱۳ میں اور قٓ ۵۰ ۔ ۱۴ میں قوم لوط کے ساتھ ملا ہوا مجملاً آیا ہے ۔ اور الشعراء ۲۶ ۔ ۱۷۶ تا ۱۹۱ میں قوم لوطؑ کے بعد ان کا ذکر مفصل آیا ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ ان کے رسول حضرت شعیبؑ تھے اور حضرت شعیبؑ کا اہل مدین کی طرف مبعوث ہونا دوسری جگہ سے ظاہر ہے والی مدین اخاھم شعیبا (الاعراف ۷ ۔ ۸۵) پس سوال یہ ہے کہ آیا یہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں یا دو الگ الگ قومیں ہیں اہل مدین کے عذاب کو ہودؑ ۱۱ ۔ ۹۴ میں صیحۃ کہا ہے اور اصحاب الایکۃ کے عذاب کو الشعراء ۲۶ ۔ ۱۸۹ میں عذاب یوم الظلۃ کہا ہے اس سے اور ایک حدیث سے جو ابن عساکر میں مذکور ہے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یہ دو الگ الگ قومیں تھیں ۔ مگر علاوہ اس بات کے جس کا ذکر اوپر ہوا کہ دونوں قوموں کی بیماری ایک ہے قرآن شریف میں جہاں اہل مدین کا ذکر ہے وہاں اصحاب الایکہ کا نہیں اور جہاں اصحاب الایکہ کا ہے وہاں اہل مدین کا نہیں جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی قوم ہے اور عذاب کے دو نام آنے سے یہ قیاس کرنا کہ الگ الگ عذاب تھے بالکل غلط ہے صیحۃ زلزلہ کو کہا ہے اور زلزلہ جس میں آتش فشاں کی سنگباری ہو عذاب یوم الظلۃ کہلا سکتا ہے پس یا یہ ایک ہی قوم ہے اور یا ایک ہی قوم کے دو ٹکڑے ہیں ۔

ع۱۴۰۷ امام کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۵۵ چونکہ رستہ پر چلا جاتا ہے اس لیے اسے بھی امام کہدیا ہے ۔
دونوں سے مراد لوط اور شعیب کی بستیاں ہیں ۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی رستہ پر واقع ہیں ۔

ع۱۴۰۸ الحجر قوم ثمود کے مسکن کا نام ہے (غ) اور یہ قطعہ مدینہ کے شمال میں ملک عرب کی حدود کے اندر واقع ہے ۔
یہاں قوم ثمود کا ذکر ہے اس سے پہلے قوم لوط اور پھر قوم شعیب کا ذکر کیا تھا ۔ ان تین کو یہاں ذکر سے کیوں مخصوص کیا ۔ اور پھر یہ ترتیب کیسی ہے کہ لوط کی قوم ثمود کے بعد ہوئی اور شعیب کا زمانہ لوط سے بعد ہے لیکن یہاں ذکر اوّل لوط کا پھر قوم شعیب کا پھر قوم ثمود کا ہے ۔ بات یہ ہے کہ ان تینوں قوموں کے مسکن اس رستہ پر ہیں ، جہاں سے اہل مکہ اپنی شام کی تجارت میں بار بار گزرتے تھے ۔ اس لیے انہی تین کو یہاں ذکر سے مخصوص کیا ۔ اور ترتیب اس لحاظ سے ہے کہ سب سے اوپر لوط کی بستیاں ہیں اس سے نیچے قوم شعیب کی اور اس کے نیچے وادی حجر ہے یعنی قوم ثمود کا مسکن ۔ ان کا ذکر اعدائے اسلام کی عبرت کے لیے کیا ۔ نبی کریم صلعم نے مسلمانوں کو فرمایا کہ ان تباہ شدہ مقاموں پر جائیں تو روتے ہوئے جائیں مطلب یہ ہے کہ عبرت

وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ اٰیٰتِنَا فَکَانُوۡا عَنۡہَا مُعۡرِضِیۡنَ ﴿۸۱﴾ — اور ہم نے انھیں اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے منہ پھیر لینے والے ہوئے۔

وَ کَانُوۡا یَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا اٰمِنِیۡنَ ﴿۸۲﴾ — اور وہ امن میں پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے۔

فَاَخَذَتۡہُمُ الصَّیۡحَۃُ مُصۡبِحِیۡنَ ﴿۸۳﴾ — سو صبح ہوتے ہی انھیں سخت آواز نے آلیا۔

فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۸۴﴾ — پس جو کچھ وہ کماتے تھے ان کے کسی کام نہ آیا۔

وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ وَ اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ ﴿۸۵﴾ — اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے حق کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے اور یقیناً (موعود) گھڑی آنے والی ہے سو خوبی سے درگزر کرتے رہو۔ ع۱۸۰۹

اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۶﴾ — تیرا رب سب کا پیدا کرنے والا جاننے والا ہے۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَ الۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ﴿۸۷﴾ — اور ہم نے ہی تجھے سات بار بار دہرائی گئی (آیتیں) اور عظمت والا قرآن دیا ہے ع۱۸۱۰

حاصل کریں (بخاری) خود مدت بعد تبوک کو جاتے ہوئے صحابہ کو اسی طرح نصیحت فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے یہ قوم قبول حق میں بہت ہی سخت تھی شاید اسی موزونیت سے سورۃ کا نام الحجر ہے۔

ع۱۸۰۹ الجمیل۔ جمال حُسن کثیر کو کہتے ہیں اور یہ دو قسم ہے ایک وہ جو انسان سے مخصوص ہے اس کے نفس میں ہو یا بدن میں یا فعل میں۔ اور دوسرا وہ جو اس کے غیر کی طرف پہنچتا ہے۔ اور یہی معنی ہیں اس حدیث کے اِنَّ اللّٰہَ جَمِیۡلٌ یُحِبُّ الۡجَمَالَ اللہ جمیل ہے جمال سے محبت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام خیرات یعنی بھلائیاں اس سے نکلتی ہیں پس وہ ایسے شخص سے محبت کرتا ہے جو دوسروں سے نیکی کرے اور پھر اس سے کثرت معنی ہو گئے ہیں اس لیے جُمۡلَۃ کے معنی کل ہیں لولا نزّل علیہ القراٰن جملۃ واحدۃ (الفرقان ۲۵-۳۲) اور جس چیز کی تفصیل نہ ہو اسے مُجۡمَل کہا جاتا ہے۔ اور جَمَل اونٹ کو کہتے ہیں جب اس کے سب دانت نکل آئیں حتّٰی یلج الجمل فی سمّ الخیاط (الاعراف ۷-۴۰) اور اس کی جمع جِمَال اور جِمَالَۃ آتی ہے کانّہٗ جمٰلۃ صفر (المرسلٰت ۷۷-۳۳)

ان تین قوموں کے ذکر میں یہ سمجھایا کہ اعمال کی جزا حق ہے۔ اس لیے اب عام کر کے سمجھایا کہ آسمان اور زمین میں جہاں تک بھی دیکھتے جاؤ یہی معلوم ہوگا کہ کوئی فعل بے نتیجہ نہیں۔ پس اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ قوم جو اعمال بد میں بڑھتی چلی جاتی ہے آخر اس کی صف لپیٹ دی جائے اور الساعۃ سے مراد یہاں وہی قوم کی تباہی کا وقت ہے جسے الساعۃ الوسطیٰ کہا جاتا ہے دیکھو ع۱۰۸ اسی لیے اس کے بعد درگزر کا حکم دیا کیونکہ ان کی ساعۃ ان کی مغلوبیت تھی جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانّہ ولیّ حمیم (حٰمٓ السجدۃ ۴۱-۳۴) یا فرمایا عسی اللہ ان یجعل بینکم و بین الذین عادیتم منھم مودّۃ (الممتحنۃ ۶۰-۷)

ع۱۸۱۰ مثانی۔ اس کا اصل ثِنۡی ہے اور ثِنۡی اور اثنان گنتی کے اعتبار سے بھی بولا جاتا ہے اور دوبارہ لانے کے اعتبار سے بھی اور دونوں کے اعتبار سے بھی۔ اور ثَنَاء حمد کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے اور مَثَانی (مثناۃ کی جمع) قرآن کریم کی سورتوں کو کہا گیا ہے اس لیے کہ وہ بار بار دوہرائی جاتی ہیں یعنی ہمیشہ پڑھی جاتی ہیں اور دوسری جگہ قرآن کریم کو مثانی کہا ہے اللہ نزّل احسن الحدیث کتٰبًا متشابھا مثانی (الزمر ۳۹-۲۳) اور یہ بھی درست ہے کہ قرآن شریف کو مثانی اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے فوائد بار بار اور از سر نو تازہ ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ حدیث میں اس کی صفت میں ہے کہ لَا یَعۡوَجُّ فَیُقَوَّمُ وَلَا یَزِیۡغُ فَیُسۡتَعۡتَبُ وَلَا تَنۡقَضِیۡ عَجَائِبُہٗ یعنی جب کبھی اس میں کجی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ اسے دور کر کے اسے قائم کرنے کا سامان کر دیگا اور جب اس میں زیغ پیدا کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے دور کر دیگا۔ اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہونگے اور اس لحاظ سے بھی مثانی کا لفظ اس پر صادق آتا ہے کہ اس میں سے ایسی باتیں ہمیشہ ظاہر ہوتی رہیں گی جن کی وجہ سے اس کی ثنا ہوتی رہے گی۔ اور اس کی بھی جو اسے پڑھے اور سیکھے اور اس پر عمل کرے اور اسی معنی میں قرآن شریف کو کریم بھی کہا ہے۔ انّہ لقراٰن کریم (الواقعۃ ۵۶-۷۷) اور مجید بھی بل ھو قراٰن مجید (البروج ۸۵-۲۱) (غ)

سبعا من المثانی سے کیا مراد ہے بخاری میں ابو ہریرہؓ اور ایک دوسرے صحابی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ یہ سورۃ فاتحہ ہے اور دونوں روایتوں میں اسی کو قرآن عظیم بھی فرمایا ہے۔ ہاں ابن عباسؓ سے اور مجاہد وغیرہما سے روایت ہے کہ اس سے مراد سات لمبی سورتیں ہیں یعنی پہلی ساتوں سورتیں (ج) لیکن یہ سورت مکی ہے اور سات لمبی سورتوں میں سے پانچ مدنی ہیں اس لیے بھی یہ معنی قابل قبول نہیں۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ اس

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾	تو اپنی آنکھوں کو اس طرف نہ لگا جو ہم نے ان میں سے کئی قسم کے لوگوں کو چند روزہ سامان دیا ہے اور ان کے لیے غم نہ کھا اور مومنوں کے لیے اپنے بازوؤں کو جھکا ۱۷۱۱
وَقُلْ اِنِّيْۤ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾	اور کہہ میں کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں۔
كَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾	جس طرح ہم نے قسمیں کھانے والوں پر اتارا ۱۷۱۲

مراد سورۂ فاتحہ ہی ہے جو اس وقت نازل ہو چکی تھی اور نمازوں میں دہرائی جاتی تھی اور وہ اس لحاظ سے بھی مثانی بالخصوص کہلائے گی کہ نماز میں یہی حصہ ہے جو بار بار دہرایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی سورت یا حصہ اور پڑھا جاتا ہے اور ہر رکعت میں دوہرائی صرف یہی سورت جاتی ہے اور اس کی سات آیات بھی ہیں۔ اور قرآن عظیم اس کو اس معنی سے کہا جیسے ام الکتاب اس لیے کہ اس میں ساری تعلیم قرآنی کا نچوڑ موجود ہے اور اس کا ذکر اس لیے کیا کہ اگر لوگوں کے پاس مال و دولت ہے دیکھو اگلی آیت جس کے بھروسہ پر وہ تمہاری مخالفت کرتے ہیں تو تمہارے پاس وہ حق موجود ہے جس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی اور وہی غالب آکر رہے گا۔

ع۱۷۱۱ تمدن۔ مَدّ کے معنی کھینچنا ہیں اور مُدّۃ وقت ممتد یعنی لمبے وقت کو کہتے ہیں اور حرف کی مَدّ اس کا لمبا کرنا اور کسی چیز کی طرف مد بصر یا مد عین سے مراد ہوتی ہے اس کی حرص کرنا یا اس کا خواہش مند ہونا (غ)

ازواجا۔ اَزْوَاج۔ زَوْج کی جمع ہے دیکھو ع۱۳۹ و ع۱۰۲۶ اور چونکہ ہر ایک قرین یا ہمنشین پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اس لیے ازواج کے معنی یہاں اشباہ اور اقران ہیں (غ) یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ اور اَصْناف بھی اس کے معنی کیے ہیں یعنی قسم قسم کے لوگ اور بعض نے تکلف کر کے رجالا مع نسائہم بھی کہا ہے یعنی مرد اور ان کی عورتیں (ر)

اخفض جناحك۔ خَفْض۔ رفع کی ضد ہے خافضة رافعة (الواقعة ۵۶:۳) اور جناح جانب کو کہتے ہیں اور مراد خفض الجناح یا پہلو کے نیچا یا نرم کرنے سے نرمی کا اختیار کرنا ہے۔ جب اس عظیم الشان حق کا ذکر کیا جو نبی کریم صلعم کو دیا گیا، تو اس کے بالمقابل جن چیزوں پر لوگ فخر کرتے ہیں ان کا ذکر بھی کیا، یعنی دنیا کا مال اور اس کی نعمتیں اور آسائشیں۔ بعض نے یہاں مراد مُتّت کو لیا ہے کیونکہ نبی کریم صلعم ابتدائے زندگی سے ہی کبھی مال دنیا کی پروا نہ کرتے تھے لیکن دیکھو ع۱۴۲ و ع۴۲۷ ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آئندہ زمانہ کی طرف اشارہ ہے جب سامان دنیوی کی افراط اس قدر دنیا میں ہونے والی تھی تو یہ سمجھایا ہے کہ دنیا کے مال و متاع کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو کیونکہ تمہارے پاس اس سے بہت بڑھ کر دولت ہے حضرت ابو بکر صدیق رض سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جس شخص کو قرآن دیا گیا پھر اس نے یہ خیال کیا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی چیز کسی کو دی گئی ہے تو اس نے ایک عظیم الشان چیز کو حقیر جانا اور ایک حقیر چیز کو بڑا سمجھا۔ ولا تحزن علیهم دوسری جگہ عیسائیوں کے ذکر میں ہے فلعلك باخع نفسك علیٰ آثارهم ان لم یومنوا بهذا الحدیث اسفا (الکهف ۱۸:۶) اور یا اس وجہ سے کہ وہ اپنے اموال کو حق کی مخالفت پر خرچ کرتے تھے تو مراد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا استیصال ضروری ہے۔

ع۱۷۱۲ مقتسمین قَسَمَ کے معنی تقسیم کیا اور تقاسما المالَ اور اقتسماہُ کے معنی ہیں ان دونوں نے باہم مال تقسیم کیا۔ اور اسی سے قِسْمَۃ ہے واذا حضر القسمة (النساء ۴:۸) اور قسم امرہ اور اِقْتَسَمَ کے معنی یوں بھی آتے ہیں کہ اس معاملہ میں سوچتا رہا کہ اسے کرے یا نہ کرے اور اَقْسَمَ کے معنی ہیں قسم کھائی اور تقاسَمَ الْقَوْمُ سب لوگوں نے ایک دوسرے سے عہد کے طور پر قسم کھائی تقاسموا بالله (النمل ۲۷:۴۹) (ل) یہاں مقتسمین سے مراد راغب نے وہ لوگ لیے ہیں جنہوں نے مکہ کی گھاٹیوں میں باہم قسمیں کھائی تھیں کہ جو لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس آئیں انہیں روک دیں گے یا نبی کریم صلعم کے خلاف تدابیر کرنے پر باہم قسمیں کھائی تھیں اور بخاری نے بھی اس کے معنی الذین حلفوا ہی کیے ہیں یعنی وہ لوگ جنہوں نے قسمیں کھائی تھیں اور بعض نے اقتسام سے مراد قرآن شریف کی تقسیم لی ہے یعنی ایسے لوگ جنہوں نے ایک حصہ کو حق کہا اور دوسرے کو باطل۔ جیسا کہ اہل کتاب کرتے تھے یہی مضمون اگلی آیت میں بیان ہوا ہے۔

آئندہ زمانہ کے عذاب کی پیشگوئی: کما کو ولقد اتینك کے متعلق سمجھا گیا ہے مگر یہاں انزال وحی کا ذکر نہیں بلکہ انزال عذاب کا ذکر ہے جس کی طرف انا النذیر المبین میں اشارہ ہے۔ جب عذاب سے ڈرایا تو فرمایا کہ ہم اسی طرح عذاب نازل کریں گے جس طرح قسمیں کھانے والوں پر اُتارا جنھوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اب ظاہر ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور ابھی نہ اہل کتاب پر عذاب اُترا تھا نہ اہل مکہ پر۔ اس لیے بعض نے خیال کیا کہ مقتسمین سے مراد پہلے انبیاء کے مخالف ہیں اور اگلی آیت میں القرآن سے بھی پہلی کتب منزلہ کو مراد لے لیا ہے مگر یہ بالبداہت غلط ہے۔ القرآن کا لفظ ان پر صادق نہیں آ سکتا پس مراد اس سے کسی آئندہ زمانہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ ع۱۷۱۱ میں دکھایا گیا جب دنیا کے سامان بہت ترقی کر جائیں تو فرمایا کہ ان پر بھی ہم اسی طرح پر عذاب نازل کریں گے جس طرح ان سے پہلے لوگوں پر کیا جنہوں نے رسول اللہ صلعم کی مخالفت پر قسمیں کھائیں اور اس صورت میں انزلنا کا استعمال بسبب تحقق وقوع درست ہے اس لیے کہ انہیں بار بار اس کی پیشگوئیاں سنا دی گئی تھیں۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ اصحاب الحجر ہی (جن کے نام پر سورت ہے) وہ لوگ تھے جن کے متعلق اپنے پیغمبر کے خلاف قسمیں کھانے کا ذکر ہے

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾
جنھوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا[۱۸۱۳]

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾
سو تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب سے پوچھیں گے ۔

عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾
جو وہ عمل کرتے تھے ۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾
سو کھول کر کہہ دے جو تجھے حکم دیا جاتا ہے اور مشرکوں کا خیال نہ کر[۱۸۱۴]

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾
ہم تیری طرف سے ہنسی کرنے والوں (کی سزا) کے لیے کافی ہیں۔

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾
جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں سو عنقریب جان لیں گے ۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾
اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا دل اس سے تنگ پڑتا ہے جو یہ کہتے ہیں ۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾
سو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتا رہ اور سجدہ کرنیوالوں میں رہ۔

ع وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾
اور اپنے رب کی عبادت کرتا رہ یہاں تک کہ تجھ پر موت آجائے[۱۸۱۵]

قالوا تقاسموا باللہ لنبیتنہ واھلہ ثم لنقولن لولیہ ماشھدنا مھلک اھلہ وانا لصدقون ۰ (النمل ۲۷ - ۴۹) اور بعینہٖ یہی معاملہ ہمارے نبی کریم صلعم کے خلاف ہوا۔

۱۸۱۳ عضین ۔ عِضُوْن ۔ عِضَۃ کی جمع ہے اور اس کی اصل عِضْوَۃ ہے جس کے معنی جزو ہیں اسی سے عُضْو اور عِضْو ہے کیونکہ عضو بھی جسم کا ایک جزو ہے اور تَعْضِیَۃ کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنا آتے ہیں (ل) اور قرآن کو عضین بنانے سے یہ منشا ہے کہ کسی حصہ پر ایمان لاتے ہیں اور کسی کا انکار کرتے ہیں اور یا یہ کہ کبھی اسے سحر کہتے ہیں کبھی کہانت کبھی شعر وغیرہ بخاری میں ابن عباس سے پہلے معنی مروی ہیں اور یہود و نصاریٰ مراد لیے گئے ہیں۔

۱۸۱۴ اصدع ۔ صَدْع ۔ سخت اجسام میں شق کرنے کو کہتے ہیں اور صَدَعَ الْاَمْرَ کے معنی ہیں اس کو کھول دیا اور صُداع سخت سر درد کو کہتے ہیں گویا درد سے سر پھٹ رہا ہو اسی لحاظ سے ہے لا یصدعون عنھا (الواقعۃ ۵۶ - ۱۹) اور تصدع القوم کے معنی ہیں تفرقوا پراگندہ ہو گئے ۔ یومئذ یصدعون (الروم ۳۰ - ۴۳)

بار بار انذار کی ضرورت: مشرکوں سے اعراض کے یہ معنی ہیں کہ ان کی مخالفت اور عداوت اور منصوبوں کی کچھ پروا نہ کرو اور کھول کھول کر بیان کرتے چلے جاؤ۔ یہ سورت مکہ کے آخری زمانہ کی ہے اور نبی کریم صلعم اس سے پہلے بھی کھول کر ہی بیان فرماتے تھے مگر اب چونکہ آپ کو مٹانے کے لیے کفار کی طرف سے سخت ترین منصوبے ہو رہے تھے اس لیے فرمایا کہ پروا نہ کرو۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ اسلام کی اصل کامیابی اسی میں ہے کہ قرآن شریف کو کھول کھول کر بیان کر دیا جائے جس طرح سخت چیز میں شق کرنے کے لیے بار بار ضرب لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ان سخت دلوں پر جو دنیا کی آلائشوں میں ملوث ہیں صداقت تب ہی اثر کرتی ہے جب اسے بار بار پیش کیا جائے۔

۱۸۱۵ الیقین ۔ یقین کے معنی یہاں موت ہیں دیکھو بخاری کیونکہ اس کا آنا یقینی ہے اور بعض نے مراد نصرت لی ہے جو کفار کے خلاف آپ کو ملنے کا وعدہ تھا۔

عبادت کب تک ہے: الحاد پسند طبائع نے ان الفاظ کی تاویل یوں کر لی ہے کہ اسی وقت تک عبادت کرنے کا حکم ہے جب تک یقین آجائے اور وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہمیں وہ یقین کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے اسلئے اب ہمیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ضرورت نہیں رہی ۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ مراد اس سے ہوتی تو کیا نبی کریم صلعم کو ساری عمر یقین نہ آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں آپکے قدم تک سوج جاتے تھے۔ یقین کے معنی یہاں موت ہیں ۔ لیکن اگر عام معنی بھی یہاں مراد لیے جائیں تو یہ مطلب نہیں کہ یقین آئے تو عبادت چھوڑ دو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ عبادت الٰہی سے یقین پیدا ہوتا ہے ۔ سو عبادت کر تاکہ وہ یقین کا مرتبہ حاصل ہو اور جب یقین کا مرتبہ حاصل ہو جائے گا پھر تو عبادت میں خود ایسی لذت پیدا ہو جائے گی کہ انسان عبادت کو نہ چھوڑ سکے گا۔

(۱۶) سُوْرَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ

ایاتها ۱۲۸ — رکوعاتها ۱۶

نام: اس سورت کا نام النحل ہے اور اس میں سولہ رکوع اور ۱۲۸ آیات ہیں۔ نحل کے معنی شہد کی مکھی ہیں اور اس سورت میں جہاں یہ دکھایا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت حیوانات تک میں کام کرتی ہوئی انسان کے لیے اچھی سے اچھی چیزیں پیدا کر دیتی ہے شہد کی مکھی کی نسبت لفظ وحی استعمال کر کے اشارہ کر دیا ہے کہ ان مثالوں میں جہاں دُودھ اور شہد کے حیوانات کے ذریعہ سے پیدا کرنے کا ذکر ہے اصل غرض وحی الٰہی کی طرف توجہ دلانا ہے۔ شہد کی نسبت بالخصوص لفظ بھی ایسے ہی استعمال فرمائے ہیں یعنی فیه شفاء للناس جیسے خود قرآن شریف کے متعلق۔ گویا ایک میں جسمانی بیماریوں کے لیے شفا ہے تو دوسرے میں روحانی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ یوں تو حیوانات میں جس قدر ہدایت فطرتاً ملتی ہے وہ سب ان کے لیے وحی کا ہی حکم رکھتی ہے مگر شہد کی مکھی کا انتخاب بالخصوص وحی کے ذکر کے لیے اس لیے کیا کہ جس طرح شہد کی مکھی مختلف پھولوں پر بیٹھ کر ان کی مٹھاس کو چوس کر ایک اعلیٰ درجہ کی شیریں اور شفا دینے والی چیز پیدا کر دیتی ہے اسی طرح وحی الٰہی جو قرآن میں ہے اس نے تمام بہترین ہدایات عالم کو جو کبھی دی گئی ہوں اس پاک کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے جس طرح پھولوں سے مٹھاس کو انسان لیکر شہد کی صورت نہیں دے سکتا اسی طرح کسی انسان کا یہ کام نہ تھا کہ ان تمام بہترین ہدایات کو ایک جگہ جمع کر سکتا اور پھر ان کو ایسا رنگ دے سکتا کہ وہ روحانی بیماریوں کے لیے شفاء کا کام دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں شہد کی مکھی کی وحی کا ذکر ہے اس سے تین آیتیں پہلے قرآن کریم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ یہ کتاب تمام اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے نازل کی گئی ہے۔ اور تمام اختلافات مذاہب کا فیصلہ ہو نہ سکتا تھا جب تک کہ تمام کی بہترین ہدایات جو باقی رکھنے کے قابل تھیں ایک نئی اور بہترین شکل میں محفوظ نہ کر دی جاتیں۔ پھول آج پیدا ہوتا ہے اور کل اپنی مٹھاس سمیت ختم ہو جاتا ہے مگر شہد جو اس سے ایک حیوان کی وحی فطرت نے پیدا کیا وہ کبھی نہیں بگڑتا۔

خلاصہ مضمون: سورت کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے جو اس کا تعلق پچھلی سورت سے کھلے طور پر قائم کرتے ہیں کیونکہ اس کا خاتمہ اعدائے اسلام کے انذار پر کیا تھا اور اس کے پہلے لفظ ہی یہ ہیں اتٰی امر الله فلا تستعجلوه وہ اللہ کا امر آہی گیا سمجھو جو اللہ کی بھیجی ہوئی صداقت کی تکذیب پر آیا کرتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی وحی جس پر چاہتا ہے بھیجتا ہے اور رکوع کی آخری آیت میں فرمایا کہ قصد السبیل سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے نہیں مل سکتا۔ اور درمیان میں آسمانوں اور زمین اور انسان اور حیوانات کی ظاہری پیدائش کی طرف توجہ دلائی کہ جو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے یہ چیزیں پیدا کرتا ہے اس کے ہدایت انسان کے لیے وحی بھیجنے پر تعجب کیوں کرتے ہو۔ دوسرے رکوع میں توحید الٰہی پر صحیفۂ قدرت کی شہادت بیان فرمائی۔ کیونکہ وحی الٰہی کا سب سے بڑا کام دنیا میں توحید الٰہی کا قائم کرنا ہے اور خلق کو توحید پر بطور دلیل پیش کیا جو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ تیسرے رکوع میں بتایا کہ توحید کی طرف تو کم وبیش صحیفۂ قدرت بھی رہنمائی کر دیتا ہے مگر بعد الموت زندگی جس کی طرف صرف وحی الٰہی رہنمائی کرتی ہے۔ اس پر ایمان کے بغیر توحید الٰہی پر ایمان بھی ناقص ہی ہوتا ہے اور آخرت کا منکر عملاً توحید کا بھی منکر ہے۔ چوتھے رکوع میں اس حق کے خلاف جو وحی الٰہی لاتی ہے تدابیر کے انجام کا ذکر کیا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے اور اعلیٰ صفات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ پانچویں رکوع میں مشرکین کے باطل عذروں کا ذکر ہے جو انھیں آخر کار کچھ کام نہ دیں گے۔ چھٹے میں اعدائے حق کی سزا کا ذکر ہے اور یہاں صاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ کس کس قسم کے عذاب ان پر آئیں گے۔ ساتویں میں بتایا ہے کہ خود فطرت انسانی شرک کو قبول نہیں کرتی۔ آٹھویں میں بتایا ہے کہ وحی الٰہی کی ضرورت دنیا سے ظلم کو دور کرنے کے لیے اور اختلافات مذاہب کو دور کرنے کے لیے تھی۔ نویں میں وحی الٰہی کی ضرورت کو تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا۔ دسویں میں مہبط وحی صلعم کی فضیلت کا ذکر کیا گیارھویں میں مہبط وحی کے انکار کا اور بارھویں میں اس انکار کی سزا کا ذکر ہے تیرھویں میں قرآن کریم کی تعلیم کامل کا ایک نمونہ بتایا اور اس پر قیام کی ضرورت کو واضح کیا۔ چودھویں میں وجوہات دیں کہ یہ وحی افترا نہیں۔ پندرھویں میں بالخصوص مکہ والوں کو انذار کیا کہ ان کی حالت امن واطمینان تبدیل کر دی جائے گی اور سولھویں میں حضرت ابراہیم کی مثال کا ذکر کر کے مومنوں کو نصیحت پر سورت کا خاتمہ کیا۔

تعلق: یہ سورت الرٰ کے مجموعہ کی ہی آخری سورت سمجھنی چاہیئے گو یہ الرٰ سے شروع نہیں ہوتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام سورتوں میں عموماً گزشتہ واقعات کی طرف توجہ دلا کر مخالفین کی ناکامی کا ذکر کیا ہے اور اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں بلکہ صحیفۂ قدرت اور فطرت کی شہادت کو وحی الٰہی کی صداقت پر پیش کیا ہے۔ اور ضمناً اس صداقت کو رد کرنے والوں کا ذکر بھی آگیا ہے اور یوں یہ سورت انہی پہلی چھ سورتوں کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے۔

زمانہ نزول: اس سورت کا نزول بھی نبی کریم صلعم کے مکّی زمانہ کے آخری ایام کا ہے اس لیے کہ اس میں صاف طور پر ہجرت کا ذکر ہے جو مدینہ کی طرف شروع ہو چکی تھی۔ اور اس ہجرت کے ذکر سے جن لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایسی آیات مدنی ہیں انہوں نے غلطی کھائی ہے کیونکہ نبی کریم صلعم کے مدینہ جانے سے بہت دن پیشتر صحابہؓ کی ہجرت شروع ہو چکی تھی۔ یوں بلحاظ زمانہ نزول بھی یہ سورت اسی الرٰ کے مجموعہ کی سورتوں میں شامل ہے اور بلحاظ مضمون بھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۱)
اللہ کا حکم آگیا سو اس کے لیے جلدی مت کرو، وہ پاک ہے اور اس سے بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں ۱۲۱۶ء

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (۲)
وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اُتارتا ہے کہ بتادو کہ میرے سوائے کوئی معبود نہیں سو میرا تقوےٰ اختیار کرو ۱۲۱۷ء

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۳)
اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ اس سے بلند ہے، جو وہ شریک بناتے ہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (۴)
انسان کو نطفہ سے پیدا کیا، پھر دیکھو وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا ہے ۱۲۱۸ء

وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۵)
اور چارپایوں کو اسی نے پیدا کیا۔ تمھارے لیے ان میں گرمی کا سامان اور کئی فائدے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے ہو ۱۲۱۹ء

ع۱۲۱۶ امر اللہ یا اللہ کے حکم کے آنے سے کیا مراد ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں وہ عذاب جس کا کفار کو وعدہ دیا جاتا تھا۔ اور سیاق بھی اسی معنی کو چاہتا ہے، پچھلی سورت کے آخر پر بھی یہی ذکر تھا۔ مگر اس عذاب کو یا مخالفت کے استیصال کو امر اللہ صرف اس لیے نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے متعلق حکم ہو چکا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے ساتھ "خدا کی بادشاہت" جس کی خوشخبری بار بار حضرت مسیح نے دی تھی زمین پر آنے والی تھی اور نبوت کے ساتھ اسلام کی بادشاہت قائم ہونے والی تھی۔ اور فلا تستعجلوہ اس لیے فرمایا کہ کفار اس عذاب کے لیے جلدی کرتے تھے ویستعجلونك بالعذاب (العنکبوت ۲۹: ۵۴) اور اس امر اللہ کے ساتھ شرک کی نفی میں یہ اشارہ ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید قائم ہوگی۔

ع۱۲۱۷ روح کے معنی کے لیے دیکھو ع۱۱ اور یہاں روح سے مراد وحی الٰہی ہی ہے کیونکہ یہاں ذکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے اور روح جو حیات ہے یا جو نفس ناطقہ ہے وہ تو سب کو ملتی ہے۔ اور اسی روح کے نازل کرنے کا نتیجہ بھی انذار ہے پس یہ یقیناً وحی الٰہی ہے اور یہاں اشارہ قرآن کریم کے نزول کی طرف ہے۔ اور پہلی آیت سے تعلق یہ ہے کہ یہ غالب آکر رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بیہودہ کام نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی ساری خلق ہی بالحق ہے جیسا کہ اگلی آیت میں بیان فرمایا تو حق کا نازل کرنا جس غرض کے لیے ہے ضرور ہے کہ وہ بھی پوری ہو کر رہے۔

ع۱۲۱۸ نطفة۔ اصل میں اَلْمَآءُ الصَّافِی یعنی مصفّٰی پانی کو کہتے ہیں (غ۔ ت ل)، خواہ قلیل ہو یا کثیر دونوں کی مثال حدیث میں موجود ہے ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ کیا وضو کے لیے پانی ہے فجاء رجلٌ بنطفة فی اداوة تو ایک شخص لوٹے میں تھوڑا سا پانی لایا جہاں تھوڑے پانی کے لیے نطفة کا لفظ استعمال فرمایا۔ اور دوسری حدیث میں ہے قال لایزال الاِسلام یَزِیدُ واهله وینقص الشرك واهله حتّٰی یَسِیْرَ الراکب بین النطفتین لا یَخْشٰی اِلَّا جَور یعنی اسلام اور اس کے اہل بڑھتے رہیں گے اور شرک اور اس کے اہل گھٹتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ ایک سوار دونوں سمندروں کے درمیان چلا جائے گا اسے کوئی خوف نہ ہوگا، سوائے اس کے کہ رستہ بھول جائے۔ جہاں دو نطفوں سے مراد عرب کے دونوں طرف کے سمندر یا مغرب میں سمندر اور مشرق میں دریائے فرات ہیں جو عرب کی حدود ہیں (ل) اور نطفة ماء الرجل کو بھی کہا جاتا ہے جو اس کے مشہور معنی ہیں، لسان العرب میں ہے کہ یہ نام اس کی قلت کی وجہ سے ہے۔ مگر چونکہ قلت و کثرت کے دونوں مفہوم لفظ میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ زیادہ صحیح ہوگا کہ اس کے مصفّٰی پن کی وجہ سے ہے گویا یہ ایک مصفّٰی جوہر ہے کیونکہ زمین کا خلاصہ پھلوں سبزیوں اناج میں آتا ہے جس سے انسان کی غذا بنتی ہے غذا سے مصفّٰی جوہر خون پیدا ہوتا ہے اور خون کا مصفّٰی جوہر وہ پانی ہے جس سے انسان بنتا ہے۔

آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بعد انسان کا ذکر کیا اور اس کی ابتدا کی طرف اشارہ کر کے اپنی قدرت کاملہ کا ذکر کیا کہ کس طرح مصفّٰی خلاصہ در خلاصہ نکلتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ انسان بنتا ہے۔ بااین انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت میں جھگڑا کرتا ہے اور اسے اس موت کے بعد زندگی جس کے لیے وحی الٰہی انسان کو تیار کرتی ہے ایک بعید بات معلوم ہوتی ہے۔

ع۱۲۱۹ دِفْءٌ۔ بَرْدٌ یعنی سردی (غ) یا حِدَّۃُ الْبَرْدِ یعنی سردی کی تیزی (ل) کی نقیض ہے۔

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ
وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝٦

اور تمہارے لیے ان میں خوبصورتی کا سامان ہے جب تم شام کو (انھیں) واپس لاتے ہو اور جب چرانے لے جاتے ہو[۱۷۲۰]

وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا
بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ
لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝٧

اور وہ تمہارے بوجھ ایسے مقامات کی طرف اٹھا لے جاتے ہیں جہاں تم سوائے جانوں کو مشقت میں ڈالنے کے نہیں پہنچ سکتے تھے یقیناً تمہارا رب مہربان رحم کرنے والا ہے۔

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا
وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝٨

اور گھوڑے اور خچریں اور گدھے (پیدا کیے) تاکہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کا سامان ہوں اور وہ کچھ پیدا کرتا رہتا ہے جو تم نہیں جانتے[۱۷۲۱]

وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ۚ
وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ۝٩

اور اللہ پر ہی سیدھی راہ پر چلانا ہے اور بعض راہیں ٹیڑھی ہیں اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کرتا[۱۷۲۲]

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ لَّكُم
مِّنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ۝١٠

وہی ہے جو تمہارے لیے بادل سے پانی اتارتا ہے اس سے پینے کے کام آتا ہے اور اس سے درخت (پرورش پاتے) ہیں جن میں تم چراتے ہو۔

يُنۢبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ

اسی سے وہ تمہارے لیے کھیتی اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور

انسان سے نیچے اُتر کر چارپایوں کا ذکر کیا جو جاندار ہونے میں انسان کے شریک ہیں۔ اور یہ بتا کر کہ ان میں انسانوں کے لیے فوائد ہیں یہ ظاہر کیا کہ انسان کی زندگی کی کوئی اور بلند غرض ہے۔

۱۷۲۰ تریحون اصل اس کا روح ہے اور رَوَاح زوالِ آفتاب کے بعد کا وقت ہے گویا کہ وہ راحت کا وقت ہے اور رَاحَ کے معنی زوالِ آفتاب کے بعد گیا جیسا کہ جمعہ کے لیے جانے پر بولا گیا ہے اور اَرَاحَ یُرِیحُ کی مصدر اِرَاحَۃ کے معنی ہیں اونٹ بکری کو چرانے کے بعد اس کے رات کو آرام کرنے کی جگہ واپس لانا (ل)

تسرحون۔ سَرْح ایک خاص درخت ہے اور اونٹ وغیرہ کو اس درخت کے چرانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور پھر عام طور پر چرانے کے لیے لے جانے پر بولا گیا ہے (غ) تریحون کو تسرحون سے پہلے رکھنے کی وجہ لفظ جمال کا استعمال ہے کیونکہ جانور جب چر کر آتے تو زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔

۱۷۲۱ خیل کے لیے دیکھو ۳۸۵ ع۔ بغال۔ بَغْل کی جمع ہے خچر۔ حمیر حمار کی جمع ہے گدھا۔ ان کا الگ ذکر کیا اس لیے کہ یہ سواری کا کام دیتے ہیں اور اونٹ گائے بکری وغیرہ سے دوسری قسم کے فوائد زیادہ ہیں اور جب ان پر سواری کا ذکر کیا تو ساتھ ہی بڑھا یا کہ اللہ تعالیٰ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے اور کرے گا جنھیں تم جانتے نہیں اور اس میں بالخصوص سواری کی ان چیزوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو ابھی ظاہر ہونے والی تھیں اور دوسری جگہ فلک یعنی کشتی کا ذکر کر کے جس سے سواری کا کام لیا جاتا ہے فرمایا وخلقنا لھم من مثلہ ما یرکبون (یٰسٓ ۳۶: ۴۲) یعنی کشتی کی مثل سواری کی اور چیزیں بھی ہم پیدا کریں گے۔ اور عام بھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ایسی ایسی مخلوق ہے جس کا انسان کو علم بھی نہیں ؞

۱۷۲۲ قصد۔ دیکھو ۸۵۴ ع قَصْد کے معنی رستہ کی استقامت یا سیدھا ہونا ہیں اور یہاں مصدر بمعنی فاعل ہے یعنی استقامت والا رستہ یا سیدھا رستہ ؞

جائر اس کی اصل جَوار بمعنی قرب سے ہے اس لیے جَارَ عن الطریق اصل میں بلحاظ قرب ہی بولا جاتا ہے پھر ہر ایک حق سے پھرنے کا نام ہو گیا جس سے جَوْر بمعنی ظلم ہے اور جائر کے معنے سیدھے رستہ سے پھرنے والا ہیں (غ)

جسمانی سامانوں کے مقابلہ پر روحانی سامان؛ جب انسان پر اپنی جسمانی نعمتوں کا ذکر کیا کہ ہم نے کیا کیا سامان اس کے لیے بنا رکھے ہیں تو اب اس طرف توجہ دلائی کہ کیا ضروری نہ تھا کہ جس نے اس قدر سامان جسمانی آسایش کے لیے بنائے ہیں وہ اخلاق اور روحانیت کے لیے بھی کوئی رستہ دکھاتا۔ اس لیے فرمایا کہ سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا ہی کام تھا اور اسی غرض کے لیے وہ وحی بھیجتا ہے۔ ہاں لوگ خود بھی رستہ تراش لیتے ہیں مگر یہ سیدھی راہیں نہیں بلکہ طریق مستقیم سے ایک طرف پھیر دینے والی ہیں ؞

وَ النَّخِيْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾

انگور اور ہر قسم کے پھل یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو فکر کرتے ہیں۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ
وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور اس نے تمھارے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں

وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور جو کچھ اس نے تمھارے لیے زمین میں پیدا کیا ہے اس کے مختلف رنگ ہیں یقیناً اس میں اُن لوگوں کے لیے نشان ہے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ ۱۲۲۳

وَ هُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ
لَحْمًا طَرِيًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً
تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ
وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور وہی ہے جس نے سمندر کو کام میں لگا رکھا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے (موتیوں کے) زیور نکالو جنھیں تم پہنتے ہو، اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے اُسے پھاڑتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اس کا فضل طلب کرو اور تاکہ تم شکر کرو ۱۲۲۴

وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ
بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾

اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈالے کہ تمھیں لیکر کانپے نہیں اور دریا اور راستے (بنائے) تاکہ تم ہدایت پاؤ ۱۲۲۵

۱۲۲۳ الوان۔ لَون کے معنی رنگ ہیں لیکن اَلوان سے بعض وقت اجناس اور انواع بھی مراد لیجاتی ہیں مثلاً اتی بِالْاَلوانِ من الاحادیث کے معنی ہیں طرح طرح کی باتیں کیں (غ) یہاں بھی نعمتوں کے مختلف انواع مراد ہیں۔ رنگوں کے اختلاف کی طرف دوسری جگہ توجہ دلائی ہے اختلاف السنتکم والوانکم۔

ان تمام نعمائے الٰہی کے ذکر میں ان کے پیدا کرنے والے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح زمین کے پھل اور آسمان کے ستارے یکساں انسان کے لیے فائدے کا موجب ہو رہے ہیں۔ یہ کام نہ عیسیٰ مسیح کا ہے جسے عیسائیوں نے خدا بنایا، نہ رامچندر اور کرشن جی کا جن کو ہندوؤں نے خدائی کا مرتبہ دیا نہ کسی بُت کا جسے بت پرست پوجتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اس سورج اور چاند کو بھی کسی نے کام میں لگا رکھا اور قید میں جکڑ رکھا ہے۔ ان تمام چیزوں کی حدبندیاں بتاتی ہیں کہ کوئی حدبندی کرنے والا بھی ہے اور یہ سارا نظم ظاہر کرتا ہے کہ کوئی اس نظام کو وجود میں لانے والا بھی ہے۔

۱۲۲۴ طری۔ تازہ۔ اسی سے طراوت ہے اور لحم طری سے مراد مچھلی کا گوشت ہے۔

حلیۃ تلبسونہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف عورتوں اور مردوں کو یکساں مخاطب کرتا ہے زیورات تو عورتیں ہی پہنتی ہیں اومن ینشؤا فی الحلیۃ (الزخرف ۴۳-۱۸) اور یہاں حلیۃ سے مراد موتی وغیرہ ہیں۔

مواخر۔ ماخِرَۃ کی جمع ہے اور مَخَرَت السَّفِینَۃ کشتی کے پانی کو چیرنے پر بولا جاتا ہے۔

سمندر کا مسخر ہونا یہ ہے کہ کشتیوں کے ذریعہ سے انسان اس پر حکمرانی کرتا ہے اور طرح طرح کے فوائد حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے تو چیزوں کو کام میں لگا رکھا ہے مگر انسان جدوجہد کے بغیر ان سے منافع حاصل نہیں کرسکتا۔

۱۲۲۵ تمید۔ مَادَ یَمِیْدُ کے لیے دیکھو ۸۹۰ اور مَیْد کے معنی اِضْطِرَابُ الشَّیْءِ العظیم بھی ہیں یعنی عظیم الشان چیز کا اضطراب جیسے زمین کا اضطراب (غ) اور مَادَ کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایک چیز ایک طرف مائل ہو گئی۔ اور یہ بھی کہ کچھ دوسرے کو دیا۔ اور ان تمید بکم کے معنی دونوں طرح ہو سکتے ہیں یعنی یہ کہ وہ تمہیں کھانے کا سامان دے اور یہ بھی کہ وہ اضطراب سے رک جائے اور پہلے معنی ترجمہ میں انہٰرا کی مناسبت سے اختیار کیے گئے ہیں کیونکہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو دریا بھی نہ ہوتے اور انسان کی روزی کے سامان کا انحصار پہاڑوں اور دریاؤں پر ہی ہے اور یہ امر کہ پہاڑ اور دریا دونوں یہاں ان تمید بکم کے حکم میں ہیں اس سے ظاہر ہے کہ انہار کو سُبُل کے ساتھ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ دریا رستوں کا کام نہیں دیتے اور حدیث میں جو آیا ہے کہ لما خلق اللہ الارض جعلت تمید فارسٰہا بالجبال یعنی جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو اس میں بہت اضطراب تھا۔

وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ⑯

اور بڑے بڑے نشان اور ستاروں سے وہ راہ پاتے ہیں۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ⑰

تو کیا جو پیدا کرتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا، سو کیوں تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ۱۷۲۶

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑱

اور اگر اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انھیں گن نہ سکو گے یقیناً اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۱۷۲۷

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ⑲

اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـــًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ⑳

اور وہ جنھیں یہ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔

اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ
ع اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ㉑

مُردے ہیں نہ زندے اور وہ نہیں جانتے کہ کب اُٹھائے جائیں گے ۱۷۲۸

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ㉒

تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، سو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل انکاری ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں ۱۷۲۹

تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ قائم کیے سو یہ بالکل درست ہے اور سائنس بھی اس پر شاہد ہے کہ پہاڑوں کے بن جانے سے زمین کا اضطراب زلزلوں کے رنگ میں کم ہو گیا۔

۱۷۲۶ انسان کے لیے ان بےشمار نعمتوں کے خلق کا ذکر کر کے اب فرماتا ہے کہ یہ سب نعمتیں پیدا کرنے والا اور وہ جو پیدا نہیں کرتا کیا یہ دونوں یکساں ہیں من یخلق صرف ذات باری ہے لہ الخلق خالق کل شئی اور لا یخلق کل معبودان باطل ہیں۔ اور چونکہ دلیل عبادت خلق ہے پس جنھوں نے پیدا نہیں کیا وہ معبود بھی نہیں ہو سکتے اور یہ بھی سمجھایا کہ جو چیزیں تمہارے ہی فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہیں ان سے بجائے کام لینے کے انہیں اپنا معبود بناتے ہو۔

۱۷۲۷ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ذکر کے بعد غفور اور رحیم کی صفات کا اس لیے ذکر کیا کہ انسان بہتیری نعمتوں کی ناشکر گزاری بھی کرتا ہے اور ان کی پرانہیں کرتا اس پر اللہ تعالیٰ اپنے غفر سے کام لیتا ہے اور جس نعمت سے فائدہ اُٹھاتا ہے اس پر صفت رحیمیت نتیجہ مترتب فرماتی رہتی ہے۔ اگلی آیت میں ما تسرون وہی نعمتیں ہیں جن سے انسان فائدہ نہ اٹھا کر انہیں گویا چھپاتا ہے اور ما تعلنون وہ جن کا وہ اپنے عمل سے اظہار کرتا ہے۔

۱۷۲۸ یہ دونوں آیتیں بتاتی ہیں کہ وہ انسان جن کو لوگ خدا کر کے پکارتے تھے وہ مر چکے تھے کوئی ان میں سے زندہ نہ تھا اور نہ ان کو یہ علم تھا کہ وہ خود کب اُٹھائے جائیں گے ان باتوں کا ذکر کیوں فرمایا؟ اس لیے کہ اوپر فرمایا تھا کہ وہ جو پیدا کرتا ہے اس کی طرح نہیں ہو سکتا جو پیدا نہیں کر سکتا اور چونکہ وہ انسان جنہیں خدا بنایا گیا ان کے متعلق بھی خود ان کے پرستاروں کو یہ اعتراف ہے کہ انہوں نے پیدا کچھ نہیں کیا۔ اس لیے یوں اتمام حجت کر کے اب بتایا کہ انہوں نے نہ صرف کچھ پیدا ہی نہیں کیا بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور مخلوق کی جو حالت ہوتی ہے وہ ان پر آئی یعنی وہ مر گئے اور بعثت چونکہ دوسری پیدائش کا نام ہے اس لیے فرمایا کہ جب انھیں پہلی خلق میں کچھ حصہ نہیں تو دوسری میں بھی نہیں۔ ان آیات سے یہ یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کو انسانوں کے ایک بڑے حصہ نے خدا بنایا ہے وہ بھی اس آیت کے نزول کے وقت مردوں میں داخل تھے۔ اموات کے بعد غیر احیاء تاکید کے طور پر لایا گیا ہے کیونکہ اموات سے یہ مراد بھی ہو سکتی تھی کہ آئندہ کبھی ان پر موت آ جائے اس لیے فرمایا کہ نہیں وہ اس وقت بھی زندہ نہیں۔ عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ روح القدس جو جبرائیل کا نام ہے وہ اموات غیر احیاء میں داخل نہیں اس لیے غلط ہے کہ اول عیسائیوں کے نزدیک روح القدس جبرائیل کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک فرضی اقنوم ہے اور دوسرے یہاں انسانوں کا ذکر ہے جنہیں خدا بنایا گیا کیونکہ یہاں بعثت کا ذکر ہے اور بعثت صرف انسانوں کے لیے ہے اور تیسرے روح القدس سے عیسائی دعائیں نہیں مانگتے جس طرح مسیح سے مانگتے ہیں۔

۱۷۲۹ منکرۃ۔ اِنکار جو ضد عرفان ہے اصل اس کی یہ ہے کہ دل پر کوئی بات وارد ہو جسے وہ تصور میں نہیں لا سکتا اور یہ ایک قسم کی جہالت ہے (رغ) یہاں مراد ہے منکرۃ للوحدانیۃ (د)

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۲۳

حق یہی ہے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں، وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۱۴۳۰

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۲۴

اور جب انھیں کہا جاتا ہے تمھارے رب نے کیا اتارا ہے کہتے ہیں پہلوں کی کہانیاں۔

لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ۲۵ ع ۳

کہ اپنے بوجھ قیامت کے دن پورے اُٹھائیں اور اُن کے بوجھوں سے بھی جنھیں علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔ سنو بُرا بوجھ ہے جو وہ اُٹھاتے ہیں ۱۴۳۱

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۲۶

انھوں نے بھی (حق کے خلاف) تدبیریں کیں جو ان سے پہلے تھے سو اللہ نے ان کی عمارت کو بنیادوں سے گرایا، سو چھت ان کے اوپر سے اُن پر آگری اور عذاب اُن پر آپہنچا جہاں سے انھیں خیال نہ تھا ۱۴۳۲

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَاۗقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۗءَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۲۷

پھر قیامت کے دن انھیں رسوا کرے گا اور کہے گا میرے شریک کہاں ہیں جن میں تم (حق کی) مخالفت کرتے تھے، جنھیں علم دیا گیا ہے، کہیں گے آج کی رسوائی اور خرابی کافروں پر ہے ۱۴۳۳

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ

جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (درانحالیکہ) وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، تب وہ فرمانبرداری

پہلے رکوع میں صحیفۂ قدرت سے وحی الٰہی پر اور دوسرے میں توحید پر دلائل دیئے تھے۔ اب دونوں باتوں کو ملا کر فرماتا ہے کہ جو لوگ زندگی بعد الموت کو نہیں مانتے ان کے دل درحقیقت توحید الٰہی سے بھی انکاری ہیں۔ گویا وہ توحید الٰہی کی حقیقت کو بھی نہیں پہچانتے یوں برائے نام اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرتے ہیں اور متکبر انکو اس لحاظ سے کہا کہ وہ اعمال کی ذمہ داری نہیں سمجھتے۔

ع۱۴۳۰ لاجرم جَرَم کے معنی ہیں گناہ کمایا۔ اور لاجَرَم محاورہ کے طور پر اسی طرح استعمال ہوتا ہے جیسے لابُدَّ۔ لامَحَالَۃَ۔ اور اس کے معنی ہیں کہ حق یوں ہی ہے (ل)

ع۱۴۳۱ لیحملوا میں لام عاقبت کا ہے۔ یعنی ان کے ایسی باتیں کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ خود بھی گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں وحی الٰہی کو جو انسان کے اعمال کی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ کوئی عمل بے نتیجہ نہیں رہیگا کہانیاں کہنے کا یہ نتیجہ ہے کہ اصلیت پر غور نہیں کرتے گمراہی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور کاملۃ اس بوجھ کو اسی لحاظ سے کہا کہ جس حد تک یہ بڑھ سکتا تھا انہوں نے اسے بڑھایا۔

ع۱۴۳۲ خلاف حق تدابیر کا انجام: جب یہ بتایا کہ توحید الٰہی کا علم درحقیقت وحی الٰہی سے ہی آتا ہے تو اب ان لوگوں کا ذکر کیا جو اس عظیم الشان امر حق کی مخالفت میں تدبیریں کر کے اسے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے اور اس آیت میں سمجھایا ہے کہ ان کی تمام تدابیر بمنزلہ ایک بڑی عمارت کے ہیں جس کی بنیادوں کو اللہ تعالیٰ کھوکھلا کردیگا اور بجائے اس کے کہ اس عمارت سے حق کو نقصان پہنچے یہ خود ہی ان تدابیر سے نقصان اُٹھائیں گے بنیان سے مراد یہاں ان کی تدابیر کی عمارت ہے دیکھو ع۱۳۵۰۔

ع۱۴۳۳ الذین اوتوا العلم۔ اول انبیاء علیہم السلام پھر ان کے حقیقی متبع ہیں وہ قیامت کو بھی ایسا کہیں گے اس دنیا میں بھی کہتے ہیں۔

مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

ظاہر کریں گے (کہیں گے) ہم کوئی بدی نہیں کرتے تھے، ہاں اللہ خوب جانتا ہے جو تم کرتے تھے[۱۴۳۴]

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اسی میں رہو گے یقیناً متکبروں کا ٹھکانا بہت بُرا ہے۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۰﴾

اور جو تقوے کرتے ہیں انھیں کہا جاتا ہے تمھارے رب نے کیا اتارا؟ کہتے ہیں بھلائی جو لوگ نیکی کرتے ہیں ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر یقیناً بہتر ہے اور متقیوں کا گھر کیا ہی اچھا ہے[۱۴۳۵]

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۱﴾

ہمیشگی کے باغ جن میں داخل ہوں گے، اُن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان کے لیے اُن میں ہے جو کچھ وہ چاہیں۔ اسی طرح اللہ متقیوں کو جزا دیتا ہے۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (درآنحالیکہ) وہ پاک ہیں کہتے ہیں تم پر سلامتی ہو جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کا بدلہ جو تم کرتے تھے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

وہ سوائے اس کے اور کچھ انتظار نہیں کرتے کہ اُن پر فرشتے آ جائیں یا تیرے رب کا حکم آ جائے اسی طرح انھوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ اپنی جانوں پر آپ ہی ظلم کرتے تھے[۱۴۳۶]

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾ ع

سو جو وہ عمل کرتے تھے اسی کی بُرائیاں اُن پر آئیں اور اسی نے انھیں آ لیا جس پر وہ ہنسی کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا

اور جو شرک کرتے ہیں وہ کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم اس

ع۱۴۳۴ سَلَم کے معنی استسلام یا فرمانبرداری یا اطاعت ہیں گویا اس دن کہیں گے کہ ہم تو فرمانبرداری ہی کرتے تھے اور کوئی بُرا کام نہیں کرتے تھے۔ گویا جھوٹ عذر پیش کریں گے جیسا دوسری جگہ ہے واللہ ربنا ما کنا مشرکین (الانعام۔ ۲۳)

ع۱۴۳۵ ان دونوں رکوعوں کا مضمون ایک ہونا اس سے ظاہر ہے کہ پچھلے رکوع میں یہی سوال کفار پر ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں یوں ہی قصے ہیں ماننے کے قابل باتیں نہیں (۲۴) یہاں وہی سوال مومنوں سے ہے۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وحی الٰہی انسانوں کی بھلائی کے سامان اپنے اندر رکھتی ہے سو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی بھلائی عطا فرماتا ہے۔ طیب کے معنی پر دیکھو ع۵۷۴

ع۱۴۳۶ اس کے معنی پر بحث ع۲۶۹ میں گزر چکی۔ یہاں آخر پر فرمایا کہ ایسے حالات میں عذاب ان پر آئے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم نہیں بلکہ ان کا اپنا ظلم اپنی جانوں پر ہے۔

عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۳۵﴾

کے سوائے کسی چیز کی عبادت نہ کرتے (نہ) ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے (حکم کے) سوائے کوئی چیز حرام ٹھیراتے اسی طرح انھوں نے کیا جو اُن سے پہلے تھے۔ سو رسولوں پر سوائے کھول کر پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۳۶﴾

اور یقیناً ہم نے ہر ایک قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو، سو اُن میں سے کوئی ایسا تھا جسے اللہ نے ہدایت دی اور کوئی ان میں سے ایسا تھا جس پر گمراہی ثابت ہوئی، سو زمین میں چلو پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا[1737]۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۳۷﴾

اگر تو ان کی ہدایت کی آرزو کرتا ہے تو اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جس پر وہ گمراہی کا فتویٰ لگا دیتا ہے[1738] اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوں گے

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ ۙ لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ یَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

اور اللہ (تعالیٰ) کی قسم کھاتے ہیں سخت ترین قسم، کہ جو مر جاتا ہے اللہ (تعالیٰ) اُسے نہیں اُٹھائے گا ہاں، یہ وعدہ ہے سچا، جو اس کے ذمہ ہے،

ع۱۷۳۷ ان دو آیتوں میں باطل پرستوں کے اس عذر باطل کا فیصلہ کیا ہے کہ اللہ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے۔ گویا اللہ ہی یہ چاہتا ہے کہ لوگ شرک کریں اگر وہ یہ چاہتا کہ شرک نہ کریں تو انہیں روک دیتا۔ اس کا جواب دیا ہے کہ اللہ تو رسولوں کو اسی لیے بھیجتا ہے کہ لوگ شرک سے بچیں فہل علی الرسل الا البلٰغ المبین۔ لیکن رسولوں کا کام صرف پیغام کو پہنچا دینا ہے وہ جبراً نہیں روکتے۔ اگر اس کا ہی منشا یہ ہوتا کہ لوگ شرک کریں تو پھر وہ رسولوں کو شرک کے خلاف تعلیم دے کر کیوں بھیجتا۔ پھر آیت ۳۶ میں اس کو اور تقویت دی کہ ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے یعنی غیر اللہ کی پرستش سے بچو۔ پھر اس تعلیم کے آنے پر دو گروہ ہو جاتے ہیں ایک وہ جنھیں اللہ ہدایت دے دیتا ہے یعنی وہ ہدایت کو قبول کر لیتے ہیں اور دوسرے وہ جن پر ضلالت یعنی گمراہی ثابت ہو جاتی ہے۔ اب اس دوسرے فریق کے متعلق فرمایا کہ ان پر گمراہی ثابت ہو جاتی ہے یعنی ان کی تکذیب اور مخالفت حق اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ان افعال کی وجہ سے ان پر گمراہ ہونے کا فتویٰ لگا دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کے آخر پر مکذبین کا ذکر کر کے اسے صاف کر دیا کہ وہ خود تکذیب حق میں یہاں تک بڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بطور سزا یہ حکم لگ جاتا ہے۔ اور یہ وہ حالت ہوتی ہے جب انسان کو اپنے ان بُرے افعال سے آہستہ آہستہ اس قدر پیار ہو جاتا ہے کہ وہ گویا اس کی طبیعت کا جزو ہو جاتے ہیں دیکھو ع۴۱ اسی لیے اگلی آیت میں یہ لفظ اختیار فرمائے ہیں فان اللہ لا یھدی من یضل یعنی جب یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ ہدایت سے بہت دور جا پڑتا ہے۔ اس لیے اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا۔ اور جو بعض جگہ ایسے لفظ آجاتے ہیں جیسے ولو شاء اللہ ما اشرکوا (الانعام ۔ ۱۰۷) یا فلو شآء لھدٰکم اجمعین (الانعام ۔ ۱۵۰) تو ان کا مفہوم بھی اسی کے مطابق ہے کیونکہ مطلب یہاں بھی یہی ہے کہ ہم نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ ایک راہ اختیار کرے یا دوسری یعنی اس کی مشیت یہی ہے کہ انسان مجبور محض نہ ہو۔ نہ وہ شرک پر مجبور ہے نہ اللہ تعالیٰ اسے ہدایت پر مجبور کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور ہی کرنا ہوتا تو وہ ہدایت پر مجبور کرتا جیسے دوسری مخلوق کو کیا ہے شرک پر کسی صورت میں مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ پس ماحصل دونوں کے الفاظ کا ایک ہے۔

ع۱۷۳۸ من یضل کے ایک معنی وہ ہیں جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں اور جن کی تشریح اوپر گزر چکی اور دوسرے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جو دوسروں کو گمراہ کرتا ہے اور مآل ایک ہے۔ اس لیے کہ ایک شخص کی جب گمراہی سے محبت ترقی کر کے اس کی طبیعت کا جزو ہو جاتی

لا يعلمون ۞ ۳۸

لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

ليبين لهم الذي يختلفون فيه

تاکہ اُن پر وہ باتیں کھول دے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں

وليعلم الذين كفروا انهم كانوا كذبين ۞ ۳۹

اور تاکہ جو کافر ہیں وہ جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔

انما قولنا لشيء اذا اردنه ان نقول

ہمارا فرمان کسی چیز کے لیے جب ہم اس کا ارادہ کریں صرف یہی

له كن فيكون ۞ ۴۰

ہوتا ہے کہ ہم اسے کہدیں ہوجا تو وہ ہو جاتی ہے۔ ۱۴۳۹ع

والذين هاجروا في الله من بعد

اور جن لوگوں نے اس کے بعد جو اُن پر ظلم کیا گیا، اللہ کے

ما ظلموا لنبوئنهم في الدنيا حسنة

لیے ہجرت کی ہم ضرور انھیں دنیا میں اچھی جگہ دیں گے اور

ولاجر الاخرة اكبر لو كانوا يعلمون ۞ ۴۱

آخرت کا بدلہ تو بڑا ہے کاش وہ جانتے ۱۴۴۰ع

الذين صبروا وعلى ربهم يتوكلون ۞ ۴۲

جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب پر ہی بھروسا کرتے ہیں۔

وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحي

اور ہم نے تجھ سے پہلے مرد ہی بھیجے تھے جن کی طرف

اليهم فسئلوا اهل الذكر ان

ہم وحی کرتے تھے۔ تو اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم

كنتم لا تعلمون ۞ ۴۳

نہیں جانتے ۱۴۴۱ع

بالبينت والزبر وانزلنا اليك الذكر

کھلی دلائل اور کتابوں کے ساتھ (انھیں بھیجا) اور ہم نے

ہے تو پھر وہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنا شروع کرتا ہے۔

۱۴۳۹ع ان کے عذر باطل کا فیصلہ کر کے اب ان کی اصل بیماری کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ انہیں آخرت پر ایمان نہیں اور اللہ تعالیٰ کو وہ اس بات پر قادر نہیں جانتے کہ موت کے بعد وہ انھیں پھر زندہ کرے اس لیے آخر پر فرمایا کہ اس کے حکم سے پہلے بھی خلق ہوئی ہے اسی کے حکم سے دوبارہ بھی ہو جائے گی۔

۱۴۴۰ع دکھوں کے وقت کامیابی کی بشارت: اس آیت میں جو ہجرت کا ذکر ہے تو اس سے دونوں ہجرتوں کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے یعنی پہلی ہجرت جو ملک حبش کی طرف ہوئی اور دوسری ہجرت جو مدینہ کی طرف ہوئی۔ کیونکہ مدینہ کی ہجرت بھی نبی کریم صلعم کی مکہ میں موجودگی میں ہی شروع ہو گئی تھی اور آپ نے سب سے آخر ہجرت کی۔ ان لوگوں کو جو اس بے سروسامانی میں اپنے گھروں سے نکلے اور جن کی کوئی بڑی تعداد بھی نہ تھی اتنی بڑی بشارت کہ ہم انھیں دنیا میں بھی اچھی جگہ دیں گے قرآن کریم کی ان بنظیر پیشگوئیوں میں سے ایک ہے جن کے سامنے سخت سے سخت معاند کو بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ یہ کی سورت ہے مکہ میں اس کا اعلان ہوتا ہے اور ان لوگوں کے متعلق جو کس مپرسی کی حالت میں کفار کے ہاتھ دُکھ اُٹھا کر بھاگے جا رہے ہیں یہ بآواز بلند ان کے مخالفین کو سنایا جاتا ہے کہ ان کا استیصال نہیں ہوگا جیسا کہ تم نے گمان کر لیا ہے بلکہ ان کو دنیا میں ہی مقامات بلند عطا ہونگے۔ سارا ملک چند نفوس کے استیصال کے درپے ہو یہ کسی کے وہم میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ یہی چند نفوس اس دنیا میں بھی اعلیٰ مقامات پر پہنچیں گے اس قسم کی پیشگوئیوں کے پورا ہونے نے ہی ملک عرب کو آخر آنحضرت صلعم کے سامنے جھکا دیا۔

۱۴۴۱ع ذکر کے لیے دیکھو ۱۹۱ع و ۱۰۴۷ع وغیرہ الذکر قرآن کریم کا نام خصوصیت سے ہے اور ہر ایک وحی کو بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے اہل الذکر سے مراد یہاں اہل کتاب بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ سوال صرف اس قدر ہے کہ انسان ہی ہمیشہ رسول ہو کر آتے رہے یا نہیں اور مسلمان بھی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ اصل غرض صرف ان پر اتمام حجت ہے۔ یعنی تم ان باتوں کو جانتے تو ہو لیکن اگر نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو۔ اور اگلی آیت میں قرآن شریف کا یہی نام الذکر لے کر اسی دوسرے معنی کی تائید کی ہے۔

عورت کی نبوت: رجال کا لفظ یہاں آنے پر یہ بحث ہوئی ہے کہ اس آیت کی تصریح کے بموجب عورت رسول تو نہیں ہو سکتی مگر آیا وہ نبی بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ روح المعانی میں ہے کہ عورتوں کی نبوت کے صحیح ہونے کی ایک جماعت قائل ہے۔ سو اصل یہ ہے کہ اس نبوت سے مراد محض اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی ہے یعنی نبوت اپنے لغوی معنی میں جس کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے جاری ہے، لیکن اصطلاح شرعی میں نبوت چونکہ ماموریت کو چاہتی ہے اس لیے وہ رسالت سے الگ نہیں ہو سکتی اور اس لیے اصطلاح شریعت میں نبوت عورتوں کو نہیں ملتی۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾

تیری طرف ذکر بھیجا ہے تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرے جو اُن کی طرف اتارا گیا ہے اور تاکہ وہ فکر سے کام لیں۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيۡنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنۡ يَّخۡسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ يَاۡتِيَهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۴۵﴾

تو کیا وہ جو بُرائی کی تدبیریں کرتے ہیں اس بات سے نڈر ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو ملک میں ذلیل کر دے یا ان پر ایسی طرف سے عذاب آجائے جس کا انھیں خیال بھی نہیں ع۱۴۴۲

اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ فِىۡ تَقَلُّبِهِمۡ فَمَا هُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ﴿۴۶﴾

یا وہ انھیں اُن کے آنے جانے میں پکڑ لے تو وہ اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتے۔

اَوۡ يَاۡخُذَهُمۡ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۴۷﴾

یا وہ انھیں ڈرا کر پکڑ لے سو تمھارا رب مہربان رحم کرنے والا ہے ع۱۴۴۳

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمۡ دٰخِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

کیا وہ ہر اس چیز کو نہیں دیکھتے جو اللہ نے پیدا کی ہے اس کے سائے بھی دائیں اور بائیں سے ڈھلتے ہیں اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں ع۱۴۴۴

ع۱۴۴۲ یخسف۔ خُسُوف چاند کی اور کُسُوف سورج کی روشنی کے جاتے رہنے کا نام ہے اور عَیۡنٌ خاسِفَۃٌ وہ چشمہ ہے جو غائب ہو جائے اور خَسۡف کا استعمال استعارۃً ذلت پر بھی ہوتا ہے۔ (غ) اور خَسۡف کے معنی ہذال اور ذلت اور اذلال یعنی کسی کو ذلیل کرنا بھی آتے ہیں اور خسف بہ الارض کے معنی ہیں اسے زمین میں غائب کر دیا (ل)۔

اس آیت میں آنحضرت صلعم کے مخالفین کے عذاب کا ذکر ہے۔ اور سب سے پہلے ان کے خسف کا ذکر کیا۔ اگر خسف سے مراد زمین میں دھنسانا لیا جائے تو یہ عذاب عام طور پر آپ کے مخالفین پر نہیں آیا۔ ایک آدھ واقعہ جیسے سراقہ کا الگ امر ہے لیکن خسف کے دوسرے معنی یعنی ذلیل کرنا آپ کے مخالفین پر اپنی عمومیت میں صادق آئے ہیں اس لیے وہی معنی یہاں لیے جائیں گے۔

ع۱۴۴۳ تخوف۔ خَوۡف کے معنی کسی مکروہ امر کی توقع ہیں جو ظنی یا یقینی علامات سے ہو اور تخویف کے معنی ایسے امور سے بچنے کی تحریص ہیں ذٰلک یخوف اللہ بہ عبادہ (الزمر ۳۹-۱۶) انما ذٰلکم الشیطان یخوف اولیاءہ (آل عمران ۳-۱۷۵) اور تخوفناھم کے معنی ہیں ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے یعنی تدریجاً کم کیا جس کا اقتضا خوف ہو اور تخوف کے معنی تنقص ہیں (ل)، اور ابن جریر میں اس کے معنی دیئے ہیں کہ ان کو اطراف و نواحی سے تھوڑا تھوڑا کر کے کم کرتا جائے، یہاں تک کہ سب کو ہلاک کر دے۔

ان تین آیات میں عذاب کے تین رنگ بیان کیے ہیں ایک ان پر ذلت وارد کرنا، دوسرے ان کے آنے جانے یا سفروں میں ان کو پکڑنا اور تیسرے تدریجاً انہیں کم کرتے چلے جانا۔ یہاں بڑی صراحت اور صفائی سے اس عذاب کا ذکر ہے جو آپ کے مخالفین پر آنے والا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر ان کی مغلوبیت کا ذکر بہت دفعہ کیا ہے مگر یہاں اس مغلوبیت کی صورتیں بھی بتا دی ہیں اور انہی رنگوں میں سے ایک نہ ایک رنگ میں اہل مکہ پر یہ عذاب آیا۔ ان کے آنے جانے کے ذکر میں ان کے تجارتی سفروں کی طرف اشارہ ہے جو وہ شام کی طرف کرتے تھے انہی سفروں پر ان کی تجارت اور خوشحالی کا دار و مدار تھا اور مسلمانوں کی مدینہ میں موجودگی اسی رنگ میں سب سے بڑھ کر ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔

ع۱۴۴۴ یتفیّؤا۔ فیٔ کے معنی اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا ہیں۔ اور فاء اور فیٔ اس سایہ پر بولا جاتا ہے جو لوٹ کر آتا ہے یعنی زوال کے بعد (غ) اور تفیّؤا اس سے باب تفعّل ہے۔

داخرون۔ دَخَرَ کے معنی ہیں ذلیل و حقیر ہوا۔ داخِر ذلیل ہونے والا۔

سایوں کے سجدہ کرنے کی تشریح ع۱۶۰۹ میں گزر چکی۔ یہاں سایوں کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے اگلی آیت میں خود ہر چیز کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے۔ یہاں کفار کی ذلت کا ذکر کر کے پھر یہ ذکر کیا ہے کہ ہر چیز کے سائے بھی ذلیل ہو کر سجدہ کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اور اس کے اصل قوانین کے سامنے ہر چیز کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے یہ کافر اس قانون سے باہر نہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور اللہ کی ہی فرمانبرداری کرتے ہیں جو کوئی جاندار آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے ع۱۴۲۵

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ السجدة

وہ اپنے رب سے جو اُن پر غالب ہے ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے کرتے ہیں ع۱۴۲۶

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾

اور اللہ نے کہا ہے کہ دو معبود مت بناؤ، وہ صرف اکیلا ہی معبود ہے سو مجھ ہی سے ڈرتے رہو ع۱۴۲۷

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور فرمانبرداری اسی کی لازم ہے تو کیا اللہ کے سوائے کسی اور کا تقویٰ کرو گے؟ ۱۴۲۸

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـــَٔـرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جو کوئی نعمت تمہارے پاس ہے سو اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو اسی کی طرف تم فریاد لے جاتے ہو۔ ۱۴۲۹

ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾

پھر جب وہ تم سے دُکھ دور کر دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک بناتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

تاکہ اس کی ناشکری کریں جو ہم نے انھیں دیا ہے۔ سو چند روزہ فائدہ اُٹھالو آخر جان لوگے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا

اور وہ ان کے لیے جو (کچھ) نہیں جانتے اس کا ایک حصہ مقرر

ع۱۴۲۵ ملائکۃ کا عطف دابۃ پر بتاتا ہے کہ فرشتے الگ قسم کی مخلوق ہیں اور معمولی جانداروں میں شمار نہیں ہوتے دابۃ وہ ہیں جنہیں حرکت جسمانی ہے کیونکہ اس کا اصل دَبّ سے ہے جس کے معنے ہلکا چلنا ہیں۔

ع۱۴۲۶ من فوقہم اللہ تعالےٰ کے ان کے اوپر ہونے سے مراد اس کا قہر اور اس کا غلبہ ہے کیونکہ فوقیت مکانی کی نسبت اس کی طرف نہیں ہو سکتی (ر) اور اس میں بظاہر ملائکہ کی طرف ضمیر جاتی ہے اور یخافون ربہم میں رب کے خوف سے مراد اس کے حکم کی خلاف ورزی کا خوف ہے۔

ع۱۴۲۷ دو خداؤں اور تین خداؤں کا عقیدہ لوگوں نے علی الاعلان اختیار کیا ہے اور دونوں عقیدوں کی تردید قرآن کریم نے کھلے الفاظ میں کی ہے۔ گو جعل الظلمٰت والنور میں بھی اس کی تردید ہو چکی ہے دیکھو ع۹۰۱ مگر یہاں اثنین کا لفظ لا کر یہ صاف کر دیا کہ ثنویہ کا عقیدہ غلط ہے اس کی دلیل لہ ما فی السمٰوات والارض اگلی آیت میں ہے خود فطرت انسانی دو خداؤں کے عقیدہ کو قبول نہیں کر سکتی۔ دو خدا جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں ان دونوں سے ایک انسان کس طرح ڈر سکتا ہے۔

ع۱۴۲۸ لہ الدین واصبا۔ دین کے معنی جزا بھی ہیں اور طاعت بھی۔ اور واصب وَصَب سے ہے جس کے معنی سقم لازم ہیں۔ اگر دین کے معنی جزا لیے جائیں تو یہ ذکر بطور وعید کے ہے کہ جو شخص دو خدا بناتا ہے اس کی سزا عذاب لازم ہے اور اگر دین بمعنی اطاعت لیا جائے اور یہی قرینہ چاہتا ہے تو واصب کے معنی دائم لیے جائیں گے اور مطلب یہ ہوگا کہ انسان پر یہ لازم ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے (غ)، یہ بھی فطرت کی شہادت ہے کیونکہ دو آقاؤں کی فرمانبرداری نہیں ہو سکتی۔

ع۱۴۲۹ تجئرون۔ جأر کے معنی ہیں دعا میں مبالغہ اور تضرع کیا یعنی بہت فریاد اور زاری کی اور جُؤَار اصل میں وحشی کے چیخنے کو کہا جاتا ہے (غ) یہ تیسری شہادت فطرت انسانی کی ہے کہ دکھ کے وقت وہ صرف ایک خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔

رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾

کرتے ہیں جو ہم نے انھیں دیا ہے اللہ کی قسم ضرور تم سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا جو تم افترا کرتے تھے ۱۷۵۰

وَ يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَ لَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھیراتے ہیں ، وہ پاک ہے اور اُن کے لیے ہے جو وہ چاہتے ہیں۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ۚ

اور جب ان میں سے ایک کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصہ سے بھرا ہوتا ہے ۱۷۵۱

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

وہ اس خبر کی بُرائی سے جو اسے دی جاتی ہے ، لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کیا اسے ذلّت کے ساتھ رہنے دے یا اسے مٹی میں گاڑ دے سنو بہت بُرا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ۱۷۵۲

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾ۧ

جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اُن کی بُری مثال ہے اور اللہ کی صفت نہایت بلند ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے ۱۷۵۳

۱۷۵۰ لما لا یعلمون میں ضمیر اٰلھۃ کی طرف ہے جن کے بنانے کا ذکر یجعلون میں ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی کچھ علم نہیں رکھتے اور خود کفار کی طرف بھی ہو سکتی ہے یعنی وہ کفار ان معبودوں کی اصل حقیقت سے کچھ بھی واقف نہیں۔

تاللہ ۔ ت عموماً افعال کی ابتدا یا آخر میں آتی ہے جیسے تضرب ۔ ضربت لیکن اسماء کی ابتدا اور آخر میں بھی آتی ہے اور ابتدا میں اسم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور تعجب کے لیے آتی ہے اور اس کے معنی قسم ہوتے ہیں اور ب اور و سے جو قسم آتی ہے اس سے بڑھ کر اس میں تعجب کے معنی ہوتے ہیں (مغنی)

۱۷۵۱ ظلّ ۔ ظلّ کے معنی بیان ہو چکے ہیں ۔ ظَلَّ (ظَلِلْتُ ایک لام کے حذف سے اور ظللت) اس کام پر بولا جاتا ہے جو دن کے وقت کیا جائے اور پھر اس کے معنی صار کی طرح ہو گئے ہیں (غ)

وجھہ مسودا ۔ چہرہ کی سیاہی سے مراد غم فکر نفرت وغیرہ کا پیدا ہونا ہے (د) سچ مچ سیاہ ہونا مراد نہیں۔

توجہ دلائی ہے کہ کس قدر انسان اپنے فعل سے خود الزام کے نیچے ہے اپنے خدا کی طرف بیٹیاں منسوب کرنے والے لوگ اپنے ہاں بیٹی کی خبر کو کس قدر بُرا مناتے ہیں ۔ گویا خود فطرت انہیں ملزم کر رہی ہے۔

۱۷۵۲ یتوارٰی ۔ وری سے ہے دیکھو ۸۱۶ اور اس کے معنی ہیں اپنے آپ کو چھپاتا ہے۔

یدس ۔ دَسّ ایک چیز کا دوسری میں جبر کے ساتھ داخل کرنا ہے (غ) اور دَسَسْتُ الشَّیْءَ فِی التُّرَابِ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹی میں چھپا دیا اور یہاں مراد زندہ دفن کرنا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا واذا الموءدۃ سئلت (التکویر ۸۱ - ۸) اور یدسہ میں ضمیر مذکر ہے (ایسا ہی یمسکہ میں) اس لیے کہ بلحاظ لفظ ضمیر ما بشر بہٖ کی طرف جاتی ہے اور قد خاب من دسّٰھا (الشمس ۹۱ - ۱۰) میں یہی مادہ ہے دل، اس لیے کہ وہاں بھی بمقابلہ تزکیہ کے جس میں نشوونما کا خیال پایا جاتا ہے ۔ قوائے یا نعمائے خداداد کا اخفا مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توحید کے ذکر میں ہی یہ ایک عظیم الشان اصلاح بھی قرآن کریم نے کی ہے یعنی لڑکیوں کو مار دینا جس کا رواج ملک عرب میں ، بالخصوص اعلیٰ طبقہ میں بہت پایا جاتا تھا ۔ بعض باتیں اصلاح کی ایسی ہیں کہ پہلے دن سے ہی قرآن کریم نے ان کی طرف توجہ دلائی ہے ، حالانکہ کوئی تفصیلات شریعت ابھی نازل نہ ہوئی تھیں جیسے یتامیٰ اور مساکین کی خبر گیری انہیں میں لڑکیوں کو مارنے یا زندہ گاڑنے کا رواج ہے جس کی اصلاح قرآن کریم نے ابتدا سے مدنظر رکھی ۔ چنانچہ اس سے بہت پہلے کی وحی میں ہے واذا الموءدۃ سئلت (التکویر ۸۱ - ۸) عرب میں لڑکی کو جب وہ پانچ چھ سال کی عمر کو پہنچ جاتی تو یا گڑھا کھود کر اس میں زندہ دھکیل کر اوپر سے مٹی ڈال دیتے یا پہاڑ سے نیچے گرا دیتے اس سنگدلی پر رحمۃ للعالمین کا دل پگھلا اور آپ کی آواز نے وہ اثر پیدا کیا جو نہ کوئی قانون اور نہ کوئی عبرتناک سزا پیدا کر سکتی ہے اسلام کے بعد اس بیرحمی کے اعادہ کی ایک اکیلی نظیر بھی پیش نہیں کی جا سکتی ۔ بدی کو دور کرنے کی جو طاقت آپ کو دی گئی ہے اس کی نظیر کوئی اور طاقت دنیا میں نظر نہیں آتی۔

۱۷۵۳ للہ المثل الاعلیٰ ۔ چونکہ دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے لیس کمثلہ شیءٌ (الشوریٰ ۴۲ - ۱۱) اس لیے یہاں مَثَل کے معنی وصف مراد ہیں۔ اور راغب نے اس آیت میں دونوں جگہ مثل کے معنی وصف ہی کئے ہیں لھم الصفاتُ الذمیمۃُ و لہ الصفاتُ العُلیٰ یعنی آخرت پر ایمان نہ

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور اگر اللہ لوگوں کو اُن کے ظلم پر پکڑتا تو اس پر کوئی جاندار نہ چھوڑتا، لیکن وہ انھیں ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے، پس جب ان کا وقت آجائے گا وہ ایک گھڑی بھی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ آگے جا سکتے ہیں ۱۷۵۴

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور اللہ کے لیے وہ ٹھیراتے ہیں جسے خود ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے بھلائی ہے حق یہی ہے کہ ان کے لیے آگ ہے اور یہ کہ وہ آگے بھیجے جائیں گے ۱۷۵۵

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

اللہ کی قسم ہم نے تجھ سے پہلے قوموں کی طرف رسول بھیجے، پھر شیطان نے انھیں اُن کے (بُرے) عمل اچھے کرکے دکھائے سو وہ آج ان کا دوست ہے اور ان کے لیے دردناک دُکھ ہے ۱۷۵۶

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

اور ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ تو ان کے لیے وہ باتیں کھول کر بیان کرے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں ۱۷۵۷

لانے والوں کی صفات نہایت بری ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات بلند ہیں اور پہلے حصہ میں معنی مثال بھی ہو سکتے ہیں اور اصل غرض تو یہ توجہ دلانا ہے کہ ان لوگوں کی حالت کیسی بری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف وہ بات منسوب کرتے ہیں جو اپنے لیے بھی پسند نہیں کرتے۔ لیکن ساتھ ہی سمجھا دیا کہ اگر یہ اپنے لیے بیٹوں کو پسند کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی بیٹا تجویز کر سکتے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف بہت بلند ہیں اور اس کی ذات ان تمام باتوں سے پاک ہے۔ جو گو انسانوں کے لیے محبوب ہوں مگر وہ ایک رنگ کا نقص ہے جو مخلوق میں پایا جاتا ہے اور خالق کی ذات اس سے برتر ہے۔

ع۱۷۵۴ دابۃ سے مراد بعض کے نزدیک سب جاندار ہیں اور بعض کے نزدیک صرف وہی ظالم لوگ ہیں جو ظلم کرتے ہیں اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ دابۃ سے مراد یہاں مشرک ہیں (ر) اور گو یہ سچ ہے کہ اگر کل انسان تباہ ہو جائیں تو دوسرے جانداروں کی جو انسان کی خاطر ہی پیدا کیے گئے ہیں کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن ظلم کا ذکر صاف بتاتا ہے کہ مراد وہی مخلوق ہے جو ظلم کر سکتی ہے یعنی انسان۔ اور اس آیت میں آنحضرت صلعم کے زمانہ میں جو حالت دنیا کی تھی اس کی تصویر کھینچی ہے۔ یعنی ظلم اس حد تک دنیا میں پھیل گیا ہے کہ زمین اس قابل نہ رہی تھی کہ اس پر انسان باقی رہے کیونکہ انسان نے اپنے خدا کو بالکل بھلا دیا اور ساری دنیا خطرناک شرک اور معصیت میں گرفتار ہو گئی۔ گویا روحانی طور پر دنیا پر موت وارد ہو گئی اس لیے یہ اس قابل تھی کہ اسے ویسے بھی مٹا دیا جاتا، مگر اس موت سے اس آسمانی بارش نے اسے بچایا جس کا ذکر صاف الفاظ میں رکوع کے آخر میں ہے۔

ع۱۷۵۵ مفرطون۔ فَرَطَ کے معنی ع۹۳۱ میں بیان ہو چکے ہیں اور اِفْرَاط کے معنی آگے بڑھنے میں حد سے تجاوز کرنا ہیں اور اِفْرَاط کے معنی اِعْجَال یعنی جلدی کرنا بھی ہیں اور اس کے معنی ترک کرنا اور بھلانا بھی آتے ہیں ما اَفْرَطْتُ من القوم احدا ای ما تَرَكْتُ اَفْرَطَ الشئَ نَسِيَهٗ (ل) پس مُفْرَط کے معنی آگے بھیجا ہوا، جلدی بھیجا ہوا یا عذاب میں چھوڑا ہوا ہو سکتے ہیں۔ فراء نے یہی آخری معنی لیے ہیں (ل)

ان کے اعتقادات فاسد کی تصویر یہاں کھینچی ہے کہ خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرتے ہیں جو اپنے لیے بھی پسند نہیں کرتے۔ اسی کا اثر اعمال پر بھی ہوتا ہے یہاں تک کہ نیک اور بزرگ لوگوں کی طرف بدیاں منسوب کرنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدی آہستہ آہستہ دل کو اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ بدترین حالت ہے جس پر قوم پہنچ جاتی ہے۔

ع۱۷۵۶ یہاں بتایا کہ پہلے بھی ہم رسول بھیجتے رہے جس طرح اب رسول بھیجا ہے لیکن ان کے متبعین بھی گمراہ ہو گئے اور شیطان نے بُرے عملوں کو ان کے لیے ایسا خوبصورت کر دکھایا کہ وہ اس کے پیچھے لگ گئے یہاں تک کہ آج یعنی رسول اللہ صلعم کی بعثت کے وقت وہ اس طرح شیطان کے تصرف میں آگئے کہ وہی ان کا ولی اور رفیق ہے۔

ع۱۷۵۷ جب پہلے رسولوں کا ذکر کیا تو اب ساتھ ہی بتایا کہ باوجود پہلی قوموں میں رسولوں کے آنے کے اب ایک اور رسول کی ضرورت تھی تاکہ ان میں جو

وَ اللّٰهُ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ۶۵ ع

اور اللہ ہی بادل سے پانی اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے یقیناً اس میں لوگوں کے لیے نشان ہے جو سنتے ہیں۔

وَ اِنَّ لَكُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً ؕ نُسۡقِیۡكُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ ۶۶

اور تمھارے لیے چارپایوں میں عبرت ہے ہم تمھیں اس چیز سے جو ان کے پیٹوں میں ہے گوبر اور لہو کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے [۱۷۵۸]

وَ مِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِیۡلِ وَ الۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡهُ سَكَرًا وَّ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۶۷

اور کھجوروں اور انگوروں کے میووں میں سے تم اس سے شراب اور اچھا رزق بناتے ہو۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں [۱۷۵۹]

وَ اَوۡحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ۶۸

اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں اور اس میں جو وہ بناتے ہیں۔

ثُمَّ كُلِیۡ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُكِیۡ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِهَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ فِیۡهِ شِفَآءٌ

پھر تمام پھلوں سے کھا اور اپنے رب کے رستوں پر فرمانبرداری سے چلی جا، ان کے پیٹوں سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے

اختلافات پیدا ہو گئے ہیں وہ اپنی وحی یعنی قرآن سے ان کا فیصلہ کر دے تمام دنیا کے اختلافات مذہبی کا فیصلہ سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے نہ ہو سکتا تھا۔ اور چونکہ قرآن سب اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے اس لیے خود مسلمانوں میں کوئی اس قسم کا اختلاف نہیں ہو سکتا جیسے پہلے مذاہب میں اختلافات ہوئے یعنی اصولی اختلاف نہیں اگلی آیت میں آسمانی پانی وحی الٰہی ہے جو مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہے۔

ع۱۷۵۸ چارپایوں میں انسان کے لیے عبرت: پچھلے رکوع میں وحی الٰہی کا ذکر تھا کہ رفع ظلم و اختلاف کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ انسان اپنی عقل سے ہی سب کچھ کر سکتا ہے۔ تو سمجھایا کہ دیکھو اگر تمہیں دودھ کی ضرورت ہے تو تم یہ نہیں کر سکتے کہ چارہ اور گھاس کو لیکر اس کا جوہر دودھ کی صورت میں نکال لو بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی قدرت سے حیوانوں کے اندر ایک کل پیدا کی ہے وہ اس چارہ کو بدل کر تین چیزوں کی صورت میں بناتی ہے ایک فضلہ جو گوبر کی صورت میں نکل جاتا ہے، دوسرا خون جو حیوان کے بقا کا موجب ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک تیسری چیز دودھ بن جاتی ہے جو انسان کے پینے کے لیے ایک نہایت ہی خوشگوار چیز ہے۔ پس اگر ایک اپنی زندگی کی ضرورت دودھ کے لیے انسان قدرت کی کل کا محتاج ہے اور خود اسے نہیں بنا سکتا تو روحانی بقا کے لیے بھی اس کی اپنی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔

ع۱۷۵۹ سکر۔ سُکر کے لیے دیکھو ع۶۶۳ اور سَکَر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے سُکر یعنی نشہ پیدا ہو (غ) اور مراد اس سے خمر ہے (ج)

دوسری مخلوق میں عبرت: اس آیت میں پچھلی آیت کے مضمون کو وسیع کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے بقا کے لیے ہر قسم کے پھل اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کے لیے پیدا کر رکھے ہیں۔ پس ضرور تھا کہ بقائے روحانی کے سامان بھی وہ خود پیدا کرتا اور انہیں انسان پر نہ چھوڑتا کیونکہ کسی چیز کا پیدا کرنا اس کی طاقت سے باہر ہے ہاں پیدا شدہ چیز کو وہ استعمال کر سکتا ہے اور یہاں اس کے استعمال میں بُرے اور اچھے استعمال کی طرف توجہ دلائی ہے کہ خدا کے پیدا کیے ہوئے پھلوں سے انسان شراب بھی بنا لیتا ہے جو ان کا بُرا استعمال ہے کیونکہ اس سے نقصان پیدا ہوتا ہے اور رزق حسن بھی لیتا ہے رزق حسن کے مقابل پر سکر کو لانے سے صاف اس کی بُرائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور حالانکہ ابھی تک شراب کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا کیونکہ یہ سورت مکی ہے مگر یہاں جس رنگ میں سُکر کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی ساری تعلیم ایک ہی اصول پر ہے۔

لِلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۶۹﴾
وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمۡ ثُمَّ یَتَوَفّٰىکُمۡ ۟ۙ وَ مِنۡکُمۡ مَّنۡ
یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ لِکَیۡ لَا یَعۡلَمَ بَعۡدَ
ع عِلۡمٍ شَیۡـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ قَدِیۡرٌ ﴿۷۰﴾
وَ اللّٰہُ فَضَّلَ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ فِی الرِّزۡقِ ۚ
فَمَا الَّذِیۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّیۡ رِزۡقِہِمۡ عَلٰی
مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ فَہُمۡ فِیۡہِ سَوَآءٌ ؕ
اَفَبِنِعۡمَۃِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۷۱﴾
وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا
وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِکُمۡ بَنِیۡنَ وَ حَفَدَۃً

یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو فکر کرتے ہیں ۱۴۶۰
اور اللہ نے تمھیں پیدا کیا پھر وہ تمھیں مارتا ہے اور تم میں سے
کوئی وہ ہے جو نہایت خراب عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے تاکہ
جاننے کے بعد کچھ نہ جانے اللہ جاننے والا قدرت والا ہے۔ ۱۴۶۱
اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں فضیلت دی
ہے تو جنھیں فضیلت دی گئی ہے وہ اپنی روزی انھیں نہیں
دیدیتے جو ان کے ماتحت ہیں کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں۔
تو کیا اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں ۱۴۶۲
اور اللہ نے تمھارے لیے تم سے ہی عورتیں بنائیں اور تمھارے
لیے تمھاری عورتوں سے بیٹے اور پوتے بنائے اور تمھیں

۱۴۶۰ شہد کی مکھی سے سبق: یہ تیسری مثال اسی اصول کی وضاحت کے لیے ہے اور یہاں وحی کا ذکر صفائی سے کیا ہے۔ گو یہ وحی اور رنگ کی ہے شہد کی مکھی علم حاصل نہیں کرتی بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کی فطرت میں رکھ دیا ہے اس کے مطابق چلکر مختلف پھولوں سے شیرینی حاصل کرکے اسے ایسے رنگ میں جمع کرتی ہے جو انسانوں کے لیے موجب شفا ہے۔ انسان اپنے سارے علوم کو خرچ کرکے وہ چیز پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جب انسان کی ہدایت کے لیے اس کی شفائے روحانی کے لیے ایک شہد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ مقصد بھی انسان کے علوم مکتب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لیے ایک وحی کی ضرورت ہے۔ ہاں چونکہ اللہ تعالیٰ کا تعلق جو اپنی ایسی مخلوق سے ہے جیسے شہد کی مکھی اس سے بہت بڑھ کر تعلق اسے انسان سے ہے اور یہ غرض بھی اعلیٰ اور ارفع ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی یہ وحی بھی اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اور یہ وحی الٰہی کا ہی کام تھا کہ تمام مذاہب کے اختلافات کا فیصلہ کرتی، کوئی انسان اپنی کوشش سے یہ نہ کر سکتا تھا اس پر زیادہ تفصیل کے لیے دیکھو نوٹ جو تمہید سورت میں اس سورت کے نام پر دیا گیا ہے۔

۱۴۶۱ انسان کے حالات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت نمائی ہے کس طرح پیدا ہوتا ہے پھر بڑھتا ہے پھر گھٹتا ہے یہاں تک کہ وفات پاتا ہے اور ارذل عمر وہ ہے جب میں عجز اور ذلت کی حالت انسان پر وارد ہو جاتی ہے۔ علم کے بعد نہ جاننے سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ جو کچھ علم سیکھا تھا وہ بھول جاتا ہے اور یہ بھی کہ جتنا علم حاصل کیا پھر اس کے بعد اور علم حاصل نہیں کر سکتا اور انسان کے حالات میں قوموں کے لیے سبق ہے کہ ان پر بھی ایک ارذل حالت آتی ہے اور اس کی طرف بھی یہاں اشارہ ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ انسان کے علم کی ایک انتہا ہے اللہ تعالیٰ کے علم کی کوئی انتہا نہیں۔

۱۴۶۲ انسانوں کے مراتب میں اختلاف اور نزول وحی: ما ملکت ایمانہم سیاق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے ماتحت ہیں یا جن سے دوسرے کام لیکر بہت دولت کے مالک بن جاتے ہیں۔ شاید اسی مناسبت سے رادی (رادین یعنی لوٹانے والے) کا لفظ استعمال فرمایا اس رکوع میں چند ایک تمثیلات بیان فرمائی ہیں جن میں یہ توجہ دلائی ہے کہ مہبط وحی صلعم کو دوسرے عام انسانوں پر اللہ تعالیٰ نے ہی فضیلت دی ہے اس سے پہلی مثال میں یہ سمجھایا ہے کہ ظاہری سامان معیشت میں بھی جو سب کے لیے یکساں کھلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہی بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ایک کام لینے والے ہیں ایک کام دینے والے۔ اسی طرح پر روحانیت میں الگ الگ استعدادیں ہیں جس کی طرف آیت کے آخر میں نعمۃ اللہ کا لفظ لاکر توجہ دلائی ہے خصوصیت سے نعمۃ اللہ کا اطلاق وحی الٰہی پر ہی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ فی الحقیقت سب سے بڑی نعمت الٰہی انسانوں پر ہے۔ اور بعض مفسرین نے بھی اس سے یہی مراد لی ہے۔ اور فما الذین فضلوا جملہ معترضہ کے طور پر ہے جس کے معنی بعض نے یوں بھی لیے ہیں کہ اپنے مملوکوں کو تمہیں اپنے برابر رکھنا چاہیئے۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ انہیں وہ کھانا دو جو خود کھاتے ہو اور وہ لباس پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ نظام عالم اس طرح کی مساوات پر چل نہیں سکتا کہ سب میں مال و دولت برابر تقسیم ہو اس لیے فرق مراتب رکھا ہے اور استعداد روحانیت میں اس فرق کا ذکر یہاں اس لیے کیا کہ پچھلے رکوع میں شہد کی مکھی کی طرف وحی کا ذکر کرکے سمجھایا تھا کہ وحی الٰہی جو سامان انسان کے لیے مہیا کر سکتی ہے وہ انسان اپنی کوشش سے نہیں کر سکتا تو اس پر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ پھر ہر شخص کو خود وحی کیوں نہیں ہو جاتی۔ اور کفار کا یہ اعتراض قرآن شریف میں منقول بھی ہے حتّٰی نُؤۡتٰی مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ رُسُلُ اللّٰہِ (الانعام۔ ۱۲۴) مفسرین نے اس مثال کو شرک پر لگایا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو بتوں کی طرف منسوب کرتے ہو۔

وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝۷۲

ستھری چیزوں سے رزق دیا تو کیا جھوٹ کو مانتے ہیں، اور اللہ کی نعمت کا وہ انکار کرتے ہیں ۱۶۶۳

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـــًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝۷۳

اور اللہ کے سوائے ان کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں آسمانوں اور زمین سے رزق دینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی کچھ طاقت رکھتے ہیں۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷۴

پس اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۱۶۶۴

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

اللہ ایک غلام کی مثال بیان کرتا ہے جو (دوسرے کے) اختیار میں ہے کسی چیز کی طاقت نہیں رکھتا اور ایک وہ ہے جسے ہم نے اپنے ہاں سے اچھا رزق دیا ہے، سو وہ اس سے چھپا کر اور ظاہر خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں برابر ہیں، سب تعریف اللہ کے لیے ہے بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے ۱۶۶۵۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰي مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ

اور اللہ دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے ایک اُن میں سے گونگا ہے، کوئی کام نہیں کر سکتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے، جدھر اُسے بھیجتا ہے کوئی اچھا کام کر کے نہیں

۱۶۶۳ انفسکم سے مراد من جنسکم و نوعکم ہے (د) یعنی تمہاری جنس اور نوع سے یہاں سے دخلق منہا زوجہا کے معنی پر روشنی پڑتی ہے۔
حفدۃ حافد کی جمع ہے اور حفد کے معنی خدمت اور کام میں سرعت ہیں چنانچہ دعائے قنوت میں آتا ہے والیک نسعٰی ونحفد یعنی عمل اور خدمت میں جلدی کرتے ہیں جس سے مراد فرمانبرداری ہے اور حَفَدَۃ کے معنی مددگار اور خدمتگذار ہیں اور بیٹیوں کو بھی حفدۃ کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک اولاد کی اولاد ہے یعنی پوتے اور بعض کے نزدیک اصہار یعنی بی بی کے قرابتی یا داماد (ل) اور ابن جریر نے مختلف اقوال نقل کر کے کہا ہے کہ اصل اس کی یہی ہے کہ مراد اس سے خدمت کرنے والے ہیں اور یہ سب لوگ اس کے اندر شامل ہیں اور حو ازواج اور بیٹے بھی ایک رنگ میں حفدۃ ہیں۔
اس آیت میں بھی اختلاف مراتب کی طرف ہی توجہ دلائی ہے حالانکہ سب انسان ایک ہی ہیں مگر ان میں کوئی مرد ہے کوئی عورت کوئی باپ ہے کوئی بیٹا، کوئی خسر ہے کوئی داماد۔ گویا اختلاف مراتب پر نظام عالم کا دار و مدار ہے اور آخر پر نعمت اللہ یعنی وحی الٰہی کے انکار کے مقابل پر ان کے باطل پر ایمان یعنی بت پرستی کا ذکر کیا اور اسی لیے اگلی آیت میں کھول کر ان کی بت پرستی کا ذکر کیا۔

۱۶۶۴ امثال۔ مِثل کی جمع بھی ہو سکتی ہے اور اس صورت میں امثال سے مراد ہوگی کہ اس کے شریک مت بناؤ اور تضربوا کے معنی تجعلوا ہونگے فلا تجعلوا للہ انداداً (البقرۃ ۲-۲۲) اور یہ معنی ابن عباسؓ سے مروی ہیں اور عموماً اسے مَثَل کی جمع مانا گیا ہے۔ اور اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ کسی دوسرے کو اس جیسا نہ کہا جائے نہ اسے دوسرے جیسا۔ یا یہ کہ اس کی صفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

۱۶۶۵ یہ کافر اور مومن کی مثال ہے (ج) اور غرض وہی ہے جس کا ذکر پہلے ہوا جب کافر اور مومن میں بھی یہ فرق بیّن ہے تو اوّل المومنین کے ساتھ ان کفار کو کیا نسبت ہو سکتی ہے اور یا رزق حسن سے مراد وحی الٰہی ہے اور وہ جسے رزق حسن دیا ہے وہ مہبط وحی صلعم ہے اگلی آیت کے آخری الفاظ اسی کے مؤید ہیں اور سرًّا خرچ کرنا اپنے قویٰ کو مخلوق کی خدمت میں لگانا ہے اور جہراً اپنے مال کو۔ اور کافر یا مشرک عبد مملوک ہے اس لیے کہ جن چیزوں پر اسے حکومت کرنے کے لیے بنایا گیا تھا وہ اپنے آپ کو ان کا محکوم اور انہیں اپنا معبود اور مسجود بناتا ہے۔ اور لا یقدر علٰی شئ اس لیے کہ جس غرض کے لیے اس کے اندر اعلیٰ درجہ کے قویٰ رکھے گئے تھے۔ وہ اسے پورا نہیں کرتا اس لیے اسے نتیجہ بھی کچھ نہیں ملتا لا یقدرون مما کسبوا علٰی شئ (ابراھیم ۱۴-۱۸)

هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّأْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٦﴾

آتا - کیا وہ اور ایسا شخص برابر ہیں جو انصاف کا حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے رستہ پر ہے ۱۶۶۶

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٧٧﴾

اور آسمانوں اور زمین کا (علم) غیب اللہ کو ہی ہے اور قیامت کا معاملہ آنکھ کے جھپکنے کی طرح ہے بلکہ اس سے بھی قریب - اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۱۶۶۷

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٨﴾

اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کیا، تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور تمہیں کان اور آنکھیں اور دل دیئے تاکہ تم شکر کرو ۱۶۶۸

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٧٩﴾

کیا یہ پرندوں کو نہیں دیکھتے جو آسمان کی فضا میں رام کیے ہوئے ہیں اللہ کے سوائے انہیں کوئی نہیں تھامتا - اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں ۱۶۶۹

۱۶۶۶ کَلّ - کَلّ وہ ہے جو سارے اجزا کو جمع کرلے اور کَلَّ یَکِلُّ کَلاًّ کے معنی ہیں تھک گیا - اور یہاں مراد وہ ہے جو دوسرے پر بوجھ ہو یا دوسرے کے لیے بمنزلہ عیال کے ہو کہ اس کا بوجھ اسے اٹھانا پڑے (ل)

یہ مثال بھی ویسی ہی ہے جیسی اس سے پہلی - مگر یہاں من یامر بالعدل وھو علی صراط مستقیم سے زیادہ وضاحت کردی ہے بعض نے ان الفاظ کی وجہ سے یہ خیال کیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور ابکم سے مراد بُت ہیں اور پھر پہلی مثال کو بھی اسی پر قیاس کیا ہے مگر اللہ کی مثال کسی چیز سے نہیں دی جاسکتی جیسا کہ ابھی خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا فلا تضربوا للہ الامثال - اس لیے من یامر بالعدل سے مراد رسول اللہ صلعم ہی ہیں اور آپ ہی صراط مستقیم پر ہیں اور اس مثال میں اسی مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا ذکر اس رکوع میں ہے اینما یُوَجِّهْهُ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ کافر اپنے کسی مقصد میں کامیاب نہ ہونگے -

۱۶۶۷ لمح - لَمَحَ اور اَلْمَحَ کے معنی ہیں آنکھ چھپا کر دیکھا اور لَمْحَۃ عُجلت کے دیکھنے کو کہتے ہیں اور لَمَحَ الْبَرْقُ بجلی کی چمکار پر بھی بولا جاتا ہے (ل) کیونکہ وہ بھی عجلت سے ہوتی ہے - کلمح البصر سے مراد اس کا عجلت سے آجانا ہے اور او ھو اقرب میں اَوْ بمعنی بَلْ ہے یعنی آنکھ جھپکنا گو ایک بہت قلیل وقفہ کو چاہتا ہے مگر وہ ساعت جب آئے گی تو اس سے بھی جلدی آجائے گی - یہ ایک بات تھی جو ان کے وہم میں بھی نہ آسکتی تھی اس لیے فرمایا کہ اس سے بھی جلدی آجائے گی جو تمہارے وہم میں آسکے -

عذاب دنیا اور الساعۃ: قرآن کریم کا تسلسل مضمون اس سے ظاہر ہے کہ کس طرح یہاں پھر اس ساعت کا ذکر کیا ہے جو اس سورت کا اصل منشاء ہے جس کی طرف سب سے پہلی آیت میں ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی - اتیٰ امر اللہ فلا تستعجلوہ - پھر چوتھے رکوع کے شروع میں آیت ۲۶ میں ان کے مکروں کا ذکر کر کے فرمایا تھا اتٰھم العذاب من حیث لایشعرون پھر اسی رکوع کے آخر میں آیت ۳۳ میں فرمایا ھل ینظرون الاان تاتیھم الملائکۃ اویاتی امر ربک پھر چھٹے رکوع میں آیت ۴۵-۴۶-۴۷ میں مختلف قسم کے عذابوں کا ذکر کیا جو ان پر آنے والے تھے اور اب پھر اس ساعت کا ذکر کرتا ہے جو ساعت کبریٰ یعنی قیامت کے لیے بطور ایک نمونہ کے ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس رکوع کی آخری آیات میں صاف طور پر کافروں کے پھر جانے اور رسول اللہ صلعم کے انکار کا ذکر ہے -

۱۶۶۸ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنے عظیم الشان احسان کا ذکر کیا ہے کہ اس نے اس کے اندر سننے اور دیکھنے اور سوچنے کی وہ طاقتیں رکھ دی ہیں جن سے وہ بڑے بڑے کام لیتا ہے چنانچہ آیت ۸۰ و ۸۱ میں جن نعمتوں کے دینے کا ذکر ہے کہ تمہارے لیے گھر بنائے اور تمہارے لیے لباس بنائے وہ انسان سب اپنے علم سے اور اپنی جد وجہد سے ہی حاصل کرتا ہے مگر اسی لیے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا کہ اگر وہ طاقتیں اس نے انسان کے اندر نہ رکھی ہوتیں تو انسان یہ کام نہ کرسکتا تھا اور لا تعلمون شیئا سے اس لیے ابتدا کی کہ وحی الٰہی بھی انسان کو ایک علم دیتی ہے تو جب علم ظاہری کے لیے بعض قوائے خدا داد کی ضرورت ہے تو علم باطنی کے لیے بھی ایسی ہی ضرورت ہے -

۱۶۶۹ جوّ کے معنی ہوا ہیں (رغ) یا آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے -

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا
وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا
تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ
وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَاۤ
اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۸۰
وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ
لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ
سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ
بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ

اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا
اور تمھارے لیے چارپایوں کی کھالوں سے گھر بنائے جنھیں تم اپنے
کوچ کے وقت اور گھر میں ٹھیرنے کے وقت ہلکا پھلکا پاتے ہو
اور ان کی اُون اور ان کی پشم اور ان کے بالوں سے تمھارے
لیے اسباب اور ایک وقت مقرر تک سامان (بنایا) ۱۷۷۰
اور اللہ نے تمھارے لیے اس سے جو پیدا کیا سائے بنائے
اور تمھارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں بنائیں۔ اور تمھارے
لیے کپڑے بنائے جو تمھیں گرمی سے بچاتے ہیں اور (ایسے)
کپڑے جو تمھیں تمھاری جنگ میں بچاتے ہیں۔ اسی طرح وہ تم پر اپنی

پرندوں کا تعلق ذکر عذاب سے: پرندوں کے ہوا میں روکنے کا ذکر دو جگہ قرآن شریف میں ہے ایک یہاں اور ایک سورۂ ملک میں اولم یروا الی الطیر فوقھم صٰفّٰت ویقبضن ؕ ما یمسکھن الا الرحمٰن (الملک ۶۷- ۱۹) یہاں بھی اعدا پر عذاب آنے کا ذکر ہے اور وہاں اس سے بھی زیادہ صاف الفاظ میں ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں ہے ولقد کذب الذین من قبلھم فکیف کان نکیر (الملک ۶۷- ۱۸) اور بعد کی آیت میں ہے امّن ھذا الذی ھو جند لکم ینصرکم من دون الرحمٰن (الملک ۶۷- ۲۰) اور کوئی تعلق اس آیت کا یہاں نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس مشکل کو خود ہی حل فرمایا جہاں تیسری جگہ پرندوں کے ذریعہ سے عذاب بھیجنے کا ذکر کیا ہے وارسل علیھم طیراً ابابیل ترمیھم بحجارۃ من سجیل (الفیل ۱۰۵: ۳ و ۴) اور خود شر کو بھی طائر کہا ہے الا انما طائرھم عند اللہ (الاعراف ۷- ۱۳۱) اور جب ہم محاورہ عرب کی طرف توجہ کرتے ہیں تو وہاں بھی یہی عجیب بات پاتے ہیں کہ عذاب یا ذلت یا شکست کے متعلق پرندوں کا ذکر کیا جاتا ہے چنانچہ میدانی نے مجمع الامثال میں یہ مثال دی ہے تَبَدَّدَ بِلَحْمِكَ الطیر جو بد دعا ہے یعنی تو ہلاک ہو جائے اور ایسی طرح ہلاک ہو کہ دفن ہونا بھی میسر نہ آئے اور پرندے تیرے گوشت کو کھائیں اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھیلائیں اور نابغہ کا شعر ہے اذا ما غدا بالجیش حَلَّق فَوْقَهٗ ٭ عَصَائِبُ طیرٍ تَهْتدی بعصائب۔ یعنی جب وہ لشکر کے ساتھ نکلتا ہے تو اس کے اوپر پرندوں کے جھنڈ حلقہ باندھ لیتے ہیں اور جدھر لشکر چلتے ہیں ان کے ساتھ ہی وہ بھی چلتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک فاتح فوج کے ساتھ پرندے ہوتے ہیں گویا ان کو علم ہو جاتا ہے کہ دشمن اس فوج کے ہاتھ سے مارا جائیگا اور ایسا ہی ابو الطیب کا شعر ہے اذا لَقُوا جیشاً تَیَقَّنَ انّہ ٭ لمن بطن طیرٍ تَنُوفَۃ مَحْشُور۔ یعنی جب ان کا مقابلہ کسی فوج سے ہوتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن وہ تنوفہ کے پرندوں کے پیٹ سے اٹھائے جائیں گے۔ اور بائبل میں یاجوج کی ہلاکت کے لیے ایسے ہی الفاظ میں پیشگوئی کی ہے" تو اسرائیل کے پہاڑوں پر گر جائے گا تو اور تیرا سارا لشکر اس گروہ سمیت جو تیرے ساتھ ہے اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لیے دونگا۔" (حزقی ایل ۳۹: ۴) پس ان تمام شہادتوں سے ظاہر ہے کہ پرندوں کے روکنے میں اشارہ عذاب اور شر کے روکنے کی طرف ہے جو ان پر آنے والی تھی اور یوں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نظاروں میں سے بھی ہے کہ کس طرح پرند ہوا میں معلق رہتے ہیں۔

۱۷۷۰ تستخفون۔ خَفِیف۔ ثَقِیل کے مقابلہ پر ہے اور یہ کبھی باعتبار وزن ہوتا ہے اور کبھی جس چیز کو آسان سمجھا جائے اسے خفیف کہہ دیا جاتا ہے اور مشکل کو ثقیل اسی معنی میں ہے اَلْئٰن خَفَّفَ اللہ عنکم (الانفال ۸- ۶۶) یرید اللہ ان یخفف عنکم (النساء ۴- ۲۸) فلا یخفف عنھم (البقرۃ ۲- ۸۶) اور کبھی ثقیل بلحاظ وقار کہا جاتا ہے اور خفیف اس کے مقابلہ پر اور اس حالت میں خفیف مذمت کا موقعہ ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اِسْتِخْفَاف کے معنی میں اختلاف ہوگا چنانچہ فاستخف قومہ فاطاعوہ (الزخرف ۴۳- ۵۴) میں اور ولا یستخفنک (الروم ۳۰- ۶۰) میں مذمت کا موقعہ ہے اور خَفُّوا عن منازلھم سے مراد ہوتی ہے ہلکے پھلکے اپنے گھروں سے چلے اور یہاں استخفاف اسی معنی میں ہے اور خُفّ موزہ کو کہتے ہیں (غ)

اصواف۔ صُوف کی جمع ہے دُنبہ یا بھیڑ کی اُون۔ ادبار۔ دَبُر کی جمع ہے اونٹ کی پشم۔ اور اشعار۔ شَعَر کی جمع ہے بکریوں کے بال ٭

اثاث۔ اَثّ کے معنی ہیں بہت ہوا۔ اور گھر کے سامان کو جب بہت ہو اثاث کہا جاتا ہے اور مال کو بھی جب بہت ہو اثاث کہا جاتا ہے اور اس کا واحد کوئی نہیں (غ)

اللہ تعالیٰ نے اپنی ظاہری نعمتوں کا ان دو آیات میں ذکر کیا ہے اور غرض اس طرف توجہ دلانا ہے کہ وہ تمہیں روحانی نعمتوں سے کس طرح محروم کو سکتا تھا۔

لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾	نعمت کو پورا کرتا ہے تاکہ تم فرمانبرداری کرو ؏۱۷۷۱
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾	پھر اگر وہ پھر جائیں تو تجھ پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔
يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ ؏	اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکر ہیں ؏۱۷۷۲
وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾	اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کرینگے پھر جنھوں نے کفر کیا انھیں ربولنے کی) اجازت نہ دیجائیگی اور نہ انھیں عتاب دور کرنیکا موقع دیا جائیگا ؏۱۷۷۳
وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾	اور جنھوں نے ظلم کیا جب عذاب کو دیکھیں گے تو نہ وہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی۔
وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾	اور جب شرک کرنے والے اپنے شریکوں کو دیکھیں گے کہیں گے اے ہمارے رب یہ ہمارے شریک ہیں جنھیں ہم تیرے سوائے پکارتے تھے تو وہ بات کو ان (کے منہ) پر ماریں گے کہ تم یقیناً جھوٹے ہو ؏۱۷۷۴
وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَىِٕذِ ۨالسَّلَمَ وَضَلَّ	اور اس دن اللہ کے سامنے فرمانبرداری پیش کریں گے اور

؏۱۷۷۱ سرابیل۔ سِربال کی جمع ہے قمیص کسی قسم کی ہو (غ)

نعمائے ظاہری سے ضرورت وحی پر دلیل: ان دونوں آیتوں میں ایسی نعمتوں کا ذکر ہے جن سے انسان کو دکھوں اور تکلیفوں سے آرام ملتا ہے چنانچہ پہلی آیت میں گھر اور خیمے اور اس آیت میں سائے اور غاریں اور کرتے مذکور ہیں اور تقیکم الحر کہہ کر حر اور بَرد یعنی گرمی اور سردی دونوں مراد لیے ہیں۔ اور اس آیت کے آخر میں اپنی روحانی نعمتوں کی طرف صاف توجہ دلائی جہاں اتمام نعمت کا ذکر کیا۔ کیونکہ اتمام نعمت اس کے بغیر نہ ہوتا تھا کہ جسمانی طور پر تو اس قدر آرام کی چیزیں ہوں اور روحانی طور پر دکھوں اور تکلیفوں سے بچانے والی کوئی چیز نہ ہوتی اسی مناسبت سے آیت کا خاتمہ تسلمون پر کیا یعنی تم اسلام میں یا سلامتی میں داخل ہو جاؤ، جس سے مراد روحانی سلامتی ہے اور اگلی آیت میں فان تولوا کہہ کر بالکل ہی مضمون کو صاف کر دیا۔

؏۱۷۷۲ نعمت اللہ وہی وحی الہٰی ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں بھی ہے اور اس کے معنی محمد صلعم سدی سے مروی ہیں (ج)

؏۱۷۷۳ یستعتبون۔ عَتَبَة دہلیز کو کہتے ہیں جو پاؤں سے روندی جاتی ہے (ل) اور عَتْب عتاب یا ناراضگی ہے جو انسان اپنے دل میں دوسرے کے لیے پاتا ہے اور اعتاب کے معنی اظہار عتاب بھی ہیں اور عتاب کا دور کرنا بھی فما ھم من المعتبین (حم السجدۃ ۲۴) میں یہی دوسرے معنی ہیں۔ اور اِسْتِعْتَاب یہ ہے کہ دوسرے سے یہ چاہا جائے۔ یا اسے یہ موقع دیا جائے کہ وہ عتاب کو دور کرے (غ)

نبی کس معنی میں گواہ ہے: گواہ سے مراد ہر قوم کا نبی ہے اور رکوع کی آخری آیت میں اس کو صاف کر دیا ہے اور نبی کا گواہ ہونا اپنے پیروؤں کے لیے بھی ہے اور مخالفوں کے لیے بھی۔ اول کے لیے اس لحاظ سے کہ قیامت کے دن ان کے ایمان اور طاعت کی گواہی دے گا اور اس دنیا میں ان کے لیے وہ نمونہ بنتا ہے جیسا کہ فرمایا وکذٰلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (البقرۃ ۱۴۳) یا حضرت عیسیٰؑ کا قول کنت علیھم شھیدا مادمت فیھم (المائدۃ ۱۱۷) اور مخالفین کے لیے اس کی گواہی ان کے کفر اور عصیان پر ہوگی فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علی ھٰؤلاء شھیدا یومئذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول لو تسوّٰی بھم الارض (النسآء ۴۱-۴۲) اور اذن نہ دینے سے مراد عذر پیش کرنے کی اجازت ہے جیسا کہ فرمایا ولا یؤذن لھم فیعتذرون (المرسلٰت ۳۶) اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان پر جو عتاب ہوگا اسے بھی دور کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی اس لیے کہ عذر اور عتاب کا دور کرنا اس وقت کوئی فائدہ نہ دیگا۔

؏۱۷۷۴ دوسری جگہ ہے ما کنتم ایانا تعبدون (یونس ۲۸) اور ایک جگہ ہے۔ بل کانوا یعبدون الجن (السبا ۴۱) اپنے ہی توہمات کی پرستش کرتے ہیں کیونکہ ان چیزوں کے نیچے کوئی حقیقت نہیں جن کی پرستش بظاہر کرتے ہیں۔

عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾

جو افترا وہ کرتے تھے ان سے جاتا رہے گا۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

وہ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب بڑھا کر دیں گے، اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے[۱۷۷۵]

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى
ع ۱۸/۱۲ لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جس دن ہم ہر امت میں سے ان کے اندر سے ایک گواہ کھڑا کر دیں گے اور تجھے ان پر گواہ لائیں گے۔ اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری ہے (جو) ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی اور فرمانبرداروں کے لیے ہدایت اور رحمت اور خوش خبری (ہے)[۱۷۷۶]

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

اللہ تمھیں عدل اور احسان اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور زیادتی سے روکتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو[۱۷۷۷]

ع۱۷۷۵ ان کا جرم صرف خود کفر کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکنا بھی ہے اس لئے عذاب پر عذاب بڑھایا۔

ع۱۷۷۶ اس آخری آیت میں وہی ذکر کر کے جو پہلی آیت میں کیا تھا قرآن کریم کا ذکر کیا جس وحی الٰہی کا انکار ہو رہا تھا۔ اور یوں اگلے رکوع کے مضمون سے تعلق قائم کیا۔ اور قرآن کریم کا تبیانا لکل شئی ہونا اس لحاظ سے ہے کہ تمام اصول مذہب کو اس میں کھول کر بیان کیا اور تمام ضروری تعلیم اپنے کمال کو پہنچائی اور تمام اصول باطلہ کی کھول کر تردید کی۔

ع۱۷۷۷ خیر و شر کی جامع تعلیم: پچھلی آیت میں جب قرآن کریم کو تبیانا لکل شئی کہا تو اب اس کی جامع تعلیم کا ایک نمونہ پیش کیا ہے اور اس آیت میں خیر اور شر کو پورے طور پر جمع کیا ہے خیر کی اقسام میں عدل اور احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کو بیان کیا ہے اور شر میں فحشاء اور منکر اور بغی اور یہ تینوں باتیں ایک ترتیب میں ہیں۔ عدل ادنیٰ درجہ کی نیکی ہے جو مساوات کے رنگ میں ہے یعنی جو کوئی تمہارے ساتھ نیکی کرے اس کے ساتھ نیکی کرنا یا احسان کے عوض احسان دیکھو ع۷۹۶ احسان وہ نیکی ہے جو بطور ابتدا بغیر کسی معاوضہ کے یا معاوضہ کے خیال کے کی جائے اور ایتاء ذی القربیٰ سے مراد صرف قریبیوں کو دینا نہیں گو صلہ رحمی بجائے خود ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے جس سے سب نیکیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ ایسا ایتاء مراد ہے جیسے ذی القربیٰ کا ہوتا ہے۔ قریبیوں کو انسان کسی احسان کے خیال سے نہیں دیتا۔ یہ بھی نہیں سمجھتا کہ میں کوئی نیکی کر رہا ہوں بلکہ یہ ایک فطری خواہش کے ماتحت ہوتا ہے۔ پس یہ تیسرا مرتبہ یہ چاہتا ہے کہ نیکی انسان میں فطری خواہش کی طرح بن جائے ایک کام کو جب انسان بار بار کرتا ہے تو آخر ہوتے ہوتے وہ اس کی طبیعت کا جزو بن جاتا ہے۔ پس انسان اس قدر احسان کی عادت کرے اور اس قدر بار بار اس کا اعادہ کرے کہ آخر ہوتے ہوتے احسان کرنا اس کی فطری خواہش کی طرح ہو جائے۔ اور اقسام شر میں سب سے پہلے فحشاء کا ذکر کیا یعنی ہر ایک امر جو بذات خود قبیح ہے گو اس کا اثر دوسروں پر ہو یا نہ ہو اور دوسری قسم منکر ہے جیسے دوسرے بُرا مانائیں اور اس کا انکار کیا جائے گویا اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔ اور تیسری قسم بغی ہے۔ جس میں انسان حد سے نکلنا چاہتا ہے وہ گویا ایسا تجاوز ہے جس کا اثر بہت ہی وسیع ہے۔ ایک دوسرے رنگ میں فحشاء قوت شہویہ سے پیدا ہوتا ہے۔ منکر قوت غضبیہ سے بغی قوت وہمیہ سے شہوت کا اثر بد دوسرے انسانوں پر بہت کم پڑتا ہے اور عموماً اس میں ظلم کا رنگ بہت کم ہوتا ہے غضب کے اثر بد کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے اور عموماً اس سے دوسرے انسانوں کو تکلیف پہنچتی ہے مگر سب سے بڑے مظالم دنیا میں قوائے وہمیہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قومیں کی قومیں اور ملکوں کے ملک صرف ایک وہم کے ماتحت تباہ کر دیئے جاتے ہیں اور یہ تینوں قوتیں اگر حالت اعتدال پر آ جائیں تو انسان بدی کی تمام راہوں سے بچ سکتا ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس آیت کو خطبہ جمعہ کے آخر میں داخل کیا۔

وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدۡتُّمۡ وَ لَا تَنۡقُضُوا الۡاَيۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡكِيۡدِهَا وَ قَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ عَلَيۡكُمۡ كَفِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿٩١﴾

اور اللہ (تعالیٰ) کے عہد کو پورا کرو، جب تم عہد کر لو اور قسموں کو ان کے پکا کرنے کے بعد مت توڑو اور تم اللہ تعالیٰ کو اپنا ضامن کر چکے ہو، اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو[۱۷۷۸]

وَ لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّتِىۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَهَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ اَنۡكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوۡنَ اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًاۢ بَيۡنَكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرۡبٰى مِنۡ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبۡلُوۡكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ مَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿٩٢﴾

اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ، جس نے محنت کرکے کاتا ہُوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا موجب بنا لیتے ہو اس لیے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھ کر ہو۔ اللہ اس طرح صرف تمھیں آزماتا ہے اور وہ ضرور تمھارے لیے قیامت کے دن وہ باتیں کھول کر بیان کرے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے[۱۷۷۹]

ع[۱۷۷۸] تنقضوا نقض۔ ابرام کی ضد ہے اور اس کے معنی ہیں ایک چیز کے اجزا کا الگ کر دینا اور بکھیر دینا۔ اور استعارہ عہد شکنی پر بولا جاتا ہے الذین ینقضون عہد اللہ (البقرۃ ۲-۲۷) ینقضون عہدھم (الانفال ۸-۵۶)۔ اور نقیض ایک چیز کی وہ ہے کہ وہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہو سکتیں اور انقض ظھرک (الانشراح ۹۴-۳) میں انقض کے معنی ہیں توڑ دیا یہاں تک کہ اس کی نقیض ہو گئی (غ)۔

توکید۔ وَکَّدَ اور اَکَّدَ قول اور فعل دونوں کے لیے آتا ہے جس کے معنی ہیں اسے مضبوط کیا۔

اللہ کا عہد اس کی شریعت ہے یا اس کی وحی اور اذا عاھدتم سے ان کا منہ سے قبول کرنا مراد ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلعم پر جو اللہ کے رسول ہیں ایمان لا کر اور آپ کے ہاتھ پر اقرار کرکے گویا اللہ کو ضامن بنایا گیا۔ کہ ہم اس عہد کو پورا کریں گے۔ پس جب قرآن کریم کی ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم بتائی اور یہ بتایا کہ وحی الٰہی تمہیں ہر نیکی کی طرف اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی نیکی کی طرف بلاتی ہے اور ہر بدی سے روکتی ہے تو اب یہ بھی سمجھایا کہ نرا منہ سے اقرار کر لینا کافی نہیں بلکہ جب تم نے پختہ عہد کیا ہے تو اسے پورا بھی کرکے دکھاؤ۔

ع[۱۷۷۹] غزل۔ غَزۡل عورت کا سوت کاتنا ہے اور مغزل یعنی کاتے ہوئے سوت کو بھی غَزۡل کہتے ہیں اور غَزَل عورتوں کے ساتھ کھیل وغیرہ شغل میں مصروف ہونا ہے (غ)

انکاث۔ نِکۡث کی جمع ہے اور نَکۡث سوت کا توڑنا یا کپڑے کا اُدھیڑنا ہے۔ اور نقض کے قریب قریب ہے اور نقضِ عہد پر بھی بولا جاتا ہے وان نکثوا ایمانہم (التوبۃ ۹-۱۲) اذا ھم ینکثون (الاعراف ۷-۱۳۵) (غ)۔

دَخَل۔ دُخُول کے معنی داخل ہونا یا اندر آنا ہیں اور مکان اور زمانہ اور اعمال میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور دَخَل فساد اور عداوت سے کنایہ ہے جیسے دَغَل (غ)

اربیٰ۔ رَبَا سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز بڑھ گئی اور ترقی کی۔ اور اربیٰ سے مراد یہاں ہے گنتی میں زیادہ یا مال میں زیادہ۔

تفرقہ پر ایک مثال: بخاری میں اور تفاسیر میں ایک عورت کا ذکر ہے جو مکہ میں تھی جو دن بھر کات کات کر شام کو توڑ دیا کرتی تھی اور یہ اس کا جنون تھا مگر سیاق بتاتا ہے اور ایسی ہی روایت مجاہد وغیرہ سے ہے کہ یہ ایک مثال کے طور پر ہے خاص عورت کا ذکر مقصود نہیں (ج) گویا پچھلی آیت میں جو فرمایا تھا کہ جب اللہ سے عہد کیا ہے یعنی ایمان لائے ہو تو اسے پورا کرو تو یہاں بتایا کہ اسے پورا نہ کرنا گویا اس عورت کی مثال ہے جو کات کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دے بظاہر یہ ایک مجنون کا فعل ہے مگر دنیا میں کتنے عقلمند کہلانے والے ہیں جو اسی فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے ایک عمارت کو کھڑا کرتے ہیں پھر خود اس کی جڑ بنیاد کو اکھیڑتے ہیں مسلمانوں کو جس بات سے بچنے کی نصیحت کی تھی انہوں نے اس کا ارتکاب کیا اور اپنے ہی افعال سے اپنے کیے کرائے کام کو بگاڑا۔ اور سب سے زیادہ نقصان جو پہنچا وہ اسی بات سے پہنچا جس کا ذکر یہاں کیا ہے یعنی باہم اختلاف اور ان معاہدات کو مد نظر نہ رکھنا جو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ اس وجہ سے کہ ایک جماعت اپنے آپ کو دوسری جماعت سے زبردست دیکھتی ہے یا اس لیے کہ وہ زبردست ہو جائے یہی مسلمانوں کی بیماری ہے جس نے انہیں موجودہ حالت تک پہنچایا جن کی دنیا پر پھیلی ہوئی حکومت اس مجنون عورت کے سوت کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

اہل جاہلیت اور معاہدات اور یورپ کی حالت: مگر اب بھی اس کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں تتخذون ایمانکم یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔ جہاں اہل جاہلیت کا ذکر

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۹۳

اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں ایک ہی گروہ بنا دیتا، لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور ضرور تم سے پوچھا جائے گا جو تم کرتے تھے۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۹۴

اور اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا موجب نہ بناؤ، ایسا نہ ہو کہ قدم جمے پیچھے پھسل جائے اور تم تکلیف کا مزہ چکھو۔ اس لیے کہ تم نے اللہ کی راہ سے روکا اور تمھیں بڑا عذاب ہو[۱۷۸۰]

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹۵

اور اللہ کے عہد کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو، جو اللہ کے پاس ہے تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۶

جو تمھارے پاس ہے وہ جاتا رہے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور جنھوں نے صبر کیا ان کے بہترین اعمال کے لیے جو انھوں نے کیے ہم ضرور انھیں اجر دینگے[۱۷۸۱]

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۷

جو کوئی اچھا عمل کرتا ہے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہے ہم یقیناً اسے ایک پاک زندگی میں زندہ رکھیں گے اور ہم انھیں بہترین اعمال کا جو وہ کرتے تھے اجر دیں گے[۱۷۸۲]

ہے یا عام طور پر دنیا کی روش کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کو خاص حکم اس بارہ میں آیت ۹۴ میں موجود ہے۔ اہل جاہلیت میں یہ رواج عام تھا کہ معاہدے موجود ہوتے مگر ایک قوم ذرا اپنے آپ کو دوسری سے طاقتور پاتی تو سب معاہدات کو بالائے طاق رکھ دیتی۔ بعینہٖ جیسے آج یورپ کی حالت ہے۔ کہ جس قوم کو کمزور دیکھا، اس کے ساتھ معاہدہ ردّی کاغذ کا ٹکڑا بن جاتا ہے۔

۱۷۸۰ فتزل قدم بعد ثبوتہا صاف بتاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا ذکر ہے کہ ان کا قدم جم کر پھر باہمی فسادات سے پھسل جائیگا اور یوں وہ اللہ کی راہ سے روکنے والے ہو جائیں گے۔ اور عذاب بھی ان پر آئے گا کیا آج اسی حکم کی خلاف ورزی کی سزا تو ہم پر نہیں!

۱۷۸۱ ینفد۔ نَفَاد کے معنی فناء ہیں ان ھذا لرزقنا مالہ من نفاد (صٓ ۳۸-۵۴) لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی (الکہف ۱۸-۱۰۹) (غ) مال دنیا ختم ہو جاتا ہے مگر اعمال حسنہ کے نتائج ختم نہیں ہوتے۔

۱۷۸۲ اس آیت میں جیسا کہ اور بھی کئی موقعوں پر قرآن شریف نے نہایت صفائی سے بتا دیا ہے کہ اعمال حسنہ کی جزا میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں باوجود ان صراحتوں کے عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن شریف کی رو سے عورت میں روح کوئی نہیں۔ جو اصل میں ان کا اپنا خیال تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ یہاں حیات کا ہی ذکر ہے۔ حیات طیبہ دینے سے کیا مراد ہے۔ بعض نے کہا اس دنیا کی زندگی جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو وہ مومن کو ہی میسر آتی ہے اور یہ درست ہے بعض نے کہا اس سے مراد برزخ میں پاک زندگی کا عطا فرمانا ہے اور بعض نے کہا آخرت میں جنت کی زندگی۔ اور حق یہ ہے کہ یہ تینوں زندگیاں ایک ہی تسلسل میں ہیں بہشتی زندگی اسی دنیا سے شروع ہوتی ہے اور یقیناً وہ قبر میں بھی رہتی ہے اور پھر قیامت کو اپنی پوری چمکار کے ساتھ ظاہر ہوگی مراتب ضرور ہیں مگر چیز ایک ہی ہے۔ اور اسی پاک زندگی کا یہاں ذکر ہے جو یہاں سے شروع ہو کر ترقی کرتی چلی جائے گی اور ختم کبھی نہ ہوگی۔ قیامت کے ظہور کے بعد پھر اس کے اور کمالات ظاہر ہوں گے۔ وما عند اللہ باق۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾

سو جب تو قرآن پڑھنے لگے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ ۱۷۸۳

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾

کیوں کہ اس کا کوئی غلبہ اُن لوگوں پر نہیں جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع

اس کا غلبہ صرف اُنہی لوگوں پر ہے جو اُسے دوست بناتے ہیں اور وہ جو اس کے ساتھ شریک بنانے والے ہیں ۱۷۸۴

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

اور جب ہم ایک پیغام کی جگہ دُوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے جو وہ اُتارتا ہے، کہتے ہیں تُو تو افترا کرنے والا ہے بلکہ اُن میں سے اکثر نہیں جانتے ۱۷۸۵

ع۱۷۸۳ تلاوت قرآن اور استعاذہ: فاذا قرات القرآن سے مراد ہے جب قرآن شریف پڑھنے لگو تو اس وقت استعاذہ کر لیا کرو۔ اور سب سے مشہور استعاذہ اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ہے جو اسی آیت کے حکم کی تعمیل ہے اور بعض روایتوں میں اعوذ باللّٰہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم بھی آیا ہے۔ اور تعامل سے بھی یہی ثابت ہے کہ اعوذ قرآن شریف کے شروع کرتے وقت پڑھا جاتا ہے۔ اور ختم کر کے پڑھنا مراد نہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ استعاذہ کی ضرورت ہر وقت ہے اور خاتمہ پر بھی ہے اور قرآن کریم کا خاتمہ بھی معوذتین پر ہی ہے اور ظاہر حکم کی تعمیل تو لفظوں میں ہوتی ہے مگر مراد یہی ہے کہ انسان ہر اس راہ سے جو شیطان کی طرف لے جاتی ہے بچنے کی کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ تلاش کرے اور قرآن شریف تو خود اللہ تعالیٰ کی راہ ہے پس اس کے پڑھنے سے پہلے شیطان سے بچنے کی درخواست بارگاہ الٰہی میں کرنا عین مناسب موقعہ ہے۔ پھر اس کی تعلیم پر قیام بھی سوائے اس کے میسر نہیں آسکتا۔

ع۱۷۸۴ شیطان کا تسلط کس پر ہے: ان دو آیات میں نہ صرف یہ بتا دیا کہ مومنوں پر شیطان کا کوئی تسلط نہیں بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ ان کا تسلط انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو خود اس کی ولایت میں جاتے ہیں اور اسے اپنا دوست بناتے ہیں۔ ورنہ کسی شخص پر بھی شیطان کا تسلط نہیں۔ ان عبادی لیس لك علیھم سلطان (الحجر ۱۵ - ۴۲)

ھم بہ مشرکون کے ایک تو وہ معنی ہیں جو ترجمہ میں اختیار کئے گئے ہیں یعنی اس کی وجہ سے یا اس کے اغوا سے شرک اختیار کرتے ہیں اور بہ میں ضمیر ربہم کی طرف بھی جا سکتی ہے یعنی وہ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں اور ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ شیطان کو اپنے اعمال میں شریک کرتے ہیں۔

ع۱۷۸۵ قرآن میں نسخ نہیں: تمام مفسرین نے اس آیت کے یہ معنی کئے ہیں کہ ہم ایک آیت قرآنی کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسری لاتے ہیں حالانکہ ادنےٰ تدبر سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ آیت قرآنی کے منسوخ ہونے کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ اول یہ کہ یہ کفار کا قول ہے اور ان کو اس سے کیا واسطہ تھا کہ آج کون سا حکم قرآنی منسوخ ہوا ہے اور کونسا قائم ہے۔ وہ تو اصول کے ہی مخالف تھے۔ اور یہ تو ہوا نہیں کہ پہلے قرآن نے کبھی شرک کو جائز رکھا ہو پھر منسوخ کر دیا ہو کہ کفار ایسا کہتے۔ دوم یہ کہ سیاق عبارت ناسخ و منسوخ کی بحث کو نہیں چاہتا اصل مضمون کفار کے مقابلہ پر وحی الٰہی کی صداقت کو ثابت کرنا ہے اور آگے آیت ۱۰۳ میں صاف ان کا قول مذکور ہے کہ ایک بشر آپ کو سکھاتا ہے۔ سوم یہ کہ یہ سورت مکی ہے اور جن آیات کو ناسخ کہا جاتا ہے وہ سب مدینہ کی نازل شدہ ہیں جب مکہ میں تفصیلات شریعت ہی نازل نہیں ہوئیں تو منسوخ کیا چیز کی گئی اور یہ قطعی دلیل ہے کہ اس آیت میں ناسخ و منسوخ قرآنی کا کوئی ذکر نہیں۔ چہارم یہاں تبدیل آیت کا ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہاں ان آیات کا ذکر ہے جو قرآن کریم کے اندر نہیں اس لیے بین الدفتین کے ناسخ و منسوخ کا یہاں کوئی ذکر نہیں اور ایسی کسی آیت کا ہمیں علم نہیں جو منسوخ التلاوۃ اور منسوخ الحکم ہو۔ پنجم اگلی آیت میں اس کے نازل کرنے کی غرض یہ بتائی کہ مومنوں کو مضبوط کیا جائے اور مسلموں کیلئے ہدایت اور بشارت ہو۔ بعض آیتوں کے بعض کو منسوخ کرنے سے مومن کس طرح مضبوط ہو سکتے تھے۔ اور کسی آیت قرآنی کے منسوخ ہونے میں ان کے لیے ہدایت اور بشارت کیا تھی یہ تو سارے قرآن کے نزول کی شان ہے جیسا کہ فرمایا لنثبت بہ فؤادك (الفرقان ۲۵ - ۳۲) ششم جب کفار تک کو یہ علم تھا اور مکہ میں ہی علم تھا کہ رسول اللہ صلعم نے فلاں فلاں آیتوں کو جو پہلے قرآن میں تھیں منسوخ کر دیا ہے تو تعجب ہے کہ ایک بھی صحابیؓ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ کبھی آنحضرت صلعم نے کسی آیت کو منسوخ فرمایا ہو۔ قرآن میں عدم تنسیخ پر اور دلائل کے لیے دیکھو ع۱۳۸۔

یہاں بھی آیت کے بدلنے سے نئی رسالت یا نئے پیغام الٰہی کا آنا مراد ہے دیکھو ع۱۳۸ اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ پچھلے سے پچھلے رکوع میں دوسرے

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

کہہ اسے رُوح القدس نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اُتارا ہے تاکہ انھیں مضبوط کرے جو ایمان لائے اور وہ فرمانبرداروں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾

اور ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اسے تو ایک انسان سکھاتا ہے اس کی زبان جس کی طرف یہ (سکھانے کی) نسبت کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ کھلی عربی زبان ہے ۱۸۸۶ ع

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

جو لوگ اللہ کی باتوں پر ایمان نہیں لاتے اللہ انھیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

جھوٹ تو صرف وہ لوگ بناتے ہیں جو اللہ کی باتوں پر ایمان نہیں لاتے اور وہی جھوٹے ہیں ۱۸۸۷ ع

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ

جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کرتا ہے مگر وہ نہیں جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

انبیاء کا جو اپنی اپنی قوموں میں آئے ذکر کیا تھا۔ دیکھو آیت ۸۴ و آیت ۸۹۔ اور پچھلے رکوع میں صرف یہ بتایا کہ قرآن کریم کی تعلیم نیکی سکھانے والی اور بدی سے روکنے والی ہے تو اب کفار کے اس اعتراض کا ذکر کیا کہ جب پہلے بھی رسول آئے تھے تو نئے رسولوں کی کیا ضرورت ہے اور کیوں اس نے سابق شرائع کو منسوخ کیا اس لیے وہ کہتے ہیں کہ یہ تو بہر حال افترا ہے۔ اس کا جواب دیا ہے کہ روح القدس نے اسے نازل کیا ہے اور روح القدس کے نازل کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا گناہ کی ظلمت میں مبتلا تھی اس کے دور کرنے کے لیے اس وحی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے ایک عالم کو گناہ سے پاک کر کے دکھا بھی دیا اور اس ظلمت کا ذکر رسول اللہ صلعم کے ظہور کے متعلق پیچھے ہو چکا ہے اور بالحق کہنے میں یہ اشارہ ہے کہ باوجود پہلی رسالتوں کے ایک نئی رسالت کی ضرورت تھی جس پر قرآن کریم میں بار بار دلائل گزر چکی ہیں۔

۱۸۸۶ ع یلحدون الیه۔ الحاد کے اصل معنی مَیل اور عُدُول ہیں یعنی ایک طرف مائل ہونا یا جھک جانا۔ اور لَحَدَ الیه بلسانه کے معنی ہیں مَالَ یعنی مائل ہوا یہاں اَلحَدَ ہے اور فراء کا قول ہے کہ یلحدون کے معنی یعترضون ہیں یعنی اعتراض کرتے ہیں اور من یرد فیه بالحاد بظلم (الحج ۲۲ - ۲۵) میں الحاد کے معنی اعتراض ہیں اور زجاج نے الحاد کے معنی اللہ کے بارہ میں شک کرنا دیئے ہیں اور ظلم بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں (ل)

مخالفین کا اعتراض کہ کوئی انسان آپ کو سکھاتا ہے: کفار مکہ بھی ایسے اعتراض کرتے تھے اور مخالفت حق میں ان کے پیرو عیسائی بھی یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کفار قریش جن لوگوں کے نام لیتے تھے وہ سب اہل کتاب عموماً عیسائی نومسلم تھے جو عجمی لوگ تھے کسی روایت میں جبر کا نام ہے اور کسی میں عایش یا یعیش کا اور ایک میں یسار کا (جو کہا جاتا ہے کہ یہودی تھا) اور ایک میں ہے کہ عبداللہ بن مسلم الحضرمی نے کہا کہ ہمارے دو نصرانی غلام تھے یسار اور جبر جو مکہ میں تلواریں بنایا کرتے تھے اور وہ انجیل پڑھا کرتے تھے۔ نبی کریم صلعم وہاں سے کبھی گزرتے تو ٹھہر جاتے تو مشرک کہتے کہ آپ ان سے سیکھتے ہیں۔ جتنے لوگوں کے نام لیے گئے ہیں وہ سب عجمی تھے اور نومسلم غلام تھے۔ ان میں سے امر اول کو تو صفائی سے بیان کیا ہے قرآن کریم کی زبان ہمیشہ کے لیے عربی زبان کی فصاحت کا معیار ہو گئی اسے کوئی عجمی کب سکھا سکتا تھا؟ اور امر دوم کی طرف اگلی آیات میں اشارہ کیا ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ اسلام کی خاطر کیا کیا تکلیفیں لوگوں کو اٹھانی پڑیں۔ اول تو ایسے لوگ جو خود سکھاتے ہوں مسلمان ہی کس طرح ہو سکتے تھے پھر ان ایذاؤں اور تکلیفوں کو برداشت وہ کیوں کرتے جب جانتے تھے کہ یہ نرا جھوٹ ہے جو ہم خود سکھا رہے ہیں جن دکھوں اور تکلیفوں میں سے مسلمان گزرے انہوں نے ان کے اخلاص پر تو ضرور مہر لگا دی اور جو کوئی چاہے کہے افترا کرنے والے یا افترا میں حصہ لینے والے انہیں کوئی نہیں کہہ سکتا۔

۱۸۸۷ ع ان دونوں آیتوں میں بتایا کہ یہ لوگ یعنی رسول اللہ صلعم اور آپ کے ساتھی مفتری نہیں ہو سکتے کیونکہ جو اللہ پر افترا کرتا ہے وہ آیات اللہ پر ایمان نہیں لا سکتا اور جو آیات اللہ پر ایمان نہیں لاتا وہ اس ہدایت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ خطرناک دکھوں اور تکلیفوں کا مقابلہ افترا کرنے والے نہیں کر سکتے۔ اگلی

مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

بلکہ وہ جس کا سینہ کفر پر کھل جائے تو ان پر اللہ کی طرف سے غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے [۱۴۸۸]

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠٧﴾

یہ اس لیے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی آخرت پر عزیز رکھی اور کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو منزلِ مقصود پر نہیں پہنچاتا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿١٠٨﴾

یہی وہ ہیں جن کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور وہی غافل ہیں [۱۴۸۹]

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٠٩﴾

کچھ شک نہیں کہ وہی آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٠﴾ ع

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اس کے بعد کہ انھیں دکھ دیا گیا ہجرت کی پھر جہاد کیا اور صبر کیا یقیناً تیرا رب اس کے بعد حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے [۱۴۹۰]

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ

جس دن ہر شخص اپنی ہی ذات کے لیے جھگڑا کرتا آئے گا اور ہر شخص کو

آیت میں اس مضمون کو اور کھولا ہے۔

۱۴۸۸ حالت مجبوری میں کلمہ کفر: اصل غرض تو اسی بات کا بیان کرنا ہے کہ کس ہمت اور کس قوت ایمانی سے مسلمانوں نے مصائب کا مقابلہ کیا اسی ضمن میں ان لوگوں کا ذکر بھی کر دیا ہے جو بعض وقت بتقاضائے بشریت کافروں کے ظلم کے نیچے منہ سے کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں جس سے ان کی جان بچ جائے بشرطیکہ قلب میں ایمان ہو۔ لیکن جو کفر کے دباؤ کے نیچے آ کر کفر پر راضی ہو جائیں تو ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ وہ غضب الٰہی کے نیچے ہیں۔ رہے وہ جو ایک وقت قلب میں تو کچھ انکار نہیں پاتے لیکن زبان سے انکار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو یہ کوئی اعلیٰ مقام نہیں ہاں چونکہ جان بچانے کی مجبوری کے لیے وہ ایسا کرتے ہیں۔ اس لیے ایک حد تک انہیں قابل سمجھا ہے چنانچہ ان دو شخصوں کے معاملہ میں جن میں سے ایک نے جان بچانے کے لیے مسیلمہ کذاب کے سامنے کلمۂ انکار کہہ دیا اور دوسرا وجہ اپنی ثابت قدمی کے شہید کیا گیا۔

مسلمانوں کا ایمان اور اخلاص: نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ ایک نے رخصت سے فائدہ اٹھایا مگر دوسرے نے حق کو نہ چھپایا سو اس کے لیے مبارک ہے اور اصل میں ایمان کامل یہی ہے کہ جان کی بھی پروا اس کے مقابلہ میں انسان نہ کرے اور یہی اکثر مسلمانوں نے کیا۔ ایسے لوگوں کی مثالیں جنھوں نے کافروں کے ظلم کے نیچے کلمہ کفر کہہ دیا ہو شاذ و نادر ملیں گی مگر ان لوگوں کی مثالیں جنھوں نے خوش دلی سے نہ صرف تکلیفیں اٹھائیں بلکہ گردنیں بھی کٹوائیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ وما ان ابالی حین اقتل مسلماً۔ علی ای شق کان للہ مصرعی۔

۱۴۸۹ اللہ کن کے دلوں پر مہر لگاتا ہے؟ جو دنیا کی زندگی میں غرق ہو کر آخرت کی پروا نہیں کرتے اور وہ مہر کیا ہے ان کی وہ حالت قلبی ہے جس کا نقشہ یہ ہے اولئك هم الغافلون۔

۱۴۹۰ ہجرت حبش اور ہجرت مدینہ: آخر میں ان لوگوں کا ذکر کیا جو نہ صرف خوش دلی سے اللہ کی راہ میں ہر قسم کی مصائب برداشت کرتے ہیں بلکہ آخر کار گھر بار کو وطن کو عزیز و اقارب کو بدی سے بچنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ بلکہ پھر اللہ کی راہ میں جہاد بھی کرتے ہیں یعنی اپنا سارا زور بھی لگاتے ہیں اور پورے استقلال سے کھڑے ہو جاتے ہیں ایسے کامل الایمان لوگوں کے لیے اللہ کا غفور ہونا یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ انھیں اپنی حفاظت میں لیکر گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ اس سورت میں دوبارہ ہجرت کا ذکر ہے اور اس سے مراد مدینہ کی ہجرت ہی ہے جس سے اس کے زمانۂ نزول کا پتہ بھی لگتا ہے کیونکہ اگر ہجرت حبشہ کا ذکر ہوتا تو پہلی بہت سی سورتوں میں بھی اس کا ذکر ہوتا، جو درمیانی زمانہ کی نازل شدہ ہیں اس ہجرت کا ذکر قرآن کریم نے اس لیے نہیں کیا کہ وہ ہجرت جس سے علم الٰہی میں مسلمانوں کی کامیابیاں وابستہ تھیں مدینہ کی ہجرت ہی تھی۔ مکی سورتوں میں جہاد کا ذکر جب ابھی قتال کی اجازت نازل نہیں ہوئی صاف بتاتا ہے کہ یہ جہاد اعلائے کلمۃ اللہ ہے جو ہر مسلمان کا سب سے پہلا فرض ہے۔

تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

جو اُس نے کیا پورا دیا جائیگا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا[۱۷۹۱]

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور اللہ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے، جو امن اور اطمینان کی حالت میں تھی، اس کی روزی ہر جگہ سے اس کے پاس بافراغت آتی تھی پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے لباس کا مزہ چکھایا، اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے[۱۷۹۲]

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور ان کے پاس ایک رسول انہی میں سے آیا تو انھوں نے اُسے جھٹلایا سو عذاب نے انھیں آلیا اور وہ ظالم تھے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

سو اس سے جو تمھیں اللہ نے دیا ہے حلال اچھی چیزیں کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اس نے تم پر صرف مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت حرام کیا ہے اور وہ جس پر اللہ کے سوائے کسی دوسرے کا نام پکارا جائے پھر جو شخص ناچار ہو جائے نہ خواہش کرنے والا اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے[۱۷۹۳]

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى

اور اسے جو تمھاری زبانیں جھوٹ بیان کر دیتی ہیں نہ کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ اللہ پر جھوٹ باندھو

ع۱۷۹۱ تجادل۔ جَدَلْتُ الْحَبْلَ کے معنی ہیں میں نے رسّہ کو مضبوط بٹا اور عمارت کے مضبوط بنانے پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے اور جدال یہ ہے کہ گویا ہر شخص دوسرے کو اپنی رائے سے ہٹانا چاہتا ہے (غ) یعنی دلائل کے ساتھ جھگڑنا وجادلھم بالتی ھی احسن (۱۲۵) الذین یجادلون فی ایات اللہ۔ (المومن۴۰۔ ۳۵) قد جادلتنا فاکثرت جدالنا (ھود۱۱۔ ۳۲) یجادلنا فی قوم لوط (ھود۱۱۔ ۷۴) اور یہاں مراد جھگڑا کرنے سے اپنی خلاصی کا جھگڑا یا کوشش یا اس کے لیے عذروں کا پیش کرنا ہے ؎

ع۱۷۹۲ لباس الجوع والخوف۔ لباس وہ چیز ہے جو پہنی جاتی ہے یا جسم کو ڈھانک لیتی ہے اور خوف اور جوع کو لباس کہا گویا اس نے جسم اختیار کرکے لباس کی صورت اختیار کر لی۔ (غ) اور چاروں طرف سے انسان کو ڈھانک لیا۔

اہل مکہ کی سزا: یہ قریہ یا بستی جس کی مثال دی ہے مکّہ ہے (ج) امن اور اطمینان کی وہ حالت جو دنیا میں کسی بستی کو میسر نہیں آئی اور باوجود وادئ غیر ذی زرع ہونے کے ہر قسم کے پھل اور غلہ وہاں پہنچتا۔ سارے عرب کی چیزیں گھر بیٹھے ان کے پاس پہنچ جاتیں، اللہ کی نعمتوں کی ناشکری یہ کہ جب سب سے بڑی روحانی نعمت ملی تو اسے قبول نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے بھوک اور خوف کے رنگ میں عذاب آیا بھوک تو یہ کہ سات سال کا قحط پڑا جس کی پیشگوئی پہلے سے ہو چکی تھی فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین (الدخان۴۴۔ ۱۰) اور خوف ایک اس لحاظ سے کہ اسلام کی قوت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ دوسرے مدینہ میں مسلمانوں کی ہجرت کی وجہ سے تجارت کے رک جانے کا خوف تیسرے آیندہ جنگوں کی وجہ سے خوف۔ امن و اطمینان کی جگہ بھوک اور خوف کفران نعمت یعنی انکار رسول کی سزا تھی جیسا کہ اگلی آیت میں صاف ذکر ہے الفاظ قرآنی کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اور آج بھی یہ لفظ کسی بستی پر صادق آتے ہیں۔

ع۱۷۹۳ اہل مکہ جو قرآن کو افترا کہتے تھے انہیں بتایا ہے کہ جو حق ہے اسے تم افترا کہتے ہو اور خود افترا کرتے ہو۔ چنانچہ غذاؤں کی حلت و حرمت کے متعلق وہ اللہ تعالیٰ پر یہ افترا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یوں حکم دیا ہے اگلی آیت میں اسے اور صاف کیا ہے ؎

اللّٰہِ الْکَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ؕ﴿۱۱۶﴾

جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ کامیاب نہیں ہوتے ۔

مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ۪ وَّ لَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۱۷﴾

تھوڑا سامان ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۔

وَ عَلَی الَّذِیْنَ ہَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَیْکَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ مَا ظَلَمْنٰہُمْ وَ لٰکِنْ کَانُوْۤا اَنْفُسَہُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور ان پر جو یہودی ہیں ہم نے وہی حرام کیا تھا جو تجھ پر پہلے بیان کر چکے ہیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے تھے ۱۷۹۴

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَ اَصْلَحُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّکَ مِنْۢ بَعْدِہَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۹﴾ ع

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جو نادانی سے بدی کر بیٹھتے ہیں پھر اس کے بعد توبہ کرتے ہیں اور اصلاح کر لیتے ہیں یقیناً تیرا رب اس کے بعد حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۔ ۱۷۹۵

اِنَّ اِبْرٰہِیْمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیْفًا ؕ وَ لَمْ یَکُ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۲۰﴾ۙ

ابراہیمؑ ایک امام اللہ کا فرماں بردار راست رَو تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا ۱۷۹۶

شَاکِرًا لِّاَنْعُمِہٖ ؕ اِجْتَبٰىہُ وَ ہَدٰىہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۲۱﴾

اس کی نعمتوں کا شکر کرنے والا اس نے اُسے چُن لیا اور اسے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کی ۔

وَ اٰتَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً ؕ وَ اِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ؕ

اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے ۔

ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰہِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۲۳﴾

پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیمؑ راست رَو کے دین پر چل اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا ۱۷۹۷

۱۷۹۴ یہ سورۂ الانعام - ۱۴۷ میں بیان ہو چکا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورہ انعام اس سورت سے پہلے نازل ہوئی تھی ۞

ع ۱۷۹۵ سزا اور عذاب کے ذکر کے ساتھ یہ بشارت بھی ہے کہ یہ تم جہالت سے بُرے کام کر رہے ہو ۔ اگر توبہ کرو اور اصلاح کرو تو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ گناہ بخش دے گا بلکہ تم پر رحم بھی کرے گا ۞

ع ۱۷۹۶ امۃ اُمَّۃ جماعت کو کہتے ہیں اور امام راغب نے یہاں معنی کئے ہیں کہ اللہ کی عبادت میں ایک جماعت کے قائم مقام تھے (غ) لیکن اس کے اور معنی بھی آئے ہیں چنانچہ ہر شخص کو جو دین حق پر ہو کر سب ادیان کا مخالف ہو اُمّۃ کہا جاتا ہے ۔ اور ایسا ہی وہ شخص جو اپنی نظیر نہیں رکھتا اور ابو عبیدہ نے اس کے معنی امام کئے ہیں اور معلّم خیر بھی اس کے معنی کئے گئے ہیں (ل)

حضرت ابراہیمؑ کا ذکر اس آخری رکوع میں دو وجہ سے کیا ۔ ایک کفار کو توجہ دلانے کے لیے کہ حضرت ابراہیمؑ جن کی وہ پیروی کا دعوےٰ کرتے ہیں مشرک نہ تھے دوسرے مسلمانوں کو بتانے کے لیے کہ وہ اس شخص کا طریق اختیار کریں جو دنیا میں راست بازوں کا سردار ہوا ۔ اور پھر اپنے زمانہ میں بے نظیر انسان تھا جس نے حق کی پیروی میں کسی کی پروا نہیں کی اور ابراہیمؑ کو امت کہنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نیکی کے معلم دنیا میں ہمیشہ سردار بن جاتے ہیں پس اگر مسلمان بھی دنیا میں نیکی کے معلم بنیں تو وہ بھی دنیا کے پیشوا بنا دیئے جائیں گے ۔ چنانچہ وان عاقبتم (۱۲۶) میں اور ان اللّٰہ مع الذین اتقوا (۱۲۸) میں مسلمانوں کی آئندہ شوکت کی طرف صاف اشارہ ہے ۞

ع ۱۷۹۷ ملت ابراہیمی پر چلنے کا ارشاد : یعنی وہی کام کرو جو ابراہیم نے کیا مطلب یہ ہے کہ تم بھی شرک کی بیخ کنی کرو جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے کی کیوں کہ ملت ابراہیمی کا اصل الاصول تو یہی بیان کیا کہ وہ مشرکوں میں سے نہ تھا ۔ شرک سے دنیا کو صاف کرنا حضرت ابراہیم کا بھی مقصد تھا یہی مقصد محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت کا تھا نیز دیکھو ع ۲۷۰ و ع ۹۸۰ ۞

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۲۴﴾

سبت (کا وبال) صرف ان لوگوں پر ڈالا گیا جنھوں نے اس میں اختلاف کیا اور تیرا رب قیامت کے دن ضرور ان میں ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے ۱۷۹۸ؑ

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۲۵﴾

اپنے رب کے رستے کی طرف ـ حکمت اور اچھے وعظ سے بُلا اور ان کے ساتھ اس طریق پر بحث کر جو نہایت عمدہ ہو۔ تیرا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے گمراہ ہوا اور وہ سیدھی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے ۱۷۹۹ؑ

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ﴿۱۲۶﴾

اور اگر تم (انھیں) بدلہ دو تو اتنا دو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی۔ اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت اچھا ہے ـ

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿۱۲۷﴾

اور صبر کر اور تیرا صبر اللہ کی مدد سے ہی ہے اور ان پر افسوس نہ کر اور اس کی وجہ سے تنگ نہ ہو جو وہ تدبیریں کرتے ہیں۔

۱۷۹۸ؑ السبت۔ سَبْت کے اصل معنی قطع عمل ہیں دیکھو ع۹۴ اور یہاں راغب نے مراد لیا ہے ترک العمل فیہ یعنی اس دن کام کا ترک کرنا اور سُبْت کے معنی مدت زمانہ بھی ہیں تھوڑی ہو یا بہت:

یہودیوں اور عیسائیوں کا سبت: اس آیت کے ماتحت مفسرین نے بخاری اور مسلم کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ بخاری کے لفظ یہ ہیں نحن الآخرون السابقون یوم القیامة بید انهم اوتوا الکتاب من قبلنا ثم هذا یومهم الذی فرض الله علیهم فاختلفوا فیه فهدانا الله له فالناس لنا فیه تبع الیهود غداً والنصاری بعد غد۔ ہم پیچھے آنے والے قیامت کے دن سب سے پہلے ہوں گے سوائے اس کے کہ انہیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی پھر ان کا دن تھا جو اللہ نے ان پر فرض کیا۔ مگر انہوں نے اس میں اختلاف کیا پس اللہ نے ہمیں اس کی طرف ہدایت دی سو لوگ ہمارے پیرو ہیں یہود کل اور عیسائی کل کے بعد۔ اور مسلم میں کچھ لفظوں کا اختلاف ہے اور اس کے ابتدائی الفاظ یوں ہیں۔ اضل الله عن الجمعة من قبلنا فکان للیهود یوم السبت وکان للنصاری یوم الاحد فجاء الله بنا فهدانا الله لیوم الجمعة اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو ہم سے پہلے تھے۔ جمعہ سے محروم رکھا سو یہودیوں کے لیے ہفتہ کا دن تھا اور عیسائیوں کیلئے اتوار کا پھر اللہ ہمیں لایا اور ہمیں جمعہ کے دن کیلئے رہنمائی فرمائی مفسرین نے آیت اور ان احادیث کا مطلب یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی قوموں کیلئے جمعہ کا دن ہی عبادت کا دن قرار دیا تھا۔ مگر انہوں نے خود ہفتہ اور اتوار کا دن اختیار کیا۔ اب آیت میں تو یہ ذکر قطعاً نہیں اور بخاری کی حدیث کا اگر یہ مطلب لیا بھی جائے جہاں دن کا نام بھی نہیں تو مسلم کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی یوم جمعہ سے ان لوگوں کو محروم رکھا اور ہفتہ اور اتوار کا دن ان کیلئے مقرر کیا اور یہودیوں نے باہم تو کوئی اختلاف سبت کے بارہ میں نہیں کیا نہ عیسائیوں نے بلکہ ان کے سبت متفقہ طور ہفتہ اور اتوار ہی رہے اور اتنے بڑے تعامل قومی میں اس قدر اختلاف کا ہونا بھی مشکل ہے۔ پھر یہود کے اندر نبی پر نبی آتے رہے اگر کسی وقت انہوں نے اس کو بدل دیا تھا تو اس کی اصلاح انبیاء کر دیتے اور بخاری کی حدیث کا مطلب کچھ اور ہونا چاہیئے۔

سبت میں اختلاف سے مراد: ممکن ہے یہی مراد ہو کہ اس امر پر یعنی نبی کریم صلعم پر پہلے عرب لوگ ایمان لائے بعد میں یہود و نصاریٰ لائیں گے۔ اور آیت کا مطلب سبت کے معنی عبادت کا دن لیکر یوں بھی ہو سکتے ہیں جعل وبال ترک تعظیم السبت یعنی سبت کی تعظیم کو ترک کرنے کا وبال ان لوگوں پر آیا جنہوں نے سبت میں اختلاف کیا یعنی سبت کی تعظیم کو قائم نہ رکھا۔ اور یہ معنی بعض مفسرین نے کئے ہیں اور یا سبت کے اصل معنی قطع عمل لے کر یہ مراد ہو گی کہ جن لوگوں نے قرآن شریف کے متعلق اختلاف کیا یا اسے نہ مانا ان کے عمل قطع ہو گئے۔ کیونکہ قرآن کریم اعمال صالحہ کی طرف توجہ دلاتا ہے اور بلحاظ سیاق یہ معنی سب سے زیادہ موزوں ہیں:

۱۷۹۹ؑ چونکہ اس سورت میں وحی الٰہی کی صداقت کا مسئلہ ہر قسم کی دلائل سے قائم کیا ہے اس لیے اس کے خاتمہ پر وحی کی اصل غرض دعوت الی الحق کا ذکر کیا اور اس کا طریق بتایا۔ حکمت مضبوط بات یا فہم ہے یا مضبوط دلیل اور وعظ تنبیہ کیلئے ہے۔ دعوت الی الحق میں یہی دو چیزیں ضروری ہیں۔ نہ دلائل محکمہ کے بغیر دعوت کا کام ہو سکتا ہے۔ نہ وعظ کے بغیر اس کے بعد جدال کا ذکر ہے یعنی بحث کا اس لئے کہ دعوت میں بحث کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے پس اگر بحث کی ضرورت پیش آئے تو عمدہ طریق پر بحث کی جائے جس سے دلوں میں تنفر اور باطل پر اصرار پیدا نہ ہو بلکہ حق بات کے فہم میں مدد ملے:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ ع	اللہ اُن کے ساتھ ہے جو تقوےٰ اختیار کرتے ہیں اور وہ جو احسان کرنے والے ہیں ۱۸۰۰

۱۸۰۰ عقاب فعل بد کے پیچھے اس کی سزا لانا ہے اور مطلق سزا یا دُکھ پہنچانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

دعوت الی الحق میں صبر کی ضرورت اور غلبہ کی پیشگوئی: پس مراد یہ ہے کہ تمہیں جو دُکھ اور تکلیفیں دی جاتی ہیں۔ ان کی سزا دینے کا موقعہ ملے تو اس سے زیادہ سزا نہ دو جس قدر تکلیف تمہیں پہنچائی گئی ہے بلکہ بہتر یہی ہے کہ تم صبر سے ہی کام لو اور بدلہ نہ لو۔ دعوت الی الحق میں اس کا ذکر اس لیے کیا کہ دعوت الی الحق کرنے والے لوگوں کو تکلیفیں بھی اٹھانی پڑتی ہیں۔ اگر وہ دنیا کے لوگوں کی طرح غلبہ کے وقت انتقام لیں تو دل ان سے متنفر ہو جائیں اس لیے فرمایا کہ تمہارا کام یہی ہے کہ دُکھ برداشت کرو اور کام کرتے جاؤ ہاں اگر کبھی ضرورت سزا دینے کی ہو تو اسی قدر سزا ہو جس قدر تکلیف تمہیں پہنچائی گئی تھی۔ سزا دینے کا ذکر کر کے صاف بتا دیا کہ تمہیں دنیا میں اس قدر غلبہ دیا جائے گا کہ تم اپنے مخالفین کو سزا دینے پر قادر ہو گے۔ اس آیت کا تعلق نہ سمجھنے کی وجہ سے اسے مدنی بھی کہہ دیا گیا ہے مگر اعتراض تو پھر بھی باقی رہے گا کہ اسے یہاں کیوں رکھا اور حق یہی ہے کہ یہ مکی ہے اگلی آیت میں پھر صبر کی تاکید کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہی اصل چیز ہے جس پر تعلیم قرآنی زور دیتی ہے دشمنوں کی ایذا پر صبر کے بغیر دعوت الی الحق کا کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا اور سب سے آخری آیت میں یہ عظیم الشان خوشخبری تسلی کے طور پر دی کہ اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں اور احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔